۱؍اپریل ۱۹۸۴ء   ایک روپیہ

بیکٹر کیوں؟
(محمد فضل)

چھاتی کا کینسر
(ڈاکٹر للت شرما)

وسنت ساٹھے

معاشرتی انقلاب کی جانب

اقتصادی جمہوریت کا مقصد

چھٹا باب

متبادل کیا ہو؟

قسط : ۱۶

جب کبھی ترقی پذیر ملکوں میں بے چینی کی صورت میں عوامی دباؤ بڑھتا ہے تو اس کا نتیجہ ہیجان کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ یہ جذبات کا سیلاب کسی بھی صورت میں سامنے آسکتاہے۔ یہ جس شکل میں سامنے آتاہے، اس کا اقتصادیات سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ اس موقع پر شہری حکّام کے اختیارات بے اثر ہوکر رہ جاتے ہیں اور فوج کو موقع مل جاتاہے اور وہ بندوق کی نالی سے مدافعت کرتی ہے اور انتظام اپنے ہاتھ میں لے لیتی ہے۔ بہت سے ترقی پذیر ملکوں میں یہی صورتِ حال دیکھنے میں آئی۔ جہاں جمہوریت کو فوجی حکومت کے سامنے ہتھیار ڈالنے پڑے۔ اس کی وجہ صرف یہی ہوئی کہ وہاں کوئی اقتصادی نظام رائج نہ ہوسکا۔ اور کوئی نظام نہ ملا جس سے عوام کی آزادی اور ترقی کو یقینی بنایا جاسکتا۔ اقتصادیات کے تحت ایسا کوئی جادوئی نظام نہیں ہے جو ایک طرف استحصال پسندی پر مبنی مخصوص مفادات کے حق میں ہو اور اس کے ساتھ ہی دوسری جانب تمام لوگوں کے لیے منصفانہ اور مساویانہ ترقی کا مظہر ہو۔ لیکن کم سے کم جبکہ نظام کی کایا پلٹ کی ضرورت لابد ہو جائے تو اس کا اظہار برملا ہونا چاہیئے جیسا کہ رال پری بیش نے کہا ہے :-

"ہوتا کیا ہے کہ وہ لوگ جو غریبی دور کرنے کی تجویز رکھتے ہیں، وہ بالعموم اپنا فارمولا پیش تو کردیتے ہیں لیکن یہ واضح نہیں کرپاتے کہ اس پر عمل درآمد کیسے ہو۔ کیا ازسرِنو تقسیم کا کام سادہ طریقے پر اور براہِ راست ہونا چاہیئے: کیا سماجی مساوات کا مسئلہ نظام کو متاثر کئے بغیر حل کیا جاسکتا ہے ؟ یہ بات قرینِ قیاس ہے کہ یہ ایسے ممالک میں تو آسان ہے جہاں کافی عرصہ گذر جانے کے دوران کافی سرمایہ اکٹھا کرلیا گیا ہے اور اس کے مقابلے غریبی چھوٹے پیمانے پر پائی جاتی ہے۔ لیکن دیگر بڑے ممالک میں جہاں حالات اس سے مختلف ہیں، اس طرح کا تصور دشوار ہے۔ ایک خاص حد تک تو اس کا صادر ہونا ممکن ہے اور اس کے بعد استحقاق یافتہ صارفین کے سماج سے مقابلہ کرنا دشوار ہے۔

جمہوری ملکوں کو متوازن ترقی کے قومی اقتصادی ضابطوں کو تسلیم کرنا ہوگا۔ اس کے لیے ایسا نظام ضروری ہے جس میں سبھی عوام اپنی اپنی سطح سے اس میں شریک ہوسکیں۔ انھیں پیداواری عمل اور اشیاء کی تقسیم کے عمل میں شرکت کرنی ہوگی۔ اقتصادی اور سیاسی جمہوریت کے تحت ہر سطح پر عوام کی شرکت ضروری ہے۔ یہ نظام عوام کے ذریعے، عوام کے واسطے اور عوام کا ہی ہونا چاہیئے۔ یہی اس مقالے کا مقصد ہے۔

اس کے لیے حکمراں پارٹی کو قیادت کرنی پڑے گی جو کہ خوش قسمتی سے عوام کی ہی ہے۔ خوش قسمتی سے یہاں کی قیادت کو عوام کا اعتماد اور ان کی شفقت حاصل ہے لیکن اس کے لیے سبھی سیاسی قوتوں کا تعاون درکار ہے اور اقتصادی جمہوریت پر سبھی کا اتفاق ہونا ضروری ہے۔ اسی لیے بات چیت کی ضرورت لاحق ہوتی ہے۔ یہ مقالہ اس طرح کی بات چیت کے لیے بنیاد فراہم کرتاہے۔ تمام تر پیچیدہ اقتصادی نظام کی مزید تفاصیل کو مرتب کرنا ہوگا اور یہ کام محض کوئی ایک فردِ واحد انجام نہیں دے سکتا۔ اس کے لیے ایک ڈھانچہ فراہم کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ جس سے کہ جمہوریت کا تحفظ ہوسکے اور اس کے ذریعے جملہ عوام کے لیے سماجی اور اقتصادی انصاف کو یقینی بنایا جاسکے۔

شراکت داری والی اقتصادی جمہوریت کے نظام کے تحت محنت کش طبقہ ہی شراکت دار ہوگا۔ انتظامیہ میں اس کا برابر کا حصہ ہوگا اور اس کے منتخبہ نمائندے اس میں ہوں گے۔ تمام نتائج سے انھیں آگاہی ہوگی۔ ایسی صورت میں ہڑتال یا تالہ بندی کی نوعیت نہیں آئے گی۔ بحیثیت مجموعی فنڈ کے پیشِ نظر نفع کی حصہ داری طے کی جائے گی۔ توسیع و تحقیق کی ضرورتوں کو بھی دھیان میں رکھا جائے گا اور ایک طبقہ دوسرے

راجندر انجم

دلی میں خاندانی بہبود کے پروگرام

صنعت اور خاندانی بہبود کی نائب مرکزی وزیر کماری کمد جوشی نے اپنی وزارت سے وابستہ پارلیمانی مشاورتی کمیٹی کے ممبران کو بتایا کہ مارچ، دسمبر ۱۹۸۳ء کی مدت کے دوران کنبہ بندی کے قومی پروگرام کے تحت کارکردگی میں ۱۹۸۲ء کی اس مدت کے مقابلے میں ۱۸ فیصد کا اضافہ ہوا۔ اس مدت کے دوران لوپ لگانے میں ۶۲،۶ فیصد، نسبندی آپریشن کرانے میں ۱۲،۸ فی صد، مانع حمل کے روائتی طریقے اپنانے میں ۱۳،۱ فیصد، مانع حمل گولیاں استعمال کرنے والوں میں ۷،۴۸ فیصد کا اضافہ ہوا۔

انھوں نے بتایا کہ کنبہ بندی کے سبھی طریقوں کے ذریعے ملک میں ۱۲ کروڑ ۱۵ لاکھ بچے پیدا کرنے کے قابل جوڑوں میں سے ۲۵،۹ فیصد جوڑوں کو موثر تحفظ دیا گیا۔

انھوں نے ملک میں خاندانی بہبود پروگرام میں تیزی لانے کے لیے کئے جا رہے مختلف اقدامات کا ذکر کیا۔ انھوں نے کہا کہ ۸۵-۱۹۸۴ء کے دوران جذام کے سدِ باب کے قومی پروگرام کے لیے ۱۵ کروڑ روپیے مختص کرنے کی تجویز ہے۔ مغربی بنگال میں گوری پور میں جذام سے متعلق ایک علاقائی تربیتی اور تحقیقی انسٹی ٹیوٹ کے قیام کی منظوری دی جا چکی ہے۔

جذام کے سدِ باب کے قومی پروگرام کی پیش رفت کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے بتایا کہ ۸۴-۱۹۸۳ کے دوران جذام کے ۳۰۲۸۴۸ نئے مریضوں کا پتہ لگایا گیا۔ دسمبر ۱۹۸۳ تک ۲۸،۱۰۸ مریضوں کا علاج کیا گیا۔ اس مدت کے دوران ۱۵۸۰۳۹ مریضوں کو علاج کے بعد اسپتال سے رخصت کیا گیا۔

انھوں نے بتایا کہ مسلسل کوششوں کے نتیجے میں ملیریا کی روک تھام کے قومی پروگرام پر عملی درآمد کے ذریعے ۱۹۸۳ء کے دوران ۱۹۸۲ء کے مقابلے میں ملیریا کے کل واقعات میں ۲۲،۳۹ فی صد کی کمی واقع ہوئی ہے۔ صحتی خدمات کی اس توسیع کے پس منظر میں دلی میں خاندانی بہبود کی رفتار ترقی ہر لحاظ سے حوصلہ افزا ہے۔

دلی ملک کی راجدھانی اور بڑا شہر ہے اس لیے اس تحریک میں اس کا اپنا ایک خاص کردار ہے۔

۱۴۸۵ مربع کلومیٹر کے رقبے میں پھیلے دلی شہر کی اپنی مشکلات ہیں۔ اس محدود رقبے میں اس وقت تقریباً ۶۶ لاکھ افراد سانس لے رہے ہیں۔ اتنا ہی کافی نہیں۔ یہاں کی آبادی میں ہر روز نئے افراد پیدا ہونے کے ساتھ ساتھ ہر برس آس پاس کے صوبوں سے بھی لگ بھگ ڈیڑھ لاکھ لوگ روزگار کی تلاش میں یہاں آ کر بس جاتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں دلی میں آبادی کا دباؤ ملک کے دوسرے شہروں کی نسبت کہیں زیادہ ہے۔ اس وقت یہاں ۴۱۸۹ افراد فی مربع میٹر کے رقبے میں رہائش پذیر ہیں۔ یہاں کی شرح پیدائش ۲،۷ فی صد اور شرح اموات ۶،۶ فی صد، اور نوزائدہ بچوں کی شرح اموات ۲۵،۱ فی ہزار ہے۔

ظاہر ہے کہ یہاں آبادی میں اضافے کی رفتار اونچا ہے اور یہاں بسنے والے مقابلتاً زیادہ غریب بھی نہیں ہیں۔ اگر انھیں دستیاب وسائل کے تناسب میں نہیں رکھا گیا اور یہاں موثر ڈھنگ سے کنبہ بندی کا پروگرام لاگو نہیں کیا گیا تو یہاں مکان بنانے، اسکول کھولنے، طبی خدمات مہیا کرانے اور دیگر ذرائع کی مانگ کا لامتناہی سلسلہ کبھی ختم نہ ہوگا اور سرکار کی پریشانی دن بدن بڑھتی چلی جائے گی۔ اس لیے دلی میں اس تحریک کو بہت موثر ڈھنگ اور سنجیدگی سے عمل میں لایا جاتا رہا ہے۔ مثال کے طور پر دلی انتظامیہ اب تک یہاں کے ۴۴ فی صد شادی شدہ جوڑوں کو کنبہ بندی کے دائرے میں لانے میں کامیاب رہا ہے۔ یہ اپنے آپ میں ایک بے مثال کام ہے۔ ملک کے دیگر حصوں میں یہ اوسط مقابلتاً بہت کم ہے۔ اس کے باوجود یہاں دس سال بعد آبادی میں اضافہ ۵۳ فیصد ہے جو کہ ملک کے ۲۴،۷۵ فی صد اضافے سے کہیں زیادہ ہے۔ اس کی کئی وجوہات ہیں۔ مثلاً یہ کہ یہاں کے دیہات شہری سہولتوں کے سبب شہری علاقے بنتے جا رہے ہیں۔ اس کے علاوہ باہر سے آنے والوں کی تعداد کے سبب بھی یہاں کی آبادی بڑھتی جا رہی ہے۔ راجدھانی ہونے کے ناطے باہر سے آنے والوں کی تعداد میں اضافہ ہوا ہے۔

(باقی کور ۳ پر)

قومی اقتصادی منظر نامے کی تبدیلی کی خاطر چند مشورے درج ذیل ہیں۔ تاکہ اس نظام میں زیادہ سے زیادہ لوگوں کو شرکت کا موقع مل سکے اور وہ ملک کی پیداواری سرگرمیوں میں شریک ہو سکیں۔

تنظیمی ڈھانچے کی تبدیلی

پیداواری سیکٹر نیز اشیا کی تقسیم سے متعلق سیکٹر کی سرگرمیاں ایک قومی واحد سیکٹر کے ماتحت کر دی جائیں۔ اور اقتصادی سرگرمی کے منظم ڈھانچے میں نجی اور سرکاری سیکٹر کی تقسیم ختم کر دی جائے۔

اشیا کی فروخت سے متعلق قومی تنظیم ہونی چاہیئے۔ اس کی حیثیت ایک وفاقی تنظیم کی ہو جس میں مختلف کاموں مثلاً غلہ، ادویات، الیکٹرانک، الیکٹریکل اور میکانیکل شعبوں کی اشیا کی تقسیم سے متعلق قومی تنظیمیں شامل ہوں۔

مختلف شعبوں میں صنعتی سرگرمیاں متعلقہ صنعت کی ایک قومی تنظیم کے ماتحت عمل میں آنی چاہئیں۔ اس طرح کی قومی صنعتی تنظیموں کے اوپر ایک اور چوٹی کی تنظیم ہونی چاہیئے تاکہ متعلقہ صنعتوں کی صنعتی پالیسیوں میں تال میل قائم ہو سکے۔

ان تمام تنظیموں کا ڈھانچہ سہ فریقی نظم و نسق کے طریقے پر پروان چڑھنا چاہیئے۔ اس میں صنعت کاروں، محنت کشوں اور مالیاتی اداروں کے نمائندے متناسب تعداد میں ہونے چاہئیں۔

ان قومی تنظیموں کی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ اشیا کی فروخت سے متعلق تنظیموں کے اشتراک عمل سے قیمتوں کے تناسب کو مناسب سطح پر رکھیں اور خام مال نیز تیار مال کی قیمتوں کے درمیان تناسب کو برقرار رکھا جا سکے۔ لاگتوں کو کم کرنے پر توجہ قائم رہنی چاہیئے۔ اس کے لیے کفائتی اقدامات اپنانے کی ضرورت ہوگی اور معاون صنعتوں کا جال بچھانا ہوگا۔

اشیا کی فروخت سے متعلق قومی تنظیم نیز صنعتی تنظیم کی سب سے اہم ذمہ داری یہ ہے کہ وہ خام مال کی فراہمی کو یقینی بنائیں اور معیاری مال تیار کرائیں، خاص کر از خود روزگار والوں کی طرف سے قائم کردہ گھریلو صنعتوں اور چھوٹے پیمانے کی صنعتوں کے لیے اس بات کی بڑی اہمیت ہے۔

نئے نظام کی ایک اور اہم بات یہ ہے کہ ہر صنعتی ادارے کے لیے یہ لازمی ذمہ داری ہوگی کہ وہ اپنے ملازمین کے لیے تعمیر مکانات کی سہولتیں بہم پہونچائے۔ تجارتی اداروں کو بھی اسی طرح کی ذمہ داری نبھانی ہوگی۔ اس عمل سے گندی بستیوں کا وجود ختم ہونے میں مدد ملے گی۔ اس کے ذریعے تعمیر مکانات کی سرگرمیاں تقویت پاسکیں گی۔ اور اس سے محنت کش اور مزدوروں کو زیادہ سے زیادہ روزگار ملے گا۔

بنیادی سہولتوں کی فراہمی

تمام صنعتی کارخانوں کو خواہ وہ پبلک سیکٹر میں ہوں یا کسی دیگر سیکٹر میں، ایسے ماہرین کی زیر نگرانی لانا ہے جو اس شعبے کی خصوصی مہارت رکھتے ہوں۔ اس میں سہ فریقی نظام کی بنیاد پر سب کی نمائندگی ضروری ہے۔

سرکار کو بنیادی سہولتیں فراہم کرنی ہیں۔ مثلاً صحت سے متعلق خدمات، اسکول، سماجی نوعیت کی سہولتیں۔ مواصلات، ذرائع نقل و حمل۔ صنعتی طور پر پسماندہ علاقوں میں یہ سہولتیں بہت ضروری ہیں۔

یونی ورسٹیوں اور تکنیکی اداروں میں قریبی تال میل ہونا چاہیئے اور پھر ان کا تعلق صنعتی اداروں سے ہونا ضروری ہے۔ تاکہ تربیت یافتہ افراد مناسب تعداد میں حسب ضرورت مل سکیں

بلاک کی سطح پر سروس کے مراکز قائم کئے جانے ضروری ہیں تاکہ کسانوں کو ان کی ضرورت کے وقت سروس اور دیکھ بھال میں دقت نہ پیش آئے۔ ان کارخانوں کو اشیا کی فروخت کی تنظیموں کے ساتھ جوڑ دینا چاہیئے۔

ہر بڑے صنعتی سیکٹر میں ایک تحقیقی مرکز ہونا چاہیئے۔ قومی سطح پر بھی صنعتی اور تجارتی اداروں کی ضرورت کو پورا کرنے والا ایک تحقیقی مرکز بھی ضروری ہے۔ مجموعی قومی پیداوار اور آلات کا ایک فی صد تحقیق پر صرف کیا جانا چاہیئے۔

انرجی کی تیاری بے حد ضروری ہے۔ انرجی کے قابل تجدید اور روایاتی وسیلوں کا فروغ بے حد اہم ہے۔ صنعتی کارخانوں میں ان کے اپنے بجلی کی تیاری والے پلانٹ ہونے چاہئیں۔ بجلی تیار کرنے والے پلانٹوں کو جب بھی قائم کیا جائے تو ان کی بجلی کی ایک مخصوص مقدار صنعتی کارخانوں کے لیے ہونی چاہیئے۔

زراعت میں بیمہ کو چالو کر دینا چاہیئے فصلوں کا بیمہ ہونا چاہیئے اور زرعی خام مال پر مبنی صنعتوں کا بھی بیمہ ہونا چاہیئے۔ زراعت کو صنعت کی طرح ہی سمجھنا چاہیئے۔ اور لاگت منافع کے تناسب اور قیمتوں سے ان کے تعلق کو ذہن میں رکھنا ضروری ہے۔

ماحول کے تحفظ پر خصوصی توجہ دی جانی چاہیئے۔ صنعتی اور زراعتی سرگرمیوں میں معاشی نوعیت کے توازن کو قائم رکھنا چاہیئے۔ جنگلی جانوروں کے تحفظ اور شجر کاری نیز جنگل بانی پر دھیان دینا بھی ضروری ہے۔

چراگاہوں کا فروغ بھی ضروری ہے مویشیوں کے لیے بہتر چارے کی ضرورت ہے۔ ڈیری کی مصنوعات کو بڑھاوا دیا جانا چاہیئے۔ دیہات کے عوام کو مویشی پروری اور دودھ دینے والے

منصوبہ بندی اور ترقیاتی پروگراموں کی جھلک پیش کرنے والا

پندرہ روزہ

یوجنا

نئی دہلی

چیف ایڈیٹر	آر۔ ٹھکرال
ایڈیٹر	لکھی رام رانا
اسسٹنٹ ایڈیٹر	محمد عادل صدیقی
سب ایڈیٹر	وسیم حیدر

جلد ۴	یکم تا ۱۵ اپریل ۱۹۸۴ء	شمارہ: ۱

۱۱ چیتر تا ۲۶ چیتر شک سمبت ۱۹۰۶ ٭ فون نمبر ۳۸۷۳۴۱

شرح چندہ } سالانہ ۔ ۲۰ روپے، دوسالہ ۔ ۳۵ روپے
سہ سالہ ۔ ۵۰ روپے، فی کاپی ۔ ایک روپیہ
طالب علموں، اُستادوں اور لائبریریوں کے لیے ۱۰ فیصد کی رعایت

اس شمارے میں

یوجنا منصوبہ بندی کے بارے میں عوام کو آگاہ کرتا ہے، مگر اس کے مضامین صرف سرکاری نقطۂ نظر کی وضاحت تک ہی محدود نہیں ہیں

بزنس منیجر: ایل۔ آر۔ بترہ ٭ اسسٹنٹ ڈائرکٹر (پروڈکشن) کے۔ آر۔ کرشنن

مضامین سے متعلق خط و کتابت کا پتہ :۔
ایڈیٹر "یوجنا" (اردو) پبلیکیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس
نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

ترسیل زر کا پتہ :۔
بزنس منیجر، پبلیکیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس
نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

جانوروں کی افزائش کی سہولتیں میسر آنی چاہیئں سوروں کی پرورش اور مرغبانی کے ذریعے دیہی عوام کی آمدنی میں اضافہ ضروری ہے۔ اس سے ان کو پروٹین بھی مل سکے گا۔ مفید خلائق مویشیوں کے ذبیحے پر پابندی ہونی چاہیئے۔ اندرون ملک ماہی گیری کی ہمت افزائی کی جانی چاہیئے۔ گہرے سمندر سے مچھلیوں کے پکڑنے کے کام کو آگے بڑھانا چاہیئے۔ روائتی دستکاریوں کی ہمت افزائی کے لیے ان شعبوں کی مصنوعات کی فروخت کے واسطے مارکیٹنگ ادارے ہونے چاہیئں۔ ان کی برآمدات کی حوصلہ افزائی کی جائے اور اس کے لیے سہولتیں دی جائیں۔ اندرون ملک ان کی ہمت افزائی کے لیے بھی متعدد اقدامات ضروری ہیں۔

منصوبہ بندی کی حکمت عملی

منصوبہ بندی کا اصل مقصد افرادی قوت اور خام وسائل کا بھرپور استعمال ہے جس سے لوگوں کو نفع بخش کام مل سکے اور ملک کے نوجوانوں کے لیے روزگار کے مواقع نکل سکیں۔ یہ مقصد قومی صنعتی اور مارکیٹنگ تنظیموں کو حرکت میں لاکر حاصل کیا جاسکتا ہے اور متوازن ترقی کی راہ پر ملک کو آگے بڑھایا جاسکتا ہے۔

ملک کا اقتصادی ڈھانچہ ایسا ہونا چاہیئے کہ فاضلات چند ہاتھوں میں مرکوز نہ ہونے پائیں۔ انفرادی آمدنیوں پر خالص آمدن کے نصف سے سے زیادہ ٹیکس نہیں لگنا چاہیئے۔ ایک خاص سطح کے بعد آمدنی قومی ملکیت میں آجانی چاہیئے ملک میں انفرادی آمدنیوں میں ایک اور دس کی نسبت قائم کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ بنیادی ضرورتوں کی قیمتیں کم رہنی چاہئیں مثلاً پارچہ جات، ٹرانسپورٹ، مکانات، ادویات، تعلیم۔ ان کو رعایتی نرخ پر مہیا کیا جانا چاہیئے۔ ایسی صورت میں شخصی دولت کو جمع کرنے کی ضرورت باقی نہیں رہ جاتی اور اس عمل سے امیر اور غریب کا فرق بھی نہیں بڑھ سکے گا۔

عوام میں کفایت سے خرچ کرنے، ظاہری ٹھاٹ باٹ سے بچنے اور فضول خرچیوں سے منہ موڑنے کی عادت ڈالنی ضروری ہے۔ اس سے بحیثیت مجموعی اقتصادی منظر نامے پر خاطر خواہ اثرات مرتب ہوسکیں گے۔

مالی مراعات

ٹکنالوجی کے ساتھ ساتھ غیر ملکی سرمایہ کاری کی اجازت دینے کی صورت میں، اس بات کا دھیان رکھنا ضروری ہے کہ اس طرح کی کسی سرمایہ کاری پر ملکی سرمایہ اُس وقت تک نہ لگایا جائے جب تک کہ وہ صنعت ترجیحی سیکٹر میں نہ آجائے۔

بیرونی سرمایہ کاری کے لیے روپے کی شکل میں اس کی واپسی کی اجازت نہیں دی جانی چاہیئے۔ یہ واپسی برآمدات کی آمدنی سے ہی ہونی چاہیئے یا غیر ملکی زرمبادلہ کی بچت سے ہونی چاہیئے جس کی زیادہ سے زیادہ حد ۳۰ فیصد ہو۔ اس مفاہمت کے بعد غیر ملکی سرمایہ کاری پر کوئی پابندی نہیں ہونی چاہیئے۔

صنعتی طور پر پسماندہ خطوں میں صنعتوں کو بڑھاوا دینے کے لیے تین سال تک یہ یقین دہانی دلانی ضروری ہے کہ وہاں سرمایہ کاری کے ماخذ کے بارے میں کوئی سوال نہیں کیا جائے گا۔ ان خطوں میں لگی ہوئی صنعتوں سے پانچ سال تک کوئی ٹیکس نہیں لینا چاہیئے۔

سرکاری ادارے چوں کہ اشیائے صارفین کے سب سے بڑے گاہک ہیں، لہٰذا ان اداروں کو چھوٹے پیمانے کی صنعتوں سے مال خریدنے کو ترجیح دینی چاہیئے۔

اُن مالیاتی اداروں کو جو کہ قومی صنعتی اور مارکیٹنگ اداروں کے ساتھ مل کر کام کررہے ہیں، چھوٹے کسانوں کی مالی امداد فراخدلی سے کرنی چاہیئے۔ انھیں چھوٹے پیمانے کی صنعتوں کی امداد بھی کرنی چاہیئے اور گھریلو صنعتوں کی حوصلہ افزائی کرنی چاہیئے۔ اور اس کے لیے سامان کی صورت میں کچا مال فراہم کرنا چاہیئے۔ ان کی سرگرمیوں کو مال کی فروخت کی سرگرمیوں سے جوڑ دینا چاہیئے تاکہ سرمایہ کاری سے بھرپور استفادہ کیا جاسکے۔

کارکنوں کا رول

اگر صنعتی اور تجارتی اداروں میں محنت کش طبقے کو انتظامیہ میں شریک کرلیا جائے اور ان اداروں سے حاصل ہونے والے نفع میں ان کا حصہ یقینی ہوجائے تو پھر ٹریڈ یونین تحریک کا تصور یکسر بدلنا پڑے گا۔ ایسی صورت میں ملازمین کی ایسوسی ایشن بہبودی سرگرمیوں پر توجہ دے گی جس سے معیار زندگی بڑھ سکے۔

اس طرح کی اقتصادی جمہوریت سے زیادہ سے زیادہ شہری معیشت کے پیداواری اور اشیاء کی تقسیم کے نظام سے وابستہ ہوسکیں گے اور تعلیمی و ثقافتی اداروں سے ان کی دلچسپیاں بڑھیں گی۔ یہ ادارے مختلف صنعتی تنظیموں کی سرپرستی میں آگے بڑھیں گے۔ یہ صنعتی ادارے کھیلوں کو بھی بڑھاوا دیں گے اور اپنے یہاں کھلاڑیوں کو روزگار دیں گے۔

نئے نظام کا اہم ترین پہلو یہ ہے کہ ہر صنعتی ادارہ اپنے کارکنوں کے لیے مکانات مہیا کریگا۔ تجارتی ادارے بھی ایسا ہی کریں گے۔ اس سے گندی بستیوں کو روکا جاسکے گا اور تعمیر مکانات کے ذریعے بہت سے لوگوں کو روزگار مل سکے گا۔ سرکار کا کام چوں کہ پالیسی بنانا اور اس کے عمل درآمد پر نگاہ رکھنا ہے، اس لیے مختلف صنعتی اور تجارتی سیکٹروں پر کافی عملہ تعینات کیا جائے گا۔

سیاسی اور سماجی تال میل

قومی سطح پر جمہوری ڈھانچے کی موجودگی میں زیادہ سے زیادہ صرف دو بڑی سیاسی پارٹیوں کے قیام اور تشکیل کے لیے ہی کوشش کرنی چاہیئے۔

اداریہ

غریبوں کے لیے انصاف

"آئین میں بیالیسویں ترمیم کے ذریعے شامل ایک نئی دفعہ ۳۹ اے میں کہا گیا ہے کہ " مملکت قانونی نظام کے مساوی موقعے کی بنیاد پر انصاف کو فروغ دے گی اور مناسب قانون سازی یا اسکیموں یا کسی اور طریقے پر مفت قانونی امداد بہم پہنچائے گی تاکہ اس امر کو یقینی بنایا جا سکے کہ کوئی بھی شخص اقتصادی پالیسی اور مجبوری کے سبب انصاف کے حصول سے محروم نہ رہ سکے"۔

بھارتی آئین میں تمام شہریوں کو انصاف اور آزادی کے ساتھ کام کرنے کے مواقع کی یقین دہانی کرائی گئی ہے۔ انفرادی طور پر بنیادی حقوق کی ضمانت دی گئی ہے اور ریاستوں کے لیے رہبرانہ اُصول مقرر کیے گئے ہیں جن کا مقصد معاشرے کے اجتماعی مفادات کا تحفظ کرنا ہے۔ آئین کی ان دفعات کو عملی جامہ پہنانے اور انھیں عوام کے لیے قابلِ قبول بنانے نیز آئینی تقاضوں کو پُورا کرنے کے لیے غریبوں کو قانونی امداد فراہم کرنے کا پروگرام شروع کر دیا گیا ہے تاکہ غریبوں کے لیے سماجی اور اقتصادی انصاف کے حصول میں اقتصادی حالات رکاوٹ نہ بن سکیں۔ یہ ضروری ہے کہ کوئی شخص محض اس وجہ سے نقصان نہ اُٹھائے کہ اس کے پاس دادرسی کا کوئی ذریعہ نہیں ہے۔ آزاد معاشرے کے ہر شخص کو اپنی شکایات کے ازالہ کے لیے خواہ وہ مملکت کے خلاف ہوں یا شہریوں کے خلاف، عدالتوں تک بہ آسانی رسائی کے اقدامات کیے گئے ہیں۔

قانونی امداد کے نظریے کو عملی روپ دینے کے لیے ۱۹۸۰ء میں ایک کمیٹی قائم کی گئی تھی جس کے چیرمین بھارتی سپریم کورٹ کے جج شری جسٹس پی این بھگوتی ہیں۔ اس کمیٹی نے قانونی امداد کے پروگرام کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا ہے —— پہلا مقدمہ اور عدالتی کارروائی کے دوران قانونی امداد اور دُوسرا اجتماعی و ترتیبی قانونی امدادی پروگرام۔ اس مقصد کے حصول کے لیے اب تک آندھرا پردیش، گجرات، ہریانہ، ہماچل پردیش، کرناٹک، مہاراشٹر، میگھالیہ، اُڑیسہ، پنجاب، راجستھان، سکم، تامل ناڈو، اُتر پردیش اور مرکز کے زیرِ انتظام علاقوں دلی اور پانڈیچری میں ریاستی قانونی امداد اور صلاح کار بورڈ قائم کیے جا چکے ہیں۔ کیرالہ اور مغربی بنگال میں بھی اس طرح کے بورڈ قائم کرنے کے لیے اقدامات کیے جا رہے ہیں۔ ریاستی قانونی امداد سے متعلق بورڈوں نے ہائی کورٹ میں قانونی امداد کی کمیٹیاں قائم کی ہیں۔ اس طریقے کے تحت عدالت میں کارروائی شروع کر کے یا کارروائی کا دفاع کرتے ہوئے یہ ثابت کیا جاتا ہے کہ غریبوں اور سماج کے کمزور طبقوں کو حقوق حاصل ہیں اور ان کی شکایات کے ازالہ کے لیے آئین میں بندوبست کیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں ریاستی بورڈ، اضلاع میں قانونی امداد کی کمیٹیاں، ہائی کورٹ اور سپریم کورٹ ضروری امداد دیتے ہیں۔

قانونی امداد کی مہم مُلک میں زور پکڑتی جا رہی ہے اور اس کے اثرات محسوس ہو رہے ہیں۔ اس سلسلے میں گجرات، مہاراشٹر، اُڑیسہ اور تامل ناڈو میں اچھی پیش رفت ہو رہی ہے نیز دُوسری ریاستوں میں یہ زور پکڑ رہی ہے۔ قانونی امداد کی مہم بعض ریاستوں میں اتنی پیش رفت نہیں کر پائی جتنی کہ اسے کرنی چاہیے تھی۔ اس کی کئی وجوہات ہیں جیسے عملہ کی کمی، مالیہ کی عدم دستیابی، وکیلوں اور ریاستی سرکاروں کا زیادہ دلچسپی نہ لینا وغیرہ۔ ریاستی قانونی امداد اور صلاح کار بورڈ عوام کی شکایات دُور کرنے میں سرگرمی سے حصّہ لے رہے ہیں۔ یہ بورڈ قانونی امداد اور مشورے بھی دے رہے ہیں۔ علاوہ ازیں یہ بورڈ قانونی امداد کے کیمپوں، لوک عدالتوں اور دیہی عوام کو قانونی سُوجھ بُوجھ اور تعلیم جیسے پروگرام بھی شروع کر رہے ہیں۔ قانونی امداد سے متعلق اسکیموں کو عملی جامہ پہنانے سے متعلق کمیٹی قانونی تعلیم اور قانونی امداد کے کیمپوں وغیرہ کے اہتمام پر زیادہ زور دے رہی ہے۔ سماج کے کمزور طبقوں کو اُن کے حقوق اور سماجی فلاح سے متعلق مختلف قوانین نیز سرکاری اسکیموں سے واقف کرانے کے لیے قانونی جانکاری کو فروغ دینا نہایت ضروری ہے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے کمیٹی ہندی اور انگریزی میں سہ ماہی قانونی امداد سے متعلق خبرنامہ شائع کرتی ہے۔ اس میں شائع ہونے والے مضامین میں ملک کے مختلف حصّوں میں قانونی امداد کے پروگرام کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی جاتی ہے۔

کمیٹی قانونی سُوجھ بُوجھ کو فروغ دینے کی غرض سے طبع زاد مواد جاری کرنے والے اداروں اور تنظیموں کو پانچ ہزار روپے تک کی مالی امداد دے رہی ہے۔ اٹاوہ کے ایڈیشنل ضلع جج شری جے کے ماتھر نے قانونی تنظیم کے لیے ایک قانونی منصوبہ مرتب کیا ہے جو زیرِ غور ہے۔ عوام کو ان کے گھروں کے قریب ترین مقامات پر ہی حصولِ انصاف کے لیے قانونی امداد کے کیمپ لگائے جا رہے ہیں۔ دیہی علاقوں میں اس طرح کے کیمپ لگائے جاتے ہیں اور ان میں زمینوں کے پٹے، جنگلاتی زمین، بندھوا مزدور اور محتاج خواتین وغیرہ کی بازآبادکاری سے متعلق معاملات پیش کیے جاتے ہیں۔ دیہی عوام میں یہ کیمپ بہت مقبول ہیں اور ریاستوں کے قانونی امداد اور صلاح کار بورڈ اکثر و بیشتر اس طرح کے کیمپوں کا انعقاد کرتے ہیں۔ توقع ہے کہ ان کی مقبولیت میں اضافہ ہوگا اور سماج کے کمزور طبقے اس سے مستفید ہوں گے۔

(باقی صفحہ ۸ پر)

محمد فضل

پبلک سیکٹر کیوں؟

پبلک سیکٹر کی خاص بات کیا ہے۔ دراصل اس کا وہ رول ہی اس کی عظمت کا جواز ہے جو اس نے ملک کو صنعت کاری کی راہ پر آگے بڑھانے میں ادا کیا ہے، اس نے مختلف طرح سے بنیادی نوعیت کی اور بھاری صنعتوں کو قائم کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے اور انھیں کے بل بوتے پر ملک کا صنعتی ڈھانچہ اپنے لیے ایک مضبوط بنیاد فراہم کر سکا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ ان مقاصد کو آگے بڑھانے میں اور کیا کرنا چاہیے۔ یہ وہ بنیادی سوال ہے جس کا جواب منصوبہ بندی کے ذمّہ داروں، منتظمین اور فیصلہ کرنے والوں کو دینا ہے۔ زیرِ نظر مضمون میں مصنف نے پبلک سیکٹر کا تاریخی پس منظر اور ملک کی معاشی ترقی میں اس کی دین پر روشنی ڈالی ہے۔ انھوں نے اس کی کارکردگی بہتر بنانے کے لیے کچھ مشورے بھی دیے ہیں۔

ملک میں منصوبہ بندی کے عمل کے آغاز ـــے ہی پبلک سیکٹر کی اہمیت تسلیم کی گئی ہے۔ میئـ راستہ سوچ سمجھ کر اپنایا گیا ہے اور اسے ملک کی ترقیاتی ـــتِ عمل میں کلیدی مقام حاصل رہا ہے۔ ہندوستانی ـنعتی پالیسی کے در پردہ جو مقاصد کارفرما ہیں وہ ـوستانی آئین میں مذکور ریاستی پالیسی کے رہنمایانہ ـولوں سے اخذ کیے گئے ہیں۔ رہنمایانہ اُصولوں کی ـتی میں ریاستی پالیسی کا مقصد یہ ہے کہ سماجی، ـادی، سیاسی انصاف پر مبنی سماجی نظام کے ـ کے ذریعے عوام کی بھلائی اور ان کی بہبود کے ـوں کو بڑھاوا دیا جائے۔ ریاستی پالیسی کے تحت ـ یہ بھی چاہتی ہے کہ وہ اپنے شہریوں کے لیے ـگار فراہم کرے اور قومی مادی وسائل کی منصفانہ ـیم عمل میں آسکے نیز دولت اور پیداوار کے ـئع چند ہاتھوں میں مرکوز ہو کر نہ رہ جائیں[۱]۔ ۱۹۵۵ء میں پارلیمنٹ میں ملک میں سماج وادی نظام کے قیام کو مقصد قرار دیے جانے کا جو اعلان کیا گیا، اس میں ریاستی پالیسی کے سماجی اور اقتصادی مقاصد کو جامع انداز میں پیش کیا گیا ہے۔

اقتصادی بنیاد

۱۹۵۶ میں صنعتی پالیسی کے متعلق قرارداد میں ان مقاصد کو ایک بار پھر دُہرا دیا گیا۔ ملک کی منصوبہ بند ترقی میں پبلک سیکٹر اور پرائیویٹ منظّم سیکٹر کے رول نیز کوآپریٹو سیکٹر اور دیہی اور گھریلو صنعتوں کے رول کی وضاحت کرتے وقت نیز ملک میں معاشی ترقی کے مستقبل کی نشاندہی کرتے وقت بھی مذکورہ بالا مقاصد کے دُہرانے کی ضرورت سمجھی گئی۔ صنعتی پالیسی سے متعلق قرارداد میں مذکور ہے کہ اقتصادی ترقی کا عمل تیزی سے بڑھا کر یہ مقاصد حاصل کیے جا سکتے ہیں۔ صنعت کاری کے فروغ کے لیے بھاری صنعتوں کے قیام اور ان کی ترقی کی اہمیت واضح طور پر تسلیم کی گئی۔ مشینی آلات اور پرزوں کی تیاری نے بھی اپنی اہمیت تسلیم کرائی، یہ کام پبلک سیکٹر کی توسیع کے ذریعے انجام دیا جا سکا۔ کوآپریٹو سیکٹر کی توسیع و ترقی کے ذریعے ان صنعتوں کو مستحکم بنایا جا سکا۔ ان کے ذریعے نفع بخش روزگار کے مواقع بڑھے اور محنت کش عوام کے معیارِ زندگی میں بہتری آسکی۔ اقتصادی طاقتوں کے ارتکاز اور نجی اجارہ داریوں کو روکنے کے لیے آمدنی اور دولت کے فرق کو کم کرنے کی ضرورت محسوس کی گئی۔ لہٰذا بڑے صنعتی شعبوں کے سلسلے میں ریاست نے آہستہ آہستہ ایک بالاتر مقام حاصل کیا اور یہ براہِ راست ریاست کی ذمہ داری ٹھہری۔ جب ملک و قوم کے سامنے سماج وادی نظام ایک مقصد ٹھہرا اور ملک کو منصوبہ بند اور سریع ترقی کی راہ پر آگے بڑھانا ضروری سمجھا گیا، تو لازمی طور پر ضروری تھا کہ بنیادی اور کلیدی اہمیت کی تمام صنعتیں اور عوامی خدمت کی تمام سروسیں پبلک سیکٹر کے تابع ہوں۔ بنیادی اور بھاری صنعتوں کے فروغ کے عمل کے بغیر پبلک سیکٹر کا رول محض پرائیویٹ اور کوآپریٹو سیکٹر کی امداد اور اس کو آگے بڑھانا ہی رہ جاتا ہے۔

متوازن علاقائی ترقی

صنعتی پالیسی کی قرارداد میں مذکور ہے کہ ریاست پرائیویٹ سیکٹر میں صنعتوں کی ہمت افزائی

[۱] ـــارکمی منصوبہ بندی کمیشن
نئی دہلی

کے لیے ٹرانسپورٹ، بجلی اور دیگر خدمات کی فراہمی کو یقینی بنائے گی اور اس کے لیے مناسب مالی اقدامات کرے گی۔ متوازن علاقائی ترقی کے لیے صنعتوں کو ایک جگہ مرکوز کرنے کی بجائے، ان کا دائرہ وسیع کیا گیا اور اقتصادی سرگرمیوں کو پھیلایا گیا۔ ان ذمہ داریوں کے سلسلے میں ریاست کا رول خاص کر یہ رہا کہ اس نے ملک کے مختلف حصوں میں صنعتوں کے فروغ کے لیے بنیادی سہولتیں فراہم کیں۔

اگر صنعتیں چند خاص علاقوں میں مرکوز ہیں، تو ان کی خاص وجہ یہ ہے کہ وہاں بجلی، پانی کی فراہمی اور ٹرانسپورٹ کی سہولتیں دستیاب ہیں۔ لہٰذا ان سہولتوں کو پسماندہ علاقوں میں پہنچانے کی ضرورت ہے تاکہ وہاں بھی صنعتی ترقی دیکھنے کو ملے۔ یہ بھی محسوس کیا گیا کہ صنعت کاری کے عمل کو تیز تر بنانے کے لیے مناسب انتظامیہ اور تکنیکی عملے کی ضرورت ہے۔ پالیسی بنانے والوں کو یہ احساس تھا کہ پبلک سیکٹر کو کامیابی کے ساتھ چلانے اور اسے ترقی کی راہ پر آگے بڑھانے کے لیے بہت سے مسائل کا سامنا ہے۔ مثلاً تنظیمی اور انتظامی مسائل پبلک سیکٹر کے اداروں کو اہل، باصلاحیت اور آزاد قیادت کی ضرورت ہے۔ اس کے لیے اختیارات کو نچلی سطح تک منتقل کرنے ہوں گے۔ اور نظام کار میں لامرکزیت لانی ہوگی۔

سرکاری اداروں سے یہ توقع کی جاتی تھی کہ وہ تجارتی لائنوں پر کام کریں گے اور وہ منافع میں چلیں گے اور اسی طرح وہ ملک کی ترقی کے عمل کو تیزی سے آگے بڑھانے میں معاون ہوں گے۔ لہٰذا انھیں کام کرنے کی پوری آزادی کا دیا جانا اور مجموعی نتائج کی بنیاد پر ان کی کارگزاری کا اندازہ لگانا ضروری سمجھا گیا۔ سرکاری اداروں کے ساتھ کچھ مقاصد وابستہ ہیں، لیکن ہوتا یہ ہے کہ پبلک سیکٹر کے اداروں کی کارگزاری جانچتے وقت ان کی ذمہ داریوں اور مقاصد کو نظرانداز کر دیا جاتا ہے۔ یہ سوال بھی ضروری ہے کہ کیا پبلک سیکٹر کی کارکردگی کو موثر بنانے اور اسے کامیاب بنانے کے لیے درکار مناسب فضا اور حالات پیدا کر لیے گئے ہیں۔ لہٰذا پبلک سیکٹر اداروں کی کارگزاری کا اندازہ مذکورہ بالا پس منظر میں کیا جانا ضروری ہے۔ قبل اس کے کہ اس موضوع پر غور کیا جائے کہ ان کی کارگزاری بہتر بنانے کے لیے کیا کیا جائے مذکورہ بالا جواب حاصل کرنا ضروری ہے۔

تاریخی پس منظر

پبلک سیکٹر کے اداروں کی کارگزاری کو اگر ان کے صحیح پس منظر میں دیکھا جائے تو اس کے بہت سے کارنامے ہیں جو اس نے گزشتہ تیس برسوں میں حاصل کئے ہیں۔ ان کی وجہ سے صنعت کاری کے عمل کو تیز کیا جا سکے۔ پبلک سیکٹر بنیادی اور بھاری صنعتوں کے قیام میں معاون ہوا اور اس کی وجہ سے بنیادی ڈھانچہ فراہم ہو سکا اس کے سبب ملک کے پسماندہ علاقوں میں صنعتوں کے پھیلانے میں مدد ملی ہے۔ چھ پنجسالہ منصوبوں میں سرکاری سطح پر سرمایہ کاری کی جو پالیسی اپنائی گئی ہے اس کے سبب پبلک سیکٹر کو ملک کی معیشت میں اعلےٰ ترین مقام مل سکا ہے۔ ریلوے، مواصلات، فضائی سروس، کان کنی، بجلی کی بنیادی، پٹرولیم کی صنعت، دفاعی صنعت، بینکنگ اور بیمہ وغیرہ میں اسے اجارہ داری حاصل ہو گئی ہے۔ جہازرانی، فولاد اور دیگر دھاتوں، بھاری مشینری، مشینی پرزے، کیمیاوی کھاد اور دواؤں نیز دیگر اشیائے صارفین کے ضمن میں اس کا وافر حصہ ہے۔

تجارت، اشیاء کی فروخت کی سرگرمیوں اور غیر ملکی تجارت وغیرہ میں بھی پبلک سیکٹر کا کلیدی رول ہے۔ گزشتہ برسوں میں سرمایہ کاری کے ڈھانچے پر نظر ڈالنے سے پتہ چلتا ہے کہ پبلک سیکٹر کو کس قدر اہمیت حاصل ہے۔ مرکزی پبلک سیکٹر میں کل سرمایہ کاری کا تقریباً ۷۱ فیصد بھاری انجینیئرنگ، کیمیاوی کھادوں، کیمیکلز، پیٹرولیم، کوئلہ، فولاد اور معدنی اشیاء وغیرہ میں لگایا گیا ہے۔ اس میں ریلوے اور ڈاک و تار کے شعبے شامل نہیں ہیں۔ ان دونوں محکموں میں ۸۳-۱۹۸۲ کے اختتام پر ۳۰ ہزار کروڑ روپے کی سرمایہ کاری کی جا چکی تھی۔ ریلوے میں ۴۴ کروڑ روپے کی سرمایہ کاری اور کمیونی کیشن میں ۲۷۷۹ کروڑ روپے کی سرمایہ کاری سے یہ واضح ہوتا ہے کہ ریاست نے بنیادی ڈھانچے کو مضبوط بنانے میں کیس قدر مؤثر رول ادا کیا ہے۔ ۸۳-۱۹۸۲ تک ریاستوں کے ذریعے پبلک سیکٹر میں ۲۴ ہزار کروڑ روپے کی سرمایہ کاری کی جا چکی ہے۔ اس میں بجلی کی تیاری سے متعلق ریاستی بورڈوں کی سرمایہ کاری اور نقل و حمل کی ریاستی کارپوریشنوں کی سرمایہ کاری بھی شامل ہے۔

ہندوستان کی منصوبہ بند ترقی کے آغاز میں ہی یہ محسوس کر لیا گیا تھا کہ خطے کی بنیاد پر متوازن ترقی کا عمل چلائے بغیر سماجی انصاف پر مبنی اقتصادی ترقی مشکل ہوگی۔ پبلک سیکٹر نے صنعتوں کے بڑے حلقے کو اپنے دائرے میں لے لیا ہے اور وہ ملک کے طول و عرض میں ان صنعتوں کو چلا رہا ہے۔ ملک کے مختلف حصوں میں جو پراجیکٹ شروع کئے گئے ہیں، ان سے عوام کی بڑی تعداد کو براہ راست روزگار مل سکا ہے۔ سڑکوں، مواصلات، بجلی وغیرہ جیسی سہولتوں میں اضافے سے مقامی معیشت کے مختلف گوشوں پر خوشگوار اثر پڑتے ہیں اور معاون صنعتوں میں مدد ملتی ہے۔ ان سہولتوں کی بدولت مقامی طور پر دستیاب کاریگروں کی مہارت بڑھتی ہے ان دور دراز علاقوں میں زندگی گزارنے والوں کا معیارِ زندگی بلند ہو سکا ہے۔ ان علاقوں میں جو مختلف طرح کے پراجیکٹ شروع کئے جا سکے ہیں، ان سے وہاں کے باشندوں کی بود و باش میں نمایاں بہتری دیکھنے کو ملی ہے۔

روزگار کے مواقع

ہندوستان میں پبلک سیکٹر نے عوام کے لیے روزگار کے مواقع مہیا کئے ہیں۔ جون ۱۹۸۳ء میں

۲۴۴ لاکھ افراد منظم سیکٹر میں برسرِ روزگار تھے۔ ان میں سے ۱۶۴ لاکھ گویا کُل کا دو تہائی پبلک سیکٹر میں ہی برسرِ روزگار تھے۔ اس سیکٹر میں ہُنرمند افرادی قوت کی بڑی تعداد ہے۔ انجینئرنگ، انتظامیہ، مالیات اور مشاورت کے شعبوں میں بہترین صلاحیتوں کے مالک افراد اس سیکٹر میں ہیں۔ اس کے علاوہ اس نے انتظامیہ کے شعبے میں نمایاں کارکردگی کا ثبوت دیا ہے اور اسے جدید صنعتی سماج کی ضرورتوں کے مطابق ڈھالا ہے۔ انفرادی اور کنبہ واری کارخانوں کے برعکس پبلک سیکٹر کے اداروں میں پیشہ ورانہ مہارت کے حامل انتظامیہ عملے کے ارکان کا کثیر طبقہ موجود ہے جنھوں نے بڑی بڑی کارپوریشنوں کے انتظامیہ کو جدید ترین لائنوں پر آگے بڑھایا ہے۔ ہُنرمندی کے فروغ میں بھی سیکٹر بے حد اہم ثابت ہوا ہے۔ پبلک سیکٹر اداروں میں انتظامیہ کے ماہرین کی تعداد ایک ۰ سے زیادہ ہے، یہ مستقبل میں صنعتی نظام کو آگے جانے کی ضمانت ہے۔ ملک میں اقتصادی ترقی کے کو آگے بڑھانے کے لیے معاون ادارے اور تی کارخانے اہم رول ادا کرتے ہیں۔ بڑے پلانٹوں تعداد میں اضافے کے ساتھ ساتھ اگر معاون نٹوں اور صنعتی اداروں اور معاون صنعتوں کا جال پھیلایا جائے تو ترقی کا عمل غیر متوازن رہے گا۔ معاون پُرزوں کی فراہمی، اوزاروں کی تیاری، نیم مصنوعہ ل، اور بڑے پلانٹوں کے لیے مددگار اور بہت خدمات کی اہمیت اس وجہ سے بھی ہے کہ ان اخراجات جاریہ یا مکرر الوقوع اخراجات میں کفایت تی ہے اور ان کے ساتھ تال میل قائم کرکے کارکردگی صلاحیت کو بہتر بنایا جا سکتا ہے اور کاروبار کے پیداواری پہلوؤں پر توجہ مرکوز کی جا سکتی ہے۔ معاون صنعتوں کے جال پھیلانے سے سرمایہ کا بہتر استعمال بھی ممکن ہوتا ہے۔ سرمایہ چونکہ کم ہوتا ہے، اور افرادی قوت وافر ہوتی ہے، لہٰذا سرمایہ کا مؤثر استعمال خاصی اہمیت رکھتا ہے۔ پبلک سیکٹر کے اداروں کا بھی بڑا اپنے پیداواری پروگراموں پر بھی نظرِ ثانی کرتے ہیں تاکہ ایسی اشیا کی تیاری سے گریز برت سکیں جو کہ چھوٹے پیمانے کے سیکٹر میں تیار ہو سکتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ۷۴-۱۹۷۳ء میں چھوٹے پیمانے کے سیکٹر میں تیار ہونے والی اشیا کی تعداد ۷۹ تھی جو بڑھ کر ۸۳-۱۹۸۲ء میں ۱۲۰۰ تک پہونچ چکی ہے۔

خود کفیلی

پبلک سیکٹر نے خود کفیلی کے مقصد کو پورا کرنے میں زبردست کردار ادا کیا ہے۔ اس نے درآمدات کے نعم البدل تیار کرکے باہر سے منگائی جانے والی بہت سی چیزوں کو اندرونِ ملک میں تیار کرلیا ہے۔ چنانچہ ایسی مشینری اور ساز و سامان کی تیاری اب زیادہ تر اندرونِ ملک ہی ہوتی ہے جو کہ ملک میں ترقی کے عمل کو آگے بڑھانے میں معاون ہے۔ ۷۸-۱۹۷۷ میں پبلک سیکٹر اداروں کو مال کی برآمدات سے ۱۵۶۲ کروڑ روپے کی آمدنی ہوئی تھی جو بڑھ کر ۸۳-۱۹۸۲ میں ۴۷۰۰ کروڑ روپے تک پہونچ گئی۔ پبلک سیکٹر نے جدیدکاری سے نیز معیشت کو متنوع بناکر بھی ایک اہم کردار ادا کیا ہے۔ اس کی بدولت تکنیکی اعتبار سے بھارت خود کفیل ہو سکا ہے۔ اجتماعی ملکیت اور مربوط منصوبہ بندی کی بدولت پبلک سیکٹر کے ادارے تکنیکی تحقیق و ترقی اور اس کے استعمال میں نمایاں پیش رفت دکھا رہے ہیں۔

سائنسی اور صنعتی تحقیق کی کونسل جسے مختصراً سی ایس۔ آئی آر۔ C.S.I.R. کہا جاتا ہے، صنعتوں سے مربوط کردی گئی ہے۔ اس کا رابطہ صنعتی ایسوسی ایشنوں، سرکاری محکموں، کارپوریشنوں، اور تکنیکی تحقیق کے صارفین وغیرہ سے قائم ہے۔ پبلک سیکٹر کے بڑے بڑے اداروں نے تحقیق و ترقی کے اپنے ہی ادارے کھول لیے ہیں۔ مثال کے طور پر فلزات (میٹالرجی)، فرٹیلائزرز، کیمیکلز، ہیوی انجینئرنگ، ہیوی الیکٹریکلز، تیل کی کھوج اور تیاری، مواصلات وغیرہ میں تحقیق و ترقی کے اپنے بڑے ادارے ہیں۔ اسی طرح دفاعی تحقیق اور ڈیزائن سے متعلق تنظیم، اٹامک انرجی اور خلائی تحقیق وغیرہ کے ادارے بھی تحقیقی کوششوں میں مصروف نظر آتے ہیں۔

اسی وجہ سے تحقیق و ترقی کے شعبے میں ہندوستانی مہارت کافی آگے بڑھ چکی ہے۔ ان کاموں کے لیے طویل المدتی منصوبہ بندی درکار ہوتی ہے، وسائل کو بڑے پیمانے پر حرکت میں لانا ہوتا ہے اور ان میں تال میل قائم کرنا ہوتا ہے۔ پبلک سیکٹر نے اس عظیم قومی ذمہ داری کو بحسن و خوبی انجام دیا ہے۔ اگرچہ یہ صحیح ہے کہ تحقیقی کوششوں اور ان کے عملی استعمال میں کافی فاصلہ ہے لیکن اس میں شک نہیں کہ اس طرح کی سہولتوں نے تحقیقی کوششوں کے عملی استعمال کے امکانات کو کافی بڑھا دیا ہے۔

بھارت میں پبلک اور پرائیویٹ دونوں ہی سیکٹر ہیں، یہاں کی معیشت ملی جُلی ہے اور دونوں ہی طرح کی معیشت قایم ہے۔ لہٰذا پبلک سیکٹر کے اداروں کی کارکردگی جانچنے کا پیمانہ اگر پرائیویٹ سیکٹر کی طرح خالصتہً تجارتی بنیادوں پر اور محض نفع بخش بنیاد پر رکھا جائے گا، تو یہ گمراہ کن بات ہوگی۔

کثیرالمقاصد

پبلک سیکٹر کے اداروں کے پیشِ نظر بہت سے مقاصد ہوتے ہیں۔ اول تو یہ ادارے ایسے کاروبار کو شروع کرتے ہیں جو بالعموم نجی طور پر شروع کرنے میں نفع بخش نہیں ہوتے مگر ان کی اقتصادی اور سماجی طور پر بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ اگر ان کو قائم کرنے میں محض نفع کا ہی تصور پیشِ نظر ہوتا، تو ان کو قائم ہی نہ کیا گیا ہوتا۔ چنانچہ ان سے زیادہ سے زیادہ نفع کمانا کبھی بھی مقصد نہیں رہا ہے۔ اگر صنعت کاری کا عمل تمام تر پرائیویٹ سیکٹر کے پاس ہوتا، تو بھارت نے اقتصادی ترقی میں وہ مقام حاصل نہ کیا ہوتا جو اسے آج حاصل ہے۔ ملک کی معیشت کا اعلیٰ سطح والا تکنیکی ڈھانچہ، درآمدات کے نعم البدل کی تیاری اور ملک کی انتظامی اور تکنیکی صلاحیتوں کا فروغ اُس سطح پر آج ممکن ہی نہ ہوتا جس پر کہ وہ آج ہے۔

پبلک سیکٹر اداروں کے منافع اور پرائیویٹ سیکٹر کے منافع کے درمیان زبردست فرق ہے۔ اس کے باوجود صارفین کے لیے کارآمد صنعتوں میں مصروف پرائیویٹ اداروں کے منافع اور پبلک سیکٹر کے اداروں کے منافع کے درمیان تقابل کا سلسلہ جاری ہے جبکہ پبلک سیکٹر کے اداروں کا دائرہ کارکردگی قطعی مختلف ہے۔

۱۹۶۸-۶۹ — ۱۹۷۸-۷۹ کے دوران کارکردگی کے جائزے سے پتہ چلتا ہے کہ مرکزی پبلک سیکٹر اداروں نے درحقیقت ۱۳۰۹ کروڑ روپے کا مجموعی منافع کمایا، جس میں ٹوٹ پھوٹ کے اخراجات بھی شامل ہیں۔ اس عرصے میں لگائے گئے سرمائے سے پبلک سیکٹر کی رقوم کا تناسب ۶۹-۱۹۶۸ کے ۷ء۵ فی صد سے بڑھ کر ۸۳-۱۹۸۲ میں ۱۳ء۵ فی صد ہو گیا۔ یہ رقوم پبلک سیکٹر کے وسائل سے ہی حاصل کی گئی ہیں جنھیں ملک کی بحیثیت مجموعی ترقی پر صرف کیا گیا ہے۔

ہماری ترقی کی بے شمار ضرورتوں نے پبلک سیکٹر کے تئیں ہمارے اندازِ نظر کو مختلف اور کثیرالجہتی سمتیں دی ہیں۔ سب سے پہلے تو غیر مالیاتی مقاصد کا حصول اپنی جگہ اہم ہے۔ ان اداروں کو اقتصادی ترقی کے لیے مالیاتی وسائل پہلے کے مقابلے میں زیادہ فراہم کرنے ہیں۔ یہ کام انتہائی اعلیٰ انتظامی صلاحیتوں کا تقاضا کرتا ہے اور اس کے بغیر یہ ممکن نہیں۔ اس کے لیے صلاحیت سے بھرپور استفادہ کرنا ہے لاگت پر نظر رکھنی ہے۔ اس کے لیے اعلیٰ کارگزاری درکار ہے۔ پبلک سیکٹر میں تیار ہونے والی اشیاء کی قیمتوں پر کڑی نظر رکھنی ہے تاکہ وہ حقیقت پسندانہ بن سکیں اور معیشت کے دیگر سیکٹروں کے لیے وہ محض امدادی ذریعہ ہی بن کر نہ رہ جائیں۔

انتظامی صلاحیت میں نمایاں بہتری

پبلک سیکٹر میں خاموشی سے انتظامی صلاحیتوں میں ایک نمایاں انقلاب دیکھنے کو ملا ہے۔ پبلک سیکٹر کے اداروں میں مرکزی سرکار کے ماتحت آج ایک لاکھ سے زیادہ انتظامی صلاحیتوں کا مالک انتظامی عملہ ہے جو کل ہند سروسوں اور مرکزی سروسوں کے انتظامی ارکان کی تعداد کا لگ بھگ تین گنا ہے۔ اس طرح کا انتظامی عملہ حصولِ آزادی کے بعد ہی ملک کو میسر آسکا ہے اور یہ اپنی قسم کا بیش قیمت اضافہ ہے۔ اس کے برعکس انتظامی عملے کی برتری ان کی تعداد اور اضافے سے ہی واضح نہیں ہے۔ انتظامی شعبوں میں ایک زبردست انقلاب اس لحاظ سے بھی دیکھنے کو ملا ہے کہ انتظامی عملے نے بہت سی ضروری اصلاحات کیں اور اُس دفتر شاہی نظام کی ازسرِنو تعمیر و تشکیل کی، جس کا کہ پبلک سیکٹر ایک ذیلی نظام ہے اس میں کوئی شبہ نہیں کہ تحریکِ عمل دینے والی ان کی قیادت اور ان کی اعلیٰ صلاحیت نے ملک کی انتظامیہ کی تاریخ پر ایک نقشِ دوام چھوڑا ہے۔ نئی نسل اور نئے انتظامی عملے کے لیے یہ رہنمائی اور تحریکِ عمل ان کی ترقی میں معاون ہوگی۔ پبلک سیکٹر میں قوم کا اعتماد اور بڑھ جائے گا بشرطیکہ پبلک سیکٹر کے ادارے گزشتہ تیس برسوں میں کی گئی ترقی کی سطح برقرار رکھ سکے اور ان میں اور زیادہ بہتری لا سکے۔

تحقیق و تربیت سے کسی بھی طرح صرفِ نظر کرنا ممکن نہیں۔ چنانچہ پبلک سیکٹر منیجروں کے لیے نیشنل اکیڈمی آف مینجمنٹ کی تجویز اس سلسلے کی کڑی ہے۔ بھارت میں پبلک سیکٹر اداروں میں ذہین اور طبّاع نئے منیجروں کے کیڈر کی تشکیل و ترقی وقت کی ضرورت ہے اور اس کے لیے مذکورہ بالا نوعیت کا ادارہ خاص اہمیت رکھتا ہے۔ آنے والی مدت میں بھارت کی بیوروکریسی کی تعمیرِ نو اور ملک کی معیشت کی تشکیل کی سمتیں واضح کرنے میں پبلک سیکٹر کا انتظامی عملہ اہم کردار ادا کرے گا۔

پبلک سیکٹر نے بھارت میں تیس سال تک سخت محنت سے ایک عظیم ذمہ داری نبھائی ہے۔ اس نے مختلف طوفانوں کا سامنا کیا ہے، اس پر اکثر اوقات جو مختلف حملے کیے گئے ان کا مقابلہ کیا ہے۔ پبلک سیکٹر انتظامیہ کی کارکردگی کا ناقدانہ جائزہ لینا بھی اس سلسلے میں مفید رہے گا۔

سرکاری دفتر شاہی نظام

پبلک سیکٹر کے ارتقائی دور میں انتظامیہ کی شکل کافی عرصے تک سرکاری انداز پر رہی۔ انتظامی طریق کار، تصوراتی نظریات، طور و طریق کے انداز غرضیکہ اسی طرح کی مختلف باتیں سرکار سے ہی مستعار لی گئی تھیں۔ ان کمپنیوں کو محدود ذمہ داریوں کے ساتھ معمولی اور عام نوعیت کی کمپنیوں کے طور پر رجسٹر کر لیا گیا تھا لیکن انھوں نے نہ صرف سرکاری دفتر شاہی نظام کی کمزوریوں کو قبول کرنے کی کوشش کی بلکہ ان سے بہت کچھ تحریکِ عمل بھی لی۔ اس صورتِ حال سے ماضی میں ترقی پر اثر پڑا ہے اور پبلک سیکٹر کی کارگزاری متاثر ہوئی ہے۔ ان کارخانوں میں مہم جوئی اور مستعدی کی خاصی اہمیت ہے لیکن ان دونوں صفات کی شروع میں بڑی حد تک کمی پائی گئی اور اگر یہ کہیں کہ ان کا فقدان تھا تو بھی بے جا نہ ہوگا۔ اس کے نتیجے میں انتظامیہ میں سخت گیری اور فرسودہ نظام دیکھنے کو ملا اور وہ حکمتِ عملی اور خوش اسلوبی اور تدبیر کی کارکردگی دیکھنے کو نہ ملی جو اس شعبے کی خصوصی اہمیت ہے۔ ان پندرہ برسوں میں پبلک سیکٹر کے انتظامیہ نے کئی سمتیں نکالی ہیں۔ اس کی ذمہ داریوں اور انتظامی صلاحیتوں نے کلیدی رول ادا کیا ہے۔ اس محاذ پر نئی حکمتِ عملی اور نئے نئے طریقِ کار دیکھنے کو ملے۔

ماضی میں سرکار میں مختلف سطحوں پر تشویش اور تردّد اور اسی طرح سرکار سے باہر مختلف سطحوں پر غیر یقینی حالت نے پبلک سیکٹر کے انتظامیہ میں اعتماد کو نقصان پہنچایا ہے۔ لیکن اب صورتِ حال بدل رہی ہے اور یہ تبدیلی حوصلہ افزا ہے۔ ایسی پالیسی وضع

(باقی ص۳ پر)

میں چھاتی کے بعض امراض خصوصاً کینسر وغیرہ کا امکان زیادہ ہوسکتا ہے۔ اُن شادی شدہ عورتوں میں چھاتی کا کینسر زیادہ ہوتا ہے جو اپنے بچوں کو اپنی چھاتی کا دودھ نہیں پلاتیں۔ جن عورتوں نے اپنے بچوں کو تھوڑے عرصے تک چھاتی کا دودھ پلایا تھا اُن میں اُن عورتوں کی نسبت چھاتی کینسر زیادہ ہوا جنھوں نے لمبے عرصے تک اپنے بچوں کو چھاتی کا دودھ پلایا تھا۔ یہاں اس امر کا ذکر کیا جاسکتا ہے کہ جاپانی اور اسکیمو عورتیں اپنے بچوں کو بہت زیادہ لمبے عرصے تک چھاتی کا دودھ پلاتی ہیں۔

جراثیمی عناصر

یہ معلوم ہوا ہے کہ چوہوں میں چھاتی کا کینسر اُن میں جراثیم داخل ہوجانے کے باعث ہوتا ہے۔ ایسے ہی جراثیم انسانی دودھ میں پائے گئے ہیں، جو چوہوں میں چھاتی کا کینسر پیدا کرتے ہیں۔ بھارت میں ۳۹ فیصد پارسی عورتوں میں بھی ایسے ہی جراثیم پائے گئے ہیں۔

علامتیں

چھاتی کے کینسر کی عام ترین ابتدائی علامت چھاتی میں ایک گومڑ ہوتا ہے جو عموماً درد سے مُبرّا ہوتا ہے اور اکثر اچانک اس کی دریافت ہوتی ہے۔ چھاتی کے کینسر کی مریضہ کھجلی کے دِکھنے، عموماً خون سے سَنے ہوئے سے مواد کے اخراج اور کھجلی کے سکڑنے کی بھی شکایت کرسکتی ہے۔ جن علامتوں کا عموماً کم اظہار ہوتا ہے وہ ہیں، چھاتی کا بڑا ہونا، چھاتی پر پھوڑا ہونا، بغل میں گوشت کا بڑھنا اور جھرّیاں پڑنا۔ رسولی کی جسامت چھونے پر عام طور پر ۲-۱ سینٹی میٹر ہوتی ہے۔ چھاتی کا کینسر زیادہ تر چھاتی کے بالائی بیرونی چوتھائی حصّے میں ایک سخت، درد سے مبرّا اور گشتی گومڑ کی صورت میں پایا جاتا ہے۔

لیکن اگر مریضہ کا مرض بڑھ گیا ہو تو گومڑ ارد گرد کی جگہوں میں جم جائے گا۔ جلد پھٹ سکتی ہے۔ یا اُس پر پھوڑے ہوسکتے ہیں۔ کینسر زدہ چھاتی کی بناوٹ یکساں ہوتی ہے مگر اپنی جگہ سے ہٹ سکتا ہے، چپٹا ہوسکتا ہے یا سکڑ سکتا ہے۔ بعض حالتوں میں بالکل ختم ہوسکتا ہے۔

عمومی تحقیق

چھاتی کا نصف کینسر چھاتی کے بالائی بیرونی چوتھے حصّے پر ہوتا ہے۔ یہ رفتہ رفتہ نشوونما پاتا ہے اور پانچ برس کے بعد چھوٹا دکھائی دے سکتا ہے۔ جُوں جُوں رسولی کی جسامت بڑھتی ہے وہ پٹھے اور جلد کے نیچے ارد گرد کی غدودی بافت پر حملہ آور ہوتی ہے۔ انجام کار رسولی کے خلیے اُس جلد کی جگہ لے لیتے ہیں جس کے پھٹنے سے پھوڑا بنتا ہے۔ اس طرح رسولی کی جسامت بڑھتی ہے اور اُس کا اثر جلد کے نئے نئے حصّوں پر پڑتا ہے۔ جوں جوں یہ عمل جاری رہتا ہے لمف اور خون کی چھوٹی رگیں متاثر ہوتی ہیں۔ رسولی کے خلیے لمف کی رگوں کے ساتھ ساتھ گذرتے ہوئے بغل کی رگوں تک پہنچتے ہیں جہاں وہ نصب ہوتے ہیں اور نشوونما پاتے ہیں۔ رسولی کے خلیے ان رگوں میں بڑھتے رہتے ہیں اور انجام کار رگیں ایک دُوسرے سے جُڑ کر گوشت کا ایک بڑا ٹکڑا بن جاتی ہیں۔ خون کی چھوٹی رگوں کے ساتھ چلنے سے رسولی کے یہ خلیے گردش میں آتے ہیں۔ یہ خلیے جسم کے اندر گردش کرتے ہیں اور وہ پھیپھڑوں، جگر، ہڈیوں اور دماغ میں نصب ہوسکتے ہیں۔ اس طرح باقاعدگی سے اس کا پھیلاؤ ہوتا ہے اور ۹۵ فیصد مریض جو غیر کنٹرولی چھاتی کے کینسر سے ہلاک ہوتے ہیں اُن میں اس مرض کا پھیلاؤ ہوتا ہے۔ پھیپھڑے، جگر اور ہڈیاں اس کا عام طور پر شکار ہوتی ہیں۔

آج مریضوں کو کسی علاج کے بغیر شاذونادر ہی ان تمام مرحلوں میں سے گذرنے دیا جاتا ہے لیکن مجھے یہ بتاتے ہوئے افسوس ہوتا ہے کہ ہمارے مُلک میں یہ بات صحیح نہیں ہے۔ مریضوں کی ایک بڑی تعداد کو جنکی بیماری بہت زیادہ بڑھی ہوئی ہے، اور چھاتی کا کینسر پھیلا ہوا ہے اور جن کی بیماری پر علاج سے کنٹرول نہیں کیا جاسکتا ابھی تک ہمارے ہسپتالوں میں دیکھا جاتا ہے۔

تشخیص میں عورتوں کا کردار

چھاتی کے کینسر کا جب وہ بہت زیادہ بڑھا ہوا نہ ہو تو سرجری سے علاج کیا جاسکتا ہے۔ جب بیماری پھیل کر بغل کی رگوں میں پہنچ جاتی ہے تو علاج کی کامیابی میں نمایاں کمی ہوجاتی ہے۔ لیکن جب یہ بیماری جسم کے دُوسرے حصّوں یعنی پھیپھڑے، جگر اور ہڈیوں میں پہونچ جاتی ہے تو کوئی علاج قطعاً ممکن نہیں ہوتا۔ چھاتی کے کینسر کی تشخیص میں خود مریض اور ڈاکٹر دونوں کو رول ادا کرنا ہوتا ہے۔ یہ ایک نہایت المناک حقیقت ہے کہ ہمارے ملک میں عورتیں ڈاکٹر سے مشورہ کرنے میں بہت دیر کردیتی ہیں۔ اس سے پہلے کہ ایسے معاملوں میں کوئی مفید علاج معالجہ شروع کیا جاسکے تاخیر کے باعث مرض کا علاج ڈاکٹر کو ناممکن نظر آنے لگتا ہے۔

تعلیم کی کمی

ہمارے بیشتر مریض خیال کرتے ہیں کہ چونکہ چھاتی اور جسم کے کسی دُوسرے حصّے میں کوئی درد نہیں ہے اور وہ عام طور پر اپنے کو تندرست محسوس کرتے ہیں اس لیے تشویش کرنے کی ضرورت بھی نہیں۔ وہ اکثر کہتے ہیں "چھاتی کے اس گومڑ نے مجھے کوئی تکلیف نہیں دی۔ اس لیے میں نے اس کی طرف کوئی توجہ نہیں دی۔"

یہ حیرانی کی بات ہے کہ عام بھارتی عورتوں کو صحت کے بنیادی امور سے کتنی زیادہ لاعلمی ہے، چھاتی کے عارضہ کی بات تو بہت دُور کی ہے۔ ہمارے نظام تعلیم میں زندگی، صحت اور مرض کے بنیادی امور عام تعلیم کے نصاب میں کہیں بھی نہیں سکھائے جاتے لہٰذا اکثر اوقات تعلیم یافتہ اشخاص کو بھی غیر تعلیم یافتہ اشخاص کی مانند مرض کے عمل کے بارے میں بے بہرہ پایا جاتا ہے۔ ہماری اسکولی یا کالجی تعلیم میں صحتی سائنسوں سے متعلق ایک بنیادی نصاب کا شامل کیا جانا مشکل نہیں ہونا چاہیے۔ کوئی کینسر جسم میں کیوں کر پیدا ہوتا ہے اور پھیلتا ہے اُس کی ابتدائی تشخیص کی اہمیت اور علاج معالجہ کے اصول کے بارے میں بنیادی امور کی وسیع پیمانے پر معلومات ہونی چاہئیں تاکہ عام لوگ اُن کی جانکاری

رسکیں...

بادی اسباب

طبی دیکھ بھال پر آنے والا بہت زیادہ خرچ
ایک اہم سبب ہے۔ ہمارے مریضوں کی
اس قدر غریب ہے کہ وہ روزمرہ کے کم از کم
ات بھی بمشکل پورے کر سکتے ہیں۔ جب چھاتی کے
کا خطرہ پیدا ہوتا ہے جس کے لیے تشخیص کی خاطر
ل میں بار بار جانا ضروری ہوتا ہے تو وہ اکثر اسے
دیتے ہیں۔

جی اسباب

ہمارے مریضوں میں اکثر ایسے کسی بھی شخص سے
ہ حاصل کرنے کا رجحان پایا جاتا ہے جو مناسب
یوں اور آپریشن کے بغیر مرض کا علاج کر سکیں۔ اس
یہ ہوتا ہے کہ چھاتی کے کینسر والی یہ عورتیں "شرطیہ"
ج کرنے والے ڈاکٹروں اور حکیموں کا شکار ہو جاتی ہیں
ہی ڈاکٹر ہوتے ہیں اور نہ ہی اُن کا علاج "شرطیہ"
ہے۔

لیکن یہ نام نہاد ڈاکٹر اور کلینک چھاتی کے کینسر
ایسے مریضوں کا دوائیوں اور انجیکشنوں وغیرہ سے
ج کرتے رہتے ہیں۔ جب مریضہ کے پاس سارا پیسہ
ار ہتے اور وہ بیزار ہو جاتے ہیں تو وہ کسی دوسری
سے مشورہ پانے کے لیے مجبور ہو جاتے ہیں۔ یہ ایک
تہ ہی افسوسناک امر ہے کہ تب تک بیماری کا بہت
دہ بڑھ چکا ہوتا ہے۔

نفسیاتی اسباب

لیسے نفسیاتی اور جذباتی اسباب کا ایک مکمل
سلسلہ موجود ہے جس سے چھاتی کے مرض خصوصاً کینسر
لیے ڈاکٹر سے مشورہ کرنے میں تاخیر ہو سکتی ہے مثال
طور پر چھاتی کے کینسر کا خوف یا آپریشن امرض
ناقابل علاج ہونا، جھوٹی شرم اور مرض کے علم ہونے
نتیجے میں افسردگی کا ہونا، اس کا طویل المدتی علاج،
ایک سہیلی کی اپنی ماں کے بارے میں روداد، جو
تی کے کینسر میں مبتلا ہو گئی تھی۔

باتی کے کینسر کی ابتدائی تشخیص: چھاتی کے
کینسر سے متعلق پبلک یا اداراتی جمعی پروگرام کا ایک
بنیادی مقصد عورتوں کو مطلع کرنا اور باور کرانا ہے کہ
اگر مرض کا ابتدائی مرحلے میں سراغ لگا لیا جائے اور
علاج کیا جائے تو اس کا علاج ہو سکتا ہے۔ چھاتی
کے کینسر کا از خود پتہ چلانا بھی ضروری ہے۔ کینسر کی ابتدائی
تشخیص میں یہ معاون ہے لہٰذا خواتین کو مشورہ دیا جاتا
ہے کہ وہ از خود اس کی شناخت کرنے کی کوشش ضرور کریں۔

خود معائنہ

چھاتی کے خود معائنے کا پہلا طریقہ ہے ایک
آئینے کے سامنے پستانوں کا معائنہ کرنا، کسی غیر
مناسب گومڑ، صورت میں تبدیلی، نپل کی جسامت،
اس کے سکڑنے، جلد پر گڑھوں یا کسی سُرخی نظر آنے
اور گھنڈی سے خون آلودہ مواد کے اخراج کی صورت
میں فوری طبی مشورہ کیا جانا ضروری ہے۔

دوسرا طریقہ ہے بہتر، صوفے یا فرش پر
لیٹ کر چھاتی کو چھو کر معائنہ کرنا۔ ہر پستان کا باری
باری مخالف ہاتھ کی چپٹی انگلیوں سے دبا کر معائنہ
کیا جائے۔ چھاتی کے تمام حصوں کا نرمی سے باقاعدگی
کے ساتھ دبا کر معائنہ کیا جانا چاہیے۔ دیکھنا یہ ہے کہ کہیں
کوئی گومڑ یا دباؤ سے درد کا احساس تو نہیں ہوتا۔

جب عورتیں تیس کے دہے کے آخری برسوں میں
ہوں تو انھیں سال میں دوبار ایسا معائنہ کرنا چاہیے۔
یہ وہ عمر ہے جب پہلے پہل چھاتی کا کینسر شروع ہوتا
ہے۔ جب چھاتی کے خود معائنے کے بارے میں
کوئی شبہ ہو تو ڈاکٹر سے فوراً مشورہ کرنا چاہیے۔

ہسپتالی مرحلہ

ہسپتالی مرحلہ تب شروع ہوتا ہے جب
سرجن کی طرف سے مریض کے جسمانی معائنے اور
تشخیص پر مبنی کینسر کی حد کی نشاندہی کرنے کا
عمل شروع ہو جائے۔

چھاتی کے کینسر کے چار مرحلے ہیں۔

مرحلہ نمبر ۱: رسولی چھاتی تک محدود رہتی ہے۔
مرحلہ نمبر ۲: رسولی چھاتی تک محدود رہتی ہے لیکن
اسے چھو کر دیکھا جا سکتا ہے۔ اسی پہلو کی بغل میں
لمف کی گشتی گومڑیاں موجود رہتی ہیں۔
مرحلہ نمبر ۳۔ رسولی پھیلتی ہوئی چھاتی کے باہر چلی
جاتی ہے۔
د۔ وہ جلد کو متاثر کرتی ہے یا چھاتی پر پھوڑا ہو
جاتا ہے۔
(ب) رسولی پٹھوں کے بغل کی رگوں کے نیچے جم جاتی
ہے۔
مرحلہ نمبر ۴: کینسر جسم کے دوسرے حصوں یعنی پھیپھڑوں
جگر اور ہڈیوں وغیرہ میں پھیل جاتا ہے۔

مداوا

۱۔ معائنہ (۲) علاج۔

معائنہ:۔ خون، پیشاب، چھاتی کا ایکسرے اور
بائیوپسی۔

بائیوپسی:۔ خوردبین سے چھاتی کی غیر معمولی بافت
یا گومڑ کا معائنہ، زخم یا مرض کی نوعیت کا تعین کرنے
کا واحد یقینی طریقہ ہے کہ چھاتی کو چھونے سے گومڑا
محسوس ہو، درد ہو یا نہ ہو۔ گشتی ہو یا نہ ہو اور وہ
کتنے ہی وقت سے موجود ہو اُس کی بائیوپسی ضرور
کرالینی چاہیے۔ چھاتی کی بائیوپسی ایک ایسا عمل ہے
جس میں کوئی خطرہ نہیں ہے اور وہ مقامی طور پر یا پورے
جسم کو سُن کر کے کی جا سکتی ہے۔ بائیوپسی سے جو مواد
الگ کیا جائے وہ خوردبینی معائنے کے لیے ضرور دیا
جانا چاہیے۔ بعض اداروں میں چھاتی کی رسولی کی
سوئی سے بائیوپسی کی جاتی ہے۔ اور وہ نہایت
اطمینان بخش ہے بشرطیکہ معائنہ کار اس قسم کے طریقے
سے جانکاری رکھتا ہو۔

آل انڈیا انسٹی ٹیوٹ آف میڈیکل سائنسز میں
منجمد سیکشن کی بائیوپسی کی سہولیات میسر ہیں۔ یہ بائیوپسی
کا نہایت اطمینان بخش طریقہ ہے۔ سارے جسم کو
سُن کر کے سرجری سے بافت نکالی جاتی ہے۔ پھر
اس نمونے پر خاص عمل کیا جاتا ہے۔ ایک بڑے معائنہ
کار کی حیثیت سے سلائیڈ پر سٹین لگایا جاتا ہے اور
رسولی کی نوعیت کے بارے میں تیار رپورٹ دی جاتی ہے۔
اُس طریقے سے سرجن کو تقریباً ۲۰ منٹ میں رپورٹ مل

ایس۔ ایم۔ عباس

سوال

اور میرے وجود کی گہرائیوں میں بہت سارے اندھیرے اُتر گئے ہیں۔

کتنا درد، کرب، کیسی خلش، چبھن، افسردگی، تلخی اور محرومی کا ایک ہجوم لیے، مَیں بوجھل قدم آگے بڑھ رہا ہوں۔ میرا ذہن آتش کدہ بن گیا ہے۔ لاوے اُبل رہے ہیں، پگھل رہے ہیں اور سوالات کے سیلاب میں، مَیں ایک تنکے کی طرح بہتا جا رہا ہوں۔

کاش کوئی کنارہ مِل جائے!

آج پھر ادھر گذر ہو گیا۔

جب بھی اِدھر سے گذرتا ہوں اُسے دیکھ کر نجانے کیوں طبیعت عجیب سی ہو گئی ہے۔ قدرت اکثر خود اپنی مخلوق کو طبع تفریح کا سامان بنا دیتی ہے۔ اُس وقت آدمی ہونا کِتنا مضحکہ خیز معلوم ہوتا ہے۔ ذہن میں اکثر یہی بات اُبھر آتی۔

اس کے اُوپر سے گول مٹول اور نیچے سے نصف مفلوج، سوکھی ٹہنیوں جیسے جسم کے ساتھ لوگوں کا مذاق دیکھ کر ایک تلخی سی وجود میں گھل جاتی۔ کوئی اُسے فٹ بال کہتا تو کوئی گاؤ تکیہ، کوئی گیند تو کوئی گنبد، لیکن وہ ساری باتوں سے بے نیاز مسکراتا رہتا۔ جیسے اپنی معصوم مسکراہٹ میں زندگی کا ہر زہر ملا کر وہ پی جانا چاہتا ہو۔

بس رُکتے ہی وہ اُچھلتا ہوا نزدیک آجاتا۔

"پالش ... بوٹ پالش ... بابو جی ... چمکا دوں؟"

اور پھر وہ جواب کا انتظار کئے بغیر فیتے پر ہاتھ لگا دیتا اور تیزی سے اس کا برش جوتے پر دوڑنے لگتا۔

بابو جی ایسا چمکا دوں گا کہ مُنہ دیکھ لیجئے۔

اس کا ہاتھ اور تیزی سے چلنے لگتا اور مَیں سوچنے لگتا کہ دوسرے کا جوتا چمکانے والے کو یہ خبر نہیں کہ خود اس کا چہرہ کتنی گرد سے اَٹا پڑا ہے۔

"دیکھ! ٹھیک سے لگانا۔"

"ذرا چمکا دینا۔"

"خوب قاعدے سے ذرا۔"

"بہکائے گا تو ٹھیک نہیں ہوگا۔"

"ابھی نہیں چمکا، پیسہ نہیں ملے گا۔"

لوگ اُسے ٹھوکا دیا کرتے اور وہ خاموشی سے مفلوج گھٹنوں کے درمیان جوتا دبائے جلدی جلدی برش چلانے میں مصروف رہتا۔ اس کے چہرے پر ننھی ننھی بوندیں اُبھر آتیں۔ اکثر یہ بوندیں جوتے پر بھی ٹپک پڑتی۔ اور تب پتہ نہیں تھک کر یا دوسرے کا نمبر لگانے کے لیے وہ یوں سر اٹھاتا جیسے اس نے بہت بڑا کارنامہ انجام دیا ہو لیکن اسی کے اس کارنامے کا بدل چالیس پیسے ہی ہوتا، اکثر جب اُسے پورے پچاس پیسے مِل جاتے تو ایسا لگتا جیسے کائنات مِل گئی ہو اس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک دوڑ جاتی۔

کچھ دنوں پہلے بھی اِدھر میرا گذر ہوا تھا۔

اسی دن مجھے اس کے اندر قدرے تبدیلی نظر آئی تھی۔

اس کا چہرہ اُترا ہوا تھا، وہ شوخی، مسکراہٹ معدوم تھی۔ آنکھوں کی چمک ماند گئی تھی۔ جیسے وہ برسوں کا بیمار ہو۔ ہاں اس کے ہاتھ میں اس کا میلا کچیلا تھیلا اور برش آ رہا تھا، وہ لوگوں کو مسرت بھری نگاہوں سے تکے جا رہا تھا جیسے وہ کچھ تلاش کر رہا ہو۔

اس دن میرا جی چاہا تھا کہ مَیں ذرا دیر اس کے پاس رُکوں لیکن اس مشینی دَور میں جب آدمی ایک ریلے کے ساتھ بہا جا رہا ہے کس کے پاس اتنا وقت ہے کہ وہ کسی کے پاس کھڑے ہو کر اپنا قیمتی وقت برباد کرے۔ آج کا کاروباری آدمی تو لمحوں کی قیمت چاہتا ہے اگر اس کے پاس کچھ ہے بھی تو وہ شطرنج، برج، ریس کورس، وی سی آر، ٹی وی اور دیگر سیر و تفریح میں اس کا مناسب استعمال کیوں نہ کرے؟

کوئی خونِ دل میں نہلائے یا آنسوؤں سے دامن بھگوئے۔ ہر آدمی اپنے حال میں مست ہے۔ کسی پر کیا گذرتی ہے اُسے اس سے کوئی غرض نہیں۔

نجانے کیوں اس دن میرے وجود میں کچھ چیز دیر تک سلگتی رہی۔ شام جب میں واپس آیا وہ مجھے پھر وہیں مِل گیا۔ میری بس لیٹ تھی۔ مَیں نے اپنا جوتا اس کی طرف بڑھا دیا اور اس سے باتیں کرنے لگا۔

امتیاز خالق

ہتھ کرگھی کپڑوں کی برآمدات

ہندوستان میں صنعت پارچہ بافی کی تاریخ دس ہزار سال سے بھی آگے جاتی ہے جب کہ ... محض اپنی اور مقامی لوگوں کی ہی حاجت کے کفیل تھے۔ ذرائع نقل و حمل محدود اور وسائل مسدود ہونے کی بنا پر کپڑوں کی درآمد و برآمد کا کوئی طریقہ نہ تھا۔ مگر جوں جوں اس سمت میں دشواریاں کم ہوتی گئیں اور حالات موافق ہوتے گئے دائرہ تجارت بھی مقامی منڈیوں سے پھیل کر وسیع تر ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ کپڑے غیر ممالک بھی بھیجے جانے لگے اور اس طرح آہستہ آہستہ کپڑوں کی باقاعدہ برآمد شروع ہو گئی۔ اپنی گوناگوں خوبیوں کی وجہ سے ہندوستانی کپڑوں نے غیر ملکی منڈیوں میں اپنا ایک معتبر اور بلند مقام پیدا کر لیا۔

آہستہ آہستہ کپڑوں کی برآمدات میں ہندوستان نے اتنی ترقی کی کہ دنیا کی منڈیوں میں ہندوستانی کپڑوں کی اجارہ داری قائم ہو گئی۔ یہی وہ دور تھا کہ جب ہندوستانی کپڑے فیشن وقت کی علامت سمجھے جانے لگے۔ ان کی قدر و منزلت کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ اس دور کے نہایت ترقی یافتہ ممالک روم و بغداد کے امرا اور سربراہ بھی ہندوستانی پارچوں کے ہی ملبوسات پہنا کرتے تھے۔

کسی بھی صنعت کی بقاء و ترقی کا دار و مدار اس کی تجارتی وسعت پر ہوتا ہے یعنی بنیادی طور پر بیرونی تجارتی دسترس ہی اس کی ضامن ہوا کرتی ہے۔ ہزاروں برس بعد آج بھی ہتھ کرگھے کی صنعت کا پوری آب و تاب کے ساتھ ہندوستان میں قائم و دائم رہنا کوئی معجزہ نہیں بلکہ یہ متاخرین کی بے پناہ مشقت اور ان تھک کاوشوں کا دیرپا ثمرہ ہے۔

گو یہ باتیں اب داستان پارینہ بن چکی ہیں کہ کبھی کپڑوں کی عالمی منڈیوں میں ہمارا سکہ چلتا تھا۔ تاہم وسط ہند میں دسویں صدی عیسوی تک ہندوستانی کپڑوں کی ایک مقدار برآمد کی جاتی رہی۔ مگر اس کے بعد انگریزوں، فرانسیسیوں اور پرتگیزیوں کی ریشہ دوانیوں نے اس کی برآمدات کو بہت حد تک متاثر کیا۔ اور بعد ازاں عہد فرنگ میں اس کے مذموم انحطاط و انسداد کی سازشوں سے کون واقف نہیں۔ برآمدات کی شرح میں تدریجاً کمی اور ملک کو کثیر زرمبادلہ کی ضرورت کے پیش نظر ۱۹۵۶ء میں امریکہ سے تجربہ کاروں کی ایک ٹیم کو تجارتی مشن پر مدعو کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ آزادی کے بعد حکومت کی جانب سے اس سمت میں یہ پہلا اقدام تھا۔ چنانچہ ۱۹۵۶ کے آخیر میں مسٹر بورس کرول (Mr. Boris Kroll) کی قیادت میں ایک وفد ہندوستان آیا۔ انھوں نے یہاں صنعت ہتھ کرگھا کے درپیش مسائل کو اچھی طرح سمجھنے کی کوشش کی اور ان کی تیاری اور برآمدات میں مانع و مزاحم عوامل کا بہ نظر غائر مشاہدہ کیا اور ان کے جملہ نکات کا تجزیہ کرنے کے بعد حکومت ہند کو اپنی مفصل رپورٹ پیش کی جس میں کہ نقائص کی نشاندہی کے ساتھ ساتھ ان کے ازالہ کی تدابیر و تعمیری مشورے بھی پیش کیے گئے۔

انھوں نے ہندوستان میں جس بات کو سب سے زیادہ محسوس کیا وہ تھی کسی ایسے مرکزی ادارے کی عدم موجودگی جو کہ ایکسپورٹرس (Exporters) کے ساتھ جملہ برآمداتی امور پر معاملہ کر سکے نیز ان کا ممد و معاون بن کر ہر طرح کی رہنمائی کرے۔ چنانچہ اس تجویز کو عملی جامہ پہنانے کے لیے ۱۹۵۹ میں ایک مرکزی تنظیم Handloom Export Organisation کی تشکیل عمل میں آئی۔ اس تنظیم کا بنیادی مقصد ہی ہتھ کرگھوں پر تیار کردہ کپڑوں کی برآمدات میں اضافے کی کوشش کرنا ہے۔ بالخصوص شمالی امریکہ اور یورپ کی منڈیوں کے لیے۔ اس تنظیم کو "اسٹیٹ ٹریڈنگ کارپوریشن آف انڈیا" کے زیر عمل ایک محکمہ قرار دیا گیا ہے۔

مقاصد مذکورہ کی بازیابی کے لیے تنظیم جن آٹھ بنیادی امور پر کاربند ہے وہ حسب ذیل ہیں۔

۱۔ ویورس سروس سنٹرس (W.S.C.) کے تیار شدہ برآمدی کپڑوں کے نمونوں کے مطابق اس کی تیاری کے لیے ضروری اقدام کرنا۔

۲۔ اپنی اشتراکی برآمدی فرموں سے کپڑوں کی خریداری کرنا۔

۳۔ تنظیم کی رکن فرموں کو خام مال مثلاً دھاگہ، رنگ و مطلوبہ کیمیاجات فراہم کرنا۔

۴۔ ممالک غیر میں ہندوستان کے ہتھ کرگھی کپڑوں کی وسیع پیمانے پر تشہیر کرنا نیز بیرون ہند منعقد ہونے والے صنعتی میلوں اور نمائشوں میں حصہ لینا[1]

---

[1] ۱۹۷۰ء میں منعقدہ کئی تجارتی میلوں مثلاً موماسا، دارالسلام، کمپالا، اور نیروبی (مشرقی افریقہ) میں ہندوستان نے حصہ لیا۔

۵۔ رکن برآمدی فرموں کو اس نوعیت کے تجرباتی ڈیزائن فراہم کرنا جو کہ غیر ملکی منڈیوں کے موجودہ مقتضیات کو مدِ نظر رکھ کر تخلیق کئے گئے ہوں۔

۶۔ ہندو بیرونِ ہند شو رومز (Show-rooms) کے اجرار کا بندوبست کرنا۔

۷۔ ممالک کی برآمدی و بیرونِ ملک درآمدی فرموں کے بیچ ثالث کی حیثیت سے کردار ادا کرنا۔

۸۔ برآمدات میں اضافے کے لیے ضروری اقدامات کئے جانے کے متعلق حکومتِ ہند کو وقتاً بموقع صلاح دینا۔

مذکورہ بالا تنظیم کے معرضِ وجود میں آنے کے کچھ ہی عرصہ بعد مزید ایک برآمدی ادارہ کا قیام عمل میں آیا۔ یہ ادارہ ہینڈی کرافٹس اینڈ ہینڈلوم ایکسپورٹ کارپوریشن بھی HEO کی مانند "اسٹیٹ ٹریڈنگ کارپوریشن آف انڈیا لمیٹڈ" کے زیر عمل ایک علیحدہ محکمہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ HHEC جن مقاصد کے حصول کی خاطر برسرِ پیکار ہے، وہ علی الترتیب یہ ہیں۔

۱۔ رکن برآمدی فرموں کو برآمدات کے لیے موزوں ڈیزائن فراہم کرنا اور برآمدات سے متعلق تکنیکی مسائل کو حل کرنے کے لیے ہر ممکنہ حرفیاتی خدمات انجام دینا۔

۲۔ ہر ایسے خام مال کی فراہمی میں اُن کی مدد کرنا جو کہ بہ آسانی دستیاب نہ ہوں۔

۳۔ رکنی فرموں سے حاصل کئے گئے نمونوں کی نمائش کرنا۔

۴۔ ملکی و غیر ملکی شو رومز (Show-rrooms) میں اشیائے برآمد کے نمونوں کی نمائش کرنا۔

۵۔ سالِ رواں میں برآمدات کی مقدارِ متوقع کے بموجب برآمدی اشیاء کی خاطر خواہ ذخیرہ افزوئی کرنا۔

۶۔ ہندوستان کے ہتھ کرگھی کپڑوں کو ممالکِ غیر میں مشتہر کرنا۔ وغیرہ۔

HHEC کے ذریعے دنیا کے متعدد بڑے شہروں میں شو رومز کھولے گئے ہیں۔ مثلاً نیویارک، بوسٹن، مانٹریئل، پیرس اور سڈنی میں "سونا" کے نام سے اور ہمبرگ میں "ویبر ہاؤس" کے نام سے۔

HHEC کی کارکردگی کا وہ پہلو جو اُسے HEO سے ممیز و ممتاز کرتا ہے وہ یہ کہ اول الذکر "آل انڈیا ہینڈلوم بورڈ" اور اُسی کے قائم کردہ "ویورس سروس سنٹرس" W.S.C. سے نہایت قریبی روابط و تعاونِ باہمی کے ساتھ کام سرانجام دیتی ہے۔

اس کارپوریشن (HHEC) ہی کی بہترین کارگذاریوں کی بدولت گذشتہ چند برسوں میں ہتھ کرگھی کپڑوں کی برآمد میں غیر معمولی اضافہ ہوا ہے۔ ۷۲-۱۹۷۱ء کے دوران صرف ۸۔۱۶ کروڑ روپیوں کے ہی کپڑے برآمد کئے گئے جب کہ گذشتہ برس اس سے کئی گنا زیادہ یعنی ۳۔۳ کروڑ روپے کی مالیت کے کپڑے برآمد کئے گئے۔

ان تنظیموں کی کوششیں بلاشبہ ہر اعتبار سے کامیاب رہی ہیں۔ تاہم ان کے مقاصد محدود تھے۔ لہٰذا مئی ۱۹۶۵ میں "ہینڈلوم ایکسپورٹ پرموشن کونسل" کے نام سے ایک اور تنظیم ٹیکسٹائل کمشنر کی چیئرمین شپ میں قیام پذیر ہوئی۔ (HEPC) ہی کے تحت اس کی ایک "انتظامیہ کمیٹی" بھی تشکیل دی گئی اور بعد ازاں ۱۹۷۰ میں اس کمیٹی کی تشکیلِ نو عمل میں آئی۔ موجودہ کمیٹی کل پچیس ارکان پر مشتمل ہے جس میں سے چار غیر منتخب اراکین یہ ہیں:۔

۱۔ ڈیولپمنٹ کمشنر برائے ہتھ کرگھا۔
۲۔ ٹیکسٹائل کمشنر یا اُس کا نمائندہ۔
۳۔ چیئرمین یا جنرل منیجر HHEC
۴۔ صدر یا نائب صدر (آل انڈیا ہینڈلوم فیبرک مارکیٹنگ کارپوریشن آف سوسائٹیز)

کونسل کا اجلاس ہر دو ماہ بعد منعقد کیا جاتا ہے جس میں کہ ہتھ کرگھی اشیائے برآمد کے بابت درپیش مسائل زیر بحث لائے جاتے ہیں اور اُس کے تمام پہلوؤں پر مع جزئیات مباحثہ کی ماحصل رپورٹ حکومتِ ہند کو بھیج دی جاتی ہے اُس میں لائحہ مستقبل کے لیے مشورے بھی شامل ہوتے ہیں۔

کونسل کی "انتظامیہ کمیٹی" نے چند معاون کمیٹیاں بھی تشکیل دی ہیں۔ جن کا کام برآمدی اجناس کا معیارِ قیمت متعین کرنا ہے۔ کونسل اس بات کی مختار و مجاز ہے کہ جس مستحق برآمدی ادارے کو مالی امداد دینا ضروری خیال کرے، دے سکتی ہے۔ بالخصوص سوتی کپڑے اور ہتھ کرگھی کپڑوں کی پوشاک برآمد کرنے والے اداروں کو ضروری امداد دے۔ گذشتہ دہے میں کونسل نے کپڑے کی فروخت بڑھانے سے متعلق مختلف ٹیموں کو بیرونی ممالک میں وہاں کی تجارتی منڈیوں کا معائنہ کرنے کی غرض سے روانہ کیا تھا۔ کونسل نے گذشتہ برسوں مغربی ممالک میں منعقدہ بین الاقوامی نمائشوں اور صنعتی میلوں میں اپنی رکن فرموں کو حصہ لینے کے مواقع فراہم کئے۔

کونسل کے ذمّہ ممالکِ غیر کی متعدد زبانوں مثلاً انگریزی، فرنچ، جرمنی، عربی، روسی اور جاپانی وغیرہ میں ہتھ کرگھی کپڑوں کی پُرزور تشہیر بھی سونپی گئی جس میں کہ وہ قطعی کامیاب رہی ہے۔

کونسل کا ایک ترجمان جریدہ بھی ہر ماہ "ہینڈلوم ایکسپورٹ" کے نام سے شائع ہوتا ہے جو کہ ہتھ کرگھی کپڑوں کے ایکسپورٹرس کو وافر مواد فراہم کرتا ہے۔

کپڑوں کی برآمد کے ساتھ ساتھ پوشاک کی برآمد میں بھی ہم نے غیر معمولی ترقی کی ہے۔ ہتھ کرگھی کپڑوں سے تیار شدہ پوشاک بیرونی ممالک میں کس قدر مقبول ہے اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ہندوستان سے پوشاک کی فی الجملہ برآمد میں سے ۶۰ فیصد پوشاک ہتھ کرگھی کپڑوں کی تیار کردہ ہوتی ہیں۔

مشد علی ارشد

سماج کی تعمیر میں طلباء کا کردار

کیفمی سماج کی تعمیر میں اِس کا
پیچھی پس منظر اور روایات کو جو دخل ہے وہی
ما کے مستقبل کا ضامن ہے۔ سماج کی تعمیر
ایت اور نئے بکھری ڈھانچوں کے امتزاج سے
ں میں آتی ہے۔ اس لیے یہ لازم ہے کہ نئی نسل
تربیت اس طرح کی جائے کہ ان میں زندگی کے لیے
لف گوشے، تہذیب اور ثقافت کے نئے معیارات،
است اور معیشت کے متوازن مواقع کا مکمل شعور بیدار
بائے۔ اس لیے یہ بھی لازم ہے کہ وہ سماج
ں پر آنے والی نسل کی تربیت اور نئے ذہن کی
داوار کی ذمہ داری ہے، وہ خود سماج اور ملک و
م کے مستقبل کے استحکام کا بار خلوص اور نیک نیتی
سنبھالیں۔ سماج میں زندگی کا عمل محض ذاتی معیشت
معاد کا آفریدہ نہیں ہے۔ بلکہ زندگی کو ملک و قوم
اکائی کے طور پر عمل پیرا ہونا چاہیئے۔ جہاں تک
لب علم کی بات ہے وہ ایک نئے آنے والے دور کی
ید بھی ہے، امانت بھی اور ضمانت بھی۔ اس
منظر میں سماج کی تعمیر میں آج کے طالب علم کی
ذمہ داری ہے، اس کے لیے یہ کہنا کافی نہیں کہ
محض حصولِ علم کا ایک آلۂ کار بن کر رہے۔ اُس
خلوص سے یہ اُمید بھی وابستہ کی جاتی ہے کہ اس
کردار آنے والے دور کے لیے ملک و قوم کا کردار
۔ آج کے دور میں تعلیم کی ہمہ گیری طلبا کو مختلف
بوں میں تقسیم کرتی ہے۔ اس میدان میں فلسفۂ
ت کے مختلف شعبے تو ہیں ہی لیکن اس کے
ساتھ سائنس، تجارت، صنعت و حرفت،
ریاضی، کیمیا اور طبیعات کے مضامین بھی ریہ میدان
تجربات، فلکیات، نجوم اور موسمیات میں بھی تقسیم
ہوتے ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ ادب اور تاریخ، جغرافیہ
اور عمرانیات میں بھی، مذہبیات اور اخلاقیات بھی
تعلیم کے اہم اور مستحکم مقاصد میں شامل ہیں۔ ان موضوعات
پر اگر ہم غور کریں تو ہمیں زندگی اور اس کی ضروریات
کی اہمیت کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ اور ہمہ جہتی کا بھی۔

طالب علم کا کردار محض حصولِ علم سے ہی متعین
نہیں ہوتا۔ بلکہ خدمتِ انسانیت کے جذبے سے بھی
متعین ہوتا ہے۔ تاریخ کے ہر موڑ پر، صفحۂ ارض کے
ہر خطے میں ہم کو ایسی عظیم ہستیاں ملیں گی جنھوں نے
خود کو ایک نئے سماج کی، ایک نئی قوم کی، ایک نئے
معاشرے کی اور ایک نئی زندگی کی تعمیر کے لیے وقف
کیا۔ اُن کا کردار، اُن کی ذات، اُن کی فہم، اُن کا
شعور، اُن کی فکر اور اُن کے کلمات آج بھی ایک
نئے سماج کی تعمیر کے لیے ہمارے کردار، ہمارے
ذہن، ہماری ذات، ہمارے شعور اور ہماری قوتِ
نمو اور قوتِ عمل نیز سوجھ بوجھ کو عزم و حوصلے کی
تلقین کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ اُن کے افکار
میں فنون کے جوہر بھی ہیں، فلسفۂ حیات کی آمیزش
بھی، صنعت و حرفت کے پیکر بھی، سائنس کی جولانیاں
بھی، کیمیا کا تجزیہ بھی، طبیعات کی ایجادات بھی اور
منطق کے شعلے بھی۔ اس پس منظر میں ہم اولوالعزم
پیغمبرانِ الٰہی، مصلحین اور محققین کے ساتھ ساتھ حکما کے
روزگار کا مطالعہ کر سکتے ہیں۔
لیکن اُن کے عمل کا خلوص، اُن کی جد و جہد کے بے
آب و گیاہ میدان، اُن کی فکر کے آبِ حیات اور
اُن کی بلاغت کی صناعیاں ہمیں اس مثبت فکر کی
جانب مائل کرتے ہیں۔ جس کے پس منظر میں ہم اُن
کے جذبوں، اُن کی کوششوں اور اُن کے احساسِ
حیات کا مطالعہ کرتے ہیں۔

معاشرہ کی ابتدا سے آج تک کی تاریخ طلبِ
علم کی تاریخ ہے۔ کبھی قرآن پاک "طلب العلم فریضۃ"
کی آواز دیتا ہے، تو کبھی وید، گیتا، پُران اور مہابھارت
علم کے باب میں विद्या धर्मयो सर्वेण धर्मम्
کی تعلیم دیتے ہیں۔ ان اقتباسات پر غور کیا جائے
تو عمل کی اور فکر کی کرنیں اپنی نورانیت کے ساتھ جلوہ گر
ہوتی ہیں۔ ہمارے ملک اور ہمارے سماج میں علم کے حصول
کی ضرورت وقت کی پکار ہے اس کے بغیر ترقی کا کوئی
عمل اور عقل و دانش کی کوئی بھی منزل سر نہیں کی جا سکتی۔
علم کا بے پایاں ذخیرہ ہر لمحہ ذہنِ انسانی کو اس لیے بھی
متاثر کرتا ہے کہ ؎

"آ رہی ہے دمادم صدائے کُن فیکون"

کُن فیکون کی آواز دراصل سماج کی تعمیر کی آواز
ہے۔ یہی آواز ذہنوں کی تعمیر کے عمل کی اور تعمیر کے ردِّ
عمل کی ہے۔ تعلیم اور تعمیر کا عمل طالبِ علم کا کردار ہے
اور ردِّ عمل اس کا نتیجہ۔

آیئے ایک نظر ہم اپنے ملک کی اور اس کی سرزمین
کی تاریخ پر بھی ڈالیں کہ ہماری روایات میں کون سی
ایسی روح کارفرما ہے جس نے اس کی ثقافت کو،

اور اس کے سماج کی بنیاد کو آج تک قائم و دائم رکھا۔ پانینی اور پاتنجلی نے ہمیں زبان اور علمِ زبان، بلاغت اور قواعد کے گوشوں سے اُس وقت آگاہ کیا جب انسانی معاشرہ عرب سے عجم تک اس میدان میں گونگا تھا۔ آریہ بھٹ نے اپنی ریاضی دانی اور سائنسی ایجادات سے ہمارے ذہنوں کو اس وقت منور کیا۔ جب علم کا ایسا کوئی چراغ روشن نہیں ہوا تھا۔ چرک اور جیون رشتی اور اسی قبیل کے دیگر ویدوں نے طبی دنیا میں اپنے علمی تجربے کی مثالیں پیش کیں اور اپنے تجربات سے انسان کی ذہنی اور جسمانی آلودگیوں کا تزکیہ کرنے کا ایک انتہائی حیرت انگیز کارنامہ انجام دیا۔ ادب اور صحافت کے میدان میں ہندوستان نے جو روایات قائم کیں، اُن کی مثال دنیا کے ادب میں ایک درخشاں حیثیت کی حامل ہیں۔

آج کے ہندوستان کی تعمیر میں نئے تجربات پھیل کر ادب کے نئے اُفق تک پہنچے۔ زبان کی تشکیل ہر دور میں نئے طور پر ہوتی رہی۔ اظہار کے نئے سانچے ڈھلتے رہے۔ صنعت و حرفت کا ارتقاء "انسٹرکیشن یان" سے "وایو یان" یعنی ہوائی جہاز اور اُڑن طشتریوں، راکٹ وغیرہ تک جا پہنچا۔ اس پس منظر میں ذرائعِ نقل و حمل کے دیگر عناصر بھی شامل ہیں اور ان مختلف ایجادات کا سہرا انھیں فقیدالمثال شخصیات کے تفکر کا نتیجہ ہے۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ایک نئے تمدن کے برگ و بار پرانی قدروں سے ہی پھوٹتے ہیں۔

اس پس منظر میں غور کرنے سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ذہن کی خاص تربیت فرد کو جب سماج سے متعلق کرتی ہے تو تہذیب اور تمدن کے نئے برگ و بار پروان چڑھتے ہیں۔ حال کی بنیاد پر مستقبل کی عمارت تیار ہوتی ہے اور زندگی کے نئے سرچشمے رواں ہوتے ہیں۔ اسی میں انسان کی اصلاح و فلاح کا جواز بھی پوشیدہ ہوتا ہے اور اخلاقیات کے دائرے بھی متعین ہوتے ہیں۔ علم کی بنیاد روح کا جذب و کیف ہے۔ طالب علم کو اخلاقیات کے جن راستوں پر چلنا ہے وہ انسانی ہمدردی، یکجہتی اور تعصب سے پاک زندگی کے راستے ہیں۔ مذاہب کی ترزیکے میں بھی پہلا سبق یہی ہے۔ جیسا کہ اس سے قبل اشارہ کیا گیا ہے، انسان کا ذوق اور شوق اور اس کی گوناگوں دلچسپیاں اگر اس کی طبیعت سے ہم آہنگ ہو جائیں تو زندگی کا کیف دوبالا ہو جائے لیکن انسانی تہذیب اور تمدن کے جو دائرے مذاہب نے بنائے ہیں، سماج کی تعمیر انھیں سے ہوتی ہے اور انسانیت کی کرنیں انھیں سے پھوٹتی ہیں۔ ابتدا سے آج تک تمام مفکرین نے تحریر و تقریر کے ذریعے انھیں کی تشریح و تفسیر پیش کی ہے۔ حکومتوں میں عدل و انصاف بھی انھیں سے مستعار لیے گئے۔

دراصل یہ کام محض حکومت کا نہیں ہے بلکہ حکومت تو اس کے لیے سہولتیں فراہم کرتی ہے اور اس طرح حکومت ایک مہذب ملک اور قوم کی تعمیر کے راستوں کا تعین کرتی ہے۔ اچھی شہریت اور اس کے حقوق کا تعین کرتی ہے۔ طالب علم کو اس کی آگہی اس لیے بھی ضروری ہے کہ وہ بحیثیت فرد ایک اچھے شہری کی نمائندگی کر سکے۔ لیکن دراصل یہ بات اُس وقت ہی پیدا ہو سکتی ہے، جب طالب علم کو اُس کی ذمہ داریوں سے گاہے بگاہے آگاہ بھی کیا جاتا رہے اور ان میں یہ شعور بھی پیدا کیا جاتا رہے کہ وہ مستقبل میں ملک و قوم کے ایسے سربراہ ہیں جن پر ملک اور قوم کی پچھلی روایات، تہذیب و تمدن اور معاشرت کا ہی بار نہیں ہے بلکہ تہذیب اور تمدن کے نئے اور روشن میناروں کا بھی دارومدار ہے۔

اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ طلباء سے زیادہ سماج کی تعمیر میں اساتذہ کا حصہ ہے اور اساتذہ کے شعور و تربیت پر یہ بات بھی منحصر ہے کہ طلباء میں جذب و قبول کا ایسا جذبہ پیدا ہو کہ وہ پورے شخصی رجحان کے ساتھ سماج کی خدمت کا جذبہ لے کر اٹھیں اور زندگی کی تمام رعنائیوں کے امین بن جائیں۔ دراصل سماج کی تعمیر خدمت کے جذبے میں مضمر ہے۔ اور خدمت کا یہ جذبہ جب تک ہر طالب علم میں پیدا نہ ہوگا۔ سماج تہذیبی بنیادوں پر کمزور ہوتا جائے گا، دراصل یہ کمزوری کسی طالب علم کی کمزوری ثابت نہیں کرتی ہے بلکہ اس نظامِ تعلیم کی کمزوری بھی ثابت کرتی ہے، جو طالب علموں کی پیداوار کا ضامن ہے۔

عمل کے جو دائرے تعلیمی نظام کے پس منظر میں نیز افکار اور نظریات کے جو عکس ہمیں ہندوستان کی تاریخ میں ملتے ہیں۔ وہ صوفیہ کی تعلیم سے لے کر اقبال جیسے عالمی مفکر تک اور اُس کے بعد ڈاکٹر ذاکر حسین، خواجہ غلام السیدین وغیرہ کی تعلیمی فکر کا جو ڈھانچہ ہمیں ملتا ہے اُس کا رشتہ بے لوث خدمت اور پُرخلوص اخلاقیات سے پُر نظر آتا ہے۔ لیکن یہ خلوص، اور یہ جذبۂ خدمت دراصل روشنی کے اُس منارہ تک ہمیں لے جاتا ہے، جہاں سے عقل و دانش، حق و انصاف، شجاعت و سخاوت، صبر و وفا، حکمت و تفکر، فصاحت و بلاغت، تحریر و تقریر، پاکیزگی و طہارت اور اطاعت و عبادت کی نورانی کرنیں پھوٹیں اور جنھوں نے نئو سو اٹھ [؟] سال میں رفتہ رفتہ سارے عالم کو منور کر دیا۔

ذہن و عقل کی رسائی کی ضرورت اور ہوش و خرد کے اسی مطالبے نے غالباً علامہ اقبال کو یہ کہنے پر مجبور کیا کہ ؎

خدا تجھے کسی طوفاں سے آشنا کر دے
کہ تیرے بحر کی موجوں میں اضطراب نہیں
تجھے کتاب سے ممکن نہیں فراغ کہ تو
کتاب خواں ہے مگر صاحبِ کتاب نہیں

غزلیں

شمس تبریزی

رے سوال کے ایسے بھی کچھ جواب ہوئے
گناہ میں نے کئے اور اُسے عتاب ہوئے

کھلے جو چھوڑ دیئے بے حسی کے دروازے
پھر اپنی زیست میں ہر لمحہ کامیاب ہوئے

جب اپنے ساتھ مسافر کو بے نوا پایا
پھر اپنے ذہن کے پردے بھی کچھ خراب ہوئے

پڑھا گیا تھا جسے حرف حرف مشکل سے
ہم اپنے آپ میں ایسی بھی اک کتاب ہوئے

حیات، کرب، خوشی، ہجر، بے حسی اور موت
ذرا سی دیر میں کیا کیا نہ انقلاب ہوئے

سفر پہ جب میں چلا تھا تو شمس تنہا تھا
سفر بڑھا تو کئی لوگ ہم رکاب ہوئے

ڈاکٹر ایم۔ آر۔ قاسمی

اُس نام کی ہر ایک ادا میرے لیے ہے
یہ پھول، یہ ساون، یہ گھٹا میرے لیے ہے

ہر آنکھ اُسی پھول کی پوجا میں ہے مشغول!
حالاں کہ وہ مظلوم، خدا میرے لیے ہے

اِس گھور اندھیرے کا گنہگار بھی مَیں ہوں
وہ چاند ہر اک شب سے خفا میرے لیے ہے

ہر ایک کو ملتی ہیں گناہوں کی سزائیں
ناکردہ گناہوں کی سزا میرے لیے ہے

اے قاسمی! کرتا ہوں میں تنہائی سے باتیں
تنہائی میں بھی ایک صدا میرے لیے ہے

فرقہ بندی

نظر برنی

فرقہ بندی سے بچو، یہ قوم کا ناسُور ہے
ہاں یہی خنجر بکف ہے قاتلِ جمہُور ہے

قتلِ انسانی پہ ڈائن قہقہہ بردوش ہے
ہائے اس ظالم کے ہاتھوں میں ہمارا ہوش ہے

اس کے جبڑوں میں لہُو ہے آج بھی انسان کا
یہ ہے مردُم خور اس کا رُوپ ہے شیطان کا

ہندو مسلم سِکھ عیسائی میں کرا دیتی ہے جنگ
اس کے ہاتھوں میں ہیں نیزے برچھیاں تیر و تفنگ

اس کے لب پر نعرۂ تخریب ہے اُف الاماں
اس کے چہرے پر سیاہ دھبّوں کے ہیں کتنے نشاں

یہ وہ ناگن ہے، نہیں ہے جس کے کاٹے کا علاج
مانگتی ہے قوم کے ہر فرد سے اپنا خراج

یہ ہے فاسٹوں کی اور سرمایہ داروں کی حلیف
اس کے ہتھکنڈوں سے بچ سکتا نہیں کوئی شریف

آؤ اس ڈائن کو بڑھ کر مَوت کا پیغام دیں
اس کے کرتوتوں کے بدلے زہر کا اک جام دیں

نفرت و بغض و عداوت کے قلعے ڈھاتے چلیں
صحن و گلشن کو گلوں کے اس سے مہکاتے چلیں

سیکولر قدروں کو سینے سے لگانا چاہیئے
جان بھی جائے بلا سے مُسکرانا چاہیئے

غزل

محمّد ابو صالح

نہ کوئی تم سے عداوت نہ شکایت جاناں
گردشِ چرخ نے ڈھائی ہے قیامت جاناں

مَیں نے ہر وعدہ ہر ایک قسم نبھائی اب تک
تم نے رکھا ہی نہیں پاسِ امانت جاناں

مَیں نے ہر یاد کو سینے سے لگا رکھا ہے
میری ہر سانس میں ہے رقصاں تری چاہت جاناں

رسمِ دُنیا ہے یہی اس میں تعجب کیا ہے
زر کی میزان پہ تُلتی ہے محبت جاناں

تُو نے اُلفت کو مری اپنی ضرورت سمجھا
مَیں نے سمجھا تری چاہت کو عبادت جاناں

ہاں سُنا ہے کہ ترے ساتھ بھی مجبُوری تھی
ورنہ ممکن ہی نہ تھی ایسی شقاوت جاناں

وہ جو تحریر مری تم نے جلائی اُس دم
سچ کہو! تھی کوئی ہونٹوں پہ شکایت جاناں

قیام نیّر

نیا سویرا

مُنّا ایک پھول سا خوبصورت بچہ تھا۔ اس کی کلکاریوں میں ریتا کے لیے ہزاروں مسرتیں پنہاں تھیں۔ اس کا گورا چِٹّا رنگ، ننھے ننھے، سپید سپید ہاتھ پاؤں دیکھ کر ریتا کے دل میں خوشیوں کا سیلاب اُمڈ آتا تھا۔ وہ سوچتی اُس کا بچہ ہر وقت اس کی آنکھوں کے سامنے ہاتھ پیر چلا چلاکر اپنی مُسکراہٹوں کا اظہار کرتا رہے۔ ہنستا رہے، کھیلتا رہے۔ مُنّا تھا بھی بہت پیارا بچہ۔ بھرے بھرے گال، پتلے پتلے کلیوں جیسے نرم و نازک ہونٹ، بڑی بڑی چمکتی ہوئی آنکھیں، مُسکراتا چہرہ، ریشم جیسے پتلے پتلے نرم نرم بال۔ ریتا نے اس کے مستقبل کے لیے بہت سارے اُونچے اُونچے، سنہرے سنہرے خواب دیکھے تھے۔ جب وہ اپنے بچّے کے متعلق تصور کی آنکھوں سے مستقبل میں جھانکتی تو ایک ڈاکٹر اُس کی آنکھوں کے سامنے کھڑا نظر آتا۔ وہ خوشی سے نہال ہو اُٹھتی۔ اُس کے حسین عارضِ پرستہ کے بہت سے خطوط ابھر آتے۔

اُس نے دل ہی دل میں فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ اپنے بیٹے کو ڈاکٹر بنائے گی۔ ایک بہت بڑا ڈاکٹر، جو بسترِ مرگ پر پڑے ہوئے لوگوں کو زندگی دے سکے گا، درد سے کراہتے ہوئے مریضوں کو سکون بخش سکے گا، جو قوم اور ملک کی خدمت کرے گا۔ لیکن موت کے بے رحم ہاتھوں نے اُس کے پتی ارون کو اَبدی نیند سُلاکر ریتا کے سارے خواب توڑ دیئے۔ اُس کی ساری تمنّائیں دھری کی دھری رہ گئیں، سارے ارمان ٹوٹ کر بکھر گئے، ریزہ ریزہ ہو گئے، اور اُس کی کرچیاں اس کے دل کو لہو لہان کرنے لگیں۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ بھگوان نے اُس کے ساتھ یہ کیا مذاق کیا ہے۔ ارون کے سوا اُس کا اس دنیا میں تھا ہی کون۔ وہ اُسی کی دست نگر تھی۔ وہ شہر جاکر ایک فیکٹری میں کام کرتا تھا اور ریتا گھر گرہستی سنبھالتی تھی۔ باہر کی دُنیا سے اُسے کوئی مطلب نہ تھا۔ بچپن ہی سے اتنا جانتی تھی کہ مرد کا کام باہر سے کما کر لانا ہے اور عورت کا کام گھر گرہستی سنبھالنا ہے، بچّے کی پرورش و پرداخت کرنی ہے، انھیں اچھی تربیت دے کر اپنی ذمّے داریوں کا احساس دلانا ہے۔ ان کے اندر قوم اور ملک کی خدمت کا جذبہ پیدا کرانا ہے۔ لیکن اب وہ کیا کرتی۔ ارون کے بغیر اُس کی دُنیا تاریک ہو گئی تھی۔ قدرت نے اُس کے ساتھ ایک عجیب مذاق کیا تھا۔ ایک بوڑھی ماں تھی وہ بھی اس کی شادی کے کچھ ہی دنوں کے بعد سورگ باس ہو گئی تھی۔ حالات نے اُسے بے آب و گیاہ صحرا کے مانند کر دیا تھا۔ وقت کے ساتھ ساتھ وہ نحیف و ناتواں ہوتی گئی۔ مُنّا جس کے بارے میں اُس نے سوچا تھا کہ وہ ڈاکٹر بن کر بسترِ مرگ پر پڑے ہوئے لوگوں کو زندگی دے سکے گا۔ لیکن اُس کی زندگی خود خطرے میں پڑ گئی تھی۔ دودھ اور اچھی غذا نہ ملنے کی وجہ سے اُس کی صحت روز بروز خراب ہوتی جارہی تھی۔ ریتا کو اپنی کوئی فکر نہ تھی فکر تھی تو مُنّا کی جو ارون کی محبت کی صورت میں اُس کے پاس تھا۔ اب اُس کی زندگی مُنّا ہی تو تھا وہ اسے آسانی سے کیسے مرنے دے سکتی تھی۔ اسے بچانے کے لیے اُسے ہر جتن کرنا تھا۔ مُنّا کی زندگی بچانے کے لیے اُس نے میکہ کی راہ لی کہ شاید وہاں اُس کے لیے کوئی سبیل نکل آئے۔

کئی گھنٹے تک وہ اپنے کمزور و ناتواں پیروں سے چلتی رہی۔ ایک طرف پیٹ کی آگ دوسری طرف مُنّا کا بوجھ ناقابلِ برداشت ہو رہا تھا۔

جب وہ مسافت کی جان لیوا تکان اور پریشانی کے ساتھ اپنے میکہ پہنچی تو کچھ دیر کے لیے اس کی ساری تکان اس کی ساری سوچ اور اس کی ساری پریشانی ختم ہو گئی۔ کچھ دیر کے لیے اس کا بچپن لوٹ آیا۔ وہ اپنے آپ سے بے خبر ہو کر سرسوں اور ارہر کے پیلے پیلے پھولوں کو دیکھنے لگی۔ سرسوں اور ارہر کے پھولوں سے اُسے بہت پیار تھا۔ بچپن میں کئی بار ارہر کے پھول چُن چُن کر اُس نے اپنی گود میں رکھ لیے۔ ارہر کے شاداب اور گھنے کھیتوں میں اپنی سہیلیوں کے ساتھ آنکھ مچولیاں کھیلتی تھیں۔ میکے کے ہر در و دیوار سے اُسے پیار تھا، اُنسیت تھی، ایک انجانا لگاؤ تھا۔ دل میں آس اور آنکھوں میں اُمید کی شمع جلائے، وہ سیدھے گاؤں کے مُکھیا کے یہاں چلی گئی۔ مکھیا گھر پر نہیں تھا۔ ان کے گھر کے لوگوں نے اس کی بگڑی ہوئی حالت دیکھی تو انھیں بہت حیرت ہوئی۔ ریتا کو ان لوگوں نے بچپن میں ہنستے کھیلتے دیکھا تھا، اس کی شوخی اور چلبلا پن دیکھ کر وہ لوگ بہت خوش ہوتے تھے۔ ان لوگوں نے اُسے حوصلہ دیا تھا اور کہا کہ مُکھیا اُسی کے گاؤں گیا ہے۔ اس کا گاؤں بہت پچھڑا ہوا تھا نئی تہذیب اور

ساجد علی

مٹّی کا کٹاؤ اور اس کا تحفّظ

زمین کے اوپری تل سے اس کی دو تین فیٹ گہری تہہ مٹی (Soil) کہلاتی ہے۔ اس مٹی میں مختلف نامیاتی (Organic) اور غیر نامیاتی (Inorganic) اجزاء وافر مقدار میں پائے جاتے ہیں جو پیڑ پودوں کی پیداوار میں معاون ثابت ہوتے ہیں۔ اسی مٹی میں پیڑ پودے اُگتے، پھلتے پھولتے اور بالآخر ختم ہو جاتے ہیں۔ کبھی کبھی ایسا دیکھا گیا ہے کہ یہی مٹی جس میں پیڑ پودے اُگتے تھے، پانی کے تیز بہاؤ سے یا تیز ہواؤں کے جھونکوں سے ایک مقام سے منتقل ہو کر دوسرے مقام پر جمع ہو جاتی ہے۔ اس طرح مٹی کے کٹاؤ سے زرخیز زمین کو بے حد نقصان پہنچتا ہے اور اس حرکت کے بار بار ہونے سے زرخیز زمین ریگستان میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ اس طرح زرخیز زمین کے بنجر زمین میں تبدیل ہونے کے عمل کو مٹی کا کٹاؤ (Soil erosion) کہا جاتا ہے۔ مٹی کے کٹاؤ کی وجہ سے بڑے بڑے سرسبز و شاداب میدان ریگستان کی شکل میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ ہر سال ہمارے مُلک میں ہزاروں ایکڑ زمین اس طرح بیکار ہو رہی ہے۔ مثلاً گذشتہ چند سالوں میں پنجاب کے ضلع ہوشیار پور میں تقریباً چالیس ہزار ایکڑ زمین بیکار ہو چکی ہے۔

یوں تو زمین کے کٹاؤ کے لیے بہت سے عناصر ذمّے دار ہیں لیکن پانی کا تیز بہاؤ، ہواؤں کے تیز جھونکے، تیزی سے کٹتے ہوئے جنگل، اور مویشیوں کی چراگاہ میں اضافہ خاص طور سے ذمّہ دار ہیں۔ ہندوستانی ندیوں میں ہر سال سیلاب کے آنے سے شمالی ہند کے میدانِ عظیم میں عام طور سے مٹی کا کٹاؤ ہوتا ہے۔ اس کٹاؤ کو شیٹ کٹاؤ (Sheet erosion) کہتے ہیں۔ جب کہ پہاڑی ڈھالوں پر جب پانی بہتا ہے تو اس کی تیزی سے زمین میں نالیاں بن جاتی ہیں جنھیں گھاٹی کٹاؤ Gully erosion کہا جاتا ہے۔ اس قسم کے کٹاؤ سے زمین میں گہری نالیاں (Deep ravines) بن جاتی ہیں۔ اس کے علاوہ تیز ہوائیں بھی زمین کو کافی نقصان پہنچاتی ہیں۔ تیز ہواؤں سے مٹی ایک مقام سے اُڑ کر دوسرے مقام پر چلی جاتی ہے، جس سے زمین کی پیداوار کی صلاحیت مجروح ہو جاتی ہے۔

ہندوستان کا کسان دوسرے ممالک کے مقابلے کم تربیت یافتہ ہوتے ہیں۔ ان میں عام طور سے علم کی کمی ہوتی ہے۔ یہاں کا خاص پیشہ کھیتی باڑی ہے۔ زراعت اور مویشی ایک دوسرے سے متعلق پیشے ہیں۔ ہندوستانی کسان بڑی بڑی زمینوں کو چراگاہ کے طور پر استعمال کرتا ہے، جس سے علاقے کے پیڑ پودے ختم ہونے لگتے ہیں۔ جس کی وجہ سے جڑوں کی گرفت مٹی کے ذرّات پر کم ہو جاتی ہے اور وہ آزاد ہونے لگتے ہیں جب تیز ہوائیں چلتی ہیں، یا بارش کا پانی ان علاقوں میں بہتا ہے تو یہ مٹی آسانی سے اپنی جگہ سے سرک جاتی ہے اور اپنی قوتِ زرخیزی کھو دیتی ہے۔

زمین کے کٹاؤ کا مسئلہ ایک عالمگیر مسئلہ ہے اس سے چھٹکارا پانے کے لیے کچھ لازمی شرائط ہیں، جن پر عمل کرنا ضروری ہے۔ کیوں کہ اگر زمین کو کٹنے سے نہیں بچایا گیا تو دنیا میں پیڑ پودے ختم ہونے لگیں گے۔ درختوں کے ختم ہونے سے ہوا میں آکسیجن کی مقدار ختم ہو جائے گی نتیجے کے طور پر تمام جانور اور انسان آہستہ آہستہ فنا ہو جائیں گے۔ مختصراً ہم کہہ سکتے ہیں کہ اگر زمین کے کٹاؤ کو روکنے کے لیے کوئی جامع قدم نہیں اُٹھایا گیا تو ایک دن اس دُنیا میں جانداروں کا وجود ہی ختم ہو جائے گا۔ ایسے طریقے جن سے مٹی کے کٹاؤ کو روکا جاتا ہے بہت ضروری ہیں۔ مٹی کے کٹاؤ کا مسئلہ ایک قومی مسئلہ ہے، حکومتِ ہند نے آئی سی اے آر (I.C.A.R.) کے تحت ۱۹۳۰ء سے اب تک مختلف صوبوں میں مٹی کے تحفّظ کے لیے شعبے قائم کیے ہیں اور مختلف دفاتر میں اعلا افسران متعین کیے گئے ہیں۔ لیکن ہمیں افسوس کے ساتھ یہ کہنا پڑتا ہے کہ اتنی کوششوں کے بعد بھی مٹی کے کٹاؤ کا یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے۔ دُنیا میں مٹی کے کٹاؤ کے لیے عام طور پر جو طریقے استعمال کیے جاتے ہیں ان پر بھی مختصر بحث کر لینا ضروری ہے۔

مٹی کو کٹاؤ سے بچانے کے لیے زمین کی زرخیزی کو برقرار رکھنا بے حد ضروری ہے۔ جب زمین زرخیز ہوگی یعنی اس میں ہیومس (Humus) کی زیادہ مقدار ہوگی تو اس قسم کے کھیتوں میں پیداوار بھی زیادہ ہوگی۔ پودے گھنے اور تندرست ہوں گے۔ ان کی جڑیں مضبوطی سے زمین کے ذرّات کو باندھ کر رکھیں گی۔ جس سے کٹاؤ رُک جائے گا۔ پودوں کو جڑوں سے اُکھاڑ پھینکنے کے مقابلے انھیں کچھ اونچائی سے کاٹ دینے سے بھی زمین کی زرخیزی برقرار رہتی

کیوں کہ اس زمین میں جس میں جڑیں موجود ہیں اپنے میں پانی کو جذب کرنے کی صلاحیت ...ا ہیں۔

زمین کی زرخیزی برقرار رکھنے سے فصلوں کو ...یا کے ساتھ بونا (Rotation of crop) ...ید ثابت ہوا ہے۔ ایک فصل کسی اناج کے کاٹنے کے ...وسری فصل لیگومنس (Leguminous) بونی ...ئے یعنی اس قسم کے پودے جن کی جڑوں میں چھوٹی ...ی گانٹھیں (Nodules) پائی جاتی ہیں۔ ...میں رائزوبیم بیکٹیریا (Rhisobium redisicoules) پائے جاتے ہیں جو ہوا ...، نائٹروجن لے کر اپنی نائٹرائٹس اور نائٹریٹس تبدیل کر دیتے ہیں اور زمین کی زرخیزی میں اضافہ ...تے ہیں۔ ایسی زمین پر جب اگلی فصل کسی اناج کی ...جاتی ہے تو پیداوار بہت اچھی ہوتی ہے۔

مویشی چرانے سے بھی زمین کو نقصان پہنچتا ...ہے گائے، بیل، بکری، بھیڑ وغیرہ پودوں کی پتیاں ...جاتے ہیں۔ بغیر پتیوں کے پودے اپنی غذا تیار ...یں کر سکتا۔ نتیجے کے طور پر وہ کمزور ہو جاتا ہے۔ ...کی جڑیں زمین کے ذرات کی پکڑ ڈھیلی کر دیتی ...۔ جس سے پودے کی طاقتِ نمو جواب دیدیتی ہے۔ ...حالت میں پودوں میں نہ تو پھل پھول ہی لگتے ...اور نہ بیج ہی بن پاتے ہیں۔ چنانچہ زیادہ مویشیوں چرانے سے ہرے بھرے کھیت کچھ عرصہ بعد بنجر ...یگستان میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔

جنگلوں کو دوبارہ قائم کرکے (Reforestation) بھی زمین کا تحفظ کیا جا سکتا ہے۔ ان ...مقامات پر دوبارہ جنگل اگائے جاتے ہیں جہاں پہلے ...جنگل کاٹ دیئے گئے تھے۔ جنگلوں کی اوپری فضا ...پانی کی نمو زیادہ ہوتی ہے کیونکہ پانی پتیوں کے ...سوراخوں سے بھاپ کی شکل میں مسلسل ہمیشہ خارج ہوتا ...رہتا ہے۔ جس سے ہوا میں پانی کی مقدار موجود رہتی ہے۔ ...گیلی ہوا جب کچھ ٹھنڈک پاتی ہے تو واپس بارش ...شکل میں جنگل کے علاقوں میں برس جاتی ہے۔ اس کے علاوہ درختوں کی پتیاں جھڑ کر زمین پر گر جاتی ہیں۔ جب ان پتیوں پر بارش کا پانی پڑتا ہے تو یہ سڑ جاتی ہیں اور ہیومس میں تبدیل ہو جاتی ہیں۔ ہیومس زمین کے لیے بہت مفید ہے۔ اچھی زمین پانی کے بہاؤ اور ہوا کے قہر سے بچی رہتی ہے۔

حکومتِ ہند نے ۱۹۵۲-۵۳ء میں سڑکوں، نہروں، ندیوں اور ریلوے لائنوں کے دونوں جانب درخت لگانے کا ایک پروگرام شروع کیا تھا۔ یہ کام خاص طور سے دہلی سے آگرہ جانے والی شاہراہ پر کیا گیا۔ جہاں یہ بات خاص طور سے محسوس کی گئی کہ جو زمین قریب مستقبل میں ریگستان میں تبدیل ہونے والی تھی اس میں بھی زرخیزی آگئی ہے اس کے علاوہ شہروں، گاؤں اور قصبوں کے چاروں جانب بھی پودے لگانے کا پروگرام عمل میں آیا۔ مرحوم سنجے گاندھی نے اپنے پانچ نکاتی پروگرام میں درخت اگانے پر بھی خاص توجہ دی۔ پیڑ پودے صرف زمین کے کٹاؤ کو ہی نہیں روکتے بلکہ ہماری بنیادی ضرورتیں بھی پوری کرتے ہیں۔ درختوں سے ہم دوائیں، پھل، گوند، ریشہ، لکڑی وغیرہ مختلف ضروری اشیاء حاصل کرتے ہیں۔ ایک پرانی کہاوت ہے، "درخت کا مطلب پانی، پانی کا مطلب روٹی اور روٹی کا مطلب زندگی ہے" یعنی درخت ہی ہماری زندگی ہیں۔ آج کے دور میں بھارت میں سماجی جنگل بانی کے پروگرام پر جو زور دیا جا رہا ہے، وہ بھی اسی پس منظر میں ہے۔

زمین کے تحفظ کے لیے درختوں کو قطار میں (Counter planting) لگانا بھی مفید ثابت ہوتا ہے۔ پہاڑی ڈھالوں پر ایسی جگہ جہاں پانی کے ذریعے مٹی بہہ جانے کا خدشہ ہوتا ہے۔ ان مقامات پر کھیت ایک جانب سے دوسری جانب تک آر پار جوتا جاتا ہے۔ اس کے بعد پورے کھیت کو لمبی لمبی پٹیوں میں منقسم کرکے پہلے کچھ اونچے پودے جیسے کپاس، مکا وغیرہ لگا دیتے ہیں اور اس کے بعد چھوٹے پودے جیسے گیہوں وغیرہ اگا دئے جاتے ہیں۔ جس سے پانی کے بہاؤ کے وقت مٹی بہنے سے رک جاتی ہے اور اس پر ہوا کا اثر بھی نہیں ہوتا۔ اس کے علاوہ ڈھال پر سے تیزی کے ساتھ بہتا ہوا پانی بھی بڑے پودوں کی وجہ سے اپنی رفتار میں کچھ کم ہو جاتا ہے اور مٹی کو بہنے سے کنٹرول کرتا ہے۔

پہاڑی علاقوں میں دوسرا طریقہ چبوترہ بنا کر (Terrace) کٹاؤ روکنے کا ہے۔ اسے (Terracing) کہتے ہیں۔ اس کے لیے ڈھلواں زمین پر چبوترہ بنا دئے جاتے ہیں جو پانی کی رفتار کو کم کر دیتے ہیں۔ اس سے مٹی کا کٹاؤ رک جاتا ہے۔ ندیوں میں آنے والے سیلاب سے حفاظت کے لیے ندیوں پر بڑے بڑے ڈیم بنائے جاتے ہیں۔ جن کے نالوں میں پانی کی فراہمی کو ضرورت کے مطابق کنٹرول کیا جا سکتا ہے۔ گرمیوں میں پانی کی کمی کو پورا کرنے کے لیے بھی ندیوں پر ڈیم بنائے جاتے ہیں۔ اس سے بھی زمین کے کٹاؤ کو روکنے میں مدد ملتی ہے۔ کبھی کبھی زمین کو ایک فصل کاٹ کر کچھ وقت کے لیے خالی چھوڑ دیا جاتا ہے۔ جس سے دو فائدے ہیں، پہلا یہ کہ سورج کی گرمی سے زمین میں موجود نقصاندہ جراثیم ختم ہو جاتے ہیں دوسرے خالی رکھنے سے آہستہ آہستہ اس کی زرخیزی میں اضافہ بھی ہوتا ہے۔ جن مقامات پر نالیاں بنی ہوئی ہیں۔ ان کے آس پاس بھی درخت لگانا ضروری ہوتے ہیں کیوں کہ اگر ایسا نہ کیا جائے تو ان نالیوں کی چوڑائی میں مزید اضافہ ہوتا رہے۔

خشک علاقوں مثلاً ریگستان میں ریت کے ٹیلے (Sand dunes) ہوا کی تیزی سے ایک مقام سے اڑ کر دوسرے مقام پر جمع ہو جاتے ہیں۔ ان مقامات پر پودے لگانا خطرے سے خالی نہیں ہوتا۔ یہاں مٹی کے کٹاؤ کو روکنے کے لیے نہریں نکالی جاتی ہیں یا کنوئیں کھودے جاتے ہیں اس سے زمین کی آبیاری کی جاتی ہے اور پودوں کو ختم ہونے سے بچایا جاتا ہے۔ کھیتوں کے چاروں جانب بڑے بڑے درخت لگا کر بھی مٹی کے کٹاؤ سے چھٹکارہ پایا جا سکتا ہے۔ ●

وسیم حیدر

کیا آپ جانتے ہیں؟

کس نے کیا ایجاد کیا؟

دریافت/ایجادات	کس نے ایجاد کی/دریافت کیا	شہرت	سال
ایٹم بم	اوٹو ہانہ (Otto Habna)	انگلینڈ	۱۹۳۹ء
بیرومیٹر	ٹوری سیلی (Torricelli)	اٹلی	۱۹۴۳ء
ڈائنامائیٹ	الفرڈ نوبل (Alferd Nobel)	سویڈن	۱۸۶۲ء
جلتا ہوا بلب (Incandescent Bulb)	ایڈیسن (Edison)	امریکہ	۱۸۶۰ء
کشش ثقل کے اصول (Laws of Gravitation)	نیوٹن (Newton)	انگلینڈ	۱۶۸۷ء
فوٹو گرافی	ایل۔ ڈیگورے (L. Daguere) نے	فرانس	۱۸۳۷ء
فوٹو گرافی (رنگین)	گیبریل لپ مین (Gabriel Lippman)	امریکہ	۱۸۵۷ء
فوٹو گرافی (رول فلم)	جارج ایسٹ مین (George Eastman)	امریکہ	۱۸۸۸ء
ریڈیم	مادام کیوری (Madam Curie)	فرانس	۱۸۸۹ء
نظریہ اضافیت (Theory of Relativity)	اے۔ آئنسٹین (A Einstein)	امریکہ	۱۸۰۵ء
ٹیلی گراف	سموئل مورسے (Samual Morse)	امریکہ	۱۸۳۲ء
ٹیلی فون	گراہم بل (Grahm Bell)	امریکہ	۱۸۷۶ء
وائرلیس	جی مارکونی (G. Marconi)	اٹلی	۱۸۹۶ء
ایکسرے	ڈبلو کے۔ رونٹگن (W.K. Rontgen)	جرمنی	۱۸۹۵ء
ایروپلین	رائٹ برادرس (Wright Brothers)	امریکہ	۱۹۰۳ء
بائیسکل	میکملن (Macmillan)	اسکاٹ لینڈ	۱۸۴۲ء
ڈائنمو	مائکل فراڈے (Michel Faraday)	انگلینڈ	۱۸۳۱ء
ڈیزل	روڈولف ڈیزل (Rudolf Diesel)	جرمنی	۱۸۹۵ء
انجن (ریلوے)	اسٹیفنسن (Stephenson)	انگلینڈ	۱۸۱۴ء
فاؤنٹن پین	واٹرمین (Waterman)	امریکہ	۱۸۸۴ء
گراموفون	ایڈیسن (Edison)	امریکہ	۱۸۷۷ء
مائکروسکوپ	زیڈ جینسین (Z. Jansen)	ہالینڈ	۱۵۹۰ء
پاور لوم	کارٹ رائٹ (Cart write)	انگلینڈ	۱۷۸۵ء
پرنٹنگ پریس	کیکسٹن (Caxton)	جرمنی	۱۴۵۰ء

بقیہ: پبلک سیکٹر کیوں؟

کی جارہی ہے جس کے تحت ایک طرف تو پبلک سیکٹر کو اپنی کارگزاری کے لیے جواب دہ ہونا ہے مگر اس کے ساتھ ہی اسے اس قدر آزادی بھی دی گئی ہے کہ وہ اپنے لیے قواعد و ضوابط اور اپنی کارکردگی کا طریق کار خود ہی متعین کرے۔ اس کے تحت طریق کار کو وقتاً فوقتاً مختلف توڑوں میں توڑا نہیں جاتا۔ اس طرح کی نکتہ چینی سرکار کے اندر اور باہر کہیں نہیں کی جاتی۔

سرکار محض کسی بھی کمپنی کے بارے میں پالیسی کے موٹے موٹے خطوط واضح کرسکتی ہے اور اس دائرے میں رہتے ہوئے کمپنی کو ہر سال اپنی کارگزاری، منافع وغیرہ کا گوشوارہ مرتب کرنا پڑتا ہے۔ ان حدود میں رہتے ہوئے پبلک سیکٹر کو آزادانہ طور پر کام کرنے کی کھلی اجازت ہونی چاہیئے۔ بھارت میں اقتصادی توسیع و ترقی کے چیلنج کا سامنا ہے اس کام میں پبلک سیکٹر کو ایک تعمیری رول ادا کرنا ہے۔ ملک کی اقتصادی ترقی کے تاریک گوشوں سے لطف اندوز ہونے کی ایک عجیب خواہش ہمارے کچھ دیش واسیوں میں دیکھنے کو ملتی ہے جو کہ ایک افسوسناک امر ہے۔ ممکن ہے کہ اس کے درپردہ کبھی کبھی کچھ بیرونی عناصر کا ہاتھ رہا ہو۔

ہمارے ملک میں قدرتی وسائل کی بہتات ہے۔ یہاں ذہین افراد کی، جن میں مرد اور عورتیں دونوں ہی شامل ہیں، کثیر تعداد ہے۔ ان دونوں اثاثہ جات کے بل بوتے پر ملک کو ترقی کی راہ پر آگے بڑھایا جا سکتا ہے۔ اور بھارت میں عظیم سماج کی تعمیر نو اور تشکیل میں حصہ لیا جا سکتا ہے۔ یہ ایک عظیم قومی فریضہ ہے جس میں پبلک سیکٹر کو کلیدی کردار ادا کرنا ہے۔

حوصلہ افزا نتائج

ان سب مشکلات کے باوجود دلّی میں کنبہ
کے محاذ پر جنگ جاری ہے اور دلّی انتظامیہ
تندہی اور ذمہ داری سے اپنے فرائض انجام
رہا ہے۔ اس وقت یہاں کنبہ بندی کے ۴۸
ر ۱۲ دیگر یونٹوں کے ذریعے کنبہ بندی کی خدمات
بجائی جا رہی ہیں۔ یہ مراکز شہر کے ہر حصے میں پھیلے
ہیں اور کئی ایجنسیوں مثلاً دلّی انتظامیہ، دلّی میونسپل
یشن، نئی دلّی میونسپل کمیٹی، ڈائریکٹر جنرل ہیلتھ اسکیم
ت سے خود اختیار اور رضا کار اداروں کی زیر
دمات انجام دے رہے ہیں۔ ہر کنبہ بندی مرکز
کی آبادی کے لیے مخصوص کیا گیا ہے۔ مندرجہ بالا
اکز میں سے ۲۵ پر اور سارے اسپتالوں میں
بندی کے آپریشن کی سہولیات بھی دستیاب ہیں۔
ل ہی میں خواتین کے آپریشن کو کم وقت، بلا
ئی اور زیادہ کارگر ڈھنگ سے کرنے کے مقصد
ہ کے ۲۲ اسپتالوں اور کنبہ بندی مراکز میں
آلہ دستیاب کرایا گیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی
ہی خدمات کی توسیع دلّی انتظامیہ کی سبھی ۱۲۱
یوں میں بھی کر دی گئی ہے تاکہ لوگوں کے گھروں
سہولیات کو پہنچایا جا سکے اور زیادہ سے
اس کا فائدہ اٹھا سکیں۔

پلے کچھ برسوں میں دلّی نے کنبہ بندی کے
ستحکم ترقی کی ہے۔ ۱۹۸۱ میں ۱۵۰۰۰ نس
الوں کی تعداد اس برس ۳۱,۳۰۰ تک پہنچ
رکر پچھلے دو برسوں میں سو فی صد سے بھی
اسی طرح کنبہ بندی میں خواتین کے دیگر
ر ٹی) لگوانے والی عورتوں کی تعداد بھی
بڑھ کر ۵۲,۰۰۰ ہو گئی ہے۔ اس ترقی میں
کا بالکل دخل نہیں ہے۔ بلکہ اس میں لوگوں
یالی اور بیدار مغزی کا جذبہ ہے۔ سال
یے نس بندی کا نشانہ ۴۴,۰۰۰ مقرر کیا گیا
تھا۔ یہ نشانہ گیارہ مہینوں کے اندر پورا کر لیا گیا ہے اور امید ہے کہ سال ختم ہوتے ہوتے یہ تعداد کافی بڑھ جائے گی کیوں کہ اس مہینے چلنے والی کنبہ بندی کی تحریک میں نس بندی کا نشانہ ۵۰۰۰ رکھا گیا ہے۔

لوگوں کی حوصلہ افزائی کے لیے سال کے دوران چلائی جانے والی کنبہ بندی کی تحریکوں میں نس بندی کا آپریشن کرانے والوں اور کرنے والوں کے لیے کئی قسم کے انعامات رکھے گئے تھے۔ ابھی حال ہی میں وزارت صحت اور کنبہ بندی نے دلّی انتظامیہ کو ہدایت دی ہے کہ وہ ہر آپریشن (نس بندی) کروانے والے کو دلّی لاٹری کے پانچ ٹکٹ مفت دے جو کہ باقی انعامات کے علاوہ ہوگا۔ اس کے علاوہ نس بندی کرنے والے اداروں کے لیے بھی کئی قسم کے نقد انعامات رکھے گئے ہیں۔

دلّی انتظامیہ نس بندی کا آپریشن کرنے والے لوگوں کو جلدی ہی گرین کارڈ جاری کرنے کی اسکیم بنا رہا ہے۔ اس گرین کارڈ کے مالکوں کو اور اُن کے کنبوں کو طبی سہولیات میں ترجیح دی جائے گی۔ مکانوں اور پلاٹوں کی الاٹمنٹ میں اُن کے لیے ۵ ر ۲۲ فی صد کوٹا مقرر ہوگا، کوآپریٹو سوسائٹیوں اور بینکوں کی طرف سے دئے جانے والی مالی امداد اور قرضوں میں اُنہیں ترجیح ملے گی۔ مکان بنانے کے لیے قرض میں سہولت ملے گی، بچوں کو اسکول کے داخلے میں ترجیح دی جائے گی اور راشن کارڈ جاری کرتے وقت انہیں سہولت دی جائے گی۔

جہاں ایک طرف کنبے کو محدود، صحتمند اور خوشحال رکھنے کے لیے دلّی انتظامیہ کی طرف سے اتنے وسیع پیمانے پر کام کیا جا رہا ہے، وہاں زچہ اور بچہ کی صحت کے تحفظ کے لیے بہت سے کارگر قدم اٹھائے گئے ہیں۔ کنبہ بندی کا اہم جز ہونے کے سبب اس پروگرام پر بھی اُتنی ہی سنجیدگی سے توجہ دی جا رہی ہے۔ ۸۰، سنٹرل گورنمنٹ ہیلتھ سروسز کی ڈسپنسریوں، ۳۴ ایمپلائز سٹیٹ انشورنس، ۹۲ دلّی انتظامیہ کے زیر نگرانی چل رہی ڈسپنسریوں اور ۷ پولیو کلینک کے توسط سے دلّی میں ماں اور بچے کی صحت کی دیکھ بھال کی خدمات انجام دی جا رہی ہیں۔ ان جگہوں پر زچگی کے پہلے اور بعد میں ماں کی دیکھ بھال، مقوی غذا کے نہ ملنے سے ماں اور بچے میں خون کی کمی اور اندھے پن کا علاج اور بچوں میں ہونے والی مختلف بیماریوں کی روک تھام کے لیے ٹیکے لگائے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ یہ سہولیات مختلف ایجنسیوں کے زیر نگرانی چل رہے ۲۷ کنبہ بندی مراکز، ۱۰۴ زچہ بچہ صحتی مراکز اور ۱۲ پوسٹ پارٹم یونٹوں میں بھی دستیاب ہیں۔ اس برس ایسے مراکز میں کافی اضافہ کیا گیا ہے تاکہ ہر گاؤں اور ہر بستی کے گھروں تک یہ سہولیات پہونچ سکیں۔ اس توسیع کے ساتھ اس برس دلّی میں پہلی بار دو علاقوں میں بچوں کو ٹیکے لگانے کی خاص مہم چلائی گئی ہے۔ دلّی انتظامیہ کے سماج کلیان محکمے کے تعاون سے غریب بچوں کے لیے چلائی گئی آنگن واڑیوں میں ٹیکے لگائے جا رہے ہیں۔ یہ تجربہ دلّی انتظامیہ کے سماج کلیان کے محکمہ، میونسپل کارپوریشن اور دلّی انتظامیہ کے محکمہ صحت کے اشتراک اور یونی سیف کی مدد سے کیا گیا ہے۔ آنگن واڑی ورکر جس کی رضا کارانہ خدمات ہی اس مہم کی محرک ہے۔ وہ اپنے زیر نگرانی چل رہی آنگن واڑی میں ایک ہزار آبادی میں سے اس عمر کے بچوں کو جمع کرتی ہے اور وہی بچوں کی ماؤں کو ٹیکے لگوانے کی ترغیب دے کر وہاں جمع کرتی ہے۔

دلّی کے ان مخصوص علاقوں میں ماہ دسمبر میں یہ مہم چلائی گئی تھی۔ ابھی تک یہاں ۲ برس کی عمر تک کے ۸۰ فیصد رجسٹرڈ بچوں کو کالی کھانسی، ٹائیفائڈ، ہیضہ اور چیچک کے ٹیکے اور پولیو کی دوا پلائی جا چکی ہے۔

اس محاذ پر جس لگن سے کام ہو رہا ہے وہ اس بات کی علامت ہے کہ اگرچہ بڑھتی ہوئی آبادی کے خلاف جنگ ابھی جاری ہے، لیکن کامیابی کی منزل اب زیادہ دور نہیں۔

★

Regd. No. D(DN) 985
R.N. 97032/81

Licensed U(DN) to post without pre-payment
at Civil Lines Post Office, Delhi-110 054.

Vol. 4 No. 1 YOJANA (URDU) 1-15 April, 1984

ہریجنوں کی فلاح و بہبود

جب باپو جی نے درجِ فہرست ذاتوں کو ہریجن کہنا شروع کیا تو اس سے ان کے خیالات اور ان کے معاشرتی فلسفے کا اظہار ہو گیا تھا انھوں نے درج فہرست اقوام کا معیار بلند کرنا اپنا بنیادی فریضہ بنالیا تھا۔ یہ نتیجہ اس حقیقت سے اخذ کیا گیا ہے کہ جہاں تک ممکن ہوتا تھا وہ ہریجنوں کی بستیوں میں قیام کرتے تھے اور خود کو ہریجن سیوک کہتے تھے۔

اس کے غالباً چار اسباب تھے۔ گاندھی جی کے نزدیک آزادی کا مطلب عام آدمیوں کی بھلائی کا ایک ذریعہ تھا۔ ہمارے معاشرے کی ایک کثیر تعداد کا تعلق درجِ فہرست اقوام سے ہے اور ان کی قابلِ رحم حالت کی وجہ سے گاندھی جی کی توجہ ان کی طرف مبذول ہوئی۔ وہ ان کے کاز میں انتہائی دلچسپی رکھتے تھے اور انھوں نے جدوجہد آزادی میں بھارتی عوام کی قیادت کرتے ہوئے ہریجنوں کا معیار بلند کرنے کے لیے بھی کام کیا۔

گاندھی جی ان لوگوں کا معیار بلند کرنے کے لیے عوام کے مذہبی جذبات سے فائدہ اُٹھانا چاہتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ بھگوان پسماندہ لوگوں کے درمیان رہتا ہے اور اس کی پُوجا کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ سماجی اور اقتصادی طور پر پسماندہ لوگوں یعنی درجِ فہرست ذاتوں کی جنھیں وہ ہریجن کہتے تھے خدمت کی جائے۔

گاندھی جی اس بات کو بخوبی سمجھتے تھے کہ انگریز بھارت میں اپنی حکومت کو طول دینے کے لیے پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو کی پالیسی پر چل رہے ہیں۔ گاندھی جی بھارتی عوام کو اتحاد اور سامراجیت کے خلاف ایک مضبوط قوت بنانا چاہتے تھے۔ وہ بھارتی معاشرے سے اتحاد کی راہ میں حائل رکاوٹوں کو جڑ سے اکھاڑ دینا چاہتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے ہریجنوں کا معیار بلند کرنے کی صدا بلند کی اور سماج کے تمام طبقوں کے درمیان اتحاد کو یقینی بنایا۔

ہریجنوں کے حالات بہتر بنانے کے لیے انھوں نے جو آواز اٹھائی اس کی بعض اقتصادی وجوہات بھی تھیں۔ معاشرے کے تمام طبقوں کی تیزی سے ترقی کو یقینی بنانے کے لیے سب کا مل جل کر آگے بڑھنا ضروری تھا۔ اگر معاشرے کا کوئی ایک طبقہ دوسرے طبقوں کے ساتھ قدم بہ قدم نہیں چلتا تو ظاہر ہے کہ اس سے ترقی کی راہ میں رکاوٹ پڑتی۔ اس لیے گاندھی جی بھارتی معاشرے کی ترقی کو یقینی بنانے کے لیے درجِ فہرست ذاتوں سے تعلق رکھنے والے لوگوں کی اقتصادی حالت بھی بہتر بنانا چاہتے تھے۔

جیسا کہ پہلے ذکر کیا جا چکا ہے کہ گاندھی جی کے لیے آزادی اپنی ذات میں ایک نہ ختم ہونے والا عمل تھا۔ آزادی عام آدمی کی زندگی کو بہتر بنانے کا طریقہ تھا۔ آزاد بھارت کے لیے یہ ایک منطقی امر تھا کہ وہ تیز رفتار ترقی کو یقینی بنانے کے لیے "بابائے قوم" کے فلسفے پر چلے اور صدیوں سے چلی آرہی غلامی سے نجات ملے۔

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ حکومت اس مقصد کے حصول کے لیے ٹھوس اور مربوط کوششیں کرتی رہی ہے۔ درجِ فہرست ذاتوں کی فلاح و بہبود اور ان طبقوں کی حالت بہتر بنانے کے لیے مختلف اسکیموں کے تحت اب تک تین ارب ۴۱ کروڑ روپے کی رقم خرچ کی جا چکی ہے۔ علاوہ ازیں داخلے کے لیے ملازمت اور ترقی کے معاملے میں ان لوگوں کے لیے جگہیں مخصوص ہیں اور دیگر متعدد اقتصادی رعائتیں دستیاب ہیں جن سے بلاشبہ ہریجنوں کو فائدہ پہنچا ہے۔ البتہ بعض وجوہات کی بناء پر ان اقدامات کا فائدہ درجِ فہرست اقوام سے تعلق رکھنے والے کمزور ترین افراد کو مکمل طور پر نہیں پہنچا ہے۔ اس عدم توازن کو نہ صرف ہریجنوں بلکہ خود ملک کے مفاد میں دور کرنا ہوگا۔ ہمیں یہ فراموش نہیں کرنا چاہیئے کہ بیشتر زرعی مزدوروں کا تعلق درجِ فہرست ذاتوں سے ہے اور یہی لوگ صنعت کا پہیہ چلانے والے مزدور بھی ہیں۔ اس طرح یہ لوگ ملک کی اقتصادی ترقی میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ برسوں سے یہ لوگ معاشرے کے غیر صاف ستھرے کام بھی کرتے رہے ہیں۔ یہ لوگ سماج کے آرام اور اس کے لیے صفائی ستھرائی کو یقینی بنانے کے لیے خاکروب اور موچی وغیرہ کا کام کرتے رہے ہیں۔ معاشرے کا یہ اہم طبقہ جو لازمی خدمات انجام دیتا ہے حصولِ آزادی کے برسوں بعد بھی اقتصادی سماجی اور ثقافتی اعتبار سے پریشانیوں اور تکالیف کا شکار ہے۔ مجموعی طور پر یہ پوری قوم کی اخلاقی ذمہ داری ہے کہ وہ ہریجنوں کی حالت بہتر بنائے اور انھیں زندگی کے اصل دھارے میں شامل کرے۔ حکومت کی کوششوں کے باوجود بعض مفاد پرستوں نے ان طبقوں کو فلاحی اور دیگر اقدامات سے فائدہ نہیں اٹھانے دیا بلکہ ان مفاد پرستوں نے خود اپنے فائدے کی خاطر ان طبقوں کا استحصال کیا۔ آج کل تیزی سے تکنیکی ترقی ہو رہی ہے اسے دیکھتے ہوئے یہ ہمارا فرض بن جاتا ہے کہ یہ طبقے جو روائتی طور پر بڑھئی، لوہار اور درزی کا کام کرتے رہے ہیں اپنے کام دھندے سے محروم نہ ہو جائیں بلکہ ضرورت اس بات کی ہے کہ انھیں جدید اور موجودہ ساز و سامان کی مدد سے کام کرنے کی تربیت دی جائے۔ ان لوگوں کی روائتی دستکاری اور اقتصادی بقاء کے لیے ایسا کرنا بہت ضروری ہے۔ ہریجنوں کی فلاح و بہبود اور ترقی کے لیے کئے جانے والے کاموں کی رفتار تیز کرنے کے لیے حکومت نے حالیہ برسوں میں خصوصی جامع اسکیموں کا آغاز کیا ہے جو ریاستوں اور مرکزی وزارتوں کے منصوبوں کا حصہ بن گئی ہیں۔ ان اسکیموں کے ذریعے ہریجنوں کی فلاح و بہبود سے متعلق اقدامات کو عملی جامہ پہنانے کے لیے رقوم کی

(باقی صـ۱ پر)

یوجنا

۱۶ تا ۳۰ اپریل ۱۹۸۴ء

ایک روپیہ

بچت اور بنک
(سید اطہر رضا بلگرامی)

ر ہند اور اقلیتیں
(محمد نسیم)

کالا موتیا — علاج اور روک تھام
(ڈاکٹر این۔ این۔ مسعود)

معیشت کے لیے توانائی کی اہمیت

تیس سال پہلے جب ہم نے اپنی معیشت کے لیے منصوبہ بند ترقی کا آغاز کیا تھا تو ملک میں صنعتوں کے لیے توانائی کی فراہمی ایک "ابتدائی" عنصر کی حیثیت رکھتی تھی۔ توانائی کا تجارتی رول بالکل محدود تھا اور توانائی کی ہماری ۷۰ فی صد ضروریات روائتی ذرائع جیسے لکڑی، گھاس پھوس اور اُپلے پوری کرتے تھے۔ تجارتی توانائی کا اہم ذریعہ کوئلہ تھا۔ اگرچہ کوئلے کی پیداوار تین کروڑ ٹن کے قریب تھی لیکن کان کنی کے جو طریقے اپنائے جاتے تھے وہ ناموزوں اور غیر سائنسی تھے۔

آج ہماری توانائی کی صنعت ایک جدید صنعت ہے جس کا کئی اعتبار سے ترقی یافتہ ممالک سے مقابلہ کیا جا سکتا ہے۔ ہم نے کوئلہ کان کنی کا مشینی طور طریقہ شروع کیا ہے اور انھیں ترقی دینے کا ایک معقول طریقہ کار اپنایا ہے۔ بتدریج کھلی کان کنی کے طریقہ پر توجہ دی جا رہی ہے۔ پیداواریت اور پیداوار بڑھانے اور یہ کام کفائتی انداز میں انجام دینے کی غرض سے بڑی بڑی کانوں کو ترقی دی جا رہی ہے۔ اس طریقۂ کار کی بدولت ہم اپنے کوئلے کی پیداوار کو ۱۳ کروڑ ٹن سالانہ تک پہنچانے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ ہم عمدہ معیار کے اپنے کوکنگ کوئلے کو محفوظ کرنے پر بھی توجہ دے رہے ہیں اور اسے خاص طور پر فولاد کی صنعت میں استعمال کیا جا رہا ہے۔ اور قدرتی گیس کمیشن قائم کیا گیا۔ اس کمیشن نے ساحل کے قریب اور ساحل سے دُور تیل کے وافر ذخائر کا پتہ لگایا ہے۔ ۱۹۶۰ کی دہائی میں ہماری کوششیں خلیج کھمبات اور شمال مشرقی خطے میں مرکوز تھیں ان کوششوں کے نتیجے میں ہم تیل کی پیداوار کو جو ۱۹۶۱ میں ۵۰ ہزار ٹن تھی، ۱۹۶۵-۶۶ء میں ۵۷ لاکھ ٹن اور ۱۹۷۳-۷۴ء میں ۹۰ لاکھ ٹن تک پہونچانے میں کامیاب ہوئے۔ ۱۹۷۰ء کے اوائل میں مغربی ساحل سے دُور بطورِ خاص بمبئی کے کھلے سمندر اور طاس کے علاقوں میں تیل کی تلاش پر زور دیا گیا۔ ان کوششوں سے مختصر عرصے میں ہمیں زبردست کامیابی حاصل ہوئی۔ بمبئی کے کھلے سمندر سے ۱۹۷۶ء میں کاروباری سطح پر پیداوار شروع ہو گئی اور تیل کی پیداوار میں بتدریج اضافہ ہوتا رہا۔ نیز ۱۹۸۲-۸۳ء میں ایک کروڑ ٹن ۲۰ لاکھ ۸۰ ہزار ٹن تیل حاصل ہوا جب کہ مجموعی پیداوار دو کروڑ ۱۰ لاکھ ٹن تھی۔ اس پیش رفت سے تیل کے شعبے میں ہماری خود کفالت کا آغاز ہو گیا۔ ۱۹۸۰-۸۱ سے ایک نئی تبدیلی یہ آئی کہ ہماری تیل کی درآمد کم ہونا شروع ہو گئی۔ اس کی وجہ محض یہ تھی کہ گذشتہ دو سال میں ہماری تیل کی پیداوار دوگنا ہو گئی تھی۔ ہم نے تیل صاف کرنے کی صلاحیت کو بھی بڑھا کر تین کروڑ ۵۰ لاکھ ٹن تک پہنچا دیا۔

بجلی کے شعبے کی کارکردگی

بجلی کے شعبے میں ہونے والی ترقی بھی کوئی کم اہمیت نہیں رکھتی۔ اس وقت ۳۸ ہزار میگاواٹ سے زائد بجلی سے فائدہ اُٹھایا جا رہا ہے۔ ۱۹۸۲-۸۳ میں بجلی کی سالانہ تیاری ۱۳۱ ارب یونٹ تھی۔ ملک کے مختلف حصوں میں بجلی کے نظام اور بجلی کی ترسیل کو مربوط بنانے نیز زیادہ سے زیادہ بجلی کی تیاری کو یقینی بنانے کے لیے "لوڈ ڈسپیچ مراکز" قائم کئے جا رہے ہیں۔ "وولٹیج" کی سطح بڑھا کر ۴۰۰ کلوواٹ کر دی گئی ہے۔

ہم ملک میں ہائی وولٹیج ڈائرکٹ کرنٹ شروع کرنے پر سنجیدگی سے غور کر رہے ہیں۔ ملک میں بڑے بڑے بجلی گھر قائم کئے جا رہے ہیں ملک کے ایسے بہت سے بجلی گھروں میں کام جاری ہے جن کی صلاحیت ۲۱۰ میگاواٹ ہے۔ اس کے علاوہ ۵۰۰ میگاواٹ کا پہلا یونٹ چالو کئے جانے کے مرحلے میں ہے۔ بجلی اب شہری لوگوں تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ ۲۹۰۰۰۰ سے زیادہ دیہات میں بجلی پہنچ چکی ہے اور آبپاشی کے مقصد سے ۵۱ لاکھ پمپ سیٹوں کے لیے بھی بجلی فراہم کی گئی ہے۔

ہمیں جلد ترقی حاصل کرنے کے لیے نیوکلیائی بجلی کی اہمیت کا احساس ہو گیا ہے اور ہم نے ایٹمی بجلی گھر لگانے کی صلاحیت بھی حاصل کر لی ہے۔ اگرچہ ایٹمی بجلی کی تیاری محض ۲ فی صد ہے۔ اس سے ہمارے اس عزمِ مُصمم کا اظہار ہوتا ہے کہ ہم توانائی کی فراہمی بڑھانے کے لیے تمام دستیاب متبادل طریقے اپنائیں گے۔ ہم نے فاسٹ بریڈر ری ایکٹر ٹیکنالوجی کو فروغ دینے کی غرض سے تحقیق اور ترقی کے پروگرام میں بھی پیش رفت کی ہے تاکہ ہم ایٹمی بجلی کے اپنے پروگرام پر خود ہی عمل کر سکیں۔ ہم نے اپنے توانائی کے مسئلے کو طویل المدتی بنیاد پر حل کرنے کے لیے دو رُخی حکمتِ عملی مرتب کی ہے۔ ایک طرف تو ہم توانائی خاص طور پر تیل کو محفوظ کرنے اور معیشت سے توانائی کی زیادہ سے زیادہ ضروریات پوری کرنے کی کوششیں کر رہے ہیں جبکہ دوسری طرف تحقیق اور ترقی کا ٹھوس اور جامع پروگرام شروع کر رکھا ہے، تاکہ اپنی معیشت کو زمینی ایندھن سے نجات دلانے کے لیے توانائی کے نئے اور قابلِ تجدید وسائل کو استعمال میں لایا جا سکے۔

ترقیاتی عمل میں سازوسامان اور آلات کی فراہمی کی اہمیت کو دیکھتے ہوئے سازوسامان کی تیاری میں بھی خود کفالت حاصل کرنے پر توجہ مرکوز کی گئی اور توانائی کے شعبے کے لیے درکار سازوسامان اور بھاری الیکٹریکل سامان کی تیاری کے کارخانے لگانے کی حوصلہ افزائی کی گئی۔ ہم نے اس سلسلے میں بھی اتنی عمدہ صلاحیتیں پیدا کر لی ہیں جن کا دُنیا کے بہت سے ترقی یافتہ ملکوں سے مقابلہ کیا جا سکتا ہے۔

(توانائی کے مرکزی وزیر شری پی شیو شنکر کی تقریر کا اقتباس)

منصوبہ بندی اور ترقیاتی پروگراموں کی جھلک پیش کرنے والا

یوجنا

چیف ایڈیٹر : آر۔ ٹھکرال
ایڈیٹر : لکھی رام رانا
اسسٹنٹ ایڈیٹر : محمد عادل صدیقی
سب ایڈیٹر : وسیم حیدر

جلد ۴ :	۱۶ تا ۳۰ اپریل ۱۹۸۴ء	شمارہ ۲

۲۷ چیتر تا ۱۰ بیساکھ شک سمبت ۱۹۰۶ کو   فون : ۳۸۷۳۴۱

شرح چندہ
سالانہ ۲۰ روپے ، دو سال ۳۵ روپے ، تین سال ۵۰ روپے
فی کاپی ... ایک روپیہ

طالب علموں، استادوں اور لائبریریوں کے لیے ۲۰ فیصد کی رعایت

اس شمارے میں

یوجنا منصوبہ بند ترقی کے بارے میں عوام کو آگاہ کرتا ہے مگر اس کے مضامین صرف سرکاری نقطۂ نظر کی وضاحت تک ہی محدود نہیں ہیں

بزنس منیجر: ایل۔ آر۔ بترہ ✶ اسسٹنٹ ڈائرکٹر (پروڈکشن) کے۔ آر۔ کرشنن

مضامین سے متعلق خط و کتابت کا پتہ
ایڈیٹر یوجنا اردو، پبلیکیشنز ڈویژن پٹیالہ ہاؤس نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

ترسیل زر کا پتہ
بزنس منیجر پبلیکیشنز ڈویژن پٹیالہ ہاؤس نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

اداریہ

قومی یک جہتی

بھارت کی گوناگونی اور بوقلمونی نے اسے گلدستۂ صد رنگ بنا دیا ہے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ ایسے ملکوں میں جہاں کہ آبادی زیادہ ہے اور وہ مختلف طرح کی ہے، وہاں قومی یک جہتی ایک بڑا مسئلہ بنا رہا ہے۔ مثال کے طور پر چند بڑے ممالک جیسا کہ روس اور چین جنھوں نے مشترکہ سیاسی آئیڈیالوجی کی بنیاد پر قومی اتحاد اور قومی یک جہتی حاصل کی ہے۔

بھارت میں کثیر الجماعتی جمہوریت کی تشکیل کی کوشش کی گئی ہے۔ ہمارے یہاں قومی یک جہتی سے مراد زبان، آئیڈیالوجی یا مذہب کے یکساں ہونے سے نہیں ہے بلکہ یہاں کثرت میں وحدت ہے۔ قومی یک جہتی کی حقیقی بنیاد ایسے مقاصد اور اقدار پر ہونی چاہیئے جن میں زیادہ سے زیادہ لوگ شریک ہوں اور ذیلی ثقافتوں کی شناخت کھوئے بغیر ہندوستانیت کے جذبے کے تئیں خود کو ہندوستانیت کا پابند سمجھیں۔

غیر ممالک میں ہمارے جذبۂ رواداری کے سبب ہی ہندوستان کا اس قدر احترام کیا جاتا ہے۔ ہمارے مذہبی تہوار جنھیں سبھی عوام منایا کرتے ہیں، اور جنھیں سبھی فرقوں کے لوگ مانتے ہیں، اکثر علاقوں میں تناؤ اور تشویش کا ذریعہ بن گئے ہیں۔ جبکہ ضرورت اس بات کی ہے کہ ملک کے کسی بھی حصے میں کسی بھی بھارتی باشندے کو غیر ضروری اور ناپسندیدہ نہیں سمجھا جائے۔ ہمارے آئین میں یہ مذکور ہے کہ ہر ایک بھارتی ذات پات، مذہب، زبان یا خطے کے کسی بھی امتیاز کے بغیر ملک کے ہر ایک حصے میں سبھی قومی سرگرمیوں میں شریک ہو سکتا ہے۔ یہی وہ مقصد ہے جس کے لیے ہمیں کام کرنا ہے۔ قومی یک جہتی ایک تاریخی عمل ہے۔ بھارت میں قومی ریاست کا تصور مذہب، علاقے اور دیگر وابستگیوں سے بالاتر ہے۔ یہ ہماری جدوجہد آزادی کی دین ہے جس میں کہ تمام فرقوں، مذہبوں اور تمام لوگوں نے حصہ لیا ہے۔ حصولِ آزادی کے بعد اس قومی اتحاد کا استحکام ایک بڑا کارنامہ ہے۔ تاریخی پس منظر میں مختلف فرقوں اور مختلف مذہبوں کے ماننے والوں کی طرف سے سیاسی جدوجہد میں شرکت کے سبب آپسی رشتے مضبوط ہوئے ہیں۔ یہ بدقسمتی ہے کہ تنگ نظری کے سبب تشدد اور تناؤ وغیرہ کے واقعات پر توجہ مبذول رہتی ہے اور قومی یک جہتی اور ایک ساتھ ہونے کا جذبہ جو کہ ایک طویل المدتی عمل ہے، بھلا دیا جاتا ہے۔ ہمیں ایسی ہر بات سے چوکنا رہنا ہے جس سے ہمارے اتحاد کو نقصان پہونچے۔ بھارت ایسے وسیع و عریض اور گوناگونی والے ملک میں اس پر قومی سطح پر کس طرح اتفاق رائے کی ضرورت ہے، اس سلسلے میں غور و خوض بیحد ضروری ہے۔ کسی بھی محدود فائدے کے لیے ایسے خیالات، عوامل اور اقدامات کی جن سے انتشار پسندانہ جذبات کی حوصلہ افزائی ہوتی ہو، حوصلہ شکنی کرنی چاہیئے۔ اور ان سے گریز کرنا چاہیئے۔ یہ محض ایک قانونی عمل بھی نہیں ہے۔ قانون ہمارے یہاں بہت ہیں مگر ہم اس حقیقت سے واقف ہیں کہ ہم قانون چاہے کتنے بھی کیوں نہ بنا لیں لیکن ان میں کوئی نہ کوئی خامی رہنے کا امکان ہر وقت رہتا ہے۔ یہ وسیع تر پس منظر میں سیاسی مقاصد اور رجحانات کا سوال ہے۔ کون کون سے خطرات اتحاد کو درپیش ہیں۔ فرقہ واریت، ذات پات، علاقائیت، لسانی عصبیت ہمارے قدیم دشمن ہیں۔ ہم میں بھارتی ہونے کا جذبہ فروغ پائے اور ہندوستان کے بارے میں صحیح تصور ہمارے پیش نظر ہو؟ اس کی خاطر مذکورہ بالا خطرات کا مقابلہ کرنے کے لیے ہمیں مسلسل کوششیں جاری رکھنی چاہئیں۔ اس محاذ پر جوش عمل سرد پڑ گیا ہے۔ ملک گیر سطح پر اس تحریک کو دوبارہ زندہ کرنے کی ضرورت سرکار کی ذمہ داری ضرور ہے۔ مگر سرکار کی طرح یہ ہر شخص کی ذمہ داری ہے، یہ ذمہ داری ہر ایک شہری، ہر ایک سیاسی پارٹی یا گروپ کی ہے۔ ہمارے خیال میں جدوجہد آزادی کے ورثے پر زور دینا بہت ضروری ہے۔ اس سلسلے میں وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی نے وزرائے اعلیٰ کو لکھا ہے۔ وزارت تعلیم بھی اس کے لیے کام کر رہی ہے۔ جدوجہد آزادی کی روح کی بیداری آپس میں ایک دوسرے کو ملانے میں معاون ہے اور یہ ایسا ورثہ ہے جس پر ہماری نوجوان نسل فخر کر سکتی ہے اور جس کے بل بوتے پر ان کی جڑیں مضبوط ہو سکتی ہیں۔ لیکن بین الاقوامی فضا اور اس کی قوتوں کو بڑے محتاط طریقے پر سمجھنا چاہیئے۔ خارجی دشمنوں میں ہم اسے نظر انداز نہیں کر سکتے۔ ہمیں شخصیتوں میں خود کو گم نہیں کرنا چاہیئے کیسی نظام کو کمزور کرنے کی کوششیں ہندوستان کے لیے پہلی بار نہیں ہیں۔ یہ کسی ایک سیاسی پارٹی یا کسی ایک شخص کو نہیں بلکہ پورے نظام کو کمزور کرنے کے لیے ہیں تاکہ اتحاد پارہ پارہ ہو جائے اور ہمارا ملک ہر طرح کے دباؤ کے آگے جھک سکے اسے جنگ کی نفسیات سے تعبیر کرنا غلط ہوگا۔ اگر یہ ایسا ہے تو پوری دنیا میں اس طرح کی جنگی نفسیات سرایت کئے ہوئے ہے یا پوری دنیا اس طرح کی نفسیات میں مبتلا ہے، جیسا کہ یہ ان بہت سے وفود اور اہم شخصیتوں کے خیالات سے واضح ہوتا ہے جو ہمارے یہاں پورے سال آتے رہتے ہیں۔ بہرصورت یہ وہ چیلنج ہیں جو ڈھکے چھپے نہیں۔ اس پس منظر میں ہمیں زبردست اتحاد کی ضرورت ہے۔

(ایڈیٹر)

سید اطہر رضا بلگرامی

دیہی بچت اور بینک

عوام کی بچت کو منظم طور پر ترغیب دینے، فروغ دینے اور انتہائی نفع بخش طور پر استعمال کرنے میں بینک سرفہرست ہیں۔ یوں تو عوام کی بچت کو اپنی طرف رجوع کرنے والے دیگر ادارے بھی ہیں جو پُرکشش سُود کی شرح پر عوام کی بچت کو اکٹھا کرنے، بڑھانے اور افادہ بخش استعمال کا کام انجام دے رہے ہیں۔ اِن اداروں میں محکمہ ڈاک وتار، لائف انشورنس، یونٹ ٹرسٹ آف انڈیا، نجی کمپنیوں کے حصص، ریاستی محکمہ لاٹری و دیگر نجی مالی ادارے قابلِ ذکر ہیں۔ لیکن ان سب پر سبقت بینکوں کو ہی حاصل ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بینکوں کو عوام کا جو اعتماد حاصل ہے وہ کسی دوسرے ادارے کو نہیں۔ پھر جتنی آسانیوں، سہولتوں اور گوناگوں خدمات کے طریق کار بینک پیش کرتے ہیں، دیگر ادارے پیش نہیں کر سکتے۔ اور پھر تاریخی اعتبار سے بھی بنکوں کو اپنے کام انجام دینے کا جو تجربہ، عوام کے مزاج ومذاق سمجھنے کی صلاحیت، اور سوجھ بوجھ حاصل ہے وہ دیگر شعبہ جات کو نہیں ہے۔ اسی لیے عوام کی چھوٹی سے چھوٹی بچت سے لے کر بچت کی ایک کثیر رقم اکٹھا کرنے، مناسب طور پر استعمال کرنے اور اُس کو فروغ دینے تک بنک ہی سرگرم عمل نظر آتے ہیں۔

عوام میں بچت کے رُجحان کو فروغ دینے، اُس کی سطح کو متعین کرنے اور ترغیب دینے میں بالواسطہ سرگرمیاں اہم رول ادا کرتی ہیں۔ لیکن ادارہ جاتی خدمات کی موجودگی کے علاوہ عوام میں بچت کی سطح کو متعین کرنے، بچت کے رُجحان کو بڑھاوا دینے اور دلچسپی پیدا کرنے والے عناصر کی اہمیت اُن سے زیادہ ہے۔ کیوں کہ اِن اداروں کی خدمات کا رول اس مقام سے شروع ہوتا ہے جہاں بچت کی جا رہی ہو۔ بچت کو پیدا کرنے میں یہ ادارے اتنا اہم رول ادا نہیں کرتے جتنا اُس کو افادہ بخش طور پر استعمال کرکے فروغ دینے میں کرتے ہیں۔ عوام میں بچت کی سطح کیا ہوگی اِس کو طے کرنے والے عناصر میں آمدنی کی سطح، اخراجات ومصارف کا انداز، قیمتوں کی سطح، ٹیکس پالیسی، فیملی سائز، ماضی کی جمع شدہ دولت اور پھر صارفین کا مزاج، انداز صرف، ترجیحات وغیرہ اہمیت کے حامل ہیں۔

بچت کو متعین کرنے والے یہ پیمانے شہری و دیہی سماج میں اپنا الگ الگ مقام، اہمیت و اثر رکھتے ہیں۔ بالعموم شہری زندگی میں یہ پیمانے واضح اور طے شدہ پائے جاتے ہیں۔ یہاں آمدو خرچ کا تخمینہ، قیمتوں و ٹیکسوں میں رُونما ہونے والی تبدیلیوں کے اثرات، عوام کے مصارف میں ہونے والی تبدیلیوں کا انداز اور موجودہ ادارہ جاتی سہولتوں میں عوام کی دلچسپی و رجحان کو سمجھنا سبھی کچھ انتہائی واضح، صاف، اور میکینکل سا لگتا ہے۔ اس لیے شہری عوام میں بچت کا رُجحان کیسا ہے، اُس کو کس طرح بڑھاوا دیا جا سکتا ہے، اُس کی موجودہ سطح کتنی ہے اور کن کن ذرائع سے اُس کو بلند کیا جا سکتا ہے، اِن تمام سوالات کا جواب آسان، تخمینہ تقریباً دُرست و قابلِ اعتماد اور پیش گوئیاں صحیح ثابت ہو سکتی ہیں۔

اِس کے برعکس دیہی سماج میں یہی پیمانے انتہائی مُبہم، غیر یقینی اور بے اعتباری کے شکار بتلائے جاتے ہیں۔ یہاں اگر پیداوار غیر یقینی ہے تو پھر آمدنی بھی یقیناً غیر مُستحکم ہوگی، اور پھر چوں کہ اس سماج میں آمدو خرچ کا طریق کار مصارف کے انداز اور لین دین کے طریق کار میں زر سے زیادہ زرعی پیداوار کو دخل ہے۔ اس لیے قیمتوں و ٹیکسوں میں ہونے والی تبدیلیوں کے اچھے یا بُرے اثرات کا اندازہ بھی مُشکل امر بن جاتا ہے، آمد و خرچ کے انداز سے اضافوں کا تخمینہ اور پھر ان اضافوں کو بحیثیت بچت کے کسی ادارے کی طرف رجوع کرنے کے بارے میں معلومات فراہم کرنا بھی دقت طلب عمل بن جاتا ہے اور پھر چونکہ طلب محدود، اخراجات کا دائرہ تنگ اور سماجی وتمدنی زندگی کے اقدار فرسودہ ہیں اس لیے بچت کی اہمیت اُس کی افادیت اور اُس میں دلچسپی کا پتہ لگانا بھی مشکل ہو جاتا ہے۔ اس لیے دیہی سماج جب تک اپنی اقتصادی ترقی کے اُس دور میں داخل نہیں ہو جاتا جہاں زر، دولت، سرمایہ کاری، آمد و اخراجات، طلب کا وسیع دائرہ، قیمتوں و ٹیکسوں کی تبدیلیوں کے ردِ عمل وغیرہ جیسے عناصر واضح نہیں ہو جاتے، دیہی سماج کی بچت کی صورتِ حال واضح ہو کر سامنے نہیں آسکتی۔ بہ الفاظِ دیگر جب تک دیہی زندگی میں صنعتی و تجارتی انداز پیدا نہیں ہو جاتا بچت کا صحیح تخمینہ لگانا، اُس کی سطح کا متعین کرنا اور اُس کے سلسلے میں کوئی پیش گوئی کرنا دشوار ہے۔

۱۹۶۹ء سے قبل کمرشیل بنک دیہی علاقوں

میں اپنی خدمات پیش کرنے سے گریز کرتے تھے۔ اس سلسلے میں بینکوں کی طرف سے بہت سے عذر پیش کئے جاتے تھے۔ اوّل تو بینکوں نے زرعی معیشت کی پسماندگی کی آڑلی اور یہ کہا کہ چوں کہ یہ سیکٹر انتہائی پسماندہ ہے، غربت کا سب سے زیادہ جھکاؤ اسی طرف ہے، پیداوار و آمدنی پست و غیر یقینی ہے، طلب کا دائرہ محدود ہے، سرمایہ کاری کا رجحان کمزور ہے اور پھر سماجی، تہذیبی و مذہبی روایتوں میں ایسا جکڑا ہوا سماج ہے جو کسی تبدیلی کو آسانی سے قبول بھی نہیں کرسکتا۔ ایسی ناپائیدار اور فرسودہ معیشت میں بینک کی کارکردگی کو خطرہ لاحق ہوسکتا ہے۔ ایسے معاشی نظام میں بینکوں کے اخراجات تو لازماً بڑھ جائیں گے اور آمدنی و منافع یقیناً غیر یقینی بنا رہے گا۔ مزید قرضہ جات کی عدم ادائیگی، فریب اور اسی طرح کے دیگر روپے ڈوب جانے والے واقعات عام ہوجائیں گے۔ اس طرح زرعی معیشت کی پسماندگی وغربت بینکوں کی سرگرمیوں کے لیے انتہائی غیر سودمند و جوکھم بھری ثابت ہوگی اور کوئی نجی سیکٹر میں چلنے والا بینک یہ خطرہ مول لینے کو تیار نہ تھا۔

پھر ایک عذر یہ بھی پیش کیا گیا کہ زراعت کو قرضہ جات کی فراہمی کے سلسلے میں حکومت نے تمام تر ذمہ داری کوآپریٹو کریڈٹ سوسائٹیز کو سونپ دی ہیں۔ اُن کو تو حکومت کی مکمل سرپرستی حاصل ہے اس لیے اُن کی موجودگی میں بینک کوئی خاص اہم رول ادا نہیں کرسکتے۔ پھر یہ بھی کہا گیا کہ زرعی سیکٹر میں جو شعبہ نسبتاً زیادہ مضبوط و مستحکم ہے یعنی دیہی صنعت، گھریلو صنعت، چھوٹے موٹے دھندے یا دستکاری وغیرہ اُن کو بینک قرضہ فراہم کرتی ہے اس لیے یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ بینک زرعی سیکٹر کی طرف کوئی توجہ نہیں دیتے۔

دراصل اس طرح کی تمام دلیلوں کے پس پُشت سب سے زیادہ اہم و طاقتور عنصر بینکوں کے نظام و کنٹرول کا طریق کار تھا۔ ۱۹۶۹ء سے قبل کمرشیل بینک ایک نجی سیکٹر کی تجارت کی حیثیت رکھتا تھا جو محض منافع کے محور پر گھوم رہا تھا۔ منافع کے فروغ کی ضمانت تو صرف معاشی اعتبار سے مضبوط سیکٹر ہی دے سکتا تھا۔ اسی لیے ۱۹۶۹ سے قبل بینکوں کی تمام تر توجہ اور سرگرمیاں شہروں، صنعتی مراکز، کاروباری علاقوں اور معاشی اعتبار سے مضبوط و مستحکم پیشوں تک محدود رہیں۔ درحقیقت بینکوں کا تصور تو ایک شہری تصور تھا جہاں فلاحی مقصد سے زیادہ انسان و کاروبار کی ساکھ پر نظر تھی چونکہ دیہی سماج ایسے مضبوط معاشی نظام کی ضمانت نہیں دے رہا تھا اس لیے منافع کے محور پر گھومنے والے یہ بینک دیہی علاقوں میں جانے میں نقصان، ناکامیابی اور مجموعی بینکنگ ساکھ پر آنچ آنے کے وہم میں مبتلا رہے۔

اس خوف کو ۱۹۶۹ میں بینکوں کو قومی تحویل میں لے کر دُور کردیا گیا۔ جس جُنوتی کو نجی سیکٹر کے بینک قبول نہیں کرسکے اُس کو حکومت نے تسلیم کرلیا، اور جس جوکھم کو پرائیویٹ سیکٹر کے بینک برداشت نہیں کرسکے اُس کو حکومت نے جھیلنا منظور کرلیا۔ دراصل حکومت نے بھی اتنا بڑا خطرہ اتنا بڑا جوکھم بغیر سوچے سمجھے نہیں لیا۔ حکومت کو یہ پورا احساس تھا کہ منصوبوں کے ذریعے زرعی معیشت کی صورت حال کافی بدل چکی ہے اور یہاں آمدنی، اخراجات اور بچت کے تصور کو کچھ زیادہ مبہم اور پیچیدہ بناکر پیش کیا جاتا رہا ہے۔ منصوبوں نے دیہی معیشت کو بڑی حد تک پائیدار بنا دیا ہے۔ آج زرعی پیداوار اتنی غیر یقینی نہیں رہی ہے جتنی دراصل ۲۰ یا ۲۵ برس پہلے تھی۔ اجناس و بہت سے صنعتی خام مال کی پیداوار میں ملک نہ صرف خودکفیل بلکہ اضافوں کو باہری ممالک کی منڈیوں میں کھپاکر زرِ مبادلہ پیدا کرنے کا مؤثر ذریعہ بھی بن چکا ہے۔ ان صحت مند تبدیلیوں کا نتیجہ یہ ہے کہ آج زرعی سیکٹر کی آمدنی ایسی غیر مستقل نہیں رہی ہے جیسے پہلے تھی۔ پھر پیداوار، آمدنی اور اضافوں کے فروغ کے ساتھ ساتھ طرزِ زندگی میں بھی نمایاں تبدیلی آچکی ہے۔ کسی زمانے میں جب کہ ماچس، مٹی کا تیل، موٹا سُوتی کپڑا ہی ایسی صنعتی اشیاء تھیں جن کی گاؤں میں کھپت تھی لیکن آج ہر اُس شئے کی گاؤں میں مانگ نظر آتی ہے جس کو شہروں میں استعمال کیا جاتا ہے۔ موٹر سائیکل، سائیکل، ٹرانسسٹر، گھڑیاں، سلائی کی مشین، بجلی کے پنکھے، اچھے ریشمی و سینتھٹک کپڑے، جوتے، تمسکو، سیمنٹ، لوہا وغیرہ ایسی لمبی فہرست ہے جس کو یکجا کرنا یقیناً دشوار ہے۔ ان اشیاء کی مانگ بڑھنے کا مطلب یہ ہے کہ صنعتوں نے اپنی اشیاء کی کھپت کا دائرہ انتہائی وسیع کر لیا ہے۔ کیا صنعتی اشیاء کے بازاروں کی یہ وسعت بغیر زرعی سیکٹر کی پیداوار و آمدنی کے استحکام اور فروغ کے ممکن تھی۔ دیہی علاقوں میں صنعتی اشیاء کی بڑھتی ہوئی مانگ اس بات کی ضمانت ہے کہ اقتصادی طور پر زرعی سیکٹر مضبوط ہے، پیداوار و آمدنی، مصارف اور مانگ کے انداز میں صحت مند تبدیلیاں رُونما ہو رہی ہیں۔ حکومت ان تبدیلیوں پر نگاہ رکھتی تھی اور سمجھ رہی تھی کہ یہی وقت ہے جب کہ اس سیکٹر کو بینکنگ خدمات عطا کر دی جائیں تاکہ بینک اپنی مخصوص کارکردگی سے دیہی سیکٹر کی آمدنی کو سرمایہ کاری کی طرف رجوع کردے۔ ایسے بدلتے ہوئے حالات میں کرادارہ جاتی ترغیب حاصل ہوجائے تو زرعی معیشت بھی صنعتی و تجارتی طرزِ زندگی گزارنے کے قابل ہو جائے گی۔ وہاں بھی آمدنی کو گھروں کے بجائے بینکوں میں جمع کرنے، اُن سے قرضہ حاصل کرنے اور مزید آمدنی کو بڑھانے کے طور طریقے رائج ہو جائیں گے۔

۱۹۶۹ تا ۱۹۸۲ کے دَوران اگر دیہی علاقوں کی بچت کا اندازہ لگائیں تو ہم کو مسلسل توسیع و ترقی نظر آئے گی۔ جو لوگ بینک میں مختلف کھاتوں

ہیں اپنی رقوم کو مختلف مدت کے لیے جمع کرتے ہیں وہ جمع شدہ رقوم اُن کی بچت ہوتی ہے یعنی وہ رقم جو اُن کے اخراجات سے فاضل ہو۔ اس روشنی میں ۱۹۶۹ تا ۱۹۸۲ کے دوران دیہی علاقے کے اعداد وشمار انتہائی حوصلہ افزا نظر آتے ہیں۔ ۱۹۸۰ تک بینکوں کی مجموعی تعداد میں دیہی سیکٹر میں کھلنے والے بینکوں کی تعداد ۲۶٫۴ فی صد تھی اور مارچ ۱۹۸۳ء تک یہ تعداد ۵۳٫۶۲ فی صد تک پہونچ گئی۔ بینکوں کی نئی شاخوں میں دیہی علاقے کے بینکوں کا حصہ ۷۰-۱۹۶۹ تک ۸٫۶۵ فی صد تھا جو ۸۰-۱۹۷۹ تک ۷۰٫۷۹ فیصد تک پہونچ گیا۔ بینکوں کی کل جمع شدہ پونجی میں دیہی پونجی کا حصہ ۱۹۶۹ء میں صرف ۱۱٫۳ فیصد تھا جو ۱۹۸۳ تک ۱۴٫۱۷ فی صد تک بڑھ چکا ہے۔ اسی طرح قرضہ جات کی تقسیم میں دیہی سیکٹر کا حصہ جو ۱۹۶۹ تک صرف ۱٫۵ فیصد تھا وہ ۱۹۸۳ء تک بڑھ کر ۱۲٫۹۵ فی صد ہوگیا۔ دیہی سیکٹر میں جمع شدہ پونجی اور قرضہ جات کا تناسب (CREDIT-DEPOSIT RATIO) ۱۹۶۹ء میں صرف ۳۷٫۲۴ فیصد تھا۔ یہ تناسب ۱۹۸۳ میں بڑھ کر ۵۸٫۳۰ فی صد ہوگیا۔ یہ اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ جو رقوم دیہی سیکٹر میں جمع کی جارہی ہے اُن کا تقریباً ۵۸ فی صد انھیں کی ترقی پر صرف ہورہا ہے جبکہ ۱۹۶۹ میں اُس کا صرف ۳۷ فیصد خرچ کیا جاتا تھا۔ اس طرح ان تخمینوں سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ بینکوں نے زرعی سیکٹر کو متاثر کیا ہے۔ دیہاتوں کی بچت کو پیداواری پروگراموں میں استعمال میں لاکر مزید بچت کے رجحان کو فروغ دینے کی ترغیب دی ہے۔

بالعموم بینکوں میں بچت کو تین کھاتوں میں رکھا جاتا ہے۔ ایک جاری کھاتا (CURRENT ACCOUNT) ہوتا ہے۔ دوسرا بچت کھاتا (SAVINGS ACCOUNTS) ہوتا ہے۔ اور تیسرا مدتی یا میعادی کھاتا۔ (TIME Fixed DEPOSITS) ہوتا ہے۔ اب اگر آبادی کو گاؤں، قصبوں یا نیم شہروں، شہروں اور بڑے شہروں (METROPOLITAN) میں تقسیم کرکے کھاتے داروں کی تعداد اور ان کھاتوں میں جمع شدہ رقوم کا اندازہ لگایا جائے تو اعداد وشمار یہ بات واضح کردیتے ہیں کہ ۸۰-۱۹۶۹ کے دوران بچت کھاتوں میں جمع شدہ رقوم اور کھاتے داروں کی تعداد سب سے زیادہ ہے اور اُس میں بھی دیہی علاقے کا فیصد حصہ سب سے زیادہ ہے۔ اس کا تخمینہ نقشہ نمبر ایک پیش کیا گیا ہے۔ یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ بچت کھاتے میں آبادی کے ہر گروپ میں کھاتے داروں کی تعداد اور جمع شدہ رقوم دوسرے کھاتوں کی بہ نسبت سے زیادہ ہے۔ مزید بچت کھاتے میں سب سے زیادہ حصہ، کھاتے داروں اور رقوم کے نقطۂ نظر سے، دیہی سیکٹر کا ہے۔

کمرشیل بینکوں میں جمع شدہ رقوم Deposits کی تقسیم: آبادی اور کھاتوں کے اقسام کی شکل میں (۱۹۸۰ء) (روپیہ لاکھ اور کھاتے ہزار میں)

آبادی	جاری کھاتے (CURRENT ACCOUNT) کھاتے داروں کی تعداد فیصد	جاری کھاتے (CURRENT ACCOUNT) رقم فیصد	بچت کھاتے SAVING ACCOUNT کھاتے داروں کی تعداد فیصد	بچت کھاتے SAVING ACCOUNT رقم فیصد	مدتی کھاتے TIME ACCOUNT کھاتے داروں کی تعداد فیصد	مدتی کھاتے TIME ACCOUNT رقم فیصد
دیہی کل جوڑ کی فیصد	۳٫۶	۸٫۰	۷۲٫۳	۴۳٫۰	۲۴٫۱	۴۹٫۱
نیم شہری "	۵٫۰	۱۱٫۳	۶۵٫۳	۳۳٫۶	۲۹٫۷	۵۵٫۱
شہری "	۶٫۱	۱۵٫۴	۶۱٫۸	۲۷٫۶	۳۲٫۱	۵۷٫۰
بڑے شہر "	۷٫۲	۱۹٫۹	۶۰٫۳	۲۱٫۵	۳۲٫۵	۵۸٫۶
کل مجموعہ "	۵٫۴	۱۵٫۴	۶۴٫۹	۲۸٫۴	۲۹٫۷	۵۶٫۲

Ref: RBI "REPORT ON CURRENCY AND FINANCE" 1980-81 (VOL I) P154

بچت کھاتوں کی سب سے زیادہ پرکشش ہونے کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ان کھاتوں میں جمع شدہ رقوم پر اچھا سود اور رقم نکالنے کی آزادی دونوں حاصل ہیں۔ جب کہ کسی دوسرے کھاتے میں رقم جمع کرنے پر یہ دونوں سہولتیں بیک وقت حاصل نہیں۔ مثلاً جاری کھاتے میں سود تو تقریباً ملتا ہی نہیں ہاں رقم کو ہر وقت نکال لینے کی پوری آزادی ہے۔ دوسری طرف مدتی کھاتوں میں سود کی سب سے اونچی شرح حاصل ہے لیکن ایک معینہ مدت سے پہلے رقم کو نکالا نہیں جا سکتا۔ یہ دونوں کھاتے سماج کے اُن طبقوں کے لیے باعث کشش ہیں جن کے پاس اتنی اضافی رقم ہو جس کو اگر وہ کسی مدت کے لیے ڈال دیں تو کاروبار پر کوئی اثر نہ پڑے یا وہ ایسے کاروبار میں لگے ہوں جہاں ہر وقت لین دین کی ضرورت پڑتی رہتی ہو۔ صنعتی، کاروباری اور تجارتی پیشہ ور دوں کو یہ کھاتے زیادہ متاثر کرسکتے ہیں۔ اِن کی تعداد تو کل آبادی میں بہت کم ہے اس لیے کل فی صد میں ان کھاتوں اور رقوم کا حصہ کم نظر آتا ہے۔ متوسط طبقہ کے لیے سب سے زیادہ موزوں کھاتا بچت کا نظر آتا ہے، جہاں وہ چھوٹی سی رقم کو جمع کرکے سود بھی حاصل کرتے ہیں، رقم کا تحفظ بھی ملتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ یہ آزادی بھی کہ ضرورت کے وقت حسبِ ضرورت رقم کو نکالا بھی جاسکتا ہے۔ بچت کھاتے ایک درمیانی کھاتے ہیں جو درمیانی عوام کو پورا فائدہ پہونچاتے ہیں۔ اسی لیے کھاتے داروں کی تعداد اور کل جمع شدہ رقوم میں اس کھاتے کے اندر

جمع ہونے والی رقم سب سے زیادہ پائی جاتی ہے۔
دیہی بچت کے سلسلے میں بینکوں نے قومی تحویل میں آنے کے بعد اِن علاقوں کی بدلتی ہوئی معاشی صورتِ حال کا ہر وقت اور پُورا فائدہ اٹھانے کی کوشش کی ہے۔ ابتدا میں یقیناً ان کو دقتوں کا سامنا کرنا پڑا ہے اور آئندہ بھی مزید دُشواریوں کا سامنا کرنا ہوگا۔ جدوجہد، محنت کے مقابلے بینکوں کی کارکردگی سُست ہو سکتی ہے۔ جمع شُدہ رقوم کم ہو سکتی ہیں۔ لاگتیں و دیگر مصارف زیادہ ہو سکتے ہیں، دھوکا، فریب و عدم ادائیگی کے واقعات کا سامنا بھی ہو سکتا ہے لیکن بینکوں کو یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ اِن تمام جُھنجھٹوں کے پس پُشت جو بنیادی عُنصر کام کر رہا ہے وہ یہ ہے کہ یہ علاقے عرصہ دراز تک بینکوں کی سرگرمیوں سے مُطلق محروم رہے ہیں، یہاں کے عوام نہیں جانتے کہ بینک کا مطلب کیا ہے۔ وہ کیا کام کرتے ہیں، کس طرح کام کرتے ہیں اور اُن کی افادیت کیا ہے۔ بینکوں کو تو اُنھیں کے ماحول میں ڈھل کر اپنے آپ کو سمجھانا پڑے گا، دیہی عوام کو سکھانا پڑے گا اور اُسی طرح اُن کی ذہنی تربیت کرنی ہوگی جس طرح ایک کسان کھیتی کے سلسلے میں اپنے بچّے کی تربیت اپنے کھیتوں پر لے جاکر کرتا ہے۔ اِس کے لیے بینکوں کو ابتدا میں اپنے روائتی اندازِ کار کردگی کو چھوڑ کر دیہی کاپیر، دیہی زبان، دیہی ماحول کو اپنانا ہوگا تاکہ دیہی عوام کے لیے وہ کوئی اجنبی اور باہر سے لاکر اُن پر تھوپا ہوا آفس نہ معلوم ہو۔ اُن کو اپنے اُوپر سے شہری لبادہ اُتارنا ہوگا۔ یہ ذہنی انقلاب اُن کے اعتماد کو بحال کرنے، زیادہ سے زیادہ قریب لانے اور اُن تمام اندیشوں کو دُور کرنے میں انتہائی موثر ثابت ہو سکتا ہے جن کو یہ بینک محسوس کرتے رہتے ہیں۔ پھر جیسے جیسے اعتماد بحال ہو، بینکوں میں دلچسپی پیدا ہو، اور وہ اپنے کاروباری سرگرمیوں میں بینکوں کو برابر سے شریک کرنے لگیں، صلاح و مشورہ لینے لگیں اور اُن سے فائدہ اٹھانے لگیں تو پھر یہی بینک اپنے روائتی انداز پر دوبارہ واپس بھی جا سکتے ہیں۔

دیہی سیکٹر میں بینکوں کو اس بات کا لحاظ رکھنا ہوگا کہ رقم چاہے جتنی چھوٹی و حقیر کیوں نہ ہو اُس کو پُوری توجہ، دلچسپی اور اہمیت کے ساتھ جمع کرنا ہو اور اُس کے فائدے سے آگاہ کرنا ہے۔ ابتدا میں تو گھر گھر جاکر اِن چھوٹی چھوٹی رقموں کو جمع کرنا ہے اور اُن کے فائدے سے آگاہ کرکے اُن میں مزید دلچسپی پیدا کرنی ہے۔ بینکوں کی تیز رَو ترقی و کامیابی کا ایک راستہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اگر کسان زری شکل میں کچھ بچت جمع کرنے سے قاصر ہیں تو اُن کو اپنی پیداوار کے اضافوں کی شکل میں بچت کھاتے کھولنے کی سہولت فراہم کریں یہاں بینک ان جمع شُدہ پیداوار کو گوداموں میں رکھوا سکتے ہیں، یا بازاروں میں مناسب قیمت پر فروخت کرکے یا کسی دُوسرے کو اُدھار دیکر پیداوار کو زر میں تبدیل کرکے اُس کھاتے میں رقم کو جمع کر سکتے ہیں اور کھاتے دار کو اُس سے باخبر رکھ سکتے ہیں۔

ہندوستان کی موجودہ دیہی معیشت بڑی حد تک مضبوط و مستحکم بن چکی ہے۔ یہاں پیداوار، آمدنی و اخراجات کے انداز اور طرزِ زندگی کے کچھ واضح اصُول اُبھر کر سامنے آ چکے ہیں۔ اب دیہی معیشت کے یہ پیمانے اِتنے مبہم اِتنے دُھندلے اور پیچیدہ نہیں رہے ہیں جتنے کچھ دہائیوں پہلے تھے۔ ان صحت مند حالات نے بچت کی بھی ایک واضح شکل اُبھار کر سامنے رکھی ہے اور اس کا احساس بچت کھاتوں میں کھاتے داروں کی تعداد اور جمع شُدہ رقوم سے بخوبی ہو جاتا ہے۔ کچھ مسائل ضرور ہیں جن کو یہ بینک محسوس کر رہے ہیں۔ یہ مسائل درحقیقت اس لیے سامنے آ رہے ہیں کہ زرعی معیشت اور اِن بینکوں کے درمیان ایک خلیج ہے جس کو دونوں طرف سے پُر ہونا ہے۔ منصُوبوں اور صنعتی ترقی کے ذریعے دیہی معیشت کو زیادہ کاروباری اور صنعتی طرز کی طرف لے جاتا ہے تاکہ وہ اپنے روائتی "دیہاتی خول" سے نکل سکیں۔ دُوسری طرف جب وقت تک یہ تبدیلی دیہات میں نہیں آتی اُس وقت تک بینکوں کو بھی انھیں کا جیسا بن کر کام ہے۔ اسی میں کامیابی ہے اور اسی میں جلد سے صحت مند تبدیلیوں کو لانے کے قوی امکان بھی۔

بقیہ: اَن داتا

دیش کی خدمت کرنا چاہتا ہے تو آپ اُس راہ میں روڑا کیوں اَٹکا رہے ہیں۔ اس طرح آ دیش کی خدمت نہیں کر رہے۔
درشن سنگھ آپ کے خیالات کا مخالف صرف وقت کے ساتھ چلنا اور بدلنا چاہتا ہے سے جو بھی بدزبانی یا گُستاخی ہوئی ہے وہ اُ کے لیے معافی مانگنے میرے ساتھ آیا ہے۔ آر اُسے اپنے پاس چارپائی پر بٹھا لیجیئے۔
گورنام سنگھ نے کمبل ہٹا کر ایک جانب دیا۔ پگڑی دُرست کی اور کہنے لگا۔
• پریتم سنگھ! اسے چارپائی پر بٹھا کر ہے۔ اِسے کھو ٹریکٹر لے آئے۔ میں اس کے نیا فرض پورا کرنے کے لیے کھیتوں پر چلتا ہوں

پروفیسر آر سی بھٹناگر

مرکزی بجٹ ۸۵-۱۹۸۴

۲۹ر فروری کو وزیر خزانہ شری پرنب مُکرجی نے ۸۵-۱۹۸۴ء کا مرکزی بجٹ لوک سبھا میں پیش کیا۔ بحیثیت وزیر خزانہ لوک سبھا کے سامنے یہ اُن کا تیسرا بجٹ ہے۔ اس بجٹ کی ایک خاص بات یہ ہے کہ ساتویں لوک سبھا میں پیش ہونے والا یہ آخری بجٹ ہے کیوں کہ اگلے سال کے شروع میں ہی عام چُناؤ کی توقع ہے۔ دُوسرے یہ سال پانچسالہ منصُوبے کا بھی آخری سال ہے۔ اس لیے اس کے مقررہ نشانوں کو پُورا کرنے میں اس بجٹ کا اہم کردار ہوگا۔

شری مُکرجی کے پیش کردہ بجٹ کا عوام نے دل سے خیر مقدم کیا ہے۔ اس میں جو اقدامات اُٹھائے گئے ہیں اُن کے ذریعے یہ کوشش کی گئی ہے کہ سماج کے ہر طبقے کو فوائد حاصل ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ تاجروں، صنعت کاروں اور تنخواہ دار لوگوں نے اسے ترقیاتی اور حکمتِ عملی والا بجٹ ہے۔ عوام کو ٹیکسوں سے راحت دینے کے علاوہ ی اور صنعتی ترقی کے جو پروگرام شروع کرنے یصلہ کیا گیا ہے اُن کے تحت یقیناً ملک نمایاں ی کرے گا۔

آئیندہ مالی سال (۸۵-۱۹۸۴) کے دوران آمدنی ۵۰۱ ء ۴۰ کروڑ روپے کی ہوگی۔ جب کہ خرچ ۵۳۶ ، ۴۲ کروڑ روپے ہوگا۔ اس طرح بٹ کا کل گھاٹا ۲۰۳۵ کروڑ روپے ہے۔ مگر یر خزانہ نے ۳، ۲ کروڑ روپے نئے ٹیکسوں کی بادیز سے حاصل کرنے کا اعلان کیا ہے۔ چنانچہ ان ٹیکسوں کی شرکت سے گھاٹا صرف ۱۶۶۲ کروڑ روپے رہ جائے گا۔ ترقیاتی پروگراموں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اور پچھلے سال کے بجٹ میں گھاٹے کو دیکھتے ہوئے اس رقم کو زیادہ نہیں کہا جا سکتا۔

بجٹ کی اہم بات یہ ہے کہ آمدنی پر لگنے والے انکم ٹیکس کی شرح میں ہر سطح پر کمی کی گئی ہے۔ یہ کمی نوکری پیشہ لوگوں کو ضرور راحت دے گی۔ ایک لاکھ سے اوپر کی آمدنی پر بھی، جہاں پہلے ۶۰ فی صدی ٹیکس لگتا تھا، اب صرف ۵۵ فی صدی ہی لگایا جائے گا۔ یہ اور بھی بہتر ہوتا اگر وزیر خزانہ انکم ٹیکس سے چھوٹ کی رقم کو ۱۵ ہزار سے بڑھا کر ۱۸ یا ۲۰ ہزار روپے کر دیتے مگر شاید موجودہ تنگ حالات میں اُن کے لیے یہ ممکن نہ تھا۔

وزیرِ خزانہ نے عام استعمال کی متعدد اشیاء کو، جہاں تک ممکن ہوا ہے، نئے ٹیکسوں کی زد میں نہیں آنے دیا بلکہ اُن میں کمی کا بھی اعلان کیا ہے۔ اس سے نہ صرف عوام کو مہنگائی سے راحت ملے گی بلکہ اُن اشیاء کی مانگ بڑھنے سے ان کی پیداوار کو بڑھا کر صنعتی ترقی کا ماحول بھی پیدا کیا جا سکے گا۔ بجٹ میں سُوتی کپڑے، گھریلو بجلی کے سامان، بجلی کے پنکھوں، کُوکروں، کمبلوں، ریکارڈ کئے ہوئے کیسٹوں، چینی مٹی کے برتنوں اور کاغذ پر پیداواری محصول میں کمی کا اعلان کیا گیا ہے۔ کھانڈسار ی پر پیداواری محصول ختم کر دیا گیا ہے اور اُمید ہے کہ اس سے کسانوں کو ملنے والے منافع میں بھی مزید اضافہ ہوگا۔

یہ ٹھیک ہے کہ کچھ اشیاء پر ٹیکسوں میں اضافہ بھی کیا گیا ہے مگر یہ کیسے ممکن ہو سکتا تھا کہ ہم وزیرِ خزانہ سے خرچے میں اضافے کی توقع تو کریں مگر ٹیکسوں کے بوجھ سے خود کو محفوظ رکھ لیں۔ خرچے اور ٹیکسوں کا چولی دامن کا ساتھ ہوتا ہے۔ اس لیے ضروری یہ ہوتا ہے کہ جہاں راحت کی ضرورت ہو وہاں راحت دی جائے اور جہاں ٹیکسوں کو بڑھانا از حد ضروری ہو وہاں اُن میں اضافہ کیا جائے۔ معاون (Auxiliary) پیداواری محصول میں عام ۵ فیصدی کا اضافہ کیا گیا ہے۔ مگر کیمیاوی کھاد، اخباری کاغذ اور ڈیزل جیسی اہم اشیاء کو اس اضافے سے محفوظ رکھا گیا ہے۔

کالا دھن، جو قیمتوں کے اضافے میں ایک اہم کردار ادا کرتا ہے، کی مقدار پر قابو پانے کے لیے شری مُکرجی نے کچھ اہم قدم اُٹھائے ہیں۔ بینکوں اور کمپنیوں سے ادا ہونے والی اُن تمام رقوم پر جو ۱۰ ہزار روپے سے زائد ہوں گی۔ ادائگی صرف کراس چیک یا ڈرافٹ کے ذریعے ہی ہو سکے گی۔ علاوہ اس کے ۱۰ لاکھ روپے سالانہ سے زیادہ کی آمدنیوں کا معائنہ بھی ضروری کر دیا گیا ہے۔ مذہبی ٹرسٹوں کی آمدنیوں پر بھی ٹیکس لگانے کی تجویز رکھی گئی ہے۔

بچت کو بڑھاوا دینے کی غرض سے ایک چار سالہ نیشنل ڈپازٹ سکیم چلائی گئی ہے۔ اس میں لگائی جانے والی رقم پر شرح سُود ½۱۰ فیصدی

رکھی گئی ہے اور سُود کے تحت ملنے والی رقم کو ۱۰ ہزار روپے تک اِنکم ٹیکس سے مُستثنیٰ کیا گیا ہے۔ اِس سکیم کے تحت جاری کئے جانے والے بانڈ ایک سال کے بعد بھی بھُنائے جا سکیں گے مگر ایسی حالت میں شرحِ سُود ۷ فیصدی دیا جائے گا۔ دُو سال پر شرح ۹ فی صدی اور تین سال پر شرحِ سُود ۱۱ فیصدی ہوگا۔

۸۵-۱۹۸۴ء کا سال چھٹے پانچ سالہ منصُوبے کا آخری سال ہے۔ اس لیے منصُوبہ جاتی پروگراموں پر اخراجات میں ۲۵ فی صدی کا اضافہ کر دیا گیا ہے۔

دیہی ترقی کے پروگراموں پر اِس بجٹ میں ۹۲۲ کروڑ روپے خرچ کرنے کا اعلان کیا گیا ہے۔ اُمید یہ ہے کہ اِس سال ۳۰ لاکھ لوگوں کو روزگار مہیا کیا جائے گا اور ۵۰ کروڑ دن روزگار کے موقعے حاصل ہوں گے ۲۰۹ کروڑ روپے پچھڑی جاتیوں اور جن جاتیوں پر خرچ کئے جانے کا امکان ہے۔ بندھوا مزدوروں کے حالات کو بہتر بنانے کے لیے ۴۰۰ کروڑ روپے کی رقم رکھی گئی ہے جو پچھلے بجٹ کے مقابلے میں چارگنا زیادہ ہے۔

بیس نکاتی پروگرام کے لیے ۴۰۳۸ کروڑ روپے خرچ کرنے کا فیصلہ کیا گیا ہے جو پچھلے بجٹ کی رقم سے ۲۴ فیصدی زیادہ ہے۔

۵۰ ہزار نئے دیہاتوں تک پینے کا پانی مہیا کرنے کے لیے بجٹ میں ۲۴۳ کروڑ روپے خرچ کرنے کا بندوبست دکھایا گیا ہے۔

کھیتی کی بڑھتی ہوئی ضرورتوں کو مدِنظر رکھتے ہوئے بجٹ میں اس کی ترقی پر ۵۸۰ کروڑ روپے خرچ کرنے کا اعلان کیا گیا ہے۔

صنعتی ترقی کے لیے کوئلے اور بجلی کی پیداوار میں اضافہ ضروری ہے۔ اس لیے بجٹ میں کوئلے کی پیداوار کو بڑھانے پر ۱۰۴۳ کروڑ روپے اور بجلی تیار کرنے پر ۳۴ فیصدی زیادہ رقم خرچ کرنے کا اعلان کیا گیا ہے۔ اُمید یہ ہے کہ مُلک اِن دو اہم ضرورتوں کے متعلق خودکفیل ہو جائے گا۔

توقع یہ ہے کہ بجٹ منصُوبہ جاتی پروگرام کو پُورا کر دے گا۔ کمر توڑ مہنگائی سے نوکری پیشہ لوگوں کو راحت دلائے گا۔ پچھڑے اور کمزور طبقوں کے لوگوں کو بہتر زندگی بسر کرنے کا موقع دینے کے ساتھ دیہی اور صنعتی ترقی کے لیے ضروری ماحول پیدا کر سکے گا۔ اُمید یہ ہے کہ مُلک میں غریبی، بھُکمری اور بے کاری کو دُور کرنے میں اس کا اہم کردار رہے گا۔

جہاں تک قیمتوں کے اضافے کا سوال ہے، یہ ضروری ہے کہ ہم حالات پر کڑی نظر رکھیں۔ جن اشیاء پر ٹیکسوں میں کمی کی گئی ہے، ان کا فائدہ عام آدمی تک پہونچانا ہوگا۔ صنعت کاروں اور تاجروں پر کڑی نظر رکھنی ہوگی تاکہ وہ خواہ مخواہ قیمتیں نہ بڑھائیں۔ قیمتوں پر قابو پانے کا سب سے بہتر طریقہ یہ ہے کہ ملک میں پیداوار کا اضافہ ہو۔ اگر اس بجٹ سے کھیتی اور صنعت کی پیداوار میں مُناسب ترقی ہو جاتی ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ لوگوں کو اپنی توقع کے مُطابق راحت نہ ملے ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ سرکاری پروگراموں کو حکمتِ عملی سے لاگو کیا جائے تاکہ ملک کی ترقی کا فائدہ ہر شخص تک پہونچ سکے۔

سرور راجہ پوری

کیا آپ جانتے ہیں؟

- دنیا میں کرکٹ کا پہلا میچ ۱۷۵۲ء میں کھیلا گیا تھا۔
- دنیا میں سب سے بڑی مورتی جس کی اونچائی بیس میٹر ہے مہاتما بُدھ کی ٹوکیو میں ہے۔
- دُنیا کا سب سے بڑا تیل صاف کرنے کا کارخانہ آبادان (ایران) میں ہے۔
- مہابھارت کے اشلوکوں کی تعداد دو لاکھ بیس ہزار ہے۔
- بھارت کا سب سے پہلا اخبار "انڈیا گزٹ" ہے۔
- دُنیا میں دو سو بانوے زبانیں بولی جاتی ہیں۔
- دُنیا کی سب سے قیمتی معدنیات ریڈیم ہے، ایک پونڈ ریڈیم کی قیمت ۳۰ کروڑ روپے سے زیادہ ہے۔
- اتوار کو چھُٹی سب سے پہلے ۱۸۴۳ء میں ہوئی۔
- جولیس ریمٹ کپ فٹ بال کا عالمی کپ ہے
- اندرا کپ پولو کے لیے ہے۔
- کناڈا کپ گولف کا عالمی کپ ہے۔
- کرکٹ کی گیند کا وزن ½۵ اونس ہوتا ہے۔
- سوئمنگ کی شروعات عرب میں ہوئی تھی۔
- امریکہ کے ہر چھ افراد میں ایک طلاق کے چکر میں اُلجھا ہے۔
- دُنیا کی سب سے زیادہ تیز ریل گاڑی جاپان میں چلتی ہے۔
- بدن کا پُورا چکر لگانے میں خون کو پندرہ منٹ لگتے ہیں۔
- سب سے زیادہ جنگل کا صوبہ آسام ہے۔
- ہندوستانی اسپنر چندر شیکھر کو چوبیس بار صفر پر کوئٹ ہونے کا عالمی ریکارڈ حاصل ہے۔
- سب سے پہلا ڈاک ٹکٹ سندھ میں ۱۸۲۵ء میں جاری کیا گیا۔

پروفیسر ریش پال*

اندھی تقلید سے نجات دلانے میں پیغام رسانی کا کردار

ماضی کے عقیدوں کی اندھی تقلید سے "قطعی آزادی" حاصل کرنے کے لیے بھارت کے لیے پیغام رسانی کا ایک ایسا ملک گیر نظام کار ہونا ضروری ہے جس پر بہت کم لاگت آتی ہو۔ ہم عوام پر مبنی معلومات کے ایک ایسے نظام کار کو تقویت دے سکتے ہیں جن سے اُن پروگراموں کو بڑے پیمانے پر مدد دی جا سکے جن میں ہم شامل ہیں۔ ہم اُن افراد کو آواز مہیا کر سکتے ہیں جنھیں شاذو نادر ہی سُنا جاتا ہے۔ نہ صرف بڑے بڑے شہروں اور قصبوں سے بلکہ اُن لاکھوں چھوٹے چھوٹے دیہات سے بھی انسانی داستانوں کی تخلیق کر سکتے ہیں جن میں بھارت بود و باش رکھتا ہے۔ ہم آسان اور سادہ ساز و سامان استعمال کر کے اپنے ملک کی شبیہہ بنا سکتے ہیں اور اپنے عوام کے خیالوں، اُمنگوں، خوشیوں اور اُمیدوں کو جگا سکتے ہیں۔

یہ لیکچر اُس "قطعی آزادی" کے بارے میں ہے جس کے لیے ہمارا انفرادی اور اجتماعی طور پر آرزومند ہونا ضروری ہے۔ ماضی کے عقیدوں سے متعین راہوں کی پیروی سے آزادی حاصل کرنا ضروری ہے۔ لیکن اس "قطعی آزادی" کو ایسی جدیدیت سے متعلق عدم مفاہمت اور عدم شرکت کے رجحانات سے مساوی طور پر خطرہ ہے جو سمندر پار ممالک سے ٹیکنالوجیکل سسٹموں کی تمام تر ٹرن کی (TURNKEY) چالو حالت میں درآمد پر مبنی ہے۔

سائنس اور ٹیکنالوجی کی تخلیق انسانی ثقافت کا جزو لاینفک ہے۔ حقیقی ترقی کی صورت کی پیمائش عوام کے گھروں میں پائے جانے والی

> سائنس اور ٹیکنالوجی کی تخلیق انسانی ثقافت کا جزو لاینفک ہے۔ حقیقی ترقی کی صورت کی پیمائش عوام کے گھروں میں پائے جانے والی یا منڈی میں دستیاب اشیاء کے سرسری جائزے سے نہیں بلکہ اُس عمل کی ماہیت سے کی جاتی ہے جس میں سے اِن اشیاء کو حاصل کیا جاتا ہے۔

یا منڈی میں دستیاب اشیاء کے سرسری جائزے سے نہیں بلکہ اُس عمل کی ماہیت سے کی جاتی ہے جس میں سے ان اشیاء کو حاصل کیا جاتا ہے۔ علم اور تکنیکوں کی تخلیق میں مصروف رہنا ایک مہذب سماج کی ایک اہم علامت ہے۔ جس طریقے سے یہ سرسری جائزے ایک دوسرے میں مدغم ہوتے ہیں اور اُس سے جو پوری تصویر یا سلسلہ بنتا ہے وہ مساوی طور پر اہم ہے۔

پُرمسرت کلیت کی جانب پیشقدمی

موجودہ دنیا میں ستقبلوں کی تخلیق کی جاتی ہے انھیں مستعار نہیں لیا جاتا۔ ہر ایسے موقع پر جب ہم ملک میں ہونے والی تکنیکی جدت کو بڑھاوا نہیں دیتے ہمارا مستقبل قدرے مدھم پڑ جاتا ہے۔ تکنیکی طور پر ترقی یافتہ ملکوں نے جو راہیں متعین کی ہیں وہ بہت مستحکم اور بیش قیمت ہیں۔ ہمیں اُن پر رشک آتا ہے جو آگے نکل گئے ہیں کیوں کہ انھیں زیادہ آزادی حاصل تھی۔ لیکن اگر ہمیں احساس ہو جائے کہ ہماری جگہ کی وسعتیں کس قدر مختلف ہیں تو ہم ایسی ہی آزادی کا استعمال کر سکتے ہیں یعنی نئی راہوں پر چلنے کی آزادی، حسب ضرورت اُن کے استعمال کرنے کی آزادی۔ اور اس کے ساتھ ہی راہوں کو پھلانگنے اور نئی نئی سمتیں قائم کرنے سے متعلق حق انتخاب کو برقرار اور اُسے بروئے کار لانے کی آزادی۔ جو لوگ بعد میں آتے ہیں، اُنھیں یہ فائدہ ہوتا ہے کہ وہ ان اینٹوں کا استعمال کر سکتے ہیں جو پیشروؤں کی طرف سے بنائی گئی تھیں۔ لیکن یہ فائدہ غلامی اور شرانداز میں منتقل ہو جاتا ہے اگر ہماری مساعی ہو بہو ایسی ہی عمارتوں اور ڈھانچوں کی تعمیر تک محدود رہیں جنھیں پیشروؤں نے اپنے لیے بنا لیا تھا۔ یہ لکیر کا فقیر بننے اور انتخاب سے دست کشی

---

* پلاننگ کمیشن کے مشیر اعلیٰ

یہ اُس لیکچر کا اختصار ہے جو پلاننگ کمیشن نئی دہلی کے مشیر اعلیٰ پروفیسر ریش پال نے یکم مارچ ۱۹۸۴ء کو انسٹی ٹیوٹ آف اکانومک گروتھ نئی دہلی میں دیا تھا۔ اس میں جن خیالات کا اظہار کیا گیا ہے وہ اُن کے ذاتی ہیں اور وہ نا پلاننگ کمیشن یا ہماری سرکار کے نہیں ہیں۔

ہونے کے مترادف ہے۔ ان میں سے بیشتر اینٹیں کارآمد ہیں لیکن جب ہم انھیں اپنی تحقیقوں اور بچتوں سے تقویت دیتے ہیں اور انھیں ایسی تعمیرات بنانے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے جس سے ہمارے سماج کی واضح ضروریات پوری ہوں تو ہم اس صورت میں لکیر کا فقیر بننے کے بجائے ایک پُرمسرت تکمیت کی جانب پیش قدمی کر سکتے ہیں۔

پیغام رسانی کا ملک گیر سسٹم

جہاں تک پیغام رسانی کا تعلق ہے ہم ایک زبردست مہم کے نیچے میں ہیں۔ اگر متعدد پُرجوش پیلجاریوں کے بعد ہم پسماندگی سے کام لیتے ہوئے اپنے ملک میں چند ایسی چیزوں کی تعمیر کریں جو امریکہ یا یورپ کی ہو بہو نقل ہو تو ہم اپنی ذمہ داریوں کی انجام دہی میں ناکام رہیں گے۔ اپنی عظیم ضروریات اور کما حقہ صلاحیتوں کا خیال کرتے ہوئے ہم ایسے سسٹموں کا ارتقا کر سکتے ہیں جن سے ہم نسل انسانی کے ایک بڑے حصے کو اتنا فائدہ پہنچا سکیں گے جتنا کسی دُوسرے نے کہیں بھی دوسرے لوگوں کو پہنچایا ہوگا۔ ہم ایسے سسٹموں اور سروسوں کو رائج کر سکتے ہیں جو ہماری ضروریات اور بنیادی ٹیکنالوجی کے لیے موزوں ہیں جو تمام تر ترقی یافتہ دُنیا کو بہت دیر میں نصیب ہوئی ہیں۔

ہم پیغام رسانی کے ایک ملک گیر نظام کار کو ایک ایسی قیمت پر فروغ دے سکتے ہیں جو چند کروڑ ٹیلی فون نصب کرنے کی قیمت کے مقابلے میں بہت کم ہوگی۔ ہم عوام پر مبنی معلومات کو ترتیب دے سکتے ہیں اور اُن ترقیاتی پروگراموں کو بڑے پیمانے پر مدد دینے کے لیے ایسے سسٹموں کو تقویت دے سکتے ہیں جن میں ہم شامل ہیں۔ ہم اُن افراد کو آواز مہیا کر سکتے ہیں جنھیں شاذ و نادر ہی سُنا جاتا ہے اور نہ صرف بڑے بڑے شہروں اور قصبوں سے بلکہ اُن لاکھوں چھوٹے چھوٹے دیہات سے بھی انسانی داستانوں کی تخلیق کر سکتے ہیں جس میں یہ ملک بود و باش رکھتا ہے۔ ہم سادہ اور آسان ساز و سامان استعمال کر کے اپنے ملک کی شبیہہ بنا سکتے ہیں اور اپنے عوام کے خیالوں، اُمنگوں، خوشیوں اور اُمیدوں کو جگا سکتے ہیں۔ ہم اپنے عوام کو اُن شبیہوں کی تخلیق میں شامل کر سکتے ہیں جو پھر آسمانوں تک جا سکتی ہیں اور ہم سب تک پہونچ سکتی ہیں۔ ہم ایسے مقامات سے ہٹ سکتے ہیں جہاں ٹی وی کا مطلب محض تفریح طبع سے ہے فلموں نیز کھیلوں سے لطف اندوز ہونے سے ہے اور جن کا جال زیادہ تر بڑے شہروں میں پھیلا ہوا ہے۔ ٹی وی کے ذریعے علم کی اشاعت، تعلیم بالغان کی توسیع اور اسی طرح کے مفاد عامہ کے بہت سے پروگراموں کو پھیلایا جا سکتا ہے۔ اس طریق کار کے تحت نظام کار پر بھی دھیان دینا ہوگا۔

پیغام رسانی، نشریات، صحت عامہ اور خاندانی بہبود وغیرہ سے متعلق ذمہ داریوں کو منقسم نہیں رکھا جا سکتا۔ اس کے لیے بیشتر نئی تنظیمی ضروریات درکار ہوں گی۔

موجودہ دنیا میں مستقبلوں کی
تخلیق کی جاتی ہے انھیں مستعار نہیں لیا
جاتا۔ ہر ایسے موقع پر جب ہم ملک میں ہونے
والی تکنیکی جدت کو بڑھاوا نہیں دیتے، ہمارا
مستقبل قدرے مدھم پڑ جاتا ہے۔ تکنیکی طور
پر ترقی یافتہ ملکوں نے جو بعض راہیں بنائی
ہیں وہ بہت مستحکم اور بیش قیمت ہیں۔ ہمیں اُن
پر رشک آتا ہے جو آگے نکل گئے ہیں، کیوں کہ
انھیں زیادہ آزادی حاصل تھی۔ لیکن اگر ہمیں
احساس ہو جائے کہ ہماری جگہ کی وسعتیں کسی
قدر مختلف ہیں تو ہم ایسی ہی آزادی کا استعمال
کر سکتے ہیں یعنی ان راہوں پر چلنے کی آزادی جب
ضرورت اُن کے استعمال کرنے کی آزادی اور اس
کے ساتھ ہی راہوں کو پھلانگنے اور نئی نئی سمتیں
قائم کرنے سے متعلق حق انتخاب کی برقراری اور
اُسے بروئے کار لانے کی آزادی۔

نئی آزادی کے لیے بیداری

یہ پُرجوش حقیقت ہے کہ ہم واقعی اب اپنے طور پر ایسا کر سکتے ہیں اور میں اُمید کرتا ہوں کہ تکنیکی اور تنظیمی طور پر بھی کر سکتے ہیں۔ تب ہم اپنی نئی راہیں تیار کریں گے۔ تب ہم ایک نئی آزادی کے لیے بیدار ہوں گے۔ دُنیا میں جو کچھ دستیاب ہے اس سے اور اس کے ساتھ ہی اپنی تجی جدت طرازیوں سے ہم فائدہ اُٹھائیں گے اور اس طرح واقعی اپنے حق انتخاب کا استعمال کریں گے۔ وہ حق انتخاب جو نہ صرف دستیاب ہے بلکہ ممکن بھی ہے

میں انجام کار اس امر کے بارے میں اپنی تشویش کا اظہار کروں گا کہ نہ صرف ہمارے ملک بلکہ دُنیا بھر میں ماہرین اقتصادیات اور منصوبہ ساز ابھی تک اُن اشیا کی قیمت کا تعین نہیں کر سکے جن کا استعمال جدت طرازیوں، تکنیکی خود کفا

(باقی صفحہ ۱۹ پر)

اپنی عظیم ضروریات اور کما حقہ صلاحیتوں کا خیال کرتے ہوئے ہم ایسے سسٹموں کا ارتقاء کر سکتے ہیں۔ جن سے ہم نسلِ انسانی کے ایک بڑے حصے کو اتنا فائدہ پہنچا سکیں گے جتنا کسی دُوسرے نے کہیں بھی دوسرے لوگوں کو پہنچایا ہوگا۔ ہم ایسے سسٹموں اور سروسوں کو رائج کر سکتے ہیں جو ہماری ضروریات اور بنیادی ٹیکنالوجی کے لیے موزوں ہیں جو تمام تر ترقی یافتہ دُنیا کو بہت دیر میں نصیب ہوئی ہیں۔

محمد نسیم

دستورِ ہند اور اقلیتیں

دستورِ ہند ہمارے ملک کا وہ اہم ترین قانون ہے جس کی بنیاد پر یہاں جمہوری نظام قائم ہے۔ ملک کے بقیہ تمام قوانین اس دستور کے متعین کردہ دائرے میں رہ کر ہی وضع کئے جا سکتے ہیں۔ کیوں کہ ۲۶ جنوری ۱۹۵۰ء کو یہ دستور ملک میں نافذ کیا گیا تھا اس لیے یہ دن "یوم جمہوریہ" قرار دیا گیا اور اس نام سے ہر سال اہلِ ہندوستان اس کو نہایت عزت، احترام اور عقیدت کے ساتھ مناتے ہیں۔

یہ اہم دستور مرتب کرنے کا کام جب کیبنٹ مشن پلان کے تحت دستور ساز اسمبلی کے عاقل و فاضل ارکان کے سپرد کیا گیا تو ان کو بخوبی ہ تھا کہ جمہوری طرزِ حکومت میں بے شمار ں کے ساتھ ساتھ کچھ خامیاں بھی ہوتی ہیں۔ یت میں ہر فیصلے کا انحصار تعداد و اکثریت یا بیشی کی بنیاد پر ہوتا ہے۔ بقول شاعرِ مشرق اقبال :-

جمہوریت وہ طرزِ حکومت ہے کہ جس میں
بندوں کو گنا کرتے ہیں، تولا نہیں کرتے

امر مسلہ کو ذہن میں رکھتے ہوئے دستور ساز کے ارکان کو یہ خدشہ تھا کہ جمہوری حکومت ڈور ملک کے اکثریتی طبقے کے ہاتھ میں کے بعد اقلیتوں پر ظلم و زیادتیاں ہونے کے تے تھے۔ پروفیسر ہمایوں کبیر کے مطابق جہاں جمہوریت وہاں اقلیت اور اکثریت میں تفریق پیدا ہو گی۔ بہ الفاظِ دیگر جمہوری نظام میں اکثریتی اور اقلیتی طبقات کا تصور لازم و ملزوم ہے۔ خصوصاً ہند جیسے ملک میں جہاں مختلف مذاہب، بے شمار نسلوں اور ان گنت زبانیں بولنے والے لوگ بستے ہیں وہاں اکثریت و اقلیت کا مسئلہ شدید ترین ہوتا ہے۔ ان تمام خدشات کے پیشِ نظر دور بین ارکانِ دستور ساز اسمبلی نے دستورِ ہند میں ایسی واضح دفعات شامل کیں کہ اقلیتوں کے مفادات کا ہر طور پر تحفظ ہو سکے اور ان کی مادری زبانوں، تعلیمی اداروں اور ان کی تہذیب کو اکثریتی طبقہ کسی قسم کا کوئی نقصان نہ پہنچا سکے۔

چیرمین دستور ساز اسمبلی ڈاکٹر امبیڈکر نے اسمبلی کو خطاب کرتے ہوئے اس حقیقت پسندانہ خیال کا اظہار فرمایا کہ ہمارے ملک میں موجود مذہب سماج دشمن ہیں کیوں کہ ہر مذہب کا ماننے والا دوسرے مذاہب کے ماننے والوں پر برتری حاصل کرنے کے لیے غیر سماجی اور غیر اخلاقی حرکتیں کرتا ہے۔

مذہبی جذبات اگر کسی بھی طور نظامِ حکومت پر اثر انداز ہوں گے تو وہ جمہوریت کے لیے سمِ قاتل ہوں گے اور اقلیتوں کے مذہبی جذبات کو مجروح کریں گے۔ کیوں کہ جمہوری طرزِ حکومت میں اقلیتوں کے مفادات کا تحفظ حکومت کا فرض اولین ہے اس لیے مذاہب کی اس سماج دشمنی کے پیشِ نظر دستورِ ہند نے بنیادی حقوق کی شکل میں ہر ہندوستانی شہری کو مذہبی آزادی کی ضمانت تو دی ہے لیکن حکومت کا ڈھانچہ سیکولرزم کی بنیاد پر رکھا ہے۔ یعنی مذہبی جذبات کو نظامِ حکومت میں بالکل دخل نہ ہوگا۔ اس طرح دستور کے ذریعے ہر وہ ممکن کوشش کی گئی ہے جس سے مستقبل میں اس مادرِ گیتی کے گیسو سنوارنے میں مدد مل سکے اور یہاں کا ہر شہری ہمیشہ سکون کا سانس لیتا رہے۔ حالانکہ بیالیسویں دستوری ترمیم سے قبل لفظ "سیکولرزم" کو دستورِ ہند میں استعمال تو نہیں کیا گیا تھا لیکن دستور کی مختلف دفعات کے ذریعے روزِ اول ہی سے سیکولرزم کی ضمانت دی گئی تھی۔ بیالیسویں دستوری ترمیم میں لفظ "سیکولرزم" کو PREAMBLE میں باقاعدہ مناسب جگہ دی گئی۔

دستورِ ہند کا حصہ سوم نہ صرف اس ملک کے رہنے والے تمام شہریوں بلکہ بلا واسطہ یا بالواسطہ اقلیتوں کو جانبدارانہ امتیازی سلوک سے محفوظ رکھنے کی ضمانت دیتا ہے۔ یعنی یہ حصہ اقلیتی طبقوں کی مادری زبانیں اور ان کے رسم الخط، ان کے تعلیمی اداروں اور ان کے مذہبی عقائد پر قائم رہنے کی مکمل آزادی سے متعلق خصوصی مراعات فراہم کرتا ہے۔

اسی ضمن میں یہ کہہ دینا بھی ضروری ہے کہ دستورِ ہند تمام لوگوں کو چاہے وہ ہندوستانی شہری ہوں یا نہ ہوں کچھ دفعات کے ذریعے بنیادی حقوق دیتا ہے۔

مساوات کا حق

دستور کی دفعہ ۱۴ ہر شخص کو بلا تفریق رنگ و نسل، مذہب و ملت قانون کی نگاہ میں

مساوی اور قانوناً ہر شخص کو مساوی تحفظ کی ضمانت دیتی ہے۔ یہ دستوری تجویز امتیاز کی ملامت کرتی ہے اور کسی مخصوص طبقے کے لیے قانون بنانے کی مخالفت کرتی ہے۔ لیکن کسی خاص مقصد کے حصول کے لیے اور اس دفعہ میں دی جانے والی ضمانت کو تقویت پہنچانے کے لیے اور معقول اختلافات کی بنیاد پر درجہ بندی کرنے کی یہ دفعہ اجازت دیتی ہے۔[1] بہ الفاظ دیگر حکومت کسی بھی شخص کے ساتھ قانون کے نفاذ یا "قانوناً" ملنے والے تحفظ کے سلسلے میں طبقہ جاتی قوانین وضع نہیں کر سکتی۔ عام مسائل سے متعلق مختلف مذاہب کے لوگوں کے لیے الگ الگ قوانین نہیں بنائے جا سکتے البتہ حکومت اپنی اور ہندوستانی شہریوں کی سہولت اور بہتری کے لیے کسی جائز بنیاد پر حد امتیاز کھینچ سکتی ہے کیوں کہ مستقل طور پر ایسے قوانین نہیں بنائے جا سکتے جو کسی جگہ وقتاً فوقتاً پیدا ہونے والے حالات پر قابو پا سکیں۔ اس لیے کسی خاص مقصد کے لیے علاقہ، وقت اور مسئلے کی نوعیت کی روشنی میں حق مساوات کو پامال کیے بغیر حکومت کچھ قوانین وضع کر سکتی ہے۔ اس قسم کے قوانین کی بنیاد "معقول درجہ بندی" REASONABLE CLASSIFICATION پر ہے۔ "مسلم پرسنل لا" معقول درجہ بندی کی ایک مثال ہے۔ جبکہ دستور کے حصہ چہارم میں یکساں سول کوڈ نافذ کرنے کی ہدایت کی گئی ہے۔[2]

اگر تمام ہندوستانی شہریوں کے حقوق مساوی نہ ہوتے تو اقلیتوں کو فراہم کردہ موجودہ تحفظات کی ضمانت نہ دی جا سکتی۔ اور ہند میں اقلیتوں کے حالات بالکل مختلف ہو چکے ہوتے۔ ایسی صورت

---

[1] جین۔ ایم۔ پی اور جین۔ ایس۔ این: "انتظامی قانون کے اصول" ترقی اردو بیورو نئی دہلی صفحہ ۱۴۲۔

[2] دستور کے حصہ چہارم میں ریاستی پالیسی کے رہنما اصول دیے گئے ہیں، جو ریاست کو پالیسی وضع کرنے میں رہنمائی کرتے ہیں۔

میں امتیاز کی بنیاد پر حکومت شاید مندرجہ ذیل قسم کے قوانین بھی وضع کر سکتی تھی اور اس کو جوابدہ بھی نہ ہونا پڑتا۔[1]

۱۔ تمام عدالتوں کے جج کسی خاص ذات یا مذہب کے ماننے والے ہوں گے۔

۲۔ ریل میں مختلف ذاتوں اور مذاہب کے لوگ الگ الگ ڈبوں میں سفر کریں گے۔

۳۔ کالی آنکھوں والے درجے کے شہری، بھوری آنکھوں والے دوسرے درجے کے شہری اور نیلی آنکھوں والے تیسرے درجے کے شہری ہوں گے۔

حکومت ہند مندرجہ بالا قوانین دستور میں دفعہ ۱۴۔ ۱۵ اور ۱۶ کی موجودگی کی بنا پر نہیں بنا سکتی۔ ذات، مذہب، نسل، علاقہ اور جائے پیدائش وغیرہ کی بنیاد پر ملازمت دینے کے سلسلے میں حکومت کسی کے ساتھ امتیاز نہیں برت سکتی لیکن حکومت عورتوں، بچوں، درج فہرست ذاتوں، قبیلوں اور سماجی و تعلیمی طور پر پچھڑے طبقوں کی فلاح و بہبود کے لیے امتیازی قوانین تشکیل دے سکتی ہے۔

مذہبی آزادی کا حق

دستور کی دفعہ ۲۵، ۲۶، ۲۷ اور ۲۸ ہر شخص

---

[1] بنیادی حقوق اور رہنما اصولوں میں فرق یہ ہے کہ اگر کسی شخص کا بنیادی حق حکومت سلب کرتی ہے یا پامال کرتی ہے تو وہ شخص یا کوئی جماعت یا کوئی اور شخص جو عوام کے مفاد میں دلچسپی رکھتا ہے حکومت کے خلاف اور کچھ حالات میں افراد کے خلاف ہائی کورٹ یا سپریم کورٹ میں چارہ جوئی کر سکتا ہے بشرطیکہ پامال شدہ حق مفاد عامہ (Public interest litigation) سے تعلق رکھتا ہو۔ لیکن رہنما اصول جیسا کہ نام سے واضح ہے حکومت کی ملک کے تئیں پالیسی وضع کرنے میں رہنمائی کے مقصد سے دستور میں شامل کیے گئے ہیں اور نہ لاگو کیے جانے پر حکومت کے خلاف کوئی عدالتی کارروائی نہیں کی جا سکتی ہے مگر کچھ رہنما اصول اصل میں بنیادی حقوق ہی کا جز ہیں۔ جیسے برابر کام کے لیے برابر تنخواہ کے رہنما اصول کو سپریم کورٹ نے رندھیر سنگھ بنام سرکار میں مساوات کے اصول ہی کی ایک شاخ مانا ہے۔

کو آزادی دیتی ہے کہ وہ جس مذہب کو چاہے مانے، کھلے عام عمل کرے اور تبلیغ کرے۔ دفعہ ۲۵ کے PROVISO کے ذریعے سکھوں کو کرپان رکھنے کا حق دیا گیا ہے کیوں کہ سکھ مذہب کے مطابق یہ ان کے مذہب کا لازمی جز ہے۔ لیکن مذہبی آزادی پر عوامی نظم و ضبط (Public Order) اخلاق (MORALITY) اور صحت (HEALTH) کی بنیاد پر پابندیاں عائد کی جا سکتی ہیں۔

مذکورہ بالا دفعات کا گہری نظر سے جائزہ لینے پر احساس ہوتا ہے کہ ان کی بنیادی مغربی فلسفہ "مذہب فرد کا ذاتی معاملہ ہے" (Religion is personal affairs) پر ہے۔ اس ضمن میں عوامی نظم و ضبط، صحت اور اخلاق کی تشریح اور وسعت اہمیت کی حامل ہیں۔

عوامی نظم و ضبط وسیع اور ذو معنی اصطلاح ہے، اس کی تشریح کی حد کو متعین کرنا دشوار ہے اسی وجہ سے اس کو مختلف اور یہاں تک کہ متضاد معنی میں استعمال کیا جا سکتا ہے۔ عوامی صحت اور اخلاق کی بنیاد پر حکومت ہندروں سے دیو داسیوں کی لعنت کو ختم کرنے میں کامیاب ہوئی۔

اقلیتوں کو کچھ خاص مراعات

دستور کی دفعہ ۲۹ اور ۳۰ اقلیتوں کو کچھ خصوصی مراعات دیتی ہیں۔ اقلیتیں اپنی زبان، تہذیب اور اپنی زبان کے رسم الخط کے تحفظ کے لیے خصوصی اقدام اٹھا سکتی ہیں۔ اس کے علاوہ اپنے مرضی کے تعلیمی ادارے اپنی دیکھ ریکھ میں چلا سکتی ہیں۔ زبان اس کا رسم الخط اور تہذیب کا تحفظ تعلیمی اداروں کے قائم کرنے کی صورت میں بھی ممکن ہے۔

کوئی بھی اقلیت کسی تعلیمی ادارے کے انتظام کے حق میں دعویٰ تب ہی کر سکتی ہے جب وہ تعلیمی ادارہ اس نے قائم کیا ہو علیگڑھ

(باقی صفحہ پر)

م۔ک۔ مہتاب

اَن داتا

گورنام سنگھ اپنی بیٹھک میں کمبل لپیٹے چارپائی میں بیٹھا زیرِ لب بڑبڑا رہا تھا۔ تھوڑی دیر پہلے اُس کی اپنی بیوی ہرنام کور کے ساتھ جھڑپ ہوئی تھی جس کی تلخی اب تک زبان پر باقی تھی ہرنام کور یاد دلانے آئی تھی کہ بارش ہوئے کئی دن بیت چلے تھے۔ زمین کی نمی خشک ہوتی جا رہی تھی۔ اگر اب بھی زمین پر ہل نہیں چلا تو زمین خشک ہو جائے گا۔ پھر کتنا پانی دینا پڑے گا اور جُتائی میں کتنی زیادہ محنت درکار ہوگی پھر فصل بھی کم ہوگی۔ لیکن گورنام سنگھ ہرنام کور کا مشورہ قبول کرنے کی بجائے اُس پر برس پڑا تھا۔

"تو یہ زمین اپنے باپ سے لائی ہے جو اِس کی کاشت کے بارے میں مشورے دے رہی ہے۔ زمین گورنام سنگھ کی اُس کے باپ کی اور اُس کے دادا کی ہے۔ اگر وہ چاہے گا تو اسے کاشت کرے گا۔ نہیں چاہے گا تو نہیں کرے گا۔ زمین بنجر ہوتی ہے تو ہونے دو۔ زمین کا مالک میں ہوں اور یہ فیصلہ بھی میں ہی کروں گا کہ زمین پر کیا کاشت ہوگی۔"

ہرنام کور گورنام سنگھ کے غصے سے خوب واقف تھی۔ وہ گرم گرم چائے کا گلاس اُس کے مُنہ پر بھی دے مار سکتا تھا۔ اِس لیے اُس نے بوڑھے شوہر کو اور بھڑکانا اچھا نہیں سمجھا اور چپ چاپ لوٹ آئی لیکن اُسے گورنام سنگھ کی ضد پسند نہیں تھی کیوں کہ اُسے اپنے شوہر کی نسبت اپنے لڑکے درشن سنگھ سے زیادہ دلچسپی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ کچھ برس بعد درشن ہی کو کھیتی باڑی کا سہارا لینا پڑے گا ہے۔ اگر اب گورنام سنگھ نے درشن کی مرضی یا رائے کو کوئی وقعت نہ دی تو ہو سکتا ہے جوان لڑکا غصے میں کام کاج میں دلچسپی لینا ہی بند کر دے۔ پاسپورٹ بنوا کر انگلینڈ یا کینیڈا چلا جائے اور وہاں روٹی کمانے کے لیے جاٹ کا بیٹا کارخانے میں مزدوری کرے یا کسی ہوٹل میں برتن صاف کرنے لگے۔ اگر اُس کی رائے کی اہمیت نہیں تھی تو پھر اُسے پڑھانے کی کیا ضرورت تھی۔ اگر بچہ اسکول کالج جائے تو جو کچھ سیکھے گا اُسے اپنے ہاں لاگو کرنے کی بھی کوشش کرے گا۔ اگر کوئی بات نہیں سُنے گا تو نوجوان خون اُبلے گا۔ گاؤں کے اور کتنے ہی لڑکے غیر ملکوں میں چلے گئے تھے اس لیے جب بھی کسی نوجوان کو غصہ آتا تھا وہ جالندھر کے پاسپورٹ دفتر کا رُخ کرتا تھا۔

ہرنام کور نے اپنے بیٹے درشن کو بھی سمجھایا تھا کہ بیٹا تیرا باپ اس زمین کو پینتالیس سال سے جوت رہا ہے۔ کھیت کی مٹی اُس کے خون میں رچ بس گئی ہے۔ وہ مجھے اتنی محبت نہیں کرتا جتنی اپنی زمین سے کرتا ہے۔ وہ اپنی زمین کے ذرّے ذرّے سے واقف ہے۔ وہ خوب جانتا ہے کہ کون سے ٹکڑے پر کیا کاشت کرنا ہے۔ وہ کسان کو مزدور نہیں بلکہ راجہ مانتا ہے جسے کھیتی صرف جیب بھرنے کے لیے نہیں اپنی پرجا کی خدمت کے لیے کرنی ہے۔ اِس بوڑھے خون میں کوئی انقلابی لہر پیدا کرنا آسان نہیں۔ تُو اُس کا کہا نہ مان کر اپنی من مرضی کرنا چاہتا ہے۔ میں جانتی ہوں کہ کالج میں تُو نے جو کچھ دیکھا کتابوں میں جو کچھ پڑھا یا ریڈیو پر جو کچھ سُنا تو اُس کے مطابق کھیتی باڑی کرنا چاہتا ہے۔ تو زمین میں نئی نئی روائیاں ڈالنا چاہتا ہے، لیکن تیرا باپ صاف کہتا ہے زمین اُس کی ماں ہے وہ اُسی کو اس زہر کے ٹیکے نہیں لگنے دے گا۔ اُس نے تجھے صاف کہہ دیا ہے کہ وہ تمھیں یہ تجربے اپنی زمین پر نہیں کرنے دے گا۔ تم اور جہاں جا ہو جا کر کرو۔ دونوں کی ضد میں گھر کا کتنا نقصان ہو رہا ہے۔ تم نے اُسے یقین دلانے کی جتنی کوشش کی وہ سب بے کار ہو گئی۔ وہ تمھارا باپ ہے، اُس نے تمھیں اُنگلی پکڑ کر ہل کے ساتھ ساتھ چلنا سکھایا ہے۔ تمھیں اُس کے رو برو یوں غصے میں اتنا اُونچا نہیں بولنا چاہیے۔ باپو اگر تمھاری بات نہیں مانتا تو نہ سہی جب تمھاری باری آئے گی تو جو تمھاری مرضی ہو گی کر لینا مگر بس یہ روز کا طوفان کھڑا کرنے سے کیا فائدہ ہے۔ تم ٹریکٹر چلا کر اپنا فرض ادا کر دو۔ باقی وہ جانے اور اُس کا کام۔

پہلے بھی تم نے اُسے ناراض کیا میں نے بڑی مشکل سے اُسے سمجھایا۔ ابھی وہ تلخی دُور نہیں ہوئی تھی کہ تم نے ٹریکٹر چلانے سے انکار کر دیا۔ ہیرا سنگھ کوئی بُرا آدمی نہیں تھا اُس کی لڑکی ہر طرح ہمارے گھر کی بہو بننے کے لائق تھی لیکن تم نے ایک ہی ضد پکڑ لی کہ تم چھوٹی عمر میں شادی نہیں کراؤ گے۔ ۲۲ برس کی عمر چھوٹی نہیں ہوتی۔ اب تم نے کہہ دیا ہے کہ ٹریکٹر تب چلاؤ گے اگر باپو اس سال گندم کی کاشت نہیں کرے گا، اس پہ دھمکی دیتے ہو کہ گھر چھوڑ کر چلے جاؤ گے۔

لیکن درشن پر ماں کی دلیلوں کا کوئی اثر نہیں تھا اُس کا ایک ہی جواب تھا کہ باپو کی ہڈیاں بہت سخت ہو گئی ہیں۔ ان میں لچک نہیں آ سکتی وہ اُسے کچھ کرنے ہی نہیں دینا چاہتا۔ وہ اُس کے ساتھ

کبھی کھیتی نہیں کرے گا، ٹرک چلالے گا۔ شہر میں نوکری کرے گا لیکن جو باپو چاہتا ہے وہ نہیں کرے گا۔"

باپ بیٹا دونوں جاٹ، قول کے پکے۔۔۔۔

گورنام سنگھ کا کہنا تھا کہ ربیع میں کاشت ہوگی تو گندم ہوگی۔ کسان کو دھرتی منافع خوری کے لیے نہیں، دھرتی پر رہنے والوں کا پیٹ بھرنے کے لیے ملتی ہے۔ وہ دھرتی کا بیٹا ہے اور اَن دینا اُس کا پہلا فرض ہے۔ جب کہ درشن سنگھ کی رائے تھی کہ اناج کی کاشت میں کچھ بچت نہیں رہی۔ ہم وہیں کے وہیں کھڑے ہیں، جہاں آج سے بیس برس پہلے تھے۔ ربیع کی دالیں اور تیل کے بیج اُگا کر ہم کہیں زیادہ منافع کما سکتے ہیں اپنی اور گھر کی حالت سُدھار سکتے ہیں۔ زمین کو سنوارنے سُدھارنے پر مزید خرچ کر سکتے ہیں۔ نئی نئی کھادیں، کیڑے مار دوائیں اور نئے بیج لگا کر بھرپور فصلیں حاصل کر سکتے ہیں۔

لیکن یہ گورنام سنگھ کے وقار کا سوال تھا اُس کا کہنا تھا کسان کوئی بنیا بیوپاری نہیں ہوتا۔ وہ کھیتی ملک کی خدمت کے لیے کرتا ہے۔ کاروبار کے لیے نہیں۔ زمین اُس کا پیٹ بھرتی ہے جب زمین کو دشمن سے خطرہ پیدا ہوتا ہے وہ تلوار اُٹھا لیتا ہے اور امن میں اناج اُگا کر زمین پر بونے والوں کا پیٹ بھرتا ہے۔ پھر اُس کی نظر میں چنے، دالوں اور تیل کے بیجوں کی فصل کا کیا بھروسہ۔ جُوا کھیلنے والی بات ہے۔ بجلی گری، کیڑا لگا سب کچھ برباد، محنت پانی، قیمتی کھاد ختم۔ نہ اپنا پیٹ بھرا نہ دوسروں کا۔ "نہ سیوا نہ میوا!" رہنے دے، رہنے دے اپنی پڑھائی اور دلیل بازی کو۔ جا چلا جا انگلینڈ اور گوروں کی سڑکیں صاف کر۔ تم راج کرنا ہی نہیں چاہتے۔"

اور گورنام سنگھ نے درشن کو ڈانٹ پھٹکار کر گھر سے باہر نکال دیا تھا۔ باپ بیٹے میں بول چال بند ہوگئی تھی۔ اس جھڑپ کو کئی دن ہوگئے تھے۔ باقی کسانوں نے فصل بھی کاشت کر دی تھی لیکن گورنام سنگھ کے کھیتوں میں ابھی جُتائی بھی نہیں ہوئی تھی، زمین کی نمی قریب قریب خشک ہوگئی تھی اب ہل چلانے کے لیے پھر ٹیوب ویل چلا کر زمین سیراب کرنی ہوگی۔ ہرنام کور گھر کے اس مسئلے سے بہت پریشان تھی۔ لوگ کھیتوں میں پانی بھی دینے لگے تھے لیکن اُن کے کھیتوں میں نہ کبھی ٹریکٹر کی آواز آئی تھی نہ ٹیوب ویل چلنے کی۔

ہرنام کور کا بھائی پریتم فیروزپور میں گرام سیوک تھا۔ وہ آیا تو ہرنام کور نے اُسے سارا ماجرا کہہ سُنایا۔ پریتم سنگھ درشن کو لے کر گورنام سنگھ کے پاس گیا۔ گورنام سنگھ بات سُننے کو تیار نہیں تھا۔ پریتم سنگھ نے سمجھانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "سردار جی! آپ کے بیٹے میں بھی آپ کا خون ہے۔ اگر اس عمر میں آپ اتنی ضد کرتے ہیں تو درشن تو ابھی جوان ہے اُسے آپ سے بھی ضدی ہونا چاہیے۔ اگر وہ آپ کی بات نہیں مانتا تو یہ بھی آپ کے اپنے ہی خون کا قصور ہے۔ اس لیے آپ اپنے ہی خون پہ اتنے خفا کیوں ہیں۔ آپ کی ہٹ دھرمی سے لڑکا کوئی راہ اختیار کر سکتا ہے جس پر آپ کو بعد میں افسوس ہوگا۔ اگر وہ ابھی شادی نہیں کرنا چاہتا تو آپ کو اس پہ کیا اعتراض ہے۔ زمانہ بدل گیا ہے لوگ کم عمر میں شادیاں پسند نہیں کرتے کیوں کہ اس طرح بچے زیادہ ہوتے ہیں۔ درشن کہتا ہے کہ اتنی سی زمین پر وہ بوجھ میں زیادہ اضافہ نہیں کرنا چاہتا اور دو چار برس بعد جب وہ آمدنی بڑھانے میں کامیاب ہو جائے گا تو آپ اُس کی شادی کر دیں۔ یہ گستاخی نہیں عقل مندی ہے۔ آپ کو بیجا غصہ تھوک دینا چاہیے۔

رہی زمین جوتنے کی بات تو ہمیشہ نیا خون، نئی پود، نئی راہ اپنانے کی کوشش کرتی ہے۔ وہ نئے تجربے کرنا چاہتا ہے تو کرنے دیجیے۔ اگر اُس کے ساتھ چلیں گے تو اُسے بہتر سمجھ آئے گی۔ کئی بار آدمی نقصان اُٹھا کر ہی سیکھتا ہے۔ اب تک اُس کا علم کتابی ہے جسے آپ اپنے چالیس برس کے تجربے کے مقابلے میں ہیچ سمجھتے ہیں۔ لیکن آپ یہ تو مانتے ہیں کہ یہ بجلی، یہ ٹیوب ویل یہ ٹریکٹر سب نئے تجربے کر کے ہی حاصل ہوئے ہیں۔ پھر آپ کبوتر کی مانند آنکھیں بند کر کے ہی کیوں بیٹھے رہنا چاہتے ہیں۔

"پریتم سنگھ! ہم کسان ہیں ہمارا فرض حرص نہیں خدمت ہے۔"

"بھائی صاحب! آپ سو فی صد ٹھیک کہتے ہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ آپ اپنے فرض سے کوتاہی کریں۔ لیکن وقت کے ساتھ ساتھ فرض بھی تو بدلتا رہتا ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ انسان کی ضرورتیں بھی بدلتی رہتی ہیں۔ آپ جیسے فرض شناس کسانوں کی بدولت اب ہمارے ملک میں اناج کی بہتات ہے۔ اگر ایک دو برس اناج کم بھی پیدا ہو تو لوگوں کی ضرورت پوری ہو سکتی ہے۔ پھر دوسرے ملکوں کا فاضل غلّہ بھی منگوایا جا سکتا ہے۔ دوسری جانب ملک میں زراعتی پیداوار میں جن چیزوں کی کمی ہے اُس سے نہ صرف ملک کے عوام کی صحت کو نقصان پہنچ رہا ہے بلکہ مہنگائی اتنی بڑھ گئی ہے کہ لوگ پریشان ہو رہے ہیں۔ وہ راحت کے لیے کسان کی طرف ویسے ہی دیکھتے ہیں جیسے اناج کے لیے۔ آپ جانتے ہیں کہ کھانے کے تیل کتنے مہنگے ہو گئے ہیں۔ دالیں جو کبھی ہر غریب آدمی کی خوراک تھیں ہاتھ نہیں لگانے دیتیں۔ لوگ اس مہنگائی سے پریشان ہیں۔ اگر کسان اَن داتا بن کر اپنی روایت سے ہی چمٹا رہے گا اور ملک کے لوگوں کو دالوں اور تیل جیسے ضروری خوراک مہیا نہیں کرے گا تب بھی وہ اپنے فرض سے کوتاہی کرے گا۔ اگر آپ وقت پڑنے پہ ہل چھوڑ کر تلوار اُٹھا لیتے ہیں تو مہنگائی اور قلت بھی تو ملک کی دُشمن ہے اُس کے خلاف لڑنا بھی آپ کا فرض ہے۔ ہم کسان اور ملک سے نہ دالیں منگوا سکتے ہیں نہ تیل کے بیج! اگر درشن سنگھ گندم کی بجائے دالیں اور تیل کے بیج کاشت کرے۔۔۔۔ (باقی صفحے پر)

غزلیں

راشد الہ آبادی

اپنے ارمانوں کا خوں آپ ہی کرنا ہوگا
زندہ رہنے کی تمنا ہے تو مرنا ہوگا

بھولی بسری سی کوئی یاد کہیں لوٹ نہ دے
ان کی گلیوں سے دبے پاؤں گذرنا ہوگا

کاش یہ جانتے آغازِ سفر سے پہلے
اس طرح ٹوٹ کے راہوں میں بکھرنا ہوگا

راہ میں کوئی شجر ہے نہ کسی کے گیسو
اپنے احساس کے سائے میں ٹھہرنا ہوگا

یورشِ غم سے جو گھبرائے تو مر جائیں گے
اب اسی آگ میں تپ تپ کے نکھرنا ہوگا

میری آنکھیں ابھی ظلمات سے مانوس نہیں
چاندنی کو مرے آنگن میں اترنا ہوگا

بے غرض کوئی زمانے میں نہیں ہے راشد
تجھ کو لوگوں کی عنایات سے ڈرنا ہوگا

نسیم شاہ جہاں پوری

ترے کوچے میں سب پر پھول برسے
مگر ہم ایک پتھر کو بھی ترسے

وقارِ بندگی ہے تیرے در سے
ترے در کا بھرم ہے میرے سر سے

ہمیں نے بھیک بھی جلووں کی مانگی
ہمیں محروم بھی تابِ نظر سے

پتہ دیتے ہیں قدموں کے نشانات
کوئی گذرا ہے پہلے بھی اِدھر سے

جسے کہیے مرا عہدِ جوانی
تھی وہ دھوپ اب دیوار و در سے

چلا ہوں اس لیے طوفاں بہ طوفاں
بہت نزدیک ہے ساحل ادھر سے

خلوصِ دل اگر شامل نہ ہوتا
پلٹ آتی دعا بابِ اثر سے

پریشاں ہے مری چشمِ تجسس
مجھے آواز دی تم نے کدھر سے

میری منزل شناسی اللہ اللہ
نسیم آگے ہوں اپنے راہبر سے

خلوص

قاضی انصاری

خلوص ایک حقیقت
خلوص سچائی
کہ اس میں مسجد و مندر بھی ہیں کلیسا بھی
کہ اس میں ہندو و مسلم ہیں سکھ ہیں عیسائی
خلوص سارے مذاہب کا ایک مجموعہ
کہ جیسے گنگ و جمن کا ہے دلنشیں سنگم
کہ جیسے پھول کے رخسار پر کوئی شبنم
خلوص صبحِ بنارس خلوص شامِ اودھ
کہیں مروت و ایثار کی نشانی ہے
کہ اس میں سارے مسائل کی اک کہانی ہے
کہیں یہ کہکشاں
شمس و قمر ستارہ ہے
حسین تاج محل کا کہیں نظارہ ہے
یہ جیسے وادیٔ کشمیر کا حسین منظر
یہ جیسے عزم ہمالہ کا دلنشیں پیکر
خلوص دن کا اُجالا ہے رات کا جگنو
خلوص چاروں طرف پھیلتی ہوئی خوشبو
خلوص ایک حقیقت
خلوص سچائی
خلوص کیا ہے؟ محبت کا پیش خیمہ ہے!
خلوص جذبۂ احساس ہے حرارت کا
خلوص مادرِ ہندوستاں کی عظمت ہے

قطعات

دھرم پال عاقل

پھول ہیں وہ حسیں خیالوں کے
پیار کے راستوں پہ چلنے کی
زندگی جن سے خوبصورت ہے
قوم کو اب بڑی ضرورت ہے

یاد رکھیے کہ خود غرض انساں
خوش کریں گے کسی کو کیا وہ لوگ
غم سے آزاد رہ نہیں سکتے
خود جو دلشاد رہ نہیں سکتے

ہے وہ سرتاجِ عاشقاں بیشک
ساری دنیا کو بھولنے والا
جو محبت میں ڈوب جاتا ہے
ساری دنیا کو یاد آتا ہے

دیکھیے آنکھ سے صداقت کی
ایک مٹی کے ہیں سبھی برتن
ایک ہی نور ہے چراغوں میں
ایک ہی رس تمام میووں میں

زندگی، زندگی ہے اُس کی جو
اپنے بیگانے سب کے کام آئے
اور جب وہ جہاں سے رخصت ہو
ہر کوئی اُس پہ پھول برسائے

ڈاکٹر این۔ این بسو[1]

آپ اور آپ کی صحت

کالا موتیا۔ علاج اور روک تھام

اگر سماج میں شعور بیدار ہو جائے تو ملک میں کالا موتیا کے ایسے بہت سے کیسوں کا پتہ لگ سکتا ہے جن کا پتہ نہیں لگ سکا ہے۔ اس بیماری کا تعلق آنکھ سے ہے اور اس کا علاج ممکن ہے۔ اس علاج کے ذریعے مریض کو عمر بھر اپنی بینائی معمول کے مطابق باقی رکھنے میں مدد مل سکتی ہے لیکن اگر ایک بار بینائی جاتی رہی، تو پھر وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے گئی۔ ان خیالات کا اظہار ایک ماہر امراض چشم نے کیا ہے۔

کالا موتیا یا نیلا موتیا آنکھوں کی بینائی کے لیے سخت قاتل ہے۔ انگریزی زبان میں اِسے " Glaucoma " کہتے ہیں۔ دنیا میں جس قدر لوگوں کی بینائی جاتی ہے، اِن میں سے دس تا پندرہ فی صد لوگوں کی بینائی کے جانے کا سبب یہی کالا موتیا ہے۔

ہندوستان میں ۱۵ کروڑ آبادی جو ۴۰ سال سے زیادہ ہے، ایسی ہے جو اس مرض کا شکار ہو سکتی ہے۔ ایک اندازے کے مطابق تقریباً ۴۰ لاکھ تا ایک کروڑ افراد ایسے ہیں جنھیں یا تو کالا موتیا ہے یا اس مرض کی طرف وہ بڑھ رہے ہیں۔ اس بیماری سے ہندوستان میں تقریباً دس لاکھ افراد یا تو پورے طور پر اندھے ہوئے ہیں یا ان کی بینائی کو نقصان پہونچا ہے۔ اس طرح کے مریض، مرض کی تشخیص کرانے کے لیے کس قدر تاخیر سے آتے ہیں، اس کا اندازہ اس مرکز کے ہسپتال میں کالا موتیا کے ۵ ہزار مریضوں کی تعداد سے لگایا جا سکتا ہے۔ اس ہسپتال میں تاخیر سے آنے والے مریضوں کی نشاندہی کچھ اس طرح کی جا سکتی ہے:-

۲،۵ فی صد مریض اُس وقت آئے جب ان کی دونوں آنکھوں کی بینائی جاتی رہی۔
۱۵ فی صد مریض اُس وقت آئے جب ان کی ایک آنکھ کی بینائی جاتی رہی۔ ۳۰ فی صد مریض وہ تھے جب ان کی کسی ایک آنکھ میں مرض کافی بڑھ گیا۔ ان میں سے بہت سے وہ بدنصیب تھے، جنھیں یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ کالا موتیا نے ان کی بینائی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اُن سے چھین لی ہے۔

کالا موتیا ہے کیا؟

کالا موتیا ایک ایسا مرض ہے جس کے سبب آنکھ کے اندر غیر معمولی دباؤ سے بینائی جاتی رہتی ہے۔ غیر معمولی دباؤ کے اسباب مختلف ہو سکتے ہیں لیکن نتیجہ ایک ہی ہے یعنی بینائی کا نقصان اور بالآخر اس سے محرومی۔ پریشان کن بات یہ ہے کہ اس کی پہلے سے کوئی علامت واضح نہیں ہوتی۔ مریض کی بینائی آہستہ آہستہ گھٹتی رہتی ہے اور بالآخر مریض کو کسی اطلاع کے بغیر اس کی بینائی اُس سے رخصت ہو جاتی ہے۔

آنکھ میں دباؤ ایک طرح کے رقیق مادے کے سبب قائم رہتا ہے۔ اسے aqueous humour کہتے ہیں۔ یہ مادّہ آنکھ میں برابر حرکت کرتا رہتا ہے اور چھوٹی اخراج والی نالیوں کے راستے آنکھ کو چھوڑتا رہتا ہے۔ اخراج والی نالیوں میں چند تبدیلیوں کے سبب رقیق مادے کے بہاؤ میں رکاوٹ پڑ جاتی ہے اور آنکھ میں دباؤ بڑھ جاتا ہے۔ آنکھ میں دباؤ کو ناپنے کے لیے ایک خصوصی آلہ جسے ٹونومیٹر tonometer کہتے ہیں۔ اخراج والی نالیوں کی صلاحیت ناپنے کے لیے الیکٹرانک نظام پر مبنی ایک ٹونوگرافر ہوتا ہے۔ رقیق مادے کی تشکیل کو دماغ کے اندر چند مخصوص حصے کنٹرول کرتے ہیں۔

بڑھے ہوئے دباؤ کے اثرات

بڑھے ہوئے دباؤ کو معمول پر لانے کے لیے وہی طریقہ استعمال میں لایا جاتا ہے جو پریشر ککر میں زائد بھاپ کو سیفٹی والو کے ذریعے نکالنے کے لیے کارآمد ہے۔ آنکھ کا نظام بھی اسی طرح ہے جب دباؤ کافی بڑھ جاتا ہے۔ (یہ ہر انسان میں مختلف ہوتا ہے۔ ایک آدمی کے لیے جو دباؤ زیادہ ہوتا ہے، وہ دوسرے کے لیے مکمل طور پر معمول کے مطابق ہو سکتا ہے) تو اس سے آنکھ کی ساخت کو نقصان پہنچ جاتا ہے۔ بالخصوص یہ بڑھا ہوا دباؤ آنکھ کے ایک کمزور حصے پر اثر انداز ہو جاتا ہے جسے ڈاکٹری اصطلاح میں ptic nerves

---

[1] آنکھوں کے امراض اور اس کے علاج سے متعلق ڈاکٹر آر۔ پی سنٹر میں ایسوسی ایٹ پروفیسر۔

یوجنا، نئی دہلی

یعنی بصری رگ کہتے ہیں۔ یہ رگ بصری پیغامات کی ترسیل میں معروف رہتی ہے۔ اس کو یہ پیغام آنکھ کے پردے سے موصول ہوتے ہیں۔ یہ دماغ کو واپس بھیج دیے جاتے ہیں اور وہاں سے نین بینائی کے عنوان سے پیش کیا جاتا ہے۔ یہ رگ دس لاکھ سے بھی زیادہ انفرادی ریشوں سے مل کر بنتی ہے۔ یہ ریشے زیادہ دباؤ برداشت نہیں کر سکتے۔ ان کو خون کی فراہمی کا عمل رک جاتا ہے۔ اگرچہ اس کے اسباب میں اس دباؤ کے علاوہ اور بھی اسباب شامل ہیں۔ رگ سے وابستہ ریشے سیاہ ہو جاتے ہیں۔ اس سے جگہ خالی ہو جاتی ہے۔ یوں سمجھئے اس کی مثال اس درخت کی سی ہے جس کے اندرونی حصے کو دیمک چاٹ گئی ہو۔ اس کو ڈاکٹری اصطلاح میں پیالہ نما شکیہ Cupping of the Disc کہتے ہیں۔ اس سے نقصان کا اندازہ ہوتا ہے اور اس کپنگ سے بیماری کی سنگینی کی نوعیت کا تعین ہو جاتا ہے۔ اس کا اندازہ لگانے کے لیے کارآمد آلے کو اوپتھلموسکوپ Opthalmo scope کہتے ہیں۔

رگوں کو نقصان کس قدر پہونچا ہے، اس کا اندازہ خاص قسم کے ڈاکٹری معائنوں سے لگایا جا سکتا ہے۔ اس کے لیے خصوصی اسکرین اور پیریمیٹر ہوتے ہیں۔

موتیا اور اس کی قسمیں

کس مریض کو کس قسم کا موتیا ہے، اس کا اندازہ لگانے کے لیے ماہر امراضِ چشم ایک خاص قسم کا معائنہ کرتے ہیں۔ اس کو انگریزی زبان میں Gonioscope کہتے ہیں۔

کالا موتیا محض اخراج والی نالیوں کے نقصان کے سبب ہی نہیں ہوتا بلکہ یہ کبھی کبھی آنکھ کی پتلی (آئیرس) یا کارنیا کی رکاوٹ کے سبب بھی ہوتا ہے۔ اس ایک اور طرح کا بنیادی کالا موتیا بنتا ہے۔ اس لیے انگریزی میں (Acute or Narrow Angle Glaucoma) کہتے ہیں۔ اس طرح کی تشخیص کے بعد کالا موتیا دو قسموں میں بٹ جاتا ہے۔ ایک وہ جس کا علاج دواؤں سے ہوتا ہے اور دوسرا وہ جس کا علاج آپریشن سے ہوتا ہے۔

کالا موتیا کن کو ہو سکتا ہے؟

کالا موتیا کا شکار ہونے والوں میں زیادہ تر وہ لوگ ہیں جن کی عمر ۴۰ برس سے زیادہ ہے — ذیابیطس کے مریض بھی اس کا شکار ہو سکتے ہیں۔ یہ مرض خاندانی بھی ہے۔ زیادہ دباؤ والے رقیق مادے کے ذریعے کالا موتیا اترنے کی شرح کا اندازہ ۴۰ سال سے زیادہ عمر کے لوگوں میں ۴۰ میں سے ایک ہے یعنی ۲٫۵ فیصد۔

علامات

خاص بات یہ ہے کہ کسی مریض میں کالا موتیا کی کوئی بھی علامت نہیں ہو سکتی۔ اس کی بینائی معمول کے مطابق ہو سکتی ہے یعنی ۶/۶ لیکن اس کے بھی بصری شکیہ ہو سکتی ہے اور اس میں کئی طرح کی بصری تبدیلیوں کے امکانات ہیں۔ خاص بات یہ ہے کہ آنکھوں کا ٹیسٹ کرتے وقت کالا موتیا کا ٹیسٹ نہیں کیا جاتا۔ ۴۰ سال کے قریب جب کسی شخص کے لیے چشمہ کا نمبر دیا جاتا ہے، اس وقت آنکھوں میں کالا موتیا کی علامات کا جائزہ لینا ضروری ہے۔ اگر کنبے میں کسی کے کالا موتیا ہے اور خود اس شخص کو ذیابیطس کی شکایت ہے تو کالا موتیا ہونے کے امکانات زیادہ ہوتے ہیں۔ اکثر ایسے افراد رات کو دیکھنے کو زیادہ دقت محسوس کرتے ہیں۔ اور ان کے چشمے کے نمبر جلدی جلدی بدلتے ہیں۔ کالا موتیا اگر شدید نوعیت کا ہے تو اس کے یہاں ظاہری علامات میں آنکھوں کے اندر اور اس کے چاروں طرف درد بھی محسوس ہوتا ہے۔ بینائی میں دھندلاپن ہوتا ہے اور مریض کو کاروں کی ہیڈلائٹ اور بلب کے ارد گرد قوسِ قزح کی طرح کی علامات دکھائی پڑتی ہیں۔ اگر کوئی فرد جذباتی طور پر پریشان ہوتا ہے، یا کوئی ہیجان خیز فلم دیکھ لیتا ہے تو اس طرح کی علامات شروع میں چند گھنٹوں تک اس میں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ اور سونے کے بعد یہ علامات باقی نہیں رہتیں اور چند ہفتوں، مہینوں اور دنوں کے بعد پھر ایسی ہی کیفیت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ایسی صورت میں بینائی کے مستقل جانے کا خطرہ ہوتا ہے اور ان کے لیے ہنگامی طور پر فوری علاج درکار ہوتا ہے۔ ابتدائی حالت میں علاج مفید رہتا ہے۔

قابلِ علاج حالت

کالا موتیا قابلِ علاج ہے۔ چوں کہ اس کا تعلق پوری زندگی سے ہے، لہٰذا اسپتالوں میں تھوڑے تھوڑے وقفے سے جانا اور ماہر امراضِ چشم سے تبادلۂ خیال ضروری ہوتا ہے۔ ہر مریض کا علاج کس طرح کا ہو، اس کا انحصار اس امر پر ہے کہ اسے کس طرح کا موتیا ہے۔ اس کا کام، اس کے لیے دستیاب سہولتوں، اس کا سماجی اور اقتصادی مرتبہ، اور اس طرح کے بہت سے موضوعات اس کے علاج کے سلسلے میں جاننی ضروری ہوتی ہیں۔ اس علاج کا مقصد یہ ہے کہ آنکھوں کا دباؤ چوبیس گھنٹے معمول پر رہے۔

ہمارے مرکز میں جہاں موتیا کا علاج ہوتا ہے، ایک ایسا نظام وضع کیا گیا ہے جس سے مزمن کالے موتیا والے مریض طبی علاج سے دس تا ۱۵ سال کے لیے اپنے مرض پر کنٹرول کر سکے ہیں۔ اب ایسی نئی دوائیں آ چکی ہیں کہ دن میں صرف دو بار دوا کا استعمال کرنا پڑتا ہے۔ البتہ ایسا کرتے وقت مریض کے کام کے پروگرام کو ملحوظ رکھا جاتا ہے۔

البتہ جن مریضوں کو دوا سے فائدہ ہونے کی امید نہیں ہوتی، وہاں آپریشن کیا جاتا ہے۔ کالا موتیا کے لیے جدید طرز سے آپریشن ایک محفوظ طریقہ ہے۔ لیکن آپریشن سے طویل المدتی بنیادوں پر مرض کے کنٹرول کی کامیابی تقریباً ۸۰ فی صد ہے۔ کچھ ایسے مریض ہوتے ہیں کہ سرجری کے بعد بھی مسلسل علاج چاہتے ہیں۔

کالا موتیا والے مریضوں کی اوسط عمر معمول کے

مطابق ہے ۔ ان کی روزمرہ کی سرگرمیوں پر کسی طرح کی کوئی معمولی پابندی درکار نہیں ہوتی ۔ مغربی ملکوں کی آبادی کے مقابلے میں ہندوستان میں تنگ زاوئے یا بند زاوئے والا کالا موتیا کافی عام ہے ۔ ہندوستانی باشندوں کی آنکھ کی ساخت ایسی ہے کہ وہ مذکورہ نوعیت کے کالا موتیا کی کافی شکار ہو سکتی ہے ۔ حالاں کہ اس مرض کی علامات پہلے سے ظاہر ہونے لگتی ہیں لیکن زیادہ تر مریض علاج کے لیے بعد میں آتے ہیں ۔ کالا موتیا اگر شدید حالت میں ہو تو آپریشن یا لیسر طریق علاج ہی کار آمد ہوتا ہے ۔ اس کے لیے انگریزی اصطلاح ہے (Iridectomy) ہے ۔ شروع میں دوا سے فائدہ نہ ہونے کی صورت میں آپریشن ہی اس کا علاج ہوتا ہے ۔ چوں کہ اس کا حملہ دوسری آنکھ کو بھی متاثر کر سکتا ہے اس لیے دوسری آنکھ کا آپریشن کرانا بھی مفید رہتا ہے ۔ اس طرح کے کالا موتیا میں آنکھوں میں ڈالنے کی دوا کا طویل المدتی عمل بے کار رہتا ہے ۔

یوں تو آنکھوں میں بینائی کی کمی کا اندازہ سالوں میں ہوتا ہے ۔ لیکن اگر اس کا حملہ شدید ہو تو پھر یہ گھنٹوں اور دنوں میں محسوس کر لیا جاتا ہے ۔ کالا موتیا کے لیے ماہر امراض چشم ڈاکٹر یہ طے کرے گا کہ آپ کو کس قسم کا موتیا ہے ۔

یوگ اور کالا موتیا

جب کوئی انسان اپنے جسم کو آرام کی حالت میں ڈھیلا چھوڑتا ہے تو اس سے آئی ۔ او ۔ پی (Intra-Ocular Pressure) یعنی آنکھ کے اندر کا دباؤ متاثر ہوتا ہے ۔ دھیان کرنے کے عمل کے دوران آنکھ کے دباؤ پر پڑنے والے اثرات کا جائزہ لیا جانا ضروری ہے ۔ دیکھنا یہ ہے کہ عام آدمی کی آنکھ اور کالا موتیا والوں کی آنکھ کے دباؤ کے اثرات میں ایسے موقعوں پر کیا فرق ہوتا ہے ۔ یوگ کے کچھ آسن سر اور گردن کے حصے میں وریدی نسوں دباؤ ڈال سکتے ہیں ۔ مثال کے طور پر سیرش آسن ۔ اس سے آنکھ کا دباؤ بھی بڑھ سکتا ہے ۔ خاص کر اس حالت میں جب کہ اسے کافی عرصے تک کیا جائے ۔

ثانوی کالا موتیا

ابتدائی کالا موتیا کی معروف قسمیں تو یہی ہیں یعنی کھلا زاویہ یا بند زاویہ والا کالا موتیا لیکن آنکھ کی ایسی بھی بہت سی حالتیں ہیں جس سے ثانوی کالا موتیا ہو سکتا ہے ۔ مثلاً آنکھ کا سوجنا ، آنکھ میں زخم ، آنکھ کے پردے کی نالیوں اور رگوں کا رکنا وغیرہ ، ان میں کچھ امراض احتیاط کرنے پر رک سکتے ہیں ۔

موتیا بند اور کالا موتیا

یہ دونوں الگ الگ حالتیں ہیں لیکن موتیا بند کے سبب کالا موتیا کی علامات چھپی رہ سکتی ہیں ۔ موتیا بند والوں کو کالا موتیا کے لیے ٹیسٹ کرا لینا چاہیئے ۔ عام تجربہ بتاتا ہے کہ مریض کو یہ کہہ دیا جاتا ہے کہ وہ موتیا بند کے لیے آپریشن کے لیے انتظار کرے کیوں کہ ابھی کچھ بینائی باقی ہے ۔ لیکن بالآخر پتہ یہ چلتا ہے کہ بینائی کا نقصان کالے موتیا کے سبب ہوا ہے ۔ اس کے برعکس اگر موتیا بند کو ضرورت سے زیادہ پکا دیا جائے تو اس سے ثانوی کالا موتیا ہو سکتا ہے ۔ موتیا بند نکالنے کے بعد کچھ مریض کالا موتیا کے شکار ہو سکتے ہیں ۔

اگر موتیا بند پکا نہیں ہے تو کالا موتیا کے لیے بھی ٹیسٹ کرالیں اور اگر موتیا بند ہے تو اسے بہت زیادہ نہ پکنے دیں ۔

دوائیں اور کالا موتیا

آنکھ کی سوجن کم کرنے والی دواؤں کا مسلسل استعمال آنکھ کا دباؤ بڑھاتا ہے ۔ اس سے موتیا بند بھی ہو جاتا ہے اگر ان کو بدستور استعمال میں رکھا جائے ۔ اس طرح کی دواؤں میں کورٹی کوسٹرائیڈ "Corticosteroids" زمرے کی دوائیں شامل ہیں ۔ ان کے نام ہیں dexamethasone Bethamethasone , hydrocortisone prednisolone ان کے علاوہ اس زمرے کی کئی دوائیں بھی الرجی رد عمل دکھاتی ہیں ۔ آنکھوں کے مرہم کے مسلسل استعمال سے بھی یہ کیفیات پیدا ہو سکتی ہیں ۔ آنکھوں کی معمولی شکایت مثلاً خارش وغیرہ میں یہ دوائیں تجویز کی جا سکتی ہیں ۔ لیکن اس کے بعد بھی ڈاکٹر کے مشورے کے بغیر ان کو مسلسل جاری رکھنا ٹھیک نہیں کیوں کہ ان کے مابعد اثرات موتیا بند اور کالا موتیا کی صورت میں واضح ہو سکتے ہیں ۔ دمہ کے مریض یا وجع مفاصل کے مریض اگر طویل عرصے تک مذکورہ بالا دواؤں کا مسلسل استعمال کرتے رہیں گے ، تو انھیں کالا موتیا کی علامات کا بھی ٹیسٹ کرا لینا چاہیئے ۔

کھانا اور کالا موتیا

آپ سب اس حقیقت کو جانتے ہوں گے کہ حال ہی میں دلی کے دو گاؤں میں مرض استسقا یعنی جلندھر نے وبائی صورت اختیار کرلی ۔ ایک اور وبائی مرض تقریباً دس برس پہلے راما کرشنا پورم کے علاقے میں پھیلا تھا ۔ یہ سرسوں کے تیل میں ملاوٹ کے سبب پھیلے تھے ۔ اس تیل میں ایک خاص قسم کے بیجوں کی ملاوٹ کی گئی تھی ۔ اس سے پیروں میں سوجن آجاتی تھی اور کالا موتیا اتر آتا تھا ۔ اور پردۂ چشم کی خون والی نالیوں پر سمیت کے اثرات ہو جاتے تھے ۔ سرسوں کے تیل میں ملاوٹ کے نقصانات سے آگاہی ضروری ہے ۔

الکحل مشروبات سے بھی آنکھ کا دباؤ کم ہو جاتا ہے لیکن بیئر سے آنکھ کا دباؤ بڑھتا ہے ۔ لیکن یہ جب ہوتا ہے جب ایک ہی بار اس میں اس طرح کے مختلف مشروبات کا کثرت سے استعمال کیا جائے ۔

پیدائشی کالا موتیا

کالا موتیا بالغوں اور نوزائیدہ بچوں کو ہو سکتا ہے ۔ لیکن خوش قسمتی سے ۲ تا ۳ سال کے بچوں کو یہ کم ہی ہوتا ہے ۔

بڑی آنکھ والے بچے اکثر خوب صورت سمجھے جاتے ہیں لیکن ان کی آنکھوں سے پانی کے بہنے اور روشنی کے سامنے آنکھیں جھپکنے کی صورت میں

کالا موتیا ہو سکتا ہے۔ اس عمر میں یہ مرض بہت خطرناک ہوتا ہے۔ اس کے علاج میں روائتی انداز کے آپریشن بہت مؤثر نہیں ہوتے۔ اس کے لیے ایک نئے قسم کے آپریشن یا مائکرو سرجری کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کے لیے انگریزی نام ہے۔ (Trabeculotomy-cum-trabeculectomy)
س مرکز پر اس طرح کے آپریشن کی سہولت دستیاب ہے۔ پچھلے پانچ برسوں میں اس طرح کے کیس کامیاب ہے ہیں۔

اُمید ہے کہ عوام کالا موتیا کے بارے میں احتیاط سے ام لیں گے اور اس بارے میں اپنی واقفیت کا فائدہ اٹھا کر ان کیسوں کو سامنے لانے میں تعاون دیں گے جن پر کالا موتیا کا بظاہر شبہ تک نہیں۔ یہ افسوسناک امر ہے کہ دی مریض اُس وقت ہسپتال پہنچے جب محض سے کالا موتیا بتا کر یہ کہا جائے کہ اب اس کا علاج ممکن نہیں۔ یہ لوگ آنکھ کا امتحان نہیں کراتے یا نکھ کے معائنے کے بغیر ہی چشمے کے سہارے کام رتے رہتے ہیں۔ یا انھیں صرف یہ کہہ دیا جاتا ہے ہ ان کے موتیا اتر رہا ہے۔ جبکہ موتیا بند اور کالا موتیا دونوں ہی اُن کی آنکھوں میں بہ یک وقت تے ہیں۔

یہ ایک ایسی بیماری ہے جو قابلِ علاج ہے اس کے سہارے وہ مریض عمر بھر عام نگاہ کے یوں کی طرح کام کر سکتا ہے۔ لیکن اگر ایک بار ئی جاتی رہے تو پھر وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے چلی ہی ہے۔ اسے دوبارہ بحال نہیں کیا جا سکتا۔ اس یے دو سنہری باتیں یاد رکھنے کے لائق ہیں۔
۔ اس کا جلد سے جلد پتہ چلا لیا جائے اور پھر یاط اور پرہیز ضروری ہے۔ نئی دواؤں اور طریق علاج مثلاً لیسر سے نیز مائکروسکوپ یشن کے طریقے سے کالا موتیا کا مؤثر علاج ممکن

آپ کو کالا موتیا ہے تو یاد رکھیئے

۱۔ مزمن کالا موتیا قابلِ علاج ہے۔ اس کا علاج دوا اور آپریشن دونوں طرح سے کیا جا سکتا ہے۔

۲۔ یہ زندگی بھر کا مسئلہ ہے اور اس سے دونوں آنکھیں متاثر ہوتی ہیں۔

۳۔ علاج سے مزید نقصان کے امکانات رُک جاتے ہیں لیکن جو بینائی پہلے جاتی رہی اس کا بحال ہونا مشکل ہے۔

۴۔ علاج باقاعدگی سے ہونا چاہیئے۔ اگر دوا کی ایک خوراک آپ کے کام کے پروگرام میں دخل انداز ہوتی ہے، تو اس کی متبادل دوائیں موجود ہیں۔

۵۔ بار بار ہسپتال جا کر آنکھ کا معائنہ کراتے رہنا چاہیئے۔

۶۔ تنگ یا شدید نادیے والے کالے موتیا کا آپریشن سے علاج ممکن ہے۔ دُوسری آنکھ کا آپریشن بھی ضروری ہے۔

کالا موتیا سے ہوشیار رہیئے

اگر آپ کی عمر ۴۰ سال سے زیادہ ہے، اور آپ کے پیشاب میں شکر کی مقدار زیادہ ہے اور آپ کے کنبے میں کسی کو کالا موتیا ہوا ہے تو ڈاکٹر سے مشورہ ضروری ہے۔

۱۔ آپ آنکھوں کا معائنہ کرائیں اور یہ معائنہ اس وقت ہو جانا چاہیئے جب کہ ابھی چشمہ کی مدد سے آپ پڑھ لکھ لیتے ہوں۔

۲۔ موتیا بند ہونے کی حالت میں آنکھوں میں کالا موتیا کے ہونے کے امکانات کی جانچ ہونی چاہیئے۔

۳۔ آنکھ میں درد، آنکھ کے آس پاس درد کی حالت میں، معائنہ ضروری ہے۔

۴۔ بچوں کی آنکھ اگر بڑی ہے تو بھی آنکھ کا معائنہ ضروری ہے۔

بقیہ: اندھی تقلید سے نجات دلانے میں پیغام رسانی کا کردار

کی تخلیق اور برقراری اور ایسے امور کی انجام دہی کے طریقوں کی کھوج اور ممکنہ طور پر تلاش میں ہوتا ہے جن کا اب تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اس بظاہر تیزی سے بدلتی ہوئی دنیا میں ان امور

> ہم سادہ اور آسان ساز و سامان استعمال کر کے اپنے ملک کی شبیہ بنا سکتے ہیں، اور اپنے عوام کے خیالوں، اُمنگوں، خوشیوں اور اُمیدوں کو جگا سکتے ہیں۔ ہم اپنی عوام کو ایسی شبیہوں کی تخلیق میں شامل کر سکتے ہیں جو پھر آسمانوں تک جا سکتی ہیں اور ہم سب تک پہونچ سکتی ہیں۔

کے لیے "بعض اقدامات" اور انھیں پروان چڑھانے اور عمل میں لانے سے متعلق ٹھوس مسائل کے بغیر مستقبل کی تعمیر ایک نہایت غیر یقینی کام ہے۔

بقیہ: انٹرنیشنل ایرپورٹ اتھارٹی آف انڈیا

برادری نے گہری دلچسپی لی ہے۔ یہ محسوس کیا گیا ہے کہ یہ جائزہ بیشتر ترقی پذیر ممالک کے لیے نہایت مفید ہے اور اس سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ آئی اے اے آئی کی تحقیقی سرگرمیوں کا تعلق ہوائی اڈوں کی پٹریوں کی تعمیر اور ٹرمینل کی عمارتوں کے ڈیزائن وغیرہ سے ہے۔

ہوائی اڈوں سے متعلق بھارت کے بین الاقوامی ادارے (آئی اے اے آئی) کو بھارت اور بیرون بھارت ہوائی اڈوں کی مشاورت کے سلسلے میں تجربہ حاصل ہو گیا ہے۔ یہ تجربہ اور مہارت مشرق وسطی مغربی ایشیا اور افریقہ کے ترقی پذیر ممالک کے مسائل سے مطابقت رکھتا ہے۔ آئی اے اے آئی کسی بھی سائز کے ہوائی اڈے کے ڈیزائن، تعمیر، ترقی، نگرانی اور انتظام وغیرہ کے بارے میں مشاورت کی خدمات انجام دینے کی مکمل صلاحیت رکھتا ہے۔ جہاں کہیں طیارے اڈے ہیں، وہاں آئی اے اے آئی کی خدمات بھی دستیاب ہیں۔ ●

انٹرنیشنل ایرپورٹ اتھارٹی آف انڈیا

ھوائی اڈوں سے متعلق بھارت کا ین الاقوامی ادارہ (آئی. اے. اے. آئی) اب اپنے ؤں پر کھڑا ہو چکا ہے اور یہ دوسرے ترقی پذیر مالک کی ہوائی اڈوں کی تعمیر اور انھیں جدید بنانے بں مدد کر رہا ہے۔ اس ادارے کو ۱۹۷۲ء میں رلیمنٹ نے ایک قانون بنا کر قائم کیا تھا اور اس کا مقصد بمبئی، کلکتہ، مدراس اور دلی کے چار ین الاقوامی ہوائی اڈوں کو ترقی دینا اور ان کا انتظام چلانا تھا۔ ان ہوائی اڈوں کو جدید بنانے اور انھیں ین الاقوامی معیار کا بنانے کے لیے شہری ہوا بازی کے محکمے سے لے لیا گیا تھا۔ اُس وقت جو حالات تھے وہ مطلوبہ معیار سے کم تھے اور ناکافی سہولیات دستیاب تھیں۔ ان چاروں ہوائی اڈوں کو توسیع دینے اور ان میں تبدیلی لانے کے لیے سنجیدگی سے غور کیا گیا۔ اس کے علاوہ مقررہ مدت میں نئے ٹرمینل تعمیر کرنے تھے تاکہ مسافروں کی بڑھتی ہوئی تعداد کی ضروریات پوری کی جاسکیں۔ بمبئی میں ایک نیا بین الاقوامی ٹرمینل تعمیر کیا گیا جس نے ۱۹۸۱ء سے کام کرنا شروع کر دیا ہے۔ دلی کے لیے نیا بین الاقوامی ٹرمینل اور بمبئی میں ٹرمینل کی [redacted] چلے کی تعمیر جاری ہے۔ علاوہ ازیں مدراس میں بھی اندرونِ ملک کے مسافروں کے لیے بھی قومی ٹرمینل کی تعمیر جاری ہے۔ چاروں موجودہ ٹرمینل پر توسیع، اضافے اور ردو بدل کا کام ریکارڈ مدت میں مکمل کر لیا گیا۔ اس نوعیت کا کام کر کے آئی۔ اے۔ اے۔ آئی نے ہوائی اڈوں کی تعمیر کے تمام شعبوں میں مہارت اور تجربہ حاصل کر لیا۔

مذکورہ بالا ادارہ رفتہ رفتہ دُنیا میں ہوائی اڈوں کی منصوبہ سازی اور تعمیر میں جدیدیت اور تکنیکی اعتبار سے ایک اہم ادارہ بن گیا ہے۔ بین الاقوامی ہوائی اڈوں سے متعلق بھارتی ادارہ ترقی پذیر ممالک کے "مرحلے وار ترقیاتی" پروگرام سے بخوبی آگاہ ہے۔

اس ادارے کو سخت عالمی مقابلے کے باوجود لیبیا میں نیوگھاٹ میں بین الاقوامی ہوائی اڈے کی تعمیر کا سب سے پہلا ٹھیکہ ملا۔ یہ آئی اے اے آئی کی ایک بڑی کامیابی تھی جو اس نے اپنے قیام کے محض چار برسوں بعد حاصل کی۔ ہوائی اڈے کے لیے درکار تمام ضروری سامان، مشینیں اور پلانٹ کو دشوار گذار راستوں سے ۱۵۰۰ کلو میٹر دور مقررہ مقام پر کشتیوں کے ذریعے پہونچا دیا گیا۔

اس ادارے نے اپنی مہارت کو بروئے کار لاکر اس پورے پراجیکٹ کی منصوبہ سازی کی اور اسے بروقت پایۂ تکمیل کو پہنچایا۔ یہ نتیجہ اعلیٰ معیار کا تھا جو کہ بین الاقوامی معیار سے مطابقت رکھتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لیبیا کی حکومت نے براک میں ایک اور ہوائی اڈے کی تعمیر کی بات چیت کی اور اس ہوائی اڈے کی تعمیر کا پہلا مرحلہ مکمل ہو چکا ہے۔ اس پراجیکٹ کی مالیت ۲۵۱۰۷ امریکی ڈالر تھی جبکہ نیوگھاٹ پراجیکٹ ۲۰۷ لاکھ امریکی ڈالر کا تھا اور یہ صحرا میں تعمیر کیا گیا تھا۔ براک پراجیکٹ کے دوسرے مرحلے کی تعمیر کا کام جاری ہے اور اُمید ہے کہ آئی اے اے آئی اسے مقررہ وقت پر مکمل کر سکے گی۔ جلد ہی آئی اے اے آئی کو حکومت تنزانیہ سے ایک ہوائی اڈے کا مشاورتی پراجیکٹ مل گیا۔ اصل سرزمین سے متصل اس پراجیکٹ کو سیاحوں کے مرکز کے طور پر ترقی دی جا رہی ہے۔ اس پراجیکٹ کی مکمل انجینئرنگ اور تعمیرات کی دستاویز ریکارڈ وقت میں اس ادارے نے مکمل کیں اور انھیں تنزانیہ کو پیش کیا۔

اس کے فوراً بعد ہی ہوائی اڈوں سے متعلق بین الا بھارتی ادارے کو ۱۰۷۲ لاکھ امریکی ڈالر کا جمہوریہ یمن ہولوے ہوائی اڈے کی تعمیر کا ٹھیکہ مل گیا۔ اس کے لیے ضروری سامان کی فراہمی ایک بڑا چیلنج تھی جہاں ہوائی اڈہ تعمیر کیا جانا تھا۔ اس کے آس بندرگاہ کی کوئی سہولت نہیں تھی۔ آئی اے اے تقریباً ۸۰ ہزار ٹن مالی اور مشینی پلانٹ وغیرہ سمیت ٹن مزید سامان بھارت سے اور تیسری دُنیا کے دیگر سے بحری جہازوں کے ذریعے ہوائی اڈے کی تعمیر کی جگہ پڑا۔ بہت سے ممالک خاص طور پر عرب ممالک بیرونی ملکوں اے اے آئی کے پراجیکٹوں میں گہری دلچسپی لیتے رہے ہیں۔ آئی اے کو ۱۹۷۹ء میں عوامی جمہوریہ یمن میں ریان میں ہوائی اڈے کا اور پراجیکٹ مل گیا۔ اس پراجیکٹ کو بھی عین پر پورا کیا گیا۔ آئی اے اے آئی نے جو شاندار کام دیا ہے اس کی بدولت اس ادارے کو حکومت یمن۔ الغایئدہ میں مکمل طور پر ایک ہوائی اڈہ تعمیر کرنے کا ٹھ دیا۔ اس ادارے نے بارہ ہفتے کے اندر ماسٹر پلا انجینئرنگ ڈیزائن اور تعمیری دستاویزات تیار کرنے لیے کیا گیا۔ اس کے بعد آئی اے اے آئی کو [redacted] امریکی ڈالر کا ٹھیکہ دیا گیا۔

ہوائی اڈوں کی تعمیر اور ترقی کی تکنیک اور ٹیکنا میں دُنیا بھر میں تیزی سے تبدیلی آرہی ہے۔ آئی اے آئی نے ایک دور اندیش تنظیم کے طور پر تحقیق اور ایک سرگرم شعبہ قائم کیا ہے جو ہوائی اڈوں کی ڈیزا اور تعمیر کے مختلف پہلوؤں کے بارے میں تحقیق کا کام انجام دیتا ہے۔ اس شعبے کی طرف سے پیش کئے نتائج میں ہوائی اڈوں سے متعلق انجینئروں کی بین الا

(باقی صفحہ ۱۹ پر)

Published by the Director, Publications Division, Patiala House, New Delhi-110001
Printed by Skylark Printers, 11355, Id-Gah Road, New Delhi-110055

یوجنا

یکم تا ۱۵ مئی ۱۹۸۴ء

ایک روپیہ

پہاڑی علاقوں کی ترقی
ناقدانہ جائزہ

(سندرلال بہوگنا)

انٹارکٹیکا کے برفیلے ویرا
تیسری ہندوستانی سائنسی مہم

(ڈاکٹر اقبال محی الدین)

دیہی ترقی کے لیے مصنوعی سیارے

کے ذریعے مواصلاتی نظام

بھارت جیسے ترقی پذیر ملک میں شہری علاقوں کی ضروریات کا بڑی حد تک حل ٹیلی مواصلات کی ترقی ہے۔ حکومت نے اس بات کو ذہن میں رکھتے ہوئے کہ دیہی ٹیلی مواصلاتی نظام کو توسیع دیئے بغیر دیہی ترقی بے معنی رہے گی۔ قومی پروگرام کے ایک حصے کے طور پر دیہی علاقوں میں ٹیلی مواصلات کو فروغ دینے کی غرض سے منصوبے مرتب کئے ہیں۔

دیہی ٹیلی مواصلات کے فروغ کے اغراض و مقاصد دنیا بھر میں ایک جیسے ہی ہیں۔ یہ ضروری ہے کہ ہر گاؤں میں ٹیلی فون کی قابلِ بھروسہ سہولت حاصل ہو اور مربوط دیہی ترقی کے لیے ٹیلی مواصلات سے متعلق ہر ٹیکنالوجی فراہم کی جاسکے۔

مواصلاتی ترقیاتی سرگرمیوں سے بھرپور فائدہ اٹھانے اور ان کی رفتار تیز کرنے کے لیے ہم متعدد طریقے اپنا رہے ہیں۔ اس سلسلے میں نومبر ۱۹۸۰ء میں پہلا قدم یہ اٹھایا گیا کہ ملک کے پانچ دُور افتادہ علاقوں پورٹ بلیئر، نکوبار، کوارتی، لیہہ اور آئزوال کا دلی اور مدراس سے انٹل سیٹ مصنوعی سیارے کے توسط سے رابطہ قائم کر دیا گیا۔ ان علاقوں تک پہنچنا انتہائی دشوار ہے اور مواصلات کے روایتی طریقوں سے ان سے رابطہ قائم کرنا بھی بہت مشکل ہے۔

انسیٹ ۱ بی مصنوعی سیارے کے داغے جانے سے مواصلاتی سرگرمیوں میں ایک جان پڑ گئی۔ کثیر المقاصد مصنوعی سیارہ انسیٹ، ایک دیہی ترقی کی اعتبار سے مدد کر رہا ہے۔ یہ مصنوعی سیارہ مواصلات سے متعلق خدمات کے علاوہ موسمیاتی اور ٹیلی ویژن نشریات کی سہولیات بھی فراہم کر رہا ہے۔ ٹیلی مواصلات سے متعلق آلات جو کہ ۱۲ ٹرانسفارمروں پر مشتمل ہیں، چھ ہزار سے آٹھ ہزار تک طویل فاصلے کے ٹیلی فون سرکٹ مہیا کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ ۲۱ زمینی سٹیشنوں میں سے ۱۵ اسٹیشن دُور دراز علاقوں میں واقع ہیں ان میں سے پانچ ابتدائی مرحلے میں مہیا کئے گئے ہیں باقی دس گنگٹوک، اروناچل پردیش، اگرتلہ، منی کوئے، بھج، ایجال، اگوا، جودھپور، سری نگر اور کوہیما میں واقع ہیں۔

تاہم چھٹے پنج سالہ منصوبے میں مزید ۲۰ زمینی اسٹیشن قائم کرنے کے لیے کہا گیا ہے، جن میں سے اٹھارہ دُور افتادہ علاقوں میں قائم کئے جائیں گے۔

مصنوعی سیاروں سے متعلق ٹیکنالوجی تیزی سے فروغ پا رہی ہے اور دیہی ترقی کے سلسلے میں اسے بروئے کار لانے کے لیے بہت سے نئے رجحان سامنے آئے ہیں۔ دُنیا کے مختلف حصوں میں ٹیلی مواصلات کے منتظمین نے الگ الگ طریقے پر اس کا استعمال کیا ہے۔ یہاں اس کا مختصر ذکر کرنا مفید رہے گا۔

بھارت میں انسیٹ ایک کے ذریعے زمینی اسٹیشنوں کو باہم مربوط کر دیا گیا ہے اور پہلے سے طے شدہ بنیاد پر سرکٹ مہیا کئے گئے ہیں۔ ۳۶ میگا ہرٹز کا مصنوعی سیارے کا ایک ٹرانس پونڈر ۸۰۰ سنگل چینل کی ضروریات پوری کر سکتا ہے۔

اگر تمام اسٹیشنوں کا رابطہ ایک دُوسرے سے جوڑ دیا جائے تو مختصر مدت میں ہر ایک ٹرانس پونڈر کی صلاحیت میں مزید اضافہ کیا جاسکتا ہے۔ دیہی نظام کے لیے یہ صورتحال پیدا نہیں کی جاسکتی اور یہ اسٹیشن عام طور پر ایک بڑے مرکزی اسٹیشن سے منسلک ہیں۔ اس طرح کے نظام سے فریکوئینسی اور سرکٹوں کی بھی بچت ہوتی ہے۔ اگر ٹیلی فون نظام قائم کیا جاتا ہے اور سطحی اسٹیشن کے توسط سے پیغام رسانی کا کام لیا جاتا ہے تو ارضی سرکٹ کا استعمال کرنا ہوگا۔ امدادی مواصلات کے آغاز کا مصنوعی سیارے کے ذریعے مواصلاتی نظام پر بھی اثر پڑا ہے۔ امدادی مواصلات کا پہلے ہی استعمال ہو رہا ہے اور اسے نت نئے شعبوں نیز سمتوں میں توسیع دی جا رہی ہے۔ تاہم اس سب کا اثر تجارتی مواصلات پر پڑ رہا ہے تاہم وہ دن بھی دُور نہیں ہے جبکہ اس کا استعمال دیہی مواصلات کے لیے بھی اہمیت اختیار کر جائے گا۔ امدادی یعنی ڈیجیٹل نظام کا مواصلاتی بندوبست کو توسیع دینے سے بھی تعلق ہے اس کے ذریعے ٹیلی فون سے متعلق معلومات اور دوسرے نظاموں کو مربوط کیا جا سکتا ہے۔ بھارت میں دیہی ٹیلی مواصلاتی خدمات یعنی ٹیلی فون اور تار دونوں کو ہی مربوط کرنے میں اس کی اہمیت بڑھ گئی ہے۔ مواصلات کی مہمات کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ ان دیہی علاقوں میں جہاں مواصلات کی ناکافی سہولت ہے یا اس طرح کی سہولیات مفقود ہیں وہاں مواصلات کی سہولیات فراہم کی جائیں۔ بین الاقوامی مواصلاتی تنظیم (انٹل سیٹ) اگلے سال کے اوائل میں دیہی مواصلاتی سے متعلق اپنے عالمی مصنوعی سیارے نظام کا، جنوبی بحرالکاہل افریقہ اور حتیٰ کہ ایشیا جیسے علاقوں میں تجربہ کرنے اور عملی مظاہرے کا ارادہ رکھتی ہے۔ ترقی پذیر ممالک کے لیے یہ ایک نہایت دلچسپ پیش رفت ہوگی اور وہ اس زبردست تیزی سے فروغ پانے والی مصنوعی سیارے سے متعلق مواصلاتی ٹیکنالوجی سے بھرپور فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

بھارت میں پہلے ہی مصنوعی سیارے پر مبنی مواصلاتی نظام کے فوائد کی حقیقت کا احساس ہو چکا ہے۔ وقت کا تقاضہ ہے کہ ٹیلی مواصلات کے منصوبہ ساز اس ٹیکنالوجی کا خاص طور پر خود اپنے مصنوعی سیارے سے فائدہ اٹھائیں جو کہ خوش قسمتی سے ہم پہلے ہی داغ چکے ہیں۔ دیہی ٹیلی مواصلات سے مکمل اور بھرپور فائدہ اٹھانے کے لیے ضروری ہے کہ مختلف اشکال میں اسے بروئے کار لایا جائے۔ ●

منصوبہ بندی اور ترقیاتی پروگراموں کی جھلک پیش کرنے والا

پندرہ روزہ

یوجنا

نئی دہلی

چیف ایڈیٹر — آر۔ ٹھکرال
ایڈیٹر — لکشمی رام رانا
اسسٹنٹ ایڈیٹر — محمد عادل صدیقی
سب ایڈیٹر — وسیم حیدر

جلد ۴	یکم تا ۱۵ مئی ۱۹۸۴ء	شمارہ: ۳
۱۱ تا ۲۵ بیساکھ شک سمبت ۱۹۰۶ ☆ فون نمبر ۳۸۷۳۴۱		

شرح چندہ سالانہ ۔ ۲۰ روپے، دو سال ۔ ۳۵ روپے
سہ سال ۔ ۵۰ روپے، فی کاپی ۔ ایک روپیہ
طالب علموں، اُستادوں اور لائبریریوں کے لیے ۱۰ فیصد کی رعایت

اس شمارے میں

●

یوجنا منصوبہ بندی کے بارے میں عوام کو آگاہ کرتا ہے، مگر اس کے مضامین صرف سرکاری نقطۂ نظر کی وضاحت تک ہی محدود نہیں ہیں

بزنس منیجر: ایل۔ آر۔ بترہ ☆ اسسٹنٹ ڈائرکٹر (پروڈکشن) کے۔ آر۔ کرشنن

مضامین سے متعلق خط و کتابت کا پتہ:-
ایڈیٹر یوجنا اردو پبلیکیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

ترسیل زر کا پتہ:- بزنس منیجر، پبلیکیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

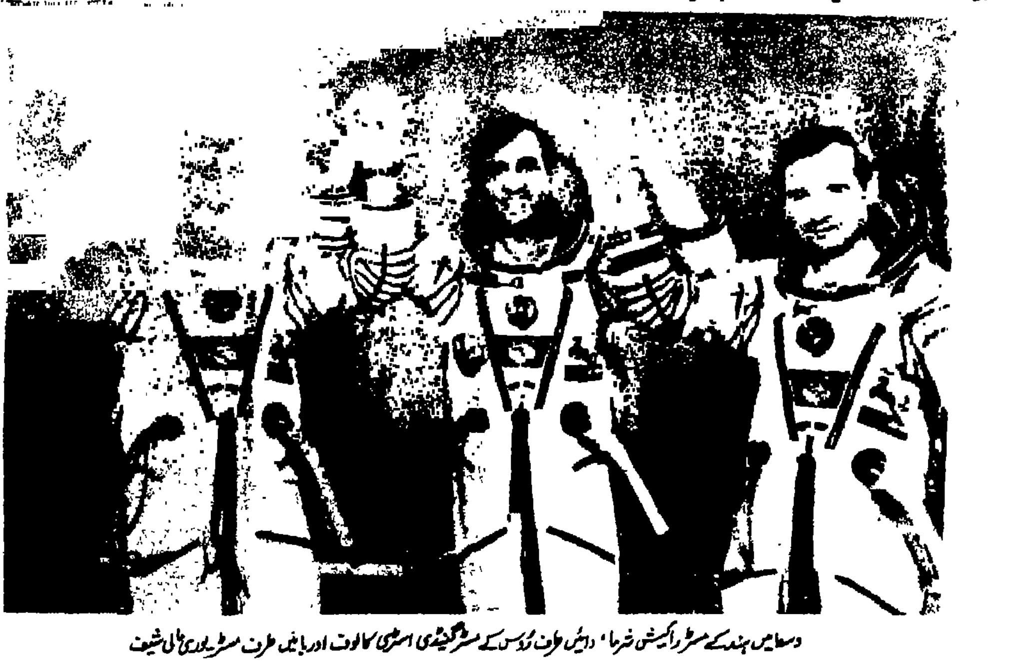
اداریہ

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں

ہماری خلائی کامیابیاں باعثِ صد افتخار

پچھلے بیس برسوں میں خلائی تحقیق میں حیرت انگیز طور پر ترقی ہوئی ہے اور کائنات کے بارے میں نئی معلومات نے ہمیں اپنے مسائل کو نئی روشنی میں دیکھنے میں مدد دی ہے۔

آج کی دنیا میں خلائی ٹیکنالوجی، رسل و رسائل، موسمیات، زمینی ذرائع اور وسائل کے ذخیروں کی تلاش اور زندگی کے بہت سے دوسرے شعبوں میں موثر طور پر کام میں لائی جا رہی ہے۔ واقعہ تو یہ ہے کہ خلائی معلومات کو زمینی زندگی کے معاملات میں استعمال کرنے کا امکان اس قدر وسیع ہو گیا ہے کہ ناواقف لوگوں کا ذہن اس کی افادیت آسانی سے سمجھ نہیں سکتا۔



وسط میں ہند کے مسٹر راکیش شرما، دائیں طرف رُوس کے مسٹر گینیڈی اسٹری کالوف اور بائیں طرف مسٹر یوری مالی شیف

حال ہی میں اسکواڈرن لیڈر مسٹر راکیش شرما نے رُوسی خلابازوں اور سائنس دانوں کے ہمراہ خلائی لیبارٹری میں تجربات کئے ہیں۔ اس طرح ہندوستان خلائی تحقیق و ترقی کے ایک نئے دَور میں داخل ہو گیا ہے، اسکواڈرن لیڈر مسٹر راکیش شرما ہندوستان کا ترنگا جھنڈا لے کر خلائی مرکز بیکونور سے خلا میں پہونچے تھے اب پورا ملک ان کی خیریت اور سلامتی سے واپسی پر مسرت کے شادیانے بجا رہا ہے۔ لوک سبھا کے ارکان نے وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی کے ساتھ مل کر اس کامیابی پر مسرت کا اظہار کیا ہے۔ مسز گاندھی نے بجا طور پر فرمایا کہ اس کامیابی پر ہمیں بجا طور پر فخر ہے۔ یہ ایک عظیم کامیابی ہے۔ خلا میں جانے والا پہلا انسان ایک رُوسی خلا باز ہی تھا اور یہی رُوس کی سرزمین ہے جہاں سے پہلا ہندوستانی رُوسی خلا بازوں کے ہمراہ خلائی سفر پر روانہ ہوا تھا۔

(باقی صفحہ پر)

سندر لال بہوگنا

پہاڑی علاقوں کی ترقی
ناقدانہ جائزہ

جنگلات کے اندھا دھند کاٹنے اور کان کنی وغیرہ کے ذریعے تباہی سے پہاڑوں کو ناقابلِ تلافی نقصان پہونچا ہے اور اس کے سبب مقامی باشندوں کی زندگی کو زبردست دھکا لگا ہے۔ بہر صورت جنگلات ہمارے لیے کئی طرح معاون ہیں۔ مٹی، پانی اور صاف ہوا فراہم کرنے میں ان جنگلات کا موثر رول ہے اور یہی تینوں چیزیں ہمارے وجود کے لیے بنیادی حیثیت رکھتی ہیں۔ پہاڑوں کی ترقی سے متعلق حکمتِ عملی کے تحت قومی ضرورتوں اور مقامی آرزوؤں اور امنگوں کے درمیان تال میل قائم کرنا ضروری ہے۔

آج کے دور میں پہاڑی علاقوں کی ترقی تشویش کا باعث بن گئی ہے۔ پہاڑیوں پر واقع جھونپڑیوں کی ترقی کی بات چیت اور ان دور دراز علاقوں کو فروغ دینے کے مسائل پر تبادلۂ خیال کہاں ہوتا ہے!۔ وہ ہوتا ہے یوجنا بھون کی کثیر المنزلہ عمارت کے ایئر کنڈیشنڈ کمروں میں اور ریاستی حکومتوں کے سیکریٹریٹ کی عمارتوں میں۔ نہ صرف ہمالیہ کا محل وقوع اہم ہے بلکہ یہ وہ مسکن ہے جہاں سے ایسے ایسے دریا نکلتے ہیں جو ہماری زندگی کو باغ وبہار بنانے میں معاون ہیں۔ ایک طرف ہمالیہ کی قومی اور بین الاقوامی اہمیت میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے اور دوسری طرف مقامی آبادی کے مفادات اور آرزوؤں اور امنگوں کے تئیں لاپرواہی کا مظاہرہ ہو رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ بر فیلے پہاڑ بے اطمینانی کا سبب بنتے جا رہے ہیں۔

ترقی کو کاروباری انداز سے انجام دینے والے نیز ہمالیائی سلسلۂ کوہ کے بارے میں کتابی علم رکھنے والے افراد منصوبہ سازوں کو نئے نئے طریقوں کا مشورہ دیتے ہیں۔ چنانچہ ان مشوروں کو سامنے رکھ کر تجربات شروع کئے جاتے ہیں۔ پہاڑی علاقوں کی یونیورسٹیوں کے توسط سے شروع کیے گئے ترقیاتی پراجیکٹ اس سلسلے کی کڑی ہیں۔ جموں یونیورسٹی کے کالج میں بھی اسی طرح کا ایک پراجیکٹ بھدروا میں شروع کیا گیا ہے۔ اس پراجیکٹ کے تحت ایسے درخت لگائے گئے، جو جلد سے جلد پرورش پا سکیں اور بڑھ سکیں۔ لیکن یہ پودے مادر گیتی کے بطن میں اتر گئے اور خالی گڑھے دیکھنے کے لیے رہ گئے۔ ان سے یہ ضرور پتہ چلتا ہے کہ طلبا اور استادوں نے ان گڑھوں کو کھودنے میں محنت کی ہے۔ اب یہ گڑھے اس موسم کا انتظار کر رہے ہیں جب کہ ان میں پودے دوبارہ سے لگائے جا سکیں۔

پہاڑی علاقوں کی ترقی کے چند متضاد پہلو یہ ہیں:۔

- مقامی آبادی کی خواہشوں اور آرزوؤں اور قومی مفادات کے درمیان تال میل نہیں ہے۔
- منصوبہ سازوں کا معیارِ زندگی اور منصوبوں پر عمل درآمد کرانے والوں کا معیارِ زندگی اُن سے قطعی مختلف ہے جن کے لیے کہ یہ منصوبے بنائے جاتے ہیں۔

مقامی آبادی کا ذہنی لگاؤ اور ان کی آرزوؤں کا تعلق اپنی مٹی سے ہوتا ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ اس سرزمین پر رہتے ہوئے وہ آرام دہ زندگی بسر کریں۔ پہاڑوں کی زندگی سخت ہوتی ہے اور وہ چاہتے ہیں کہ انھیں اپنی حیات کی بقا کے لیے اتنی شدید جدوجہد نہ کرنی پڑے جتنی کہ بالعموم وہ کرتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ انھیں جن اشیا کی دستیابی میں دشواری پیش آتی ہے، وہ انھیں بآسانی دستیاب ہونے لگیں۔ تقریباً بیس برس پہلے جبکہ ہمالیائی خطے کی بھرپور ترقی کا پروگرام شروع کیا گیا تھا، تو ان علاقوں کو میدانی علاقوں سے جوڑنے کی سرتوڑ کوشش کی گئی اور اس مقصد کے لیے سڑکیں تعمیر کی گئیں۔ بڑی بڑی سڑکوں کی تعمیر کے بعد چھوٹی چھوٹی سڑکیں اور ضمنی ومعاون سڑکیں بنانے پر توجہ دی گئی۔ یہ کام آج بھی جاری ہے اور یہ اس وقت تک چلتا رہے گا جب تک کہ ہر گاؤں ایک ایسی سڑک سے نہ جوڑ دیا جائے جہاں کہ موٹر دوڑ سکتی ہو۔

بے اطمینانی کی راہیں

چٹانوں کا گرنا اور مٹی کا کٹاؤ بار بار بڑھنے

چھانے پر پیش آ رہا ہے۔ ماحولیاتی سائنس اور ہمالیائی ارضیاتی طبقات کے مشہور سکالر ڈاکٹر کے۔ ایس۔ والدیہ نے کہا ہے کہ ۴۴ ہزار کلومیٹر سڑکوں کی تعمیر سے ۲۰۰۰۰ ملین مکعب میٹر ملبہ اکٹھا ہوگیا ہے۔ اس خطے میں ہر سال ان سڑکوں کے ایک کلومیٹر فاصلے پر ۵۰۰ مکعب میٹر ملبہ چٹانوں کے گرنے اور ہبوط ارضی کے نتیجے میں اکٹھا ہوجاتا ہے۔ اس طرح ہر سال تقریباً ۴۴ ملین مکعب میٹر تلچھٹ ڈھلوان حصے سے کھسک کر نیچے آجاتی ہے اور اس سے ہریالی کو نقصان پہونچا ہے اور پہاڑی چشموں کے بہاؤ میں رکاوٹ پڑتی ہے۔ سڑکوں والے علاقوں میں مٹی کے کٹاؤ کی شرح جنگلات والے علاقوں کی بہ نسبت دوہزار گنی زیادہ ہے۔

پہاڑی سڑکوں کی مثال اس کارٹون کی سی ہے جہاں ایک بونا اپنے بازو تلے ایک بڑا درخت لیے ہوئے دوڑ رہا ہے اور جب اس سے پوچھا گیا کہ وہ کہاں جارہا ہے، تو اس نے جواب دیا کہ میں اس درخت کو چھپانے کے لیے کسی محفوظ جگہ کی تلاش میں دوڑ رہا ہوں کیوں کہ سیمنٹ سے بنی ہوئی سڑک میرے پیچھے دوڑ رہی ہے۔ سڑکوں کی مسلسل تعمیر نے جنگلات کی تباہی کا لامتناہی سلسلہ شروع کردیا ہے۔ اس کی وجہ سے عمارتی لکڑی کی تجارت اور درختوں کو ناجائز طور پر گرانے کے عمل کو تقویت ملی ہے۔ پہاڑ کے ڈھلوان حصے بڑے بڑے لکڑی کے گٹھوں کے وہاں موجود رہنے کے سبب ننگے پڑے ہیں۔ جنگلاتی علاقوں کے قلب میں آرا مشینیں چلا رہی ہیں۔ جیسا کہ جموں و کشمیر میں وادئی چناب میں دیکھنے کو ملتا ہے۔ اُتر کاشی اور مغربی بنگال کی دارجلنگ کی پہاڑیوں میں بھی اسی طرح کے مناظر دیکھنے کو ملتے ہیں۔ کان کنی کا کام ترقی پا رہا ہے دہرہ دون کی وادی میں، الموڑہ میں، جھرولی میں اور پتھورا گڑھ میں چند ہاک میں کان کنی کے نظام نے جنگلات کو ناقابل تلافی نقصان پہنچایا ہے۔

دیہی معیشت کا نقصان:۔ ان سرگرمیوں سے دیہی معیشت کو ایسا نقصان پہنچا ہے کہ مقامی باشندے اب مقامی وسائل سے روزی پیدا کرنے میں دشواری محسوس کرتے ہیں۔ پہلے دیہات سے نمک، تیل، شیرہ اور کپڑا وغیرہ مل جاتا تھا۔ ان کی جگہ اب چھوٹے چھوٹے بازار ملتے ہیں جن میں ایسا سامان بکتا ہے جو شہروں کے اسٹوروں پر دستیاب ہوتا ہے۔ اب چیز کے بدلے چیز کا نظام ختم ہوگیا ہے۔ اس کی جگہ ہر چیز اب پیسے کے عوض خریدی جاتی ہے۔ اس عمل میں گاؤں والوں کو بحیثیت خریدار اور بحیثیت تاجر دونوں طرح نقصان رہتا ہے۔ دیہات والے اب دودھ، گھی اور دیگر اشیاء کو بیچنے کے لیے مجبور ہیں۔ اب وہ روپیہ کمانے کے لیے غیر سماجی ذرائع اختیار کرنے پر مجبور ہیں۔ وہ اپنی اشیاء کو بیچنے کے لیے تیار ہیں تاکہ روپیہ حاصل کرکے اپنی پسند کی چیزیں خرید سکیں، اور اپنی ضرورتوں کو پورا کرسکیں۔ یہ دیہی بازار شراب اور جوئے کے مرکز بن گئے ہیں۔ صحتمند آدمی گاؤں کو چھوڑ کر ملازمت کی تلاش میں نکلتے ہیں اور جب دو سال بھر کے بعد چھٹی پر آتے ہیں تو اپنا پیسہ بے دریغ خرچ کرتے ہیں، اس وجہ سے پہاڑی عورتوں کی زندگی اور دقت طلب ہوگئی ہے۔

پہاڑی علاقوں میں دوسرا ترقیاتی پروگرام اسکولوں اور تعلیمی اداروں کے کھولنے سے تعلق رکھتا تھا۔ اس کی وجہ سے تعلیمی نظام کے نقائص پہاڑی زندگی میں بھی سرایت کرگئے ہیں اور نوجوان اپنی ثقافتی زندگی سے لاتعلق ہوگئے ہیں نیز انھیں بے روزگاری کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ تعلیم یافتہ بے روزگاروں نے کچھ ایسے کام سنبھالے ہیں مثلاً ٹھیکیداری، یہ وہ کام ہے جس کے ذریعے وہ کم سے کم محنت سے زیادہ سے زیادہ نفع کمانا چاہتے ہیں۔ اس سے بدعنوانی کو تقویت ملی ہے اور قدرتی وسائل کا استحصال ہوا ہے۔

زراعت اور مویشی پروری کے کاموں میں بہتری نہیں آئی ہے۔ پہاڑی علاقوں کی معیشت جسم و جان کا تعلق برقرار رکھنے سے ہے۔ وہاں زرعی پیداوار فروخت نہیں کی جاتی۔ قطعات اراضی بہت چھوٹے ہیں۔ زراعت اور مویشی پروری میں عورتیں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتی ہیں لیکن ترقیاتی پروگراموں کے فائدوں سے عورتوں کو نفع نہیں ہوسکا ہے۔

ڈیم تباہی کا پیش خیمہ

پہاڑی علاقوں میں ایسے ڈیم تیار کئے گئے ہیں جن سے میدانی علاقوں کی آبپاشی کی ضرورتیں پوری کی جاسکیں۔ مستقبل کے لیے بھی ایسے بہت سے پروگرام وضع کئے گئے ہیں۔ اس طرح کے پراجیکٹوں کی تعداد صرف گنگا اور اس کے معاون دریاؤں پر ۲۲ ہے۔ ہماچل پردیش میں پونگ ڈیم اس طرح کا ایک پراجیکٹ ہے جسے مکمل کیا جاچکا ہے۔ اترپردیش میں بھاگیرتھی پر ٹہری ڈیم زیر تعمیر ہے۔ پہاڑی علاقوں کے لیے یہ پروگرام تباہی کا پیش خیمہ ہے۔

یہ ڈیم وادیوں کے زرخیز سطح قطعات اراضی میں پانی بھر دیں گے۔ ان جگہوں سے جو لوگ اُجڑ جائیں گے، ان کی بحالی ایک مسئلہ بن گئی ہے۔ پونگ ڈیم سے اُجڑنے والوں کے لیے اگرچہ راجستھان میں ان کی بحالی کے لیے زمین دی گئی ہے لیکن وہ وہاں نہیں بس پائے ہیں۔ مجوزہ ٹہری ڈیم سے متاثرہ ۹۲ گاؤں میں سے ابھی تک صرف چار گاؤں کی بحالی بھی عمل میں نہیں آسکی ہے۔ اس تبدیلی کے عمل نے سماجی، نفسیاتی اور ثقافتی مسائل پیدا کردئے ہیں۔

پہاڑی علاقوں کی ترقی کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ قدرتی جنگلات کو ایسی ذخیرہ گاہوں میں بدل دیا گیا ہے جہاں سے جنگلاتی دولت پر مبنی صنعتوں کو خام مال مل سکے۔ میدانی علاقوں میں زراعت کے لیے بڑے بڑے قطعات اراضی وقف کردئے گئے ہیں۔ چوتھے، پانچویں اور چھٹے پنجسالہ منصوبوں کے مقاصد کے تحت پہاڑی علاقوں میں

صنعتوں کے لیے کارآمد شجرکاری کے یہ پروگرام رکھے جاتے رہے ہیں۔ اسی وجہ سے بیش قیمت شاہ بلوط و جو کہ اتر پردیش میں رنگالی میں اور ہماچل پردیش میں تھا لتو گھوڑ منڈی میں ہوتے تھے، کے درختوں کی جگہ دیودار کے جنگلات نے لے لی۔ مشرقی ہمالیہ میں گھنے جنگلات کو کاٹ لیا گیا اور ان کی جگہ دھوپی کے درخت لگائے گئے۔ کرناٹک میں شمالی کنارا کے ضلع میں جنگلات صاف کر کے چائے اور یوکلپٹس کے درخت لگا دیئے گئے۔ حالاں کہ اس آب وہوا میں یوکلپٹس پھل پھول نہ سکے۔

مالدار سماجی طبقوں کی بڑھتی ہوئی مانگ کو پورا کرنے کے لیے ایسے علاقوں سے فائدہ اٹھانا جہاں کہ اب تک وسائل سے کام نہیں لیا گیا ایک عالمی مسئلہ ہے۔ پہاڑی علاقوں کے ترقیاتی پروگرام اسی نظریئے کی تائید کرتے ہیں۔ چنانچہ سڑکوں کی تعمیر، ڈیموں کی تنصیب، کان کنی، جنگلات سے استفادے کی حکمتِ عملی اس بات کا ثبوت پیش کرتی ہے کہ ان علاقوں سے وہاں کے قدرتی مناظر کو ختم کر کے انہیں چٹیل میدانوں اور میدانِ جنگ کی طرح کے علاقوں میں تبدیل کر دیا گیا ہے۔ اس کا بڑا سبب یہ ہے کہ منصوبہ سازوں کے نظریات اور ان کا اندازِ فکر اور ہے جبکہ پہاڑی عوام کا اور۔ یہ فرق محض عمل کا ہی نہیں ہے بلکہ دونوں کے ذہنوں اور دماغوں کا فرق ہے۔ اسی وجہ سے مقامی آبادی نے ایک نعرہ بلند کیا۔ یہ نعرہ ٹہری ڈیم کی تعمیر کے وقت لگایا گیا اور یہ نعرہ تھا کہ آپ کو بجلی سے محبت ہے، ہمیں مٹی سے۔ چنانچہ عوام کی ناراضگی کی موجودگی میں اس کی تعمیر مسلح گارد کے پہرے میں شروع کرائی گئی۔ اسی طرح چپکو تحریک کے دوران یعنی کہ جنگل بانی سے متعلق نظم و نسق کے روایتی نعرے کے دوران کہا گیا کہ جنگلات سے کیا ملتا ہے، رال، عمارتی لکڑی اور غیر ملکی زرمبادلہ مگر اس کی مخالفت میں بنوال گھاٹی کی دیہاتی عورتوں نے کہا کہ جنگلات ہمیں دیتے ہیں مٹی، پانی اور صاف ہوا، اور ان سے ہی ہمارا وجود قائم ہے۔ ان باتوں سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ منصوبہ سازوں اور پہاڑی آبادی کے سوچنے میں کتنا فرق ہے۔

روایات کا احترام

ترقیاتی پروگراموں کو برکات سے تعبیر کیا جاتا ہے مگر ایسا سوچنے سے بہت سے مسائل پیدا ہو گئے ہیں۔ نام نہاد ترقی یافتہ سماج میں غربت نے اپنی شکل بدل لی ہے۔ تیل کی قیمتوں میں اضافہ، آلودگی کی مستقل موجودگی، بنک کی رقم کی شرحِ سود میں اضافہ اور تنخواہ دار طبقہ کی قوتِ خرید کی کمی کی شکل میں یہ غربت واضح ہوتی ہے۔

اس ترقیاتی دور میں روپے کے بغیر زندگی ناممکن دکھائی دیتی ہے۔ ہمیں عام سطح کے انسانوں کا روایتی طرزِ زندگی اپنانا ہوگا جس میں کہ ہر شخص کو سانس لینے اور جینے کا حق حاصل ہے۔ جب کہ اقتصادی نابرابری اس قدر نہ تھی جیسا کہ آج ہے۔ قدرتی وسائل سے زندگی کی بنیادی ضرورتوں کے پورا کرنے کا کام لیا جاتا تھا۔ مقامی آبادی اپنے ماحول سے آکسیجن، پانی، خوراک، پناہ گاہوں اور کپڑے کی ضرورتوں کو پورا کیا کرتی۔ اس طرح ہمیں عوام کے ان تجربوں سے استفادہ کرنا ہے، جو انہوں نے نسلاً بعد نسلٍ حاصل کئے ہیں اور ان کے رسم و رواج، روایات اور دانش سے استفادہ کرنا ہوگا اور دانشورانہ بنیادوں پر تیار کی گئی بڑی بڑی رپورٹوں اور تحقیقی مقالوں کی بہ نسبت مذکورہ عملی تجربات کو پیشِ نظر رکھنا ہوگا۔

قومی ضرورتوں اور مقامی آبادی کی خواہشوں اور امنگوں کے درمیان تال میل ضروری ہے۔ پہاڑی علاقوں اور خاص کر ہمالیائی علاقوں میں قومی مفاد کے پیشِ نظر ایسی ترقی ضروری ہے جو قومی دفاع کے نقطۂ نظر سے اہم ہو۔ تجربہ بتاتا ہے کہ سرحدی علاقوں میں خود مکتفی اور قناعت پسند آبادی سب سے زیادہ مضبوط دفاعی لائن ہے۔ اس سے بھی زیادہ انہیں اپنی ثقافتی روایتوں پر پختہ یقین ہے۔ ۱۹۶۲ء میں توانگ علاقے میں مونپا برادری نے اس بات کا ثبوت مہیا کیا تھا۔ اس علاقے کے وسائل کا بھرپور استعمال بھی قومی ضرورت کو پورا کرنے میں معاون ہے۔ چنانچہ جنگلات دولت، پانی اور معدنی دولت سے استفادے کے لیے منصوبہ بندی درکار ہے۔

ہمیں جنگلاتی پالیسی ورثے میں ملی ہے، جس کی وجہ سے جنگل کے پاس اپنی ہی سرزمین میں بدیسی دکھائی پڑتے ہیں۔ اس کی وجہ سے وہ خود جنگلات کے دشمن دکھائی پڑتے ہیں۔

ہمارے قدرتی جنگلات غائب ہو گئے ہیں۔ اب یہ عمارتی لکڑی کی کان بن گئے ہیں۔ صنعتی خام مال کا مرکز اب یہی جنگل دکھائی پڑتے ہیں۔ جنگلاتی رقبے میں روز بروز کمی آ رہی ہے۔ پورا ملک تباہ کن سیلاب سے پریشان ہے۔ مٹی کا کٹاؤ روز بروز بڑھ رہا ہے۔ اب ساتویں منصوبے کے آغاز پر ماحول کے تحفظ کی ضرورت کا خیال آیا ہے۔ اقوام متحدہ نے اب یہ نعرہ دیا ہے "تباہی کے بغیر ترقی" اب یہ سائنسی تحقیق تسلیم کی جانی چاہیے کہ ہمالیائی جنگلات کا اہم رول شمالی ہندوستان کی آب و ہوا کا توازن قائم رکھتا ہے۔ اس کے ذریعے گنگا کے طاس اور گنگا جمنا کے میدانوں کی زرخیزی بحال رکھتی ہے۔ یہ پانی کی ذخیرہ گاہ ہے۔ یوں کہیے کہ یہ مٹی بنانے کی فیکٹری ہے۔ ماہرینِ موسمیات اور گلیشیروں کے ماہرین کی یہ تحقیقات کہ درجۂ حرارت میں اضافہ ہو رہا ہے اور گلیشیر کم ہوتے جا رہے ہیں، نظرانداز نہیں کی جا سکتی۔ ہمالیائی جنگلات کی تازہ ترین صورتِ حال سیٹلائٹ کے ذریعے موصول ہونے والی تصاویر سے واضح ہو جاتی ہے۔

ڈاکٹر جی۔ ایس۔ سنگھ اور ڈاکٹر ایس۔ پی۔ سنگھ نے جن کا تعلق کمایوں یونیورسٹی سے ہے کچھ مطالعے کئے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ اتر پردیش کے آٹھ پہاڑی اضلاع میں صرف ۳۱ فی صد جنگلاتی رقبہ ہے۔ صرف ۸ء۴ فی صد رقبے پر گھنے جنگل ہے۔ پہاڑیوں میں

جنگلات کا رقبہ اراضی کا ۶۰ فی صد ہونا چاہیئے جیسا کہ جاری قومی پالیسی کا تقاضہ ہے مگر مذکورہ صورتِ حال اس سے بالکل مختلف ہے قومی سطح پر اور مقامی طور پر جنگلات کے تحفظ کی اہمیت کے پیشِ نظر جنگلات کے رقبے میں اضافے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ درختوں کے کاٹنے اور تجارتی مقاصد کے لیے مال نکالنے کی پالیسی فوراً ترک کر دینی چاہیئے اور درختوں کی ایسی اقسام لگانی چاہیئے جس سے مٹی کا تحفظ ہو اور پانی رک سکے نیز درخت سایہ دار ہوں اور سایہ دے سکتے ہوں۔

بحساب فی کس فی آدمی کسی شخص کے پاس کتنی اراضی ہو اس بنیاد پر حالات موافق ہیں۔ پہاڑوں سے کافی رقبہ ڈھکا ہے مگر آبادی کم ہے۔ آبادی کا دباؤ پہاڑوں میں سب سے زیادہ ہے مگر یہ اسی وقت جبکہ صرف قابلِ کاشت رقبے کو سامنے رکھا جائے۔ پہاڑیوں میں اراضی پر بڑھتی ہوئی آبادی کے ثبوت میں یہ بھی پیش کیا جا سکتا ہے کہ جنگلات سے ڈھکے ڈھلواں اور غیر پیداوار ڈھلوان کو بھی عوام الناس نے نہیں چھوڑا۔ پہاڑوں میں بڑھتی ہوئی انسانی آبادی جھم کے طریقِ کاشت کو اپنا رہی ہے۔

زراعت اور جنگلات کے درمیان حدِ فاصل قائم کرنا دشوار ہے۔ زیرِ کاشت رقبے کا ایک یونٹ (اکائی) جنگلاتی رودست سات گنا چاہتا ہے جو کہ آبادی کے لیے بے حد ضروری ہے۔ مغربی گھاٹ کے حوالے سے یہ اندازہ لگایا گیا تھا کہ ۵۰ سال پہلے چائے کے باغات کی ایک ایکڑ اراضی پر ۹ ایکڑ جنگلات چاہئیں تاکہ مطلوبہ چھاؤں اور سایہ انھیں مل سکے۔ مٹی کو ہری کھاد اور نمی بھی ان سے ملتی ہے۔ چنانچہ ایسے پیڑ لگانے کی ضرورت محسوس کی گئی ہے، جن سے مذکورہ مقاصد بخوبی پورے ہو سکیں۔

دیگر شعبوں میں جنگلات سے تجارتی پیمانے پر استفادے نے پہاڑی علاقوں میں بسنے والی آبادی اور جنگل کے ذمہ داروں کے درمیان تنازعہ کی صورت پیدا کر دی ہے۔ اراضی کی منصوبہ بندی کا مقصد یہ ہے کہ خوراک، چارہ، ایندھن کی لکڑی، ہری کھاد حاصل کرنے کی غرض سے درخت لگائے جائیں۔ اس طرح عوام اور جنگلات کے ذمہ داروں کے درمیان تنازعے کی صورت پیدا ہو گئی ہے۔ اس صورتِ حال کو بدلنے کی ضرورت ہے۔

چراگاہوں کی ترقی

چراگاہوں کی ترقی پر بھی زور دیا جانا ضروری ہے۔ بلند مقامات پر جہاں کی آب و ہوا درختوں کے پھلنے پھولنے میں معاون نہیں ہے، وہاں چراگاہوں کے فروغ پر دھیان دیا جانا ضروری ہے۔ اور وہاں مویشی پروری کے دھندے کو آگے بڑھانا چاہیئے۔ معیشت دراصل بڑی حد تک مویشیوں پر انحصار رکھتی ہے کیونکہ ان سے ہمیں خوراک، اُون، دودھ اور نقل و حمل کے ذرائع ملتے ہیں۔ بیاس اور ڈرما کی وادیوں کے بالائی قطعات پر بسنے والے لوگوں کے لیے جہاں کہ بھارت، چین اور نیپال کی سرحدیں ملتی ہیں، پچھلے بیس برسوں میں سب سے اچھا منصوبہ یاک اور گائے کی مخلوط نسل کی افزائش والا رہا ہے۔ ان کی وجہ سے ایسے اسٹارک (ملق تق) نسل کے یاک مل سکے جو مال برداری اور سامان کو ڈھونے کے لیے بے حد کارآمد رہے۔ گدھوں اور خچروں کے اختلاط سے ملنے والی خچروں کی نسل بھی مال برداری کے لیے بے حد مفید رہتی ہے۔ یہ مویشی مال کی ڈھلائی میں معاون ہوتے ہیں اور ان سے روزی روٹی کا وسیلہ ملتا ہے۔

اُتر پردیش میں اُتر کاشی نیز ہماچل پردیش کے بالائی حصہ میں بھیڑوں کی پرورش بھی نفع بخش روزگار کا وسیلہ رہا ہے۔ ان کے سامنے زیادہ بڑا مسئلہ یہی رہا ہے کہ پہاڑ کے دامن میں سردیوں کے موسم میں چراگاہوں کی کمی محسوس ہوتی ہے۔ ترائی اور بھابر کی چراگاہیں کم ہوتی جا رہی ہیں کیونکہ وہاں کی زمین پر کھیتی باڑی کی جانے لگی۔ چنانچہ ایسی گھاس اگانے پر زور دیا جانا چاہیئے جو خشک چارے کے طور پر موسم سرما میں کام آ سکے۔ سطحِ سمندر سے ایک ہزار اور دو ہزار میٹر بلند مستقل آبادیوں میں چارے کی کمی کی زبردست شکایت ہے۔ یہ وہ خطہ ہے جہاں کی آبادی گھنی ہے لیکن خاص قسم کے صنوبر اور اشناس کے جنگلات کی کثرت نے چارے کی کمی کا مسئلہ سامنے لا کھڑا کیا ہے۔ اس خطے میں تغذیہ بخش چارے کی افزائش پر دھیان دینا ضروری ہے۔ یہ کام بڑے پیمانے پر ہونا چاہیئے۔ ہماچل پردیش میں چمبا ضلع کی تحصیل بھٹیات کے عوام نے صنوبر کے درختوں کو اکھاڑ پھینکا ہے اور ان کی جگہ ایسے درخت لگائے ہیں جن سے چارہ مل سکے۔ اب تک تو صرف خالی پڑی زمینوں اور بنجر زمینوں پر جنگلات لگانے کے کام کو تیز کیا جا رہا ہے لیکن یہ کام تمام علاقوں میں بشمول اُن علاقوں کے جو کہ جنگلات سے بھرپور ہیں، کیا جانا چاہیئے۔ جنگلات کسی ایک طرز اور کسی ایک ہی قسم کے درختوں سے بھرپور نہیں ہونے چاہئیں بلکہ وہاں پر مختلف طرح کے ملے جلے درخت ہونے چاہئیں۔ اس سے ماحول کو صاف ستھرا رکھنے میں مدد ملے گی اور جنگلات میں آگ لگنے کے واقعات میں کمی آ سکے گی۔

ایندھن کی لکڑی کی بہتات اور افزائش کے لیے بھی کام ہونا چاہیئے۔ ایسے درخت اُگانا ضروری ہیں جنھیں کاٹ لیا جائے تو ان کی جگہ جلد سے جلد دوسرے درخت اُگائے جا سکیں۔ اس سلسلے کی ایک خاص قسم ہتب (Hatab) ہے۔ یہ درخت کشمیر میں ہوتا ہے۔ اسے کاٹ لیا جائے تو اس کی جگہ دوسرا درخت فوراً ہی ہو جاتا ہے لیکن اسے خود رو پودا سمجھ کر اس کی بیخ کنی کی گئی اور اب اس کی تعداد گھٹتی جا رہی ہے۔ ایندھن کی لکڑی کی دستیابی سے انرجی کا بحران دور ہو سکے گا۔ پہاڑی علاقوں میں افرادی قوت اور مویشیوں کی تعداد وہاں کی معیشت بنانے میں بے حد اہم رول ادا کرتی ہے۔ اس لیے تغذیہ بخش غذا دینے والے

درخت لگا کر ان ہی کا تحفظ کیا جانا چاہیئے۔ اس طرح مویشیوں کے لیے تغذیہ بخش چارے کی افزائش بے حد اہم ہے۔ جنگلات سے ہریالی تو ملتی ہی ہے مگر اس سے کھاد بھی ملتی ہے۔ پہاڑی علاقوں میں کیمیاوی کھادوں کا استعمال مفید نہیں رہا کیوں کہ وہاں کی مٹی اسے قبول نہیں کرتی۔ دوسرے وہاں آب رسانی کی سہولتیں بھی کم ہوتی ہیں کیمیاوی کھادوں نے تو وہاں نقصان پہونچایا ہے۔ اس لیے نامیاتی کھادوں کی وہاں بڑی اہمیت ہے۔ یہ پتیوں اور مویشیوں کے گوبر سے بنتی ہے۔ جن اقسام کو تجارتی جنگل بانی کی راہ میں حائل سمجھا جاتا ہے اور جنھیں بے کار سمجھ کر اکھاڑ دیا جاتا ہے، وہی کمپوسٹ کھاد کی تیاری میں بے حد مددگار ثابت ہوتی ہیں۔ جنگلات سے صنعتوں کے لیے ریشہ ملتا ہے۔ گھریلو صنعتوں کے لیے کچا مال ملتا ہے۔ کتائی بُنائی اور رسی بٹنا وغیرہ دھندے جنگلات کی دولت پر ہی منحصر ہیں۔ پہاڑی علاقوں میں ایسی صنعتوں کی گنجائش نہیں جن پر وسائل زیادہ سے زیادہ خرچ کئے جائیں مگر وہاں کے عوام اُن سے بڑے پیمانے پر فائدہ نہ اٹھا سکیں۔ وہاں کی معیشت کو پھولوں، پھلوں، پتیوں، بے کار ہوئی لکڑیوں وغیرہ پر منحصر ہونا چاہیئے۔ اخروٹ، شہتوت اور توبانی وغیرہ صنعتوں کے لیے اچھا کام مال فراہم کرتی ہیں۔ شہد کی مکھیوں کے من پسند کئی درخت ہیں۔ ان درختوں سے شہد کی مکھیوں کے لیے نفع بخش خوراک ملتی ہے۔

پچھلے برسوں میں منصوبہ بند ترقی میں آرام ملوں کو لگانے کی حوصلہ افزائی کی گئی، لہٰذا ہمالیائی خطے میں بہت سے آرا مل ہو گئے اور وہ کشمیر سے کوہیما تک پھیلے پڑے ہیں۔ ان سے شدید نقصان پہونچ رہا ہے۔ پہاڑیوں پر جنگلات ایسے دو وسائل ہیں جن سے نہ صرف لکڑی ملتی ہے بلکہ مٹی کے کٹاؤ سے روکنے کے اور پانی کے بہاؤ کو متوازن بنانے میں مدد ملتی ہے۔ پہاڑی علاقوں پر چیڑ کے جنگلات صرف ۱۱۹ ٹن ہیکٹر بائیوماس دیتے ہیں جب کہ چلے جلے بلوط کے جنگلات سے ۸۶،۶ ٹن فی ہیکٹر بائیوماس ملتا ہے۔ دریاؤں میں پانی کے بہاؤ کو روکنے اور سیلابوں سے زمین کو بچانا بھی بہت ضروری ہے۔ عظیم ہمالیہ کے گلیشیروں میں بڑے بڑے دریاؤں کے ماخذ واقع ہیں، لیکن زیادہ پانی والے دریا جن سے کہ سیلاب آتا ہے، وسط ہمالیہ کے جنگلاتی رقبے میں ہیں۔ وسط ہمالیہ میں پنڈاری اور گومکھ کے گلیشیر ہر سال بالترتیب ۱۳ میٹر اور ۱۸ میٹر کم ہو رہے ہیں۔ اس کا سبب فضا کی درجۂ حرارت میں بتدریج اضافہ ہے اور جو کہ جنگلات کی کمی کا براہِ راست نتیجہ ہے۔ ان میں دریاؤں میں پانی کے بہاؤ کا تناسب خشک موسم اور موسم برسات میں ایک سے ۶۰ تک کے درمیان گھٹتا بڑھتا رہتا ہے جبکہ بھوٹان میں جہاں کہ ابھی تک جنگلات کافی ہیں یہ صرف ایک تا ۶ کے درمیان رہتا ہے۔ اس اُتار چڑھاؤ کا اثر بجلی کی تیاری پر پڑتا ہے اور بجلی کی فراہمی میں خلل واقع ہوتا رہتا ہے۔ یعنی بجلی کا مستقبل تابناک ہے اور ملک کو اس سے بڑی اُمیدیں وابستہ ہیں۔ اس کے لیے ہمالیائی خاص کے علاقے ہریالی چاہتے ہیں۔ اراولی، ست پڑہ، وندھیاچل اور مشرقی اور مغربی گھاٹ کے پہاڑوں کے لیے بھی یہی بات صادق آتی ہے۔ ہائیڈرو الیکٹرک پراجیکٹ دریائی پانی کو روک کر عملی جامہ پہنتے ہیں۔ مگر یہ سلسلہ ختم ہونا چاہیئے اور اس کی جگہ پانی کے بڑے بڑے ذخیرے بنائے جانے چاہئیں۔ پانی کے شعبے کے ماہرین اس نتیجے پر پہونچے ہیں کہ ماحول کے تحفظ کے لیے اور دریاؤں کے پانی کی صفائی کے لیے پانی کے قدرتی بہاؤ کو روکنا مناسب نہیں۔ آبادی میں اضافے کے ساتھ ساتھ صاف پانی کی ضرورت بڑھ رہی ہے اور صنعت کاری کے فروغ نے پانی کی صفائی کی ضرورت واضح کر دی ہے۔ صنعتی طور پر ترقی یافتہ ملکوں میں ان مسائل کا سامنا ہے۔ امریکہ کے سائنسداں اس نتیجے پر پہونچے ہیں کہ ۲۰۰۰ء تک صاف پانی کی فراہمی ہر روز مشکل سے ۲۰ تا ۳۰ منٹ ہو سکے گی۔ لیکن ایسا کوئی تکنیکی عمل نہیں جس سے پانی کو مختصر سے وقت میں صاف کیا جا سکے۔

مقامی ترقی کے نقطۂ نظر سے پانی کے وسیلوں کا تحفظ ضروری ہے۔ بہت سے گاؤں میں پینے کا پانی کا مسئلہ ہے۔ پینے کے صاف پانی کی فراہمی کی اسکیمیں کامیاب نہیں کیوں کہ آبی وسائل کچھ دنوں میں سوکھ جاتے۔ اس لیے موسم بہار میں پانی کی فراہمی کو یقینی بنانے پر زور ہے اس کے لیے جنگلات میں اضافہ ضروری ہے۔ ابھی تک پانی سے چن بجلی کی تیاری پر ہی زور دیا جاتا رہا ہے۔ ان بڑے پراجیکٹوں سے مقامی ضرورتیں بھی پوری کی جا رہی ہیں۔ ہماچل پردیش میں یہ صورتِ حال بخوبی واضح ہوتی ہے۔

سنٹرل گرڈ نظام سے بجلی کے انتظامیہ کے اخراجات بڑھ جاتے ہیں اور ترسیل میں کافی بجلی ضائع ہونے لگتی ہے۔ بجلی کے نظام میں خلل واقع ہونے کے بعد اس کی بحالی میں کافی وقت لگتا ہے۔ بہتے دریاؤں پر کثیر المقاصد اجتماعی یا ہائیڈرو الیکٹرک پاور ہاؤسس کی تعمیر کی حوصلہ افزائی کی جانی چاہیئے۔ اسی سے دھان کوٹنے آٹے کی چکی چلانے، تیل نکالنے، گھروں کو روشن کرنے اور گرم رکھنے کے لیے بجلی فراہم کی جا سکتی ہے۔ اگر بجلی کی تیاری زیادہ ہونے لگے تو پانی کو آب رسانی کی غرض سے اوپر اٹھا کر پھینکنے کا کام لیا جانا چاہیئے۔ اسی طرح بڑے بجلی پراجیکٹوں پر زیادہ دباؤ نہ رہے گا اور شہری ضرورتوں کو بڑی حد تک انھیں پراجیکٹوں سے پورا کر لیا جائے گا۔

اب تک جن پنجسالہ منصوبوں کو عملی جامہ پہنایا گیا ہے، یا سڑکیں تعمیر کی گئی ہیں یا اسکول کھولے گئے ہیں، ان سب سے عورت کی زندگی پر خراب اثر پڑا ہے۔ ان سے گھر میں کام کا بوجھ بڑھ گیا ہے۔ روپے پیسے کی بڑھتی ہوئی مانگ نے ہر شخص کو روزگار کی تلاش میں لگا دیا ہے۔

اس کی تعمیر سے بچے پہاڑی علاقوں کی محنت کے لیے غیر موزوں ہو جاتے ہیں۔ اس طرح سے عورت کا گھر کا کام کاج کرتی ہے، گھر پر بوڑھوں کی دیکھ بھال کرتی ہے۔ کھیتی باڑی کا کام کرتی ہے، مویشیوں کی خدمت کرتی ہے، چارہ لاتی ہے، ایندھن لاتی ہے، پانی لاتی ہے، گھٹی کاٹتی ہے، دھان کوٹتی ہے۔ اس لیے اگر یہ سب کام مشینوں سے ہونے لگے تو عورت کو راحت ملے گی۔ عورتوں کے مشورے سے ہی ترقیاتی منصوبہ سود مند ہوگا۔ مقامی روایات کو اب تک جس طرح نظر انداز کیا گیا ہے وہ ترقیاتی پلان کی سب سے بڑی کمی ہے۔ مقامی ہنرمندی اور دیہی ترقی کے ایسے پلان جو عورتوں نے وضع کیے ہوں، کامیاب ہو سکتے ہیں۔

اس منصوبہ بند ترقی کا مقصد یہ ہے کہ عوام میں خود اعتمادی پیدا ہو اور وہ اپنی ضرورتوں کے خود کفیل ہوں۔

بقیہ :- ہندوستان میں مچھلیوں کی پیداوار

پیدا کی جاتی ہیں۔ سمندری مچھلیوں میں سالمن، میکرے، شارک، سارڈین، ہیرنگ، اکابی، پران، شیڈ جانبا، سلورفش، کیٹ فش وغیرہ خاص ہیں۔

مگر کچھ دنوں سے پانی کی آلودگی بڑھتی جا رہی ہے سمندروں میں پانی جہاز وغیرہ کے چلنے سے، تالابوں میں کپڑے دھونے اور نہانے سے، نیز ندیوں میں کارخانوں سے نکلے ہوئے کثیف اجزا پانی کی آلودگی میں معاون ہیں۔ بیشتر غلاظت ندیوں میں بہا دی جاتی ہے۔ جس کے باعث ندیوں میں کیچڑ پیدا ہو جاتی ہے۔ پانی کا بہاؤ رک جاتا ہے اور ایک طرح کا ہرے رنگ کا پودا پیدا ہوتا ہے جو رفتہ رفتہ پورے تالاب یا ندی کے بیشتر حصے پر پھیل جاتا ہے۔ یہ پانی سے آکسیجن ختم کر دیتے ہیں کیونکہ خود تو پانی کا آکسیجن لیتے ہیں ساتھ ہی ساتھ سلفر کاربن ڈائی آکسائیڈ پیدا کرتے ہیں۔ جس سے مچھلی کی پیداوار کو کافی حد تک اثر انداز کرتے ہیں اسی طریقے سے خلیج ہند میں عراقی حملے کے ذریعے ایرانی تیل کے کنوؤں

[illegible]

کو نقصان پہنچا ہے۔ جس کے باعث روزانہ ...۲۰۰ سے ... گیلن تیل بہہ رہا ہے۔ جس سے پانی میں رہنے والے جاندار بالخصوص مچھلیوں کو کافی حد تک نقصان پہنچ رہا ہے۔ مچھلی کی اہمیت انسانی زندگی میں بہت ہے کیونکہ جاپان میں تقریباً ۱۰ لاکھ افراد اسی دھندے سے صرف اپنی زندگی ہی نہیں بسر کر رہے ہیں، بلکہ اس کی تجارت سے کافی امیر ہو گئے ہیں۔ مچھلیاں بھی جلد نہیں سڑتی اس لیے اس کے تیل اور اس کی درآمد و برآمد سے لوگوں نے اپنی معاشی حالت سدھاری ہے اور ان کا معیار زندگی بلند ہوا ہے۔ جاپان میں آئسٹر مچھلی کو پال کر اس کے اندر بالو کے ذرات ڈالتے ہیں۔ اور موتی تیار کرتے ہیں۔ اس لیے اگر ہمارے ملاحوں کو بھی کولڈ اسٹوریج، ہاربر پورٹ اور برآمد کرنے کی مزید سہولیات مہیا کی گئیں تو وہ کافی تعداد میں مچھلی حاصل کریں گے۔

بقیہ : اداریہ

روس و ہند مشترکہ خلائی پرواز کی تجویز پہلی بار دسمبر ۱۹۸۰ء میں روس کے صدر مسٹر لیونڈ بریژنیف نے رکھی تھی۔ اب تقریباً تین سال بعد اسی تجویز کو عملی شکل میں دیکھا جا رہا ہے یوں تو خلائی تحقیق میں ہندوستانی سائنس دانوں نے مختلف ملکوں کا تعاون حاصل کیا ہے مگر اس سلسلے کا خاص تعاون روس سے مل سکا ہے۔ اس موقع پر یاد آتا ہے کہ کیرالہ کے مقام تھمبا سے راکٹ کی پرواز کے لیے کچھ ضروری سامان روس سے ہی آیا تھا۔ اس کے بعد سے اب تک تھمبا سے ۱۵ سو راکٹ داغے جا چکے ہیں۔ ہندوستان کا پہلا مصنوعی سیارہ آریہ بھٹ ۱۹ اپریل ۱۹۷۵ء کو روس سے ہی چھوڑا گیا تھا۔ زمین کے حالات کا جائزہ لینے کے لیے پہلا ہندوستانی سیارہ بھاسکر اول اور اس کے بعد بھاسکر دوم بھی روسی راکٹوں کے ذریعے سے ہی خلا میں بھیجے گئے۔ آریہ بھٹ اور بھاسکر کے نام پانچویں اور چھٹی صدی کے دو عالموں کے نام پر رکھے گئے جو علم ریاضی و فلکیات پر عبور رکھتے تھے انسیٹ ون بی، امریکی خلائی گاڑی چیلنجر کی مدد سے داغا گیا ۱۱ فروری ۱۹۸۴ء کو وزیر اعظم محترمہ اندرا گاندھی نے انسیٹ ون بی کو پُرامن مقاصد کے لیے قوم کو سونپ دیا۔ یہ مواصلاتی سیٹلائٹ ۱۵ اکتوبر ۱۹۸۳ء سے خلا میں کام کر رہا ہے۔

ہندوستان میں خلائی تحقیق کی خاص بات ہے کہ اس کو امن پسند اغراض و مقاصد کے تحت فروغ دیا جا رہا ہے۔

راکیش شرما کو خلا میں جانے سے پیشتر بہت سخت ترین آزمائشوں سے گزرنا پڑا تھا مگر پروگرام کے مطابق ۱۱ اپریل کی شام کو ان کی بخیریت واپسی نے ان کی اعلیٰ صلاحیتوں کا لوہا منوا لیا ہے۔ خلا میں ایک ہفتے صبر آزما قیام کے دوران انھوں نے ہمالیہ کے دشوار گزار علاقوں اور بحرِ ہند کے بہت سے خطوں کی جدید طرز کیمرے سے جو تصاویر لی ہیں، ان سے برف کے پگھلنے کی رفتار، آبی وسائل اور جنگلات کے بارے میں مفید معلومات دستیاب ہو سکیں گی۔ اس سفر کے دوران انسانی جسم اور ذہن پر پڑنے والے اثرات کا مطالعہ بھی کیا جائے اور خلائی بیماریوں کی روک تھام میں یوگ کی مشقوں کی [illegible] کا اندازہ لگایا جائے گا ——— خلا میں ایک ہفتہ قیام کے دوران مسٹر شرما نے بائیو میڈیکل اور مادی سائنس پر تجربے کیے، تصاویر لیں جن سے زمینی اور سمندری وسائل کے بارے میں مفید معلومات مل سکیں گی۔ مرکب دھاتوں پر [illegible] والے اثرات، خلا میں بیماریوں کو دور رکھنے میں یوگ کی مشق کی افادیت اور توہمات اور اندھی تقلید پر مبنی بہت مفروضات کی حقیقت سامنے آ سکے گی۔ پروگرام کے مطابق اسکواڈرن لیڈر مسٹر راکیش شرما [illegible] مئی کو ہندوستان لوٹیں گے جہاں ان کا شاندار خیر مقدم کیا جائے گا۔

صدر جمہوریہ ہند گیانی ذیل سنگھ نے سویوز کے خلا بازوں کو اشوک چکر اور ونگ کمانڈر روینش ملہوترہ کو جو کہ سویوز ٹی کے عملے میں شریک ضرور تھے مگر خلا میں نہیں جا سکے تھے، کیرتی چکر دیا ہے۔ روس کی حکومت نے شری راکیش شرما کو ہیرو آف سوویت یونین کا خطاب اور گولڈ اسٹار میڈل اس کے ساتھ ملتا ہے، دیا ہے اس کے علاوہ شری شرما کو آرڈر آف لینن ایوارڈ بھی دیا گیا ہے۔ (ایڈیٹر)

ڈاکٹر اقبال محی الدین

انٹارکٹیکا کے برفیلے ویرانے میں
تیسری ہندوستانی سائنسی مہم

سائنسی ترقی کی اس سے بہتر مثال نہیں ہو سکتی کہ آپ جب چاہیں ۱۸۶ نمبر اپنے ٹیلی فون پر ڈائل کر کے تیسری ہندوستانی سائنسی مہم کے ممبران سے انٹارکٹیکا میں رابطہ قائم کر سکتے ہیں۔ یہ تیسری سائنسی مہم ۲۷ر دسمبر ۱۹۸۳ کو انٹارکٹیکا کے برفیلے ویرانے میں پہونچی تھی۔ اس سے قبل دو اور ہندوستانی سائنسی مہمیں وہاں پہونچ کر اپنے جھنڈے گاڑ چکی تھیں۔

پہلی ہندوستانی سائنسی مہم ۹ر جنوری ۱۹۸۲ء کو انٹارکٹیکا پہونچی تھی۔ اس مہم کے سربراہ ڈاکٹر سید ظہور قاسم صاحب تھے جو حکومتِ ہند کے شعبہ بحری ترقیات کے سکریٹری ہیں۔ اس پہلی سائنسی مہم نے دکھن گنگوتری پر اپنی سائنسی تجربہ گاہ قائم کی تھی۔ یہ مہم انٹارکٹیکا میں دس روز تک رہ کر واپس ہندوستان آگئی تھی۔ اس مہم کا سب سے بڑا مقصد یہ تھا کہ انٹارکٹیکا پہونچ کر سائنسی تجربہ کی دنیا میں پہل کی جائے اور آنے والی نسلوں کے لیے وہاں جانے کی راہ ہموار کی جائے اور دنیا کے دوسرے ممالک کے ساتھ سائنسی اور علمی تجربات میں شانہ بشانہ ساتھ دیا جائے۔ بہت حد تک یہ مہم اپنے مقصد میں کامیاب رہی۔ جو کام ان لوگوں نے وہاں شروع کیا تھا دوسری سائنسی مہمیں اُن کو پورا کرتی رہیں گی۔

دوسری ہندوستانی سائنسی مہم ڈاکٹر وی کے رینا (ڈائرکٹر جیولوجیکل سروے آف انڈیا) کی سربراہی میں ۲۸ر دسمبر ۱۹۸۲ء کو انٹارکٹیکا پہونچی۔ اور وہاں دو ماہ تک رہی۔ پہلی مہم نے جو سامانات اور سائنسی آلات وہاں چھوڑ دیے تھے وہ مکمل طور پر کام کر رہے تھے جس کا دوسری مہم نے پورا فائدہ اُٹھایا۔

دوسری ہندوستانی سائنسی مہم کا مقصد یہ تھا کہ لوگوں کو زیادہ دنوں تک برفیلے ریگستان میں رکھ کر اُن پر وہاں کی فضا کا ردِ عمل دیکھا جائے۔ اس مہم میں ۲۸ ممبران تھے۔ پہلی سائنسی مہم نے انٹارکٹیکا میں جو کام شروع کیا تھا، دوسری مہم نے اُس کو ایک ٹھوس شکل دے دی۔

تیسری سائنسی مہم جب انٹارکٹیکا پہونچی تو اس نے سب سے پہلے دکھن گنگوتری میں اپنے خیمے لگانے شروع کئے۔ یہ جگہ پہلی ہندوستانی سائنسی مہم نے چُنی تھی۔ اس تیسری مہم کے سربراہ ڈاکٹر ایچ۔ کے۔ گپتا نے وہاں سے شعبہ بحری ترقیات کو یہ رپورٹ دی کہ انٹارکٹیکا میں موسم گرما اور برف کی کیفیت بہت اچھی ہے۔

ہندوستان کی تیسری سائنسی مہم ۲۴ روز میں انٹارکٹیکا پہونچی۔ فن پولیرس نامی برف توڑنے والے جہاز سے اس مہم نے یہ سفر طے کیا تھا۔ پہلی مہم نے جو خیمے اور ہٹ نصب کئے تھے اُن کو تلاش کرنے میں اس مہم کو کوئی دُشواری نہیں ہوئی۔ دوسری سائنسی مہم نے وہاں کے جغرافیائی حالات کی ضرورتوں کو پورا کرنے والے پہلے سے بنائے گئے جو خیمے ۱۹۸۳ میں نصب کئے تھے وہ بالکل اُسی حالت میں موجود تھے جیسے انھیں رکھ کر چھوڑ دیا گیا تھا۔

فن پولیرس نامی جہاز سے سامان کیمپ تک لے جانے میں ۴ ہیلی کوپٹروں کا استعمال کیا گیا۔ سب سے پہلے کیمپ نصب کئے گئے تاکہ رہنے اور سامان کو رکھنے میں آسانی ہو۔ ۲۷ر دسمبر ۱۹۸۳ء کو ہی یہ سارے کیمپ نصب کر دئے گئے اور سامان اُن میں رکھا جانے لگا۔

پہلی سائنسی مہم نے ہندوستان سے انٹارکٹیکا تک پہونچنے میں ۴۳ دن کا وقت لیا تھا۔ دوسری مہم نے ۲۷ دن اور تیسری مہم صرف ۲۴ دن میں وہاں پہونچ گئی تھی۔ پہلی مہم برفیلے ریگستان پہ دس روز تک ہی رہی۔ جبکہ دوسری مہم ۵۶ روز تک وہاں رہی۔ تیسری مہم ۷۰ روز تک انٹارکٹیکا میں رکی۔ اس سائنسی مہم کے ۱۲ ممبران مزید ۹ ماہ تک

لے ڈاکٹر اقبال محی الدین نے "انٹارکٹیکا سے متعلق چند دلچسپ حقائق۔ ڈاکٹر سید ظہور قاسم صاحب کے تاثرات" یوجنا (اُردو) ۱۶ تا ۲۸ فروری ۱۹۸۲ (پہلی ہندوستانی سائنسی مہم) کے بارے میں تفصیل سے لکھا ہے براہ کرم ملاحظہ فرمایئے۔

لہ ڈاکٹر اقبال محی الدین نے "انٹارکٹیکا سے متعلق چند دلچسپ حقائق۔ دوسری سائنسی مہم کے تاثرات" یوجنا (اُردو) یکم تا ۱۵ جولائی ۱۹۸۳ء کے شمارے میں لکھا ہے۔ براہِ کرم ملاحظہ فرمایئے

انٹارکٹیکا کے برفیلے ویرانے میں قیام پذیر ہوکر سائنسی تجربات کرتے رہیں گے اور بقیہ ممبران مہم ۱۹ مارچ ۱۹۸۴ کو ڈاکٹر ایچ ۔ کے ۔ گپتا کی سربراہی میں ہندوستان واپس آگئے۔

یہ چھوٹی ٹیم نائب سربراہ مہم لیفٹیننٹ کرنل ایس ایس شرما کے زیر قیادت وہاں رُکی ہے اور سخت ترین سردیوں میں کام کرتی رہے گی اور سائنسی اعداد و شماریات جمع کرتی رہے گی ۔ انٹارکٹیکا کی سردیاں بہت شدید ہوتی ہیں۔ درجۂ حرارت صفر درجہ سے بہت زیادہ نیچے رہتا ہے اور برفانی ہواؤں کا جھکڑ ۲۰۰ کلومیٹر فی گھنٹہ کے حساب سے چلتا رہتا ہے۔ ہر طرف تاریکی ہی تاریکی ہوتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے پورے انٹارکٹیکا نے تاریکی کا ٹھنڈا لبادہ اوڑھ لیا ہے۔ ایسی حالت میں وہاں پورے ۹ ماہ تک رہنا اور سائنسی تجربات کرتے رہنا واقعی اس تیسری سائنسی مہم کے ۱۲ سے ۱۶ ممبران کے لیے زبردست کارنامہ ہوگا۔

ہندوستان کی تیسری سائنسی مہم اپنے ساتھ Prefabricated ڈھانچوں کا اسٹیشن انٹارکٹیکا لے گئی تھی جس میں ساری ٹیم کے لوگ رہے تھے۔ اس میں جینریٹر کے ذریعے بجلی اور گرمی کا انتظام کیا تھا۔ تاکہ مہم کے ارکان بہت آرام کے ساتھ اس میں رہ کر اپنے سائنسی تجربات کر سکیں۔ بجلی، روشنی اور گرمی کے لیے یہ مہم اپنے ساتھ ۴ لاکھ کلو لیٹر ڈیزل آئل وہاں لے گئی تھی۔

جب تک تیسری سائنسی مہم انٹارکٹیکا کے برفیلے ویرانے میں رہے گی وہ دہلی کے کنٹرول روم سے مستقل آواز اور ویڈیو چینل کے ذریعے رابطہ قائم رکھے گی۔

ہندوستان کی مستقل سائنسی تجربہ گاہ انٹارکٹیکا پر قائم کرنے کے لیے تیسری مہم نے کام شروع کر دیا تھا تجربہ گاہوں کی عمارات کو وہ Prefabricated مواد سے تیار کر چکے ہیں۔ اب جبکہ یہ مستقل سائنسی تجربہ گاہ وہاں بن کر تیار ہو جاتی ہے تو ہندوستان کے کچھ سائنسداں وہاں پر مستقل طور پر رہ کر تجربات کرتے رہیں گے۔ اس طرح ہندوستان دُنیا کے دُوسرے ممالک مثلاً امریکہ، روس، جاپان، آسٹریلیا وغیرہ کے ساتھ انٹارکٹیکا میں مستقل طور پر اپنا قیام کرے گا۔

۸۰ ممبران پر مشتمل ہندوستان کی تیسری سائنسی مہم ۳ ردسمبر ۱۹۸۳ء کو گوا سے روانہ ہوکر ۲۷ ردسمبر ۱۹۸۳ کو ڈھائی بجے صبح انٹارکٹیکا پر پہونچی ممبران مہم میں دو عورتیں بھی ہیں جو سائنس داں ہیں جن کو چیتک ہیلی کوپٹر کے ذریعے فن پولیری جہاز سے دکھن گنگوتری کے کیمپ تک پہونچایا گیا۔ اس برف توڑنے والے جہاز نے صرف ماریشس میں رُک کر پٹرول لیا تھا۔

تیسری سائنسی مہم انٹارکٹیکا میں اپنے تجربات جیولوجی۔ جیوفزکس، بائیولوجی، میٹرولوجی اور اوشنوگرافی کے میدان میں کرتی رہی۔ سائنس دانوں کی مدد کے لیے دو ڈبل ڈوزر اور اسنو اسکوٹر کام میں لائے گئے۔ لیفٹیننٹ کرنل ایس ۔ ایس ۔ شرما جاڑے میں رُکنے والی پارٹی کے اسٹیشن کمانڈر ہیں — اس پارٹی کے ممبران چوتھے سائنسی مہم کے ممبران کے ساتھ واپس ہندوستان آئیں گے ۔ یہ چوتھی مہم مارچ ۱۹۸۵ میں انٹارکٹیکا سے واپس ہوگی۔

حالاں کہ تیسری سائنسی مہم اپنے ساتھ بہت عمدہ قسم کے ٹینٹ (خیمے) جو سردیوں اور ہواؤں کی تیزی کو روکنے کے لیے بہت مضبوطی سے بنائے گئے تھے، انٹارکٹیکا لے گئی تھی مگر احتیاط کے طور پر ایسے گول پیپے بھی وہ لوگ اپنے ساتھ لے گئے تھے جن میں بجلی کے ذریعے بہت آرام دہ گرمی مُہیا کی گئی تھی تاکہ وہ لوگ ان گول پیپوں میں رہ سکیں اور سردی سے دوہری حفاظت اُن کو ملتی رہے۔

گول پیپے (Containers) ڈیفنس ریسرچ اور ڈیولپمنٹ آرگنائزیشن نے خاص طور پر اس مقصد کے لیے تیار کر کے تیسری مہم کو دیئے تھے۔ تیسری انٹارکٹیکا مہم نے اپنا بیس کیمپ (Base Came) دکھن گنگوتری میں تیار کر لیا ہے۔ ہیلی کوپٹروں کے ذریعے فن پولیرس جہاز سے سائنسی سازو سامان کو بیس کیمپ پہنچانے کا کام بھی مکمل ہو چکا ہے۔ سائنس داں انٹارکٹیکا کی تین ماہ کی گرمیاں وہاں گزار کر سائنسی تجربات کرتے رہے ۔ جہاز جہاں لنگر انداز ہوا تھا وہاں سے بیس کیمپ تک نئی سڑک کی تعمیر بھی ہو چکی ہے جس پر اسنو اسکوٹر کے ذریعے آمدورفت جاری ہو گئی ہے۔

حکومت ہند کے شعبۂ بحری ترقیات کے سکریٹری ڈاکٹر ظہور قاسم صاحب کا کہنا ہے کہ ہندوستان جلد ہی انٹارکٹیکا سے کرل مچھلی پکڑ کر یہاں بھیجے گا۔ انٹارکٹک اوشن سے اگست کے مہینے سے کرل کو حاصل کرنے کا کام شروع کر دیا جائے گا۔ یہ انٹارکٹیکا کے سمندر کی بہت بڑی دولت ہے جس سے ہندوستان کو مستقبل میں فائدہ پہونچتا رہے گا۔ کرل مچھلی کو پکڑنے کے لیے ہندوستان ڈنمارک سے برف توڑنے کا مضبوط جہاز حاصل کرے گا جس کی قیمت ۱۵ کروڑ روپے ہوگی۔

کوچین میں تجربات شروع کئے جا چکے ہیں کہ انٹارکٹیکا سے پکڑی ہوئی کرل مچھلی کو انسانی استعمال کے لیے کیسے موزوں بنایا جائے ۔ جس طرح گوشت، لوبسٹر، شرمپ وغیرہ میں پروٹین پایا جاتا ہے، اسی طرح کرل مچھلی میں بھی ۱۵ فیصد پروٹین کی مقدار ہوتی ہے۔ انٹارکٹیکا سے ۷۰ ملین ٹن کرل مچھلی ہر سال پکڑی جائے گی جس سے تقریباً چوتھائی انسانی آبادی کو ہر روز ۲۰ گرام پروٹین مل سکتی ہے۔

ہندوستان کی تیسری سائنسی مہم نے اپنے بیس کیمپ کے پاس اپنا پہلا Satellite ommunication Terminal قائم کر دیا ہے۔ جس کے ذریعے ہندوستان سے رابطہ قائم کیا جا سکتا ہے۔ اب تک فن پولیرس نامی جہاز سے ہی ہندوستان سے رابطہ قائم کیا جاتا تھا لہٰذا اب دو Communication Terminals قائم ہو گئے ہیں جن سے دہلی میں واقع شعبہ بحری ترقیات سے سیٹلائٹ کے ذریعہ رابطہ قائم ہو سکتا ہے۔

بیس کیمپ پر ایک ہیلی پیڈ بھی تیار کرلیا گیا ہے۔ جس پر سے کسی بھی موسم میں ہیلی کوپٹروں کو اُتارا یا اُتارا جاسکتا ہے۔ یہ آسانی سے ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنے والے ہیلی پیڈ کو محکمۂ دفاع کی تحقیق و ترقی سے متعلق تنظیم Defence Research and Development Organisation. نے تیار کیا ہے۔

تقریباً دو منزلہ عمارت انٹارکٹیکا میں تیار ہوچکی ہے جس میں ہمارے سائنس داں مستقل طور پر وہاں رہیں گے اور سائنسی تجربات کرتے رہیں گے۔ اس اسٹیشن میں اندرونی درجۂ حرارت ۱۵ سے ۲۰ ڈگری سیلسیس رہے گا جو بہت آرام دہ گرمی ہے جس سے ہمارے سائنس دانوں کو کام کرنے میں سہولت ہوگی۔ اس عمارت میں تفریحی آسانیاں بھی مہیا کی گئی ہیں مثلاً ٹیبل ٹینس کھیلنے سے لے کر تاش، کیرم اور دوسرے اندرونی خانہ کھیلوں کا انتظام کیا گیا ہے۔ ویڈیو کیسیٹ ریکارڈرس بھی وہاں رکھے گئے ہیں اور ہندوستانی کلاسیکل سنگیت کے ریکارڈرس بھی وہاں سائنس دانوں کی تفریح کے لیے رکھے گئے ہیں۔

باہر برف پر فٹ بال کھیلنے یا باسکٹ بال کھیلنے کا بھی انتظام کردیا گیا ہے۔ خالی اوقات میں سائنس دانوں کو دوسری بین الاقوامی زبانوں کے سیکھنے کے لیے لنگوا فون کا بھی انتظام کیا گیا ہے۔

یہ عمارت ۲ تجربہ گاہوں اور ایک لائبریری اور ریڈنگ روم پر مشتمل ہے۔ کچن میں بہتے ہوئے نل کے گرم پانی کا بھی انتظام کردیا گیا ہے۔ برف کو پگھلانے کی مشین بھی اس عمارت میں نصب کردی گئی ہے۔ کپڑے دھونے کی مشین اور سنٹرل ایرکنڈیشن کا بھی انتظام کردیا گیا ہے۔

اس عمارت میں ۱۵ آدمی رہ سکتے ہیں۔ عمارت کے باہر برف پر چلنے والی گاڑیوں کے ٹھہرانے کے لیے جگہ مہیا کردی ہے۔ [illegible]

انٹارکٹیکا کا جغرافیائی تجزیہ: انٹارکٹیکا دُنیا کے جنوب ترین حصے کے بالکل وسط میں واقع ہے، جس کا رقبہ تقریباً ۱۴ ملین مربع کلومیٹر ہے۔ یہ دنیا کا سب سے ٹھنڈا، سب سے زیادہ خشک، سب سے زیادہ تیز ہواؤں کا برفیلا ریگستان ہے اور ساتوں برّاعظموں میں سب سے زیادہ مشکل پہونچ کا برّاعظم ہے۔

برّاعظم انٹارکٹیکا چاروں طرف سمندروں سے گھرا ہوا ہے۔ اس کے شمال مشرق میں بحرِ ہند پھیلا ہوا ہے۔ شمال میں بحرِ اٹلانٹک ہے اور مغرب اور جنوب میں بحرالکاہل اس کو اپنے آغوش میں لیے ہوئے ہے۔

انٹارکٹیکا کے ساحلی علاقے بحرِ جنوبی سے گھرے ہوئے ہیں۔ شمال مغربی حصہ ویڈیل سی سے گھرا ہوا ہے۔ ویڈل سی کے شمال مغرب میں سوشیا سی ہے جس میں فاک لینڈ آئی لینڈ اور ساؤتھ سینڈوچ آئی لینڈ ہیں۔ انٹارکٹیکا کے جنوبی حصے میں ساحلی علاقہ روس سی (Ross Sea) سے گھرا ہوا ہے۔

انٹارکٹیکا کے شمالی حصے کو کوئین موڈ لینڈ کہتے ہیں۔ یہ ناروے کی املاک ہے۔ گراہم لینڈ برطانیہ کی املاک میں آتا ہے۔ اس میں ویڈیل سی اور الیگزینڈر آئی لینڈ شامل ہیں۔ جنوبی علاقہ ایلسورتھ ہائی لینڈ ہے جس میں بائرڈ لینڈ اور روک فیلر پلیٹو شامل ہیں۔ یہ امریکہ کی املاک میں ہے۔ وکٹوریہ لینڈ اور ولکیز لینڈ آسٹریلیا کی املاک میں شامل ہیں۔ جنوب مشرق کا تھوڑا سا حصہ فرانس کی املاک میں ہے۔ یہ سارے برّاعظم کو مختلف ملکوں نے اپنے املاک میں شامل کیا تھا۔ مگر ۱۹۵۹ء کے بین الاقوامی معاہدے میں یہ بات طے ہوئی تھی کہ مستقبل میں انٹارکٹیکا کسی ملک کی ملکیت نہیں ہوگا بلکہ اس کو صرف سائنسی تجربات اور پُرامن مقاصد کے لیے استعمال کیا جائے گا۔ اور اس پر ایٹمی دھماکہ بھی نہیں کیا جائے گا۔

ہندوستان اور انٹارکٹیکا کے درمیان پانی کی ایک چادر ہے جس کو بحرِ ہند کہتے ہیں۔ اور اسی لیے ہندوستان سے انٹارکٹیکا براہِ راست پہونچنے کے لیے صرف بحرِ ہند کو طے کرنا ہوتا ہے۔

انٹارکٹیکا میں قطبِ جنوبی بھی واقع ہے جس تک پہونچنے کے لیے اُمنڈسین پہلے سیاح تھے جو دسمبر ۱۹۱۱ء میں پہونچے تھے۔ اس کے بعد اسکاٹ جنوری ۱۹۱۲ء میں ساؤتھ پول تک پہونچے۔ ہلیری اور فکس بالترتیب ۴ جنوری اور ۱۹ جنوری ۱۹۵۸ء کو قطبِ جنوبی پر پہونچے تھے۔

تیسری سائنسی مہم کے مقاصد

تیسری ہندوستانی سائنسی مہم کا سب سے بڑا مقصد یہ ہے کہ انٹارکٹیکا میں وہ ایک مستقل سائنسی تجربہ گاہ قائم کرے تاکہ ہندوستانی سائنس داں وہاں مستقل رہ کر تجربات کرتے رہیں۔ اس طرح ہندوستان دوسرے ممالک کی دوڑ میں شانہ بشانہ رہے گا۔ دکھن گنگوتری پر مشتمل تجربہ گاہ سائنس کی دُنیا میں ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھے گی جس سے ہندوستان کا وقار دنیا کے دوسرے ممالک میں بہت بڑھ جائے گا۔

اس کے علاوہ دوسری مہم نے جو سائنسی آلات انٹارکٹیکا میں چھوڑے تھے اُن کی جانچ پڑتال کرنا، موسمی اعداد و شمار حاصل کرنا۔ فضا میں موسم کے اعتبار سے جو تبدیلیاں رونما ہوں گی اُن کے اعداد و شمار حاصل کرنا بھی اس مہم کا مقصد ہے۔ وہ چھوٹی ٹیم جو ۹ ماہ تک وہاں رُکی ہے وہ یہ سارے سائنسی تجربات کرتی رہے گی۔ اس ٹیم میں ۱۲ ممبران ہیں ـــــ جو لیفٹیننٹ کرنل ایس۔ ایس۔ شرما کی قیادت میں کام کرتی رہے گی۔

سائنس دانوں کا خیال ہے کہ انٹارکٹیکا میں بیش بہا معدنیات کا ذخیرہ ہے جن میں کوئلہ، تیل اور گیس کے بہت بڑے ذخیرے موجود ہیں۔ ان کے علاوہ یورینیم جیسی قیمتی دھات بھی وہاں

ملنے کے امکانات ہیں۔ ان معدنیات کا علم حاصل کرنا بھی اس تیسری مُہم کا مقصد ہے۔

انٹارکٹیکا پر ہزاروں فیٹ برف جمی ہوئی ہے جو تہ بہ تہ جمتی چلی گئی ہے۔ لاکھوں سال سے یہ برف کی تہیں جمتے جمتے پورے برف کے پہاڑ بن گئے ہیں۔ ان برف کے نمونوں پر تجربات کرنا۔ ان میں زندگی کے آثار دیکھنا یا کیڑے مکوڑوں پر سائنسی تجربہ کرنا بھی اس تیسری سائنسی مُہم کا مقصد ہے۔ سائنسدانوں کا خیال ہے کہ اگر کسی طرح یہ ساری انٹارکٹیکا کی برف پگھلا دی جائے تو سمندر میں پانی اتنا زیادہ بھر جائے گا کہ سارے دنیا کے سمندروں کی سطح ۲۰۰ سے ۳۰۰ میٹر تک اوپر ہو جائے گی۔ دُنیا کا ۹۰ فی صد تازہ پانی کا ذخیرہ انٹارکٹیکا میں موجود ہے۔ یہ بہت بڑی دولت ہے جو انٹارکٹیکا پیاسی دُنیا کو دے سکتا ہے۔

برف کی دراروں پر بھی تجربات کئے جائیں گے جن سے معلوم ہو سکے گا کہ ان دراروں سے نکلی آواز فضا کو کیسے متاثر کرتی ہے۔ اس تجربہ سے ہمالیہ میں آنے والے طوفان کو سمجھنے اور اُن کی پیشین گوئی کرنے میں مدد ملے گی۔

انٹارکٹیکا میں برف کے نیچے سیکڑوں میٹر کی گہرائی میں بہت پُرانی ہوا کے بے شمار بُلبُلے جمے ہیں جن سے زمین کی فضائی کیفیت اور قدرتی تاریخ کے کئی عقدے کھُل سکیں گے۔ اس پہلو پر بھی تیسری سائنسی مُہم تجربات کر رہی ہے اور مختلف گہرائیوں سے برف کے ٹکڑے حاصل کرکے اُس پر تجربہ گاہوں میں تفصیلی مطالعہ کیا جا رہا ہے۔

انٹارکٹیکا میں زمین کی مقناطیسی کشش کو بھی ناپنے کا تجربہ تیسری مُہم کرتی رہے گی۔ مقناطیسی کشش کی ہلچل ساری زمین پر محسوس کی جاتی ہے، لیکن انٹارکٹیکا میں یہ ہلچلیں بہت زیادہ ہیں۔ ان کی وجہ سے ریڈیو مراسلات کا سلسلہ ٹوٹ جاتا ہے۔ اس طرح انٹارکٹیکا میں جو لوگ تجرباتی اسٹیشنوں پر رہتے ہیں ان کا بعض اوقات اپنے ملک سے یا دوسرے ممالک سے ریڈیائی لہروں کا رابطہ ختم ہو جاتا ہے۔ اس بات کا تیسری مُہم خاص طور پر تجربہ کریگی، تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ ان مقناطیسی ہلچلوں کی رکاوٹ ریڈیائی لہروں اور مراسلات پر نہ پڑ سکے۔

موسمی کیفیات کی تبدیلی کو ریکارڈ کرنے کے لیے ایسے کیمرے لگائے گئے جن پر وہاں کے موسمیات کے اعداد و شمار ریکارڈ ہوتے رہیں گے۔

برف کے نمونوں کے علاوہ یہ تیسری سائنسی ہم اپنے ساتھ انٹارکٹیکا کی پہاڑیوں کے ٹکڑے لے آئی ہے اور اُن پر تجربہ گاہوں میں تجربہ کیا جائے گا تاکہ وہاں کی معدنیات اور تاریخ پر روشنی پڑ سکے۔ نباتاتی و حیواناتی زندگی کے آثار پر بھی تجربات ہوں گے۔

دُنیا بھر کے تقریباً بارہ سو سائنسداں انٹارکٹیکا میں تجربہ کر رہے ہیں۔ اس ملی جُلی کوشش کا نتیجہ یقیناً بہت مفید ہوگا۔ سائنسی علم کو ترقی دینے میں امداد باہمی ہمیشہ مشعل راہ دکھاتی رہے گی۔ معاشی طور سے بھی دُنیا کے سارے ممالک مُستفید ہوں گے اور ساتھ میں ہندوستان کو بھی فائدہ پہونچے گا۔

ہندوستان کی تیسری سائنسی مُہم سے ہمیں بہت زیادہ اُمیدیں وابستہ ہیں جس نے انٹارکٹیکا میں ایک مستقل سائنسی تجربہ گاہ قائم کرکے سائنسی ترقی کی راہ میں ایک نیا باب کھول دیا ہے۔ سائنسی کے ہر پہلو پر اُس تجربہ گاہ میں تجربات کئے جائیں گے اور ہندوستان کے سائنس داں مستقل طور سے وہاں رہ کر تجربات کرتے رہیں گے جس سے ہندوستان کو مستقبل میں سائنسی اور معاشی فوائد حاصل ہوتے رہیں گے۔ ●

بقیہ: اِنصاف

یور آنر، یہ انصاف نہیں ہے ... یہ انصاف نہیں ہے .... یہ انصاف نہیں ہے ....

(پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتا ہے)

جج: (اپنی بات جاری رکھتے ہوئے) ...

... لیکن شری رام لال جی کو ہیں قطعی طور پر معاف نہیں کیا جا سکتا ... مگر کیوں کہ شری رام لال اپنے کئے کی کافی سزا پا چکے ہیں۔ اس لیے عدالت ان کے ساتھ نرمی برتتے ہوئے ان کو صرف یہ حکم دیتی ہے کہ انھیں آج ہی اپنے گناہوں کی تلافی کرنی ہوگی .... انھیں آج ہی سے (Streptomycine) کے انجکشن لگوانے ہوں گے اور یہ سلسلہ ۹۰ انجکشنوں کے لگ جانے تک جاری رہے گا۔ ساتھ ہی ساتھ انھیں اٹھارہ مہینے تک بلاناغہ (Isozone) کی گولی بھی کھانی پڑے گی ...... یہ ہی نہیں بلکہ آج ہی انھیں اپنے ہاتھوں سے اپنے گھر کی ساری شراب کی بوتلیں توڑنی ہوں گی اور سگریٹ اور حقّہ کو ہمیشہ کے لیے بھول جانا ہوگا ..... انھیں اپنے پیسے کو گھر کی صفائی اور اچھے کھانے پینے میں لگانا ہوگا انھیں اپنے بچوں کو بی سی جی نہیں بلکہ ہر مرض کے ٹیکے لگوانے ہوں گے اور انھیں اپنی اولاد کو صاف جگہوں پر رہنے اور چھوٹا پریوار رکھنے کی ترغیب بھی دینی ہوگی !!

رام لال:- (زمین پر ماتھا ٹیک کر) ہے بھگوان تیری کرپا ہے ... میں قسم کھاتا ہوں کہ میں وہ سب کروں گا جو جج صاحب نے کہا۔ !

(یم راج کی گدا ان کے بھینسے کی پیٹھ پر ڈھلکی ہوئی ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے وہ ابھی ابھی تھک گئے ہوں۔ ان کے چہرے پر مایوسی ہے .. وہ دھیرے سے اپنی سواری کا رُخ دُوسری طرف موڑ لیتے ہیں، ان کی سواری بھاری قدموں سے دھیرے دھیرے چلتے ہوئے آنکھوں سے اوجھل ہو جاتی

دیہی اقتصادی منظر نامے کی تبدیلی کی خاطر چند مشورے درج ذیل ہیں۔ تاکہ اس نظام میں زیادہ سے زیادہ لوگوں کو شرکت کا موقع مل سکے اور وہ ملک کی پیداواری سرگرمیوں میں شریک ہو سکیں۔

تنظیمی ڈھانچے کی تبدیلی

پیداواری سیکٹر نیز اشیا کی تقسیم سے متعلق سیکٹر کی سرگرمیاں ایک قومی واحد سیکٹر کے ماتحت کر دی جائیں۔ اور اقتصادی سرگرمی کے منظم ڈھانچے میں نجی اور سرکاری سیکٹر کی تقسیم ختم کر دی جائے۔

اشیا کی فروخت سے متعلق قومی تنظیم ہونی چاہیئے۔ اس کی حیثیت ایک وفاقی تنظیم کی ہو جس میں مختلف کاموں مثلاً غلہ، ادویات، الیکٹرانک، الیکٹریکل اور میکانیکل شعبوں کی اشیا کی تقسیم سے متعلق قومی تنظیمیں شامل ہوں۔

مختلف شعبوں میں صنعتی سرگرمیاں متعلقہ صنعت کی ایک قومی تنظیم کے ماتحت عمل میں آنی چاہیئں۔ اس طرح کی قومی صنعتی تنظیموں کے اوپر ایک اور چوٹی کی تنظیم ہونی چاہیئے تاکہ متعلقہ صنعتوں کی صنعتی پالیسیوں میں تال میل قائم ہو سکے۔

ان تمام تنظیموں کا ڈھانچہ سہ فریقی نظم و نسق کے طریقے پر پروان چڑھنا چاہیئے۔ اس میں صنعت کاروں، محنت کشوں اور مالیاتی اداروں کے نمائندے متناسب تعداد میں ہونے چاہیئں۔

ان قومی تنظیموں کی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ اشیا کی فروخت سے متعلق تنظیموں کے اشتراک عمل سے قیمتوں کے تناسب کو مناسب سطح پر رکھیں اور خام مال نیز تیار مال کی قیمتوں کے درمیان تناسب کو برقرار رکھا جا سکے۔ لاگتوں کو کم کرنے پر توجہ قائم رہنی چاہیئے۔ اس کے لیے کفایتی اقدامات اپنانے کی ضرورت ہوگی اور معاون صنعتوں کا جال بچھانا ہوگا۔

اشیا کی فروخت سے متعلق قومی تنظیم نیز صنعتی تنظیم کی سب سے اہم ذمہ داری یہ ہے کہ وہ خام مال کی فراہمی کو یقینی بنائیں اور معیاری مال تیار کرائیں، خاص کر از خود روزگار والوں کی طرف سے قائم کردہ گھریلو صنعتوں اور چھوٹے پیمانے کی صنعتوں کے لیے اس بات کی بڑی اہمیت ہے۔

نئے نظام کی ایک اور اہم بات یہ ہے کہ ہر صنعتی ادارے کے لیے یہ لازمی ذمہ داری ہوگی کہ وہ اپنے ملازمین کے لیے تعمیر مکانات کی سہولتیں بہم پہونچائے۔ تجارتی اداروں کو بھی اسی طرح کی ذمہ داری نبھانی ہوگی۔ اس عمل سے گندی بستیوں کا وجود ختم ہونے میں مدد ملے گی۔ اس کے ذریعے تعمیر مکانات کی سرگرمیاں تقویت پا سکیں گی۔ اور اس سے محنت کش اور مزدوروں کو زیادہ سے زیادہ روزگار ملے گا۔

بنیادی سہولتوں کی فراہمی

تمام صنعتی کارخانوں کو خواہ وہ پبلک سیکٹر میں ہوں یا کسی دیگر سیکٹر میں، ایسے ماہرین کی زیر نگرانی لانا ہے جو اس شعبے کی خصوصی مہارت رکھتے ہوں۔ اس میں سہ فریقی نظام کی بنیاد پر سب کی نمائندگی ضروری ہے۔

سرکار کو بنیادی سہولتیں فراہم کرنی ہیں۔ مثلاً صحت سے متعلق خدمات، اسکول، سماجی نوعیت کی سہولتیں۔ مواصلات، ذرائع نقل و حمل۔ صنعتی طور پر پسماندہ علاقوں میں یہ سہولتیں بہت ضروری ہیں۔

یونیورسٹیوں اور تکنیکی اداروں میں قریبی تال میل ہونا چاہیئے اور پھر ان کا تعلق صنعتی اداروں سے ہونا ضروری ہے۔ تاکہ تربیت یافتہ افراد مناسب تعداد میں حسب ضرورت مل سکیں۔

بلاک کی سطح پر سروس کے مراکز قائم کئے جانے ضروری ہیں تاکہ کسانوں کو ان کی ضرورت کے وقت سروس اور دیکھ بھال میں دقت نہ پیش آئے۔ ان کارخانوں کو اشیا کی فروخت کی تنظیموں کے ساتھ جوڑ دینا چاہیئے۔

ہر بڑے صنعتی سیکٹر میں ایک تحقیقی مرکز ہونا چاہیئے۔ قومی سطح پر سبھی صنعتی اور تجارتی اداروں کی ضرورت کو پورا کرنے والا ایک تحقیقی مرکز بھی ضروری ہے۔ مجموعی قومی پیداوار اور آلات کا ایک فی صد تحقیق پر صرف کیا جانا چاہیئے۔

انرجی کی تیاری بے حد ضروری ہے۔ انرجی کے قابل تجدید اور روایاتی وسیلوں کا فروغ بے حد اہم ہے۔ صنعتی کارخانوں میں ان کے اپنے بجلی کی تیاری والے پلانٹ ہونے چاہیئں۔ بجلی تیار کرنے والے پلانٹوں کو جب بھی قائم کیا جائے تو ان کی بجلی کی ایک مخصوص مقدار صنعتی کارخانوں کے لیے ہونی چاہیئے۔

زراعت میں بیمہ کو چالو کر دینا چاہیئے۔ فصلوں کا بیمہ ہونا چاہیئے اور زرعی خام مال پر مبنی صنعتوں کا بھی بیمہ ہونا چاہیئے۔ زراعت کو صنعت کی طرح ہی سمجھنا چاہیئے۔ اور لاگت منافع کے تناسب اور قیمتوں سے ان کے تعلق کو ذہن میں رکھنا ضروری ہے۔

ماحول کے تحفظ پر خصوصی توجہ دی جانی چاہیئے۔ صنعتی اور زراعتی سرگرمیوں میں معاشی نوعیت کے توازن کو قائم رکھنا چاہیئے۔ جنگلی جانوروں کے تحفظ اور شجرکاری نیز جنگل بانی پر دھیان دینا بھی ضروری ہے۔

چراگاہوں کا فروغ بھی ضروری ہے۔ مویشیوں کے لیے بہتر چارے کی ضرورت ہے۔ ڈیری کی مصنوعات کو بڑھاوا دیا جانا چاہیئے۔ دیہات کے عوام کو مویشی پالنے اور دودھ دینے والے

ریاستوں میں آبادی کی شرح میں قابلِ لحاظ کمی ہوئی ہے۔ اپریل ۱۹۸۲ سے دسمبر ۱۹۸۳ء تک کے دوران ۲۰،۳۹،۹۴۸ نس بندی آپریشن ہوئے۔ تامل ناڈو میں سب سے زیادہ نس بندی آپریشن کروائے گئے ہیں۔ مجموعی حیثیت سے مہاراشٹر وہ پہلی ریاست ہے جو خاندانی منصوبہ بندی پروگرام کی کامیاب عمل آوری میں سرِ فہرست ہے۔ توقع ہے کہ تقریباً تمام ریاستیں اور مرکزی زیرِ انتظام علاقے ۲۰۰۰ء تک اپنا نشانہ مکمل کر لیں گے اور ہماری آبادی کی رفتار میں توازن قائم ہو جائے گا۔

وزیرِ اعظم شریمتی اندرا گاندھی نے ۶ فروری ۱۹۸۴ء کو آبادی اور ترقی سے متعلق پہلی ایشیائی کانفرنس کا افتتاح کرتے ہوئے کہا تھا کہ ایشیا دنیا کا سب سے زیادہ گنجان آبادی والا براعظم ہے۔ بھارت میں خاندانی منصوبہ بندی اقتصادی ترقی کے منصوبے کا ایک جز ہے۔ ہم خاندانی منصوبہ بندی کے سلسلے میں موافقانہ فضا قائم رکھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اگر والدین کو دو بچوں کی صحت مند حیات کی یقین دہانی کرا دی جائے تو وہ اپنے خاندان کو محدود رکھ سکتے ہیں۔ ۸۱-۱۹۷۱ء کے دوران خاندانی منصوبہ بندی کے نتیجے میں تین کروڑ ۹ لاکھ بچوں کی پیدائش روکی جا سکی اگر اس کو نہ روکا گیا ہوتا تو آبادی میں شرح اضافہ تقریباً ۳۰ فیصد ہو جاتا۔

وزیرِ اعظم نے آگے چل کر کہا کہ "ہندوستان ان ملکوں میں شامل ہے جنھوں نے خاندانی منصوبہ بندی کو قومی پالیسی کے طور پر اپنایا۔ ہمارا تجربہ یہ بتاتا ہے کہ جب لوگ خود سمجھنے لگتے ہیں کہ یہ پالیسی خود ان کے مفاد میں ہے تو وہ اسے اپنانے پر خود ہی آمادہ ہو جاتے ہیں۔"

خاندانی منصوبہ بندی کے سلسلے میں خواتین کو بھی اہم رول ادا کرنا ہوگا۔ خواتین ہمارے سماج کے لیے ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ان کی شخصیت پورے سماج پر اثر انداز ہوتی ہے ان کی

(باقی صفحہ ۲۰ پر)

راحت پروین

کیا آپ جانتے ہیں؟

ہندوستان کے مشہور پہاڑی مقامات

مقام	ریاست
الموڑہ	اتر پردیش
چیرا پونجی	میگھالیہ
کناّنور	تامل ناڈو
ڈلہوزی	ہماچل پردیش
دارجلنگ	مغربی بنگال
گلمرگ	کشمیر
کسولی	ہماچل پردیش

مقام	ریاست
مہابلیشور	مہاراشٹر
ماؤنٹ آبو	راجستھان
مسوری	اتر پردیش
نینی تال	اتر پردیش
اوٹاکمنڈ	تامل ناڈو
پنچ مڑھی	مدھیہ پردیش
رانی کھیت	اتر پردیش
شیلانگ	میگھالیہ
شملہ	ہماچل پردیش

ہندوستان کے مشہور پل

پل	لمبائی (فٹ)
سون پل (بہار)	۱۰,۰۵۲
گوداوری پل	۹,۰۹۲
الیگزینڈرا	۹,۰۸۸
مہاندی پل (اڑیسہ)	۶,۹۱۲
آنزنٹ پل (الہ آباد)	۶,۸۳۰

پل	لمبائی (فٹ)
گنگا پل (پٹنہ)	۶,۰۷۸
نرمدا پل	۴,۶۸۷
سرائی گھاٹ (برہمپتر)	۴,۲۵۸
ستلج پل	۴,۲۱۰
ڈفرن پل (بنارس)	۳,۵۷۸
جمنا پل (الہ آباد)	۳,۲۳۵

ہندوستان کے مشہور میوزیم

- انڈین میوزیم، کلکتہ
- وکٹوریہ میموریل ہال، کلکتہ
- نیشنل میوزیم، نئی دہلی
- نیشنل گیلری آف ماڈرن آرٹ، نئی دہلی
- نہرو میموریل میوزیم اینڈ لائبریری، نئی دہلی
- انڈین وار میموریل میوزیم، دہلی
- سالار جنگ میوزیم اینڈ لائبریری، حیدرآباد

ہندوستان کی مشہور لائبریریاں

- نیشنل لائبریری، کلکتہ
- سینٹرل ریفرنس لائبریری، کلکتہ
- خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، کلکتہ
- سینٹرل لائبریری، بمبئی
- دہلی پبلک لائبریری، دہلی
- سینٹرل سیکریٹریٹ لائبریری، دہلی

ڈاکٹر ہلال فریدی

یک بابی ڈرامہ

اِنصاف

کردار :-

۱۔ M.T.B. مائیکو بیکٹیریم ٹیوبر کیولوسس۔

(وہ بیکٹیریا جس سے .T.B کا مرض ہوتا ہے)

۲۔ رام لال .T.B کا ایک مریض۔

۳۔ کملا ۔ رام لال کی لڑکی۔

۴۔ جج۔ ۵۔ یم راج اور اس کا بھینسا۔

۶۔ اردلی ۔ ۷۔ چار نوجوان۔

سین :- عدالت کا ایک کمرہ، بیچ میں ایک لمبی میز کے پیچھے اُونچی کرسی پر جج بیٹھا ہے۔ اس سے ایک زینہ نیچے ایک اسٹول پر عدالت کا اردلی ہے۔ جج کی بائیں طرف ایک کٹہرا ہے جس میں ایم۔ٹی۔بی کھڑا ہے۔ اردلی اٹھتا ہے اور ایک کتاب ایم۔ٹی۔بی کے پاس لاکر کہتا ہے۔

اردلی :- اس مقدس کتاب پر ہاتھ رکھو اور بھگوان حاضر ناظر جان کر کہو، میں جو کچھ بھی کہوں گا [illegible] کہوں گا۔ سچ کے سوا کچھ نہیں کہوں گا۔

[illegible]۔ٹی۔بی :- میں بھگوان کو حاضر ناظر جان کر کہتا [illegible] ہوں کہ میں جو کچھ بھی کہوں گا سچ کہوں گا، [illegible] کے سوا کچھ نہیں کہوں گا۔

[illegible] :- تم پر یہ الزام ہے کہ تم نے شری رام لال [illegible] زندگی کی خوشیاں چھینیں اور پھر انھیں جان [illegible] سے مار ڈالنے کی کوشش بھی کی۔ تم اپنے جرم کا اقبال [illegible] کرتے ہو یا اس سے انکار کرتے ہو۔

[illegible]۔ٹی۔بی :- یور آنر، میں اس سلسلے میں کچھ بھی [illegible] سے پہلے شری رام لال سے جرح کرنے کی اجازت چاہتا ہوں۔

جج :- اجازت ہے۔

اردلی :- شری رام لال ولد سکھ لال حاضر ہوں۔

شری رام لال عدالت کے اندر آتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ ان کے پیچھے پیچھے اُن سے دس قدم کی دُوری پر بھینسے پر بیٹھے یم راج چلے آرہے ہیں۔ شری رام لال ادھیڑ عمر کے آدمی ہیں۔ انھیں دیکھ کر ایسا لگتا ہے جیسے برسوں کے بیمار ہوں۔ چہرے پر مُردنی چھائی ہوئی ہے۔ آنکھیں گڑھوں میں دھنسی ہوئی۔ گال پچکے۔ سینے اور بدن کی ہڈیاں دُور سے ہی گنی جاسکتی ہیں۔ ان کے ہاتھ کی اُنگلیاں دیکھ کر ایسا لگتا ہے جیسے ناخنوں کی جگہ سفید کاغذ چپکا دیا گیا ہو۔ سانس لیتے ہیں تو لگتا ہے جیسے اس عمل میں کافی محنت کرنی پڑ رہی ہو، چال میں لڑکھڑاہٹ ہے۔ قدم ایسے بڑھاتے ہیں جیسے کسی بھاری چیز کو گھسیٹ رہے ہوں۔ آکر Witness Box میں کھڑے ہوتے ہیں۔ وِٹنیس باکس میں آتے ہی انھیں کھانسی کا دَورہ سا پڑتا ہے اور کھانسی کے ساتھ ڈھیر سارا خون اُگل کر وِٹنیس باکس کے پاس گر جاتا ہے۔

ایم۔ٹی۔بی :- کمر پر ہاتھ رکھے یہ سب دیکھ رہا ہے اس کے چہرے پر ایک عجیب سی مسکراہٹ ہے (ایم۔ٹی۔بی :- ہاں تو مسٹر رام لال مجھ پر یہ الزام ہے کہ میں نے آپ کی خوشیاں چھینیں اور آپ کو جان سے مارنے کی کوشش کی۔ میں اپنے کو بے گناہ ثابت کرنے کے لیے آپ سے کچھ پوچھنا چاہتا ہوں۔

رام لال :- (کانپتی ہوئی آواز میں جس سے نفرت ٹپک رہی ہے) بدذات! ... قاتل ... میں تیرے کسی سوال کا جواب نہیں دوں گا، ظالم تو نے ....

جج :- آرڈر، آرڈر! ... عدالت ہے۔ سوال کا جواب ٹھیک ٹھیک اور تمیز سے دیا جائے۔

ایم۔ٹی۔بی :- (فاتحانہ مسکراہٹ کے ساتھ تھوڑا جھک کر) تھینک یو یور آنر (رام لال کی طرف دیکھ کر) ہاں تو شری رام لال آپ عدالت کو اپنی کہانی سُنانے کی زحمت کریں۔

رام لال :- (نڈھال ہوکر) جج صاحب! آج سے کچھ عرصے پہلے تک بالکل ٹھیک تھا ... اچھا خاصا تندرست اور صحتمند، ۴۵ سال کی اس عمر میں بھی! اچھے اچھے نوجوان مجھ پر رشک کرتے تھے۔ پھر نہ جانے کیا ہوا جج صاحب کہ میری طبیعت گری گری سی رہنے لگی۔ ہر شام مجھے بخار سا محسوس ہوتا رات کو سونے لیٹتا تو پسینے سے شرابور ہو جاتا۔ میری بھوک بھی روز بروز گھٹنے لگی۔ پانچ چپاتیاں کھانے والا میں۔ اب دو چپاتیاں بھی نہیں کھا پاتا۔ مجھے ایسا لگنے لگا جیسے میرا وزن بھی تیزی سے گھٹ رہا ہو۔ میری ... میری صحت گرتی ہی گئی جج صاحب ... میں ... میں کمزور سے کمزور تر ہوتا گیا ..... (روسنے لگتا ہے)

جج :- رام لال ہمت سے کام لو عدالت کو بتاؤ کہ اس کے بعد کیا ہوا؟

رام لال :- (کچھ سنبھل کر) اس کے بعد ... اس

کے بعد ... جج صاحب مجھے کھانسی کا مرض لگ گیا ... جج صاحب مجھ کو بے پناہ کھانسی آنے لگی ... یہ کھانسی ہر وقت آتی رہتی۔ کسی طرح سکون ہی نہیں ملتا۔ کھانسی کے ساتھ بلغم بھی ہوتا۔ پہلے تو صرف چکنا چکنا بلغم ہی آتا تھا۔ لیکن پھر تو بلغم کے ساتھ خون کی ایک لکیر بھی لگی ہوئی آنے لگی۔ کچھ دن ایسا ہی رہا۔ لیکن اس کے بعد خون کے بلغم کی جگہ خون کی ام لٹیوں نے لے لی۔ میں اپنی یہ حالت دیکھ کر بہت پریشان رہنے لگا ... جج صاحب بہت پریشان۔

ایم۔ ٹی۔ بی :۔ (طنزیہ ہنسی کے ساتھ) شری رام لال اگر آپ واقعی پریشان تھے تو آپ ڈاکٹر کے پاس کیوں نہیں گئے ؟۔

رام لال :۔ جج صاحب! میری بیوی نے مجھ سے کئی بار کہا کہ میں ڈاکٹر کو دکھاؤں ... لیکن میں ڈرتا تھا کہ اگر بات پھیلی اور محلے والوں کو پتہ چل گیا کہ مجھے کھانسی کا مرض ہے تو کیا سوچیں گے میں تو کہیں کا نہیں رہتا۔ جج صاحب ..... (رونے لگتا ہے)۔

ایم۔ ٹی۔ بی :۔ اب ڈھونگ چھوڑیئے رام لال جی! اور یہ بتایئے کہ آپ کے گھر میں کسی اور کو تو اس قسم کی شکایت نہیں تھی ؟

رام لال :۔ (خاموش رہتا ہے)۔

ایم۔ ٹی۔ بی : جواب دیجئے رام لال جی! تھی یا نہیں تھی ... ؟

رام لال :۔ تھی .. !

ایم۔ ٹی۔ بی :۔ کسے۔ ؟

رام لال :۔ میری .... میری .... میری بیٹی کملا کو ... !!

ایم۔ ٹی۔ بی :۔ لیکن آپ نے کملا دیوی کو بھی ڈاکٹر کو نہیں دکھایا ... ایسا کیوں ؟!

رام لال :۔ کملا میری اکلوتی لڑکی تھی۔ اگر لوگوں کو پتہ چل جاتا کہ اسے کھانسی کا مرض ہے تو اس کی شادی مشکل میں پڑ جاتی !

ایم۔ ٹی۔ بی :۔ یور آنر! میں کملا دیوی سے کچھ پوچھنا چاہتا ہوں۔

جج :۔ اجازت ہے۔!!

اردلی :۔ کماری کملا دیوی ولد رام لال حاضر ہوں!

(کوئی نہیں آتا)۔

اردلی :۔ (پھر سے) کماری کملا دیوی ولد رام لال حاضر ہوں!

(اس بار چار نوجوان ونسس بکس کے سامنے والے دروازے سے اندر داخل ہوئے ہیں ان کے کاندھوں پر ایک چارپائی ہے، چارپائی پر کوئی لیٹا نظر آ رہا ہے۔ جس نے اپنے اوپر چادر تان رکھی ہے۔ چارپائی کو بیچ عدالت میں رکھ دیا جاتا ہے۔ اس دوران رام لال بالکل خاموش کھڑا ہے۔ اس نے جذبات کی شدت سے اپنے ایک ہاتھ کو دوسرے ہاتھ میں تھام رکھا ہے۔ اس کی نگاہیں پلنگ پر گڑی ہیں اور آنکھوں میں آنسو تیرتے نظر آ رہے ہیں۔ رام لال کے پیچھے کھڑے پہلوان اپنی مونچھوں پر تاؤ دے رہے ہیں۔)

ایم۔ ٹی۔ بی :۔ تو یہ ہیں کماری کملا دیوی! .... ہاں تو کملا دیوی ... چارپائی پر کوئی حرکت نہیں ہوتی ... کملا دیوی !! (پھر بھی چارپائی پر کوئی حرکت نہیں ہوتی۔

وقفہ

(اردلی اٹھ کر آتا ہے اور چارپائی پر لیٹے شخص کے اوپر پڑی چادر اٹھا دیتا ہے ..... اندر ایک لڑکی کی سوکھی ہوئی لاش نکلتی ہے !!)

اردلی :۔ جج صاحب یہ تو مر چکی ہے!

(رام لال کی نگاہیں اب پلنگ کے بجائے خلا میں گھور رہی ہیں۔ جو آنسوؤں سے آنکھیں کچھ دیر پہلے ڈبڈبا رہی تھیں وہ اب اس کے دھنسے ہوئے گالوں پر بہہ نکلے ہیں، وہ زار و قطار رو رہا ہے)۔

ایم۔ ٹی۔ بی :۔ (معنی خیز انداز میں سر ہلا کر) یہ تو مر چکی، یور آنر لیکن میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ اس کے B.C.G کا ٹیکا لگا تھا یا نہیں ؟

جج :۔ عدالت بھی یہ جاننا چاہتی ہے کہ ہمیں بتایا جائے کہ اس لڑکی کے بائیں کندھے پر کسی ٹیکے کا نشان ہے یا نہیں ؟

اردلی :۔ (لاش کا معائنہ کر کے) کوئی نشان نہیں ہے سرکار۔

ایم۔ ٹی۔ بی :۔ ہاہاہاہا! رام لال جی تمہیں تو اپنی بیٹی سے بڑا پیار تھا؟ (کچھ دیر رک کر) ... تمہاری بیٹی کی موت ہی میری بے گناہی کا ثبوت بنے گی۔ ... خیر رام لال جی، چھوڑیئے ان باتوں کو، یہ بتایئے کہ آپ کے گھر میں کتنے لوگ رہتے ہیں ؟

رام لال :۔ سات، میں، میری بیوی اور پانچ بچے۔

ایم۔ ٹی۔ بی :۔ پانچ بچے! یور آنر، یہ پوائنٹ نوٹ کیا جائے! اور آپ کے گھر میں کمرے کتنے ہیں

رام لال :۔ دو کمرے۔

ایم۔ ٹی۔ بی :۔ (مضحکہ اڑانے والے انداز میں) دو کمرے ..... اور پانچ بچے .... بہت خوب رام لال جی بہت خوب .... اچھا اب یہ بتایئے کہ ان کمروں میں کوئی کھڑکی یا روشن دان یا ہوا اور روشنی کے لیے آنے جانے کے لیے کوئی اور راستہ ہے یا نہیں ؟

رام لال :۔ دونوں کمرے آپس میں جڑے ہوئے ہیں اور دونوں کے لیے ایک کھڑکی ہے۔

ایم۔ ٹی۔ بی :۔ یہ کھڑکی کہاں کھلتی ہے ؟

رام لال :۔ کھڑکی گھر کے پچھواڑے سے کھلتی ہے، جہاں گھر کے مویشی باندھے جاتے ہیں۔

ایم۔ ٹی۔ بی :۔ (ہنس کر) یعنی آپ کے گھر کی کھڑکی بھی ایک گندی جگہ کھلتی ہے ..... خیر رام لال جی ... اب یہ بتایئے کہ آپ سگریٹ تو نہیں پیتے ؟

رام لال :۔ (شرم کے مارے سر جھکا لیتا ہے)

ایم۔ ٹی۔ بی :۔ (ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے) رام لال جی جواب دیجئے .... آپ سگریٹ پیتے ہیں یا نہیں ؟!

رام لال :۔ (دھیمی آواز میں) پیتا ہوں۔!

ایم۔ ٹی۔ بی :۔ کتنی ؟

رام لال :۔ ایک دن میں چار یا پانچ ڈبی۔

ایم۔ ٹی۔ بی :۔ ایک دن میں پانچ ڈبی یعنی پچاس سگریٹ روز!!!۔

یور آنر، یہ پائنٹ بھی دوبارہ نوٹ کیا جائے! .... بس ایک سوال اور رام لال جی، آپ کوئی اور نشہ تو نہیں کرتے ...؟ میرا مطلب ہے چرس پیتے ہوں، گولی کھاتے ہوں یا اس قسم کی کوئی اور چیز؟

رام لال :۔ (کوئی جواب نہیں دیتا بس شرم سے سر نیچے جھکا لیتا ہے)

ایم۔ ٹی۔ بی :۔ (کڑک کر) جواب دیجئے رام لال جی۔

رام لال :۔ (پھر کوئی جواب نہیں دیتا۔)

جج :۔ عدالت جواب چاہتی ہے۔!

رام لال :۔ ج... جج صاحب ... م ... میں کبھی کبھی مجبور ہو کر سش ... ش ... شراب ...

ایم۔ ٹی۔ بی :۔ او ہو ہو ہو ... تو حضور یہ شوق بھی رکھتے ہیں! بہت خوب ... بہت خوب!! میں ان سے اور کچھ پوچھنا نہیں چاہتا ہوں۔۔ یہ نیچے اتر آئیں اب میں اپنی صفائی پیش کروں گا۔

(رام لال جی ڈیفنس باکس سے نکل کر سامنے پڑی ایک کرسی پر گر جاتے ہیں۔ ایم ٹی بی بھی ان کے ساتھ ہی اپنی جگہ بدل دیتے ہیں۔ ایم ٹی بی ان سے دو قدم کے فاصلے پر کھڑے ہیں اور بڑے ہی مطمئن نظر آ رہے ہیں۔ وہ اپنی گدا کو کچھ اس طرح اپنے بائیں کندھے پر مار رہے ہیں جس طرح کہ کوئی کرکٹ کا کھلاڑی گیند کے آنے سے پہلے بلے کو زمین پر مارتا رہتا ہے)

ایم۔ ٹی۔ بی :۔ (پھر پورے اعتماد کے ساتھ) یور آنر مجھ پر یہ الزام ہے کہ میں رام لال کی موجودہ حالت کا ذمہ دار ہوں۔ لیکن یہ بات سراسر غلط ہے کیونکہ یور آنر میں تو ایک ادنیٰ سا بیکٹیریا ہوں ... جب ٹی بی کا کوئی مریض کھانستا ہے تو میں ہوا میں آ جاتا ہوں اور پھر اپنے دباؤ اور متعدی اثرات کے ذریعے اپنے نئے شکار کے اندر داخل ہو جاتا ہوں۔ چھوٹے، گندے اور بوسیدہ گھروں میں رہنے والے پریواروں کے سگریٹ باز اور شرابی لوگ میرا من پسند شکار ہیں۔! یور آنر میں بھی ایک زندہ چیز ہوں اور ہر زندہ چیز کی طرح اپنی زندگی گزارنے کا حق مجھے بھی حاصل ہے ... اس لیے میں نے شری رام لال جی کے جسم میں داخل ہو کر صرف اپنے زندہ رہنے کے حق کا استعمال کیا ہے ... کوئی جرم نہیں کیا!!! ...

رام لال :۔ (چیخ اٹھتا ہے) نہیں جج صاحب یہ خونی ہے ... قاتل ہے .... اس نے میری بچی کو مار ڈالا ... یہ سب سے بڑا گنہگار ہے!

ایم۔ ٹی۔ بی :۔ (پر زور آواز میں) رام لال! گنہگار میں نہیں گنہگار تم ہو! جس طرح مجھے یہ حق حاصل ہے کہ میں اپنی زندگی گزاروں اسی طرح تمہارا بھی یہ فرض ہے کہ تم مجھ سے اور مجھ جیسے تمام بیکٹیریا سے اپنی اور اپنے پریوار کی حفاظت کرو   تم نے ایسا نہ کر کے اپنے فرض سے غفلت برتی ہے۔ تمہیں اس کی سزا ملنی چاہیئے!

(ایم ٹی بی اپنی گدا سیدھی کرنے لگتے ہیں اور ان کا پیسنا رام لال کے دو قدم اور قریب آ جاتا ہے)

ایم۔ ٹی۔ بی :۔ یہ آدمی رام لال بڑے پریوار والا سگریٹ باز اور شرابی ہے۔ اس نے اپنے جسم کے اندر اور اپنے اطراف میں ایسا ماحول بنا رکھا ہے جو میرے ہی کیا کسی بھی بیکٹیریا کی زندگی کے لیے بہترین ماحول ہے۔ اگر میں اس کے جسم میں داخل نہ ہوتا تو اسے کوئی اور بیماری ہو جاتی۔ بہت ممکن تھا کہ اسے پھیپھڑوں کا کینسر ہو جاتا۔ ... کینسر نہ ہوتا تو دل کی کوئی اور بیماری ہو جاتی، دل کی بیماری نہ ہوتی تو شراب سے اس کا جگر سوکھ جاتا .... یور آنر اسے کوئی نہ کوئی مرض تو ہونا ہی تھا! مجھے تو محض بدنام کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے کیوں کہ میں اپنی بدنصیبی سے اس کو اس حالت تک پہنچانے کا ایک معمولی سا ذریعہ بن گیا ہوں۔ ورنہ اپنی اس حالت کا ذمہ دار تو یہ خود ہے ... ذرا سوچیئے کہ اگر یہ واقعی کوشش کرتا تو کیا یہ مجھ سے بچ نہیں سکتا تھا۔! ... کیا یہ سگریٹ اور شراب سے دور نہیں رہ سکتا تھا؟! ... کیا یہ ایک چھوٹا پریوار نہیں رکھ سکتا تھا؟! ... کیا یہ اپنی بری عادتوں پر خرچ ہونے والی رقم کو ایک اچھا اور ہوادار گھر بنوانے میں نہیں لگا سکتا تھا؟! کیا یہ جہالت کی باتوں کو بھول کر خود کو اور اپنی بچی کو ڈاکٹر سے دوائیں نہیں دلا سکتا تھا۔! .... یور آنر یہ آدمی یہ سب کچھ کر سکتا تھا۔ لیکن اس نے اپنی لاپرواہی اور جہالت کی بدولت ایسا کرنے کی کوشش ہی نہیں کی ... اور اس طرح اس نے نہ صرف اپنی یہ حالت کی بلکہ اپنی بیٹی کا بھی خون کیا .... اس لیے یہ سخت سے سخت سزا کا مستحق ہے!۔

(ایم راج رام لال کے دو قدم اور قریب آ جاتے ہیں ... عدالت میں سناٹا سا چھایا ہوا ہے ... جج صاحب اپنے قلم سے کچھ لکھ رہے ہیں۔)

وقفہ

جج :۔ تمام بیانات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے عدالت اس نتیجے پر پہنچی ہے کہ رام لال نے اپنی زندگی نہایت لاپرواہی سے گزاری اس نے کئی ایسی غلطیاں بھی کیں جو قابلِ معافی نہیں ہیں۔ ... لیکن ملزم یعنی Mycobacterium Tuberculosis کو کوئی حق نہیں پہنچتا تھا کہ وہ قانون اپنے ہاتھ میں لے کر رام لال کی زندگی کو ختم کر دینے کی کوشش کرتا۔ صرف یہ ہی نہیں عدالت یہ بھی واضح کر دینا چاہتی ہے کہ اس دنیا میں جینے کا حق صرف اسے ہے جو خود جیئے اور دوسروں کو بھی جینے دے ... جس کی زندگی کا مقصد ہی دوسروں کی زندگی چھیننا ہو اسے زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں ... ان سب باتوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے میں مائیکو بیکٹیریا کو سزائے موت دیتا ہوں!!

(ایم۔ ٹی۔ بی :۔ (چیخ کے ساتھ) نہیں ...!!!

(باقی صفحہ ۱۲ پر)

مادرِ وطن کے نام

مناظر حسن شاہین

کیا حسیں پھول کھلا آج ترے گلشن میں
گلِ جمہور کی خوشبو ہے میرے آنگن میں
تیرا آئین مساوات کا ہے آئینہ دار
بندھ گئے اہلِ وطن آج اسی بندھن میں

ادنیٰ و اعلیٰ نہیں کوئی نظر میں تیری
گُل مساوات کے کِھلتے ہیں ترے گلشن میں

تیرے آئین کی عظمت ہے عیاں ہر دل پہ
کتنی وسعت ہے ترے پیار بھرے آنگن میں

ہندو مسلم بھی ہیں سکھ، پارسی، عیسائی بھی
سب مذاہب کے کھلے پھول ترے گلشن میں

تجھ سی سیتا کو کوئی آنکھ اُٹھا کر دیکھے
عزم و ہمت یہ کہاں آج کسی راون میں

تیرے بیٹے جو گئے رن میں تری سُن کے پکار
ایک بھونچال سا آیا ہے صفِ دشمن میں

تیری عزت پہ کبھی آنچ نہ آنے دیں گے
عہد لو کرتے ہیں ہم آج کے دن جیون میں

متحد ہوں گے ہم آپس میں ہیں بھائی بھائی
خود کو باندھیں گے نئے دور سے اک بندھن میں
پیار کے ساز پہ رقصاں ہے مسرت شاہینؔ
آج برسی ہے خوشی بن کے گھٹا جیون میں

غزلیں

ڈاکٹر آزاد قاسمی (علیگ)

شبِ فراق کی ظلمت مٹائے جاتے ہیں
فضا پہ نورِ سحر بن کے چھائے جاتے ہیں
یہ دَور خوب ہے، میخانۂ حقائق میں
توہمات کے ساغر، پلائے جاتے ہیں
یہ میرا ظرف کہ اُن کو بنایا لافانی
یہ اُن کا ظرف کہ مجھ کو مٹائے جاتے ہیں
نہ جانے کون سے عالم میں ہیں یہ اہلِ یقیں
ہزار غم ہیں مگر، مسکرائے جاتے ہیں
ہمارے سینے بہرحال غم سے چھلنی ہیں
یہ بات اور ہے، کیوں مسکرائے جاتے ہیں
ہمارا عزم تو دیکھو کہ آندھیوں میں بھی
چراغِ راہِ محبت جلائے جاتے ہیں
تمام عمر جو جیتے ہیں، دوسروں کے لیے
کچھ ایسے لوگ بھی دُنیا میں پائے جاتے ہیں

فریاد آذر

دل میں چھانے لگا زہریلی جلن کا احساس
اب زمانے کو بھی ہوگا مرے فن کا احساس
سامنے پلکے اُسے یوں مرے ارماں اُبھرے
دیکھ کر جیسے سرابوں کو ہرن کا احساس
پھر ذرا دیر سُلا زلف کے سائے میں مجھے
پھر زمانے نے جگایا ہے تھکن کا احساس
ورنہ مدہوش بھلا کون ہوا کرتا ہے
ہے ہواؤں میں ترے لمسِ بدن کا احساس
مَیں سُلگتا ہی رہا ہوں یوں ہی تنہا تنہا
جیسے راتوں کو کسی بیوہ دُلہن کا احساس

ڈاکٹر کمارؔ پانی پتی

خلوصِ ذکر سے صحراؤں کو سرسبز کردے گی
یہ میخانے کی مٹی ہے اسے گھر گھر بکھرنے دو
زمیں کا ہر سرا مَیں آسماں سے ایک کردوں گا
ذرا اِک بار دل میں وَلولوں کو پھر اُبھرنے دو

بگولوں کی طرح آزاد ہوں رشتوں کی بندش سے
حیات و مرگ کے صحراؤں سے اُڑ کر گزرنے دو

لہو پی کر سنور سکتی ہو گلشن کی اگر مٹی
مَیں حاضر ہوں، اسے میرا لہو پی کر سنورنے دو

مسیحاؤ نہ چھینو مجھ سے میرے درد کی لذّت
ابھی کچھ اور نشتر میرے سینے میں اُترنے دو

مصوّر سبزواری

بَین کرتے رہے گم گشتہ زمانے اپنے
زخم دیکھے ہی نہیں درد پُرانے اپنے
اب کوئی جائے اماں ہی نہیں تا حدِ نظر
وقت نے ڈھونڈھ لیے سارے ٹھکانے اپنے
جس جگہ پھول صلیبوں پہ چڑھائے جائیں
ہم چلے آئے وہاں داغ دکھانے اپنے
دھوپ ہی کھینچ لی ساحل کے بدن سے تم نے
پری آئی تھی کوئی بال سکھانے اپنے
قتل نیندوں کا ہوا آنکھ میں جن کی تاعمر
وہی لوگ آئے یہاں خواب سُنانے اپنے
جشن پت جھڑ کا اکیلا ہی نہ رہ جائے کہیں
چلو ہم بھی چلیں ویرانے سجانے اپنے
راکھ میں ڈھلتا زرِ جسم بتاتا ہوگا
ہم نے مٹی میں ملائے تھے خزانے اپنے

محمد ابراہیم

کشمیر معاشیات کے آئینے میں

کشمیر کی قدرتی خوبصورتی نہ صرف جغرافیہ دانوں کو بلکہ عام لوگوں اور سیاحوں کو بھی اپنی طرف ملتفت کرتی ہے۔ کشمیر میں تازہ اُبلتے ہوئے ٹھنڈے پانی کے آبشار ہیں۔ حدِ نظر تک وادیٔ کشمیر پیراہنِ رنگین میں ملبوس اور قدرتی مناظر سے بھر پور نظر آتی ہے۔ گہرے اور نیلگوں تالاب اور بل کھاتی ہوئی جوان ندیاں، سفید و شفاف پانی سے لبریز چشمے، قدرتی مناظر میں چار چاند لگاتے ہیں۔ آسمان سے باتیں کرتے ہوئے یخ بستہ کوہ گراں ہیں جن پر برفانی غازہ اس طرح لگا ہے گویا برف پہاڑوں کے رخساروں پر بوسے رہا ہے۔ کشمیر کی قدرتی خوبصورتی اور دل کو موہ لینے والے دلکش مناظر عوام کو اپنی طرف کھینچتے ہیں۔ اسی لیے عرفِ عام میں کشمیر کو "مشرق کا سوئٹزرلینڈ" بھی کہا جاتا ہے۔

جغرافیائی پہلو

اگر اٹلس کے نقشے میں کشمیر کو دیکھا جائے تو ایسا معلوم ہوتا ہے گویا ہندوستان کے سر پر تاج جلوہ افروز ہے۔ کشمیر کا رقبہ ۸۴،۴۷۱ مربع میل ہے جس میں پہاڑی علاقے بھی شامل ہیں۔ وادیٔ کشمیر کا مقابلتاً چھوٹا رقبہ ہے جس کے پیچھے ایک لمبی اور پُرانی تاریخ ہے۔ اسی وادی نے بیرونی ممالک کے لوگوں کو اپنے کوہساروں اور سبزہ زار علاقے میں دعوتِ سکونت دی ہے۔ وادیٔ کشمیر کا رقبہ محض ۸۵ میل لمبا اور ۲۵ میل چوڑا ہے۔

کشمیر میں دو مشہور پہاڑوں کا سلسلہ ہے۔ ایک تو شمال میں ہے جس کو قراقرم کہتے ہیں اور دوسرا جنوب میں جس کو ہمالیہ اور زانسکر کہتے ہیں۔ ان دونوں پہاڑی سلسلوں کے درمیان سے دریائے سندھ نکلتا ہے۔ ہمالیہ کے جنوب میں ایک مشہور وادی ہے جس کو پیر پنجال کی پہاڑیوں نے محاصرے میں لے لیا ہے۔

جنوب مغرب میں پیر پنجال کا سلسلہ کشمیر کے بے حد زرخیز حصوں کو منقسم کر دیتا ہے۔ ایک تو شمال اور مشرق میں جہلم بیسن کہلاتا ہے اور دوسرا جنوب اور مغرب میں جموں کا میدانی حصہ کہلاتا ہے۔ وادیٔ جہلم کا نہایت اہم حصہ وادیٔ کشمیر کہلاتا ہے جس میں سارے کشمیر کی دو تہائی آبادی رہتی ہے۔ یہی وہ علاقہ ہے جو زرعی اور معاشی اعتبار سے بہت اہم ہے۔

جموں کے میدانی حصے کی عام طور سے اونچائی پیر پنجال کے جنوب اور مغرب میں ۱۱۰۰ سے ۴۰۰۰ فٹ تک ہے۔ یہ علاقہ عام طور پر دوسرے علاقوں کی نسبت زیادہ گرم رہتا ہے۔ جہلم بیسن کے شمال مشرق میں تبتی پہاڑیوں کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ یہاں کی آب و ہوا سرد رہتی ہے اور صحت بخش ہے۔ تبتی پہاڑی سلسلے آسٹر اور بلتستان گلگت کے کچھ حصوں میں ضم ہو جاتے ہیں۔ یہاں کے پہاڑی سلسلے عموماً بنجر رہتے ہیں جن پر برف باری ہوتی رہتی ہے۔ یہی برف باری آبپاشی کے لیے بہترین ذرائع بن جاتے ہیں۔

معاشی پہلو: کشمیر کے پہاڑوں اور میدانی علاقوں نے کشمیر کی معاشی ترقیات پر گہرا اثر ڈالا ہے۔ پہاڑی جنگلات نے بھی کشمیر کی معاشی حالت کو سدھارنے میں ایک اہم رول ادا کیا ہے۔ دیودار، چیڑ، پوپلر، ٹیک، اوک، چنار، فر اور پائن کے جنگلات کا لامتناہی سلسلہ معاشی خوشحالی کے لیے بے حد اہم رہے ہیں جنھوں نے کشمیر میں معاشی پہلو کو کافی حد تک خوشحال بنا دیا ہے۔ یہ سارے پہاڑی جنگلات ۲۰۰۰ سے ۹۰۰۰ فٹ کی بلندی تک پائے جاتے ہیں۔

جنگلات کی دولت کے علاوہ ریاست جموں اور کشمیر میں شہتوت کے درختوں کا بھی بہترین استعمال کیا گیا ہے۔ شہتوت کے پھل کے علاوہ ریشم کے کیڑے ان درختوں پر پال کر اپنی معاشی حالت کو بہتر بنانے میں مقامی عوام نے ایک ٹھوس قدم اُٹھایا ہے۔ اس طرح زرِ مبادلہ کمانے میں اور ریاست کی معاشی حالت درست کرنے میں وہاں کے کسانوں کا بہت بڑا حصہ ہے۔ نہ صرف کھیتی باڑی میں ہی بلکہ صنعت و حرفت میں بھی کشمیری عوام کا ایک اہم رول رہا ہے جس سے ریاست کی معاشی حالت پر ایک صحت مندانہ اثر پڑا ہے۔

صنعت و حرفت کی ترقی میں کشمیری عوام کا نمایاں کارنامہ رہا ہے۔ قالین، گبہ اور نمدہ کی صنعت بہت ترقی کر رہی ہے۔ کشمیری ریشم کے کپڑے اور ساڑیاں بہت مقبول ہیں۔ ریشم کی ساڑیوں کی صنعت بھی کافی ترقی پذیر ہے۔

قالین اور ریشمی کپڑوں کی صنعت کے علاوہ

کشمیر میں مٹی کے بہت عمدہ برتن بنتے ہیں۔ مٹی کے ڈنر سیٹ، چائے کا سیٹ اور اسی طرح کے برتن یہاں خوب بنتے ہیں۔ اُن پر عمدہ پالش سے وہ بہت خوبصورت لگتے ہیں۔ سیاحوں کو یہ برتن اور کانگڑی بیحد پسند آتی ہے اور وہ لوگ خوب ان کو خریدتے ہیں۔ کانگڑی مٹی کی ایک چھوٹی سی ہانڈی کی شکل کی ہوتی ہے جن کے اوپر بید کے جال بنے ہوتے ہیں۔ رنگ و روغن سے ان کو بہت دلکش بنا دیا جاتا ہے۔ کانگڑی میں آگ رکھ کر کشمیری عوام یا سیاح اپنے جسم کو تاپتے رہتے ہیں۔

کشمیر میں پنجسالہ پلان کے نفاذ سے تعلیمی ترقی خوب ہو رہی ہے۔ ریاست کے بجٹ کا تقریباً چھٹواں حصہ تعلیم پر خرچ کیا جا رہا ہے۔ بقیہ بجٹ پختہ سڑکیں بنانے میں، بجلی کی ترقیاتی منصوبے میں اور ریشم کے کاروبار پر استعمال کیا جا رہا ہے۔

زرعی پہلو

حالانکہ وادیٔ کشمیر میں ۸۰ فیصدی آبادی کھیتی باڑی میں مشغول ہے لیکن اس کے باوجود فصلوں کی پیداوار میں کمی ہوتی جا رہی ہے۔ اس کی مختلف وجوہات ہیں۔ اوّل تو آبپاشی کے لیے وقت پر پانی نہیں مل پاتا ہے۔ دوئم زراعت پر ٹیکس زیادہ لگنے کی وجہ سے وہاں کے کسان کھیتی میں زیادہ دلچسپی نہیں لیتے ہیں کیونکہ اُن کو زرعی پیداوار کچھ بہت زیادہ نہیں ملتی ــ مجموعی طور سے کشمیر کا رقبہ ۵۲ لاکھ ایکڑ ہے جس میں ۴۴ لاکھ ایکڑ زرعی اعتبار سے بالکل بے کار ہے۔ باقی آٹھ لاکھ ایکڑ کا چوتھائی حصہ ہی کھیتی کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ اس چوتھائی حصے کا دو تہائی وادیٔ کشمیر میں واقع ہے۔

کشمیری عوام کی مرغوب غذا چاول ہے۔ اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ چاول بذاتِ خود ایک عمدہ اناج ہے بلکہ دوسری اشیا کے مقابلے میں اس کی پیداوار دوگنی ہے۔ چاول کی کاشت ....، فٹ کی بلندی تک کی جا سکتی ہے۔ پہاڑی ڈھالوں پر بھی کھیتی کی جاتی ہے جس میں آلو، جَو، اور معمولی قسم کا گیہوں (جو جانوروں کو کھلانے کے کام آتا ہے) بویا جاتا ہے۔ جوار کی اہمیت چاول کے بعد آتی ہے۔ روزمرّہ کے استعمال میں جوار درمیانی طبقے کے لوگوں کی مرغوب غذا ہے۔ اس کے علاوہ گیہوں اور جَو کی بھی کاشت ہوتی ہے مگر اُس کا عام استعمال کم ہی ہوتا ہے۔

جھیلوں کی اپنی انفرادی اہمیت ہے۔ اُن میں کشتیاں چلائی جاتی ہیں جو وہاں کے مقامی لوگوں کا ذریعہ معاش ہے۔ مچھلیاں بھی پکڑی جاتی ہیں۔ تالابوں اور جھیلوں میں اُگی ہوئی قدرتی گھاس جانوروں کو کھلانے کے کام آتی ہے۔ پانی میں کھِلے ہوئے کنول اور کنول گٹے اور دوسری سبزیاں انسانوں کے استعمال میں آتی ہیں۔ جھیلوں میں سبزیاں اُگانے کا طریقہ بھی عجیب و غریب ہے۔ بانس کے پتواروں کو جوڑ کر اُن پر مٹی اور کھاد ڈالتے ہیں اور اُن میں سبزیاں بوتے ہیں۔ یہ پتوار پانی میں تیرتے رہتے ہیں۔ اُن کی بہت دیکھ بھال کرنی پڑتی ہے، کیوں کہ اُن کی چوری کا بہت ڈر ہوتا ہے۔ اِن سب چیزوں کی معاشی اہمیت کے علاوہ جھیلوں میں پڑی ہوئی خوبصورت ہاؤس بوٹ (وہ کشتیاں جن کو گھر کی طرح استعمال کیا جاتا ہے)، شکارے اور تیرتے ہوئے سبزیوں اور پھلوں کے باغات بہت خوبصورت مناظر پیش کرتے ہیں۔

تجارتی سبزیوں میں زعفران وادیٔ کشمیر کا نایاب و بیش قیمت تحفہ ہے۔ اس کو رنگنے یا خوشبو یا دواؤں میں استعمال کیا جاتا ہے۔ پام پور کا علاقہ زعفران کی کاشت کے لیے بیحد موزوں ہے۔ جس وقت زعفران اپنے شباب پر ہوتا ہے اور پھلتا پھولتا ہے، سارا علاقہ اُس کی بھینی بھینی دلکش خوشبو سے معطر ہو جاتا ہے۔

جب ذائقہ دار پھل جیسے سیب، آڑو، ناشپاتی شہتوت اور اسی طرح کے مختلف پھل پک کر تیار ہوتے ہیں تو ساری وادی ایک میٹھی خوشبو کے آغوش میں ہوتی ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ پھل اور پھول وادیٔ کشمیر کے دامن پر چاند اور ستاروں کی مانند جڑے ہوئے ہیں۔ جو ایک نئی نویلی دُلہن کی یاد تازہ کرتے ہیں۔ اِن کے علاوہ ہرے بھرے باغات اور سبزہ زار بھی کشمیر کے قدرتی حُسن میں اضافہ کرتے ہیں۔

بقیہ: سُہانے خواب سچی تعبیریں

آغوشِ تربیت ہی بچوں کی ذہنی نشوونما، کردار کی تشکیل اور شخصیت کی تعمیر میں معاون ثابت ہوتی ہے اگر وہ صحت مند رہیں گی تو بچوں کی جسمانی و ذہنی صحت بھی قائم رہے گی اس لیے ان پر آبادی کو محدود کرنے کی زیادہ تر ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ اگر بچے زیادہ ہوں تو ماں کی صحت پر اثر پڑے گا، اور وہ سب پر مناسب توجہ نہ دے سکے گی۔ اگر بچوں کی تعداد کم ہو تو ظاہر ہے کہ انھیں ماں کا دودھ میسّر ہوگا، اچھی غذا ملے گی اور بہتر تعلیم کا بندوبست ہوگا۔

موجودہ حالات اِس بات کے متقاضی ہیں کہ ہمیں اچھی اور خوشحال زندگی کے سپنے دیکھنے کا جہاں حق ہے وہاں خاندان کو محدود کرنے کی ذمہ داری بھی عائد ہوتی ہے۔ اس سے نہ صرف ہماری اپنی زندگی میں بلکہ ملک و قوم کے گلستان میں وہ بہاریں آ سکتی ہیں جن کی آرزو میں ہم اپنے شب و روز گزار رہے ہیں۔ یہی ہمارے سُہانے خوابوں کی سچی تعبیریں ہیں۔ ○

ل سجاد

ہندوستان میں مچھلیوں کی پیداوار

مچھلی سے کون واقف نہیں؟ مچھلی دُنیا کے تقریباً سبھی خطّوں میں پائی جاتی ہے۔ وجہ؟ یہی ہے کہ مچھلی کے لیے صرف اور صرف وافر پانی کی ضرورت ہوتی ہے اور جہاں وافر پانی ہوگا وہاں آبی پودے اُگیں گے۔ مچھلیوں کی غذائی ضرورت پوری ہو گئی۔ ازمنۂ قدیم سے انسان مچھلی کو کھاتا رہا ہے۔ مچھلی میں کافی حد تک پروٹین ہونے کے باعث یہ انسانی غذا میں اہم مقام رکھتی ہے۔ علاوہ ازیں وٹامن اے، وٹامن ڈی اور معدنی نمک ہوتے ہیں۔ مچھلی کھانے کے علاوہ کھاد اور تیل کے لیے بھی کارآمد ہے اور کھاتے وقت دسترخوان میں مچھلی کی موجودگی اس کی زینت بڑھا دیتی ہے اور دوسری سبزی و ترکاری کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی ہے۔ مچھلی پکڑنا اور اس کی تجارت آج کے ترقی پذیر ممالک کا محبوب مشغلہ ہے۔

مچھلیاں تقریباً سبھی آب و ہوا والے علاقوں (یعنی گرم و سرد اور معتدل) میں پائی جاتی ہیں۔ مچھلیوں کو دو درجے میں رکھا جا سکتا ہے۔

۱۔ کھارے پانی کی مچھلیاں اور ۲۔ میٹھے پانی کی مچھلیاں۔ مچھلیاں پلینکٹن، بحری اسپنج اور دوسرے آبی کیڑے و آبی پودے استعمال کرتی ہیں۔ سمندری غار میں یہ کثیر تعداد میں ہوتی ہیں کیونکہ انڈا دینے والا مقام محفوظ ہونا چاہیے۔ چھچھلے پانی میں مچھلیاں بہ نسبت گہرے پانی کے زیادہ پائی جاتی ہیں۔ ایسے علاقوں میں جو سرد گرم دھاراؤں کا ملن ہوتا ہے وہ علاقہ مچھلیوں کے لیے زیادہ بہتر ہوتا ہے۔

دنیا کی سب سے چھوٹی مچھلی پنڈا کا پگمی (Pandaka Pygmae) ہے جو فلپائن کے پانی میں ملتی ہے یہ ڈیڑھ سینٹی میٹر لمبی ہوتی ہے اور پورے شارک یعنی قطبی شارک دُنیا کی سب سے بڑی مچھلی ہے۔ مچھلیوں کی عمر ایک سے سو برس تک ہوتی ہے۔ گوبیز کی عمر ایک سال ہے جبکہ ہائٹ اسٹرجین مچھلیوں کی عمر سو سال تک ہوتی ہے۔ مرینیفیتہ مچھلی کے تراپی مادہ کے دیئے ہوئے انڈوں کو منہ میں سیتی ہیں۔ تلیپیا مچھلی میں بھی یہ صفت یعنی Incubation in mouth بدرجۂ اتم موجود ہوتی ہے۔ بعض مچھلیاں برقی سیرت رکھتی ہیں۔ ان میں اسکیٹ، برقی رے اور برقی ایل کے نام لیے جا سکتے ہیں۔ برقی رے (Electric ray) قابلِ قدر برقی کرنٹ پیدا کرتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کافی چھوٹی ہونے کے باوجود دشمنوں سے محافظت اور غذائی فراہمی کے وسیلے سے قدرت نے اسے مستفیض کیا ہے۔ آمیزن ندی میں پائی جانے والی مچھلیاں ... ۵ وولٹ کی برقی رو پیدا کرتی ہیں۔ اسکیٹ مچھلی اپنی طویل پتلی دُم سے جب کسی پر حملہ کرتی ہیں تو مار کی تاب نہ لا کر یعنی الکٹرک کرنٹ سے شکار مردہ یا بے ہوش ہو جاتا ہے۔ اور اس طریقے سے اسے غذا فراہم ہو جاتی ہے۔ کیٹ فش ۳۵۰ وولٹ کی بجلی کی رو پیدا کرتی ہیں۔

آپ سُن کر متحیر رہ جائیں گے کہ بعض مچھلیوں میں شعاعی غدود ہوتے ہیں اور یہ اپنی نوعیت کا پہلا جاندار ہے جس میں قدرتی طور پر روشنی پیدا ہوتی ہے۔ ایسی مچھلیوں میں لالٹین مچھلی (Lantern fish) اور آرکیٹائیر بلیکس خاص ہیں۔ گویا کہ مچھلیوں میں چند ایک حیرت انگیز خصوصیات موجود رہتی ہیں۔

ماہی گیری میں ہندوستان کا نمبر ساتواں ہے۔ گویا کہ جاپان، برما، یو۔ ایس۔ اے، سری لنکا، برطانیہ، ناروے سے بھی ہندوستان صرف پیچھے ہے۔ جاپان میں فی کس ۹۰ پونڈ، برما میں ۷۰ پونڈ فی کس مچھلی ہے۔ اور ہندوستان میں بھی چند علاقوں میں بہت زیادہ مچھلی استعمال کی جاتی ہے۔ یعنی کیرل میں ۲۱ پونڈ، تامل ناڈو میں ۷، ۱۲ پونڈ اور مغربی بنگال میں ۸، ۶ پونڈ، بہار میں صرف ۲۱ پونڈ استعمال کی جاتی ہے۔ ہندوستان میں بھی مچھلیاں کھارے اور میٹھے پانی سے حاصل کی جاتی ہیں۔ میٹھے پانی یعنی کہ ندیوں، جھیلوں، نہروں، تالابوں اور دیگر آبی ذرائع سے تقریباً ۴۰ اکونیمشل مچھلیاں پکڑی جاتی ہیں۔ گنگا، جمنا، کرشنا، کاویری، گوداوری، نرمدا، تاپتی، مہاندی وغیرہ سے زیادہ تر میٹھے پانی کی مچھلیاں پکڑی جاتی ہیں۔ ان میں زیادہ تر رہو، کتلہ، ملہا، پران، جھینگا (چنگڑی)، کارپ، تھنکر، پام کورٹ، مرل، ہیرنگ، ٹرانٹ وغیرہ پائی جاتی ہیں۔ تین تہائی میٹھے پانی کی مچھلیاں بنگال، آسام اور بہار سے مل جاتی ہیں کیونکہ ایسٹ زون میں سندربن کا ڈیلٹا، چلکا جھیل، مہاندی، کرشنا، گوداوری، گنگ جیسے میٹھے پانی کے ذرائع ہیں۔ بنگال و مدھیہ پردیش میں تالاب و پوکھر سے خوب مچھلیاں پکڑی جاتی ہیں

کھارے پانی کی مچھلیاں کارومنڈل، منارا، کاٹھیاواڑ، کونکن، کنارا، ملیبوٹ ساحل وغیرہ میں ملتی ہیں۔ ہمارے ماہی گیروں کو بہت سی سہولیات نہیں ہیں اس لیے وہ صرف ۱۰-۱۲ کیلو میٹر کے فاصلے تک پکڑنے جاتے ہیں۔ سمندری مچھلیاں کیرل سے تقریباً ۷ لاکھ ٹن، مہاراشٹر سے پونے دو لاکھ ٹن، تامل ناڈو سے ڈیڑھ لاکھ ٹن، کرناٹک سے سوا لاکھ ٹن حاصل ہوتی ہیں۔ اتنی مچھلیاں (تین تہائی سے بھی زیادہ) ان علاقوں :

(باقی صفحہ پر ۲)

عضا بھلے ہی جسم سے جاتے رہیں مگر معذوری نہ ہو

سمانی طور پر معذور افراد کے لیے روزگار کے مواقع

ایک وہ زمانہ تھا کہ اگر کوئی آدمی کسی
ر پر معذور ہوگیا تو یہ خیال کر لیا جاتا تھا کہ اب
زندگی میں ناکام ہے اور وہ کوئی کام انجام نہیں
ے سکتا۔ سماج اسے حقارت سے دیکھنے لگتا اور
آدمیوں میں اپنا وقار کھو لیتا تھا۔ مگر اب صورتحال
کل بدل گئی ہے۔ اب ہمارے دور کی سائنس اور
ی کمالات نے وہ مقام پیدا کر لیا ہے کہ اگر کوئی
سان جسمانی طور پر معذور بھی ہو جائے تو اس
ضائع شدہ عضو مصنوعی طور پر تیار کر کے اس کے
صب کر دیا جاتا ہے۔ دور حاضر میں معذور افراد
ے تئیں ہمارا نظریہ یکسر بدل گیا ہے۔ سرکار معذور
راد کے حسب حال انھیں کوئی نہ کوئی کام شروع
رنے کی ترغیب دیتی ہے، ان کی مدد کرتی ہے۔ ان
ی تربیت کا بندوبست کرتی ہے۔ یہ اقدامات محض
ری حکومت ہی انجام نہیں دے رہی ہے، بلکہ
یاستی حکومتیں بھی اسی طرح کی کوششوں میں مصروف
ظر آتی ہیں۔ معذور افراد کی ملازمتوں کے لیے ہر کارخانے
ور دفتر میں ان کا کوٹہ مقرر کر دیا گیا ہے۔ ان کی
وصلہ افزائی کے لیے متعدد اسکیمیں شروع کی گئی
یں۔ مقصد یہ ہے کہ معذور افراد سماج پر بوجھ نہ
نیں اور اقتصادی طور پر خود کفیل ہوں اور زندگی
ہ باوقار طریقے پر گزارہ کر سکیں۔ اس سے ان کے
قار کو دھکا نہیں پہونچے گا اور وہ سماج کے معزز اور
فتخر ارکان سمجھے جائیں گے۔ معذور افراد کو سماج
ے مفید اور باوقار رکن بنانا وقت کی اہم ضرورت
یقت کو پوری طرح ذہن نشین کیا جا
ے بے لوث طریقے پر انجام دیا جاتا ہے۔
عذور ہیں اور ہر ایک کی معذوری کس
اس بارے میں صحیح صحیح اعداد

شمار پیش کرنا دشوار ہے۔ ایک اندازے کے
مطابق دس افراد میں سے ایک معذور ہے۔ یہ خرد،
بھلائی، یا ذہنی کمی کا شکار ہے۔ ایشیائی اور
پیسفک ملکوں کی آبادی تقریباً ۲۵۰ کروڑ ہے،
جو ۵۰ ملکوں میں آباد ہیں۔ ان میں سے تقریباً
۲۵ کروڑ افراد معذور ہیں۔ زیادہ تر معذور افراد
دیہات میں ہیں اور کئی کی غور و پرداخت کے
محتاج ہیں، اندھاپن، سماعت سے محرومی،
جسمانی معذوری، کوڑھ، تپ دق، ذہنی کمزوری
وغیرہ معذوری کے اسباب ہیں۔

ہندوستان میں کون کس حد تک معذور ہے،
اس بارے میں صحیح صحیح اعداد و شمار دستیاب نہیں
ہیں، لیکن پھر بھی معذوروں کی تعداد کم نہیں۔
ان کی غور و پرداخت ضروری ہے۔ ۱۹۸۱ء کی مردم
شماری کے دوران مختلف طریقے سے حاصل کردہ معلومات
کی بنا پر اندھے افراد، یا گونگے یا معذور افراد کی
تعداد کا گوشوارہ اس طرح ہے:۔

اندھے	"	۴۷۸۶۵۷
جسمانی طور پر مکمل معذور	"	۴۶۳،۲۰۰
پوری طرح گونگے	"	۲۷۲،۶۹۱

یہ اعداد و شمار ایسے افراد کا پتہ دیتے ہیں جن کے
دونوں بازو جاتے رہے یا جن کی دونوں ٹانگیں جاتی
رہیں۔ اعداد و شمار فراہم کرنے میں یہ خیال رہا ہے
کہ ہاتھ پیر بھلے ہی جسمانی طور پر غائب نہ ہوئے
ہوں، لیکن وہ کام کے لائق نہیں ہیں۔

ملک میں بڑھتی ہوئی بے روزگاری کے سبب،
جسمانی طور پر معذور افراد کے لیے روزگار کے
مواقع کم ہیں۔ اس پس منظر میں معذور افراد کی
بحالی اور ان کے لیے کام کی فراہمی ایک بڑا مسئلہ ہے۔
اس عظیم کام کو سچے دل سے اور پوری لگن سے انجام دینا ہوتا
معذور افراد کے دل سے عدم تحفظ کا احساس ختم کیا جا سکے۔

معذور افراد کی بحالی کے لیے اقدامات

الگ سے دفاتر روزگار

روزگار کے قومی پروگرام کے تحت قائم شدہ
مختلف دفاتر روزگار بالعموم معذور افراد کی بحالی کی ذمہ
داری سنبھالتے ہیں، لیکن اس کام کی اہمیت کے پیش نظر
جسمانی طور پر معذور افراد کی بحالی کے واسطے خصوصی
نوعیت کے دفاتر روزگار قائم کیے گئے ہیں۔ یہ دفاتر
معذور افراد کی معذوری کو ذہن میں رکھتے ہوئے
ان کے لیے ایسا کام فراہم کرانے کی کوشش کرتے ہیں
جس سے کہ ان کی معذوری ان کے کام میں حارج نہ ہو۔
اس وقت ملک میں ۲۲ خصوصی دفاتر روزگار کھولے
گئے ہیں۔ یہ دفاتر احمد آباد، اگرتلہ، بڑودا، بنگلور،
بمبئی، بھونیشور، سورت، کلکتہ، چنڈی گڑھ، دلی،
گوہاٹی، حیدرآباد، جبل پور، جے پور، کانپور، راجکوٹ،
شملہ، لدھیانہ، مدراس، پٹنہ، اور امپھال میں کھولے
گئے ہیں۔ مختلف کاموں میں معذور افراد کی بحالی کے
لیے یہ خصوصی دفاتر روزگار معاون ہیں۔ ہر کام کی ضرورت
اور تقاضے کے پیش نظر آدمی کا انتخاب کیا جاتا ہے اور
اُسے نفع بخش کام دلانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ ایسا
کرتے وقت مندرجہ ذیل باتوں کو دھیان میں رکھنا پڑتا ہے۔

۱۔ صلاحیت کی بنیاد پر ملازمت کی نشاندہی۔

۲۔ انفرادی انداز نظر۔

۳۔ معذور افراد کی بحالی کے تئیں مثبت انداز نظر۔

۴۔ بحالی سے قبل معذوری دور کرنے کی کوششیں۔

۵۔ تربیت اور ہنرمندی پیدا کرنے پر زور۔

سردست یہ دفاتر روزگار اندھوں، بہروں اور جسمانی
طور پر معذور افراد کی امداد کرتے ہیں۔ وزارت امور صحت
نے کہا ہے کہ کوڑھ کے مرض سے پیدا شدہ معذور افراد
کی بحالی پر بھی دھیان دیا جائے۔ ان مراکز پر اب
جذام کے سبب معذوری رکھنے والے افراد کی
رجسٹریشن بھی ہونے لگی ہے تاکہ ان کی بحالیاتی سرگرمیاں
کو آگے بڑھایا جائے۔

Published by the Director, Publications Division, Patiala House, New Delhi-110001
Printed by Skylark Printers, 11355, Id-Gah Road, New Delhi-110055

یوجنا

۱۶ تا ۳۱ مئی ۱۹۸۴ء

ایک روپیہ

پہلا ہندوستانی — روسی خلائی مشن

(ڈاکٹر اقبال محی الدین)

منصوبہ بندی کیوں۔

(پی۔ آر۔ دوبھاشی)

تعلیم کے بارے میں مسز اندرا گاندھی کا نظریہ

ہمارے دیش میں عورتوں کی تعلیم کو، بڑھاوا دینے کی خاص ضرورت ہے۔ تعلیم کی کمی عام طور سے محسوس کی جاتی ہے لیکن خاص طور سے مسلمانوں میں عورتوں کی تعلیم کی طرف زیادہ توجہ دینی چاہیئے۔ ہمارے سماج کا موجودہ تانا بانا ایسا ہے کہ اس کی وجہ سے عورتوں پر زیادہ ذمہ داریاں ہیں۔ عورتوں کو گھر کی دیکھ بھال بھی کرنی پڑتی ہے اور بچوں کی پرورش اور تربیت کے کام بھی کرنے پڑتے ہیں۔ اس کے علاوہ آجکل گھر کے اندر اور گھر کے باہر اور بہت سے کاموں میں شریک ہونا پڑتا ہے۔ ایک بے پڑھی لکھی عورت، مجبور ہو کر اپنے ماں باپ، شوہر اور اولاد کی محتاج بن کر رہتی ہے! ایسی حالت میں اس کی زندگی خود اس کے لیے بیجا بوجھ معلوم ہونے لگتی ہے۔ تعلیم کے ذریعے، اس میں اپنی عزت کا احساس پیدا ہوتا ہے اور اس لیے کام کے بہت سے دروازے کھلتے ہیں۔ وہ جسمانی محنت کے کام کر سکتی ہے۔ اور پیشہ ورانہ زندگی میں، قابل تعریف کام کے ذریعے نام پیدا کر سکتی ہے۔ وہ اپنی دماغی قوتوں اور اچھائیوں کی وجہ سے اپنی شخصیت کو منوا سکتی ہے۔ تعلیم حاصل کرنے کے بعد، اگر وہ گھریلو زندگی بسر کرنا پسند کرتی ہے تو وہ اپنی اولاد کی اچھے طریقے سے رہنمائی کر سکتی ہے اور اپنے خاندان کے لوگوں کے لیے مختلف طریقوں سے مددگار ثابت ہو سکتی ہے۔ آپ سب نے یہ مشہور کہاوت ضرور سُنی ہوگی کہ ایک لڑکے کو پڑھانے کا مطلب ایک شخص کو پڑھا دینا ہے اور ایک لڑکی کو پڑھانے کا مطلب ایک خاندان یا ایک نسل کو پڑھا دینا ہوتا ہے۔

تعلیم ہمارے سماج کے ہر طبقے کے لیے لازمی اور ضروری ہے۔ ہم سب کی برابر ترقی کے لیے، سب کا تعلیم یافتہ ہونا ضروری ہے۔ ترقی کے لیے تعلیم سے زیادہ کوئی اور کامیاب ذریعہ نہیں ہے۔ تعلیم سب کا پیدائشی حق ہے اور ہر مرد اور عورت کو اس کو حاصل کرنے کا حق ہے۔ آجکل نظریۂ تعلیم میں برابر تبدیلی اور پھیلاؤ پیدا ہو رہا ہے۔ تعلیم کے ذریعہ علم اور عمل میں گہرا ربط پیدا ہونا چاہیئے جو علم حاصل کیا جائے اس کو زندگی میں استعمال کیا جائے۔ اس علم کے ذریعہ زندگی کے مسئلوں کو حل کیا جائے۔ اس کی مدد سے صورتِ حال کے ساتھ، خواہ وہ کتنی ہی نازک اور پیچیدہ کیوں نہ ہو، سمجھوتہ کرنا چاہیئے۔ ہاں ایسا کرتے وقت اپنے تمدنی ورثہ کی حفاظت کا پورے طور پر خیال رکھا جائے۔ ہمیں اپنے دیش کے تہذیبی اور تمدنی ورثہ پر فخر کرنا چاہیئے۔ ہمیں یاد رکھنا چاہیئے کہ تعلیم ٹوٹے ہوئے دلوں کو جوڑتی ہے اور بچھڑے ہوؤں کو ملاتی ہے اس کا کام تعمیر ہے، تخریب نہیں۔ تاریخی اعتبار سے مختلف زمانوں کو مختلف مذہبوں کے نام سے پکارنا دُرست نہیں ہے۔ جن فنکاروں اور دستکاروں نے مل کر نئی دلی کو بنایا تھا، وہ ان ملکوں کی اولاد ہیں جنھوں نے اپنے زمانے میں سورج کنڈ اور جامع مسجد کی تعمیر کی تھی۔ وہ اپنے زمانے کے مختلف مذہبوں کے ماننے والوں میں سے تھے۔ تعلیم کا مقصد، خاص طور سے اسکولی تعلیم کا مقصد سوجھ بُوجھ والی شخصیتوں کا بنانا ہوتا ہے اور اس قسم کی شخصیتیں اس وقت بن سکتی ہیں جبکہ ہمارے سامنے ہماری تمدنی روایات کا صحیح اور قابلِ قبول تصوّر ہو، اور اس کی روشنی میں پڑھنے پڑھانے کا ماحول پیدا کیا جائے۔

ہندوستان کا پانچ ہزار سال پُرانا تہذیبی اور تمدنی سرمایہ، ہمارے دیش کے ہر مذہبی طبقے کے لوگوں کی دین ہے۔ تہذیب کے کسی ایک حصّے کو بھی مذہبی طبقہ یہ نہیں کہہ سکتا ہے کہ یہ صرف تنہا اسی کی دین ہے۔

ہم ترقی کی راہ میں اکیسویں صدی کے قدموں کی آمد کی آواز سن سکتے ہیں۔ ہمیں تعلیم کے ذریعے ان تمام مسئلوں کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہونا چاہیئے جو آئندہ زندگی میں پیش آسکتے ہیں۔ انسانوں کی تکنیکی قوتوں کی، ہمیں اور دوسری قوموں کو بہت ضرورت ہے۔ تکنیکی سماج کے مطالبوں میں روز بروز تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے۔ اس لیے کہ ہمارے قومی سرمایہ کے نظم و نسق کا کام برابر پھیلتا جا رہا ہے اور اس میں خاطر خواہ ترقی ہوئی ہے۔ ہمارے تکنیکی نوجوانوں کی تعداد میں اس لحاظ سے ترقی ہونی چاہیئے، تاکہ ہم خود اپنی تکنیکی ضرورتوں کو پُورا کر سکیں۔

تعلیم صرف اس لیے نہیں دی جاتی کہ اس کے ذریعے چند جسمانی، پیشہ ورانہ اور دماغی مہارتوں میں چمک دمک پیدا ہو جائے۔ تعلیم دراصل روحانی ترقی کا ایک عمل ہے۔ ہمارا سماج بالکل سیکولر سماج ہے سیکولر محض مادی لحاظ سے نہیں، بلکہ اس اعتبار سے بھی سیکولر ہے کہ یہاں ہر شخص اور جماعت کے مذہبی عقیدوں کا احترام کیا جاتا ہے۔ ہر شخص کو اپنے عقیدے اور طریقے کے مطابق عبادت کا حق حاصل ہے۔ میرے خیال میں تعلیم کو مسلم تعلیم، ہندو تعلیم یا عیسائی تعلیم کے نام سے پکارنا دُرست نہیں ہے۔ ہر شخص کو مذہبی تعلیم حاصل کرنے کا اختیار ہے اور بعض اخلاقی اور رُوحانی خوبیاں اپنے مذہب کے مطابق، اپنے بچوں کو ذہن نشین کرانا ضروری ہے۔ لیکن تعلیم کی بنیاد قومی ضرورتوں اور اونچے خیالوں کو بنایا جائے، تو اچھا ہے۔ مُسلمانوں کے تعلیمی اداروں کی فطری طور پر یہ خواہش ہونی چاہیئے کہ ان کے طلبا اسلام سے متعلق زیادہ سے زیادہ تعلیم حاصل کریں۔ یہ خواہش بُری نہیں ہے، لیکن اس کے ساتھ ساتھ ہمارے تمام بچوں کو دُنیا کے دُوسرے مشہور مذہبوں کو بھی پڑھایا جائے اور انھیں یہ سمجھایا جائے کہ پڑھنے سے ہی پڑھنے کا شوق پیدا ہوتا ہے۔ اس میں جتنا اضافہ ہو سکے، کیا جائے۔ خود حضرت محمدؐ نے علم حاصل کرنے کو فرض قرار دیا ہے۔

یہ آپ کی اس ہدایت کا صدقہ ہے کہ دَورِ جہالت میں مسلمانوں نے سائنس اور تمدنی میدانوں میں

(باقی ص۱۹۱ پر)

اِس شمارے میں

منصوبہ بندی اور ترقیاتی پروگراموں کی جھلک پیش کرنے والا

پندرہ روزہ

یوجنا

نئی دہلی

چیف ایڈیٹر	آر۔ ٹھکرال
ایڈیٹر	لکھی رام رانا
اسسٹنٹ ایڈیٹر	محمد عادل صدیقی
سب ایڈیٹر	وسیم حیدر

جلد ۱۴	۱۶ تا ۳۱ مئی ۱۹۸۴ء	شمارہ: ۴

۲۶ بیساکھ تا ۱۰ جیٹھ شک سمبت ۱۹۰۶ ٭ فون نمبر ۳۸۷۳۴۱

شرح چندہ سالانہ ۔ ۲۰ روپے، دو سالہ ۔ ۳۵ روپے
سہ سالہ ۔ ۵۰ روپے، فی کاپی ۔ ایک روپیہ
طالب علموں، اُستادوں اور لائبریریوں کے لیے ۱۰ فیصد کی رعایت

یوجنا منصوبہ بندی کے بارے میں عوام کو آگاہ کرتا ہے، مگر اس کے مضامین صرف سرکاری نقطۂ نظر کی وضاحت تک ہی محدود نہیں ہیں

بزنس منیجر: ایل۔ آر۔ بترہ ٭ اسسٹنٹ ڈائرکٹر (پروڈکشن) کے۔ آر۔ کرشنن

مضامین سے متعلق خط و کتابت کا پتہ:-

ایڈیٹر "یوجنا" (اردو) پبلیکیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس
نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

ترسیلِ زر کا پتہ:-

بزنس منیجر، پبلیکیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس
نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

اداریہ

ہمارے سائنس داں اور ان کی ذمہ داریاں

جواہر لال نہرو اور ڈاکٹر ہومی بابا نے ہندوستان میں ایسی نیوکلیر صلاحیت کے فروغ پر زور دیا تھا جس کے ذریعے ملک کو خودکفیل بنایا جاسکے اور جس کا منبع اور ماخذ اندرونِ ملک حاصل ہونے والے وسائل ہی ہوں۔ اس کے ساتھ ہی انھوں نے اس بات پر بھی مسلسل زور دیا کہ ہندوستان میں نیوکلیر توانائی کا استعمال پُرامن مقاصد کے لیے ہوگا۔ چنانچہ پہلے پہل غیر ملکی امداد سے تاراپور اور کوٹا میں نیوکلیر ری ایکٹر قائم کیے گئے۔ ہندوستان میں ۱۹۷۴ء میں پہلے پُرامن نیوکلیر تجربے کے بعد کینیڈا نے امداد سے ہاتھ کھینچ لیا اور اب ہندوستان کو اپنے طور پر ہی آگے بڑھنا پڑا۔ چنانچہ کلپکم کا بجلی گھر خودکفیلی کی اس راہ پر ایک اہم سنگِ میل ہے۔

اس سے واضح ہوگیا کہ ہندوستانی سائنسداں اور ماہرینِ ٹیکنالوجی انتہائی پیچیدہ نوعیت کے سائنسی کارنامے انجام دے سکتے ہیں۔ تاہم اس طرح کے چھوٹے بڑے کام انجام دینے کے باوجود ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ ہم کلی طور پر جدید اور ترقی یافتہ اقوام کی فہرست میں آگئے ہیں۔ سائنس کے فروغ کی بدستور ضرورت ہے اور اسے ہماری قومی زندگی اور ہماری جدوجہد کے ہر دائرہ کار میں شدومد سے داخل ہونا ہے۔ بصورتِ دیگر ملک میں عدم توازن کو فروغ ملے گا۔ یہ عدم توازن بالکل اسی صورت سے دیکھنے کو ملے گا جس طرح سے کہ پچھلے دو سو برسوں میں مختلف ملکوں کے مابین دیکھنے کو ملا ہے۔ ایسی صورتِ حال مقابلتاً طاقتور لوگوں کو فائدہ پہونچاتی ہے اور غریبوں کی زندگی میں دشواریاں پیدا کرتی ہے۔ سائنس سماجی انصاف لانے میں ممد و معاون ثابت ہوئی ہے۔ سائنسدانوں کو ہندوستان کے ترقیاتی عمل کو آگے بڑھانے میں سرگرم حصہ لینا ہے۔ انھیں صرف آج کے بارے میں ہی نہیں بلکہ کل کے بارے میں بھی سوچنا ہے۔ سب سے پہلی بات یہ ہے کہ انسانوں کے لیے خوراک، مویشیوں کے لیے چارہ اور صنعتوں کے لیے ایندھن نیز عوامی صحت کے لیے طبی خدمات مہیا کی جائیں۔ ان تمام خدمات کی فراہمی میں سماج کے کمزور طبقوں کا خاص خیال رکھا جائے۔ مگر ان ذمہ داریوں کو نبھانا تو اس طویل سفر کا آغاز ہی کہا جاسکتا ہے جو ملک کو ترقی یافتہ ملکوں کی صف میں لانے کے لیے کی جانی ہیں۔ اس سلسلے میں دیہی عوام کی رہنمائی خاص اہمیت رکھتی ہے۔ ان میں ایسا شعور بیدار کرنا ہے کہ ضائع ہونے والی ہر شئے کو کارآمد بنا سکیں۔ ہر خطّے میں گھریلو صنعتوں کو فروغ دینا ہے۔ بحساب فی کس پیداوار بڑھانی ہے۔ علاوہ ازیں دیہی علاقوں میں ایندھن اور انرجی کی بڑھتی ہوئی ضرورتوں کو پورا کرنا ایک سب سے بڑا چیلنج ہے۔ چنانچہ انرجی کے قابلِ تجدید وسیلوں کو فروغ دینا سائنسدانوں کی بڑی ذمہ داری ہے۔ انھیں انرجی کی فراہمی پر آنے والے اخراجات کو بھی قابو میں رکھنا ہے۔ حالات کا تقاضہ یہ ہے کہ رقوم کو سوچ سمجھ کر صرف کیا جائے۔ ہمیں ایسے علوم اور تحقیقی سرگرمیوں پر ہی سرمایہ کاری کرنی چاہیئے جن کا فائدہ براہِ راست عوام کو پہونچے۔ اس لحاظ سے تحقیقی سرگرمیوں کو سوچ سمجھ کر منتخبہ بنیادوں پر آگے بڑھانا ہے۔ سائنسدانوں کو تغذیہ بخش خوراک کی فراہمی، پبلک ہیلتھ، تعلیم، زراعت، آبرسانی، کوئلہ، پٹرولیم، بجلی، ٹرانسپورٹ، انجینئرنگ، دفاعی صنعتوں اور روزگار دلانے والی مختلف صنعتوں کے تئیں نئے اندازِ نظر سے کام لینے کی ضرورت ہے۔ ترجیحات کا اندازہ ان کے لیے مخصوص کردہ رقومات کی بنیاد پر نہیں کیا جانا چاہیئے بلکہ اس کے لیے ان کی افادیت بھی پیشِ نظر ہونی چاہیئے۔ بلاشبہ حکومت کا فرض ہے کہ وہ عوام کے فوری مسائل پر توجہ دے لیکن وہ بنیادی سائنس کو کسی بھی طریقے سے نظرانداز نہیں کر سکتی کیونکہ یہی تو ترقی یافتہ ٹیکنالوجی کے لیے بنیاد فراہم کرتی ہے، اسی کے بل بوتے پر مستقل طور پر عوام کو بہتر زندگی میسر آسکے گی۔ سائنس کے انتہائی جدید شعبوں میں مثلاً ایٹمی توانائی، خلا، بایو ٹیکنالوجی، مائکرو الیکٹرانکس، بنیادی تحقیق وغیرہ میں سائنس کے ماہرین کے مشوروں پر عمل کرنا ایک لازمی امر ہے کیونکہ اس کے سوا اور کوئی چارۂ کار نہیں، لیکن ان تمام شعبوں میں نوجوان نسل کے سائنس دانوں کو شریک کرنا اس طریقِ عمل کو اور زیادہ بامعنی اور مفید بنا سکتا ہے۔ کوئی بھی پراجیکٹ ہو اس کا کسی نہ کسی انداز میں کسی دوسرے پراجیکٹ سے ضرور تعلق ہے اور اس کے ساتھ ہی نوجوان سائنسدانوں کی شرکت ضروری ہے۔

لہٰذا سائنس دانوں کو محض اپنے مخصوص شعبے یا اپنے ہی پراجیکٹ کے بارے میں نہیں سوچنا ہے بلکہ ان کا اندازِ فکر ایسا ہو جس سے دوسرے پراجیکٹوں کے ساتھ تال میل میں آسانی رہے۔ سائنس دانوں کو منصوبہ بندی سے زیادہ دلچسپی لینی چاہیئے کیونکہ منصوبہ بندی قومی مسائل کے حل میں سائنس اور عقل کے استعمال کو دعوت دیتی ہے۔ ساتویں منصوبے کو تشکیل دیتے وقت سائنسدانوں کا تعاون اسے مبنی برحقیقت بنا سکتا ہے۔ ساتویں منصوبے میں زراعت اور صنعت کو جدید ترین لائنوں پر لانے کے لیے سائنس دانوں کے مشورے خاص طور پر اہم ثابت ہوں گے۔ ان سے دورِ حاضر کے چیلنجوں کا بآسانی مقابلہ کیا جاسکتا ہے۔

(ایڈیٹر)

پی۔ آر۔ دوبھاشی



منصوبہ بندی کیوں؟

منصوبہ بندی دورِ حاضر کا ایک ایسا طریق کار ہے جو سائنسی انداز نظر پر مبنی ہے اور جو مستقبل کے باقاعدہ انتظامات کی ضرورت اور حکمت عملی کو واضح کرتا ہے۔ یہ توہمات پر عقل و دانش، ناواقفیت اور جہالت پر مفاہمت اور تعصبات کی بے بسی پر منظم پیش قدمی کی فتح کی نقیب ہے۔

برٹرنڈ رسل نے اس صدی کے آغاز میں کہا تھا کہ اب ہم سب سوشلسٹ ہیں۔ اس سے بھی کہیں زیادہ جواز کے ساتھ پچھلے ۲۵ برسوں کے دوران ہم کہہ سکتے ہیں کہ اب ہم منصوبہ بندی کو اپنائے ہوئے ہیں۔ ممکن ہے کہ ابھی بہت سے لوگ ایسے ضرور ہوں، جو خود کو سوشلسٹ نہ کہیں، لیکن وہ کسی بھی طرح خود کو منصوبہ ساز کہنے سے نہیں ہچکچائیں گے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ منصوبہ بندی جدید سائنسی عہد کے طریقوں کے ہم معنی ہو گئی ہے۔ منصوبہ بندی اپنے اس مفہوم سے یہ واضح کرتی ہے کہ اس کا تعلق مستقبل کے باقاعدہ انتظامات سے ہے۔ منصوبہ بندی کے تحت مستقبل پر اثر انداز ہونے والی قوتوں کو سوجھ بوجھ کے ساتھ سمجھا ہے اور مستقبل کو محض حالات کے آثار چڑھاؤ کے تابع ہونے نہیں دیا جاتا ہے۔ اس طرح مستقبل کے انتظامات کے عمل کو آسان بنانا ہوتا ہے۔ اپنے مقاصد اور امنگوں نیز آرزوؤں کی تکمیل کی خاطر مستقبل کے یہ انتظامات ضروری ہوتے ہیں۔

منظم پیشقدمیوں کی فتح

منصوبہ بندی کے تحت قوت ارادی سے کام لینا ہوتا ہے مگر ماحول کے آگے ہتھیار ڈالنا نہیں ہوتا۔ اس مفہوم کے ساتھ منصوبہ بندی توہمات پر عقل و دانش، ناواقفیت پر مفاہمت کی بالادستی اور تعصبات کی بے بسی پر منظم پیشقدمی کی نقیب ہوتی ہے۔

جدید ٹیکنالوجی اور تنظیمی امور کے باعث انسان کی اُن حالات کو سمجھنے کی صلاحیت بڑھی ہے، جو اس کی زندگی پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ ان کے باعث وہ ان عوامل کا جائزہ لے سکتا ہے جو اس کی زندگی کے بنانے میں معاون ہیں۔ اسی لیے منصوبہ بندی ٹیکنالوجی اور تنظیمی امور کے تابع ہو کر رہ گئی ہے۔

اس لیے آج کے دور کے ہر انسان یا افراد باتنظیم سے یہ بجا طور پر توقع کی جاتی ہے کہ وہ مستقبل کی منصوبہ بندی کریں۔ اس لحاظ سے جدید سماج اور دورِ حاضر کی معیشت میں منصوبہ بندی ایک خاص مفہوم رکھتی ہے۔ جس حد تک کوئی سماج اس طرح کی منظم کارروائیوں کو اپنی معاشی زندگی کا جزو بنا لیتا ہے، اسی قدر وہ سماج اور ترقی پذیر ہو جاتا ہے۔

جے۔ کے۔ گیلبریتھ نے اپنی کتاب نئی صنعتی ریاست The New Industrial State میں صنعتی سماج میں منصوبہ بندی کی اہمیت واضح کی ہے۔ سامان کی تیاری اور خدمات کی فراہمی کے عمل کے دوران جدید ترین ٹیکنالوجی کا استعمال وقت کی بڑی ضرورت ہے۔ اس کے لیے بڑے پیمانے پر وسائل کی تخصیص درکار ہے۔ ایسا کرنے سے قبل باریک بینی کے ساتھ تحقیق کی ضرورت ہے۔ یہ جدید تکنیک نہ صرف سامان کی تیاری اور خدمات کی فراہمی کے عمل میں درکار ہے بلکہ اشیاء کی فروخت کے نظام میں بھی اس کی ضرورت ہے۔

بوشیت کے الفاظ میں "نئے تقاضوں کے سامنے آنے سے بہت پہلے اُن طریقوں پر غور اور تحقیق کی ضرورت ہے جن سے انھیں پورا کیا جا سکے۔ اس سلسلے کی تحقیق کے نتائج سامنے آنے میں تقریباً ۵ سال لگ سکتے ہیں۔ مغربی ممالک کے مستقبل کے اندازوں اور پروگراموں کی بنیاد ازجی پر ہے۔ یہ عمل گزشتہ بیس برس سے چلا آرہا ہے۔ معمول کے مطابق قیمتوں پر ازجی کی فراہمی کا انحصار پچھلے پندرہ سال سے چلی آرہی سرمایہ کاری پر ہے۔ سرمایہ کاری میں اضافے کی ضرورت اور شعبوں میں بھی محسوس کی گئی ہے۔ مثلاً کیمیاوی صنعتوں اور دیگر توسیع پذیر صنعتوں میں اس ضرورت کو محسوس کیا گیا ہے۔

جدید انتظامیہ کی تکنیک

منصوبہ بندی کسی بھی کارخانے کی کامیابی کا پاسپورٹ ہے۔ یہ جدید ترین انتظامیہ کی سب سے

پہلا اور اہم تکنیک ہے منصوبہ بندی کی عدم موجودگی کا مطلب ہے تیاری کا فقدان اور اس کا نتیجہ ہے ناکامی۔ ترقی میں مختلف عوامل کا ایک دوسرے پر انحصار ہوتا ہے، اس لیے قومی اور بین الاقوامی سطح پر اندازے لگائے جاتے ہیں۔ ان اندازوں کو واحد فرموں یا معیشت کے سیکڑوں تک محدود نہیں کیا جا سکتا بلکہ عالمی پس منظر میں ان کو دیکھنا ہوتا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ منصوبہ بندی کا مفہوم ماہرین منصوبہ بندی کی نظر میں اتنا کچھ نہیں ہے۔ منصوبہ بندی ماضی میں اختلافی موضوع رہا ہے اور یہ آج بھی اختلاف رائے کا موضوع ہے کیوں کہ ماہرین اقتصادیات، سماجی مفکر اور پالیسی ساز منصوبہ بندی سے کچھ اور مطلب سمجھتے ہیں۔ ان کی رائے میں منصوبہ بندی وہی ہے جو افراد یا نجی اداروں کی منصوبہ بندی کی جگہ ریاستی سطح کی منصوبہ بندی ہو۔ منصوبہ بندی ایک ایسا اقتصادی نظام ہے جو معیشت کے آزادانہ نظام اور انفرادی اعمال میں مداخلت سے احتراز کا متبادل ہے۔

ریاست کے ذریعے منصوبہ بندی کا مقصد یہ ہے کہ انفرادی یا پرائیویٹ اداروں کے فیصلوں پر اثر انداز ہوا جائے اور ان کو نئی سمتیں دی جائیں۔ ان فیصلوں کو صارفین، مال تیار کرنے والوں اور محنت کشوں کے مفاد کے تحت اس طرح نئی سمتیں ملنی چاہئیں کہ اُن سے وہ مقاصد حاصل ہو سکیں جنھیں منصوبہ سازوں نے پہلے ہی سے طے کر رکھا ہے۔ اس مفہوم کے ساتھ منصوبہ بندی ماہرین اقتصادیات کا طرح طرح کا ایسا پسند خاطر مجموعی نظام ہے جو سماجی مصلحین اور مختلف مکاتب فکر کی حامل پارٹیوں اور مختلف ازم اور سیاسی، اقتصادی نیز سماجی نظاموں کے مابین اختلاف رائے کا موضوع بنتا ہے۔

لہٰذا اس امر کے باوجود کہ منصوبہ بندی مختلف مکاتب فکر کے ماننے والوں کے درمیان ایک مرغوب اور پسند خاطر عمل ہے، منصوبہ بندی سے ان سب کی مراد ایک سی نہیں ہے۔ منصوبہ بندی کے جس قدر مکتب ہائے فکر ہیں، اسی قدر اس کے تصورات اور مفاہیم بھی ہیں۔

ایک مکتب فکر وہ ہے جو کہ اس بات میں یقین رکھتا ہے کہ یہ نظام سرمایہ داری نظام کی خامیوں پر قابو پانے میں مددگار ہے۔ وہ منڈی کے معاشی نظام کی بنیادی حقیقتوں کو جوں کا توں بنائے رکھنے کے حق میں ہے اور اسی میں اس کا یقین ہے۔ وہ منصوبہ بندی کو محض منڈی کی معیشت کو درست کرنے کے لیے کام میں لانا چاہتا ہے۔ وہ اس معاشی نظام کو ختم نہیں کرنا چاہتا بلکہ اسی میں اصلاح و بہتری لانا چاہتا ہے۔ اس طرح اس کے سامنے اہم مقصد ہے کہ منصوبہ بندی کو منڈی کے نظام کے ساتھ مربوط کر دیا جائے۔

اس کے برعکس سوشلسٹ چاہتے ہیں، کہ منڈی کے معاشی نظام کو ختم کیا جائے اور پیداوار کے نجی ذریعوں کو ختم کر دیا جائے۔ ان ذرائع پر سماجی کنٹرول ہو۔ منصوبہ بندی کے ذریعے پیداوار کے ان ذرائع کا جن پر سماج کا کنٹرول ہے، نظم و نسق کیا جائے۔

غریبی کا چکر ختم کرنے کی کوشش

ترقی پذیر ملکوں میں منصوبہ بندی کے ذریعے غریبی کے چکر کو ختم کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ وہ جلد سے جلد اقتصادی ترقی اور سماجی تبدیلی لانے کے حق میں ہیں۔

لہٰذا منصوبہ بندی کس نوعیت کی ہو، اس کا مفہوم کیا ہو، اس کا انحصار اس مکتب فکر سے ہے جہاں کہ منصوبہ بندی لاگو کی جا رہی ہو۔ منصوبہ بندی خواہ کہیں پر کوئی بھی مفہوم کیوں نہ رکھتی ہو، ایک نقطہ پر ضرور متفق ہے اور وہ ہے کہ مستقبل کے لیے باقاعدہ نظم و نسق۔ مختلف لوگ، مختلف مفاہیم کے ساتھ منصوبہ بندی کی افادیت کے قائل ہیں لیکن ایک ایسا بھی طبقہ ہے جو منصوبہ بندی میں یکسر یقین نہیں رکھتا، جو یہ سوچتا ہے کہ معاشی وسائل کا منصوبہ بندی کے ذریعے نظم و نسق ناممکن ہے، یہ قابل عمل نہیں ہے اور بالآخر اسے ناکام ہونا ہے۔ اس طرح کے مفکرین میں لڈوگ وَن مسز اور ایف۔ اے ہَوَن ہیک شامل ہیں۔ یہ اقتصادی نظام مختلف نوعیت کے اقتصادی سوالوں کے مبادیات کے جوابات دیتا ہے۔ یہ سوال ہیں :-

کیا پیدا کرنا ہے؟ کتنا پیدا کرنا ہے؟ کس کے لیے پیدا کرنا ہے؟ کیسے پیدا کرنا ہے، کب پیدا کرنا ہے، کہاں پیدا کرنا ہے اور کیوں پیدا کرنا ہے۔ ان میں سے آخری سوال سب سے زیادہ اہم ہے کیوں کہ اس کا تعلق اقتصادی محرکات کے بنیادی مسئلے سے ہے۔

انسان — اقتصادی جانور

"ویلتھ آف نیشنز" نامی کتاب کے مصنف آدم اسمتھ کے دنوں سے معیشت کا جس طرح ارتقا ہوا ہے اس کے مطابق انسان اقتصادی جانور ہے۔ اس کے اقتصادی فیصلے اس کے اپنے مفادات کے بنیادی محرکات کے تابع ہوتے ہیں۔ یعنی یہ کہ کیا وہ صارفین میں سے ہے، مال پیدا کرنے والوں میں سے ہے، یا کارکن میں سے ہے۔ ان میں سے ہر زمرے کا عامل کم سے کم اقتصادی مفاد کی قربانی سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانا چاہتا ہے۔ صارفین کا زمرہ کوشش کرتا ہے کہ مختلف اشیا پر رقم کی آخری اکائی کا صرفہ بدستور وہی رہے اور اسے زیادہ سے زیادہ اطمینان حاصل ہو۔ محنت کش طبقہ کوشش کرتا ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ اطمینان حاصل کرے۔ اس کے لیے وہ فاضل اوقات کار سے پیدا شدہ ضمنی بے اطمینانی کو فاضل اُجرتوں سے حاصل شدہ سامان اور خدمات کے اطمینان سے برابر کرنا چاہتا ہے۔ بالآخر صنعت کار یا پروڈیوسر پیداوار کو زیادہ سے زیادہ حد تک بڑھانے کے لیے اخراجات میں جزوی اضافے کو منافع کے اضافے سے برابر کرنا چاہتا ہے۔

ہر انسان کے ساتھ اقتصادی محرکات کے ان عوامل سے بنیادی اقتصادی سوالوں کے جوابات مل جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر کیا پیدا کرنا ہے؟ اس

کا جواب صارفین کے تقاضوں اور مزدوروں پر منحصر ہے۔ صارفین کی مانگ کا انحصار اس کی آمدنی پر ہے اور اس بات پر بھی کہ اس کی پسند کا پیمانہ کیا ہے اور قیمت اور مانگ میں تعلق کس طرح کا ہے جسے ہم مانگ کی لچک بھی کہہ سکتے ہیں۔ یا یہ سوال کہ کتنا پیدا کرنا ہے اور کس کے لیے پیدا کرنا ہے' ان کا جواب مانگ پر اثر انداز ہونے والے اس طرح کے حالات پر منحصر ہے۔

منڈی کی معیشت

منڈی کی معیشت کے بارے میں یہ خیال کیا جاتا ہے کہ وہ صارفین کی خودمختاری کے تابع ہے پیداوار کا نظام صارفین کے استعمال میں آنے والی چیزوں کے تابع ہے۔ یہ اس بات کا جواب بھی دیتا ہے کہ کیا اور کتنا اور کس کے لیے پیدا کیا جائے۔ منڈی کا نظام یا کہ قیمتوں کا نظام پیداوار کے عمل میں وسائل کی تخصیص کا فیصلہ کرتا ہے اسی طرح سے پیداوار کے ڈھانچے اور صارفین کی مانگ کے ڈھانچے میں ربط قائم ہوتا ہے۔ فی الحقیقت آمدنیوں کی تقسیم، مصنوعات کی قیمتوں کے تعین کی پالیسی' اور پیداوار کے تمام عناصر بہ یک وقت اس نظام کے تحت گردش کرتے ہیں۔

اخراجات اور قیمتوں کے درمیان توازن کو یقینی بنانے کے لیے مسلسل رجحان چلا آرہا ہے۔ پیداواری عناصر میں معاوضت امور اور ان کا معاوضہ، سامان اور سروسوں کی مانگ اور رسد اور پیداوار کے عناصر کے لیے رسدات بھی اس سلسلے کی کڑی ہیں۔ لاگتوں اور قیمتوں میں عدم توازن' مانگ اور سامان کی رسد' اور پیداواری عناصر کی فراہمی میں نابرابری کو منڈی کے متوازن رجحانات کے ذریعے درست کیا جاتا ہے۔ اقتصادی سائنس کے بانی ادم اسمتھ نے اس نظام کو غیر مرئی ہاتھ سے تعبیر کیا ہے۔

اس طرح کی آزاد اور مقابلے کے نظام پر مبنی منڈی میں ناجائز منافع خوروں کی گنجائش نہیں ہوتی۔ اور صارفین کا استحصال نہیں ہوتا، کام کرنے والے یا مال تیار کرنے والے کا بھی استحصال نہیں ہوتا۔ اشیاء کی مستقل بنیادوں پر زیادتی یا کمی نہیں ہوتی اور بے روزگاری مسلسل عمل نہیں بنتی۔ کیونکہ ان میں سے کوئی بھی عدم توازن زیر عمل متحرک قوتوں کے ذریعے درست ہو سکے گا۔ اس کے ذریعے وسائل کا بھرپور استعمال ہو سکے گا اور پیداوار نقطۂ عروج پر پہونچ سکے گی۔

پیداوار کس طرح ہو؟

کہاں پیدا کیا جائے، کیسے پیدا کیا جائے، اور کب پیدا کیا جائے۔ یہ سوالات بھی اسی پس منظر میں جواب حاصل کر سکیں گے۔ کہاں پیدا کیا جائے، اس کا جواب جگہ کی اقتصادی تھیوری کا موضوع ہے۔ اس تھیوری کو سب سے پہلے الفریڈ ویبر نے اٹھایا تھا، اس کے بعد دوسرے ماہرین اقتصادیات نے ادھر دھیان دیا۔ صنعتوں کے قیام میں خام مال کی فراہمی اور منڈی کی قربت وہ خاص امور ہوتے ہیں جن کا دھیان رکھنا پڑتا ہے۔ ان کے علاوہ نقل و حمل کے اخراجات بھی سامنے رکھنے ہوتے ہیں۔

اگر خام مال مثلاً گنے کی ڈھلائی پر کافی اخراجات آتے ہیں تو یہ فیکٹری گنے کے کھیتوں کے پاس ہی لگائی ٹھیک رہے گی۔ اگر اس طرح نقل و حمل پر کم اخراجات آتے ہیں تو تیار مال کو منڈی تک لے جانے میں آنے والے اخراجات کو دھیان میں رکھنا ہوگا۔ یہ کارخانے ایسے مقامات پر لگنے سودمند ہوں گے جہاں سے کم لاگت پر مال شہروں اور صارفین کے مرکز تک پہنچایا جا سکے۔ انھیں امور کو سامنے رکھ کر یہ فیصلہ کیا جائے تاکہ کیا کوئی مال ملک میں ہی تیار کر لیا جائے یا باہر سے منگایا جائے۔ لاگتوں کے تقابلی مطالعے کو منڈی کی معیشت کے قانون کی عالمی توسیع کہہ سکتے ہیں۔

کیسے پیدا کیا جائے اور کب پیدا کیا جائے۔ یہ وہ امور ہیں جو بچتوں کی جزوی قربانی کو سرمایہ کاری کی مارجنل مصنوعات کے ساتھ متوازن بنانے کا فیصلہ کرتے ہیں۔ بچتوں کی جزوی قربانی کو اخراجات کے التوا سے پیدا شدہ تسلی اور اطمینان کے نقصان سے ناپا جاتا ہے۔ جبکہ سرمایہ کاری کی جزوی پیداواری صلاحیت مستقبل میں سامان اور سروسوں کی فراہمی کو بڑھانے کے خیال سے موجودہ صرف کے التوا سے ہونے والے فائدوں کا تعین کرتی ہے۔ اگر بچتوں کی قربانی سرمایہ کاری کے حاصل سے زیادہ ہے تو فیصلہ پیداواری عمل کے حق میں ہوگا۔ اس کے برعکس سرمایہ کاری کی اعلیٰ پیداواری صلاحیت سے پیداوار کے ایسے عمل کو تقویت ہوگی جو بھاری سامان میں وسائل کی سرمایہ کاری یا پیدایا عمل کے لیے کافی مدت والا نظام ہوگا۔

منڈی کا نظام صارفین کو زیادہ سے زیادہ مطمئن کرتا ہے، مال پیدا کرنے والوں کو زیادہ سے زیادہ نفع پہونچاتا ہے۔ وسائل کی زیادہ سے زیادہ تخصیص کرتا ہے۔ وسائل کے بھرپور استعمال کے لیے راہ نکالتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ اگر منڈی کی معیشت اس قدر مکمل ہے تو اقتصادی امور کی منصوبہ بندی کی کیا ضرورت ہے کیوں نہ انھیں منڈی کے نظام کے تابع ہی رہنے دیا جائے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ منڈی کا نظام اسی وقت کامیاب ہو سکتا ہے جبکہ چند مفروضات پورے کئے جا سکیں۔ منڈی کی معیشت نے کبھی بھی اُس تھیوری کے مطابق کام نہیں کیا' جیسا کہ تھیوری میں بتایا جاتا ہے۔ اقتصادی انحرافات مستقل بنیادوں پر جھلکتے رہے اور اسی وجہ سے سماجی مفکرین نے اس نظام کے مبادیات پر اعتراض کر دیا اور انھوں نے سرمایہ دارانہ اقتصادی نظام کی اکملیت پر شبہ کا اظہار کیا'۔

سرمایہ دارانہ اقتصادی نظام میں اندرونی تضادات:- کارل مارکس نے پیشین گوئی کی تھی کہ سرمایہ دارانہ بنیادوں پر منڈی کا معاشی نظام اندرونی تضادات کی روشنی میں خود ہی ناکام ہو جائے گا گو کچھ ماہرین اقتصادیات نے اس بات کو اچھا نہ سمجھا۔

ماہرینِ اقتصادیات کو مجموعی سرمایہ دارانہ نظام پر مبنی منڈی کی معیشت کی بڑی بڑی برائیوں اور خامیوں کے بارے میں سوچنا پڑا۔ اس کے علاوہ انھیں اجارہ داری، نابرابری، بے روزگاری اور پیداواری اور سماجی تصورات کے تئیں لاپرواہی جیسے عناصر پر بھی غور کرنا پڑا۔

منڈی کے نظام کی تمام تر معقولیت کا انحصار بے شمار مال تیار کرنے والوں اور بے شمار صارفین کے درمیان آزادانہ مقابلے کے مفروضے پر ہوتا تھا۔ لیکن عملاً اس مفروضے کا انحصار بڑھتے ہوئے منافعوں کے قانونی عمل درآمد پر ہے۔ بڑے پیمانے پر پیداوار اور تنظیم کے بہی فائدے تھے جو سرمایہ دارانہ معیشت کے ارتقا میں معاون ہیں۔ فولاد، موٹر کاروں، خوراکی اشیا، فرٹیلائزرز وغیرہ میں یہی رجحان رہا۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ چھوٹے کارخانے زندہ نہ رہ سکے اور صرف بڑے بڑے کارخانے باقی رہے اور وہ پیداواری نظام پر غالب رہے۔ بھلے ہی کوئی واحد فرم ان سب کی اجارہ دار نہ بن سکی پھر بھی بڑے بڑے کارخانوں کا ہی بول بالا رہا۔ پروفیسر گلبریتھ نے واضح صورت میں اپنی نئی صنعتی اسٹیٹ' میں واضح کیا ہے کہ امریکہ میں تقریباً ۵۰۰ اجارہ دارانہ کارخانے پوری معیشت پر حاوی ہیں۔ عوامی فلاح کے اداروں میں مثلاً ریلوے، بجلی وغیرہ کے محکموں میں اجارہ داری کا نظام ایک اشد ضرورت تھی۔ اسی طرح اجارہ داری اور اجارہ دارانہ مقابلے وقت کی ضرورت بن گئے اور ان کو خال خال دیکھنے کی بجائے اصولاً دیکھنا ضروری ہوا۔

ملی جلی یادیں

اجارہ دارانہ نظام ملی جلی یادوں کی علامت ہے۔ ایک طرف اس سے بڑے پیمانے پر کاروبار والے فائدے حاصل ہوتے ہیں اور دوسری طرف اجارہ دار کو صارفین کو قابو میں رکھنے کا موقع ملتا ہے اور وہ سماج کا استحصال کرتے ہیں۔ اجارہ داری نظام ایک دفعہ جما تو اس سے بہت سی برائیاں پیدا ہونے لگتی ہیں۔ اجارہ دار مصنوعی قلت پیدا کرتا ہے اور قیمتوں کو بڑھا دیتا ہے۔ وہ اشتہارات پر کافی خرچ کرتا ہے اور اس کے ذریعے وہ صارفین کو مجبور کرتا ہے کہ وہ اجارہ دار کی من مانی کو چلنے دیں۔ وہ بغیر کسی حقیقی جواز کے مصنوعات کی کوالٹی گھٹا دیتا ہے۔ وہ پیداوار کو روک دیتا ہے اور قیمتیں بڑھاتا ہے۔ اس کا مقصد زیادہ نفع کمانا ہوتا ہے۔ وہ قدرتی وسائل کا اندھا دھند استعمال کرتا ہے۔

نابرابری کا وسیلہ

اجارہ داری سے پیداوار کے تمام ذرائع مجتمع ہو جاتے ہیں اور پیداوار کے فائدے چند ہاتھوں میں مرکوز ہو کر رہ جاتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں اجارہ داری نابرابری کا سب سے بڑا وسیلہ ہے۔ نابرابریوں کی منجملہ دیگر برائیوں میں سے ایک یہ ہے کہ پیداوار کا نظام مسخ ہو جاتا ہے اور وسائل کا استعمال ایسی سمتوں میں ہونے لگتا ہے جو سماجی اعتبار سے کم تر ترجیح کی مستحق ہوں۔ چوں کہ قوتِ خرید چند ہاتھوں میں ہی مرکوز ہو جاتی ہے، اس لیے چند افراد کا تعیش پیداواری نظام کو اپنی طرف راغب کر لیتا ہے جبکہ بہت سے لوگوں کی ضرورتیں پوری ہونے سے رہ جاتی ہیں۔

منڈی کی معیشت کی طرف سے ایک اہم فائدے کا دعویٰ کیا جاتا ہے کہ یہ پیداواری قیمتوں اور صارفین کی مانگ کے طرز کے درمیان تطابق پیدا کرتا ہے۔ لیکن یہ نام نہاد فائدہ ایک بڑی برائی میں بدل جاتا ہے۔ اگر صارفین کی مانگ بذاتِ خود اقتصادی نابرابریوں کی عکاسی کرتی ہو اور جہاں کہ امیر آدمیوں کے پالتو کتوں کی خوراک غریب آدمی کے کپڑے، مکان اور خوراک کی ضرورت کے مقابلے زیادہ ترجیح پاتی ہو۔

اجارہ داری اور نابرابری کی یہ دونوں برائیاں ہی دراصل بے روزگاری کی برائی کی جڑ ہیں۔ سرمایہ دارانہ معیشت نے روایتی طور سے کاروباری اتار چڑھاؤ کے پھیر کے واقع ہونے سے نقصان اٹھایا ہے۔ معیشت خوشحالی اور کساد بازاری کے چکر میں پڑی رہی ہے۔ کساد بازاری کے دوران بہت سے لوگ بے روزگار ہو گئے۔ ۱۹۲۹ کی سب سے بڑی کساد بازاری نے معیشت کو زبردست دھکا پہنچایا جس کے سبب سرمایہ داری نظام کی جڑیں ہل گئیں اور جس سے روایتی اقتصادی تجزیے کے از سرِ نو تشکیل دہ مطالعے کی ضرورت سامنے آئی۔ اس مطالعے سے یہ واضح ہوا کہ معیشت میں مندا کاروبار کے منافعوں میں کمی کے سبب آیا اور پھر اس کے نتیجے میں قیمتوں میں اضافہ ہوا۔ اس کا علاج یہ تھا کہ لاگت کو کم کیا جائے یعنی اجرتوں کو کم کیا جائے اور سود کی شرحوں میں تخفیف کی جائے۔ اجرتوں میں کمی کی پالیسی نے مندے کو اور بڑھا دیا۔ چنانچہ جان مینارڈ کینیز کے ذہن نے معیشت کا جو تجزیہ کیا اُس کے مطابق مانگ کی کمی مندے کا سبب بنی اور قوتِ خرید کی کمی مانگ میں کمی کا سبب رہا۔ لہٰذا اس کا علاج سرکاری سرمایہ کاری کے پروگرام کے ذریعے مانگ میں موثر اضافہ کرنا تھا۔ اس کے ذریعے سماجی تحفظ کے پروگرام کو جامع بنانا تھا۔ اس طرح کی سرمایہ کاری کے لیے رقومات کو امیر طبقے والی اشیا کے زمرے سے نکال کر غریب طبقے میں استعمال میں آنے والی اشیا کے لیے لگایا گیا۔ اس پالیسی کے تحت صارفین کی اشیا کے استعمال کو بڑھانے پر بھی زور دیا گیا تاکہ مانگ میں اضافہ ہو۔

فلاحی معیشت کا تصور

منڈی کی معیشت کے حامی کبھی کبھی پیداواری صلاحیت اور نفع کی صلاحیت کو خلط ملط کر دیتے ہیں۔ اجارہ داری، قلت اور اشیا کی نقل و حمل میں جمود سے زیادہ نفع دینے والی کاروباری سرگرمیوں کو تقویت ملتی ہے لیکن ضروری نہیں کہ وہ پیداواری صلاحیت بڑھانے میں معاون ہوں اور سماجی طور پر پسندیدہ بھی۔

مغربی ملکوں کی معیشتوں میں منصوبہ بندی کیوں آئی۔ اگر اس کا اس کا مقصد کلی طور پر اجارہ داری کی برائیوں اور بے روزگاری کو ختم

کرنا ممکن نہیں تھا یا عوام کی بنیادی اور سماجی احتیاجات کو کم کرنا نہیں تھا تو بھی سرمایہ دارانہ نظام کی برائیوں کی طرف رہنما ضرور تھا۔ بار بیرو وٹن کے الفاظ میں منڈی اپنے نظام کی نوعیت کے اعتبار سے اسکی ترجیحات کی نشاندہی سے قاصر ہے جن کا اندازہ صارفین کی مانگوں سے نہیں لگایا جا سکتا۔ مثلاً مکمل روزگار کے لیے ترجیح اور سماجی اقدار وغیرہ۔ ان کا فروغ سوچی سمجھی منصوبہ بندی کے ذریعے ہو سکتا ہے نہ کہ تجارتی منڈی سے۔ اس طرح کی منصوبہ بندی کا ایجنڈا سرکاری سرمایہ کاری کا پروگرام چاہتا ہے۔ اس کے لیے متعدد مالی اور عملی اقدامات کرنے ہوں گے — امدادی رقوم کی فراہمی بتدریجی ٹیکس کاری، سرکاری ملکیت کے پروگرام، سماجی بیمہ وغیرہ اس سلسلے کے پروگرام ہو سکتے ہیں۔ اس سلسلے کی تفاصیل الگ الگ ہو سکتی ہیں لیکن مغربی معیشتوں میں یہ منصوبہ بندی کے جزو لازم بن گئے ہیں۔

تبدیلی کی ہوا

دوسری جنگ عظیم کے بعد منصوبہ بندی نے مغربی ملکوں میں نمایاں مقام حاصل کیا۔ یہ تبدیلی کا ذریعہ بنی۔ سماج روایتی سرمایہ دارانہ ڈھانچے سے باہر آنے لگا۔ جس قدر مغربی یورپی ممالک منصوبہ بندی کو اپنائے ہوئے تھے، اُن میں فرانس پیش پیش تھا۔ ان کے اشاراتی منصوبہ بندی کے نظام نے منڈی کی معیشت کے نظام کے ساتھ سمجھوتہ کیا۔ صارفین اور کاروباری افراد دونوں کو پسند کیا۔ آزادی دی گئی البتہ یہ کام مرکزی ہدایت کاری کے تحت ہوا۔ اس کے لیے سرمایہ اور محنت دونوں سے مشورے ہوئے۔ ترقی کے لیے منصوبہ بندی ضروری سمجھا گیا اور سرکاری نیز غیر سرکاری اداروں میں قیمت، پیداوار اور افرادی قوت کی پالیسیوں کے تعین کے لیے منصوبہ بندی جزو لازم کی صورت اختیار کر گئی۔ رفتہ رفتہ یہ مغربی ملکوں میں ایک باقاعدہ فن کی صورت اختیار کر گئی۔ وہ اس کے طریقہ کار میں نمایاں اور جدید ترین تبدیلیاں دیکھنے کو ملیں۔ اس کی وجہ سے سرمایہ دارانہ اقتصادی نظام میں معیاری اعتبار سے اہم کایا پلٹ دیکھنے کو ملی۔ اب منڈی کی معیشت کو محض مانگ اور رسد کی قوتوں کے تابع ہی نہیں رہنے دیا گیا۔ اب یہ نظام با مقصد اور دور اندیشانہ طریقہ کار کے تحت کام کرنے لگا۔ اس نے اقتصادی نظام کے مختلف ساجھی داروں کو کام کرنے کے لیے ایک مشترکہ ڈھانچہ دیا — صنعت کاروں کو اپنے فیصلوں پر پہنچتے وقت منصوبے کو سامنے رکھنا ہوتا ہے۔ منصوبے میں ان کے لیے طویل المدتی اندازِ نظر کی گنجائش ہوتی ہے۔ منڈی کی معیشت کی کارگزاری میں منصوبہ بندی ایک مستقل عنصر کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس طرح مختلف اقتصادی طبقوں میں اقتصادی فائدوں میں زیادہ سے زیادہ حصہ پانے کی جدوجہد ہوتی ہے۔ یعنی طبقاتی جدوجہد سے نجات نہیں ملتی البتہ یہ منصوبہ بندی کے راستے اجتماعی ترقی کی طرف رہنمائی کرتی ہے۔ منصوبے کے ذریعے کم سے کم اجتماعی نظم و ضبط کسی حد تک لانے کی کوشش ضرور ہوتی ہے۔ منصوبہ بندی مستقبل کی خوشحالی کے لیے مختلف طبقات کی جدوجہد کا رجحان اور اس کے لیے متحدہ مربوط کوششوں کی علامت بن گئی۔ منصوبہ بندی اس بات کی یقینی علامت ہے کہ سرمایہ داری بدل رہی ہے۔

فرانس کے تجربے کی روشنی میں برطانوی حکومت نے بھی جولائی ۱۹۶۱ء میں نیشنل اکونومک ڈیولپمنٹ کونسل قائم کی۔ ۱۹۵۹ میں بلجیم کی حکومت نے پروگرام وضع کرنے والا ایک دفتر قائم کیا جس کے ذمے ۱۹۶۵ کے لیے اقتصادی منصوبوں کا مسودہ ترتیب دینا تھا۔ ۱۹۴۵ میں اس نے سنٹرل پلاننگ بیورو قائم کیا۔ اس کا کام منصوبہ بندی کے موضوع پر تحقیق کرنا تھا۔ اس کے تحت سالانہ منصوبوں کے ذریعے ملک کی متوازن اقتصادی ترقی کے عمل کو آگے بڑھانے کی کوشش کی گئی اس سلسلے میں اس دفتر کی طرف سے پیش کی گئی سفارشوں کو سامنے رکھا گیا۔ اٹلی نے ۱۹۵۵ سے ۱۹۶۴ کے درمیانی عرصے کے لیے ایک ایسا منصوبہ تیار کیا جو کہ روزگار اور آمدنی بڑھانے کے سلسلے میں معاون ثابت ہو سکے۔ اگست ۱۹۶۲ میں حکومت نے اقتصادی ترقیاتی پروگرام وضع کرنے کے لیے ایک نیشنل کمیشن قائم کیا۔ جاپان اگرچہ وہ ایشیائی ملک ہے لیکن اس کا زمرہ بندی اقتصادی ترقی کے اعتبار سے مغربی ملکوں کی معیشتوں کے ساتھ ہوتی ہے۔ اس نے اقتصادی منصوبہ بندی کا ادارہ قائم کیا۔ اس نے مطلوبہ اقتصادی مقاصد کے لیے جو رپورٹیں پیش کیں، وہی حکومت کی منظوری کے بعد پلان کی صورت میں آ گئیں۔ اس ادارے نے بہت سے منصوبے تیار کئے۔

۱۹۶۱ء سے ۱۹۷۰ کے درمیانی عرصے کے منصوبے میں قومی آمدنی کو دوگنا کرنے کا نشانہ رکھا گیا تھا۔ اس عرصے میں سالانہ شرح ترقی کا اندازہ ۲ء۵ فیصد سالانہ کے حساب سے لگایا گیا تھا۔ (باقی آئندہ)

بقیہ۔ پہلا ہندوستانی۔ روسی خلائی مشن

نے اپنی ہمت اور جواں مردی سے یہ ثابت کر دیا کہ انسان مشکل سے مشکل کام کر سکتا ہے اور ہر جگہ کامیابی حاصل کر سکتا ہے۔

اس طرح ہندوستان کا پہلا خلاباز راکیش شرما ہوا۔ ملک اور بیرون ملک سے راکیش کو مبارکباد کے خطوط اور تار مل رہے ہیں۔ حکومت ہند نے اس عظیم کامیابی پر راکیش شرما کو اور اُن کے دوسرے خلائی ساتھیوں یوری میلی شیف اور گنیدی اسطریکالوف کو اشوک چکر سے نوازا ہے۔ یہ پہلی مرتبہ ایسا ہوا ہے کہ اشوک چکر غیر ملک کے دو شہریوں کو حکومت ہند کی طرف سے عطا کیا جا رہا ہے۔

ہندوستانی خلائی تاریخ میں راکیش شرما نے ایک نیا باب کھول دیا ہے۔ اس باب کے کھلتے ہی ہند اور روس دوستی بھی خلاء کی بلندیوں کو چھونے لگی ہے۔

کرشن شرما

صنعت کار خواتین

ہندوستان میں عورتوں کی ترقی کی علامت

دُنیا بھر میں صدیوں سے عورتوں کے خلاف امتیاز برتا جاتا رہا ہے۔ حالانکہ دُنیا کی نصف آبادی عورتوں پر مشتمل ہے اور اوقاتِ کار کا دو تہائی حصّہ ان کے پلّے پڑتا ہے۔ تاہم یہ عجیب بات ہے کہ مردوں کے مقابلے میں عورتوں کو دُنیا کی آمدنی کا ایک تہائی حصّہ ہی نصیب ہوتا ہے۔

لیکن آزاد ہندوستان کی عورت نے ثابت کر دیا ہے کہ وہ مرد کے آہنی پنجے سے آزاد ہوتی جا رہی ہے۔ وہ اقتصادی طور پر آزاد ہو جانا چاہتی ہے۔ اس سلسلے میں مہاتما گاندھی نے عورت کی صحیح حوصلہ افزائی کی تھی۔ انھوں نے خواتین کو خراجِ تحسین ادا کرتے ہوئے کہا تھا۔۔ "عورت کو صنفِ نازک کہنا اس کی توہین کرنے کے مترادف ہے۔ یہ کہہ کر مرد عورت سے ناانصافی کرتا ہے۔۔۔۔ میں ایسا ہندوستان دیکھنا چاہتا ہوں جس میں عورتوں کو مردوں کے برابر حقوق حاصل ہوں۔"

پنڈت جواہر لال نہرو نے کہا تھا "جب عورت آگے بڑھتی ہے تو سارا خاندان آگے بڑھتا ہے، گاؤں آگے بڑھتا ہے اور تمام قوم آگے بڑھتی ہے"۔ ان کے یہ الفاظ بار بار دُہرائے جاتے ہیں کیوں کہ یہ بات مانی جا چکی ہے کہ اقتصادی اور سماجی ترقی اُسی صورت میں ممکن ہو سکتی ہے جب کہ ترقی کی دَوڑ میں عورتیں پیش پیش ہوں۔ چنانچہ اب اس بات کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے کہ عورت کو گھر کی چار دیواری سے نکل کر کام کرنا چاہیے تاکہ سب کا معیارِ زندگی بلند ہو۔ صنعت کار خواتین کے کردار کو اسی ضرورت کی روشنی میں پرکھا جانا چاہیے، خصوصاً آجکل جب کہ بے روزگاری روز بہ روز بڑھتی جا رہی ہے۔

ہندوستان کی اولوالعزم خواتین کو منظم کرنے کے خیال سے نومبر ۱۹۷۵ء میں دلّی میں نوجوان صنعت کار خواتین کی پہلی کانفرنس بُلائی گئی تھی جس میں ۲۰ سے زیادہ صنعت کار خواتین نے شرکت کی اور اس مسئلہ پر غور کیا کہ سماج میں عورت کا رتبہ کیسے بڑھایا جائے اور عورت کو اپنے اوپر بھروسہ رکھنے کے قابل کیسے بنایا جائے۔

چنانچہ طے کیا گیا کہ عورتوں کے لیے تربیتی سہولتیں بڑھائی جائیں اور اگر وہ اپنا کام دھندا خود شروع کرنا چاہتی ہوں تو انھیں ضروری لوازمات سے لیس کیا جائے۔ انھیں اپنی ضرورت کا خام مال ملنا چاہیے اور بینکوں سے اُدھار کی سہولت بھی حاصل ہونی چاہیے۔ عورتوں کی راہ میں حائل سب سے بڑی رکاوٹ یہ تھی کہ لوگوں کے خیالات دقیانوسی تھے۔۔ وہ عورت کو محض گھر کی چار دیواری میں مقیّد کر کے رکھنا چاہتے تھے۔ چنانچہ محسوس کیا گیا کہ ایسی تحریک چلانی چاہیے جس سے متاثر ہو کر عورتیں اپنے لیے خود ملازمت پیدا کرنے کا سامان کریں۔

اس کے بعد سے یکے بعد دیگرے کئی کانفرنسیں منعقد ہوئیں اور اب یہ حالت ہے کہ حکومتِ ہند نے اصولاً مان لیا ہے کہ ضلع کے صنعتی مرکز میں کم از کم ایک عورت ایڈیشنل جنرل منیجر ہونی چاہیے۔

عورتوں کو اپنا کام دھندا خود شروع کرنے کی جانب راغب کرنے کے لیے چھٹے پنجسالہ پلان میں پہلی بار الگ رقم رکھی گئی تھی۔ تحقیق نے یہ نتیجہ برآمد کیا تھا کہ جب تک عورتوں کی صلاحیتوں کو بروئے کار نہیں لایا جاتا اقتصادی منصوبہ بندی کامیاب نہیں ہو سکتی۔ خیال ہے کہ ساتویں پلان میں اس جانب اور بھی زیادہ توجہ دی جائے گی۔ ہماری راہ میں حائل سب سے بڑی مشکل ہندوستانی رویّے کی ہے۔ ایک طرف تو ہم عورت کو دیوی مانتے ہیں، اس کی پرستش کرتے ہیں، دوسری طرف اُسے مجبور، "ابلا" سمجھتے ہیں۔ ہماری روزمرّہ کی زندگی میں یہ بڑا بھاری تضاد ہے۔ عورت کو مرد کے مقابلے میں گھٹیا درجے کی مخلوق سمجھا جاتا ہے۔ اس کی عقل اور رائے کو ناقص خیال کیا جاتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ عورت زندگی کی کشمکش میں آگے نہیں بڑھ پاتی۔

اس ضمن میں کیرالہ کی عورتوں نے میدان مار لیا ہے۔ سب سے زیادہ تعلیم یافتہ عورتیں کیرالہ میں ملتی ہیں۔ ہندوستان کی عورتوں میں خواندگی ۲۹ فیصدی ہے۔ مگر کیرالہ میں ۶۰ فیصدی ہے۔ وہاں سماج میں عورتوں کو خاص مقام حاصل ہے۔

کیرالہ میں عورتوں کی آبادی مردوں سے زیادہ ہے۔ کیرالہ کی عورتیں کام کے لیے کہیں بھی جانے کو تیار ہیں۔ وہاں کی نرسیں اور اُستانیاں دنیا بھر میں دیکھی جا سکتی ہیں۔

چنانچہ جب بین الاقوامی خواتین کا سال منایا گیا تو اپنی روزی خود کمانے کے سلسلے میں متحدہ کارروائی کرنے کے لیے قدم اُٹھایا گیا۔ عورتوں نے چھوٹی صنعتوں کی اسکیم کے تحت انفرادی طور پر چھوٹے چھوٹے یونٹ قائم کر لیے دوسری طرف عورتوں نے مل کر چھوٹی صنعتیں قائم کرنی شروع کر دیں۔ انھوں نے جوائنٹ اسٹاک کمپنیاں قائم کیں، ساجھے داری میں کام شروع

کیا، امداد باہمی کے طرز پر غیر اقتصادی سوسائٹیاں چلائیں۔ ان سے ہونے والے منافع ممبر خواتین آپس میں بانٹ لیتی تھیں۔ ہتھ کرگھا چلانا وغیرہ، عورتوں کے مخصوص کام سمجھے جاتے تھے۔ لیکن کیرالہ کی عورتیں ان سے مطمئن نہ ہوئیں۔ انھوں نے صنعتی پیداوار میں نئی راہیں تلاش کرنا شروع کر دیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۹۷۵ کے بعد سے اب تک ۵۰۰ سے زیادہ چھوٹی صنعتوں کو عورتیں چلا رہی ہیں اور "کیرالہ اسٹیٹ کی عورتوں کی صنعتوں کی ایسوسی ایشن" قائم ہو چکی ہے۔ اس انجمن نے صنعت کار خواتین کے کاز کو بڑھا دیا ہے۔ چھوٹے یونٹوں کے مسائل پر توجہ دی ہے، ان کی بنائی ہوئی اشیا کی نمائش کی ہے، حکومت اور مالی اداروں سے بات چیت کی ہے تاکہ کارکردگی کو بہتر بنایا جا سکے، مشکلات کو دور کیا جائے اور سامان فروخت کرنے کی نئی راہیں ڈھونڈی جائیں۔ چنانچہ ان سب باتوں سے متاثر ہو کر کیرالہ اسٹیٹ سرکار نے عورتوں کی صنعتوں کے لیے صلاح کار بورڈ قائم کر دیا ہے۔ جو عورتوں کی صنعتوں کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔

آج کل عورتیں کئی طرح کی صنعتیں چلا رہی ہیں۔ مثلاً پرزے جوڑ کر ریڈیو تیار کرنا، ٹیلی ویژن بورڈ بنانا، ہندوستان مشین ٹولز کے لیے پرزے تیار کرنا، توشیبا آنند فرم کے لیے بیٹریاں تیار کرنا اور کیمیکل یونٹ چلانا۔ اس سلسلے میں بڑی بڑی کمپنیوں کو قائل کرنا پڑا کہ عورتوں کے صنعتی یونٹ مقررہ معیار کی اشیا تیار کر سکتے ہیں۔ ان یونٹوں کی کامیابی کو دیکھتے ہوئے بڑی بڑی کمپنیوں نے کل پرزے بنانے کا کام چھوٹے یونٹوں کو دینا شروع کر دیا ہے۔ اب مانگ کی جا رہی ہے کہ آندھرا، مہاراشٹر اور تامل ناڈو کی طرح کیرالہ میں بھی "خواتین کی مالی امداد کارپوریشن" قائم ہونا چاہیئے۔

عورتوں کو مل جل کر کام کرنے اور اپنا مستقبل روشن کرنے کا موقعہ دینے کے لیے کیرالہ میں تین ہزار سے زیادہ دیہاتی مہیلا سماج قائم ہیں۔ دیکھا گیا ہے کہ اس طرح کے منظم گروپ صنعت کے قیام کی راہ ہموار کر سکتے ہیں اور منافع کی منصفانہ تقسیم کا ذریعہ بن سکتے ہیں۔ چنانچہ نہ صرف انفرادی خواتین بلکہ خواتین کی کمپنیاں اور انجمنیں بھی صنعتی پراجکٹ چلا رہی ہیں۔

تجربہ بتاتا ہے کہ اپنا کام دھندا خود چلانے کا کام اسی صورت میں ٹھیک رہتا ہے جبکہ:

۱۔ اس میں کام کرنے والی عورت کا حصّہ ہو۔

۲۔ پراجکٹ رپورٹیں سمجھدار حکام کی مدد سے تیار کی جائیں۔

۳۔ خام مال بہ آسانی دستیاب ہو۔

۴۔ شروع شروع میں بنکوں سے رعایتی شرح سود پر روپیہ مل سکے۔

۵۔ عورتوں کو مناسب تربیت دینے، ان کی رہائش اور بچوں کی دیکھ بھال کا انتظام ہو۔

۶۔ ۹۵ فیصدی ورکر عورتیں ہوں کارخانہ دار کو مزدوروں سے متعلق قوانین کی جانکاری ہو اور کوئی فیصلہ کرتے وقت عورتوں سے مشورہ کر لیا جائے۔

دیکھنے میں آیا ہے کہ اگر عورتیں مل کر صنعت چلاتی ہوں تو وہ اچھی شہری ثابت ہوتی ہیں اور تمام سماجی و اقتصادی سرگرمیوں میں حصّہ لے سکتی ہیں۔ جس اسٹیٹ میں تعلیم یافتہ مگر بے روزگار عورتوں کی تعداد لاکھوں میں ہو وہاں بے کاری دُور کرنے کا ایک ہی ذریعہ ہے۔ اپنا کام دھندا خود شروع کرو۔ عورتوں کو اقتصادی اعتبار سے آزاد بنا دینے سے سماج میں زبردست تبدیلیاں آئیں گی اور عورتیں صدیوں سے چلی آ رہی بے انصافی اور ان کے خلاف برتے جا رہے امتیاز کا مقابلہ کرنے کے لائق بن جائیں گی۔

بقیہ: بہبودی کا تصوّر

امکان ہے جس کا اشتباہ کیا جاتا ہے۔ لیکن اس معلوماتی مسئلے کے علاوہ کسی بھی صورت میں خوراک کے استعمال کے بجائے غذائیت کا جائزہ زیادہ معنی خیز ہے کیونکہ خوراک کا استعمال از خود اہم نہیں ہے اور اس کی قدر و قیمت کا اندازہ محض غذائیت پر اس کے اثر سے کیا جاتا ہے۔

ایک ایسا معاملہ جو سماجی بہبودی کے کسی بھی تجزیئے کے لیے اہم ہے نام نہاد جنسی تناسب ہے جس سے آبادی میں عورتوں اور مردوں کے تناسب کا پتہ چلتا ہے اور دوسری باتوں کے ساتھ ساتھ) مردوں کے مقابلے میں عورتوں کی بقا کے نسبتی امکانات کا اظہار ہوتا ہے۔ دولتمند ملکوں میں جنسی تناسب ۱٫۰۵ یا ۱٫۰۶ کے آس پاس ہے کیونکہ بقا کے معاملے میں عورتیں حیاتیاتی طور پر فائدے میں معلوم ہوتی ہیں۔ لیکن بھارت میں یہ تناسب صرف ۱٫۰۰ سے کم ہے بلکہ یہ گر کر اب محض ۰٫۹۳۵ رہ گیا ہے جبکہ وہ اس صدی کے شروع میں ۰٫۹۷۲ تھا۔ یہ تناسب تقریباً کم ترین ہے جو دُنیا میں کہیں بھی دیکھا جا سکتا ہے۔

دیگر نادار ملکوں میں بھی جنسی تناسب کافی بلند ہے۔ یعنی چین اور جنوب مغربی ایشیاء میں ۰٫۹۶، لاطینی امریکہ میں ۰٫۹۹، جنوب مشرقی ایشیاء میں ۱٫۰۱، اور افریقہ میں ۱٫۰۲ ہے۔ نسبتی طور پر کہا جائے تو جہاں تک زندگی اور موت کے سوالات کا تعلق ہے افریقی عورتیں بھارتی عورتوں کی نسبت مردوں کے مقابلے میں بہتر پوزیشن میں ہیں۔

اگر بہبودی کے تصوّر کا تعلق عملی کامیابیوں اور مثبت آزادی سے قائم کیا جائے تو ایسے بیشتر اقتصادی امور ابھر کر سامنے آئیں گے جو نظری مباحثوں اور پالیسی سے متعلق عملی مباحثوں میں مثالی طور پر نظر انداز کئے جا چکے ہیں۔ ●

سید محمود نقوی

ہندوستان میں ٹیلی ویژن کی توسیع

ہندوستان میں ٹیلی ویژن کی شروعات

اس کی ایجاد (۱۹۲۵ء) کے ۳۴ برس بعد ۱۵ ستمبر ۱۹۵۹ء کو ہوئی۔ ابتداء میں یہ محض اسکولی تعلیم کے لیے مخصوص تھا۔ چنانچہ ۱۹۶۱ء سے کچھ مضامین خاصکر سائنس میں بچوں کے لیے اسباق پیش کیے جانے لگے۔ چونکہ ٹیلی ویژن کے ذریعے دید و شنید یعنی دیکھنے اور سننے دونوں ہی کا لطف حاصل ہوتا ہے اس لیے بجا طور پر اسے ایک مؤثر وسیلۂ اظہار سمجھا جاتا ہے۔ ۱۵ اگست ۱۹۶۵ء سے اجتماعی دید کی خاطر (For Community Viewing) روزانہ پروگرام بھی نشر کیے جانے لگے۔ ان نشریات میں عورتوں، بچوں اور نوجوانوں کے لیے ہندی و انگریزی پروگرام شامل تھے جن میں خبریں، خبروں پر تبصرے، لوک گیت اور ناچ، انٹرویو، معلوماتی سوال و جواب اور فلمیں وغیرہ دکھائی جاتی تھیں۔ یہ پروگرام روزانہ تین گھنٹے شام کے اوقات میں پیش کیے جاتے۔ اس طرح سترھویں دہائی کے خاتمے تک ٹیلی ویژن کی مقبولیت آہستہ آہستہ بڑھی تو لیکن بہت زیادہ عام نہیں ہوا۔ جس کا ثبوت یہ ہے کہ ۳۱ دسمبر ۱۹۷۰ء کو مجموعی طور پر ہمارے ملک میں ۲۲۸۳۳ ٹیلی ویژن سیٹ تھے جن میں فورڈ فاؤنڈیشن اور دوردرشن کے اشتراک سے اسکولوں کے لیے فراہم کیے گئے تقریباً چار سو ٹیلی ویژن سیٹ بھی شامل ہیں جن سے تقریباً بیس ہزار طالب علموں کو تعلیمی پروگرام کی نشریات سے مستفید کرنا مقصود تھا۔

کاشتکاری کے میدان میں جدید تکنیکی معلومات کو مقبول بنانے کے لیے ۲۶ جنوری ۱۹۶۷ء سے دہلی دوردرشن نے ایک خاص دیہی پروگرام شروع کیا اور کرشی درشن کے نام سے یہ پروگرام ہفتہ میں تین دن پیش کیا جانے لگا۔ اس پروگرام سے پورا فائدہ اٹھانے کی خاطر دیہی علاقوں میں ٹیلی کلبوں کی تشکیل کی گئی تاکہ کلب کے ممبر کسان اجتماعی طور پر یہ پروگرام دیکھیں اور بعد میں تبادلۂ خیالات سے مزید وضاحتیں حاصل کر سکیں۔ اس طرح کے ۸۰ "فارم ٹیلی کلب" عالم وجود میں آئے جن میں سے ۶۰ دہلی کے مرکزی علاقے میں اور ۲۰ اتر پردیش و ہریانہ کے نواحی علاقوں میں تھے۔ ایک اندازے کے مطابق آٹھ ہزار افراد اس پروگرام سے مستفید ہو رہے تھے۔

اس پراجیکٹ کا خاطر خواہ اثر ہوا اور نتیجتہً ٹیلی ویژن پروگرام دیکھے جا سکنے والے علاقوں میں کاشتکاروں نے نسبتاً زیادہ بڑے پیمانے پر کاشتکاری کے جدید طریقے استعمال کیے۔ نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف ایجوکیشن کے جائزے کے مطابق ٹیلی ویژن پروگراموں کے علاقے میں بالعموم سبھی کسانوں کو فائدہ پہونچا اور ان میں سے ۶۸ فی صد نے کاشتکاری کے بارے میں مفید اور بروقت معلومات حاصل کیں۔ ان ہی کرشی درشن پروگراموں سے کم از کم ۷۰ فی صد کسانوں کو فصلوں کی کاشت اور دیکھ بھال سے متعلق ایسی اہم و بنیادی ہدایات و معلومات ملیں جو کسی اور وسیلے سے انھیں حاصل نہیں ہو سکتی تھیں۔ ٹیلی ویژن کے ذریعے پہونچائی گئی معلومات نشر و اشاعت کے دوسرے وسیلوں کے مقابلے میں ان کے لیے زیادہ واضح بھی تھیں اور بہتر طور پر قابلِ عمل بھی۔ قابلِ اطمینان بات یہ ہے کہ ٹیلی ویژن سے مستفید ہونے والوں میں زیادہ تعداد چھوٹے اور ناخواندہ کسانوں کی تھی۔ ان نتائج سے یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ ہمارے یہاں زراعت کے میدان میں پیداوار بڑھانے کے لیے ٹیلی ویژن کی نشریات مؤثر طور پر ایک مفید وسیلہ بن سکتی ہیں۔

ہمارے ہندوستان میں دوسرے ترقی یافتہ ملکوں کے مقابلے میں تبلیغی و اصلاحی وسیلے کے طور پر ٹیلی ویژن کا استعمال اس لیے بھی زیادہ اہمیت رکھتا ہے کیوں کہ ناقابلِ انکار حقیقت کے طور پر دنیا کی سب سے بڑی ناخواندہ آبادی یہیں رہتی ہے جو اپنی معلومات میں اضافے کے لیے پڑھنے لکھنے کا سہارا نہیں لے سکتی۔ ان حالات میں اس طرح کے ہندوستانی عوام تک جن کی تعداد تقریباً ۳۴ کروڑ ہے، پیغامات رسانی و معلومات فراہمی کے لیے ٹیلی ویژن بہترین وسیلہ بن سکتا ہے۔ اس وجہ سے ہندوستان میں ٹیلی ویژن کی توسیع و مقبولیت ضروری بھی ہے اور خوش آئند بھی۔

چنانچہ دہلی ٹیلی ویژن سنٹر کا حلقۂ اثر (Coverageares) چالیس کلومیٹر سے

پٹھان کوٹ ساٹھ کلو میٹر کر دیا گیا جس سے ہریانہ اور پنجاب کی بیشتر دیہی آبادی اس کے حلقۂ اثر میں آگئی۔ سیٹلائٹ اسکیم (Satellite Scheme) کے تحت پانچ ہزار گاؤں کے لوگ مستفید ہو رہے ہیں۔ بمبئی اور سری نگر کے ریڈیو سنٹروں میں ٹیلی ویژن کی سہولتیں بھی فراہم کردی گئی ہیں۔ بمبئی کے ٹی۔وی۔ سنٹر سے گریٹر بمبئی کے باشندوں کی ضرورتوں کو پورا کیا جاتا ہے اس مرکز کے پونہ ریڈیو اسٹیشن سے الحاق کے ساتھ پونہ ضلع کے سارے دیہی اور شہری علاقے کو ٹیلی ویژن کی سہولیات حاصل ہوگئی۔ اس فیصلے کے مطابق کہ ہندوستان کی پچاس فی صد آبادی ٹیلی ویژن پروگراموں کے حلقۂ اثر میں آجائے ۱۱۲ کروڑ روپے کے مصارف پر مشتمل ایک بڑا منصوبہ تیار کیا گیا جو دو مرحلوں میں پورا کئے جانے کی تجویز تھی پہلے مرحلے میں نئی دہلی ٹیلی ویژن اسٹیشن کو بہتر بنانے اور بمبئی، سری نگر، مدراس، لکھنؤ، کلکتہ اور جالندھر میں چھ اضافی اسٹیشن بنائے جانے اور مسوری، پونہ، کانپور، آسنسول، امرتسر، بھٹنڈا اور چنڈی گڑھ میں نشری اسٹیشن (Broadcast Vans) قائم کئے جانے کی تجویز تھی۔ پہلے مرحلے کے ان کاموں پر ۲۵ کروڑ روپے کے مصارف کا تخمینہ تھا اور اس کی تکمیل سے ہندوستان کا دس فیصد رقبہ اور سترہ فیصد آبادی ٹیلی ویژن کے حلقۂ اثر میں شامل ہو جاتی تھی۔

ٹیلی ویژن ترقیاتی پروگرام کے دوسرے مرحلے میں جسے پانچویں پنجسالہ منصوبے (۷۴-۱۹۷۹) کے دوران عملی جامہ پہنایا جانا تھا، پانچ پہلوؤں پر زور دیا گیا تھا۔ ۱۱ صوبائی مرکزوں میں ٹیلی ویژن اسٹیشن بنائے جانا، ان کے ساتھ نشری اسٹیشنوں کا قیام، نشری گاڑیوں (Broadcast Vans) کا بندوبست، دہلی میں مستقل طور پر ٹیلی ویژن کے صدر دفتر کی سہولتوں کی تکمیل اور موجودہ اسٹیشنوں کا فروغ۔ اس پروگرام کا مقصد ۳۲ فی صد مزید علاقے اور ۲۲ فیصد مزید آبادی کو ٹیلی ویژن کے حلقۂ اثر میں لانا تھا تاکہ ملک کی معتدبہ دیہی آبادی اور اہم شہری علاقے ٹیلی ویژن کی سہولتوں سے بہرہ اندوز ہو سکیں۔

اس منصوبے پر عمل درآمد کے نتیجے میں یکم اپریل ۱۹۷۶ء کو باقاعدہ عملی طور پر ٹیلی ویژن کا محکمہ آل انڈیا ریڈیو سے الگ کر دیا گیا اور اسے دُور درشن کا نام دیا گیا تاکہ اس وسیلۂ ابلاغ کو زیادہ بہتر اور مؤثر طور پر استعمال کیا جا سکے۔ اس طرح سر دست ہمارے ملک میں سات باقاعدہ ٹیلی ویژن سنٹر موجود ہیں۔ جو بمبئی، کلکتہ، دہلی، جالندھر، لکھنؤ، مدراس اور سری نگر میں واقع ہیں۔ ان کے علاوہ پانچ نشری اسٹیشن (Relay Station) ہیں۔ پونہ کا نشری اسٹیشن بمبئی کے پروگرام، مسوری کا نشری اسٹیشن دہلی کے پروگرام، کانپور کا نشری اسٹیشن لکھنؤ کے پروگرام، امرتسر کا نشری اسٹیشن جالندھر کے پروگرام اور بنگلور میں واقع پانچواں نشری اسٹیشن مدراس اور بمبئی کے پروگرام پیش کرتے ہیں۔ ٹیلی ویژن کی ان سہولتوں کے علاوہ درج ذیل سات جگہوں پر ٹرانسمیٹر بھی نصب ہیں، احمد آباد، گلبرگہ، حیدرآباد، جے پور، مظفر پور، رائے پور اور سمبل پور جو سائٹ (Satellite Instructional Television Programme) منصوبے کے تحت علاقائی ٹیلی ویژن سروس (Terrestrial T.V. Service) کی سہولتیں فراہم کرتے ہیں۔ سائٹ اپنی نوعیت کا سب سے بڑا پروگرام ہے اس کا مقصد اہم زبانوں میں ہدایتی پروگرام پیش کرنا ہے۔ آندھرا پردیش، بہار، کرناٹک، مدھیہ پردیش، اڑیسہ اور راجستھان چھ صوبوں میں تقریباً ۲۴۰۰ دیہات اس سے مستفید ہو رہے ہیں۔

ٹیلی ویژن کا بنیادی مقصد ملک کے سماجی اقتصادی فروغ کو تقویت پہنچانا اور عوام کو تہذیب کی روشنی سے بہرہ اندوز کرنا ہے۔ اس مقصد کو پیش نظر رکھتے ہوئے پیش کئے جانے والے پروگرام سبق آموز اور دلچسپ بنائے جاتے ہیں۔ یقیناً غریب لوگوں تک ابھی ٹیلی ویژن نہیں پہنچا ہے اس لیے ٹیلی ویژن کے مفادات غریبوں تک پہنچانے کے لیے اجتماعی مرکزوں (Community Centre) اور اسکولوں وغیرہ میں ٹیلی ویژن سیٹ فراہم کئے گئے ہیں۔ ایک اندازے کے مطابق اجتماعی مقاصد کی غرض سے ۳۳۳ ٹیلی ویژن سیٹ بہم پہنچائے جا چکے ہیں۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ بچوں کے کردار کی تعمیر میں ٹیلی ویژن ایک اہم رول ادا کر سکتا ہے۔ اس لیے یہ ضروری ہے کہ ٹیلی ویژن کے ذریعے جو مواد پیش کیا جائے اور پیشکش کا جو طریقہ اختیار کیا جائے وہ صحت مند اور دلچسپ ہو۔ اس مقصد کی تکمیل کے لیے یہ بھی لازمی ہو جاتا ہے کہ قومی شعور اور صحت مند ذہن رکھنے والے باصلاحیت افراد کو اس طرف متوجہ کیا جائے اور بہرحال اس کا دھیان رکھا جائے کہ اس مفید اور مؤثر وسیلۂ اظہار کو کارگر طریقے سے استعمال کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہ دیا جائے۔

ٹیلی ویژن کے اس کامیاب وسیلۂ اظہار اور اس کی اہمیت و افادیت کے پیش نظر حکومت کا یہ منصوبہ ہے کہ ٹیلی ویژن کے پانچ سو کم طاقتی نشری اسٹیشن (Low Power T.V. Relay Station) آئندہ چار پانچ برسوں میں قائم کئے جائیں تاکہ ملک کی ۷۰ فیصد آبادی ٹیلی ویژن کی سہولتوں اور فائدوں سے بہرہ ور ہو سکے۔ اس منصوبے کے تحت آئندہ پانچ برسوں (اور اگر ممکن ہو سکا تو چار ہی برسوں) کے دوران ہر سال سو سو کم طاقتی نشری اسٹیشن کھولے جائیں جن پر تقریباً ۱۰ کروڑ روپے سالانہ کے مصارف ہوں گے۔ اس طرح اس منصوبے پر

(باقی صفحہ ۱۹ پر)

ڈاکٹر اقبال محی الدین

پہلا ہندوستانی۔روسی خلائی مشن

انسان کی ہمیشہ سے یہی تمنا تھی کہ وہ خلاء میں پرواز کرے۔ دُنیا کے کچھ ممالک اس میدان میں تجربات بھی کرتے رہے، خاص طور سے امریکہ اور روس۔ آج سے ۲۷ برس پہلے ۱۹۵۷ء میں رُوس نے ایک چھوٹا سا اسپوتنک خلاء میں چھوڑا تھا اور ساری دُنیا کو حیرت میں ڈال دیا تھا۔ اُس کے بعد ہی امریکہ نے بھی اس خلائی دَوڑ میں حصہ لینا شروع کیا تھا اور کافی آگے بڑھ گیا۔ کولمبیا اسپیس شٹل کے خلاء میں چھوڑنے کے بعد امریکہ اس خلائی دَوڑ میں بہت آگے بڑھ گیا۔ یہ دونوں ممالک خلائی تجربات کرتے رہے اور آدمیوں کو بھی خلاء میں وقتاً فوقتاً بھیجتے رہے۔ یہاں تک کہ امریکہ نے چاند پر اپنے آدمی اُتارے جس نے ساری دُنیا کو محوِ حیرت کر دیا۔ اس کے بعد دونوں ممالک برابر خلائی سائنسی تجربات کرتے رہے۔ رُوس کا ارادہ ہے کہ وہ خلاء میں مستقل طور پر اپنا خلائی اسٹیشن قائم کر دے اور بہت ممکن ہے کہ ہندوستانی خلا بازوں کو بھی تحقیقی کام کے لیے وہاں بھیجے۔

ہندوستان خلائی سائنس کے میدان میں اجنبی نہیں ہے کیوں کہ اُس نے مدارِ ارضی میں اپنے کئی سیٹے لائٹ چھوڑے ہیں جن کے نام ہیں آریہ بھٹ، بھاسکر I اور بھاسکر II، روہنی۔ ایپل اور انسیٹ وَن بی۔ اور اب رُوس کے تعاون سے سویوز۔ ٹی۔ ۱۱ میں اپنا پہلا آدمی خلاء میں بھیجا۔ دراصل یہ قابلِ فخر کارنامہ ہمارے سابق وزیرِ اعظم پنڈت جواہر لال نہرو کی سوجھ بوجھ کی وجہ سے عملی جامہ پہن سکا جو سائنسی ترقیاتی پروگرام میں بیحد دلچسپی لیتے تھے۔ سائنس کی ترقی سے انسانیت کو بیحد فائدے پہونچتے ہیں۔ اسی لیے زمین کے اُوپر، زمین کے اندر اور بحری ترقیاتی پروگرام میں ہمارے سائنس داں دلچسپی لے رہے ہیں۔ اس کے علاوہ خلائی سائنس کی معلومات کے لیے ہندوستان بھی بہت کوشاں ہے۔ روس کی مدد سے ہندوستان نے اپنا ایک خلا باز خلاء میں بھیجا جس نے بہت سی سائنسی معلومات اور تجربات خلا میں رہ کر کئے۔ ہندوستان اور رُوس دوستی کی اس سے بہتر مثال نہیں ہو سکتی کہ ہندوستانی سائنسی ترقیات میں اور خاص طور سے خلائی سائنس میں رُوس ہندوستان سے ہر طرح کا تعاون کر رہا ہے۔

رُوس کے پہلے خلائی آدمی یوری گگیرین نے ۱۹۶۱ میں نئی دہلی میں کہا تھا کہ "ایک وقت وہ بھی آئے گا جب ہندوستان ایک آدمی خلاء میں بھیجے گا"۔ اس پیشین گوئی کے ۲۳ سال بعد وہ خلائی آدمی ہے راکیش شرما جس کو ہندوستان نے خلاء میں ۳ اپریل ۱۹۸۴ کو بھیجا۔

پہلا ہندوستانی خلاء باز

پہلا ہندوستانی خلا باز راکیش شرما اپنے دو روسی خلا باز ساتھیوں کے ساتھ ۳ اپریل ۱۹۸۴ء کو روسی قزاقستان کے بیکونُور کوسمو ڈروم سے خلاء میں پرواز کر گیا۔ ان دو روسی خلا بازوں کے نام ہیں یوری میلی شیف اور گنیڈی اسٹریکا لوف۔ یہ ہندوستانی۔ روسی خلا بازوں کی ٹیم سویوز۔ ٹی ۱۱ راکٹ کے ذریعے ۱۸ ٹن والے روسی خلائی اسٹیشن سیلوٹ میں داخل ہو کر ایک ہفتہ تک مختلف سائنسی تجربات کرتی رہی۔ ان تجربات میں سب سے زیادہ اہم بات یہ تھی کہ خلاء میں وزن ختم ہو جانے پر جسم میں دَورانِ خون میں کیا نمایاں تبدیلی ہو جاتی ہے اور اس کو یوگا کے ذریعے کیسے ختم کیا جا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ ریموٹ سینسنگ (Remote Sensing) پر تجربات اور مختلف دھاتوں کو خلاء میں پگھلا کر دُوسری دھاتیں تیار کرنا بھی منصوبے میں شامل تھا۔

راکیش شرما کے دوسرے ہندوستانی خلائی ساتھی تھے رویش ملہوترا۔ ان کی بھی خلائی تربیت راکیش کے ساتھ ہی ہوئی تھی۔ مگر چوں کہ صرف ایک کو ہی خلاء میں جانا تھا لہٰذا راکیش شرما کو آخر میں اس مقصد کے لیے منتخب کیا گیا اور رویش ملہوترا کو بیکونُور کوسموڈروم پر تیار رکھا گیا تاکہ وقتِ ضرورت اُس کو راکیش کی جگہ بھیجا جا سکے۔ امید ہے کہ دُوسرے خلائی مشن میں رویش ملہوترا کو خلاء میں مزید سائنسی تجربات کے لیے بھیجا جائے گا۔

ابھی حال ہی میں خلائی اسٹیشن سیلوٹ میں دو خلا باز بھیجے گئے تھے جن میں ایک ماہرِ امراضِ قلب بھی تھا۔ یہ خلائی اسٹیشن اپریل ۱۹۸۲ء سے خلا میں بخوبی کام کر رہا ہے۔ اس میں دو سائنسی ٹیم رُوس سے آ کر بالترتیب ۱۵۰ اور ۲۱۱ دن تک رہ کر تجربات کر چکی تھیں۔

خلا میں جب زمین کی کشش ختم ہو جاتی ہے تو انسانی جسم پر بہت بُرا اثر پڑتا ہے۔ وزن ختم ہو جانے کے وجہ سے دَورانِ خون پیر کی طرف سے سَر کی طرف دَوڑنے لگتا ہے۔ بہت زیادہ خون جسم کے

اُوپری حصے پر آجانے کی وجہ سے سر میں درد ہو جاتا ہے اور آنکھوں کے پیچھے اندھیرا چھانے لگتا ہے۔ پہلے جانے والے خلائی انسانوں نے اس کیفیت سے بیحد تکلیف اٹھائی تھی۔ سائنس دانوں نے اُس کا حل آخر کار یوگا کسرتوں کے ذریعے نکال ہی لیا۔ راکیش شرما کو خاص طور پر اس بات کی ٹریننگ دی گئی کہ خلا میں یوگا کے ذریعے کس طرح دل و دماغ پر اثر انداز ہونے والی تکلیف پر قابو پا سکے۔ لہٰذا راکیش نے روزانہ خلاء میں یوگا کیا اور وہ اس تکلیف سے محفوظ رہا۔ اُن کے دوسرے روسی ساتھیوں نے بھی ایسے ہی تجربات کرکے اپنے کو محفوظ کر لیا۔ یہ تجربہ جو روسی اور ہندوستانی خلا بازوں نے سیلوٹ خلائی اسٹیشن میں کیا وہ ہوائی فوج کی ٹریننگ پروگرام کے لیے بہت ضروری ہیں۔ اس طرح کے تجربات سے معلوم ہو گیا کہ Space Sickness) کو روکنے کے لیے یوگا کسرتیں بیحد مددگار ثابت ہوتی ہیں۔ دل کے دھڑکنے کی کیفیت کو (ECG) کے ذریعے جانا جاتا ہے۔ یہ تجربہ جو روسی اور ہندوستانی خلا بازوں نے سیلوٹ خلائی اسٹیشن پر کیے وہ (ECG) سے بہتر نتائج دے رہے ہیں۔

ہندوستانی خلائی مشن کے اغراض و مقاصد اور فوائد

ہندوستان کی سائنسی ترقیات میں اور خاص طور سے خلائی سائنس کے میدان میں تعاون دینے میں رُوس نے بیحد اہم رول ادا کیا ہے۔ جب سے خلائی پروگرام دونوں ممالک نے بنائے اور راکیش شرما کو خلا میں بھیجا گیا، ہندوستان روس دوستی خلا کی بلندیوں کو چھونے لگی۔ روسی اور ہندوستانی سائنس دانوں کا یہ بھی مقصد ہے کہ ہندوستان میں چھپی ہوئی معدنیاتی دولت کا بھی پتہ لگایا جائے۔ زمین کے استعمال سے متعلق بھی سروے کیا جائے اور طوفان، موسم اور برف پگھلنے کی کیفیت کا بھی اندازہ لگایا جائے اور تیل اور گیس کے ذخیروں کا بھی پتہ لگایا جائے۔ اس کام کے لیے ریموٹ سینسنگ Remote Sensing کے ذریعے خلاء سے تصاویر لی گئیں۔ ۲.۲ ملین اسکوائر کلومیٹر زمین کے رقبے کی تصاویر لی گئیں جن سے اعداد و شمار جمع کرنے میں مستقبل میں آسانی ہوگی۔ ہندوستان پر سے دن رات ملا کر چھ مرتبہ رُوسی خلائی اسٹیشن گزرتا رہا اور راکیش شرما اور اُن کے دوسرے روسی ساتھی ہائی ریزولوشن ملٹی اسپکٹرل کیمروں کی مدد سے ہندوستانی سرحد اور مختلف جگہوں کی تصاویر کھینچتے رہے۔ ان تصاویر کی وضاحت سے سائنس دانوں کو سمندروں میں طوفان کا پتہ چل سکے گا، گرد و غبار کے طوفانوں کا پتہ لگ سکے گا، سیلاب زدہ علاقوں کا علم ہو سکے گا، جنگلات کا پتہ چل سکے گا، کھیتی والی فصلیں اور اُن سے پیدا ہونے والے اناج کا تخمینہ لگ سکے گا۔ اس کے علاوہ پہاڑوں پر برف کے پگھلنے اور دریاؤں کے بہاؤ اور پانی کا تخمینہ لگ سکے گا۔

انڈین اسپیس ریسرچ آرگنائزیشن نے ریموٹ سینسنگ کا پروگرام بنایا تھا جس کو ہندوستانی۔ رُوسی سائنسی مشن نے پایۂ تکمیل کو پہنچایا۔ ہمالیہ پہاڑ کے دُشوار گزار راستوں کی تصاویر لی گئیں، بلند چوٹیوں اور برف کے ذخائر کی تصاویر بھی ریموٹ سینسنگ کے ذریعے لی گئیں۔ ریگستان تھار اور بحرِ ہند کی تصاویر بھی لی گئیں۔ ہمالیائی تصاویر کے مطالعے سے سائنس دانوں کو ہندوستان کے دریاؤں اور تازہ پانی کے ذخائر کا علم ہوگا۔ ریگستان تھار کے سروے سے معلوم ہو سکے گا کہ وہاں زمین کے اندر پانی کے ذخائر کہاں کہاں دستیاب ہیں۔ بحرِ ہند کی تصاویر سے یہ اندازہ لگانے میں آسانی ہوگی کہ کہاں کہاں مچھلیاں پائی جاتی ہیں اور کہاں اُن کو زیادہ سے زیادہ پالا جا سکتا ہے۔ ریموٹ سینسنگ Remote Sensing کے ذریعے لی گئی تصاویر سے ملک کے اندر تیل اور گیس کے ذخائر کا بھی علم ہو سکے گا۔

مخصوص کیمروں کی مدد سے جو تصاویر لی گئیں یا خلائی اعداد و شمار جمع کیے گئے اُن سے PhotoInterpretationTechnique کو ترقی دینے میں بہت مدد ملے گی۔ جنگلات سے متعلق معلومات میں اضافہ ہوگا، زمین کے استعمال سے متعلق نقشوں کے بنانے میں بیحد مدد ملے گی۔ اس کے علاوہ علم نقشہ نویسی، علم بحریات، علوم ارضی اور سمندری ساحلی علاقوں کے مطالعہ میں بیحد مدد ملے گی۔

پہلا ہندوستانی خلا باز راکیش شرما زمین سے ۳۰۰ کلومیٹر اوپر خلاء میں سیلوٹ۔۷ روسی خلائی اسٹیشن ریموٹ سینسنگ کے ذریعے ہندوستان کے مختلف حصوں کی تصاویر لیتا رہا۔ ایک ہفتہ کی اس اڑان اور دوران قیام اُس کا ایک ایک منٹ معروف رہا تھا۔ صفر کشش ارضی (Zero Gravity) میں یہ سارے سائنسی تجربات کرنا معمولی بات نہ تھی جبکہ جسم کا یا کسی بھی چیز کا وزن وہاں نہیں رہتا اور ہر چیز خلا میں تیرتی رہتی ہے یا معلق رہتا ہے۔ یوگا کسرت کے ذریعے جسم میں دورانِ خون کے اُلٹے دوڑنے کی وجہ سے (Space Sickness) کو ختم کرنے پر بھی تجربات ہوئے جو کامیاب رہے۔

مختلف دھاتوں کو ایک ساتھ پگھلا کر صفر کشش ارضی میں ٹھنڈا کرکے دوسری دھات تیار کرنا بھی اس ہندوستانی۔ رُوسی مشن کا مقصد تھا جس کو بخوبی انجام دیا گیا۔ چاندی اور جرمینیم کو خلائی اسٹیشن کی بھٹی میں پگھلا کر نئی دھات تیار کی گئی جس کا تجزیہ تجربہ گاہوں میں کیا جائے گا۔

سویوز ٹی۔ ۱۱ کا صد ارضی میں داخلہ اور سیلوٹ۔۷ سے ملاقات:۔

ہندوستانی خلا باز اسکواڈرن لیڈر راکیش شرما پہلا ہندوستانی خلائی مشن لے کر سویوز ٹی۔۱۱

راکٹ سے خلائی اسٹیشن ۔ یہ رات ۱۱ بجکر ۲ منٹ پر پہونچے جہاں سیلوٹ اسٹیشن کے کمانڈر لیونڈ کزیم نے اُن کا اور اُن کے دو روسی ساتھیوں کا بہت گرم جوشی سے استقبال کیا۔ سیوز ٹی ۔ ۱۱ سیلوٹ خلائی اسٹیشن سے جاکر مل گیا تھا جس کو ایک خاص تالے کے ذریعے خلائی اسٹیشن سے جوڑ دیا گیا اور وہ سیلوٹ ۔ ۷ خلائی اسٹیشن کے ساتھ تین گھنٹے تک مدارِ ارضی میں چکر لگاتا رہا۔ جس وقت یہ راکٹ خلائی اسٹیشن سے جا ملا تھا اُس وقت وہ روس کے ٹھیک اُوپر تھے۔ زمین کا مشن کنٹرول سنٹر کمپیوٹر کے ذریعے راکٹ اور خلائی اسٹیشن کے سربراہوں کو ہدایات جاری کرتا رہا تھا تاکہ ایک نرم جھٹکے کے ساتھ دونوں ایک دوسرے میں جُڑ جائیں۔ بعد میں راکیش شرما اور اُس کے دونوں روسی خلائی ساتھی یوری میلشیف اور گنیڈی اسٹریکالوف راکٹ کے ایک تنگ راستے سے سیلوٹ۔۷ خلائی اسٹیشن میں داخل ہو گئے جہاں اُن کو مختلف سائنسی خلائی تجربات ایک ہفتہ تک کرنا تھا۔

اس کامیاب خلائی پرواز اور سیلوٹ خلائی اسٹیشن سے بالکل صحیح طور سے مل جانے سے روس اور ہندوستان دونوں ملکوں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ سارا پروگرام ٹیلی ویژن نے کروڑوں لوگوں کو دکھایا اور ریڈیو نے تفصیل سے ساری خبریں نشر کیں۔ اخباروں کی سرخیوں میں جلی حروف میں ہندوستان ۔ روس کی دوستی کو تہِ دل سے سراہا گیا۔ وزیراعظم محترمہ اندرا گاندھی نے اور صدر جمہوریہ ہند محترم گیانی ذیل سنگھ نے مبارکباد کے تار ماسکو بھیجے اور روس ۔ ہندوستان کے خلائی مشن کی کامیابی اور دونوں ملکوں کی دوستی کو سراہا۔

سارے جہاں سے اچھا ....

وزیراعظم محترمہ اندرا گاندھی نے ۵ اپریل ۱۹۸۴ء کی شام ساڑھے آٹھ بجے وائیو بھون، نئی دہلی کے ایک خاص اسٹوڈیو سے خلاباز اسکواڈرن لیڈر راکیش شرما سے ٹیلی ویژن مواصلاتی نظام کے ذریعے بات کی۔ اس طرح راکیش شرما نہ صرف پہلا ہندوستانی خلاباز تھا بلکہ پہلا آدمی ہے جس سے وزیراعظم ہند نے خلاء میں بات کی۔ سب سے پہلے محترمہ وزیراعظم اندرا گاندھی نے یہ پوچھا کہ آپ کو خلاء سے ہندوستان کیسا لگ رہا ہے؟ جواب میں راکیش شرما نے علامہ اقبال کے شعر کا ایک مصرعہ "سارے جہاں سے اچھا ....." پڑھا جس نے اُس کے جذبات کی ترجمانی کے ساتھ ساتھ سوال کا بہت عمدہ جواب دیا۔ وزیراعظم ہند نے راکیش کے ساتھ ساتھ اُس کے اور روسی خلاباز ساتھیوں کو بھی اُن کی کامیابی کی مبارکباد دی اور اُن کو ہندوستان آنے کی دعوت بھی دی۔ اندرا گاندھی نے یہ بھی کہا کہ آپ لوگ ہم سے بہت دور خلائی اسٹیشن سیلوٹ ۔ ۷ میں ہیں لیکن ہمارے دل اور ہماری نیک خواہشات آپ لوگوں کے ساتھ ہیں۔

اب تک ہمیشہ یہ ہوتا رہا ہے کہ لوگ اندرا گاندھی سے انٹرویو لیتے تھے۔ لیکن یہ ایسا اہم تاریخی موڑ آگیا جس میں پہلی مرتبہ ایک ہندوستانی خلا میں داخل ہوا تو اندرا گاندھی نے زمینی اسٹیشن سے خود راکیش شرما کا انٹرویو دس منٹ تک لیا اور مختلف سوالات پوچھے۔ یہ سارا پروگرام دور درشن کے انسیٹ وَن بی کے ذریعے پورے ملک کے عوام کو دکھایا۔ خوشی سے ہر آدمی جھوم رہا تھا کہ کتنے فخر کی بات ہے کہ ہندوستان نے بھی خلاء میں پہلا آدمی بھیج دیا اور ہند روس دوستی کے نعرے بلند ہونے لگے۔

خلاء میں یوگ آسن

اب تک یوگ کسرتیں زمین تک ہی محدود تھیں لیکن یہ خیال کیا گیا کہ خلاء میں وزن ختم ہو جانے سے جسم طرح طرح کی بیماریوں سے دوچار ہو جاتا ہے۔ اسے یوگ کسرتوں کے ذریعے ختم کیا جا سکتا ہے۔ راکیش شرما روزانہ سیلوٹ ۔ ۷ خلائی اسٹیشن پر یوگا آسن کرتے رہے اور اُن کا مقابلہ اُن کے دوسرے روسی خلائی ساتھیوں کے ساتھ کیا گیا جس سے یہ ثابت ہو گیا کہ یوگ آسن خلائی بیماری سے نجات دلانے میں بہت کارآمد ہے۔ جب صفر کشش ارضی میں خلائی آدمی جاتے ہیں تو اُن کا وزن ختم ہو جاتا ہے اور جسم میں خون کی گردش اُلٹی ہو جاتی ہے یعنی پیر کی طرف سے سر کی طرف دورانِ خون ہو جاتا ہے جس سے خلابازوں کے سر میں شدید درد شروع ہو جاتا ہے۔ اس خلائی بیماری کا علاج یوگ آسنوں کے ذریعے راکیش شرما نے کیا۔ اُس نے "پرانا یاما" یوگ آسن کیا۔ اس کے علاوہ اُس نے اور تین طرح کے آسن بھی کئے جن کے نام ہیں "پدا ہستا آسن"۔ "پاری ورتا آسن"۔ "ترکیو آسن" اور "اُستر آسن"۔ یہ وہ کسرتیں ہیں جن کو خاص طور سے خلاء میں پیدا ہونے والی بیماریوں کے اثرات کو انسانی جسم سے ختم کرنے کے لیے کیا گیا۔ راکیش شرما نے روزانہ ایک ہفتہ تک یوگ آسنوں کو خلاء میں کیا اور اس کی وجہ سے اُن کو "خلائی بیماری" سے نجات مل گئی اور اُن کے جسم کا دورانِ خون سر سے پیر کی طرف ہی رہا۔

ایک خاص طرح کی مشین پر دل کے دھڑکنے کی رفتار اور جسم میں دورانِ خون کا دباؤ کا ریکارڈ برابر لیا جاتا رہا تاکہ صفر کشش ارضی کی حالت میں انسانی جسم میں کیا کیا تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں اور ان خرابیوں کو دور کرنے کا کیا مداوا ہے۔ ان پر تفصیلی مطالعہ کیا جا سکے گا، تاکہ آئندہ خلاء میں جانے والے خلابازوں کو کوئی تکلیف نہ ہو۔

خلاء میں دھاتوں پر تجربات

خلائی اسٹیشن سیلوٹ ۔ ۷ پر راکیش شرما نے اپنے دوسرے خلائی ساتھیوں کے ساتھ دھاتوں پر تجربات کئے۔ یہ ایسے خاص تجربات تھے جو زمین پر ممکن نہیں تھے۔ کچھ دھاتوں کو خلائی اسٹیشن کی بھٹی میں پگھلا کر صفر کشش ارضی میں ٹھنڈا کیا گیا جس سے کچھ نئے دھات تیار ہو سکے۔ یہ دھات زمین کی

یوجنا، نئی دہلی

تجربہ گاہوں میں مزید تجزیہ کے لیے بھیج دی گئی ہے۔ اُمید ہے ان دھاتوں کے (Micro Nucleation Structure) سمجھنے میں سائنس دانوں کو بہت مدد ملے گی۔

چاندی اور جرمنیم کو ایک ساتھ خلائی بھٹی میں پہلے تو بالکل پگھلا دیا گیا اور پھر ان دونوں دھاتوں کو خلا کی صفر گریوٹی میں اندر سے ٹھنڈا کیا گیا تاکہ دونوں دھاتیں ایک دوسرے میں ضم ہو کر کسی نئی دھات کی شکل میں پیدا ہو جائیں۔ یہ تجربہ زمین پر نہیں ہو سکتا کیوں کہ زمین کی کشش ان دھاتوں کو اندرونی طور پر ٹھنڈا ہونے سے روکتی ہے۔ یہ صرف خلا ہی میں ممکن ہے جہاں صفر گریوٹی ہوتی ہے۔

اب تجربہ گاہوں میں مزید تفصیلی تجزیہ سے بعد ہی معلوم ہو سکے گا کہ یہ نئی دھات کون سی ہے اور اس سے کیا فوائد حاصل ہو سکتے ہیں۔

ٹیرا تجربات بذریعہ ریموٹ سینسنگ

۷ اپریل ۱۹۸۴ تک مخصوص کیمروں کی مدد سے ہندوستان کے تقریباً ۲۰ فیصد حصوں کی تصاویر خلا سے لی جا چکی تھیں جن سے اُمید ہے زمین کے اندر کی بناوٹ کے ساتھ ساتھ معدنیات سے متعلق معلومات بھی فراہم ہو سکیں گی۔ اس طرح کے خلائی تجربات کو ٹیرا تجربات کہا جاتا ہے۔ خلا بازوں نے ۳۲۰ تصاویر ہندوستان کی اور روسی پامیر پہاڑ کی کھینچیں۔ یہ تصاویر اس وقت لی گئیں جب خلائی اسٹیشن ہندوستان اور روس کے اوپر سے گزر رہا تھا۔ خلا بازوں نے ملٹی اسپیکٹرل MKF 6M اور کیٹ ۱۴۰ کیمروں کا اس مقصد کے لیے استعمال کیا۔ راکیش شرما نے اس کام میں بہت مہارت دکھائی جس کی تعریف اُن کے روسی خلا باز ساتھیوں نے بھی کی۔

جب خلائی اسٹیشن انڈمان اور نکوبار جزائر پر سے گزر رہا تھا اس وقت خلا بازوں نے سمندر کی تصاویر لیں تاکہ سمندر کے اندر جاندار زندگی کا علم ہو سکے۔ اس کے علاوہ ان جزائر کے زمین کی اندرونی بناوٹ کی تصاویر لیں تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ تیل اور گیس کے ذخائر وہاں موجود ہیں یا نہیں۔ جزائر کے جنگلات کی بھی ریموٹ سینسنگ کے ذریعے تصاویر لی گئیں تاکہ بعد میں اُن جگہوں کے نقشے تیار ہو سکیں اور وہاں کی معدنیاتی دولت کا بھی اندازہ ہو سکے۔

خلائی اسٹیشن سیلوٹ کا دوسرا چکر درمیانی ہندوستان پر سے تھا۔ خلا بازوں نے لکش دیپ جزائر کی بھی تصاویر لیں۔ انھوں نے وہاں Ring Structure پایا جس سے اندازہ ہے کہ ان جزائر میں معدنیات کے ذخائر ہوں گے۔

اسی دوسرے چکر میں گنگا اور نربدا دریاؤں کے بیسن کی بھی تصاویر لی گئیں۔ تیسرے خلائی اسٹیشن کے چکر میں ہمالیہ اور پامیر پہاڑوں کی تصاویر لی گئیں۔ خلا بازوں نے یہ دیکھا کہ ہمالیہ پہاڑ کے اوپر بادلوں کا پھیلاؤ بہت زیادہ ہے بمقابلہ اُس کی وادیوں کے۔ ۷ اپریل کو ہی سیلوٹ خلائی اسٹیشن ہندوستان پر سے دو بار اور گزرا اور خلا بازوں نے اپنا " Terra Experiment دو حصوں میں کیا۔ پہلا صبح ۱۱ بجے سے ۱۱ بج کر ۵ منٹ تک اور دوسرا اُس میں ایک بج کر ۴۰ منٹ سے ایک بج کر ۴۴ منٹ تک گیا۔

۸ اپریل کو بھی ٹیرا تجربات خلا بازوں نے کئے۔ خلا سے گنگا برہمپترا کے ڈیلٹا کی تصاویر لی گئیں اور بحرِ عرب کی بھی تفصیلی تصاویر ریموٹ سینسنگ کے ذریعے لی گئی۔ ان کے علاوہ نئی دہلی اور آگرہ کی بھی تصاویر کھینچی گئیں۔ ۱۰ اپریل ۸۴ تک تقریباً ۴۰ فی صد ہندوستانی زمین کی تصاویر کھینچی جا چکی تھیں ساحلی علاقوں کی بھی تصاویر لی گئیں جن سے مختلف اعداد و شمار حاصل کرنے میں مدد ملے گی۔

اسی خلائی گردش کے دوران خلا بازوں نے برما کے جنگلات میں آگ لگی ہوئی دیکھی اور فوراً انھوں نے زمینی کنٹرول اسٹیشن کو ماسکو میں خبر دی۔ روسی زمینی کنٹرول سنٹر نے حکومتِ ہند کو اس بات کی اطلاع دی اور حکومتِ ہند نے حکومتِ برما کو آگ سے خبردار کر دیا جنھوں نے آگ پر فوراً قابو پا لیا مگر اُس وقت تک تقریباً ۵ کلومیٹر تک آگ پھیل چکی تھی۔ یہ آگ اتنے گھنے جنگلات کے درمیانی حصوں میں لگی تھی کہ جس کو خلا سے ہی دیکھنا ممکن تھا۔

اس ٹیرا تجربات کے ساتھ ساتھ خلا بازوں نے ۸ اپریل کو ہی خلائی بھٹی کی مرمت کا کام بھی انجام دیا جس میں تھوڑی سی خرابی آ گئی تھی۔ بھٹی کے ٹھیک ہوتے ہی چاندی اور جرمنیم کے پگھلانے کا کام شروع کر دیا گیا تھا اور کامیابی سے یہ تجربہ بھی مکمل کیا گیا۔

هندوستانی اور روسی خلا بازوں کا روزانہ خلائی پروگرام

سیلوٹ ۷ خلائی اسٹیشن پر راکیش شرما اور اُن کے روسی خلا باز ساتھی بہت مستعدی سے مختلف سائنسی تجربات میں ایک ہفتہ تک منہمک رہے۔ انھوں نے یوگا آسن سے لے کر ٹیرا تجربات اور دھاتوں کو پگھلا کر نئی دھات بنانے کے تجربات تک کام کئے۔

دوردرشن نے روزانہ ٹیلی ویژن پر انسیٹ ون بی کے ذریعے راکیش شرما اور اُن کے دوسرے ساتھیوں کی بات چیت لاکھوں لوگوں کو دکھایا۔ راکیش شرما نے خلائی اسٹیشن کے اندر کی ہر چیز پر تفصیل سے روشنی ڈالی اور اوپر سے زمین کو بھی دیکھا۔ اپنے کھانے پینے کے طریقے کو عوام کو بتایا کہ وہ لوگ جو کھانا اپنے ساتھ لے گئے تھے وہ سب مشین کے ذریعے اتنا دبا دیا گیا تھا کہ کھاتے وقت ایک ٹکڑا بھی اِدھر اُدھر نہ گر جائے اور کھانے کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کر کے پیکٹ میں رکھے گئے تھے کیوں کہ خلا میں وزن نہ رہ جانے کی وجہ سے وہ گرا ہوا کھانے کا ٹکڑا خلا میں تیرتا پھرتا اور سانس کے ساتھ جسم میں جا کر نقصان پہنچا سکتا تھا۔

یوجنا نگم وہار

سیلوٹ۔ ۷ اسپیس اسٹیشن کے اندر تجربات میں خلابازوں کو بہت دقت ہوتی تھی کیونکہ وزن نہ ہونے کی وجہ سے ہر چیز ذرا بھی ہاتھ کے دباؤ سے ہٹی اور خلا میں تیرنے لگتی تھی۔ لہٰذا ہر چیز کو پکڑ کر یا باندھ کر رکھنا پڑتا تھا۔ اسی لیے تجربات میں کافی دیر لگتی تھی۔

رُوسی زمینی کنٹرول اسٹیشن اِن خلابازوں سے مستقل رابطہ قائم رکھے ہوئے تھا اور روزانہ ٹیلی ویژن پر اُن لوگوں کی تصاویر اور آواز ہم تک پہونچاتا رہا تھا۔ روزانہ دہلی دُور درشن خاص طور پر خلائی پروگرام ہندوستانی عوام کو دکھاتا رہا۔ زمین کے کنٹرول اسٹیشن سے بہت سے اخبار والوں نے اور سائنس دانوں نے راکیش شرما سے اور اُن کے ساتھیوں سے بات چیت کی۔ آواز بہت صاف اُن لوگوں تک پہونچ رہی تھی اور اُن کی بھی آواز اور تصویریں بہت صاف ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر آ رہی تھیں۔ سائنس کی اِس زبردست ترقی نے ہمیں حیرت میں ڈال دیا۔ اب فاصلے کی اہمیت آج کے دَور میں بالکل نہیں رہی۔ اور یہ سب ممکن ہو سکا ہندوستانی اور رُوسی سائنس دانوں کی انتھک محنت اور لگن کی وجہ سے۔

خلا بازوں کی زمین پر واپسی

حالانکہ ہندوستانی اور رُوسی خلا بازوں کو ۱۱ اپریل ۱۹۸۴ کی شام کو زمین پر واپس پہونچنا تھا لیکن اس کی تیاری اُن لوگوں نے ۹ اپریل سے ہی شروع کر دی۔ سارے تجربات کو وقت پر مکمل کر لینے میں ایک ایک منٹ کا وقت بھی اُن لوگوں نے اپنے کو بہت مشغول رکھا۔ جس خلائی راکٹ سویوز۔ ۱۱ سے وہ لوگ خلائی اسٹیشن سیلوٹ۔ ۷ تک پہونچے تھے وہ اب تک خلائی اسٹیشن کے ساتھ جڑا ہوا تھا۔ اس کے علاوہ دوسرا راکٹ سویوز۔ ۱۰ جس سے پہلے والی ٹیم پہنچی تھی وہ بھی خلائی اسٹیشن سے ۹ فروری ۱۹۸۴ سے جڑا ہوا تھا۔ راکیش شرما، کمانڈر میلی شیف اور انجینئر اسٹریکالوف سویوز۔ ۱۰ سے واپس آنے کی تیاری کر رہے تھے اور اس کی دیکھ بھال بھی انھوں نے کی۔ سویوز۔ ۱۱ سے پہلی خلائی ٹیم جو تین آدمیوں پر مشتمل ہے، واپس آئے گی۔ ۱۱ اپریل کو تینوں خلاباز راکیش شرما، کمانڈر میلی شیف اور انجینئر اسٹریکالوف نے واپسی کی تیاری میں اپنے اپنے خلائی سوٹ پہنے اور سویوز۔ ۱۰ میں پہونچ گئے۔ سویوز۔ ۱۰ کے تین حصے تھے ایک ورکنگ موڈول، دوسرا ڈیسینٹ موڈول Descent Module اور تیسرا انجن اور دوسری مشینیں۔

ان تینوں حصوں میں سے صرف گھنٹی کی شکل والا ڈیسینٹ موڈول ہی زمین پر آیا اور فضائے ارضی میں داخل ہونے سے پہلے ورکنگ موڈول سویوز۔ ۱۰ سے الگ ہو گیا۔ اور بقیہ دونوں حصے فضائے ارضی میں داخل ہو گئے۔ خلابازوں نے فضا میں داخل ہونے سے پہلے ریٹرو راکٹ کو فائر کیا جس سے انجن کو پوری طاقت فضا میں داخل ہونے کے لیے مل گئی۔ کشش ارضی کی وجہ سے (Descent Module) تیزی سے زمین کی طرف گرنے لگا اور ساتھ ہی ساتھ فضا میں زبردست رگڑ پیدا ہونے سے (Descent Module) کے اُوپری حصہ میں آگ لگ گئی اور اُس کا درجۂ حرارت بڑھ کر ۲۵۰۰ ڈگری سیلسیس Celcius تک پہونچ گیا مگر اندر کا درجۂ حرارت صرف ۲۰ ڈگری سیلسیس ہی قائم رہا۔ Descent Module کے اوپر جو کوٹنگ کی گئی تھی اُس کی وجہ سے Descent Module پگھلا نہیں بلکہ ایک خاص درجۂ حرارت (2500.0) تک قائم رہا اور موڈول کے اندر کی گرمی کو بھی بڑھنے نہیں دیا جس کی وجہ سے تینوں خلاباز محفوظ رہے۔

خلا سے زمین کے اُوپری فضا میں داخل ہونے میں امریکہ اور رُوس کے کئی بغیر آدمی کے راکٹ جل چکے تھے۔ اس خطرے کو ٹالنے کے لیے امریکہ نے خاص قسم کی Tiles کا استعمال کیا تھا جبکہ رُوس نے خاص کوٹنگ کا موڈول پر استعمال کیا۔

خلا سے واپس آنے سے قبل خلیج بنگال کی بہت سی تصاویر لی گئیں۔ حالانکہ تصاویر وہاں کی لی گئی تھیں مگر بادل آ جانے سے تصویریں صاف نہیں تھیں۔ خلا سے مشرقی ساحل کی بھی تصاویر لی گئیں۔ سارے ٹیپ، فلمیں، دھات کے ٹکڑے وغیرہ کو بہت احتیاط سے واپس لایا گیا۔

سیلوٹ۔ ۷ کے تین خلاباز جو وہاں ۸ فروری سے موجود ہیں پوری گرمیاں گزار کر سویوز۔ ۱۱ راکٹ کے ذریعے زمین پر واپس آئیں گے اور اُمید ہے وہ ۲۱۱ دن خلا میں رہنے والے پہلے ریکارڈ کو توڑ دیں گے۔

خلائی اسٹیشن سیلوٹ۔ ۷ کو چھوڑنے اور زمین تک پہونچنے میں خلابازوں کو ۳½ گھنٹے تک ۱۱ اپریل ۱۹۸۴ کو اسکواڈرن لیڈر راکیش شرما، یوری میلی شیف اور گنیڈی اسٹریکالوف روسی قزاقستان کے ارکالک مقام پر ہندوستانی وقت کے مطابق شام ۴ بجکر ۱۹ منٹ پر واپس زمین پر پہونچے۔ ارکالک بیکانور سے ۶۰۰ کلومیٹر دُور ہے اور ماسکو سے ۳ ہزار کلومیٹر دُور ایک برف کی دلدلی جگہ ہے، یہاں ان کا موڈول پیراشوٹ کی مدد سے بہت آہستہ آہستہ اُترا۔ پہلے سے تیار ہیلی کوپٹروں، جہازوں اور رُوسی سائنسدانوں نے اُن کا استقبال کیا، اُن کا میاب خلائی پرواز پر اُن کو مبارکباد دی اور پھولوں کے ہاروں سے اُن کو لاد دیا۔ اس پورے واپسی کے پروگرام کو ٹیلی ویژن پر لاکھوں لوگوں نے ہندوستان، رُوس اور دُنیا کے دوسرے ممالک کے لوگوں نے دیکھا اور بیحد پسند کیا۔ رُوسی سائنس دانوں نے اور دوسرے لوگوں نے تینوں خلا بازوں کو موڈول سے باہر نکالنے میں مدد کی کیوں کہ وہ لوگ اپنے سے چل نہیں سکتے تھے۔ ایک ہفتہ تک بےوزنی کی حالت میں خلا میں رہنے کی وجہ سے اُن کے جسم کے پٹھوں میں اتنی طاقت نہیں رہ گئی تھی کہ دوبارہ "وزن کی حالت" کا فوراً بوجھ اُٹھا سکتے۔ ان تینوں خلا بازوں

(باقی صفحہ پر)

م.م. راجندر

افسانہ

خان پارس ناتھ

اِس محلے میں آنے کے بعد جن صاحب سے میں سب سے زیادہ متاثر ہوا وہ میری ہی گلی کے نکڑ پر رہنے والے ایک بزرگ پٹھان تھے۔ عمر ستر سے کم نہیں ہوگی۔ سفید نورانی داڑھی، لمبا قد اور کمر کے مقابلے میں چھریرا اور چست جسم۔ سر پر کلاہ اور پگڑی۔ پٹھانوں کا سا کرتہ اور اس پر وہی واسکٹ، اسی طرح لٹھے کی چوڑے پائنچوں کی شلوار اور وہی افغانی چپل۔ چہرے پر آنکھوں کے نیچے نظر آنے والی عمر اور تجربے کی چند جھریاں اور بڑی بڑی لیکن مرجھائی ہوئی سی آنکھیں جن کی پتلیوں میں جیسے سارے زمانے کی گرمی اور سردی سمائی ہوئی ہو۔ ایک چھوٹی سی چھڑی ھ میں لے کر صبح اور شام سیر کے لیے باہر نکلتے۔ آنے نے والوں کو دیکھتے مگر چپ چاپ آگے بڑھ جاتے۔ ئی سلام یا آداب عرض کر دیتا تو اُس کا جواب دے یتے۔ لوگ انھیں خان صاحب کہا کرتے تھے۔

چند دنوں میں ہی اپنے ایک پڑوسی سے اِن بارے میں باتیں کرنے کے وران، میں یہ ن کر حیران رہ گیا کہ جن بزرگوار کو میں مسلمان جھے ہوئے تھا وہ دراصل ہندو تھے اور ان کا م خان پارس ناتھ تھا۔ مجھے یہ نام کچھ عجیب ا لگا۔ بہرحال پتہ لگا کہ خان صاحب ملک کی تسیم سے پہلے شمال مغربی سرحدی صوبے میں دان کے پاس ایک ایسے گاؤں کے رہنے الے تھے جہاں خان قبیلہ بستا تھا جس کے افراد ہندو ر مسلمان دونوں تھے۔ تقسیم کے فسادات میں ہندوستان تے ہوئے راستے میں اپنا رہا سہا اثاثہ اور اکلوتا لڑکا نوا چکے تھے۔ جذباتی اور مالی طور پر برباد ہو کر یہاں پہنچے تھے اور جب سے بس اِسی چھوٹی سی کوٹھری میں تنہا رہتے تھے۔ وہاں کسی عدالت میں پیشکار تھے اور اب اُسی ملازمت کی بنا پر یہاں کی سرکار پچاس روپے ماہوار پنشن دے رہی تھی جس میں گزارہ کر رہے تھے۔ پتہ لگا کہ پٹھانی غیرت اور شرافت میں بڑا اعتقاد رکھتے تھے اور سخت سے سخت حادثے اور مصیبت نے بھی اس عقیدے کو جنبش نہیں دی تھی۔ ایک وقت روٹی خود بنا لیتے تھے اور اُسے دونوں وقت کھا لیتے تھے۔ اپنے کپڑے خود دھو لیتے تھے۔ خدا جانے اِس قلیل رقم میں جس میں سے اِس کوٹھری کا آٹھ روپے ماہوار کا کرایہ بھی ادا کرتے تھے کیسے گزارہ کر لیتے تھے۔ نگران صاحب کا کہنا تھا کہ جب سے آئے ہیں کبھی کسی سے کسی مدد کے طلب گار نہیں ہوئے۔ اُردو، فارسی اور عربی جانتے تھے اور اکثر گفتگو میں ان زبانوں کے اشعار کا حوالہ دیتے تھے۔

اِن تفصیلات کو سن کر مجھے اُن سے ملنے کا اشتیاق پیدا ہوا۔ ایک روز جب وہ سامنے سے چلے آ رہے تھے تو میں نے انھیں آداب عرض کیا اور کھڑا ہو گیا۔ وہ بھی رُک گئے اور بولے۔

"برخوردار میں نے تمھیں پہچانا نہیں۔"

"جناب میرا نام محمد اسلم ہے اور میں یہاں کالج میں اُردو کا لیکچرار ہوں۔ میں تقریباً تین ہفتے ہوئے اس محلے میں آیا ہوں اور اسی گلی میں دو سامنے اُوپر کے مکان میں رہتا ہوں۔ آپ کے بارے میں بہت کچھ سُن چکا ہوں اور آپ سے ملنے کا بڑا اشتیاق تھا۔" میں نے کہا۔

خان پارس ناتھ مُسکرائے اور بولے۔

"عزیز تم نوجوان ہو اور میں چراغِ سحری۔ یہ دُنیا تم جیسے نوجوانوں کے لیے ہے۔ خوش رہو اور آباد رہو۔ تم نے مجھ سے ملنے کی خواہش ظاہر کی تو یہ تمھاری سعادت مندی ہے۔ صبح یا شام جب وقت ملے آ جانا۔ میں گھر میں ہی پڑا رہتا ہوں۔"

یہ کہہ کر خان پارس ناتھ آگے بڑھ گئے۔ ان کی ذات میں میری دلچسپی اور تجسس اور بڑھ گیا۔ اگلے روز اتوار تھا۔ صبح ناشتے سے فارغ ہو کر اُن کے یہاں پہونچ گیا۔ ایک چارپائی پر بیٹھے ہوئے منشی سورج نارائن مہر کا لکھا ہوا گیتا کا اُردو منظوم ترجمہ پڑھ رہے تھے۔ میرے پہنچتے ہی کتاب بند کر دی اور مجھے چارپائی پر سرہانے کی طرف بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے آپ پائنتی کی طرف کھسک گئے۔ میں نے دیکھا کہ ان کا اثاثہ صرف یہ چارپائی، ایک مختصر بستر، ایک چھوٹا سا ٹوٹا ہوا لوہے کا ٹرنک جس میں صرف دو چار کپڑے ہی آ سکتے تھے، ایک انگیٹھی اور کھانا بنانے اور کھانے کے چند برتن تھے۔ ایک کتاب یہ اس وقت پڑھ رہے تھے اور ایک موٹے سے بستے میں بندھی ہوئی سامنے طاق میں رکھی ہوئی تھی۔ اس خستہ حال کوٹھری میں کوئی الماری وغیرہ نہیں تھی جہاں کچھ اور سامان رکھا ہوا ہوتا۔ باتیں شروع ہوئیں اور دیر تک میرے بارے میں پوچھتے رہے اور اپنی سُناتے رہے۔

خان پارس ناتھ کو اپنے پٹھان ہونے پر بڑا فخر تھا اور انھوں نے اسی بات کی تصدیق کی کہ تقسیم سے پہلے شمال مغربی سرحدی صوبے میں متعدد ہندو گھرانے خان قبیلے سے تعلق رکھتے تھے اور نام اور مذہب کے اختلاف کے باوجود وہاں لباس، رسوم، طرزِ رہائش، تہذیب اور معاشرت سب ایک تھی اور یہ پہچاننا مشکل تھا کہ کون ہندو ہے اور کون مسلمان۔ قدرے جوش میں آ کر بولے،

"مجھے اپنے پٹھان ہونے پر بڑا فخر ہے۔ مذہب ہندو کا ہے، مسلمان کا ہے اور عیسائی کا ہے مگر ایک آفاقی مذہب انسان کا بھی ہے اور وہ انسانیت ہے۔ جب کبھی انسانی بھائی چارے کا سوال اٹھا، پٹھان قوم نے انسانی مذہب یعنی انسانیت کو اپنے نجی مذہب کے مقابلے میں برتر جگہ دی۔ یہ اُن کی وسعتِ قلبی اور فراخدلی کا ثبوت ہے اور برخوردار کیا یہی صحیح نظریۂ زندگی نہیں ہے؟"

اس نظریۂ زندگی کی صحت سے کون منکر ہو سکتا تھا اور میں نے مسکرا کر اثبات میں سر ہلا دیا۔ میں خان پارس ناتھ کے پاس آدھ گھنٹہ بیٹھا رہا اور جس وقت میں گھر لوٹا تو میں نے اپنے آپ کو زیادہ صحیح اور زیادہ دانشمند محسوس کیا۔!

میں خان پارس ناتھ کی شخصیت سے بہت متاثر ہوا اور جب کبھی وقت ملتا تو اُن کے پاس ہو آتا تھا۔ ان کی زندگی بڑی ریاضت کی زندگی تھی۔ وہ عملی طور پر ایک فقیر تھے۔ جس شخص کے اصولوں کو زندگی کے بھیانک حادثوں اور زمانے کی نیرنگیوں اور بے مہریوں نے نہیں ڈگمگایا اور جو بوجود دشواریوں اور پریشانیوں کے باوجود انسانی مشترکہ تہذیب کی ابدی قدروں میں یقین رکھتا ہو، وہ عظیم نہیں تو اور کیا ہے۔ میں نے کئی دفعہ کوشش کی کہ انھیں گھر بلاؤں مگر ہر دفعہ یہ کہہ کر ٹال گئے کہ گھر آؤں گا تو آپ کا دل ٹوٹے گا کیوں کہ میں پانی کا گلاس تک نہیں پیوں گا۔ ان آخری ایام میں کوشش یہی ہے کہ اپنی کسی بھی ضرورت کے بارے میں کسی کو تکلیف نہ دوں۔ آگے جو خدا کو منظور ہے۔

میں خان پارس ناتھ کی فقیرانہ زندگی اور خیالات کی بلندی سے زیادہ سے زیادہ متاثر ہوتا چلا گیا۔ وہ نسل، مذہب اور رنگ کی تفریق کے بغیر دنیا بھر کے انسانوں کے ایک ہونے میں یقین رکھتے تھے اور مجھے بار بار کہتے تھے کہ عزیز ہمیشہ اس بات کا دھیان رکھنا اور کبھی کسی آدمی کے جذبات کو جان بوجھ کر مجروح نہ کرنا۔ دُنیا کے تمام مذاہب کی منزل صرف ایک ہے کیوں کہ خدا صرف ایک ہے۔

مجھے یہ محسوس ہوا کہ خان پارس ناتھ کا گزارہ اپنی قلیل پنشن میں نہیں چل رہا تھا کیوں کہ مہنگائی دن بدن بڑھ رہی تھی، شاید اسی وجہ سے وہ اب صرف ایک وقت کھانا کھاتے تھے، بلکہ کبھی کبھی ناغہ بھی کر دیتے تھے۔ ایک روز میں پہنچا تو وہ ایک کاغذ پر رکھے ہوئے بھنے ہوئے چنے پہلے اپنی ہتھیلیوں سے مل کر اور توڑ کر اپنے چند دانتوں سے کچھ چبا کر اور کچھ پھول کر کھا رہے تھے۔ میں نے پوچھا:

"کیا آپ چنے آسانی سے کھا لیتے ہیں؟"

"دو داڑھیں اور دو دانت ابھی باقی ہیں۔ دقت تو ہوتی ہے مگر کھا لیتا ہوں۔"

"کیا آج آپ نے روٹی نہیں بنائی" میں نے انگیٹھی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"چنوں سے بھی پیٹ بھر جاتا ہے۔" وہ بے اعتناقی سے بولے۔ (اعتنائی)

حقیقی وجہ میں جانتا تھا مگر مجبوری یہ تھی کہ جو شخص کسی کو پانی تک کے لیے تکلیف نہیں دے سکتا وہ کسی سے مالی امداد یا کھانے کی کوئی چیز کیسے قبول کرے گا۔ میں ایک دو بار پھل لے گیا تھا مگر یہ کہہ کر لوٹا دیے تھے کہ ایسا کر کے میرے جذبات کو ٹھیس نہ پہنچایئے کیوں کہ میری ضرورت صرف اتنی ہے جس سے زندگی جب تک ہے چلتی رہے۔ انسان پانی پی کر اور روکھی سوکھی کھا کر بھی جی سکتا ہے۔

ایک روز خان پارس ناتھ سیر کے لیے جاتے ہوئے صبح نظر آئے نہ شام کو۔ اگلی صبح کالج جانے سے پہلے ان کے یہاں گیا تو دیکھا کہ چادر اوڑھے پڑے ہیں۔ آواز دی تو مُنہ کھول کر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ پتہ لگا کہ کل سے بخار ہے اور دل تیزی سے دھڑک رہا ہے۔ کہنے لگے کہ سر بھی پھٹا جا رہا ہے اور ٹانگیں بھی درد کر رہی ہیں۔ میں نے سر دبانے کے لیے ہاتھ بڑھائے تو فوراً اُٹھ کر بیٹھ گئے اور بولے۔۔

"کبھی اپنی اہلیہ اور اولاد کو بھی ایسا نہ کرنے دیا۔ آپ کا بہت شکریہ مگر مجھے شرمندہ نہ کریں۔"

میں نے ڈاکٹر کو بُلوانے اور دوا لانے کی پیشکش کی مگر منع کر دیا۔ اس خیال سے کہ یہ کسی کی بات نہ مانیں گے اور اگر میں کچھ کروں گا تو ان کے دل کو دُکھ پہنچے گا میں کالج چلا گیا۔ مگر کالج میں ہر وقت ان کا خیال رہا اور واپسی پر سیدھا ان کے پاس پہونچا۔ ایک دو صاحب اور بیٹھے ہوئے تھے۔ حالت بدستور ویسی ہی تھی مگر پوچھنے پر بولے کہ اب بہتر ہوں۔

میں اور چند لوگ جن میں میرے مالک مکان لالہ حکم چند بھی شامل تھے رات کو کافی دیر تک ان کے پاس بیٹھے رہے۔ خان پارس ناتھ نے کسی کو نہ ڈاکٹر کو بلانے دیا اور نہ کوئی ایسی دوا لانے دی جو سر درد میں بغیر ڈاکٹر سے پوچھے بھی دے دیتے ہیں۔ بلکہ وہ ہمیں بار بار جانے کے لیے کہتے۔ لیکن ہم انھیں ایسی حالت میں چھوڑ کر کیسے جا سکتے تھے۔ پھر آہستہ سے مجھے پاس بُلا کر بولے۔ "میرا دھیان اس وقت خالقِ مطلق کی طرف ہے لیکن آپ سب کی موجودگی اس میں خلل ڈال رہی ہے۔ مہربانی کر کے آپ سب لوگ گھر جا کر آرام کریں۔" ہم لوگوں کو مجبوراً گھر جانا پڑا۔

اگلے روز کوئی دس بجے صبح ماسٹر ثناء اللہ اور لالہ حکم چند نے خبر دی کہ خان پارس ناتھ صاحب کی حالت خراب ہے۔ میں فوراً پہونچا۔ کچھ لوگ پہلے ہی سے آئے ہوئے تھے اور سب کے چہروں پر مایوسی عیاں تھی۔ پتہ لگا کہ قوتِ گویائی جواب دے چکی تھی۔ میں نے ٹھیک کر پکارا مگر نہ آنکھ کھولی اور نہ کچھ بولے۔ میں وہیں ان کے پاس بیٹھ گیا۔ ظاہر تھا کہ یہ ان کا آخری وقت تھا۔ دل میں ڈاکٹر کو بُلانے کی کشمکش شروع ہوئی۔ سب سے صلاح کی اور خان پارس ناتھ کی مجبوری کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے اور انسانی فرض کی تکمیل کے لیے میں ڈاکٹر کو لانے کے لیے نکل پڑا۔ لیکن ابھی گلی سے باہر بھی نہ نکلا تھا کہ ماسٹر ثناء اللہ پیچھے سے دوڑتے ہوئے آئے اور بولے کہ لوٹ آیئے، جانا بے سُود ہے، خان صاحب اللہ کو پیارے ہو گئے۔

میں دھک سے رہ گیا اور منہ لٹکائے لوٹ پڑا۔ جس شخص نے زندگی بھر کسی کو تکلیف نہ دی ہو اور اصولاً کبھی

سے کوئی خدمت نہ کروائی ہو وہ بھلا اپنے آخری لمحوں میں ہسپتال اور ڈاکٹر کا مرہونِ منت کیوں ہوتا۔ میں نے ہاتھ لگا کر دیکھا، خان صاحب کا جسم چند منٹ میں ہی بالکل ٹھنڈا ہو گیا تھا اور جسم میں زندگی کی کوئی رمق باقی نہ تھی۔ ہم نے انھیں نیچے اُتار دیا۔ ان کی چادر پر مجھے کاغذ کا ایک پُرزہ دکھائی دیا۔ میں نے اسے اٹھایا۔ اُس پر ایک بہت شکستہ خط میں یہ تحریر تھی۔

"عزیز بھائیو! آپ سب کے بے انتہا خلوص اور محبت کا شکریہ۔ کفن کے لیے میرا خریدا ہوا کپڑا آپ کو ٹرنک میں مل جائے گا۔ اُسی کی تہہ میں ستر روپے بھی رکھے ہیں، ازراہِ کرم میری تجہیز و تکفین میں اس سے زیادہ ایک پائی بھی خرچ نہ کریں۔"

جانے کس وقت یہ رقعہ اپنے آپ ہی لکھ لیا تھا۔ میں نے اسے دوسروں کو پڑھنے کے لیے دے دیا، اور ٹرنک کھول کر اس میں سے کپڑا اور ستر روپے نکال لیے۔ کپڑا اور روپے میں نے لالہ حکم چند کو تھما دیئے۔ طاق میں رکھی ہوئی موٹی سی کتاب کو جو بستے میں بندھی ہوئی رکھی تھی کھول کر دیکھا تو وہ قرآن پاک کی ایک جلد تھی۔ چند منٹ سوچ اور غم میں ڈوبا ہوا کمرے میں بیٹھا رہا۔ پھر لالہ حکم چند کے ساتھ ارتھی کا سامان بازار لانے چلا گیا۔

جس وقت ہم لوگ ان کی ارتھی تیار کر رہے تھے تو ایک صاحب آئے اور انھوں نے ایک رقعہ ماسٹر ثناء اللہ صاحب کو پکڑا دیا کہ مسجد سے مولوی صاحب نے بھیجا ہے۔ ماسٹر جی نے پڑھ کر میری طرف بڑھا دیا۔ اُس پر تھا۔

"ابھی ابھی خبر ملی ہے کہ آپ کی گلی میں ایک پٹھان لاوارث اور کس مپرسی کی حالت میں مر گیا ہے۔ براہِ مہربانی اس کی تصدیق کیجیے تاکہ محلّے کے مسلمان اس کی تجہیز و تکفین کا انتظام کریں۔"

میں نے اسی پرچے کے نیچے یہ جواب لکھ دیا۔

"جن صاحب کی موت ہوئی ہے، ان کا اسمِ گرامی خان پارس ناتھ تھا۔ وہ دیکھنے میں مسلمان تھے لیکن مذہب کے ہندو تھے اور عقائد کے اعتبار سے انسان تھے۔ اُن کی موت بلاشبہ کس مپرسی کی حالت میں ہوئی ہے مگر وہ ایک غیور انسان تھے اور اپنی تجہیز و تکفین کا انتظام خود کر گئے ہیں۔ ان کے اثاثے میں جو سب سے زیادہ قابلِ احترام چیزیں ہیں وہ گیتا کا ایک منظوم ترجمہ اور قرآن مجید کی ایک جلد ہے۔ گیتا کو ہم لوگ گیتا بھون بھجوا رہے ہیں اور قرآن شریف کی جلد مہربانی کر کے آپ وصول کر لیں۔"

اور میں یہ سطور لکھتے وقت آنسوؤں کے اُن گھونٹوں کو جو کب سے آنکھوں میں اُبل پڑنے کی کوشش کر رہے تھے، نہ روک سکا۔ یہ آنسو اس لیے نہیں ٹپک پڑے تھے کہ ایک آدمی مر گیا تھا بلکہ اس لیے کہ اب آنکھیں ایسا مسلمان، ایسا ہندو، ایسا پٹھان اور ایسا انسان شاید اب کبھی نہ دیکھیں گی۔ ●

بقیہ: ہندوستان میں ٹیلی ویژن کی توسیع

مجموعی اخراجات ۵ء ۷ سے ۸ کروڑ کے درمیان ہونے کا تخمینہ ہے۔ ان نشری اسٹیشنوں سے قومی پروگراموں کے علاوہ ویڈیو سیٹوں (Video Sets) کے ذریعے علاقائی دلچسپی کے پروگرام بھی پیش کیے جانے کی تجویز ہے تاکہ اس مخصوص علاقے کے لوگ دلکشی اور جاذبیت محسوس کر سکیں اور ٹیلی ویژن کے ذریعے قومی تعمیر و ترقی اور عوامی فلاح و بہبود کے بنیادی مقاصد پورے ہو سکیں۔ ایک عام اندازے کے مطابق اس پروگرام کے تحت کھولے جانے والے ہر اسٹیشن پر اس کے جائے وقوع کے اعتبار سے دس سے پندرہ لاکھ روپے کے مصارف ہوں گے۔

ہمیں اُمید کرنا چاہیئے کہ اس طرح ہمارے ملک کے طول و عرض میں رہنے والے باشندے ذہنی و جذباتی طور پر بھی ایک دوسرے کے قریب آ سکیں گے اور ٹیلی ویژن قومی یکجہتی کے حصول میں بھی معاون ثابت ہوگا۔

بقیہ: تعلیم کے بارے میں مسز اندرا گاندھی کا نظریہ

قابلِ تعریف کام انجام دیئے ہیں۔ موجودہ زمانے میں سائنسی معلومات اور علم حاصل کرنے کی ضرورت کو جس شدت سے محسوس کیا جاتا ہے، وہ اس سے پہلے کبھی نہیں محسوس کی گئی۔

اُردو زبان انتہائی شیریں اور پُر اثر ہے۔ یہ ہمارے قومی ورثہ کا ایک اہم حصّہ ہے۔ ملک کے بہت سے حصّوں میں اردو بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ اُردو زبان کسی مذہب یا فرقے سے تعلق نہیں رکھتی لیکن یہ ضرور ہے کہ لاکھوں مسلمانوں کی مادری زبان ہے۔ اس کی ترقی کی بھی وہی اہمیت ہے جو ہمارے قومی ورثہ کے دوسرے شعبوں کی۔ بہت سی ہماری ریاستوں میں اُردو کی اکادمیاں قائم ہو چکی ہیں۔ حکومتِ ہند نے کافی بڑے سرمایہ سے اُردو کی ترقی کے لیے اُردو ترقی بورڈ قائم کیا ہے۔ حکومت اُردو کی تعمیری تجویزوں اور ترقی کے لیے ہمدردی رکھتی ہے جس سے کہ اس زبان کی اسی طرح مزید ترقی اور اشاعت ہو سکے۔ جس طرح سے اور دوسری زبانوں کی۔

تعلیم کا معیار اُستادوں پر منحصر ہوتا ہے۔ اس کا خاص طور پر انحصار اس پر ہوتا ہے کہ وہ نوجوانوں میں علم حاصل کرنے کی صلاحیت اور شوق کس حد تک پیدا کر سکتے ہیں۔ تعلیم کا مقصد سیکولرازم کو محفوظ رکھنا ہونا چاہیئے اور نوجوانوں کے دلوں میں قومی آثارِ قدیمہ کو محفوظ رکھنے کا جذبہ پیدا ہونا چاہیئے، اسی طرح قدرتی ماحول کے تحفظ کے لیے قومی سطح پر تعاون کی ضرورت ہے۔ گزشتہ زمانے میں اُستادوں کا بہت احترام کیا جاتا تھا چاہے ان کو اپنے کام کا تھوڑا معاوضہ ملتا ہو، لیکن آج کل اُستادوں کو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ نہ ان کو عزت دی جاتی ہے اور نہ ان کو معقول معاوضہ۔ ایک اُبھرتے، نکھرتے اور ترقی کرتے ہوئے سماج میں کوئی بھی طبقہ پوری طرح مطمئن نہیں ہوتا لیکن سماج کو استادوں کے احسان کو بھلانا نہیں چاہیئے۔ ●

غزلیں

قیصر الجعفری پوری

پیاسوں پہ یزیدوں کے ستم دیکھ رہے ہیں
پھر کرب کے ہم بڑھتے قدم دیکھ رہے ہیں

پھر رات گئے ٹوٹ گیا زخم کا ٹانکا
یوں آنکھ تری یاد میں نم دیکھ رہے ہیں

کہہ دو کہ کبھی دل کی گلی تک بھی وہ آئیں
کیا لوگ ہیں جو دیر و حرم دیکھ رہے ہیں

نکلے جو ترے شہر میں آئینہ لیے ہم
ہر لمحہ میاں اِک سنگِ ستم دیکھ رہے ہیں

ہے آج بھی قائم ترے وعدے کا بھرم دوست
ہم راہ تری جانِ قسم دیکھ رہے ہیں

کہہ دیں نہ کہیں لوگ مسیحا کو بھی قاتل
پردے میں کرم کے وہ ستم دیکھ رہے ہیں

کیا کیا نہ مٹا گردشِ حالات سے لیکن
ہم دل کا وہی دردِ الم دیکھ رہے ہیں

شادابیٔ گلشن کا یقیں ہم کو ہے قیصر
آئے گا ادھر ابرِ کرم دیکھ رہے ہیں

ظفر محمد ظفر

کیا جانے کس کا خوف ہے کیسا ہراس ہے
جس کو بھی دیکھتا ہوں یہاں بدحواس ہے

ہنسنے کو ہنس رہا ہوں مگر جی اُداس ہے
میں وہ ہوں جس کے ہونٹوں پہ صدیوں کی پیاس ہے

آئینہ خلوص کی جانب نہ دیکھیے
اس آئینے میں سب کا بدن بے لباس ہے

اپنا فسانہ کہہ کے سناتے ہیں جس کو لوگ
میری حدیثِ غم کا وہ اک اقتباس ہے

ڈرتا ہوں جس کو لاتے ہوئے میں زبان پہ
اُس کی نگاہ میں بھی وہی التماس ہے

مقتل سے کس کی لاش اُٹھی دھوم دھام سے
کیا ہو گیا کہ چہرۂ قاتل اُداس ہے

اس عالمِ عجیب کو کیا نام دوں ظفر
میں اُس سے دور ہوں جو مرے دل کے پاس ہے

جامعہ نئی دہلی

ڈاکٹر اختر نظمی

ہم ہی کشتی کو جلا کر آئے
کیسے الزام کسی پر آئے

اُس نے کھل کر نہ لکھی بات کبھی
خط تو آئے ہیں برابر آئے

چاروں سمتیں ہی مری دشمن ہیں
دیکھو، کس سمت سے پتھر آئے

میں سفر میں ہوں خطا میری ہے
خار مجھ تک نہیں چل کر آئے

پیڑ ہے گھر میں پڑوسی کے مگر
میرے آنگن میں بھی پتھر آئے

سب کو آنکھوں میں سجاتا کیسے
راہ میں سیکڑوں منظر آئے

پیاس کچھ اور بھڑک اُٹھتی ہے
یاد اگر کوئی سمندر آئے

تم کو ہنگاموں نے کب دی تھی صدا
تم ہی خود گھر سے نکل کر آئے

کچھ ہمیں یاد نہیں ہے نظمی
گھر سے کب نکلے تھے، کب گھر آئے

رُباعیاں

نور محمد یاس

(۱)

پَر تولتی آشاؤں کے پَر کٹتے ہیں
لَو خیز تمناؤں کے سر کٹتے ہیں
مرتے ہیں نئی زیست کے امکاں کتنے
جب شاخ، جھلستی ہیں شجر کٹتے ہیں

(۲)

دھرتی پہ بجز خاک نہ ہوگا کچھ بھی
گندم، شکر و تاک، نہ ہوگا کچھ بھی
تخریب کے بولیں گے وہاں بیج، جنھیں
انجام کا ادراک نہ ہوگا کچھ بھی

ہندوستان

شوکت پردیسی

سب کی نظروں میں ہے جادۂ کہکشاں
کس قدر خوبصورت ہے یہ گلستاں
اِس کی رفعت کا قائل ہے سارا جہاں
اِس کی کشتی کا ساحل ہے گنگ و جمن

یہ ہمارا وطن، یہ ہمارا وطن

اِس میں جوہر کا علم و شجاعت بھی ہے
اِس کے دامن میں نہرو کی چاہت بھی ہے
اِس میں باپو کے دل کی صداقت بھی ہے
اِس میں شامل ہے آزاد کی انجمن

یہ ہمارا وطن، یہ ہمارا وطن

اِس میں بنگال بھی ہے، بہار بھی ہے
اِس میں کشمیر کا بول بالا بھی ہے
اِس میں مسجد بھی ہے اور شوالہ بھی ہے
ہے یہ پنجاب و گجرات کا بھی چمن

یہ ہمارا وطن، یہ ہمارا وطن

اِس میں قدوائی جیسے بھی رہبر ہوئے
اِس میں اقبال و ٹیگور و جوہر ہوئے
ایک سے ایک بڑھ چڑھ کے لیڈر ہوئے
اِس میں ہے اندرا جی کے دل کی لگن

یہ ہمارا وطن، یہ ہمارا وطن

سب زبانوں کا سنگم ہے ہندوستاں
جنتِ ابنِ آدم ہے ہندوستاں
مرکزِ امنِ عالم ہے ہندوستاں
اِس کی آغوش میں ہے بڑا بانکپن

یہ ہمارا وطن، یہ ہمارا وطن

رتیاسین

بہبودی کا تصوّر

گو بہبودی کے تصوّر کا تعلق عملی کامیابیوں مثبت آزادی سے قائم کیا جائے تو ایسے بیشتر تصادی مسائل اُبھر کر سامنے آئیں گے جو نظری مباحثوں پالیسی سے متعلق عملی مباحثوں میں مثالی طور پر انداز کر دیئے گئے ہیں۔ بہبودی کا موزوں تصوّر حی اقتصادیات کا اہم جزو ہے۔ مصنف کی رائے یہ محض نظری مشق نہیں ہے۔

فلاحی اقتصادیات کی بنیادیں کیا ہیں؟ یعنی بی بہبودی کا تصوّر کیونکر باندھا جائے جس پر حی اقتصادیات کا انحصار ہو۔ میری رائے ہے کہ ماسوال تک پہونچنے کے دو راستے جنھیں اقتصادی بہئے کے ادب میں غالب مقام حاصل ہے بُنیادی رپر کافی نہیں ہیں۔ ایک دستورِ کار افادیت کے ہمراہ بہبودی وابستہ ہے اور دوسرے دستورِ کار میں بہبودی کو سے دولتمندی کے تصوّر کے طور پر دیکھا گیا ہے۔ ل الذکر میں ذہنی ردِّ عمل پر زور دیا جاتا ہے۔ بہ موخر الذکر میں اشیاء آمدنیوں اور خوشحالی کے ظہر پر توجہ مرکوز کی جاتی ہے۔

ایک نادار شخص کی زندگی میں خوشی اور ب بہتر زندگی کی شدید خواہش کا فقدان اکثر ایک بے شکست خوردہ سمجھوتے کے علاوہ کسی دوسری ، کا مظہر نہیں ہو سکتا جو ایک تلخ حقیقت کے اتھ وابستہ ہو۔ جن بے زمین مزدوروں کا استحصال ! جاتا ہے، جن فصل کاٹنے والوں کا حصّہ محفوظ ہیں ہوتا، جن گھریلو ملازموں سے ضرورت سے بدہ کام لیا جاتا ہے اور جن خانہ دار عورتوں کو تنگی ، رہنا پڑتا ہے وہ تمام اپنے متعلقہ مصائب کے تہ ایسے ڈھنگ سے سمجھوتہ کر لیتے ہیں کہ شکایات ندبے اطمینانی بقاء کی ضرورت میں مدغم ہو جاتی ہے بے اطمینانی اور غیر افادیت ان حالات میں

ایک المیہ نہیں بنتی بلکہ وہ ایک تخلیقی و تحقیقی عمل کا جزو بن جاتی ہے۔

اگرچہ مال اور سروسیں قیمتی ہیں۔ تاہم وہ از خود قیمتی نہیں ہیں۔ اُن کی قیمت کا دارومدار اس امر پر ہے کہ وہ لوگوں کو کیا فائدہ پہنچا سکتی ہیں یا زیادہ درست طور پر۔ لوگ اُن سے کیا استفادہ کر سکتے ہیں۔ انسانوں میں دلچسپی نہ ہونے کے باعث دولتمندی کا دستورِ کار اُس مرض میں مبتلا ہے جسے مارکس نے "اشیا پرستی" کا نام دیا ہے

گو دولتمندی کا دستورِ کار فلاحی اقتصادیات کے ماہرین میں کم مروج ہے (جو مثالی طور پر افادیت کے "دستورِ کار" سے زیادہ متاثر ہیں) تاہم عملی پالیسی سازوں اور منصوبہ بنانے والوں میں یہ ایک نہایت عام بات بن گئی ہے کہ وہ اقتصادی خوشحالی، اشیا کی ملکیت اور دولتمندی پر زیادہ توجہ دیتے ہیں اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آخر میں لوگ پس پشت پڑ جاتے ہیں اور مال اور اشیاء کو تمام تر توجہ اور عظمت حاصل ہو جاتی ہے۔

یہ دلیل دی جا سکتی ہے کہ فلاحی اقتصادیات کی بنیاد پر بہبودی کا کوئی ایسا تصوّر ہونا چاہیئے جو نہ ہی لا علاج طور پہ داخلی ہونا چاہیئے (جیسا کہ افادیت کو ہونا چاہیئے) اور نہ ہی پختہ طور پر اشیاء پرستی ہونا چاہیئے۔ (جیسا کہ اشیا پر اشیا کے طور پر توجہ مرکوز کرنا پڑتی ہے) دراصل دو مختلف خیال ہیں جو بہبودی کے موزوں تصوّر کے طور پر ہماری توجہ کے مقتضی ہیں۔ ایک یہ ہے کہ ایک شخص کیونکر "عمل" کرتا ہے۔ یعنی وہ کیونکر زندگی بسر کرتا ہے۔ ایسے کون سے مختلف کام ہیں۔ جنھیں انجام دینے میں شخص کامیابی حاصل کرتا ہے وغیرہ وغیرہ۔

دولتمندی کا دستورِ کار

دوسرا بدایاتی دستورِ کار "دولتمندی" کا ہے جس میں اس امر پر زور دیا جاتا ہے کہ ایک شخص کے پاس کس قدر اشیاء ہیں اور وہ کس قدر خوشحال ہے اس میں "افادیت کے دستورِ کار" کی داخلیت سے احتراز کیا جاتا ہے لیکن یہ مال و زر کے سوائے عوام اور اُن کی بہبودی سے کوئی تعلق نہیں رکھتا.

اس امر پر زور دیا جاتا ہے کہ ایک شخص کیا کرتا ہے بلکہ اس امر پر بھی توجہ مرکوز کی جاتی ہے کہ وہ کون سے مختلف کام ہیں جنھیں وہ انجام دے سکتا ہے

لیکن یہ دلیل دی جا سکتی ہے کہ مثبت آزادی ایک شخص کے مجموعی فائدے کے لیے درست دستورِ کار ہونے کا مضبوط دعویٰ کرتی ہے۔ اقتصادی سیاق و سباق میں اس تناظر کی تائید ایک طرف ایڈم سمتھ اور دُوسری طرف کارل مارکس کی تحریروں میں تلاش کی جا سکتی ہے۔ دونوں ہی کو انجام کار مثبت آزادی کے معانی میں فائدے کا اندازہ لگانے میں دلچسپی تھی۔ ایک شخص کیا کر سکتا ہے۔ کیا حاصل کر سکتا ہے۔ اُسے کیا تجربہ ہو سکتا ہے۔ میرا یقین ہے کہ یہ بہبودی کے اقتصادی تجزیے اور ترقی کے سماجی جائزے کی جانب قدرتی سمت ہے۔

مثال کے طور پر غذائیت کے شعبے میں کتنی کامیابیاں حاصل ہوئی ہیں۔ اور ایسے عام ترقی کا جائزہ لینے اور طبقوں میں آمدنی کے گروپوں، علاقوں اور مردوں اور عورتوں کے درمیان تفاوت کی پیمائش کرنے کے لیے بروئے کار لایا جا سکتا ہے۔ بھارت میں غذائیت کے معاملوں میں مردوں اور عورتوں اور لڑکوں اور لڑکیوں کے درمیان امتیاز کی اعلیٰ سطح پائی جاتی ہے اُس کا مشاہدہ غذائیت سے متعلق براہِ راست اعداد کے ذریعے زیادہ موثر طور پر کیا جا سکتا ہے اور یہ جاننے کے لیے کوشش کرنا ضروری نہیں کہ کتنی خوراک کا استعمال کیا جا رہا ہے۔ اس امر کی جانچ کرنا بہت مشکل ہے کہ کون کُنبے کے اندر صحیح طور پر کس قدر کھاتا ہے اور ایسے مشاہدے کی مساعی سے اُس نقشے کے مسخ ہونے کا

(باقی ص ۹ پر)

Regd. No. D(DN) 985
R.N. 97032/81

Licensed U(DN) to post without pre-payment
at Civil Lines Post Office, Delhi-110 054.

VOL.4 NO.4 (YOJNA URDU) 16-31 May-1984

یوجنا کے آئندہ شمارے

یکم تا ۱۵ر جون ۱۹۸۴ء

سے

ایک نیا دلچسپ اور معلوماتی سلسلہ

یعنی

وسنت ساٹھے کی مشہور تصنیف

"معاشرتی انقلاب کی جانب

اقتصادی جمہوریت کا مقدمہ"

سلسلہ وار شائع کی جائے گی

یہ وہی کتاب ہے جس کا چرچا اکثر ماہرینِ اقتصادیات کے یہاں ہوتا رہتا ہے

یہ سلسلہ اُردو کے علاوہ ہندی، انگریزی، گجراتی، مراٹھی، تمل، تیلگو، ملیالم، آسامی اور بنگالی میں بیک وقت شروع کیا جا رہا ہے۔

براہِ کرم آج ہی ایجنٹ سے اپنی کاپی محفوظ کرالیں۔

Published by the Director, Publications Division, Patiala House, New Delhi-110001
Printed by Skylark Printers, 11355, Id-Gah Road, New Delhi-110055

یوجنا

یکم تا ۱۵ ؍ جون ۱۹۸۴ء

ایک روپیہ

شرقی انقلاب کی جانب

ادی جمہوریت کا مقدمہ

فلسفۂ زندگی

(وسنت ساٹھے)

منصوبہ بندی کی منطق

(پی۔ آر۔ دوبھاشی)

بچوّں کی نشوونما اور تغذیہ بخش خوراک

ہمارے ملک کی آبادی ۶۸ کروڑ ہے۔ اس میں تقریباً ۴۰ فی صد بچّے ہیں۔ لہٰذا سماجی بہبود کے پروگراموں کے تحت بچوّں کی بہبود کو اعلیٰ ترین ترجیح دی گئی ہے۔ سماجی بہبود کی وزارت پر بچوّں کی نشوونما اور اس سے متعلق سرگرمیوں میں تال میل لانے کی ذمہ داری ہے۔ اس کے ذریعے سماجی بہبود کے بہت سے پروگراموں کو بروئے کار لایا جاتا ہے۔ بھارت سرکار نے اگست ۱۹۷۴ء میں بچوّں کی بہبود سے متعلق قومی پالیسی اپنائی تھی۔ اس میں بچوّں کو اہم ترین سرمایہ کہا گیا ہے۔ اس میں یہ بھی مذکور ہے کہ ان کی پرورش نشوونما اور ان کا آرام و سکون ہماری اہم ذمہ داریاں ہیں۔ یہ وزارتوں، محکموں کی سرگرمیوں میں تال میل کی ضرورت پر زور دیتی ہے تاکہ مرکزی سرکار اور ریاستی سرکاروں اور دیگر اداروں کے اس سلسلے کے کاموں کے درمیان تال میل قائم ہو سکے۔

اس پالیسی کے تحت نیشنل چلڈرنز بورڈ ہے جس کی صدارت وزیراعظم کے پاس ہوتی۔ اس کے ذریعے بچوّں کی بہبود سے متعلق عام ضروری خدمات اور سرگرمیوں میں تال میل رکھا جاتا ہے۔ ان پر نظرثانی کی جاتی رہتی ہے اور یہ عمل بدستور جاری رہتا ہے۔ اس قومی پالیسی کے تحت ریاستوں اور مرکز کے زیرِانتظام علاقوں میں بچوّں کی بہبود سے متعلق بورڈوں کے قیام کے لیے کہا گیا ہے چنانچہ ہماچل پردیش اور چنڈی گڑھ کو چھوڑ کر باقی تمام ریاستوں اور مرکز کے زیرِانتظام علاقوں میں یہ بورڈ قائم کر دیے گئے ہیں۔ "بچوّں کے بین الاقوامی سال کے دَوران جو کہ ۱۹۷۹ء میں منایا گیا تھا۔ ایک فنڈ قائم کیا گیا تھا جس کا تعلق بچوّں کی بہبود سے متعلق تھا۔ اس فنڈ سے رضاکارانہ تنظیموں کی سرگرمیوں کے لیے رقومات دی گئیں۔ اس کے لیے سماجی بہبود کی وزارت نے ایک لاکھ روپے کی رقم فراہم کی۔ پبلک کارپوریٹ باڈیز کے عطیات سے اس فنڈ کو بڑھایا جا رہا ہے۔ پبلک سیکٹر کے ادارے بھی اس کے لیے عطیات دیتے ہیں۔ دسمبر ۱۹۸۲ء میں اس فنڈ کی میزان ایک کروڑ ۷ لاکھ روپے تھی۔

بچوں کی ترقی سے متعلق مربُوط خدمات کا مقصد یہ ہے کہ بچوّں کی بہبود کے پروگرام مثلاً تغذیہ بخش خوراک، بیماریوں سے محفوظ رکھنے کے لیے ٹیکے، صحتی خدمات کی توسیع زچہ، بچّہ کی دیکھ بھال، دودھ پلانے والی ماؤں کی دیکھ بھال، چھوٹے بچوں کی غیر رسمی تعلیم وغیرہ کے پروگراموں کو آگے بڑھایا جا سکے۔ اس طرح سے بچوّں کی نشوونما کے عمل کو تیزی سے آگے بڑھا کر انھیں سماج کے مفید رکن بنانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ یہ پراجیکٹ پسماندہ دیہی علاقوں اور قبائلی آبادی والے علاقوں میں کافی توجہ کے مستحق سمجھے گئے ہیں۔ یہ پروگرام ۷۶ - ۱۹۷۵ میں زیرِعمل پراجیکٹ والے ۳۳ علاقوں میں شروع کیا گیا۔ کم عمر ایسے بچوّں کو جنھوں نے ابھی اسکول جانا شروع نہیں کیا ہے۔ بیماریوں سے محفوظ بنانے اور تغذیہ بخش خوراک فراہم کرنے کے واسطے ۳۰ لاکھ بچوّں کو فائدہ پہنچانے کا نشانہ رکھا گیا ہے۔ اس اسکیم کے مقاصد درجِ ذیل ہیں:۔

۶ سال تک کی عمر کے بچوّں کی صحت کو بہتر بنانا اور انھیں تغذیہ بخش خوراک فراہم کرنا: بچوّں کی جسمانی، سماجی اور نفسیاتی تربیت کے لیے بنیادوں کو مضبوط کرنا۔ تغذیہ بخش خوراک کی کمی اور دَورانِ تعلیم اسکولوں سے بھاگے ہوئے بچوّں پر دھیان اور ان کی شرحِ اموات کو کم کرنا: بچوّں کی بہبود و ترقی سے متعلق مختلف اداروں کی پالیسیوں اور کاموں میں تال میل قائم کرنا۔ وغیرہ وغیرہ۔

ہر گاؤں میں ان تمام پروگراموں کو مربوط ڈھنگ سے چلانے کے لیے ایک آنگن واڑی ہے۔ یہ آنگن واڑی گرام سیوک کی نگرانی میں چلائی جاتی ہے۔ بالعموم اس کی نگران ایک عورت ہوتی ہے جو کہ اس جگہ سے تعلق رکھتی ہے۔ اس کی مدد کے لیے ایک مددگار ہوتا ہے۔ محکمہ سپروائزر آنگن واڑی کے ورکروں کے کام کی نگرانی کرتی ہیں۔ بچوّں کی بہبود سے متعلق پراجیکٹ کے افسروں کو بچوں کی بہبود کے مربوط پراجیکٹ کا براہِ راست انچارج بنا دیا گیا ہے۔ ہر پراجیکٹ کے علاقے میں صحتی عملہ تعینات کیا گیا ہے۔ اس کے لیے ایک میڈیکل افسر، لیڈی ہیلتھ وزیٹر، اور دیگر معاون عملہ ہوتا ہے۔ ۵ ہزار کی آبادی کے لیے پرائمری ہیلتھ سب سنٹر ہوتا ہے۔ ہر سنٹر پر ایک نرس۔ مڈ وائف ہوتی ہے۔ ۸۲-۱۹۸۱ تک صحتی خدمات کے لیے جو فاضل عملہ ان پراجیکٹوں میں تعینات کیا گیا۔ ان کے مجموعی اخراجات سماجی بہبود کی وزارت نے برداشت کیے ہیں۔ ۸۳-۱۹۸۲ کے دَوران شہری گندی بستیوں میں قائم کردہ پراجیکٹوں کے اخراجات سماجی بہبود کی وزارت کے ذمّے رہے تاہم قبائلی آبادی اور دیہی علاقوں میں واقع ان پراجیکٹوں کے اخراجات وزارتِ صحت کے ذمّے رہے ہیں۔

رضاکارانہ اداروں کی خدمات کی اس سلسلے میں بڑی ضرورت اور اہمیت سمجھی گئی ہے۔ اس کے علاوہ اجتماعی شراکت اور مختلف وزارتوں، محکموں اور تنظیموں کے کام میں تال میل کی کوششوں کی بڑی اہمیت ہے۔ مرکزی، ریاستی، ضلعی، اور پراجیکٹ کی سطح پر تال میل کمیٹیاں قائم کی گئی ہیں۔

منصوبہ بندی اور ترقیاتی پروگراموں کی جھلک پیش کرنے والا

پندرہ روزہ

یوجنا

نئی دہلی

چیف ایڈیٹر ❖ آر۔ ٹھکرال
ایڈیٹر ❖ لکھی رام رانا
اسسٹنٹ ایڈیٹر ❖ محمد عادل صدیقی
سب ایڈیٹر ❖ وسیم حیدر

جلد ۴	یکم تا ۱۵ جون ۱۹۸۴ء	شمارہ ۵

۱۱ تا ۲۵ جیشٹھ شک سمبت ۱۹۰۶ ❖ فون: ۳۸۷۳۴۱

شرح چندہ

سالانہ ۲۰ روپے۔ دوسالہ ۳۵ روپے، سہ سالہ ۵۰ روپے
فی کاپی: ایک روپیہ

طالب علموں، اُستادوں اور لائبریریوں کے لیے ۱۰ فی صد کی رعایت

اس شمارے میں

یوجنا منصوبہ بندی کے بارے میں عوام کو آگاہ کرتا ہے، مگر اس کے مضامین صرف سرکاری نقطۂ نظر کی وضاحت تک ہی محدود نہیں ہیں

بزنس منیجر: ایل۔ آر۔ بترہ ❖ اسسٹنٹ ڈائرکٹر (پروڈکشن) کے۔ آر۔ کرشنن

مضامین سے متعلق خط و کتابت کا پتہ:۔
ایڈیٹر "یوجنا" (اردو) پبلیکیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس
نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

ترسیل زر کا پتہ:۔
بزنس منیجر، پبلیکیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس
نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

اداریہ

دیہات اور صنعتیں

دیہی ترقی کے عمل کو آگے بڑھانے کا کام اقتصادی سرگرمیوں کو مختلف انداز میں پھیلانے سے تعلق رکھتا ہے۔ ایسی سرگرمیوں کے ذریعے پیداوار بڑھانے میں معاون روزگار کے نئے نئے مواقع نکالنے پر زور دیا جاتا ہے۔ ہندوستان میں چوں کہ افرادی قوت کی کمی نہیں، لہٰذا ہر وہ کام جس میں زیادہ سے زیادہ لوگوں کو روزگار ملے، یہاں کے معاشی ڈھانچے میں موزوں ہوتا ہے۔ ہندوستان کی دیہی آبادی کی روزی روٹی کا دارو مدار کھیتی پر ہی ہے، لہٰذا انھیں وہاں سے نکال کر دیگر سرگرمیوں میں لگانا ضروری سمجھا گیا ہے۔ دیہات میں روزگار کے مواقع بڑھانے کے لیے مختلف النوع سرگرمیوں کی ہمت افزائی کی گئی ہے۔ مثلاً مویشی پالنا، مرغبانی، بھیڑیں پالنا، شہد کی مکھیاں پالنا، سوروں کی پرورش وغیرہ۔ ان کے علاوہ دیہی اور گھریلو صنعتوں کے فروغ کو بھی اس کے لیے ضروری سمجھا گیا ہے۔ دیہی صنعتوں میں وہاں کے لوگ خود کو مشغول رکھ سکتے ہیں اور یہ کام بلا تاخیر شروع ہو سکتا۔ اس سے آمدنیوں کی تقسیم میں بڑی حد تک نابرابری ختم ہو سکتی ہے۔ اس صنعت کاری کے عمل سے دیہات سے نہ صرف غریبی کا خاتمہ کرنے میں مدد ملتی ہے بلکہ عوام کی بڑی تعداد کو نفع بخش کام بھی ملتا ہے۔ دیہی صناع اور دیہی دستکار اپنے گھر پر رہتے ہوئے اپنی ہنرمندیوں سے کام لے سکتے ہیں۔ ان صنعتوں سے جہاں ایک طرف دیہی عوام کی حالت بہتر بنانے میں مدد ملتی ہے، وہیں اس سے دیہی ترقی کے عمل میں مدد ملتی ہے اور وہاں کے حالات بہتر ہوتے ہیں۔ ایسی تمام کوششوں سے دیہی عوام کے معیارِ زندگی کو سدھارنے میں مدد ملتی ہے۔ ایک اور بڑا فائدہ یہ ہوا ہے کہ جو لوگ شہروں کی طرف بھاگتے ہیں، اس پر بھی اس کے ذریعے روک لگ سکتی ہے۔ علاقائی عدم توازن کو دور کرنے میں یہ بے حد معاون ثابت ہوئی ہیں۔ یوں تو دیہات میں صنعت کاری کے عمل کی اہمیت حصول آزادی کے وقت ہی محسوس کر لی گئی تھی۔ گاندھی جی نے دیہی علاقوں میں گھریلو اور دیہی صنعتوں کے فروغ پر کافی زور دیا تھا۔ وہ دیہات کو معاشی اعتبار سے خود کفیل بنانا چاہتے تھے۔ مہاتما جی کی سودیشی تحریک کا مقصد قوم کو خود کفیلی کی طرف لے جانا تھا۔ چنانچہ حصول آزادی کے بعد اس پس منظر میں دیہی ترقی اور دیہات میں صنعتوں کے فروغ کے لیے بہت سے پروگرام شروع کیے گئے جن میں سے کچھ یہ ہیں:-

۱۔ کچھ ایسے آئٹموں کا مخصوص کر دیا جانا جنھیں چھوٹے پیمانے کی صنعتیں یا گھریلو صنعتیں ہی تیار کر سکتی ہیں۔ ۲۔ دیہی صنعتوں سے متعلق پراجیکٹ۔ ۳۔ کھادی اور دیہی صنعتوں سے متعلق کمیشن کا قیام۔ ۴۔ از خود روزگار کے لیے دیہی نوجوانوں کی تربیت کا پروگرام جسے ٹرائی سم (Tryson) پروگرام کے نام سے پکارتے ہیں۔ اس طرح ملک کی منصوبہ بند ترقی میں صنعتی صنعتوں کے پروگراموں کو مختلف شکلیں دی جا سکیں۔ لیکن ان تمام کوششوں کے باوجود دیہی علاقوں سے غریبی کا بھرپور طریقے سے خاتمہ نہیں ہو سکا ہے اور ابھی تک وہاں بے روزگاری اور نابرابری دیکھنے کو ملتی ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ اگرچہ ہم نے گاندھی جی کے نظریات تو ضرور اپنائے لیکن ان کے حصول کے لیے ان کے بتائے ہوئے طریقے نہیں اپنائے۔ دیہی صنعت کاری کے پروگرام گاؤں سے باہر بیٹھ کر بنائے گئے اور ان پر عمل درآمد کے دوران دیہی علاقوں میں رہنے والوں کی ضروریات کا لحاظ نہیں رکھا جا سکا۔ غالباً اسی لیے آج بھی ہمارے دیہی عوام میں اس شعور کی کمی ہے کہ انھیں ملک کی تعمیر و ترقی میں بھرپور طریقے سے حصہ لینا ہے۔ اس کے علاوہ عمل درآمد کے ذمہ دار مختلف اداروں میں تال میل کی کمی بھی دیہی عوام کی ترقی کی راہ میں حائل رہی۔ لہٰذا دیہی ترقی کے کام میں پنچایتوں کے ذریعے تال میل قائم کرکے اس میں مزید بہتری لائی جا سکتی ہے۔ پنچایت دراصل نچلی سطح پر جمہوریت کی جڑوں کو مضبوط بنانے کے لیے ہے۔ اسے عوام کو اپنے ساتھ شریک کرکے نظم و نسق کو بہتر بنانا ہے۔ پنچایت میں چونکہ عوامی نمائندے ہوتے ہیں، لہٰذا وہ عوام کی امنگوں اور خواہشات کے احترام میں حقیقت پسندانہ فیصلے کر سکتے ہیں۔ دیہی صنعت کاری کے عمل کی کامیابی کا دارو مدار اس بات پر ہے کہ مقامی ضرورتوں، مقامی وسائل اور ہنرمندی وغیرہ کے بارے میں ٹھیک ٹھیک جانکاری ہو۔ پنچایت اس سلسلے میں موزوں ترین معلومات فراہم کر سکتی ہے۔ اس طرح کی معلومات سے دیہی صنعت کاری کا عمل تیزی سے آگے بڑھ سکتا ہے۔ پنچایت ہر علاقے میں دیہی مربوط ترقی کے عمل کو ٹھیک ڈھنگ سے آگے بڑھانے میں معاون ہو سکتی ہے۔ وہ اس بات کو یقینی بنا سکتی ہیں کہ ان کے یہاں کوئی بھی فرد ایسا نہ رہے جس کے پاس کام نہ ہو۔ اس مقصد کے لیے یہ تربیتی نصابات کا اہتمام کر سکتی ہیں۔ پنچایتوں کو اپنے کام کو سلیقے سے کرنے کے لیے مقامی دباؤ سے آزاد ہونا ہوگا اور انھیں تنگ نظری پر مبنی چند لوگوں کے مفادات سے قطع نظر کرکے پوری دیہی برادری کے بھلے کے لیے کام کرنا ہوگا۔ متعدد ریاستوں میں پنچایتوں کی اعلیٰ کارکردگی نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ وہ ان ذمہ داریوں کو بحسن و خوبی انجام دے سکتی ہیں۔ (ایڈیٹر)

وسنت ساٹھے

معاشرتی انقلاب کی جانب

اقتصادی جمہوریت کا مقدمہ

پہلا باب

فلسفۂ زندگی

انسان اور حیوان میں فرق یہ ہے کہ انسان میں سوچنے اور اپنی عقل کے مطابق کام کرنے کا مادّہ موجود ہے۔ مخلوق کی دیگر اقسام میں بھی کسی حد تک سوجھ بوجھ کا مادہ ہو سکتا ہے، تاہم دلیل سے کام لینا اور تخلیق کی قابلیت رکھنا صرف انسان ہی کے حصے میں آیا ہے۔ یہاں بھی نشوونما اور ارتقاء کی کئی سطحیں دیکھنے میں آتی ہیں۔ مثال کے طور پر اگر جزائر انڈیمان و نکوبار کے آونگی قبائل کو دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ وہ عقل کی بجائے زندہ رہنے کی قدرتی جبلتوں سے کام لیتے ہیں۔

انسان کے ارتقاء کی داستان دراصل اس کے ذہن و عقل کے ارتقا کی داستان ہی ہے۔ یعنی کہ اس نے بیرونی دنیا اور اپنے اندر کی دُنیا کو سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ اندر کی دُنیا سے مراد اس کی یہ تلاش ہے کہ وہ کیا ہے اور کیوں ہے۔ یہی وہ سوال ہے جس کے جواب کی تلاش میں اس نے دَر دَر کی خاک چھانی ہے تاکہ معلوم ہو سکے کہ پردے کے پیچھے کیا ہے۔

اپنے وجود کا سبب معلوم کرنے کی خاطر ہی انسان میں زندگی کے ہر شعبے میں کام کی صلاحیت پیدا ہوئی ہے۔ اس کی ساری کشمکش، بیرونی قوتوں سے ہم آہنگی پیدا کرنے کی کوشش اور من میں شانتی پانے کی خواہش اسی ولولے کا نتیجہ ہے۔ جونہی اس نے دماغ سے کام لے کر یہ معلوم کر لیا کہ بعض مخصوص قدم اُٹھانے سے نئی اشکال وجود میں لائی جا سکتی ہیں یا انہیں بدلا جا سکتا ہے۔ یعنی کہ جب اُس نے بیج بونے کے بعد کونپل پھوٹنے اور پھر پودے میں سے بیج نکلتے دیکھا تو اسے محسوس ہوا کہ دنیا میں موجود ہر شئے کی پُشت پر کوئی نہ کوئی سبب ضروری ہے۔ اپنے ذہن کے ارتقا کے ابتدائی دنوں میں وہ ہر اُس چیز کو معجزاتی قوت قرار دیتا رہا جو اسے اپنے سے زیادہ طاقتور نظر آئی اور اپنی زندگی کو متاثر کرنے والی دکھائی دی مثلاً آگ، بادل، بارش اور دھوپ۔ اپنے والدین اور بزرگوں کے ساتھ رہتے اُسے معلوم ہوا کہ ان کی بات مان لینے سے بزرگ خوش ہوتے ہیں اور اس پر کرم کرتے ہیں۔ چنانچہ اس نے بالاتر قوتوں کے سامنے سر جُھکانا سیکھ لیا۔

اور انھیں دیوتا سمجھنے لگا۔

لیکن اپنے ارتقا کے دَوران جب اُسے معلوم ہو گیا کہ بادل کیا ہیں، آگ کیسے جلائی جاتی ہے اور کائنات کی ساخت کے جزو کیا ہیں تو آہستہ آہستہ یہ چیزیں خوفناک دیوتا نہ رہیں بلکہ روزمرہ کی اشیاء ہو گئیں۔ چنانچہ دیوتا یا خدا کا تخیّل انسان کی جہالت اور پردے کے پیچھے جھانک کر دیکھنے کی کوشش ہی کی پیداوار ہے۔ میرے خیال میں انسان کی سب سے بڑی ایجاد خدا کا یہ تخیّل ہے۔ اس کا نتیجہ بڑا مفید رہا۔ اس نے انسان کے من کے جہاز کو ڈانوا ڈول نہیں ہونے دیا، اس کی زندگی کو جب کبھی شکوک نے گھیرا انسان نے اس تخیّل کی پناہ لے لی اور ذہنی سکون تلاش کر لیا۔

ارتقاء کے تمام مراحل پر سب سے بڑا سوال یہی آتا رہا کہ کیا کوئی مافوق الفطرت طاقت بھی موجود ہے۔ انسان اپنے اردگرد کے ماحول اور فضا کے متعلق زیادہ سے زیادہ باتیں معلوم کرنے میں سرگرداں رہا، اپنے خیالات کا تجزیہ کرتا رہا انھیں منظّم کرتا رہا۔ اپنے تجربات اور خیالات کو گپھاؤں کی دیواروں پر تصویریں بنا کر ظاہر کرتا رہا، پھر انھیں زبانی یاد کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ دوسروں کو سکھاتا رہا اور پھر جب اُسے لکھنا آ گیا تو کتابیں لکھنے لگا مگر وہ ہمیشہ سوچتا رہا کہ کیا کوئی معجزاتی قوت بھی ہے؟ اب جبکہ اُسے معلوم ہو گیا ہے کہ سورج، چاند اور آسمانوں کی دیگر اشیاء محض اشیا ہیں اور ان میں کسی چیز کی تخلیق کرنے یا کسی چیز کو تباہ کرنے کی قوت موجود نہیں جیسی کہ اس کے اپنے اندر موجود ہے تو اس نے عقل دَوڑانی شروع کی کہ عالم میں اُن چیزوں سے بالاتر بھی کوئی طاقت موجود ہے۔ جسے نہ صرف اُن ظاہری اشیاء پر قابو ہے بلکہ جس کا ذہن میرے ذہن سے بالاتر ہے اور جس میں نہ صرف بنانے بلکہ بگاڑنے کی طاقت بھی موجود ہے۔ یہ محض اس کے اپنے خیالات ہی کی توسیع تھی۔

اپنی سوچ کی بنا پر خالق اور تخلیق کے مابین تعلق معلوم کرنے کی اس کوشش ہی کا اُس نے "رُوحانیت" نام رکھا۔ جو کچھ نظر آتا ہے اور موجود ہے اس کے متعلق زیادہ سے زیادہ جانکاری حاصل کرنے کے لیے اُس نے "سائنس" کا نام دیا۔ لیکن یہ دونوں سرگرمیاں اس کے اپنے ذہن، اس کی معلومات اور تجربے ہی کی پیداوار تھیں۔ مختصراً جس چیز کا اُسے جواب نہ ملا اُس چیز کو اس نے "رُوحانیت" قرار دے دیا، اور جس چیز کا جواب مل گیا یا جس کا جواب

مل سکتا تھا، وہ سائنس بن گئی۔

آج سائنسدانوں نے عالم کی بیرونی حدود، کہکشاں، ستاروں کے جھرمٹوں اور زماں و مکاں کی وسعتوں کا پتہ لگا لیا ہے ۔ وہ دو سیاروں کے درمیانی فاصلے کو "کروڑہا نوری سال" کے طور پر ذہن میں لاسکتے ہیں۔ انھیں زندگی پیدا کرنے والے چھوٹے سے چھوٹے خلیوں کا پتہ ہے، اور مصنوعی طور پر بھی ان خلیوں کی تخلیق کرنے لگے ہیں۔ انھوں نے دریافت کرلیا ہے کہ مادّے کا چھوٹے سے چھوٹا ذرّہ ناقابلِ تقسیم ایٹم نہیں ہے۔ بلکہ قابلِ تقسیم "الیکٹران" اور "پروٹون" ہیں جن کی شکل لہروں کی سی ہے۔

پھر بھی انسان سائنسداں ہونے کے باوجود پردے کے پیچھے جھانک کر دیکھنا چاہتا ہے اور معلوم کرنا چاہتا ہے کہ جو کچھ موجود ہے اس کا سبب کیا ہے۔ لیکن جب اُسے جواب ہاتھ نہیں آتا تو جو چیز عقل سے پرے ہے اُسے وہ مافوق الفطر کہہ دیتا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ جس مافوق الفطرت کو وہ سمجھ نہیں سکتا وہ ہوگا ہی ایسا کہ اُسے کوئی سمجھ نہ سکے اور اس طرح حدِ ادراک سے پرے ہوگا۔ روشن ضمیر لوگوں نے ہزارہا سال پیشتر یہی لیا تھا۔ وہ اپنی سوجھ بوجھ کے سہارے اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ ایک دُنیا ایسی ہے، ذہن جس کا احاطہ نہیں کرسکتا جو ابھی تک دریافت نہیں ہوئی ہے، اور اس دُنیا تک ذہن کی مدد سے نہیں پہنچ جاسکتا۔

جن لوگوں نے دعویٰ کیا کہ انھیں گیان حاصل ہوگیا ہے اور جنھوں نے انسانی زندگی اور تہذیب پر اپنا اثر چھوڑا، ان سب کا یقین تھا کہ تمام طاقتوں سے بالاتر بھی ایک طاقت ہے جو اس عالم کی خالق ہے اور جس کی قوتِ ارادی انسان سے کہیں زیادہ اعلیٰ درجے کی ہے اور اسی لیے وہ انسان کی سمجھ سے بالاتر ہے۔ ان کا خیال تھا کہ وہ اس عظیم طاقت سے رابطہ قائم کرسکتے ہیں اور وہ مدارج طے کرسکتے ہیں جہاں انسان خودی کو پہچان لیتا ہے یا اپنے آپ کو جان لیتا ہے لیکن اصل میں یہ چیز بھی ان کے ذہن ہی کی پیداوار تھی۔ جسم انسانی میں تمام خیالات دماغ سے اُٹھتے ہیں۔ دماغ کی اس سرگرمی کو ہم ذہن، تخیل، ضمیر، وجدان، آگہی اور ادراک جیسے الفاظ سے یاد کرتے ہیں۔ مگر کچھ بھی کہیں ہمیں گیان دماغ ہی کے ذریعے حاصل ہوتا ہے۔ ابھی تک تو ہم نہیں کہہ سکتے کہ اگر سر قلم کردیا جائے یا سر کے اندر سے دماغ نکال لیا جائے تو کیا جسم کا کوئی دوسرا عضو بھی اس لائق ہے کہ اس کی مدد سے انسان سوچنے لگے اور کیا دماغ کی مدد کے بغیر جسم کوئی کام کرسکتا ہے۔ جب تک سائنس کی مزید دریافتوں کے ذریعے اس حقیقت کو جھٹلایا نہیں جاتا تب تک ہم یہ فرض کرنے میں حق بجانب ہوں گے کہ سوچنے کی قوت دماغ میں مرکوز ہے۔

چنانچہ جب گیان کا متلاشی شخص پہاڑ پر یا جنگل میں جا پہنچتا ہے یا کسی درخت کے نیچے بیٹھ کر ذہن کو یکجا کرکے سوچنے لگتا ہے کہ سب سے بڑی طاقت یا سب سے بڑا ذہن کونسا ہے تو اُس حالت میں بھی یہ سرگرمی اس کے اپنے دماغ سے تعلق رکھتی ہے۔ اسی کے باعث قوتِ اعلیٰ کا نقشہ ہماری آنکھوں کے سامنے کھنچتا ہے۔ اس لیے کہا جاسکتا ہے کہ قوتِ اعلیٰ بھی اس کے اپنے ذہن کی پیداوار ہے۔

شاید ایسا کرتے وقت اُسے علم ہی نہیں ہوتا کہ وہ کیا کررہا ہے۔ پھر تجربہ ہو جانے اور کسی نتیجے پر پہنچ جانے کے بعد وہ واپس جاکر زندگی اور اپنے ساتھیوں سے اس کا تعلق جوڑتا ہے۔ اس طرح وہ پیغمبر بن جاتا ہے۔ اگر گیان حاصل کرلینے کے بعد پیغمبر یا اہلِ بصیرت لوگ منظر سے غائب ہوگئے ہوتے تو اُن کی کوئی اہمیت ہی نہ ہوتی۔ جن پیغمبروں یا روشن ضمیر لوگوں نے اپنے تجربے کو دوسروں کی زندگی سے جوڑ کے دیکھا، جنھوں نے بتایا کہ بلند و برتر ہستی کو کیا ہونا چاہیے، صرف انہی پیغمبروں کا نام باقی رہا اور انھوں نے دُوسروں کی زندگی کو سنوارا اور مفید مطلب ثابت ہوئے۔ یہی حال ان سائنسدانوں کا ہے جنھوں نے چیزیں دریافت کیں، اختراعات کیں اور ان کا تعلق زندگی کے ساتھ قائم کیا اور اپنی دریافتوں و اختراعوں کو لوگوں کی بھلائی کے لیے وقف کیا۔

اُلجھن اس وقت شروع ہوتی ہے جب وہ شخص جس نے اپنے آپ کو پا لیا ہے، یہ کہنا شروع کردیتا ہے یا اس کے چیلے کہتے ہیں کہ اُس نے کہا تھا کہ اس نے جو گیان حاصل کیا اُن سچائی بس وہی تھی۔ کہ اُسے بزرگ و برتر ہستی سے جو ہدایات حاصل ہوئیں سچائی صرف وہی تھی اور جن لوگوں کا تجربہ اس کے اپنے تجربے سے مختلف رہا، اُس تجربے میں سچائی نہیں تھی۔ عالمِ غیب کے متعلق یہی تخیل تمام مذاہب کی بنیاد ہے اور تمام جھگڑے اُن لوگوں سے پیدا ہوئے ہیں جنھوں نے "انجانے" کو جان لینے کا دعویٰ کیا اور اُسی سے بات چیت کرنے کے بعد دعویٰ کیا کہ سچائی کی کنجی صرف انھیں کے پاس ہے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ پیغمبروں یا گیان والے لوگوں نے خود کبھی دعویٰ نہیں کیا کہ سچائی سے صرف وہی واقف ہیں۔ یہ دعویٰ ان کے چیلوں نے کیا ہے۔ یہی جھگڑے کی جڑ ہے۔ جب ان پیغمبروں نے اپنے تجربے اور گیان کی بنا پر اپنے عوام کے لیے ضابطۂ زندگی طے کیا تو اُسے مذہب کہا جانے لگا۔ تاریخ میں مختلف پیغمبروں نے اپنے اپنے زمانے کے معاشرتی حالات کی جانکاری کی بنا پر مختلف ضابطۂ حیات طے کیے۔ انھوں نے بنیادی طور پر طے کردیا کہ زندگی میں انسان کا چلن کیسا ہونا چاہیے۔ کیوں کہ ان کا خیال تھا کہ اس ضابطے سے زندگی خوشگوار ہوگی۔ بیشتر باتیں تمام مذاہب میں یکساں پائی جاتی ہیں مثلاً پیار، رحم، رواداری اور مفاہمت۔

"جانا" اور "انجانا"

تصوّف یا علم معرفت آخر کار اُس قوت کا نام ہے جو کوئی شخص مختلف ذہنی اور جسمانی ریاضتوں کے

بعد اس "انجانی" یا "نامعلوم" ہستی سے حاصل کرتا ہے جو دنیا میں موجود تمام قوت کا منبع ہے۔ عام آدمی ایسے شخص کے فلسفے یا معقول سوچ سے متاثر نہیں ہوتا بلکہ اُس حیرت انگیز شکتی سے متاثر ہوتا ہے جس کے متعلق فرض کر لیا جاتا ہے کہ وہ صوفی کے پاس موجود ہے۔ دنیا ایسے لوگوں سے بھری پڑی ہے جن کی پابوسی کو سمجھدار اور معقول خیالات کے مالک اشخاص بھی جھک جاتے ہیں۔ یہ لوگ صوفیوں سے شفا کے خواہشمند ہوتے ہیں، تکلیفوں سے چھٹکارے کے طلبگار ہوتے ہیں، یا عام منفعت کے طلبگار ہوتے ہیں کیونکہ انھیں یقین ہوتا ہے کہ ان کے پاس بعض مافوق الفطرت طاقتیں موجود ہیں جو سائنسی علوم مثلاً طب سے حاصل نہیں کی جا سکتیں۔

اس لیے سب سے پہلے تو اس بات پر غور کرنا ضروری ہوگا کہ :-

۱۔ کیا کوئی اس قسم کی عالمگیر قوت ہو سکتی ہے اور اگر ہو سکتی ہے تو اس کی نوعیت کیا ہوگی۔

۲۔ کیا اس نوعیت کا بیان کیا جا سکتا ہے اور کیا کوئی شخص اس قوت سے رابطہ قائم کر سکتا ہے۔

۳۔ کیا رابطہ قائم کر لینے کے بعد کوئی شخص اُس قوت سے فائدہ حاصل کر سکتا ہے مثلاً ایسے نتائج برآمد کر کے دکھا سکتا ہے جو عام سائنسی ذریعوں سے حاصل نہیں ہو سکتے مختصراً کیا کوئی شخص معجزے دکھلانے کی قوت حاصل کر سکتا ہے؟

تصوف کے بارے میں جو اُلجھن پائی جاتی ہے وہ یہیں سے شروع ہوتی ہے۔ اگر ہم پیچھے کی طرف چلیں تو ہم بھی اسی طرح کا سوال پوچھ سکتے ہیں جیسا کہ ایک عظیم سنت نے پوچھا تھا۔ بات یوں ہوئی کہ ایک شخص نے ۲۰ سال سے بھی زیادہ عرصہ تک ریاضت کی، دھیان لگایا اور اس طرح معجزے دکھلانے کی طاقت جسے عرفِ عام میں سدھی کہا جاتا ہے حاصل کر لی۔ وہ دریائے گنگا کی سطح پر چل کر دکھا دیتا تھا۔ سنت نے اس شخص سے پوچھا کہ اس ۲۰ سال تک ریاضت کرنے والی کیا بات تھی؟ وہی طاقت ایک عام کشتی والے کے پاس موجود ہے جو معمولی سی رقم کے عوض نہ صرف خود کو بلکہ دوسروں کو بھی دریا پار کرا دیتا ہے۔ اس کتھا سے سبق یہ ملتا ہے کہ اگر اُس عظیم "نامعلوم" شکتی کے ساتھ رابطہ قائم کرنے کے بعد جو نہ صرف تمام جانداروں پر بلکہ زمان و مکاں پر بھی حاوی ہے۔ انسان صرف اتنی سی طاقت حاصل کرتا ہے کہ خاک کی چٹکی یا طلائی انگوٹھی یا گھڑیاں یا وہسکی کی بوتل جو کہیں اور چھپی ہے اسے حاضر کر دے تو کیا اُسے "عظیم ہستی" کا ظہور قرار دینا مناسب ہوگا؟

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ خدا کے ان بندوں اور صوفیوں کے پاس شفا بخشنے کی قوت ہوتی ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ صرف امیروں ہی کو بھلا چنگا کیوں کر کے دکھاتے ہیں؟ وہ ہر روز کسی عام ہسپتال میں جا کر اور ہاتھ پھیر کر تمام مریضوں کو ان کی بیماریوں سے چھٹکارا کیوں نہیں دلا دیتے؟ مگر جیوتشیوں کی طرح ان اللہ والوں کے پاس بھی گھڑا گھڑایا جواب موجود ہوتا ہے۔ جیوتشی کہہ دیتا ہے کہ اس کی پیشین گوئی اس لیے غلط نکلی کہ متعلقہ شخص نے اپنی پیدائش کا وقت منٹ سکنڈ تک صحیح نہیں بتایا۔ اسی طرح یہ خدا کے بندے کہہ دیتے ہیں کہ ان کی شکتی تبھی کارگر ثابت ہو سکتی ہے جبکہ مریض کو اس پر یقین کامل ہو اور وہ اپنا سب کچھ ـ عقل، شعور غرضیکہ ہر چیز اللہ والے کے سپرد کر دے۔ اس طرح غلطی ہمیشہ مریض کی یا طلبگار کی ہوگی، صوفی کی نہیں ہوگی۔ جائے حیرت ہے کہ نہ تو جیوتشیوں اور نہ ہی صوفیوں نے اپنی طاقت کا کبھی معقول ڈھنگ سے مظاہرہ کیا ہے۔ لیکن مشکل تو یہ ہے کہ دلیل بازی سے تو آپ ان لوگوں کو پرکھ سکتے ہی نہیں، انھیں گمان ہی اس بات پر ہے کہ وہ ایک ایسی شکتی کے نمائندے ہیں جہاں دلیل کام نہیں کرتی۔ اس کے باوجود وہ خود گوشت پوست کے انسان ہوتے ہیں اور جب خود بیمار پڑتے ہیں تو اپنا علاج عام ڈاکٹروں اور ہسپتالوں سے کرواتے ہیں۔ "عظیم ہستی" کے یہ نمائندے اُسی عام ہوا میں سانس لیتے ہیں جس میں دوسرے لوگ سانس لیتے ہیں اور زندہ رہنے کے لیے عام خوراک ہی کا استعمال کرتے ہیں۔ مگر یہ دلیلیں تو عقل کی پیداوار ہیں جبکہ علم تصوف میں دلیل بازی کا کوئی کام نہیں ہے!

میرے پاس اس طرح کے اولیا اللہ والے اور جیوتشی آتے رہے ہیں جن کے متعلق ہمیشہ ایسا نظر آیا ہے کہ انھیں نہ صرف ماضی کا بلکہ مستقبل کا حال بھی معلوم ہے۔ پیشین گوئی کرنے کی قوت اُنھیں بلند و برتر ہستی سے ملی ہوگی۔ اگر ان کی پیشین گوئیاں صحیح ثابت ہوتیں تو میں آج تک کم از کم دس دفعہ مر چکا ہوتا۔ ہر تین سال بعد کوئی نہ کوئی جیوتشی یہ کہہ دیتا تھا کہ میری زندگی میں اگلے دو سال بڑے بھاری ہیں، اور انھیں بخوبی معلوم تھا کہ جسم انسانی کے مقدر میں ایک نہ ایک دن فنا ہونا لکھا ہے۔ زندگی کے تغیر کے اس چکر میں یہی ایک چیز ہے جو ہر حالت میں ہو کے رہتی ہے۔ اس لیے موت کی پیشین گوئی ہمیشہ کی جا سکتی ہے۔ صرف چند ماہ یا چند سال آگے پیچھے کر دینے ہوں گے۔ اگر اتفاق سے واقعی موت ہو گئی تو جیوتشی جی مہاراج کی یا اللہ والے شخص کی پیشین گوئی درست ثابت ہوئی اور اگر وہ شخص نہ مرا تو پھر وہ اُس لیے موت کے چنگل سے بچ نکلا کہ صوفی یا اللہ والے کی دعائیں اس کے ساتھ تھیں یا اس کی پیدائش کا وقت صحیح نہیں بتایا گیا تھا۔

لوگ مستقبل کا حال بتلانے والے جیوتشیوں، دست شناسوں اور دعا ہمہ پر یقین لانے لگتے ہیں حالانکہ متعدد بار ثابت کیا جا چکا ہے کہ یہ لوگ انسان کی سریع الاعتقادی کا فائدہ اٹھاتے ہیں۔ مثال کے طور پر دسمبر ۱۹۸۲ میں نئی دلی میں جیوتش پر جو کل ہند سیمینار ہوا تھا اس میں شامل ایک جیوتشی نے بھی پیشین گوئی نہیں کی کہ جلد ہی آندھرا پردیش اور کرناٹک اسمبلی کے جو چناؤ ہونے والے ہیں اس میں کانگریس (آئی) کو اس قدر شکست فاش نصیب ہوگی۔ ملک کے

اخباروں کی طرح وہ بھی یہی خیال کئے بیٹھے تھے کہ آندھرا پردیش میں کانگریس (آئی) جیتے گی ضرور مگر اس کی اکثریت گھٹ جائے گی اور کرناٹک میں وہ بہ آسانی جیت جائے گی۔

چنانچہ اگر جیوتشی لوگ چند روز پہلے صحیح پیشین گوئی نہیں کر پائے یہ یقین کر لینا کہ وہ برسوں پہلے ساری زندگی کا حال بتا دیں گے، حماقت نہیں تو اور کیا ہے!

تعجب اس پر ہوتا ہے کہ سمجھدار لوگ بھی ان کی باتوں میں آجاتے ہیں۔ ایسا کیوں؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ زندگی بڑی عجیب چیز ہے، اس میں بعض چیزیں اچانک رونما ہو جاتی ہیں۔ مثلاً انسان اچانک لاٹری جیت کر مالامال ہو جاتا ہے یا ورثے میں دولت پاتا ہے یا بلند رتبہ حاصل کر لیتا ہے، جو محنت و مشقت سے یا ایماندارانہ کوششوں سے اُسے کبھی حاصل نہ ہو پاتی۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ اس کی وجہ سماج کی بعض خرابیاں ہیں۔ یعنی کئی طرح کے مشکوک دھندوں، اسمگلنگ، دھوکہ بازی اور بدعنوانی کی مدد سے انسان دنوں میں امیر کبیر بن سکتا ہے یا اعلیٰ رتبہ پا سکتا ہے، مگر جو شخص امیر بنتا ہے یا اعلیٰ رتبہ پاتا ہے وہ یہی کہتا ہے کہ یہ سب کچھ کسی نہ کسی دیوی دیوتا یا اولیا اللہ والے کی دین ہے (چاہے وہ شخص اب زندہ بھی نہ ہو) جب کوئی شخص دوسرے کو اچانک امیر کبیر بنتے دیکھتا ہے تو یہ وہ دوسرے سے کہتا ہے دوسرا تیسرے سے اور یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل جاتی ہے۔ حتیٰ کہ ہر شخص چاہنے لگتا ہے کہ وہ بھی نام نہاد اللہ والوں کی معرفت تکڑم لڑا کر جلد از جلد امیر کبیر بن جائے۔ ہم اس بات پر ذرا بھی غور نہیں کرتے کہ ہزاروں میں سے ایک شخص لاٹری جیتتا ہے یا جوئے میں رقم پاتا ہے حالانکہ اس ایک چانس کے لیے ہزاروں لوگوں نے داؤ لگا رکھے ہوتے ہیں۔ عجیب بات ہے کہ ہم اسے بھی بزرگ و برتر ہستی کے نام سے ساتھ جوڑ دیتے ہیں۔ تصوف اس منطق سے بھرا پڑا ہے۔

لیکن جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں جب کسی "انجانی" ہستی میں خوبیاں نظر آئیں تو اُسے "دیوتا" کہہ دیا گیا۔ اگر خرابیاں نکلیں تو "شیطان" قرار دیا گیا۔ لیکن یہ انسان ہی تھا جس نے دیوتاؤں کے لیے جنت کی اختراع کی اور شیطان کے لیے دوزخ کی۔ یہ بھی اسی کے دماغ کی اختراع تھی کہ جو کچھ اس دنیا میں ممنوع ہے وہ جنت میں جا کر نصیب ہوگا اور اگر اُس نے زمین پہ زندگی ٹھیک ڈھنگ سے نہ گذاری تو اُسے دوزخ میں طرح طرح کی اذیتیں ملیں گی۔

اس طرح بزرگ و برتر ہستی کے ساتھ رابطہ قائم کرنے اور اس ہستی سے رعایتیں حاصل کرنے کا سارا چکر خیالی داستان ہے۔ وجہ یہ کہ جونہی ہم کہتے ہیں کہ جانی یا انجانی ایک ایسی عظیم طاقت موجود ہے جو صرف ذہن میں سما سکتی ہے یا پھر ذہن میں گھر نہیں کر سکتی اور اس کا محض دماغی طور پر لطف لیا جا سکتا ہے تو فوراً سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر واقعی کوئی اس قسم کی طاقت موجود ہے تو وہ طاقت یہ قوت کہاں سے حاصل کرتی ہے۔؟

آپ ایک عالمگیر قوت سے دوسری عالمگیر قوت تک چلتے جائیے، بالآخر اس معمے کو حل کرنے کے لیے آپ خود ہی جواب دینے لگیں گے جو اہلِ بصیرت دیتے آئے ہیں کہ "انجانی" ہستی کا نہ کوئی آغاز ہے اور نہ کوئی انجام، یہ اپنے اندر ہی سے پیدا ہوتی ہے اور یہ "انجانی" ہستی تم خود ہو۔ یعنی تم سے مطلب تمہارا ذہن ہے کیوں کہ تمام غور و فکر کا گہوارہ ذہن ہی ہے اور انجانی ہستی کو معلوم کرنے کا سارا سلسلہ وہیں سے شروع ہو کر وہیں ختم ہو جاتا ہے۔

"تہذیب انسانی کا سلسلہ ارتقا اسی کوشش کا مرہونِ منت ہے کہ قوت دماغی سے کام لیا جائے اور دُنیا میں وجود کی ہر شکل کے متعلق زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کی جائیں اور پھر سائنسی طریقے سے حاصل شدہ اس علم کے ذریعے ان اشکال میں ربط پیدا کیا جائے، ان میں تعلق قائم کیا جائے اور فائدہ حاصل کیا جائے۔ اسی کو سائنس کہتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ تجربے اور ثبوت کے ذریعے سبب، اُس کے انجام اور اطلاق کو طے کیا جائے تاکہ اُسی طریقے کے بار بار استعمال سے ایک مخصوص نتیجہ برآمد ہونے لگے۔ اسی طریقے سے شروع شروع میں دو لکڑیوں یا دو پتھروں کو ایک دوسرے کے ساتھ گھسنے سے آگ پیدا ہونے لگی، کچھ پتھر ڈھنگ سے ایک دوسرے پر رکھ کر گھروندے بنائے گئے، زمین میں بیج بو کر اور انھیں سینچ کر فصلیں اُگائی گئیں، جانور کی اُون اُتار کر کپڑے بُنے گئے، لکڑی کو ایک خاص ڈھنگ سے تراش کر کشتی یا پہیہ تیار کیا گیا، بعض جڑی بوٹیوں کے تجربے سے بیماریاں دُور کی گئیں اور پھر بانس کی ایک کھپچی کے سروں کو ڈور سے باندھا اور بانس کے ایک اور ٹکڑے کو اس میں اڑا کر انسان نے تیر چلانا سیکھا جو بہت دور جا کر کسی جانور یا دشمن کو زخمی کر دیتا تھا، اس ایجاد نے طرح طرح کے اسلحہ کو جنم دیا۔ چنانچہ ہزاروں برس کے تجربے کے بعد اب انسان اس مرحلہ پر آن پہنچا ہے کہ وہ ایسے راکٹ اور خلائی جہاز چھوڑتا ہے جو مریخ یا زہرہ سیارے تک جا پہنچتے ہیں۔ انسان نے تقریباً سبھی بیماریوں پر قابو پا لیا ہے اور ابھی مزید تحقیق جاری ہے۔

تمام مذاہب اسی طرح عالمِ وجود میں آئے ہیں کہ ہم سمجھتے ہیں کہ عالم میں کوئی "انجانی" ہستی بھی ہے اور بعض لوگوں نے خودی کو بلند کر کے یا اس وجہ سے کہ وہ دیوتا کی اولاد تھے، اُس ہستی سے رابطہ قائم کر لیا تھا۔ مذہب کیا ہے؟ روزمرہ کی زندگی کا ایک طرز ہے جو انسان کے لیے اس لیے طے کیا گیا ہے کہ وہ سماج میں مل جل کر رہے مگر ان مذاہب کے بانیوں نے یا تو یہ دعویٰ کیا کہ انھیں نامعلوم ہستی (اس کا نام چاہے کچھ بھی رکھیں) سے براہِ راست احکام اور ہدایات کے ذریعے عرفان حاصل ہوا یا انھوں نے کہا کہ وہ تو محض نامعلوم ہستی کی خواہش اور ہدایات کو دوسروں تک پہنچا رہے ہیں تاکہ نامعلوم ہستی کی تمام مخلوق بغیر کوئی اعتراض اٹھائے ان پر عمل کرے اور انھیں مانے ــ اگر

ہدایات پر عمل کرنے میں کوئی کوتاہی ہوئی تو اس کی سخت سزا ملے گی جو موت بھی ہو سکتی ہے۔ یہی ایک بات ہے جس سے انسان خوف کھاتا ہے۔ وہ اس بات سے بھی ڈرتا ہے کہ اس کا مال و دولت اس سے چھن نہ جائے۔ اس لیے تمام مذاہب میں ایک طرف تو یہ خوف کارفرما رہتا ہے اور دوسری طرف پیروکار کی تسلی بھی کرائی جاتی ہے کہ اُسے نامعلوم ہستی کا اشیرباد بھی حاصل رہے گا مگر یہ اشیرباد نامعلوم ہستی کے نمائندے کی معرفت ملے گا۔

جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے اگر یہ ساری کائنات ایک ہی خالق کی تخلیق ہے تو سمجھ میں نہیں آتا کہ خالق کے اتنے سارے نمائندے کیسے ہو سکتے ہیں جو لوگوں کے لیے ایک دوسرے سے مختلف ضابطۂ حیات طے کر گئے۔ آپ لاکھ بحث کیجئے اندھ وشواس کرنے والوں کو قائل نہیں کر سکتے۔ وہ یہی کہتے رہیں گے کہ بعض باتوں پر اعتراض نہیں اٹھایا کرتے انھیں گروں کا قول مان لیا کرتے ہیں۔ جب تک یہ اندھ وشواس اور یہ اُلجھن قائم ہے تب تک سماج میں مذہب کے نام پر باقی اُلجھنیں قائم رہیں گی۔

ان لوگوں کا زمرہ مختلف ہے جن کے متعلق خیال ہے کہ کم سے کم تکلیف اٹھا کر زندگی گذارنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ پیار کی زندگی بسر کی جائے۔ نہ صرف بندوں سے بلکہ ساری مخلوق سے اس زمرے کے تمام لوگوں نے یہی نتیجہ اخذ کیا۔ ہر ایک نے اپنے زمانے کے سنتوں، سادھوؤں اور پیغمبروں کے تجربات بیان کئے ہیں۔ دوسرا زمرہ ان لوگوں کا ہے۔ جن کا دعویٰ ہے کہ انھیں نہ صرف یہ معلوم ہے کہ نامعلوم ہستی کے دل میں کیا ہے، بلکہ وہ نامعلوم ہستی کی ہدایات کو اسی زبان میں بیان کر سکتے ہیں جس زبان میں کہ نامعلوم ہستی نے یہ باتیں کہی ہیں۔ انھوں نے مقدس کتابوں کی شکل میں ضابطۂ حیات طے کر دئے ہیں جھگڑا وہاں شروع ہوتا ہے جبکہ وہ یا اُن کے پیروکار کہنے لگتے ہیں کہ صرف انھی کے گرنتھوں میں نامعلوم ہستی کے دل کی بات اور صداقت بھری ہے، اور ان کے الٹ کام کرنے والا نامعلوم ہستی کی خواہش کو ٹھکراتا ہے۔ تاریخی اعتبار سے اس کشمکش نے انسان کے ہاتھوں انسان کو مروا دیا ہے اور آج بھی ایسا ہو رہا ہے۔

اگر اس کا تجزیہ معقولیت سے کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اپنے ضابطۂ حیات میں ان اہلِ بصیرت حضرات نے جو مثالیں دی ہیں وہ اسی زمانے، صورتِ حال اور سماج کی زندگی سے تعلق رکھتی ہیں جس سے کہ وہ خود واقف تھے۔ افسوس کہ ان کے پیروکار بھی ہزاروں سال پیشتر کی انھیں مثالوں کو سامنے رکھ کر چلتے آ رہے ہیں جب کہ سماج کا ڈھانچہ یکسر بدل چکا ہے۔ سب سے زیادہ افسوسناک بات یہ ہے کہ لوگ ہٹ دھرمی پر تُلے ہوئے ہیں اور دلیل سے کام لینے کو تیار نہیں۔ جائے حیرت ہے کہ اچھے بھلے سمجھدار لوگ جو تمام دیگر معاملوں پر معقولیت سے بحث کر سکتے ہیں، مذہب کا نام آتے ہی سینکڑوں سال پہلے کے طے کردہ ضابطۂ حیات پر اعتراض اٹھانا تو درکنار بحث کرنے کو بھی تیار نہیں ہوتے اور متعصب ہو جاتے ہیں۔ اس کے برعکس سائنس کے میدان میں مسلسل سوال کرنے کے بعد وہ جواب حاصل ہوتا ہے جسے عملی طور پر ثابت کر کے دکھایا جا سکتا ہے اور اس کے بعد ہی اسے سچائی کے طور پر تسلیم کیا جاتا ہے۔ اسی بنا پر دُنیا میں ترقی ہوئی ہے اور یہ تحقیق برابر جاری ہے۔

مثال کے طور پر سائنس ثابت کرتی ہے کہ ایک ڈھنگ سے تیار کردہ بجلی کو دوسرے ڈھنگ سے جگہ بہ جگہ پہنچایا جا سکتا ہے پھر اس سے چاہے بلب روشن کرو، چاہے ریڈیو، ریفریجریٹر، ہیٹر، اور ٹیلیفون چلا لو۔ اس بات کی صحت سے انکار نہیں کیا جاتا کیونکہ دُنیا کے دُوسرے حصوں میں بھی یہی معلومات حاصل ہوئی ہیں اور یہی طریقہ استعمال کیا جاتا ہے اور اس کا وہی نتیجہ برآمد ہوا ہے۔

تصوف میں یہ عمل غائب ہے۔ وہاں تو یہ مان کر چلتے ہیں کہ انجانی ہستی کا بھید صرف صوفی کے پاس یا اہلِ بصیرت کے پاس ہے۔ اس لیے اہلِ بصیرت شخص (۱) اس کی وضاحت اور اسے ثابت نہیں کر سکتا یا (ب) اپنا علم یا تجربہ دوسروں کو منتقل نہیں کر سکتا کیونکہ اس انجانی چیز کو جانا نہیں جا سکتا بلکہ صرف محسوس کیا جا سکتا ہے۔ اپنے آپ کو پانے کے لیے متعدد اشخاص نے کئی طرح کے مراقبے اور "یوگ" جیسے عمل بتائے ہیں۔ مگر وہ سب ذاتی نوعیت کی ورزشیں ہیں۔ مثال کے طور پر ایک تکنیکی ماہر یا انجینئر برسوں تک پڑھائی کرتا ہے اور پھر اپنی طرح تربیت یافتہ لوگوں کی مدد سے ہوائی جہاز جیسی چیز ایجاد کرتا ہے جس کی مدد سے وہ ہوا میں اُڑ سکتا ہے اور چند گھنٹوں میں ہزاروں میل کی مسافت طے کر سکتا ہے۔ اس کے بعد نہ صرف وہ خود بلکہ اس جیسے تربیت یافتہ سبھی دوسرے لوگ بھی یہی کام کر کے دکھا سکتے ہیں۔

اب مراقبے یا "یوگ" کے واقف کار کہتے ہیں کہ ایک مخصوص قسم کی تربیت سے انسان اپنے جسم کو ہوا میں معلق کر سکتا ہے۔ گو اس عمل کو ممکن مانا جا سکتا ہے مگر اس پر یقین کرنا محال ہے کیونکہ افواہوں کو چھوڑ کر کسی نے بھی آج تک ایسا کر کے دکھایا نہیں ہے جبکہ ہر سائنسی تجربے اور کامیابی کو تسلیم ہی تب کیا گیا ہے جبکہ اُسے کر کے دکھایا گیا۔ ایک بار نہیں بلکہ بار بار۔ جب تک کہ رائٹ برادرز نے اُڑان کر کے نہیں دکھائی، کوئی شخص یہ ماننے کو تیار نہ تھا کہ کسی مشین کی مدد سے ہوا میں اُڑا بھی جا سکتا ہے۔ جب تک لوگوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھ نہیں لیا تب تک کوئی شخص ماننے کو تیار نہیں ہوا کہ جس گاڑی کو ہزاروں سال سے جانور کھینچتے چلے آ رہے ہیں اُس میں یہ حیرت انگیز تبدیلی آ جائے گی کہ اُسے اسٹیم انجن کھینچنے لگیں گے یا موٹر کار ایجاد ہو جائے گی۔ تصوف اس بات پہ چلا آ رہا ہے کہ جو کچھ کہا جائے اُسے آنکھیں بند کر کے تسلیم کر لیا جائے۔ لوگ کہتے ہیں انھیں روشنی نظر آئی، درشن ہوئے اور بزرگ ہستی نے ان سے بات چیت کی۔ لیکن ذرا سا بھی سوچا جائے تو معلوم ہوگا کہ درشن انہی شکلوں کے ہوئے جو شکل کہ فرد نے انجانی ہستی کے متعلق اپنے

(باقی صفحہ ۔ پر)

GRAMMAR OF PLANNING
گرامر آف پلاننگ

پی. آر. دوبھاشی

منصوبہ بندی کی منطق

اس سلسلے کا پہلا عنوان "منصوبہ بندی کیوں" تھا جو گزشتہ شمارے میں شائع کیا گیا تھا۔ اس میں مصنف نے بتلایا تھا کہ منصوبہ بندی مستقبل کے خیال سے باقاعدہ انتظامات کا ذریعہ ہے۔ اس میں مصنف نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ شرح ترقی کو نقطۂ عروج تک پہنچانے اور سرمایہ دارانہ سماج وادی اور ترقی پذیر معیشتوں میں نابرابریوں کو کم سے کم کر دینے کے درمیان کشمکش کو دور کرنے میں منصوبہ بندی کس قدر ضروری ہے۔

اگرچہ منصوبہ بندی سرمایہ دارانہ معیشت کی غلط کارکردگی، اس کے عدم توازن اور اس کی لغزشوں کی اصلاح کے لیے ایک ذریعہ ہے تو گویا یہ سماج وادی معیشت کے نظم و نسق کا ایک طریقہ ہے۔ ذرائع پیداوار کو سماجی ملکیت میں لے آنے سے نجی صنعت کاروں یا فرموں یا کارخانوں وغیرہ کے ڈائرکٹروں کی جگہ ریاست کی طرف سے مقرر کیے گئے مینیجران کا انتظام سنبھالیں گے۔ یہ مینیجر خواہ کھیتوں وغیرہ کے نظام کے لیے ہوں یا فرموں کے لیے، فیصلہ کرنے کے سلسلے میں آزاد نہیں ہوں گے بلکہ وہ ریاست کے عامل کی حیثیت سے کام کریں گے۔ ریاست کے حکام جس طرح کی ہدایات جاری کریں گے، اُن کی پابندی کرنا، ان کے لیے ضروری ہوگا۔ ریاست کے مرکزی حکام یا تو اس سلسلے میں مفصل ہدایات جاری کریں گے اور ایسی ہدایات دیں گے جن کا تعلق معیشت کے انفرادی یونٹوں کے نظم و نسق سے ہوگا یا پھر وہ عام نوعیت کے رہبرانہ خطوط جاری کریں گے اور ان کی روشنی میں انفرادی مینیجر اپنے اپنے یونٹوں سے متعلق فیصلے کریں گے۔ سماج وادی معیشت میں یہ ہدایات یا رہبرانہ خطوط ہی منصوبہ بندی کی تشکیل کرتے ہیں۔ لہٰذا شالن کا یہ کہنا صحیح تھا کہ ہمارے منصوبے ہدایات کا مجموعہ ہوتے ہیں۔

سماج وادی منصوبہ بندی

مائسنر Mises اور ہائیک Hayek کی رائے میں سوشلزم ناقابلِ عمل ہے اور اس پر عمل درآمد نہیں ہو سکتا کیوں کہ بے شمار ادارے بے شمار قسم کا سامان تیار کرتے ہیں اور مختلف طرح کی سروسیں فراہم کرتے ہیں۔ ان کے لیے مختلف طرح کے فیصلے درکار ہوتے ہیں جن کا تعلق پیداواری عمل سے ہوتا ہے اور کوئی بھی مرکزی اتھارٹی اس تمام پیچیدہ عمل میں ہدایات دینے اور فیصلہ کرنے کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ پیداواری عناصر کے بنیادی اجزا اور سامان کی تیاری اور خدمات کی فراہمی وغیرہ کے توازن کے لیے بیک وقت ہدایات دینا اور اس سلسلے کے عدم توازن کے مسائل کو حل کرنے کے لیے ضروری ہدایات اور اطلاعات فراہم کرنا کسی ایک ادارے کے بس سے باہر ہے۔ مائسنر اور ہائیک نے یہ خیال کمپیوٹری عہد سے بھی پہلے ظاہر کیا تھا۔ لیکن کمپیوٹر کی مدد سے بھی اس بات کو یقینی نہیں بنایا جا سکتا کہ منصوبہ بندی سے متعلق کوئی بھی مرکزی ادارہ اس ضمن کے فیصلوں کو بے شمار مال تیار کرنے والوں، صارفین، اور کارکنوں تک پہنچا سکتا ہے۔

لیکن سماج وادی معیشت میں منصوبہ بندی سے ضروری نہیں کہ یہی کام لیا جائے کہ وہ مرکزی سطح پر ہی تمام فیصلے کیے جائیں اور پھر انھیں مرکزی اتھارٹی کے توسط سے ہی سب تک پہنچایا جائے۔ آسکر لنگے نے اپنی کتاب اکونومک تھیوری آف سوشلزم میں یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ سماج وادی منصوبہ بندی لامرکزی بنیادوں پر ممکن ہے۔ منصوبہ بندی سے متعلق مرکزی ادارہ انفرادی یونٹوں کے صنعت کاروں کو رہبرانہ خطوط فراہم کرے گا تاکہ حاشیائی لاگتوں کو حاشیائی منافعوں کے مساوی بنایا جا سکے۔ اس سے ہر انتظامیہ کے الگ الگ اپنے فیصلوں سے پیداوار کو زیادہ سے زیادہ حد تک لانے کا عمل یقینی بنایا جا سکے گا۔ منڈی کی معیشت اس طرح اپنا کام کر سکے گی۔ یہ سماج وادی معیشت کے ساتھ موافقت پیدا کر سکے گی۔ کیونکہ پیداواری ذرائع سماج کی ملکیت میں ہوں گے اور فاضلات سرمایہ دار صنعت کار کے منافع کی شکل میں نہیں ہوں گے بلکہ وہ ریاست کی آمدنی یا سماج وادی معیشت کی آمدنی شمار ہوگی۔

منصوبہ بندی مرکزی، لامرکزی دونوں طرح سے ہو سکتی ہے۔ بہرصورت یہ سماج وادی معیشت کے نظم و نسق کے لیے ایک لازمی ذریعہ ہے۔

سریع اقتصادی ترقی کا ذریعہ

دوسری جنگِ عظیم کے خاتمے پر ایشیا اور افریقہ کے بہت سے ممالک جو کہ اس سے قبل مغربی سامراجی ملکوں کی نوآبادیات کی شکل میں تھے، آزاد ہو گئے۔ ان سب ملکوں نے سیاسی آزادی کو

اقتصادی ترقی کا ایک ذریعہ سمجھا۔ ایشیائی ممالک پر مغربی ملکوں کے اقتدار کے باعث، جن میں سے بہت سے ممالک اگرچہ آزاد ہو گئے تھے، لیکن وہ آزاد اور خود مختار اقتصادی پالیسی کو اپنانے سے قاصر رہے۔ وہ اپنے مستقبل کے خود مختار اور آزاد ممالک نہ بن سکے۔ البتہ کچھ ممالک ایسے تھے جنھوں نے خود کو مغربی اقتدار سے آزاد رکھا اور اپنی آزاد اور خود مختار اقتصادی پالیسی اپنا کر ترقی کی راہیں ہموار کیں۔

ان ملکوں نے اقتصادی ترقی کا راستہ اپناتے وقت اس بات کو سمجھ لیا کہ وہ اپنی اقتصادی ترقی کو منڈی کی معیشت کے اُتار چڑھاؤ پر نہیں چھوڑ سکتے لہٰذا انھیں اپنی اقتصادی ترقی کے لیے سوجھ بوجھ والا منصوبہ چلانا اور اپنانا ہوگا۔ اس طرح کم ترقی یافتہ ملکوں کے لیے منصوبہ بندی سریع اقتصادی ترقی کا ذریعہ بن گئی۔

ان میں سے بہت سے ممالک منصوبہ بندی کو اپنانے کے لیے بالکل وہی طریقہ جُوں کا توں نہیں اپنا سکے جو کہ اس کے لیے چلا آرہا تھا۔ نہ تو ان کو کمیونسٹ ملکوں کی مرکزی نظام والی منصوبہ بندی پسند تھی۔ اور نہ ہی مغربی ملکوں کی جزوی یا ہر چیز کا احاطہ کرنے والی منصوبہ بندی۔ ان کو ایک ایسا درمیان کا راستہ چاہیئے تھا جس میں سوشلزم اور سرمایہ دارانہ نظام کا امتزاج ہو اور جو ان کے لیے قابلِ عمل ہو۔ اس طرح وہ ملی جُلی معیشت یعنی پرائیویٹ اور پبلک سیکٹر دونوں کو احاطہ کرنے والی ایسی منصوبہ بندی درکار تھی جس میں کوآپریٹو سیکٹر کو بھی دخل ہو۔ معیشت کا خواہ کچھ بھی طرز کیوں نہ ہو، یہ نئے ممالک یہ چاہتے تھے کہ ان کے یہاں اقتصادی ترقی کا عمل تیز ہو۔ صنعتی ترقی کی دوڑ میں پیچھے رہ جانے کے سبب، وہ چاہتے تھے کہ صدیوں کے دوران ہوئی صنعتی ترقی کے پھل چند ہی برسوں میں مل سکیں کیوں کہ صنعتی ترقی کے فائدے تو ابھی تک مغربی ممالک کے حصے میں ہی آئے تھے۔ روستو نے اقتصادی ترقی کے تاریخی عمل کے دوران اقتصادی ترقی کے پانچ واضح مراحل کی نشاندہی کی۔ یعنی روایتی معیشت، عوامی معیشت، جست لگانے والی معیشت، اپنے پیروں پر آپ کھڑی ہونے والی معیشت اور ضروریات زندگی کی بڑے پیمانے پر اشیاء تیار کرنے والی معیشت، ایشیا میں اُبھرنے والے بہت سے ممالک خاص طور پر ہندوستان نے عبوری مراحل میں خود کو رکھا اور منصوبہ بندی کو اس لیے ضروری سمجھا کہ اس کی بنیاد پر آگے کی طرف بڑھا جا سکے اور اس ترقیاتی عمل سے اپنے پیروں پر آپ کھڑی ہونے والی اور اپنے وسائل پر انحصار کرنے والی معیشت کو فروغ مل سکے۔

کم ترقی یافتہ معیشت میں منصوبہ بندی کا جواز کئی طرح سے پیش کیا جاتا ہے۔ کم ترقی یافتہ معیشت کے ملکوں میں مکمل روزگار کے اقدامات کی سفارش پیش کرنے کے لیے اقوام متحدہ کی طرف سے مقرر کیے گئے کمیشن نے اس امر کی طرف توجہ دلائی کہ منڈی کی معیشت میں صرف جزوی یا حاشیانہ تبدیلیاں ہو سکتی ہے۔ مکمل روزگار کے لیے کم ترقی یافتہ ملک کو کچھ بنیادی نوعیت کی ایسی تبدیلیاں درکار ہوتی ہیں جن کا تعلق ڈھانچے کی تبدیلی سے ہے اور اس طرح کی بنیادی تبدیلیاں منصوبہ بندی کے ذریعے سے ہی آسکتی ہیں۔

اس ضمن میں شرح نمو اور ترقی کے درمیان فرق بھی ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔ شرح نمو اشارہ کرتی ہے توسیع کی جانب۔ اس کے ذریعے مجموعی قومی پیداوار میں اضافہ ہوتا ہے۔ اس کا تعلق مقداری اضافے سے ہے۔ ترقی اس کے برعکس معیار کی طرف اشارہ کرتی ہے اور معیار کے ساتھ مقدار میں بھی اضافہ چاہتی ہے۔ اس کے ذریعے انداز نظر میں تبدیلی آتی ہے۔ افرادی قوت اور اس کے ساتھ ہی اداروں اور تنظیموں میں تبدیلی کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ اس تبدیلی کے ذریعے وسائل کو حرکت میں لانے کے امکانات کا اندازہ ہوتا ہے۔ یہ تمام کا تمام نظام منڈی والی معیشت کے ذریعے عمل میں نہیں آسکتا۔ اس کی موجودگی میں پُرانے اور فرسودہ نظریات ترک کرنے پڑتے ہیں اور توہمات کے چکر سے باہر آنا پڑتا ہے۔ پیداواری عمل پر اثر انداز ہونے والے عناصر مثلاً ذات پات، مذہب اور مشترکہ خاندان، ان سبھی کے تئیں اندازِ نظر بدلنا پڑتا ہے۔ صنعت اور زراعت کی ترقی کے لیے مالی اداروں کو تشکیل دینا ہوتا ہے۔ زرعی توسیعی سروس اور کوآپریٹو اور اجتماعی ترقی کی تحریکیں چلانی ضروری ہوتی ہیں۔ ان کے لیے تربیت، تعلیم اور تحقیق کی سہولتیں فراہم کرنی ہوتی ہیں۔ سڑکوں کی تعمیر، پانی کی فراہمی، بجلی کی تیاری، ہسپتالوں اور اسکولوں کے قیام، اور مکانات کی تعمیر وغیرہ کے ذریعے بنیادی ڈھانچہ فراہم کرنا ہوتا ہے۔ فولاد، کوئلہ اور بجلی جیسی بنیادی صنعتوں کو ریاست کی طرف سے بڑھاوا دیا جاتا ہے۔ ورنہ تو ان کا فروغ ہی ممکن نہیں۔

نابرابریوں کو دور کرنا

ترقی یافتہ ملکوں کے لیے منصوبہ بندی کا طریقہ اپنانا یوں بھی ضروری ہوا کہ یہ ممالک ترقی کے ساتھ ساتھ نابرابریوں کو کم کرنے کے خواہشمند ہیں۔ ان ملکوں میں توقعات بڑھتی جارہی ہیں اور آزاد معیشت کے فروغ کا عجیب و غریب عمل جس سے کہ ترقی کے لیے مسالہ ضرور ملتا ہے اور جہاں کہ منڈی کی رعائتیں اس کے لیے راہ ہموار کرتی ہیں وہیں اس کے ذریعے نابرابری کو بھی فروغ ملتا ہے، قابلِ قبول نہیں ہے لہٰذا منصوبہ بندی اس لیے بھی ضروری ہے کہ اس سے شرح ترقی کو زیادہ سے زیادہ کرنے اور نابرابریوں کو کم سے کم کرنے کے درمیان کشمکش دور ہو سکتی ہے۔

کم ترقی یافتہ ملک میں منصوبہ بندی اس لیے بھی ضروری ہے کیوں کہ کم ترقی یافتہ ممالک میں منڈی کا نظام عام حالات میں کام نہیں کر سکتا۔ منڈی کی معیشت میں قیمتیں پیداوار کے مختلف عناصر کے تناسب اور ان کی نایابی کو پورے طور پر واضح نہیں

کرتی ہے۔ یہ ایسے مختلف عناصر کی فراہمی کو واضح کرتی ہیں جنھیں جعلی قیمتیں کہہ سکتے ہیں اور جو منڈی میں رائج قیمتوں سے مختلف ہوتی ہیں۔ منصوبہ بندی سے متعلق ذمہ دار ادارہ ان جعلی قیمتوں کو سامنے رکھتے ہوئے وسائل کی تخصیص کی کوشش کرتا ہے۔

منڈی کی معیشت اُن بیرونی معیشتوں اور جھٹکوں کے لیے بھی گنجائش پیدا نہیں کرتی جن کی طرف روسنسٹین روڈان Rosenstein Rodan نے توجہ دلائی تھی۔ ایسی صورت میں کامیابی کا انحصار پیچیدہ اور ایک دوسرے پر انحصار کرنے والے پراجیکٹوں کی بیک وقت منصوبہ بندی پر ہوتا ہے۔ ایسی حالت میں ریاست یا منصوبہ بندی سے متعلق اتھارٹی سرمایہ کاری کی ضرورت پوری کرسکتی ہے کیوں کہ اُن سب سرمایہ کاریوں کو ایک ساتھ رکھ کر دیکھا جائے تو اندازہ ہوگا کہ یہ صرف اسی صورت میں باکفایت ہوسکتی ہیں ورنہ نہیں۔

اقتصادی ترقی میں سرمائے کی تشکیل کلیدی اہمیت رکھتی ہے۔ اس کے لیے بچتوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ ڈبلیو۔ آرتھر لیوس نے کہا ہے کہ کم ترقی یافتہ معیشت سے ترقی یافتہ معیشت تک پہونچنے کے لیے بچتوں کی شرح ۵ فی صد سے بڑھ کر ۱۲.۵ فی صد ہونی چاہیئے۔ وسائل کو حرکت میں لانے اور بچتوں کی شرح بڑھانے کے لیے ریاست کو بڑے پیمانے پر اقتصادی نظام میں شریک ہونا ضروری ہے۔ مالی اداروں کا قیام نیز بنکنگ اور بیمہ کے نظام کو سرکاری ملکیت میں لینا ضروری ہے۔ مالی اداروں کا قیام ضروری ہے اور معیشت کے اہم شعبوں میں ریاست کا عمل دخل ضروری ہے۔

ریاست کے زیر اہتمام منصوبہ بندی اور منصوبہ بندی میں ریاست کی شرکت کے لیے یہی عناصر وجہ جواز پیش کرتے ہیں۔ رگنر نرکسے Ragnar Nurske نے بتایا کہ کم ترقی یافتہ ملک میں سرمائے کی تشکیل کے لیے افرادی قوت کے وسیلوں کو کام میں لانے اور خالی پڑی افرادی قوت سے کام لینا ضروری ہے۔ یہ کام منصوبہ بند طریقے پر ہی آگے بڑھایا جاسکتا ہے اور اسی لیے اقتصادی ترقی کے منصوبہ بند طریقۂ کار کی ضرورت ہے۔ اس طرح کم ترقی یافتہ ملک میں منصوبہ بندی نہ تو سرمایہ داری ختم کرنے کے لیے ہے اور نہ اس میں اصلاح و بہتری لانے کے لیے اور نہ ہی اس کے ذریعے سماج وادی نظام کا قیام مقصود ہوتا ہے۔ منصوبہ بندی ایک ایسا ذریعہ ہے کہ اس کو قومی وسائل کو حرکت میں لانے کے لیے استعمال کیا جاسکتا ہے خواہ وہ سرکاری سیکٹر کی سرمایہ کاری ہو یا غیر سرکاری سیکٹر کی۔ منصوبہ بندی کے ذریعے قومی وسائل کے استعمال میں تال میل قائم کرنا اور انھیں حرکت میں لانا مقصود ہوتا ہے جس سے کہ اقتصادیات کا عمل تیز تر ہوسکے اور سماجی تبدیلی کا عمل آگے بڑھ سکے۔ منصوبہ بندی کا بظاہر مقصد اقتصادی ترقی ہی ہوتا ہے، لیکن تجربے نے بتایا ہے کہ اقتصادی ترقی کی شرح، اقتصادی منصوبہ بندی کی جامعیت یا شدت سے میل نہیں کھاتی۔ لہذا ہندوستان نے ۱۹۵۲ سے جامع منصوبہ بندی کا عمل اپنایا ہے لیکن اس کی اقتصادی ترقی اس تناسب سے نہیں ہو پائی ہے۔ ہندوستان کی مجموعی قومی پیداوار میں اضافہ ۳ فی صد کی شرح سے قدرے زیادہ ہوا ہے جبکہ جاپان، جنوبی کوریا کم جامعیت والی منصوبہ بندی سے شرحِ ترقی زیادہ ہوسکی ہے۔

تصورات و نظریات

اس طرح تین مختلف اقتصادی نظاموں کے تعلق سے منصوبہ بندی کے تئیں تین مختلف نظریات ہیں۔ مثلاً سرمایہ دارانہ نظام میں منصوبہ بندی معیشت کے مارکیٹنگ نظام کی خامیوں کی اصلاح و بہتری کا ذریعہ ہے جیسا کہ بے روزگاری، اجارہ داری، نابرابری یا پرائیویٹ صنعتی اداروں یا پراجیکٹوں کے سماجی اخراجات۔ سماج وادی معیشت میں منصوبہ بندی پیداوار کے سماجی ملکیت میں آتے ہوئے ذرائع کے نظم و نسق سے تعلق رکھتی ہے۔ ترقی پذیر ملکوں میں منصوبہ بندی اقتصادی ترقی کے عمل کو تیزی سے آگے بڑھانے کا ذریعہ ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا ان تینوں مذکورہ مختلف نظریوں کے درمیان کوئی قدر مشترک ہے اور کیا کوئی طریق کار "تنظیم" مشینری، وسائل کو حرکت میں لانے وغیرہ کے ضمن میں ان کے درمیان مشترک ہے۔ کیا اس سلسلے کی تکنیک منصوبہ بندی کے مختلف نظریات سے میل کھاتی ہے تاکہ مختلف ممالک ایک دوسرے کے تجربے سے سبق لے سکیں مختلف معاشی نظاموں سے قطع نظر کیا منصوبہ بندی کے طریق کار میں کوئی ایسا بھی طریق کار ہے جس سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھایا جاسکے اور جو انتہائی موافق حالات میں کام کرسکے۔ آئندہ کے ابواب میں اسی پس منظر میں گفتگو کی جائے گی۔ ●

بقیہ: جمہوریت کے آداب

میں پوشیدہ ہے۔ مہاتما گاندھی نے صحیح فرمایا تھا کہ "جمہوریت کا بنیادی اُصول یہ ہے کہ کمزور ترین فرد کو انتہائی شہ زور کے مساوی مواقع حاصل ہوں"۔ جواہر لال نہرو کے الفاظ میں جمہوریت کا وہ رُوپ جس میں اکثریت کو ہر معاملے میں برتری اور مختاری حاصل ہوتا ہے نامناسب اور ناقابلِ قبول ہے۔ غرضیکہ اقلیتوں سے برتاؤ نیز ان کی املاک اور حقوق کے تحفظ میں ہی جمہوریت کی کامیابی کا راز پوشیدہ ہے۔

مختصر الفاظ میں جمہوریت کا نام لینا جتنا آسان ہے جمہوریت پر عمل پیرا ہونا اتنا ہی مشکل ہے کسی بھی ملک میں جمہوریت کا تجربہ اسی وقت کامیابی سے ہمکنار ہو سکتا ہے جب پورا معاشرہ مکمل طور پر جمہوری ہو یعنی جس میں ہر سطح پر جمہوریت پر عمل کیا جاتا ہو۔ ●

ڈاکٹر ایم سلیم قدوائی

جمہوریت کے آداب

موجودہ دَور کو بجا طور پر جمہوریت کا دَور کہا جاسکتا ہے۔ اقوامِ متحدہ کی زبردست اکثریت جمہوریت کی علمبردار ہونے کی دعویدار نظر آتی ہے لیکن جمہوریت کی بے پناہ مقبولیت کے باوجود دُنیا کے اکثر ممالک میں جمہوریت کا تجربہ مایوس کُن اور ناکام ثابت ہو رہا ہے اور بیشتر ممالک میں خاص طور سے تیسری دُنیا سے تعلق رکھنے والے ممالک میں جمہوریت کا مستقبل ایک سوالیہ نشان بن کر اُبھر رہا ہے! ایسا کیوں ہے؟

دراصل جمہوریت کے کچھ مخصوص آداب ہیں، کچھ مسلّم اُصول اور ضوابط ہیں۔ جب تک ان آداب کو برتا نہ جائے، جب تک ان اُصولوں و ضابطوں کی پابندی نہ کی جائے اس وقت تک جمہوریت کا خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا۔ بدقسمتی سے آج جمہوریت کے نام لیواؤں، جمہوریت کے دعویداروں، جمہوریت کے علمبرداروں، جمہوریت کے پرستاروں اور جمہوریت کے شیدائیوں کی تعداد جتنی زیادہ ہے، جمہوریت پہ یقین رکھنے والوں، جمہوریت کے صحیح مفہوم سے آشنا ہونے والوں، جمہوریت کی رُوح اور اس کے آداب سے واقفیت رکھنے والوں اور ان پر عمل پیرا ہونے والوں کی تعداد اتنی ہی کم ہے۔

اب سوال یہ اُٹھتا ہے کہ جمہوریت کے کیا آداب ہیں؟ جمہوریت کی بقا کے لیے کن اصولوں اور ضابطوں کو ملحوظِ خاطر رکھنا لازمی ہے۔ ان سوالات کے جواب تلاش کرنے سے قبل یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ لفظ جمہوریت کی مختصر طور پر وضاحت کر دی جائے۔ عام طور سے جمہوریت سے مراد ایک ایسا طرزِ حکومت ہوتا ہے جس میں اکثریت کی مرضی کے مطابق حکومت چلائی جاتی ہے۔ یہ جمہوریت کی ایک سطحی، محدود، نامکمل اور ادھوری تعریف ہے۔ جمہوریت کو محض ایک نظامِ حکومت تصور کرنا جمہوریت کے ساتھ ناانصافی کے مترادف ہے۔ جمہوریت کا مفہوم اس سے کہیں زیادہ وسیع اور گہرا ہے۔ جمہوریت محض ایک طرزِ حکومت کا نام نہیں ہے بلکہ ایک مکمل نظامِ حیات ہے۔ جمہوری حکومت جمہوری نظام کا محض ایک پہلو ہے۔ جمہوریت سے مُراد درحقیقت ایک ایسا معاشرہ ہے جس میں ہر سطح پر جمہوریت کے اُصولوں پر عمل کیا جاتا ہو۔ جب تک پورا معاشرہ جمہوری نہ ہوگا اس وقت جمہوریت کا تصور محال رہے گا۔

جمہوریت کی اوّلین ضرورت ڈسپلن یا نظم و ضبط ہے۔ اس کو اگر جمہوریت کی رُوح کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ ڈسپلن ایک شعوری اور اختیاری ضبط ہے جو فرد اپنے اعمال پر عائد کرتا ہے اور اس کے نتیجے میں ایک ضابطہ پیدا ہو جاتا ہے۔ ڈسپلن ایک خود اختیاری پابندی ہے جسے قانون یا طاقت کے ذریعے لادا نہیں جاسکتا۔ ایک جمہوری مملکت کے شہریوں کے لیے لازم ہے کہ وہ ایک زندہ اور متحرک قوم کی مانند ڈسپلن یا نظم و ضبط کا مظاہرہ اپنی روزمرّہ کی زندگی میں کریں۔

جمہوریت کا اہم ترین اُصول یا ضابطہ یہ ہے کہ حقوق و فرائض لازم و ملزوم ہیں اور ایک ہی سکّے کے دو رُخ ہیں۔ ہر حق کے ساتھ ایک فرض لامحالہ طور پر فرد پر عائد ہوتا ہے اور اس کی بجا آوری لازمی ہے۔ حقیقی جمہوریت اس وقت عالمِ وجود میں آسکتی ہے اور پنپ سکتی ہے جب فرائض کو حقوق کے برابر اہمیت دی جائے۔ بدقسمتی سے آج دنیا کے بیشتر جمہوریت کے دعویدار ممالک میں جتنا زور حقوق پر دیا جا رہا ہے اتنا فرائض اور ذمہ داری پر نہیں۔ چنانچہ اس کا نتیجہ ہمارے سامنے ہے۔

بلاشبہ انفرادی آزادی جمہوریت کا لازمی جُز ہے۔ لیکن اس انفرادی آزادی کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ ہر شخص اپنی مرضی کے مطابق عمل کرنے میں لگ جائے کیونکہ اگر ایسا ہوتا ہے تو ہر طرف بدنظمی اور انتشار پھیلنا ناگزیر ہے۔ اس لیے یہ جمہوریت کے آداب میں سے ہے کہ فرد کی آزادی کا استعمال مناسب حدُود کے اندر ہو۔ مشہور انگریزی مفکر جان اسٹیوارٹ مل نے بجا طور پر کہا تھا کہ "صحیح آزادی وہ ہے جس میں فرد خود اپنی بھلائی کے لیے کوشش کرنے کا حق رکھے لیکن اس حد تک کہ اس کی آزادی سے کسی دُوسرے کے مفاد کو نقصان نہ پہونچے"۔ غرضیکہ جمہوریت کی کامیابی کے لیے ضروری ہے کہ ہر فرد اپنے ذاتی مفاد پر مفادِ عامہ کو ترجیح دے اور یہ نہ سمجھے کہ اس کے حقوق بھی مفادِ عامہ سے زیادہ اہمیت کے حامل ہیں۔ جمہوری نظام میں رائے عامہ کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔

جمہوریت کا تصوّر اقلیتوں کے ساتھ منصفانہ سلوک کے بغیر بے معنی ہے۔ دراصل اقلیتوں سے سلوک جمہوریت کی کسوٹی ہے۔ حقیقی جمہوریت میں اکثریت کی حیثیت بڑے بھائی کی سی ہوتی ہے اور اس کا یہ فرض ہوتا ہے کہ وہ اقلیت میں اعتماد اور تحفّظ کا احساس اُجاگر کرے تاکہ اقلیت قومی بھلائی اور مشترکہ مفاد کے لیے اکثریت کی طرف خوش دلی اور گرمجوشی کے ساتھ تعاون اور اشتراک کا ہاتھ بڑھائے۔ غیر مطمئن اور سہمی ہوئی اقلیتیں جمہوریت کے لیے خطرہ بن جاتی ہیں۔ بلاشبہ اکثریتی حکومت کی کامیابی کا راز اقلیتوں کے تحفّظ اور خوشحالی

(باقی صفحہ پر)

نصرت ظہیر

سیر و سیاحت

صحت مند تفریح، مفید کاروبار

ایک زمانہ تھا کہ سیاحت کچھ خاص قسم کے لوگوں کی دلچسپی کا شغل ہوا کرتی تھی۔ کسی شخص کو ملک کے بارے میں مکمل معلومات حاصل کرنے کی خواہش ہوتی تھی تو وہ اس ملک میں جاتا اس کے سیکڑوں قصبوں اور دیہات میں گھومتا، وہاں کے باشندوں کے درمیان رہ کر اس ملک کی تہذیب و ثقافت، رسم و رواج، رہن سہن کے طور طریقوں اور نظریات کا مطالعہ کرتا اور یوں اپنے تجسس کو تسکین دیتا تھا۔ ہندوستان میں اور اس ملک کی قدیم تہذیب میں بیرونی ملکوں کے دانشوروں، مورخوں اور سیاحوں کی دلچسپی بڑے پرانے زمانے سے رہی ہے۔ ہیونگ سانگ، فاہیان، البیرونی اور ابن بطوطہ جیسے عظیم فلسفی سیاح، دانشور، اور مورخ قدیم زمانے سے ہند آتے رہے ہیں۔ یہ ہندوستان میں غیر ملکیوں کی زمانہ قدیم سے چلی آرہی دلچسپی کا کھلا ثبوت ہے۔

لیکن آج کے زمانے میں سیر و سیاحت صرف گنے چنے لوگوں کی تفریح طبع یا دلچسپی کا موضوع نہیں رہا ہے۔ جیسے جیسے نقل و حمل کے ذرائع نے ترقی کی ہے ایک دوسرے ملک میں جانے والے سیاحوں کی تعداد بڑھتی گئی ہے۔ سیاحت اب چند دانشوروں، فلسفیوں، مورخوں وغیرہ تک محدود نہیں رہ گئی ہے۔ عام آدمی، عورت، مرد، بچے، بوڑھے جوان سبھی اس میں دلچسپی لینے لگے ہیں۔ لوگ اب چھوٹے بڑے گروپ بنا کر بھی مختلف ملکوں کا سفر کرتے ہیں اور لمبی لمبی چھٹیاں دوسرے ملکوں میں گذارتے ہیں۔ سیاحت کے فروغ سے ایک دوسرے ملک کی تہذیب و ثقافت کے بارے میں باہمی سمجھداری بڑھ رہی ہے۔ دنیا کے ایک خطے کے لوگ دوسرے خطے کے لوگوں کے اور نزدیک آرہے ہیں اور دلوں کے فاصلے سمٹ رہے ہیں۔

اس صدی کے آغاز سے پہلے تک سیر و سیاحت محض ایک سماجی یا عملی سرگرمی سمجھی جاتی تھی لیکن اب اس کے ساتھ اقتصادی پہلو بھی جڑ گئے ہیں۔ ہندوستان جس قدر متنوع اور رنگا رنگ ملک ہے اتنے ہی اس ملک میں سیاحت کو فروغ ملنے کے امکانات وسیع ہیں۔ گذشتہ برسوں میں ہندوستان آنے والے سیاحوں کی تعداد اور سیاحت سے حاصل ہونے والے غیر ملکی زر مبادلہ میں مسلسل اضافہ ہوا ہے۔

اگر اعداد و شمار کی زبان میں اس اضافہ کی تشریح کی جائے تو محکمہ سیاحت کے مطابق اس سال صرف جنوری میں ہی ۹۱ ہزار ۳۰۸ بین الاقوامی سیاح ہند آئے، جبکہ گذشتہ سال ۱۹۸۳ء کے اس مہینے میں ۹۰ ہزار ۱۰۸ سیاح آئے تھے۔ ایک ہی سال میں ۱۴،۱ فیصد کا یہ اضافہ کوئی معمولی اضافہ نہیں کیونکہ اگر اس سے بھی پہلے کے اعداد و شمار کو دیکھا جائے تو ۱۹۷۶ء میں ۶ لاکھ ۴۴ ہزار ۵۹۹ سیاح ہند آئے تھے، اور تین برس بعد یعنی ۱۹۷۹ء تک اس تعداد میں صرف ۲،۲ فی صد کا اضافہ ہوا تھا یعنی تین سالوں میں سیاحوں کی تعداد میں صرف ۱۴ ہزار ۸۶۷ کا اضافہ ہوا۔

جہاں تک غیر ملکی زر مبادلہ کا تعلق ہے تو ۱۹۷۸ء میں ملک نے ۳ ارب ۳۰ کروڑ روپے کا زر مبادلہ حاصل کیا۔ اگلے سال یعنی ۱۹۷۹ء میں اس میں ۸ کروڑ روپے کا اضافہ ہوگیا یعنی اس سال ۳ ارب ۳۸ کروڑ روپے کے زر مبادلہ کی آمدنی ہوئی۔

لیکن ۱۹۸۲ء میں ریزرو بینک آف انڈیا کے تخمینہ کے مطابق ملک نے ۱۰ ارب روپے کمائے اور ۱۹۸۳ء میں ریزرو بینک کے عبوری تخمینہ کے مطابق سیاحت سے ۱۱ ارب روپے کی آمدنی ہوئی۔ کہا جا سکتا ہے کہ کسی بھی ملک میں سیاحت سے ہونے والی یہ سب سے زیادہ فی کس آمدنی ہے۔ جن ملکوں میں تعداد کے لحاظ سے ہندوستان سے بھی زیادہ سیاح آتے ہیں۔ ان کے مقابلے میں بھی ہند کو سیاحت سے دوگنی آمدنی ہوئی ہے۔

سیاحوں کی تعداد اور غیر ملکی زر مبادلہ کے حصول میں اس اضافے کی اہمیت یہ بھی ہے کہ یہ اضافہ دنیا کی بحرانی صورت حال اور بین الاقوامی کساد بازاری جیسے ناموافق حالات کے بیچ حاصل کیا گیا۔ اس کے پیچھے یقیناً سرکار کی بعض پالیسیوں اور کوششوں کا بھی کچھ ہاتھ ہے۔ سیاحت پر جہاں سرکاری خرچ کو مستحکم کیا گیا وہاں غیر ملکوں میں بھی ہندوستانی سیاحت کو فروغ دینے سے متعلق سرگرمیاں تیز کی گئیں تاکہ زیادہ سے زیادہ سیاحوں کو ہند آنے کے لیے راغب کیا جا سکے۔

سیاحوں کی دلچسپی کے مقامات میں تنوع لانے کے لیے سمندری ساحلوں اور خوبصورت پہاڑی علاقوں کو ترقی دینے کے کام ہاتھ میں لیے گئے۔ چھٹے پنجسالہ منصوبے میں سیاحت کے فروغ کے لیے ۳۰ کروڑ روپے فراہم کرائے گئے۔ جبکہ پانچویں منصوبے میں یہ رقم ۲۳ کروڑ ۶۲ لاکھ روپے تھی۔ کئی برسوں سے محکمہ سیاحت

ملک میں سیاحت کی سہولتوں کو بڑھانے اور غیر ممالک میں سیاحوں کو متوجہ کرنے کی دو سطحی پالیسی پر چل رہا ہے۔ اس میں اب ایک تیسری سطح بھی شامل ہو گئی ہے اور وہ ہے گھریلو سیاحت کو فروغ دینے کا کام۔ گھریلو سیاحت کے فروغ پر بھی اب اتنا ہی دھیان دیا جا رہا ہے جتنا کہ بین الاقوامی سیاحت کے فروغ پر دیا جاتا ہے۔

سیاحت اور شہری ہوا بازی کی مرکزی وزارت کا محکمہ سیاحت، انڈین ٹورازم ڈیولپمنٹ کارپوریشن کے ساتھ مل کر اس تجارت کو ترقی دینے میں لگا ہے۔ سیاحت کے علاقائی دفاتر ملک اور بیرون ملک دونوں جگہ پھیلے ہوئے ہیں۔ بمبئی، دلی، کلکتہ اور مدراس کے علاوہ آگرہ، اورنگ آباد، کوچین، جے پور، کھجوراہو اور وارانسی میں بھی محکمہ کے ایڈیشنل آفسس موجود ہیں۔ یہ دفاتر ریاستی حکومتوں، ٹریول ایجنٹوں، ہوٹلوں وغیرہ کے ساتھ پورا تال میل رکھ کر کام کرتے ہیں۔ غیر ممالک میں ہند کے دفاتر سیاحت، نیویارک، لاس اینجلس، شکاگو، ٹورنٹو، لندن، جنیوا، پیرس، فرینکفرٹ، برسلز، اسٹاک ہوم، میلان، ویانا، کویت، بنکاک، ٹوکیو، پرتھ، سنگاپور اور سڈنی جیسے عالمی سیاحتی مراکز میں کام کر رہے ہیں۔ ان کے علاوہ ڈلاس، سیامی، سان فرانسسکو، واشنگٹن، اوساکا، ملبورن اور تہران میں سیاحوں کو ہند کی طرف راغب کرنے سے متعلق سرگرمیوں کو چلانے والے مرکز واقع ہیں۔ غیر ملکوں میں مختلف دفاتر متعلقہ علاقوں کی طرف سیاحوں کو آمادۂ سفر کرنے کے لیے محکمہ سیاحت اور ایئر انڈیا کے درمیان قریبی تعاون کی ایک خاص اسکیم کے تحت کام کر رہے ہیں۔ سیاحوں کو کئی طرح کی سہولتیں دی گئی ہیں۔ پولیس رجسٹریشن، غیر ملکی زر مبادلہ پر کنٹرول، کسٹم، نشہ بندی اور ویزا سے متعلق قواعد و ضوابط کو نرم کیا گیا ہے۔ محکمہ ریلوے کی طرف سے گھریلو سیاحوں کو رعایتی ٹکٹ دئے جاتے ہیں۔ طلباء کو خاص رعائتیں دی جاتی ہیں۔ اس طرح سیاحوں کو اور بہت سی سہولتیں حاصل ہیں اور ان سہولتوں میں مسلسل اضافہ کیا جا رہا ہے۔

سیاحت چونکہ بیرونی زر مبادلہ حاصل کرنے کا سب سے بڑا ذریعہ بنتا جا رہا ہے اس لیے اب سیاحت کو تجارتی نقطۂ نگاہ سے فروغ دینا بڑا ضروری ہو گیا ہے۔ کچھ ریاستوں نے اس سمت میں قدم اٹھائے ہیں اور نئے منصوبے بنائے ہیں۔

مثال کے طور پر کرناٹک کا نام لیا جا سکتا ہے۔ وہاں سیاحوں کے لیے سستے ہوٹل بنائے جا رہے ہیں تاکہ ہند کے سیاحوں کو بھی زیادہ سے زیادہ سہولت مل سکے۔ ریاستی حکومت نے ایک ہوٹل بکنگ اسکیم شروع کی ہے جس کے ذریعے سیاح ریلوے اسٹیشن اور ہوائی اڈے پر ہی ہوٹلوں میں اپنے کمرے بک کرا سکتے ہیں۔

لیکن مرکزی محکمہ سیاحت کو قومی ملکیت میں لینے کے لیے ابھی بہت کچھ کرنا باقی ہے۔ مرکز نے ۱۹۹۰ تک ۲۵ لاکھ سیاحوں کے ملک میں آنے کا نشانہ مقرر کیا ہے۔ ۲۵ لاکھ سیاحوں کا ہر سال ملک میں آنا یقیناً بڑی کامیابی ہوگی۔

●

بقیہ: فلسفۂ زندگی

ذہن میں شعوری یا غیر شعوری طور پر قائم کر رکھی تھی۔ شکل چاہے شوجی کے کائناتی رقص کی ہو یا "نادر ہم" (صدائے عالمگیر) کی، 'حلقۂ نور' والے مرد کی ہو یا عورت کی یا کسی اور طرح کی تیز روشنی کی۔

کیا یہ چیز ہمارے خوابوں میں نظر آنے والی چیز سے ملتی جلتی نہیں؟ اس کی وضاحت علم نفسیات کی مدد سے معقول سائنسی ڈھنگ سے کی جا سکتی ہے اور ثابت کیا جا سکتا ہے کہ ہم ذہن کو جلا دے کر سمادھی یا مراقبے میں جا سکتے ہیں اور اپنے اوپر ہپناٹزم کا سا عمل کر کے وہی شکلیں دیکھ سکتے ہیں جو ہم دیکھنا چاہتے ہیں اور خواب کی مانند ان سے بات چیت بھی کر سکتے ہیں۔ وگرنہ یہ کیا بات ہے کہ جس شکل کے درشن ہوتے ہیں وہ صرف اسی زبان میں بات کرتی ہے جو کہ درشن پانے والا سمجھتا ہے؟ اب ساتھ ساتھ ترجمہ ہوتا جاتا ہو تو بات الگ ہے یا پھر یہ بات ہو کہ برتر وبالا ہستی کو کئی زبانوں پر حاوی ہے۔ یہ بات بڑی مضحکہ خیز معلوم ہوتی ہے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ سارے عملی ارتقا میں انسان نے اپنے اردگرد کی چیزوں کا بیان کرنے کے لیے مثلاً سمندر، لہروں، پہاڑوں، دریاؤں، مناظر کی خوبصورتی، پھولوں کے بیان کے لیے اپنی ذہنی صلاحیتوں کو اس ڈھنگ سے جلا دی کہ پہلے ان چیزوں کو اپنے ذہن میں جگہ دی اور پھر انھیں ایسے خوبصورت انداز میں بیان کیا کہ اس کے بیان نے شاعری یا ادب کا درجہ حاصل کر لیا۔ جب اس نے اپنے تجربات اور واقعات کی تفصیل کو نوٹ کیا تو وہ مندرجات تاریخ بن گئے۔ جب اس نے مادے پر تجربے کئے تو وہ علم طبیعات یا علم کیمیا بن گیا۔ جب اس نے پہیئے سے شروع کر کے چیزیں بنانے کا عمل جاری رکھا تو یہ چیز بڑھتے بڑھتے انجینئرنگ کا علم بن گئی۔ اس بات کا اطلاق مصوری، موسیقی، سماجی علوم، پولیٹیکل سائنس اور اقتصادیات پر بھی کیا جا سکتا ہے۔ لیکن فرد کی حیثیت سے جب انسان الجھن میں پھنس جاتا یا اسے کوئی معقول جواب نہ ملتا تو وہ عالم غیب پر انحصار رکھنے لگ جاتا۔ لیکن اس کی ساری نشو و نما سوالیہ ذہن رکھنے کی وجہ سے ہوئی ہے کیونکہ وہ نت نئی معلومات حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اس کی ترقی کا راز صرف یہ ہے کہ اُسے یقین تھا کہ وہ مادی اشیا اور دیگر انسانوں کے ساتھ اپنے تعلق میں تبدیلی لا کے دکھا سکتا ہے۔ لیکن جس حد تک اس نے اندھ وشواس پر انحصار رکھا اور ایسی صورت پر قانع ہو گیا جو اس کے قبضے سے باہر تھی، اس حد تک اس کی حالت میں جمود آ گیا اور لوگوں نے اسے لوٹا کھسوٹا اور زیادہ خراب کیا۔

مدن لعل منچندہ

دو پھول

مکان کے پچھواڑے، نالے کے قریب ڈھلان پہ ایک گھنے پتوں والا درخت تھا جس کی خوبصورت لمبی لمبی نازک شاخیں زمین پہ جھکی رہتی تھیں، اُس کے گول گول، گہرے ہرے رنگ کے پتے جن کی ہریالی پت جھڑ میں بھی قائم رہتی تھی نہایت ہی بھلے معلوم ہوتے تھے۔ لیکن آج تک کسی نے اس درخت پر پھول کھلتے یا پھل لگتے نہیں دیکھا تھا۔ چند دنوں سے اکثر شام کے وقت جب سورج غروب ہونے لگتا تو مکان کے پچھواڑے دو بچے کھیلتے کھیلتے اس درخت کے قریب ٹیلے پر آ کھڑے ہوتے اور ہر آنے جانے والے کے چہرے کو گھور گھور کر دیکھنے لگ جاتے۔ سورج کی سُنہری کرنوں کی زد میں اُن کے دمکتے چہرے درخت کی چھوٹی ہوئی کونپلوں پہ لٹکتے ہوئے گلاب کے دو پھولوں کی مانند مسکرا اُٹھتے اور پھر جب سُورج اپنی کرنیں سمیٹ کر غائب ہو جاتا اور آہستہ آہستہ ہر شے شام کے دُھندلکے میں جذب ہونے لگتی تو درخت کی اوٹ سے ایک سایۂ نمودار ہوتا، جسے دیکھتے ہی بچے بڑھ کر اُس سے چمٹ جاتے۔ یہ سایہ اپنے پھیلے ہوئے بازوؤں کے گھیرے میں اُنھیں لے کر اپنی چھاتی سے بھینچ لیتا۔ دو ننھے ننھے معصوموں کے زور سے دھڑکتے ہوئے دل اس کے دل کی دھڑکن کو بھی تیز کر دیتے۔

پاپا!"

"روبی!"

"پاپا، تم کب گھر آؤ گے؟" ٹونی بھی ہر روز والی بات دوہرا دیتا۔

"بہت جلد، بس تھوڑے ہی دنوں میں" وہ ٹونی کو چھاتی سے لگا کر اُس کی پیشانی چُومتے ہوئے ہر روز کہی جانے والی بات کو پھر سے کہہ دیتا۔

ٹونی اپنی سہمی سہمی نظروں سے پاپا کو گھورنے لگتا جیسے اُسے پاپا کی بات پر یقین نہیں آیا تھا، لیکن اس کا ننھا سا دماغ کچھ بھی نہیں سوچ سکتا تھا۔ پھر بھی نہ معلوم وہ بار بار جھوٹ ثابت ہونے والی بات کو بُھلا کر پاپا کے نئے وعدے پر کیوں یقین کر لیتا تھا۔ کچھ دیر اور ہلکی ہلکی سرگوشیاں جاری رہتیں اور پھر حسب معمول پاپا اُنھیں باری باری چُومتے اور ہاتھ میں بسکٹ، ٹافی یا کوئی اور مٹھائی دے کر اُنھیں رخصت کر دیتے۔ بچے ٹافی کو چُوستے ہوئے خوشی سے اپنے ننھے ننھے ہاتھ، بائی بائی، گُڈ بائی میں سر ہلاتے گھر کی طرف روانہ ہو جاتے۔ اُنھیں نظروں سے اوجھل ہوتے دیکھ کر وہ اپنا دل مسوس کر رہ جاتا اور پھر کچھ دیر سر جُھکائے اپنی نمناک آنکھوں سے آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا نالے کے اُس پار نہ جانے تاریکی میں کہاں غائب ہو جاتا۔

چند دن یُوں ہی بیت گئے۔ ٹونی بار بار وہی سوال دوہراتا رہا۔ اور پاپا ہر روز اپنے وعدے کو جلد ہی آنے والے کسی دن پر ٹالتے رہے۔ لیکن ایک دن تو ٹونی پاپا کی چھاتی سے لگ کر زور زور سے رونے لگا۔ اپنے بھیا کو روتے دیکھ کر روبی نے ٹافی چُوستے چُوستے چھوڑ دیا۔ باوجود کوشش کے وہ ٹونی کے رونے کا سبب نہ سمجھ سکی۔ پاپا نے اُسے لاکھ پچکارا اور لاڈ پیار کیا۔ مگر اُس کی آنکھوں سے آنسو نہ تھمے۔ پاپا کے بار بار پُوچھنے پر ٹونی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اور بدستور سِسکیاں بھر بھر کر روتا رہا۔

"اچھے بیٹے تو فوراً بتا دیتے ہیں" پاپا نے ایک نئی ترکیب آزمائی۔

"ممی .... ممی کہتی ہیں .... وہ برابر سسکیاں بھر رہا تھا۔

"کہتی ہیں، کہتی ہیں" اُس نے ہچکیوں کے درمیان کہا "پاپا نہیں آئیں گے" اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

"نہیں تو"... پاپا نے اُسے حوصلہ دیتے ہوئے اپنے کندھوں سے لگا لیا۔

آہستہ آہستہ جب اُس کی سسکیوں میں کمی واقع ہوئی تو اُس نے پھر اپنی زبان کھولی۔

"اور کہتی ہیں، تم پاپا کے پاس نہیں جاؤ گے۔"

"اچھا"

"اور جاؤ گے تو ...؟ ٹونی نے مُنہ بسورتے ہوئے کہا۔ "سخت مار پڑے گی"

"اور"

"اور روبی نہیں جائے گی تو اُسے مٹھائی ملے گی۔"

"پاپا، ممی ہمیں مٹھائی دیں گی نا" روبی نے انتہائی معصومانہ لہجے میں اپنی توتلی زبان ہلائی اور خوشی سے جھوم اٹھی۔

"نہیں"۔ ٹونی نے چیخ کر روبی کو آنکھیں دکھائیں اور وہ کچھ سہم کر پھٹی پھٹی آنکھوں سے ٹونی کو دیکھنے

گی۔

پھر جب ڈونی کو پاپا کی نظروں سے شہ نہ ملی تو اُسے پاپا کی ناراضگی کا احساس ہونے لگا اور اُس نے جھٹ اپنی باہیں پاپا کے گلے میں ڈال دیں۔ اور کچھ ہی دیر میں پاپا کے چہرے کو اپنے دونوں ہاتھوں میں تھام کر پاپا سے نظریں ملاکر کسی نامعلوم سوال کا جواب طلب کرنے لگا۔ لیکن پاپا کو کسی سوچ میں ڈوبا پاکر وہ خود ہی بول اٹھا۔

"پاپا، تو ہمیں اچھے لگتے ہیں نا؟"

"ہاں، بہت اچھے" رُوبی نے خوش ہوکر ڈونی کی ہاں میں ہاں ملائی۔

سوچ میں غرق پاپا نے دونوں کو پھر سے باری باری چوم لیا۔ اور اُس کی آنکھیں نمناک ہوگئیں۔

بچے اپنے پاپا سے اور بھی لپٹ گئے۔

"ممی کہتی ہیں، پاپا خراب ہیں" اور

"ہم پاپا سے کبھی نہیں بولیں گے۔"

اور

"ہم پاپا سے الگ رہیں گے۔" اور

"پاپا سے ہماری کٹی ہوگئی ہے۔"

ڈونی نے ایک ہی سانس میں نہ جانے کتنی ہی باتیں کہہ ڈالیں۔

"نہیں، بیٹا۔ ایسا نہیں۔" پاپا نے ایک لمبی سانس بھری اور اپنے سینے میں ایک خنجر سا اُترتا ہوا محسوس کیا۔ غصے سے اُس کی رگیں پھول اُٹھیں۔ لیکن وہ ایک پر بریدہ پرندے کی طرح پھڑپھڑا کر رہ گیا۔ آپریشن کے بعد تو اب وہ اور بھی نقاہت محسوس کرنے لگا تھا۔

"پاپا، ممی خراب باتیں کرتی ہیں نا،" جیسے ڈونی اپنے پاپا کے الفاظ کی نسبت اُس کی لمبی سانس کا مفہوم زیادہ بہتر سمجھتا ہو۔

"نہیں، ایسا نہیں کہتے۔" پاپا نے اپنے جذبات پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ لیکن اُس کے دُھندلے چہرے اور ماتھے پر اُبھرنے والی لاتعداد شکن اُس کے دل کی کیفیت کو ظاہر کر رہے تھے۔ اسی لیے پاپا کے حوصلہ افزا الفاظ کے باوجود بچے سہمے سہمے تھے اور پھر ڈونی ممی کی وہ تمام باتیں یاد کر کے زور زور سے رونے لگا۔

پاپا کے پُچکارنے کے باوجود ڈونی نے رونا بند نہیں کیا۔

اور پاپا کے ساتھ ہی چلنے کے لیے ضد کرنے لگا۔ پاپا نے اُس کی توجہ نئے نئے کھلونوں کی طرف دلانے کی کوشش کی۔ اور وعدہ کیا کہ وہ کل ڈونی اور رُوبی کے لیے ایک ہوا میں اُڑنے والا گھوڑا، بندوق چلانے والا شکاری اور ایک اچھی سی گڑیا لاکر دیں گے اور مٹھائی اور ٹافیاں۔

ان کے ننھے دماغ کچھ لمحات کے لیے کھلونوں کی دنیا میں کھوئے ہوئے واپس لوٹ آئے۔

ڈونی بچپن سے ہی اپنے پاپا کے بازوؤں میں جھول کر بڑا ہوا تھا۔ اور اکثر رات کو بھی اپنے پاپا کے پاس ہی سوتا تھا۔ ممی کے پاس وہ شاید دودھ ہی پینے کے لیے جایا کرتا تھا۔ اس لیے پاپا کی مسلسل غیر حاضری اُس کے لیے سخت اذیت کا باعث بن چکی تھی۔ وہ ہر وقت اُداس سا پاپا کے تصور میں ڈوبا ہوا رہنے لگا، رات کو وہ نیند میں باتیں کرتا کبھی زور زور سے ہنستا اور کبھی چیخ چیخ کر روتا اُس کی چیخ و پکار میں ایک لفظ جو بار بار واضح طور پر اُبھرتا وہ "پاپا" تھا۔ لبا اوقات وہ اُٹھ کر بیٹھ جاتا آیا کی ہزار تدبیروں کے باوجود وہ سونے کا نام نہ لیتا۔ اور نہ ہی کسی اور کو سونے دیتا۔ اُس کا زرد اور کمزور چہرہ دن بدن پھیکا پڑنا شروع ہو گیا۔

اُس کی ممی ضرور فکرمند تھی۔ لیکن اُس کا خیال تھا کہ جتنی جلدی وہ اپنے پاپا کو بھلانے کی کوشش کرے گا۔ ویسے ہی ٹھیک ہونا شروع ہو جائے گا اس لیے یہ ضروری تھا کہ پاپا کی یاد کو کم کرنے کی ہر تدبیر عمل میں لائی جائے اور ممی اولاً ڈونی کو پاپا سے ملنے کا موقع ہی نہ ملے اس لیے اُس نے آیا کو ہدایت کی کہ ڈونی کو ادھر اُدھر مت گھومنے دے۔

ڈونی اور رُوبی کی اب کڑی نگرانی کی جانے لگی۔

لیکن ایک دن شام ڈھلے ڈونی نظر بچا کر مکان کے پچھواڑے اُسی درخت کے پاس پہنچا۔ اتنے دنوں سے مایوس لوٹنے والے سائے نے جھٹ اپنے بازو پھیلا کر اُسے اپنے سینے سے لگا لیا۔ اچانک ہی مکان کے عقبی حصے والی کھڑکی کھلی اور دو گھورتی ہوئی آنکھیں ڈونی کے تعاقب میں اُٹھیں۔ کچھ ہی دیر میں آیا بڑھتی ہوئی دکھائی دی۔ ڈونی ڈر کے مارے پاپا سے اور بھی چپک گیا۔ پھر آیا نے محبت بھرے لہجے میں "ڈونی بابا" "ادھر آؤ بابا" کی آوازیں لگائیں۔ تو وہ کچھ ممی کے ڈر سے اور کچھ آیا کے بلانے سے گھر لوٹ آیا۔

گھر پہنچتے ہی ممی نے اُسے بڑا ڈانٹا اور آیا کو بھی بُرا بھلا کہا۔ اُس کے بعد بہت دنوں تک ڈونی کو گھر سے نکلنے کا موقع نہیں ملا۔ لیکن ایک دن آیا جب شام کی سبزی لینے گئی تو ڈونی اور رُوبی بھی چپکے سے ممی کی نظر بچا کر اُس درخت کے پاس جا پہنچے۔ کافی دیر تک جب گھر میں ڈونی اور روبی کسی کی بھی آواز سنائی نہ دی تو ممی نے ایک آواز دی۔ لیکن پیہم خاموشی اور گہرے سکوت میں سے کوئی آواز نہ اُبھری۔

ممی اُن کی تلاش میں دبے پاؤں اُسی درخت کے پاس پہونچ گئی۔ درخت کی اوٹ سے کچھ ہی فاصلے پر اُس نے وہ منظر دیکھا کہ اُس کے دل کے تار جھنجھنا اُٹھے۔ بچے باپ کی چھاتی سے لپٹے تھے، اور ایسا محسوس ہوتا تھا کہ وہ اپنے پاپا کی قربت میں ایک عجیب راحت محسوس کر رہے تھے۔ پاپا کی جھکی ہوئی آنکھوں سے تو شفقت کے آنسو ٹپ ٹپ گر رہے تھے۔

ایک لمحہ کے لیے تو وہ کچھ کھو سی گئی اور اُس کے ذہن کے کسی گوشے میں کسی نازک خیال نے انگڑائی لی۔ لیکن پھر خود ہی اُس نے کسی شدید جذبے کے تحت اپنے ہونٹ کاٹے اور جھنجھلا اُٹھی۔ "نہیں، نہیں ہرگز نہیں۔"

تیز تیز قدموں سے وہ واپس گھر پہنچی۔ آیا بھی بازار سے لوٹ چکی تھی اُس نے آیا سے بچوں کو

فوراً واپس لانے کے لیے کہا۔ آیا بچوں کو لے آئی۔

"ٹونی، اُس کی ممی کڑک کر بولی "۔ ادھر آؤ۔"

ٹونی کے چہرے پر ہوائیاں اُڑنے لگیں۔ وہ رُک رُک کر آگے بڑھا۔ نزدیک آتے ہی ممی نے اُس کے زور سے ایک تھپڑ جمایا۔ اُس کے نرم نرم گالوں پر اُنگلیوں کے نشان جم گئے۔ ایک لمحہ تو ٹونی کا سانس ہی ختم ہوگیا۔

"خبردار اگر پاپا کا نام لیا تو" اُس کی ممی نے گرج کر کہا۔ اور ایک قہر آلود نظر ٹونی پر ڈالی۔ مگر ٹونی خوف کے مارے "پاپا" پاپا" چلاتا رہا۔

"تم باز نہیں آؤگے" وہ جھنجھلا اُٹھی اور غصے میں لال پیلی ہو کر اُس کے ایک زوردار چپت اُس کے دُوسرے گال پر دے ماری۔

"چیختا چلاتا ٹونی ڈر کے مارے ممی سے لپٹ گیا۔

ٹونی کافی دیر تک روتا رہا۔ اور اُسے کسی نے چپ نہیں کرایا۔ پھر وہ خود ہی آہستہ آہستہ چُپ ہوگیا۔ اُس کے گال سوج گئے تھے اور اُس کا چہرہ انار کے دانوں کی طرح سے تمتما رہا تھا۔ اُس رات ٹونی نے کھانا نہیں کھایا اور ایسے ہی سو گیا۔ صبح وہ دیر سے اُٹھا۔ اُس نے اپنی ادھ کھلی آنکھوں سے ممی کو دیکھا۔ ممی اُسے کچھ عجیب سی لگ رہی تھی۔ اُسے ایسا محسوس ہو رہا تھا، جیسے اُسے ممی سے ڈر لگ رہا تھا۔

وہ سوچ کی دُنیا میں ڈوبتا چلا گیا۔ وہ پہروں اپنے کھیل میں گُم سُم لگا رہتا۔ ممی اُسے کئی کئی بار بلاتی، تب وہ کہیں جواب دیتا۔ ہر ایک بات کو جلد جلد بھول جانا اُس کی فطرت بن چکی تھی۔ کسی بات کو زیادہ دیر تک یاد رکھنا اُس کے بس کی بات نہ رہ گئی تھی، اُس کا رنگین تصوّر چل چکا تھا اور دماغ کُند ہو چکا تھا۔

دن ہفتوں میں اور ہفتے مہینوں میں تبدیل ہونے لگے۔ ٹونی کی مسکین صورت اور بھی قابلِ رحم ہوتی گئی۔ بھیا کے غمگین چہرے کا پَرتو روبی پر بھی پڑنا شروع ہوگیا۔

ایک دن جب سورج کی کرنیں مُنڈیروں پر سونا چڑھا رہی تھیں اور پرندے قطار اندر قطار فضا میں پرواز کر رہے تھے۔ گلی کے سب بچے کھیل کود میں اِدھر اُدھر پھدک رہے تھے۔ لیکن ٹونی الگ ایک کونے میں اُداس سا بیٹھا تھا۔ اُس کے دل کی کلی مُرجھا سی چکی تھی۔ اور اب اُس میں بچوں کے ساتھ مل کر کھیلنے کی تمنّا تک باقی نہ تھی۔

کچھ دیر میں روبی بھی اُدھر سے آتی دکھائی دی اور چُپ چاپ اپنے بھیّا کے ساتھ آکر بیٹھ گئی۔ اُن کے چہرے جو چند مہینے پہلے کھلتے گلاب کے پھولوں کی سُرخی لیے تھے آج بسنتی پھولوں کی طرح زرد اور پھیکے پڑ چکے تھے۔

ممی بہت دیر تک اُنھیں یونہی دیکھتی رہی۔ دوسرے بچے کس طرح کھیل کود میں خوشی سے چہک رہے تھے، اُس کے دل کو کسی نے جیسے ڈس لیا تھا۔ ممتا کے جذبے نے جوش مارا اور وہ اُٹھ کر ان دو ننھے معصوموں کے پاس آئی اور بے اختیار اُنھیں اُٹھا کر سینے سے لگا لیا۔

" بیٹے تم کھیلتے کیوں نہیں ؟ تمھیں کیا چاہیئے؟

ننھے بچوں نے اس اُمڈتے ہوئے پیار اور ماں کی ممتا کو محسوس کیا۔ اور جھٹ سے ٹونی نے کچھ زیرِ لب کہا۔ ممی سوائے کچھ ہلکی سی آواز کے کچھ بھی سُن نہ پائی لیکن روبی فوراً ہی بول اُٹھی ۔ "ہاں ۔ پاپا"۔ اور پھر اُس نے ٹونی کی طرف دیکھا۔ ٹونی لپک ماں سے لپٹ گیا۔ اور بے اختیار بولا "ممی" پاپا کو بلا لونا، پاپا بڑے اچھے ہیں۔ وہ اب تم سے نہیں لڑیں گے۔"

ماں کی آنکھوں سے بھی آنسو جھرنے کی طرح بہنے لگے اور شدّتِ جذبات سے اُس نے مُنہ پھیر لیا۔

بقیہ: آیورویدا اور طبِ یونانی میں استعمال ہونیوالی جڑی بُوٹیاں اور اُنکی تجارت

دواخانے ہمارے ملک میں تقریباً ۴۴۳ ہیں۔ اِن میں ہزاروں جڑی بوٹیوں کے پھل، پھول، تنے جڑیں اور ان کی چھالیں، پتیاں، بیج اور ان پیڑ پودوں سے نکلے ہوئے گوند یا دُوسرے قیمتی مادے دوا بنانے کے لیے استعمال میں لائے جاتے ہیں۔ یہ جڑی بوٹیاں، پیڑ پودے اور درخت وغیرہ ہندوستان کے مختلف علاقوں جیسے جنگلوں، پہاڑوں اور میدانی علاقوں سے جمع کر کے بازاروں میں لائی جاتی ہیں۔ کچھ ایسی ادویات مثلاً طباشیر یا ونسلوچن، گاؤزبان، سورنجان، لول با، مرمکی، سقمونیا، ہلیلہ، ابہل یا بابڑ بیر، تودری، سرخ و سفید ثعلب مصری، شقاقل، کباب چینی، مصطگی رومی، مازو یا مایا پھل، چوب چینی، عناب، عقرقرحا، بہمنی، درونج عقربی، ہینگ، عصارہ ریوند، ریوند چینی، حب النار، حب العاس وغیرہ جیسی اہم ادویات کو برآمد کیا جاتا ہے۔ اسی طرح سے ہمارے ملک سے بہت ساری ادویات کو دُوسرے ممالک میں درآمد کیا جاتا ہے۔ آج کل باہر کے ممالک میں ستاور، اسپغول، اسرول اور دیگر ادویاتی پیڑ پودوں کو کافی تعداد میں برآمد کیا جا رہا ہے۔ جس کی وجہ سے ان ادویات میں تجارت کرنے سے کثیر تعداد میں زرِمبادلہ مل جاتا ہے۔

اب وہ دن دُور نہیں کہ ادویاتی پیڑ پودوں کی بڑھتی ہوئی مانگ کے مدِنظر ہمارے ملک میں ان کی دیکھ بھال، کاشت، پیداوار کو بڑھانے کے لیے تمام ملک میں زور دیا جائے گا اور ہندوستان کی غریب آبادی کی ایک بڑی تعداد ان پیڑ پودوں کی ادویاتی اہمیت سے واقف اور ان کے استعمال سے نہ صرف مستفید ہوگی بلکہ ان کی پیداوار اور کاشت کر کے آمدنی کا ذریعہ بھی بنائے گی۔

■

غزل

کوشنے موہنی

جنونِ عشقِ عمل، انقلاب پیدا کر
حیاتِ سرد میں کیفِ شباب پیدا کر

دلوں کو جوشِ نشاطِ عمل سے گرما دے
نئے جہان میں نئی آب و تاب پیدا کر

ترے جنوں میں سراپا سوال ہیں ہم لوگ
جو کر سکے تو ہمارا جواب پیدا کر

بہت ملول ہے انساں بھیج کوئی رسول
علاجِ دردِ جہانِ خراب پیدا کر

خرد بھی ڈھونڈھ رہی ہے جنوں کا اپناپن
یگانگت کے دلوں میں حساب پیدا کر

پسند آئے گا تیرا کمال دنیا کو
خیال و فکر میں لطفِ کتاب پیدا کر

رہِ خلوص میں اتنا میٹھا میٹھا مت رہ
نگاہِ شوق میں کچھ رعب و داب پیدا کر

سمجھا رہا ہے جنوں زیست ہے قرار و سکوں
سکھا رہی ہے خرد، اضطراب پیدا کر

فقیہہ شہر کی تلقین ہے کس قدر سنگیں
پئے بغیر سرورِ شراب پیدا کر

زمیں پہ جس سے سما ہیم نور کی ضو آئے
نئے اُفق سے نیا آفتاب پیدا کر

تلاشِ حسنِ معانی ہے ذہن کا آکاش
نئے نجوم، نیا ماہتاب پیدا کر

نسیمِ فکر، دلوں کی تپش کو دور کرے
سخن میں کیف و سرورِ سحاب پیدا کر

جو چاہتا ہے کہ اس کی ہو کچھ پذیرائی
کتابِ زیست میں جرأت کا باب پیدا کر

شعور، نور، تمیز و شعور لازم ہے
خطابِ حسن میں حسنِ خطاب پیدا کر

نہ مانگنے کی طرح مانگ التفات اس کا
نگاہِ شوق میں شرم و حجاب پیدا کر

کہا ہے یہ کسی نے کسی بار کرشن موہن سے
شعور و عزم سے تعبیرِ خواب پیدا کر

"ہند کے سپوت"

ساغر رامپوری

چاہتا ہے چھوٹنا بندِ غلامی سے اگر
اُٹھ کھڑا ہو امتیازِ مذہب و ملّت نہ کر

ہر طرف دُنیا نے آزادی ہی آتی ہے نظر
ہو رہی ہے زندگی دُنیا کی عشرت سے بسر

کس لیے تیری بڑھی ہیں اس قدر بیہوشیاں
ہوش میں آ، دیکھ کیا سے کیا ہوا ہندوستاں

تا بکے اے غافل، انجامِ غفلت ہوشیار
دوڑ اب تُو بھی ترقی کی طرف دیوانہ وار

ہو چکی بربادیوں کی حد تعصب چھوڑ دے
ہے لبالب زہر سے یہ ظرف اس کو پھوڑ دے

اشرف المخلوق ہو کر اور یہ نادانیاں
ہنس رہے ہیں تیری حالت پر زمین و آسماں

آرزوئیں

زیّس صدیقی ایم۔ اے۔ بی ایڈ

خار سے دامن سجانا چاہیئے
رنج میں بھی مسکرانا چاہیئے

زندگی بھر بس یہی سوچا کئے
اب کسی سے دل لگانا چاہیئے

بجلیوں میں تاب کیا جو گر سکیں
آشیانہ راس آنا چاہیئے

عشق کے ہوتے رہے ہیں امتحاں
حسن کو بھی آزمانا چاہیئے

زندگی بخشی ہے جس نے اے زیّس
اس کے آگے سر جھکانا چاہیئے

پیغام

نصر قریشی

ہر قدم راہِ ترقی پر بڑھانا ہے ہمیں
مشکلیں جتنی بھی ہوں منزل کو پانا ہے ہمیں

نفرتوں کی تیز آندھی کے مقابل ہر گھڑی
شمعِ اخلاص و وفا ہر سو جلانا ہے ہمیں

رُوحِ مذہب پیار ہے اور نامِ مذہب پیار ہے
مذہبی تفریق ذہنوں سے مٹانا ہے ہمیں

جہل کی تاریکی کو کافور کرنے کے لیے
علم کے سورج کی کرنوں کو جگانا ہے ہمیں

سب برابر ہیں یہاں کوئی نہیں چھوٹا بڑا
زندگی کرنے کا حق سب کو دلانا ہے ہمیں

بجلی پانی، کارخانوں کی سہولت سے بہم
گاؤں کو بھی شہر کی صورت بنانا ہے ہمیں

اپنے منصوبوں کو پورا کرنے کا پھر عہد لیں
بے زری، بیروزگاری کو مٹانا ہے ہمیں

دیش کی بڑھتی ہوئی آبادی پہ کچھ دھیان دیں
نسلِ انسانی کا مستقبل بنانا ہے ہمیں

عظمتِ تہذیب کی توقیر بڑھتی ہی رہے
اونچے آدرشوں سے قد اپنا بڑھانا ہے ہمیں

اپنی تہذیب و ثقافت کے امیں ہو کر رہیں
ساری دنیا میں سکوں کا نغمہ لانا ہے ہمیں

کاٹ کر دریا کے رُخ، بنجر زمینوں کے لیے
اپنی فصلوں کو تباہی سے بچانا ہے ہمیں

جنگ کے شعلوں میں جل جاتا ہے بستی کا سہاگ
امن کا نغمہ زمانے کو سنانا ہے ہمیں

ملک کی عظمت، محبت اور اخوت سے بڑھے
قومی یکجہتی کے جذبے کو بڑھانا ہے ہمیں

ساری دُنیا دیکھتی ہے نصر اب اپنی طرف
ملک کو اپنے عمل ہی سے سجانا ہے ہمیں

ظفر زاہدی

نینی تال — خوابوں کا شہر

نینی تال جو ۱۹۳۸ میٹر بلندی پر واقع ہے، سیاحوں کی جنت اور ان کے خوابوں کا شہر ہے۔ موسم گرما شروع ہوتے ہی لوگ کھنچ کھنچ کر یہاں پہونچنا شروع ہو جاتے ہیں اس کے خوشنما قدرتی مناظر تفریح کا بہترین سامان فراہم کرتے ہیں۔

قدیم کتابوں میں نینی تال کا ذکر "تری رشی سرور" کے نام سے آیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ تین رشیوں آرتی پلستیا اور پلاہا یہاں یاترا کی غرض سے آئے تھے انھیں پانی کی قلت کا سامنا کرنا پڑا تو تینوں نے ایک گہرا گڈھا کھودا جو جلد ہی جھیل میں تبدیل ہو گیا۔ اسی بنا پر اسے تری رشی سرور کا نام دے دیا گیا۔

۱۸۳۹ء سے پہلے نینی تال کا کوئی باضابطہ اور مفصل ذکر نہیں ملتا۔ حکومت اتر پردیش کے محکمہ آثار قدیمہ کے ریکارڈ سے یہ پتہ چلتا ہے کہ کسی نے ۱۸۳۹ء میں اس کا پتہ لگایا تھا مگر ۱۸۴۱ء میں اس وقت دوسرے لوگوں کو اس کے بارے میں معلوم ہوا جب اس سلسلے میں "آگرہ اخبار" میں ایک خط شائع ہوا۔ اس کے بعد ۱۸۴۲ء میں لوگوں نے پٹے پر وہاں زمین حاصل کرنے کے لیے درخواستیں دینا شروع کیں۔ ۱۸۴۳ء کے وسط میں کمایوں کے اس وقت کے کمشنر لشنگٹن سمیت نو افراد کے مکانات بن گئے تھے اور چودہ مکانات زیر تعمیر تھے۔ ۱۸۴۷ء تک نینی تال ایک تفریحی مقام بن گیا تھا اس وقت تک چالیس مکانات تعمیر ہو چکے تھے۔ اسی سال مارچ اور اگست کے درمیان چھ سیاح وہاں آئے اور ۱۶ سیاحوں نے وہاں موسم گرما کی چھٹیاں گذاریں۔

۱۸۵۷ء تک نینی تال کو اہم مقام حاصل ہو گیا۔ وہاں چونکہ مکمل امن و امان تھا اسی لیے برطانوی باشندے اسے ایک محفوظ مقام تصور کرتے تھے۔ کچھ عرصہ بعد ہی یہ شہر شمال مغربی صوبوں کے لیے موسم گرما کا ہیڈ کوارٹر بن گیا اور رفتہ رفتہ وہاں سرکاری عمارتیں اور تعلیمی ادارے قائم ہونے لگے۔ ۱۸۸۲ء میں کاٹھ گودام تک ریلوے لائن بچھ گئی جس سے نینی تال کے میدانی علاقوں تک پہونچنا آسان ہو گیا۔ ۱۸۵۷ء اور ۱۹۱۵ء کے دوران سینٹ میری کانونٹ، سینٹ جوزف کالج، نلنڈر اسمتھ (موجودہ برہ دو یا مندر) رمسے ہاسپٹل (موجودہ جی بی پنت ہاسپٹل) شیروڈ کالج، گورنمنٹ ہاؤس اور سکریٹریٹ قائم ہو گئے جو وہاں کے مشہور ادارے ہیں۔

۱۹۱۵ء میں کاٹھ گودام اور نینی تال کے درمیان موٹر کاریں چلنے لگیں۔ ۱۹۱۵ء سے ۱۹۴۷ء تک نینی تال کو ایک تفریحی مقام کی حیثیت سے ترقی دینے کی طرف خصوصی توجہ دی گئی۔ اس دوران یہاں کمرشیل عمارتوں کی تعداد میں کافی اضافہ ہو گیا۔

۱۹۴۷ء کے بعد اور خاص طور پر ۱۹۶۰ء اور ۱۹۷۵ء کے دوران ہوٹلوں اور مکانوں کی تعمیر زور و شور سے ہوئی اور ایک طرح سے اس کا مقابلہ ہونے لگا۔ اس کی وجہ سے شہر میں عمارتوں کا جال بچھ گیا اور بھیڑ بھاڑ بڑھ گئی۔ آج نینی تال کو نہ صرف سیاحتی مرکز بلکہ ایڈمنسٹریٹو ہیڈ کوارٹر اور تعلیمی مراکز کی وجہ سے بھی نئی اہمیت حاصل ہو گئی۔

نینی تال شہر کے اندر اور ارد گرد خوبصورت تر تفریحی مقامات ہیں۔ موسم گرما میں دلکش پہاڑیوں کے دامن میں صاف ستھرے اور خوشنما لمبے لمبے درختوں کی قطاریں اور کامرانی و خوشحالی کے نغمے سیاحوں کو اپنی طرف کھینچتے ہیں۔ نینی تال شہر میں قابل دید مقامات یہ ہیں:۔

نینی پہاڑی (۲۶۱۱ میٹر بلند) لاریا کانتا (۲۴۸۱ میٹر بلند) کلبری (۲۱۹۴ میٹر بلند) ہنومان گڑھی (۱۹۰۱ میٹر بلند) اور کھریا تال (۱۶۳۳ میٹر اونچائی پر) ان میں سے اکثر مقامات برف سے ڈھکے رہتے ہیں اور خوشنما قدرتی مناظر پیش کرتے ہیں۔

نینی تال کی جھیل نے اس کے حُسن کو اور دوبالا کر دیا ہے جو دن میں بارش کے بعد اور دلکش ہو جاتی ہے۔ ساتوں پہاڑیاں اس پر بنے ہوئے کاٹیج اور چھوٹے چھوٹے خوبصورت مکانات جھیل میں صاف جھلکتے ہیں۔ رات اس سے بھی زیادہ دلفریب ہوتی ہے۔ پہاڑیوں کے ایک کنارے لٹکے ہوئے بلب جب اس میں چمکتے ہیں تو عجیب و غریب سماں پیدا ہو جاتا ہے۔ خوبصورت باغات کے لیے بھوالی مشہور ہے۔ بھیم تال، نوکچیا اور سات جھیلیں دیکھنے اور تیرنے والوں کے لیے جنت کا نمونہ پیش کرتی ہیں۔ گورمکھی کا لارڈ گولا مندر اور سینک اسکول مشہور ہیں۔ رام گڑھ اور مکتیشور سیب کے باغات کے قلب میں واقع ہیں۔ اس کے آس پاس کے قدرتی مناظر یاتریوں اور سیاحوں کے دل لبھاتے ہیں، لوگ وہاں پہونچ کر باقی دنیا کو بھول جاتے ہیں۔

رشید الدین احمد

آیورویدا اور طبِّ یونانی میں استعمال ہونے والی جڑی بوٹیاں اور ان کی تجارت

علاج اور معالجہ کے لیے دُنیا میں مختلف طریقۂ علاج رائج ہیں۔ ان میں سب سے مشہور ایلوپیتھک سسٹم ہے۔ جس کو مغربی یا جدید طریقۂ علاج بھی کہا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ چین اور تبت میں اپنے طریقۂ علاج موجود ہیں۔ ہندوستان میں آیوروید اور یونانی طب علاج معالجہ کے لیے اہم مقام رکھتی ہیں۔ جنوبی ہندوستان خاص طور پر تامل ناڈو میں سِدھا طریقہ علاج عام طور پر اپنایا جاتا ہے۔ ہندوستان میں رائج یہ سب دیسی طریقہ علاج (انڈین سسٹمس آف میڈیسن) میں شمار کیے جاتے ہیں۔ اس طرح جرمنی میں پیدا ہوا ہومیو پیتھی تمام ہندوستان میں آج رائج ہے۔ آیوروید اور یونانی طب کی تاریخ کا اگر جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ زمانہ قبل مسیح سے لے کر آج تک کسی نہ کسی صورت میں رائج ہیں اور ہزاروں، لاکھوں لوگ ان دیسی طریقہ علاج سے آئے دن مستفید ہوتے رہتے ہیں۔ اسی لیے آج حکومت ہند ان کو مزید مقبول اور ہردلعزیز بنانے کے لیے اہم اقدامات اٹھا رہی ہے۔ عالمی صحت کے ادارے ڈبلیو۔ ایچ۔ او۔ W.H.O. نے بھی ان دیسی طریقۂ علاج کو بڑھاوا دینے کے لیے مختلف اسکیمیں تیار کرنا شروع کر دی ہیں تاکہ ان کو اپنا کر دُنیا کی بڑھتی ہوئی غریب آبادی کی علاج معالجہ کی ضرورتوں کو جلد از جلد پورا کیا جا سکے۔

آیوروید اور یونانی طب ایسے طریقہ علاج ہیں جن میں جڑی بوٹیاں اپنی اصلی یا قدرتی شکل میں استعمال کی جاتی ہیں اور اسی لیے ان کو کروڈ ڈرگس ((Crude drugs)) کا بھی نام دیا جاتا ہے۔

ان جڑی بوٹیوں کے علاوہ ان میں معدنیات اور حیوانات سے حاصل شدہ ادویات کو بطور ادویہ مفردہ کے استعمال میں لایا جاتا ہے۔ یہ ادویاتی پیڑ پودے یا جڑی بوٹیاں ان دیسی طریقہ علاج میں مرکبات (جیسے آیوروید میں ارشٹ، اولیہہ، بھسم وغیرہ اور یونانی طب میں جوارشات، معجون، قرص، جوشاندہ اور روغنیات وغیرہ) بنانے کے لیے استعمال میں لائی جاتی ہیں۔ یہ مرکب ادویات (Compound Formulation) بعد میں مختلف امراض کے لیے استعمال کی جاتی ہیں۔ مغربی طریقہ علاج میں بھی ان ہی جڑی بوٹیوں یا ادویاتی پیڑ پودوں کو استعمال میں لایا جاتا ہے مگر کسی دوسری شکل میں۔ یعنی ان جڑی بوٹیوں سے اہم کیمیاوی اجزاء نکال کر ان کا جانوروں پر تجربہ کیا جاتا ہے اور پھر ان کو مختلف امراض کے لیے دوا کے طور پر استعمال کے لیے بازاروں میں فروخت کیا جاتا ہے۔

آیوروید اور یونانی میں ادویات کے استعمال کی بنیاد مختلف فلسفوں پر مبنی ہے۔ آیوروید میں ان فلسفوں میں سب سے اہم وات، پت اور کف کا فلسفہ ہے۔ اس طرح یونانی طب میں اخلاط (Humors) یعنی سودا، صفراء اور مزاج (Temperament) کا ہے۔ ان ہی فلسفوں کو مدِّنظر رکھتے ہوئے ادویات کا استعمال کیا جاتا ہے اور تمام امراض کی جڑ اخلاط میں سمجھے جاتے ہیں۔ یونانی طب میں ادویات کو مزاج کے فلسفے کے تحت مختلف درجات جیسے رطب یا یبس، حار اور بارد وغیرہ میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ اسی طرح مریض کو بھی ان چار قسموں میں بانٹا جاتا ہے اور ادویات کو اسی حساب سے تجویز کیا جاتا ہے۔ چینی طب میں یہ فلسفہ یان (Yen) اور ین (Yan) کی صورت میں ملتا ہے۔

تمام دُنیا کی بڑھتی ہوئی آبادی کے ساتھ آج امراض بھی بڑھتے جا رہے ہیں۔ دُنیا کی اس بڑھتی ہوئی آبادی کی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے بڑی بڑی صنعتیں اور کارخانے بھی قائم کیے جا رہے ہیں، جس کے نتیجے میں بڑھتی ہوئی ماحول کی آلودگی نئے نئے امراض پیدا کرنے میں اور تعاون دے رہی ہے۔ مگر ان امراض کو دُور کرنے کے لیے طبّی سہولتوں کی فراہمی نسبتاً کم ہے۔ اسی لیے آج پوری دُنیا میں اسی بات پر زور دیا جا رہا ہے کہ امراض سے چھٹکارا پانے کے لیے علاج معالجہ کی سہولتیں زیادہ سے زیادہ فراہم کی جائیں جس کے لیے ضروری ہے کہ تمام دُنیا میں رائج ایلوپیتھی طریقہ علاج کے علاوہ دوسرے طریقہ علاج کو بھی بروئے کار لایا جائے تاکہ بڑھتی ہوئی آبادی کے بڑھتے ہوئے امراض کا ازالہ ہو سکے۔ جہاں ایک طرف ایلوپیتھی سے دُنیا کے لاکھوں کروڑوں لوگ مستفید ہوتے ہیں وہاں ہندوستان، پاکستان، چین اور تبت میں بھی کروڑوں غریب لوگ اپنے ان دیسی طریقہ علاج

کو اپنا کر مختلف امراض سے چھٹکارا پاتے ہیں ہمارے ملک میں بھی ہزاروں سال سے چلے آرہے طریقۂ علاج (آیورویدا اور یونانی طب) سے لوگ فائدہ اٹھاتے آرہے ہیں اور بیشتر امراض سے چھٹکارا پاتے ہیں۔ یہ بات آجکل عام دیکھنے میں آتی ہے کہ جہاں جدید طریقۂ علاج میں بہت سارے امراض کو دور کرنے کی صلاحیت ہے وہاں ان میں استعمال ہونے والی ادویات میں مضر اثرات بھی پائے جاتے ہیں۔ مگر یہ بات اپنی جگہ پر مسلّم ہے کہ دیسی طریقۂ علاج کی ادویات کو استعمال کرنے سے کم سے کم مضر اثرات کا سامنا نہیں کرنا پڑتا ہے اور ہزاروں سال سے ان ادویات کے استعمال کے باوجود کوئی ایسی بات ظہور میں نہیں آئی ہے جس سے یہ کہا جاسکے کہ ان طریقۂ علاج کی ادویات میں مضر اثرات ہوتے ہیں جو کہ ایک نہایت اہم تحقیقاتی پہلو ہے۔ یہی وجہ ہے کہ علاج کے ایسے طریقوں کو روزبروز مقبولیت حاصل ہوتی جا رہی ہے اور تمام مغربی ممالک میں ان ادویات کی خوبی کی بنا پر مفردات کو مختلف طریقۂ علاج کے واسطے بروئے کار لانے کے لیے تحقیقی کام زور شور سے کئے جا رہے ہیں۔

ہمارے ملک میں دیسی طریقۂ علاج میں استعمال ہونے والے تمام ادویاتی پیڑ پودوں کی کل تعداد ۱۵ سو سے لے کر ۲ ہزار تک ہے۔ جن کے سائنسی ناموں کی شناخت کہ وہ کس خاندان سے تعلق رکھتے ہیں مکمل طور پر ہو چکی ہے اور ان پیڑ پودوں کے کیا کیا افعال و خواص ہیں اور ان جڑی بوٹیوں میں سے کون کون سے اہم کیمیائی اجزاء حاصل کئے جاتے ہیں۔ ان کا بھی زیادہ تر تحقیقی حوالہ موجود ہے۔ اس کے علاوہ جن ادویات پر اس سلسلے میں تحقیقاتی کام نہیں ہوا ہے ان پر ملک کے بڑے بڑے اداروں، یونیورسٹیوں اور تجربہ گاہوں میں کام ہو رہا ہے۔ اس بات کی بھی کوشش حکومت ہند کی وزارت صحت عامہ اور خاندانی بہبود کی طرف سے کی جا رہی ہے کہ جلد از جلد ان ادویات پر تحقیقات کر کے ان طریقۂ علاج کی قرابادین تیار کی جائیں اور ادویہ مفردہ کے مختلف پہلوؤں پر قرابادینی نقطۂ نظر سے تحقیقاتی کام کر کے ان کو مستند بنایا جاسکے۔

ہندوستان میں جو ادویاتی پیڑ پودے ہیں ان کو جمع کرنے اور ان سے ادویات حاصل کرنے کا طریقہ بڑا ہی ناقص اور بے بنیاد رہا ہے جو ادویات بازاروں میں لائی جاتی ہیں ان کو ایسے لوگ جمع کرتے ہیں جو ان جڑی بوٹیوں کے ادویاتی اور سائنسی پہلوؤں سے اکثر ناواقف ہوتے ہیں۔ اور بازاروں میں زیادہ تر دوا فروش بھی ان کے طبی اور سائنسی پہلوؤں سے ناآشنا ہوتے ہیں، جس کی بنا پر ادویات میں ملاوٹ ہو جاتی ہے اور اصل دوا کی جگہ پر دوسری جڑی بوٹیاں شامل ہو جاتی ہیں جس کی وجہ سے دواساز کارخانے بھی لاعلمی کی وجہ سے غلط ادویات تیار کر دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ ان ادویات کو جمع کرنے کا کوئی ایسا مرکزی ادارہ نہیں ہے جو کہ ان پیڑ پودوں یا جڑی بوٹیوں کی پیداوار، خرید و فروخت، کاشت اور تحقیقاتی نقطۂ نظر سے صحیح معنوں میں دیکھ بھال کر سکے۔ اس لیے ان ادویات کی اہمیت کو مدِّنظر رکھتے ہوئے اس بات کی ضرورت ہے کہ یہ کام ملک کے ماہرینِ ادویات اور اس فن کے جاننے والوں کی سرپرستی میں ہو تاکہ اچھی اور بہتر سے بہتر ادویہ تیار کی جاسکیں۔ چونکہ ہمارے ملک میں ان طریقۂ علاج کی ادویات بنانے والے کارخانے روزبروز بڑھتے جا رہے ہیں۔ جس کی وجہ سے ان پیڑ پودوں (جڑی بوٹیوں) کی مانگ بھی بڑھتی جا رہی ہے۔ اس لیے اب ضروری ہے کہ ان ادویاتی پیڑ پودوں کی پیداوار پر بھی توجہ دی جائے تاکہ ایسا وقت نہ آنے پائے کہ یہ ادویاتی پیڑ پودے ختم ہونے لگیں۔ کیونکہ بہت سارے ادویاتی پیڑ پودے کثرت سے استعمال کرنے کی وجہ سے دھیرے دھیرے ختم ہوتے جا رہے ہیں۔ اس لیے اس بات پر زور دینا ہوگا کہ ان ادویاتی پیڑ پودوں کو استعمال کرنے سے پہلے ان کی پیداوار اور کاشت کرلی جائے اور بڑے پیمانے پر ان کو اگانے کا کام بھی کیا جائے تاکہ ان کے ختم ہونے کا اندیشہ نہ رہے۔ اکثر ہمارے دوا بنانے والے ادارے اس بات کی شکایت کرتے ہیں کہ ادویاتی پیڑ پودوں کی کمی ہے اور جڑی بوٹیاں مہنگی ہوتی جا رہی ہیں۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ ان ادویات کو اگانے، جمع کرنے، خرید و فروخت اور تحقیق کا کوئی مرکز نہیں ہے۔ اور نہ ہی اس تجارت میں مشغول لوگ ان ادویات کے طبی اور سائنسی پہلوؤں سے واقف ہیں۔

آیورویدا اور یونانی طب میں استعمال ہونے والی متعدد جڑی بوٹیاں مثلاً اسگندھ، بھانگرا، پنرنوا، بچھو کھپڑا، بانسہ، وساکا، آدھا کوڑا، گوکھرو، مدار، برہمی بوٹی، تلسی، السی، امربیل، بھارنگی اور [illegible] پیڑ پودے مثلاً اشوک، املتاس، نیم، بکائن، بیل، آملہ، کھیر، سرس وغیرہ اور اسی قسم کی دوسری جڑی بوٹیاں اور درخت صحیح معلومات نہ ہونے کی وجہ سے ضائع ہو جاتے ہیں کیونکہ بہت ہی کم لوگ ان اشیاء کی اہمیت سے واقف ہوتے ہیں۔ اگر ان کی دیکھ بھال کا معقول انتظام کیا جائے تو ان جڑی بوٹیوں، پیڑ پودوں اور درختوں سے کافی منافع کمایا جاسکتا ہے اور ہزاروں غریب لوگ برسرِ روزگار ہو سکتے ہیں۔ بہت سارے کسان بھائی ان جڑی بوٹیوں کی کاشت کر کے آمدنی بڑھا سکتے ہیں۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ ایک فصل کے بعد دوسری فصل کے بیچ کاشتکاروں یا کسانوں کی زمینیں کافی عرصہ کے لیے خالی پڑی رہتی ہیں اگر اس دوران ان جڑی بوٹیوں کی پیداوار کی جائے تو ان کی خالی زمین آمدنی کا اچھا خاصہ ذریعہ بن سکتی ہے۔ مختلف باغات میں بڑے بڑے درختوں کی درمیانی زمین بھی خالی پڑی رہتی ہے، جو کہ چھوٹی موٹی جڑی بوٹیوں کو لگا کر صحیح طور پر استعمال میں لائی جاسکتی ہے اس طرح یہ درمیانی زمین بے کار نہیں ہوگی بلکہ اس کا صحیح استعمال کیا جاسکتا ہے۔

دیسی طریقۂ علاج کی ادویات بنانے کے

(باقی صفحہ پر)

سرداری لال نشتر

بڑھتی ہوئی آبادی

ایک خوفناک طوفان

یہ ایک مسلّمہ حقیقت ہے کہ ہمارے
ملک کی آبادی بہت سُرعت سے بڑھ رہی ہے۔
۱۹۶۱ء کی مردم شماری میں ہندوستان کی آبادی
۴۴ کروڑ سے زائد افراد پر مشتمل تھی۔ ۱۹۵۱ء میں
کروڑ اور ۱۹۷۱ء میں ۵۵ کروڑ کے لگ بھگ
تھی۔ ۱۹۸۱ء میں ہماری آبادی ۶۸ کروڑ تک
پہنچ گئی۔ اور اب ۷۰ کروڑ سے بھی آگے نکل
گیا ہے۔ غور کیجیے کہ ملک کی آبادی کس تیز رفتاری
سے بڑھ رہی ہے۔ اور اگر اسی رفتار سے بڑھتی
رہی تو محض ۲۵ سال میں ایک ارب سے بھی زائد
ہو جائے گی۔ ماہرین کے اندازہ کے مطابق
ہمارے مُلک میں ہر سال ۲ کروڑ ۳۰ لاکھ بچے
پیدا ہوتے ہیں اور ۹۰ لاکھ انسان مرتے ہیں گویا
ہر سال ہماری آبادی میں ایک کروڑ ۴۰ لاکھ کا اضافہ
ہوتا ہے۔ دُوسرے لفظوں میں، جتنی آبادی آسٹریلیا
کی ہے، اتنی آبادی کا سالانہ اضافہ، ہندوستان
میں ہوتا ہے۔ ان اعداد شمار سے بخوبی اندازہ
لگایا جا سکتا ہے کہ ہمارے مُلک کی آبادی کا مسئلہ
خطرناک صُورت اختیار کر رہا ہے۔ اس لیے
ضرورت ہے کہ اس مسئلہ پر صدقِ دلی سے غور کیا
جائے اور اس کے انسداد کی طرف خاص توجہ دی
جائے۔

آج کل، ماہرین معاشیات و سیاسیات کے
اس مسئلے کی طرف متفکر اور متوجہ ہیں کہ آبادی
کی موجودہ تیز رفتاری، ہماری خوشحالی کے معیار
کو کسی طرح بھی قائم نہیں رکھ سکے گی۔ اس لیے
ہمیں آبادی کو بڑھنے سے روکنا چاہیے تاکہ
معیارِ زندگی پست نہ ہو جائے۔ تمام مفکرین
اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ اب مزید ترقی کے امکانات
نہیں رہے، اور اگر زیادہ آبادی بڑھی، تو موجودہ
معیارِ زندگی پست ہو کر، بہت جلد خوشحالی کا
دور خواب و خیال ہو جائے گا۔ اس حقیقت میں
کوئی شک نہیں کہ ہمارے مُلک کی آبادی میں اضافہ
اس کی مفلوک الحالی کا باعث ہو رہا ہے۔ اس
لیے اس اضافہ کو روکنے کے لیے اِنسدادی تدابیر
لازمی طور پر اختیار کرنی چاہئیں۔

آبادی کی روک تھام دو طریقوں سے ہوتی
ہے۔ اوّل قدرتی طور پر یعنی جنگیں و بائی بیماریاں،
سیلاب، قحط سالی، فسادات اور حادثات، آبادی
کم کرتے ہیں۔ نظامِ قدرت کے ذریعے، آبادی کو
کم کرنے کا یہ نظریہ غیر متوازن ہے۔ جس پر یقین
نہیں کیا جا سکتا۔ دوسرا اِمتناعی طریقہ ہے، جس
میں عوام خودداری کے طور پر، افزائشِ نسل کو
قابو میں رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ پائدار
اور مؤثر ذریعہ ہے جس کو "ضبطِ تولید" کہا جاتا ہے
یہاں یہ تبلا دینا بھی ضروری ہے کہ ضبطِ تولید کوئی
نئی چیز نہیں ہے۔ کثرتِ اولاد سے بچنے کے لیے
اگلے زمانے میں بعض طریقے عوام و خواص کی توجہ کا
مرکز رہے ہیں۔ کیونکہ وہ لوگ ملک کی خوشحالی شرح
اموات میں کمی اور طویل العمری وغیرہ کو ضبطِ تولید
ہی کا نتیجہ تصوّر کرتے تھے۔ اس لیے پُرانے
زمانے میں ہر طبقے کے لوگ اس سے فائدہ
اُٹھاتے تھے۔ عہدِ قدیم میں ضبطِ نفس (یعنی
"برہم چریہ") پر زور دیا جاتا تھا۔

اس طریقے میں جسمانی بقاء، رُوحانی پاکیزگی
اور اخلاق وُسعت کے نظریے مضمر ہیں۔ جن
کو مقبولِ عام بنانے کی ہر ممکن کوشش ہونی
چاہیئے، بلکہ اس پر سب سے زیادہ زور دینے
اور عمل کرنے کی ضرورت ہے۔ کیوں کہ نفس
پر قابو پا لینا اس سنگین مسئلے کا واحد علاج ہے۔
اس حقیقت سے کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا کہ
ملک کی ترقی اور خوشحالی کے لیے "کنبہ بندی"
انتہائی ضروری ہے۔ کنبہ اگر چھوٹا ہوگا، تو کنبے
کے ہر فرد کے لیے زیادہ سہولیات مہیا کی جائیں
گی۔" خاندانی منصوبہ بندی دراصل خواتین اور
بچّوں کی صحت کو بہتر بنانے کا ایک مؤثر ذریعہ ہے۔
اس طرح قوم بحیثیت مجموعی زیادہ مضبوط اور
طاقت ور بن سکے گی۔ ظاہر ہے کہ اس پروگرام
کو ہر سطح پر اہمیت دی جانی چاہیئے۔ اور اس
کو ایک ایسا معاملہ جاننا چاہیئے جو تنازعے سے
بالاتر ہو تاکہ اس پروگرام کو ملک کے تمام
لوگوں کی حمایت حاصل ہو سکے۔ اس مقصد کو حل
کرنے کے لیے یہ اشد ضروری ہے کہ خاندانی منصوبہ
بندی کا کام لوگوں کو سمجھانے بجھانے اور اُن کو
باخبر کرنے کے لیے بالکل رضاکارانہ ہونا چاہیئے
کیونکہ جب تک کہ ہر شخص اس کی حمایت نہ کرے گا
شرحِ آبادی کو معقول حدُود میں رکھنے کی کوشش
کامیاب نہ ہو سکے گی۔ اس لیے اس پروگرام کو عملی
جامہ پہنانے کے لیے ملک کی کُل آبادی کو شریک
کرنے کی بہت ضرُورت ہے۔ جن میں خاص طور پر
سماجی بھلائی کے ادارے، نوجوانوں کی تنظیمیں،
فلاح و بہبود کے کاموں میں حصّہ لینے والے
کارکنان، سیاسی و مذہبی رہنما، ڈاکٹر، حکیم، وکیل،
سبھی لوگ شامل ہوں۔ موجودہ حالات کے پیشِ نظر
اس پروگرام کی قطعی کامیابی کے لیے اس میں
عوامی شرکت بہت ہی ضروری ہے۔ اس کے بغیر
آبادی کے بے تحاشہ اضافے کو روکنا ناممکن ہے۔
چوں کہ آبادی کے فروغ کے ساتھ عوام کی غربت،
افلاس اور پسماندگی میں بھی اضافہ ہوتا ہے۔ اس
لیے یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ ہمارے ملک کی بڑھتی
ہوئی آبادی ایک خوفناک طوفان ہے جو خوشحالی
کے اسباب کو اپنے ساتھ بہالے جا سکتا ہے اور پھر
صدیوں تک ہمیں دوبارہ اُبھرنے اور ترقی کرنے کا
موقع نہیں مل سکے گا۔

شریمتی اندرا گاندھی کے ہاتھوں

پبلی کیشنز ڈویژن کی کتاب کا اجراء

وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی نے پچھلے مہینے نئی دہلی میں کلکٹیڈ ورکس آف مہاتما گاندھی' نامی کتاب کی ۸۹ ویں اور ۹۰ ویں جلدوں کا اجرا کیا۔ یہ کتابیں وزارتِ اطلاعات و نشریات کے پبلی کیشنز ڈویژن نے شائع کی ہے۔ یہ عظیم کام اس ڈویژن نے ۱۹۵۶ء میں شروع کیا تھا۔ یہ کام پنڈت جواہر لال نہرو کی ایما پر شروع کیا گیا تھا۔ یہ پراجیکٹ محض اس لیے نہیں شروع کیا گیا تھا کہ قوم پر آزادی کے اس معمار کا جو قرض ہے، قوم کو اسے چکانا ہے۔ بلکہ یہ اس یقین و اعتبار کے ساتھ شروع کیا گیا تھا کہ مہاتما گاندھی کی تحریریں، تقریریں، ملاقاتیں، انٹرویو اور خطوط کی تدوین و تالیف سے آنے والی نسل کو فائدہ پہنچے گا۔

مہارت تھی کہ وہ اس عظیم اور وسیع مواد کو جمع کر سکتا اور یہ سب کام مستند اور اعلیٰ علمی صلاحیت کے ساتھ چھاپ سکتا۔ اس سلسلے کا کام اگرچہ پایۂ تکمیل کو پہونچ گیا ہے۔ لیکن ابھی کچھ اور مواد بچ گیا ہے جسے ۴ یا ۵ ضمنی جلدوں میں ایڈٹ کرنے کے بعد چھاپا جائے گا۔ اس سلسلے کی ہندی کی جلدوں میں اس ڈویژن نے اب تک ۷۰ جلدیں شائع کی ہیں۔ ۸۰ اور ۹۰ ویں جلدیں تیاری کے مختلف مراحل سے گزر رہی ہیں۔

وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی نے ۳۰ اپریل ۱۹۸۴ کو کلکٹیڈ ورکس آف مہاتما گاندھی کی مذکورہ جلدوں کا اجرا کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ مجموعہ محنت سے عشق کا ثبوت ہے اور عشق کی محنت کا ثمرہ بھی۔ اس کتاب کے پیش لفظ میں شریمتی اندرا گاندھی نے کہا کہ یہ کتاب تاریخ کی ایک عظیم ترین ہستی کے ارتقاء کا مستند ریکارڈ ہے۔ وزیر اعظم نے اس کتاب سے وابستہ چیف ایڈیٹر و اطلاعات و نشریات شری ایچ. کے. ایل. بھگت نے کہا کہ ہندوستان کے پہلے وزیر اعظم شری جواہر لال نہرو نے اس کو بڑی اہمیت دی تھی اور اس کی پہلی جلد کا پیش لفظ لکھا تھا، جبکہ موجودہ وزیر اعظم نے اس سلسلے کی آخری کتاب کا پیش لفظ لکھا۔

پبلی کیشنز ڈویژن کے ڈائرکٹر ڈاکٹر شیام سنگھ ششی نے اس موضوع پر اپنی تقریر میں کہا کہ ادارہ ہذا نے جنوری ۱۹۵۶ء میں اس کی پہلی جلد شائع کی تھی۔ آخری جلد میں مہاتما گاندھی کی زندگی کے آخری ا۱ دنوں کے واقعات کا ذکر ہے۔ آپ نے کہا کہ ادارہ ہذا کو اتنا بڑا کام اس لیے سونپا گیا تھا کیوں کہ کوئی پرائیویٹ پبلشر اتنی بڑی ذمہ داری کو نبھانے کے لیے تیار نہیں ہو سکتا تھا۔ آپ نے کہا کہ اس ادارے نے اس وقیع کتاب کے علاوہ بھی مہاتما گاندھی پر ہندی اور انگریزی میں بہت سی دیگر کتابیں شائع کی ہیں۔ آپ نے بتایا کہ یہ ادارہ پبلک سیکٹر میں

وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی نئی دلی میں کلکٹیڈ ورکس آف مہاتما گاندھی کی ۸۹ ویں اور ۹۰ ویں جلد کا اجراء کرتے ہوئے۔ وزیر اعظم کے دائیں جانب اطلاعات و نشریات کے مرکزی وزیر ریاست شری ایچ. کے. ایل. بھگت اور بائیں طرف اس پراجیکٹ کے چیف ایڈیٹر پروفیسر کے. سوامی ناتھن اور پبلی کیشنز ڈویژن کے ڈائرکٹر ڈاکٹر ایس. ایس. ششی نظر آرہے ہیں۔ تصویر میں شری بھگت کے دائیں طرف نائب وزیر اطلاعات و نشریات شری غلام نبی آزاد تشریف فرما ہیں۔



اس عظیم کام کی ذمہ داری پبلی کیشنز ڈویژن پر ڈالی گئی تھی کیونکہ کسی بھی پرائیویٹ پبلشر کے پاس نہ تو اتنے وسائل تھے اور نہ اداراتی سطح پر اس قدر

کے کام کی سراہنا کی۔ انھوں نے کہا کہ موجودہ چیف ایڈیٹر شری کے سوامی ناتھن نے اس یادگاری کام کو ۱۹۶۰ سے تن من لگا کر انجام دیا۔ وزیر اطلاعات و

سب سے بڑا پبلشنگ ہاؤس ہے۔ اس نے انگریزی ہندی اور دیگر بھارتی زبانوں میں ۶ ہزار سے زیادہ کتابیں شائع کی ہیں۔ ●

یوجنا

۱۶ تا ۳۰ جون ۱۹۸۴ء

ایک روپیہ

اشرتی انقلاب کی جانب

مادی جمہوریت کا مقدمہ

سکونِ زندگی
(وسنت ساٹھے)

منصوبہ بندی کتنی طرح کی؟
(پی۔ آر۔ دومباشی)

آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں

روحانیت اور سائنس

عشرت علی صدیقی

قومی یکجہتی اور جذباتی ہم آہنگی نئے ہندوستان کو پرانے ہندوستانی ترکے میں ملی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس معاملے میں قدرت اس ملک کو دنیا کے لیے ایک نمونہ بنانا چاہتی تھی۔ یہاں سمندر اور خشکی کے راستے مختلف سمتوں سے مختلف قوموں کے لوگ آتے رہے۔ کچھ تجارت کے لیے آئے کچھ لوٹ مار کے لیے کچھ فتوحات کے لیے کچھ اغراض و مقاصد دنیاوی تھے اور کچھ روحانی۔ یوں لوگ ملک میں پہلے سے موجود تھے اور جو لوگ بعد میں باہر سے آئے ان کے درمیان میل اور محبت کے رشتے بھی قائم ہوئے اور جھگڑے اور ٹکراؤ کی نوبت بھی آئی۔ اس عمل اور ردِ عمل سے ایک ہندوستانی قوم اور ہندوستانی کلچر نے جنم لیا۔ اور جذباتی ہم آہنگی پیدا ہوئی۔ اس ہم آہنگی کی جھلک رہن سہن، رسم و رواج، مذہب و عقائد، زبان و ادب، فن تعمیر اور فن مصوری میں نظر آتی ہے۔ ان سب چیزوں کے اعتبار سے آج کا ہندوستان دراوڑی اور آریائی دور کے ہندوستان سے مختلف ہے۔ یہاں کے مسلمان عرب و شام کے مسلمان سے مختلف ہیں اور یہاں کے عیسائی امریکا اور روم کے عیسائیوں سے مختلف ہیں۔ مختلف مذہبوں کے ماننے والے ہندوستانی دوسرے ملکوں میں رہنے والے اپنے ہم مذہبوں کے ساتھ ایک جذباتی لگاؤ رکھتے ہیں لیکن اس لگاؤ اور اپنے ہی ملک میں دوسرے مذہبوں کے ماننے والوں کے ساتھ تعلقات میں کوئی ٹکراؤ نہیں۔ اس ملک کی قدیم تاریخ میں ایسی ان گنت مثالیں موجود ہیں کہ ہندو راجہ کی فوج مسلمان افسر کی قیادت میں مسلمان حکمران سے لڑی اس طرح مسلمان بادشاہوں کی حکومت اور فوج میں ہندو افسروں اور اہلکاروں نے اہم خدمات انجام دیں اور مذہب کا فرق ان خدمات پر تقرر اور ان کی انجام دہی میں رکاوٹ نہیں بنا۔

یوروپی قوموں کے ہندوستان آنے سے پہلے باہر کے جو لوگ ہندوستان آئے وہ یہیں کے ہو کر رہ گئے۔ ایک ہی آدھ نسل کے بعد ان کا رشتہ باہر سے ٹوٹ گیا یا بہت کمزور ہو گیا اور اس بات سے قومی، قومی یکجہتی اور جذباتی ہم آہنگی کو تقویت ملی۔ اس یکجہتی اور ہم آہنگی کا مظاہرہ برطانوی حکومت کے خلاف ۱۸۵۷ء کی بغاوت میں نمایاں طور سے ہوا۔ یہ بغاوت اگرچہ غیر منظم اور شمالی ہند تک محدود تھی پھر بھی اگر یہ کامیاب ہو جاتی تو پورے ملک کی تاریخ بدل جاتی۔ یہی سوچ کر بدیسی حکمرانوں نے چمن ہند پر اپنا قبضہ قائم رکھنے کے خیال سے پھوٹ کی کانٹے دار جھاڑیاں لگا دیں اور یہ بدقسمتی کی بات ہے کہ جو لوگ اس چمن کے پھولوں اور پھلوں سے فائدہ اٹھاتے تھے اور جنھیں ان کا بچاؤ کرنا چاہیے تھا انہی میں سے کچھ لوگ لالچ یا دھوکے میں آکر کانٹے دار جھاڑیوں کی آبپاشی میں لگ گئے ان کی اس بھول اور بدیسی حکومت کی شرارت کی وجہ سے یکجہتی کے بجائے مخاصمت اور ہم آہنگی کی جگہ باہمی بیزاری پھیلنے لگی۔ اسے پھیلانے میں سیاسی خود غرضوں، سرکار میں ریشہ دوانیوں اور تاریخ کو مسخ کرنے والی کتابوں نے اہم رول ادا کیا۔

لیکن آزادی کی تحریک نے ان رجحانات کے لیے ایک بریک کا کام کیا۔ اس تحریک کو کامیاب بنانے کے لیے اتحاد ضروری تھا اور تحریک چلانے والوں نے یکجہتی کے سلسلے میں اپنی کوششیں جاری رکھیں۔ آخر کار نیکی نے بدی پر فتح پائی ملک آزاد ہو گیا اور ایک نئے ہندوستان نے جنم لیا۔ پھول اور کانٹے کا فرق نمایاں ہو گیا۔ لگ بھگ سو برس میں جو کانٹے دار جھاڑیاں اگائی گئی تھیں وہ سب ابھی تک جڑ سے اکھاڑی نہیں جا سکی ہیں۔ پھر بھی ان کی نشاندہی آسان ہو گئی ہے اور صفائی کا عمل جاری ہے۔

قومی یکجہتی اور جذباتی ہم آہنگی کی جڑیں پھوٹ پھیلانے والے پودوں کی جڑوں سے زیادہ گہری ہیں اور ان کی مضبوطی کے مظاہرے ان موقعوں پر ہوتے رہے ہیں جب ہندوستان کو بیرونی حملوں کا سامنا کرنا پڑا۔ قومی مفادات کے تحفظ کی خاطر قومی قیادت کی آواز پر پوری قوم سینہ سپر ہو گئی۔ مذہبی، سیاسی اور علاقائی فرق، اختلاف اور تعصب دب گئے۔ اکثریت اور اقلیت کی تمیز ختم ہو گئی اور قومی سورماؤں کی فہرست میں بھی سبھی فرقوں کے لوگوں کے نام سنہرے حرفوں میں لکھے گئے۔ یہ قومی یکجہتی اور جذباتی ہم آہنگی کا ایک بہت ہی اہم پہلو ہے لیکن یکجہتی اور ہم آہنگی کے دوسرے پہلو اور تقاضے بھی قابلِ توجہ ہیں۔ ان میں سے بعض کا ذکر پچھلے دنوں قومی یکجہتی کونسل کی اسٹینڈنگ کمیٹی کے اجلاس میں آیا ہے۔

مثال کے طور پر مرکزی وزیر تعلیم شریمتی شیلا کول نے اس کام کی تفصیل بتائی جو ان کی وزارت تاریخ اور زبان کی درسی کتابوں کے نظر ثانی کے سلسلے میں کر چکی ہے نظر ثانی کی ہوئی کتابیں ۸۴-۱۹۸۳ء تک رائج ہو سکیں گی۔ یہ کام ریاستی سطح پر بھی ہوا ہے۔ اور منجملہ دوسری ریاستوں کے اتر پردیش میں بھی بعض درسی کتابیں نظر ثانی کے بعد شائع ہو چکی ہیں۔ کتابوں خاص کر ابتدائی درجوں میں پڑھائی جانے والی کتابوں کے ذریعے جو باتیں طالب علم سیکھتا ہے ان کی چھاپ اس کے کردار اور عمل پر بہت دنوں تک برقرار رہتی ہے اس لیے کتابوں کا سدھار تعلیم کے پھیلاؤ سے زیادہ ضروری ہے۔ کیونکہ ملک ابھی ناخواندگی کے مکمل خاتمے کی منزل تک نہیں پہنچا ہے اس لیے ناقص کتابوں سے پیدا ہونے والا زہر ایک محدود حلقے تک ہی پہونچ سکتا ہے۔ پھر بھی جن لوگوں کا ذہن اس زہر سے متاثر ہو جاتا ہے وہ اپنی تحریروں اور ناتوں اور طور طریقوں سے دوسرے لوگوں کی ذہنیت کو بھی متاثر کر سکتے ہیں۔ تعلیمی اور تحقیق و تربیت کی قومی کونسل این۔ سی۔ ای۔ آر۔ ٹی، ٹیچروں کے استعمال کے لیے اپنا مواد بھی تیار کر رہی ہے جس کی مدد سے بچوں میں قومی اتحاد کا جذبہ مستحکم کیا جا سکے۔ لیکن بچوں کی تربیت کے علاوہ جوانوں اور بوڑھوں کی تربیت بھی ضروری ہے اخبار، ریڈیو اور ٹیلی ویژن اس سلسلے میں مفید خدمات انجام دے سکتے ہیں۔ اختلاف، کشمکش اور ٹکراؤ پیدا کرنے والی باتیں ہر سماج کی طرح ہندوستانی سماج میں پائی جاتی ہیں اور پیدا ہوتی رہتی ہیں قومی یکجہتی کا جذبہ اتنا گہرا ہونا چاہیے کہ یہ باتیں قومی مفاد کو نقصان نہ پہنچانے پائیں۔ اخباروں نے فرقہ وارانہ واقعات اور ذاتیات پر مبنی جھگڑوں میں ایک ضابطہ اطوار بنایا ہے پریس کمیشن نے حال ہی میں ایسے ضابطے کی تائید کی ہے اور اخبار نویسوں کو اپنے طور پر اس بات کا جائزہ لیتے رہنا چاہیے

منصوبہ بندی اور ترقیاتی پروگراموں کی جھلک پیش کرنے والا

پندرہ روزہ

یوجنا

نئی دہلی

چیف ایڈیٹر	آر۔ ٹھکرال
ایڈیٹر	لکھی رام رانا
اسسٹنٹ ایڈیٹر	محمد عادل صدیقی
سب ایڈیٹر	وسیم حیدر

جلد ۴	۱۶ تا ۳۰ جون ۱۹۸۴ء	شمارہ ۶

۲۶ جیشٹھ تا ۹ اساڑھ شک سمبت ۱۹۰۶ فون : ۳۸۷۳۴۱

شرح چندہ

سالانہ ۲۰ روپے۔ دو سالہ ۳۵ روپے، سہ سالہ ۵۰ روپے

فی کاپی : ایک روپیہ

طالب علموں، اُستادوں اور لائبریریوں کے لیے ۱۰ فی صد کی رعایت

اِس شمارے میں

یوجنا منصوبہ بندی کے بارے میں عوام کو آگاہ کرتا ہے مگر اس کے مضامین صرف سرکاری نقطۂ نظر کی وضاحت تک ہی محدود نہیں ہیں

بزنس منیجر : ایل۔ آر۔ بترہ ✤ اسسٹنٹ ڈائرکٹر (پروڈکشن) کے۔ آر۔ کرشنن

مضامین سے متعلق خط و کتابت کا پتہ :-

ایڈیٹر "یوجنا" (اردو) پبلیکیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس
نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

ترسیلِ زر کا پتہ :-

بزنس منیجر، پبلیکیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس
نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

اداریہ

شیڈولڈ کاسٹ کی ترقی

انسان فطرتاً آزاد پیدا ہوا ہے۔ لیکن اس کے لیے زندگی میں قدم قدم پر رکاوٹیں ہیں۔ اقتدار زمانہ کے ساتھ نوعِ انسانی مختلف ذاتوں، فرقوں اور مذہبوں میں بٹ گئی ہے۔ اس عمل کے دوران سماج میں اچھوت طبقہ بنا جس کے لیے یہ سمجھا گیا کہ یہ دولت رکھنے والے طبقے کی خدمت کے لیے پیدا ہوا ہے۔ دولت رکھنے والا طبقہ سورن ذات سے تعبیر کیا گیا۔ سماج کے کسی بھی طبقے کے ساتھ امتیازی سلوک خواہ وہ کسی بھی بنیاد پر ہو ایک گناہ اور جرم ہے۔ راشٹر پتا مہاتما گاندھی نے اس ناانصافی کے خلاف ایک مہم شروع کی تاکہ ہم یہ محسوس کر سکیں کہ شیڈولڈ کاسٹ اور شیڈولڈ ٹرائب ہمارے ہی عزیز ہیں اور سماج کا ایک اہم حصہ ہیں۔ شیڈولڈ کاسٹ کی آبادی بھارت میں ۸ کروڑ کے لگ بھگ ہے۔ آبادی کا یہ بڑا حصہ اقتصادی استحصال اور سماجی امتیازات کا شکار رہا ہے۔ یہ زیادہ تر زرعی مزدوروں کی صورت میں زندگی بسر کرتے ہیں یا پھر دوسرے کمتر درجے کے ایسے پیشے اور کام کر کے گزارہ کرتے ہیں جو ان کے لیے مخصوص سمجھے جاتے ہیں۔ ان کی پسماندگی اور سماجی رکاوٹیں انھیں روزگار کے اُن نئے مواقع سے فائدہ نہیں اٹھانے دیتیں جو اقتصادی ترقی کے مختلف پروگراموں کے نتیجے میں سامنے آتے ہیں۔ وہ دراصل ایک ایسے بُرے چکر میں پھنسے ہیں جہاں وہ استحصال پسندوں کی گرفت سے آزاد نہیں ہو سکے ہیں۔ اور انھیں اپنی روزی روٹی کے لیے انھیں پر انحصار کرنا پڑتا ہے اور وہ آزادانہ طور پر روزی کمانے کی صلاحیت پیدا کرنے سے عاری رہتے ہیں۔

شیڈولڈ کاسٹ کا تناسب ملک کی آبادی میں ۵ فیصد ہے لیکن غریب افراد کی تعداد کے درمیان ان کا تناسب اور بھی زیادہ ہے۔ ایک اندازے کے مطابق شیڈولڈ کاسٹ کے کارکنوں کا ۲ء۵ فیصد زرعی مزدوروں پر مشتمل ہے۔ ۲۰ فیصد کاشتکار ہیں۔ مگر یہ زیادہ تر چھوٹے اور مارجنل کسان ہیں یا بٹائی پر کاشت کرتے ہیں۔ کچھ چمڑے کا کام کرنے والے قریب قریب تمام شیڈولڈ کاسٹ ہیں۔ نام نہاد گندے پیشے جن سے سماج کو صاف ستھرا رکھنے میں مدد ملتی ہے، مثلاً یہ کہ جھاڑو لگانا، چمڑے کی صفائی رنگائی وغیرہ یہ سب کام انھیں لوگوں کے لیے چھوڑ دیے گئے ہیں۔ شہری علاقوں میں رکشا چلانے والے، بیل گاڑی وغیرہ چلانے والے، غیر منظم شعبے میں کام کرنے والے اور غیر زرعی پیشوں میں مزدوری کرنے والے، میونسپلٹیوں وغیرہ میں کام کرنے والے اس طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ بندھوا مزدوروں کے دو تہائی طبقے کا تعلق شیڈولڈ کاسٹ سے ہے۔ خواندگی کی سطح پر نظر ڈالنے سے پتہ چلتا ہے کہ شیڈولڈ ذاتوں میں خواندگی کی شرح جیسا کہ ۱۹۷۱ء میں درج کی گئی۔ صرف ۱۴ء۷ فیصد ہے جبکہ کل ہند بنیادوں پر دیگر ذاتوں میں خواندگی کا اوسط ۳۳ء۸۰ فیصد ہے۔ شیڈولڈ کاسٹ عورتوں میں خواندگی کا اوسط صرف ۶ء۴۴ فیصد ہے، جبکہ دیگر ذاتوں کی عورتوں کا اوسط ۲۲ء۲۵ فیصد ہے ـــ شیڈولڈ کاسٹ ملک میں پیداواری نظاموں کی ترقی اور اسے برقرار رکھنے میں کافی اہم رول ادا کرتے ہیں۔ ہمارے ملک میں معیشت کا انحصار زراعت پر ہے۔ ملک میں زرعی مزدوروں کی بڑی تعداد انھیں لوگوں میں سے ہے لیکن بدقسمتی سے یہ بہت سے لوگ اپنی محنت کا بہت کم پھل پاتے ہیں ـــ آئینی تحفظات کے باوجود شیڈولڈ کاسٹ کے لوگوں کی ترقی کے لیے کیے گئے اقدامات ان کی اقتصادی اور سماجی حالت سدھارنے کے لیے ناکافی رہے ہیں۔ ان میں سے بہت سے لوگ غریبی کی سطح سے نیچے زندگی گذار رہے ہیں۔ انھیں چھوت چھات کی بدعتوں اور لعنتوں کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ملک کی پارلیمنٹ کو ۳۰ سال کے بعد بھی ان کو ایسی بہت سی مراعات دینے کا فیصلہ کرنا پڑا جو بھارتی آئین کی تشکیل کے وقت انھیں دی گئی تھیں۔

پچھلے تیس برسوں میں مختلف پروگرام شروع کیے گئے تاکہ شیڈولڈ ذاتوں کی تعلیمی ترقی کے لیے عملی اقدامات کو بروئے کار لایا جا سکے۔ یکے بعد دیگرے مختلف منصوبوں میں ۱۴۳ کروڑ روپے شیڈولڈ ذاتوں کی بہبود پر خرچ کیا جا چکا ہے۔ ان اقدامات سے اگرچہ تعلیم یافتہ افراد کی تعداد بہت زیادہ نہیں بڑھ سکی ہے، تاہم انھوں نے نشستوں پر تقرری حاصل کی ہے اور ان کو تعلیمی اور اقتصادی شعبوں میں بہت سے مواقع ملے ہیں۔

معاون منصوبہ: ۔ شیڈولڈ کاسٹ کی ہمہ جہت ترقی کے لیے بیس نکاتی پروگرام میں بہبود کی بہت سی نئی اسکیموں کو شروع کیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں شیڈولڈ کاسٹ کی ترقی کی ریاستی کارپوریشنوں کے لیے مرکزی امداد اور شیڈولڈ کاسٹ کی ترقی سے متعلق دیگر پروگراموں اور معاون منصوبوں کے لیے خصوصی مرکزی امداد دینے کی پالیسی اپنائی گئی ہے۔ ان کے علاوہ دیہات میں روزگار کے قومی پروگرام اور دیہات کی مربوط ترقی کے توسیع شدہ پروگراموں کو بھی اس مقصد کے تحت مؤثر بنایا گیا ہے، لیکن پھر بھی اسے کام کی ابتدا ہی کہا جا سکتا ہے۔ ان کے دائرہ کار کو وسعت دینی ہوگی اور ان کو مؤثر انداز سے نئی سمتیں دینی ہوں گی۔ توقع ہے کہ شیڈولڈ کاسٹ کی ترقی سے متعلق معاون منصوبہ اس صورتِ حال کو بہتر بنا سکے گا۔ عام منصوبے سے سالانہ منصوبے میں رقومات کی منتقلی بھی عمل میں آ سکے گی اور شیڈولڈ کاسٹ کی ترقی کے لیے مرکز اور ریاستی منصوبوں میں رقومات کی فراہمی کا عمل بھی مؤثر بن سکے گا۔

(ایڈیٹر)

وسنت ساٹھے

معاشرتی انقلاب کی جانب

اقتصادی جمہوریت کا مقدمہ

فلسفۂ زندگی

پہلا باب — قسط ۲

سکونِ زندگی

اکثر دماغی سرگرمیوں کو دو حصوں میں بانٹنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ ایک کا تعلق دماغی قوتوں سے ہے اور دوسری کا تعلق وجدانی دنیا سے ہے۔ جسے ہم ضمیر بھی کہہ کر پکار لیتے ہیں۔ لیکن وجدان کا مسکن بھی اگر طبعی اعتبار سے تجزیہ کرکے دیکھا جائے تو دماغ ہی ہے۔ یہ بات قرینِ قیاس ہے کہ انسانی دماغ کی صلاحیتیں ان سے کہیں زیادہ ہیں۔ جو اب تک ہمارے سامنے آچکی ہیں۔ بڑی حد تک دماغ کا ارتقاء ہو چکا ہے تاہم اس میں ابھی مزید امکانات کی بڑی گنجائش ہے۔ سائنسی اعتبار سے انسان کی قوتِ مستخرجہ اور قوتِ اخذ اگر دونوں کا استعمال کرکے دیکھا جائے تو بجا طور پر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ قوتِ فکر اور خیال دونوں ہی انرجی کی ایک شکل ہے اور ان کی مثال بالکل اسی طرح ہے جیسا کہ آواز، روشنی، خلاء یا وقت۔ لہٰذا ان میں قوتِ عمل کی کہیں زیادہ صلاحیتیں موجود ہیں لیکن دماغ کی توجہ مرکوز کرنے کی مشق یا یوگا کی تربیت کے ذریعے ہی ان سے کام لیا جا سکتا ہے۔ اس بات پر سبھی متفق ہیں کہ حتمی تجزیے کے طور پر دماغی نظم و ضبط اور غور و فکر کے ذریعے انجانی اشیاء کے بارے میں حاصل کردہ علم جسے روحانیت کا نام دیا جاتا ہے اور سائنس کے ذریعے جانی پہچانی یا جاننے کے لائق اشیاء کا علم دونوں کا مقصد ایک ہے اور وہ ہے علم کی پیاس بجھانا اور علم کے حصول کی تکمیل۔ انتہائی سرگرمیوں کے پیچھے یہ محرکات کارفرما نظر آتے ہیں۔ خواہ ان کا تعلق بظاہر انتہائی معمولی اور مادی ضرورتوں کا پورا کرنا ہو چاہے ذہنی اور وجدانی نوعیت کی اعلیٰ ترین صفات کا۔

نامعلوم عالمِ حقیقی کے متلاشی بھی اس ظاہری دنیا سے اس لیے مطابقت رکھتے ہیں کیوں کہ وہ انسانوں کی طرح رہتے ہیں اور انسانی شکل میں رہ کر اپنے تجربے اور علم کو پوری نوعِ انسانی کے ساتھ وابستہ کرتے ہیں بھلے ہی وہ اپنے تجربات کو لفظوں میں نہ بیان کر سکیں۔ ان کی نصیحت اور دانشمندی کے ان الفاظ نے جس کے تحت انھوں نے روزمرہ کی زندگی گزارنے کا سبق سکھایا اور انسانی برادری کے ساتھ معاملات کرنے کا وہ طریقہ بتایا جس پر چل کر انسان خوشی سے ہمکنار ہو سکتا ہے، انھیں گیان دھیان کے مالک ہونے کے باوجود سماج سے جوڑے رکھا۔ یہ صورتِ حال آج بھی ہے۔ چنانچہ جو لوگ دنیا میں ہر طرح کی دولت سے مالا مال ہیں اور جنھیں انسانی اور مادی وسائل پر اقتدار حاصل ہے مگر وہ ذہنی سکون سے محروم ہیں اور اسی لیے اسے پانے کے لیے وہ ہر اس چیز کے آگے جھک جاتے ہیں جو انھیں دماغی سکون دلانے کا وعدہ کرے۔ چنانچہ اہم بات یہ نہیں کہ اس خدا رسیدہ بندے نے اپنی ذہنی سطح کتنی اونچی کر لی ہے یا وہ کتنی صفات کا مالک بن گیا ہے۔ یہ صفات بھلے ہی اس میں ہوں تاہم اس سے محبت اور جذبۂ ترحم کا جو پیغام ملتا ہے وہی ذہنی سکون کا سبب بنتا ہے۔ اکثر سادہ لوح انسانوں کے ذریعے یہ صفات بے شمار انسانی مکر کو جنم دیتی ہے کیونکہ اس شعبے میں اصل معاملات کا محور ایک ایسی ہستی ہوتا ہے جو خیال اور فکر سے ماورا ہے اور جس کی ذات کو بحث میں نہیں لایا جا سکتا اور کچھ لوگوں کا تو کہنا یہاں تک ہے کہ اسے آزمائش کی کسوٹی پر نہیں پرکھنا چاہیے۔ ایسا کرنا یا سوچنا بے ادبی کے مترادف سمجھا جاتا ہے اور اس بارے میں جو کچھ کہا جاتا ہے اسے بے چوں و چرا تسلیم کرنا پڑتا ہے کیوں کہ اس کا ماخذ ایک ایسا تجربہ ہوتا ہے جس کو نہ جان سکتے ہیں اور نہ بیان کر سکتے ہیں۔ اس طرح ہم ایک بڑے چکر میں پڑ جاتے ہیں۔ ہماری کوشش یہ نہیں ہوتی کہ ہم پُر اعتماد تفتیش کو لائحہ عمل بنائیں۔ جو کہ ہمیں اپنی ذات کے پہچاننے کے لیے بھی ضروری ہے جس کو ہم نہیں جانتے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ توہمات اور اندھ وشواس کی ہمت افزائی ہوتی ہے۔ ذہنی سکون کی تلاش میں انسان ادھر اُدھر مارا مارا پھرتا ہے۔ وہ ذہنی سکون کو زعفرانی لباس میں ملبوس سوامی، سادھو اور فقیروں سے لینا چاہتا ہے۔ یا پھر وہ اُسے تزکیہ نفس کے ماہرین اور دماغی معالجین سے حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

اس موضوع پر تفصیل سے اس لیے بحث کی گئی ہے کیوں کہ یہ تمام انسانی سرگرمیوں کا محور ہے۔ سچائی کی تلاش ایک عمل مسلسل ہے جس کا کوئی کنارا نہیں۔ جس قدر علم حاصل ہوتا ہے اس سے ایک ہی بات سامنے آتی ہے کہ ابھی جاننے کے لیے بہت کچھ ہے

چنانچہ وہ لوگ بھی جو کہ گیان دھیان پا چکے ہیں، وہ انجانی یا ناقابل فہم ہستی کے ساتھ صرف یکتائی کا تجربہ رکھتے ہیں۔ انھوں نے انسانی شکل میں ایک ایسا منظر نامہ حاصل کیا ہے جس کے ذریعے وہ تمام کائنات اور تمام مخلوق پر اس طرح نظر دوڑا سکیں کہ گویا وہ اس میں شامل تو ضرور ہیں مگر اس کے ہر طرح کے تاثر سے بری ہیں۔ اور یہی تاثر انھوں نے دوسروں کو دیا ہے لیکن انھوں نے کبھی بھی انسان کی ان کوششوں کی مذمت نہیں کی ہے جو نظم و ضبط اور تعلیم و تربیت کے راستے اسے زیادہ سے زیادہ جاننے کے لیے کی گئی ہیں۔ مثال کے طور پر سائنس اور ریاضی اور اسی طرح کے دیگر علوم کے ذریعے اس لامتناہی دنیا کو جاننے کے لیے کی گئی کوششیں کبھی بھی مذموم قرار نہیں دی گئیں۔ البتہ ایک بات پر ضرور دھیان دیا گیا کہ ایسا کرتے ہوئے بنیادی نظریہ کبھی بھی آنکھوں سے اوجھل نہیں ہونا چاہیے۔ چنانچہ اگر ایک شخص مسلسل کائنات کی وحدت کا بنیادی نظریہ پیش نظر رکھتا ہے تو وہ بہت سی انسانی برائیوں سے دور رہ سکتا ہے۔ نیز حسد، بغض، نفرت، تشدد، دوسروں کے لیے دل میں برائی اور لالچ وغیرہ سے وہ خود کو دور رکھ سکتا ہے کیوں کہ یہ وہ برائیاں ہیں جو انسان کی پریشانیوں کا سبب بنتی ہیں اور پورے نوع انسانی کو ان سے مسرت کی بجائے پریشانیاں لاحق ہوتی ہیں اور دنیا تباہی کی طرف بڑھتی ہے۔ چنانچہ جن لوگوں کو روشنی ملی ہے اور جنھوں نے معرفت حاصل کی ہے ان سب نے سب سے اہم خدمت یہی انجام دی ہے کہ مذکورہ بالا عالمگیر منظر نامے کو عام کیا جائے۔ یہ ایک ایسا منظر نامہ ہے جو تمام نوع انسانی کے لیے ضروری ہے۔ چنانچہ انھوں نے اس عمل کو بغیر کسی تردد کے آگے بڑھایا اور نوع انسانی کو ان کی تعلیمات سے خواہ وہ اوتار ہوں، پیغمبر ہوں یا دانشور، فائدہ پہنچا۔

اگر یہ ایک بنیادی حقیقت تسلیم کر لی جائے تو ایک عام ذہین انسان کے لیے دونوں سطحوں پر کام کرنا دشوار نہ ہوگا یعنی سائنسی سطح پر اور روحانی یا وجدانی سطح پر۔ ان دونوں کا تعلق دماغ سے ہے یا روح سے یا شعور کی اعلیٰ ترین کیفیت سے یا درونِ باطن سے یا پھر آپ اسے کچھ بھی نام کیوں نہ دیں۔ سائنسی سطح پر باہری دنیا کے بارے میں ایسا علم حاصل ہوتا ہے جو واضح بھی کیا جا سکتا ہے اور جسے دہرایا بھی جا سکتا ہے مگر روحانی سطح خود زندگی کے تئیں صحیح نظریہ قائم کرنے میں مدد دیتی ہے۔ یہ کہنا غلط ہے کہ چوں کہ ذاتِ بالا کا علم اور اس کا حصول صرف تجربے سے ہو سکتا ہے لہٰذا یہ نعمت چند خوش نصیبوں کے حصے میں ہی آتی ہے۔ اور چونکہ اسے دوسرے نہ تو سکھا سکتے ہیں، نہ دے سکتے ہیں، اس لیے یہ محض چند گیان پائے ہوئے افراد کا خصوصی حصہ ہے۔ ذہن کی تربیت سے اس علم کو پا لینا ممکن ہے اس کے نتائج اور اس کی جانچ متعلقہ شخص کے بس میں ہے اور وہ اسے دوسروں کو پیش کر سکتا ہے۔ یہ متعلقہ شخص کے روبرو اس حد تک سامنے آتا ہے جس حد تک کہ وہ اس حقیقی عالمگیر ظاہری تناسب اور توازن کو پا لیتا ہے۔

اُپنشدوں کے منتروں میں اس کو خوبصورت انداز سے مختصر کرکے بیان کیا گیا ہے جو کہ سائنس اور روحانیت دونوں کے لیے صحیح ہے۔ ایک رشی نے کہا ہے:

عالمگیر اجتماعیت بڑی سے بڑی سطح پر مکمل ہے۔
یہ وہ حقیقت ہے جو ممکنہ حد تک چھوٹی سے چھوٹی سطح پر بھی مکمل ہے اگر مکمل میں سے مکمل نکال لیا جائے تو جو باقی بچتا ہے، وہ بھی مکمل ہے۔

اگلا سوال جو سامنے آتا ہے وہ یہ ہے کہ یہ صحیح پیش منظر ہے کیا؟ یہاں پھر وہی بات ہے یعنی اگر اوپر پیش کیا گیا مفروضہ تسلیم کر لیا جائے یعنی کہ یہ بات تسلیم کر لی جائے کہ انسان یا انسانیت کو بحیثیت مجموعی اپنی ان صلاحیتوں پر بھروسہ کرنا چاہیے، جو کہ انسانی جسم میں ودیعت کردہ ذہنی صلاحیتوں سے تعلق رکھتی ہے اور جسے ہم دماغ کہہ کر پکارتے ہیں تو کیا یہ انجانے کا تصور، کائناتی روح کا تصور، وجدانی ذہن کا تصور، ذہن سے پرے ذہنی صلاحیتوں کا تصور، نیم نفسیاتی تصور یا الہامی تصور یا کوئی اور تصور جسے کہ کل ایجاد کیا جا سکتا ہو، ہوگا جسے انسانی دماغ کے ذریعے جوڑا جائے گا اور انسانی دماغی صلاحیتوں کے ذریعے اسے حاصل کیا جائے گا۔ اگر انسانی دماغ سے ماورا بھی کچھ ہے تو اسے بھی دماغ کے ذریعے ہی سمجھنا ہوگا اور سمجھ میں آنے کے بعد اسے انسانی دماغ کے توسط سے ہی جوڑا جائے گا۔ سائنسدانوں کا اس بات پر اتفاق ہے کہ انسانی دماغ کی صلاحیتوں کا مشکل سے دس فی صد ابھی تک استعمال کیا جا سکا ہے یا اس کا ارتقا عمل میں آسکا ہے۔ اس لیے مزید ارتقا کی زبردست گنجائش ہے

لہٰذا جب کچھ لوگ مراقبہ یا دھیان کی بات کرتے ہیں اور وہ اسے ذہن کی صفائی کا ذریعہ سمجھتے ہیں، تو ان کی یہ بات سائنسی معیار پر پوری اترتی ہے۔ اس کی مثال یوں ہے کہ اگر کوئی کسی تجربے کی خاطر کسی ٹیسٹ ٹیوب کو بھرنا چاہے تو اسے پہلے خالی کرکے، اس کی سمیّت دور کرنے کے لیے اسے صاف کرنا ہوگا۔ اور اس کے بعد ہی کوئی نئی چیز اس میں بھرے گا۔ دماغ پہلے ہی کچھ تصورات اور ذہنی خیالات سے پُر ہے، لہٰذا اس میں کسی نئی اور کسی ایسی بات کو لانے کے لیے جس کو پہلے کبھی نہ سوچا گیا ہو، اس کا خالی ہونا ضروری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر وہ لوگ جنھوں نے انجانے کے سلسلے کے اپنے تجربات بیان کرنے کی کوشش کی ہے انھوں نے اس کام کو ایسے انداز میں انجام دیا ہے جس سے شعوری یا تحت الشعوری طور پر وہ واقف ہیں۔ خواہ ان کے تصور میں ایک بڑی، انجانی، اَن سُنی آواز آ جائے جیسا کہ اونکار یا آمین یا وہ بہت چمکدار روشنی دیکھیں، جو کہ کافی طاقتور اور تہ در تہ نظر آتی ہو، کچھ نے کائناتی رقص دیکھا ہوگا یا کسی اور انداز سے

رقص دیکھا ہو یا کوئی بھی شکل دیکھی ہو، اس کا منبع ذہن پر ملتا ہے کہ اس انداز یا طریق کار کو پہلے اس نے کبھی بھی سنا ہے یا پڑھا ہے اور وہ اس کے کسی نہ کسی طور پر تحت الشعور میں ہے۔ انسانی دماغ کے لیے یہ بالکل ممکن ہے کہ وہ اس طرح ارتقا پائے جس سے خلاء میں مستقبل میں اس کے وجود کی ضرورتیں پوری ہو سکیں یا کسی بھی کرہ میں رہتے ہوئے جہاں کہ زندگی کے امکانات ہوں، اس کے تقاضے پورے ہو سکیں۔

لہٰذا دماغ کی تیسری اور چوتھی پرت کے ساتھ تطبیق کے امکانات پر غور کیا جا سکتا ہے۔ جو چیز کسی زمانے میں محض افسانہ تھی، وہ آج سائنسی حقیقت بن چکی ہے۔ یہ ذہن کی تربیت اور اس کے نظم و نسق کا نتیجہ ہے۔ خیال سب سے زیادہ تیز رفتار برقی رو ہے اور ٹیلی پیتھی، پارا سائیکلوجی اور دیگر سائنسی طریقوں سے تجربے کیے جا رہے ہیں تاکہ یہ پتہ لگ سکے کہ کیا ایک انسان میلوں دور ہونے کے باوجود ایک دوسرے سے رابطہ قائم کر سکتا ہے اور کیا وہ رابطہ ریڈیو لہر کے طریقے پر ہی صحیح صحیح قائم ہو سکتا ہے۔ خیال کی قوت ارتکاز کے ذریعے اس عمل کو جانچا جا رہا ہے۔ اگر یہ طریقہ سامنے آ سکا تو یہ ابھی تک کے جانے پہچانے انرجی کے مختلف وسیلوں میں سب سے زیادہ طاقتور ہوگا۔ اس لیے یوگ، آسن وغیرہ کے ذریعے سے ذہنی اور دھیانی سطح کے لیے کام کرنا سائنسی انداز کی کھوج کی رُت کو واضح کرتا ہے۔ اس کام میں ایسی کوئی بات نہیں چھوڑ دینی جس کا تعلق محض فرد کی صلاحیت سے ہو یا جس کا انحصار محض اتفاق پر ہو اور جس کے ڈانڈے کسی انداز فکر سے نہیں ملائے جا سکتے یا جسے کسی طور ثابت نہیں کیا جا سکتا یا جس کا مظاہرہ نہیں کیا جا سکتا۔ گو یا عقلی سطح پر سوچے سمجھے بغیر ایسے کسی فکر کو قبول نہیں کیا جا سکتا۔

اگر ایسا نہ ہوا تو انسانی سماج کے ساتھ دھوکے کا حقیقی خطرہ موجود رہے گا۔ اس سے ترقی رکے گی اور انسانی استحکام کو خطرہ لاحق ہوگا۔ لہٰذا اس بحث کا مرکزی خیال یہ ہے کہ ہر مفروضے کو عقل کے سطح پر پرکھنے اور جانچنے کی ضرورت ہے۔

چونکہ ہم کچھ خصوصی طاقت کچھ افراد کے ہاتھوں میں دے دیتے ہیں اور پھر ان کا بے سوچے سمجھے اتباع کرتے ہیں اور ان کے پیچھے چلا کرتے ہیں، چنانچہ یہی آج ہماری زندگی کا سب سے بڑا انتشار ہے اور اس سے گڑبڑ آئی ہے۔ شخصی تعلقات ہوں چاہے وہ چھوٹے درجے میں ہوں یا بڑے درجے میں، ان کے پیچھے یہی عنصر کارفرما نظر آتا ہے۔ کسی معمار کی تعریف یہ سمجھ کر کرنا اور بات ہے کہ اس نے ایک بڑی عمارت کا خاکہ تیار کیا ہے اور اگر کسی کو اس کے مکمل ڈیزائن کے بارے میں واقفیت بھی نہ ہو، تو بھی اس کے بارے میں یہ ضرور معلوم ہے کہ وہ اس عمارت کی تعمیر کے لیے خواہ مختصر پیمانے پر ہی سہی، کام کر رہا ہے مگر کسی پر اندھا دھند یقین کر کے، اس کے ساتھ کام کرنا اور یہ سمجھنا کہ اس سے معجزے صادر ہوں گے، اور بات ہے۔ اور یہی صورتِ حال آج ہر شعبے میں دیکھنے کو ملتی ہے۔

لیکن اگر ہم اپنی تمام ذہنی سرگرمیوں کو اپنی ذات کے ایک حصہ بنانے کا فیصلہ کرتے ہیں، بھلے ہی یہ ذات نظم و نسق کے مختلف خانوں میں بٹی ہو۔ جیسا کہ مختلف آلاتِ موسیقی الگ الگ آوازیں رکھتے ہوئے بھی ایک ایسی آواز اور راگ نکالتے ہیں جو کانوں کو بھلا معلوم ہوتا ہے، تو ہمیں زندگی کا پیش منظر صحیح صحیح اپنانے میں دشواری محسوس نہ ہوگی۔ صحیح تناظر یہ نہیں ہے کہ ہم جیومیٹری کے ایک مسئلے کی طرح زندگی کو سمجھیں اور پھر اس کی تفاصیل بیان کر کے کہیں کہ بس ہمیں یہی ثابت کرنا تھا بلکہ وہ یہ ہے کہ زندگی کو بحیثیت مجموعی سامنے رکھیں اور پھر اس میں ہم آہنگی لانے کی کوشش کریں۔ یہ کام ہر انسانی ذہن کر سکتا ہے اور یہ طریقہ ہر انسانی ذہن میں پرورش پا سکتا ہے۔

یہ سچ ہے کہ ہر شخص معمار نہیں ہو سکتا اور ہر شخص زندگی کا راگ نہیں بنا سکتا۔ البتہ معمولی سی تربیت اور علم کی مدد سے تاج محل کی فنکارانہ خوبیوں، یا روی شنکر کے راگ کی خصوصیتوں یا کسی بھی فنکار کے فن سے لطف اندوز ہو سکتا ہے۔ اسے پہاڑ کی برف پوش چوٹیاں لطف دے سکتی ہیں، بہتے ہوئے چشمے اس کی آنکھیں کھول سکتے ہیں، درختوں، پھولوں اور قدرت کے تمام تر حسین مناظر سے وہ لطف اٹھا سکتا ہے

اس کے لیے ایک آسان طریقہ اپنانا ہوگا اور وہ یہ کہ اسے یہ سوال پوچھنا ہوگا کہ ارتقائی عمل میں تاریخی تجربے کی روشنی میں اس مہم کو انسان کی زندگی پر کیسے منطبق کیا گیا ہے۔ اور اس علم کو خواہ یہ کسی بھی سطح پر حاصل کیا گیا ہو، خواہ یہ الہامی ہو یا سائنسی (اگرچہ یہ مصنوعی حدود ہیں) مختلف زمانوں میں انسانی سماج میں کس طرح اعتماد حاصل ہو سکا ہے۔ کبھی کبھی یہ علم یا یہ اطلاع اس وقت قابل عمل بن سکی ہے جبکہ وہ فرد جس نے اسے اپنے بھائیوں اور برادری تک پہنچایا، اس دنیا میں نہیں رہا۔ بہرصورت یہ ایک حقیقت ہے علم سماج سے مطابقت رکھنے کی صلاحیت کے ساتھ ہی کارآمد ہے اور جب کوئی شخص نوعِ انسانی کی بات کرتا ہے تو اس سے مراد یہی ہوتی ہے کہ پورے ماحول سے انسانی سرگرمی کس طرح جڑی ہے۔ غرضیکہ ایسا کوئی شعبہ نہیں جو انسانی ذہن کی تصوراتی دسترس سے باہر ہو۔ ایک بار یہ حقیقت سامنے آجانے کے بعد انتشار اور ذہنی پراگندگی دور ہو سکتی ہے۔ ہم یہ بات جان سکتے ہیں کہ کیا کوئی مخصوص طرزِ عمل یا اندازِ نظر انسان کی سرگرمیوں میں اضافہ کر سکتا ہے یا نہیں۔ اس کے تحت جاننے کی خواہش کا بیدار ہونا ضروری ہے اور پھر اس کے ارتقا اور حصول کے لیے کوشش ضروری ہے۔ اس عمل کے ذریعے سے ہی ہم آہنگی آ سکتی ہے۔

انسانی تاریخ مظہر ہے کہ کچھ افراد کا انداز فکر وسیع تر بنیادوں پر تھا اور وہ وسیع تر پس منظر میں سوچتے تھے مگر ان کے ساتھیوں نے اسے سمجھنے کی کوشش نہ کی کیوں کہ ان کا علم محدود تھا۔ لیکن انسانی ارتقا کے عمل میں ترقی اگر آئی ہے تو وہ انھیں لوگوں کے انداز فکر کا ثمرہ ہے۔ ان لوگوں نے مادی سائنس کے شعبے میں اپنا علم واضح کیا ہے اور انسانی تعلقات کے باب میں اپنی دانشوری کا ثبوت دیا۔ اور جذبۂ محبت، جذبۂ ترحم، جذبۂ رواداری اور ایثار و قربانی کی واضح مثالیں عملی صورت میں پیش کیں۔ ان کے باعث امن، خوشی اور اطمینان حاصل ہوا اور جن لوگوں نے ان کا بتایا ہوا راستہ اپنایا، انھیں یہ سب خوشیاں میسر آئیں۔ تجربے نے یہ بھی بتایا کہ ایسا نہ کرنے سے نقصان دہ اور تکلیف دہ حالات بھی سامنے آئے۔

میڈیسن، سائنس یا مذہب کے ضمن میں یہ صورت حال قطعی صادق آتی ہے۔ ان میں سے کسی بھی شعبے میں کسی بات کو اندھا دھند ماننے کی ضرورت نہیں اور اس کا استعمال ہمیشہ ہمیشہ کے لیے سچا بھی نہیں ہو سکتا کسی خاص ماحول میں ایک خاص طریق کار یا برتاؤ کا ایک خاص ڈھنگ وہاں کے ماحول سے مطابقت رکھتا ہے۔ مگر دوسرے ماحول میں، اس طریق کار کی روح تو باقی رہ سکتی ہے لیکن اس کی شکل اور ہیئت میں تبدیلی ضروری ہو سکتی ہے۔ کٹر پنتھی اس روح کو ہیئت کے ساتھ خلط ملط کر دیتے ہیں اور پھر ان کا سارا زور ہیئت پر ہوتا ہے۔ اس سے انتشار پیدا ہوتا ہے اور تحقیق و تفحص کا جذبہ جاتا رہتا ہے۔

درحقیقت ذہن کے حقیقی سکون کی خاطر مذکورہ بالا طریق کار ضروری ہے۔ یہ سکون ان سب کو مل سکتا ہے جو انسانی سماج کہیں نہ کسی طرح اثر انداز ہوا کرتے ہیں کیوں کہ یہی وہ لوگ ہوتے ہیں جن کے ہاتھوں اور جن کے فیصلوں سے اور جن کے عمل سے عوام کے کثیر طبقوں کو نقصان یا فائدہ پہونچتا ہے۔ زندگی میں صاحب منصب اور صاحب اقتدار لوگوں کے لیے یہ انداز نظر بہت ضروری ہے۔ زندگی، موت، اقتصادی خوشحالی اور تعلیمی ترقی کا معاملہ ہو یا چھوٹی موٹی جنگ میں دنیا کے پھنس جانے کا خطرہ ہو یا کسی بھی آفت کا اندیشہ ہو یا نیوکلیائی جنگ کا خطرہ ہو، ہر جگہ اسی صحیح انداز نظر کو اپنانے کی ضرورت ہے۔ یہ ایک عالمگیر ماحول ہے۔ اسے روحانی اعتبار سے بھی مستقبل کا لائحۂ عمل کہا جا سکتا ہے۔ یہ روزمرہ کی زندگی کا انداز نظر ہے جسے ہم اپنے فکر و عمل میں نظر انداز کر دیتے ہیں۔ یہ بات خاص طور پر ان میں دیکھنے کو ملتی ہے جو سرکاری صنعتی اداروں یا کاروباری اداروں یا تجارت میں اہم عہدوں اور ذمہ داریوں کو سنبھالے ہوئے ہیں۔ ذرا ان لوگوں کے طرز عمل پر اس وقت غور کیجئے جبکہ یہ کابینہ کی میٹنگ میں بیٹھتے ہیں۔ یا کسی بورڈ کی میٹنگ میں شرکت کرتے ہیں یا پارٹی کی میٹنگوں میں شرکت کرتے ہیں۔ اور یہ دیکھیں کہ وہ کس حد تک عملی انداز نظر یا حقیقت پسندانہ طریق کار پیش کرتے ہیں۔ ایک اہم تجربہ کار صاحب اقتدار اور باخبر فرد کی حیثیت سے، ان کے غور و فکر کا دائرہ محض فوری فائدوں تک محدود رہتا ہے جس سے ان کا اقتدار باقی رہے یا جس سے ان کے پاس طاقت آسکے۔ یا جس سے دنیاوی فائدے ان کے لیے میسر آسکیں اور ان کی برادری یا ان کے ملک کو مل سکیں اور یہ سب حقیقت پسندی اور عملی طریق کار کے پردے میں ہوتا ہے۔ ان کا مقصد دوسروں پر فوقیت حاصل کرنا ہوتا ہے۔ اور وہ اس طرح کے عملی تنائج اس کے لیے مرتب کرتے ہیں تاکہ دیگر افراد کے مقابلے میں مادی اقتدار حاصل کرکے ان کی فائدہ حاصل کرنے کی صلاحیت بڑھ سکے۔

اس طرح عملی انداز نظر کی ایک معمولی سی جنبش سے روحانی نسبت اور تعلق کٹ کے رہ جاتا ہے۔ اور زندگی محض مادی طریق کار اختیار کرلیتی ہے اور تنازع للبقا کا نظریہ پوری طرح کارفرما نظر آتا ہے گویا کہ بڑی مچھلی چھوٹی مچھلی کو نگلتی ہوئی نظر آتی ہے۔ یہ سب نام نہاد صاحب اقتدار لوگ مادی دولت کے حصول کے سبب اپنی نیند کھو بیٹھتے ہیں۔ گویا کہ انھوں نے خود کو انسانی تاریخ میں اہم بنانے کے لیے مادی وسیلوں کا سہارا لیا اور اس عمل میں روحانیت ان سے دور ہو گئی لیکن اس کوشش کو اگر صحیح پس منظر میں دیکھا جائے تو وقت کے دھارے میں اس کی بھی اپنی کوئی اہمیت نہیں اور وہ انتہائی غیر معمولی کہا جا سکتا ہے۔ دوسرے انسان جنھیں زندگی میں اس قدر اقتدار نہیں مل پاتا۔ وہ ان لوگوں کی اقتدا کرتے ہیں اور وہ اس امید میں ان کے پیچھے چلتے ہیں کہ ایسا کرنے سے انھیں مادی اور ذہنی فائدہ پہنچ سکے گا۔ لیکن ایک اندھا آدمی دوسرے اندھے آدمی کی قیادت کیسے کر سکتا ہے۔ جب یہ صاحب اقتدار لوگ، خواہ وہ زندگی کے کسی بھی شعبے میں ہوں، بذات خود زندگی کے بارے میں کوئی صحیح نظریہ نہیں رکھتے اور اس نظریے کو روزمرہ کے انداز فکر میں کام میں نہیں لا سکتے۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ حقیقت پسندی اور عملی انداز نظر کے پردے میں اس نظریۂ حیات کے منکر ہوتے ہیں، تو ایسی حالت میں کیسی ایسے انداز فکر کی توقع کیسے کی جا سکتی ہے جس سے زندگی میں ہم آہنگی آسکے اور جو خوشی لا سکے۔ لہٰذا تمام ذہین افراد کے لیے ضروری ہے کہ وہ سنجیدگی سے اس سوال پر غور کریں۔

اب وہ وقت آگیا ہے جبکہ انسانی سماج کے تمام ارکان ایک دوسرے کے قریب آچکے ہیں اور دنیا کے فاصلے سمٹ چکے ہیں جو کہ سائنس کی ترقیوں کا ثمرہ ہے۔ لیکن اس کے باوجود مساوات کے مناسب خطوط مرتب کئے جانے کے سبب ان انسانوں میں ہم آہنگی اور مطابقت کے عنصر کو فروغ نہیں دیا جا سکا۔ تمام دانشوروں، گروؤں اور پیغمبروں کے دانشورانہ الفاظ نے اس ہم آہنگی کے لیے بنیادی طور پر ایک واحد اصول کی ہدایت کی ہے یعنی نوع انسانی سے محبت اور جذبۂ ترحم۔ تجربہ یہ بتاتا ہے کہ ان عناصر سے ہی ہم آہنگی اور

خوشی میسر آتی ہے لیکن تنازعہ وہاں پیدا ہوتا ہے جبکہ ایک خاص شکل میں اصولوں کو ماننے کے دعویدار اس بات پر اصرار کرتے ہیں کہ صرف وہی راستہ اس مقصد کے حصول کے لیے سب سے زیادہ موثر ہے۔ اگر کوئی شخص ہر دعویدار کے دعویٰ کو مان بھی لے تو بھی ایک دوسری کمی یہ رہتی ہے کہ دوسروں کے لیے رواداری اور ان کے لیے گنجائش پیدا نہیں ہوتی۔ اور اس طرح کے تجربات سے گزر نے والے دوسرے افراد کے لیے کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔ ایک دوسرے کے تجربات کے تبادلے کے سلسلے میں انکار کر دیا جاتا ہے۔ ایک دوسرے کے تئیں جاننے اور آپسی مفاہمت کی کوئی کوشش نہیں ہوتی۔ ان عقائد کے ذریعے انسانی بہبود اور آرام کے راستے تلاش کرنے کی بظاہر کوشش کے درپردہ دوسروں پر زبردستی اپنے عقائد اور خیالات تھوپنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ یہیں سے تنازعہ شروع ہو جاتا ہے۔ سیاسی سماجی، اقتصادی، صنعتی اور حتیٰ کہ ثقافتی میدانوں نیز تعلیم اور فنونِ لطیفہ غرضیکہ تمام شعبوں میں اس صورتِ حال کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ لہٰذا انسانی عقائد سے وہ عناصر بہت زیادہ مطابقت رکھتے ہیں۔ یعنی بغیر عقلی دلائل کے کوئی بات تسلیم نہ کی جائے۔ کوئی مسئلہ خواہ کسی بھی دور سے تعلق رکھتا ہو اور خواہ اس کا تعلق تاریخِ انسانی کے کسی بھی زمانے سے ہو اسے کیوں اور کیسے ایسے سوالوں کی روشنی میں ہی تسلیم کیا جانا چاہیئے۔ اس عمل سے علم اور دانش کے جواز کو مستحکم بنانے میں مدد ملے گی۔ اور وہ کبھی سرد نہیں پڑ سکے گا۔ درحقیقت بنیادی دانش کا تقاضہ ہے کہ دیگر دانشورانہ خیالات کے ساتھ عالمگیر سطح پر ہم آہنگی لائی جائے۔ اگر کوئی شخص متعصب نہ ہوگا یا وہ تنگ نظر نہ ہوگا اور دانشورانہ افکار و خیالات کے تئیں اس کا اندازِ نظر محدود نہ ہوگا، خواہ یہ اندازِ نظر ان مذہبی تصورات کے متعلق ہو جو کہ ہم تک عظیم دانشوروں اور پیغمبروں کے ذریعے سے پہونچتے ہیں یا یہ کسی دوسری طرح حاصل کیے گئے علوم کے متعلق ہو، تو اس اندازِ نظر اور وسیع المشربی کی اہمیت کا فوراً احساس ہو سکے گا۔ اور آج کے دور میں جو انتشار پھیلا ہوا ہے، وہ دور ہو سکے گا۔ انسانی خوشی کے لیے معاون دوسرا تجربہ یہ ہے کہ انسان دوسرے انسانوں سے محبت کرے اور اس کا دائرہ محبت محض انسانوں تک ہی نہیں بلکہ روئے زمین کی پوری مخلوق تک پھیلا ہو اور وہ سب سے ہم آہنگی پیدا کرنے کے لیے مطابقت پیدا کرے۔ انسان کی باطنی مسرت حاصل کرنے کی اس طرح کی کوشش جس سے کہ دوسروں کے باطن یا دوسروں کی ذات سے ٹکراؤ نہ ہو، مسرت کے خزانے میں اضافے کا سبب بنتی ہے۔ ہاں اگر کوئی صرف اپنی ذات کو فائدہ پہنچانا چاہے اور دوسروں کو محروم کر کے فائدہ حاصل کرنا چاہے خواہ یہ عمل بذریعہ طاقت ہو یا کسی دھوکہ یا چال کے ذریعے ہو یا دوسروں کو مساوی مواقع سے محروم کر کے ہو، تو تنازعہ شروع ہو جاتا ہے۔

تجربہ بتاتا ہے کہ تمام عظیم دانشوروں اور پیغمبروں میں مثلاً مہاتما بدھ، حضرت عیسیٰ، پیغمبرِ اسلام محمد صلعم یا پھر دورِ حاضر میں مہاتما گاندھی۔ غرضیکہ ہر جگہ یہی تناظر کارفرما نظر آتا ہے۔ ان کے اپنے دور میں جبکہ عوام ان کی بات ماننے کو تیار نہ تھے، تو ان دانشوروں اور پیغمبروں نے اسی تناظر کی اشاعت و تبلیغ کی اور اسی پر عمل کیا۔ اور انسانی سرگرمیوں پر اس کے اطلاق کے لیے کوششیں کیں۔ اس تناظر نے انسانی تاریخ کا دھارا موڑ دیا۔ اور اسی سے زبردست مسرت اور خوشی اور ہم آہنگی حاصل کی جا سکی۔

لہٰذا ہمیں یہ سوچنا ہے کہ کیا وہ صاحبِ اقتدار لوگ جو زندگی میں خوش قسمتی سے اہم منصب پر فائز ہیں اور جو انسانی زندگی پر اثر انداز ہونے کی صلاحیت رکھتے ہیں، مذکورہ بالا نوعیت کا تناسب باطنی، یا تناسب قلبی یا تناسب نظری رکھتے ہیں۔ اور کیا وہ اسے روزمرہ کی زندگی اور اپنے فیصلوں میں پیشِ نظر رکھتے ہیں۔ وہ جس حد تک اس سے دور ہوتے ہیں اور فوری فائدوں کے تابع نظر آتے ہیں اسی حد تک وہ ہم آہنگی سے دور ہو جاتے ہیں۔ بالکل اسی طرح جیسا کہ ایک ستار نواز اپنے آرکسٹرا پر اپنا ہی راگ الاپے مگر وہ راگ مجموعی ترتیب کے تعلق سے ہم آہنگ نہ ہو۔ یہ لوگ جو فوری فائدوں کو سامنے رکھتے ہیں، ان کا تعلق ذاتی مفاد سے بھی ہوتا ہے، مختصر سے طبقے کے مفادات سے بھی ہوتا ہے اور ملک کے کثیر طبقے یعنی قوم سے بھی ہو سکتا ہے۔ آج یہی معاملہ ہر جگہ پیش آ رہا ہے لیکن خاص کر سیاسی حلقے میں اس کا اثر زیادہ ہی پایا جاتا ہے اور آج انسانی زندگی پر سب سے زیادہ اثر اس سیاست کا ہے۔

ایک سادہ سا ابتدائی مفروضہ اس بحث کو سلجھانے میں معاون ہو سکتا ہے۔ یعنی ہر اس فرد کے لیے خواہ وہ زندگی میں کسی بھی درجے پر ہو، جو انسانی خوشی کے حصول کے لیے مشترکہ خیال سے ہم آہنگی قائم کرنے کا خواہشمند ہو، یہ یقین کرنا کہ دوسرا فرد بھی اتنا ہی ایماندار ہے اور اسی خیال کے تحت مفاہمت قائم کرنے کی غرض سے بات چیت یا بحث و مباحثے سے کبھی بھی انکار نہ کرنا اور پھر اس بات چیت کے ماحصل میں بڑے پیمانے پر انسانی برادری کو شریک کرنا اور پھر صحیح راستے کا انتخاب ان کی اپنی صوابدید پر چھوڑ دینا، بحیثیت مجموعی انسانی برادری کے فائدے میں ہے۔

ماضی میں عظیم روشن خیال انسان مہاتما بدھ نے عوام سے کہا کہ وہ اندھی تقلید اور توہمات کو ترک کر دیں اور ایک ایسی ذہانت کو کام میں لائیں اور اس پر بھروسہ کریں جس کی بنیاد محبت، جذبۂ ترحم اور عدم تشدد پر ہو۔ لیکن ان کے پیروکاروں نے جلد ہی اس ذہانت اور روشنی کے آگے ہتھیار ڈال دئے۔ اور اس کے آگے سر جھکانا شروع کر دیا۔ اس کے لیے یہ منتر پڑھا جانے لگا کہ "بدھم شرنم گچھامی" یعنی میں روشن دماغ اور وقوف والے

ہوئے بدھ کے آگے سر جھکاتا ہوں۔ انھوں نے مہاتما بدھ کو دیوتا کا رُوپ دیا جبکہ خود مہاتما بدھ نے دیوتاؤں کی مذمت کی۔

عیسائیت میں بھی یہی کچھ ہوا۔ حضرت عیسیٰؑ نے کہا تھا کہ اپنے پڑوسی سے پیار کرو اور اگر تمہارے ایک گال پر کوئی چپت مارے تو اس کے آگے دوسرا گال پیش کر دو لیکن حضرت عیسیٰؑ کے پیرو کاروں کے دعویداروں نے زیادہ سے زیادہ جنگیں لڑی ہیں اور انھوں نے بہت سا خون بہایا ہے۔

پیغمبر اسلام محمد صلعم نے فرمایا کہ اسلام امن و آشتی کا مذہب ہے اور عقیدے اور مذہب کے معاملے میں کوئی زبردستی نہیں (لا اکراہ فی الدین) لیکن اسلام کے دعویداروں نے اسلام کی تعلیمات کی تعمیل سے زیادہ ان کی خلاف ورزی کی۔ وہ لوگ جو ویدوں کی نصیحتوں اور احکامات پر عمل کرنے کے دعویدار ہیں اور جنھوں نے ویدوں کے زمانے کا طرز زندگی اپنانے کا دعویٰ کیا ہے، ان کی زندگی میں عقل و دانش کی تمام بڑی بڑی نصیحتوں کی تقریباً نفی نظر آتی ہے۔ ہمیں بتایا گیا تھا کہ کسی چیز کے بارے میں یہ سوچنا کہ یہ میری ہے، اور دوسری شے کسی دوسرے کی ہے تنگ نظری کے خیالات کا مظہر ہے۔ وسیع المشرب کے لیے پوری دنیا ایک کنبہ ہے۔

اگر ہم اپنی ذات کا گہرائی سے مطالعہ کریں تو ہمیں اس بات پر یقین آجائے گا کہ ہمارے قول و فعل میں تضاد ہے۔ لہٰذا سب سے زیادہ منطقی راستہ جس پر ہمیں چلنا ہے، یہ ہے کہ ہم اپنی ذات پر بھروسہ کریں کیوں کہ یہی وہ واحد راستہ ہے جس پر چل کر ہم اپنے مسئلوں کو حل کر سکتے ہیں یا سمجھ سکتے ہیں۔

یہ کہا گیا ہے اور بجا طور پر کہا گیا ہے کہ جو خود فکر کا راستہ اپنانے کے منکر ہوتے ہیں، وہ متعصب ہوتے ہیں جو غور نہیں کر سکتے، وہ بے وقوف ہیں اور جو سوچنے سمجھنے کی جرأت نہیں کر سکتے وہ بزدل ہوتے

ذہن کی قوت

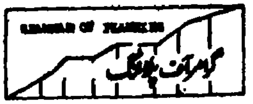
ایک بار یہ مفروضہ کہ تمام علم، حتیٰ کہ انجانی یا ناقابلِ فہم اشیاء کا علم ذہنی قوت کی مدد سے حاصل کیا جا سکتا ہے اور یہ قوت ہر شخص کے ذہن میں ودیعت کر دی گئی ہے، تسلیم کر لیا جائے تو اس سے یہ نتیجہ سامنے آتا ہے کہ اس سائنسی اور منطقی اندازِ نظر کی بنیاد پر حاصل کردہ علم وہ ہونا چاہیے جو دوسروں تک پہنچایا جا سکے اور جس پر کچھ تربیت اور مشق کے بعد عمل درآمد ہو سکے اور اس کے سلسلے میں یہ خیال ترک کر دینا ہوگا کہ یہ صفت صرف کسی ایک آدمی میں ہے جس کے بارے میں یہ فرض کر لیا گیا ہے کہ اسے یہ صفت کسی الہامی ذریعے سے ملی ہے۔ یہ سائنسی اور معقول پسندانہ اندازِ نظر انجانی شئے سے متعلق تحقیق کے لیے راستہ ہموار کرتا ہے اور اس راستہ میں رکاوٹ نہیں بنتا۔ درحقیقت سوچنے سمجھنے کی یہ صلاحیت انسانی ذہنی قوتوں کے ارتقاء سے میل کھاتی ہے۔ یہ صلاحیت نسلاً بعد نسلٍ گھٹتی بڑھتی رہتی ہے اور ہر نسل کے اپنے دور میں مختلف انسانوں میں بھی گھٹتی بڑھتی رہتی ہے۔ لیکن انجانے کو جاننے کا شوق برقرار رہتا ہے۔ اسی طرح اسے سائنس کی دنیا میں لانے کی خواہش بنی رہتی ہے۔ انجانے کو واضح کرنے اور پھر اسے دُہرانے کی خواہش قائم رہتی ہے۔ اس طرح جب انجان شے سے سب لوگ واقف ہو جاتے ہیں۔ اور وہ کوئی بھید نہیں رہتی۔ تو یہ خواہش آگے بڑھتی ہے اور اب اس چیز کے بارے میں جاننے کی خواہش تیز ہوتی ہے جو ابھی تک سامنے نہیں آسکی ہے۔

مثال کے طور پر سائنسی اندازِ نظر کے تحت اب یہ سمجھا جاتا ہے چند مخلوقات بشمول انسان یکساں یا مشترک ذہن رکھتی ہیں لیکن کچھ تجربوں نے یہ ثابت کیا ہے کہ کسی ایک جگہ بسی ہوئی چوہیوں کے اجتماعی تجربے ہزاروں میل دور پر بسی ہوئی دیگر چوہیوں کو منتقل ہو جاتے ہیں۔ اور اس کی بنیاد پر ایکساں صورت حال میں ہر جگہوں پر چوہیوں کا ردِ عمل یکساں صورت میں واضح ہوتا ہے۔ اس طرح معقول پسندانہ اور سائنسی منطق کی بنیاد پر یہ بات قابلِ فہم ہے کہ خیالات کی لہریں ہر جگہ ذہنوں پر اثر انداز ہوا ہیں اور دوسروں تک پہونچتی ہیں۔ ریڈیو یا ٹیلیویژن کی لہروں کی طرح ان کے لیے یہ ممکن ہوتا کہ ان کا پیغام کسی خاص انداز پر ہو اور کسی خاص فریکوینسی پر دوسرے تک پہونچ سکے اور پیغام پانے والا اسے وصول کر سکے تو یہ لہریں پیغام ترسیل میں اس طرح معاون ہوتیں جس طرح کہ ریڈیو وغیرہ پر ہوتی ہیں۔ سائنسی دنیا میں یہ تصور نامعلوم میں سے نہیں ہے۔ پارا سائیکولوجی کے مختلف پہلوؤں کے بارے میں بھی یہی بات صادق آتی ہے۔ یہ یاد رکھنا اہم ہے کہ ارتقائی عمل میں جو خیالات انسان کے ذہن میں محض سوچنے کی حد تک تھے، انھیں سائنس کی حقیقی دنیا میں لے آیا گیا۔ انسان نے تصور باندھا کہ وہ چڑیوں کی طرح آسمان میں اُڑے، چنانچہ وہ اپنی اس کوشش میں کامیاب ہوا۔ انسان نے سوچا کہ وہ مستقبل میں وہ دیکھے اور سُنے جو کچھ کہ ماضی میں واقع ہوا ہے اس لیے اس نے فلم بنائی۔ اور ٹیپ کیا۔

اب یہ کمپیوٹر کا دَور ہے۔ انسان کا ذہن اور اس کی دانشمندی انجانی باتوں کے سمجھنے اور جاننے کے بارے میں زیادہ بے چین ہے اور وہ بہت سے رازہائے سربستہ کا انکشاف کر رہا ہے لیکن جتنا زیادہ ہم جانتے ہیں اس سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ ابھی جاننے کے لیے پہلے سے کہیں زیادہ انجانی حقیقتیں سامنے ہیں۔ لیکن پھر بھی انسان کے ذہن کو مزید جاننے کی خواہش بنی رہتی ہے۔ اور اس عمل میں کوئی رکاوٹ نہیں پڑتی۔ حتیٰ کہ خیال بھی کہ ذہن کے بارے میں خود کچھ معلوم نہیں انسان کے ذوقِ تفتیش و تجسس کو نہیں روکتا بلکہ اس میں ہم آہنگی لانے کے لیے عزم و ارادے کو اور زیادہ

(باقی صفحہ پر)

پی۔آر۔ دوبھاشی



منصوبہ بندی کتنی طرح کی؟

منصوبہ بندی کی منطق بیان کر دینے کے بعد جو کہ یوجنا کے (یکم تا ۱۵، جون) کے شمارے میں شائع ہو چکی ہے، مصنف نے منصوبہ بندی کی اقسام پر بحث کی ہے یعنی مختلف طرح کی منصوبہ بندی میں ہر صنف کی کیا کیا نمایاں خصوصیات ہیں اور اس مطالعے میں جامع انداز کی منصوبہ بندی یا جزوی منصوبہ بندی، اشاراتی منصوبہ بندی یا لازمی منصوبہ بندی، ایک ہی مرکزی نظام کے تحت کی جانے والی منصوبہ بندی یا جمہوری انداز پر کی جانے والی منصوبہ بندی، شعبہ وار منصوبہ بندی یا مکانی منصوبہ بندی۔ عملی یا مالی منصوبہ بندی، تناظری یا طویل المدتی منصوبہ بندی، مختصر المدتی یا سالانہ منصوبہ بندی یا مزدوروں اور تقاضوں کے تحت کی جانے والی منصوبہ بندی کو شامل کیا ہے۔

منصوبہ بندی کے نظریے کا تجزیہ کرتے وقت تین طرح کی منصوبہ بندی کی نشاندہی پہلے ہی کی جا چکی ہے۔ یعنی منڈی کی معیشت میں منصوبہ بندی جیسا کہ مغربی ممالک میں پائی جاتی ہے، سماج وادی یا اشتراکی منصوبہ بندی جیسا کہ روس میں اور دیگر مشرقی یورپ کے ملکوں میں پائی جاتی ہے اور ملی جلی معیشت جیسا کہ بہت سے ترقی پذیر ملکوں مثلاً ہندوستان وغیرہ میں رائج ہے۔

لیکن منصوبہ بندی کے اور بھی بہت سے نظام ہیں۔ مثلاً جامع انداز کی منصوبہ بندی یا جزوی منصوبہ بندی، اشاراتی منصوبہ بندی یا لازمی منصوبہ بندی، ایک ہی مرکزی نظام کے تحت کی جانے والی منصوبہ بندی یا جمہوری انداز پر کی جانے والی منصوبہ بندی، شعبہ وار منصوبہ بندی یا مکانی منصوبہ بندی، عملی یا مالی منصوبہ بندی، تناظری یا طویل المدتی منصوبہ بندی، مختصر المدتی یا سالانہ منصوبہ بندی یا مزدوروں اور تقاضوں کے تحت کی جانے والی منصوبہ بندی۔

جامع انداز کی منصوبہ بندی

جامع انداز کی منصوبہ بندی پوری معیشت کی منصوبہ بندی کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ اس نظام میں معیشت کے تحت دستیاب تمام وسائل کو سامنے رکھا جاتا ہے اور بحیثیت مجموعی معیشت کے لیے مجموعی نشانے متعین کیے جاتے ہیں۔ سماج وادی ملکوں کی معیشتوں میں جہاں پیداوار کے بہت معمولی ذرائع کے سوا باقی سبھی ذرائع سماج کی ملکیت ہوتے ہیں۔ ضروری اشیاء کی منصوبہ بندی کو جامع بنانا پڑتا ہے۔ اس کے برعکس مغربی ملکوں میں جہاں منصوبہ بندی معاشی نظام کے نقائص کی اصلاح کے لیے کام میں لائی جاتی ہے۔ وہاں یہ عمل سرکاری سرمایہ کاری کی منصوبہ بندی تک محدود رہتا ہے یعنی وہاں بجٹ کے وسیلوں سے پروگراموں کے لیے رقوم فراہم کی جاتی ہیں اور سرکاری ادارے بھی یہ رقوم فراہم کرتے ہیں۔ یہ تسلیم شدہ امر ہے کہ سرکاری سرمایہ کاری کا مقصد براہ راست یا بالواسطہ طور پر پوری معیشت پر اثر انداز ہونا ہوتا ہے لیکن اس حالت میں منصوبہ بندی صرف سرکاری سرمایہ کاری تک محدود ہوتی ہے مگر معیشت پر بحیثیت مجموعی اس کے اثرات قومی آمدنی کا حساب لگاتے وقت یا اعداد و شمار کا تجزیہ کرتے وقت سامنے ضرور رکھے جاتے ہیں۔ بہر صورت زیادہ تر ترقی یافتہ ممالک اقتصادی اعداد و شمار، آمدنی، پیداوار اور روزگار کو مجموعی شکل میں پیش کرتے ہیں۔

بہت سے کم ترقی یافتہ ملکوں میں نظریاتی اعتبار سے معیشت کو پبلک اور پرائیویٹ سیکٹر میں تقسیم کیا گیا ہے۔ اس امتیاز کی موجودگی میں جزوی منصوبہ بندی کو پبلک سیکٹر کی منصوبہ بندی سے واضح کیا جاتا ہے۔ پبلک سیکٹر کا انحصار متعلقہ ملک کی اقتصادی پالیسی پر ہوتا ہے اور اس امر پر ہوتا ہے کہ وہ ملک اقتصادی سرگرمیوں میں شرکت کے لیے کیا لائحہ عمل اپناتا ہے۔ بہت سے ملکوں میں اس میں ٹرانسپورٹ، مواصلات، بجلی پہنچانا، آبرسانی، تعلیم، صحت اور سماجی بہبود کی سرگرمیاں وغیرہ شامل ہیں۔ قومی ملکیت کے ضمن میں اختیار کی گئی پالیسی کے پیش نظر اس میں تکنیک، انشورنس، عوامی خدمات، ریشم، کوئلہ اور دیگر بنیادی صنعتوں کو بھی شامل کیا جا سکتا ہے۔

جزوی منصوبہ بندی

منصوبہ بندی کے دائرہ کار اور اس کے اصل

مقصد کے پیشِ نظر جامع انداز کی منصوبہ بندی اور جزوی منصوبہ بندی میں حدِ فاصل قائم کی جاتی ہے۔ مگر لازمی منصوبہ بندی اور اشاراتی منصوبہ بندی اور اسی طرح ضرورتوں اور تقاضوں کے تحت منصوبہ بندی یا بذریعہ ترغیب منصوبہ بندی کا تعلق منصوبہ بندی کے طریقِ کار سے ہے۔ اشاراتی منصوبہ بندی ایک ایسا نظام ہے جس میں منصوبہ میں مقاصد کا عام ڈھانچہ واضح کیا جاتا ہے اور اس طرح نشانوں کے ضمن میں بھی ایک عام ڈھانچہ پیشِ نظر ہوتا ہے۔ اور ان کی تکمیل کا کام معیشت میں شرکت کرنے والے مختلف اقتصادی اداروں پر چھوڑ دیا جاتا ہے۔ اس کے برعکس لازمی منصوبہ بندی ایک ایسا نظام ہے جس میں منصوبوں کی تکمیل، شرکت کرنے والے مختلف اقتصادی اور مالیاتی اداروں کی بلاتحریک غیر خود بخود رونما ہونے والی کوششوں پر نہیں چھوڑی جاتی ہے بلکہ تنظیم و ضبط کے مختلف طریقوں سے بروئے کار لائی جاتی ہے۔ یہ فرق ڈبلیو آرتھر لیوس نے اس طرح واضح کیا ہے :۔

اشاراتی اور نظم و ضبط والی منصوبہ بندی کے درمیان فرق سمجھ لینا ضروری ہے۔ کمیونسٹ ملکوں کی لازمی طرز کی منصوبہ بندی کے تحت حکم ناموں کی صورت میں دستاویز مرتب کرلی جاتی ہے یعنی ان میں بتایا جاتا ہے کہ ہر صنعت کو کیا مال تیار کرنا ہے اور اس پر کس قدر سرمایہ کاری کرنی ہے۔ ترقیاتی منصوبہ جو کہ اشاراتی نوعیت کا ہوتا ہے، کسی طرح کا حکم نامہ مرتب نہیں کرتا۔ سرکاری اخراجات کی تخصیص بھی منصوبے میں واضح نہیں ہوتی۔ بلکہ صرف پارلیمنٹ سالانہ بجٹ پاس کرتی ہے۔

لازمی منصوبہ بندی

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ لیوس نے لازمی منصوبہ بندی کو جامع منصوبہ بندی کے ساتھ ملا دیا ہے۔ لازمی منصوبہ بندی معیشت کی جملہ سرگرمیوں پر حاوی ہوتی ہے اور معاشی سرگرمیوں کے بہت سے گوشوں کا احاطہ کرتی ہے جس میں پیداوار کا حجم، قیمتیں، صنعتوں کے قیام کے لیے جگہ کا تعین اور روزگار وغیرہ کے سبھی پہلو شامل ہوتے ہیں۔ انتہائی صورت یہ ہے کہ ملک کی حیثیت ایک واحد فرم کی سی ہوتی ہے جیسے بہت سی فیکٹریوں کا نظم و نسق چلانا ہوتا ہے۔ یہ حتمی مانگوں کا فیصلہ کرتا ہے، کھپت، سرمایہ کاری، پیداوار وغیرہ کو ترجیحی بنیادوں پر متعین کرتا ہے۔ معاشی عوامل کے بلا تحریک غیر ردِ عمل کو سامنے نہ رکھ کر محض ترجیحات کو سامنے رکھتا ہے۔ عمل درآمد کے لیے اسے احکامات پر انحصار کرنا پڑتا ہے۔ مرکزی منصوبہ بندی بیورو، مالی تنظیمیں اور سب سے بڑی بات یہ کہ سیاسی اقتدارِ اعلیٰ اس کی نگرانی کرتا ہے۔

اشاراتی منصوبہ بندی

اشاراتی منصوبہ بندی کے ضمن میں اکثر فرانس کا نام لیا جاتا ہے۔ یہ سچ ہے کہ فرانسیسی نظام منصوبے کی تشکیل کے عمل میں مختلف اقتصادی اداروں کو شریک کرکے منصوبہ بندی کے تحت مقررہ نشانوں کی تکمیل سے مطابقت پیدا کرتا ہے۔ لیکن یہ خیال کرنا غلط ہوگا کہ فرانس تنظیمی طریقِ کار کو یکسر ترک کر بیٹھا ہے اور اس کے لیے وہ کسی طرح کے ضابطے کی پابندی کو ضروری نہیں سمجھتا۔ مالی ضوابط فرانس میں بھی بے حد ضروری سمجھے جاتے ہیں۔ اشاراتی انداز میں مکمل طور پر کوئی بھی منصوبہ بندی نہیں ہوسکتی۔ یعنی محض مقاصد، پروگرام اور نشانے واضح کر دیے جائیں۔ اور ان کو پورا کرنے کے لیے تدابیر، حکمتِ عملی وغیرہ کے ضمن میں کوئی حصہ نہ لیا جائے۔ سرکار کا بھی اعمال خصوصاً تجارت وغیرہ میں دخل نہ دینے سے بھی یہی مفہوم نکلتا ہے۔ اشاراتی منصوبہ بندی عمل کی آزادی میں کافی معاون ہے۔ اور لازمی منصوبہ بندی کے مقابلے اشاراتی منصوبہ بندی میں عمل کی آزادی کا کہیں زیادہ موقع۔ یہ لازمی منصوبہ بندی بالعموم سوشلسٹ اشتراکی ملکوں میں دیکھنے کو ملتی ہے۔ مثلاً کہا تھا: "ہمارے منصوبے ہدایات کا مجموعہ" دوسرے الفاظ میں منصوبہ بندی کے نشانے مقاصد حکم ناموں کی صورت میں ہیں۔ چینی نظام میں مختلف اداروں کے ذمہ داریاں بجا لانا ہے۔ منصوبہ بندی کے تحت مقررہ نشانوں کی تکمیل کو یقینی بنانے کے لیے ترغیبات جاتی ہیں۔ لیکن اب روس تک میں مالی ترغیب اور منڈی کے معاشی نظام کی طرف بڑھنے کا رجحان ہو رہا ہے۔ مقابلے کی صورتِ حال پیدا ہو رہی ہے اور نفع کمانے کی صلاحیت بڑھ رہی ہے۔ جامع اور لازمی منصوبہ بندی کے مقابلے میں جزوی اور اشاراتی منصوبہ بندی کا ایک فائدہ یہ ہے کہ وہ زندگی کی ضرورتوں پر توجہ مرکوز کرتی ہے۔

تقاضوں اور ضرورتوں کے تحت منصوبہ بندی یا منصوبہ بندی بذریعہ ترغیب

منصوبہ بندی بذریعہ ترغیب اور تقاضوں اور ضرورتوں کے تحت کی جانے والی منصوبہ بندی کے درمیان فرق کو سمجھنے کے لیے منصوبے کے نشانوں کی تکمیل کو یقینی بنانے کے واسطے استعمال کی جانے والی مختلف تکنیکوں کا مطالعہ کرنا ہوگا۔ تقاضوں اور ضرورتوں کے تحت کی جانے والی منصوبہ بندی میں خام مال کی تخصیص اور نیم مصنوعہ مال کو پیداواری یونٹوں تک پہنچانے کے لیے کنٹرول کی ضرورت ہوتی ہے۔ چنانچہ صنعت، زراعت، اشیائے صارفین، غیر ملکی مبادلہ کا کوٹہ، صنعتوں کے قیام کے لیے پرمٹ اجرا وغیرہ میں مذکورہ نوعیت کے کنٹرول کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کے برعکس ترغیبات کے ذریعے منصوبہ بندی کا نظام مختلف مالی اور اقتصادی طریقوں کا مطالبہ کرتا ہے۔ یہ طریقے مرکزی ...

یا منصوبہ بندی کی ذمہ دار ایجنسی کی طرف سے بروئے کار لائے جاتے ہیں۔ ان طریقوں میں ٹیکس کاری، امدادی نظام کی فراہمی، قیمتوں اور ٹیرف کی ترتیب و تنظیم، سود کی شرحیں، بینکوں میں محدود کی شرحیں کھلے بازار کی سرگرمیاں، قرضوں کا اجراء اور تمسکات کا اجراء وغیرہ شامل ہیں۔ ایک ماہر اقتصادیات نے تقاضوں اور ضرورتوں کی منصوبہ بندی کو کلٹنے والی منصوبہ بندی اور ترغیبات کی منصوبہ بندی کو بھونکنے والی منصوبہ بندی کہہ کر پکارا ہے۔

ایک نظام کلی کے تحت کی جانے والی منصوبہ بندی یا جمہوری نظام کے طریقے پر کی جانے والی منصوبہ بندی

مذکورہ ہر دو نظاموں میں بھی کبھی کبھی فرق کیا جاتا ہے۔ نظامِ کلی کے تحت کی جانے والی منصوبہ بندی ریاستی اقتدار اعلیٰ اور نظام یا منصوبہ بندی کے ذمہ دار اقتدار اعلیٰ کے تحت کام کرتی ہے۔ اس میں منصوبہ بندی کا نظام تھوپا جاتا ہے۔ اس میں کارکنوں، منیجروں، صارفین، کسانوں، اور مجموعی حیثیت سے عوام کو پسند یا ناپسند کا اختیار نہیں ملتا اور انھیں کوئی آزادی نہیں ملتی۔ اس حالت میں مجوزہ منصوبے سے سرمو انحراف نہیں کیا جاتا ہے۔ اس کے برعکس جمہوری منصوبہ بندی میں ایسا عمل بروئے کار لایا جاتا ہے جس میں منصوبوں کی تشکیل اور عمل درآمد میں عوام کو شریک کیا جاتا ہے۔ کبھی کبھی یہ کہا جاتا ہے کہ منصوبہ بندی کی تعریف اس بات کی متقاضی ہے کہ عوام کی پسند کی جگہ منصوبہ سازوں کی پسند کو رکھا جائے۔ دوسرے لفظوں میں منصوبہ بندی اور جمہوریت بنیادی طور پر ایک دوسرے سے لگا نہیں کھاتیں۔ درحقیقت پروفیسر ہیک (Hayek) نے منصوبہ بندی کو غلامی کی سڑک کہا ہے۔ پروفیسر شم پیٹر (Sohumpter) نے اسے سماجوادی کے لیے ایک بڑا خطرہ بتایا ہے۔ اقتصادی فیصلوں سے متعلق جملہ اختیارات منصوبہ سازوں کے پاس ہوتے ہیں۔ اس طرح آہستہ آہستہ نہ صرف اقتصادی شعبوں میں بلکہ دیگر شعبوں میں بھی فیصلوں کا اختیار حکمرانوں کے پاس ہی منتقل ہو جاتے ہیں۔ منصوبہ بندی اس طرح دفتر شاہی نظام کو نہ صرف آگے بڑھاتی ہے بلکہ اسے پست بھی بنا دیتی ہے ۔

درحقیقت جمہوریت ایسے سیاسی نظام کے رُوپ میں بہت زیادہ نہیں چل سکتی جہاں منصوبہ بندی کو ایک اختیار کلّی کے تحت دے دیا جائے۔ اس کے برعکس یہ بھی کہا جاتا ہے کہ منصوبہ بندی اور جمہوریت میں نہ صرف آپس میں مطابقت ہے بلکہ درحقیقت وہ لازم و ملزوم ہیں۔ منصوبوں کی کامیابی کا انحصار اس بات پر ہے کہ عوام اس میں زیادہ سے زیادہ حصہ لیں کیونکہ عوامی شعور بیدار کرنے میں جمہوری نظام ہی معاون ہے۔ باربرا ووٹن Barbara Wootten نے کہا ہے کہ منصوبہ جس قدر تفصیلی ہوگا اور اس پر عمل درآمد کا دائرہ جس قدر لوگوں میں پھیلا ہوا ہوگا، اسی قدر عام شہری اس کے لیے حقیقی طور پر معاونت دے سکے گا۔ اقتصادیات کی ماہر اس خاتون نے کہا ہے کہ منصوبہ بندی کی ناہمواری اس وقت دور ہو سکتی ہے جبکہ اقتصادی منصوبہ بندی میں سرکار کی مداخلت کے ساتھ ساتھ مقامی طور پر عوام کا طبقہ بھی مرکزی سطح پر تیار کیے گئے منصوبوں پر عمل درآمد میں شریک ہو۔

مرکزی اور لامرکزی منصوبہ بندی:

ایک طرف جامع انداز کی منصوبہ بندی، لازمی منصوبہ بندی، ایک نظام کلی کے تحت کی جانے والی منصوبہ بندی جو چند مادی مجبوریوں پر مبنی ہو اور دوسری طرف جزوی اشاراتی یا جمہوری منصوبہ بندی جو کہ منڈی کی معیشت کے نظام کار پر مبنی ہو، ان دونوں کے درمیان فرق کو واضح کر کے ہی مرکزی منصوبہ بندی اور لامرکزی منصوبہ بندی کے درمیان فرق کو مختصر طور پر بیان کیا جا سکتا ہے۔ منصوبہ بندی کی یہ جز بندی ہمیشہ ہی قابلِ قبول نہیں ہو سکتی۔ یہ پہلے بھی بتایا جا چکا ہے کہ چند ماہرین اقتصادیات نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ منصوبہ بندی اور حتیٰ کہ سماج وادی معیشت منڈی کی معیشت کے طور پر قیمت، لاگت تحریک عمل کے استعمال پر مبنی ہو سکتی ہے۔ اس کے برعکس مغربی ملکوں کی معاشیات اس مفروضے پر مبنی ہیں کہ منصوبہ بندی کے تحت ضروری نہیں کہ پیداواری ذرائع کی ملکیت مرکزی سرکار کے ہاتھوں میں ہو۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ منصوبہ بندی کے ساتھ ساتھ بڑھنے والی اقتصادی سرگرمی کی ملکیت سرکار کے ہاتھوں منتقل ہونے کا رُجحان پایا جاتا ہے۔

موثر منصوبہ بندی کے لیے اقتدار کا دائرۂ کار وسیع سے وسیع تر ہوتا جاتا ہے۔ ہر سطح پر صلاحیت کی قیمت مرکزی نظام کی توسیع اور مرکزی حکومت کے دائرۂ کار نیز دائرۂ کار کے کنارے پر آنے والے طبقے کے درمیان بڑھتے ہوئے فرق کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے۔

سیکٹروار یا مکانی منصوبہ بندی

سیکٹروار منصوبہ بندی اور مکانی منصوبہ بندی میں ایک فرق ہے۔ منصوبہ بندی آمدنی یا روزگار یا پیداوار کی میزان اور اس طرح کی دیگر میزانوں کی سطح پر نہیں رُک سکتی۔ روایت یہ ہے کہ منصوبے سیکٹروں میں بانٹ دیے جاتے ہیں۔ اور اس کے لیے تین سیکٹر ہوتے ہیں یعنی ابتدائی، ثانوی، اور تیسرے درجے کے منصوبے۔

ابتدائی سیکٹر کے منصوبے میں زراعت اور اس سے متعلق سرگرمیاں مثلاً جنگل بانی، ماہی گیری اور کان کنی آتی ہے۔ ثانوی سیکٹر میں مصنوعات کی تیاری آتی ہے اور تیسرے سیکٹر میں کاروبار، تجارت، نقل و حمل، بینکنگ، بیمہ وغیرہ آتا ہے۔ ان سیکٹروں کے ذیلی منصوبے بحیثیت مجموعی

پلان کے جزو ہوتے ہیں۔ البتہ علاقائی سائنسوں کی ترقی سے علاقائی ترقی کے تصور پر توجہ مبذول کی جا سکی ہے۔ یہ علاقے یا خطے منصوبہ بندی سے متعلق خطے کہلاتے ہیں۔ مکانی منصوبہ بندی جغرافیائی بنیادوں پر منصوبہ بندی کے فائدوں کو پھیلانے میں معاون ہوتی ہے اور یہ تقسیم سائنسی اندازِ نظر کے تحت عمل میں آتی ہے۔

اب یہ تسلیم شدہ امر ہے کہ وسائل کا مربوط اور مکمل فروغ منصوبے کی سرگرمیوں کو پھیلا کر سماجی انصاف لانا اور عمل وقوع کا زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانا، اور اسی طرح کے بہت سے نظریات سے بھرپور فائدہ اٹھانا اسی وقت ممکن ہے جبکہ مکانی منصوبہ بندی پر بھی توجہ دی جائے۔

مسلسل کوشش

منصوبہ بندی ایک عمل مسلسل کا نام ہے۔ قدرتی وسائل کا فروغ یا منصوبہ بندی کے مقاصد کا فروغ جیسا کہ معیارِ زندگی بلند کرنا یا پسماندہ علاقوں کی ترقی کرنا، یہ سب وہ کام ہیں جو طویل عرصہ چاہتے ہیں۔ مثلاً بیس یا تیس سال کا عرصہ اس کے لیے درکار ہوتا ہے۔ لہٰذا موجودہ صورتِ حالات سے نپٹنے کے لیے ہمیں کوششیں کرنی ہیں۔ اور عملی پروگرام وضع کرنے ہیں۔ اگر عملی پروگرام کچھ عرصہ پیشتر ہی مرتب کر لیا جائے تو ممکن ہے کہ وہ وقت کے ساتھ ساتھ فرسودہ ہو جائے۔ لہٰذا تناظری منصوبہ بندی ضروری ہے۔ اس کے تحت طویل المدتی رجحانات اور ہدایات کی نشاندہی کرنے والے منصوبے تیار کرنے کے ساتھ ساتھ متوسط مدت کے پلان بھی وضع کرنے ضروری ہیں۔ مثال کے طور پر ۵ سالہ پلان درکار ہیں تاکہ طویل المدتی پروگراموں کے درمیان ربط قائم ہو سکے۔ سالانہ منصوبوں کو سالانہ بجٹ کے ساتھ مربوط کر دیا جاتا ہے۔ اس طرح یہ تینوں طرح کے منصوبے درکار ہیں تاکہ اس عمل کو جاری رکھا جا سکے۔ اس طریقے سے سابق کی کامیابیوں کو مستقبل کی ہدایات کے ساتھ جوڑا جا سکتا ہے۔

رولنگ پلان

ایک اور نظریہ رولنگ پلان کا ہے۔ پانچ سالہ منصوبے کو سال بہ سال آگے بڑھایا جاتا ہے۔ پہلے سال کی کارگزاری کے بعد اس پر نظرِ ثانی کی جاتی ہے اور اسے آئندہ سال کے منصوبے سے جوڑ دیا جاتا ہے۔ اس طرح یہ سال بہ سال آگے بڑھتا ہے۔

مادی اور مالی منصوبہ بندی

مادی اور مالی منصوبہ بندی میں بھی فرق کرنا ضروری ہے۔ حتمی طور پر تجزیے میں مادی منصوبے میں مختلف اشیاء کی پیداوار میں اضافے کی نشاندہی کی جاتی ہے اور خوراک، چینی، دودھ، پھل اور دیگر طرح سے سماج کے لیے کارآمد اشیاء جیسے پینے کا پانی، اسکول، ہسپتال، یا پائیدار اثاثہ جات مثلاً مکانات یا بنیادی نوعیت کا سامان مثلاً فولاد، سیمنٹ، یا کیمیاوی کھاد وغیرہ کی پیداوار میں اضافے کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے۔ اس سلسلے میں وسائل مثلاً افرادی قوت، اراضی، معدنیات وغیرہ کی بھی نشاندہی کی جاتی ہے لیکن زر پر مبنی ہماری معیشتوں میں منصوبہ بندی مالیاتی اصطلاح کے سہارے آگے بڑھتی ہے اور وسائل کو مہیا کرنا پڑتا ہے۔ اور معیارِ زندگی اور قومی آمدنی کی سطح کا اندازہ بھی روپے پیسے کی اصطلاح سے ہی واضح کیا جاتا ہے۔ البتہ منصوبہ بندی زر کی بنیاد پر دھوکہ کھا سکتی ہے۔ خالص مالیاتی اصطلاح میں قومی آمدنی میں اضافہ ایک ایسی معیشت میں محض دھوکہ دے سکتا ہے جہاں کہ افراطِ زر تیزی سے بڑھ رہا ہو۔ منصوبہ سازوں کو یہ دیکھنا ہوتا ہے کہ مادی اور مالیاتی منصوبہ بندی کے درمیان قیمتوں میں غیر معمولی اضافے کے سبب رابطہ منقطع نہ ہو جائے جو کہ منصوبہ بندی کے عمل کی بنیادوں کو ہی کھوکھلا کر سکتا ہے۔

منصوبہ بند معیشت کے نظام کا مختلف اندازِ نظر سے مطالعہ کرنے کے نتیجے میں منصوبہ بندی کی مذکورہ بالا مختلف قسمیں سامنے آسکی ہیں۔ منصوبہ بند معیشت اپنے اندر منصوبہ بندی کے مختلف تصورات رکھتی ہے۔ یہ آپس میں ایک دوسرے سے مربوط ہیں۔ اس طرح جامع انداز کی منصوبہ بندی، لازمی منصوبہ بندی، ایک نظامِ عمل کے تحت کی جانے والی منصوبہ بندی، مادی منصوبہ بندی، یہ سب ایک ساتھ کام کرتی ہیں۔ اور انھیں مرکزی نظام والی منصوبہ بندی کہا جاتا ہے۔ جو کہ سماج وادی معیشت میں ہوتی ہیں۔ اسی طرح منتخبہ، اشاراتی، جمہوری اور مالی منصوبہ بندی، مغربی ملکوں کی منڈی کے معاشی نظام پر انحصار رکھنے والی معیشتوں سے تعلق رکھتی ہے۔ لیکن ان سب کو ایک دوسرے سے الگ نہیں سمجھنا چاہیئے۔ حالیہ برسوں میں سماج وادی منصوبہ بندی حتیٰ کہ روس جیسے ملک میں اس طرح کی منصوبہ بندی بھی منڈی کے معاشی نظام کو بروئے کار لانے کی کوشش کرتی ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی اہم اور کلیدی صنعتیں حکومت کے زیرِ انتظام رہتی ہیں۔ منصوبہ بند معیشتوں کے تحت نجی صنعت کاروں پر کنٹرول کے مادی وسیلوں کی مدد سے کام لینے کی کوشش کی گئی ہے۔ ایسے مختلف معاشی نظاموں کا ایک ہی مرکز کی طرف مائل ہونا کہا جاتا ہے۔ یہ میلان جدید ٹکنالوجی کے رہنما اصولوں کے سبب ضروری ہو گیا ہے۔ ★

بقیہ: قومی یکجہتی تاریخ کے آئینے میں

بابر اور بہادر شاہ ظفر کے احساس کے یہ دو نمونے تہذیبی اور قومی یکجہتی کے طویل اور مسلسل عمل کو بہت خوبصورت اور موثر طور پر پیش کرتے ہیں۔

(پٹنہ سے نشر شدہ، ڈاکٹر قیام الدین احمد کی تقریر)

بشکریہ آل انڈیا ریڈیو

ڈاکٹر زینت رشید

خلائی پرواز میں ہندوستان کا ایک تاریخی کارنامہ

کہتے ہیں صدیوں پہلے کے انسان نے آسمان میں آزادی سے اُڑنے والے پرندوں کو دیکھ کر خود بھی زمین کو چھوڑ کر نیلے اور بے کراں آسمان پر اُڑنے کی اُمید پوری کرنے کے لیے کوئی نیا طریقہ ڈھونڈھ نکالنے کی کوشش کی۔ وقت گذرتا رہا، زمانے میں تبدیلیاں آئیں۔ سائنس نے ترقی کرنا شروع کی اور انسان اپنی آسمان میں اُڑنے کی خواہش کو دل میں لیے نت نئے طریقوں کی کھوج میں معروف رہا۔ سب سے پہلے اس خواہش کی کامیاب تکمیل امریکہ کے رائٹ (Wright) برادران نے کی جنھوں نے ۱۹۰۳ء میں قلیل عرصہ کے لیے زمین سے اُڑ کر اپنا کچھ وقت آسمانی فضا میں گذارا۔ ۱۳ر جنوری ۱۹۰۸ء کو امریکہ ہی کے ہنری فارمن نے ایک میل کے دائرے میں ایک کامیاب اُڑان بھری جس کے لیے انھیں پچاس ہزار فرانس کا انعام بھی دیا گیا ان کی یہ اُڑان ہوائی اُڑان کی ایک کامیاب شروعات تھی۔ اس کے بعد ہوائی اُڑانوں کے لیے طرح طرح کے ہوائی جہازوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ان جہازوں کی صلاحیتوں میں نئے نئے اضافے ہوتے رہے۔ جہاز کے بعد راکٹ آئے، اسپوٹنک بنے، میزائیلوں کی ایجاد ہوئی اور آخر میں خلائی طیارے بھی منظرِ عام پر آئے۔ ان ساری ایجادات کے پیچھے انسان کی خواہش زمین کے مدار سے باہر نکل کر خلاء میں سفر کرنے کی تکمیل کے سلسلے میں ہوئی، خلائی سفر کے لیے سب سے پہلے راکٹ ایجاد ہوئے، راکٹ ہی وہ پہلا ایسا جہاز تھا جو خلاء میں کامیابی کے ساتھ بھیجا گیا اور جس نے انسانی زندگی کو بے حد متاثر کیا۔ ۴ر اکتوبر ۱۹۵۷ء کو رُوس کے سائنسدانوں نے اپنا پہلا زمینی سیٹے لائیٹ بنایا جو ایک راکٹ کی مدد سے خلاء میں بھیجا گیا اور اس کے ساتھ دُنیا کے خلائی دَوڑ کی شروعات ہوئی اِس وقت سیٹے لائیٹ کو "اسپوٹنک" کا نام دیا گیا تھا۔ رُوس نے یکے بعد دیگرے کئی فضائی راکٹ داغے جن میں سے کچھ میں بندر، چوہے، کُتے اور پیڑ پودے بھی خلائی سفر کے لیے روانہ کئے گئے تھے۔ ۱۲ر اپریل ۱۹۶۱ء کو رُوس نے سب سے پہلے ایک انسانی خلا باز میجر یوری گگارین کو مدار میں پہنچایا۔

ہندوستان میں خلائی سائنس کے تحقیقاتی پروگرام کی شروعات ۱۹۶۲ء میں ہوئی، جب خلائی تحقیقات کے لیے "انڈین نیشنل کمیٹی" کی بنیاد رکھی گئی۔ ۱۹۶۹ء میں "انڈین اسپیس ریسرچ آرگنائزیشن" (ISRO) کی تشکیل ایک خاص مقصد کے تحت کی گئی، اس محکمہ میں خلائی سائنس، خلائی ٹکنالوجی اور خلائی سائنس کے دور رس اور فائدے مند نتائج کو انسانی بہبودی کے لیے استعمال کرنے کے سلسلے میں نئے نئے پلان بنائے جاتے ہیں اور ان پر عمل کیا جاتا ہے۔ ہندوستانی حکومت نے ۱۹۷۲ء میں "اسپیس کمیشن" کی تشکیل بھی کی یہ کمیشن ڈپارٹمنٹ آف اسپیس کی خلائی تحقیق اور اس پر آنے والے خرچے کے متعلق ساری پالیسیاں مرتب کرتا ہے۔ لیکن ہند کی باقاعدہ خلائی کھوج کا آغاز ۲۱ر نومبر ۱۹۶۳ء کو تھمبا (کیرالہ) کے خلائی اڈے سے ایک استوائی راکٹ کے داغے جانے سے ہوا، حالانکہ یہ راکٹ ساخت کے حساب سے کافی چھوٹا تھا لیکن اس میں ایک راکٹ کے سارے ہی سازوسامان موجود تھے۔ اس کے بعد سے تقریباً ایک ہزار مختلف شکلوں اور سائزوں کے راکٹ فضا میں داغے جا چکے ہیں اور ہر کامیابی کے بعد اِن راکٹوں کے سائز، ساخت، مضبوطی، پیچیدگی اور کوالٹی میں سُدھار ہوتا گیا۔

۱۹۷۰ء میں بھارت اور روس کے درمیان تعاون کا معاہدہ ہوا اس معاہدے کے تحت دونوں ملک سائنسی اور خلائی میدان میں ایک دوسرے کے ساتھ اشتراک کرتے چلے آرہے ہیں اور اُمید ہے کہ یہ اشتراک مستقبل میں بھی قائم رہے گا۔

۱۹ر اپریل ۱۹۷۵ء کو بھارت نے پہلا مصنوعی سیارہ "آریہ بھٹ" خلاء میں بھیجا، اس طرح بھارت وہ دُوسرا ترقی پذیر ملک بنا جس نے مصنوعی سیارے کو مدار میں پہنچایا۔ بھارت میں خلائی سائنس کو عوام کا معیارِ زندگی

بلند کرنے، ملک سے غریبی ہٹانے اور مواصلاتی رابطے کو موثر بنانے کے لیے فروغ دیا جارہا ہے۔ خلائی سائنس کی ترقی اور مصنوعی سیاروں سے معلومات کے جو ذخیرے انسانی فلاح و بہبود کے لیے دستیاب ہوتے ہیں وہ اتنے اہم ہیں کہ ان سیاروں پر خرچ کی ہوئی رقم کا بوجھ ہندوستان جیسے ترقی پذیر ملک کے لیے نہ تو قابلِ اعتراض ہے اور نہ ہی گھاٹے کا سودا۔ اسی لیے یکے بعد دیگرے ۱۹۷۵ء کے بعد سے مصنوعی سیاروں کا داغے جانے کا سلسلہ حالیہ دور تک جاری ہے۔ جس کی حالیہ مثال ہندوستان و روس کے اشتراک سے خلاء میں چھوڑا جانے والا خلائی سیارہ "سویوز ٹی ۔ ۱۱" ہے۔ ۳ اپریل کو سویوز ٹی ۔ ۱۱ بھارت کے ایک اور روس کے دو خلائی مسافروں کو لے کر آٹھ روزہ خلائی پرواز کے لیے روانہ ہوا تھا۔ خلائی تحقیق کے میدان میں بھارت کا یہ ایک اہم قدم اور اس کے خلائی پروگرام کا ایک اہم سنگِ میل ثابت ہوا ہے کیونکہ اس خلائی پرواز میں نہ صرف یہ کہ ہمارے ملک نے شمولیت کی بلکہ خلاء میں رہ کر ہمارے ملک کے ایک نمائندے نے سائنسی تجربات بھی انجام دیے۔ ہمارے ملک کے اس خوش قسمت اور بہادر نمائندے کا نام اسکواڈرن لیڈر راکیش شرما ہے جن کے خلائی سفر کی شروعات ۳ اپریل ۱۹۸۴ کو شام کے چھ بجکر ۳۹ منٹ پر روس کے قزاقستان کے خلائی کاسموڈروم بیکانور سے ہوئی، دراصل اس خلائی پرواز کے لیے تیاری اب سے تقریباً ۱۷ مہینے پہلے شروع ہوئی تھی، جب بھارتی ہوائی فوج کے دو اسکواڈرن کمانڈر رویش ملہوترہ اور اسکواڈرن لیڈر راکیش شرما کو تارا سٹی میں ۱۵ ماہ کی ٹریننگ دینا شروع کی گئی تھی۔ اس ٹریننگ کی شروعات ستمبر ۱۹۸۲ء کو ہوئی تھی۔ اس ٹریننگ کا ایک اہم مقصد خلائی مسافر کو بے وزنی کی حالت کا عادی

بنانا تھا۔ فی الحال ڈاکٹروں کا خیال ہے کہ بیحد مشکل اور سخت ٹریننگ کے بعد بھی ایک ہزار افراد میں سے صرف پانچ افراد اس قابل ہوتے ہیں کہ وہ خلاء میں بے وزنی کی حالت میں کامیابی سے سفر کر سکتے ہیں۔ خلائی سفر پر جانے کے لیے کسی بھی شخص میں چند خاص خوبیوں کا ہونا نہایت ضروری ہے۔ مثلاً خلائی مسافر کا قد نہ تو بہت چھوٹا ہو اور نہ ہی بہت زیادہ لمبا۔ عام طور سے ۵ فٹ اور ۱۰ سے ۱۱ انچ کا قد بہترین مانا جاتا ہے۔ خلائی مسافر کی عمر بھی ۳۶ سال کے نیچے ہی ہونا چاہیئے۔ خلائی مسافر کے لیے مضبوط، طاقتور اور صحتمند ہونا ضروری ہے۔ لیکن وزن بھی قد کے لحاظ سے کچھ کم ہو تو زیادہ بہتر رہتا ہے۔ اس کے علاوہ اس کے لیے ڈاکٹری، انجینئرنگ، ہوائی پرواز اور خلائی سائنس کی بھی خاص ٹریننگ لینا بہت ضروری ہے۔ مزاجی اعتبار سے خلاء میں جانے والے شخص کو پُرسکون، مطمئن اور غصے پر قابو رکھنے والا ہونا چاہیئے۔ ایک ایسا شخص جو ہر وقت خطرے کی صورت سے دوچار رہنے والے حالات میں بھی دوسروں کے ساتھ تعاون برقرار رکھنے میں کامیاب رہ سکے۔ اسکواڈرن لیڈر راکیش شرما تقریباً ان ساری ہی خصوصیات پر پورے اُترتے تھے اس لیے ان کا انتخاب اس سفر کے لیے کیا گیا۔ ان کی خلائی پرواز کے لیے جس جہاز کو منتخب کیا گیا تھا اسے سویوز ٹی ۱۱، یا جو پیرٹ بھی کہا جاتا ہے۔ اس خلائی جہاز کا وزن ۶٫۸ ٹن ہے اور اس کی اوسط رفتار ۸ کلومیٹر فی سیکنڈ ہے۔ یہ جہاز سات میٹر لمبا ہے۔ روانگی سے ڈھائی گھنٹے پہلے خلاء باز اس جہاز پر سوار ہو گئے تھے۔ اس جہاز کو پہلے ۱۶ منزلہ عمارت کے برابر اونچے راکٹ پر چڑھا کر داغنے کی پیٹی پر نصب کر دیا گیا تھا۔ اور ہندوستانی وقت کے بموجب ٹھیک ۶ بجکر

۳۸ منٹ پر یہ جہاز خلائی سفر کے لیے روانہ کر دیا گیا تھا۔ بھارتی خلاء باز اپنے ساتھ مہاتما گاندھی، جواہرلال نہرو، وزیر اعظم اندرا گاندھی اور وزیر دفاع شری آر۔ وینکٹ رمن کی فوٹو اور راج گھاٹ کی ایک مٹھی مٹی بھی اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ زمین کے مدار میں اپنے پہلے تین چکروں کے دوران تینوں خلاء بازوں نے خلائی جہازوں کے مختلف نظاموں کا معائنہ کیا۔ چوتھے اور پانچویں چکر میں خلائی جہاز اونچے مدار میں چلا گیا اور اپنے ۱۷ ویں چکر میں خلائی جہاز سیلیوت خلائی تجربہ گاہ کے نزدیک پہنچ چکا تھا اور ۱۸ ویں چکر میں یہ ہندوستانی وقت کے مطابق ۸ بجکر ۲ منٹ پر یہ خلائی تجربہ گاہ سے جُڑ چکا تھا۔ سویوز جہاز ۸۸٫۶۲ منٹ میں اپنا ایک مدار مکمل کر لیتا ہے اور زمین سے اس جہاز کا زیادہ سے زیادہ فاصلہ ۲۷۵ کلومیٹر اور کم سے کم فاصلہ ۲۲۲ کلومیٹر تھا۔ خلائی تجربہ گاہ سیلیوت ۷، جس میں ان تینوں خلاء بازوں نے سات دن گذارے ۱۵۰ میٹر لمبی ہے اور خلاء میں مدار کے گرد چکر لگاتی رہتی ہے۔ یہ خلائی اسٹیشن اپریل ۱۹۸۲ سے خلاء میں موجود ہے۔ اس خلائی اسٹیشن میں اس دفعہ سے قبل دو بار دیگر خلائی مسافر قیام کر چکے ہیں جن کا قیام اس اسٹیشن میں ۱۵۰ اور ۲۱۱ دن رہ چکا ہے۔ اس خلائی اسٹیشن میں باربرداری کے لیے جہاز تھوڑے تھوڑے وقفہ سے بھیجے جاتے رہتے ہیں جن میں یہ صلاحیت ہوتی ہے کہ وہ خود بخود سیلیوت ۷ سے جا کر منسلک ہو جاتے ہیں۔ اس تجربہ گاہ میں حالیہ ٹیم کے پہنچنے کے وقت تک تین روسی خلاء باز ۵۰ دن سے مختلف تجربات کر رہے تھے۔ ان تین نئے ساتھیوں کے پہنچنے پر انھوں نے ان کا انتہائی گرم جوشی سے استقبال کیا۔ ایسا پہلی بار ہوا ہے کہ مدار میں چکر لگانے والے کسی روسی خلائی اسٹیشن میں چھ خلاء بازوں

نے ایک ساتھ نہ صرف قیام کیا بلکہ مختلف سائنسی تجربات بھی کیے۔ سیلیوت ۷ اور سویوز ٹی۔ ۱۱ کے جڑنے کے تاریخی منظر کو ہندوستان کے عوام اور وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی نے براہ راست ٹیلی ویژن پر دیکھا اس کے علاوہ روس میں موجود ہندوستان کے سفیر پروفیسر نورالحسن نے بھی روس کے لیڈروں کے ساتھ یہ واقعہ دیکھا۔ اور اپنی خوشی کا اظہار کیا۔ صدر جمہوریہ ہند گیانی ذیل سنگھ نے اپنے پیغام میں کہا کہ "مشترکہ خلائی مشن ہند و روس دوستی کی نشانی اور اس بات کی واضح مثال ہے کہ کس طرح دو ممالک مل جل کر سائنس کی ترقی اور نوع انسانی کی بھلائی کے لیے تعمیری کام کر سکتے ہیں۔"

موجودہ پرواز سے ہندوستان اس خلائی کلب میں شامل ہو گیا جس میں وہ ۱۲ ممالک شامل ہیں جنھوں نے اپنے آدمیوں کو خلاء میں بھیجا ہے۔ اس کلب میں شامل ہو جانے سے دنیا کو اس بات کا یقین ہو گیا ہے کہ ہندوستان خلائی سائنس میں اب کسی سے پیچھے نہیں ہے۔

۳ اپریل کی خلائی پرواز پہلے انسانی روسی خلاء باز یوری گگارین کے خلائی سفر کی ۲۳ ویں سالگرہ پر ہوئی۔ یہ خلائی پرواز جو بے حد کامیاب رہی ہے اس کے بعد ہمارے ملک کا ارادہ ہے کہ مزید ایسی اڑانوں کا انتظام کیا جائے کیوں کہ اس بات کی قوی امید ہے کہ بھارت اب خلائی میدان میں خود کفیل ہو جائے گا۔

۵ اپریل کو دی گئی خلائی محکمہ کی ایک بجٹ رپورٹ میں یہ بات واضح کی گئی کہ ۸۵-۱۹۸۴ کے دوران بھارت ساؤنڈنگ راکٹوں اور سیٹلائیٹوں کے ڈیزائن اور ان کی تیاری خود مکمل کر سکتا ہے۔ اس رپورٹ میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ بہت جلد بھارت میں لانچ وہیکل کے ذریعے خلائی طیارے مدار میں بھیجے جا سکیں گے۔

ہندوستان خلائی معلومات کا استعمال پُر امن مقاصد اور انسانی بھلائی کے لیے کرے گا۔ اس بات کو مد نظر رکھتے ہوئے حالیہ مشن خلاء کے سربستہ رازوں کے بارے میں بنی نوع انسان کی معلومات بڑھانے کے لیے بڑی ہی اہمیت رکھتا ہے۔ اس بات کا پورا یقین ہے کہ خلاء میں بھی تجربات کئے گئے ہیں۔ ان سے ہمارا ملک ضرور مستفید ہو سکے گا۔

خلائی مسافروں نے اپنے سارے کام طے شدہ پروگرام کے مطابق کئے۔ ان خلاء بازوں کا رابطہ مشن کنٹرول سینٹر سے براہ راست تھا۔ یہ سینٹر ماسکو سے تقریباً ۲۰ کلو میٹر دور ہے اور اس میں ½۲ ہزار افراد کام کرتے ہیں۔ یہاں ایک ایسا ہال ہے جہاں دو ہزار کمپیوٹر چینلوں سے چلنے والی اطلاعات جمع کی جاتی ہیں۔ لگ بھگ ۳۰ ماہرین اہم فیصلے کرنے کے کام پر مامور ہیں۔ سیلیوت ۷ پر کام کرنے والے خلاء باز مشن کنٹرول سے جس کا نام "لائیٹ ہاؤس" ہے۔ لگاتار رہنمائی حاصل کرتے رہتے ہیں۔

خلاء بازوں نے خلاء میں جو تکنیکی نوعیت کے تجربات سرانجام دیئے ہیں انھیں کئی زمروں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلے زمرے میں سیمی کنڈکٹر، چشموں کے شیشوں اور دیگر سائنسی آلات کی تیاری کے بارے میں تجربات کئے گئے۔ بھارتی خلاء باز نے انڈین ہوائی فوج اور دیگر ریسرچ اداروں سے متعلق مختلف سائنسی شعبوں کے تجربات بھی کئے ہیں۔

اسکواڈرن لیڈر راکیش شرما نے ۷ اپریل کو خلاء اور زمین کے درمیانی رابطے کے ذریعے ایک پریس کانفرنس میں شمولیت کی اور بتایا کہ جو بائیو میڈیکل تجربات انھوں نے خلاء میں کئے ہیں وہ ہوائی فوج کے لیے بے حد کار آمد اور مفید ثابت ہوں گے۔ اس کے بہت سے تجربات ہوائی فوج کے لیے بھی بے حد کار آمد اور مفید ثابت ہوں گے۔ انھوں نے بتایا کہ اس قسم کے تجربات کرنے کا شرف وہ پہلے ہندوستانی ہیں جنھیں حاصل ہوا ہے۔ ان سارے تجربات سے ہندوستان کی اقتصادی حالت کو بہتر بنانے میں بے حد مدد ملے گی۔

اس خلائی سفر کے آٹھ روزہ وقفہ کے دوران اسکواڈرن لیڈر راکیش شرما نے خلائی بیماریوں کو دور کرنے کے لیے اور منفی اثرات کا مقابلہ کرنے کے لیے یوگا کی ورزشیں بھی پابندی سے کیں۔ اب سائنسداں ان کی صحت کا موازنہ دونوں روسی خلاء بازوں سے کر کے دیکھیں گے کہ خلاء میں یوگا سے کیا اثر پڑتا ہے۔ پچھلے تجربات بتاتے ہیں کہ خلاء میں زیادہ طویل عرصہ تک رہنے سے جسم کے اندر کچھ اہم تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں اس کے علاوہ صحت سے متعلق چند دوسری پریشانیاں بھی لاحق ہو جاتی ہیں۔ مثلاً ہڈیوں کی گھساوٹ اور پٹھوں کی کمزوری۔ خون کے دباؤ میں تبدیلی اور خون میں سرخ دانوں کی کمی۔ یہ کیفیتیں کشش ثقل سے دور رہنے کے نتیجے میں ظہور پذیر ہوتی ہیں۔ ان علامات پر قابو پانے کے سلسلے میں سائنسداں اور ڈاکٹر مسلسل تحقیق اور تجربات کر رہے ہیں تاکہ ان بیماریوں پر قابو پایا جا سکے۔ یوگا ورزشوں کا عمل بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

بھارتی خلاء باز نے ہندوستانی علاقوں کی تصویریں بھی لی ہیں جس کے لیے انھوں نے مشرقی جرمنی کے بنے ہوئے کیمرے کا استعمال کیا۔ اس کیمرے کی مدد سے کھینچی گئی ہر تصویر ۳۰۰ میٹر لمبے اور ۲۵۰ کلو میٹر چوڑے رقبے کا عکس اتار سکتی ہیں۔ ایک شاٹ میں یہ کیمرہ کیرالہ کے آدھے رقبے کے برابر کا فوٹو لے سکتا ہے۔ خلائی سفر کے دوران راکیش شرما نے انڈمان، نکوبار جزائر کے اوپر سے جو تصویریں لی ہیں ان کی مدد سے اس

علاقے میں سمندر کی گہرائیوں میں تیل اور گیس کے ذخائر کی تلاش میں مدد ملے گی۔

اس کے علاوہ ہند کے صحرائی خطوں، خلیج بنگال، لکشدیپ، گنگا، برہم پتر، نربدا اور دریائے سندھ کے بیسنوں، ہمالیائی چوٹیوں، پامیر کے علاقوں اور تھار کے ریگستان کی تصویریں بھی لی ہیں اور ہندوستان کے مغربی حصے، عرب ساگر، گجرات کے کچھ حصوں، وادیٔ جہلم اور کیلاش نندہ دیوی کے علاقوں کی تصویریں بھی لی ہیں۔ ان تصویروں سے ارضیاتی ساخت زمین کے استعمال، ماحول، برف، پانی اور زراعت کے شعبوں میں معلومات حاصل کی جائیں گی۔ روس کے خلائی امور کے ایک ماہر نے بتایا کہ ان تصویروں سے بھارت کو جغرافیائی، ارضیاتی، ماحولیاتی اور موسمی حالات کا پتہ لگانے میں بھی مدد ملے گی۔ ماسکو میں ایر مارشل ملک راج نے جو یہاں انڈین ٹکنیکل کمیٹی کے سربراہ ہیں ایک بیان میں کہا کہ موجودہ خلائی پرواز سے جو کامیاب تجربات ہوں گے ان کی بنا پر بھارت اپنے طور پر اسی طرح کی پروازیں کرنے کے سلسلے میں خود کفیل ہو سکتا ہے۔

انٹر کاسموس کے صدر مسٹر کونل نکوف نے جو کہ روس کی اکاڈمی کے نائب صدر ہیں۔ یو این۔ آئی کو بتایا کہ ان خلا بازوں کی کامیابی اور تجربات سے جو اعداد و شمار میسر آئیں گے۔ ان سے ان ممالک کی ترقی اور معاشی حالت سدھارنے اور ٹکنالوجی کو ترقی دینے میں مدد ملے گی۔ مسٹر نکوف نے یہ بھی کہا کہ اس دہائی کے وسط میں ہندوستان ایک مصنوعی سیارہ داغے گا یہ سیارہ بھی روس سے روانہ کیا جائے گا۔ اس سے ہندوستان کو ہائیڈرولوجی، زراعت اور جنگلات کے شعبے کے لیے مفید اعداد و شمار میسر آسکیں گے۔

خلا میں اپنے آٹھ روزہ قیام کے دوران ان خلا بازوں نے اپنے سارے تجربات پہلے سے طے شدہ پروگرام کے مطابق ختم کیے اور یہ عملہ اپنے کامیاب مشن کے بعد ۱۱ر اپریل کو ہندوستانی وقت کے بموجب شام کو چھ بجکر ۱۹ منٹ اور چھ سیکنڈ پر زمین پر بخیر و عافیت واپس ہوا۔ یہ لوگ سویوز ٹی۔ ۱۱ میں بیٹھ کر واپس ہوئے۔ یہ جہاز ۶۰ روز پہلے تین رُوسی خلا بازوں کو لے کر سیلیوت ۷ سے آکر ملا تھا۔ سویوز ٹی۔ ۱۰ تین حصوں پر مشتمل ہے۔ ان میں سے ایک ورکنگ موڈیول، دوسرا واپسی موڈیول اور تیسرے حصے میں انجن اور دوسری مشینیں وغیرہ ہیں۔ واپسی موڈیول کو ایک خاص قسم کے مصالحہ سے ڈھکا گیا تھا تاکہ زمین کی حدود میں داخل ہونے پر ہوا کے ذرات کی رگڑ سے پیدا ہونے والی گرمی کو جذب کر سکے۔ اور جل کر راکھ نہ ہو جائے۔ زمین کی حدود میں داخل ہونے سے پہلے ہی ورکنگ موڈیول واپسی موڈیول سے الگ ہو کر جل چکا تھا اور زمین کی حدود میں داخل ہوتے ہی واپسی موڈیول میں لگے ہوئے پیراشوٹ کھل چکے تھے اور جہاز کی برق رفتاری میں بھی کمی آگئی تھی۔ سویوز ٹی۔ ۱۰ بیکانور سے ۶۰۰ کلومیٹر دور روس کی ریاست قزاقستان کے آرکلیک کے مقام پر واپس ہوا جس کا تعین پہلے ہی کیا جا چکا تھا۔ زمینی فضا میں داخل ہوتے ہی ہوا سے رگڑ کھا کر طیارے کا بیرونی حصہ جل کر سُرخ ہو گیا تھا اور طیارے کے باہر کا درجۂ حرارت ڈھائی ہزار ڈگری سیلسیس تک پہنچ گیا تھا لیکن اندرونی درجۂ حرارت صرف ۲۰ ڈگری تک ہی محدود رہا۔ جس کی وجہ سے ان مسافروں کو کسی قسم کی دقت کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔

سیلیوت ۷، ۹ر فروری سے خلا میں ہے اور توقع ہے کہ وہ خلا میں رہنے کا اب تک کا ۲۱۱ دن کا ریکارڈ توڑ کر ہی واپس آئے گا۔

اسکواڈرن لیڈر راکیش شرما نے بتایا ہے کہ وہ اپنے ساتھ جو تصاویر اور اعداد و شمار لائے ہیں ان کی جانچ کی جا رہی ہے اور آئندہ آنے والے چھ مہینوں میں اس کے نتائج معلوم ہو جائیں گے۔ انھوں نے اُمید ظاہر کی ہے کہ جو نتائج بھی برآمد ہوں گے وہ ہمارے ملک کے لیے بیحد فائدہ مند ثابت ہوں گے●

بقیہ:۔ نئے ہندوستان میں یکجہتی اور جذباتی ہم آہنگی

کہ ان کی تحریروں سے قومی یکجہتی کو تقویت ملتی ہے یا اس پر چوٹ پڑتی ہے اس کے لیے حقائق کو چھپانا ضروری نہیں ہے لیکن جب آگ لگی ہو تو اس پر تیل کے بجائے پانی ڈالنا چاہیے اور اس حقیقت کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے کہ اکثر اوقات فرقہ وارانہ واقعات بنیادی طور پر غیر فرقہ وارانہ ہوتے ہیں اور شرارت، سیاست یا بے احتیاطی کی وجہ سے وہ فرقہ وارانہ بن جاتے ہیں۔ کبھی کبھی انفرادی واقعات کو اجتماعی رنگ دینے کی کوشش کی جاتی ہے افسوس کی بات ہے کہ ملک کی سیاست میں فرقہ واریت ابھی تک مختلف شکلوں میں باقی ہے لیکن فرقہ پرست پارٹیاں بھی اپنے کو غیر فرقہ پرست کہتی ہیں اور اس رجحان سے ظاہر ہوتا ہے کہ فرقہ پرستی کو ایک قابلِ مذمت چیز سمجھا جاتا ہے۔ سیاسی پارٹیوں کے ضابطۂ اطوار کی بات قومی یکجہتی کونسل کی اسٹینڈنگ کمیٹی میں کہی گئی ہے اور اگر عوام تعمیر و ترقی کے کاموں اور منصوبوں کو اولیت دینے لگیں تو فرقہ وارانہ اپیلیں بے اثر ہو جائیں گی۔ رنگا رنگی ہندوستان کے کلچر کی ایک بنیادی خصوصیت ہے اور یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ کسی کلچر کے محدود اور محبوس ہو جانے پر اس میں زوال ہو جاتا ہے۔ کلچر ان تجربوں کا مجموعہ ہے جو فطرت، ماحول اور مسائل سے نپٹنے کے دوران حاصل ہوئے ہیں۔ انسانی فطرت بنیادی طور پر یکساں ہونے کے باوجود الگ الگ ماحول اور مسائل کا الگ الگ اثر قبول کرتی ہے۔

(آکاشوانی لکھنؤ سے جناب عشرت علی صدیقی کی تقریر سے اقتباسات) (بشکریہ آل انڈیا ریڈیو)

سطوت زہرا

کھیون ہار

میں ایک پرائیویٹ فرم میں ملازم ایک معمولی سا کلرک۔ جب میرے کانوں میں یہ آواز گونجی کہ میں ایک لڑکی کا باپ بن گیا ہوں تو میں نے محسوس کیا کہ گویا میرے پیروں کے نیچے سے آہستہ آہستہ زمین کھسک گئی اور میں نے اپنے آپ کو خلاء میں محسوس کیا۔ میرا دم گھٹنے لگا اور میں نے حسرت بھری نظر لیبر روم پر ڈالی۔ اُس لیبر روم پر جس نے اب مجھے اور زیادہ لیبر کرنے پر مجبور کر دیا ہے ... لیکن یہ کیا دروازہ کھلا اور گھبرائی ہوئی نرس آئی۔

"سوری جناب بچی تو بچ گئی مگر آپ کی والئف ..." !!

"کیا ہوا میری تینی کو ؟" میں نے اس کے جملے کو مکمل ہونے سے پہلے گھبرا کر پوچھا۔

"وہ ... وہ !! اب اس دنیا میں نہیں رہیں" اور آگے بڑھ گئی ..."

اور میں ! منجمد ہو گیا۔ پتھر کی طرح جم گیا ایک بُت کی طرح خاموش ہو گیا۔ وہ میری بیوی جس نے ایثار و قربانی جس نے دو سال شادی شدہ زندگی میں مجھے کیا دے دیا۔ پیار محبت کے پھول، خلوص و وفا کی بوچھاریں۔ عقیدت کے پھول۔ وہ میری زندگی کے ایک ایک لمحے میں شریک جو ابھی اسپتال آنے سے پہلے میرے لیے رات کا کھانا بنا کر، میرے نہانے کا پانی رکھ کر، میرے جوتوں پر پالش کر کے آئی ہے۔ وہ ایسی نہیں ہو سکتی ... نہیں وہ ایسا کر نہیں سکتی کہ مجھے چھوڑ کر خود اتنی خاموشی سے اس دنیا کو تیاگ دے ... نہیں نہیں اور اب میں بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رو دیا۔ اب دماغ پر چھائے ہوئے بادل بارش بن کر برس چکے تھے۔ میرا ذہن صاف ہوا۔ اور مجھے ایک بات سوجھی وہ وفا کی دیوی تھی۔ اس نے مر کے بھی میرے ساتھ وفاداری نبھائی، اس نے جب سُنا ہوگا کہ وہ مجھے ایک لڑکی کا باپ بنا رہی ہے تو اس نے یہ ضرور سوچا ہوگا کہ میرا غریب شوہر ایک ہی بوجھ اٹھانے کے قابل ہے، خواہ بیوی کا بوجھ اٹھالے یا بیٹی کا ... !! اور وہ ننھی ننھی کومل کومل اُنگلیاں میرے ہاتھوں میں تھما گئی۔

اور میں نے اس کی امانت کو اس کی دی ہوئی کلی کو اس طرح پالا پوسا کہ دنیا کہہ اُٹھی کہ بچی کو ماں کی کمی نہ محسوس ہوئی۔ اب وہ پورے ۱۶ سال کی ہو گئی ہے۔ گیارہویں کلاس میں پڑھ رہی ہے اس کی خوبصورتی کا شور پورے محلے میں ہے۔ میں اُسے دیکھتا ہوں تو دیکھتا ہی رہتا ہوں۔ یہ میری آشا ہے میری آشا !! میں نے بارہا یہ سوچا ہے اب یہ بڑی ہو رہی ہے۔ کیا میں ایک معمولی کلرک اپنی آشا کے لیے کوئی اچھا سا لڑکا خرید سکوں گا؟"

شاید خرید سکوں، شاید نہ بھی !!

آجکل گرمی کی چھٹیاں ہیں۔ میری بیٹی کا شگفتہ چہرہ اچانک مرجھا سا گیا ہے۔ اب اس کے چہرے پر وہ شگفتگی نہیں ہے اس کی آنکھوں کی شرارت جانے کہاں جا چھپی ؟؟ اس کے لبوں کا تبسم تو گویا ایک خواب سا ہو گیا ہے۔ وہ کسی کام میں دل ہی نہیں لگا پا رہی ہے، اس کی آنکھوں کی ویرانی چہرے کی افسردگی دل و دماغ کی پریشانی کو دیکھ کر جانے کیوں اور کب میرا دل دھڑکنے لگا اور میں کہہ اُٹھا۔ آشا میں کاش تمہارا باپ نہ ہو کر ماں ہوتا تو تجھ سے پوچھ تو لیتا کہ تیرے اوپر آجکل کیا گذر رہی ہے۔ آجکل میرا سکون بھی درہم برہم ہو گیا ہے۔ پھر ایک دن وہ خوف میرے سامنے آگیا۔ وہ شک میرے سامنے حقیقت بن کر ناچنے لگا۔ میری آشا نے خودکشی کر لی ... خودکشی کر لی۔ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ سے معلوم ہوا کہ وہ ایک بچے کی ماں بننے والی تھی ... !!

پوسٹ مارٹم کی رپورٹ نے یہ تو بتا دیا کہ وہ ماں بننے والی تھی۔ مگر وہ رپورٹ یہ نہ بتا سکی کہ کس کے بچے کی ماں بننے والی تھی .... ورنہ میں اس سانپ کا خون پی جاتا۔ جس نے میری آشا کو ڈسا تھا۔ میں اس کا گریبان پکڑ کر پوچھتا تجھے کیا ملا میری آشا کو نراشا میں بدلنے پر ؟؟ میں پوچھتا جس کلی کو میں آج سولہ سال سے زمانے کے حوادث سے بچائے رکھا اسے مسل ڈالنے سے تجھے کیا ملا۔ میں سوچتا رہا، سوچتا رہا مگر مجبور و لاچار سوائے آنسو بہانے کے کچھ نہ کر سکا۔ اب میرے آنسو تھم سے گئے ہیں۔ زخموں پر گرد سی جم گئی ہے۔

اب میں دفتر سے گھر نہیں جاتا بلکہ جمنا کے اس کنارے بیٹھا رہتا ہوں جہاں سے کود کر میری آشا نے جان دی تھی۔ میں ہر شام گئی رات تک

جمنا پر بھی تھوڑا احسان کر آتا ہوں اس کی موجوں میں اشکوں کی شکل میں تھوڑا پانی بڑھا آتا ہوں گئی رات تک میں اس جگہ بیٹھا رہتا ہوں اور سوچتا ہوں میری آشا کہیں سے جاگ اُٹھے گی اور کہے گی کہ ڈیڈی جی وہ سب جھوٹ تھا میں نے تو تمھیں ڈرانے کے لیے یہ کھیل کیا تھا اور گھر لوٹ چلیں۔ مگر کسی شام ایسا نہ ہوا۔ میری آشا کی کرن کبھی نہ پھوٹی۔ اور میں تنہا کچھ آنسو بہتی جمنا میں چھڑک کر اپنے گھر واپس آجاتا ہوں۔

مگر یہ کیا آج میری سسکیوں کے ساتھ کسی اور کی سسکیاں شامل ہیں!! میں نے سُنسان اور ویران جمنا کے تٹ پر اپنی نگاہیں دوڑائیں، اور مجھے دور ایک سایہ تھرتھراتا نظر آیا۔ میں یکبارگی اس سائے کی طرف دوڑ گیا۔ اس سے پہلے کہ وہ جمنا میں چھلانگ لگاتی میں نے اُسے پوری قوت سے اپنی باہوں میں جکڑ لیا۔

"کون .... کون ہو تم ... ؟

"میں کوئی بھی ہوں، مگر میں مرنا چاہتی ہوں"۔ میں نے ہلکی ہلکی روشنی میں اس کے چہرے پر وہ کرب دیکھا جو خودکشی سے پہلے میری بیٹی کے چہرے پر تھا۔

نہیں ... نہیں اب میں کسی لڑکی کو اس طرح نہیں مرنے دوں گا۔ میں نے دیوانوں کی طرح اس کو دبوچ لیا۔

"چھوڑو ... چھوڑو ... مجھے"۔ اس نے مجھ سے اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کی۔

"نہیں ... نہیں میں نہیں چھوڑوں گا میں تمھیں مرنے نہیں دوں گا۔

"میری موت ہی میری حیات ہے۔ آپ مہربانی کر کے میرے درمیان سے ہٹ جائیں، اس نے التجا کی۔

"تم بزدل ہو، بزدل لوگ خودکشی کرتے ہیں"۔

نہیں میں مجبور ہوں ... میں آپ سے کیا کہوں میں کسی کو منھ دکھانے کے قابل نہیں رہی۔ میں نے دھوکہ کھایا ہے۔ میرا علاج موت ہے۔ وہ سسک اُٹھی۔

"نہیں ... نہیں میں تمھیں خودکشی کرنے نہیں دوں گا"۔

آپ جانتے ہیں اگر میں زندہ رہ گئی تو یہ سماج یہ دُنیا مجھے زندہ درگور کر دے گی۔ کون ہے جو مجھے سہارا دے گا۔ وہ جس پر میں نے بھروسہ کیا اس نے مجھے لُوٹ لیا۔ میری جیسی لڑکی کو کون اپنائے گا۔

"غصہ بہت بُری چیز ہے میں نے آہستہ آہستہ اس کو چپ کرایا۔ بہت دیر تک اس کو سمجھاتا رہا اور پھر اسے اپنے گھر لے آیا۔

اور پھر !!

اس سے پہلے کہ سماج جاگ اُٹھے میں نے ایک مندر میں جا کر بہت خاموشی اور سادگی سے اس سے شادی کر لی ... !! اور میں اس کی بھنور میں پھنسی ہوئی نیا کا کھیون ہار بن گیا !!

★

بقیہ: فلسفۂ زندگی

قوت عطا کرتا ہے۔

انجانے کے وجود کے بارے میں سوال پوچھنے پر اور پھر زندگی کے اس معمّے کے جواب سوچنے کے لیے ذہن کو آمادہ پا کر کسی بھی فرد کے لیے یہ ضروری نہیں ہوگا کہ کسی دوسرے آدمی پر کسی معجزاتی قوت کے لیے بھروسہ کیا جائے ... اور ایسی قوتوں کے اظہار کا سہارا لیا جائے جس سے ذہنی سکون کی شکل تلاش کی جا سکے یا کچھ عزائم اشیاء سامنے آسکیں۔

اس کے بعد انسان کو ایسے آدمیوں سے خطرہ نہیں رہتا جنھیں اقتدار یا کوئی بلند و بالا مقام حاصل ہوتا ہے۔ انسان پوری انسانی برادری کے تئیں عزت و احترام کے جذبات رکھے گا، اور زیادہ علم رکھنے والے اور انسانوں کی بہتر طور پر خدمت کرنے والے انسانوں کا احترام کیا جائے گا۔ یہ کام مناہمت اور محبت سے ہو سکتا ہے۔ نہ کہ خطرے، ڈر یا اندھو پشواس سے۔

اس ساری بحث سے دو باتیں سامنے آگئی ہیں کہ انسان کو ہمیشہ تحقیق و تفتیش کرتے رہنا چاہیئے، اور دوسروں کو سمجھنے اور دوسروں سے پیار و محبت کے لیے ہمیشہ تیار رہنا چاہیئے۔ ان اصولوں کو اپنا کر خوشی اور ترقی حاصل ہو سکتی ہے اور ایسی سرگرمیوں میں اضافہ ہو سکتا ہے جن سے انسان کو خوشی اور ترقی مل سکے۔ ویدوں کے دور کے دانشوروں نے جس سائنسی جائزے کا ذکر کیا ہے، وہ بہت اہم ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ پوری کائنات کے مشاہدہ کرنے کا انداز نظر اپنایا جائے جس میں کہ سورج اور چاند اس کے دو چھوٹے ذرّے ہیں۔ انسان کو ذہنی صلاحیتیں عطا کی گئی ہیں، اس لیے ان قوتوں کی مدد سے پورے وجود کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کی جانی چاہئیں۔ اس کی مثال ایک اداکار کی سی ہے جو اسٹیج پر ایک خاص کردار ادا کرتا ہے۔ یہ انداز نظر ہر شخص کے اپنے بس میں ہے خواہ وہ کسی بھی مقام پر ہو۔ اس رول کی اہمیت کے پیش نظر روشن دماغ انسانوں نے اپنے دوسرے بھائیوں اور پوری انسانی برادری کو کچھ نہ کچھ دینا چاہا ہے۔ اور ان سے رابطہ قائم کیا ہے اور یہ وہ عمل ہے جو نوعِ انسانی کی تاریخ میں جاری و ساری نظر آتا ہے۔

(آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں)

روحانیت اور سائنس

●

غزلیں

ڈاکٹر مشتاق الرحمٰن خاں مشتاؔ

زخم کھاؤ اور دنیا کو دعا دیتے رہو
دوستو ہر حال میں دادِ وفا دیتے رہو

کچھ تو دکھلاتے رہو اپنا شعورِ زندگی
تو کچھ نہ کچھ تو اپنی ہستی کا پتہ دیتے رہو

اپنا جینا خود ہے مشکل پھر بھی اسکے باوجود
بے لبوں کو زندگی کا آسرا دیتے رہو

خونِ دل سے کرکے روشن علم و حکمت کے چراغ
تیرگی سے ڈرنے والوں کو ضیا دیتے رہو

پیار اُلفت کے خزانے کم نہ ہونے پائیں گے
جو بھی مانگے اس کو حسبِ مدعا دیتے رہو

وقت کا دراصل اے مشتاؔ تقاضہ ہے یہی
سونے والوں کو جگانے کی صدا دیتے رہو

حیا فاروقی

اُمیدِ لطف کیا فکرِ ستم کیا
محبت میں خوشی کیا اور غم کیا

محبت ہو تو پھر مرنے کا غم کیا
ہماری زندگی کیا' اور ہم کیا

خود اپنے خونِ دل کا اے ستمگر
مجھی کو غم نہیں پھر تجھ کو غم کیا

کبھی تو اک نگاہِ لطف پرور
دلِ مایوس پر مشقِ ستم کیا

تری رسوائیوں کا ڈر ہے ورنہ
مجھے خود اپنی بربادی کا غم کیا

اگر حاصل ہو دوری میں حضوری
ملالِ ہجر کیا، فکرِ ستم کیا

یہی ہے آرزو دل سے حیاؔ کی
سلامت تو رہے، اے دوست ہم کیا

تشنہ بلگرامی

بیاباں یا بہارِ گلستاں کی بات کرتے ہیں
نجانے تیرے دیوانے کہاں کی بات کرتے ہیں

تجاوز کر گئی ہے حد سے میرے دل کی ویرانی
کہ ہم اب فصلِ گل میں بھی خزاں کی بات کرتے ہیں

جو بزدل ہیں وہ بجلی کی چمک سے چونک اٹھتے ہیں
بہادر زخم کھا کر بھی سناں کی بات کرتے ہیں

نمایاں نقش ہیں جس کے زمانے کی جبینوں پر
یہ دیوانے اُسی سنگِ گراں کی بات کرتے ہیں

ہٹا دو سب نظر آتے ہیں جو نقشِ کہن تم کو
نئے اب ہم زمین و آسماں کی بات کرتے ہیں

تماشا دیکھئے عقل و خرد کا اس زمانے میں
مکاں کے رہنے والے لامکاں کی بات کرتے ہیں

تخیل کی بلندی نے کھلایا ہے یہ گل تشنہؔ
زمیں پر رہنے والے آسماں کی بات کرتے ہیں

جُنید حزیں لاری

میں ایک قطرۂ بے مایہ کس شمار میں تھا
فنا کے بعد مگر بحرِ بے کنار میں تھا

ہزار شکل میں اس کا وہ ایک عکس رواں
ہزار رنگ سے رنگِ گل و ہزار میں تھا

وہ ایک میں کہ رہا کائنات در آغوش
وہ ایک تو کہ غمِ ذات کے حصار میں تھا

اسی کو دستِ خزاں نے کیا بہت پامال
جو پھول سب سے حسیں موسمِ بہار میں تھا

یہ جانتا تھا کہ تم سے نہ مل سکوں گا کبھی
قدم قدم پہ میں پھر کس کے انتظار میں تھا

خدا کا شکر کہ اب آگیا ہے منزل تک
وہ قافلہ جو کبھی پردۂ غبار میں تھا

مرے وجود کی پہچان تھا مرا لہجہ
وقارِ فن کا مرے لہجے کے وقار میں تھا

وہ ایک لمحہ جسے حاصلِ حیات کہیں !!
حزیںؔ کے بس میں کہاں، ان کے اختیار میں تھا

اے میرے وطن !

اسعد بدایونی

مرے وطن ترے صدقے ترے نثار کہ تو
مری نگاہ میں ہے شاہکارِ رنگ و بو

یہ سچ کہ تیرے گلوں سے ہے پیار بھی مجھ کو
عزیز ہیں ترے گلشن کے خار بھی مجھ کو

وہ تیرے گاؤں کے پنگھٹ وہ گوریوں کی بہار
وہ تیرے شہر، وہ شہروں کے خوشنما بازار

وہ تیرے کھیتوں میں دہقاں حیات اُگاتے ہوئے
وہ کارخانے ترے، زندگی سجاتے ہوئے

وہ سرحدوں پہ جوانوں کے مورچے تیرے
وہ آسماں پہ جہازوں کے سلسلے تیرے

بڑے خلوص سے بعد ادب سے کہتے ہیں
فسانہ تیری بہاروں کا سب سے کہتے ہیں

ترا وقار، ترا مرتبہ رہے قائم
یہ نکہتیں یہ بہاریں یہ رنگ جہاں دائم

رہزنِ متاعِ خرد

ریاض آختر ادیبی

اے بے نیازِ ہوش اے دیوانۂ شراب
اے رہزنِ متاعِ خرد، دشمنِ شباب

زہر آب ہے یہ بادۂ رنگیں خدا گواہ
احساسِ خوب و زشت کو کرتی ہے یہ تباہ

ہر دور میں یہ رہزنِ ایمان و ہوش ہے
اس کی ہر ایک بوند قیامت بدوش ہے

رنگینیٔ حیات کا ساماں نہیں ہے یہ
ناداں کسی بھی درد کا درماں نہیں ہے یہ

قاتل دل و جگر کی ہمیشہ سے ہے شراب
تریاقِ زندگی ہے نہ یہ راحتِ شباب

ہشیار باش محفلِ امکاں کا حسن دیکھ
دشت و چمن کا کوہ و بیاباں کا حسن دیکھ

قدرت کے میکدہ میں وہ مے ہے کہ واہ واہ
بہتے ہیں جس کو پیتے ہی روشن دل و نگاہ

ابوسعد

شجرکاری اور اس کی اہمیت

انسانی زندگی میں درختوں اور جنگلوں کی بہت اہمیت ہے۔ درخت انسان کو صرف سائے اور ہریالی ہی نہیں دیتے بلکہ ان کی پیداوار کا استعمال ہم اپنی زندگی کے ہر شعبہ میں کسی نہ کسی شکل میں قدم قدم پر کرتے ہیں۔

بین الاقوامی اطلاعات اس چیز کی شاہد ہیں کہ آئندہ آنے والی صدی میں ایندھن اور عمارتی لکڑی کی کمیابی ایک بحران کی صورت اختیار کرے گی اس لیے اس پر قابو پانے کی اشد ضرورت ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ ہم زیادہ سے زیادہ درخت لگا کر مستقبل میں ان سے عمارتی لکڑی اور ایندھن کے حصول کو یقینی بنا دیں۔ شجرکاری بذات خود نہ صرف ایک منفرد کاروبار ہے بلکہ اس سے اور بھی بہت سے فوائد ہیں، مثلاً وہ زمین جو صدیوں سے بیکار پڑی ہے اور اس کو استعمال میں لانا اور پھر اس کے گرد و نواح کے ماحول کو خوبصورت اور دلکش بنانا، جنگلی جانوروں کو پناہ مہیا کرنا، زمین کو ٹوٹنے اور پھوٹنے کے عمل سے روکنا، ریگستانوں کو پھیلنے سے روکنا

ہمیں درختوں سے سایہ ملتا ہے، عمارتی لکڑی ملتی ہے، ایندھن ملتا ہے، جانوروں کے لیے چارا ملتا ہے، پھل اور پھول ملتے ہیں، پیڑوں سے نئی مٹی بنتی ہے اور پرانی مٹی زرخیز ہوتی ہے۔ درختوں سے آکسیجن ملتی ہے جس سے ہوا صاف ہوتی ہے، نائٹروجن اور کاربن ڈائی آکسائڈ جیسی نقصان دہ گیس کم ہوتی ہے۔ درختوں کی جڑیں زمین کے اندر کا پانی اوپر لاتی ہیں جس سے مختلف طرح کی گھاس اگتی ہے اور مٹی کے کٹاؤ میں کمی آتی ہے۔ اس طرح درخت اس زمین پر انسانوں کے سب سے پرانے دوست ہیں۔

درختوں کی بے تحاشہ کٹائی سے آب و ہوا میں فرق، قحط، سیلاب اور ریگستانوں کے پھیلاؤ میں زیادتی آتی ہے۔ کھیتوں کی پیداوار میں کمی واقع ہوتی ہے اس لیے درختوں کی کٹائی کم سے کم کی جانی چاہیئے۔ بقول پنڈت نہرو "لاپرواہ ہاتھوں کے ذریعے کسی اچھے درخت کو جسے بڑا ہونے میں ایک عرصہ لگا اور جو پوری شان سے پھیلا ہوا کھڑا ہے، کاٹتے ہوئے دیکھ کر مجھے بڑا دکھ ہوتا ہے اگر ایسا کرنا ضروری ہی ہے تو اس درخت کی کمی پوری کرنے کے لیے کم سے کم دو پیڑ لگائے جائیں" دنیا میں بڑی تیزی کے ساتھ درختوں کا صفایا کیا جا رہا ہے اقوام متحدہ کے خوراک و زراعت کے ادارے کی رپورٹ کے مطابق دنیا میں ہر سال ایک ارب چالیس کروڑ کیوبک میٹر لکڑیوں کو جنگلوں سے صاف کر دیا جاتا ہے۔ ہندوستان میں پچھلے تیس ۳۰ سالوں میں بے شمار درختوں کو کاٹ ڈالا گیا۔ گزشتہ تیس ۳۰ سالوں میں ملک کی آبادی میں بھی تیزی کے ساتھ اضافہ ہوا ہے جس سے درختوں کو کاٹنے میں اور تیزی آئی ہے۔ اس کے علاوہ گائے، بیل، بھینس بھیڑ اور بکریوں کو جنگلوں میں چرانے سے بھی درختوں کو بہت زیادہ نقصان ہوا ہے۔

ہندوستان میں سات سو اڑتالیس لاکھ ہیکٹیئر زمین پر جنگلات پائے جاتے ہیں۔ جو ملک کے کل رقبہ کا صرف تیئس ۲۳ فیصد ہے جبکہ کسی بھی ملک میں کم سے کم تینتیس ۳۳ فیصد زمین پر جنگل ہونا لازمی ہے تبھی اس ملک کی آب و ہوا کی کیفیات کو محفوظ رکھنے میں مدد مل سکتی ہے۔ ہمارے ملک میں ۱۹۵۲ میں قومی جنگلات کے سلسلے میں ایک قرارداد پاس ہوئی تھی جس کے مطابق پہاڑوں اور پٹھاری علاقوں کے ساٹھ فیصد حصے پر جنگلات ہونا چاہیئے جس سے ان علاقوں میں زمین میں خراش تراش کے عمل، چٹانوں کے کھسکاؤ اور سیلابوں کو روکا جا سکے۔ اس قرارداد کے مطابق میدانی علاقوں کے بیس فیصد حصہ پر جنگلوں کا ہونا ضروری ہے مگر ابھی تک ہم اس مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکے ہیں۔ ہندوستان میں کل جنگلات کا ستاون فیصد جنوبی بھارت اور پٹھاری علاقوں میں، ۱۸ فیصد ہمالیہ اور ترائی علاقوں میں، بیس فیصد مغربی اور مشرقی گھاٹ اور ساحلی علاقوں میں اور صرف پانچ فیصد میدانی علاقوں میں پایا جاتا ہے۔ ہمارے ملک میں فی کس جنگل کا رقبہ صرف ۰.۲ ہیکٹیئر ہے جو کہ بہت ہی کم ہے۔

شجرکاری کی مہم کو ایک طاقتور عوامی تحریک بنانے کے لیے کوشش کی جانی چاہیئے تاکہ عوام کے اندر خود بخود شجرکاری کے لیے ایک جذبہ پیدا ہو۔ اس مہم میں سبھی ہندوستانی کسان، مزدور، آفیسر، ٹیچر، طالب علم، ایم۔ ایل۔ اے، ایم۔ پی اور وزیر بڑھ چڑھ کر حصہ لیں۔ ہر ایک آدمی درخت لگائے اس کے فائدوں کو سمجھے اور اس کے کٹنے سے پیدا ہونے والے نقصان سے بھی واقف ہو۔ اسکولوں، کالجوں، یونیورسٹیوں اور دوسرے شعبوں کی طرف سے شجرکاری کے لیے کیمپ لگائے جائیں۔ پیڑ لگانے کے ساتھ ساتھ اس کو محفوظ رکھنے کے لیے بھی ترکیبیں استعمال کی جائیں۔ گاؤوں، قصبوں اور شہروں کے چاروں طرف خالی زمینوں پر درخت لگائے جائیں۔

ملک میں چار کروڑ بیس لاکھ ہیکٹیئر زمین سڑکوں، ریلوے لائینوں، تالابوں اور نہروں کے دونوں کناروں پر بے کار پڑی ہے۔ اس بے کار زمین میں کروڑوں درختوں کو لگایا جا سکتا ہے۔ اس سلسلے میں کچھ حد تک کامیابی بھی ہوئی ہے مرحوم سنجے گاندھی نے اپنے پانچ نکاتی پروگرام میں ان بے کار زمینوں پر درختوں کو لگانے میں خاص توجہ دی تھی۔ وزیراعظم کے بیس نکاتی پروگرام کے تحت شجرکاری کی مہم کافی کامیاب ثابت ہوئی ہے اب تک اربوں پیڑوں کو لگایا جا چکا ہے۔ سڑکوں اور نہروں کے کنارے بیکار زمینوں پر چھوٹے چھوٹے درخت دیکھنے کو مل رہے ہیں

ڈاکٹر قیام الدین احمد

ہندوستان کی طویل تاریخ کے دوران مختلف نسلوں اور قبیلوں کے لوگ اس ملک کی سرحد میں داخل ہوتے رہے اور اس کے علاقوں میں آباد ہوتے رہے۔ یہ سلسلہ سنہ عیسوی کی ابتدا سے قبل شروع ہوا اور مختلف مدتوں کے وقفوں کے ساتھ جاری رہا۔ باہر کے لوگوں کی آمد فوجی حملوں یا قبائلی ہجرت دونوں ہی طور پر ہوئی۔ مگر عموماً اس طرح کی نقل آبادی قلیل المدت ہوا کرتی تھی۔ کسی خاص علاقے میں بسنے والے چند قبیلوں کی ہجرت کے بعد یہ سلسلہ بند ہو جاتا اور باہر سے آئے ہوئے یہ افراد اپنے قدیم مرکز سے بالکل کٹ کر رہ جاتے۔

اس سلسلے کی ایک اہم کڑی اس ملک میں مسلمانوں کی آمد تھی۔ ابتدائے اسلام سے قبل بھی عربوں کے ساتھ ہندوستان کے تجارتی تعلقات تھے۔ بعد میں تاجروں، سیاحوں اور صوفیوں کی آمد انفرادی طور پر ہوتی رہی۔ آٹھویں صدی کی ابتدا میں سندھ پر عربوں کا حملہ ایک دوسری نوعیت کا واقعہ تھا۔ اس سے ہندوستان میں عرب مسلمانوں کی حکومت اور اسلامی تہذیبی اثرات کا آغاز ہوا۔ بعض مورخین کا یہ کہنا درست نہیں ہے کہ یہ ایک بے معنی اور بے اثر فتح تھی۔

پھر بھی یہ صحیح ہے کہ سیاسی اعتبار سے اس کے اثرات محدود رہے۔

۱۲ ویں صدی کے اواخر میں بیرونی حملوں کا ایک نیا دور شروع ہوا جس میں وسط ایشیائی ترکی قبیلے پیش پیش تھے اور جس کے نتیجے میں دہلی سلطنت کا قیام ۱۲۰۶ میں ہوا۔ شمالی ہندوستان میں اور پھر بعد میں جنوبی ہندوستان میں ترک اور مغل مسلم شاہی خاندانوں نے حکومت کی جڑیں مضبوط کیں۔ اس وقت تک اسلامی اقتدار اور اسلامی تہذیب اپنے تعمیری عہد کو پار کر چکی تھی۔ ہندوستان میں مسلمانوں کا یہ نیا حکمران طبقہ اپنے مذہبی عقائد اور معاشرے کی تنظیم کے اعتبار سے بہت حد تک مختلف تھا۔ دوسری جانب ہندوستان کی اپنی ایک قدیم اور ترقی یافتہ تہذیب تھی۔ ان دونوں ترقی یافتہ تہذیبوں کا باہمی تعلق اور ایک دوسرے سے اثر پذیری بہت ہی دلچسپ اور سبق آموز موضوع ہے۔ سیاسی سطح پر ٹکراؤ ہوتا رہا ہے اور جنگیں ہوتی رہی ہیں مگر متعدد دیگر سطحوں پر باہمی اثرات پذیری کا عمل بھی جاری رہا گو یہ ہمیشہ ظاہر اور نمایاں نہیں ہوتا۔ باہر سے آئے مسلمان یہاں بس گئے۔ یہاں کے رسم و رواج کو قبول کیا۔ مقامی تہذیب کے بہت سارے پہلوؤں سے متاثر ہوئے اور اس کے مداح بن گئے۔ اس کا ثبوت اس دور کے مصنفین اور مؤرخین کی تحریروں، صوفیاء کے ملفوظات و مکتوبات ادب و فن اور طرز تعمیر کے نمونوں میں ملتا ہے۔

اسلامی معاشرہ اور تہذیب عالمی نوعیت کی ہے اس کی سیاسی تنظیم یعنی خلافت بھی عالمگیر تھی۔ بعد میں جب سیاسی استحکام منتشر ہو گیا اور عالم اسلام میں مختلف سلطنتیں قائم ہو گئیں ـــــ جن میں دہلی سلطنت بھی ایک تھی ـــــ تب بھی ان سلطنتوں کی بنیاد الگ الگ شاہی خاندانوں پر قائم تھی۔ قومیت کے نظریے پر نہیں۔ قومیت کے نظریے کی ابتدا ۱۹ ویں صدی میں مغربی یورپی مفکرین نے کی۔ قومیت کے اس تصور کے تحت ایک مخصوص جغرافیائی علاقے اور ماحول میں رہنے والے ایک زبان کے بولنے والے اور ایک مشترک ثقافت اور روایات کے حامی۔ ایک قوم کے افراد مانے جاتے ہیں اور ان کی بقا اور اظہار کے لئے ایک علیحدہ سیاسی تنظیم، ایک قومی ریاست، ضروری سمجھی جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ قومیت کا یہ تصور اسلامی عالمی تہذیب اور اقدار سے بالکل مختلف ہے۔ شاید یہی وجہ ہے انگریزی لفظ National ism کا صحیح عربی متبادل لفظ نہیں ملتا۔ بہر حال ۱۹ ویں صدی کے دوران قومیت کی لہر عالم اسلام میں بھی پھیلی اور دیگر اسباب کے ساتھ مسلم قومی ریاستوں کی تشکیل کا ایک سبب بنی۔ موجودہ دنیا کے زیادہ تر ممالک قومی ریاستوں کے طور پر بنے ہیں۔ پھر بھی دنیا کا سیاسی نقشہ مکمل طور پر قومی سرحدوں کے مطابق نہیں بن سکا ہے۔ بعض ممالک میں نسلی، مذہبی اور لسانی اقلیتیں سیاسی علیحدگی کا دعویٰ کر رہی ہیں۔ پھر کچھ بڑے ممالک ایسے ہیں جہاں دو یا اس سے زیادہ مختلف معاشرے اور مذاہب والے لوگ آباد ہیں۔ ایسے معاشروں کو Plural Societies کہتے ہیں۔ ہندوستان میں بھی یہ صورت پائی جاتی ہے۔ بڑی تعداد کی اقلیتوں والے ایسے ممالک میں قومی اور تہذیبی یکجہتی ایک اہم مسئلہ ہے۔

باہمی تہذیبی اثرات کے عمل کے متعلق پہلے اکثر ماہرین سماجیات کا خیال تھا کہ یہ عمل بہت حد تک یک طرفہ ہوتا ہے ورقوی، ترقی یافتہ، معاشرہ، کمزور ترقی پذیر معاشرے کو متاثر کرتا ہے۔ یہ لوگ یعنی پھیلاؤ اور نفوذ کے نظریے کے قائل تھے، مگر اب اس رجحان میں تبدیلی آئی ہے اور اس بات پر زور دیا جا رہا ہے کہ اثر پذیری کا یہ عمل لازمی طور پر یک طرفہ نہیں ہوتا۔ ناپ تول کر یہ کہا نہیں جا سکتا کہ کس نے زیادہ دیا اور کس نے زیادہ قبول کیا مگر یہ ضرور ہے کہ لین دین دونوں جانب سے ہوتا ہے۔

ہندوستان کی تاریخ میں ہمیں اس بات کے واضح نشانات ملتے ہیں۔ میں نے ابھی ذکر کیا کہ عہد وسطیٰ کے ہندوستان کی تحریروں، پوشاک و خوراک رہن سہن کے طریقوں، فن و ادب اور طرز تعمیر کے نمونوں میں یہ عمل صاف ظاہر ہوتا ہے۔ تفصیلات کا یہ موقع نہیں، مگر مختلف میدانوں میں مجموعی طور پر اس کی نشان دہی کی جا سکتی ہے۔

امیر خسرو ہندوستان اور ہندوستانیوں کی تعریف میں زور قلم دکھاتے ہیں۔ صوفیاء کرام اپنی مجلسوں میں سوالات کے جواب میں اس بات پر زور دیتے ہیں کہ مقامی رسم و رواج اور طور طریقوں کو قبول کرنے میں کوئی مذہبی قباحت محسوس نہیں کرنی چاہئے۔ دوسری جانب بھکتی تحریک کی ابتدا اور اس سے متعلق بعض ممتاز شخصیتوں خصوصاً کبیر اور گرونانک کے افکار میں اسلامی اثرات بہت نمایاں ہیں۔ عہد وسطیٰ کے راجپوت اور دیگر ہندو شاہی گھرانوں کی طرز رہائش، عمارات اور انتظامیہ میں مغل سلطنت کے اثرات واضح ہیں۔

اس عہد کی طرز تعمیر کے لئے ہند اسلامی طرز تعمیر کی اصطلاح سے ہی یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ اس طرز میں مقامی اور بیرونی اثرات کا ایک متناسب اور حسین امتزاج ہے۔ اسلامی فن تعمیر سے متعلق خصوصیات مثلاً گنبدوں، محرابوں اور میناروں کی تعمیر اور ہندوستانی فن نقاشی ـــــ پتھروں، اینٹوں اور چونے کی پلاسٹر شدہ سطحوں پر پھول پتیوں، اقلیدسی شکلوں اور جالیوں کا بکثرت استعمال۔ یہ چیزیں اس دور کی عمارتوں میں اب بھی دیکھی جا سکتی ہیں۔

تہذیبی یکجہتی اور مقامی اثرات کی قبولیت کی ایک عمدہ مثال ہمیں بابر اور بہادر شاہ ظفر کی زندگیوں میں ملتی ہے۔ سلطنت مغلیہ کے بانی، بابر نے اپنی زندگی کا تقریباً سارا حصہ وسط ایشیا میں گذارا تھا اور صرف آخری چند سال ہندوستان میں۔ اگرچہ وہ ہندوستان کی بعض باتوں، مثلاً موسم برسات کا لطف اور یہاں کے کاریگروں کی ہنرمندی وغیرہ کی تعریف کرتا ہے۔ مگر اپنی خود نوشت ڈائری "توزک بابری" میں وہ اکثر اپنے آبائی ملک اور مانوس معاشرے کو یاد کرتا ہے اور اپنے وطن لوٹ جانے کی خواہش کا اظہار کرتا ہے۔ بابر کے ہی خاندان کا ۳۰۰ سالوں بعد کا ایک فرد اور سلطنت مغلیہ کا آخری تاجدار، بہادر شاہ ظفر تھا، جو ۱۸۵۷ کی جنگ آزادی کے بعد رنگون جلاوطن کر دیا گیا اور مرنے کے بعد وہیں دفن ہوا۔ اس کا وہ مشہور شعر آپ سب نے سنا ہوگا جس میں وہ خاک وطن میں جگہ نہ پانے پر اپنی بدنصیبی پر اظہار افسوس کرتا ہے۔

کتنا ہے بدنصیب ظفر دفن کے لئے
دو گز زمین بھی نہ ملی کوئے یار میں

باقی ۔ ۱۲ ۔

Regd. No. D(DN) 985
R.N. 97032/81

Licensed U(DN) to post without pre-payment
at Civil Lines Post Office, Delhi-110 054

Vol. 4 No. 6 YOJANA (URDU) 16-30 June, 1984

ہینڈلوم کی مصنوعات کی برآمدات میں کافی اضافہ ہوا ہے۔ رواں مالی سال میں یہ ۲۸۵ کروڑ روپے تک پہنچ جائیں گی۔ ۱۹۷۰-۷۱ء میں ملک سے ۲۵۰ کروڑ ۱۶ لاکھ روپے کی مالیت کی مصنوعات غیر ملکوں کو بھیجی گئی تھیں جو بڑھ کر ۱۹۸۲-۸۳ء میں ۲۳۰ کروڑ ۸۹ لاکھ روپے ہوگئیں۔ چھٹے پنج سالہ منصوبے میں ۱۰۴۱ کروڑ روپے کی مالیت کا ہینڈلوم کا سامان باہر ملکوں کو بھیجا گیا

کامرس کی وزارت ہینڈلوم سیکٹر کے فروغ میں دلچسپی لے رہی ہے۔ اس شعبے میں زیادہ سے زیادہ لوگوں کو روزگار ملنے کے امکانات ہیں۔ زراعت کے بعد سب سے زیادہ تعداد میں اسی شعبے میں لوگ کھپ سکتے ہیں۔ اس میں ایک کروڑ افراد کو روزگار ملا ہوا ہے۔ ۱۹۸۲-۸۳ء کے دوران پیداوار کا اندازہ ۳۲۰۰ ملین میٹر کپڑا ہے۔ اس سیکٹر میں ۱۹۸۴-۸۵ء میں ۴۱۰۰ ملین میٹر کپڑے کی تیاری کا نشانہ رکھا گیا ہے۔ ۱۹۸۲-۸۳ میں ہینڈلوم سیکٹر میں ۳۴۰۰ ملین میٹر کپڑا تیار کیا گیا تھا، جب کہ اس سے ایک سال قبل ۳۲۵ ملین میٹر کپڑے کی تیاری ہوئی تھی۔ رواں سال میں پیداواری نشانہ ۳۵۰۰ ملین میٹر کپڑے کی تیاری کا ہے۔ ہینڈلوم کی صنعت میں پولیسٹر دھاگے اور کئی طرح کے مرکب دھاگوں سے کپڑا تیار کر کے اسے بہتر بنا دیا گیا ہے۔

قومی سطح پر نمائشوں اور قومی میلوں کا اہتمام کر کے ہینڈلوم کپڑے کی فروخت بڑھانے کے اقدامات کئے گئے ہیں۔ اس طرح کے میلے بڑے بڑے شہروں میں لگائے گئے ہیں۔ ان کے ذریعے ہینڈلوم کپڑے کی عوام میں مقبولیت بڑھی۔ ہینڈلوم کپڑا تیار کرنے والوں کے فائدے کے لیے بہت سی اسکیمیں شروع کی گئی ہیں تاکہ ان کے ڈیزائن میں بہتری آسکے اور معیاری کپڑا مناسب داموں پر دستیاب ہوسکے۔ ڈیزائن سازی کپڑے کی برآمدات میں اہم رول ادا کرتی ہے۔ چنانچہ ملک کے مختلف حصوں میں ۲۴ ویورز سروس سینٹر کھولے گئے ہیں۔ وارانسی، سیلم اور گوہاٹی میں ہینڈلوم ٹکنالوجی سے متعلق تین ادارے قائم کئے گئے ہیں۔ ان اداروں میں نئے رنگ اور نئے ڈیزائنوں کی تیاری کا کام ہو رہا ہے۔

ملیشیا، انڈونیشیا، سنگاپور، ہانگ کانگ، تھائی لینڈ، ساؤتھ کوریا، جاپان، فلپائن، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ میں دورہ کر کے ہینڈلوم کی اشیاء کی فروخت کے امکانات کی کھوج نکالی گئی ہے۔

ان مطالعوں کی روشنی میں ملک میں ہینڈلوم کی صنعت کو عصر حاضر کے تقاضوں کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ ان اقدامات کے ذریعے صارفین کے مزاج اور ان کی پسند کا پتہ لگانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ ایسے موقع بھی فراہم کئے جاتے ہیں جہاں خریدار اور مال فروخت کرنے والے ایک جگہ اکٹھے ہو کر آپس میں تبادلۂ خیال کریں۔ ان کے علاوہ بین الاقوامی میلوں اور نمائشوں میں شرکت کا [illegible] کیا جاتا ہے۔

مال برآمد کرنے والوں کو نقد معاوضہ جاتی امداد کی ایک اسکیم کے تحت ہینڈلوم کپڑوں پر دس فی صد کے حساب سے امدادی رقوم دی جاتی ہیں۔ کپڑوں کی منتخبہ اقسام پر نقد معاوضہ جاتی امداد کی شرح وضع ہے۔ خام مال درآمد کرنے کے واسطے اور مشینری منگانے کی غرض سے غیر ملکی زرمبادلہ کا انتظام بھی کیا جاتا ہے۔ ہمارے غیر ممالک میں قائم سفارت خانوں کی معرفت پبلسٹی کی مہم چلائی جاتی ہے۔ کتابچے وغیرہ شائع کئے جاتے ہیں۔ متعلقہ ملکوں میں واقع تجارتی مشن ہینڈلوم کی مصنوعات سے دلچسپی رکھنے والوں سے رابطہ قائم کر کے انھیں اس کی خرید کے لیے تیار کرتے ہیں۔ مارچ ۱۹۸۳ تک تقریباً ۱۵۱۳۴ کھڈیاں برآمداتی مال تیار کرنے کی اسکیم سے فائدہ اٹھا رہی تھیں۔

ہندوستان سے باہر ملکوں کو بھیجا جانے والا مال سوتی کپڑوں کی صورت میں زیادہ مقبول ہے۔ مدراسی رومال، پوشاک کے طور پر کارآمد کپڑے وغیرہ کافی پسند کئے جاتے ہیں۔ ہینڈلوم کپڑوں کی برآمدات کا نظم نسق پرائیویٹ ایکسپورٹر کرتے ہیں۔ ان کے علاوہ ہینڈی کرافٹس اینڈ ہینڈلوم ایکسپورٹ کارپوریشن، آل انڈیا ہینڈلوم فیبرکس، مارکیٹنگ کوآپریٹو سوسائٹی لمیٹڈ بمبئی، تمل ناڈو کی کوآپ ٹیکس اور آندھرا پردیش کی اپکس کوآپریٹو ادارے شامل ہیں۔

۱۹۸۲-۸۳ء میں ایک ہزار کروڑ روپے کی مالیت کا کپڑا یورپی اقتصادی برادری کے ملکوں میں بھیجا گیا۔ اس میں ہینڈلوم کا حصہ ۳۳ فی صد تھا۔ مدراسی رومال کی نائیجیریا میں بے حد مانگ تھی۔ امریکہ، جاپان اور آسٹریلیا میں بھی ہینڈلوم کپڑوں کی برآمدات کے امکانات روشن ہیں۔

یوجنا

یکم تا ۱۵ر جولائی ۱۹۸۴

ایک روپیہ

معاشرتی انقلاب کی جانب

اقتصادی جمہوریت کا مقدمہ

سائنس اور روحانیت

(وسنت ساٹھے)

ماحول کا تحفظ

وقت کی اہم ترین ضرورت

(عادل صدیقی)

عادل صدیقی

ماحول کا تحفظ

وقت کی اہم ترین ضرورت

۵ ر جون کو پوری دنیا میں ماحولیات کا دن منایا جاتا ہے۔ اس موقع پر اقوام متحدہ کے ماحولیاتی پروگرام کے ایگزیکیٹو ڈائرکٹر مسٹر مصطفیٰ۔ کے۔ طلبہ نے کہا کہ انسان کے ہاتھوں خود ان وسائل کی تباہی سے جو اس کی بقا اور حیات کا ذریعہ ہیں، ماحولیات کے شعبے کو زبردست خطرہ ہے۔ مسٹر طلبہ یہاں عالمی ماحولیاتی دن کی تقاریب میں شرکت کے لیے بطور مہمان خصوصی آئے تھے، انھوں نے اس بات پر حیرانی کا اظہار کیا کہ ترقی یافتہ ممالک روئے زمین پر ریگستان کو پھیلنے سے روکنے کے لیے ۔۔ بلین امریکی ڈالر خرچ کرنے میں لیں و پیش کر رہے ہیں جب کہ انھوں نے اسلحہ بنانے پر ۵۰ ہزار بلین امریکی ڈالر سے زیادہ خرچ کر ڈالا ہے۔ اس سال یوم ماحولیات کے موقع پر وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی نے اپنے ایک پیغام میں دنیا بھر کے عوام سے اپیل کی ہے کہ وہ خود کو حیات بخش ماحول کے تحفظ اور اس کے دانشمندانہ انتظام کے لیے وقف کریں۔ اس پس منظر میں ہندوستان میں ماحولیات کے تحفظ کے سلسلے میں کیے گئے چند امور اور ان کا مختصر مطالعہ قارئین کی دلچسپی کا سبب ہوگا۔ ایڈیٹر

آج نوعِ انسانی نے سائنس اور ٹیکنالوجی کی مدد سے ترقی کی ایسی منزلیں طے کی ہیں جن کا کسی زمانے میں تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ ماحول کی آلودگی بھی سائنس کی ترقی یافتہ شکل سے پیدا شدہ خطرات میں سے ایک ہے۔ چنانچہ کچھ عرصے سے ماحول کے تحفظ کا مسئلہ عالمی توجہ کا مرکز بنا ہوا ہے۔ اب یہ جغرافیائی اور سیاسی حد بندیوں سے ماورا ہو کر نوعِ انسانی کے بالمقابل آ کھڑا ہوا ہے اور فی زمانہ صورتِ حال یہ ہے کہ یا تو اس مسئلے پر قابو پا کر نوعِ انسانی کے تحفظ کا راستہ نکالا جائے یا اسے نیست و نابود ہونے دیا جائے۔

قدرتی وسائل سے اندھا دھند فائدہ اٹھانے پر زور ہے کیونکہ صنعتی ترقی کے خیال سے یہ ضروری سمجھا گیا ہے۔ اس لیے صورتِ حال اور زیادہ خطرناک ہے۔ ماحول میں ہمہ جہت آلودگی کا ایک سبب یہی صنعتی ترقی ہے۔ مشکل سے ہی تازہ ہوا میسر آسکتی ہے یا شور و شغب سے محفوظ ماحول مل سکتا ہے کیونکہ ہر جگہ انسانی آبادی پھیلتی چلی جا رہی ہے۔ پانی بھی آلودہ ہو چکا ہے۔ کچھ منحرف انسانوں کی بے پناہ حرص نے ہمارے جنگلات کو روئے زمین سے غائب کرنے پر کمر باندھی ہے لہٰذا ہر روز جنگلات کم سے کم ہوتے جا رہے ہیں۔ اس کے سبب بارشوں کا نظام بگڑا ہے اور وہ کم ہو گئی ہیں۔ کہیں خشک سالی اور کہیں سیلاب کی صورتِ حال نے ہر سال ہماری معیشت کو تباہ کرنا شروع کر دیا ہے۔ ہمالیائی منظر نامہ یکسر بدل چکا ہے اور پچھلے دس برسوں میں یہ تبدیلی دیکھنے کو ملی ہے۔ بڑے بڑے قطعات اراضی بنجر دکھائی دیتے ہیں کیونکہ پرانے زمانے کے خوب صورت، حسین اور پیارے پیارے صنوبر وغیرہ کے درخت تجارتی مقاصد کے لیے کاٹ لیے گئے ہیں۔ نچلے حصوں میں ہریالی اور ہرے بھرے باغات اور جنگلات کو بُری طرح ختم کیا گیا ہے۔ "مٹی کے کٹاؤ" اور اس کے سبب پیدا ہونے والی کمزوریاں ہماری آنکھوں کے سامنے ہیں۔ دریائی نظاموں کی آلودگی اور جنگلی جانوروں کی تباہی بھی بے درد انسانوں کے سبب واقع ہوئی ہے۔ دریائی پانی کی تجزیوں سے پتہ چلتا ہے کہ کارخانوں سے نکلنے والے زہریلے عناصر اس پانی میں ملے ہوئے ہیں۔ دریاؤں کو ہر طرح کے فضلات سے بھرا جا رہا ہے۔ ان تمام باتوں سے جو خطرناک نتائج سامنے آئے ہیں ان کے بارے میں اکثر و بیشتر سنا جانے لگا ہے۔ صنعتی کارخانوں سے نکلنے والے زہریلے مادّے سمندر میں پھینک دئے جاتے ہیں جس سے سمندری پانی پر ان کے بُرے اثرات مرتب ہوتے ہیں اس کا بڑا نقصان یہ ہے کہ سمندر میں پیدا ہونے والی بہت سی اشیاء آہستہ آہستہ کم یا ختم ہو رہی ہیں۔ کبھی کبھی سمندری کنارے پر مُردہ لاشیں پڑی ملتی ہیں اور بہت سے جانور مُردہ شکل میں پائے جاتے ہیں۔ کیمیاوی اجزا کے زہریلے اثرات اپنا اثر دکھاتے ہیں۔ مختصراً یہ کہ ہمارا معاشی نظام تباہی کی طرف جا رہا ہے۔

ہمارے ملک میں مضر اثرات کو کچھ تاخیر سے محسوس کیا گیا ہے۔ خوش قسمتی سے ماحول کے تحفظ کا مسئلہ اب محض علمی بحث ہی نہیں رہ گئی ہے بلکہ اس نے سرکار کی توجہ اپنی طرف عملی صورت میں مبذول کرائی ہے۔ مرکز میں ماحول کے تحفظ سے متعلق مکمل شعبے کا قیام اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ سرکار ماحول کے تحفظ کی ضرورت سے پوری طرح باخبر ہے اور وہ ہر اس چیز کے تحفظ سے دلچسپی رکھتی ہے جس سے نوعِ انسانی کی بھلائی وابستہ ہے۔ یہ ایک عظیم کام ہے۔ اب نہ صرف بھارت بلکہ دُنیا کے ہر ایک خطے میں ماحول کا تحفظ ایک سماجی تحریک کی صورت اختیار کر چکا ہے۔

اس سلسلے میں سب سے پہلے قدرتی وسائل کے تحفظ پر زور دیا جا رہا ہے۔ ترقیاتی نظام کو ایسے خطوط پر وضع کیا جا رہا ہے کہ معاشی نظام کو متاثر کئے بغیر اس کے صنعتی اثرات کو روکا جا سکے، اور ایسے پیڑ پودوں اور جانداروں کا تحفظ ہو سکے جو معدوم ہونے کے قریب ہیں۔

مائی کورس

منصوبہ بندی اور ترقیاتی پروگراموں کی جھلک پیش کرنے والا

پندرہ روزہ

یوجنا

نئی دہلی

چیف ایڈیٹر ؛ آر. ٹھکرال
ایڈیٹر ؛ لکھی رام رانا
اسسٹنٹ ایڈیٹر ؛ محمد عادل صدیقی
سب ایڈیٹر ؛ وسیم حیدر

جلد ۲۸	یکم تا ۱۵ر جولائی ۱۹۸۴ء	شمارہ ۷
۱۰تا۲۴ آساڑھ شک سمبت ۱۹۰۶ ؛ فون: ۳۸۷۳۴۱		

شرح چندہ

سالانہ ۲۰ روپے ۔ دوسالہ ۳۵ روپے، سہ سالہ ۵۰ روپے
فی کاپی: ایک روپیہ

طالب علموں، اُستادوں اور لائبریریوں کے لیے ۱۰ فی صد کی رعایت

اِس شمارے میں

یوجنا منصوبہ بندی کے بارے میں عوام کو آگاہ کرتا ہے، مگر اس کے مضامین صرف سرکاری نقطۂ نظر کی وضاحت تک ہی محدود نہیں ہیں

بزنس منیجر: ایل. آر. بترہ ؛ اسسٹنٹ ڈائرکٹر (پروڈکشن) کے. آر. کرشنن

مضامین سے متعلق خط و کتابت کا پتہ:۔
ایڈیٹر یوجنا (اردو) پبلیکیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس
نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

ترسیلِ زر کا پتہ:۔
بزنس منیجر، پبلیکیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس
نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

اِداریہ

ساتواں منصوبہ اور ہماری ذمہ داریاں

وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی نے بجا طور پر فرمایا ہے کہ روزگار کے مواقع فراہم کرنے اور غربت دُور کرنے پر زیادہ توجہ دی جانی چاہیئے کیونکہ ان دونوں کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ منصوبہ بندی کمیشن نے ۴ جون ۱۹۸۴ کو نئی دلی میں جو میٹنگ بلائی اس کا افتتاح کرتے ہوئے وزیر اعظم نے کہا کہ روزگار پر زور دینے کی ضرورت ہے۔ منصوبہ بندی کمیشن نے اس میٹنگ میں ساتویں منصوبے کے تئیں عام اندازِ نظر کی منظوری دی اور یہ طے کیا کہ اس کا زیادہ زور خوراک، کام اور پیداواری صلاحیت بڑھانے پر ہونا چاہیئے۔ بحیثیت مجموعی شرح ترقی کا نشانہ ۵ فیصد سے کچھ زیادہ رکھا گیا ہے۔ یہ زیادہ تر وہی ہوگا جو چھٹے منصوبے کے لیے تھا۔ منصوبے کے اہم مقاصد میں زرعی پیداوار بڑھانے اور خاص کر خوراکی اجناس کی پیداوار بڑھانے کو شامل کیا گیا ہے۔ اس مقصد کے لیے آبپاشی پر پورا زور دیا جائے گا اور اس لحاظ سے آبپاشی کے جو امکانی وسیلے پیدا کیے جا چکے ہیں، اُن سے پُورا پُورا فائدہ اٹھایا جا سکے گا۔ اس کے علاوہ مزید صلاحیت پیدا کی جائے گی۔ زراعت کی بسرعت ترقی اور خوراکی اجناس کی پیداوار بڑھانے کے لیے درکار صنعتی ڈھانچے کو مضبوط بنانے کے لیے سرمایہ کاری اور تکنیکی صلاحیتوں کے بڑھانے کے کام کو اوّلیت دی جائے گی۔ بنیادی مقصد یہی ہے کہ عوام اپنی مدد آپ کر سکیں اور اپنے پیروں پر آپ کھڑے ہو سکیں۔ اس سے ان میں خود اعتمادی پیدا ہوگی اور سماج میں انھیں باعزت مقام مل سکے گا۔ ملک کو آزاد ملک کی حیثیت سے آگے بڑھانے میں خود کفیلی اور خود اعتمادی دو بنیادی ستون ہیں۔ ان کی مضبوطی کے بغیر ملک میں ترقی کے تمام عناصر کمزور رہیں گے۔ مبنی بر انصاف سماجی ترقی کے حصول کے لیے بھی یہ بنیادی شرط ہے۔ ملک میں روزگار کے مواقع بڑھانے اور عوام کے کثیر طبقے کو از خود روزگار کی اسکیموں کی طرف راغب کرنے کا مقصد بھی دراصل ان کی غربت دور کرنا ہے۔ چنانچہ ساتویں منصوبے میں خوراک، کام اور پیداواری صلاحیت کے ذریعے مختلف ترقیاتی پروگراموں کے لیے راستہ ہموار کرنا ہے۔ منصوبہ بند ترقی کے ذریعے نہ صرف مذکورہ ترجیحات کو پیشِ نظر رکھنا ہے بلکہ غریبوں کو باور کرانا ہے اور خاص طور پر خود اپنے آپ کو بھی یہ یقین دلانا ہے کہ وہ غیر معینہ عرصے تک تبدیلی کے لیے انتظار نہیں کر سکتے۔ ظاہر ہے کہ ان کے صبر کا پیمانہ لامحدود نہیں ہے۔ سماجی انصاف کی طرف ہمارے قدم تیزی سے بڑھنے چاہیئں اور ان کے اثرات ہر جگہ محسوس ہونے چاہیئں۔ پیداواری روزگار سے پیداوار بڑھے گی اور آمدنی میں اضافہ ہوگا اور یہ بڑھوتری مستقل بنیادوں پر جگہ پا سکے گی۔ اس سلسلے کے پروگرام مثلاً دیہات میں روزگار کے قومی پروگرام اور دیہات میں بے زمین افراد کے لیے روزگار کی ضمانت کی اسکیم کو شدومد سے آگے بڑھانے کی ضرورت ہوگی۔ لیکن روزگار اور ترقی دونوں کا چولی دامن کا ساتھ رہا ہے اور معیشت کے مختلف شعبوں میں ترقی سے ہی روزگار کے نئے مواقع سامنے آسکیں گے۔

ہمارے پاس ایسا بنیادی ڈھانچہ ہے جس کی مدد سے ہم روزگار کے مسئلے کو براہِ راست حل کر سکتے ہیں اور وہ ہے ترقی کا ڈھانچہ جسے اس انداز سے وضع کیا جانا چاہیئے، جس سے روزگار کے مواقع زیادہ سے زیادہ پیدا ہوں۔ اگر ہم اسے ساتویں منصوبے کا سب سے پہلا مقصد قرار دے سکیں تو اس سے منصوبہ بندی کے عمل میں دوبارہ سے یقین و اعتماد کی فضا پیدا ہو سکے گی۔ روزگار کے مواقع کی بڑے پیمانے پر توسیع کے مضمرات کا جائزہ لینا بھی ضروری ہے۔ اگرچہ منصوبہ بندی کے تئیں اندازِ نظر سے متعلق دستاویز میں بہت زیادہ واضح نہیں کیا گیا ہے۔ تاہم دیہات میں روزگار کے مواقع بڑھانے پر زور دینے کی بات ضرور کہی گئی ہے جو اس سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ اس کے ساتھ ہی دیہات میں روزگار کے قومی پروگرام، زمین مزدوروں کے لیے دیہات میں روزگار کی ضمانت کی اسکیم اور دیہات کی مربوط ترقی کے پروگرام کے ذریعے ان کوششوں کو آگے بڑھانے کی ضرورت بتائی گئی ہے۔ ان پروگراموں پر موثر عمل درآمد بہت ضروری ہے۔ ایسی بھی اطلاعات ملی ہیں کہ فائدہ اٹھانے والوں کو اُس امداد سے بھرپور استفادے کا موقع شاذ و نادر ہی ملتا ہے، جو انھیں دی گئی ہے۔ اس طرح کی خامیوں کو دُور کیا جانا ضروری ہے۔ اگر ان اسکیموں نے خاطر خواہ اپنے نتائج نہیں دکھائے ہیں تو ان کے اسباب کا بھی پتہ چلانا ہوگا اور اس راستے میں جہاں کہیں خامیاں نظر آئیں گی، انھیں دُور کرنا ہوگا۔

ماحول کا تحفظ آج کے دور میں: آج کے دور میں ماحول کی آلودگی کے مسئلے نے جو سنگینی اور شدت اختیار کی ہے اس کو دیکھتے ہوئے بجا طور پر سوال کیا جا سکتا ہے کہ کیا انسان کی زندگی کو جو مختلف خطرات درپیش ہیں اور معاشیاتی نظام نے اس کے لیے جو پیچیدگیاں پیدا کر دی ہیں، ان کی روشنی میں اس سوال کا جواب آسان نہیں۔ دوسرے ان خطرات سے بخوبی آگاہ ہوتے ہوئے بھی کسی کو یہ پروا نہیں کہ ماحول کے تحفظ کی ضرورت پر دھیان دیا جائے اور ان خطرات سے نوعِ انسانی کو محفوظ کرنے کی کوشش کی جائے۔ ہندوستان میں بھی اس مسئلے کی سنگینی کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ دستیاب پانی کی کثیر مقدار آلودگی کے خطرے سے دوچار ہے۔ کلکتہ میں رہنے والی ۶۰ فیصد آبادی اس کے باعث سانس کی بیماریوں میں مبتلا ہے۔ اس سے فضائی اور آبی وسائل کی آلودگی کا ایک سرسری سا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ زمین کی صورتِ حال بھی اس سے کچھ زیادہ مختلف نہیں۔ جنگلات کا جس تیزی سے صفایا ہو رہا ہے، اور ریگستان جس تیزی سے پھیلتا جا رہا ہے وہ مستقبل کے بھیانک خطرے کی گھنٹی ہیں۔

(باقی صفحہ ۴ پر)

معاشرتی انقلاب کی جانب

اقتصادی جمہوریت کا مقدمہ

فلسفۂ زندگی ~ پہلا باب ~ قسط ۲ ~ رُوحانیت اور سائنس

ایک بات جو ابھی تک سمجھ میں نہیں آئی وہ یہ ہے کہ بیشتر لوگ قادرِ مطلق کو ایک خاص شکل دے کر اور پھر اُس کی پرستش کر کے بڑا ذہنی سکون اور تسکین محسوس کرتے ہیں۔ ان میں ایسے لوگ بھی ہیں جن کی پرورش سائنسی استدلال کے ماحول میں ہوتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ بڑے بڑے عقلیت پسند بھی اگر اس طرح کا رُجحان رکھتے ہیں تو اُن کے پاس اس کی مزید کوئی وجہ ہوگی اور وہ دوسروں کے لیے مثال بن سکتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ واقعی دوسروں کے لیے مثال قائم کرتے ہیں اور ہم دیکھتے ہیں کہ تمام دلائل کے باوجود عام لوگ جہالت اور اندھی عقیدت کے چکر میں پھنس جاتے ہیں۔ اس طرح کی ذہنی حالت پھر تعصبات کو جنم دیتی ہے۔

مگر یہ رُجحانات بھی آسانی سے سمجھ میں آسکتے ہیں۔ کیوں کہ نفسیاتی طور پر کائنات کی وسعت کا احساس آدمی کو اس قابل بناتا ہے کہ وہ نہ صرف اپنی سطح سے اوپر اُٹھ کر دیکھے بلکہ ہم آہنگی قائم کرنے کے لیے ایک صحیح راستہ بھی اختیار کرے۔ مگر یہ احساس اُسی وقت پیدا ہوتا ہے اگر وہ کسی ایسی علامت کو اپنی توجہ کا مرکز بنالے جس سے زندگی کی اعلیٰ قدروں کا ادراک حاصل ہوتا ہے۔ پرستش کا یہی مطلب ہے۔ مگر جوں ہی اُس علامت کو آخری سچائی یا پرستش کے اُسی طریقے کو ہی ایک صحیح راستہ سمجھ لیا جاتا ہے تو آدمی میں خواہش پیدا ہوتی ہے کہ وہ دوسروں کو بھی اُسے اختیار کرنے پر مجبور کرے۔ علاوہ اس کے جو لوگ اُس کے عقیدے کی پیروی نہیں کرتے، اُنھیں وہ حقیر سمجھنے لگتا ہے۔ جھگڑے کی بنیاد یہاں سے ہی پڑتی ہے۔ پرستش کے سب طریقوں کا بنیادی اور مشترک عنصر یہ ہے کہ عابد یا پجاری نہ تو اِن عقائد کے متعلق اپنے آپ سے کوئی سوال کرتا ہے اور نہ ہی وہ کسی دوسرے کو سوال کرنے کی اجازت دیتا ہے۔ اس اندھی عقیدت سے رواداری کا فقدان پیدا ہوتا ہے اور رواداری کا فقدان ہی جھگڑے کی بنیاد بنتا ہے۔ اس لیے گیان دھیان یا عبادت کا کوئی طریقہ ذہنی سکون حاصل کرنے کا ایک سیدھا سا راستہ تو ہو سکتا ہے مگر یہ کہنا بھی ضروری ہے کہ یہ بھی دماغ کا عمل ہے اور دماغ کو کسی عقیدے یا آخری سچائی کا پابند نہیں بنانا چاہیے۔

درحقیقت دُنیا میں کوئی سچائی ہے تو وہ یہ کہ آخری سچ کو کسی ایک کی ملکیت نہیں کہا جا سکتا۔ ہماری کائنات میں صرف ایسے حقائق نہیں جن کا تعلق کسی خاص وقت، فاصلے اور مادی اشیاء سے ہوتا ہے۔ یہ حقائق مختلف اوقات میں مادے اور توانائی کے باہمی رشتوں سے پیدا ہوتے ہیں۔ کچھ حالات میں ایسی چیزیں ظاہر ہوتی ہیں جو بار بار وہی شکل اختیار کرتی ہیں اور ایسی کائنات کا سارا نظام ہر وقت مختلف مظاہر میں ہم آہنگی پیدا کرتا ہے۔ اس لیے اُصولی طور پر تو مادہ توانائی کا ہی نام ہے مگر پھر بھی مادی چیزوں میں ظاہر ہونے والی توانائی مختلف شکلیں اختیار کرتی رہتی ہے۔ اینٹوں سے مکانات، شیشے سے کانچ کا سامان، لکڑی سے فرنیچر اور گیس سے آگ حاصل ہوتی ہے۔ اِن ہی چیزوں کو ہم ایک وسیع پس منظر میں دیکھیں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ اس کائنات میں چاند، ستاروں، سیاروں اور کہکشاں وغیرہ کا وقت کے ساتھ بڑا گہرا تعلق ہے۔ چیزوں کا یہ باہمی تعلق انسانی زندگی کے لیے بڑی اہمیت رکھتا ہے اور آخر میں ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ مختلف اشیاء کے باہمی تعلقات کا توانائی کے ساتھ بڑا گہرا رشتہ ہے۔ اس لیے اگر ہم گہری نظر سے دیکھیں تو علم حاصل کرنے کا مطلب یہ کہ ہم حقائق کو جاننے کی مسلسل کوشش کرتے رہیں، سوال کرنے کے لیے ہر وقت تیار رہیں اور جو واقفیت بھی ہمیں حاصل ہوتی ہے اُس کی روشنی میں زندگی کے سب شعبوں میں ہم آہنگی پیدا کریں۔

ایک انسان دو حدود کے اندر رہ کر ہی کام کرتا ہے۔ یہ حدود ہیں اُس کی پیدائش اور موت کی گھڑیاں۔ حالانکہ پیدائش اور موت کی گھڑیوں کے متعلق یقین سے کوئی پیشین گوئی نہیں

کی جاسکتی مگر موت تو ہر حال میں آتی ہے چاہے زندگی کتنی بھی لمبی ہو، آدمی کی ساری تلاش اُس کی زندگی تک ہی ہے۔ اور یہ بات بھی اب ثابت ہو چکی ہے کہ ارتقاء کے عمل میں انسانی ذہن کی صلاحیتوں میں مسلسل اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ کائنات کے متعلق آدمی کے علم میں برابر اضافہ ہوتا رہے گا مگر پوری کائنات کے تعلق سے ہم دیکھیں تو اِس علم کی حیثیت ہمیشہ سمندر میں قطرے کے برابر ہی رہے گی۔ ہرانسان کی ذہنی صلاحیتیں اس قدر محدود ہیں کہ کائنات کی حقیقت کے متعلق وہ جو بھی روشنی حاصل کرے گا وہ بھی اُسے بہت دُور تک نہیں لے جائے گی کیوں کہ کائنات کی حقیقت آدمی کے سمجھنے کی قوت سے بہت بڑی ہے۔ اسی وجہ سے آدمی آسان راستہ اختیار کرتا ہے اور تخلیق کا رشتہ خدا سے جوڑتا ہے۔ اسی لیے وہ سارے تضادات کا حل ڈھونڈھ لیتا ہے اور کسی اُلجھن میں نہیں پڑتا۔ مگر اِس کے باوجود ایک ذہین آدمی ہمیشہ یہ سمجھتا رہے گا کہ یہ ایک دھوکا ہے اور حقیقت سے فرار حاصل کرنے کا طریقہ ہے۔ ایسا ذہین شخص یہ جاننے کی کوشش کرتا ہے کہ انسان کی صلاحیتوں کی حدود کیا ہیں اور پھر وہ اِن حدود کے اندر رہ کر کام کرتا ہے۔ ایک عام آدمی نہ صرف اپنے دل کی دُنیا میں ہم آہنگی تلاش کرتا ہے بلکہ خارجی دُنیا میں بھی جس میں قدرت اور اُس کے رفیق بھی شامل ہیں، وہ کوئی جھگڑا یا تضاد نہیں چاہتا۔ اسی لیے آخرکار وہ یہ محسوس کرے گا کہ اِس دنیا میں سب سے اہم کام یہ ہے کہ امن و آشتی کی تلاش کی جائے اور اُسے قائم کرنے کی کوشش کی جائے۔ پھر تجربے اور مشاہدے سے اُسے معلوم ہوگا کہ مقصد حاصل کرنے کا سب سے اہم ذریعہ محبت ہے۔ یہ محبت بڑا وسیع لفظ ہے جس میں مفاہمت سے لے کر دردمندی تک بہت کچھ شامل ہے۔ اگر ہم اپنے کائناتی شعور اور ہم آہنگی تلاش کرنے کے کام کو روزانہ زندگی میں بھی استعمال کریں تو ہمارے بہت سے ذاتی اور سماجی مسئلے حل ہو جائیں۔ اب میں ہندوستان کی مثال لے کر اس اُصول کو انسانی معاشرے پر استعمال کرنے کی کوشش کروں گا مگر اس اصول کا اطلاق دوسرے معاشروں پر بھی ہو سکتا ہے جہاں لوگوں کے رُجحانات دوسری قسم کے ہیں۔

اعتقاد، علم اور جانکاری

جانکاری اور علم میں بڑا واضح فرق ہے۔ جانکاری ہمیں علم حاصل کرنے میں مدد دیتی ہے۔ اسی لیے کمپیوٹر اور اس طرح کی دوسری مشینیں جانکاری حاصل کرنے کا ذخیرہ تو ہو سکتی ہیں، مگر علم کا نہیں۔

اِس لیے انسان کے لیے سب سے اچھی راہ یہی ہے کہ قدرت کے اسرار جاننے کے کام میں اپنی محدود صلاحیتوں کا احساس کرے۔ اس کے ساتھ یہ بھی جان لے کہ زندگی کا معیار بہتر بنانے کے لیے وہ بہت زیادہ صلاحیت رکھتا ہے۔ اُسے یہ جاننا چاہیے کہ انسانی ذہن کے ارتقاء کے دَوران جو جانکاری اُس نے حاصل کی ہے اُس سے انسانی معاشرے کو نئے سرے سے ترتیب دیا جاسکتا ہے۔ اور اُس کی شکل بہت حد تک بدلی جاسکتی ہے۔ اجتماعی طور پر وہ دُنیا کے متعلق اور زیادہ واقفیت حاصل کر سکتا ہے، حالانکہ یہ واقفیت بھی سمندر میں قطرے کے برابر ہوگی۔ زندگی کا مشاہدہ اپنی صلاحیتوں کا احساس، رویّے میں انکساری اور فکر و نظر میں وُسعت پیدا کرے گا۔

انسانی زندگی کے ارتقاء میں دو چیزیں بالکل واضح طور پر سامنے آئی ہیں۔ ایک تو یہ کہ کائنات کے "اسرار" جو انسانی ذہن کی گرفت سے باہر ہیں وہ اگر کسی اور ذریعے سے گرفت میں آ بھی جائیں تو بھی ہماری سمجھ سے باہر رہیں گے۔ کیونکہ اُن کی تفسیر تو دماغ کے ذریعے سے ہی ہوگی۔ بہرصورت اس سلسلے کی روشنی خواہ ہمیں کسی بھی طرح ملے، ایک بات ضرور واضح ہوتی ہے اور وہ یہ کہ اس طرح جو بھی عالمگیر توانائی یا کائناتی قوت حاصل ہوتی ہے، اس کے ذریعے زندگی کے تئیں ایک عالمگیر نظریہ وجود میں آتا ہے جس کی مدد سے پوری نوعِ انسانی کی فلاح و بہبود حاصل ہو سکتی ہے۔ یہ کوئی بھی انسان خواہ وہ کسی قدر بھی گیان دھیان کا مالک ہو اس سے زیادہ کچھ حاصل نہ کر سکا۔

دوسرے اب یہ بات واضح ہو گئی ہے کہ انسان کے بیشتر مسائل سائنس اور ٹیکنالوجی کے ذریعے حل کیے جا سکتے ہیں۔ بشرطیکہ ہم آہنگی قائم کرنے کا جذبہ بھی ساتھ ہو۔ سائنسی طریقے اختیار کر کے ہم خلائی دَور کی ضروریات پوری کرنے کے لیے اپنی صلاحیتوں میں اور بھی اضافہ کر سکتے ہیں۔

انسان کی خوشی اور خوشحالی کے لیے اب ہم دُوسری چیز کی اہمیت پر غور کرتے ہیں۔ یہ ہے محبت، اس کا مطلب ہے کہ انسان میں کسی کو دینے کی صلاحیت ہو۔ محبت کے احاطے میں سب صالح جذبات آجاتے ہیں جیسے دردمندی، رحم، بہادری، سخاوت۔ محبت کا دنیا بھر میں ایک ہی معیار ہے اور شدّتِ جذبات سے اسے پرکھا جاتا ہے۔

کسی دوسرے فرد، نظریے یا اور کسی چیز سے جسمانی یا ذہنی طور پر وابستہ ہونے کی خواہش کا نام بھی محبت ہے۔ اس کے مختلف حصے ہیں۔ اور یہ الگ الگ شکلیں اختیار کرتی ہے۔

زندگی میں بحران یا تصادم کے وقت انسان کو کچھ چیزیں چھوڑنی پڑتی ہیں۔ ایسے وقت میں انسان اُسی چیز کو اپنے ساتھ رکھتا ہے جس کی قدر اُس کے دل میں زیادہ ہو۔ مثال کے طور پر بیٹے کے لیے ماں کے پیار کو لیجئے۔ بیٹا ہی اُس کا سہارا ہے اور بڑھاپے میں اُسے بیٹے کی سب سے زیادہ ضرورت ہے۔ اس کے باوجود اگر اُسے کسی ایسے مقصد کے لیے ماں کو چھوڑنا پڑے جو اُسے بہت عزیز ہو تو اپنی محبت کے باوجود ماں اُس کی مجبوری سمجھ جائے گی۔ نہ صرف یہ بلکہ اپنے کام پر جانے کے لیے وہ اپنے بیٹے کو مجبور کرے گی۔ اس طرح محبت کے تحت بڑی سے بڑی چیز

کے لیے چھوٹی چیز کو قربان کر دینے کی صلاحیت ہے۔ زندگی کی قدروں کا سوال ایسے ہی موقعوں پر اٹھتا ہے۔

علم اور محبت اگر مل جائیں تو آدمی کی نظر کو وسعت ملتی ہے۔ اس وسعتِ نظر کے ساتھ انسان کو اُس نیکی اور خوبصورتی کا احساس ہوتا ہے جو عالمگیر ہے۔

یہ نیکی اور حُسن ہی ہے جو انسان کو یہ جاننے کے باوجود کہ وہ فانی ہے، زندہ رہنے اور کام کرنے کی طرف مائل کرتی ہے۔

انسان کا اپنے فانی جسم سے اس قدر گہرا رشتہ ہے کہ اُسے اس بات کا احساس ہی نہیں کہ جسم سے الگ بھی اُس کا کوئی وجود ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ نہیں جانتا کہ جسم اور احساسات کی دُنیا سے آگے کیا ہے۔

قدرت کے اسرار جاننے کی کوششوں کے دوران اپنے آپ کو سمجھانے کا اُس نے ایک آسان راستہ اختیار کر لیا ہے۔ ایک بچّے کی طرح جو ماں کی گود میں آرام سے سویا ہوا ہے وہ کسی چیز پر ایمان لے آتا ہے اور اس طرح عدم تحفّظ کا خوف دُور کرتا ہے۔

جب آدمی کسی لیڈر، گرو یا سادھو مہاتما پر اعتقاد لے آتا ہے، تو ایسا ہی ہوتا ہے۔ انسان کی زندگی ایسے ہی ایمان کی بنیاد پر قائم ہے کیونکہ ایمان وہاں سے شروع ہوتا ہے جہاں عقل اُس کا ساتھ چھوڑ دیتی ہے۔ جس طرح کسی پر ایمان لانے کے بعد انسان مطمئن ہو جاتا ہے اسی طرح سے ایسا اعتقاد آدمی کو ذہنی طور پر مفلوج کر دیتا ہے۔ وہ جلد ہی کٹر پنتھی ہو جاتا ہے۔ اور اس بات کو تسلیم نہیں کرتا کہ دُوسرے شخص کے اعتقادات میں بھی کچھ سچائی ہو سکتی ہے۔ وہ سمجھنے لگتا ہے کہ دُوسرے تمام مذاہب نہ صرف غلط ہیں بلکہ نقصان دہ بھی ہیں۔ انسان کی تاریخ میں جس قدر بھی لڑائی جھگڑے ہوئے اُن میں سے بیشتر کی وجہ اسی اعتقاد کا تصادم تھا ــ یہ اعتقاد جو کہ بذاتِ خود اندھا ہے اور آدمی کو آگے نہیں لے جاتا۔ اسی لیے اس بات کو سمجھنے کی بہت ضرورت ہے کہ سب مذہبی اعتقادات ایک ہی چیز سے پیدا ہوتے ہیں ــ قدرت کے اسرار کے متعلق آدمی کی لاعلمی اور اس بات کا یقین کہ کوئی دوسرا شخص یہ سب بھید جانتا ہے۔

اِسی لاعلمی اور جہالت کی وجہ سے عام لوگ سمجھنے لگتے ہیں کہ کوئی خاص شخص روحانی طاقت رکھتا ہے اگر سوچ بوجھ کے ساتھ جانچ پڑتال کی جائے تو معلوم ہو جاتا ہے کہ اس طرح کے اعتقاد کی کوئی بنیاد نہیں۔ مگر جس طرح سے اندھے کو اندھا راستہ دکھاتا ہے، لوگ دوسروں کے کہنے پر معجزوں پر یقین کرنے لگتے ہیں۔

۱۱ یہ بات تو سطحی طور پر دیکھنے سے بھی معلوم ہو جاتی ہے کہ کرامات دکھانے والے بزرگ اپنی "طاقت" کا استعمال صرف چند افراد پر کرتے ہیں۔ کسی نے آج تک ہسپتالوں میں پڑے مریضوں کو صحت یاب کرنے کے لیے اپنی روحانی قوت کا استعمال نہیں کیا اور نہ ہی بیروت کی تباہی میں بے گناہ عورتوں اور بچّوں کو بچایا۔ یہ بزرگ راکھ کی چٹکی یا چاول کے کچھ دانے تو نکال کر دکھا سکتے ہیں مگر شہروں کو تباہ ہونے سے اور قحط میں مر رہے لوگوں کو بچانے کے لیے کچھ نہیں کر سکتے۔

اِن حقائق کے باوجود پڑھے لکھے سمجھدار لوگ بھی، جن میں سیاستدان، جج، سائنسدان سبھی طرح کے افراد ہوتے ہیں، دُنیاوی فائدہ حاصل کرنے کے لیے جادو ٹونا کرنے والوں اور کرامات دکھانے والوں کے جھانسے میں آ جاتے ہیں۔ اسی لیے جدید دور کے انسان کا مذہب سائنسی بنیادوں پر انسان دوستی ہونا چاہیے۔ اس طرح کی انسان دوستی کا مختلف مذاہب کی قائم کی ہوئی قدروں سے بھی کوئی تضاد نہیں ہوتا۔ ساری نسلِ انسانی کے لیے سائنس پر اعتماد کی عمارت اُستوار کرنے کے لیے روایتی قدروں کو بنیاد کے طور پر استعمال کیا جا سکتا ہے۔ ایک ایسا ذہن جس نے سائنس اور روحانیت میں ہم آہنگی پیدا کر لی وہ انسانوں کے بیشتر مسائل حل کر سکتا ہے۔ آیئے اس پہلو پر کچھ تفصیل سے غور کریں۔

سب پیغمبر اور ہادی اُس حد تک انسان کے لیے مفید ہیں جس حد تک وہ مَن کی شانتی، دردمندی اور محبت کا پیغام دیتے ہیں۔ مگر یہ ایک بڑی عجیب بات ہے کہ اپنی عام روحانی قوتوں اور معجزوں کے باوجود یہ سادھو مہاتما اور درویش پیسہ بٹورنے کے لیے ایک دوسرے سے مقابلے بازی میں لگے رہتے ہیں۔ اس طرح قادرِ مطلق کے یہ خود ساختہ نائب چند ٹکوں کے لیے لوگوں کو من کی شانتی فروخت کرتے پھرتے ہیں۔

ہزاروں سال کے عمل سے مذہبی نظریات، تبلیغ کرنے والے صحیفے، روایات اور پرستش کی رسومات زندگی کا اور ہمارے کلچر کا ایک ضروری جزو بن گئی ہیں۔ اور ان سب چیزوں نے مل کر انسانی معاشرے کو یکجہت کر رکھا ہے۔ انفرادی طور پر بھی جب کوئی انسان کوشش کے باوجود اپنا مقصد حاصل نہیں کر سکتا تو وہ اپنی ناکامی کو اوپر والے کی مرضی سے منسوب کرتا ہے۔ اس حد تک تو بات سمجھ میں آتی ہے کہ مگر جب وہ کسی دُوسرے زندہ یا مُردہ شخص میں مافوق الفطرت روحانی قوت دیکھنے لگتا ہے تو ایسا اعتقاد اُسے کمزور اور تقدیر کا غلام بنا دیتا ہے۔ ایسا شخص کٹر پنتھی اور اُن لوگوں کے لیے خطرناک ہو جاتا ہے جن کا مذہب اُن سے الگ ہے۔ اسی لیے جب تک ایک خدا میں اعتقاد سب لوگوں میں مشترک ہے اور ایک مذہب کے ماننے والوں میں دوسروں کے لیے رواداری کا جذبہ ہے تو ہمیں کسی بات کا خطرہ نہیں۔ مگر جوں ہی آدمی یہ سمجھنے لگتا ہے کہ خدا کے متعلق صرف اُسی کا نظریہ صحیح ہے تو رواداری کا جذبہ ختم ہو جاتا ہے اور

ڑدوں کا آغاز ہوتا ہے۔

ہندوستانی فلسفے کا نچوڑ ویدانت ہے جس کے معنی ہیں ویدوں کا علم۔ ایک طویل انے تک مشاہدے اور تحقیق کے بعد رسے ریشی منی اس نتیجے پر پہنچے کہ کائنات چلانے والی قوت ایک ہی ہے۔ وہ کل اور زو میں بھی ایک ہی ہے۔ وقت بھی وہی ہے، فاصلہ بھی وہی ہے، مادہ بھی وہی ہے، دگی بھی وہی ہے۔ اور دانش و حکمت بھی وہی ہے۔ کائنات میں الگ الگ مظاہر اسی ایک ت کی مختلف شکلیں ہیں۔ اور آخرکار جو ل کہ زال بھی آدمی کے دماغ سے نکلتا ہے، اور اب بھی وہی دیتا ہے۔ سوال کرنے والا بھی وہی ہے اور جواب دینے والا بھی وہی۔ اسی لیے خری جواب جس سے وہ مطمئن ہوا یہ ہی تھا کہ ہی قوت بھی تم ہی ہو۔

اس طرح ہم نے دیکھا کہ انسان کی سب ہ اہم خواہش یہ ہی رہی ہے کہ وہ اس سب سے ہی قوت سے اپنے آپ کو منسلک کرے جس کا حصہ ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ جب انسان اپنے بتوں اور بھجنوں میں اپنی ذات کو بھاتما کے ساتھ ملانے کی خواہش کا اظہار کرتا ہے تو اس انور بیان اپنے عروج پر ہوتا ہے اور ایسا علوم ہوتا ہے کہ اپنے تخیل کی قوت میں اپنا آپ مدغم کرنے کی خواہش میں وہ کھچا جا رہا ہے پنے آپ کو ملانے یا مدغم کرنے کی خواہش اس قت سب سے زیادہ آسان ہو جاتی ہے جب معبود انسان کی شکل و صورت رکھتا ہو چاہے وہ زندہ ہو یا مردہ۔ مثال کے طور پر کرشن کے لیے اودھا اور میرا کا پیار۔

روحانیت کو وسیع معنوں میں دیکھا جائے تو سوچنے کی قوت کا نام ہے جو کہ اس بڑی طاقت کی سب سے اعلیٰ شکل ہے اور جو کہ صرف نسان کو ملی ہے، یہ قوت آدمی کو نہ صرف اس کائنات

کے رموز سمجھنے کی صلاحیت عطا کرتی ہے بلکہ قدرت کے اسرار جاننے میں بھی یہ ہی قوت اس کی مددگار ہے اور اس طرح سے انسان اپنا رشتہ ابدی حقیقت کے ساتھ جوڑتا ہے۔ اپنے ذہن کی صلاحیتوں کے سہارے انسان اس طاقت کو اپنے تصور کی گرفت میں لاتا ہے جسے وہ خدا کے نام سے پکارتا ہے اور جس کی اس نے کئی شکلیں اپنے تخیل میں بنا رکھی ہیں۔

سائنس تو اس مادی دنیا کو جاننے کے علم کا نام ہے اور انسانی ضرورتوں کے لیے اس کا اطلاق ٹیکنالوجی کہلاتا ہے۔ روحانیت اس اوپری قوت کو جاننے کا علم ہے اور زندگی میں اس کا اطلاق انسانی برادری میں باہمی رشتے قائم کرنے پر ہوتا ہے۔ اس کے بعد قدروں کا سوال آتا ہے جن کا انحصار ہمارے جذبات اور انسانی معاشرے میں صحیح اور غلط کے تصور پر ہے۔

ایک بار جب یہ بات معلوم ہو گئی کہ سائنس اور روحانیت کائنات کی اسی ایک قوت کے دو رخ ہیں تو، اس سے قدرتی طور پر یہ نتیجہ اخذ کیا جاتا ہے کہ سائنس میں روحانیت کا امتزاج اور روحانیت میں سائنس کا امتزاج ضروری ہے۔ سائنس اور روحانیت دونوں اب اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ ہر سطح پر عالمی قوت ایک ہی ہے۔ یہ علم آدمی کو مسلسل تلاش اور تحقیق کے بعد حاصل ہوا۔ اس کام میں یہ رجحان بھی شامل رہا ہے کہ کسی بات کو آخری سچائی نہ سمجھا جائے۔ علم حاصل کرنے والے کے طریقۂ کار کو پرکھنے کی کسوٹی یہ ہی ہے کہ وہ کھلے دل و دماغ سے ہر سوال کا جواب حاصل کرنے کی کوشش کرے۔

اس کے باوجود انسانی تخیل کی پرواز کے لیے کچھ گنجائش ہے۔ جس طرح آدمی پریوں اور جانوروں کے قصے کہانیاں لکھتا ہے جنھیں بچے بچے سمجھتے ہیں، اسی طرح اس نے دیوتاؤں کے

متعلق دیومالا کی کہانیاں بھی تصنیف کیں اور ساتھ ہی اس حقیقت کو بھی سمجھ لیا کہ خالق کائنات انسان کی سمجھ سے باہر کی چیز ہے۔ تجربے سے اُسے معلوم ہو چکا ہے کہ کیا اچھا ہے اور کیا بُرا۔ اس لیے اپنے تصور سے اس نے دیوتاؤں کو اچھائی کے مجسمے دکھایا اور راکشسوں کو برائی کے۔

شاعری اور کلاسیکی ادب میں اس تخیل نے بڑی اونچی پرواز کی مگر جس طرح اسے ہم پریوں کی کہانیوں کے کرداروں کی حقیقت جانتے ہیں، اسی طرح ہمیں یہ بھی جاننا چاہیے کہ ان دیومالائی داستانوں کی اصل حقیقت کیا ہے۔

اگر کوئی شخص زمین سے اوپر چلا جائے، اور کچھ فاصلے سے اس پر نظر ڈالے تو اُسے فوراً ہی اس بات کا احساس ہو جائے گا کہ دنیاوی فائدے حاصل کرنے کے لیے لڑائی جھگڑوں میں پڑنا اپنے وقت کا، طاقت کا اور وسائل کا کتنا بڑا نقصان کرنا ہے۔ یہ بات جان لینے کے بعد اگر آدمی کوئی بھی رتبہ رکھتا ہو، وہ صدر مملکت ہو، وزیر اعظم ہو یا ملک کا ڈکٹیٹر ہو اُسے اس کا احساس ہو جائے گا کہ دنیاوی کاموں میں اس کی بیشتر جدوجہد کتنی بچکانہ حیثیت رکھتی ہے۔

ہر شخص کی زندگی میں کچھ لمحات ایسے آتے ہیں جب اُسے دنیا کی حقیقت کا احساس ہو جاتا ہے یا ذہنی طور پر وہ اپنے آپ کو ایک بلند سطح پر پاتا ہے۔ یہ لمحات اسی دن آتے ہیں جب آدمی اکیلا ہوتا ہے، اُسے کوئی روح پرور منظر دکھائی دیتا ہے، وہ کوئی بہت ہی نیکی کی بات یا موسیقی سنتا ہے، وہ موت کے قریب آ جاتا ہے یا پھر کسی ایسے وقت میں جب وہ اپنی کسی محبوب ہستی سے اپنے آپ کو بالکل ہم آہنگ کر لیتا ہے۔

مگر یہ لمحات بہت ہی مختصر ہوتے ہیں،

اور ان کے بعد آدمی پھر معمول کے دنیاوی کاموں میں اُلجھ جاتا ہے اور اُس پر رتبہ یا پیسہ حاصل کرنا، دوسروں پر سبقت لے جانے اور حریف کو شکست دینے کے خیالات غالب آجاتے ہیں۔ دوسرے ہی لمحے یہ ہی آدمی امن، بھائی چارے اور اس طرح کے اعلیٰ جذبات کا اظہار کرتا ہے جو اُس نے پبلک کے سامنے کسی کانفرنس یا جلسے میں کہنے کے لیے یاد کر رکھے ہیں۔ کسی اچھے مقصد کے لیے زندہ رہنے والی عظیم ہستیوں اور اُن لوگوں کے درمیان یہ ہی فرق ہے جو اُونچی جگہوں پر پہنچنے کے باوجود دُنیا کے معمولی فائدوں کے لالچ میں پھنس جاتے ہیں۔

دُنیا کے ہر بڑے مفکر اور نیک ہستی نے عالمی بھائی چارے کی ضرورت پر زور دیا ہے۔ مگر پھر بھی حقیقی زندگی میں آدمی اپنے پیار کا خاص درجہ چاہتا ہے۔ اصلیت اور اصول میں یہ ہی فرق ہے۔ ہم جس حد تک اس فرق کو ختم کرتے ہیں اور اپنے اصول کو عملی جامہ پہنا کر اُسے حقیقت کا رُوپ دیتے ہیں زندگی اُسی قدر خوبصورت اور پُرامن ہوتی ہے۔

مگر جب آدمی کے قول اور فعل میں فرق ہو اور وہ اپنے اصولوں کا تو پرچار کرتا پھرے جبکہ اُس کے عمل حقیقت پسندی کے نام پر بالکل اُلٹ ہوں تو یہ صاف اور سیدھی ریاکاری ہے۔ یہ دھوکا دینا ہے۔ نہ صرف دوسروں کو بلکہ اپنے آپ کو بھی۔ ہم دولت، اقتدار اور رُتبہ حاصل کرتے ہیں اور دُنیا سمجھتی ہے کہ ہم زندگی میں بہت کامیاب ہیں۔ مگر ہمیں اس سے خوشی حاصل نہیں ہوتی کیوں کہ ہم انسانی برادری کی بہبود اور خوشحالی کے ساتھ اپنے آپ کو ہم آہنگ نہیں کر پاتے۔

مذہب کا اقتصادی پہلو

آیئے اب اقتصادی پہلو پر غور کریں جس کی کہ اہمیت روز بروز بڑھ رہی ہے۔

اقتصادی زندگی کا یہ نظریہ جس کے تحت چند ایک افراد باقی آبادی کا استعمال کرنے کا حق حاصل کر لیتے ہیں حیاتِ انسانی کا حلیہ بگا‌ڑ دیتا ہے۔ جاگیرداری دور میں اقتصادی طاقت اُن لوگوں کے ہاتھوں میں مرکوز تھی جو زمین اور مویشیوں کے مالک تھے۔ ان جاگیرداروں کا سردار بادشاہ کہلاتا تھا۔ یہ بادشاہ اپنے مفاد حاصل کرنے کے لیے مذہب کو ایک ذریعہ بناتا تھا۔ مذہب میں عقیدۂ قضا و قدر ایک غالب عنصر کی حیثیت رکھتا ہے اور آدمی تقدیر کے سامنے اپنے آپ کو بے بس محسوس کرتا ہے۔ روایتی عقائد کے مطابق یہ تقدیر پجاری، پروہت یا سادھو مہاتما کی روحانی قوت پر مکمل ایمان لانے سے ہی بدل سکتی ہے جو کہ اُس مذہب کا نمائندہ ہوتا ہے۔ اُس زمانے میں جب بادشاہ اور مذہبی پیشوا ایک ہی شخص ہوتا تو وہ سارے معاشرے کو مکمل طور پر اپنی گرفت میں لے لیتا۔ آج بھی کچھ تھوڑے سے فرق سے یہی صورتِ حال ہے۔

اب بادشاہ اور جاگیردار تو نہیں رہے۔ مگر اُن کی جگہ سیاستدانوں اور سرمایہ داروں نے لے لی ہے۔

یہ لوگ بھی کئی طریقوں سے مذہبی پیشواؤں کا استعمال کرتے ہیں اور اقتدار اپنے ہاتھ میں رکھنے کے لیے جاگیرداری کی ایک نئی شکل کو بڑھاوا دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی کے باوجود اب بھی لوگ قسمت پر بھروسہ کرتے ہیں اور اس کی وجہ سے وہ نظام اب بھی قائم ہے، جس کی مدد سے چند افراد دولت اور اقتدار اپنے ہاتھ میں لے لینے کا حق حاصل کر لیتے ہیں۔

اگر ہم غور کریں تو معلوم ہوگا کہ دُکھ اور تکلیف پہنچانے کے مسائل آدمی کے اپنے ہی پیدا کئے ہوئے ہیں۔ غریبی اور ضروری اشیاء کی کمی کو ذرائع کی مناسب تقسیم سے دُور کرنا آدمی کے بس میں ہے۔ ریل اور کار کے حادثات بھی جن کا الزام ہم قسمت کو دیتے ہیں انتظام کی کمی اور ٹریفک ڈسپلن کے فقدان کی وجہ سے ہوتے ہیں۔ موت چوں کہ یقینی ہے اور اسے کسی صورت میں ٹالا نہیں جا سکتا۔ اس لیے ہم سمجھتے ہیں کہ دوسری چیزیں بھی آدمی کے کنٹرول سے باہر ہیں۔ اس طرح سے ہم اُن چند ایک چالاک لوگوں کو حق بجانب قرار دیتے ہیں۔ جنھوں نے ایک ایسا نظام قائم کر رکھا ہے جس کے تحت دُنیا کے سارے سُکھ، آرام، سہولیات پر انھوں نے اپنا اجارہ قائم کر رکھا ہے۔

نوکر شاہی نے جاگیرداری نظام کی ایک اور شکل اختیار کر رکھی ہے جس کے تحت دفاتر میں کام کرنے والوں کی تعداد شیطان کی آنت کی طرح بڑھتی ہے اور سب طرف فائلیں حکومت کرتی ہیں۔

آدمی کے علم کا دائرہ چاہے کچھ شعبوں میں کتنا ہی محدود کیوں نہ ہو مگر یہ بات ماننی پڑے گی کہ مادّی دُنیا اور اس زمین کے ماحول کے متعلق اُس کا علم اس قدر ضرور ہو گیا ہے کہ وہ انسانی زندگی کو اس زمین پر پھر سے ترتیب دے جس سے روٹی، کپڑا، مکان اور عام آدمی کی زندگی کو بہتر بنانے والی دوسری سہولیات سب کو میسّر آ سکیں۔ اُسے کچھ لینا چاہیے کہ بات صرف مادّی وسائل کا بہتر انتظام کرنے کی ہے۔ اقتصادی زندگی کے اصول کا چہرہ مسخ کر دینے سے ہی کچھ افراد، فرقوں یا قوموں کو دوسروں کا استحصال کرنے اور اُنھیں اُن کے حصے سے محروم کرنے کا حق مل جاتا ہے۔

جدید دور میں اس استحصال کو بیان کرنے یا اُسے حق بجانب قرار دینے کے لیے اصطلاحات

گھڑلی گئی ہیں۔ ایسے سرمایہ داری آزاد سرمایہ کاری، نئی نو آبادیات وغیرہ کے نام دیے گئے ہیں۔ ان سب اصطلاحات کا ایک ہی مطلب ہے۔ اگر کوئی شخص یا گروہ چالاکی سے دھوکے سے، سمگلنگ یا منشیات کا بیوپار کر کے یا پھر اسی طرح کے کسی غیر قانونی اور غیر اخلاقی کام سے امیر ہو جاتا ہے تو اسے قسمت کا نام دیتے ہیں۔ اسی طرح سے اگر ہزاروں لاکھوں لوگ نقلی دواؤں یا ہتھیاروں کی دوڑ کا شکار ہو جاتے ہیں تو اسے بھی تقدیر کا نام دیا جاتا ہے۔ اس نظریے کا چلن سب شعبوں میں ہوتا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ریاکاری ایک عام چیز ہو گئی ہے۔ جب تک آدمی قسمت پر تکیہ کرنے کا نظریہ نہیں چھوڑتا اور یہ نظام نہیں بدلتا جس کے تحت چند ایک لوگ دوسروں کا استحصال کرتے ہیں۔ تب تک انسانی زندگی میں بہتری کی کوئی اُمید نہیں کی جا سکتی۔

دُنیا کے مختلف حصّوں میں سنجیدہ اور پُرخلوص لیڈر اسی استحصالی نظام کے اندر زندگی کے حالات میں بہتری لانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ وہ اِس نظریے کے تحت کام کرتے ہیں کہ اگرچہ چند لوگوں کو بلا روک ٹوک دولت جمع کرنے کی آزادی دی جاتی ہے تو وہ اتنا فاضل سرمایہ بنا لیتے ہیں جو جگہ نہ ہونے کے باعث فاضل پانی کی طرح باہر نکلنے لگتا ہے اور اُس فاضل سرمائے کو عام آدمی کی بہبود کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ اس اصول کا اطلاق اُن افراد پر ہوتا ہے جو مُلک کے اندر رہتے ہیں اور اگر کوئی مُلک دُوسرے مُلکوں کا استحصال کر کے ترقی کرنے کی پوزیشن میں ہو تو پھر اس کا اطلاق بین الاقوامی سطح پر بھی ہو سکتا ہے مگر استحصال کا قانون جو تقدیر پر بھروسہ کرنے کی بُنیاد پر وضع کیا گیا ہے، اُسی طرح سے قائم رہتا ہے۔ اگر آدمی اپنے علم پر بھروسہ کر کے اس اقتصادی نظام کا جائزہ لینا شروع کرے اور ہر بات کو دلیل اور منطق کی کسوٹی پر پرکھے اور ایسے نظام کو تسلیم کرنے سے انکار کر دے جو چند لوگوں کو چاہے وہ ذہین ہی کیوں نہ ہوں، اکثریت کا استحصال کرنے کی اجازت دیتا ہے تو پھر حالات میں سُدھار شروع ہو سکتا ہے۔

اگر ہم غور کریں تو معلوم ہوگا کہ یہ ہمارے نظام کا ڈھانچہ ہی ہے جس نے معاشی اور معاشرتی زندگی کا حلیہ بگاڑ کر رکھا ہے۔ ہمارے سیاستدان جنھوں نے پُرانے زمانے کے بادشاہوں کی جگہ لی ہے اور جمہوری معاشروں میں جنھیں عوام نے اس اُمید پر اقتدار سونپا ہے کہ یہ حالات میں سُدھار کریں گے ہماری بہت سی مصیبتوں کے ذمّہ دار ہیں کیوں کہ انھوں نے استحصال کرنے والوں کے ساتھ گٹھ جوڑ کر لیا ہے۔ معاشی نظام کا ڈھانچہ بدلنے کی بجائے یہ لوٹ کھسوٹ کرنے والوں کے ساتھ مل گئے ہیں اور عوام کی سب اُمیدیں کہ اُن کے بھی اچھے دن آئیں گے، خاک میں مل گئی ہیں۔

یہ سب اُن ہی سیاستدانوں کا کام ہے جو خلوصِ دل سے عوام کے دُکھ دُور کرنا چاہتے ہیں۔ جلد ہی ان سیاستدانوں کو احساس ہو جاتا ہے کہ نظام کو بدلنا اُن کے بس کی بات نہیں۔ پھر حقیقت پسندی کے نام پر وہ اسی نظام کی ضروریات کے مطابق اپنے آپ کو ڈھالنا شروع کر دیتے ہیں اور اس کا فائدہ بھی اُٹھانے لگتے ہیں۔ یہ بات دُنیا کے اُن سب مُلکوں کے سیاستدانوں پر صادق آتی ہے جہاں استحصال کا نظام قائم ہے۔

پھر سوال یہ اُٹھتا ہے کہ کیا ہم اِس صورتِ حال میں تبدیلی لا سکتے ہیں یا ایسا نظام قائم کر سکتے ہیں جس میں استحصال نہ ہو، سب کو برابر کے مواقع ملیں اور فرد کی آزادی قائم رہے۔

بڑی بڑی اصطلاحات کو نظر انداز کر کے اگر ہم اقتصادی زندگی کی سرگرمیوں کو دیکھیں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ یہ سرگرمی اشیا پیدا کرنے اور دُوسری سہولیات پہنچانے کا ہی نام ہے۔ اس سرگرمی سے جو فاضل چیزیں پیدا ہوتی ہیں، وہ سرمائے اور دولت کی شکل اختیار کر لیتی ہیں۔ ان مصنوعات کی خرید فروخت چاہے روپے پیسے سے ہو، چاہے چیزوں کے تبادلے سے یہ سب تفصیلات کی باتیں ہیں۔ لوگوں کو ذہنی طور پر اُلجھانے اور حیران کرنے کے لیے ماہرین انھیں اور پیچیدہ بنا سکتے ہیں مگر اقتصادی ڈھانچے کا بنیادی عنصر قائم رہتا ہے۔ وہ یہ کہ تھوڑے سے لوگ جو ذہین اور طاقتور ہیں وہ اَن پڑھ اور سیدھے سادے عوام کا استحصال کرنے کا حق ہر حال میں اپنے ہاتھ میں رکھنا چاہتے ہیں۔

اس ساری بحث کا مقصد یہ ہے کہ انسانی زندگی میں جو گوناگوں مسائل پیدا ہوتے ہیں اُن پر گہرائی سے غور کرنے کی ضرورت ہے۔ جب تک آدمی سوچنے کی قوّت کا استعمال نہیں کرتا، جو اُسے دُوسرے جانداروں سے ممتاز کرتی ہے، نہ صرف زندگی کے معیار میں کوئی ترقی نہیں ہوگی بلکہ ارتقا کے عمل میں بھی رُکاوٹیں پڑیں گی۔

تجربہ کہتا ہے کہ سوچنے کے عمل کو کچھ باتوں کا پابند بنا دینے سے نقصان پہنچا ہے۔ یہ بھی اصرار کیا جاتا ہے کہ دانشوروں کو بھی کچھ حدُود کے اندر رہ کر ہی سوچنا چاہیے۔ یہ حدُود جو عام طور پر قائم کی جاتی ہیں، مذہب کی حدُود ہیں۔ آدمی سے کہا جاتا ہے کہ وہ غور تو ضرور کرے مگر ایک خاص مذہب کے قائم کیے ہوئے دائرے میں رہ کر۔ یہ مذہبی اُصول کسی کتاب میں درج ہوں، یا کسی مذہب کے بانی نے وضع کیے ہوں، ان سب کی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ ان پر اعتراض نہیں کیا جا سکتا اور ان کو پرکھنے کی اجازت نہیں ہوتی۔ ان شرائط کی وجہ سے جو اُلجھنیں اور تضادات پیدا ہوتے ہیں اُنھیں ہم اچھی طرح سے جانتے ہیں۔

سائنس اور سائنسی مزاج کے اس جدید

(باقی صفحہ ۱۲ پر)

گروتھ آف پلاننگ

پی۔ آر۔ دوبھاشی

سیکٹروار منصوبہ بندی

اس سے پچھلے مضمون میں مصنف نے یہ بتایا تھا کہ منصوبہ بندی کتنی طرح کی ہوتی ہے۔ یہاں وہ سیکٹروار منصوبہ بندی سے بحث کرتا ہے۔ مثلاً بنیادی، ثانوی، تیسرے درجے کی منصوبہ بندی بنیادی سامان سے متعلق منصوبہ بندی، اور بہ آمدات کو بڑھاوا دینے والی منصوبہ بندی۔ اس سلسلے میں وہ خیال ظاہر کرتا ہے کہ منصوبہ بندی مجموعی شرح ترقی اور سیکٹروار شرح ترقی کے درمیان توازن اور یکسانیت قائم کرتی ہے۔ یہی نہیں اس کے ذریعے سرمایہ کاری اور پیداوار کے درمیان توازن قائم ہوتا ہے اور بچتوں اور سرمایہ کاری، افرادی قوت اور شرح ترقی نیز پیداوار اور اشیائے صارفین کی مانگ کے درمیان بھی توازن قائم ہوتا ہے۔

منصوبہ بندی یا تو مطلوبہ مقاصد سے پیچھے کی طرف یا ترقی کے لیے دستیاب وسائل سے آگے کی طرف شروع ہو سکتی ہے۔ پہلی حالت میں منصوبہ سازوں کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ وہ مطلوبہ مقاصد انتہائی کفایت کے ساتھ اور کم سے کم وقت میں حاصل کریں، یعنی وسائل کے کم سے کم ممکنہ اخراجات کے ساتھ اور کم سے کم ممکنہ مدت میں پورے کریں۔ دوسری حالت میں منصوبہ سازوں کے سامنے مقصد یہ ہوتا ہے کہ اُن وسائل سے فائدہ اٹھا کر زیادہ سے زیادہ ممکنہ حد تک نتائج دکھائیں، جو منصوبے کی مدت میں دستیاب ہوتے ہیں۔ ترقیاتی منصوبہ وضع کرنے میں سب سے پہلے قدرتی وسائل کا سروے کر کے، ان کا پتہ لگانا پڑتا ہے اور جغرافیائی فائدوں اور اقتصادی امکانات کی روشنی میں ان کی افادیت کو پرکھا جاتا ہے۔

منصوبہ بندی کے مقاصد یا تو جامع ہو سکتے ہیں یا پھر نوعیت کے اعتبار سے محدود۔ جہاں منصوبہ بندی کا تصور محدود ہے اور جہاں مقصد صرف اتنا ہے کہ اقتصادی نظام کی خامیوں کا ازالہ کیا جا سکے، وہاں مقاصد کی نوعیت بھی محدود ہوتی ہے اور سرکاری سرمایہ کاری اور سرکاری پالیسیوں کے مخصوص پروگراموں کے ذریعے اُن مقاصد کو حاصل کیا جا سکتا ہے، جہاں مقاصد وسیع تر ہوتے ہیں وہاں ان کی نوعیت عمومی ہوتی ہے یا مجموعی حالت میں ہوتی ہے مثلاً یہ کہ قومی آمدنی میں واضح اضافہ، پیداوار، روزگار میں اضافہ یا خطّوں اور سماج کے مختلف طبقات میں مبنی بر انصاف تقسیم۔ اس کے علاوہ معیارِ زندگی بلند کرنے اور بحساب فی کس آمدنی بڑھا کر اس عمل کو بروئے کار لانے کے لیے جامع انداز کی منصوبہ بندی درکار ہوگی۔

جامع منصوبہ بندی:

جامع طرز کی ترقیاتی منصوبہ بندی بالعموم اس شرط کے ساتھ شروع ہوتی ہے کہ عوام کے معیارِ زندگی میں اضافہ لابدّ ہے۔ مجموعی طور پر یہ سطح فی کس اوسط آمدنی کی اصطلاح میں ظاہر کی جاتی ہے یعنی مجموعی قومی آمدنی کو مجموعی آبادی سے تقسیم کر کے فی کس جو آمدنی آتی ہے، وہی اس سطح کو ظاہر کرتی ہے۔ مقابلتہً اعلیٰ معیارِ زندگی کے تصور کے پیشِ نظر اُن ملکوں کے عوام کے معیارِ زندگی سے تقابلی موازنہ کیا جاتا ہے جو ترقی پذیر یا ترقی یافتہ ممالک کے زمرے میں آتے ہیں اور ان کا معیارِ زندگی مقابلے میں زیادہ ہوتا ہے یا پھر یہ مقابلہ اپنی ہی ملک کے ماضی سے کیا جاتا ہے۔ اس طرح کا موازنہ عمومی اصطلاح کی روشنی میں گمراہ کن ہو سکتا ہے کیوں کہ ایسا کرتے وقت ماحولیاتی تغیر و تبدل اور ترجیحات کے مختلف پیمانوں کو سامنے نہیں رکھا جاتا۔ قیمتوں کے تغیر و تبدل کا تو ذکر ہی کیا جس سے صرف مالی سطح پر مقابلہ ہو سکتا ہے، اور وہ اس وقت تک بے معنی ہے جب تک کہ قیمتوں کے فرق کو سامنے رکھ کر صحیح صحیح نہ کیا جائے۔ اسی طرح جنوبی ہندوستان کے گرم خطے میں کپڑوں کے محدود اخراجات سے عوام کا کمتر معیارِ زندگی ظاہر نہیں ہوتا جو کہ ٹھنڈی آب و ہوا کے خطے کے عوام سے یقیناً کم ہے۔ جگدیش بھگوتی نے صحیح صحیح نشاندہی کی ہے اور کہا ہے کہ اسکیموز کے طرزِ زندگی میں ریفریجریٹر کبھی بھی ترجیحی زمرے میں نہیں آئے گا۔ ان تمام تغیرات کو ذہن میں رکھتے ہوئے اکثر یہ کہا جاتا ہے کہ شرح ترقی کی اصطلاح میں منصوبہ بندی کے مقاصد کا تعین اقتصادی حسابات

سے زیادہ سیاسی پسند کا معاملہ ہے۔ سیاسی پسند سے بلاشبہ مُراد یہ ہے کہ وہ پسند جو عوام کی آزادی اور اُمنگوں کے اُتار چڑھاؤ پر مبنی ہو۔ لیکن عوام اپنی پسند کو معیشت کے تناسب کی اصطلاح میں مشکل ہی سے ظاہر کرتے ہیں، اور اس طرح اقتصادی ترقی کی شرح میں اضافے کے بارے میں پسند اپنی نوعیت کے اعتبار سے کسی قدر یک طرفہ ہوتی ہے۔

شرح ترقی:

شرح ترقی کے بارے میں انتخاب موجودہ کھپت اور مستقبل کی کھپت کے درمیان پسند سے تعلق رکھتا ہے۔ مقابلتہً زیادہ شرح ترقی کی قیمت موجودہ کھپت کو آگے کے لیے اٹھا رکھنے یا موجودہ خرچ کو ملتوی کر دینے کی شکل میں ادا کرنی ہوتی ہے۔ مستقبل میں اشیائے صارفین کی مقابلتہً زیادہ پیداوار سے پیدا کرنے کی اعلیٰ صلاحیت چاہتا ہے اور یہ صلاحیت موجودہ کھپت سے وسائل کو اس صلاحیت کی طرف منتقل کر دینے سے ہی پیدا ہوتی ہے۔ اسی لیے جیسا کہ بوشیت (Bauchet) نے کہا ہے سرمایہ کاری اور کھپت کے اپنے اپنے دائروں کو متعین کرنے کے لیے اشیائے صارفین کی بڑھتی ہوئی مانگ اور زیادہ مال تیار کرنے کے لیے قوم کی سرمایہ زیادہ مُہیا کرنے کی صلاحیت کے درمیان ایک توازن قائم ہونا چاہیئے۔ وسائل کی محض موافقانہ تخصیص سے ہی ترقی حاصل نہیں ہو سکتی۔ موافقانہ تخصیص سے مُراد یہ ہے کہ سرمایہ کاری کے مختلف شعبوں میں سرمایہ کاری کی آخری اکائی سے مساوی فائدہ ہو۔ سرمایہ کاری کی شرح کو برطرف رکھنا ہوگا۔ اور شرح ترقی کو منصوبہ سازی کے فیصلے میں شعوری مقام حاصل ہوگا۔ سماج کے افرادی ارکان کی طرف سے فیصلوں کے تعین کی بجائے منصوبہ سازوں کے فیصلے جگہ لیں گے۔

منصوبہ سازی کی اقتصادی حسابیات کا عمل درحقیقت شرح ترقی کی مختلف پسندیدگیوں کے ساتھ شروع ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں سب سے زیادہ معروفی طریقہ جو عام طور پر اپنایا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ منصوبہ بندی دستیاب وسائل سے ہم آہنگ ہو۔

مجموعی قومی آمدنی کی شرح ترقی کا تعین ہو جانے پر، اس کا بڑھتی ہوئی آبادی کے ساتھ موازنہ کیا جاتا ہے تاکہ فی کس آمدنی میں حقیقی اضافے کا حساب لگایا جا سکے۔

نابرابریوں میں کمی

منصوبہ بندی کے مقاصد کو محض مجموعی قومی پیداوار میں مجموعی اضافے کی اصطلاح سے ہی واضح نہیں کیا جا سکتا یا فی کس اوسط آمدنی میں اضافے سے ہی اس کی وضاحت نہیں ہو سکتی۔ منصوبے میں تقسیمی پہلوؤں کو بھی پیش نظر رکھنا ہوگا۔ اگر تمام فاضل آمدنی صرف انھیں کے حصے میں آئے جن کے پاس پہلے ہی کافی ہے، تو اس سے منصوبہ بندی کے مقاصد حاصل نہیں ہوتے۔ درحقیقت غریب ملکوں میں مالدار ملکوں کی طرح سے ہی مجموعی قومی پیداوار کی ازسرِنو تقسیم منصوبہ بندی کے اہم مقاصد میں سے ایک ہے۔ دولت کی ازسرِنو تقسیم کے مقاصد کو نابرابری کی سطحوں کی [illegible] کیا جا سکتا ہے یا مقابلتہً کم آمدنی والے طبقوں کی آمدنی میں اضافے سے ظاہر کیا جا سکتا ہے۔

آمدنی کی منصفانہ تقسیم کا ایک طریقہ یہ ہے کہ سب کے لیے نفع بخش روزگار مُہیا کیا جا سکے۔ اگرچہ مالدار ممالک میں بھی کسی نہ کسی انداز پر بے روزگاری کا سامنا ہے تاہم تمام کم ترقی یافتہ ملکوں میں کم روزگاری یا غیر واضح صورت میں بے روزگاری وہاں کا ایک پُرانا مسئلہ ہے۔ اس طرح روایتی سیکٹر (مثلاً زراعت اور دیہی صنعت) کثرتِ آبادی یا آبادی کے دباؤ سے نقصان میں بتائے جاتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں زراعت میں ایسی زائد آبادی ہے جسے الگ کیا جا سکتا ہے۔ اگر کچھ محنت کشوں کو زراعت سے ہٹا بھی لیا جائے تو ضروری نہیں کہ اس سے پیداوار گھٹ جائے۔ ماہرینِ اقتصادیات اس کی وضاحت یہ کہہ کر کرتے ہیں کہ ایسی صورت میں مزدور کی پیداوار صفر ہوتی ہے۔ اگرچہ سماج کے تمام ارکان بظاہر کسی نہ کسی سرگرمی میں مشغول نظر آتے ہیں لیکن یہ ضروری نہیں کہ وہ پوری طرح پیداواری سرگرمیاں ہوں۔

ایک ایسی صورتِ حال میں فاضل آبادی دیہات سے روزگار کی تلاش میں شہروں کو منتقل ہوتی ہے۔ شہروں میں اس فاضل آبادی سے بھیڑ بھاڑ والی گندی بستیاں بننے لگتی ہیں۔ اتفاقی مزدور نظر آتے ہیں اور چلتی پھرتی آبادی کے دیگر طبقوں اور غیر مستقل باشندوں کی بھیڑ دکھائی پڑتی ہے۔ ان کا بنیادی مقصد نفع بخش روزگار کی تلاش ہوتا ہے، اور منصوبہ بندی کے سامنے بھی یہی عنصر مقصد کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔

اس طرح منصوبہ بندی کے مقاصد کو مجموعی قومی آمدنی کی ترقی، سماج کے مقابلتہً کم آمدنی والے طبقات کے عوام کی فی کس اوسط آمدنی میں اضافے اور روزگار کے مزید مواقع کی فراہمی کی اصطلاحات سے واضح کیا جاتا ہے۔

سب کے لیے نفع بخش روزگار

بالعموم روزگار اقتصادی سرگرمیوں کا ہی ایک حصہ تصور کیا جاتا ہے۔ البتہ کسی بھی اقتصادی سرگرمی کے نتیجے میں پیدا شدہ روزگار کا انحصار اس بات پر ہے کہ اس میں کس قدر سرمائے اور کس قدر محنت کش طبقے کی کھپت ہے۔ جس قدر پیداواری ذرائع محنت کش طبقے کو کھپانے کے اہل ہوں گے، اسی قدر روزگار کے مزید مواقع دستیاب ہو سکیں گے۔ روزگار، پیداوار کے ضمن میں ایک متضاد خیال یہ ہے کہ پیداوار بڑھانے کی اہم حکمت عملی کے طور پر بے کار پڑی افرادی قوت کو نفع بخش روزگار فراہم کرانے کے خیال سے کام دلایا جائے۔ اس صورت میں روزگار کو پیداوار کا طریقہ،

عمل سمجھنے کی بجائے، محض پیداوار کو روزگار کا طریقہ عمل سمجھا جاتا ہے۔

پیداوار، آمدنی، روزگار اور ساق کی تقسیم کے مجموعی نشانے خلا میں منفرد نہیں کیے جا سکتے۔ ان کو حقیقت پسندانہ بنانے کے لیے، انھیں ماضی کی اقتصادی سرگرمیوں اور مستقبل کے متوقع رجحانات سے جوڑنا ہوگا۔ ان کی بنیاد پر ہی مستقبل کے لیے کوئی بات کہی جا سکتی ہے۔ اور یہی منصوبہ بندی کی بنیاد بن سکتی ہے۔ کسی بھی منصوبے کے لیے پیش قیاسی ایک بنیادی شرط ہے۔ اس کے ذریعے ممکنہ زیادہ سے زیادہ اور کم سے کم توسیعی حدود کا تعین ہو سکتا ہے۔

اقتصادی پیش قیاسی

جہاں کہیں معیشت پوری طرح سماج وادی نہیں ہے وہاں مستقبل کی منصوبہ بندی کے خیال سے حال کا اندازہ اور جائزہ خاص اہمیت رکھتا ہے۔ اجتماعی ملکیت پر مبنی سماج وادی معیشت میں ریاست کو ایسے اختیارات حاصل ہوتے ہیں جن کی بنیاد پر دوسروں کو مجبور کیا جا سکے۔ ان اختیارات کی مدد سے مقاصد کے تعین کے وقت ریاست کو اس کا موقع ملتا ہے کہ وہ یک بہ یک رونما ہونے والے اقتصادی رجحانات کے مقابلے میں تکنیکی پہلوؤں پر زیادہ توجہ دے جبکہ مغربی طرز کی معیشت میں حکام افراد، فرموں اور گروپوں کے موجودہ رویے کا محتاط طریقے پر مطالعہ کرتے ہیں، یہ پتہ لگاتے ہیں کہ معیشت از خود کیسے ترقی پا رہی ہے اور پھر ایک عام ڈھانچہ تشکیل دیتے ہیں، اس کے بعد ہی وہ منصوبے کی تشکیل کرتے ہیں۔ یک بہ یک رونما ہونے والے اقتصادی رویے کی پیش قیاسی اور اس کا تجزیہ مغربی ملکوں میں منصوبہ بندی کے لیے بیحد اہم سمجھا جاتا ہے۔ ہالینڈ اور فرانس کی پیش قیاسیاں اس کی امتیازی مثالیں ہیں۔ فرانس میں یہ تجزیے اور پیش قیاسیاں تکنیکی اور اقتصادی موضوعات پر مختلف النوع معلومات بہم پہنچاتی ہیں۔ اس عمل میں ممکنہ ترقی کی اقتصادی پیش قیاسی کا خاص خیال رکھا جاتا ہے۔ منصوبہ بناتے وقت اس کو بنیاد سمجھا جاتا ہے۔ منصوبہ بنانے کے لیے عام نوعیت کی ہدایات ہوتی ہیں اور ان کی مدد سے ایک ایسا ڈھانچہ وضع ہو جاتا ہے جس میں جدید طرز کے کمیشنوں کو اپنی کوششوں کو دکھانے کا موقع ہوتا ہے تاکہ منصوبے کو مربوط کیا جا سکے۔

منصوبہ بندی کے سیکٹر

مجموعی شرح ترقی سے یا مجموعی قومی پیداوار کی شرح ترقی سے، معیشت کے مختلف سیکٹروں اور شعبوں کے لیے اور بالآخر مختلف اشیا اور خدمات کے لیے ضمنی اور ثانوی شرح ترقی کا اخذ کرنا ضروری ہوتا ہے۔ پروفیسر کولن کلارک کے مشورے کی رو سے معیشت کو تین اہم سیکٹروں میں بانٹا جا سکتا ہے، بنیادی، ثانوی اور تیسرے درجے کی۔ لیکن یہ تقسیم بھی موٹے طور پر کی گئی ہے اور منصوبہ سازوں کو معیشت کو مزید ذیلی زمروں میں تقسیم کرنا پڑتا ہے اور ہر شعبے کی ترقی کی شرح کو زیادہ تفصیل سے مرتب کرنا ہوتا ہے۔ اس لیے بنیادی سیکٹر کی معیشت کو زراعت، کان کنی، جنگل بانی، مویشی پروری، باغبانی اور ماہی گیری میں بانٹنا پڑتا ہے۔ مینو فیکچرنگ سیکٹر کو بڑی صنعتوں، چھوٹے پیمانے کی صنعتوں، گھریلو صنعتوں، زرعی خام مال پر مبنی صنعتوں، اشیائے صارفین سے متعلق صنعتوں، مشین کی تیاری سے متعلق صنعتوں، بنیادی صنعتوں وغیرہ میں بانٹنا پڑتا ہے۔ اسی طرح تیسرے درجے کی معیشت کو تجارت، ٹرانسپورٹ، بنکنگ، بیمہ وغیرہ میں بانٹنا پڑتا ہے۔ ان کے علاوہ بنیادی نوعیت کے سیکٹر میں سڑکیں، صحت تعلیم آبرسانی، بجلی وغیرہ کے شعبے آ گئے ہیں۔

گھریلو معیشت کے علاوہ جسے مختلف شعبوں میں تقسیم کیا جاتا ہے، ماہرین منصوبہ بندی برآمدات کو ایک الگ شعبہ مانتے ہیں۔

ان میں سے کچھ سیکٹر نمایاں اور پیش پیش رہنے والے گوشے ہوتے ہیں اور دوسرے شعبے ان کے پیچھے چلنے والے۔ پیش پیش رہنے والے سیکٹروں میں شرح ترقی مجموعی شرح ترقی سے زیادہ ہوگی جب کہ پیچھے چلنے والے سیکٹروں میں یہ قدرے کم ہوگی۔ اب یہ سوال کہ کون سا سیکٹر پیش پیش ہو اور کون سا سیکٹر پیچھے رہے، وہ ہر سیکٹر کے اپنے امکانات پر منحصر ہوگا۔

یہ سیکٹر ایک دوسرے سے یا بحیثیت مجموعی معیشت سے آزاد بھی نہیں ہوں گے۔ مختلف سیکٹروں کے درمیان یا تو صنعتی تعلق یا اقتصادی تعلق ہوتا ہے۔ اس طرح زراعت صنعت اور تجارت کے لیے بنیادی سامان فراہم کرتی ہے۔ جبکہ صنعت اور تجارت زراعت کے لیے اس کی ضرورتیں پوری کرتے ہیں۔ ہر سیکٹر کی شرح ترقی چند مخصوص بنیادی اشیا پر منحصر ہے جو کہ دیگر معاشی شعبوں کی پیداوار ہیں۔

پیداوار اور بنیادی اشیا سے متعلق گوشوارے

منصوبہ ساز مختلف سیکٹروں کی شرح ترقی کی مجموعی تصویر پیداوار اور بنیادی اشیا سے متعلق گوشواروں کی شکل میں پیش کرتے ہیں جس میں اُفقی کالم معیشت کے دیگر شعبوں میں مدد دینے والے سیکٹر کی پیداوار ظاہر کرتا ہے جبکہ عمودی کالم اُس سیکٹر کی بنیادی اشیا کو واضح کرتا ہے۔

اقتصادی منصوبہ بندی کے لیے اس طرح کا گوشوارہ بنیادی ضرورت ہے۔ اس کے ذریعے منصوبہ بندی میں یکساں روی اور استقامت آتی ہے۔ ان گوشواروں کی تفاصیل کی عدم موجودگی میں الگ سے ہر ایک سیکٹر کے لیے مقرر کردہ شرح ترقی حاصل نہیں ہو سکتی کیوں کہ انھیں مختلف بنیادی اشیا کی کمی کا سامنا کرنا ہوگا۔

سیکٹر وار پیداواری نشانے، سیکٹر وار سرمایہ کاری

کا ڈھانچہ بھی فراہم کرتے ہیں۔ بین شعبہ جاتی، سرمایہ کاریوں کا ڈھانچہ منصوبہ بندی کی ترجیحات کو واضح کرتا ہے۔ اسی طرح صنعت اور تجارت کے مقابلے زراعت کے لیے قابل سرمایہ کاری وسائل کی مقابلتہً زیادہ تخصیص سے یہ واضح ہوتا ہے کہ زراعت کو زیادہ ترجیح دی گئی ہے۔ لیکن یہ منصوبہ بندی کی ترجیحات کو سمجھنے کا صحیح نظریہ اور طریقہ نہیں ہوگا۔ سب سے پہلی بات تو یہ کہ سرمایہ کاری کے ڈھانچے کو بحیثیت مجموعی معیشت کے ساتھ اس کا مقابلہ کرنا ہوگا۔ مزید برآں اگر ترجیح کے تصور سے، معاشی شعبوں کے درمیان مقابلہ کی بنیاد پر بین صنعتی، تعلق واضح ہوتا ہے تو پیداوار اور بنیادی اشیا کے گوشواروں سے یہ واضح ہوتا ہے کہ ایک شعبے کی ضرورتیں دوسرے شعبے کی مدد سے پوری ہوسکتی ہیں نیز اس سے بین شعبہ جاتی نشانوں کے درمیان استقامت کو یقینی بنانے کی ضرورت واضح ہوجاتی ہے۔

پیداواری نظام میں اندرونی استقامت لانا ہی ضروری نہیں بلکہ سامان اور سروسوں کی حتمی ترتیب میں بھی استواری لانا ضروری ہے۔ اس کے ساتھ ہی صارفین کی مانگ کے ڈھانچے میں بھی یک رنگی لانے کی ضرورت ہے۔ پیداواری نظام سے صارفین کی آمدنیاں ظہور میں آتی ہیں۔ لیکن مختلف اشیاء اور خدمات کے لیے صارفین کی مانگ صارفین کی پسند والا معاملہ ہے۔ ایک ایسے اقتصادی نظام میں جہاں کہ قیمتیں مانگ اور رسد کی قوتوں کا باہمی رشتہ واضح کرتی ہوں، وہاں صارفین کی مانگوں کے ڈھانچے اور پیداوار کے ڈھانچے کے درمیان کسی بھی طرح کا عدم تعادل اشیا کی رسد میں کمی اور ان کی قیمتوں میں اضافے کا موجب بن سکتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی زیادہ فراہم ہونے والی اشیاء کی قیمتیں گھٹ سکتی ہیں۔ جہاں منصوبہ سازوں کی طرف سے قیمتیں مقرر کردی جائیں، وہاں اس عدم توازن کا اظہار اشیا کی نایابی کی صورت میں ہوسکتا ہے۔ چنانچہ کم پیدا ہونے والی اشیاء نایاب ہوجائیں گی اور زیادہ پیدا ہونے والی اشیاء کا فاضل سٹاک بن جائے گا۔ ہر دو حالتوں میں منصوبے کے نشانوں پر نظرثانی ضروری ہوجاتی ہے۔

اگرچہ منصوبہ بندی میں پیداوار اور مانگ کے ڈھانچے میں مدادمت کا ہونا ضروری ہے گویا کہ اس کا مقصد مانگ کے ڈھانچے میں تبدیلی لانا ہوسکتا ہے تاکہ غریب طبقے کی قوت خرید بڑھ سکے اور انفرادی اور اجتماعی کھپت کے لیے سامان کی مانگ میں اضافہ ہوسکے اور عوامی کھپت کی اشیا مثلاً خوراک، کپڑا اور سماجی خدمات جیسا کہ تعلیم، صحت، محنت کش طبقے کے لیے مکانات اور بہبود سے متعلق مختلف پروگراموں کی رفتار بڑھ سکے۔ مجموعی قومی آمدنی کے تحویلات اس کے حجم کے مقابلے زیادہ اہم ہیں۔ پانچویں منصوبے میں یہی حکمت عملی اپنائی گئی اور اس سے غریبی کے خلاف براہ راست حملہ کیا گیا۔ مانگ کی ازسرنو جزبندی، روزگار پیدا کرنے والی سرمایہ کاری اور محنت کش طبقے کو کھپانے والی سرگرمیوں کے ذریعے عمل میں آتی ہے۔

سرمایے کے وسائل

ترقیاتی نشانے منصوبہ بندی کے لیے دستیاب رقوم، افرادی قوت اور قدرتی وسائل کے ساتھ ہم آہنگ ہونے چاہئیں۔ ایک اہم وسیلہ ہے، سرمایہ۔ ایک بار پیداواری نشانے متعین ہو جانے کے بعد، منصوبے کے لیے، سرمائے کی صورت میں درکار وسائل سرمایہ اور پیداوار کے تناسب کی بنیاد پر محسوب ہو سکتے ہیں۔ یہ اقتصادی منصوبہ بندی کا جانا پہچانا معیار ہے البتہ بہت سے ماہرین اقتصادیات نے سرمایہ و پیداوار کے تناسب کے استحکام پر شبہ ظاہر کیا ہے، اور اقتصادی منصوبہ بندی کے موزوں ذریعے کے طور پر اس کی افادیت کو مشتبہ نگاہوں سے دیکھا ہے۔ اس کے علاوہ سرمایہ و پیداوار کے تناسب کو بنیادی کلائی نہیں سمجھا جاسکتا۔ پلان کی پالیسی کے تحت جانی بوجھی اور سوچی سمجھی انتخاب کے ذریعے یہ بدلا جاسکتا ہے اور اس طرح پیداوار تکنیک کے تحت بھی بدلا جاسکتا ہے۔

سرمایہ کی کھپت والی ٹکنالوجی مقابلتہً زیادہ پیداوار کے تناسب کی متقاضی ہے، جبکہ محنت کش طبقے کی کھپت والی سوچی سمجھی پالیسی مقابلتہً سرمایہ و پیداوار کے تناسب کا جواز پیش کرتی۔ یہ کہا جاسکتا ہے کہ بحیثیت مجموعی معیشت کے سرمایہ و پیداوار کا کوئی تناسب نہیں ہوسکتا، ہی یہ پورے منصوبے کے عرصے کے لیے مستحکم ہو سکے۔ تناسب کے استعمال سے متعلق ان مختلف حدشنایہ کے باوجود عملاً یہ اقتصادی ترقیاتی منصوبے کے سرمایہ کی ضرورت کا اندازہ لگانے کا ایک مفید ذریعہ رہا ہے۔ سرمایہ۔ پیداوار کا موزوں تناسب منحصر اس بات پر منحصر ہے کہ پیداوار کے موجودہ ذرائع ہیں ملک زیادہ سرمایہ والی اور محنت کش طبقے کی زیادہ تعداد کو کھپانے والی پیداواری تکنیک کو بڑھاوا دینے والی پالیسیوں پر منحصر ہے کم ترقی یافتہ ملکوں جہاں سرمایہ کم ہے اور افرادی قوت بے کار پڑی ہے وہاں جدیدیت کے نام پر سرمایہ کی کھپت والی تکنیک کا اپنانا قطعی غیر موزوں ہے۔ وہاں متوسط یا محنت کش طبقے کو کام دلانے والی تکنیک کا اپنانا زیادہ موزوں رہے گا۔

بچت کی شرح:-

منصوبے کے لیے سرمایہ کاری کے نشانوں کی تکمیل کے واسطے سرمائے کی ضروریات معیشت سے ہی پوری کی جاتی ہوتی ہیں۔ اس لیے بچت کی شرح سے ان کا تناسب ہونا ضروری ہے۔ بچت کا ... آمدنی اور بچت کرنے کے رجحان سے ہے۔ اگر بچت سے سرمایہ کی ضرورتیں پوری نہیں ہو پاتیں تو یا تو منصوبے کے اخراجات میں کمی کرنی ہوگی یا رغبت دلا کر بچت کو بڑھانا ہوگا یا پھر گھریلو بچتوں کو غیر ملکی امداد کی مدد سے بڑھانا ہوگا۔ آمدنی کی تقسیم نے بچتوں کے

قیمت بڑھائی جا سکتی ہے۔ صارفین کی ترجیحات پر
نا انداز ہے کہ بھی بچتوں میں اضافہ ہو سکتا ہے بشرطیکہ
شرح بڑھا کر بھی بچتوں میں اضافہ کیا جا سکتا ہے
بت کی رغبت کا جواب خرچ کرنے کے میلان سے
ا ہوتا ہے۔ جبکہ عوام کی کھپت کا معیار پہلے ہی کم ہے۔
بچت کی گنجائش کم ہے۔ اس لیے زیادہ خوشحال
لوگوں پر وسائل کو جمع کرنے کی ذمہ داری آتی ہے لیکن
یں کہ ان کی تعداد کم ہوتی ہے، لہٰذا غریب ملکوں میں
سرمایہ کی تشکیل بہت محدود پیمانے پر ہو سکتی ہے۔
ن کا خرچ کرنے کا معیار پہلے ہی بہت کم ہے، اگر
ن پر بچت کے لیے دباؤ ڈالا جائے گا تو اس سے
ناؤ پیدا ہوگا اور یہ جھگڑے کا سبب بنے گا ترقیاتی
روگراموں کو آگے بڑھانے والا منصوبہ افراد کی
بنیادی ضروریات اور عوام کی روزمرہ کے استعمال میں
آنے والی اشیاء کی تکمیل سے ہم آہنگ ہونا چاہیے۔
کھپت کے معیار میں فوری اضافہ کی اُمید بذاتِ خود
منصوبے کی کوششوں کو آگے بڑھانے کا ذریعہ بن سکتی
ہے۔ عوام کی بڑھتی ہوئی امیدوں کے عزم کے سبب
کھپت اور بچت میں رسہ کشی کو اور بڑھاوا ملا ہے۔
یک نظام کُلی کے تحت آنے والی معیشت میں جبری
بچت کا امکان ہو سکتا ہے لیکن یہاں بھی صارفین مختلف
صورتوں میں مزاحمت کریں گے۔ جمہوری منصوبہ بندی
میں منصوبہ سازوں کو ڈبلیو اے تھو لیوس کے اس
مشورے پر عمل کرتے ہوئے زیادہ ترقی کے جوش کو
روکنا پڑے گا کہ صدیوں کی کمیاں ایک دہائی میں دور
نہیں ہو سکتیں۔

افرادی قوت

منصوبہ بندی میں افرادی قوت درکار ہوتی ہے
درخاص کر تربیت یافتہ افرادی قوت کی ضرورت پڑتی ہے
مختلف سیکٹروں کے لیے افرادی قوت کا بجٹ تیار
کرنا ہوگا اور حسب ضرورت افرادی قوت کی مانگ
کے مطابق تعلیمی بنیادی ڈھانچہ مضبوط کرنا ہوگا۔ اس
کے لیے طویل المدتی منصوبہ بندی درکار ہے۔ مختلف
برسوں کی تخمینہ افرادی قوت کی ضروریات بہت

پہلے واضح کر دینی ہوں گی اور پھر اس کی تکمیل کے لیے
ضروری پیشگی اقدامات کرنے ہوں گے۔

اس لیے مجموعی طور پر شرحِ ترقی اور سیکٹروار
شرحِ ترقی کے درمیان ہم آہنگی ضروری ہے اور اسی
طرح سرمایہ کاری اور پیداوار، بچت اور سرمایہ کاری
افرادی قوت اور شرحِ ترقی نیز پیداوار اور صارفین
کی مانگ کے درمیان توازن کا قائم ہونا ضروری ہے۔

منڈی کی معیشت میں اشیاء کی قیمتوں کے ذریعے
باہمی توازن قائم کیا جاتا ہے۔ منصوبہ بند معیشت
میں اسے بنیادی سامان کی کھپت اور اس سے حاصل
ہونے والی پیداوار کے گوشواروں کی تکنیک وغیرہ کے
ذریعے حاصل کیا جاتا ہے۔ لہٰذا منصوبہ بندی کو بجا طور پر سلسلہ وار
قریبی اندازوں کا عمل کہا گیا ہے۔ اگر منصوبہ سازوں کو اشیاء کی
قیمتیں اشارہ فراہم کرتی ہیں تو اس منصوبے پر حقیقت پسندانہ طور پر نظرثانی
کی جا سکتی ہے۔ منصوبہ محض شرحِ ترقی، بنیادی اشیاء کی کھپت
اور پھر اس سے حاصل ہونے والی پیداوار کے گوشواروں
مادی تقاضاجات، بچتوں اور افرادی قوت کے
اعداد و شمار وغیرہ کا نام نہیں ہے اقتصادی حسابیات
کی مشق بھی نہیں بلکہ یہ ان اقدامات کا نام ہے جو
اس بات کو یقینی بناتے ہیں کہ شرحِ ترقی اور مطلوبہ
نشانے وغیرہ پایۂ تکمیل کو پہونچیں گے۔ اگر معیشت
تمام تر سماج وادی نہیں ہے تو یہ اور بھی ضروری ہے
کیونکہ نشانوں کی تکمیل نجی صنعت کاروں کے رضا
کارانہ فیصلوں پر منحصر ہوتی ہے۔ زراعت کے شعبے
میں نجی صنعت کار ہزار ہا چھوٹے کسانوں پر مشتمل
ہوتے ہیں، منصوبہ سازی کے حکام کو پیداوار کے
چھوٹے یونٹوں کے طریقِ کار پر اثر انداز ہونا ضروری
ہوتا ہے۔ چنانچہ منصوبے میں ایسے بہت سے اقدامات
ہوتے ہیں جن سے منصوبے کے نشانے مکمل کیے جا
سکیں۔ یہ اقدامات ادارہ جاتی، مالی، لین دین اور
عملی ضرورتوں میں روبہ عمل لائے جاتے ہیں۔

سیکٹروار نشانے اوران کا انتخاب

سیکٹروار نشانے متعین کر دینے سے ہی منصوبہ
مکمل نہیں ہوتا۔ ان کو مختلف اشیاء کے ضمن میں بانٹنا

پڑتا ہے۔ ان کی تکنیکی اور اقتصادی مضبوطی کو جانچنا
ہوتا ہے اور ہر پراجیکٹ پر اپنے حساب سے غور
کرنا ہوتا ہے۔ لیکن ہر شعبے کے ضمن میں تفصیلی منصوبہ
بندی کی کوئی حد ہوگی۔ اس لیے انتخاب کا
عمل ناگزیر ہے، بوشیٹ نے کہا ہے کہ بنیادی
اشیاء اور سروسوں نیز تیار مال کی بے شمار اقسام
کے درمیان فرق کرنا پڑے گا اور ان کے بیچ حدِ
فاصل قائم کرنی ہوگی۔ اول الذکر زمرے کے
پروگراموں کو ترقیاتی مقاصد کو خطرے میں ڈال کر
پلان کی اسکیموں کو بروئے کار لانا ہوتا ہے جب کہ
موخر الذکر کے لیے کچھ لچک ممکن ہے بلکہ پسندیدہ
بھی۔ یہاں اشیاء کی تیاری میں ردّ و بدل ممکن ہے
یہ تبدیلی قیمتوں کے رُجحانات اور صارفین کے
رجحانات کی روشنی میں عمل میں لائی جا سکتی ہے۔
اول الذکر زمرے میں بجلی، لوہا، فولاد، کوئلہ، سمنٹ،
کھیتی باڑی کے آلات، ٹرانسپورٹ وغیرہ آتے ہیں۔

یہ دیکھا گیا ہے کہ منصوبے اگرچہ پراجیکٹوں کے
لیے درکار بنیادی سامان اور پھر اُن سے حاصل ہونے
والی پیداوار کے گوشواروں وغیرہ کو سامنے رکھ کر
بنائے جاتے ہیں لیکن مضبوط اور ٹھوس پراجیکٹوں
کی تیاری پر دھیان نہیں دیا جاتا۔ اس کے نتیجے میں
منصوبہ محض احتیاطی بن کر رہ جاتا ہے۔ اس پر
اعتماد کی گنجائش کم ہی رہ جاتی ہے کیونکہ اس کے
مبادیات جن پر اس منصوبے کی عمارت کھڑی کی گئی
ہے، بذاتِ خود مشتبہ ہوتے ہیں۔ اسی لیے سامان
کی کھپت اور پھر اس سے حاصل ہونے والی پیداوار اور
اسی طرح بچتوں کا رجحان ان سب کی بنیاد محض قیاس
پر ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ منصوبے حقیقت سے
دور ہوتے ہیں۔ کسی بھی صورت میں ٹھوس پراجیکٹوں
کے بغیر منصوبے عملی صورت میں اپنا اثر نہیں دکھا
سکتے۔ اس لیے یہ مشورہ دیا جاتا ہے کہ منصوبہ سازی
کا طریقِ کار ایسے ٹھوس پراجیکٹوں پر مبنی ہونا چاہیے
جو تکنیک اور مادیات کے اعتبار سے مستحکم ہوں۔
حقیقت سے دور مجموعی اندازے (باقی صفحہ پر)

ریکھا شرما

بے زمین مزدوروں کے لیے مکان

بیس نکاتی پروگرام کی ایک مُفید اِسکیم

وزیراعظم شریمتی اندرا گاندھی کے طے کردہ بیس نکاتی پروگرام کی ایک مد یہ ہے کہ جن دیہاتی کنبوں کے پاس مکان بنانے کے لیے جگہ نہیں ہے انھیں قطعے الاٹ کیے جائیں اور مکان تعمیر کرنے کے لیے انھیں مالی امداد مہیا کی جائے۔

اصل میں یہ اسکیم اکتوبر ۱۹۷۱ء میں شروع کی گئی تھی تاکہ دیہات میں رہنے والے غریب لوگوں کی حالت کو سدھارا جاسکے۔ اسکیم یہ تھی کہ جن کھیت مزدوروں کے پاس زمین نہیں ہے انھیں مکان بنانے کے لیے زمین دی جائے۔ اس کے تحت ریاستی سرکاروں اور مرکزی انتظام والے علاقوں کو گرانٹ کی شکل میں سو فیصد امداد دی گئی تھی تاکہ جہاں کہیں ضروری ہو اس کام کے لیے زمین حاصل کی جاسکے اور اس زمین کو سدھارنے کے لیے ڈیڑھ سو روپیہ فی قطعہ تک کا خرچہ دیا گیا تھا۔

چوتھے پانچسالہ پلان تک تو اس اسکیم کی دیکھ بھال مرکزی سرکار کرتی رہی۔ بعد ازاں اسے ریاستوں کے حوالے کردیا گیا اور جولائی ۱۹۷۵ء سے بیس نکاتی پروگرام میں شامل کرلیا گیا۔

اب مقصد یہ ہے کہ چھٹے پانچسالہ پلان کے آخر تک یعنی ۱۹۸۵ء تک تمام بے زمین کسانوں کو سر چھپانے کے لیے جگہ مل جائے۔ اس مقصد کو پورا کرنے کے لیے ۶۸ لاکھ کنبوں کو قطعات زمین الاٹ کرنے ہوں گے۔ اس اسکیم کی رو سے ۳۶ لاکھ کنبوں کو مکان تعمیر کرنے کے لیے مالی امداد بھی دی جاتی ہے تاکہ وہ اپنی محنت سے اپنا مکان تعمیر کرلیں۔ اپنی وسعت کے اعتبار سے یہ ایک بے مثال پروگرام ہے۔

مکان بنانے کے لیے جو قطعے دیے جائیں گے وہ زیادہ سے زیادہ ایک سو مربع گز رقبے کے ہوں گے۔ لیکن ریاستی سرکاروں کو ہدایت کی گئی ہے کہ ایک ایکڑ زمین سے چوبیس سے زیادہ قطعے نہ کاٹے جائیں۔ ۱۹۷۵ء کی ایک سفارش کے مطابق زمین کو صاف کرنے اور سدھارنے کا خرچ بڑھا کر میدانی علاقوں میں ۳۰۰ روپے اور پہاڑی علاقوں میں ۵۰۰ روپے کردیا گیا ہے۔ زمین کو سدھارنے کا مطلب یہ ہے کہ اسے ہموار کرکے قطعے کاٹنا اور کچی سڑکیں اور نالیاں تعمیر کرنا۔

یہ دیکھنا ریاستی سرکاروں کا کام ہے کہ مختلف فرقوں، ذاتوں اور مذہبوں کے بے زمین کسانوں کو جب قطعے الاٹ کیے جائیں تو اس ڈھنگ سے کیے جائیں کہ ان کی معاشرتی اور اقتصادی زندگی میں یگانگت اور یکجہتی پیدا ہو اور ایسا نہ ہو کہ نچلے درجے ذاتوں اور نیچے درجے قبیلوں کے افراد کو دوسروں سے الگ تھلگ کردیا جائے انھیں جابجا دوسری ذاتوں اور فرقوں کے افراد کے بیچ میں جگہ دی جائے۔ اس سلسلے میں ریاستی سرکاروں سے درخواست کی گئی ہے کہ پرچی نکال کر زمین الاٹ کی جائے۔

اسکیم کو اٹھارہ ریاستوں اور ۶ یونین والے علاقوں میں عملی جامہ پہنایا جارہا ہے۔ منی پور، میگھالیہ، ناگالینڈ، سکم، اروناچل پردیش، لکشدیپ اور مزورم کی سرکاروں نے رپورٹ دی ہے کہ ان کے ہاں دیہاتی علاقوں میں اس قسم کا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔

اسکیم کو اور زیادہ وسعت دیتے ہوئے طے کیا گیا تھا کہ الاٹ شدہ زمین پر مکان یا جھونپڑا کھڑا کرنے کے لیے فی کنبہ پانچ سو روپے کی مالی امداد دی جائے تاکہ اس سے لوگ مقامی عمارتی سامان خرید سکیں۔ لیکن تعمیر کے لیے محنت مزدوری کنبے کو خود کرنی ہوگی۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا اتنی رقم سے تعمیر کے لیے سامان خریدا جاسکتا ہے۔ بغور دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ یہ امدادی رقم بالکل ناکافی ہے۔ چنانچہ تجویز کیا گیا ہے کہ امدادی رقم ایک ہزار روپیہ فی کنبہ دی جائے۔ یعنی ۵۰۰ روپے کی امداد تو ریاستی سرکار دے اور ۵۰۰ روپیہ ہی مرکزی سرکار دیا کرے۔ ۵۰۰ روپے کی محنت مزدوری کنبے کے افراد کو خود کرنی ہوگی۔ یہ ہوا ۱۵۰۰ روپیہ۔ اس ۱۵۰۰ کے ساتھ مزید ۱۵۰۰ روپے کی مالی امداد قرض کی صورت میں بینکوں سے دلوائی جائے گی۔ اس طرح ایک بے زمین کنبہ ۳۰۰۰ روپے کے خرچ سے اپنا مکان یا جھونپڑا تعمیر کرسکے گا۔ ممکن ہے بعض ریاستوں میں یہ رقم بھی کم رہے مگر دیکھنے والی بات یہ ہے کہ ہم فائدہ کس کو پہنچا رہے ہیں۔ کیا دیہات کے ایسے بے زمین مزدور کو جو قرض کے

ادائیگی کے لیے کوئی بچت نہیں کر پاتا۔ کبھی وجہ ہے کہ بینکوں سے مزید قرض دلوانا ممکن نہ ہو سکے گا اور مزدوروں کو گھر نہیں تو گھروندہ پر ہی اکتفا کرنا ہوگی۔ یہ اسکیم آجکل پلاننگ کمیشن کے زیرِ غور ہے

قطعاتِ زمین الاٹ کرنے اور مالی امداد مہیا کرنے کی دو اسکیموں پر یکساں رفتار سے عمل درآمد نہیں ہوا ہے۔ آٹھ اسٹیٹوں نے بچھتر فیصدی نشانے پورے کر لیے ہیں اور اُمید ہے کہ وہ جہاں تک زمین کی الاٹمنٹ کا سوال ہے، پلان ختم ہونے تک باقیماندہ نشانے بھی پورے کر لیں گی۔ ان اسٹیٹوں کے نام ہیں۔ آندھرا پردیش (۹۰٫۲ فیصدی)، گجرات (۸۸٫۵ فیصدی)، ہریانہ (۹۰٫۴ فیصدی)، ہماچل پردیش (۹۹٫۷ فیصدی)، کرناٹک (۹۳٫۵ فیصدی)، مدھیہ پردیش (۸۰٫۵ فیصدی)، تامل ناڈو (۸۰٫۸ فیصدی) اور مغربی بنگال (۸۶٫۸ فیصدی)۔ کہتے ہیں کہ پانچ ریاستیں اپنے نشانے پوری طرح مکمل کر چکی ہیں اور وہ یہ ہیں:۔

مہاراشٹر، پنجاب، راجستھان، تریپورہ اور اُتر پردیش۔ بعض ریاستوں کی کارکردگی ۵۰ فیصدی سے بھی کم رہی ہے اور خیال نہیں کہ وہ اپنے نشانے پورے کر پائیں گی۔ ایسی ریاستوں کے نام ہیں:۔

آسام (۱۶٫۴۶ فیصدی)، بہار (۳۹٫۴۶ فیصدی)، جموں و کشمیر (۳۲٫۳۵ فیصدی)، کیرالہ (۲۲٫۲ فیصدی) اور اُڑیسہ (۴۴٫۴ فیصدی)

جہاں تک تعمیری امداد کی اسکیم کا تعلق ہے جس کی رُو سے مستحق کنبوں میں سے ۲۵ فیصدی کنبوں کو مالی امداد مہیا کی جاتی ہے، چھ ریاستیں اپنے نشانے پورے کر چکی ہیں۔ ان کے نام ہیں: آندھرا پردیش (۲۶٫۳۹ فیصدی)، گجرات (۴۲٫۷۰ فیصدی)، ہماچل پردیش (۶۲٫۴۸ فیصدی)، کرناٹک (۲۸٫۳۷ فیصدی)، مغربی بنگال (۴۳٫۳ فیصدی) اور مہاراشٹر۔ جو اسٹیٹیں اس معاملے میں بیحد پچھڑتی رہی ہیں وہ یہ ہیں: بہار (۲٫۰۸ فیصدی)، آسام (۸ فیصدی)، ہریانہ (۹٫۶ فیصدی)، جموں و کشمیر (۶ فیصدی)، اُڑیسہ (۳ فیصدی) اور تامل ناڈو (۰ فیصدی)

پلاننگ کمیشن کے تخمینوں کے مطابق پلان کے آخری دو برسوں میں مزید ۳۴ لاکھ ۳۰ ہزار کنبوں کو مکان بنانے کے لیے قطعے الاٹ کرنے ہوں گے اور ۲۲ لاکھ کنبوں کو مالی امداد بھی مہیا کرنی ہوں گی۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ کارکردگی کی رفتار بہت بڑھانی ہوگی اور روپیہ بھی زیادہ فراہم کرنا ہوگا۔

سوال ہے کہ مستحق کنبہ کونسا کہلائے گا؟ اس ضمن میں مستحق کنبے کی تعریف یوں کی گئی ہے کہ:

۱۔ گاؤں میں یا دیہاتی علاقوں میں کنبے کے سربراہ یا کسی اور رُکن کے پاس زرعی یا دوسری کسی طرح کی بھی زمین نہ ہو۔

۲۔ کنبے کا گزارہ محنت مزدوری کر کے چلتا ہو

۳۔ کنبے کے افراد سال کا بیشتر حصہ گاؤں میں یا دیہاتی علاقے میں گزارتے ہوں۔

مستحق کنبوں کی تعداد کا اندازہ ریاستی سرکاروں نے لگا رکھا ہے۔ جولائی ۱۹۸۳ء میں تعمیراتِ مکانات کے وزیروں کی جو کانفرنس سرینگر میں ہوئی تھی اُس نے سفارش کی تھی کہ بے زمین مزدور کی اصطلاح میں ایسے دستکاروں، ماہی گیروں وغیرہ کو بھی شامل کر لیا جائے جن کے پاس مکان بنانے کے لیے زمین نہ ہو یا اور کسی طرح کی بھی زمین نہ ہو۔ خیال کیا گیا تھا کہ یہ لوگ بھی دیہاتی آبادی کا ایک اٹوٹ حصہ ہیں۔ یہ سفارش منظور کر لی گئی تھی۔

مندرجہ بالا اسکیم اپنی جگہ واقعی قابلِ تعریف اسکیم ہے اور اس پر جا بجا عمل درآمد بھی ہوا ہے مگر اکثر یہ شکایت بھی سننے میں آئی ہے کہ مکان بنانے کے لیے زمین تو الاٹ کر دی گئی لیکن صفائی اور حوائجِ ضروریہ سے فارغ ہونے کے لیے غسل خانوں اور بیت الخلاء کا کوئی معقول بندوبست نہیں کیا گیا۔ اس خامی کی طرف توجہ دینے کی بیحد ضرورت ہے۔ اس سلسلے میں گاؤں پنچایتوں کو چاہیئے کہ وہ افراد کی رہنمائی کریں صفائی کی کم خرچ اسکیموں کے لیے بھی بینکوں سے قرضہ دلوایا جا سکتا ہے کیونکہ صفائی اور گندے پانی کا نکاس دو بڑے اہم مسئلے ہیں۔ ان مسئلوں کے حل کی طرف توجہ دینا لازم ہو گیا ہے۔

●

بقیہ: ماحول کا تحفظ
وقت کی اہم ترین ضرورت

مارچ ۱۹۸۱ء میں فضائی آلودگی سے بچنے کے لیے ایک ایکٹ پاس کیا گیا۔ آبی آلودگی کی روک تھام سے متعلق مرکزی بورڈ کو اس کی عمل آوری کی ذمہ داری سونپی گئی ہے۔ یہ بورڈ ۱۹۷۴ء میں ہی قائم کر دیا گیا تھا۔ سماجی جنگلات کے پروگراموں کے تحت پودوں کے تحفظ اور شجر کاری کی اسکیموں کو آگے بڑھایا جا رہا ہے۔ اراضی اور جنگلات کے تحفظ کے لیے جنگل بانی کی ضرورت و اہمیت کو تسلیم کیا جا چکا ہے اور ریاستی سرکاریں اس سلسلے میں ضروری اقدامات کر رہی ہیں۔ شہروں اور دیہات میں ماحول کو صاف ستھرا اپنانے کے لیے شعور پیدا کرنے کی مزید ضرورت محسوس کی جا رہی ہے۔

مختصراً یہ کہ یہی اقدامات اس عظیم مسئلے کے حل میں خشتِ اول کی حیثیت رکھتے ہیں۔ البتہ اس کے تئیں جس قدر سیاسی سطح پہ بیداری آ چکی ہے اس کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اُمید کی جا سکتی ہے کہ مستقبل میں ان مسائل کا خاطر خواہ حل تلاش کیا جا سکے گا۔

●

گلناز بانو

بوٹ پالش

"کیا سوچا تم نے ؟" میرے ساتھ چلنے کے لیے تیار ہونا؟ اچانک اس کے کانوں میں آواز آئی۔ اُس نے جوتا پالش کرتے ہوئے اپنا چہرہ اُوپر اٹھایا اور حقارت بھری نگاہوں سے اُسے دیکھتا ہوا بولا "نہیں مجھے نہیں جانا ہے تمہارے ساتھ۔ تم کیا سمجھتے ہو مَیں تمھارے بہکاوے میں آکر چوری ڈکیتی اور قتل و غارتگری شروع کر دوں گا۔ تم آخر روز کیوں پوچھتے ہو مجھ سے۔ میں نے ایک بار نہیں ہزار بار کہا ہے تم سے کہ مَیں نہیں جاؤں گا، نہیں جاؤں گا۔"

"سوچ لو۔ اس دنیا میں دولت اور طاقت کی ہی پوجا ہوتی ہے۔ جس کے پاس یہ دو نوں چیزیں ہیں اُسے دنیا کی ساری سہولتیں اور آسائشیں میسّر ہیں۔" چیز ... چیز کیا۔ انسان کے لیے ضروری چیزیں ہوتی ہیں، کھانا، کپڑا اور رہنے کی جگہ ــ اُتنا مَیں یہاں بیٹھ کر اپنے ہاتھوں سے کام کر کے کما لیتا ہوں۔"

"ہوں ... " وہ ہنسا ... "اِس دنیا میں لوگ غریبوں کو جینے نہیں دیتے پیارے۔ وہ اُنھیں نالی کا کیڑا سمجھ کر مسل دیا کرتے ہیں۔ یہاں جینے کے لیے اپنے آپ کو ان کی طاقت کے برابر لانا ہوگا۔ اپنے وجود کو اپنے زورِ بازو سے منوانا ہوگا تب ہی ہم اُن کے سماج میں رہ کر جی سکیں گے۔"

"اچھا! اچھا! بہت ہوا، اب اپنا بھاشن بند کرو اور جاؤ یہاں سے۔ ہم اتنا جانتے ہیں کہ جو محنت کرتا ہے اسے پھل ضرور ملتا ہے اور پھر کوئی کسی کو زبردستی تھوڑے ہی تنگ کرتا ہے۔ جب تک وہ کوئی غلطی نہ کرے۔" ٹھیک ہے۔" اُس نے ایک ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے کہا۔ "بھگوان کرے تو امیروں کے ظالم پنجوں سے بچا رہے۔" یہ کہہ کر وہ چلنے لگا اور سامنے پنواڑی کی دُکان پر پان کھانے لگا۔

کریم ایک غریب گھرانے کا لڑکا تھا جب وہ دس سال کا تھا تو اُس کے باپ نے اُس سے اپنی اُنگلی چھڑا کر موت کا دامن تھام لیا تھا اور اس کے ایک ہی سال کے بعد وہ اپنی ماں کے سائے سے بھی محروم ہوگیا۔ ماں کے مرنے کے بعد اُس نے ماں کے جمع کئے ہوئے پیسوں کو نکال کر جوتا پالش کرنے کا سامان خریدا اور اُس وقت سے یہی کام کرتا آرہا ہے۔

اگلے دن وہ حسبِ معمول اپنے سامان کو تھیلے میں لے کر آیا اور اپنی مقررہ جگہ پر بیٹھ کر اپنا کام شروع کر دیا۔ اُس کے پاس اچھے خاصے گاہک آیا کرتے تھے اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ جہاں پر بیٹھتا اُس کے سامنے ہی ایک شوگر فیکٹری تھی اور اس میں کام کرنے والے سبھی لوگ تقریباً اُسی کے یہاں اپنے جُوتے پالش کرواتے تھے۔ وہ اپنے گاہکوں کے ساتھ بہت اچھی طرح پیش آتا تھا ــ وہ ایک پُرانا جُوتا سی رہا تھا کہ۔ چانک چار آدمی اُس کی طرف آتے ہوئے دکھائی دیے۔ اُن چاروں آدمیوں نے قیمتی سوٹ پہن رکھے تھے اور دیکھنے میں بڑے آدمی معلوم ہو رہے تھے وہ لوگ اُس کے قریب آئے اور اپنے جوتوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولے۔

"جلدی جلدی ان چاروں جوڑے پر پالش کر دے اور ہاں جوتے بالکل چمک جانے چاہئیں۔"

"اچھا مالک ... ایسا چمکا دیں گے طبیعت خوش ہو جائے گی آپ لوگوں کی۔"

کریم نے ہنستے ہوئے کہا اور اپنے تھیلے اندر سے برش اور پالش کا ڈبہ نکال کر اُن جوتوں کو پالش کرنے لگا۔ چار جوڑے جوتوں کو پالش کرنے میں کافی وقت لگ رہا تھا۔ اپنے چھوٹے چھوٹے اور معصوم ہاتھوں سے پالش کرتا رہا اُس کا پورا چہرہ پسینے سے تر ہو چکا اور وہ سانس بھی تیز تیز لینے لگا تھا۔ قریب ڈیڑھ گھنٹے کی مسلسل محنت کے بعد چاروں جوتے تیار ہوئے۔ اُن چاروں آدمیوں نے اپنے جوتوں کو پہنا۔ اُن میں سے کسی ایک آدمی اپنی جیب سے ایک آٹھ آنے کا سکہ نکال کر اُس کی جانب اُچھال دیا اور پھر چاروں آگے کی طرف بڑھنے لگے۔

کریم نے اُس آٹھ آنے کے سکے کو اُٹھایا اُن کی طرف مخاطب ہو کر کہنے لگا۔

"یہ کیا مالک! یہ اٹھنّی دے رہے ہو، جوڑے جُوتوں کے دو روپے ہوتے ہیں؟"

"ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔ بہت ہیں پچاس پیسے اور کیا پچاس روپے چاہئیں کیا؟" اُن لوگوں نے پلٹ کر جواب دیا اور آگے کی طرف بڑھ گئے۔ کریم دوڑ کر اُن کے قریب آگیا اور گڑ

ہوئے کہنے لگا۔

"مالک ... مالک میں نے ڈیڑھ گھنٹے تک محنت کی ہے۔ کلیجہ ہانپ گیا ہے میرا، مالک۔ یہ آٹھ آنے سے ہم کیا کریں گے۔ آج کی مہنگائی کے زمانے میں آٹھ آنے صرف ایک پیالی چائے کا دام ہے۔ آپ کسی سے بھی پوچھ لیجئے۔ ایک جوڑے جوتے کا پورا آٹھ آنہ ریٹ ہے۔ میں نے چار جوڑے جوتوں کو پالش کیا ہے۔ مجھے اور پیسے دو مالک۔ ہم پر ظلم مت کرو۔ ہم بہت غریب آدمی ہیں۔"

جب اُن لوگوں میں سے کسی نے اُس کی ایک نہ سنی اور آگے کی طرف چلتے ہی رہے تو وہ دوڑ کر اُن میں سے ایک کے پاؤں میں لٹک گیا اور دوبارہ ملتجی انداز میں کہنے لگا۔

"مالک! میرا پورا پیسہ دے دو ... تمھارا کیا ہے تم لوگ تو امیر آدمی ہو۔ تم ہمیں دو پیسے دے دوگے تو تم پر کوئی فرق نہ پڑے گا لیکن اگر تم نے ہمیں پیسے نہیں دئے تو میں دن بھر بھوکا رہ جاؤں گا مالک۔ اور میں کوئی حرام کا نہیں مانگ رہا ہوں تم سے۔ میں نے محنت کی ہے، پسینہ بہایا ہے میں نے اپنا۔"

وہ گڑگڑا ہی رہا تھا کہ اچانک اُن میں سے ایک نے اس کی پیٹھ پر ایک بھرپور لات ماری، اور وہ اوندھے منہ جا کر سامنے رکھی سبزی کی ٹوکری میں گر پڑا۔ ٹوکری میں رکھی ہوئی کٹار سے اُس کے ماتھے پر ہلکی سی خراش آگئی۔ اگر وہ ذرا سا اور زور سے گرتا تو وہ کٹار اُس کی گردن کے پار ہو جاتی۔

اُس نے پلٹ کر اُن لوگوں کو اپنی گھورتی ہوئی نظروں سے دیکھا اور غصے سے بھبوت ہو کر چلانے لگا۔

"گھبراؤ مت ... میری آہ خالی نہیں جائے گی۔ خدا تم سے ضرور بدلہ لے گا۔ خدا نے چاہا تو تم لوگ کتّے کی موت مروگے، حرام کا پیسہ زیادہ دنوں تک نہیں چلتا، کمینو۔"

"کیا؟ کمینہ کہتا ہے۔"

چاروں پھر پلٹ کر آئے اور اُس ننھی سی جان پر گھونسوں کی بارش کرنے لگے۔ کریم چلاتا رہا اور وہ لوگ اُسے بے رحمی سے پیٹتے رہے۔ کچھ دیر کے بعد جب اُن لوگوں کو تسلی ہو گئی تو وہ اُسے چھوڑ کر چلے گئے۔

گھنٹوں کریم سڑک کے کنارے بیہوش پڑا رہا اور جب اُس کی آنکھ کھلی تو سب سے پہلے اُس نے تھیلے کو اُٹھا کر ایک نالی میں پھینکا اور پھر پنواڑی کی اُس دوکان کی طرف چلنے لگا جس دوکان پر کل اُس ڈاکو نے کھڑے ہو کر پان کھایا تھا۔

★

بقیہ: سائنس اور رُوحانیت

دَور میں بھی لوگوں سے کہا جاتا ہے کہ وہ چند ایک سیاسی نظریات یا کسی خاص اقتصادی نظام کی حدود میں رہ کر اپنے مسائل پر غور کریں۔ اس بات پر اصرار کہ اُوپر سے ملا حکم ماننا ہی پڑے گا سب جگہ نہیں ہے اور ان احکامات کی وجہ سے اکثر ایسا ہوتا ہے کہ غور و فکر کے عمل میں رکاوٹیں پڑتی ہیں اور اُس میں جمود کی سی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔

میں نے ایک ایسے معاشرے کی مثال سامنے رکھ کر اُس کا مطالعہ کرنے کا فیصلہ کیا ہے جس سے میں واقف ہوں۔ یہ معاشرہ ہندوستان کا ہے۔ میرا ارادہ ہے کہ میں ہندوستان کی زندگی کے سب پہلوؤں ــ سیاسی، سماجی اور اقتصادی ــ پر غور کروں اور دیکھوں کہ ان شعبوں میں کچھ بنیادی مسائل عقلی اور استدلالی انداز فکر سے حل ہو سکتے ہیں یا نہیں۔

اسرار

بقیہ: اداریہ

ہر روز صورت حال پہلے کے مقابلے میں خراب ہوتی جا رہی ہے۔ البتہ یہ امر خوش آیند ہے کہ اب نہ صرف حکومت کی سطح پر بلکہ عوامی سطح پر بھی اس کے تئیں شعور بڑھ رہا ہے۔ اس طرح سے سرکاری اور رضاکارانہ کوششوں کے ذریعے اس کام کو آگے بڑھایا جا سکے گا۔ حکومت ہند نے صنعتوں کا بھرپور سروے کیا ہے تاکہ آلودگی کے امکانات کا ایک اندازہ ہو سکے۔ اگرچہ ۱۷۰۰ ایسی صنعتوں کی نشاندہی کی جا سکی ہے جن سے آبی آلودگی کا مسئلہ بنتا ہے تاہم ابھی تک صرف ۵۰۰ صنعتوں نے ایسے پلانٹ نصب کئے ہیں جن میں وہ صنعتی کچرے کو کارآمد کر سکتی ہیں۔ باقی صنعتوں میں سے ۵۰۴ صنعتی کارخانوں پر آبی آلودگی کے قانون کے تحت مقدمہ چلایا گیا ہے۔ ہندوستان میں محکمہ ماحولیات کے قیام کی غرض و غایت بھی یہی ہے کہ اس مسئلے پر قومی سطح پر ایک پالیسی تشکیل دی جا سکے۔ ایک تجویز یہ بھی ہے کہ ماحولیات کے نظم و نسق پر نگاہ رکھنے کے واسطے ایک قومی تنظیم قائم کی جائے۔ اس کے تحت ملک بھر میں سو مراکز قائم کئے جا سکیں گے۔ سمندری آلودگی سے بچاؤ کے لیے بھی اسکیم تیار کی جا رہی ہے۔ ہمارے ملک میں کوسٹ گارڈ نامی تنظیم کو سمندری آلودگی کو روکنے کی ذمہ داری سونپی گئی ہے۔ یہ اقدام مختصر پیمانے پر ضرور ہیں لیکن اپنی جگہ بیحد اہم ہیں۔ ان سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ سرکاری سطح پر اس مسئلے کے تئیں کافی بیداری موجود ہے، اور اس کے تحت مناسب اقدامات کئے جانے کی زبردست خواہش پائی جاتی ہے۔ لیکن یہاں پھر وہی سوال سامنے آتا ہے کہ کیا سرکاری اقدامات سے ہی یہ مسئلہ حل ہو جائے گا۔ سرکار کے سامنے وسائل کے محدود ہونے کا مسئلہ ہے۔ ان حالات میں سرکاری رول اس محاذ پر معیشت کے دیگر شعبوں کی طرح محدود ہی رہے گا۔

(ایڈیٹر)

غزلیں

بسنت نگار بسنت

چند لمحوں میں محبت کی نشانی دے گیا
شہرِ غم کو وہ بہارِ زندگانی دے گیا

رُت سہانی دے گیا، راتیں سہانی دے گیا
کون کل شب نکہتِ لطفِ جوانی دے گیا

وقت نے حالات کے زخموں پہ مرہم رکھ دیا
ہر غمِ نوراں نشاطِ جاودانی دے گیا

اجنبی کہہ لو اُسے اچھا مگر تھا دوست سے
چند لمحوں میں سکونِ زندگانی دے گیا

وہ نہ بجلی تھا، نہ شعلہ تھا مگر کیا شخص تھا
سنگ ریزوں کو بھی دریا کی روانی دے گیا

دل کو، دُنیا کو، در و دیوار کو لمحات کو
اپنے اخلاص و محبت کی نشانی دے گیا

کل کی شب یہ کون دل جو تھا بسنتؔ آغوش میں
غم جو سارے لے گیا اور شادمانی دے گیا

اسلام پرویز

راہ تکوں میں دیپ جلاتے، پاؤں کی آہٹ جب بھی آئے
شور مچائے دل کی دھڑکن صحرا صحرا شام ڈھلے

کروٹ بدلوں نیند نہ آئے، ہر پل تیری یاد ستائے
انکھیاں برسیں جیسے ساون صحرا صحرا شام ڈھلے

ڈھونڈا ئیں نے گلشن گلشن پربت پربت نگر نگر
پھر بھی مجھ کو ملا نہ ساجن صحرا صحرا شام ڈھلے

من مندر میں تمہیں بٹھاؤں، پیار کا ہر سُو دیپ جلاؤں
دیتی ہے آواز پجارن صحرا صحرا شام ڈھلے

پیار کا سپنا ٹوٹ گیا تو سپنوں کی اس نگری میں
بنوں گی جوگن تیرے کارن صحرا صحرا شام ڈھلے

چاند دھام پوری

اے فراق یار کچھ رختِ سفر
تو بھی کیا کم ہے برائے رہ گذر

درد دل داغِ الم سوزِ جگر
یہ عنایت کم نہیں ہے عشق پر

امتحاں ہی امتحاں ہیں عشق میں
کس قدر ہے پُر خطر یہ رہ گذر

یوں نہیں آتے تری گلیوں میں ہم
حرف آجائے نہ تیرے نام پر

چھوڑیئے جو کچھ کہا جس نے کہا
چاندؔ پہ سب کی طرف پر ہے نظر

رونقؔ شہری

ٹھونٹھ پیپل کوئی رستے میں کہاں آتا ہے
گھر مرا شہر کے نقشے میں کہاں آتا ہے

وہ پرندہ جو ہمیشہ رہا پیہم پرواز
اس طرف خون خرابے میں کہاں آتا ہے

عافیت اس میں کہ ہر شخص مجھے رد کردے
اضطراب اندھے عقیدے میں کہاں آتا ہے

دُشمنِ جاں بھی کبھی جان چھڑکتا ہوگا
تذکرہ اس کا لطیفے میں کہاں آتا ہے

بھول جائے نہ مجھے خط کہیں لکھنا رونقؔ
اب مرا نام رسالے میں کہاں آتا ہے

قدم ملا کے چلو

ارمؔ عمر پوری

جہانِ زیست کی تاریکیاں مٹا کے چلو
سوادِ شام کو حسنِ سحر بنا کے چلو
تمام گھور اندھیروں پہ فتح پا کے چلو
دلوں میں مشعلِ نورِ یقیں جلا کے چلو
قدم ملا کے چلو

اَلم نصیب دلوں میں غمِ خوشی نہ رہے
یہ رنگِ شام کہیں صبحِ زندگی نہ رہے
اسیرِ گردشِ حالات آدمی نہ رہے
ہر ایک غم کی مسلسل ہنسی اُڑا کے چلو
قدم ملا کے چلو

حیاتِ ظلم و تشدد کا دَور اب نہ رہے
کہیں بھی گردشِ دَوراں کا جور اب نہ رہے
نظامِ زیست کا پہلا سا طور اب نہ رہے
نئی حیات کے خاکے نئے بنا کے چلو
قدم ملا کے چلو

دِلوں سے فرق نکل جائے اوج و پستی کا
سروں سے نشہ اُتر جائے خود پرستی کا
تمام طور بدل جائے نظمِ ہستی کا
دل و دماغ سے سب پستیاں مٹا کے چلو
قدم ملا کے چلو

اگر ہے راہ میں حائل سماج تو کیا غم
بنے ہوئے ہیں رکاوٹ رواج تو کیا غم
بجا ہے وقت کا برہم مزاج تو کیا غم
رعایتوں کی ڈگر سے قدم بچا کے چلو
قدم ملا کے چلو

ضیاالرحمٰن غوثی

نگینہ لکڑی کے دلکش آرائشی سامان کا مرکز

ہماری بدلتی ہوئی ساری قدروں کی طرح گھر کی آرائش اور زیب وزینت کی قدریں بھی تیزی سے بدلتی جارہی ہیں۔ پہلے جن چیزوں کو کمروں کی آرائش کا اعلیٰ معیار سمجھا جاتا تھا۔ اب انھیں قدامت پسندی کی علامت مانا جاتا ہے۔ لیکن بعض چیزیں ایسی بھی ہیں جو آج بھی اپنے اندر پہلے جیسی دلکشی رکھتی ہیں۔ مثال کے طور پر آپ ہندوستان کی راجدھانی دلّی کی جامع مسجد کے اُردو بازار سے گذریں یا کبھی چاندنی چوک کی سیر کا موقع ملے تو آپ پٹریوں پر خوبصورت نقش ونگار والے آرائشی چوبی سامان ضرور دیکھیں گے۔ ان میں بُک شلف، تپائی، ایش ٹرے، فلاور پوٹ جیسے سامان ضرور ہی آپ کو اپنی طرف متوجہ کر لیں گے۔ ان سامانوں کے متعلق ایک خاص بات یہ ہے کہ یہ اپنی کاریگری اور خوبصورتی کے مقابلے میں بیحد سستے ملتے ہیں اور آپ بہت ہی کم پیسے میں ان اشیاء سے اپنے ڈرائنگ رُوم کو بڑی خوش اسلوبی سے سجا لیں گے۔

پہلے ایسے سامان کے خریدار عموماً رؤسا، حُسن پرست اور دانشور اور اہل ذوق حضرات ہی ہوا کرتے تھے اور سچ پوچھئے تو ان کی سرپرستی میں ہی یہ صنعت پروان چڑھی۔ لیکن اب یہ دیکھا گیا ہے کہ ہندوستان کے تمام بڑے شہروں میں اس چوبی سامان کے بیشتر خریدار غیر ملکی سیاح ہی ہوتے ہیں۔ جو ہندوستان سے نوادرات کے طور پر یہ سامان اپنے ملکوں میں لے جاتے ہیں۔

ریاست اُترپردیش کے ضلع بجنور میں امروہہ کے قریب ایک چھوٹا سا قصبہ ہے۔ نگینہ۔ ملک کی چوبی سامان کی صنعت کا یہی مرکز ہے۔ اس قصبے سے حافظ محمد ابراہیم اور مولانا حفظ الرحمٰن جیسے قومی رہنماؤں کا تعلق رہا ہے۔ نگینہ ہی میں چوبی سامان کی صنعت کو فروغ حاصل ہوا۔ بعد میں سہارنپور اور دوسرے مقامات پر بھی چوبی سامان بننے لگے۔ نگینہ کے چوبی سامان کی خاص بات یہ ہے کہ یہاں کے سامان فن برائے فن کا زندہ مثال ہیں۔ اطراف کے رؤسا برابر اس صنعت کی سرپرستی کرتے رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں کے کاریگر سب سے زیادہ ماہر ہیں۔ یہ خاص طور پر رؤسا کی خوشنودی کی خاطر ان کی حویلیوں کی آرائش کے لیے سامان بناتے رہے ہیں۔ ان میں کاروباری نقطۂ نظر بالکل نہیں۔ خالص فنی نقطۂ نظر سے چوبی سامان تیار کرنا نگینہ کے کاریگروں کا مزاج بن چکا ہے۔

نگینہ اور اس کے اطراف میں مختلف قسم کے تقریباً ۱۰۰ چوبی آرائشی اشیا بنائی جاتی ہیں۔ ان میں ہکون ٹیبل، بینجل بوکس، فلاور پوٹ، ٹی پاٹ اسٹینڈ، کیک اسٹینڈ، ریڈنگ ٹیبل، رحل، بک شلف، لیٹر ریک، تاج محل، سگریٹ کیس، ایش ٹرے، فروٹ باسکٹ، کینڈل اسٹینڈ، وال برڈ، ہوڈر گونگ، اسکرین پارٹیشن، اگر بتی اسٹینڈ وغیرہ، خاص طور پر پوپلر آئٹم ہیں۔ یہ سامان بمبئی، کلکتہ، دلّی، مدراس، کشمیر، حیدرآباد، بھوپال، پٹنہ، لکھنؤ، علیگڑھ وغیرہ شہروں میں کافی تعداد میں جاتا ہے۔ ایک اندازے کے مطابق روزانہ ۵ لاکھ روپے کا سامان تیار ہوتا ہے اور پھر نہ صرف اندرونِ ملک بلکہ بیرونی ملکوں کو بھی بھیجا جاتا ہے۔ جس سے خاصہ غیر ملکی زرِ مبادلہ بھی حاصل ہوتا ہے۔ جاپان، امریکہ، جرمنی، ایران، مصر اور عرب خاص طور پر نگینہ اور اس کے اطراف میں بننے والے چوبی سامان کے خریدار اور قدردان ہیں۔

یہ چوبی سامان بنانا نگینہ اور اس کے اطراف میں لوگوں کا مخصوص ذریعۂ معاش ہے۔ اس صنعت کے ذریعے ۴۰ ہزار سے زائد لوگوں کو روزگار مہیا ہو جاتا ہے۔ کئی سو برسوں سے اس علاقے کے لوگوں نے اس صنعت کو اپنا پیشہ بنایا ہوا ہے۔ نگینہ کے چوبی سامان کی صنعت نے زمانے کے کافی اُتار چڑھاؤ دیکھے ہیں۔ خاص طور پر مُغل حکمرانوں نے اس صنعت کی کافی حوصلہ افزائی کی۔ ان کے زمانے میں فنکاروں کی خوب خوب قدردانی ہوتی تھی اور کاریگروں کے فن کے چند نمونے پیش کرتے پر انھیں دربار سے اتنا کچھ مل جاتا تھا کہ ساری عمر کے لیے کافی ہو جاتا تھا۔

یوجنا، نئی دہلی

جب انگریزوں کا دورِ حکومت آیا تو ہندوستان کی دوسری اہم صنعتوں کی طرح اس صنعت سے بھی بے نیازی کا رویہ برتا گیا۔ جس کی وجہ سے دھیرے دھیرے یہ صنعت کمزور پڑتی گئی۔ ملک آزاد ہوا۔ اُمید کی نئی کرن پھوٹی۔ نگینہ کے ہنرمندوں اور دست کاروں کی اُمنگوں نے انگڑائیاں لیں اور وہ ایک نئے جوش و خروش سے اپنی صنعت کو آگے بڑھانے میں لگ گئے۔ لیکن ملکی حکومت سے جتنی حوصلہ افزائی کی اُمید تھی وہ پوری نہ ہوئی۔ جس کے نتیجے میں گزشتہ تیس برسوں میں بھی یہ صنعت کچھ زیادہ آگے نہ بڑھ سکی۔ حالانکہ یہ صنعت بھارت کی تہذیب و تمدن کی علامت ہے اور مُلک کی خالص گھریلو صنعت ہے۔

سب سے افسوسناک پہلو یہ ہے کہ اس صنعت میں لگے کاریگروں کی مالی حالت آج بھی بے حد خراب ہے۔ انھیں اوسطاً محض دس بیس روپے یومیہ کی آمدنی ہوتی ہے۔ البتہ صنعت کار جو اس صنعت میں سرمایہ لگاتے ہیں وہ ضرور کچھ فائدے میں ہیں۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ حکومت بھی اس صنعت میں کافی سرمایہ لگائے اور دوسرے سرمایہ کاروں کو مالی اور تکنیکی امداد نیز مصنوعات کی برآمدات کے سلسلے میں بھی تمام ضروری سہولیات دی جائیں۔ کوآپریٹو تحریک کو اپنا کر بھی کاریگر لوگ اس صنعت کو فروغ دے سکتے ہیں۔ اور خود بڑے پیمانے پر کام کر کے اپنی مالی حالت بہتر بنا سکتے ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ اس صنعت کو نہ صرف سارے ملک بلکہ ساری دُنیا میں مقبول بنا سکتے ہیں۔

میں نے نگینہ کے کاریگروں کے کئی خاندانوں سے بات چیت کی ہے لیکن انھیں مایوس پایا ہے۔ انھوں نے بتایا کہ وہ فن کا اعلیٰ سے اعلیٰ نمونہ کئی نسلوں سے پیش کرتے آ رہے ہیں۔ لیکن ان کا معیارِ زندگی آج بھی وہی ہے جو پشتوں سے چلا آ رہا ہے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اس فن کو فن کی طرح برت رہے ہیں اور خالص منافعے کے خیال سے کام نہیں کرتے۔ حکومت اُترپردیش کا محکمہ صنعت جہاں دوسری تمام صنعتوں کے فروغ کے لیے موثر اقدامات کر رہا ہے، اگر اس نے نگینہ کے چوبی سامان کی اس صنعت کی طرف توجہ نہ دی تو بھارت کی ایک قدیم اور اہم صنعت اپنی تمام خوبیوں کے ساتھ باقی نہ رہ سکے گی اور بھارت کی اگلی نسل اپنے ایک قیمتی ورثے سے محروم رہ جائے گی۔

اچھا ہوتا کہ نگینہ میں چوبی نقش و نگار کے کام کا ایک بین الاقوامی تربیتی مرکز بھی قائم ہو جاتا۔ اس سے یہ صنعت یقیناً ساری دنیا میں مقبول ہو جائے گی، اور بھی اچھا ہوتا اگر ریاستی یا ملک گیر پیمانے پر فنکاروں کو اعزاز اور ایوارڈس بھی دیئے جاتے تاکہ لوگوں کی زیادہ سے زیادہ دلچسپی اس گھریلو صنعت سے بڑھتی۔

بقیہ: سیکٹر وار منصوبہ بندی

منصوبے وضع کرنے سے گریز کرنا چاہئیے۔ مسٹر رولف گننگ اسٹالپر نے نائجیریا کے اپنے تجربے کی بنا پر حقیقت کے بغیر منصوبہ بندی کو محض مجموعی منصوبوں کے انداز پر تسلیم کرنے سے انکار کر دیا ہے۔

حقیقتوں کے بغیر منصوبہ بندی اقتصادی وسائل کی محض تضیع ہے۔ اس طرح کی ایک مثال گھانا کی ہے۔ گھانا میں نیوکلیر ری ایکٹر ہے جس کے بارے میں نئی حکومت کے کچھ ارکان کو معلوم تک نہیں۔ یہ بے مصرف پڑا ہے۔ وہاں ایک گلاس فیکٹری ہے جب کہ باہر سے درآمد کئے گئے شیشے کا دو سال کے لیے اسٹاک ہے۔ وہاں کترنوں کے خام مال پر مبنی فولاد ساز کارخانہ ہے جبکہ فولاد کی کترنیں وہاں نہیں ہیں۔ وہاں افریقہ کے طویل ترین رن ویز بنائے گئے ہیں۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ یہ کیوں تعمیر کئے گئے، یا یہی گیری کا ایک بیڑہ ہے جس نے ابھی تک کام شروع نہیں کیا ہے۔ وہاں چینی بنانے کے کارخانے ہیں، جو کھیتوں سے بہت دور ہیں۔

ہندوستان کا پہلا پانچ سالہ منصوبہ مابعد جنگ تعمیر نو کے پراجیکٹوں کی تشکیل پر مبنی تھا۔ یہ مجموعی اندازوں مبنی نہیں تھا۔ یہی وجہ ہے کہ یہ بعد والے پانچ سالوں منصوبوں کے مقابلے زیادہ کامیاب تھا۔ اسٹالپر نے ایک ایسے منصوبے کی سفارش کی ہے جو نائجیریا کی معیشت کے پراجیکٹوں پر مبنی ہو۔

مجموعی منصوبہ بندی کے لیے درکار حقائق سے صرف نظر نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے لیے بڑی محنت درکار ہے۔ اول تو تکنیکی اور اقتصادی اعتبار سے دقت طلب سروے کرنے ہوں گے مثلاً جغرافیائی سروے، معدنی امکانات کے پیشِ نظر سروے، منڈی سے متعلق سروے وغیرہ وغیرہ۔ جب تک یہ کافی بھرپور اور حقیقت پسندانہ نہ ہوں گے، اس وقت تک کے لیے ٹھوس بنیادوں والے خصوصی قسم کے پراجیکٹ ہی مفید ہوں گے۔

۱۵ اگست ۱۹۸۴ء کے موقع پر یوجنا کی خصوصی پیش کش

پچھلے سال "سائنسی مزاج اور روایات کی بندش" کے موضوع پر یوم آزادی کے موقع پر یوجنا کا خصوصی شمارہ عوام نے بے حد پسند کیا۔ چنانچہ اس سال بھی یوم آزادی کے موقع پر ملک کے مقتدر اور مستند ادیبوں، مفکروں کے قابلِ قدر اور فکر انگیز دینے والے مضامین پر مشتمل ایک خصوصی شمارہ قارئین کی خدمت میں پیش کیا جائے گا۔ اس میں لکھنے والے چند نام یہ ہیں:- خواجہ احمد عباس، وسنت ساٹھے، مالکم ایس آدیشیا، کمل نین کابرا، بی۔ ایم بھارگو وغیرہ۔

بھارت اور ماحولیاتی منصوبہ بندی

آبادی بڑھ رہی ہے اور صنعتی ترقی عمل میں آ رہی ہے۔
ئے وسائل پیداوار کا بڑھنا قدرتی ہے۔ صنعت کاری اور
ہروں کے بسانے پر زیادہ زور ہونے کے سبب
ضائی اور آبی آلودگی میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔
ں صورتِ حال پر قابو پانا ضروری ہے۔ چنانچہ
ار کی طرف سے اس بارے میں توجہ دی جا رہی ہے۔
ب سے پہلے تو محکمہ ماحولیات نے ان مسائل
سنگینی سے عوام کو روشناس کرانے پر زور دیا
ے۔ تاکہ ماحول میں ہر بیش قیمت چیز کا تحفظ
یا جا سکے۔ اس کے علاوہ مستقبل کی منصوبہ
دی کرتے وقت ماحول کے تحفظ کے امور
پیشِ نظر رکھنا ضروری ہو گیا ہے۔

دوسرے ملکوں کی طرح بھارت میں بھی
حولیاتی منصوبہ بندی کی باقاعدہ شروعات
ٹاک ہوم کانفرنس کے بعد سے ہوئی۔ اس
نفرنس سے متعلق ابتدائی کام انجام دینے والی
ٹی نے قابلِ قدر خدمات انجام دی ہیں۔ اسی
ٹی کی کوششوں سے ایسے گوشوں کی نشاندہی
، جا سکی جو ہمارے ملک کے لیے تشویشناک
بت ہو رہے ہیں۔ ماحول کی منصوبہ بندی اور
ں سے متعلق کاموں میں تال میل قائم کرنے سے
علق قومی کمیٹی کے قیام سے قبل مذکورہ کمیٹی
، ہی اس کے لیے راہیں ہموار کیں۔

ماحول کے تمام پہلوؤں کی جانچ پڑتال، ماحول
صاف ستھرا بنانے کے لیے پالیسیوں کی تشکیل
، پروگراموں پر عمل درآمد اس کمیٹی کے دائرہ کار
، شامل ہے۔ نشاندہی اور انسانی بستیوں کے
ماشی اثرات نیز متعلقہ امور کی جانچ پڑتال اور
یق اس کمیٹی کی ذمہ داریوں میں شامل ہے۔ اس
مد کے لیے تحقیقی پراجیکٹوں کے لیے رقوم مختص
گئیں۔ ان پراجیکٹوں میں دتی کے ذرائع نقل و حمل
کے اثرات، مختلف حیاتیاتی نظاموں میں ڈی ٹی
وغیرہ کے اثرات، کشمیر میں جھیل ڈل کا تحفظ،
معاشی نظاموں اور انسانی سرگرمیوں کا تعلق نیز
ان سے پیدا ہونے والے مختلف اثرات اور
دریائے گنگا اور ہمالیہ کے علاقوں میں علم ہیئت
حیوانات کا مطالعہ وغیرہ شامل ہیں۔ ان مطالعوں
کی بنیاد پر مختلف شعبوں میں بہت سے پراجیکٹ
تشکیل پا رہے ہیں۔ بہت سے ترقیاتی پراجیکٹوں
کا ماحول کی آلودگی کے نقطۂ نظر سے مطالعہ کیا
گیا ہے اور اس سلسلے میں ماحول کے تحفظ اور
اسے صاف ستھرا رکھنے کے بارے میں ضروری
ہدایات اور مشورے دئے ہیں۔ مخصوص نوعیت
کے مسائل کے مطالعے کے لیے ماہرین پر مشتمل
ٹیموں اور ورکنگ گروپ تشکیل دئے گئے ہیں۔
اہم مسائل پر قومی توجہ کو مرکوز کرنے کے لیے
ورکشاپوں کا اہتمام کیا گیا ہے۔

اس قومی کمیٹی کی کامیابی کا اندازہ اس
بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس نے عوام کے
شعور کو بیدار کیا۔ شریمتی اندرا گاندھی نے جنوری
۱۹۸۰ء میں اقتدار سنبھالنے کے بعد فوراً ہی
ایک اعلیٰ اختیارات والی کمیٹی قائم کی۔ منصوبہ
بندی کمیشن کے نائب صدر اس کے چیرمین بنائے
گئے۔ اس کمیٹی کو ماحول کے تحفظ کو یقینی بنانے
کے لیے آئین اور انتظامی اقدامات وضع کرنے کی
ذمہ داری سونپی گئی۔ اس کمیٹی کا نام تیواڑی کمیٹی پڑا۔
اس نے کچھ دُوررس نتائج کی حامل سفارشات
پیش کیں۔ ان سفارشوں کے نتیجے میں محکمہ ماحولیات
قائم کر دیا گیا۔

تیواڑی کمیٹی کی رپورٹ کئی لحاظ سے خاص
اہمیت رکھتی ہے۔ اس کمیٹی نے سفارش کی کہ
ماحول کی منصوبہ بندی کے مسائل حل کرنے کے
لیے ادارہ جاتی قرضے دیے جائیں۔ اس نے
ان مسائل کی نشاندہی کی جو ماحول کی آلودگی سے
متعلق ہیں۔ اس نے ملک کے قدرتی وسائل
کی جو اراضی، جنگلات اور پانی وغیرہ سے
متعلق ہوں، مناسب نظم و نسق کی ضرورت پر
زور دیا تاکہ قوم اور ملک کے معاشی ڈھانچے
کو استوار کیا جا سکے اس نے اراضی سے متعلق
مرکزی کمیٹی کے قیام کے لیے سفارش کی اور اسے
اس مقصد کے حصول میں پہلا قدم قرار دیا۔ یہ
بات باعثِ طمانیت ہے کہ سرکار نے اس سفارش
کو منظور کر لیا ہے اور اس پر عمل درآمد کے لیے
اقدامات کئے جا رہے ہیں۔ تیواڑی کمیٹی نے تین اور
گوشے ایسے بتلائے جو باعثِ تشویش ہیں یعنی
نباتات و حیوانات کی وہ نسلیں جو معدوم ہوتی جا رہی
ہیں، ان کو بچانا ضروری ہے۔ اس کے علاوہ فضائی
آلودگی، آبی آلودگی جو صنعت کاری کی ترقی کا نتیجہ
ہے، اس سے تحفظ ضروری ہے۔ اس کمیٹی نے انسانی
بستیوں کے حالات میں سدھار لانے اور انھیں صحت
کے خطرات سے بچانے کی ضرورت پر بھی زور دیا۔
اس مقصد کے لیے اسکولی بچوں کو ماحول کے تحفظ،
اس کی ضرورت و اہمیت کے بارے میں واقف
کرانا ضروری سمجھا گیا۔ پوری قوم کو ان خطرات
سے آگاہ کرنے اور ان میں ان مشکلات سے
بچنے کا شعور پیدا کرانے کی اہمیت پر زور دیا گیا۔

تیواڑی کمیٹی نے یہ محسوس کیا ہے کہ بھارت کی
صفائی ستھرائی اور اس کو سبز انقلاب سے ہمکنار کرنے
کے لیے بڑے پیمانے پر ایک مہم شروع کی جائے
تاکہ موجودہ غیر تسلی بخش حالات کا تدارک کیا جا سکے
لیکن اس اندازِ نظر کی کامیابی کے لیے سیاسی سطح
پر زبردست حمایت درکار ہوگی۔

اس سلسلے میں ابھی بہت کچھ کرنا باقی ہے۔
ہمارے سامنے یہ مسئلہ بڑی بھیانک صورت میں ہے۔
البتہ یہ امر حوصلہ افزا ہے کہ اس بارے میں کچھ
مفید کام انجام پا چکا ہے، چنانچہ تمام بڑے ترقیاتی
پراجیکٹ منظور کرتے وقت ماحولیاتی مسائل کو
بھی پیشِ نظر رکھا جاتا ہے اور اس محاذ پر ضروری
احتیاطی تدابیر کے بعد ہی انھیں منظوری دی جاتی ہے۔

(باقی ص۱۵ پر)

Regd. No. D(DN) 985
R.N. 97032/81

Licensed U(DN) to post without pre-payment
at Civil Lines Post Office, Delhi-110 054.

Vol. 4 No. 7 YOJANA (URDU) 1-15 July, 1984

ساہتیہ اکیڈمی کی اہم خدمات

ہندوستانی آئین کے آٹھویں شیڈول میں ۱۵ زبانوں کو تسلیم کیا گیا ہے۔ اس میں وقتاً فوقتاً ترامیم کے امکانات کی گنجائش بھی بتائی گئی ہے۔ ہندوستان گلدستۂ صد رنگ ہے، یہاں کی بوقلمونی ضرب المثل ہے۔ ہندوستان میں حصول آزادی کے بعد ثقافتی و ادبی زندگی کو جس طرح مالا مال کرنے کی کوششیں کی گئی ہیں وہ اپنی جگہ ایک مثال ہے۔ چنانچہ ۱۹۵۴ء میں حکومت نے ساہتیہ اکیڈمی کی داغ بیل ڈالی یہ ایک خود مختار قومی تنظیم کی صورت میں معرض وجود میں آئی۔ اس کے قیام کا مقصد ہندوستانی زبانوں میں ہونے والی ادبی سرگرمیوں میں تال میل پیدا کرنا اور مختلف زبانوں کو ایک دوسرے کے قریب لانا ہے۔ اس وقت یہ (۱۵ + ۷) زبانوں کی ہمت افزائی میں مصروف ہیں۔ یہ زبانیں ہیں:-

آسامی، بنگالی، ڈوگری، انگریزی، گجراتی، ہندی، کنڑ، کشمیری، کونکنی، میتھلی، ملیالم، منی پوری، مراٹھی، نیپالی، اڑیہ، پنجابی، راجستھانی، سنسکرت (پالی پراکرت، اپ بھرنش)، سندھی، تمل، تیلگو اور اردو۔

۱۲ مارچ کو یہ ادارہ اپنے تیسویں سال میں قدم رکھ چکا ہے۔ اس کی خود مختاری بدستور قائم ہے۔ تیس سال قبل اُس وقت کے وزیر اعظم شری جواہر لال نہرو نے جو کہ اس اکیڈمی کے پہلے صدر منتخب ہوئے تھے، کہا تھا کہ ایک سچے جمہوریت پسند ہونے کے ناطے میں ہندوستان کے وزیر اعظم کو ساہتیہ اکیڈمی کے صدر کے فرائض میں مداخلت کی اجازت نہ دوں گا اور وہ اپنے اس قول میں سچے ثابت ہوئے۔

ساہتیہ اکیڈمی تخلیق اور تنقیدی ادب سے دلچسپی رکھنے والوں کی مجلس ہے۔ اس ادارے کا مقصد یہ ہے کہ علمی شخصیتوں کے کارناموں کو تسلیم کیا جائے اور عوامی ذہن اور ذوق کی تربیت کی جائے تاکہ ادب کا معیار بلند ہو سکے اور ادبی تنقید کی حوصلہ افزائی ہو۔ ادب کی پرورش مذہب کی طرح سے تنہائی چاہتا ہے۔



رابندر بھون میں ساہتیہ اکیڈمی کا ایک منظر

جب تک انسان کو ذہنی طور پر یکسوئی حاصل نہ ہوگی، اس وقت تک عظیم ادبی شہ پارے معرض وجود میں نہیں آ سکتے۔ چنانچہ ساہتیہ اکیڈمی آج ادب کے میدان میں تحریک عمل کا سرچشمہ ہے۔ یہ ادارہ ہندوستانی کلاسیکی ادب کے غیر ملکی زبانوں اور غیر ملکی کلاسیکی ادب کے ہندوستانی زبانوں میں ترجمے کے لیے یونیسکو کے ساتھ اشتراک عمل کرتا ہے۔ یہ اکیڈمی ملک کی ۲۲ زبانوں کے درمیان پُل کا کام کرتی ہے۔ اس نے شمال سے جنوب اور مشرق سے مغرب تک جذباتی ہم آہنگی اور قومی یکجہتی کے عمل کو آگے بڑھانے میں مفید خدمات انجام دی ہیں۔ اس وقت اس اکیڈمی کے اعزازی صدر ڈاکٹر وی۔ کے گوکک ہیں جو کہ سابق میں بنگلور یونیورسٹی کے وائس چانسلر رہے ہیں۔ آسامی زبان کے مصنف ڈاکٹر بریندر کمار بھٹاچاریہ اس کے اعزازی نائب صدر ہیں۔ دلی یونیورسٹی اور بنارس ہندو یونیورسٹی کے ڈاکٹر اندر ناتھ چودھری اس کے سکریٹری ہیں جنھوں نے ڈاکٹر کیلکر کی جگہ لی ہے۔ کروکشیتر یونیورسٹی کے ڈاکٹر امریش دت کو اکیڈمی کی طرف سے منظور شدہ ۲۲ زبانوں سے متعلق انگریزی میں ہندوستانی ادب پر انسائیکلوپیڈیا کی تین جلدیں تیار کرنے کا عظیم پراجیکٹ سونپا گیا ہے۔ ماضی میں جن ہستیوں کو اس ادارے کا صدر ہونے کا فخر حاصل ہوا، وہ بھی دنیائے ادب کی اہم ترین شخصیتوں میں شمار ہوتی ہیں۔ مثلاً جواہر لال نہرو، رادھا کرشنن، ذاکر حسین، سنیتی کمار چیٹرجی اور اوما شنکر جوشی۔ ایوارڈز کے لیے پچھلے تین برسوں میں شائع شدہ معیاری کتابوں کو چُنا جاتا ہے۔ زیادہ زور تعداد پر نہیں بلکہ معیار پر ہوتا ہے۔ اس نمایاں کارکردگی کے لیے سبھی زبانیں ہمیشہ معیار پر پوری نہیں اُترتیں۔ اس اکیڈمی سے تقریباً ۵ ہزار مصنفین وابستہ ہیں۔ اکیڈمی انگریزی یا ہندی میں علاقائی زبانوں پر سیمینار کراتی ہے

Published by the Director, Publications Division, Patiala House, New Delhi-110001

یوجنا

۱۶ تا ۳۱ جولائی ۱۹۸۴ء

ایک روپیہ

معاشرتی انقلاب کی جانب

اقتصادی جمہوریت کا مقدمہ

سیاسی نظام
(وسنت ساٹھے)

علاقائی منصوبہ بندی
(ایل. آر. دوبھاشی)

میرا خواب پورا ہو گیا



(خصوصی انٹرویو)

مس بچھندری پال

انٹرویو لینے والے : ڈی ۔ کے ۔ ارورہ

مس بچھندری پال پہلی بھارتی خاتون ہیں جو کوہ ایورسٹ پر جانے میں کامیاب ہوئی ہیں ۔ اب تک اس چوٹی پر جانے والی جتنی خواتین ہیں ۔ ان میں یہ سب سے کم عمر ہیں ۔ انھوں نے ۲۳ مئی کو ماؤنٹ ایورسٹ سرکی اور ۴۳ منٹ اس چوٹی پر رہیں ۔

ماؤنٹ ایورسٹ پر جانے والی دیگر چار خواتین میں جاپان کی مسز جنکو طبئی ، چین کی مسز فن ٹوگ ، پولینڈ کی مسز وانڈا کتی وسز اور جرمن کی مسز شماتز شامل ہیں ۔

مس بچھندری پال کی اس شاندار کامیابی کے اعتراف کے طور پر انھیں بھارت میں کوہ پیمائی کی فاؤنڈیشن کی رکنیت عطا کی گئی ہے ۔ یہ ایک ایسا اعزاز ہے جو کم ہی لوگوں کو ملتا ہے ۔ آپ کو اس کامیابی کے صلے میں فاؤنڈیشن ہذا کی طرف سے گولڈ میڈل دیا گیا ہے ۔ وہ پہلی بھارتی خاتون ہیں جنھیں یہ اعزاز ملا ہے ۔ اُتر پردیش کی سرکار نے بھی انھیں ۵۰ ہزار روپے کا نقد ایوارڈ دیا ہے ۔

ایمپلائمنٹ نیوز کے جنرل منیجر اور چیف ایڈیٹر شری ڈی ۔ کے ۔ ارورہ نے موصوفہ سے اُس وقت ملاقات کی جبکہ وہ دلی آئی تھیں ۔ ان سے اس کامیابی کے سلسلے میں جو بات چیت ہوئی اس کا متن درج ذیل ہے :۔

ارورہ : آپ پہلی ہندوستانی خاتون ہیں جو ایورسٹ کی چوٹی پر چڑھ سکی ہیں ۔ کیا آپ بتائیں گی کہ آپ کو کن کن مشکلات کا سامنا کرنا پڑا ؟

پال : ہم سے پہلے جو پارٹی گئی تھی ان کے ساتھ ایک حادثہ ہو گیا ۔ یہ لوگ ایک برفیلے طوفان کی چپیٹ میں آ گئے ۔ اس میں ایک شیر پا ختم ہو گیا تھا اور اس کے بعد ایک باورچی کے پھیپھڑوں میں سوجن آ گئی تھی جس کی وجہ سے وہ مر گیا تھا ۔ لیکن یہ سب اس کی غلطی کی وجہ سے ہوا ۔ اس کے بعد ایک طوفان ۱۵ مئی کی رات کو آیا ۔ جس میں میں بھی تھی ۔ یہ کیمپ نمبر ۳ کی بات ہے جو ۲۴۰۰۰ فٹ کی اونچائی پر تھا ۔ اس میں ہمارے کئی ساتھیوں کو چوٹیں لگی تھیں جس میں ٹیم کے دو ممبران بھی تھے این ۔ ڈی شیرپا اور لوپ سانگ ۔ کچھ شیرپاؤں کے پیر میں چوٹیں آئیں ۔

ارورہ : یہ ان قسمت کی بات ہے کہ آپ کو کوئی چوٹ نہیں لگی ؟

پال : جی ہاں ۔

ارورہ : جب آپ ایورسٹ کی چوٹی پر پہنچیں تو آپ کو کیا کیا خیال آیا ! کیسا محسوس ہوا ؟

پال : مجھے ایسا لگا کہ میرا خواب پورا ہو گیا ۔ اس پر خوش ہونا ایک فطری بات تھی ۔ لیکن اس وقت مجھے واپسی کی فکر تھی ۔

ارورہ : ہمیں جو رپورٹ ملی ہے اس میں ہم نے پڑھا ہے کہ چڑھنے سے اُترنا مشکل ہوتا ہے ؟

پال : یہ ایسی بات ہے کہ چوٹی تک پہونچنے میں آدمی کافی تھک جاتا ہے ۔ پھر واپسی میں تھکان بھی ہوتی ہے اور کیمپ میں پہنچنے کی سب کو بڑی جلدی رہتی ہے اس وجہ سے تھوڑا لا پروا ہو جاتا ہے اور پھر اگر تھوڑا سا بھی پیر پھسل جائے تو آدمی بہت نیچے گر سکتا ہے ۔ چڑھائی کے وقت تو آدمی ویسے بھی دھیرے دھیرے چلتا ہے اس لیے اتنا خطرہ نہیں رہتا ۔

ارورہ : آپ کے پاس جو اپنا ساز و سامان تھا ۔ آکسیجن سلنڈر اور دوسری چیزیں کیا ان میں کوئی گڑبڑی نہیں آئی ؟

پال : جی نہیں ۔ ایسی کوئی گڑبڑی نہیں آئی ۔

ارورہ : آپ آکسیجن کے ساتھ ہی چڑھیں آپ کی باقی چیزیں ٹھیک طرح سے کام کر رہی تھیں ؟

پال : جی ، ساز و سامان سارا ہی اچھا تھا ۔

ارورہ : یہ ساز و سامان غیر ملکی تھا یا ہندوستانی ؟

پال : غیر ملکی بھی تھا اور ہندوستانی بھی ۔ دونوں ہی طرح کا سامان تھا ۔

ارورہ : آپ نے ایورسٹ کی چوٹی پر کیا کیا چیزیں رکھیں ؟

پال : رکھنے کے لیے میں ساتھ میں "درگا" کی مورتی اور چھوٹا سا "ہنومان چالیسا" لے کر گئی تھی ۔ پہلے میں نے پوجا کی اس کے بعد واپسی میں وہیں چھوڑ کر آ گئی ۔ ویسے ہندوستان اور نیپال کا جھنڈا بھی لہرایا تھا لیکن یہ سب کچھ واپس لے آئے ۔

ارورہ : جب آپ چوٹی پر پہنچیں تو آپ کے جذبات میں کس طرح کی ہلچل تھی ۔ اس کے علاوہ آپ نے کیا کیا محسوس کیا ؟

پال : آئس فال مجھے کافی اچھا لگا ۔ ایورسٹ میں چاروں طرف جو برف سے بھری چوٹیاں دکھائی دیتی ہیں وہ بہت ہی خوبصورت لگتی ہیں ۔ ان کو تو میں الفاظ میں بیان نہیں کر سکتی ۔ جیسے کنچن چنگا ، مکالو ، لوتسے ۔

ارورہ : سننے میں آیا ہے کہ وہاں کا آئس فال زمین کے اسنو فال سے مختلف ہوتا ہے ۔ یہ کیسے مختلف ہوتا ہے ۔ ایورسٹ کے "اسپرنگ آئس" کے بارے میں کچھ بتائیں ؟

پال : اسپرنگ آئس کے بارے میں کچھ زیادہ تو نہیں معلوم ہے لیکن ایک جگہ وہاں بہت خطرناک ہے جس کا نام ہے " دم پوائنٹ " وہاں پر ہمیشہ برف باری ہوتی رہتی ہے ۔ کبھی کبھی برف کی سطح نیچے دھنس جاتی ہے اور اس میں ہلچل ہوتی ہے ۔ اوپر نیچے ۔ آج ایک راستے سے جاتی ہے تو اگلے دن اس راستے کا کچھ پتہ نہیں چلتا ہے ۔

(مسلسل جاری کور پیج نمبر ۳ پر)

اس شمارے میں

منصوبہ بندی اور ترقیاتی پروگراموں کی جھلک پیش کرنے والا

پندرہ روزہ

یوجنا

نئی دہلی

چیف ایڈیٹر :- آر۔ ٹھکرال
ایڈیٹر :- لکھی رام رانا
اسسٹنٹ ایڈیٹر :- محمد عادل صدیقی
سب ایڈیٹر :- وسیم حیدر

جلد ۴	۱۶ تا ۳۱ جولائی ۱۹۸۴	شمارہ ۸

۲۵ آساڑھ تا ۹ شراون شک سمبت ۱۹۰۶ فون : ۳۸۷۳۴۱

شرح چندہ :-

سالانہ ۲۰ روپے۔ ۲ سالہ ۳۵ روپے۔ سہ سالہ ۵۰ روپے
فی کاپی :- ایک روپیہ

طالب علموں، استادوں اور لائبریریوں کے لیے ۱۰ فی صد کی رعایت

یوجنا منصوبہ بند ترقی کے بارے میں عوام کو آگاہ کرتا ہے مگر اس کے مضامین صرف سرکاری نقطۂ نظر کی وضاحت تک ہی محدود نہیں ہیں

بزنس منیجر: ایل۔ آر بترہ * اسسٹنٹ ڈائرکٹر (پروڈکشن) کے۔ آر کرشنن

مضامین سے متعلق خط وکتابت کا پتہ

ایڈیٹر 'یوجنا' اردو، پبلیکیشنز ڈویژن پٹیالہ ہاؤس نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

ترسیل زر کا پتہ

بزنس منیجر، پبلیکیشنز ڈویژن پٹیالہ ہاؤس نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

اداریہ

بچوں کی تربیت گاہ ـ آغوشِ مادر

بھارت میں خواتین اور بچوں کی بہبود کو ہمیشہ سے ہی مقدم سمجھا گیا ہے۔ ہمارے آئین کے آرٹیکل ۳۹ میں مذکور ہے کہ ریاست پر یہ ذمّہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ مرد اور خواتین کارکنوں اور کم عمر بچوں کو استحصال سے بچائے۔ گزشتہ سال وزیر اعظم ہند نے ملک سے غریبی دُور کرنے اور یہاں کے عوام کا معیارِ زندگی بلند کرنے کے لیے جس نئے بیس نکاتی پروگرام کا اعلان کیا تھا، اس میں بھی خواتین اور بچوں کی بہبود کو کافی اہمیت دی گئی ہے۔

حکومتِ ہند نے اگست ۱۹۷۴ء میں بچوں کی بہبود سے متعلق جو قومی پالیسی تشکیل دی، اس میں بچوں کو قوم کا بیش قیمت اثاثہ بتایا گیا تھا۔ اس قرارداد میں یہ واضح کیا گیا تھا کہ ریاستوں کی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ بچوں کی پیدائش سے قبل اور اس کے بعد ان کی بہبود اور حفاظت کے لیے بہتر سے بہتر خدمات مہیا کرائیں تاکہ ان کی جسمانی، ذہنی اور سماجی ترقی کو یقینی بنایا جا سکے۔

اگر ہم اپنے ملک کے حالات کا جائزہ لیں تو یہ بات سامنے آئے گی کہ کچھ عرصہ پہلے تعلیم یافتہ کنبوں کے چند بچے ہی ترقیاتی سہولتوں سے فیضیاب تھے اور وہ بھی شہری علاقوں میں۔ لیکن زیادہ تر بچے خاص کر گندی بستیوں میں رہنے والے بچے تعلیم سے محروم تھے۔ ان کے والدین میں اس شعور کی کمی رہی کہ ان کے بچے زیورِ تعلیم سے آراستہ ہوں۔ نہ ان کی خوراک صحیح تھی، نہ ان کا لباس اور نہ ہی ان کو حفظانِ صحت کے طریقے اور اُصول معلوم تھے۔ بچے زیادہ تر پیدا ہوتے ہی مر جاتے تھے یا بیمار رہتے تھے۔

چونکہ بچوں کی اصل تربیت گاہ آغوشِ مادر ہے، لہٰذا حصُول آزادی کے بعد ملک میں عورتوں اور بچوں کی بہبود کے مربوط پروگرام خاص توجہ کا مرکز قرار پائے۔ ان پروگراموں کے ذریعے عورتوں کو بچوں کی صحت برقرار رکھنے کی تعلیم دی جا سکی۔ انھیں تغذیہ بخش غذاؤں، بیماریوں سے حفاظت، حفظانِ صحت کے اصولوں وغیرہ سے واقف کرایا گیا۔ سماج کے کمزور طبقوں کے بچوں کے لیے اسکولی تعلیم کا بندوبست کیا گیا۔ پانچ سال سے کم عمر کے بچوں کے لیے پری اسکول تعلیم کی سہولت بہم پہنچائی گئی۔ زچہ بچہ کی نگہداشت پر خاص زور دیا گیا۔

اکتوبر ۱۹۷۵ء سے بچوں کی بہبود کے مربُوط پروگرام کو تیزی سے آگے بڑھایا گیا۔ اُس سال اس سلسلے کے ۳۳ پراجیکٹ شروع کیے گئے۔ یہ تجربہ کامیاب رہا اور حوصلہ افزا نتائج برآمد ہوئے۔ ۱۹۷۸-۷۹ء میں مزید ۶۷ پراجیکٹوں کی منظوری دی گئی۔ ۱۹۸۰-۸۱ میں مزید سو پراجیکٹوں کو اس پروگرام سے جوڑ دیا گیا۔ اس طرح اس وقت ملک میں ۳۰۰ سو سے زیادہ بچوں کی بہبود کے مربوط پراجیکٹ زیرِ عمل ہیں۔ ہر پراجیکٹ سے ایک لاکھ آبادی کو فائدہ پہونچتا ہے۔ یہ خدمت سو آنگن واڑیوں کے توسط سے انجام دی جا رہی ہے۔ البتہ قبائلی آبادی چونکہ گھنی نہیں ہے، اس لیے وہاں ہر پراجیکٹ سے ۳۵ ہزار افراد کو فائدہ پہونچتا ہے۔ عوام کو زیادہ سے زیادہ فائدہ پہنچانے اور ان کا تعاون حاصل کرنے کی غرض سے آنگن واڑی کے لیے مقامی طور پر منتخبہ معلّمہ رکھی جاتی ہے۔ کسی بھی اسکیم کو کامیابی سے آگے بڑھانے کے لیے تربیت یافتہ عملہ درکار رہتا ہے۔ چنانچہ ان پروگراموں کو چلانے کے لیے چائلڈ ڈیولپمنٹ پراجیکٹ افسر اور آنگن واڑی کارکنوں کی تربیت کا خصوصی نصاب تیار کیا گیا ہے۔ اس میں حسبِ ضرورت تبدیلیاں بھی کرلی جاتی ہیں تاکہ یہ عصری تقاضوں کو پورا کر سکے۔ نئی دلّی میں واقع نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف پبلک کوآپریشن اینڈ چائلڈ ڈیولپمنٹ میں ۱۹۸۳-۸۴ء تک ۸۷۵ پراجیکٹ افسروں اور ۱۸۹۰ مکھیہ سیوکاؤں کی تربیت کا نشانہ رکھا گیا تھا۔ سُپروائزروں کی تربیت کے لیے ۳ ماہ کا نصاب شروع کیا گیا ہے۔

ہمارے مُلک میں عورتوں کی تعلیمی سہولتوں میں اضافے کی خاص ضرورت محسوس کی گئی ہے۔ خصوصیت کے ساتھ پسماندہ طبقات میں تو یہ اور بھی ضروری ہے۔ آج کے دَور میں جو سماجی نظام چل رہا ہے، اس میں عورتوں پر خاص ذمہ داری آتی ہے۔ انھیں گھریلو ذمہ داریاں نبھانی پڑتی ہیں اور نئی نسل کی پرورش کا بار بھی انھیں کے کاندھوں پر ہے۔ وہ مردوں کی ذمہ داریوں میں کئی طرح سے ہاتھ بٹاتی ہیں۔ اگر عورت تعلیم یافتہ نہیں ہے تو وہ مجبور اور بے بس ہو کر اپنے حالات پر انحصار کرتی ہے یا پھر وہ اپنے شوہر یا اولاد کی دست نگر ہوتی ہے اس صورت میں اسے اپنی زندگی ایک بوجھ سی لگنے لگتی ہے۔ تعلیم کے ذریعے انسانی وقار اور خود اعتمادی میں اضافہ ہوتا ہے اور انسان کے سامنے ترقی کی راہیں کھُلی نظر آتی ہیں۔ عورت کسی بھی شعبے میں اپنی صلاحیتوں کا ثبوت دے سکتی ہے۔ اگر کچھ بھی نہ کرے محض گھر کی دیکھ بھال ہی اپنے ذمہ لے لے تب بھی وہ اپنے بچوں کی بہتر رہنمائی کر سکتی ہے اور اپنے کُنبے کے لیے ایک اثاثہ ثابت ہو سکتی ہے۔ (ایڈیٹر)

وسنت ساٹھے

معاشرتی انقلاب کی جانب

اقتصادی جمہوریت کا مقدمہ

دوسرا باب: سیاسی نظام — قسط ۴ — تاریخی خط و خال

موجودہ سیاسی منظرنامے پر بحث کرنے سے قبل، یہ بات زیادہ موزوں ہوگی کہ مختصراً ہندوستان کے سیاسی نظام کے تاریخی خط و خال کا موٹے طور پر مطالعہ کر لیا جائے۔ ہندوستان کا شمار دورِ حاضر کی تہذیبوں میں ایک قدیم ترین تہذیب کی حیثیت سے ہوتا ہے اور غالباً اسے ان چند تہذیبوں میں گنا جاتا ہے جس کے حال اور ماضی کے درمیان برابر ایک رشتہ قائم رہا ہے۔ اگر ہم وادیٔ سندھ کی تہذیب کا مطالعہ کریں تو اس سے واضح ہوتا ہے کہ اس دور کے عوام کافی ترقی یافتہ تھے وہ اجتماعی زندگی کے تصور سے واقف تھے۔ انھیں شہروں کو بسانا وغیرہ بھی آتا تھا۔ وہ جہاز رانی اور آبرسانی کے نظام سے بھی واقف تھے۔ ہمارے ملک میں آریہ اپنے اس فلسفہ کے ساتھ آئے جو ان کے ایک ہزار سالہ سفر کا نچوڑ تھا جبکہ وہ قطب شمالی سے اپنے مویشیوں کے ساتھ چل کر گرم آب و ہوا نیز نئی چراگاہوں کی تلاش میں آئے اور جنھیں راستہ بھر مسلسل لڑائی لڑنی پڑی۔ ان کے پاس جنگ کا بہتر طریقہ بھی تھا اور بہتر ہتھیار بھی۔

وادیٔ سندھ ایک زرخیز علاقہ ہے اور ہر طرح سے مالا مال ہے۔ یہاں کی زندگی میں استحکام ہے۔ یہاں لوگ آرام کی زندگی کے عادی تھے۔ ایسی حالت میں طاقتور آریہ جو کہ اپنے لیے جگہ کی تلاش میں تھے، یہاں آئے لیکن کچھ عرصہ گزرنے پر یہ لوگ بھی اس خطے اور دریائے سندھ کے گرد و نواح کی ترقیوں، علم و دانش اور ماحول سے متاثر ہوئے۔

اس مرحلے پر یہ بات ذہن نشین ہونا دلچسپی ہوگا کہ دریائے سندھ کا مطلب سنسکرت میں پانی کے ایک کثیر ذخیرے سے ہے گویا کہ سمندر۔ اس دور میں یونانی اسے انڈس کہہ کر پکارتے اور فارس والوں نے اسے 'ہندو' کہا۔ اس لیے سرزمین انڈس کے لیے انڈیا کا لفظ استعمال ہوا۔ ہندوستان کا لفظ ہندو سے بنا ہے۔ یہ دراصل لفظ سندھو کا فارسی میں تلفظ تھا۔ ہندو کا لفظ کسی بھی مذہبی کتاب یا قدیم ویدک ادب میں نہیں ملتا۔ لہٰذا مجھے اکثر اس بات پر حیرانی ہوئی کہ ہندو مذہب کی اصطلاح اس عرصے میں کیسے ہوگئی۔ یہ ایسا ہی ہے کہ ہم یہ کہیں کہ ہندوستانی عوام کا مذہب ہندوستانی ہے۔ میں یہ بات اس لیے کہہ رہا ہوں کیونکہ لفظ ہندو بذاتِ خود دوسرے مذاہب مثلاً عیسائیت، اسلام، بودھ مت کے طرز پر مذہب کا تصور پیش نہیں کرتا۔ مذہب کے ارتقا کے باب میں اس پہلو کو مزید واضح کیا جائے گا، لیکن یہاں یہ کہنا کافی ہے کہ جو لوگ یہاں آئے، وہ وادیٔ سندھ کے اصل باشندوں کے ساتھ ضم ہو گئے جو کہ پہلے ہی کافی ترقی یافتہ تہذیب کے مالک تھے اور اب اس اضافے کے بعد انھوں نے ترقی کی، اور ان کا پھیلاؤ ہوا اور اب وہ پنجاب کے پانچ دریاؤں پر مشتمل پوری وادی کو پار کر گئے اور دریائے گنگا تک آگئے۔ اس مقام پر آنے کے بعد چند ہزار سالوں میں ایک بہت ہی متنوع اور مالا مال قسم کی ثقافت کو فروغ ہوا۔ یہ وہ سرزمین تھی جہاں آبادی محدود اور زراعت، کاشت، مویشی پروری اور باغبانی وغیرہ کے امکانات بہت روشن تھے۔ یہاں کے مناظر کا حسن دلفریب مفکروں اور شاعروں کو، چونکانے اور ان کی تخلیقی صلاحیتوں کو جلا دینے کے لیے کافی تھا۔ ایسی فضا میں ایسے اشخاص کا جنم ہونا جو ان تمام عجوبۂ روزگار کے پس پردہ رازہائے درون جاننے کے لیے خواہشمند ہوں، حیرانی کی بات نہ تھی۔ سلسلہ ہائے کوہ کے دلکش مناظر مثلاً ہمالیہ پہاڑ اور وسیع و عریض دریا جو کہ اس پوری سرزمین کے لیے زندگی بخش تھے، قدرت کے تحائف تھے جو یہاں کی آبادی کو ودیعت ہوئے تھے۔ چنانچہ ویدوں میں شامل افکارِ عالیہ اور مفکرین و دانشوروں کی سوجھ بوجھ اور جستجو کا سلسلہ چل نکلا اور بالآخر انھوں نے سچ کی پہچان کرنے اور گیان حاصل کرنے کے بعد ہی دم لیا۔ ترقی کے اس دور کی ایک اہم بات یہ تھی کہ شوق و جستجو پر کوئی رکاوٹ نہ تھی اور ہر شعبے میں تلاش و جستجو کا عمل جاری رہا۔ میڈیسن، فلکیات، ریاضی، انجینئرنگ، آرکیٹکچر، فنونِ لطیفہ، ادب غرضیکہ زندگی کے سبھی شعبوں میں تلاش کا سلسلہ مدھم ہونے نہ پایا۔ البتہ تحریر اور چھپائی کے ذرائع مفقود ہونے سے اس میں کچھ رکاوٹ پڑی۔ اس کے سبب

ہے۔ اس طرح یہ نظام جاری رہا۔ جب کہ وہ لوگ جنھیں بعد کے زمانے میں فارس کے حملہ آوروں نے ہندو کہہ کر پکارا، اگر اسلام یا عیسائی دھرم میں آنا چاہیں تو ان کے لیے تبدیل کا راستہ کھلا تھا۔ حالاں کہ کچھ مصلحین نے ایسے لوگوں کو جب دوبارہ ہندومت میں لانا چاہا یا بنیادی طور پر انھیں ہندومت میں داخل کرنا چاہا، تو ان کی اس بارے میں محنت و مشقت اور ساری کوششیں بے کار ثابت ہوئیں۔

ذات پات کا نظام پیشہ کی بنیاد پر وجود میں آیا۔ یہ نسلاً بعد نسل ایک خاندان سے دوسرے خاندان میں منتقل ہوتا رہا۔ اور کسی ایک پیشہ یا کام کی تربیت اور اس کا علم ایک نسل سے دوسری نسل کو منتقل ہوتا رہا۔ ابتدا میں یہ پیدائش کے ساتھ جڑا ہوا نہیں تھا لیکن رواجاً یہ پیشے، دستکاریاں اور مختلف النوع کام خاندان کے ساتھ وابستہ ہو کر رہ گئے اور پھر یہ طبقوں کے ساتھ مخصوص ہو کر رہ گئے اور یہیں سے ذات پات کی ابتدا ہوئی۔ کچھ عرصہ گزرنے پر ان پیشوں پر سماجی اور مذہبی رو سے مہر تصدیق ثبت کر دی گئی اور ہندوستانی پس منظر میں یہ کم و بیش سماجی ضابطۂ حیات بن گئے۔ علوم و فنون نیز فنون حرب نیز تجارت وغیرہ کے سبب اُن لوگوں کے ہاتھوں میں اقتدار آگیا جو کہ ان میں مہارت رکھتے تھے اور یہ ذاتیں اور طبقے مقابلتاً افضل خیال کی جانے لگیں اور ہاتھ کے کام والے پیشے کرنے والوں کو مقابلتاً کم درجہ ملا۔ بدقسمتی سے ہاتھ کے کام کی چند اقسام کو گندہ اور غلیظ خیال کیا گیا اور جو ذاتیں ان کاموں سے وابستہ تھیں انھیں اچھوت کہا گیا۔ یہ عملاً ایک طرح کا سماجی ناسور بن گیا۔ ہندوستانی سماج اس بیماری میں گھر گیا۔ چنانچہ اب وقت کی اہم ترین ضرورت یہ بن گئی ہے کہ اس لعنت سے نجات حاصل کی جائے۔

سماجی اور مذہبی مصلحین نے سیکڑوں سال اس بیماری کی بیخ کنی کی کوشش کی لیکن ذاتیں چوں کہ پیشے سے منسلک ہیں، لہٰذا اس بُرائی سے نجات نہیں مل سکی۔ لیکن اب دورِ حاضر میں طریقِ تعلیم، پیشہ ورانہ تربیت اور صنعتی ترقی کے سبب یہ ممکن ہو سکا ہے کہ مختلف لوگ مختلف کام انجام دے سکیں اور نہ صرف وہ لوگ جو ایک خاص پیشہ والے کنبے میں پیدا ہوئے ہیں بلکہ دوسرے لوگ بھی وہی کام انجام دے سکیں، لہٰذا ذات پات کا پورا نظام ایک بنیادی تبدیلی سے گزر رہا ہے۔

آج ایک برہمن کا بیٹا جو کہ سورن ذات سے متعلق سمجھا جاتا ہے، وہ آج جوتوں کی دکان پر جوتے بیچنے کے کام میں لگا ہے لیکن پھر بھی کوئی اس کی ذات کو موچی نہیں بتاتا۔ اس طرح کمتر ذاتوں کے کسی کنبے میں پیدا ہونے والا فرد تعلیم پالیتا ہے اور لیکچرر یا پروفیسر بن جاتا ہے یا ڈاکٹر بن جاتا ہے لیکن پھر بھی اس کو اس ذات کا فرد شمار نہیں کیا جاتا جو کہ علم و دانش کے لیے بنی تھی۔

میں نے اکثر یہ محسوس کیا ہے کہ اس ذات پات کے نظام سے چھٹکارا پانے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ ہر شخص کے نام سے اس کے ایسے شناختی نام ہٹا دیے جائیں جن سے اس کی ذات کی طرف اشارہ ملتا ہے۔ اس سے قبل لوگ مردم شماری تک میں اپنی ذات یا مذہب بتانے کے عادی تھے لیکن ہمارے آئین نے ذات پات کے نظام کو ختم کر دیا ہے۔ خاص کر چھوت چھات کے نظام کی بیخ کنی کر دی ہے، اس لیے اب اسے مردم شماری میں واضح نہیں کیا جاتا۔ البتہ مذہب ضرور بتانا پڑتا ہے اور ہندو مذہب میں ذاتوں کی شناخت خاندانی ناموں سے ہو جاتی ہے۔ اس لیے یہ خاندانی نام ہٹا دینا مناسب رہے گا۔ اس لیے نام نہاد کمتر ذات والوں کے نام کے وہ جزو اُڑا دینے چاہئیں جن سے ان کی ذات کی شناخت ہوتی ہے۔ ایسا کرنے سے ایک یا دو نسلوں کے دوران اس طرح کے بیرونی شناختی عناصر غائب ہو سکیں گے۔ اس کے ساتھ ہی یہ دیکھنا بھی ضروری ہے کہ اگرچہ کمتر ذات والوں کے فائدے کے لیے ریزرویشن دینے کا بنیادی خیال قابلِ تعریف تھا۔ لیکن یہ استحقاق اور ریزرویشن ذات پات کے نظام کو دوام بخشتے رہے ہیں اور اس کے سبب ان کی شناخت پر مُہرِ تصدیق ثبت ہوتی جا رہی ہے۔ اگر یہ مراعات اقتصادی بنیادوں پر دی جائیں تو کیا اس سے مطلوبہ مقاصد حل نہیں ہو سکتے؟ کیونکہ پسماندہ طبقے یا پسماندہ ذاتوں کے لوگ اس طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں جو اقتصادی طور پر کمزور ہے۔ اس لیے اقتصادی طور پر کمزور طبقوں کی امداد اور رعایتوں سے انھیں کا بھلا ہوگا۔ اس سے اُن مذہبی اقلیتوں کا بھلا ہوگا جو پسماندہ اور پچھڑی ذاتوں کو دیے جانے والے حقوق اور رعایتوں سے فائدہ نہیں اُٹھا پاتیں۔

آج ایک عجیب تصور کارفرما ہے۔ اقتصادی طور پر کمزور ہر ایک طبقہ یہ مانگ کر رہا ہے کہ اسے شیڈولڈ کاسٹ اور شیڈولڈ ٹرائب کے زمرے میں رکھا جائے تاکہ اسے چند مراعات، استحقاق اور ریزرویشن مل سکے۔ یہ سب کیا ہیں۔ ان سب رعایتوں کا ماحصل اقتصادی فائدے حاصل کرنا ہی تو ہے۔ لیکن چوں کہ انھیں ذات پات کے نظام سے جوڑ دیا گیا تھا اس لیے اس کی شناخت بدستور چلی آرہی ہے اور یہی سبب ہے جو اس کی راہ میں حائل ہے۔ میں جانتا ہوں کہ اس مسئلے سے نپٹنا آسان نہیں کیوں کہ یہ ہزاروں سال پرانا مسئلہ ہے۔ لیکن جب تک سنجیدگی سے اس پر غور نہیں ہوگا اور دوررس علاج نہیں کیا جاتا، اس وقت تک اس مسئلے کا پائیدار حل تلاش کرنا دشوار ہے جس سے انسان کو انسان ہی سمجھا جائے۔ اور اس کے لیے صلاحیت اور لیاقت پیمانہ ہو اور کوئی دوسرا نہیں۔

کبھی کبھی میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ اگر مذہبی رہنما سناتن دھرم گویا کہ ہندو دھرم کی خاص چار شاخوں کے شنکر اچاریہ ایک ساتھ مل کر یہ اعلان کر دیں کہ

(باقی صفحہ پر)

ہنسراج رتن

بھارت میں توانائی کے وسائل

کئی واقعات ایسے ہوتے ہیں جو ملک و ملت کے عمل اور خیالات دونوں کو بدل دیتے ہیں۔

ایسا ہی ایک واقعہ ۱۹۶۰ میں ہوا۔ جبکہ امریکہ کی ایک کمپنی نے جو باہر سے تیل منگوایا کرتی تھی۔ تیل کی قیمتوں میں کمی کر دی۔

عرب دیس اور ایران جن کو اس عمل سے شدید نقصان پہنچا۔ انھوں نے تیل برآمد کرنے والی قوموں کی ایک انجمن بنائی اور سوچ بچار کرنے لگے کہ خسارے کو کیسے پورا کیا جائے۔ ان ملکوں کی آمدنی کا ذریعہ تیل کی برآمد تھی۔

۱۳ برس گزر گئے اور یہ ملک تیل کی قیمت ۲ ڈالر فی بیرل سے بڑھا نہ پائے۔

۱۹۷۳ میں یوم کپور (Yom Kippur) کی جنگ ہوئی اور ان ملکوں کی رگ حمیت پھڑک اٹھی اور تیل برآمد کرنے والی انجمن نے یکایک تیل کی قیمتوں میں چار گنا اضافہ کر دیا۔ اس سے امریکہ تو کیا دنیا بھر میں ہلچل مچ گئی۔ صنعتیں ٹھپ ہو کر رہ گئیں۔ سینکڑوں ملکوں کے بجٹ میں بے پناہ اضافہ ہو گیا۔ قیمتوں میں ایک دم اس طرح اضافہ ہوا کہ لوگوں کا دم نکلنے لگا۔ ہندوستان پر بھی اس کا بیحد برا اثر پڑا۔

اور ابھی لوگ سنبھلنے بھی نہ پائے تھے کہ ۸۰-۱۹۷۹ میں تیل برآمد کرنے والے ملکوں نے تیل کی قیمتوں میں پھر اضافہ کر دیا۔ بھارت نے ۸۱-۱۹۸۰ میں جو تیل باہر سے منگایا۔ اس کی قیمت ۵۳۰۰ کروڑ روپے کے لگ بھگ تھی۔ دوسرے لفظوں میں بھارت کی کل برآمدی آمدنی کا ۸۰ فیصد حصہ تیل کی درآمد میں خرچ ہو گیا۔ اور اس طرح بھارت کی برآمدی تجارت میں ۵۸۰۰ کروڑ روپے کا گھاٹا ہوا۔

لیکن جب جب مشکلیں پیدا ہوتی ہیں، نئے راستے تلاش کرنے میں انسانی ہمت کارگر ثابت ہوتی ہے۔ بھارت میں بھی ایسا ہوا۔ انگلستان نے بھی تیزی سے تیل کے وسائل ڈھونڈنے شروع کئے۔ لیجئے پہلے انگلستان کی بات ہی سنئے۔

ان ۱۳ برسوں میں انگلستان نے شمالی سمندر کے ساحلی علاقوں میں ۲۱ کنوئیں بنائے۔ یہ سمندر بیحد خطرناک لہروں کا مالک ہے۔ یہاں ۱۰۰ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے بیحد سرد ہوائیں چلتی ہیں، جو تیل ڈھونڈنے والے کل پرزوں کو توڑ دیتی ہیں۔ لیکن انگلستان نے ہمت نہیں ہاری۔ یہ زندگی اور موت کا سوال تھا۔ ۱۹۷۸ میں انگلستان نے ۱۰ کروڑ ۳۱ لاکھ ٹن تیل پیدا کیا۔ جو اس کی ضرورت سے کہیں زیادہ ہے اور اس طرح انگلستان دنیا میں تیل پیدا کرنے والے ملکوں میں پانچویں نمبر پر آ گیا۔

اندازہ لگایا جاتا ہے کہ کویت، انڈونیشیا اور ابوظہبی جس قدر تیل پیدا کر رہے ہیں اسی قدر انگلستان بھی کرنے لگا ہے۔

انگلستان نے تیل پیدا کرنے میں بہت زیادہ سرمایہ لگا دیا۔ یہاں تک کہ جو ساحل سمندر پر تیل کھودنے کے لئے پلیٹ فارم بنائے ان پر اس کا ۱۳۰ کروڑ پونڈ صرف ہو گیا۔ لیکن اس کا جو نتیجہ نکلا، وہ اس قدر دل خوش کن تھا کہ سب خرچ واپس آ گیا۔ ۱۹۸۰ میں اگر انگلستان نے تیل کی فروخت سے ۱۴ ارب پونڈ کمائے تو اگلے برس ۲۰ ارب پونڈ۔ اور اس میں ہر برس اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ انگلستان نے تیل کی کھوج میں نئی مشینیں استعمال کیں۔ نئے تجربات کئے اور کامیاب رہا۔

بھارت نے بھی تیل صاف کرنے کے میدان میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ ۵۱-۱۹۵۰ میں بھارت محض ۵ لاکھ ٹن کے قریب تیل پیدا کرتا تھا۔ ۶۶-۱۹۶۵ میں یہ ۴۳ لاکھ ٹن ہوا اور ۷۱-۱۹۷۰ میں ۶۸ لاکھ ٹن۔ جن دنوں تیل کی قیمتوں میں پہلی بار اضافہ ہوا۔ اس وقت بھارت لگ بھگ ۸۰ لاکھ ٹن تیل پیدا کرتا تھا اور اس کی ضرورتیں ۲ کروڑ ٹن تیل باہر سے منگوا کر پوری ہوتی تھیں۔

جیسے ہی تیل کی درآمدی قیمتوں میں اضافہ ہوا، بھارت سرکار نے ایک نئی وزارت قائم کی۔ اکتوبر ۱۹۷۴ میں انرجی منسٹری قائم ہوئی۔ اس وزارت کے ذمے نہ صرف تیل کی کھوج رکھی گئی بلکہ توانائی کے تمام وسائل کی تلاش، استعمال اور تقسیم کا کام بھی سپرد کر دیا گیا۔

اس وقت بھارت کو ہر سال ۳ کروڑ ۵۰ لاکھ ٹن تیل کی ضرورت ہے اور وہ اس کا ۶۵ فیصد حصہ اندرونی وسائل سے پورا کرتا ہے لیکن ۳۵ فی صد درآمد پر لگ بھگ ۵۰۰۰ کروڑ روپے غیر ملکی سکے کے زرمبادلہ میں ادا کرنے ہوتے ہیں جس سے بھارت کی برآمدی تجارت کی کمائی ضائع ہو جاتی ہے۔ اس وقت

بھارت نے جو پلان بنائے ہیں اور جیسا منصوبے پر رو چل رہا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اگلے ۱۵ برس میں بھارت تیل کی ضرورت خود اپنے وسائل سے پوری کرنے لگے گا۔

تیل کی کھوج کے ساتھ ساتھ بھارت توانائی کے دوسرے وسائل بھی استعمال کرنے کی کوشش میں ہے۔ اس وقت بھارت میں ۲۴۰ یونٹ فی کس کے حساب سے بجلی خرچ ہو رہی ہے، جو بہت کم ہے۔ اور یہ بجلی بھی بڑی بڑی صنعتوں، شہروں اور کارخانوں کی ضرورت پوری نہیں کر سکتی۔ ہر روز ندر جنوں بار بجلی کم ہو جاتی ہے۔ تیزی سے چلتی ہوئی فیکٹریاں آناً فاناً بند ہو جاتی ہیں۔ ان کے کل پرزے ٹوٹ جاتے ہیں۔ کھیتوں میں پانی نہیں پہنچ رہا۔ سکولوں کے بچے رات کو پڑھ نہیں سکتے۔ بجلی نہیں تو کوئلہ کی کانوں سے کوئلہ نہیں نکل سکتا۔ کوئلہ نہیں تو ریلوے کی گاڑیاں نہیں چل سکتیں۔

غرضیکہ بجلی کی قلت نے ملک کی اقتصادی ترقی روک رکھی ہے اور غریبی دور کرنے کی تمام کوششیں بے کار جا رہی ہیں۔ اس پر طرہ یہ کہ بھارت میں بجلی پیدا کرنے کے اس قدر وسائل ہیں کہ وہ ملک بھر کے ہر گاؤں میں بجلی پہنچا سکتا ہے۔ ہر فیکٹری کو ۲۴ گھنٹے بجلی مہیا کر سکتا ہے۔

بھارت کے پاس ۱۱۱۰۷/۰ کروڑ ٹن تو کوئلہ کے بھنڈار ہیں۔ ۱۵۰۰ کروڑ ٹن تیل کے ذخیرے ہیں۔ یورانیم، تورینیم اس قدر ہے کہ اگلے ڈیڑھ سو برس میں بھی کھپت نہ ہو پائے۔

جہاں تک دریاؤں کے پانی کا سوال ہے۔ اس میں اس قدر تیزی اور روانی ہے کہ بھارت سارے ملک کو بجلی دے سکتا ہے۔

ایک مثال لیجئے:۔

برہم پتر دریا میں سے ۱۰۰۰۰ میگاواٹ بجلی پیدا کی جا سکتی ہے۔ ۱۹۸۱ میں برہم پتر بورڈ قائم ہوا تھا اس نے برہم پتر کے طاس میں بجلی پیدا کرنے کے تین اہم منصوبے بنائے ہیں۔

اروناچل پردیش میں ایک دریا ہے "دی ہانگ" یہ برہم پتر کے طاس کا ہی حصہ ہے۔ بورڈ نے اس طاس کے پانی سے ۲۲۰۰۰ میگاواٹ بجلی پیدا کرنے کی ایک اسکیم بھارت سرکار کو منظوری کے لیے پیش کی ہے۔ دوسری دو اسکیمیں ہیں۔ ۵۰۰۰ میگاواٹ۔ سبان سری سے جو آسام اور اروناچل کی سرحدوں پر بہتا ہے۔ اور ۱۵۰۰ میگاواٹ۔ بارک سے جو منی پور، میزورم اور آسام میں سے گزرتا ہے۔

اندازہ یہ ہے کہ دی ہانگ منصوبے پر ۹۰۰۰ کروڑ روپے خرچ ہوں گے اور اسی طرح دوسرے منصوبوں پر بھی بھاری خرچ آئے گا۔ لیکن اگلے دس برسوں میں ان منصوبوں سے بجلی ملنے لگے گی۔ دریائے برہم پتر کے طاس کے تمام دریاؤں میں بجلی پیدا کرنے کی جو صلاحیت ہے وہ ملک کی تمام صلاحیت کا ۴۰ فیصد ہے۔ لیکن اس میں سے محض ایک فیصد استعمال کیا جاتا ہے۔ اسی طرح بھارت کے پاس سورج، گیس، ایٹم اور درجنوں ایسے ہی طریقوں سے بجلی پیدا کرنے کی صلاحیت ہے کہ ملک چمک اٹھے۔

سوال محض لگن، محنت اور سرمایہ کاری کا ہے۔ لیکن یہ تبھی ممکن ہے جب وسائل کو استعمال کرنے کے لیے لوگ تکنیکی طور پر تیار رہیں۔ دیس میں ہی اعلیٰ قسم کی مشینیں بنیں، تعلیم و تربیت مناسب ہو، اور یہ تب ممکن ہے۔ جب امن قائم رہے۔ لوگ تن من دھن لگا کر ملک کی ترقی کے ضامن ہوں۔

لیکن اداسی یا نا امیدی کی کوئی وجہ نہیں۔ اس ملک کی کچھ بات ہے کہ یہ ہر لمحہ ترقی پر گامزن ہے اور جب جب اس پر مشکلیں پڑیں، تب تب اس کے عوام نے نئی منزلیں ڈھونڈ نکالیں۔

بے پناہ وسائل، دعوتِ عمل دیتے ہیں۔ آیئے آگے قدم اٹھائیں۔



بقیہ: سیاسی نظام

پیدائش اور پیشہ پر مبنی ذات پات کا نظام اپنی اہمیت کھو بیٹھا ہے اور دورِ حاضر میں وہ لایعنی ہے اور وہ ذات پات کے نظام کو یکسر موقوف کر دیں تو میرا خیال ہے کہ یہ سناتن دھرم کا اپنی حقیقی اور سچی روح کے ساتھ آزادانہ لیکن دین کے ذریعے احیاء ہوگا۔

تاریخ کی تفاصیل میں جائے بغیر ہم یہ جانتے ہیں کہ اسلام کے پیروکار (اور وہ بہت سے لوگ جو تبدیلیٔ مذہب کے بعد مسلمان ہو گئے تھے) تقریباً ایک ہزار سال تک سیاسی منظر نامے پر چھائے رہے۔ انھوں نے ہندوستان کے بڑے حصے پر حکمرانی کی اور اسے اپنی سرزمین بنایا خاص کر شمالی ہندوستان کے علاقوں میں، سماجی، سیاسی زندگی پر اسلام کے اثرات کے علاوہ اس کے تاریخی اثرات بھی پڑے اور حتیٰ کہ ایسٹ انڈیا کمپنی نے جو کہ تجارتی اغراض و مقاصد کے تحت آئی تھی' یہ محسوس کیا کہ یہاں ایک حکمراں کو دوسرے کے خلاف اُبھارنے سے اپنا اقتدار جما سکتی ہے۔ دو بڑی مذہبی قوتوں یعنی سناتن دھرم اور اسلام نے جو رول ادا کیا اس سے سبھی واقف ہیں۔ بالآخر اس نے ملک کو تقسیم کر دیا۔ یہ تقسیم اس لیے نہیں ہوئی کہ دونوں مذہبوں کے ماننے والے ایک ساتھ نہیں رہ سکتے تھے بلکہ اس سے بھی زیادہ اس کا سبب یہ تھا کہ دونوں نے یہ محسوس کیا کہ آزاد ہندوستان میں ان کو محدود اختیارات حاصل ہونے چاہئیں جس سے کہ وہ حکمرانی کر سکیں۔ برطانوی حکمرانوں نے اس طرح کی زمرہ بندی کو نہ صرف ہوا دی بلکہ ہر مرحلے پر اس کی حوصلہ افزائی کی۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ملک کو تقسیم وحشیانہ آپریشن سے گزرنا پڑا! اور یہ سب کام آزادی کی مسرت اور خوشی کے نام پر ہوا۔

(آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں: آزادی کے بعد کا منظر)

پی۔ آر۔ دوبھاشی

علاقائی منصوبہ بندی



اس سے پچھلے مضمون میں مصنف نے سیکٹروار منصوبہ بندی کی وضاحت کرتے ہوئے کہا تھا کہ یہ منصوبہ بندی کا وہ طریق کار ہے جس کی رو سے مجموعی شرح ترقی اور سیکٹروار شرح ترقی میں توازن قائم کیا جاتا ہے۔ زیر نظر مضمون میں اس نے یہ واضح کیا ہے کہ مکانی منصوبہ بندی یا علاقائی منصوبہ بندی، علاقائی ترقی کے تصور کے گرد گھومتی ہے۔

پچھلے باب میں منصوبہ بندی کے طریق کار کو قومی مجموعی حدود میں رکھ کر اس پر غور کیا گیا تھا۔ ظاہر ہے کہ ہندوستان جیسے وسیع و عریض ملک میں منصوبہ بندی ذیلی قومی اکائیوں مثلاً ریاست یا جمہوریہ یا ضلع یا بلاک یا گاؤں وغیرہ سے متعلق ہو سکتی ہے۔ معیشت کے سیکٹروں کے لیے ذیلی منصوبوں کی تشکیل سے اگر ایک خاص قسم کے طریق کار سے متعلق مسائل اٹھ کھڑے ہوتے ہیں، تو ان ذیلی قومی اکائیوں کے لیے ذیلی منصوبوں کی تشکیل سے دوسری طرح کے ایسے مسائل اٹھ کھڑے ہوتے ہیں جن کا تعلق بھی طریق کار سے ہے۔ جس طرح مجموعی منصوبوں کی ذیلی تقسیم کے طریق کار کا مسئلہ سامنے آتا ہے اور انھیں سیکٹروار منصوبوں کے ایک متوازن نظام کے تحت لانا ایک مسئلہ ہوتا ہے۔ اسی طرح قومی منصوبے کو مذکورہ نوعیت کے یونٹوں کے ایک متوازن نظام میں بانٹنا بھی طریق کار کے مسئلے سے خالی نہیں۔ جس طرح یہ خیال ظاہر کیا جاتا ہے کہ مجموعی منصوبوں سے اکائی والے پلان کی طرف جانے کے مقابلے میں بہتر یہ ہے کہ مجموعی منصوبہ اقتصادی طور پر مستحکم اور تکنیکی اعتبار سے مضبوط پراجیکٹ والے منصوبوں کی بنیاد پر وضع کیا جائے۔ اسی طرح یہ خیال بھی ظاہر کیا گیا ہے کہ قومی منصوبہ دیہی منصوبوں کو یکجا کر کے تشکیل دیا جانا چاہیے۔ یعنی کہ دیہی منصوبے پہلے وضع کیے جائیں۔

منصوبہ بندی کے طریق کار سے متعلق اختلاف رائے

اس عنوان سے منصوبہ بندی کے طریق کار کے بارے میں ایک تنازعہ اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا منصوبہ بندی لازمی طور پر اوپر کی طرف سے شروع ہو یا نیچے کی طرف سے۔ ایک خیال یہ ہے کہ منصوبہ بندی لازمی طور سے اوپر سے شروع ہونی چاہیے کیونکہ وسائل کا اندازہ قومی سطح پر ہی ہو سکتا ہے اور وسائل اور ضرورتوں کا قومی سطح پر اندازہ لگانے کے بعد ہی متوازن قومی منصوبہ تشکیل پا سکتا ہے۔ اس کے برعکس یہ کہا جاتا ہے کہ دیہی منصوبہ ہی مقامی ضرورتوں اور مقامی وسائل کے بارے میں بتا سکتا ہے۔ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ جمہوری منصوبہ بندی کے نقطہ نظر سے یعنی عوامی اشتراک کی مدد سے مقامی منصوبہ بندی قومی منصوبہ بندی کے مقابلے زیادہ نفع بخش ہے۔ اس کے ذریعے عوامی تعاون اور اشتراک عمل بڑے پیمانے پر حاصل کیا جا سکتا ہے اور ان کی مدد سے مقامی منصوبے کو موثر طریقے سے عملی جامہ پہنایا جا سکتا ہے۔

البتہ نچلی سطح سے عمل میں لائی گئی منصوبہ بندی کہیں بھی عملی طور پر کامیاب نہیں ہوئی۔ ایک تو یہ کہ بڑے پراجیکٹ یقیناً مقامی منصوبہ سازوں کے دائرہ اختیار سے باہر ہوں گے اور دراصل یہی بڑے پراجیکٹ تبدیلی کا اہم ذریعہ ثابت ہوں گے۔ ان کے ذریعے ملک کی اقتصادی ترقی میں اہم تبدیلی لائی جا سکتی ہے مزید براں مقامی منصوبہ بندی ضرورتوں کو تو احاطہ کر سکتی ہے مگر ان کی تکمیل کے لیے وسائل کو حرکت میں لانے کے لیے کافی نہیں ہو سکتی۔ اس کے نتیجے میں مقامی منصوبوں کا قومی منصوبے کی صورت میں اجتماع محض آرزوؤں اور امنگوں کا اظہار تو بن سکتا ہے مگر ان کی تکمیل کا وسیلہ نہیں، اس طرح کے اجتماع کی کوشش بھی بے سود ثابت ہو گی۔

نچلی سطح سے کی جانے والی منصوبہ بندی کے یہ نقائص ہیں مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ اوپر کی طرف سے کی جانے والی منصوبہ بندی مسائل سے خالی ہے۔ بہت ممکن ہے کہ اس طرح کی منصوبہ بندی میں مقامی وسائل اور ضرورتوں کا لحاظ نہ رکھا گیا ہو۔

اگر اوپر کی سطح سے کی جانی والی منصوبہ بندی تسلیم کر لی جائے تو قومی منصوبہ کو ذیلی قومی اور مقامی منصوبوں میں توڑنے کا طریق کار وضع کرنا ہوگا۔ اس کے لیے قومی پراجیکٹوں، علاقائی پراجیکٹوں اور مقامی پراجیکٹوں کے درمیان حد فاصل قائم کرنی ہوگی۔ علاقائی منصوبے میں علاقائی پراجیکٹ اور ایسے قومی پراجیکٹ شامل

ہوں گے جو کہ اُس نقشے میں آتے ہیں۔ اس طرز پر مقامی منصوبے مقامی پراجیکٹوں اور ایسے علاقائی پراجیکٹوں پر مشتمل ہوتے ہیں جو کہ اس مقام سے متعلق ہیں۔ علاقائی اور مقامی منصوبے وضع کرتے وقت منصوبہ سازی سے متعلق مقابلتہً اعلیٰ ایجنسی کی طرف سے عام سائز کا اشارہ دے دیا جائے گا اور اس کی نشاندہی کر دی جائے گی البتہ اس کی تفاصیل علاقائی اور مقامی حکام ہی طے کریں گے۔ علاقائی اور مقامی حکام کو قومی سرمایہ کاری کے نتیجے میں وجود میں آنے اثرات نیز قومی پراجیکٹ... کی سرمایہ کاری کے اثرات ... ہوگا۔

معیار کا سوال

مرکزی سیکٹر، ریاستی سیکٹر اور مقامی سیکٹر کے دائرہ کار میں آنے والی سرگرمیوں کی درجہ بندی کے لیے معیار اور کسوٹی کا سوال ہے؛ لامرکزیت کے ماحول کے حامی زیادہ سے زیادہ پراجیکٹ مقامی سیکٹر کے تحت چاہیں گے جب کہ مرکزی اُصول کے حامی مرکزی سیکٹر کے لیے زیادہ سے زیادہ سرگرمیاں پسند کریں گے۔ لہٰذا ایسا واضح اقتصادی معیار کہ کون سا پراجیکٹ مرکز کے پاس ہو۔ اور کون سی سرگرمی لامرکزی سیکٹر میں ہو، وضع کرنا آسان نہیں۔

جہاں تحریری آئین موجود ہے، وہاں وفاقی اور ملحقہ اکائیوں کے درمیان ایسی آئینی تقسیم موجود ہے جس کی بنیاد پر قومی اور علاقائی سیکٹر کی نشاندہی کی جا سکتی ہے۔ مرکزی پلان کی تقسیم کے سلسلے میں طریقِ کار کی وضاحت ہو جانے کے بعد بھی اوپر والے منصوبوں اور نچلی سطح والے منصوبوں کے درمیان تال میل کا سوال باقی رہ جاتا ہے۔ نچلی سطح کا منصوبہ مقامی وسائل اور مقامی ضرورتوں پر مبنی ہوتا ہے اوپر کی سطح کا منصوبہ قومی منصوبے میں اُس جزو کی صرف نشاندہی کرے گا جو کہ کسی خاص مقام کے منصوبے سے تعلق رکھتا ہے اور جو مقامی وسائل کی بنیاد پر وضع کیا گیا ہے۔ ان دونوں میں تال میل قائم کر کے مقامی منصوبے اور مرکزی منصوبے کے درمیان ہم آہنگی پیدا کرنی ہے۔

مقامی پلان محض قومی پلان کی رسمی تقسیم کو ہی واضح نہیں کرتے جو کہ اس کی مختلف اکائیوں کی صورت میں عمل میں آتی ہے۔ ہر مقام کے اپنے وسائل اور امکانات ہیں، وہاں کی ضرورتیں الگ ہیں۔ چنانچہ قومی وسائل کی تخصیص میں ان سب باتوں کو سامنے رکھنا ہوتا ہے اس کے لیے علاقائی سطح پر خصوصی تجزیوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ حالیہ برسوں میں علاقائی بنیادوں پر تجزیہ و تحلیل نیز اُن کے مطالعوں کے سلسلے میں نئی نئی تکنیک اپنائی گئی ہیں۔ اس مطالعے کا نام ہی الگ سے ریجنل سائنس پڑ گیا ہے۔

ماہر اقتصادیات الفریڈ ویبر (Alfred Weber) کی مقام کے تعین کی تھیوری کے نتیجے میں یہ ریجنل سائنس ظہور پذیر ہوئی۔ الفریڈ ویبر نے ایسے عناصر کی نشاندہی کی جس کی بنیاد پر کسی خاص مقام پر کسی خاص صنعت کو کس حد تک لگایا جا سکتا ہے یا رد کیا جا سکتا ہے۔ انھوں نے وسائل کی مرکزیت اور لامرکزیت کے سلسلے میں کچھ اصول بتائے۔ جب کبھی کسی نئی جگہ پر زیادہ سے زیادہ سرگرمیاں شروع کی جاتی ہیں، تو ایک خاص حد تک یہ نئی سرگرمیاں مفید ثابت ہوتی ہیں۔ لیکن اُس حد کے پار صنعتوں کا ارتکاز اور معاشی سرگرمیوں کی بھیڑ بھاڑ نفع بخش نہیں ہوتی اور پھر یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ اس مقام سے دور نئی سرگرمیوں کو شروع کیا جائے۔ ان نظریات کی بنیاد پر والٹر اسارڈ (Walter Isard)، اور کرسٹالر (Christaller) اور دیگر ماہرین اقتصادیات نے علاقائی منصوبہ بندی کی مزید واضح تھیوریاں وضع کی ہیں۔

علاقائی منصوبہ بندی

علاقائی منصوبہ بندی یا مکانی منصوبہ بندی علاقے کی ترقی کے تصور پر مبنی ہے۔ اقتصادی منظر نامہ ایسے قدرتی اور اقتصادی عناصر کی آغوش میں پرورش پاتا ہے جن کی وہاں مقامی طور پر بہتات ہوتی ہے اور جن کے سبب اس علاقے میں یکسانیت آتی ہے۔ اس طرح سے ماہرین اقتصادیات نے مرکزی خطوں، دریائی وادیوں کے علاقوں، صنعتی پٹیوں، جغرافیائی احاطوں، کان کنی کی پٹیوں، طاس کے علاقوں، سیلابوں کی روک تھام والے علاقوں وغیرہ کی نشاندہی کی ہے۔ چند یکساں عناصر مثلاً پانی، مٹی کی اقسام، ٹرانسپورٹ کے نظام وغیرہ کے پیشِ نظر علاقائی بنیادوں پر اقتصادی منصوبہ بندی فروغ پا سکتی ہے۔ ضروری نہیں کہ یہ علاقے انتظامی حدود کے ساتھ میل کھاتے ہوں۔ دریائی طاس یا مٹی کی اقسام مصنوعی حد بندیوں سے ماورا ہوتی ہیں۔ اس لیے ایک نیا تصور اُبھر رہا ہے کہ موجودہ انتظامی حدود سے ہم آہنگی رکھنے والے علاقوں کے لیے پلان وضع کرنے کی بجائے منصوبہ بندی والے علاقوں کی حد بندی کر دینی چاہیے اور ایسے علاقوں کے لیے علاقائی یا ریجنل پلان تیار کیے جانے چاہییں۔ اس لیے خروشچیف نے روسی منصوبہ بندی میں ایک نیا نظام چالو کیا اور اس نے ملک کو ۵۵ منصوبہ بندی والے خطوں میں بانٹ دیا۔

اس طرح کے منصوبہ بندی والے خطوں کے لیے کچھ ایسی حدود ہیں جو انھیں آپس میں بانٹ دیتی ہیں یہ تقسیم اقتصادی محرکات کے روشن امکانات کے پیشِ نظر ہوتی ہے۔ کبھی کبھی اقتصادی محرکات کے لحاظ سے روشن اُن مرکزوں کو کلیدی مقامات یا ترقی کے مرکز کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ ان ترقیاتی مرکزوں کے نظام کی سب سے پہلی سیڑھی چند گاؤں یا ان سے متعلق چند برادریاں ہوتی ہیں۔ اس طرح کے معاون مرکزی مقامات کے جھرمٹوں کو مقابلتہً اعلیٰ زمرے کے ترقیاتی مرکز کے گرد رہنا پڑتا ہے۔

علاقائی منصوبے یا مقامی منصوبے میں بحیثیت مجموعی علاقے کی اقتصادی سرگرمیوں کے نشانوں کی

(باقی صفحہ ۱۲ پر)

کے۔ سی۔ بترہ

بکھرے پھول

پاربتی رسوئی گھر میں بکھرے برتنوں کو بٹور رہی تھی کہ اتنے میں ٹوٹے سے پنگوڑے میں لیٹا ننھا بلک بلک کر رونے لگا۔ اُس کی عمر تو تھی ایک سال مگر نحیف ہونے کے باعث پانچ چھ مہینے کا لگتا تھا۔ نحیف و لاغر ہوتا بھی کیوں نا جبکہ صرف دو تین ماہ ہی اُس نے اپنی ماں کا دودھ پیا تھا۔

پاربتی نے ننھے کا رونا سُنا تو بڑبڑانے لگی، "ابھی تو پنگوڑے میں لٹایا تھا، اور اتنی سی دیر میں پنگوڑا کھٹیں کاٹنے لگا۔" یہ کہتے کہتے پاربتی نے بچے کو گود میں اُٹھا لیا اور یک بیک اُس کا رونا بند ہو گیا۔ پاربتی بچے کو گود میں لٹکائے پھر سے بکھرے برتنوں کو سمیٹنے لگی۔

باہر آنگن میں چار سالہ مالتی اور تین سالہ کلو ریت کے گھروندے بنا رہے تھے، اچانک تیز ہوا کے جھونکے سے کلو کا گھروندا ٹوٹ گیا۔ کلو بھلا یہ کیسے برداشت کرتا کہ مالتی کا اونچا گھروندا سلامت رہے جبکہ اُس کا گھروندہ مٹی میں مل گیا ہو۔ لہٰذا اُس نے مالتی کے گھروندے کو بھی اپنے پیر کی ٹھوکر سے گرا دیا۔ اور تالیاں بجانے لگا۔

مالتی کو تاؤ آ گیا۔ اُس نے کلو کی پیٹھ پر دو چار مکے ایسے جمائے کہ وہ تلملا اُٹھا۔ اور لگا زور زور سے چلانے "دادی! دادی اماں... مار دیا... مار دیا ملتو نے مار دیا اوں ہوں ہوں..."

برتن ابھی تک بکھرے پڑے تھے رسوئی کے ہر کونے میں۔ ایک گھنٹہ پہلے ہی تو بچے ناشتہ کھا کر سکول گئے تھے۔ سب سے بڑا راجو ساتویں میں، دوسرا سوہن پانچویں میں، پھر چمیلی تیسری جماعت میں اور اُس سے چھوٹی کمو پہلی میں تھی۔ پاربتی نے کلو کا رونا سُنا تو ننھے کو گود سے لٹکائے بھاگتی ہوئی باہر آئی اور ناک بھوں چڑھا کر مالتی کو ڈانٹنے پھٹکارنے لگی۔ روتا سا منہ بنائے مالتی آنگن سے باہر گلی میں چلی گئی اور اُس کے پیچھے پیچھے کلو بھی فرار ہو گیا۔

اتنے میں لالہ بھگوان دین آ پہنچے "غضب ہو گیا ماں! تمہاری بہو کی زندگی خطرے میں ہے۔ بچہ تو ہو گیا مگر ڈاکٹر کا کہنا ہے کہ کمزوری کے باعث سکو کا بچنا مشکل ہے۔" سنبھالتے گرتے گرتے بھگوان دین نے سمجھایا۔ "وہ بول بھی نہیں سکتی ماں! بیہوش سی پڑی ہے۔ نو پونڈ کا بچہ بھی نجانے کب دم توڑ دے۔ لگتا ہے سکو کا ہتھیارا میں ہوں... میں...! میں نے ہی اُس کے صحت مند سڈول جسم کو بار بار زچگی کی چکی میں پیس ڈالا ہے اور اب اُس میں ایک بوند خون بھی نہیں رہا۔

مصیبتوں کی ماری بڑھیا پاربتی کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ پھر بھی اُس نے جی کڑا کر کے بھگوان دین کو ڈھارس بندھانے کی کوشش کی "دل چھوٹا مت کرو بھگوان دین، زندگی اور موت تو اوپر والے کے ہاتھ میں ہے۔ ہونی تو ہو کر رہتی ہے۔ صبر سے کام لو، اور پھر گھبراتے کیوں ہو۔ ابھی تمہاری عمر ہی کیا ہے۔ پھر بھی کوئی ایسی ویسی بات ہو بھی جائے تو دوسرا گھر بسا لینا۔"

اتنا سنتے ہی بھگوان دین آگ بگولہ ہو اُٹھے اور کڑک کر بولے "نہیں ماں نہیں ایسا مت کہو، میں نے سکو بیچاری نادان بچوں پر ظلم کیا ہے۔ جب میں ان کو پیٹ بھر کھانا نہیں دے سکتا تو مجھے ان کو پیدا کرنے کا کیا حق تھا؟"

"اسے کیا بکتا ہے۔ بچے اوپر والے کی دین ہیں۔ جو دیتا ہے وہی پالتا ہے، تو کون ہے اِن کو پالنے والا۔" پاربتی بولی۔

"نجانے کون ہے اوپر والا۔ کیسے دیتا ہے وہ بچے یہ باتیں اپنی سمجھ سے باہر ہیں ماں!" آنگن سے باہر جاتے جاتے بھگوان دین بولا "ہسپتال جا رہا ہوں، دیکھوں تو سکو کی حالت کیسی ہے؟"

پاربتی پھر سے برتن بٹورنے لگی اور ساتھ ہی ساتھ اُس کی آنکھوں کے سامنے گھومنے لگیں۔ بیتے دنوں کی تصویریں۔

چالیس برس قبل جب وہ اس گھر میں نئی نویلی دلہن بن کر آئی تھی... لالہ رام دین کی تیسری بیوی بن کر... بوڑھے رام دین کو اولاد کی خواہش تھی۔ کتنا دھن لٹایا تھا، انہوں نے بیٹا پانے کے لیے بے شمار دولت پانی کی طرح بہا دی۔ ٹونے ٹوٹکوں پر، پیر فقیروں پر۔ تب جا کر کہیں پیدا ہوا بھگوان دین۔ جس کے جنم دن پر لالہ رام دین نے لاکھوں لٹا دیئے۔ پاربتی سوچنے لگی اور اب وہی بھگوان دین اولاد کے نام سے چڑتا ہے۔ اسے منحوس سمجھتا ہے۔ اور اپنے آپ کو گناہگار ٹھہراتا ہے۔

ننھے کو پنگوڑے میں ڈال کر اور برتن بٹور کر انھیں راکھ سے مانجھنے بیٹھ گئی تھی پاربتی کہ الماری میں سے "ٹپ ٹپ" کی آواز سُنائی دی۔ بڑھیا کے کان کھڑے ہو گئے مگر بلی مونچھوں پر تاؤ دیتے ہوئے اور بڑھیا کا منہ چڑاتے ہوئے کھڑکی سے باہر نکل بھاگی۔ پاربتی دانت پیس کر رہ گئی۔ اب کیا ہوگا، ننھے کا دودھ ستیاناس ہو

بچّے کے پیٹ میں جا چکا تھا۔ وہ سوچنے لگی۔

یادوں میں کھوئی پاربتی دھیرے دھیرے برتن دھوتی رہی۔ ایک وقت تھا جب اس گھر کے آنگن میں گائیں اور بھینسیں بندھتی تھیں۔ دو بالٹی دودھ صبح اور شام نکلتا تھا۔ دہی، پنیر، مکھن، گھی سے گھر بھرا رہتا تھا۔ اور اب ایک چھوٹے بچّے کے لیے پاس گرام دودھ بھی نہیں۔ مگر اس میں بچارے بھگوان دین کا کیا قصور۔ چھوٹی سی دکان اور اُس پر اتنے بڑے کنبے کا خرچ۔ وہ سوچنے لگی کہ ڈاکٹر بائی کی بات غلط نہیں تھی۔ پریوار اگر چھوٹا ہوتا … اگر بھگوان دین کا بیاہ چھوٹی عمر میں نہ کیا ہوتا … گھر کا خرچ آمدنی سے زیادہ نہ ہوتا، تو شاید ہم سکھی ہوتے۔ اگر بہو رانی کو ڈاکٹر بائی کی صلاح پر چلنے دیتی۔ اُس کی نس بندی کرا دیتی تو آج وہ بیچاری بھی بسترِ مرگ پر نہ پڑی ہوتی۔

اسی اُدھیڑ بُن کے دوران پاربتی کو ایک بار پھر مالتی اور کالو کے جھگڑے کو نپٹانا پڑا۔ مالتی منہ پھلائے آنگن کے ایک کونے میں ریت کے گھروندے بنانے لگی۔ کالو دوسرے کونے میں گرتی پانی پر بیٹھے ایک پھڑے سے چھیڑ چھاڑ کرنے لگا۔

پاربتی نے برتن مانجھ دھو کر ٹوکرے میں رکھے ہی تھے کہ ننھا پنگوڑے سے نیچے زمین پر گرا اور زور زور سے رونے لگا۔ اُدھر کالو کو بھڑ نے کاٹا اور درد کے مارے وہ چیخنے چلّانے لگا۔ مالتی جیسے ہی کالو کو سنبھالنے کو دوڑی کہ منہ کے بل گری اور زخمی ہو گئی۔

برتنوں کا ٹوکرا ہاتھوں میں لٹکائے بڑھیا پاربتی آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہی تھی۔ کبھی بلکتے ہوئے ننھے کی طرف، کبھی درد سے کراہتے کالو کی سمت اور کبھی چوٹ کھائی مالتی کی جانب۔ کہ اتنے میں بھگوان دین نے آنگن میں قدم رکھا اور پچھاڑ کھا کر گرا۔ اُس کی آنکھوں سے گنگا اور جمنا رواں تھیں اور بولتا چلا جا رہا تھا۔ ہائے! میں کہیں کا نہ رہا۔ اب ان نادان بچّوں کا کیا ہوگا۔ پاربتی کھڑی پتھرا گئی۔ اُس کا

سر چکرانے لگا اور برتنوں کا ٹوکرا اُس کے ہاتھوں سے چھوٹ گیا۔ ٹن ٹن کر پیتل اور کانسے کے برتن بکھر گئے۔ رسوئی گھر کے کونے میں۔ ٹھیک اُن پھولوں کی طرح جو آندھی کے جھونکوں کا شکار ہو کر ٹہنی سے الگ ہو جاتے ہیں اور جھاڑیوں کے آس پاس پھیل جاتے ہیں۔ ٹھیک مالتی، کالو اور ننھے کے موافق جو دھول اور مٹی میں پڑے سے چیخ چلّا رہے تھے۔ ★

بقیہ : علاقائی منصوبہ بندی

بات چیت کرنے کی بجائے ترقیاتی مرکزوں کے تعلق سے اقتصادی سرگرمیوں کی نشاندہی کر دی جاتی ہے۔ منصوبہ بندی میں مقام کے تعیّن کے سلسلے میں اسی پہلو کو اہمیت دی جاتی ہے۔ اس طریقے سے منصوبہ بندی کو حقیقت پسندی کا جامہ پہنایا جاتا ہے۔

علاقائی یا مکانی منصوبہ بندی کا ایک اہم مقصد یہ ہے کہ مرکز کی بے جسی دُور ہو اور اس سے نچلی سطح کی بے عملی کا تدارک کیا جا سکے۔ اقتصادی قوتیں شہری مراکز پر جمع ہونی شروع ہوتی ہیں جبکہ اندرونی علاقے باہر کی طرف نقل و حمل مکانی کے باعث خالی ہونے شروع ہوتے ہیں۔ شہروں میں حد سے زیادہ ارتکاز کے باعث ان سرگرمیوں کا بے قاعدہ پھیلاؤ ہوتا ہے اور وہ اس حد تک کہ وہاں آبادی بے پناہ بڑھ جاتی ہے اور سماجی سہولتیں جیسے کہ مکانات، ٹرانسپورٹ، پانی کی دقّت پیش آتی ہے، اور وہاں گندی بستیوں، پٹڑیوں پر دھرنا، مکانات کی قلّت اور پھر گھر میں آدمیوں کا ہجوم، پانی کے نکاس کی دشواری اور ماحول کی آلودگی کے مسائل بڑھ جاتے ہیں۔ ڈبلیو ارتھر لیوس نے بجا طور پر کہا ہے کہ اچھی ترقی کے تحت ایسے اقدامات ضروری ہیں، جن سے ۵ لاکھ سے زیادہ آبادی والے شہروں کی مزید ترقی کو محدود کر دیا جائے اور ۵ ہزار سے لے کر ۵۰ ہزار تک کی آبادی والے مراکز کو بڑھایا جانا چاہیے۔

بقیہ: پنکھے کی صنعت

کارخانے لگائے گئے۔

تب سے پنکھا صنعت کو ترقی ہوئی اور اب تو ہندوستان سے پنکھے برآمد بھی کئے جاتے ہیں۔ ایک اندازے کے مطابق ہر سال ہندوستان کے بڑے بڑے کارخانوں میں ساٹھ لاکھ سے زیادہ اور چھوٹے موٹے کارخانوں میں دس لاکھ سے زیادہ پنکھے تیار ہوتے ہیں۔ پنکھے بھی قسم قسم کے بنتے ہیں۔ ٹیبل فین، پیڈسٹل فین، سیلنگ فین، کیبن فین، ایگزاسٹ فین اور گوکر وغیرہ۔ ہر کمپنی کے پنکھے کا رنگ و روپ الگ الگ ہوتا ہے۔

گھروں، دفتروں، بڑے بڑے ہالوں، فیکٹریوں اور تجارتی اداروں کے لیے مختلف قسم کے پنکھے ہوتے ہیں۔ بیرونی ملکوں میں بھی ان پنکھوں کی کافی مانگ ہے۔ اندرونِ ملک بھی ان کی کھپت بڑھ رہی ہے۔ حالیہ سروے کے مطابق ہر سال ملک میں پنکھوں کی مانگ دس سے بیس فیصد تک بڑھ رہی ہے۔ بجلی کی پیداوار میں اضافے اور رہن سہن کے معیار میں بہتری کے ساتھ مانگ کا بڑھنا ضروری بات ہے۔

اس وقت ایشیا، افریقہ، امریکہ اور یورپ کے مختلف ملکوں کو پنکھے برآمد کئے جا رہے ہیں۔ زبردست مقابلے کے باوجود یہ صنعت تیزی کے ساتھ ترقی کر رہی ہے اور پھل پھول رہی ہے۔ ★

غزلیں

دار شفیق

، یہ حالات کی سختی کا اثر ہے کتنا
ف کہ شب میں مگر خاک بسر ہے کتنا

اس خرابے میں کوئی لمحہ رہائش تو کرے
ہم بھی دیکھیں اُسے جینے کا ہنر ہے کتنا

بتائیں رُخِ حالات یہ ہے جن کی نظر
یہ وقت کی شاخوں میں ثمر ہے کتنا

ضربِ تیشہ کی کرامت سے یہ معلوم ہوا
سینۂ سنگ میں آشوبِ شرر ہے کتنا

ہری حسن و شباہت سے ہم آہنگ نہیں
ا باطن بھی مگر تنگ نظر ہے کتنا

گو چھپتی ہے میرے بستر سے یہ سورج کی کرن
تیری آنکھوں میں ابھی خوابِ سحر ہے کتنا

ے سب کچھ تمہارے ہاتھ میں اب کچھ بھی نہیں
ت کی بات ہے یہ شعبدہ گر ہے کتنا

روز دنیا میں بچھاتی ہے سنہری چادر
صبح کے ہاتھ میں گنجینۂ زر ہے کتنا

ہم کو بس راہ نوردی سے غرض ہے اے شفیق
راستہ جانے کہ باقی یہ سفر ہے کتنا

سیم مینائی شاہ جہانپوری

وڑیے نجم و مہِ کامل کی بات
یجئے اب داغ ہائے دل کی بات

انتہائے رنج و غم کے باوجود
لب پہ میرے ہے نشاطِ دل کی بات

ستانِ حال و ماضی کہہ چکے
ب ہمیں کرنی ہے مستقبل کی بات

اور ضبطِ عشق رُسوا ہو گیا
کاش ہم دل ہی میں رکھتے دل کی بات

ے سلامت جذبۂ منزل رسی
یوں کریں ہم دوریٔ منزل کی بات

اُٹھ گیا اہلِ جہاں کا اعتبار
کیا کہے کوئی کسی سے دل کی بات

چاہے ڈوبے یا بچے کشتی وسیم
ہم نہیں کرتے کبھی ساحل کی بات

میرا وطن ہندوستان

مختار ٹونکی

میرا وطن ہندوستان حد غیرتِ باغِ جناں
بہترین و لاجواب
بے عدیل و بے مثال
خوبصورت شاندار
باوقار و باکمال
پُرشکوہ عظمت نشاں میرا وطن ہندوستاں
اس کے دریا دل نشیں
اس کے میداں دل پسند
باغ ہائے دل رُبا
اور پہاڑ سر بلند
چُومتا ہے آسماں میرا وطن ہندوستان
سیکڑوں قوموں کا گھر
مذہبوں کا آشرم
مشترک تہذیب ہے
علم و فن بھی ہیں بہم
اعلیٰ تمدن کا نشاں میرا وطن ہندوستان
امن و اہنسا کی زمیں
گہوارۂ انسانیت
علم و عرفاں کی جگہ
اور مرکزِ روحانیت
سجدہ گاہِ قدسیاں میرا وطن ہندوستان
حملہ آور اجنبی!
اکثر یہاں آتے رہے
اس کی کھلی آغوش میں
آکر سکوں پاتے رہے
دیتا رہا سب کو اماں میرا وطن ہندوستان
آج بھی عالم میں یہ
مقتدر رحمت دہ ہے
برتر و بہتر ہے یہ
مجھ کو اس پہ ناز ہے
فخرِ زماں فخرِ جہاں میرا وطن ہندوستان

شذرات

پیروڈی

نظر برنی

لبکہ دشوار نہیں جیل کا مہماں ہونا
آپ ہی جلوہ کریں آپ پشیماں ہونا
یہ کوئی بات نہیں ہندو مسلماں ہونا
"آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا"

یہ بھی ہے کوئی ضروری کہ بہانہ ڈھونڈو
صاف کہہ دو کہ مقدر میں ہے ویراں ہونا
آگ وہ تم نے لگائی ہے شہر میں یارو
"در و دیوار سے ٹپکے ہے بیاباں ہونا"

ہم کو آزاد ہوئے ایک زمانہ گذرا
آج تک دیکھئے ہر چشم کا گریاں ہونا
عقل و دل میں ہے ابھی تک وہی بیگانہ روی
ہے مزاجوں کا مقدر وہی بیچاں ہونا

"عشرتِ قتل گہہ اہلِ تمنا مت پوچھ"
کام آئے گا نہیں مفت میں قرباں ہونا
سرفروشیٔ وطن ہو تو کوئی بات بنے
"عیدِ نظارہ ہے شمشیر کا عریاں ہونا"

جُرم کے بعد نہیں کرتے جفا سے توبہ
جاؤ کس کام کا ہے قبر پہ گریاں ہونا
کاش اندیشۂ انجامِ قیامت ہوتا
"ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا"

★

عزیز مراد آبادی

پنجسالہ منصوبوں کی روشنی میں خود کفالت کی جانب بڑھتے قدم

چوتھے پنجسالہ منصوبے میں کہا گیا ہے:

"خود کفالت کا مطلب نہ صرف غیر ملکی امداد پر انحصار سے نجات حاصل کرنا ہے، بلکہ اس میں عوام الناس کے لیے ایک قابلِ قبول معیارِ زندگی اور اس میں مسلسل اضافے کا اہتمام کرنا بھی شامل ہے"۔ خود کفالت کی یہ تعریف درج ذیل باتوں پر زور دیتی ہے:-

۱۔ بقایا جات کی ادائیگی میں گھاٹے کو ختم کرنا، بہ الفاظِ دیگر: رامدآت کی ادائیگی کے لیے توازن کا اہتمام۔

۲۔ زرِ مبادلہ کی دَر ۲۰۔۲۱ فیصد تک بڑھانا تاکہ غیر ملکی بچتوں پر انحصار کم کیا جا سکے!

۳۔ اعلیٰ معیار کی تکنیکی صلاحیت میں اضافہ کرنا۔

۴۔ درآمد کی پالیسی کے منافع کی بنیاد پر متوازن بنانا ..... وغیرہ۔

شریمتی اندرا گاندھی کے الفاظ میں۔

"خود کفالت کا مفہوم اقتصادی نظام کو کلیتہً الگ کر دینا نہیں۔ ہمیشہ اشیاء اور خدمات کے مفید تبادلے کی ضرورت رہے گی۔ ہمیں غیر ممالک سے حاصل ہونے والی نئی تکنیک اور آلات کو دیش میں جذب کرنے کے لیے یقیناً کافی وقت لگے گا۔ لیکن ہمیں ان اشیاء اور سیواؤں کے بھگتان کے لیے اپنی برآمدات کو بڑھا کر ادائیگی کرنی ہوگی"۔

خود کفالت کا مفہوم کسی قدر واضح ہو جانے کے بعد یہ بھی دیکھ لینا چاہیے کہ ہندوستان میں خود کفالت کی ضرورت کیوں اور کتنی ہے؟ کوئی بھی ملک اپنی ضرورت کے مطابق ہی کسی منزل کی سمت قدم بڑھاتا ہے۔ لہٰذا بھارت کی ضرورت کو سامنے رکھ کر ہی خود کفالت کی جانب بڑھتے قدم کی رفتار کو محسوس کیا جا سکتا ہے۔ ہمارے دیش کے لیے خود کفیل ہونے کی ضرورت یا اہمیت کا اندازہ ان اسباب سے لگایا جا سکتا ہے۔

سماج وادی طرز پر سماج کا قیام

ہندوستان کا اہم مقصد سماج وادی سماج کا قیام کرنا ہے، جو اقتصادی ترقی و خوشحالی کا متمنی کش ہے۔ غیر ملکی امداد کے بل پر ایسے خوشحال سماج کا صحیح معنوں میں قیام ممکن نہیں ہے۔ گویا اقتصادی خود کفالت بہتر سماج کی بنیاد ہے۔

سیاسی آزادی

سیاسی آزادی کو قائم و مستحکم رکھنے کے لیے ملک کا اقتصادی طور پر خود کفیل ہونا لازمی ہے۔ ہماری یہ خود کفالت نہ صرف ہماری سیاسی آزادی کو برقرار رکھے گی بلکہ ہمارا دنیا بھر میں ساکھ بھی بڑھائے گی اور کوئی ٹیڑھی نظر سے ہماری طرف دیکھنے کی ہمت تک نہیں کر سکتا۔ اس کے برعکس ہمارا ملک عالمی معاملات میں اہم رول بھی ادا کر سکتا ہے۔

غیر ملکی امداد

عموماً غیر ملکی امداد مشروط ہوتی ہے، جسے (TIED AID) کہا جاتا ہے۔ امداد پانے والا ملک اپنی مرضی سے اسے خرچ نہیں کر پاتا۔ اور یہ شرط غیرت مند ملک کے لیے خودداری کے ضیاع کے مترادف ہے۔ اس لیے بھارت کے لیے بھی مشروط امداد شایانِ شان نہیں ہو سکتی۔ ایسی امداد سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے غیر ملکی امداد پر انحصار بتدریج کم ہوتا رہتا ہے ـ اور اس کے لیے نسخہ ہے خود کفالت کا حصول:

مندرجہ بالا چند سطور سے ظاہر ہے کہ بھارت میں خود کفالت کی منزل کو سر کر لینے کی ضرورت کس قدر ہے۔ اپنے وجود کی سالمیت سے لے کر ملک کی خوشحالی تک خود کفالت کی ضرورت قدم قدم پر نہ صرف ضروری ہے بلکہ لازمی بھی ہے۔

خود کفالت اور پنجسالہ منصوبے

دیش کے پنجسالہ منصوبوں میں خود کفالت کی منزل پر پہونچنے کو اہم ترین مقصد قرار دیا گیا ہے۔ پہلے منصوبے میں غذائی اجناس کی خود کفیل ہونے کے مقصد سے زراعت کو سب سے زیادہ ترجیح دی گئی تھی۔ دوسرے منصوبے میں صنعتی خود کفالت کے لیے بنیادی صنعتوں کو اولیت دی گئی تھی۔ تیسرے پنجسالہ منصوبے میں خود کفالت کے لیے مکمل اقتصادی نظام کے قیام کا مقصد پیشِ نظر تھا۔ چوتھے منصوبے میں خود کفالت دو ستونوں پر مشتمل تھی:

۱۔ غیر ملکی امداد سے نجات حاصل کرنا۔

۲۔ ایک معیارِ زندگی مہیا کرنا اور اس میں لگاتار اضافہ کرنے کا عہد۔ پانچویں پنجسالہ منصوبے میں شروع میں ہی یہ ذکر کیا گیا ہے:

"غریبی کا خاتمہ اور خود کفالت کا حصول دو ایسے اہم مقاصد ہیں جن کی تکمیل پانچویں منصوبے میں دیش کو کرنی ہے۔ اور چھٹی یوجنا کا اہم مقصد

ہے۔ یہ اقتصادی نظام کو بہتر بنانا اور ترقی دینا، وسائل کے استعمال میں صلاحیت کو فروغ دینا اور پیداوار میں اضافہ کرکے اقتصادی و تکنیکی خود کفالت حاصل کرنا۔"

خود کفالت کی منزل کی جانب بڑھتے قدم

مکمل طور پر خود کفیل ہونے کا نظریہ فی الواقع ایک خیالی مفروضہ ہے، کیونکہ کسی بھی ملک کے لیے ہر شعبے میں خود کفالت حاصل کر پانا تقریباً ناممکن ہی ہے۔ البتہ کچھ شعبوں میں ایسا ممکن ہے اور باقی شعبوں میں امکانات کے بل پر خود کفیل ہونے کی مستحسن مساعی برقرار رکھی جا سکتی ہیں۔ ان معنوں میں بھارت کے ذریعے مختلف شعبوں میں حاصل شدہ خود کفالت کو مندرجہ ذیل عنوانات کے آئینوں میں دیکھا جا سکتا ہے۔

غذائی امداد سے نجات

غذائی اجناس میں خود کفیل ہونا ہماری سبھی یوجناؤں کا اہم ترین مقصد رہا ہے۔ پہلے منصوبے کے آغاز میں غذائی اجناس کی درآمد کل حصول کا ۸ فیصد تھی جو پہلے منصوبے کے آخر تک گھٹ کر ۲٫۲ فیصد، دوسرے منصوبے کے اختتام پر ۲٫۴، لیکن تیسرے منصوبے کے خاتمے پر بڑھ کر ۱۴ فیصد، چوتھی یوجنا کے آخر میں پھر گھٹ کر ۳٫۵ فیصد رہ گئی لیکن ۱۹۷۸ میں ہم نے دس لاکھ ٹن غذائی اجناس برآمد کیں۔ اس طرح ۱۹۷۹ میں پانچویں منصوبے کے آخر تک ہم غذائی معاملے میں خود کفیل ہو چکے تھے۔ ۱۹۸۲ میں ہماری غذائی درآمدات کل حصول کا صرف ۳٫۰۱ فیصد تھی۔ ظاہر ہے کہ غذا کے ضمن میں ہم نشیب و فراز سے دوچار رہے ہیں۔ لیکن مجموعی طور پر ہم اس اہم ترین شعبے میں خود کفالت کی منزل پر اپنے قدم جمانے کی کوشش میں مصروف ہیں۔ مثلاً ۸۳-۱۹۸۲ میں ۸۰-۱۹۷۹ء کی طرح خشک سالی کا مقابلہ کرنے کے باوجود کسی شخص کو بھوک سے نہیں مرنے دیا گیا اور نہ ہی بڑے پیمانے پر امداد کے لیے کسی بیرونی ملک کے آگے دستِ طلب دراز کرنا پڑے۔

دفاعی پیداوار میں تقریباً خود کفیل؛ دفاعی سازوسامان کی پیداوار کی ضرورت ۷۱، ۶۵، ۱۹۶۲ء میں جارحیت کا مقابلہ کرنے کے بعد سنجیدگی کے ساتھ محسوس کی گئی تھی۔ لہٰذا بھارت نے ۸۰-۱۹۷۹ میں دفاعی صنعت پر ۳۰۱۰ کروڑ روپے خرچ کئے جو کل قومی پیداوار کا ۲٫۲ فیصد ہے۔ ۸۳-۱۹۸۲ء میں اس مد پر ۴۲۰۰ کروڑ روپے صرف کئے گئے۔ اب بھارت قومی دفاع کے نقطۂ نظر سے تقریباً خود کفیل ہو گیا ہے اور جوہری اسلحہ بنانے کے علاوہ تقریباً ہر طرح کا سامانِ حرب تیار کرنے کے لائق ہو چکا ہے۔

غیر ملکی امداد میں بتدریج کمی

بھارت پہلی چار یوجناؤں میں غیر ملکی امداد پر بہت زیادہ انحصار کرتا رہا۔ پہلے منصوبے میں ۲۰ فیصد، دوسرے میں ۲۳ فیصد، تیسرے اور چوتھے پنج سالہ منصوبوں میں بالترتیب ۲۸ فیصد اور ۲۷ فیصد بیرونی امداد حاصل کی گئی تھی۔ پانچویں منصوبے میں غیر ملکی انحصار کو کم کرنے کی غرض سے ۶٫۲ فیصد امداد ہی پر اکتفا کیا گیا تھا، لیکن ترمیم شدہ منصوبے میں یہ بڑھ کر ۱۴٫۹ فیصد ہو گیا اور ترمیم شدہ چھٹے منصوبے میں یہ ۱۲٫۲ فیصد ہے، جبکہ امداد کا یہ حصہ پہلے ۱۰ فیصد ہی تھا۔ تاہم اتار چڑھاؤ کے معمولی فرق کے ساتھ یہ حقیقت واضح ہے کہ غیر ممالک سے مالی امداد حاصل کرنے کا رجحان لگاتار گھٹ رہا ہے۔ جو خود کفالت کے لیے نیک شگون خیال کیا جانا چاہیے۔

معدنی تیل کی پیداوار میں اضافہ

۸۱-۱۹۸۰ء تک بھارت اپنی ضرورت کا صرف ۳۰ فیصد معدنی تیل پیدا کرتا تھا اور ۷۰ فیصد غیر ممالک سے منگواتا تھا۔ اب ہم لگ بھگ ۵۰ فیصد پیدا کرتے ہیں اور چھٹے منصوبے کے آخر تک ۷۰ فیصد تک خود کفیل ہونے کا امکان ہے۔ ۸۲-۱۹۸۱ء میں گزشتہ سالوں کے مقابلے میں بھارت نے ۷۰۰ کروڑ روپے کا معدنی تیل کم درآمد کیا تھا۔

درآمد کی حوصلہ شکنی

بلاشبہ گزشتہ چند برسوں سے ہم نے مسلسل درآمد کی جانے والی ضروری اشیاء کو اپنے ہاں بنانے کا اقدام کرکے اپنی صلاحیت کو نمایاں کیا ہے، جو خود کفالت کے لیے سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ ثبوت کے طور پر غذائی اجناس، دھات اسپات، المونیم، پیٹرولیم، سائیکل، پنکھے، برقی آلات، کپاس، پٹ سن، کھاد وغیرہ کی پیداوار اتنی بڑھی ہے کہ ان کی درآمد اب بہت حد تک کم ہو گئی ہے۔ اس کے علاوہ برآمدات کے رجحان کو فروغ دے کر بھی خود کفالت کی جانب پیش رفت کی کوششیں برابر جاری ہیں — جیسا کہ ہمیں علم ہے کہ بھارت کی ادائیگی کا توازن ۷۷-۱۹۷۶ء کے علاوہ برقرار نہیں رہ سکا ہے۔ یعنی ہماری برآمدات، ہمارے ذریعے کی گئیں درآمدات سے کم رہی ہیں۔ اسی لیے بقایاجات کی ادائیگی میں گھاٹے کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ اس روگ سے نجات پانے کے لیے ہی برآمدات کی حوصلہ افزائی اور درآمدات کی حوصلہ شکنی کے اقدامات مضبوطی کے ساتھ کئے جا رہے ہیں، جو خود کفالت کے حصول کے لیے مستقبلِ قریب میں ممد و معاون ثابت ہوں گے۔

زراعت میں ترقی

خود کفالت کا مسئلہ جب بھی زیرِ بحث آتا ہے، تبھی زرعی شعبے پر نظر جاتی ہے، کیونکہ کسی بھی ملک کی خود کفالت کی اصل بنیاد اسی شعبے کو گردانا جاتا ہے۔ ہم نے آزادی کے بعد لائقِ تحسین کامیابی حاصل کی ہے۔ اس شعبے میں متعدد اسکیموں اور ترقیاتی منصوبوں کے تحت ہم نے سبز انقلاب برپا کرکے زراعت میں خود کفالت حاصل کر لی ہے۔

ثبوت کے طور پر اگلے صفحہ پر جدول ملاحظہ فرمائیے۔

تکنیکی معلومات

بڑی صنعتوں کے قیام اور ترقیاتی منصوبوں کی تکمیل کے لیے پہلے بیرونی ممالک سے فنی ماہرین کی خدمات حاصل کرنی پڑتی تھیں۔ لیکن اب ملک اس سلسلے میں تقریباً خودکفیل ہے اور خلیجی ممالک کو سائنسدانوں، انجنیئروں اور فنی ماہرین کی خدمات فراہم کرتا ہے۔

مندرجہ بالا مختصر جائزے سے ثابت ہوجاتا ہے کہ ہندوستان اب کل اشیائے ضروریہ، غذائی وخامی سامان وغیرہ پیدا کرنے اور بنانے میں کامیابی کی منازل طے کرنے میں ہمہ تن مصروف ہے، جو اس کی خودکفالت کی منزل کو بخوبی پہنچانے کے لیے کافی ہے۔ گزشتہ برس جو نیا بیس نکاتی پروگرام شروع کیا گیا، اس کی بدولت یہ ملک خودکفیلی کی جانب تیزی سے بڑھ رہا ہے۔ لہذا وہ دن دور نہیں جب ہم بیشتر شعبہ ہائے زندگی میں خودکفیل ہونے کا دعویٰ فخروانبساط کے ساتھ کرنے کے لائق ہوں گے۔

راحت پروین

کیا آپ جانتے ہیں؟

- نیودلی، سرایڈون لیتھمبس (Sir Edwin Lethimbus) نے تعمیر کرائی تھی اور اس کا ڈیزائن بھی اسی نے بنایا تھا۔
- بھارت میں لمبائی کے اعتبار سے سب سے بڑا دریائی ڈیم ہیراکنڈ ڈیم ہے جو مہاندی پر تعمیر ہوا ہے۔ یہ اڑیسہ میں ہے اس کی لمبائی ۲۵ء۴۸ کلومیٹر ہے۔
- کائنات کی نقشہ نویسی اور اس کے واضح کرنے کی سائنس کو کازموگرافی کہتے ہیں۔
- زیرآب آواز کی حرکت ناپنے کے آلے کو ہائیڈروفون (Hydrophone) کہتے ہیں۔
- انٹراسکول کرکٹ چیمپین شپ آف انڈیا کے لیے "کوچ بہار" ٹرافی دی جاتی ہے۔
- سرونٹس آف انڈیا سوسائٹی گوپال کرشن گوکھلے نے ۱۹۰۵ء میں قائم کی تھی۔
- ٹمپل آف دی ٹرتھ (Temple of the truth) کنڈی (سری لنکا) میں ہے۔
- ہوانا کیوبا کی راجدھانی ہے۔
- زہر کی سائنس سے متعلق مطالعہ ٹوکسی کولوجی (Toxicology) کہتے ہیں۔
- پولی گیمی (Polygamy) رواج سے مراد ہے ایک سے زیادہ شادی، بہت سی بیویاں۔
- سب سے چھوٹا براعظم آسٹریلیا ہے۔
- ڈیری کی صنعت کے لیے سب سے زیادہ مشہور ریاست ہریانہ ہے۔
- بجلی کو جذب کرنے والا کنڈکٹر فرینکلین نے ایجاد کیا۔
- دنیا کی سب سے بڑی جھیل کیسپین روس اور ایران میں واقع ہے۔
- دنیا میں سب سے زیادہ چاندی کینیڈا میں پیدا ہوتی ہے۔
- ایئرکرافٹ یعنی طیارے کی آواز کو (Zoom) کہتے ہیں۔
- ویویکانند ٹیک میموریل کنیاکماری میں آباد ہے۔
- آنکھ کا رنگین حصہ (Iris) کہلاتا ہے۔
- ہندوستان کا سب سے بڑا سفاری پارک نندن کانن میں ہے۔
- ۸ مئی کو بین الاقوامی ریڈکراس ڈے منایا جاتا ہے۔
- اقوام متحدہ میں انگریزی اور فرانسیسی زبانوں میں کام ہوتا ہے۔
- سیاسی پارٹی کی حکمت عملی اور ڈسپلن کی ذمہ داری سنبھالنے والے شخص کو (Whip) کہتے ہیں۔
- جموں وکشمیر کو بھارت کے آئین کی دفعہ ۳۷۰ کے تحت خصوصی حیثیت حاصل ہے۔

پیداوار کے اضافے کی تفصیل

اشیاء	۱۹۵۰-۵۱ء میں پیداوار	۱۹۸۱-۸۲ء میں پیداوار
غذائی اجناس	۵ کروڑ ۵۰ لاکھ ٹن	۱۳ کروڑ ۴۰ لاکھ ٹن
گنا	۷ کروڑ ۵۰ لاکھ ٹن	۱۷ کروڑ ٹن
تلہن	۵۱ لاکھ ٹن	۱۱۲ لاکھ ٹن
کپاس (ایک گانٹھ ۱۷۰ کلو)	۲۹ لاکھ گانٹھیں	۸۰ لاکھ گانٹھیں
جوٹ (ایک گانٹھ ۱۸۰ کلو)	۳۳ لاکھ گانٹھیں	۸۲ لاکھ گانٹھیں
سیراب زمین	۲ کروڑ ۲۶ لاکھ ہیکٹر	۶ کروڑ ۱۰ لاکھ ہیکٹر
مشینی کھاد (کیمیاوی)	۱۸ ہزار ٹن	۵۸ لاکھ ٹن
مشینی کھاد کی کھپت	۸۹ ہزار ٹن	۶۲ لاکھ ٹن
گیہوں (فی ہیکٹر)	۶ کوئنٹل	۱۶ کوئنٹل

یوجنا، نئی دہلی

محمد خلیل

ہندوستان میں دیہی ترقی

حکومت نے حصولِ آزادی کے بعد ملک کی تعمیر و ترقی میں زراعت کو اولین ترجیح دی اس کے نتیجے میں ملک میں اناج کی پیداوار ۵ کروڑ ۵۰ لاکھ ٹن سے بڑھ کر تقریباً ۱۴ کروڑ ٹن سے زائد ہو چکی ہے۔ اسی زراعتی ترقی کا اثر دیہی ترقی کو بہتر بنانے میں مددگار ثابت ہوا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ دیہی ترقی کا زرعی ترقی سے گہرا تعلق ہے اسی سبب سے زراعت کو بہتر بنانے کے لیے اور زمین کو زراعتی نقطۂ نظر سے اور زرخیز بنانے کے لیے پانچ سالہ منصوبے میں کثیر رقم رکھی گئی تھی اور اس کے اچھے نتائج برآمد ہو رہے ہیں۔ مثال کے طور پر زمین کے کٹاؤ کو روکنے کے اقدامات' غیر آبپاشی والے علاقے میں کھیتی کا فروغ' بے کار زمینوں کو کاشت کے قابل بنانا وغیرہ اقدامات کے ذریعے زرعی محاذ پر کامیابی حاصل ہو سکتی ہے۔ اس کا ایک جیتا جاگتا ثبوت "سبز انقلاب" ہے۔ جس کے ذریعے دیہی علاقوں میں بڑی ترقی ہوئی۔ یہ ترقی زراعتی نقطۂ نظر سے بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ ہندوستان میں صوبۂ پنجاب' ہریانہ' اُتر پردیش اور راجستھان کی ریاستوں میں دیہی ترقی میں ایک بڑی تبدیلی رونما ہوئی ہے۔ زرعی ترقی میں آبپاشی کے علاوہ عمدہ بیجوں کا حاصل کرنا اور اس کی عمدہ کاشت کے لیے کیمیاوی کھاد کو حاصل کرنا بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ مثال کے طور پر ملک میں ۱۹۵۰-۵۱ء کے دوران کیمیاوی کھاد کی کھپت تقریباً ۵۹ ہزار ٹن تھی جب کہ ۱۹۸۰-۸۱ء میں یہ بڑھ کر ۵۶ لاکھ ٹن ہو گئی۔ اس میں جہاں ہمارے زراعتی ماہرین کی کوششیں ہیں وہیں اس حقیقت کو بھی ماننا ہوگا کہ ہمارے کسانوں نے بھی اس میں کچھ کم رول ادا نہیں کیا ہے۔ لیکن زراعتی نقطۂ نظر سے دیہی ترقی کے لیے ابھی ہمیں بہت کچھ کرنا ہے۔ کیونکہ ملک کے بہت سے دیہی علاقے ایسے ہیں جو ابھی پیچھے ہیں۔ انھیں مسائل کے پیشِ نظر حکومت نے اپنے پنج سالہ منصوبے میں دیہی ترقی کو بڑی اہمیت دی ہے اور وزیر اعظم کا ۲۰ نکاتی منصوبہ بھی دیہی ترقی کی اہمیت کے مدِ نظر رکھ کر بنایا گیا ہے تاکہ دیہی ترقی کو اور تیز تر کیا جا سکے۔ دیہی ترقی کو سامنے رکھتے ہوئے ۱۹۷۰ کے آخیر میں ایک خصوصی منصوبہ بنایا گیا جو خشک سالی سے متاثرہ علاقوں کو زرخیز بنانے کے لیے تھا۔ اس کے ساتھ ہی دیہی علاقوں میں تعلیم' صحت عامہ' پینے کا پانی'، بجلی کی فراہمی' سڑکیں اور مکان کے لیے زمینوں کی فراہمی کو اور بہتر بنانے کے لیے ابھی بہت کچھ کرنے کی ضرورت ہے۔ دیہی ترقی کے پروگرام کا اہم مقصد یہ ہے کہ پسماندہ عوام کی حالت کو اور بہتر بنایا جائے اور اُن کی فی کس آمدنی میں اضافہ کیا جائے' اُن کے لیے مزید نوکریاں مہیا کی جائیں۔ جو خوشحال کسان نہیں ہیں اُنھیں چھوٹی صنعت قائم کرنے کے لیے سرمایہ فراہم کیا جائے اس کے ساتھ ہی جانوروں کا پالنا' مچھلیوں کا پالنا اور اسی طرح کی چھوٹی صنعتوں کو گھریلو دستکاری کو قائم رکھنا اور انھیں بڑھانا دیہی ترقی میں مزید خوشحالی لانے کے لیے نہ صرف ضروری ہیں بلکہ عوام کو نفع بخش روزگار دلانے میں بھی یہ اہم ہیں۔

ملک کے دیہی علاقوں کی ترقی کے لیے ۲۳۰۰ بلاک قائم کیے گئے ہیں۔ ہر سال مزید ۳۰۰ بلاک بنائے جاتے ہیں تاکہ زیادہ سے زیادہ دیہی علاقوں کو ترقیاتی پروگراموں سے فائدہ پہنچایا جا سکے۔ بلاک قائم کر کے دیہات کی مربوط ترقی کے نظام کو فروغ دیا جا سکے ـــــــ اس سلسلے میں چھوٹے کسانوں کی ترقی کو بڑھاوا دینے کے لیے ایجنسیاں قائم کی گئی ہیں۔ ہر بلاک کو ۱۲ لاکھ سے ۱۴ لاکھ روپے کے درمیان اُن کی ضروریات کو دیکھتے ہوئے حکومت سرمایہ بھی فراہم کر رہی تھی۔ لیکن اب حکومت نے اس میں اور اضافہ کر دیا ہے اور چھٹے پانچ سالہ منصوبے کے دوران ہر بلاک کو ۳۵ لاکھ روپے کی امداد فراہم کی جائے گی اور اُن کو عملی جامہ پہنانے میں مرکز اور صوبائی حکومتیں برابر کی شریک ہیں۔ اس کام کے لیے مختلف علاقوں اور اُن سے متعلق شہروں میں اس کے لیے کمیٹیاں اور سوسائٹیاں قائم کی گئی ہیں۔ اس کے لیے اس کمیٹی میں جو شہری سطح کی کمیٹی بنائی گئی ہے اس میں تین اراکین کی ایک ٹیم منصوبہ تیار کرنے کے لیے بھی بنائی گئی ہے۔ چھٹے پانچ سالہ منصوبے کے دوران جانوروں کی حفاظت اور اُن کی تعداد پر بھی خاص طور پر خیال رکھا گیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ دیہی علاقوں میں جانور بھی ترقی کے نقطۂ نظر سے بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔

یوجنا نئی دہلی

لیکن جہاں ان علاقوں کی ترقی کے لیے بہت کچھ کیا جا رہا ہے وہیں ان علاقوں میں رہنے والے عوام اور ان کے مویشیوں کے لیے صحت کے نقطۂ نظر سے ابھی بہت کچھ کرنے کی ضرورت باقی ہے۔ اور انھیں مسائل کے پیش نظر حکومت اس سلسلے میں بھی مختلف اقدام کر رہی ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ اگر ان دیہی علاقوں کا ماحولیاتی توازن (Ecological Balance) کسی وجہ سے متاثر ہوگا تو اس کا اثر یکساں طور پر وہاں کی زندگی پر پڑے گا اس طرح جنگلات کے کٹنے سے دیہی علاقے ہی نہیں بلکہ اکثر شہری علاقے بھی متاثر ہوئے ہیں لیکن چونکہ دیہی علاقے پہلے سے ہی مختلف مسائل سے دوچار ہیں اس طرح وہاں کی زندگی مقابلتاً زیادہ اثرانداز ہوئی ہے۔ صنعتی ترقی کے نتیجے میں پیدا ہونے والے مسائل میں سے ایک یہ ہے کہ ماحولیاتی توازن کو قائم رکھا جائے اور اس کے لیے درختوں کے کاٹنے پر پابندی لگائی جائے، دیہات میں آبپاشی کے ذرائع کو فروغ دے کر غیر زرخیز زمینوں کا جائزہ لے کر کھیتی کو ترقی دینے کی ضرورت ہے۔ جس قدر زمین زرخیز ہوگی اسی قدر فصل بہتر ہوگی اور وہاں کے عوام کے مسائل حل ہوسکیں گے۔ اسی طرح ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ فصل کے اچھے ہونے سے وہاں کا غذائی مسئلہ ہی حل نہیں ہوگا بلکہ ان دیہی علاقوں کی صنعتوں میں توسیع اور ترقی ہوگی اس سے جانوروں کو زندہ رہنے کے لیے چارہ ملے گا، بنجر علاقے ختم ہوں گے۔ زمین کا صحیح استعمال شروع کرنے میں مدد ملے گی۔

آج بھی ملک میں کچھ ایسے علاقے ہیں جہاں سے شہر کی طرف آنے میں وقت درکار ہے۔ اور اس سے حکومت بھی پوری طور پر باخبر ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ حکومت نے دونوں کو قریب لانے کے لیے بہت کچھ کیا ہے لیکن ابھی بہت کچھ کرنا باقی ہے تاکہ یہ تاثر ختم ہو جائے کہ آسانیاں شہری زندگی میں ہی ہیں اور دیہی زندگی روزمرہ کی سہولتوں سے خالی ہے اور ظاہر ہے کہ اس کے لیے دیہی علاقوں کو بھرپور ترقی دینی ہوگی یہاں زیادہ سے زیادہ صنعتوں کو قائم کرنا ہوگا، کارخانے کھولنے ہوں گے خاص طور پر وہاں کی ضرورتوں کے پیش نظر وہاں صنعتیں قائم کرنی ہوں گی۔ دیہی علاقوں میں تعلیم کی زیادہ سے زیادہ سہولتیں فراہم کی جا رہی ہیں لیکن یہاں ابھی تعلیم کو بہت پھیلانے کی ضرورت ہے تاکہ وہاں کے عوام میں سائنسی، صنعتی اور سماجی نقطۂ نظر کا صحیح معیار پیدا ہو جو ان کی ترقی میں صحیح رہنمائی کر سکے۔ اگر دیہی عوام خود صنعت کھولنے اور ہاتھ کی صنعت اور چھوٹی مشینوں کی صنعت کو چلانے کے قابل بن جائیں تو زرعی مسائل کو بڑی حد تک تیزی سے حل کیا جا سکتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ حکومت خود صنعتوں کو چلانے اور اس قسم کے مختلف کورسوں کی ٹریننگ کا کام شروع کر چکی ہے اس کے اچھے نتائج برآمد ہو رہے ہیں اور ایک اندازے کے مطابق ہر سال تقریباً دو لاکھ دیہی نوجوانوں کو ٹریننگ دی جا رہی ہے اور ہر فرد پر تقریباً ۲۰۰۰ ہزار روپے حکومت صرف کر رہی ہے تاکہ دیہی عوام آئندہ نوکری کے بجائے اپنا کام خود چلانے کے قابل بن سکیں۔ اس طرح کے منصوبے کے لیے حکومت نے چھٹے پانچسالہ منصوبے میں تقریباً پانچ کروڑ کی رقم کا تعین کیا ہے۔ زرعی علاقوں میں بینک کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ سرمایے کی فراہمی بھی موجودہ منصوبے کے دوران بڑی اہمیت رکھتی ہے اس طرح مختلف اشیاء کی حفاظت اور بچاؤ کے لیے کولڈ اسٹوریج کا قیام بھی بڑی اہمیت رکھتا ہے۔

اب تک دیہی علاقوں میں جو ترقی ہوئی ہے وہ کچھ کم اہمیت نہیں رکھتی مثال کے طور پر شمالی ہندوستان میں پنجاب، ہریانہ، اتر پردیش اور راجستھان کے صوبوں میں "سبز انقلاب" کے علاوہ دوسرے شعبوں میں بھی بڑی ترقی ہوئی ہے۔

دیہی علاقے ہمارے ملک کا اہم حصہ ہیں اس لیے حکومت بھی ان علاقوں کے لیے بہت کچھ کرنا چاہتی ہے۔ اس اہم مقصد میں کامیابی کے لیے حکومت نے حیدرآباد میں دیہی ترقی کے لیے ایک ادارہ قائم کیا ہے تاکہ پیدا شدہ مسائل کو تحقیق سے حل کیا جا سکے۔ گذشتہ برسوں میں دیہی ترقی کے لیے حکومت نے جو کچھ کیا ہے، اس کے امید افزا نتائج برآمد ہو رہے ہیں لیکن ابھی اس سلسلے میں بہت کچھ کرنا باقی ہے اور دیہی عوام کو متعدد دوسری آسانیاں فراہم کرنی ہیں۔ تاکہ شہری اور دیہی علاقے میں زیادہ دوری باقی نہ رہے اور یہ ایک جیسے ہو جائیں اس کا ملک کی ترقی پر بھی بہتر اثر پڑے گا۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اس بات کے امکانات نظر آتے ہیں کہ مستقبل میں دیہی علاقوں میں بھی شہری آسانیاں فراہم ہو جائیں گی اور یہی حکومت اور عوام کی سب سے بڑی خواہش ہے۔ جس کی تکمیل اب بہت زیادہ دور نہیں۔

★

آزادی

تاج پیامی

غلامی کی کٹیں اِک ایک کر کے ساری زنجیریں
شعاعِ مہرِ آزادی سے چمکیں اپنی تقدیریں
اب اپنا راج ہے، آئین اپنا، اپنی تعزیریں
کبھی جو خواب دیکھا تھا اسی کی ہیں یہ تعبیریں
وطن میں ظلم کی دیوار اِک اِک ڈھ گئی آخر
محبت کے محل کی ہر طرف ہوتی ہیں تعمیریں
بجائے رنگ ہم نے خون ہی اپنے بھرے ان میں
اسی سے خوشنما اتنی ہیں آزادی کی تصویریں
عروسانِ بہار ناز پہ ہم فخر کرتے ہیں
ہمارے کام آئیں اے پیامی اپنی تدبیریں

★

سعداللہ فراہی

پنکھے کی صنعت



خواہ بادشاہ ہو یا غریب، گرمی سب کو ستاتی ہے۔ پُرانے زمانے میں بھی بادشاہوں جیسے دولت مند لوگ گرمی سے بچنے کے لیے کوئی نہ کوئی طریقہ استعمال کرتے ہی رہے ہوں گے۔

بتایا جاتا ہے کہ مغلیہ دور کی مشہور ملکہ ممتاز محل جب بیمار پڑی تو شاہ جہاں نے اپنی محبوب بیگم کا کمرہ شدید گرمی میں ٹھنڈا رکھنے کے لیے ہمالیہ سے برف منگوائی تھی۔ سیکڑوں میل دُور سے برف منگوانے کے لیے باری باری سے کئی گھوڑا گاڑیاں استعمال کی گئیں۔ گھوڑوں کے تھکنے پر دوسری گاڑی تیار رہتی تھی۔ کافی عرصے تک ہمالیہ سے برف لانے کا یہ سلسلہ جاری رہا۔ برف سے کمرہ ٹھنڈا رکھنے کے ساتھ ساتھ مور پنکھ سے بنے پنکھے جو طلائی تاروں سے جُڑے رہتے تھے باندیاں جھلتی رہتی تھیں۔

شروع میں چوڑے پتوں سے پنکھے بنائے جاتے تھے جن سے امیر غریب سب گرمی دُور کرتے تھے۔ بعد میں خس لگا کر پنکھے بنائے جانے لگے جنھیں پانی سے بھگو دیا جاتا تھا تاکہ ٹھنڈی ہوا دیں۔ جھلنے سے پانی کی نمی دھیرے دھیرے اُڑ جاتی تھی یہ کولر بنانے اور ایر کنڈیشننگ کی سمت پہلا قدم تھا۔

اپنے اپنے ذوق اور پسند کے مطابق پنکھے بھی الگ الگ قسم کے ہوتے تھے۔ مثلاً شکاریوں کو نازک پنکھے پسند نہیں تھے وہ ہرن اور دوسرے جنگلی جانوروں کی کھالوں سے پنکھے بنواتے تھے کچھ شکاری تو شیر کی کھال کے پنکھے بھی استعمال کرتے تھے۔ عورتیں نازک اور خوبصورت پنکھے پسند کرتی تھیں۔ کاریگروں نے ان کے لیے چڑیوں کے خوبصورت پنکھوں سے نازک پنکھے بنائے مگر مور پنکھ سب سے زیادہ مقبول تھا۔

خواتین کی پسند اور فیشن تو جلد جلد بدلتے رہتے ہیں اس لیے ان کے لیے طرح طرح کے نازک اور خوبصورت پنکھے بننے لگے۔ ریشم کے نرم اور مہین کپڑوں کے پنکھے بھی بنے۔ ان پنکھوں میں کپڑوں کو بڑی مہارت سے بانس کی مہین کھپچیوں میں لگایا جاتا تھا۔ اس قسم کے پنکھوں کا تو آج بھی چلن ہے۔ ہاتھ کے چھوٹے چھوٹے پنکھوں کے علاوہ بڑے بڑے پنکھے بھی ہوتے تھے جنھیں غلام اور باندیاں بیگم بادشاہوں اور امراء کو جھلتی تھیں۔ محلوں اور حویلیوں میں شاید ہاتھ کے نازک پنکھوں میں ہیرے موتی بھی جڑے رہتے تھے۔ ان کے علاوہ چھت سے جھولنے والے پنکھے بھی استعمال ہوتے تھے۔ چھت پر لمبے ڈنڈے کے دونوں سرے رسّی سے باندھ کر ڈنڈے پر لمبا چوڑا کپڑا لگا رہتا تھا اور اس پنکھے کو بڑی ڈور سے جھلایا جاتا تھا۔

طرح طرح کے پنکھے بنانے والوں میں پہلے بھی مقابلہ رہتا رہا ہوگا جو آج بھی ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ہاتھ کے پنکھوں کو چھوڑ کر دوسرے پنکھے دھات کے بننے لگے ہیں اور بجلی سے چلتے ہیں۔

جہاں تک بجلی سے چلنے والے پنکھوں کا تعلق ہے ان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ۱۸۹۰ء یا ۱۸۹۵ء کے بیچ ان کی ایجاد عمل میں آئی ـــــ ۱۸۲۱ء میں مائیکل فراڈے نام کے ایک برطانوی شہری نے بجلی چمبک چکر کا اصول ڈھونڈھ نکالا۔ ساٹھ سال بعد ۱۸۸۱ء میں فرانس کے لوسے گلارڈ اور امریکہ کے جون ڈی گبس نے بڑے پیمانے پر استعمال کے لیے "اے سی بجلی" کی سپلائی کا طریقہ ایجاد کر لیا۔ ۱۸۸۲ء میں انگلینڈ کے سینٹ جارج فاکس اور امریکہ کے تھامس الوا ایڈیسن نے ڈائرکٹ کرنٹ (ڈی سی) کی لگاتار سپلائی کا طریقہ بھی ڈھونڈھ نکالا۔ اگلے پانچ برسوں میں نیویارک اور لندن جیسے بڑے بڑے ملکوں میں بجلی کی روشنی ہونے لگی۔

۱۸۸۸ء میں امریکہ میں آباد نکولا ٹلسا نے فراڈے کے تیار کردہ اُصول کی بنیاد پر استعمال کے لیے اے سی بجلی کا پہلا موٹر ایجاد کیا۔ اگلے دو برسوں میں برطانیہ میں ڈی سی بجلی سے بھی ایسے موٹر چلنے لگے۔ ۱۸۹۰ء اور ۱۸۹۵ء کے دوران گھریلو استعمال کے لیے چھوٹے چھوٹے موٹروں کی خرید فروخت شروع ہو گئی اس عرصے میں کسی نے موٹر پر دھات کے بنے پنکھے لگا کر بجلی کے پنکھے چلانے شروع کیے ہوں گے۔ اس کے بعد امریکہ اور برطانیہ میں بجلی کے پنکھے بکنے لگے لیکن اس وقت کے پنکھے کافی بھاری بھرکم تھے اور شور بھی بہت کرتے تھے۔

۱۹۱۰ء میں کلکتہ میں انگریز یہ پنکھے استعمال کرتے تھے۔ اگلے چند برسوں میں چھت کے پنکھے بھی چل پڑے۔ شروع میں تمام پرزے باہر ہی سے درآمد کیے جاتے تھے۔ ہندوستان میں انھیں صرف جوڑنے کا کام ہوتا تھا جس کے لیے چھوٹے موٹے

(باقی صفحہ ۱۲ پر)

سبزۂ گفتار

(غزلیات)

ڈاکٹر یعقوب عامر

عامر پبلیکیشنز، قریش نگر، صدر بازار دہلی نمبر ۶

اشاعت: ۱۹۸۰ء ✤ قیمت: ۲۰ روپے

زیرِ نظر مصنف کا پہلا شعری مجموعہ ہے جو موصوف کی تقریباً بیس سال کی تخلیقی کاوشوں کا آئینہ دار ہے۔ عامر کا شعری کردار ایک ایسی صورتِ حال سے نتیجہ ہے جس کے منجملہ خد و خال ایک اہلِ زبان کی تعلیمی دسترس کے ترتیب و تہذیب پاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسے میں خالص غزل گوئی کا شعار روایت کی اساس پر ہی خود استواری کی تکمیل ڈھونڈتا ہے اور عصری رجحانات اور جدید میلانات سے آنکھ مچولی کا مرتکب ہوتا ہے۔

عامر کی غزلوں میں لب و لہجۂ رنگ و آہنگ کی ایک متنوع اور ہموار انفرادیت ہمیں شروع سے آخر تک میسر آتی ہے۔ موصوف کے یہاں احساس کی داخلی سچائی، جذبات کے بیرونی نقوش تک پہنچنے میں ہمیشہ تر و تازہ تخیل کا سہارا لیتی ہے اور جو ترسیلی تصویر سامنے آتی ہے اس کے خد و خال نہ صرف جمالیاتی حسن تک محدود رہتے ہیں بلکہ ایک فکری تہہ داری سے دانشوری کی نشاندہی بھی کرتے ہیں۔ گویا عامر عصری سچائی سے بھری پُری معقول شاعری کا اہل ہے۔ اس کے اشعار میں معنوی منطق، خاصی بے ساختہ، برجستہ اور موثر شعریت کے ساتھ رونما ہوتی ہے۔ خیالات کی سچائی، تجربات کی حقیقت اور انسانی نفسیات کے عصری پہلوؤں کو منعکس کرنے میں عامر کا تخلیقی وجدان اور فنی شعور ہر حال میں بروئے کار رہتا ہے۔ یہ اشعار اس نقطۂ نگاہ سے توجہ کے مستحق ہیں:

صحرا میں کون تھا جسے مجنوں پکارتا ✤ دیوار ہی تھی کوئی صدا لینے آ گیا

منزل ویران ہوتی جا رہی ہے ✤ تمہاری راہ میں کب سے کھڑا ہوں

کیوں عمر دیتے ہو یارو اک نہ اک طوفان کی

کیا ہے پیچھے اس خبر کے یہ تو بتلاؤ ہمیں

جنھیں دیکھا تھا البم میں سجا کر ✤ وہ تصویریں بدلتی جا رہی ہیں

بھیس کر کی روشنی آتی کہاں ✤ اندر کی کچھ کر چلے ہیں وہ دستو

عامر کا تخلیقی استعداد کچھ پیچھے نئے موڑ کاٹ رہا ہے

طلامت کا استعمال ان کے یہاں تو وارد ہے لیکن ایک سرکشی اور کھنکتی ہوئی ڈکشن، رعایاتِ لفظی سے بے نیاز ان کے بڑے ہی معتبر تخلیقی آلات ہیں جن سے وہ خوب تر کے مرحلے طے کرتا جائے گا۔

کتاب دیدہ زیب اور صاف چھپائی کا اعلان کرتی ہے۔ غزل شناس و اربابِ ذوق کو دعوتِ مطالعہ

رام پرکاش راہی

[illegible] (شعری مجموعہ)

...د قریشی

... پبلیکیشنز، حیدرآباد - ۵۰۰۲۶۵

صفحات: ۱۰۴ ✤ قیمت: ۱۰ روپے

حمد، نعت، غزل، نظم اور قطعات پر مشتمل یہ کتاب مصنف کی پہلی پیشکش ہے۔ زاہد قریشی جیسا ابھرتا ہوا شاعر اگر جرأتِ رندانہ کے ساتھ منظرِ عام پر آیا ہے تو ان کے اس مجموعے میں ذوقِ سلیم، موزونیٔ طبع اور جولانیٔ فکر کے عناصر بھی تلاش کئے جا سکتے ہیں۔ زاہد قریشی احساس کا شاعر ہے اور اس نے اپنے احساسات کو جذباتی اور رومانی رنگ و آہنگ دینے کی حتی الوسع کوشش کی ہے۔ غزل کے یہ اشعار اس صورتِ حال پر روشنی ڈالتے ہیں:

ناز و انداز اُن کے کہتے ہیں ✤ کچھ حیا بھی ہے کچھ غرور بھی ہے

تمہارے ذکر پہ کھلتے ہیں پھول گلشن کے

بہار کیسے کہوں، رونقِ بہار ہو تم

زاہد نے دوسری اصنافِ شعر میں طبع آزمائی کی ہے گویا وہ غزل تک ہی محدود نہیں رہنا چاہتا۔ یہ ایک صحت مند رجحان ہے لیکن اس رجحان کو صحیح چلا دینے کے لیے فنی شعور بہت ضروری ہے۔ زیرِ نظر کتاب میں بہت سے اشعار ایسے مل جاتے ہیں جو اوزان اور لب و لہجہ کی ہم آہنگی سے ادھر اُدھر ہو گئے ہیں۔ کتاب کی کتابت اور چھپائی نے اس صورتِ حال کو اور بھی خراب کر دیا ہے۔

اُمید ہے زاہد صاحب اس سلسلے میں غور کر کے اپنی جرأتِ رندانہ کو تخیل کے قریب لا کر اپنے شعری مذاق اور قارئین کی توقعات سے انصاف کریں گے۔

برہما نند جلیس

پریم چند کا فنی و فکری مطالعہ

مصنف: سید محمد عصیم ✤ ضخامت ۱۴۴ صفحات

قیمت: ۳۰ روپے ✤ سائز: ڈیمائی

پریم چند کے مختلف پہلوؤں پر سید محمد عصیم کا یہ آٹھ مختلف مضامین کا مجموعہ ہے جو وقتاً فوقتاً مختلف رسائل و جرائد میں شائع ہو چکے ہیں۔ کتابی شکل میں ان تمام مضامین نے پریم چند کے تجزیاتی مطالعہ کی بھرپور اور بڑی حد تک مکمل، مربوط اور ہمہ پہلو شکل اختیار کر لی ہے، یہاں تک کہ کتاب کو پڑھ کر مکمل سیری کا احساس ہوتا ہے۔

پیش گفت میں اردو کے مشہور و معتبر ماہرِ پریم چند، پروفیسر قمر رئیس نے بجا طور پر اس بات پر اظہارِ طمانیت کیا ہے کہ پریم چند کی معنویت کو انھوں نے اپنے عہد کے تقاضوں اور پریم چند کے سماجی محرکات کے پس منظر میں تلاش کیا ہے۔ پروفیسر قمر رئیس کا یہ قول کتاب کے حق میں سند کا درجہ رکھتا ہے۔ تجزیاتی طریقِ تنقید اکثر بے رس اور اکتا دینے والی رسمی کارروائی ہوتی ہے مگر سید محمد عصیم کے ذہنِ رسا کو جو قلم ودیعت ہوا ہے، اس کے جادو نے حیرت انگیز طور پر ان مقالوں کو دلچسپ اور پُر کیف بنا دیا ہے۔ محمد عصیم صاحب کے طرزِ تحریر کی نمایاں خصوصیت اقتباس کے برتنے میں ہے وہ اقتباس کو کچھ اس ڈرامائی انداز میں لاتے ہیں جیسے کوئی کردار اسٹیج پر آ کر اپنا رول ادا کر رہا ہو۔ ہر دوسرا اقتباس کسی حقیقت کی پردہ پھاڑ کرتے ہوئے گفتگو کو آگے بڑھاتا ہے اور بعض اوقات حیرت میں اضافہ کرنے کے لیے اچانک نمودار ہوتا ہے۔ گویا تجزیہ بزبانِ خود بول رہا ہو۔ اُن کے تحقیقی طریقِ کار میں موضوع کی ترتیب اور بحث کا نظم و ضبط خاص طور پر جاذبِ نظر ہے۔ اس تار و پود میں ان کی مکمل ذہانت، لگن اور صداقت سے ہم آہنگی پیدا کرنے کا شعور اُبھر کر سامنے آتا ہے۔ بعض مسائل آج کے تاریک دور میں اور بھی اہم ہو گئے ہیں مثلاً پریم چند اور فرقہ پرستی، دیہات کے مسائل اور ضابطۂ اخلاق۔ عصیم صاحب اُن تمام مسائل کی عکاسی پر چونکہ چراغ ان کی تحریروں میں ڈھونڈ کر ان کی بصیرت کے مطابق کچھ پیاکار "یہ جامعیت، حقیقت پسندی اور معروضیت" ہی منتخبہ بندرہ بازوقیت کے مصداق ہے۔ ڈاکٹر محمد یعقوب عامر

ہ : آپ کو راستے میں اور چوٹی پر موسم لگا ؟

: شروع میں ایک بار پہلے ہی ساؤتھ پول تھی جو ۲۶،۲۰۰ فٹ پر ہے، لیکن خراب ی وجہ سے واپس آنا پڑا۔

رہ : تو آپ ساؤتھ پول کے راستے سے پس آئیں ؟

: جی ہاں۔ اس کے بعد کچھ دنوں تک موسم رہا، پھر جب میں آخری بار گئی تو موسم تھا۔

ہ : اچھے موسم سے آپ کا کیا مطلب ہے ؟ ٹھنڈک ہوتی ہوگی ؟

ٹھنڈک تو وہاں کافی ہوتی ہے لیکن دھوپ ے اتنا محسوس نہیں ہوتا۔

ہ : آپ کو اندازہ ہوگا کہ چوٹی پر کتنا درجہ ت تھا ؟

: جی نہیں۔ ہمیں پتہ نہیں چلا کیوں کہ ہم حرارت معلوم کرنے کے لیے کوئی آلہ نہیں ے تھے۔ ہوا اُس دن چل رہی تھی لیکن بہت ہ نہیں۔ واپسی کے وقت کافی برفیلی ہوا چل تھی۔ اور ہمیں کھڑے رہنا پڑتا تھا، چلنے ی تکلیف ہو رہی تھی۔

ہ : آپ کو کوہ پیمائی کا شوق کیسے ہوا، کیا کے خاندان کے دُوسرے افراد بھی کوہ پیمائی ہیں ؟

: جی ہاں۔ میرے بڑے بھائی نے بیسک اور انس کورس کیا ہے ان کو دیکھ کر یہ شوق پیدا ور نہرو انسٹی ٹیوٹ آف ماؤنٹنیرنگ" اُترَ نی" ہمارے گاؤں کے پاس ہی ہے وہاں مُلک بیرون ملکوں کے لوگ پہاڑ پر چڑھنے کی نگ لیتے ہیں۔ بہت سے تربیت پانے والے ہمیشہ دیکھتے رہتے ہیں۔ میرے گھر کے آگے ٹریکس بھی نکلتے رہتے ہیں۔

رڑہ : آپ کا گاؤں کہاں ہے ؟

: میرا گاؤں" اُترکاشی" سے ۱۱ کلو میٹر کی دُوری پر ہے۔

اروڑہ : آپ نے ٹریننگ کہاں لی ؟

پال : میں نے نہرو انسٹی ٹیوٹ آف ماؤنٹنیرنگ اُترکاشی سے ٹریننگ لی۔

اروڑہ : کتنے عرصے کی ٹریننگ تھی ؟

پال : میں نے سب سے پہلے بیسک کورس کیا جو ایک مہینے کا تھا۔ پھر ایڈوانس کورس کیا وہ بھی ایک مہینے کا تھا۔

اروڑہ : ایڈوانس کورس میں آپ نے کون کون سی چوٹیاں سَر کیں ؟

پال : ایڈوانس کورس میں میں نے بلیک پیک، یعنی کالا ناگ چوٹی سَر کی۔ یہ ہر کی دون کی طرف ہے۔ اس کی اونچائی ۲۱۰۰۰ فٹ کے لگ بھگ ہے۔ اس کے بعد کرنل پریم چند نے میرے نام کی سفارش کی جو کہ اس ٹیم کے ڈپٹی لیڈر ہیں۔ ان دنوں وہ انسٹی ٹیوٹ کے وائس پرنسپل بھی تھے۔ اس کے بعد ایورسٹ کے لیے سلیکشن کیمپ لگے۔

اروڑہ : کتنے سلیکشن کیمپ لگے ؟

پال : دو سلیکشن کیمپ لگے۔ ایک گنگوتری کے علاقے میں اور دُوسرا مانا میں لگا۔

اروڑہ : گنگوتری علاقے میں کتنی خواتین تھیں ؟

پال : دونوں سلیکشن کیمپوں میں ۱۲ خواتین تھیں، لیکن ابھی اس ٹیم میں ۶ خواتین تھیں جو ایورسٹ پر گئیں۔ اس سے پہلے ایک کیمپ رڈوم کے لیے سلیکشن ہوا تھا وہ ہمالین ماؤنٹنیرنگ انسٹی ٹیوٹ دارجلنگ کی طرف سے ہوا تھا۔ وہاں ایک سلیکشن کیمپ ہوا تھا اور ایک گنگوتری میں ہوا تھا۔ پھر وہ جو دونوں جگہ چُنے گئے تھے ان کا ملا جُلا سلیکشن مانا میں ہوا اس میں سے جن کا سلیکشن ہوا انھیں ایورسٹ ٹیم میں رکھا گیا۔

اروڑہ : وانڈا رکتی وسز جو پولینڈ کی پہاڑ پر چڑھنے والی ایک خاتون ہیں، انھوں نے کہا ہے کہ خواتین اور مردوں کی ملی جُلی ٹیم میں مرد عورتوں پر حاوی رہنے کی پوری کوشش کرتے ہیں اور عورتوں کو اپنی صلاحیت دکھلانے کا پورا موقع نہیں ملتا۔ ان کا کہنا ہے کہ خواتین اور مردوں کی ٹیم الگ الگ ہونی چاہیے۔ اس کے بارے میں آپ کا ذاتی خیال کیا ہے، کیا آپ کو مرد ساتھی سے پورا تعاون ملا ؟

پال : جی ہاں۔ مجھے پورا تعاون ملا۔ کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جو حاوی ہونا چاہتے ہیں لیکن سب کے بارے میں ایسا نہیں کہہ سکتی۔

اروڑہ : حاوی ہونے میں تو ایک عورت دوسری عورت پر حاوی ہو سکتی ہے۔ اس میں عورت مَرد کا سوال نہیں ہے کیا آپ محسوس کرتی ہیں کہ عورتوں کی الگ ٹیم ہونی چاہیے ؟

پال : ہونی تو چاہیے اگر ان میں اتنی قابلیت ہے، لیکن میں سوچتی ہوں کہ ہمارے مُلک میں لڑکیاں ابھی پہاڑ پر چڑھنے میں اتنی آگے نہیں بڑھی ہیں۔ اس کے لیے تو کافی ہمت کی ضرورت ہے۔ ابھی لڑکیاں اس میدان میں پوری طرح سے آگے نہیں آئی ہیں کیونکہ ابھی بھی لڑکیوں کو چہار دیواری میں رکھتے ہیں۔ ہاں اگر اس میں لڑکیوں کی دلچسپی بڑھے اور زیادہ سے زیادہ لوگ اس میں تربیت یافتہ ہوں تو پورے یقین کے ساتھ کہہ سکتی ہوں کہ لڑکیوں کی الگ ٹیم بھی کافی کچھ کر سکتی ہے۔

اروڑہ : ایک ذاتی قسم کا سوال ہے۔ آپ نے ابھی شادی کی ہے یا ابھی تک کنواری ہیں ؟

پال : جی نہیں۔ ابھی تک میں نے شادی نہیں کی ہے۔

اروڑہ : کیا شادی کے بعد بھی آپ اس شوق کو بنائے رکھیں گی ؟

پال : ہمارے پہاڑوں میں شادی کے بعد کوہ پیمائی کرنا بہت مشکل ہے۔ ہاں اگر کوئی پہاڑ پر چڑھنے والا ساتھی ملے تو کوہ پیمائی میں کچھ مدد مل سکتی ہے۔ اس سے ایک دُوسرے کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔

اروڑہ : آپ کو کس طرح کی کتابیں پڑھنے کا شوق ہے، کیا ناول وغیرہ پڑھتی ہیں، پہاڑ پر چڑھنے کے علاوہ اور کون سا شوق ہے ؟

پال : ٹریکنگ کا شوق ہے اور مجھے گھوڑ سواری کا بھی شوق ہے لیکن ابھی تک کر نہیں پائی۔ اس کا مجھے شوق بہت پہلے سے ہے لیکن موقع نہیں ملا۔ اب تک

اروڑہ : شکریہ۔ ★

Regd. No. D(DN) 985
R.N. 97032/81

Licensed U(DN) to post without pre-payment
at Civil Lines Post Office, Delhi-110 054.

Vol. 4 No. 6 YOJANA(URDU) 16-31 July, 1984

یوم آزادی

۱۵ اگست ۱۹۸۴ء

کے موقع پر

یوجنا کی خصوصی پیشکش

اس میں مختلف النوع موضوعات پر فکر انگیز اور بصیرت افروز مضامین شامل کیے گئے ہیں۔ اس میں صفِ اول کے مفکروں اور ادیبوں کے مضامین شامل ہیں مثلاً خواجہ احمد عباس، مالکم ایس ادی سیشیہ، پی۔ ایس۔ اپّو، امریک سنگھ، وسنت ساٹھے، بنکر رائے، سولی ایس سوراب جی، جسٹس وی۔ آر۔ کے آئر اور مدھو دنڈوتے وغیرہ۔ اس میں اگست کے مہینے کے دونوں شماروں کو یکجا کرکے، اسے ایک تاریخی دستاویز بنا دیا گیا ہے۔

جسے کا

آپ کی فائل میں ہونا ضروری ہے۔

براہِ کرم

آج ہی اپنی کاپی کے لیے ایجنٹ کو لکھ دیں۔

۱۵ اگست، خصوصی شمارہ
۱۹۸۴ء

یہ گندے لوگ
یہ گندہ کھیل

میدان میں	ریفری	میدان میں	ریفری
سیاست داں	وسنت ساٹھے مدھو ڈنڈوتے	پیشہ ورانہ مہارت رکھنے والے	ڈی۔ آر۔ کرشنا آئر سول جج۔ سوراب جی
بیوروکریٹس	پی۔ این۔ ہکسر پی۔ ایس۔ اپّو	واعظ	خواجہ احمد عباس دیوی پرشاد چٹوپادھیائے
منصوبہ ساز	مالکم ایس۔ آدیشیہ بنکر رائے	تاجر	موہت سین کلدیپ نیر
ماہرین تعلیم	پی۔ ایم۔ بھارگو امریک سنگھ	صحافی	خشونت سنگھ سی۔ پی۔ راما چندرن

جلد : ۴
شمارہ : ۹ اور ۱۰
قیمت : ۲ روپے

جہاں ذہن پر کسی طرح کا خوف نہ ہو اور جہاں سر فخر سے اُونچا ہو۔
جہاں علم و دانش کے حصول پر کسی طرح کی رُکاوٹ نہ ہو۔
جہاں تنگ نظری پر مبنی گھریلو دیواروں نے دُنیا کو چھوٹے چھوٹے حصّوں میں تقسیم نہ کیا ہو۔
جہاں مُنہ سے جو لفظ باہر آئے وہ حقیقت پسندی کی سچّی تصویر ہو۔
جہاں تکمیل کی خاطر اَن تھک کوششیں اپنے بازو پھیلائے ہوئے ہوں۔
جہاں مُردہ رُسوم اور عادات کے تھکا دینے والے ریگستانی ریت میں معقول پسندی اور عقل و بینش کے صاف شفّاف دھارے نے اپنا راستہ کھو دیا ہو۔
جہاں تُو ذہن کو ہمیشہ آگے کی طرف پہنچانے کا ذریعہ ہے، جس سے حیاتِ فکر و عمل میں وسعتیں آئیں۔
میرے پتا! میرے مُلک کو آزادی کی ایسی ہی جنّت میں آنکھ کھولنے دے۔



منصوبہ بندی اور ترقیاتی پروگراموں کی جھلک پیش کرنے والا

۱۵ اگست ۱۹۸۴ء
خصوصی شمارہ

یوجنا
نئی دہلی

چیف ایڈیٹر ☆ آر. ٹھکرالے
ایڈیٹر ☆ لکھی رام رانا
اسسٹنٹ ایڈیٹر ☆ محمد عادل صدیقی
سب ایڈیٹر ☆ وسیم حیدر

جلد ۴	یکم تا ۳۱ اگست ۱۹۸۴ء	شمارہ ۹، ۱۰

۱۴ شراوت تاو بہادر شنک سبب ۱۹۰۶ پتہ فون : ۳۸۷۳۴۱

شرح چندہ
سالانہ ۲۰ روپے۔ ۲ سالہ ۳۵ روپے۔ ۳ سالہ ۵۰ روپے
فی کاپی :- ایک روپیہ
خصوصی شمارے کے لیے :- دو روپے

طالب علموں، استادوں اور لائبریریوں کے لیے ۱۰ فی صد کی رعایت

یوجنا منصوبہ بند ترقی کے بارے میں عوام کو آگاہ کرتا ہے مگر اس کے مضامین سرکاری نقطۂ نظر کی وضاحت تک ہی محدود نہیں ہیں۔

اس شمارے میں

بزنس منیجر ۔ ایل. آر. بترہ ☆ اسسٹنٹ ڈائرکٹر (پروڈکشن) آر. ایس. منجال

مضامین سے متعلق خط و کتابت کا پتہ :- ایڈیٹر "یوجنا" (اردو) پبلیکیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

ترسیل زر کا پتہ :- بزنس منیجر، پبلیکیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

اداریہ

"یوجنا" یوں تو اقتصادی منصوبہ بندی سے متعلق ایک رسالہ ہے لیکن اسے ایسی کیا پڑی کہ وہ ان مسائل کا تذکرہ کرے جو موٹے طور پر اس کے دائرۂ کار میں نہیں آتے۔ اگر آپ کے دل میں کوئی ایسا خیال آئے تو ذرا دو تین منٹ کے لیے توقف کریں۔ تو اس کی حقیقت آپ پر واضح ہو جائے گی۔

شمارے کا موضوع ہے "یہ گندے لوگ، یہ گندہ کھیل" مگر ہم آپ کو یقین دلاتے ہیں اور ایک دفعہ نہیں بلکہ بار بار۔ ہم نے یہ موضوع کسی بُرے جذبے سے نہیں چُنا ہے۔ ممکن ہے کہ آپ کو یہ موضوع کچھ اَٹ پٹا سا لگے لیکن یہ یقیناً غیر متعلق نہیں ہے۔

سلسلۂ روز و شب نقش گرِ حادثات بنتا چلا جا رہا ہے ایک طرف بد وضع اور بد قطع طریق کار ہے جسے ہم سسٹم یا نظام کہہ کر پکارتے ہیں۔ اس کے ساتھ زندگی کی تمام بُرائیاں جڑی ہوئی ہیں۔ دوسری طرف وہ کروڑوں خاموش لوگ جو بے چارے ایک صاف ستھری اور سادہ زندگی جینے کی اُمید اپنے دل میں لیے بیٹھے ہیں۔ لیکن کیا یہ اُمید صرف ایک پاکیزہ خواہش ہی بن کر رہ جائے گی؟ شاید ہاں! لیکن ایک صاف ستھری اور اچھی زندگی گذارنے کے لیے یہ پاکیزہ خواہش بُری تو نہیں ہے۔

بہر صورت آپ کے خیال میں سماج میں ایسے کون لوگ ہیں جو ہماری زندگی میں یہ گندہ کھیل کھیلتے ہیں اور زندگی کو اجیرن بنا دیتے ہیں۔ آخر کوئی انھیں روک کیوں نہیں پاتا۔ کیا انھیں کوئی روکنے کی ہمت کر سکتا ہے۔ کیا کبھی کوئی ایسا وقت بھی آئے گا کہ نیک ارادوں والے لوگ ایسے گندے کھیل کو بند کرانے میں کامیاب ہو سکیں گے۔ سچ بات یہ ہے کہ یہ ایسے متعلقہ سوالات ہیں جن کا جواب دینا ہمارے لیے اتنا آسان نہیں۔ تو پھر سوال اٹھتا ہے کہ اس موضوع پر اظہارِ خیال کرنے سے کیا حاصل؟

دراصل ہم نے اس بات پر بار بار سوچا کہ اس موضوع کو شروع کریں یا نہ کریں۔ کافی سوچ بچار کے بعد ہم نے یہ طے کیا کہ ایسا قدم تو اٹھانا ہی چاہیے چنانچہ ہرچہ بادا باد ما کشتی در آب انداختیم۔ لیکن آپ یہ نہ سمجھ لیں کہ ہم اتنے مشکل مسائل کا حل جاننے کا کوئی دعویٰ کر رہے ہیں۔ یا ان مسائل کا ہمارے پاس آسان حل ہے۔ یا ہم اس میدان کے خصوصی شہ سوار ہیں۔ ہمارا دعویٰ تو بس اتنا ہی ہے کہ ان مسائل سے نپٹنے اور ان سے جوجھنے کے لیے اپنے اندر ایک جذبہ ضرور رکھتے ہیں۔ اس لیے اس نظام کو چلاتے والی قوتوں کی نشان دہی کرنے کی ایک کوشش کی گئی ہے۔ اور ان کے کارناموں پر ملک کے کچھ مستند اور عظیم دانشوروں کے خیالات یہاں پیش کئے گئے ہیں۔

زندگی کا جو موجودہ ڈھچر ہے۔ اس کے بارے میں عوام کیا سوچتے ہیں؟ کیا وہ اس نظام سے پوری طرح مطمئن ہیں یا وہ یہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ اس کو بدلنے کی کوئی بھی کوشش بے کار اور صدا بہ صحرا ثابت ہوگی؟

کم سے کم جو کچھ ہو رہا ہے، اسے دیکھ کر تو یہ لگتا ہے کہ کبھی کبھی سُنائی دینے والی کچھ دبی دبی آوازوں کو چھوڑ کر، دیگر لوگوں نے اس صورتِ حال سے سمجھوتہ کر لیا ہے۔

لیکن جو بات ہمیں زیادہ کچھ کے لگاتی ہے، وہ یہ کہ آخر آج کے حالات میں ہمارا پریس میڈیا کیا کر رہا ہے۔ کہا تو یہ جاتا ہے کہ وہ عوام کے ترجمان ہیں۔ لیکن وہ اپنے قارئین کو دے کیا رہے ہیں؟ ویسے تو جو کچھ وہ چھاپتے ہیں، وہ اُن کے اپنے خیال میں قارئین کے مفاد کے لیے اور ان کی بھلائی کے لیے ہے اور جب تعدادِ اشاعت بھی بڑھ رہی ہو تو اس کے ماننے میں ہرج بھی کیا ہے کہ پڑھنے والے کو جو بھی دے دو، سب چلے گا۔ بس پھر تو یہ ڈھرا ہی ٹھیک ہے۔ خبریں ایسی جیسی وہ دینا چاہیں خیال ایسے، جو مخصوص مفادات کی ترجمانی کرتے ہوں اور مضامین ایسے جو ہاتھوں ہاتھ فروخت ہوں۔ جی ہاں اصلی مقصد تو اخبار کی فروخت ہے اور یہ فروخت بڑھتی ہے سنسنی خیز خبروں کے چھاپنے سے۔ اخبارات یہ سمجھتے ہیں کہ قارئین کی دلچسپیاں گپ شپ، سیکس، اسکینڈل اور ایک دوسرے پر کیچڑ اُچھالنے سے ہیں۔ ۔ میں انھیں کیا پڑی ہے کہ وہ سنجیدہ مسائل پر قلم اٹھائیں۔ اُن سے ایک طرف تو پڑھنے والے کے دماغ پر بوجھ پڑتا ہے اور دوسرے ایسے سنجیدہ موضوعات کے لیے اُس کے پاس نہ وقت ہے اور نہ دلچسپی۔ آپ مانیں یا نہ مانیں یہ سب اس نظام کی بدولت ہے اور اسے چلانے میں یہ معاون ہے۔ ایسی حالت میں میڈیا کا یہ رول بھی قدرتی ہے کہ وہ بھی ایسا ہی کھیل کھیلیں جس سے اس کھیل میں اُن کی ٹیم کو برابر تعاون ملتا رہے۔

آخر کیوں؟

معزز قارئین! ایسے خلاء میں ہمارا ذہن بار بار اُن اداروں کی طرف جاتا ہے جو ممکن ہے کہ اس دھارے کا رُخ موڑ سکیں۔ یہ ادارے ہیں سرکاری ذرائع ابلاغ۔ ان کی پہونچ اور دسترس دُور تک ہے۔ اگر واقعی وہ کچھ کرنا چاہیں تو وہ ان حالات سے کیسے نظریں چُرا سکتے ہیں جو ہماری صاف شفاف زندگی میں تاریکی اور اندھیرے کا سبب بن گئے ہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ سرکار میں گاڑی کا پہیہ کیسے گھوما ہے؟ آخر سرکار ہے کیا، چوٹی پر ایک یا دو درجن سیاست دان اور افسر شاہی کی ایک بڑی جماعت۔ یہی تو اپنی خواہش کے بموجب انتظام و انصرام کرتے ہیں اور جب یہ دونوں ہی مل جائیں تو پھر کیا۔

جو بھی ہو، موجودہ نظام سے ملک کے اتحاد کو درپیش خطرے کو کوئی بھی نظر انداز نہیں کر سکتا۔ اس خطرے کے سبھی پہلوؤں کا ذکر کرنا نہیں ہے لیکن صرف ایک بات ضرور کہنا چاہیں گے اور وہ ہے فرقہ وارانہ ہم آہنگی اور باہمی خیرسگالی کے تئیں سرکاری پالیسی۔ پیارے قارئین یہاں اس کا مختصر خاکہ ہی پیش کیا جا رہا ہے تاکہ آپ بھی اس پر غور کر سکیں۔

جس روز سے ملک آزاد ہوا، یعنی ۱۵ اگست ۱۹۴۷ سے لے کر آج تک یہ کوشش رہی ہے کہ ہم مذہبی رسومات، اقدار اور سادھو سنتوں کے اُپدیشوں کے ذریعے عوام کے ذہن میں یہ بات بٹھائیں کہ یہ رنگارنگی ہی ہماری وحدت کی بُنیاد ہے، لیکن سچ بات تو یہ ہے کہ یہ پالیسی ناکام ہو چکی ہے۔ اگر ایسا نہیں تو مختلف فرقوں اور برادریوں کے درمیان مسلسل بے اعتمادی کی فضا آخر کیوں؟ یہ صورتِ حال یقیناً فکر کی دعوت دیتی ہے اور یہ تقریباً وہی ہے جیسا کہ ۱۵ اگست ۱۹۴۷ کو تھی لیکن ایسا کیوں؟

پیارے قارئین! گومگو کا یہ معاملہ اس لیے ہے کہ ہم ابھی تک خود کو ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی ہی سمجھتے ہیں۔ مگر نہیں سمجھتے اور یقیناً نہیں سمجھتے تو معقول پسند انسان۔ ہم فرقوں کے نام پر بنائی گئی تنگ گلیوں میں جیتے ہیں۔ گویا کہ اس کے لیے ہماری زندگی مذہبی قوانین کے تحت گزارنا مقدر ہو چکا ہے۔ جس طرزِ زندگی میں ہم سانس لیتے ہیں، اس کو ہی زندگی کی سب سے بڑی خوبی سمجھتے ہیں۔ ہمارے فرقے کے رہنما اور ہمارے مبلغ ہم پر اس بات کے لیے بار بار زور دیتے ہیں کہ ہم اپنی اپنی شناخت ضرور بنائے رکھیں۔ اگر زندگی کا یہی ڈھچر ہے تو سماج میں پیدا ہونے والے اور پھر اس میں پروان چڑھنے والے افراد میں اس طرح کی قدرتی باتوں کے ہونے میں حیرانی کی کونسی بات ہے۔ اس طرح زندگی باہمی آویزشوں اور خلفشار کے درمیان آگے بڑھتی ہے اور ذرا کوئی "دباؤ یا تناؤ" ہوا تو پھر زندگی کا یہی ڈھچر طرح طرح کے خطرات کو سامنے لا کھڑا کرتا ہے۔

سچ تو یہ ہے کہ سبھی فرقوں کے لوگ اپنی اپنی مذہبی اقدار کے مطابق ہی زندگی گزارنا پسند کرتے ہیں۔ دراصل ایسی زندگی سے نجات پانے کا واحد طریقہ یہی ہے کہ ہم پورے جوش و خروش اور عزم و عمل سے ان لوگوں کے شعور کو بیدار کریں۔ تاکہ ہماری معاشرتی زندگی میں ترقی کے تصور کو صحیح ڈھنگ سے سمویا جا سکے اور سماج کو صحیح ڈھنگ سے اور صحیح معنی میں ترقی دی جا سکے۔ ہمیں فرقہ پرستی کے ان دائروں کو توڑنا ہے جو قدیم تاریکی دَور سے اب تک بنائے گئے ہیں۔ آج سائنس اور ٹکنالوجی نے بہت سے ڈھکوسلوں کا پردہ فاش کر دیا ہے۔ آج بچوں کی تعلیم کا آغاز اس ڈھنگ سے نہ ہونا چاہیئے جیسا کہ آج کل ہو رہا ہے۔ یعنی کہ ہندوؤں کی مقدس کتاب بھگوت گیتا ہے، مسلمانوں کی مقدس کتاب قرآن شریف ہے، سکھوں کی مقدس کتاب گرنتھ صاحب ہے۔ اور عیسائیوں کی مقدس کتاب بائبل ہے وقت کا تقاضہ ہے کہ انھیں ایسی باتیں سکھائی جائیں جس سے وہ ہر بات کی سچائی جاننے اور پرکھنے کے لیے بے چین ہوں اور ان میں اتنی ہمت ہو کہ وہ ہر بات کو استدلال کی کسوٹی پر پرکھیں یہاں تک کہ ان مقدس کتابوں میں کہی گئی باتوں کو بھی۔

فرقہ بندی کے حصار میں رہ کر زندگی گزارنے سے تو بات بنتی نظر نہیں آتی۔ مختصراً یہ کہ آج کی سب سے بڑی ضرورت ہے کہ نوعِ انسانی کو اس فرقہ بندی کے شکنجے سے آزاد کرائیں۔ ان کے جھوٹے فخر کا پردہ فاش کریں۔ تنگ نظری پر مبنی خیالات ان کے ذہنوں سے نکالیں۔ تاکہ وہ یہ جان سکیں کہ اوروں کے ساتھ مل کر بھرپور زندگی سے لُطف اندوز کیسے ہوا جا سکتا ہے۔

پر کیا یہ سب بدلے گا۔ "ہمیں امید ہے کہ یہ ضرور بدلے گا اور یقیناً یہ زندگی جینے کے لائق بن پائے گی۔

چیف ایڈیٹر

وسنت ساٹھے

طاقت ہمارے ہاتھ میں ہے

حکمرانی افسران کے

سیاست دانوں میں جو گراوٹ آئی ہے اور جس طرح انھوں نے انسانی قدروں کو پس پُشت ڈالتے ہوئے محض عیش و عشرت کو اپنا لائحہ عمل بنا کر حکمرانی کے اپنے فرض کو سرکاری افسران کو سونپ کر ملک میں ابتری پیدا کی ہے، اس مضمون میں وسنت ساٹھے نے اس کا ذکر کیا ہے انھیں افسوس ہے تو اس بات کا کہ کسی پارٹی کا دامن بھی تو پاک نہیں۔ ایڈیٹر

اگر سیاست، حکومت کی سائنس اور حکمرانی کا آرٹ ہے۔ تو سیاست دانوں کے اہم کردار کو بآسانی سمجھا جا سکتا ہے۔ انسانی

> اگر انتخاب کی نوبت آئے تو وہ سیاست دان جن میں سماجی اور سیاسی سیاست کی خو اور خاصیت ہو ان سے بہتر ہیں۔ جو محض سیاسی آرٹسٹ ہیں۔ وہ بلا مناسب فکر و نظر کے عوام پر اثر انداز ہوتے ہیں۔

سماج کا کوئی گروہ یا طبقہ عوام کی زندگیوں کو اس قدر متاثر نہیں کرتا جبقدر کہ یہ سوشل سائنس دانوں اور آرٹسٹوں کی جماعت سیاستدانوں کے رُوپ میں کرتی ہے۔ ان کے کارگر یا غیر موثر ہونے کا زیادہ تر انحصار اس بات پر ہے کہ ان میں طاقتور گروہ سیاسی اور سماجی سیاست دان ہیں یا سماجی اور سیاسی آرٹسٹ۔ بہتر تو یہ ہے کہ سیاست دانوں میں ان دونوں عناصر جمع ہوں۔ اور اگر انتخاب کی نوبت آئے تو وہ سیاست دان جن میں سماجی اور سیاسی سیاست کی خو اور خاصیت ہو ان سے بہتر ہیں۔ جو محض سیاسی آرٹسٹ ہیں اور بلا مناسب فکر و نظر کے عوام پر اثر انداز ہوتے ہیں۔

یہ بات تعلیمی طور پر درست ہے کہ ایک نمایندہ حکومت میں جس کے لیے عوام کو مقررہ وقت پر اپنے نمایندے چُننے کا حق ہوتا ہے۔ سیاست دان میں یہ خوبی ہونا لازمی امر ہے کہ وہ درست بنا سکے۔ پُر اثر انداز ہوسکے اور دُوسروں کو قائل کرسکے۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اس سیاست دان کے لیے ایک عمدہ مقرر یا ایکٹر ہونا ضروری ہے۔ ہاں یہ بات تو ہے کہ وہ عوام کے قریب ہو اور عوام یہ محسوس کریں کہ وہ ایسے شخص کا انتخاب کرکے اس کے ہاتھ میں اپنی خوشحالی سپرد کرسکتے ہیں۔

زمانہ حال میں ان کا رول

زمانہ حال کی جمہوریتوں کے پس منظر میں جہاں کہ عوام کو اپنے سماج کے نظم و نسق کے لیے اپنے نمایندے چُننے کا حق حاصل ہے۔ سیاست دانوں نے بحیثیت ایک جماعت اور گروہ کے اہم کردار حاصل کرلیا ہے۔ موجودہ دَور میں حکمرانی محض نظم و نسق اور دفاع تک ہی محدود نہیں۔ بلکہ عملی طور پر کسی بھی سماج کی سرگرمیوں کے ہر میدان کو چھُوتی اور اس پر حاوی ہوتی ہے۔ لہٰذا سیاست داں کی ذاتی قابلیت استعداد، اطوار و کردار کی بہت اہمیت ہے۔

جنگِ آزادی کے دنوں میں ماسوائے ان لوگوں کے جو غیر ملکی حکومت کے طرفدار تھے۔ دُوسرے لوگوں کو سیاسی طاقت کے من وسلوے حاصل کرنے کے مواقع حاصل نہیں تھے، بلکہ تحریکِ آزادی سے مراد تھی۔ حکمرانی کا عتاب اور مشکلات کا سامنا پُرامن تحریک میں بھی جیلوں میں جانے اور لمبے عرصے تک نظربند رہنے کا خدشہ لاحق رہتا تھا۔ ان حالات نے سیاست دانوں کی ایسی جماعت کو جنم دیا۔ جو ان تمام مشکلات کا سامنا صرف مہاتما گاندھی کی تحریک کے ایک جزو کی حیثیت سے کرنے کو تیار تھے بلکہ جنھوں نے اس سے قبل بھی گوکھلے، تلک، لالہ لاجپت رائے، بپن پال اور دُوسرے رہنمائے آزادی کے زمانہ میں بھی ایک خاص قسم کا لائحہ عمل اور شایستہ کردار کا راستہ اپنا لیا تھا۔ ان کا سب سے بڑا سرمایہ یہ تھا کہ وہ آزادی کی جدوجہد میں اپنے ہم وطنوں کے لیے کیا مثال قائم کریں اور انھیں کیا بھروسہ دلائیں کہ وہ بھی ان کے دکھلائے ہوئے راستے پر گامزن ہوں۔ گاندھی جی جب منظر پر آئے تو انھوں نے پہلے سے بھی زیادہ زندگی کا نظم و ضبط

کھادی اور تعمیری کام وغیرہ کی صورت میں پیش کیا۔

اگرچہ آغاز میں ہمارے ہاں ایسی لیڈرشپ تھی جو تحریک آزادی کے ضبط و نظم کی پیداوار تھی لیکن جیسے ہی ہم آزاد ہوئے اس لیڈرشپ سے زیادہ دیر تک مستفید نہ ہو سکے۔ کیونکہ قدروں کا یہ معیار ایسے اقتصادی نظام کی وجہ سے بدل کر رہ گیا۔ جس نے ایک طبقہ کی دوسرے دوسرے طبقہ کے ہاتھوں لوٹ کھسوٹ کو ہی جنم نہیں دیا بلکہ چند لوگوں کے ہاتھ میں تمام سرمایہ کے اجتماع کو بھی جائز قرار دے دیا تھا۔ یوں تو نظری طور پر ہر جگہ لوگ خاص طور پر برسراقتدار طبقہ اور اخبار نویس۔ کورپشن پر لعن طعن بھیجتے اور اس پر نکتہ چینی کرتے رہے لیکن کورپشن کا سرچشمہ ناقابلِ تشریح دولت اور اس کا استعمال۔ یعنی عملی طور پر کورپشن نہ صرف برحق ہی قرار پائی بلکہ ہماری زندگی کا ایک اہم جزو بن کر رہ گئی۔ جیسا کہ ایک بار ونوبا بھاوے جی نے کہا تھا کہ آہستہ آہستہ مگر یقینی طور پر بھرشٹاچار بجائے خود شِشٹاچار بن گیا۔ یعنی کورپشن زندگی کا لائحہ عمل ہو گئی۔

کالی قدروں کا نظام

جس طرح ایک کوئلے کی کان سے نکلتے ہوئے مزدور ایک دوسرے کو منہ کالا ہونے کا طعنہ دیتے ہیں اسی طرح ہماری زندگی کا کوئی ایسا میدان نہیں جس پر بلاواسطہ یا بالواسطہ کالے دھن اور

اگر سرسری طور پر بھی ان کا جائزہ لیا جائے، تو معلوم ہو جائے گا کہ جو بہت زور سے لعن طعن کرتے تھے کیا وہ اسی امر سے انکار کر سکیں گے۔ کہ انھوں نے دولت کی بہتی ہوئی یا چڑھتی ہوئی ندی سے لطف نہیں اٹھایا۔ لیکن جو لوگ سب سے زیادہ مستفید ہوتے ہیں (اور میرا یہ یقین ہے) وہ سیاست دان ہیں۔ کیونکہ انھوں نے نہ صرف اپنی خوشحالی کا بیڑا اٹھایا ہے۔ بلکہ اپنے اکثر ہم وطنوں کا بھی۔

آغاز میں ہمارے ہاں ایسی لیڈرشپ تھی جو تحریکِ آزادی کے ضبط و نظم کی پیداوار تھی۔ لیکن جیسے ہی ہم آزاد ہوئے اس لیڈرشپ سے زیادہ دیر تک مستفید نہ ہو سکے کیونکہ قدروں کا یہ معیار ایسے اقتصادی نظام کی وجہ سے بدل کر رہ گیا جس نے ایک طبقہ کی دوسرے طبقہ کے ہاتھوں لوٹ کھسوٹ کو ہی جنم نہیں دیا بلکہ چند لوگوں کے ہاتھ میں تمام سرمایہ کے اجتماع کو بھی جائز قرار دیدیا تھا۔

کے ہاتھ میں دے دیں — یہ لازم آ جاتا ہے کہ جو لوگ عوام کی رہنمائی کے طلب گار ہیں وہ اپنا ایسا مثالی کردار پیش کریں جس سے عوام کے اعتقاد اور اعتماد کو دھکا نہ لگے اور اس کردار کا اظہار محض ظاہری نمائش تک ہی محدود نہیں رہنا چاہیئے۔ بلکہ اس کا اظہار ان تبدیلیوں میں بھی رونما ہونا چاہیئے جو سیاست دان اپنے ہم وطنوں کی اکثریت کی بہتر زندگی بنانے میں لاتے ہیں۔ جنھوں نے ان پر بھروسہ رکھا ہے۔

طاقت سے لطف اندوزی

بدقسمتی سے جب آزادی کے بعد پہلا جوش مسرت ختم ہو گیا تو سیاست دان آہستہ آہستہ طاقت کے نشے میں آرام طلب زندگی بسر کرنے لگے۔ اور انھوں نے سمجھا ہے بجائے حقیقی حکمران بلکہ اس کا لائحہ عمل بنانے کا فرض بھی اسی وہم کی بنا پر سرکاری افسران (بیوروکریسی) پر چھوڑ دیا کہ یہ ان پر لازم نہیں کہ وہ انتظامیہ امور میں براہ راست دخل دیں یا سیاسی حکمت عملیوں کو زیر عمل لائیں۔ ان کا خیال تھا کہ وہ تو محض سیاسی پلیٹ فارم پر پروپیگنڈہ کرنے والے یا پرچارک ہیں۔ نتیجتاً ایک ایسا نظام قائم ہوا جس میں جیسے جیسے دن گزرتے گئے لوگوں کے نمائندوں کو یہ احساس ہونے لگا کہ انھیں کسی مہارت خصوصی استعداد یا علم و فن کی ضرورت نہیں رہی۔ بس جس کسی نے کوئی کرشمہ سازی کی۔ پبلسٹی کے فن کو استعمال میں لا کر عوام کے سامنے خود کو

نظریات کی رو سے ہر جگہ لوگ خاص طور پر برسراقتدار طبقہ اور اخبار نویس، کورپشن پر لعن طعن بھیجتے اور اس پر نکتہ چینی کرتے رہے لیکن کورپشن کا سرچشمہ ناقابلِ تشریح دولت اور اس کا استعمال۔ یعنی عملی طور پر کورپشن نہ صرف برحق ہی قرار پائی بلکہ ہماری زندگی کا ایک اہم جزو بن کر رہ گئی۔

سیاہ نظام اقتصاد نے اثر نہ ڈالا ہو۔ جو لوگ، خاص طور پر اخبار نویس سب سے زیادہ نکتہ چینی کرتے ہیں۔ سب سے پاک باز نظر آتے ہیں لیکن

اس دعوے کے پیشِ نظر اور اس بنا پر کہ وہ عوام کے ہاں جا کر ان سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ اپنی قسمت کی باگ ڈور سیاست دانوں

حسن موہنی صورت میں پیش کیا۔ وہ چن لیا گیا اور ایک بار چنے گئے تو اب معاملہ صرف اگلا انتخاب کے لیے وسائل فراہم کرنے اور ان آسائشوں سے

جو لوگ سب سے زیادہ مستفید ہوتے ہیں۔ (اور میرا یہ یقین ہے) وہ سیاست داں ہیں۔ کیونکہ انھوں نے نہ صرف اپنی خوشحالی کا بیڑا اٹھایا ہے بلکہ اپنے اکثر ہم وطنوں کا بھی۔

جب آزادی کے بعد پہلا جوشِ مسرت ختم ہوگیا تو سیاست دان آہستہ آہستہ طاقت کے نشے میں آرام طلب زندگی بسر کرنے لگے اور انھوں نے گاہے بگاہے حقیقی حکمرانی بلکہ اس کا لائحہ عمل بنانے کا فرض بھی اس وہم کی بنا پر سرکاری افسران (بیوروکریسی) پر چھوڑ دیا کہ یہ ان پر لازم نہیں کہ وہ انتظامیہ امور میں براہِ راست دخل دیں یا سیاسی حکمت عملیوں کو زیر عمل لائیں۔

ایک بار چنے گئے تو اب معاملہ صرف اگلے انتخاب کے لیے وسائل فراہم کرنے اور ان آسائشوں سے لطف اندوز ہونے کا تھا جو دولت کی طاقت پیدا کرتی ہے۔ اسی طرح سیاست دانوں کی ایک فوج جن کی قدروں کا معیار کسی نہ کسی طرح طاقت حاصل کرنا تھا وجود میں آگئی۔

لطف اندوز ہونے کا تھا جو دولت کی طاقت پیدا کرتی ہے۔ اسی طرح سیاست دانوں کی ایک فوج جن کی قدروں کا معیار کسی نہ کسی طرح طاقت حاصل کرنا تھا وجود میں آگئی۔

اور یہ فطرت تمام سیاسی جماعتوں کی مشترک سرشت بن گئی ہے۔ اور اگر کسی میں کوئی کمی بیشی ہے تو یہ مواقع کے ملنے نہ ملنے کی بناء پر ہے۔ ورنہ تمام پارٹیوں کا بنیادی اصول اور نظریۂ حیات ایک ہی ہے۔

ان سیاسی جماعتوں کو جن کے کارکنوں کی تربیت اشتراکی اقدار کے نعروں پر ہوئی تھی۔ جلد ہی معلوم ہوگیا کہ انتخاب لڑنے کے لیے سرمایہ کی ضرورت ہے۔ اور سرمایہ ڈول یا بالٹی گھمانے سے نہیں بلکہ ان لوگوں سے آتا ہے جنھوں نے غیر تشریحی دولت جمع کر رکھی ہے۔ اور وہ اس امید پر چندہ دیتے ہیں کہ جب یہ چندہ لینے والے نمائندے چنے جائیں گے تو ان کو فیض پہونچائیں گے۔ لہٰذا گندی سیاست کا کھیل کھیلنے والے سیاستدان کا وجود اس نظام کی پیداوار ہے جو ہمارے روکنے، نہیں نہیں بلکہ جو ہماری چشم پوشی کی بنا پر سر پر چڑھا۔ ہو سکتا ہے اسے بعض لوگوں نے راضی خوشی سے قبول کیا ہو۔ جب تک ہماری یہ دلی خواہش نہیں ہوگی کہ ہم اسی نظام اور ڈھانچے کو بدل ڈالیں اور کورپشن کے زہریلے مواد کے رکھنے کو بند نہیں کر دیں گے۔ اس وقت تک ایک دوسرے پر رشوت ستانی کے الزامات محض ویرانے میں چیخ و پکار سے زیادہ کچھ حیثیت نہیں رکھتے۔ اپنے ضمیر کی تسلی کے لیے چند

(باقی صفحہ پر)

ان سیاسی جماعتوں کو جن کے کارکنوں کی تربیت اشتراکی اقدار کے نعروں پر ہوئی تھی۔ جلد ہی معلوم ہوگیا کہ انتخاب لڑنے کے لیے سرمایہ کی ضرورت ہے اور یہ سرمایہ ڈول یا بالٹی گھمانے سے نہیں بلکہ ان لوگوں سے آتا ہے جنھوں نے غیر تشریحی دولت جمع کر رکھی ہے اور وہ اس امید پر چندہ دیتے ہیں کہ جب یہ چندہ لینے والے نمائندے چنے جائیں گے تو ان کو فیض پہنچائیں گے۔

مدھو ڈنڈوتے

ذات پات سے متعلق

ہمارا ناپاک کھیل کہیں زیادہ خطرناک ہے!

زیرِ نظر مضمون میں فاضل مضمون نگار نے جو ایک ممتاز اور ماہر رکن پارلیمنٹ ہیں'۔ بدترین قسم کی بدعنوانی اور ذات پرستی کے لیے ذمہ دار' ہماری اقدار میں آچکی خرابی کی مذمت کرتے ہوئے کہا ہے کہ آج کی سیاست تبدیلی لانے والی سائنس نہ رہ کر، محض ذات پات کے اعداد و شمار کا جوڑ توڑ ہو کر رہ گئی ہے۔ مزید برآں چونکہ عوام میں بے چینی سے سیاست دانوں کو انتخابات میں فائدہ پہنچتا ہے' اس لیے یہ لوگ اِن میں آپسی جھگڑوں کو ہوا دینے کے ناپاک کھیل میں تندہی سے لگے رہتے ہیں۔

ہمارے ملک میں متعدد شعبے انحطاط کا شکار ہیں' تاہم جو بات دور رس نتائج کی حامل ہے' وہ ہے اقدار کی خرابی کے باعث ہمارے جمہوری اداروں کا مسخ ہونا۔ اِس بگاڑ سے ہمارے ملک میں سیاست دانوں کے طرزِ عمل اور سیاسی اداروں کو کاری ضرب لگی ہے۔

"گوڈویٹ فیلڈ" (وہ خدا جو ناکام رہا) نامی شہرۂ آفاق کتاب میں اِگناتزیو سلونے نے کہا ہے.....

"نظریات اور اقدار کے مابین امتیاز کو کافی حد تک تسلیم نہیں کیا جاتا ہے لیکن یہ ایک بنیادی امر ہے۔ نظریات کے ایک مجموعے پر ایک فرد ایک مکتب کی ہی بِنا ڈال سکتا ہے' لیکن اقدار کا ایک مجموعہ ایک ثقافت' ایک تمدن اور انسانوں کے آپس میں مل جُل کر جینے کا ایک نیا انداز قائم کرسکتا ہے۔

تاہم اقدار کے اُس مجموعے کو' جس کی طرف اگنازیو سلونے نے اشارہ کیا ہے' سیاست میں زک پہنچی ہے۔ بدعنوانی کوئی نیا مظہر نہیں ہے۔ بھارت میں انگریزی راج کے دوران بھی بدعنوانی موجود تھی۔ یہاں تک کہ آزادی کے بعد بھی بدعنوانی کا صفایا نہیں ہو سکا۔ لیکن اقدار کے تئیں ہمارے لگاؤ نے سماج کو اس بات پر تیار کیا کہ وہ بدعنوانی کو ایک لغزشِ خیال کرے۔ لیکن اب بدعنوانی کی نوعیت مستقل سی ہو چکی ہے' اور ایسا لگتا ہے کہ اسے اب بدنامی کی علامت بھی نہیں سمجھا جاتا۔

سیاست دانوں کا ضمیر بھی مردہ ہو چکا ہے۔ وہ لوگ' جنھیں قانون ساز مجلسوں میں اپنی اکثریت کھونے پر اقتدار سے دست بردار ہونا ہوتا ہے' وہ آسانی سے اور بلا چوں و چرا ایسا نہیں کرتے۔ اقتدار سے چپکے رہنے کے لیے اُن کی آخری کوشش یہ ہوتی ہے کہ وہ اراکینِ مجلسِ قانون ساز کو رشوت دے کر اقتدار کا توازن اپنے حق میں کر لیں۔ اسمبلی کی سیاسی اقلیت راتوں رات اکثریت میں بدل جاتی ہے اور اس ناپاک کھیل میں کامیابی کی بدولت' وہ اقتدار کی کرسی پر قابض رہتے ہیں۔ سیاست کے اس ناپاک کھیل کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ پارلیمانی جمہوریت کا ادارہ مذموم و ملعون ہو کر رہ گیا ہے۔

> سیاست دانوں کا ضمیر بھی مردہ ہو چکا ہے۔ وہ لوگ، جنھیں قانون ساز مجلسوں میں اپنی اکثریت کھونے پر اقتدار سے دست بردار ہونا ہوتا ہے، وہ آسانی سے اور بلا چوں و چرا ایسا نہیں کرتے۔ اقتدار سے چپکے رہنے کے لیے اُن کی آخری کوشش یہ ہوتی ہے کہ وہ اراکینِ مجلس قانون ساز کو رشوت دے کر اقتدار کا توازن اپنے حق میں کر لیں۔

فرقہ وارانہ تشدد: مہاراشٹر میں واقعہ

بھیونڈی اور بمبئی جیسے مقامات پر حال ہی میں فرقہ وارانہ تشدد کا وہ آتش فشاں پھوٹا کہ جس کی مثال نہیں ملتی۔

ایک عام آدمی اپنے آپ میں امن پسند ہوتا ہے۔ وہ اپنے پڑوسیوں کے ساتھ، خواہ اُن کا مذہب کوئی بھی ہو، اُلفت اور بھائی چارے سے رہنا چاہتا ہے۔ تاہم کئی سیاست دان، جو محض فرقہ وارانہ جھگڑوں سے اپنا اُلّو سیدھا کر سکتے ہیں، عوام کے فرقہ وارانہ جذبات کو ہوا دیتے ہیں۔ اگرچہ عوام کے خلاف معاشرتی و اقتصادی میدانوں میں کی جانے والی ناانصافی کے سلسلے میں اُنھیں بیدار کرنا مشکل ہوتا ہے تاہم اُن کے سفلی فرقہ وارانہ جذبات کو بھڑکانا مقابلتاً آسان ہوتا ہے۔ تنگ نظر سیاستدانوں کا یہ ایک ناپاک کھیل ہے۔ وہ اپنے گوشۂ عافیت میں بیٹھ کر تحریر و تقریر کے ذریعے مذہبی جنون کو مشتعل کرتے ہیں، اور اپنے جمہور کی برتری کے دعویدار انداز فکر کے باعث اپنے ہم مذہبوں میں اُونچا مقام بنا لیتے ہیں۔ لیکن اس کا نتیجہ وہ فرقہ وارانہ فسادات ہوتے ہیں، جن میں مختلف فرقوں کے صرف غریب لوگوں ہی کی جانیں جاتی ہیں اور صرف اُنھی بے چاروں کا جو تھوڑا بہت اثاثہ ہوتا ہے، تباہ و برباد ہوتا ہے۔ سیاست دان، جو اس ساری مصیبت کی جڑ ہوتے ہیں، غریبوں کے جلے ہوئے جھونپڑوں کی سُلگتی ہوئی راکھ کا محض دُور سے نظارہ کرتے ہیں۔

کچھ حالیہ فرقہ وارانہ فسادات میں، وابستہ مفادات کو شہ دینے والے سیاست دانوں

تاہم کئی سیاست دان، جو محض فرقہ وارانہ جھگڑوں سے اپنا اُلّو سیدھا کر سکتے ہیں، عوام کے فرقہ وارانہ جذبات کو ہوا دیتے ہیں۔ اگرچہ عوام کے خلاف معاشرتی و اقتصادی میدانوں میں کی جانے والی ناانصافی کے سلسلے میں اُنھیں بیدار کرنا مشکل ہوتا ہے۔ تاہم اُن کے سفلی فرقہ وارانہ جذبات کو بھڑکانا مقابلتاً آسان ہوتا ہے۔

کا مکروہ چہرہ سامنے آیا ہے۔ بھیونڈی میں کچھ لوگوں کو اُن کی جھونپڑیوں میں آگ لگا کر زندہ ہی بھون ڈالا گیا، عام طور پر یہی کہا جا رہا ہے کہ یہ المیہ زمینداروں اور سیاست دانوں کی ملی بھگت کا شاخسانہ تھا، چونکہ خالی زمین حاصل کرنے میں اُن کا مفاد چھپا ہوا تھا، اس لیے انھوں نے جھونپڑیوں کو پھنکوا ڈالنے کی سازش کی۔ لیکن جب حکام نے یہ اعلان کیا کہ فسادات میں بچے ہوئے لوگوں کو پھر سے بسانے کے لیے جلائی گئی جھونپڑیوں کو دوبارہ بنایا جائے گا، تو زمینداروں نے

یہ سیاست دانوں کا ایک ناپاک کھیل ہے۔ وہ اپنے گوشۂ عافیت میں بیٹھ کر تحریر و تقریر کے ذریعے مذہبی جنون کو مشتعل کرتے ہیں، اور اپنے جمہور کی برتری کے دعویدار انداز فکر کے باعث اپنے ہم مذہبوں میں اُونچا مقام بنا لیتے ہیں۔

اس معاملے میں التوائے فیصلہ کے لیے قانونی عدالت میں چارہ جوئی کر دی۔ اس کام میں انھیں کچھ سیاست دانوں کی سرپرستی حاصل تھی۔ کیا اس سے بڑھ کر کوئی ذلیل حرکت ہو سکتی ہے؟ عبادت گاہوں کی حرمت اور عظمت کے بارے میں سیاست دان اکثر بہت بڑھ چڑھ کر باتیں کیا کرتے ہیں۔ مگر عجیب اُلٹی بات ہے کہ وہی سیاست دان، جو پرستش گاہوں کی عظمت کی بڑی شدومد سے وکالت کرتے ہیں، اِن کو گولہ بارود اور اسلحہ کی ذخیرہ گاہیں، مجرموں اور دہشت پسندوں کے مسکن بنا دینے میں اعانت کرتے ہیں۔

عبادت گاہوں کی حُرمت اور عظمت کے بارے میں سیاست دان اکثر بہت بڑھ چڑھ کر باتیں کیا کرتے ہیں۔ مگر عجیب اُلٹی بات ہے کہ وہی سیاست دان، جو پرستش گاہوں کی عظمت کی بڑی شدومد سے وکالت کرتے ہیں، اِن کو گولہ بارود اور اسلحہ کی ذخیرہ گاہیں نیز مجرموں اور دہشت پسندوں کے مسکن بنا دینے میں اعانت کرتے ہیں۔

اِن کاموں سے پرستش گاہوں کی بے حُرمتی ہوتی ہے۔ یہ سیاست دانوں کا ایک ناپاک کھیل ہے۔ بدقسمتی سے اس کا شکار بھی عام طبقے کے لوگ ہی ہوتے ہیں۔

ایک پھوٹ ڈالنے والی قوت۔

ایک وقت تھا جب ہندوستانی سیاست کا اصل دھارا ملک میں ایک دوسرے کو آپس میں ملانے والی قوت کی حیثیت رکھتا تھا۔ مگر آج یہ تیزی سے ایک تفرقہ پرداز قوت بنتا جارہا ہے۔ انتخابات میں امکانی جیت سے للچاکر، سیاست داں ایسی سیاست کو بڑھاوا دے رہے ہیں، جس پر ذات برادری کا عنصر غالب ہے۔ سیاست اب اُن سیاستدانوں کا کھیل بن گئی ہے، جو پسماندہ نیز ذات برادری کے تعصب سے مغلوب ہیں۔ سیاست ایک تبدیلی لانے والی سائنس نہ رہ کر، محض ذات برادری کے اعداد و شمار کا جوڑ توڑ ہوکر رہ گئی ہے۔ چونکہ مختلف فرقوں میں کشیدگی سیاست دانوں کو انتخابات میں جیت کے مواقع فراہم کرتی ہے، اسی لیے یہ لوگ انتخابات پر اپنی نظریں ٹکائے ہوئے فرقہ وارانہ جھگڑوں کو ہوا دینے کے ناپاک کھیل میں اپنے آپ کو گہری حد تک مشغول رکھتے ہیں۔

صرف اُسی وقت، جب کہ ملک کو جارحیت یا مطلق العنانیت کے خلاف جدوجہد جیسے قومی بحران کا سامنا ہو، سیاست دانوں کے بڑی ترکیب و احتیاط سے پالے ہوئے یہ انتشار پسند رجحانات پس منظر میں ہٹ جاتے ہیں۔ لیکن جونہی یہ بحران ختم ہوتا ہے، یہ دوبارہ اپنا سر اُٹھانے لگتے ہیں۔

خواہ یہ سیاست دانوں کی کرائی ہوئی دَل بدلی ہو، بدعنوانی کا قائم کرنا ہو یا فرقہ وارانہ کشیدگی سے اپنا اُلّو سیدھا کرنا، اور خواہ کسی تاجر کا کسی سیاست داں یا افسر کی شہ پاکر اشیاء میں ملاوٹ کرنا ہو، یہ سب اقدار کی گراوٹ ہے، جس نے سیاست دانوں کے ناپاک کھیل کو ممکن بنایا ہے۔ سیاست دانوں کے اس ناپاک کھیل کو تبھی ختم کیا جاسکتا ہے جب انھیں کے خلاف ایک پُرزور جدوجہد شروع کی جائے اور ایک پاکیزہ عوامی زندگی کے حصول کے لیے قربانیاں دی جائیں۔ یا ایک طویل تعلیمی عمل کے ذریعے عوام میں اچھے چال چلن اور صالح اقدار کا ذوق پیدا کیا جائے۔ یہ ڈگر ہے تو کٹھن، لیکن ہماری عوامی زندگی اور سیاست کی تطہیر کے لیے اس پر چلنا بہت ضروری ہے۔

مگر آج یہ تیزی سے ایک تفرقہ پرداز قوت بنتا جارہا ہے۔ انتخابات میں امکانی جیت سے للچاکر، سیاست داں ایسی سیاست کو بڑھاوا دے رہے ہیں، جس پر ذات برادری کا عنصر غالب ہے۔ سیاست اب اُن سیاست دانوں کا کھیل بن گئی ہے، جو پسماندہ نیز ذات برادری کے تعصب سے مغلوب ہیں۔ یہ ایک تبدیلی لانے والی سائنس نہ رہ کر، محض ذات برادری کے اعداد و شمار کا جوڑ توڑ ہوکر رہ گئی ہے۔

خواہ یہ سیاست دانوں کی کرائی ہوئی دَل بدلی ہو، بدعنوانی کا قائم کرنا ہو یا فرقہ وارانہ کشیدگی سے اپنا اُلّو سیدھا کرنا، اور خواہ کسی تاجر کا کسی سیاست داں یا افسر کی شہ پاکر اشیاء میں ملاوٹ کرنا ہو، یہ سب اقدار کی گراوٹ ہے، جس نے سیاست دانوں کے ناپاک کھیل کو ممکن بنایا ہے۔

بقیہ: طاقت ہمارے ہاتھ میں ہے

سروں کی قربانی اپنے آپ کو اور عوام کو دھوکا دینا ہوگا۔ لیکن اس سے ہماری زندگی پر کوئی صحیح اثر نہیں پڑے گا۔ ★

جب تک ہماری یہ دلی خواہش نہیں ہوگی کہ ہم اس نظام اور ڈھانچے کو بدل ڈالیں اور کورپشن کے زہریلے مواد کے رسنے کو بند نہیں کردیں گے، اس وقت تک ایک دوسرے پر رشوت ستانی کی تہمتیں محض ویرانے میں چیخ و پکار سے زیادہ کچھ حیثیت نہیں رکھتیں۔

اپنے ضمیر کی تسلی کے لیے چند سروں کی قربانی اپنے آپ اور عوام کو دھوکا دینا ہوگا۔ لیکن اس سے ہماری زندگی پر کوئی صحیح اثر نہیں پڑے گا۔

پی۔ این۔ ہکسر

دیگچی اور کیتلی کی داستان

یوجنا نے جناب پی۔ این۔ ہکسر سے مندرجہ ذیل سوال کیے :۔

۱۔ یوجنا نے اپنے اس خاص نمبر میں جس کا موضوع ہے "یہ گندے لوگ ۔ گندہ کھیل" بیوروکریسی (افسرانِ اعلیٰ) کو بھی شامل کیا ہے۔ اس ضمن میں آپ کا کیا خیال ہے ؟

۲۔ بیوروکریسی کے طریقِ عمل میں جو گراوٹ آئی ہے۔ اس کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے ؟

۳۔ طرفدار بیوروکریسی کے تصور کو آپ کس نظر سے دیکھتے ہیں اور آیا موجودہ بیوروکریسی اپنے فرض کو بخوبی سرانجام دینے کے اہل ہے ؟

۴۔ بیوروکریسی سے صنعت کاروں کو جو شکایت ہے۔ اس کو آپ کس نظر سے دیکھتے ہیں۔

جناب ہکسر نے جو جواب ارشاد فرمائے وہ پیشِ خدمت ہیں۔ (چیف ایڈیٹر)

آپ نے جس انداز سے سوالات کی ترکیب کی ہے۔ ان کا صداقت آمیز جواب کچھ مشکل سا نظر آتا ہے۔ ہمارے دیس میں سسٹم (نظام) کے تصور کی وضاحت کرنا دشوار ہے۔ اس کے ساتھ ہی اداروں کی تشکیل اور اُن کی خبرگیری بھی مشکل کام ہے۔ بحیثیت قوم ہم افراد سے متعلق رہتے ہیں۔ یا بڑی حد تک ہم اپنی ذات اور نجات میں گہرے طور پر کھوئے رہتے ہیں۔ ہماری یہی محویت اداروں کی قدر و منزلت اور جسے میں مجموعی نظام اپنانے کا نام دوں گا۔ ان کی تباہی کا باعث بنتی ہے۔ اگرچہ ہمارے دانشور نظریہ کلیت کے تحت بحیثیت مجموعی اندازِ نظر کی بات کرتے ہیں لیکن ہم عملی طور پر تاریخی، سماجی، کلچرل سیاسی اور اقتصادی عناصر کے باہمی اثر و نفوذ کو بالکل ہی نظرانداز کر دیتے ہیں۔ اور اسی کا نتیجہ ہم سب کے سامنے ہے۔ اداروں کی بربادی، ہر طرف انتشار اور پریشانی حالی۔ اُدھر قومی ایکتا کو فروغ دینے کے لیے سیمنار منعقد کیے جا رہے ہیں اور لمبے چوڑے درس دیے جا رہے ہیں اور ادھر ہم اسی ایکتا کو توڑے جا رہے ہیں۔

بیوروکریسی کوئی غیر معمولی اور الگ تھلگ صورت حال نہیں۔ یہ ہمارے ریاستی نظام کا ایک جز رہی ہے۔ اگر ملک کو ایک جہاز سے

> **بحیثیت قوم ہم افراد سے متعلق رہتے ہیں۔ یا بڑی حد تک ہم اپنی ذات اور نجات میں گہرے طور پر کھوئے رہتے ہیں۔ ہماری یہی محویت اداروں کی قدر و منزلت اور جسے میں مجموعی نظام اپنانے کا نام دوں گا۔ ان کی تباہی کا باعث بنتی ہے۔**

تشبیہ دی جائے تو سیاسی لیڈرشپ اس جہاز کے دیدبان (برج) کو سنبھالے ہوئے ملے گی، اور یہی مجموعی طور پر جہاز کی کپتان ہوگی۔ بیوروکریسی اس جہاز کے انجن روم کے مانند ہوگی۔ اُسے کسی خاص سمت میں لے جانے کے لیے دونوں کو مل جل کر کام کرنا ہوگا اور اس سمت کا تعین سیاسی لیڈرشپ کرتی ہے۔ جہاز کی تمثیل بہت آسان ہے۔ کیونکہ اس کی حرکت۔ اس کی منزل یا منزلیں پہلے سے ہی معلوم ہو جاتی ہیں۔ لیکن جب تاریخی، سیاسی، سماجی، اقتصادی، تہذیبی تعلیمی، سائنسی اور صنعتی ہیئت کی کایا پلٹ کے وسیلہ عمل کے لیے لیڈرشپ کی ضرورت پیش آتی ہے۔ تو صورتِ حال بے حد اُلجھ جاتی ہے اور ہندوستان کے حالات اور زیادہ اُلجھے ہوئے ہیں جہاں کہ ہم پہلی بار جدید انڈسٹری کا زراعت، جدید سائنس اور ٹیکنالوجی کا خیر کر رہے ہیں۔ اور ایک ایسا قومی نظام قائم کرنا چاہتے ہیں جسے نہ تو ہم نظام مغل کہہ سکتے ہیں گپتا، نہ وجے نگر، نہ چولا اور نہ ہی چیرا۔ یہ سلطان شاہی یا خاندانی وراثت پر مبنی تھے ملک، سرکار کے اختیار میں ہے اور سرکار سیاسی پارٹی اور اس کی لیڈرشپ کے ہاتھ میں جہاز اور ریاست کی تمثیل کی طرف اگر بار پھر دھیان دیں تو ذرا خیال فرمائیے کہ اگر کپتان اور جہاز کے عملے میں تال میل نہیں ہے اور ایک دوسرے پر اعتماد نہیں کریں گے تو جہاز کا کیا حشر ہو سکتا ہے۔

کسی ملک کی حکومت کو بخوبی چلانے کے لیے ۔ خاص طور پر جبکہ وہ نظام جمہوری ہو اعتقاد اور احساسِ اعتماد نہایت اہم اور ضروری ہے۔ ریاستی نظام حکومت بھلے ہی ایسے عمل سے جسے انقلاب کا نام دیا گیا ہے۔ وجود میں آیا ہو۔ اسے برقرار رکھنے اور سنبھالنے کے

بیوروکریسی ایک اہم ضرورت بن جاتی ہے۔ اس کی مثال ۱۸ ویں صدی فرانس کے ۲۰ ویں صدی کے چین اور روس کے انقلاب سے دی جا سکتی ہے۔

اس نظام کے سیاسی اور افسر شاہی دونوں جزو، افراد کے ایک ماحول میں کام کرتے ہیں۔ البتہ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس نظام اقتدار کو کون بنائے گا۔ اور اسے کون قائم رکھے گا اور اس کی کون قدر کرے گا۔ قدیم دانش مندانہ ایک کہاوت ہے کہ یتھا راجہ، تتھا پرجا۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ بادشاہ کو اپنی رعایا کے لیے ایسے معیار قائم کرنا چاہئیں جو ان میں بہتری کا احساس پیدا کر دیں۔ اور جسے وہ لبیک کہیں۔

اگر آپ خالق اور تخلیق کے نظریے پر یقین رکھتے ہیں تو آپ کو تمام مذہبی کتابوں میں یہ ملے گا۔ کہ خدا نے ہی ہر چیز، یعنی سمندر، آسمان، سورج، زمین، چاند، تارے، بلکہ بنی نوعِ انسان کی تخلیق کی۔ لہٰذا ایک نظام پیدا کرنے کے بعد خدا بحیثیت مطلق العنان یہ حکم صادر فرما سکتا تھا کہ وہ اس کا انتظام اپنی مرضی اور رضا کے مطابق چلائے گا۔ لیکن مذہبی عقائد کی بنا پر خداوند تعالےٰ دانشمند اور واقف کل ہے۔ اس لیے اس کو اس امر کا احساس تھا کہ اگر اس نے اپنی رضا کے مطابق دُنیا کو چلایا تو نظامِ عالم پیدا ہونے کے بجائے انتشارِ کائنات کا سبب ہوگا۔ لہٰذا اس نے اپنی تخلیق کے جزو اور اعضا کو ایک سسٹم میں تنظیم دینا شروع کیا۔ شمسی نظام پیدا ہوا اور خالقِ مطلق نے اس سسٹم کو چلانے کے لیے قاعدے اور قانون بنائے۔ ہزاروں لاکھوں برس گذرنے کے باوجود زمین اپنے محور کے گرد گھومتی ہے۔ اور یہی اصول دوسری تخلیق پر عائد ہوتا ہے۔

یوں تو ہمارے سیاست داں خدا پر اعتماد کے دعویٰ دار ہیں۔ لیکن طاقت کے نشے اور اس کی تلاش نے انھیں اندھا کر رکھا ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ انھیں کسی قاعدے قانون سے کوئی سروکار نہیں۔ انھیں ملکی نظام کے سیاسی یا حکمرانی پہلوؤں میں کسی معیار اور ضبط قائم رکھنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ سیاسی نظام کی برقراری کے لیے جن اقدار کی ضرورت ہوتی ہے۔ انھیں بھی مستقل طور پر اپنانے کی انھیں پرواہ نہیں ہے۔

ہمارے قدیم دانشوروں کے مطابق سرکار یعنی حکومت یا ریاست عوام کے بڑے طبقے میں اس حد تک جواز کا درجہ رکھتی ہے اور اس حد تک احترام سے دیکھی جاتی ہے جس حد تک اس کے نظریات بلند ہوں اور یہی در پردہ سرکار کا اقبال بھی کہا جاتا ہے۔ یہ سرکار عوام کو ایسے طریقے فراہم کرتی ہے جن سے وہ اپنی شکایات تناؤ یا بے اطمینانی کو ظاہر کر سکیں۔ ایسی سرکار عوام میں مقبول ہوتی ہے اور اسے "سنوائی" کا نام دیا جاتا ہے۔

اب تک جو کچھ میں نے کہا ہے۔ اگر اس میں کوئی صداقت ہے تو میں یہ کہوں گا کہ بیوروکریسی میں جو انتشار پیدا ہوا ہے اور اس کے اعمال میں جو ظاہرا طور پر فرض اور اخلاق کی خامیاں رُونما ہوئی ہیں۔ وہ آئینہ دار ہیں، اس سیاسی نظام کی گراوٹ، سیاسی لیڈر شپ کے انحطاط اور اقدار کی تباہی کی۔ جس کی ذمہ داری سیاست دانوں اور ان کی روش پر عائد ہوتی ہے۔ نتیجتاً ایمانداری، راست بازی اور اپنا فرض نبھانے سے لگاؤ میں واضح طور پر زوال آ رہا ہے

ایسے ماحول میں جہاں زندگی بسر کرنے کا فن اور اصول قاعدے، قانون اور اخلاقی معیار کو محض فریب دینا ہو۔ اس کا تعلق چاہے سیاست، بیوروکریسی، صنعت و حرفت یا کاروباری زندگی سے ہو، تو حیرانی کی کوئی بات نہیں کہ دفتری افسر بھی اس کھیل میں اپنا خاص پارٹ ادا کرتے ہیں۔ اور یہ بات تو ماننا ہی پڑے گی۔ کہ یہ کھیل ذلیل سے ذلیل تر ہوتے جا رہے ہیں۔

گذشتہ زمانے میں زمین دار اور مزارع

یوں تو ہمارے سیاست دان خدا پر اعتماد کے دعویٰ دار ہیں۔ لیکن طاقت کے نشے اور اس کی تلاش نے انھیں اندھا کر رکھا ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ انھیں کسی قاعدے قانون سے کوئی سروکار نہیں انھیں ملکی نظام کے سیاسی یا حکمرانی پہلوؤں میں کسی معیار اور ضبط قائم رکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔

یا فصل کا حصہ پانے والے کے درمیان خاندانی شرافت کی ذمہ داری نبھانے کا ایک رشتہ ہوتا تھا۔ جو انھیں باندھے رہتا تھا۔ اسی طرح کا رشتہ اعلیٰ رہنماؤں اور عوام کے درمیان ہوتا تھا۔ جو ضرورت کے وقت تعظیم اور امید کی نظر سے ان کی طرف رُجوع کر سکتے تھے۔

ایسے ماحول میں جہاں زندگی بسر کرنے کا فن اور اصول قاعدے، قانون اور اخلاقی معیار کو محض فریب دینا ہو اس کا تعلق چاہے سیاست۔ بیوروکریسی۔ صنعت و حرفت یا کاروباری زندگی سے ہو۔ تو حیرانی کی کوئی بات نہیں کہ دفتری افسر بھی اس کھیل میں اپنا خاص پارٹ ادا کرتے ہیں اور یہ بات تو ماننا ہی پڑے گی کہ یہ کھیل ذلیل سے ذلیل تر ہوتے جا رہے ہیں۔

اس کا اب کہیں وجود نہیں رہا۔ اب یہ شرافت کا رشتہ قیمت مانگتا ہے۔ مجھے غلط نہ سمجھئے۔ پُرانے نظام کو بدلنا ہی تھا۔ لیکن اس کا مطلب یہ تو نہیں تھا کہ نئے نظام کی تشکیل کرتے

وقت ہم ان اعلیٰ اقدار کو بھی بے دردی سے نظرانداز کردیتے جو نئے صنعتی انقلاب، جدیدیت، سیکولرازم وغیرہ کا مناسب حصہ بن سکتی تھیں۔

آپ شاید یہ کہیں کہ ہر چیز ختم ہوگئی ہے جس کی کوئی تلافی نہیں ہوسکتی۔ میرا جواب ہے، نہ صاحب ایسا نہیں ہے لیکن شرط یہ ہے کہ ہم یہ پکا فیصلہ کرلیں کہ ہم ملکی نظام کو قانون اور طے شدہ قاعدوں کے مطابق چلائیں گے۔ اور انسانوں کو ان کی ذاتی اہلیت اور ان کے کاموں کے واقعیت پسندانہ تجزیہ پر پرکھیں گے۔ اور ان معیار کو توڑیں گے نہیں۔ پروانۂ تقرری (آموز کاری کا زمانہ) ترقی۔ تبادلہ۔ سزا اور جزا سب انصاف پسندانہ اور عیاں ہونی چاہئیں اور یہ انصاف اور کھلے بندوں عمل ہر وقت نظر بھی آئے اور زیرِ عمل بھی رہے۔ ہمیں یہ بات یاد رہنی چاہیے کہ سزا وہی انصاف پسندانہ ہوتی ہے جسے سماج بھی درست سمجھے۔ لیکن اگر سزا طرفدارانہ ہو۔ اور افسر کی اہلیت کا جائزہ صحیح معیار سے ہٹ کر کیا گیا ہو۔ اور اس پر سیاست دانوں کی ذاتی پسند کا رنگ چڑھا ہوا ہو۔ تو ہم کارآمد افسر شاہی کا نظام قائم نہیں کرسکتے۔ ہم اسے توڑ کر رکھ دیں گے۔ جیسا کہ ہم نے کر دکھایا ہے۔ ان حالات میں افسروں میں سے جو چالاک ہوگا وہ "وفادار" کا روپ دھارن کرلے گا۔ لیکن ہوگا وہ ضمیر فروش، یہ بھی لازم ہے کہ ہم فیصلہ کرتے

ہر چیز ختم ہوگئی ہے جس کی کوئی تلافی نہیں ہوسکتی میرا جواب ہے نہ صاحب ایسا نہیں ہے۔ لیکن شرط یہ ہے کہ ہم یہ پکا فیصلہ کرلیں کہ ہم ملکی نظام کو قانون اور طے شدہ قاعدوں کے مطابق چلائیں گے۔ اور انسانوں کو ان کی ذاتی اہلیت اور ان کے کاموں کے واقعیت پسندانہ تجزیہ پر پرکھیں گے۔ اور ان معیار کو توڑیں گے نہیں۔

کے ضمن میں ایسی واضح پالیسیاں بنائیں جو بیرونی اثر و نفوذ کے ہاتھوں چکنا چور نہ ہو پائیں۔ اہم ترین بات یہ ہے کہ ہم ایسا ماحول پیدا کریں اور اس کو برقرار رکھیں۔ جس میں اپنے خوابوں کے ہندوستان کی تعمیر میں سیاست دان اور افسران دونوں برابر کے حصے دار ہوں۔ تاریخ اس امر کی گواہ ہے کہ جو قوم مدبرانہ تفکر کھو دیتی ہے اس کی تہذیبیں اور اس کے سماج مٹ جاتے ہیں۔

طرفدارانہ افسرشاہی

آخر میں طرفدارانہ افسرشاہی کو لیجیے۔

ہمیں صلاحیتوں، صحیح جائزوں، ایمانداری اور اپنے عوام اور ملک کی بہتری اور بہبود کا طرف دار ہونا چاہیے۔

ہندوستان میں کوئی بھی ایسا انسان نہیں جسے ایک یا دوسرے معاملے میں خاص لگاؤ نہ ہو۔ ہم ایک یا دوسرے چیز سے وابستہ ہیں۔ افسوس اس بات کا ہے کہ یہ مخصوص لگاؤ خود سے ہے۔ اپنے خاندان سے ہے۔ اپنے قبیلے سے ہے۔ مذہب۔ ذات پات یا علاقے وغیرہ سے ہے۔ ان طرفداریوں کی بنیاد پر ہم ہندوستان کی قومی یکجہتی کی تشکیل نہیں کرسکتے۔ ہمیں صلاحیتوں، صحیح جائزوں، ایمانداری اور اپنے عوام اور ملک کی بہتری اور بہبود کا طرف دار ہونا چاہیے۔ اور ہر انسان کو چاہیے وہ سیاست دان ہو، افسر، صنعت کار، تاجر، کار خانہ دار، ماہرِ تعلیم، اخبار نویس، مصنف یا فن کار۔ اسے بھی طرفدارانہ اپنانی ہوگی۔ اور اس کا اپنے اعمال و کردار میں واضح اظہار کرنا ہوگا۔

ہمارے افسرانہ نظام میں جو لوگ شامل ہوتے ہیں۔ میں ان کی صلاحیتوں کا بھی کچھ ذکر کرنا چاہوں گا۔ مجھے افسرانہ نظام کے مختلف شعبوں میں ان مرد و زن کا گہرا علم ہے۔ وہ اسی قدر صلاحیت کے مالک ہیں جس قدر کہ ہمیں توقع ہونا چاہیے۔ لیکن ان کی تربیت محض رسمی اور غیر موزوں ہوتی ہے۔ چند برس گزرنے کے بعد ان کی بلند نظری جس کو لیے ہوتے انھوں نے ملازمت اختیار کی تھی بے حد کمزور ہو جاتی ہے۔ انسانوں کی اس قدر بربادی ایک المیہ ہے۔

میرا یقین ہے کہ ابھی سب کچھ تلف نہیں ہوا۔ اور اگر سیاسی عزم سے کام لیا گیا تو سب کچھ درست ہوسکتا ہے۔ اس لیے مجھے اُمید کامل ہے کہ میں نے مرض کی جو تشخیص کی ہے اسے قبول کرلیا جائے گا۔ اور یہ تشخیص میرے لمبے تجربے اور گہرے مشاہدوں پر قائم ہے۔ کہ کیسے ہم نے غلط سمجھ لیا یا عمل کے بے حقیقت مفروضوں کی وجہ سے اپنے ملکی نظام اور اداروں میں سخت قسم کی کشمکش، ربائی، گھٹن اور رخنے پیدا ہونے دیے۔

بیوروکریٹ کو پبلک سیکٹر کے کارخانوں کے انتظام یا ان کے فیصلوں کے بارے میں دخل انداز نہیں ہونا چاہیے میں تو ایک قدم اور آگے جانا چاہوں گا اور وہ یہ کہ پبلک سیکٹر کے ان کارخانوں کو وزارتی اور افسران کی گرفت سے کلی طور پر آزاد کردینا چاہیے۔

بیوروکریٹ اور ٹیکنوکریٹ

جہاں تک بیوروکریٹ اور ٹیکنوکریٹ کے درمیان نزاع کا سوال ہے۔ یہ قیل و قال بیجا ہے۔ میرے خیال میں ٹیکنوکریٹ کو اگر بہتر نہیں تو اسی قدر تنخواہ ملنی چاہیے جس قدر کہ بیوروکریٹ کو ملتی ہے۔

میرا یہ بھی یقین ہے کہ بیوروکریٹ کو پبلک

(باقی صفحہ ۳۵ پر)

پی۔ ایس۔ اپّو

بیوروکریٹس گراوٹ میں اور بھی آگے

آج کی بیشتر خرابیوں کے لیے بیوروکریسی کو قصوروار ٹھہراتے ہوئے مسٹر اپّو ملک کو درپیش مسائل کو سلجھانے سے متعلق اس کی پیشہ ورانہ قابلیت اور ایمانداری پر حرف گیری کرتے ہیں۔ اُن کی رائے ہے کہ پلان کے پراجیکٹوں کی تعمیل میں بڑھتی ہوئی گراوٹ اور پھیلی ہوئی بدعنوانیوں کی زیادہ تر وجہ یہ ہے کہ بڑے بڑے سرکاری افسران اپنے سیاسی آقاؤں کی نسبت زیادہ گندے ہیں۔

ہر دور میں تمام لوگوں، خصوصاً عمر رسیدہ لوگوں کا یہ رجحان رہا ہے کہ وہ زمانہ حال کو کوستے آئے ہیں اور ماضی کی "عظمتوں" کی کھلے دل سے تعریف کرتے آئے ہیں۔ اس رجحان کا نمایاں طور پر اظہار سبکدوش بیوروکریٹوں (اعلیٰ سرکاری افسران) جیسے قدامت پسند گروپ میں زیادہ ہوتا ہے۔ چنانچہ اس سلسلے میں منصفانہ اور دانشمندانہ رخ اختیار کرنے کے باوجود عین ممکن ہے کہ بیوروکریسی (افسر شاہی) کے طرز عمل کے بارے میں میرا جائزہ زیادہ شدید معلوم ہو۔ لیکن تاریخ شاہد ہے کہ جب جب حالات واقعی بدتر ہوئے ہیں، معاشرے نمایاں طور پر زوال و تنزل کے ادوار سے گذرے ہیں۔ اس میں کلام نہیں کہ ہم ایک ایسے ہی تنزلی دور سے گذر رہے ہیں۔ ہمارے تمام ادارے انحطاط پذیر ہوگئے ہیں۔ ماضی کی اقدار ٹوٹ گئی ہیں۔ مملکتی ڈھانچے میں زیادہ بگاڑ آ رہا ہے۔ لاچاری، ناامیدی اور مایوسی کا احساس پھیلتا جا رہا ہے۔ ان حالات میں یہ تعجب نہیں کہ بیوروکریسی کی حالت بھی بگڑ گئی ہے۔

> **کسی بھی دوسرے بڑے جمہوری ملک میں سرکاری ملازموں کو اتنا قانونی تحفظ حاصل نہیں ہے جتنا کہ انھیں بھارت میں حاصل ہے۔ یہ بلاشبہ ایک بالکل دوسری بات ہے کہ تمام مضبوط ضمانتوں کے باوجود ہماری بیوروکریسی اُن اُمیدوں کو پورا کرنے میں ناکام رہی ہے جو آئین کے بانی بزرگوں نے جگائی تھیں۔**

جمہوری ڈھانچہ کچھ اس طرح سے بنا ہے کہ اس میں مختلف ادوار میں مختلف سیاسی پارٹیاں برسر اقتدار آتی ہیں۔ وزراء جو مختصر اوقات کے لیے عہدہ سنبھالتے ہیں اکثر ضروری تجربہ و مہارت سے عاری ہوتے ہیں۔ لہٰذا پیشہ ورانہ طور پر قابل اور سیاسی طور پر غیر جانبدار سیول سروس ایک جمہوری حکومت کا کاروبار مستعدی کے ساتھ اور کسی رکاوٹ کے بغیر چلانے کے لیے نہایت ضروری ہے۔ بھارتی آئین کے بانی بزرگ ایک ایسی سیول سروس کی اعلیٰ ضرورت سے شدید طور پر آگاہ ہیں۔ اسی آگاہی کے باعث سرکاری ملازموں کی بھرتی اور ملازمت کی شرائط اور آئین کے آرٹیکل ۳-۱ کے تحت ضمانتوں سے متعلقہ معاملات میں پبلک سروس کمیشن کو اہم ترین رول سونپا گیا۔

کسی بھی دوسرے بڑے جمہوری ملک میں سرکاری ملازموں کو اتنا قانونی تحفظ حاصل نہیں ہے جتنا کہ انھیں بھارت میں حاصل ہے۔ یہ بلاشبہ ایک بالکل دوسری بات ہے کہ تمام مضبوط ضمانتوں کے باوجود ہماری بیوروکریسی اُن اُمیدوں کو پورا کرنے میں ناکام رہی ہے جو آئین کے بانی بزرگوں نے جگائی تھیں۔

> **زمانہ مابعد آزادی میں بھارتی بیوروکریسی کی کارکردگی کا وسیع جائزہ لیا جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ اس کی پیشہ ورانہ قابلیت کا معیار پست ہے اس کے اعلیٰ افسران سیاسی غیر جانبداری سے کورے ہیں اور کہ تمام سطحوں پر یہ بدعنوانیوں سے ماؤف ہو چکے ہیں۔**

زمانہ مابعد آزادی میں بھارتی بیوروکریسی کی کارکردگی کا وسیع جائزہ لیا جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ اس کی پیشہ ورانہ قابلیت کا معیار پست ہے۔ اس کے اعلیٰ افسران سیاسی غیر جانبداری سے کورے ہیں ــــ تمام سطحوں پر یہ بدعنوانیوں سے حادث ہو چکے ہیں۔

پیشہ ورانہ مہارت کی کمی کا اظہار اس امر سے ہوتا ہے کہ اعلیٰ سرکاری افسران میں صاف بیانی اور بے خوفی سے مشورہ نہ دینے کا رُجحان بڑھتا جا رہا ہے، جن مسائل نے ملک کو پریشان کر رکھا ہے وہ اُنھیں قابلیت سے سُلجھا نہیں پا رہے، جو مشکل سوالات ہیں درپیش ہیں وہ اُنھیں سُوجھ بُوجھ سے نپٹانے اور نئے نئے سجھاؤ دینے کی اہلیت نہیں رکھتے۔

پیشہ ورانہ قابلیت کا پست معیار

اعلیٰ درجے کی پیشہ ورانہ قابلیت کسی بھی صورت میں ایک جدید بیوروکریسی کی غالب خصوصیت ہونا چاہیئے۔ آج بھارتی بیوروکریسی کی مہلک ناکامی اس کی پیشہ ورانہ مہارت کی پست معیاری ہے۔ پیشہ ورانہ مہارت کی کمی کا اظہار اس امر سے ہوتا ہے کہ اعلیٰ سرکاری افسران میں صاف بیانی اور بے خوفی سے مشورہ نہ دینے کا رُجحان بڑھتا جا رہا ہے، جن مسائل نے ملک کو پریشان کر رکھا ہے وہ اُنھیں قابلیت سُلجھا نہیں پایا ہے۔ جو مشکل سوالات ہیں درپیش ہیں، وہ اُنھیں سُوجھ بُوجھ سے نپٹانے اور نئے نئے سجھاؤ دینے کی اہلیت نہیں رکھتے۔ وہ جدید ترقیوں سے باخبر ہونے اور نئی مہارتوں کو حاصل کرنے میں ناکام ہو رہے ہیں۔ پراجیکٹوں کی تیاری اور تعمیل میں لاپرواہی برت رہے ہیں۔ پراجیکٹوں پر آنے والی لاگت کا اندازہ نہیں لگا سکتے۔ کاہل الوجود ہیں اور ان سب سے زیادہ بڑی بات یہ ہے کہ معمول کے نظم و نسق کے بارے میں بھی اُن میں ناقابلِ معافی غفلت پائی جاتی ہے۔ ایک مختصر مضمون میں ان تمام ناکامیوں پر بحث کرنا ممکن نہیں ہے۔ میں ان میں سے بعض کا ذکر کروں گا۔

اگرچہ ایک پارلیمانی جمہوریت میں بلاشبہ ایک وزیر کا اور اہم معاملات میں مجلس وزرا کا یہ خصوصی حق ہے کہ وہ کوئی قطعی فیصلہ کرے تاہم اعلیٰ سرکاری افسران پالیسی کی تشکیل میں اہم رول ادا کرتے ہیں۔ بعض امور میں وزیر پوری طور پر پالیسی بناتے وقت اپنی رائے دے سکتا ہے اور اس وسیع تر ڈھانچے کو سامنے رکھ کر پالیسی بنائی ہوتی ہے لیکن زیادہ تر ہوتا یہی ہے کہ وزیر نے اس سلسلے میں اپنے ذہن سے کام لینے کی کوشش نہیں کی۔ لیکن وہ زیادہ تر سوال کے بارے میں اپنی رائے نہیں دے سکتا، اگرچہ یہ بھی حقیقت ہے کہ کسی خاص معاملے کے بارے میں اس کے اپنے خیالات ایک خاص ذہن کے ساتھ ہوں گے جسے عصبیت کا نام بھی دیا جا سکتا ہے۔ تمام معاملات میں سرکاری افسران کا یہ واضح فرض ہے کہ وہ ہر تجویز کے محاسن کا تفصیلی جائزہ لیں اور بے خوفی سے اپنی رائے کا اظہار کریں۔ تین دہے پہلے سرکاری افسران کی بھاری تعداد اس آدرش پر پوری اتری تھی لیکن آج سرکاری افسران کی بھاری تعداد چاپلوسوں کی طرح عمل کرتی ہے اور وہ وزرا اور اُن کے ساتھیوں کو خوش کرنے کی فکر میں رہتی ہے۔ یہ ایک نہایت افسوسناک امر ہے کیوں کہ وزرا کی قابلیت میں تیزی سے کمی آ جانے سے آج ماضی کی نسبت اور بھی زیادہ ضروری ہو گیا ہے کہ وزرا کو صاف دلانہ اور صحیح مشورہ دیا جائے۔

تمام معاملات میں سرکاری افسران کا یہ واضح فرض ہے کہ وہ ہر تجویز کے محاسن کا تفصیلی جائزہ لیں اور بے خوفی سے اپنی رائے کا اظہار کریں۔ تین دہے پہلے سرکاری افسران کی بھاری تعداد اس آدرش پر پوری اُتری تھی۔ لیکن آج سرکاری افسران کی بھاری تعداد چاپلوسوں کی طرح عمل کرتی ہے اور وہ وزراء اور اُن کے ساتھیوں کو خوش کرنے کی فکر میں رہتی ہے۔

پست کارکردگی کے لیے بیوروکریسی ذمہ دار

ایک دوسرا اہم شعبہ جہاں بیوروکریسی کی کارکردگی نمایاں طور پر پست ہے وہ ہے ترقیاتی پروگراموں اور پراجیکٹوں کی تشکیل اور تعمیل کا شعبہ۔ اسکیمیں اکثر ملکی سطح پر خصوصاً زراعت، دیہی ترقیات اور سماجی سروسوں جیسے سیکٹروں میں اس امر کا خیال کئے بغیر مرتب کی جاتی ہیں کہ کیا وہ قابلِ عمل ہیں، اُن کی جبلی قدر و قیمت کیا ہے اور کیا وہ خصوصی علاقوں کے لیے موزوں ہیں اور اُن سے سماجی مطابقت رکھتی ہیں۔ بارہا معمولی سی انگیخت پر بھی ان ملکی پروگراموں میں ترمیم کی جاتی ہے اور اُنھیں ترک کیا جاتا ہے جس کا نتیجہ غیر یقینی حالت یا گڑبڑ میں نکلتا ہے اور جہاں تک ریاستوں کا تعلق ہے وہاں تو پراجیکٹ اکثر نہایت سُرعت کے ساتھ تقریباً مشینی طور پر مرتب کئے جاتے ہیں اور اُن سے متعلقہ تکنیکی، مالی اور انتظامی پہلوؤں کی جانب کوئی توجہ نہیں دی جاتی۔ ہچکچاہٹ اور خزانہ و منصوبہ بندی کے محکموں کی طرف سے طویل پڑتال کے باعث تاخیر ہو جاتی ہے لیکن پراجیکٹوں کے مشمولات

میں کوئی بہتری نہیں ہوتی۔ زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ جونہی منظوری دی جاتی ہے تو وہ سرعت غائب ہو جاتی ہے جو ترتیب و تشکیل کے مرحلے میں دکھائی جاتی ہے۔ جہاں تک تمام پراجیکٹوں کا تعلق ہے، خواہ وہ مرکز کے ہوں یا ریاستوں کے، تعمیل کے مرحلے میں تمام تر نااہلیت کے باعث اُن کی تکمیل میں ناگزیر طور پر غیر ضروری تاخیر ہوتی ہے۔ کام کا معیار ہلکا ہوتا ہے اور لاگت میں بھاری اضافہ ہو جاتا ہے۔ یہ بھارتی اقتصادی منصوبہ بندی کی ستم ظریفی ہے کہ گذشتہ برسوں میں منصوبہ بندی کی تکنیک زیادہ سے زیادہ جدید ہو گئی ہیں تاہم اُن کی تعمیل کے معیار میں بھاری گراوٹ آگئی ہے۔ اس الزام کے لیے زیادہ تر بیوروکریسی لازماً ذمہ دار ہے۔

> یہ بھارتی اقتصادی منصوبہ بندی کی ستم ظریفی ہے کہ گذشتہ برسوں میں منصوبہ بندی کی تکنیکیں زیادہ سے زیادہ جدید ہو گئی ہیں تاہم اُن کی تعمیل کے معیار میں گراوٹ آگئی ہے۔ اِس الزام کے لیے زیادہ تر بیوروکریسی لازماً ذمہ دار ہے۔

بھارتی بیوروکریسی کی ایک قابلِ ذکر کمزوری یہ ہے کہ وہ انتظام و انصرام کی جدید تکنیکوں سے بہرہ ور ہونے، نئی مہارتیں حاصل کرنے اور اپنی پیشہ ورانہ اہلیت کو تقویت دینے میں ناکام ثابت ہوئی ہے۔ اعلیٰ سرکاری افسران کے بارے میں ایک اور مساوی طور پر ناخوشگوار بات یہ ہے کہ وہ لاگت آشنا نہیں ہیں۔ بلاشبہ ایسے اعلیٰ افسران بہت کم ہیں جو سُود کی مرکب شرح کی اہمیت کو جانتے ہیں اور محسوس کرتے ہیں کہ آج کے روپے اور دو برس بعد کے روپے میں بہت بھاری فرق ہے۔ چونکہ بیوروکریٹ لاگت آشنا نہیں ہیں اس لیے وہ جزوی طور پر فیصلوں کو ٹالنے کا رُجحان رکھتے ہیں۔ اعلےٰ افسران بھاری تعداد میں اُس دن کو کوستے ہیں جب وہ کوئی فیصلہ کرنے کے لیے مجبور ہو جاتے ہیں۔ جب فیصلے کو مزید ملتوی کرنا ممکن نہیں ہوتا تب وہ فیصلہ سازی کے عمل میں اپنے متعدد ساتھیوں کو لپیٹ کر خطرے کے خیال کو کم از کم کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

> اعلیٰ سرکاری افسران کے بارے میں ایک اور مساوی طور پر ناخوشگوار بات یہ ہے کہ وہ لاگت آشنا نہیں ہیں۔ بلاشبہ ایسے اعلیٰ افسران بہت کم ہیں جو سُود کی مرکب شرح کی اہمیت کو جانتے ہیں اور محسوس کرتے ہیں کہ آج کے روپے اور دو برس بعد کے روپے میں بہت بھاری فرق ہے۔

> اعلیٰ سرکاری افسران بھاری تعداد میں اُس دن کو کوستے ہیں جب وہ کوئی فیصلہ کرنے کے لیے مجبور ہو جاتے ہیں۔ جب فیصلے کو مزید ملتوی کرنا ممکن نہیں ہوتا تب وہ فیصلہ سازی کے عمل میں اپنے متعدد ساتھیوں کو لپیٹ کر خطرے کے خیال کو کم از کم کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

سنگین ترین ناکامی: بیوروکریسی کے خلاف سنگین ترین الزام یہ ہے کہ وہ اپنے روایتی انضباطی امور کو انجام دینے میں بھی ناکام ہو گئی ہے۔ ملک کے بیشتر حصوں، خصوصاً وادی گنگا میں امن و قانون کا ڈھانچہ ہی ٹوٹ گیا ہے۔ ان علاقوں میں عوام کا جان و مال محفوظ نہیں رہا۔ پولیس جس کا ابتدائی فرض جان و مال کا تحفظ کرنا ہے جبر و استبداد کا ذریعہ بن گئی ہے۔ بعض علاقوں میں نظم و نسق کی مشینری مفلوج ہو گئی ہے اور چند مقامات پر تو اس کے ٹوٹنے کی نوبت آگئی ہے۔ کوئی بھی شخص اچانک ایک سرکاری دفتر میں جا کر دیکھ سکتا ہے کہ ضوابط کو یکسر نظر انداز کیا جا رہا ہے۔ اب ایسا مرحلہ آگیا ہے کہ جب کوئی بھی شہری رشوت دیئے بغیر یا متعلقہ افسر پر کافی دباؤ ڈلوائے بغیر کوئی کام نہیں کرا سکتا۔ ٹیلکس اور تار کے سسٹموں اور ریلوے کی حالت دیکھ کر پتہ چلتا ہے کہ

مرکزی حکومت کے تحت یہ ادارے بھی اسی موذی مرض کا شکار ہو گئے ہیں۔ حکومت کے ابتدائی فرائض معمولی سی مستعدی اور ایمانداری سے بھی انجام نہیں دئے جا رہے، اور اس کی اولین ذمہ داری لازمی طور پر بیوروکریسی کے کندھوں پر ہے۔

اگرچہ بیوروکریسی زیادہ تر سیاسی لحاظ سے متواتر غیر جانبدار ہے تاہم اعلیٰ سرکاری افسران کی ایک بڑی تعداد نے خود کو انفرادی لیڈروں کے خاص خاص سیاسی گروپوں سے وابستہ کر لیا ہے۔ ایسے معاملے بھی ہوئے ہیں جن میں اُنھوں نے انتخابات میں سرگرمی سے اپنے سرپرستوں کی امداد کی۔

اور بلاشبہ ملک بھر میں تمام سطحوں پر بیوروکریسی غیر جانبداری کے اس اعلیٰ معیار کو برقرار رکھنے میں ناکام رہی ہے، جس کی اُس سے توقع کی گئی تھی۔ چند سرکاری افسران قانون کی حکومت کو سنبھالا دینے یا اپنے ضمیر کی آواز کے مطابق کام کرنے کے لیے سخت جدوجہد کرتے ہیں۔ اپنے سیاسی آقاؤں کے معمولی سے اشارے پر بھی سرکاری افسران کی بھاری اکثریت کسی بھی قانون، قاعدے یا تسلیم شدہ اصولوں کی خلاف ورزی کرنے کے لیے آمادہ ہو جاتی ہے۔

بدعنوان اعلیٰ افسران

ایسا کوئی بھی وقت نہیں تھا جب بیوروکریسی بدعنوانیوں سے قطعاً پاک رہی ہو۔ لیکن کوئی تیس برس پہلے اعلیٰ سرکاری افسران میں بدعنوان اشخاص کی تعداد بہت ہی کم تھی، ان کی بھاری اکثریت نے ایمانداری کا اعلیٰ معیار برقرار رکھا ہوا تھا۔ یہ بیوروکریسی اپنی چادر کے اندر پاؤں پسارتی تھی اور سرکاری مال کا ناجائز استعمال کرنے سے ڈرتی تھی۔ گذشتہ دس یا پندرہ برس کے اندر حالات بدل گئے ہیں۔ آج سرکاری افسران کی بڑی تعداد رشوت خور بن گئی ہے اور اُس سے بھی بڑی تعداد چھوٹی چھوٹی بدعنوانیوں کا شکار ہو گئی ہے۔ سرکاری ٹرانسپورٹ کا ناجائز استعمال تقریباً ہمہ گیر ہو گیا ہے۔ اخلاقی اصول اس حد تک بدل گئے ہیں کہ سرکاری افسران کی تھوڑی سی تعداد جو ایمانداری کا علم تھامے ہوئے ہے، اپنی آمدنی کے اندر ہی گذر کرتی ہے اور اپنی ہی کاروں میں دفتر جاتی ہے اُسے حقارت سے دیکھا جاتا ہے اور اُسے بے وقوف تصور کیا جاتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ رشوت خوری آج اُسی طرح بڑے پیمانے پر پھیل گئی ہے جس طرح وہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے ابتدائی دنوں میں پھیلی ہوئی تھی۔

منظر کا مختصر جائزہ لینے کے بعد کوئی بھی شخص یہ ناگزیر نتیجہ اخذ کر سکتا ہے کہ بھارت میں بیوروکریسی پیشہ ورانہ اہلیت، سیاسی غیر جانبداری اور ایمانداری کے اُس معیار پر جس کی توقع ایک عظیم جمہوریت کی مستقل سروسز سے کی جاتی ہے، پورا اُترنے میں ناکام رہی ہے۔ افسران کی طرف سے گذشتہ چند برسوں کے دوران جو بیشتر غلط پالیسیاں بے اعتنائی سے عمل میں لائی گئی ہیں ان کے نتیجے میں بیوروکریسی میں خصوصاً اعلیٰ افسران میں کمزوری اور گراوٹ آئی ہے۔ آج اعلیٰ سرکاری افسران شاذ ہی کارکردگی سے ترقی پاتے ہیں۔ چاپلوسی جن میں اکثر قابلیت اور ایمانداری کا فقدان ہوتا ہے۔ لیکن جو بلا شک کے ضمیر اور لچکدار ریڑھ کی ہڈی کے مالک ہیں کلیدی عہدوں پر فائز کیے جاتے ہیں۔ بعض اوقات قابل، ایماندار اور عقیدت مند سرکاری افسروں کو قصداً ایسے عہدوں سے باہر رکھا جاتا ہے۔ کبھی کبھی تو ایماندار افسران کو بار بار کے تبادلوں اور دیگر طریقوں سے پریشان کیا جاتا ہے۔

ان باتوں کے نتیجے میں ہونے والی پست ہمتی اس قدر عظیم ہے کہ آج سول سروس سرکار کا پالیسیوں

> بیوروکریسی کے خلاف سنگین ترین الزام یہ ہے کہ وہ اپنے روایتی انضباطی امور کو انجام دینے میں بھی ناکام ہو گئی ہے۔ ملک کے بیشتر حصوں، خصوصاً وادیٔ گنگا میں امن و قانون کا ڈھانچہ ہی ٹوٹ گیا ہے۔ ان علاقوں میں عوام کا جان و مال محفوظ نہیں رہا۔

> چند سرکاری افسران قانون کی حکومت کو سنبھالا دینے یا اپنے ضمیر کی آواز کے مطابق کام کرنے کے لیے سخت جدوجہد کرتے ہیں۔ اپنے سیاسی آقاؤں کے معمولی سے اشارے پر بھی سرکاری افسران کی بھاری اکثریت کسی بھی قانون، قاعدے یا تسلیم شدہ اصولوں کی خلاف ورزی کرنے کے لیے آمادہ ہو جاتی ہے۔

> اخلاقی اصول اس حد تک بدل گئے ہیں کہ سرکاری افسران کی جو تھوڑی سی تعداد ایمانداری کا علم تھامے ہوئے ہے، اپنی آمدنی کے اندر ہی گذر کرتی ہے اور اپنی ہی کاروں میں دفتر جاتی ہے اُسے حقارت سے دیکھا جاتا ہے اور اُسے بے وقوف تصور کیا جاتا ہے۔

کی تعمیل کرنے یا معمول کا نظم و نسق انجام دینے کا بھی دم نہیں بھرتی۔ چنانچہ آج کے عوام میں بھارتی بیوروکریسی کی ایک یکسر پست ہمت، کمزور، نااہل، کاہل اور بدعنوان ادارہ کے طور پر جو شبیہ بن گئی ہے وہ کسی بھی طرح غیر مناسب نہیں ہے۔

بیوروکریٹ کیا کہتے ہیں

بیشتر سرکاری افسران کہتے ہیں کہ وہ بے قصور ہیں اور کہ اس افسوسناک صورتِ حالات کے لیے گندے سیاستداں ذمہ دار ہیں۔ یہ واقعی ایک ایسا معاملہ ہے جس میں ایک دوسرے کو قصوروار ٹھہراتا ہے۔ بلاشبہ بھارتی سیاست دانوں کو کئی باتوں پر قصوروار ٹھہرایا جانا ضروری ہے۔ لیکن بیوروکریسی میں تیزی سے جو گراوٹ آئی ہے اس کے لیے انھیں خصوصی طور پر یا ابتدائی طور پر بھی قصوروار ٹھہرانا نامناسب اور غیر منصفانہ ہے۔ قصور کے لیے زیادہ تر خود سرکاری افسران ذمہ دار ہیں۔ یہ ایک ناخوشگوار حقیقت ہے کہ بیشتر معاملوں میں سرکاری افسران نے سول سروس کو تباہ کرنے میں سرگرمی سے اعانت کی ہے اور اس تباہی میں وہ محض خاموش تماشائی یا نارضامند ساتھی نہیں رہے ہیں۔

میں نے بھارتی بیوروکریسی کے بارے میں بہت ناخوشگوار باتیں کہی ہیں لیکن میں اس کے ساتھ ہی یہ کہنے میں پیچھے نہیں رہوں گا کہ بیوروکریسی ایک خود مختار ادارہ نہیں ہے۔ وہ سرکاری تنظیم کا ایک جزو لاینفک ہے۔ اور کسی وہ معاشرے کے تمام حصوں کے نمائندوں پر مشتمل ہے۔ جب سرکاری تنظیم بھی پستی اور معاشرے میں بدنظمی آجائے جیسا کہ آج بھارت میں ہے، تو بیوروکریسی میں گراوٹ آجانا بھی لازمی ہے۔ لہذا بیوروکریسی کی اصلاح کرنے سے متعلق مساعی تب تک بیکار ثابت ہونگی جب تک کہ ان موذی امراض کو دور نہ کیا جائے۔ جن سے سرکاری تنظیم مبتلا ہے۔ اس سلسلے میں ضروری ہے کہ سیاست داں اپنے عمل کے لیے جوابدہ ہوں۔ اس سلسلے میں سوجھ بوجھ کے ساتھ مشترکہ کوششوں کی ضرورت ہے۔ سرکاری ڈھانچے کے درست ہونے پر بیوروکریسی کو درست کرنا مشکل نہیں ہوگا۔ آخرکار اس کی صفوں میں آج بھی بعض اشخاص نمایاں قابلیت اور ایمانداری کے مالک ہیں۔ اور ہر برس نئی نسل کے بعض نہایت ذہین مرد اور خواتین اس کی صفوں میں شامل ہوتی ہیں۔ پبلک سروس سے متعلق درست پالیسیاں اختیار کر کے اور اس کا حوصلہ بحال کر کے بیوروکریسی کو ایک ایسا موزوں ذریعہ بنانا ممکن ہو جائے گا۔ جس سے وہ اپنے کاموں کو بخوبی انجام دے سکیگی۔

★

آج اعلیٰ سرکاری افسران شاذ ہی کارکردگی سے ترقی پاتے ہیں۔ چاپلوسی جن میں اکثر قابلیت اور ایمانداری کا فقدان ہوتا ہے لیکن جو پلاسٹک کے ضمیر اور لچکدار ریڑھ کی ہڈی کے مالک ہیں کلیدی عہدوں پر فائز کیے جاتے ہیں۔ بعض اوقات قابل، ایماندار اور صاحب نظر سرکاری افسروں کو قصداً ایسے عہدوں سے باہر رکھا جاتا ہے۔

قصور کے لیے زیادہ تر خود سرکاری افسران ذمہ دار ہیں۔ یہ ایک ناخوشگوار حقیقت ہے کہ بیشتر معاملوں میں سرکاری افسران نے سول سروس کو تباہ کرنے میں سرگرمی سے اعانت کی ہے اور اس تباہی میں وہ محض خاموش تماشائی یا نارضامند ساتھی نہیں رہے ہیں۔

منظر کا مختصر جائزہ لینے کے بعد کوئی بھی شخص یہ ناگزیر نتیجہ اخذ کر سکتا ہے کہ بھارت میں بیوروکریسی پیشہ ورانہ اہلیت، سیاسی غیر جانب داری اور ایمانداری کے اس معیار پر جس کی توقع ایک عظیم جمہوریت کی مستقل سروسز سے کی جاتی ہے، پورا اترنے میں ناکام رہی ہے۔

مالکم ایس آدی سیشیہ

جی ہاں منصوبہ ساز بھی گندہ کھیل کھیلتے ہیں

منصوبہ بندی کے ماہر شری آدی سیشیہ نے اپنے اس بے لاگ تنقیدی مضمون میں بتایا ہے کہ منصوبہ ساز کیا کھیل کھیلتے ہیں، پہلے تو منصوبے کی مدت کے دوران شرح ترقی متعین کرنے میں، دوسرے منصوبے کے اس حصے کی جسے "کورسیکٹر" (Core Sector) کہتے ہیں، نشاندہی کرنے میں اور تیسرے غریبی کو کم کرنے کے معاملے میں کیوں کہ وہ جان بوجھ کر یہ واضح نہیں کرتے کہ اس کے لیے وسائل کو ازسرنو کس طرح تقسیم کرنا پڑے گا جس سے غریب آدمی کی آمدنی میں لگاتار اضافہ ہو۔

میں شروع میں ہی اپنی اصطلاحات کی وضاحت کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ لفظ گندگی کے استعمال سے ذہن جسمانی غلاظت کی طرف جاتا ہے۔ لفظ گندہ عام طور پر ایک ایسے شخص کے لیے استعمال کیا جاتا ہے جس کے جسم پر صحت و صفائی کا خیال نہ رکھنے کی وجہ سے گندگی کی پرت جم گئی ہو۔ میں اس اصطلاح کو ذومعنی سمجھتا ہوں کیوں کہ منصوبہ سازوں سے متعلق زیرِ نظر مضمون میں "گندگی" اور "گندہ" الفاظ اس سماجی عمل یا بے عملی کے تعلق سے استعمال کیے گئے ہیں جس کے نتیجے میں سماج کو مقررہ نشانوں کو حاصل کرنے میں مدد نہیں ملتی یا جس سے یہ نشانے مسخ ہوتے ہیں۔

گندگی۔ اس کے تین پہلو

گندہ ہے اُن طریقوں کا استعمال جن سے طے شدہ مقاصد کو حاصل کرنے میں مدد نہ ملتی ہو یا جن سے ان مقاصد کو زک پہونچتی ہو۔ مثال کے طور پر اگر ہم ایک سوشلسٹ جمہوری سماج کی تشکیل کا اعلان کرنے کے باوجود سماجی حالات کو جوں کا توں رکھنے پر قناعت کرلیں یا اگر ہم سماج کی ترقی کا منصوبہ ایک مرکزی نقطے سے بنائیں اور اس بات کا خیال نہ رکھیں کہ کسی علاقے کے لوگ کیا چاہتے ہیں یا کیا کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں تو یہ جمہوریت کے منافی ہوگا۔ لہٰذا "گندے لوگوں" کی اصطلاح میں جو گندگی ہے وہ بنیادی طور پر سماجی اعتبار سے ہے انفرادی اعتبار سے نہیں۔

ان "گندے لوگوں" کی "گندگی" کا ایک پہلو یہ ہے کہ ان کی سماجی یا سماج مخالف زندگی اور ان کے کاموں کی نوعیت کچھ ایسی ہوتی ہے کہ وہ خود بخود قائم رہتے ہیں اور ازخود بڑھتے رہتے ہیں۔

بڑے پیمانے پر پائی جانے والی غریبی کے مسئلے ہی کو لیجیے۔ اگر اس کو حل کرنے کے لیے کوئی ایسے طریقے اختیار کیے جاتے ہیں جو ریلیف مہیا کرنے تک محدود ہوں اور اس میں خرد برد کی گنجائش ہو تو ریلیف پروگرام نہ صرف سالوں بلکہ ایک منصوبے سے چل کر دوسرے منصوبے میں بھی جاری رہیں گے کیونکہ ان سے کسی کو کوئی نقصان تو پہونچتا نہیں ہے مگر ایک بھی شخص فی الواقع غریبی کی سطح سے اوپر نہیں اٹھ پائے گا۔ اسی طرح جب ملک کے کمیاب سرمایہ جاتی وسائل کو اجرت پیشہ لوگوں کے استعمال کا سامان تیار کرنے کے شعبے میں ترجیحی طور پر استعمال کرنے کے لیے کنٹرول کا طریقہ اختیار کیا جاتا ہے۔ تب اگر اس سرمائے کو سامانِ تعیش تیار کرنے کے لیے استعمال کیا جائے (جس کی مارکیٹ وسائل کے مالدار صارفین کے ہاتھوں میں مجتمع ہونے کی وجہ سے برابر بڑھتی ہے) تو اسی قسم

بڑے پیمانے پر پائی جانے والی غریبی کے مسئلے ہی کو لیجیے۔ اگر اس کو حل کرنے کے لیے کوئی ایسے طریقے، اختیار کیے جاتے ہیں جو ریلیف مہیا کرنے تک محدود ہوں اور اس میں خرد برد کی گنجائش ہو تو ریلیف پروگرام نہ صرف سالوں بلکہ ایک منصوبے سے چل کر دوسرے منصوبے میں بھی جاری رہیں گے کیونکہ ان سے کسی کو کوئی نقصان تو پہونچتا نہیں ہے مگر ایک بھی شخص فی الواقع غریبی کی سطح سے اوپر نہیں اٹھ پائے گا۔

کے غیر مزدوری سامان کی تیاری یا سروسوں کے لیے مزید لائسنسوں کا اجرا ایک از خود جاری رہنے اور بڑھنے والا عمل بن جاتا ہے۔

گندے لوگوں میں جمع ہونے والی اور تسلسل کے ساتھ ملنے والی گندگی کا ایک تیسرا پہلو یہ ہے کہ یہ گندے لوگ اپنی گندگی کی حمایت میں ظاہرہ یا غیر ظاہرہ طور پر اپنی ایک برادری بنانے کی کوشش کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ گندگی کو دوبارہ اکٹھا نہ ہونے دینے اور اس کو دور کرنے کے حامی افراد کے مقابلے میں ان کی گندگی کا سلسلہ چلتا رہے۔ "گندے لوگوں" کی یہ برادری اپنی کوتاہی و خوبی سے باخبر اور استوار برادری نہیں ہوتی۔ یہاں تک کہ اس کے ارکان ایک دوسرے کو جمع شدہ گندگی سے ہی پہچان سکتے ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ سماجی مقاصد کو مسخ کرنے یا ناکام بنانے کے معنوں میں گندگی جتنی زیادہ ہوتی ہے اتنا ہی بلند مرتبہ اُن کا گندگی کے نظامِ مراتب میں ہوتا ہے۔

> یہ گندے لوگ اپنی گندگی کی حمایت میں ظاہرہ یا غیر ظاہرہ طور پر اپنی ایک برادری بنانے کی کوشش کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ گندگی کو دوبارہ اکٹھا نہ ہونے دیں اور اس کو دور کرنے کے حامی افراد کے مقابلے میں ان کی گندگی کا سلسلہ چلتا رہے۔ "گندے لوگوں" کی یہ برادری اپنی کوتاہی و خوبی سے باخبر اور استوار برادری نہیں ہوتی۔ یہاں تک کہ اس کے ارکان ایک دوسرے کو جمع شدہ گندگی سے ہی پہچان سکتے ہیں حقیقت تو یہ ہے کہ سماجی مقاصد کو مسخ کرنے یا ناکام بنانے کے معنوں میں گندگی جتنی زیادہ ہوتی ہے اتنا ہی بلند مرتبہ ان کا گندگی کے نظامِ مراتب میں ہوتا ہے۔

یہ برادری وہی لوگ بناتے ہیں اور وہی اس کو مانتے ہیں جن کے اندر "گندگی" ہے اور جن کے اندر "گندگی" جمع ہوتی جا رہی ہے۔ اس برادری کے ارکان مل کر طرح طرح سے اپنی "گندگی" کی حمایت کرتے ہیں جب کہ وہ لوگ جن میں "گندگی" نہیں ہے ان کی مخالفت کرتے ہیں۔

> یہ برادری وہی لوگ بناتے ہیں اور وہی اس کو مانتے ہیں، جن کے اندر "گندگی" ہے اور جن کے اندر "گندگی" جمع ہوتی جا رہی ہے، اس برادری کے ارکان مل کر طرح طرح سے اپنی "گندگی" کی حمایت کرتے ہیں جب کہ وہ لوگ جن میں "گندگی" نہیں ہے ان کی مخالفت کرتے ہیں۔

اب یہاں ایک عجیب و غریب حقیقت یہ ہے کہ صاف ستھرے لوگ وہ ہیں جو غریب ہیں اور جن کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ یہ لوگ اس لیے صاف ستھرے نہیں ہیں کہ وہ "گندگی" کے خلاف ہیں (یہاں "گندگی" سے مراد سماجی مقاصد کو ناکام بنانے کے طریقوں سے ہے۔ جیسا کہ پہلے تشریح کی جا چکی ہے)۔ یہ لوگ اس لیے "گندگی" کے خلاف ہیں کہ انھیں "گندہ" بننے کے مواقع میسر نہیں ہیں۔ منصوبہ ساز کی حیثیت ایک ٹیکنیشین کی ہے۔ وہ بالعموم ایک ماہرِ اقتصادیات یا ماہرِ شماریات ہوتا ہے۔ وہ بنیادی طور پر اور پیشے کے اعتبار سے ایک "گندہ" آدمی ہوتا ہے کیوں کہ وہ سماجی مقاصد یا نشانوں کو توڑنے مروڑنے یا انھیں ناکام بنانے کو کارِ مفوضہ سمجھتا ہے اور اپنے طے شدہ مقاصد اور نشانوں کو حاصل کرنے کے طریقے تجویز کرتا ہے۔ یہاں میں یہ اور کہہ دوں کہ منصوبہ ساز ہونے کی حیثیت سے میں خود اپنا ذکر بھی بطور ایک "گندے" آدمی کے کر رہا ہوں۔ منصوبہ ساز کے "گندے کھیل" کی مزید وضاحت کے لیے ذیل میں تین مطالعے مثال کے طور پر پیش کر رہا ہوں۔

تین مطالعے:

ایک: شرحِ ترقی

معیشت کی شرحِ ترقی ہی کو لیجیے جس پر دیگر بہت سے مقاصد کے حصول کا دار و مدار ہے۔ منصوبہ ساز سے کہا جاتا ہے کہ وہ اونچی سے اونچی شرح نکالے جسے منصوبے کی مدت کے لیے منظور کیا جائے۔ وہ ۵ء۷۴ فیصد سالانہ کی شرح نکالتا ہے جو ممکن السمں ہے۔ لیکن جب وہ یہ کہتا ہے کہ بنیادی سال میں ۲ر۵ فیصد کی منفی ترقی ریکارڈ کی گئی ہے تو وہ پانچ سالوں کے لیے ۱۲ر۵ فیصد سالانہ کی شرح تجویز کرتا ہے یہ واضح کیے بغیر کہ ۱۰ر۵ فیصد سالانہ کی اضافی ترقی بنیادی سال، جبکہ منفی شرح ریکارڈ کی گئی تھی، سے پہلے کی حالت پر لوٹنے کو ظاہر کرتی ہے۔ وہ دوسرے "گندے لوگوں" کو جو ملک کو چلاتے ہیں، بتاتا ہے کہ یہ اونچی شرح بنیادی سال کی منفی شرح ترقی پر مبنی ہے لیکن چوں کہ یہ تشریح تکنیکی اور پیچیدہ نوعیت کی ہے اور عوام کو گمراہ کرنا آسان ہے اس لیے اونچی شرح کو معیشت کی حقیقی ترقی کی شکل میں پیش کیا جاتا ہے۔ منصوبہ سازی کی یہ مشق گذشتہ سال کی ۱۰ فیصد کم شرحِ ترقی کے پس منظر میں اس سال بھی دہرائی گئی ہے۔ اسی طرح منصوبہ ساز شاید نہ چاہتے ہوئے اور نہ جانتے ہوئے عوام کو اس بارے میں گمراہ کرنے کے کھیل میں شریک ہے کہ سال کے لیے یا منصوبے کے پہلے چار سالوں کے لیے اصل شرحِ ترقی کیا ہے۔

> منصوبہ ساز سے کہا جاتا ہے کہ وہ اونچی سے اُونچی شرح نکالے جسے منصوبے کی مدّت کے لیے منظور کیا جائے۔ وہ ۷٫۴ فیصد سالانہ کی شرح نکالتا ہے جو ممکن العمل ہے۔ لیکن جب وہ یہ دیکھتا ہے کہ بنیادی سال میں ۲٫۵ فیصد کی منفی ترقی ریکارڈ کی گئی ہے تو وہ پانچ سالوں کے لیے ۲٫۵ فیصد سالانہ کی شرح تجویز کرتا ہے۔ یہ واضح کئے بغیر کہ ۰٫۵ فیصد سالانہ کی اضافی ترقی بنیادی سال، جبکہ منفی شرح ریکارڈ کی گئی تھی، سے پہلے کی حالت پر لوٹنے کو ظاہر کرتی ہے۔

دو:۔ کورسیکٹر

منصوبہ ساز نے پنج سالہ منصوبے کے ایک حصّے جیسے 'کورسیکٹر' (Core Sector) کا نام دیا گیا ہے، کے گرد اُونچی دیواریں کھڑی کر کے ایک باڑہ سی لگا دی ہے تاکہ منصوبے کے پانچ سالوں میں افراطِ زر کی شرح خواہ کچھ بھی کیوں نہ ہو، اس حصّے میں لگائے جانے والے حقیقی وسائل اُسی سطح پر برقرار رکھے جائیں جیساکہ منصوبہ بناتے وقت طے کیا گیا تھا۔ اب یہ کورسیکٹر جس کی تشکیل منصوبہ ساز نے کی ہے، ہے کیا؟ کوئی بھی شخص یہ سوچ سکتا ہے کہ منصوبے کے دس مقاصد جن پر بیس نکاتی پروگرام میں بھی زور دیا گیا ہے، کی روشنی میں اُن شعبوں پر زیادہ توجہ دی جائے گی جو عوام کی بہبود سے تعلق رکھتے ہیں۔ ایسے شعبے ہیں عوام کی صحت کی دیکھ بھال اور اُن کی تغذیہ پر توجہ دینا، خاص کر سماج کے کمزور طبقوں مثلاً اسکول جانے سے پہلے کی عمر کے بچوں اور دودھ پلانے والی ماؤں وغیرہ کی صحت و تغذیہ پر، پرائمری تعلیم اور تعلیم بالغان جس کے ذریعے بچے صاحبِ فکر اور کارکن بالغ بن سکتے ہیں اور اَن پڑھ بالغوں کی آمدنی بڑھائی جا سکتی ہے جو سب سے غریب طبقے میں آتے ہیں، پینے کے صاف پانی کی بہم رسانی خاص کر ہار سے ۸۰۳ لاکھ گاؤں میں جہاں گندے پانی یا چھوت سے پیدا ہونے والی بیماریاں پھیلتی ہیں، دیہی علاقوں میں بے زمین افراد کو رہنے کے لیے مکان یا مکان بنانے کے لیے زمین دینا۔ یہی وہ مدیں ہیں جو کم سے کم ضروریات کے پروگرام میں بھی شامل کی گئی ہیں اور جنھیں منصوبہ ساز کے کورسیکٹر میں بھی ہونا چاہیئے کیوں کہ منصوبہ ساز کا کام ایسے طریقے اور پروگرام تجویز کرنا ہے جن سے سماج کو منصوبے کے اختیار کردہ مقاصد کو حاصل کرنے میں مدد ملے۔ لیکن منصوبہ ساز جسے "کورسیکٹر" کہتا ہے وہ بجلی، کوئلہ، ریلوے، فولاد، خام پیٹرولیم اور پیٹرولیم کی مصنوعات پر مشتمل ہے۔ چنانچہ ان پانچ چند شعبوں میں سرمایہ کاری کا خاص خیال رکھا جاتا ہے۔ اگرچہ یہ شعبے واقعی ملک کی زراعتی و صنعتی ترقی کے لیے ضروری ہیں۔ لیکن اِن کا انسانی بہبود و بہتری سے اِتنا سیدھا تعلق نہیں

> اب یہ کورسیکٹر جس کی تشکیل منصوبہ ساز نے کی ہے، ہے کیا؟ کوئی بھی شخص یہ سوچ سکتا ہے کہ منصوبے کے دس مقاصد جن پر بیس نکاتی پروگرام میں بھی زور دیا گیا ہے، کی روشنی میں اُن شعبوں پر زیادہ توجہ دی جائے گی جو عوام کی بہبود سے تعلق رکھتے ہیں۔

ہے جتنا کہ اوپر بیان کئے گئے پہلے زمرے کی مدوں کا ہے۔ منصوبہ ساز کے تصور کے کورسیکٹر میں سرمایہ کاری کا تحفظ کیا جاتا ہے جس کے معنی ہیں اس سیکٹر میں وسائل کے بہاؤ کو بڑھانا جیساکہ موجودہ منصوبے میں کیا گیا ہے۔ (موجودہ منصوبے میں اس سیکٹر میں شروع میں سوچی گئی سطح سے تقریباً بیس فیصد زیادہ وسائل کا اہتمام کیا گیا ہے۔) ایسا کرنے کا مطلب ہے اصلی کورسیکٹر سے، جو صحت کی دیکھ بھال، تغذیہ، تعلیم پینے کے پانی کی بہم رسانی وغیرہ پر مشتمل ہے، وسائل کو ہٹا کر منصوبہ ساز کے کورسیکٹر میں لے جانا۔

> انسانی و سماجی ترقی کے پروگرام میں اسے جو ادنیٰ اہمیت دی گئی اس سے ظاہر ہے کہ منصوبہ سازوں نے اس "گندگی" کی جانب نگاہ نہیں کی ہے جو ان کے گرد اس وجہ سے جمع ہو رہی ہے کہ وہ یہ محسوس نہیں کرتے کہ وہ منصوبے اور سماج کے طے شدہ انسانی و سماجی مقاصد کے حصول کو ناکام بنا رہے ہیں۔

سہ: اُلٹا نقطۂ نگاہ

اس انحراف کا تجزیہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وسائل کا تقریباً ۱۵ فیصد جس نے جسے اصلی کورسیکٹر کہا ہے وہاں سے نکال لیا گیا ہے۔ یعنی انسانی اور سماجی بہبود کے شعبوں سے ہٹا کر

منصوبہ ساز کے بتاتے ہوئے کورسیکٹر میں لے جایا گیا ہے۔ کورسیکٹر کیا ہے اس کے متعلق اُلٹے نقطۂ نگاہ کی ایک اور افسوسناک مثال منصوبہ ساز کی وہ مزاحمت ہے جو ہماری ایک ریاست میں دس سال تک کی عمر کے تمام بچوں کو ہر روز دوپہر کو تغذیہ بخش خوراک بہم پہنچانے کے لیے شروع کی گئی اسکیم کے خلاف کی گئی۔ اس اسکیم کا اصل مقصد یہ تھا کہ اُس ریاست کی غریب اکثریت کے تقریباً ۵۲ لاکھ بچوں کو روزانہ کم از کم ایک ٹھوس غذا بہم پہنچائی جائے۔ منصوبہ ساز جن میں میں بھی بحیثیت ایک منصوبہ ساز کے شامل ہوں، اس لیے اس اسکیم کے خلاف تھے کہ وہ ریاست اس اسکیم (جس پر ۱۰۰ تا ۱۲۰ کروڑ روپئے خرچ ہوتے) کے مصارف برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ اور اس کے لیے اپنے کورسیکٹر یعنی بجلی اور پاور کے شعبے سے وسائل کو ہٹا رہی تھی۔

آج بھی میرے سوا، میرے تمام منصوبہ ساز دوست اس اسکیم کے خلاف ہیں۔ میں اب اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ اس اسکیم کی جگہ جیسے ہی کورسیکٹر کہتا ہوں، اس کے مرکز میں ہے کیونکہ ایسے حالات میں جبکہ غریبی کی بیخ کنی ایک طویل مدت تک نہیں کی جا سکتی غریبوں کے بچوں کو خوراک دینے کی اسکیم تمام غریبوں کو (جن کی تعداد ۵۲ لاکھ غریب بچوں سے پانچ گنی ہوگی) کھلانے کے مقابلے میں زیادہ قابلِ عمل ہے۔ دوسرے اس اسکیم پر ریاست کے سالانہ بجٹ کے تین فیصد سے بھی کم خرچ آئے گا۔ تیسرے اس اسکیم کا مطلب ریاست کی آئندہ انسانی ترقی کے لیے سرمایہ لگانا ہوگا — مجھے یقین ہے کہ یہ اسکیم ساتویں اور آٹھویں منصوبے میں وزیراعظم کے بیس نکاتی پروگرام کا حصہ بنے گی اور قوم کی غریبی کے خلاف ایک اہم امدادی قدم ہوگی۔ لیکن اس اسکیم کی جو مخالفت ہوئی اور انسانی و سماجی ترقی کے پروگرام میں اسے جو ادنیٰ اہمیت دی گئی اس سے ظاہر ہے کہ منصوبہ سازوں نے اس "گندگی" کی جانب نگاہ نہیں کی ہے جو ان کے گرد اس وجہ سے جمع ہو رہی ہے کہ وہ یہ محسوس نہیں کرتے کہ وہ منصوبے اور سماج کے طے شدہ انسانی و سماجی مقاصد کے حصول کو ناکام بنا رہے ہیں۔

> دراصل منصوبہ سازوں سے نشانے اور تعداد مقرر کرنے کو کہا گیا۔ چنانچہ ہم نے کہا ہے کہ چھٹے منصوبے کے پانچ سالوں میں ہم غریبی میں رہنے والے ۳۳ کروڑ افراد میں سے ۱۰ کروڑ افراد کو غریبی کی سطح سے اُوپر لے آئیں گے۔ اس معاملے میں گندگی اس بات کے واضح نہ کیے جانے میں مستور تھی کہ اس تعداد کو غریبی کی سطح سے اوپر لانے کے لیے سماج میں وسائل کو کس طرح از سرِ نو تقسیم کرنا پڑے گا جس سے غریب آدمی کی آمدنی میں مسلسل اضافہ ہو۔

تین:

غریبی میں کمی لانا

منصوبے کے بڑے اور اہم مقاصد میں سے ایک ملک میں غریبی کو کم کرنا ہے۔ دراصل منصوبہ سازوں سے نشانے اور تعداد مقرر کرنے کو کہا گیا۔ چنانچہ ہم نے کہا ہے کہ چھٹے منصوبے کے پانچ سالوں میں ہم غریبی میں رہنے والے ۳۳ کروڑ افراد میں سے ۱۰ کروڑ افراد کو غریبی کی سطح سے اوپر لے آئیں گے۔ اس معاملے میں گندگی اس بات کے واضح نہ کیے جانے میں مستور تھی کہ اس تعداد کو غریبی کی سطح سے اوپر لانے کے لیے سماج میں وسائل کو کس طرح از سرِ نو تقسیم کرنا پڑے گا جس سے غریب آدمی کی آمدنی میں مسلسل اضافہ ہو" ایسے چاہے زمین یا کسی اور اثاثے کی ملکیت کے ذریعے ہو (جس کے لیے زمین کی حد مقرر کرنے اور زمین کی تقسیم کا پروگرام موجود ہے) یا مرکوز دیہی ترقی کے پروگرام کے ذریعے، یا تعلیم یافتہ بے روزگاروں کے لیے

> اس طرح غریبی کو کم کرنے کے تیسرے مثالی کیس میں منصوبہ بنانے والے کو اس طرح سے ایک "گندہ کھیل" کھیلنے پر مجبور کیا جاتا ہے:- ۱۔ عارضی ریلیف پروگراموں کی محدود نوعیت اور پروگراموں کی خامیوں کو نظر انداز کرکے، ۲۔ ایک ایسا طریقہ ایجاد کرکے جس سے پبلک کو اس بارے میں ثابت نہ ہونے والی اطلاعات (اور شاید غلط اطلاعات) دی جائیں کہ غریبی کو کم کرنے کا بنیادی سماجی مقصد کس حد تک پورا ہو رہا ہے۔

> اوزاروں کے ایک اور سیٹ سے ایک اور منصوبہ ساز یہ نتیجہ نکالتا ہے کہ صرف ۵۰ لاکھ افراد کو غریبی کی سطح سے اوپر اٹھایا گیا ہے۔ یہ دونوں گروپ ایک ایسے سماجی نظام میں کام کر رہے ہیں جو غریبی کی بیخ کنی کے مقصد کی نفی کرتا ہے۔

حال ہی میں شروع کی گئی۔ خود روزگاری اسکیم کے ذریعے یا خشک سالی کی زد میں آنے والے علاقوں کے لیے بنائے گئے پروگرام اور چھوٹے کاشتکاروں کی ترقی کے پروگرام کے ذریعے۔

اس اہم مقصد میں مزید "گندگی" مندرجہ ذیل صورتوں میں ہے:

(ا) اس بات کو واضح نہیں کیا گیا ہے کہ قومی دیہی روزگار پروگرام، دیہات کے بے زمین افراد کو روزگار کی گارنٹی کے پروگرام اور عورتوں اور قبائل سے متعلق ضمنی منصوبوں میں اس بات کا انتظام نہیں کیا گیا ہے کہ جس شخص کو عارضی ملازمت دلائی جائے گی وہ مسلسل کوشش جاری رکھے گا۔ کیوں کہ عارضی ملازمت سے وہ غریبی کی سطح سے مستقل طور پر اوپر نہیں اٹھ سکے گا۔

(ب) ملکیتِ زمین کی حد مقرر کرنے اور زمین تقسیم کرنے کے پروگراموں نیز مربوط دیہی ترقی کے پروگرام میں اگرچہ اس قسم کے جاری رہنے والے فوائد کا عنصر موجود ہے لیکن ان میں جو خامیاں اور کمزوریاں ہیں ان کی وجہ سے لوگوں کو غریبی کی سطح سے اوپر اٹھانے کا مقصد پورا نہیں ہو پاتا۔

جب سیاسی حکام منصوبہ ساز سے اس بات کا اندازہ لگانے کو کہتے ہیں کہ پانچ سال کی مدت میں جن دس کروڑ لوگوں کو غریبی کی سطح سے اوپر اٹھانے کا نشانہ مقرر کیا گیا تھا ان میں سے کتنے لوگوں کو پہلے دو سالوں کے اختتام یعنی منصوبے پر عمل درآمد کا جائزہ لینے کے وقت، غریبی کی سطح سے اوپر اٹھایا جا سکا ہے۔ آخری برائی اسی وقت دیکھنے میں آتی ہے کیوں کہ منصوبہ ساز کچھ قابلِ اعتراض طریقوں سے یہ اندازہ لگاتا ہے کہ پانچ کروڑ ۷۰ لاکھ افراد کو غریبی کی سطح سے اوپر اٹھایا جا چکا ہے۔ ان طریقوں میں یہ غیر حقیقی مفروضہ بھی شامل ہے کہ سماج کی غریب اکثریت کی آمدنیوں میں اضافے کی شرح وہی ہے جو امیر اقلیت کی ہے جبکہ سبھی تجربی مطالعات سے یہ بات سامنے آئی ہے کہ افراطِ زر کی ایک مدت میں (پہلے سال ۸۱-۱۹۸۰ میں افراطِ زر کی شرح ۱۷ فیصد رہی اور دوسرے سال یعنی ۸۲-۱۹۸۱ میں یہ ۲ء۱۸ فیصد تھی اور پہلے دو سالوں میں یہ کل ۵ء۳۲ فیصد تھی۔) مرفع الحال لوگوں کی آمدنیوں میں اضافے کی شرح غریب عوام کی آمدنیوں میں اضافے کی شرح سے لگ بھگ دو یا تین گنی ہے۔ یہ بھی فرض کر لیا جاتا ہے کہ غریب عوام عام زرعی ترقی اور دیہی صنعتوں کی ترقی کے پروگراموں سے مستفید ہوئے، یہ بات صحیح بھی ہو سکتی ہے لیکن یہ فیلڈ سروے پر مبنی نہیں ہے بلکہ زیادہ تر قیاس پر مبنی ہے۔ اس طرح غریبی کم کرنے کے تیسرے مثالی کیس میں منصوبہ بنانے والے کو اس طرح سے ایک "گندہ کھیل" کھیلنے پر مجبور کیا جاتا ہے:

> منصوبہ ساز کو اپنے ہم مرتبہ سماجی گروپ کے دوسرے اراکین سے زیادہ اس بات کا احساس کرنا چاہیئے کہ مختلف قانونی خامیوں اور ٹیکنیکلیٹو اور انتظامیہ کمزوریوں اور خامیوں سے سماجی مقاصد کو کتنی زک پہونچ رہی ہے۔ اسے وقتاً فوقتاً کھل کر سامنے آنا چاہیئے اور پبلک کو بتانا چاہیئے کہ اقتصادی کوششوں کے گرد جو "گندگی" ہے وہ کیسے سماجی مقاصد پر اثر انداز ہو رہی ہے۔

۱۔ عارضی ریلیف پروگراموں کی محدود نوعیت اور پروگراموں کی خامیوں کو نظر انداز کر کے

۲۔ ایک ایسا طریقہ ایجاد کر کے جس سے پبلک کو اس بارے میں ثابت نہ ہونے والی اطلاعات (اور شاید غلط اطلاعات) دی جائیں کہ غریبی کو کم کرنے کا بنیادی سماجی مقصد کس حد تک پورا ہو رہا ہے۔

راستہ:

پھر منصوبہ ساز کو "گندہ کھیل" کھیلنے والے "گندے لوگوں" میں سے نکلنے والے لیے کیا کرنا چاہیئے؟

ایک ابتدائی اور قریب قریب ناقابلِ عبور دشواری جس کا منصوبہ ساز کو سامنا کرنا پڑتا ہے یہ ہے کہ ایک ایسے سماج سے جس میں اس کے ہم مرتبہ اور اس سے برتر لوگ سب "گندے" ہیں، وہ اپنے آپ کو ایک "گندہ" شخص بنے رہنے سے باز نہیں رہ سکتا۔ جس طرح آپ آس پاس کی ایک مربع کلومیٹر کی گندگی میں ایک مربع میٹر صفائی نہیں رکھ سکتے اسی طرح منصوبہ ساز کے خود کو دوسروں سے الگ کر لینے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ ایک ایسے سماج میں جہاں "گندے لوگوں" کی تعداد زیادہ ہے منصوبہ ساز بھی "گندہ" ہی ہوگا۔

ایک:

اس لیے میں منصوبہ ساز کو پہلا مشورہ یہ دوں گا کہ وہ اس کا احساس کرے کہ وہ "گندہ" ہے اور اسے ایک "گندہ کھیل" کھیلنے کے لیے مجبور کیا جا رہا ہے۔ یہ احساس مجبوری ضروری ہے۔ اس کی تکنیکی مہارت اسے اپنے اوزاروں سے لاپروا بنا سکتی ہے۔ مثال کے طور پر اوزاروں کے ایک سیٹ (ماڈل) سے منصوبہ سازوں کی ایک جماعت یہ نتیجہ اخذ کرتی ہے کہ پانچ کروڑ بیس لاکھ افراد کو غریبی کی سطح سے اوپر اٹھایا گیا ہے۔ اوزاروں کے ایک اور سیٹ سے ایک اور منصوبہ ساز یہ نتیجہ نکالتا ہے کہ صرف ۵۰ لاکھ افراد کو غریبی کی سطح سے اوپر اٹھایا گیا ہے۔ یہ دونوں گروپ ایک ایسے سماجی نظام میں کام کر رہے ہیں،

(باقی صفحہ پر)

خودساختہ اُصولوں سے اُن کا کھیل خوب چل نکلا

اس مضمون میں فاضل مصنف نے بتایا ہے کہ ہمارے منصوبہ ساز عقل اور ذہن پر بہت زیادہ بھروسہ کرتے ہیں۔ اور جب کہ عملاً ان کے یہاں ہاتھ کی محنت کا کوئی کام ہی نہیں ہے، نتیجہ ظاہر ہے ۔ اسے غیر عملی منصوبہ بندی ہی کہہ سکتے ہیں ۔ مگر اس پر طرّہ یہ کہ انھیں اس بات پر پورا پورا اعتماد و یقین ہے کہ وہ صحیح ہیں ۔ وہ اپنی پُشت پناہی کے لیے مغربی منطق کا سہارا لیتے ہیں اور ہندوستان کا طبقہ واری نظام ان کا تحفظ کرتا ہے۔ اگر پراجیکٹ کامیاب ہو جاتا ہے تو اس کی کامیابی کا سہرا ان کے سر جاتا ہے۔ اگر یہ ناکام ہو جاتا ہے تو حکومت کے نچلی سطح کے عامل اور حکام اس کی ناکامی کے لیے ذمہ دار ٹھہرائے جاتے ہیں۔

ایک ایسے ملک میں جہاں ناخواندگی کی شرح اتنی زیادہ ہو، وہاں تحریری الفاظ اور اقوال کو بڑے احترام سے دیکھا جاتا ہے۔ ایک ایسے ملک میں جہاں صلاحیت، افضلیت، تفوق، برتری اور اہلیت کی بنیاد بالعموم وہ ڈگریاں ہوتی ہیں جو کسی کے پاس ہوتی ہیں۔ وہاں منصوبہ ساز بلاشبہ بہت محفوظ مقام پر ہیں۔ اعداد و شمار کی اس شعبدہ گری کے لیے اصول و ضوابط منصوبہ ساز ہی طے کرتے ہیں۔ وہ بہت سے موضوعات پر کام کرتے ہیں۔ اگر رائج الوقت نظام کو غیر حقیقی نوعیت کے نتائج ہی پر زندہ رہنا اور انھیں نتائج کو سامنے لانا ہے، تو اس کے لیے کچھ مفروضات ضروری ہیں۔ پہلی بات یہ کہ کچھ فاصلہ رکھا جائے اس لیے آپ کو حقیقت سے دور رکھنے کے لیے کافی رکاوٹیں ہیں۔ یہ بھی فرض کر لیا گیا ہے کہ منصوبہ سازوں کو عملی تجربے کی ضرورت نہیں۔ ان کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ وہ ہمدردیاں جتاتے رہیں اور کافی کام وہ اپنی قوتِ متخیلہ اور قوتِ حس کو کام میں لا کر کریں۔ اس کی ضرورت نہیں محسوس کی جاتی کہ زرعی مزدوروں اور مارجنل کسانوں کے ساتھ مل کر کام کیا جائے اور اپنے ہاتھ گندے کیے جائیں اور پھر اُن کے مسائل سمجھے جائیں۔ محض ضلع کلکٹر ہونا کافی ہے۔ غریبی کے 'دکھوں' اور غریبوں کے مسائل جاننے کے لیے تین وقت بھوکا رہنا کوئی نہیں چاہے گا۔ اس طرح وہ عملی تجربے کے بعد بدنام خطِ افلاس پر بحث میں حصہ نہیں لے گا۔ محض اقتصادی سطح کی اعداد و شمار کی روشنی سے جانچ ہی کو کافی سمجھ لیا جاتا ہے۔ منصوبہ سازوں کا کام یہ نہیں کہ وہ کچھ جھونپڑیوں میں وقت گزاریں یا دو قبائلی آبادی کے ساتھ براہِ راست رابطہ قائم کریں یا ہاتھ سے چلنے والے نلوں سے پانی پیئں، یا ہندستان کے لکھوکھا عوام کی طرح کھلی فضا میں سوئیں، ان ڈگریوں کے سبب

> ظاہر ہے کہ ہم نے آزادیٔ افکار کے لیے اپنی عزّت کھو دی ہے۔ ہم نے اپنی آنکھوں کو کھلا رکھ کے اور اپنے مشاہدے اور اپنی سماعت کے بل بوتے پر گاؤں کے حالات جاننے کے ضمن میں اپنا وقار کھو دیا ہے، اس کی بجائے ہم نے انھیں کہاں جگہ دی ہے، وہ ہیں ہماری کچھ یونیورسٹیاں یا پھر غیر ممالک میں آباد بین الاقوامی ٹولہ۔ شرمناک بات یہ ہے کہ دیہی عوام کے مسائل کو ہم اپنی ذاتی ترقی اور اپنے ذاتی مقاصد کے حل کے لیے کام میں لاتے ہیں۔ اُن کے اوپر یکے بعد دیگرے کئی کئی مقالے لکھتے ہیں۔ اس بہانے ہم اس موضوع کے ماہر کہلاتے ہیں۔ جبکہ دیہات کے خستہ حال کسان اور وہاں کی دیگر آبادی کی حالت جوں کی توں رہتی ہے۔

جو انھوں نے حاصل کی ہیں، ان کی پوزیشن خاص بن جاتی ہے۔ اور اُن کے عہدے اُن تک عوام کی رسائی کو ناقابلِ عمل بنا دیتے ہیں اور ان کی بصیرت (خواہ وہ کتنی ہی غلط یا مسخ شدہ ہو) ان کو اپنے محفوظ مقام کا احساس دلاتی ہے۔

حقیقت سے بُعد

یہ نظام ایسے ہیں کہ ان کے ذریعے وہ حقائق سے دُور ہو جاتے ہیں اور وہ اس خیال اور اس تصور کو ترک کرنے پر آمادہ نہیں ہوتے کہ یہ سب کچھ پہلی اور دوسری دنیا کے نظاموں اور طریق کار سے ہی اخذ کردہ ہے۔ ہم خیالات اور فارمولے کے لیے اب تک بھی اُن کی طرف نظر دوڑاتے ہیں۔ بڑی خاموشی اور موثر ڈھنگ سے اُن پر یہ شرط عائد کر دی جاتی ہے کہ وہ صرف ایک خاص حد تک ہی آزادی دکھا سکتے ہیں۔ ہم کو ابھی تک اس بات پر فخر حاصل ہوتا ہے کہ ہمارے منصوبہ ساز حال ہی میں لندن اسکول آف اکونومکس، ورلڈ بینک، اقوام متحدہ اور اسی طرح کے دیگر اداروں سے آئے ہیں گویا کہ یہ وہ ضروری شرط ہو جس سے وہ لوگ ملک کے غریب عوام کے قریب آ سکیں۔ ظاہر ہے کہ ہم نے آزادیٔ افکار کے ضمن میں اپنی عزت کھو دی ہے۔ ہم نے اپنی آنکھوں کو کھلا رکھ کے اور اپنے مشاہدے اور اپنی سماعت کے بل بوتے پر گاؤں کے حالات جاننے کے تئیں اپنا وقار کھو دیا ہے۔ اس کی بجائے ہم نے انھیں کہاں جگہ دی ہے،

وہ ہیں ہماری کچھ یونیورسٹیاں یا پھر غیر ممالک میں آباد بین الاقوامی ٹولہ۔ شرمناک بات یہ ہے کہ دیہی عوام کے مسائل کو ہم اپنی ذاتی ترقی اور اپنے ذاتی مقاصد کے حل کے لیے کام میں لاتے ہیں۔ ان کے اوپر یکے بعد دیگرے کئی کئی مقالے لکھتے ہیں۔ اسی بہانے ہم اس موضوع کے ماہر کہلاتے ہیں۔ جب کہ دیہات کے خستہ حال کسان اور وہاں کی دیگر آبادی کی حالت جُوں کی تُوں رہتی ہے۔ میں نے اس طرح کی چالبازیاں اکثر دیکھی ہیں کہ انھوں نے اپنی زندگی میں ایمانداری سے اس محاذ پر کوئی کام نہیں کیا ہے مگر نچلی سطح کے عوام کے ساتھ مل جل کر کام کرنے کا جھوٹا دعویٰ کرتے رہے، ان کی طرف سے نمائندگی کرتے رہے اور اسی طرح ان کی منصوبہ بندی ہوا میں ہوتی رہی۔ اس حالت میں انھوں نے اس کے لیے ان تھک کوشش کی کہ ان کی عظمت کو تسلیم کر لیا جائے۔ یہ ایک افسوسناک پہلو ہے لیکن آج کے منصوبہ ساز کی عملی زندگی کا نچوڑ ہے۔

> میں نے اس طرح کی چالبازیاں اکثر دیکھی ہیں کہ انھوں نے اپنی زندگی میں ایمانداری سے اس محاذ پر کوئی کام نہیں کیا ہے مگر نچلی سطح کے عوام کے ساتھ مل جل کر کام کرنے کا جھوٹا دعوے کرتے رہے، ان کی طرف سے نمائندگی کرتے رہے اور اس طرح ان کی منصوبہ بندی ہوا میں ہوتی رہی۔ اس حالت میں انھوں نے اس کے لیے اَن تھک کوشش کی کہ اُن کی عظمت کو تسلیم کر لیا جائے۔ یہ ایک افسوسناک پہلو ہے لیکن یہ آج کے منصوبہ ساز کی عملی زندگی کا نچوڑ ہے۔

"ماڈل" اور اس کے کرتب

دیہی غریب عوام کے لیے منصوبہ بندی ایک رواج بن گئی ہے۔ ماڈلوں کے سہارے ایسے ایسے کرتب دکھلائے جاتے ہیں کہ یہ صورت حال پیش آئی تو عوام کا ردِعمل یہ ہوگا اور فلاں صورت حال پیش آئی تو ردعمل یہ ہوگا۔ گویا کہ دُنیا میں سب سے زیادہ آسان کام یہی بتانا ہوگا کہ دیہات کا غریب اور ٹوٹا پھوٹا کسان اور اس کا کنبہ اس کی بہبود کے لیے بنائی گئی اسکیموں کے تئیں کس ردِعمل کا اظہار کرے گا۔ دیہات میں پندرہ برسوں میں ہم اس کام کو نہیں کر پائے ہیں۔ ہم صرف ایک ماہ پیشگی

> منصوبہ بندی کے عمل کے ذریعے ایک ایسے بڑے نظام کا اعلان کیا گیا کہ غریبی کے خط سے نیچے زندگی گذارنے والے ۳۰ کروڑ سے زیادہ افراد کے لیے آن کی ضرورتوں کا بنیادی سامان فراہم کیا جائے گا لیکن تیس سال کے عرصے کے بعد جو کچھ سُننے کو ملتا ہے اس سے تعلیم یافتہ طبقے کے لفاست پسند اور دقیقہ رس ذہنوں کی اجتماعی ناکامی کا ثبوت ملتا ہے۔

> کسی کلکٹر سے دریافت کیجیے کہ کیا وہ اپنے کسی ایسے پروگرام کو جوں کا توں نبھا سکا جو کہ اس نے صرف ایک دن پہلے بنایا ہو، اور پھر دیکھیے کہ وہ کیا کہتا ہے۔ سماجی مطالبات اور دباؤ کے سامنے عملاً اس پروگرام کو جوں کا توں نبھانا مشکل ہو جاتا ہے۔ اسی کے ساتھ ہی ریاستی راجدھانیوں سے استفسارات اور بغیر پیشگی اطلاع کے ایسے مہمانوں کی آمد جو کہ اس کے خواہشمند ہوں کہ ان کا دورہ عوام کے علم میں آئے اور پھر اُن کی یہ خواہش کہ اس کے لیے ہفتہ بھر پہلے تیاری ہو۔

منصوبہ نہیں بنا سکتے ہیں چہ جائیکہ ایک سال۔ منصوبہ سازوں کے پاس دیگر ایسی بہت سی تیز مندیاں اور تراکیب ہوتی ہیں جس سے وہ اندھیرے میں جھانک لیتے ہیں جب کہ دیہات کی سطح پر کام کرنے والوں کے پاس نہ تو ایسی کوئی ترکیب ہوتی ہے اور نہ ہی اختیارات۔ کسی کلکٹر سے دریافت کیجیے کہ کیا وہ اپنے کسی ایسے پروگرام کو جوں کا توں نبھا سکا جو کہ اس نے صرف ایک دن پہلے بنایا ہو، اور پھر دیکھیے کہ وہ کیا کہتا ہے۔ سماجی مطالبات اور دباؤ کے سامنے عملاً اس پروگرام کو جوں کا توں نبھانا مشکل ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ ساجد صاحبوں سے استفسارات اور بغیر پیشگی اطلاعات کے ایسے مہمانوں کی آمد جو کہ اس کے خواہشمند ہوں کہ ان کا دورہ عوام کے علم میں آئے اور پھر ان کی یہ خواہش کہ اس کے لیے ہفتہ بھر پہلے تیاری ہو۔

اس طرح کے واقعات کو سو گنا کر لیجیے ایسی صورت میں کلکٹر کو نہ تو باقاعدہ کھانا کھانے کا وقت ملے گا، نہ اس کے لیے سلامتی یقینی ہوگی اور عوام کے ہاتھوں پریشان اور ہراسانی کے واقعات اس پر مستزاد ہوں گے۔ حکومت جن لوگوں کی سلامتی اور پریشانی دور کرنے کے لیے کوشاں ہوگی، انھیں کے ہاتھوں یہ سب کچھ ملے گا ایسی حالت میں اس آدمی کا تصور کیجیے جس کے لیے ہم منصوبہ بندی کر رہے ہیں۔ منصوبہ بندی کے عمل کے ذریعے ایک ایسے بڑے نظام کا اعلان کیا گیا کہ غریبی کے خط سے نیچے زندگی گزارنے والے ۳۰ کروڑ سے زیادہ افراد کے لیے ان کی ضرورتوں کا بنیادی ساماں فراہم کیا جائے گا لیکن تیس سال کے عرصے کے بعد جو کچھ سننے کو ملتا ہے اس سے تعلیم یافتہ طبقے کے نفاست پسند اور دقیقہ رس ذہنوں کی اجتماعی ناکامی کا ثبوت ملتا ہے۔ ہم مسلسل اس بات کے لیے کوشاں رہے ہیں کہ مغربی طرز کے غیر ملکی ماڈل، انتظامیہ کے طریقے اور شہری خیالات و تصورات کو ہر ایک کے حلق سے نیچے اتار دیں اور یہ سب کام دیہی ترقی اور منصوبہ بندی کے نام پر کرتے رہے ہیں۔ لیکن اب وہ وقت آگیا ہے کہ ہم آنکھ کھولیں اور یہ حقیقت پہچانیں کہ یہ کامیاب ہونے والا نہیں ہے۔ اس کے بجائے ہمیں ملکی حالات سے مطابقت رکھنے والی حکمت عملی اپنانی ہوگی۔ یہ ہندوستان اور دیہی نوعیت کی حکمت عملی ہو اور اس کے لیے ہمیں غیر ملکی ماہرین کا سہارا نہ لینا پڑے جن کے پاس ہمارے دیہی مسائل کا کوئی حل نہیں ہے۔

کیا ہم میں اتنی سکت ہے کہ ہم یہ کھیل کھیلنا بند کر دیں۔

منصوبہ بندی ہی کو کیوں الزام دیں؟

سچی بات تو یہ ہے کہ ہمیں منصوبہ سازوں کو بے عملی کا الزام نہیں دینا چاہیے۔ ان کو مغربی ممالک میں ڈھیلی ڈھالی تعلیم ملی ہے لیکن اس کی پرورش اس یقین کے تحت ہوئی ہے کہ ملک کے لیے یہی کچھ ٹھیک ہے۔ اس سلسلے میں ان سے کہا گیا ہے کہ جو کچھ پہلی اور دوسری دنیا کے لیے ٹھیک ہے، وہی تیسری دنیا کے لیے بھی ہے۔ ہندوستان کے لیے بھی ٹھیک ہے۔ جی ہاں اگر جاپان ایسا کر سکتا ہے تو ہندوستان کیوں نہیں کر سکتا۔ اس طرح کے لامتناہی سوالات کا سلسلہ جاری رہ سکتا ہے لیکن میرے سامنے بلاک ڈیولپمنٹ افسروں کے کام کی نوعیت ہے۔ اس کا کام نمٹانا پڑتا ہے جبکہ ہر شخص اسے جانتا اور

اگر چند ایک ایسی حکمت عملیاں جن پر دلی کے صاحب اقتدار لوگوں نے غور و خوض کیا ہو اور جنھیں انھوں نے مرتب کیا ہو، پیداوار بڑھانے میں مددگار بننے کی بجائے، الٹا اثر دکھائیں تو کیا یہ منصوبہ سازوں کا قصور ہے؟ اگر منصوبہ ساز اور عمل درآمد کے جتنے ذمہ داروں کے درمیان تال میل کی کمی پائی جائے اور ایک دوسرے پر اعتماد کی کمی محسوس ہو، تو کس کو مورد الزام ٹھہرایا جائے۔ منصوبہ ساز کس طرح سے نگراں ہو سکتا ہے؟ اس کا ہی حرف آخر کیوں ہو۔ وہ کیا کھیل کھیل رہا ہے۔؟

اس کے لیے ضروری نہیں کہ کسی غیر ملکی یونیورسٹی کی ڈگری درکار ہو اور وہی دیہی سطح کا مسئلہ حل کر سکتا ہو۔ منصوبہ سازوں کے پاس یہ صفت ہے کہ وہ ایک آسان عمل کو الجھا دیتے ہیں اور اسے پیچیدہ بنا کر پیش کرتے ہیں۔ ضلع اور دیہی سطح کے حکام کو یہ صلاحیت حاصل ہوتی ہے کہ وہ کسی عمل کے راز ہائے درون پردہ کو واضح کریں اور اسے ان کے لیے قابل فہم بنائیں جن کو اس سے فائدہ اٹھانا ہے لیکن اس طرح کی حکمت عملی کو قدر کی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا۔

منصوبہ ساز دیہی عوام کے مسائل کو عالمی سطح پر رکھ کر سوچتے ہیں اور انھوں نے یہ ایک ایسی ڈگر ڈال دی ہے جس سے وہ خود کو محفوظ سمجھتے ہیں۔ یہ وہ کھیل ہے جسے کھیلنا انھیں آتا ہے اور جہاں وہ ایک ایسے بہتر مقام پر ہیں جو ناقابل فہم ہے۔

تسلیم کرتا ہے لیکن منصوبہ بندی کے عمل کے تحت عوام سے رابطے کے اس اہم سلسلے کو کس قدر غیر اہم اور کم قیمت بنا دیا گیا ہے۔ اس طرح کے تنگ نظر اور دور اندیشی سے محروم لوگوں کو ہم منصوبہ ساز کہیں جو کہ اپنی ناک سے پرے تک بھی نہ دیکھ سکیں، ایسا کیوں؟ یہ جان بوجھ کر اپنائی گئی پالیسی بھی نہیں ہو سکتی۔ یقیناً کہیں پر غلطی ضرور ہے۔ اور وہ غلطی ہمارے اندر ہے۔ اس کا تعلق ایسے ماحول اور ایسی زندگی سے ہے جو ہمارے عوام کی زندگی سے مختلف ہے۔ وہ صرف اپنے رنگ کے اعتبار سے ہندوستانی ہے۔ وہ سر تا پا مغرب کے لیے رطب اللسان ہے۔ اور اس ملک کی قسمت پر آنسو بہایا کرتا ہے۔ وہ ایسی ٹیکنالوجی کا مداح ہے اور اس سے متاثر ہے جو انسان کو شماریات کا ادارہ بنا دے اور جو ضلع کو حقیر بنا کر پیش کرے۔ وہ آئین میں یقین ضرور رکھتا ہے لیکن اس ملک کے آدھے سے زیادہ لوگوں نے اسے نہیں دیکھا۔ چہ جائیکہ اس کا پڑھنا اور مطالعہ کرنا۔ وہ انسانی حقوق اور سماجی انصاف میں یقین رکھتا ہے لیکن وہ ان منصوبوں کو جن سے ان مقاصد کے عمل میں مدد نہ ملے، غلط نہیں ٹھہراتا۔ حالانکہ یہ منصوبے کہیں کہیں تو ان مقاصد کی تکمیل تو کیا، ان کی نفی کرتے ہیں۔ وہ استحصال پر اپنے خوف و خدشے کا اظہار کرتا ہے اس استحصال پر جو کہ ذاتوں، طبقات اور برادریوں کے درمیان دیکھنے کو ملتا ہے لیکن وہ کہیں بھی ان کے خلاف نہیں ٹھہرتا اور کہیں بھی ان کے خلاف کارروائی نہیں کرتا۔ اقتصادی مسائل پر وہ سب سے زیادہ زور دیتا ہے اور جبکہ اس طرح کی اسکیموں پر

> **اسے پتہ چلے گا کہ وہ جن کاموں کو بہت آسان سمجھتا ہے، ان پر وقت صرف کرنا کتنا مشکل ہے۔ مثال کے طور پر پنشن، قرضہ امدادی رقوم، زرعی اور صنعتی خدمات، شیڈولڈ ذاتوں کے بچوں کا دور دراز اسکول جانا، وغیرہ وغیرہ۔ ان تمام امور کی دشواریوں کا علم اسی وقت ہو سکتا ہے۔ جبکہ انھیں بچشم خود دیکھا جائے، اس سے اندازہ ہوگا کہ سماج کے ان غیر اہم لوگوں کے مسائل کو حل کرنے میں یہ نظام کس قدر ان کے تئیں لاپروا ہے۔**

اقتصادی طور پر مضبوط ہونے کو لیبل لگ جاتا ہے تو وہ اس پر اطمینان کا سانس لیتا ہے اور راحت محسوس کرتا ہے۔ اس پر عمل درآمد نہ ہو، تو یہ کوئی مسئلہ یا بات نہیں ہوتی لیکن یہ صاف ستھرا اور خوبصورت مزدور دکھائی دینا چاہیے کم سے کم کاغذات پر اس کے ضمن میں کوئی خامی نظر نہ آنی چاہیے۔ اعداد و شمار اس قدر حقیقی بن کر سامنے آنے چاہئیں کہ وہی حرف آخر ثابت ہوں۔

اس کے محافظ

مہاتما گاندھی نے محنت کشوں اور دانشوروں کو ایک دوسرے کے ساتھ دوش بدوش چلنے پر زور دیا تھا، دانشوری پر حد سے زیادہ انحصار اور محنت سے گریز کے سبب ہمارے منصوبہ ساز آج اس حالت میں ہیں جو ہم دیکھ رہے ہیں۔ گویا کہ بے عمل کاشتکار ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی انھیں اس بات پر اعتماد ہے کہ وہ صحیح ہیں۔ اپنی پشت پناہی کے لیے وہ مغربی فلسفہ کا سہارا لیتے ہیں، ہندوستانی طبقہ وارانہ نظام

> **جو لوگ رائج الوقت طریقوں سے ہٹ کر کام کے لیے کوئی دوسرا راستہ اپناتے ہیں، انھیں بیورو کریسی میں وہمی اور معزور خیال کیا جاتا ہے اور اگر میں اس سلسلے میں ایسے شخص سے امید وابستہ کروں جو کہ منصوبہ بندی کو اس کے رواجی مفہوم سے زیادہ وسعت دینا چاہتا ہے، تو میرا اشارہ ان چند مٹھی بھر بیورو کریٹس میں ہوگا جو منصوبہ بندی کے اس نظام کے تحت لکیر کے فقیر بننا نہیں چاہتے جہاں اوسط درجے کے ذہن کے لوگ درکار ہیں اور جہاں اس کے لیے بھی کوالیفکیشن ہے۔**

ان کا محافظ بنتا ہے۔ اگر پراجیکٹ کامیاب ہوتا ہے تو اس کی کامیابی کا سہرا ان کے سر بندھ جاتا ہے، لیکن اگر یہ تباہ یا ناکام ہو جاتا ہے تو نچلی سطح کے سرکاری عامل یا افسران اس کے لیے ذمہ دار ٹھہرائے جاتے ہیں۔ اگر ایک خوفناک اور مہیب نیز ڈراؤنی قسم کی دستاویز ضلع کی سطح کے افسروں کی سمجھ میں نہیں آ پاتی اور نچلی سطح کے سرکاری عامل اسے نہیں سمجھ پاتے تو اس میں بیچارے منصوبہ سازوں کا کیا قصور؟ اگر کچھ اسکیموں کی کامیابی کا انحصار اور استحکام زیادہ تر اعداد و شمار پر ہے اور انھیں بدلنا دشوار ہے، تو اس میں منصوبہ سازوں کی کیا خطا؟ اگر چند ایک ایسی حکمت عملیاں جن پر دلی کے صاحب اقتدار لوگوں نے غور و خوض کیا ہو اور جنھیں انھوں نے مرتب کیا ہو، پیداوار بڑھانے میں مددگار بننے کی بجائے، الٹا اثر دکھائیں تو کیا یہ منصوبہ سازوں کا قصور ہے؟ اگر منصوبہ ساز اور عمل درآمد کے ذمہ داروں کے درمیان تال میل کی کمی پائی جائے اور ایک کو دوسرے پر اعتماد کی کمی محسوس ہو، تو کس کو مورد الزام ٹھہرایا جائے۔ منصوبہ ساز کس طرح سے نگران ہو سکتا ہے؟ اس کا ہی حرف آخر کیوں ہو۔ وہ کیا کھیل کھیل رہا ہے؟۔

یقیناً اس رول کو بدلنا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ جو شخص وہی سطح پر پروگراموں کو عملی جامہ پہنائے، اس کی بات سنی جائے۔ عملی زندگی میں اسے نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ منصوبہ سازوں کے ساتھ اس کا رابطہ قائم

۱۶

نہیں ہوتا اور چونکہ دفتری نظام میں ہر کاغذ اور ہر بات اپنے اوپر والے افسر کے براہ راست توسط سے جاتی ہے جسے انگریزی میں "تھرو پراپر چینل" کی اصطلاح سے یاد کیا جاتا ہے، اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دیہی سطح پر کام کرنے والا نظر انداز کر دیا جاتا ہے اور کچلا دیا جاتا ہے۔ میرے نزدیک ہندوستان میں یہ سب سے بڑا المیہ ہے۔ ذرائع رسل و رسائل کا گلا گھونٹ دیا گیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ قابلِ وثوق اور بیش قیمت اطلاعات صحیح مقام تک نہیں پہونچ پاتیں۔ اس کے لیے ضروری نہیں کہ کسی غیر ملکی یونیورسٹی کی ڈگری درکار ہو اور وہی دیہی سطح کا مسئلہ حل کر سکتا ہو۔ منصوبہ سازوں کے پاس یہ صفت ہے کہ وہ ایک آسان حل کو اُلجھا دیتے ہیں اور اسے پیچیدہ بنا کر پیش کرتے ہیں۔ ضلع اور دیہی سطح کے حکام کو یہ صلاحیت حاصل ہوتی ہے کہ وہ کسی عمل کے رازہائے درون پردہ کو واضح کریں اور اسے اُن کے لیے قابلِ فہم بنائیں جن کو اس سے فائدہ اٹھانا ہے لیکن اس طرح کی حکمت عملی کو قدر کی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا۔ ٹیکنالوجی کے رازہائے درون پردہ کو بے نقاب کرنے کو چور دروازے سے ڈاڑھی چھونے کی اجازت دینے سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اور مخصوص مفادات اس کی پوری طرح مخالفت کرتے ہیں بالکل اسی طرح جیسا کہ منصوبہ ساز منصوبہ بندی میں لامرکزیت لانے کے مخالف ہیں۔ منصوبہ بندی کے عمل سے وابستہ اور اُن سے فائدہ اٹھانے والوں کے ہاتھ مضبوط کرنے کی کوئی بھی مہم ناکام بنا دی جاتی ہے۔ ترقیاتی عمل میں دیہی سطح پر ہنرمندی کی تعریف و توصیف یا اسکو تسلیم کیا جانا نیز دیہی عوام کی عقلمندی یا دانشوری یا ان کے علم کو تسلیم کیا جانا، منصوبہ سازوں کی سمجھ سے باہر ہے اور اس کے لیے ان کی حمایت کا ملنا ممکن نہیں دکھائی دیتا ہے اس لیے کہ ان کا عملی تجربہ محدود ہے لیکن ایسا بھی نہیں کہ وہ اپنی اس خامی کو کسی بھی طرح تسلیم کرلیں۔ منصوبہ ساز دیہی عوام کے مسائل کو عالمی سطح پر رکھ کر سوچتے ہیں اور انھوں نے یہ ایک ڈگر ڈال دی ہے جس سے وہ خود کو محفوظ سمجھتے ہیں۔ یہ وہ کھیل ہے جسے کھیلنا انھیں آتا ہے اور جہاں وہ ایک ایسے بہتر مقام پر ہیں جو ناقابلِ فہم ہے۔

آس پاس کا حلقہ

منصوبہ سازوں نے اپنے اردگرد جس طرح کا حلقہ بنا رکھا ہے اس نے حالات کو اور خراب کر دیا ہے۔ مثال کے طور پر کسی کھیت کا کوئی منصوبہ ہے تو وہاں منصوبہ ساز یعنی ایک ماہر کو بلانے کی ضرورت بتائی جائے گی۔ اگر اسکول نہیں چل رہے ہیں اور حاضری کم ہو رہی ہے تو کہا جائے گا کہ نظامِ تعلیم میں کوئی خامی یا گڑبڑ ہے۔ اور تعلیمی منصوبہ بندی کے ماہر کو بلانے کی ضرورت ہے۔ جس نے کہ اپنی زندگی میں اسکول نہ چلایا ہو یا جو زندگی میں کبھی اُستاد نہ رہا ہو لیکن ان تمام پہلوؤں کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ اگر صحت کے نظام میں گڑبڑ ہے تو باہر ملکوں سے کسی کو اس مسئلے کو حل کرنے اور اس پر غور کرنے کی دعوت دی جائے گی۔ ممکن ہے کہ یونی سیف کے ماہر کو دعوت دی جائے یعنی ایک ایسے شخص کو بلایا جائے گا جو ہندوستان کے بارے میں صرف اس قدر جانتا ہے کہ یہ سانپ کا تماشہ دکھانے والوں اور مہاراجاؤں کا دیش ہے۔ پینے کے صاف پانی کی فراہمی کے لیے درکار ہینڈ پمپوں کی دیکھ بھال اور مرمت کا معاملہ ہو، دیہی علاقوں میں عورتوں اور بچوں کے لیے بہبود کے پروگراموں کی تشکیل کا معاملہ ہو، بندھوا مزدوروں کو رہا کیے جانے اور انھیں بسانے کا معاملہ ہو، اس طرح کے مختلف امور اور پراجیکٹ ماہر منصوبہ سازوں کی ہٹ دھرمی اور تحکم کا شکار رہتے ہیں۔ وہ زندگی کے کتنے شعبوں میں دخل اندازی کا حق رکھتے ہیں، اس سلسلے میں فہرست طویل ہے۔ کھیتوں سے متعلق مسائل اور امور پر ان سے مشورہ طلب کیا جاتا ہے۔ چنانچہ حکومت اور عوام کے درمیان اعتبار قائم نہ ہونے کا ایک سبب یہ بھی ہے۔

اور اگر میں حالات کو بدل سکوں!

اگر نظام کی تبدیلی کا عمل میرے ہاتھ میں آجائے تو میں کیا کروں گا؟ میں اس بات کو یقینی بنانے کی کوشش کروں گا کہ منصوبہ ساز اپنا کافی وقت دیہات میں گزاریں۔ ضروری نہیں کہ وہ اپنے ہاتھ سے کام بھی کریں کیونکہ جب تک وہ اقتدار کے کسی عہدے پر فائز ہوں گے، تو ضروری نہیں کہ اُس وقت تک اُن کی صحت بھی اتنی ہی اچھی رہے، لیکن انھیں بغور مطالعہ کرنا ہوگا، کسانوں کے ساتھ بیٹھنا اور ان کی باتیں سننا ہوں گی۔ عوام کی اُن تک رسائی ہونی چاہیے۔ اور بحیثیت انسان انھیں سب کے ساتھ ملنا چاہیے انھیں اس بات پر نظر رکھنی ہے کہ کسانوں کی طرف سے ان کے منصوبوں پر عمل درآمد ہو رہا ہے یا نہیں۔ اس راستے میں چند خامیاں محسوس ہوئیں، ان کی فوری اصلاح ضروری ہوگی۔ منصوبہ بندی کے اچھے بُرے اثرات کا جائزہ لینا ضروری ہے۔ پراجیکٹوں کے متعلق ایسی اصطلاحات میں بات چیت کرنے سے جو عام کسانوں یا عوام کی سمجھ سے بالاتر ہوں، گریز کرنا چاہیے کیونکہ یہ سب باتیں عالمی یا قومی سطح پر رکھ کر کہی جاتی ہیں اور دیہات کے عوام اس طرح کے پراجیکٹوں کے بارے میں سننے سے کوئی دلچسپی نہیں رکھتے۔

دیہی عوام کے ردِ عمل کے نتیجے میں منصوبہ سازوں کو زمین پر رہ کر ہی بات چیت کرنی چاہیئے اور انھیں فوری مسائل کا قابلِ عمل حل تلاش کرنا چاہیئے۔ اور یہ بھی دیکھنا چاہیئے کہ وہ اسے خود کس طرح حل کر لیتے ہیں۔ وہ یہ دیکھ سکتے ہیں کہ غریب عوام اپنے پیروں پر آپ کھڑے ہیں اور گاؤں کے مقابلتاً زیادہ تر امیر کسانوں اور افراد کی نسبت یہ اپنے لیے وسیلوں کی کھوج میں زیادہ چاق و چوبند ہیں جب کہ یہ امیر کسان زیادہ تر سرکار پر انحصار کرتے ہیں۔ قابلِ قدر اور قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ غریب افراد کے پاس بنیادی سہولتوں کے نہ ہوتے ہوئے بھی اپنے کام کے جوڑ توڑ کے لیے کیسی کوششیں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ اسی طرح یہ ناخواندہ (غیر تعلیم یافتہ نہیں) دیہاتی منصوبہ سازوں کے لیے مشعلِ راہ بن سکتے ہیں۔ ان کی عملی زندگی سے جو سبق حاصل کئے جاتے ہیں، وہ کسی کتاب یا کسی مطالعے یا کسی رپورٹ سے عمر بھر حاصل نہیں ہو سکتے۔

منصوبہ ساز کو ان لوگوں کے رابطے سے جنھیں وہ سماجی اور اقتصادی طور پر کمتر سمجھتا ہے، بہت سی نئی باتیں معلوم ہوں گی۔ اسے پتہ چلے گا کہ وہ جن کاموں کو بہت آسان سمجھتا ہے ان پر وقت صرف کرنا کتنا مشکل ہے۔ مثال کے طور پر پنشن یا قرضہ، امدادی رقم، زرعی اور صنعتی بنیادی سامان، صحتی خدمات، شیڈولڈ ذاتوں کے بچوں کا دور دراز اسکول جانا، وغیرہ وغیرہ۔ ان تمام امور کی دشواریوں کا علم اسی وقت ہو سکتا ہے جبکہ انھیں بچشمِ خود دیکھا جائے، اس سے اندازہ ہو سکا کہ سارے کے سارے غیر اہم لوگوں کے مسائل کو حل کرنے میں یہ نظام کس قدر ان کے تئیں لاپرواہ ہے، ممکن ہے کہ ان گم نام لوگوں اور مشاہدوں سے اس میں تبدیلی آئے اور اس کے نتیجے میں منصوبہ بندی کے عمل میں تبدیلی دیکھنے کو ملے۔

منصوبہ سازوں کو ذرا اس عمل پر بھی نظر دوڑانی چاہیئے کہ دیہی اور بلاک کی سطح پر اعداد و شمار کس طرح اکٹھے کئے جاتے ہیں۔ مناسب اور مستند اعداد و شمار اکٹھے کرنے کے لیے کوئی موثر اور معتبر طریقہ نہیں ہے۔ اس کام کو کوئی اہمیت بھی نہیں دی جاتی۔ درحقیقت اسے وقت ضائع کرنا سمجھا جاتا ہے۔ اعداد و شمار جمع کرنے والے بالعموم چائے والے کی دکان پر بیٹھ جاتے ہیں اور فارموں کی خانہ پری کر لیتے ہیں۔ اپنے مفاد اور تحفظ کی خاطر پٹواری، گرام سیوک، کوآپریٹو انسپکٹر، اعداد و شمار کا کھیل اس طرح کھیلتے ہیں جس طرح کہ منصوبہ سازی کے ماہر بلاک کی سطح پر کھیلتے ہیں۔

اس ملک میں ۵ ہزار بلاک ہیں، ان سب پر اس طرح کی غلطی کا اندازہ کر لیجیئے۔ اس کے بعد منصوبہ سازوں کے فراہم کردہ اعداد و شمار کی صحت کا اور اس طرح منصوبہ بندی میں ان کے یقین و اعتماد کا اندازہ کر لیجیئے۔

اور اُمید؟

فی الحال تو یہ ایک کھیل ہے۔ ضرورت یہ ہے کہ یہ کھیل اور مذاق بن کر نہ رہ جائے اس میں اسی وجہ سے تبدیلی لانی ضروری ہے تاکہ یہ بامقصد بن سکے اور اس کا مفہوم اس کے موجودہ مفہوم سے زیادہ وسیع ہو سکے۔ لیکن ہم اپنے خود غرضانہ مفادات کے سبب راہِ راست سے ہٹ جاتے ہیں۔ ہم منصوبہ بندی کو ایک ایسا ذریعہ سمجھتے ہیں جس سے ہم توجہ کا مرکز بن سکیں اور ہمیں تسلیم کیا جا سکے۔ اس تمام تجربہ اور مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ اس میں غریب ہی نقصان میں ہے اور اس پر اس کا اثر پڑتا ہے۔ اس کی حالت کو سدھارنے کی نہ کوئی فوری ضرورت محسوس کی جاتی ہے اور نہ ہی اس سلسلے میں منصوبہ بندی کو لازمی خیال کیا جاتا ہے۔ جو لوگ رائج الوقت طریقوں سے ہٹ کر کام کے لیے کوئی دوسرا راستہ اپناتے ہیں، انھیں بیوروکریسی میں وہمی اور مغرور خیال کیا جاتا ہے۔ اور اگر میں اس سلسلے میں کسی ایسے شخص سے اُمید وابستہ کروں جو کہ منصوبہ بندی کو اس کے رواجی مفہوم سے زیادہ وسعت دینا چاہتا ہے، تو میرا شمار ان چند مٹھی بھر بیوروکریٹس میں ہوگا جو منصوبہ بندی کے اس نظام کے تحت لکیر کے فقیر بننا نہیں چاہتے جہاں اوسط درجے کے ذہن کے لوگ درکار ہیں۔ اور وہی اس کے لیے کوالیفکیشن ہے۔ ان کے لیے یہ کھیل نہیں ہے وہ اپنے طور پر ایک مثال قائم کر رہے ہیں۔

میرے نزدیک ان کی تعداد میں اضافے کے لیے کچھ ہی دیر کی بات ہے۔ سردست مارک ٹوائن کے الفاظ کا دُہرانا ہی کافی ہوگا۔ اس نے کہا تھا "اچھائی اور اچھی بات پر عمل کرنا ایک شاندار کام ہے۔ صرف دوسروں کو اچھائی کی بات پر عمل کرنے کے لیے کہنا بھی اچھا ہے لیکن یہ پہلی بات کے مقابلے زیادہ آسان ہے۔

★

پی۔ ایم۔ بھارگو

مُلک کی سرزمین کو داغدار کرنے والوں پر ایک نظر

ہمارے معلّمین کے کیا کارنامے ہیں؟ طلبا کی بدنصیب جماعت سے پوچھئے۔ اُنھوں نے مُلک کے نامور معلّمین اور ماہر تعلیم سے حاصل کیا ہے تو کیا؟ راہنمائی؟ ہرگز نہیں۔ علم؟ خدا کی قسم یہ بھی نہیں۔ کوئی قابلِ اقتداشال؟ یہ بھی شاید نہیں۔

اِن ہی وجوہات کی بنا پر طلبا میں بے چینی اور مایوسی پائی جاتی ہے۔ اور وہ بے کار کے مظاہرے اور ہڑتالیں کرتے، دیواروں پر اوٹ پٹانگ تصویریں بناتے ہیں۔

مندرجہ ذیل مضمون میں ان باتوں پر جناب پی۔ ایم۔ بھارگو نے جو خود ایک ماہر تعلیم ہیں روشنی ڈالی ہے۔ ملاحظہ فرمائیے۔ ایڈیٹر۔

یہ کون لوگ ہیں؟ ہمارے ملک میں یہ کالجوں اور یونیورسٹیوں کے منتظم، ریسرچ اسکالر اور تعلیم کے منتظمین ہیں۔ جو اس سلسلے کے کارکن ہیں۔ یہ اسکولوں کے معمولی اُستاد نہیں جو حقیقت میں اس نظام کا شکار بنے ہوئے ہیں۔

یہ وہی تو ہیں جن کا گھیراؤ ہوسکتا ہے۔ کبھی آپ نے کسی اسکول کے اُستاد کا گھیراؤ ہوتے سُنا ہے۔ اپنی تمام خامیوں اور کمزوریوں کے باوجود جن میں کم تنخواہ اور سماجی درجہ بھی شامل ہے۔ وہ زیادہ محنت کرتا ہے، اور عام طور پر یونیورسٹی کے پروفیسر یا اعلیٰ معلّم کی بہ نسبت اپنے طلبا سے بہت نزدیک رہتا ہے۔ ہمارے اسکول کوئی معیاری نہیں ہیں وہ موثر بھی نہیں ہیں، لیکن اس کے باوجود اسکول کے اُستاد کو وہاں کچھ ایسی عزت ملتی ہے جو دوسرے معلّمین کو میسّر نہیں آتی۔ اگر ان دنوں کوئی یونیورسٹی ایسے ۱۰ اُستادوں کے نام لے سکے، جن کی واقعی عزت اور توقیر ہوتی ہو اور جن کی طرف طلبا ناز سے دیکھتے ہوں تو ایسی یونیورسٹی مبارکباد کی مستحق ہے۔

> کبھی آپ نے کسی اسکول کے اُستاد کا گھیراؤ ہوتے سُنا ہے۔ اپنی تمام خامیوں اور کمزوریوں کے باوجود جن میں کم تنخواہ اور سماجی درجہ بھی شامل ہے، وہ زیادہ محنت کرتا ہے، اور عام طور پر یونیورسٹی کے پروفیسر یا اعلیٰ معلّم کی بہ نسبت اپنے طلبا سے بہت نزدیک رہتا ہے۔

برعکس حال کوئی ایسی یونی ورسٹی نکل بھی آئے تو اس کی یہ خودستائی محض دکھاوا ہوگی۔ طلبا وہی اچھے اُستادوں کا وہاں جینا محال کردیں گے۔

اس کا آغاز کیا ہے؟

یہ طلباء ایک خاص چیدہ آبادی کا حصہ ہیں۔ یہ بجائے خود کوئی بُری بات نہیں۔ لیکن بدنصیبی سے یہ خود نگر ہیں۔ مُلک کی ۷۰ کروڑ آبادی میں سے یہ پُشت در پُشت ایسی آبادی کے گروہ سے آتے رہے ہیں جو اس وقت ۳ فیصد سے بھی کم ہے۔ یعنی ۲ کروڑ سے زیادہ نہیں۔ اس میں سے ۴۰ لاکھ تو چھوٹے چھوٹے خاندانوں کے چشم و چراغ ہیں اور غالباً ۵ لاکھ بڑے خاندانوں کے۔ ان کنبوں کے لڑکے لڑکیاں چاہے وہ تعلیم حاصل کرنے کے اہل ہوں یا نہ ہوں، اسکولوں میں داخل ہوں گے۔ پھر ہائی اسکول پہنچیں گے۔ کالج میں آئیں گے اور وہاں سے یونیورسٹی میں۔ وہ ڈگری حاصل کریں۔ عام طور پر ایم۔ اے یا اس سے بھی آگے۔ اور کوئی ملازمت کر لیں گے۔ ذرا اپنے اردگرد نظر دوڑائیے۔ آپ کے کسی دوست کا کوئی بچہ جس کے خاندان میں پُشت در پُشت تعلیم کا چرچا رہا ہو۔ ڈگری کے بغیر ہے۔ یا جسے کوئی ملازمت نہ ملی ہو۔

یہ خاندان آسودہ حال ہیں۔ ان کو مراعات ملی ہوئی ہیں۔ یہ حکمران طبقہ ہے۔ جس کے لیے دوسرے ۶۸ کروڑ انسان محنت مزدوری کرتے ہیں اور ایسا مدتوں سے ہوتا آرہا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ہمارے ملک میں لوگوں میں نسل، زبان، ریاست، ذات پات سے اہم فرق پیدا نہیں ہوتا۔ بلکہ یہ فرق تعلیم کے ہونے یا نہ ہونے سے ہے۔ درحقیقت ہمارے

ہاں دو جماعتیں ہیں۔ ایک دوسرے سے قطعی مختلف۔ ۳ فیصد آسودہ حال۔ جنھیں پشتوں سے تعلیم کی سہولیات حاصل ہیں۔ اور باقی ۹۷ فیصد جنھیں پشتوں سے ہی تعلیم کی مراعات نہیں ملیں۔ اس طبقہ سے شاید ہر سال محض ۱۰ ہزار کے قریب لوگ آسودہ حال جماعت میں شریک ہوتے چلے گئے۔ اس سے کسی گروہ کا بھی رنگ روپ نہیں بدلتا، بلکہ ہوتا یہ ہے کہ نئے داخل ہونے والے بھی لکھے پڑھے گروہ کے طور طریقے اپنا لیتے ہیں اور ان کی قدریں بھی (جن کا میں نیچے ذکر کروں گا) پہلے آسودہ حال گروہ سے مل جاتی ہیں۔ تعلیم یافتہ لوگوں کے بچے بھی تعلیم یافتہ ہو جاتے ہیں اور بے تعلیم یافتہ لوگوں کے بچے بھی تعلیم حاصل نہیں کر پاتے۔ اور یہی کچھ پشت در پشت ہوتا آرہا ہے۔

میں نے جن باتوں کا اوپر ذکر کیا ہے، ان کا ثبوت کئی حقیقتوں اور مشاہدوں سے ملتا ہے مثال کے طور پر پرائمری اسکولوں کی نسبت ہمارے ہاں ہائی اسکول ہیں، جبکہ ہائی اسکول بھی اتنے ہی ہونے چاہئیں جتنے کہ پرائمری اسکول۔ جو طالب علم آئی آئی ٹیز [illegible] یا آل انڈیا انسٹی ٹیوٹ آف میڈیکل سائنسز یا انسٹی ٹیوشنس آف مینجمنٹ۔ یا سنٹرل سروسز یعنی آئی اے ایس، آئی ایف ایس، یا آئی پی ایس میں داخل ہوتے ہیں۔ ان کے اگر

> محنت سے تعلیم حاصل کرنے کی بجائے نقل، سٹرائیک اگر کم نمبر ہیں، اور بیرونی دباؤ اور بے ایمانی۔ ڈگری حاصل کرنے کے یہ آسان طریقے ہیں۔ (اور یہ وہ طریقے ہیں جنھیں اگر ماہرین تعلیم نے خود پیدا نہیں کیا تو کم از کم ان کو شہ دی ہے) وجہ یہ ہے کہ اگر آپ آسودہ حال طبقے سے آئے ہیں تو آپ کو محض ڈگری کی مہر درکار ہے، علم و فضل نہیں۔

بیک گراؤنڈ کا جائزہ لیا جائے تو واضح ہو جائے گا کہ یہ نوجوان مراعاتی طبقہ سے آتے ہیں اور ان کے خاندان میں تعلیم ہی ان کا طرۂ امتیاز تھی۔

لہذا ہمارے معلمین، آسودہ حال، استحقاق یافتہ اور استحصالی طبقہ سے آتے ہیں جن میں میں اور آپ۔ اور اس مضمون کو پڑھنے والوں میں سے ۹۵ فیصد شامل ہیں۔

ان کی قدریں کیا ہیں؟

ہندوستان میں ان لوگوں کے نقطۂ آغاز سے ہی اس امر کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ان پڑھے لکھے لوگوں کی قدریں لوٹ کھسوٹ کی بنیادوں پر قائم ہوں گی۔ ان میں سے اکثر تو وہ ہیں جنھیں باعزت، صاف ستھری، آسان۔ جہاں انھیں کم کام کرنا پڑے۔ اور جس کام کو ناپنے یا جانچنے کا کوئی معیار نہ ہو۔ ملازمت حاصل ہے۔ اسکول کے استاد کی طرح نہیں جس کا ہر قدم پر امتحان ہوتا ہے۔

یہ لوگ یقینی طور پر تعلیم یا اعلیٰ درس و تدریس سے دلچسپی نہیں رکھتے ہیں۔ اور اس کی ضرورت بھی کیا ہے؟ ان کے بچے ہر حال میں تعلیم حاصل کریں گے۔ ان کو ڈگریاں بھی مل جائیں گی اور پھر ملازمت بھی۔ چاہے وہ ان کے اہل تھے یا نہیں ہمارا تعلیمی نظام ہی کچھ ایسا ہے۔

محنت سے تعلیم حاصل کرنے کی بجائے۔ نقل، اسٹرائیک اگر کم نمبر ہیں اور بیرونی دباؤ اور بے ایمانی۔ ڈگریں حاصل کرنے کے یہ آسان طریقے ہیں۔ (اور یہ وہ طریقے ہیں جنھیں اگر ماہرین تعلیم نے خود پیدا نہیں کیا۔ تو کم از کم ان کو شہ تو دی ہے) وجہ یہ ہے کہ اگر آپ آسودہ حال طبقہ سے آئے ہیں تو آپ کو محض ڈگری کی مہر درکار ہے علم و فضل نہیں۔

ہمارے ماہرین تعلیم اور استاد پڑھنے پڑھانے یا مطالعہ میں دلچسپی نہیں رکھتے۔ ذرا دیکھئے تو یونیورسٹی کے ایک استاد کو کتنی کلاسیں لینا ہوتی ہیں اور اس کے مقابلے میں وہ کتنی کلاسیں لیتا ہے؟ اور اگر وہ کوئی کلاس لیتا بھی ہے تو کسی طالب علم سے پوچھئے کہ اس نے کلاس میں کیا پڑھا۔ ذرا بتائیے اس نے گذشتہ پانچ برس میں کتنی اچھی کتابوں کا مطالعہ کیا؟

محض خود غرضی

ان استادوں کو ۶۸ کروڑ عوام سے کوئی دلچسپی نہیں۔ ان کی توجہ کا بڑا مرکز ان کی اپنی ذات ہے۔ انھوں نے اپنی معمولی تعلیم کے دوران یا یوں کہئے کہ تعلیم کے سایے میں۔ اپنی کمزوریوں اور ناکامیوں کو چھپانے کا ڈھنگ یا بہانہ سیکھا ہے۔ وہ کہیں گے یہ سرکار کی خامی تھی۔ یا کسی اعلیٰ افسر کی نااہلی۔ یہ دوسروں کی خطا ہوگی۔ کسی طرح بھی ان کی اپنی نہیں۔ حالانکہ انھوں نے اسی نظام کی وجہ سے سماج سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھایا ہے۔ اسی سماج نے تعلیم جیسا بہترین تحفہ دیا۔ اور وہ بھی دوسروں کی قیمت پر۔

> ہمارے ماہرین تعلیم اور استاد پڑھنے پڑھانے یا مطالعے میں دلچسپی نہیں رکھتے۔ ذرا دیکھئے تو۔ یونیورسٹی کے ایک استاد کو کتنی کلاسیں لینا ہوتی ہیں۔ اور اس کے مقابلے میں وہ کتنی کلاسیں لیتا ہے اور اگر وہ کوئی کلاس لیتا بھی ہے تو کسی طالب علم سے پوچھئے کہ اس نے کلاس میں کیا پڑھا۔

سچ تو یہ ہے کہ ہماری اس ۳ فیصد آبادی نے اس بات کا کبھی دھیان نہیں کیا کہ انھیں کیسی قدر مراعات حاصل ہیں اور یہ کہ ان کی تعلیم باقیماندہ ۹۷ فیصد آبادی کی محنت و مشقت اور پسینہ کی کمائی کے خرچ کی مرہون منت ہے۔ بہت کم ایسے تعلیم یافتہ یا معلمین ہوں گے جنھیں ان لوگوں کی طرف اپنی ذمہ داریوں کا احساس ہوتا ہوگا جنھوں نے ان کی کامیابی کو ممکن بنایا۔ جنھیں اس امر کا خیال آتا ہوگا

سر اگر کھلے بندوں مقابلہ ہوتا اور ۷۰ فیصد کو بھی وہی مراعات ملتیں جو پڑھے لکھے خاندان کے لوگوں کو ملیں تو شاید وہ ۳۰ میں سے ایک بھی مقام حاصل نہ کر پاتے۔ یہ تو ظاہر ہے کہ مراعات سے عاری ۷۰ فیصد آبادی میں ایسے لوگ ہیں جو موجودہ پڑھے لکھے لوگوں سے کچھ کم عقلمند اور ہونہار نہیں ہیں۔ دلیل یہ ہے کہ عقلمندی محض برے ماحول کو اچھی طرح نپٹنے کا دوسرا نام ہے۔ اور ۷۰ فیصد آبادی سینکڑوں پشتوں سے بلکہ اس سے بھی زیادہ عرصہ سے چلتی چلی آئی ہے۔ یہ اس کی زندگی کا ثبوت ہے۔ اگر وہ نااہل یا کمزور ہوتے تو ڈارون کے نظریہ کے مطابق مٹ چکی ہوتی۔

ان کی توجہ کا بڑا مرکز ان کی اپنی ذات ہے انھوں نے اپنی معمولی تعلیم کے دوران یا یوں کہیے کہ تعلیم کے سایہ میں۔ اپنی کمزوریوں اور ناکامیوں کو چھپانے کا ڈھنگ یا بہانہ سیکھا ہے۔ وہ کہیں گے یہ سرکار کی خامی تھی یا کسی اعلیٰ افسر کی نااہلی۔ یہ دوسروں کی خطا ہوگی کسی طرح بھی ان کی اپنی نہیں۔ حالاں کہ انھوں نے اس نظام کی وجہ سے سماج سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھایا ہے۔

جرأت کا مظاہرہ نہیں کیا۔ یہ کسی وقت بھی تو کسی معاملہ میں دلیری سے کھڑے نہیں ہوئے۔ انھوں نے کبھی بھی تو اظہارِ مراعات یا اپنی پوزیشن کو کسی اعلیٰ مقصد کے حصول کے لیے خطرے میں نہیں ڈالا۔ انھوں نے کبھی بھی تو ایک سار ہو کر کسی ایسے مقصد کے لیے کوئی جدوجہد نہیں کی جو ان کے ذاتی مفاد سے بلند ہو۔ اکا دکا کسی نہ کسی نے کچھ کیا ہے۔ لیکن بحیثیت مجموعی جماعت یا گروہ کے نہیں۔ مجموعی طور پر یہ لوگ باطل پرست، توہم پرست اور پرانی لکیروں کے فقیر ہیں۔ انھیں نجومیوں پر اعتبار ہے۔ یہ ہومیو پیتھی پر یقین کرتے ہیں لیکن نظام ارتقا پر نہیں۔ ملک میں زوولوجی کے پروفیسر اور

مستثنیٰ قرار دیتا ہے۔ اصول پرستی اور ایمانداری دوسروں کے لیے ہے۔ ان کے لیے نہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو ریلوے ٹرین میں جگہ لینے کے لیے رشوت دینے سے گریز نہیں کریں گے۔ انکم ٹیکس کا جھوٹا بیان دیں گے۔ حکومت سے کم سود پر مکان کے لیے قرض حاصل کریں گے اور پھر اس سے مکان بنا کر بھاری بھرکم کرایہ پر دے دیں گے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنی طاقت، پوزیشن، اثر و رسوخ اور تعلقات کو استعمال کریں گے تاکہ کسی ایک کو ملازمت مل جائے یا ان کے اپنے لڑکے کو کالج میں داخلہ مل جائے۔ یا ٹریفک کے اصولوں کی صریحاً اور بڑی غلطی سے چھٹکارا حاصل کیا جاسکے۔ لیکن جب کوئی دوسرا ایسا کرتا ہو تو یہ لوگ چیخ چیخ کر اس کی مخالفت کریں گے۔ ان کا خیال ہے کہ دنیا ان کے لیے ہی بنی ہے اور وہی اس کے حقدار ہیں۔ ان کی خواہشات، ان کے ارمان اور ان کے تصورات کی تسکین ہونی چاہیے۔ چونکہ وہ خدا کا رُتبہ لے کر پیدا ہوئے ہیں اور اعلیٰ مراعات ان کا پیدائشی حق ہے۔ اصول پرستی اور دوسروں سے ہمدردی سے انھیں کوئی سروکار نہیں، انھیں سروکار ہے تو غیر ملکی اشیا سے۔ یا غیر ملکی دواؤں سے جس کو حاصل کرنے کے لیے وہ ذلیل سے ذلیل حرکت کرنے

نہیں ایسا نہیں

آپ خیال کرتے ہوں گے کہ ہمارے

جب سے ملک آزاد ہوا ہے۔ اس کی پوری تاریخ میں اس نام نہاد تعلیم یافتہ طبقہ نے کبھی بھی تو جرأت کا مظاہرہ نہیں کیا۔ یہ کسی وقت بھی تو کسی معاملہ میں دلیری سے کھڑے نہیں ہوئے۔ انھوں نے کبھی بھی تو اپنی مراعات یا اپنی پوزیشن کو کسی اعلیٰ مقصد کے حصول کے لیے خطرے میں نہیں ڈالا۔ انھوں نے کبھی بھی تو ایک سار ہو کر کسی ایسے مقصد کے لیے کوئی جدوجہد نہیں کی جو ان کے ذاتی مفاد سے بلند ہو۔

تعلیم یافتہ لوگ سیکولر ہوں گے۔ یا باہمت اور وہ محنت کو باعث عزت سمجھیں گے۔ یا کہ وہ انسان کے بنیادی حقوق کی قدر کرتے ہوں گے۔ ایسا نہیں ہے۔ ہمارے اکثر و بیشتر ماہر تعلیم یا تعلیم یافتہ طبقے سے تعلق رکھنے والے لوگ جہیز مانگنے والے۔ کم نظر۔ بیوی کو جلانے والے اور محنت کی قدر و منزلت اور انسانی حقوق کے احساس سے عاری ہیں۔ ہاں وہ اس کے خلاف آواز اٹھاتے ہیں۔ جب نزلہ ان پر گرتا ہے۔

جب سے ملک آزاد ہوا ہے۔ اس کی پوری تاریخ میں اس نام نہاد تعلیم یافتہ طبقہ نے کبھی بھی تو

اسی طرح دوسرے سائنس دان ہیں جو کلاس میں تو کہیں کہ انسان کا وجود آہستہ آہستہ عمل میں آیا۔ لیکن اپنی ذاتی زندگی میں اس کے برعکس نظریہ رکھتے ہیں یعنی یہ کہ خداوند تعالیٰ نے انسان کو جیسا کہ وہ بنا بنایا ہے۔ اسی طرح زمین پر نازل کردیا۔

بجائے خود مستثنیٰ

ہمارا تعلیم یافتہ طبقہ خود کو ہر اصول سے

سے نہیں چوکیں گے۔

یہ ہمارے تعلیم یافتہ لوگ ہیں جو رشوت ستانی اور فرسودہ خیالات کے ذمہ دار ہیں۔ ان ملکوں کے برعکس جہاں تعلیم محض ایک خاص طبقہ کی اجارہ داری نہیں۔ ہندوستان میں

راشٹریہ سویم سنگھ اور جماعت اسلامی کے ممبران کمیونسٹ پارٹی کے ممبران سے زیادہ تعلیم یافتہ ہیں۔

میں نے اب تک جو کہا اور جو کہنے جا رہا ہوں، اس سے ہٹ کر بھی مثالیں ملیں گی۔ ان کے سامنے میرا سر جھک جاتا ہے اور میں ان کی توقیر کرتا ہوں۔ ملک کو شاید اس امر کا احساس نہیں کہ ان لوگوں نے اس کو کیا کچھ دیا ہے۔ ان کی زندگی۔ ان کے کارنامے اور ان کی جد و جہد، سینما کی تصویروں سے کہیں زیادہ جاذبِ توجہ ہے۔ وہ ایسے گمنام ہیرو ہیں جن کی دلیرانہ کوششوں نے تعلیم کے اُجڑے ہوئے ڈھانچے کو ابھی تک سنبھالے رکھا ہے۔ لیکن ان کی پرواہ ہی کون کرتا ہے؟ بلکہ ہوتا یوں ہے کہ ہم ہر ممکن کوشش کرتے ہیں کہ یہ لوگ بے کار ہو جائیں۔

ان کے مقاصد

پہلے تو آئیے، یہ دیکھیں کہ ہمارے ماہرِ تعلیم اور معلمین کے مقاصد میں کیا کچھ شامل نہیں ہے۔ اور سچی تعلیم ان کے مقاصد میں نہیں ہے۔ ان کا یہ مقصد بھی نہیں ہے کہ وہ اپنی اس ذمہ داری کو نبھائیں جو ان پر ۹۰ فیصد آبادی کی طرف سے عائد ہوتی ہے۔ جن کی قیمت پر ان کی تعلیم ہوئی ہے۔ ہاں ان کا یہ مقصد ہے کہ وہ اونچے سے اونچا اٹھتے چلے جائیں۔ انھیں طاقت اور اقتدار حاصل ہو۔ یہ اقتدار کیسے بھی حاصل ہو۔ چاہے وہ اس کے اہل ہیں یا نہیں۔ ذرا عدالتوں میں ہمارے تعلیم یافتہ لوگوں کے مقدمات کی تعداد پر ہی نظر ڈال کر دیکھئے۔

ایک یونیورسٹی میں لیکچرار، ریڈر یا پروفیسر لگتے وقت جس قدر سفارشیں وصول ہوتی ہیں وہ ہی دیکھ لیجئے اور جن بنیادوں پر لوگ نکالے جاتے ہیں انھیں بھی دیکھئے۔ آخر اہلیت کا کہاں تک ان میں دخل ہوتا ہے۔ آپ کتنے ایسے لوگوں کو جانتے ہیں جنھوں نے ان سفارشات کو نظر انداز کیا۔ یا اس کے خلاف قدم اٹھایا۔ آپ ایسے کتنے لوگوں کو جانتے ہیں جو ایمانداری سے یہ قبول کرے کہ دوسرا شخص اس سے زیادہ اہل ہے۔ خاص طور پر اس وقت جبکہ وہ دوسری ذات برادری کا ہو یا دوسرے گروہ سے تعلق رکھتا ہو۔

ملک بھر میں ایسی کتنی تعلیم گاہیں ہوں گی، جہاں کسی ایک شعبے کے تمام ممبر مل جل کر رہتے ہیں۔ اور ایک دوسرے کے خلاف منہ نہیں کھولتے، جہاں ہر کوئی ایک دوسرے کا گلا کاٹنے کی کوشش میں نہیں تاکہ وہ کم سے کم وقت میں اور چھوٹے سے چھوٹے راستے سے ترقی کی سیڑھیاں طے کر جائے۔ تعلیمی کام اور ایمانداری جائے بھاڑ میں۔

> ملک میں زولوجی کے پروفیسر اور اسی طرح دوسرے سائنس دان ہیں۔ جو کلاس میں تو کہیں کہ انسان کا وجود آہستہ آہستہ عمل میں آیا۔ لیکن اپنی ذاتی زندگی میں اس کے برعکس نظریہ رکھتے ہیں۔ یعنی یہ کہ خداوند تعالےٰ نے انسان کو جیسا کہ وہ بنا بنایا ہے۔ اسی طرح زمین پر نازل کر دیا۔

ملک میں اس وقت ہمارے ماہرِ تعلیم اور اُستادوں پر آسان زندگی گذارنے اور پبلک ریلیشن کے ذریعے ترقی کرنے کا بھوت سوار ہے۔ ان کے خیالات میں جمود رہے۔ وہ تعلیمی مسائل کے ناقابلِ قبول حل پیش کرتے ہیں اور پھر وہ اس پر مُصر ہوتے ہیں کہ ان کو مان لیا جائے۔ تعلیمی ترقی سے ان کا کوئی سروکار نہیں ہوتا اس لیے وہ اپنی تعلیمی زندگی میں غیر اہم کام کرتے ہیں وقت گذار دیتے ہیں۔ اسلیے حیرانی کی کوئی بات نہیں کہ سائنس دانوں کی ہمارے ہاں اتنی تعداد تھی کہ دُنیا میں ہم تیسرے درجے پر آتے ہیں، لیکن جو کام ہم کرتے ہیں اس کا درجہ بیحد گھٹیا ہے۔

کسی عام معلم کے ہاں جائیے۔ چلئے وہ یونیورسٹی کا ایک اُستاد ہے دیکھئے تو وہ کیا پڑھ رہا ہے۔ اور اس کے ہاں کونسی کتابیں اور میگزین ہیں۔ آپ کو وہاں غالباً (India Today) یا (Femina) ملے گا اور اگر آپ اس سے کہیں کہ وہ ان پانچ سنجیدہ کتابوں (ہیرلڈ سی یا جیمز ہیڈلے چیز نہیں) کا نام لے دے۔ جو اس نے گذشتہ پانچ برس میں پڑھیں تو اسے مشکل پیش آئے گی۔ دوسرے مضامین کا تو ذکر ہی کیا۔ وہ اپنے مضمون میں بھی پچھڑ گیا ہوگا، لیکن جب وہ بات کرے گا تو پورے طمطراق سے۔ اس کے اُونچے اونچے مقاصد ہوں گے۔ جسے وہ اس نظام کے ذریعے حاصل کرنا چاہے گا۔ جس میں اوسط درجے کی عقل، خود غرضی اور بے ایمانی صفات بن گئی ہیں اور اہلیت، ایمانداری، اصول پرستی اور ذمہ داری عیب۔

> ان کی خواہشات، ان کے ارمان، اور ان کے تصورات کی تسکین ہونی چاہیئے۔ چونکہ وہ خدا کا رُوپ لے کر پیدا ہوئے ہیں اور اعلےٰ مراعات ان کا پیدائشی حق ہے۔ اصول پرستی اور دوسروں سے ہمدردی سے انھیں کوئی سروکار نہیں۔ ہاں انھیں سروکار ہے تو غیر ملکی اشیاء سے۔ یا غیر ملکی دواؤں سے جس کو حاصل کرنے کے لیے وہ ذلیل سے ذلیل حرکت کرنے سے نہیں چُوکیں گے۔

اور ان کے اعمال

جو ان کا شکار ہوتے ہیں، ان سے پوچھئے،

یعنی طلبا کی جماعت سے۔ ان سے پوچھیے کہ انھوں نے مُلک کے نامور معلّمین اور ماہرِ تعلیم سے حاصل کیا ہے تو کیا؟ رہنمائی؟ ہرگز نہیں، علم؟ خدا کی قسم یہ بھی نہیں۔ کوئی قابلِ اعتنا مثال؟ یہ بھی شاید نہیں۔ ان ہی وجوہات کی بنا پر طلبا میں بے چینی اور مایوسی ہے۔ اور وہ بے کار مظاہرے کرتے ہیں، اور مانگیں مانگتے ہیں۔ دیواروں پر اُول جلول تصویریں بناتے ہیں۔ ہمارے معلّمین اور ماہرِ تعلیم، غیراہم سیاست کے سب سے بڑے معاون ہیں۔ اگر ہماری تعلیم یافتہ جماعت مضبوط ہوتی یا یُوں کہیئے کہ یہ صحیح طور پر کوئی جماعت ہوتی تو ہمارے سب مسائل، جن میں طلبا کے مسائل بھی ہیں اور عمروں کا جو تفاوت پایا جانے لگا ہے، وہ اس حد تک نہ ہوتا جو اس وقت نظر آرہا ہے (سماجی طور پر، ایک جماعت ان افراد کا مجموعہ ہوتی ہے۔ جو ایک نظریے کو دانشمندانہ طور پر اپناتے ہیں اور وہ اس نظریے کو حاصل کرنے کے لیے اپنے ذاتی مفاد سے اُوپر اُٹھتے ہیں اور اپنے تن من دھن کو اس نظریے کو پایۂ تکمیل تک لے جاتے ہیں)

اگر ہمارے ہاں صحیح معنوں میں تعلیمی سماج ہوگا تو وہ ہماری سیاسی بُرائیوں کو روکنے میں مددگار ثابت ہوگا۔ اب ہمیں ایسے قانون ساز ملے ہیں جو ہمارے ماہرِ تعلیم اور استادوں کی دین ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ ہمارے معلّمین، ہمارے قانون سازوں سے یوں تو زیادہ پڑھے لکھے ہیں لیکن یہ بات یقینی ہے کہ ہمارے معلّمین ہمارے قانون سازوں سے صحیح طور پر زیادہ تعلیم یافتہ نہیں ہیں۔

اور کیا نتائج ہوں گے: سب سے اہم بات یہ ہے کہ اس وقت بہت تعداد میں ایسے لوگ یونی ورسٹی کے سلسلۂ تعلیم سے گذرتے ہیں جنھیں یہ موقع حاصل نہیں ہونا چاہئے تھا: وہ لوگ کسی دوسرے کام میں بہتر نتائج پیدا کرتے۔ شاید کوئی چمتکار دکھا پاتے۔

یہ ہمارے تعلیم یافتہ لوگ ہیں جو رشوت ستانی اور فرسودہ خیالات کے ذمہ دار ہیں۔ ان ملکوں کے برعکس جہاں تعلیم محض ایک خاص طبقہ کی اجارہ داری نہیں۔ ہندوستان میں راشٹریہ سویم سنگھ اور جماعت اسلامی کے ممبران کمیونسٹ پارٹی کے ممبران سے زیادہ تعلیم یافتہ ہیں۔

میں نے اب تک جو کہا اور کہنے جارہا ہوں اس سے ہٹ کر بھی مثالیں ملیں گی۔ ان کے سامنے میرا سَر جھک جاتا ہے اور میں ان کی توقیر کرتا ہوں۔ ملک کو شاید اس امر کا احساس نہیں کہ ان لوگوں نے اس کو کیا کچھ دیا ہے۔ ان کی زندگی ان کے کارنامے، اور ان کی جدوجہد سینما کی تصویروں سے کہیں زیادہ جاذبِ توجہ ہے۔ وہ ایسے گمنام ہیرو ہیں جن کی دلیرانہ کوششوں نے تعلیم کے اُجڑتے ہوئے ڈھانچے کو ابھی تک سنبھالے رکھا ہے۔ لیکن ان کی پرواہ ہی کون کرتا ہے؟

ہمارے تعلیمی نظام اور ہمارے ماہرینِ تعلیم نے اوسط درجے کے نوجوان پیدا کردیئے ہیں، اور دوسری طرف ہم، ۹۰ فیصد آبادی کی اہلیت کو استعمال کرنے سے محروم رہ گئے ہیں جو اس وقت مراعات سے عاری اور تعلیم یافتہ ہے۔

ان وجوہات کی بنا پر جہاں ہمارے ہاں تعلیم یافتہ لوگوں کی تعداد بہت زیادہ ہے وہاں اس کے مقابلے میں اہلیت کے اعتبار سے بہت کم ہے۔ اس سے مُراد یہ نہیں کہ ہم نے کچھ نہیں کیا میں نے اس سے قبل نہایت فخر سے اس بات کا ذکر کیا ہے کہ آزادی کے بعد ہم نے بہت کام کیا ہے لیکن یہ کامیابیاں ہمارے تعلیمی نظام یا ہمارے ماہرینِ تعلیم کی مرہونِ منّت نہیں بلکہ ان سے الگ تھلگ محض اسی طرح جس طرح ۱۹۳۰ء کے آس پاس ہم نے سائنس میں نوبل پرائز حاصل کیا۔ یہ کامیابی اس وقت کے تعلیمی یا سیاسی نظام سے کوئی تعلق نہیں رکھتی تھی۔ بلکہ اس کی راہ میں رکاوٹ ہوسکتی تھی۔

دوم طلبا میں نظم وضبط نہیں رہا۔ اور ان میں ناخوشی کی لہر دوڑ گئی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اگر ہمارے اُستاد اور ماہرینِ تعلیم ایسے ہوتے کہ طلبا ان کو مثالی رہبر سمجھتے تو بہت حد تک ہمارے مسائل پیدا ہی نہ ہوتے۔

اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اسی وقت جو طلبا اعلیٰ تعلیمی اداروں سے ہوکر نکلتے ہیں، ان کی اوسط تعداد ایسی ہے جن کی قابلیت نہایت معمولی ہوتی ہے۔ یہی لوگ مستقبل کے اُستاد ہوں گے۔ اس طرح یہ نظام دائمی بن جاتا ہے اور تعلیم کی بنا پر جماعتی تفاوت پُشت در پُشت پنپتا جاتا ہے۔

ہمارے قومی مسائل کے تین یا چار اہم وجوہ میں سے ایک یہ ہے کہ ہمارے ۱۵ فیصد لوگ صحیح معنوں

ملک بھر میں ایسی کتنی تعلیم گاہیں ہوں گی، جہاں کسی ایک شعبے کے تمام ممبر مل جل کر رہتے ہیں، اور ایک دوسرے کے خلاف منہ نہیں کھولتے۔ جہاں ہر کوئی ایک دوسرے کا گلا کاٹنے کی کوشش میں نہیں تاکہ وہ کم سے کم وقت میں اور چھوٹے سے چھوٹے راستے سے ترقی کی سیڑھیاں طے کر جائے تعلیمی کام اور ایمان داری جائے بھاڑ میں؟

میں تعلیم یافتہ نہیں ہیں اور یہ وجہ ہماری غربت، مفلسی، بیماری، مایوسی، وافر آبادی اور سب سے بڑھ کر کرپٹ کھسوٹ سے تعلق رکھتی ہے۔ کیا آپ نے کبھی صحیح تعلیم یافتہ شخص کو بندھوا مزدور دیکھا۔ یا یہ دیکھا کہ اس نے کسی کو بندھوا مزدوری میں رکھا ہو۔

اور حل

اول : مدتوں تک کا ایک ہی حل ہے۔ تعلیم کو عام کر دیا جائے۔ اس بات کو یقینی بنائیں کہ جس لڑکے کو اسکول میں جانا ہے وہ اسکول میں ہے اور اس کے بعد وہ ہائی اسکول تک جائے گا اور اسکول کی تعلیم میں ہر بچہ کو ایک ہی طرح کی سہولتیں میسّر ہوں گی۔ اس کا ذمہ دار سماج ہے، یا حکومتِ وقت۔ (اگر ہم نے اسکول کے درجہ کی تعلیم کا یوں خیال رکھا تو اعلیٰ تعلیم خود بخود سُدھر جائے گی)

اس لیے پبلک اور پرائیویٹ اسکولوں کو ختم کر دینا چاہیئے۔ اس کی جگہ سارے مُلک میں سرکاری انتظام کے اسکول ہونے چاہئیں، اسی طرح ہم اپنے اسکولوں کو عمدہ طور پہ چلانے کے اہل ہو سکیں گے اور تعلیم کا معیار بھی بلند ہو جائے گا۔

دوئم : اسکول کے استادوں کو ان کا وہ حق ملنا چاہیئے جس کے وہ اہل ہیں۔ ان کی عزت ہونی چاہیئے۔ انھیں اچھی تنخواہ دیجیے، ان کو ملک میں سب سے زیادہ تنخواہ پانے والا بنا دیجیے۔

سوئم :

اسکول کی تعلیم کو قومی دیکھ ریکھ میں لے کر ایسا نصاب بنائیے اور ایسی تعلیمی کتابیں تیار کیجئے کہ طلبا میں صحیح انسانی اقدار پیدا ہوں اور کسی خاص نظریے کو ان کے ذہنوں میں ٹھونسا نہ جائے، جو نظامِ اقتدار پیدا ہو اسے ہم صحیح طور پر بدیہی کہہ سکیں۔ تعلیم کبھی بھی اقدار سے عاری نہیں ہوئی، کہنے والے چاہے کچھ بھی کہتے رہیں، جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ تعلیم اقدار سے آزاد ہو، وہ دراصل یہ کہہ رہے ہیں کہ اس وقت جو اقدار ہیں وہ قائم رہیں اور یہ وہ اقدار ہیں جو آسودہ حال اور مراعات کار لوگوں کو اپنی پوزیشن بنائے رکھنے میں معاوُن ہیں اور غریب اور پچھڑے ہوئے طبقے کو آگے بڑھنے سے روکتی ہیں۔

چہارم :

جس قدر پرائمری اسکول ہیں۔ اسی تعداد میں ہائی اسکول بنائے جائیں۔ ان اسکولوں کی کم سے کم کیا ضرورتیں ہوں گی۔ اس کا جائزہ لیا جائے۔ مجھے یقین ہے کہ ان اسکولوں کی ضروریات پوری کی جا سکتی ہیں بشرطیکہ ہم ایسا کرنا چاہیں۔ ایسا کرنا ہمارے وسائل سے ممکن ہے۔ خاص طور پر موجودہ ٹیکنالوجی کے ہوتے ہوئے (میں نے جس قدر وسائل درکار ہیں اس کا ایک جائزہ نیو کوئسٹ (New Quest) کی جلد ۱۵۔ مئی، جون ۱۹۷۹ء میں صفحہ ۱۴۷-۱۴۸ میں دیا ہے۔)

سوال وسائل کا نہیں۔ آیا ہم یہ فراہم کر سکتے ہیں، یا نہیں۔ سوال یہ ہے کہ آیا ہم ایسا کرنا چاہتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں آیا ہمارے ماہرینِ تعلیم ایسا کرنا چاہیں گے، کیوں کہ آخرکار اس کا اثر تو ان پر اور ان کے طبقے پر پڑے گا۔

پنجم :

اور اب ہم آخری نکتہ پر آ پہنچے ہیں۔ ہمارے مُلک میں سیاست دان اور صنعت کار ایسے دو اور طبقے ہیں جو معلمین اور ماہرینِ تعلیم سے لگا کھاتے ہیں۔ (کچھ ماہرینِ تعلیم کو مستثنیٰ قرار دیا جا سکتا ہے)۔ حقیقت تو یہ ہے کہ گذشتہ ۵۰ برس میں تعلیم یافتہ بیوپاری اور سیاست دانوں کا گٹھ جوڑ ہی ملک کی مصیبتوں کا باعث بنا رہا ہے۔ اگر ان کے محور کو توڑا نہ گیا تو جو تجاویز پیش کی گئی ہیں وہ محض دیوانے کا خواب بن کر رہ جائیں گی۔

تعلیمی ترقی سے ان کا کوئی سروکار نہیں ہوتا۔ اس لیے وہ اپنی تعلیمی زندگی میں غیر اہم کام کرتے ہوئے وقت گذار دیتے ہیں۔ اس لیے حیرانی کی کوئی بات نہیں کہ سائنس دانوں کی ہمارے ہاں اتنی تعداد ہے کہ دُنیا میں ہم تیسرے درجے پر آتے ہیں۔ لیکن جو کام ہم کرتے ہیں اس کا درجہ بے حد گھٹیا ہے۔

کسی عام معلم کے ہاں جائیے، چلیے وہ یونیورسٹی کا ایک اُستاد ہے۔ دیکھیے تو وہ کیا پڑھ رہا ہے۔ اور اس کے ہاں کونسی کتابیں اور میگزین ہیں۔ آپ کو وہاں فے می نا (Femina) یا India Today ملے گا۔ اور اگر آپ اس سے کہیں کہ وہ ان پانچ سنجیدہ کتابوں (پیری میسن یا جیمز بانڈ نہیں) کا نام لے دے جو اس نے گذشتہ پانچ برس میں پڑھیں تو اسے مشکل پیش آئے گی۔

ہمارے ماہرینِ تعلیم یا معلم حقیقت میں
بیوپاری تھے، جو نیم سیاست دان بھی ہیں۔ سیاست

ہوئے ہیں اور جن کو مراعات حاصل نہیں ہیں۔
آج نہیں تو کل ان مسئلوں کا حل

افسوسناک ہے کہ موجودہ نظام طبقہ ملک کا تعلیم
یافتہ گروہ ہے، جس میں ماہرِ تعلیم اور معلمین

طلبا کی جماعت سے پوچھیے کہ انھوں نے ملک کے نامور معلمین اور ماہرِ تعلیم سے حاصل کیا ہے، تو کیا؟ رہنمائی؟ ہرگز نہیں۔ علم؟ خدا کی قسم یہ بھی نہیں۔ کوئی قابلِ اعتنا مثال؟ یہ بھی شاید نہیں۔ انہی وجوہات کی بنا پر طلبا میں بے چینی اور مایوسی ہے اور وہ بیکار مظاہرے کرتے ہیں اور مانگیں مانگتے ہیں۔ دیواروں پر اول جلول تصویریں بناتے ہیں۔

طلبا میں نظم و ضبط نہیں رہا۔ اور ان میں ناخوشی کی لہر دوڑ گئی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اگر ہمارے اُستاد اور ماہرین تعلیم ایسے ہوتے کہ طلبا ان کو مثالی رہبر سمجھتے تو بہت حد تک ہمارے مسائل پیدا ہی نہ ہوتے۔

دان اور بیوپاری دونوں خلط ملط ہو گئے اور کچھ کچھ پڑھے لکھے۔ لیکن مجھے اس میں ذرا بھی شک نہیں کہ میرے ہم وطن، جو اس وقت دبے

ڈھونڈھ ہی لیں گے۔ تاریخ اس امر کی شاہد ہے کہ کوئی قوم ہمیشہ مظلوم نہیں رہ سکتی۔ یا امر

شامل ہیں اور جو برہمنی روایات پر گامزن ہے۔

بقیہ:- دیگچی اور کیتلی کی داستان

سیکٹر کے کارخانوں کے انتظام یا ان کے فیصلوں کے بارے میں دخل انداز نہیں ہونا چاہیے۔ میں تو ایک قدم اور آگے جانا چاہوں گا اور وہ یہ کہ پبلک سیکٹر کے ان کارخانوں کو وزرا اور افسران کی گرفت سے کلی طور پر آزاد کر دینا چاہیے۔ اگر یہ قدم اُٹھا لیا جائے، تو بیورو کریٹ اور ٹیکنوکریٹ کے تنازع کی بنیاد ہی ختم ہو جاتی ہے۔ اور اب وقت آگیا ہے کہ اس تنازع کو ختم کر دیا جائے۔

میں اپنے فرض اور اپنے آپ سے انصاف نہیں کر پاؤں گا۔ اگر میں ان خطرناک نتائج کی طرف اشارہ نہ کروں جو پنجاب کے کرائیسس کی وجہ سے ریاست کے قریب قریب تمام انتظامیہ ڈھانچے کے ٹوٹ جانے سے پیدا نہ ہوئے ہوں۔ اور اگر سچ کہوں تو بہار میں بیورو کریسی اور انٹیلی جینس کا تمام ریاستی انتظامیہ کی حالت پنجاب سے بھی بدتر ہے۔

بھیونڈی کے فسادات نے یہ ثابت کیا ہے کہ پولیس اور انتظامیہ اس سے نپٹنے میں ناکام رہے ہیں اور اسی لیے ان کی مدد کو فوج بلانا پڑی۔ میں اپنے تجربے کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ اُتر پردیش اور بھارت کی دُوسری ریاستوں میں بھی انتظامیہ کی حالت کوئی بہتر نہیں ہے۔

پنجاب کے کرائسیس نے زوال کے رگ ریشے سے جو پردے اٹھائے ہیں، ان سے موقع پیدا ہوا ہے کہ ہم ہوش میں آئیں سوچ بچار کریں اور کوئی موثر قدم اٹھائیں کہ اس کا تدارک ہو سکے۔

سنسکرت کا ایک پُرانا مقولہ ہے کہ آگ لگنے کے بعد کنواں کھودنا شروع کرنا کوئی دانشمندی نہیں ہے۔
"ما کرپ خانم یک تم پرادینے دیا فی تا گرہے"

امریک سنگھ

پورا تعلیمی نظام زنگ آلود ہو چکا ہے

فاضل مضمون نگار، ایک مشہور و معروف ماہرِ تعلیم ہیں، اُن کی رائے میں بنیادی امر یہ ہے کہ تعلیمی نظام، بالخصوص اُونچی تعلیم کو اندر ہی اندر زنگ کھا چکا ہے۔ نیز اوپر سے نیچے تک ہر جگہ بدعنوانی گھر کر چکی ہے۔ اس کا جواز اگرچہ یہ دیا جاتا ہے کہ بدعنوانی تو ہر جگہ پر رہی ہے، تاہم ان کے نزدیک یہ کوئی دلیل نہیں ہے۔ کیونکہ تعلیم کا معاملہ دیگر شعبوں سے قطعی جُدا ہے۔

اکثر و بیشتر یہ سوال پوچھا جاتا ہے کہ اعلیٰ تعلیم کے ضمن میں وہ کون سا واحد اور اہم ترین مسئلہ ہے، جسے حل کیا جانا ہے۔ اس کے مختلف جوابات دیئے جاتے ہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ اُن تفصیلات میں جایا جائے۔ البتہ میری رائے یہ ضرور ہے کہ اس طرح کے جوابات میں اکثر بنیادی امر سے گریز کیا جاتا ہے۔ میرے مشاہدے کے مطابق بنیادی امر یہ ہے کہ اُونچی تعلیم کا نظام اندر ہی اندر زنگ خوردہ ہو گیا ہے۔ اس میں ہر طرف سے اور ہر سطح پر بدعنوانی آ چکی ہے۔ اس نظام میں انتظامی اور تعلیمی سطح نیز اس کی بنیادی ساخت کے اعتبار سے بہت سے ایسے بنیادی مسائل ہیں جو حل طلب ہیں۔ لیکن اُن میں اہم ترین بات یہ ہے کہ اعلیٰ تعلیم کو بدعنوانی کی لعنت سے پاک کیا جائے۔ کیونکہ حقیقت یہ ہے کہ اس کے بعد ہی اُن مسائل سے نمٹا جا سکتا ہے اور اُنھیں کسی حد تک حل کیا جا سکتا ہے۔

مجھے اس بات کا پُورا احساس ہے کہ میں نے ایک ہی سانس میں کئی جامع باتیں کہہ دی ہیں۔ ان میں سے کچھ کو چیلنج بھی کیا جا سکتا ہے اور چیلنج کیا بھی جائے گا۔ لہٰذا یہ اہم ہے کہ بدعنوانی کی صراحت اور وضاحت کر دی جائے۔ لفظ بدعنوان کے لغوی معنی بیان کرنے ضروری نہیں۔ ایک فرد سِنِ بلوغ تک اس شعور کو ضرور پہنچ جاتا ہے کہ وہ مستحق کتنا پانے کا ہے اور اُسے ملتا کیا ہے۔

> میرے مشاہدے کے مطابق بنیادی امر یہ ہے کہ اونچی تعلیم کا نظام اندر ہی اندر زنگ خوردہ ہو گیا ہے۔ اس میں ہر طرف سے اور ہر سطح پر بدعنوانی آ چکی ہے۔ اس نظام میں انتظامی اور تعلیمی سطح نیز اس کی بنیادی ساخت کے اعتبار سے بہت سے ایسے بنیادی مسائل ہیں جو حل طلب ہیں۔

یہاں یہ حقیقت بھی پیشِ نظر ہونی ضروری ہے کہ کچھ ایسے بھی لوگ ہیں جن کو اپنے بارے میں غلط تصورات ہیں اور وہ اصلیت سے زیادہ خود کو مُبالغہ آمیز طور پر حقدار سمجھتے ہیں۔ تاہم ایسے معاملات کو خاطر میں نہ لانا چاہیئے۔ لیکن کچھ حقائق کھُلے ہوتے ہیں۔ اُن کی سچائی کو تسلیم کرنا لازمی ہوتا ہے اور اُن کے ساتھ اُسی طرح پیش آنا بھی ضروری ہے۔ مثال کے طور پر ایک یونیورسٹی کے پروفیسر کو کسی ادارے کی تربیت کی سند، نیز کچھ نہ کچھ تدریسی و دیگر تجربہ حاصل کرنا ہی ہوتا ہے۔ اگر کوئی ایسا فرد، جو ان لوازمات سے عاری ہو، پروفیسر بننے کی آرزو کرے یا فی الواقعی پروفیسر بن جائے، تو میں اسے بدعنوانی سمجھوں گا۔ ہر کوئی اس اُصول سے اتفاق نہیں کرے گا، لیکن پھر یہ معاملہ ہے بھی تو ایسا، جس میں تصفیہ کرنا اتنا آسان بھی نہیں ہے۔ اس بارے میں، اس بات پر بہت کچھ مُنحصر ہوتا ہے کہ ایک شخص کا اندازِ نظر کیا ہے۔

آئیے کچھ توقف اور غور و فکر کریں:-

یونیورسٹی پروفیسر کی مذکورہ مثال دینے کی ایک وجہ ہے۔ اُن ممالک میں جہاں یونیورسٹی نظام مستحکم اور اچھی وقعت کا حامل ہے، ایک تسلیم شدہ روایت ہے کہ کس قسم کا آدمی یونیورسٹی پروفیسر ہونا چاہیئے۔ مذکورہ روایت کو ایک اصول کی شکل میں بیان کرنے کی کوشش کرنا ہمیشہ کامیاب نہیں ہو سکتا۔ لیکن اتنا تو ماننا پڑے گا کہ ایک یونیورسٹی پروفیسر ایک اچھا عالم ہوتا ہے اور تحقیق نیز تحقیق کرنے والے کی رہنمائی کرنے کا کچھ تجربہ رکھتا ہے، نہ صرف یہ، بلکہ وہ یہ بھی جانتا ہے کہ اسی کے منتخبہ میدانِ مطالعہ میں، نیز

اُن معلومات، جن میں آپ کی دلچسپی ہے، کے شعبوں میں کیا کیا ہو رہا ہے۔

اگر ایک یونیورسٹی پروفیسر سے متعلق اس نظریے کا اطلاق ہم اپنے گردوپیش کے مشاہدے پر کریں، تو یہ واضح ہوگا کہ ان عہدوں پر فائز ۸۰ ۔ ۹۰ فیصد لوگوں کو وہاں نہیں ہونا چاہیئے تھا۔ یو جی سی کے تازہ ترین احکام، جن کے تحت مقررہ مدت گزرنے پر لگ بھگ خود بخود ترقی ہوتی جاتی ہے، کے الفاظ کے بعد صورتِ حال نمایاں طور پر اور بھی بگڑ گئی ہے۔ کچھ ایسی بھی یونیورسٹیاں ہیں، جہاں کچھ شعبوں میں ایک درجن پروفیسر ہوتے ہیں، جب کہ ریڈر محض دو اور لکچرار ایک بھی نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ ایسی صورتِ حال ہر جگہ نہ ہو۔ لیکن یہ حقیقت کہ کچھ ایسے ادارے ضرور ہیں، جہاں ایسا ہوتا ہے، اسی کے لیے وجہ جواز یہی ہے کہ ہم اس صورتِ حال پر غور و فکر کریں۔

> ہم جو کچھ اپنے چاروں طرف دیکھتے ہیں، میرے نزدیک اس کا سبب یہ ہے کہ ہم کیا کچھ پانے کے مستحق ہیں اور ہمیں کیا کچھ ملا ہے اُن لوگوں کے درمیان کوئی ربط قائم نہیں کر سکتے ہیں۔ اس میں ایسے متعدد فیصلے شامل نہیں جن میں سے ہر ایک پر اعتراض ہو سکتا ہے۔

ایک سابق رکن جامعہ کے یہ الفاظ ایسے معلموں کی ایک بڑی تعداد میں غم و غصہ کی لہر دوڑا دیں گے اور اس موضوع پر کچھ لعنت نامے بھی سپردِ قلم کر دیے جائیں تو بھی حیرانی کی بات نہ ہوگی۔ لیکن یہ حقیقت اپنی جگہ پر قائم ہے کہ یہ صورتِ حال قابلِ علاج ضروری ہے۔

ہم جو کچھ اپنے چاروں طرف دیکھتے ہیں، میرے نزدیک اس کا سبب یہ ہے کہ ہم کیا کچھ پانے کے مستحق ہیں اور ہمیں کیا کچھ ملا ہے اُن لوگوں کے درمیان کوئی ربط قائم نہیں کر سکتے۔ اس میں ایسے متعدد فیصلے شامل نہیں جن میں سے ہر ایک پر اعتراض ہو سکتا ہے۔ مزید برآں، سب اشیاء کو کسی ایک ہی زاویے سے نہیں دیکھا جا سکتا۔ ہر وہ شخص، جو یہ محسوس کرتا ہے کہ اسے ہدفِ تنقید بنایا جا رہا ہے، اگر زیادہ نہیں تو درجن بھر ایسے نظائر دریافت کر لے گا، جہاں زیادہ نااہل لوگوں نے وہ کچھ حاصل کیا، جس کے وہ مستحق نہیں تھے۔ اُن کا ایسا کہنا بالکل دُرست ہوگا، نیز اُن کے قول یا ادراک سے اختلاف کرنا ممکن نہ ہوگا۔

یہی بات مجھے صاف صاف کہنا ہے، اُونچی تعلیم کو اندر ہی اندر زنگ کھا چکا ہے، نیز اوپر سے نیچے تک ہر جگہ بدعنوانی ہی بدعنوانی چھائی ہوئی ہے۔ چانسلر، جنھیں باوقار اور بے لوث طریقے پر کام کرنا چاہیئے، ہمیشہ ایسا نہیں کرتے، ایسے معدودے چند افراد کو چھوڑ کر، جن کا جائزہ انداز میں وائس چانسلر بننے کا استحقاق بنتا ہے اور وہ اس عہدے پر فائز بھی ہو جاتے ہیں۔ باقیماندہ لوگ اُن عہدوں کے مطلقاً اہل نہیں ہیں، جن پر وہ فائز ہیں۔ ڈینوں، پروفیسروں، ریڈروں اور لکچراروں کے بارے میں بھی یہی بات صادق آتی ہے۔ ہر سطح پر یہ کمزوری راہ پا چکی ہے۔ ۱۵ ۔ ۲۰ برس قبل لفظ کمزوری موزوں تر ہوتا۔ لیکن اب ماہیتی تبدیلی وقوع پذیر ہو چکی ہے۔ تبھی لفظ بدعنوانی استعمال کیا جا رہا ہے۔ لفظ بدعنوانی کی میری تعریف اس کے عام معانی سے کہیں زیادہ وسیع ہے، اس کا کلیدی مفہوم اس تعلق کو بیان کرتا ہے، جو کسی شخص کی اہلیت اور حصول و آرزومندی کے مابین ہوتا ہے۔

> اونچی تعلیم کو اندر ہی اندر زنگ کھا چکا ہے نیز اوپر سے نیچے تک ہر جگہ بدعنوانی ہی بدعنوانی چھائی ہوئی ہے۔ چانسلر جنھیں باوقار اور بے لوث طریقے سے کام کرنا چاہیئے، ہمیشہ ایسا نہیں کرتے، ایسے معدودے چند افراد کو چھوڑ کر، جن کا جائزہ انداز میں وائس چانسلر بننے کا استحقاق بنتا ہے اور وہ اس عہدے پر فائز بھی ہو جاتے ہیں۔ باقیماندہ لوگ اُن عہدوں کے مطلقاً اہل نہیں ہیں، جن پر وہ فائز ہیں۔

جداگانہ نوعیت

بدعنوانی کا آغاز ضابطۂ تعلیم میں نہیں ہوتا۔ زیادہ تر یہ اور کہیں شروع ہوتی ہے اور پھر ضابطۂ تعلیم میں سرایت کر جاتی ہے اور "کہیں" کی صراحت کرنا مشکل ہے، کیونکہ ضابطۂ تعلیم کے باہر کا ہر امر "اور کہیں" ہوتا ہے، ضابطۂ تعلیم کے باہر اس قدر بدعنوانی ہے کہ اگر یہ زہر ضابطۂ تعلیم میں بھی نفوذ کر چکا ہے تو اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں۔ لیکن پھر میری دلیل کا اہم حصہ یہ ہے کہ ضابطۂ تعلیم دیگر سبھی امور سے الگ ہے۔

تعلیم وہ چیز ہے، جو ہمیں زندگی کے حقائق کا سامنا کرنے کے لیے تیار کرتی ہے، اگر ہم اس عمل میں بد اطوار بن جاتے ہیں تو یہ ایسے ہی ناگزیر ہے، جیسے کہ رات کے بعد دن ہے، یعنی مابعد کی زندگی میں بھی یہی بد اطوار ملحوظِ نظر رہا ہے، بیشتر چال چلن اور طریقِ کار پر حاوی رہے گا۔ اگرچہ بدعنوانی کی ابتدا اور کہیں ہوتی ہے، تاہم یہ مختلف طرز پر ظہور پذیر ہوتی ہے اور ضابطۂ تعلیم کے رگ و پے میں سرایت کر جاتی ہے۔ یہ عمل کافی پہلے شروع

ہوا۔ یہاں تک کہ اب ایسا ضابطۂ تعلیم سراسر بدعنوانی کا شکار ہو چکا ہے۔ وہ لوگ جو زندگی میں ضابطۂ تعلیم کے وسیلے سے داخل ہوتے

کا آغاز کہیں اور ہوتا ہے۔ پر اُس کا شکار وہ بنتے ہیں۔ کافی حد تک وہ صحیح بھی ہیں۔ لیکن کیا کوئی شخص کسی ایسے شخص کو جانتا ہے جو زندگی میں کوئی بھی حیثیت رکھتا ہو اور یہ تسلیم کرنے کو تیار ہو کہ اِس

کام کرے، بلا لحاظ اس کے کہ دوسرے کیا کرتے ہیں یا نہیں کرتے، تاکہ جو کچھ کیا جائے اُس میں بدعنوانی کا شائبہ نہ ہو۔ کسی بھی شخص کو استحقاق کے مطابق آمدنی کرنی چاہیئے۔ دونوں میں ربط کے فقدان کے باعث مسائل پیدا ہو جاتے ہیں۔ ایک شخص کے استحقاق

> بدعنوانی کی ابتدا خواہ اور کہیں ہوئی ہو، لیکن چونکہ یہ پہلے ہی ضابطۂ تعلیم کو متاثر کر چکی ہے اور تعلیم کے بعد ہی انسان زندگی کے مختلف گوشوں میں قدم رکھتا ہے، لہٰذا یہ صورتِ حال ایک چکر بن کر رہ گئی ہے۔

[اپنے سا]تھ چھوت کو اپنے ہمراہ لاتے ہیں، ایک لحاظ سے اس طرح یہ چکر پورا ہو جاتا ہے۔ بدعنوانی کی ابتدا خواہ اور کہیں ہوئی ہو، لیکن چوں کہ یہ پہلے ہی ضابطۂ تعلیم کو متاثر کر چکی ہے

معاملے میں پہل کرنا اور جو کچھ ہو رہا ہے اُس کا قلع قمع کرنا، اُس کا کام ہے؟ ہر کوئی اپنی ذمہ داری دوسرے پر ڈالتا ہے۔ "آپ پورا چکر کاٹ لیں، پر ایسا ایک آدمی بھی نہیں ملے گا"

اور کامیابیوں میں باہمی تعلق ہونے کی بات کوئی عجیب و غریب بات نہیں ہے، بودھوں کا تصورِ دھرم بالکل اسی خیال کی شکل ہے یورپی اصطلاح میں، جب افلاطون عدل کی

> ٹھوس اصطلاح میں، یہ دیکھنے کی ضرورت ہے کہ تعلیمی اداروں میں داخلے اور جماعت کے کمروں میں پڑھائی کے انداز اور سال کے آخر میں ہونے والے امتحانات کے طور طریق کیا ہیں۔ انھیں دیکھ کر یہ بات بغیر کسی شک کے صاف ہو جاتی ہے کہ یہ سب اپنے مقصد سے کوسوں دور ہیں۔

اور تعلیم کے بعد ہی انسان زندگی کے مختلف گوشوں میں قدم رکھتا ہے، لہٰذا یہ صورتِ حال ایک چکر بن کر رہ گئی ہے۔ کسی فرد، گروہ یا کسی ادارے کو بھی اس کے لیے موردِ الزام ٹھہرانے سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ امرِ واقعہ یہ ہے کہ تمام تر نظام میں یہ بیماری لگ چکی ہے۔

جو یہ تسلیم کرنے کو تیار ہو کہ اِس سلسلے کو توڑنا اُس کی ذمہ داری ہے۔ خواہ ایک سیاستدان ہو یا ایک منتظم، یا ایک معلم، سبھی ایک جیسے ہیں۔ ہر ایک کے پاس ایک ہی جواب ہے۔ ہر کوئی دوسرے کو قصوروار ٹھہراتا ہے۔ کوئی

بات کرتا ہے، تو وہ بھی یہی کچھ بیان کرتا ہے۔ جو گیتا میں لکھا ہے، وہ بھی ہمارے مبحث کا ایک طرح سے ترجمہ ہے، کسی شخص کے استحقاق اور اصل یافت میں کسی انحراف سے معاشرتی اور قانونی اصطلاحات میں ایک قسم کا عدم توازن پیدا

> صاف لفظوں میں، ہم اپنے قابلِ اعتراض رویے کے وسیلے سے یہ چھوت پھیلانے والے بن جاتے ہیں۔ اگر ہم یقینی طور پر یہ بیماری دوسروں کو لگاتے ہیں، تو سوال اٹھتا ہے کہ کیا ہم اپنی ذمّے داریوں کے تئیں لاپروائی برت سکتے ہیں؟ امرِ واقعہ یہ ہے کہ یہ سوال شاذ و نادر ہی پوچھا جاتا ہے۔

یہ المناک منظر

یہ سوال دریافت کرنا زیادہ برمحل ہوگا کہ ایسی صورتِ حال کو کیسے سنبھالا جائے۔ اس کا کوئی صاف جواب نہیں ہے۔ ضابطۂ تعلیم سے متعلق کوئی بھی شخص ہمیں یہ بتائے گا کہ خرابی

بھی یہ تجویز ماننے کو تیار نہیں ہے کہ کہنے کو یہ کھیل کھیلنے سے انکار کر کے، وہ اس سلسلے کو منقطع کر دے گا۔
لیکن اِس سلسلے کو کہیں نہ کہیں توڑنا تو ہے ہی۔ مثال کے طور پر، ہر شخص کو چاہیئے کہ وہ ٹھیک

ہو جاتا ہے، اور یہ وہی نقص ہے جو بدعنوانی کا روپ دھار لیتی ہے۔

بس اس سے آگے نہیں

ٹھوس اصطلاح میں، یہ دیکھنے کی ضرورت ہے کہ تعلیمی اداروں میں داخلے اور جماعت کے

کمروں میں پڑھائی کے انداز اور سال کے آخر میں ہونے والے امتحانات کے طور طریقے کیا ہیں۔ انھیں دیکھ کر یہ بات بغیر کسی شک کے صاف ہو جاتی ہے کہ یہ سب اپنے مقصد سے کوسوں دور ہیں۔ کلیدی کردار ادا کرنے والے معلموں کی تربیت، انتخاب اور بھرتی کا کل طریقِ عمل پاس و لحاظ سے ملوث ہوتا ہے۔ جس کے باعث گہری چھان بین ممکن نہیں ہوتی۔ متوسط درجے میں پھیلے اس زہر کی مثال کے طور پر میں نے اس مظہر کا کسی اور جگہ تجزیہ بھی کیا ہے، امر واقعہ یہ ہے کہ یہ زہر زندگی کے ہر دیگر شعبے میں چھوت لگا چکا ہے، لہٰذا ضابطۂ تعلیم سے تعلق رکھنے والا ہر فرد کہتا ہے کہ یہ کہاں کا ہمارا فرض ہے کہ ہم نیک و پارسا بنے رہیں، جب کہ دوسرے بد اطوار بننا چاہتے ہیں؟۔
اس سوال کا میری طرف سے دیا جانے والا جواب یہ ہے کہ پیشے کے تقاضے اس کا مطالبہ کرتے ہیں۔ ہم میں سے وہ جو ضابطۂ تعلیم سے متعلق ہیں، انھوں نے قصداً یا سہواً ایسا پیشہ اختیار کیا ہے، جس میں عیاری یا بدمعاشی کی شکل ہی سے گنجائش ہے۔ جو کچھ ہم کرتے ہیں ہم تک ہی محدود نہیں رہتا۔ وہ ان لوگوں تک بھی پہنچ جاتا ہے جو ہمارے رابطے میں آتے ہیں، یعنی ہمارے طلباء۔ صاف لفظوں میں ہم اپنے قابلِ اعتراض رویّے کے وسیلے سے یہ چھوت پھیلانے والے بن جاتے ہیں۔ اگر ہم یقینی طور پر یہ بیماری دوسروں پر لگاتے ہیں تو سوال اٹھتا ہے کہ کیا ہم اپنی ذمہ داریوں کے تئیں لاپروائی برت سکتے ہیں؟۔

امر واقعہ یہ ہے کہ یہ سوال شاذ و نادر ہی پوچھا جاتا ہے اور اس وجہ سے ہم لگ بھگ گزشتہ ربع صدی سے بے مقصد چلتے جا رہے ہیں۔

کسی نہ کسی کو، کسی نہ کسی مرحلے پر، یہ کہنا ہی ہوگا کہ بس اب اس سے آگے نہیں۔ میری رائے میں وہ واحد پیشہ، جو یہ انداز اختیار کرنے پر مجبور ہے، معلمی کا پیشہ ہے۔ جب معلم "دوسروں" کی طرح کام کرنے لگیں تو اس کا مطلب ہے کہ وہ پیشے کے سماجی تقاضوں سے روگردانی کر رہے ہیں۔ معلمی ایسا پیشہ نہیں ہے، جو کہ خانگی یا نجی ہو۔ اس کا عمل کسی معمار یا ہنرمند فرد کی مانند صرف اپنی تخلیق تک ہی محدود نہیں ہوتا۔ بلکہ اس کے سماجی اور معاشرتی مضمرات ہوتے ہیں۔ کئی پیشے ایسے ہیں، جن میں سماجی اثرات کا فوری اور صریحی اظہار ہوتا ہے، مثلاً صحافت کا پیشہ۔ سماج پر اثر انداز ہونے والے سبھی پیشوں میں کردار کے نتائج کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اُن کو نظر انداز کرنا اپنے پیشے سے اِنحراف کے مترادف ہے۔

کسی نہ کسی کو، کسی نہ کسی مرحلے پر، یہ کہنا ہی ہوگا کہ بس اب اس سے آگے نہیں۔ میری رائے میں وہ واحد پیشہ، جو یہ انداز اختیار کرنے پر مجبور ہے، معلمی کا پیشہ ہے۔ جب معلم "دوسروں" کی طرح کام کرنے لگیں تو اس کا مطلب ہے کہ وہ سماجی تقاضوں سے روگردانی کر رہے ہیں۔ معلمی ایسا پیشہ نہیں ہے، جو کہ خانگی یا نجی ہو۔

کئی پیشے ایسے ہیں، جن میں سماجی، اثرات کا فوری اور صریحی اظہار ہوتا ہے، مثلاً صحافت کا پیشہ۔ سماج پر اثر انداز ہونے والے سبھی پیشوں میں کردار کے نتائج کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اُن کو نظر انداز کرنا اپنے پیشے سے اِنحراف کے مترادف ہے۔

امتحانات کا یہ طور طریقہ

مذکورہ بیان کا زیادہ تر حصہ بغیر کسی واضح مثال کے موٹے طور پر بیان کر دیا گیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ جو کچھ کہا جا رہا ہے، اُسے یا تو ہر کوئی سمجھ نہیں پائے گا، یا لوگ اُس سے متفق ہوتے ہوئے بھی، اس کا مطلب صاف اور واضح طور پر نہیں جان پائیں گے۔ لہٰذا جو کچھ کہا جا رہا ہے، اُس کی کم از کم ایک ٹھوس مثال پیش کرنا معاون ثابت ہوگا۔

ہم اپنے ملک میں امتحانات سے متعلق اُس نظام میں بیحد اعتقاد رکھتے ہیں جو ہمارے یہاں گزشتہ برسوں میں قائم کیا گیا ہے۔ اکثر کوششیں یہ ہو رہی ہیں کہ اسے امریکی رواج کے مطابق بدل دیا جائے۔ جہاں کہ اُستاد ہی اپنے شاگرد کی صلاحیتوں وغیرہ کا اندازہ لگا لیتا ہے۔ لیکن اکثر کوششیں بار آور ثابت نہیں ہوئیں۔ آئی آئی ٹی اور زراعتی یونیورسٹیوں کو چھوڑ کر فقط جواہر لال نہرو یونیورسٹی ہی ایسی ہے، جس میں اس طریقہ پر عمل کیا جاتا ہے۔ ذرا کسی اُستاد سے بات کر کے دیکھئے تو پھر آپ کو پتہ چلے گا کہ وہ اس نظام سے چھٹکارا پانے کا کس قدر حامی ہے۔ یہی نہیں، سرکاری امتحانات کا نظام گزشتہ چند برسوں میں غیر معمولی طور پر مقبول ہوا ہے۔ کمال یہ ہے کہ عوام کی بڑھتی

تعداد اس کی برائیوں سے واقف ہے۔ اور ان میں ماہرِ تعلیم اور دیگر لوگ بھی شامل ہیں، لیکن وہ اسے پھر بھی ایک کمتر برائی تصور کرتے ہیں۔

اس کے جواز کے لیے صرف ایک ہی بات کہی جاتی ہے کہ چونکہ اسے گمنام طور پر چلایا جاتا ہے، اس لیے اس میں کسی داخلی عنصر کے کارفرما ہونے کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ کیا خود علامتی کی اس سے بری کوئی اور صورت ہو سکتی ہے، کہ ہم اپنے رفقاءِ کار کی اُن کے ناموں سے کی گئی تشخیص پر تو بدگمانی کریں، لیکن اگر یہی لاشخصی طور پر کی جائے تو ہم اُس پر اپنی آنکھوں پر پٹی باندھ کر اعتبار کرنے پر تیار ہوں۔

> ہر وہ شخص جو کالج یا یونیورسٹی میں پڑھ رہا ہے، جانتا ہے کہ امتحانات میں کیا ہوتا ہے۔ کئی جگہوں پر تو صورتِ حال اس قدر بگڑ چکی ہے کہ ایماندار فرد بہت نقصان میں رہتا ہے، اور عیار اور کھوٹے لوگ پھلتے پھولتے ہیں، دوسرے لوگ محض اس تسلی کے ساتھ رہ جاتے ہیں کہ اُنھوں نے ایمانداری سے کام لیا۔

اس کا جواز خواہ کچھ بھی ہو، یہ ایک صداقتِ محض ہے، اور گزشتہ کئی دہوں میں اس نظام کو تبدیل کرنے کے لیے کی گئی سبھی جرأت مندانہ کوششوں کے باوجود ہم اس کے ساتھ چپکے ہوئے ہیں۔ اور اس امر کا غالب امکان ہے کہ ہم ابھی کچھ اور آئندہ سالوں تک اسی حالت میں رہیں گے۔

> جب تک زندگی کے حُسن کو حاصل کرنے کی تلاش دائم نہ ہو، اُونچی تعلیم بے سود ہے۔ جو کچھ سیکھا جائے اور جس طریقے پر سیکھا جائے اور پھر اُس کا تجزیہ کیا جائے ہر دو کے درمیان مخلصانہ بنیادوں پر تعلق قائم ہونا ضروری ہے، ورنہ تو اعلیٰ تعلیم کا مقصد ہی فوت ہو جائے گا۔

صرف کھوٹے آدمیوں کے لیے

امتحانات کے سلسلے میں واقع ہونے والی بدعنوانی بھی اُتنی ہی قابلِ مذمت ہے۔ ان میں جو کچھ ہوتا ہے، اُس کا کوئی ثبوت دینے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہر وہ شخص جو کالج یا یونیورسٹی میں پڑھ رہا ہے، جانتا ہے کہ امتحانات میں کیا ہوتا ہے۔ کئی جگہوں پر تو صورتِ حال اس قدر بگڑ چکی ہے کہ ایماندار فرد بہت نقصان میں رہتا ہے۔ اور عیار اور کھوٹے لوگ پھلتے پھولتے ہیں۔ دوسرے لوگ محض اس تسلی کے ساتھ رہ جاتے ہیں کہ انھوں نے ایمانداری سے کام لیا۔

ظاہر ہے کہ یہ ایک ناقابلِ برداشت صورتِ حال ہے۔ ایمانداری ٹوٹے میں ہے۔ اور مکاری کے وارے نیارے ہیں۔ اس مسئلے کو ہم کیسے حل کریں؟ انفرادی طور پر یہ عوام کی ایک بہت بڑی تعداد کی تشویش ہو سکتی ہے۔ اس مسئلے کو حل کرنے کا واحد طریقہ یہ ہے کہ ہر شخص ایمانداری اور دیانت سے کام کرے۔

لیکن کچھ ایسی مایوسی کا عالم طاری ہو چکا ہے کہ ایمانداری کا ذکر کرنا مذاق اُڑانا ہے۔ اس بات کو سمجھنا کہ ایسا کیوں کر ہے کوئی مشکل بات نہیں ہے، ایسا ردِ عمل کمزوری، غیر مستقل مزاجی، ارادے کے فقدان یا اُس سے بھی بدتر حالت کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ تاہم، معاشرتی رویے کی اصلاح میں کیا کوئی شخص اس مسئلے کے تئیں ایک الگ اندازِ نظر کی سفارش کر سکتا ہے؟

اونچی تعلیم، جس کے ضمن میں میں اپنا آپ کو کسی قابل سمجھتا ہوں، کے بارے میں بدعنوانی کی بات کر کے میں کسی تقریر بازی، سنسنی خیزی یا عصبی خلل کا مظاہرہ نہیں کر رہا ہوں بلکہ اس کا مقصد صورتِ حال کو اس کے صحیح تناظر میں تسلیم کرنا ہے۔ جب تک زندگی کے حُسن کو حاصل کرنے کی تلاش دائم نہ ہو، اُونچی تعلیم بے سود ہے۔ جو کچھ سیکھا جائے اور جس طریقے پر سیکھا جائے اور پھر اس کا تجزیہ کیا جائے۔ ہر دو کے درمیان مخلصانہ بنیادوں پر تعلق قائم ہونا ضروری ہے، ورنہ تو اعلیٰ تعلیم کا مقصد ہی فوت ہو جائے گا۔

اگر ایک دفعہ ہم یہ دو نہایت ضروری باتیں تسلیم کر لیں، تو ہر چیز اپنی جگہ پر آ جائے گی۔ طلبا اپنی بہترین صلاحیت سے کام کریں گے اور معلم بھی ویسے ہی کام کریں گے، جیسے کہ انھیں کرنا چاہیے۔ اگر یہ دونوں باتیں ہونے لگیں، تو بدعنوانی اپنے آپ ہی دُور ہو جائے گی۔ بدعنوانی بس یہی کچھ تو ہے کہ ایک شخص اپنے حق سے زیادہ پانے کی کوشش کرتا ہے۔ اور یہ بُرائی اُس ذہنی کیفیت کا نتیجہ ہوتی ہے، جس میں ایماندارانہ کام کو ندامت کی علامت سمجھ لیا جاتا ہے۔

جسٹس وی. آر. کے آئر

ایک استحصالی نظام کی پاسبانی

> ممتاز مضمون نگار کی رائے میں ہمارا ذی اثر برگزیدہ طبقہ، جو اونچے پیشوں میں لگا ہوا ہے، اپنی اُس جدید خصوصی مہارت کو، جس کے بغیر ملکی ترقی ایک قرونِ وسطیٰ کا ساعمل، بزنبدمذاق پر مبنی ناکامی اور جمہوری تباہی ہوگی، اجارہ دارانہ گرفت سے اپنے تسلط میں رکھے اور گھیرے ہوئے ہے۔ موصوف نے مزید کہا ہے کہ ہمارے لیے سوائے اس بات کے کوئی چارہ نہیں کہ یہ حکماً کہا جائے کہ ماہر پیشہ ور تبھی اپنا کام کرسکیں گے، بشرطیکہ اُنھیں یہ قبول ہو کہ وہ عوام الناس کے لیے اپنے آپ کو جمہوری طریقِ کار کا پابند کریں گے۔ یہ عوام الناس وہ ہیں، جو کہ مجبور اور ستم رسیدہ ہیں، نہ کہ ناز و نعم میں بگڑا ہوا طبقہ اُمراء۔

ڈزریلی نے ایک بار کہا تھا "میں اِس بات کا اعادہ کرتا ہوں کہ تمام اقتدار ایک امانت کی مانند ہوتا ہے، اور ہم اس کے استعمال کے بارے میں جوابدہ ہوتے ہیں۔ اور یہ کہ یہ عوام سے حاصل ہوتا ہے اور لازماً اسے عوام ہی کے لیے قائم رہنا چاہیے۔ یہ نہایت اہم امانتی ہدایت ہمارے آئین کے ابتدائیے "ہم ہندوستانی" کے اعتقادی جملے میں مضمر ہے۔ ہمارے ملک کا ذی اثر برگزیدہ طبقہ، جو اُونچے پیشوں، عالمانہ کاموں نیز مقبولِ عام کاموں میں لگے ہوئے ہیں" اپنے اپنے کام کی اُس جدید خصوصی مہارت اور پیچیدہ جانکاری کو، جس کے بغیر ملک کی منصوبہ بند ترقی ایک قرونِ وسطیٰ کا ساعمل، بدمذاقی پر مبنی ناکامی اور جمہوری تباہی ہوسکتی ہے، اجارہ دارانہ گرفت سے اپنے تسلط میں رکھے اور گھیرے ہوئے ہے۔ پس ہمارے لیے کوئی اور چارۂ کار نہیں رہ جاتا کہ ہم حکماً کہیں کہ پیشوں کو اُسی صورت میں چلتے رہنے کی اجازت دی جائے گی، جب اُنھیں یہ منظور ہو کہ وہ عوام الناس کی فلاح کے لیے اپنے آپ کو جمہوری طریقِ کار کا پابند کریں گے، وہ عوام الناس جو کہ ایک مجروح اور مقہور طبقہ ہے، نہ کہ ناز و نعم میں بگڑا ہوا طبقہ، امراء۔

دراصل ایک قاعدے کی صداقت کو ثابت کرنے والی استثنیات کے ساتھ، پیشے اور عوام ایک طرح کے دُور کے پڑوسی ہوتے ہیں۔ یہ بات برنارڈ شا کے اسی تیکھے جملے کی یاد دلاتی ہے کہ سبھی پیشے عوام کے خلاف سازشات ہوتے ہیں۔

دراصل ایک قاعدے کی صداقت کو ثابت کرنے والی استثنیات کے ساتھ، پیشے اور عوام ایک طرح کے دُور کے پڑوسی ہوتے ہیں۔ یہ بات برنارڈ شا کے اس تیکھے جملے کی یاد دلاتی ہے کہ سبھی پیشے عوام کے خلاف سازشات ہوتے ہیں۔

پھر سے بنیادی واضح سمت متعین کرنے کا استدلال:-

ذی فہم گروہ کے سازگار امکانات، جو سماج کی فلاح و بہبود کو ترقی دینے کے لیے مختلف پیشوں میں منظم کیے گئے ہیں، اگر انہی میں عوام کی متعین شدہ ترقی پسند بنیاد پر جان ڈالی جائے تو یہ ایک نعمت عظمیٰ ہوگی۔ جب تک ایسا نہیں ہوتا کہ قانونی پیشے میں لگے ہوئے لوگ، کثیر تعداد میں عوام کی مدد کو آئیں، قانونی خواندگی کو پھیلائیں، مساوی انصاف کے لیے لڑیں، قانونی نظام کو عدالتی چارہ جوئی، نیز ایک معمولی سے معمولی اور گم شدہ شخص تک پہنچنے والی دیگر تخلیقی کارروائیوں کے توسط سے بدل دیں، ایک فعال قانون کی عملداری، اپنی جمہوری جگجوئی اور ایک معمولی ہندوستانی کے سیاسی، شہری، ثقافتی اور اقتصادی و معاشرتی حقوق کی نگہبانی کے لحاظ سے آج کی طرح محض ایک بڑا بول ہی رہے گا۔

جب تک طبی پیشے کو اس بلند مقصد کے حصول کے لیے مناسب طور پر حرکت میں نہیں لایا جاتا، ہمارا قومی صحتی منصوبہ بندی جس کی بدولت ہمارے کثیر آبادی والے سماج کے ہر ایک فرد کو کم از کم اقل ترین طبی امداد اور حفظانِ صحت سے متعلق بنیادی ضروریات کی یقین دہانی کرائی گئی ہے محض ایک خواب

ہمارا جھگڑا طب کا کوئی بھی ایسا نظام ہے مطلب ہے جو بھلے ہی کسی بھی نظریے کا پابند ہو، لیکن وہ اپنی پیشہ ورانہ خدمات سے عوام کو مستفید کرنے کا اہل نہ ہو، غریبوں کے لیے مکانات فراہم کرنے، گاؤں کو برقیانے، دیہی و اصلاحی نظام تعمیر کرنے، ملک میں صنعتی کارخانے کھولنے، نیز سرکاری شعبے کی معیشت کو مستحکم کرنے کے لیے ہمیں انجینئری کے پیشے میں دل و جان سے شمولیت کی ضرورت ہے۔

نیچے عوام تک پہونچنے والا، نیز آئین کی اقداری انتہا پسندی سے متاثر تعلیمی انقلاب اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتا، جب تک کہ درس گاہوں کو اس کاز کے لیے جہاد کرنے کے لیے تحریک نہیں دی جاتی۔ ہم قوم ترقی کے ایسے میداوں کی تعداد اور بڑھا سکتے ہیں، جن میں لازمی طور پر روشن خیال طبقہ، اپنی خصوصی ہنرمندیوں اور اعلیٰ مہارتوں سے عوام کے لیے اپنے آپ کو وقف کر کے، ترقی کے سفر نما کے طور پر کام کر سکتا ہے۔ آخر تبدیلی کے لیے بنیادی لوازمات کیا ہیں۔

میرے نزدیک اس طرح کے چند لوازمات میں پیشوں سے متعلق وہ نئے اصول اور ضابطۂ اخلاق جن میں عوام کے مفاد کو اہمیت دی گئی ہو، اور اس کے لیے اپنائی گئی وہ ٹیکنالوجی جو تیسری دنیا کے ملکوں سے ہم آہنگ ہو، جہاں زندگی کی سرگرمیوں میں عوام کی بہبود اور شرکت کو اولیت دی گئی ہو اور نچلے طبقے کو ان کے ساتھ وابستہ کیا گیا ہو اور ان کے دل و دماغ کی تخلیقی صلاحیتوں سے بھی کام لیا گیا ہو۔ اس طرح کا نظام اس طریقِ حیات سے نجات پانے کے لیے ضروری ہے جو طبقۂ امرا کے چند ہاتھوں میں ہے، اور جس کی بنیاد زر پرستی پر ہے۔ اور جو نوآبادیاتی نظام کی وراثت سے دی گئی ذہنیت کے تابع ہے۔ دورِ حاضر میں ہندوستان میں دیہی اور شہری غیر استحصالی یافتہ طبقے کے افراد کی اکثریت ہے، چنانچہ یہی عمل ترقیاتی ذمہ داریوں کو پورا کرنے اور عوام کے ساتھ روحانی رابطہ قائم کرنے میں معاون ہو سکتا ہے۔

یہ طور ماہر پیشہ ور سائنسدانوں کو بھی اپنی ایک نئی اور واضح سمت متعین کرنا ہے۔ "پیشے برائے عوام" نام کی تحریک پر معاشرتی ضروریات کا عنصر، نہ کہ بازار کی معیشت کی اخلاقیات غالب ہونی چاہئیں، نیز اسے قوم کے جمہوری کاروائی نامے پر سرِ فہرست رکھا جانا چاہیے۔ نیز پیشہ ورانہ ضابطۂ تو اللہ تعالیٰ میں نوآبادیاتی ورثے کو ترک کر دینے کا مطالبہ آج بھی اتنا ہی اہم ہے۔ ڈزریلی نے ایک مرتبہ کہا تھا "لندن ہندوستان کی سیاست کی کنجی ہے"۔ افسوس کہ ہمارے پیشوں کے بارے میں آج بھی یہ بات زیادہ تر صحیح ہے۔

ماضی کا خمار:- زورِ جان کے لیے اپنے الفاظ کو دہراتے ہوئے میں یہ کہوں گا کہ ہندوستان کے برگزیدہ ماہرین، ماضی کے خمار کے انداز میں بندر کی سی نقالی کے ساتھ اینگلو فیشن اختیار کرتے ہیں اور اپنے ان گوروں برٹش ہم سروں کی اخلاقیات اور طریقِ عمل اپناتے ہیں، جن کے مقابلے میں سارے نوآبادیاتی نظریے کے مطابق کوئی بھی رفعت نشین نہیں تھا۔ لیکن، آئینی لحاظ سے، اونچے درجے کے گراہک، وہ لوگ نہیں ہیں، جو بلا شرکتِ غیرے، پیشے اختیار کرنے کے لیے حقِ ملکیت ادا کرتے ہیں۔ تیسری دنیا کے حالات کے مماثل کسی اشتراکی جمہوریہ میں ایک اصلی حلقۂ انتخاب ادنیٰ ترین طبقے کے افراد سے عبارت ہوتا ہے۔ لہٰذا ہمیں تمام پیشوں کے اصولوں اور پابندیوں، ہوشمندی اور لیاقت کی کارکردگی کے زاویے سے سماجی جانچ کرنا ہے، مسخ شدہ حالات کو صحیح کرنا ہے، اور نئے تخلیقی افق وا کرنے ہیں۔ کیوں کہ انگریز راج کے قواعدِ اخلاق اور جمہوریہ کی نہایت اہم امانتی ہدایات میں تضاد ہے۔

پرٹش انڈیا کی روایات سے بڑھ کر، انقلابی تغیر و تبدل وہ قیمت ہے، جو کسی ہندوستانی پیشہ ورانہ اجارے کو ادا کرنی پڑتی ہے، کیوں کہ آئین میں درج بنیادی اقدار نئے نئے حلقے فراہم کرتی ہیں۔ جو انگریزوں کے دورِ حکومت میں تو غیر موجود تھے، لیکن جب آزادی نے ترقی کو متحرک معنی عطا کیے تو یہ فوری نوعیت کے حامل ہو گئے۔ مالدار لوگوں کے بٹوؤں پر نظر رکھتے ہوئے، پیشہ ورانہ تربیت، مزاج اور ٹیکنالوجی کے ضمن میں کیے جانے والے قدیم نیز اوروں کی رہنمائی میں کیے جانے والے دورے، اب ہمیں غلط منزلوں پر لے جاتے ہیں، کیوں کہ

> **لہٰذا ہمیں تمام پیشوں کے اصولوں اور پابندیوں، ہوشمندی اور لیاقت کی کارکردگی کے زاویے سے سماجی جانچ کرنا ہے، مسخ شدہ حالات کو صحیح کرنا ہے، اور نئے تخلیقی افق وا کرتے ہیں۔ کیونکہ انگریزی راج کے قواعدِ اخلاق اور جمہوریہ کی نہایت اہم امانتی ہدایات میں تضاد ہے۔**

> **مالدار لوگوں کے بٹوؤں پر نظر رکھتے ہوئے، پیشہ ورانہ تربیت، مزاج اور ٹیکنالوجی کے ضمن میں کیے جانے والے قدیم نیز اوروں کی رہنمائی میں کیے جانے والے دورے اب ہمیں غلط منزلوں پر لے جاتے ہیں، کیونکہ جیسا کہ کوسوک اعلانیے میں درج ہے "ترقی سے مراد اشیاء کو ترقی دینا نہیں ہونا چاہیے، بلکہ انسان یعنی ہندوستانی فرد کی ترقی ہونا چاہیے۔"**

جیسا کہ گوشیلک اعلانیہ میں درج ہے' "ترقی سے مراد اشیاء کو ترقی دینا نہیں ہونا چاہیئے' بلکہ انسان یعنی ہندوستانی فرد کی ترقی ہونا چاہیئے۔

عوامی عنصر

جدید پیشوں میں جس اہم ترین جمہوری ہدایت کا گہرا اثر پڑنا چاہیئے' وہ ہے عوامی عنصر یعنی اُس عام آدمی کے تئیں فرض کی ادائیگی جو اِن معاشرتی حکمران طبقوں کو قانونی طور پر دیئے گئے اقتدار کو جائز قرار دیتی ہے۔ قانون کا اصل مدعا یہ ہونا چاہیئے کہ وہ اس کے ماہروں کو اس کا پابند بنادے کہ وہ خدمت کے جذبے سے کام کریں اوران کی ہُنرمندیوں کو عوام کے وسیع تر مفاد کے لیے کام میں لایا جاسکے۔ وہ محض پُرانے فنون اور حکمتِ عملی تک ہی محدود نہیں رہتا ہے جس میں کہ وہ اداروں کے مفاد کے سلسلے میں پہلے ہی طاق سمجھے جاتے ہیں بلکہ انھیں ذہنی بیداری اور نئے خیالات سے کام لینا ہے۔ ان کا یہ عمل بھی سماج کی بہبود سے متعلق سرگرمیوں کو انجام دینے کے کام میں چوکس دینے کے اصول کی بجائے فلاحی پالیسیوں کے اصل مدعا کو سامنے رکھ کر انجام پانا چاہیئے۔

ہُنرمندیوں اور مسخ شُدہ اُصولوں کا انداز، مختصراً عالمانہ اور شُرفا کے پیشوں کا اسلوب اور تار و پود ایسے رویّوں اور رشتوں کو عیاں کرتے ہیں' جو اُن ترقی پسند مقصودات اور بڑے مقاصد کے مخالف ہوتے ہیں' جنھیں تیسری دُنیا کی زندہ منطق سمجھا جاتا ہے۔ بھارت میں موجودہ بدعنوانی کے سیاق و سباق میں' ایک زبردست نظام کی اعانت کے بغیر' قدیم پیشوں کی روائتی ترتیب کے ساتھ بُنیادی انقطاع ایک ایسا کمال ہوگا' جس کی صِدقِ دِلی سے تمنا کرنی چاہیئے۔ عوام کی ترقی میں لگائی ہوئی انسان دوست ٹیکنالوجی' اشتراکی نظر رکھنے والا ترقی پسند پیشہ ورانہ وفود' معاشرتی انصاف کو مقدم رکھنے والا ایک عوام سے باخبر با اُصول ضابطہ' ایک پاک وصاف منضبط مستقل علم اور ثقافت کی مزاحمت کرنے والی راست بازی' مریخ وہ شئے ہیں' جو ہندوستانی پیشہ ورانہ منڈلی میں کمیاب ہیں۔

> بھارت میں موجودہ بدعنوانی کے سیاق وسباق میں' ایک زبردست نظام کی اعانت کے بغیر' قدیم پیشوں کی روائتی ترتیب کے ساتھ بنیادی انقطاع ایک ایسا کمال ہوگا' جس کی صِدق دِلی سے تمنّا کرنی چاہیئے۔

عوام النّاس کے مفاد میں' مساوی بُنیادی حقوق کے آئینی اختیار کا انحصار جائز پابندیوں پر ہوتا ہے۔ ہماری جمہوریہ ہر پیشے سے توقع رکھتی ہے کہ وہ فقط ہندوستانی عوام کے تئیں اپنا فرض ادا کرے۔ یہ نظریاتی تبدیلی اور آئینی جبرا اجارہ دارانہ پیشوں کے متعلق اصول رکھنے والے اراکین کو قانونی طور پر پابند کرتا ہے کہ وہ اپنے تناظر کو باضمیر بنائیں' اپنی خصوصی مہارت میں انسانی عنصر شامل کریں' اپنے اوزاروں کو حساس بنائیں' عوام کے تئیں جوابدہ ہونے کی ذمہ داری قبول کریں' نیز خود میں ایسا معاشرتی اور جمہوری عقیدہ پیدا کریں جو بدیہی طور پر ہماری اشتراکی اور لادینی جمہوریہ سے منعکس

> تاہم جھوٹ اور سچائی ایک دوسرے کی کھلی اُڑاتے ہیں۔ سماج کے تئیں خود کو پابند کرنے کے بلند تر معیارات اکثر سطحی ہوتے ہیں مگر ہر جائز و ناجائز طریقے سے اپنے معاملے میں جیت حاصل کرنے کا جذبہ عمیقِ رُوح تک گہرا ہوتا ہے۔ انحطاط کے اس دَور نے کسی بھی اونچے دھندے کو نہیں بخشا۔

رکھتا ہو۔ عوام کے لیے پیشوں کا یہ ایک پسندیدہ ترین ذوق اور تصوراتی منشار ہے۔

ایک پیشے سے کیا مُراد ہے ؟

ایک پیشے سے کیا مُراد ہے ؟ اس کی وضاحت کے لیے ضروری ہے کہ اس کی تعریف ہم یوں کریں۔ رسکوئے پاؤنڈ نے "لائر فرام اینٹی کوئٹی ٹو ماڈرن ٹائمز (۱۹۵۳) میں یوں لکھا ہے۔

" ایک روائتی باوقار دھندے کے مقابلے میں ایک پیشے میں بہت کچھ ہوتا ہے۔ اس اصطلاح سے مُراد لوگوں کے ایک ایسے گروہ سے ہے' جو خدمتِ خلق کے جذبے سے ایک عالمانہ فن کو بطور ایک عام دھندے کے اختیار کرتے ہیں۔ برسبیلِ تذکرہ' اگرچہ یہ دھندا روزی کمانے کا ذریعہ بھی ہوسکتا ہے' تاہم یہ خدمتِ خلق سے کم تر نہیں ہونا چاہیئے۔ کسی عالمانہ فن کو خدمتِ خلق کے جذبے سے اپنانا پہلی شرط ہے۔"

امریکہ کی عدالتِ عالیہ کے جسٹس برنڈیس نے ایک پیشے کے ضمن میں مندرجہ ذیل تین معیارات مقرر کئے ہیں۔

اوّل : ایک پیشہ وہ کاروبار ہوتا ہے' جس میں محض ایک ہُنرمندی سے بغاوت کے طور پر معلومات اور کچھ حد تک علمیت پر مشتمل روشن خیال نوعیت کی ابتدائی تربیت ضروری ہوتی ہے۔

دوم : یہ ایک ایسا کاروبار ہوتا ہے' جسے

محض خود کے لیے نہیں، بلکہ زیادہ تر اوروں کے لیے اختیار کیا جاتا ہے۔

یہ ایک ایسا کاروبار ہوتا ہے، جس میں مالی منفعت کو کامیابی کا مسلمہ پیمانہ نہیں مانا جاتا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ دیگر پیشوں میں قانون، طب اور جمع خرچ نویسی ایسے پیشے ہیں، جو شرفاء کے لیے مخصوص ہیں۔ نظریاتی طور پر، ایک پیشے میں بہتری کے لیے خدمتِ خلق کی تحریک، نیز تیز فہم بنائی ہوئی خصوصی مہارت غالب رہتی ہے۔ اُس میں ایک ضبط اور بلند اُصول کی رہنمائی ہوتی ہے، نیز اُس میں کمال اور گراہک کی مادی کامیابی کو اُتنی اہمیت نہیں دی جاتی۔

تاہم جھوٹ اور سچائی ایک دُوسرے کی کھلی اُڑاتے ہیں۔ سماج کے تئیں خود کو پابند کرنے کے بلند تر معیارات اکثر سطحی ہوتے ہیں مگر ہر جائز و ناجائز طریقے سے اپنے معاملے میں جیت حاصل کرنے کا جذبہ عموقِ روح تک گہرا ہوتا ہے۔ اختلاط کے اس دَور نے کسی بھی اُونچے دھندے کو نہیں بخشا۔

پیشہ وری کا دماغی خلل کا زہر

مفادِ نفسی بنام مفادِ عامہ، کم مایہ گراہکوں سے بے نیاز ہوکر مالدار طبقے کی ضروریات کو پُورا کرنے کے لیے کوئی پیشہ کرنے کے خصوصی حق کا استحصال کرنا، سماج کے افلاس کے مقابلے میں شرفاء کے پیشوں کا اچھوت پن اور ناقابلِ رسائی، اور وہ اصول اور حکمت عملیاں جو سُننے میں بہت بڑھیا، پڑھنے میں پُرشکوہ، اخباری تقریروں میں انتہائی انسان دوست، لیکن حقیقی عمل میں بےکار، تکلیف دہ فریب نظر نیز غیر سچائی کے وعدے! یہ ہے ہندوستانی پیشہ وری کا دماغی خلل کا زہر، جو خواہ قانون کا پیشہ ہو یا طب یا محاسبی کا، یا کوئی اور، ہر جگہ پھیلا ہوا ہے۔ اپنی جمہوری لپیٹ میں معاشرتی انصاف برگزیدہ پیشہ وری کا ایک دُور کا پڑوسی ہے۔ جمی کارٹر جب امریکہ کے صدر تھے، تو انھوں نے لاس اینجلز بار ایسوسی ایشن کی صدی کی تقریب کے موقع پر کہا تھا:۔

"وکلا ہم پر بہت غالب رہے ہیں۔ بارسوخ اور بااثر وکلا نے شہری حقوق اور معاشیاتی انصاف کے خلاف جدوجہد کی رہنمائی کی ... انھوں نے خود اپنے پیشے میں جدتوں کے خلاف جنگ کی ... ایک پیشے کی حیثیت سے انھوں نے معاشرتی انقلاب نیز معاشیاتی اصلاحات، ہر دو کی مزاحمت کی۔"

دیگر پیشے بھی انہی کے ہم خیال ہیں، نیز امیروں اور با اقتدار لوگوں کی چاکری کرتے ہیں۔ اِن پیشوں کو غریبوں کے مسائل سے کوئی سروکار نہیں ہے اور وہ اُن کے لیے غیر اہم ہیں۔

ایسا کونسا اجتماعی علاج ہے، جو سماج، بالخصوص اس کے کمزور طبقوں کے لیے عالمانہ پیشوں کو، خود کو اُن کے لیے وقف کر دینے کے احساس کا ٹیکہ لگا سکتا ہے؟ پیشہ ورانہ بدچلنی سے نمٹنے کے لیے، اعلیٰ سطح کے بیرونی عناصر رکھنے والی تنظیموں کی جانب سے کون سے فیصلہ کُن انتظامی قواعد مرتب کیے جائیں؟ انتہائی طور پر پیسے ہوئے، لیکن ناپدید افراد کے لیے، اوزاروں اور تکنیکی طریقوں کو کس طرح باتعلق بنایا جائے؟ معاشرے کی سماج دشمن ٹکڑیوں کے خلاف کس نوع کی محاربانہ کارروائی کی جائے؟ کیا ہم اپنے پیشوں سے متوقع حقیقی اقتدار پرستی تخلیق کرنے کی غرض سے اُن میں جدت لا سکتے ہیں؟ موٹے طور پر یہ جمہوری، مجاہدانہ اور اشتراکی ضمنی معنی ہیں۔ دفعہ ۱۹ (۴) کے تقاضے اصلح کے اُصول کو، ہمارے سماج کی ترقیاتی ضروریات کے لیے، ہماری پسماندہ اقتصادی صورتِ حال کے لیے ایک بامعنی تصور کے طور پر، ایک واضح سمت دینا ضروری ہے۔ یہ ایک ٹھوس حقیقت ہے کہ ہر پیشے کی نمایاں جمعیتیں اکثر اپنے فنون کو طبقۂ امرار اور سیاست دانوں کی ضروریات کے مطابق تشکیل دیتی ہیں، نیز معاشرتی عدل کے خواستگار، لاتعداد افراد سے اجتناب کرتی ہیں۔

نظریہ اور مقصد

پیشوں کے اخلاقی اصول دل نشین دکھلائی دیتے ہیں۔ لیکن اُونچے طبقے کے عالم کُھلی تجارت کے اصول پر عمل کرتے ہوئے اپنی صلاحیت اور پیشہ ورانہ وقار کو اس بازار میں فروخت کر دیتے ہیں۔ جہاں انھیں زیادہ قیمت ملے۔ ماسوائے بڑے سرمایہ داروں اور قانون شکن جماعتوں کے سب سے زیادہ بولی کون دے سکتا ہے اور کیوں؟

امیروں کی نہیں بلکہ لاکھوں عوام انسانوں کو سامنے رکھ کر ایک انقلابی آواز اٹھانا ہوگی۔ ایک بنیادی تبدیلی لانا ہوگی۔ تاکہ ایک نیا عوامی اخلاق اور قوم کی خدمت کا شدید جذبہ اُبھارا جاسکے۔ اور یہی آواز ہے جس کی اعلیٰ پیشہ وروں کو اپنے فرض کی طرف جھنجھوڑ سکتی ہے۔

یہ صدا چھوٹے لوگوں کی کُندالنی شکتی کو جلد ہی بیدار کر دے گی۔ تاکہ وہ حاکموں، ججوں،

یہ ایک ٹھوس حقیقت ہے کہ ہر پیشے کی نمایاں جمعیتیں اکثر اپنے فنون کو طبقۂ امرار اور سیاستدانوں کی ضروریات کے مطابق تشکیل دیتی ہیں، نیز معاشرتی عدل کے خواستگار، لاتعداد افراد سے اجتناب کرتی ہیں۔

محاسبوں، پولیس، ڈاکٹروں کا محاسبہ کرسکیں اور اخلاق کو قبولیت عام کا درجہ دے سکیں۔ اور وکیلوں، محاسبوں اور ڈاکٹروں کا ضمیر جگا سکیں۔ یہ اس تحریک کا نظریہ اور مقصد ہے، جسے "عوام کے لیے پیشوں" کا نام دیا گیا ہے۔ جو انفرادی بہبود کی بجائے انتظامی تبدیلیوں کی خواہاں ہے۔

ہر پیشہ ور جماعت میں ایک ایسا نیک صاحبِ دل پیدا ہونا چاہیئے اور ایک صحیح ہندوستانی تمدنی انقلاب رونما ہونا چاہیئے۔ جو ایک ایسی اخلاقی رُوح پھونکے کہ تمام پیشے طاقتوروں کی بجائے کمزوروں کی خدمت کریں۔ محض الفاظ تراشی اور لَن ترانیوں سے نہیں بلکہ ایماندارانہ کوششوں سے ملک و قوم کی عوامی بہبود کے وسائل اور فنون سے خدمت کریں۔ ان اعلیٰ پیشوں میں اس خدمت کا بھاری خزانہ موجود ہے۔

مختلف پیشوں سے یہ جمہوریت جو غریب انسانوں کا ہندوستان ہے۔ اس سماجی انصاف کی توقع تو کرسکتی ہے۔

دو مالکوں کی خدمت ناممکن

نفسِ موضوع یہ ہے کہ پیشے ایک ہی وقت میں دو مالکوں کی خدمت نہیں کرسکتے یعنی عوام اور خواص، کارخانہ دار اور مزدور۔ حضرت عیسٰی اور غدار یہودی۔ محروم پانڈو اور غاصب کورو۔

پیشوں کے اندر ایک ایسی مجاہدانہ تحریک پیدا ہونی چاہیئے، جو ان میں "پیشے برائے عوام" اور بھارت سے گہرے حب الوطنی کے جذبے کو پیدا کرسکے۔ ہمیں ایسے پیشہ وروں کی ضرورت ہے جو دیس کے سماجی حالات کے مطابق ہوں۔

ہمارے آئین میں جسے ہم نے اپنایا ہے اس بات کی اجازت ہے کہ کوئی بھی جو چاہے پیشہ اختیار کرے۔ لیکن کسی پیشے کو بھارت کی ہی تباہی کا باعث بننے کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔ آئین کی دفعہ ۱۴ اور ۱۹ پر ایک نظر ڈالنے سے یہ بات واضح ہو جائے گی۔ جابر پیشہ وروں کا مسلک ایسی مورچہ بندیاں کرتا ہے کہ کوئی دوسرا چاہے وہ غیر پیشہ ور ہو یا نیم پیشہ ور گھس نہیں پاتا۔ یہ مورچہ بندیاں سماج کو ان پیشہ وروں کی اصلی صلاحیت۔ ان کی ایمان داری اور ان کی کارگزاری کا جائزہ ہی نہیں لینے دیتیں بلکہ ان کی غیر سماجی حرکات، اور ان کا قانون شکن جماعتوں سے جو تعلق ہے اس کی پردہ دری بھی کرنے سے روکتی ہیں۔

پبلک قانون کو اس بات پر اصرار کرنا چاہیئے کہ ہر عوامی پیشے کے لیے صرف اسی وقت اجازت دی جائے جب کہ وہ جمہوریت، سماج واد اور ترقیاتی ضرورتوں کو پورا کرتا ہو۔ مقصد یہ نہیں کہ ماہرینِ فن یا ماہرینِ خصوصی کے علم برداروں کی عزت نہ کی جائے یا ان کا وقار نہ ہو۔ بات صرف اتنی ہے کہ سماجی انقلاب اس امر کا متقاضی ہے کہ پیشوں کو جو آئینی یا غیر آئینی حفاظت میسّر ہے وہ قوم کو نقصان نہ پہنچائے چاہے ان پیشوں نے عمدہ اخلاقیات اور بہترین کارکردگی کا جامہ ہی کیوں نہ اوڑھ رکھا ہو۔

پیشوں کے نظام، طریقِ کار اور دعووں میں سادگی اور عوامی خدمت کے جذبے کو دخل ہونا چاہیئے۔ تاکہ عوام کی ضروریات پوری ہوسکیں۔ "عوام کی خدمت" ہی ایک ایسی کنجی ہے۔ جس سے مروجہ پیشوں کو انھیں قبولیت کا درجہ دیا جاسکتا ہے۔ پیشوں کی اجارہ داری آئین کی کسوٹی پر پورا نہیں اتر سکتی۔ ان کے لیے تو ضروری ہے کہ وہ پیشہ ورانہ مہارت محض عوام کی مسرّت اور بہبود کے لیے ہے۔

مسلکی لبادہ

ہر پیشے کو چاہے وہ عدالتی لبادے یا بیرسٹر کے مسلکی کپڑے میں ملبوس ہو عوامی خدمت کی ترازو پر پورا اترنا ہوگا۔ اس کی پرانے دقیانوسی مالکانہ نظریے سے حفاظت نہیں کی جاسکتی۔ جو بات ججوں پر جو "ہتکِ عزت" کی بنا پر دوسروں کو سزا دے سکتے ہیں، عائد ہوتی ہے۔ وہ دوسرے پیشوں پر بھی چاہے وہ کتنے ہی اونچے ہوں، عائد ہونا چاہیئے۔

جناب جے روم فرینک جج نے عدالتی پیشے کے ضمن میں جس کا جائزہ اب ہمارے دیس میں بھی لیا جارہا ہے۔ کہا تھا "لبادہ ایک دقیانوسی نشانِ خصوصی ہے۔ ایک سہو زمانی جو حکومتِ وقت کے ظاہری رسوم کی یاد ہے ایک ناپختہ سماج ہی اپنے حاکموں سے خوف کھانے کی ضرورت محسوس کرے گا۔ لیکن ایک ترقی پذیر امریکہ مکمل مساوات کا خطرہ مول لے سکتا ہے۔

ایک جج جو ایسے قانونی نظام کے عجیب و غریب لباس نہیں پہننا چاہے، یہ لبادے جہاں انسان کے جسم کی بناوٹ کو چھپاتے ہیں، اسی طرح بلاوجہ یہ عوام کے سامنے ان کی ذہنی صلاحیتوں کو بھی چھپاتے ہیں۔

انصاف کی روشنی میں جب انسان کی خصوصیت ہی چھپ گئی تو انصاف تو اندھیرے ہی میں کارفرما ہوگا۔ اب جبکہ سپریم کورٹ نے جیوڈیشری کو ایک واضح جمہوری سرکار کا حصہ قرار دیا ہے میرا خیال ہے کہ لبادہ کا مسلک ختم کردینا چاہیئے۔

جماعتِ وکلا کو بھی یہ بات یاد رکھنا چاہیئے۔ قانون کے میدان میں ان کو جو اجارہ داری حاصل ہے، اس کا وہ صحیح جواز تلاش کریں اور اپنے پیشے کو عوام کے حقوق کی حفاظت اور غریب انسانوں کی پریشانیوں کو دور کرنے کے اہل بنائیں۔ عوامی قانون اس امر کا خواہاں ہے کہ یہ پیشہ عوامی بنے۔ عوام کی بہبود کا طرفدار ہو اور اسے پُراسرار لبادوں کو خیرباد کہہ دینا چاہیئے۔ اب جبکہ میرا پروفیشنل لوگوں کی عوام کو ضرورت

ہے، مروجہ پیشوں کا آئینی احاطہ نہیں کیا گیا۔ ان کی سماجی ذمہ داریوں کو اجتماعی سماج میں نہیں پرکھا گیا۔ اور انھوں نے دوسروں پر جو دروازے بند کر رکھے ہیں ان کا بھی جائزہ نہیں لیا گیا۔ بھارت کے خصوصی ماحول میں پیشے اور اسی قسم کے دوسرے سوالات پر غور نہیں ہوا۔ اگر اس قسم کا جائزہ لیا جائے تو مروجہ پیشوں کی اجارہ داری کو جس سے وہ آئین کے تحت فائدہ اٹھا رہے ہیں خطرہ پیدا ہو جائے گا۔ بچنے کا صرف ایک طریقہ ہے کہ وہ اس میں تعمیری تبدیلیاں کریں۔

آئینی ضمانت

آئین کی دفعہ ۱۹ (۱) (جی) ہر شہری کو اس امر کا حق دیتی ہے کہ وہ جو چاہے پیشہ اختیار کرے یا کاروبار چلائے۔

تاہم سرکار اگر سرکار چاہے تو قانون کے ذریعے کوئی پیشہ ورانہ یا صنعتی کوالیفکیشن کی شرط عائد کر سکتی ہے۔ بشرطیکہ یہ بندش معقول ہو اور عام لوگوں کے مفاد میں۔

اگر قانون کی ڈگری نقلی ہو، اگر میڈیکل کوالیفکیشن غیر مستند ہو اور اگر عطائی حکیم ڈگری یافتہ سے بہتر کام کر سکیں۔ اگر اٹارنی۔ اکاؤنٹنٹ اور حکیم سماج دشمن ہوں، اور اگر پیشہ ورانہ قابلیت عام لوگوں کے لیے جن میں قصائی، نان بائی اور موم بتی بنانے والے ہیں۔ بے کار ثابت ہو، اور اسے اسمگلر، عیار لوگ اور انکم ٹیکس نہ دینے والے یا کارپوریشن کے حلقہ میں کام کرنے والے، غلط طور پر استعمال کریں تو مجھے یہ خدشہ ہے کہ آئین کی دفعہ ۱۹ کی شق ۶، شاید ہی اس پیشہ ورانہ خرابی کا سدِباب کر سکے۔

اگر کسی پیشے کو آئینی ہاتھوں سے بچنا ہے تو اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ عوام کی خدمت کے لیے وقف ہو۔ مکر کی پڑھی لکھی ویشیا اگر پیشہ وروں کے کپڑے پہن کر آئے گی تو وہ آئین کی کسوٹی پر پرکھے جانے سے بچ نہ سکے گی۔

ہمارا میڈیکل پیشہ بہت عمدہ ہے۔ وہ اپنے امریکی ہم پیشہ کے معیار کے مطابق اوپن ہارٹ سرجری کر سکتا ہے۔ اور گردے کا تبادلہ بھی۔ لیکن سماجی دوائیاں، روک تھام کی دوائیاں، جذری بیماری اور پچھڑے ہوئے علاقوں خاص طور پر قبائلی علاقوں میں، جو لوگوں کی حیات و موت کے مسائل ہیں۔ ان پر ہمارے پیشے نے کوئی دھیان نہیں دیا۔ آدمی ٹروں کو کارپوریشن کی گرفت، کم نظری اور روایاتی طرزِ عمل سے چھٹکارا پانا چاہیئے۔ اس کی بجائے انھیں نئی طرز کے حساب کتاب کی روایت قائم کرنا چاہیئے۔ جس سے دیہاتی لوگوں اور چھوٹے چھوٹے کاروبار کرنے والوں کو فائدہ پہونچ سکے۔

مقاصد اور ذرائع میں گہرا تعلق ہے۔ لہٰذا جب خدمت ہی کسی پیشے کا مقصد ہو تو اس کے حصول کے لیے مناسب ذرائع بھی سامنے آنے چاہئیں۔ ان کا تعلق نظام اور ٹیکنیک دونوں سے ہو۔

"پیشے برائے عوام" کی تحریک کا یہ بھی ایک دائرہ عمل ہے۔

ڈھانچے میں انقلاب

لہٰذا ہمیں ڈھانچے میں انقلاب، طرزِ عمل میں انقلاب کی ضرورت ہے جو آگے چل کر آئینی انقلاب کی شکل اختیار کر لے۔ "پیشے برائے عوام" کا تصور ہمارے ذی فہم عالموں کا قوم سے ایک اعلیٰ درجہ کا قول ہے۔ سماجی احیا کے لیے یہ ایک مجاہدانہ تحریک ہے۔ جس کی قوت انسانی ہمدردی ہے۔ ہندوستان کی اقتصادی اور ترقیاتی ضروریات اس امر کی متقاضی ہے کہ عوام سے اس قسم کا وعدہ کیا جائے۔

پیشے آزاد ہیں۔ یہ پریوں کی کہانی ہے۔ اس افسانے سے لوگ دھوکا نہیں کھا سکتے۔ چونکہ دیکھا یہ گیا ہے کہ شرافت زا اور عالمانہ پیشے جب بروئے کار آتے ہیں تو وہ سماج سے بے انصافی اور اس کے مفاد سے دغا کرتے ہیں۔ ان دنوں شک یہ کیا جا رہا ہے کہ پیشہ وری کا گروہ پرائیویٹ سرمایہ داروں کی خدمت کرتا ہے اور اس سے لوگوں میں بے حد ناراضگی پیدا ہوتی ہے۔ ان پیشہ وروں کی ذہنیت میں ایک ایماندارانہ اور شرافت آمیز تبدیلی آنا ضروری ہے تاکہ ان کی عوام دوستی اور تعمیری حسن قابلِ تحسین بن سکے۔

اس بحث کا لب لباب یہ ہے کہ سماجی نظام میں جس طرح کی تبدیلی کا ہمارے آئین کی دفعہ ۳۸ میں ہے۔ وہ اس امر کی متقاضی ہے کہ ہمارے پیشوں میں بھی اسی طرح کی تبدیلی رونما ہو۔ جو تیسری دنیا کے تقاضوں کو پورا کر سکے۔

ہماری حالیہ ضروریات

سماجی انصاف کی شرائط کو پورا کرنے کے لیے ہمارے سوشل ڈھانچے میں اہم تبدیلیوں کی ضرورت ہے۔ نئے گاہکوں کی مانگوں کو پورا کرنے کی غرض سے ہمارے پیشوں کو بہت کچھ کرنا ہوگا۔ مثال کے طور پر وکلاء کی جماعتوں قانونی فرموں، غربا کے وکیلوں، ننگے پاؤں چلنے والے وکلاء۔ سرکاری کارخانوں کے وکیل۔ قومی اور ریاستی حلقوں کے مفت قانونی مشیر۔ سب کو نئے سرے سے منظم ہونا ہوگا۔

سماج کی خدمت کرنے والے پیشہ ور لوگوں اور تنظیموں کو انکم ٹیکس کی رعائتیں دینے اور انھیں عوام میں عزت بخشنے کے ضمن میں قدم اٹھایا جانا چاہیئے۔

اسی طرح میڈیکل میدان میں ڈاکٹروں کی جماعتوں۔ ننگے پاؤں چلنے والے ڈاکٹروں

(باقی صفحہ ۔۔ پر)

سولی جے سوراب جی

آج یہ سراسر روپیہ بنانے کا ذریعہ ہیں

وکیلوں، ڈاکٹروں، معماروں، انجینیروں، چارٹرڈ اکاؤنٹنٹوں اور صحافیوں وغیرہ جیسے ماہر پیشہ وروں کے کردار میں جو گراوٹ آئی ہے، اس کا رونا روتے ہوئے نیز اُن کی کرتوتوں کا پردہ چاک کرتے ہوئے، فاضل مضمون نگار نے متنبہ کیا ہے کہ اگر ناانصافی اور جبر کا شکار ایک فرد، بھاری فیس ادا کرنے کی سکت نہ ہونے کی وجہ سے، معقول قانونی خدمات کرنے سے محروم رہ جاتا ہے، یا درد اور تکلیف میں کراہتا ہوا ایک مریض شفایابی کے لیے کسی معالج کو بُلا نہیں پاتا تو اُس صورت میں جارجیبرنارڈ شا کا عائد کردہ یہ الزام یقیناً سچا ثابت ہو جائے گا کہ سبھی پیشے عوام کے خلاف سازشنات کا درجہ رکھتے ہیں۔

آج کا زمانہ ایسا زمانہ ہے جس میں چرب زبانی سے کام لے کر حقائق کو مسخ کر دیا جاتا ہے اور واقعات کو توڑ مروڑ کر پیش کیا جاتا ہے۔

وہ ملک جہاں کی حکومتیں اپنی رعایا کے بنیادی انسانی حقوق کو اپنے پاؤں تلے روندتی ہیں، نیز قاعدے قانون کی مسلسل خلاف ورزی کرتی ہیں، اپنے آپ کو جمہوری ملک کہلانے کا دعوےٰ کرتے ہیں۔ بہت سے اشخاص اپنا سیاسی اُلّو سیدھا کرنے کے لیے مذہب کی آڑ میں نفرت اور تشدد کا پرچار کرتے ہیں۔ اور خود کو سنت کہلواتے ہیں، مگر تعجب تو یہ ہے کہ لوگ جلد ہی اُنھیں ایسا ماننے بھی لگ جاتے ہیں۔ نیز وہ لوگ جو سماج کے دوسرے افراد کا حق مار کر خاص خاص پیشوں میں مہارت حاصل کرتے ہیں، اور ہر جائز و ناجائز طریقے سے دولت کمانے کو اپنا نصب العین سمجھتے ہیں، خود کو ماہر پیشہ ور کہتے ہیں۔

افسوس صد افسوس کہ اس طرح لسانی پاکیزگی کو آلودہ کیا جاتا ہے اور الفاظ کو غلط معنی پہنائے جاتے ہیں۔

کسی لفظ کے صحیح معنی جاننے کے لیے کبھی کبھار لغت کا رُخ کرنا ٹھیک رہتا ہے۔ ویبسٹر نے اپنی ڈکشنری میں لفظ "پیشہ" کے معنی یہ بتائے ہیں۔ "ایک ایسا دھندا، جس کے لیے ایک خاص جانکاری نیز مشق و مہارت کے ساتھ ساتھ اکثر طویل اور بھرپور تیاری کی ضرورت ہوتی ہے۔۔۔ اور جو اسے اختیار کرنے والوں کو مسلسل مطالعے اور اس نوع کے کام کا پابند کرتا ہے، جس کا اصل مقصد خدمتِ خلق ہوتا ہے۔"

روسکوئے پاؤنڈ نے اسی بات کو تھوڑے لفظوں میں قابلِ تعریف طور پر یوں بیان کیا ہے۔ "تاریخی اعتبار سے ایک پیشہ، تنظیم، حصولِ علم اور خدمتِ خلق کے جذبے پر مشتمل ہوتا ہے۔ یہ تینوں باتیں تو لازمی ہیں۔ رہا روزی کمانے کا معاملہ تو وہ محض اتفاقی ہے۔"

آج "پیشہ" کا تعلق محض قانون، ادویہ اور اہلِ کلیسا تک ہی محدود نہیں رہا۔ اس کے دائرے میں اب معمار، انجینیر، چارٹرڈ اکاؤنٹنٹس، کاسٹ اکاؤنٹنٹس، صحافی، فوٹو گرافرز، نرسیں، موسیقار وغیرہ بھی آجاتے ہیں۔

> وہ لوگ جو سماج کے دوسرے افراد کا حق مار کر خاص خاص پیشوں میں مہارت حاصل کرتے ہیں، اور ہر جائز و ناجائز طریقے سے دولت کمانے کو اپنا نصب العین سمجھتے ہیں، خود کو ماہر پیشہ ور کہتے ہیں۔

کیا سیاست بھی ایک پیشہ ہے؟

عجیب بات ہے کہ سپریم کورٹ نے سیاست کو ایک پیشہ گردانتے ہوئے، یہ کہا کہ ایک سیاست دان بھی ایک ماہر پیشہ ور ہوتا ہے۔ لیکن یہ بات انکم ٹیکس کی دفعات کے سیاق میں کہی گئی تھی۔ کوئی شخص ایک سیاست دان کو سنجیدگی سے ویسا ماہر پیشہ ور نہیں سمجھتا جیسا کہ ایک قدیم ترین پیشہ اختیار کرنے والے کو۔

جب تک ہم اسی بنیادی حقیقت کو کہ ایک

پیشہ محض پیسہ کمانے کا دھندا نہیں ہوتا اور کہ اس میں تجارت پرستی کا عنصر بھی شامل نہیں ہوتا، فراموش نہیں کرتے، پیشے کی اصطلاح کو وسعت دینے میں کوئی بُرائی نہیں ہے۔

لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ ماہر پیشہ ور محض محبت اور ہوا پر ہی جیئیں اور کہ اپنی خدمات کا کوئی معاوضہ وصول نہ کریں۔
ایک ماہر پیشہ ور کو بھی دوسروں کی طرح پیسے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اُسے بھی زندہ رہنے کے لیے کمائی چاہیئے۔ مگر اُس کا اصل نصب العین اور مقصد یہ ہونا چاہیئے کہ وہ ان لوگوں کے کام آئے اور ان کی مدد کرے جو ان سے مدد کے خواستگار ہوں۔ ایسی حالت میں کہ جس میں ایک مؤکل موٹی فیس دے سکتا ہو اسے لے لینے میں کوئی حرج نہیں، مگر یہ فیس بہت ہی زیادہ اور بے حد گراں ہرگز نہیں ہونی چاہیئے۔ لیکن ایسی حالت میں، جبکہ ایک مؤکل مناسب فیس یا کچھ بھی دے سکنے کے ناقابل ہو پیشہ ورانہ خدمت بخوشی مفت یا کم قیمت ہی پر سرانجام دے دینی چاہیئے۔
دراصل تجارت اور پیشے میں بنیادی فرق یہ ہے کہ جب کہ تجارت کا اصل مقصد ذاتی فائدہ ہوتا ہے، پیشے کا خاص مدعا ہوتا ہے خدمت خلق۔

روپیہ بنانے کی چال

بدقسمتی سے روزمرہ کی زندگی میں اس بنیادی صداقت کو بُری طرح نظرانداز کیا جاتا رہا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ ماہر پیشہ ور مانگ اور رسد کے اُصول پر عمل پیرا ہے جہاں تک قانونی پیشے کا تعلق ہے، حد درجے کی تجارت پرستی کی کرتیں اس پر چھا گئی ہیں اور یہ ایک روپیہ بنانے کا ذریعہ بن کر رہ گیا ہے۔ مؤکلوں سے اتنی بڑی بڑی فیسیں وصول کی جاتی ہیں کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے دلیل یہ دی جاتی ہے کہ چونکہ مؤکل ایک مالدار شخص ہے لہٰذا اتنی بڑی فیس ادا کرنے کے قابل ہے۔ وکلاء اپنے مؤکلوں کے بھاری خرچے پر ہوٹلوں میں قیام کرتے ہیں اور اپنے ملنے والوں کی خاطر تواضع بھی۔ ایسا کرنے میں اُنھیں کوئی بُرائی نظر نہیں آتی، کیوں کہ اُن کا مؤکل "ایک مالدار اور صاحب حیثیت شخص" ہوتا ہے۔ اس کے برعکس حاجتمند اور مفلس لوگوں کی بنا فیس یہ قانونی خدمت سرانجام دینے کا خیال بھی کامیاب وکلاء کے دل و دماغ میں نہیں آتا۔ ان حالات میں اس سوال کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہ جاتی کہ ماہر پیشہ ور عوام کے پیچھے ہوتے ہیں۔

> اس بات کو تھوڑے لفظوں میں قابلِ تعریف طور پر یوں بیان کیا ہے: "تاریخی اعتبار سے ایک پیشہ تنظیم، حصولِ علم اور خدمتِ خلق کے جذبے پر مشتمل ہوتا ہے۔ یہ تینوں باتیں تو لازمی ہیں، رہا روزی کمانے کا معاملہ تو وہ محض اتفاقی ہے۔"

> دراصل تجارت اور پیشے میں بنیادی فرق یہ ہے کہ جب کہ تجارت کا اصل مقصد ذاتی فائدہ ہوتا ہے، پیشے کا خاص مدعا ہوتا ہے خدمتِ خلق۔

بڑی بدقسمتی کی بات تو یہ ہے کہ تجارت پرستی کا یہ زہر نوجوان وکیلوں بالخصوص جونیئر وکیلوں میں بھی سرایت کر گیا ہے۔ البتہ کچھ استثنیات بھی ہیں۔ لیکن جونیئر وکیلوں کی اکثریت اس خیال سے تو بیک پاتی ہے کہ کم سے کم ممکنہ وقت میں جتنا زیادہ ممکن ہو سکے روپیہ بناؤ۔ آج افراطِ زر کی گنجائش رکھنے کے بعد بھی جونیئر وکیل اتنی فیس وصول کرتے ہیں جو سینیئر وکیلوں کی دس سال قبل کی فیس سے بھی بہت زیادہ ہوتی ہے۔ یہ بات وہ بالکل بھول چکے ہیں کہ اُن کے پیشے کے ساتھ کے تئیں کچھ فرائض اور ذمے داریاں بھی ہیں۔ وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ انھیں عوام کی خدمت کرنی ہے۔ اپنے ابنائے وطن سے معاملہ کرتے وقت خدمت کے اُصول کو سراسر فراموش کر رہے ہیں اور ان کی مزدوری کا احساس کیے بغیر ذاتی مفاد کو پیشِ نظر رکھتے ہیں۔

اِن کا شکار ایک عام آدمی ہوتا ہے۔

بھارت ایسے غریب ملک میں عام آدمی زیادہ تر ان پیشہ ورانہ ماہروں کی خدمات سے محروم رہ جاتا ہے۔ اس صورتِ حال کو دیکھ کر مختلف پیشوں سے وابستہ افراد کی سماجی ذمہ داریاں ایک اہم مسئلے کی صورت میں سامنے آتی ہیں۔

ویسے تو یہ کہا جاتا ہے کہ ہمارا عدالتی نظام اس طرح سے وضع کیا گیا ہے کہ ہر ایک شہری کو انصاف پانے کے یکساں مواقع حاصل ہوں۔ لیکن عملاً ہر قسم کی قانونی خدمات انھیں لوگوں کا حصہ رہی ہیں جنھوں نے اُن کے لیے زیادہ سے زیادہ قیمت ادا کی ہے۔ متمول ترین اشخاص نیز بلدیات کو اعلیٰ ترین مشورہ دستیاب ہوتا ہے۔ سماج کے غریب ترین افراد یعنی "تیسری دنیا کے باشندوں" کو جو قانونی صلاح میسر ہوتی ہے، وہ یا تو برائے نام ہوتی ہے یا بے حجم سی۔ "تیسری دنیا" کی اصطلاح اُن سب پر صادق آتی

جنون یہ ہے لیبل، سماج کا استعمال شدہ عنصر، پچھڑے ہوئے اقلیتی گروہ، فلاحی امداد پانے والے، سابقہ نوآبادیاتی، نوآبادیاتی، نئے نوآبادیاتی، اصل غیر مہذب باشندے، پرولتاری اور کاشتکار ہونے کے لیبل چسپاں ہوتے ہیں۔ ان میں سماج کے وہ لوگ بھی شامل ہیں، جو منجملہ دیگر افراد کے منحرف، زندانی، دماغی بیمار، انتہاپسند، سرکاری رائے کے مخالف اور اپنے ہم جنسوں کے ساتھ مباشرت کرنے والے کہلاتے ہیں، نیز بالعموم لزبن گروپ مثلاً نوجوان خواتین اور کلیسائے انگلستان کے غیر مقلد بھی اس زمرے میں شمار کیے جاتے ہیں۔

۱۹۰۵ء میں امریکہ کے ایک ممتاز ماہر قانون برنڈیس نے کہا تھا "ہمارے انتہائی متمول سرکردہ وکلاء خاص کر طلبیات کے دعووں کی تائید میں لگے رہتے ہیں اور کم قابل وکلاء کافی حد تک بڑی بڑی کارپوریشنوں سے وابستہ ہوکر رہ گئے۔ انھوں نے غریب عوام کے تحفظ کے ضمن میں اپنی ذمہ داریوں کو یکسر فراموش کردیا ہے" افسوس کہ ۱۹۸۴ میں بھی صورت حال لگ بھگ ویسی ہی ہے؟ کامیاب وکلاء کم و بیش مسلمہ نظام اور مستحکم مفادات کے محافظ رہے ہیں۔ کیونکہ ایسے سماج میں، جس پر تجارت اور صنعت کا غلبہ ہو، انفرادی اور اجتماعی طور پر مالکان جائداد اُن کے خاص مؤکل رہے ہیں۔ اگر یہی رجحان جاری رہا تو بالآخر وکلاء کا سماج میں مرتبہ کم تر اور قابلِ تحقیر حد تک گر جائے گا۔

چونکہ میرا تعلق اسی پیشے سے ہے، اس لیے میں نے خاص طور پر وکالت کے پیشے کی بات کی ہے۔ دراصل کسی بھی پیشے کو اختیار کرنے والا، اُس کی قیمت اُس کے عہدے سے پہلے سے متعلق گہری واقفیت حاصل کرنے کی صورت میں ادا کرتا ہے۔

اور یہ معالج حضرات

بڑے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ خدمت اور ایثار کا وہ جذبہ جو ڈاکٹری کے پیشے کا کبھی طرۂ امتیاز تھا، آج روبہ زوال ہے۔ اکثر حالات میں ڈاکٹروں کی فیس اس قدر زیادہ ہوتی ہے کہ غریب بیمار بلاعلاج ہی دم توڑ دینے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

بدقسمتی سے روزمرہ کی زندگی میں اِس بنیادی صداقت کو بُری طرح نظرانداز کیا جاتا رہا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ ماہر پیشہ ور مانگ اور رسد کے اُصول پر عمل پیرا ہے۔ جہاں تک قانونی پیشے کا تعلق ہے، حد درجے کی تجارت پرستی کی قوتیں، اِس پر چھا گئی ہیں، اور اور یہ ایک روپیہ بنانے کا ذریعہ بن کر رہ گیا ہے۔

مجھے ایک متوسط درجے کی برسرکار خاتون کا، جس کا لڑکا علاج کے لیے اسپتال میں داخل تھا، ایک قصہ یاد آرہا ہے۔ انچارج ڈاکٹر ہر روز خوش دلی سے اُس سے اور اُس کے بیمار لڑکے سے ہر روز صبح کو خیریت پوچھتا۔

بڑی بدقسمتی کی بات تو یہ ہے کہ تجارت پرستی کا یہ زہر نوجوان وکیلوں، بالخصوص جونیئر وکیلوں میں بھی سرایت کر گیا ہے۔ البتہ کچھ استثنیات ہیں۔ لیکن جونیئر وکیلوں کی اکثریت اس خیال سے تحریک پاتی ہے کہ کم سے کم ممکن وقت میں جتنا زیادہ ممکن ہوسکے روپیہ بناؤ۔

چند منٹ اُن دونوں سے باتیں کرتا، اور پھر انھیں اکیلا چھوڑ کر چل دیتا۔ وہ خاتون پہلے تو اُس ڈاکٹر کے دوستانہ اور ہمدردانہ سلوک سے بے حد خوش ہوئی، لیکن جب اُسے اُس ڈاکٹر کے غیر ارادی طور پر معائنے کے لیے آنے جانے سے متعلق بطور فیس ایک موٹی رقم ادا کرنے کے لیے بل ملا تو اُس کی ساری خوشی کافور ہوگئی۔

یہ سن کر بڑا دکھ ہوتا ہے کہ کئی ڈاکٹر اپنے مریض کا آپریشن کرنے کے بعد، اُس کے اگلے علاج سے انکار کر دیتے ہیں، تاوقتیکہ اُن کی فیس پیشگی ادا نہ کی جائے۔

جھوٹے ڈاکٹری سرٹیفکیٹ بڑی آسانی سے حاصل کیے جا سکتے ہیں۔ بالخصوص عدالتوں میں التوائے پیشی کے ذریعے فریقینِ مقدمہ کو فائدہ پہنچانے کے لیے اور اگر اُن کے لیے موٹی رقم دی جائے تو زیرِ حراست اسمگلروں کو حراست کے دوران بہتر سہولیات بہم پہنچانے میں بھی مدد کی جا سکتی ہے۔

یقیناً اس ضمن میں کئی استثنیات بھی ہیں، لیکن مشکل یہ ہے کہ یہ محض استثنیات ہیں اور مسئلہ انھیں ایک عام قاعدے میں بدلنے کا ہے۔

اس امر کی فوری ضرورت ہے کہ جملہ پیشوں کا واضح اور صحیح رُخ عوام کی فلاح و بہبود کے جانب موڑا جائے، اور کہ یہ سب اپنے کو خدمتِ خلق کے لیے ازسرِنو مرتب کریں۔ ورنہ اس امر کا قوی خطرہ ہے کہ یہ عوام کی اکثریت کے لیے ایک قطعی غیر متعلق شئے بن کر رہ جائیں گے۔ لہٰذا اس رُجحان کو لازماً روکنا ہوگا۔

بدقسمتی سے اصل بُرائی، ہمارے احساسِ اقدار کی تباہ کن گراوٹ ہے۔ آج ہمیں اچھائی،

ایمانداری اور مہربانی جیسے سیدھے الفاظ سے
ڈر لگنے لگا ہے، چونکہ ہم نے مستحسن پُرانی

...ے ڈاکٹری سرٹیفکیٹ بڑی آسانی سے حاصل کیے جا سکتے ہیں۔ بالخصوص عدالتوں میں التوائے پیشی کے ذریعے فریقینِ مقدمہ کو فائدہ پہنچانے کے لیے، اور اگر ان کے لیے موٹی رقم دی جائے تو زیرِ حراست اسمگلروں کو حراست کے دوران بہتر سہولیات بہم پہنچانے میں بھی مدد کی جا سکتی ہے

قدروں میں یقین رکھنا چھوڑ دیا ہے۔ اسی لیے پُرانے بھلے الفاظ میں بھی ہمارا اعتقاد نہیں رہا۔ تبھی لِن یوتنگ نامی ایک چینی مفکر کے قول کے مطابق' یہی وجہ ہے کہ دُنیا آج علیل ہو گئی ہے۔

آج کا منظر ورڈز ورتھ کی مندرجہ ذیل سطور کی یاد دلاتا ہے۔ ہماری زندگی محض ایک دکھاوا ہے۔ یہ کسی کاریگر، کسی خانساماں یا کسی سائیس کا ایک اوسط درجے کا دستی کام ہے۔ ہمیں لازمی طور پر کھلی دھوپ میں ایک ندی کے مانند چمکتے ہوئے رواں دواں رہنا چاہیے۔ ورنہ ہم منحوس ہو لگے۔
۔۔۔۔ سادہ زندگی اور اُونچی سوچ کا

آج
ہمیں اچھائی،
ایمانداری اور مہربانی جیسے
سیدھے الفاظ سے ڈر لگنے لگا ہے، چونکہ
ہم نے مستحسن پُرانی قدروں میں یقین
رکھنا چھوڑ دیا ہے۔ اسی لیے پُرانے بھلے
الفاظ میں بھی ہمارا اعتقاد نہیں رہا۔

نظریہ اب مفقود ہو چکا ہے'۔

جو شخص بے انصافی اور جور و ستم کا شکار ہوتا ہے اور جو ادائیگی کی سکت نہ رکھنے کے

باعث معقول قانونی امداد سے محروم رہتا ہے۔ یا درد اور تکلیف سے کراہتا ہوا ایک مریض شفایابی کے لیے کسی ڈاکٹر کو بلانے کی طاقت

نہیں رکھتا تو جارج برنارڈ شا کا یہ الزام سچا ثابت ہو جائے گا کہ سبھی پیشے عوام کے خلاف سازشات ہیں۔

ہمیں لازم ہے کہ اس صورت حال کو بدل ڈالیں۔ ماہر پیشہ وروں کے دل و دماغ پر صالح اقدار کا نقش بٹھانے اور انھیں خدمتِ خلق کے لیے اپنے آپ کو ازسرِ نو وقف کرانے کے لیے ایک طاقتور، ثابت قدم اور منظم مہم شروع کرنے کی ضرورت ہے۔

بقیہ :۔ منافع ہی اُن کا دھندا ہے

اُن کے اختیار میں ہیں۔ انھوں نے تعلیمی میدان میں بھی گھر کر رکھا ہے اور وہ ایسی ثقافتی سرگرمیوں کو پیدا کرتے یا اُن کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں جو سماجی تبدیلیوں کی ضد ہوتی ہیں۔

یہ سوچنا کہ ایسے مفروضات پر نظرِ ثانی کے بغیر جن کی بنا پر تاجر طبقوں کا کردار متعین کیا گیا تھا، ہمارے ملی جلی معیشت کے ماڈل کو کارآمد بنایا جا سکتا ہے، شترمرغ کی طرح آنکھیں بند کر کے خطرے سے بے خبر ہو جانے والی بات ہو گی۔ جو لوگ کالے دھن کی معیشت کی پیداوار کرنے والے ہیں۔ اخلاقی قدروں سے لاپرواہیں' جنھوں نے سیاست کو کٹھائی میں ڈال رکھی

ہے وہ ایک بہتر اور صحت مند مستقبل کے لیے سماجی تبدیلیوں کے نقیب نہیں بن سکتے۔ تاجر طبقوں نے آج تک جو بھی حل تجویز کیے ہیں یا یادداشتیں پیش کی ہیں اُن کے مطالعہ سے ایک عام آدمی بھی اندازہ لگا سکتا ہے کہ ان تمام تحریروں سے بلاشبہ ایک ہی بات کا پتہ لگتا ہے کہ یہ لوگ نجی فائدوں کے لیے کچھ اور سہولت چاہتے ہیں۔ وہ شاید یہ سوچتے ہیں کہ جو چیز منظم کاروبار کے مفاد میں نہیں ہے وہ مجموعی معاشرے کے حق میں نہیں ہو سکتی۔

ہندوستان میں تاجر طبقے کو جو کردار سونپا گیا ہے اُس کی سائنسی بنیادوں پر پوری چھان بین کی جانی چاہیے تاکہ یہ پتہ لگایا جا سکے کہ جو کردار انھیں سونپا گیا ہے وہ کہاں تک جائز ہے؟ تاکہ ہمارے معاشی ترقی کے نمونے پر یہ الزام نہ آئے کہ وہ مالکِ املاک تاجر طبقوں کی طاقت اور مراعات سے نظریاتی طور پر وابستہ تھا۔ ہم نے اب تک جو دلیلیں دی ہیں اگر وہ درست ہیں تو تاجر طبقہ قوم کی توقعات پر پورا اُترنے میں اب تک ناکام رہا ہے اور آئندہ چل کر بھی اُن لوگوں کی کارکردگی میں کسی بہتری کی اُمید نظر نہیں آتی۔

★

خواجہ احمد عباس

واعظ یا فریب کار

عباس صاحب فرماتے ہیں، اِن لوگوں کے بارے میں سب کچھ ایک ہی مضمون میں لکھنا مشکل ہے۔ ہمارے معاشرے میں ایسے بہت سے لوگ ہیں جنھیں گاندھی جی کے الفاظ میں رضاکار صفائی کرمچاری" کہا جاسکتا ہے جو دوسرے لوگوں سے نبٹ لیں گے اس لیے یہاں صرف مذہبی واعظوں اور اللہ والوں، دیویوں اور بال بھگوانوں کا ہی ذکر کرنا چاہتا ہوں جو نام نہاد رُوحانی " غلاظت" اور تصوف کی گرد پھیلا رہے ہیں اور اس طرح ہمارے عوام کے پراگندہ ہوئے ذہنوں کو اور بھی پراگندہ کر رہے ہیں

مختلف معروف و غیر معروف مذاہب کے قابلِ اعتراض خلیفا واعظوں کو فریب کار کہنا زیادہ موزوں ہوگا۔ یہ لوگ مہا آچاریہ، ورشنٹ آچاریہ جی مہاراج خادم الایمان اور ہادیٔ دین جیسے نام اختیار کرلیتے ہیں۔ وہ ٹوٹے

ان میں ایک چنگھاڑنے والے باپائی فصاحت کے ساتھ کہتے سُنا، "بھائیو! میں نے اپنے یار کا جلوہ دیکھا۔ وہ ایک عجیب روشنی سے منوّر تھا، ایک عجیب چمک سے چمک رہا تھا۔ یہ چمک دمک خدائی تھی۔ یہ ایسا حُسن تھا جو دُنیا کے حسینوں میں نظر

بار اللہ اکبر کے نعرے بلند کیے۔

یا اُس سیاہ فام عیسائی پادری کا تصّہ لیجئے جو پکار رہا تھا "آسمان کے اُن بادشاہوں اور بیگموں پر خدا کی رحمت ہو جو عیسائیت کی شفقت کے عظیم سمندر کے سبب زمین پر دکھائی دیں گے۔

اِن واعظوں کی تقریروں میں سماج واد اور اشتراکیت اور ایسے ہی دُوسرے عقائد مثلاً سیکولرازم اور معقولیت کی قیمت پر مزاح کے چھینٹے بھی ہوتے ہیں لیکن وہ کبھی پونجی واد یا سرمایہ داری پر طنز نہیں کرتے۔ وہ اپنی طنز کے تیر سامعین کے خالی پیٹوں کو دیکھ کر چھوڑتے ہوئے کہیں گے۔ مجھے بہت افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے میرے پیارو۔"

ہوئے گراموفون کی مانند چنگھاڑتے ہیں اور ایسی عجیب و غریب زبان میں اپنا پیغام دیتے ہیں جو اُن کی جماعت کے ذہنوں کے اوپر اوپر سے گذر جاتا ہے۔ لیکن چیخ چنگھاڑ کے دوران وہ رام، کرشن، بُدھ، محمدؐ اور یسوعؑ کے مقدس ناموں کا تذکرہ اتنی شناسائی اور گہری محبت کے اظہار سے کرتے ہیں۔ گویا یہ پیغامبر اُن کے جگری دوست رہے ہوں۔ وہ خدا بھگوان اور اللہ کا ذکر بھی اس طرح کرتے ہیں گویا وہ اُن کے یار ہوں۔

الوہیت کا مآخذ : مثال کے طور پر ٹیلے

نہیں آتا خواہ یہ ہالی وُڈ کی اداکارہ ہیلی بیمر کا حسن ہو یا مارلین منرو کا روشن چہرہ۔ وجینتی مالا یا زینت امان جیسی ہندوستانی فلم ایکٹریسوں کا تو کہنا ہی کیا ہے۔

ایک اور خدائے پیغمبر جیسے کہ وہ اپنے آپ کو کہتا تھا، چیخ رہا تھا" انشاء اللہ، ماشاءاللہ جب رسول نے خدا کا چہرہ دیکھا تو یہ مجسم حسن تھا جو بیان نہیں ہو سکتا، یہ ناقابلِ تصور آسمانی حُسن تھا جو اس دُنیا میں کہیں نظر نہیں آتا جو اللہ کی تجلّی سے دمک رہا تھا۔ اللہ اکبر" اور پانچ ہزار حاضرین نے تین

ابراہیم اور کریم فرشتے، ان کی روحوں پر خدا کی رحمت نازل ہو، آسمانوں سے وارد ہوتے ہوئے اپنے مقدس پروں کو آسمانی موسیقی کے ساتھ پھڑ پھڑا رہے تھے"...

اِن واعظوں کی تقریروں میں سماج واد اور اشتراکیت اور ایسے ہی دُوسرے عقائد مثلاً سیکولرازم اور معقولیت کی قیمت پر مزاح کے چھینٹے بھی ہوتے ہیں لیکن وہ کبھی پونجی واد یا سرمایہ داری پر طنز نہیں کرتے۔ وہ اپنی طنز کے تیر سامعین کے خالی پیٹوں کو دیکھ کر چھوڑتے

ہوئے کہیں گے۔ مجھے بہت افسوس کے ساتھ
کہنا پڑتا ہے میرے پیارو!"
ان میں سے ایک مقرر نے اپنے مضمون کا
موضوع "سماج وادسے ساودھان" منتخب کیا
تھا۔ یہ شخص بمبئی کے سیٹھوں اور صنعت کاروں
میں بہت مقبول تھا جو بھگوے کپڑے پہننے والے
ہر شخص کے معتقد ہیں۔
یہ مہاتما اپنے میزبان کے ساتھ چمچماتی کار

کے بعد وہ انھیں اپنا خوبصورت ڈرائیو کی دلکش
پشت کی جھلک دیکھنے کے لیے کھول رہا تھا۔
اور جب یہ مہاتما رتھ سے (اگرچہ یہ رتھ
نہیں بلکہ خوبصورت درآمد کردہ کار ہوتی ہے)۔
اترتے ہیں تو کار کے پاس چاندی کا پائیدان
رکھا جاتا ہے جہاں سے مہاتماجی کی منزل کے
لکڑی کی کھڑاویں، سرخ مخمل کی بچھی پٹی ہیں
جو لفٹ تک بچھائی گئی ہوتی ہے۔ لفٹ
اگربتیوں کی خوشبو سے مہک رہی ہوتی ہے اور

پہنچنے تک بہت وقت لے لیتی ہے کیوں کہ ہر
منزل پہ بیمار اور اپاہج لوگ مہاتماجی کے درشنوں
کے لیے قطار باندھے کھڑے ہوتے ہیں اور وہاں
لفٹ ٹھہرتی بھی ہے کیوں کہ ان لوگوں سے وعدہ
کیا گیا ہوتا ہے کہ مہاتماجی جن کے درشن میں ہی
شفا کی قوت ہے ایک آدھ سیکنڈ کے لیے وہاں
رکیں گے۔

لپ اسٹک کی اجازت نہیں

ودیا اشنا مہاتماجی کی زعفرانی لباس میں ملبوس
سیکریٹری (جو قدرتی طور پر اعلیٰ نسب سے تعلق

اللہ والے خواہ وہ جعلی ہوں یا اصلی، ان کے سروں کے چاروں طرف ایک کراماتی روشنی جسے نورانی تاج بھی کہا جاتا ہے، منسوب کرلی گئی ہے، اور اس میں غلطی کے کسی امکان کی گنجائش ہی نہیں سمجھی جاتی۔ مثلاً جے کرشنامورتی کو اللہ والا نہیں کہا جاسکتا کیونکہ ایسا نہیں لگتا کہ وہ خدا پر یقین رکھتا ہے اور نہ ہی اس نے کبھی اپنے لیکچروں میں خدا کا نام لیا ہے لیکن انھیں تب ضرور اللہ والا کہا جاتا اگر وہ اس عقیدے پر جمے رہتے کہ مادام بلواتسکی ان کے لیے مخصوص ہوئی ہیں، لیکن انھوں نے اس عقیدے سے بغاوت کی۔

میں بیٹھ کر جس کی پچھلی نشست پر شیر کی کھال
بچھی ہوئی ہے اپنے میزبان کے شاہی بنگلے
میں آئے۔ خداشناس مہاتما اپنا ہاتھ مردہ
شیر کے خوفناک چہرے پر پھیر رہا تھا۔
بیش قیمت درآمد کردہ غیرملکی لمبی کار کو ایک
نوجوان خاتون چلا رہی تھی جسے یہ ذمہ داری
مہاتما نے سونپ رکھی تھی۔ اس حسینہ نے
چلارکے رنگ کی بنا آستین کی چولی پہن رکھی
تھی۔ یا ہوسکتا ہے کہ وہ مہاتماجی کے بھگت
سیٹھ میزبان کی لڑکی ہو جو سنت جی مہاراج
کے شوفر اور فیشن کے اظہار کے دوہرے
فرائض انجام دے رہی ہو کیوں کہ اس عظیم
روحانی ہستی نے صاف کہہ دیا تھا کہ کسی اور
قسم کے ڈرائیور یا اس کے کسی اور قسم کے
لباس سے ان کی سادھنا یا عبادت میں خلل پڑے گا
اور یہ کہہ کر اپنی پلکیں دھیان میں بند کرلیں حالانکہ
پلکیں پوری طرح بند نہیں تھیں اور وہ ہلکے جھٹکے

اس کے علاوہ اللہ والے کی اور نشانیاں
بھی ہیں۔ اس کی ایک خانقاہ (اس کے لیے
آشرم ایک معمولی لفظ ہے) ہوتی ہے، جہاں
غیرملکی چیلے ۲۵ ڈالر یومیہ کرائے پر عبادت
کے لیے ایک ائیرکنڈیشنڈ گپھا لے سکتے ہیں۔
اگر ویدک سچائی کا متلاشی مالی طور پر کمزور
ہے تو وہ ۱۵ ڈالر یومیہ دے کر پانچ دوسرے
لوگوں کے ساتھ ایک بڑے کمرے میں ٹھہر
سکتا ہے لیکن وہ سب کے سب غیرملکی ہوں گے۔

اسے مہاتماجی کے من پسند سرخ رنگ کی ویلویٹ
سے ڈھانپا گیا ہوتا ہے۔
لفٹ زمین سے آخری منزل کی چھت پہ

رکھتی ہے) حاضرین کو بلند آواز
میں تنبیہ کرتی ہے کہ مہاتماجی صاحب، خانے
لپ اسٹک اور جسم کے نچلے حصے سے خارج ہونے
والی گیس کی بدبو برداشت نہیں کرسکتے۔ اس
لیے جن حاضرین نے ان میں سے کوئی خوشبودار
کاسمیٹک لگا رکھی ہو یا جن کے جسم سے گیس
خارج ہونے کا امکان ہو وہ مہاتماجی کے نتھنوں
کے سونگھنے کی حد سے جو عام طور پر منبر سے
پچاس فٹ مقرر کی جاتی ہے، باہر جاکر بیٹھیں
کچھ آراستہ پیراستہ خواتین اور دو تین موٹے
موٹے مرد مہاتماجی کی نازک مزاجی کے دائرے
سے باہر جا بیٹھنے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔
تب مندر کی گھنٹی یہ اعلان کرنے کے لیے
بجی کہ مہاتماجی کی بجلی ۲۰ منزلوں پر کھڑے دکھیوں
اور مریضوں کو اپنے درشنوں کی شفا کا نظارہ تقسیم
کرتے ہوئے آخری چھت پہ پہنچ گئے ہیں۔

قیاس آرائی

اسی طرح ایک مسلمان درویش تھے جو اپنی غیب دانی اور روشن ضمیری کے واسطے نام پائے ہوئے تھے، ان کے ہاتھ میں شفا بتائی جاتی تھی، وہ جس کو چھوتے اسے آرام آجاتا۔ آپ کو انھیں دو اعداد کے سوا جن میں سے ایک دو ہندسوں اور دوسرا سات ہندسوں پر مشتمل تھا، کچھ نہیں بتانا ہوتا تھا۔ باقی سب کام وہ بزرگ خود کر لیتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ آپ کسی پھول، تین سنتوں صوفیوں اور تین کھانوں کے بارے میں سوچئے جو آپ کے من پسند ہوں۔ وہ کہتے تھے کہ آپ ان کے نام ایک کاغذ پر لکھ دیجئے۔ یہ درویش اس کاغذ کو اچھی طرح تہہ کرکے قرآن شریف میں رکھ دیتے۔ تب وہ خاموشی سے آپ کی جانب کچھ منٹ دیکھتے رہتے، پھر وہ جو کچھ کاغذ میں لکھا ہوتا آپ کو زبانی بتانے لگتے۔ اس میں چالاکی یہ تھی کہ جب ابھی آپ نے نام لکھنے کا فیصلہ نہیں کیا ہوتا تو وہ آپ کی جانب دیکھتے ہوئے اُس پھول، تین فقیروں اور تین کھانوں کا نام آپ کو بتا دیتے۔

چنانچہ میں نہیں جانتا کہ میں نے بو علی سینا قلندر، گرو نانک اور سنت کبیر کا نام کیوں لکھا، ماسوائے اس وجہ کے کہ اُس بزرگ نے مجھے مسحور (Hypnotize) کرکے مجھ سے یہ نام لکھوا لیے۔ باقی بات آسانی سے سمجھ میں آسکتی ہے۔ اُس نے مجھے یقین دلایا کہ میرا دیرینہ نزلہ دو دن میں غائب ہو جائے گا جو ایک ماہ بعد بھی نہیں گیا۔ جہاں تک سرطان کے ایک مریض کا تعلق ہے وہ تو شکایت ہی نہیں کر سکا کیونکہ وہ تو ساتویں دن ہی چل بسا۔ جب اُس اللہ والے سے اس بارے میں پوچھا گیا تو وہ کہنے لگے "میں خدا نہیں ہوں۔ میں نے اُسے بتا دیا تھا کہ تمھاری تکالیف ایک ہفتے میں دُور ہو جائیں گی اور وہ ہو گئی ہیں"۔

آپ عقیدے سے شفا بخشنے والے کسی شخص سے بحث نہیں کر سکتے۔ وہ جانتا ہے کہ کسی وقت کس سے کیا کہنا ہے۔ بہت سے سادہ لوح بندے اُس کے پاس اگر سات روپے نذرانہ پیش کرتے ہیں کہ وہ اُن کی مدد کرے۔

یہ ولی اللہ یا بھگوان کوئی مختلف چیز نہیں ہے۔ ہاں اُن میں سے کچھ ہپناٹزم، مسمریزم، یوگ اور تنتر کی شعبدے بازی بلکہ آلات کی مدد بھی لیتے ہیں۔

گاڈمین۔ خدا شناس یا اللہ والے کا نام اُن کے ساتھ کیسے جُڑ گیا ہے؟ یہ میں نہیں جانتا۔ ہو سکتا ہے کہ ہمیشہ ہی انھیں اس نام سے پُکارا گیا ہو۔ لیکن یہ لفظ یقیناً غیر ملکی اور اینگلو سیکسن ابتدا کا ہے، دو حصوں پر مشتمل یہ لفظ خدا اور فرد کے تعلق کی جانب اشارہ کرتا ہے۔ لفظ گاڈمین یقیناً کسی ہندی یا سنسکرت لفظ یا محاورے کا ترجمہ نہیں۔ گورو، سنیاسی، رشی، مہارشی، سنیاسن، مردِ مبارک، فقیر، درویش سب الفاظ کے معنی جُدا گانہ ہیں۔

گاڈمین کے معنی ہیں، خدا کے بندے۔ لیکن مخلوق میں سارے بندے ہی خدا کے بندے ہیں ... لہٰذا یہ اصطلاح یقیناً یہ ظاہر نہیں کرتی کہ گاڈمین کوئی انوکھی مخلوق ہے۔ ہاں جیسے کہ محاورہ بن گیا ہے اللہ والے خواہ وہ جعلی ہوں یا اصلی، ان کے سر کے چاروں طرف ایک کراماتی روشنی جسے نورانی تاج بھی کہا جاتا ہے، منسوب کر دی گئی ہے، اور اس میں غلطی کے کسی امکان کی گنجائش ہی نہیں سمجھی جاتی۔ مثلاً جے کرشنامورتی کو اللہ والا نہیں کہا جا سکتا کیونکہ میں نہیں سمجھتا کہ وہ خدا پر یقین رکھتا ہے اور نہ ہی اُس نے کبھی اپنے لیکچروں میں خدا کا نام لیا ہے۔ لیکن انھیں تب ضرور اللہ والا کہا جاتا اگر وہ اس عقیدے پر جمے رہتے کہ مادام بلواتسکی اُن کے لیے مخصوص ہوئی ہیں، لیکن انھوں نے اس عقیدے سے بغاوت کی اور ایک فلسفی اور انگریزی زبان کے ماہر بن گئے۔ انھیں بعض اوقات اللہ والا سمجھ لیا جاتا ہے کیوں کہ انھیں سُننے کے لیے جو لوگ آتے ہیں اُن میں سے کچھ لوگ دُوسرے اللہ والوں کو سُننے بھی جاتے ہیں۔

زر پرستی

اللہ والے (خاص طور پر جعلی) مختلف قسموں کے ہیں حالانکہ اُن میں سے کچھ ایسے اچھے خوش بیان مقرر ہیں کہ اُن پر کرشنامورتی کی خوش بیانی کا دھوکہ ہوتا ہے۔ خوش بیانی اور چیز ہے اور پُر پیچ دار گفتگو دوسری چیز ہے حالانکہ اکثر انھیں غلطی سے ایک ہی سمجھ لیا جاتا ہے۔

ایک چیز جو جعلی اللہ والوں کی خاصیت ہے، ان کی زر پرستی یا کامیابی کا لالچ ہے جو دراصل ایک ہی چیز ہے کیوں کہ کامیابی کے ساتھ ہی پیسہ اور اقتدار ملتا ہے۔ سنگِ مرمر کے ائرکنڈیشنڈ محلات (خواہ انھیں گپھا کا نام دیا جاتا ہے) جو غیر ملکی متلاشیانِ حق کے آرام کے لیے ائرکنڈیشنڈ کی جاتی ہیں کیونکہ وہ ان آسائشوں کے لیے ڈالر اور مارک ادا کرتے ہیں) ہوائی جہاز (خواہ انھیں ان اُڑنے والے گوروؤں کی زبان میں ویدانتک اور ویدک گرڑ ہی کہا جاتا ہو) اور غیر ملکی ائرکنڈیشنڈ لمبی کاریں ہندوستان کی سڑکوں پر سفر کے لیے حاصل ہوتی ہیں۔ جن کے ہر قدم پر کاروں کے ڈھانچے کو نقصان پہنچنے کا ڈر رہتا ہے۔ لیکن خدا کی وہی لامحدود رحمت جو یہ کاریں عطا کرتی ہے ان آشرموں (جو محلات سے ملتے جلتے ہیں) اور گاڑیوں کو محفوظ رکھتی ہے۔ جو دیتا ہے وہ اُسے قائم اور محفوظ بھی رکھتا ہے۔ اس کے علاوہ اللہ والے کی اور نشانیاں بھی ہیں۔ اُس کی ایک خانقاہ (اس کے لیے آشرم ایک معمولی لفظ ہے) ہوتی ہے جہاں غیر ملکی چیلے ۲۵ ڈالر یومیہ کرائے پر عبادت کے لیے ایک ائرکنڈیشنڈ گپھا لے سکتے ہیں۔ اگر ویدک سچائی کا متلاشی مالی طور پر کمزور ہے تو وہ ۱۰ ڈالر یومیہ دے کر پانچ دوسرے لوگوں کے ساتھ ایک بڑے کمرے میں ٹھہر سکتا ہے۔ لیکن وہ سب کے سب غیر ملکی ہوں گے۔

غیر ملکوں میں گھوم چکے مہاتما جی غیر ملکیوں کے خورد و نوش کے لیے ایک کینٹین کا بھی اہتمام کرتے ہیں۔ یہاں پانچ ڈالر میں ایک کھانا ملتا ہے گوشت کا ایک کچا پکا ٹکڑا اور ایک میٹھا بند ایک ڈالر میں ملتا ہے۔ میٹھی دہی جو دیوتاؤں کی خوراک سمجھی جاتی ہے، دو ڈالر میں ملتی ہے۔ یہ خانقاہ یا آشرم

غیر ملکی چیلوں کے آرام کے لیے ہمالیہ کی تلہٹی میں تعمیر کی جاتی ہے کیوں کہ اللہ والے بزرگ کی زیادہ تر دلچسپی اپنے غیر ملکی چیلوں سے ہوتی ہے۔

مذہب کی ٹھیکیدار دیویاں' اللہ والی عورتوں کی طرح سمجھی جاتی ہیں' اللہ والوں کی طرح یہ دیویاں عورتوں میں پائی جاتی ہیں۔ لیکن ابھی تک کسی دیوی کو اتنی مادی کامیابی یا روحانی بین الاقوامی شہرت حاصل نہیں ہوئی جتنی اللہ والے مردوں کو ہوئی ہے۔ پھر بھی دیوی، دیوی ہی ہے خواہ وہ ہندوستانی نژاد اور مقامی شہرت کی مالک ہی کیوں نہ ہو۔

وسطی ہندوستان میں ایک دیوی تھی جسے عالمی شہرت حاصل ہوئی کیوں کہ وہ قتل کے ایک مقدمے میں پھنس گئی۔ لیکن جب وہ عدالت میں پیش ہوئی تو وہ الف ننگی تھی، ماسوائے اپنی مسحورکن مسکراہٹ کے اُس کے جسم پر کوئی لباس نہیں تھا۔ اُس کی خوبصورت جوان چھاتیاں سیاہ لمبے بالوں سے قدرے ڈھکی ہوئی تھیں اور جسم کے اعضاء مخصوصہ گیندوں کے لمبے ہاروں تلے چھپ رہے تھے جو اُس دیوی کے چیلوں نے اُس کے خوبصورت گلے میں ڈالے تھے۔ وہ تھکے ہارے فلم فوٹوگرافروں کے لیے بھی ایک قابلِ دید نظارہ تھی۔

اور بھی دیویاں ہیں جو برہنہ نہیں ہیں لیکن جو سفید یا زعفرانی لباس میں ملتی ہیں۔ اُن میں سے کئی ایک نے بمبئی کے ائرکنڈیشنڈ ہالوں میں وعظ اور گھن گرج والی تقریریں کی ہیں اور بلاشبہ بھاری تعداد میں لوگ انھیں سُننے کے لیے آئے۔

اُن کے آتے ہی بھرے ہوئے ہال تالیوں سے گونج اُٹھتے ہیں۔ اُن کی آوازمیں (جنسی دلکشی) ایک دلکشی ہوتی ہے جو چیلوں کو اپنی جانب کھینچ لیتی ہے۔ اُن کے لمبے کالے بال ہمیشہ جوگن کا اثر پیدا کرنے کے لیے کھلے رہتے ہیں۔ وہ اپنے مدِمقابل مرد مہاتماؤں کی طرح تیز خوشبو یا بدبو سے متنفر نہیں ہوتیں۔

اور ہوں بھی کیوں؟

بال بھگوان

بھگوان کرشن کی کہانیاں بے شمار ہیں۔ اُن کی بال لیلاؤں نے رادھا کے علاوہ سینکڑوں دوسری عورتوں کو مسحور کیا۔

ایک بال بھگوان امریکہ میں رہتے ہیں۔ وہ مردوں عورتوں اور نوجوان لڑکیوں کے ایک بڑے گروہ کے ساتھ کرشن اور گوپیوں کے قصوں میں اضافہ کرنے کے لیے ہندوستان آئے۔ لیکن اُنھیں جلد ہی ہندوستان چھوڑ کر امریکہ کے مہمان نواز ساحلوں پر واپس جانا پڑا کیوں کہ یہاں اُن پر کئی تہمتیں لگیں جن میں منشی ادویات اور ہندوستانی کرنسی کے قواعد کی خلاف ورزی کے الزامات بھی شامل تھے۔

اس کے بعد اُس بال بھگوان کے بارے میں کوئی خبر نہیں آئی۔

لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ایسے کئی بھگوان ہندوستان کے ہر ضلعے میں گھوم رہے ہیں۔ جن ضلعوں میں توہم پرستی زیادہ ہے وہاں لازماً ان کی تعداد ایک سے زیادہ ہوگی۔

اُنھیں خدا کی اولاد نہیں کہا جاتا لیکن اُن کی پرستش خدا کی طرح کی جاتی ہے۔

وہ مسئلہ تناسخ کے ثبوت ہیں۔۔۔ اگر ایسا ثبوت درکار ہو۔ اُن کے بارے میں فرض کیا جاتا ہے کہ وہ بچپن سے ہی سنسکرت کے شلوک بولنے لگتے ہیں اور اُنھیں سابقہ جنم یا جنموں کے کچھ قصے یاد ہوتے ہیں۔

اُن کے سرپرست اُنھیں خوب سکھاتے پڑھاتے ہیں تاکہ وہ اُن سے نوری کمائی کر سکیں۔ یہ بھگوان پیشین گوئی کر سکتے ہیں، جنم پتریاں پڑھ سکتے ہیں اور جو لوگ مالی یا جسمانی تکالیف میں مبتلا ہوں اُن کے لیے دُعا کر سکتے ہیں۔ وہ کچھ ایسی غیبی طاقتوں کے مالک سمجھے جاتے ہیں جو اُنھیں نیوٹن کے کشش ثقل کے اصولوں سے بالاتر رکھتی ہیں۔

زوردار صفائی کی ضرورت

چنانچہ یہ وہ اللہ والی دیویاں اور بال بھگوان ہیں جو ہمارے توہم پرست مُلک میں توہمات کے جال پھیلاتے رہے ہیں۔ ہمیں اپنے درمیان میں سے اس گندگی کو صاف کرنے کے لیے منطق معقولیت اور علم کی بہت بڑی جھاڑو کی ضرورت ہے۔ ★

> **چنانچہ یہ وہ اللہ والے اللہ والیاں اور بال بھگوان ہیں جو ہمارے توہم پرست ملک میں توہمات کے جال پھیلاتے رہے ہیں۔ ہمیں اپنے درمیان میں سے اس گندگی کو صاف کرنے کے لیے منطق معقولیت اور علم کی بہت بڑی جھاڑو کی ضرورت ہے۔**

دیبی پرشاد چٹوپادھیائے

کرامت والوں کے بارے میں

گوتم بدھ نے کیا کہا!

اس مضمون میں مصنف نے کرامات کی قوت کے اظہار کے بنیادی اخلاقی جواز پر اعتراض اٹھایا ہے اور کہا ہے کہ سب سے پہلے یہ مسئلہ مہاتما بدھ کے سامنے آیا اور انھوں نے اس کا منھ توڑ جواب دیا۔ مہاتما بدھ نے اپنے ملفوظات میں جو کہ ونے پٹک کے نام سے پالی زبان میں ہیں، لکھا ہے کہ ان کا اظہار اسی قدر ذہن کو پراگندہ کرتا ہے جتنا کہ ایک بردہ فروش عورت کی طرف سے گاہکوں کو للچانے کے لیے برہنہ جسم کی نمائش پر ہوتا ہے۔ مصنف نے مزید لکھا کہ مہاتما بدھ نے اپنے پیروکاروں کو اس راستہ پر چلنے سے سخت منع کیا ہے۔

میں اپنی بات ایک معمولی سے سوال سے شروع کرتا ہوں، جس کا تعلق کرامات سے ہے یا اگر اس بات کو زیادہ واضح کر کے کہا جائے تو کرامات کی قوت کے اظہار سے ہے۔ مادہ پرست جس طرح اس کا جواب دیتے ہیں، بلا شبہ اس سے سبھی واقف ہیں۔ لیکن ان پر بالعموم بڑے آدمی ہونے کا ٹھپہ لگ جاتا ہے۔ انھیں فسادی اور مصیبتیں کھڑی کرنے والے انسان کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ پارسا اور نیک لوگ ایسے لوگوں سے گریز کرتے اور ان سے بچنے میں ہی عافیت سمجھتے ہیں۔

لہٰذا ہمیں یہاں وہ کچھ نہیں دُہرانا جو کہ وہ کہتے ہیں۔ بہرصورت کرامات کا سوال پھر بھی باقی رہتا ہے۔ حتیٰ کہ وہ لوگ جو تاریخ میں انتہائی پاکیزہ شخصیتیں شمار ہوتے ہیں۔ انھوں نے بھی اسی سوال پر اظہارِ خیال کو ضروری سمجھا۔

اس طرح کی ایک سب سے قدیم شخصیت گوتم بدھ کی تھی۔ ان کو بھی کرامات کے سوال کا سامنا کرنا پڑا۔ ان کے سامنے بھی کراماتی قوتوں کے اظہار کا معاملہ آیا۔ انھوں نے اس کا دوٹوک جواب دیا۔ ان کے لیے یہ معاملہ ذہن کو اتنا ہی پراگندہ کرنے والا تھا جس قدر کہ اس بردہ فروش عورت کی طرف سے اپنے برہنہ جسم کی نمائش جو کہ اپنے گاہکوں کو لبھانے کے لیے ایسا کرتی ہے۔ انھوں نے اپنے پیروکاروں کے لیے اس راستے پر چلنے کی ممانعت کر دی۔

> **اے بھکشوؤ! تم کو کراماتی قوتوں اور مافوق الفطرت عادتوں کا اظہار عوام کے سامنے نہیں کرنا ہے۔ جو ایسا کرتا ہے، وہ مجرم ہے۔ اس لکڑی کے پیالے کے ٹکڑے کر دو اور جب تم اسے پیس کر اس کا سفوف بنا لو گے تو پھر اسے بھکشوؤں میں بانٹ دو تاکہ وہ اسے آنکھ کے مرہم کے لیے خوشبو کے طور پر استعمال کر لیں۔**

ونے پٹک میں کیا کہا گیا ہے؟

گوتم بدھ نے اپنے پیروکاروں کے لیے ایک ضابطۂ اخلاق مرتب کیا۔ اسے ونے پٹک کے نام سے پکارا اور اس میں ایک بیان کے آخر میں انھوں نے کرامات کے سلسلے میں اپنا فیصلہ دیا۔ یہ فیصلہ درحقیقت اپنی سادگی و پُرکاری کے لیے بڑا عجیب ہے۔ اس کے مختصر خدوخال درج ذیل ہیں:۔

قصہ یوں ہے کہ "اس زمانے میں راجا گرہ کے ایک سوداگر نے ایک بیش قیمت صندل کی لکڑی کا ایک ٹکڑا حاصل کیا۔ اس سوداگر نے سوچا کہ کتنا اچھا ہو اگر میں اس لکڑی کے ٹکڑے کا ایک پیالہ بنوا لوں۔ اس طرح سے اس کے بچے ہوئے لکڑی کے ٹکڑے میری ملکیت ہوں گے اور پیالہ میں کسی کو دے دوں گا۔

لہٰذا اس سوداگر نے صندل کی لکڑی کے ٹکڑے کا پیالہ بنوا لیا اور اسے ہوا میں ٹانگ دیا۔ اسے بانس کے اوپری سرے پر رکھ کر اوپر اٹھایا اور اس

بانس کے نیچے بہت سے بانس ایک دوسرے کے ساتھ جوڑ کر اُسے بہت ہی اُوپر اُٹھا دیا اور پھر اعلان کیا کہ اگر کوئی سنت سادھو مہاراج کے پاس کراماتی قوت ہے تو اُسے اپنی قوت سے اس پیالے کو نیچے اُتارنا چاہیئے۔ یہ اس کو تحفہ میں پیش کیا جائے گا۔ اپنی دانشمندی کے لیے مشہور بہت سے اشخاص ایک ایک کر کے وہاں پہونچے اور سوداگر سے بات چیت کی۔ سوداگر نے کہا کہ اگر آپ کرامات والے سادھو سنت ہیں تو آپ اپنی اُس قوت سے اس پیالے کو نیچے اُتار لیں۔ لیکن اُن میں سے کوئی بھی پیالے کو نیچے نہ لا سکا۔

اُس وقت گوتم بُدھ کے دو قریبی پیروکار بھکشا لیتے لیتے راجا گرہا میں پہونچے۔ ان میں سے ایک کا نام تھا موگ لانا اور دوسرے کا پنڈولا بھاردواج۔ یہ دونوں سادھو سنت تھے۔ اور ان کو کراماتی قوت حاصل تھی۔ ان دونوں نے ایک دوسرے سے مشورہ لیا کہ پیالہ حاصل کیا جائے۔ طے یہ پایا کہ پنڈولا بھاردواج اسے حاصل کریں۔ چنانچہ پنڈولا بھاردواج ہوا میں اُڑے اور پیالہ لے لیا اور ہوا میں ہی راجا گرہا کے تین چکر کاٹے۔ اس سوداگر اور اس کی بیوی بچوں نے پنڈولا بھاردواج کو ہوا میں اُڑتے دیکھا تو اور اُن سے درخواست کی کہ وہ نیچے اُن کی رہائش گاہ پر اُتر آئیں۔ جب وہ نیچے آئے تو سوداگر نے اس پیالے کو بہت قیمتی کھانوں سے بھر دیا اور بھاردواج کی خدمت میں اسے پیش کیا۔ اسے لے کر وہ بھکشوؤں کے کیمپ میں پہونچے۔ ان کے پیچھے خلقت بھی جوان کی اس کرامت کو دیکھ کر حیران ہو اُٹھی تھی۔ یہ لوگ نعرے لگا رہے تھے۔ گوتم بُدھ نے اُن کو چلاتے ہوئے سُنا اور آنندا سے پوچھا کہ یہ سب کیا ہے؟ آنندا نے انھیں بھاردواج کے اس کارنامے کے بارے میں بتایا۔

عام طور پر اس کے اظہار کا مقصد چوں کہ عوام سے کچھ نہ کچھ نفع اینٹھنا ہوتا ہے، لہٰذا یہ بیحد کریہہ اور ناپسند عمل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ گوتم بدھ نے اسے ایک ایسی فاحشہ عورت سے تشبیہہ دی جو چند سکے بٹورنے کے لیے اپنے جسم کی نمائش کرتی ہے۔

گوتم بُدھ کی ناراضگی

گوتم بُدھ نے اس موقع پر اس سلسلے میں بھکشوؤں کی ایک سبھا بلائی اور اس میں بھاردواج سے پوچھا کیا یہ سب کچھ حقیقت میں صحیح تھا بھکشو بھاردواج نے تسلیم کیا کہ یہ سب صحیح تھا۔

اس پر گوتم بُدھ نے اُسے جھاڑا اور کہا" یہ مناسب نہیں ہے۔ یہ تعلیمات کے خلاف ہے، یہ بات بھکشو کو زیب نہیں دیتی۔ اس سے بچنا چاہیئے کیوں کہ یہ غیر مناسب ہے۔ بھاردواج! یہ کیسے مناسب ہے کہ ایک معمولی سے لکڑی کے برتن کی خاطر تم اپنی کراماتی قوتوں کا اظہار عوام کے سامنے کرو۔ ایسا کرو گے تو تمہاری مثال اُس عورت کی سی ہو گی جو چند سکوں کی خاطر اپنے جسم کی نمائش کرتی ہے۔ کیا تم نے ایک معمولی لکڑی کے برتن کی خاطر عوام کے سامنے اپنی کراماتی قوتوں کی مافوق الفطرت صفت کا اظہار کیا ہے۔

جب گوتم بدھ اسے سرزنش کر چکے، اور اپنا مذہبی لیکچر دے چکے تو انھوں نے بھکشوؤں سے مخاطب ہو کر کہا۔" اے بھکشوؤ! تم کو کراماتی قوتوں اور مافوق الفطرت عادتوں کا اظہار عوام کے سامنے نہیں کرنا ہے۔ جو ایسا کرتا ہے، وہ مجرم ہے۔ اس لکڑی کے پیالے کے ٹکڑے کر دو اور جب تم اسے پیس کر اس کا سفوف بنا لوگے تو پھر اسے بھکشوؤں میں بانٹ دو تاکہ وہ اسے آنکھوں کے مرہم کے لیے خوشبو کے طور پر استعمال کریں۔"

یہ ہے وہ مستند بیان جو ہم نے بُدھ کی تعلیمات میں پڑھا ہے اور جو ایک مستند کتاب ونے پٹک میں شامل ہے۔

دراصل سوال یہ نہیں ہے کہ کیا گوتم بُدھ کرامات کی صلاحیت کے حقیقی امکان میں یقین رکھتے تھے یا نہیں اور یہ ہماری بحث کا موضوع بھی نہیں ہے۔ گوتم بدھ کی تعلیمات کو عوام تک پہونچانے کے لیے جو تفصیل بیان کی گئی ہے، اس میں اس کے امکان کو یکسر غیر ممکن نہیں بتایا گیا ہے۔

گوتم بدھ کی تعلیمات کے تمام پہلوؤں کے بارے میں دور حاضر کے اسکالروں کو ایک نقطۂ اتصال پر آنا پڑے گا۔ لیکن اس سلسلے میں جو دل کو لگنے والی اور دل کو چھونے والی اور براہِ راست سمجھ میں آنے والی باتیں ہیں، ان سے صرفِ نظر نہیں کیا جا سکتا۔ وہ اتنے واضح ہیں کہ ان کے بارے میں شبہ کی کوئی گنجائش ہی نہیں۔

لیکن اِن تعلیمات کا مقصد ہی دوسرا ہے۔ ان سے کراماتی قوتوں کے تئیں گوتم بدھ کے اندازِ نظر کا پتہ چلتا ہے اس میں بنیادی طور پر ایک اخلاقی سوال اٹھایا گیا ہے۔ مافوق الفطرت قوتوں کے حصول کے امکانات کو تسلیم کئے جانے کے بعد بھی، بھکشوؤں کے لیے یہ بات ٹھیک نہیں بتائی گئی کہ وہ اس کے اظہار کے لیے کوشش کریں اور عوام کے سامنے اپنی ان صفات کا اظہار

عام لوگ سے ہٹ کر ہیں۔ اور جن میں
نے غیر معمولی صلاحیت حاصل کر لی ہے۔
تم بدھ نے اپنی تعلیمات میں اس کا رد
اب دیا ہے۔ بھکشوؤں کے نقطۂ نظر سے
ہے کہ اخلاقی نقطۂ نظر سے یہ ایک سخت
اور گوتم بدھ نہیں چاہتے تھے کہ ان کے
پیروکار اسے اپنائیں۔ عام طور پر اس
کے اظہار کا مقصد چونکہ
عوام سے کچھ نہ
کچھ نفع

اس کا تعلق ان کے کرتبوں کے بنیادی اخلاقی جواز سے ہے۔ اگر ہم گوتم بدھ کی تعلیمات سے کچھ اخذ کرنے کے لیے تیار ہیں، تو ہم اس طرح کے کاموں کی اجازت نہیں دے سکتے، یا پھر یہ اجازت اس معنی میں ہوگی، جس طرح کہ ایک فاحشہ عورت کو چند سکوں کی خاطر اپنے جسم کی نمائش کے لیے دی جاتی ہے۔

ہوتا ہے، لہٰذا یہ بے حد کریہہ اور ناپسند
۔ یہی وجہ ہے کہ گوتم بدھ نے اسے ایک
فاحشہ عورت سے تشبیہ دی جو چند سکے
کے لیے اپنے جسم کی نمائش کرتی ہے۔
ہے کہ گوتم بدھ نے قیمتی صندل کی لکڑی
لے کو چورا چورا کرنے اور اس کا سفوف
کی بات کہی۔ حالاں کہ انھوں نے اس کے
ہی یہ دانشمندانہ بات بھی کی کہ اس
کو دواؤں کی تیاری میں کام میں لیا جاسکتا
نفیس صندل کی لکڑی کے گُم ہو جانے سے کوئی
یا عداوت نہ تھی۔ اسے حاصل کرنے پر انھیں
شکایت نہ تھی۔ درحقیقت ونے پٹک میں
بدھ کی طویل بات چیت سے یہ ظاہر
ہے کہ یہ برادہ مختلف طریقوں پر بھکشوؤں
دری نے حاصل بھی کیا۔ لیکن مسئلہ تو اس
ٹ کر کچھ اور ہی ہے۔
ب سوال یہ ہے کہ ہم کو گوتم بدھ سے جدا

ہوئے ڈھائی ہزار سال سے زیادہ ہو چکے ہیں۔ وہ بہت سی باتیں اور عقائد جو ان کے زمانے میں رائج تھے، اب محض ایک تاریخی اور شاید عمرانیات کی دلچسپی کے عنوان کے طور پر باقی رہ گئے ہیں۔ البتہ آج کے دور میں ان کی تعلیمات کی روح کو سمجھنے کی ضرورت ہے چوں کہ ان تعلیمات کا جو نچوڑ ہے، وہ آج کے زمانے میں بے حد اہم ہے۔ گوتم بدھ ہمارے لیے مُردہ نہیں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج بھی اُن کے پیغام کو واضح کرنے اور دورِ حاضر سے اس کی مطابقت قائم کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

گوتم بدھ کی تعلیمات کے تمام پہلوؤں کے بارے میں دورِ حاضر کے سکالروں کو ایک نقطۂ اتصال پر آنا پڑے گا لیکن اس سلسلے میں جو دل کو لگنے والی اور دل کو چھونے والی اور براہِ راست سمجھ میں آنے والی باتیں ہیں، ان سے صرفِ نظر نہیں کیا جا سکتا۔ وہ اتنی واضح ہیں کہ ان کے بارے میں شبہ کی کوئی گنجائش ہی نہیں۔ مندرجہ بالا اقتباس جو اس مضمون میں نقل کیا گیا ہے، اس میں یہی خوبی دیکھنے کو ملتی ہے۔ اس کا ہمارے مسائل سے براہِ راست تعلق ہے۔ آج ہندوستان میں اس طرح کی کرامات دکھانے والے مذہبی پیشواؤں کا ایک گروہ ہے۔ وہ عوام کو اپنی کرامات سے مرعوب و مسحور کرنا چاہتے ہیں۔ ان کو بے نقاب کرنے کی بلاشبہ کوششیں بھی جاری ہیں کیوں کہ وہ نیم حکیم کی طرح سے اس سماج میں کام کر رہے ہیں اور شعبدہ گری دکھانے میں مصروف ہیں۔

سرِ دست میں ان کے بارے میں صرف ایک ہی سوال اٹھاؤں گا۔ اس کا تعلق ان کے کرتبوں کے بنیادی اخلاقی جواز سے ہے۔ اگر ہم گوتم بدھ کی تعلیمات سے کچھ اخذ کرنے کے لیے تیار ہیں، تو ہم اس طرح کاموں کی اجازت

دراصل سوال یہ نہیں ہے کہ کیا گوتم بدھ کرامات کی صلاحیت کے حقیقی امکان میں یقین رکھتے تھے یا نہیں اور یہ ہماری بحث کا موضوع بھی نہیں ہے۔ گوتم بدھ کی تعلیمات کو عوام تک پہونچانے کے لیے جو تفصیل بیان کی گئی ہے، اس میں اس کے امکان کو یکسر غیر ممکن نہیں بتایا گیا ہے۔ لیکن ان تعلیمات کا مقصد ہی دوسرا ہے، ان سے کراماتی قوتوں کے تئیں گوتم بدھ کے اندازِ نظر کا پتہ چلتا ہے۔ اس میں بنیادی طور پر ایک اخلاقی سوال اٹھایا گیا ہے۔

نہیں دے سکتے، یا پھر یہ اجازت اس معنی میں ہوگی جس طرح کہ ایک فاحشہ عورت کو چند سکوں کی خاطر اپنے جسم کی نمائش کے لیے دی جاتی ہے۔ ★

موہبت حسین

تجارت گندہ پیشہ ہے

مصنف نے فلم "مانیسٹر ورڈاکس" میں چارلی چپلین کا حوالہ دیتے ہوئے تجارت کے بارے میں ایسے الفاظ کہے ہیں۔ جب ایک طوائف کو اُن ہتھکنڈوں سے صدمہ پہنچتا ہے جو تاجروں کی طرف سے اس دھندے کو جاری رکھنے کے لیے ہوتے ہیں تو یہ عظیم فن کار اُس سے کہتا ہے کہ "جانِ من! تجارت ایک گندہ پیشہ ہے"۔ یہ مختصراً تجارت کی تصویر ہے۔

چارلی چپلین کی فلموں میں پھر سے دلچسپی لی جانے لگی ہے۔ لیکن بھارت میں اب تک اُس کے دو شاہکاروں کی دوبارہ نمائش نہیں ہوئی اس میں ایک ہے لائم لائٹ (LIME LIGHT) جس میں اُس کی ذہانت نے عمر کے انحطاط کے عام موضوع کو ایک المیہ کی صورت میں پیش کیا ہے دوسری فلم ہے مانیسٹر ورڈاکس (MONSIEUR VERDOUX) جو سرمایہ داری، منافع خوری کے زہر کے لازمی پھیلاؤ پر ایک تیکھا اور ظالمانہ طنز ہے۔

موخرالذکر میں چپلین عظیم اور گہرے نقوش چھوڑنے والے الفاظ بولتا ہے جب ایک طوائف کو اُن ہتھکنڈوں سے صدمہ پہنچتا ہے جو تاجروں کی طرف سے اس دھندے کو جاری رکھنے کے لیے استعمال کئے جاتے ہیں تو یہ عظیم فن کار اُس سے کہتا ہے کہ "جانِ من! تجارت گندہ پیشہ ہے۔" یہ بات مختصر طور پر تمام تر تجارت پر لاگو ہوتی ہے۔

> **انسانوں سے ایسا سلوک اور ایسی چھٹنی جیسے کہ فاضل اشیاء میں سے کاٹ چھانٹ کی جاتی ہے تاجروں کا طریقہ کار ہے۔ ایسا ماضی میں ہوتا تھا اور اب بھی ہے۔ کیلی فورنیا میں ایسا ہے اور منی پور میں بھی ایسا ہی ہے۔**

ناظرین کو اسی موضوع پر بعض دوسرے شاہیر کے اقوال یاد ہوں گے۔ آپ نے فرانسیسی سوشلسٹ "پرادھوں" کا نام سُنا ہوگا جس نے اپنے نوعمری کے دنوں میں یہ اعلان کرکے اپنے ناظرین کو چونکا دیا تھا کہ "تمام مال وزر مسروقہ ہے"۔ بالزک نے اس سے بھی زیادہ سخت الفاظ استعمال کرتے ہوئے لکھا تھا۔ "تمام عظیم دولت کی پشت پر عظیم جرم کا ہاتھ ہے۔ اور بلا شبہ کارل مارکس بھی تھے جنھوں نے اپنی مشہور کتاب "سرمایہ" میں ایک فرانسیسی مصنف کا حوالہ دیا تھا جس نے کہا تھا سرمایہ اپنے جنم کے ساتھ اپنے رخسار پر خون کے دھبے لے کر دنیا میں آتا ہے لیکن مارکس نے اس میں اضافہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ سرمایہ جب دُنیا میں آتا ہے وہ سر سے پاؤں تک خون اور گرد سے لت پت ہوتا ہے۔

"چھوٹے" بڑے ہو رہے ہیں

بعض لحاظ سے اور ذاتی طور پر بولتے ہوئے کوئی بھی شخص اس ماحول میں نشو ونما پاتا ہے جہاں یہ دستورکار یا تربیت خود اُس ماحول کی پیداوار ہے لیکن یہ اُس نوجوان کی رومانیت نہیں ہے جو وہ بصورت دیگر آزاد بھارت میں رہنے اور کام کرنے کی سنجیدہ حقیقت میں تلاش کرتا ہے۔ کوئی بھی شخص دیکھ سکتا ہے اور حتٰی کہ اُس کے تجربے میں یہ بات آئی ہے کہ بعض "چھوٹے" لوگ کیونکر بڑے ہوگئے اور وہ جدید اداروں کے منتظموں کو بھی سُن سکتا ہے جو اپنے آقاؤں کے دولت کمانے کے کارنامے بیان کرتے ہیں۔

یہ ایک پڑوسی کی روئداد ہے جو کام پر اور اپنے دوستوں سے ملنے کے لیے گھر سے سائیکل پر جایا کرتا تھا۔ پھر "ملک پاوڈر کنٹ" (دودھ پاوڈر کے ٹھیکے) کا کالا دھندہ اُس کے ہاتھ لگ گیا دو برس میں اُس نے دو مکان کھڑے کرلیے اور ایک پُرانی مرسیڈیز (موٹر گاڑی) لے کر اُسے نیا رنگ روغن کرالیا۔ اُس کی طرف دیکھ کر کوئی بھی جان سکتا تھا کہ اُس میں کوئی انوکھی بات نہیں تھی۔ وہ اُوپر ہی اُوپر اٹھتا جارہا تھا، اور ممکن ہے کہ بعد میں وہ مطعون بھی ہو جاتا لیکن وہ جتنا اوپر اٹھتا تھا اُتنا ہی اس کی مقبولیت اور عزت وتوقیر میں بھی اضافہ ہوتا جاتا تھا۔

ایک حساس منتظم تھا جو ہمارے ایک بڑے شہر میں ایک نہایت جدید اور مغربی طرز کے بڑے

تجارتی ادارے کے عملے کا سربراہ تھا۔ اُن دنوں ملازموں کی "قبل از وقت رضا کارانہ سبکدوشی" کی سکیم پر غور ہو رہا تھا تاکہ طرزِ جدید کے دفتری آلات کی تنصیب کی جا سکے۔ منتظم بیشتر ملازموں کی ظاہرا پریشانی سے رنجیدہ تھا جو ادھیڑ عمر سے گذر رہے تھے۔ لیکن جونہی وہ جذبات کی رَو میں بہنے لگا ہیڈ آفس سے فوراً ٹیلکس پر پیغام آ گیا جس میں اُس سے کہا گیا کہ وہ یاد رکھے کہ جب انسانی ملازم ملازمت کرتے کرتے بوڑھے ہو جاتے ہیں تو وہ زیادہ مہنگے ہو جاتے ہیں جبکہ مشینیں برس گذرنے کے ساتھ ساتھ گھساؤ کی بدولت ارزاں تر ہو جاتی ہیں۔ چنانچہ ملازموں کی چھٹنی کے ساتھ کمپنی کے مفاد میں ہمدردی بھی چلی جاتی ہے۔

یہ کوئی الگ تھلگ معاملہ بھی نہیں ہے کوئی بھی شخص جو کسی ایسے شخص کو جانتا ہے جو کسی بھی قسم کے چھوٹے یا بڑے تجارتی ادارے میں کچھ بھی ہے اس تجربے کو دہرائے گا۔

انسانوں سے ایسا سلوک اور ایسی چھٹنی جیسے کہ فاضل اشیاء میں سے کاٹ چھانٹ کی جاتی ہے، تاجروں کا طریقہ کار ہے۔ ایسا ماضی میں ہوتا تھا اور اب بھی ہے۔ کیلی فورنیا میں ایسا ہے اور منی پور میں بھی ایسا ہی ہے۔

تاریخی تناظر

لیکن جو کچھ تبدیل ہوا ہے وہ ہے تاریخی سیاق و سباق۔ کسی بھی شریف ہستی کے لیے یہ آداب خواہ کیسے ہی پریشان کن اور رنجیدہ ہوں تاریخ میں ایسا وقت تھا جب زندگی سے متعلق ایسا نظریہ رکھنے والوں کا پیداوار پر قبضہ تھا۔ وہ نہ صرف مادی پیداوار میں بے نظیر ترقیوں کے اعلیٰ منتظم اور حامی تھے بلکہ سائنسی دریافتوں سے لے کر جمہوری سیاسی عوامل تک خیال و فکر میں انقلاب کے رہنما تھے۔ اُن کے تاریخی ظہور کے پہلے دور میں اُن کے چوٹی کی سطح کے خاندے

ایسے اشخاص تھے جو ناقابلِ یقین توانائی اور مفاد کی آفاقیت کے مالک تھے۔ یہ تاریخ کی ستم ظریفی ہے کہ تمام انسانی گروہوں اور طبقوں میں نہایت، انسانیت سوز بھی وہی تھے جو نوعِ انسانی کی بہبود کے لیے نعرہ بازی کرتے رہے۔ اُس وقت بھی ایک "لکشمن ریکھا" تھی جس سے حدود کا خط کھینچا گیا تھا اور وہ تھا منافع کا حصول اور منافع کے نظام پر مبنی دستور کار کی توسیع اور اس کا دفاع تھا۔ مثال کے طور پر غلاموں کی تجارت اسی سے وجود میں آئی یا ہمارے ملک میں ڈھاکہ کی ململ بُننے والوں کے انگوٹھے اور اُنگلیاں کاٹی جانے لگیں۔

اگر کوئی تاریخ کا مطالعہ کرے تو اُسے معلوم ہوگا کہ ایسی باتیں دیر تک جاری نہیں رہتیں۔ اس کے تضاد ہی نے آئیڈیالوجی اور تحریکِ سوشلزم کی صورت میں اپنا حریف پیدا کیا۔ ۱۹۲۹ء کے بعد سے جب جواہر لال نہرو نے اُس وقت کے

بارے میں اندرا گاندھی کو لکھا تھا تو سوشلزم کے ملک سے پلاننگ (منصوبہ بندی) کا ایک نیا جادوئی لفظ وجود میں آیا۔ اس کی جادوئی اہمیت یہ تھی کہ یہ صحیح طور پر تجارتی دنیا کے نام نہاد جادو کا توڑ تھا۔ یہ متبادل عقائد کے ساتھ اقتصادی ترقی کا ایک متبادل طریقۂ ترقی۔ یہ مستقبل کا نظریہ تھا اور اس پر عمل ہوا اور ایک نظریے سے سوشلسٹ تحریک نے سماجی ترقی کے ایک تجربہ کی صورت اختیار کی اور وہ پروان چڑھا۔

بھارت کا المیہ

بھارت میں ہمارے ملک اور ہمارے تاجروں کے لیے بھی المیہ یہ ہے کہ انھوں نے صحیح طور پر ایسے وقت میں بلوغت پائی جب عالمی منظر پر اُن جیسے

بھارت میں ہمارے ملک اور ہمارے تاجروں کے لیے بھی المیہ یہ ہے کہ انھوں نے صحیح طور پر ایسے وقت میں بلوغت پائی جب عالمی منظر پر اُن جیسے لوگ نہ صرف زائد المیعاد ہو چکے تھے بلکہ وہ روکاوٹ بھی بن گئے تھے۔ اُن کے طریقے نہ صرف بدلے جا چکے تھے بلکہ وہ ناکارہ بھی ہو چکے تھے اور اِس سے پہلے کہ وہ اُس رسّی کو کاٹ سکتے جس نے اُنھیں جاگیرداری سے ملایا ہوا تھا کہ اُنھیں اجارہ داری کے روگوں نے گھیر لیا۔

ملی جلی معیشت نے یقیناً تاجروں اور اُن کے اداروں کو یقیناً موقع دیا لیکن اُنھوں نے اس سے فائدہ نہیں اُٹھایا۔ اس سے بھی زیادہ بڑی بات یہ ہے کہ اُنھوں نے اُس اعتماد کو توڑا جو اُن میں رہناؤں اور جدّت کاروں کے طور پر کام کرنے کے لیے سونپا گیا تھا۔

لوگ نہ صرف زائد المیعاد ہو چکے تھے بلکہ وہ رکاوٹ بھی بن گئے تھے۔ اُن کے طریقے نہ صرف بدلے جا چکے تھے بلکہ وہ ناکارہ بھی ہو چکے تھے۔ اور اس سے پہلے کہ وہ اُس رسی کو کاٹ سکتے جس نے اُنہیں جاگیرداری سے ملایا ہوا تھا کہ اُنھیں اجارہ داری کے روگوں نے گھیر لیا۔ اس سے پہلے جیسا کہ حالت تھی، وہ منفعت بخش پیداوار سے منافع کمانے کے طریقے سیکھ سکتے انھیں جائدادوں کے تبادلے سے ہونے والے منافع کا چسکہ لگ گیا۔ جب انھوں نے مال کی اجارہ داری شروع کی تو انھوں نے شروع کیا

کی عادت کو نہیں چھوڑا تھا۔ تاہم وہ اس سے چپٹے رہے اور ابھی تک چپٹے ہوئے ہیں۔ اس کے باوجود یہ افسانے مشہور کیئے جا رہے ہیں کہ وہ ناگزیر اور برتر ہیں۔

جواہر لال نہرو حیران کُن حد تک درست تھے جب انھوں نے برسوں پہلے کہا تھا کہ بھارت کی ترقی کے لیے ترقیات کا سوشلسٹ نظام ہی واحد طریقہ ہے۔ ایسا اس لیے نہیں تھا کہ وہ ذاتی طور پر سوشلزم کے نظریات اور تہذیب کو پسند کرتے تھے۔ بلکہ اس لیے کیوں کہ کوئی ایسا دُوسرا طریقہ نہیں تھا جسے سماجی انصاف کے ہمراہ ترقی کہا گیا ہو۔ ملی جُلی معیشت نے یقیناً تاجروں اور اُن کے اعتماد کو توڑا جو اُن میں رہنماؤں اور حدت کاروں کے طور پر کام کرنے کے لیے کہا گیا تھا۔

سرکشانہ باتیں

اول : آؤ ہم اُن باتوں پر غور کریں جنھیں ایک بار سٹالن نے سرکشانہ باتیں بتایا تھا۔ ایک اہم "عطیہ" جو تاجروں نے بھارت کی معیشت کو دیا ہے وہ ہے "بیمار" صنعتی اور تجارتی اداروں کی توسیع۔ اُن "بیمار" یونٹوں کے مالک کون ہیں جنھیں حکومت نے اپنے ہاتھ میں لیا ہے ؟ کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ بیمہ زندگی اور جنرل بیمہ کمپنیوں کو حکومت نے اس لیے اپنے ہاتھ میں لیا تھا کیوں کہ پرائیویٹ مالک متوسط طبقوں کی عمر بھر کی بچت کو اُڑا رہے تھے۔ کیا پرائیویٹ مالی بچت کے اداروں کا تجربہ اب کچھ بہتر ہے ؟ کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ کوئلہ کی کانوں اور کان کنوں کو حقیقی طور پر ذبح کیا جا رہا تھا جس کی وجہ سے اُنھیں قومی ملکیت میں لیے جانے کے سوائے کوئی چارہ نہیں رہا ؟ یہ کیا بات ہے کہ کپڑا ملوں کی زمین اُن کی پیداواری مشینری سے بڑھ کر اثاثہ ثابت ہو رہی ہے ؟ دُنیا میں کسی دُوسری جگہ پاور لوموں نے فیکٹری کی پیداوار کو غائب کیا ہے ؟ لیکن یہ ہمارے وسیع منظر کا تعجب خیز حصہ ہے کہ یہ صنعتیں اور کاروباری ادارے ہیں جو بیمار ہو رہے ہیں۔ اُن کے مالک موٹے تازہ ہوتے جا رہے ہیں اور پھر ایسے ہی نئے نئے منصوبے بنائے ہیں۔

دو : آؤ "بیماری" سے ہلکے بخار والے شعبے یعنی محض دھوکہ دہی کا جائزہ لیں۔ اقتدار کے اعلیٰ منصبوں پر تعینات بیشتر اصحاب اُن سرٹیفکیٹوں کو اکثر بڑے فخر سے لٹکاتے ہیں جو عالمی بینک کی طرف سے دیئے گئے ہیں اور جن میں ہماری معیشت کی تخمینہ کاری اور اُن کے منتظموں کی اہلیت کی شہادت دی گئی ہے۔ لیکن عالمی بینک کی اُس رپورٹ کے بارے میں کیا کیا جائیگا جس کے مطابق ہمارے ملک کو دنیا میں سب سے زیادہ کالے دھن والا ملک ہونے کا شرف حاصل ہے ؟ اندازہ ہے کہ یہ رقم کوئی ۴ ارب، کھرب روپیہ ہے۔ سابق وزیر خزانہ چوان کی اس صاف بیانی کے بارے میں کیا کہا جائیگا کہ بھارت میں دو متوازی اقتصادی نظام ہیں۔ ایک سرکاری اور دُوسرا ہے کالے دھن کا نظام۔ موجودہ وزیر خزانہ کے اس الزام کا کیا جواب ہے کہ کئی ہزاروں کروڑ روپے کے ٹیکس محض مقدمہ بازی کی آڑ میں ادا نہیں کیئے جا رہے ؟ مزدوروں اور ملازموں کے پراویڈنٹ فنڈوں سے کیسی دھوکہ بازی کی جا رہی ہے ؟ اِس بارے میں کیا کہا جائیگا کہ بھارت میں بے نامی تجارت کی ہم معنی بن گئی ہے۔

تین : آؤ ہم دھوکہ دہی سے سرکاری فنڈوں کے "جائز" استعمال کا ذکر کریں ان فنڈوں کا استعمال اپنے خاندان کے ساتھ ساتھ اپنی نجی سلطنت قائم کرنے کے لیے کہا جاتا ہے۔ مدیر محترم نے شروع ہی اصرار کیا تھا کہ اس سلسلے میں کسی کے نام کا ذکر نہ کیا جائے۔ لہٰذا میری مثالیں ناموں کے بغیر رہیں گی گو شاید وہ غیر معروف نہیں ہوں گی۔ لیکن تمام دوسرے پہلوؤں کو چھوڑ کر ایل آئی سی کے اُس سادہ حق پر اتنی غوغا آرائی کیوں کی جاتی ہے، جو وہ ایک شیئر ہولڈر کے طور پر استعمال کرنا چاہتی ہے ؟ کیا وزیر اعظم اندرا گاندھی بالکل درست نہیں تھیں جب انھوں نے کہا تھا کہ بھارت میں پرائیویٹ کاروبار نہ تو اس قدر پرائیویٹ ہے اور نہ ہی وہ کاروبار ہے۔ اس میں یہ اضافہ کیا جانا چاہیئے کہ وہ سرکاری خزانے کے فنڈوں کو ہتھیانے کا کاروبار ہے جس بات کی زیادہ کھوج کرنے کی ضرورت ہے وہ یہ ہے کہ وہ کیونکر ایسے فنڈ ہتھیاتے ہیں۔

چار : ہم یہاں سے اُس مقام کی طرف بڑھ سکتے ہیں، جہاں پیداوار محدود کر کے منافع کمایا جاتا ہے۔ کیا اشیاء کی قلت مصنوعی طور پر پیدا نہیں کی جاتی ؟ ورنہ مثال کے طور پر اخبارات میں یہ اعلانات کیوں شائع کیئے جاتے ہیں کہ حکومت اپنے ذخیروں سے مزید چینی بازار میں لا رہی ہے تاکہ پرائیویٹ تاجر اپنے اُن ذخیروں کو نکال دیں جو انھوں نے جمع کر رکھے ہیں۔ یہ پرائیویٹ تاجروں کے لیے کیونکر بہتر ہوتا، اگر پیداوار اس قدر کم ہو جاتی کہ حکومت کے پاس بازار میں نکالنے کے لیے کوئی اسٹاک ہی نہ ہوتا ؟ ایسی کئی مزید ظالمانہ مثالیں ہیں جیسے کہ حیات بخش ادویات دستیاب نہیں ہو رہی ہیں کیونکہ بعض اوقات

> یہ کیا بات ہے کہ کپڑا ملوں کی زمین اُن کی پیداواری مشینری سے بڑھ کر اثاثہ ثابت ہو رہی ہے جو دنیا میں کسی دُوسری جگہ پاور لوموں نے فیکٹری کی پیداوار کو غائب کیا ہے؟ لیکن یہ ہمارے وسیع منظر کا تعجب خیز حصہ ہے کہ یہ صنعتیں اور کاروباری ادارے ہیں جو بیمار ہو رہے ہیں۔ ان کے مالک موٹے تازہ ہوتے جا رہے ہیں اور پھر ایسے ہی نئے نئے منصوبے بنائے ہیں۔

ہر مفید اور بعض اوقات ضرر رساں برانڈ کی دوائیاں تیار کرنا زیادہ منافع بخش ہوتا ہے۔ ہمارے ہاں کے تاجر دوسرے ملکوں کے اپنے شریک کار تاجروں کی مصنوعات کی نقل کر رہے ہیں۔ کیا ہمیں بعض حکومتوں کی یہ اطلاعات موصول نہیں ہوتیں کہ وہ پیداوار کے محدود کرنے کے لیے امدادی رقوم دیتی ہیں؟ کیا سنگترے کیلی فورنیا میں سمندر کے اندر نہیں پھینکے جاتے، کافی کی پھلیاں برازیل میں جلائی نہیں جاتیں اور مکھن یورپ کی غاروں میں لڑنے کے لیے جمع نہیں کیا جاتا؟۔

پانچ: اس کے بعد نہ صرف عام طور پر لوگوں بلکہ فوری طور پر اپنے ہی کنبے کے افراد کو مراعات اور ملازمتیں دینے کے دستور کا ذکر کیا جاتا ہے۔ اس موقع پر ناظرین کو ڈالمیا جین کمپنیوں کے گروپ کے بارے میں دیوین بوس رپورٹ کا مطالعہ کرنے کا مشورہ دیا جاتا ہے۔ فاضل جج نے ایک مثال دیتے ہوئے کہا کہ جب ایک نئی کمپنی شروع کی گئی تو اُسے بنانے والے ایک مشہور تاجر نے اپنی ۔ ۸ سالہ ماں کو اُس کا چیرمین بنا دیا۔ قدرتاً اُس بوڑھی خاتون نے اپنے بیٹے کو اُس کا منیجنگ ڈائریکٹر مقرر کر دیا۔ لیکن جب کمپنی خسارے میں جا کر ناکام ہونے لگی تو اُس بوڑھی خاتون نے اب کیا گُل کھلایا؟ اُس نے اپنے بیٹے کو منیجنگ ڈائریکٹر کے عہدے سے برخاست کر دیا۔ جج بوس نے اُسے قدرتی خیال کیا۔ لیکن گہری چھان بین کرکے یہ پایا کہ برخاست شدہ بیٹے کو گریجوئٹی اور معاوضے وغیرہ کی صورت میں بہت بڑی رقم دے دی گئی۔ اس پر فاضل جج نے طنزاً تبصرہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ عام طور پر ملازمت کرنا سود مند ہے لیکن بھارت کی کاروباری دنیا میں برخاستگی اس سے بھی زیادہ سُود مند ہے۔

چھ: انجام کار جب اس سے بھی زیادہ روپیہ کمانے کا موقع ملتا ہے تو یہی طریق کار صرف باہری لوگوں کے خلاف بلکہ اپنے ہی کنبے کے خلاف برتا جاتا ہے۔ فلم ساز شیام بنگل نے ایک تخلیقی فلم بنائی ہے لیکن اپنے "کلجگ" میں کوئی افسانہ نہیں گھڑا۔ جس کو اس پر شبہ ہو وہ احمد آباد، بمبئی یا مدراس کے بعض خصوصی علاقوں میں جا سکتے ہیں، اور کیا چلاپتی راؤ اس بات کو ریکارڈ میں نہیں لائے کہ ایک اخباری مالک نے انھیں بتایا تھا کہ اُس نے ہرا ایسا جُرم کیا ہے جس کے بارے میں سوچا جا سکتا ہے۔ اُس وقت کے پہلے پریس انکوائری کمیشن کے صدر راؤ نے دریافت کیا "کہ کیا قتل بھی؟" اس کا جھٹ سے جواب آیا کہ "ارادہ تھا لیکن جسم میں دَم نہیں تھا"۔ اسی میں سارا معاملہ بیان کر دیا گیا ہے۔ ★

کیا وزیر اعظم اندرا گاندھی بالکل درست نہیں تھیں جب انھوں نے کہا تھا کہ بھارت میں پرائیویٹ کاروبار نہ تو اس قدر پرائیویٹ ہے اور نہ ہی وہ کاروبار ہے۔ اس میں یہ اضافہ کیا جانا چاہیئے کہ وہ سرکاری خزانے کے فنڈوں کو ہتھیانے کا کاروبار ہے جس بات کی زیادہ کھوج کرنے کی ضرورت ہے وہ یہ ہے کہ وہ کیونکر ایسے فنڈ ہتھیاتے ہیں۔

کیا اشیاء کی قلت مصنوعی طور پر پیدا نہیں کی جاتی؟ ورنہ مثال کے طور پر اخبارات میں یہ اعلانات کیوں شائع کئے جاتے ہیں کہ حکومت اپنے ذخیروں سے مزید چینی بازار میں لا رہی ہے تاکہ پرائیویٹ تاجر اپنے اُن ذخیروں کو نکال دیں جو انھوں نے جمع کر رکھے ہیں۔ یہ پرائیویٹ تاجروں کے لیے کیونکر بہتر ہوتا اگر پیداوار اس قدر کم ہو جاتی کہ حکومت کے پاس بازار میں نکالنے کے لیے کوئی اسٹاک ہی نہ ہوتا؟۔

اور کیا چلاپتی راؤ اس بات کو ریکارڈ پر نہیں لائے کہ ایک اخباری مالک نے اُنھیں بتایا تھا کہ اُس نے یہ ایسا جُرم کیا ہے جس کے بارے میں سوچا جا سکتا ہے اُس وقت کے پہلے پریس انکوائری کمیشن کے صدر (راؤ) نے دریافت کیا "کہ کیا قتل بھی؟ اس کا جھٹ سے جواب آیا "ارادہ تھا لیکن جسم میں دَم نہیں تھا"

تاجر

کمل مین کابرا

منافع ہی اُن کا دھندا ہے

گزشتہ کچھ دہائیوں میں ہندوستانی تجارت اور تاجروں کی ترقی کا جائزہ لیتے ہوئے مضمون نگار کی رائے ہے" جو لوگ کالے دھن کی معیشت کے جنم داتا ہیں۔ اخلاقی قدروں سے لاپرواہ ہیں، جنھوں نے سیاست کو کٹھالی میں ڈال رکھا ہے اور جن کا مذہب صرف اپنی تصویر کو اُبھارنا ہے وہ ملک کے لیے بہتر اور صحت مند مستقبل کے لیے ایک سماجی انقلاب لانے کے محرّک نہیں بن سکتے۔ تاجر طبقوں نے آج تک جو بھی حل تجویز کئے ہیں یا یادداشتیں پیش کی ہیں اُن کے مطالعے سے ایک عام آدمی بھی اندازہ لگا سکتا ہے کہ ان سب تحریروں سے بلاشبہ ایک ہی بات پتہ لگتی ہے کہ یہ لوگ نجی منافع کے لیے کچھ اور سہولت چاہتے ہیں۔

ملک میں آزادی کے بعد جو سماجی و معاشی نظام اُبھرا ہے اُس میں تاجر طبقوں کو ایک اہم اور طاقتور حیثیت حاصل ہوئی ہے۔ یہ دَور تاریخ کی پیداوار اور آئین سازوں کے سوچے سمجھے عمل کا نتیجہ ہے۔ کیوں کہ آئین کی رُو سے جائداد کی ملکیت ایک بنیادی حق ہے اور مناسب معاوضہ دئے بغیر بڑے پیمانے پر قومیانے کے عمل کو خارج از بحث قرار دے دیا گیا ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ گزشتہ چالیس برس کے دَور میں تاجر طبقوں کو جو مقام حاصل ہو گیا ہے وہ ایک تاریخی ورثہ بھی ہے اور چیدہ چیدہ طاقتور افراد کے سوچے سمجھے انتخاب کا نتیجہ بھی۔ ہندوستان کے حالات کو مدِّنظر رکھتے ہوئے ملک کے عوام کے پاس اس صورتِ حال کو منظور کر لینے کے سوا اور کوئی چارہ کار نہیں تھا۔ اس کے بعد جو لگاتار انتخابی معرکے ہوتے رہے اُن میں ملک کے لوگ اُس سرکار کی توثیق کرتے رہے جو واضح اور بلند آواز میں نہ صرف تاجر طبقوں کی اس حقیقت اور کردار کو قبول کرتی رہی بلکہ اُسے عملی جامہ پہناتی رہی۔ لوگوں کی یہ توثیق بھی موجودہ سماجی و اقتصادی نظام کے سبب ہی ہے نہ کہ اُن اسباب کی وجہ سے جن کی بدولت یہ نظام رائج ہوا ہے۔

قدرتی طور پر موجودہ اقتصادی نظام کی بقا، ترقی اور کارکردگی بہت حد تک تاجر طبقوں کی کارکردگی، قوت اور سماجی و تاریخی ذمہ داری کے احساس پر انحصار رکھتی ہے۔

ایک طاقتور طبقہ: تاریخ کے کسی بھی دَور میں تاجر طبقوں کا اتنے وسیع پیمانے پر اقتصادی سرگرمیوں کے ماحول پر تصرف اور غلبہ نہیں رہا۔ پیداواری املاک پر اتنے بڑے پیمانے پر براہِ راست قبضہ نہیں رہا اور سماجی، ثقافتی و سیاسی طاقت پر اتنا زوردار اور مضبوط شکنجہ نہیں رہا جتنا انھیں آزاد، سیکولر اور سماج وادی جمہوریۂ ہند کے تحت حاصل ہے جو ۱۹۴۷ میں ایک سیاسی قومیت کے طور پر اُبھر کر منظرِ عام پر آئی۔ تاجر طبقوں کی اقتصادی سرگرمیوں کا دائرہ کتنا وسیع ہے اُس کا اندازہ کسانوں اور تاجروں کی سرگرمیوں میں فرق سے لگایا جاسکتا ہے۔ آج

اِس موقع پر یہ واضح کرنا موزوں ہوگا کہ ہم تاجر طبقوں کے لفظ کو جمع میں کیوں بیان کرتے آئے ہیں؟ اس کا سبب یہ ہے کہ ہندوستان کے تاجر طبقوں کی علاقائی، لسانی، ثقافتی، اور اقتصادی سرگرمیاں بہت وسیع اور متنوع ہیں جو اِن کا ہی طرۂ امتیاز ہیں۔

کسان بلکہ بھولے اور چھوٹے کسان بھی عملاً
زرنت گئے ہیں اور کھیتی باڑی کے ایک طرزِ
گی ہونے کی صرف یادیں ہی باقی رہ گئی ہیں۔
نچہ ماسوائے سرکاری دائرۂ کار اور چھوٹے
شیاتی فارموں کے سیکٹر اور دوسرے نجی
ادا کرنے والے کاشتکاروں کے باقی تمام
صادی سرگرمیاں براہِ راست تاجروں کے
ت میں آگئی ہیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ
دل
طاقت
ری دائرہ کار
ی طور پر زرعی
دار حاصل کرنے والوں
شعبے پر اثر انداز نہیں ہوتی۔
لکہ یہ دونوں سیکٹر بھی کسی طرح سے
ویٹ تجارت
شعبے سے وابستہ
۔ چنانچہ یہ کوئی
ن کی بات نہیں ہے
قتدار، اثر و رسوخ
مراعات کے آسمان
دوسرے طبقے غائب
نے جا رہے ہیں۔ جس کا
یہ ہوا ہے کہ جو جماعتیں اُفقِ
ار پر باقی رہ گئی ہیں وہ شان د
ت سے فیض یاب ہو رہی ہیں۔ قدرتی طور
جودہ اقتصادی نظام کی بقا و ترقی اور کارکردگی
حد تک تاجر طبقوں کی کارکردگی، قوت اور
ا و تاریخی ذمہ داری کے احساس پر انحصار
ہے۔

اس موقع پر یہ واضح کرنا موزوں ہوگا
تاجر طبقوں کے لفظ کو جمع میں کیوں بیان
ے آئے ہیں؟ اس کا سبب یہ ہے کہ ہندوستان
اجر طبقوں کی علاقائی، لسانی، ثقافتی اور

اقتصادی سرگرمیاں بہت وسیع اور متنوع ہیں جو ان کا ہی طرۂ امتیاز ہیں۔

اسی طرح موجودہ سماجی نظام نے انہیں جو کردار سونپ رکھا ہے وہ بھی کم متنوع نہیں ہے۔ یہ کردار انھیں ملی جُلی معیشت کے نمونے کی بدولت حاصل ہوا ہے۔ ملی جلی معیشت ایک گمراہ کُن اظہارِ بیان ہے کیونکہ کہیں اِس کی وضاحت نہیں کی گئی اور اس کا اطلاق آج کی دُنیا کی ہر اقتصادی سرگرمی پر کیا جا سکتا ہے۔ تاہم ملی جُلی معیشت کے ہندوستانی تصور میں تاجر طبقوں کو ایک وسیع کردار ادا کرنے کے لیے دیا گیا ہے جس کا بیان ۱۹۵۶ء کی صنعتی پالیسی کی قرارداد کی جدول الف اور ب میں کیا گیا ہے۔

اس بیان میں بھی تاجر طبقوں پر کوئی سخت پابندی یا محرومی عائد نہیں کی گئی ہے کیوں کہ ۱۹۵۶ء کی صنعتی پالیسی پر عمل درآمد کا طریقہ کار نہایت لچکدار ہے۔

نظریاتی بُنیاد

ہندوستان کی ترقیاتی حکمتِ عملی کو عملی جامہ پہنانے میں تاجر طبقوں سے جو توقع وابستہ کی گئی تھی کیا وہ وسیع تر اقتصادی اصطلاح میں ترقی پر ہی مبنی تھی؟ پیشتر ازیں کہ ہم اس سوال کو چھیڑیں یہ بہتر ہوگا کہ ہم تاجروں کے کردار کی نظریاتی بنیادوں کا مختصراً ذکر کریں جو وہ نجی تجارت والے مُلکوں کی معاشی و سماجی زندگی میں ادا کرتے ہیں۔ آدم اسمتھ کا کہنا ہے کہ اگر ہمیں روٹی گوشت یا شراب حاصل ہوتی ہے تو اس میں نان فروش یا قصاب وغیرہ کی کوئی مہربانی نہیں ہے۔ اُن کے اپنے مفاد میں ہے کہ تاجر لوگ یہ چیزیں فروخت کرنے اور معاشرے کی ضرورت پوری کرنے کے لیے بازار میں لاتے ہیں۔ تاجر کے ذاتی مفاد اور سماج کی مختلف اشیاء کی ضروریات کا یہ باہمی تعلق تاجر کی سرگرمی پر مبنی سماجی زندگی کی تنظیم کی بنیاد ہے۔

تاجروں کی صلاحیت، معاشرے میں اُن کے بنیادی مقام سے قطع نظر، اُن کی ذاتی ہمت اور اولوالعزمی سے آگے بڑھنے کے عمل سے موسوم

اُن سے یہ بھی اُمید کی جاتی تھی کہ مُلک میں ترقی کے عمل میں یہ لوگ اپنے سرمائے کو بار بار استعمال کر کے، وسائل کو حرکت میں لا کر، نئے طریقوں اور تکنیک کے استعمال اور درآمدات کی جگہ ملکی مال کی تیاری کے ذریعے پیداواری صلاحیتوں کے نئے معیار قائم کریں گے۔

اِس اُمید کا حاصل مقصد یہ تھا کہ ایک مفلس قوم صرف افلاس ہی تقسیم کر سکتی ہے جو کسی کو پسند نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا یہ ضروری ہے کہ ایسے لوگوں پر انحصار رکھا جائے جن کے پاس قومی آمدنی میں کافی اور مُسلسل اضافہ کرنے کے لیے وسیلہ اور مہارت ہے۔

نئے کاروباری طبقوں میں سے ایک چھوٹا سا طبقہ اُبھرا جسے اپنی اقتصادی اور سیاسی صلاحیت کا علم تھا اور جو اُسے حاصل کرنے کے لیے کوشش کر رہا تھا۔ تاجروں کی اس مخروطی ترقی کا ایک سبب ہندوستانی معیشت میں مضمر یاسیت بھی تھی جو غیر ملکی حکومت اور غلبے کی وجہ سے پیدا ہوئی تھی۔

ہوگئی ہے۔ شوپن ہار کا خیال ہے کہ تاجر یا تو دیدہ و دانستہ تباہی کے عمل میں معروف ہوتا ہے یا توازن کے عمل کے لیے ایک محرک کا کام کرتا ہے۔ ان تاجروں سے لے کر جو دُور دراز مقامات اور طویل وقت کے لیے خرید و فروخت کرتے ہیں، اُن تاجروں تک جو نئی نئی اشیا نئے طریقہ ہائے کار اور نئے وسیلے منڈیوں میں لاتے ہیں، بلند ہمت اور اولوالعزم تاجروں سے یہ اُمید کی جاتی ہے کہ وہ معیشت کو سماجی تقاضوں کے لیے درکار سمتوں میں لے جائیں گے۔ لیکن کام خواہ کچھ بھی ہو اُن کا اصل مقصد ذاتی مفاد سے ہی وابستہ رہتا ہے جو مختلف شکلوں میں ظاہر ہو جاتا ہے۔

اس قسم کے نئے نئے کاروبار کرنے والے تاجروں کی جو نکتہ چینی ہوتی ہے اُس کا ذکر کرنا موزوں نہیں ہوگا۔ یہ تاجر سماجی تبدیلی کی قوت اور سماجی اقتدار کی بدلتی ہوئی تنظیم کو نظر انداز کر دیتے ہیں، جس کے نتیجے کے طور پر نئے نئے کاروبار شروع کرنے کا کردار اور صلاحیت اس بات پر منحصر رہ جاتی ہے کہ اقتدار کی باگ ڈور پر قابو رکھنے کے لیے اُن کے پاس کتنے وسیلے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یہ وسیلے چند ہاتھوں میں جمع ہونے لگتے ہیں۔ اور تاجرانہ اجارہ داریاں اُبھرنے لگتی ہیں۔

توقعات

ہندوستان میں یہ توقع کی جاتی تھی کہ تاجر ہماری پیداواری صلاحیت اور ملک میں حقیقی کھپت کی کم صلاحیت کے درمیانی خلا کو پُر کریں گے۔ اُمید کی جاتی تھی کہ یہ لوگ ترقی کے انجن کے لیے جس کی راہ سرکار متعین کرے گی اہم پرزے کے طور پر کام کریں گے۔ اُن سے یہ بھی اُمید کی جاتی تھی کہ ملک میں ترقی کے عمل میں یہ لوگ اپنے سرمائے کو بار بار استعمال کر کے، وسائل کو حرکت میں لا کر، نئے طریقوں اور تکنیک کے استعمال اور درآمدات کی جگہ ملکی مال کی تیاری کے ذریعے پیداواری صلاحیتوں کے نئے معیار قائم کریں گے۔ توقع تھی کہ نئے نئے کاروبار کرنے والے باہمت تاجروں کی تحقیق و ترقی کی یہ کوششیں اُنھیں ترقی یافتہ ملکوں کے انقلابی تاجروں کی سطح پر لا کھڑا کریں گی۔ اُمید کی جاتی تھی کہ اس عمل میں لوگ روزگار کے نئے وسیلے پیدا کریں گے اور اپنے فاضل سرمائے کا ایک حصہ سرکاری خزانے میں ڈالنے کے مالی نظم و ضبط کو قبول کریں گے تاکہ اقتصادی ترقی کے بنیادی عمل میں جو نابرابریاں پیدا ہوئی ہیں اُنھیں دُرست کیا جائے۔ اُن کی پھر سے سرمایہ کاری سے روزگار کے مواقع کی پیداوار اور ٹیکسوں کی ادائیگی کے کردار سے توقع کی جاتی تھی کہ اِن سے ترقی کے فائدے نچلی سطح تک پہنچائے جا سکیں گے جس سے ملکی کھپت کی منڈیاں وسیع ہوں گی اور اس سارے عمل سے سماجی ترقی کی بنیاد رکھی جا سکے گی۔

ان لوگوں کو اپنے انتظامیہ وسائل اور ٹیکنیکل مہارت کا استعمال کرتے ہوئے سماجی وسیلوں کا امین بننا تھا۔ جو لوگ مہاتما گاندھی کے سائے میں چلے تھے اُن سے یہ توقع رکھنا بے جا نہیں تھا جیسے کہ یہ گذشتہ دنوں ڈیوک آف اڈنبرا کے اعزاز میں دیے گئے دوپہر کے کھانے کے موقع پر تاجروں کی ایک سرکردہ تنظیم کے سربراہ نے خود کہا "ہم صدقِ دل سے یہ یقین رکھتے ہیں کہ جو چیز سارے سماج کی بھلائی کے لیے نہیں ہے وہ منظم تجارت کے مفاد میں بھی نہیں ہو سکتی"۔ جب ملک کے رہنماؤں نے تاجر طبقوں کو ملکی معیشت اور سماج کی بھاری تبدیلی کی اہم ذمہ داریاں سپرد کیں تو اُن کی توقعات بھی کچھ اسی قسم کی تھیں۔

اُمیدوں کا نچوڑ

اس اُمید کا حاصلِ مقصد یہ تھا کہ ایک مفلس قوم صرف افلاس ہی تقسیم کر سکتی ہے جو کسی کو

> تاہم آزادی سے پہلے منظم کاروباری طبقے وجود میں آنے لگے جو اقتصادی مالی، ٹرف اور دوسری پالیسیوں کے معاملات میں ایک ہی نظریہ اپنا سکتے تھے۔

> قدرتی طور پر دور اندیش تاجر طبقے یہی چاہتے تھے۔ تاجر طبقے کے حقیقی کردار کا جائزہ لیتے ہوئے یہ یاد رکھنا ہوگا کہ تاجروں کا بہت بڑا طبقہ اگر سب سے نہیں۔ آزادی کے بعد کے دور میں اپنے نئے کردار اور اس کے سیاق و سباق سے مطمئن تھا۔

> بہت سی ایسی تبدیلیوں کا ذکر نہ کرتے ہوئے جواب اُن کا مقصد بن گئی ہیں۔ بلا خوفِ تردید یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہندوستان میں افراد کا شاید ہی اور کوئی ایسا گروہ ہوگا جس نے اِس دَور میں اتنی ترقی کی ہو جتنی تاجروں نے کی ہے۔

پسند نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا یہ مفروضہ ہے کہ ایسے لوگوں پر انحصار رکھا جائے جن کے پاس قومی آمدنی میں کافی اور مسلسل اضافہ کرنے کے لیے وسیلہ اور مہارت ہے۔ بظاہر یہ سوچا گیا تھا کہ اگر ایک بار ہم غربت اور انتظامیہ تکنیکی ہُنر مندی کی رُکاوٹوں اور مذموم چکروں کو توڑنے میں کامیاب ہو جائیں تو پھر ہم غربت نہیں دولت تقسیم کر سکیں گے۔ ظاہر ہے کہ جب تک تاجر طبقے اس قسم کا سیاسی و اقتصادی کردار انجام نہ دیں جو بعد ازاں معاشرے کو سب کے فائدے اور انصاف پر مبنی سماج کی سمت میں لے جانے کی راہ میں حائل نہ ہو، ملی جلی معیشت کا نمونہ اپنے پاؤں پر کھڑا نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح ایسی سیاست کے بارے میں بھی سوچا گیا تھا جو تمام تر اقتصادی طاقت چند ہاتھوں میں مرکوز کرنے کی خواہش کے سامنے گھٹنے ٹیک دے۔ لہٰذا ایک جانب ایک ایسے تاجر طبقے کا خیال سامنے رکھا گیا جو گاندھیائی ٹرسٹی شپ کے نظریے پر کام کرے۔ دُوسری جانب سیاست دانوں کی ایک ایسی نسل اور سیاست کی ایک ایسی قسم کے بارے میں سوچا گیا جو ہوسِ زر کے اقتدار سے بالاتر رہ کر کام کر سکے۔

متضاد شواہد

شواہد: ملک کی پالیسی میں تاجروں کو جو کردار سونپا گیا اُسے دیکھتے ہوئے یہ پوچھا جا سکتا ہے کہ کیا اس بات کے کافی ثبوت تھے کہ یہ لوگ اُس کام کے اہل ثابت ہو سکیں گے جو اُنھیں سونپا گیا ہے؟ جہاں تک ان لوگوں کی حقیقی صلاحیتوں کا تعلق ہے جن کا مظاہرہ وہ کر چکے تھے، ہمیں متضاد شواہد دیکھنے کو ملتے ہیں۔ ہندوستانی تاجروں نے بہت سے نئے اور بڑے پیمانے کے پیداواری کارخانے بڑی کامیابی سے کھڑے کیے۔ اور جو کام بھی انھوں نے شروع کیا اُس میں اُنھیں اکثر و بیشتر کامیابی حاصل ہوئی لیکن یہ نئے کاروباری ادارے ہندوستانی معیشت کو ملک کی صلاحیت جتنا بڑا صنعتی دیو نہیں بنا سکے۔ اس ناکامی کے لیے برطانوی تاجروں کے تخریبی اور لوٹ کھسوٹ کے عمل کو ذمہ دار قرار دیا گیا ہے جس کا مظاہرہ وہ ہندوستان میں اپنے سیاسی تسلط کے دنوں میں کرتے رہے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نوآبادی نظام کے ابتدائی دور میں جب ہندوستان کے ہُنر مندوں کی سرگرم اور خوشحال معیشت کو ختم کر دیا گیا، تو سرگرم تاجر طبقے کی ترقی کے چشمے بھی خشک ہو گئے۔ نہ صرف یہ بلکہ برطانوی تاجروں نے سیاسی دباؤ کے تحت پہلے کام شروع کر لینے کے فوائد کو اور مضبوط کرتے ہوئے بہت سی اقتصادی سرگرمیوں جن میں نئی ٹیکنالوجی تجارتی تنظیم کی صورتوں، روزگار کے کافی مواقع پیدا کرنے اور مقامی اختراعی صلاحیتوں سے فائدہ اٹھانے کی بھاری صلاحیت موجود تھی، قبضہ کر لیا اور اُنھیں ہندوستان میں صنعت کاری کے مفادات کے خلاف استعمال کیا۔

ہندوستانی تاجروں پر لگائی گئی پابندیوں سے انگریزوں کی تاجرانہ سرگرمیوں سے پیدا عدم توازن دُور نہ ہو سکا۔ مزید براں ملکی منڈیوں میں ہندوستانی تاجر طبقوں کو چونکہ اُن کے جائز حقوق نہیں ملے لہٰذا اُنھوں نے یا تو غیر ملکی سرمائے کی چھتری کے تحفظ کے نیچے یا متعدد بے اصولے طریقوں سے فائدہ اٹھانے کی راہیں اختیار کیں لہٰذا اگر ہندوستانی تاجر طبقوں میں تیزی سے آگے بڑھنے کی کمی پائی گئی تو اُسے حکمران قوم اور اُس کے ساتھی ملکوں کے تاجروں کی بے انصافی اور نابرابر مقابلہ بازی کا صدقہ قرار دیا گیا۔

غیر مُلکی اثر

برطانوی تاجروں کے غلبے کی اڑچنیں پیدا کرنے والے اور تباہ کن اثرات کا احساس

> یہ بنیادی مفروضہ کہ سیاست کاروبار سے بالاتر اور آزاد ہے اور سیاست سماجی مقاصد اور خواہشات کو ملکی تجارت پر عائد کر سکتی ہے۔ ہندوستان کے حالات کے تجربے میں غلط ثابت ہو چکا ہے۔

> سیاست اور تجارت میں گٹھ جوڑ سے اقتصادی اور سیاسی طاقت کے ایک جگہ جمع ہونے کا انتہائی خطرناک عمل شروع ہونا لازمی ہے۔ یہ غریب عوام کی اکثریت کے مفادات کے لیے بہت نقصان دہ ہے۔

> ہندوستان کے تجارتی طبقوں نے کئی سمتوں میں جو ترقی کی ہے اور اُن کے طریقہ کار میں جو تبدیلی اور پختگی آئی ہے وہ کافی حد تک ہندوستان کے سیاسی عمل کی مرہونِ منت ہے۔ ایک کامیاب ہندوستانی تاجر کو اقتصادیات مالیات اور ٹیکنالوجی کے نئے استعمالات میں جتنی مہارت ہے اتنی ہی وہ سیاسی و انتظامیہ معاملات کی ہیرا پھیری سے بھی واقفیت رکھتا ہے۔

ہندوستانی تاجروں کو ہو گیا تھا۔ لہٰذا انھوں نے
غیر ملکی تاجروں کی حیثیت اور اقتدار کو نقصان
پہنچانے اور اپنے لیے سیاسی اور ثقافتی میدانوں
میں نرم گوشے پیدا کرنے کی کوششیں کیں۔ جن
تجارتی ایوانوں پر غیر ملکیوں کا غلبہ تھا۔ اُن سے
ہندوستانی تاجروں کو حسد اور غیرت کو ٹھیس
ہی نہیں لگی بلکہ اُن سے اُنھیں ایک نمونہ مل
گیا کہ آگے چل کر انھیں کن خطوط پر چلنا چاہیے۔
چنانچہ ہندوستانی تاجروں کے بعض گروہ سیاسی
امداد حاصل کرنے، دَرپردہ معاملات
طے کرنے، مالی ہیرا پھیری،
تنظیمی اداروں،
مثلاً

لیے کوشش کر رہا تھا۔ تاجروں کی اس محدود طبقی
ترقی کا ایک سبب ہندوستانی معیشت میں
معتبر یاسیت بھی تھی جو غیر ملکی حکومت اور
غلبے کی وجہ سے پیدا ہوئی تھی۔
لہٰذا غیر ملکی اور ہندوستان
کی بڑے پیمانے کی تجارت
کی مشترکہ

یہ بنیادی
سامان جس کی
تیاری پر زرِ مبادلہ
خرچ آتا ہے اور جس کے
لیے درآمد کردہ ٹیکنالوجی استعمال
کی جاتی ہے۔ غیر ملکی طرزِ زندگی کی
نقالی اور اشیا کی کھپت کے رجحان
کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔ کھپت کی اِن
قدروں کی اشاعت اور ایسے طرزِ زندگی کو اپنانے
والا معاشرہ سماجی تبدیلیوں کے عمل کا راستہ روکتا ہے
کیونکہ یہ لوگ دوسروں کے طور و طریقے اختیار کرنے
کے آلۂ کار بن جاتے ہیں۔

زمروں کے شریک کار اور غیر ملکی حکمرانوں کے
غیر ملکی حکمرانوں کے ساتھ مل کر ہندوستان
دولت کو لوٹنے والے اور ہندوستان کے را
یا نواب، تاجر طبقوں کی شکل اختیار نہ
کر سکتے تھے۔ لہٰذا آزادی سے قبل
تجارتی طبقے اتنے طاقتور نہیں ہو سکے
وہ ملک میں صنعت کاری کا دَور شروع کر سکے
اس کے مقابلے میں چھوٹے کاروباری طبقے
تاجرانہ اور مالیاتی مفاد کا عنصر مضبوط ہوتا
جس کی نشانیاں اب بھی ملکی معیشت میں نظر
آتی ہیں۔

تاہم آزادی سے پہلے منظم کاروباری
طبقے وجود میں آنے لگے جو اقتصادی مالیاتی
اور دوسری پالیسیوں کے معاملات میں ایک
ہی نظریہ اپنا سکتے تھے۔ اُنھوں نے غیر ملکی حکمرانوں
سے مصالحانہ رویّہ اختیار کرنے کے لیے جو اُن کی
بقا اور ترقی کے لیے بہت ضروری تھا اور ملک
کی آزادی کے عمل میں معروف قومی رہنماؤں سے
وابستہ بنائے رکھنے کے عمل میں اعلیٰ اہلیت کا
اور پیشہ ورانہ قابلیت کا مظاہرہ کیا۔ وہ بڑی
کامیابی سے برطانوی حکمرانوں کی اقتصادی اور
پالیسیوں پر اثر انداز ہوئے اور انھوں نے ملک
کی تحریک آزادی سے قریبی رابطے قائم کر لیے
ہندوستانی تاجروں نے جو یہ تاریخی کردار ادا
کیا اُس کی بدولت اُنھیں منصوبہ بند سماجی کوشش
کے ذریعے ایک خوشحال ہندوستان کی تعمیرِ نو
کام میں ایک بڑا کردار سونپا گیا۔

چونکہ
تاجر طبقہ
لوٹ مار اور
سماجی بے انصافی
سے حاصل کردہ دولت
کو سمیٹنے کے قدیم طریقوں
کو چھوڑ کر نئے طریقے اختیار
کرنے کو تیار نہیں اس لیے وہ
اپنی فاضل رقوم کو سماجی طور پر
منظور شدہ کاموں میں نہیں لگاتا۔

سر پرستی میں ایسا
کوئی وسیع
پیمانے کا

استطاعت ایجنسیوں کے نظام اور انتظامیہ مہنر
مندی میں انگریزوں کی نقل کرتے ہوئے آگے
بڑھنے کی کوشش کرنے لگے۔ بدقسمتی کی بات یہ
رہی کہ ایسے تاجر طبقوں کی جسامت میں ہندوستان
میں دستیاب انسانی اور مادّی وسائل کے تناسب
اضافہ نہیں ہو سکا۔ نئے کاروباری طبقوں میں
سے ایک چھوٹا

درحقیقت یہ باور کرنے کی وجہ موجود
ہے کہ یہ حسابات محض روزمرہ کے کاروبار کے ہی
مظہر ہوتے ہیں۔ جو معاملات ننگے ہو جاتے ہیں اُن کی وجہ یہ ہوتی
ہے کہ یا تو تاجر لوگ عیبی ضرورت پوری کرنے میں ناکام رہتے ہیں یا اِس میں کوئی تجارتی رقابت
شامل ہوتی ہے جس کا فائدہ کچھ سیاست داں اُٹھا لیتے ہیں اور اسے اپنا نام
چمکانے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔

آزادی کے بعد کا دَور

آزادی کے
فوراً بعد
پالیسیوں اور پیش منظروں کا ایک نیا دَور شر
ہوا جو کشادہ قومی ہم آہنگی اور بنیادی طور
متضاد مفادات کے درمیان مصالحت اور
احترام کے عقیدے پر مبنی تھا۔ قدرتی طو

تجارتی طبقہ پیدا نہیں ہو سکا جو ہندوستان کی
پیداواری سرگرمیوں مثلاً زراعت اور کاریگروں
کی صلاحیت سے مطابقت رکھتا ہو۔ بڑی بڑی

سا طبقہ اُبھرا جسے اپنی اقتصادی اور سیاسی
صلاحیت کا علم تھا اور جو اُسے حاصل کرنے کے

دُور اندیش تاجر طبقے بھی چاہتے تھے۔ تاجر طبقوں کے حقیقی کردار کا جائزہ لیتے ہوئے یہ یاد رکھنا ہوگا کہ تاجروں کا بہت بڑا طبقہ اگرچہ سب کا سب آزادی کے بعد کے دَور میں اپنے نئے کردار اور اس کے سیاق و سباق سے مطمئن تھا۔

گذشتہ چالیس برسوں میں تاجر طبقوں نے جو کام کیا ہے اُسے نام نہاد ملی جُلی معیشت کے نمونے کی کارکردگی کے ایک حصّے کے طور پر دیکھا جانا چاہیئے۔ پہلی بڑی چیز جو ہمیں اس دَور میں دکھائی دیتی ہے وہ یہ ہے کہ

> نابرابریوں میں اضافہ ہو جانے سے غربت کو دُور کرنے اور سماجی و اقتصادی فوائد کی علاقائی تقسیم کی صلاحیت کام میں نہیں لائی جاسکی۔ نابرابری میں یہ اضافہ ہمارے تاجروں کے کارناموں اور کام سے کوتاہی کے سبب ہوا ہے۔

تاجر طبقوں کی تعداد میں بھاری اضافہ ہے۔ یہ طبقے وسیع علاقوں میں پھیل گئے حالانکہ اُن کے بنیادی اُصولوں میں مقابلتاً وسعت نہیں آئی۔ یہ تجارتی طبقے جو اشیاء اور خدمتیں مہیا کرتے تھے اُن میں بھاری اضافہ ہوا اور سبز انقلاب نے زراعت کے دَوران میں اُن کے پاؤں مضبوطی سے جما دیئے۔ نظم و نسق کے نئے طریقوں کا بڑے پیمانے پر اطلاق کیا گیا۔ لیکن زمین کی ملکیت کی حد یا پابندی کے سبب کمپنی یا کارپوریٹ قسم کا انتظام زراعت میں رائج نہیں ہو سکا۔

تاجر مختلف انجمنوں اور ایوان ہائے تجارت کے ذریعے پہلے سے زیادہ منظّم ہوگئے اور جب بھی اُن کے مفاد کا تقاضہ ہوا انھوں نے ایجی ٹیشن کے طریقوں کے استعمال سے کبھی گریز نہیں کیا۔ وراثتی جانشینی کی سہولت کے باوجود تاجروں کے جانشینوں نے تعلیم اور ٹیکنیکل تربیت حاصل کی۔ تاجروں کے بین الاقوامی کاروبار، ٹیکنیکل، پیشہ ورانہ سیاسی، نظریاتی اور ثقافتی رابطے وسیع و گہرے ہوئے۔ اُنھیں غیر ملکی سرمائے سے جو خوف اور مقابلے کا احساس تھا وہ بہت حد تک تعاون اور باہمی امداد میں تبدیل ہوگیا۔

اس عرصے میں ہمارے تاجروں کے کم و بیش سب طبقوں نے اپنی اقتصادی اور سماجی معیشت کو بہتر بنالیا۔ اس عمل میں بہت سے تاجر گھرانوں کو کاروبار دلانے کے اپنے روائتی طریقوں کو خیرباد کہنا پڑا۔ کاروبار کے نئے طریقے اختیار کرتے ہوئے ان میں سے بہت سے کاروباری گروہوں کو کئی تکلیف دہ مراحل میں سے گذرنا پڑا لیکن ایک بار جب اُنھوں نے ان مشکلات پر قابو پالیا تو اُن کی حالت پہلے سے کہیں بہتر ہوگئی۔

بہت سی ایسی تبدیلیوں کا ذکر نہ کرتے ہوئے جو اَب اُن کا مقصد بن گئی ہیں بلاخوفِ تردید یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہندوستان میں افراد کا شائد ہی اور کوئی ایسا گروہ ہوگا جس نے اس دَور میں اتنی ترقی کی ہو جتنی تاجروں نے کی ہے۔

شہادت سے کیا ثابت ہوتا ہے

تاجروں کی حیثیت میں مقابلتاً جو ترقی یا بہتری ہوئی ہے۔ اُس کا مقابلہ بعض اوقات کئی حلقوں میں سیاست دانوں اور دفتروں کے افسروں کی حیثیت اور ترقی کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ اس کا کہنے کا مقصد یہ ہے کہ شاید موخرالذکر لوگ تاجروں سے بھی زیادہ فارغ البال ہوگئے ہیں۔ مجھے معلوم نہیں کہ اس معاملے میں کوئی باقاعدہ مطالعہ ہوا ہے یا نہیں پھر بھی بالواسطہ شہادتوں اور دلیلوں سے درجِ ذیل باتیں کہی جاسکتی ہیں۔

ایک

اول یہ کہ تاجر املاک کے مالک اور فیصلہ کرنے والے افراد ہیں لہٰذا وہ سیاست دانوں کی نسبت زیادہ مالی فائدے اُٹھا سکتے ہیں۔ تمام بزنس مین مل کر معیشت کی ترقی میں جو حصہ ڈالتے ہیں۔ وہ اُس فائدے کا عشرِ عشیر بھی نہیں ہوتا جو اُنھیں فاضل آمدنی کی شکل میں حاصل ہوتا ہے۔

دُوسرا

دوسرا یہ کہ ایک بار جب کٹوتیوں اور مالی پابندیوں کا کوئی باقاعدہ نظامِ عمل بن آتا ہے تو تاجروں اور سیاست دانوں کو الگ الگ زمروں میں تقسیم کرنا زیادہ موزوں دکھائی نہیں دیتا۔ بنیامی کاروبار کسی خاص شخص کی اجارہ داری نہیں ہے سماج میں اپنے تعلقات کی بدولت سیاست دان بھی کاروبار کر سکتے ہیں۔ جو رقوم جمع ہوتی ہیں آخرکار وہ کسی کاروبار میں آنی چاہئیں۔ جس طرح تاجر لوگ بڑی تعداد میں نمایاں طور پر بزنس میں آگئے ہیں۔ اُسی طرح بہت سے سیاست داں بالواسطہ یا بلاواسطہ اور بنیامی کے ذریعے تجارت کرنے لگے ہیں۔ یہ امر قابلِ افسوس ہے کہ اس معاملے میں کوئی تخصیص نہیں کی گئی۔

تیسرا

تیسرے یہ کہ کسی حد تک تجارت میں سیاست کے کئی خصوصی پہلو شامل ہوگئے ہیں اور اسی طرح سیاست ایک بڑے کاروبار کی شکل اختیار کرتی جارہی ہے۔ نہ صرف سیاست اور چناؤ میں سرمائے لگانے اور سیاسی چندوں کو ایک قسم کی سرمایہ کاری سمجھنے کا طریقہ کار اکثر سیاسی جماعتوں کے لیے ایک عام طریقہ کار بنتا جارہا ہے بلکہ نجی

اقتصادی سرگرمیوں اور مالی و تجارتی پالیسیوں کی قاعدہ بندی، تنظیم و نسق اور حوصلہ افزائی کے لیے جو طریقے اختیار کیے جا رہے ہیں اُن سے تجارت اور سیاست کو الگ کرنے والی دیوار گرتی جا رہی ہے۔

قریبی تعلق

اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ سیاست اور کاروبار میں ہاتھ ملا کر چلنے کا رشتہ پیدا ہو گیا ہے۔ لہٰذا اگر اس بات کا جائزہ لیا جائے کہ تجارت نے ملک کے لیے کیا کیا ہے تو وہ سیاسی اور انتظامیہ عمل سے تجارت کے تعلق کے بارے میں موجودہ طریقۂ کار پر مبنی ہونا چاہیے۔ تاہم منظم کاروبار جس طرح عمل میں لایا جا رہا ہے اُس نے بزنس اور سیاست میں ایک پختہ اتحاد اور اشتراک پیدا کر دیا ہے۔ جب تک کاروبار اور سیاست کے اشتراک کی نمائندہ سماجی طاقت کے محور کو تبدیل کرنے کے کام کو اولین ترجیح نہیں دی جاتی، اقتصادی سرگرمیوں کی توسیع حوصلہ افزائی اور قاعدہ بندی کے لیے کوئی متبادل طریقۂ کار تلاش کرنے کی بحث بے کار ثابت ہوگی۔ یہ بنیادی مفروضہ کہ سیاست کاروبار سے بالاتر اور آزاد ہے اور سیاست سماجی مقاصد اور خواہشات کو ملکی تجارت پر عائد کر سکتی ہے۔ ہندوستان کے حالات کے تجربے میں غلط ثابت ہو چکا ہے۔ تاجروں کے تعلیے والی تجارت کا ہندوستانی ماڈل لوگوں کو زیادتیوں، بے انصافیوں اور تکلیفوں کے بوجھ سے بچانے کے لیے تشکیل دیا گیا تھا جن کا سامنا اُنھیں کئی سابقہ نظاموں میں کرنا پڑتا تھا۔ آزادی کے بعد ملک کے اقتصادی نظام کا جو نمونہ تیار کیا گیا اُس میں سیاست کی کاروبار سے آزادی اور تاجروں پر اصولوں کی پابندی بنیادی ضروریات خیال کی گئی تھیں اس نمونے کا مقصد یہ تھا کہ ہندوستان نے اپنے مستقبل کے لیے جو راہ اختیار کی ہے، اس میں سماج کے سب طبقوں کو ایک جیسا سماجی اقتصادی اور سیاسی انصاف حاصل ہوگا اور وہاں عوام کے مفادات کے برعکس کہیں اقتصادی طاقت کا اجتماع نہیں ہوگا۔ کسی بھی شخص کو اس بارے میں حقیقی شکوک ہو سکتے ہیں کہ کیا اس قسم کی بنیادی ضروریات کبھی پوری ہو سکتی ہیں۔

سیاست اور تجارت میں گٹھ جوڑ سے اقتصادی اور سیاسی طاقت کے ایک جگہ جمع ہونے کا انتہائی خطرناک عمل شروع ہونا لازمی ہے۔ یہ نہ صرف غریب عوام کی اکثریت کے مفادات کے لیے بہت نقصان دہ ہے بلکہ طاقت کا یہ اشتراک مقابلتاً چھوٹے تاجروں کی ترقی کی راہ میں بھی رکاوٹ پیدا کر سکتا ہے۔ اگر ہندوستان کے پیمانے کی بے روزگار افرادی قوت زمین اور افراد کے غیر موافق تناسب، درآمد کردہ ٹیکنالوجی کے لیے سرمائے کی ضروریات اور ہماری روزگار دینے کی محدود صلاحیت کو مدِنظر رکھا جائے تو ہماری ملی جلی معیشت اقتصادی ڈھانچے کی بنیادی پسماندگی کو کم کرنے اور روزگار کے مزید مواقع پیدا کرنے کی اُمید دلا سکتی ہے اور ترقی کے فوائد کو کسی حد تک بہتر طور پر تقسیم کر سکتی ہے لیکن یہ صرف اُس صورت میں ممکن ہو سکتا ہے جب چھوٹے پیمانے کی گھریلو اور ہُنرمندوں پر مبنی صنعتوں کو وسیع پیمانے پر ترقی دی جائے لیکن تجارت اور بزنس کی طاقت کا اتحاد اور اس کے نتیجے کے طور پر پیدا ہونے والا طاقت کا مہیب اجتماع اس ترقی کے راستے میں رکاوٹ بنا ہوا ہے۔

قوم سے دشمنی

اگر مذکورہ بالا امور کو سامنے رکھا جائے تو یہ نظر آنا مشکل نہیں کہ تاجر طبقوں نے قوم دشمنی کی ہے چونکہ اقتصادی ذمہ داریوں اور ترقی کے حقائق سب کو معلوم ہیں۔ لہٰذا میں اس مضمون کو اعداد و شمار سے لادنا نہیں چاہتا۔ ہندوستانی تجارتی طبقوں نے کئی سمتوں میں ترقی کی ہے اور اُن کے طریقۂ کار میں جو تبدیلی اور ترقی آئی ہے وہ کافی حد تک ہندوستان کے سیاسی نظام کی مرہونِ منت ہے۔ ایک کامیاب ہندوستانی تاجر کو اقتصادیات، مالیات اور ٹیکنالوجی کے نئے استعمالات میں جتنی مہارت ہے وہ سیاسی اور انتظامیہ معاملات کی ہیرا پھیری سے بھی اتنی واقفیت رکھتا ہے۔

تجارت کے اس قسم کے نظام نے ہندوستانی نظام میں مقداری و معیاری دونوں لحاظ سے تبدیلیاں کی ہیں۔ اگر گذشتہ تاریخی ادوار سے مقابلہ کیا جائے تو اس امر کی شہادت موجود ہے کہ جمود کے دن ختم ہو گئے ہیں اور ہم نے اقتصادی سرگرمیوں میں ایسی شرح سے مسلسل ترقی کی ہے جس کی مثال گذشتہ تیس برسوں میں نہیں ملتی۔ ہم نے بہت سی درآمد ہونے والی اشیا کے نعم البدل بھی تیار کر لیے ہیں۔ جدید صنعتیں تجارت اور منڈی ملک کے کئی حصوں میں پہلی بار داخل ہوئی ہیں۔ لاکھوں لوگ اپنے آپ کو بہتر حالات میں دیکھ رہے ہیں اگرچہ کئی لاکھ لوگوں کی حالت پہلے سے پتلی ہو گئی ہے۔

اب سوال ترقی کے اس ڈھانچے کا ہے، جو ہمارے سامنے پروان چڑھا ہے۔ تاجروں نے

> امیروں کی طاقت کی متواتر ترقی نے ایک بہت قیمتی چیز یعنی عوام، خاص طور پر غریب عوام کے دلوں میں اعتماد کے اس جذبے کو ٹھیس پہنچائی ہے کہ وہ اپنی زندگی میں غربت اور بے قدری کے احساس کو ختم کر سکیں گے۔

اشیاء کی پیداوار میں کافی اضافہ کیا ہے۔ وہ ماسوائے گندم اور چاول کے زیادہ تر ایسی ہیں جن سے زیادہ اجرت حاصل نہیں ہوتی۔ گندم اور چاول کی مزید پیداوار بھی موٹے اناجوں، دالوں اور تلہن تل قیمت پر حاصل کی گئی ہے۔ عوامی کھپت کی اکثر دیگر اشیاء کی فی کس دستیابی بھی نہیں بڑھی بلکہ کم ہوئی ہے۔ اس کے مقابلے میں ہم کچھ خوشحال افراد کی کھپت کے لیے انواع و اقسام کا سامان تیار کر رہے ہیں۔ یہ بنیادی سامان جس کی تیاری پر زرِ مبادلہ خرچ آتا ہے اور جس کے لیے درآمد کردہ ٹیکنالوجی استعمال کی جاتی ہے، غیر ملکی طرزِ زندگی کی نقالی اور اشیاء کی کھپت کے رجحان کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔ کھپت کی ان قدروں کی اشاعت اور ایسے طرزِ زندگی کو اپنانے والا معاشرہ سماجی تبدیلیوں کے عمل کا راستہ روکتا ہے کیونکہ یہ لوگ دوسروں کے طور طریقے اختیار کر کے آلہ کار بن جاتے ہیں۔

اشتراکِ عمل کے رویّے اور طریقوں کی بدولت ہمارے تاجر ایسی وسائل پر مبنی ٹیکنالوجی کے طریقے ایجاد نہیں کر سکے۔ روزگار کے وسیلے پیدا کرنے، ملکی کھپت کی منڈیوں کی توسیع جیسی سماجی و اقتصادی ضروریات اور لازمی شرائط کی جانب بھی توجہ نہیں دی گئی کیوں کہ تاجروں نے اپنے کاروبار کے لیے خود نئی ٹیکنالوجی کا انتخاب کیا ہے۔ اِن شعبوں میں بھی جو بزنس مینوں نے خود چُنے ہیں ہم اُن ملکوں سے کہیں پیچھے ہیں جہاں سے ہم نے ٹیکنالوجی سرمایہ اور کام کا ڈھنگ حاصل کیا ہے۔ ایسا ہونا لازمی امر ہے کیونکہ مانگی ہوئی بیساکھیوں پر کوئی دوڑ جیتی نہیں جا سکتی۔ ان لوگوں کے اپنے کھپت کے معیار بھی بگڑ گئے ہیں کالے دھن کی خفیہ کمائی کے سبب جو اُن کے پاس ہے، اُن پر عیش و عشرت کے سامان کی کھپت کا بھوت

سوار ہو گیا ہے۔ چونکہ تاجر طبقہ لوٹ مار اور سماجی بے انصافی سے حاصل کردہ دولت کو سمیٹنے کے قدیم طریقوں کو چھوڑ کر نئے طریقے اختیار کرنے کو تیار نہیں اس لیے وہ اپنی فاضل رقوم کو سماجی طور پر منظم شدہ کاموں میں نہیں لگاتا۔

اور کالا دھن

کالی معیشت کا سارا عمل ذاتی مفاد کے حصول کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ جس سے ہماری ملکی معیشت کے تمام دعوے جھوٹے ہو جاتے ہیں۔ کاروبار کا کمپنی طریقۂ کار، سرمایہ لگانے والے عوام کا خزانے اور سرکاری مالیاتی اداروں کی قیمت پر نجی تجوریاں بھرنے کا طریقہ بن گیا ہے۔ بہت سے تجارتی گروپوں کے معاملات کی تحقیقات کے لیے مقرر کردہ کمیشنوں نے جو نتائج نکالے ہیں، یا سرکاری محاسبوں نے اُن کے حسابات اور مالیات کے بارے میں جو رپورٹیں دی ہیں یا ٹیکس نہ دینے کے خلاف کامیاب مقدمات سے جو کچھ معلوم ہوا ہے وہ سب سمندر کے نیچے تیرتے ہوئے برف پہاڑ کی باہر نکل آنے والی چھوٹی سی چوٹی کے برابر ہے۔ درحقیقت یہ باور کرنے کی وجہ موجود ہے کہ یہ حسابات محض روزمرہ کے کاروبار کے ہی مظہر ہوتے ہیں۔ جو معاملات ننگے ہو جاتے ہیں اُن کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ یا تو تاجر لوگ غیبی ضرورت پوری کرنے میں ناکام رہے ہیں یا اس میں کوئی تجارتی رقابت شامل ہوتی ہے جس کا فائدہ کچھ سیاست دان اٹھا لیتے ہیں اور وہ اسے اپنا نام چمکانے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ اس کے باوجود دیکھا جاتا ہے کہ حکمران طبقہ تاجروں کے شانہ بہ شانہ چل کر

اُن کے خلاف منصوبوں کا ادگھاٹن کر رہا ہے حالانکہ یہ پرائیویٹ کمپنیوں کی ٹیکس سے بچائی گئی رقوم سے ہی چلائے جاتے ہیں۔ ان کمپنیوں یا تاجروں سے جو چندے لیے جاتے ہیں، وہ کُھلے طور پر دکھائی نہیں دیتے کیوں کہ اب یہ چندے پارٹیوں کی معرفت نہیں لیے جاتے۔ نابرابریوں میں اضافہ ہو جانے سے غربت کو دُور کرنے اور سماجی و اقتصادی فوائد کی علاقائی تقسیم کی صلاحیت کو کام میں نہیں لایا جا سکا۔

نابرابری میں یہ اضافہ ہمارے تاجروں کے کارناموں اور کام سے کوتاہی کے سبب ہوا ہے جنھوں نے ملک کے وسائل کے بہت بڑے حصے پر قبضہ کر رکھا ہے۔ تاجروں کے گروہوں نے ناقص خطوط پر ترقی کا جو طریقہ اختیار کیا ہے اور دوسروں پر انحصار رکھنے کے جس رویّے کا مظاہرہ کیا ہے اُس نے اُن لوگوں کو قومی ترقی کا امین بنانے کے اقتصادی نظام سے وابستہ امیدوں کو پاش پاش کر دیا ہے۔

امیروں کی طاقت کی متواتر ترقی نے ایک بہت قیمتی چیز یعنی عوام، خاص طور پر غریب عوام کے دلوں میں اعتماد کے اس جذبے کو ٹھیس پہنچائی ہے کہ وہ اپنی زندگی میں غربت اور بے قدری کے احساس کو ختم کر سکیں گے۔ امیر طبقے کی طاقت نے ثقافتی دائرہ کار کو بھی اپنے تسلط میں لے لیا ہے۔ ذرائع ابلاغ، اخبارات، سینما، اشاعتی اداروں اور لٹریچر پر اُن کا قبضہ ہے۔ مذہبی ذات پات اور دوسری تقسیم کرنے والی طاقتیں

(باقی صفحہ ۸۲ پر)

جو لوگ کالے دھن کی معیشت کے پیدا کرنے والے ہیں، اخلاقی قدروں سے لاپرواہ ہیں، جنھوں نے سیاست کو کھٹائی میں ڈال رکھا ہے وہ ایک بہتر اور صحت مند مستقبل کے لیے سماجی تبدیلیوں کے نقیب نہیں بن سکتے۔

خشونت سنگھ

سچائی کے دعویداروں کا کھوکھلا پن

فاضل صحافی نے اس مختصر مگر دلچسپ مضمون میں کچھ ایسے ذاتی مگر حقیقت پر مبنی تجربات بیان کئے ہیں جن سے اخبار نویسوں کی بدعنوانیاں سامنے آتی ہیں۔ یہ لوگ اخبار کے مالکان اور سیاست دانوں سے مل کر اور اُن سے گٹھ جوڑ کر کے اپنی مٹھی گرم کرتے ہیں اور معصوم اور غریب قارئین کو صحیح اطلاعات دینے کی بجائے غلط اطلاعات بہم پہنچاتے ہیں۔ طرّہ یہ کہ اس کے باوجود ان کی شدید خواہش یہی ہوتی ہے کہ انھیں سچائی کا پیغام رساں سمجھا جائے۔

میں ۴۰ سال سے بھی زیادہ عرصے سے صحافت سے منسلک ہوں۔ اس عرصے میں کم سے کم پندرہ برس تک میں کسی نہ کسی جرنل کا ایڈیٹر رہا ہوں۔ میں نے شروع میں "یوجنا" کی ادارت سنبھالی۔ اس کے بعد السٹریٹڈ ویکلی آف انڈیا نئی دلّی میں چلا گیا اور آخر میں ہندوستان ٹائمز کا ایڈیٹر بنا۔ جب تک مجھے اس پیشے کے بارے میں بہت کچھ معلوم نہ تھا تو میں کہا کرتا تھا کہ یہ میری بدقسمتی ہے کہ میں ایک ایسے پیشے سے وابستہ ہوں، جہاں کوئی بھی مجھے رشوت دینے کی نہیں سوچتا کیوں کہ میرے پاس اس کے بدلے انھیں دینے کو کچھ نہیں ہے۔ مجھے جو مضامین ملتے اور میں ان کو منظور کرتا، اُن کے بدلے اُن چند لڑکیوں کی مسکراہٹ جن کی نظمیں میں چھاپ دیتا تھا ضرور ملتی تھی۔ کھانے پر بھی دعوت دی جاتی اور کبھی کبھار دیوالی یا کرسمس پر اسکاچ کی ایک بوتل مل جاتی۔ بس آپ یہی کچھ سمجھ لیجئے۔ میں ان کو رشوت نہ سمجھتا کیوں کہ ان کی وجہ سے کسی بھی طرح ان مضامین کے بارے میں میرے فیصلے متاثر نہ ہوتے جو مجھے بھیجے جاتے۔ چنانچہ میں غیر معیاری مضامین کو مسترد کر دیتا۔ میری منطق ایک طرح سے پنجابی تھی "اسکاچ کی ایک بوتل تحفہ ہے البتہ اسکاچ کا کریٹ رشوت ہے"۔ بہرصورت میں اپنے آپ کو اس لائق نہ سمجھتا کہ مجھے کوئی رشوت دی جا سکتی ہے۔ میں اپنے آپ کو اس روشنی میں دیکھتا جس میں کہ بہت سے انگریز اپنے صحافیوں کو دیکھتے ہیں۔

"خدا کا شکر ہے کہ آپ انگریزی صحافی کو نہ تو رشوت دینے کی اُمید کر سکتے ہیں اور نہ ہی اس کی طبیعت یا سیرت کا رجحان بدلنے کی توقع کر سکتے ہیں۔ لیکن وہ بغیر رشوت لیے ہی جو کچھ کرتے ہیں، اسے دیکھ کر یہ کہنا پڑتا ہے کہ اس میں رشوت یا مول تول کی گنجائش ہی کہاں رہ جاتی ہے۔"

خبروں اور آراء کو دوسروں کے دلوں میں جمانا

عوام مجھے کہتے کہ فلاں موضوع پر لکھئے اس طرح جن موضوعات پر وہ اظہار خیال کی خواہش رکھتے، اس کا برملا مجھ سے اظہار کرتے اور ایسا کرتے ہوئے نہ تو ان کو اپنا وقت برباد کرنا پڑتا اور نہ ہی مجھ پر کوئی رقم خرچ کرنی پڑتی۔ مجھے کچھ عرصے بعد پتہ چلا کہ میرے پیشے میں بھی ناجائز طور پر روپیہ بٹورنے کے کافی مواقع ہیں۔ یہی نہیں میں نے یہ بھی جانا کہ میری صحافیانہ برادری میں کافی لوگ اس طرح کے موقعوں کا ناجائز فائدہ اُٹھاتے ہیں۔ اور اس طرح اُن کے اخراجات اخبار سے ملنے والی اُن کی تنخواہ سے کہیں زیادہ ہیں۔ اس کے بدلے وہ لوگ ایسی کہانیاں، قصے اور خبریں گھڑتے ہیں جو ان کی ضرورت ہوتی ہیں۔ خبر کو ان کے مفاد کے مطابق توڑ مروڑ کر پیش کر

مجھے کچھ عرصہ بعد پتہ چلا کہ میرے پیشے میں بھی ناجائز طور پر روپیہ بٹورنے کے کافی مواقع ہیں۔ یہی نہیں میں نے یہ بھی جانا کہ میری صحافیانہ برادری میں کافی لوگ اس طرح کے موقعوں کا ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں اور اس طرح اُن کے اخراجات اخبار سے ملنے والی اُن کی تنخواہ سے کہیں زیادہ ہیں۔

سیاست دانوں وغیرہ کی شہرت کا سامان
کیا جاتا۔ مختلف ہتھکنڈے استعمال کرنے
والے لوگ اگر اُن کے خاموش رہنے کی فیس
ادا کرنے سے انکار کرتے، تو ان کی حرکتوں کا
بھانڈا پھوڑا جاتا۔ ظاہر ہے کہ میں ان سب
"ایسے آدمیوں" کا نام نہیں بتا سکتا کیونکہ ایسا
کرنے پر وہ مجھے اور "یوجنا" کو لامحدود عرصے
کے مقدمے میں پھنسا لیں گے۔ جس کے متحمل ہم
نہیں ہو سکتے۔ پیارے قارئین! میں آپ کو یقین
دلاتا ہوں کہ اس طرح کی مثالیں میرے ذاتی تجربوں
پر مبنی ہیں اور وہ بالکل سچی ہیں۔ افسوس کی
بات یہ ہے کہ اس پیشے میں اس طرح کا گندہ
کھیل کھیلنے والوں کی تعداد اُن سے کہیں
زیادہ ہے جو صحافیانہ اصولوں کو
نظر انداز کر چلتے ہیں۔

چند ذاتی تجربات

آپ ایک سابق
وزیر کا بیٹے کی کہانی جانتے ہی ہوں گے جو
صحافیوں کو رشوت دینے میں پیش پیش تھا۔
کہا جاتا ہے کہ وہ اپنی ریاست کے تمام اخبار
نویسوں کی خوب مالش کیا کرتا تاکہ وہ اس کی
کارگزاری کے بارے میں خوب بڑھا چڑھا کر لکھیں۔
کہتے ہیں کہ ایک بار وہ غیر ممالک کے دورے سے
واپس آیا وہ اپنے ساتھ سوٹ کے کپڑوں کی کچھ
گٹھیں لایا۔ یہ کپڑا اس نے صحافی دوستوں
کو تحفے کے طور پر دے دیا۔ کچھ دنوں بعد اس
نے پریس کانفرنس بلائی۔ یہ محض اتفاق تھا کہ
ننانوے سے جو اس کانفرنس میں آئے،
سب کے سب ایک ہی طرح کا سوٹ
پہنے تھے۔ اس طرح وزیر موصوف نے
سچائی کو پہنچانے والے ان پیغامبروں
کا ہلکا پھلکا اور کھوکھلا پن بے
نقاب کر دیا۔
بظاہر اس تحفے میں کچھ مرچ مسالہ بھی لگایا
گیا ہوگا تاکہ صحافیوں میں سرایت کردہ بدعنوانیوں
کو پوری طرح واضح کیا جا سکے۔ لیکن میں نے جو
تجربات بیان کئے ہیں، ان میں کوئی مرچ مسالہ
نہیں لگایا گیا ہے۔

جب میں باتصویر جرنل کا ایڈیٹر تھا تو مجھے
استعمال شدہ
تصاویر
کا بل

> وہ ملک بھر میں پانچ ستاروں والے
> ہوٹل میں اپنے دوستوں کو کھانے
> اور شراب پر مدعو کیا کرتے۔ شراب
> کی صنعت پر تجزیاتی مقالے کے لیے
> وہ وہسکی، رم وغیرہ کے کریٹ وغیرہ
> لے لیا کرتے۔ یہ لوگ شراب کی بوتلیں
> ہی نہیں بلکہ کریٹ کے کریٹ اس
> بہانہ حاصل کرتے کہ ان کو ایڈیٹر کو
> کافی تعداد میں بوتلیں پہنچانی ہیں اور
> وہ انھیں اسٹاک کرنا چاہتا ہے۔

پاس کرنا پڑتا تھا۔ بہت سی
تصاویر بغیر طلب کی ہوئی
اور مفت ہوتی تھیں۔
کیونکہ عوام کو پبلسٹی
درکار تھی۔ مجھے
دو سال بعد
یہ پتہ
چلا کہ میں
مفت اور بے
طلب تصاویر کے بل "بے نامی فوٹو ایجنسی" کے نام
سے پاس کرتا چلا آرہا ہوں۔ یہ ایجنسی میرے سٹاف
کے ایک کارکن نے اپنی بیوی کے نام پر اور اس
کے فائدے کے لیے کھول رکھی ہے۔ وہ مجھ
سے بھی پیسہ لے لیتا تھا اور اس شخص سے
بھی جس سے تصویر لے کر چھپواتا۔ اس طرح
سے وہ کئی ہزار روپے ہر مہینے کما لیتا اور
اس پر اسے ٹیکس بھی ادا نہ
کرنا پڑتا۔ دو اور ساتھی خوراک
اور شراب کے ماہر سمجھے جاتے تھے۔
وہ ملک بھر میں پانچ ستاروں والے
ہوٹل میں اپنے دوستوں کو کھانے اور
شراب پر مدعو کیا کرتے۔ شراب کی صنعت
پر تجزیاتی مقالے کے لیے وہ وہسکی، رم وغیرہ
کے کریٹ وغیرہ لے لیا کرتے۔ یہ لوگ شراب
کی بوتلیں ہی نہیں بلکہ کریٹ کے کریٹ اس

> ہندوستان میں کچھ ایسے جرنل ہیں جن
> کا گزارہ ہی بلیک میل پر ہے۔ ہم میں
> سے بہت سے لوگ اس بات کو جانتے
> ہیں لیکن پھر بھی ان اخبارات کو پڑھتے
> رہتے ہیں کیونکہ ہمیں ہتھکنڈے والی اور
> گپ شپ والی خبروں کو پڑھنے میں
> مزا آتا ہے۔ کچھ صحافی سیاست دانوں
> کی بدعنوانیوں اور جرائم کو بے نقاب
> کرنے میں خاصی مہارت حاصل کرتے ہیں۔
> انھیں معاشرے کی برائیوں کو بیان کرنے
> اور ان کو بے نقاب کرنے کا ملکہ ہوتا ہے
> کچھ صحافی فلمی ستاروں پر توجہ دیتے
> ہیں اور ان کے معاشقہ کی داستانوں
> کو بے نقاب کرتے ہیں۔ اس طرح کی
> خبروں کی اشاعت کو روکنے کے لیے
> بڑی بڑی رقوم دی جاتی ہیں۔

بہانہ حاصل
کرتے کہ ان
کو ایڈیٹر کو کافی
تعداد میں بوتلیں
پہونچانی ہیں۔ اور وہ
انھیں اسٹاک کرنا چاہتا
ہے۔ ایک اور ساتھی فلم دیکھنے
جاتے اور آتے دونوں طرف کا ٹیکسی
کرایہ وصول کرتے۔ ان کا کہنا تھا کہ
میں اس فلم پر اخبار میں ریویو لکھوں گا۔
وہ بس سے جاتا۔ نجی تصاویری لائبریری
قائم کرنے کی غرض سے بہت سی تصاویر حاصل
کرتا اور پھر منافع پر دوسرے اخبارات کو یہ
تصاویر مہیا کرتا۔ یہ لوگ شان و شوکت کی
زندگی بسر کرتے۔ جو ایماندار تھے، وہ کام کرتے،
بیڑی پیتے اور کالی کافی پیتے اور گھروں کو پیدل
جاتے۔

بلیک میل پر گزارہ: ہندوستان میں کچھ

خشونت سنگھ

سچائی کے دعویداروں کا کھوکھلاپن

فاضل صحافی نے اس مختصر مگر دلچسپ مضمون میں کچھ ایسے ذاتی مگر حقیقت پر مبنی تجربات بیان کئے ہیں جن سے اخبار نویسوں کی بدعنوانیاں سامنے آتی ہیں۔ یہ لوگ اخبار کے مالکان اور سیاست دانوں سے مل کر اور اُن سے گٹھ جوڑ کر کے اپنی مٹھی گرم کرتے ہیں اور معصوم اور غریب قارئین کو صحیح اطلاعات دینے کی بجائے غلط اطلاعات بہم پہنچاتے ہیں۔ طرّہ یہ کہ اس کے باوجود ان کی شدید خواہش یہی ہوتی ہے کہ انھیں سچائی کا پیغام رساں سمجھا جائے۔

میں ۳۰ سال سے بھی زیادہ عرصے سے صحافت سے منسلک ہوں۔ اس عرصے میں کم سے کم پندرہ برس تک میں کسی نہ کسی جرنل کا ایڈیٹر رہا ہوں۔ میں نے شروع میں "یوجنا" کی ادارت سنبھالی۔ اس کے بعد السٹریٹڈ ویکلی آف انڈیا نئی دلی میں چلا گیا اور آخر میں ہندوستان ٹائمز کا ایڈیٹر بنا۔ جب تک مجھے اس پیشے کے بارے میں بہت کچھ معلوم نہ تھا تو میں کہا کرتا تھا کہ یہ میری بدقسمتی ہے کہ میں ایک ایسے پیشے سے وابستہ ہوں، جہاں کوئی بھی مجھے رشوت دینے کی نہیں سوچتا کیوں کہ میرے پاس اس کے بدلے انھیں دینے کو کچھ نہیں ہے۔ مجھے جو مضامین ملتے اور میں ان کو منظور کرتا، اُن کے بدلے اُن چند لڑکیوں کی مسکراہٹ جن کی نظمیں میں چھاپ دیتا تھا ضرور ملتی تھی۔ کھانے پر بھی دعوت دی جاتی اور کبھی کبھار دیوالی یا کرسمس پر اسکاچ کی ایک بوتل مل جاتی۔ بس آپ یہی کچھ سمجھ لیجئے۔ میں ان کو رشوت

> مجھے کچھ عرصہ بعد پتہ چلا کہ میرے پیشے میں بھی ناجائز طور پر روپیہ بٹورنے کے کافی مواقع ہیں۔ یہی نہیں میں نے یہ بھی جانا کہ میری صحافیانہ برادری میں کافی لوگ اس طرح کے موقعوں کا ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں اور اس طرح اُن کے اخراجات اخبار سے ملنے والی اُن کی تنخواہ سے کہیں زیادہ ہیں۔

نہ سمجھتا کیوں کہ ان کی وجہ سے کسی بھی طرح ان مضامین کے بارے میں میرے فیصلے متاثر نہ ہوتے جو مجھے بھیجے جاتے۔ چنانچہ میں غیر معیاری مضامین کو مسترد کر دیتا۔ میری منطق ایک طرح سے پنجابی تھی: "اسکاچ کی ایک بوتل تحفہ ہے البتہ اسکاچ کا کریٹ رشوت ہے۔" بہر صورت میں اپنے آپ کو اس لائق بھی نہ سمجھتا کہ مجھے کوئی رشوت دی جا سکتی ہے۔ میں اپنے آپ کو اس روشنی میں دیکھتا جس میں کہ بہت سے انگریز اپنے صحافیوں کو دیکھتے ہیں۔

"خدا کا شکر ہے کہ آپ انگریز صحافی کو نہ تو رشوت دینے کی اُمید کر سکتے ہیں اور نہ ہی اس کی طبیعت یا سیرت کا رجحان بدلنے کی توقع کر سکتے ہیں۔ لیکن وہ بغیر رشوت لیے ہی جو کچھ کرتے ہیں، اسے دیکھ کر یہ کہنا پڑتا ہے کہ اس میں رشوت یا مول تول کی گنجائش ہی کہاں رہ جاتی ہے۔"

خبروں اور آرا کو دوسروں کے دلوں میں جمانا

عوام مجھے کہتے کہ فلاں موضوع پر لکھئے۔ اس طرح جن موضوعات پر وہ اظہار خیال کی خواہش رکھتے، اس کا برملا مجھ سے اظہار کرتے اور ایسا کرتے ہوئے نہ تو ان کو اپنا وقت برباد کرنا پڑتا اور نہ ہی مجھ پر کوئی رقم خرچ کرنی پڑتی۔ مجھے کچھ عرصے بعد پتہ چلا کہ میرے پیشے میں بھی ناجائز طور پر روپیہ بٹورنے کے کافی مواقع ہیں۔ یہی نہیں میں نے یہ بھی جانا کہ میری صحافیانہ برادری میں کافی لوگ اس طرح کے موقعوں کا ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں۔ اور اس طرح اُن کے اخراجات اخبار سے ملنے والی اُن کی تنخواہ سے کہیں زیادہ ہیں۔ اس کے بدلے وہ لوگ ایسی کہانیاں، قصے اور خبریں گھڑتے ہیں جو ان کی ضرورت ہوتی۔ خبروں کو ان کے مفاد کے مطابق توڑ مروڑ کر پیش کیا

جاتا۔ سیاست دانوں وغیرہ کی شہرت کا سامان فراہم کیا جاتا۔ مختلف ہتھکنڈے استعمال کرنے والے لوگ اگر اُن کے خاموش رہنے کی فیس ادا کرنے سے انکار کرتے، تو ان کی حرکتوں کا بھانڈا پھوڑا جاتا۔ ظاہر ہے کہ میں ان سب "شریف آدمیوں" کا نام نہیں بتا سکتا کیوں کہ ایسا کرنے پر وہ مجھے اور "یوجنا" کو لامحدود عرصے تک مقدمے میں پھنسا لیں گے۔ جس کے متحمل ہم نہیں ہو سکتے۔ پیارے قارئین! میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اس طرح کی مثالیں میرے ذاتی تجربوں پر مبنی ہیں اور یہ بالکل سچی ہیں۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ اس پیشے میں اس طرح کا گندہ کھیل کھیلنے والوں کی تعداد اُن سے کہیں زیادہ ہے جو صحافیانہ اصولوں کو مدنظر رکھ کر چلتے ہیں۔

سچے ذاتی تجربات

آپ ایک سابق مرکزی وزیر کابینہ کی کہانی جانتے ہی ہوں گے جو صحافیوں کو رشوت دینے میں پیش پیش تھا۔ کہا جاتا ہے کہ وہ اپنی ریاست کے تمام اخبار نویسوں کی خوب مالش کیا کرتا تاکہ وہ اس کی کارگزاری کے بارے میں خوب بڑھا چڑھا کر لکھیں۔ کہتے ہیں کہ ایک بار وہ غیر ممالک کے دورے سے واپس آیا وہ اپنے ساتھ سوٹ کے کپڑوں کی کچھ گانٹھیں لایا۔ یہ کپڑا اس نے صحافی دوستوں کو تحفہ کے طور پر دے دیا۔ کچھ دنوں بعد اس نے پریس کانفرنس بلائی۔ یہ محض اتفاق تھا کہ تمام نمائندے جو اس کانفرنس میں آئے، وہ سب کے سب ایک ہی طرح کا سوٹ پہنے تھے۔ اس طرح وزیر موصوف نے سچائی کو پہنچانے والے ان پیامبروں کا ہلکا پن اور کھوکھلا پن بے نقاب کر دیا۔

بظاہر اس قصے میں کچھ مرچ مسالہ بھی لگایا گیا ہوگا تاکہ صحافیوں میں سرایت کردہ بدعنوانیوں کو پوری طرح واضح کیا جا سکے۔ لیکن میں نے جو تجربات بیان کئے ہیں، ان میں کوئی مرچ مسالہ نہیں لگایا گیا ہے۔

جب میں باتصویر جرنل کا ایڈیٹر تھا تو مجھے استعمال شدہ تصاویر کا بل پاس کرنا پڑتا تھا۔ بہت سی تصاویر بغیر طلب کی ہوئی اور مفت ہوتی تھیں۔ کیوں کہ عوام کو پبلسٹی درکار تھی۔ مجھے دو سال بعد یہ پتہ چلا کہ میں مفت اور بے طلب تصاویر کے بل "بے نام فوٹو ایجنسی" کے نام سے پاس کرتا چلا آرہا ہوں۔ یہ ایجنسی میرے اسٹاف کے ایک کارکن نے اپنی بیوی کے نام پر اور اس کے فائدے کے لیے کھول رکھی ہے۔ وہ مجھ سے بھی پیسہ لے لیتا تھا اور اُس شخص سے بھی جس سے تصویر لے کر چھپواتا۔ اس طرح سے وہ کئی ہزار روپے ہر مہینے کما لیتا اور اس پر اسے ٹیکس بھی ادا نہ کرنا پڑتا۔ دو اور ساتھی خوراک اور شراب کے ماہر سمجھے جاتے تھے۔ وہ ملک بھر میں پانچ ستاروں والے ہوٹل میں اپنے دوستوں کو کھانے اور شراب پر مدعو کیا کرتے۔ شراب کی صنعت پہ تجزیاتی مقالے کے لیے وہ وہسکی، رم وغیرہ کے کریٹ وغیرہ لے لیا کرتے۔ یہ لوگ شراب کی بوتلیں ہی نہیں بلکہ کریٹ کے کریٹ اس بہانہ حاصل کرتے کہ ان کو ایڈیٹر کو کافی تعداد میں بوتلیں پہونچانی ہیں۔ اور وہ انھیں اسٹاک کرنا چاہتا ہے۔ ایک اور ساتھی فلم دیکھنے جاتے اور آتے دونوں طرف کا ٹیکسی کرایہ وصول کرتے۔ ان کا کہنا تھا کہ میں اس فلم پر اخبار میں ریویو لکھوں گا۔ وہ بس سے جاتا۔ نجی تصاویری لائبریری قائم کرنے کی غرض سے بہت سی تصاویر حاصل کرتا اور پھر منافع پر دوسرے اخبارات کو یہ تصاویر مہیا کرتا۔ یہ لوگ شان و شوکت کی زندگی بسر کرتے۔ جو ایماندار تھے، وہ کام کرتے، بیڑی پیتے اور کالی کافی پیتے اور گھروں کو پیدل جاتے۔

بلیک میل پر گزارہ: ہندوستان میں کچھ

وہ ملک بھر میں پانچ ستاروں والے ہوٹل میں اپنے دوستوں کو کھاتے اور شراب پر مدعو کیا کرتے۔ شراب کی صنعت پر تجزیاتی مقالے کے لیے وہ وہسکی، رم وغیرہ کے کریٹ وغیرہ لے لیا کرتے۔ یہ لوگ شراب کی بوتلیں ہی نہیں بلکہ کریٹ کے کریٹ اس بہانہ حاصل کرتے کہ ان کو ایڈیٹر کو کافی تعداد میں بوتلیں پہنچانی ہیں اور وہ انھیں اسٹاک کرنا چاہتا ہے۔

ہندوستان میں کچھ ایسے جرنل ہیں جن کا گزارہ ہی بلیک میل پر ہے۔ ہم میں سے بہت سے لوگ اس بات کو جانتے ہیں لیکن پھر بھی ان اخبارات کو پڑھتے رہتے ہیں کیونکہ ہمیں ہتھکنڈوں اور گپ شپ والی خبروں کو پڑھنے میں مزا آتا ہے۔ کچھ صحافی سیاست دانوں کی بدعنوانیوں اور جرائم کو بے نقاب کرنے میں خاصی مہارت حاصل کرتے ہیں۔ انھیں معاشرے کی برائیوں کو بیان کرنے اور ان کو بے نقاب کرنے کا ملکہ ہوتا ہے۔ کچھ صحافی فلمی ستاروں پر توجہ دیتے ہیں اور ان کے معاشقہ کی داستانوں کو بے نقاب کرتے ہیں۔ اس طرح کی خبروں کی اشاعت کو روکنے کے لیے بڑی بڑی رقوم دی جاتی ہیں۔

ریاستی نامہ نگاروں کے اُس دباؤ کا مقابلہ کرنا صرف اخبار کے بہادر مالک کا ہی گردہ ہے یا اس اخبار کے ایڈیٹر ہی کی ہمت ہے، جو ریاستی وزرائے اعلیٰ کے توسط سے ڈالا جاتا ہے۔ یہ نامہ نگار وزرائے اعلیٰ کے احسان مند ہوتے ہیں۔ اس طرح مرکزی حکومت کے وزیروں سے بھی ان کے رابطے ہوتے ہیں۔ ان تمام بدعنوانیوں کا شکار وہ غریب اور بے نوا قاری بنتا ہے جسے اخبار کے ذریعے غلط اطلاعات فراہم کی جاتی ہیں۔

ایسے جرنل ہیں جن کا گزارہ ہی بلیک میل پر ہے۔ ہم میں سے بہت سے لوگ اس بات کو جانتے ہیں لیکن پھر بھی ان اخبارات کو پڑھتے رہتے ہیں کیونکہ ہمیں ہتھکنڈوں اور گپ شپ والی خبروں کو پڑھنے میں مزا آتا ہے۔ کچھ صحافی سیاست دانوں کی بدعنوانیوں اور جرائم کو بے نقاب کرنے میں خاص مہارت حاصل کرتے ہیں۔ انھیں معاشرے کی بُرائیوں کو بیان کرنے اور ان کو بے نقاب کرنے کا ملکہ ہوتا ہے۔ کچھ صحافی فلمی ستاروں پر توجہ دیتے ہیں اور معاشقے کی داستانوں کو بے نقاب کرتے ہیں۔ اس طرح کی خبروں کی اشاعت کو روکنے کے لیے بڑی بڑی رقوم دی جاتی ہیں۔ مشتہرین کو دھمکی دے کر انھیں اشتہارات کی جگہ خریدنے پر مجبور کیا جاتا ہے اور ان سے کہا جاتا ہے کہ اگر انھوں نے ایسا نہ کیا تو ان کے خلاف مہم چلائی جائے گی۔

مجھے ایک پنجابی رسالے کا واقعہ یاد ہے، جس کی بہت معمولی اشاعت تھی۔ اس کا خرچہ وہ پورے صفحے کے اشتہارات سے چلتا تھا۔ ان میں سے ایک اشتہار تھا، کوکاکولا کا اور دوسرا تھا پنجاب اور سندھ بنک کا۔ جب کوکاکولا نے اشتہار دینا بند کر دیا تو اس کے ایڈیٹر نے اس کے خلاف مضامین کا سلسلہ سلسلہ شروع کر دیا۔ اور ایسے پوسٹر چھاپنے لگا جس میں عوام کو آگاہ کر دیا گیا تھا کہ اس کے پینے سے مضر اثرات سامنے آتے ہیں۔ حتیٰ کہ انسان نامرد تک ہو جاتا ہے۔ اس سے اس کی بکری پر اثر پڑا اور اسے دوبارہ اشتہار ملنے لگا۔ اس کے بعد کوکاکولا کے فائدوں کے بارے میں مضامین کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

انگلینڈ میں دو سب سے بڑے اخبارات کے مالک لارڈ راتھر مور (LORDS ROTHEBMORE) اور بیور بروک (BEAVER BROOK) کے لیے کپلنگ نے جو کچھ لکھا، وہ مناسب ہی تھا اس نے لکھا "ان اخبارات کی ملکیت کا مُدعا اور مقصد کیا ہے؟ وہ ہے اقتدار، اور ذمہ داری کے بغیر اقتدار"

بمبئی میں اس طرح کے اشتہارات کی بہتات ہے۔ بُلِٹز کے اخبارات کو اشتہارات کی سب سے زیادہ آمدنی ہوتی ہے۔ ان کی سنسنی خیز صحافت اور فحاشیات والی صحافت کے باوجود ریاستی سرکاریں انھیں خصوصی نمبر نکالنے کے لیے کافی رقم دیتی ہیں۔ اور ان کے ایڈیٹروں کے ساتھ شاہانہ سلوک ہوتا ہے۔ حتیٰ کہ مرکزی وزیر بھی ان کو خصوصی انٹرویو دینے کے لیے بے چین نظر آتے ہیں اور اپنے محکمے سے انھیں اشتہارات دلا کر ان کو نفع پہونچاتے ہیں۔

فلمی میگزین اور بھی کمتر سطح پر کام کرتے ہیں۔ ان کا تجارتی گُر بھی نہ جیسا ہوتا ہے چنانچہ وہ فلموں میں نمایاں حیثیت کے مالک ہیرو اور ہیروئن کے اسکینڈلوں کا پردہ فاش کرنے پر توجہ دیا کرتے ہیں۔ وہ لکھا کرتے ہیں کہ فلاں فلم فلاپ ہو گئی۔ یا فلاں فلم ہِٹ ہو گئی۔ فلمی ستارے اور پروڈیوسر دونوں ہی اس بات کی کوشش میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کے لیے کوشاں نظر آتے ہیں کہ ان کا ذکر اچھی طرح سے ہو اور ان کے رقیبوں کا ذکر خراب ڈھنگ سے۔ چونکہ فلمی دُنیا زیادہ تر کالے دھن پر کام کرتی ہے اس لیے اس کا کچھ حصہ فلمی صحافیوں کی جیب میں بھی آتا ہے۔

ملکی اور قومی اخبارات

روزنامے خاص کر قومی اخبارات کے زمرے میں آنے والے وہ اخبارات جن کے ایڈیشن دلی سے شائع ہوتے ہیں، زیادہ تر سیاسی بدعنوانیوں پر چلتے ہیں۔ سیاست دان چاہتے ہیں کہ ان کے نام اخبارات میں موافقانہ اور مناسب ڈھنگ سے چھپیں، خاص کر مرکزی حکومت کے حکمراں طبقے میں پڑھے جانے والے اخبارات میں ان کے بارے میں ایسی خبریں ہوں جو ان کے لیے موافق ثابت ہوں۔ اگر کوئی صحافی دوست ہے تو اُسے با وثوق ذرائع کے حوالے سے خبر کو اپنے موافق بنا کر چھاپنے کے لیے کہا جاتا ہے۔

یہ خبر اس طرح سے گھڑی جاتی ہیں کہ فلاں فلاں کے نام پر گورنر یا سفیر یا قومی ملکیت کے بنک کے چیرمین یا پبلک سیکٹر ادارے کے چیرمین کی حیثیت سے تقرری کے بارے میں سنجیدگی سے غور کیا جا رہا ہے۔ دراصل اس طرح سے کچھ نام زیرِ غور آئے ہیں۔ وزیر صحافیوں کو رازداروں پر وہ خبریں کو پہنچاتے ہیں۔ بشرطیکہ وہ خبر ان کے مرتبے یا عہدے کو بڑھانے سے متعلق ہو یا جس سے ان کے مخالف کی تذلیل ہوتی ہو۔

مرکزی حکومت کوشش کرتی ہے کہ رابطہ عامہ

ـبار نویسوں کو مطمئن رکھے۔ بہت سوں کو
رس رہائشی گاہ فراہم کی جاتی ہے۔ اگر
صحافیوں سے معاملہ کرنا دشوار ہو تو انھیں
ـش گاہ سے محروم بھی کردیا جاتا ہے۔ ریاستی
ـرے اعلیٰ بھی چاہتے ہیں کہ دلی سے پرچوں
ـن کی کارگزاری چھپے۔ وہ ریاستی راجدھانی
ـقیم نامہ نگاروں کو مکان کی اور دیگر سہولتیں
ـم کرتے ہیں۔ اکثر ریاستی نامہ نگاروں کی جیب
ـرماہ کرنسی نوٹوں کا ایک لفافہ بھیجنے کی رسم
اس سے خبروں سے متعلق وہ عملہ اور ایڈیٹر
ـف ہے جو ان کو چھاپتا ہے۔ وہ زیادہ کچھ
ـیں، البتہ مجلہ کی کمی کے نام پر ان پر کی گئی نکتہ
ـکو یا فل فیاڑہ پھیلنے جانے والی تعریف کو
ـن کردیتا ہے۔ ان نامہ نگاروں کی طرف سے
ـ پریشان کئے جانے کی صورت میں ان کو
ـدسری ریاست میں بدل بھی دیا جاتا ہے۔ ریاستی
نگاروں کے اس دباؤ کا مقابلہ کرنا صرف
ـر کے بیادر مالک کا ہی گروہ ہے یا اس اخبار
ایڈیٹر ہی کی ہمت ہے، جو ریاستی وزراء
ـسکے توسط سے ڈالا جاتا ہے۔ یہ نامہ نگار
ـرے اعلیٰ کے احسان مند ہوتے ہیں۔ اس
ـ مرکزی حکومت کے وزیروں سے بھی ان کے
ـلے ہوتے ہیں۔ ان تمام بدعنوانیوں کا شکار
غریب اور بے نوا قاری بنتا ہے جسے اخبار
ذریعے غلط اطلاعات فراہم کی جاتی ہیں۔

اخبار کے مالکان بھی بدعنوانیوں کا شکار
اور یہ ترابیاں ہندوستانی اخبارات کی رگ
ـمیں بس گئی ہیں، اس طرح روپیہ کمانے کی
ـر نکھنے والے اخبار نویس بھی بدعنوانیوں کے
ـب ہیں۔

انگلینڈ میں دو سب سے بڑے اخبارات
مالک لارڈ راتھرمور (Lords Bother-
nor (Beaver Brook) اور بیور بروک
ـیے کپلنگ نے جو کچھ لکھا، وہ مناسب ہی
تھا۔ اس نے لکھا "ان اخبارات کی ملکیت کا
مدعا اور مقصد کیا ہے؟ وہ ہے اقتدار، اور
ذمہ داری کے بغیر اقتدار۔"

★

بقیہ: جی ہاں منصوبہ ساز بھی گندہ کھیل کھیلتے ہیں

جو غریبی کی بیخ کنی کے مقصد کی نفی کرتا ہے اور
اس حد تک دونوں کو اس "گندگی" کا احساس
ہونا چاہیئے جو ان کے اردگرد موجود ہے۔

دو:

دوسرے منصوبہ ساز کو اپنے ہم مرتبہ سماجی
گروپ کے دوسرے اراکین سے زیادہ اس
بات کا احساس کرنا چاہیئے کہ مختلف قانونی
خامیوں اور لیجسلیٹو اور انتظامیہ کمزوریوں
اور خامیوں سے سماجی مقاصد کو کتنی زک پہنچ
رہی ہے۔ اسے وقتاً فوقتاً کھل کر سامنے آنا
چاہیئے اور پبلک کو بتانا چاہیئے کہ اقتصادی کوششوں
کے گرد جو "گندگی" ہے وہ کیسے سماجی مقاصد
پر اثر انداز ہو رہی ہے۔

منصوبہ ساز کو چاہیئے کہ وہ اہم اقتصادی
اور سماجی مسئلوں پر گاہ بگاہ پبلک کے سامنے
اس سچائی کو پیش کرے جسے وہ خود دیکھتا ہے۔

اور تین:

آخر میں میں یہ کہوں گا کہ ایسے موقعے آسکتے
ہیں جب منصوبہ ساز کو منصوبہ سازی کے نظام
عمل سے خود کو الگ کر لینا چاہیئے تاکہ وہ گندگی
اور کدورتوں کے سمندر میں ڈوب نہ جائے۔ لیکن
ایسا بہت کم ہوگا، لیکن شائد ایک بار ہی ایسا
کرنا ہوگا۔ منصوبہ ساز کو حقائق کو ڈھونڈ نکالنے
اور اپنے تجزیہ کو اس وقت تک جاری رکھنے
کی جو تربیت ملتی ہے جب تک کہ وہ جس بات
کو سچائی سمجھتا ہے اس تک نہ پہونچ جائے،
وہ اسے "گندے لوگوں" کے "گندے کھیل" سے
الگ ہو جانے پر آمادہ کرے گی۔ ایسا اس وقت
ہوگا جب وہ یہ دیکھے گا کہ عوام کی خواہشات
اور سماج کے مطلوبہ نصب العین کو واضح یا غیر
واضح ناکامی کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ تبھی
منصوبہ ساز سچائی کا پتہ لگانے کی کوشش
کرے گا۔ اس کو "گندے لوگوں" کے "گندے
کھیل" سے الگ ہو جانے کے بعد سماجی علیحدگی
اور اقتصادی خاموشی اختیار کرنی ہوگی اور یہ
ایک بھاری قیمت ہے جو اسے ادا کرنی پڑے
گی۔ لیکن وہ اس طرح "گندگی" کو کم کرتے
اور "گرد" کو دور کرنے میں اپنا حصہ ادا کر
رہا ہوگا۔

★

بقیہ: ایک استحصالی نظام کی پاسبانی

عوام کی خدمت کرنے والے ڈاکٹروں
کے کوآپریٹو اداروں، مفت ہسپتالوں، کمزور
طبقے کو مفت دوائی دینے والے اداروں،
سماج کی بیماریوں کی مخصوص ضروریات
کے کفیل ڈاکٹروں، قبائلی معالجوں، گندے
اور غلیظ علاقوں کو صاف کرنے والے کارکنوں
وغیرہ کو بھی اسی قسم کی سہولتیں ملنا چاہئیں۔

لہٰذا اگر پیشہ ور سامراجی انداز سے
کارفرما ہے تو بھارت میں ان کا کوئی
مستقبل نہیں۔ بھارت میں مستقبل ان پیشہ ور
لوگوں کا ہے، جو معذور عوام کو اپنے
زندہ ضمیر کا مصلحت آمیز مرکز بنا کر ان
کی بہبود کا کام کرتے ہیں۔

سی۔ پی۔ رام چندرن

ایک ناخوشگوار پہلو اور اُس کا مطالعہ

مالکانہ دخل اندازی اور جرنلسٹوں کے ذاتی مفاد نے اخبار کے ایڈیٹر کو مالکوں کا محض ایک ایجنٹ بنا کر رکھ دیا ہے۔
آج کا پریس عوام کی رائے کی صحیح ترجمانی نہیں کرتا۔ بلکہ اس کو مسخ کر رہا ہے اور کوئی بھی اس حالت کو سدھارنے کے لیے خطرہ مول لینا نہیں چاہتا۔ نوکری سلامت رہے۔ لہٰذا عام پٹی ہوئی خبریں شائع کی جاتی ہیں۔
ان حالات کو المیہ قرار دیتے ہوئے۔ شری سی پی رام چندرن اس طور پر افسوس ظاہر کرتے ہیں کہ سدھار کی کوئی گنجائش نہیں کیونکہ جن لوگوں کا مفاد خطرے میں ہے۔ وہ لوگ ان افسران کے بہت قریب ہیں۔ جو ان حالات کو بدلنے کا لائحہ عمل بنا سکتے ہیں۔ ایڈیٹر

ہیرالڈ میک ملن نے جو انتھنی ایڈن کے بعد برطانیہ کے وزیراعظم بنے۔ اپنی سوانح عمری میں ایک مقام پر لکھا ہے کہ "دی ٹائمس آف لنڈن" کے پارلی منٹری کارسپانڈنٹ نے ہاؤس آف کامنز میں ہوئی تقریر کو جس میں نیول چیمبرلین کی گھٹنا ٹیک پالیسی پر حملہ کیا گیا تھا۔ اچھی اہمیت دی۔ لیکن رات کے وقت اخبار کے نیوز ایڈیٹر نے چپکے سے آکر اس کے اہم نکات کو اس میں سے نکال دیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ "دی ٹائمس" چیمبرلین کا بڑا حامی تھا اور اخبار کے مالک بھی تھے کلی وی ڈن گروہ کے لیڈر تھے (کلی وی ڈن آسٹرز کا گھر تھا) جن کا یہ خیال تھا کہ انگلستان کو ہٹلر سے مفاہمت کا راستہ نکالنے کے لیے کام کرنا چاہیے۔ اس خبر کا افسوسناک پہلو بھی دیکھئے۔ پارلی منٹری کارسپانڈنٹ وہ تو اس ابتدائی معرکے کی فوج میں شامل ہو کر ہلاک ہو گیا جو جنگِ عظیم شروع ہوتے ہی فرانس میں لڑتے ہوئے اور نیوز ایڈیٹر صاحب نے بوڑھے ہو کر انتقال فرمایا۔

مالکان کے ایجنٹ: اخبارات کے معاملات میں مالکانہ دخل اندازی تو روزمرہ کا معمول ہے یہ بات ان اخباروں میں خاص طور پر واقع ہوتی ہے۔ جن کے مالک صنعت کار یا کاروباری آدمی ہیں۔ اور جنھیں افسرانِ اعلیٰ اور سیاست دانوں کو خوش رکھنا ہوتا ہے۔ ایک مثال سنیئے۔ دہلی کے ایک اخبار میں ایک خبر شائع ہوئی کہ فلاں وزیر صاحب جب جاپان سے لوٹے تو وہ ممنوعہ اشیاء لائے تھے۔ (وہ چیزیں جن کی اجازت نہیں)۔ یہ وزیر جو بعد میں گورنر بنے اور جن کا دورہ پر ہوئے انتقال ہوا۔ اخبار کے صنعت کار مالک کے دوست تھے۔ لہٰذا دوسرے ہی دن اس خبر کی تردید شائع ہوئی اور جس اخبار نویس نے یہ خبر دی تھی اس کے سختی سے کان کھینچے گئے۔ مرحوم سی پی۔ راما سوامی پہلے پریس کمیشن کے صدر تھے۔ اس کمیشن کی میعاد کی مدت رہی جب اس کے سامنے ایک اخبار کے مالک شری رام کرشن ڈالمیا نے یہ اعتراف کیا کہ انھوں نے انسانی دماغ کے ہر جرم کا ارتکاب کیا ہے۔ ہو سکتا ہے یہ محض اپنے آپ کو بے حمیت ظاہر کرنے کی کوشش ہو۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ جس خبر سے کسی کاروبار کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو اسے چھپنے نہیں دیا جاتا۔ ایک وقت تھا کہ ہندوستان میں لگی ہوئی ٹیلی پرنٹر سروس کو اخبار کے مالک بازار

> **جوں جوں سال گذرتے گئے۔ ایڈیٹر اخبار کے مالکان کا ایجنٹ بن کر رہ گیا ہے اس کی اپنی کوئی شخصیت نہیں رہی۔ اور نہ کوئی ذاتی حمیت جس کی کوئی پرواہ بھی کرے۔ (شاید کوئی ذاتی حمیت ہے بھی نہیں) ان ایڈیٹروں کو اچھی تنخواہیں ملتی ہیں۔ مفت بنگلے اور موٹر گاڑیاں اور دوسری سہولتیں۔ لہٰذا بہت کم (شاید ایک آدھ) مالکوں کے دباؤ سے آزاد رہ سکتے ہیں۔**

کے آثار چڑھاؤ معلوم کرنے کے لیے استعمال کرتے تھے۔ شاید یہ رواج ابھی تک ختم نہیں ہوا۔

۲۰۔ ۱۹۵۰ء کے درمیان جبکہ شری جواہر لال نہرو کے ماتحت شری وی۔ کے کرشنا مینن بطور وزیر دفاع کے کام کرتے تھے تو ان کے خلاف اعتراضات کا ایک طومار برپا تھا۔ مینن کے خلاف نکتہ چینی کا آغاز امریکہ میں ہوا۔ کیونکہ مینن اقوام متحدہ میں ہندوستان کے نمائندہ کی حیثیت سے سامراج ہماکے خلاف سخت تقریریں کیا کرتے تھے۔ ان پر یہ الزام لگایا گیا کہ انھوں نے ۱۹۴۷ میں جبکہ ہندوستانی افواج کشمیر کے محاذ پر جنگ لڑ رہی تھیں۔ جیپوں کی خرید میں خرد برد

ناراض کر لیا تھا کہ بھارت کے تیل کے وسائل کی خود کھوج کرنا چاہتے تھے۔ بھارت پٹرولیم کے معاملے میں دوسروں کا محتاج تھا۔ مالویہ جی نے یہ صورت حال بدل ڈالی۔ لہٰذا ان پر ہر طرح کے الزامات تھوپے گئے۔ ایک بار دہلی سے شائع ہونے والے ایک اخبار نے اپنی اعلیٰ سُرخی جمائی کہ تیل کے چند کوئیں وزیر کی نااہلی کی وجہ سے گر گئے ہیں۔ ظاہر یہ کیا گیا تھا کہ یہ خبر کلکتہ سے آئی ہے۔ ایک مہینہ گزرا تھا کہ میرا کلکتہ جانا ہوا۔ وہاں میری اس اخبار نویس سے ملاقات ہو گئی۔ جس کے بارے میں یہ کہا گیا تھا کہ تیل کے کنوئیں گرنے کی خبر اس نے حاصل کی ہے۔ جب میں نے

رشوت ہے۔ اس ضمن میں دہلی کے ایک اخبار کے ایڈیٹر کی مثال پیش کی جا سکتی ہے جو ایمرجنسی کے دوران دھیمے دھیمے انداز میں نکتہ چینی کرنے کی جرأت کیا کرتا تھا۔ جب ایمرجنسی ختم ہو گئی اخبار کے مالک نے اس کو باہر نکال دیا۔ اور اس کی جگہ اپنے ایک چہیتے کو رکھ لیا۔

اور یہ جرنلسٹ صاحبان

یہ محض اخبار کے مالک ہی نہیں جنھیں مورد الزام ٹھہرایا جا سکتا ہے۔ اس زمرے میں اخبار نویس بھی آتے ہیں۔ یہ مانی ہوئی بات ہے کہ جو اخبار نویس ضلعے سے خبریں بھیجتے ہیں اور ان میں سے اکثر محض فرصت کے وقت خبریں جمع کرتے ہیں، وہ

> **یہ محض اخبار کے مالک ہی نہیں۔ جنھیں موردِ الزام ٹھہرایا جا سکتا ہے۔ اس زمرے میں اخبار نویس بھی آتے ہیں۔ یہ مانی ہوئی بات ہے کہ ضلعی سطح کے کارس پانڈنٹ جن میں سے اکثر پارٹ ٹائمر ہوتے ہیں۔ اپنے مفاد کے عوض میں ضلعی حکام کی بے حد تعریف لکھ بھیجتے ہیں۔ ان کو ان مراعات کی ضرورت اس لیے پیش آتی ہے کہ وہ وہاں اپنا کاروبار بھی کرتے ہیں۔**

کی۔ چھوٹی وہاں میں اس کو جیپ اسکینڈل کا نام دیا گیا۔ اخبارات کے کاروباری مالکان کو غصہ یہ تھا کہ مینن سوشلسٹ ہیں اور وہ پبلک سیکٹر کی توسیع کرنا چاہتے ہیں۔ ایک اخبار کے مالک نے تو یہ حکم دے رکھا تھا کہ مینن کی کوئی تصویر شائع نہ کی جائے۔ سوائے ایسی تصویر کے جس سے ان کا مذاق اُڑے یا جس سے وہ بُری شکل میں پیش ہو رہے ہوں۔ ان دنوں انگلستان کے اخبارات پر امریکی اثر و رسوخ تھا۔ اور جو کوئی اخبار نویس اس دباؤ کے خلاف اٹھنے کی کوشش کرتا اسے اپنا نوکری خطرے میں ڈالنا ہوتی تھی۔

کیشو دیو مالویہ، جو بھارت کے تیل محکمے کے وزیر تھے۔ اخباروں کے ہاتھوں پریشان رہا کرتے تھے۔ وہ بائیں بازو کے نظریہ رکھتے تھے۔ علاوہ ازیں انھوں نے امریکی مفاد کو اس بنا پر

اس سے اس ضمن میں سوال کیا تو اس نے سرے سے ہی انکار کر دیا کہ اس نے ایسی کوئی خبر دی تھی۔ ہوا یہ کہ کچھ لوگ جو برما شیل میں کام کرتے تھے، انھوں نے دہلی اخبار کے کارس پانڈنٹ کو مسالہ دیا اور ایڈیٹر نے چشم پوشی کی۔ اور خبر کو کلکتہ کی تاریخ سے شائع کر دیا گیا۔ یہ کمینی حرکت تھی جو جان بوجھ کر کی گئی۔

• جوں جوں سال گذرتے گئے ہیں۔ ایڈیٹر اخبار کے مالکان کا ایجنٹ بن کر رہ گیا ہے۔ اس کی اپنی کوئی شخصیت نہیں رہی اور نہ کوئی ذاتی حیثیت جس کی کوئی پرواہ بھی کرے۔ (شاید کوئی ذاتی حیثیت ہے ہی نہیں) ان ایڈیٹروں کو اچھی تنخواہیں ملتی ہیں۔ مفت بنگلے اور موٹر گاڑیاں اور دوسری سہولتیں۔ لہٰذا بہت کم (شاید ایک آدھ) مالکوں کے دباؤ سے آزاد رہ سکتے ہیں۔ یہ ایک قسم کی

مقامی افسران سے فائدہ اٹھانے کے لیے ان کی بے حد تعریف و توصیف لکھ بھیجتے ہیں انھیں یہ اس لیے کرنا ہوتا ہے کہ وہ ان مقامات پر کاروبار کرتے ہیں۔

میں ایک ایسے شخص کو جانتا ہوں جو ٹرانسپورٹ کا دھندا کرتا ہے۔ اسے جب بھی موقع ملتا ہے وہ ٹرانسپورٹ کے حق میں طومار باندھ دیتا ہے۔ ریاست کے صدر مقام پر بعض اخبار نویسوں کو عام کرائے پر مکان دئیے جاتے ہیں۔ قدرتی بات ہے کہ وہ ریاستی سرکار کے خلاف کچھ لکھنے سے جھجکتے ہیں۔ کیونکہ ان کو خطرہ ہوتا ہے کہ کہیں وہ مکانوں سے نکال نہ دئیے جائیں۔ یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ بعض جرنلسٹ اپنا الگ کاروبار بھی چلاتے ہیں۔ بعض اخبار نویس اپنے بچوں کو اچھے کالجوں میں داخل کرانے کی بنا پر اپنی ذمہ داری اور غیر جانبداری کو طاق پر رکھ دیتے ہیں۔

بات یوں ہے کہ اس رشوت ستانی کے ماحول میں جہاں ہر کام بے ایمانی سے ہو ایک اخبار نویس بھی بہک جاتا ہے۔

ایسا بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ بعض جرنلسٹ جب اپنے مقصد پانے میں ناکام رہتے ہیں، تو افسران اور سیاست دانوں کو بلیک میل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

دو برس ہوئے کماؤں کے جنگلات میں تباہ کن آگ لگی عام لوگوں کو معلوم تھا۔ اس آگ کو لکڑی کے سوداگروں نے بھڑکایا ہے۔ لیکن ان سوداگروں کے خلاف کسی اچھے اخبار میں ایک سطر تک بھی نہ نکلی۔ کیوں کہ ان سوداگروں نے جرنلسٹوں کی خوب آؤ بھگت کر رکھی ہے۔ اسی قسم کی ایک اور بات ہے۔ اخباروں میں خبر شائع کرائی گئی کہ کلکتہ کے ایک علاقے میں عورتوں کو ناجائز تنگ کیا جاتا ہے۔ اور وہاں کے تالاب عورتوں کی انگلیوں سے اٹے پڑے ہیں۔ یہ جھوٹ اس لیے تراشا گیا کہ اچھے مکرجی کی بائیں بازو کی سرکار کو بدنام کیا جا سکے۔

اور یہ ایڈی ٹوریل

اخباروں کے ایڈی ٹوریل بھی اسی قسم کے ہوتے ہیں۔ اقتصادی معاملات سے تعلق رکھنے والے مسائل کے بارے میں اخبارات ایک سی رائے پیش کرتے ہیں۔ جب بینکوں کو قومیایا گیا تھا تو کوئی بھی بڑا اخبار ایسا نہیں تھا۔ جس نے اس قدم پر نکتہ چینی نہ کی ہو۔ ہر بات اس دلیل پر چھوٹتی تھی کہ اس سے ملک کی مالی حالت میں بحران پیدا ہوگا۔

> **اخباروں میں ایڈی ٹوریل کی رائے میں یکسانیت پائی جاتی ہے**
> **اقتصادی مفاد پر اثر انداز ہونے والی کسی خبر پر اخبار ایک سی لکیر پکڑتے ہیں۔ جب بینکوں کو قومیایا گیا تو ایک بھی بڑا اخبار ایسا نہ تھا جس نے اس قدم پر نکتہ چینی نہ کی ہو۔ ہر دلیل یہ تھی کہ اس سے ملک کی حالت میں بلا کا فتور پیدا ہو جائے گا۔**

اب قومی ملکیت کے بنکوں کی افادیت تسلیم کرلی گئی۔ اخباروں کے چند ایک مالک بینکوں کے بھی مالک تھے یا ان کے ڈائرکٹر۔ لہذا ان کا اس بات پر خفا ہونا سمجھ میں آ سکتا ہے۔ لیکن ایسے ایڈی ٹوریل کی کیا وقعت اگر سب ایک سا ہی لکھدیں؟ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اخبار کے ایڈی ٹوریل کی رائے سے لوگوں کا اعتبار اٹھتا گیا ہے۔

> **اخباروں سے ہندی عوام کو اپنے پیسوں کا صحیح عوض نہیں ملتا۔ یہ ایک حقیقت ہے۔ کئی کمیشن بٹھائے گئے تاکہ اخباروں ملکیت کے طور طریقے معلوم کئے جائیں اور اخباروں کو ان کے چنگل سے رہائی دلائی جائے۔ یا اخباروں کو جمہوری بنایا جائے۔ لیکن ہوا کچھ بھی نہیں۔ کیونکہ اخباروں کے ساتھ بہت سے مفاد وابستہ ہیں اور مالکان کی ان لوگوں تک پہنچ ہے جو پالیسی طے کرتے ہیں آج کا یہ ایک المیہ ہے۔**

ملکی زبانوں کے پریس کے ضمن میں بھی یہی بات سچ نظر آتی ہے۔ بلکہ اس سے بھی زیادہ۔ ملکی زبانوں کے اخبارات تو کبر نفسی کا شکار ہیں۔ اور وہ انگریزی اخباروں کی نقل کرنے کی حتی الوسع کوشش میں رہتے ہیں۔ اگر انگریزی اخبار نے کسی ایک شخص کو اپنا نشانہ بنایا۔ تو مقامی زبان کے اخبار نے بھی وہ طرز اختیار کی۔ ایک حالیہ مثال سے معلوم ہو جائے گا کہ مقامی زبان کے جرنلسٹ کس قدر کمزور ہیں۔

لارکن بھائیوں کی جاسوسی کی خبر سب سے پہلے ایک ہندی اخبار نویس کے ہاتھ لگی تھی۔ اس کے ایڈیٹر نے اول تو یہ خبر شائع کرنے سے گریز کیا۔ شاید وہ سرکار کو ناراض کرنا نہیں چاہتا تھا۔ بہت کچھ کہنے سننے کے بعد اس نے خبر کو اخبار کے ایک غیر اہم کونے میں شائع کردیا۔ اسی ہندی اخبار کے مالک کا انگریزی اخبار بھی ہے۔ اس انگریزی اخبار کے چست اور چالاک رپورٹر نے اس خبر کو خوب اچھالا اور اس کے بعد تو یہ سنسنی خیز اولیں خبر بھی بن گئی۔

یوں تو اخبار کو عوام کی رائے کا آئینہ کہا جاتا ہے لیکن یہ عوام کی رائے کو مسخ کر کے پیش کر رہا ہے۔ کوئی بھی تو خطرہ مول لینا نہیں چاہتا۔ لہذا عام قسم کی خبریں شائع کی جاتی ہیں۔

خبر رساں ایجنسیاں بالکل آزاد نہیں ہیں۔ وہ سرکاری اداروں خاص ریڈیو اور ٹیلی ویژن سے جو چندے ملتے ہیں ان پر انحصار کرتی ہیں۔ ریاستی سرکاریں بھی ان خبر رساں ایجنسیوں کو چندہ دیتی ہیں۔

ہندی عوام کو اخباروں سے اپنی رقم کا عوض نہیں ملتا۔ یہ ایک حقیقت ہے۔ کئی ایک کمیشن بٹھائے گئے تاکہ اخباروں کی ملکیت کے طور طریقے معلوم کئے جائیں۔ اور اخباروں کو ان کے چنگل سے رہائی دلائی جائے یا اخباروں کو جمہوری بنایا جائے لیکن ہوا کچھ بھی نہیں۔ کیونکہ اخباروں کے ساتھ بہت سے مفاد وابستہ ہیں۔ اور مالکان کی ان لوگوں تک پہنچ ہے۔ جو پالیسی طے کرتے ہیں۔

آج یہ ایک المیہ ہے۔

ہماری خدمات مثالی ہونی چاہئیں۔ یہی نہیں کہ وہ کارگزاری کے اعتبار سے اعلیٰ ہوں بلکہ وہ فرقہ وارانہ، صوبائی اور دیگر طرح کے تصورات سے پاک ہوں اور اعلیٰ سطح کی ایمانداری کی مظہر ہوں۔ اس ملک میں بہت سی انتشار پسندانہ اور سماج دشمن قوتیں ہیں۔ اور اکثر یہ کہا جاتا ہے کہ قوم کا اخلاقی تانا بانا وہ نہیں جو کہ ماضی میں تھا۔ ہمارے ملک میں تنگ نظری پر مبنی فرقہ واریت اور موقع پرستی کی برائیاں چوری چھپے گھر کر رہی ہیں۔ چور بازاری اور اسی طرح کی دیگر برائیوں نے بڑی حد تک تجارت اور کاروبار کو خراب کر دیا ہے۔ اپنی خدمات کے ذریعے ان برائیوں کے خلاف جنگ کرنی ہے۔ مگر یہ اسی وقت ہو سکتی ہے جب کہ ہمارے افراد بشمول مرد و زن صاحب کردار ہوں اور بے لوث خدمات اور ایمان داری کا مرقع ہوں۔ ہم جہاں کہیں برائی کو دیکھیں، ہمیں اس کے خلاف جنگ کرنی ہے۔ ہم اس کے خلاف ہتھیار نہیں ڈال سکتے اور ہم بے عمل بن کر محض خاموش تماشائی نہیں بن سکتے۔



Regd. No. D(DN) 985
R.N. 97032/81
Vol. 4 No. 9 & 10
YOJANA (URDU)
Licensed U(DN) to post without pre-payment at Civil Lines Post Office, Delhi-110 054.
1-31 August, 1984-Special Issue

یہ بارہ گندے لوگ

سماج کو گندگی سے پاک کرنے کے لیے یوجنا نے ذلّت آمیز حرکات کا پردہ چاک کرنے کا جو قابلِ تحسین فیصلہ کیا ہے۔ اس کا مقابلہ مہاتما گاندھی کے اُس فیصلے سے کیا جا سکتا ہے جو اُنھوں نے جنوبی افریقہ میں ٹولسٹائے فارم کے اپنے باتھ روم اور بیت الخلاء کو صاف کرنے کے لیے کیا تھا۔

اس واقعہ کو نصف صدی سے زیادہ کا عرصہ ہو چکا ہے' لیکن اب تک سماج نے کسی وسیع پیمانے پر اپنی غلاظت دُور کرنے کا کوئی قدم نہیں اُٹھایا۔ لہٰذا آیئے سماج سُدھار کے اس اہم فریضہ کے لیے لنگر لنگوٹ کس لیں۔

انفرادی نام نہیں لیے جائیں گے۔ البتّہ ان گروہوں کا ذکر ہوگا' جو سماجی بہاؤ کو اپنی گندی حرکات اور گندے مواد سے روک دیتے ہیں۔ یہ پردہ دری شاید سماج کو اُن گندے لوگوں اور اُن کی گندی حرکات سے باخبر کر دے اور یہ بھی اُمید کی جا سکتی ہے' کہ یہ گروہ بھی اپنی کالی کرتوتوں سے آگاہ ہو جائیں' بہت ممکن ہے کہ ان میں از خود شعور پیدا ہو سکے اور وہ خود کو صاف ستھری زندگی گذارنے کے لیے تیار کر سکیں۔

پورے ایک درجن ہیں ان گروہوں میں' اور ان میں شامل ہیں:۔

۱ــ بیوروکریٹ ــ۲ ــ سیاست داں (حکمراں) ــ۳ ــ سیاست داں (اپوزیشن)
۴ــ پلانرز (سرکاری) ــ۵ ــ پلانرز (کرسی کی زینت اور خیالی پُلاؤ پکانے والے) ۶۔ میڈیا والے (اعلیٰ) ــ ۷ ــ میڈیا والے (ادنیٰ) ــ ۸ ــ خطیب واعظ (مذہبی) ــ
۹ــ ناصح' واعظ (خالی ذہن کے فلاسفر اور ماہرینِ اقتصادیات) ــ۱۰ــ مذہبی پیشوا (دیویاں اور بال یوگی) ــ۱۱ــ تاجر' اور ۱۲۔ ماہرینِ تعلیم۔

خواجہ احمد عباس

Published by the Director, Publications Division, Patiala House, New Delhi-110001
Printed by Skylark Printers, 11355, Id-Gah Road, New Delhi-110055

یوجنا

ایک روپیہ

یکم تا ۱۵ ستمبر ۱۹۸۴ء

آزادی اور جمہوریت
(گیانی ذیل سنگھ)

19/9/84

ہندوستان کی ترقی کی ایک جھلک
(شریمتی اندرا گاندھی)

معاشرتی انقلاب کی جانب اقتصادی جمہوریت کا مقدمہ
حصولِ آزادی کے بعد
(وسنت ساٹھے)

شریمتی اندرا گاندھی

ہندوستان کی ترقی کی ایک جھلک

یوم آزادی کے موقع پر وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی نے آج لال قلعہ کی فصیل سے تقریر کرتے ہوئے کہا:

ہم آج کے دن لال قلعہ پر کیوں جھنڈا لہراتے ہیں؟ یہ کوئی آزادی کی علامت نہیں ہے، زمانہ قدیم کی علامت ہے۔ لیکن نیتا جی سبھاش چندر بوس نے نعرہ دیا تھا کہ جب ہم آزاد ہوں گے تو لال قلعہ سے ترنگا لہرائیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ بھارت کے پہلے وزیر اعظم جواہر لال نہرو نے ۱۵ اگست کو یہاں جھنڈا لہرایا اور تب سے ہر وزیر اعظم اس فرض کو انجام دے رہا ہے۔ جھنڈا لہرایا گیا اس سے پہلے اس لال قلعہ میں تین ہمارے بہادر گرفتار تھے۔ وہ جس راستے پر نہیں چل رہے تھے ان کا کچھ دوسرا راستہ تھا۔ لیکن وہ بھی آزادی کی چاہ میں سب کچھ چھوڑنے اور قربان کرنے کو تیار ہو گئے تھے، وہ تھے شاہنواز خان، پریم سہگل اور ڈھلوں جنہیں دلی کے لوگ اچھی طرح جانتے ہیں۔ کوئی ہم نے ان کا انتخاب نہیں کیا تھا، کسی غیر ملکی حکومت نے انھیں نہیں چُنا تھا لیکن تب بھی اتفاق سے ان کا تعلق تین مذاہب سے تھا۔ میں یہ بات بار بار اس لیے کہہ رہی ہوں کہ ہم سمجھیں کہ یہ ملک آزاد کیسے ہوا۔ کیونکہ سب مذاہب کے لوگ سب زبانوں کے بولنے والے، سب ریاستوں کے باشندے اور سب فرقوں کے لوگ ایک تھے۔ ان کا نصب العین ایک تھا۔ لہٰذا بھارت کو آزادی ملی۔

جب ہم آزادی کے لیے لڑ رہے تھے تو ہم صرف سیاسی آزادی کے لیے نہیں بلکہ سماجی انصاف، مساوات اور اقتصادی انصاف کے لیے لڑ رہے تھے۔ ایک منزل طے ہو گئی دوسری ابھی جاری ہے۔ راستہ لمبا اور دشوار ہے۔ اس عرصے میں جب میں گزشتہ مرتبہ آپ سے خطاب کر رہی تھی تب سے ٹی۔ وی اور ریڈیو کے ذریعے بہت سے نئے دیہات کے گاؤں اس میں شامل ہو گئے ہیں۔ بجلی کی زیادہ تو سپلائی ہوئی ہے پینے کا پانی اور بہت سی جگہوں پر پہنچا ہے۔ غریبوں کی ہر طرح سے مدد کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

ہماری پالیسی چاہے ملک کے اندر یا ملک کے باہر سے متعلق ہو، ہمیشہ یہی رہی ہے یعنی گاندھی جی، جواہر لال نہرو اور مولانا آزاد کی سکھائی ہوئی پالیسی۔ جہاں تک ممکن ہو سکے سمجھوتہ کرنا چاہیے، دوستی کرنی چاہیے، ہماری طرف سے لڑائی نہیں ہے بشرطیکہ جس کی ذرا سی بھی کوئی مانگ ہوتی ہے، خواہ وہ میرا ساتھی ہو یا مخالف، میں نے ہمیشہ اس پر توجہ دی ہے، ان سے ملی ہوں، اور جہاں تک ممکن ہو سکا ہے اسے پوری کرنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن میری طاقت بھی محدود ہے، وسائل محدود ہیں اور روپے محدود ہیں، اس کے تحت ہی ہم کام کر سکتے ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ کبھی کبھی ایسے مطالبات پیش کئے جاتے ہیں جو کچھ لوگوں کو پسند ہوتے ہیں۔ اور دوسروں کو مشتعل کر سکتے ہیں، دوسری ریاست میں گڑبڑی ہو سکتی ہے۔ اس لیے سوچ سمجھ کر چلنا ہے۔ جو لوگ مطالبات رکھتے ہیں، چاہے ان کا تعلق علاقائیت سے ہو، مذہب یا زبان سے ہو، ان سے میری اپیل ہے کہ وہ اپنی تکلیف کی طرف ضرور دیکھیں لیکن اپنے چاروں طرف بھی دیکھیں کہ ان کے مطالبات کو پورا کرنے سے دوسروں کو تکلیف تو نہیں ہوگی، بھارت پر اقتصادی یا دوسرا بوجھ تو نہیں پڑے گا جس سے بھارت کمزور ہو یا اس بوجھ سے دب جائے کیونکہ اگر ہمارے اوپر ایسی کوئی اقتصادی دشواری آتی ہے۔ تو ان پر بھی آتی ہے۔ ہم نے اپنے منصوبے کے اندر سب پر توجہ دی ہے اور ہماری کوشش ہے کہ سب طبقوں کو اور سب ریاستوں کی امداد سے مدد ہو اور ہر جگہ خوشحالی، ترقی کا کام آگے بڑھے۔ اس وقت مرکز اور ریاستوں کے درمیان کیا رشتہ ہے اس پر بحث جاری رہی ہے اور ہم نے بھی کہا ہے کہ اس پر بات چیت ہو سکتی ہے اور ہمیں یقین ہے کہ سچے دل سے بات چیت کریں تو آسانی سے سمجھوتہ بھی ہو سکتا ہے۔

۷۱-۱۹۷۰ء میں جہاں مرکز سے ریاستوں کو ۵۰۰ کروڑ روپے کی رقم کا تبادلہ ہو رہا تھا وہاں آج ۱۲ ہزار کروڑ کا ہو رہا ہے۔ کتنی رقم بڑھی ہے۔ لیکن ہر ریاستیں مطمئن ہیں اور نہ ہی ہماری مرکزی وزارتیں سب کہتے ہیں کہ ہم کو کم مل رہا ہے۔ ٹھیک ہے، جتنی ضرورت ہے اس سے کم ہے۔ لیکن کسی بھی ملک میں چاہے وہ امیر سے امیر ملک ہو آپ دیکھیں گے کہ سب کے مطالبات مکمل طور پر پورے نہیں ہو رہے ہیں، مطالبات تو ہمیشہ رہیں گے اور ان میں اضافہ بھی ہوگا۔ ہم کو دیکھنا ہے کہ جو خوشحال ہیں، جو دوسروں سے زیادہ اچھی حالت میں ہیں، ان کے مطالبات پورے کرنے سے کہیں جو غریب ہیں، جو رہے ہوئے لوگ ہیں، کمزور ہیں، ان کے مطالبات نظر انداز نہ ہو جائیں۔ کہیں ان کی کمزوری نہ بڑھ جائے۔ کیونکہ وہ بھارت کے غریب لوگ ہیں، وہ مضبوط ہوں گے تو سارا ملک مضبوط ہوگا تب ہی آج جو خوشحال ہیں وہ اپنی طاقت بھی بڑھا سکیں گے۔

اور میں توقع کرتی ہوں کہ وہ اپنی طاقت کو اپنے فائدے کے لیے نہیں بڑھائیں گے۔ ملک کی بھلائی کے لیے، کمزور کی مدد کرنے کے لیے، ملک کو ہر طرح آگے بڑھانے کے لیے بڑھائیں گے۔ اس لیے ہمارا نظریہ رہا ہے کہ کمزور طبقوں کی زیادہ مدد کی جائے۔ بیس نکاتی پروگرام کا بھی یہی نصب العین تھا اور اس کے تحت ڈیڑھ کروڑ کنبوں کو اپنا معیار زندگی تھوڑا سا بلند کرنے میں مدد کی گئی ہے۔ ڈیڑھ کروڑ تو بہت سے ملکوں کی تمام آبادی سے بھی زیادہ ہے۔ لیکن جہاں ہماری آبادی ہے اس میں تو یہ کم ہیں۔ کوئی جادو نہیں ہے جب سے ہم ان ۷۰ کروڑ تک جلدی سے پہنچ جائیں۔ بہرحال ہم

(باقی صفحہ ۲ پر)

منصوبہ بندی اور ترقیاتی پروگراموں کی جھلک پیش کرنے والا

پندرہ روزہ

یوجنا

نئی دہلی

چیف ایڈیٹر :- آر۔ ٹھکرال
ایڈیٹر :- لکھی رام رانا
اسسٹنٹ ایڈیٹر :- محمد عادل صدیقی
سب ایڈیٹر :- وسیم حیدر

شمارہ ۱۱	یکم تا ۱۵ ستمبر ۱۹۸۴	جلد ۴

۱۰ بھادر تا ۲۴ بھادر شک سمبت ۱۹۰۶ فون : ۳۸۲۳۴۱

شرح چندہ :-

سالانہ ۲۰ روپے ۔ ۲ سالہ ۳۵ روپے ۔ سہ سالہ ۵۰ روپے
فی کاپی :- ایک روپیہ

طالب علموں، استادوں اور لائبریریوں کے لیے ۱۰ فی صد کی رعایت

اس شمارے میں

یوجنا منصوبہ بند ترقی کے بارے میں عوام کو آگاہ کرتا ہے مگر اس کے مضامین صرف سرکاری نقطۂ نظر کی وضاحت تک ہی محدود نہیں ہیں

بزنس منیجر : ایل۔ آر۔ بترہ ★ اسسٹنٹ ڈائرکٹر (پروڈکشن) : رام سروپ منجال

مضامین سے متعلق خط و کتابت کا پتہ
ایڈیٹر یوجنا (اردو) پبلیکیشنز ڈویژن پٹیالہ ہاؤس نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

ترسیلِ زر کا پتہ
بزنس منیجر، پبلیکیشنز ڈویژن پٹیالہ ہاؤس نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

اداریہ

منصوبہ بندی کے تقاضے

ہمارے لیے آزادی اور ترقی ناقابلِ تقسیم ہیں۔ ترقی کے بنا آزادی ہمارے لکھوکھا عوام کے لیے خلا میں ایک نعرہ بن کر رہ جائے گی۔ جدوجہد آزادی کے بہت سے سورماؤں اور اس کے بہت سے بانیوں نے ہماری اقتصادی اور سماجی حقیقتوں کا گہرا مطالعہ کیا۔ اس سلسلے میں، دادا بھائی نوروجی، رمیش چندر اور گوکھلے وغیرہ کا ذکر کیا جا سکتا ہے، جنھوں نے نوآبادیاتی نظام کے اثرات کا جائزہ لیا۔ ان کے علاوہ مہاتما گاندھی اور جواہر لال نہرو نے ہمیں صرف ہماری حالت سے آگاہ کرایا۔ بلکہ اس سلسلے میں ہماری رہنمائی بھی کی۔ انھوں نے عوام کو بتایا کہ انھیں کیا کرنا ہے۔ دراصل اس وقت غربت دُور کرنے کا تصور اس حقیقت کے پیشِ نظر آگے بڑھا کہ ہمیں آزادی کی جدوجہد کو آگے بڑھانا ہے۔ ۱۹۳۰ء کے دہے کے آخری برسوں میں کانگریس کی قومی سطح کی منصوبہ بندی کمیٹی نے آزاد بھارت کے اقتصادی ایجنڈے کو ترتیب دیا۔ آزادی کے بعد ہم نے وقت برباد کئے بغیر اقتصادی اور سماجی ترقی کے لیے عملی پروگرام متعین کیا۔ منصوبہ بندی سے متعلق موجودہ حکمت عملی سے اتفاق نہ کرنے والے ناقدین بالعموم یہ تسلیم کریں گے کہ ہم نے تکنیکی ترقی کے لیے جو بنیادی ڈھانچہ مرتب کیا ہے وہ انرجی اور سرمایہ کاری کی منصوبہ بند ترقی کے بغیر ممکن نہ ہوتا۔ ہندوستان اور بیرونِ ہندوستان جمہوری سوشلزم کے تصور سے اختلاف رکھنے والوں کا اعتراض ہے کہ منصوبہ بندی کے عمل نے معاشی تبدیلیوں سے زیادہ ماہرینِ اقتصادیات پیدا کئے ہیں اور اس کے نتیجے میں نتائج کے مقابلے میں رپورٹیں زیادہ مرتب کی گئی ہیں۔ گزشتہ کچھ دنوں سے رعایتی نرخ پر ہمیں جو امداد مل رہی ہے' اسے بند کرنے کے لیے وجہ جواز تلاش کرنے کی کوشش جاری ہے تاکہ یہ رقومات دوسرے ملکوں کو منتقل کی جا سکیں۔ ہمیں مشورہ دیا جاتا ہے کہ ہم منڈی میں قسمت آزمائی اور برآمدات بڑھانے کی کوششوں کے ذریعے رقومات حاصل کریں جیسا کہ دوسرے ملکوں نے کیا ہے۔ چھوٹے ملکوں کے لیے خود کو نوجی اور اقتصادی بلاکوں سے جوڑ کر منصوبہ بندی کے بغیر ترقی کرنا ممکن ہو سکتا ہے لیکن بھارت ایک وسیع و عریض ملک ہے جہاں ترقی کی سطح یکساں نہیں ہے اور جہاں کئی طرح کے عناصر کارفرما ہیں۔ چنانچہ ایسے ملکوں میں منصوبہ بندی کے بغیر اس کے اتحاد کی برقراری اور اس کے فیصلے کی آزادی کا تحفظ ممکن نہیں۔ ۱۹۷۷ سے ۱۹۷۹ کے درمیان منصوبہ بندی سے گریز کیا گیا اور رولنگ پلان کے ذریعے جو تجربہ کیا گیا وہ اس کے ثبوت میں پیش کیا جا سکتا ہے۔

وسائل کو یکجا کرکے ان سے بہتر کام لینے کے معقولیت پسندانہ نظام کو ہی منصوبہ بندی کہتے ہیں۔ یہ ایک ایسا طریقہ ہے جس کے ذریعے مادی اور ثقافتی مقاصد کی تکمیل ممکن ہے۔ بلاشبہ یہ ایک مشکل اور دشوار راستہ ہے چنانچہ اکثر و بیشتر منصوبہ بندی کی راہ میں غیر متوقع حالات حائل ہوئے۔ متعدد حملے، بار بار خشک سالی، تیل کی عالمی قیمتوں میں اضافہ اور صنعتی مشینری کی قیمتوں میں اضافہ اور اس طرح کی متعدد مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ ان تمام دقتوں کے باوجود پچھلے تیس برسوں میں منصوبہ بندی کے سبب ملک نے ترقی کی ہے۔ اس کے ذریعے سماجی انصاف کو ممکن بنایا جا سکا ہے۔ منڈی کے آزادانہ انتخابات کے مقابلے میں منصوبہ بندی کے رائج الوقت طریقوں کے ذریعے ترقی اور سماجی انصاف کا عمل تیزی سے آگے بڑھ سکا ہے۔ ہندوستان منصوبہ بند ترقی کا ہمیشہ سے حامی رہا ہے۔ اس کے ساتھ ہی ہمیں مطلوبہ مقاصد کے حصول کے لیے اسے مزید موثر بنانا ہے۔ خود اعتمادی اور سماج کے کمزور طبقات کی خوشحالی اور علاقائی بنیادوں پر شکایات کے ازالے نیز عدم مساوات کو دُور کرنے کے اقدامات کے لیے ہمیں برابر کام کرتے رہنا ہے۔ اندازِ نظر میں وسعت لا کر ہمیں لچک پیدا کرنی ہے اور جدید تقاضوں سے خود کو ہم آہنگ کرنا ہے۔ اس سلسلے میں کچھ اقدامات موثر ثابت نہیں ہوئے تو دوسرے اقدامات کو آزمانا ہے۔ ★ (ایڈیٹر)

وسنت ساٹھے

معاشرتی انقلاب کی جانب
اقتصادی جمہوریت کا مقدمہ

دوسرا باب

سیاسی نظام قسط: ۵ حصولِ آزادی کے بعد

ملک تقسیم ہوا اور اس کے سبب خون خرابے کا ہولناک منظر سامنے آیا۔ یہ ایک ایسا گہرا زخم تھا جو بہت جلد مندمل ہونے والا نہ تھا۔ البتہ اس کے نتیجے میں دونوں حصوں کو یہ آزادی ضرور ملی کہ وہ دو میز قوموں کی صورت میں ترقی اور فروغ کے لیے اپنا اپنا راستہ اپنائیں۔

اب جمہوریت کا بڑا سوال سامنے آیا۔ ہندوستان اور پاکستان دونوں نے اور اس ناطے یہی دونوں نہیں بلکہ ایشیا کے بہت سے دیگر ممالک نے اپنے اپنے آئین میں ابتدا میں جمہوری سیاسی نظام اپنایا۔ لیکن چونکہ جمہوریت کی بنیادوں کو پہنچنے کا موقع نہ ملا تھا اور جمہوریت کے پودے کو جڑ پکڑنے اور اس کی شاخوں کو ابھرنے اور پھلنے پھولنے کا موقع میسر نہ آیا تھا، لہذا بہت سی جمہوریتیں مطلق العنانہ اور کلیت پسند ڈکٹیٹرانہ نظام کا شکار ہو گئیں۔

ہندوستان وہ واحد خوش قسمت ملک ہے جس کے پاس مہاتما گاندھی کی قیادت میں جدوجہد آزادی کا پس منظر تھا۔ اس کے سبب ہندوستان میں نہ صرف قومیت کا تصور مضبوط ہوا بلکہ یہاں کے منظرنامے پر ایسے ایسے عظیم دانشور ابھرے جنہوں نے آئین ساز اسمبلی میں اپنے اپنے تجربات کا نچوڑ پیش کیا اور اس ملک کو ایک قابلِ عمل جمہوری آئین دیا۔ شروع ہی سے آئین کے جنم داتا اس حقیقت سے واقف تھے کہ ہندوستانی سماج بنیادی طور پر وفاقی ہے کیوں کہ یہاں مختلف زبانوں کے بولنے والے اور مختلف ثقافتوں کے نمائندے ہیں۔ یہ ملک ثقافتی گوناگونی اور بوقلمونی کا ایک حسین مرقع ہے۔ جغرافیائی اعتبار سے ہندوستان ایک عظیم برصغیر ہے اور گزشتہ ہزار سال میں یہاں کے مختلف حصوں کے عوام اپنے اپنے مزاج اور طریقوں کے مطابق پروان چڑھے ہیں۔ لہذا اس عرصے میں ان سب کو ایک ہی رشتے میں منسلک کرنے کے لیے سناتن دھرم کا تسلسل، اس کی لچک اور اس کی گہرائی کام آئی۔

ان حالات میں یہاں کے دانشوروں نے اس حقیقت کو پہچانا کہ دورِ حاضر میں تمام مذہبی عقائد کے تئیں مساوی احترام کا اصول اور اس کی بنیاد پر سیکولر نظریات کا فروغ یہاں کی سیاسی جمہوریت کے ساتھ ساتھ ہندوستان کے آئین کی بنیاد بن سکتا ہے۔ تعلیم، ثقافت اور ثقافتی ورثے کو ایک دوسرے سے مربوط کرنے میں تعلیم بنیادی رول ادا کرتی ہے۔ لہذا آئین کے بنانے والوں نے آئین تشکیل دیے جانے کے تھوڑے عرصے بعد ہی ہندوستان کی ریاستوں کی لسانی بنیادوں پر تشکیل کا نظریہ قبول کر لیا۔ یہ وہ عمل تھا جو ۱۹۵۱ کے بعد کے دس برسوں کے دوران شروع ہو کر پایۂ تکمیل کو پہونچا۔

اس پس منظر میں ایک مشترکہ زبان کی ضرورت اور اس کی اہمیت کو سمجھنا آسان ہے۔ یعنی ایک ایسی زبان جسے تمام دیش واسی سمجھ سکیں۔ ظاہر ہے کہ خیالات کی ترسیل و ابلاغ اور نظریات و افکار کو ایک دوسرے تک پہونچانے کا کام زبان کے ذریعے ہی انجام پا سکتا ہے۔ بحیثیت قوم عوام کو ایک دوسرے سے ملانے اور انھیں آپس میں متحد رکھنے میں زبان کا کلیدی رول ہوتا ہے۔ البتہ انتہائی نیک ارادوں کے باوجود پورے ملک کے لیے ایک مشترکہ زبان کا قبول کیا جانا ممکن نہیں ہو سکا ہے۔ کسی بھارتی زبان کو قومی زبان کے طور پر اپنانے کی راہ میں ایک اور دشواری یہ بھی رہی ہے کہ تعلیم یافتہ طبقات کی زبان انگریزی ہے اور یہ ملک کے تمام حصوں میں پھیلی ہوئی ہے اور اسے ملک میں اہم مقام حاصل ہے۔ سرکاری سطح کے عہدے ہوں یا صنعتی سطح کے ہر جگہ پر یہی کلیدی رول ادا کرتی ہے۔

زبان بہرصورت ہر طرح کے جذباتی لگاؤ کے باوجود عوام کے درمیان رابطے کا ذریعہ ہے اور جب تک عوام خود ایک خاص زبان کی رابطہ عامہ کے ذریعے کے طور پر ضرورت محسوس نہ کریں، وہ اسے نہیں اپنائیں گے۔ اس بات سے بھی آگاہی کہ جب ایک خطے کے لوگ دوسرے

جنسے ہی تجارت کی غرض سے جاتے ہیں، تو وہ بہت جلد اُس خطے کی زبان سیکھ جاتے ہیں۔

معقولیت پسندانہ ایک نظریے کے طور پر ملک کے مختلف حصوں میں بسنے والے عوام اس بات سے آگاہ ہیں کہ قومی زبان کے طور پر ہندی یا ہندوستانی وہ زبان ہے جسے زیادہ تر لوگ بولتے ہیں اور جس کو اپنانا بہت آسان ہے۔ لیکن کسی بھی زبان کو تھوپا نہیں جا سکتا۔ اور تھوپنے کا یہی مفہوم اور جذبہ ہے جس سے ناراضگی اور عناد پیدا ہوتا ہے۔ میرا تاثر اکثر یہ رہا ہے کہ ہندی کے نام نہاد حامیوں نے ہندی کی اشاعت اور اس کی قبولیت کو اس کے مخالفوں سے زیادہ نقصان پہونچایا ہے۔ اور یہ بات ایک ایسے شخص کی بات ہے جس کی مادری زبان ہندی نہیں ہے، لیکن جس نے ہندی پر کافی عبور حاصل کر لیا ہے۔ آج بھی میں مخلصانہ طور پر اس بات کو تسلیم کرتا ہوں کہ اگر ملک بھر میں ہندی بطور ایک زبان اور ایک مضمون رضاکارانہ طور پر پرائمری سطح پر شروع کر دی جائے اور پھر اسے اعلیٰ جماعتوں کے طلباء کو بھی پڑھنے دیا جائے تو دس تا پندرہ برس کے عرصے میں ہندی ملک کے ہر نوجوان تعلیم یافتہ فرد کی زبان بن سکتی ہے۔ لیکن اس زبان کو دوسروں پر تھوپنے کا تصور کسی طرح ذہن میں نہ آئے اور ہندی کو قبول کئے جانے کی کوئی بھی حد مقرر نہ کی جائے۔ اس کے ساتھ ہی یہ بات بھی ذہن نشین ہونی ضروری ہے کہ خود ہندی کو بھی ملک کی مختلف زبانوں کے الفاظ قبول کر لینے چاہئیں اور اس کا ارتقا ان الفاظ کی مدد سے ہونا چاہیئے۔ کسی نہ کسی روز کوئی ایک مشترکہ رسم الخط اختیار کرنا مفید اور ضروری ہو سکتا ہے۔ اور اس سلسلے میں دیوناگری کو ترجیح دی جا سکتی ہے۔ اس لیے نہیں کہ یہ ایک ایسا رسم الخط ہے جس سے سنسکرت پر مبنی دیگر بہت سی زبانوں کے رسم الخط نکلے ہیں بلکہ اس لیے بھی کہ قواعد اور لسانی اعتبار سے بھی یہ آسان، قابلِ عمل اور مفید رسم الخط ہے۔ اس میں حسبِ ضرورت کچھ تبدیلیاں بھی کی جا سکتی ہیں۔

ہندوستان کے رہنماؤں کا اس بات پر تقریباً اتفاق ہے کہ ہندوستان میں متوازن اقتصادی ترقی ایسے منصوبہ بند ترقیاتی نظام کے ذریعے لائی جا سکتی ہے جہاں استحصال نہ ہو اور جہاں ترقی سے ہونے والے فائدوں میں سب کا حصہ ہو اور اس کی منصفانہ تقسیم ہو۔ اس اصول کو جلد ہی آئین کی تمہید میں شامل کر لیا گیا اور اسے سماج واد کا مقصد قرار دیا گیا۔

کسی ایک علاقے میں انسانی سماج جب منظم پیمانے پر پھلتا پھولتا ہے، تو ایک ریاست کی تشکیل عمل میں آتی ہے اور برادریوں کے وہ طبقات جو اتحاد کے رشتے میں منسلک ہو جاتے ہیں۔ وہ ایک قوم کہلاتی ہیں۔ قوم ایک ریاست کی صورت میں ایک ایسا نظام وضع کرتی ہے جس کی بنیاد قوانین پر ہوتی ہے اور جو ایک آئین کے تابع ہوتا ہے جس سے کہ سماجی امور کو چلایا جا سکے۔ خواہ وہ سماجی، سیاسی، دفاعی اور خارجی غرضیکہ کسی بھی شعبہ جات سے تعلق رکھتے ہوں۔ اس منظم ڈھانچے کا نام حکومت ہے۔ جمہوری نظام میں عوام بحیثیت قوم زندگی کے تمام گوشوں اور امور میں حتمی فیصلہ کُن عنصر ہوتے ہیں، لیکن چونکہ عوام ملک کے بڑے حصے پر پھیلے ہوئے ہیں، لہٰذا عملاً اس کے لیے الیکشن کا طریقِ کار وضع کر لیا گیا ہے۔ عوام تھوڑے تھوڑے وقفے سے اپنے نمائندے منتخب کر لیتے ہیں۔ ان کو حکومت کے کام چلانے کے اختیارات منتقل کر دیے جاتے ہیں۔ یہ منتخبہ تنظیم مختلف ناموں سے پکاری جاتی ہے، یعنی پارلیمنٹ یا کانگریس یا اسمبلی وغیرہ۔ یہ تنظیم عوام کے خود مختارانہ حقوق کی ضامن ہوتی ہے اور ہمیشہ ہی ان کے سامنے جوابدہ ہوتی ہے۔ اگر وہ عوام کے اعتماد پر پوری نہیں اُترتی تو عوام کو مقررہ مدت کے بعد ان کو بدلنے کا اختیار ہوتا ہے۔

لہٰذا عوام کی اس منتخبہ تنظیم کے علاوہ کوئی اور تنظیم عوام کی خواہشات کی ترجمانی کا دعویٰ نہیں کر سکتی۔ ہندوستانی آئین کسی بھی ضابطۂ قوانین کی طرح سے حکومت کے ڈھانچے کی وضاحت کرتا ہے۔ عوام کے منتخبہ نمائندے ہی اس میں ترمیم کر سکتے ہیں۔ کوئی بھی فرد یا ادارہ یا عدالت خواہ وہ کتنا ہی مقتدر کیوں نہ ہو عوام کی نمائندگی کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ چہ جائیکہ منتخبہ نمائندوں کے حقوق کو سلب کرنا کیونکہ یہی نمائندے عوام کی خود مختارانہ خواہشات، آرزوؤں اور اُمنگوں کے ضامن اور کفیل ہوتے ہیں۔ وہ اگر غلطی کریں گے تو عوام اُن کو بدل کر صورتِ حال کی اصلاح کر سکتے ہیں۔ لیکن اگر اعلیٰ ترین عدالت غلطی کرے تو اس کے اوپر دوسرا کوئی ادارہ اس کی اصلاح کے لیے نہیں ہوتا۔ ہائی کورٹ یا سپریم کورٹ کی جانب سے یہ جانچنا ایک بات ہے کہ آئین کی کوئی ترمیم عوام کی خواہشات کے بموجب ہے یا نہیں جبکہ پارلیمنٹ کو آئین کے چند آرٹیکل کی ترمیمات کے حق سے محروم کرنا دوسری بات ہے اور موخرالذکر مفروضہ کا مطلب ہوگا جمہوریت کی نفی۔

ایک خیال یہ ہو سکتا ہے کہ کوئی بھی غیر محتاط پارلیمنٹ جس کی دونوں ایوانوں میں دو تہائی کی اکثریت ہے، آئین میں ترمیم کر کے عوام کو کلیتہً جمہوری حقوق سے محروم کر سکتی ہے اور ڈکٹیٹرانہ نظام اُن کے سر پہ تھوپ سکتی ہے۔ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ انتہائی مفید اور

نفع بخش ترامیم مثلاً کام کرنے کے حق یا شہری اراضی کی بالائی حد کو، سپریم کورٹ کی طرف سے غیر مجاز قرار دیا جاسکتا ہے۔ پارلیمنٹ میں تو عوام موقع ملتے ہی غلط راستوں پر چلنے والے اپنے ان نمائندوں کو اتار سکتے ہیں، لیکن سپریم کورٹ کے فیصلے کو صحیح کرنے کا ان کے پاس کوئی موقع نہیں ہے، خواہ سپریم کورٹ کا فیصلہ ان کی اپنی خواہش کے بالکل خلاف ہی کیوں نہ ہو۔

ہم جمہوری آئین کو فوجی ڈکٹیٹرشپ کے ذریعے توڑ پھوڑ کے لیے نہیں سوچ رہے ہیں کیوں کہ اس حالت میں سپریم کورٹ کی بھی ضرورت باقی نہیں رہ جاتی اور وہ بھی فالتو بن کر رہ جاتا ہے۔

ہندوستان کے آئین کی تمہید میں مذکور ہے:

ہم ہندوستانی عوام ہندوستان کو خود مختار سیکولر جمہوری ری پبلک کی صورت میں تشکیل دیے جانے کا سنجیدہ عزم کرتے ہیں۔ اور اس کے تمام شہریوں کو سماجی، اقتصادی، سیاسی انصاف دلانا چاہتے ہیں نیز اظہارِ خیال کی آزادی، عقائد اور عبادت نیز پوجا کی آزادی دلانا چاہتے ہیں۔ سب کے لیے مواقع کی یکساں فراہمی چاہتے ہیں نیز ان کے درمیان ایک بھائی چارہ پیدا کرنا چاہتے ہیں جس سے انفرادی وقار اور قومی اتحاد و سالمیت کو فروغ مل سکے۔ چنانچہ آج ۲۶ نومبر ۱۹۴۹ء کو آئین ساز اسمبلی میں اس آئین کو قبول کرکے، اسے قانونی حیثیت دے کر خود کو اس کا پابند بناتے ہیں۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ ہمارے ملک کے اقتصادی اور سماجی نظام سے محولہ بالا مقاصد پورے ہوتے ہیں یا ہمارے سیاسی نظام سے جو کہ ہمارے آئین میں شامل کیا گیا ہے۔ مندرجہ بالا مقاصد کی تکمیل ہو پا رہی ہے۔ اس سلسلے میں پہلے سیاسی منظرنامے پر نگاہ ڈالتے ہیں یعنی جمہوری ڈھانچہ۔

جمہوری ڈھانچہ

سیاسی سطح پر ہم اس بات کو مانتے ہیں کہ جمہوری سیاسی نظام کسی بھی فرد کو نہ صرف سوچنے اور اظہارِ خیال کا بہترین موقع فراہم کرتا ہے بلکہ اس کے ذریعے وہ اپنی پسند سے اپنے تخلیقی عمل اور تخلیقی قوتوں کی پرورش بھی بہتر ڈھنگ سے کرسکتا ہے۔ اس جمہوری نظام کے اظہار کے لیے یہ جملہ پیش کیا جاتا ہے کہ یہ ایک ایسا سیاسی نظام ہے جہاں انسانی معاملات عوام کے ذریعے اور خود عوام کے لیے انجام پاتے ہیں۔ اس سلسلے میں ایک وسیع تر سوال یہ ہے:-

کیا یہ سیاسی نظام انسانی اور مادّی دولت کے نظم و نسق اور اس کی تنظیم اور ان کے ذریعے وسائل کو حرکت میں لاکر ایک ایسا اقتصادی ڈھانچہ وجود میں نہیں لاتا جس میں معیشت بھی عوام کی ہو، عوام کے ذریعے ہو اور عوام کے لیے ہو، کیا موجودہ سائنسی نظام عوام کے نام پر چند لوگوں کے لیے اور محدود سے چند افراد کے لیے نہیں ہے۔

جمہوریت کی بنیادی شرط یہ ہے کہ عوام کو منتخب نمائندوں پر مشتمل سرکار کو چننے کا آزادانہ ماحول ملے اور صرف یہی نہیں بلکہ انھیں نمائندہ سرکار پر اپنا اثر ڈالنے اور اس کی نگرانی کا موقع بھی میسر ہو۔ جب تک سرکار پر عوام کا اثر اور ان کا مؤثر اشتراک کا سلسلہ چلتا رہے گا اس وقت تک جمہوریت مستحکم اور مضبوط ہوگی۔ لیکن اگر انتخاب محض ایک رسم بن جائے اور وہ بطور رسم چار یا پانچ سال بعد ہوتے رہیں اور جب کہ سرکار میں شامل افراد خود کو عوام سے دور سمجھیں، نیز سرکار عوام کی اُمنگوں اور آرزوؤں کی تکمیل میں قاصر رہے اور جو اپنے کو اُن عوام کے سامنے جنھوں نے کہ انھیں چُنا ہے، جوابدہ اور ذمّہ دار نہ سمجھیں، تو سمجھ لیجیے کہ جمہوری نظام کا تانا بانا پارہ پارہ ہونا شروع ہوگیا ہے۔

جمہوری نظام کی دوسری بنیادی ضرورت خاص کر پارلیمانی جمہوریت کے لیے ایک واضح اور قابلِ شناخت انتخاب کی عوام کے لیے سہولت فراہم کرنا ہے۔ خاص کر قومی سطح پر ایسا ہونا ضروری ہے جس سے کہ وہ اپنے نمائندے منتخب کرسکیں اور پھر یہ نمائندے یا رہنما ان کے لیے ایک مضبوط انتظامیہ اور حکومت فراہم کرسکیں جس سے تمام ملک ایک رشتے میں منسلک رہے اور پورے ملک میں قومی اتحاد اور سالمیت کا رشتہ قائم رہ سکے۔ میری رائے میں ہندوستانی جمہوریت کی سب سے بڑی خامی یہی ہے کہ حصولِ آزادی کو آج ۳۶ برس سے زیادہ عرصہ ہو جانے کے بعد بھی قومی سطح پر کانگریس پارٹی کی متبادل مضبوط پارٹی نہیں اُبھر سکی ہے۔ اس کے بہت سے اسباب ہیں اور جس محدود مقصد کے لیے یہ بات چیت شروع کی گئی ہے، اس کے ضمن میں ان کی وضاحت سے کوئی مفید مقصد بھی برآمد نہیں ہوگا۔ یہ کہنا کافی ہے کہ تحریکِ آزادی کی جو اہم اور مستحکم قوتیں کانگریس کے نام پر پروان چڑھیں، وہی اصل سیاسی پارٹی کی صورت میں چلتی رہیں اور ان کے ذریعے ہی قوم کا اتحاد بنا رہا۔ وہی عوام کی نمائندہ کہلائیں اور اس کے متبادل دوسری قوت جسے بنیادی طور پر پوری طرح تسلیم کرلے اور جو عوام میں اعتماد قایم کرسکے اور عوام کو یہ باور کرا سکے کہ وہ آئین کے مقاصد کو آگے بڑھانے اور ان پر عمل درآمد کرنے کی صلاحیت رکھتی ہیں، ہرگز سامنے نہ آسکی۔

اپوزیشن پارٹیوں میں زیادہ تر وہ ہیں جو کانگریس کی ہی شاخ ہیں، اس کے ذریعے وہ ایک صحت مند رجحان کی ترجمان بن سکتی تھیں۔ لیکن اقتدار کی ہوس میں انھوں نے

فرقہ وارانہ قوتوں سے گٹھ جوڑ کر لیا۔ اور ایسی قوتوں کے ساتھ مل گئیں جو غیر جمہوری کردار کی جماعتیں ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ جمہوری سماج واد اور سیکولر عناصر اپنا اعتماد کھو بیٹھے۔

قومی سطح پر مستحکم متبادل سیاسی نظام کی عدم موجودگی کا ایک اور بڑا سبب یہ رہا ہے کہ لیڈروں کے مفادات، تنگ نظری پر مبنی رہے ہیں۔ اور جنھوں نے قومی متبادل نظام کی پرورش اور اس کے فروغ نیز اس کے پنپنے کے لیے صبر و تحمل کا ثبوت نہیں دیا۔ یہ حقیقت اس وقت واضح ہو گئی جبکہ ہندستانی عوام نے پوری اپوزیشن کو سرکار بنانے کا موقع دیا اور ۱۹۷۷ء میں قومی سطح پر ان کی سرکار بنی، لیکن ذاتی مفادات اور اغراض و مقاصد کے تحت ملک کی قیادت نے اس موقع کو ہاتھ سے جانے دیا۔ انھوں نے صرف اقتدار کی خواہش میں یہ موقع کھو دیا۔

کانگریس کی شکست نے اس کی جڑ تک کو ہلا دیا۔ لیکن یہ ایک طرح کا جھنجھوڑا جانا تھا جس کی بنیادی صلاحیت ایک بار پھر ابھر کر سامنے آئی اور اس کے ساتھ ہی اس کو اپنی کمزوری کا بھی پتہ لگ گیا۔ اس کی بنیادی قوت اس بات میں تھی کہ عملاً اس کی شاخیں ملک کے تمام حصوں میں تھیں اور سب جگہ اس کی جڑ پھیلی ہے۔ دیہات تک اس کی بخوبی رسائی ہے اور قومی سطح پر بھی یہ ایک جھنڈے تلے جمع ہو سکتی ہے۔ البتہ اس کے تنظیمی ڈھانچے میں کمزوریاں تھیں۔

کانگریس ابتدا میں ایک تحریک تھی، نہ کہ حقیقی معنوں میں سیاسی پارٹی۔ کبھی کبھی میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ بعد کے عرصے میں بھی، کانگریس کی قیادت نے ضبط تحریر میں لائے بغیر ایک مفاہمت کے طور پر، کانگریس کو ایک ڈھیلی ڈھالی تحریک ہی رہنے دیا اور درحقیقت اسے منظم صورت میں سیاسی پارٹی بنانے کی کبھی کوشش ہی نہیں کی۔ ممکن ہے کہ اس کا کچھ عرصے تک فائدہ بھی ہوا ہو اور وہ جدوجہد آزادی کے ثمرہ کے طور پر ملا ہو۔ لیکن اب یہ غور کرنے کی ضرورت محسوس کی جانے لگی ہے کہ کیا اس طرح کا بے ہنگم تنظیمی ڈھانچہ وقت کے تقاضے پورے کر سکتا ہے۔ کانگریس کو جن تکالیف کا سامنا کرنا پڑا، وہی کم و بیش دیگر سیاسی پارٹیوں کو بھی کرنا پڑا۔ مشکل ہی سے کوئی ایسی پارٹی ہوگی جس کا تنظیمی ڈھانچہ پوری طرح مضبوط ہو، جو پورے ملک میں اپنا اثر اور رسوخ رکھنے کا دعویدار ہو اور جو پوری قوم کو ایک رشتہ میں منسلک رکھتا ہو۔ سیاسی ڈھانچہ خواہ وہ کسی ایک پارٹی کا ہو یا ریاست کا ہو، کسی مقصد کے حصول کا راستہ ہے، بذاتِ خود مقصد نہیں۔ مقصد تو پورے سماج کی بھلائی ہے جس نے کہ یہ سیاسی ڈھانچہ تشکیل دیا ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ اس سیاسی ڈھانچے نے عوام کی بہبود اور بھلائی کے مقصد کی تکمیل میں کس حد تک کام کیا ہے اور ان کی ترقی اور فروغ میں کس حد تک معاون ثابت ہوا ہے۔

ملک کے آئین کے لیے اگر پارٹی پر انحصار کرنے والی جمہوریت کو خواہ وہ پارلیمانی طرز کی ہو یا صدارتی نظام کے طرز کی، پنپنا ہے تو ضروری ہے کہ پارٹی کا ڈھانچہ اس طرح سے ترتیب دیا جائے جس سے عوام نہ صرف تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد اپنے نمائندوں کا آزادانہ طور پر انتخاب کر سکیں بلکہ وہ اپنے نمائندوں کی معرفت تسلیم شدہ پروگراموں اور پالیسیوں پر عمل درآمد میں سرگرمی کے ساتھ حصہ بھی لے سکیں۔

ہندوستان کو ورثہ میں ایسا انتظامیہ ڈھانچہ ملا ہے جس میں مستقل سول سروس ملک کے نظم و نسق کو گاؤں کی سطح تک چلاتی ہے۔ یہ انتظامیہ دراصل شروع میں نظم و نسق یعنی لا اینڈ آرڈر قائم کرنے کے لیے تھا اور اس کے ساتھ ہی مال گزاری جمع کرنا اس کے فرائض میں داخل تھا۔ لیکن دائرہ کار میں توسیع ہوتی گئی۔ اور اس انتظامی ڈھانچے کو اقتصادی، سماجی اور تکنیکی شعبوں کی ذمہ داریاں بھی سونپ دی گئیں۔ ملک کے بہترین افراد میں سے چنے گئے ذہین اور ہوشیار افسروں پر مشتمل یہ انتظامی ڈھانچہ، عملاً آج بھی پوری قوم کے لیے نظم و نسق کا ذمہ دار ہے اور یہی کاروبار چلاتا ہے۔

جس حد تک سیاسی اقتدار اعلا بحیثیت عوام کے نمائندے کے، عوام کی بہبود اور بھلائی سے مطابقت رکھنے والے پروگراموں اور پالیسیوں کی تشکیل میں مددگار ہوتا ہے اور ان پر عمل درآمد کو یقینی بنانے کی کوشش کرتا ہے، اسی حد تک یہ قابلِ عمل جمہوری نظام لانے میں معاون ثابت ہوگا۔ انتظامیہ کی نفسیات یہ ہے کہ وہ بالعموم حالات کے جوں کا توں رہنے پر قانع ہوتا ہے۔ اور چونکہ سماجی اور اقتصادی پروگراموں پر عمل درآمد کے لیے اس کی کوئی براہِ راست ذمہ داری نہیں ہوتی۔ اس لیے وہ صرف فائلوں پر خود کو محفوظ رکھنے کی کوشش کیا کرتا ہے۔ نگرانی کا کاغذی نظام ہوتا ہے جس کی ہر سطح پر چیکنگ کا ایک طریقہ اور پھر اس چیکنگ کی چیکنگ کا نظام کام کرتا ہے۔ اس طرح سے یہ ایک پیر پیچ راستہ بن گیا ہے۔ فیصلہ کرنے کے مجاز حکام کی طرف سے تاخیر کا اصل سبب فیصلہ کرنے والوں اور ان پر عمل درآمد کرنے والوں کے درمیان تال میل کی کمی ہے۔

اس پس منظر میں انتظامیہ کے طریق کار کو نئی سمتیں دیے بغیر جس سے کہ وہ نہ صرف فیصلہ کرنے والوں کے لیے مددگار ثابت ہو سکے، بلکہ عوامی نمائندوں کے ذریعے منظور شدہ پروگراموں پر عمل درآمد بھی کرا سکے، موجودہ نظام نہ تو مطلوبہ نتائج دکھا سکتا ہے اور نہ موثر ثابت ہو

سکتا ہے۔ جمہوریت کے لیے اس سے زیادہ ضروری بات یہ ہے کہ پالیسی بنانے اور اس پر عمل درآمد کرانے میں عوام کے نمائندوں کی شرکت ہو۔ آج صورتِ حال یہ ہے کہ پورا سیاسی ڈھانچہ یعنی سیاسی پارٹیاں اور قانون ساز ادارے محض ایک رسم بن کر رہ گئے ہیں اور ان کا وجود ایک فاضل صورت میں ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جمہوری رواج کی لکیر پیٹ رہے ہیں اور سماجی تبدیلی لانے کے سلسلے میں خواہ پالیسی کی تشکیل ہو یا اس پر عمل درآمد کا معاملہ ہو، وہ کہیں بھی موثر نہیں ہیں۔

اگر ہم پارلیمنٹ یا ریاستی اسمبلیوں کی کارروائی پر نظر دوڑائیں تو پتہ چلے گا کہ منتخبہ نمائندوں کی ایک مکمل جماعت مہینوں نشستیں کرتی ہے اور عام انداز میں اپنے تاثرات کا اظہار کرتی ہے لیکن اس نظام کے تحت مشکل ہی سے قانون سازی کے عمل میں ان کا کوئی موثر رول یا تعاون ہوتا ہے۔

دیکھنے میں یہ آتا ہے کہ کسی بھی بل پر چند ارکان بول سکتے ہیں۔ اور وہ بھی چند منٹوں تک یعنی سات سے لے کر پندرہ منٹ تک۔ زیرِ بحث بل کا مسودہ اس انتظامیہ کی طرف سے ہی مرتب کر لیا جاتا ہے، جو کہ حکومت یا برسرِ اقتدار پارٹی کی خواہشات کا آئینہ دار ہوتا ہے موجودہ نظام کے تحت ایسا کوئی سیاسی فورم نہیں ہے جہاں تنقیدی سطح پر اس کی دفعات کی جانچ کی جا سکے۔ بل پر عام انداز میں تاثرات کا اظہار ضرور ہو جاتا ہے لیکن کسی بھی ممبر کی طرف سے خواہ وہ کتنا ہی ذہین کیوں نہ ہو، اس میں کسی مفید اور معتدبہ اضافہ کی امید نہیں کی جاتی۔

لہٰذا ایسا ڈھانچہ وضع کرنا ضروری ہے جس میں ارکان پارلیمنٹ چھوٹی چھوٹی کمیٹیوں کی صورت میں مل بیٹھ سکیں۔ ہر ممبر کو اس کی اپنی پسند کے موضوع سے متعلق کمیٹی سے وابستہ کیا جا سکتا ہے۔ دیگر ملکوں کے جمہوری نظاموں میں اس طرح کی گنجائش رکھی گئی ہے اور وہ مفید ثابت ہو رہا ہے۔ کم سے کم اس سے شرکت حقیقت پسندانہ تو ہو ہی جاتی ہے۔

اگر قانون سازی کی سطح پر اس بات کا احساس ہو جاتا ہے کہ اس میں شرکت محض فضول کی ہے، تو یہی احساس عمل درآمد کی سطح پر اس سے بھی زیادہ ہوتا ہے۔ عمل درآمد کی سطح پر اس ایک شخص کو چھوڑ کر جسے وزیر کہا جاتا ہے، عمل درآمد سے وابستہ پورے نظام میں چنے ہوئے کسی بھی ممبر کی کوئی آواز نہیں ہوتی۔ کاغذی طور پر فیصلوں پر عمل درآمد کے لیے وزیر ذمہ دار ہوتا ہے لیکن کوئی ایک فرد تمام سطحوں پر کام نہیں کر سکتا اور وہ محض ایک طائرانہ نظر ڈال سکتا ہے، اس لیے عمل درآمد کی اس کی ذمہ داریاں محض کاغذی کارروائی بن کر رہ جاتی ہیں۔ درحقیقت قوانین اور فیصلوں پر عمل درآمد کی تمام تر ذمہ داریاں انتظامی ڈھانچہ کی صلاحیت اور قوتِ ارادی پر چھوڑ دی جاتی ہیں۔

پارٹی کا تنظیمی ڈھانچہ کچھ فضول سے تھوڑا زیادہ رکھتا ہے، جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے۔ لیکن دیگر تمام سطحوں پر اس کی کوئی آواز نہیں۔ اگر کہیں آواز ہے بھی، تو کسی بھی سطح پر اسے عمل درآمد کے اختیارات نہیں۔ مختلف مشاورتی کمیٹیوں میں پارٹی آرگنائزیشن کے ارکان اعزازی حیثیت سے ہوتے ہیں اور چونکہ ان کی کوئی ذمہ داری نہیں، اس لیے وہ صرف انتشار کا باعث ہوتے ہیں اور کسی بھی طرح مددگار ثابت نہیں ہوتے۔ کمیٹیوں پر کمیٹیاں بنتی چلی جاتی ہیں اور انتظامیہ ان کے روبرو جوابدہ ہوتا ہے لیکن اس سے کام آگے بڑھنے کی بجائے اور رکتا ہے۔

اس عرصے میں حاصل شدہ تجربے کی روشنی میں ایسا وقت آ گیا ہے کہ اس موضوع پر غور کریں کہ پارٹی کے عہدیداروں کو قانون سازی کے عمل میں ذمہ دارانہ اور موثر کردار ادا کرنے کا کس طرح پابند بنائیں اور اس کے ساتھ ہی تمام سطحوں پر پالیسیوں کے اور پروگراموں پر عمل درآمد کے عمل میں ان کا سرگرم تعاون کیسے حاصل کریں۔ اس ملک میں سیاست دانوں کے ذہن کے کسی گوشے میں یہ احساس ضرور ہے کہ سیاسی عہدیداروں میں انتظامی عہدیداروں کے برعکس ایسے لوگ ہوں گے جن میں بے لوث خدمت کا جذبہ ہو اور وہ بے لوث قربانی دے سکیں اور وہ بغیر کسی مناسب معاوضہ یا صلے کے کام کریں۔ یہ تصور ماضی کی دین ہے اور اس کے تئیں اندازِ نظر اس قدر منافقانہ ہے کہ اس نے جمہوری پارٹیوں کے تمام سیاسی کردار کو مسخ کر دیا ہے۔

مثال کے طور پر پارٹی تنظیموں کو لے لیجیے۔ کسی نے کبھی بھی یہ یقین نہیں کیا ہے کہ پارٹی تنظیمیں بھی پورے وقت کام کرنے والے عہدیدار چاہتی ہیں اور یہ کہ ان لوگوں کو مناسب مشاہرہ ملنا چاہیے۔ تاکہ وہ اپنا گزر بسر اور اپنے کنبے کی پرورش کر سکیں۔ ایمرجنسی کے وقت مثلاً یہ کہ جنگ کے موقع پر ہر شہری مزید کام کرتا ہے اور وہ اس کو رضاکارانہ طور پر انجام دیتا ہے لیکن عام حالات میں ہر شخص سے رضاکارانہ طور پر فالتو وقت میں کام کی امید نہیں کی جا سکتی۔ تاوقتیکہ اس کے لیے مناسب معاوضہ نہ ہو۔ اس کے نتیجے میں پارٹی تنظیموں کے پاس نہ تو مناسب فنڈ ہیں، نہ عمارتیں ہیں جہاں کہ ان کی پارٹی سے متعلق دفتری امور انجام دیے جا سکیں۔ اور ان کے پاس تنخواہ دار ملازمین بھی کام کرنے کے لیے نہیں ہیں۔ کبھی کبھی یہ بات حیران کن نظر آتی ہے کہ بہت سے ایسے افراد نے جن کا جدوجہد آزادی سے کسی طرح کا کوئی تعلق نہیں رہا ہے، انفرادی طور پر یا کسی ادارے کے نام پر ملک کے بہت سے شہروں میں بیش قیمت پلاٹ حاصل کر کے ان پر عمارتیں

کھڑی کیں اور پھر ان سے ہر ماہ بھاری کرایہ وصول کیا لیکن کسی نے بھی سیاسی پارٹیوں کے لیے ایسا قدم اُٹھانا نہ چاہا جو کہ جمہوریت کی بنیادیں ان پارٹیوں کو مستحکم اقتصادی بنیادوں پر کھڑا کرنے کے بارے میں کبھی نہیں سوچا گیا جو کہ جمہوریت کی بنیاد ہیں۔ ان کے لیے مستقل آمدنی کا کوئی ذریعہ نہیں بنایا گیا۔ وہ نہ کسی عمارت کا کرایہ وصول کرتی ہیں نہ کسی آمدنی پر سُود لیتی ہیں۔ جس سے کہ وہ اپنی پارٹی کے نظم و نسق کو بہتر طور پر چلا سکیں۔

اس کا نتیجہ ہر شخص کے سامنے ہے چنانچہ ہر سیاسی ورکر کے سامنے یہی راستہ ہے کہ وہ قانون ساز ادارے میں داخل ہو، خواہ وہ قانون سازی کے عمل کے لیے کوئی ذہن رکھتا ہو یا نہ رکھتا ہو، اس طرف راغب ہو یا نہ ہو۔ ان سب باتوں سے قطع نظر وہ بس قانون ساز ادارے میں صرف اس لیے داخل ہونے کی کوشش کرتا ہے کیوں کہ وہاں اسے سماج میں مرتبہ بھی ملے گا اور مشاہرہ بھی۔

دیگر تمام سطحوں پر پارٹی ممبروں کا صرف ایک رول ہے کہ وہ بچولیوں کی طرح کام کریں۔ وہ حکومت میں سیاسی آقاؤں اور صنعتی اداروں یا کاروباری اداروں کے چلانے والوں کے درمیان کی کڑی ہیں۔ ان کا کام یہ ہے کہ وہ اس اُمید میں دوسروں کے نام پر لائسنس یا پرمٹ حاصل کریں کہ انھیں بھی کمیشن ملے گا یا پھر ان کا کام کچھ لوگوں کو ترقی دلانا اور کچھ کا تبادلہ کرانا وغیرہ ہے۔ پس اس طریقے سے وہ اپنا اثر ڈالتے ہیں اور اپنا سماجی مرتبہ بنائے رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ افسوس کی بات ہے کہ جس شخص کو پارٹی کے کاموں سے انہماک ہے، اسے ایک بینک یا سرکاری دفتر کے چپراسی کے برابر بھی ماہانہ تنخواہ نہیں ملتی۔ لہٰذا اس پر سنجیدگی سے غور کرنے کی ضرورت ہے کہ پروگراموں اور پالیسیوں پر عمل درآمد کے لیے انتظامیہ کے طریقِ کار کے ساتھ ساتھ مختلف سطحوں پر پارٹی کے سرگرم ارکان کو کس طرح باعزت طریقے پر شریک کیا جائے تاکہ وہ بھی بطور ایک اکائی عوام کے اس طبقے کے سامنے جوابدہ ہوں جس نے اُن پر اعتماد کیا ہے۔ اگر یہ سوچ لیا جائے کہ سیاسی پارٹی کے ارکان کا مختلف سطحوں پر سرکار کی کارکردگی میں کوئی رول نہیں ہے تو آہستہ آہستہ مگر یقینی طور پر پارٹی کا ڈھانچہ ابتری کا شکار ہو کر رہ جائے گا۔ تب اسے تحریک کہا جائے گا یہ مسلسل عوامی تحریک۔ جس کے معنی یہ ہوئے کہ کسی ذمہ دار عملے کی ضرورت نہیں۔

ایسی صورتِ حال میں ممبر سازی کی بھی کوئی خاص ضرورت نہیں رہ جاتی کیوں کہ ارکان کی نہ تو ذمہ داریاں ہوتی ہیں اور نہ اُن کے حقوق صرف ایک ڈھیلے ڈھالے نظام کی ایسی ضرورت باقی رہ جاتی ہے جو الیکشن کے وقت کارآمد ہو سکے، اور ووٹ کے لیے عوام کو آگاہ کر سکے اور اس موقع پر وہ لوگ فائدہ اٹھاتے ہیں جو سرکار اور منتخبہ نمائندوں سے فائدہ اُٹھانے کا فن جانتے ہیں۔ اسی لیے پچھلے اتنے برسوں سے ملک میں کسی بھی سیاسی پارٹی کی ایسی ممبر سازی نہیں ہوئی ہے جہاں کہ نچلی سطح کے کارکنوں نے اعلیٰ ترین تنظیموں کی سطح تک اپنے نمائندے چننے کے اپنے حق کا استعمال کیا ہو، جب تک کہ پارٹی کی ممبرشپ کے رول کے بُنیادی تصور کو واضح نہیں کیا جاتا، اس وقت تک موجودہ صورتِ حال برقرار رہے گی۔

اس طرح یہ جمہوری ڈھانچہ ایک فاضل مد نظر آتا ہے۔ یہاں تک کہ پارٹی کی سطح پر یہ محض ایک ڈھکوسلہ بن کر رہ جاتا ہے۔ قانون سازی محض ایک رواج بن کر رہ جاتی ہے۔ عمل درآمد کی سطح پر جو انتظامی ڈھانچہ ہوتا ہے، وہ قابل ضرور ہوتا ہے مگر کسی کے سامنے جوابدہ نہیں ہوتا۔ اور عدلیہ کی سطح پر تقدس کا ایک تصور کارفرما نظر آتا ہے۔

اخبارات جمہوریت کا چوتھا ستون کہلاتے ہیں۔ یہ سماج کے آئینہ دار ہوتے ہیں، ان سے عوام کی بے اطمینانی اور دل شکستگی کا پتہ چلتا ہے اور بہت جلد شہری حلقۂ اقتدار کا جمہوری نظام ختم ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ اور پھر کچھ عرصے میں پورا ڈھانچہ دھڑام سے آ پڑتا ہے۔ اس کی جگہ مطلق العنان آمرانہ نظام جگہ لے لیتا ہے۔ یہ زیادہ تر فوجی ڈکٹیٹرشپ میں ہوتا ہے اور جس کا سارا کاروبار بندوق کی نوک کے سہارے انجام پاتا ہے۔

یہ سچ ہے کہ جمہوریت ہندوستانی عوام کے مزاج میں رچ بس گئی ہے اور یہ بھی حقیقت ہے کہ ہندوستانی عوام نے بڑی دانشمندی اور ہوش و خرد کا ثبوت دیا ہے۔ جمہوری نظام کی آبرو بچانے میں یہ دانشمندی ہی کام آئی۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ زیادہ تر انتخابات آزادانہ اور منصفانہ ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ ہندوستان کا وسیع و عریض رقبہ بھی بالواسطہ طور پر ہندوستان کے کام آیا اور وہ کسی مرکزی مطلق العنانہ نظام کے آگے نہیں جھکا۔ اس لیے ملک میں جمہوری نظام پرورش پاتا رہا اور توقع ہے کہ یہ سلسلہ جاری رہے گا۔ لیکن اس کے برعکس اگر ہم جمہوریت کے اہم اجزاء کو کمزور کر دیں گے اور انھیں زنگ خوردہ بنا دیں گے اور عملاً انھیں مفلوج بنا دیں گے تو اس سے دیر یا سویر پورا سیاسی نظام متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکے گا۔

لہٰذا پارٹی نظام اور انتظامی طریق کار دونوں پر نظرِ ثانی کی ضرورت ہے تاکہ اس کے ڈھانچے میں ضروری تبدیلیاں لائی جا سکیں۔ پارٹی نظام میں عوام کی زیادہ سے زیادہ تعداد کو شریک کرنا ہے اور انتظامیہ کو ایسا بنانا ہے جس سے وہ اپنے نتائج واضح کر سکے اور اپنی کارروائیوں کے لیے جواب دہ ہو سکے۔

GRAMMAR OF PLANNING

• گرامر آف پلاننگ

پی۔ آر۔ دوبھاشی

ضلعی اور مقامی پلاننگ

اِس مضمون میں مصنف نے مقامی اور ضلعی پلاننگ کی اہمیت کو واضح کیا ہے۔ پچھلے شمارے میں انھوں نے "سپیشل یعنی مکانی منصوبہ بندی" کا ذکر کیا تھا۔ جو وسیع رقبے کا احاطہ ہے۔

مضمون نگار نے انتظامیہ مشینری، مقامی حکومت کے مختلف اداروں اور سماج کے مقامی لیڈروں سے کہا ہے کہ وہ پلاننگ کے فورم پر آئیں اور اپنی ذہنی قوتوں اور تنظیماتی صلاحیتوں کو مقامی حالات اور سماج سے اپنی گہری واقفیت کو جوڑ کر مقامی علاقوں کے لیے واقعیٔ قابلِ عمل پلان بنائیں۔

بھارت میں یوجنا کے مسودوں میں یوں تو مقامی لامرکزی اور نچلی سطح کی منصوبہ بندی کو لگاتار اہمیت دی گئی۔ لیکن عملی طور پر اس طرف کوئی تسلی بخش قدم نہیں اٹھایا گیا۔ دوسرے پنج سالہ منصوبے میں پہلے دیہی پلان بنانے کی کوشش کی گئی تاکہ دیہات سے تعلقہ یا بلاک اور بلاک سے اضلاع اور اضلاع سے ریاستی پلان بنیں جو مجموعی طور پر قومی پلان کی بنیاد ہوں۔ لیکن یہ طریقۂ کار قطعیٔ طور پر کامیاب نہ ہوا۔ سچ تو یہ ہے کہ اس کی صحیح آزمایش ہی نہیں کی گئی۔ تمام محنتوں کا نتیجہ نکلا دیہات کی ضروریات کی ایک لمبی فہرست جس کو بروئے کار لانے کے لیے مناسب سرمائے کے ذرائع کی تلاش ناممکن تھی۔

ان ناکامیوں کے جو وجوہ ہیں وہ عیاں ہیں۔ گاؤں بحیثیت ایک اکائی۔ منصوبہ بندی کے یا ترقی کے وسائل کی فراہمی کے اہل نہیں۔ ایک امریکی ماہرِ معاشیات پروفیسر جان۔ پی۔ لیوس دیہی منصوبہ بندی کے تصور سے چپٹے رہنے کو دیہاتی پن کا نام دیتے ہیں۔ وہ اسے خود کفیل یا دانشمندانہ منصوبہ بندی کے خلاف قرار دیتے ہیں۔ منصوبہ بندی ہر گاؤں کو خود کفیل بنانے کی کوشش نہیں کر سکتی۔ منصوبہ بندی کے سامنے وسیع میدان ہونا چاہیے۔ وہ ہر گاؤں کے تنگ معاشی نظام میں گھٹ کر نہیں رہ سکتی۔ منصوبہ بندی اگر قوم کے لیے نہیں تو کم از کم ریاست یا علاقے کے لیے تو ہو۔ اسے عمومی اور جامع ہونا چاہیے۔ اس طرزِ کار سے شاید چھوٹے چھوٹے گاؤں ختم ہی کیوں نہ ہو جائیں۔ لہٰذا دیہی بنیاد پر چھوٹی منصوبہ بندی کامیاب نہیں ہو سکتی۔ گاؤں کا اقتصادی مستقبل وسیع جامع پلان سے منسلک ہے۔

بلاک کی سطح کی یوجنا

اگر ایک گاؤں منصوبہ بندی کی اکائی نہیں بن سکتا تو کس علاقے کو منصوبہ بندی کی اکائی مانا جائے؟۔ ۱۹۵۲ء میں جب کمیونٹی ڈیولپمنٹ کا پروگرام شروع ہوا تو بلاک کو منصوبہ بندی اور ترقی کی ایک اکائی بنانے کی حمایت کی گئی۔ کیونکہ ہر بلاک تقریباً ایک سو گاؤں پر مشتمل ہوتا ہے۔ بلاک منصوبہ بندی کا مرکز اس لیے خیال ہونے لگا۔ کیونکہ اجتماعی ترقی پروگرام کے پہلے سال میں اس کا بجٹ ۱۵ لاکھ روپے تھا جو زراعت، پرورشِ مویشیاں، آب پاشی، سماجی تعلیم، جوان طبقے کی ترقی، دیہی صنعت اور امدادِ باہمی کی تعمیر وغیرہ کے شعبوں کے لیے مخصوص ہوتا تھا۔ اُمید کی جاتی تھی کہ ان وسائل میں محکماتی رقوم اور عوامی چندوں سے اضافہ ہو جائے گا۔ یہ تو رہی وسائل کی بات، اب آیئے ضروریات کی طرف۔ بلاک ڈیولپمنٹ پروگرام کے پہلے دس برس میں تنظیم منصوبہ بندی بلاک کی سطح کو پیشِ نظر رکھ کر کی جاتی رہی۔ لیکن تجربے نے ثابت کیا کہ بلاک کو منصوبہ بندی اور ترقی کے پروگرام کا ایک اکائی ماننا کامیابی کا ضامن نہیں ہو سکتا۔ بلاک کی ترقیاتی سرگرمیاں۔ بلاک کے بجٹ کے دائرے میں ہی محدود رہتی تھیں۔ دوسرے محکموں کو جو یوجنا کی رقوم ملتی تھیں وہ بھی بلاک

بجٹ میں اضافہ نہیں کرتی تھیں۔ کمیونٹی ڈیولپمنٹ پروگرام کے تحت دس برس گزر جانے کے بعد بلاک بجٹ بھی معدوم ہو گیا۔ بلاک کی سطح کی پنچایتی سمیتیاں اور دیہاتی منتخب لوکل سلف گورنمنٹ کے ادارے۔ بلاک کے وسائل میں اضافہ کرنے کے لیے کوئی خاص رقم پیدا نہ کر سکے۔ لہٰذا بلاک کی میعاد ختم ہونے کے بعد بلاک کے پاس وہی گنی چُنی اسکیمیں رہ گئیں۔ جن کی تکمیل بلاک کی سطح پر سرکار کی مرہونِ منت تھیں۔

اضلاعی یوجنا

بلاک کی یوجنا اور ترقی کی اکائی کا تصور پنچایتی راج کے اداروں کے ڈھانچے سے بھی تعلق رکھتا تھا۔ آغاز میں جب بلاک کو منصوبہ بندی اور ترقی کی ایک اکائی کے طور پر چُنا گیا، تو دیہات، بلاک اور اضلاع میں لوکل سلف گورنمنٹ یا پنچایتی راج کے تین درجاتی اداروں کا خیال پنہاں تھا۔ اور ان میں سے بلاک میں واقع پنچایت سمتی۔ مقامی پلاننگ کے لیے بہترین آلہ تھی۔ لیکن جب مہاراشٹرا اور گجرات میں ایک ضلع کو یوجنا اور ترقی کا ایک خودکفیل جزو سمجھا گیا، تو یہ ضلع ہی مقامی ترقی کی ایک اہم ترین اکائی قرار پایا۔ چند ریاستوں میں ضلع پریشد تھیں۔ ان میں اضلاعی سطح پر ترقی اور منصوبہ بندی کو عمدہ ترین اکائی تسلیم کیا گیا۔ ضلع پریشد کے پاس زیادہ وسائل تھے اور زیادہ مہذب منڈاسٹان، لہٰذا وہ ترقی اور منصوبہ بندی کے کام کو بخوبی سرانجام دے سکتی تھیں۔ لیکن جس طرح پنچایت سمیتیاں بلاک لیول پر منصوبہ بندی کرتی تھیں، اس طرح کی منصوبہ بندی ضلع پریشدوں نے اضلاعی سطح پر کی۔ یہ درست ہے کہ ضلع پریشد کے لیول پر مقامی سیکٹر نے وسیع تر ترقیاتی اسکیموں کو اپنے احاطے میں لیا۔ لیکن ضلع پریشد کے بجٹ اور ریاستی سرکار نے جو رقوم فراہم کیں وہ دونوں مل کر بھی اس قابل نہیں تھیں کہ اضلاعی لیول پر وسیع پیمانے کی منصوبہ بندی کا کام سرانجام دے سکیں۔ اضلاعی منصوبہ بندی کی غیر تسلی بخش ماہیت کو ماہرین اقتصادیات منصوبہ کاروں اور انتظامیہ نے تسلیم کیا ہے اور اس پر دھیان بھی دیا ہے۔ بھارت کے ایک چوٹی کے ماہر اقتصادیات سورگ باشی پروفیسر ڈی آر گیڈگل نے اس پر گہرا وچار کیا ہے۔ اور آر۔ آر۔ کالے میموریل لیکچرز میں اضلاعی پلاننگ کے موضوع پر روشنی ڈالی ہے۔ ان کی دیکھ ریکھ میں وار دھا ڈسٹرکٹ کے لیے ایک ڈسٹرکٹ ڈیولپمنٹ پلان بنایا جا رہا تھا۔ اس پلان کی تشکیل کرتے وقت پروفیسر گیڈگل نے اضلاعی منصوبہ بندی کے ڈھانچے کے ضمن میں چند تصورات کو اپنایا۔ انھوں نے مندرجہ ذیل چار اجزا کو ایک ضلع کی منصوبہ بندی کے لیے اہم قرار دیا۔

۱۔ ضلع کے قدرتی وسائل کی ترقی۔

۲۔ منصوبے کی تکمیل کے وسائل کی ترقی۔

۳۔ زراعت اور صنعت میں بارآور روزگار کی ترقی۔

۴۔ اکانومی میں باعث افزائش مراکز کی ترقی۔

ان بنیادوں پر عظیم یوجنا اسی وقت ممکن ہو گی، جب مناسب اعداد و شمار فراہم کر لیے جائیں۔ ان کا تجزیہ کیا جائے اور ٹھوس اور قابل عمل منصوبے پروگرام اور اسکیمیں بنائی جائیں جو مجموعی یوجنا کے قابل اعتنا جزو بن سکیں۔

ڈسٹرکٹ پلان ایک عظیم پلان ہے یعنی وسیع ترین علاقوں پر اثرانداز ہونے والی یوجنا کی ایک صورت۔ ضلعی یوجنا جو عظیم پلان کی ایک ضمنی حد کے طور پر بنائی گئی ہو۔ وسیع (Spatial) پلان نہیں ہو سکتی۔ وسیع پلان (Spatial) مقامی وسائل کے تجزیہ پر توجہ مرکوز کرتا ہے اور ان وسائل کے بہترین استعمال کے لیے قدم اٹھاتا ہے تاکہ ضروری اشیا اور خدمات حاصل وجود میں لا سکے۔ وسیع پلان جغرافیائی، انسانی پیدائش و موت کے اعداد و شمار اور اقتصادیات کے قاعدوں کو موضوعِ منصوبہ بندی بناتا ہے۔

وسیع پلان

وسیع پلان تشکیل کرتے وقت، ماہرینِ اقتصادیات تمام اکانومی کو قدرتی مادی، معاشی، اقتصادی وغیرہ کے لحاظ سے ایک جیسے طبقوں میں تقسیم کرتے ہیں: وسیع پلان کے نقطۂ نظر سے دریائی گھاٹیوں یا شہری مرکز کے زیر اثر نیم شہری علاقوں یا قبائلی علاقوں کو الگ الگ مخصوص کیا جا سکتا ہے۔ 'ڈیوڈ للی انتھل' کے ماتحت، ٹے نے سی ویلی اتھارٹی کی کارکردگی کو وسیع پلان کی ایک رہنما مثال کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔ بھارت میں بھی پانچویں پنج سالہ پلان میں بڑے آب پاشی کے منصوبوں کے لیے مخصوص ۵۵ علاقوں کو چُنا گیا۔ تاکہ ان کے پانی کے منبع کو ترقی دی جا سکے۔ آب پاشی کے بڑے پراجیکٹوں نے ملک بھر میں آب پاشی کے وسیع وسائل پیدا کیے لیکن آب پاشی کی ترقی کے لیے ایک جامع پلان کی عدم موجودگی کی وجہ سے ان کا خاطر خواہ فائدہ نہ اٹھایا جا سکا۔ بہرحال اب یہ نظریہ تسلیم کر لیا گیا ہے کہ پانی کے منبع کی ترقی کے لیے مخصوص علاقوں کا جامع پلان بنایا جائے۔

پانی کے کمانڈ ایریا کی جامع ترقی کے لیے جو پلان بنایا جائے اس میں کئی ایک دوسرے سے متعلق اور جڑی ہوئی باتوں کا دھیان رکھنا ہو گا۔ مثال کے طور پر نہروں کی تعمیر و تقسیم پانی کے راستے، کھیتوں میں پانی لانے کے لیے نالے۔ اور نشیبی مقام۔ زمین کو ہموار اور اس کی نئی

ترتیب، نالیاں، زراعت کی توسیع، کاشتکاروں کو آب پاشی کی ترقی کے لیے تربیت۔ مناسب کھیتی باڑی۔ کھاد اور بیجوں کی فراہمی، دیہی رسل و رسائل، پیداوار کی فروختگی، گودام اور جھاڑ و پھونس اور ترقیاتی علاقوں میں شہروں اور دیہات کی منصوبہ بندی۔ آب پاشی کی ترقی کے پلان میں بھی۔ پی ڈبلو ڈی، محکمۂ زراعت، امدادِ باہمی، مالیات اور پلاننگ کی امداد اور باہمی کوششوں کی ضرورت لاحق ہوگی۔

سوکھا پڑنے والے علاقوں کی طبقاتی منصوبہ بندی اس قسم کی ایک اور مثال ہے۔ ہندوستان کے ۶۰ اضلاع ایسے ہیں جو بارش کے سایہ میں رہتے ہیں۔ جہاں بارش کی قلت سے قحط پڑجاتا ہے۔ خشک سالی سے آفت زدہ علاقوں کو مالیہ کی معافی یا مدت میں توسیع، تقاوی رعایت، کم داموں پر اناج کی فراہمی۔ سب پرانی روایت ہے۔ جو ان علاقوں کی مستقل حفاظت کے لیے اب مناسب خیال نہیں کی جاتی۔ لہٰذا ایک ایسا پروگرام بنایا گیا ہے جو ان متاثرہ علاقوں میں پانی اور زمین کی اس طرح متوازن ترقی کرے گا۔ جس سے جونہی سوکھا پڑے ان کی مستقل طور پر مناسب امداد کی جائے۔

اس قسم کے پروگرام کے لیے جہاں سوکھا پڑتا ہے ان علاقوں کی نشان دہی کرنا ہوگی، اور اسی طرح اس خطے میں جہاں پانی کے ذخیرے ہیں ان کا پتہ لگانا ہوگا۔ چھوٹی آب پاشی سے پانی اور رطوبت کے تحفظ کے لیے پانی کے علاقوں میں خاص کوشش کرنا ہوگی اور زمین کو بچانا ہوگا۔ درخت لگانے ہوں گے ایسے جو ہوا کے زور کو توڑ سکیں۔ زمین کو کٹاؤ سے محفوظ کرنا ہوگا۔ اور چراگاہیں پیدا کرنی ہوں گی۔ علاوہ ازیں ان علاقوں سے جو پیشے رنگا کھاتے ہیں ان کو بروئے کار لانا ہوگا۔

مثلاً پرورشِ مویشیاں، بھیڑ بکری پالنا، ریشم سازی، مچھلی پکڑنا، باغبانی وغیرہ، یہ بھی ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ خشک سالی کی زد میں آنے والے علاقے ایک سے زیادہ اضلاع پر مشتمل ہوسکتے ہیں۔ عظیم پلاننگ کی تیسری مثال مغربی گھاٹ کے علاقوں میں خاص پروگرام پیش کرتے ہیں۔ یہ پروگرام ایک ریاست کے مختلف اضلاع پر ہی اثرانداز نہیں ہوئے۔ بلکہ مختلف ریاستوں مثلاً مہاراشٹر، کرناٹک اور کیرالہ کا بھی احاطہ کرتے ہیں۔ قدرتی علاقوں کی یہ عظیم منصوبہ بندیاں آنے والے زمانے میں زیادہ توجہ کی مستحق ہوں گی اور مقامی پلاننگ کا ایک حصہ بن جائیں گی۔

عظیم پلاننگ

عظیم پلاننگ خاص علاقوں تک ہی محدود نہیں رہ سکتی جن کی مادی فطرت زراعت اور موسم ایک سے ہیں اور جن کے پانی کے وسائل اور زمین کی صورت بھی ایک سی ہے بلکہ آبادی کے اس حصے کو بھی اپنے دامن میں لے سکتی ہے۔ جس پر خاص توجہ کی ضرورت ہے اور جو ماضی میں نظر انداز کر دیا گیا ان کی واضح مثال چھوٹے چھوٹے کسان اور کمزور کاشتکار اور مزدور ہیں۔ چیدہ چیدہ اضلاع میں اس طبقے کے واسطے منصوبہ سازی کے کام کے لیے خاص ترقیاتی ایجنسیاں بنائی گئی ہیں جنھیں سرکار کے ساتھ رجسٹرڈ کر دیا گیا ہے۔ یہ ایجنسیاں چھوٹے اور کمزور کاشتکاروں کے مخصوص معاملات کو دھیان میں رکھتے ہوئے عظیم جامع پروجیکٹ تیار کرتی ہیں۔ چھوٹے کاشتکاروں کو انجمن امدادِ باہمی کا ممبر بنانا۔ ان کو کم عرصے درمیانے اور لمبے عرصے کے لیے قرض دینا۔ قرض کا ایک چوتھائی محض امداد کے طور پر چھوڑنا۔ ساجھی آب پاشی کے پروجیکٹ بنانا۔ کھیتوں کی ساجھی رکھوالی کے لیے تاریں لگانا تاکہ پیداکرنا اور خالی وقت کے لیے باغبانی یا ڈیری فارم کی سہولیات فراہم کرنا وغیرہ شامل ہے۔

Spatial وسیع پلاننگ کے نظریہ کا تعلق ایک اور طریقِ عمل سے بھی ہے جو ماہرین مرحوم شاہ ری افزائش کے مراکز کی نشاندہی سے کرتے ہیں۔ اس کا بنیادی اصول یہ ہے کہ ترقی بغیر کسی سانچے کے ممکن نہیں اور ان نمونوں یا سانچوں کا تعلق مراکزِ افزائش سے ہے۔ کیوں کہ ہر مرکزِ افزائش اپنے ارد گرد کے علاقوں میں ترقی کی روح پھونکتا ہے۔ منصوبہ بندی کا جو طریقۂ کار مراکزِ افزائش کو نظر انداز کرتا ہے، وہ اقتصادی ترقی کی قوتِ متحرکہ کو بھی نظر انداز کر دیتا ہے۔ مراکزِ افزائش کے نظریے کو مقامی سائنس دانوں سے خاصی تقویت ملی ہے اور اس موضوع پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔

کوشش کی گئی ہے کہ ان طبقاتی اور اضلاعی پلاننگ کے نظریہ کو اپنایا جائے اور ٹھوس پراجیکٹ بنائے جائیں۔ اس طرح کہ یہ مراکزِ افزائش پلاننگ کے لیے ڈھانچوں کا خاص نقطۂ کار بن جائیں۔ یہ طریقِ کار اسی وقت کامیاب ہوگا جب مراکزِ افزائش کا ایک نظامِ مراتب ہو (یعنی چھوٹا بڑا اور اس سے بڑا)۔

مراکز میں نظامِ مراتب کے چار درجے منتخب ہوئے ہیں۔

۱۔ ایک مرکزی گاؤں جو کئی ایک قریبی گاؤں کو کم سے کم پرائمری اسکول اور ڈسپنسری وغیرہ کی سہولیات فراہم کرے۔

۲۔ ایک سروس سینٹر جو بنیادی سہولتیں جن میں مارکیٹ وغیرہ بھی شامل ہے فراہم کرے۔

۳۔ ایک مرکزِ افزائش جو پانچ سے دس سروس سنٹروں کو جن کا ذکر اوپر نمبر۲ میں ہوا ہے۔ مارکیٹ اور سروس کی سہولیات مہیا کرے۔ اس قسم کا مرکز صنعتی ترقی کا بھی ضامن ہو سکتا ہے۔

۴۔ ایک ایسا مرکزِ افزائش جو پانچ سے

دس مراکزِ افزائش کو دوسرے اور تیسرے درجے کی صنعتوں کی سہولتیں اور مخصوص خدمات فراہم کرسکے۔ یہ مراکز عام استعمال کی تیار اور نیم مصنوعی اشیاء پیدا کریں گے۔ ان کے ہاں وسیع پیمانے پر ان چیزوں کے بنانے کے سازوسامان ہوں گے۔ ان مرکزوں کے ترقیاتی منصوبوں میں جو سرمایہ لگایا جائے گا اس کا بہترین استعمال ہوگا کیونکہ :

اوّل ۔ منصوبہ بندی وسائل کو مراکزِ افزائش میں اس طرح لگائے گی کہ اس سے زیادہ سے زیادہ علاقوں کو فائدہ ہو۔ (دوئم) اور یہ منصوبہ بندی ایک مرکز سے دوسرے مرکز میں رابطہ کا بھی خیال رکھے گی۔ افزائشی مرکزوں میں ایک ابتدائی ریسرچ پراجیکٹ کو ہند سرکار نے چوتھے پلان میں پایۂ تکمیل کو پہنچایا تھا۔ اس اسکیم کے تحت ۲۰ ریسرچ اور تحقیقی مراکز قائم کیے گئے جو ان طریق کار اور اصولوں کی کھوج کرتے تھے جن کی نئے اُبھرتے ہوئے مراکزِ افزائش کو ترقی کا کام کرنے میں ضرورت پیش آتی ہے۔ یہ ریسرچ سنٹر ان نئے مرکزوں کو مقامی ضروریات کی ایک جچی تلی فہرست اور اس کی تکمیل کے لیے سماجی اور اقتصادی میدان میں امداد بھی فراہم کرتے تھے۔

بینکوں کا اہم کردار

حالیہ سالوں میں خاص طور پر بینکوں کے قومیانے کے بعد سے بینکوں کو سماجی اور معاشی ترقی کے کاموں میں زیادہ سے زیادہ کردار ادا کرنے کی ذمہ داری دی گئی ہے۔ قومیانے اور سماجی کنٹرول سے قبل بینک عام طور پر شہری علاقوں یا بڑے بڑے شہروں پر اپنی توجہ مرکوز رکھتے تھے اور منصوبہ بندی میں ان کا حصّہ بہت محدود تھا۔ پلاننگ کا اب نظریہ یہ ہے کہ بجٹ کی رقوم طے کرتے وقت بینکوں کے وسائل کو بھی شامل کیا جائے۔ بینکوں سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ معاشی ترقی کے اداروں کے لیے ہی نہیں بلکہ دیہی علاقوں کی ترقی کے لیے بھی سرمایہ فراہم کریں۔ علاقائی ترقی کے لیے اس کام کو لیڈ بینک کے سپرد کیا گیا ہے، جو اس علاقے کا جائزہ لیتا ہے۔ اور ترقی کے مواقع کی نشاندہی کرتا ہے۔ بینک جو روپیہ قرض دیتے ہیں، ان کا تعلق اقتصادی ترقی کی منصوبہ بندی سے بہت گہرا اور واضح ہونا چاہیے۔ قرض کا جو پلان بنایا جائے گا اس کے تحت بینکوں کے سرمایہ کو زیادہ سے زیادہ فوری کام کے پروجیکٹوں اور ضرورت مند افراد پر لگایا جائے گا۔ چاہے وہ معمولی کاشتکار ہوں یا کاریگر۔

قرضوں کی یہ اسکیم محض ان پروجیکٹوں پر لاگو ہونی چاہیے جو سودمند ثابت ہوسکیں۔ کیونکہ قرض دار کو یہ رقم سود کے ساتھ واپس بھی تو کرنی ہے۔ کمرشل بینکوں کو اس امر کی اجازت ہے کہ وہ رعایتی سود کی شرح پر قرض دے سکیں لیکن بینکوں کے اس سرمایہ کا سودمند استعمال تبھی ہو سکے گا جب کہ عمومی ترقیاتی یوجنا میں فنی اور انتظامیہ امداد ملے اور پروجیکٹ کو پایۂ تکمیل تک پہونچانے کے لیے جن انفراسٹرکچر (بنیادی سہولتوں) کی ضرورت ہے وہ مختلف محکمے فراہم کریں۔

کمرشل بینکوں سے قبل دیہی ترقی کے کام میں انجمن امداد باہمی کے بینک سرگرم کار تھے۔ پرائمری کوآپریٹو کریڈٹ سوسائٹی، جس کو ڈسٹرکٹ کوآپریٹو سنٹرل بینک کی حمایت حاصل تھی۔ موسمی زراعتی کام کے لیے کم مدت کے قرض دیتی تھیں اور پرائمری لینڈ ڈیولپمنٹ بینک (PLDB) اسے پیکس بینک اور اگریکلچرل ری فائنانس اینڈ ڈیولپمنٹ کارپوریشن (ARDC) کی امداد سے زمین میں سرمایہ لگانے کی غرض سے لمبے عرصے کے لیے قرض دیتی تھی۔ جو زمین کو کٹاؤ سے بچانے، زمین کو دوبارہ کاشت کے قابل بنانے، ہموار کرنے، کنوئیں کھودنے، باغ لگانے وغیرہ پر صرف ہوتا تھا۔ اسے آرڈی سی اور ورلڈ بینک کی انٹرنیشنل ڈیولپمنٹ ایسوسی ایشن جو ان پروجیکٹ کی مدد کرتی تھی۔ وہ اس امر پر زور دیتی تھی کہ علاقائی ترقی کے منصوبے بنائے جائیں۔

جامع ضلعی پلان

ضلع کے پلان کو ان تمام اجزاء اور طرزِ کار کو ایک ہی لڑی میں پرونا ہوگا۔ اور جو اجزا اس پلان کا لازمی حصّہ بنیں وہ ہیں :-

۱۔ قدرتی وسائل کی نشاندہی اور ان کا پورا پورا استعمال۔

۲۔ اہل کار لوگوں کا مکمل استعمال۔

۳۔ اداروں اور انجمنوں کا قیام تاکہ وہ ترقیاتی کاموں میں زیادہ سے زیادہ حصّہ لے سکیں۔

۴۔ مالی اداروں کی حتی الوسع کوششیں تاکہ زیادہ سے زیادہ سرمایہ بچایا جاسکے اور اسے پیداوار بڑھانے میں لگایا جاسکے۔

۵۔ ترقی کی اسکیموں کو کامیاب بنانے کے لیے جن سہولتوں (Infrastructure) کی ضرورت ہے۔ ان کی فراہمی۔

۶۔ مراکزِ افزائش کی نشاندہی اور ان کی ترقی۔

۷۔ عام ضرورت کی چیزوں کی فراہمی جن سے سماج کچھ تو فائدہ اٹھائے۔

۸۔ دیہی علاقوں میں صنعت وحرفت کی ترقی۔

ان میں سے ہر ایک جزو کو ضلع کی علاقائی یا عظیم ترقیاتی منصوبہ بندی میں سمونا ہوگا۔

قدرتی وسائل کی نشاندہی اور استعمال

کسی علاقہ کے قدرتی وسائل زمین، پانی، معدنیات، جنگلات اور سمندری پیداوار پر

مشتمل ہوتے ہیں۔

ڈاکٹر سوامی ناتھن کے قول کے مطابق "اولین شرط یہ ہے کہ زمین، پانی، معدنیات اور قدرتی وسائل کی ایک جامع فہرست بنائی جائے اور زمین اور پانی کے وسائل کو سائنٹفک طور پر ترقی دینے کا منصوبہ بنانے پر زیادہ سے زیادہ زور دیا جائے۔" ایک ضلع کو بہ آسانی پلاننگ یونٹوں میں جن کے قدرتی وسائل ایک جیسے ہوں، تقسیم کر کے ان کی الگ الگ یوجنا بنائی جا سکتی ہے۔ مگر بارش کی مقدار کے علاوہ دریاؤں اور زیر زمین پانی کے جو ذخیرے موجود ہیں، ان کو دھیان میں رکھنا ہوگا۔

زمینوں کی بھی کئی قسمیں ہیں جو مختلف قسم کی فصلوں کے لیے مناسب ہوتی ہیں۔ کالی زمین، کپاس، غالباً گندم اور سورج مکھی پھولوں کے لیے اچھی گنی جاتی ہے۔ جب کہ سرخ اور ہلکی زمین مونگ پھلی اور باجرے یا موٹے اناج کے لیے خاص طور پر جب اس میں ریتلا پن ہو، مناسب سمجھی جاتی ہے۔ کم عرصے میں پکنے والے بیجوں نے کاشتکار کو ایک ہی موسم میں ایک سے زیادہ فصلیں حاصل کرنے کے اہل بنا دیا ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ زمین کے نمونے لے کر ان کا سائنسی جائزہ لیا جا سکے۔ لہٰذا فصلوں کی کاشت کا ڈھانچہ اور ان کی منصوبہ بندی زمین، پانی اور موسمی حالات کے مکمل جائزہ لینے پر منحصر ہوگا۔

جس طرح زمین کے وسائل کی جانکاری مٹی کے تجزیہ اور اس کے سروے سے حاصل کی جا سکتی ہے۔ اسی طرح زیر زمین پانی کے وسائل کا بھی جائزہ لیا جا سکتا ہے۔ اور ایسا اب کئی ایک اضلاع میں ہو بھی رہا ہے۔ ضلعی پلان کو ان زیر زمین آبی وسائل کا دھیان رکھنا ہوگا۔ اور پانی کے اس ذخیرے کے مطابق ہی کنوئیں کھودے ہوں گے۔

جن علاقوں میں بڑے آب پاشی کے پروجیکٹ زیر عمل لائے جا رہے ہیں وہاں باہمی اتحاد سے کام لیا جا سکتا ہے۔

زرعی منصوبہ بندی کو ڈیری فارمنگ، باغبانی، ریشم سازی، ماہی گیری اور دوسرے ایسے ہی کاموں سے تقویت دینی ہوگی۔

ساحلی علاقوں، بڑے دریاؤں اور تالابوں میں ماہی گیری کے کام کی یوجنا بنانی ہوگی۔ ترقیاتی منصوبہ بندی چاہے وہ زراعت کے لیے ہو یا پرورش مویشیاں یا ماہی گیری کے لیے۔ وہ آگے پیچھے دور تک اثر کرتی ہے۔ مثلاً اگر زراعت کی یوجنا بنائی جائے، تو ضروری ہے کہ بیجوں، کھادوں، کیڑے مار دواؤں اور زرعی اوزاروں کا بھی انتظام کیا جائے۔ باغبانی کی یوجنا کے لیے بھی پودوں وغیرہ کا انتظام کرنا ہوگا۔ ڈیری فارمنگ کے لیے اچھی نسل کے مویشی، مصنوعی تخم پاشی، چارہ اور علاجِ مویشیاں کے مراکز وغیرہ ضروری ہوں گے۔ پیداوار بڑھانے کی جو یوجنا بنے گی۔ اس کے ساتھ ہی مارکیٹ، گودام، چھانٹ پھونس وغیرہ کا انتظام کرنا ہوگا۔ ورنہ پیداوار منجمد ہو کر رہ جائے گی۔ اب اس امر کا بھی احساس ہو گیا ہے کہ زراعت کی جو یوجنا بنائی جائے اس میں مختلف گروہوں کا واضح دھیان رکھا جانا چاہیئے جو زراعت کے کام میں ہاتھ بٹاتے ہیں۔ یعنی بڑے کاشتکار، چھوٹے اور کمزور کسان، مزارع اور زرعی مزدور۔ سب سے پہلے تو کسانوں کے مختلف درجے طے کیے جائیں اور کمزور اور چھوٹے کسانوں اور کھیتی باڑی کرنے والے مزدوروں کا خاص خیال کیا جائے۔ چھوٹے اور کمزور کسانوں کے لیے فصلیں اگانے میں کام آنے والی چیزوں کو گروہ در گروہ فراہم کرنی چاہیئں اور جو پیداوار ہو اس کی فروختگی کا بھی منصوبہ بنانا چاہیئے۔ ان کو پیداوار کے وسیع میدان کا حقدار بنانا ہوگا۔

اوپر بیان کیے گئے تجزیہ سے یہ پتہ چلے گا کہ اگرچہ زرعی منصوبہ بندی، معیشت کا بنیادی شعبہ ہے، لیکن اس کی اور اس سے منسلک دوسرے پیشوں کی منصوبہ بندی ثانوی اور تیسرے درجے کے طبقوں کی منصوبہ بندی کا بھی احاطہ کیے ہوئے ہے۔ زرعی ترقی کا مطلب ہے کہ مارکیٹیں پیدا ہوں۔ اناج پر انحصار کرنے والی صنعتیں وجود میں آئیں۔ زراعت میں کام آنے والی اشیاء بنائی جائیں۔ سامان کو خرید و فروخت اور تقسیم پیداوار کے کام ملیں اور بینک کاری اور انشورنس کا کام بڑھے۔

افرادی قوت کا پورا استعمال

اگر زمین پیداوار کا اولین جزو ہے، تو مزدور دوسرا۔

مزدور یعنی انسانی طاقت کے وسائل کی اس طرح منصوبہ بندی کرنی چاہیئے کہ ان کے ہنر اور فن سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھایا جا سکے۔ ان کی طاقت، ان کی اہلیت اور ان کی صلاحیتوں کا پورا استعمال ہونا چاہیئے۔ یہ تو سچ ہے کہ آبادی کا زیادہ تر حصہ زراعت پر لگا ہوا ہے اور وہ محض روایاتی ہنر جانتا ہے۔ لیکن مختلف کاشتکار مختلف قسم کی کاشتکاری کی خاص مہارت رکھتے ہیں۔ کچھ تو وہ ہیں، جو باغبانی کے ماہر ہیں دوسرے بھیڑ بکری پالنے کے۔ اور بعض ڈیری فارمنگ وغیرہ کے۔ ان تمام روایاتی ہنروں کی نشان دہی کر کے۔ ان کی مزید ترقی کے لیے جدید طریقوں کی کم عرصے کی تربیت دینا ہوگی۔ یا کاشتکاروں کو مختلف جگہ لے جا کر ان کے تجربات میں توسیع کرنی ہوگی۔

اسی طرح کاریگروں کے ہنروں کا بھی جائزہ لینا ہوگا۔ تاکہ ان کو زراعت کو جدید شکل دینے کے لیے تیار کیا جا سکے۔ زراعت کے لیے

نئے اوزاروں کی ضرورت پیش آئے گی۔ روایاتی ہنرمند کاریگروں کو تربیت دینی چاہیئے۔ انھیں متحد کرنا چاہیئے اور انھیں قرض دینے چاہئیں تاکہ وہ جدید قسم کی بیل گاڑیاں، بیج بونے اور کھاد پھینکنے اور اسی قسم کے اوزار بنا سکیں جو آب پاشی یا زمین کو نئی ترتیب دینے کے کام آسکیں۔

مستقبل کی ٹیکنالوجی کے لیے ضرورت ہوگا کہ ایک گاؤں کے کاشتکار یا ایک جگہ کے پانی کے وسائل والے لوگ، مجموعی طور پر کام لیں اور نئے اور جدید طریقے استعمال کریں۔ کاشتکاروں اور کاریگروں کو اجتماعی انتظامیہ کے ڈھنگوں کی تربیت دینی ہوگی تاکہ وہ قدرتی وسائل اور انسانی قوت کا بہترین استعمال کریں۔ دیہی علاقوں میں اب تعلیم کا رواج ہوگیا ہے اور دیہاتی علاقوں میں اب پڑھے لکھے لوگوں کی زیادہ تعداد موجود ہے۔ ایک پڑھا لکھا آدمی دیہی ماحول میں کھویا کھویا محسوس کرتا ہے۔ لیکن اگر اس کی مناسب ہمت افزائی کی جائے اور اس کو نئے راستے دکھائے جائیں تو وہ دیہاتی علاقوں میں نہایت کارآمد ثابت ہوسکتا ہے۔ اگر کسانوں کے بچوں کو زراعت یا حفاظتِ مویشیاں کی تربیت دی جائے تو وہ تبدیلی کا ایک موثر ذریعہ بن سکتا ہے۔ ترقیاتی منصوبے ایسے تعلیم یافتہ لوگوں کی خدمات سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں اور انھیں مزید تربیت دے کر انھیں دیہی ترقی کے پروگراموں میں لگا سکتے ہیں۔ بدقسمتی سے کسان کے لڑکے کو عام اور اونچی تعلیم تو حاصل ہے لیکن اسے اعلیٰ زرعی تعلیم میسر نہیں۔ تاہم یہ کسان بچے جو اعلیٰ تعلیم حاصل کر لیتے ہیں، وہ دیہی اداروں کی تشکیل کا کام کرسکتے ہیں۔ مثال کے طور پر وہ زرعی ورک شاپ کھول سکتے ہیں۔ کوآپریٹو سوسائٹیاں بنا سکتے ہیں، ٹریکٹر مکینک بن سکتے ہیں اور اس سے کئی ایک کھیتوں میں کام کرسکتے ہیں، وغیرہ وغیرہ۔ یہ اس سے کہیں بہتر ہے کہ وہ شہروں میں کلرکی کی نوکری کے لیے مارے مارے پھریں۔ دیہات میں جس طرح کی اہلیت کے لوگ ملیں، ہمیں ان کا پوری طرح استعمال کرنا چاہیئے۔ یہ بات دھیان میں رہنی چاہیئے کہ برطانیہ میں صنعتی انقلاب جدید سائنس دانوں کی کوششوں سے نہیں بلکہ کاری گروں اور مستریوں کی نئی نئی ایجادوں سے رونما ہوا۔

اداروں کی تشکیل وتعمیر اور پیداواری کوششوں میں ان کا بہترین استعمال

اداروں اور افراد کی کوششوں سے جو چیزیں آخرکار پیدا ہوتی ہیں وہ تمام ترقیاتی طرزِ کار کی روداد ہیں۔ اداروں کے ایک سلسلے کی ضرورت ہے تاکہ وہ ترقیاتی کاموں میں ہاتھ بٹا سکیں۔ مقامی پلاننگ کے ضمن میں جو ادارے اہم کردار ادا کرسکتے ہیں، وہ مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ دیہی سطح پر، پنچائتیں، پرائمری کوآپریٹو سوسائٹیاں یا کاشتکاروں کی سروس انجمنیں۔ اور ان کی امداد کے لیے عورتوں اور جوانوں کے کلب وغیرہ۔

۲۔ تحصیل یا بلاک کی سطح پر، مقامی بورڈ، زمین کے ترقیاتی بینک، کمرشل بینکوں کی برانچیں، تعلقہ کی زرعی پیداوار کی مارکیٹ سوسائٹی۔ یا زرعی پیداوار مارکیٹ سوسائٹی (APMS) وغیرہ۔

۳۔ ضلع کی سطح پر، ضلع پریشد یا ڈسٹرکٹ ڈیولپمنٹ کونسل، ڈسٹرکٹ سنٹرل کوآپریٹو بینک، کمرشل بینک وغیرہ۔

ان میں سے ہر ایک ادارے کو ایک واضح کردار ادا کرنا ہے۔ انھیں اپنے احاطۂ سرگرمی میں ترقیاتی پلان بنانا ہوگا۔ دیہی پنچایتوں، تحصیل کے ترقیاتی بورڈوں، ضلع پریشدوں یا ڈسٹرکٹ ڈیولپمنٹ کونسلوں کو جہاں عمومی یوجنائیں بنانی ہوں گی، وہاں کوآپریٹو اور کمرشل بینکوں کو قرضے دینے کی اسکیمیں طے کرنی ہوں گی۔ مارکیٹس کی انجمنوں اور زرعی پیداوار کی مارکیٹ سوسائٹی کو مارکیٹوں کا پلان طے کرنا ہوگا۔ اسی طرح نوجوان اور عورتوں کی انجمنوں کو اپنے محدود مقصد کے لیے پلان بنانا ہوگا۔

علاوہ ازیں سیٹی اور ٹاؤن کے علاقوں میں میونسپل کونسلوں اور کارپوریشنوں کو اپنے اپنے علاقوں کے لیے پلان بنانے ہوں گے اور جہاں دیہات اور شہروں میں لگاؤ اور تعلق ہوگا۔ وہاں ایک مجموعی پلان تیار کرنا ہوگا۔

بچت اور سرمایہ کاری

کریڈٹ پلان جو معاشی پلان کی امداد کرتا ہے۔ اور کوآپریٹو اور بینکوں کے ادارے پلان بنانے میں جو کردار ادا کرتے ہیں۔ ان کا ذکر اوپر کیا جاچکا ہے۔ کوآپریٹو کریڈٹ ادارے بعض اوقات یہ خیال کرتے ہیں کہ ان کا فرض محض قرضے دینا ہے۔ اور جو رقوم ان کو بڑے اداروں یا بینکوں سے ملتی ہے، انھیں (RBI) اور (ARC) کی سطح پر لاکر تقسیم کرنا ہے کمرشل بینک کی ان علاقوں میں سرگرمیاں بہت محدود ہوتی ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کسی نے اب تک اس امر کا جائزہ نہیں لیا کہ ان قرضوں کی وجہ سے لوگوں کی آمدنی میں کس قدر اضافہ ہوا۔ مقامی معاشی حالت کہاں تک سدھری اور لوگ کس قدر بچت کر پائے۔

بینکوں کو دیہی علاقوں میں بچت کو جمع کرنے کے لیے کوشش کرنی چاہیئے تاکہ اس بچت کو معاشی ترقی میں لگایا جاسکے۔ اگرچہ یہ بچت کاری عظیم جامع پلان کا ایک اہم جزو ہے، تاہم بینکوں نے اس کی نشوونما، بچت کاری، سرمایہ کاری اور آمدنی میں مزید اضافے کے سلسلے کی طرف کوئی خاص دھیان نہیں دیا۔

ترقی کے ضامن رگ و ریشہ کی سہولیات

زراعت، صنعت، مارکیٹ یا کسی علاقے میں سرمایہ لگانے اور اس سے آمدنی پیدا کرنے کا کام اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ ترقی کا رگ و ریشہ یعنی سڑکیں اور بجلی فراہم نہ کی جائے۔ سڑکوں کا تعمیری پلان جن میں نیشنل اور اسٹیٹ ہائی وے کے علاوہ دیہات کے درمیان اور ہر گاؤں کی اپنی سڑکیں بھی شامل ہیں۔ درجہ بدرجہ پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے بنایا جانا چاہیئے۔ ایسے جامع پلان کی عدم موجودگی میں دیکھا یہ گیا ہے کہ سڑکوں کی تعمیر کا کام ادھورا ہی چھوڑ دیا جاتا ہے اور مٹی کے تودے راستے میں پڑے ملتے ہیں۔ یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ مارکیٹ کے اردگرد بڑے بڑے گاؤں میں بھی رسل و رسائل کا فقدان ہوتا ہے۔ آب پاشی کی ترقی بھی سڑکوں کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ اگر ٹرانسپورٹ کو اقتصادی ترقی کے لیے بہت ضروری خیال کیا جاتا ہے تو یہ صحیح بات ہے۔ پنجاب میں اگر فصلوں کی پیداوار میں انقلاب آیا تو اس کی وجہ صرف پیداوار کو بڑھانے کی کوششیں ہی نہیں تھیں بلکہ ایک وسیع دیہاتی رسل و رسائل کا عمدہ سلسلہ بھی تھا۔

زرعی ترقی، صنعتوں کی نشو و نما اور دیہاتی زندگی کے سدھار کے لیے گاؤں گاؤں میں بجلی پہونچانا بے حد ضروری ہے۔ کچھ علاقوں میں تو ہر جگہ بجلی پہونچا دی گئی ہے۔ تاہم دوسرے علاقے بہت پیچھے رہ گئے ہیں۔ علاقائی اور مقامی یوجناؤں کو اس تفاوت کا پتہ لگا کر اسے دور کرنا چاہیئے۔

پیداواری مراکز کی نشاندہی اور ترقی

مراکز کے جو مختلف درجے ہیں ان کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے۔

سطح اور سطحوں کی مارکیٹوں پر جو بعض اوقات تعلقہ کے مرکز پر ہی واقع ہوتی ہیں دیہی معاشی زندگی کا ایک حد تک انحصار ہوتا ہے۔ یہ مارکیٹس ہو سکتا ہے کہ میونسپل شہروں اور بڑے بڑے دیہات میں بھی ہوں۔ ہر ایک مرکز کے لیے ایک ایسا مستقبل میں کام آنے والا پلان بنانا چاہیئے۔ جو ان مرکزوں کے اردگرد کے علاقوں کی ترقی میں معاون بن سکے۔

عمومی ضروریاتِ زندگی کی اشیاء

اب تک جن باتوں کا ذکر ہوا ہے۔ ان کا مقصد مقامی اقتصادی وسائل کو ترقی دینا تھا۔ جب یہ وسائل ترقی کریں گے تو عمومی ضروریات کی اشیاء اور خدمات کی فراہمی خود بخود ممکن ہو جائے گی اور اس کے ساتھ سود مند ملازمتیں بھی مل سکیں گی۔ انفرادی استعمال کی ضروریات اور سروسز کے علاوہ بھی چند ایک ایسی ضروریات ہیں جن کا تعلق پورے سماج سے ہے، اور جنھیں ان ترقیاتی منصوبہ بندیوں سے پورا کرنا ہوگا۔ ان ضروریات میں شامل ہیں، پینے کا پانی، اسکول، ہیلتھ سنٹر، حالیہ دور میں ان میں بہت ترقی ہوئی ہے۔ لیکن جہاں اب بھی ان کی ضرورت ہے وہاں اس کی فراہمی کا انتظام ہونا چاہیئے۔

دیہات میں ٹیکنالوجی کی نشو و نما

سائنس دانوں نے اس امر کو تسلیم کیا ہے کہ سائنس اور ٹیکنالوجی کی کھوج اب سارے ہندوستان کو ایک اکائی ماننے کی بجائے مقامی سطح پر کرنی چاہیئے۔

یہ آٹھوں عناصر مقامی ڈیولپمنٹ پلان کے لازمی جزو ہونے چاہئیں۔ لیکن یہ تمام ایک دوسرے کے امدادی عناصر ہیں۔ ہر ایک جزو کی ترقی اپنے طور پر ہونی چاہیئے اور پھر یہ تمام جزو ایک دوسرے میں منظم ہو جانے چاہئیں۔ مثال کے طور پر انسانی وسائل اور قدرتی وسائل کی نشو و نما ایک ساتھ ہونی چاہیئے۔ لیکن اس مقصد کے لیے ترقی کے رگ و ریشہ کی ضرورت ہوگی اور کئی ایک سروسز فراہم کرنا ہوں گی۔ لہذا ترقی کے رگ و ریشہ کی توسیع کے ساتھ ساتھ ہی قدرتی وسائل اور انسانی وسائل کی منصوبہ بندی چلے گی۔ ایک منظم اور جامع پلان میں پنچائتیں اور کوآپریٹوز بہت اہم کردار ادا کریں گے۔ لیکن اس انداز کا ضلعی پلان اسی وقت بنایا جا سکے گا، جب پلان کی ترتیب و تشکیل کے ساز و سامان سے پوری طرح آگاہی ہو۔ یہ محسوس کیا گیا ہے کہ ایک مصروف افسر جیسے ڈپٹی کمشنر یا کلکٹر جس پر روز بروز کے کام کا دباؤ رہتا ہے۔ اس کے پاس اتنا وقت نہیں ہوگا کہ وہ ایسا پلان بنا سکے۔

لہذا ڈسٹرکٹ پلاننگ آفیسر تعینات کر کے اور ان کو ضلع کی پلاننگ کی مناسب ٹریننگ دے کر ضلع کی پلان مشینری کو مضبوط بنانے پر توجہ دی گئی ہے۔ ضلعی پلاننگ آفیسر میں علم و فن اور انتظامیہ اہلیت دونوں ہونی چاہئیں۔ لیکن اس کا حصول کوئی آسان بات نہیں۔

مقامی علاقوں کے لیے ایک جامع منظم منصوبہ بندی کرنے کا نظریہ کوئی نیا نہیں لیکن اب تک ہم کوئی جامع پلان تیار نہیں کر پائے۔ ہمیں پلاننگ کے کل پرزوں کی کمزوریوں کو جو کئی صورتیں اختیار کر چکی ہیں۔ دور کرنے کے لیے لگاتار کوشش کرتے رہنا چاہیئے۔

بہت سے اعداد و شمار تو جمع ہو گئے ہیں، لیکن وہ حالیہ صورت حال کا احاطہ نہیں کرتے۔ اور اگر اعداد و شمار مل بھی جائیں تو ان کو استعمال کرنے کی صلاحیت نہ ہونے کی وجہ سے ان کو نہ تو اچھی طرح جذب ہی کیا جاتا ہے، اور نہ پلاننگ کے ڈھانچے کے ساتھ منسلک کیا جاتا ہے۔ ضلع اور ہر تعلقہ میں اعداد و شمار جمع کرنے والے آفیسر موجود ہیں جو بندھے ٹکے طور پر اعداد و شمار جمع کرتے ہیں اور ہیڈ کوارٹر کو بھیج دیتے ہیں۔ ان افسروں کی تربیت ہونی

(باقی صفحہ ۴)

محمد بشیر مالیرکوٹلوی

ندامت کے آنسو

خالہ بیڈ پر بے ہوش پڑی ہیں۔ زیادہ خون بہہ جانے کی وجہ سے، اُن کا رنگ قدرے زرد ہو چلا ہے۔ میرے بازو میں ندیم سر جھکائے بیٹھا ہے۔ خالہ کے قریب ہی بھائی صاحب اور فرخ بھابی عجیب تذبذب کے عالم میں کبھی اُس نوجوان کو جس کے خون کا ایک ایک قطرہ خالہ کے جسم میں زندگی بن کر داخل ہو رہا ہے۔ اور کبھی خالہ کو دیکھ رہے ہیں۔ نوجوان کے چہرے پر مسرت کا رنگ پھیلا ہوا ہے۔ بھائی صاحب نے میری طرف دیکھ کر آنکھوں ہی آنکھوں میں مجھ سے کہا ہے۔

"اور کوئی چارہ بھی تو نہ تھا!"

میں اپنے سر کو ہلکی سی جنبش دے کر خالہ کے چہرے کو دیکھنے لگا ہوں۔ کس قدر پُرنور چہرہ ہے۔ شاید یہ اُن کی عبادت اور پاکیزگی کی دین ہے۔

یُوں تو خالہ امّی کی چچا زاد بہن ہیں، مگر میرا ان حیدرآباد سے علی گڑھ آنے کا پہلا ہی اتفاق تھا۔ مجھے یونیورسٹی میں ایم۔ اے انگلش جوائن کرنا تھی۔ پہلے ہی دن میں اور بھائی صاحب مزدوری کا غذات لے کر گھر سے نکل گئے۔ تقریباً دو بجے مجھے اکیلے ہی گھر لوٹنا پڑا۔ بھوک کی شدّت سے میری انتڑیاں پیٹ سے باہر آ رہی تھیں۔ برآمدے میں پہونچ کر دیکھا، کھانا دسترخوان پر لگایا جا چکا تھا۔

خالہ کی خدمت میں آداب بجا کر میں ندیم کے قریب ہی بیٹھ گیا۔ خالہ کے چہرے کا رنگ تھوڑا بدل سا گیا۔ سفید دوپٹے کا پلّو دُرست کرتے ہوئے وہ شفقت بھرے لہجے میں بولیں "دیکھو بیٹے۔! تم پہلی بار اس گھر میں آئے ہو، تنویر باجی (میری امّی جان) نے شاید تمھیں اس گھر کے بارے میں کچھ بتایا نہیں۔ تمھیں اب یہیں رہنا ہے، ہمارے بیچ۔ اس لیے اس گھر کے طور طریقے اچھی طرح سمجھ لو۔!"

میں بڑی سعادت مندی سے بولا "جی بہتر خالہ جان!!"

پھر انھوں نے اپنے آئین کا پہلا باب سُنانا شروع کیا۔

اللہ معاف کرے! — میاں جب گھر میں قدم رکھو، تو ڈیوڑھی کے پاس لگی ہوئی پانی کی ٹونٹی کو، ساتھ والے چمبیلی کے درخت کے پتّے سے، یا ردّی کاغذ سے گھماؤ۔ صابن سے خوب مَل کر ہاتھ دھو لو، پھر گھر کی کسی چیز کو چھوؤ۔ اللہ معاف کرے، پتہ نہیں کیسے کیسے لوگوں سے ہاتھ ملاتے ہیں۔ کن کن ناپاک چیزوں کو چھوتے ہیں۔ اور ہاں! برآمدے میں آکر جوتا ضرور بدلو۔"

میں اُٹھا، سیدھا چمبیلی کے درخت کے پاس پہونچا اور اُن کا حکم بجا لایا۔

اللہ معاف کرے!! اب سر ڈھک لو اور بسم اللہ کرو۔!!"

ابھی پہلا ہی نوالہ ہونٹوں تک پہونچا تھا کہ میری پلیٹ میں کباب رکھتے ہوئے بولیں۔

" اُن سے مجھے نفرت ہے۔ جو لوگ نماز سے مُنہ پھیرتے ہیں۔!"

اُس دن کے بعد ایک دو بار مجھ سے غلطی ہوئی۔ مگر بعد میں خود بخود میرا معمول بن گیا۔ کسی نئے آدمی کا اس گھر میں گذر مشکل ہی تھا۔ اُس نے خالہ کے مُوڈ کے خلاف بات کی نہیں کہ خالہ کا پارہ چڑھ جاتا۔

کئی بار بھائی صاحب سمجھاتے "امّی، اگر کوئی مہمان ایک دو دن کے لیے اس گھر میں آجاتا ہے۔ تو آپ اُس پر اپنے ان اُصولوں کو تھوڑا نرم کر لیا کریں۔ اب دیکھئے نا! — سُوکھا پاک ہے۔ آپ باہر سے آنے والوں سے ہاتھ دُھلاتی ہیں، تو وہ پہلے چمبیلی کا پتّہ یا کاغذ لگا کر ٹونٹی گھمائے۔ بھلا یہ سب مذہب میں کہاں ہے!!؟"

وہ سیخ پا ہو کر بولیں۔" اللہ معاف کرے!! — کیا وقت آگیا ہے!! — اسے! کسی کو اچھی بات بتاتی ہوں، کیا ظلم ڈھاتی ہوں!!؟ — تم سب مل کر مجھ بڈھی کو زہر ہی کیوں نہیں دے دیتے۔ پھر من مانی کرنا۔ اپنے جیتے جی میں اس گھر کی نفاست اور پاکیزگی کو برباد نہ ہونے دوں گی۔ اللہ بخشے تیرے ابّو نے بھی

میرے ان معاملوں میں کبھی دخل نہ دیا تھا۔ اور یہ تو بچے کہ !!"

"امی آپ سمجھتی کیوں نہیں !!" بھائی صاحب سے مزید کچھ کہتے نہ بنتا تو وہ گھر سے نکل جاتے۔

خالہ ابھی بھی سو رہی ہیں۔ گھر کا نوکر تلسن دروازہ کھول کر کمرے میں داخل ہوا ہے اس نے گلوکوز کا پیکیٹ اور پھلوں کا تھیلا بھابی کو دیا ہے۔ بھابی نے اُسے سرگوشی میں کہا۔

"تھوڑی دیر بعد اسپتال کی کینٹین سے گرم دُودھ لے آنا۔"

"جی ! — اچھا !!" تلسن قریب پڑی بنچ پر بیٹھ کر خالہ کی طرف دیکھنے لگا ہے۔ پچھلے سنڈے ہی کی تو بات ہے۔ خالہ تلسن پر بہت برسی تھیں۔ ہوا یُوں کہ ندیم کا ایک وکیل دوست اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ اُس کے دفتر میں آگیا۔ جب وہ چلے گئے تو تلسن چائے کے جھوٹے برتن اُٹھا کر باورچی خانے میں لے گیا۔ خالہ عصر کی نماز پڑھ کر برآمدے سے نکلیں، اُسے باورچی خانے سے نکلتے ہوئے دیکھ کر گرج اُٹھیں۔

تلسن !! — باورچی خانے میں کیا رکھ کر آیا ہے رے !!"

"برتن وکیل صاحب آئے تھے ! نیچے میں رُک کر اُس نے سوچا تو اُس کا رنگ اُڑ گیا۔ جملہ پُورا کرتے کرتے وہ رحم طلب نظروں سے خالہ کی طرف دیکھنے لگا۔

"ہائے ! ہائے !! — تیرا بیڑا غرق ہو !۔ مردُود کہیں کے !! — جانے کہاں سے اُٹھا لایا فیروز اس گدھے کو ! — فرخ ! — اری او فرخ !! — ارے کا سُنو تو !!"

بھابی بوکھلائی ہوئی کمرے سے نکلیں "کیا ہوا — امی جان !!"

"اُس کم بخت نے سارا باورچی خانہ ناپاک کر دیا۔ اُس بھنگی زادے کے جھوٹے برتن اندر رکھ دیئے۔ اللہ غارت کرے اس نگوڑے کو !! مسلمان ہے پر پاک اور ناپاک کی تمیز نہیں۔ ابھی حساب کراس کا !"

یہ شور سُن کر ندیم بھی وہیں آگیا۔ "کیا ہوا امی ! — کیا کیا اس بے چارے نے !!"

"ہوا تیرا سر ! کئی بار کہا ہے کہ اپنے دفتر کے لیے ٹی سیٹ الگ منگوا کر رکھ ! — اللہ معاف کرے پھر چاہے پُورے شہر کے بھنگیوں کو چائے پلاتا پھر ! — میری بلا سے !!"

"مگر امی وہ انسان ہیں ! — اور انسان کا جھوٹا پاک ہے !!"

"اب تو بھی مجھے سکھاتا ہے !؟ کیوں نہیں وکیل جو بن گیا ! — اپنی وکالت اپنے پاس رکھ، ایک تو چوری دوسرے سینہ زوری — میں کہے دیتی ہوں، جب تک باورچی خانہ پاک نہ ہوگا میں اس گھر کا لقمہ تک نہ کھاؤں گی !!"

ان کے آگے کس کی چلتی !؟ — پھر وہی ہوا۔ بھابی نے کریمّا بُوا کی مدد سے دھات کے سارے برتن آگ پر تپائے اور مانجھے۔ باورچی خانے کو کئی بار دھویا اور لوبان سے معطّر کیا۔ چائے کے جھوٹے برتن توڑ ڈالے۔

آج صبح گیارہ بجے کے قریب ندیم بوکھلایا ہوا میرے ڈیپارٹمنٹ میں آیا اور لرزتی آواز میں بولا "امی باتھ رُوم میں گر گئی ہیں۔ کافی خون بہہ گیا۔ خون کی سخت ضرورت ہے۔ ہم سب نے ٹیسٹ کروالیا۔ اُن کے خون سے کسی کا گروپ نہیں ملا۔ نہ ہی سٹاک میں موجود ہے۔ ہمیں فوری اس گروپ کی دو بوتلیں چاہئیں !" میں نے ڈاکٹر کی سلپ دیکھی میرا خون بھی دُوسرے گروپ کا ہے۔ میں فوراً یونیورسٹی کے میڈیکل ڈیپارٹمنٹ پہونچا۔ انچارج نے ڈاکٹر بھاسکر کی سلپ دیکھ کر سر ہلا دیا "سوری ! — آپ میرس روڈ چلے جایئے !؟"

موٹر سائیکل ہوا میں اُڑاتے ہوئے ہم سعید بلڈ بنک پہونچے جو میرس روڈ پر واقع ہے۔ وہاں سے مایوس ہوکر ہم شہر کے سب سے بڑے بلڈ بنک پہونچے وہاں کے انچارج مسٹر گپتا نے سلپ دیکھ کر کہا۔ "سوری آؤٹ آف اسٹاک ہے !! — آپ دہلی چلے جائیں، یہ گروپ بہت ہی کم لوگوں میں پایا جاتا ہے۔"

اُس کے بعد ہم شہر کی مزید خاک چھان کر، اسپتال پہونچے۔ تاکہ بھائی صاحب کو صورتِ حال سے آگاہ کیا جائے اور دہلی جانے کی تیاری کریں۔ ہم روم میں داخل ہوئے تو ڈاکٹر بھاسکر مُسکرا کر بھائی صاحب کو کہہ رہے تھے۔

"مبارک ہو ! فیروز صاحب ! — اُس لڑکے کا خون آپ کی مدر کے گروپ سے مل گیا۔ اب گھبرانے کی ضرورت نہیں !!"

بھائی صاحب نے حیران ہوکر پوچھا۔ "کس لڑکے کا، ڈاکٹر !!؟"

"کمال ہے — ! — آپ نے ہی تو بھیجا تھا اُس کو !!"

"میں نے !!"

ہم سب حیران تھے کہ دروازہ کھُلا، وہ مسکراتا ہوا اندر داخل ہوا، اور سب کو ہاتھ جوڑ کر نمسکار کیا۔

"نمستے بہُو ! — تم !! — تم کب پہونچے !!؟"

وہ جذباتی ہوکر بولا۔ "بڑے میاں ! بھگوان کی کرپا سے آج میں اماں جی کے کام آرہا ہوں۔ مجھے روکیے گا نہیں !!"

ہم سب پر سکتہ سا طاری ہو چکا تھا۔ کشمکش کے گہرے طوفان میں گھِر چکے تھے ہم۔ آناً فاناً دوسرا بیڈ لگا دیا گیا۔ وہ خوشی خوشی بیڈ پر لیٹ گیا۔ ڈاکٹر بھاسکر نے اُس کی کلائی زور سے پکڑ کر نس تلاش کی، اور سرنج داخل کر دی۔ دونوں طرف نالی ہٹا کر کے ڈاکٹر اطمینان کے ساتھ کرسی پر بیٹھ کر

(باقی صفحہ پر)

احسان اللہ خاں

ارضیات اور ارضی تحقیقات

یہ جان کر شاید تعجب ہو کہ حضرتِ انسان تقریباً پچاس ہزار سال قبل جب اشرف المخلوقات کی حیثیت سے اس ارض پر وارد ہوئے تو ان کو رہائش گاہ کا احساس نہ تھا اور تن ڈھکنے کا بھی شعور نہ تھا بلکہ وہ مادرزاد ننگے جنگلوں میں مارے پھرتے مگر اس وقت بھی وہ ارضی تحقیق میں مشغول تھے اور ہر وقت ان کو اس کی فکر دامن گیر رہتی تھی کہ وہ کونسا ایسا پتھر منتخب کریں جس سے بہترین اوزار تیار کر سکیں۔ لہٰذا ابتدا میں انھوں نے کوارٹزائٹ (Quartisite) کا انتخاب کیا۔ پھر کوارٹز (Quartz) ابسیڈین، (obsidian) اور اگیٹ (Agate) وغیرہ کو منتخب کیا اور ان سے پتھر کے اوزار بنا کر جانوروں کا شکار کرنے لگے۔ تاکہ ان کی خوراک کے لیے گوشت فراہم ہو سکے۔ یہ سلسلہ تقریباً تیس ہزار سال قبل تک جاری رہا علاوہ ازیں اوچر (Ochers) کو تیل میں ملا کر پینٹ (Paint) بنایا اور اپنے جانوروں کی تصویریں گپھاؤں میں بنائیں جن کا وہ شکار کرتا تھا۔ اس کے بعد انسان تقریباً تیس ہزار سال قبل مٹی کے برتن اور مکان بنانے کے لیے اینٹیں پکا کر بنانے لگا اس طرح ارضیاتی تحقیق کا دوسرا باب شروع ہوا، جو تقریباً دس ہزار سال قبل تک جاری رہا۔

تقریباً دس ہزار سال قبل انسان نے تانبہ (Copper) کو دریافت کیا اس کے قبل وہ سونا دریافت کر چکا تھا۔ اس کو مختلف طریقوں سے استعمال کرنے لگا، مثلاً زیورات اور برتن وغیرہ۔ شروع شروع میں یہ تانبے کے ٹکڑوں کو دریاؤں اور پہاڑوں سے اٹھایا کرتا تھا مگر پھر انھیں کھدائی کر کے حاصل کرنے لگا۔ اس زمانے کی بہت سی کانیں کشمیر اور راجستھان میں دریافت کی جا چکی ہیں اور ایسی کانیں دنیا کے دوسرے علاقوں میں بھی کثیر تعداد میں موجود ہیں۔ بعد میں انسان کو احساس ہوا کہ اس میں سختی نہ ہونے کی بنا پر یہ اکثر مُڑ جاتا ہے۔ لہٰذا اس کو مضبوط بنانے کے لیے اس میں ٹِن (Tin) کو ملا کر کانسی (Bronse) بنایا گیا۔ اس طرح کانسی بنانے کے لیے ٹِین کی بھی دریافت ہو گئی۔ یہ سلسلہ تقریباً پانچ ہزار سال قبل تک جاری رہا۔ مگر اس زمانے میں چین، ہندوستان، عراق اور مصر میں بڑی بڑی حکومتیں قائم ہو گئی تھیں۔ لہٰذا بادشاہوں اور امیروں کے محلوں کو بنانے کے لیے گرینٹ (Granite) اور کوارٹز (Quartz) عام طور سے استعمال کیا گیا۔ علاوہ ازیں امیروں اور بادشاہوں کی زیب و زینت کے لیے کئی قسم کے قیمتی پتھروں کو بھی دریافت کیا گیا جن میں ہیرا (Diamond) سنگِ سلیمانی (Agate) سنگِ مردہ (Quartz) نیلم (Sapphire) زمرد (Emerald) عقیق (Garget) اور پکھراج (Topaz) وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ ان قیمتی پتھروں کو حاصل کرنے کے لیے کافی گہری کانیں ہوتی تھیں اس طرح کھدائی کی انجینئرنگ (Mining Engineering) بھی ترقی پر تھی۔

یہ حکومتیں آپس میں تجارتی تعلقات برقرار رکھنے کے علاوہ اپنے گرد و نواح کے علاقوں پر اکثر فوج کشی بھی کر کے اپنی حکومتوں کو اور بھی وسیع کرنے میں مشغول رہتی تھیں۔ لہٰذا یہ کانسی کے جنگی آلات بھی بناتی تھیں مگر ان میں پائدار نہیں ہوتی تھی اور یہ اکثر ٹوٹ جاتے تھے اس بنا ان کو ایسی دھات کی تلاش تھی جو بہترین جنگی آلات کا کام دے سکے اس جستجو نے آخر کامیابی حاصل کی اور تقریباً تین ہزار سال قبل ترکی کے ایک قبیلے نے لوہے کو دریافت کیا یہ قبیلہ ہٹائٹ (Hittete) کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس دریافت نے زمانے کا رُخ ہی بدل اور نئی تہذیب کی بنیاد پڑی۔ جدید تہذیب لوہے کے مختلف استعمالات کا نتیجہ ہے۔ ابتدا میں لوہے کا عام استعمال جنگی آلات میں ہوتا پھر اس کی بڑی بڑی کشتیاں بنائی جانے لگیں جس نے لکڑی کی کشتیوں کا خاتمہ کر دیا۔ ہندوستان نے پہلی مرتبہ تقریباً ڈھائی ہزار سال قبل لوہے استعمال سیکھا۔

یونانی تہذیب کے عروج کے دور میں جہاں فلسفہ اور سیاست پر کافی تحقیقی کام ہوا وہاں ارضیاتی میدان میں محض چند معدن کو دریافت کیا گیا۔ اگرچہ تھیوفراسس (Theophrastus 372-287 B.C.) نے معدنیات پر کتاب لکھی جس میں سولہ معدن کو تفصیل سے بیان کیا۔ رومی تہذیب میں کوئی نئی قابلِ ذکر ارضیاتی تحقیق نہ ہو سکی۔ خلیفہ المامون رشید کے زمانے میں جب اسلامی تہذیب کا علمی دور عروج پر تھا اور ہندوستانی، ایرانی، یونانی اور رومی سائنس کو عربی میں منتقل کیا گیا اس وقت اور اس کے بعد بھی ارضیات پر کوئی خاص تحقیقی کام انجام نہ پاسکا محض ابنِ سینا اور ابن رشید کی تحریرات میں چند ارضیاتی تحقیقی مواد ملتا ہے۔

یورپ میں جب نشاۃ ثانیہ کے آثار کافی ابھر کر سامنے آئے تو وہاں پر تمام علوم پر دوبارہ تحقیق شروع ہوئی لہٰذا ارضیات پر بھی کام ہوا اگرچہ جیورجینز (Georgins Aricole 1494 - 1555) نے معدن کے جنم پر پہلی کتاب لکھی اور ہاٹن (Hutton) نے ۱۷۸۸ میں ارضیاتی علم کو صحیح بنیاد پر شروع کیا۔ ۱۸۳۵ء میں انگلینڈ میں ارضیاتی جائزہ لینے والا ادارہ قائم ہوا۔ پھر اس کے تمام شعبوں پر گہری نظر رکھنے کی خاطر اس کو حسبِ ذیل حصوں میں تقسیم کیا گیا۔

۱۔ حجریات (Petrology)
۲۔ معدنیات (Mineralogy)
۳۔ طبقیات (Straligraphy)
۴۔ معدومیات (Palaeontology)
۵۔ معاشی ارضیات (Economic Geology)
۶۔ ارضیاتی طبیعات (Geophysics)

ابتدا میں یورپ کے تمام ممالک میں خاص طور سے انگلینڈ، فرانس اور جرمنی میں ان مختلف شعبوں پر کافی کام کیا گیا پھر ان پر الگ الگ تحقیقی ادارے قائم کئے گئے۔ علاوہ ازیں ان شعبوں کی تعلیم تمام یونیورسٹیوں میں عام کر دی گئی امریکہ میں آزادی کے بعد ان شعبوں پر کافی تحقیقی کام کیا گیا۔ لہٰذا یہ جلدی ہی یورپ کے تمام ممالک سے آگے بڑھ گیا۔ روس میں بھی اس کے لیے کئی ادارے قائم کئے گئے۔ دُنیا کے دوسرے ممالک میں بھی بیسویں صدی میں ان پر تحقیقیں شروع کر دی گئیں مگر ہر ملک میں ابتداً معدنیات پر زیادہ کام ہوا تاکہ اس تحقیق سے معاشیاتی فوائد حاصل کئے جائیں لہٰذا بعد میں معاشیاتی ارضیات ایک مخصوص شعبہ کی حیثیت سے اُجاگر ہوا کیوں کہ ہر ملک نے ایسے سائنسدانوں کی زیادہ ہمت افزائی کی جو کچی دھات کے ذخائر (Ore Deposits) کی وجوہات پر کام کرتے تھے تاکہ کم خرچے پر بڑے بڑے ذخائر دریافت ہو سکیں۔ دورِ جدید میں مصغر پودے اور جانوروں پر (Macio Fauna & flora) کافی توجہ دی جانے لگی کیوں کہ ان کے مطالعہ سے پیٹرول کے ذخائر دریافت کرنے میں کافی آسانیاں پیدا ہوتی تھیں۔ فی الحال ارضیاتی طبعیات پر کافی توجہ دی جا رہی ہے کیوں کہ اس کی مدد سے معدنی ذخائر جلد از جلد معلوم ہو جاتے ہیں۔

ہندوستان میں ۱۸۵۱ء میں ارضیاتی جائزے کے ادارے کی بنیاد رکھی گئی۔ ابتداء میں اس کا مقصد یہ تھا کہ جو جہاز انگلینڈ سے ہندوستان آتے تھے ان کے لیے کوئلہ فراہم کیا جائے تاکہ واپسی کے لیے بھی ان جہازوں کو انگلینڈ سے کوئلہ نہ لانا پڑے۔ پہلی مرتبہ کلکتہ میں ۱۸۹۲ میں ارضیات کی تعلیم شروع کی گئی تاکہ ہندوستانی اس ادارے میں کام کر سکیں۔ آزادی کے قبل تک یہی ادارہ معدن معلوم کرنے کا واحد ادارہ تھا اگرچہ کئی یونیورسٹیوں میں ارضیات کی تعلیم دی جا رہی تھی۔

آزادی کے بعد اس مرکزی ادارے کے علاوہ کئی دوسرے ادارے بھی قائم کئے گئے علاوہ ازیں ہر صوبے میں ایسے ایک ادارے کا اضافہ کیا گیا تاکہ ہر صوبہ اپنے معدنیات کی دریافت کر سکے اور ان سے مناسب فائدہ حاصل کر سکے۔

ہندوستان میں حسبِ ذیل مرکزی ارضیاتی تحقیقی ادارے قابلِ ذکر ہیں:۔

۱۔ ارضیاتی جائزہ ادارہ کلکتہ۔
Geological Survey of India

۲۔ پٹرول اور گیس کا ادارہ دہرہ دون۔
Oil & Natural Gas Commission

معدنی ادارہ، ناگپور۔
Mineral Exploration Corporation

معدنی کھدائی کا ادارہ، دھنباد۔
Mining Geology

۔ تانبے کا ادارہ۔ کھیتری۔
Copper Corpobation

۶۔ بیربل قدیم نباتاتی ادارہ، لکھنؤ۔
Birbal Institute of Paleobotany

۷۔ واڈیہ ہمالیہ ارضیاتی ادارہ، دہرہ دون۔
Wadia Institute of Himalayan Geology

۸۔ کوئلہ ادارہ، ہزاری باغ۔
Coal Corporation of India

۹۔ ارضیاتی طبیعاتی ادارہ، حیدرآباد۔
National Geophysical Research Institute

ان اداروں میں جو تحقیقات ہوئی ہیں، ان کے نتیجے میں ملک کو ہر سال کروڑہا روپیہ کا فائدہ ہوتا ہے۔

★

بقیہ: ہندوستان کی ترقی کی ایک جھلک

اور رحم دلی سکھائی ہے اور اس مذہبی راستے پر اگر ہم چلیں تو ہم ایک نیا سماج بنا سکتے ہیں۔ اس وقت بھی معاشرے میں نیا پن لایا جا رہا ہے۔ ہم اپنی پُرانی روایات پر قائم رہ کر جدیدیت کی طرف جا رہے ہیں اور یہی ایک وجہ ہے کہ ہمارے ملک میں بھی دشواریوں میں اضافہ ہوا ہے اور باہر سے بھی ہم پر زیادہ دباؤ اور دشواریاں رہی ہیں لیکن زندگی میں دکھ اور سُکھ کا امتزاج ہوتا ہے۔ آپ میں سے ہر شخص چاہے وہ چھوٹا بچّہ ہو یا تجربہ کار آدمی، اپنی زندگی میں یہ بات دیکھی ہوگی۔ ہم دُکھ سے، تکلیف سے دب سکتے ہیں یا اس سے اُوپر اُٹھ سکتے ہیں یہ ہمارے ہاتھ میں ہے۔ اس میں سرکار مدد نہیں کر سکتی، کوئی سیاسی پارٹی مدد نہیں کر سکتی۔ یہ اس بات پر منحصر ہے کہ ہم میں کتنا حوصلہ کتنی کتنی اندرونی طاقت ہے۔ یومِ آزادی کا یہی پیغام ہے۔

ہمارے سائنسدانوں نے دکھایا کہ وہ امن اور ترقی کے لیے کیا کر سکتے ہیں، کس لیے؟ بم بنانے کے لیے نہیں اور ایک بھی بم ہمارے پاس نہیں ہے، اس لیے کہ اس سے ہم بجلی بنائیں، اس سے اپنے کسانوں کی مدد کر سکیں۔ اس سے دیکھیں کہ ہم ڈاکٹری علاج میں کیا مدد کر سکتے ہیں۔ ہمارے جو پروگرام ہیں چاہے خلائی پروگرام ہو، چاہے کھیل کُود کو فروغ دینے کا ہو، چاہے سائنس کو ترقی دینے کا ہو، تب تک کامیاب نہیں ہو سکتے جب تک نوجوان اس کام میں آگے نہیں بڑھتے۔ اگر ان میں اہلیت اور صلاحیت نہیں ہوتی تو ہمیں کامیابی نہیں ملتی۔ یہ سب کام ہم اس لیے کر رہے ہیں تاکہ بھارت کے جو غریب اور متوسط طبقے کے لوگ ہیں، ان کی دشواریاں کچھ کم ہوں۔

(۱۵ اگست ۱۹۸۴ء کی
لال قلعے کی تقریر سے اقتباسات)

★

بقیہ: ندامت کے آنسو

گھڑی دیکھنے لگا۔ چلتا ہوا خون سفید نالی سے صاف نظر آرہا تھا۔

"آ — ! — آں !" تقریباً دس منٹ بعد خالہ کے حلق سے ایک کمزور سی آواز اُبھری ہے۔ انھوں نے اپنی بھاری پلکوں کو جنبش دی ہے۔ بھائی صاحب کی طرف دیکھ کر وہ بڑی مشکل سے بولیں۔

"ف — ی — روز ! — یہ ! — ہم لا — میں کہاں ہوں !!؟"

"آپ ٹھیک ہیں امّی جان، اللہ نے آپ کی جان بخش دی !" بھائی صاحب کی آنکھیں نم ہوگئیں وہ کچھ اور نہ کہہ سکے۔

ہم سب نے خالہ کو اپنے گھیرے میں لیا ہے تاکہ وہ اِدھر اُدھر نہ دیکھ پائیں مگر ڈاکٹر نے ہمیں پیچھے بیٹھنے کو کہا۔ ہم مجبوراً اپنی اپنی نشستوں پر آبیٹھے ہیں۔ ہمارے ہٹتے ہی خالہ نے کمرے کا جائزہ لیا ہے۔ اُن کی بھنویں تن گئیں ہیں! آہستہ آہستہ سر گھما کر انھوں نے پاس والے بیڈ پر پڑے ہوئے نوجوان کو دیکھا ہے۔ اُن کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں اور ہم سب کی سانسیں رُک گئی ہیں، ہم سب کسی اچانک حادثے کے منتظر ہیں۔

"فیروز ! — فیروز — یہ کیا !!" — ہماری مہترانی کے لڑکے !!" باقی الفاظ اُن کے اندر ہی کہیں جم کر رہ گئے ہیں۔ بھائی صاحب تھوک نگل کر بولے۔

"امّی یہ ! — یہ تو ہمارے لیے مسیحا بن کر آیا ہے یہ نہ آتا تو آج ہم سب آپ کو کھو دیتے امّی !!" — آپ کے گروپ کا خون ملنا ناممکن ہو گیا تھا !!"

خالہ نے آنکھیں مُوند لی ہیں۔ شاید اُن کا ذہن کہیں اُلجھ کر رہ گیا ہے۔ دوسرے ہی لمحے اُنھوں نے آنکھیں کھولی ہیں، وہ ممتا بھری نظروں سے خون دینے والے نوجوان کی طرف دیکھ کر مُسکرائی ہیں... دو موٹے موٹے آنسو اُن کی آنکھوں سے آزاد ہوگئے ہیں، اور ہونٹ پھڑ پھڑا اُٹھے ہیں۔

"اللہ — مجھے معاف کرے !!" ★

بقیہ: ضلعی اور مقامی پلاننگ

چاہیے تاکہ وہ ان اعداد و شمار کو مقامی ترقی کے کام لا سکیں۔ ان افسروں کو انتظامیہ اور منصوبہ کار دونوں کے لیے سُودمند ثابت ہونا چاہیے۔ ادھر انتظامیہ کے افسروں اور منصوبہ کاروں میں اتنی صلاحیت ہونی چاہیے کہ وہ ان اعداد و شمار کو استعمال کر سکیں۔

ڈپٹی کمشنروں، اسٹےٹسٹیکل افسروں، ڈسٹرکٹ پلانرز اور ضلع میں پلان پر عمل درآمد کے ذمہ دار دوسرے اداروں نے جن میں پنچائتیں اور کوآپریٹو وغیرہ سبھی شامل ہیں، مقامی پلان بنانے کے لیے کوئی محنت نہیں کی۔ اس قسم کی بے نیازی کا اظہار تو مقامی سماج بھی کرتا ہے۔ ضلع کے مرکز میں کئی ایک تعلیمی ادارے ہیں۔ ان میں اہلِ کار بھی ہیں، نیچرل سائنس دان بھی، سوشل سائنسٹسٹ اور سوشل ورکرز بھی۔ لیکن بدقسمتی سے ایسے بہت کم لوگ ہوں گے، جنھوں نے اپنے اپنے علاقوں کی ترقی اور پلاننگ کی روش پر کوئی دھیان دیا ہو۔ انتظامیہ کی مشینری، مقامی سرکار کے اداروں اور مقامی لیڈروں نے منظم مقامی یا وسیع منصوبہ بندی کا وہ جوش نہیں دکھایا جو انھیں دکھانا چاہیے تھا۔ انھیں پلاننگ فورم پر باہم اکٹھا ہونا ہوگا۔ اور اپنی ذہنی قوتوں اور نظریاتی صلاحیتوں کے ساتھ مقامی حالات اور سماج سے اپنی گہری واقفیت کو جوڑ کر سائنٹفک پلان بنانے ہوں گے۔

★

ِگرام تو ابھی حال ہی میں شروع ہوا ہے۔ اس
ِگرام کے تحت وہ بے روزگار جو ہمارے دیہات
ے ہیں یا تعلیم یافتہ ہیں یا دوسرے نوجوانوں کو
وزگار دینے کا بھی بندوبست ہے اور اس میں
میابی حاصل ہوئی ہے، قرضہ فراہم کرنے اور دوسرے
وگراموں میں بھی کامیابی ملی ہے۔ مجھے معلوم ہے
کمیاں بھی ہیں۔ مجھے معلوم ہے کہ لوگوں نے غلطیاں
ہیں اور لوگوں نے آکر مجھ سے شکایت بھی کی ہے۔
پ کو تعجب ہوگا جو لوگ دلی میں نہیں رہتے یا پہلی
بُشن رہے ہیں، کہ چھٹی کے دنوں کے علاوہ، جب بھی
دلی میں ہوتی ہوں تو کبھی کچھ سَو، کبھی کچھ ہزار لوگ
سے روز صبح ملنے آتے ہیں۔ ان کا تعلق ہر طبقے،
مذہب اور بھارت کے ہر حصے سے ہوتا ہے۔ کچھ
کہتے ہیں کہ ہم تو صرف درشن کرنے آئے ہیں، کچھ
اپنا دکھ بیان کرتے ہیں، کچھ شکایت کرتے ہیں،
ترقی کی ستائش بھی کرتے ہیں۔ اس پر بہت سے
رکے لوگوں نے مجھ سے کہا کہ کیا اتنے لوگوں سے ملنے
آپ کا وقت برباد نہیں ہوتا؟ دوسرے ملکوں کے
رہنما ملتے نہیں ہیں۔ لیکن میں نے کہا کہ اس سے
رت کی تصویر کیا ہے، انسان کیا ہے، لوگوں کے دل
ات کیا ہیں، میرے سامنے آتے ہیں اور اس میں
ت کبھی برباد نہیں ہو سکتا۔ سب سے ضروری کام یہی ہے۔
ہم نے سینچائی کے کام کو تو بہت بڑھا لیا ہے۔ ہمارے
کسان بھائی تحریک چلا رہے ہیں۔ لیکن جتنا ہم نے
گذشتہ چار برسوں میں کسانوں کے لیے کیا اتنا شاید کبھی
نہیں ہوا۔ ویسے ان کی طرف دھیان آزادی کی تحریک
تھا ہی۔ وہ تحریک کی جڑ کی طرح تھے۔ اس کے بعد بھی
ت ان کی طرف توجہ تھی۔ وہ ہمارے اَن داتا ہیں۔
معلوم ہے کہ جو چیزیں وہ خریدتے ہیں ان کے دام
ہیں۔ لیکن ہم پوری کوشش کر رہے ہیں کہ اپنی طرف
ان کی مدد کریں اور کی بھی ہے۔
ملک کے لیے یہ آسان نہیں ہے۔ اس طرح سے جو وہ
رتے ہیں اس کی قیمت بھی پہلے سے کافی بڑھی ہے۔
یہ ٹھیک ہے کہ جن چیزوں کی ان کو ضرورت ہے ان کی

کچھ قیمتیں بڑھی ہیں، یہاں بڑھی ہیں دوسرے ملکوں میں بڑھی ہیں۔ یہ بھی سچ ہے کہ جیسے جیسے ترقی ہوتی ہے، ویسے ویسے مانگیں بھی بڑھتی ہیں۔ جو لوگ دو تین سال پہلے ٹریکٹر کے بارے میں سوچتے بھی نہیں تھے، ٹریکٹر کے بارے میں سوچتے بھی نہیں تھے، اتنی کھاد یا کیڑے مارنے کی دوا کا استعمال نہیں کرتے تھے، آج ان کی وہ مانگ بڑھی ہے۔ اور جتنی مانگ بڑھتی ہے اتنی پیداوار نہیں بڑھتی۔ اس لیے دام بڑھتے ہیں۔ تو ہم کو ان سب باتوں کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے سوچنا ہے۔ جتنا ہم ان پر منحصر ہیں اتنا وہ بھی کارخانوں کی پیداوار پر منحصر ہیں۔

تو مزدوروں کی طرف بھی توجہ دینا ہے۔ کہ ان کو انصاف ملے۔ کبھی ہمارا قصور ہوتا ہے، کبھی مل مالکوں کا قصور ہوتا ہے اور کبھی خود مزدوروں کا قصور ہوتا ہے۔ کیوں کہ اگر ایک یونٹ یا ایک کارخانہ میں بہت سی یونینیں ہوں اور ایک دوسرے کا مقابلہ کریں، لڑائی کریں تو اس میں وقت بھی برباد ہوتا ہے اور پیداوار کو بھی نقصان پہنچتا ہے۔ ان امور کی طرف ہم کو توجہ دینا ہے۔

اور اگر ہر ایک طبقہ اپنے سوال کو بڑے بھارت کی تصویر کے تحت دیکھے تو وہ دیکھے گا کہ صرف اس کی ہی مشکلات نہیں ہیں۔ کسانوں کی مشکلات ہیں، مزدوروں کی مشکلات ہیں اور گھریلو خواتین کی بھی مشکلات ہیں۔ جنھیں کم سے کم خرچ میں اس مہنگائی کے زمانے میں اپنا گھر چلانے کی کوشش کرتی ہے۔ یہ مہنگائی کے شکار صرف بھارت کے لوگ ہی نہیں ہیں ساری دُنیا کے لوگ ہیں۔ ہم کوشش کر رہے ہیں کہ جو ضروری اشیا ہیں۔ وہ لوگوں تک پہنچیں۔ اور اس سلسلے میں جو راشن کا نظام ہے اس کے ذریعے اناج تقسیم کرنے اور دُور دُور تک پہنچانے کے لیے ۵۰ کروڑ روپے خرچ کیے جا رہے ہیں اور کوشش ہے کہ یہ بڑھے۔ اگر کوئی بیچ میں بے ایمانی کرتا ہے، بدعنوانی کرتا ہے تو اس کے خلاف سخت سے سخت اقدام کرنا چاہیے لیکن یہ اس وقت پتہ ہونا چاہیے کہ کس نے کیا اور کہاں کیا۔ اگر سب کہیں گے کہ یہ سب کرتے ہیں تو کارروائی کرنی مشکل ہو جاتی ہے۔ یہ

تو وہ جو وہاں کے رہنے والے ہیں، مستقل لوگ ہیں ان کو اس سے خبردار رہنا ہے۔ جو مظالم ہوتے ہیں چاہے ہریجنوں پر ہوں چاہے اقلیتوں پر ہوں، چاہے عورتوں پر ہوں، اگر پڑوس کے لوگ چوکنے رہیں گے، بیدار رہیں گے تبھی اس کا کوئی راستہ نکلے گا۔ ہماری طرف سے تو قانون کو مزید سخت کرنے کی پوری کوشش رہے۔ جو نئیں بھی مانگ کرتا ہے ہم اس کی مانگ پر بھی غور و فکر کرتے ہیں کہ یہ مشکل پیدا ہو سکتی ہے لہٰذا ہم اس کے لیے مزید کیا کریں۔

اگر آپ چاہتے ہیں کہ آپ اپنے پاؤں پر کھڑے ہوں تو ہمارا نعرہ ہے کہ قوم خود کفیل ہو، یہی ہماری کوشش ہے۔

اور اس کے ساتھ ہی ایک ذمّہ داری عائد ہوتی ہے کہ آپ اپنے فرض کو بھی ادا کریں۔ آپ دیکھیں کہ تشدد نہ ہو۔ آپ دیکھیں کہ جو مقدس مقامات اور مذہبی جگہیں ہیں وہ تشدد کے مرکز نہ بن جائیں۔ اسلحہ جمع کرنے کے اڈّے نہ بن جائیں، بُرے کاموں کی آماجگاہ نہ بن جائیں۔ آپ کا فرض ہے کہ فرقہ پرستی کا نعرہ بلند نہ ہو اور جہاں بلند ہوتا ہے آپ خود وہاں جائیں جیسے آزادی کے زمانے میں ہمارے کارکن جاتے تھے اور لوگوں میں امن بحال کرتے تھے اور وہ جو ان کو اشتعال آتا تھا اسے کم کرنے کی کوشش کرتے تھے — ہمیں یقین ہے کہ آئندہ ہم اور بڑے کام انجام دے سکتے ہیں۔ ملک کے اندر ہمیشہ خطرے رہتے ہیں جہاں اتنی گوناگونی، اتنے مذہب، اور زبانیں، اتنے نظریے اور رسمیں ہیں وہاں کچھ نہ کچھ تو ایک دوسرے سے مقابلہ چلتا رہتا ہے لیکن ہم نے ہمیشہ یہی سوچا کہ یہ گوناگونی کمزوری کی نشانی نہیں ہے۔ یہ ایک خوشحالی کی نشانی ہے۔ یہ بھارت کو مزید خوبصورت بناتی ہے۔ ہمارے معاشرے کو حسین بناتی ہے۔ اس لیے ہم چاہتے ہیں کہ کسی کے مذہب پر آنچ نہ آئے۔ سب اپنے اپنے راستے پر گامزن ہوں۔

کسی مذہب میں یہ نہیں کہا گیا ہے کہ لڑائی کرو۔ ہر مذہب نے بھائی چارہ سکھایا ہے، محبت

(باقی صـــ پر)

گیانی ذیل سنگھ

آزادی اور جمہوریت

حصولِ آزادی کے بعد ہم نے جمہوری ڈھانچے کے اندر رہ کر اور متعدد اڑچنوں کا سامنا کرتے ہوئے بہت سی کامیابیاں حاصل کی ہیں جو ہمارے ملک کے عوام کی لگن اور ان کے مستحکم ارادے کا جیتا جاگتا ثبوت ہیں۔ تاہم ابھی ہمیں اپنے ملک کے عوام کو مکمل اقتصادی اور سماجی آزادی دلانے کے لیے بہت کچھ کرنا ہے۔

آزادی کے بعد سے بھارت کے سیاسی نظام نے اندرونی اور بیرونی تخریب پسند قوتوں کے ذریعے پیدا کئے گئے چیلنجوں کا بڑی کامیابی سے سامنا کیا ہے۔ بھارت کی آزادی ملک کے مختلف عقائد کو ماننے والے سبھی ہم وطنوں کی مجموعی کوششوں کا نتیجہ تھی۔ بھارت کے سبھی لوگ چاہے وہ ملک کے کسی بھی حصے کے رہنے والے ہوں اور کوئی بھی زبان بولتے ہوں مہاتما گاندھی اور ہمارے دوسرے قومی رہنماؤں کی پکار پر بڑی ہمت اور جوش کے ساتھ اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ اس طرح ہماری آزادی کسی ایک فرقے یا طبقے کی نہیں بلکہ سب کی مشترکہ میراث ہے جس کے حصول کے لیے ہمارے ہم وطنوں نے زبردست قربانی دی تھی۔ اب اس کے تحفظ کرنے کی ذمہ داری ہم سب پر ہے۔

آزادی کے بعد بھارت کی اقتصادی حالت میں لگاتار بہتری آئی ہے [redacted] ایک مضبوط اور ٹھوس بنیادی ڈھانچہ تیار ہو گیا ہے جس کا سہرا بڑی سمجھ داری سے مرتب کئے گئے ہمارے منصوبوں اور ہمارے ملک کے عوام کی محنت کے سر ہے۔ اسی کی بدولت ہمیں زراعت کی پیداوار بڑھانے اور اس کی بڑھی ہوئی شرح پیداوار کو برقرار رکھنے میں کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ مجھے اس بات پر از حد مسرت ہے کہ ملک میں ۸۴ - ۱۹۸۳ء میں ۱۵۱۰ لاکھ میٹرک ٹن اناج کی بے مثل پیداوار ہوئی ہے۔ جو کہ گذشتہ سال کی پیداوار سے ۱۱ فی صد زیادہ ہے۔

ملک میں صنعتی ڈھانچہ مضبوط ہو جانے کی وجہ سے بھارت اب دُنیا کا ایک اہم صنعتی ملک بن گیا ہے۔ منصوبوں کی شروعات سے جو سائنٹفک بنیاد ملک میں رکھی گئی ہے۔ اس کا فائدہ اب ہمیں ملنے لگا ہے۔ بھارت سائنس اور ٹیکنالوجی کے متعدد میدانوں خصوصًا نیوکلیائی اور خلائی سائنس، نیز تجربات میں بتدریج ترقی کر رہا ہے۔

زراعت اور صنعت کے میدان میں لگاتار پیداوار بڑھ رہی ہے ہمیں اس رفتار کو برقرار رکھنا ہے تاکہ ہم اپنے عوام کے معیارِ زندگی کو بلند کر سکیں۔ ہمیں غریبی، بھوک، ناخواندگی اور بیماری کو بھی جڑ سے ختم کرنا ہوگا۔ یہ ہمارا سب سے اہم کام ہے اور اس میں تاخیر نہیں کی جا سکتی۔ متعدد تحریکوں اور دہشت پسند سرگرمیوں سے ان کوششوں میں کسی بھی رکاوٹ سے ہماری ترقی کی رفتار رک جائے گی۔ ملک کمزور ہو جائے گا اور غریبی دور نہیں ہوگی۔ کوئی بھی ایسی کارروائی جس سے اقتصادی ترقی میں رخنہ پڑتا ہو، اقتصادی حالت کمزور ہوتی ہو، عوام دشمن اور ملک دشمن ہے۔ تشدد کمزوری کی نشانی ہے۔ طاقت اور ذہانت کی نہیں۔ آئیے ہم عہد کریں کہ ہم سچائی پیار اور امن کے راستے سے نہیں ہٹیں گے اور ان جاوداں اُصولوں پر کاربند رہیں گے جس کی بھارت ہمیشہ تائید و حفاظت کرتا رہا ہے۔ ملک کی ترقی امن اور خوشحالی کے راستے پر لے جانے کے لیے اس عظیم کام کو پُورا کرنے میں ہر شہری کو اپنا رول نبھانا ہوگا۔ مجھے یقین ہے کہ ہمارے ہم وطن اس سلسلے میں پوری پوری کوشش کریں گے اور متحد ہو کر آگے بڑھیں گے۔

بین الاقوامی میدان میں ہمارا مُلک ناوابستہ تحریک کی قیادت کر رہا ہے۔ ایک مبنی بر انصاف بین الاقوامی اقتصادی نظام کے قیام اور دُنیا میں سیاسی کشیدگی کو کم کرنے میں کامیابی حاصل کرنے کی سمت میں مسلسل کوشش کی جا رہی ہے۔ حکومت جنوب ایشیائی علاقائی تعاون سے متعلق پروگراموں پر عمل درآمد کر کے اور پڑوسی مُلکوں کے ساتھ دوستانہ تعلقات قائم کر کے علاقائی تعاون کو فروغ دینے کا کام بھی جاری رکھے ہوئے ہے۔

سبھی ممالک کے لیے ضروری ہے کہ وہ یہ محسوس کریں کہ وہ آزادی اور جمہوریت کے ذریعے ایک ایسی صورتِ حال پیدا کر سکتے ہیں جس میں بین الاقوامی تعلقات میں خوف کو ایک آلے کے طور پر استعمال نہیں کیا جائے گا۔ ایک ایسے عالمی نظام کے قیام کی ضرورت ہے جس میں بڑے ملک چھوٹے ملکوں کو ڈرا دھمکا نہ سکیں۔ پھر بھی اس کی ذمہ داری عام طور پر بڑی طاقتوں پر عائد ہوتی ہے۔ سبھی ملکوں کو اپنی پالیسیاں اپنانے اور اپنے مقاصد کے لیے جدّوجہد کرنے کی آزادی ہونی چاہیئے۔ ہر آدمی میں مقابلہ کرنے کا جذبہ ہوتا ہے۔ یہ جذبہ ہر ملک میں پایا جاتا ہے۔ لیکن اگر کوئی ملک مقابلے میں جیتنا چاہتا ہے تب بھی اسے دوسرے مُلکوں میں شکست کا احساس نہ پیدا ہونے دینا چاہیئے۔ اگر بین الاقوامی صورتِ حال میں اس سطح تک بہتری آجاتی ہے تو بین الاقوامی امن کو یقینی بنایا جا سکتا ہے اور بنی نوعِ انسان کو لاحق خطرہ کو مستقل طور پر ختم کیا جا سکتا ہے۔

یہ سبھی کو معلوم ہے کہ کسی بھی تہذیب کی خوبی اقلیتوں اور خواتین کے ساتھ اس کے رویّے سے جانی جاتی ہیں۔

بھارت کا رویّہ دونوں کے ساتھ اچھا رہا ہے اور ان کے لیے اپنی اہلیت کے مطابق ترقی کرنے کے پورے مواقع موجود ہیں۔ یہاں اقلیتوں کو اکثریتوں کے مساوی حقوق حاصل ہیں، خواتین سیاست، قانون، تعلیم، سائنس، تجارت، صنعت اور دیگر سبھی شعبوں میں اعلیٰ سطح پر موجود ہیں۔ مردوں کے ساتھ کندھے سے کندھا ملا کر آگے بڑھ رہی ہیں۔ ابھی حال ہی کی ایک مثال ہے کہ ایک بھارتی خاتون ایورسٹ کی چوٹی پر چڑھنے میں کامیاب ہوئی تھی۔

یوجنا

۱۶ تا ۳۰ ستمبر ۱۹۸۴ء

ایک روپیہ

معاشرتی انقلاب کی جانب ...

اقتصادی جمہوریت کا مقدمہ

جمہوریت کی بقا

(وسنت ساٹھے)

پراجیکٹ پلاننگ

(این۔ آر۔ دوبھاشی)

شو ناتھ سیکہ

زرعی تحقیق کی کونسل اور اس کی چند اہم خدمات

ہندوستان میں چھوٹے اور مارجنل کسانوں کی تعداد کاشتکاروں کی کُل تعداد کے نصف سے بھی زیادہ ہے۔ لہٰذا ہمارے زرعی سائنسداں زرعی شعبوں میں جو نت نئی معلومات فراہم کر رہے ہیں، اسے ان کسانوں تک پہنچانا اور انھیں اُس سے واقف کرانا بے حد ضروری ہے۔ اس کے بغیر زرعی پیداوار میں اضافہ ممکن نہیں۔ ہمارے ملک میں ان نئی دریافتوں کے سبب خوراکی اجناس کی پیداوار میں اضافے کے زبردست امکانات ہیں۔ اگر ان معلومات اور جدید ترین تکنیک سے فائدہ اٹھایا جا سکا تو اُمید ہے کہ مستقبل قریب میں ہمارے ملک میں زرعی پیداوار میں مزید اضافے ہوں گے۔ یہ بات حوصلہ افزا ہے کہ ہمارے زرعی سائنسدانوں نے جو نئی تکنیک دریافت کی ہے، وہ نہ صرف آسان اور قابلِ عمل ہے بلکہ ہمارے اُن کسانوں کے لیے قابلِ فہم بھی ہے جو کہ اپنی تعلیم کے اعتبار سے بہت پیچھے ہیں۔ لیکن انھیں اس سے واقف کرانا اور اس کی افادیت کے بارے میں یقین دلانا ایک مشکل ترین کام ہے اور آج ہمارے زرعی سائنسدانوں پر یہ بہت بڑی ذمہ داری ہے کہ ان کسانوں کو جدید ترین تکنیک سے واقف کرایا جائے۔ پچھلے بیس برس میں ہمارے ملک میں زرعی پیداوار میں جو حوصلہ افزا اضافے ہوئے ہیں، ان کا بڑا سبب یہی جدید ٹکنالوجی ہے۔ ایک اندازے کے مطابق ہمارے ملک میں دستیاب زرعی ٹکنالوجی کا صرف ۱۵ تا ۲۰ فیصد کھیتوں پر استعمال ہوتا ہے جبکہ ترقی یافتہ ملکوں میں اس جدید تکنیک کا ۸۰ تا ۸۵ فیصد عملی صورت میں کام میں لایا جاتا ہے۔

حصولِ آزادی کے بعد کسانوں کو جدید ترین ٹکنالوجی سے واقف کرانے کے لیے بہت سے پروگرام شروع کیے جا چکے ہیں۔ اس کی بڑی ذمہ داری مرکزی وزارت زراعت کے شعبۂ زراعت اور ریاستوں پر ہے۔ اس کے علاوہ زرعی تحقیق کی بھارتی کونسل نے بھی اس ذمہ داری کو بحسن و خوبی نبھانے کی کوشش کی ہے۔ اس نے قومی سطح پر ڈیمانسٹریشن کے پروگرام شروع کیے۔ عملی تحقیق کے کام کو بڑھاوا دیا اور کرشی وگیان کیندر کھولے۔ اس کے علاوہ اس نے لیباریٹری سے کھیتوں تک کے عنوان سے جدید ٹکنالوجی کو کسانوں تک پہنچانے کی ذمہ داری سنبھالی۔

ریاستی سرکاروں کے ایکسٹنشن ڈیپارٹمنٹ مختلف نتائج حاصل کرکے، ان کے عملی اور افادی پہلوؤں سے کسانوں کو واقف کراتے ہیں۔ اس طرح سے ہمارے اَن پڑھ کسان جدید طریقوں سے استفادہ کرکے زرعی پیداوار میں اضافہ کر سکے۔ مگر ایک مرحلہ وہ آیا کہ یہ محسوس کیا گیا اس پروگرام سے کسانوں نے اُتنا فائدہ نہیں اُٹھایا جتنا انھیں اٹھانا تھا۔ لہٰذا زرعی تحقیق کی بھارتی کونسل نے ایک اسکیم ۱۹۶۷ء میں شروع کی تاکہ قومی سطح پر تجربات پیش کرکے کسانوں کو زیادہ پیداوار دینے والے بیجوں کی کاشت اور ان کے طریقِ کار سے واقف کرایا جائے۔ اس اسکیم کے تحت سائنسدانوں نے خود عملی صورت میں بڑے پیمانے پر تجربات کرکے دکھائے اور بڑے سائز کے پلاٹوں پر کاشت کرکے اس کی افادیت سے کسانوں کو روشناس کرایا۔ اس طرح کسانوں کو عملی تربیت بھی دی جا سکی اور اس نئی تکنیک کے افادی پہلوؤں سے انھیں واقف کرایا جا سکا۔ اس عمل کے دوران ایکسٹنشن سے متعلق عملے کو بھی بچشم خود اس کے فائدوں سے واقفیت ہوئی اور اس طرح مستقبل کے لیے ان کا کام آسان ہوا۔ اس طرح سے اس کے بارے میں جو خدشات اور شبہات کسانوں کے دل میں تھے، وہ دُور ہو سکے۔ اس کام میں سائنسداں اور ایکسٹنشن سے متعلق عملہ مل جل کر کسانوں کی مشکلات اور ان کے شبہات دُور کرتا ہے۔ اسی طرح کے عملی تجربے کے لیے بالعموم نصف ہیکٹیئر پلاٹ لیا جاتا ہے۔ ہر فصل کی پیداوار کے لیے انھوں نے نشانے متعین کر رکھے ہیں۔ اس طرح سے ایک وقت میں کئی کئی فصلیں اُگانے کے پروگرام کے تحت جو نشانے مقرر کیے گئے وہ اس طرح ہیں۔ دو خوراکی اجناس کی بہ یک وقت پیداوار کے تحت کم سے کم فی ہیکٹیئر ۱۰ ٹن کا نشانہ رکھا گیا ہے جبکہ تین خوراکی اجناس کی بہ یک وقت کاشت کے تحت فی ہیکٹیئر ۱۵ ٹن کا نشانہ رکھا گیا ہے۔

مارچ ۱۹۷۴ میں پہلا کرشی وگیان کیندر کھولا گیا۔ یہ مرکز چوتھے پنجسالہ منصوبے کے آخر میں زرعی تحقیق کی بھارتی کونسل نے پانڈی چری میں کھولا۔ یہ کوئمبٹور میں واقع تمل ناڈو کی زرعی یونیورسٹی کے زیرِ اہتمام کھولا گیا۔ اس میں دیہی نوجوانوں، کھیتوں پر کام کرنے والی عورتوں اور ماہی گیری کی تربیت کا انتظام کیا گیا۔ یہ مذکورہ کونسل کی وہ پہلی کوشش تھی جس کے تحت وہ لیباریٹری کے تجربات کو کھیتوں تک لے جانا چاہتی ہے۔ لیباریٹری کے تجربات کو کسانوں کے کھیتوں تک عملی صورت میں پہنچانے کا کام کونسل ہٰذا نے ۱۹۶۹ء میں تیز کر دیا۔ اس کے ذریعے اس نے چھوٹے اور مارجنل کسانوں کی اقتصادی حالت بہتر بنانے کی کوشش کی۔ اس مقصد کے تحت اس نے مویشی پروری، ڈیری، ماہی گیری اور بہت سے دیگر کاموں کو فروغ دیا۔ اس نے کسانوں کی تربیت، ماہی گیروں کی تربیت اور ان کے کنبے کے ارکان کی

(باقی صفحہ ۱۹ پر)

منصوبہ بندی اور ترقیاتی پروگراموں کی جھلک پیش کرنے والا

پندرہ روزہ

یوجنا

نئی دہلی

چیف ایڈیٹر ÷ آر۔ ٹھکرال
ایڈیٹر ÷ لکشمی رام رانا
اسسٹنٹ ایڈیٹر ÷ محمد عادل صدیقی
سب ایڈیٹر ÷ وسیم حیدر

جلد ۴ | ۱۶ تا ۳۰ ستمبر ۱۹۸۴ء | شمارہ ۱۲

۲۵ بھادر تا ۸ آشون شک سمبت ۱۹۰۶ ÷ فون: ۳۸۷۳۴۱

شرح چندہ

سالانہ ۲۰ روپے۔ دوسالہ ۳۵ روپے، سہ سالہ ۵۰ روپے

فی کاپی: ایک روپیہ

طالب علموں، استادوں اور لائبریریوں کے لیے ۱۰ فی صدی رعایت

اس شمارے میں

یوجنا منصوبہ بندی کے بارے میں عوام کو آگاہ کرتا ہے، مگر اس کے مضامین صرف سرکاری نقطۂ نظر کی وضاحت تک ہی محدود نہیں ہیں

بزنس منیجر: ایل۔ آر۔ بترہ ÷ اسسٹنٹ ڈائرکٹر (پروڈکشن) آر۔ ایس۔ منچال

مضامین سے متعلق خط وکتابت کا پتہ:۔
ایڈیٹر "یوجنا" (اردو) پبلیکیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس
نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

ترسیل زر کا پتہ:۔
بزنس منیجر، پبلیکیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس
نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

اداریہ

سائنسداں اور دیہی عوام

دورِ حاضر میں ہندوستان ترقی کے مختلف مراحل طے کر چکا ہے۔ یہاں ترقی کے بہت سے نئے نئے گوشے آنکھوں کے سامنے آئے ہیں۔ اب زور اس بات پر ہے کہ ان نت نئی ایجادوں اور ترقیوں سے دیہی عوام کی زندگی میں سدھار لایا جائے۔ ان کی مدد سے انھیں کام کے نئے نئے ڈھنگ سکھائے جا رہے ہیں۔ ان کی محنت بچانے کے لیے بہت سی مشینیں ایجاد ہو گئی ہیں۔ گاندھی جی نے ابتدا میں اگرچہ یہ خیال پیش کیا تھا کہ کسی بھی طرح کی مشینری استعمال نہ کی جائے لیکن رفتہ رفتہ اب اس نظریے سے مختلف راستہ اپنایا گیا، حتیٰ کہ آج ہمارا چرخہ بھی پہلے کے مقابلے میں جدید ڈیزائن کا ہے۔ لیکن اس تبدیلی کا آنا ایک لازمی ضرورت تھی۔ ابتدائی چرخے سے کافی سوت نہیں ملتا تھا اور اس سے آمدنی بھی کم ہوتی تھی۔ ٹکنالوجی سے مطلب یہی نہیں کہ صرف بڑی بڑی صنعتیں چلائی جائیں یا متوسط درجے کی صنعتوں کو فروغ دیا جائے یا چھوٹی صنعتوں کو عوام میں مقبول بنایا جائے۔ اس کا مطلب ہے دیہی صنعتوں میں بہتری لائی جائے اور ان پر زیادہ توجہ دی جائے۔ پرانے زمانے کی چکی جس میں اُس زمانے میں آٹا پیستے تھے، اب کہاں ہے۔ اگرچہ یہ حقیقت سبھی تسلیم کرتے ہیں کہ ہاتھ سے پسا ہوا آٹا اپنی غذائی افادیت کے لحاظ سے افضل ہے اور ذائقے میں بھی بہتر ہے۔ بیل گاڑیاں اب ٹائر کے پہیوں سے چلتی ہیں۔ اس سے نہ صرف سفر تیزی سے ہوتا ہے بلکہ سڑکیں کم خراب ہوتی ہیں اور بیل پر بوجھ کم پڑتا ہے۔ اس طرح ہم بیل گاڑی سے زیادہ فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

اس طرح کی کوششیں یہ بتاتی ہیں کہ ہمارے سائنسدانوں نے دیہی عوام کی دقتیں کم کرنے پر ہمیشہ ہی توجہ دی ہے۔ غریبی محض کسی ایک اشارے سے دور نہیں ہو سکتی۔ البتہ اس میں درجہ بدرجہ کامیابی مل سکی ہے۔ اس کے لیے روزگار کے پروگراموں کو بڑھاوا دیا جا رہا ہے۔ آبرسانی کی سہولتیں بڑھائی جا رہی ہیں، دیہی عوام کی تربیت اور صحت کو بہتر بنانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ ان کوششوں سے نتائج بھی حاصل ہوئے ہیں۔ کچھ مقامات پر کامیابیاں بہت نمایاں انداز میں دیکھی جا سکتی ہیں البتہ یہ سب فائدے ان قبائلی بھائیوں کو نہیں مل سکے ہیں جو دور دراز مقامات پر زندگی گزار رہے ہیں۔ لہٰذا سائنسدانوں کے لیے ایک ضرورت یہ ہے کہ اس طرح کے علاقوں کے لیے چھوٹے چھوٹے پراجیکٹ وضع کیے جائیں۔ یہ پراجیکٹ ایسے ہوں کہ ان میں زیادہ سرمایہ کاری درکار نہ ہو۔ البتہ ان سے عوام کی زندگی میں تبدیلی ضرور لائی جا سکتی ہے۔ افسوس اس بات کا ہے کہ اکثر و بیشتر سائنسداں ترقی کے اس پہلو کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ اگر یہ سائنسداں اس ضرورت کو سمجھ لیں اور اس پر اتفاق کر لیں تو ہمارے دیہی عوام کی زندگی میں زبردست انقلاب آسکتا ہے۔

منصوبہ بندی میں ہی عوام کے مسائل کا حل ہے

آزادی اور ترقی ناقابلِ تقسیم ہیں۔ ترقی کے بغیر آزادی ہمارے کروڑوں عوام کے لیے محض ایک خیالِ خام ہوتا۔ چنانچہ منصوبہ بندی پر تنقید کرنے والے بہت سے افراد اس حقیقت کو تسلیم کیے بغیر نہیں رہ سکتے کہ ہمارے ملک میں غریبی ہٹاؤ تحریک کے فروغ اور تکنیکی ترقی کے لیے کوئی بھی راستہ منصوبہ بند ترقی کے بغیر موثر ثابت نہیں ہو سکتا تھا۔ چنانچہ ہمارے ملک میں جب بینکوں کو قومی ملکیت میں لیا جانے لگا اس وقت بھی اس کی موافقت اور مخالفت میں کافی لوگوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اس وقت تجزیہ کو بنیاد بنا کر حامیوں اور مخالفوں کی طرف سے متعدد دلائل دیے گئے۔ لہٰذا آج بھی پبلک سیکٹر کے بینکوں کی کارکردگی کا جائزہ لیتے وقت یہی پس منظر پیشِ نظر ہوتا ہے۔ بینکوں کو قومی ملکیت میں لیے بغیر سماجی ترقی کی عظیم ذمہ داری پوری نہیں کی جا سکتی تھی۔ ان بینکوں نے ترجیحی سیکٹر کے لیے ۱۹۸۵ تک کل قرضوں کے ۴۰ فیصد کے بقدر دینے کا پلان بنایا ہے۔ بینکوں کی توسیع کے نتیجے میں اس کے تحت جمع کی جانے والی رقومات میں اضافہ ہوا ہے۔ لہٰذا ایک اندازے کے مطابق بینکوں کی دیہی اور نیم شہری شاخوں میں جمع شدہ رقوم اور دیے جانے والے قرضوں کا تناسب ۶۰ فیصد تک پہنچ سکے گا۔ ۱۹۸۲ تک براہِ راست زرعی قرضوں کی رقم کا نصف حصہ سماج کے کمزور طبقوں کو دینے کا نشانہ رکھا گیا تھا۔ سماج کے کمزور طبقوں اور چھوٹے پیمانے کی صنعتوں کو ۱۹۸۵ تک اس مد کے تحت دیے جانے والے قرضوں کی رقوم کا کم سے کم ساڑھے بارہ فیصد مل سکے گا۔ شیڈولڈ کاسٹ افراد کے لیے رعایتی شرح سود پر قرض دینے کی اسکیم چالو ہے اور جہاں کہیں بینک نہیں ہیں وہاں بینکوں کو کھولنا ہے۔

مختصراً یہ کہ یہ وہ عظیم سماجی ذمہ داریاں ہیں جو قومی ملکیت کے بینکوں کے بغیر نہیں نبھائی جا سکتی تھیں۔ بینکوں کی طرف سے زراعت، چھوٹی صنعتوں، کاریگروں، دیہی دستکاروں، شیڈولڈ ذاتوں، قبیلوں اور پسماندہ طبقوں سے ترجیحی سلوک کی امید اس قدم کے بغیر نہیں کی جا سکتی تھی۔

لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ سوال بھی اہم ہے کہ کیا منصوبہ بندی کو آگے بڑھانے اور سرکاری پالیسی پر عمل درآمد کے لیے یہی کچھ کافی ہے۔ اس پس منظر میں ایک خیال یہ ہے کہ اگر یہ مقاصد پوری طرح حاصل بھی کر لیے جائیں تو معیشت میں زیادہ فرق نہیں پڑے گا بلکہ منصوبوں کے تحت مطلوبہ مقاصد پورا کرنے کے لیے بینکوں سے زیادہ [illegible] اُمید کی جاتی ہے۔

(ایڈیٹر)

وسنت ساٹھے

معاشرتی انقلاب کی جانب
اقتصادی جمہوریت کا مقدمہ

دوسرا باب: سیاسی نظام قسط : ۶ جمہوریت کی بقا

جمہوریت کی بقا کے لیے قومی سطح پر کم سے کم دو مضبوط پارٹیوں کا ہونا ضروری ہے' جس سے عوام مقصدی انداز میں اپنی پسند کے نمائندوں کا انتخاب کرسکیں۔ پارٹی کے عہدیدار اور اس کی قیادت اگر جمہوری انداز نظر کو فروغ دینے سے فی الواقعی دلچسپی رکھتی ہے، تو اسکے لیے خود اس کی تنظیم بھی جمہوریت پسند ہونی چاہیئے۔ اگر پارٹی کے تنظیمی ڈھانچے میں طریق کار عملی طور پر جمہوری نہیں ہے، تو وہ لوگ بھی جو کہ اس پارٹی کے ذریعے عوام کا اعتماد حاصل کریں گے اور اس طرح سیاسی اقتدار کے مالک بنیں گے، جمہوریت میں یقین و اعتماد کے بغیر ہی کام چلائیں گے۔

نمائندگی کے کردار کے اس اصول کو جس کے تحت آزادانہ اور منصفانہ انتخاب میں عوام اپنی پسند کے نمائندوں کو چُن لیتے ہیں' ہر سیاسی پارٹی کے داخلی طریق کار پر لاگو کرنا چاہیئے۔ سیاسی پارٹی چوں کہ بہتر طور پر منظم ہوتی ہے اور چوں کہ وہاں لیڈروں اور ارکان کے روزمرّہ کے باہمی ردعمل کا اظہار ہوتا رہتا ہے' لہٰذا اس کا تنظیمی ڈھانچہ بھی منظم ہوتا ہے۔ سیاسی پارٹی کی رکنیت بھی واضح طور پر قابل شناخت اور قابل تشریح ہونی چاہیئے۔ یعنی اس میں وہ ارکان ہونے چاہئیں جو اس پارٹی کے مقاصد سے اتفاق کرتے ہوں اور اس کے پروگراموں اور پالیسیوں کو عملی صورت میں دیکھنا چاہتے ہوں۔ کچھ عرصہ پہلے مَیں نے کانگریس کے صدر کے نام ایک خط میں کانگریس پارٹی کے از سرِ نو منظم کئے جانے کا مشورہ دیا تھا اور کہا تھا کہ یہ عمل بنیادی رکنیت سے شروع ہو۔ اور آج کے دور میں روپے کی قیمت کو دیکھتے ہوئے بنیادی رکنیت کی فیس ۵ روپے ہو' نیز پارٹی کے ہر رکن کو ایک شناختی کارڈ دیا جائے جس پر اس کا فوٹو اور پورا پتہ ہو۔ یہ مشورہ دیگر سیاسی پارٹیوں کے لیے بھی مفید ہو سکتا ہے۔ ذیل میں اس خط کا اقتباس نقل کیا جا رہا ہے :۔

حالیہ الیکشن جو کہ موجودہ رکنیت کی بنیاد پر لڑا جاتا ہے، وہ زیادہ تر ناقص ہے اور پارٹی کے مفاد میں نہیں ہے۔ ہر آدمی جس نے ۲۵ ممبر بنائے ہوں' اسے سرگرم ممبر کہا جاتا ہے۔ اور ہوتا یہ ہے کہ وہ ۲۵ روپے کی رقم اپنی جیب سے ۲۵ مختلف ناموں سے جمع کرا دیتا ہے۔ یہی لوگ عام ممبروں کی فہرست میں ہوتے ہیں۔ لیکن یہ نظام تنظیم کے بنیادی مفاد کے خلاف ہے۔ اور اس کے ڈھانچے کو کمزور کر دیتا ہے۔ اس لیے میرا مشورہ ہے کہ :۔

" ہر ممبر سالانہ ۵ روپے جمع کرائے اور یہ رکنیت از سرِ نو ہو۔ اسے شناختی کارڈ دیا جائے جس پر اس کی تصویر ہو' ان کو بلاک کے کور میں محفوظ طریقے پر رکھا جا سکتا ہے۔ اس کی ایک کاپی ریاستی سطح پر اور دوسری مرکزی دفتر میں ہو' اس طرح سے جمع شدہ رکنیت کی اس فیس کو اس طرح تقسیم کیا جا سکتا ہے:

دو روپے کارڈوں کی چھپائی کے لیے'
ایک روپیہ مرکزی دفتر کے فنڈ کے لیے' ایک روپیہ ریاستی دفتر کے لیے اور ایک روپیہ ضلع کے دفتر کے لیے۔ اس کے ساتھ ہی سرگرم ممبر اور تمام ممبر جیسی کوئی تقسیم نہیں ہونی چاہیئے جو لوگ پارٹی کی دلچسپیوں سے سرگرمی دکھائیں گے، یقیناً ان کے لیے بہتر مواقع میسر آسکیں گے۔ بلاک کی سطح سے اوپر کی جانب تنظیمی ڈھانچہ ان ارکان کی طرف سے منتخب ممبروں کی بنیاد پر ہو۔ اس کے لیے غیر جانب دار انتخابی نظام وضع کیا جا سکتا ہے۔ یہ نظام الیکشن کمیشن کے طرز پر ہی اپنا کام جاری رکھ سکتا ہے۔

پارٹی کے فنڈ اور مالی ڈھانچہ

کانگریس ملک بھر میں تیس برس سے زیادہ عرصے سے کام کر رہی ہے۔ لیکن اس عرصے میں مختلف سطحوں پر کام کرنے والی تنظیمیں حتیٰ کہ ضلع یا تعلقہ کی سطح تک کی تنظیمیں مالی اعتبار سے مضبوط نہیں ہیں۔ البتّہ افراد نے فائدہ اٹھایا ہے اور ادارے وجود میں آئے ہیں۔ لیکن وہ پارٹی سے جُڑے ہوئے نہیں ہیں اور پارٹی کے یونٹوں کو ان سے کوئی باقاعدہ مالی امداد نہیں ملتی۔ شہری علاقوں اور مرکزوں میں آمدنی کا ایک

باقاعدہ ذریعہ عمارتوں سے وصول ہونے والا کرایہ ہے۔ بہت سے افراد اور کاروباری لوگ اپنے اثر و اقتدار سے پلاٹ حاصل کر چکے ہیں اور یہ پلاٹ اہم تجارتی مرکزوں میں واقع ہیں۔ ان پر بڑی بڑی عمارتیں اور تجارتی مراکز تعمیر کر لیے گئے ہیں۔ یہ عمارتیں بنکوں وغیرہ سے قرض لے کر بنائی گئی ہیں۔ کچھ نے زندگی بیمہ کارپوریشن وغیرہ سے قرض لے کر یہ عمارتیں بنائی ہیں۔ ان عمارتوں سے بھاری کرایہ وصول کیا جا رہا ہے۔ اگر پارٹی دفاتر کو اہم مقامات پر پلاٹ دلا کر ان پر کچھ عمارتیں بنوا دی گئی ہوتیں اور پھر ان کو بنکوں وغیرہ کو کرائے پر دے دی گئی ہوتیں تو اُن سے ضلع اور ریاست کی سطح کے دفتروں کی مالی حالت سُدھر جاتی۔ اس سے وہ اپنے عملے کا خرچ چلا سکتی تھیں۔ کوئی بھی سیاسی پارٹی یہ کام بغیر کسی اعتراض کے انجام دے سکتی ہے۔

ضلع اور ریاست کی سطح کے دفاتر کے لیے جائز آمدنی کا مستقل ذریعہ ہونا ضروری ہے۔ جس سے کہ وہ اپنے کارکنوں کو اچھی تنخواہ دے سکیں۔ اگر ضلع یا ریاست کی سطح کے پورے وقت کام کرنے والے صدر اور جنرل سکریٹری کو ایک ایم۔ ایل۔ اے یا ایم۔ پی کے مساوی تنخواہ مل جائے تو ہر شخص کو قانون ساز اداروں میں جگہ حاصل کرنے کی ضرورت محسوس نہ ہو۔

پارٹی ورکروں کے لیے ترقی کے مواقع

۱۔ اب وہ وقت آگیا ہے کہ ہم صحیح شعبے کے لیے صحیح آدمی کو انتخاب کریں۔ اس کے لیے ممبروں کی ان کی اپنی پسند اور ان کے اپنے رُجحان کے مطابق نشاندہی کرنی ہوگی۔ اس کے ساتھ ہی ان کی کوالی فیکیشن، مذاق اور شوق کو بھی سامنے رکھنا ہوگا۔ مختلف اداروں میں نظم و نسق سے متعلق عہدوں سے رکن بنا کر بھی پارٹی ورکروں کو ترقی دی جا سکتی ہے۔ بالعموم یہ وہ ادارے ہوتے ہیں جو مالیات کے سرکاری اداروں سے رقم حاصل کرتے ہیں۔ پالیسی یہ بنانی ہوگی کہ ہر وہ ادارہ خواہ وہ سرکاری ہو یا غیر سرکاری، جو کہ اپنے فنڈ کا ۵۰ فی صد سے زیادہ حصہ سرکاری مالیاتی اداروں سے لے، اپنے انتظامی بورڈ میں کم سے کم تین آن ڈائرکٹروں کو لے جنھیں اُن مالیاتی اداروں کی طرف سے نامزد کیا گیا ہو۔ ان میں سے ایک ڈائرکٹر مالی شعبے سے تعلق رکھتا ہو جبکہ ایک ریاستی سرکار کی طرف سے اور ایک مرکزی سرکار کی طرف سے نامزد کردہ ہو۔ یہ ارکان حکمراں پارٹی کے مجاز اور سرگرم کارکن ہوں۔ ان ارکان کو ہر مہینہ باقاعدہ تنخواہ ملے۔ ان کو ان مختلف صنعتی اور تجارتی اداروں میں تجربہ حاصل ہوگا اور اس کے ساتھ ہی وہ عوام کے نمائندے کی حیثیت سے حکمراں پارٹی کے مقاصد پر عمل درآمد کی جانچ بھی کر سکیں گے۔

لیجسلیچروں کو مختلف باضابطہ کمیٹیوں میں بانٹ کر قانون سازی کے عمل کو بھی از سرِ نو منظم کرنا ضروری ہے۔ قانون کے بل ایوان میں پیش کئے جانے کے بعد ان کمیٹیوں کے روبرو جانے چاہئیں جو کہ اس کی ہر کلاز پر غور کریں۔ اور اس کے بعد حتمی خواندگی کے لیے ایوان میں لایا جائے۔ اس سے قانون ساز اداروں میں بہت سا وقت بچ سکے گا اور ارکان قانون سازی میں مثبت طور پر معاون ثابت ہو سکیں گے۔ اسمبلی یا پارلیمنٹ میں قانون سازی کے عمل سے ارکان کی دلچسپی کے نہ ہونے کا ایک سبب یہ ہے کہ ان کے پاس کسی بل پر غور کرنے کے لیے چند منٹ بھی تو نہیں۔ اگر اس کے لیے کمیٹی ہو جہاں اس پر غور ہو سکے، تو سیاسی پارٹیاں بھی ایسے ارکان چننے پر مجبور ہوں گی، جنھیں قانون سازی کا علم ہو اور جو اہم موضوعات کے بارے میں باخبر ہوں۔

پارٹی کے ارکان کے لیے ان ادارہ جاتی اور قانون سازی کے مواقع کو چھوڑ کر جن کا ذکر اُوپر کر دیا گیا ہے، مزید سیل قائم کئے جا سکتے ہیں۔ مثلاً سائنس اور ٹیکنالوجی کا شعبہ اور ذرائع ابلاغ کا شعبہ، ماحولیات کا شعبہ وغیرہ وغیرہ۔ ان شعبوں میں پارٹی ممبر زیادہ باقاعدگی سے مطالعے کریں گے۔ ان میں مختلف موضوعات کے ماہرین حصہ لیں گے۔ اور ان کو ہمدرد و معاون کے طور پر ان شعبوں سے وابستہ کیا جائے گا۔ ان خصوصی ماہرین اور پارٹی کے ارکان کے درمیان خصوصی رابطہ قائم رہنا چاہیئے اس کے لیے اسٹڈی سرکل، کے طریق کار کا احیا ہو سکتا ہے۔ یہاں مختلف سماجی و اقتصادی اور دیگر موضوعات پر سنجیدگی سے غور کیا جا سکتا ہے فلاحی ریاست میں حکومت کی طرح سے، اب ایک سیاسی پارٹی کو زندگی کے تمام شعبوں سے جُڑا ہونا چاہیئے۔ اور مختلف شعبوں میں غور و خوض کا کافی موقع فراہم کیا جانا چاہیئے اس وقت پارٹی ممبروں کی مختلف سطحوں کی سرگرمیوں میں تصنّع کا عنصر زیادہ ہے۔ اور یہ سرگرمیاں بالعموم سطحی نوعیت کی ہوتی ہیں۔ یہ زیادہ تر انتخابی مُہم کی شکل میں ہوتی ہیں اور پارٹی ممبروں کو اس کا مشکل ہی سے وقت مل پاتا ہے کہ وہ کسی خاص موضوع پر سنجیدگی سے غور کریں۔

میرا اکثر اس بات میں یقین رہا ہے کہ ہمیں پارٹی ورکروں کو مُفت خدمت کرنے کی حوصلہ افزائی نہیں کرنی چاہیئے۔ اور کسی کاز کے لیے بے لوث قربانی کے نام پر یہ خدمات انجام دیئے جانے کی حوصلہ افزائی نہیں ہونی چاہیئے۔ اس کے مُضر اثرات واضح ہو رہے ہیں۔ خاص کر ایسی صورت میں جبکہ وہ دیکھتے ہیں کہ اُن سے مفت خدمت کے لیے کہنے والے بذاتِ خود اقتصادی طور پر بے حد خوشحال ہیں اور انھوں نے اعلا عہدے حاصل کئے ہیں۔ لہٰذا ایسی کوشش کی جانی چاہیئے کہ جو بھی پارٹی کے لیے پُورے وقت کام کرے، اس کو باقاعدہ

اس کی اُجرت اور معاوضہ ملے اور وہ اس کی جائز آمدنی کا ذریعہ بنے۔ ایک اور پہلو جس پر سنجیدگی سے غور کیا جانا چاہیئے، وہ ایک ایسے قومی ادارے کی ضرورت ہے جسے ملک کے تمام شہری براہِ راست چُنیں۔ اس طرح کا ادارہ ملک کے اتحاد اور سالمیت کے لیے ضروری ہے۔ اس کے بدلے قومی سطح پر ایک سے زیادہ کام کرنے والی قومی پارٹیوں کے فروغ کی ضرورت سامنے آسکے گی۔ اس مشورے پر بھی غور کیا جاسکتا ہے کہ کیا صدرِ جمہوریہ، نائب صدر جمہوریہ اور وزیر اعظم کا انتخاب بھی براہِ راست عوام کرسکتے ہیں۔ انھیں پالیسی سے متعلق امور میں پارلیمنٹ کے رُوبرو جواب دہ ہونا چاہیئے۔ لیکن پارلیمنٹ انھیں اگر نکالنا چاہے تو وہ صرف اسی صورت میں ایسا کرسکتی ہے کہ ایوان میں موجودہ ارکان کی دو تہائی تعداد ایسا کرے اور ووٹنگ میں بھی پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں میں مکمل اکثریت حاصل ہو۔ صدرِ جمہوریہ، نائب صدر جمہوریہ اور وزیر اعظم کے اختیارات کی بھی پوری طرح وضاحت ہونی چاہیئے۔ ان کے امور میں باہمی آویزش کی گنجائش نہ رہ کر ایک کے کام دوسرے کے لیے معاون ثابت ہونے چاہئیں۔ مثال کے طور پر صدر جمہوریہ تمام انتظامی اور عاملانہ کارروائیوں کے لیے ذمہ دار ہوسکتا ہے تاکہ انتخاب کرنے والوں نے جو امور سونپے ہیں، وہ ان پر عمل درآمد کرا سکے۔ اور ملک کا نظم و نسق پارلیمنٹ کی طرف سے وقتاً فوقتاً بنائے گئے قوانین کی روشنی میں چلایا جاسکے۔ نائب صدر جمہوریہ، صدر جمہوریہ کی مدد کرے اور اسے بھی چند اہم شعبے سونپے جاسکتے ہیں۔ وزیر اعظم بطورِ خاص پارلیمنٹ کا ذمہ دار ہو، اور اس کے سامنے جواب دہ ہو۔ اس کے لیے آئین کے آرٹیکل ۵۲ تا ۷۵ میں ترمیم ضروری ہوگی۔ اس کے بعد ہندوستان کے کل دو ٹرمل کر صدر جمہوریہ کا براہِ راست انتخاب کرسکتے ہیں۔

جیسا کہ اس سے قبل کہا جاچکا ہے کہ انتظامیہ کی بڑی بڑی معات کے تحت پارلیمنٹ باضابطہ کمیٹیوں میں تقسیم کی جاسکتی ہے جہاں تھوڑی تھوڑی تعداد میں ارکان قانون سازی کے موضوعات پر گہرائی سے غور کرسکیں گے اور مختلف محکموں کے انتظامیہ پر نگاہ بھی رکھ سکیں گے۔ پارلیمنٹ کا عام کھلا اجلاس بلانے کے لیے صرف ۲ یا ۳ مہینے درکار ہوں گے۔ جب ارکان کو عام پالیسیوں اور مسائل پر اظہارِ خیال کی آزادی ہوگی تو وہ مختلف موضوعات پر زیادہ کھل کر اور گہرائی کے ساتھ اظہارِ خیال کرسکیں گے۔

اس کے نتیجے میں ایسے ارکان کے انتخاب کے لیے ذہن بن سکے گا جو اپنے علم و تجربے کے اعتبار سے افضل ہوں اور جو فی الواقعی اپنی خدمات اور اپنے علم سے فائدہ پہنچا سکیں۔ چونکہ سیاسی عہدوں سے نفع بخش کام مل سکیں گے جیسا کہ ہر طرح کی تنظیم کے بورڈ آف مینجمنٹ کی رکنیت اور بانتخواہ ارکان کی تقرری، اس لیے ان کی سرگرمیاں بھی زندگی کے تمام شعبوں پر حاوی ہوں گی۔ اس طرح پارٹی کا ہر رُکن قانون ساز ادارے کا رُکن بننے کی کوشش نہیں کرے گا۔ تاوقتیکہ اسے اس کا چسکا ہی زیادہ ہو۔ یہ صورتِ حال مواقع کی کمی سے پیدا ہوتی ہے۔

روزگار کے جب کافی مواقع نہیں ہوتے تو لوگ یقیناً ایسی جگہوں کے لیے بھی کوشش کرنے لگتے ہیں جہاں کہ ان کی میرٹ اس کے لیے متقاضی نہیں ہوتی اور وہ خصوصی شعبوں مثلاً میڈیکل سائنس اور انجینیرنگ نیز انتظامی عہدوں کے لیے خواہشمند اور کوشاں نظر آتے ہیں۔ یہ صورتِ حال انتہائی خطرناک ہے۔ اور ترقی کے لیے راستہ روکتی ہے۔ اگر کسی شخص کی جہاز اُڑانے کی صلاحیت نہ ہو اور اسے محض سفارش یا کسی اور خیال سے ایسا کرنے دیا جائے تو یہ کیسے ممکن ہوسکتا ہے۔ اس کے لیے تو اس کی صلاحیت پر ہی بھروسہ کیا جاسکتا ہے۔ یہی مثال سرکاری عہدوں پر صادق آتی ہے جہاں عوام کی زندگی کسی نہ کسی شکل میں ان لوگوں کی صلاحیتوں پر منحصر ہے جنھیں ذمہ داری سونپی جاتی ہے۔ لیکن سرکاری عہدوں پر ایسے لوگوں کا انتخاب ہو جانے سے جو کہ اس کے اہل نہیں ہیں، جو نقصان پہونچتا ہے، اس کا احساس فوری طور پر نہیں ہو پاتا۔ خوش قسمتی سے ابھی تک ایسا انتظامیہ ہے جو فیصلوں پر عمل درآمد کرا دیتا ہے، لہٰذا عوام اس بات کے لیے زیادہ پریشان معلوم نہیں ہوتے کہ وہ لایق افراد کو اپنا نمائندہ بنا کر قانون ساز اداروں میں بھیجیں۔ اس طرح روزگار کے مواقع بڑھیں گے۔ اور قانون ساز ادارے زیادہ موثر کردار ادا کرسکیں گے۔ ان میں مختلف ایسی کمیٹیاں ہوں گی جو قانون سازی کے عمل کو اپنے تجربے اور مطالعے نیز مشاہدے سے موثر بنا سکیں گی اور اس طرح نمائندگی کی نوعیت بھی خود بخود بدل جائے گی۔ اس کے بدلے منتخب نمائندوں کے لیے عزت و احترام میں اضافہ ہوگا اور یہ احترام محض انتظامیہ میں ہی نہیں بلکہ عوام میں بھی بڑھے گا۔ جمہوریت میں یقین و اعتماد کو بحال کرنے کے لیے قانون ساز اداروں کی کارکردگی بہتر بنانی ضروری ہے۔

پارلیمانی نظام کی از سرِ نو تنظیم کا معاملہ غور و خوض کا محتاج ہے۔ اس طرح عوام کے ذریعے قومی سطح پر منتخب ہونے والے ارکان پر مشتمل نظام بھی نظرِ ثانی چاہتا ہے۔ انتشار پسندانہ رُجحانات اپنا سر اُٹھا رہے ہیں، ان میں علاقے کے نام پر اور فرقوں کے نام پر کشیدگی پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ جس سے ملک کی سالمیت کو خطرہ لاحق ہوگیا ہے۔

اس برصغیر میں تجربہ شاہد ہے کہ اس طرح کے رُجحانات غالب آجانے پر ملک پارہ پارہ

ہو جاتا ہے اور قومی ایکتا خطرے میں پڑ جاتی ہے۔ لہٰذا تمام دانشوروں کے لیے یہ غور و خوض کا موضوع ہے کہ اس طرح کی پیش رفت کو کیسے روکا جائے۔

آج بھی اپوزیشن کی قیادت نے ذاتی اور گروہی مفادات کو قومی مفادات کے تابع کرنے پر غور نہیں کیا ہے تاکہ قومی سطح پر کانگریس کا متبادل نظام معرض وجود میں آسکے۔ اس لیے لسانی بنیادوں پر، علاقائی بنیادوں پر یا فرقوں کے نام پر جذبات سے کھیلنے کا عمل زور پکڑ گیا ہے۔ ہر شخص یہ محسوس کرتا ہے کہ یہ رجحان خطرناک ہے۔ کیوں کہ اس سے انتشار پسندانہ اور آپس میں ایک دوسرے کو بانٹنے کے عمل کو بڑھاوا ملتا ہے۔ سیاسی قیادت تنگ نظری پر مبنی خیالات و تصورات سے بالاتر ہونی چاہیئے تاکہ ملک میں مضبوط جمہوری نظام پروان چڑھ سکے اور قوم کا اتحاد برقرار رہ سکے۔ کبھی کبھی ایسا محسوس ہوتا ہے کہ دانشوروں کی نوجوان نسل کو یہ چیلنج قبول کرنا ہے اور اگر ضروری ہوا تو سیاسی طور پر جامد لیڈروں کو میدان سے ریٹائر کر دینا ہے اور اس متحرک قومی قوت کو برسرکار لانا ہے۔ جو جمہوریت میں یقین رکھتی ہو اور جسے پوری قوم کی بھلائی کا خیال ہو، اور جو ہندوستان کو مضبوط بنا سکتی ہو۔

متوازن طریقے پر اقتصادی اور سماجی ترقی کی ہمت افزائی کرنے میں معاون جز کے طور پر ہی۔ علاقائی خود مختاری کا تصور پنپ سکتا ہے اور صرف اسی صورت میں اس کو گوارا کیا جا سکتا ہے۔ اسے مذہب، ذات پات اور زبان کے نام پر محدود نہیں رہنے دیا جا سکتا۔ موثر عمل آوری کے لیے اگر لامرکزی نظام مفید ثابت ہو، تو ایسی ہی کوئی نئی تشکیل دی جا سکتی ہیں مگر اس طرح کہ یہ کسی بھی طرح بحیثیت مجموعی ہندوستانی ایکتا اور سالمیت کی راہ میں حائل نہ ہوں۔ یہ مسائل معقول پسندانہ بات چیت سے حل ہو سکتے ہیں۔ درحقیقت اس طرح کا علاج اس وقت بھی سوچا گیا تھا، جب کہ آئین میں آرٹیکل ۳۷۰ کو شامل کیا گیا تھا۔

بدقسمتی سے ہماری قومی سطح پر سب سے بڑی کمی یہ ہے کہ تمام سطحوں پر دانشوروں کے درمیان تبادلۂ خیال کا موقع نہیں ہے۔ جب تک دانشوروں میں اور سیاسی قیادت کے مابین ایک ساتھ بیٹھ کر کھلے ذہن سے تبادلۂ خیال کا موقع نہیں ملتا، اور جب تک ذاتی اور تنگ نظری پر مبنی گروہی مفادات کو قومی مفادات کے تابع نہیں کیا جاتا اس وقت تک صحت مند پارلیمانی نظام برقرار رکھنا ممکن نہ ہوگا۔ فرقہ وارانہ قوتیں اپنا سر ابھار رہی ہیں اور ملک کے اتحاد کو خطرے میں ڈال رہی ہیں، اور صحت مند پارلیمانی نظام کی عدم موجودگی میں یہ خطرہ برابر بنا رہے گا۔

کبھی کبھی یہ محسوس ہوتا ہے کہ یہ قومی اخبارات جنہوں نے یہ ثابت کیا ہے کہ یہ اجتماعی طور پر رجحانات میں تبدیلی لانے کا ذریعہ بن سکتے ہیں، جیسا کہ بہار پریس بل کے معاملے میں دیکھا گیا ہے، قومی جمہوری پارٹی کی ضرورت پر زور دینے کا فیصلہ کر لیں تو وہ ایک ایسی مہم چلا سکتے ہیں جن سے سیاسی رجحانات والی تمام قوتوں کو ایک ساتھ اکٹھا کیا جا سکے اور قومی سطح پر ایک متبادل پارٹی تیار کی جا سکے۔ اگر اخبارات اور ملک کے نوجوان اس معاملے کو سنجیدگی سے اٹھائیں تو یہ معاملہ مشکل نہیں۔ اگر اس نازک موقع پر قومی سطح پر منضبط سیاسی متبادل پارٹی معرض وجود میں آسکے تو یہ جمہوریت کی بڑی خدمت ہوگی۔ لیکن اس کے لیے زبردست کسوٹی یہی ہے کہ نفرت کسی کے لیے دل میں نہ ہو، دوستی اور جذبۂ ترحم ہر ایک کے لیے ہو، خود غرضی اور انا نہ ہو اور رنج و غم نیز مسرت و خوشی میں سکونِ دل ہاتھ سے نہ جانے پائے۔

اس سلسلے میں عدم تشدد کے نظریے پر غور کرنا ضروری ہے۔ جیسے مہاتما گاندھی نے پیش کیا اور ہندوستان کو اس بات پر فخر ہے کہ اس سرزمین پر زبردست دانشور اور سادھو سنت ہوئے ہیں۔ مثلاً مہاتما بدھ، گورو نانک، اور حال ہی میں مہاتما گاندھی اور ونوبا بھاوے، ہم مہاتما گاندھی کی زندگی کو مسلسل پیش کر رہے ہیں اور عدم تشدد کے نظریے کی تبلیغ میں مصروف ہیں۔ ظلم و ستم کے خلاف بھی مقابلے کے لیے عدم تشدد کے ذریعے کی تلقین کی جاتی رہی ہے۔ حال ہی میں ایٹن برو کی مہاتما گاندھی کی زندگی پر جو فلم تیار کی گئی ہے، اس کے ذریعے پوری دنیا میں عدم تشدد کے نظریے کا پرچار ہوا ہے۔ لہٰذا بیرون ہندوستان کے عوام قدرتی طور پر اس بات کے جاننے کے خواہشمند ہیں کہ ان کے عدم تشدد کے نظریے کو خود ان کے ملک میں کس قدر اپنایا گیا ہے۔ خوش قسمتی سے مہاتما گاندھی کے اس فلسفۂ حیات کے تئیں کوئی بھی اختلافی رائے نہیں ہے اور سبھی اس کے قدردان ہیں اور اسے عزت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔

میرا مشورہ یہ ہے کہ ایک بنیادی طریقِ کار یہ ہونا چاہیئے کہ تمام سیاسی پارٹیاں اور سماجی اور مذہبی تنظیمیں یہ عہد لیں کہ وہ کسی بھی داخلی تحریک یا جدوجہد کے لیے تشدد کا طریقہ نہیں اپنائیں گی۔ میں ۲۵ سال سے زیادہ عرصے تک ٹریڈ یونین کا سرگرم کارکن رہا ہوں اور ٹریڈ یونین تحریکوں کی مدتوں رہنمائی کی ہے۔ بہت سے احتجاجی جلوسوں کی قیادت کی اور بہت سے مورچوں کی قیادت کی۔ درحقیقت یہ میری ایک مسلسل سرگرمی رہی ہے۔ تجربہ کی بنیاد پر میرا یہ اعتقاد ہے کہ اگر تحریک کے قائد کا ذہن پاک صاف ہے تو تشدد کی کہیں ضرورت نہیں پڑے گی اور اس سے سرے سے بچا جا سکتا ہے۔ ٹریڈ یونین کی میری تمام سرگرمیوں میں، میں نے دیگر سرگرم کارکنوں کو ترغیب دے کر اور سمجھا بجھا کر اس بات کو یقینی بنانے کی کوشش کی کہ ہم کہیں بھی تشدد

پر نہ اُتر آئیں۔ ایسی صورت میں پولیس کو اس بات کو یقینی بنانا پڑتا ہے کہ جب تک مظاہرے پُرامن ہوں اور لاء اینڈ آرڈر کا مسئلہ نہ بنے، مثلاً یہ کہ وہ ٹریفک کو نہ روکیں، یا معمول کی زندگی میں فرق لانے کے لیے مجبور نہ کریں، اس وقت تک وہ کسی بھی طور پر طاقت کا استعمال نہ کرے۔ لاء اینڈ آرڈر کے ذمّہ داروں کو انفرادی جرائم کی روک تھام کی ہمیشہ کوشش کرنی چاہیئے اور کسی کو بھی اس طرح کے حق دینے کے سوال پیدا نہیں ہوتا بلکہ اس طرح کے حق دینے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کہ وہ انفرادی طور پر یا اجتماعی طور پر مہلک ہتھیار رکھے اور وہ بھی مذہب کے نام پر۔ اس مسئلے پر سنجیدگی سے غور کیا جانا چاہیئے اور اس بارے میں سنجیدگی سے پوچھ تاچھ ہونی چاہیئے۔ ہتھیار لے کر چلنا تاریخ کے کسی دوَر میں ضروری رہے ہوں گے لیکن اسے اس دوَر میں بھی مذہب کا جزو بنا لینا غیر معقولیت کی انتہا ہے۔ بدقسمتی سے عوام اس طرح کے موضوعات کو زیر بحث لاتے ہوئے بھی ڈرتے ہیں۔ یہ غیر معقولیت پسندانہ عصبیت ہی ہے جس سے کٹّر پنتھی تحریکوں کا مذہب کے نام پر احیاء ہو رہا ہے۔ جیسا کہ پہلے کہا جا چُکا ہے کہ تمام مذاہب اور ان کے بانیوں نے انسانوں کے مابین مفاہمت امن اور صلح و دوستی کی تعلیم دی ہے۔ لہٰذا ملک میں اگر ہر سیاسی پارٹی اور سماجی اور مذہبی تنظیم اپنے مسائل کے حل کے لیے پُرامن طریقوں کو اپنانے کا عہد کر لے تو ہندوستان عدم تشدّد کے اُس فلسفے کی جسے راشٹر پِتا نے سِکھایا، ایک زندہ اور عملی مثال پیش کر سکتا ہے۔

جواہر لال نہرو نے ہمیں جس سماج وادجمہوریت کی تعلیم دی، اس پر ایک نظر دَوڑانی بھی ضروری ہے۔ ملک کے سامنے ابتدا میں منصوبہ سازوں نے جو مقاصد رکھے تھے، ان میں سے یہ ایک اہم مقصد ہے۔ ہم سماج واد کی بات چیت بہت بڑھ چڑھ کر کرتے ہیں۔ یہ ہمارے آئین کی تمہید میں بھی شامل ہے۔ اور اسے جمہوریت اور سیکولرازم کے بنیادی مقاصد کے ساتھ شامل کر دیا گیا ہے، لیکن اب یہ اصطلاح افسانۂ ماضی بن گئی ہے اور بہت کم لوگ اسے تسلیم کرتے ہیں۔ سبب یہ ہے کہ ہم جس لمحے سوشلزم کی بات کرتے ہیں، اسی وقت اصولی اور منطقی بحثوں میں اُلجھ جاتے ہیں اور اقتصادی شعبوں کے ماہروں کے نظریات کا اندازہ لگانے لگتے ہیں جو کہ جمہوریت اور انفرادی آزادی کے اصولوں سے ہم آہنگ نہیں ہیں۔

سچّی بات یہ ہے کہ سوشلزم یا سماج واد کا مقصد یہ ہے کہ ہر فرد کو اس بات کی زیادہ سے زیادہ آزادی حاصل ہو کہ وہ اپنی پسند کی اقتصادی، سماجی اور سیاسی سرگرمی میں شریک ہو اور اس کے ذریعے نہ صرف اس کی ذات کو فائدہ ہو بلکہ پُوری نوعِ انسانی کا بھلا ہو۔ یہاں بنیادی تصور یہ ہے کہ ہر فرد کے اپنے ہر عمل سے پوری نوعِ انسانی اور نسلِ انسانی مستفید ہو سکے۔ اس کی مثال انسان کے جسم سے دی جا سکتی ہے۔ جسم کے مختلف اعضاء اپنے ڈیل و ڈول، جثّہ اور قد و قامت کے اعتبار سے ایک دوسرے سے مختلف ہیں لیکن ہر عنصر اپنی جگہ بے حد اہم ہے۔ دماغ کا کام بالکل ایک حکومت یا سرکار کے مانند ہے۔ یعنی وہ جسم کے تمام حصّوں کو ضروری ہدایات اور شعور دیتا ہے تاکہ وہ صحت مند طریقے پر ہم آہنگی کے ساتھ کام کر سکیں۔ ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ دماغ بھی اس وقت تک نہ تو سوچ سکتا ہے، نہ کام کر سکتا ہے جب تک کہ پھیپھڑے اور قلب اسے تازہ خون فراہم نہ کرتے رہیں۔

لہٰذا ہمیں ایک ایسا اقتصادی جمہوری نظام مطلوب ہے جس میں ہر سطح پر سبھی کی شرکت یقینی ہو، تاکہ تمام طبقات کے درمیان رابطہ، تال میل اور ہم آہنگی قائم رہے۔ اور کہیں بھی اگر کوئی انحراف ہو تو اس کی اصلاح عمل میں آ سکے۔ پارلیمانی سطح پر باضابطہ پارلیمانی کمیٹیوں کو تشکیل دے کر یہ مقصد حاصل کیا جا سکتا ہے۔ وزارتوں اور انتظامیہ کو ان کمیٹیوں کے روبرو جوابدہ ہونا ہے۔ یہ کمیٹیاں ان کے کاموں پر مسلسل نظر رکھیں گی۔

جواہر لال نہرو کو اس بات پر یقین تھا کہ ہندوستان کے اقتصادی مسائل کا یقینی حل سماج واد میں ہے۔ وہ چاہتے تھے کہ اسے جمہوریت کے سیاسی دائرے میں رہ کر ہی اختیار کیا جائے تاکہ انفرادی آزادی کے فائدے برقرار رہ سکیں، اور اس کے ساتھ ہی سماجی اور اقتصادی انصاف لایا جا سکے۔ ۱۹۳۶ میں انڈین نیشنل کانگریس سے خطاب کرتے ہوئے انھوں نے کہا تھا:-

"مجھے یقین ہے کہ عالمی مسائل اور ہندوستان کے مسائل کے حل کی کلید سماج واد ہے۔ ہندوستان سے غریبی دوَر کرنا ہو، یا بے روزگاری، ہندوستانی عوام کو پستی سے نجات دلانا ہو یا محکومی سے، یہ سب مسائل سماج واد کے طریقے پر ہی حل ہو سکتے ہیں، اس کے لیے ہمیں اقتصادی اور سماجی ڈھانچے میں دوَر رس تبدیلیاں لانی ہوں گی۔ اس کے لیے ہندوستان سے رجواڑوں کا نظام ختم کرنا ہوگا اور زمینداری کو ختم کرنا ہوگا۔ اس کا مطلب نجی ملکیت کا خاتمہ سوائے اس کے کہ اسے چند مخصوص حالتوں میں اسے باقی رکھا جائے۔ اس کے ساتھ ہی نفع کمانے کے موجودہ نظام کی جگہ کوآپریٹو نظام بروئے کار لانا ہوگا۔

جواہر لال نہرو نے ۱۹۳۶ میں اپنی خود نوشت سوانح حیات لکھی، اس میں وہ سماج واد پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہتے ہیں:-

"سماج واد زندگی اور اس کے مسائل کے تئیں ایک خاص نفسیاتی اندازِ نظر ہے۔ یہ محض ایک منطق ہی نہیں ہے۔ لابد نتیجے کے طور پر ہمارے سامنے سماج واد نظام کا قیام ہی واحد ممکن حل ہے۔ ابتدا میں یہ مکمل سرحدوں کے اندر لاگو کرنا ہے اور بالآخر بحیثیت مجموعی پُوری دنیا میں اسے لاگو ہونا ہے۔ ایک ایسا نظام جہاں دولت کی تقسیم اور پیداوار ایک منضبط نظام

کے تابع ہو جس سے وہ بحیثیت مجموعی عوام کے کام آسکے۔ اگر اس طرح کی تبدیلی لانے میں سماجی ادارے راستے میں حائل ہوں، تو ان کو بدلنا ہے۔ ان کے ساتھ سمجھوتہ کرنا اور ان کی خاطر مطلوبہ مقاصد سے منہ موڑنا صحیح راستہ اور اپنے مقصد سے انحراف ہوگا۔ ظاہر ہے کہ سماجی نظام کے تحت جو عظیم تبدیلیاں لانی ہیں، وہ محض چند قوانین کے پاس کر دینے سے نہیں آئیں گی۔ اس کے لیے بنیادی قوانین اور اقتدار کی ضرورت ہوگی جس سے مطلوبہ سمت بڑھا جائے اور اس نظام کی بنیاد رکھی جا سکے۔

اگر سماج واد نظام کی عظیم تعمیر پھر آگے کی طرف قدم بڑھایا جائے تو ایسا نہیں کہ یہ کام اس بات پر چھوڑ دیا جائے کہ جب اس کا موقع ملے گا، اسے کر لیا جائے گا یا تھوڑا تھوڑا موقع بہ موقع اسے انجام دیا جائے گا۔ سماج واد نظام کے لیے جذباتی اپیل ہی کافی نہ ہوگی۔ اس کے لیے دانشوروں کا تعاون اور ان کے دلائل اور شواہد مددگار ہوں گے۔ یہ دلائل حقیقت پسندی پر ہوں گے۔ اور اس کام کو معقول دلیلوں اور نکتہ چینیوں کے درمیان انجام دینا ہوگا۔ ہندوستان میں سماج واد کی تعمیر و تشکیل کے لیے ہندوستانی حالات کو [illegible] رکھنا ہوگا اور ان کا گہرائی کے ساتھ مطالعہ کرنا ہوگا۔

انفرادی آزادی اور جمہوریت کے ضمن میں سماج واد پر گفتگو کرتے ہوئے نہرو نے درج ذیل خیالات کا اظہار کیا:۔

"حقیقی امنِ عالم اور عالمی نظام اُسی وقت معرضِ وجود میں آسکے گا جب سماج واد کی ضرورت اور اہمیت عالمگیر پیمانے پر محسوس کر لی جائے۔ اثباتی طور پر سماج واد کو جمہوری ذرائع سے لانا ممکن ہے، بشرطیکہ جمہوریت پوری طرح کارفرما ہو، لیکن راستوں میں مختلف طرح کی دشواریوں کے امکانات ہو سکتے ہیں کیونکہ سماج واد کے مخالف اس جمہوری طریقے کو اُسی وقت مسترد کر دیں گے جب وہ دیکھیں گے کہ ان کا اقتدار خطرے میں ہے۔"

سماج وادی نظام کے تحت افراد کی زیادہ آزادی کا امکان نہیں۔ یقیناً اس صورت میں افراد کو اس سے زیادہ آزادی نہیں دی جا سکتی جتنی ان کو موجودہ حالت میں حاصل ہے۔ اس کو ذہن و ضمیر کی آزادی حاصل ہو سکتی ہے، کام کرنے کی، مہم جوئی کرنے کی آزادی حاصل ہو سکتی ہے اور محدود پیمانے پر نجی جائداد اور املاک کے حاصل ہونے کی آزادی بھی حاصل ہو سکتی ہے۔ اقتصادی تحفظ کے نتیجے میں اسے آزادی حاصل ہوگی اور یہ وہ آزادی ہے جو آج کے دور میں کم ہی لوگوں کو حاصل ہے۔ میرا خیال ہے کہ ہندوستان اور پوری دُنیا سماج واد کی طرف بڑھ کر رہے گی، مختلف ملکوں میں سماج واد لانے کی رفتار مختلف ہوگی اور اس کے لیے عبوری اقدامات یکساں نہیں ہوں گے۔

۱۴ اپریل ۱۹۵۶ کو نئی دلّی میں آل انڈیا مینوفیکچررز آرگنائزیشن کی کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے جواہرلال نہرو نے سماج واد اور سماج وادی طرز کے درمیان تمام امتیازات کے بارے میں شبہ دُور کرایا تھا۔

"سماج وادی نظریۂ حیات سماج واد ہی ہے۔ کچھ لوگ اس سلسلے میں منطقی بحثیں اٹھاتے ہیں اور اس ضمن میں اس کے مختلف امتیازات کو واضح کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ایسا کرتے وقت وہ مختلف اصطلاحات کا سہارا لیتے ہیں جیسا کہ سوشلزم، سوشلسٹ طرز اور سوشلسٹک (Scientific Pattern)

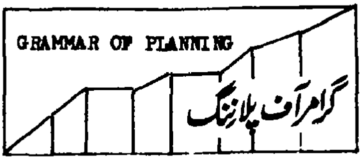
اقتصادی ترقی کی راہ میں سیاسی جمہوریت کے بارے میں اظہارِ خیال کرتے ہوئے جواہرلال نہرو نے جنوری ۱۹۳۶ء میں ایک انگریز کو خط لکھا، اس میں مذکور ہے کہ:۔

"سیاسی جمہوریت مقصد کے حصول کا راستہ ہے، حتمی مقصد نہیں۔ اس کا سرچشمہ اقتصادی تبدیلیاں لانے کی حقیقی مانگ ہے۔ اگر یہ تبدیلیاں جلد عمل میں نہ لائی گئیں تو سیاسی ڈھانچہ عدم استحکام کا شکار ہوگا۔ میں یہ سوچنے پر مجبور ہوں کہ ہندوستان میں جیسا کہ آج کل حالات ہیں، اقتصادی تبدیلیاں لانے کی ضرورت ہے اور اہم اقتصادی تبدیلی کے نتیجے میں دُور رس اقتصادی تبدیلیوں کا آنا لازمی ہے۔"

جیسا کہ شروع میں کہا جا چکا ہے کہ یہ وقت اس بات کا متقاضی ہے کہ سیاستداں، دانشور اور نوجوان تنگ نظری پر مبنی ذاتی تصورات سے بالاتر ہوں اور وسیع تر مقاصد کے حصول کی خاطر ایک ہوں جس سے نہ صرف جمہوریت کا تحفظ ہو سکے بلکہ اسے نوعِ انسانی کی خدمت کے لیے وقف کیا جا سکے۔ اکثر حقیقت پسندی اور عملی اندازِ نظر کی صورت میں، خاص کر اقتدار کا کھیل کھیلنے والوں کی نظر میں اعلیٰ ترین اقدار کی اپیل اور نظریات عملاً غیر ممکن ہیں۔ یہ محض عوام کے لیے ہیں اور ان کا تعلق زبانی جمع خرچ سے ہے۔ لیکن حقیقی زندگی میں، جس کی لاٹھی اُس کی بھینس، کا نظریہ زیادہ صادق آتا ہے۔ یہ لوگ جانتے ہیں کہ عملی سیاست میں الیکشن لڑنے کے لیے روپیہ درکار ہوتا ہے، دیگر سرگرمیوں کے لیے بھی روپیہ درکار ہوتا ہے، یہ رقم ان لوگوں سے آتی ہے جن کے پاس بے حساب روپیہ ہوتا ہے، اور صاحبِ اقتدار لوگوں کے فیصلے سے فائدہ بھی انھیں لوگوں کو ہوتا ہے جن کے پاس کالا دھن ہوتا ہے۔ ہم اکثر بدعنوانیوں کے بارے میں اتنی سطحی گفتگو کرتے ہیں جتنی کہ ہم ماحول کی آلودگی یا خون میں سمّیت وغیرہ کی۔ لہٰذا جب تک ان بُرائیوں کو روکنے کے لیے سنجیدگی سے نہ سوچا جائے اور اس کی بیخ کنی کے لیے بنیادی اقدامات پر غور نہ کیا جائے تو اس کے تھوڑے تھوڑے اور کہیں کہیں علاج کی کوشش مسئلہ کو حل نہ کر سکے گی۔ یہ بدعنوانی ہمارے مزاج میں کیسے رچ بس گئی، اس کا ذکر آئندہ آئے گا لیکن حتمی طور پر سیاسی ڈھانچہ، سماجی اور اقتصادی ڈھانچہ اور فلسفیانہ اندازِ نظر سب کی ایک ساتھ ضرورت ہے کیوں کہ ایک کا اثر دوسرے پر پڑتا ہے۔ لہٰذا اس مسئلے پر بحیثیت مجموعی نظر ڈالنی ہوگی۔ اس کے لیے ادھورا یا محض کھوکھلا اندازِ نظر مسئلے کو حل نہیں کر سکے گا۔ ●

(آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں "اقتصادی نظام")

پی. آر. دوبھاشی



پراجیکٹ پلاننگ

ڈسٹرکٹ پلان تیار کرتے وقت مقامی انجمنوں کو جن میں پنچائتیں، بلاک ڈیولپمنٹ بورڈ، لینڈ ڈیولپمنٹ بنک، لیڈ بنک اور ڈسٹرکٹ ڈیولپمنٹ کونسل شامل ہیں' اہم کردار ادا کرنا پڑتا ہے اور ان کو اپنے حلقہ اثر میں ترقیاتی منصوبے تیار کرنے بھی چاہئیں۔ ان کے علاوہ مقامی سرکاری اداروں اور عوامی رہنماؤں کو اپنے تجربات اور خیالات کے اتحاد سے عمدہ منصوبے بنانے چاہئیں جن پر باقاعدگی سے عمل ہو سکے۔ (مصنف ۱۵ باتوں کا گذشتہ شمارے میں بہ تفصیل ذکر کر چکا ہے)
حالیہ مضمون میں مصنف پروجیکٹ رپورٹ کی اہمیت کا ذکر کر رہا ہے، جو منصوبہ بندی کا نقطۂ انتہا ہے۔ اور پلان کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے پہلی منزل ہے یہ پلاننگ اور اس کی تکمیل میں ایک اہم کڑی ہے۔

قومی منصوبے کو چاہے ہم سیکٹر وار بانٹ دیں یا اسے مکانی منصوبہ بندی کے تحت بڑے پیمانے پر ہی رہنے دیں' ایک بات ضرور سامنے رکھنی ہوگی اور وہ یہ کہ اقتصادی سرگرمی کے کسی نہ کسی مخصوص شعبے میں ہر علاقے کی ضرورت کے مطابق کوئی نہ کوئی الگ سے پراجیکٹ شروع کرنا ہی ہوگا۔ پراجیکٹ پلاننگ کو اسی بنا پر منصوبہ بندی کا انتہائی نقطہ قرار دیا گیا ہے' اور یہی پلان کی تکمیل کا سرآغاز ہے۔ پراجیکٹ منصوبہ بندی اور اس کی تکمیل کے درمیان ایک کڑی ہے۔

اقتصادی نقطۂ نظر سے دیکھیں تو پراجیکٹ میں قیمتی وسائل صرف ہوتے ہیں۔ جن سے اشیاء اور کام پیدا کئے جاتے ہیں۔ سرمایہ کاری میں روپیہ لگتا ہے۔ اور نقصان کا اندیشہ بھی رہتا ہے۔ ہاں اگر پراجیکٹ بنانے سے پہلے پراجیکٹ رپورٹ تیار کر لی جائے تو جو خرچ اٹھے گا وہ بھی مناسب سمجھا جائے گا اور جو خطرہ مول لیا جائے گا وہ حق بجانب ہوگا۔ پراجیکٹ رپورٹ اقتصادی اور ٹیکنیکل اعداد و شمار پر مشتمل ایک جامع اور منظم دستاویز ہوتی ہے۔ جس میں پراجیکٹ پر خرچ آنے والی رقم، اس سے پیدا ہونے والے فوائد، اس کی خوبیوں اور خامیوں کا معقول جائزہ لیا جاتا ہے۔ کم ترقی یافتہ ملکوں کی منصوبہ بندی کے تجربہ سے ثابت ہوتا ہے کہ جہاں پراجیکٹ بناتے وقت پوری طرح دھیان نہیں دیا گیا وہاں قومی وسائل ضائع ہو گئے۔ پراجیکٹ تو اقتصادی ماحول کا ایک نگینہ ہے۔ وہ خلا میں نہیں رہتا۔ وہ تو روشنی کا ایک مرکز ہے جس سے معیشت کو روشن کرنے والی شعاعیں نکلتی ہیں۔
یہ بھی خیال رہے کہ پراجیکٹ کی کامیابی یا ناکامی معاشی ماحول کی ہی نتیجہ ہے۔ لہٰذا پراجیکٹ رپورٹ کو محض پراجیکٹ کو زیر نظر نہیں رکھنا۔ بلکہ اسے تو پراجیکٹ اور اقتصادی نظام کے باہمی رشتہ پر بھی غور کرنا ہوگا۔

پراجیکٹ کے اہم اجزاء

پراجیکٹ رپورٹ کو کئی ایک مقامات سے گزرنا ہوتا ہے۔ یعنی وسائل کی نشان دہی، تعمیر، نگہبانی، تشخیص اور ان کا جائزہ۔ پراجیکٹ کی کامیابی کا انحصار اس پر ہے کہ اس کی عقل مندانہ سے نشاندہی کی جائے۔ سائنسی انداز سے اسے بنایا جائے۔ مستعدی سے جائزہ لیا جائے۔ دانائی کے ساتھ اسے زیر عمل لایا جائے۔ اور نہایت ہوشیاری سے اس کی دیکھ بھال جاری رکھی جائے۔
پراجیکٹ کی نشاندہی ماخذ یا منزل سے کی جا سکتی ہے۔ مثلاً مختلف قدرتی وسائل سے پتہ چلے گا کہ پراجیکٹ کے لیے خام مال کہاں سے حاصل ہوگا۔ اور اس سے معلوم ہوگا کہ کس قسم کا پراجیکٹ بنایا جا سکتا ہے۔ اسی طرح مارکیٹ کی ضروریات سے ایسے پراجیکٹ کی نشاندہی ہو سکتی ہے، جو زیادہ نفع کا موجب بنے۔ ایک پراجیکٹ کسی طبقاتی پلاننگ کا جزو ہو سکتا ہے۔ یا جغرافیائی علاقے کا رنگ۔ اس کی بنیاد اندرون ملک کی ضروریات پر ہو سکتی ہے۔ یا برآمدات کے امکانات پر۔ مقصد یہ ہے۔ کہ جب امکانات کا اندازہ ہو جائے گا تو ابتدائی طور پر پراجیکٹ کی نشاندہی ہو جائے گی۔
اس کے بعد سرمایہ لگانے سے قبل سروے کی بات ہے۔ جس کی بنیاد پر ابتدائی پراجیکٹ رپورٹ بنائی جا سکتی ہے۔ جو یہ بتائے گی کہ کون کون سے لائحہ عمل چُنے جا سکتے ہیں۔ یہی ابتدائی پراجیکٹ رپورٹ مکمل پراجیکٹ کا انتخاب کرنے میں کارآمد ثابت ہوئی ہے۔ جب یہ انتخاب طے پا جاتا ہے تو پراجیکٹ رپورٹ کی تفصیلات طے کرنے کا مرحلہ آتا ہے۔ اور اس رپورٹ کے تین حصے ہوتے ہیں۔ انجنیئرنگ، اقتصادیات اور انتظامیہ۔ انجنیئرنگ پراجیکٹ پیداوار کے طریقہ کار۔ پلانٹ اور مشینری۔ کارخانے کی جگہ اور محل وقوع۔ کارخانہ لگانے اور تعمیر کرنے کا پروگرام اور اس سے تعلق رکھنے والے دوسرے کام یعنی پانی اور بجلی کی فراہمی کے معاملات کی تفصیل ہوتی ہے۔

پراجیکٹ اکنامکس

اقتصادی پراجیکٹ رپورٹ میں مارکیٹ کا جائزہ اور مانگ کا ذکر ہوتا ہے۔ پراجیکٹ پلاننگ کا نقطۂ آغاز ہی مانگ کی نشاندہی اور

مارکیٹ کی ضرورت ہے۔ آمدنی اور قیمتوں کا مقصد ہی مانگ ہے۔ ہوسکتا ہے کہ چالو قیمتوں پر کچھ مانگیں پوری نہ کی جاسکیں، اور یہی مانگیں ہیں جو پوری نہیں ہوتیں۔ جن کو پورا کرنے کے لیے نئے پراجیکٹ بنائے جاتے ہیں۔

مارکیٹ کے تجزیے کے اعداد و شمار کی بنیاد ان اطلاعات پر ہوتی ہے جو گاہکوں کی پسند۔ ان کے نظریے اور واقعات کے سروے سے حاصل ہوتے ہیں۔ ماضی میں جو کام ہوئے ہیں ان سے اندازہ لگا کر مستقبل کے بارے میں فیصلہ کیا جاسکتا ہے، لیکن ایسا اندھا دھند نہیں کرنا چاہیئے۔ کیونکہ مستقبل کی تصویر ماضی سے مختلف ہوسکتی ہے۔ کئی بیرونی عناصر جن میں آبادی، آمدنی، پسندیدگی کے معیار، بجلی کی مانگ میں تبدیلی وغیرہ شامل ہیں۔ اس تصویر میں نئے رنگ بھر سکتے ہیں۔ نئے نئے پراجیکٹ جن اشیا اور کاموں کو مستقبل میں فراہم کرنے کے بارے میں قیاس لگاتے ہیں ان کو ان باتوں کا خاص طور پر دھیان رکھنا چاہیئے۔

اگر مارکیٹ کے سروے سے یہ پتہ چلے کہ نئے پراجیکٹ سے بننے والی اشیار کی مارکیٹ میں مناسب مانگ ہے تو پھر یہ فیصلہ کرنا ہوگا کہ کارخانہ کہاں لگایا جائے اور وہ کتنا بڑا ہونا چاہیئے۔ کارخانہ اتنا ہی ہونا چاہیئے۔ جس سے کہ وہ مانگیں پوری ہوسکیں جو ابھی تک رہ گئی ہیں اور اگر وہ مانگیں ایسی ہیں کہ ان کو پورا کرنے کے لیے تیکنیکی طور پر چھوٹے سے چھوٹا کارخانہ بھی نہیں لگایا جاسکتا تو پھر ایسا کارخانہ لگ ہی نہیں سکتا۔ اور اگر مانگیں اس قدر زیادہ ہیں کہ تیکنیکی لحاظ سے اتنا بڑا کارخانہ لگانا ممکن نہیں۔ تو فیصلہ کرنا پڑے گا کہ کونسی مشینری اور پلانٹ لگایا جائے۔ مختلف سائز کے کارخانوں کا جائزہ لینا ہوگا اور ایسا کارخانہ لگانا ہوگا جو زیادہ سے زیادہ فائدہ مند ثابت ہوگا۔

مقام

کارخانہ لگاتے وقت ایسے مقام کا انتخاب کرنا ہوگا جہاں پانی، بجلی، کم از کم انتظامیہ اور رسل و رسائل کی سہولتیں میسر ہوں اور اگر ایک یا دو جگہ پر یہ سب سہولتیں مل رہی ہیں تو ایسی جگہ کا انتخاب کرنا ہوگا جو ان سب میں سے اعلیٰ ترین ہو۔ یہ فیصلہ کرتے وقت خام مال کی نقل و حمل اور تیار شدہ اشیار کی فروخت اور ان کی تیاری پر جو خرچ اٹھتا ہے ان کا خیال رکھنا ہوگا۔

چند کاروبار تو ایسے ہیں جو وہیں ہونے چاہئیں جہاں نزدیک ہی خام مال ملتا ہے۔ اگر خام مال بھاری بھرکم ہے اور رسل و رسائل پر بہت خرچ اٹھتا ہے۔ یا وہ جلد خراب ہونے والا ہے اور لانے لے جانے میں گلنے کی طرح بہت نقصان ہونے کا خدشہ ہے۔ تو جہاں خام مال پیدا ہوتا ہے، وہیں کارخانہ ہونا چاہیئے لیکن بعض پراجیکٹ ایسے ہوتے ہیں جن کی تیار کردہ اشیار کی بڑے بڑے شہروں میں زیادہ مانگ ہوتی ہے۔ لہٰذا ان کو وہیں قائم کرنا پڑتا ہے کس فیصلے میں زیادہ فائدہ ہے، اس کی کسوٹی تو سائز اور مقام کے مقابلے میں لاگت ہے۔ اس طرح کی جانچ کے لیے اقتصادیات کا جو اصول لاگو ہوتا ہے اس کے تحت فوائد میں سے اخراجات کو منہا کر کے سب سے زیادہ ماحصل پیش نظر رہتا ہے۔

پراجیکٹ پر خرچ کے ضمن میں یہ بات زیر غور رہنی چاہیئے کہ کس قدر سرمایہ کارخانے میں لگے گا اور کس قدر اس کو چلانے کے لیے درکار ہوگا۔ پلانٹ، مشینری، عمارت وغیرہ میں جو پیسہ لگتا ہے۔ وہ جذب ہو جاتا ہے اور خام مال، لیبر، بجلی، ایندھن، پانی کی فراہمی، کرایہ وغیرہ ایسی روز مرہ کی چیزیں ہیں جن کی قیمتوں میں اتار چڑھاؤ رہتا ہے۔ انتظامیہ پر جو خرچ آتا ہے اس کو مستقل خرچ کی صورت میں شمار کرنا چاہیئے۔

اب باری آتی ہے پراجیکٹ کے بجٹ بنانے کی۔ ایسا کرتے وقت پراجیکٹ کی مجموعی مدت کو سامنے رکھنا ہوگا۔ اس کے ساتھ ہی اس پر آنے والی ہر سال کی فاضل لاگت اور فاضل منافعوں کو بھی واضح کرنا ہوگا۔ ابتدائی برسوں میں فائدہ کی بہ نسبت خرچ زیادہ آئے لیکن اگر پراجیکٹ کے قائم کل مدت میں خرچ کی بہ نسبت زیادہ رہے تو ہم اسے کفائت کا پراجیکٹ کہیں گے۔ پراجیکٹ سودمند ہے یا نہیں اس کا اندازہ تیار شدہ اشیا اور کاموں کی کل قیمت کو سامنے رکھ کر لگایا جاسکتا ہے اور جس قدر سرمایہ ڈالا گیا ہے۔ اس کے تناسب سے اگر تیار شدہ اشیا اور سروس کی قیمت زیادہ ہے تو یہ پراجیکٹ بہت مناسب ہے۔

پراجیکٹ کی اقتصادی صورت حال میں سب سے آخری بات جو قابل غور ہے، وہ یہ ہے کہ طے شدہ سرمایہ اور کاروباری روپیہ کہاں سے آرہا ہے اور اس پر کیا ادائیگی کرنا ہوگی۔ کچھ سرمایہ تو ذاتی ہوتا ہے اور کچھ اُدھار لینا پڑتا ہے اگر قرضہ بہت زیادہ ہو اور اس پر سود کی شرح بھی زیادہ ہو تو پراجیکٹ بے کار ہے۔

انتظامیہ

پراجیکٹ رپورٹ کا تیسرا حصہ ہے انتظامیہ اور کام کی دیکھ بھال۔ کام چاہے پبلک سیکٹر میں ہو، پرائیویٹ سیکٹر میں یا کوآپریٹو سیکٹر میں ان سب کے لیے کافی تعداد میں حصہ دار ہونے چاہئیں اور اس کے انتظامیہ کی بنیاد بہت مضبوط ہوتی چاہیئے۔ اس کے کارندے اچھی طرح تربیت یافتہ ہوں اور ان میں حساب کتاب رکھنے اور کام کاج کو سنبھالنے کی صلاحیت ہونی چاہیئے۔ ملازمین کے انتخاب اور ان کی تنخواہوں کا لائحہ عمل طے ہونا چاہیئے۔ انتظامیہ، ملازمین اور کام کے چارٹ بننے چاہئیں۔

پراجیکٹ رپورٹ کے ضمن میں مندرجہ بالا امور تو محض عام باتیں ہیں۔ پراجیکٹ رپورٹ تو جس قسم کا پراجیکٹ ہو اسی اعتبار سے بالکل مناسب تیار ہونی چاہیئے۔

اگر اقتصادی اور ٹیکنالوجی کے اعتبار سے عمدہ اور قابل عمل پراجیکٹوں کے مسودے تیار ہوں تو ان میں جو سرمایہ لگایا جائے گا۔ اس کی تفصیلات بہ آسانی طے کی جاسکتی ہیں۔ لیکن پراجیکٹ رپورٹ کے بغیر سرمایہ لگانے سے تو کوئی منصوبہ کامیاب نہیں ہوسکتا۔ ★

ابوسعد

ہندوستان میں ماہی گیری کی صنعت

ماہی گیری انسان کے قدیم ترین پیشوں میں شمار ہوتی ہے۔ دُنیا میں ماہی گیری متعدد اقوام کا اہم پیشہ ہے۔ اس سلسلے میں جاپان سرِفہرست ہے۔ ماہی گیری میں صرف مچھلیاں پکڑنا ہی نہیں بلکہ دوسرے سمندری جانوروں کا شکار بھی ماہی گیری ہی کا حصہ ہے۔ ابتدائی زمانے میں ماہی گیری کو مقامی اہمیت حاصل تھی کیوں کہ زیادہ تر شکار مقامی طور پر صرف ہو جاتا تھا، لیکن آج ماہی گیری کو بین الاقوامی اہم صنعت کا درجہ حاصل ہو گیا ہے۔ کیوں کہ اب نقل وحمل کے ذرائع میں حیرت انگیز ترقی ہوئی ہے اور مچھلیوں کو پکڑنے و محفوظ کرنے کے جدید طریقے استعمال کیے جا رہے ہیں۔

ماہی گیری ہمارے ملک میں تجارتی سطح پر ترقی کر رہی ہے۔ یہاں مچھلیوں کو پکڑنے کے لیے مختلف طرح کے قدرتی اور جغرافیائی عوامل پائے جاتے ہیں کیوں کہ اس کا سمندری ساحلی علاقہ تقریباً چھ ہزار ایک سو کلومیٹر لمبا ہے۔ اس کے علاوہ یہاں سینکڑوں ندیاں، نہریں، جھیلیں اور تالاب پائے جاتے ہیں۔ ہندوستان کے مختلف حصّوں میں کئی طرح کی مچھلیاں پکڑی جاتی ہیں۔ اب تک ہمارے سمندروں میں اٹھارہ سو قسم کی مچھلیوں کی دریافت ہو چکی ہے لیکن کچھ ہی قسم کی مچھلیوں کا شکار زیادہ ہوتا ہے۔ یہ شکار زیادہ تر سمندری ساحلی علاقوں میں ہوتا ہے۔ ہندوستان کے ایک لاکھ اسّی ہزار مربع کلومیٹر سمندری علاقے میں زبردست مچھلیوں کا بھنڈار پایا جاتا ہے۔ اگر ماہی گیری کی صنعت کی ترقی کے لیے تجربہ کار ماہی گیر، بہتر نظامِ نقل وحمل و رسل و رسائل، مچھلیوں کو برآمد کرنے کے لیے عمدہ بندرگاہ اور بازاروں سے قربت اور صحیح ٹکنالوجی کا استعمال کیا جائے تو مچھلی کی پیداوار میں زبردست اضافہ ہو سکتا ہے۔

مچھلی کی غذائی افادیت مسلّم ہے۔ مچھلی میں کافی حد تک پروٹین ہونے کے باعث یہ انسانی غذا میں اہم مقام رکھتی ہے۔ مچھلی میں وٹامن اے، وٹامن ڈی اور معدنی نمک وغیرہ ہوتے ہیں۔ ملک کی آبادی میں جس طرح پچھلے تیس سالوں میں اضافہ ہوا ہے اس کے پیشِ نظر ماہی گیری کی اہمیت اور زیادہ ہو گئی ہے اگر صحیح ٹکنالوجی اور صحیح انتظامی صلاحیت کو بروئے کار لایا جائے تو مچھلیوں کی پیداوار ایک کروڑ ٹن سالانہ کی جا سکتی ہے۔ جبکہ موجودہ پیداوار صرف چھبیس لاکھ ٹن سالانہ ہے۔ اس پنج سالہ منصوبے کے آخر تک مچھلیوں کی پیداوار کا نشانہ پینتیس لاکھ ٹن سالانہ ہے۔ اگر مچھلیوں کی پیداوار ایک کروڑ ٹن سالانہ ہو جائے تو ملک کی آمدنی میں تقریباً چار سو پچاس کروڑ روپے کا اضافہ ہو سکتا ہے۔ ایک کروڑ ٹن مچھلیوں میں سے دو تہائی حصہ سمندری ساحلی علاقوں اور گہرے سمندروں سے اور باقی حصہ اندرونِ ملک آبی ذخائر سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔ ماہی گیری کی صنعت کی ترقی کے ساتھ کچھ اور صنعتوں کو ترقی دی جا سکتی ہے۔ مثلاً کشتیاں بنانا، مچھلیاں کو پکڑنے کے لیے پھندے، جال اور متعدد آلات وغیرہ بنانا، پکڑی ہوئی مچھلیوں کو سکھانا، ڈبّوں میں بند کرنا، برف میں جمانا، تیل نکالنا اور کھاد بنانا وغیرہ۔

مرکزی ادارہ برائے ماہی گیری مچھلیوں کو پکڑنے کے لیے صحیح ٹکنالوجی کا استعمال کر رہا ہے۔ اس ادارے نے بڑے بڑے اور جدید جہازوں کو بنایا ہے۔ یہ جہاز بڑے مضبوط ہوتے ہیں اور گہرے سمندروں میں بہت دور تک جا سکتے ہیں اور زیادہ عرصہ تک کھلے سمندروں میں رہ سکتے ہیں۔ ان جہازوں میں کولڈ اسٹوریج کی بھی سہولیات ہوتی ہیں۔ ہر روز حاصل ہونے والی مچھلیوں کو کولڈ اسٹوریج میں رکھ دیا جاتا ہے۔ جس سے مچھلیاں زیادہ دنوں تک خراب نہیں ہوتیں اور ان کی تازگی برقرار رہتی ہے۔ مرکزی ادارہ برائے ماہی گیری مچھلیوں اور دوسرے آبی جانوروں کی زندگی پر بھی تحقیق کر رہا ہے جس سے ساحلی علاقوں، گہرے سمندروں، جھیلوں اور تالابوں میں کثیر پیداواری مچھلیوں کی افزائش میں بہت مدد ملی ہے۔ ساحلی علاقوں اور گہرے سمندروں میں کثیر پیداواری مچھلیوں کی افزائش میں نارویے (Indo-Norwegian Fisheries Community)

Development Programme اور ریاستہائے متحدہ امریکہ (Indo-USA Technical Mission Programme) سے مدد لی جا رہی ہے۔

ماہی گیری سے متعلق تعلیمی مراکز بھی قائم کئے گئے ہیں۔ ایسے مراکز بمبئی، کوچین، مدراس اور وشاکھاپٹنم وغیرہ شہروں میں کھولے گئے ہیں۔ مچھلیوں کی فروخت کے کئی مراکز قائم ہیں، جہاں مچھلیوں کو اکٹھا کرنے کے لیے کولڈ اسٹوریج بنائے گئے ہیں۔ ملک میں نمک لگا کر مچھلیوں کو محفوظ رکھنے کا انتظام کیا گیا ہے جن جگہوں پر یہ کام ہوتا ہے انھیں فش کیورنگ یارڈ (Fish-curing Yard) کہتے ہیں۔ ایسے یارڈ ملک میں سینکڑوں کی تعداد میں ہیں۔ اس صنعت میں چار سہکاری ماہی گیری انجمنیں، پینتیس۳۵ مرکزی ماہی گیری انجمنیں اور پچیس۲۵ سو ابتدائی سہکاری ماہی گیری انجمنیں کام کر رہی ہیں۔ حکومت کی سطح پر ماہی گیری کی سہکاری انجمن سازی کی ہمت افزائی کی جا رہی ہے۔ ان کو زیادہ سے زیادہ مالی امداد فراہم کی جا رہی ہے تاکہ ماہی گیری کو ترقی دی جا سکے اور مچھلیوں کی پیداوار میں اضافہ کیا جا سکے۔

ہمارے ملک میں جتنی مچھلیاں پکڑی جاتی ہیں اس کا آدھا تر فی صد کھانے میں استعمال کی جاتی ہیں، تینتیس۳۳ فی صد سکھا دی جاتی ہیں، تین فی صد برف میں جما کر رکھ دی جاتی ہیں اور چار فی صد مچھلیوں کو کھاد بنانے اور دوسرے کاموں میں استعمال کیا جاتا ہے۔ مچھلیوں سے نکلنے والے تیل میں وٹامن اے، بی اور ڈی پائے جاتے ہیں۔ یہ تیل زیادہ تر شارک اور سارڈائن مچھلیوں سے نکالا جاتا ہے۔ بمبئی، مدراس اور کوزی کوڈ میں مچھلیوں سے تیل نکالنے کے کئی کارخانے ہیں۔ اس تیل کا استعمال چمڑے کو ملائم کرنے، فولاد کو چمکانے، صابن اور دوائیاں وغیرہ کو بنانے میں کیا جاتا ہے۔ سڑی ہوئی مچھلیوں سے کھاد بنائی جاتی ہے۔ مچھلیوں کے ٹکڑوں کو مرغیوں اور دوسرے جانوروں کو کھلایا جاتا ہے۔

ہندوستان میں مچھلیوں کی کل پیداوار کا ستر فیصد اتھلے اور گہرے سمندروں سے اور تیس فیصد اندرونِ ملک آبی ذخائر سے حاصل ہوتا ہے۔ سمندروں میں عام طور پر دو سو میٹر کی گہرائی تک مچھلیاں پکڑی جاتی ہیں۔ دو سو میٹر گہرا سمندری علاقہ تقریباً تین لاکھ مربع کلومیٹر میں پھیلا ہوا ہے اس علاقے کے صرف ۲ فیصد حصہ پر مچھلیوں کا شکار ہوتا ہے۔ سمندری علاقوں سے حاصل ہونے والی مچھلیوں کے لحاظ سے ہمارے ملک کا دُنیا میں ساتواں نمبر ہے۔ سمندری مچھلیوں میں سارڈائن، ہیرنگ، اینکابی، میکرل، بارس، میشر بل، تیڈ اور پرچے وغیرہ زیادہ مقدار میں ملتی ہیں اس طرح کی مچھلیاں زیادہ تر سمندری ساحلی علاقوں سے آٹھ سے سولہ کلومیٹر تک کی دوری میں پکڑی جاتی ہیں۔ سمندری مچھلیاں زیادہ تر گجرات کے ساحلی علاقوں، مہاراشٹر اور مالابار ساحل، خلیج منار اور کارومنڈل کے ساحلی علاقوں میں پکڑی جاتی ہیں۔ منار کی کھاڑی میں آؤسٹر قسم کی مچھلیاں پائی جاتی ہیں جن سے اچھے قسم کے موتی حاصل کئے جاتے ہیں۔ مغربی ساحل سے زیادہ مچھلیاں حاصل کی جاتی ہیں۔ مانسون کے دنوں میں مچھلیوں کے پکڑنے میں رُکاوٹ آ جاتی ہے مگر تامل ناڈو کے مشرقی ساحل پر سال بھر مچھلیوں کا شکار ہوتا ہے کیوں کہ یہ علاقہ جنوب مغربی مانسون کے راستے میں نہیں پڑتا ہے۔

ملک کے لمبے سمندری ساحل پر مچھلی پکڑنے کے لیے تقریباً نوّے ہزار کشتیاں کام کر رہی ہیں ان میں دس ہزار موٹر کشتیاں ہیں جو جدید قسم کی ہیں ایسی کشتیاں سمندر میں چوبیس۲۴ کلومیٹر دُور تک جا سکتی ہیں۔ اب ان کشتیوں کی جگہ جدید ماہی گیر جہازوں کا استعمال شروع کیا جا رہا ہے۔ ان جہازوں کے استعمال سے مچھلیوں کی پیداوار میں زبردست اضافہ ہوگا۔ اور موجودہ پنج سالہ منصوبے میں مچھلی کی پیداوار کا نشانہ پینتیس۳۵ لاکھ ٹن سالانہ پورا کیا جا سکے گا۔

اندرونِ ملک آبی ذخائر سے حاصل ہونے والی مچھلیوں کے لحاظ سے ہمارے ملک کا دُنیا میں چین کے بعد دوسرا مقام ہے۔ میٹھے یا تازہ پانی کی مچھلیاں ملک کی ندیوں، جھیلوں، نہروں، تالابوں اور باندھوں سے حاصل ہوتی ہیں۔ اُتر پردیش میں گنگا و جمنا اور ان کی مددگار ندیاں، آسام کی برہم پُتر اور جنوبی ہند کی مہاندی، کرشنا، گوداوری اور کاویری وغیرہ ندیوں میں بہت زیادہ مقدار میں مچھلیاں پکڑی جاتی ہیں۔ چوں کہ تازے پانی کے علاقے اندرونِ ملک واقع ہیں، اس لیے موسم کی تبدیلی سے مچھلیوں کو پکڑنے میں کوئی رُکاوٹ نہیں پڑتی۔ البتہ موسم برسات میں ندیوں میں سیلاب آ جانے سے مچھلی پکڑنے میں دُشواریاں پیش آتی ہیں۔ ہمارے ملک میں سب سے زیادہ بنگال میں تازے پانی سے مچھلیاں حاصل ہوتی ہیں۔ پورے ملک کی تازے پانی سے حاصل ہونے والی تقریباً انتیس۲۹ فی صد مچھلیاں مغربی بنگال میں پکڑی جاتی ہیں۔ اس کے بعد بہار اور آسام کا نمبر آتا ہے۔ یہ تینوں صوبے تازے پانی سے حاصل ہوئے مچھلیوں کا بہتر فی صد پیدا کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ اُتر پردیش، آندھرا پردیش، مدھیہ پردیش، کرناٹک، تامل ناڈو اور مہاراشٹر وغیرہ صوبوں میں خوب پکڑی جاتی ہیں۔ اندرونِ ملک آبی ذخائر سے حاصل ہونے والی مچھلیوں میں ریہو، قتلہ، ہلسا، ٹینگر، پران، کالا باسُو، سوَر، چِلوا، شنگر، کیٹ فش، ہیرنگ اور جھینگا وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔

بھارت سے مچھلیوں کی برآمد محدود پیمانے پر ہوتی ہے۔ یہ برآمد سری لنکا، بنگلہ دیش، سنگاپور اور ہانگ کانگ وغیرہ ملکوں کو کی جاتی ہے۔ ملک کی کُل برآمدات میں مچھلی اور دوسرے آبی جانوروں کا حصہ ۶۲-۱۹۶۱ء میں ۰٫۱۶ فیصد تھا جو کہ ۸۰-۱۹۷۹ء میں ۰٫۵۰ فیصد ہو گیا۔ ★

محمد مزمل

زرِ مبادلہ کی شرح کا مسئلہ

زرِ مبادلہ دورِ حاضر میں محض ایک اقتصادی اصطلاح کے طور پر ہی اہم نہیں بلکہ یہ ملک کے معاشی حالات کو بہتر بنانے کے لیے جزوِ لازم ہے۔

زرِ مبادلہ کی شرح وہ شرح ہے جس پر ایک ملک کی کرنسی یا سکّے، دوسرے ملک کی کرنسی یا سکّے میں تبدیل ہوتے ہیں۔ اس طرح زرِ مبادلہ کی شرح کا تعلق دو کرنسیوں کے درمیان مبادلہ کی نسبت حسابی سے ہے۔ مُلک کے اندر خرید و فروخت کے لیے سکّہ رائج الوقت استعمال کیا جاتا ہے۔ مثلاً ہندوستان میں روپیہ، انگلینڈ میں پونڈ اور امریکہ میں ڈالر رائج ہے۔ اس لیے ان مُلکوں کے اندر اشیاء اور خدمات کی لین دین میں یہاں کے اندرونی سکّے استعمال ہوتے ہیں۔ لیکن جب ایک ملک کے لوگ دوسرے مُلک میں خرید و فروخت کرنا چاہیں تو اُنھیں اپنے سکّے یا اپنی کرنسی کے بدلے میں بیرونی سامان نہیں مل سکتا ہے۔ مثلاً اگر ہم انگلینڈ سے سامان خریدنا چاہتے ہیں تو ہمیں پونڈ چاہیئے اور اگر امریکہ سے سامان خریدنا چاہتے ہیں تو ہمیں ڈالر چاہیئے۔ ظاہر ہے بیرونی سامان یا خدمات خریدنے سے پہلے ہمیں زرِ مبادلہ کی ضرورت پڑتی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ ایک ملک کے ایک سکّے کی قیمت دوسرے ملک کے کتنے سکّوں کے برابر ہوگی۔ یعنی ہندوستان کا ایک روپیہ کتنے امریکی ڈالر کے برابر ہوگا یا انگلینڈ کا ایک پونڈ کتنے سعودی ریال کے برابر ہوگا وغیرہ۔

یہی زرِ مبادلہ کی شرح کا مسئلہ ہے۔ مثال کے طور پر اگر یہ کہا جائے کہ ایک ڈالر برابر آٹھ روپے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ آٹھ روپے ایک ڈالر خرید سکتا ہے یا دوسرے الفاظ میں آٹھ روپے سے ایک ڈالر کی قیمت کے برابر اشیا یا خدمات خریدی جا سکتی ہیں۔ جس طرح بازار میں کسی چیز کی قیمت اُس کی بہم رسانی اور مطالبہ یعنی (DEMAND & SUPPLY) سے طے ہوتی ہے اُسی طرح زرِ مبادلہ کی بازار میں ایک کرنسی یا ایک سکّے کی قیمت دُوسرے ملک کی کرنسی یا سکّے میں اُس کی بہم رسانی اور مطالبہ کی قوتوں سے متعیّن ہوتی ہے۔ اگر زرِ مبادلہ کی بہم رسانی مطالبے سے زیادہ ہوگی تو زرِ مبادلہ کی شرح کم ہوگی اور اس کے برعکس جب زرِ مبادلہ کا مطالبہ زیادہ ہو اور بہم رسانی کم ہو تو شرح مبادلہ زیادہ ہوگی۔

زرِ مبادلہ کی شرح کا ملکوں میں رائج زری و معاشی نظام سے گہرا تعلق ہے۔ چنانچہ جب دُنیا کے ملکوں میں سونے کے سکّے رائج تھے یا سکّے کی قیمت سونے میں طے تھی، جس نظام کو گولڈ اسٹینڈرڈ (GOLD STANDARD) کے نام سے موسوم کیا گیا۔ اُس وقت زرِ مبادلہ کی شرح کا تعیّن بہت آسان تھا۔ محض یہ دیکھ لینا کافی تھا کہ جن دو مُلکوں کی شرح مبادلہ متعیّن کرنی ہے اُن کی سونے میں کیا قیمت ہے۔ یعنی مثال کے طور پر اگر ایک پونڈ اور چار ڈالر برابر مقدار میں سونا خرید سکتے ہیں تو بہت آسانی سے کہا جا سکتا ہے کہ پونڈ اور ڈالر کے درمیان شرح مبادلہ ایک اور چار کی ہوگی۔ زرمبادلہ کے تعیّن کا یہ اصول ٹکسالی برابری کے اُصول (MINT PAR THEORY) کے نام سے مشہور ہے۔ دُنیا کے ممالک میں یہ طریقہ ۱۸۷۰ء سے ۱۹۱۴ء تک اور پھر پہلی جنگِ عظیم کے بعد سے ۱۹۳۰ء کے آس پاس تک رائج رہا۔ اس کے بعد ملکوں نے گولڈ اسٹینڈرڈ ترک کرنا شروع کیا۔ اور فرانس آخری ملک تھا جس نے سب سے بعد میں ۱۹۳۶ء میں سونے کا زری نظام ترک کیا۔

اس کی وجہ سے بین الاقوامی معاشیات میں ایک غیر یقینی حالت پیدا ہوگئی۔ اب سوال یہ تھا کہ گولڈ اسٹینڈرڈ ترک کردئے جانے کے بعد زرِ مبادلہ کی شرح کیسے طے ہو۔ ماہرینِ معاشیات کے مذاکرات سے یہ طے پایا کہ ایسی حالت میں زرِ مبادلہ کی شرح دونوں ملکوں کے سکّوں کے اندرونی قوتِ خرید (PURCHASING POWER) سے طے ہوگی۔ مثال کے طور پر اگر ہندوستان میں ایک کلو شکر کی قیمت آٹھ روپے ہے اور امریکہ میں ایک کلو شکر ایک ڈالر میں ملتی ہے تو گویا آٹھ روپے اور ایک ڈالر کی قوتِ خرید برابر ہوگی۔ اس لحاظ سے زرِ مبادلہ کی شرح آٹھ روپے برابر ایک ڈالر ہوگی۔ اسے قوت خرید کی برابری کا اصول (PURCHASING POWER PARITY THEORY) کہا گیا۔ اس طریقے میں سب سے بڑی خرابی یہ تھی کہ اگر ملک کے اندر قیمتیں بدل جائیں تو زرِ مبادلہ کی شرح تبدیل ہو جائے گی۔ دوسری جنگِ عظیم کے دوران بیشتر ممالک میں

قیمتوں میں تیزی سے تبدیلی آئی۔ اس لیے زرمبادلہ کے طے کرنے کا وہ نظام جو سکّے کی قوتِ خرید پر منحصر تھا، بری طرح متاثر ہوا۔ مختلف رفتار سے قیمتوں میں اضافے سے زرمبادلہ کی شرح میں بے روک ٹوک تبدیلی ہونے لگی۔ اس سے بین الاقوامی تجارت کو دھکا لگا اور ماہرین معاشیات کا دھیان پھر اس طرف مبذول ہوا۔ کہ زرمبادلہ کی شرح کو طے کرنے اور اس میں استحکام لانے کے لیے کوئی نیا اور بہتر نظام قائم کیا جائے۔ نتیجے کے طور پر بین الاقوامی زر فنڈ (INTERNATIONAL MONETARY FUND) اور اس پر مبنی بین الاقوامی زری نظام وجود میں آیا۔ اس طرح دوسری جنگ عظیم کے بعد زرمبادلہ کی شرح کا مسئلہ بین الاقوامی زر فنڈ کے سبھی ممبر ممالک سے یہ کہا گیا کہ وہ اپنی کرنسی کی قیمت سونے یا ڈالر میں اعلان کردیں۔ کرنسی کی قیمت سونے یا ڈالر میں ظاہر کرنے کی وجہ یہ تھی کہ بین الاقوامی زرفنڈ میں امریکہ نے یہ وعدہ کیا تھا کہ پینتیس۳۵ ڈالر کی قیمت ایک آؤنس سونے کے برابر ہوگی۔ اس طرح بین الاقوامی زری نظام میں سونے اور ڈالر کو برابر کا درجہ دیا گیا۔ اسی لیے کچھ ماہرین معاشیات نے یہ خیال ظاہر کیا کہ بین الاقوامی زرفنڈ پر مشتمل بین الاقوامی زری نظام پرانے گولڈ اسٹینڈرڈ کا ہی نیا روپ ہے۔ یعنی کسی ملک کے سکّے کی زرمبادلہ کی شرح اس بات سے طے ہوگی کہ اُس کے سکّے کی قیمت سونے یا ڈالر میں کتنی ہے۔ اس طرح مثال کے طور پر، اگر ایک پونڈ کی قیمت تین ڈالر اور سات روپے کی قیمت ایک ڈالر ہو تو ایک پونڈ اکیس۲۱ روپے کے برابر ہوگا۔ سبھی غیر ممالک کے مابین زرمبادلہ کی شرح میں کافی حد تک استحکام بھی آگیا۔ یہ نظام ۶۹-۱۹۶۸ء تک تو بالکل ٹھیک چلتا رہا لیکن اس کے بعد اس میں خرابیاں پیدا ہونے لگیں۔ کئی زری و معاشی وجوہات کی بنا پر امریکہ کو ۱۹۷۱ء اور ۱۹۷۳ء میں دو بار ڈالر کا ڈی ویلیویشن (DEVA-ULATION) کرنا پڑا۔ یعنی ڈالر کی قیمت سونے میں پینتیس۳۵ ڈالر فی آونس سے گھٹا کر اڑتیس ڈالر فی آونس اور پھر دوبارہ ۳۸ ڈالر فی آونس سے گھٹا کر ۴۲٫۲۲ ڈالر فی آونس کردی گئی۔ اس طرح سونے کی قیمت میں اضافہ ہوتا گیا اور ڈالر کی قیمت مسلسل کم ہوتی گئی۔ ڈالر کی گھٹتی ہوئی قیمت کو دیکھ کر تمام ممالک کا یقین ڈالر سے اُٹھ گیا۔ اس طرح زرمبادلہ کی شرح طے کرنے کا نظام جو ڈالر پر مشتمل تھا تہس نہس ہوگیا۔ کئی سال تک بہت غیر مستقل حالت بنی رہی۔ زرمبادلہ کی شرح کی تعیین کا کوئی نظام باقی نہ رہا۔ بین الاقوامی زرفنڈ اور غیر ممالک کو بڑی تشویش پیدا ہوئی۔ لیکن نئے نظام کی تلاش میں کئی سال گزر گئے۔ آخر کار ۱۹۷۶ء میں بین الاقوامی زرفنڈ نے ۱۹۴۵ء سے چلا آرہا بین الاقوامی زری نظام ترک کرکے ایک نئے نظام کا اعلان کیا۔ اس نئے بین الاقوامی زری نظام میں سونے کو کوئی اہمیت حاصل نہیں ہے۔ ڈالر کی جگہ ایس۔ ڈی (SPECIAL DRAWING RIGHT) نے لے لی ہے۔ اور تمام غیر ممالک کی کرنسیوں کو بیرونی زری بازار (FOREIGN EXCHANGE MARKET) میں کھلا چھوڑ دیا گیا ہے۔ جس سے زرمبادلہ کی شرح میں کوئی بھی تبدیلی ممکن ہے۔ اب بین الاقوامی زرفنڈ صرف نگرانی رکھنے کا کام کرے گا اور اُسی وقت مداخلت کرے گا جب ایک ملک کی زرمبادلہ کی شرح اور اُس کی بیرونی لین دین کی پالیسی دوسرے ملکوں کے لیے خطرناک ثابت ہو۔ اس نئے طریقۂ کار کو آزادانہ تیرتی ہوئی زرمبادلہ کی شرح کا نظام یعنی (FREELY FLOA-TING EXCHANGE RATE SYSTEM) کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ اس طرح اب تمام ملکوں کی کرنسیوں مثلاً روپیہ، ڈالر، پونڈ وغیرہ کی بہم رسانی اور مطالبہ کی قوتوں (FORCES OF SUPPLY AND DEMAND) سے ہی ان کی باہمی اشیا زرمبادلہ طے ہوگی۔ ظاہر ہے اس کھلے بازار میں بڑے ملکوں کی کرنسی بازی مارے جائیں گی اور چھوٹے اور غریب ملکوں کو زرمبادلہ کی شرح میں زبردست نقصان کا اندیشہ بنا رہے گا۔ اسی لیے اس نئے نظام کو ترقی پذیر ممالک نے قبول کرنے سے اپنا انکار ظاہر کیا تھا۔ مگر جیسا کہ ہمیشہ ہوتا آیا ہے غریب ملکوں کی فریاد بڑے ملکوں کی بلند آواز کے نیچے دب کر رہ گئی ہے۔

اس موجودہ نظام میں زرمبادلہ کی شرح ڈیمانڈ اور سپلائی کی قوتوں کا کھیل ہے۔ ظاہر ہے زرمبادلہ کی ڈیمانڈ اور سپلائی میں جس طرح زیادتی اور کمی واقع ہوگی، زرمبادلہ کی شرح اُسی حساب سے گھٹتی بڑھتی رہے گی۔ اس آزادانہ یا بے لگام اُتار چڑھاؤ میں کسی قدر استحکام لانے کے لیے ملکوں کے مرکزی بینک مداخلت کرتے ہیں اور ضرورت پڑنے پر زرمبادلہ کی شرح میں استحکام بنائے رکھنے کے لیے زرمبادلہ کی خرید فروخت کرتے رہتے ہیں۔ اسے تیرتی ہوئی زرمبادلہ کی شرح کا نظام (MANAGED FLOAT OF EXCHANGE RATE) کہتے ہیں۔ کبھی کبھی استحکام حاصل کرنے کے لیے بہت سے ملک اپنی کرنسی کو کسی بڑے ملک کی کرنسی سے باندھ دیتے ہیں۔ اسے زرمبادلہ کی شرح کا باندھنا (PEGGING OF EXCHANGE RATE) کہتے ہیں۔ مثال کے طور پر اگر کوئی ملک اپنی کرنسی کو ڈالر کے ساتھ باندھ دے یا (PEG) کردے تو اُس کی کرنسی کی بیرونی قیمت ڈالر کی قیمت کے ساتھ گھٹتی بڑھتی رہے گی۔ ایسا کرنے میں یہ فائدہ رہتا ہے کہ کمزور ملک کی کرنسی زرمبادلہ کی بازار میں غیر ضروری تھپیڑے کھانے سے بچ جاتی ہے۔ بین الاقوامی زرفنڈ کے ایک جائزے کے مطابق اس وقت دنیا

کے کئی ترقی پذیر ممالک اپنی کرنسی کو بڑے ملکوں کو کرنسی کے ساتھ باندھ دیتے ہیں یعنی (PEG) کر دیتے ہیں۔ عالمی زرفنڈ تحقیق کے مطابق وہ ممالک جہاں پر افراطِ زر کی رفتار تیز ہے اپنی کرنسی پیگ (PEG) کرتے ہیں اور جن ملکوں میں افراطِ زر کم ہے وہ ممالک باقابو تیرتی ہوئی شرح مبادلہ (MANAGED FLOAT OF EXCHANGE RATE) اختیار کرتے ہیں۔ یہاں پر یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ تیرتی ہوئی شرح کا مطلب تغیر پذیر شرح سے ہے۔ یعنی جس شرح میں قطعی استحکام نہ ہو اور کوئی بھی تبدیلی ممکن ہو۔ بین الاقوامی زرفنڈ کی رپورٹ کے مطابق (دیکھئے - FINANCE & DEVELOPMENT, JUNE, 1982) کوریا، انڈونیشیا، فلپین اور تھائی لینڈ جہاں افراطِ زر کی رفتار تیز (۱۰ فی صد سے ۱۰ فیصد تک) رہی ہے، نے اپنی کرنسی کو ڈالر کے ساتھ پگ (PEG) کیا۔ یعنی ڈالر کے ساتھ باندھ رکھا۔ ہندوستان، ملیشیا اور سنگاپور جہاں افراطِ زر کی رفتار نسبتاً کم رہی، باقابو تیرتی ہوئی (MANAGED FLOAT) یعنی تغیر پذیر زرمبادلہ کی شرح کا نظام اپنائے رکھا۔ قابلِ غور بات یہ ہے کہ زرمبادلہ کی شرح میں اُتار چڑھاؤ سے ملکوں کے مابین افراطِ زر کی معاشی بیماری بھی منتقل ہوتی رہتی ہے۔ اسی لیے ترقی پذیر ممالک مستحکم زرمبادلہ کی شرح کو ترجیح دیتے ہیں۔

زرمبادلہ کی شرح کو مستحکم کرنے کا ایک اور طریقہ رائج ہے۔ وہ ہے مستقبل کی لین دین کو حال میں رائج شرح سے طے کر لینا۔ یعنی بین الاقوامی بازار میں خریدنے اور بیچنے والے یہ طے کر لیتے ہیں کہ جو لین دین مثال کے طور پر آج سے ۶ ماہ بعد ہوگی وہ اُسی شرح پر ہوگی جو آج رائج ہے بھلے ہی ۶ ماہ بعد اُس وقت کی رائج شرح کچھ اور ہو۔ اسے فارورڈ ایکسچینج آپریشن (FORWARD EXCHANGE OPERATION) کہا جاتا ہے۔

زرمبادلہ میں سٹے بازی کرنے والے لوگ بھی کبھی کبھی تو اس کی شرح کو مستحکم کرنے میں مدد کرتے ہیں اور کبھی اسے اور تغیر پذیر بنا دیتے ہیں۔ بھلا یہ دونوں کیسے ممکن ہے؟ جواب دلچسپ ہے۔ فرض کیجئے زرمبادلہ کی شرح بڑھ رہی ہے یعنی ڈالر کی قیمت میں اضافہ ہو رہا ہے تو سٹے باز یہ فیصلہ کر سکتے ہیں کہ شرح بڑھ گئی ہے ڈالر کا اسٹاک بیچ دیا جائے اگر وہ ایسا کرتے ہیں تو ڈالر کی بہم رسانی (SUPPLY) بڑھ جائے گی اور زرمبادلہ کی شرح میں اضافے کی رفتار کم ہو جائے گی اور اس طرح استحکام آ جائے گا۔ لیکن اگر سٹے باز یہ نظریہ لیں کہ چوں کہ زرمبادلہ کی شرح بڑھ رہی ہے اس لیے ممکن ہے اس میں ابھی اور اضافہ ہو لہٰذا وہ بڑھی ہوئی شرح پر بھی ڈالر فروخت کرنے کے بجائے خریدنا شروع کر دیں گے۔ یعنی ڈالر کی ڈمانڈ یا مطالبہ بڑھ جائے گا۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ زرمبادلہ کی شرح میں اضافہ توقع سے زیادہ تیز ہو جائے گا۔ اور شرح مبادلہ مزید تغیر پذیر ہو جائے گا یہ پیشین گوئی کر پانا بہت مشکل ہے کہ سٹے باز کب کیا فیصلہ کریں گے۔ اس لیے بس اتنا کہا جا سکتا ہے کہ زرمبادلہ کی شرح میں سٹے بازی (SPECULATION) سے استحکام اور تغیر دونوں ممکن ہے۔

مذکورہ بالا سے ظاہر ہے کہ زرمبادلہ کی شرح کی دو قسمیں ہیں۔

۱۔ مستحکم زرمبادلہ کی شرح۔

(FIXED EXCHANGE RATE)

۲۔ تغیر پذیر زرمبادلہ کی شرح۔

(FLEXIBLE EXCHANGE RATE)

تغیر پذیر زرمبادلہ کی شرح دو طرح کی ہو سکتی ہے۔

(الف) آزادانہ تیرتی ہوئی زرمبادلہ کی شرح (FREELY FLOATING EXCHANGE RATE)

(ب) باقابو تغیر پذیر (تیرتی ہوئی) زرمبادلہ کی شرح (MANAGED FLOATING EXCHANGE RATE)

مستحکم زرمبادلہ کی شرح گولڈ اسٹینڈرڈ نظام کے دوران قائم تھی۔ اُسی وقت اس میں بہت معمولی تبدیلی ہی ممکن تھی۔ اس کے بعد جب بین الاقوامی زرفنڈ قائم ہوا تو بھی ایک طرح سے مستحکم زرمبادلہ کی شرح ہی اختیار کی گئی جو ۱۹۷۱ء میں آکر تغیر پذیر شرح مبادلہ کی شکل میں تبدیل ہو گئی۔ اس کے بعد کچھ ملکوں نے آزادانہ تیرتی ہوئی شرح مبادلہ کا طریقہ اور کچھ ملکوں نے باقابو تغیر پذیر زرمبادلہ کی شرح کا نظام اپنایا۔ آخری دونوں طریقے ابھی بھی رائج ہیں۔ ترقی یافتہ ممالک کے نظریے سے تغیر پذیر زرمبادلہ کی شرح کا نظام زیادہ اچھا ہے جب کہ ترقی پذیر ممالک کے لحاظ سے بہتر تو یہ تھا کہ مستحکم شرح ہو لیکن اگر ایسا ممکن نہیں ہے تو پھر باقابو تغیر پذیر شرح مبادلہ ہی نسبتاً بہتر تسلیم کیا جائے گا۔ یہ بات ترقی پذیر ممالک کی زرمبادلہ کی پالیسی سے بھی ثابت ہے جیسا کہ مذکورہ بالا بین الاقوامی زرفنڈ کی رپورٹ سے ظاہر ہے۔

زرمبادلہ کی شرح کا مستحکم ہونا عوام کے لحاظ سے اور تجارت کے فروغ کے لحاظ سے ضروری ہے۔ کیوں کہ اگر ایسا نہ ہوا تو عوام کو اپنا فیصلہ محض قیاس آرائی پر کرنا ہوگا۔ جو بہت خطرناک ہے۔ مثال کے طور پر اگر کوئی شخص حج بیت اللہ کے لیے سفر کرتا ہے تو اُسے یہ پکا معلوم ہوتا ہے کہ روپیہ اور ریال کی شرح مبادلہ کیا ہے اور اس کا مستحکم ہونا ضروری ہے۔ ورنہ اگر عرب پہنچنے کے بعد پتہ چلا کہ روپیہ اور ریال کی شرح مبادلہ تبدیل ہو گئی تو اس کے تمام اخراجات کا تخمینہ غلط ہو جائے گا۔ موجودہ دَور میں جب بین الاقوامی تجارت بہت تیزی سے بڑھ رہی ہے اور دنیا کے تمام ممالک کے لوگ ایک دوسرے کے یہاں کثیر تعداد میں آ جا رہے ہیں، عوام کے لیے یہ بات اور اہم ہو جاتی ہے کہ زرمبادلہ کی شرح کیسے طے ہوتی ہے اور اسے کس طرح مستحکم کیا جاتا ہے۔

جب کبھی بھی ملک کی اندرونی معاشیات اور بیرونی کھاتے میں توازن لانے میں ترجیح دینے کی بات پیش آتی ہے تو بیشتر ممالک اندرونی معاشیات

میں توازن قائم کرنے کو ترجیح دیتے ہیں اور اپنا دھیان فوراً اُسی طرف رجوع کرتے ہیں۔ اور اس طرح بیرونی کھاتے میں توازن قائم کرنے کا مسئلہ وہ توجہ حاصل نہیں کر پاتا جو اسے حقیقتاً ملنا چاہیئے۔ ملک کے بیرونی کھاتے میں توازن قائم کرنے کے لیے ضروری ہے کہ زرِ مبادلہ کی شرح کو طے کرنے اور اس کو مستحکم بنائے رکھنے کے لیے ملک کی سرکار پُورا پُورا خیال رکھے۔ یہ بات اُس وقت اور اہم ہو جاتی ہے جب مُلک کی معیشت میں بیرونی تجارت کا تناسب بڑھتا ہے ہو۔ مثلاً اس وقت ہندوستان کی بیرونی تجارت کا تناسب یہاں کی کُل قومی آمدنی کا تقریباً ۱۳ فیصد ہے اور اس میں مُسلسل اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔

بین الاقوامی سطح پر ہونے والے مختلف معاشی مذاکرات میں جو فیصلے کئے جاتے ہیں اُن سے ترقی یافتہ ممالک ہی مستفید ہوتے ہیں۔ اس لیے ضروری ہے کہ تمام ترقی یافتہ ممالک خاص کر وہ ممالک جو ایک ہی طرح کی معاشیات کے حامل ہیں۔ ایک ایسا کرنسی بلاک (CURRENCY BLOCK) بنائیں جس سے اُن کے باہمی معاشی مفاد کی حفاظت ہو سکے۔ دُنیا کے ترقی پذیر ممالک میں ہندوستان کو خاص اہمیت حاصل ہے اور یہ ناوابستہ ممالک کا صدر بھی ہے۔ اس لئے ہمارے اوپر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ اس ضمن میں غور و خوض کریں اور کوئی معقول حل کھوج نکالیں۔

●

تعلیم میں ہانہ ہو بلکہ دستکاری یا دوسرے پیشوں میں ہو تو وہ روایتی تعلیم میں وقت لگانے کے بجائے اپنی پسند کی پیشہ ورانہ تعلیم حاصل کر سکتا ہے۔ اسکیم بہت اچھی ہے اور اس کا مقصد یہی ہے کہ جو بچے دستکاری میں یقین رکھتے ہیں وہ جب اسکول کی پڑھائی ختم کر کے باہر آئیں تو اس دستکاری میں کچھ کرنے کے قابل بھی ہوں جو انھوں نے اسکول میں سیکھی ہے تاکہ انھیں بے روزگاری کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ اس اسکیم کو شروع کرنے میں کچھ دِقتیں پیش آئی ہیں۔ بچوں کو کورس کی کتابیں بروقت نہیں ملیں۔ کورس میں وقتاً فوقتاً تبدیلیاں ہوتی رہیں جو اسکول سرکار چلاتی ہے یا منتظمین امداد دیتی ہے وہاں مالی امداد سب کو بروقت نہ مل سکی اور مختلف محکموں میں تال میل کی کمی کے باعث کہیں کہیں ورکشاپ بھی پوری طرح نہیں تیار ہو سکے۔

کہیں کہیں ایسا بھی ہوا کہ ورکشاپ ہے تو انسٹرکٹر نہیں لیکن اسکیم کو اپنا صحیح روپ اختیار کرنے کے لیے وقت دئے بغیر اس کے کامیاب یا ناکام ہونے کا فیصلہ کر دینا اسکیم کے ساتھ ناانصافی ہوگی اسکولوں میں ورکشاپ کھولنے اور (Vocational Stream) لاگو کرنے میں جو مشکلات آ رہی ہیں ان کا حل یہ بھی ہو سکتا ہے کہ (ITI's) کا استعمال کیا جائے ان کی گنجائش (Capacity) بڑھائی جائے اور ان میں موجودہ ورکشاپس کو بہتر بنایا جائے ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ (ITI's) میں ہمیں پہلے سے ہی تربیت یافتہ ٹیچر مل جاتے ہیں جو کہ (Vocational Stream) کے شروع کرنے میں بہت مدد دے سکتے ہیں۔ اس طرح اسکولوں کے بجائے (ITI's) میں (Vocational Stream) چلانا زیادہ آسان ہوگا۔ ★

جناب ستیہ پال بخشی کی ایک تقریر کا اقتباس
(بہ شکریہ آل انڈیا ریڈیو)

بقیہ: زرعی تحقیق کی بھارتی کونسل اور اِس کی چند اہم خدمات

مختلف کاموں کی تربیت کا بندوبست کیا۔ کرشی وگیان کیندر میں ایک ٹریننگ آرگنائزر چیف ٹریننگ آرگنائزر ہوتا ہے جس کی مدد کے لیے بہت سائنسداں اور تکنیکی مہارت رکھنے والے افراد ہوتے ہیں۔ ان سب کی مشترکہ کوششوں سے چھوٹے اور خاص کر مارجنل کسانوں کو فائدہ پہنچانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ ان مراکز پر تربیت پانے والے کسانوں کی تعداد میں ہر سال اضافہ ہو رہا ہے۔ اس سلسلے میں اس کونسل کی کارگزاری درج ذیل نقشے سے واضح ہو جاتی ہے:۔

شعبہ جات	۱۹۸۰ تربیتی نصابات کی تعداد	۱۹۸۰ تربیت پانے والے امیدواروں کی تعداد	۱۹۸۲ تربیتی نصابات کی تعداد	۱۹۸۲ تربیت پانے والے امیدواروں کی تعداد
۱۔ فصل کی پیداوار	۵۴۶	۱۶،۰۸۶	۸۷۵	۲۱،۴۹۸
۲۔ مویشیوں کی پرورش اور افزائش	۱۹۳	۲،۸۲۸	۳۳۰	۳،۷۳۵
۳۔ باغبانی	۱۶۵	۴،۱۴۲	۳۰۹	۱۰،۹۱۵
۴۔ ہوم سائنس	۱۲۱	۴،۸۰۲	۴۷۰	۵،۴۲۱
۵۔ ایگری کلچرل انجینئرنگ	۵۲	۱،۱۰۴	۲۴۲	۴،۲۱۰
۶۔ ماہی گیری	۴۵	۶۸۴	۷۰	۱،۱۹۵
۷۔ دیگر	۵۲	۵۸۸	۲۵۰	۳،۷۱۳
میزان	۲۲۱	۳۰،۲۳۸	۲،۴۵۰	۵۰،۶۸۷

بقیہ: ہندوستان میں تعلیم کا ڈھانچہ کیسا ہو؟

کے علاوہ یہ فیصلہ بھی ضروری ہوتا ہے کہ بچے (Academic Stream) (خالص کتابی تعلیم) یا (Vocational Stream) (پیشہ ورانہ تعلیم) اختیار کرے اس سے جب بچے کا رجحان اعلیٰ

م.م. راجندر

بیل گاڑی

آدھی رات گزر گئی تھی۔ ساری کائنات خاموش تھی جیسے زمین کا ذرّہ ذرّہ سو گیا ہو۔ اس گہرے سکوت میں دو میل پرے بھی کوئی آواز پیدا ہوتی تو یہاں تک صاف سُنائی دے جاتی۔ مثلاً یہاں سے ایک میل کی دُوری پر اورنگ آباد کو جانے والی سڑک پر کبھی کبھی کوئی موٹر یا لاری گزرتی تو اس کی کھڑکھڑاہٹ اور ہارن کی آواز یہاں تک صاف آ جاتی۔ اسی طرح کافی دُور کے فاصلے پر بھی کوئی کُتّا بھونکتا تو ایسا لگتا کہ کہیں پاس ہی بھونک رہا ہے۔ اور تو اور اس سنّاٹے میں دیوار پر کیل سے لٹکی اُس کی چالیس سال پُرانی جیبی گھڑی کی ٹِک ٹِک بھی کمرے میں صاف سُنائی دے رہی تھی۔!

دُنیا کی کوئی بھی حرکت دراصل کسی بھی وقت نہیں رُکتی۔ بس صرف مدّھم یا تیز ہو جاتی ہے۔ یہی صدائیں دن میں بھی ہوتی تھیں لیکن اتنے فاصلے سے کوئی بھی سُنائی نہیں دیتی۔ دن کے وقت زندگی کی گاڑی کے پہیئے اتنی تیزی سے گھومتے، اتنی گرد اور دھول اُڑتی، اتنا شور و شغب ہوتا کہ کوئی بھی آواز کانوں سے ٹکرا کر دل میں نہ اُترتی۔ بس جیسے یہ شور اس بظاہر بے مقصد زندگی کا ایک حصّہ ہو! کسی بھی تنہا اور مدّھم آواز کی اس شور کے مقابلے میں کیا قیمت تھی؟

رام سرن اب پینسٹھ[۶۵] سال کا تھا اور اس کا جسم اس سوکھے ہوئے خاموش کُرّہ کی طرح تھا جس کی حرارت ختم سی ہو گئی ہو اور جس کا شور ماند پڑ چکا ہو۔ اور اب اسی خاموشی کی کوکھ میں سے اُبھر کر ایک آواز اسے صاف سُنائی دے رہی تھی جیسے کسی ٹوٹے ہوئے گنبد کی صدا ہو۔ یہ آواز رام سرن کی رُوح کی تھی، اس کے ضمیر کی جو اس سے پہلے اس تیزی سے کبھی سُنائی نہیں دے رہی تھی۔ اب یہ آواز اتنی تیزی سے آ رہی تھی اور اتنی مسلسل تھی، جیسے کوئی تند و تیز پہاڑی ندی شور مچاتی ہوئی بہہ رہی ہو۔ یہ ایک عجیب تبدیلی تھی جو اس کے دل کو دہلا رہی تھی۔ جب وہ جوان تھا اسے اس تبدیلی کا احساس بھی نہیں تھا۔ اس نے ذہن پر زور ڈال کر سوچا، مگر نہیں یہ آواز اس سے پہلے اتنی صاف اور اتنی تیزی سے اسے سُنائی نہیں دی تھی۔

ہاں، رام سرن کو یاد آیا، ایّامِ جوانی میں بعض مرتبہ جب اس کا دل کسی گناہ کی طرف راغب ہوتا، وہ کوئی جُرم کرنے کی سوچتا یا جان بُوجھ کر کوئی غلط کام کرتا یا کوئی ایسا قدم اُٹھاتا جس سے کسی دوسرے کا نقصان اور اس کا فائدہ ہوتا تو دل میں سے کوئی آواز اُٹھتی تھی اور اسے منع کرتی تھی لیکن یہ آواز اتنی مدّھم اور ہلکی ہوتی تھی کہ وہ سُنی اَن سُنی کر دیتا تھا اور ایک طاقتور آواز اور شور اسے اپنی طرف کھینچ لیتا تھا۔ یہ شور اور پیک بڑی طاقتور ہوتی اور وہ بے بس سا ہو کر اس کی طرف کھِنچ جاتا۔ ایک دو بار تو ایسا بھی ہوا کہ اس نے ضمیر کی اجازت اور ضمیر کی آواز کی بات کی لیکن اسے یہ اختیار اور یہ صدا اتنی مدّھم تھی کہ اس نے پرواہ بھی نہیں کی۔ دراصل کئی مرتبہ تو رام سرن اپنی دولت اور طاقت کے نشے میں کھلکھلا کر ہنس پڑا تھا کہ خدا نے انسانی گناہوں پر ضمیر کا یہ پہرا لگایا بھی تو کتنا کمزور کہ کوئی معزور انسان خیال بھی نہ کرے اور اسے توڑ کر آگے بڑھ جائے۔!

لیکن آج اس منزل پر یہ صدا اتنی بلند اور طاقتور کیوں ہو گئی تھی؟ بالکل اسی طرح جیسے رات کے سنّاٹے میں کوئی لاری سڑک کو روندتی ہوئی جا رہی ہو، جیسے کوئی دریا اُمڑ اُمڑ کر بہہ رہا ہو، جیسے سمندر کی مضطرب لہریں کسی چٹان سے ٹکرا رہی ہوں۔

رام سرن گھبرا کر اپنی چارپائی پر سے اُٹھ گیا اور کھڑکی کھول کر باہر جھانکنے لگا۔ اس نے سردی کے باوجود اپنے اندر ایک جلن، بے چینی اور گھبراہٹ کا احساس کیا۔ وہ لوٹ گیا اور دروازے کی طرف بڑھا اور اسے کھول کر باہر جانا ہی چاہتا تھا کہ دُور سے کسی کُتّے کے بھونکنے کی آواز آئی اور عین اسی وقت کوئی وزنی لاری سڑک کو اپنے پہیّوں سے روندتی ہوئی گزری اور وہ خوفزدہ سا ہو کر واپس ہو لیا۔

تو کیا، رام سرن چارپائی پر لیٹ کر سوچنے لگا، مجھے اس سنّاٹے میں ہر آواز ہیبت ناک لگنے لگی اور کیا میرے ضمیر کی آواز اس خاموشی میں آنے والی ہر صدا سے مل کر ایک دل دوز چیخ بن جائے گی؟۔ ایسی چیخ جو سارا معرق پر گونج اُٹھے گی۔ وہ گھبرا کر بیٹھ گیا، اور اس نے کمرے میں روشنی کر لی۔ پھر اس نے دروازے کی چٹخنی لگا دی، کھڑکی کو مضبوطی سے بند کر دیا اور کونے میں کھڑے ہوئے بانس کو اُٹھا کر روشن دان بھی بند کر دیا۔ باہر سے آنے والی آوازوں اور وقتی شور کا گلا سا گھُٹ گیا۔ وہ اطمینان سے چارپائی پر بیٹھ گیا اور دیوار پر لٹکی ہوئی اپنی جیبی گھڑی کو دیکھنے لگا۔ پتہ نہیں روشنی میں کیا جادو تھا یا کمرے میں کونسی دوسری آوازیں اُبھر آئی تھیں کہ اب تو گھڑی کی ٹِک ٹِک بھی اسے صاف سُنائی نہیں دے رہی تھی۔

رام سرن لیٹ گیا اور اس نے سونے کی کوشش کی لیکن بے سُود۔ کئی سالوں سے اس کی نیند کا یہی حال تھا۔ سو گیا تو ایک دو گھنٹے نیند آ گئی ورنہ رات رات بھر جاگا رہتا۔ کئی دنوں سے اسے اپنے بھائی دیّا سرن کی بیوہ یعنی اپنی بھابی کا ہی خیال آ رہا تھا، حالانکہ اسے مرے ہوئے بھی کئی برس ہو گئے

تھا تو دوسرے رشتے داروں کے کہنے سننے سے اس نے اس کی بیوہ کو باپ کی چھوڑی ہوئی جائداد کا نصف حصہ دینا منظور کر لیا تھا لیکن دل نے بے ایمانی پہ تا فب کیا اور اس نے حساب کتاب میں گڑ بڑ کر کے اسے بہت ہی کم حصہ دیا۔ وہ بیچاری صرف چند سال ہی آرام سے رہ سکی اور اس کے لڑکے کی اچھی طرح پڑھائی لکھائی بھی نہ ہو سکی۔ رام سرن نے اپنے ہوشیار بھتیجے کو آگے پڑھانے میں بالکل مدد نہیں کی اور اپنے نالائق لڑکے پر روپیہ پانی کی طرح بہایا۔ وہ لڑکا عیاش ہو گیا اور اس نے باپ کو بڑا نقصان پہنچایا اور وقت نے ایک ایسی کروٹ لی کہ وہ جائداد اور وہ روپیہ پیسہ بھی اس کے پاس نہیں رہا تھا۔ لیکن اُس وقت اس کے ضمیر کی آواز کتنی کمزور تھی کہ وہ حقارت سے اسے کچلتا ہوا اپنی من مانی کر گیا تھا۔!

یہ بات تو نہیں تھی کہ زندگی میں جب کبھی رام سرن کسی گناہ یا جرم کی طرف مائل ہوا ہو تو اس کے ضمیر نے اسے ٹوکا نہیں تھا۔ مثلاً جب کبھی وہ بزنس میں ہزاروں کی بے ایمانی اور ہیرا پھیری کرتا، کوئی اُسے کسی قسم کا لالچ دیتا یا وہ کسی کو رشوت دیتا، یا وہ کوئی ناجائز منافع کماتا تو اسے ایک دفعہ یہ ضرور خیال آتا کہ وہ ٹھیک نہیں کر رہا ہے۔ یہ خیال ضمیر کی آواز تھی، اس کی ایک ہلکی سی دستک تھی۔ مگر ضمیر کے اس ٹوکنے کے باوجود وہ کام کر بیٹھتا کیوں کہ اس کا نتیجہ کسی بُری شکل میں فوراً سامنے نہ آتا اور جوانی اور طاقت کے ایام میں مستقبل کی فکر کسے ہوتی ہے۔ اس طرح رام سرن اپنے ضمیر کی آواز نہ سُن پایا وہ آواز اتنی کمزور ہوتی کہ وہ اس کی پرواہ نہ کرتا۔ زندگی کی ریل پیل، گہما گہمی اور چکا چوند میں ایسی درویشی کی کون سُنتا۔ وہ حیران تھا کہ جوانی میں آدمی جان بوجھ کر گناہ اور جرم کا مرتکب ہوتا ہے اور دل کے کسی کونے سے ایک حقیر سی آواز اُٹھتی ہے، جسے وہ رعونت سے خود ہی کچل دیتا ہے۔

رام سرن نے اُٹھ کر بتی بجھا دی اور منہ ڈھانپ کر لیٹ گیا۔ پچھلی زندگی کے واقعات سلسلہ وار اس کے ذہن پر منڈلانے لگے اور اسے نیند نہ آئی۔ اس نے زندگی میں بڑے گناہ کیے تھے، بڑی غلطیاں کی تھیں مگر وہ دولت اور طاقت کے نشے میں چور رہا تھا۔ اس نے ایک غریب آدمی راجو کو اس کی لڑکی کی شادی کے موقع پر دو ہزار روپیہ بھاری سود پر اُدھار دیے تھے، حالانکہ راجو نے مدتوں اس کے گھر میں اور اس کے کھیت پر برائے نام اُجرت پر کام کیا تھا۔ اس وقت اسے خیال آیا تھا کہ لڑکی بہت غریب اور بن ماں کی ہے اور وہ اس کنیا دان کے لیے یہ رقم راجو کو ویسے ہی دان کے طور پر دے سکتا تھا مگر یہ خیال چند لمحوں میں ہی غائب ہو گیا تھا اور بعد میں اس نے روپے کی وصول کے لیے راجو کے سامان اور اس کے چھوٹے سے کچے مکان کی قرقی کرالی تھی۔ رام سرن نے راجو کا خیال آتے ہی آنکھیں بند کر لیں اور ڈر کے مارے خیال کسی اور طرف لے جانے لگا۔ لیکن اسے نیند بھی تو نہیں آ رہی تھی۔ وہ سوچنے لگا کہ لوگوں نے ہمیشہ اس کی عزت کی تھی، کچھ ڈر سے، کچھ اس کی ظاہری شان و شوکت کی بنا پر۔ لیکن جس طرح شام ہوتے ہی درختوں کے سایے سمٹ جاتے ہیں، دولت اور طاقت کی وہ سُہانی دھوپ بھی سمٹ گئی تھی اور وہ آج بے سہارا اور ناطاقتی کا مجسمہ بنا اس کسمپرسی کی حالت میں پڑا تھا۔

کوئی تین بجے کے قریب رام سرن کی آنکھ لگی مگر مشکل سے کوئی آدھ گھنٹہ سویا ہوگا کہ پھر آنکھ کھل گئی۔ اس نے غور سے سُنا تو باہر سڑک پر کسی بیل گاڑی کے گزرنے کی آواز آ رہی تھی۔ پھر دور اورنگ آباد کو جانے والی سڑک پر کوئی لاری شور مچاتی ہوئی گزری۔ رام سرن سوچنے لگا کہ اس معرفی پر زندگی کا یہ بے ہنگم شور کبھی بند نہیں ہوتا۔ سوئی ہوئی کائنات کو بھی انسانی زندگی کا یہ بے ربط قُل اتھل پتھل کرتا ہی رہتا ہے۔ اس خیال کے آتے ہی وہ پھر اپنی زندگی کے بارے میں سوچنے لگا۔ یہ کاٹ کھانے والی تنہائی، بڑھاپے میں یہ بے بسی اور یہ خوف و ہراس، ایک کتا بیکار زندگی کا قدرتی انجام ہو سکتا ہے کہ یہ سوچتے ہوئے اس کے دل کے نہاں خانے سے کتنی ہی صدائیں پھر ابھریں اور وہ پڑا پڑا آنکھیں کیے آوازوں کو سُنتا رہا۔ پھر اس نے آنکھیں کھول دیں اور تاریک خلا میں گھورتا رہا۔ اس کے ایک انجانے ڈر نے پھر جکڑ لیا اور اس نے اُٹھ کر بتی جلا دی۔ پھر اس نے ایک گھٹن کا احساس کیا اور آگے بڑھ کر دونوں کھڑکیاں کھول دیں۔ ٹھنڈی اور صاف ہوا کے تیز سے جھونکے اس کے بوڑھے جسم میں سرسراہٹ پیدا کرتے ہوئے اندر گھس آئے۔ باہر ابھی تک تاریکی سکوت کا تسلط تھا۔ اور کسی بھی زندگی کا ثبوت صرف کتوں کے کبھی کبھی بھونکنے کی آواز اور کبھی کبھی دور سڑک پر گزرتی ہوئی موٹروں اور لاریوں کے شور کی صورت میں تھا۔ وہ کھڑکی کے پاس ہی کھڑا رہا۔ اور اچانک اپنے آپ سے بولا۔

"اب اس منزل پر ان آوازوں کا کیا فائدہ! خدا کی قدرت کہ یہ صدائیں جوانی میں کتنی مدھم اور اب اس کھوکھلے جسم میں کتنی طاقتور اور پُر شور۔

لیکن دراصل تو یہ آواز کبھی بھی کمزور نہیں تھی یہ دوسری بات ہے کہ اس نے اسے کبھی نہیں سُنا اور اس کی پرواہ نہیں کی۔ عین اسی وقت ہوا کا ایک جھونکا چیختا ہوا اندر گھسا اور کھڑکی کے دروازے پھٹ کی آواز کے ساتھ بند ہو گئے۔ رام سرن خوفزدہ سا ہو گیا مگر چارپائی پر لیٹنے کی بجائے دروازہ کھول کر باہر کھلی ہوا میں آ گیا۔ کائنات بے حد خستگی اور سکوت میں لپٹی ہوئی سوئی پڑی تھی۔ درخت بے خوابیدہ تھے، اچانک ہوا کے جھونکوں سے کھڑکھڑانے لگتے۔ بیل گاڑی کو یہاں سے گزرے ہوئے بڑی دیر ہو گئی تھی اور وہ دُور نکل گئی ہوگی لیکن بیلوں کے گلوں میں پڑی ہوئی گھنٹیوں کی آواز اس دُوری سے یہاں تک آ رہی تھی۔ صاف اور مسلسل جیسے جب سے اس بیل گاڑی کا سفر شروع ہوا تھا، یہ گھنٹیاں بجتی رہی تھیں اور جب تک سفر ختم نہیں ہوگا بجتی رہیں گی۔ ضمیر کی اس آواز کو کوئی سُنے یا نہ سُنے۔!

★

غزلیں

قاضی انہار

نیا ساعزم دے گا اک نئی سی زندگی دے گا
مرا ہر شعر ہر تیرہ شبی میں روشنی دے گا

طلسم ساحری دے گا نہ سازِ سرمدی دے گا
مری تخلیق کا لہجہ ہی بڑھ کر برتری دے گا

کسی مخلوق میں ہے سر فروشانہ صفت یارب
کہ سجدے میں کٹا کر اپنا سر ہی آدمی دے گا

مرے دل تیری بے چینی مقدر بن گئی تیرا
کوئی تسکین کا ساماں گھڑی با دو گھڑی دے گا

بھٹک کر دشمنی جب یوسفِ بے کارواں ہوگی
تو چپکے سے ابھر کر کوئی نکہ دوستی دے گا

جہاں پر ختم ہو جائے گی حدِ منصفانہ بھی
وہیں پر جذبۂ اخلاص ربطِ باہمی دے گا

رہو گے پھر بھی تم انہارؔ اپنے ظرف پر قائم
سمندر کی طرح تم کو کوئی تشنہ لبی دے گا

٭

جاوید وششٹ

یوں تو ہر دل کے لیے دیدۂ تر ہوتا ہے
عشق کی آنکھ کا آنسو ہی گہر ہوتا ہے
دشت میں سایہ فگن کوئی شجر ہوتا ہے
دھوپ میں پیڑ کا سایہ بھی ثمر ہوتا ہے
ہم گنہگار ہیں، اس سے ہمیں انکار نہیں
فطرتاً شر سے عبارت ہی بشر ہوتا ہے
بات اب کس کی سنیں! کس کو پکاریں لوگو!
خیر و شر دونوں کا، اس دل سے گزر ہوتا ہے
ہم نے کچھ سوچ کے ہی جام و سبو توڑے ہیں
میکدہ آج سے اللہ کا گھر ہوتا ہے
شیشۂ دل نے کہی سنگِ گراں سے یہ بات
پھول کی پتی میں ہیرے کا جگر ہوتا ہے
دل سے ہوتی ہیں بہت پیار کی باتیں جاویدؔ
جذب و احساس کا ہر لمحہ بسر ہوتا ہے

٭

روحِ فطرت

رضاؔ امروہوی

روحِ فطرت آج رقصاں آئی ہے
زندگی کی صبحِ خنداں آئی ہے

اے بہارو، آکے آرائش کرو
نازشِ حسنِ گلستاں آئی ہے

آج تو میری حریمِ شوق میں
نکہتِ زلفِ پریشاں آئی ہے

ہو مبارک تم کو اے اہلِ چمن
غیرتِ نسرین و ریحاں آئی ہے

نور سے جس کے چمک اٹھی حیات
آج وہ شمعِ فروزاں آئی ہے

ہو گئے روشن چراغِ آرزو
جانِ محفل، جانِ جاناں آئی ہے

جو بہارِ گلشنِ احساس ہے
وہ بہارِ بزمِ امکاں آئی ہے

جس کی ضو سے ہے منور زندگی
آج وہ روحِ چراغاں آئی ہے

کیوں نہ میں سرمستِ عشرت ہوں رضاؔ
میری جنت زمزمہ خواں آئی ہے

٭

فضاؔ ابن فیضی

نہ وہ ماحول، نہ میراث کی حد سے نکلا
یوں نکلنے کو تو قیدِ اب و جد سے نکلا

کاوہ بارِ نفس و جسم تھا صدیوں پہ محیط
حاصلِ زندگی بس ایک عدد سے نکلا

میں خفیف اس سے ہوا، اُس کے مقابل آکر
یعنی اونچا وہ بہت اپنے ہی قد سے نکلا

ہیں ابھی شہر میں خوش وضع کماندار بہت
یہ گماں چھوڑ کے میں تیروں کی زد سے نکلا

ہمت افزا ہے بہت اس کا یہ بے رحم سلوک
کام اپنا اسی خنجر کی مدد سے نکلا

صیدِ ابنائے زمانہ ہوں، یہی میرا نصیب
میں کہاں وقت کی فتراکِ حسد سے نکلا

مر گئے چارہ نوازانِ ازل کے ناخن
میں وہ کانٹا، جو نہ پہلے نہ ابد سے نکلا

لفظ تا لفظ رہا معنیٔ پنہاں کا غبار
کچھ نتیجہ نہ ہماری رد و کد سے نکلا

وسیم حیدر

اولمپک ۱۹۸۴
چند حقائق

- ۲۳ ویں اولمپک کھیلوں کا افتتاح امریکہ کے صدر جناب رونالڈ ریگن کے ہاتھوں ہوا جو ۲۹ جولائی تا ۱۲ اگست ۸۴ تک چلتا رہا۔ اولمپک کھیلوں میں ۱۴۰ ملکوں کے ۹ ہزار کھلاڑیوں نے شرکت کی جو اولمپک تاریخ میں سب سے زیادہ ہے۔ اور ۲۴ کھیلوں کا مقابلہ ہوا۔
- ۲۴ واں اولمپک کھیل ۱۹۸۸ میں سیول (Seoul) میں ہوگا۔
- افتتاحی پروگرام میں ہندوستانی دستہ کی قیادت ہاکی ٹیم کے کپتان ظفر اقبال نے کی۔
- اولمپک کھیلوں میں شرکت کرنے والا سب سے بڑا دستہ امریکہ کا تھا جو ۷۰۵ کھلاڑیوں پر مشتمل تھا۔
- اسٹیڈیم میں سب سے پہلے داخل ہونے والے کھلاڑی یونان کے تھے۔ جہاں سب سے پہلے ان کھیلوں کا آغاز ہوا تھا۔ میزبان امریکی کھلاڑی سب سے آخر میں آئے۔
- اولمپک کھیل ۵۲ برس بعد دوبارہ لاس اینجلس میں ہوا۔
- ۳۲ برس کی غیر حاضری کے بعد چین نے دوبارہ اولمپک کھیلوں میں شرکت کی۔
- رومانیہ مشرقی بلاک کے ملکوں کا واحد ملک تھا جس نے لاس اینجلس اولمپک میں حصہ لیا۔ افتتاحی تقریب میں رومانیہ کے کھلاڑیوں کا پرجوش استقبال ہوا۔
- ۱۹۸۴ اولمپک کا بائیکاٹ کرنے والے ممالک:- ۱۔ روس ۲۔ پولینڈ ۳۔ مشرقی جرمنی ۴۔ افغانستان، ۵۔ کیوبا ۶۔ لاؤس ۷۔ چیکوسلواکیہ ۸۔ بلغاریہ ۹۔ جنوبی یمن ۱۰۔ ہنگری ۱۱۔ ایتھوپیا ۱۲۔ شمالی ویتنام ۱۳۔ ایران ۱۴۔ البانیہ ۱۵۔ بولیویا ۱۶۔ انگولا۔ ایران بھی وجوہات کی بنا پر شامل نہ ہو سکا۔
- امریکہ میں ہندوستان کے سفیر مسٹر کے ایس۔ باجپئی نے اولمپک کھیلوں میں شرکت کے لیے یہاں آئے ہوئے ہندوستانی کھلاڑیوں کے اعزاز میں ایک ضیافت دی۔
- بنگلہ دیش کے ایتھلیٹ سید الرحمٰن پہلے بنگلہ دیشی ایتھلیٹ ہیں جنہوں نے لاس اینجلس اولمپک میں حصہ لیا اور اولمپک افتتاحی تقریب میں اپنے ملک کے چار رکنی وفد کی قیادت کی۔
- اولمپک ہاکی ٹورنامنٹ میں اولمپک اعزاز کا دفاع کرنے والی ہندوستانی ٹیم سیمی فائنل میں نہ پہنچ سکی۔ مغربی جرمنی کے ساتھ اس کا آخری لیگ میچ برابر رہا اور گول اوسط کی بنیاد پر مغربی جرمنی کی ٹیم سیمی فائنل میں پہنچ گئی۔
- ۲۳ ویں اولمپک کھیلوں میں ہندوستانی دستہ کی طرف سے مس پی۔ ٹی۔ اوشا نے ہندوستان کے لیے خوش کن کارکردگی انجام دی۔ مس اوشا پہلی ہندوستانی خاتون ہیں جو اولمپک دوڑ کے فائنل میں پہنچیں۔ لیکن ان کی بہترین ٹائمنگ بھی اولمپک میں چوتھے نمبر پر رہی۔
- خواتین کی ۴۰۰×۴ فائنل ریلے ریس میں ہندوستانی خواتین کی ٹیم چوتھے نمبر پر رہی، اس ٹیم میں پی۔ ٹی۔ اوشا، ولسما، شائنی ابراہم اور وندنا راؤ شامل تھیں۔
- پاکستان نے اولمپک ہاکی فائنل میں مغربی جرمنی کو ۲-۱ گول سے ہرا کر سونے کا تمغہ حاصل کیا اور برصغیر کا وقار بحال رکھا۔ پاکستان کو فتح سے ہمکنار کرانے والا گول کلیم اللہ نے پنالٹی کارنر سے کیا۔ مغربی جرمنی کو چاندی کا تمغہ اور برطانیہ کو کانسے کا تمغہ ملا۔
- اولمپک مقابلوں میں عورتوں کی ۴۰۰ میٹر ہرڈل (رکاوٹی دوڑ) میں مراکش کی مس نوال المتوکل (Nawal El Moutawakel) نے اولمپک ریکارڈ قائم کر کے سونے کا تمغہ جیت لیا۔ مس متوکل نے یہ فاصلہ ۵۴.۶۱ سکنڈ میں طے کیا۔ اولمپک تاریخ میں پہلی بار عرب خاتون کو سونے کا تمغہ ملا۔
- امریکہ کے کارل لیوس (Carl Lewis) نے ۱۰۰ میٹر، ۲۰۰ میٹر لمبی دوڑ اور ۴۰۰×۴ ریلے دوڑ میں سونے کے تمغے حاصل کئے۔
- مردوں کے تیر اندازی مقابلوں میں امریکہ کے ڈیرل پیس (Darrel Pace) کو سونے کا تمغہ اور رچ میک کنی (Rich Mc Kinny) کو چاندی کا تمغہ اور جاپان کے ہیروشی یاماٹو (Horyshi Yamamoto) کو کانسے کا تمغہ ملا۔
- مردوں کے باسکٹ بال مقابلے میں امریکہ کو سونے کا تمغہ، اسپین کو چاندی کا اور یوگوسلاویہ کو کانسے کا تمغہ ملا۔
- عورتوں کے باسکٹ بال مقابلے میں امریکہ کو سونے کا تمغہ، ساؤتھ کوریا کو چاندی کا تمغہ اور چین کو کانسے کا تمغہ ملا۔
- مردوں کے بائیسکل مقابلے میں ۱۹۰ کیلو میٹر روڈ ریس میں امریکہ کے الکسی گریوال (Alexi Grewal) کو سونے کا تمغہ، کناڈا کے الیس بیوئر (S. Bauer) کو چاندی کا تمغہ اور ناروے کے ڈی لارٹی زن (D-Laurtizen) کو کانسے کا تمغہ ملا۔
- عورتوں کے پہلے اولمپک بائیسکل ریس میں ۷۹ کیلو میٹر کی دوڑ میں امریکہ کی کونی کارپنٹر (Connie Carpenter) کو سونے کا تمغہ، ربیکا ٹوگس (Rebecca Twiggs) کو چاندی کا اور مغربی جرمنی کی سانڈرا شوماخر (Sandra Schumacher) کو کانسے کا تمغہ ملا۔
- فٹ بال کے مقابلے میں فرانس کو سونے کا تمغہ، برازیل کو چاندی کا اور یوگوسلاویہ کو کانسے کا تمغہ ملا۔
- مردوں کے والی بال کے مقابلے میں امریکہ کو سونے کا تمغہ، برازیل کو چاندی کا اور اٹلی کو کانسے کا تمغہ ملا۔
- عورتوں کے والی بال مقابلے میں چین نے سونے کا تمغہ جیتا۔ امریکہ کو چاندی کا اور جاپان کو کانسے کا تمغہ ملا۔
- آسٹریلیا کے پیراک ۲۰ سالہ طالب علم جان سیبن (Jan Sieben) نے پیراکی کے مقابلوں میں مردوں کی ۲۰۰ میٹر بٹر فلائی پیراکی میں عالمی ریکارڈ توڑ دیا اور سونے کا تمغہ حاصل کیا۔ مغربی جرمنی کے مائیکل گروس (Michael Gross) کو چاندی کا اور وینزویلا کے نیل کوچرن (Neil Cochran) کو کانسے کا تمغہ ملا۔
- عورتوں کے آل راؤنڈ جمناسٹک مقابلوں میں امریکہ کی میری لاؤ ریٹن (Mary Lou Retton) نے سونے کا تمغہ حاصل کیا۔ رومانیہ کی ایکاترینا سزابو (Ecaterina Szabo) نے چاندی کا تمغہ حاصل کیا۔ ★

پیشاب میں شکر
اور اِس کا علاج

بھارت میں ذیابیطس کے پھیلاؤ کو ... کرنے کے لیے مختلف ریسرچ ورکرز نے ... الگ علاقوں میں کام کیا ہے۔ ان تحقیقات ... پانڈیچری میں ۱۰۷ سے لے کر مدراس میں ... فیصدی تک اس کی شرح پائی گئی ہے۔ شمالی ... کے دیگر مقامات میں ۲ فیصد آبادی اس ... کا شکار پائی گئی ہے۔ یہ بھی پتہ چلا ہے کہ ... بھارت میں کم عمر بچوں میں ذیابیطس کی شرح مغربی ... ممالک کے مقابلے میں بہت کم ہے۔ یہ بات اس ... بھی اہم ہے کہ کم عمر کے مریض میں شکر کی بیماری ... شدید ہوتی ہے اور اس کو کنٹرول کرنا مشکل ... ہے۔ عام طور پر ۴۰ تا ۵۰ سال کی عمر کے لوگ ... ملک میں اس بیماری میں مبتلا ہیں، اس ... میں بیماری معمولی درجہ میں ہوتی ہے اور کنٹرول ... کرنے میں بھی آسانی ہوتی ہے۔ موٹاپے اور ذیا... بیطس کا قریبی تعلق پایا گیا ہے۔ چالیس یا پچاس ... فیصد ذیابیطس کے مریض موٹاپے میں مبتلا ہوتے ... یہ بات علاج کرنے اور غذائی پرہیز میں سہولت ... باعث ہوتی ہے۔ کمزوری اور ناقص غذائی ... کے نتیجے میں جو ذیابیطس کے اثرات ... ہوتے ہیں ان کا علاج زیادہ مشکل اور پیچیدگیاں ... زیادہ عام ہوتی ہیں۔ اس قسم کے مریض غریب ... اور دیہی آبادی سے تعلق رکھتے ہیں۔ بھارتی ... میں دیہی اور شہری آبادی میں ذیابیطس کا ... بالترتیب ۲ اور ۷ پایا گیا ہے۔ شہر میں متمول ... تعلیم یافتہ لوگ اس بیماری کا زیادہ شکار ہیں۔ ... کے علاج کے لیے سہولت اس وجہ سے بھی ... جاتی ہے کہ یہ طبقہ اپنی صحت کے بارے میں زیادہ ... دیتا ہے۔ بیماری ابتدائی درجہ میں دریافت ... جاتی ہے اور ایسے لوگ پرہیز کے بھی زیادہ پابند ہوتے ہیں۔ اس کے برخلاف غریب طبقہ اور دیہی آبادی میں جہالت اور لاپرواہی کے سبب مرض کی تشخیص دیر سے ہوتی ہے۔ غذائیت کی کمی کی وجہ سے ذیابیطس کی پیچیدگیاں زیادہ ہوتی ہیں۔ ایسے لوگ بالعموم علاج اور پرہیز کے زیادہ پابند ہوتے ہیں۔

بھارتی عوام کی غذا میں کاربوہائیڈریٹ زیادہ، پروٹین اور چکنائی کم ہوتی ہے۔ ذیابیطس کے مریض کو زیادہ پروٹین اور کم کاربوہائیڈریٹ کھانا چاہیے۔ جو ہمارے عوام کے لیے مہنگی غذا بن گئی ہے۔

لوگوں کی اکثریت سبزیوں کی عادی ہے جس میں پروٹین نسبتاً کم پایا جاتا ہے۔ ملک کے الگ الگ حصوں میں کھانے کی عادات بھی مختلف ہیں مثلاً جنوبی ہند، آسام، بنگال میں چاول، پنجاب گجرات میں گیہوں اور مہاراشٹر میں جوار باجرہ لوگوں کی خاص غذا ہے۔ تیلوں میں بھی ملک کے الگ الگ حصے مختلف قسم کے تیل استعمال کرتے ہیں۔ غذا کے سلسلہ میں ہدایت دیتے وقت ڈاکٹر کو ان تمام باتوں کو ذہن میں رکھنا چاہیے۔ یہ بات عام طور پر تسلیم کی گئی ہے کہ ذیابیطس ورثہ میں منتقل ہوتی ہے۔ لیکن یہ سمجھنا غلط ہے کہ ذیابیطس کی بیماری کے شکار والدین کی اولاد لازمی طور پر اس میں مبتلا ہو۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اولاد میں اس بیماری کے اثرات قبول کرنے کا زیادہ رجحان پایا جاتا ہے۔ یہ بات شادی اور ازدواجی زندگی میں اہمیت رکھتی ہے، تاکہ ذیابیطس والے خاندان شادی بیاہ سے احتیاط کریں، ہمارے ملک میں موسم گرم ہونے اور زیادہ پسینہ بہنے کے سبب جلدی امراض مثلاً پھوڑے پھنسیوں کی شکایت ہوتی ہے۔ شکر کی بیماری میں جلدی امراض زیادہ پائے جاتے ہیں۔ بعض جلدی امراض کی وجہ سے شکر کی بیماری کا شبہ اور تشخیص ہو جاتی ہے۔ بالعموم لوگ حفظانِ صحت کے اصولوں سے لاپرواہی برتتے ہیں۔ صفائی اور پانی کی حالت غیر تسلی بخش ہوتی ہے۔ لوگ یا تو ننگے پاؤں گھومتے ہیں یا ایسی چپلیں استعمال کرتے ہیں جن سے جلدی امراض پیدا ہوتے ہیں۔ شکر کی بیماری میں یہ جلدی امراض زیادہ شدت اختیار کر لیتے ہیں۔ ان تمام باتوں کے باوجود ہمارے ملک میں ذیابیطس کم پایا جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہماری غذا میں کاربوہائیڈریٹ زیادہ اور چکنائی کم ہوتی ہے۔ یہاں یہ ذکر کرنا مناسب ہوگا کہ ۴۰ فیصد ذیابیطس کے مریض لبلبہ کی پتھری میں مبتلا ہوتے ہیں جو کہ شراب نوشی کا نتیجہ ہے جس سے جگر اور لبلبہ پر ورم ہوتا ہے اور آہستہ آہستہ شکر کی بیماری پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کے علاج میں انسولین اور گولیاں مفید پائی گئی ہیں اس کے ساتھ زیادہ پروٹین اور Pancreatic Enzyme زیادہ فائدہ مند ہوتے ہیں۔ جسم میں معدے کے پیچھے ایک غدود ہوتا ہے جسے لبلبہ کہتے ہیں۔ اس کے خلیے انسولین خارج کرتے ہیں انسولین خون کے اندر شکر کو توانائی میں بدلتا ہے اور زائد شکر جگر اور رگ پٹھوں میں گلائیکوجین کی صورت میں جمع کرتا ہے۔ عام حالت میں جسم میں دو تین چمچے شکر کی مقدار گردش کرتی ہے۔ کھانے کے بعد کاربوہائیڈریٹ کی وجہ سے خون میں شکر کی مقدار بڑھنا شروع ہو جاتی ہے۔ عام طور پر ابتدائی درجہ میں کوئی تکلیف محسوس نہیں ہوتی حتیٰ کہ کوئی پریشانی مثلاً دل کا دورہ یا آنکھ میں خرابی کے باعث اس کی پہچان ہوتی ہے۔ یہ بیماری معمولی جانچ سے بآسانی پہچانی جاتی ہے۔ اس کی یہ خصوصیت یاد رکھئے کہ چالیس سال بعد ہر آدمی اپنے پیشاب کا معائنہ کرائے اور بلڈ پریشر چیک کرائے تاکہ ان امراض کی تشخیص ابتدائی درجے میں ہو سکے۔ اس کے ساتھ وزن کو بھی کنٹرول میں رکھنے کی کوشش کریں۔ کیونکہ موٹاپا، بلڈ پریشر شکر کی بیماری اور دل کی بیماری کے لیے زمین فراہم کرتا ہے۔ ★

Regd. No. D(DN) 985
R.N. 97032/81

Licensed U(DN) to post without pre-payment
at Civil Lines Post Office, Delhi-110 054.

Vol. 4 No. 12 YOJANA (URDU) 16-30 September, 1984

ہندوستان میں تعلیم کا ڈھانچہ کیسا ہو؟

اس بات کی ضرورت ہمیشہ سے محسوس کی گئی ہے کہ ہندوستانی تعلیم کا ڈھانچہ ایسا ہو کہ اس سے نہ صرف ہمیں تربیت یافتہ لوگ ملیں جو روزمرہ کی ضرورتوں کو پورا کریں بلکہ اچھے ہندوستانی بھی ثابت ہوں۔ اس کو سامنے رکھ کر عوام اور سرکار کی طرف سے کوششیں کی جاتی رہی ہیں۔ مختلف تعلیمی کمیشن بٹھانے کا مقصد یہ جانچ کرنا رہا ہے :-

۱۔ تعلیم دینے کے ڈھنگ میں کیسے بہتری لائی جائے۔؟

۲۔ تعلیم کا معیار کیسے اونچا کیا جائے۔؟

۳۔ تعلیم کو ہندوستانی ضرورتوں کے لیے کیسے مفید بنایا جائے؟ تاکہ اسکولوں اور کالجوں سے پڑھ کر نکلنے والے لوگ دیش کی ترقی میں حصہ لے سکیں۔

اس پس منظر میں تعلیمی کمیشن نے بہت سی سفارشات کیں اور مشورے دیئے اور ان پر عمل بھی ہوا۔ لیکن چونکہ تعلیم اسٹیٹ سبجیکٹ رہا ہے اس لیے تعلیم کا معیار سارے ملک میں ایک سا نہیں رہا۔ حالانکہ تعلیم کو ہندوستانی دستور میں جو بول کی ذمہ داری بنانے کا مقصد یہ تھا کہ عام طور پر تعلیم کا معیار ایک سا رہے اور خاص طور پر اپنے صوبے کی ضرورتوں کو پورا کرے۔ تعلیم کا نصاب یہ دیکھ کر بنایا جائے کہ صوبہ کو آنے والے دس پندرہ برسوں میں کس قسم کے انجینیروں، ڈاکٹروں، کاریگروں اور ماہروں کی ضرورت پڑے گی۔ اس بات کو بھی دھیان میں رکھا جائے کہ پڑھ لکھ کر نکلنے والے یہ نوجوان اگر اپنی تعلیم کی بنیاد پر دوسرے صوبوں میں نوکری لینا چاہیں تو انھیں دقت نہ ہو۔ اس کے علاوہ مرکزی سرکار نے ایسے تعلیمی ادارے کھولے جو کہ سارے ہندوستان کے لیے مفید تھے جیسے کہ (AIIMS (All India Institute of Medical Science) وغیرہ۔

کچھ بے جا نہ ہوگا اگر اسکولوں میں دی جانے والی تعلیم کے بارے میں تفصیل سے بات کی جائے۔ عام طور پر ہمارے اسکول دو طرح کے ہیں۔

۱۔ سرکاری انتظام سے چلنے والے اسکول۔

۲۔ غیر سرکاری انتظام سے چلنے والے اسکول ان میں ایسے اسکول بھی شامل ہیں جنھیں مذہبی ادارے چلاتے ہیں۔

آزادی کے بعد پبلک اسکولوں کی تعداد بہت بڑھی ہے اس طریقہ کی کامیابی سے متاثر ہو کر حکومت نے سینک اسکول اور ملٹری اسکول کھولے ہیں جو پبلک اسکول کی لائن پر چل رہے ہیں مالی حالت بہت مضبوط نہ ہوتے ہوئے بھی فنڈز کے بہتر استعمال کی وجہ سے ان اسکولوں میں پڑھنے والے بچوں کو پڑھائی اور کھیل کود کی بہترین سہولیات کلچرل ٹرننگ کے بہترین موقعے اور سائنس کی بہترین لیباریٹریز ملتی ہیں۔ جب یہ بچے ان اسکولوں سے تربیت لے کر نکلتے ہیں تو کسی میدان میں مات نہیں کھاتے۔ ان اسکولوں میں پڑھے ہوئے بچے آپ کو فوج میں افسر بنے ملیں گے حکومت کے مختلف اونچے عہدے پر ملیں گے اور مانے ہوئے انجینیر اور ڈاکٹر بنے ملیں گے مساوات پسندی کا نقطۂ نظر رکھنے والے لوگوں کی مانگ ہے کہ ان اسکولوں کو ختم کیا جانا چاہیئے کیونکہ ان سے اونچ نیچ کو بڑھاوا ملتا ہے۔

حکومت کی کوشش یہی رہی ہے کہ تعلیم مفید ہو اس کا معیار بلند ہو۔ بے روزگاری گھٹے اور زیادہ لوگ تعلیم حاصل کریں۔ اس کے لیے کوششیں اور تجربات ہر دور میں کئے گئے ہیں۔

ابھی کچھ عرصے پہلے تک تعلیم کا طریقہ کار ہمارے یہاں روایتی سا رہا ہے طالب علم چاہیے ان کا رجحان ہو یا نہ ہو سیدھے کالجوں میں جاتے رہے ہیں۔ اس کا اثر روزگار کے مواقع پر پڑا اور طلبا میں ایک عام اکتاہٹ پیدا ہوئی اس کا اظہار کالجوں اور یونیورسٹیوں میں ہڑتال، تشدد کے واقعات اور طلبا کی عام بے راہ روی کی صورت میں ہوا۔ تعلیم بے فائدہ ہو کر رہ گئی اور تعلیم میں لگے قومی سرمائے کا مفید استعمال نہ ہو سکا۔ زیادہ سنجیدگی سے صورت حال کا جائزہ لیا گیا اور تقریباً چار سال پہلے مرکزی حکومت نے کوٹھاری کمیشن کی سفارشات کو مان کر ۱۰+۲+۳ اسکیم شروع کی۔ اس کا مقصد ہے: ۱۔ بے روزگاری دور کرنا۔ ۲۔ سفید پوش آسامیوں کی چاہت کو ختم کرنا۔ ۳۔ سماج میں محنت کا مرتبہ بلند کرنا تاکہ ہاتھ سے کام کرنے والے لوہار، بڑھئی، راج مزدور، فٹر اور دوسرے دستکاروں کو سماج میں ان کا جائز مقام ملے اور ان کے پیشوں کو کم درجے کا یا معیوب نہ مانا جائے۔ ۴۔ اس طرح ایسے شہریوں کو تربیت دینا جو سب کے سب ملک کی تعمیر اور ترقی کے لیے کارآمد ہوں۔ اس اسکیم کے تحت (Work expe-- rience) یعنی عملی تجربہ کا پروگرام شروع کیا گیا جس کا مقصد بچوں کی مختلف دستکاریوں میں دلچسپی کی نشاندہی اور تربیت ہے۔ یہ اسکیم بڑے پیمانے پر سنٹرل بورڈ آف سیکنڈری ایجوکیشن کے اسکولوں میں شروع کی گئی۔ ٹیچروں کو اس کے لیے خاص طور پر ٹریننگ دی گئی۔ اس اسکیم کے تحت دس سال کی پڑھائی لازمی ہے جس کے ساتھ (Work expe-- rience) بھی ضروری ہے اگلے دو سالوں کی پڑھائی میں طالب علم کی قابلیت اور اس کے رجحان کو دھیان میں رکھ کر اس کو مضامین چننے کا اختیار دیا جاتا ہے! ...

(باقی صفحہ ... پر)

Published by the Director, Publications Division, Patiala House, New Delhi-110001
Printed by Skylark Printers, 11355, Id-Gah Road, New Delhi-110055

یوجنا

یکم تا ۱۵ر اکتوبر ۱۹۸۴ء

ایک روپیہ

معاشرتی انقلاب کی جانب
اقتصادی جمہوریت کا مقدمہ
(اقتصادی نظام)
(وسنت ساٹھے)

منصوبہ بندی کا اصل
مدعا کیا ہے؟
(بی۔ آر۔ دوبھاشی)

پیٹ کی گیس
(ڈاکٹر راکیش ٹنڈن)

بشیر احمد ڈبلا

جموّں و کشمیر میں سماجی بہبود کی سرگرمیاں

ہندوستان ترقی یافتہ ملک نہیں ہے۔ اس ملک میں بہت لوگ غریب ہیں اور بہت سارے لوگ غربت کی لائن سے بھی نیچے ہیں۔ اس کے علاوہ لوگوں کی ایک بڑی تعداد روایتی سماجی بندشوں میں پھنسی ہوئی ہے۔ آزادی کے بعد حکومت ہندوستان نے غربت اور اس کے سماجی و معاشی اثرات کو دور کرنے کے لیے موثر تدابیر شروع کیں اور اس کی انتھک کوشش یہ رہی کہ سماجی طور سے نیچے رہنے والوں کو معاشی خوشحالی کے ذریعے اُوپر لایا جائے۔ اس طرح سے سماجی انقلاب کے مقصد کو مدِّنظر رکھ کر ملک بھر میں سماجی بہبود کی سرگرمیوں کو بڑھاوا ملا۔

ریاست جموّں و کشمیر میں آزادی کے بعد یہاں سے سماجی بہبود کی سرگرمیاں شروع ہوئیں۔ اب تین دہائیاں گزرنے کے بعد ان سرگرمیوں کو زبردست بڑھاوا ملا ہے۔ سماجی بہبود کا ادارہ (Social Welfare Department) جو کہ ریاست میں سماجی بہبود کی سرگرمیوں کا واحد حکومتی ادارہ ہے، زندگی کے تمام شعبوں میں، تمام ضرورت مند طبقوں میں، اور ریاست کے تمام صوبوں، جموّں، کشمیر اور لدّاخ میں سرگرم عمل ہے۔ ادارے کے پروگراموں میں درجِ فہرست ذاتوں، پچھڑے طبقوں، گوجروں اور بکروالوں سے تعلق رکھنے والے غریب ترین لوگوں پر خاص توجہ دی گئی۔ عورتوں، بچوّں اور نوجوانوں سے متعلق فلاحی پروگرام مرکزی اہمیت کے حامل رہے۔ وزیرِ اعظم شریمتی اندرا گاندھی کے بیس نکاتی پروگرام نے بھی سماجی بہبود کے ان پروگراموں کی خاص سمت مقرر کی۔ اس طرح سے ریاست جموّں و کشمیر میں سماجی بہبود کے متعلق اسکیمیں پوری طرح سے کام کر رہی ہیں اور ضرورت مند لوگوں کی ضرورتیں پوری کرتی ہیں۔ سماجی بہبود کے ادارے کی یہ سرگرمیاں ان کوششوں کا ایک حصّہ ہیں، جن کے مطابق پچھڑے اور بکھرے انفرادی افراد کو صحت مند شہریوں میں تبدیل کیا جائے۔ اس ادارے کی سماجی بہبود سے متعلق سرگرمیاں مندرجہ ذیل میدانوں میں قابلِ ذکر ہیں :-

۱۔ تعلیمی سہولیات۔
۲۔ معاشی کفالت۔
۳۔ رہائشی مکانات کی فراہمی۔
۴۔ بچوّں کی فلاح و بہبود۔
۵۔ جسمانی طور پر معذور افراد کی فلاح و بہبود۔
۶۔ عورتوں کی فلاح و بہبود۔
۷۔ دوسری فلاحی سرگرمیاں۔

تعلیمی سہولیات

تعلیمی سہولیات میں درجِ فہرست ذاتوں اور پچھڑے طبقوں سے تعلق رکھنے والے طلبا کے لیے میٹرک سے پہلے اور میٹرک کے بعد والے وظائف اور ایم۔ بی۔ بی۔ ایس، ایم ڈی، ایم ایس، بی ای اور ایم ای کے لیے وظائف شامل ہیں۔ ان سہولیات کی وجہ سے ان کمزور طبقوں سے تعلق رکھنے والے ہزاروں طلبا درمیانی اور اعلیٰ درجے کی تعلیم حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔

۸۳-۱۹۸۰ء کی مدّت میں ۹۸٫۴۲ لاکھ روپے خرچ کر کے ۸۶٫۵۲۹ طلبا کو فائدہ پہنچایا گیا۔ موجودہ سال میں ۵۴٫۹۴ لاکھ روپے خرچ کر کے ۲۰٫۸۷۶ طلبا کو فائدہ دیا جائے گا۔ ۵۲٫۰۰۰ طلبا کو کتابیں، اسٹیشنری اور وردیاں مہیا کی گئیں اور درجِ فہرست ذاتوں سے تعلق رکھنے والے ۴۳۴ اسکول چھوڑنے والوں کے لیے میٹرک سے قبل کی کوچنگ اسکیم شروع کی گئی۔ ان طلبا اور گوجر و بکروال طلبا کی فیس کی ادائیگی کا انتظام بھی کیا گیا جس سے ۳۰٫۰۰۰ طلبا مستفید ہوئے۔ اس کے علاوہ مرکزی حکومت کی ایک اسکیم کے تحت کتابوں کے بہت سارے بینک شروع کئے گئے۔ جن سے پچھلے ۴ سالوں کے دوران ۴۲۰ طلبا کو کتابیں مفت فراہم کی گئیں۔

غریب ترین طبقوں میں معاشی بہتری لانے کی غرض سے کاٹیج انڈسٹری مراکز شروع کئے گئے۔ ان میں غریب لڑکے اور لڑکیوں کو ٹریننگ دی گئی اور بعد میں اُن کو اپنے مراکز شروع کرنے کے لیے معاشی و غیر معاشی امداد دی گئی۔

(باقی کور ۳ پر)

یوجنا، نئی دہلی
یکم تا ۱۵ ستمبر ۱۹۸۴

اس شمارے میں

منصوبہ بندی اور ترقیاتی پروگراموں کی جھلک پیش کرنے والا

پندرہ روزہ

یوجنا

نئی دہلی

چیف ایڈیٹر :- آر۔ شنکرن

ایڈیٹر :- لکھمی رام رانا

اسسٹنٹ ایڈیٹر :- محمد عادل صدیقی

سب ایڈیٹر :- وسیم حیدر

جلد ۲۸	یکم تا ۱۵ اکتوبر ۱۹۸۴	شمارہ ۱۳

۹ آشون تا ۲۳ آشون شک سمبت ۱۹۰۶ فون : ۳۸۷۳۴۱

شرح چندہ :-

سالانہ ۲۰ روپے۔ ۲ سالہ ۳۵ روپے۔ ۳ سالہ ۵۰ روپے

فی کاپی :- ایک روپیہ

طالب علموں، استادوں اور لائبریریوں کے لیے ۱۰ فی صد کی رعایت

یوجنا منصوبہ بند ترقی کے بارے میں عوام کو آگاہ کرتا ہے مگر اس کے مضامین صرف سرکاری نقطۂ نظر کی وضاحت تک ہی محدود نہیں ہیں

بزنس منیجر: ایل۔ آر۔ بترہ ★ اسسٹنٹ ڈائرکٹر (پروڈکشن): رام سروپ منجال

مضامین سے متعلق خط و کتابت کا پتہ

ایڈیٹر یوجنا (اردو)، پبلیکیشنز ڈویژن پٹیالہ ہاؤس نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

ترسیل زر کا پتہ

بزنس منیجر، پبلیکیشنز ڈویژن پٹیالہ ہاؤس نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

اداریہ

ساتویں منصوبے میں غریبی دُور کرنے پر زور

اقوامِ متحدہ کے خوراک اور زراعت سے متعلق ادارے نے ترقی پذیر ملکوں میں دیہی حالات کا ایک جائزہ لیا ہے۔ اس اندازے کے مطابق ترقی پذیر ملکوں میں دیہات میں آباد ۷۰ کروڑ افراد انتہائی غربت میں زندگی گزار رہے ہیں۔ گویا کہ تیسرے ملکوں کی کثیر آبادی بھوک اور ناقص غذاؤں کا شکار ہے۔ آج دنیا میں بھوک اور ناقص غذاؤں کے ازالے کے لیے توجہ دی جا رہی ہے۔ ان ملکوں میں غربت کی اصل وجہ اقتصادی نظام کی ناکامی ہے۔ ان ملکوں میں سماجی انصاف، مساوات، اور عوام کی بحیثیت مجموعی بہبود نیز سماجی اور دولت کی تقسیم سے متعلق نظام کی تبدیلی ایک چیلنج کی حیثیت رکھتی ہے۔

تیسری دنیا کے بہت سے ممالک نے اقتصادی ترقی کے لیے بہت سی حکمتِ عملیاں اپنانے کی کوشش کی ہے، لیکن تجربہ شاہد ہے کہ اقتصادی ترقی کے فائدوں کی تقسیم منصفانہ نہیں ہے۔ یہ امر مسلمہ ہے کہ اقتصادی ترقی کے ذریعے سے ہی ان ملکوں کے سماجی اور اقتصادی مسائل کو حل کیا جا سکتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی ترقی پذیر ملکوں میں دیہی ترقی نے ایک خاص اہمیت اختیار کر لی ہے۔ اس سلسلے میں سماجی، ثقافتی اور اقتصادی نابرابریوں کو دُور کرنے پر خاص زور ہے۔

ہندوستان کا جہاں تک تعلق ہے دیہی علاقوں میں جہاں کہ ملک کی تقریباً ۷۰ فیصد آبادی رہتی ہے، عوام میں بڑے پیمانے پر غریبی ہے نیز بے روزگاری، ناخواندگی اور پیداواری صلاحیت کی کمی وغیرہ ہے۔ اس سلسلے میں قرضہ اور سرمایہ کاری سے متعلق کُل ہند سروے کی رپورٹ میں مذکور ہے کہ دیہی غریب عوام کی تقریباً ۱۰ فیصد آبادی کے پاس کسی طرح کی کوئی اراضی نہیں ہے۔ اسی طرح دیہی عوام میں ۱۲ فیصد آبادی کے پاس اپنا ذاتی مکان نہیں ہے۔ ۴۵ فیصد کسانوں کے پاس زرعی آلات نہیں ہیں۔ ۵۰ فیصد دیہی عوام کے پاس کوئی مویشی نہیں ہے اور دس فی صد کے پاس کسی طرح کا کوئی مستقل اثاثہ نہیں ہے۔ لہٰذا ساتویں منصوبے میں غریبی دور کرنے کے پروگرام کو اعلیٰ ترین ترجیح دینا وقت کی ضرورت ہے۔ منصوبہ بندی کے عمل میں پہلی بار اس پروگرام کو عملی جامہ پہنانے پر شروع کیا جا رہا ہے۔ اس کے لیے آمدنی کے وسیلے بڑھانے پر زور ہے۔ توقع ہے کہ روزگار کے مواقع بڑھانے کے لیے چلائے گئے مختلف پروگرام غریبی دُور کرنے کے پروگرام کو کامیاب بنانے میں معاون ہوں گے۔

پہاڑی علاقوں کے لیے ہینڈ لوم پراجیکٹ:— کامرس کی وزارت نے اُتر پردیش، ہماچل پردیش، جموں و کشمیر اور شمال مشرقی ریاستوں میں ہینڈ لوم کی مصنوعات کی تیاری سے متعلق ایسے پراجیکٹ شروع کرنے کے لیے اقدامات کئے ہیں جن کو باہر ملکوں میں بھیجا جا سکے۔ یہ پراجیکٹ خاص طور پر پہاڑی علاقوں میں قائم کئے جا رہے ہیں۔ ۸۵-۱۹۸۴ میں اس مقصد کے لیے ۵۰ لاکھ روپے کی رقم رکھی گئی ہے۔ ان پراجیکٹوں کے قیام کا مقصد یہ ہے کہ معیاری سامان تیار کیا جا سکے۔ اور وہ غیر ملکی منڈیوں میں اپنی ساکھ جما سکے۔ اس مقصد کے لیے ہینڈ لوم کی مصنوعات سے وابستہ لوگوں کو قرضے کی سہولتیں، تنظیمی سہولتیں، اشیاء کی فروخت کی سہولتیں وغیرہ دی جا رہی ہیں۔ اُمید ہے کہ ان اقدامات سے ہینڈ لوم کی صنعت کو بڑھاوا مل سکے گا اور بنکروں کی حالت سُدھر سکے گی۔

ہینڈ لوم کی مصنوعات کی برآمدات میں اضافے سے متعلق پراجیکٹوں کا سلسلہ ۷۶-۱۹۷۵ میں ہی شروع ہو گیا تھا۔ اب تک ۲۱ پراجیکٹوں کی منظوری دی جا چکی ہے۔ ہر پراجیکٹ کے تحت ایک ہزار کھڈیاں کام کریں گی۔

قرضہ دینے والے کوآپریٹو ادارے:— سبز انقلاب کی آمد سے زرعی ترقی کے نئے نئے گوشے سامنے آ سکے ہیں۔ زراعت کو جدید لائنوں پر لانے کے لیے زرعی آلات درکار ہیں، اور زرعی آلات فراہم کرنے کے خیال سے زرعی قرضوں کی مانگ بڑھی ہے۔ چنانچہ کسانوں کے لیے قرضہ فراہم کرنے کے واسطے بہت سے ادارے کام کر رہے ہیں۔ اس سرمایہ کاری کا بنیادی مقصد دیہات کی ہمہ جہت ترقی ہی ہے۔ ان کے ذریعے زراعت کو آگے بڑھانا مقصود ہے۔ لیکن ان کوششوں سے خاطر خواہ نتائج سامنے نہیں آ سکے تو اس لیے کہ اس نظام کے تحت مربوط طریقے پر کام انجام نہیں دیا جا سکا۔ دیہی عوام کو قرضہ فراہم کرنے میں کوآپریٹو اداروں کا رول سب سے زیادہ اہم سمجھا جاتا ہے۔ ان اداروں کی طرف سے قرضے فراہم کرنے کے لیے ایک وسیع نظام زیرِ عمل ہے اور اسے دیہی سطح پر قرضہ کی فراہمی کا بہترین نظام تسلیم کیا گیا ہے۔ بنکنگ کمیشن نے بھی ۱۹۷۲ میں اپنی رپورٹ میں کریڈٹ کوآپریٹو اداروں کے رول کی اہمیت واضح کی تھی۔ اس میں ایک تو فائدہ یہ ہے کہ ان کی کارگزاری کا مرکز مقامی ہوتا ہے، دوسرے ان کے نظم و نسق کا جمہوری کردار ہوتا ہے۔ تیسرے یہ ادارے مقامی کسانوں کی ضرورت کو سمجھ سکتے ہیں اور ان کی ضرورتوں کو بہتر طریقے پر پورا کر سکتے ہیں۔ اسی لیے ان اداروں کے کردار کو ہر طرف سے تائید حاصل ہے۔ گزشتہ دس برسوں میں ان اداروں کی اہمیت کے پیشِ نظر ان کی سرگرمیوں کو مزید تیز کئے جانے کی ضرورت محسوس کی گئی ہے۔ خاص کر پسماندہ علاقوں میں ان کی سرگرمیوں کو بڑھانے کی خاص ضرورت ہے تاکہ زرعی ترقی کے لیے ان سے عملی صورت میں امداد مل سکے۔

(۲۱ تا صفحہ ۲)

وسنت ساٹھے

معاشرتی انقلاب کی جانب

اقتصادی جمہوریت کا مقدمہ

تیسرا باب
اقتصادی نظام قسط : ۷

سیاسی اقتصادیات اور معیشت انسانی سرگرمیوں کا ایک اہم شعبہ ہے۔ یہ کبھی کبھی دیگر شعبوں کی سرگرمیوں پر نگرانی کرتی ہے اور انھیں بڑھاوا دیتی ہے۔ حتیٰ کہ سائنس اور ٹیکنالوجی کے فروغ کا ذریعہ بھی بنتی ہے۔

اس سے پہلے باب میں ہم نے دیکھا کہ انسان کا بطور ایک باشعور مخلوق مکمل ارتقا محض اس کی جسمانی ضروریات پورا کرنے کی جدوجہد سے ہی نہیں ہوا بلکہ یہ اس کی علم حاصل کرنے کی پیاس، اپنے ماحول سے ہم آہنگ ہونے اور اپنے گرد و پیش کی دنیا اور ماورا کو ڈھالنے اور ان پر حاوی ہونے کی خواہش کا بھی مرہونِ منت ہے۔ اسی خواہش نے جو علم و شعور کی تشنگی سی پیدا کر رہی ہے، انسان کو کھوج کرنے اور اپنی حیات و موت کے راز کی حقیقت جاننے پر اکسایا۔ اپنی کھوج کے دوران جب انسان ناقابلِ تسخیر سنگِ راہ سے دوچار ہوا، تو اس نے اس نامعلوم شکل کو کسی حاکمِ مطلق سے منسوب کر کے اپنے آپ کو دلاسا دے دیا۔ لیکن باوجود اس کے اس نے اپنی تلاش جاری رکھی۔ یوں تو تاریخ پر ایک نظر ڈالنے سے شاید ایسا معلوم ہو کہ تہذیبوں کی تمام تر نشو و نما اور ترقی جاہ طلبیوں کی ذاتی اُمنگ یا چند بوالہوسوں کی تمنا ہو، تاہم تمدن، تہم جوئی، سائنس اور فنون کے وسیع میدان میں انسان کو متحرک کرنے والی مادی حرص سے زیادہ کوئی دوسری تمنائیں تھیں۔ لہٰذا جب ہم انسان کی سیاسی اور اقتصادی سرگرمیوں کا ذکر کرتے ہیں تو ہمیں اس نظریے کو جسے اکثر پیش کیا جاتا ہے سرے سے ہی رد کر دینا چاہیئے کہ سماجی، اقتصادی یا سیاسی میدان میں جو کچھ بھی ظہور میں آیا اس کی پشت پر انسان کی مادی طاقت حاصل کرنے کی حرص اور دوسروں پر حکمرانی کرنے کی ہوس تھی۔ اس دلیل کا بھی اکثر اعادہ ہوتا ہے کہ جب تک آزاد تجارت اور بلا مداخلت کاروبار کی اجازت نہیں ہوگی۔ چاہے اس سے مراد اپنے ہی بھائی بندوں سے ناجائز فائدہ اٹھانا ہی کیوں نہ ہو۔ اس وقت تک صنعت اور کاروبار میں بہتر سرگرمی پیدا کرنے کے لیے آپ جوش اور اُمنگ پیدا نہیں کر پائیں گے۔ ہمیں اس نقطہ پر زیادہ غور کرنے کی ضرورت نہیں کیوں کہ اس دلیل کی مجہولیت زندگی کے ہر میدان میں بار بار ثابت ہو چکی ہے۔

یہ بات آسانی سے سمجھ میں آسکتی ہے کہ انسان کی بنیادی تمنا یہی رہتی ہے کہ وہ اپنی مادی اور جسمانی ضروریات فراہم کرے تاکہ وہ اپنی بخوبی پرورش کر سکے اور ایک آسودہ حال زندگی کو ممکن بنا کر مختلف میدانوں میں اپنی پسند اور انتخاب کے مطابق سرگرمِ کار ہو سکے۔ مثلاً حصولِ علم و فن کی طرف جس کا ذکر ہم پہلے کر چکے ہیں۔ انسانی تاریخ میں ایسا ہی ہوتا آیا ہے نارمل بنیادی ضروریات اور آسائشوں کے پورے ہونے کے بعد ایک ایسا مقام آتا ہے جبکہ اس کی مادی ہوس کی وجہ محض یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنی شان و شوکت اور رعب و دبدبہ کا اپنے بھائی بندوں کے سامنے اظہار کر سکے۔

جہاں تک بنیادی ضروریات کا تعلق ہے، اس طرہٗ امتیاز کے دکھاوے سے کوئی ذاتی تشفی نہیں ہوتی۔ اگر ہم نے ایسے حالات رونما ہونے دیئے جہاں بعض افراد دوسرے لوگوں کو ان کے حق سے محروم کرتے ہوئے مادی سرمایہ کو ہتھیانے اور اس پر قابض ہونے میں کامیاب ہو گئے تو مواقع کی مساوات اور سماجی انصاف کا نظریہ بے معنی ہو کر رہ جائے گا۔ انسان کا اپنے جسم پر حق ایسا ہی بنیادی حق ہے جیسا کہ اپنی جائداد پر۔ اور یہ ہر انسان کا بنیادی حق ہونا چاہیئے کہ وہ زندہ رہنے یا نہ رہنے کا خود فیصلہ کر سکے۔ اگر کوئی شخص سماج سے تعلق نہیں رکھنا چاہتا تو وہ اس سے الگ تھلگ ہونے میں آزاد ہونا چاہیئے اور اگر وہ سماج سے قطعی طور پر الگ ہونا پسند کرے تو اس امر کا انتخاب کرنے کی اس کو مکمل آزادی ہونی چاہیئے۔ اس کا منطقی نتیجہ یہ ہے کہ اگر کوئی شخص اپنے کردار سے سماج کے دوسرے ممبروں کو نقصان پہنچاتا ہے تو سماج کو حق

حاصل ہونا چاہیے کہ وہ سوشل اناٹمی کے طور پر اس بیمار ممبر کا علاج کر سکے۔ اور اگر بیماری ناقابلِ علاج ہو تو اس شخص کو جسم کا ایک بے کار حصہ سمجھ کو رد کر سکے۔ اس ضمن میں کوئی اخلاقی زبردستی نہیں ہونا چاہیے۔

لہٰذا ہندوستان کے لیے جو حال ہی میں غیر ملکی سیاسی جبر اور اقتصادی ستم سے آزاد ہوا تھا۔ اولین اور سب سے زیادہ قابلِ غور بات تھی کہ اس کے لیے ایسا اقتصادی ڈھانچہ تیار کیا جائے جو بیرونی اور اندرونی استحصال پسندوں سے بچ کر تمام قوم کی متوازن ترقی کا ضامن بن سکے۔

غیر ملکی غلبہ سے رہائی کا مطلب ہر ہندوستانی کی اقتصادی آزادی نیز غربت اور لوٹ کھسوٹ سے نجات بھی ہونا چاہیے تھا۔ خاص طور پر غریب ترین طبقہ کی۔ کیوں کہ جنگِ آزادی کے سارے دور میں جس کی رہنمائی مہاتما گاندھی، جواہر لال نہرو اور ایسے ہی دوسرے نیتاؤں نے کی۔ ہمارے پیشِ نظر یہی تصور اور یہی لائحۂ عمل تھا۔ غریب ترین طبقے کے مسائل کو سب سے پہلے حل کرنے پر جو زور دیا گیا وہی تمام انتظامیہ اور سرکار کے لیے معیارِ عمل سمجھا گیا۔ مہاتما گاندھی کا ایک مشہور قول ہے :-

"میں آپ کو ایک مشورہ دیتا ہوں، جب کبھی آپ شک و شبہ کا شکار ہوں یا آپ خود کو سنبھال نہ پائیں تو مندرجہ ذیل نسخہ اپنایئے! کسی غریب ترین اور کمزور ترین انسان کے چہرے کا تصور کیجئے اور اپنے آپ سے سوال کیجئے کہ جو قدم آپ اٹھانا چاہتے ہیں، اس سے اسے کوئی فیض حاصل ہوگا۔ کیا اس سے اسے کچھ مل پائے گا؟ کیا اس سے وہ اپنی زندگی اور اپنے مستقبل پر غالب ہونے کے اہل ہو سکے گا؟ دوسرے الفاظ میں کیا یہ لاکھوں بھوکے اور روحانی پیاسوں کو سوراج کی طرف لے جائے گا؟ ایسے میں آپ کے شک و شبہات دور ہو جائیں گے اور آپ کی خودی پیچھے جائے گی۔"

حکومت کے افسرانِ اعلیٰ کی میزوں پر یہ قول اکثر رکھا ہوتا تھا۔ اور اسی مقصد کے پیشِ نظر پنڈت جواہر لال نہرو کی موثر اور دور اندیش رہنمائی میں ہم نے منصوبہ بندی کے نظریہ کو اپنایا تاکہ متوازن اقتصادی ترقی کر سکیں۔ جس سے لاکھوں بھوکے اور غریب عوام کی بہبود ممکن ہو پائے۔

تینتیس برس سے زیادہ کا عرصہ ہو چکا ہے اور وقت آگیا ہے کہ ہم اس کی کامیابی کا اندازہ لگائیں۔ اور یہ بھی معلوم کریں کہ جس مقصد کے لیے منصوبہ بندی شروع کی گئی تھی وہ حاصل ہو رہا ہے یا کہ ہمیں نشوونما اور اقتصادی سرگرمیوں کے ضمن میں اپنے لائحہ عمل میں تبدیلی کرنی اور نیا رُخ اپنانا ہے۔ مجموعی طور پر دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ ہم نے مختلف میدانوں میں بہت ترقی کی ہے۔ حقیقتاً ہم نے تعمیری کاموں میں بلا کی اہلیت دکھائی ہے۔ اور خاص طور پر نشوونما کے حصے میں ہم نے ترقی کے بنیادی سلسلے کا ٹھوس کام کیا ہے اور ہم اپنی کامرانی پر صحیح طور پر فخر کر سکتے ہیں یہ تو ہوا۔ لیکن ہم اس امر سے آنکھیں نہیں موند سکتے کہ تعمیر و ترقی مقابلتاً بھارتیوں کے ایک چھوٹے سے طبقہ تک محدود رہی ہے۔ ہم نے تو غربت کے سمندر میں خوشحالی کا ایک چھوٹا سا جزیرہ پیدا کر دیا ہے۔ جس میں آبادی کا ایک حقیر حصہ جدید تہذیب کے ہر آرام سے مستفید ہے۔

ہماری قومی ترقی کی عکاسی بمبئی ایسے بڑے شہر سے ہوتی ہے۔ جہاں آپ کو آسمان سے باتیں کرتی ہوئی عمارتیں ملیں گی۔ اور عمدہ ترین ہوٹل۔ لیکن ان کے اردگرد آپ تاحدِ نظر غریبوں کے جھونپڑے اور گندی بستیاں پائیں گے۔

غیر متوازن ترقی کی اس سے واضح مثال کہاں سے ملے گی؟ لیکن اس امر سے انکار ممکن نہیں کہ انسانی زندگی کو بہتر بنانے کے لیے جو مجموعی طور پر پالیسی بنائی گئی تھی اس سے کچھ فائدے بھی ہوئے ہیں۔

چند لوگوں کو قبل از آزادی لوگوں کی حالت کا پتہ ہے۔ وہ جب دور دراز دیہات میں زندگی بسر کرنے کے حالات کو دیکھیں گے تو پہلے سے کہیں زیادہ تبدیلیاں پائیں گے۔ اوسطاً ہندوستانیوں کی عمر ۲۶ برس سے ۵۴ برس تک بڑھ جانا بجائے خود ایک عجوبہ ہے اور وہ بھی ۳۰ برس میں یوں تو قابلِ اعتنا ترقی ہوئی ہے۔ پھر بھی حقیقت میں جو بگاڑ پیدا ہوا ہے۔ اس سے انکار نہیں کیا جاتا ہے۔ خاص طور پر جب ہم یہ معلوم کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ (جیسا کہ جواہر لال نہرو نے مہالانوبس کمیٹی مقرر کر کے معلوم کرنے کی کوشش کی تھی) کہ منصوبہ بندی سے جو ترقی ہوئی ہے۔ وہ سب کی سب کہاں ہوا ہو گئی یا ترقی محض چند ہاتھوں تک محدود رہی۔

اس سے ہماری آبادی کا بیشتر حصہ نہ صرف محروم ہی رہا بلکہ اس کو ترقی کرنے کے مواقع ہی نہیں ملے بیکار لوگوں کی فوج میں اضافہ ہو رہا ہے۔

اگر ہم سماجی بے چینی کے مسائل کی جڑوں تک جائیں تو ہمیں معلوم ہو جائے گا کہ چاہے ان کی صورت صوبائی اور علاقائی شورو شر ہو یا لسانی اور مذہبی۔ ان کی تہہ میں اقتصادی محرومی ہے۔ خاص طور پر جوان طبقہ میں جنھیں نفع بخش ملازمت حاصل کرنے اور ترقی کرنے کے مواقع ہی نہیں ملے۔ اس سے ان نوجوانوں میں مایوسی پیدا ہوتی ہے۔ انھوں نے عام تعلیم حاصل کی۔ بعض صورتوں میں ٹیکنیکل تعلیم بھی۔ لیکن وہ کوئی ایسی ملازمت حاصل نہیں کر پائے۔ جس سے وہ اپنی اور اپنے لواحقین کی مناسب طور پر دیکھ بھال کرنے کے لیے کچھ کما سکیں۔ ایسے نوجوان لوگ صبر کا دامن ہاتھ سے دے بیٹھتے ہیں اور انھیں آنے والے مستقبل کے وعدوں سے دلاسا نہیں ملتا اس لیے یہ نوجوان تنگ نظری پر مبنی مفادات کی فوری اپیل کا شکار بن جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر ان کو یہ احساس ہونے لگتا ہے کہ اگر وہ ان لوگوں کو جو ان سے زبان، مذہب یا کسی دوسرے ظاہرا انداز سے مختلف ہیں۔ مار باہر کریں اور نکال ڈالیں"

ن کے لیے ملازمتوں کی راہیں کھل جائیں
اور سود مند کاروبار کے مواقع پیدا ہو جائیں گے
ہ بنیادی خیال کے ساتھ دوسرے جذباتی معاملات
ڑ دیے جاتے ہیں اور اس طرح جو ایجی ٹیشن
م لیتا ہے، وہ قومی مفاد کو بالکل نظرانداز کر دیتا
اور وہ محض جذباتی باتوں سے بھڑک جاتا
ہے۔ یہ بات نہیں کہ نوجوان خاص طور پر
وان میں سے تعلیم یافتہ ہیں۔ انھیں قومی احساس
نہ یا انھیں اس مضبوط اور متحدہ قوم کا فرد ہونے
فخر نہیں ہے۔ وہ محض جذبات کی رَو میں بہہ
اتے ہیں جبکہ اس کے درپردہ مالی بحران کی اصل وجہ یہاں بے اقتصادی
ہ راہ روی کو لہٰذا نہ جھٹلایا جا سکتا ہے نہ اس
ے آنکھیں چرائی جا سکتی ہیں۔

۲۷ ویں سیمپل سروے NSS 1973-74
) سے فی کس اسراف کا جو اندازہ ہوتا ہے
س کی تفصیل آپ مندرجہ ذیل گوشوارہ میں ملاحظہ فرمائیے۔

میں نے جان بوجھ کر اسراف کے وہ اعداد و شمار لیے ہیں جو سب سے نچلی سطح پر آتے ہیں۔ اور وہ اس لیے کہ بنیادی طور پر آپ وہی کچھ خرچ کر پائیں گے جو آپ کے پاس ہوگا۔ اور جو کچھ آپ خرچ کرتے ہیں اسی سے ڈیمانڈ پیدا ہوتی ہے۔ لہٰذا جو اعداد و شمار دیے گئے ہیں، وہ اسراف کی بنیاد پر ہیں۔ اور قابلِ اعتبار۔ اس سے معلوم ہو پائے گا کہ مؤثر ڈیمانڈ (ضرورت) کیا ہے۔ جو اقتصادی سرگرمی کا موجب ہے۔

جب ان اعداد و شمار کا جائزہ لیا جائے گا تو اس سے مندرجہ ذیل صورتحال سامنے آئے گی۔

۱۔ نیشنل سیمپل سروے نے جو دریافت کی ہے، اس کی بنا پر ۱۹۸۱ کی مردم شماری سے یہ پتہ چلتا ہے کہ ۵۲۴٫۴ کروڑ دیہی آبادی میں سے لگ بھگ ۹۱٫۵۲ فیصد یعنی ۴۷۹٫۹۵ کروڑ کا فی کس خرچ ۱۲۰۰ روپے سالانہ سے کم ہے۔ دوسرے الفاظ میں ۱۰۰ روپے ماہانہ سے کم۔

چھٹے پانچ سالہ پلان کی ٹاسک فورس نے یہ اندازہ لگایا تھا کہ ۸۲-۱۹۸۱ء میں جو لوگ دیہات میں ۱۰۴ روپے سے کم ماہانہ خرچ کریں گے، وہ غریبی کی لکیر سے نیچے گنے جائیں گے۔

شہری علاقوں کی ۱۵۹٫۵۳ کروڑ آبادی میں سے ۱۱۸٫۷۵ کروڑ یعنی ۷۴٫۴۳ فیصد ۱۲۰۰ روپے سے کم خرچ کرنے والے گروہ میں آتی ہے۔ غربت کی لکیر یہاں ۱۱۳ روپے فی کس ماہانہ طے ہوئی تھی۔

دیہی اور شہری آبادی کو اگر اکٹھا لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ۵۹٫۸۷۰ کروڑ لوگوں کا فی کس سالانہ خرچ کا معیار ۱۲۰۰ روپے سے بھی کم ہے۔ ایسے میں یہ سوال کرنا غیر مناسب نہیں ہوگا کہ ایک سو روپے ماہانہ سے موجودہ حالات میں کیا کیا

فی کس اسراف کی بناء پر تقسیم آبادی

مردم شماری ۱۹۸۱ء

سالانہ اخراجات کی حد بمطابق (نیشنل سیمپل سروے، ۱۹۷۳-۷۴) فی کس	دیہات میں ۱۰ لاکھ کے اعتبار سے	دیہاتی آبادی کی فیصد شرح کے اعتبار سے	شہری آبادی ۱۰ لاکھ کے یونٹ میں	شہری آبادی کی فیصد شرح کے اعتبار سے
الف: صفر روپے سے لیکر ۸۰۴ روپے تک	۱۲۰٫۹۴	۲۳٫۰۶	۱۴٫۸۳	۹٫۳۰
ب: ۸۰۴ اور ۱۲۰۰ روپے کے درمیان	۳۵۹٫۰۱	۶۸٫۴۶	۱۰۳٫۹۲	۶۵٫۱۳
ج: (الف + ب) کی میزان	۴۷۹٫۹۵	۹۱٫۵۲	۱۱۸٫۷۵	۷۴٫۴۳
د: ۱۲۰۰ روپے سے اوپر	۴۴٫۴۶	۸٫۴۹	۴۰٫۷۸	۲۵٫۵۷
ہ: الف + ب + د کی میزان	۵۲۴٫۴۱	۱۰۰	۱۵۹٫۵۳	۱۰۰٫۰۰

سنٹرل سٹاٹسٹیکل آرگنائزیشن نے جو مفصل ضمیمہ نمبر ۱ اور نمبر ۲ فراہم کیا ہے۔ قارئین کو اسے بھی دیکھنا چاہیے۔ ۱۹۸۱ء کی مردم شماری کی بنا پر بھارت کی کل آبادی ۶۸٫۳۹۷ کروڑ ہے۔

ضروریات خریدی جاسکتی ہیں۔ یعنی تین روپے ۳۵ پیسوں کے روزانہ خرچ سے۔

دُوسرے الفاظ میں ۷۰ کروڑ انسانوں میں سے ۴۰ کروڑ انسان غربت کی لکیر کے قریب یا اس کے نیچے ہیں۔

۵۷٫۶ ۱۳۱ کروڑ لوگ جن میں سے ۱۲۰٫۹۳ کروڑ دیہات میں اور ۳۸٫۴۳ ۱ کروڑ شہروں میں رہتے ہیں۔ ۴۰٫۸ روپے سے کم ہی سالانہ خرچ کرسکتے ہیں۔ یعنی ۳۴ روپے ماہانہ۔ جس کا مطلب یہ ہوا کہ بے حد غربت میں زندگی بسر کر رہے ہیں یعنی کیڑے کی طرح جی رہے ہیں۔

اس طرح باقی وہ خوش قسمت رہ جاتے ہیں جو سالانہ فی کس ۱۲۰۰ روپے یا اس سے زیادہ خرچ کرسکتے ہیں اور جن کے اردگرد تمام اقتصادی سرگرمیاں گھومتی ہیں۔ ان کی تعداد ۲۴٫۵۲ ۸ کروڑ ہے اور یہ لوگ دیہات اور شہروں میں برابر بٹے ہوئے ہیں۔ یعنی ۴۴٫۶ ۴ کروڑ دیہات میں اور ۴٫۰۸ کروڑ شہروں میں۔

دیہی علاقوں میں قوت خرید کے بہترین اعداد و شمار ۴۴٫۶ ۴ کروڑ ہیں تو یہ دیہی آبادی کا محض ۸٫۴۸ فیصد ہیں۔ اور شہری علاقوں میں ان لوگوں کی تعداد ۴٫۰۸ کروڑ یعنی کل شہری آبادی کا ۲۵٫۵۷ فیصد۔ ہندوستان میں مجموعی طور پر یہ ۲۸٫۵ ۸ کروڑ کی آبادی کل آبادی کا ۱۲٫۵ فیصد ہے۔

یہ لوگ جن کی آمدنی ایک سو سے سو روپے ماہوار ہے، زندگی کی اہم ترین ضروریات۔ مثلاً خوراک۔ ایندھن۔ کپڑے اور دوائیاں ہی خرید پاتے ہوں گے اور کسی جگہ سر چھپانے کا انتظام کرتے ہوں گے۔ اگر بچت ہوتی ہوگی تو ان لوگوں سے جو ۲۰۰ روپے ماہوار سے زیادہ خرچ کرسکتے ہوں گے۔ نیشنل سیمپل سروے کی دریافت کے مطابق جس کا ذکر پہلے کیا جاچکا ہے، یہ لوگ دیہات میں ۰٫۹۸ فیصد ہیں اور شہروں میں ۲٫۵ فیصد۔ (تفصیل کے لیے دیکھیے ضمیمہ نمبر ۲۶) گویا کہ یہ دو کروڑ افراد ہیں جو کچھ بچا سکتے ہیں۔ اور جو سب اہم مصنوعات کی خرید و فروخت کی مارکیٹ فراہم کرتے ہیں۔

اس تصویر کا دُوسرا رُخ بھی ہے۔ جسے دیکھنے سے پتہ چلے گا کہ اہم اقتصادی سرگرمیاں کہاں اور کیسے مرکوز ہیں اور کون ان پر حاوی ہے۔ فیکٹریوں اور کھیتوں میں جو چیزیں پیدا ہوتی ہیں اور تجارت کے ذریعے جو تقسیم کی جاتی ہیں۔ بالآخر اس اقتصادی سرگرمی سے تو آمدن پیدا ہوتی ہے اور اسی آمدن پر انکم ٹیکس کا اندازہ لگایا جاتا ہے اور یہ انکم ٹیکس ہی حکومت کی آمدن کا ایک بڑا وسیلہ ہے۔ حکومت انکم ٹیکس کے حربے کو نہ صرف فاضل آمدنی کو وصول کرنے کے لیے استعمال میں لا رہی ہے۔ بلکہ وہ انکم ٹیکس میں مناسب ردّ و بدل کر کے آمدنیوں میں جو بہت اُونچ نیچ پائی جاتی ہے۔ اسے بھی کم کرنے کے لیے استعمال کر رہی ہے۔ اس میدان میں کس قدر لوگ متاثر ہوتے ہیں۔ اس کا ذکر ہم ابھی کریں گے مندرجہ ذیل گوشوارہ سے معلوم ہوگا کہ مختلف آمدنی والے کتنے لوگ ہیں جو ٹیکس دیتے ہیں اور ہر آمدن کے زمرے میں ان کی فیصد تعداد کیا ہے۔ کس قدر وصولی ہوتی ہے اور یہ وصولی کل انکم ٹیکس کا کتنی فیصد ہے۔

انکم ٹیکس کی تفصیل (۸۰ــــ۱۹۷۹ء)

اوسط آمدن	انکم ٹیکس دینے والے	کُل کا فیصد	جن آمدن پر ٹیکس لگایا گیا کروڑ روپے میں	کُل کا فیصد	جو ٹیکس ادا کرنا تھا کروڑوں روپے میں	کُل کا فیصد
۱۰۰۰۰ سے کم	۱۳۶۷۷۰۳	۷٫۵	۱۱۲٫۶	۱٫۸	۵٫۲	۰٫۳
۱۰۰۰۰ سے ۱۵۰۰۰ تک	۷۳۷۱۸۱	۴۳٫۸	۹۵۹٫۶	۱۵٫۶	۵۷٫۳	۳٫۷
۱۵۰۰۰ سے ۲۵۰۰۰	۵۱۳۷۷۷	۲۸٫۲	۹۶۸٫۴	۱۵٫۸	۹۷٫۳	۵٫۷
۲۵۰۰۰ سے ۵۰۰۰۰	۲۴۸۶۰۶	۱۳٫۷	۸۴۵٫۵	۱۳٫۸	۱۴۳٫۴	۸٫۴
۵۰۰۰۰ سے ۱۰۰۰۰۰	۸۸۴۰۱	۴٫۹	۵۹۴٫۳	۹٫۶	۱۲۷٫۷	۷٫۵
ایک لاکھ سے ۵ لاکھ	۳۱۳۶۲	۱٫۷	۵۳۲٫۳	۸٫۶	۱۶۳٫۰	۹٫۴
۵ لاکھ سے اوپر	۳۲۴۵	۰٫۱۷	۲۱۳۶٫۲۰	۳۴٫۸	۱۱۱۱٫۳	۶۵٫۰
کُل	۱۸۱۹۵۰۵	۱۰۰٫۰۰	۶۱۴۸٫۹	۱۰۰٫۰۰	۱۷۰۵٫۲	۱۰۰٫۰۰
۵۰ ہزار سے اوپر	۱۲۳۰۰۸	۶٫۷۷	۳۲۶۲٫۸	۵۳٫۰	۱۴۰۲٫۰	۸۱٫۹
ایک لاکھ سے زیادہ	۳۴۶۰۷	۱٫۸۷	۲۶۶۸٫۵	۴۳٫۴	۱۲۷۴٫۳	۷۴٫۷

ان اعداد و شمار میں کمپنیاں بھی شامل ہیں جنھوں نے ۸۰-۱۹۷۹ء میں ۱۱۶۳۶ انکم ٹیکس کے جائزے پیش کیے۔ جو ۲۰۲۰ کروڑ روپے کی آمدن پر مشتمل تھے اور جن پر ۱۱۰۵ کروڑ انکم ٹیکس دینا تھا۔

ماخذ: ڈائرکٹوریٹ آف انسپکشن، ڈپارٹمنٹ آف انکم ٹیکس۔ حکومت ہند، نئی دہلی۔ آل انڈیا انکم ٹیکس اعداد و شمار برائے ۸۰-۱۹۷۹ء۔

مندرجہ بالا اعداد و شمار سے ظاہر ہے کہ انکم ٹیکس دینے والے کی ۸۰-۱۹۷۹ء میں تعداد ۱۸ لاکھ سے کچھ ہی زیادہ تھی۔ یعنی ۷۰ کروڑ آبادی میں سے صرف ۱۸ لاکھ ہیں جن سے انکم ٹیکس وصول کرنا ہوتا ہے۔ ان میں سے ۷۵ فی صد ٹیکس وہ ادا کرتے ہیں جن کی آمدنی ایک لاکھ روپے یا اس سے زیادہ ہوتی ہے۔ اور ان کی تعداد ۳۴۶۰۷ ہے۔ یہ قابل اعتنا امر ہے کہ وہ لوگ جن کی انکم ٹیکس دینے کی آمدنی ۵ لاکھ روپے یا اس سے زیادہ سالانہ ہے۔ اور جو کُل انکم ٹیکس کا ۶۵ فیصد ادا کرتے ہیں ان کی تعداد محض ۵۴۲ ہے۔ ان اعداد و شمار سے یہ معلوم ہوگا کہ کتنے افراد یا کمپنیاں ملک بھر کی تمام اقتصادی سرگرمیوں پر حاوی اور سارے ہیں۔

دوسرے انکم ٹیکس دینے والوں میں وہ لوگ ہیں جن کی آمدن طے شدہ ہے۔ یعنی سرکاری اور پرائیویٹ سیکٹر کے ملازم۔ پیشہ ور اور معمولی کاروباری لوگ۔ ان کی آمدن ۵۰ ہزار روپے سالانہ سے کم ہے۔ لیکن تعداد ۱۶۹۶۵۷۷ یعنی انکم ٹیکس دینے والوں کی کُل تعداد کا ۹۳٫۳ فیصد۔ اور ان سے وصول ہوتا ہے کُل ٹیکس کا محض ۱۸ فیصد۔

ملک کی اقتصادی سرگرمیوں میں یہ لوگ کچھ دخل تو رکھتے ہیں لیکن یہ نہیں کیا جا سکتا کہ وہ ان سرگرمیوں کی راہ تعین کرتے ہوں یا ان پر غالب ہوں۔

(اگلے شمارے میں ہم کالے دھن میں بے پناہ اضافے پر نظر ڈالیں گے)۔

ماہانہ فی کس اخراجات کی بنا پر ریاست وار کنبوں کی تقسیم (دیہی)

ماہانہ فی کس خرچ کرنے والے طبقے (روپیوں میں)

ریاست یا یونین ٹیری ٹری	۰-۱۳	۱۳-۱۵	۱۵-۱۸	۱۸-۲۱	۲۱-۲۴	۲۴-۲۸	۲۸-۳۴	۳۴-۴۳
آندھرا پردیش	۰٫۹۷	۰٫۳۲	۱٫۱۳	۲٫۸۳	۳٫۳۲	۴٫۶۱	۱۱٫۱۷	۲۲٫۱۷
آسام	۰۰	۰٫۱۷	۰٫۱۷	۰٫۳۳	۲٫۵۰	۳٫۱۷	۷٫۳۳	۱۹٫۵۰
بہار	۰٫۳۸	۰٫۱۵	۱٫۷۷	۱٫۹۲	۲٫۱۵	۴٫۲۳	۹٫۲۳	۱۲٫۵۴
گجرات	۰٫۱۹	۰٫۱۹	۰٫۷۷	۰٫۳۸	۰٫۷۵	۴٫۱۵	۷٫۹۲	۱۸٫۸۷
ہریانہ	۰۰	۰٫۱۷	۰۰	۰٫۵۰	۰٫۵۰	۲٫۶۵	۵٫۸۰	۱۱٫۷۷
ہماچل پردیش	۰٫۲۵	۰۰	۰٫۵۱	۰۰	۰٫۲۵	۰٫۵۱	۲٫۰۳	۸٫۳۸
جموں وکشمیر	۰۰	۰۰	۰٫۲۳	۰٫۵۳	۱٫۶۶	۳٫۱۷	۸٫۶۷	۱۷٫۵۱
کرناٹک	۰٫۱۹	۰٫۲۸	۰٫۲۸	۱٫۶۶	۳٫۵۴	۵٫۶۳	۱۸٫۰۸	۱۸٫۳۶
کیرالہ	۰٫۷۸	۰٫۴۷	۱٫۵۵	۲٫۴۸	۴٫۵۴	۴٫۶۵	۹٫۱۵	۱۵٫۹۷
مدھیہ پردیش	۰٫۴۵	۰٫۲۳	۰٫۶۸	۲٫۴۲	۳٫۴۸	۶٫۹۷	۱۳٫۷۱	۱۷٫۷۴
مہاراشٹر	۰٫۱۸	۰٫۲۶	۰٫۸۸	۲٫۲۰	۲٫۱۱	۵٫۹۰	۱۱٫۰۱	۱۸٫۶۹
منی پور	۰۰	۰۰	۰۰	۰٫۹۰	۰۰	۲٫۷۰	۷٫۶۶	۱۸٫۴۷
میگھالیہ	۰٫۴۴	۰۰	۰۰	۰٫۴۴	۰٫۴۴	۰٫۸۸	۳٫۱۰	۹٫۲۹
ناگالینڈ	۰۰	۰۰	۰۰	۰۰	۰۰	۰۰	۰۰	۰۰
اڑیسہ	۰٫۷۴	۰٫۸۹	۲٫۵۳	۳٫۴۲	۵٫۶۸	۱۱٫۳۱	۱۶٫۳۷	۲۰٫۰۹
پنجاب	۰۰	۰٫۱۵	۰۰	۰٫۳۰	۰٫۳۰	۰٫۱۵	۲٫۸۴	۹٫۲۵
راجستھان	۰۰	۰۰	۰٫۴۹	۰٫۶۵	۱٫۹۶	۳٫۴۳	۷٫۳۴	۱۳٫۲۱
تمل ناڈو	۰٫۱۱	۰٫۳۳	۱٫۷۶	۲٫۹۳	۴٫۸۳	۵٫۷۱	۱۲٫۲۹	۱۹٫۵۴

تری پورہ	۰۰	۰۰	۰٫۵۳	۲٫۱۴	۰٫۵۳	۴٫۸۱	۱۰٫۱۴	۱۸٫۷۴
اتر پردیش	۰٫۱۱	۰٫۱۱	۰٫۳۴	۰٫۹۰	۱٫۹۱	۴٫۳۲	۱۱٫۸۸	۲۱٫۷۵
مغربی بنگال	۱٫۲۹	۱٫۴۶	۲٫۳۳	۳٫۸۸	۵٫۵۳	۸٫۳۲	۱۴٫۳۷	۱۷٫۹۷
انڈمان اور نکوبار	۰۰	۰۰	۰۰	۰۰	۰۰	۰۰	۰۰	۰۰
اروناچل پردیش	۰۰	۰۰	۰۰	۰۰	۰۰	۰۰	۰۰	۰۰
چنڈی گڑھ	۰۰	۰۰	۰۰	۰۰	۰۰	۰۰	۰۰	۰۰
دہلی	۰۰	۰۰	۰۰	۰۰	۰۰	۰۰	۰۰	۰۰
گوا، دمن، دیو	۰۰	۲٫۳۸	۰۰	۰۰	۲٫۳۸	۴٫۷۶	۴٫۷۶	۱۱٫۷۶
لکشدیپ	۰۰	۰۰	۰۰	۰۰	۰۰	۰۰	۰۰	۰۰
میزورم	۰۰	۰۰	۰۰	۰۰	۰۰	۰۰	۰۰	۰۰
پانڈیچری	۰۰	۰۰	۰۰	۰۰	۰۰	۳٫۸۵	۱۱٫۵۴	۳۰٫۷۶
کل ہند	۰٫۳۹	۰٫۳۵	۱٫۰۲	۱٫۹۲	۲٫۹۷	۵٫۲۸	۱۱٫۱۰	۱۸٫۵۳

نوٹ: ناقابلِ اطلاق، سروے میں انھیں نہیں لیا گیا۔

ضمیمہ نمبر ۱ :-

۴۳ — ۵۵	۵۵ — ۷۵	۷۵ — ۱۰۰	۱۰۰ — ۱۵۰	۱۵۰ — ۲۰۰	۲۰۰ اور اس سے اوپر	تمام جماعتیں
۲۰٫۴۰	۱۸٫۲۰	۷٫۵۲	۵٫۰۲	۱٫۲۹	۱٫۰۵	۱۰۰٫۰۰
۲۶٫۳۳	۲۶٫۳۳	۹٫۵۰	۴٫۱۷	۰٫۵۰	۰۰	۱۰۰٫۰۰
۲۲٫۲۴	۲۱٫۱۵	۱۲٫۰۰	۵٫۸۵	۱٫۳۱	۱٫۰۸	۱۰۰٫۰۰
۲۳٫۲۱	۲۳٫۲۱	۱۲٫۲۶	۶٫۹۸	۰٫۷۵	۰٫۵۷	۱۰۰٫۰۰
۱۷٫۰۸	۲۲٫۸۸	۱۷٫۹۱	۱۲٫۳۴	۴٫۱۵	۳٫۶۵	۱۰۰٫۰۰
۱۷٫۲۹	۲۷٫۹۱	۲۳٫۶۰	۱۳٫۷۱	۳٫۸۱	۱٫۷۸	۱۰۰٫۰۰
۳۳٫۷۳	۲۴٫۸۶	۱۰٫۵۵	۵٫۶۵	۱٫۰۶	۰٫۳۸	۱۰۰٫۰۰
۱۸٫۶۸	۱۹٫۷۱	۹٫۱۸	۵٫۶۳	۲٫۴۲	۰٫۸۱	۱۰۰٫۰۰
۱۸٫۴۵	۱۷٫۲۰	۱۱٫۹۴	۸٫۹۹	۱٫۵۵	۲٫۴۸	۱۰۰٫۰۰
۱۷٫۷۴	۱۶٫۸۹	۱۰٫۱۵	۶٫۷۴	۱٫۳۶	۱٫۴۴	۱۰۰٫۰۰
۲۰٫۷۱	۲۰٫۲۷	۸٫۷۲	۶٫۸۷	۱٫۳۲	۰٫۸۳	۱۰۰٫۰۰
۲۱٫۶۲	۳۲٫۸۹	۱۱٫۳۶	۴٫۰۵	۰٫۴۵	۰۰	۱۰۰٫۰۰
۲۶٫۱۱	۳۳٫۶۴	۱۶٫۸۱	۶٫۶۴	۰٫۴۴	۱٫۷۷	۱۰۰٫۰۰
۰۰	۰۰	۰۰	۰۰	۰۰	۰۰	۱۰۰٫۰۰
۱۳٫۸۴	۱۵٫۹۲	۵٫۳۶	۲٫۹۸	۰٫۴۵	۰٫۴۵	۱۰۰٫۰۰
۱۸٫۹۵	۲۴٫۳۲	۱۸٫۶۶	۱۶٫۷۴	۵٫۶۷	۳٫۶۹	۱۰۰٫۰۰
۳۲٫۰۲	۲۲٫۳۵	۱۳٫۵۴	۱۱٫۰۹	۲٫۹۱	۱٫۳۱	۱۰۰٫۰۰
۱۹٫۹۷	۱۷٫۷۸	۸٫۵۶	۴٫۷۲	۱٫۵۴	۰٫۳۳	۱۰۰٫۰۰

۲۳٫۵۳	۲۴٫۹۱	۹٫۰۹	۳٫۲۱	۲٫۱۴	۰٫۵۳	۱۰۰٫۰۰
۲۱٫۹۱	۲۰٫۰۶	۱۰٫۵۴	۴٫۵۴	۰٫۹۵	۰٫۴۶	۱۰۰٫۰۰
۱۶٫۷۶	۱۳٫۵۹	۸٫۲۵	۳٫۸۸	۱٫۳۶	۰٫۳۹	۱۰۰٫۰۰
..	..	..	..	..	..	..
..	..	..	..	..	..	..
..	..	..	..	..	..	..
۱۱٫۶۷	۵۲٫۹۵	۱۷٫۶۵	..	..	۵٫۸۸	۱۰۰٫۰۰
۱۶٫۶۷	۱۶٫۶۷	۱۶٫۶۷	۱۶٫۶۷	۲٫۳۸	..	۱۰۰٫۰۰
..	..	..	..	..	..	..
..	..	..	..	..	..	..
۱۷٫۳۱	۱۳٫۴۲	۱۷٫۳۱	۳٫۸۵	۱٫۹۲	..	۱۰۰٫۰۰
۲۰٫۱۹	۱۹٫۴۸	۱۰٫۲۶	۵٫۰۷	۱٫۴۲	۰٫۹۵	۱۰۰٫۰۰

ضمیمہ نمبر ۲: ماہانہ فی کس اخراجات کی بنا پر ریاست وار کنبوں کی تقسیم (شہری)

ماہانہ فی کس خرچ کرنے والے طبقے (روپوں میں)

ریاست یا یونین ٹیری ٹری	۰٫۱۳	۱۳٫۱۵	۱۵٫۱۸	۱۸٫۲۱	۲۰٫۲۴	۲۴٫۲۸	۲۸٫۳۴
آندھرا پردیش	..	۰٫۱۳	۰٫۴۵	۰٫۴۵	۰٫۲۰	۲٫۲۹	۶٫۹۳
آسام	..	..	۰٫۴۴	..	..	۰٫۸۷	۳٫۹۳
بہار	۰٫۲۰	..	۰٫۴۱	..	۰٫۳۱	۱٫۲۲	۵٫۰۹
گجرات	..	۰٫۲۸	..	۰٫۲۳	..	۱٫۴۰	۳٫۶۴
ہریانہ	..	..	..	..	۰٫۴۲	۱٫۲۹	۵٫۰۲
ہماچل پردیش	..	..	..	..	..	..	۱٫۶۷
جموں و کشمیر	..	..	..	۰٫۲۰	۰٫۶۰	۲٫۸۱	۷٫۶۳
کرناٹک	..	..	۰٫۲۷	۰٫۵۴	۰٫۸۱	۲٫۹۸	۹٫۲۳
کیرالا	..	۰٫۴۱	۰٫۸۲	۱٫۲۲	۳٫۲۷	۴٫۴۹	۷٫۷۹
مدھیہ پردیش	..	..	۰٫۲۲	۰٫۲۲	۱٫۱۱	۱٫۵۵	۷٫۵۴
مہاراشٹر	۰٫۱۰	۰٫۱۰	۰٫۱۰	۰٫۵۲	۰٫۶۰	۲٫۵۲	۴٫۹۳
منی پور	..	..	..	..	..	..	..
میگھالیہ	..	..	..	..	..	..	..
ناگالینڈ	..	..	..	..	..	..	..
اڑیسہ	..	..	..	۰٫۹۲	۱٫۲۸	۴٫۰۵	۶٫۴۵
پنجاب	..	..	..	..	..	..	۱٫۰۹

راجستھان	۰٫۰۳۱	--	..	..	۰٫۳۱	۱٫۵۵	۴٫۳۳
تمل ناڈو	۰٫۱۳	۰٫۵۴	۰٫۱۳	۰٫۵۴	۱٫۰۳	۴٫۳۰	۵٫۳۳۱
تری پورہ	..	..	..	..	..	..	..
اُتر پردیش	۰٫۱۲	۰٫۱۲	۰٫۲۳	۰٫۲۳	۱٫۱۰	۲٫۱۹	۷٫۲۷
مغربی بنگال	۰٫۵۴	۰٫۱۴	۰٫۲۸	۰٫۲۷	۰٫۹۵	۱٫۳۵	۳٫۵۱
انڈمان ونکوبار	..	--	..	..	..	..	..
اروناچل پردیش	..	..	..	..	..	--	..
چنڈی گڑھ	..	..	..	..	..	--	..
دہلی	..	..	۰٫۹۰	..	۱٫۲۰	۹٫۹۰	۱٫۲۰
گوا۔ دمن۔ دیو	..	..	..	..	..	--	۴٫۳۵
لکشدیپ	..	..	..	..	..	..	..
مزورم	..	..	..	..	..	..	..
پانڈی چری	..	..	--	..	..	۳٫۲۳	۹٫۴۵
کل ہند	۰٫۱۳	۰٫۱۵	۰٫۲۸	..	..	۲٫۲۲	۵٫۲۷

نوٹ:۔ ناقابلِ اعتنا سروے میں یہ نہیں لیا گیا۔

بقیہ: ہٰذا مِن فضلِ ربّی

انسانی کوشش میں قدرت کا دستِ کرم ضرور شامل رہتا ہے۔ ورنہ بجلی کا ایک کوندا پورے کھلیان کو بھسم کرسکتا ہے۔ دانہ پھوٹ کر پودا نہیں بن سکتا اور آپ کا شریف ڈرائیور جو چھ بار ٹرک اُلٹنے پر بھی زندہ رہا آج ملک شرافت حسین خاں سرپنچ علاقہ پنچایت نہیں بن سکتا۔

شرافت حسین خاں عربی بورڈ کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ تیز لُو چلنے لگی تھی بیلمہ نے ہمارے لیے کٹے ہوئے سُرخ تربوز کی دو طشتریاں ملازم کے ہاتھ بھجوادی تھیں اور خود سونے کی چوڑیوں والے ہاتھوں میں بادام کے شربت کے دو سفید گلاس پکڑے چلی آرہی تھی۔

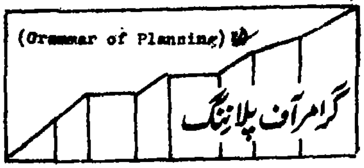
بقیہ: اداریہ

ریگستان کو سرسبز و شاداب بنانے کی کوششیں

تھار کا ریگستان اب تباہی کا موجب نہیں بنتا اگر اس کا صحارا، کالاہری اور گوبی ایسے ریگستانوں سے مقابلہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ تھار ایسا ریگستان ہے جہاں پیڑ پودے، جانور اور بنی نوعِ انسانی کی آبادی پائی جاتی ہے۔ سائنسدانوں کا کہنا ہے کہ راجستھان میں جتنی دھوپ پڑتی ہے اگر اس کے استعمال کا کوئی طریقہ نکال لیا جائے تو یہ ہمارے پورے ملک کی بجلی کی ضروریات کے لیے کافی ہوگا۔ ہمارے ملک کا ۲ء۳ لاکھ مربع کیلومیٹر علاقہ ریگستان پر مشتمل ہے جو ملک کے مجموعی رقبے کا ۱۲ فیصد ہے۔ تقریباً ایک کروڑ ۹۰ لاکھ افراد تھار کے ریگستان میں رہتے ہیں اور ریگستان زیادہ گنجان آباد ہونے کا دعوےٰ کرسکتا ہے کیونکہ یہاں ایک مربع کیلومیٹر میں ۶۱ افراد بستے ہیں۔ جبکہ دیگر ریگستانوں میں ایک مربع کیلومیٹر میں صرف تین افراد رہتے ہیں۔ تھار کے مویشیوں کی تعداد جو ۱۹۵۱ء میں ۱۰۲٫۷ لاکھ تھی اب بڑھ کر ۲۳۰ لاکھ ہوگئی ہے۔ ۱۹۵۰ء کی دہے میں اندازہ لگایا گیا تھا کہ تھار کا ریگستان ایک سال میں آدھ میل کے حساب سے سکڑ رہا ہے۔ انڈین نیشنل سائنس اکیڈمی نے ریگستانی علاقوں کے سائنسی انتظام کی ضرورت پر زور دیا ہے۔ اس پر توجہ دیتے ہوئے اور ریگستانی علاقوں کی ترقی سے متعلق یونیسکو کی صلاح کار کمیٹی کی سفارشات کے مطابق حکومتِ ہند نے ۱۹۵۲ء میں جودھپور میں ریگستان کو جنگل میں تبدیل کرنے سے متعلق اسٹیشن قائم کیا۔ ۱۹۵۹ء میں اس ادارے نے بنجر علاقوں کی تحقیق سے متعلق انسٹی ٹیوٹ کی شکل اختیار کرلی۔

آج دنیا میں اس ادارے کو ریگستان کے بارے میں مطالعہ کرنے کے کام میں بڑی مہارت حاصل ہوچکی ہے۔ اس ادارے نے ریگستانوں کی معیشت کو بہتر بنانے کے لیے بیر، کھجور، امرود، شہتوت وغیرہ کی اقسام دریافت کی ہیں جن کی اس علاقے میں کاشت کی جاسکتی ہے۔

(ایڈیٹر)



پی۔ آر۔ دوبھاشی

منصوبہ بندی کا اصل مدّعا کیا ہے؟

گزشتہ باب میں مصنف نے پراجیکٹ پلاننگ کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی تھی۔ ان میں منجملہ دیگر وضاحتوں کے پراجیکٹوں کی نشاندہی، جگہ کا انتخاب، منڈی کی مانگ اور پراجیکٹ رپورٹ تیار کرنا شامل تھا۔ وہاں وہ اس امر سے بحث کرتے ہیں کہ منصوبہ بندی کی روح کیا ہے۔ ان کی وضاحت کے مطابق اس میں معیشت کے اوّل، دوم اور سوم یعنی بنیادی، ثانوی اور اعلیٰ سیکٹروں میں پیداوار اور تقسیم کے پروگرام شامل ہیں۔ ہر سیکٹر کی منصوبہ بندی پوری تفاصیل اور جزویات کے ساتھ عمل میں آنی چاہیے اور ایسا کرتے وقت تکنیکی، اقتصادی اور تنظیمی پہلوؤں پر مربوط انداز سے نظر ڈالنی چاہیے۔

منصوبہ بندی کی روح معیشت کے تینوں زمروں میں پیداوار اور تقسیم کے پروگراموں پر مشتمل ہے۔ ان کو اس طرح وضع کیا جاتا ہے کہ منصوبہ بندی کے مقاصد ان کے ذریعے حاصل ہو سکیں یعنی پیداوار بڑھے، روزگار کے مواقع زیادہ پیدا ہوں۔ اور دولت کی منصفانہ تقسیم عمل میں آئے۔ پیداواری عناصر کی بہم رسانی کو یقینی بنا کر پیداوار بڑھانے پر زور دیا جاتا ہے۔ اور نئے علم اور دستیاب تحقیقی کوششوں کے بل بوتے پر پیداواری صلاحیت بڑھانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اور اس کے لیے سائنس اور ٹکنالوجی کے استعمال اور اس کی جدید ترین تحقیق سے فائدہ اٹھایا جاتا ہے۔ مختلف اداروں کی مدد سے نظم و نسق کو بہتر بنانے پر زور ہوتا ہے۔

پرائمری یعنی بنیادی سیکٹر

بنیادی پیداواری سیکٹروں میں زراعت، مویشی پروری، ماہی گیری، جنگل بانی، ریشم کے کیڑے پالنا، وغیرہ شامل ہیں۔ زرعی شعبہ منصوبہ بندی کے لیے بجا طور پر کلیدی شعبہ شمار کیا جاتا ہے۔ باربرا نے بجا طور پر کہا ہے :-

زراعت اور صنعت بنیادی طور پر ایک دوسرے پر انحصار کرتے ہیں اور پیداواری عمل کے لیے یکساں طور پر اہمیت کے حامل ہیں لیکن ان کی ابتدا زراعت ہی ہے۔

زرعی پیداوار کے بنیادی عناصر میں مٹی اور پانی کے وسیلے، افرادی قوت، بیل گاڑی اور ٹریکٹر اور دیگر زرعی آلات اور مشینیں ہیں۔ ان کے علاوہ بیج، کیمیاوی کھاد، جراثیم کش دوائیں اور زرعی آلات نیز شمسی توانائی وغیرہ بھی بنیادی اہمیت رکھتی ہے۔

مٹی کی مختلف خصوصیات ہیں جو مختلف طرح کی فصلوں کے لیے موزوں ہیں اور زرعی سائنسی تحقیق کا ایک بنیادی مقصد یہ بھی ہے کہ فصلوں کے لیے ایک ہی نمونہ وضع کیا جائے جو کہ زرعی حالات اور آب و ہوا کی مناسبت سے ہو۔ اور جہاں کہیں ضرورت ہو اراضی کو دوبارہ قابلِ کاشت بنایا جائے۔ یہ کام کیمیاوی اجزا کے استعمال یا پانی کے نکاس کے ذریعے ہو یا کہ جیسی بھی ضرورت ہو انجام دیا جائے۔

پانی کے وسائل میں سب سے پہلے زمینی پانی آتا ہے۔ انھیں آبرسانی کے بڑے، متوسط اور چھوٹے پراجیکٹوں کے ذریعے کام میں لایا جاتا ہے۔ مثلاً ڈیموں کی تعمیر، بندھ کی تعمیر وغیرہ۔ آبرسانی کے بڑے ڈیم پلان کے وافر وسائل لگا جاتے ہیں۔ لیکن یہ منصوبہ بندی کے اہم اور مایہ ناز ستون شمار ہوتے ہیں۔ ایران، عراق سرحد پر ریگستانی خطے میں نخلستان دوبارہ پھلنا پھولنا شروع ہو گیا ہے۔ یہ کام دریائے دیز کے پانی کو ذخیرہ کرنے سے انجام دیا جا سکا ہے۔ بھاکرا ننگل، تنگ بھدرا اور ناگ ارجن کونڈا، جدید ہندوستان کے مندر کہے جا سکتے ہیں۔ زیرِ زمین پانی کو کنوئیں کھود کر ان میں پمپ لگا کر کام میں لایا جاتا ہے۔ بیلوں کی مدد سے، ڈیزل پمپوں سے یا بجلی کے ذریعے اس پانی کو باہر نکالا جاتا ہے۔

زرعی پیداوار کو بڑھانے کے لیے زیادہ پیداوار دینے والے بیجوں اور مخلوط اقسام کے بیجوں سے کاشت کی جاتی ہے۔ حال ہی میں زرعی پیداوار میں

اضافہ گندم کی کئی نئی اقسام مثلاً سونرا چھوٹی لرما، سیفد لرما، لرما روزو، یو۔ پی ۳۰۱، ۲۰۱ اور جوار کی اقسام سی ایچ ایس، چاول کی آئی آر ۸، آئی آر ۲۰ وغیرہ کی مدد سے کیا جا سکا ہے۔ کپاس کی نئی قسم مخلوط ام ایجاد کرکے پیداوار میں بھی اضافہ لایا جا سکا ہے۔ کیمیاوی کھادوں اور جراثیم کش دواؤں کی نئی اقسام ایجاد کی گئی ہیں۔ اس طرح زرعی دنیا میں کیمیاوی انقلاب لایا جا سکا ہے۔ روایتی طور پر ہندوستان میں زرعی پیداوار کمپوسٹ کھاد، ہری کھاد وغیرہ پر انحصار رکھتی تھی۔ اس سے نائٹروجن کی محدود سی مقدار ملتی تھی، مٹی کو درکار کم سے کم اجزا ملتے تھے۔ کیمیاوی کھادوں سے مٹی کی پیداوار کی صلاحیت بڑھ گئی ہے۔ البتہ ان میں مختلف اقسام کے تحت نائٹروجن فاسفیٹ، پوٹاشیم اور فاسفورس کی مختلف مقدار استعمال کی جاتی ہے۔ چنانچہ ہر جگہ کی مٹی کی ضرورت کے مطابق مٹی کو جانچ کر اس کے لیے کیمیاوی کھادوں کے استعمال کی سفارش کی جاتی ہے۔

زرعی پیداوار کے لیے درکار بیج کیمیاوی کھاد، جراثیم کش دوائیں، اراضی کو دوبارہ قابل کاشت بنانا، کنوؤں کی تعمیر وغیرہ پر کثیر سرمایہ کاری درکار ہے۔ کسانوں کی آمدنی چونکہ محدود ہے، لہذا وہ ان سب کے لیے سرمایہ کاری نہیں کر سکتے۔ ہر موسم میں فصل کی پیداوار بھی جدا جدا ہوتی ہے۔ آمدنی اس لیے غیر مستقل ہے۔ چنانچہ مالی ادارے کسانوں کو مالی امداد فراہم کرتے ہیں۔ وہ مختصر المدتی قرضے دیتے ہیں۔ متوسط مدت اور طویل المدت کے قرضے دیتے ہیں۔ یہ قرضے کوآپریٹو بنکوں یا تجارتی بنکوں سے ملتے ہیں۔ پیداوار کے لیے کسانوں کو درکار زرعی سامان کی فراہمی کے لیے ایسا ادارہ جاتی نظام وسیع پیمانے پر پھیلایا جانا چاہیے جس سے دیہات میں رہنے والے افراد پوری طرح فائدہ اٹھا سکیں۔

ضروری سامان اور مراعات

کاشتکاروں کو ترغیب عمل کے لیے کچھ مراعات بھی دی جانی چاہئیں۔ یہ ضروری سامان کی فراہمی اور مالی امداد کی شکل میں دی جانی چاہیے۔ زرعی پیداوار کے لیے منڈیاں بھی بہت سی رعائتیں دے سکتی ہے۔ اس مقصد کے لیے مارکیٹنگ اور درجہ بندی سے متعلق ادارے درکار ہیں۔ جہاں کہیں اشیاء کی تقسیم کے لیے سرکاری نظام موجود ہے وہاں پیداوار کا فاضل حصہ سرکاری ادارے خرید سکتے ہیں۔ ان کو کسانوں کی پیداوار کی مناسب قیمت لگانی چاہیے ورنہ کسان پیداوار کو روک لیں گے اور اس کے اثرات طویل المدتی بنیادوں پر زراعت پر مضر ہوں گے۔ روس میں اقتصادی انقلاب کے آغاز میں کسانوں سے ان کی زرعی پیداوار کم داموں پر لی گئی اسے کمیونزم کی جنگ کا نام دیا گیا، یہ روس کی زراعت کے لیے طویل المدتی بنیادوں پر مضر ثابت ہوئی۔

سماج وادی معیشت میں اراضی، پیداوار کے بنیادی ذریعے کے طور پر کوآپریٹو بنیادوں پر یا اجتماعی فارموں کی شکل میں قومی ملکیت میں لی جا سکتی ہے۔ روس کے ریاستی فارم یا اجتماعی فارم بڑے بڑے سائز کے ہیں گویا کہ ہر ایک فارم ایک ہزار ایکڑ کا۔ ان کو فیکٹریوں کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ سٹالن کی طرف سے روس کی زراعت کو قومی ملکیت میں لیے جانے کے ۴۰ برس بعد روس کی کھیتی تنظیم نو کی ایک دوسری بڑی اسکیم کے تحت لائی جا رہی ہے۔ اسے بریزنیف پلان کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ اسے دسمبر ۱۹۷۳ میں کمیونسٹ پارٹی نے مرتب کیا تھا۔

اس نظرثانی شدہ اسکیم کے تحت اجتماعی اور ریاستی فارموں کو زیادہ بڑے مربوط نوعیت کے دیہی یونٹوں میں بدلا جا رہا ہے۔ ان فارموں پر مویشی پروری، افزائش نسل، چارے کی پیداوار اور دیگر خوراکی پیداوار بڑھانے کے اقدامات کئے جا رہے ہیں۔ ہر فارم کے لیے کچھ سماجی ذمہ داریاں رکھ دی گئی ہیں۔ ان فارموں کو اپنے پیروں پر آپ کھڑا کرنے اور دیہی سماج کو صحت کی بہتر خدمات اور دیگر سہولتوں سے فیضیاب کرنے پر برابر نظر رہتی ہے۔ ان کے لیے تعمیراتی سامان بھی فراہم کردیا جاتا ہے۔

اجتماعی کاشت

اجتماعی کاشت کی ایک شکل وہ ہے جو اسرائیل میں رائج ہے۔ انقلابی جوش کے تحت اجتماعی کوششوں کی یہ ایک بڑی مثال ہے۔ کبتز (Kibutz) میں اراضی اور ذرائع پیداوار تمام تر سماجی ملکیت میں ہیں۔ حتیٰ کہ بچے بھی ایک جگہ کر دئے جاتے ہیں۔ سب کے لیے مشترکہ باورچی خانہ ہے، مشترکہ کھانے کا کمرہ ہے۔ مشان شتوفی میں کاشت انفرادی ضرور ہے لیکن سروس اجتماعی طور پر فراہم کی جاتی ہے۔ موشوف میں بھی ان کے درمیان کا ایک نظام رائج ہے۔

البتہ سماج وادی بھی ممالک میں زراعت سماجی ملکیت کے تحت نہیں ہے۔ حالانکہ صنعت اور تقسیم کرنے والے ادارے سماجی ملکیت میں ضرور ہیں۔ زراعت کو سماجی ملکیت میں لینے میں ایک بڑی دشواری یہ ہے کہ اراضی کے ٹکڑے جگہ جگہ پھیلے ہوئے ہیں۔ کسان کو اپنی زمین سے ایک روایتی محبت اور تعلق ہوتا ہے۔ ایسی صورت میں پرائیویٹ یونٹوں کو پیداوار کی اجازت دینے میں فائدہ نظر آتا ہے۔ البتہ کسانوں کو خاص کر چھوٹے کسانوں کو سروس، قرضہ، زرعی پیداوار کے لیے درکار سامان اور سہولتیں وغیرہ کوآپریٹو طریق کار کے مطابق فراہم کی جاتی ہیں۔

البتہ اگر زراعت کو سماجی ملکیت میں نہیں لیا جاتا تو بھی کچھ دیگر تبدیلیاں درکار ہیں۔ زرعی اصلاح کے تحت کسانوں کو زمینداروں کے چنگل سے آزاد کرانا ہے اور ساہوکاروں سے نجات دلانی ہے۔ زمینداری نظام کی تنسیخ کا قانون اسی کے لیے ضروری ہے۔ کسان اور ان کو زمین پر ان کے مالکانہ حقو

لانے کے لیے تحقیقی دکان داری نظام ختم کرنا ضروری ہے۔ زراعت کو جدید لائنوں پر لانے میں جاپان نے مثالی کردار ادا کیا ہے۔ وہاں انفرادی کاشت کا نظام باقی رکھتے ہوئے کھیتی کے لیے درکار جملہ سامان کی تقسیم کرنا کوآپریٹو کے تحت ہے۔ زراعت کی طرح سے ڈیری کی صنعت بھی کوآپریٹو بنیادوں پر قائم کی جاسکتی ہے۔ گجرات میں انل نے ہندوستان میں کوآپریٹو ڈیری کا کامیاب نظام پیش کیا ہے۔

جانوروں کی پرورش کے منصوبے

مویشی پروری کے وسائل میں گائے، بیل، بھینس، بھیڑ، مرغی اور دیگر جانوروں کی پرورش کے منصوبے شامل ہیں۔ بیل اور بھینس وغیرہ سے گاڑی کھینچی جاتی ہے اور یہ ایسے موقعوں پر بہت کارآمد ہیں جہاں بجلی وغیرہ کی سہولتیں ابھی نہیں ہیں۔ ڈیری کھولنے سے اور مویشی پروری کے پروگراموں سے زرعی پروگراموں کو مدد ملتی ہے اور کسانوں کی آمدنی میں اضافہ ہوتا ہے۔ مویشی پروری پروگراموں کے تحت جانوروں، مویشیوں اور پرندوں وغیرہ کی جدید انداز سے پرورش، ان کی دیکھ بھال اور خوراک وغیرہ شامل ہے۔ ان کی افزائش نسل کے لیے مصنوعی تخم ریزی اب ایک مسلمہ اصول بن چکی ہے۔ کسانوں کو اس طرح کے مراکز کی خدمات اب بآسانی دستیاب ہیں۔ جانوروں کی افزائش کے لیے جدید اور بہتر قسم کی تخم ریزی کی ضرورت ہے، اندھا دھند تعداد بڑھانا نقصان دہ ہے اور اس طرح کے نسل بڑھانے کے اہل کر اور جانوروں کو مویشیوں کے ڈاکٹروں سے آختہ کرانا ہوگا۔ مویشیوں کو ایسا چارہ ملنا چاہیئے جس سے ان کی صحت اچھی ہو اور جو تغذیہ بخش ہو۔ اس کے لیے برسیم اور کئی جدید قسم کے چارے تیار کئے گئے ہیں۔ مویشیوں کو بیماریوں سے بچانے کے لیے ٹیکہ لگانا ضروری ہے تاکہ وہ چند خطرناک بیماریوں، خصوصاً رنڈرپسٹ Rinderpest اور گلگھوٹو وغیرہ کی بیماریوں سے محفوظ رہ سکیں۔ مویشیوں کے لیے ہسپتالوں کی سروس بڑھانی ضروری ہے۔

مرغبانی اور بھیڑوں وغیرہ کا فروغ سائنسی اور جدید ترین انداز پر ہونا چاہیئے۔ ان کو بیماریوں سے بچانا ضروری ہے اور ان کی دیکھ بھال کے سلسلہ میں جدید طریقوں سے استفادہ کرنا ہے۔ ان کے مال کی بکری کے لیے منڈی تلاش کرنی ہے۔ مرغبانی کی اس کی اقسام میں رہوڈ آئی لینڈ Rhode Island کا نام آتا ہے۔ اس کے علاوہ وہائٹ لیگ ہارن انڈوں کے لیے اچھی نسل ہے۔

بھیڑوں کی پرورش کے سلسلے میں میرینو کے مینڈھے مخلوط نسل کی افزائش کے لیے اچھے سمجھے جاتے ہیں۔ گڈریوں کے لیے جو کہ خانہ بدوش قوم میں شمار ہوتے ہیں، تربیت اور تنظیم درکار ہے۔

باغبانی کا فروغ

باغبانی کے پروگرام کو آگے بڑھانے کے لیے پودے درکار ہیں، پھلوں کی فروخت کا نظام درکار ہے، ان کو ٹھنڈی جگہ پر محفوظ رکھنے کے لیے کولڈ اسٹوریج درکار ہے۔ فصلوں کو بیماریوں سے بچانا ضروری ہے۔ پیوندی کاشت کے طریقے کو مضبوط بنانا ہے۔ اس کے لیے طویل المدتی منصوبہ بندی درکار ہے۔ پھلوں کے پودوں کو لگانے اور ان کی افزائش کے لیے کافی وقت درکار ہوتا ہے۔ ناریل کا پیڑ، اخروٹ، آم، سیب تو کافی وقت چاہتے ہیں۔ پھل اور ترکاریاں انسانی غذائیت میں مفید اضافے کرتی ہیں۔ اس لیے ان کی اور بھی اہمیت ہے۔ باغبانی کو زرعی سرگرمیوں کا جزو لازم بنایا جاسکتا ہے اور اس مقصد کے لیے اس کی اراضی کا تھوڑا سا حصہ پھلوں اور ترکاریوں کے لیے الگ سے مخصوص کیا جاسکتا ہے۔

ماہی گیری کا فروغ بھی ضروری ہے۔ زراعت کے دیگر شعبوں کی طرح سے منصوبہ بندی کا فروغ نئی ٹکنالوجی کو اپنانے سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کے لیے نائیلون کے جال اور ٹرالروں کی مدد سے گہرے سمندر سے ماہی گیری کے کام کو آگے بڑھایا جاسکتا ہے۔ تالابوں میں بھی مچھلیوں کی پرورش کا سامان کیا جاسکتا ہے۔ مچھلیوں کو سڑنے سے بچانے کے لیے کولڈ اسٹوریج اور ان کی نقل و حمل کے وسیلوں کو بڑھانا ضروری ہوگا۔ ماہی گیروں کے کوآپریٹو ادارے بنانے ہوں گے۔

دودھ، انڈا، مچھلی، ترکاریوں اور مچھلیوں کو تغذیہ بخش خوراک کی منصوبہ بندی کے پروگرام کے ساتھ جوڑنا ہوگا تاکہ سماج کے کمزور طبقوں کو تغذیہ بخش خوراک مل سکے۔ چوں کہ کمزور طبقے کی قوت خرید کم ہوتی ہے، لہٰذا ان اشیاء کی فراہمی سستے داموں اور رعایتی نرخ پر ہونی چاہیئے۔

باغبانی کی طرح جنگل بانی اور پودوں کو اگانا بھی طویل المدتی منصوبہ بندی کے تحت آتا ہے۔ معاشی توازن کے خیال سے شجرکاری کے پروگرام کی بڑی اہمیت ہے۔ جنگلات کی تباہی سے بڑے پیمانے پر مٹی کا کٹاؤ عمل میں آجاتا ہے اور تالابوں کی تہہ میں ریت بھر جاتا ہے جس سے معیشت پر تباہ کن اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ قدرتی جنگلات کے تحفظ کے علاوہ، مصنوعی جنگلات کی تعمیر و ترقی بھی ضروری ہے۔ جاپان کی طرح سے یہاں بھی شجرکاری اور مصنوعی جنگلات کے فروغ کو تیزی سے آگے بڑھانا چاہیئے۔ جاپان میں آبادی کے دباؤ کے باوجود تقریباً ۳ چوتھائی رقبہ پر جنگلات ہیں۔ چائے، کافی، ربڑ کی کاشت بڑھانے کے لیے کثیر سرمایہ کاری چاہیئے۔ زرعی منصوبہ بندی کے پروگرام میں درج ذیل پروگرام شامل ہونا چاہئیں۔

۱۔ بنیادی نوعیت کی تحقیق جو ہندوستان کے حالات کے مطابق ہو۔

۲۔ ہر پیداواری یونٹ میں تحقیقی پروگراموں کی توسیع۔

۳۔ زرعی قرضوں کی فراہمی۔

۴۔ زرعی پیداواری صلاحیت کا فروغ اور اس

کے لیے آبرسانی، بجلی اور کھیتوں میں شعبوں کے استعمال کے لیے سرمایہ کاری بڑھانا۔

۵۔ سڑکوں کی تعمیر، مواصلاتی نظام کا فروغ اور کولڈ اسٹوریج وغیرہ کی سہولتوں میں اضافہ۔

۶۔ اشیا کی فروخت اور درجہ بندی کی سہولتیں ان اقدامات سے روایتی زرعی پروگراموں کو جدید اور متحرک زراعت میں تبدیل کیا جا سکے گا جس سے پیداواری صلاحیت میں اضافہ ہوگا۔

ثانوی شعبہ

صنعتی منصوبہ بندی، بڑے پیمانے کی صنعتوں، متوسط صنعتوں، چھوٹے پیمانے کی صنعتوں اور دیہی صنعتوں کے سلسلے میں ضروری ہے۔ صنعتی ترقی کا مدار سرمایہ، خام مال کی فراہمی، ضروری مشینوں کی فراہمی اور تکنیکی افرادی قوت پر ہے۔ اس کے لیے ڈیزائننگ، اشیا کی فروخت، قرضہ، بیمہ اور تنظیم نیز رعایتوں وغیرہ کی فراہمی کے نظام کی ضرورت ہے۔

فولاد، کوئلہ، جہاز سازی، ریلوے کے انجن، ہوائی جہازوں کی تیاری بڑے پیمانے کی صنعتیں ہیں۔ یہ اتنی بڑی صنعتیں ہیں کہ غیر سماجی واد ملکوں میں بھی ان کی ملکیت حکومت کے پاس ہی ہے۔ ہر پبلک سیکٹر کے لیے سوچ سمجھ کر پلان مرتب کیا جانا چاہیے۔ اس پر سرمایہ کاری اور روزگار کے امکانات پیداوار، اضافی فائدوں، مال اور دیگر نوعیت کے فائدوں وغیرہ پر غور کرنا چاہیے۔ جہاں غیر سرکاری سیکٹر کافی وسیع ہے۔ توازن کے لیے بھی صنعت وار مخصوص نشانے مرتب کرنے ہوں گے کیوں کہ اقتصادی ترقی کی شرح کا انحصار پرائیویٹ سیکٹر کی کارکردگی پر بھی ہے اور پبلک سیکٹر کے اخراجات کے مقابلے پرائیویٹ سیکٹر کے اخراجات سے اس شرح کا تعین زیادہ وابستہ ہے۔

چھوٹے پیمانے کی صنعتوں کی منصوبہ بندی انفرادی صنعت کاروں پر چھوڑ دی جاتی ہے لیکن سرکاری ادارے ان کی مدد ضرور کرتے ہیں، مثلاً بینکوں سے قرض، خام مال کی فراہمی، تکنیکی امداد وغیرہ۔

صنعت اور زراعت کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ صنعتوں کو خام مال زراعت سے ملتا ہے اور زراعت کو کیمیاوی کھاد، جراثیم کش ادویہ اور زرعی آلات صنعتوں سے۔

درمیانی سیکٹر

صنعت اور زراعت کو درمیانی سیکٹر یا تیسرے سیکٹر سے بہت مدد چاہیے۔ مثلاً بجلی کی فراہمی، نقل و حمل کی سہولتیں، بینک کی سروس۔ ان کی منصوبہ بندی بھی مربوط طریقے پر ہونی چاہیے۔

بجلی کی منصوبہ بندی طویل المدتی بنیادوں پر ہونی چاہیے۔ بجلی کے پلانٹ کئی کئی برس چاہتے ہیں اور ان کی تنصیب کے لیے کافی وقت درکار ہوتا ہے۔ اس لیے مانگ کو دھیان میں رکھتے ہوئے ان کی منصوبہ بندی ضروری ہے، ترقی پذیر معیشت میں بجلی کی مانگ تیزی سے بڑھتی ہے، اس لیے اس کی پیشگی منصوبہ بندی ضروری ہے ورنہ ترقی کا عمل رک جائے گا۔ بجلی کی تیاری ہائیڈرو الیکٹرک، تھرمل الیکٹرک یا اٹامک الیکٹرک تینوں شعبوں میں توجہ چاہتی ہے۔ پن بجلی پراجیکٹ پوری صلاحیت سے کام کرنے سے معذور ہیں۔ بارشوں کی کمی سے بجلی کی تیاری میں جو کمی آئے گی، اسے تھرمل بجلی سے پورا کیا جاتا ہے۔ اس سلسلے میں، بجلی کی ترسیل میں جو نقصانات ہوتے ہیں، ان سے حفاظت بھی ضروری ہو جاتی ہے۔

بنیادی رول

ذرائع نقل و حمل اقتصادی ترقی میں اہم رول ادا کرتے ہیں۔ کنڈل برگر Kindle berger، جیسے ماہر معاشیات سے بنیادی اہمیت دیتے ہیں۔ لیلین ناولس Lilian Knowles نے کہا ہے کہ برطانیہ اور دیگر ترقی یافتہ ملکوں میں تجارتی اور صنعتی انقلاب لانے میں ٹرانسپورٹ نے اہم رول ادا کیا ہے۔ نقل و حمل کے ذرائع کا فن ریلوں کے ذریعے نقل و حمل اور سڑک کے ذریعے نقل و حمل سے ہے۔ اس کے علاوہ دریائی نظاموں میں کشتی رانی سے بھی اس کا تعلق ہے۔ ریلوے کا نظام تو ریاست کی ملکیت میں ہے لیکن روڈ ٹرانسپورٹ پبلک میں ہے۔ لیکن ذرائع نقل و حمل کسی بھی نوعیت کے کیوں نہ ہوں ان کی ترقی ریل گاڑیوں یا ٹرکوں وغیرہ کی تیاری پر منحصر ہے۔

بینکوں کے فروغ کی منصوبہ بندی آمدنی پر منحصر تاکہ عوام کے ذریعے روپیہ جمع کرانے کی صلاحیت بڑھے اور وہاں سے زراعت اور صنعت کے شعبوں کو قرضے دیے جا سکیں۔ بینکنگ کا نظام بڑے بڑے مراکز پر زیادہ توجہ دیتا ہے۔ لہٰذا پسماندہ نئے علاقوں کی ترقی پر خصوصی توجہ درکار ہے۔ بینکوں کی توسیع کے لیے سوچا سمجھا اور جامع پروگرام درکار ہے۔

سماجی بنیادی ڈھانچہ

اس سلسلے میں تعلیم، صحت اور تعمیر مکانات پر خصوصی توجہ درکار ہے۔ تعلیم کے تحت سب کے لیے پرائمری تعلیم ضروری ہے۔ اس کے علاوہ ثانوی اعلا اور تکنیکی نیز پیشہ ورانہ تعلیم کے لیے سہولتوں میں اضافہ ضروری ہے۔ تعلیمی نظام سے افرادی قوت حسب ضرورت مل سکے گی۔ منصوبہ بندی کو افرادی قوت کی کمی سے بچانا ہے اور اس مقصد کے لیے صحیح اور ضرورت کے مطابق افراد تیار کرنے ہیں۔ تعلیمی نظام کے ذریعے ایسے افراد کی بہتات بھی نہیں کرنی چاہیے جس سے سفید کالر کی ملازمت کے متلاشیوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا رہے اور ان کو کھپایا نہ جا سکے۔ نوآبادیاتی نظام کے حکمرانوں کی طرف سے دیا ہوا تعلیمی روایتی نظام اقتصادی ترقی کے لیے موزوں نہیں ہو سکتا۔ تعلیمی نظام کو عام انداز پر عملی ضرورتوں کے پورا کرنے کے اہل بنانا چاہیے زرعی، صنعتی اور دیگر پیشہ ورانہ نصابات کی ضرورت ہے تاکہ ملک میں تکنیکی سطح پر انقلاب آ سکے۔

صحت بھی اقتصادی ترقی کی راہ میں معاون ہے صحت مند لوگ پیداواری صلاحیت بڑھانے کے ضامن ہیں۔ بیماری سے پیداوار رک جاتی ہے۔ ہمارے ملک میں شرح پیدائش کو روکنے میں اتنی کامیابی نہیں ملی ہے جتنی کہ شرح اموات کو روکنے میں۔

صحت کے اداروں کے ذریعے آبادی میں اضافہ لازمی ہے۔ صحت کے پروگراموں کے تحت پرہیز اور احتیاطی تدابیر اور علاج معالجہ دونوں سے عوام کی صحت کو بیماریوں سے بچانا ہے۔

صحت سے متعلق احتیاطی تدابیر میں پینے کے پانی کی فراہمی، ماحول کی صفائی، وغیرہ کے پروگرام شامل ہیں۔ بہت سے کم ترقی یافتہ ملکوں میں پینے کا صاف پانی بھی میسر نہیں ہے اور علاج معالجہ کی بنیادی سہولتیں تک میسر نہیں ہیں۔ ڈاکٹر شہروں میں رہنا پسند کرتے ہیں۔ دیہات میں نیم حکیم اور عطائی دوا فروش اپنی دکانیں سجاتے ہیں۔ دیہات میں صحتی مراکز کا قیام ضروری ہے۔ ترقی یافتہ ملکوں میں صحت سے متعلق جامع اسکیمیں چالو کر دی گئی ہیں۔ اس طرح کی صحت کا معیار ترقی پذیر ملکوں میں لانے میں ابھی کچھ وقت لگے گا۔

استوائی ملکوں میں تعمیر مکانات کی ضرورت اور اخراجات سرد ممالک کے مقابلے میں کم ہوتے ہیں۔ لیکن بہت سے ترقی پذیر ملکوں میں یہ اخراجات بہت ہی کم ہیں اور ان پر سرمایہ کاری کی اشد ضرورت محسوس کی گئی ہے۔ تعمیر مکانات کی سرکاری اسکیموں سے یہ مسئلہ کسی حد تک حل کیا جا سکتا ہے لیکن بڑے پیمانے پر نجی سرمایہ کاری کے بغیر اسے حل کرنا دشوار ہے۔ نجی سرمایہ کاری کے لیے سرکاری مالیاتی اداروں کی طرف سے تعاون ضروری ہوگا۔

دیہی آبادی چونکہ شہروں کی طرف منتقل ہوتی ہے، اس لیے شہروں میں گندی بستیوں کا مسئلہ ابھر کر آ رہا ہے۔ شہروں میں صفائی ستھرائی اور مکانات کی تعمیر ایک سنجیدہ مسئلہ بن گیا ہے۔ گندی بستیوں کی صفائی منصوبہ بندی میں جگہ پاتی ہے لیکن اس کے لیے کئی طرح کے وسیع تر اقتصادی اقدامات درکار ہیں۔ اس کے لیے صنعتوں کو پھیلانا اور روزگار کے مواقع بڑھانا ضروری ہوگا۔

اس طرح اقتصادی سرگرمی کے ہر سیکٹر اور ذیلی سیکٹر کی منصوبہ بندی کو بہت تفصیل سے انجام دینا ہے اور یہ کام تکنیکی، اقتصادی اور تنظیمی پہلوؤں کو مربوط کرکے انجام دیا جاتا ہے۔ ★

بقیہ: پیٹ کی گیس

آنتوں میں اچھا اثر چھوڑتی ہے اور اس سے اجابت ٹھیک ہوتی ہے۔

آنتوں کے عمل کو درست کرنے کے لیے دوائیں بھی استعمال کی جاتی ہیں لیکن وہ ڈاکٹر کے مشورے سے ہی استعمال کی جانی چاہئیں۔ گیس کو ختم کرنے کے لیے کچھ مقبول عام دوائیں ہیں جیسا کہ کوئلہ اور سائم تھیکون SIMETHICONE ان کے بارے میں مشہور ہے کہ یہ گیس ختم کر دیتی ہیں۔ پیٹ کے اپھارے میں ان کو تجویز کیا جاتا ہے لیکن ان کی افادیت محدود ہے۔ کیوں کہ ہر شخص میں گیس کی مقدار جدا جدا ہے اور وہ مریض کو پریشان کرنے میں بھی جدا جدا اثرات رکھتی ہیں۔ ایسے مریضوں کے لیے جسمانی کسرت بھی مفید ہے۔ شروع زمانے سے ہی دوپہر کے کھانے کے بعد تھوڑا آرام اور رات کے کھانے کے بعد ٹہلنا ضروری بتایا گیا ہے۔ اب اسے یوں بدل لیا جائے تو اچھا رہے گا دوپہر کے کھانے کے بعد ایک میل ٹہلو اور رات کے کھانے کے بعد دو میل۔

گیس کو روکنے کے لیے کچھ احتیاطی تدابیر یہ ہیں:-

۱۔ جسم کی صفائی اور غذائی صحت کے اصولوں پر پوری توجہ دی جائے۔

۲۔ بھوسی دار غذا کے استعمال سے ٹٹی کو ٹھیک رکھا جائے۔ اسپغول کا استعمال کیا جائے۔

۳۔ معدہ، چکنائی دار غذا، گوبھی وغیرہ سبزیوں سے پرہیز رکھا جائے۔

۴۔ ہوا کے نگلنے کے عمل میں احتیاط برتی جائے۔

گیس والے مشروبات استعمال نہ کئے جائیں مسلسل چبانے سے پرہیز کیا جائے۔

۵۔ فکر و تردد سے بچا جائے۔

۶۔ باقاعدہ ورزش کی جائے۔

(آل انڈیا انسٹی ٹیوٹ آف میڈیکل سائنس کے ایک لیکچر پر مبنی) ★

بقیہ: صنعتی ترقی میں اشتراکِ عمل

اور آزادی سے قبل تک تو انگلینڈ نے ہندوستان میں جو چاہا کیا۔ لیکن آج بھی لنکا شائر اور مانچسٹر کے کارخانے ہندوستان کے خام مال کے رہین منت ہیں۔

زمانہ قدیم سے ہندوستان اپنی دولت، صنعت و حرفت کے لیے دوسرے ملکوں کے واسطے کشش کا باعث ہے۔ آزادی کے بعد ہندوستان کے عظیم لیڈروں نے ہندوستان کی اس عظمت کو دوبارہ بحال کرکے ایک بار پھر اس کا شمار دنیا کی ممتاز اقوام میں کرا لیا ہے۔ ہم پُر امید مستقبل کی طرف رواں ہیں۔ ہم آگے بڑھیں گے۔ اس لیے کہ ہمارے پاس قدرت کے پوشیدہ خزانے بھی ہیں اور ان سے فائدہ اٹھانے کی صلاحیت بھی۔ ہم بخیل نہیں ہیں۔ دوسرے ملکوں کی تعمیر و ترقی کے لیے ہم ہر وہ قدم اٹھانے کے لیے تیار ہیں جس کی ہمارے وسائل نے اجازت دے رکھی ہے۔ ایشیا میں صرف پاکستان ایک ایسا ملک ہے جس کے ساتھ صنعتی تعاون کا کوئی معاہدہ نہیں ہے ہم پاکستان کے ساتھ دوستانہ تعلقات کے لیے برابر کوشاں ہیں کیونکہ ہندوستان اور پاکستان ایک دوسرے کے ساتھ سائنسی اور صنعتی ترقی میں مفید اور بامقصد تعاون کر سکتے ہیں۔

(جناب خان امانت کمال کی ریڈیائی تقریر کا خلاصہ)
بشکریہ آل انڈیا ریڈیو۔

م۔ک۔ مہتاب

ھٰذا مِن فضلِ ربّی

حُسن چہرے کا ہو یا جسم کے کسی دوسرے عضو کا، پردوں میں بھی عُریاں ہو جاتا ہے۔ کہنا چشم کو چاہیئے ہر رنگ میں وا ہو جانا۔ میں ڈاکٹر شہزاد کی دکان پر بیٹھا شرافت حسین کا انتظار کر رہا تھا۔ میرے رُو برو کرسی پر بیٹھی خاتون کا چہرہ تو سیاہ ریشمی برقعے میں ڈھکا ہوا تھا لیکن سیاہ پردے میں سے نکلتے ہوئے گورے ہاتھ جن کی انگلیوں پر مہندی کی خوبصورت لکیریں نمایاں تھیں بہت ہی خوبصورت تھے۔ گول گول حنائی انگلیوں پر سونے کی دو دو انگوٹھیاں اور بھری بھری کلائیوں پر طلائی چوڑیاں بانہوں کی خوبصورتی میں اور بھی اضافہ کر رہی تھیں۔

میں ان ہاتھوں کو دیکھ کر غالب کا شعر حسن بہر رنگ رقیب سروساماں نکلا۔ گنگنا رہا تھا کہ شرافت حسین کی گاڑی دکان پر آ کر رُکی۔ وہ خاتون اُٹھ کر شرافت حسین کی گاڑی میں جا بیٹھی۔ سلمہ شرافت حسین کے بڑے لڑکے رضوان کی بیوی تھی اور جوالاپور جانے کے لیے میری طرح شرافت حسین کا انتظار کر رہی تھی۔ ہمیں رُڑکی سے جوالاپور کے گاؤں شام پور جانا تھا جہاں شرافت حسین کا فارم تھا اور جہاں آج گیہوں کی کٹائی کے آغاز پر شرافت حسین نے میرے جیسے اپنے کچھ خاص احباب کو مدعو کر رکھا تھا۔

گاڑی میں شرافت حسین نے اپنی بہو سلمہ کا تعارف مجھ سے کرایا تو مجھے شرافت حسین کی قسمت پر رشک ہونے لگا کہ کیا شرافت حسین عرف شریفو جیسا اَن پڑھ دیہاتی جو کبھی ہماری ٹرانسپورٹ کمپنی میں ٹرک چلایا کرتا تھا اور کہاں سلمہ جیسی حسین و جمیل لڑکی جسے نہ صرف بات چیت کا سلیقہ تھا بلکہ جو کھیتی باڑی، ملک کی اقتصادیات بلکہ سیاست سے بھی خوب واقف تھی اور انگریزی کے ایسے ایسے چُست الفاظ دَوران گفتگو بول جاتی گویا کسی اچھے کالج کی پیداوار ہو۔ اُس کی طلائی چوڑیوں کی جھنکار سُن کر میں من ہی من میں کہہ رہا تھا، شریفو بیٹے! جب خُدا دن پھیرتا ہے تو چاروں طرف اُس کی برکتیں نازل ہوتی دکھائی دیتی ہیں۔"

کار میں ہی سلمہ نے مجھے بتایا کہ شام پور فارم میں اُن کا ایک اچھا مکان بھی ہے۔ جب تک گیہوں منڈی میں بھیجنے کا کام پُورا نہیں ہو جاتا وہ وہیں رہے گی۔ اُس نے مجھے بھی آج رات کا کھانا فارم ہاؤس میں کھانے کی دعوت دی۔

شرافت حسین کی زندگی میں واقعی ایک انقلاب آ گیا تھا۔ کہاں وہ شخص جو بیوی بچوں کی ضروریات کے نام پر ہمیشہ تنخواہ ایڈوانس مانگتا رہتا تھا اور کہاں یہ سیاہ شیشوں والی ایمبیسڈر گاڑی جس میں بیٹھی سلمہ جیسی خاتون کی طلائی چوڑیوں کی چھنک جو اُس کی کھنکتی ہوئی آواز میں بار بار شامل ہو جاتی تھی۔

اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے ہوئے ہم شام پور آ پہونچے۔ شرافت حسین کے فارم کی ایک جانب اُونچے اُونچے سفیدے کے درختوں کی قطار تھی جس کے نیچے ایک پہاڑی نالہ بہہ رہا تھا اور فارم کے عقب میں اُبھرتی ڈوبتی پہاڑیوں کی ایک قطار دکھائی دے رہی تھی۔ فارم کے بڑے دروازے سے داخل ہوتے ہی سامنے ایک سبز بورڈ پر سفید حروف میں عربی میں لکھا تھا "ھٰذا مِن فضلِ ربّی" میں نے شرافت حسین سے اِس بورڈ کا مطلب پوچھا تو وہ کہنے لگا۔ یہ سب خدا کے فضل و کرم کی بدولت ہے۔

فارم میں شہتوت کے گھنے درختوں کا ایک سلسلہ دُور تک چلا گیا تھا اُن میں کالے لمبے شہتوت دُھوپ کی روشنی میں خوب چمک رہے تھے۔ نیچے کچھ بچے جھولیوں میں پھل اکٹھا کر رہے تھے۔ ہم شہتوت کے سائے میں چلتے چلتے فارم کے بہت اندر تک چلے آئے تھے۔ سلمہ مکان کی جانب چلی گئی تھی۔ گندم کی فصل پک کر تیار کھڑی تھی۔ گھنی کھیتی سنہری رنگ گویا قدرت پہاڑوں کے عقب سے نکل کر ان زمینوں پر سونے کی بارش کر گئی ہو۔ گندم کی سنہری بالیاں ہلکی ہلکی ہوا میں یوں لہرا رہی تھیں گویا زمین کے بازوؤں میں دُور تک پڑی چوڑیاں ہلکورے لے رہی تھیں زمین اور عورت دونوں خالق ہیں دونوں پیدا کرتی ہیں دونوں کے بازوؤں پر سونے کی چوڑیاں لہراتی ہیں۔

گندم کے کھیتوں کے کنارے کنارے درختوں کے تنے پر کئی رنگدار بورڈ آویزاں تھے۔ کیمیائی کھاد والوں کے بورڈ، ٹریکٹر اور کھیتی کی مشینوں والوں کے بورڈ، کیڑے مارنے والی دوائیوں کے بورڈ، ٹیوب ویل والوں کے بورڈ۔ میں نے شرافت حسین سے پوچھا یہ فارم میں اتنے

بڑے بڑے بورڈ کیوں لگوا رکھے ہیں؟ تو وہ کہنے لگا کہ یہ جو تم زمین پر سونا سا بچھا کہہ رہے ہو نا یہ سب ان بورڈوں والوں کی مہربانی ہے۔

باتیں کرتے کرتے ہم وہاں پہنچ گئے جہاں گندم کی کٹائی شروع ہونے والی تھی۔ شرافت حسین کے کنبے کے افراد اور کچھ اور احباب بھی وہاں موجود تھے۔ پانچ دیہاتی عورتیں جن کے سر اور کمر کے درمیان رنگ رنگ کی اوڑھنیوں کی جھولیاں بنی تھیں اور ہاتھ میں درانتیاں تھیں اپنے مردوں کے ساتھ فصل کاٹنے کے لیے تیار کھڑی تھیں۔ شرافت حسین کے دونوں لڑکے اور سلمہ شربت اور شیرینی بانٹ رہے تھے۔ ایک ڈھول والے نے بسم اللہ کہہ کر ڈھول بجایا اور شرافت حسین کے فارم سے سونا سمیٹنے کا عمل شروع ہو گیا۔

شرافت حسین نے مجھے بتایا کہ وہ ہر برس کٹائی سے پہلے کارندوں کی خوشی کے لیے اس چھوٹی سی تقریب کا اہتمام کرتا ہے جس میں وہ اپنے کچھ دوستوں کو بھی بلاتا ہے۔ دوپہر اور رات کے کھانے کا اہتمام یہاں ہی ہوتا ہے۔ جب اللہ دیتا ہے تو بندہ ہاتھ کیوں کھینچے۔

ہم درخت کے نیچے بیٹھے مزدوروں کو فصل کاٹتے اور گاتے دیکھ رہے تھے۔ شرافت حسین کے دونوں بیٹے بھی پہلے دن کی کٹائی میں شامل ہو گئے تھے۔ میں نے شرافت حسین سے پوچھا کہ اگر وہ اتنی زمین اور ایسے فارم کا مالک تھا تو ہماری ٹرانسپورٹ کمپنی میں ٹرک ڈرائیور تھا کے لیے کیوں مارا مارا پھرتا تھا؟

"یہ وقت وقت کی بات ہے سہگل صاحب!" شرافت حسین کندھے پر رکھے زرد رومال سے چہرہ صاف کرتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ میرے پاس زمین تھی اور نہیں بھی۔ بیس ٹکڑے زمین چار دیہات میں بکھرے ہوئے تھے۔ میرے کسی کام کے نہیں تھے لوگ ہی جوت لیتے تھے مجھے کچھ دانے مل جاتے تھے۔ نہ میں کہیں جا سکتا تھا نہ ٹھیک کر کاشت کر سکتا تھا بھوکوں رہنے سے بہتر تھا کہ زمین پٹے پر دے دوں اور خود ٹرک چلاؤں۔ پھر یوں ہوا کہ سرکار نے زمینوں کی چک بندی کرادی یعنی اڑوس پڑوس کے دیہات میں ایک ایک مالک کی زمین ایک جگہ اکٹھی کردی۔ سہگل صاحب جب میری زمین کے ٹکڑے اکٹھے ہوئے تو مجھے یوں دکھائی دیا گویا میرے بچوں کے لیے روٹی کے ٹکڑے اکٹھے ہو گئے ہیں۔ آپ کو یاد ہو گا سہگل صاحب کہ میں آپ کا ٹرک کانپور میں چھوڑ کر گاؤں بھاگ آیا تھا۔ میں یہاں زمین کے کاغذات تیار کراتا رہا پھر ایک کھیت تھا، ایک مالک دونوں نے مل کر ہاتھ بڑھایا تو یہ فارم ابھرنے لگا جو آپ کے سامنے ہے۔

شروع شروع میں تو بال بچوں کی گزر بسر کے لیے اناج وغیرہ پیدا ہونے لگا۔ پھر سرکاری ادارے امداد کو آ گئے۔ کسی نے آ کر کہا شرافت بادلوں کی طرف کیوں دیکھتے رہتے ہو آؤ تمہیں ٹیوب ویل کے لیے قرضہ دیتے ہیں۔ بنک نے زمین لکھوا کر ٹیوب ویل لے دیا۔ جب فصل نے جھولی بھری تو دو برس میں ہی دوسرا ٹیوب ویل لگ گیا۔ اور آج آپ دیکھ رہے ہیں فارم میں چار ٹیوب ویل چل رہے ہیں۔ زمین پوری پیداوار نہیں دیتی تھی۔ سرکاری انسپکٹروں نے اچھے بیج استعمال کرنے کا مشورہ دیا۔ فصل اگانے کے نئے طریقے سمجھائے۔ ٹریکٹر والے آ گئے اُن کی مہربانی سے زمین کا سینہ اُلٹ پلٹ کر دیکھا گیا۔ اب ایک دانے سے ستر دانے تک فصل ہونے لگی ہے۔ اسی پر بس نہیں۔ کیمیائی کھاد والوں نے جن کا بہت بڑا بورڈ آپ نے شہتوت کے اُس پیڑ پر لگا دیکھا ہے، میرے فارم میں کئی نمائشی پلاٹ لگائے۔ اڑوس پڑوس کے کسان شرافت حسین کی گھنی کھیتی دیکھنے آنے لگے۔ خدا نے ہاتھ سیدھا کیا تو اپنا ٹریکٹر خرید لیا۔ فرم والوں نے کہا شرافت حسین محنت کرو اور جتنا چاہو لے جاؤ۔ یہ ٹرالیاں یہ گندم صاف کرنے کی مشینیں سب اُن کی مہربانی سے ہی یہاں موجود ہیں۔ یہ سب کچھ اُن کی بدولت ہے تو اپنا بورڈ یہاں کیوں نہ لگائیں۔ فصل پکتی ہے تو سرکاری ادارے یہاں سے ہی خرید کر لے جاتے ہیں۔

بچے بڑے ہو گئے تھے۔ اچھے مکان کی ضرورت تھی۔ سرکار مدد دینے کو تیار تھی۔ یہ درختوں کے جھنڈ کے اندر جو مکان دکھائی دے رہا ہے یہ سرکاری قرضے سے ہی بنا ہے۔ اس میں پانی، بجلی سب ہے۔ فارم کی دیکھ بھال کے لیے یہاں رہنا ضروری ہے۔ گاؤں میں ہمارا جو چھوٹا سا گھر تھا وہ چھوڑ کر ہم سب یہاں آ گئے۔ لیکن اب بھی وہ گھر وہیں ہے اور کبھی کبھی ہم یہ دیکھنے چلے جاتے ہیں کہ ایک کمرے اور رسوئی کے مکان میں ہم چھ فرد کیسے رہتے تھے؟۔

بچوں نے زراعت کی اچھی تعلیم پائی ہے۔ وہ کام میں اور بھی اضافہ کر رہے ہیں۔ فارم کی زمین پچھلے دس برس میں دوگنی ہو گئی ہے۔ ڈیری فارم والے کہہ رہے ہیں کہ اگر ہم یہاں بھینسیں پالنے اور مرغیاں رکھنے کا کام کریں تو وہ نہ صرف مالی مدد ہی دیں گے، بلکہ ساری پیداوار بھی اُٹھا لیا کریں گے۔ رمضان کی بیوی سلمہ مرغیاں پالنے کا طریقہ سیکھنے کے لیے ہی ہر روز شہر پڑھنے جاتی ہے۔

ہم درختوں کے زیر سایہ چلتے چلتے باتیں کرتے آ رہے تھے۔ میں نے شرافت حسین سے ازراہِ مذاق پوچھا۔ "شرافت! اگر یہ زمین تمہیں چک بندی والوں کی بدولت ملی ہے، پانی ٹیوب ویلز کی مہربانی سے حاصل ہو رہا ہے۔ بھرپور پیداوار اچھے بیج والوں، کھاد والوں، ٹریکٹر والوں اور کیڑے مارنے والوں کی مہربانی سے حاصل ہو رہی ہے، سرمایہ بنکوں نے دیا ہے اور مکان سرکار نے تو فارم کے دروازے پر یہ اتنا بڑا عربی کا بورڈ کیوں لگا رکھا ہے کہ "خدا کے فضل کے سوا کچھ بھی نہیں"۔

شرافت ایک لمحے کے لیے رُک گیا۔ پھر کہنے لگا: "سہگل صاحب! میں جانتا ہوں کہ یہ سب کچھ سرکار اور امدادی اداروں کی ترقیاتی کوششوں کی بدولت حاصل ہوا ہے لیکن اپنا اپنا اعتقاد ہے۔

(باقی صفحہ ۔۔ پر)

ڈاکٹر راکیش ٹنڈن

آپ اور آپ کی صحت

پیٹ کی گیس

گیس کی بیماری کی عام شکایت رہتی ہے۔ حکیم یا ڈاکٹر کے پاس جانے والا ہر تیسرا مریض اس بیماری کا شکار ہوتا ہے۔ پیٹ کی اس بیماری کا علاج طبی صحیح آنے سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کے لیے مریض کو ریشہ دار غذا ملنی چاہیئے۔ بھوسی والی غذا اس کے لیے مفید رہتی ہے۔

گیس، ریاح، اپھارہ، بادی، موٹاپا، گڑگڑاہٹ، کھٹی ڈکار آنا، پیٹ کا پھولنا، قراقر وغیرہ وہ نام ہیں جو پیٹ میں گیس کے مرض کو ظاہر کرتے ہیں۔ ان کے درمیان فرق کو نہ تو مریض ہی اہمیت دیتے ہیں اور نہ ان کے معالج۔ اس کے لیے فساد معدہ کی اصطلاح استعمال کرلی جاتی ہے یا پھر اسے اعصابی فساد کے نام سے پکار لیا جاتا ہے اس میں پیٹ میں ہوا کی جملہ کیفیات آجاتی ہیں۔ یہ اصطلاح ایک امریکی شاعر نیش نے وضع کی اور اس نے شاعری کرتے ہوئے ان خیالات کا اظہار کیا۔

آج میں کیسا محسوس کرتا ہوں! میں خود کو غیر صحت مند، غیر موزوں اور صحت سے دور پاتا ہوں

یہ ذہن کے فساد اور گڑبڑی کا نتیجہ ہے اور اسے پیٹ کا فساد بھی کہتے ہیں۔ بظاہر یہ علامات معمولی دکھائی پڑتی ہیں لیکن ان سے انسان بے دم ہو جاتا ہے۔ ان کے بار بار وقوع پذیر ہونے سے مریض پریشان ہو جاتا ہے۔ گیس سے جسمانی پریشانی اور ذہنی ناآسودگی ہونے لگتی ہے۔ سماجی طور پر اسے پریشانی محسوس ہونے لگتی ہے اریاح بار بار خارج ہونے کے سبب وہ لوگوں میں بیٹھنے کے لیے خود کو ناموزوں خیال کرنے لگتا ہے۔ ریاح کا اخراج آواز سے ہونے کی صورت میں یہ پریشانی اور بھی لاحق ہونے لگتی ہے۔ آواز کے ساتھ ریاح کا اخراج ہمارے معاشرے میں اچھا نہیں سمجھا جاتا ڈاکٹر کے پاس جانے والا ہر تیسرا مریض ریاح اور گیس کا شاکی ہے۔ اس کے لیے آیوروید میں بہت سی دوائیں ہیں۔ جسم میں ریاح یا ہوا یا بادی کا ہونا اور متوازن حالت میں رہنا ضروری ہے اس کا توازن خراب ہونے سے کئی طرح کی بیماریاں لاحق ہو جاتی ہیں۔ اس طرح جسم میں پت اور کف کا ہونا بھی ضروری ہے۔ گھریلو انداز کی بہت سی دوائیں یا چورن اس میں کام آتی ہیں۔ لیکن اس کے باقاعدہ علاج کے لیے گیس کا سائنسی تجزیہ اور یہ کیوں پیدا ہوتا ہے، اس کی وجہ جاننی ضروری ہے۔

آنتوں کی گیس کی مقدار

بغیر کھائے پیئے کسی انسان کی آنتوں کے راستے نیز ۲۰۰ ملی گرام سے بھی کم گیس ہوتی ہے دن بھر میں وہ تقریباً بارہ دفعہ گیس خارج کرتا ہے۔ اس طرح وہ اوسطاً ۶۰۰ ملی گرام گیس خارج کرتا ہے۔ ہر انسان کی ریاح مختلف مقدار اور مختلف تعداد میں خارج ہوتی ہے۔ اس کا تعلق اس بات سے ہے کہ اس نے کیا خوراک کھائی ہے ایسے بھی مریض ہیں جو دودھ کو مناسب طرح سے ہضم نہیں کر سکتے۔ ان کے پیٹ میں ہوا بھری ہوتی ہے۔ ہری ترکاریاں مثلاً گوبھی، پالک اور پھلی وغیرہ زیادہ گیس پیدا کرتی ہیں۔ چنانچہ جو لوگ ان ترکاریوں کا استعمال کرتے ہیں ان کے کھوکھلے حصے میں زیادہ گیس ہوگی۔

پیٹ کی دو تہائی گیس ہضم ہو جاتی ہے اور باقی آنتوں میں اور معدہ میں ہوتی ہے۔ خوراک کا جو حصہ ہضم ہونے سے رہ جاتا ہے اس میں کیڑے خمیر پیدا کرتے ہیں اور دوسرے خون سے آنتوں میں نفوذ کے ذریعے بھی گیس بنتی ہے۔

گیس کیسے بنتی ہے؟

آنتوں کی گیس پانچ گیسوں کا مرکب ہے۔ نائٹروجن، کاربن ڈائی آکسائڈ، ہائیڈروجن، میتھن اور آکسیجن۔ ان کی مقدار کا انحصار ان باتوں پر ہے۔ ۱۔ نگلی گئی ہوا کی مقدار ۲۔ آنتوں والے بیکٹریا کی اقسام اور ان کی مقدار ۳۔ خوراک۔

۱۔ حلق سے نیچے اُتاری گئی ہوا کی مقدار:-

ہر لقمہ میں ۲ تا ۳ ملی گرام ہوا خوراک کی نلی سے اندر جاتی ہے۔ اس کا کچھ حصہ باہر آجاتا ہے لیکن اس کا کچھ حصہ آنتوں میں پہونچ جاتا ہے۔

نکودین کی حالت میں ہوا کی کافی مقدار حلق سے نیچے اتر جاتی ہے۔ گلا دُکھ رہا ہو یا چھاتی دُکھ رہی ہو تو بھی ہوا کا نگلنا زیادہ ہوتا ہے۔ تمباکو کے کھانے والے، پان کھانے والے، پان مسالہ کھانے والے، چبا چبا کر کھانے والے دوسروں کے مقابلے زیادہ ہوا نگل جاتے ہیں۔ اس میں فضائی نائٹروجن ہوتی ہے لہذا اس کا اخراج بغیر بدبو کے ہوتا ہے۔

۲۔ بیکٹیریا: کاربن ڈائی آکسائیڈ، ہائیڈروجن اور میتھین وہ خاص گیسیں ہیں جو بغیر ہضم ہوئی خوراک کے خمیرے پیدا شدہ بیکٹیریا سے پیدا ہوتی ہیں۔ مختلف بیکٹیریا، مختلف مقدار میں ان گیسوں کو پیدا کرتے ہیں۔ اس کا انحصار بڑی حد تک اُس خوراک پر بھی ہے جو انسان کھاتا ہے۔ ہندوستان جیسے ملکوں میں صحت و صفائی اور حفظانِ صحت کے اصولوں کی پابندی مشکل سے ہوتی ہے۔ لہذا ان کی آنتوں میں زیادہ بیکٹیریا پیدا ہو جاتے ہیں۔ ایسے لوگوں میں گیس کافی پیدا ہو جاتی ہے۔ کچھ نقائص انسان کے جسم میں ایسے ہوتے ہیں جن سے آنتوں میں خاص قسم کے بیکٹیریا بن جاتے ہیں اور پھر خاص قسم کی گیس بننے لگتی ہے۔ مثال کے طور پر میتھین گیس جس سے معدہ اور آنتوں میں ریاح بنتی ہے۔ اس سے دست آنے لگتے ہیں۔

خوراک :- آنتوں میں کاربو ہائیڈریٹ پوری کی پوری کھپ جاتی ہے۔ لیکن جہاں یہ پوری طرح ہضم نہیں ہو پاتی، وہاں شوگر گیس پیدا کرنے کا سبب بن جاتی ہے۔ چنانچہ جو لوگ دودھ ہضم نہیں کر پاتے، ان کو ریاح بن جاتی ہے۔ خوردنی ترکاریاں مثلاً پھلی وغیرہ میں بھی ایسی چکنائی ہوتی ہے جو ناقابل ہضم ہوتی ہے۔ یہ بیکٹیریا کے عمل سے بڑی آنت میں خمیر بنا دیتی ہیں۔ اور پھر اُن سے گیس پیدا ہونے لگتی ہے۔ ڈکار آنا یا پیٹ کا صدا یا ریاح کا آواز کے ساتھ اخراج اسی کے سبب ہوتا ہے۔ بوتل سے دودھ پینے والے بچے بھی دودھ کی بوتل کو منہ میں لگائے رکھنے کے ساتھ ساتھ ہوا بھی ضرور لے لیتے ہیں۔ ماں کو یہ مشورہ دیا جاتا ہے کہ بچے کو دودھ پلانے کے بعد سیدھا لٹائے تاکہ ریاح خارج ہوتی رہے۔ بالغوں میں کچھ لوگ تو اسے مذاق ہی سمجھتے ہیں۔ کچھ لوگ تیز اور جلد کھانا کھانے کے سبب بڑے بڑے لقمے تیزی سے نگلتے ہیں۔ اس وجہ سے بھی ریاح زیادہ بنتی ہیں۔ ریاح کے اخراج کا عارضہ ایک طبی مسئلہ ہے جو دل کو خون کی رسد کی کمی کے سبب اور دیگر وجوہات سے لاحق ہو جاتا ہے۔ اسے نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے۔

ہوا کا نگلنا :- یہ کھانے کو تیزی سے نگلنے کے سبب ہوتا ہے۔ اعصابی مریض عموماً اس کا شکار رہتے ہیں۔ اس سے پیٹ اندر سے پھول جاتا ہے۔ انسان بے چین ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد ریاح کا اخراج ہونے لگتا ہے۔

نیند کے دوران ہوا کو نگلنے والے افراد اگر سوتے وقت لیٹنے کا ڈھنگ بدل لیں اور سونے کے دوران ایک اور تکیہ استعمال کریں تو انھیں اس سے بچنے میں مدد مل سکتی ہے۔

ڈکار آنا :- جو لوگ نگلی ہوئی ہوا کو ڈکار کے ذریعے باہر پھینکنے کے عادی نہیں ہیں، وہ اسے پیٹ میں رکھنے کے لیے مجبور ہیں۔ اس طرح پیٹ کی گڑگڑاہٹ بھی ہے۔ بہت سے افراد کے پیٹ میں گڑگڑاہٹ رہتی ہے۔ یہ آنتوں کی حرکت کے سبب ہے جو کہ باقاعدہ سکڑتی رہتی ہیں۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ہاضمہ ٹھیک نہیں ہے۔ غیر ہضم شدہ چکنائی کی بڑی مقدار آنتوں کے نچلے حصے میں پہنچ جاتی ہے۔ اس کی وجہ سے ہائیڈروجن اور دیگر قسم کی گیسیں پیدا ہونے لگتی ہیں۔ اس سے آنتوں کی حرکت بڑھ جاتی ہے۔

منہ کی بدبو :- منہ سے بدبو بھی بدہضمی کی علامت ہے۔ یہ بھی غیر ہضم شدہ چکنائی سے پیدا ہوتی ہے، لہذا ایسے لوگوں کو چکنائی کم لینی چاہیئے۔ انھیں ریشہ دار غذا زیادہ لینی چاہیئے۔ ان کو نیومالسین کی خوراک دینے سے ٹٹی کی بدبو اور ریاح کی بدبو کم ہو سکتی ہے۔ ان کی خوراک میں پھلی اور ریاح پیدا کرنے والی دیگر ترکاریاں کم ہونی چاہئیں۔

پیٹ کا درد :- ہمارے سماج میں اکثر موٹے پیٹ والوں کے پیٹ چکنائی کے سبب ہی پھولتے ہیں۔ منہ کے ذریعے داخل ہوئی ہوا آنتوں اور پیٹ کے اوپری حصے میں رک جاتی ہے جس سے بے چینی محسوس ہونے لگتی ہے اور پیٹ پھول جاتا ہے۔ ڈاکٹری اصطلاح میں اس کا نام ہے :-

Gas-bloat Syndrome

آنتوں میں پیدا ہونے والی گیس بھی بڑی آنت کے پچھلے حصے میں رک جاتی ہے۔ اس سے بھی پیٹ پھولتا ہے اور اس میں درد ہونے لگتا ہے۔ ڈاکٹری اصطلاح میں اسے Splenic flexure Syndrome کہتے ہیں۔ یہ بڑی آنتوں کے سکڑنے اور اینٹھنے سے پیدا ہوتا ہے۔ اس کے لیے درج ذیل احتیاط اور علاج تجویز کیا جاتا ہے۔

پیٹ کا پھولنا نوجوانوں اور بوڑھوں دونوں کو ستاتا ہے۔ یہ شکایت بالعموم شام کو ہوتی ہے۔ اس کے لیے محض چت لیٹنا ہی کافی ہو جاتا ہے اور کسی خاص علاج کی ضرورت نہیں ہوتی۔

علاج :- سب سے پہلے تو غذا پر دھیان دینا ضروری ہے۔ ہوا کا نگلنا کم کرنے کے لیے رضاکارانہ کوششوں کو بڑھانا چاہیئے۔ ہر شخص کی جسمانی ساخت کے لحاظ سے ہوا کا نگلنا اور اس کی مقدار کا پیٹ میں رہنا جُدا جُدا ہے۔ جس مقدار میں پیٹ کی ہوا کسی کے لیے وبالِ جان بن گئی ہے، وہی مقدار دوسرے کو کسی بھی طرح متاثر نہیں کرتی۔ پیٹ کا درد آنتوں کے غیر معمولی طور پر حرکت کرنے کا سبب ہوتا ہے۔ علاج میں سب سے زیادہ ضرورت اس امر پر دھیان دینے کی ہے کہ ٹٹی صحیح آئے۔ مریض کو بھوسی دار غذا زیادہ مقدار میں دینی چاہیئے۔ اچھا ہو کہ بغیر چھانے آٹے کی روٹی دی جائے۔ اس میں اسپغول کا اضافہ کر لیا جائے تو اور اچھا ہے۔ خوراک میں ریشہ اور بھوسی

(باقی ص۱۵ پر)

غزلیں

خواجہ قطب الدین مونس

ہے یہاں کون مہرباں، کہیے
کس سے آزارِ قلب وجاں کہیے

آگ کس کی ہے یہ لگائی ہوئی
وقت ہے کیوں دُھواں دُھواں کہیے

شکوۂ جورِ آسماں سُنیے
قصۂ عمرِ رائیگاں کہیے

ہر نفس ہے روانیِ شمشیر
زندگی کو اک امتحاں کہیے

مصلحت کا یہی تقاضا ہے
ظالموں کو بھی مہرباں کہیے

ابنِ آدم ہوں میری ہستی کو
وجہِ تخلیقِ دوجہاں کہیے

ہر جگہ ہے بلا کی ویرانی
کس کو صحرا کسے مکاں کہیے

لُطف جب ہے کہ دل کی دھڑکن کو
نغمۂ سازِ دل رُبا کہیے

کیا خوشی، کیسی راحتیں مونس
ان کے غم کو رفیقِ جاں کہیے

نسیم شاہجہاں پوری

بُجھ گیا دل آرزو کرتے رہے
کھو گئے اور جستجو کرتے رہے

خود وہ خود سے گفتگو کرتے رہے
آئینہ کو سُرخرو کرتے رہے

میں گناہِ آرزو کرتا رہا
آپ خونِ آرزو کرتے رہے

تجھ کو پانے کے لیے ہم عمر بھر
آپ اپنی جستجو کرتے رہے

اُف! حیاتِ عشق کی مجبوریاں
آرزو پر آرزو کرتے رہے

کی تلافی روز دامن پھاڑ کر
روز ہم جُرمِ رفو کرتے رہے

آرزوؤں پر شباب آتا رہا
صرف ہم دل کا لہُو کرتے رہے

واقفِ آدابِ عرضِ شوق تھے
چُپ رہے اور گفتگو کرتے رہے

خونِ دل سے عمر بھر روشن نسیم
ہم چراغِ آرزو کرتے رہے

اس سے پہلے کہ ایٹمی شعلے

ڈاکٹر کمار پانی پتی

اس سے پہلے کہ ایٹمی شعلے
پھونک ڈالیں چمن کے پھولوں کو
آؤ مِل جُل کے پختگی بخشیں
زندگی کے حسیں اُصولوں کو

وہ سُنہری اُصول جو کل تک
آدمیت کی رُوح تھے، جاں تھے
جو بزرگوں کی دین تھے ہم کو
جو امانت تھے نسلِ نو کے لیے

وہ سُنہری اُصول، جن کو کبھی
ہم نے انسانیت کا نام دیا
جن سے قوت مِلی اِرادوں کو
جن کا صدیوں نے احترام کیا

آؤ دھرتی کی مانگ بھر ڈالیں
اُنس واُلفت کے اِن اُصولوں سے
تاکہ بچ پائیں کل کی نسلیں تو
جنگ کے ایٹمی بگولوں سے

اس سے پہلے کہ ایٹمی شعلے
پھونک ڈالیں چمن کے پھولوں کو...

نیاز اعظمی

بصد خلوص بصد احترام آیا تھا
سلام اس کا کبھی میرے نام آیا تھا

یہ سوچتا ہوں اسے پیشِ زندگی کردوں
وہ ایک شخص کبھی میرے کام آیا تھا

ہر ایک شام مجھے انتظار رہتا ہے
کہ مجھ سے ملنے کوئی ایک شام آیا تھا

دریچے کھول کے کمرے میں آج پھر بیٹھوں
ہوا کے ہاتھ کبھی اک پیام آیا تھا

نیاز اعظمی تم بھی جواب دیدیتے
بَلا سے دوست کا رسمی سلام آیا تھا

راجیندر بہادر موج

نہ دیکھا اور پہچانا کسی نے
تجھے اتنا ہی سمجھا آدمی نے

قدم بھٹکے جہاں راہِ وفا میں
وہیں آواز دی مجھ کو کسی نے

بُھلایا ابتدا اور انتہا کو
دکھائے خواب ایسے زندگی نے

جہاں پہونچے نہیں اربابِ دانش
وہاں پہونچا دیا میری خودی نے

کیا وہ پھُول نے مُرجھا کے ظاہر
چھُپا کر راز جو رکھا کلی نے

بہت رنگین تھا نقشہ جہاں کا
کیا پھیکا محبت کی کمی نے

وہیں اسے موج ہے آغوشِ ساحل
جہاں پر ڈوب جاتے ہیں سفینے

معاشی خودکفالت

یروں اور دوسرے ایسے طبقوں کی مالی امداد نئی اور درجِ فہرست ذاتوں اور پچھڑے قوں کی مجموعی فلاح و بہبود کے لیے ایک رپوریشن تشکیل دی گئی۔ کاٹیج انڈسٹری مراکز ، روائتی حرفتوں مثلؔا قالین بافی، نمدہ سازی، ڑے اور لکڑی کے کام میں مہارت دی گئی۔ ۸۲-۱۹۸۰ کی مدت میں ان مراکز میں ۵ لاکھ روپے خرچ کرکے ۶۰۰ لڑکوں اور لڑکیوں کو ہر بنادیا گیا۔ ان ماہر طلبا کو تجارتی بنیادوں اپنے مراکز شروع کرنے کی خاطر مالی معاونت ے علاوہ سازو سامان بھی فراہم کیا گیا۔ مزید ITI سے فارغ شدہ درجِ فہرست ذاتوں الے طلبا کو اپنا روزگار آپ حاصل کرنے کی اطر مالی مدد دی گئی۔ اس کے علاوہ غریب ھیروں کو نائیلون، ٹیٹرلین جال بھی مفت فراہم ئے گئے۔ اس پروگرام کے تحت ۳۰۰ درجِ ہرست والے ITI سے فارغ شدہ اور ۴۰۰ مچھیروں کو فائدہ ملا۔

رہائشی مکانات کی فراہمی

درجِ فہرست والی ذاتوں، پچھڑے طبقوں، وجروں اور بکروالوں سے تعلق رکھنے والے ن خاندانوں کو جن کے پاس رہائشی مکانات ہیں تھے، سماجی بہبود کے ادارے نے بھاری الی امداد کی۔ ہر ایسے خاندان کو نئے مکان کی تعمیر کے لیے ۳۰۰۰ روپے کی سبسڈی دی گئی۔ زید مکانات کی تعمیر کے لیے زمین بھی مفت راہم کی گئی۔ اس سلسلے میں ۸۲-۱۹۸۰ء کے رصے میں ۴۲,۹۴ لاکھ روپے خرچ کیے گئے۔ جس سے ۱۶۴۷ لوگوں کو فائدہ ہوا۔ موجودہ سال کے دوران اس مد میں ۱۵۰۰ لاکھ روپے خرچ کرنے کا اندازہ ہے جس سے ۵۰۳ لوگوں کو فائدہ ملے گا۔

بچوں کی فلاح وبہبود: سماجی بہبود کے پروگراموں میں بچوں کی فلاح کا پروگرام خاص اہمیت کا حامل ہے۔ اس سلسلے میں بال آشرم قائم کئے گئے، بچوں کی مجموعی ترقی کی اسکیم (Integrated Child Development Scheme) کو رُوبہ عمل لایا گیا۔ بچوں کے قانون کو عملایا گیا اور معاشی یا سماجی طور پر ابتر بچوں کی مالی معاونت کی گئی۔ بال آشرم یا مرکز فلاحِ اطفال معاشرے کے غریب ترین طبقوں سے تعلق رکھنے والے بچوں میں یتیمی اور لاچاری کے احساس کو ختم کرنے کی غرض سے وجود میں لائے گئے۔ نتیجے کے طور پر ان مراکز نے ۸۳-۱۹۸۰ کی مدت میں ۱۵۰۰ چھوٹے بچوں کو تحفظ security احساس اور اچھی شخصیت کے اُبھار کے لیے مناسب ماحول مہیا کیا۔ اس طرح سے بیس نکاتی پروگرام کے سلسلے میں مرکزی حکومت کی شروع کردہ بچوں کی مجموعی ترقی کی سکیم کا مقصد ۶-۵ سال کی عمر کے بچوں کی صحت اور کھانے کے معیار کو بلند کرنا اور بچوں کی اموات کو کم کرنا ہے۔ اس اسکیم کا ایک اور مقصد ۴۵-۱۵ سال کی عمر کی عورتوں میں عام تعلیم اور طبی تعلیم کو پھیلانا ہے۔ تاکہ ان میں بچوں کی مکمل نگہداشت کے احساس کو جگایا جائے۔ اس وقت ریاست جموں وکشمیر میں ۲۲ ایسے مراکز کام کر رہے ہیں اور ۸۳-۱۹۸۰ کی مدت میں ۹۰۰۰ بچوں اور ان کی ماؤں کی خدمت کی گئی۔ اس کے علاوہ طلاق شدہ عورتوں، کینسر، ٹی۔بی کے مریضوں، ناقابلِ معذور اشخاص اور دماغی امراض میں مبتلا والدین کے بچوں کی خصوصی نگرانی کے لیے ۳,۲۰ لاکھ روپے خرچ کئے گئے۔

جسمانی طور پر معذور افراد کی فلاح و بہبود

جسمانی بہبود کے پروگراموں میں جسمانی طور پر معذور افراد کا خاص خیال رکھا گیا۔ اِن افراد کو بغیر کسی شرط کے اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے تمام سہولیات بشمول وظیفہ فراہم کی گئیں۔ ذہنی طور پر خراب بچوں کو ان کی بلوغیت تک ماہانہ رقم دینے کا انتظام کیا گیا۔ ان دونوں پروگراموں پر ۸۲-۱۹۸۰ء میں ۴۵,۶۳ لاکھ روپے خرچ کئے گئے اور ۶۰۰۰ بچے اس سے مستفید ہوئے۔

عورتوں کی فلاح وبہبود

عورتوں سے متعلق فلاح کے پروگراموں کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ اس سلسلے میں جہاں ناری نکیتن یعنی مرکز فلاحِ مستورات میں بیواؤں اور بے کسوں کو سہارا دیا گیا، وہاں سماجی بہبود کے مراکز نے عورتوں کو فائدہ مند معاشی سرگرمیوں میں مصروف کیا۔ ان پروگراموں کے تحت ۸۳-۱۹۸۰ء کے دوران ۱۸۲۶ عورتوں کو فائدہ ملا۔ اور ۱۷,۲۸ لاکھ روپے خرچ کیے گئے۔ اس کے علاوہ دیہاتی عورتوں کو زراعت، گھریلو صفائی، خاندانی بہبود اور دیہی ترقی کے نئے ذرائع سے روشناس کرانے کی خاطر ریاست بھر میں ۹۳ دیہاتی کیمپ منعقد ہوئے۔

دوسری فلاحی سرگرمیوں میں جو کوششیں قابلِ ذکر ہیں اُن میں درجِ فہرست ذاتوں سے تعلق رکھنے والے افراد کی قانونی مدد، ان کو غربت کی لائن سے اوپر لانے کی سعی میں مدد کرنا، ان کو بینک قرضہ حاصل کرنے میں مدد دینا اور اُن کی فلاح سے متعلق کئی اداروں کی مالی مدد کرنا شامل ہے۔

★

R.N. 97032/81

U(L v) to post without pre-payment ... Civil Lines Post Office. Delhi-110 054.

Vol. 4 No. 13 YOJANA (URDU) 1-15 October 1984

خان امانت کمال

صنعتی ترقی میں اشتراکِ عمل

مختصر جائزہ

ہندوستان کے بیرونی ملکوں کے ساتھ زیادہ تر شہری ترقی (فلک بوس عمارتیں) نقل و حمل کے بہترین ذرائع (سڑکیں اور ریلوے لائن) ہوائی اڈوں اور بندرگاہوں کی توسیع و تعمیر، تعلیمی پروجیکٹ، پاور پلانٹ، شوگر اور ٹیکسٹائل انڈسٹری کے سلسلے میں معاہدے ہوئے ہیں اور ہندوستان کی پرائیویٹ کمپنیاں ان ملکوں کی صنعتی ترقی میں اپنا قیمتی سرمایہ اور بہتر ٹکنالوجی صرف کر رہی ہیں۔ جولائی ۱۹۸۰ء میں ہندوستان کی طرف سے بیرونی ملکوں کے سامنے ۲۹۰ پروجیکٹ رکھے گئے ان میں سے ۱۹۰ پروجیکٹ منظور ہوئے ان پر ۳۰،۳۴۲ کروڑ روپیہ صرف ہوا لیکن ان پروجیکٹوں سے ہندوستان کی توقع کے مطابق نفع ہوا۔ سب سے زیادہ ۵۷ پروجیکٹ ملیشیا کے لیے تھے۔ ان میں سے ۲۳ پروجیکٹوں پر کام ہوا ۲۳ پروجیکٹوں پر بالکل نہیں ہوا۔ پانچ پروجیکٹ ادھورے چھوڑ دیے گئے۔ افریقہ کے ملکوں میں ۱۰۰ پروجیکٹوں میں سے ۵۵ پر کام ہو رہا ہے۔ دوسرے ملکوں کو صنعتی ترقی میں تعاون دینے سے دوسرے ملکوں کو فائدہ ہوا ہے لیکن خود ہندوستان کے صنعت کاروں کو اتنا نفع نہیں ہوا جتنا انھیں اپنے ملک کے صنعتی اداروں سے ہوتا ہے۔ اس کے کچھ اسباب ہیں۔ ان خامیوں اور نقائص کو دور کرنے کے لیے تجاویز پیش کی جا رہی ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ ایشیا اور افریقہ کے ملکوں میں ہمارے ملک کی بینکوں کی ۱۲۳ شاخیں کام کر رہی ہیں۔ لیکن قاعدے اور قانون کی پابندیوں کی وجہ سے وہ صنعت کاروں کی اتنی مدد نہیں کر پاتیں جتنی انھیں ضرورت ہوتی ہے۔ مقامی آبادی کے تعاون کا بھی مسئلہ ہے۔ ہمیں بھی امریکہ اور روس کی طرح کام کرنا ہوگا۔ امریکہ اور روس دوسرے ملکوں میں ان کی کمپنیوں کے ساتھ تعاون کر کے ان کے صنعتی پروجیکٹوں کی تکمیل میں تعاون دیتے ہیں۔ اس طرح انھیں مقامی صنعت کاروں اور سرمایہ داروں کا ضرورت کے مطابق تعاون حاصل ہوتا ہے۔

بھارت سرکار بھی اس مسئلے پر غور کر رہی ہے کہ دوسرے ملکوں کی صنعتی ترقی کو اپنی قومی صنعتی پالیسی کا جزو بنا لیا جائے اس سلسلے میں پہلا قدم اپنایا جا چکا ہے۔ دوسرے ملکوں کی صنعتی ترقی میں کام کرنے والے ہندوستانی ماہرین کی فلاح و بہبود کے لیے ایم آر ٹی، پی ایکٹ بنا دیا گیا ہے۔ دوسرے اقدامات بھی زیرِ غور ہیں۔

بیرونی ملکوں کے لیے کچھ اہم پروجیکٹ جن پر کام شروع نہیں ہوا ہے ان کی ایک وجہ ایران اور عراق کی جنگ بھی ہے۔ ایران ہندوستان کے تعاون سے اپنے ملک میں فولاد سازی کا کارخانہ لگائے گا۔ جہاں کدرے مکھ کا کچا لوہا استعمال ہوگا۔ کدرے مکھ ہندوستان کے جنوب میں ایک مقام ہے جہاں وافر مقدار میں کچا لوہا پایا جاتا ہے۔ لیکن عراق اور ایران کی جنگ کی وجہ سے اس اہم صنعتی پلانٹ پر کام رکا ہوا ہے۔ ہندوستان اور مصر کے مابین جیٹ جہازوں کے انجن اور پرزے بنانے کے معاہدے پر بھی ابھی عمل شروع ہوا ہے۔ عراق اور ایران کی جنگ نے عراق میں کام کرنے والی ہندوستانی کمپنیوں پر بہت خراب اثر ڈالا ہے۔ عراق جنگی اخراجات کے بوجھ سے دب جانے کی وجہ سے ہندوستانی کمپنیوں کے بل ادا نہیں کر پا رہا ہے اور ہندوستانی کمپنیوں کو مجبوراً صنعتی پروجیکٹوں پر کام روک دینا پڑا ہے اور وہ ادھورے پڑے ہیں۔ ہندوستان بنگلہ دیش کی جوٹ صنعت کو جدید بنانے اور نیپال کو اس کے کوسی پروجیکٹ کی تکمیل میں بھرپور مدد دے رہا ہے۔ لیبیا، الجیریا اور مراکش کے تعلیمی منصوبوں کی تکمیل میں ہندوستان نمایاں پیش رفت کی ہے۔ ہندوستان سے دانشور اور پروفیسر ان ملکوں میں بھیجے گئے ہیں۔ جو ان کے تعلیمی منصوبوں کو پورا کرنے میں عملی حصہ لے رہے ہیں۔

ہندوستان ایشیا اور افریقہ کے ملکوں کی صنعتی ترقی میں اپنی عددی قوت کے ذریعے میں مدد دے رہا ہے۔ ہندوستان کے لاکھوں ٹیکنیشینز، سائنسدان اور انجینیئر اور ہنرمند عرب ممالک اور شمالی افریقہ کے ملکوں کی تعمیر ترقی میں جٹے ہوئے ہیں۔ دوسرے ملکوں کی صنعتی ترقی کے سلسلے میں جو اصلاحات زیرِ غور ہیں۔ اس کے بعد یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ ہندوستان کو اپنے سرمایہ، اپنی عددی قوت اور مہارت کا توقع کے مطابق فائدہ مل سکے گا۔

آخر میں اگر یہ کہا جائے کہ جاپان اور انگلینڈ کی ترقی میں ہندوستان کا بہت بڑا ہاتھ ہے تو اسے غلط واقعہ نہیں سمجھنا چاہیے۔ [illegible] صنعتی ترقی کے لیے خام مال کی ضرورت ہے۔ ہندوستان جاپان کو آج تک وافر مقدار میں کوئلہ اور کچا لوہا سپلائی کرتا ہے۔

(باقی ص۵ پر)

Published by the Director, Publications Division, Patiala House, New Delhi-110001
Printed by Skylark Printers, 11355, Id-Gah Road, New Delhi-110055

نومبر میں یوجنا کا خصوصی شمارہ

ملک کی تعمیر و ترقی میں رضاکار تنظیموں کے کردار کی اہمیت

یوجنا

۱۶ تا ۳۱ اکتوبر ۱۹۸۴ء

ایک روپیہ

معاشرتی انقلاب کی جانب

اقتصادی جمہوریت کا مقدمہ

کالے دھن کا بے پناہ اضافہ

(وسنت ساٹھے)

برتھ کنٹرول کے طریقے

(پروفیسر ویر اہنگورانی)

منصوبہ بندی کی تنظیم

(پی۔ آر۔ دوبھاشی)

سیمی جاوید

اتحاد و یک جہتی

جب کبھی، جہاں کہیں فساد ہوتا ہے، میرا دل مچل جاتا ہے۔ میں سوچنے لگتا ہوں آخر یہ کیوں ہوا کرتا ہے۔ کیا ہو گیا ہے ان انسانوں کو جو انسانیت کے گُن بھی گاتے ہیں اور فسادات میں اپنے چہروں سے نقاب بھی اُلٹ دیتے ہیں۔ فسادات ہوتے ہیں تو میرا دل اس لیے نہیں مچلتا کہ کسی خاص فرقے کی تباہی و بربادی کا مجھے اندیشہ رہتا ہے، بلکہ اس لیے کہ فسادات، انسانیت کے لیے چیلنج ہوتے ہیں اور حق یہ ہے کہ اسی انسانیت کی چاہت میں بے تاب ہوا جاتا ہوں۔

انساں کو انساں سے کینہ نہیں اچھا
جس سینے میں کینہ ہو وہ سینہ نہیں اچھا
(ناسخ)

کاش کوئی سمجھے کہ انسان کسے کہتے ہیں اور اُس کی کیا اہمیت ہوتی ہے۔ انسان، انسان کا جب خون کرتا ہے تو درحقیقت وہ خود پر ظلم کرتا ہے۔ یہ کتنی بڑی جہالت ہے۔ ہر ایک انسان دوسرے انسان کا خون کرے، اس کا مال و اسباب لوٹے، اور پھر یہ سوچے کہ اس نے جو کچھ بھی کیا ہے وہ ٹھیک ہی کیا ہے! یہ احساس کس قدر بھیانک اور ظالمانہ ہے کہ ایک انسان، بحیثیت ہندو یا مسلمان، ایک دوسرے سے اس حد تک نفرت کرے کہ زندگی کی کوئی قدر و قیمت ہی باقی نہ رکھے۔ زندگی بڑی قیمتی شئے ہوتی ہے، اس کی ارزانی کا تصور تو صرف درندوں کے ہاں ملتا ہے۔

ہم انسانوں کو یہ کیا ہو گیا ہے۔ ہم انسان، انسان سے ہٹ کر مذہبی خانوں میں بٹ گئے ہیں۔ ہم ایک دوسرے سے جب ملتے ہیں تو مذہبی لیبل لگا کر کیوں ملتے ہیں۔ کیا ہم انسان نہیں ہیں؟ کیا ہم بھارتی نہیں ہیں؟ ہم انسانوں کی طرح کیوں نہیں ملتے؟ ہم بھارتی کی طرح اپنے تعلقات کو کیوں پروان نہیں چڑھاتے؟ آخر ہماری زندگیوں میں یہ زہر کس نے گھولا ہے؟ ان پاپیوں کے عزائم کو ناکام بنانے میں ہم نے ابھی تک کیا کیا ہے؟۔

یہ ایسے سوال ہیں، جو اکثر میرے ذہن میں گردش کرتے رہتے ہیں، لیکن افسوس کہ یکجہتی اور ہم آہنگی کی برقراری کے لیے وہ کام نہیں ہو پا رہے ہیں، جن کی موجودہ دور میں شدید ضرورت ہے۔ فرقہ پرست، انتشار پسند اور انسان دشمن طاقتیں برابر پروان چڑھ رہی ہیں، ایسے لوگوں کو مسلسل تقویت حاصل ہوتی جا رہی ہے جو صرف خود کو ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی کی حیثیت سے سوچتے ہیں، اسی عینک سے دیکھتے ہیں، اور اسی تصور کو عملی جامہ پہنانے کے بھرپور جتن کیا کرتے ہیں۔ اپنے مذہب پر چلنا بُرا کام نہیں ہوتا، اور نہ ہی یہ بُرا ہوتا ہے کہ کوئی اپنے مذہب کے لیے کام کرے، بلکہ بُرا یہ ہوتا ہے کہ دوسرے مذہب کے پیروؤں کو نفرت کی نظر سے دیکھے، اور انھیں تباہ و برباد کرنے کے منصوبے بنائے اور اُس پر عمل کرے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ایسا آدمی اچھا یا ہندوستانی کہلانے کا مستحق قرار نہیں پا سکتا ہے ؎

تیری چھاتی دھرتی سمندر
جس کی موجیں مسجد مندر
دونوں کی ہے گونج برابر
اللہ اللہ، ایشور ایشور
(آرزو لکھنوی)

کسی مذہب نے بھی "نفرت" کی تعلیم نہیں دی ہے۔ ہر مذہب اتحاد و یک جہتی اور رواداری کا درس دیتا ہے، انسانیت اور مساوات پر زور دیتا ہے۔ ظلم و بربریت کو کسی مذہب نے بھی پسند نہیں کیا ہے۔ قرآن پاک کہتا ہے :۔ ترجمہ:

- یہ خیال ہرگز نہ کرو کہ خدا ظالموں کے کام سے بے خبر ہے۔ (پارہ ۱۳، سورہ ۱۴، آیت ۴۲۔)
- خدا کو فساد پسند نہیں۔ (پارہ ۲، سورہ ۲، آیت ۲۰۵۔)
- ملک میں امن و امان قائم کرو۔ (المائدہ ۳۳۔)
- مُلکی قانون کا احترام اور اُس کی پابندی کرو۔ (الانعام ۸۵۔)
- آپ (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) نے ساری دُنیا کی بھلائی کے لیے کام کیا۔ (یونس ۱۰۸، الانبیاء ۱۰۷، البقرہ ۲۱۔)

سنتوں، صوفیوں اور سکھوں کے گروؤں، سبھی نے تو نفرت و انتشار کو سخت ناپسند کیا ہے۔ کبیر نے ایک موقع پر کہا تھا۔

(باقی کور ۳ پر)

منصوبہ بندی اور ترقیاتی پروگراموں کی جھلک پیش کرنے والا

پندرہ روزہ

یوجنا

نئی دہلی

چیف ایڈیٹر ⋄ آر. ٹھکرال
ایڈیٹر ⋄ لکھی رام رانا
اسسٹنٹ ایڈیٹر ⋄ محمد عادل صدیقی
سب ایڈیٹر ⋄ وسیم حیدر

جلد ۴	۱۶ تا ۳۱ اکتوبر ۱۹۸۴	شمارہ ۱۴

۲۴ آشوک تا ۹ رکا رنگ شنک سبھا ۱۹۷ ⋄ فون: ۳۸۷۳۴۱

شرح چندہ

سالانہ ۲۰ روپے - دوسالہ ۳۵ روپے، سہ سالہ ۵۰ روپے
فی کاپی: ایک روپیہ

طالب علموں، استادوں اور لائبریریوں کے لیے ۱۰ فیصد کی رعایت

یوجنا منصوبہ بند ترقی کے بارے میں عوام کو آگاہ کرتا ہے مگر اس کے مضامین صرف سرکاری نقطۂ نظر کی وضاحت تک ہی محدود نہیں ہیں

اس شمارے میں

بزنس منیجر: ایل۔ آر بترہ ⋆ اسسٹنٹ ڈائرکٹر (پروڈکشن): رام سروپ منجال

مضامین سے متعلق خط و کتابت کا پتہ
ایڈیٹر یوجنا (اردو)، پبلیکیشنز ڈویژن پٹیالہ ہاؤس نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

ترسیل زر کا پتہ
بزنس منیجر پبلیکیشنز ڈویژن پٹیالہ ہاؤس نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

اداریہ

اپنا روزگار آپ

امورِ محنت و بحالیات کی وزارت کے ماتحت دفاتر روزگار کے ڈائرکٹر شری کے. کمار نے گزشتہ دنوں ایک انٹرویو کے دَوران کہا کہ خود روزگاری کا پروگرام ایک ایسا تعمیری پروگرام ہے جس میں ملک کی بے روزگاری کے مسئلے کا حل پوشیدہ ہے۔ ایک جائزے کے مطابق ۱۹۸۳ء کے آخر میں بے روزگاروں کی تعداد ۲ کروڑ ۱۹ لاکھ ۵۰ ہزار تھی۔ ان میں سے آدھی تعداد پڑھے لکھے بے روزگاروں کی تھی۔ ظاہر ہے کہ یہ اتنا بڑا مسئلہ ہے کہ اسے محض سرکاری ملازمتیں دے کر یا پبلک سیکٹر کی ملازمتیں دے کر حل نہیں کیا جاسکتا۔ اس کے لیے ایک واحد راستہ یہی رہ جاتا ہے کہ ہمارے نوجوان "اپنی مدد آپ" کے مقولے پر کاربند ہوں اور اپنے لیے خود روزگار تلاش کریں۔ اس راستے میں ایک بڑی دشواری رُجحان کی ہے۔ یعنی یہ کہ ہمارے نوجوان ابھی بھی وہائٹ کالر جابس کو قابلِ قدر سمجھتے ہیں اور انھیں اس کی تلاش میں دن رات کوششیں کرنی پڑتی ہیں جس سے نہ صرف ان کا اپنا وقت ضائع ہوتا ہے بلکہ ان میں بلاسبب ایک مایوسی کی کیفیت اور شکست خوردگی کا احساس بھی پیدا ہونے لگتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وزیرِ اعظم شریمتی اندرا گاندھی نے پچھلے سال یومِ آزادی کے موقع پر روزگار کی دو اسکیموں کا اعلان کیا۔ اس کے تحت تعلیم یافتہ تمام ایسے بے روزگار نوجوان جو دسویں کلاس پاس ہیں یا اس سے اوپر کی تعلیم حاصل کیے ہوئے ہیں اور جن کی عمر ۱۸ تا ۳۵ سال ہے، فائدہ اٹھانے کے مستحق ٹھہرے اور قومی ملکیت کے بینکوں کو اس اسکیم کو موثر ڈھنگ سے آگے بڑھانے کے لیے کہا گیا۔ بینکوں نے از خود روزگار کی اس نئی اسکیم کے تحت ۱۱ مئی ۱۹۸۴ء تک ۸۴ کروڑ روپے تقسیم کیے۔

اس اسکیم کی راہ میں سب سے بڑی دشواری یہی ہے کہ ہمارے نوجوانوں کو اس سلسلے کی معلومات کم ہیں اور ان میں خطرہ مول لینے کی عادت نہیں۔ اس کے لیے اگر دَوران تعلیم ہی انھیں یہ باور کرانے کی کوشش کی جائے کہ نجی کاروبار اور دھندہ ملک و قوم کے وسیع تر مفاد میں ہے اور اس سے سماج میں ان کی ساکھ جم سکے گی تو اس کے لیے راستہ ہموار ہوسکتا ہے۔ ضلعی صنعتی مراکز، قومی ملکیت کے بینک، پیشہ ورانہ بحالیاتی مرکز اور دیگر مالی ادارے خود روزگار کی اسکیموں کو آگے بڑھانے میں موثر رول ادا کرسکتے ہیں۔ ساتویں منصوبے میں خود روزگاری اسکیموں پر زیادہ توجہ دینے کی ضرورت محسوس کی گئی ہے۔ نوجوانوں کو ایک اور دشواری کا بھی سامنا ہوتا ہے کہ وہ کون سا کام کریں۔ مثال کے طور پر چھوٹے پیمانے کی صنعتوں کے پروگرام سے فائدہ اُٹھائیے۔ اس کے لیے اُمیدوار کو اختراعی قوتوں سے کام لینا ہوگا۔ دوست بنانے ہوں گے، عوام کا دل جیتنا ہوگا، نوجوانوں کو اپنی محنت اور صلاحیت کا ٹھیک ٹھیک اندازہ لگا کر ہی کام کرنا چاہیے۔ دفاتر روزگار میں اب پیشہ ورانہ رہنمائی کے لیے مراکز کھولے جارہے ہیں۔ سماج میں معذور افراد اور عورتیں بھی اتنی ہی اہمیت رکھتے ہیں جتنی کہ دُوسرے افراد، لہٰذا انھیں باعزت روزگار دلاکر اور عورتوں کی ذہنی صلاحیتوں سے کام لے کر انھیں بھی سماج کا مفید رُکن بنایا جاسکتا ہے۔ شیڈولڈ ذاتوں اور شیڈولڈ ٹرائبس کے لیے خصوصی اسکیموں کے ذریعے ان کے معیارِ زندگی بلند کرنے اور انھیں سماج میں باعزّت مقام اور روزگار دلانے کے اقدامات یقیناً مستحسن ہیں۔ ایک بار سفر صحیح سمت میں شروع ہو جائے اور پُرعزم طریقے سے کام آگے بڑھایا جائے تو کامیابی یقینی ہے۔ نوجوانوں کو محض اپنے کاروبار کو جمانا ہی نہیں ہے بلکہ اس کا ایک معیار بھی قائم کرنا ہے۔ چھوٹے پیمانے کی صنعتوں کے فروغ سے متعلق ریاستی کارپوریشنوں نیز مرکزی سطح پر اس کے مماثل اداروں اور مالیاتی اداروں سے رابطہ قائم کرکے اقتصادی حالت بہتر بنائی جاسکتی ہے اور اس عزیز ترین وقت کو بچایا جاسکتا ہے۔ جو ملازمتوں کے پیچھے بھاگ بھاگ کر ضائع کرنا پڑتا ہے۔

تعلیم یافتہ بے روزگار افراد کی تعداد یعنی ایسے افراد جنھوں نے میٹرک یا اس سے اوپر کی تعلیم حاصل کی ہے، ۱۹۸۰ء میں ہی ۴۴ لاکھ سے زیادہ تھی۔ ان میں دس لاکھ سے زیادہ گریجویٹ اور ڈپلومہ ہولڈر تھے۔ تعلیم یافتہ افراد میں بے روزگاری کی شرح ۱۵ اعشاریہ ۳ فیصد تھی۔ ان میں مختلف زمروں کے تحت بے روزگاری کا تناسب بھی مختلف رہا ہے۔ مثلاً آرٹس کے گریجویٹوں میں یہ تناسب ۲۲ فیصد تک ہے۔ جبکہ دانتوں کے ڈاکٹروں وغیرہ کے ضمن میں یہ صرف ۲ فیصد ہے۔

ملک میں بے روزگار افراد کی صحیح صحیح تعداد کا پتہ لگانا بھی کئی وجہ سے دُشوار ہو رہا ہے۔ دفاتر روزگار کے اعداد و شمار میں اس کمی کا احساس ہوتا ہے کہ اوّل تو سب بے روزگاروں نے اپنے نام رجسٹر نہیں کرائے ہیں، کچھ طالب علموں نے دَورانِ تعلیم ہی اپنے نام رجسٹر کرالیے تاکہ ان کی سینارٹی بنی رہے جبکہ انھیں ابھی ملازمت کی ضرورت بھی نہیں ہوتی۔ کچھ اُمیدوار اپنے مستقبل کو بہتر بنانے کے خیال سے نام لکھاتے ہیں، ورنہ ان کے پاس روزگار ہے۔ کچھ طالب علموں نے کئی کئی دفتروں میں نام لکھا ڈالے، اس طرح کی خامیوں اور مجبوریوں کے پس پردہ یہ پتہ چلانا دُشوار ہے کہ بے روزگاروں کی صحیح تعداد کیا ہے۔

(ایڈیٹر)

نصرت ظہیر

روشن حال، تابناک مستقبل

ملک میں اناج کی پیداوار

پچھلے کئی برسوں سے بالخصوص ۸۱-۱۹۸۰ء سے یہ امر کافی اطمینان بخش رہا ہے کہ ملک میں اناج کی پیداوار ہر سال بڑھتی جا رہی ہے۔ صرف ۸۳-۱۹۸۲ء کا سال ہی ایسا گزرا جس میں قدرتی آفات اور بے موسم بارشوں کے نتیجہ میں اناج کی پیداوار اس سے پچھلے سال کے مقابلے میں ۴ فیصد گھٹ گئی۔ اس سال ۱۲ کروڑ ۸۳ لاکھ ۶۰ ہزار ٹن اناج پیدا ہوا تھا جبکہ اس سے پچھلے سال یعنی ۸۲-۱۹۸۱ء میں ۱۳ کروڑ ۳۰ لاکھ ٹن کی پیداوار ہوئی جو اس وقت تک کی ریکارڈ پیداوار تھی۔ لیکن اگلے ہی سال اس نقصان کی تلافی ہو گئی اور ۸۴-۱۹۸۳ء میں نہ صرف پیداوار میں آنے والی یہ ۴ فیصد کمی پوری ہو گئی بلکہ اناج کی پیداوار کا ایک نیا ریکارڈ بھی قائم ہو گیا۔ اس سال کُل ملا کر ابتدائی اندازوں کے مطابق ۱۴ کروڑ ۹۷ لاکھ ۶۰ ہزار ٹن پیداوار ہوئی۔ لیکن ماہ مئی کے آخر میں نئی دلّی میں منعقدہ دو روزہ قومی زرعی کانفرنس میں مختلف ریاستوں نے اعداد و شمار پیش کئے ان کے مطابق اس سال اناج کی پیداوار ۱۵ کروڑ ۱۰ لاکھ ٹن رہی۔ اس ریکارڈ کی ایک خاص بات یہ ہے کہ پلاننگ کمیشن نے چھٹے پنجسالہ منصوبے کے آخری سال یعنی ۸۵-۱۹۸۴ء (رواں مالی سال) کے لیے ۱۴ کروڑ ۶۰ لاکھ سے ۱۵ کروڑ ۸۰ لاکھ ٹن تک کی اناج پیداوار کا جو نشانہ مقرر کیا تھا اسے ایک سال پہلے ہی پورا کر کے پار کر لیا گیا ہے۔ درحقیقت اسے زرعی شعبے میں ہندوستان کی اب تک کی سب سے بڑی کامیابی کہا جانا چاہیئے۔ اس کامیابی کا سہرا کھیتی باڑی کے جدید طور طریقوں اور آبپاشی کی پہلے سے بہتر سہولیات کے سر جاتا ہے۔ حکومت اور دوسری متعلقہ ایجنسیوں کی مسلسل کوششوں کے نتیجے میں جدید کاشتکاری اب کافی معقول ہو گئی ہے۔ جہاں قدرتی وسائل سے آبپاشی ممکن نہیں وہاں بجلی اور ڈیزل انجنوں کی مدد سے سینچائی کو فروغ مل رہا ہے۔ گڑائی اور کٹائی میں مشینوں اور ٹریکٹروں کا استعمال بڑھتا جا رہا ہے۔ جدید کاشتکاری کی مقبولیت کا ایک ثبوت اس بات سے بھی ملتا ہے کہ کیمیائی کھاد کے استعمال اور اس کی کھپت میں ہر سال اضافہ ہو رہا ہے۔ بلکہ کئی مقامات پر تو مانگ بڑھ جانے کی وجہ سے کھاد کی قلت ہو گئی ہے اور کھاد کی موجودہ پیداوار کافی کم معلوم ہونے لگی ہے۔

اعداد و شمار کے مطابق ۸۴-۱۹۸۳ء میں ۱۴ کروڑ ۷۷ لاکھ ۶۰ ہزار ٹن اناج کی جو پیداوار ہوئی۔ ملک کی معیشت پر اس کا بہت اچھا اثر پڑنے کی اُمید کی جا سکتی ہے کیوں کہ پیداوار میں یہ ریکارڈ اضافہ سبھی قسم کے اناجوں میں ہوا ہے۔ اس کو ذرا تفصیل سے دیکھیں تو اس سال چاول کی پیداوار کے لیے ۵ کروڑ ۷۰ لاکھ ٹن کا نشانہ مقرر کیا گیا تھا جب کہ چاول کی کُل پیداوار اس نشانے سے تقریباً ۲۳ لاکھ ٹن زائد یعنی ۵ کروڑ ۹۳ لاکھ ۳۰ ہزار ٹن رہی۔ اس طرح گیہوں کی پیداوار بھی ۴ کروڑ ۱۰ لاکھ ٹن کے مقررہ نشانے سے آگے نکل گئی اور تقریباً ۴ کروڑ ۵۴ لاکھ ۶۰ ہزار ٹن گیہوں پیدا ہوا۔ دوسرے اناجوں کی پیداوار بھی ۳ کروڑ ۱۰ لاکھ ٹن کے مقررہ نشانے سے زائد یعنی ۳ کروڑ ۳۹ لاکھ ۱۰ ہزار ٹن کے آس پاس رہی اس طرح اناج کی کُل پیداوار ۱۳ کروڑ ۷۰ لاکھ ٹن یعنی مقررہ نشانے سے تقریباً ایک کروڑ ٹن زائد رہی۔ لیکن دالوں کے سلسلے میں صورت حال ایسی نہیں رہی۔

دالوں کی پیداوار کا نشانہ ایک کروڑ ۳۰ لاکھ ٹن کا تھا۔ لیکن یہ پورا نہ ہو سکا اور اندازے سے ۵ لاکھ ٹن کم رہا اور کُل ملا کر دالوں کی پیداوار ابتدائی اندازے کے مطابق تقریباً ایک کروڑ ۲۵ لاکھ ٹن رہی۔ دالیں ملک کے روایتی غذائی نظام اور لوگوں کی خوراک سے متعلق ضروریات کے ضمن میں بڑی اہمیت رکھتی ہیں کیوں کہ سویابین کے بعد سب سے زیادہ پروٹین دالوں میں ہی ہوتا ہے۔ دالوں کی پیداوار بڑھانے میں حکومت کی کوششوں کو پچھلے برسوں میں خاطر خواہ کامیابی نہیں مل سکی ہے۔ گذشتہ اعداد و شمار کو اگر دیکھا جائے تو دالوں کی کل پیداوار کا اب تک کا ریکارڈ اب سے ۲۳ سال پہلے ۶۱-۱۹۶۰ء میں قائم ہوا تھا۔ اس سال ایک کروڑ ۲۷ لاکھ ۴ ہزار ٹن دالیں پیدا ہوئی تھیں اور یہ ریکارڈ ابھی تک نہیں ٹوٹا۔ اس ریکارڈ کے قائم ہونے سے پہلے

۱۹۵۰-۵۱ میں دالوں کی پیداوار صرف ۸۴ لاکھ ۱۰ ہزار ٹن رہی تھی جس میں ہر سال تیزی سے اضافہ ہونے کے سبب یہ ریکارڈ قائم ہوا لیکن ۱۹۶۰-۶۱ کے بعد دالوں کی پیداوار مسلسل کم ہوتی رہی نہ ۱۹۷۰-۷۱ء میں دالوں کی پیداوار ایک کروڑ ۱۸ لاکھ ہزار ٹن کی سطح پر رہی۔ ۱۰ برس بعد ۱۹۸۰-۸۱ء میں یہ اور گھٹ گئی اور پیداوار ایک کروڑ ۶ لاکھ ۷۰ ہزار ٹن کی سطح پر آگئی تاہم ۱۹۸۱-۸۲ میں قدرے اضافہ ہوا اور پیداوار ایک کروڑ ۱۳ لاکھ ۵۱ ہزار ٹن تک پہونچ گئی تب سے پیداوار تقریباً اسی سطح پر برقرار ہے۔ چنانچہ یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ اس سال مرکز نے دالوں کی پیداوار بڑھانے کے لیے ایک تفصیلی منصوبہ تیار کیا ہے۔ اس منصوبے کے تحت ایک طرف تو مرکز اس سلسلہ میں ریاستی حکومتوں کی کوششوں میں تعاون دے گا دوسری طرف اُڑد، مونگ اور کچھ دوسری دالوں کی کم وقت میں پیدا ہونے والی قسموں کی بوائی کی حوصلہ افزائی کی جائے گی۔ یہ دالیں ربیع کی فصل میں بھی ان آبپاشی والے علاقوں میں بچی کھچی نمی کے ذریعے اگائی جا سکتی ہیں جہاں چاول پیدا ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ سینچائی والے علاقے یا سینچائی کی سہولت سے محروم علاقوں میں سویا بین، باجرہ، کپاس، مکئی اور مونگ پھلی کے ساتھ ساتھ ارہر کی بھی بوائی کرنے کی ترغیب دی جائے گی۔ خاص زور نئے بیجوں اور فاسفیٹک کھادوں کے استعمال اور جدید طریقے اپنائے جانے پر زور دیا جائے گا تاکہ دالوں کی پیداوار ایک ہی سطح پر نہ ٹکی رہے۔

اس مقصد میں کامیابی کی کچھ توقع ضرور کی جا سکتی ہے کیوں کہ کم از کم چاول کے معاملے میں تو حکومت کی کوششیں کافی کامیاب رہی ہیں۔ چاول کی پیداوار جو پچھلے کئی برسوں سے ۵ کروڑ ۳۵ لاکھ ٹن کے آس پاس رکی ہوئی تھی اس میں گذشتہ مالی سال کے دوران تقریباً ۶۰ لاکھ ٹن کا اضافہ ایک دم ہو گیا ہے۔ جبکہ اندازہ اور نشانہ تقریباً ۴ لاکھ ٹن کے اضافے کا تھا۔

کیمیائی کھاد کے مسئلوں کو حل کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ کھاد کے کارخانے بالخصوص امداد باہمی (کوآپریٹو سیکٹر) کے کارخانے اپنی صلاحیت سے زیادہ پیداوار دے رہے ہیں۔ اس کے علاوہ کھاد کی بڑھتی ہوئی مانگ کو دیکھ کر بھاری مقدار میں کھاد کی درآمد بھی کی گئی ہے۔ نیشنل فرٹیلائزرز لمیٹڈ کئی اور مقامات پر کھاد کے نئے کارخانے لگا رہا ہے۔ ان میں سب سے اہم ضلع گنا مدھیہ پردیش میں وجے پور کے مقام پر ۶ ارب ۹۰ کروڑ روپے کی لاگت سے لگایا جانے والا کارخانہ ہے جس کی تعمیر کا کام اسی مہینے شروع ہوا ہے۔ بمبئی ہائی سے ملنے والی گیس پر مبنی اس زبردست کارخانے میں ہر روز ۱۳۵۰ ٹن امونیا اور ۲۲۰۰ ٹن یوریا کھاد پیدا ہوا کرے گی۔ یہ ادارہ بھٹنڈہ (پنجاب) پانی پت (ہریانہ) اور ننگل (پنجاب) میں پہلے ہی کھاد کے پلانٹ شروع کر چکا ہے۔

۱۹۸۳-۸۴ء میں اناج کی شاندار پیداوار اور گذشتہ تجربات کو نظر میں رکھتے ہوئے محکمہ زراعت نے رواں زرعی سال (۱۹۸۴-۸۵ء) کے لیے کئی ابتدائی نشانے مقرر کئے ہیں۔ اناج کی کل پیداوار کے لیے ۱۵ کروڑ ۳۶ لاکھ ٹن کا جو نشانہ طے کیا گیا ہے اس میں خریف کا نشانہ ۸ کروڑ، ۹ لاکھ ۷۰ ہزار ٹن اور ربیع کرنے کے لیے ۶ کروڑ ۴۹ لاکھ ۲۰ ہزار ٹن مقرر ہوا ہے۔ اناجوں کو الگ الگ لیجئے تو چاول کے لیے ۶ کروڑ ۱۵ لاکھ ٹن، گیہوں کے لیے ۴ کروڑ ۵۶ لاکھ ٹن باجرے کے لیے ۵۵ لاکھ ٹن مکئی کے لیے ۸۰ لاکھ ٹن اور جوار کے لیے ایک کروڑ ۱۵ لاکھ ٹن پیداوار کے نشانے مقرر کئے گئے ہیں۔ دالوں کی پیداوار کے لیے ایک کروڑ ۳۰ لاکھ ۵ ہزار ٹن کا نشانہ طے ہوا ہے۔

اناج کی کل پیداوار کا یہ نشانہ ایسا نہیں کہ اسے پورا نہ کیا جا سکے۔ خاص طور سے اس سال لگ بھگ ۱۵ کروڑ ٹن کی کل پیداوار کو دیکھتے ہوئے تو یہ قطعی زیادہ معلوم نہیں ہوتا۔

یہاں یہ ذکر کرنا مناسب نہ ہوگا کہ اس صدی کے اختتام تک ملک کی تمام آبادی کی غذائی ضرورتوں کو پورا کرنے کے سنہ ۲۰۰۰ء میں اناج کی سالانہ پیداوار کو ۲۲ کروڑ ۵۰ لاکھ ٹن تک پہنچانے کا جو نشانہ درکار ہوگا اس سے ۱۹۸۴-۸۵ء کا یہ ابتدائی نشانہ صرف ۷ کروڑ ٹن کم ہے۔ صدی کے اختتام میں ۱۵ برس باقی ہیں اور اگر ۵۰ لاکھ ٹن سالانہ کی رفتار سے بھی اناج کی پیداوار بڑھتی رہی تو سنہ ۲۰۰۰ء سے کافی پہلے ہی ملک کی تمام آبادی کی غذائی ضروریات پوری ہو جائیں گی۔

گذشتہ تجربات کی روشنی میں امید کی جا سکتی ہے کہ رواں زرعی سال میں بھی اناج کی پیداوار مقرر نشانے سے زائد رہے گی اور تب ملک خوراک کے مسئلے کے مکمل حل اور ہر باشندے کی غذائی ضروریات کو پورا کرنے کی منزل کے اور قریب آ پہنچ جائے گا۔

ساجد علی ٹونکی

صنعتی مزدوروں میں قرض کی عادت

ترقی پذیر ممالک میں عام طور سے اور ہندوستان میں خاص طور سے مزدوروں کے معیارِ زندگی میں پستی کی ایک اہم وجہ ان میں قرض کی عادت کا پایا جانا ہے۔ بھارت میں ہم دیکھتے ہیں ایک مزدور مقروض ہی پیدا ہوتا ہے اسی حالت میں زندگی گذارتا ہے اور اسی حالت میں دُنیا سے رخصت ہوجاتا ہے۔ قرض کی بدترین شکل اس وجہ سے بھی نظر آتی ہے کہ ہمارے مُلک میں مہاجنوں اور ساہوکاروں سے قرض لیا جاتا ہے اور ان کی دریں بازار کے مقابلے میں بہت اُونچی ہوتی ہیں جس کے لیے مُلکی بدنظمی اور مزدور کی لاعلمی کافی حد تک ذمّے دار ہے۔ ہندوستان میں سُود کی غیر سرکاری شرح عام طور سے ۱۲ فی صد سے ۲۰ فی صد سالانہ ہے اور کچھ علاقوں میں یا پھر مدت کی نوعیت پر یہ شرح ۶۰ فی صد تک پہنچ جاتی ہے۔ نوّے یا اسّی روپے دے کر سو روپے بہت کم مدت کے لیے لینا تو لوگوں کی پُرانی عادت ہے اور اس کو عیب بھی نہیں سمجھا جاتا یہی وجہ ہے کہ مزدور اپنی قلیل آمدنی کا کچھ حصہ ہمیشہ قرض کی ادائیگی میں صَرف کرتا رہتا ہے۔ ہمارے ملک کا مزدور عام طور سے جن ذرائع سے روپیہ قرض لیتا ہے اور جتنی مقدار میں لیتا ہے اس کی تفصیل حسب ذیل فہرست سے معلوم ہوجائیگی۔

نمبر شمار	ذریعہ	قرض کی مقدار
۱	عزیزو رشتے داروں سے	۴۰٫۸ فی صد
۲	مہاجن اور ساہوکاروں سے	۳۰٫۷ " "
۳	کوآپریٹو سوسائیٹیوں سے	۴٫۷ فی صد
۴	دلال یا ایجنٹوں سے	۲٫۱ "
۵	مکان مالکوں سے	۳٫۵ "
۶	افسروں یا حاکموں سے	۴٫۹ "
۷	دیگر ذرائع سے	۲٫۶ "

مزدوروں کے لیے قائم کی گئی تحقیقی کمیٹی کے ایک جائزے سے یہ بات سامنے آئی ہے کہ بمبئی میں ۶۳ فی صد خاندان مقروض ہیں جبکہ شولاپور میں ۴۸ فی صد اور ناگپور میں تقریباً ۸۲ فی صد تک خاندان قرض میں مبتلا ہیں۔ اسی طرح چمڑے کی صنعت میں بھی قرض کا یہ مرض شدت اختیار کرچکا ہے۔ ایک اندازے کے مطابق چمڑے کی صنعت میں کانپور میں ۶۵ فی صد اور مدراس میں ۶۶ فی صد لوگ مقروض ہیں۔ کلکتہ میں تو یہ تعداد سو فی صد ہی نظر آتی ہے۔ اسی طرح کے اعداد وشمار چینی ملوں کے مزدوروں میں نظر آتی ہے۔ ایک جائزے کے مطابق تمباکو کی صنعت میں تقریباً ۸۰ فی صد مزدور مقروض ہیں۔ اگر ہم یہ کہیں تو بے جا نہ ہوگا کہ ہمارے ملک میں کوئی بھی صنعت ایسی نہیں ہے جس کا مزدور مقروض نہ ہو۔

ان تمام اعداد وشمار کا علم ہو جانے کے بعد ہمارے ذہن میں جو سوال بجلی کی لہر کی طرح دوڑتا ہے وہ یہ ہے کہ مزدور آخر قرض کیوں لیتا ہے؟ کیا وہ عادی ہو چکا ہے یا کوئی اور وجہ اُسے ایسا کرنے پر مجبور کر رہی ہے۔؟

دراصل اس کی متعدد وجوہات ہیں۔ ہر مزدور یہ تو جانتا اور مانتا ہے کہ قرض کی عادت ایک بُرائی ہے۔ لیکن اس کے سماجی، سیاسی، اور معاشرتی حالات اُسے ایسا کرنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ جو وجہ ہمیں سب سے اہم نظر آتی ہے وہ مزدور کو دی جانے والی مزدوری کی کمی سے متعلق ہے۔ چونکہ اخراجات کے مقابلہ مزدوری کم ہے، لہٰذا بڑھے ہوئے بجٹ کو قرض لے کر پورا کیا جاتا ہے۔ لیکن یہی ایک وجہ نہیں ہے جو اسے قرض لینے پر مجبور کرتی ہے بلکہ کبھی کبھی مزدور کو قرضہ ورثے میں بھی ملتا ہے۔ اُس کے بُزرگ مرتے وقت یہی نصیحت کرجاتے ہیں کہ فلاں کے اتنے ..... اور فلاں کے اتنے ہیں۔ یاد کرکے دے دینا؟ کبھی کبھی مزدور کی بُری عادتیں بھی اس کے اخراجات میں اضافہ کردیتی ہیں۔ مثلاً شراب نوشی، زنا کاری، جُوابازی وغیرہ۔ ان ضروریات کو پورا کرنے کے لیے مزدور کو چوری، رشوت وغیرہ کا سہارا لینا پڑجاتا ہے جس سے پیداوار کم اور امن کو خطرہ بھی لاحق ہو جاتا ہے۔

ہمارے مُلک میں یہ بات عام طور سے دیکھی جاتی ہے کہ تنخواہ ملنے کے دس دن سے لے کر پندرہ دن بعد سے مزدور قرض لینا شروع کر دیتا ہے۔ چونکہ یہاں قرض خواہوں یا سُود خوروں کی فراہمی بھی بہ آسانی ہوجاتی ہے لہٰذا مزدور کو قرض لینے میں کوئی دقت نہیں ہوتی اور وہ بہ آسانی قرض

گہوارہ ہے۔ یہاں دُنیا کے تقریباً ہر مذہب کے ماننے والے موجود ہیں اور شاید ہی کوئی ہفتہ یا کوئی دن ایسا جاتا ہو جب کہ اس ملک کے کسی نہ کسی خطے میں کوئی تیوہار نہیں منایا جاتا ہو۔ ان موقعوں پر اور اس کے علاوہ شادی بیاہ اور دیگر مذہبی رسوم پر بھی بھارت دل کھول کر اخراجات کرتا ہے۔ چونکہ یہ اخراجات کارِ ثواب کی نسبت سے کئے جاتے ہیں۔ لہٰذا مزدور کو کسی قسم کی کراہیت بھی قرض لینے میں نہیں ہوتی۔ ہمارا ملک ایک تو یُوں ہی پچھڑا ہوا ہے دُوسرے بے روزگاری بھی ہے۔ جب یہاں کا مزدُور شہر کی چمک دمک میں آتا ہے تو اس کی آنکھیں چُندیا جاتی ہیں۔ کہاں بھارت کے دیہات اور کہاں شہری زندگی۔ بس اِسے ہی وہ جنت سمجھ بیٹھتا ہے لیکن پیٹ کو روٹی اور تن کو کپڑا تو چاہیئے۔ چلو مکان کی جگہ تو فٹ پاتھ پر بھی گذارا ہو جاتا ہے۔ جب کام کی تلاش میں نکلتا ہے تو اُس نئے شہر میں کوئی کام دینے والا اُسے نظر نہیں آتا اور جو مزدوروں کو تلاش کرتے ہیں انھیں یہ نہیں مل پاتا۔ انھیں چکروں میں وہ دلالوں یا ایجنٹوں کے چُنگل میں پھنس جاتا ہے۔ یہ دلال یا تو اس سے یک مُشت رقم لے لیتے ہیں جو وہ قرض لے کر ادا کرتا ہے یا پھر اپنی مزدوری میں سے ماہوار قسطیں ادا کرتا رہتا ہے۔

کچھ صنعتیں موسمی ہوتی ہیں یہاں کا مزدُور سال کے کئی خاص مہینوں میں ہی کام کر پاتا ہے، بقیہ وقت بے کار رہتا ہے۔ ایسی حالت میں اس کا گذارہ قرض کے سہارے ہی چلتا ہے۔ قرض داری کی اس عادت کے منفی اثرات جہاں ایک جانب ملک کی پیداوار پر پڑتے ہیں وہیں دُوسری جانب مزدُور پر بھی وہ ذہنی طور پر مفلوج ہو جاتا ہے۔ گھر کے لڑائی جھگڑے قرض خواہوں کی ڈانٹ پھٹکار مزدُور کے ذہن پر تناؤ پیدا کر دیتے ہیں، جس سے مزدُور احساسِ کمتری میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اور یہیں سے اس کی ترقی رُک جاتی ہے۔

لہٰذا بہت سے لوگ ایسے اپنا پیشہ ہی بنا لیتے ہیں یہ وہ لوگ ہیں جو کام دھام نہ کر کے صرف قرضداروں سے اُونچی شرح پر سُود وصول کرتے رہتے ہیں۔ یہیں سے امیر اور غریب کا جھگڑا شروع ہوتا ہے۔

جب مزدُور مقروض ہوتا ہے تو وہ مالک کے ہر ظلم و ستم کو برداشت کرتا رہتا ہے۔ کیونکہ اس بے روزگاری کے زمانے میں اُسے ہر وقت یہی دُھن لگی رہتی ہے کہ کس طرح قرض ادا کیا جائے۔ لہٰذا مزدُور کی سودا کرنے کی قوت بھی (Bargaining Power) کمزور ہونے لگتی ہے۔

دراصل بڑے پیمانے پر قرض کے اثرات خطرناک ثابت ہوتے ہیں۔ یُوں تو ایک جانب قرضدار کو قرض خواہ اور قرض خواہ کو قرض دار گاہک کی شکل میں مل جاتے ہیں، لیکن اقتصادی طور پر اس کے نقصانات بہت زیادہ ہیں لہٰذا ہر انسان پر یہ ذمّے داری عائد ہوتی ہے کہ اِس بُرائی کے خلاف جدوجہد کرے۔ ہمارا مُلک چونکہ ایک جمہوری ملک ہے یہاں عوام کے چُنے ہوئے نمائندے ہی دراصل قانون صرف ہم کر اپنی چالاکیوں اور مکّاریوں سے مخفی اور اعلانیہ ان قوانین کی توہین کرتے ہیں۔

جہاں تک حکومت کا تعلق ہے حکومتِ ہند نے ہمیشہ ان تمام اقدامات کی مخالفت کی ہے جن سے غریبوں کا استحصال ہوتا ہو یا ان پر ظلم ہوتا ہو۔ مزدوروں کو راحت دلانے کے لیے مزدوروں میں تعلیم و تبلیغ کا سلسلہ بھی شروع کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ بھرتی کرنے کے بھی سائنٹفک طریقے استعمال کئے جا رہے ہیں، فیکٹریوں اور کارخانوں کے قریب سے جُوئے خانے اور شراب خانے کے ٹھیکوں کو ہٹایا جا رہا ہے۔ اس کے نتیجے میں آج مزدور زیادہ بیدار اور با اخلاق نظر آنے لگا ہے۔ حکومتِ ہند اس قسم کے انتظامات بھی کر رہی ہے جس سے مزدوروں میں اتفاق و اتحاد پیدا ہو سکے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے کوآپریٹیو سوسائٹیاں بھی قائم کی گئی ہیں۔ یہ جہاں ایک جانب مزدُور میں بچت کی عادت کو بڑھاوا دیتی ہیں تو دوسری جانب مالکوں اور دیگر لوگوں کے استحصال سے بھی اسے بچاتی ہیں۔ واجبی قیمتوں کی دکانیں بھی مزدور کے لیے معاون ثابت ہوئی ہیں۔

یوجنا کی ایک اور خصوصی پیش کش

حصولِ آزادی کے بعد ملک بھر میں غریبی دُور کرنے کے پروگراموں کو خاص اہمیت دی گئی ہے۔ اس سلسلے میں عوام کے تعاون کو ہمیشہ ہی ضروری سمجھا گیا ہے، چنانچہ پندرہ روزہ "یوجنا" نے نومبر ۱۹۸۴ء کے دونوں شماروں کو یکجا کر کے ایک ایسا خصوصی نمبر شائع کرنے کا فیصلہ کیا ہے، جس میں ملک سے غریبی ہٹانے میں رضاکارانہ تنظیموں کی اہمیت و ضرورت واضح کی گئی ہے۔ اس سلسلے میں ان تنظیموں کی کارگزاریوں اور ان کے اغراض و مقاصد کا ناقدانہ اور بے لاگ جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ اس شمارے میں اس اہم موضوع پر اظہارِ خیال کرنے والوں میں مشہور ماہرینِ اقتصادیات، مفکر، دانشور اور انتظامی امور کے ماہر اور اس شعبہ کا عملی تجربہ رکھنے والے بہت سے اصحاب ہیں۔ چند نام یہ ہیں:- ایس۔ کے ڈے، موہت سین، بکرم سرکار، بھرت ڈوگرا، نانا دیش مکھ، مہاشویتا دیوی اور ڈی بندوپادھیائے۔ حسبِ سابق یہ شمارہ بھی ایک اہم دستاویز ہوگا۔ (ایڈیٹر)

پروانہ ردولوی

ہماری فلمیں اور فرقہ وارانہ مفاہمت

پوری دنیا میں صرف ہند کی فلم انڈسٹری ہی ایسی ہے جس میں مکمل فرقہ وارانہ مفاہمت پائی جاتی ہے۔ اس دعوے کی تصدیق اس حقیقت سے ہوتی ہے کہ ہماری فلم انڈسٹری میں نہ ذات پات کی تفریق ہے نہ مذہبی اور صوبائی تعصب۔ ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی، پارسی، الغرض ہر ذات برادری اور فرقہ کے لوگ ہماری فلم انڈسٹری کا حصہ ہیں۔ اور سب مل جل کر پوری مفاہمت اور ہم آہنگی کے ساتھ فلم انڈسٹری کو ترقی دے رہے ہیں، صرف اداکار اور گلوکار ہی نہیں، کیمرہ مین، ٹیکنیشین، ڈائرکٹر، کہانی نگار و مکالمہ نگار، پروڈیوسر اور موسیقار وغیرہ بھی مختلف فرقوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کا مسلک، ان کے عقائد اور ان کے مذہبی نظریات تو الگ الگ ہیں لیکن ان سب کا مقصد ایک ہے اور یہ مقصد ہے اچھی فلمیں بنانا اور بلا تفریق مذہب و ملت تمام باشندگان ملک کی تفریح کا سامان فراہم کرنا میرے خیال میں ہند میں بننے والی ہر فلم فرقہ وارانہ مفاہمت کی مثال ہوتی ہے، چاہے فلم کا موضوع فرقہ وارانہ مفاہمت ہو یا نہ ہو۔ اور میرے اس خیال کی تصدیق کسی بھی فلم کے ٹائیٹل دیکھنے کے بعد ہو سکتی ہے، یہ بات میں اس لیے کہتا ہوں کہ فلم کسی ایک فرد کی کوششوں کا نتیجہ نہیں ہوتی، بلکہ کچھ افراد کے ذوقِ عمل اور مشترکہ جد و جہد کا نتیجہ ہوتی ہے اور ان افراد میں ہر فرقہ اور ہر طبقہ کے لوگ ہوتے ہیں، اس لیے عملی طور پر فلم بھی فرقہ وارانہ مفاہمت کی نمائش کرتی ہے۔

جہاں تک فرقہ وارانہ مفاہمت کے موضوع پر بننے والی فلموں کا تعلق ہے، اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ایسی فلموں کی تعداد بہت کم ہے، لیکن کسی بھی فلم کے اجزائے ترکیبی کے پیشِ نظر یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہماری ہر فلم فرقہ وارانہ مفاہمت کا مظہر ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر پروڈیوسروں میں کیدار شرما، بی۔ آر۔ چوپڑہ، گلشن رائے اور راج کپور کے ساتھ کے۔ آصف مرحوم، محبوب خاں مرحوم، سہراب مودی، میشر ریاض، طاہر حسین، ناصر حسین اور اسمٰعیل میمن، داؤد وغیرہ کے نام بھی آتے ہیں۔ اداکاروں میں یحییٰ خان، سمیر خان، فیروز خان، دلیپ کمار، یوسف پرویز، امتیاز، عادل اور امجد خان وغیرہ کے ساتھ سنجیو کمار، امیتابھ بچن، ونود کھنہ، ششی کپور، شتروگھن سنہا، رشی کپور، اور ونود مہرہ وغیرہ کے نام بھی آتے ہیں اسی طرح اداکاراؤں میں ثریا، نرگس، مینا کماری مرحومہ، ممتاز، زاہرہ، ریحانہ سلطان، زینت امان، شرمیلا ٹیگور اور شبانہ اعظمی وغیرہ کے ساتھ ہیما مالنی، راکھی، ریناراۓ، ریکھا، نیتو سنگھ، پدما کھنہ، ہیلن وغیرہ کے نام بھی آتے ہیں۔ گانے والوں میں رفیع کے ساتھ کشور کمار اور خورشید بیگم کے ساتھ لتا منگیشکر یکساں طور پر مقبول ہیں، موسیقاروں میں نوشاد اور غلام محمد مرحوم کو جو مقبولیت حاصل ہے وہی رام چندر، آر ڈی برمن اور شنکر جے کشن وغیرہ کو حاصل ہے، کہانی نگاروں میں سلیم جاوید کے ساتھ گلشن نندہ اور ساگر سرحدی، فلمی شاعروں میں ساحر لدھیانوی، مجروح سلطان پوری، اسد بھوپالی، کیفی اعظمی، جاں نثار اختر مرحوم اور شمیم جے پوری کے ساتھ امت کھنہ، من موہن تلخ، قمر جلال آبادی، نقش لائل پوری، حسرت اور شیلندر وغیرہ کے نام بھی آتے ہیں۔

اسی طرح فلم سازی کے تمام شعبوں میں فرقہ وارانہ مفاہمت پائی جاتی ہے۔ یہ تو چند مثالیں ہیں جو میں نے اپنے خیال کی تائید میں پیش کر دیں۔

کسی فلم میں شبانہ اعظمی کا ہیرو رشی کپور یا رمن کھنہ ہوتا ہے تو کسی فلم میں ریحانہ سلطان اور ظاہو کا ہیرو پریکشت ساہنی ہوتا ہے۔ کسی فلم میں ڈائرکشن منوج کمار کا ہوتا ہے تو فائٹ عظیم بھائی کی۔ الغرض کوئی بھی فلم ایسی نہیں جس میں ہر فرقہ وارانہ مذہبی نظریے کے لوگ مل جل کر کام نہ کرتے ہوں۔

جہاں تک فرقہ وارانہ مفاہمت کے موضوع کا سوال ہے، تقریباً نوے فیصدی فلموں میں اسے تھوڑا بہت استعمال کیا جاتا ہے اور بہت سی فلموں میں تو یہ موضوع بھرپور طریقہ پر پیش کیا گیا ہے۔ میں اس موقع پر صرف مثال کے لیے تین فلموں میں مغلِ اعظم، گرم ہوا اور مندر مسجد کا تذکرہ کروں گا۔ مغلِ اعظم میں مغل شہنشاہ اکبر کی ملکہ اور شہزادہ سلیم کے ماموں کے کردار، گرم ہوا کی پوری کہانی اور مندر مسجد میں ایک ہندو خاتون کے ذریعہ ایک بے سہارا مسلم بچے کی پرورش و پرداخت کے مناظر اس انداز میں پیش کیے گئے ہیں کہ فرقہ وارانہ مفاہمت کو کافی تقویت پہونچتی ہے۔

اگر میں یہ کہوں کہ فرقہ وارانہ ہم آہنگی اور مفاہمت ہی نے ہماری فلم انڈسٹری کو دنیا کی سب سے بڑی فلم انڈسٹری بنایا ہے تو غلط نہ ہوگا۔ اگر ہماری فلم انڈسٹری میں فرقہ وارانہ منافرت اور تعصب ہوتا تو یہ بات ہونی ممکن نہ تھی۔

اس سلسلے میں ایک بات اور عرض کرتا چلوں کہ میرا نقطۂ نظر زیادہ واضح ہو جائے گا، یہ بات ہے مختلف طبقوں اور فرقوں سے تعلق رکھنے والی اداکاراؤں اور اداکاروں کا

دوسرے فرقوں اور طبقوں سے تعلق رکھنے والے کرداروں میں خود کو پیش کرنے کا۔ مسلم اداکار ہندو زمیندار کے رول میں اور ہندو اداکار مسلم نواب کے رول میں آتے رہتے ہیں ان کرداروں میں حقیقت کا رنگ اسی وقت بھرا جا سکتا ہے جب وہ ایک دوسرے کی تہذیب اور معاشرت کے ساتھ ہی رسم و رواج، اٹھنے بیٹھنے اور کھانے پینے کے طریقوں سے بھی واقف ہوں اور یہ واقفیت اسی وقت حاصل ہو سکتی ہے جب مختلف فرقوں کے درمیان کسی قسم کی خلیج حائل نہ ہو بلکہ رفاقت و مفاہمت کا جذبہ کارفرما ہو۔ جس طرح گرم ہوا میں بلراج ساہنی نے اور شطرنج کے کھلاڑی میں سنجیو کمار نے مسلم کرداروں میں حقیقت کا رنگ بھر دیا ہے۔ اسی طرح سے گنگا جمنا اور بیراگ میں دلیپ کمار نے اور دھرماتما میں فیروز خان نے ہندو کرداروں میں بے داغ اداکاری کے جوہر دکھائے ہیں۔

میں فلم بینوں کو بھی فلموں میں فرقہ وارانہ مفاہمت کا ایک جزو لاینفک سمجھتا ہوں۔ اگر ہمارے فلم بینوں میں فرقہ وارانہ مفاہمت نہ ہوتی تو ہماری فلم انڈسٹری اور فلموں میں بھی فرقہ وارانہ مفاہمت کا فقدان ہوتا، مغلِ اعظم، چودھویں کا چاند، مرزا غالب، پاکیزہ، گرم ہوا اور مندر مسجد کی طرح کی فلمیں صرف وہی طبقہ دیکھتا جن کے معاشرے کی نمائندگی یہ فلمیں کرتی ہیں اور رانی جھانسی، شہید، جوگن، مرگیہ، جے سنتوشی ماں جیسی فلمیں صرف اسی طبقہ میں شرفِ قبولیت حاصل کرتیں جن کے معاشرے کو اپنی فلموں میں پیش کیا گیا ہے۔

سچ تو یہ ہے کہ فرقہ وارانہ مفاہمت ہماری گھٹی میں پڑی ہوئی ہے اور ہم بنیادی طور پر کسی چیز کو بھی تعصب کی عینک سے دیکھنے کے عادی نہیں ہیں، اگر فلم انڈسٹری اور فلم بینوں میں فرقہ وارانہ تعصب ہوتا تو شاد، دلیپ کمار، ثریا، نرگس، ممتاز آئی، جلال آغا، معتری، زینت، فیروز خان، امجد خان، ریحانہ سلطان وغیرہ ششی کپور، جے کشن، راج کپور، راکھی، نوتن، ہیما مالنی، ریکھا، امیتابھ بچن اور سنجیو کمار وغیرہ کے شانہ بشانہ نظر نہ آتے۔ اپنی اپنی ڈفلی، اپنا اپنا راگ والی بات ہوتی۔

چونکہ ابلاغ کے ذرائع میں سینما کی اہمیت سب سے زیادہ ہے، اس لیے ہماری حکومت بھی سنجیدگی اور دیانت داری کے ساتھ فرقہ وارانہ مفاہمت اور یکجہتی کو فروغ دینے والی فلموں کی ہمت افزائی کرتی ہے اور بلا تفریق مذہب و ملت اداکاروں، اداکاراؤں، پروڈیوسروں، ڈائرکٹروں، موسیقاروں اور گلوکاروں وغیرہ کو قومی ایوارڈوں سے نوازتی رہتی ہے، اس دعوے میں نہ کوئی غلو ہے نہ خوش فہمی کہ ہماری فلمیں اور ہماری فلم انڈسٹری کی بنیادیں فرقہ وارانہ مفاہمت پر ہیں اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ مفاہمت مزید استحکام حاصل کر رہی ہے۔

ہمارے ملک میں جس معاشرے اور جن نظریات کے فروغ کی کوششیں کی جا رہی ہیں ان کے پیشِ نظر پوری ذمہ داری کے ساتھ یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ آنے والے زمانوں میں یہ مفاہمت اور بڑھے گی ●

ایک ریڈیائی تقریر کا اقتباس

(بشکریہ آل انڈیا ریڈیو)

اظہار الحق

غذائی مسائل

بڑھتی یا گھٹتی آبادی کا غذائی اشیاء پر براہِ راست اثر پڑتا ہے۔ بڑھتی ہوئی آبادی کے مطابق غذائی اشیاء کی طلب تکمیل سے کہیں زیادہ ہوتی ہے۔ جن ممالک کا خاص پیشہ زراعت ہے، وہاں آبادی میں اضافہ تیزی سے ہوتا ہے، جس سے غذائی بحران پیدا ہو جاتا ہے۔ ان کی غذائی تکمیل خانگی ذرائع سے نہیں ہو پاتی۔ ایک قیاس کے مطابق مغربی و مشرقی ایشیا میں کل عالمی آبادی کا ۵۵ فیصدی لوگ رہتے ہیں، لیکن ان علاقوں میں عالمی زراعتی پیداوار صرف ۳۵ فیصد ہی ہوتی ہے۔ اس کے بالمقابل امریکہ، کناڈا میں دنیا کی کل آبادی کا تقریباً ۶ فیصد لوگ رہتے ہیں لیکن ان دونوں ملکوں میں دنیا کی کل غذا کی ۱۹ فیصدی پیداوار ہوتی ہے۔ زیادہ آبادی والے علاقے غذائی قلت سے متاثر نظر آتے ہیں۔ آج دنیا کے پچاس کروڑ سے بھی زائد لوگ پورے طور سے فاقہ کشی کرتے ہیں اور علاوہ ازیں ایک سو پچاس کروڑ لوگوں کو پیٹ بھر کھانا دشوار ہے۔

مناسب خوراک کی شکل میں ہر آدمی کو تین ہزار کیلوریز کی ضرورت ہوتی ہے لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ بعض دنیا کی آبادی کا ۱/۳ حصہ کو ہی صحیح طور سے مل پاتی ہے۔ باقی ۲/۳ حصہ لوگ اس سے محروم رہ جاتے ہیں۔ اگر روزانہ ایک ہزار کیلوریز سے کم ملے تو آدمی کا صرف ڈھانچہ ہی دکھائی دیگا۔ ایک دیگر قیاس کے مطابق ترقی پذیر ممالک کے پاس پروٹین کی سخت کمی پائی جاتی ہے۔ غذا میں پروٹین کے نہ ہونے سے ان ملکوں میں تقریباً ۱۰ فیصدی بچے موت کے آغوش میں چلے جاتے ہیں، اسی طرح وٹامن 'اے' کی کمی کے باعث ہر سال دس ہزار سے بھی زائد بچے اندھے ہو جاتے ہیں اگر ان خامیوں پر ورلڈ ہیلتھ آرگنائزیشن توجہ نہیں دیتی ہے تو بچوں کے اندر دماغی تناؤ پیدا ہوگا۔ جس سے دنیا میں صحت مند دماغی بچوں کی تعداد میں روز بروز خاص طور پر کمی ہوتی جائے گی۔

روئے زمین انسان کو تباہی سے بچانے کے لیے ترقی یافتہ ملکوں کو کم از کم غذائی پیداوار کے علاقے میں جلد از جلد خود اعتمادی حاصل کرنی ہوگی لیکن جتنی کوششیں اور اخراجات ان مقاصد کے حل کرنے کے لیے کی گئی ہیں، اتنی غذائی پیداوار میں ترقی نہیں ہو سکی۔ ★

پروفیسر ویرا ہنگورانی

آپ اور آپ کی صحت

برتھ کنٹرول کے طریقے

اب زیادہ سے زیادہ شادی شدہ لوگ چھوٹے کنبے کی ضرورت اور افادیت محسوس کرنے لگے ہیں۔ خاندان کے ارکان کو مناسب تعلیم دلانے اور ان کی صحت برقرار رکھنے نیز ان کی عام بہبود و بھلائی کی ذمہ داریاں اسی صورت میں نبھائی جاسکتی ہیں، جبکہ کنبہ چھوٹا ہو، چنانچہ جو شادی شدہ جوڑے اپنے کنبے کو محدود رکھنا چاہتے ہیں، ان کے لیے چند طریقوں کا مشورہ درج ذیل ہے۔

اب زیادہ سے زیادہ لوگ یہ محسوس کرنے لگے ہیں کہ کنبہ اور قوم کی بھلائی اس میں ہے کہ کنبہ چھوٹا رہے۔ اس کے سبب کنبہ کے ارکان کی صحت بن سکے گی۔ معیارِ زندگی بہتر ہو سکے گا اور اچھی تعلیم دلائی جاسکے گی۔

کنبہ کتنا بڑا ہو؟

ہمارا نعرہ ہے کہ "ہم دو ہمارے دو" یہ نعرہ مناسب ہی ہے۔ قطع نظر اس بات کے کہ ہمارے دونوں بچے لڑکے ہیں یا لڑکیاں۔ ہمارے آئین کی رو سے مرد اور عورت برابر ہیں۔ ہم سب کو اجتماعی طور پر اس بات کے لیے کوشش کرنی ہے کہ لڑکا اور لڑکی کا امتیاز جو کہ ہمارے سماجی نظام میں جڑ پکڑے ہوئے ہے، ختم کردیا جائے۔

جس طرح چھاتہ، کپڑا اور مکان ہمیں دھوپ، گرمی اور بارش سے بچاتا ہے، اسی طرح ہم خود کو "ان چاہے بچوں" سے بھی بچا سکتے ہیں، اس کے لیے برتھ کنٹرول ضروری ہے اور برتھ کنٹرول یا ضبطِ تولید کے لیے کچھ قابلِ بھروسہ طریقے ہیں۔

شادی کب کی جائے؟

۱۔ لڑکیوں کے لیے ۲۰ تا ۲۵ سال کی عمر شادی کے لیے مناسب ہے۔ کیوں کہ اس عمر تک بلوغت مکمل ہو جاتی ہے۔ اگرچہ کچھ ایسے معاملات میں بھی جہاں کہ تعلیم کی وجہ سے اس کو آگے بڑھا دیا جاتا ہے، اس تاخیر سے حقیقتاً زیادہ نقصان نہیں ہوتا۔

بیس اور تیس سال کے درمیان عورت کے دو بچے ہونے چاہئیں، یہ اس کے لیے بہترین عمر ہے۔ پہلا بچہ ۲۰ تا ۲۵ سال کے درمیان ہونا چاہئے اس عمر میں بچہ کی پیدائش کے لیے حالات موزوں رہتے ہیں اور اگر کسی وجہ سے اسے اور بھی ٹالا دیا جائے نیز حفاظت اور احتیاط سے کام لیا جائے تو بھی نتائج اچھے ہی رہیں گے۔

تاخیر کے لیے اقدامات

۲۰ سال کے آس پاس عورت کی شادی ہو جانے پر اگر وہ چند برسوں تک بچہ نہیں چاہتی، تو پھر وہ کیا طریقہ اپنائے تاکہ حمل قرار نہ پاسکے اگر وہ کوئی ایسا طریقہ چاہتی ہے جو پوری طرح کامیاب رہے اور عملاً سو فیصد کامیاب رہے، تو اسے کھانے کی گولیاں باقاعدگی سے استعمال کرنی چاہئیں۔ ایک گولی روزانہ تین ہفتے تک۔ یہ گولی وہ حیض کے پانچویں ہی روز کھانی شروع کرے۔ تین ہفتے کے کورس کے بعد وہ ایک ہفتے کے لیے ان گولیوں کو کھانا بند کر دے۔ اس عرصے میں اسے دوبارہ حیض شروع ہوگا اور وہ حیض کے پانچویں روز دوبارہ گولی کھانی شروع کردے۔

اِسے اس پروگرام پر باقاعدگی سے عمل کرنا چاہیئے۔ کیوں کہ کسی بھی روز گولی کھانا یاد نہ رہے گا تو اس سے حمل قرار پاسکتا ہے۔ اگر یہ بھول ہو بھی جائے تو اگلے روز دو گولیاں ایک ساتھ کھا لینی چاہئیں۔ البتہ یہ طریقہ تمام عورتوں کے لیے مفید نہیں ہوسکتا۔ کیوں کہ درجِ ذیل حالات میں ان گولیوں کے کھانے کے مضر اثرات بھی ہو سکتے ہیں:۔

۱۔ دل کی بیماریوں کی مریض یا مرگی کی مریض عورتیں۔
۲۔ حال ہی میں یرقان کی مریضہ عورتیں۔
۳۔ ذیابیطس کی مریضہ عورتیں یا ہائی بلڈ پریشر یا گُردے کی مریضہ عورتیں۔
۴۔ انجمادِ خون کی مریضہ عورتیں۔
۵۔ حیض کی گڑبڑی کی شکایت رکھنے والی عورتیں۔ حیض زیادہ یا کم یا بے قاعدہ ہولنہ
۶۔ کوئی اور متعدی مرض۔
۷۔ سرجری سے متعلق کوئی اور طبی دشواری۔

بہتر یہ ہے کہ زنانہ امراض کی ماہر ڈاکٹر دن

سے مشورہ کر لیا جائے اور اس کے بعد ان گولیوں کو استعمال کیا جائے۔ اور لگاتار ڈاکٹر سے رابطہ قائم رکھا جائے۔ گولیوں کے بعد ایام میں کمی کی شکایت ہو سکتی ہے۔ وہ بند ہو جائیں تو ڈاکٹر سے مشورہ کرنا چاہیئے اور پھر کوئی دوسرا طریقہ اپنانا چاہیئے۔

کچھ عورتیں ان گولیوں کے ذریعے بچّے کی پیدائش پر سوفی صدی روک لگانے کے حق میں نہ ہوں گی اور کچھ کے لیے یہ طریقہ مناسب نہ ہوگا، شادی شدہ ایسے جوڑے کنڈوم کا استعمال کر سکتے ہیں۔ یہ مردوں کے لیے ہے۔ عورتوں کے لیے جیلی کا استعمال ہوتا ہے۔ عورتیں ڈائی فرام بھی استعمال کر سکتی ہیں۔ یہ مادہ منویہ میں افزائش نسل کے جراثیم مارنے والی جیلی کے ہمراہ استعمال کیا جا سکتا ہے۔ یہ طریقے محفوظ ایام میں استعمال کئے جانے سے کافی موثر ثابت ہوئے ہیں۔ خطرناک گویا کہ افزائش نسل کے لیے موافق دنوں میں مباشرت سے بچنے سے بھی برتھ کنٹرول میں مدد ملتی ہے۔ ڈائی فرام کے لیے ڈاکٹر کی ضرورت ہوتی ہے مگر کنڈوم کے لیے نہیں۔ لہٰذا یہ وہ عام طریقہ ہے جو ضبطِ تولید کے لیے سب لوگ استعمال کرتے ہیں مگر یہ پوری طرح کامیاب نہیں ہے۔

مغربی ملکوں میں جہاں کہ جنسی تعلقات کے ضمن میں بہت کچھ آزادی ہے، رحم میں رکھنے والی ایسی بہت سی حکمت عملیاں ایجاد ہو گئی ہیں، جن سے وہ عورتیں فائدہ اٹھاتی ہیں جو ابھی بچّہ نہیں چاہتیں۔ ہم ان کا مشورہ نہیں دیں گے اور یہ صرف اُن عورتوں کے لیے موزوں ہو سکتی ہیں جو کہ کم سے کم ایک بچّہ پیدا کر کے اس بات کا ثبوت دے چکی ہیں کہ وہ بچّہ پیدا کرنے کے اہل ہیں۔ کیوں کہ مغربی ملکوں کے اس طریقے سے سمیت یعنی انفیکشن کا خطرہ لاحق رہتا ہے جس سے عورت بانجھ ہو سکتی ہے۔

بچّہ پیدا کرنے میں وقفہ

ماؤں سے کہا جاتا ہے کہ وہ اپنے بچّوں کو چھاتی کا دُودھ پلائیں۔ اس سے ماں اور بچہ دونوں کو فائدہ پہونچتا ہے۔ اس سے چھاتی کا کینسر نہیں ہوتا اور اندام نہانی کا کینسر بھی نہیں ہوتا۔ شروع کے تین تا چھ ماہ کے دوران اس سے ضبطِ تولید کا کام بھی لیا جاتا ہے اور حمل قرار نہیں پاتا۔ جو مائیں بچّوں کو صرف اپنا دودھ ۲ یا ۳ گھنٹے کے وقفے سے پلاتی ہیں، وہ اس عرصے میں حمل سے محفوظ رہتی ہیں۔ البتہ یقینی طور پر حمل سے حفاظت کے لیے لُوپ پہننا ضروری ہے۔ یہ لُوپ ڈیلیوری کے آٹھ تا دس ہفتے کے بعد پہنا جاتا ہے۔ اس سے بچّے کی پیدائش پر روک لگ جاتی ہے۔ ایسے موقعوں پر یہ بہترین طریقہ خیال کیا جاتا ہے۔ دُودھ پلانے کے دوران عورت کو ایام نہیں ہوتے اور جب تک عورت بچہ کو اپنے دُودھ کے سوا کسی دوسری غذا پر لاتی ہے، یا جس وقت تک اس کے ایام شروع ہوتے ہیں، اس وقت تک لُوپ اندر جگہ لے لیتا ہے اور اس سے خون زیادہ نہیں آنے پاتا ورنہ اس کے علاوہ دیگر عرصے میں لُوپ لگوانے سے خون زیادہ آنے کی شکایت ہوتی ہے۔

متبادل طریقِ کار کے طور پر اگر عورت عضویاتی مانع حمل طریقہ اپنانا چاہے تو وہ گولیاں کھا سکتی ہے لیکن جب بچّہ چھ ماہ کا ہو جائے، اس کے بعد ہی یہ گولیاں کھانی چاہئیں۔ وہ ہر دوسرے مہینے نیٹ کا انجکشن لگوا سکتی ہے۔ یہ بہت سے مراکز پر دستیاب ہیں۔ حیض شروع ہونے کے بعد ان کو لگوایا جا سکتا ہے۔ کنڈوم معہ کریم یا ڈایافرام معہ کریم بھی تمام مرکزوں پر دستیاب ہے لُوپ لگوانے سے قبل ان کا استعمال ہو سکتا ہے۔

مانع حمل کے حتمی طریقے

جو شادی شدہ جوڑے اپنا کنبہ پورا کر چکے ہیں، انھیں آپریشن کرا لینا چاہیئے۔ آپریشن مرد کا بھی ہو سکتا ہے اور عورت کا بھی۔ مرد کا آپریشن آسان ہے۔ مقامی طور پر جگہ کو سُن کر کے یہ آپریشن ہوتا ہے۔ اس کے تھوڑی دیر بعد مرد حرکت کر سکتا ہے۔ صحت کے عالمی ادارے کی تحقیقات کے مطابق جن لوگوں نے دس بیس سال پیشتر آپریشن کرایا تھا، ان کی صحت پہلے کے مقابلے بہتر ہے۔ یہ لوگ اپنے ایسے ہم عمر لوگوں کے مقابلے جنھوں نے آپریشن نہیں کرایا، صحت میں بہتر ہیں۔ اس کے باوجود ہمارے ملک میں ۱۹۷۶ کو چھوڑ کر عورتوں نے اپنے آپریشن کرائے ہیں۔ یہ کام انھوں نے اپنے لیے اپنی رضامندی سے پسند کیا ہے۔ در اصل مصیبت اور تکلیف بھی تو عورت کو ہی اٹھانی پڑتی ہے اور ہر وقت انھیں حمل کا خطرہ رہتا ہے۔ بچّہ کی پیدائش کے بعد آپریشن کیا جا سکتا ہے۔ دوربین کے ذریعے عورت کے مانع حمل آپریشن نے بھی دورِ حاضر میں مقبولیت حاصل کر لی ہے۔

جس عورت کے ۲۸ روز کے بعد باقاعدہ ایام آتے ہیں، اس کے حیض شروع ہونے کے بعد چودہویں روز بیضہ تشکیل پاجاتا ہے۔ یہ بیضہ صرف ۲۴ گھنٹے رہ سکتا ہے، لہٰذا اگر وہ ایک ہفتہ مباشرت سے بچی رہے یعنی بیضہ تشکیل پانے کی مدت سے تین روز پہلے اور تین روز بعد تو اسے حمل کا خطرہ نہیں رہتا۔

نئے طریقے:-

مانع حمل کچھ اور طریقے، تجربے کی منزل سے گزر رہے ہیں۔ مستقبل قریب میں ان سے فائدہ اٹھایا جائے گا۔

۱۔ نیٹ کا انجکشن، مہینے میں ایک بار یا ۲ ماہ میں ایک بار۔

۲۔ ہر مہینے نیٹ کا اسٹروجن کے ساتھ انجکشن۔

۳۔ نارپلانٹ   استعمال کی متوقع مدت ۳ تا ۵ سال۔

۴۔ ہارمون والے رحم میں استعمال کرنے کے لائق چھلّے۔

(باقی صفحہ ۱۵ پر)

غزلیں

ملک زادہ جاوید احمد

خوشبو تھے اُس کے پھول سے پیکر میں کھو گئے
قطرے کی طرح ہم بھی سمندر میں کھو گئے

وعدہ تو کر کے آئے تھے لوٹ آئیں گے مگر
ہم شہر آکے رزق کے چکر میں کھو گئے

کب تک اُتار پائیں گے ان فائیلوں کا قرض
اس فکر میں ہم آج بھی دفتر میں کھو گئے

یہ کون دیکھتا کہ کوئی بے لباس ہے
سب اپنی خواہشات کی چادر میں کھو گئے

جاوید ہم نے دیکھے تھے راتوں میں جتنے خواب
آئی سحر تو فکر کے لشکر میں کھو گئے

عبدالحفیظ خالق تسکین

خط اسے کیسے لکھوں کہ لاپتہ رہتا ہے وہ
جانے کس گوشے میں دُنیا کے چھپا رہتا ہے وہ

رفتہ رفتہ استقامت اس میں پیدا ہو گئی
اپنے ہر اک فیصلہ پر اب اڑا رہتا ہے وہ

یہ محبت کو چھپانے کا کھلا انداز ہے
دیدہ و دانستہ مجھ سے اب خفا رہتا ہے وہ

جو کہا کرتا تھا میرے قرب ہی کو زندگی
جائے حیرت ہے کہ مجھ سے اب جدا رہتا ہے وہ

اجنبی کوئی کبھی نقصان پہنچاتا نہیں
قتل جو کرتا ہے اکثر آشنا رہتا ہے وہ

کوئی خوش فہمی مجھے ہو تو تعجب بھی نہیں
پیار کی نظروں سے اکثر دیکھتا رہتا ہے وہ

اس کو آتا ہی نہیں میری محبت پر یقیں
جانے کن وہموں میں اکثر مبتلا رہتا ہے وہ

پوچھتے کیا ہو خلش کا حال مجھ سے دوستو
اک دیا روشن تھا پہلے، اب بجھا رہتا ہے وہ

★

عابدہ مناوری

اپنے وجدان کے آئینے میں دیکھا جاؤں
کاش میں خود سے الگ کر کے بھی سوچا جاؤں

میں ہوں مجبور کہ ہوں جھیل کا قیدی ورنہ
موج در موج اُچھلتا ہوا بہتا جاؤں

نام اُس کا جو کوئی لے تو بھر آئیں آنکھیں
جام لبریز کی مانند چھلکتا جاؤں

بار بار ایسے اُچھالو نہ مجھے سوئے فلک
کہیں ایسا نہ ہو سورج سے میں ٹکرا جاؤں

اس سے پہلے کہ نگل جائے سمندر مجھ کو
ابر بن کے کسی صحرا پہ برستا جاؤں

اپنی قربت کا ہے احساس ابھی اے عابد
اتنا تنہا بھی نہیں ہوں کہ میں گھبرا جاؤں

امان اللہ خاں شیروانی

رنگوں کا حُسن سے رشتہ
بہت نمایاں ہے
ہر اک رنگ بھی
اپنی جگہ پہ یکتا ہے
گلوں کا رنگ!
شفق سُرخ! اور
پودے سبز!
لبوں کا رنگ
گلابی!
دیے کی لَو ہے زرد!
(دھنک) دھنک کی شکل میں
ان سب رنگوں کی یکجہتی
فروغِ حُسن ہے
معراج ہے
مصّور کی۔

یہ ہے میرا وطن

نظر برنی

کوئی دیکھے مرے گلستاں کی پھبن
ہر روش پر لہکتا ہوا بانکپن
ڈالی ڈالی ہے اپنی ادا میں دلہن
لہلہائے بہاروں سے سرو و سمن
سارا گلشن ستاروں بھری انجمن
یہ ہے میرا وطن، یہ ہے میرا وطن

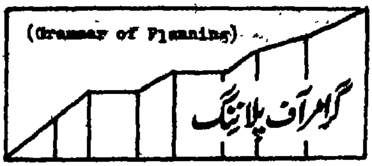
کوہ و صحرا میں بجتی ہیں شہنائیاں
دُور تک ہیں ہمالہ کی پرچھائیاں
باوضو ہیں ایلورا کی تنہائیاں
پاک ساگر میں بہتی ہیں رعنائیاں
پھوٹ نکلا اجنتا سے اک بانکپن
یہ ہے میرا وطن، یہ ہے میرا وطن

ہے مسرت کا ہر بوٹے پر اک نشاں
کونپلیں ہیں مگن ڈالیاں نغمہ خواں
میرے کھیتوں کی بالوں کا رنگیں سماں
جیسے بالک کوئی ہو رہا ہو جواں
اِک حسیں نرم و نازک سا سیمیں بدن
یہ ہے میرا وطن، یہ ہے میرا وطن

میرے گلشن میں جنت کی سوغات ہے
اس میں کشمیر، بنگال، گجرات ہے
جو نہیں ہے زمانہ میں وہ بات ہے
ہر گھڑی اس میں خوشیوں کی برسات ہے
اس کی ہر اک ادا نازِ گنگ و جمن
یہ ہے میرا وطن، یہ ہے میرا وطن

صاحبِ ہوش و ادراک، بالغ نظر
میری دھرتی نے اُگلے ہیں لعل و گہر
شانتی اور اہنسا کا دیکھو ثمر
کچھ شہیدوں کی قربانیوں کا اثر
یہ ہے گہوارۂ نازشِ علم و فن
یہ ہے میرا وطن، یہ ہے میرا وطن

پی۔ آر۔ دوبھاشی



منصوبہ بندی کی تنظیم

اس سے پچھلے باب میں مصنف نے منصوبہ بندی کی رُوح بتائی تھی۔ اس کے تحت معیشت کے مختلف شعبوں میں اشیا کی تیاری اور تقسیم کے پروگرام شامل ہیں۔ اس میں منصوبہ بندی کی تنظیم کے مختلف ڈھانچوں اور مختلف طرز پر اظہارِ خیال کیا گیا ہے۔ یہ مختلف طرز انتظامی اور اقتصادی نظام کے تحت اپنی ساخت، قوت اور نوعیت کے اعتبار سے الگ الگ ہو سکتے ہیں۔

اگر کوئی قوم یا ملک بحیثیت مجموعی جامع انداز کی منصوبہ بندی کرنا چاہتا ہے، تو اس کے لیے یہ ضروری ہوتا ہے کہ ایک ایسی مناسب اور موزوں تنظیم یا ادارہ قائم کیا جائے جو اس کام کو بحسن وخوبی انجام دے سکے۔ اگر منصوبہ بندی محض اشاراتی ہے، تو ایک ایسی چھوٹی اور مختصر سی تنظیم کافی ہو سکتی ہے جیسا کہ فرانس میں ہے۔ اس میں اعلا تعلیم یافتہ ماہرینِ اقتصادیات اور تکنیکی عملہ درکار ہوگا مگر یہی کام اگر بڑے انداز پر کیا جائے اور پوری معیشت کو اس کے دائرہ کار میں لے لیا جائے تو اس کے لیے بڑے پیمانے پر منصوبہ بندی سے متعلق ایک تنظیم درکار ہوگی۔ جیسا کہ رُوس میں گاس پلان (Gosplan) ہے۔ جہاں کہ منصوبہ بندی سے متعلق تنظیم چھوٹی ہے، وہاں بھی منصوبہ بندی سے متعلق تنظیم کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ وہ متعدد مشاورتی ادارے یا ورکنگ گروپ تشکیل دے جن میں بڑے اداروں اور ایجنسیوں کی نمائندگی ہو اور جہاں مختلف اداروں اور مفادات کی ترجمانی ہو سکے۔

جہاں ملک بڑا ہے اور وہاں وفاقی تنظیم ہے، وہاں منصوبہ بندی سے متعلق تنظیم کے علاوہ ایک ایسا متبادلۃً بڑا ادارہ کھولنے کی ضرورت ہوتی ہے جس میں وفاقی حکومت اور اس کے اجزائے ترکیبی دونوں کی نمائندگی ہو۔ منصوبہ بندی سے متعلق تنظیم کے مختلف ممکنہ ڈھانچے ہو سکتے ہیں۔ ملک کے اقتصادی اور انتظامی نظام میں یہ اپنی ساخت، قوت، نوعیت اور جائے وقوع کے اعتبار سے مختلف ہو سکتے ہیں۔

علاحدہ تنظیم

ایک نقطۂ نظر یہ ہے کہ منصوبہ بندی کی تنظیم کی الگ سے کوئی ضرورت نہیں بلکہ یہ خود ... کا ہی ایک جزو ہونی چاہیے۔ ایسی صورت میں ایک سوال یہ بھی سامنے آتا ہے کہ کیا منصوبہ بندی کی تنظیم کو سرکار کا الگ سے ایک شعبہ ہونا چاہیے۔ یا ایک قائم شدہ ادارے یا محکمے کا ایک حصہ ہونا چاہیے۔ ایک نظریہ یہ ہے کہ منصوبہ بندی کی تنظیم وزیراعظم کے ذاتی دفتر میں ہونی چاہیے۔ ایک اور نظریہ یہ ہے کہ یہ وزارت مالیات کا ایک حصہ ہونا چاہیے۔ ان تمام باتوں کو سامنے رکھ کر منصوبہ بندی کی تنظیم سرکاری انتظامیہ کے دائرہ کار میں رہتے ہوئے کام کرے گی۔ خیال یہ ہے کہ ایسی صورت میں یہ نظام انتظامی اور اقتصادی صورتِ حال پر خاطر خواہ اثر نہیں ڈال سکے گا کیوں کہ منصوبہ بندی کی تنظیم پہلے سے مسلمہ اور قائم شدہ تنظیم کے ماتحت ہے اور اس کا ایک حصہ ہے۔ لہٰذا جب تک مضبوط اور الگ قائم کردہ ایک تنظیم نہ ہو، اس وقت تک منصوبہ بندی کا عمل موثر ثابت نہیں ہو سکتا۔

اگر منصوبہ بندی کی الگ سے تنظیم قائم کر دی جائے تو پھر اس کی نوعیت کیا ہو اور اس کا طریقِ کار کیا ہو۔ کیا یہ اپنی نوعیت کے لحاظ سے مشاورتی ہو یا اسے فیصلہ کرنے کا حق ہو اور اس کے فیصلے لازمی طور پر قابلِ قبول ہوں اور سرکار کے تمام شعبوں کے لیے ان پر عمل درآمد ضروری ہو۔ کیا یہ ماہرین پر مشتمل ایک تنظیم ہو یا یہ ایک سیاسی تنظیم ہو۔

منصوبہ بندی ایک پیچیدہ عمل ہے، اس کے

بہت سے سوالوں کا جواب دینا آسان نہیں۔ وسائل اور پیداوار کی ترتیب اور اُن کے گوشوارے، مادی وسائل کی دستیابی، افرادی قوت کی منصوبہ بندی، نشانوں کی تکمیل اور ان کی برقراری یہ اور اس طرح کے بیشتر سوال تکنیک اور ٹیکنالوجی سے متعلق ہیں۔ اس کے علاوہ بہت سے امور ایسے ہیں جن کا فیصلہ وہ اقتدار ہی کر سکتی ہے جسے فیصلہ کرنے کے اختیارات ہوں۔ مثلاً کھپت کی موجودہ شرح اور مستقبل کے فائدے، کھپت کی قربانی دے کر شرح ترقی کو بلند کرنا یا کھپت کی معمولی قربانی دینا اور شرح ترقی کو تھوڑا ہی بڑھانا منصوبہ بندی کے بوجھ میں ذمہ داریوں کی تقسیم اور اس سلسلے میں طریق کار کا انتخاب، پیداواری وسائل کو کس حد تک قومی ملکیت میں لیا جائے۔ ظاہر ہے کہ اس طرح کے اہم فیصلے وہی ادارہ کر سکتا ہے جو بحیثیت مجموعی پوری قوم کا نمائندہ ہو۔

اگر الگ سے قائم کردہ منصوبہ بندی کی تنظیم میں صرف ماہرین ہی شامل کر لیے جائیں، اور ان کی تقرری سیاسی اقتدار کے حامل افراد کی جانب سے ہو اور جن کے پاس خود اپنے اختیارات کچھ نہ ہوں تو پھر ان کا دائرہ کار منصوبہ بندی کی ٹیکنالوجی سے متعلق ہو کر رہ جاتا ہے یعنی منصوبہ بندی کی دستاویزات کی تیاری، منصوبہ بندی کی تنظیم ایسی صورت میں سیاسی اقتدار اور پسند کے تابع ہو کر رہ جائے گا۔ ایسی تنظیم زیادہ تر مشاورتی تنظیم کی حیثیت سے کام کرتی ہے اور ماہرانہ صلاحیت کے بل بوتے پر اپنے مشاورتی اختیارات حاصل کرتی ہے۔ ایسے نظام میں یہ ڈر ہے کہ اس طرح کی سیاسی اعتبار سے غیر جانب دار منصوبہ بندی کی تنظیم سرکاری حکام کی نظر میں کسی طرح کوئی اہمیت نہیں رکھے گی اور وہ اسے نظر انداز کر سکتے ہیں۔ اس بحران کو حل کرنے کے لیے یہ طریقہ ہو سکتا ہے کہ منصوبہ بندی کی تنظیم میں کچھ ماہر اور کچھ سیاسی اقتدار کے حامل افراد ہوں۔

مثلاً منصوبہ بندی کمیشن کی صدر وزیر اعظم ہیں۔ منصوبہ بندی کے وزیر اس کے نائب صدر ہیں۔ اور وزیر مالیات اس کے رُکن ہیں۔ اس نظم و نسق کا ایک فوری نقصان یہ ہے کہ منصوبہ بندی کی تنظیم اپنا آزادانہ کیریکٹر کھو دے گی اور سرکار اور سیاسی اقتدار کے ماتحت رہ کر کام کرے گی! اس کے اقتصادی اندازے سیاسی خواہش اور مرضی کے مطابق مرتب کئے جاتے رہیں گے۔

لہٰذا منصوبہ بندی کی تنظیم کی نوعیت خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہو، اسے دو بُرائیوں کے درمیان گھر جانے کا خطرہ رہتا ہے۔ ایک طرف اپنا اثر کھو دینے کا اور غیر موثر ہونے کا اور دوسری طرف اپنی آزادی کھو دینے کا۔ ان کے بیچ درمیانی راستہ کی کھوج آسان کام نہیں۔ فرانس میں جس طرز پر منصوبہ بندی کی گئی ہے، وہ اس بحران کے حل میں کسی حد تک معاون ہو سکتی ہے۔ چنانچہ منصوبہ بندی کے مستقل نظام میں ڈپٹی کمشنر، سیکریٹری جنرل اور چارلس کونسلر شامل ہونے چاہئیں۔ ان کا تعلق زندگی کے مختلف شعبوں سے ہونا چاہیئے۔ یہ ایک غیر جانب دار تنظیم ہو۔ اس ادارے میں غیر جانب داری سے مراد یہ ہے کہ یہاں نجی مفادات، سرکاری ملازموں کے ارکان اور ہر وزارت کے مختلف محکمے ایک ساتھ بیٹھ کر اپنے اختلافات دُور کریں۔ اس میں شخصی مراتب کے تصورات کام کو آگے بڑھانے میں مانع نہ ہوں۔

فرانس میں منصوبہ بندی کی تنظیم محض ایک مشاورتی ادارہ نہیں ہے جیسا کہ ہالینڈ میں پلاننگ بیورو ہے۔ یا امریکہ میں صدر کے لیے اقتصادی مشیروں کی ایک کونسل ہے۔ فرانس میں اس ادارے کے کمشنر جنرل خود یا ورکنگ گروپوں کے توسط سے فیصلہ کرانے میں شریک ہوتا ہے اور پھر اُن فیصلوں کو عملی جامہ پہنایا جاتا ہے۔ اس طرح سے یہ نظام مشاورتی نظام سے بڑی چیز ہے۔ اور اقتصادی پالیسیوں کے تال میل کے لیے حقیقی مرکز سے کچھ کم حیثیت کا مالک ہے۔

اگر منصوبہ بندی کی الگ سے تنظیم قائم کر دی جاتی ہے تو اس کی تنظیمی قوتوں اور عملے کے ارکان کی تقرری کا سوال سامنے آتا ہے۔ منصوبہ بندی کے تحت اقتصادی، تکنیکی اور انتظامی معاملات آتے ہیں۔ اور اس طرح یہ ایک پیچیدہ عمل ہے۔ ان کا تعلق معیشت کے تمام پہلوؤں سے ہے۔ یہ سماج کے سبھی شعبوں اور ان کی سرگرمی کے سبھی گوشوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ محض ماڈل اور نمونہ تیار کرنے کا ایک عمل ہی نہیں ہے۔ اس کے تحت پالیسیوں کی تشکیل اور ان پر عمل درآمد کی ذمہ داریاں سنبھالنی ہوتی ہیں۔ اقتصادی پروگراموں کو عملی جامہ پہنانا ہوتا ہے۔ اقتصادی ترقی محض ایک اقتصادی تصور ہی نہیں ہے۔ یہ محض ایک نظریہ ہی نہیں ہے۔ اس کا تعلق سماجی تبدیلیوں سے ہے۔ سماجی تبدیلیوں کے آثار وامکانات کو پیش نظر رکھنا ضروری ہوتا ہے اور یہ تبدیلیاں اقتصادی اور تکنیکی پیچیدگیوں سے کس طرح کم اہم نہیں ہیں۔ اس طرح اعلاترین سطح پر منصوبہ بندی تنظیم میں زندگی کے مختلف شعبوں کے ماہرین شامل ہونے چاہئیں یعنی مالیات، عمرانیات، پبلک ایڈمنسٹریشن، سائنس اور ٹیکنالوجی اور خاص کر زراعت اور صنعت۔

منصوبہ بندی تنظیم کو چلانے کے لیے ضروری عملہ ہونا چاہیے۔ یہ صحیح ہے کہ منصوبہ بندی تنظیم کے عملے کا تقرر، اسی طرح ہونا چاہیئے جس طرح سرکار کے مستقل اور باقاعدہ محکموں میں ہوتا ہے۔ اس کے واسطے محض سیناریٹی یا بھرتی کے لیے باضابطہ طریق کار ہی کافی نہ ہوگا۔ بہتر ہو کہ مختلف شعبوں کے ماہروں سے ایک معاہدہ کر لیا جائے۔ سرکاری محکموں کے علاوہ اس سلسلے میں عملی اداروں، کاروباری، گھرانوں،

اور صنعتی تنظیموں سے بھی رابطہ قائم کیا جاسکتا ہے۔ منصوبہ بندی زندگی کے سبھی شعبوں اور سبھی سرگرمیوں پر حاوی ہے۔ لیکن منصوبہ بندی کی تنظیم کے لیے عملے کی تشکیل ضروری نہیں کہ سرکاری انتظامیہ کے متوازی خطوط پر ہو۔ اس طرح سے یہ تنقید ہوسکتی ہے کہ منصوبہ بندی کا ادارہ متوازی سرکار ہے۔

اگر منصوبہ بندی کی تنظیم آہستہ آہستہ عمل درآمد سے متعلق کچھ اختیارات بھی لے لے تو اس کی منصوبہ بندی سے متعلق سرگرمیاں ڈھیلی پڑ جائیں گی اور منصوبہ کی تکمیل اور اس پر عمل درآمد کی راہ میں ایک رکاوٹ ثابت ہوگی۔

عملے کی تقرری

منصوبہ بندی تنظیم کے لیے عملہ کتنا ہو، اس کا انحصار اس امر پر ہے کہ منصوبہ بندی کس نوعیت کی ہے۔ اشاراتی منصوبہ بندی میں بہت تھوڑے عملے کی ضرورت ہوگی جبکہ جامع طرز کی منصوبہ بندی کے لیے بہت زیادہ عملہ درکار ہوگا۔ فرانس میں ۱۹۶۳ء میں منصوبہ بندی کے ادارے میں پیشہ ورانہ عملے کے ارکان کی تعداد ۳۵ تھی جبکہ ہندوستان میں یہ ۱۸۰ تھی۔ روس میں گاس پلان میں عملے کے ارکان کی تعداد اس سے بھی کہیں زیادہ ہے۔ فرانس میں پیداواری کونسلوں کی منصوبہ بندی تنظیم میں انضمام کے بعد عملے کے ارکان کی تعداد ۳۵ سے بڑھ کر ۱۲۵۰ ہوگئی۔

منصوبہ بندی تنظیم میں داخلی انتظامات کے لیے مختلف طرز اختیار کئے جاسکتے ہیں۔ ایک مشورہ یہ ہے کہ منصوبہ بندی تنظیم کو تین حصوں میں بانٹ دیا جائے۔ ایک منصوبے کی تشکیل کی ذمہ داری سنبھالے، دوسرا منصوبہ بندی پر عمل درآمد کا جائزہ لے اور تیسرا منصوبہ بندی کا اس لحاظ سے جائزہ لے کہ وہ اپنے بنیادی مقاصد کی تکمیل میں کس حد تک معاون ہے۔ ان تینوں شعبوں کے دائرہ کار میں سیکٹر وار اور وسیع تر بنیادوں پر کام میں تخصیص کی نوعیت واضح رہنی چاہیے۔

منصوبہ بندی میں شماریات اور اقتصادی تجزیوں کے لیے موثر نظم و نسق اور تنظیم کی ضرورت ہے۔ منصوبہ بندی جس قدر پیچیدہ ہوتی چلی جائے گی۔ اور جس قدر وہ جدید تقاضوں کو پورا کرتی نظر آئے گی، اسی قدر اُسے مختلف طرح کے اعداد و شمار کی ضرورت پہلے سے زیادہ نظر آئے گی۔ البتہ اعداد و شمار کی فراہمی، ان کا تجزیہ اور جانچ پڑتال مکمل انداز کی تحقیقی سرگرمی کے رُوپ میں نہیں چلانی چاہیئے۔ یہ کام علمی اداروں کا ہے۔ فرانس میں یہی ہوتا ہے۔

گروپوں کے درمیان تال میل

منصوبہ بندی کی تنظیم کے کام کا ایک اور ڈھنگ یہ ہوسکتا ہے کہ اسے مختلف گروپوں میں تقسیم کیا جائے۔ یہ مختصر المدتی اور سالانہ منصوبے وضع کریں۔ البتہ یہ بات مشکوک ہے کہ کیا منصوبہ بندی کی تنظیم کے کام میں اس طرح کی تقسیم مناسب رہے گی۔ منصوبہ بندی کے ہر سیکٹر میں، تناظری منصوبہ بندی، مختصر المدتی منصوبہ بندی، اور سالانہ منصوبے تینوں میں رابطہ قائم ہونا ضروری ہے ورنہ تناظری منصوبہ بندی ترقی کے لیے کوئی اور نقشہ پیش کرے گی، اور مختصر المدتی اور سالانہ منصوبہ بندی بالکل دوسرا۔

منصوبہ بندی بنیادی طور پر قدرتی وسائل کو حرکت میں لانا ہے، اس کے علاوہ مالی وسائل، افرادی قوت کے وسائل اور انتظامی تنظیم کو حرکت میں لانا بھی اس کے فرائض میں شامل ہے۔ ایسی صورت میں منصوبہ بندی کی تنظیم کے داخلی امور کو گروپوں میں بانٹنا ممکن ہے تاکہ ہر ایک کے لیے وسائل کی الگ الگ تخصیص ہوسکے۔

منصوبہ بندی تنظیم کے الگ وجود کے باوجود سرکار کے محکمہ جاتی نظام کی ضرورت پھر بھی باقی رہے گی۔ اور منصوبہ بندی کے کام انھیں محکموں کے توسط سے انجام پاتے رہیں گے اس لیے یہ مشورہ دیا جاتا ہے کہ ہر محکمے میں منصوبہ بندی سے متعلق ایک شعبہ ہونا چاہیئے۔ یہ مناسب نہ ہوگا کہ منصوبہ بندی سیل کا کام کسی ادنیٰ حاکم کے سپرد کر دیا جائے۔ ہر ادارے کے سربراہ پر منصوبہ بندی کے پروگراموں پر عمل درآمد کی ذمہ داری ہونی چاہیئے۔

منصوبہ بندی کی الگ سے تنظیم پلان کی تیاری و تشکیل کے لیے ضروری ہے لیکن معیشت کے مختلف سیکٹروں کے نمائندوں اور سرکاری وزارتوں کے درمیان تال میل بڑا ضروری ہے۔ ان دونوں کی اجتماعی کوشش سے ہی پلان پر عمل درآمد کو یقینی بنایا جاسکتا ہے۔ فرانس میں منصوبے کی تیاری صرف وہ ۱۵۰۰ آدمی نہیں کرتے جو کہ منصوبہ بندی تنظیم سے وابستہ ہیں۔ بلکہ اس کی تیاری میں ۳ یا ۴ ہزار دیگر افراد شریک ہوتے ہیں اور وہ جدید طریق کار کی مدد سے پلان تشکیل دیتے ہیں۔ بحیثیت اس طریق کار کو فرانس کے منصوبہ بندی نظام کا حقیقی عنصر بتاتا ہے۔ پلان کی تشکیل سے متعلق متعدد کمیٹیز آپسی تال میل سے کام کرتے ہیں۔ ان میں سماج کے سبھی طبقوں، سرکار اور صنعت کی مختلف ذمہ داریوں کی نمائندگی ہوتی ہے۔

روس میں سرکار پارٹی تنظیم کے تابع ہوتی ہے۔ پارٹی کے ذمہ دار منصوبہ بندی سے متعلق نظام الگ سے قائم کرتے ہیں۔ جمہوری نظام میں بھی جہاں پارٹی اور سرکار الگ سے ہوتی ہیں، وہاں پارٹیوں کو اپنے فورم تشکیل دینے چاہئیں۔ تاکہ منصوبہ بندی پر عمل درآمد میں عوام کا تعاون حاصل ہوسکے۔ ہندوستان میں منصوبہ بندی کا نظام ریاستی سطح پر ارتقا کے عمل سے گزر رہا ہے۔ ریاستی سطح پر منصوبہ بندی کے نظام کا جو مطالعہ کیا گیا، وہ ۱۹۶۹ء میں شائع کیا گیا۔

اس میں مذکور ہے کہ ریاستوں میں منصوبہ بندی کے نظام نام کی کوئی چیز نہیں ہے۔ بہت سی ریاستوں نے ابھی تک منصوبہ بندی کو ایک ایسا ضمنی کام تصور کیا ہے جو سرکار کا کوئی بھی ایسا حاکم انجام دے سکتا ہے جس کے پاس اس کے لیے کسی طرح کی کوئی کوالی فیکیشن نہ ہو۔ یہ افسر ترقیاتی محکمے کی طرف سے پیش کردہ اسکیموں میں تال میل قائم رکھتا ہے۔ ریاستی منصوبہ بندی کو اگر ہم محکمہ جاتی منصوبہ بندی کہیں تو یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔ ریاستی سطح پر منصوبہ بندی کمیشن کی طرح کی ماہرین کی کوئی کمیٹی نہیں ہے، لہٰذا ریاستی منصوبہ بندی میں مقصد کی نشاندہی نہیں کی جاسکی ہے اور وہاں ترجیحات کا تعین بھی نہیں ہو سکا ہے۔

البتہ اب صورتِ حال بدل رہی ہے۔ منصوبہ بندی کمیشن ریاستوں سے کہہ رہا ہے کہ وہ ریاستی سطح پر منصوبہ بندی کا مستقل نظام قائم کریں۔ اکثر ریاستوں میں منصوبہ بندی سے متعلق محکمے کے علاوہ ترقیاتی محکموں میں منصوبہ بندی سے متعلق سیل اور بین محکمہ جاتی کمیٹیاں اور منصوبہ بندی سے متعلق کیبنٹ کمیٹیاں قائم کردی گئی ہیں۔ تمل ناڈو، کیرالہ، کرناٹک میں منصوبہ بندی سے متعلق بورڈ قائم کر دیئے گئے ہیں اور اس میں مناسب تربیت یافتہ عملہ تعینات کردیا ہے۔ ریاستی سطح پر یہ عمل جاری رہے گا اور اس کے بعد یہ عمل علاقائی، ضلع اور ریاستی سطحوں پر بھی شروع کیا جائے گا۔

ایک بڑے ملک میں ریاستوں یا جمہوریتوں (ری پبلک) پر منصوبہ بندی کی کچھ نہ کچھ ذمہ داری ضرور عائد ہوتی ہے اور لامرکزی نظام کے تحت ریاستوں یا ری پبلک پر عائد کردہ ذمہ داریاں نبھانی پڑتی ہیں۔ لہٰذا ریاستی سطح پر منصوبہ بندی کے نظام کو مستحکم بنانے کی ضرورت ہے۔ یہ مرکزی سطح کے منصوبہ بندی نظام کی طرح وسیع نہیں ہو سکتا لیکن اسے اپنے طور پر منصوبہ بندی عمل کو آگے بڑھانے کی مہارت ضرور ہونی چاہیئے۔ ریاستی سطح پر کمزور نظام منصوبہ بندی کے عمل کو موثر ڈھنگ سے آگے نہیں بڑھا سکتا۔ ریاست میں منصوبہ بندی کا نظام اگر کمزور ہوگا تو وہ ترقیاتی اسکیموں کی پیش رفت سے متعلق اعداد و شمار جمع کرنے کی ایک ٹیم بن کر رہ جائے گا۔

منصوبہ بندی کا عمل فائلوں میں گم ہوتے ہی منصوبے کی تشکیل اور منصوبے پر عمل درآمد، منصوبے کی تنظیم اور محکمہ جاتی تنظیم کے درمیان کوئی فرق باقی نہیں رہتا۔ خطہ داری اور مقامی سطح پر بھی منصوبہ بندی خصوصی مہارت چاہتی ہے۔ مرکز کے نظام کی کمزوری یا خامی ہو یا ریاستی یا خطہ داری سطح کی منصوبہ بندی کی خامی ہو، دونوں طرح کی خامیاں منصوبہ بندی کے استحکام میں رکاوٹ کا سبب بن جائیں گی۔

علاقائی اور ضلع کی سطح پر منصوبہ بندی کے نظام کی کمزوری، محض ہندوستان میں ہی نہیں بلکہ دوسرے ملکوں میں بھی ہے۔ یوشیت نے کہا ہے کہ فرانس میں ۱۹۶۳ میں سات سال کی کوششوں کے بعد علاقائی منصوبہ تیار کیا جاسکا۔ اسے معاشیات، سماجیات اور علاقائی ترقی سے متعلق ریجنل پلان کا نام دیا گیا۔ یہ دشواری اس لیے پیش آئی کیوں کہ سابق میں کوئی علاقائی اقتصادی نظام وجود میں نہ تھا۔ مناسب جغرافیائی ڈھانچے کے قیام کی کوشش کے تحت ہر ضلع نے اب ایک ایسی مستقل تنظیم قائم کرنی ہے جو کہ عوامی خدمت اور افادیت کے پروگراموں کا مطالعہ کر سکے اور ان کے درمیان تال میل قائم کرسکے۔ ایک پری فیکیٹ Perfect تال میل کے کام سے وابستہ پری فیکیٹ کے طور پر اس کا صدر ہوتا ہے جہاں منصوبے مرکزی اور ریاستی سرکاروں کی مشترکہ ذمہ داری ہوتے ہیں۔ وہاں ایک اعلاترین تنظیم جو کہ دونوں سطحوں پر اعلاترین سیاسی اقتدار کی نمائندہ ہوتی ہے، منصوبہ بندی کے لیے درکار ہوتی ہے۔ ہندوستان میں اس طرح کی تنظیم قائم کی جاچکی ہے اور اسے نیشنل ڈیولپمنٹ کونسل کا نام دیا گیا ہے۔

پارلیمانی جمہوری نظام میں پارلیمنٹ اور اس کی کمیٹیوں کو ایسے مواقع نکالنے ہوں گے نیز نظم و نسق اور ان پر عمل درآمد کے ذمہ دار منصوبہ پر عمل درآمد کا جائزہ لیں گے۔ فرانس میں پارلیمانی نگرانی کے متوازی معاشی امور کی ذمہ دار کونسل بھی نگراں ہوتی ہے۔ اس میں سماجی اور پیشہ ورانہ زندگی کے مختلف شعبوں کے ماہر ہوتے ہیں۔ ریاستی سطح پر بھی اسی طرح کا ایک ادارہ درکار ہوتا ہے۔ جس میں مقامی سرکاری ادارے شریک ہوتے ہیں۔ اور اس طرح منصوبہ بندی کے عمل میں ضلع اور مقامی سطح کے اداروں کی شرکت یقینی ہو جاتی ہے۔

(آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں
منصوبہ بندی پر عمل درآمد) ★

بقیہ: برتھ کنٹرول کے طریقے

۵۔ ہارمون لیے ہوئے لوپ۔

۶۔ کاپرٹی کا طریقہ استعمال کرنے کی بجائے زیادہ مقدار میں کاپر والے لوپ، تاکہ وہ دیرپا ثابت ہوں۔ اس طرح لوپ میں چاندی ملاکر استعمال کرنے کا طریقہ مستقبل بعید میں کچھ ایسے طریقے بھی کامیاب ہو سکیں گے جو اس وقت تجربے کی منزلوں سے گزر رہے ہیں:۔

ایسے کچھ طریقے یہ ہیں:۔

۱۔ عورتوں کے لیے ویکسین۔

۲۔ مردوں کے لیے ویکسین۔

۳۔ مردوں کے لیے ہارمون کی تیاری۔

۴۔ چھوٹی مقدار میں مردوں اور عورتوں کے لیے ہارمون پہونچانا۔

(آل انڈیا انسٹی ٹیوٹ آف میڈیکل سائنسز، نئی دلی کے ایک لیکچر پر مبنی)

وسنت ساٹھے

معاشرتی انقلاب کی جانب

اقتصادی جمہوریت کا مقدمہ

اقتصادی نظام

تیسرا باب

قسط: ۸

کالے دھن کا بے پناہ اضافہ

پچھلے شمارے میں جو اعداد و شمار پیش کیے گئے تھے، اُن کے ساتھ ساتھ ہمیں متوازن معیشت کی اصلاح پر بھی نظر ڈالنی چاہیے۔ گویا کہ ہمیں اُس دولت پر بھی نظر رکھنی ہے جسے ریونیو کی مد میں شمار نہیں کیا جا سکا اور یہ اُن کے ہاتھوں میں رہی جنھوں نے کر اسے جمع کیا ہے اور انھوں نے ہی اسے استعمال کیا ہے۔ وانچو کمیٹی نے کالے دھن کی رقم کا اندازہ لگانے کے لیے ایک کوشش کی تھی جو کہ اس سلسلے کی پہلی کوشش تھی۔ اسے براہِ راست ٹیکسوں کی تحقیقات سے متعلق کمیٹی کہا گیا تھا۔ اس میں کہا گیا تھا کہ:-

• ان تمام مجبوریوں کو ذہن میں رکھتے ہوئے اور دستیاب اطلاعات کی بنیاد پر موٹے طور پر تطبیق کو عمل میں لاتے ہوئے وہ آمدنی جس پر ٹیکس ادا نہیں کیا گیا اور جسے چوری چھپے ٹیکس سے بچا لیا گیا، وہ ۶۲-۱۹۶۱ میں ۷۰۰ کروڑ روپے اور ۶۶-۱۹۶۵ میں ایک ہزار کروڑ روپے کے لگ بھگ ہے۔ ۶۲-۱۹۶۱ اور ۶۹-۱۹۶۸ کے درمیانی عرصے میں قومی آمدنی میں چالو قیمتوں کی بنیاد پر سو فی صد اضافہ ہوا ہے، لہٰذا اسی تناسب سے ۶۹-۱۹۶۸ میں ۱۴۰۰ کروڑ روپے کی آمدنی کو ٹیکس سے بچا لیا گیا اور اس پر ٹیکس ادا نہیں کیا گیا۔ لہٰذا ٹیکس کی چوری کی حد کا جہاں تک تعلق ہے، اس سے پتہ چلتا ہے کہ ۶۶-۱۹۶۵ کے لیے تشخیص کردہ آمدنی پر ٹیکسوں کی اوسط شرح ۲۵ فی صد کے لگ بھگ تھی لیکن اس مدت میں کالے دھن اور ٹیکسوں کی چوری کے مسئلے نے جو شدت اختیار کر لی ہے، اس کو سامنے رکھتے ہوئے اور یہ بات دھیان میں رکھتے ہوئے کہ آمدنی کی مقابلتاً اعلیٰ سطحوں پر ٹیکسوں کی چوری زیادہ ہے، ٹیکسوں سے بچائی گئی آمدنی پر لاگو ہونے والی ٹیکسوں کی شرح ۶۹-۱۹۶۸ میں ۳۳ ۱/۲ فیصد سے کم نہ ہوگی۔ اس طرح ۶۹-۱۹۶۸ میں انکم ٹیکس کی چوری کا اندازہ ۴۷۰ کروڑ روپے کے لگ بھگ ہے جو کہ ۱۴۰۰ کروڑ روپے کا ایک تہائی ہے۔ کالے دھن سے متعلق معاملات کی قدرِ زر ۶۹-۱۹۶۸ میں ۷ ہزار کروڑ روپے سے کم نہ ہوگی۔ البتہ اس بات کو ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ ۶۹-۱۹۶۸ میں جس قدر آمدنی کو ٹیکسوں کی ادائیگی سے بچایا گیا ہے، اس کا اندازہ چند مفروضات کا رہینِ منت ہے اور ان کے بارے میں اختلاف رائے ممکن ہے کیوں کہ صحیح صحیح اعداد دستیاب نہیں ہیں۔ اس کے ساتھ ہی اس تاثر کا سدِّباب ضروری ہے کہ ٹیکسوں سے بچائی گئی آمدنی ناجائز طور پر ذخیرہ کر دی گئی ہے جسے حکام اپنے قبضے میں کر سکتے ہیں۔ ان میں سے بہت سی رقم اثاثہ جات کی صورت میں بدل دی گئی ہے یا پھر اُسے خرچ کر دیا گیا ہے یا پھر وہ خفیہ کاروباری معاہدوں میں استعمال کی جا رہی ہے۔

ملک میں کالے دھن کو مختلف طریقوں سے کھپایا جاتا ہے، چنانچہ جس قدر اس کے کھپانے کے مختلف طریقے نکالے گئے ہیں، اسی قدر طریقے اس کے کمانے کے بھی ہیں۔ یہ نمبر ۲ کا کھاتہ کہلاتا ہے۔ مثلاً سونے کی اسمگلنگ، ہیروں اور سامانِ تعیش کی اسمگلنگ، غیر ملکی کرنسی سے متعلق غیر مجاز لین دین، کمیاب اشیاء کی جمع خوری کے خیال سے خرید، سٹہ بازی، ناجائز نفع خوری، چور بازاری وغیرہ۔ غیر قانونی طور پر کوٹے کی خریداری پر بھی یہ رقم خرچ کی جاتی ہے۔ اس سے خفیہ کمیشن، رشوت، مقدمہ بازی وغیرہ کے لیے روپیہ دیا جاتا ہے۔ صنعتی امن قائم کرنے، الیکشن کے اخراجات نپٹانے اور سیاسی پارٹیوں کے لیے عطیات بھی اسی مد سے دیئے جاتے ہیں۔ ناجائز ہنڈی کے قرضوں، متوسط اور غیر متوسط املاک کی خریداری، زیورات، ہیرے، جواہرات، ٹیکس سے مبرا سرکاری تمسکات کی خریداری، ہندوستان اور غیر ملکی بنکوں میں رقوم کو فرضی ناموں سے جمع کروانا وغیرہ اس مد سے ہوتا

ہے۔ رہائش پر بے پناہ مصارف، فضول خرچی، شادی بیاہ پر غیر معمولی اخراجات وغیرہ بھی کالے دھن سے ہوتا ہے۔

ایک حالیہ مطالعے کی روشنی میں جو کہ کالے دھن اور فاضل گردش کا روبار کے سلسلے میں کیا گیا، یہ معلوم ہوا کہ ۷۹-۱۹۷۸ء میں کالے دھن کی میزان ۴۶۸۶۶٫۸ کروڑ روپے اور سرکاری مجموعی قومی آمدنی میں اس کا تناسب ۴۸٫۸ فی صد ہے، درج ذیل گوشوارہ کالے دھن کے بے پناہ اضافے کو واضح کرتا ہے۔

سال	کالے دھن کی میزان (کروڑ روپے میں)	سرکاری مجموعی قومی آمدنی سے اس کا تناسب
۶۸-۱۹۶۷	۳,۰۳۴٫۴	۹٫۵
۷۳-۱۹۷۲	۱۵,۱۹۰٫۵	۳۱٫۸
۷۴-۱۹۷۳	۱۵,۸۹۴٫۹	۲۷٫۰
۷۵-۱۹۷۴	۱۴,۵۱۸٫۱	۲۰٫۸
۷۶-۱۹۷۵	۱۸,۴۵۷٫۹	۲۵٫۴
۷۷-۱۹۷۶	۲۴,۰۱۴٫۲	۲۹٫۴
۷۸-۱۹۷۷	۳۴,۳۳۵٫۲	۳۹٫۵
۷۹-۱۹۷۸	۴۶,۸۶۶٫۸	۴۸٫۸

مندرجہ بالا اعداد و شمار کی روشنی میں کالے دھن کا اندازہ ۸۲-۱۹۸۱ء میں ۱۵ ہزار کروڑ روپے ہے۔

بہت سا کالا دھن بنکوں میں رکھا جاتا ہے۔ قومی ملکیت کے بنکوں میں بھی بہت سا کالا دھن ہوتا ہے۔ جو کہ فرضی ناموں سے ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں اکثر بنک والوں اور فرد متعلقہ کے درمیان ایک مفاہمت ہوتی ہے۔ بنکوں کو بھی کھاتوں میں جمع شدہ رقوم میں اضافہ دکھانا ہوتا ہے۔ کھاتوں میں جمع شدہ ان رقومات سے بنکوں سے جائز طور پر قرضہ لیا جاتا ہے۔ اس طرح کالا دھن، سفید دھن کو کھینچنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے جس سے کالے دھن میں مزید اضافہ ہوتا ہے۔ کالے دھن سے روپیہ کمانے کے اور بھی بہت سے طریقے ہیں، مثلاً یہ کہ چند لوگ اور مختلف طرح کی سٹہ بازاری۔

سنچایتا انوسٹمنٹس کے مقدمے میں جو کہ سپریم کورٹ میں تھا، یہ بات سامنے آئی کہ بنک کی سہولتوں کو کالے دھن کے لیے کس طرح آزادانہ طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ اکونومک اور پولیٹیکل ویکلی نے خبر دی کہ سنچایتا کے ایک حصہ دار کے گھر کی تلاشی سے منجملہ دیگر اشیاء کے ایک پاس بک ملی جو کہ کلکتہ میں سنٹرل کیپٹل بنک کی گری ہٹ برانچ کی تھی۔ یہ جعلی نام سے تھی اور اس میں ۲۸ کروڑ روپے کی رقم تھی۔ (ملاحظہ کیجئے ۱۳ر فروری ۱۹۸۲ء کا شمارہ) سپریم کورٹ کے چیف جسٹس مسٹر وائی وی چندر چوڑ نے لکھا کہ "فرم کے حصہ دار راتوں رات کروڑ پتی بن گئے۔ ۱۹۷۰ء میں ان میں سے کچھ کلرک تھے۔ یا کیمسٹ لیکن آج وہ ایسی املاک کے مالک ہیں کہ کوئی شہزادہ بھی ان کو دیکھ کر شرمائے۔ اس طرح تیزی سے اور آسانی سے امیر بن جانے کو بجا طور پر چیتھڑوں سے امارت کی جانب" کہا جا سکتا ہے کہ فرم نے اس بڑی دولت اور رقم کو کالے دھن کی گردش اور کالے دھن سے کالا دھن پیدا کرنے کے طریقہ پر حاصل کیا۔ کمپنی نے ۴۸ فیصد سالانہ کی شرح سود ادا کرنے کی پیشکش کی اور ملک میں غالب پارٹی کو دل کھول کر عطیات فراہم کئے۔

جائزہ معیشت کی طرف آتے ہوئے ۸۰-۱۹۷۹ کی آمدن ٹیکس تشخیص کے اعداد و شمار کی روشنی میں ایک ہزار روپے سے زیادہ آمدن والوں کی تعداد ۲۰ لاکھ کے لگ بھگ رہی۔ اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ بہت سے وہ لوگ ہیں جنھوں نے اپنی حقیقی آمدنی چھپائی ہے، اور اس لیے وہ ٹیکس ادا کرنے والوں کے زمرے میں نہیں آتے، تو بھی یہ تعداد دوگنی ہو سکتی ہے گویا کہ ۴۰ لاکھ۔ یعنی ۷۰ کروڑ کی آبادی میں ۴۰ لاکھ افراد۔ بچوں کی تعداد اور کام نہ کرنے والی عورتوں اور کام نہ کرنے والے مردوں کی تعداد کو گھٹا کر ملک میں کام کرنے والی افرادی قوت آبادی کی نصف تعداد سے بھی کم ہے یعنی ۳۵ کروڑ اور کام کرنے والی افرادی قوت کا صرف ایک فی صد انکم ٹیکس ادا کرتا ہے۔ اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ بڑے بڑے شہروں کی آبادی میں اشیائے صارفین کا جو انبار لگا ہے، وہ اس محدود طبقے کے لیے ہی ہے۔ اس ضمن میں غیر محسوب کالے دھن کے اثرات کو سمجھا جا سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ قومی مجموعی آمدنی اقتصادی سرگرمی کی اصطلاح میں پوری آبادی پر تقسیم کی جاتی ہے، مگر حقیقت یہ ہے کہ ۵۰ فی صد کے لگ بھگ آمدنی چند سو ہزار نفوس کے ہاتھوں میں ہے۔ اور اس کی تقسیم اور گردش فیصل کرنے والے مقامات یا سماجی خدمت کے مراکز پر ہوتی ہے مگر اس کے باوجود ظاہری دکھاوے اور غیر ضروری سامانِ تعیش پر خرچ کرنے کے واسطے کافی فاضل رقم ہوتی ہے۔ چنانچہ نام و نمود اور پانچ ستاروں والی ثقافت کے غیر معمولی اخراجات اسی کالے دھن کی بدولت ہیں۔ اس نے پوری معیشت کو اپنی گرفت میں لے رکھا ہے اور سماج کا

وسنت ساٹھے

معاشرتی انقلاب کی جانب
اِقتصادی جمہوریت کا مُقدمہ

اقتصادی نظام
تیسرا باب — قسط: ۸

کالے دھن کا بے پناہ اضافہ

پچھلے شمارے میں جو اعداد و شمار پیش کیے گئے تھے، اُن کے ساتھ ساتھ ہمیں متوازن معیشت کی اصطلاح پر بھی نظر ڈالنی چاہیے۔ گویا کہ ہمیں اُس دولت پر بھی نظر رکھنی ہے جسے ریونیو کی مد میں شمار نہیں کیا جا سکا اور یہ اُن کے ہاتھوں میں رہی جنھوں نے کر اسے جمع کیا ہے اور انھوں نے ہی اسے استعمال کیا ہے۔

وانچو کمیٹی نے کالے دھن کی رقم کا اندازہ لگانے کے لیے ایک کوشش کی تھی جو کہ اس سلسلے کی پہلی کوشش تھی۔ اسے براہِ راست ٹیکسوں کی تحقیقات سے متعلق کمیٹی کہا گیا تھا۔ اس میں کہا گیا تھا کہ:-

• ان تمام مجبوریوں کو ذہن میں رکھتے ہوئے اور دستیاب اطلاعات کی بنیاد پر موٹے طور پر تطبیق کو عمل میں لاتے ہوئے وہ آمدنی جس پر ٹیکس ادا نہیں کیا گیا اور جسے چوری چھپے ٹیکس سے بچا لیا گیا، وہ ۶۲-۱۹۶۱ میں ۷۰۰ کروڑ روپے اور ۶۶-۱۹۶۵ میں ایک ہزار کروڑ روپے کے لگ بھگ ہے۔ ۶۲-۱۹۶۱ اور ۶۹-۱۹۶۸ کے درمیانی عرصہ میں قومی آمدنی میں چھُوٹ کر موجودہ قیمتوں کی بنیاد پر سو فی صد اضافہ ہوا ہے۔ لہٰذا اسی تناسب سے ۶۹-۱۹۶۸ میں ۱۴۰۰ کروڑ روپے کی آمدنی کو ٹیکس سے بچا لیا گیا اور اس پر ٹیکس ادا نہیں کیا گیا۔ لہٰذا ٹیکس کی چوری کی حد کا جہاں تک تعلق ہے، اس سے پتہ چلتا ہے کہ ۶۶-۱۹۶۵ کے لیے تشخیص کردہ آمدنی پر ٹیکسوں کی اوسط شرح ۲۵ فی صد کے لگ بھگ تھی لیکن اس مدت میں کالے دھن اور ٹیکسوں کی چوری کے مسئلے نے جو شدت اختیار کر لی ہے، اس کو سامنے رکھتے ہوئے اور یہ بات دھیان میں رکھتے ہوئے کہ آمدنی کی مقابلتاً اعلیٰ سطحوں پر ٹیکسوں کی چوری زیادہ ہے، ٹیکسوں سے بچائی گئی آمدنی پر لاگو ہونے والی ٹیکسوں کی شرح ۶۹-۱۹۶۸ میں ۳۳ ۱/۳ فیصد سے کم نہ ہوگی۔ اس طرح ۶۹-۱۹۶۸ میں انکم ٹیکس کی چوری کا اندازہ ۴۷۰ کروڑ روپے کے لگ بھگ ہے جو کہ ۱۴۰۰ کروڑ روپے کا ایک تہائی ہے۔ کالے دھن سے متعلق معاملات کی قدرِ زر ۶۹-۱۹۶۸ میں ۷ ہزار کروڑ روپے سے کم نہ ہوگی۔ البتہ اس بات کو ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ ۶۹-۱۹۶۸ میں جس قدر آمدنی کو ٹیکسوں کی ادائیگی سے بچایا گیا ہے، اس کا اندازہ چند مفروضات کا رہینِ منت ہے اور ان کے بارے میں اختلافِ رائے بھی ہے کیوں کہ صحیح صحیح اعداد دستیاب نہیں ہیں۔ اس کے ساتھ ہی اس تاثر کا سدِّ باب ضروری ہے کہ ٹیکسوں سے بچائی گئی آمدنی ناجائز طور پر ذخیرہ کر دی گئی ہے جسے حکام اپنے قبضے میں کر سکتے ہیں۔ ان میں سے بہت سی رقم اثاثہ جات کی صورت میں بدل دی گئی ہے یا پھر اُسے خرچ کر دیا گیا ہے یا پھر وہ خفیہ کاروباری معاہدوں میں استعمال کی جا رہی ہے۔

ملک میں کالے دھن کو مختلف طریقوں سے پھیلایا جاتا ہے، چنانچہ جس قدر اس کے پھیلانے کے مختلف طریقے نکالے گئے ہیں، اسی قدر طریقے اس کے کمانے کے بھی ہیں۔ یہ نمبر ۲ کا کھاتہ کہلاتا ہے۔ مثلاً سونے کی اسمگلنگ، ہیروں اور سامانِ تعیش کی اسمگلنگ، غیر ملکی کرنسی سے متعلق غیر مجاز لین دین، کمیاب اشیا کی جمع خوری کے خیال سے خرید، سٹہ بازی، ناجائز نفع خوری، چور بازاری وغیرہ۔ غیر قانونی طور پر کوٹے کی خریداری پر بھی یہ رقم خرچ کی جاتی ہے۔ اس سے خفیہ کمیشن، رشوت، مقدمہ بازی وغیرہ کے لیے روپیہ دیا جاتا ہے۔ صنعتی امن قائم کرنے، الیکشن کے اخراجات نپٹانے اور سیاسی پارٹیوں کے لیے عطیات بھی اسی مد سے دیے جاتے ہیں۔ ناجائز ہنڈی کے قرضوں، متوسط اور غیر متوسط املاک کی خریداری، زیورات، ہیرے، جواہرات، ٹیکس سے مبرا سرکاری تمسکات کی خریداری، ہندوستان اور غیر ملکی بینکوں میں رقوم کو فرضی ناموں سے جمع کروانا وغیرہ اس مد سے ہوتا

ہے ۔ رہائش پر بے پناہ مصارف، فضول خرچی، شادی بیاہ پر غیر معمولی اخراجات وغیرہ بھی کالے دھن سے ہوتا ہے۔

ایک حالیہ مطالعے کی روشنی میں جو کہ کالے دھن اور فاضل کاروبار کے سلسلے میں کیا گیا، یہ معلوم ہوا کہ ۷۹-۱۹۷۸ء میں کالے دھن کی میزان ۴۶۸۶۶٫۸ کروڑ روپے اور سرکاری مجموعی قومی آمدنی میں اس کا تناسب ۴۸٫۸ فیصد ہے، درج ذیل گوشوارہ کالے دھن کے بے پناہ اضافے کو واضح کرتا ہے۔

بہت سے طریقے ہیں، مثلاً یہ کہ چیک، فنڈ اور مختلف طرح کی سٹہ بازاری۔

سنچایتا انوسٹمنٹس کے مقدمے میں جو کہ سپریم کورٹ میں تھا، یہ بات سامنے آئی کہ بینک کی سہولتوں کو کالے دھن کے لیے کس طرح آزادانہ طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ اکونومک اور پولیٹیکل ویکلی نے خبر دی کہ سنچایتا کے ایک حصہ دار کے گھر کی تلاشی سے منجملہ دیگر اشیاء کے ایک پاس بک ملی جو کہ کلکتہ میں سنڈیکیٹ بینک کی گریہٹ برانچ کی تھی۔ یہ جعلی نام سے تھی اور

سال	کالے دھن کی میزان (کروڑ روپے میں)	سرکاری مجموعی قومی آمدنی سے اس کا تناسب
۶۸-۱۹۶۷	۳,۰۳۴٫۴	۹٫۵
۷۳-۱۹۷۲	۱۵,۱۹۵٫۵	۳۱٫۸
۷۴-۱۹۷۳	۱۵,۸۹۴٫۹	۲۷٫۰
۷۵-۱۹۷۴	۱۴,۵۱۸٫۱	۲۰٫۸
۷۶-۱۹۷۵	۱۸,۴۵۰٫۹	۲۵٫۴
۷۷-۱۹۷۶	۳۰,۰۱۴٫۲	۳۹٫۴
۷۸-۱۹۷۷	۳۴,۳۳۵٫۲	۳۹٫۵
۷۹-۱۹۷۸	۴۶,۸۶۶٫۸	۴۸٫۸

مندرجہ بالا اعداد و شمار کی روشنی میں کالے دھن کا اندازہ ۸۲-۱۹۸۱ء میں ۱۴ ہزار کروڑ روپے ہے۔

بہت سا کالا دھن بنکوں میں رکھا جاتا ہے۔ قومی ملکیت کے بنکوں میں بھی بہت سا کالا دھن ہوتا ہے۔ جو کہ فرضی ناموں سے ہوتا ہے، اس سلسلے میں اکثر بنک والوں اور فرد متعلقہ کے درمیان ایک مفاہمت ہوتی ہے۔ بنکوں کو بھی کھاتوں میں جمع شدہ رقوم میں اضافہ دکھانا ہوتا ہے۔ کھاتوں میں جمع شدہ ان رقومات سے بنکوں سے جائز طور پر قرضہ لیا جاتا ہے۔ اس طرح کالا دھن، سفید دھن کو کھینچنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے نا کہ اس سے کالے دھن میں مزید اضافہ ہوتا ہے۔ کالے دھن سے روپیہ کمانے کے اور بھی

اس میں ۲۰ کروڑ روپے کی رقم تھی۔ (ملاحظہ کیجئے ۱۳ر فروری ۱۹۸۲ء کا شمارہ) سپریم کورٹ کے چیف جسٹس مسٹر وائی وی چندر چوڑ نے لکھا کہ "فرم کے حصہ دار راتوں رات کروڑ پتی بن گئے۔ ۱۹۷۵ء میں ان میں سے کچھ کلرک تھے، یا کیمسٹ لیکن آج وہ ایسی املاک کے مالک ہیں کہ کوئی شہزادہ بھی ان کو دیکھ کر شرما جائے۔ اس طرح تیزی سے اور آسانی سے امیر بن جانے کو بجا طور پر چیتھڑوں سے امارت کی جانب" کہا جا سکتا ہے کہ فرم نے اس بڑی دولت اور رقم کو کالے دھن کی گردش اور کالے دھن سے کالا

دھن پیدا کرنے کے طریقے پر حاصل کیا، کمپنی نے ۴۸ فیصد سالانہ کی شرح سود ادا کرنے کی پیشکش کی اور ملک میں غالب پارٹی کو دل کھول کر عطیات فراہم کئے۔

جائز معیشت کی طرف آتے ہوئے ۸۰-۱۹۷۹ کی آمدنی ٹیکس تشخیص کے اعداد و شمار کی روشنی میں ایک ہزار روپے سے زیادہ آمدنی والوں کی تعداد ۲۰ لاکھ کے لگ بھگ رہی۔ اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ بہت سے وہ لوگ ہیں جنھوں نے اپنی حقیقی آمدنی چھپائی ہے، اور اس لیے وہ ٹیکس ادا کرنے والوں کے زمرے میں نہیں آتے، تو بھی یہ تعداد دوگنی ہو سکتی ہے گویا کہ ۴۰ لاکھ۔ یعنی ۷۰ کروڑ کی آبادی میں ۴۰ لاکھ افراد۔ بچوں کی تعداد اور کام نہ کرنے والی عورتوں اور کام نہ کرنے والے مردوں کی تعداد کو نکال کر ملک میں کام کرنے والی افرادی قوت آبادی کی نصف تعداد سے بھی کم ہے یعنی ۳۵ کروڑ اور کام کرنے والی افرادی قوت کا صرف ایک فی صد انکم ٹیکس ادا کرتا ہے۔ اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ بڑے بڑے شہروں کی آبادی میں اشیائے صارفین کا جو انبار لگا ہے، وہ اس محدود طبقے کے لیے ہی ہے۔ اس ضمن میں غیر محسوب کالے دھن کے اثرات کو سمجھا جا سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ قومی مجموعی آمدنی اقتصادی سرگرمی کی اصطلاح میں پوری آبادی پر تقسیم کی جاتی ہے، مگر حقیقت یہ ہے کہ ۵۰ فی صد کے لگ بھگ آمدنی چند سو ہزار نفوس کے ہاتھوں میں ہے۔ اور اس کی تقسیم اور گردش فیصلہ کرنے والے مقامات یا سماجی خدمت کے مراکز پر ہوتی ہے مگر اس کے باوجود ظاہری دکھاوے اور غیر ضروری سامانِ تعیش پر خرچ کرنے کے واسطے کافی فاضل رقم ہوتی ہے۔ چنانچہ نام و نمود اور پانچ ستاروں والی ثقافت کے غیر معمولی اخراجات اسی کالے دھن کی بدولت ہیں۔ اس نے پوری معیشت کو اپنی گرفت میں لے رکھا ہے اور سماج کا

پیسہ تانا بانا اور زندگی کا ڈھیر اور تمام اقدار اس کے تابع ہو کر رہ گئی ہیں۔

تیس سال کی منصوبہ بندی کا یہی نچوڑ ہے لیکن اس سکے کا دُوسرا رُخ بھی ہے۔ یعنی منصوبہ بندی کے ذریعے حاصل کی گئی کامیابیاں خاص کر پبلک سیکٹر اداروں کے توسط سے حاصل شدہ کامیابیاں۔ یہ ہندوستان کی اقتصادی معیشت میں ریڑھ کی ہڈی ہیں اور ان میں عوام کا روپیہ لگایا گیا ہے۔

پبلک سیکٹر :- اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ پبلک سیکٹر کی صنعتوں میں طویل المدتی بنیادوں پر سرمایہ کاری کی ضرورت ہوتی ہے۔ ان کے ذریعے صرف بنیادی ضرورتوں کی تکمیل ہی نہیں ہوتی بلکہ نوعِ انسانی کی بہبود سے سرگرمیوں کی سرمایہ کاری بھی ہوتی ہے۔ مثلاً یہ کہ تعمیر مکانات کی سرگرمیاں، کسی بھی سیکٹر میں موثر انتظامیہ کو کچھ مسلمہ اصولوں اور پیمانوں کو تسلیم کرنا پڑتا ہے اور کچھ عرصہ گزرنے کے بعد سرمایہ کاری پر مناسب نفع کی توقع ہوتی ہے۔ نہ معلوم کس طرح پبلک سیکٹر کی صنعتوں میں یہ تاثر قائم ہو گیا ہے کہ انھیں کسی طرح کے نفع بخش نتائج دکھانے کی ذمہ داری نہیں دکھانی ہے۔ اور معقولیت پسندی کے تحت کوئی اُصول اُن پر لاگو نہیں ہوتا اور وہ پبلک سیکٹر میں ہونے کے ناطے "پوتر گائے" کی طرح ہیں اور ان پر کسی طرح کی کوئی نکتہ چینی نہیں کی جا سکتی! اس کا نتیجہ یہ ہے کہ صنعتی سرگرمی کے ابتدائی طور و طریق اپنانے کے معاملے میں بھی اس سیکٹر کی صنعتیں پیچھے رہ گئی ہیں۔ مثال کے طور پر لاگت اور پیداوار کا تناسب، تغیر پذیر اور غیر تغیر پذیر کا تناسب، صنعتوں کے لیے درکار سامان اور ان کی ذخیرہ بندی، وقت مقررہ پر پورا نہ ہونے سے اس کے لیے زیادہ وقت طلب کرنا اور اس دَوران اس کے اخراجات میں اضافہ، معیاری سامان کی حصولی سے متعلق منصوبہ بندی کی کمی، بجلی کی خرابی کے سلسلے کے ناکافی انتظامات خام مال کی حصولی کے ناقص نظام وغیرہ وہ پہلو ہیں جو بالعموم ہر صنعتی سرگرمی کے لیے درکار ہوتے ہیں مگر یہاں ان کو نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ اگر کُل سرمایہ کاری کے تناسب سے کُل منافع کو دیکھا جائے تو نفع برائے نام ہے۔

پبلک سیکٹر کے ۱۸۷ مرکزی اداروں میں ۸۲-۱۹۸۱ء میں سرمایہ کاری کی میزان ۲۱۸۹۵ کروڑ روپے تھی اور ۸۳-۱۹۸۲ء کے شروع میں یہ ۲۵ ہزار کروڑ روپے کے لگ بھگ تھی درج ذیل گوشوارے سے ان کارخانوں میں سرمایہ کاری کا پچھلے پانچ برسوں میں کی گئی، ظاہر ہوتی ہے اور ان کارخانوں سے بحیثیت مجموعی نفع یا نقصان اور ان کا کاروبار واضح ہوتا ہے۔

مندرجہ ذیل گوشوارہ ملاحظہ فرمایئے :-

گوشوارہ :- پبلک سیکٹر کے اداروں کا نقشہ (کروڑ روپوں میں)

آئٹم	۱۹۷۷-۷۸	۱۹۷۸-۷۹	۱۹۷۹-۸۰	۱۹۸۰-۸۱	۱۹۸۱-۸۲
پبلک سیکٹر کے چالو کارخانوں کی تعداد :	۱۵۵	۱۵۹	۱۶۹	۱۶۸	۱۸۷
لگایا گیا سرمایہ	۱۲۰۶۵	۱۳۹۶۹	۱۶۱۸۲	۱۸۲۰۷	۲۱۸۹۵
کاروبار	۱۸۰۲۰	۱۹۰۶۱	۲۲۳۹۰	۲۸۶۳۵	۳۶۴۴۳
سود اور ٹیکس سے قبل مجموعی منافع :	۹۱۵	۱۰۷۱	۱۲۲۹	۱۴۱۸	۲۶۷۵
ٹیکس سے قبل خالص منافع :	۱۶۰	۱۸۵	۲۲۵	۱۹	۱۰۷۴
ٹیکس کے بعد خالص منافع :	-۹۱	-۴۰	-۷۴	-۲۰۳	۴۸۵
داخلی وسیلے	۷۰۸	۹۰۶	۱۰۳۰	۱۲۲۵	۲۲۴۹
کی گئی سرمایہ کاری کے تناسب سے مجموعی منافع :	۷٫۶	۷٫۷	۷٫۶	۷٫۸	۱۲٫۲
سرمایہ کاری کی نسبت سے ٹیکس کی ادائیگی سے قبل خالص منافع کا فیصد :	—	—	—	—	۴٫۹
روزگار (لاکھوں میں)	۱۶٫۳۸	۱۷٫۰۳	۱۷٫۷۵	۱۸٫۳۸	۱۹٫۰۲

ماخذ :- اکونومک سروے ۸۳-۱۹۸۲ء صفحہ ۹۴، وزارتِ مالیات، نئی دہلی۔

صفحہ نمبر کا گوشوارہ پرائیویٹ سیکٹر کی کمپنیوں کی کارگزاری کا نقشہ پیش کرتا ہے۔ یہ ۷۸-۱۹۷۷ء سے ۸۱-۱۹۸۰ء تک کے عرصے کے لیے ہے۔

پرائیویٹ سیکٹر کی کمپنیوں کا نقشہ (کروڑ روپوں میں)

آئیٹم	۷۸-۱۹۷۷	۷۹-۱۹۷۸	۸۰-۱۹۷۹	۸۱-۱۹۸۰
پرائیویٹ سیکٹر کے اداروں کی تعداد :	۴۲۱	۴۲۹	۴۳۳	۴۳۳
سرمایہ	۷٫۲۲۲	۷٫۸۴۳	۸٫۷۰۲	۹٫۸۶۰
کاروبار	۱۱٫۱۶۱	۱۲٫۴۰۲	۱۴٫۱۴۵	۱۶٫۶۵۶
ٹیکس اور سود سے قبل مجموعی منافع :	۱٫۱۰۲	۱٫۲۸۳	۱٫۵۳۷	۱٫۷۰۲
ٹیکس سے قبل خالص منافع :	۷۴۴	۸۹۴	۱٫۱۲۱	۱٫۱۹۸
ٹیکس کے بعد خالص منافع :	۳۴۹	۴۵۳	۵۹۷	۶۹۲
داخلی وسیلے	۵۳۱	۹۴۳	۸۱۸	۹۴۹
لگائے گئے سرمائے پر مجموعی منافع کا تناسب	۱۵٫۳	۱۶٫۴	۱۷٫۷	۱۷٫۳
سرمایہ کاری کے تناسب سے ٹیکس سے قبل خالص منافع فی صد :	—	—	—	۱۲٫۱
روزگار	دستیاب نہیں	دستیاب نہیں	دستیاب نہیں	دستیاب نہیں

ریزرو بینک آف انڈیا کے بلیٹن جون ۱۹۷۹ء، جولائی ۱۹۸۰ء، اکتوبر ۱۹۸۱ء اور اگست ۱۹۸۲ء

۸۲-۱۹۸۱ کے دوران پبلک سیکٹر کے اداروں نے ۴۸۵ کروڑ روپے کا خالص منافع کمایا جو کہ پچھلے برسوں کے خالص نقصانات کے برداشت کرنے کے بعد ہوا۔ یہ رجحان یقیناً حوصلہ افزا ہے۔ لیکن اس کارگزاری کو اب تک اِتنے اداروں میں کی گئی مجموعی سرمایہ کاری سے مقابلہ کرکے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ کُل سرمایہ کاری یعنی ۲۱۸۶۵ کروڑ روپے کے مقابلے میں ۸۲-۱۹۸۱ء میں ٹیکس کی ادائیگی کے بعد خالص نفع صرف ۲۳ء۰ فیصد کی رقم واضح کرتا ہے۔ یہاں بھی اگر ہم پیٹرولیم سیکٹر کی کمپنیوں کے ۱۱ فیصد منافع کو نکال دیں جو کہ سال زیرِ تبصرہ میں ۸۸۵ روپے ہوگیا تھا۔ تو باقی پبلک سیکٹر کے اداروں کو شاید ہی کوئی مشکل سے فائدہ ہوا ہو۔

البتہ پبلک سیکٹر میں محنت کش طبقے کا ۱۲ فیصد برسرِکار ہے اور مجموعی قومی آمدنی کا ۳ فی صد اس میں سرمایہ لگا ہے اور پورے ملک میں پبلک سیکٹر سے پیدا شدہ مجموعی قومی آمدنی کا تقریباً ۲۰ فی صد سرمایہ لگا ہے۔ ۷۷-۱۹۷۳ء میں پبلک سیکٹر کے اداروں کی تعداد ۱۲۰ تھی جو بڑھ کر ۸۲-۱۹۸۱ء میں ۱۸۷ ہوگئی اور ان اداروں کے مجموعی مستقل اثاثہ جات میں ۱۸ فیصد سالانہ کے حساب سے اضافہ ہوا۔ اس عرصے میں بحیثیت مجموعی صنعتی پیداوار کے فی صد سالانہ کے حساب سے بڑھی۔ تمام کارخانوں کی مجموعی فروخت کا ایک تہائی حصہ پٹرولیم کمپنیوں کا مرہونِ منت ہے اور اس میں اس عرصے میں ۱۶ فیصد اضافہ ہوا۔ مرکزی حکومت کے اداروں میں نفع کمانے کی صلاحیت کا رجحان روبہ زوال ہے ——

پبلک سیکٹر اور پرائیویٹ سیکٹر میں سرمایہ کاری پر منافع سے متعلق ایک تصویر درج ذیل گوشوارہ سے ظاہر ہے۔ اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ پبلک سیکٹر کے کارخانوں میں سرمایہ کاری پر نفع پرائیویٹ سیکٹر کی بڑی کمپنیوں کے مقابلے کم ہے۔

۷۸-۱۹۷۷ء اور ۸۰-۱۹۷۹ء کے دوران پبلک سیکٹر کے کارخانوں میں سرمایہ کاری پر نفع تیزی سے گھٹا جب کہ اس عرصے میں پرائیویٹ کمپنیوں کا منافع بڑھا۔ درج ذیل گوشوارہ پبلک اور پرائیویٹ سیکٹر کی کمپنیوں میں سرمایہ کاری کے نفع کو ظاہر کرتا ہے۔

(خالص منافع جو شیئر ہولڈروں کے فنڈ کے تناسب سے ٹیکس کے بعد ہوا۔

(سرمایہ + ریزرو)

سال	مرکزی سرکار کے غیر محکمہ جاتی اور تجارتی کارخانے	پرائیویٹ سیکٹر کی بڑی کمپنیاں (فیصد)
	(فیصد)	
۷۶-۱۹۷۵	۲٫۶	۸٫۲
۷۷-۱۹۷۶	۳٫۲	۷٫۹
۷۸-۱۹۷۷	-۱۴٫۰	۸٫۸
۷۹-۱۹۷۸	-۰٫۶	۱۲٫۶
۸۰-۱۹۷۹	-۰٫۹	۱۲٫۱

ہندوستانی معیشت کی جانچ اور پرکھ کا مرکز۔ اگست ۱۹۸۱۔ ہندوستانی معیشت میں پبلک سیکٹر

پبلک سیکٹر کے اداروں کی کارگزاری کی صحیح صحیح جانچ کے لیے کُل سرمائے پر حاصل شدہ کل منافع کو دیکھنا چاہیئے۔ کُل منافع سے مُراد ہے کہ سود اور ٹیکسوں کی ادائیگی سے قبل حاصل شدہ رقم اور کُل سرمائے سے مُراد ہے کہ زیرِ عمل سرمایہ جاتی کاموں کو خارج کرکے خالص

مستقل اثاثہ جات مع چالو سرمایہ لگائے گئے سرمائے پر کل منافع ۷۶ - ۱۹۷۵ء میں ۶ء ۷ فی صد تھا جو بڑھ کر ۷۷ - ۱۹۷۶ء میں ۴ء ۹ فی صد ہو گیا اور اس کے بعد گھٹ کر ۷ء ۰ فیصد رہ گیا۔ اگر ٹیکسوں کی ادائیگی کے بعد خالص نفع دیکھا جائے تو پتہ چلے گا کہ پبلک سیکٹر کے کارخانے نقصان میں چل رہے ہیں۔ ۸۲ - ۱۹۸۱ء کے علاوہ باقی دونوں میں نقصان کی صورت حال واضح ہے۔ پبلک سیکٹر کے ۱۸۷ کارخانوں میں ۱۰۷ نے ۸۳ - ۱۹۸۲ء میں ۱۲۹۷ کروڑ روپے کا نفع کمایا اور باقی ۸۰ نے ۸۱۲ کروڑ روپے کا نقصان اُٹھایا۔ جس سے خالص نفع ۵ء ۴ کروڑ روپے ہوا۔ لگائے گئے سرمائے پر کل نفع کا تناسب جو کہ پچھلے دنوں ۶ء ۰ فی صد اور ۸ء ۰ فی صد کے درمیان رکا ہوا تھا، اس میں ۸۲ - ۱۹۸۱ء میں سدھار ہوا اور وہ ۲ء ۱۲ فی صد ہو گیا۔ ۸۳ - ۱۹۸۲ء میں اس میں مزید بہتری کی اطلاعات ہیں۔ اس عمل کو صلاحیت کے بھرپور استعمال کے ذریعے ممکن بنایا جا سکا اور ان کارخانوں کو ان کی مصنوعات کی مناسب قیمتیں دلائی گئیں۔

پبلک سیکٹر میں مستقل اثاثہ جات کی تشکیل کے لیے سرمایہ کاری بھی غور و خوض چاہتی ہے۔ پبلک سیکٹر میں داخلی وسائل پیدا کرنے کی صلاحیت پرائیویٹ سیکٹر کے مقابلے کم ہے۔ اس لیے پبلک سیکٹر کو خارجی وسائل پر انحصار کرنا پڑتا ہے۔ (خارجی وسائل میں لقدی کے لیے شیئروں کے ذریعے حاصل شدہ سرمایہ، منڈی کے قرضے، وغیرہ شامل ہیں۔) مرکزی پبلک سیکٹر اداروں میں ۷۶ - ۱۹۷۵ء سے ۸۰ - ۱۹۷۹ء تک مجموعی مستقل اثاثہ جات کی تشکیل کی غرض سے سرمایہ کاری سے واضح ہوتا ہے کہ ۳۶ فی صد داخلی وسائل سے اور ۶۴ فی صد خارجی وسائل سے لگایا گیا لیکن جہاں تک پرائیویٹ کارپوریٹ سیکٹر کا تعلق ہے وہ بڑی کمپنیوں کے معاملے میں اور ہی تصویر پیش کرتا ہے یعنی اسی عرصے میں انھوں نے ۸۱ فیصد داخلی وسائل سے اور ۱۹ فیصد خارجی وسائل سے سرمایہ لگایا۔

البتہ وسائل کو داخلی اور خارجی وسائل کی مدد سے مہیا کرنے کے سلسلے کی جو وضاحت کی گئی ہے، وہ یہ ظاہر کرتی ہے کہ داخلی وسائل کے لیے ضروری نہیں کہ وہ اس طرح کے مہیا کردہ وسائل پرائیویٹ سیکٹر میں لگا دیں۔ پرائیویٹ سیکٹر میں نفع کا دوبارہ بطور سرمایہ کاری صرف کرنا داخلی وسائل پیدا کرنے کے ہم معنی نہیں ہے۔ موجودہ کمپنیوں میں جو نفع کمایا جاتا ہے، اسے ہمیشہ ہی نئی کمپنیوں میں سرمایہ کی فراہمی کے لیے استعمال نہیں کیا جاتا۔ موجودہ نفع کی رقم دیگر مقاصد کی تکمیل کے لیے کام میں لے لی جاتی ہے۔ اسی وجہ سے کالا دھن پیدا ہوتا ہے۔

دونوں سیکٹروں کے فرق کو واضح کیا جا سکتا ہے۔ ایسا کرنے کے لیے پبلک سیکٹر اور پرائیویٹ سیکٹروں کے دائرہ کار پر نظر دوڑانی ہوگی۔ پبلک سیکٹر بھاری سامان کی تیاری میں مصروف ہے۔ وہ مشینری تیار کرتا ہے اور صنعتی ترقی کے لیے بنیادی ڈھانچہ فراہم کرتا ہے۔ پبلک سیکٹر کے کارخانوں میں اشیاء کی قیمتوں کا تعین بحیثیت مجموعی اقتصادی ترقی کے فوائد کے اغراض و مقاصد کو سامنے رکھ کر کیا جاتا ہے — ایسا کرتے وقت منصوبے کی ترجیحات کو سامنے رکھا جاتا ہے۔ اس سیکٹر میں قیمتیں محض نفع کی بنیاد پر ہی نہیں ہوتیں۔ اس سے مقابلتاً کم نفع ملتا ہے اور داخلی وسائل کے لیے زیادہ رقم ملتی ہے اس کے برعکس پرائیویٹ کارپوریٹ سیکٹر میں اشیائے صارفین تیار ہوتی ہیں، نیم منصوعہ مال تیار ہوتا ہے۔ انھیں بہت سی مراعات حاصل ہوتی ہیں اور غیر ملکی منڈیوں میں مقابلے کی سکت پیدا کرنے کے لیے بہت سی مراعات دی جاتی ہیں۔ پرائیویٹ سیکٹر میں تیار کردہ اشیاء کی نفع بخش قیمتیں حاصل ہوتی ہیں اور اس کی وجہ سے ان کی نفع کمانے کی صلاحیت زیادہ ہوتی ہے۔

پبلک سیکٹر میں تیار کردہ مصنوعات اور خدمات سے پرائیویٹ سیکٹر کو نفع ہوتا ہے۔ یہ ایسے گوشوں کے سامان تیار کرتا ہے جہاں کر اشیائے صارفین کی مانگ زیادہ ہوتی ہے اور یہ سامان ایسے لوگوں کے لیے کام میں آتا ہے جن کی آمدنی زیادہ ہے۔ پرائیویٹ سیکٹر اقتصادی طور پر خوشحال طبقے کی ضرورتوں کا سامان تیار کرتا ہے، جبکہ پبلک سیکٹر عام آدمی کے لیے کارآمد اشیا تیار کرتا ہے۔ ان کے ذریعے بحیثیت مجموعی اقتصادیات کا ڈھانچہ تقویت پاتا ہے۔ لہٰذا پبلک سیکٹر کے فاضلات کی صورت حال اس پس منظر میں ہی دیکھنی چاہیے۔ ہماری اقتصادی ترقی کی راہ میں یہ ایک اہم عنصر ہے۔ ان کارخانوں میں نفع کمانے کی کمتر صلاحیت کی بڑی وجہ یہ ہے کہ ان کی صلاحیت کا پورا پورا استعمال نہیں ہو پاتا۔ کچھ کارخانوں میں تو اس صلاحیت کا استعمال ۸۲ - ۱۹۸۱ کے دوران ۴ فیصد سے بھی کم رہا۔

اس لحاظ سے پبلک سیکٹر کے اداروں کی کارگزاری بڑھانے کی بڑی گنجائش ہے تاکہ ان کے ذریعے فاضل رقوم مہیا کی جا سکیں اور بحیثیت مجموعی اقتصادی نظام مستحکم ہو سکے۔ ★

قومی یک جہتی وقت کی اہم ضرورت

• وہی شخص سچا مسلمان یا سچا ہندو ہے، جس کی نیت شک و شبہ سے بالاتر ہے۔

سنت ملوک داس نے کہا ہے کہ میرے لیے جو غیر مرئی روحانیت ہے، وہی اللہ ہے، جو برہم ہے وہی خالق ہے، وہی خدا ہے۔ مجھے تو فرق نظر نہیں آتا، فرق تو مایا سے پیدا ہوتا ہے۔ رام میری جان ہیں۔ رحمان میرے دین اور ایمان ہیں۔ میں تو اب سارا فرق بھول گیا ہوں۔

الکھ اللہ، برہم خالق خدا ہے ایک
میرے تو ابھید بھاؤ مایا متی کھوئی ہے

رام میرے پران رحمان میرے دین ایمان
بھول گیو بھیا سب لوک لاج دھوئی ہے

مہاتما گاندھی نے تو اتحاد و یک جہتی کی خاطر بڑی قربانیاں دی ہیں۔ ان کا کہنا تھا کہ :-

• مذاہب انسان کو علیحدگی نہیں سکھاتے بلکہ یک جہتی کا درس دیتے ہیں۔

• تمام مذاہب کی ایک ہی منزل ہے۔

اُنھوں نے نہ صرف ملک کی آزادی کے لیے جدوجہد کی تھی، بلکہ تمام مذاہب سے تعلق رکھنے والے بھارتیوں کی فلاح و بہبود اور یک جہتی کے لیے بھی تاریخ ساز اور مثالی کام انجام دئے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انھیں بابائے قوم یا راشٹر پتا کہا جاتا ہے۔ آج راشٹر پتا کے بتلائے ہوئے راستوں کو نظرانداز کرکے نفرت و حقارت کی خار دار راہوں کا تعین کیا جا رہا ہے۔ ہم ان کی تصاویر کو اپنے گھروں کی زینت تو بنا چکے، مگر ان کے پیغام کو فراموش کر دیا۔ سال میں ایک مرتبہ دو منٹ کی خاموشی اختیار کرکے ہم نے یہ سمجھ لیا کہ چلو راشٹر پتا کو خراج عقیدت پیش کر دیا گیا ہے۔ مگر یہ نہیں دیکھا کہ فسادات میں متعدد انسانوں کے قتل سے راشٹر پتا کی روح پر کیا گذر رہی ہوگی۔ کیا ہم اس طرح کے قتل و خون کو روک کر راشٹر پتا کی آتما کو شانتی نہیں پہنچا سکتے۔ کیا ہمارے لیے یہ کام اہم نہیں ہیں؟۔ ہم اپنے درمیان خلیج حائل کرکے آخر کس بھگوان یا خدا کو خوش کرنا چاہتے ہیں۔ کبیر نے سچ ہی کہا ہے۔

• اگر اللہ مسجد میں رہتا ہے تو باقی دُنیا کس کی ہے، اگر رام ایک مندر کی محض مورتی میں رہتا ہے، تب وہ کون ہے جو مورتی کے باہر کا کاروبار چلا رہا ہے۔

ہم سب کو آخر کیا ہو گیا ہے، ہم یہ کیوں بھول گئے ہیں کہ انسان سے محبت ہی خدا یا بھگوان کی محبت ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ ہم نے خدا یا بھگوان کو سمجھا ہی نہ ہو؟ سجدہ یا پُوجا کرکے ہم یہ سمجھ رہے ہیں کہ خالق ہمارے اس عمل سے خوش ہو گیا ہوگا؟ اگر ایسا ہی ہے تو یہ ہماری بڑی بھول اور بے وقوفی ہے۔ سچ یہ ہے کہ بے وقوفوں اور بھولنے والوں کا کوئی مذہب نہیں ہوا کرتا۔ یہ جو مذہب کے نام پر کھیل ہو رہا ہے، اُسے "احمقوں کی آرزو" ہی کا نام دیا جا سکتا ہے۔ کیوں کہ وہ اس خوش فہمی میں مبتلا رہتے ہیں کہ اس طرح خدا یا بھگوان کو خوش کیا جا رہا ہے۔ حالاں کہ بات ایسی نہیں ہوتی! بھلا خالق اپنی مخلوق کے قتل پر کس طرح خوش ہو سکتا ہے؟ کیا کوئی انسان اپنے بنائے ہوئے گھر کو تباہ کرکے مسرت حاصل کر سکتا ہے؟ کیا کوئی مصور اپنی بنائی ہوئی تصویر کے ٹکڑے کرکے خوشی محسوس کر سکتا ہے؟ کیا کوئی صانع اپنی مصنوعات کو بگاڑ کر مسرور ہو سکتا ہے؟ اگر ایسا نہیں ہو سکتا ہے تو پھر وہ رب، وہ خالق، وہ بھگوان، وہ پرماتما کس طرح خوش ہو سکتا ہے؟۔

یہ سیدھی سادی بات بھی لوگوں کی سمجھ میں کیوں نہیں آتی؟ دراصل اشتعال دلا کر لوگوں کے جذبات سے کھیلنا بظاہر آسان بات نظر آرہی ہے۔ عقل کے اندھے جب میر کارواں بن جاتے ہیں تو وہ اپنے پیروکاروں سے اسی قسم کے کام لیتے ہیں۔ اُنھیں نفرت کی تعلیم دی جاتی ہے، تشدد کا راستہ دکھایا جاتا ہے، ان کے ذہنوں کو آہستہ آہستہ پلٹا جاتا ہے اور ہمنوائی کی ساری تدبیریں کرلی جاتی ہیں۔ بالآخر آگے چل کر لوگ جذباتی انداز میں سوچنے کے عادی ہو جاتے ہیں۔ ماحول بن جاتا ہے اور معمولی سی بات کا بتنگڑ بنا کر نفرت کے یہ سودائی اپنے عزائم کو عملی جامہ پہنانا شروع کر دیتے ہیں۔ اسی کو آج ہم عوامی زبان میں "فساد" کہتے ہیں۔

اس طرح یہ معلوم تو ہو گیا کہ فساد کس طرح اور کیوں ہوتے ہیں۔ اب آیئے ملک پر ان فسادات کے اثرات کا ایک جائزہ بھی لے لیں۔ فسادات درحقیقت ملک کے ماتھے کا ایک بدنما داغ ہیں۔ ان سے نہ صرف ترقی رک جاتی ہے بلکہ جب جب فساد ہوتے ہیں، مُلک کئی برس پیچھے چلا جاتا ہے۔ ساری دُنیا میں فسادات کی وجہ سے ہمارا وقار متاثر ہو رہا ہے، باہر کی دُنیا سوچتی ہوگی کہ ہندوستان جسے جنت نشان بھی کہتے ہیں، اور جہاں "اہنسا اور عدم تشدد" کے گُن گائے جاتے ہیں، کیا وہاں ایسے کچھ درندے، جاہل، اور بے وقوف بھی رہتے اور بستے ہیں کہ ایک دُوسرے کی تکا بوٹی نوچنا جن کا مشغلہ ہے۔

ان احساسات کا ہمارے پاس کوئی جواب نہیں ہے۔ لہٰذا اگر ہم اپنے ملک سے پیار کرتے ہیں، اس کی ترقی سے دلچسپی رکھتے ہیں، اس کی نیک نامی کو برقرار رکھنا چاہتے ہیں تو پھر پہلے ایک سچا محب وطن بننا ہوگا۔ سچا محب وطن ایک اچھا انسان ہی ہو سکتا ہے۔ اچھا انسان وہی ہو سکتا ہے جس کا عقیدہ "جیو اور جینے دو" پر ہو، شیخ سعدیؒ نے کہا تھا:-

• آدمی کو اچھی بات سیکھنی چاہیئے خواہ وہ دیوار پر ہی کیوں نہ لکھی ہو۔

Regd. No. D(DN) 985
R.N. 97032/81
Licensed U(DN) to post without pre-payment at Civil Lines Post Office, Delhi-110 054.
Vol. 4 No. 14 YOJANA (URDU) 16-31 October, 1984

انوار انصاری

المونیم کی صنعت

بلا مبالغہ موجودہ دَور میں زندگی کے ہر شعبے میں المونیم کی ضرورت شدّت کے ساتھ محسوس کی جانے لگی ہے۔ ماہروں کا کہنا ہے کہ المونیم کے چار ہزار فوائد ہیں اور اس کا استعمال مختلف طریقوں سے کیا جاتا ہے۔ حکومتِ ہند کی ایک رپورٹ کے مطابق آنے والا دَور ہلکے دھات کے استعمال کا دَور ہوگا۔ چنانچہ اسی رپورٹ کے مطابق آئندہ برسوں میں المونیم کا مستقبل درخشاں ہونے کی قوی اُمید ہے۔

ماہروں نے المونیم کی دھات کو "عوامی دھات" سے منسُوب کیا ہے۔ المونیم کا استعمال طیّارہ بنانے، سڑکوں کی تعمیر، ریل، عمارت، پانی کے ٹینکوں اور باورچی خانے کے برتنوں میں ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ اس کا استعمال آمدورفت، جہازرانی، کیمیکل، کرافٹ اور ریڈیو میں بھی کیا جاتا ہے۔ المونیم کا استعمال غلّے کے اسٹوریج کے لیے بھی کیا جاتا ہے۔ ۱۹۴۹ء میں امریکہ کو اسٹوریج کی سخت ضرورت پڑ گئی تھی۔ اس ضرورت کو ۵۰ ہزار المونیم اسٹوریج نے پورا کیا تھا۔ اسی سال امریکہ کا ۵۰۰ کروڑ شیل غلّہ محفوظ کیا گیا تھا۔

کسی ملک کی صنعت صحیح معنوں میں اُس وقت تک ترقی یافتہ نہیں کہی جا سکتی ہے جب تک کہ اس ملک میں مختلف قسموں کی دھاتوں کا استعمال نہ ہوتا ہو۔ ہندوستان اس لحاظ سے ایک خوش قسمت ملک ہے جہاں تانبا، لوہا، سونا، چاندی، سیسہ، جستہ کے علاوہ بوکسائیٹ اور خام دھاتوں اور خام لوہے کی بہتات ہے۔ بوکسائیٹ سے المونیم نکالا جاتا ہے۔

المونیم کی صنعت کو ترقی دینے کے لیے دو چیزوں کی خاص ضرورت ہوتی ہے۔ اوّل باکسائیٹ اور دوئم Power یا بجلی۔ بوکسائیٹ کے متعلق پلاننگ کمیشن نے جانچ کرانے کے بعد یہ اندازہ کیا ہے کہ ہندوستان میں ۲۵۰ لاکھ ٹن المونیم کا خزانہ پوشیدہ ہے۔ اتنا بڑا المونیم کا خزانہ مدھیہ پردیش، اُڑیسہ، بہار، بمبئی، مدراس اور کشمیر کے علاقوں میں منقسم ہے۔ یہ بھی تخمینہ لگایا گیا ہے کہ اگر ۶۰ ہزار ٹن سالانہ المونیم کا استعمال کیا گیا تو بھی ہندوستان میں اس قدر وافر مقدار میں بوکسائیٹ کی بہتات ہے جو سَو سال کے لیے کافی ہے۔

المونیم کی صنعت کو ترقی دینے کے لیے سستی بجلی کی بھی اشد ضرورت پڑتی ہے۔ چنانچہ اس صنعت کو ترقی دینے کے لیے حکومت نے بجلی کی پیداوار میں خاطر خواہ اضافہ کیا ہے۔ حکومتِ ہند نے اس صنعت کو ترقی دینے کے لیے عام اجازت دے دی ہے۔

ہندوستان میں المونیم کی تین بڑی کمپنیاں ہیں، ان کے نام ہیں :-

۱۔ انڈین المونیم کمپنی۔
۲۔ ہیراکنڈ المونیم کمپنی، اُڑیسہ۔
۳۔ المونیم کارپوریشن آف انڈیا، آسنسول

اس کے علاوہ بہار، بنگال، بھوپال، بمبئی، مدراس، میں المونیم کی بہت سی کمپنیاں قائم ہیں جو اس صنعت کو بامِ عروج پر پہنچانے کے لیے کوشاں ہیں۔

پلاننگ کمیشن کی رپورٹ کے مطابق ۱۹۶۰ تک المونیم کی پیداوار ملک کی تمام ضرورتوں کو پُورا نہیں کرتی تھی مگر رفتارِ زمانہ کے ساتھ اس صنعت میں بھی نمایاں ترقی ہوئی ہے اور اب المونیم کی صنعت ملک کی ضرورت کے لیے خود کفیل بن چکی ہے، اور سالانہ پیداوار ۵۵ ہزار ٹن سے زائد ہونے لگی ہے۔ یہ سچ ہے کہ المونیم کی صنعت کو ایجاد ہوئے ابھی نصف صدی سے کچھ زائد عرصہ گذرا ہے۔ مگر عوام میں بڑھتی ہوئی مقبولیت کے باعث اس صنعت کی اہمیت مسلّم ہو چکی ہے۔ دُنیا کے ہر ملک میں المونیم کی مقبولیت بڑھ رہی ہے۔ موجودہ زمانے میں یہ عام رُجحان ہو گیا ہے کہ وزنی چیزوں کا استعمال کم کیا جائے۔ اس لحاظ سے المونیم کم وزنی دھات ہے اور اس سے تمام ضرورتیں پوری ہو جاتی ہیں۔

لہٰذا اس صنعت کی ترقی بہت ضروری ہو گئی ہے۔

★

Published by the Director, Publications Division, Patiala House, New Delhi-110001
Printed by Skylark Printers, 11355, Id-Gah Road, New Delhi-110055

خصوصی شمارہ

یوجنا

نومبر ۱۹۸۴
دو روپیہ

رضاکار اداروں پر گہری نظر

پروفیسر سی۔ ایچ۔ ہنومنتھ راؤ، پروفیسر راج کرشنا، ایس۔ کے۔ ڈے، مالکم ایس ادی سیشیہ، بنکر رائے، موہت سین، ڈی بندھوپادھیائے، کمل نین کابرا، نانا دیش مکھ، بھرت ڈوگرہ، الوسی، ایس پی فرننڈیز، کرشن دیو دیوان، نتیش ڈے، جے۔ بی۔ سنگھ، بکرم سرکار، مہا شویتا دیوی۔

نیا اندازِ فکر

غریبی دور کرنے کے لیے قومی سطح پر جن کوششوں کو اہم سمجھا گیا ہے، ان کے تحت کیے گئے مختلف اقدامات کی جانچ اور پرکھ کے لیے مستحکم طور پر ایک ایسا شعبہ قائم کرنا ہوگا جو کہ اس بات کا پتہ لگائے کہ منصوبہ بند ترقی کے تحت عوام کے جن طبقات کو فائدہ پہونچانا مقصود تھا، فی الواقعی انھیں کو فائدہ مِل سکا ہے اور عوامی استعمال کی اشیاء اور اثاثہ جات سے انھیں لوگوں نے فائدہ اٹھایا ہے جن کے خیال سے وہ فراہم کیے گئے ہیں۔

غریبی کم کرنے کے لیے جو مختلف پروگرام شروع کیے گئے ہیں، ان میں رضاکار اداروں کی شرکت کو زیادہ سرگرم بنانے اور انھیں اس کام میں بہت قریب سے شریک کرنے پر زور دیا جائے گا۔ اس طرح عوام کے معیارِ زندگی کو بہتر بنانے کے لیے بنیادی اشیاء کی فراہمی کے لیے جو کوششیں کی جارہی ہیں، ان میں بھی ان رضاکار اداروں اور تنظیموں کی شرکت کو یقینی بنایا جائے گا۔ غریبوں کی فلاح و بہبود کے لیے جو بھی پروگرام شروع کیے جائیں گے، انھیں تقویت دینے کی حکمتِ عملی کے طور پر یہی اندازِ نظر اپنایا جائے گا۔ ان تنظیموں کی کارکردگی کی اس لحاظ سے جانچ کی جاتی رہے گی کہ کیا غریبی دُور کرنے سے متعلق ترقیاتی پروگراموں سے سماج کے اُن طبقوں کو فائدہ ہو سکا ہے جن کے لیے وہ فی الواقعی وضع کیے گئے ہیں۔

(ساتویں منصوبے کے تئیں اندازِ نظر سے متعلق

دستاویز کا ایک اقتباس)

منصوبہ بندی اور ترقیاتی پروگراموں کی جھلک پیش کرنے والا

خصوصی شمارہ

نئی دہلی

چیف ایڈیٹر: آر۔ ٹھکرال
ایڈیٹر: لکھی رام رانا
اسسٹنٹ ایڈیٹر: محمد عادل صدیقی
سب ایڈیٹر: وسیم حیدر

جلد ۴	یکم تا ۳۰ نومبر ۱۹۸۴ء	شمارہ ۱۵، ۱۶

۱۰، اکبر روڈ تا ۱۰، گراؤنڈ فلور سمت ۱۹ ◆ فون نمبر: ۳۸۷۳۴۱

شرح چندہ:-

سالانہ ۲۰ روپے۔ ۲ سال، ۳۵ روپے۔ ۳ سال، ۵۰ روپے

فی کاپی: ایک روپیہ ؛ خصوصی شمارہ دو روپیہ

طالب علموں، اُستادوں اور لائبریریوں کے لیے ۱۰ فی صد کی رعایت

اس شمارے میں

بزنس منیجر: ایل۔ آر بترہ * اسسٹنٹ ڈائرکٹر پروڈکشن آر۔ ایس منہال

مضامین سے متعلق خط و کتابت کا پتہ
ایڈیٹر یوجنا اُردو، پبلیکیشنز ڈویژن پٹیالہ ہاؤس نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

ترسیل زر کا پتہ
بزنس منیجر، پبلیکیشنز ڈویژن پٹیالہ ہاؤس نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

تلاش کچھ سہاروں کی

کسی اچھے کام کو موثر ڈھنگ سے انجام دینے کے لیے طریقِ کار کا تلاش کرنا اور اچھے ذرائع کا پالینا کوئی آسان کام نہیں، چنانچہ کوئی بھی شخص جسے کوئی اعلیٰ ذمہ داری سونپ دی جاتی ہے، اسے مسلسل اس دشوار گذار مرحلے سے گزرنا پڑتا ہے۔ پیارے قارئین! ذرا خیال تو فرمائیں کہ اس صورتِ حال کی موجودگی میں اُن لوگوں کی تکلیف اور شدتِ احساس کا کیا ٹھکانا ہوگا، جنھیں غریبی کے دشوار ترین اور پیچیدہ مسئلے کو حل کرنے کی عظیم ذمہ داری سونپی گئی ہے۔

آج یہ مسئلہ ایک حقیقی صورت میں ہمارے سامنے موجود ہے۔ اور تمام اربابِ حل وعقد اس کے حل کرنے اور اس کے لیے وسائل کی تلاش میں بدستور سرگرداں نظر آتے ہیں۔ کمیشن جو بظاہر یہ بھاری ذمہ داری سنبھالے ہوئے ہے، اب اس طرح کی کچھ کوششوں اور مشقوں میں مشغول ہے۔ لہٰذا اب مسئلہ یہ ہے کہ دیہی عوام کی جلد مدد کی جائے اور اس طرح بیس نکاتی پروگرام کے تحت مقرر کردہ نشانے پورے کیے جائیں۔ وہ اپنی بے شمار خامیوں کی موجودگی میں اُس قوت اور طاقت سے کام نہیں کر سکتا جو دورِ حاضر میں اس مسئلے کے حل کے لیے درکار ہے۔ چنانچہ مسئلہ یہ ہے کہ ایسے وسائل کی نشاندہی کی جائے اور پھر انھیں گلے لگایا جائے جنھیں اعلیٰ نظریات سے تحریک مل جائے تاکہ وہ ترقی میں معاون ثابت ہو سکیں اور دفتر شاہی نظام اپنے فرائض کو بہ سرعت اور بہ عجلت انجام دے سکے۔

اس تحقیق وتلاش کے لیے جس شعبہ پر نظر گئی ہے وہ ہیں رضاکار ادارے، ان اداروں نے گزشتہ برسوں میں بقول منصوبہ بندی کمیشن غریب طبقات کے ساتھ براہِ راست رابطہ قائم کرنے کی نئی تکنیک تلاش کی ہے اور دیہی ترقی کے بیشتر پروگراموں کی انجام دہی کے دوران پیشہ ورانہ مہارت حاصل کی ہے۔ اس طرح ان کا کام ماضی کی بہبود اور راحت پہونچانے والی سرگرمیوں سے مختلف ہے۔

یہاں تک تو یہ سب ٹھیک ہے، لیکن جب یوجنا نے اس سلسلے میں مزید معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی اور یہ جاننا چاہا کہ ایسے اداروں کی صحیح صحیح نوعیت اور تعداد کیا ہے جنھیں یہ نئی عظیم ذمہ داری سونپی جا سکے تو منصوبہ بندی کمیشن نے یہ کہا کہ اس سلسلے میں کوئی نپا تُلا جواب دینا ممکن نہیں۔ اس کے لیے زیادہ انحصار اس پر کرنا پڑے گا کہ مختلف رضاکار اداروں نے گھریلو انداز کی ضرورتیں پوری کرنے والے پروگراموں پر عمل درآمد کے دشوار کام سے خود کو کس قدر وابستہ کیا ہے۔ نیز یہ کہ انھوں نے اپنی خدمات سے مقامی انتظامیہ اور ان لوگوں میں جن کو فائدہ پہنچانے کے لیے انھوں نے کام کیا ہے، کس قدر اعتماد حاصل کیا ہے۔ یہ ایک جاری وساری رہنے والا عمل ہے۔ البتہ ماضی کی کارگزاری کی بنیاد پر انھوں نے جو اعتماد قائم کیا ہے ابتدائی مرحلے میں اُن کے انتخاب میں وہی ایک بڑا عنصر بن سکے گا۔

اس طرح کی کوشش اس وقت کسی لائق ثابت ہوگی جبکہ ہر ریاست میں کم سے کم ایک درجن رضاکار ادارے اس کام کو آگے بڑھانے کے لیے مل سکیں۔ لیکن جیسا ہم سمجھتے ہیں کہ شاید یہ بھی مشکل ہوگا۔ اس کے بارے میں اُن لوگوں سے بات چیت سے جو کہ پہلے سے اس کام سے وابستہ ہیں، یہ پتہ چلتا ہے کہ پورے ملک میں حقیقی طور پر سود مند اس طرح کے اداروں کی شناخت کے لیے اگر پوری کوشش بھی کی جائے تو بھی شمار کرنے کے باوجود شاید وہ دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کے برابر بھی نہ ہو پائیں۔ اور کہاں یہ کہ ہر ریاست میں بارہ ادارے۔

اگر صورتِ حال یہ ہے تو پھر یہ ایک سراب ہے اور سراب کے پیچھے دوڑنے سے کیا فائدہ۔ یہ بالکل سچ ہے کہ ہمارے درمیان کچھ ایسی ہستیاں ہیں جنھوں نے خود کو اس کاز کے لیے وقف کیا ہے اور جو اس طرح کے اداروں کی سرگرمیوں کی رہنمائی کر رہی ہیں، لیکن آج

یکہ حالات میں اسی طرح کی سرگرمیاں کسی نہ کسی شخصیت کے گرد گھومتی ہیں۔ ایسی صورت میں کیا اس مشق سے کسی نتیجے کی امید رکھنا مفید ہوگا۔ بہرصورت جیسے جیسے ہم اس پر عمل پیرا ہوتے ہیں۔ اس سلسلے میں ہمارا مشورہ ہے کہ ہم ان اداروں کی تشکیل کی حقیقی نوعیت کو یقینی بنانے میں پوری احتیاط سے کام لیں۔ ان اداروں کو جن خفیہ ہاتھوں کے ذریعے مدد کی جاتی ہے کہا جاتا ہے کہ وہ کچھ ایسے طریقے ہیں جو پردۂ راز میں رہتے ہیں۔ جوں جوں ہم اس راستے پر آگے بڑھتے ہیں، ایک تکلیف دہ تصور ہمارے ذہن کو کچوکے لگاتا ہے۔ وہ یہ کہ ہم حقیقی صورتِ حالات کا مقابلہ کرنے سے کیوں ہچکچاتے ہیں اور فرضی تصورات کو بڑھاوا دینے اور انھیں عام کرنے میں کیوں مددگار ثابت ہوتے ہیں۔

نیشنل سیمپل سروے کے ۲۶ ویں دور کی رپورٹ میں غریبی کی علامات کے بارے میں جو حقائق پیش کئے گئے ہیں وہ کچھ اس طرح ہیں:- دیہات کے غریب کنبوں کی کل تعداد ۷ کروڑ ۴۸ لاکھ ہے۔ ان میں سے ۵۰ لاکھ ۶۰ ہزار کنبوں کے پاس قطعی کوئی قطعہ اراضی نہیں ہے۔ دیگر ۲ کروڑ ۶۵ لاکھ دس ہزار کنبوں کے پاس بہت چھوٹے قطعاتِ اراضی ہیں گویا کہ ایک ایکڑ سے بھی کم۔ اس طرح کل دیہی کنبوں کے ۴۴،۷۸ فیصد کنبے یعنی کہ ۳ کروڑ ۱۵ لاکھ ۷۰ ہزار کنبوں کے پاس یا تو کوئی اراضی نہیں یا اگر ہے بھی تو وہ ایک ایکڑ سے بھی کم۔

زیرِ کاشت قطعاتِ اراضی پر نظر ڈالنے سے پتہ چلتا ہے کہ ۲ کروڑ ۱۵ لاکھ دیہی کنبے وہ ہیں جو کسی قطعہ اراضی پر کاشت نہیں کرتے اور ایک کروڑ ۱۷ لاکھ کنبے ایک ایکڑ سے بھی بہت کم قطعات پر کاشت کرتے ہیں۔ اس طرح ۳ کروڑ ۳۲ لاکھ دیہی کنبے کسی قطعہ اراضی پر کاشت نہیں کرتے یا پھر ایک ایکڑ سے بھی بہت کم رقبے پر کاشت کرتے ہیں اور ان کی تعداد دیہی کنبوں کی ۴۳،۴۴ فیصد ہے۔ خواہ آپ کسی بھی طرح نظر ڈالیں، یہ واضح ہے کہ دیہی کنبوں کی ۴۵،۲۴ فیصد تعداد وہ ہے جس کے پاس یا تو کوئی اراضی نہیں یا اگر ہے بھی تو وہ بہت چھوٹا رقبہ ہے۔

اب ذرا ان قطعاتِ اراضی پر نظر دوڑائیے جو اقتصادی اعتبار سے مستحکم کہے جاتے ہیں ان کو تین زمروں میں بانٹا جا سکتا ہے، اور ہر زمرے کے تحت قطعۂ اراضی ۲ ہیکٹیر سے زیادہ ہے۔ پہلا زمرہ وہ ہے جو نیم متوسط کہلاتا ہے گویا کہ ۲ تا ۴ ہیکٹیر، دوسرا متوسط جو کہ ۴ تا دس ہیکٹیر اراضی پر مشتمل ہوتا ہے۔ باقی وہ جو کہ دس ہیکٹیر سے اوپر ہیں۔ نیم متوسط قطعاتِ اراضی ایک کروڑ ۷ لاکھ ہیں گویا کہ ۲۵،۲ فیصد قطعاتِ اراضی جو کل رقبے کے ۱۸،۵ فیصد حصے پر مشتمل ہیں۔ متوسط قطعاتِ اراضی ۱۱،۲ فیصد ہیں اور کل رقبے کے ۳۰ فیصد حصے پر مشتمل ہیں۔ اور بڑے قطعاتِ اراضی صرف ۳،۴ فیصد ہیں، جو کل رقبے کے ۳۱ فیصد حصے پر مشتمل ہیں۔ مختصر یہ کہ غریبی سے متعلق ہمارے مسئلے کی شدت کا اندازہ اس سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔

غریب کی زندگی جب اس مرحلے سے گذر رہی ہو، تو کیا اپنے منصوبہ بندی کے اپنے ماہروں سے یہ امید نہیں کرنی چاہیئے کہ وہ غریبی کے دھارے کا رُخ موڑنے کے لیے ایسی حکمتِ عملی وضع کریں جو غریبی کی شدت کے تناسب سے ہی موثر ترین ہو۔ ان حالات میں تو سماج وادی نظام حیات کے قواعد و ضوابط اور اس سے متعلق نظم و ضبط اپنانے میں ہی اس کا علاج مضمر نظر آتا ہے۔ سماجی نظام تو وہی ہے جس میں ان باتوں کی گنجائش نہیں جو آج ہم اپنے درمیان دیکھتے ہیں۔ گویا کہ متوازی کالے دھن والی معیشت چند ہاتھوں میں محدود ہو کر رہنے والی سخت قسم کی دیہی حکمتِ عملی اور ترقیاتی پروگراموں سے وابستہ بدعنوانی کا مرتکب دفترشاہی نظام۔ کیا ہم نے پہلے ہی ایک ایسا آئین نہیں اپنایا ہے، جس کی رُو سے بھارت ایک خود مختار، سماج وادی، سیکولر اور عوامی اصولوں کی پابند جمہوریت ہے۔

وقت کا تقاضا ہے کہ اس ادھورے کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے جی جان سے جُٹ جائیں کیوں کہ دلاسے تو آخر دلاسے ہی رہ گئے۔

(چیف ایڈیٹر)

پروفیسر سی. ایچ. ہنومنتھ راؤ ممبر، پلاننگ کمیشن، نئی دہلی۔

رضاکار ادارے منصوبہ بندی کمیشن کی نظر میں

یوجنا کی طرف سے پروفیسر سی ایچ ہنومنتھ راؤ سے ایک انٹرویو لیا گیا۔ یاد رہے کہ مسٹر ہنومنتھ راؤ منصوبہ بندی کمیشن کے کارکن کی حیثیت سے رضاکار اداروں کے موضوع سے وابستہ ہیں۔ اس ملاقات میں یہ جاننے کی کوشش کی گئی کہ ساتویں منصوبے میں غریبی دور کرنے کے پروگراموں پر عمل درآمد کے سلسلے میں رضاکار اداروں کو سرگرمی سے اس عمل درآمد میں جوڑنے کے بارے میں منصوبہ بندی کمیشن کا کیا خیال ہے۔ ذیل میں اس انٹرویو کا متن پیش کیا جارہا ہے۔

چیف ایڈیٹر: اشیاء اور خدمات کی فراہمی کے موجودہ نظام میں رضاکار اداروں کو سرگرمی سے جوڑنے کی ضرورت پر منصوبہ بندی کمیشن میں ایک قسم کا نیا احساس پایا جاتا ہے۔ یہ کیا بات ہے کہ اس بات کی ضرورت ساتویں منصوبے کے آغاز پر ہی محسوس کی گئی۔ جبکہ اس سے قبل اس کی ایسی ضرورت محسوس نہ کی جاسکی۔

سی ایچ ہنومنتھ راؤ: یہ کوئی نیا احساس نہیں ہے۔ دیہی ترقی اور کم سے کم ضرورتوں کو یا کم بنیادی ضرورتوں کے پروگرام کی وسعت، قدرت اور حجم اس قدر پھیلا ہوا تھا کہ یہ محسوس کر لیا گیا کہ عوام کی بھلائی، بہبود اور فائدے سے دلچسپی رکھنے والی کسی بھی تنظیم کو آگے بڑھانا چاہیئے اور اس کی ہمت افزائی کی جانی چاہیئے، تاکہ وہ ان پروگراموں پر مسلسل عمل درآمد کے لیے پوری قوت سے کام کرسکیں۔ اکتوبر ۱۹۸۲ کے شروع میں ہی وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی نے ریاستی وزارت اعلیٰ کے نام ایک مراسلے میں بیس نکاتی پروگرام پر عمل درآمد میں رضاکار اداروں کے رول کو وسعت دینے پر زور دیا تھا۔ وزیر اعظم نے یہ بھی مشورہ دیا تھا کہ ریاستی حکومتوں کو رضاکارانہ تنظیموں کے مشاورتی گروپ کے قیام پر غور کرنا چاہیئے اور اس گروپ کا صدر چیف سکریٹری یا ڈیولپمنٹ کمشنر ہونا چاہیئے۔ اس کے ارکان میں ان رضاکار اداروں کے نمائندے ہونے چاہئیں جو پہلے سے ہی دیہی ترقیاتی پروگراموں کے عمل درآمد میں مصروف ہیں گویا کہ وہ ارکان جو فی الواقعی دیہی منظر نامے میں سرگرم حصہ لے رہے ہیں۔ اس طرح کے گروپ کی گاہے بگاہے منعقدہ میٹنگوں میں سرکاری اسکیموں پر عمل درآمد کی رفتار ترقی کا نقشہ پیش کیا جانا چاہیئے اور پھر ان کے حل کے لیے کوشش کی جانی چاہیئے۔ منصوبے میں شامل پروگراموں پر عمل درآمد میں رضاکار اداروں کی خدمات کے استعمال کی ضرورت محسوس کر لیے جانے کے بعد، اس کی ضرورت محسوس کی گئی کہ اس موضوع پر ان اداروں کے ساتھ تبادلۂ خیال بھی کیا جانا چاہیئے۔

چنانچہ مئی ۱۹۸۴ میں ساتویں پنجسالہ منصوبے کے ضمن میں غریبی دور کرنے کے پروگراموں اور بنیادی ضرورتوں کی تکمیل کے پروگراموں پر عمل آوری میں رضاکار اداروں کے رول پر ایک میٹنگ بلائی گئی۔ اس میٹنگ میں مختلف شعبوں اور علاقوں میں کام کرنے والے رضاکار اداروں کے نمائندوں نے شرکت کی۔

سوال: کیا منصوبہ بندی کمیشن نے رضاکار اداروں کی کارکردگی کے مطالعے کے لیے اپنے طور پر کوئی مطالعہ کیا ہے، یا متبادل صورت میں کسی ایسے مطالعے سے فائدہ اٹھایا ہے اور اس کے بعد وہ کسی فیصلے پر پہنچا ہے۔

جواب: منصوبہ بندی کمیشن نے حال ہی میں رسمی طور پر کوئی ایسی مشق نہیں کی ہے جس سے رضاکار اداروں کے وسعت پذیر رول کو توسیع دی جاسکے۔ تاہم پروگراموں کے عمل درآمد کے جائزے میں ادارہ ہذا کے شعبے نے ۱۹۷۰ کے بعد سماجی بہبود کے کام میں رضاکار اداروں کے رول کا جائزہ لیا تھا، البتہ رضاکار اداروں کو منصوبہ بندی کے عمل کے آغاز

سے ہی اجتماعی ترقی کے پروگراموں اور دیگر پروگراموں پر عمل درآمد کے کام میں شریک کر لیا گیا تھا۔ اس طرح منصوبہ بندی کمیشن اور رضاکار اداروں کا آپسی تعلق کافی پرانا ہے۔ یہ ایک بات ہے کہ شروع کے منصوبوں میں ان کے لیے کوئی مخصوص اور واضح رول متعین نہیں کیا گیا۔ اتفاق سے پانچویں پنجسالہ منصوبے میں رضاکارانہ تنظیموں اور سماجی بہبود کے پروگراموں کے فروغ سے متعلق ایک اسکیم شامل کی گئی جس کا بظاہر مقصد دیہی ترقی کے رضاکارانہ عمل کو آگے بڑھانا تھا۔ اس کے لیے ریاستوں، مرکز کے زیر انتظام علاقوں نیز رضاکارانہ اداروں کو مالی امداد دی گئی تاکہ اس کی مدد سے عوامی اشتراک عمل کے تجرباتی اور رہنمایانہ پراجیکٹوں کی حوصلہ افزائی کی جا سکے۔ یہ اسکیم چھٹے منصوبے میں بھی چلتی رہی اور اس کے لیے ۱۰۰ لاکھ روپے کی رقم مخصوص کی گئی۔

سوال: کیا اس بات کو صحیح سمجھا جائے کہ رضاکار اداروں نے اپنے طویل المدتی تجربے کے دوران ایک مقام پا لیا ہے۔ اور انھیں اس قدر طاقت اور استحکام مل چکا ہے کہ وہ حکام میں اعتماد حاصل کر سکتی ہیں۔

جواب: اس عرصے میں کچھ رضاکار اداروں نے از خود ایسی نئی تکنیک اپنائی کہ ملک کے غریب عوام پر براہ راست اثر انداز ہو سکے۔ انھوں نے ایسی پیشہ ورانہ مہارت حاصل کی جس سے کہ وہ دیہی ترقی اور دیہی عوام کی بہبود کے لیے پروگرام شروع کر سکیں۔ یہ پروگرام اِن پروگراموں سے قطعی مختلف نوعیت رکھتے ہیں جو کہ ابتدائی دور میں بہبودی سرگرمیوں یا راحت پہنچانے والے پروگرام کے نام سے جانے جاتے تھے۔

سوال: اس نئی تحریک کے سلسلے میں ریاستی حکومتوں سے کوئی مشورہ ہوا ہے؟

جواب: جی ہاں، اپریل ۱۹۸۳ء میں ریاستی وزرائے اعلیٰ کی جو کانفرنس ہوئی، جو کہ بیس نکاتی پروگرام پر عمل درآمد کے سلسلے میں بلائی گئی تھی، اس میں دیہات کی ترقی کے مربوط پروگرام، دیہات میں روزگار کے قومی پروگرام، اصلاحاتِ اراضی، کم سے کم گویا کہ بنیادی ضرورتوں کی تکمیل کا پروگرام، زرعی مزدوروں کے لیے کم سے کم اجرتوں کی ادائیگی کا پروگرام، بندھوا مزدوروں کی بحالی کا پروگرام، شیڈولڈ کاسٹ اور شیڈولڈ ٹرائب کی بہبود کا پروگرام، دیہی علاقوں میں پینے کے پانی کی فراہمی کا پروگرام، عورتوں اور بچوں کے لیے بہبود کے پروگرام، تعمیر مکانات کے لیے جگہوں کی فراہمی کے پروگرام وغیرہ سے متعلق دستاویز رکھی گئی۔ اس کانفرنس میں اس دستاویز پر عمل درآمد کے لیے غور و خوض کیا گیا۔

سوال: رضاکار اداروں کی وہ صحیح تعداد اور ان کی نوعیت کیا ہے۔ جن کو یہ نئی عظیم ذمہ داری سونپی جا سکتی ہے۔

جواب: اس کا صحیح صحیح جواب دینا مشکل ہے۔ اس کا انحصار اس بات پر ہے کہ مختلف رضاکار ادارے اس کام میں کتنا جوش و خروش اور دلچسپی دکھاتے ہیں اور ان میں سے بہت سے پروگراموں خاص کر گھریلو اشیاء، سامان اور خدمات کی فراہمی کے پروگراموں پر عمل درآمد میں وہ کس طرح پیش پیش رہنے کی کوشش کرتے ہیں۔ نیز یہ کہ وہ مقامی انتظامیہ اور پروگرام سے فائدہ اٹھانے والوں میں اپنے لیے کس قدر مقام بناتے ہیں۔ اور اپنے لیے کتنا اعتماد پیدا کرتے ہیں۔ یہ ایک جاری رہنے والا عمل ہے۔ البتہ ماضی کی کارگزاری کی بنیاد پر ان کا اعتماد ہی وہ اہم عنصر ہوگا جو ابتدا میں ان کا انتخاب کے لیے معیار بن سکے گا۔

سوال: رضاکار اداروں کو زیادہ سرگرمی سے شریک کرنے کے لیے کون کون سی سرگرمیاں کو مخصوص کیا گیا ہے۔

جواب: اس سلسلے میں بہت سی سرگرمیاں زیر غور ہیں، منصوبہ بندی کمیشن کی میٹنگ میں رضاکار اداروں نے خود یہ مشورہ دیا کہ وہ ان تمام پروگراموں میں حصہ لیں گے جو کہ غریبی دور کرنے اور بنیادی ضرورتوں کی تکمیل سے متعلق پروگرام ہیں۔ مثال کے طور پر دیہات کی مربوط ترقی کے پروگرام میں وہ ان لوگوں کے انتخاب اور ان کی نشاندہی میں مدد کریں گی، جن کو فائدہ پہنچانا ضروری ہے، یعنی کہ جو ان پروگراموں سے فائدہ اٹھانے کے مجاز ہیں۔ اس کے علاوہ مختلف ترقیاتی پروگراموں سے عوام کو واقف کرانے اور غریبوں کی بہبود سے متعلق پروگراموں کی جانکاری دینے، تجرباتی پراجیکٹوں کا مظاہرہ کرنے، ان پروگراموں میں کامیاب اور ناکام ہونے والوں کی نشاندہی کرنے، دیہی عوام کو منظم کرنے تاکہ ان کی سودے بازی کی طاقت بن سکے اور وہ منڈی کی قوتوں، اس کے اتار چڑھاؤ اور مخصوص مفادات کا مقابلہ کر سکیں، وغیرہ میں بھی ان کی طرف سے شرکت کی پیش کش کی گئی۔

سوال: ہم اس طرح کے رضاکار اداروں کی نشاندہی کس طرح کریں گے؟ کیا اس سلسلے میں ریاستی حکومتوں کی بھی کوئی آواز ہوگی۔

جواب: بنیادی طور پر یہ انتخاب ریاستی سرکاروں کا ہی کام ہے۔ رضاکارانہ تنظیموں کے موضوع پر منصوبہ بندی کمیشن کی طرف سے ایک اعزازی مشیر مقرر ہے۔ اس کی اس شعبے میں ایک اہم حیثیت ہے۔ اس نے کمیشن ہذا کی طرف سے مختلف ریاستوں کا دورہ کر کے ایسی تنظیموں کی نشاندہی کی کوشش کی ہے جو کہ غریب عوام میں رہ کر کام کرنے والی تنظیموں کی فہرست میں آ سکیں۔ اور ایسی تنظیموں کی نشاندہی کی جا سکے جو کہ ان پروگراموں پر سرگرم عمل درآمد سے حقیقی اور عملی دلچسپی رکھتی ہیں۔ اس نے اس طرح کے اداروں کی ایک فہرست مرتب کی ہے۔ یہ فہرست ریاستی سرکاروں کو بھیجی گئی ہے تاکہ وزیر اعظم کی طرف سے دیئے گئے مشورے

کی روشنی میں مشاورتی گروپ تشکیل دیئے جا سکیں گے۔ ریاستی حکومتوں کو اس میں ترمیم و تنسیخ کا اختیار ہے۔ وہ اپنی اطلاعات کی بنیاد پر ایسا کر سکتی ہیں۔

سوال: بظاہر اب ہماری تجویز یہ ہے کہ گرانٹ ان ایڈ کے تصور سے آگے بڑھا جائے جیسا کہ اب تک اس نظام کو اپنایا جاتا رہا ہے۔ کیا اب ہماری تجویز یہ ہوگی کہ مخصوص پراجیکٹوں کے لیے فنڈ مخصوص کیا جائے۔ اگر ایسا ہے تو جوابدہی کی کیا صورت ہوگی۔

جواب: ظاہر ہے کہ منصوبے میں شامل پروگراموں پر عمل درآمد میں سرگرم حصہ لینے کے لیے انھیں رضا کار اداروں کو چنا جائے گا، جنھوں نے اس طرح کی اسکیموں پر عمل درآمد میں پہلے ہی اپنی اہلیت اور صلاحیت کا ثبوت دیا ہے اور جو مقامی اخلاقیہ اور پروگراموں سے فائدہ اٹھانے والوں کی نظروں میں پہلے ہی سے معتمد ہیں۔ ان سے امید کی جاتی ہے کہ وہ سماجی طور پر ذمہ دار ہوں گے۔ البتہ ان کو جو رقومات دی جائیں گی، ان کا عام طریقے کے مطابق آڈٹ کیا جائے گا۔ "ہندوستان کی ترقی عوام کے ذریعے" نامی پروگرام کے تحت اس طرح کے بیت سے رضا کار ادارے یہ امداد پا رہے ہوں گے۔ یہ پروگرام جسے "پیپلز ایکشن فار ڈیولپمنٹ" کا نام دیا گیا ہے اور جسے مختصراً پاڈی PADI کہتے ہیں، ایک خود مختار تنظیم کی صورت میں دیہی ترقی کی وزارت کے ماتحت ہے۔ اس ادارے کے پاس ایک ایسا وسیع نظام پہلے ہی موجود ہے جس کے تحت وہ یہ یقینی طور پر جان سکتا ہے کہ فنڈ جس غرض سے دیا گیا ہے، وہ اس کے مطابق ہی استعمال ہوا ہے۔

سوال: کیا آپ ایسا نہیں سمجھتے کہ اس نئے اقدام سے یہ تاثر پیدا ہو سکتا ہے کہ ریاستی نظام اس عظیم کام میں ناکام ہوا ہے۔

جواب: یقیناً نہیں؛ اس سے صرف یہ واضح ہوتا ہے کہ ریاستی حکومتیں صورتِ حال سے زیادہ سے زیادہ قریب سے واقف ہو سکتی ہیں۔ اور رضا کار اداروں کی اضافی کوششوں سے عمل درآمد کے نظام میں معیاری طور پر یقیناً بہتری آئی ہے۔ اس سے بھی زیادہ یہ کہ دفترشاہی نظام اور رضا کارانہ ادارے کے نظام کے آپسی صحت مند مقابلے سے منصوبے میں شامل پروگراموں کی رفتارِ ترقی کو بہتر بنایا جا سکے گا۔

جیسا کہ میں نے شروع میں ہی کہا ہے کہ اس پروگرام کی وسعت اتنی زیادہ ہے کہ اس کے پیچھے تمام سیکڑوں حتیٰ کہ ان پروگراموں سے فائدہ اٹھانے والوں کی طرف سے قائم کردہ تنظیموں کی امداد اور اشتراکِ عمل ہی اس بات کو یقینی بنا سکتا ہے کہ اس محاذ پر کسی طرح کی کوئی تضییع نہیں ہے اور فی الواقعی یہ پروگرام انھیں کو صحیح معنی میں فائدہ پہنچا رہے ہیں، جن کے لیے وہ وضع کیے گئے ہیں۔ ★

بقیہ: آپ پورے طور پر ان پر بھروسہ نہیں کر سکتے

سے سیکولر اور غیر سیاسی ہونی چاہئیں۔

اگر سرکار کی پالیسی یہ بن جائے کہ ترقیاتی پروگراموں پر عمل درآمد کی ذمہ داری رضا کار تنظیموں کی ہے، تو سرکار کے لیے ضروری ہوگا کہ کم سے کم ضلع کی سطح پر ایسے افراد بھیجے اور انھیں تعینات کرے جو رضا کارانہ اداروں کی افادیت میں یقین رکھتے ہوں۔ رضا کار افراد کے انتخاب، ان کی تربیت اور ان میں کام کرنے کی اُمنگ، اور جوش پیدا کرنے کی محتاط تدابیر اختیار کرنی ہوں گی۔ اس سلسلے میں محض کسی رضا کار ادارے کا قیام ہی کافی نہ ہوگا۔ ترقیاتی پروگراموں پر عمل درآمد کی ذمہ داری صرف ایسے اداروں کو دی جانی چاہیئے جو اسی طرح کے کاموں میں عملی طور پر سرگرم ہوں۔ ایسا نہ کرنے کی صورت میں رضا کارانہ اداروں کو یہ کام سونپنے کا مقصد ہی فوت ہو جائے گا۔ اس کے علاوہ ضلع کی سطح پر ایک ایسے افسر کی تقرری ضروری ہے جو اس تمام سرگرمی پر نگاہ رکھے اور رضا کار ایجنسیوں کے کام کی پیش رفت اور ان کی رفتارِ ترقی کا جائزہ لیتا رہے۔ ★

بقیہ: رضا کار ادارے، یہ رضا کارانہ کام

نہرو صحیح معنوں میں "فردِ قلندر" تھے، ہمیں ان کی معمولی خامیوں پر بہت زیادہ شور اٹھانے کی ضرورت نہیں۔ نہرو کو مرے ہوئے اب بیس برس سے زیادہ کا عرصہ ہو گیا۔ لیکن نہرو اب بھی زندہ ہیں۔ ہم نے انھیں یوں تو بہت خراجِ عقیدت پیش کیے۔ لیکن "انسانی تعمیر" کے جس کام کو انھوں نے عزیز جانا اور جس پر وہ عمل پیرا رہے، اسے ہم نے ختم کر دیا۔ یا اس کو بالکل اکھاڑ ڈالا۔ "یہ انسانی صفات ہیں، جو کسی قوم کو عظیم بناتی ہیں" یہ تھا ان کا اصولِ حیات۔

۱۴ نومبر کو بچوں کا دن منانے کا اعلان کر کے قوم نے اس حقیقت کو تسلیم کیا۔ اور ۲۰ برس کا عرصہ انسان کو نئے سبق حاصل کرنے کے لیے کافی ہے۔ بشرطیکہ اس کے دل و دماغ پر حیوانیت نے پوری طرح قبضہ نہ کر لیا ہو۔ نہرو نے جو روشن تدبیر پیش کی تھی وہ ایک طلسم تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ رضا کارانہ عمل انسان کے اندر سے ایک جذبے کی صورت میں ابھرنا چاہیئے۔ سرکاری بوس و کنار سے اس جذبے کی موت ہو جائے گی۔ انھوں نے کئی بار اس امر پر زور دیا کہ "بادشاہ اس فقیر سے خوف زدہ ہے جو کچھ مانگتا نہیں" ماسوائے اس مقصد کے لیے جو خود اس کا جواز ہے۔ ★

انٹرویو

یہ کوشش محض بیکار ہے

پندرہ روزہ 'یوجنا' کی طرف سے پروفیسر راج کرشن سے درجِ ذیل سوالات کیے گئے:۔

۱۔ ساتویں پنجسالہ منصوبے کے تئیں اندازِ نظر سے متعلق دستاویز میں رضا کار تنظیموں/اداروں کو ان پروگراموں پر عمل درآمد میں سرگرمی کے ساتھ شریک کرنے کو کہا گیا ہے، جو کہ غریبی دور کرنے سے متعلق ہیں۔ آپ کی اس بارے میں کیا رائے ہے؟

۲۔ کیا یہ نیا اندازِ فکر اشیا کی تقسیم اور اصفات کی بہم رسانی کے موجودہ نظام کو بہتر بنانے میں کچھ کارگر ہوگا۔ اس بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

۳۔ منصوبہ بندی کمیشن کے کارکن کی حیثیت سے رضاکارانہ اداروں سے آپ کا جو واسطہ پڑا ہے، اس سلسلے میں آپ کا تجربہ کیا ہے۔ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ انھیں یہ نیا رول دینا واقعی موزوں رہے گا۔

۴۔ ایک تاثر یہ ہے کہ رضا کار ادارے بالعموم مقامی اثرات کے تابع ہیں، ان حالات میں کیا آپ سمجھتے ہیں کہ ترقیاتی پروگراموں کی مد پر خرچ کی جانے والی رقوم سے فی الواقع انھیں طبقات کو فائدہ ہوگا جن کے خیال سے وہ خرچ کی جا رہی ہیں۔

۵۔ رضا کار تنظیموں کی کارکردگی میں غیر ملکی مفادات کے عمل دخل کا چرچا اکثر سننے کو ملتا ہے۔ اس کے مضمرات کیا ہیں؟

۶۔ نئے اندازِ فکر کی رو سے رضا کار ادارے تقسیم کے موجودہ نظام کا جزوِ لازم ہوں گے۔ آپ کی رائے میں کس طرح کا انتظام اسبات کو یقینی بنا سکے گا کہ ان کی کارکردگی صحیح معنوں میں موثر ہو؟

۷۔ آج مختلف طرح کے رضاکار ادارے کام کر رہے ہیں۔ آپ کے نزدیک کون سا ادارہ فی الواقع اپنے مقاصد سے انصاف کر رہا ہے۔ اس سلسلے میں انتخاب کا طریقہ کیا ہو سکتا ہے؟

۸۔ ہمارے ملک میں مختلف ریاستوں میں مختلف سیاسی پارٹیاں نظامِ حکومت سنبھالے ہوئے ہیں۔ کیا ان کے انتخاب میں مرکز اور ریاست کا اختلاف کسی طرح اثر انداز ہوگا؟

اِن سوالات کے جوابات پروفیسر کرشنا نے دیئے، جو درجِ ذیل ہیں:۔

(چیف ایڈیٹر)

منصوبے سے متعلق حالیہ بہت سی دستاویزات میں رضا کار تنظیموں کے رول کو دیہی ترقی کے لیے ضروری بتایا گیا ہے۔ ان کے بارے میں یہ فرض کر لیا گیا ہے کہ ان کا رول تین لحاظ سے سرکاری ایجنسیوں سے بھی برتر ہے۔ ایک یہ کہ رضاکار اداروں کے کارکن غریبوں کی مصیبتوں اور پریشانیوں کو کم کرنے کے عظیم کام سے سرکاری عملے کے مقابلے زیادہ مخلصانہ اور دل جمعی سے دلچسپی لے سکتے ہیں، دوسرے یہ کہ وہ دیہی غریب عوام سے بہتر رابطہ قائم کر سکتے ہیں۔ جتنا کہ سرکاری ملازم نہیں کر سکتے تیسرے یہ کہ وہ دفتر شاہی قوانین سے بندھے ہوئے نہیں ہوتے، وہ زیادہ لچک سے کام کر سکتے ہیں۔ ان کی سرگرمیوں میں حسبِ ضرورت تبدیلی اور تال میل آسان ہے اور اس عمل کو وہ بدستور تیزی سے آگے بڑھا سکتے ہیں اور تجربہ کی روشنی میں وقتاً فوقتاً ضروری رد و بدل کر سکتے ہیں۔

لیکن بنیادی بات یہ ہے کہ دیہی ترقی سے وابستہ دفتر شاہی نظام خود مختار اداروں کے فروغ کا حامی نہیں ہے، لہٰذا یہ زیادہ تر رضاکار اداروں کے کام میں رخنہ ڈالتا ہے۔ یا پھر ان کو اپنے سخت گیر کنٹرول کے تحت لانا چاہتا ہے اور اس پر قانون اور ضابطہ پرستی کے تحت حلقۂ اثر بڑھانا چاہتا ہے۔ سرکاری مالیات کے دم چھلے کی مدد سے وہ اس کنٹرول کو برقرار رکھنا چاہتا ہے۔ چنانچہ صرف چند وہ رضاکار ادارے جو کہ اپنی مالیات کے لیے سرکاری ذرائع پر انحصار نہیں رکھتے اور جنھوں نے اپنا ایک خود مختار اور آزادانہ ڈھانچہ بنا لیا ہے۔ بس وہی خود مختاری سے کام کر سکتے ہیں۔ انھوں نے تجارتی گھرانوں کے وسیلے تک رسائی حاصل کر لی ہے جیسا کہ منت لال یا گاندھیائی فنڈ، یا عیسائی چرچ یا پھر چند غیر ملکی رضا کار تنظیمیں۔ بیشتر رضا کار ادارے خاص طور پر سرکاری مالیات پر انحصار کرتے ہیں۔ اس طرح یہ سرکاری دفتر شاہی نظام کی توسیع کا ایک جزو ہیں۔ جبکہ زیادہ تر کوآپریٹو ادارے۔

مگر ان پر سیاستدانوں اور دفتر شاہی نظام کا قبضہ نہیں ہو سکتا ہے تو دیہاتی اور مقامی سیاستدانوں نے ان کو اپنے چنگل میں لے رکھا ہے یا پھر وہ داداؤں کے ہاتھ میں ہیں جیسا کہ کوآپریٹو اداروں کے نظم و نسق کو دیکھ کر اندازہ ہو سکتا ہے۔ سرکار ان کو جو روپیہ دیتی ہے وہ ان داداؤں کے ہاتھوں خورد برد ہو جاتا ہے۔

سرکار اگر رضا کار اداروں یا تنظیموں کو امداد دینے کے لیے چنتی ہے، تو وہ دفتر شاہی نظام یا گروہانہ طرفداری کے مرتکب داداؤں کے نظام کی ہی توسیع ہے۔

یہ زندگی کی تلخ اور سچی حقیقتیں ہیں، ان حالات میں رضا کارانہ سیکٹر کے فروغ سے جو فائدے متصور کیے گئے ہیں، وہ بالعموم عملی صورت میں سامنے نہیں آئے۔ البتہ اِکا دُکا معاملات کی بات اور ہے۔

رضا کار اداروں کے جائز فروغ کے لیے درج ذیل باتیں ضروری ہیں:۔

۱۔ سرکار کو رضا کار اداروں کے اس کام میں مداخلت نہ کرنی چاہیئے کہ وہ کون سا کام کرنا پسند کرتے ہیں، اپنے فنڈ کو کس طرح کام میں لاتے ہیں۔ کس طرح روپیہ خرچ کرتے ہیں، کس طرح عملے کا تقرر کرتے ہیں، وغیرہ وغیرہ۔

۲۔ تمام سرکاری محکموں کو تمام سطحوں پر ان کی پوری طرح مدد کرنی چاہیئے۔

۳۔ سرکار کو تو بس اسی شرط پر اکتفا کرنا چاہیئے کہ وہ جو مالیات دے، اس کی روشنی میں متعلقہ اداروں کو ایک سالانہ رپورٹ دینی چاہیئے، اور چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ کے ذریعے آڈٹ رپورٹ موصول ہونی چاہیئے۔ فنڈ کی خورد برد کی صورت میں سرکار کو صرف یہ اختیار ہونا چاہیئے کہ وہ رقوم میں تخفیف کر دے۔

رضا کارانہ سیکٹر میں بلاشبہ فنڈ کے غلط استعمال کی گنجائش ہے۔ لیکن یہاں رقومات کے غلط استعمال کے جو امکانات ہیں، وہ سرکاری ایجنسیوں کی طرف سے ضائع کی جانے والی بڑی بڑی رقومات کی میزان سے بہت کم ہے۔

البتہ دادا اور روپے پیسے کے بھوکے بیوروکریٹ نیز اقتدار کے ہوس رکھنے والے اور دفتر شاہی نظام میں یقین رکھنے والے افسر وسیع اور صحت مند رضا کار سیکٹر کی ترقی کے لیے حالات پیدا نہیں ہونے دیں گے۔ لہٰذا یہ پیشن گوئی کی جا سکتی ہے کہ ہندوستان میں صحیح معنوں میں رضا کار سیکٹر کے پنپنے کی گنجائش اور امکان بہت کم ہیں۔ البتہ ایسا سیکٹر صرف وہ ہوگا اور ایسے نام نہاد رضا کار اداروں پر مشتمل ہوگا جو کہ مقامی سیاست کے کارکنوں کے تابع ہوگا یا پھر وہ دفتر شاہی نظام کے تابع ہوگا اور اس طرح روپے کے خورد برد کرنے کا یہ ایک اور راستہ بن کر رہ جائے گا۔

البتہ تھوڑی سی تعداد میں چند وہ رضا کار ادارے جو کہ غیر سرکاری رقومات پر انحصار رکھتے ہیں، اور جن کے پاس مخلص اور لگن کے ساتھ کام کرنے والے لوگ ہیں اور جن کو اچھے کام اور حسن کارکردگی کی بنیاد پر عوامی حمایت حاصل ہے، باقی رہ سکتے ہیں۔

★

بقیہ: غیر حقیقی متبادل کیوں

فائدہ حاصل نہ ہوگا۔ ایک پلان جو مقامی لوگ خود بنائیں اور جس کی تیاری میں غریب ترین طبقے بھی شامل ہوں۔ اس پر عمل درآمد غیر سرکاری ادارے کریں جنہیں حکومت نے سرمایہ فراہم کیا ہو وہ غالباً حکمراں طبقے کے لیے قابل قبول نہ ہوگا۔ لہٰذا صرف یہی صورت رہ جاتی ہے کہ غیر سرکاری ادارے سرکاری طور سے تیار شدہ پلانوں پر عمل درآمد کریں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ ہر طرح کا مفاد پرست طبقہ آئے گا بلکہ کچھ اور نئے مفاد پرست حلقے پیدا ہو جائیں گے۔ ★

بقیہ: رضا کار جماعتیں جمہوریت کا ایک اٹوٹ حصہ

جس کو نقصان ہوا ہے۔ اب ان کی دیہات میں ضرورت نہیں رہی۔ بہت سی رضا کار جماعتیں باہمی تعاون کے تصور کو اُجاگر کرنے میں معاون ثابت ہو رہی ہیں۔ تاکہ ہر انسان محنت و مشقت کر کے غربت سے نجات پا سکے لیکن عوامی ایکشن کی اب روایاتی باتوں یا انداز سے کوئی مدد نہیں ہو رہی۔ یہ بھی ٹوٹ گئی ہیں۔ ان کی جگہ رضا کار جماعتوں کو ایک نیا مناسب نظام پیش کرنا ہوگا جو کمیونٹی کو اپنے امور کو سنبھالنے میں مدد دے سکے۔ جتنی میٹنگیں ہوں ان کی روداد رکھی جائے، جو فیصلے ہوں ان کو لکھ لیا جائے۔ جو ذمہ داریاں سپرد کی جائیں ان کا تعین ہو، اور جو جرمانے کیے جائیں ان کی وضاحت کی جائے۔ کمیونٹی کو اگر اپنی قوت تعمیر کرنا ہے اور اپنی کمزوریوں کو دور کرنا ہے تو اسے باقاعدہ اپنی باتوں کی تحریر کرنے اور ان کے عمل پر نظر رکھنے کا سسٹم اپنانا ہوگا۔

گذشتہ ۴ مہینوں میں رضا کار جماعتوں سے جو توقعات پیدا ہوئی ہیں۔ اگر ان کو صحیح ثابت ہونا ہے تو رضا کار جماعتوں کو بہت دور کا سفر طے کرنا ہے۔ عمومی طور پر یہ کیا جا سکتا ہے کہ انہیں ایک شخص کے ارد گرد گھومنے سے احتراز کرنا ہوگا۔ چاہے وہ کتنا ہی تجربہ کار کیوں نہ ہو، اس کی جگہ ساجھی اور مقامی ذمہ داری کو لینا ہوگی۔ اس عادت کو بھی چھوڑنا ہوگا کہ جو قدم اٹھایا جائے، خاص طور پر جب اس سے سرکار کا نقصان ہوتا ہو تو اس کی شہرت کی جائے۔ اس کی جگہ ان باتوں کو نرمی سے بیان کرنا ہوگا جو سرانجام دی گئیں اور جن میں عوام اور ان کے اداروں نے حصہ لیا۔

ایس۔ کے۔ ڈے — سابق مرکزی وزیر برائے کمیونٹی ڈیولپمنٹ اینڈ کوآپریشن، نئی دہلی۔

رضاکار ادارے، یہ رضاکارانہ کام کیا ہے اور کس کے لیے

مصنف ایک بزرگ انسان ہیں۔ جو مرکزی وزارت کمیونٹی ڈیولپمنٹ کے وزیر بھی رہ چکے ہیں۔ اور جن کا شمار ان لوگوں میں ہوتا ہے جنھوں نے اس تحریک کی بنیاد رکھی۔ انھوں نے اس مضمون میں اپنے اس غم کا اظہار کیا ہے۔ جو انھیں یہ دیکھ کر ہوا کہ کس طرح اس عوامی تحریک کو مفاد پرستوں نے کمزور کردیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ موجودہ صورتِ حالات کے پیشِ نظر ہمیں ماضی سے سبق لینا چاہیے، اور رضاکار اداروں پر انحصار کرنے سے پہلے بار بار سوچنا چاہیے کہ آیا وہ ملک میں خاطر خواہ تبدیلی کے ضامن ہوسکتے ہیں۔

رضاکارانہ کوششوں کے ذریعے خاص طور پر مفلوک الحال لوگوں کو کیا امداد ملتی ہے اس کی تحقیق کے لیے یوجنا نے جو قدم اٹھایا ہے، وہ قابلِ ستائش ہے۔ اس سے قبل کہ ہم تحقیق کے عمل میں مصروف ہو جائیں۔ ہمیں جو کچھ کہنا ہے اسی کا پسِ منظر بیان کرنا ضروری ہے۔ جاگیردارانہ یا کلی طور پر سرمایہ دارانہ ملک میں کوئی رضاکارانہ قدم نہیں اٹھتا، ماسوائے اس کے کہ وہ اس نظام کی بہبود اور ترویج کے لیے ہو۔ رضاکارانہ عمل اور وہ بھی معنی خیز انداز میں وہاں ممکن ہے، جہاں ایک ایماندارانہ اور خالص جمہوری نظام میں عوامی طاقت کارفرما ہو۔ ابراہیم لنکن نے ایسی جمہوریت کی جو تعریف کی ہے اس کے سوائے ابھی تک کوئی مناسب تعریف نہیں ملی۔ انھوں نے اس کی یوں تعریف کی تھی

"جمہوریت ایک ایسی عوامی حکومت ہے، جسے عوام بناتے ہیں اور جو عوام کے لیے ہی ہوتی ہے۔ انھوں نے یہ بھی کہا تھا "چونکہ میں غلام بننا نہیں چاہونگا اس لیے حاکم بھی نہیں۔ اور جمہوریت کے بارے میں میرا یہی نظریہ ہے، اور اس سے آپ جس قدر بھی دور جائینگے۔ اسی قدر جمہوریت سے دور جائینگے۔" تعجب کی کیا بات ہے کہ صدر ابراہیم لنکن کو ایک بھاڑے کے ٹٹو کی گولی کا شکار ہونا پڑا۔

حالیہ دور کے ایک امریکی صدر کینیڈی کو بھی ایسی ہی بدنصیبی کا شکار ہونا پڑا۔ ان کے قول کے مطابق: "اگر ایک حکومت بے شمار غریبوں کی مدد نہیں کرسکتی تو وہ چند امریکیوں کی کیا حفاظت کر سکے گی۔" اس مقالہ کی بنیاد اس مفروضہ پر رکھی گئی ہے کہ ۱۵ اگست ۱۹۴۷ سے ہماری جدوجہد ایک جمہوری نظام قائم کرنے پر مبذول رہی۔ محض دکھاوے کی جمہوریت کے لیے نہیں۔

پنڈت نہرو نے اپنے دورِ حیات میں

> جاگیردارانہ یا کلی طور پر سرمایہ دارانہ ملک میں کوئی رضاکارانہ قدم نہیں اُٹھتا ماسوائے اس کے کہ وہ اس نظام کی بہبود اور ترویج کے لیے ہو۔ رضاکارانہ عمل اور وہ بھی معنی خیز انداز میں وہاں ممکن ہے جہاں ایک ایماندارانہ اور خالص جمہوری نظام میں عوامی طاقت کارفرما ہو۔

ڈیموکریٹک ڈی سنٹرلائزیشن، پنچایتی راج اور سہکاری سماج پر خاص طور پر زور دیا۔ اور یہی وہ تین ستون ہیں جو پنڈت نہرو کے تصور کی جمہوریت کو سنبھال سکتے ہیں اور اسے مضبوط بنا سکتے ہیں۔ ابراہیم لنکن اور کینیڈی کی طرح پنڈت نہرو کا قتل تو نہیں ہوا، لیکن انھیں ایک طویل عرصہ تک افسردگی کی انتہا کا شکار ہونا پڑا جسے ان لوگوں نے ہوا دی تھی جنھیں پنڈت نہرو نے طاقت کے دربار سے الگ رکھا۔ اور جنھوں نے اکتوبر ۱۹۶۲ کے واقعات کے پردہ میں ان پر نکتہ چینی کے تیروں کی بوچھار کردی اور وہ اسی وقت فائدہ اٹھا سکے جب پنڈت جی نہ رہے۔

چند عمدہ مثالیں

اس پس منظر کو دھیان میں رکھتے ہوئے ہمیں بھارت اور غیر ملکوں میں رضاکارانہ اقدام کی عمدہ مثالوں کا ذکر کرنا چاہیئے۔ بہت زمانہ گزرا۔ جناب سپنسر ہیچ اور ان کی اہلیہ نے جو دونوں مخلص مشنری تھے۔ اپنی تمام تر توجہ کا مرکز وائی ایم سی اے کے مرغی پالنے اور شہد تیار کرنے کے پروگراموں کو بنایا۔ جو ٹراونکور کی سابق ریاست کے مارتھنڈم تعلقہ میں چلائے جارہے تھے۔ یہ پروگرام خوب پھیلے اور دوسروں نے بھی اسے کو اپنایا۔ حالانکہ جناب ہیچ اور ان کی اہلیہ دونوں وہاں سے جاچکے تھے، مارتھنڈم سے آج بھی انڈے کلکتہ بھیجے جاتے ہیں اور شہد دہلی۔ ڈاکٹر لیونارڈ ایلم ہرسٹ نے ٹیگور کے ساتھ مل کر دیہی تعمیر نو کا کام کیا۔ جس سے شانتی نکیتن ایسی رہنما انسٹی ٹیوشن وجود میں آئی۔ کومیلا میں جو اب بنگلہ دیش کا حصہ ہے۔ ایک آئی سی ایس پٹھان نے صدر ایوب کے زمانہ میں دیہی تعمیر کی اکیڈمی کی بنیاد ڈالی۔ اور اس قسم کا تجربہ کل ملک میں کرنے کی بجائے ایک تعلقہ میں کرنا پسند کیا۔ اگرچہ

> پنڈت نہرو نے ڈیموکریٹک ڈی سنٹرلائزیشن، پنچایتی راج اور سہکاری سماج پر خاص طور پر زور دیا اور یہی وہ تین ستون ہیں جو پنڈت نہرو کے تصور کی جمہوریت کو سنبھال سکتے ہیں اور اسے مضبوط بنا سکتے ہیں۔

> ٹھاکر بابا اور ان کی طرح کے لوگوں نے جو شمع جلائی ہے اس سے ملک بھر میں جہاں جہاں بھی ضرورت پیش آئی اس سے مزید روشنی ملی۔ اور یہ کامیابی اس کے باوجود ظہور میں آئی جب کہ مفاد پرست عناصر نے جو عموماً اونچے طبقے کے ہیں، افسران بالا اور سیاست دانوں اور حکومت کے ساتھ ساز باز کرکے ملک میں اپنی جڑیں بہت گہری کر لی ہیں۔

پٹھان اختر حمید ۱۹۷۱ کے بعد جب بنگلہ دیش وجود میں آیا؟ وہاں سے چلا گیا۔ لیکن کومیلا اکیڈمی ابھی تک قابلِ تحسین کام کررہی ہے۔ بنگلہ دیش میں اگرچہ فوجی راج ہے۔ لیکن رضاکارانہ طور پر ایف حسید اور ڈاکٹر زیڈ۔ آر۔ چودھری تا اپنی برطانوی بیوی کے ساتھ دیہی تعمیر کے کاموں کو جو عورتوں اور بچوں کی بہبود کا احاطہ کرتے ہیں، عمدگی سے چلا رہے ہیں۔ انھوں نے اپنا ملک چھوڑ کر اب بنگلہ دیش کو ہی اپنا لیا ہے۔

ایک عوامی لیڈر کی حیثیت سے۔ جسے بازاری سیاست سے کوئی سروکار نہیں۔ تری بھون داس پٹیل نے ایک ناظم اور ٹیکنالوجسٹ ڈاکٹر کورین کے ساتھ مل کر امُل کوآپریٹو ڈیری فارم کی بنیاد رکھی۔ جس کی مثال اب گجرات سے نکل کر دوسری ریاستوں میں اپنائی جارہی ہے۔ یہاں تک کہ ڈیری فارمنگ کا کام اب کوآپریٹو کے احاطہ میں آگیا ہے۔ اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں کہ شمالی ہند میں جہاں ہندی بولی جاتی ہے، مفاد پرست لوگ کوآپریٹو تحریک کے خلاف کمر باندھے ہوئے ہیں۔ مہاراشٹر میں چینی کوآپریٹو جو کل ہند کی چینی پیداوار کا ۴۰ فی صد پیدا کرتی ہیں، کوآپریٹو سپننگ ملز، کوآپریٹو جننگ ملز وغیرہ۔ گجرات میں کئی دوسری قسم کی امداد باہمی کی انجمنیں جو آرٹس اینڈ کرافٹس، صنعت و حرفت کی ترویج کی ضامن ہیں۔ پروفیسر ڈی۔ آر۔ گاڈگل۔ پروفیسر ڈی۔ جی۔ کاروے۔ ڈاکٹر وکنٹھ بھائی مہتہ، جو کوآپریٹو تحریک کے روشن ستارے ہیں، اس تحریک کے مددگار و معاون ہیں۔ اور ان رہنماؤں سے بہت سے نوجوانوں نے اس میدان میں تحریکِ عمل پائی ہے اور ان کے نقشِ قدم پر چلنے لگے ہیں۔

ٹھاکر بابا اور ان کی طرح کے لوگوں نے جو شمع جلائی ہے۔ اس سے ملک بھر میں جہاں جہاں بھی ضرورت پیش آئی۔ اس سے مزید روشنی ملی۔ اور یہ کامیابی اس کے باوجود ظہور

ہیں آئی جب کہ مفاد پرست عناصر نے جو غریب یا اوسط درجے کے خون پسینہ پر پھلتے پھولتے ہیں افسران بالا بلکہ نعرہ باز سیاست دانوں اور حکومت کے ساتھ مل کر اس کے راستے میں روڑے اٹکانا چاہیے۔

اگر حکومت میں سیاسی ارادہ ہو اور اس کے لیڈر خدمت کے جذبہ سے سرشار رہیں اور لوٹ کھسوٹ نہ کریں تو سمندر میں طوفان پیدا کیا جا سکتا ہے۔

ڈاکٹر رجنی کانت اور مہابلی اروول نے مہاراشٹر کے مقام جمکھیڈ میں دیہی صحت کے ضمن میں جو کام سرانجام دیا ہے وہ تو سونے کے مقابلے میں تولنے کے قابل ہے۔ ہم اگر کلکتہ میں نریندر پور، یا کوئمبٹور میں جائیں تو ہمیں راما کرشنا مشن جو خاموشی سے رضاکارانہ کام کر رہا ہے۔ اس کی صدائے بازگشت سنائی دے گی دہلی سے ۵۰ کلومیٹر دور شاہراہ کے ساتھ ساتھ تلوکھڑی رضاکارانہ کوششوں کی اور ایک زندہ مثال ہے۔ جہاں ۱۹۴۷ کے فوراً بعد نئے بھارت کی از سر نو تلاش کرنے کی بنیاد رکھی گئی۔ اور جہاں دیہی اور شہری بہبود کے کام رضاکارانہ انجمنیں سرانجام دے رہی ہیں۔ جن کی پشت پناہی کسی وقت خود پنڈت جی نے کی۔ اور جسے اب کئی طرف سے جس میں حکومت کے کارندے بھی شامل ہیں، مخالفت کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ ان چند مثالوں سے جن کا اوپر ذکر کیا گیا۔ اس بات کا اندازہ ہو سکتا ہے کہ اگر مقصد ایماندارانہ ہو اور لگن سے کام کیا جائے تو انسان کے اندر جذبہ اور تڑپ ہو تو کیا کچھ کیا جا سکتا ہے۔ اگر حکومت میں سیاسی ارادہ ہو اور اس کے لیڈر خدمت کے جذبہ سے سرشار ہوں اور لوٹ کھسوٹ نہ کریں تو سمندر میں طوفان پیدا کیا جا سکتا ہے۔ اور اس سے جو لہریں اٹھیں تو ہمت اور طاقت کے سرمایہ

کو اچھال کر سامنے ڈال دیں گی۔

اب آئیے دوسری طرف کی مثالوں کو لیں، جو ہماری آنکھوں کو حیران کر دیں گی۔ ۱۵ اگست ۱۹۴۷ کے فوراً بعد پلاننگ منسٹر نے بھارت سیوک سماج کا گرانقدر نظریہ پیش کیا۔ ان کے پیش نظر سارے بھارت کو رضاکارانہ انجمنوں کے احاطہ میں لانا تھا اور خود ان انجمنوں کی سربراہی

ہندوستان کی بڑھتی ہوئی آبادی کا کلیان زراعت کو اولیں درجہ دینے میں ہی ہے۔ لیکن اس کا انحصار اس بات پر تھا کہ زمین کاشتکاروں کو دی جائے۔ اور اس کے لیے ضروری تھا کہ زمین کی ملکیت، مزارعوں کی حفاظت اور زمین کی پیداوار کی تقسیم کے سلسلہ میں موثر انتظام کی جائیں لیکن زمین تو شان و دبدبہ کی علامت تھی جس نے تاریخ کے لمبے دور میں سماج کو غلام بنا رکھا تھا۔ سرکار کے لیے اس کو چھیڑنا بھڑوں کے چھتے کو چھیڑنے سے کم نہ ہوگا۔

کے فرائض اپنے ہاتھ میں رکھنے تھے۔ اس کے بعد بھارت سیوک سماج بنایا گیا اور پھر بھارت سادھو سماج جس کا مقصد بھارت کے تمام سادھوؤں کو تعمیر ملک کے کام میں لگا دینا تھا۔ جھگڑا اس بات پر ہوا کہ سادھو سماج کا لیڈر جب سفر کرے یا دوسرا کام کر رہا ہو، تو اسے سرکار کے کلاس ون Class one افسر کا درجہ دیا جائے۔

پہاڑ ٹوٹنے لگے۔ اور یہ گراں بہا انجمنیں کیسے ختم ہو گئیں۔ ایسی داستان ہے۔ جو پرانی دستاویزوں کے محافظ خانے میں رکھے جانے کے قابل ہیں۔

سروسیوا سنگھ

گاندھی انسٹی ٹیوشن جو گاندھی جی کے نام پر قائم کی گئی اور جس کی سربراہی بڑے بڑے آدمیوں کے ہاتھ میں سونپی گئی تھی، حکومت کے اس نظریہ سے متفق تھی کہ ہندوستان کی بڑھتی ہوئی آبادی کا فائدہ زراعت کو اولیں درجہ دینے میں ہی ہے۔ لیکن اس کا انحصار اس بات پر تھا کہ زمین کاشتکاروں کو دی جائے۔ اور اس کے لیے ضروری تھا کہ زمین کی ملکیت مزارعوں کی حفاظت اور زمین کی پیداوار کی تقسیم کے سلسلہ میں موثر انتظام کی جائیں۔ لیکن زمین تو شان و دبدبہ کی علامت تھی جس نے تاریخ کے لمبے دور میں سماج کو غلام بنا رکھا تھا۔ سرکار کے لیے اس کو چھیڑنا، بھڑوں کے چھتے کو چھیڑنے سے کم نہ ہوگا۔ جیسے آسمان سے تارہ آ جاتا ہے۔ اسی طرح سنگھ "کھل جا سم سم" کی کنجی لیے ہوئے "گرام دان"، "تحصیل دان"، "ضلع دان" "پردیش دان" اور آخر کار بھارت کا اپنا پروگرام لیے ہوئے "بھارت دان" وارد ہوا۔

یہ دنیا کا ایک عجوبہ تھا۔ ایک عوامی انقلاب
جس میں کسی کا کہیں بھی ایک قطرۂ خون بھی نہیں
گرا۔ ملک بھر میں اس کا سواگت ہوا۔ لیکن
اسے "جیون دان" اور "بھارت دان" کے
شکل میں جو کچھ حاصل ہوا۔ وہ ایک دوسری
کہانی کا حصہ ہے۔

ریاست میسور کے مقام پر یلوال میں ایک
خاص جلسہ ہوا۔ جس میں صدر راجیندر پرشاد،
وزیراعظم نہرو اور دوسرے سرکاری افسروں
کے ساتھ سنگھ کے ادھیکاری بھی
شامل تھے۔ پنڈت نہرو
کو کمیونٹی ڈیولپمنٹ
پروگرام۔ پنچایتی راج
اور سہکاری سماج بہت دل
پسند تھے۔ اس لیے خیال کیا گیا ان کی [illegible]
پشت پناہی کے لیے اگر غیر سرکاری انجمنوں
یعنی سنگھ کے تانے بانے پر پروگرام کو مل کر کیا
جائے تو بہت بہتر ہوگا۔ اس بات کو قبول کر
لیا گیا۔ مقصد یہ تھا کہ سارے دیش پر اس پروگرام
کو لاگو کیا جائے۔ فیصلہ ہوا کہ دونوں انجمنوں
کی ملی جلی تعاون کمیٹی بنائی جائے۔ یہ بھی فیصلہ
ہوا کہ اڑیسہ کے پسماندہ ضلع کوراپٹ میں
جہاں گرام دان اور بلاک دان کے
پروگرام سے ... قبائلی بلاک میں کام ہو رہا ہے،
سنگھ کے تحت ایک پائلٹ پروجیکٹ شروع

کیا جائے۔ ان میں سے ایک بلاک سنگھ کے اختیار
میں دے دیا گیا۔ لیکن کارکن بلاک کی طرف سے ہی مقرر کیے
گئے۔ ایک سال گزر گیا اور تمام وسائل ختم ہو
ہو گئے۔ وجہ یہ ہوئی کہ بلاک ڈیولپمنٹ افسر
نے جسے سرکار نے چنا تھا۔ اپنا ایک ایسا آرام
آشرم بنایا جیسا کہ مہاتما گاندھی کو بھی اپنے
سیواگرام میں میسر نہیں تھا۔ اور آشرم کے لیے

مکمل کیا
جاتا۔ جب تک کہ
اس کے لیے سیماؤ اسی
نذر کی جائے۔ ایک خوبصورت
ترین آدی باسی دوشیزہ کو آشرم اور
آشرم باسیوں کی دیکھ بھال کے لیے متعین کیا

گیا۔ جس میں وہ [illegible]
سٹور روم بھی بنایا گیا۔
استعمال نہیں ہو سکتی تھی۔ جب سنگھ کو اس
کی خبر دی گئی تو اس افسر کو تبدیل کر دیا گیا اور
یہ ملا جلا پروگرام بھی دھرے کا دھرا رہ گیا۔

بھارت دان کی بھی [illegible]

سرو سیوا سنگھ نے اپنے "بھارت دان" کے
نظریے پر بڑے جوش و خروش سے کام کرنا شروع
کیا۔ کارکنوں کو سرکاری اہلکار بڑے تپاک
سے خوش آمدید کہتے۔ ان کی لمبی چوڑی خاطر
تواضع کرتے۔ تاکہ یہ لوگ زمینی اصلاحات
زندگی میں انقلاب لا سکیں۔ جن
کی مشکلات اور مصیبتوں
کو وہ زمین کی اصلاحات
کر کے خود کو برداشت
کرنے کے نااہل پاتے
تھے۔ اسی دوران
پنڈت نہرو انتقال
فرما گئے۔ انھوں نے
جن مخالف طاقتوں
کو روک رکھا تھا وہ
سب پھر سے ابھر
آئیں اور نہرو کو جو کام
عزیز تھا ان سب
کو ملیامیٹ کر کے رکھ
دیا۔

پنچایتی راج اور سہکاری سماج جو پنڈت نہرو کی رہنمائی میں پھل پھول رہے تھے، ان لوگوں کے لیے جو مدتوں سے دوسروں کو غلام بنائے ہوئے تھے، خطرہ پیدا کرنے لگے تھے۔ نہرو کے بعد اگر حالات بدل جاتے ہیں تو ان امیر لوگوں کو نقصان کا کوئی اندیشہ نہیں رہے گا۔ سچ تو یہ ہے کہ اس سے ان کی ذلیل ذہنیت کو، جواب بھارتی روایت بن گیا ہے، تقویت ملی۔

حالیہ برسوں میں ٹرسٹوں اور انجمنوں کا ایک جال سا پھیل گیا ہے۔ جو یوں تو عوام کے نام پر قائم ہونے کے دعوے دار ہیں۔ لیکن ان کی باگ ڈور مفاد پرستوں اور سیاست دانوں کے ہاتھ میں ہے۔ جس میں اعلیٰ اور درمیانی طبقے کے لوگ ہیں۔ اور جنھوں نے انھیں اپنی ریاست بنا رکھا ہے۔ ان میں غیر سرکاری لوگوں کو نہیں لیا گیا ہے کیونکہ ریاستوں میں وزیر صاحبان نے عوام اور ان کی انجمنوں کو بہت حد تک اپنے قبضہ میں لے رکھا ہے۔

گیا۔ اس جنگل میں ایک قیمتی خیمہ قائم کیا گیا۔
جنگل کی پیداوار جمع کرنے کے ایک لمبا چوڑا

پہلا شکار:۔ کمیونٹی ڈیولپمنٹ پروگرام
یکم تا ۳۰ نومبر ۱۹۸۲

پنچایتی راج اور سہکاری سماج جس نے ملک کی آبادی کے ۸۰ فیصد کا احاطہ کر لیا تھا۔ اسے سب سے پہلے نشانہ بنایا گیا۔ کیونکہ پنڈت نہرو نے اس کو دنیا میں ایک بے مثال خدمت خلق کا نام دیا تھا۔ اور اس نفسیاتی دور میں سنگھو اور جیودانیوں نے مایوسی اور انجانے میں یہ معلوم کر لیا کہ بہار کی رشوت زدہ ریاست میں پنچایت کے صدر اور بلاک ڈیولپمنٹ افسر اور تحصیلدار ہی ان کے سنگھو یا لیکے مقاصد کو حاصل کرنے کے راستے میں روڑے اٹکا رہے ہیں۔ انھوں نے کمیونٹی ڈیولپمنٹ اور پنچایتی راج کے تمام پروگراموں کو ختم کرنے کی پکار کی اور یہ مہدا افسروں کو بھا گئی۔ جو اس کے لیے پہلے سے منصوبہ بنائے ہوئے تھے۔ لہذا جنوری ۱۹۶۶ سے قبل ہی متعلقہ وزارت ختم کر دی گئی۔

نہرو کے بعد کے زمانے میں سیاست دانوں نے ایک زبان ہو کر یہ نعرہ لگایا کہ اجتماعی ترقی پوری طرح ناکام رہی ہے۔ اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں کہ حکمران اور مخالف دونوں قسم کی جماعتوں نے اس نعرے کو اپنایا۔ اگرچہ ان کے مقاصد جدا جدا تھے اور وہ غلط بھی نہیں تھے۔ کمیونٹی ڈیولپمنٹ واقعی ناکام رہی خاص طور پر اقتصادی اور سماجی میدان میں۔ اور ایسا ہونا بھی تھا۔ زراعت پر زور دینا بھارت کو خوراک کے معاملے میں خود کفیل بنانے

کے لیے ضروری تھا۔ اور اس کے لیے دیہات میں بڑے بڑے زمینداروں پر انحصار کرنا پڑا۔ اور یہی لوگ ٹیکنیکل اور مادی ذرائع جو ۷۰-۱۹۶۰ء کے درمیان سامنے آنے لگے تھے، اپنی کاشتکاری میں تیزی سے استعمال کر سکتے تھے۔ دیہات میں کام کرنے والے (اہل کاروں کا بھی غریبوں کی بہ نسبت امیر زمینداروں سے زیادہ قریبی تعلق تھا۔ غریب کاشتکاروں کے پاس بہت کم زمین تھی۔ یا وہ بے زمین تھے۔ اور یہ لوگ بے زبان اور بے کس تھے۔ قدرتی بات تھی کہ دیہات کی زمیندار سوسائٹی اور اسمبلیوں میں ان کے نمائندے نے کمیونٹی

> بلاک ڈیولپمنٹ افسر جو کسی وقت ترقی کے ستون سمجھے جاتے تھے۔ وہ اب محض ایک پبلک ریلیشنز افسر بن کر رہ گئے ہیں یا ایسے ہی شکایت کا سبب ہیں کہ مصروف رہتے ہیں۔ اب بلاک کی لغت میں تال میل کا لفظ بلاک کا اہم لفظ خیال کیا جاتا تھا جو ترقی کا ... ممنوع ہے۔

ڈیولپمنٹ کو گنہگار ٹھہرایا۔ اور اس طرح غریب عوام سے اپنی جان بچائی۔

گاندھی جی کے نام کی تجارت

پنچایتی راج اور سہکاری سماج جو پنڈت نہرو کی رہنمائی میں پھل پھول رہے تھے، ان لوگوں کے لیے جو مدتوں سے دوسروں کو غلام بنائے ہوئے تھے خطرہ پیدا کرنے لگے تھے۔ لہٰذا نہرو کے بعد اگر حالات بدل جاتے ہیں تو ان امیر لوگوں کو نقصان کا کوئی اندیشہ نہیں رہے گا۔ سچ تو یہ ہے کہ اس سے ان کی ذلیل ذہنیت کو جو کہ اب بھارتی روایت بن گئی ہے، تقویت ملی۔

گاندھی جی کے اصلی نام لیواؤں کو نظر انداز کرتے ہوئے چند ایک انجمنوں اور لوگوں نے گاندھی کے نام پر جو گل کھلائے ہیں، اس کی بے دردی کیڈل کیشن کر رہا ہے۔ حالیہ برسوں میں ٹرسٹوں اور انجمنوں کا ایک جال سا پھیل گیا ہے، جو یوں تو عوام کے نام پر قائم ہونے کے دعوی دار ہیں لیکن ان کی باگ ڈور خود غرض ٹرسٹیوں اور سیاست دانوں کے ہاتھ میں ہے جن میں اعلیٰ اور درمیانی طبقے کے لوگ ہیں۔ اور جنھوں نے آئی کو اپنی ریاست بنا رکھا ہے۔ ان میں غیر سرکاری لوگوں کو نہیں لیا گیا کیونکہ ریاستوں میں وزیر صاحبان نے عوام اور ان کی انجمنوں کو بہت حد تک اپنے قبضے میں لے رکھا ہے۔ وزیر صاحبان کی ضرورت کے مطابق روپوں اور چیزوں کی مانگ ہوتی ہے۔ اسمبلیوں اور پارلیمنٹ میں جانے والے یہ وہ لوگ ہیں جنہیں عوام کی تانشگی اداماں کی

> پنچایتی راج کا دنیا بھی ایک عجیب تجربہ اور وہ بھی بڑا ناکام تجربہ ہے وجہ یہ نہیں۔ کوئی وقت تھا کہ ترقی کی سطح پر بھی پنچایت اور ... تھا۔ مثلاً ... معیار ... ہیں۔ اور کسی حد تک اب اس ... گیا ہے۔ اور اس کی ... سرکاری عمل ... ممنوع ہے۔

زندگی بنانے کے لیے سمجھا جاتا ہے، اور ان کی تنخواہوں اور محنتوں میں برابر اضافہ ہو رہا ہے مگران سب کے باوجود وہی مکروہ صورت حال درپیش ہے جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے۔ اور سیاست کی ملکی اطلاک ایک بن گئی ہیں۔ اگرچہ یہ نظام اُن ریاستوں پر بھی لاگو ہے۔ جس کی سیاسی پارٹی مرکز میں بھی حکمران ہے۔ لیکن دوسری ریاستیں بھی اس سے دور نہیں ہیں۔ اگرچہ وہ شاید اس قدر بیہودہ یا عریاں نہ ہوں۔ بھارتی جمہوریت میں یہ ایک خاص ایجاد بن کر قبولیت کا شرف حاصل کر چکی ہے۔

خاموشی سے رخصت

جمہوری لامرکزیت، ذمہ داری اور وسائل لگ بھگ ختم ہو گئے ہیں۔ حکومت کی یہ جرأت نہیں کہ وہ پنچایتی راج کی انجمنوں کو ختم کر دے۔ لہٰذا یہ ادارے قائم ہیں۔ بلکہ ان کی تعداد میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ اور اسی انداز سے ان کے کارکنوں کی تعداد بھی بڑھتی جا رہی ہے۔ حکومت ان کو وسائل بھی فراہم کر رہی ہے لیکن زندگی اور قوت دونوں خاموشی سے جاتی رہیں۔ ملک کے وہ ادارے جو عوام میں تعمیری کام کر رہے ہیں۔ اور جن کا بلاک اور ضلع کے اداروں سے گہرا تعلق تھا اور جسے برسوں کی لاانتہا محنت اور مشقت سے قائم کیا تھا۔ اب داستان پارینہ

میں تقسیم کر دیے گئے ہیں اور مختلف محکموں میں بانٹ دیے گئے ہیں۔ بلاک ڈیویلپمنٹ افسر جو کسی وقت ترقی کے ستون ہوتے تھے۔ وہ اب محض پبلک ریلیشنز آفیسر بن کر رہ گئے ہیں یا ایسے ہی مختلف کاموں میں مصروف رہتے ہیں۔ اب تو بلاک کی لغت میں تال میل کا لفظ جو ترقی کا اہم محرک خیال کیا جاتا تھا، ممنوع ہے۔ پنچایتی راج کا دیہی سطح کے بغیر اور وہ بھی برائے نام ہی وجود نہیں۔

وقت تھا کہ ... کوئی
پھر بھی پورے ... یہ اونچی سطح
تھا۔ مثلاً مہاراشٹر ... شباب پر

ہیں۔ اب اس پر گہرا سیاسی رنگ چڑھ گیا ہے۔ اور اس کی شگفتگی کی چالبازیوں سے سرکاری عمل و دخل سے مفلوج ہو گئی ہے۔ بھگی ہند پنچایت پریشد جس کی بنیاد بلونت رائے مہتہ نے رکھی اور جس کی سربراہی کئی دوسرے حضرات کے علاوہ خود جے پرکاش نے کی، اب ذاتی جائداد کا بن کر رہ گئی ہے۔ اس کے صدر کا نہ انتخاب ہوتا ہے اور نہ اس کے چھٹنے کے لیے ممبران ہی ہیں۔ پنچایتی راج کے لیے لیڈرشپ ٹریننگ کی جو قومی انسٹی ٹیوٹ قائم کرنے کی خاطر وسائل فراہم کیے گئے۔ اور جس کے لیے ایک دیہی پنچایت نے جمنا پار، ایک قیمتی زمین دان میں دی اور جس کی منظوری دہلی سرکار سے بھی ملی، اور دوسری ریاستوں نے بھی جسے امداد دی

اب ایک ذاتی جائداد کا کام دیتی ہے۔ یا سیاسی کارکنوں کی پرورش اور ان کے گزارے کے لیے صرف ہوتی ہے۔

ریاستی ادھیکار غصب

پنچایتی راج کی بے حرمتی کا قدرتی نتیجہ یہ نکلا ہے کہ ریاستی وسائل اور ذمہ داریاں مرکز نے غصب کر لیں۔ اور مرکز پر عوام کے دباؤ نے یہ اثر ڈالا ہے کہ غیر محسوس لیکن یقینی طور پر اسے چی صنوبریوں کے ہاتھوں بیچ دیا گیا۔ وہ ریاستیں جہاں اپوزیشن کی حکومت ہے مرکز کے رحم و کرم پر ہیں اور جہاں مرکزی ایسی پارٹی کا راج ہے، وہاں بڑے وزیروں کا جھکاؤ مرکز کرتا ہے اور توازن کے طور

> مرکز ہو یا ریاستیں ہر جگہ اب
> ان فیڈریشنوں پر حکمران
> پارٹی کے لوگ چھائے
> ہوئے ہیں چاہے
> وہ اسمبلیوں کے
> ممبر ہیں یا پارلیمینٹ
> کے یا سرکاری افسران
> ایک کنٹرول چھوڑتا ہے تو
> دوسرا آ بیٹھتا ہے۔ یہ نیا انداز
> کوآپریشن کی جڑوں کو کاٹتا ہے اور
> اس اصول کے خلاف جاتا ہے کہ تحریک
> عوامی تحریک ہے۔ جس میں پارٹی بازی کا کوئی
> مقام نہیں۔

حل یہ نہیں کہ اس تباہ شدہ جمہوریت میں اس تحریک کو ختم کر دیا جائے یا کم کر دیا جائے بلکہ حل یہ ہے کہ اسے زیادہ تیزی کے ساتھ پھیلایا جائے کیوں کہ عوام ہی اس کی زندگی کے ضامن ہو سکتے ہیں۔

بن گئے ہیں حقیقت یہ ہے کہ زراعت، مویشی پرورش، مویشیاں۔ تعلیم، صحت، سڑکوں اور مزروعہ جھگڑوں ... اور گجرات میں۔ اور کسی حد تک آندھرا اور تامل ناڈو ... پر پارٹی کے صدر کا تعین بھی وہیں سے ہوتا ہے۔

اور ان ممالک میں جو چپقلش رہتی ہے اس کا نقصان مرکز اپنے پیدا کئے ہوئے رخنوں سے کرتا ہے۔

برطانیہ کی نیشنل کونسل برائے لوکل سیلف گورنمنٹ کو اگر آپ دیکھ جائیں (یہ ایک خود مختار ادارہ ہے جسے اعلیٰ ترین مقبولیت حاصل ہے) تو آپ دیکھیں گے کہ برطانوی عوام طبعی طور پر اس بات کو محسوس کرتے ہیں کہ حکمران اور اپوزیشن دونوں کو جمہوریت کے بنیادی نظام کے لیے زندہ اور کارگر رہنا ہے۔ اور عوام اس اصول پر پوری طرح ایمان رکھتے ہیں۔ یہ ایک روایت سی ہو گئی ہے کہ لوکل سیلف گورنمنٹ کے ممبران کی اکثریت کو پارلیمنٹ کے برعکس اپوزیشن پارٹی سے چنا جاتا ہے۔ لیکن ہمارا قدیمی جاگیردارانہ نظام مرکز یا ریاستوں کی حکومتوں کے راستے میں اس طرح حائل ہو جاتا ہے کہ اپوزیشن کو عزت اور حرمت کے ساتھ کام کرنے کا کوئی موقع میسر نہیں آتا۔ ملک بھر پر ایک اچٹتی نظر ڈالیے اور جو واقعات رونما ہو رہے ہیں، ان کا مطالعہ کیجیے۔ تو آپ کو اس جمہوریت کی حقیقت معلوم ہو جائے گی، جس کے ہم آئے دن گن گاتے پھرتے ہیں۔

متوازن طاقت :- جمہوری ملکوں میں

> اول تو یہ کہ مرکز اور ریاستوں کے درمیان تعلقات مناسب بنیاد پہ قائم ہوں اور آئین نے ریاستوں کو جو حقوق دئے ہیں انھیں تسلیم کیا جائے۔ ری پبلک کے آغاز میں ریاستوں کو جو حقوق ملے وہ برقرار ہوں اور مرکز ریاستوں کی فیڈریشن کے طور پر کام کرے۔

کوآپریشن ایک عوامی پروگرام ہے۔ آزادی سے قبل برطانوی ہندوستان میں جس کا مختصر طور پر اوپر ذکر بھی آیا، سازگار بھی تھا۔ کمیونٹی ڈیولپمنٹ، پنچایتی راج اور کوآپریشن کے لیے جوائنٹ اور آخری وزارتیں تھیں ان میں کوآپریشن ایک الگ محکمہ تھا اور معاشی توازن قائم رکھنے کی غرض سے یہ محکمہ پبلک اور پرائیویٹ سیکٹر میں کوآپریشن کی مشق کو پوری طرح اپنے قبضے میں رکھتا تھا۔ کوآپریشن کے لیڈروں کی رضامندی سے ریزرو بنک آف انڈیا سے بھی اسے الگ رکھا گیا۔ وہاں صرف ایک ایسا محکمہ تھا جو ڈپٹی گورنر کے تحت زیادہ تر زراعت کی تربیت یا تحقیق کو دیکھتا تھا اور اگری کلچرل وزارت میں ایک انڈر سکریٹری بنیک کو سرکاری امداد کے سلسلے میں تعاون دیتا تھا۔ جہاں تک کہ کوآپریشن کا سوال ہوتا تھا، تو یہ خصوصی معاملات کی فیڈریشن کی طرح ایک نیشنل کوآپریٹو یونین وجود میں آئی اور اس کے ذمے یہ فرض عائد ہوا کہ وہ سرکاری اور غیر سرکاری افسروں کی تربیت کرے تاکہ وہ سہکاری سماج کی تدریج و ترقی میں معاون ثابت ہوں۔ اور اس طرح معاشی صورت میں توازن رہے۔ اس نئی تحریک کو کامیاب بنانے کے لیے جس کی بنیاد نیچے سے اوپر تک اتحاد چنے ہوئے نمائندوں پر رکھی گئی تھی۔ درجن بھر خصوصی جماعتیں وجود میں آ گئی تھیں۔

نئے جاگیردار

پنڈت نہرو کے واضح حکم کے مطابق، نئی وزارت نے کوآپریشن کے کندھوں سے وزیروں کو بڑی مشکل اور پریشانیوں کے بعد ہٹا دیا۔ یہ لوگ کوآپریشن کو اپنی ذاتی جائداد بنائے ہوئے تھے۔ اور ساتھ ساتھ وزارتی مراعات سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ آج حالات بالکل برعکس ہیں۔ مرکز ہو یا ریاستیں ہر جگہ اب ان فیڈریشنوں پر حکمران پارٹی کے لوگ چھائے ہوئے ہیں۔ چاہے وہ اسمبلیوں کے ممبر ہوں یا پارلیمنٹ کے۔ یا سرکاری افسران۔ ایک کنٹرول چھوڑتا ہے تو دوسرا آ بیٹھتا ہے۔ یہ نیا انداز کوآپریشن کی جڑوں کو کاٹتا ہے اور اس اصول کے خلاف چلتا ہے کہ یہ تحریک عوامی تحریک ہے جس میں پارٹی بازی کا کوئی مقام نہیں۔ اونچے طبقے کی فیڈریشن کو نچلی سطح کی فیڈریشن سے طاقت ملتی تھی۔ لیکن اب

> یونٹ کی سطح کے قابل عمل پروگرام چاہے ان کا تعلق پلان سے ہو یا پلان سے باہر، عوام پر چھوڑ دینے چاہئیں تاکہ وہ ان کو پایۂ تکمیل تک پہنچائیں۔ اور اگر ضرورت پڑے تو سرکاری یا کوآپریٹو ادارے ان کی مدد کریں۔ یہ میدان بہت وسیع ہے۔ اور اس میں مقامی انجینئر، نوجوان طبقہ، عورتیں، کاشتکار، صنعت کار اور ماہرین سبھی رضاکارانہ طور پر مدد دے سکتے ہیں۔

یہاں ایوب خاں کی طرز کی بنیادی جمہوریت ماسوا ہے اور اونچے طبقے کی فیڈریشن اب نچلے طبقے کی فیڈریشن کو محض اپنی جائداد سمجھ کر پرائیویٹ میدان میں خود خرید و فروخت کا کام کرتی ہے۔ چند ایک کو چھوڑ کر دوسری فیڈریشنیں تو ایک نئے جاگیردار کی طرح اپنی ہی سلطنتیں بنا رہی ہیں۔

کیسے بچیں :۔ اس پس منظر میں کو جو حقوق ملے وہ برقرار رہیں اور مرکز ریاستوں کی فیڈریشن کے طور پر کام کرے۔ خود مختاری کا احیا ایک واضح ترمیم سے ہونا چاہیئے۔ جس میں ریاستی طاقت، وسائل اور ذمہ داریوں کا کھلے لفظوں میں ذکر ہو اور اس مقصد کے لیے ایک با اختیار ادارہ ہر ریاست میں قائم کیا جائے اور یہ ادارہ اس طاقت کی برقراری کے عمل کی دیکھ بھال کرے۔ یہی طریقہ سرکاری یا کرایہ پر شیاطین سے ان کی مدد کریں۔

یہ میدان بہت وسیع ہے۔ اس میں مقامی انجمنیں، جوان طبقہ سبھی رضاکارانہ طور پر مدد دے سکتے ہیں۔ اگر قومی یا ریاستی رضاکارانہ اداروں کو ان مقامی کاموں میں لگایا گیا تو جاگیردارانہ نظام کا راستہ کھل جائے گا اور جو مراعات حاصل ہوں گی وہ خود برباد ہو جائیں گی۔ عوام کو رضاکارانہ

بھارت میں اس وقت جو جمہوریت بچی کھچی رہ گئی اس کی حفاظت کے لیے چار عنصر ہیں۔ افسران، اسمبلیاں، عدالتیں، اور پریس۔ اور پانچواں عنصر ہے، جو کہ ان سب سے زیادہ ضروری ہے وہ ہے عوام۔

۷۰ برس کا عرصہ انسان کو نئے سبق حاصل کرنے کے لیے کافی ہے۔ بشرطیکہ اس کے دل و دماغ پر حیوانیت نے پوری طرح قبضہ نہ کیا ہو۔

کیا راستہ ہے۔ جیسے ایسا کریہ عوامی تحریک سیاسی پارٹی بازی اور سرکاری عمل دخل سے بچ نکلے۔ اس کا جواب تو واضح ہے، چاہے اس وقت وہ ممکن نظر نہ آئے۔

حل یہ نہیں کہ اس تباہ شدہ جمہوریت میں اس تحریک کو ختم کر دیا جائے۔ یا کم کر دیا جائے، بلکہ حل یہ ہے کہ اسے زیادہ تیزی کے ساتھ پھیلایا جائے۔ کیوں کہ عوام ہی اس کی زندگی کے ضامن ہو سکتے ہیں۔ لہٰذا پہلی ضرورت اس امر کی ہے کہ طاقت عوام کے ہاتھ میں آئے۔ تاکہ بھارت سیاسی طور پر گذشتہ زمانے کی طرح ٹکڑے ٹکڑے ہونے سے بچ جائے۔

اوّلاً تو یہ کہ مرکز اور ریاستوں کے درمیان تعلقات مناسب بنیاد پر قائم ہوں اور آئین نے ریاستوں کو جو حقوق دیئے ہیں انھیں تسلیم کیا جائے۔ ری پبلک کے آغاز میں ریاستوں ہے جس کہ ریاستی سیاست بلندی کی طرف مائل ہو سکتی ہے اور چاپلوسی کی گراوٹ سے نکل کر غریب اور امیر کی بڑھتی ہوئی خلیج کو پاٹ سکتی ہے۔

رضاکارانہ عمل کو لیجئے۔ رضاکارانہ کام کرنے والے ادارے چاہے وہ قومی سطح پر ہوں یا ریاستی یا اس سے بھی نچلے مقام پر۔ ان کے ذمہ یہ کام دینا چاہئے کہ پروگراموں کا جائزہ لیں۔ پلاننگ کے محکمہ سے مشورہ کریں۔ اور جہاں جہاں خاص قسم کی تربیت کی سہولتیں میسر ہیں وہاں ان کو اس طرح استعمال میں لائیں کہ حکومت کی تشفی ہو۔

یونٹ کی سطح کے قابلِ تحسین عملی پروگرام چاہے ان کا تعلق پلان سے ہو یا پلان سے باہر، عوام پر چھوڑ دینے چاہئیں تاکہ وہ ان کو پایۂ تکمیل تک پہنچائیں اور اگر ضرورت پڑے تو عمل میں ان سے بچ کر چلنا ہوگا۔ بھارت میں اس وقت جو جمہوریت بچی کھچی رہ گئی اس کی حفاظت کے لیے چار عنصر ہیں۔ افسران، اسمبلیاں، عدالتیں اور پریس۔ اور پانچواں عنصر ہے، جو کہ ان سب سے زیادہ ضروری ہے وہ عوام۔ خوش قسمتی سے انسانی نسل اور عوام بے ترتیب ہیں۔ اور ان کو رضاکارانہ جماعتوں کے سوا کسی ایک جگہ جمع نہیں کیا جا سکتا۔ اور یہ ان کی اپنی رضا جوئی سے ممکن ہے۔

اس پانچویں عنصر کو ہم بجا طور پر "عوامی رضاکارانہ عنصر" کہہ سکتے ہیں اور یہی سیاسی طاقت کا جواب پیش کر سکتا ہے۔ اس میں ملک کے ہر میدان سے بہترین انسانوں کو لیا جا سکتا ہے۔ جو اس وقت موجودہ گندے نظام کے خلاف چیخ و پکار کر رہے ہیں اور اس کو ختم کرنے کے لیے تیار ہیں۔

(باقی صفحہ ۔۔ پر)

[redacted] مالکم ایس آدی سیشیہ چیرمین مدراس انسٹی ٹیوٹ آف ڈیولپمنٹ اسٹڈیز۔ مدراس۔

چھوٹا مُنہ، بڑی بات

یہ مُنہ اور مسُور کی دال

قومی زندگی اور اس کی ترقی کے ایسے میدان میں جہاں مالی اور انسانی وسائل کی وسیع پیمانے پر ضرورت درپیش ہو۔ رضاکارانہ قدم ممکن نہیں۔ لیکن رضاکار ایجنسیاں سماجی بہبود کے کوئی کام کر سکتی ہیں۔ وہ لوگوں میں اُتساہ پیدا کر سکتی ہیں۔ انھیں منظم کر سکتی ہیں۔ ان میں جدت متحرک کر سکتی ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ رضاکار ایجنسیوں کا دائرہ عمل محض مثالیں پیدا کرنا، یا پائیلاٹ قسم کے پروگرام کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے تک محدود ہے۔ مضمون ذیل میں مصنف نے جو وضاحت فرمائی ہے، ملاحظہ فرمایئے۔

کیا رضاکار ایجنسیاں کام کر سکتی ہیں؟ وہی کام جس کے مقاصد، مطمح نظر، نشانات، پروگراموں اور پراجیکٹوں کا تعین چھٹے پلان میں جو کہ اب تکمیل کی آخری منزل پر ہے، کیا جا چکا ہے اور جس کے باقی نشانات کو ساتویں منصوبے تک پایۂ تکمیل تک پہنچانے کی کوشش ہے۔

اس سوال کا جواب نہیں بھی ہے، اور ہاں بھی۔

منفی

رضاکار ایجنسیاں بعض میدانوں میں کام نہیں کر سکتیں۔ مثلاً ترقیِ زراعت۔ آبپاشی، پاور، کوئلے اور دھاتوں کی کان کنی۔ انڈسٹری، بچت، سرمایہ کاری، لین دین کا توازن کا جائزہ، کی صلاحیت کے مطابق ان کا استعمال قیمتوں کا تعین، انحصار کا لین دین۔ اس کی دو وجوہات ہیں۔ یہ کام بہت بڑے ہیں اور اس کے لیے وسیع فیصلوں کی ضرورت ہے۔ اور کوئی رضاکار ایجنسی اس قابل نہیں ہوتی کہ اتنے بڑے سرمایے، یا اتنے بڑے فیصلوں سے نبرد آزما ہو سکے۔ یہ وہ صاف میدان ہیں، جہاں رضاکار ایجنسی فعال ثابت نہیں ہو سکتی۔ دوسرے الفاظ میں قومی زندگی اور اس کی ترقی کے اس میدان میں جہاں وسیع وسائل، مادی یا انسانی ضرورت پیش ہو اور جس کا اثر سارے ملک پر پڑتا ہو۔ رضاکار ایجنسی اس کو سرانجام نہیں دے سکتی۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ قومی زندگی کے محض انہی علاقوں میں رضاکار ایجنسی کام کر سکتی ہے۔ جہاں اسے محدود قرض دئے گئے ہوں، اور وہ وسیع کناروں کا اضافہ نہیں کر سکتی۔

مثبت

ہاں تو، رضاکار ایجنسیاں اپنے محدود دائرے میں چند خاص قسم کے پروگراموں کو متحرک اور منظم کر سکتی ہیں۔ ان کی نئی راہ بنا سکتی ہیں اور انھیں مکمل کر سکتی ہیں۔ رضاکار ایجنسیوں کے کام کرنے کا جو وسیع میدان ہوتا ہے۔ وہ ہے عوام کی غربت دور کرنا۔ جس پروگرام کو ساتویں

> **رضاکار ایجنسیوں کے کام کرنے کا جو وسیع میدان ہے۔ وہ ہے عوام کی غربت دور کرنا۔ جس پروگرام کو ساتویں پلان میں اولیں اہمیت دی گئی ہے۔**

پلان میں اولین اہمیت دی گئی ہے اور جس کا تعلق عوام کی بھاری تعداد سے ہے، جو ابھی تک غریب ہیں۔

غریبوں کی تنظیم

غریبی دُور کرنے کے پروگرام کے دائرے میں رہتے ہے۔ جس حد تک غریب خود اس کا احساس کریں۔ اپنی تعلیم کا استعمال کریں اور اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لائیں اور منظم ہو کر اپنی زندگی کا ثبوت دیں۔"

غربت دُور کرنے کا ہی مرکزی خیال ہے جو اس کے مواقع دلائے جائیں۔ کئی ایک رضا کار ایجنسیاں جیسے گاندھی گروپ جو سارے ملک میں خاموش اور موثر انداز سے نیز بغیر شور اٹھائے کام کر رہا ہے۔ یا مذہبی گروہ۔ مثلاً کرسچین مشن اور راما کرشنا مشن اور اسی قسم کے دوسرے مشن جو ہمارے غریب بھائیوں کی چاہے وہ بے زمین زرعی مزدور ہوں جنھیں بہت کم اجرت ملتی ہے یا ہریجن خاندان ہوں جنھیں لوٹ کھسوٹ اور جانبداری

رضا کار ایجنسیاں جو کام کر سکتی ہیں، وہ ہے غریب عوام کو ان کے حق کے لیے نبرد آزما ہونے کے لیے منظم کرنا، تاکہ جن فوائد کو قوانین میں ان کے لیے مخصوص کیا ہے وہ انھیں مل جائیں اور آج کی طرح نہیں کہ انھیں دوسرے ہتیائے رہیں۔

ہوئے رضا کار ایجنسیاں جو کام کر سکتی ہیں، وہ ہے، غریب عوام کو ان کے حق کے لیے نبرد آزما ہونے کے لیے منظم کرنا، تاکہ جن فوائد کو قوانین میں ان کے لیے مخصوص کیا ہے، وہ انھیں مل جائیں۔ اور آج کی طرح نہیں، انھیں دوسرے ہتیائے رہیں۔ غریب منظم ہو کر اپنے خلاف جو لوٹ کھسوٹ، جانبداری، اور ظلم و ستم ہو رہا ہے، اس کا خود مقابلہ کریں۔ یہ تجویز پانچویں پلان ۸۳ - ۱۹۷۸ء میں متوازن بات کا متقاضی ہے۔ کہ غریب خود منظم ہو کر اپنے حقوق کی حفاظت کرنے کے لیے لڑیں خاص طور پر ان حقوق کے لیے جو انھیں قومی زندگی میں قانوناً دیے گئے ہیں۔ حقیقت میں یہ غیر مناسب درجہ بندی توڑنا ہوگی۔ دیہی زندگی میں انقلابی تبدیلی لانا ہوگی اور شہروں میں پھیلی ہوئی گندی بستیاں ختم کرنا ہوں گی۔ یہ وہ کام ہے، جو حکومت یا سرکاری ادارہ سرانجام نہیں دے سکتے۔ دنیا میں کہیں بھی کوئی حکومت ایسے پروگرام شروع نہیں کرتی جو اس کے اپنے امدادی ڈھانچے کے کسی حصے کو نقصان پہنچائے۔

کاشت کار ہونا پڑتا ہے یا غلام مزدور ہوں جنھیں آزادی کے بعد باناً آزادی دلانے سے بھی مشکل کام ہے، یا پھر ان عورتوں کی جنھیں ہمارے سماج میں برابری کا درجہ حاصل نہیں، مدد کر رہے ہیں تاکہ وہ منظم ہو کر اپنے حقوق لے سکیں۔ رضا کار ایجنسیاں اس اہم میدان میں اکا دکا اور اپنے طور پر غریب عوام کی مختلف جماعتوں کے ساتھ

غریب خود منظم ہو کر اپنے حقوق کی حفاظت کرنے کے لیے لڑیں خاص طور پر ان حقوق کے لیے جو انھیں قومی زندگی میں قانوناً دیئے گئے ہیں۔ حقیقت میں یہ غیر مناسب درجہ بندی توڑنا ہوگی۔ دیہی زندگی میں انقلابی تبدیلی لانا ہوگی۔ اور شہروں میں پھیلی ہوئی گندی بستیاں ختم کرنا ہوگی۔

انصاف کی تقسیم کے تحت کی گئی تھی۔ اس تجویز کو دبے دبے الفاظ میں ساتویں پلان کے اپروچ پیپر (Approach Paper) میں پھر سے اٹھایا گیا ہے۔ جہاں اس کا یوں ذکر آتا ہے۔

"آخر میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ غربت کو دُور کرنے کا مقصد اسی حد تک پورا ہو سکتا ہے جو مستقبل ہوتا ہے امیر اور استحصال پسند اُن افراد پر جن کی تعداد معدودے چند ہوتی ہے چنانچہ غریبوں کی امداد سے اس سرگرمی کو جو کہ اولین ترجیح کا حق رکھتی ہے غیر سرکاری ادارے … سرانجام دے سکتے ہیں۔ کیوں کہ ان کی بنیاد اس اصول پر قائم ہوتی ہے کہ سماج کو ترقی دی جائے اور عوام کو انصاف اور برابری

مل کر کام کر رہی ہیں۔ انھیں روپوں پیسوں کی ضرورت نہیں، کیونکہ یہ کسی ایسے کار خیر میں جہاں خیرات دینی ہو معروف نہیں ہیں۔ بلکہ یہ ایجنسیاں اس سے بھی مشکل کام میں جس کا مقصد غریب عوام کو حوصلہ دینا ہے کہ وہ منظم ہوں اور اپنی طاقت کا احساس کریں، لگی ہوئی ہیں۔ اس کام میں ان

ایجنسیوں کو طاقتور دیہی اور شہری گروہوں۔ مالدار جماعتوں کی منظم طاقت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ کیونکہ یہ لوگ جانتے ہیں کہ غریب عوام کی انجمنوں اور تنظیموں سے ان کی اپنی پوزیشن کو خطرہ لاحق ہو جائے گا۔

"میں نے ان دیہات میں جہاں میرے لوگ کام کر رہے ہیں۔ اس قسم کی مخالفت زمینداروں کی طرف سے ہوتے دیکھی ہے، میرے لوگ تعلیم دے رہے ہیں۔ ایسی صنعتیں سکھا رہے ہیں کہ لوگ روزی کما سکیں۔ اور ان میں جاگرتی پیدا کر رہے ہیں تاکہ وہ اپنی حیثیت پہچانیں۔ اس کا قدرتی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ان میں خود کو منظم کرنے کی خواہش پیدا ہو جاتی ہے۔ اور وہ ایک گروہ بنا کر زمیندار کے ہاں جاتے ہیں اور اس سے قانونی اُجرت مانگتے ہیں۔ جس کے وہ حقدار ہوتے ہیں۔ یا اس زمین کے ٹکڑے پر قبضہ کرتے ہیں جسے فاضل سمجھ کر زمیندار نے بے نامی رجسٹر کرا دیا ہو۔ یا سانجھی چراگاہ پر قبضہ کر کے اسے آپس میں بانٹ لیتے ہیں۔

زمیندار طبقوں اور مالدار لوگوں کی مخالفت کا رضا کار ایجنسیاں مقابلہ کر سکتی ہیں، اور وہ کر بھی رہی ہیں۔ لیکن ان کے خلاف ترازو کا پلڑا اس وقت بھاری ہو جاتا ہے جب سرکاری ایجنسیاں یعنی بلاک ڈیولپمنٹ افسر، تحصیل دار، ڈسٹرکٹ کلکٹر یا کمشنر اور پولیس، گاؤں میں زمین کے مالکوں اور شہروں میں گندی بستیوں کے مالدار قابضوں کے ساتھ مل کر قانون اور امن کے نام پر کام روک دیتی ہیں۔ لہٰذا ضرورت اس امر کی ہے کہ ان رضا کار ایجنسیوں کی امداد کے لیے ایک ایسا قانون بنایا جائے۔ یا سرکاری حکم جاری کیا جائے جو غریبوں کی اس تحریک کو جو انہیں اپنے حقوق حاصل کرنے کے لیے منظم کر رہی ہے۔ قانونی طور پر تسلیم کرے۔ اور سرکاری اداروں سے کہے کہ وہ ان غریب عوام کی منظم تحریک کو جو اضافہ کے لیے لڑ رہی ہے مدد نہیں کرتے تو کم از کم غیر جانبدار تو رہیں دوسرے الفاظ میں غریبوں کی ان تنظیموں کو اور ان کی مدد کرنے والی رضا کار ایجنسیوں کو وہی درجہ دیا جائے جو اس وقت ٹریڈ یونینوں کو ملک بھر میں حاصل ہے۔ رضا کار ایجنسیوں کا ایک دوسرا گروہ بھی ہے۔ جو غریب عوام کی تنظیم میں خاص طور پر دیہات میں مصروف کار ہے۔ یہ گروہ مختلف سیاسی جماعتوں مثلاً سی پی آئی، سی پی ایم۔ کانگرس، لوک دل وغیرہ پر مشتمل ہے جو غریب عوام کو اپنی پارٹی میں شامل کرنے کی غرض سے انہیں صحیح اُجرت، مکان بنانے کے لیے زمین کا ٹکڑا فاضل زمین کا حق یا بے زمین مزدور کو قانونی سہولیات دلانے کے لیے کوشش کرتا ہے۔ میں اس گروہ کو الگ دوسرا درجہ دیتا ہوں۔ کیونکہ رضا کار گروہ کی طرح یہ گروہ بغیر مقصد کام نہیں کرتا بلکہ اس کا اولین مقصد اپنی سیاسی پارٹی میں ممبروں کی تعداد کو بڑھانا ہے۔

دنیا میں کہیں بھی کوئی حکومت ایسے پروگرام شروع نہیں کرتی جو اس کے اپنے امدادی ڈھانچے کے کسی حصے کو نقصان پہنچائے۔ یہ حصہ مشتمل ہوتا ہے ایسے مراعات استعمال پسند اُن افراد پر جن کی تعداد معدودے چند ہوتی ہے۔

کرسچین مشن اور دیگر ایسے ہی ادارے غریب بھائیوں کی مدد کر رہے ہیں، چاہے وہ بے زمین زرعی مزدور ہوں جنھیں بہت کم اُجرت ملتی ہے۔ ہریجن خاندان ہوں جنھیں لوٹ کھسوٹ اور جانبداری کا شکار ہونا پڑتا ہے، غلام مزدور ہوں جنھیں آزادی کے بعد لبادہ آزادی دلانے بھی مشکل کام ہے، یا وہ عورتیں ہوں جنھیں ہمارے سماج میں برابری کا درجہ حاصل نہیں ہے۔

لینڈ ریفارم میں کردار

لینڈ ریفارم مشتمل ہے :-

۱۔ زمیندار کے پاس قانونی طور پر کتنی زمین چھوڑی جائے گی اور اس سے فاضل زمین غریب بے زمین میں تقسیم کی جائے گی۔ اس کا صحیح صحیح تعین۔ ۲۔ مزارعین کی زمیندار کے ساتھ باقاعدہ لکھت پڑھت۔ ۳۔ زمین کے ریکارڈ کو جدید اور حالیہ صورت دینا۔ اور اس کام کے لیے بھی جسے ساتویں پلان کے لاگو عمل میں غریبی دور کرنے کا اہم جزو قرار دیا گیا ہے سرکار ہی پارلیمنٹ یا ریاستی اسمبلیوں میں واضح قانون بنا کر انہیں پایۂ تکمیل کو پہنچا سکتی ہے۔ اور ان ریفارم کو زیر عمل لانے کے لیے کئی قانونی مرحلے طے کرنے ہوتے ہیں۔ اس لیے یہ کام بھی سرکاری اداروں اور افسران کو سر انجام دینا چاہیے۔ رضا کار ایجنسیاں البتہ ان خامیوں کی نشاندہی کر سکتی ہیں۔ جو لینڈ سیلنگ قانون میں باقی رہ گئی ہیں جن کا سہارا لے کر بڑے لوگ اور ان کے دوست صاف بچ نکلتے ہیں۔ یہ ایجنسیاں چھوٹے اور اوسط کھیت کاروں کی مدد

کی جاسکتی ہیں۔ جیسے کہ ان کی ملکیت یا مزارع ہونے کو رجسٹر کرایا جائے یا دیہات کے ریکارڈ میں جن فیصدی مزارعین کا نام نہیں ان کو باقاعدہ مزارعین کی حیثیت میں درج کرانے میں معاون ثابت ہو سکیں۔ اور سب سے اہم بات یہ کہ فاضل زمین کے

تیسرا مطالعہ کیا تو پتہ چلا کہ اس زمیندار کے خاندان میں ۳۰۷، ایکڑ زمین موجود ہے۔ جبکہ سیلنگ قوانین کے تحت ان کے پاس محض ۳۰ ایکڑ زمین ہونی چاہیئے تھی۔ ۱۹۸۲ میں ایس گوپان اور کستھلین گو نے معلوم کیا کہ وہی لوگ ۲۵۰ ایکڑ زمین پر قابض ہیں۔ اسی قسم کے دوسرے

کے سرمایہ پیدا کرنے کے مقاصد کے ساتھ ہی براہ راست روزگار پیدا کرنے کا قومی ترقی کا مقصد جڑا ہوا ہے۔

آئی۔آر۔ڈی۔پی (IRDP)، غریب سے غریب ترین خاندان کی امداد کے لیے

انھیں روپوں پیسوں کی ضرورت نہیں کیونکہ یہ کسی ایسے کارِ خیر میں جہاں خیرات دینی ہو مصروف نہیں ہیں۔ بلکہ یہ ایجنسیاں اس سے بھی مشکل کام میں لگی ہوئی ہیں۔ سب کا مقصد غریب عوام کو حوصلہ دینا ہے کہ وہ منظم ہوں اور اپنی طاقت کا احساس کریں۔

بے نامی اندراج، اپنے دستکاران کو بلاک یا گاؤں کے رجسٹر میں درج کرایا جائے اور ان کے اصل مالکوں کی جو زرعی قوانین کی خلاف ورزی کر رہے ہوں۔ نشاندہی کی جائے۔ سرکاری اور کمیونٹی ترقیاتی اداروں کے مطالعوں سے ثابت ہوتا ہے کہ اس قسم کا کام غیر جانبدار اور آزادانہ طور پر کام کرنے والی ایجنسیاں ہی سرانجام دے

مطالعوں سے جو مختلف ریاستوں کے دیہات میں کئے گئے ہیں۔ خاص طور پر ان علاقوں میں جہاں سبز انقلاب (Green Revolution) وقوع پذیر ہوا، یہ ثابت ہوا ہے کہ قوانین کو نظر انداز کرتے ہوئے زمین انہی لوگوں کے قبضہ میں رہی جن سے یہ دوسروں میں تقسیم ہونا تھی۔

تشکیل دیا گیا، تاکہ مویشی، پولٹری، اجتماعی کرگھا، اور دوسرے صنعتی اوزار دئے جائیں اور اس طرح اسے کچھ تو روزی کمانے کا ذریعہ ملے۔ پھر اسے اور مدد دی جائے تاکہ اس کی اس آمدنی میں اضافہ ہو اور وہ خود کفیل بنتا جائے۔ لیکن یہ پروگرام

اس کام میں مصروف ان ایجنسیوں کو طاقتور دیہی اور شہری گروہوں، مالدار جماعتوں کی منظم طاقت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ کیونکہ یہ لوگ جانتے ہیں کہ غریب عوام کی انجمنوں اور تنظیموں سے ان کی اپنی پوزیشن کو خطرہ لاحق ہو جائے گا۔

سکتی ہیں۔

مثال کے طور پر ۱۹۱۶ میں گلبرٹ اسلاٹر نے اروویلپیٹو (IRUVELPATTU) کے گاؤں کا مطالعہ کیا تو معلوم ہوا کہ ۴۵۶ ایکڑ زمین میں سے ۳۵۰ ایکڑ یعنی ۸۰ فیصد زمین محض ایک شخص کی ملکیت تھی۔ ۱۹۳۶ میں اے۔ کے۔ ویرا راگھون (A.K. Veeraghavan) نے اسی گاؤں کے بارے میں بتایا کہ اس زمیندار کے پاس گاؤں کی ۱۰۳۴۵ بیگھڑ زمین تھی۔ ۱۹۶۱ میں ایم۔ آر۔ ہیسول (M.R. Haswell) نے جب

بعض اوقات تو یہ بھی پتہ چلا کہ ان زمینوں کے مالکان سیاسی پارٹیوں کے مالی کمانڈر کے ممبر اور عہدے دار ہیں۔ ظاہر ہے کہ جو قوانین بنے ہیں۔ ان میں ایسے رخنے ہیں کہ لینڈ ریفارم پر عمل نہیں ہو سکتا۔ ان حالات میں رضاکار ایجنسیوں کا فرض ہے کہ وہ ان قوانین پر عمل درآمد کرائیں اور طے شدہ حدود کے اندر ان کو فعال بنائیں۔

دیہی ترقی کا (IRDP) مجموعی پروگرام، دیہی ترقی کے کل پروگرام

دو وجوہ سے ناکام ہو رہا ہے۔

پلاننگ کمیشن کے درمیانی عرصے کے جائزے سے جسے پروگرام ایویلیوایشن آرگنائزیشن (PEO) نے سرانجام دیا۔ یہ پتہ چلا کہ اس پروگرام کا فائدہ غریبوں کے بجائے ان کو پہنچ رہا ہے جو غریب نہیں ہیں۔ بلکہ مقابلتہً امیر ہیں۔ اور جن کی گاؤں میں آواز ہے۔ ریسرچ اداروں بلکہ کئی سرکاری ایجنسیوں کے مطابق ۱۵۰۰ کروڑ روپیہ جو اس پروگرام کے لیے ۸۱۔۱۹۸۰ سے تین سال کے لیے رکھا گیا تھا۔ اس میں محض ۱۰ فیصد ان خاندانوں کو ملا

جن کے لیے بیٹے کیا گیا، بانٹیں لمندہ دہلی سے گاؤں تک پہنچتے پہنچتے مختلف رشوت خور ذرائع غیر قانونی ادائیگیوں اور سیاسی لوٹ کھسوٹ کے ہاتھوں کھو گیا۔ یو۔ پی کے مرزاپور ضلع میں سروے کی رپورٹ سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض روپے بنانے کا پروگرام بن کر رہ گیا۔ جہاں تمام رقم افسروں

ہے کہ بچا سرمایہ کے خانہ میں ایجنسیں درج کر دیتا ہے) یہ ایجنسیاں اشیاء پہنچانے کے بعد بھی دیکھ بھال کر سکتی ہیں۔ تاکہ ان غریب خاندانوں کو غریبی کے پنجے سے رہائی دی جا سکے۔

منسٹری آف رورل ڈیولپمنٹ کی سالانہ

یہ ثابت ہوتا ہے کہ یا تو اس پروگرام میں دلچسپی نہیں دکھائی جا رہی ہے یا ریاستوں کو دیتے ہیں جو راہ طے کرنا ہوتی ہے وہ بہت لمبی ہے۔

سوم: آئی آر ڈی پی اور این آر ای پی میں کوئی ربط نہیں جس سے کہ جو سرمایہ پیدا ہوا ہے اسے سنبھالا جا سکے۔ اطلاع کے مطابق ۸۱-۱۹۸۰ میں ریاستوں کو ۱۰۵ کروڑ روپیہ مستقل سرمایہ قائم کرنے

ضرورت اس امر کی ہے کہ ان رضاکار ایجنسیوں کی امداد کے لیے ایک ایسا قانون بنایا جائے۔ یا سرکاری حکم جاری کیا جائے، جو غریبوں کی اس تحریک کو جو انھیں اپنے حقوق حاصل کرنے کے لیے منظم کر رہی ہے قانونی طور پر تسلیم کرلے۔ اور سرکاری اداروں سے کہے کہ وہ ان غریب عوام کی منظم تحریک کی جو کہ اضافہ کے لیے لڑ رہی ہے مدد نہیں کرتے تو کم از کم غیر جانبدار تو رہیں۔

اور ان کے درمیانی حواریوں میں بٹ گئی اور بعض کچھ قطرے اصلی لوگوں تک پہنچے۔ اے ٹی پی ڈسٹرکٹ کے مطالعہ سے بھی یہ ثابت ہوتا ہے کہ فنڈ اور سرمایہ کو کس طرح بری طرح استعمال کیا گیا۔ جس کے نتیجے میں دودھ دینے والی گائے غریب خاندان پر بوجھ بن گئی۔ اور اسے یا تو بیچ دیا گیا۔ یا اسے مار دیا گیا۔ رضاکار ایجنسیاں سرکاری افسروں

رپورٹ سے پتہ چلتا ہے کہ دیہی روزگار پروگراموں اور دیہی بے زمین لوگوں کو روزگار دینے کے پروگراموں میں بہت رخنے اور رشوت روی ہے۔ اول تو یہ کہ جتنی تعداد میں روزگار پیدا کرنا متعین کیا گیا۔ وہ اس سے کم تعداد میں پیدا ہو رہا ہے۔ ۸۱-۱۹۸۰ میں ۱۳۰ء۱ لاکھ افرادی ایام (Mandays) کے حساب سے روزگار دلایا گیا۔ ۸۲-۱۹۸۱ میں ۲۴۵۰ لاکھ۔ ۸۳-۱۹۸۲ میں

کے لیے دیا گیا۔ دسمبر ۱۹۸۳ تک اس کا کوئی حساب کتاب نہیں بتایا گیا۔

اور آخر میں دسمبر ۱۹۸۳ کی پبلک اکاؤنٹس کمیٹی کی رپورٹ میں منسٹری کی لاپرواہی کی طرف دھیان دلایا گیا ہے کہ اس نے کمیٹی کو جو اعداد و شمار دیے اس میں کہا گیا تھا کہ روزگار پیدا کرنے میں گزشتہ تین برس میں ۵ء۲۲ فیصد کی کمی ہوگی لیکن پارلیمنٹ کو جو اعداد و شمار دیے گئے، معلوم ہوتا ہے کہ

غریبوں کی ان تنظیموں کو اور ان کی مدد کرنے والی رضاکار ایجنسیوں کو وہی درجہ دیا جائے جو اس وقت ٹریڈ یونینوں کو ملک بھر میں حاصل ہے۔

اور آئی آر ڈی پی کے کارکنوں کی کارگزاری پر نظر رکھتے ہوئے اس امر کی ضامن بن سکتی ہیں کہ جن لوگوں کے لیے یہ پروگرام بنا ہے انھیں موجودہ دس فیصد کی جگہ کم سے کم ۶۰، یا ۸۰ فیصد تو مل جائے۔ ہو سکے تو یہ اس سے بھی بڑھ جائے۔ ان ایجنسیوں کو غریبوں تک اشیاء پہنچانے کی ذمہ داری بھی سپرد کی جا سکتی ہے۔ بلاک ڈیولپمنٹ افسر، اس قدر مصروف ہوتا

۳۵۰۰ لاکھ اور ۸۴-۱۹۸۳ میں یہ ۱۴۰۰ لاکھ رہ گئے۔ دوئم جو رقم دی گئی اور جو اناج رکھا گیا۔ انھیں ریاستوں نے جو خود پروگرام بناتی ہیں پوری طرح استعمال نہیں کیا۔

۸۳-۱۹۸۲ میں ۳۰۰ کروڑ روپے اور ۴ء۳ لاکھ ٹن اناج رکھا گیا۔ اس میں سے صرف ۲۰۰ کروڑ روپے اور ۳ء۴ لاکھ ٹن غلہ استعمال کیا جا سکا۔ ۸۴-۱۹۸۳ میں ۵ء۲۱۵ کروڑ روپے اور ۲ء۳ لاکھ ٹن غلہ رکھا گیا۔ اس میں سے صرف ۴ء۲۹ روڑ روپے اور ۳۰ء۵ لاکھ ٹن غلہ استعمال کیا گیا۔ اس سے

منسٹری کو قطعی طور پر معلوم نہیں کہ منصوبہ کیا ہے۔ مرکز اور ریاستوں نے اس کے لیے کتنی رقوم رکھی ہیں۔ اور افسران نے ان پروگراموں کو کہاں تک سرانجام دیا ہے:

یہاں بھی رضاکار ایجنسیاں مقامی ضروریات اور وسائل کا خیال رکھتے ہوئے پروگرام بنانے میں کام آسکتی ہیں۔ اور انھیں ان پروگراموں کی تکمیل میں بھی لگایا جا سکتا ہے۔ اس سے

بے روزگار اور کم روزگار لوگوں کی صلاحیت کے مطابق پلان بن پائے گا۔ اور جو پروگرام چلے گا وہ وہیں غریبوں کی ضروریات کے مطابق ہوگا۔ مثال کے طور پر

سماجی میدان میں کم سے کم ضرورت (Minimum need programme) کے پروگرام کے ساتھ چار اور پروگرام وابستہ ہیں۔ ان کی

کو بڑھانے کے لیے آبادی پر کنٹرول کو ایک لازمی امر بنانا، زرعی اور صنعتی پیداوار میں اضافہ۔ عورتوں کی فلاح و بہبود اور عمومی ترقی کے پروگرام کو کامیاب بنانے کے لیے دو بچوں تک فیملی کو محدود رکھنا۔ عورتوں کا درجہ بڑھانا

> رضاکار ایجنسیاں (البتہ) ان خامیوں کی نشاندہی کر سکتی ہیں، جو سینڈ سیلنگ قانون میں باقی رہ گئی ہیں۔ جن کا سہارا لے کر یار لوگ اور ان کے دوست صاف بچ نکلتے ہیں۔ یہ ایجنسیاں چھوٹے اور ادنیٰ کھیت کاروں کی مدد کر سکتی ہیں، تاکہ ان کی ملکیت یا مزارع ہونے کو رجسٹر کرایا جاسکے۔

> رضاکار ایجنسیاں سرکاری افسروں اور آئی آر ڈی پی کے کارکنوں کی کارگزاری پر نظر رکھتے ہوئے اس امر کی ضامن بن سکتی ہیں کہ جن لوگوں کے لیے یہ پروگرام بنا ہے۔ انھیں موجودہ دس فیصد کی جگہ کم سے کم ۶۰، ۷۰ یا ۸۰ فیصد تو مل جائے۔

> ان میں سے کسی کا بھی سارے ملک، ریاستوں اور یونین علاقوں میں عمل نہیں ہے، ضلع، بلاک یا ملک کی پنچایتوں کا تو ذکر ہی کیا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ رضاکار ایجنسی کا کام ایک دائرہ تک ہی محدود رہے گا۔

وقت والا گروپ کے مطالعے کے مطابق بے روزگار اور کم روزگار لوگوں کو اگر انھیں اپنے گھر سے دور روزگار دیا جائے گا تو وہ اسے منظور نہیں کریں گے۔ رضاکار ایجنسی اس صورت حالت کو پیش نظر رکھتے ہوئے پروگرام بناتی ہے اور اس کو پورا کرنے کا کام کرتی ہے۔ خود روزگاری کے ضمن میں دیہی نوجوانوں کو جو ٹریننگ دی جاتی ہے۔ اور جس کا سامنا ([illegible]) کو جو حال ہی میں شروع کی گئی ہے کرنا ہوگا۔ کچھ خامیاں ہیں۔ جنھیں رضاکار ایجنسیاں کسی حد تک دور کرنے میں معاون ہو سکتی ہیں۔

تکمیل میں رضاکار ایجنسیاں مصروف تو ہیں لیکن ان پروگراموں میں رضاکار ایجنسیوں کو وسعت دینے کی ضرورت ہے۔ ہیلتھ اور فیملی پلاننگ، ابتدائی صحت کی ترویج، ہیلتھ سروسز کی وسعت اور ان کی صلاحیت میں اضافہ۔ آبادی کی موجودہ شرح اور ۲ فیصد سے (جس کا ذکر رجسٹرار جنرل نے کیا ہے) ایک فیصد کے قریب لانا۔ (جسے اپروچ پیپر (Approach paper) دوراندیشانہ اور جرأت انگیز عمل کا نام دیا ہے)۔ معیار زندگی

اور ان کی شادی کچھ زیادہ عمر میں کرنا۔ ان کاموں کے لیے عورتوں کے کالجوں اور ہوم سائنس اداروں کو استعمال میں لانا (جس کی تجویز اپروچ پیپر میں ہے)۔ اور سب سے اہم تعلیم کو وسیع طور پر پھیلانا۔ یہ وہ میدان ہیں جن میں رضاکار ایجنسیوں کے زیادہ سے زیادہ عمل دخل پر اپروچ پیپر نے بار بار زور دیا ہے۔ ان ایجنسیوں میں اپروچ پیپر نے جن کو شامل کیا ہے وہ ہیں غیر سرکاری ادارے، کمیونٹی کے سربراہ اور رہنما۔ اور ان کی ٹریننگ تاکہ وہ جی توڑ کر ترقی کے

کاموں میں کمیونٹی ہیلتھ اور فیملی پلاننگ
کے میدان میں رضا کار ایجنسیوں نے جو کام کیا ہے وہ بہت اچھا رہا ہے۔ اور قابل تعریف ہے۔ اس ضمن میں، میں سرسری طور پر اپاسی (UPASI) ادارے کا ذکر کروں گا۔ جس نے جنوبی ہند میں کھیتی باڑی کے مزدور خاندانوں، پونیہ کے ضلع میں کیم (KEM) ہسپتال کے

> رضا کار ایجنسیاں خود سرمایہ جمع کرنے میں دقت محسوس کرتی ہیں۔ جبکہ وہ لوگ جن سے سرمایہ حاصل کیا جاسکتا ہے وہ اس پر اصرار کرتے ہیں کہ ان کو انکم ٹیکس کی چھوٹ دی جائے۔ اور یہ چھوٹ اکثر غلط استعمال ہوتی ہے۔

چلائے ہوئے واڈو دیہی ہیلتھ پراجیکٹ، مالور پرائمری ہیلتھ سنٹر میں فاپائی (FPAI) کا کام۔ مدراس میں ورکنگ ومنز فورم کی گندی بستیوں میں سرگرمیاں۔

دریائے گنگا کے کنارے سماجی مارکیٹ چلانے کے لیے وارانسی کمیونٹی پروجیکٹ رجنی کانت اور میبل اروں کا لاتانی جمکھیڈ رورل ہیلتھ پراجیکٹ۔ تامل ناڈو کے الوتورتم مقام پر گاندھی گرام کا کام اور ہوڑہ کمیونٹی ایسوسی ایشن کا منبو تو لیہ کے لیے کھانے کی گولیاں دینا ہے، یہ ان ہزاروں میں سے چند ایک مثالیں ہیں۔ جو رضا کار ایجنسیاں تندہی سے ہیلتھ اور فیملی پلاننگ کے معیار کو بلند کرنے کے لیے سرانجام دے رہی ہیں۔ اور یہ وہ کام ہیں جو سرکاری ادارے نہیں کر سکتے۔

اسی طرح تعلیم بالغان کے ضمن میں مرکزی وزارت تعلیم اور ریاستی سرکاروں نے ایک ہزار سے بھی زیادہ رضا کار ایجنسیوں کی خدمات حاصل کر رکھی ہیں۔ جو ۸ لاکھ ان پڑھ غریبوں کو خاص طور پر شیڈولڈ کاسٹ اور شیڈولڈ ٹرائب اور عورتوں کو جو غریبوں میں بھی سب سے غریب ہیں، علم کی روشنی سے منور کر رہی ہیں۔ انھیں روزی کمانے کی تربیت دے رہی ہیں۔ رضا کار ایجنسیاں بعض ریاستوں میں محض کچھ حصوں میں کام کرتی ہیں۔ میری ریاست تامل ناڈو میں ۵۰ رضا کار ایجنسیاں محض ۲۰ فیصد ان پڑھ بالغوں میں کام کرتی ہیں۔ جبکہ سرکاری پروگرام ۸۰ فیصد کا احاطہ کرتا ہے۔ یہ رضا کار ایجنسیاں تعلیم کی ترویج کے لیے نئے

نئے تجربات کرتی ہیں اور ذرائع پیدا کرتی ہیں۔ جو سرکاری ایجنسیاں ان سے جلد ہی سیکھ لیتی ہیں اور اپنے پروگراموں میں ان کو اپناتی ہیں۔ بعض حالات میں یہ رضا کار ایجنسیاں تعلیمی پروگرام کو ان پڑھ غرباء میں جاگرتی پیدا کرنے کے لیے استعمال کرتی ہیں تاکہ یہ لوگ کم سے کم قانونی اُجرت، زمین، صاف پانی اور ایسی ہی دوسری مراعات کو حاصل کرنے کے لیے منظم ہو سکیں۔ جن پر ان کا واجب حق ہے۔ اور یہ وہ میدان ہیں جہاں سرکاری ادارے کارآمد نہیں ہو سکتے۔ بچوں کی بہبود کے جامع پروگرام میں رضا کار ایجنسیوں نے جو کام کیا ہے، اس پر مرکزی وزارت اور ریاستی سوشل ویلفیئر بورڈوں نے قبولیت کی مہر لگائی ہے۔ اس ضمن میں رضا کار ایجنسیاں ماں اور بچے کی مقامی ضروریات کا اندازہ کرتے ہوئے پروجیکٹ کو اس کے مطابق ڈھال سکتی ہیں۔ اور جہاں جہاں انھیں ان پروگراموں کو چلانے کا کام سپرد کیا جاتا ہے۔ وہ اس بات کی ذمہ داری لے سکتی ہیں کہ ماں اور بچے تک پروگرام کے فوائد پہنچیں گے۔ ایڈ دج پیپر میں بھی رضا کار ایجنسیوں کو یہ ذمہ داری سونپنے کی کھلے لفظوں میں وضاحت کی گئی ہے۔ اس میں ذکر آتا ہے "عوام تک پروگرام پہنچانے کے لیے رضا کار اداروں کی حوصلہ افزائی کرنا ہوگی اور ان کی صلاحیت کو پوری طرح استعمال میں لانا ہوگا۔"

رُکاوٹیں

ترقی کے ان کاموں میں رضا کار ایجنسیاں کچھ رکاوٹیں محسوس کرتی آئی ہیں۔ جو ابھی تک بھی موجود ہیں۔ پہلے یہ کہ ان میں سے کسی کا بھی سارے ملک، ریاستوں اور یونین علاقوں میں عمل نہیں ہے۔ ضلع، بلاک، یا ملک کی پنچایتوں کا تو ذکر ہی کیا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ رضا کار ایجنسی کا کام ایک دائرہ تک ہی محدود رہے گا۔ دوم، دیہات میں جہاں کہ رضا کار ایجنسیوں کا اہم کام ہے۔ ان کی تعداد بہت محدود ہے۔ مرکزی وزارت اور ریاستی سوشل ویلفیئر بورڈوں نے رضا کار ایجنسیوں کی جو جامع فہرست بنائی ہے۔ اس کے مطالعہ سے واضح ہوتا ہے کہ اکثر ایجنسیوں کے مراکز شہروں میں ہیں۔ اور یہ لوگ ایک خیرات بانٹنے والے لوگوں کے روپ میں شہروں سے گاؤں میں کام کرنے کے لیے جاتے ہیں اور جہاں دیہات میں ایجنسیاں ہیں۔ ان کمپنیوں تربیت یافتہ ماہرین اور کارکنوں کی تعداد بہت کم ہے۔ چہارم، سرکاری وزارتوں اور سرکاری اداروں اور رضا کار ایجنسیوں میں باہمی شک وشبہ پایا جاتا ہے۔ جس کے فریقین خود ذمہ دار ہیں، اور جس کی وجہ سے پروگرام طے کرنا اور ان کو پایۂ تکمیل تک پہنچانا ناممکن ہو جاتا ہے۔

سوشل ویلفیئر وزارت، وزارت صحت کے فیملی ویلفیئر ڈویژن، وزارت تعلیم بالغان کے ڈویژن اور دوسرے محکموں کو چھوڑ کر مرکز اور ریاستوں میں رضا کار ایجنسیوں کو کوئی بھی اطلاع نہیں دیتا

(باقی صفحہ ۔۔ پر)

بنکر رائے کنسلٹنٹ پلاننگ کمیشن و ڈائرکٹر سوشل ورک اینڈ ریسرچ سنٹر تلونیا (راجستھان)۔

کاش ہمیں اُن کی ضرورت نہ ہوتی اگر اُن کا کام حکومت کرتی

صاحبِ مضمون طریقِ رضاکاری کے پُرجوش حامی ہیں۔ زیرِ نظر مضمون میں انھوں نے قدرے تشویش کے ساتھ اس امر پر روشنی ڈالی ہے کہ رضاکارانہ تنظیموں کی اقلیم میں کیا کچھ ہو رہا ہے۔ انھیں افسوس ہے کہ یہ تنظیمیں یہی کام کرنے والی سرکاری ایجنسیوں سے بہتر یا زیادہ اہل نہیں ہیں۔ لیکن ان کے تجزیے کا نچوڑ یہ ہے کہ رضاکارانہ تنظیمیں آہستہ آہستہ صحیح سمت اختیار کر رہی ہیں اور موجودہ حالات میں انھیں ایک اہم رول ادا کرنا ہے۔

اگر میری بات کا غلط مطلب نہ نکالا جائے تو میں یہ کہنا چاہوں گا کہ اگر حکومت اور اس کا وسیع نظامِ تقسیم دیہات کے غریبوں کو موثر انداز میں بنیادی نوعیت کی تکنیکی اور سماجی و اقتصادی خدمات فراہم کر سکتی، سماج کی ضرورتوں کو بروقت پورا کر سکتی، مساوات اور سماجی انصاف لا سکتی اور اقتصادی نابرابری کو دور کرنے کے بارے میں جو کچھ کہا جاتا ہے، اسے عملی جامہ پہنا سکتی تو رضاکارانہ تنظیموں کی کوئی ضرورت نہ ہوتی۔ یہ کہنے سے میرا مطلب یہ نہیں ہے کہ رضاکارانہ تنظیمیں یہ تمام فرائض زیادہ اعتماد کے ساتھ انجام دینے کی اہلیت رکھتی ہیں — وہ دیہی علاقوں کی ترقی میں ایک اہم پارٹ کیوں ادا نہیں کر پا رہی ہیں اس کی بہت سی وجوہ ہیں۔

> یہ ایک انوکھی دنیا ہے۔ رضاکاری کے شعبے میں بھی آپسی مقابلہ اتنا سخت اور غیر اخلاقی ہے کہ لگن اور ایثار کا جذبہ موجود ہونے کے باوجود نئے خیالات، نئے نقطۂ نگاہ اور نئے طریقوں کا خیر مقدم نہیں کیا جاتا۔

تلخ حقیقت: ایک ظاہرہ اور سب سے زیادہ نقصان پہونچانے والی وجہ یہ ہے کہ ہم نے حکومت کو رضاکارانہ شعبے میں بہت زیادہ فرائض انجام دینے کی اجازت دی ہے۔ مثلاً ہم نے حکومت کو رضاکارانہ تنظیموں کے لیے اسکیمیں اور پروگرام مرتب کرنے اور احکامات صادر کرنے دیا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ مالیات کے معاملے میں ہم سب گداگر بن گئے ہیں۔ ادارات کا رویہ یہ ہو گیا ہے کہ جو کچھ وہ دے رہے ہیں،

ہی چلتا ہے تو اسے لوجی چاہے چھوڑدو۔ گویا ہم پر مہربانی یا احسان کر رہے ہوں۔ ہم نے حکومت کو یہ سمجھنے دیا ہے کہ دیہی علاقوں کی ترقی کے لیے معلومات، مہارت اور تجربہ صرف انھیں کو حاصل ہے، ہم تو محض ان کے ہاتھ کے نیچے کام کرنے والے ہیں۔ سرکاری ادارے اپنے حکموں پر سختی کے ساتھ جو شرائط نافذ کرتے ہیں ہم نے بھی ان کی پابندی کرنا منظور کرلیا ہے گویا رضاکارانہ تنظیمیں حکومت ہی کا ایک شعبہ ہوں۔ ہم نے حکومت کو اپنے لیے سوچنے اور کام کرنے دیا ہے۔ حکومت ہی ہمیں بتاتی ہے کہ ترقی کیا ہے اور ہم اسے مان لیتے ہیں۔

تنظیموں کے بارے میں بھی سچ ہے جو اچھی تنخواہیں دے رہی ہیں۔ تحفظ اور سہولیات کی آرزومند ہیں۔ اسٹائل سے رہ رہی ہیں۔ اپنے دفاتر بڑے بڑے شہروں میں قائم کر رکھا ہیں اور وہیں سے دیہات کے غریبوں کے لیے کام کررہی ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کے بائیں بازو کو حکومت تسلیم کرتی ہے، سراہتی ہے اور اہمیت دیتی ہے لیکن اگر حکومت کی مدد و رہنمائی لیے بغیر حکومت کے ساتھ ایک کاروباری رشتہ قائم کرنے کی کوشش کی جاتی ہے تو یہ کہا جاتا ہے کہ "ہماری آزادی وخود مختاری ختم ہوجائے گی۔ ہم خود کو حکومت کے ہاتھوں فروخت کررہے ہیں"۔ اگر ہم حکومت کے زیادہ نزدیک جائیں گے تو وہ ہمارے کاموں میں مداخلت کرے گی اور ہمیں پریشان کرے گی۔ ہماری اپنی پہچان ختم ہوجائیگی۔"

ایک گندہ لفظ ہے کیوں کہ یہ نیا ہے اور اس سے تجارت پرستی کی بو آتی ہے۔ اجتماعی یا گروہی عمل کو دیکھ کر بھنویں تن جاتی ہیں جیسے یہ رضاکاری کو آلودہ کررہے ہوں۔ رضاکاری کے شعبے میں افراد واحد کے کام کے خلاف کسی قدم کو جذبات کے خلاف سمجھا جاتا ہے۔ لامرکزیت کی تو صرف بات کی جاتی ہے اور کوئی بھی سنجیدگی سے اس پر توجہ نہیں دیتا۔ اس بارے میں ناراضگی بڑھ رہی ہے کہ رضاکار شعبے میں بڑے چھوٹی نسل کے لیے ایک خراب اخلاقی مثال قائم کررہے ہیں۔ اس ناراضگی کو گستاخانہ اور ہتک آمیز سمجھا جاتا ہے۔ اس کی جوابدہی تو بڑوں کو ہی کرنی ہے کہ انھوں نے گذشتہ تیس برسوں میں کیا کیا ہے۔

"اس بارے میں ناراضگی بڑھ رہی ہے کہ رضاکار شعبے میں بڑے چھوٹی نسل کے لیے ایک خراب اخلاقی مثال قائم کررہے ہیں۔ اس ناراضگی کو گستاخانہ اور ہتک آمیز سمجھا جاتا ہے"

وہ رضاکارانہ ایجنسیوں کے لیے ضروری انتظامات کرنے کے نام پر شہروں کو چلے گئے ہیں اور ہمیں سینٹرل سوشل ویلفیئر بورڈ اور پبلک کوآپریشن وترقی اطفال کے قومی انسٹی ٹیوٹ کے آسرے چھوڑ گئے ہیں۔ یہ

اس سے پہلے کہ ہم یہ سوال کریں کہ کیا رضاکارانہ ایجنسیاں کام کرسکتی ہیں۔ ہمیں معلوم کرنا چاہیے کہ ان سے کیا کام کرانا مقصود ہے۔ ہم کو حکومت کے فرائض خود نہیں سنبھالنے چاہئیں۔ اور اگر کہیں رضاکارانہ تنظیمیں ایسا کرنے کی سوچ رہی ہیں تو وہ رضاکارانہ تنظیمیں نہیں رہ گئی ہیں۔

ہم نے ان تمام مسئلوں پر آزادانہ طور پر سوچنا بند کردیا ہے پھر بھی ہم اپنے نقطۂ نگاہ کو لچکدار بتلاتے ہیں۔

ہم اب بھی یہ دعوٰی کرتے ہیں کہ ہم کارنامہ یا نصب العین متعین کرنے، اپنی دلیری اور تحریک عمل کا ثبوت دینے اور بہتر قابلیت کے اشخاص فراہم کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں۔ یہ فرض کیا جاتا ہے کہ ہم دوسروں سے زیادہ لگن اور خلوص سے کام کرسکتے ہیں۔ زیادہ سخت اور مشکل حالات میں نمٹ سکتے ہیں۔ اور ایک مثال قائم کرسکتے ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ ہم ایسی رضاکارانہ

انوکھی دُنیا

یہ ایک انوکھی دُنیا ہے۔ رضاکاری کے شعبے میں بھی آپسی مقابلہ اتنا سخت اور غیر اخلاقی ہے کہ لگن اور ایثار کا جذبہ موجود ہونے کے باوجود نئے خیالات، نئے نقطۂ نگاہ اور نئے طریقوں کا خیرمقدم نہیں کیا جاتا۔ اس طرح رضاکاری کے شعبے کے اندر پیشہ ورانہ مہارت

دونوں ادارے رضاکار کم اور سرکاری زیادہ ہیں۔ دونوں فنڈ فراہم کرنے والی ایجنسیاں ہیں جو سخت سرکاری قواعد و ضوابط کے تحت کام کرتی ہیں۔ یہ خود اپنے اندر کوئی تبدیلی لانے، اپنے لیے ایسے منصوبے اپنے

آپ بنانے اور میدان میں کام کرنے والی رضاکار ایجنسیوں کے مفادات کی دیکھ بھال کرنے کے نا اہل ہیں۔ سرکاری پالیسیوں پر اثر ڈالنے، رضاکارانہ تحریک کے لیے جی جان سے لڑنے اور نچلی سطح کی چھوٹی چھوٹی تنظیموں کو امداد مدد فراہم کرنے کے بجائے یہ سب سے الگ تھلگ سلطنتیں سی بن کر رہ گئے ہیں۔ یہ بھی نہیں کہ ایک ایسا فورم ہی مہیا کریں جہاں لوگوں کے گرد جمع ہو کر اپنے مسائل پر تبادلۂ خیالات کر سکیں اور وہاں سے نیا اعتماد لے کر جا سکیں۔ ہو سکتا ہے وہ روایتی قسم کی اُن رضاکار ایجنسیوں کے لیے اہم خدمات انجام دے رہے ہوں، جو روایتی معنوں میں خیرات، بازآباد کاری اور سماجی بہبود کے لیے بنائی گئی ہیں۔ لیکن یہ خدمات دیہات کی ترقی کی حکمتِ عملی اور پروگراموں کے لیے قطعاً ناموزوں ہیں۔ سرکاری سطح پر ایک غیر جانبدار لابی کی ناموجودگی میں خلا کو پُر کرنے اور چھوٹے گروپوں کی نمائندگی کرنے کے لیے اور خود مدد باہمی خطوط کی بنیاد پر کچھ پریشر گروپ بن گئے۔ اگرچہ ان کے درمیان بہت سے اختلافات تھے تاہم ایک بات ان میں مشترک تھی اور وہ یہ کہ سرکار سے ان کا تعلق نہیں تھا۔

جو کچھ ہوا

یہ کوئی دانشمندانہ عمل نہیں تھا کیونکہ اس کے نتیجے میں رضاکارانہ ایجنسیوں کے لیے منصوبے سرکار بنانے لگی۔ رابطۂ عامہ کی کمی اور بڑھ گئی۔ اس کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ سچے اور پُر خلوص لوگ الگ رہے اور چھٹ بھیوں کی بن آئی اور انھوں نے اسے سیاست میں داخل ہونے کی سیڑھی بنا لیا۔ پھر کیا تھا شکوک و شبہات، باہمی حسد و رقابت اور لاتعلقی کا احساس پیدا ہو گیا۔ رضاکار ایجنسیاں اُس وقت تک قصوروار رہیں جب تک کہ انھوں نے اپنی معصومیت ثابت نہیں کر دی۔ دونوں اطراف میں سے کسی نے بھی زخموں پر مرہم رکھنے کی کوشش نہیں کی۔ اگرچہ پہلے پنجسالہ پلان کے زمانے میں رضاکار ایجنسیوں کو (نہ کہ رضاکارانہ کوششوں کی) نمائندگی کرنے والی کسی ایک ایجنسی کو، غیر سرکاری کوششوں اور عوامی اشتراکِ عمل کی اہمیت کے بارے میں بہت کچھ کہنا ہوتا تھا۔ تاہم چھٹے پلان تک پہنچتے پہنچتے رضاکارانہ ایجنسیوں کی اہمیت بہت کم ہو گئی۔ ہاں ان کے بارے میں یہاں وہاں ایک سطر یا ایک پیراگراف دکھائی دیا۔ بیوروکریٹ اتنا ہی کر سکتے تھے۔ اور رضاکارانہ شعبے کے سرکردہ نمائندے اس صورتِ حال کو بجنسہٖ تسلیم کرنے کو تیار ہو گئے۔ اس طرح انھوں نے طریقِ رضاکاری کو شکار ہو جانے دیا اور غلط فہمیاں برقرار رہیں۔ اب تک تو رضاکاری پیشہ ورانہ حیثیت حاصل کر چکی ہوتی مگر یہ نہیں ہوا اس کے بجائے اس کو سیاسی نوعیت دے دی گئی۔ وہ کہہ سکتے تھے کہ رضاکار ایجنسیاں سماجی بہبود، خیرات اور بازآباد کاری بحالی کے کام کے علاوہ اور بھی کچھ کر سکتی ہیں۔ لیکن وہ خاموش رہے۔ وہ اربابِ اقتدار سے گذشتہ تین دہائیوں میں منوا سکتے تھے کہ رضاکارانہ ایجنسیوں کی شناخت کیسے کی جائے۔ نیز کس کس نوعیت کی رضاکار ایجنسیاں موجود ہیں اور وہ کیا رول ادا کر سکتی ہیں۔ ایسا کرنے کے بجائے انھوں نے سرکار کو یہ سب

> **شاید یہ سوال پوچھنے کا وقت آ گیا ہے کہ ایک رضاکارانہ ایجنسی کب رضاکارانہ ایجنسی نہیں رہتی؟ گاؤں اور بلاک کی سطح پر رضاکارانہ ایجنسیوں کی سرکاری کوششوں کو اپنی مدد سے آگے بڑھانا چاہیے لیکن اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ حکمتِ عملی، پالیسی اور طریقِ کار کے معاملے میں وہ حکومت کے تابع ہو جائیں۔**

> **ہم میں سے کتنے ہیں جو یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہم یہ کام کر رہے ہیں یا کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں؟ یہ وہ کام ہیں جو ہمیں کرنے چاہئیں یہ وہ کردار ہیں جو ہمیں ادا کرنے چاہئیں، لیکن کتنی رضاکارانہ ایجنسیاں ہیں جو وقت پر ایک مضبوط موقف اختیار کرنے اور مفاد پرستوں سے ٹکر لینے کو تیار ہیں؟**

کر لے دیا۔ وہ حکومت کو للکار کر یہ دکھا سکتے تھے کہ حکومت سے دستیاب رقوم سے ایک زیادہ خرچ والا سادہ اور پُراثر کام کیسے سرانجام دیا جاسکتا ہے۔ وہ ایک مثال قائم کر سکتے تھے اور اپنی عزت بڑھا سکتے تھے۔ لیکن اس کے بجائے انھوں نے خود کو اپنے ذاتی رجحانات کے زیر اثر رہنے دیا اور کہتے رہے کہ سرکاری روپیہ داغی روپیہ ہے۔ گویا کہ بدیسی رقوم صاف ستھری ہوں۔ وہ مجاہد بن سکتے تھے۔ اپنے ضمیر کی آواز پر چل سکتے تھے اور نئے نئے خیالات کو بڑھاوا دے سکتے تھے، رضاکارانہ اعتماد کا تحفظ کر سکتے تھے۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔ اب ہم شخصیت پرستی، قدامت پرستی، سلامتی کی فکر اور حالات کو جوں کا توں رکھنے کی کوششیں دیکھتے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک غیر محسوس طور پر آپ کی پیٹھ میں چھرا گھونپنے کو تیار ہے۔

> **اگرچہ عام فضا ایسی نہیں ہے جس سے رضاکارانہ ایجنسیوں کی ترقی میں مدد ملے پھر بھی ایسا لگتا ہے کہ اب سرکاری انداز نظر کے متبادل کے طور پر رضاکارانہ ایجنسیوں کو بروئے کار لانے کی اہمیت سمجھی جانے لگی ہے۔**

اور روشن پہلو

ملک میں رضاکارانہ مساعی کا تاریک پہلو پیش کرنے کے بعد آیئے اس کے روشن پہلو پر نظر ڈالی جائے۔ ظاہر ہے کہ انکسار و عاجزی سے کسی حد تک فائدہ ہوا ہے۔ پر لیڈر گڈ پولا اور

نچلی سطح کی تنظیموں نے ظاہری طور پر حکومت کی توجہ اپنی جانب کھینچی ہے اور کچھ سبق بھی سیکھے گئے ہیں۔ پہلی دفعہ اعلیٰ افسران نے کسی تحریک یا ترغیب کے بغیر مختلف پلیٹ فارموں پر یہ کہنا شروع کیا ہے کہ اکیلی حکومت ہی غریبوں تک نہیں پہنچ سکتی، ان کے پاس سارے مسائل کے حل نہیں ہیں۔ وہ مانتے ہیں کہ غریبوں کی ترقی کے لیے متبادل راستے، مختلف طریقے اور مختلف نقطہ ہائے نگاہ موجود ہیں اور ان کا اظہار آزاد اور جمہوری سماج میں منصوبہ بندی کے سارے عمل میں ہونا چاہیے۔ رضاکارانہ ایجنسیوں کی ترقی و ترویج ایک ایسا ہی اظہار ہے جسے حکومت کو صحیح طور پر تسلیم کرنا چاہیے۔ اس سے پہلے کہ ہم یہ سوال کریں کہ کیا رضاکارانہ ایجنسیاں کام کر سکتی ہیں۔ ہمیں معلوم کرنا چاہیے کہ ان سے کیا کام کرانا مقصود ہے۔ ہم کو حکومت کے فرائض خود نہیں سنبھالنے چاہئیں اور اگر کہیں رضاکارانہ تنظیمیں ایسا کرنے کی سوچ رہی ہیں تو وہ رضاکارانہ تنظیمیں نہیں رہ گئی ہیں۔ شاید یہ سوال پوچھنے کا وقت آگیا ہے کہ ایک رضاکارانہ ایجنسی کب رضاکارانہ ایجنسی نہیں رہتی؟ گاؤں اور بلاک کی سطح پر رضاکارانہ ایجنسیوں کی سرکاری کوششوں کو اپنی مدد سے آگے بڑھانا چاہیے لیکن اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ حکمت عملی، پالیسی اور طریق کار کے معاملے میں وہ حکومت کے تابع ہو جائیں مثلاً حکومت کی پالیسی پینے کا پانی مفت بہم پہنچانا ہے لیکن رضاکارانہ ایجنسی اس پالیسی کو غلط سمجھتی ہے اور معمولی سی رقم، جو سماج بخوبی دے سکتا ہے، وصول کرتی ہے۔ تو یہ نقطۂ نگاہ کا فرق ہے۔ یہ حکومت کی فراہم کردہ ایک سہولت کو بڑھانا ہے۔ یہ دوہری پالیسی ہے جس سے سماج خود استعمال کنندگان سے کچھ سبق سیکھ سکتا ہے۔ دوہری پالیسی کی اہمیت یہیں ظاہر ہوتی ہے۔

> **ہمیں یہ جاننا ہے کہ رضاکارانہ ایجنسیوں نے ٹیکنالوجی کے اسرار کیسے کھولے ہیں، کیسے انھوں نے تعلیمی قابلیت کو تجربے، ذمہ داریوں، سوجھ بوجھ، طبعی میلان اور اہلیت سے الگ کر دیا ہے، یہ تنظیمیں اور ادارے بنتے بگڑتے کیسے پھلی پھولی ہیں، انھوں نے اپنی پہچان کھوئے بغیر کس طرح رضاکارانہ رسم کا استعمال کیا ہے۔**

یہ سبق ہیں :-

۱۔ استعمال کنندگان "فائدہ اٹھانے والے" نہیں رہے ہیں بلکہ "صارفین" ہیں جن کے سامنے دو متبادل راستے ہیں۔ وہ پانی مفت لیں یا اس کے لیے پیسہ دیں۔ زیادہ تر لوگ پیسہ دیں گے۔

۲۔ اب اس کی نوعیت اجارہ دارانہ نہیں رہی ہے بلکہ ایک نجی اور سرکاری سیکٹر کو بڑھاوا دینے کی سرکاری پالیسی سے مطابقت رکھتی ہے۔ گاؤں کی سطح پر ایک رضاکارانہ تنظیم کو نجی سیکٹر کے روپ میں دیکھئے جس کا مقصد نفع کمانا نہیں ہے۔

۳۔ یہ اعتماد، خودداری اور خود مختاری پیدا کرنے کی ایک کوشش ہے۔ اگر انھوں نے کوئی ہینڈ پمپ لگا لیا ہے وہ اسے اپنا

سمجھتے ہیں اور اس کی پوری دیکھ بھال کرتے ہیں۔ سرکاری ہینڈ پمپ چونکہ مفت کا ہے، اس لیے یہ بے کار ہو جاتا ہے۔

کرنے کو بہت سے کام ہیں

رضاکارانہ ایجنسیاں بہت سے کام کر سکتی ہیں۔ ساتویں پلان کے ضمن میں درج فہرست ذاتوں کے لیے وزارت داخلہ کے مقرر کردہ ورکنگ گروپ کی رپورٹ کے مطابق رضاکارانہ ایجنسیاں درج ذیل خدمات انجام دے سکتی ہیں:۔

۱۔ لچک، تحریکِ عمل، کم خرچ والے تکنیکوں، کام کے سادہ اور موثر طریقوں اور کسی ضرورت کے وقت فوری طور پر کوئی نہ کوئی ترکیب نکالنے وغیرہ کے سلسلے میں ایک مثال قائم کرنا۔

۲۔ حکمتِ عملی، پالیسیوں اور غریبوں تک پہونچنے کے طریقوں کے سلسلے میں کسی کوتاہی کے بغیر حکومت کی کوششوں کو آگے بڑھانا۔

۳۔ لوگوں کے ردِ عمل سے آگاہ کرنا اور عوام کی آواز منصوبہ سازوں یا پالیسیاں بنانے والوں تک پہنچانا۔

۴۔ نظام کو اتنا فعال بنانا کہ وہ لوگوں کی ضرورتوں سے آگاہ ہو سکے اور ان پر دھیان دے سکے۔ یہ دیکھنا کہ کم از کم اُجرت سے متعلق قانون، بندھوا مزدوری کو ختم کرنے کے قانون، شہری حقوق کے تحفظ کے قانون پر سختی سے عمل کیا جائے۔

۵۔ اطلاعات کی تشہیر و اشاعت گاؤں کی سطح پر جانکاری اور معلومات ایک طاقت ہیں اور اس طاقت کو حتی الامکان زیادہ سے زیادہ لوگوں میں تقسیم کرنا چاہیے تاکہ اسے سرپرستی کے طور پر نہ استعمال کیا جائے۔

۶۔ یہ دکھانا چاہیے کہ مقامی وسائل کو از خود ترقی کے لیے کیسے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ تاکہ گاؤں میں انسانی اور دیگر وسائل کو جنھیں پوری طرح کام میں نہیں لایا جا رہا ہے۔ پوری طرح بروئے کار لایا جا سکے۔ رضاکارانہ تنظیموں کو ٹیکنالوجی کے اسرار کو کھولنا چاہیے۔

۷۔ نچلی سطح کے دیہی کارکنان کے ایک کاڈر (Cadre) کو تربیت دینی چاہیے، پیشہ ورانہ تربیت اور سائنسی معلومات سے آگاہ کرنا چاہیے تاکہ دیہی علاقوں کے غریب افراد خود اپنے آپ پر اعتماد کر سکیں اور بچولیوں پر انحصار نہ رکھیں۔

۸۔ سماج کے مالی وسائل کو حرکت میں لانا اور خود انحصاری کو بڑھاوا دینا۔

۹۔ غریبوں کو حرکت میں لانا اور انھیں منظم کرنا تاکہ ان کے زور دباؤ سے بہتر سروسیں حاصل ہو سکیں اور سرکاری کارکن کا رویہ بہتر بنایا جا سکے، اور

۱۰۔ دیہی اور شہری علاقوں میں اقتصادی، ثقافتی اور ذات پات پر مبنی نابرابریوں کو دور کرنا اور سماجی انصاف کے لیے کام کرنا۔

لیکن کیا ہم یہ سب کر رہے ہیں؟

ہم میں سے کتنے ہیں جو یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہم یہ کام کر رہے ہیں یا کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں؟ یہ وہ کام ہیں جو ہمیں کرنے چاہئیں یہ وہ کردار ہیں جو ہمیں ادا کرنے چاہئیں لیکن کتنی رضاکارانہ ایجنسیاں ہیں جو وقت پر ایک مضبوط موقف اختیار کرنے اور مفاد پرستوں سے ٹکر لینے کو تیار ہیں؟ حساس اور مشکل علاقوں میں کام کرنے والی رضاکارانہ ایجنسیوں کو شک و شبہ کی نظر سے دیکھا جاتا ہے اور انھیں نکسل وادی، انقلابی یا سی۔ آئی۔ اے، کا ایجنٹ قرار دیا جاتا ہے۔ کتنی ایجنسیاں ہیں جو ان ناموں سے پکارے جانے کو تیار ہیں؟ سیاسی جماعتیں بھی ان کی نکتہ چینی کرنے میں پیچھے نہیں رہتیں۔ اتنی مشکلات کے باوجود رضاکار ایجنسیاں خود کو اربابِ اقتدار سے تسلیم کروانے کے لیے کچھ بھی کرنے کو تیار ہو جائیں گی۔

بہت کم افسر اپنے آپ آزادانہ فیصلے کر سکتے ہیں بلکہ کچھ کے پاس تو اپنا دماغ ہی نہیں ہوتا۔ خود اپنی سلامتی کی خاطر وہ نچلی سطح کے کارکنان، پٹواری، تھانے دار، تحصیل دار اور اس کے ساتھیوں کی رائے پر ہی چلنا پسند کریں گے۔ ایک اوسط درجے کا افسر تو رضاکارانہ تنظیموں کے بارے میں کوئی رائے فائل پر لکھی ہوئی رپورٹ کی بنیاد پر ہی قائم کرے گا جو رضاکارانہ ایجنسیاں کم از کم اُجرت، بندھوا مزدوروں کی رہائی اور بازآباد کاری، درج فہرست ذاتوں اور قبیلوں کی ترقی، پینے کے پانی کی فراہمی، مناسب داموں والی دکانوں کی کارکردگی بہتر بنانے اور صارفین کی تحریک سے متعلق خدمت انجام دے رہی ہیں، انھیں نچلی سطح کے سرکاری کارکنان کی حمایت حاصل ہونے کا کوئی امکان نہیں ہے۔ خود ریاستی حکومتوں نے رضاکارانہ ایجنسیوں سے متعلق ریاستی سطح کے مشاورتی گروپوں میں نمائندگی کے لیے معین رضاکارانہ ایجنسیوں کو چُنا ہے اس سے بھی یہ بات ظاہر ہے۔ اگرچہ منصوبہ بندی کمیشن نے اس بات کی پوری وضاحت کر دی ہے کہ وہ رضاکارانہ ایجنسی کسے سمجھتا ہے پھر بھی منصوبہ بندی کمیشن کی بات بہت کم معاملوں میں مانی گئی ہے۔ ذیل میں وہ شرائط درج کی جاتی ہیں جن کی بنیاد پر دیہی ترقی کے میدان میں کام کرنے والی رضاکارانہ ایجنسیوں کی شناخت کی جا سکتی ہے۔

۱۔ ایجنسی کو رجسٹریشن آف سوسائٹیز ایکٹ ۱۸۶۰ء یا ریاستی حکومت کے وضع کردہ ہم پلہ قانون کے تحت رجسٹرڈ ہونا چاہیے۔

۲۔ ایجنسی دیہی علاقے میں ہونا چاہیے اور وہاں اسے کم از کم چار پانچ برس کام کیا ہو۔

۳۔ اس کو پیشہ ورانہ اور انتظامیہ مہارت حاصل ہونی چاہیے۔ اور اسے حکومت سے ملی ہوئی

رقوم کے بارے میں باقاعدہ آڈٹ شدہ بیانات اور رپورٹیں پیش کرنی چاہئیں۔

۴۔ ایسے براہِ راست یا بالواسطہ طور پر کسی سیاسی جماعت سے وابستہ نہیں ہونا چاہیئے نیز کوئی بھی شخص جو الیکشن کے ذریعے چُنے جانے کے بعد کسی پبلک عہدے پر فائز ہو وہ اس کا ممبر نہیں بن سکتا۔

۵۔ اس کو واضح طور پر سیکولرزم، سوشلزم اور جمہوریت کے اصولوں پر عمل کرنا ہوگا اور یہ اعلان کرنا ہوگا کہ یہ دیہی ترقی کے لیے صرف قانونی اور غیر متشدّانہ طریقے ہی اختیار کرے گی۔

۶۔ اسے غریبی دُور کرنے، لوگوں کی کم از کم ضروریات کو پُورا کرنے اور سیاسی و اقتصادی ترقی لانے کے پروگراموں کو عملی جامہ پہنانا ہوگا جن کا مقصد خطِ غریبی سے بھی نیچے زندگی گذارنے والے کُنبوں میں بیداری پیدا کر کے ان کی زندگیوں کے معیار کو بلند کرنا ہوگا۔

اگرچہ بہت سی ریاستوں کی حکومتوں نے ان سب باتوں کو مان لیا ہے لیکن جب ان پر عمل کرنے کا وقت آتا ہے تو وہ احتیاط برتتے ہوئے ایسے لوگوں کو چُنتی ہیں جن سے انھیں کوئی خطرہ نہیں ہوتا جن کے بارے میں یہ خیال ہوتا ہے کہ وہ حکم کے مقابلے میں قانون کو زیادہ اہمیت دے سکتے ہیں یا نازک سوالات پوچھ سکتے ہیں یا جو دباؤ میں نہیں آئیں گے انھیں عموماً دُور ہی رکھا جاتا ہے۔

اہمیت سمجھی جانے لگی ہے۔

اگرچہ عام فضا ایسی نہیں ہے جس سے رضاکارانہ ایجنسیوں کی ترقی میں مدد ملے پھر بھی ایسا لگتا ہے کہ اب سرکاری اندازِ نظر سے متبادل کے طور پر رضاکارانہ ایجنسیوں کو بروئے کار لانے کی اہمیت سمجھی جانے لگی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ رضاکارانہ ایجنسیاں کام کر سکتی ہیں، بشرطیکہ وہ اپنے موقف کی وضاحت کرنے کی پہل کریں جس سے حکومت کو ان کا رول سمجھنے میں مدد ملے۔ حکومت کو، چاہیئے جیسے بھی ہو، اس بات کا یقین ہو چکا ہے کہ ترقی اسی صورت میں ممکن ہے جب لوگ پوری طرح رضاکارانہ ایجنسی کے نظام پر انحصار رکھیں۔ لیکن رضاکارانہ ایجنسیاں لوگوں یا ان کے سماج کو آزاد بنانے کے لیے کام کر رہی ہیں اور اس کے لیے یکسر مختلف اندازِ نظر کی ضرورت ہے۔ اس اندازِ نظر کی وضاحت صرف رضاکارانہ ایجنسیاں ہی کر سکتی ہیں لیکن چونکہ اس اندازِ نظر سے نتائج کے برآمد ہونے کی کئی مثالیں موجود ہیں، اس لیے حکومت کو بیٹھ کر دیکھنا اور سُننا چاہیئے۔ ہمیں یہ جاننا ہے کہ رضاکارانہ ایجنسیوں نے ٹیکنالوجی کے اسرار کیسے کھولے ہیں، کیسے انھوں نے تعلیمی قابلیت کو تجربے، ذمہ داریوں، سمجھ بوجھ، طبعی میلان اور اہلیت سے الگ کر دیا ہے، یہ تنظیمیں ادارے بنے بغیر کیسے پھلی پھُولی ہیں، انھوں نے اپنی پہچان کھوئے بغیر کس طرح رضاکارانہ سسٹم کا استعمال کیا ہے، کس طرح اپنے انقلابی خیالات کی اشاعت کی ہے اور کیسے انھیں حکومت سے منوایا ہے تاکہ وہ وسیع تر پیمانے پران کا تجربہ کر سکے۔ ہمیں یہ بھی سیکھنا ہے کہ ان تنظیموں نے کیسے اپنی اپنی تنظیم میں لامرکزیت لانے کا اصُول اپنایا ہے اور فرائض و اختیارات علاقے کے لوگوں میں تقسیم کیے ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ رضاکارانہ تنظیمیں خود اپنے فائدے کے لیے ان تمام باتوں کو دستاویزی شکل میں تحریر میں لائیں۔

اس تجزیے کے بعد میں یہ سوچنے پر مائل ہوں کہ رضاکارانہ ایجنسیاں دھیرے دھیرے صحیح سمت میں جا رہی ہیں۔ چند ایک کو چھوڑ کر باقی ایجنسیاں حکومت کے ساتھ اپنی شرائط پر بات کرنے کو تیار ہیں۔ اگر ہم اتفاق نہ کرنے پر بھی اتفاق کرتے ہیں تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ ہم مسلسل میز پر بیٹھ کر مزید بات چیت کرنے کے بعد ایک دوسرے سے متفق نہ ہو سکیں۔ ہمیں ایک دوسرے سے بہت کچھ سیکھنا ہے لیکن پہلی بات تو یہ ہے کہ ہم دونوں یہ تسلیم کریں کہ ہم دونوں کے پاس ایک دوسرے سے کہنے کے لیے کچھ ہے۔ پہلا قدم اُٹھایا جا چکا ہے جیسا کہ میرے دفتر میں ایک پوسٹر لگا ہوا ہے جس میں تمام رضاکارانہ ایجنسیوں کو یہ پیغام دیا گیا ہے:

"مسافر! تیرے سامنے کوئی راستہ نہیں ہے راستے تو چل کر بنائے جاتے ہیں۔"

★

بقیہ: اُمید کیا صرف اُمید ہی رہیگی

اس کے برعکس مفاد پرست رضاکار اداروں میں ہر عنوان قسم کے لوگ اس طرح

> بہت سے ایماندار لوگ یہ محسوس کریں گے سرکار نے دیہات کے مربُوط ترقی کے پروگرام اور دیہی ترقی کے قومی پروگرام پر زور دیا ہے مگر وسائل کی تقسیم کے بُنیادی کام کو غیر متوازن ہی رکھا ہے۔ اس لیے انھیں ترقیاتی پروگراموں پر عمل درآمد میں اپنی شرکت کا احساس نہیں ہو پاتا۔

کے گمراہ کُن ترقیاتی پروگراموں میں اپنی شرکت خوشی سے پسند کریں گے کیونکہ ان کا مقصد تو کسی نہ کسی طرح پیسہ کمانا ہے۔

★

موہت سین — ممبر سنٹرل پولیٹیکل بیورو، سی۔ پی۔ آئی۔ نئی دہلی۔

رضاکاراداروں پر بھروسہ نہ صرف غلط بلکہ مضر

مضمون نگار کا کہنا ہے کہ اپنے ملک میں افلاس کو کم کرنا ایک اہم معاملہ ہے۔ لہٰذا موجودہ حالات میں رضاکارانہ ایجنسیوں کو کوئی کردار سونپنا، پلان اور اُس کی تکمیل میں ایک سرسری اور لاابالی رویّہ اختیار کرنے کے مترادف ہوگا۔ موصوف کا کہنا ہے کہ "پلان سے متعلق واقعی وہ بہت کم ہے، جسے لازمی کہا جائے اشتراکی ممالک کے برعکس پلان قانون کا درجہ نہیں رکھتا۔ پلان کی عدم تکمیل قانون شکنی کے مساوی نہیں ہوتی۔ لہٰذا اُس کے لیے تعزیری یا کسی اور سرزنش کا اہتمام نہیں ہوتا۔ دوسرے لفظوں میں ہمارے پلان پہلے ہی کافی حد تک رضاکارانہ صفت سے متصف ہیں!"

خاص کر لکھو کھا غریب عوام کی بہبود کے لیے بنائے گئے پلان پروجیکٹوں کی جزوی تکمیل کے لیے بھی رضاکارانہ ایجنسیوں پر بھروسہ کرنا غلط، بلکہ مضر ہوگا۔ رضاکارانہ ایجنسیوں پر کم و بیش حد تک تکیہ کرنے کا اندازِ نظر، پلان اور اُس کی تکمیل کے تئیں

اور کایا پلٹ کی ایک اہم ترین شکل ہے، جو موٹے طور پر اکثر اُس سے مطابقت رکھتی ہے۔ پلان یقیناً سرکاری کام ہے، یا بے شک اسے ایسا ہونا چاہیئے۔ خاص کر لکھو کھا عوام کی غریبی کو کم کرنے جیسے اہم معاملے میں، اُس کی عمل آوری بے پناہ طور پر ریاست، سرکار اور

معنوں میں اس پر سنجیدگی سے دھیان نہیں دیتیں۔ پہلی بات یہ ہے کہ اسے اُسی انداز میں پیش کیا جاتا ہے، جس میں کہ اسے مرتب اور

> پلان یقیناً سرکاری کام ہے یا بے شک اِسے ایسا ہونا چاہیئے خاص کر لکھو کھا عوام کی غریبی کو کم کرنے جیسے اہم معاملے میں، اِس کی عمل آوری بے پناہ طور پر ریاست، سرکار اور اس کی ایجنسیوں کی ذمّہ داری اور سعی ہونی چاہیئے۔

سرسری یا لاابالی رویّہ رکھنے پر دلالت کرتا ہے۔ جبکہ اُمور سے قطع نظر پلان ہمارے معاشرتی و اقتصادی نظام میں سرکار یا ریاست کی جانب سے مداخلت، راہنمائی

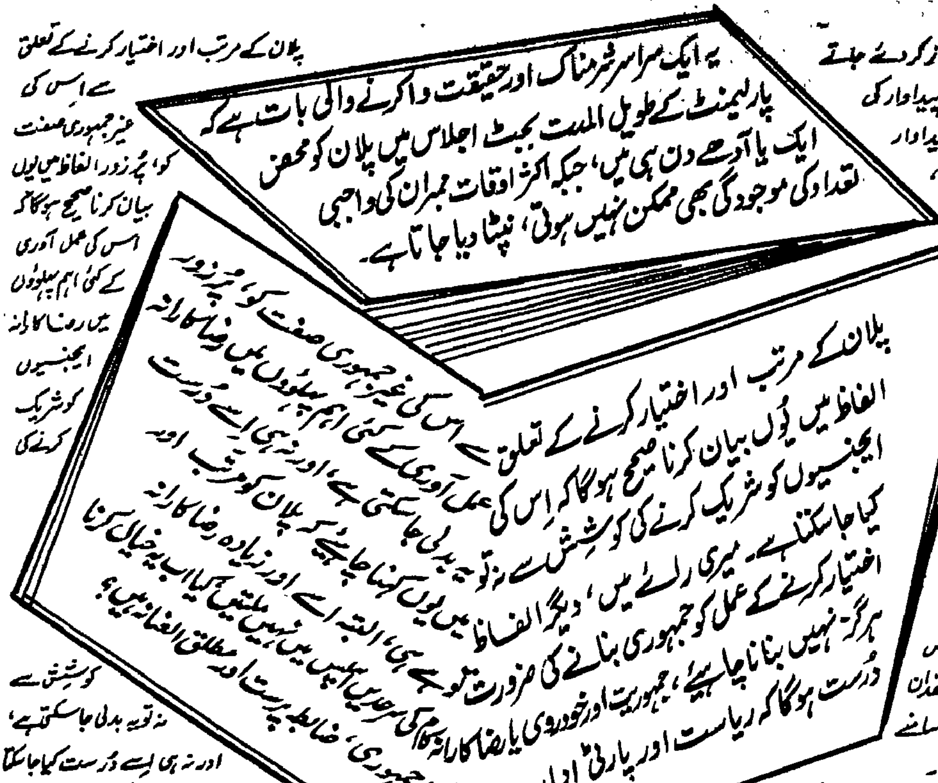
اُس کی ایجنسیوں کی ذمہ داری اور سعی ہونی چاہیئے۔

بھارت کے پلانوں کے تعلق سے بڑی مشکل یہ ہے کہ ریاست اور سرکار صحیح

اختیار کیا جاتا ہے۔ پلاننگ کمیشن تو اس ضمن میں واقعی کافی محنت کرتا ہے۔ بے شک یہ ادارہ اپنے طور پر مناسب معلومات اور مہارت رکھتا ہے۔ اِس ضمن میں وزارتوں کو بھی اپنا اپنا رول ادا کرنا ہوتا ہے۔ خاص کر وزارتِ خزانہ کو۔ نیشنل ڈیولپمنٹ کونسل میں وزرائے اعلیٰ کو بھی اس عمل میں شریک کیا جاتا ہے، لیکن جو امور

اکثر نظر انداز کر دیئے جاتے ہیں، وہ ہیں پیداوار کی اکائیاں، پیداوار کے مقامات، نیز سائنس دار تخلیق کار۔ اس طرح حقیقی اور ٹھوس سنجیدگی کا فقدان ابھر کر عین سامنے آجاتا ہے۔

مزید برآں جب پلان کم و بیش حتمی صورت میں مرتب ہو جاتا ہے تو اسے جائزے کے لیے پارلیمنٹ کے سامنے رکھا جاتا ہے، جو بدقسمتی سے اس وقت بے ربط ہوتا ہے۔ بھارت میں منصوبہ بندی کی قدر و قیمت کا اندازہ اس شرمناک حقیقت سے لگایا جاسکتا ہے کہ پارلیمنٹ کے طویل المدت بجٹ اجلاس میں، پلان کو محض ایک یا آدھے دن ہی میں، جب کہ اکثر اوقات ممبران کی واجبی تعداد کی موجودگی بھی ممکن نہیں ہوتی، نپٹا دیا جاتا ہے۔ بعد ازاں یہ تو ضرور ہوتا ہے کہ سالانہ یا "وسط مدتی جائزے" کے دوران ایک بے ربط سی نظر ثانی کے لیے پلان کو پھر سامنے لایا جاتا ہے۔ ویسے ایسے بجٹ کی تخصیصات اور بعض اوقات وزرائے اعلیٰ اور منصوبہ بندی کمیشن کے مابین جوڑ توڑ کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا جاتا ہے۔



پلان قانون نہیں ہے

پلان میں واقعی ایسا بہت کم ہوتا ہے جسے لازمی کیا جائے۔ اشتراکی ممالک کے برعکس، پلان ایک قانون کا درجہ نہیں رکھتا۔ اس کی عدم تکمیل قانون شکنی کے مساوی نہیں ہوتی۔ نیز اس کے لیے تعزیری یا کسی اور سرزنش کی گنجائش نہیں ہوتی۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہنا چاہیئے کہ ہمارے پلان پہلے ہی کافی حد تک رضاکارانہ صفت سے متصف ہیں۔

پلان کے مرتب اور اختیار کرنے کے تعلق سے اس کی غیر جمہوری صفت کو، پُر زور الفاظ میں یوں بیان کرنا صحیح ہوگا کہ اس کی عمل آوری کے کئی اہم پہلوؤں میں رضاکارانہ ایجنسیوں کو شریک کرنے کی کوشش سے نہ تو یہ بدلی جاسکتی ہے، اور نہ ہی اسے درست کیا جاسکتا ہے۔ میری رائے میں، دیگر الفاظ میں یوں کہنا چاہیئے کہ پلان کو مرتب اور اختیار کرنے کے عمل کو جمہوری بنانے کی ضرورت تو ہے ہی، البتہ اسے اور زیادہ رضاکارانہ ہرگز نہیں بنانا چاہیئے۔ جمہوریت اور خودروی یا رضاکارانہ کام کی سرحدیں آپس میں نہیں ملتیں، کیا اب یہ خیال کرنا درست ہوگا کہ ریاست اور پارٹی ادارے لازماً غیر جمہوری، ضابطہ پرست اور مطلق العنانہ ہیں؟

اگلا سوال یہ اٹھتا ہے کہ اکثر رضاکارانہ ایجنسیوں کی نوعیت اور مقصد کیا ہے۔ خاص کر اُن کا جو غریب بھارتی عوام میں کام کرنے کی دعویدار ہیں۔ اکثر چند ایک ایجنسیوں کو چھوڑ کر جن کا مذاق اُڑایا جاتا ہے جبکہ وہ حقیقت میں غیر ملکی ہاتھ کے خطرے سے خالی نہیں، دوسری بہت سی ایجنسیاں غریبوں کے لیے کام کرتی ضرور نظر آتی ہیں تاہم ان کا حقیقی کام غریبوں کی ترقی کی راہوں میں

حائل ہے۔

یہ غلط اندازِ نظر

میری رائے میں یہ غلط اندازِ نظر مندرجہ ذیل تین بنیادی عناصر سے مرکب ہے :۔

اوّل :

یہ عنصر بنیادی معاشرتی و اقتصادی تبدیلی سے قطع نظر غریبی کو قومی، اقتصادی ترقی اور معاشرتی انقلاب سے ہٹ کر دیکھتا ہے۔ اس اندازِ نظر کے حامی یہ مانتے ہیں کہ غریبی کا سوال اصلاحی مسائل سے الگ ہے۔

دوم :

ایسی اکثر رضاکارانہ تنظیموں کا مرکزی نقطۂ نظر زیادہ سے زیادہ خیرات پر مبنی ہوتا ہے۔ خیرات نجی تعلقات میں تو ایک ضروری اور قابلِ قدر خوبی ہے لیکن معاشرتی ارتباط میں یہ ایک خطرناک شئے ہے۔ سٹیفان زویزنے برسوں پہلے بڑے پُرجوش انداز میں، نجی تعلقات میں ترحم سے خبردار رہنے کے لیے متنبہ کیا تھا۔ لہٰذا جب کوئی کسی مفلس کی مفلسی میں مدد کرنے کے لیے اُس کے پاس پہنچتا ہے تو اُسے اور بھی زیادہ خبردار رہنا ضروری ہے۔

ترحم کا جذبہ اور ہمدردی اسی لیے بجا ہوتے ہیں کیونکہ وہ شفقت، عزت اور اعتماد کے ساتھ ساتھ چلتے ہیں، لیکن خیرات کے بارے میں یہ صحیح نہیں ہے، مجھے بھلے ہی عیب جوئی کرنے کا الزام دیا جائے لیکن میں یہ کہے بغیر نہیں رہوں گا کہ ایسی اکثر رضاکارانہ ایجنسیوں کے لیے غریب لوگ وہ تنکے ہیں جن کا مفقود ہو جانا، خود ان کے وجود کی دلیل ہی سے اُن کو محروم کر دے گا۔ اُن کی رائے میں غریب عوام نہ صرف ہمیشہ ہمارے ساتھ ہوتے ہیں، بلکہ ہمیشہ اُن کو ہمارے ساتھ ہونا چاہیے۔ مذکورہ بالا بیان کی شدت کو کم کیے بغیر میرا اسی بات پر اصرار ہے کہ ان رضاکارانہ ایجنسیوں میں اکثر کام کرنے والے نیک دل ہوتے ہیں اور وہ لازماً ایسے افراد کی خاصی تعداد کو راحت پہنچاتے تھے، جنھیں اور سب لوگ اکثر نظرانداز کر دیتے ہیں، لیکن یہ ضروری نہیں کہ انفرادی اخلاقی خوبیاں معاشرتی بھلائی کی ترغیب بھی دیں۔

مجھے بھلے ہی عیب جوئی کرنے کا الزام دیا جائے، لیکن میں یہ کہے بغیر نہیں رہوں گا کہ ایسی اکثر رضاکارانہ ایجنسیوں کے لیے غریب لوگ وہ تنکے ہیں، جس کا مفقود ہو جانا، خود ان کے وجود کی دلیل ہی سے اُن کو محروم کر دے گا۔ اُن کی رائے میں غریب عوام نہ صرف ہمیشہ ہمارے ساتھ ہوتے ہیں، بلکہ ہمیشہ ان کو ہمارے ساتھ ہونا چاہیے۔

سوم : ایسی بیشتر رضاکارانہ ایجنسیوں اور بیشتر اُن لوگوں کے اندازِ نظر میں، جو ان ایجنسیوں کے سربراہ یا رہنما ہوتے ہیں، سرکاری اور دیگر سیاسی ایجنسیوں کے تئیں حقارت اور اتہامات کا ملا جلا رویّہ کارفرما ہوتا ہے۔ خدا معلوم سرکاری و دیگر سیاسی ایجنسیوں کے بارے میں کتنا کچھ ہولناک طور پر غلط ہے، لیکن کیا سبھی رضاکارانہ ایجنسیاں یا اُن کی اکثریت، مع اُن کے کہ جن کی بانی نامور ہستیاں ہیں اور جو باوقار غیر ملکی پیسے رکھتی ہیں، زیادہ بہتر ہیں۔ کیا وہ سبھی بے داغ ہیں؟ کیا وہ موقع پرستی کی بدعت سے پاک ہیں، کیا ان پر کامیابی کے جنون کی شدت بیدار نہیں ہوئی؟ کیا انھوں نے متوسط طبقے کو جس سے کہ خود زیادہ تر تنظیمیں اُبھریں، آگے بڑھانے اور زک پہنچانے کے ملے جلے عمل کا ثبوت نہیں دیا۔

جدید نوآبادیاتی نظام کی ایک بڑی برائی یہ ہے کہ اس کے توسط سے سیاسی چلن، جماعتوں اور شخصیتوں کو بدنام کیا جاتا ہے۔ ہمارے ہم وطنوں کی قومی اخلاقی گراوٹ نیز ہمارے ملک کے بین الاقوامی وقار کو گرانے کے لیے چلائی گئی جدید نوآبادیاتی اور نوشہنشاہیت پسند عام مہم کا یہ ایک اہم پہلو ہے۔ ایسے کام کے لیے صریح طور پر دورِ حاضر کا انتخاب کیا گیا ہے، کیونکہ ہماری خود مختار، سرمایہ دارانہ ترقی کے تضادات جہاں جہاں واضح ہونا شروع ہو گئے ہیں، پھر بیٹھ کر غور...

خدا معلوم سرکاری و دیگر سیاسی ایجنسیوں کے بارے میں کتنا کچھ ہولناک طور پر غلط ہے، لیکن کیا سبھی رضاکارانہ ایجنسیاں یا اُن کی اکثریت، مع اُن کے کہ جن کی بانی نامور ہستیاں ہیں اور جو باوقار غیر ملکی پیسے رکھتی ہیں، زیادہ بہتر ہیں۔

حال ناوابستہ تحریک کی صدارت کی بہت بڑی بین الاقوامی ذمہ داری، نیز بھارت کے ایک عظیم ایشیائی اور عالمی قوت بن جانے کے ایک بہت ہی حقیقی امکان کے ساتھ جڑ گئی ہے۔

حل یہ ہے:

جبکہ میری رائے میں غریب عوام کو پلان کی تکمیلی اسکیموں میں شریک کرنے میں رضاکارانہ ایجنسیاں بہت ہی تھوڑا رول ادا کر سکتی ہیں، اس کا مطلب یہ نہیں کہ ایسی شرکتِ عامہ کے حصول کے لیے ایک محنت طلب، باہمت اور یہاں تک کہ کسی غیر سرکاری سعی کی کوئی ضرورت نہیں۔ لا محالہ غریب عوام ہی کو اپنی غربت کو جھٹک پھینکنا ہوگا اور اس کام کے لیے پلان اور دیگر سرکاری اسکیمیں ایک ایسا ہتھیار ہے، جسے انھیں ضرور استعمال میں لانا چاہیئے۔ اس ضمن میں برسرِ اقتدار پارٹی نیز اُن دوسری پارٹیوں کو، جن کا کچھ مدار اُن مقامات پر ہو، جہاں کہ غریب عوام بستے اور کام کرتے ہیں، ایک فیصلہ کن کردار ادا کرنا ہے۔ حکومت اور برسرِ اقتدار پارٹی کا طریقِ عمل الگ الگ ہونا چاہیئے۔ ایسا کرنا نہ صرف ایک دوسرے کے فرائض میں مداخلت کو روکنے کے لیے ازبس ضروری ہے، بلکہ یہ اس لیے بھی ضروری ہے تاکہ مزید مداخلت سے کام میں رخنہ نہ پڑے اور ظاہر ہے کہ یہ مداخلت حکمراں پارٹی کے مفادات کے تحفظ کے لیے ہوگی جو کہ ایک امتیازی سلوک کی نشاندہی کرے گی۔ ایک دفعہ نمایاں پیمانے پر شروع ہو جائے تو برسرِ اقتدار پارٹی حکمرانی سے متعلق اپنا لازمی طریقِ عمل کھو دیتی ہے! اسی طرح حزبِ مخالف بھی اُس کی تقلید میں اپنی ساکھ اور ایک حقیقی متبادل سمجھے جانے کے امکان کو کھو بیٹھتی ہے، تاہم، اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں کہ سرکار پلان میں شامل اسکیموں کی تکمیل کی خواہشمند ہو اور سیاسی جماعتیں، قوتیں اور شخصیتیں اِس معاملے میں اپنا تعاون پیش کریں، یہ قول ایسی پارٹیوں کی زیرِ سرکردگی کام کرنے والی یا خود مختار عوامی تنظیموں پر بھی لاگو ہوتا ہے۔

یہ کہا جائے گا کہ ہمارے ملک کے غریب عوام کی بڑی بڑی ٹکڑیاں ایسی ہیں، جو کسی خاص سیاسی جماعت یا عوامی تنظیم سے منسلک نہیں ہیں، لہٰذا اُن تک کیسے پہنچا جائے اور انھیں کیونکر اس کام میں شریک کیا جائے؟ یہاں تک بھی کہا جاتا ہے کہ ایسے لوگوں کی ایک بہت بڑی تعداد ایسی ہے جو ووٹ نہیں ڈالتی اور یہاں تک کہ جو ووٹ ڈالتے ہیں اُن کی بھی ایک بہت بڑی تعداد اس کام میں شریک پارٹیوں اور مسائل سے بالکل نابلد ہے، اس امر کو چھوڑ کر کہ ایسا کہنا صورتِ حال کو توڑ مروڑ کر اور مبالغے سے بیان کرنا ہوگا۔ ہمارے ملک کے عوام کئی طرح کی کھینچا تانی کے باوجود سیاسی امور سے کافی واقف اور باخبر

حکومت اور برسرِ اقتدار پارٹی کا طریقِ عمل الگ الگ ہونا چاہیئے۔ ایسا کرنا نہ صرف ایک دوسرے کے فرائض میں مداخلت کو روکنے کے لیے ازبس ضروری ہے، بلکہ اس لیے بھی ضروری ہے تاکہ مداخلت سے کام میں رخنہ نہ پڑے اور ظاہر ہے کہ یہ مداخلت حکمراں پارٹی کے مفادات کے تحفظ کے لیے ہوگی جو کہ امتیازی سلوک کی نشاندہی کرے گی۔ اگر ایسا ایک دفعہ نمایاں پیمانے پر شروع ہو جائے تو برسرِ اقتدار پارٹی حکمرانی سے متعلق اپنا طریقِ عمل کھو دیتی ہے۔

عوام الناس کی بیش از بیش شرکت کے لیے اہم ضرورت اس بات کی ہے کہ اس کام میں لگی ہوئی سیاسی جماعتیں اپنے آپ کو محدود انتخابی پاس و لحاظ سے چھٹکارہ دلائیں اور اپنی ذاتی ترقی کے زاویے سے بھی اُن کا تناظر طویل تر ہو۔ حتیٰ کہ بزرگ اور تجربہ کار سیاسی لیڈروں کا، جنھوں نے اپنے آپ کو بنیادی تبدیلیوں کا پابند کر رکھا ہے، یہ رونا سُن کر دُکھ ہوتا ہے کہ باوجودیکہ انھوں نے عوام الناس کی خدمت کی ہے، وہ انھیں ووٹ نہیں دیتے۔

ہیں۔ صورتِ حال کو سدھارنے کے لیے یہ بات بالکل بجا ہے۔ سیاسی سرگرمی اور بڑے پیمانے پر سیاسی امور کی آگہی کا کوئی متبادل نہیں ہے۔

ایسے مسائل جن میں اختلافِ رائے اور جانبداری کا کم سے کم عنصر شامل ہو، ان کے تئیں یہ طریقِ عمل بہترین ثابت ہوتا ہے۔

آگہی و بیداری

سیاسی جماعتوں اور عوام الناس کی تنظیموں کا سارا زور بلکہ آپسی مقابلہ اس امر میں ہونا چاہیے کہ وہ اپنی بھرپور کوششوں سے یہ یقینی بنائیں کہ پلان کی اسکیموں کی برکات اُن لوگوں تک پہنچ پائیں، جن کے لیے وہ مرتب کی گئی تھیں، بلکہ اس سے بھی زیادہ اس امر کی ضرورت ہے کہ اِن اسکیموں سے مستفید ہونے والے خود چوکس رہیں، اپنے آپ کو منظم کریں اور خود اعتمادی پیدا کریں، آج کے ہندوستان میں کھیلے جا رہے ایک عظیم انسانی ڈرامے میں انھیں فعال بنانے میں اُن کی مدد اور راہنمائی کی جانی چاہیے۔ یہ شدید طور پر ایک سیاسی کام ہے، لہٰذا تبھی اس کی تکمیل کا کام صریحاً ناقابلِ ذکر بلکہ مشکوک رضاکارانہ ایجنسیوں پہ نہیں چھوڑا جا سکتا۔

عوام الناس کی بیش از بیش شرکت کے لیے اہم ضرورت اس بات کی ہے کہ اس کام میں لگی ہوئی سیاسی جماعتیں اپنے آپ کو محدود انتخابی پاس و لحاظ سے چھٹکارا دلائیں اور اپنی ذاتی ترقی کے زاویئے سے بھی اُن کا تناظر طویل تر ہو۔ حتیٰ کہ بزرگ اور تجربہ کار سیاسی لیڈروں کا، جنھوں نے اپنے آپ کو بنیادی تبدیلیوں کا پابند دکھایا ہے، یہ رونا سُن کر دُکھ ہوتا ہے کہ باوجودیکہ انھوں نے عوام الناس کی خدمت کی، وہ اُنھیں ووٹ نہیں دیتے۔ ماضی میں ایسے لیڈر اپنی خدمت کی عوض یا عوام الناس کے جوابی فعل کے بارے میں ایسے ردِّ عمل کا اظہار نہیں کرتے تھے۔ اُن دنوں کوئی انتخابی اُمید وابستہ نہیں کی جاتی تھی۔ عوام اگر سرکش اور بےحرکت نظر بھی آئے تو بھی اُن سے ہمدردی ہوتی تھی اور اس جمود کی موجودگی میں بھی یہ عزم کارفرما نظر آتا تھا کہ وہ کس طرح جاگیں اور منظم ہوں اور ان کوششوں کو ہی ان کی بالآخر فتح کی ضمانت سمجھا جاتا تھا۔

> یہ بات اُن رضاکارانہ ایجنسیوں اور راہنماؤں کے کئی دہائی ترقی کے پروگراموں کے بارے میں بھی درست ہے، جو واضح طور پر ہمارے قومی سطح پر تسلیم شدہ مقاصد، منصوبوں اور پروگراموں کے سخت مخالف ہیں۔ اس لیے اُن کی اِن کھوکھلا کرنے والی سرگرمیوں کے لیے مزید مواقع فراہم کرنے کے بجائے، اُن کے بڑے منصوبوں کا پتہ چلانا، نیز اُن پر نگرانی رکھنا اور روک لگانا بہتر ہوگا۔

ایسے تعیینِ سمت کی ضرورت آج بھی ہے۔ اور چونکہ آخری تجزیے میں یہ ذاتی منیر اور لگن کا معاملہ ہے اس لیے اسے رضاکارانہ کہا جا سکتا ہے۔ پلان کی تکمیل میں عوام الناس کی کامیاب شرکت کے لیے اس نوع کا رضاکارانہ اندازِ نظر رکھنے والی جماعتوں اور تنظیموں کی مدد اور تعاون یقیناً ناگزیر ہے۔

ریڈیو ٹیلی ویژن کا بہتر استعمال کیجیے

اس مسئلے کا ایک اور پہلو بھی ہے جس پر اس مقالے میں بحث کی جائے گی، وہ ہے عوام الناس کی راست بیداری اور سرکار کی طرف سے اُنھیں اپنے آپ کو منظم کرنے کی تحریک دینے کا نیا امکان اور یہ کام بےشک اولاً ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے استعمال سے ممکن ہے اور پھر اخبارات سے بھی۔ معاصر دَور میں انقلابات اور جوابی انقلابات دونوں کا تجربہ یہ بتاتا ہے کہ اب ذرائعِ ابلاغِ عامہ کو مملکتی قوت کا فیصلہ کن عنصر سمجھنا چاہیے۔ کسی بھی ملک کو، جو عوام الناس کی بیداری کا خوف نہ رکھتا ہو، بلکہ اس کے برعکس اپنے قومی احیا اور ترقی کے لیے اسے اپنی سعی کے جزو کے طور پر صاف طور پر اُبھارنا چاہتا ہو، پرچار وسائل کو اس مقصد کے لیے استعمال کرنا چاہیے۔

پرچار وسائل کا یہ استعمال صرف برسرِ اقتدار پارٹی اور اُس کے پروگرام کو آگے بڑھانے کے غلط استعمال جیسا نہیں ہونا چاہیے۔ ہم نے خود کو ایک ایسا آئین دیا ہے، جس کے ابتدائیے میں سوشلزم، سیکولرازم اور جمہوریت کے لیے من حیث القوم ہمارے پابند ہونے کا صاف صاف ذکر کیا گیا ہے، قومی سطح پر تسلیم کی گئی، اس آئینی پابندی کو نبھانے کے لیے عوام الناس کی پلان کی تکمیل میں شرکت واقعی ایک اہم اور لازمی جزو ہے۔ جب ایسا ہے تو پھر ریڈیو اور ٹیلی ویژن کو اس مقصد کے حصول کے لیے پورے زور شور سے کیوں نہیں استعمال کیا جا سکتا۔ عوام الناس کی تعلیم کو حفظانِ صحت اور کھاد وں

(باقی صفحہ [illegible] پر)

ڈی بندوپادھیائے ایڈوائزر، پلاننگ کمیشن، نئی دہلی۔

رضاکارانہ خدمت — فرار یا پابندی

عوام کو باشعور بنانے اور ترقیاتی اسکیموں کی تعمیل میں رضاکار تنظیموں کی سرگرم شرکت کی پُرزور حمایت کرتے ہوئے مصنف نے بتایا ہے کہ بیوروکریسی اُن مختلف امور کو بدرجہ اتم انجام دینے کے معاملے میں بُنیادی پابندیوں سے جکڑی ہوئی ہے جو نہ صرف غریب طبقوں کو مادّی طور پر فائدہ پہونچا سکتے ہیں بلکہ سماجی تبدیلی کے عمل کا بھی آغاز کر سکتے ہیں۔

دوسروں کے افلاس و غلاظت اور بیماری معذوری کا چرچا کرنا اُن اشخاص کے لیے جو خوشحالی سے اُکتائے ہوئے ہیں اور اقتصادی طاقت اور بلند سماجی رتبہ کے مالک ہیں، نہ صرف مَن بہلاوا ہے بلکہ کسی قدر مہذب تفریح بھی ہے۔ عام طور پر یہ بات بھی دیکھنے میں آتی ہے کہ دولتمند کنبوں اور اہم گھرانوں کی معمر خواتین پھولوں سے آراستہ مکانوں کی چھتوں پر یا میخانہ کلب کے خوبصورت طعام خانوں میں یا کسی پانچ ستارہ ہوٹل کے خصوصی کمروں میں جوش و خروش کے بغیر بات چیت کرتی ہیں اور اُن کا موضوع ہوتا ہے کہ خواتین کے کسی سلائی کڑھائی کے مرکز یا بچوں کے کسی ڈے کیئر ہوم، انتظامیہ کمیٹیوں یا سب کمیٹیوں کی میٹنگوں کے لیے تاریخیں مقرر کرنا۔

اور اہم فیصلے

ایسی میٹنگوں میں جو شاندار مکانوں میں ہوتی ہیں اور جن میں باوقار معمر خواتین چند طرح دار لڑکیوں کے ہمراہ شرکت کرتی ہیں کسی آیا کو پانچ روپے کی ترقی دینے یا پھر کسی دوسرے گھریلو ملازم کے بھتیجے کو جزوی وقت کے چوکیدار کا کام دلانے سے متعلق یادگاری فیصلے پوری متانت کے ساتھ کئے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ شادی کے رشتوں اور نا لائق داماد گھرانوں کے بارے میں چرچا ہوتا ہے جس کے ساتھ ہی وہ بڑے شوق سے چیم، جیلی، لسّی اور دار جلنگ کی چائے پر ہاتھ صاف کرتی ہیں۔

اس کھیل کو خوشامدی آہنگ بھرے خوش پوشش کمپنی ایگزیکٹو دیکھتے ہیں جن کے لیے ایسے اجتماع اُن کے کیریئر کی تیز رفتار ترقی کے لیے مختصر راستہ فراہم کرتے ہیں۔ وہ سمندر پار ممالک سے آنے والے تحفوں کے بنڈلوں کو کسٹم آفس سے چھڑانے ایسی اہم میٹنگوں کے لیے انکم ٹیکس والوں سے 35 CCA کے تحت کٹوتی کے حصول کے لیے سوچ سمجھ کر حساب تیار کرنے اور سینٹر یا محتاج گھر کو چلانے کے لیے متعلقہ سرکاری محکموں سے مراعات حاصل کرنے کے لیے بھاگ دوڑ کرتے ہیں۔ ایسے محتاج گھروں یا سینٹروں کے مکین یا ایسے پراجیکٹوں سے مستفید ہونے والے لوگ کسی بھی وقت کسی ایسی قابلِ ذکر تقریب کے لیے سامعین یا افرادی قوت کا کام دیتے ہیں جو اعلیٰ گھرانے یا

ایسی بیشتر تنظیمیں تیسری دنیا کے غریبوں کے لیے غیر ملکی فنڈ لانے کا کام کرتی ہیں جن کا زیادہ تر حصّہ اِن پُرشکوہ تنظیموں کی دیکھ بھال پر خرچ ہوتا ہے جن کے اراکین ایک بین الاقوامی ہوائی مرکز سے دوسرے مرکز کو پرواز کرتے رہتے ہیں اور "شیراٹن" اور "ہولی ڈے اِن" کے عالیشان ہوٹلوں میں غریبوں کے لیے اپنا دردِ دل لیے قیام پذیر ہوتے ہیں۔

کمیٹیوں کی طرف سے منعقد کی جاتی ہے۔ روزمرہ کے عمل سے ہونے والی اُکتاہٹ کو دُور کرنے کی کوشش میں بعض لوگ غریبوں کے سرگرم ہمدرد بن جاتے ہیں اور اس سے انھیں بھی بارسوخ پبلک شخصیتوں اور چوٹی کے سرکاری افسروں کے رابطے میں آنے کا موقع ملتا ہے جس سے انھیں زندگی کے دُوسرے شعبوں میں فائدہ پہنچتا ہے۔ ایسی رضاکارانہ سرگرمیوں کو کوئی بھی سمجھ سکتا ہے۔

اُن لوگوں کے لیے مطلوبہ سماجی تبدیلی لانے کے لیے ٹھوس اور صدقدلانہ کوششیں کر رہے ہیں جن کے لیے وقت کی رفتار بہت عرصہ پہلے رُک چکی ہے۔ اُنھیں کس چیز سے تحریک حاصل ہوتی ہے؟ انھیں کس چیز نے تھام رکھا ہے؟ اُن کے پاس کیا وسائل ہیں؟ انھیں مایوس ہونے سے کونسی بات روک رہی ہے؟ اس سے پہلے کہ ایسے رضاکار غیر سیاسی کارکن اور اُن کی تنظیمیں غریبوں کے انسداد اور سماجی انصاف سے متعلق مستحکم اور طویل عرصہ تک چلنے والے پروگراموں سے

سے ہونے والے غم و غصہ یا مایوسی سے ایک قسم کا فرار ہے جس نے اُن کے ساتھ سختی سے سلوک کیا تھا؟ کیا یہ انتقام کا جذبہ ہے جس کے باعث وہ غریبوں کے ساتھ جڑ گئے ہیں؟ یا یہ ایک ایسے ٹوٹے ہوئے سماج کے مصیبت زدگان کے لیے صدق دلانہ اظہار تشویش ہے۔ جس میں تھوڑے سے خوشحال لوگوں کا زیادہ تر دارومدار بیشتر عوام کی ناداری پر ہے؟ اس کا جواب خواہ کچھ بھی ہو، یہ حقیقت ہے کہ وہ اپنی اپنی جگہوں پر ہیں اور اس کی کوئی وجہ نہیں کہ وہ جب تک وہاں ہیں ایسے کام کرنے کے لیے اُن کا تعاون اور امداد کیوں نہ طلب کی جائے جنھیں بہترین بیورو کریٹ بھی بہترین حالات میں انجام نہیں دے سکتے۔

اور یہ گروپ

رضاکار تنظیموں میں ایسے قسم کے لوگوں اور گروپ بھی ہیں جن کے عہدیدار زیادہ تر ہوائی سفر پر رہتے ہیں۔ اور اکثر دیہات کی سربجن بستیوں یا بڑے بڑے شہروں میں گندی بستیوں کے بجائے بین الاقوامی میٹنگوں میں دیکھے جاتے ہیں۔ ایسی بیشتر تنظیمیں تیسری دُنیا کے

> **ہمارے ذہن میں تو اس قسم کی رضاکار تنظیمیں اور گروپ ہیں جو غریبوں کے سماجی و اقتصادی مصائب دُور کرنے کے آدرش سے تحریک پاتے ہیں اور غریبوں کے ساتھ رہ کر اور کام کر کے اُن کے سُکھ دکھ میں شریک ہوتے ہیں۔**

سماجی کارکنوں کی دوسری قسم

لیکن سماجی کارکنوں کی ایک دوسری قسم اب ہمارے ملک کے متعدد حصوں میں کافی مشکل اور کٹھن حالات میں مظلومین، نادار اور دبے ہوئے لوگوں کے بیچ کام کر رہی ہے۔ ایسے لوگ ماضی میں مشنریوں کے سوائے نظر نہیں آتے تھے۔ ان میں ایک بھیم راؤ جھابوا میں، ایک جیوتنا سنگھ بھوم میں، ایک ارون رائے راجستھان کے جھیل علاقوں میں، ایک اَجیت داس کورا پٹ میں اور ایسے ہی بیشتر دوسرے اشخاص بے غرضی اور بے خوفی سے کام کر رہے ہیں اور اپنی جوانی اور توانائی کا بیشتر حصہ ناانصافی کے خلاف لڑنے اور غریب طبقوں کو اپنی تمام چیزیں دلانے کی کوشش میں صرف کر رہے ہیں جو جائز طور پر اُن کا حصہ ہیں۔

اِن میں سے بیشتر اشخاص کے لیے یہ دولت کی اُکتاہٹ سے فرار نہیں ہے بلکہ وہ

> **بنیادی طور پر یہ تمام گروپ دیہات میں موجود رہتے ہیں جہاں وہ کام کرتے ہیں۔ وہ کسی دُور دراز مقام سے کیے گئے کنٹرول کے نظام کے ذریعے نہیں بلکہ وہ جن لوگوں کے بیچ میں ہیں اُن کے ساتھ مل کر کام کرتے ہیں۔**

وابستہ ہوں یا اُن کو شروع کریں ان سوالات کے جوابات جاننا لازمی ہے یہ بلاشبہ اُن کا ہی کام ہے کہ وہ اِن سوالوں کے جوابات تلاش کریں۔ تاہم اگر اُن سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ غریبوں، محتاجوں اور محرومین کے لیے بنائے گئے پلان کے پروگراموں کی تعمیل کے کافی اہم رول ادا کریں تو کم از کم اس اَمر کا اشارہ تو ملنا چاہیے کہ اُنھیں کس چیز سے تحریک حاصل ہوتی ہے اور اُن کے وسائل کی بُنیاد کیا ہے۔ کیا اُن کے لیے بھی یہ اُس غیر مساوی سماج

غریبوں کی ترقی کے لیے غیر ملکی فنڈ لینے کا کام کرتی ہیں جن کا زیادہ تر حصہ اِن پُرشکوہ تنظیموں کی دیکھ بھال پر صَرف ہوتا ہے جن کے اراکین ایک بین الاقوامی ہوائی مرکز سے دوسرے مرکز کو پرواز کرتے رہتے ہیں اور شیرائن اور ہولی ڈے اِن" کے عالیشان ہوٹلوں میں غریبوں کے لیے اپنا دردِ دل لیے قیام پذیر ہوتے ہیں۔ یہ بھی

رضاکاروں کی ایک قسم ہے جس کا ہم ذکر نہیں کر رہے ہیں۔

ہمارے ذہن میں تو اسی قسم کی رضاکار تنظیمیں اور گروپ ہیں جو غریبوں کے سماجی و اقتصادی مصائب دُور کرنے کے آدرشوں سے تحریک پاتے ہیں اور جو دیہات میں کام کرتے ہیں۔ اور غریبوں کے ساتھ رہ کر کام کرکے اُن کے دُکھ میں شریک ہوتے ہیں۔ یہ اشخاص عموماً تعلیم یافتہ ہوتے ہیں اور ان میں مرد و خواتین شامل ہوتے ہیں۔ بعض اوقات یہ گروپ رجسٹرڈ ہوتے ہیں اور بعض اوقات نہیں۔ اکثر معاملوں میں ان گروپوں نے بعض ایسے حالات میں کام کرنا شروع کیا جن کے بارے میں ان کا خیال تھا کہ اُن میں مسلسل تنظیمی سرگرمیوں سے بہتری ہو سکتی ہے۔ وہ آدرشوں سے تحریکِ عمل پائے ہوئے افراد بھی ہو سکتے ہیں۔ جو کوئی باقاعدہ گروپ بنائے بغیر دیہی علاقوں میں رہ کر کام کرتے ہیں تاکہ وہ جماعتی عمل سے بعض پسندیدہ سماجی مقاصد حاصل کر سکیں۔ بنیادی طور پر یہ تمام گروپ دیہات میں موجود رہتے ہیں جہاں وہ کام کرتے ہیں۔ وہ کسی ایسے نظامِ کار کے تحت کام کرتے ہیں جس پر دُور سے کنٹرول ہوتا ہو بلکہ سب لوگوں کے بیچ میں اُن کے ساتھ مل کر کام کرتے ہیں۔

ایک جائز سوال

کوئی بھی شخص جائز طور پر یہ سوال اٹھاتا ہے کہ حکومت رضاکاروں کے ایسے مختلف بکھرے ہوئے گروپوں کے تعاون کی کیوں خواہاں ہے جن کی تعداد محدود ہے اور پھیلاؤ کم ہے جب کہ اُس کے پاس اپنی ایسی مشینری ہے جس کی پشت پر بہت زیادہ مالی وسائل ہیں۔ چھٹے پانچ سالہ منصوبے میں مربوط دیہی ترقیاتی پروگرام، قومی دیہی روزگار اور دیہات میں بے زمین اشخاص کے روزگار کی ضمانت کے پروگراموں کے لیے تقریباً ۴ ارب روپے کا خرچ رکھا گیا تھا۔ اگرچہ کوئی نہیں جانتا کہ ساتویں پانچ سالہ منصوبے میں خرچ کرنے کے لیے صحیح طور پر کتنا روپیہ رکھا جائے گا، تاہم یہ آسانی سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ چھٹے منصوبے کے مقابلے میں اس خرچ کی رقم تقریباً دوگنی ہوگی کیونکہ ساتویں منصوبے میں پبلک سیکٹر کے اخراجات چھٹے منصوبے کے مقابلے میں بہت زیادہ ہوں گے۔ وسائل کی دستیابی بہت زیادہ ہے۔ اس کے علاوہ تقریباً ۴۰۰ اضلاع کے تحت ۵۰۹۲ بلاک کام کر رہے ہیں جس سے دستیاب کل افرادی قوت بھی بہت زیادہ ہوگی۔ اگر اس ڈھانچے میں کچھ آسامیاں ہوں تو وہ بھی ضروری سرکاری عملے کے فراہم کرنے کے لیے آسانی سے پُر کی جاتی ہیں۔ جہاں تک انسدادِ افلاس کے پروگراموں کے لیے انسانی اور مالی وسائل کو حرکت میں لانے کا تعلق ہے، ہمارے ملک کی اقتصادی تاریخ میں اس کی کوئی مثال نہیں ملتی جو اس وقت عمل میں لایا جا رہا ہے۔

> لیکن ایسا ترقیاتی عمل جس کا مقصد محض یہ ہو کہ اُوپری سطح سے فوائد نچلی سطح پر مسکین عوام تک پہنچتے رہیں وہ درحقیقت ترقیات کے تمام تر مقصد کی نفی کرتا ہے۔

لیکن جن ترقیاتی پروگراموں کا مقصد محض یہ ہو کہ اُوپری سطح سے فوائد اپنی نچلی سطح پر مسکین عوام تک پہنچتے رہیں، وہ درحقیقت ترقیات کے تمام تر مقصد ہی کی نفی کرتا ہے۔ ترقیات کا مقصد یہ ہے کہ اس سے مستفید ہونے والے خاموشی سے فیاضانہ عطیات حاصل کرنے کے بجائے اس عمل میں سرگرمِ کار ہوں۔ یہ مقصد تب تک حاصل نہیں کیا جا سکتا جب تک کہ مستفید ہونے والے ان حالات سے آگاہ نہ ہوں جنھوں نے انھیں نادار بنا رکھا ہے، ان کو اپنے حقوق سے آگاہ ہونا بھی ضروری ہے اور ان میں یہ جذبہ پیدا ہونا ضروری ہے کہ سماجی اور اقتصادی قوتوں کے باہمی عمل سے حالات میں تبدیلی لائی جائے۔ جب تک یہ نہ ہوگا اس وقت تک امدادی فنڈ میں گول مال ہونے کا سلسلہ جاری رہےگا اور روزگار کے دیہی قومی پروگرام اور دیہاتی مزدوروں کے لیے روزگار کی ضمانت کے پروگرام کے تحت پوری اُجرت ادا نہیں کی جا سکے گی۔

> بیشتر مستحق اشخاص میں سے چند ایک کے انتخاب کا مسئلہ تقریباً ناقابلِ حل ہے۔ خالصتاً بیوروکریسی کے ڈھنگ سے اس کام کو انجام دینے کی کوئی بھی کوشش ناکام ہو سکتی ہے۔ اس عمل میں عوامی شرکت سے غلط انتخاب کے اِمکانات یقیناً کم ہو جائیں گے۔

عوام کو باشعور بنانا

عوام میں بیداری پیدا کرنے کا کام کون اپنے ہاتھ میں لے سکتا ہے؟ کیا ایک سرکاری ادارہ مناسب طور پر یہ کام انجام دے سکتا ہے؟ نظری طور پر شاید اس پر اعتراض نہ ہو سکے لیکن اسے عمل میں لانا ایک بھاری مسئلہ ہو سکتا ہے۔ اس سے

زیادہ فیر فعال ہونے کا رجحان پیدا ہو جائے گا۔ اس سے عوام میں تساہل آسکتا ہے اور وہ تنقیدی بیداری پیدا نہیں ہو سکتی جو انھیں تبدیلی کے عمل میں سرگرم کار شریک بنانے کے لیے لازمی ہے۔ لہٰذا ایسا کار اداروں کی ضرورت ہے جن میں نظریاتی موافقت کے ساتھ ساتھ اس کام کو ہاتھ میں لینے کی صلاحیت ہو۔ بیداری کا عمل خلاء میں انجام نہیں دیا جا سکتا۔ اسے موثر بنانے کے لیے ضروری ہے کہ اس کا حقیقی زندگی کے حالات سے تعلق ہو اور بعض پروگراموں کے ذریعے حقائق کو بدلنے کی کوشش کی جائے۔ یہ کوئی پر ہنگامہ طریقۂ کار نہیں ہو سکتا لیکن ایک یا زائد پروگراموں کی تعمیل کے ذریعے عوام کے شعور میں انقلابی تبدیلی لانے سے متعلق کوشش آسان تر اور وسیع طور پر قابلِ قبول ہوگی۔ اس سے تضاد زیادہ واضح ہوگا اور اس سے جو سبق ملے گا وہ آسانی سے فراموش نہیں کیا جا سکے گا۔ اس کی ایک مثال یہ ہے کہ جو رضاکار تنظیمیں دیہی علاقوں میں سماج کے غریب تر طبقوں کی اقتصادی ترقی کے لیے کام کر رہی ہیں۔ وہ مربوط دیہی ترقیاتی پروگرام کے تحت امکانی طور پر مستفید ہونے والوں کے ساز کو منگنی بھانا ایالا کے طور پر مل جل کر کام کر سکتی ہیں۔ اس سے پہلے کہ مستفید ہونے والے کوئی اثاثہ حاصل کریں اور بعد ازاں اپنی اقتصادی حالت کو بہتر بنانے کی کوشش کریں۔ اس سلسلے میں متعدد اقدامات کرنے ہوں گے۔

سب سے پہلے نشاندہی اور انتخاب کا سوال ہے۔ بیشتر مستحق اشخاص میں سے چند کے انتخاب کا مسئلہ تقریباً ناقابلِ حل ہے۔ فارمعتاً بیورو کریسی کے ڈھنگ سے اس کام کو انجام دینے کی کوئی بھی کوشش ناکام ہو سکتی ہے۔ اس عمل میں عوامی شرکت سے یقیناً غلط انتخاب کے امکانات کم ہو جائیں گے۔

جن اشخاص کو فائدہ پہنچانا مقصود ہے اُن کا انتخاب کرنے کے بعد صحیح قسم کی سرمایہ کاری کے چناؤ کی ضرورت پیدا

بعض ایسے اُمور کو بدرجۂ اتم انجام دینے کے لیے بیورو کریسی کے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں جو نہ صرف غریب طبقوں کو مادی طور پر فائدہ پہنچا سکتے ہیں بلکہ سماجی تبدیلی کے عمل کا آغاز بھی کر سکتے ہیں۔

قواعد و ضوابط کی زنجیروں سے جکڑی ہوئی اور صرف سرکاری نظام کے اندر اپنے افسرانِ بالا کے رُو برو جوابدہ بیوروکریسی پلان کی تعمیل میں رضاکار تنظیموں کی صدق دلانہ شرکت پر نفرت اور غم و غصہ کا اظہار کرے گی۔

ہوتی ہے۔ جو ایک کنبے یا کنبوں کے گروپ کے لیے موزوں ہو۔ سر دست چند معیاری اشیا و خیالات ایسے اشخاص کی رضامندی یا صلاحیت کو ذہن میں رکھے بغیر ان پر لاد دیے جاتے ہیں۔ کنبوں کو جس چیز کی سب سے زیادہ ضرورت ہے وہ ہے چھوٹی سرمایہ کاریوں کا ایک سلسلہ جو کنبے کی صلاحیت و انتظام کی حدود کے اندر ہو اور جس میں کنبے کے تمام افراد حصہ لے سکیں اور سمجھ

کو مستحکم بنا سکیں۔ یہ واضح طور پر ترقیاتی عملے کی صلاحیت سے باہر ہے کہ وہ کوئی ایسا پروگرام بنا سکیں۔

تیسرے، بنکوں سے تعلق رکھنے والی اسکیموں کی تیاری اور مطلوبہ اثاثہ جات کی خرید کے لیے بنکوں سے سرمایہ اور امداد حاصل کرنے کے لیے بہت زیادہ بھاگ دوڑ کرنی پڑتی ہے۔ آج ایسا کوئی نظام کار نہیں ہے جو خود بخود اس کام کو انجام دے

سکے۔ ترقیاتی عملے میں بچولیوں کی ایک ایسی جماعت پیدا ہو چکی ہے جو ایسے اشخاص کی لاعلمی اور اس امر سے بھی فائدہ اٹھاتی ہے کہ وہ اپنے جائز واجبات کے حصول کے لیے جگہ جگہ رابطہ قائم نہیں کر سکتے۔

چوتھے، اثاثہ خریدنے کے بعد یہ شخص منڈی کے ٹھگوں کے چنگل میں پھنس جاتا ہے جو سب کے سب اُس کے خلاف صف آرا ہیں۔ جب وہ کوئی چیز فروخت کرتا ہے تو نقصان اُٹھاتا ہے اور جب خریدتا ہے تو دھوکہ کھاتا ہے۔ جب تک وہ اپنے پاؤں پر کھڑا نہ ہو جائے اُسے منافع کی کوئی امید نہیں کرنی چاہیے۔

اصلاحاتِ اراضی کے پروگرام

اگر کوئی شخص اُن اقدامات پر ایک نگاہ ڈالے جو اراضی کی تقسیم نو کے اصلاحی پروگرام سے تعلق رکھتے ہیں تو وہ اس کارروائی کے مختلف مرحلوں کو بھی دیکھ سکتا ہے۔ یہ ہو سکتے ہیں :-

۱۔ اُن کنبوں کی نشاندہی جن کے پاس

سیلنگ (زیادہ سے زیادہ حد) سے زیادہ زمین ہے یا ہونے کا شبہ ہے۔

۲۔ ایسے قطعاتِ اراضی کا پتہ لگانا اور نشاندہی کرنا جو ہر ایسے کنبے کے موثر اور حقیقی قبضے نیز حقوق (جہاں وہ ہوں) کے ریکارڈ یا رجسٹری کے مطابق ہیں اور ایسی اراضیات کی کھوج کرنا جو خفیہ طور پر کسی کے قبضے میں ہوں یا کسی فرضی انتقال کے ذریعے کسی دوسرے کے نام چڑھا دی گئی ہوں۔ (بے نامی)۔

۳۔ ایسی ٹھوس شہادت فراہم کرکے جو عدالت کی کارروائی پر پوری اُتر سکے کسی دوسرے کو منتقل کی گئی فاضل اراضی کے بارے میں نیم عدالتی عمل شروع کرنا۔ اس میں فرضی انتقال اور بے نامی کی زمین بھی شامل ہے۔

۴۔ عدالتی اور دیگر انتظامیہ کارروائی کے مکمل ہونے کے بعد ایسی زمین کو قبضے میں لینا۔

۵۔ ایسی فاضل زمین کو قانونی طور پر ترجیح کے مطابق بے زمین کسانوں اور غریب کسانوں میں بانٹنا۔

۶۔ ایک چھوٹا سا خود مختار نظام کار فراہم کرنا جس سے سابقہ مالکوں کو روکا جائے کہ وہ تشدد کے ذریعے اس طرح بانٹی گئی زمین سے کاشتکاروں کو جبراً بے دخل نہ کر سکیں اور

۷۔ کھپت و پیداوار کے قرضے اور زراعت میں استعمال ہونے والی دیگر اشیاء کے لیے بعض اقدامات جن سے نئے الاٹی سابقہ سرپرستوں کے قرضے کے جال میں پھنسے بغیر کاشت شروع کر سکیں اور انجام کار زمین سے محروم ہونے کے امکان سے بچے جا سکیں۔

اس قسم کی اُن سرگرمیوں کی فہرست تیار کی جاسکتی ہے جو دیہی غربا کی اقتصادی و سماجی ترقی سے تعلق رکھنے والے مختلف دیگر پروگراموں سے وابستہ ہیں لیکن اگر کوئی صرف ان دو مدوں کو دیکھے تو وہ جان سکے گا کہ بیورو کریسی اُن مختلف قسم کے اقدامات کی موثر انجام دہی پر بنیادی پابندیوں سے جکڑی ہوئی ہے جو نہ صرف غریب طبقوں کو مادی طور پر فائدہ پہنچا سکتے ہیں بلکہ سماجی تبدیلی کے عمل کا بھی آغاز کر سکتے ہیں۔ جماعتی کارروائی اور بیرونی امداد مربوط دیہی ترقیاتی پروگرام کے لیے ضروری ہے تاکہ جنھیں فائدہ پہنچانا مقصود ہے، اُن کا درست انتخاب ہو، سرمایہ کاری کا چناؤ کیا جائے۔ وقت پر قرضے منظور کرائے جائیں۔

حتمی تجزیہ میں رضاکار تنظیموں کو غریبوں کے مفادات کے نگراں کے طور پر کام کرنا ہوگا اور اس کام کو موثر طور پر انجام دینے کے لیے انھیں غاصبوں سے لڑنا ہوگا۔ کیا وہ ایسا کر سکے گی؟

اور منڈی کے غیر سازگار حالات پر قابو پاکر مناسب آمدنی پیدا کی جائے۔ ایک عقیدت مند رضاکار تنظیم فائدے کے طالبوں کی اجتماعی کارروائی کے لیے میدان تیار کرکے اُنھیں باخبر اور باشعور بنانے کے لیے کام کر سکتی ہے۔ اور ان تمام مقامات پر موزوں مداخلت کے ساتھ ایسا کر سکتی ہے۔

اسی طرح اصلاحات اراضی کے معاملے میں اراضی کے درجے کے بارے میں فصل کے حصہ داروں اور زرعی کارکنوں کو کافی معلومات دستیاب ہیں۔ انفرادی طور پر وہ عدالت یا ٹریبونل کے سامنے شہادت دینے کے لیے کبھی بھی آگے نہیں آئیں گے۔ لیکن اگر اُنھیں منظم کیا جا سکے یا ایک ایسا ادارتی ڈھانچہ تیار کیا جا سکے جہاں وہ اجتماعی طور پر آگے آسکتے ہیں۔ تو بیشتر چھپائی ہوئی اراضی قانونی طور پر واگذار کی جاسکتی ہے اور اُسے دیہی غربا میں بانٹا جا سکتا ہے۔ ایک سرکاری تحقیقی ادارہ یقیناً کسی حد تک یہ کام کر سکتا ہے لیکن اگر اُسے بٹائی پر کام کرنے والوں اور زرعی کارکنوں کے رضاکار اداروں کی حمایت حاصل ہو تو وہ زیادہ بہتر طور پر یہ کام انجام دے سکتے ہیں۔ اس ملک کی بعض ریاستوں میں ایسے کامیاب مقدمات کی کچھ مثالیں ملتی ہیں۔

غیر ادارتی رویّہ

اس وقت جو تنظیمیں موجود ہیں اور نچلی سطح پر کام کرتی ہیں اُن میں سے بیشتر بنیادی طور پر غیر ادارتی (سرکاری) رویہ کے لیے وجود میں آئی ہیں۔ اُنھیں ان ناداروں لوگوں کے بارے میں گہری تشویش تھی۔ اور اس امر کا احساس تھا کہ اُن کے لیے قطعاً کچھ بھی نہیں کیا جارہا، یا کچھ زیادہ نہیں کیا جارہا۔ اس سے نظریاتی طور پر تحریک پانے والے سماجی کارکنوں نے غریبوں میں سرگرمی سے کام شروع کر دیا۔ مقامی مفادات خصوصی کی طرف سے شدید جبر و استبداد کے معاملوں سے ان کارکنوں کو تحریک حاصل ہوئی کہ وہ مظلومین کے مابین کام کرکے اُنھیں منظم کریں تاکہ وہ اپنے جائز حقوق کے لیے لڑ سکیں۔ ان میں سے بعض گروپ سرکار کی طرف سے چلائے گئے پروگراموں میں تعاون دینے سے جھجکتے ہیں۔ لیکن نظری طور پر اس میں کوئی بُرائی نہیں ہے۔ چونکہ اُن کی اعلانیہ پالیسی غریبوں کے لیے لڑنا ہے اس لیے وہ زیادہ بہتر طور پر یہ امر یقینی بنا سکتے ہیں کہ غریبوں کے لیے جو متعدد پروگرام بنائے گئے ہیں وہ اُن سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اُٹھائیں۔

جہاں کہیں رضاکار تنظیمیں موجود ہیں وہ مختلف

سرگرمیوں کو موزوں طور پر انجام دلانے کے لیے آگے آسکتی ہیں۔ اور اس عمل میں ایسے زرعی کارکن اجتماعی کارروائی کے لیے پہل کرسکتے ہیں۔ اُنھیں مقامی افسران اور غالب سماجی گروپوں کے ساتھ تعاون اور ٹکراؤ کا رویّہ اختیار کرنا ہوتا ہے۔ جہاں کہیں وہ دیکھتے ہیں کہ مقامی بیوروکریسی ہمدرد، رضامند اور سازگار ہے وہ تعاون کرتے ہیں۔ جہاں وہ پاتے ہیں کہ وہ غیر ہمدرد، بدعنوان، متکبر اور عوام دشمن ہے، اُنھیں ٹکراؤ کا راستہ اختیار کرنا ہوتا ہے اور ایسے زرعی کارکنوں کو مقامی سیاسی حکام اور مفاداتِ خصوصی اور انتقامی کارروائی سے بچانا ہوتا ہے۔ یہ ایک نازک کام ہے۔ لیکن اگر یہ بخوبی انجام دیا جاسکے تو مل جل کر کام کرنے کی کارروائی کے بیج بوئے جائیں گے اور ایک اجتماعی تنظیم جلد وجود میں آئیگی جو بعدازاں اپنی دیکھ بھال خود کرسکے گی۔

تعلیم بالغان، صحتِ عامہ، خصوصاً صحت کی احتیاطی تدابیر کے معاملے میں رضاکار تنظیموں کے لیے اس امر کا بہت بڑا امکان ہے کہ وہ عوام اور نظامت کو قریب تر لائیں۔

عدم شمولیت

تعاون کے شعبوں کا سجھاؤ دیتے ہوئے یہ مراد نہیں ہے کہ رضاکار تنظیموں کو اس سسٹم میں سرکاری مشینری کے اعزازی توسیعی اداروں کے طور پر شامل کیا جائے۔ دراصل ایسی شمولیت سے خواہ وہ ایگیمنٹ شدہ ہوں یا رضاکارانہ ہوں، اُن کی صلاحیت میں بھاری کمی آجائے گی اور وہ مؤثر طور پر کام نہیں کرسکے گی۔ اُنھیں اپنے مقام پر ہی رہنا چاہیئے اور اپنے آدرشوں اور تنظیمی خود مختاری کو بلند رکھنا چاہیئے۔ اُن کی موجودگی اور کارکردگی سے مقامی بیوروکریسی چوکس رہے گی۔ اور اس کی طرف سے شرارت کا امکان کم ہوجائے گا۔

ظاہر ہے کہ بیشتر معاملوں میں بیوروکریسی اُن کی موجودگی۔ خصوصاً کہ اُن کے سرگرم رول کو سخت ناپسند کرے گی۔ قواعد وضوابط کی زنجیروں سے جکڑی ہوئی اور صرف سرکاری نظام کے اندر اپنے افسرانِ بالا کے سامنے جوابدہ بیوروکریسی پلان کی تعمیل میں رضاکار تنظیموں کی صدق دلانہ شرکت پر نفرت اور غم و غصہ کا اظہار کرے گی۔

بیوروکریسی کو احساسِ ہمدردی کی ضرورت ہے، جو زیادہ تر تب آئے گا جب وہ رضاکار تنظیموں کے ساتھ مل کر کام کریگی۔ رضاکار تنظیمیں جس حد تک نادار کسانوں کی شیرازہ بندی کرنے اور اُن کے لیے فوائد حاصل کرنے میں کامیاب ہوں گی، وہ اُسی حد تک مقامی استحصال پسندوں کے غم و غصہ کا شکار ہوں گی۔ اس کے نتیجے میں کردار پر حملوں اور جھوٹے فوجداری مقدموں سے لے کر قتل تک کچھ بھی ہو سکتا ہے جس کا دارومدار اس امر پر ہے کہ ایسے مفاداتِ خصوصی کے قلعہ پر اُن کا حملہ کیا زور دار اور مؤثر ہوا ہے۔ رضاکار اداروں کو ان عناصر کا عزمِ صمیم اور ہمت کے ساتھ مقابلہ کرنا ہوگا۔

حتمی تجزیہ میں رضاکار تنظیموں کو غریبوں کے مفادات کے نگراں کے طور پر کام کرنا ہوگا۔ اس کام کو مؤثر طور پر انجام دینے کے لیے اُنھیں ان عادی غاصبوں کے خلاف لڑنا ہوگا۔ کیا وہ ایسا کرسکے گی؟

★

بقیہ: رضاکار اداروں پر بھروسہ نہ صرف غلط بلکہ مُضر

کے بہتر وقرض کے فروغ جیسے محدود تکنیکی انداز میں نہیں دیکھنا چاہیئے۔ بلکہ اس کا لازمی مقصد عوام کو ایسی معلومات فراہم کرنا ہونا چاہیئے جن سے وہ یہ جان پائیں کہ وہ سرکاری اسکیموں اور منصوبوں سے کیا کچھ حاصل کرسکتے ہیں، یہ بہت ضروری ہے کہ ریڈیو اور ٹیلی ویژن عوام الناس کی مہم کے آلات کا کام دیں۔ یہ کام سرکاری حکمتِ عملی اور عمل کا وہ ناگزیر حصہ ہے، جس میں رضاکارانہ ایجنسیوں کو قطعاً کوئی رول ادا نہیں کرنا ہوگا۔

تنبیہہ

آخر میں اُن رضاکارانہ ایجنسیوں کے بارے میں، جو ہمارے سماج کے غریب ترین طبقوں میں سرگرمِ عمل ہیں، بطور تنبیہہ چند الفاظ رقم ہیں۔

میرے خیال میں دُنیا میں شاید ہی ایسا کوئی ملک ہوگا، جہاں بھارت کی طرح غریبوں کی مدد کے نام پر ہر کہیں اور ہر کسی تک پہنچا جاسکتا ہو۔ اس کے باعث نہ صرف ہمارے ملک کے بارے میں ناقابلِ یقین حد تک بُرا اور غلط نقش دماغ میں بیٹھتا ہے، بلکہ اس میں عدم استحکام پیدا کرنے والی سب طرح کی ایجنسیاں بھی سہل ترین طریقے سے گھس آتی ہیں۔ یہ بات نہ صرف غیر ملکی ایجنسیوں پر صادق آتی ہے، بلکہ بھارتی ایجنسیوں کے بارے میں بھی ایسا ہی ہے۔ اس ضمن میں چند سال قبل عوام الناس میں پھیلی ہوئی ناخواندگی کے خاتمے کے لیے فراہم کی گئی بھاری رقوم کی مثال سامنے ہے۔ یہ بات اُن رضاکارانہ ایجنسیوں اور راہنماؤں کے کئی دیہی ترقی کے پروگراموں کے بارے میں بھی دُرست ہے، جو واضح طور پر ہمارے قومی سطح پر تسلیم شدہ مقاصد، منصوبوں اور پروگراموں کے سخت مخالف ہیں۔ اس لیے ان کی زن کھوکھلا کرنے والی سرگرمیوں کے لیے مزید مواقع فراہم کرنے کے بجائے اُن کے بُرے منصوبوں کا پتہ چلانا، نیز اُن پر نگرانی رکھنا اور روک لگانا بہتر ہوگا۔

کمل نین کابرا معاشیات کے پروفیسر، انڈین انسٹی ٹیوٹ آف پبلک ایڈمنسٹریشن، نئی دہلی

غیر حقیقی متبادل کیوں؟

پلاننگ اور ترقیاتی کاموں کے لیے بیوروکریسی یا نوکر شاہی کو استعمال کرنے کے بجائے کوئی دوسری متبادل صورت پیدا کی جائے۔ یہ ایک اچھا خیال ہے۔ مگر مصنف کی رائے ہے کہ اس معاملے میں حقیقت پسندانہ رویّہ اپنایا جائے۔ مضمون نگار کا خیال ہے کہ ہم لوگوں نے بہت سے مسائل کو حل کرنے کے لیے بہت سے غیر حقیقی متبادل ڈھونڈ لیے ہیں۔ لہٰذا سرکاری طور سے تسلیم شدہ اور شریک کار غیر سرکاری ایجنسی جس کے لیے سرمایہ بھی حکومت فراہم کرے گی، نامناسب اور غیر حقیقی ثابت ہوگی۔

اگر کسی علاقے میں اجتماعی ترقی سے متعلق کسی پروگرام پر عمل درآمد کے چند غیر سرکاری ادارے وجود میں آجاتے ہیں تو بلاشبہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ ادارے مہاتما گاندھی کی قائم کردہ تعمیری روایت کا تسلسل ہیں۔ اگر بہت سے ادارے وجود میں آ جائیں جو بہت سے کام اپنے ہاتھوں میں لے لیں تو بلاشبہ ان میں تال میل پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ حکومت اور پلان بنانے والوں کی نظروں میں یہ تال میل ضروری ہوگا۔ جب کہ رضاکار تعمیری ادارے اسے مداخلت بے جا تصور کریں گے۔ ایسی صورت میں جہاں منافع یا فائدے کے کا امکان ہوتا ہے۔ وہاں مثبت ترقی اور سماجی وسائل کے حصول میں ذاتی محنت اور پیش روی کا عمل دخل بہت زیادہ ہوتا ہے۔ یہ تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ ایسے اداروں پر جو محض سماجی بھلائی کے لیے کام کرتے ہیں، ذاتی فائدے کے لیے نہیں، اُن پر ایسے ضابطے اور قوانین لاگو نہیں جانے چاہئیں جو منافع کمانے والے اداروں پر لاگو کئے جاتے ہیں۔

لیکن خطرہ یہ ہے کہ:

اگر کوئی غیر سرکاری ادارہ رضاکارانہ طور سے سماج سے وسائل حاصل کرتا ہے تو وہ سماج کے ساتھ کام کرتا ہے (سماج کے لیے نہیں) یا وہ قومی معیشت کا ایک حصہ سماج کی طرف منتقل کر دیتا ہے جس میں غیر ملکی سرمایہ شامل نہیں ہوتا اور جو ملک کے قانونی ڈھانچے کے اندر ہوتا ہے جیسے (سوسائٹیوں کے رجسٹریشن کے قانون کے تحت رجسٹریشن، آڈٹ، ضابطہ اور نگرانی وغیرہ) اور جس سے عوامی منصوبہ بندی کی کوششوں میں کوئی رکاوٹ نہیں پڑتی یا کوئی نقصان نہیں ہوتا تو ایسی صورت میں ایسے اداروں کو کام کرنے کی اجازت دی جا سکتی ہے تاکہ وہ اجتماعی ترقی کے مقامی نوعیت کے کاموں کے لیے وسائل مہیا کریں اور ان پر عمل درآمد کرائیں۔ اپنی مرضی سے چلائے گئے ترقیاتی کاموں کے لیے اگر ایسے ادارے عوام کا سرگرم تعاون حاصل کرنے کی کوشش کریں اور اس کی نگرانی کریں کہ سرکاری طور پر جو ترقیاتی کام شروع کئے گئے ہیں ان کے فائدے سبھوں کو مناسب ڈھنگ سے پہنچیں تو ایسی صورت میں سرکاری حمایت یا مداخلت بالکل بے معنی ہوگی۔ حکومت کو صرف یہ کرنا چاہیے کہ وہ غیر سرکاری اداروں کی راہ میں رکاوٹ نہ بنے،

اس عمل سے دہرا فائدہ ہوتا ہے کہ ترقی پانے والے اور دینے والے دونوں کا بھلا ہوتا ہے۔

بہرحال ایسی انجمنیں بہت کم تعداد میں ہیں جو رضاکارانہ اور اجتماعی کوششوں کے ذریعے بھلائی کے کاموں میں لگی ہوئی ہیں

تاکہ وہ منظم عمل اور اپنے اثرات کو بروئے کار لاسکیں۔ اس کے بعد صرف یہ رہ جاتا ہے کہ غیر سرکاری اداروں کے رول اور سرگرمیوں کو کس حد تک قبولِ عام نصیب ہوتا ہے۔

بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس طرح کی مختصر اور لامرکزی کوششیں، جو ان تمام آنادیوں اہمیت اور ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ایسی رضاکارانہ کوششیں جو خلوص پر مبنی ہیں۔ اور جو سب سے نچلی سطح یا اس سے کچھ اوپر کی سطح سے اٹھتی ہیں یا سماج کی خدمت کے آدرشوں کو اپنائے ہوئے ہیں۔ وہ اجتماعی بھلائی کے کاموں میں ہاتھ بٹا سکتی ہیں۔ حالانکہ سے مدد حاصل کرتی ہیں۔ قطع نظر اس بات کے کہ بعض کے مشتبہ اداروں سے خفیہ رابطے ہیں، بعض مقامی ذرائع سے سرمایہ، عملہ اور کام کاج کا ڈھانچہ اور طریقہ حاصل کرتی ہیں۔ بعض انجمنوں کو بہت سے لوگوں سے چھوٹی موٹی امداد ملتی ہے، جو نقد، جنس یا کام کی شکل میں ہوتی ہے اور

> کچھ انجمنیں اکثر صورتوں میں اِن ہی وسائل اور ذرائع سے حاصل کرتی ہیں جن کے فائدے کے لیے وہ کام کر رہی ہیں۔ بھلائی کے کام کرنے کا جذبہ، نظریاتی، سیاسی، انسانی بھلائی، مذہبی یا نفسیاتی وجوہ سے پیدا ہوتا ہے۔ حتیٰ کہ کٹر قدامت پرست حلقے بھی جڑوں تک پہنچنے کے لیے رضاکارانہ کام میں لگے ہوئے ہیں۔

> کاروباری اور خوشحال لوگ ان کاموں کے لیے مختلف وجوہ سے روپیہ دیتے ہیں۔ کچھ سماجی ذمہ داری محسوس کرتے ہیں۔ ٹرسٹ دیتے ہیں، بعض کمپنیوں کو ٹیکس میں چھوٹ اور دوسری رعائتیں مِل جاتی ہیں، علاوہ اثر بڑھانے کا موقع مِلتا ہے اور تجارتی ادارے کو نیک نامی حاصل ہوتی ہے۔

سے فائدہ اٹھاتی ہیں۔ جو ہمارے نظام کے اندر دستیاب ہیں، اس رجحان کو کمزور بنانے کا سبب بنیں گی کہ صرف حکومت ہی تعمیر و ترقی کا واحد ذریعہ یا وسیلہ ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نہیں نکالنا چاہیے کہ اس رویے کی وجہ سے حکومت اور اس کے رول یا کردار کی نفی ہوگی۔ مقصد یہ ہے کہ ایک متبادل ذریعہ سامنے آئے۔ خصوصاً ان لوگوں کے لیے جو موجودہ ترقیاتی کوششوں کو بے معنی سمجھتے ہیں یا ان لوگوں کی نیت یا طریقہ کار سے بالکل غیر مطمئن ہیں جو حکومت کو کنٹرول کر رہے ہیں۔ بالکل بنیادی سطح پر اپنی مدد آپ کا اصول یا ایسی ملی جلی خدمات مہیا کرنا کہ غریب افراد خود ان کوششوں سے اوپر اٹھ سکیں، رضاکار اداروں کا خاص کام ہے اور اس طرح ان کی بعض فلسفیانہ موشگافیوں کے تحت اس پورے نظریے کو ناپسند کیا جاتا ہے کہ کچھ لوگوں کو یہ اخلاقی حق حاصل ہے کہ وہ دوسروں کو ترقی دیں) اس عمل سے دہرا فائدہ ہوتا ہے کہ ترقی پانے والے اور دینے والے دونوں کا بھلا ہوتا ہے۔ بہرحال ایسی انجمنیں بہت کم تعداد میں ہیں، جو رضاکارانہ اور اجتماعی کوششوں کے ذریعے بھلائی کے کاموں میں لگی ہوئی ہیں۔

اندھادھند اضافہ

متذکرہ بالا انجمنوں کے برعکس دوسری قسم کی رضاکار انجمنوں کی تعداد میں اندھادھند اضافہ ہوا ہے۔ ایسی انجمنوں میں بعض ایسی ہیں جن کو غیر ملکوں سے سرمایہ ملتا ہے اور بعض مذہبی یا خاص فرقوں کے لیے قائم کردہ اداروں جو بعض صورتوں میں ان ہی وسائل اور ذرائع سے حاصل کرتی ہیں، جن کے فائدے کے لیے وہ کام کر رہی ہیں۔ بھلائی کے کام کرنے کا جذبہ، نظریاتی، سیاسی، انسانی بھلائی، مذہبی یا نفسیاتی وجوہ سے پیدا ہوتا ہے۔ حتیٰ کہ کٹر قدامت پرست حلقے بھی جڑوں تک پہنچنے کے لیے رضاکارانہ کام میں لگے ہوئے ہیں۔

ایسے بھی رضاکار ادارے ہیں جنہیں بڑے بڑے تجارتی یا صنعتی یا ایسے دوسرے اداروں سے سرمایہ حاصل ہوتا رہتا ہے۔ کاروباری اور خوشحال لوگ ان کاموں کے لیے مختلف وجوہ سے روپیہ دیتے ہیں۔ کچھ سماجی ذمہ داری محسوس کرتے ہیں۔ بعض ٹرسٹ ہوتے ہیں، بعض کمپنیوں کو ٹیکس میں چھوٹ اور دوسری رعائتیں مل جاتی

ہیں۔ حلقۂ اثر بڑھانے کا موقع ملتا ہے اور تجارتی ادارے کو نیک نامی حاصل ہوتی ہے۔ اس طرح مال پہنچنے میں بھی مدد ملتی ہے۔ بڑی بڑی تجارتی کمپنیاں ان ہی کاموں کے لیے ایک سمجھے بوجھے ہوئے منصوبے کے تحت روپیہ دیتی ہیں۔ بعض صورتوں میں ٹیکس بچ جاتا ہے۔ یا ٹیکس سے بچنے کا راستہ نکل آتا ہے۔ اور کمپنیوں کے مالکوں کو عوام میں شہرت اور نیک نامی ملتی ہے۔ براہ راست معاشی مالی اور سماجی فائدے بھی ہوتے ہیں۔

اور یہ نیا رجحان

رضا کار ایجنسیوں میں ایک نیا رجحان پیدا ہوا ہے۔ بعض دانشور اور ممتاز پیشہ ور مثبت یا "مقصدی" طریقۂ کار سے مطمئن نہیں ہیں جس کے تحت ریسرچ کے ذریعے مسئلہ اور اس کا حل پیش کیا جاتا ہے۔ بعض حلقوں کا یہ خیال ہے کہ رضا کار ادارے غریبوں

ظاہر ہوتا ہے کہ سیاسی گروہوں کی مخالفت کرنے والے بعض خاص قسم کے رضا کار اداروں کے حامی بن رہے ہیں۔ اس طریقۂ کار کا مقصد یہ ہے کہ کوئی تبدیلی، خواہ بذریعہ انقلاب یا بغاوت، نہ آنے پائے۔ تھوڑی بہت تبدیلی آجائے لیکن ایسی بنیادی تبدیلی نہ آئے جس سے

ان کی غیر سرکاری یا رضا کارانہ حیثیت بالکل ختم ہو جاتی ہے۔ گویا وہ حکمراں حلقے اور سرکاری ڈھانچے میں داخل ہونے یا اثر و نفوذ پیدا کرنے کا ایک دوسرا راستہ ڈھونڈ لیتے ہیں۔

دعویٰ ہے کہ

بعض غیر سرکاری ادارے اپنے دعوے کی بنیاد اس بات پر رکھتے ہیں کہ بیوروکریسی اور سرکاری

> **بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ اس طرح کی مختصر اور لامرکزی کوششیں جو ان تمام آزادیوں سے فائدہ اٹھاتی ہیں جو ہمارے نظام کے اندر دستیاب ہیں، اس رجحان کو کمزور بنانے کا سبب بنیں گی کہ حکومت ہی تعمیر و ترقی کا واحد ذریعہ یا وسیلہ ہے۔**

ان کا اقتدار خطرے میں پڑ جائے۔ طاقت اور اقتدار کو باقی رکھنے کا یہ بڑا اچھا حربہ ہے۔

اگر یہ رضا کار ادارے حکومت کی سرپرستی اور تعاون اور نظامِ حکومت میں وابستگی کے

مشینری کے ذریعے غریبی دور کرنے کے لیے دیہی اور زرعی حلقوں میں جو ترقیاتی منصوبے چلائے جا رہے ہیں۔ وہ ٹھیک ڈھنگ سے نہیں چل رہے ہیں۔ لہٰذا انھیں زیادہ موثر رول ادا کرنے کا موقع دیا جائے۔

> **بعض حلقوں کا یہ خیال ہے کہ رضا کار ادارے غریبوں میں حرکت و عمل پیدا کرنے کا ایک متبادل ذریعہ بن رہے ہیں اور اس طریقے سے نچلی سطح پر سیاست کا کھیل کھیلا جا رہا ہے۔ اس طرح کھُلم کھُلا یا ڈھکے چھپے طور پر یہ کوشش کی جا رہی ہے کہ قومی سطح پر منظم سیاسی حلقوں یا گروہوں کو جو صحیح طور سے غریب اور پچھڑے ہوئے لوگوں کی مدد میں لگے ہوئے ہیں، ان کو بُرا یا نکما ثابت کیا جائے۔**

میں حرکت و عمل پیدا کرنے کا ایک متبادل ذریعہ بن رہے ہیں اور اس طریقے سے نچلی سطح پر سیاست کا کھیل کھیلا جا رہا ہے۔ اس طرح کھُلم کھُلا یا ڈھکے چھپے طور پر یہ کوشش کی جا رہی ہے کہ قومی سطح پر منظم سیاسی حلقوں یا گروہوں کو جو صحیح طور سے غریب اور پچھڑے ہوئے لوگوں کی مدد میں لگے ہوئے ہیں، ان کو بُرا اور نکما ثابت کیا جائے اور انھیں کمزور بنایا جائے۔ جس طریقے سے بعض بین الاقوامی ایجنسیاں اور حکومتیں گرمجوشی کے ساتھ ان اداروں کی طرف لپکتی ہیں اس سے

طلب گار ہیں تو ان کے بارے میں بہت سے سوال ذہن میں پیدا ہوتے ہیں خصوصاً یہ سوال کہ یہ رضا کار ادارے کس حد تک رضا کار ہیں۔ اس صورت میں کیا حکومت کے ذریعے تیار کردہ پروگراموں پر عمل درآمد کرنے کے لیے نام نہاد رضا کار ادارے حکومت کی منظوری، سرمایہ، اشتراک اور حمایت حاصل کرنے کے طلب گار ہیں اور اپنے کو زیادہ جانکار، کارکرد، با مقصد اور کم خرچ قرار دیتے ہیں تو

یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ سرکاری افسران اور پلان بنانے والے یونیورسٹی کی ڈگریوں کے بل بوتے پر چُنے جاتے ہیں۔ اور انھیں کوئی عملی تجربہ نہیں ہوتا۔ کہا جاتا ہے کہ جو لوگ گاؤں میں نہیں رہتے، غریبی کا مزہ نہیں چکھتے، ہاتھوں کو دھول اور مٹی سے گندہ نہیں کرتے، چھوٹے کسانوں کے ساتھ کام نہیں کرتے، گندی بستیوں میں نہیں

رہتے اور جن کا علم صرف کتابوں تک محدود ہے' وہ کس طرح غریبوں کی بھلائی کا پلان بنا سکتے ہیں اور اس کا نفاذ کر سکتے ہیں۔ ان نکتہ چینیوں میں اس بات کا کوئی ذکر نہیں کیا جاتا کہ کس طرح طبقہ واری یا پیشہ ورانہ مفاد، سماجی اور معاشی مخصوص مفادات۔ اور بیوروکریسی کے اپنے مفاد کے پیش نظر رضا کار اداروں کی حمایت کی جاتی ہے جس کے تحت ترقی کا فائدہ

کہ تکنیکی اور انتظامی عملے (جیسے زراعتی سائنسداں اور آئی۔ اے۔ ایس پروبیشنرز) کو غیر سرکاری اداروں سے ٹریننگ دیں۔ یہ بھی مشورہ دیا جا رہا ہے کہ مختلف پروگراموں اور پروجیکٹوں کو آنکنے اور جانچنے میں غیر سرکاری اداروں کو شریک کیا جائے تاکہ وہ حکومت کے کان اور آنکھ بن جائیں۔

ہر فن مولا قرار دے گا۔ اور جو حکومت کے بنائے ہوئے پروجیکٹ اور پلان پر عمل کرانے کے لیے حکومت کے مہیا کردہ سرمائے اور عملے سے کام لے گا۔ یہ صحیح ہے کہ ایسے رضا کار اداروں کی نشاندہی اور انتخاب حکومت کرے گی۔ یہ بھی ظاہر نہیں ہوتا کہ رضا کار اداروں کے کارکن اعزازی ہوں گے یا ان کی مدد تنخواہ دار عملہ کرے گا۔ اگر اس جماعت میں پیشہ ور لوگ رہیں گے تو انہیں معاوضہ کون ادا کرے گا۔ اگر رضا کار اداروں کے کارکن دولت مند گھرانوں میں پیدا ہوئے ہیں' اور ان کے پاس اتنی دولت ہے کہ وہ روٹی کمانے کے جھمیلوں سے آزاد ہوں یا ان کی مدد بین الاقوامی' سیاسی' مذہبی' سفارتی یا کاروباری ادارے کر رہے ہیں تو پھر ان میں کون سی رضا کارانہ

اس کی وجہ غالباً یہ ہو سکتی ہے کہ رضا کار اداروں کی ان سے الگ اپنی کوئی شناخت نہیں ہے جس جگہ وہ لینا چاہتے ہیں۔

مستحق لوگوں کے علاوہ دوسروں کو پہنچتا ہے۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہو سکتی ہے کہ رضا کار اداروں کی ان سے الگ اپنی کوئی شناخت نہیں ہے' جس کی جگہ وہ لینا چاہتے ہیں۔

اگر ان مشوروں پر عمل کیا گیا تو نتیجہ یہ ہوگا کہ موجودہ سرکاری عمال (جو ایک منظم طریقے اور قاعدے کے تحت چُنے جاتے ہیں' تربیت حاصل کرتے ہیں' تعینات کیے جاتے ہیں' تنخواہ پاتے ہیں۔ کنٹرول میں رہتے ہیں اور جن کی صلاحیتوں کی جانچ کی جاتی ہے)۔ ان کے ساتھ ساتھ ایک ایسا طبقہ وجود میں آجائے گا جو بزعم خود اپنے کو

یہ صحیح ہے کہ ایسے رضا کار اداروں کی نشاندہی اور انتخاب حکومت کرے گی یہ بھی ظاہر نہیں ہوتا کہ رضا کار اداروں کے کارکن اعزازی ہوں گے' ان کی مدد تنخواہ دار عملہ کرے گا۔

مطالبہ اور اس کے مضمرات

رضا کار اداروں کے بہی خواہ یہ مطالبہ کر رہے ہیں کہ دیہی ترقی کے مربوط پروگرام، بیس نکاتی پروگرام کے تحت جو اقدام چل رہے ہیں ان کا دس فیصد حصہ ایسے رضا کار اداروں کے لیے مخصوص کر دیا جائے جن کی نشاندہی ریاستی حکومتیں کریں۔ یہ بھی کہا جا رہا ہے کہ منصوبوں کے بنانے اور عمل درآمد میں غیر سرکاری اداروں کو ایک صلاح کار ادارے کی شکل دی جاتی ہے۔ دراصل یہ مانگ کی جا رہی

خصوصیت باقی رہ جاتی ہے۔ سوائے اس کے وہ اپنے آپ کو اس خدمت کے لیے پیش کرتے ہیں یا ان کو سرکاری عملے پر جو ایک قانونی اور رسمی طریقے سے چُنے جاتے ہیں۔ کوئی ترجیح دی جائے۔

بعض اہم سوال

حکومت کا ایک حصہ بن جانے کی وجہ سے اس کا امکان ہے کہ غیر سرکاری اداروں اور سرکاری عملوں میں ایک طرح کی کشمکش پیدا ہو جائے۔ کیا دونوں کے کاموں کے درمیان ایک ایسا خط فاصل موجود ہوگا جو دونوں کے ٹکراؤ کو

اگر ان غیر سرکاری اداروں کو غریبوں میں حرکت اور عمل پیدا کرنے کے لیے کام کرنا پڑے تاکہ وہ اپنے حقوق کا مطالبہ کریں اور مفاد پرستوں پر ضرب لگا سکیں تو اس کی کیا ضمانت ہے کہ ان کا رول حکومت کے رول سے مختلف ہوگا یا یہ کہ اگر وہ ناکام رہے ہیں تو یہ کامیاب ہوں گے۔

روک سکے خصوصاً اس صورت میں جب غیر سرکاری اداروں کو اپنے کاموں کی جانچ پڑتال کے لیے اسی بیوروکریسی کے پاس جانا پڑیگا جو ان کا نشانہ بحث ہے۔ "پھر یہ کہ اگر ان غیر سرکاری اداروں کو غریبوں میں حرکت اور عمل پیدا کرنے کے لیے کام کرنا پڑے تاکہ وہ اپنے حقوق کا مطالبہ کریں اور مفاد پرستوں پر ضرب لگا سکیں تو اس کی کیا ضمانت ہے کہ ان کا رول حکومت کے عمال سے مختلف ہوگا یا یہ اگر وہ ناکام رہے ہیں تو یہ کامیاب ہوں گے۔

بعض رضاکار اداروں نے بعض جگہوں اور بعض کاموں میں بڑی اچھی کارکردگی دکھائی ہے۔ اس کی بنیاد پر یہ نہیں کہا جاسکتا کہ ریاست کی منصوبہ بندی اور انتظامی ڈھانچے سے وابستگی اور بیوروکریسی کے مقابلے میں کچھ پوزیشن حاصل کرنے کے بعد بھی ان کی کارکردگی باقی رہے گی۔ اس سے اہم بات یہ ہے کہ آئندہ جو بہت سے نئے غیر سرکاری ادارے میدان میں آئیں گے وہ اسی خلوص، جذبہ اور کارکردگی کے ساتھ کام کرتے رہیں گے اور مفاد پرستوں کے اثر اور نفوذ سے بالکل مامون رہیں گے۔ مفاد پرست کب رضاکارانہ خدمت کا لبادہ اوڑھ کر میدان میں آجائیں گے اس کا تدارک کون کرے گا۔؟

سبھی جانتے ہیں کہ جس خلوص اور کارکردگی کے ساتھ کچھ غیر سرکاری اداروں نے کام کیا ہے ویسے ہی خلوص اور کارکردگی کا مظاہرہ کچھ سرکاری عمال نے بھی کیا ہے۔ کیا اس کی بنا پر بحیثیت مجموعی بیوروکریسی کے لیے کوئی رول متعین کیا جاسکتا ہے۔؟

اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ صرف انسان کامل ہی غیر سرکاری اداروں میں ہوں گے، جو موجودہ نظام کے دباؤ اور اثرات سے آزاد رہیں گے اور ان کے علاوہ حکومت کسی دوسرے کو IRDP اور NREP کے پروگرام میں حصہ لینے کی اجازت نہیں دے گی۔ تب بھی زیادہ سخت اور ایماندارانہ عمل درآمد کا حقیقی انعکاس ممکن ہوگا۔ لیکن سرکاری اداروں اور پروگراموں سے وابستگی کے بعد غیر سرکاری اداروں کا رول ان سے کچھ مختلف نہ ہوگا جو باہر سے آکر کام کرتے ہیں اور نہ ہی وہ حکومت اور اس کی بیوروکریسی کی مفاد پرستانہ نوعیت اور کردار سے اوپر اٹھ سکیں گے۔

بنیادی مسئلہ

عام طور سے یہی کہا جاتا ہے کہ غیر سرکاری ادارے غیر سیاسی ہوتے ہیں۔ یا ان کا کسی سیاسی پارٹی سے تعلق نہیں ہوتا۔ چونکہ برسراقتدار جماعت غیر سرکاری اداروں کا انتخاب کرے گی، لہٰذا اس کا امکان ہے کہ دیہی ترقی کے مختلف پروگراموں میں ان ہی غیر سرکاری اداروں کو کام کرنے کا موقع دیا جائے جن کا تعلق حکمراں جماعت سے ہو۔ اگر یہ بات بھی مان لی جائے کہ صرف وہی ادارے کام کریں گے جن کا تعلق حکمراں جماعت سے ہوگا اور یہ ادارے بڑی ایمانداری کے ساتھ منصوبوں پر عمل درآمد کرائیں گے، ان حلقوں کی نشاندہی کریں گے جن کی مدد کرنی ہے، مختلف قسم کے مفاد پرست گروہوں کا مقابلہ کریں گے اور صحیح تصویر پیش کریں گے تو پھر شاید دوسرے سیاسی گروہوں کو دور ہی رکھنا مناسب ہوگا۔ لیکن اگر حکمراں جماعت کے اثر اور رسوخ سے یہ سب کچھ ممکن ہو جائے تو پھر غیر سرکاری اداروں کی ضرورت کیا رہ جاتی ہے۔ کیوں کہ حکومت کا بیوروکریسی پر زیادہ کنٹرول ہوتا ہے۔

کیا ترقیاتی پروگراموں پر عمل درآمد نیم سیاسی یا غیر سرکاری کوششیں ہیں؟ کیا وہ لوگ جو رضاکار اداروں میں شریک ہیں ان کے بارے میں یہ سمجھا جائے کہ صرف یہی لوگ غریبوں کے سچے ہی خواہ اور ہمدرد ہیں؟ ترقیاتی کوششوں کے پیچھے جو سیاسی عناصر کارفرما ہیں اگر وہ سیاسی اقتدار سے بالکل الگ کر دئے جائیں گے تو IRDP اور NREP جیسے ترقیاتی پروگرام محض سماجی بے چینی کو روکنے، سرمایہ کاری کے لیے مزدوروں کی بھلائی کو جاری رکھنے، اور مال پیدا کرنے والوں کے لیے بازار مہیا کرنے کا ذریعہ بن جائیں گے تاکہ منافع صنعت کاروں کو ملتا رہے۔ حکومت سے وابستہ نیم رضاکار اور حکومت کی طرف سے فراہم کردہ سرمایہ استعمال کرنے والے ادارے جو حکومت وقت کے تیار کردہ پروگراموں پر عمل درآمد کرائیں گے وہ غیر سیاسی یا غیر جانبدار نہیں رہ سکیں گے وہ بڑی خوشی سے برسراقتدار جماعت کا آلۂ کار بن جائیں گے۔ اگر چھپا ہوا غیر ملکی سرمایہ بھی استعمال ہونے لگا تو پھر یہ ادارے ایک خطرہ بن جائیں گے اور بین الاقوامی طاقتیں ملک میں انھیں انتشار پیدا کرنے کے لیے استعمال کریں گی کیوں کہ ان کا وطیرہ یہی ہے کہ کھلم کھلا جنگ سے پہلے ملک میں اندرونی خلفشار پیدا کیا جائے۔

خلاصۂ کلام

مختصراً یہ کہ بیوروکریسی کی بجائے پلاننگ اور ترقیاتی کاموں کے لیے ایک متبادل وسیلے کی ضرورت پر غور کیا جانا چاہیئے۔ بہرحال عام سرکاری ڈھانچے کی جگہ غیر سرکاری اداروں کو دینے کا مطلب یہ ہوگا کہ ایک ایسا گروہ آجائے گا جو بزعم خود اپنے کو ماہر تصور کرے گا اور ان کا کام، سرمایہ، نگرانی، نظریہ اور ترقیاتی کاموں کو سرانجام دینے کا طریقہ، سماجی بنیاد اور رویہ کم و بیش ویسا ہی ہوگا جیسے موجودہ محکموں، مقامی اداروں، خود مختاری جماعتوں یا ترقیاتی کارپوریشنوں کا ہوتا ہے۔ سرکاری پلانوں پر غیر سرکاری اداروں کے ذریعے عمل درآمد کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ جانچ پڑتال اور کارکردگی متاثر ہوگی اور اس کے عوض کوئی

(باقی صفحہ۔۔۔ پر)

نانا دیش مکھ چیئرمین، دین دیال ریسرچ انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی۔

رضا کار تنظیمیں یقیناً ایک خوش آئند تحریک ہے

غریب اور دبے ہوئے عوام کو دوسرے لوگوں کی سطح پر لانا حکومت کے لیے ایک آزمائش ہے۔ مضمون نگار کی رائے ہے کہ حکومت یہ کام دفتر شاہی کے ذریعہ کبھی انجام نہیں دے سکتی۔ یہ کام ترقی کے عمل میں رضا کار اداروں کے سرگرم تعاون سے ہی پورا ہو سکتا ہے۔ شری دیش مکھ کا کہنا ہے کہ یہ کام صرف ایسے بے لوث لوگ ہی انجام دے سکتے ہیں جو غریب لوگوں کے درمیان رہتے اور کام کرتے ہیں۔

ہندوستان کو آزاد ہوئے کئی برس ہو چکے ہیں لیکن اب بھی ہمارے کروڑوں غریب اور اَن پڑھ لوگ انتہائی تکلیف دہ زندگی گذار رہے ہیں۔ حالانکہ مرکزی منصوبہ بندی کمیشن ۱۹۵۲ء سے کوشش کر رہا ہے کہ بنی نوعِ انسان کی اس بھاری تعداد کی مایوس زندگی میں خوشی کا کوئی پہلو شامل کیا جا سکے۔ اس مقصد کے لیے اب تک کروڑوں بلکہ اربوں روپیہ خرچ کیا جا چکا ہے۔ لیکن اب بھی ہمیں مطلوبہ نتائج حاصل نہیں ہو سکے۔ چنانچہ منصوبہ بندی کمیشن ایسے طریقوں کی تلاش میں ہے جو اس مقصد کے حصول کے لیے زیادہ کار آمد اور مناسب ہو۔ اس سلسلے میں اس بات پر بھی غور کیا جا رہا ہے کہ رضا کار ادارے ترقیاتی سرگرمیوں میں کہاں تک حصہ ادا کر سکتے ہیں۔ یہ ایک ایسا قدم ہے جو خوش آئند ہے اور جس کا بہت دیر سے انتظار تھا۔

ترقی کے عمل کو عام طور پر اقتصادی ترقی سمجھا جاتا ہے اور یہی سبب ہے کہ ہمیں "غریبی ہٹاؤ" جیسے نعرے سُننے کو ملتے ہیں اور شاید یہی سبب ہے کہ ترقیاتی منصوبوں میں مالیات کو اتنی اہمیت دی جاتی ہے۔ بے شک ترقی کے لیے مالی ذرائع کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا پھر کافی وسائل بجائے خود مطلوبہ نتائج کی ضمانت نہیں دے سکتے۔ گذشتہ تیس برسوں کا تجربہ اس کا مُنہ بولتا ثبوت ہے۔

مایوس کُن نفسیات

سائنس کے موجودہ دور میں بھی ہمارے اکثر غریب اور اَن پڑھ بھائیوں کا اعتقاد ہے کہ خدا نے انھیں غریب پیدا کیا ہے اور کوئی کوشش اُن کا مقدر نہیں بدل سکتی۔ جب تک ہمیں اس نفسیات کو جو صدیوں کی غربت اور لاپرواہی کا نتیجہ ہے، تبدیل نہیں کرتے تب تک ان لوگوں کی تبدیلی اور حالات میں بہتری کے امکانات کے بارے میں اُمید نہیں کی جا سکتی۔ حکومت لگاتار انھیں جو تھوڑی بہت امداد دے کر اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے اور حالت کو بہتر بنانے کی کوشش کرتی ہے لوگوں کو اُس سے الگ کرنا اتنا آسان نہیں ہے۔ ایسا کرنے کے لیے اُنھیں کچھ مالی امداد دے دینا ہی کافی نہیں۔ اس کے لیے ہمیں اُن کے چہار اطراف ترقی کا ایک ماحول پیدا کرنا ہوگا۔ اور انھیں خود کفیل ہونے کی ترغیب دینی ہوگی۔ ہمیں انھیں اپنی مدد آپ کرنے کا عادی بنانے کے لیے مدد دینی ہوگی۔

حقیقت یہ ہے کہ ان لوگوں کے لیے کامیاب ترقی کے عمل کے لیے درکار خود کفالت کا جذبہ گھاٹے کا سودا ہے۔ جب کہ ترقی کے لیے کسی پر انحصار رکھنے کی عادت میں فائدہ ہے۔ لوگوں کے کان یہ سُننے کے عادی ہو گئے ہیں کہ حکومت اُن کی تمام ضروریات پوری کرے گی۔ بہت سے لوگ خصوصاً نوجوانوں نے یہ سوچ لیا ہے کہ انھیں کچھ نہ کر کے بھی کچھ نہ کچھ ملتا رہے گا۔ لہٰذا اپنی مدد آپ کرنے، ذاتی وقار اور دوسروں کی مدد کا جذبہ کافور ہو گیا ہے۔ یہی سبب ہے کہ وہ بے روزگاری کا بھتّہ مانگتے ہیں۔ جب تک نئی نسل کی شکست خوردہ اور ترقی کے مخالف ذہنیت کو تبدیل نہیں کیا جاتا اُسے ترقی کے عمل میں شرکت کے لیے ترغیب دینا ناممکن ہے۔

ترقی کی تہذیب

حکومت کے پاس قانون بنانے، سرکار چلانے اور رقوم مہیا کرنے کے اختیارات ہیں۔ لیکن جب تک لوگوں کے ذہنی تعصبات دور نہیں کیے جاتے

اچھے قوانین کے بجائے خود اچھے نتائج برآمد نہیں ہوسکتے۔ نہ ہی قانون بجائے خود لوگوں کو

کے مسائل حقیقی ہیں اور انھیں حل کیا جانا چاہیے۔ لیکن اس کے لیے یہ پسندیدہ طرزِ عمل نہیں ہے کہ لوگ قانون کا احترام کرنا بند کردیں۔ سماج دشمن

حاصل کرنے کے لیے پرچار کے تمام ذرائع کام میں لائے جارہے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ سماج کی ہر سطح پر عدم اعتماد کی فضا پائی جاتی ہے۔ جب ایسی صورت

بیشک ترقی کے لیے مالی ذرائع کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا پھر کافی مالی وسائل بجائے خود مطلوبہ نتائج کی ضمانت نہیں دے سکتے۔ گذشتہ تیس برسوں کا تجربہ اس کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

اس بات کی ترغیب دے سکتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو نئے دور کے تقاضوں کے مطابق ڈھالیں۔ چھوت چھات کو دور کرنے اور جہیز پر پابندی لگانے کے لیے قوانین بنائے گئے ہیں۔ پھر بھی یہ برائیاں موجود ہیں۔ لہذا یہ ضروری ہے کہ ان قوانین کو مؤثر طور پر عملی جامہ پہنانے میں مدد دینے کے

عناصر اس صورتِ حال کا پورا فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ اور سرکار لگاتار کمزور ہوتی چلی جارہی ہے۔ اس صورتِ حال سے کسی کو بھی فائدہ نہیں پہنچے گا۔ لیکن ایسا لگتا ہے کہ ہمارے رہنما اس بات کو محسوس نہیں کررہے۔ یہی وجہ ہے کہ لاتا دکھے

ہو تو ہم لوگوں میں ترقی کے لیے درکار تعاون اور خیرسگالی کا ضروری جذبہ کیسے پیدا کرسکتے ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے...

جب میں ان چار مسائل کا ذکر کرتا ہوں تو میرا کہنے کا مطلب یہ نہیں کہ ان چار مشکلات کی

بہت سے لوگوں خصوصاً نوجوانوں نے یہ سوچ لیا ہے کہ انھیں کچھ نہ کرکے بھی کچھ نہ کچھ ملتا رہے گا۔ لہذا اپنی مدد آپ کرنے، ذاتی وقار اور دوسروں کی مدد کا جذبہ کافور ہوگیا ہے۔

لیے موزوں سماجی ماحول پیدا کیا جائے۔ اس ضرورت کو محسوس تو کیا جارہا ہے لیکن پورا نہیں کیا جارہا۔ اس سلسلے میں کہا جاسکتا ہے کہ ہمارے رہنما جس ڈھنگ سے کام کررہے ہیں اُس سے بہت تشویش ہوتی ہے۔ ہمارا سیاسی قیادت کا عمل قانون کی رُو کے مخالف ہے۔ آزاد ہندوستان میں بھی

بڑھتی جارہی ہے۔ یہ صورتِ حال ترقیاتی تہذیب کے بالکل منافی ہے۔

لوک بھلائی یا فلاحِ عامہ کا انحصار شہریوں میں سرگرم تعاون کے جذبے پر ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ ملک کے باشندوں میں فرداً فرداً اور سماجی فرقوں یا گروہوں میں ایک دوسرے کے لیے خیرسگالی کا جذبہ موجود ہے۔ دراصل آزادی

وجہ سے غریبوں اور پچھڑے ہوئے لوگوں کو اٹھانے کے لیے کچھ نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن یہ ضروری ہے کہ ہمیں حقیقی صورتِ حال کی اصل وجوہات کا علم ہو تب ہی ہم حالات کی اصلاح کے لیے ضروری قدم اٹھا سکتے ہیں۔ ورنہ وقت اور وسائل کے غیر ضروری نقصان کے بغیر ملک کی ترقی ممکن نہیں ہوتی۔

نتیجہ یہ ہے کہ سماج کی ہر سطح پر عدم اعتماد کی فضا پائی جاتی ہے۔ جب ایسی صورت ہو تو ہم لوگوں میں ترقی کے لیے درکار تعاون اور خیرسگالی کا ضروری جذبہ کیسے پیدا کرسکتے ہیں؟

حقیقی یا فرضی شکایات کو دور کرنے کے لیے قانون توڑنے کے وہی طریقے استعمال کیے جاتے ہیں، جو آزادی سے پہلے کیے جاتے تھے۔ لوگوں

کے بعد ایک دوسرے کی ٹانگ کھینچنا ہمارے لوگوں کا محبوب مشغلہ بن گیا ہے۔ اِسی مقصد کو

ہمارا معاشرہ بہت قدیم ہے۔ بہت سی پرانی اور غیر موزوں عادات یہاں گہری جڑیں

پکڑے ہوئے ہیں۔ پھر بھی غلامی کی وراثت بھی موجود ہے۔ لہذا ہمیں سائنس کی ترقی کو کام میں لانا چاہیئے۔ اور ایسا طرزِ عمل و تکنیک اختیار کرنی چاہیئے جو ان حقائق کے مطابق ہو۔ ہمیں اپنی قدروں کو قربان کئے بغیر معاشرے کی اصلاح اور معیشت کی تعمیر کرنی ہے۔ لہذا ہمارے

بنانا ہے جو غربت کی سطح سے اوپر اٹھنا چاہتے ہیں۔ ہمیں غریبوں اور پسے ہوئے عوام کو ملک کی باقی آبادی کی سطح پر لانا ہے۔ اس مقصد کے لیے ہمیں اُن میں خود آگے بڑھنے کے جذبے کو روشن کرنا ہے۔ جب تک وہ خود قدم آگے نہیں بڑھائیں گے نہ تو وہ ہمہ گیر ترقی کر سکیں گے اور نہ ہی اپنی ترقی کی سطح کو برقرار رکھ سکیں گے۔ حکومت یہ کام ذخیری

پسے ہوئے لوگوں کی بھلائی اور ترقی کے لیے خون پسینہ ایک نہیں کریں گے۔ آزادی کی جد وجہد میں بہت سے لوگوں نے گھروں کے آرام اور سرکاری اعزازات کو خیرباد کیا اور اپنی جانوں کی بازی لگا دی۔ ایسے محب وطن ہماری نوجوان نسل کے لیے شمعِ ترغیب تھے۔ جنھوں نے اپنے رہنماؤں سے بھی بہتر کام کر کے دکھلائے۔ ان لوگوں کو کسی قسم کا لالچ نہیں تھا۔

یہ نہایت ضروری امر ہے کہ نوجوانوں کی قوت کے وسیع ذخیرے کو تعمیری طور پر کام میں لانا چاہیئے۔ صرف رضا کار ادارے ہی اُنھیں اس کام کے لیے راغب کر سکتے ہیں۔

لیے یہی بہتر ہوگا کہ اس اہم بات کو ذہن نشین کریں۔ مہاتما گاندھی کی قیادت میں ہمارے عوام نے دنیا کی سب سے بڑی سلطنت کی ڈیڑھ سو سالہ غیر ملکی حکومت کو ختم کیا۔ یہ کامیابی زر یا حکومت کے زور سے نہیں بلکہ عوامی قوت اور اُصولوں کی طاقت سے حاصل ہوئی۔ آج ہم روپے اور سرکار کی طاقت کو بھی سماجی مقاصد کے حصول پر لگا سکتے ہیں۔ لہذا اب ہمارا کام پہلے سے زیادہ آسان ہونا چاہیئے۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ کام درحقیقت پہلے سے بھی کٹھن ہو گیا ہے۔

اِس کی وجہ یہ ہے کہ وہی سماجی طاقت جس نے ہمیں غیر ملکی حکومت سے چھٹکارہ دلوایا تھا آج سرکار اور روپے کی طاقت پر انحصار رکھنے لگی ہے۔ یہی بڑی وجہ ہے کہ ہمیں ترقیاتی کوششوں کے متوقع نتائج حاصل نہیں ہو رہے لہذا یہ نہایت اہم ضرورت ہے کہ معاشرے کی ہر سطح پر عوامی قوت بالخصوص نوجوانوں کی قوت اور سرکاری کوششوں کے درمیان سرگرم تعاون کو فروغ دیا جائے۔

یہ کام کون کر سکتا ہے؟

ہمیں سب سے پہلے اُن لوگوں کو خود کفیل

عملے کی مدد سے کبھی سرانجام نہیں دے سکتی۔ یہ کام صرف وہی لوگ کر سکتے ہیں جو غریبوں کے درمیان رہے ہیں۔ جنھیں کسی عہدے کی بھوک نہیں اور جو آرام و آسائش کے ذرائع کے پیچھے نہیں بھاگ رہے۔ یہ کام صرف وہ لوگ کر سکتے ہیں جن کا دل غریبوں کی غربت سے متاثر ہوتا ہے جو غریبوں کو اپنا بھائی سمجھتے ہیں اور جو غیر ملکی مشنریوں کی طرح دور دراز دیہات گھنے جنگلوں میں جا کر کسی آرام یا دکھ اور چھوا چھوت کی پرواہ کئے بغیر اُن لوگوں کی خدمت کرنے کے لیے تیار رہیں۔

لاتعداد نوجوانوں نے ملک کے لیے قربانیاں دیں اور مصائب جھیلے۔ بہت سے لوگ مُلک کی آزادی کے لیے ہنستے ہنستے پھانسی پر چڑھ گئے۔ لہٰذا یہ سوچنا غلط ہے کہ ہمارے نوجوان غریبوں اور

صرف رضا کار ادارے

لیکن آزادی آنے پر یہ سب کچھ بدل گیا آج کے رہنما جو کچھ کرتے ہیں کچھ حاصل کرنے کے لیے کرتے ہیں۔ وہ صرف سیاسی اقتدار کو سامنے رکھ کر کچھ کرنا چاہتے ہیں۔ اس طرح سارا ماحول اقتدار کے محور کے گرد گھومنے لگا ہے۔ ایسے ماحول میں نوجوانوں سے کسی اچھے کام کی توقع کیسے کی جا سکتی ہے۔؟ اس لیے یہ ضروری ہے کہ تعلیم یافتہ، تجربہ کار اور مشہور لوگ آگے آئیں اور غریبوں کی خدمت کی مثال لوگوں کے سامنے رکھیں۔ یہ کام صرف رضا کار ادارے ہی کر سکتے ہیں۔ میں یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ یہ ادارے اس کام سے عہدہ برا ہو سکتے ہیں لیکن وہ ترقیاتی منصوبوں کی کامیابی کے لیے سماجی خدمت کی اہمیت میں یقین رکھتے ہیں۔ یہ نہایت ضروری امر ہے۔ نوجوانوں کی قوت کے وسیع ذخیرے کو تعمیری طور پر کام میں لایا جائے۔ صرف رضا کار ادارے ہی اُنھیں اس کام کے لیے راغب کر سکتے ہیں۔ تحریکِ آزادی میں بھی سماجی اصلاح کاروں نے بھاری کردار ادا کیا تھا لیکن آزادی

(باقی ص ۶۵ پر)

اقتدار کی سیاست ہر شے پر غالب آگئی ہے۔ لہذا لوگ کچھ لینا چاہتے ہیں دینا نہیں چاہتے۔ ایسی صورت میں صرف ایسی رضا کار انجمنیں ہی مددگار ثابت ہو سکتی ہیں جو اصولی طور پر اقتدار یا سیاست سے دور رہنا چاہتی ہوں۔

بھرت ڈوگرہ   فری لانس جرنلسٹ، نئی دہلی۔

اُمیّد ــ کیا صرف اُمیّد ہی رہے گی

اس مضمون کے مصنف ایک مشہور معروف صحافی ہیں۔ انھوں نے اس مضمون میں رضاکار تنظیموں سے جو بہت زیادہ توقعات وابستہ کرلی گئی ہیں، اس کے خلاف آگاہ کیا ہے۔ انھوں نے کہا ہے کہ مخصوص نوعیت کے مفادات اس کی راہ میں جو روڑے اٹکاتے ہیں، ان سے باخبر رہنے کی ضرورت ہے اور صورتِ حال کا حقیقی انداز میں جائزہ لینے کی ضرورت ہے۔ رضاکار ایجنسیوں سے دیہات کی مربوط ترقی اور دیہات میں روزگار کے قومی پروگرام پر عمل درآمد میں جو اُمیدیں لگائی گئی ہیں، ان کو بھی حقیقت کی آنکھ سے دیکھنا ضروری ہے۔

حالیہ برسوں میں سرکاری اور غیر سرکاری بہت سے بیانات اور دستاویزات میں اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ مختلف ترقیاتی پروگراموں میں رضاکارانہ اداروں کو شریک کرنا چاہیے۔ کبھی کبھی ان سفارشات کو عملی جامہ پہنانے پر بہت زیادہ زور دیا جاتا ہے اور یہ توقع کی جاتی ہے کہ ان پر عمل درآمد سے بہت زیادہ کامیابی ملے گی اور نتائج خاطر خواہ سامنے آسکیں گے۔

اس ضمن میں یہاں بہت سے بیانات دیے جا سکتے ہیں لیکن یہاں صرف چھٹے پنجسالہ منصوبے کی دستاویزات کے حوالے سے کچھ ایسے اقتباسات نقل کیے جاتے ہیں جن سے یہ امید وابستہ کرلی گئی ہے کہ غیر سرکاری تنظیمیں جو کہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے باضابطہ اور بے ضابطہ دونوں طرح کی ہیں، ترقیاتی کاموں کے لیے عوام کو ترغیب دے سکتی ہیں۔ اور ان کا تعاون حاصل کرسکتی ہیں۔

اس دستاویز کی روشنی میں اس سمت عوام کو متحرک بنانے اور ان میں شعور پیدا کرنے کا عظیم کام اسی وقت مؤثر طور پر پایۂ تکمیل کو پہنچ سکتا ہے جبکہ یہ ادارہ جاتی نوعیت اختیار کرلے۔ انفرادی عمل اگرچہ اپنی جگہ اہم ہوتا ہے لیکن اس کے اثرات کہیں کہیں چھوٹے موٹے انداز میں ہی محسوس کیے جا سکتے ہیں جبکہ ادارہ جاتی نوعیت کا کام نمایاں طور پر اہم ہوتا ہے۔ اور وہ مقامی وسائل کو حرکت میں لانے میں زیادہ مؤثر اور دیرپا ہوتا ہے۔ ادارہ جاتی کوششوں سے ترقیاتی پروگراموں کو چلانے کے عظیم کام میں تال میل لایا جا سکتا ہے۔ اور مقامی ضرورتوں کا احساس کرکے ان کی تکمیل کے لیے کوشش کی جا سکتی ہے۔

> انفرادی عمل اگرچہ اپنی جگہ پر اہم ہوتا ہے لیکن اس کے اثرات کہیں کہیں چھوٹے موٹے انداز میں ہی محسوس کیے جا سکتے ہیں جبکہ ادارہ جاتی نوعیت کا کام نمایاں طور پر اہم ہوتا ہے اور وہ مقامی وسائل کو حرکت میں لانے میں زیادہ مؤثر اور دیرپا ہوتا ہے۔ ادارہ جاتی کوششوں سے ترقیاتی پروگراموں کو چلانے کے عظیم کام میں تال میل لایا جا سکتا ہے۔ اور مقامی ضرورتوں کا احساس کرکے ان کی تکمیل کے لیے کوشش کی جا سکتی ہے۔

گمشدہ کڑی

اس دستاویز میں متعدد مخصوص نوعیت کے ایسے رضاکار اداروں کی نشاندہی بھی کی گئی ہے جن کو ترقیاتی پراجیکٹوں پر عمل درآمد

کے کام میں لگایا جا سکتا ہے۔ اس فہرست میں ایسی تنظیموں کو خارج کر دیا گیا ہے جو کہ پریشان حال، بے زمین مزدوروں کو حرکت میں لانے کا کام کر رہی ہیں تاکہ وہ استحصال کے خلاف نبرد آزما ہو سکیں۔ اس کے برعکس روٹری کلب، اور لائنز کلب، کاروباری گھرانوں اور ان کے ایوانوں وغیرہ کو شامل کر لیا گیا ہے۔ درحقیقت یہ بھی مشورہ دیا گیا ہے کہ ہر ریاست میں مخصوص بلاکوں کو ترقیاتی پروگراموں کے لیے چن لیا جائے۔ یہ کام متعدد کاروباری گھرانے مربوط کوششوں کے ذریعے انجام دے سکتے ہیں۔ لہٰذا مستقبل میں امید کی جا سکتی ہے کہ زرعی پروگراموں کو فرٹیلائزر کمپنیاں عملی جامہ پہنائیں، ڈیری کے فروغ سے متعلق پروگراموں کو ڈیری سے متعلق ساز و سامان تیار کرنے والے ادارے اور کمپنیاں عملی جامہ پہنائیں، اور اسی طرح ماہی گیری کے پروگراموں کو ٹرالر مینوفیکچرر اور مچھلی کی برآمدات سے وابستہ ادارے عملی جامہ پہنائیں یا پھر ایسے رضاکارانہ ادارے ان پروگراموں کو عملی جامہ پہنائیں جنھیں یہ ادارے (جن کا ذکر کیا گیا ہے) مالی امداد فراہم کرتے ہوں۔

اس دستاویز میں متعدد ایسے بیانات بھی ہیں جن سے اس طرح کی کوششوں کی کامیابی نمایاں طور پر واضح ہوتی ہے۔ اس سلسلے میں چار صراحت شدہ مثالیں دی گئی ہیں۔ لیکن ان میں سے دو مثالیں نکتہ چینی کی زد میں آ چکی ہیں ایک کا تعلق مویشیوں کی پرورش اور افزائش نسل سے متعلق ٹکنالوجی سے ہے اور دوسری کا خاتون ورکروں کے استحصال سے تعلق ہے۔ اس دستاویز میں کہا گیا ہے کہ ملک میں ایسی بہت سی مثالیں ہیں جہاں رضاکارانہ نوعیت کے اداروں نے نمایاں کامیابی حاصل کی ہے۔

مستقبل میں رضاکار تنظیموں کی شرکت زیادہ بڑے پیمانے پر کی جانی ہے۔ اس سلسلے میں ایک فہرست کے ذریعے چند ایک ایسے شعبوں کی نشاندہی کی گئی ہے، جہاں اس طرح کی شرکت پہلے سے بڑے پیمانے پر کی جاتی ہے۔ ان شعبوں کے لیے عوام کے شعور کی بیداری اور ان کی باشعور شرکت کامیابی کے واسطے ضروری سمجھی گئی ہے۔ مگر اس فہرست سے اصلاحات اراضی اور کم سے کم اجرتوں کی ادائیگی کے قوانین کو جہاں کہ عوام کی شرکت از بس ضروری ہے، خارج کر دیا گیا ہے۔

تنقیدی نگاہ کی ضرورت

اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ ترقیاتی کاموں میں رضاکارانہ تنظیموں کی شرکت سے جو بڑی امیدیں وابستہ کی گئی ہیں، وہ کس حد تک جائز ہیں۔ اس بنیادی سوال کے جواب میں ایک بنیادی مسئلہ جو درپیش ہے، وہ یہ کہ ہر رضاکار تنظیم اپنے مقاصد، ترغیب عمل، آئیڈیالوجی، کام کے حیثیں خود کو وقف کر دینے کی صلاحیت، کام کے معیار اور عملے کے ارکان کی تعداد و نوعیت وغیرہ کے اعتبار سے، ہر دوسری رضاکار تنظیم سے جدا ہے۔ (ہزاروں) رضاکار ادارے ہیں جو کسی نہ کسی شکل میں ترقیاتی کاموں سے وابستہ ہیں۔ لیکن ایک دوسرے سے قطعی جدا ہیں، ہر ادارے کے کام کرنے کی حد، اور اس کے کام کے معیار اور مقصد اور سمت دوسروں سے جدا ہے۔

کچھ رضاکار ادارے بدعنوانیوں کی روک تھام، کام کے معیار کو گرنے سے بچانے کی روک تھام وغیرہ کے لیے کام کر رہے ہیں۔ ایسے ادارے بالعموم بہت سے ترقیاتی پروگراموں پر عمل درآمد میں دشواری پیدا کر رہے ہیں۔ کچھ ادارے کچھ ایسے مسائل کا تکنیکی حل تلاش کرنے کے لیے بنے ہیں جو دیہی عوام کی غریبی کا سبب ہیں تاکہ وہ اپنے کھیتوں کی پیداوار بڑھا سکیں۔ کچھ اور ادارے غریبی اور استحصال کے بنیادی ڈھانچے کی اصلاح و بہتری کے لیے سرگرم تعاون دے رہے ہیں۔ کچھ ایسے ادارے بھی ہیں جن کے مقاصد ملے جلے ہیں۔ اور جو مذکورہ بہت سے مقاصد کو ایک ساتھ لے کر چل رہے ہیں۔ کچھ ادارے اپنے اغراض و مقاصد کی بنیاد پر اپنے لیے کوئی واضح سمت متعین نہیں کر سکے ہیں۔

ایسی صورت میں کیا ہو؟

اس کے برعکس کچھ لوگ جو کہ نام نہاد رضاکار ادارے قائم کر لیتے ہیں، وہ ذاتی مفادات کے تحت اپنا کام آگے بڑھاتے ہیں۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ شروع میں ان کا ارادہ نیک ہو لیکن بعد میں وہ بدعنوانی کے مرتکب ہو جاتے ہیں (ایک طرح سے "ترقیاتی پروگرام" بھی منظم پیمانے پر ایک پیشہ بن چکا ہے۔ مثال کے طور پر کچھ ایسی کمپنیاں جو کہ ایک سے زیادہ ملکوں میں اپنا کاروبار چلا رہی ہیں، ایک مخصوص نوعیت کی ترقیاتی حکمت عملی سے دلچسپی رکھتی ہیں کیونکہ اس کے ذریعے ان کی مصنوعات کی فروخت کو بڑھاوا ملتا ہے اس حکمت عملی کو متحمل عام بنانے کے لیے وہ ایسے رضاکارانہ اداروں کو بالواسطہ طور پر یا بلاواسطہ طور پر مالی امداد دیتی

مستقبل میں اُمید کی جا سکتی ہے کہ زرعی پروگراموں کو فرٹیلائزر کمپنیاں عملی جامہ پہنائیں، ڈیری کے فروغ سے متعلق پروگراموں کو ڈیری سے متعلق ساز و سامان تیار کرنے والے ادارے اور کمپنیاں عملی جامہ پہنائیں۔ اور اسی طرح ماہی گیری کے پروگراموں کو ٹرالر مینوفیکچرر اور مچھلی کی برآمدات سے وابستہ ادارے عملی جامہ پہنائیں یا پھر ایسے رضاکارانہ ادارے ان پروگراموں کو عملی جامہ پہنائیں جنھیں یہ ادارے (جن کا ذکر کیا گیا) مالی امداد فراہم کرتے ہوں۔

ہیں جو ان کے مطلب کو پورا کرنے والی ترقیاتی حکمتِ عملی کی تشہیر کرتے ہیں یا کسی خاص قسم کی ایسی ٹکنالوجی کو عوام میں مقبول بناتے ہیں جس سے ان کو فائدہ پہونچتا ہو۔

آج غریبی دور کرنے کے نام پر قومی اور بین الاقوامی سطح پر بہت سی رقومات حاصل کی جاسکتی ہیں۔ اس لیے کسی بھی بہانے فنڈ حاصل کرکے بدعنوانی کے مرتکب افراد اسے کام میں لے آتے ہیں یا پھر اسے اپنے رشتہ داروں کو کام دینے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ کچھ ادارے جو کہ غیر ملکی امداد پاتے ہیں، ان کے مقاصد اور بھی خطرناک ہوسکتے ہیں۔

کچھ رضاکار تنظیمیں اس قدر کھلے عام بدعنوان نہ ہوں لیکن وہ چوری چھپے اور مختلف انداز سے بدعنوانی کرسکتی ہیں۔ ان کو اپنے کام کو آسانی سے چلانے کے لیے مختلف وسیلوں سے فنڈ ملتا ہے۔ اور ان کے کاموں کا انحصار اس روپے پر ہوتا ہے۔ گاؤں والوں سے رابطہ رکھنے کے دوران وہ کچھ ایسے نتایج پر پہونچ سکتے ہیں، جو ان وسیلوں کے لیے قابلِ قبول نہ ہوں جن سے کہ وہ روپیہ حاصل کرتے ہیں۔ چنانچہ اس رقم کو مسلسل حاصل کرنے کی کوشش میں، وہ حقیقت سے روگردانی کرسکتے ہیں یا پھر اس کے لیے مختلف حیلے بہانے تلاش کرسکتے ہیں۔ اور اس کام کا رُخ ہی بدل سکتے ہیں۔

اس بات میں کوئی شبہ نہیں کہ غریب عوام کی بھلائی کے پروگرام پر عمل درآمد کے لیے خود غریبوں کی شرکت اس میں ضروری ہے لیکن سوال یہ ہے کہ یہ متعدد رضاکار تنظیمیں کس حد تک صحیح معنی میں غریبوں کی نمائندہ ہیں اور صدق دلی سے ان کی بہبود کے کاموں میں مشغول ہوئی ہیں۔

اس سوال کا جواب مختلف رضاکار اداروں کی طرف سے مختلف ہوگا۔ عوام کی شرکت کے نام پر اور رضاکار تنظیموں کی شرکت کے نام پر ترقیاتی کاموں میں سازشں اور مفاد پرست گروپوں کی ہمت افزائی نہیں کی جانی چاہیئے۔

اتفاق رائے کیسے ہو؟

متعدد موقعوں پر سرکاری طور پر یہ کہا گیا ہے کہ سرکار کے ترقیاتی پروگراموں پر عمل درآمد کے کاموں میں رضاکار تنظیموں کو شریک کیا جانا چاہیئے تاکہ ان پر مناسب عمل درآمد کو یقینی بنایا جاسکے۔ البتہ ایسے بیانات بنیادی طور پر حقائق سے دور معلوم ہوتے ہیں کہ رضاکار تنظیمیں موٹے طور پر اس بات پر متفق ہیں کہ آج کے دور کے سرکاری ترقیاتی پروگرام صحیح قسم اور صحیح طرز کے پروگرام ہیں۔ کسی پروگرام پر عمل درآمد میں کسی رضاکار ادارے کے تعاون کا سوال اس کے بعد ہی آتا ہے جبکہ وہ اس بات پر متفق ہو کہ یہ صحیح پروگرام ہے اور اس پر عمل درآمد کی ضرورت ہے۔ اس کے بعد ہی وہ اس کی معاونت کے لیے تیار ہوگا۔

اس کے برعکس اگر کوئی رضاکار ادارہ کسی ترقیاتی پروگرام سے متفق نہیں ہے بلکہ اس پر نکتہ چینی کرتا ہے تو اس پر عمل درآمد کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

اس سلسلے میں ایک مثال دی جاسکتی ہے۔ ٹکنالوجی کا گوشہ ہی لیجئے۔ ہمارے ملک میں مخلوط نسل کی گایوں کی ٹکنالوجی کے بارے میں مختلف آرا ہیں۔ کچھ پسند کرتے ہیں اور کچھ ناپسند۔ کچھ لوگ اسے ڈیری کے فروغ میں معاون سمجھتے ہیں اور کچھ ایسا نہیں سمجھتے۔ لیکن سرکار کے زیادہ تر پروگرام اس ٹکنالوجی کو صحیح مان کر شروع کیے گئے ہیں۔ اس طرح بہت سے ناقدین دودھ کی مصنوعات کی بڑی مقدار میں تحفظ کی صورت میں وصولی کو اچھا نہیں سمجھتے لیکن ڈیری کا موجودہ پروگرام درآمد شدہ انھیں تحائف پر انحصار رکھتا ہے۔ ایسے بہت سے اور بھی گوشے بتلائے جاسکتے ہیں جہاں کہ ترقیاتی کام سے وابستہ تجربہ کار علمی

ہزارہا رضاکار ادارے ہیں جو کسی نہ کسی شکل میں ترقیاتی کاموں سے وابستہ ہیں۔ لیکن ایک دوسرے سے قطعی جدا ہیں، ہر ادارے کے کام کرنے کی حد اور اس کے کام کا معیار اور مقصد اور سمت دوسروں سے جدا ہے۔

ایک طرح سے ترقیاتی پروگرام بھی منظم پیمانے پر ایک پیشہ بن چکا ہے۔ مثال کے طور پر کچھ ایسی کمپنیاں جو کہ ایک سے زیادہ ملکوں میں اپنا کاروبار چلا رہی ہیں، ایک مخصوص نوعیت کی ترقیاتی حکمتِ عملی سے دلچسپی رکھتی ہیں کیونکہ اس کے ذریعے ان کی مصنوعات کی فروخت کو بڑھاوا ملتا ہے۔

ماہرین اور سماجی کارکنوں نے سرکاری پروگراموں کی حکمت عملی پر نکتہ چینی کی ہے اور سرکاری پروگراموں کی ملک گیری سے اتفاق نہیں کیا ہے۔ کیا ایسے اداروں سے کہا جائے کہ وہ ان پروگراموں کو عملی جامہ پہنانے میں شرکت کریں جن سے انھیں اتفاق نہیں ہے یا کیا ان سے یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ ان پروگراموں پر عمل درآمد میں عملی جوش و خروش کا ثبوت دیں گے۔

حالیہ سرکاری دستاویزات کی روشنی میں سرکار بڑی حد تک دیہات کی ترقی کے مربوط پروگرام اور دیہی روزگار کے قومی پروگرام وغیرہ پر انحصار رکھتی ہے

روشنی میں (چھٹے منصوبے کا مسودہ) دیہی گھرانوں میں اعلیٰ ترین ۲۵ فی صد کے ۵،

ان کی زمینی ملکیت ... کا اعلیٰ ترین ایک فی صد کچھ نچلی سطح کے ۱۰ فی صد گھرانوں کے مقابلے زیادہ اثاثہ جات کے مالک ہیں۔

اس حقیقت کو سامنے رکھ کر سرکار کے تقسیم املاک اور تقسیم وسائل کے جو پروگرام ہیں، وہ بہت ابتدائی نوعیت کے ہیں۔ ۴۰۰ء۳ لاکھ ایکڑ قابل کاشت اراضی میں سے صرف ۲۰ لاکھ ایکڑ اراضی ۱۹۸۳ء تک دوبارہ تقسیم کی گئی ہے۔ یہ تقسیم زمین کی بالائی حد کے قوانین کے تحت عمل میں آئی ہے۔ حالاں کہ اس محاذ پر بہت کچھ سننے کو ملتا ہے۔ ان حالات میں بامقصد رضاکار ایجنسیوں میں بہت سے ایماندار لوگ یہ محسوس کریں گے کہ سرکار نے دیہات کے مربوط ترقی کے پروگرام اور دیہی ترقی کے قومی پروگرام پر زور دیا ہے مگر

کچھ رضاکار تنظیمیں

اس قدر کھلے عام بدعنوان نہ ہوں لیکن وہ چوری چھپے اور مختلف انداز سے بدعنوانی کرسکتی ہیں۔ ان کو اپنے کام کو آسانی سے چلانے کے لیے مختلف وسیلوں سے فنڈ ملتا ہے اور ان کے کاموں کا انحصار اس روپے پر ہوتا ہے۔

لیکن سوال یہ ہے کہ یہ متعدد رضاکار تنظیمیں کس حد تک صحیح معنی میں غریبوں کی نمائندہ ہیں اور صدق دلی سے ان کی بہبود کے کاموں میں جٹی ہوئی ہیں۔ اس سوال کا جواب مختلف رضاکار اداروں کی طرف سے مختلف ہوگا۔

تاکہ ان کے ذریعہ غریبی دور ہوسکے۔ اس کے برعکس ملک میں متعدد لوگ یہ محسوس کرتے ہیں کہ ہندوستان میں غریبی کی جڑیں موجودہ نابرابری اور عدم مساوات میں ہیں۔ منصوبہ بندی کمیشن کے اعداد و شمار کی

فی صد آبادی پر کاشت کرتے ہیں۔ جب کہ باقی ۷۵ فی صد صرف ۲۵ فی صد اراضی پر کاشت کرتے ہیں۔ سی۔ ٹی۔ کورین نے تمل ناڈو میں جو مطالعے کئے ہیں جو کہ آئی۔ سی۔ ایس۔ ایس۔ آر (ICSSR) کے زیر اہتمام ہوئے،

وسائل کی تقسیم کے بنیادی کام کو غیر متوازن بنا رکھا ہے۔ اسی لیے انھیں ترقیاتی پروگراموں پر عمل درآمد میں اپنی شرکت کا احساس نہیں ہو پاتا۔

کسی پروگرام پر عمل درآمد میں کسی رضاکار ادارے کے تعاون کا سوال اس کے بعد ہی آتا ہے جب کہ وہ اس بات پر متفق ہو کہ یہ صحیح پروگرام ہے اور اس پر عمل درآمد کی ضرورت ہے۔ اس کے بعد ہی وہ اس کی معاونت کے لیے تیار ہوگا۔

رضاکار جماعتیں

جمہوریت کا ایک اٹوٹ حصہ

رضاکار جماعتوں کے مفید کام کی حمایت کے ساتھ ساتھ مصنف نے انھیں اس بات سے بھی آگاہ کیا ہے کہ اس ضمن میں انھیں کیا خطرات لاحق ہیں۔ وہ پوچھتے ہیں کہ "اپنا رضاکارانہ کردار کھوئے بغیر ایک ایجنسی کس حد تک سرکار سے تعاون کر سکتی ہے؟" اور اس کے جواب میں وہ کہتے ہیں:

• اگر رضاکار جماعتیں بہت کم ہوں گی یا موثر نہیں ہوں گی اور یا وہ سرکاری نظام سے بہت زیادہ منسلک ہو جائیں گی تو وہ اپنا فرض پورا نہ کر پائیں گی۔"

۱۳۰۰ ہیکٹر بنجر اور بے درخت زمین پر جو پتھریلی اور تودوں سے کٹی اور پھٹی پڑی ہے۔ جس میں اوسطاً ۴۰۰ ملی میٹر سالانہ بارش پڑتی ہے، اور جس کے زیر زمین پانی کے وسائل بہت کم ہیں" ایک رضاکار انجمن ۴۰۰ مزدور قبیلوں کو جنہیں حال ہی میں طوقِ غلامی سے نجات ملی ہے" ایک خود کفیل کمیونٹی کے طور پر بسانے کا ارادہ رکھتی ہے اور ایسا ہونا بالکل ممکن ہے۔ یہ یوں کہ اس زمین پر گزشتہ دو برسوں کے دوران ۱۰ ہزار اشجار پھلنے پھولنے لگے۔ کنوؤں اور بندوں نے اس قدر پانی جمع کر لیا ہے کہ درختوں کے اُگنے کی جگہ پیدا ہو چکی ہے؛ زمین میں اُبھار آگیا ہے۔ مونگ پھلی کی فصل سے ہر خاندان کو ایک ہزار روپیہ کی اوسطاً آمدنی ہوتی ہے۔ ایک کوآپریٹو سوسائٹی جو ۱۵۰ ممبروں پر مشتمل وجود میں آگئی ہے، اور ۲۵ پکے مکان تعمیر ہوگئے ہیں۔ وہ بینک جو شخص ایک برس پہلے ایک کوڑی تک قرض دینے کو تیار نہ تھا چوں کہ ان کے ماہرین کا یہ خیال تھا کہ یہاں کچھ بھی تو پیدا نہیں ہوگا۔ اب انھوں نے فصلوں اور بیلوں کے لیے ۱۰ لاکھ روپیہ ان نئے آباد کاروں کو قرض دیا ہے اور اس قرض کو کوآپریٹو سے منسلک کیا ہے۔ کمیونٹی اب ایک ڈیولپمنٹ کونسل چلا رہی ہے جو آہستہ آہستہ کمیونٹی کے روزمرہ کے مسائل کی دیکھ بھال کرنے لگی ہے اور کوآپریٹو سے رابطہ بنائے ہوئے ہیں۔ غرضیکہ یہ کمیونٹی اب ترقی کے کاموں کو چلانے کے لیے ایک کونسل بنانے کا ارادہ رکھتی ہے جو ان کے روزمرہ کے مسائل کی دیکھ بھال کرے۔

یہ سوال برسوں سے اٹھتا آیا ہے کہ رضاکار جماعت کو کہاں تک دخل انداز ہونا چاہیئے بعض لوگ تو ایسے ہیں جو سرے ہی سے اس کے خلاف ہیں۔ مگر کئی ایسی برحق وجوہات رضاکار جماعتوں کے وجود کے ضمن میں پائی جاتی ہیں جو اسے جمہوری طرز نظام کا ایک لازمی جزو قرار دیتی ہیں۔

یہ سوال برسوں سے اُٹھتا آیا ہے کہ رضاکار جماعت کو کہاں تک دخل انداز ہونا چاہیئے؛ بعض لوگ تو ایسے ہیں جو سرے ہی سے اس کے خلاف ہیں۔ مگر کئی ایسی برحق وجوہات رضاکار جماعتوں کے وجود کے ضمن میں پائی جاتی ہیں جو اسے جمہوری طرز نظام کا ایک لازمی جزو قرار دیتی ہیں۔

تاہم ایک مناسب اور اہم سوال پیدا
ہوتا ہے کہ ان جماعتوں کو اپنا بنیادی کردار
کھوئے یا کم کئے بغیر سرکار سے کہاں
تک تعاون کرنا چاہئے۔

وجہ یہ ہے کہ

رضا کار جماعتوں کی مالیہ ضرورت یہ ہے کہ جدید انتظامی امور اور محاسبہ کے نظام کو بروئے کار لائیں۔ وجہ یہ ہے کہ اب بہت سی جماعتیں بڑی ہو گئی ہیں۔ کم از کم ۲۰ تو ایسی ہیں جن کے کارکنوں کی تعداد سو تک ہے۔ اور جن کے ہاتھوں بہت بڑے سرمائے کا استعمال ہوتا ہے۔

اگر رضا کار جماعتیں بہت کم ہوں گی یا موثر نہیں ہوں گی تو وہ کام کو سرانجام نہیں دے پائیں گی۔ اور اگر وہ سرکاری نظام سے گہرے طور پر منسلک ہو جائیں گی تو بھی بے کار ہو کر رہ جائیں گی۔ اگر رضا کار جماعتوں کو کامیاب ہونا ہے تو انھیں لچکیلے پن اور اصول پسندی کے بنیادی کرداروں کے علاوہ جو ان کے بنیادی جزو ہیں۔ مندرجہ ذیل باتوں کا بھی دھیان رکھنا ہوگا۔

۱۔ گاندھی جی کی سی سادہ زندگی۔
۲۔ غریبوں کی ایسی اعلیٰ نظریے پر تنظیم جو نام نہاد بائیں بازوں کا طرۂ امتیاز سمجھی جاتی ہے
۳۔ قدیم چرچوں کے نظریے کی سی مضبوطی۔
۴۔ مناسب انتظام جس کا محاسبہ ہو سکے۔

کیا یہ بہت زیادہ مطالبات ہیں؟
ہرگز نہیں، بشرطیکہ رضا کار جماعتوں کو سرخرو ہونا ہے، اور جو امتحان اس کو پیش آئیں گے، اُن سے وقت پر نپٹنا ہے۔ اکثر بیشتر رضا کار جماعتوں میں مندرجہ بالا خوبیاں موجود ہوتی ہیں۔ لیکن ان پر ان کے وجود میں آنے اور ان کی پشت پر جو جذبہ کار فرما تھا، اُن

کا بہت گہرا رنگ چڑھا ہوتا ہے۔ زیادہ تر جماعتوں میں پہلے تین امور کار فرما ہیں۔ کیونکہ ۱۹۶۰ء سے ۱۹۷۰ء کے درمیان منظور شدہ رضا کار جماعتیں یا تو گاندھین تھیں یا ان کی پشت پر چرچوں کا جذبہ تھا اور بائیں بازو کے گروہ تو ۱۹۷۰ء کے آغاز میں رونما ہوئے۔

رضا کار جماعتوں کی مالیہ ضرورت یہ ہے کہ جدید انتظامی امور اور محاسبہ کے نظام کو بروئے کار لائیں۔ وجہ یہ ہے کہ اب بہت سی جماعتیں

رضا کار جماعتوں کی طاقت اس میں نہیں کہ سرکار ان کی کس قدر پشت پناہی کرتی ہے یا جن کو قرضہ ملے گا وہ کس قدر ضمانت دے سکتے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ کوئی سیکورٹی ہوتی ہی نہیں۔ بلکہ ان کی طاقت اس میں ہے کہ وہ کس موثر انداز میں یہ امداد فراہم کر سکتی ہیں۔

بڑی ہو گئی ہیں۔ کم از کم ۲۰ تو ایسی ہیں جن کے کارکنوں کی تعداد سو تک ہے۔ اور جن کے ہاتھوں بہت بڑے سرمائے کا استعمال ہوتا ہے۔ ان جماعتوں کو غریبی دور کرنے اور کم سے کم ضرورت پوری کرنے کے پروگراموں

میں بھی انتخابات کی سرکاری پالیسی کے بعد تو اور بھی سرمایہ ملنے لگے گا۔ لہٰذا بہترین نظام اور محاسبہ کی ضرورت شدید ہو جاتی ہے۔

لیکن سوال یہ ہے

سرکار کی نئی پالیسی سے جس کا مقصد رضا کار جماعتوں کو زیادہ سے زیادہ حصہ دار بنانا ہے، غالباً یہ خیال پیدا ہوتا ہوگا کہ اس سے قبل ان کو ان کاموں میں کوئی خاص اہمیت نہیں دی جاتی تھی۔ ایسا نہیں تھا۔ مالی امداد کی انجمنوں کو (بینک وغیرہ) اپنے سماجی مطمح نظر کو پورا کرنے کے لیے ایسی جماعتوں سے امداد لینا ضروری تھی جو عوام میں کام کر رہی ہوں۔ اکیلی مائی راڈا MYRADA نے گذشتہ برس نے بارڈ NABARD اور ICAR (آئی سی آر) DRDA (ڈرڈا) ایجنسیوں اور کو آپریٹو سوسائٹیوں کے ساتھ مل کر ۲۵ لاکھ روپیہ فراہم کیا۔ اور یہ کوئی واحد مثال نہیں ہے۔ اس رقم میں کچھ حصہ تو قرضوں کی شکل میں ہے اور کچھ امداد کی صورت میں۔ تاہم حکومتوں کا رضا کار جماعتوں کو تسلیم کرنا دودھاری تلوار کی حیثیت رکھتا ہے۔ سوال یہ نہیں ہے کہ کتنی زیادہ یا کم جماعتیں ان پروگراموں کو چلا رہی ہیں۔ سوال یہ ہے کہ یہ پروگرام کس خوبی سے چل رہے ہیں۔ اور ان میں کس قدر سرمایہ لگ رہا ہے اور کس صحیح طریقے سے۔

رضا کار جماعتوں کو یہ ذمہ داری دینا کہ ان کی سفارشوں پر

جیسے بیج وغیرہ قرض دیں۔ یا جب ان کو سال ختم ہونے سے قبل ایک طے شدہ رقم استعمال کرنا ہوتی ہے۔ رضا کار جماعتوں کے حق میں نہیں ہے۔ رضا کار جماعتوں کی طاقت اس میں نہیں کہ ان کی سرکار کس قدر پُشت پناہی کرتی ہے یا جن کو قرضہ ملے گا وہ کس قدر ضمانت دے سکتے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ کوئی سیکیورٹی ہوتی ہی نہیں۔ بلکہ ان کی طاقت اس میں ہے کہ وہ کس موثر انداز میں یہ امداد فراہم کر سکتی ہیں۔

سرکاری امداد اور گرانٹ کا غلط استعمال ہو سکتا ہے، اگر رضا کار جماعتیں اس امر کی تسلی نہ کریں کہ جن پروجیکٹوں کے لیے رقم دی جاتی ہے۔ وہ قابلِ اعتنا اور صحیح ہیں۔ مثال کے طور پر بایو گیس Biogas پلانٹ کی منظوری دی گئی، جو بجا طور پر کم تھے، امدادی رقم طلب کی گئی لیکن کام ادھورا چھوڑ دیا گیا۔ یہ ایسے مقام ہیں، جہاں رضا کار جماعتیں اہم کردار ادا کر سکتی ہیں۔ اور اس بات کو یقینی بنا سکتی ہیں کہ امدادی رقم کسی طرح سے بدعنوانی کا منظم ذریعہ نہ بن جائے۔

فائدہ مند تعلق

سرکاری کاموں کے ساتھ تعلق پیدا کرنا ایک اور طرح سے بھی فائدہ مند ہے۔ لیبارٹری ٹیسٹ زمین تک کے لیے جو گرانٹ ملے۔ اس میں سے ایک ہزار کی رقم دو برسوں میں اس طرح استعمال کی جائے کہ پیداوار کو بڑھایا جا سکے۔ مثال کے طور پر ۵۰۰ روپے کی پہلی گرانٹ سے ایک اعلیٰ مخلوط نسل کا بیل خریدا جائے۔

(یہ بیل عام طور پر رضا کار جماعتوں کے مویشی پالنے کے پروگرام کا حصہ ہوتا ہے) رضا کار جماعت، ڈرڈا DRDA یا نابارڈ NABARD جو مویشی پالنے کے معاملے میں کئی قسم کی امداد فراہم کرتی ہیں، کی امداد حاصل کرتی ہے تاکہ غریب کسان کی مناسب خدمت ہو سکے۔ رضا کار جماعت اس دوران ویٹرنری سروسز یعنی مویشیوں کی غور و پرداخت سے متعلق خدمات

رضا کار جماعت کا اپنا تصور ہے، اور وہ اس کو پورا کرنے کے لیے خود ہی لائحہ عمل طے کرتی ہے۔ مذہب کے برعکس۔ رضا کار جماعت "عوامی تعاون" کی اپنی بائبل خود لکھتی ہے۔ اور یہ اوپر سے نافذ نہیں ہوتی بلکہ نیچے سے اوپر اثر کرتی ہے۔

غریبی دور کرنے یا کم سے کم ضرورت کے پروگراموں کو تکمیل تک پہنچانے کے ضمن میں عوامی تعاون کی اہمیت کو تسلیم تو کیا گیا ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ آیا سرکاری نظام میں اس قدر لچک، نرمی اور ایمانداری ہے، کہ وہ اس حقیقت سے پیدا شدہ نتائج کو بھی تسلیم کر لے۔

مہیا کرتی ہے، اور پیداوار کی خرید و فروخت کا انتظام بھی کرتی ہے۔ حتیٰ کہ اس قدر دودھ پیدا ہونے لگتا ہے کہ خود سرکار اس کو لانے لیجانے کا انتظام کرنے لگتی ہے۔

رضا کار جماعت کو کھیتی باڑی کے میدان سے سابقہ کر جب کام کرنا ہوتا ہے، وہ بہت محنت اور ہمت کا ہوتا ہے۔ رضا کار جماعت لوگوں کو مختلف صنعتوں کی تربیت دینے کے اہل تو ہوتی ہے۔ لیکن جہاں زیادہ دھیان دینا ضروری ہے وہ ہے ڈیزائن اور کوالٹی۔ قدیم ڈیزائن چلائے جا رہے ہیں جبکہ خود دیہات میں نیا مذاق اور نئی پسند پیدا ہو گئی ہے۔ رضا کار جماعت اگر یہ خیال کرتی ہے کہ ان کی اشیا سماجی وجوہ کی بنا پر بک جائیں گی تو یہ صحیح نہیں ہے۔ اگر دیہی کاریگروں کو مناسب ٹریننگ دی جائے، ان کی اشیا کا مناسب انتظام ہو اور صحیح مارکیٹ ملے تو یہ لوگ اس مقابلے بھرے بازار میں بھی کامیاب رہ سکتے ہیں۔ رضا کار جماعتوں کا اہم فرض یہی نہیں کہ TRYSEM ترائی سم ایسے پروگرام کو زیر عمل لائیں۔ بلکہ ان کا یہ بھی فرض ہے، جو تربیت دی جائے وہ مناسب بھی ہو اور اس کی مارکیٹ میں مانگ بھی ہو۔ تربیت کے بعد اس پر لگاتار نظر رکھنا بھی ضروری ہے۔ یہ خیال کر لینا کہ TRYSEM کے تحت جتنے لوگ تربیت پا چکے ہیں، وہ سبھی پیداواری کام میں مصروف ہو جائیں گے۔ اور اس نقطے سے ان پر نظر رکھنا ناکامی کا موجب ہوگا۔ غیر کاشت کاری میدان میں عورتوں کو فائدہ مند طور پر لگایا جا سکتا ہے۔ یہ وہ میدان ہے جس میں رضا کار جماعتیں دیہات میں سے سلیقہ شعار اور جوان لڑکیوں کو بھرتی کر سکتی ہیں۔ یہ عورتیں آگے چل کر عورتوں کی بھلائی کے پروگراموں کو موثر بنا سکتی ہیں۔ یہ خوش آہنگ بات ہے کہ اعلیٰ تعلیم کے اداروں سے نوجوان لڑکیاں نکل کر دیہاتی علاقوں میں آنے لگی ہیں۔ اور ان کے دیہاتیوں

رہ کر کام کرنے لگی ہیں۔ ان لڑکیوں کی حفاظت ہونا چاہیئے۔ تاکہ وہ ایک ٹیم کے طور پر کام کر سکیں۔ اور ایک اچھی اور موثر تنظیم ان کے ساتھ ہو۔ کیا تمام رضاکار جماعتیں اس قسم کا ماحول فراہم کر سکتی ہیں ؟

عوامی تعاون

وسائل کے موثر استعمال پر نظر رکھنے اور سرکار سے ربط و ضبط پیدا کرنے کے علاوہ رضاکار جماعتوں کی قوت اس پر انحصار رکھتی ہے کہ وہ تعلیم انتظام اور رسل و رسائل (مواصلات) کے طریقوں کو جدید بنا سکے۔ اس عمل کو "عوامی تعاون" کا نام دیا جاتا ہے۔ اور یہ ایک ایسی بات ہے۔ جسے بے حد غلط استعمال کیا جا رہا ہے۔ دوسرے الفاظ میں عوامی تعاون کے نظریے کی حقیقت کا جائزہ لیے بغیر اس پر غلط سلط زور دیا جاتا ہے۔ یہ تو صحیح ہے کہ "عوامی تعاون" سے کیا مراد ہے۔ اس کا کوئی واضح مفہوم نہیں ملتا۔ ہر رضاکار جماعت کا اپنا تصور ہے۔ اور وہ اس کو پورا کرنے کے لیے خود ہی لائحہ عمل تیار کرتی ہے۔ مذہب کے برعکس رضاکار جماعت "عوامی تعاون" کی اپنی بائبل خود لکھتی ہے اور یہ اوپر سے نافذ نہیں ہوتی بلکہ نیچے سے اوپر اخذ کرتی ہے۔ اس کا منبع اوپر سے طے شدہ حقیقت نہیں۔ بلکہ عوام جو مشورہ دیں جو سوالات اٹھائیں۔ ان کو دھیان سے سننے اور ان کو ہمدردی سے پرکھنے پر منحصر ہے۔ اس کا نقطۂ عمل اوپر سے طے نہیں ہوتا اور اگر کوئی پروگرام اوپر سے طے کیا بھی ہو تو وہ عوامی لیڈر شپ اور ان کے مشوروں سے جو سب مل کر پیش کرتے ہیں بدل جاتا ہے۔ لہٰذا نشانہ بنانے والے یا لائحہ عمل طے کرنے والے جب نیچے سے یہ پتہ لگانا چاہتے ہیں کہ کس قدر کام ہوا۔ اور کتنا رہ گیا تو وہ دراصل اپنے لیے "خوراک" چاہتے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ تمام عمل ہی الٹ گیا ہے۔ اور یہ وہ میدان ہے جہاں رضاکار جماعت۔ سرکاری اثر و نفوذ سے نکل کر ایسے ماحول میں عمل پیرا ہوتی ہے۔ جہاں سرکاری مشینری کام نہیں کر سکتی۔ غریبی دور کرنے یا کم سے کم ضرورت کے پروگراموں کو تکمیل تک پہنچانے کے ضمن میں عوامی تعاون کی اہمیت کو تسلیم تو کیا گیا ہے لیکن سوال یہ ہے کہ آیا سرکاری نظام میں اس قدر لچک نرمی اور ایمانداری ہے کہ وہ اس حقیقت سے پیدا شدہ نتائج کو بھی تسلیم کرے۔ یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ ہر ایک تجربہ دوسرے تجربے سے مختلف ہوگا۔ رضاکار جماعتوں کو عوامی تعاون کے لیے موثر قدم ہی نہیں اٹھانا ہوگا۔ بلکہ اسے سرکاری نظام کو اس مقصد کے لیے کھلا۔ لچکیلا۔ اور حساس بنانے کی ترکیب بھی سوچنا ہوگی۔ اور یہ ضد کرنا کہ سرکار جو کچھ کرتی ہے وہ غریبوں کی بھلائی کے لیے نہیں، تعمیری گفتگو کے ہر دروازے کو بند کرنے کے مترادف ہوگا۔ ہمارے نظریاتی غرور سے تو غریبوں کو ہی نقصان ہوگا۔

> یہ ضد کرنا کہ سرکار جو کچھ کرتی ہے، وہ غریبوں کی بھلائی کے لیے نہیں تعمیری گفتگو کے ہر دروازے کو بند کرنے کے مترادف ہوگا۔ ہمارے نظریاتی غرور سے تو غریبوں کو ہی نقصان ہوگا۔

بہت دور جانا ہے

کمیونٹی ڈیولپمنٹ میں عوامی تعاون کوئی نئی بات نہیں۔ قدیم دیہی زندگی کا یہ ایک اہم کردار تھا۔ تالاب کی صفائی، نالیوں کی دیکھ ریکھ، کمیونٹی کی املاک سبھی کمیونٹی کے عمل دخل میں ہوا کرتی تھی۔ جدید پلاننگ اور ڈیولپمنٹ پروجیکٹوں نے اس کمیونٹی عمل کو ختم کر کے رکھ دیا ہے۔ دیہی زندگی میں ایک دوسرے سے جو تعلق رہا کرتا تھا وہ اب ٹوٹ گیا ہے۔ بنگلور کے ارد گرد بڑے بڑے کاشتکار اب سفیدے یا یوکلپٹس کے درخت لگا رہے ہیں۔ جبکہ پہلے وہ جوار باجرہ اگایا کرتے تھے۔ نتیجہ یہ نکلا ہے کہ دیہات سے جن مزدوروں کو کام ملتا تھا وہ ختم ہو گیا ہے۔ اب اس بڑے کاشتکار کو اپنے کھیتوں سے باقاعدہ طور پر سالانہ آمدن کی ضرورت نہیں رہی کیوں کہ اس کے اور بھی وسائل ہیں۔ جب درخت بڑے ہو جائیں گے تو ٹھیکیدار آئے گا اور کرایہ کے مزدور لائے گا اور درخت کاٹ کر لے جائے گا۔ یہ تو غریب مزدور کے منہ

> گزشتہ ۶ مہینوں میں رضاکار جماعتوں سے جو توقعات پیدا ہوئی ہیں۔ اگر ان کو صحیح ثابت ہونا ہے تو رضاکار جماعتوں کو بہت دُور کا سفر طے کرنا ہے۔ عمومی طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ انھیں ایک شخص کے ارد گرد گھومنے سے احتراز کرنا ہوگا۔ چاہے وہ کتنا ہی عجوبہ کار کیوں نہ ہو۔ اس کی جگہ ساجھی اور مقامی ذمہ داری کو لینا ہوگی۔

(باقی صفحہ پر)

کرشن دیو دیوان جنرل سکریٹری، ویشالی ایریا اسمال فارمرز ایسوسی ایشن، ویشالی (بہار)۔

آپ پورے طور پر ان پر بھروسہ نہیں کر سکتے

اگرچہ ترقیاتی کاموں میں رضاکارانہ ادارے معاون ہو سکتے ہیں اور سرکاری کوششوں کو آگے بڑھا سکتے ہیں۔ لیکن مصنف کا خیال ہے کہ موجودہ حالات میں وہ ہر طرح کے دباؤ کا شکار ہیں، لہٰذا غریبی دور کرنے کے پروگراموں کو پھیلانے میں تمام تر ان پر انحصار ایک حقیقی خطرہ بن کر سامنے آسکتا ہے۔

قومی ترقیاتی کاموں میں اگر سماج باشعور اور پوری طرح خبردار ہو تو اس کے کردار کی اہمیت اور اس کے سرگرم تعاون سے کون انکار کر سکتا ہے؟ اس کے یقیناً بہت سے فائدے ہیں۔ ایسی صورت میں منصوبے عوام کی حقیقی ضرورتوں کو پورا کیے جانے کی غرض سے ہی مرتب کیے جائیں گے، اخراجات میں کفایت ہوگی، عمل درآمد مقابلتاً آسان ہوگا اور بالآخر عوام کی امنگیں اور آرزوئیں بروئے کار آسکیں گی۔ انتظامیہ کے اخراجات کم سے کم ہوجائیں گے۔ اور اس طرح جو رقم بچے گی وہ مجموعی قومی پروگرام بڑھانے میں مددگار ہوگی۔ ہندوستان ایسے ملک میں جہاں کہ آبادی زیادہ ہے، اقتصادی ترقی کا یہ طریقہ اور یہ عمل عوام کی حالت سدھارنے اور ان کا معیارِ زندگی بلند کرنے سے متعلق منصوبوں کے ضمن میں سرکار کا بوجھ کم کردے گا۔ لیکن بظاہر یہ بات کہنی آسان ہے مگر اس پر عمل درآمد دشوار ہے۔ اس طرح کی کسی بھی کوشش میں کامیابی کے لیے عوامی شعور کی بیداری ضروری ہے۔ عوام توہمات کی دنیا سے باہر نکلیں، روایتی ذہنی پابندیوں کو ترک کردیں اور نیا اندازِ نظر اپنائیں۔ اسی طرح کے شعور کی عدم موجودگی میں جیسا کہ تاریخ بتاتی ہے، جمہوری ادارے نہ تو پنپ سکتے ہیں اور نہ ہی عرصۂ دراز تک زندہ رہ سکتے ہیں۔ اگر عوام اپنی سماجی ذمہ داریوں اور مقاصد سے باخبر ہوں اور تنگ نظری اُن سے جاتی رہے تو امنِ عالم کو فروغ مل سکتا ہے۔

ہندوستان کا پس منظر

ہندوستان کی پوزیشن عجیب ہے، یہاں ایسی متحرک جمہوریت ہے، جہاں آئین کی رو سے کسی ایک فردِ واحد یا افراد کے گروہ کا حکم نہیں چلتا۔ شہری اپنی بہبود کے لیے کام کرنے میں آزاد ہیں اور وہ سماج وادی نظام کے دائرہ کار میں رہتے ہوئے اپنا ترقی سے پروگراموں کو آگے بڑھا سکتے ہیں۔

اگرچہ ہمارے آئین میں اس فرق کو دور کرنے کے لیے بہت سی دفعات رکھی گئی ہیں، لیکن ان پر عمل درآمد کے لیے ذمہ داری اسی عملے کو سونپی گئی جو کہ غیر ملکیوں کے ساتھ سازباز کرکے اس طرح کے فرق لانے کا سبب بنے تھے۔

پرانی روایتوں نے ہمیشہ ہمیں قدیم ورثہ کی یاد دلائی ہے۔ باہمی تعاون اور ایک کے مفادات کو دوسروں کی بھلائی کے لیے قربان کرنا، یہ سب

وہ قدریں ہیں جو ہمارے ساتھ رہی ہیں اور یہ ہمارے ماضی کے ورثے کی دین ہیں۔ حالاں کہ برطانوی دورِ حکومت میں ان اقدار کو زبردست دھکا پہونچا۔ مٹھی بھر غیر ملکیوں نے چند خود غرض انسانوں پر مشتمل ایک جماعت تیار کی جنھوں نے ملک کے عوام کا خون چوسا اور اپنے آقاؤں کی ہندستان پر گرفت کو مضبوط بنایا۔ اس سے سماج دو حصوں میں بٹ گیا۔ حکمراں طبقہ، غلام اور ماتحت طبقہ۔ خوشحالی، اعلیٰ تعلیم، صحتی خدمات اور دیگر بہبودی کے اقدامات ان مٹھی بھر افراد کے قبضے میں چلے گئے اور مصیبتیں، ناخواندگی، بیماری اور دیگر خامیاں اور برائیاں غریبوں کے حصے میں آئیں ——— جو کہ ان امیر آدمیوں کے استعمال کا آلہ بنے ہوئے تھے۔ ملک کی آبادی کی اکثریت انھیں غریب افراد پر مشتمل تھی۔ ان کی بہبودی اور ان کی حالت کا سدھار کسی بھی طبقۂ امرا کا پسندیدہ موضوع نہ بن سکا۔ ان کی طرف سے اس عدم توجہی نے غریبوں کو اور پیچھے دھکیل دیا اور وہ مایوسی اور پریشانیوں کا شکار ہو گئے۔ وہ حکمراں طبقے اور زمینداری کے مفادات کے تابع ہو کر رہ گئے۔ اس صورتِ حال نے ان میں امیروں کے لیے ایک تنفر کی فضا پیدا کر دی۔

زبردست فرق

غیر ملکی حکمرانوں کا اقتدار ختم ہونے تک سماج کے ان دونوں طبقوں کے درمیان فرق بہت زیادہ ہو گیا۔ طبقۂ امرا ایک تو تعلیم میں برتر تھا اور سماجی طور پر بھی اس نے اپنا مرتبہ اونچا کر رکھا تھا، چنانچہ اس نے ملک کی خدمات اپنے قابو میں کر لیں اور عدلیہ نیز قومی معیشت کے دیگر شعبوں میں اپنا اثر جما لیا۔

اگرچہ ہمارے آئین میں اس فرق کو دور کرنے کے لیے بہت سی دفعات رکھی گئی ہیں، لیکن اُن پر عمل درآمد کے لیے ذمہ داری اسی عملے کو سونپی گئی جو کہ غیر ملکیوں کے ساتھ سازباز کر کے اس طرح کے فرق لانے کا سبب بنے تھے۔ چنانچہ کچھ ہی عرصہ میں یہ ایک بھیانک مسئلہ بن گیا۔ اگرچہ لیڈروں نے اس حقیقت کو اس وقت محسوس کیا جب کہ بہت زیادہ قیمتی وقت گزر چکا تھا۔ جب پارلیمنٹ اور دیگر قانون ساز اداروں میں مخصوص مفادات نے جڑ مضبوط کر لی ہے، اس کے بعد اس مسئلے کی سنگینی کا احساس ہوا۔ اس سے قومی قیادت کو تشویش لاحق ہو گئی۔ چنانچہ اصلاحات اراضی کے بہت سے قوانین، شیڈولڈ کاسٹ کی بھلائی کے بہت سے پروگرام، شیڈولڈ ٹرائب کے بہت سے پروگرام، پسماندہ طبقات اور غریبوں کی بہبود کے بہت سے اقدامات وضع کیے گئے اور انھیں عملی جامہ پہنانے کی کوشش کی گئی، لیکن افسوس ماہرین پارلیمان اور قانون سازی کے ماہرین، عدلیہ کے وہ افسر جن پر پروگراموں کی عمل درآمد کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے، اور ایڈمنسٹریٹر نیز طبقۂ امرا اور بڑے بڑے زمینداروں نے اس سلسلے کے اصلاحی اقدامات سے نہ صرف آنا کانی کی بلکہ ان پر عمل درآمد کی راہ میں رکاوٹ بنے۔ ایسی صورت میں غریب اپنی اصلاح و بہتری کے لیے کیسے امید کر سکتا تھا۔

قومی قیادت نے جب صورتِ حال کا جائزہ لیا، تو وہ یہ دیکھ کر مبہوت اور پریشان ہو گئی کہ زیرِ عمل اقدامات کو عملی جامہ نہیں پہنایا جا سکا ہے۔ یہی نہیں ان پر عمل درآمد میں رکاوٹ ڈالی گئی ہے، لہٰذا وہ سماج کی حالت بدلنے میں ناکام رہی ہے۔ جب یہ افسوسناک صورتِ حال پالیسی سازوں پر منکشف ہوئی تو انھوں نے مختلف بہبودی پروگراموں کو تشکیل دینے اور ان پر عمل درآمد کے لیے کوششیں شروع کیں۔ مثلاً پنجسالہ پلان، بیس

آج بھی قانون ساز اداروں، سماجی بہبود کی خدمات اور حتیٰ کہ عدلیہ تک پر عوام کے چند طبقوں کا اثر ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تعلیمی ادارے، یونیورسٹیاں، میڈیکل کالج، اور دیگر ترقیاتی تنظیمیں صرف ان لوگوں کے لیے ہیں جن کے پاس دولت ہے، اقتدار ہے۔

قومی ملکیت کے بینکوں کے فائدے صرف ان لوگوں کو میسر ہیں جو کہ پہلے ہی امیر ہیں۔ ایسے ترقیاتی پروگرام جن کا اصل منشا غریبوں کو فائدہ پہنچانا ہے، عمل درآمد سے محروم ہیں جس سے سیاسی اور سماجی لیڈر پریشان ہیں۔ افسران اور غیر سرکاری عمال پریشان اور سراسیمہ ہیں۔ لیکن کیا اس کے اسباب و علل کسی طرح کے تبصرے کے محتاج ہیں۔

سماجی پروگرام وغیرہ وغیرہ۔

ایمانداری کی بات یہ ہے کہ صورتِ حال میں بہت زیادہ تبدیلی نہیں آئی ہے حالانکہ آزادی حاصل ہوئے تقریباً ۴۰ برس ہونے کو آئے ہیں۔ آج بھی قانون ساز اداروں، سماجی بہبود کی خدمات اور حتیٰ کہ عدلیہ تک پر عوام کے چند طبقوں کا اثر ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تعلیمی ادارے، یونیورسٹیاں، میڈیکل کالج، اور دیگر ترقیاتی تنظیمیں صرف ان لوگوں کے لیے ہیں جن کے پاس، دولت ہے، اقتدار ہے پنجسالہ منصوبوں نے بھی خاطر خواہ ترقی نہیں کی ہے۔ ملک کی آبادی کا کثیر طبقہ ہمت ہار بیٹھا ہے، اور اس کے چہرے سے کمزوری کے آثار نمایاں ہیں۔ قومی ملکیت کے بینکوں کے فائدے صرف ان لوگوں کو میسر ہیں، جو کہ پہلے ہی امیر ہیں۔ ایسے ترقیاتی پروگرام جن کا اصل منشا غریبوں کو فائدہ پہنچانا ہے، عمل درآمد سے محروم ہیں جس سے سیاسی اور سماجی لیڈر پریشان ہیں۔ افسران اور غیر سرکاری عمال پریشان اور سراسیمہ ہیں۔ لیکن کیا اس کے اسباب و علل کسی طرح کے تبصرے کے محتاج ہیں۔ سچ بات یہ ہے کہ اس کے ذمہ دار وہ لوگ ہیں جو یا تو موجودہ سماجی اور اقتصادی نظام میں موجودہ نابرابریوں سے ناواقف ہیں یا پھر وہ حقائق کا مقابلہ کرنے کی جرأت نہیں رکھتے۔ غالباً اسی تاثر کے زیرِ اثر قومی قیادت نے رضاکارانہ تنظیموں کو ترقیاتی کاموں کے عظیم کام میں جوڑنے کی کوشش کی۔ اس خیال کے تحت منصوبہ بندی کمیشن نے ان کو چھٹے اور ساتویں منصوبے میں بڑی ذمہ داریاں سونپیں۔

> افسوس کی بات ہے کہ ترقیاتی عملے کے بہت سے ارکان، جن میں سرکاری اور غیر سرکاری دونوں ہی شامل ہیں، خود فائدہ بٹورنے میں مشغول ہیں اور وہ اقتدار کو اپنے ہاتھوں سمیٹنے میں مصروف ہیں۔ ان کے پاس غریبوں کی بھلائی کے لیے سوچنے اور کام کرنے کا وقت نہیں۔

رضاکارانہ تنظیمیں کیا کر سکتی ہیں؟

اگر جمہوری نظام کے اندر رہتے ہوئے ہم غریبوں کے حالات سدھارنے کے لیے کوششوں کو عزیز رکھتے ہیں، تو ہمیں از خود رضاکارانہ تنظیموں کو تشکیل دینا ہوگا اور مسلسل ترقی کی حکمتِ عملی وضع کرنی ہوگی۔ اس سلسلے میں سرکاری اور غیر سرکاری دونوں طرح کے اداروں کی معاونت لینی ہوگی۔ افسوس کی بات ہے تو یہ کہ ترقیاتی عملے کے بہت سے ارکان، جن میں سرکاری اور غیر سرکاری دونوں ہی شامل ہیں۔ خود فائدہ بٹورنے میں مشغول ہیں اور وہ اقتدار اور طاقت کو اپنے ہاتھوں سمیٹنے میں مصروف ہیں۔ ان کے پاس غریبوں کی بھلائی کے لیے سوچنے اور کام کرنے کا وقت نہیں۔ اپنے مفادات کو برقرار رکھنے اور انھیں ہر طرح کی ضرب سے محفوظ رکھنے کے لیے وہ ان لوگوں کو تکلیف پہنچانے اور ان کا گلا گھونٹنے سے بھی گریز نہیں کرتے جو ایمانداری کے ساتھ کام کرنا چاہتے ہیں۔ بہت سے لیڈر آئے دن ایسے طریقوں سے اور جائز اور ناجائز طور پر اقتدار کو اپنے ہاتھ میں لے لینے کے لیے حربے استعمال کیا کرتے ہیں۔ جبکہ غریب افراد اپنے خون پسینے کی کمائی سے پیٹ پالتے ہیں اور اس کے لیے ایڑیاں رگڑتے ہیں۔ ایسی صورت میں صرف ایک ہی امید باقی رہ جاتی ہے اور وہ ہے رضاکارانہ تنظیموں کی خدمات۔

ماضی کا تجربہ بتاتا ہے کہ رضاکارانہ تنظیمیں ترقیاتی نظام کا ہاتھ بٹا سکتی ہیں اور یہ ایک قابلِ تعریف طریقہ ہے۔ البتہ یہ تنظیمیں اس وقت تک اپنے مقاصد میں کامیاب نہیں ہو سکتیں جب تک کہ عوام میں بحیثیت مجموعی سماجی بیداری نہ ہو اور وہ اپنی حالت کے بدلنے پر خود کو تیار نہ کر لیں۔ اس وقت ملک میں ہزاروں رضاکارانہ ادارے کام کر رہے ہیں۔ ان کو موٹے طور پر دو زمروں میں بانٹ سکتے ہیں۔ ایک زمرہ وہ جن میں سماجی طور پر جوشیلے افراد، گروپ بنا کر کام کرتے ہیں اور ان کے کام کا دائرہ دیہات اور چھوٹی چھوٹی بستیوں تک پھیلا ہوا ہے۔ ان کی تعلیم اچھی ہے، ان کو سب طرح کی سہولتیں ہیں، حالانکہ وہ ایسے لوگوں میں کام کرتے ہیں۔ جو زیادہ تر ناخواندہ ہیں۔ ان پڑھ ہیں اور کم ترقی یافتہ ہیں۔ دوسری طرح کی رضاکارانہ تنظیمیں وہ ہیں جو عوام کو ترقیاتی پروگراموں کو وضع کرنے اور خود اپنے

> یہ تنظیمیں اس وقت تک اپنے مقاصد میں کامیاب نہیں ہو سکتیں جب تک کہ عوام میں بحیثیت مجموعی سماجی بیداری نہ ہو اور وہ اپنی حالت کے بدلنے پر خود کو تیار نہ کر لیں۔

ترقیاتی پروگراموں کو آگے بڑھانے میں مدد دیتی ہیں۔ موجودہ رضاکارانہ تنظیمیں زیادہ تر پہلے زمرے میں آتی ہیں۔ درحقیقت ان کے کام کی صورت وہی ہے جیسا کہ غیر سرکاری محکمہ جاتی نظام کی۔ ان کے اور سرکاری محکموں کے کام کے طریقوں میں بہت زیادہ فرق نہیں ہے۔ لیکن ان میں زیادہ تر تنظیمیں فرقہ وارانہ، سیاسی اور کسی حد تک استحصال

پسندی والے دباؤ کا شکار ہیں۔ اس طرح سے وہ مقاصد جن کی تکمیل کے لیے وہ بنی ہیں، بڑی حد تک

فوت ہو جاتے ہیں۔

ملک کو آج درحقیقت کس چیز کی ضرورت ہے، وہ دراصل ایسی رضاکارانہ تنظیموں کا طلبگار ہے جو کسی طرح کے دباؤ کا شکار نہ ہوں البتہ ان کی تعداد بہت کم ہے۔ اس کے سبب کا پتہ چلانا دشوار نہیں۔

حقیقی خطرہ

سچی بات یہ ہے کہ اگر ہم فی الواقعی ان لوگوں کے لیے کچھ کرنا چاہتے ہیں جو زندگی کی آسائشوں سے محروم ہیں، تو عوام کو منظم کرنا ہے۔ یہاں ایک بات کا لحاظ رکھنا بہت ضروری ہے اور وہ یہ کہ اگر رضاکار تنظیمیں اپنی سرگرمیوں کو اپنا اور پچھڑے طبقات تک ہی محدود رکھیں گی تو سماج میں عدم توازن پیدا ہو جائے گا۔

باقی جو لوگ رہ گئے ہیں ان کے بارے میں کیا ہو گا؟ سچی بات یہ ہے کہ مقامی انتظامیہ ہمیشہ ان کی طرفداری کرتا ہے جو رضاکار اداروں کے دائرہ کار سے باہر رہتے ہیں۔ اس کے برعکس اگر ہمارے یہاں ایسے رضاکار ادارے ہوں جو سماج کے سبھی طبقات کو اپنے دائرہ کار میں لے لیں تو پچھڑوں کی بہبود پر توجہ ہٹ جاتی ہے۔ محروم افراد کو از خود سوچنے اور کام کرنے کا موقع نہیں مل پاتا۔ جلد یا بدیر رضاکار تنظیمیں غیر موثر ہو جاتی ہیں اور ان

کا کوئی مقصد باقی نہیں رہ جاتا۔

درحقیقت رضاکار اداروں کی طرف سے شروع کیے گئے بہت سے ترقیاتی پروگرام اپنے حقیقی مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکے ہیں۔ آج کے دور میں یہ بات صادق آتی ہے کہ سرکار کی طرف سے وضع کردہ پروگراموں پر عمل درآمد کے لیے تمام تر رضاکار ایجنسیوں پر انحصار ایک حقیقی خطرہ بن کر سامنے آسکتا ہے۔ اگر سرکار کا ترقیاتی پروگراموں سے وابستہ نظام اپنے مقاصد کو بروئے کار نہیں لاسکا ہے اور رضاکار تنظیمیں بھی غریب کو سماجی انصاف دلانے میں

ناکام رہی ہیں تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر کیا کیا جائے۔

قابلِ عمل حل

موجودہ صورت حال میں کوئی بھی علاقائی رضاکار ایجنسی اس وقت تک کامیابی کی امید نہیں کر سکتی جب تک کہ یہ پچھڑے طبقات کو اپنے دائرہ کار میں نہ لے لے اور شیڈولڈ کاسٹ اور شیڈولڈ ٹرائب اور سماج کے دیگر طبقات کو بھی اپنے پروگراموں سے مستفید ہونے کا موقع نہ دے۔ کام کو آسان اور قابلِ عمل بنانے کی غرض سے ذیلی کمیٹیاں یا سیل قائم کر دیئے جائیں۔ یہ سیل قطعات اراضی، آمدنی، تعلیم، تعمیر مکانات وغیرہ کی بنیاد پر قائم کیے جا سکتے ہیں۔ ان ذیلی کمیٹیوں اور سیلوں کو اپنے منصوبے اور پروگراموں پر عمل درآمد کی آزادی ہونی چاہیے۔ اعلیٰ ترین سطح پر یہ ورکنگ گروپ ایک ساتھ بیٹھیں گے۔ اور اپنے دائرہ کار میں آنے والے پروگراموں کی رفتار ترقی کا جائزہ لیں گے۔ ایک اور حقیقت جو کہ ہمیں ذہن نشین رکھنی ہے وہ یہ کہ جہاں تک غریبوں کے ساتھ انصاف کا تعلق ہے، اس سلسلے میں آج کے سیاسی او

ملک کو آج درحقیقت کس چیز کی ضرورت ہے، وہ دراصل ایسی رضاکارانہ تنظیموں کا طلبگار ہے جو کسی طرح کے دباؤ کا شکار نہ ہوں، البتہ ان کی تعداد بہت کم ہے۔ اس کے سبب کا پتہ چلانا دشوار ہے۔

اگر سرکار کا ترقیاتی پروگراموں سے وابستہ نظام اپنے مقاصد کو بروئے کار نہیں لاسکا ہے اور رضاکار تنظیمیں بھی غریب کو سماجی انصاف دلانے میں ناکام رہی ہیں تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر کیا جائے۔

اقتصادی حالات کے پیش نظر مقامی آبادی کا تعاون اور شرکت مقامی انتظامیہ سے زیادہ موثر ثابت ہوگا۔

یہاں چند منتخبہ دیہات میں اس کا تجربہ کیا جا رہا ہے اور ترقیات کے لیے عوامی تعاون جو کہ دیہی ترقی کی وزارت کا شعبہ ہے کامیابی سے اپنے فرائض انجام دے رہا ہے۔ یہاں دیہی عوام کو ایک سماج میں منظم کر لیا گیا ہے۔ اور سوسائٹیز ایکٹ کے تحت اسے رجسٹر کر لیا گیا ہے۔ اس تمام پروگرام کے مختلف پہلوؤں کی دیکھ بھال کے لیے الگ سے ایگزیکیٹو کمیٹیاں تشکیل دی گئی ہیں۔ کمیٹیوں کے ممبر صرف وہ ہوسکتے ہیں جو متعلقہ پراجیکٹ سے وابستہ ہوتے ہیں۔ یہ ترقیاتی پراجیکٹ قومی ملکیت کے بینکوں کے تعاون سے زیر عمل لائے جاتے ہیں، حالانکہ یہ پراجیکٹ اپنا کام خود بھی چلا سکتے ہیں۔

اس حل میں، اگرچہ یہ کافی حد تک قابل عمل ہے، بہت سی دشواریاں بھی ہیں۔ غریبوں کی ترقی کی راہ میں سماج دشمن عناصر حارج ہوتے ہیں اور با اثر اور صاحب اقتدار لوگ اس کام میں روڑا اٹکاتے ہیں۔ درحقیقت ان عناصر کو اقتدار کی بجائے سرپرستی حاصل ہو رہی ہے۔ ایک اور رکاوٹ یہ ہے کہ اس طرح کے لوگ بالعموم بینکوں کا قرضہ نہیں لوٹاتے، حالاں کہ وہ اسے لوٹا سکتے ہیں۔ ان کی مقامی انتظامیہ سے ساز باز ہوتی ہے اور وہ ان قرضوں کی بعض ادائیگی کو التوا میں ڈالتے رہتے ہیں۔ اس سے ان لوگوں کی ہمت ٹوٹتی ہے جو منظم قسم کے افراد ہیں اور جو اپنا قرضہ پابندی سے لوٹا دیتے ہیں۔ اس طرح کی کچھ خامیوں کو چھوڑ کر یہ ادارے کامیاب ثابت ہوتے ہیں۔

کسی بھی ترقیاتی پراجیکٹ کو کامیابی سے چلانے کے لیے ایسے کارکنوں کی ضرورت ہے، جو لوگوں کو منظم کرسکیں اور مقامی قیادت کو ان پروگراموں پر عمل درآمد میں شریک کرسکیں۔ میرے مشورے کا یہی بنیادی ماحصل ہے۔ میرے نزدیک فعال اور پرجوش کارکنوں کی رضاکار اداروں کے مقابلے کہیں زیادہ ضرورت ہے۔ جیسا کہ ابتدا میں کہا گیا ہے کہ دیہی عوام موجودہ سبھی صورت حالات سے قطعی غیر مطمئن ہیں۔ انھیں ابھی تک اس بات کا یقین نہیں ہے کہ موجودہ انتظامی ڈھانچہ یا اقتصادی طور پر خوشحال ان کے بھائی ان غریب لوگوں کی بہبود سے کوئی دلچسپی یا ہمدردی رکھتے ہیں۔ اس طرح کے غیر مطمئن عوام کو منظم کرنے کی ضرورت ہے۔ ان میں خود اعتمادی پیدا کرانی ہے اور باہمی تعاون سے کام کرنے کے جذبے کو ابھارنا ہے۔

ترقیاتی پروگراموں کو آگے بڑھانے کے لیے درکار پرجوش رضاکار کارکنوں کی تلاش میں ہمیں آگے بڑھنا ہے اور ان کے لیے معقول حد تک معیار زندگی کو کسی نہ کسی طرح یقینی بنانا ہے۔ حالاں کہ ہندوستان میں عرصہ دراز تک غیر ملکی راج رہا ہے لیکن اس کے باوجود ہندوستانی ثقافت نے اپنے عوام پر سے اپنا اثر زائل نہیں ہونے دیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم رسمی اور انتظامی طریقوں کا سہارا لے کر رضاکار کارکنوں کی تلاش کر رہے ہیں، حالانکہ جوشیلے رضاکار کارکنوں کی تلاش کے لیے ذاتی مراسم نیز ترغیب و تحریص کے عمل سے کام لینا ہوگا۔

> کسی بھی ترقیاتی پراجیکٹ کو کامیاب بنانے کے لیے ایسے کارکنوں کی ضرورت ہے جو لوگوں کو منظم کرسکیں اور مقامی قیادت کو ان پروگراموں پر عمل درآمد میں شریک کرسکیں۔

> ایک اور حقیقت جو کہ ہمیں ذہن میں رکھنی چاہیے یہ ہے کہ جہاں تک غریبوں کے ساتھ انصاف کا تعلق ہے اس سلسلے میں آج کے سیاسی اور اقتصادی حالات کے پیش نظر مقامی آبادی کا تعاون اور شرکت مقامی انتظامیہ سے زیادہ موثر ثابت ہوگا۔

کچھ مشورے

ترقیاتی منصوبوں پر عمل درآمد میں رضاکار تنظیموں کی اہمیت کو سمجھنا اور اسے واجب مقام دینا ضروری ہے۔ سرکار کو صرف ایسی رضاکار تنظیموں کو تسلیم کرنا چاہیے جن کے عہدیداران ارکان اور مجلس انتظامیہ کے ارکان، ترقیاتی کاموں اور ان پر عمل درآمد میں عملی طور پر حصہ لے رہے ہیں۔ رضاکارانہ تنظیمیں اپنے کردار کے لحاظ

(باقی صفحہ پر)

نتیش ڈے ڈائرکٹر، پنجاب اسٹیٹ انسٹی ٹیوٹ آف پبلک ایڈمنسٹریشن، چنڈی گڑھ۔

رضاکار تنظیمیں بھی خلا کو پورا کرتی ہیں

> فامینل مہتہ نے منصوبہ بندی کے لیے توسیع پسندانہ انداز نظر کی حمایت کی ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ مختلف ادارہ جاتی نظام سماج کی مختلف اور گوناگوں ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے ضروری ہے۔ سماج کی ضرورتیں اور اس کے مطالبات کئی لحاظ سے پیچیدہ ہیں۔ ان ضرورتوں کو پورا کرنے میں رضاکار اداروں کا رول یقیناً اہم ہے۔ ان اداروں نے سماجی خدمت کا جو ریکارڈ قائم کیا ہے اس کے پیش نظر ترقیاتی عمل میں ان کی اہمیت و ضرورت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

ہندوستان میں ترقیاتی پروگرام کی جہتیں اس قدر وسیع ہیں کہ ملک میں ترقیاتی عمل کو برابر آگے بڑھانے کی ضرورت ہی محسوس کی جا سکتی ہے۔ اس سلسلے میں ملک کے پچھڑے پن کو دور کرنے میں ترقیاتی ہنگاموں کی کمی کسی طور جائز نہیں ہو سکتی۔ ممکن ہے کہ ترقیاتی عمل کو مختصر کرنے یا اسے گھٹانے کی منطق کو کاغذ پر جائز قرار دیا جا سکے لیکن ایسا کرنے سے ترقیاتی پروگرام کو آگے بڑھانے اور ملک سے پچھڑے پن کو دور کرنے میں مدد نہ ملے گی۔ اب اس حقیقت کو تسلیم کر لیا گیا ہے کہ منصوبہ بندی کے لیے توسیع پسندانہ انداز نظر کی ضرورت ہے۔ اس سلسلے میں بہت سے ایسے انداز نظر اور فلسفے اور بہت سی حکمت عملیاں بیک وقت اپنائی جا سکتی ہیں، جن کو سطحی انداز سے دیکھنے سے عبوری اقدامات، یا غیر متوازن اقدامات اور ایک دوسرے سے لگا نہ کھانے والے اقدامات کہا جا سکتا ہے۔ اس طرح کے انداز نظر کے لیے کوئی نہ کوئی بنیاد بھی ہو سکتی ہے۔ ان خدشات کے باوجود اس سلسلے میں مختلف حکمت عملیوں کو اپنانے کی بنیاد یہ ہے کہ ہمارے سماج سے متعلق حقائق پیچیدہ ہیں اور ان کی جہتیں مختلف ہیں یعنی سماجی، سیاسی، اقتصادی اور ثقافتی۔ چنانچہ ان مختلف جہتوں سے نمٹنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ مختلف ادارہ جاتی نظام وضع کیے جائیں۔ اس کو یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ اشیاء ضروری کی مختلف اقسام کی تکمیل کے لیے ضروری ہے کہ اس تنوع کو پورا کرنے کے لیے گوناگوں ردعمل کو سامنے رکھا جائے۔

غلط تقسیم

منصوبہ بندی کی تشکیل کے عمل اور اس کو بروئے کار لانے کے عمل کے درمیان جو حد فاصل قائم کی جاتی ہے یا اس طرح منصوبہ بندی کو جو خانوں میں تقسیم کیا جاتا ہے، وہ ایک فضول اور [illegible] کی تقسیم ہے۔ جب ترقیاتی عمل میں حصہ لینے [illegible] نہیں، اس وقت ہمارا رویہ ایک خاص ذہنی ساخت کے تابع ہوتا ہے اور اس ذہنی ساخت کے زیر اثر مختلف کارکنوں اور مختلف ادارو[illegible] کو سمجھنے کے لیے [illegible] کی مختلف انداز سے تقسیم ذہنوں میں ہوتی ہے اس کے ساتھ ہی بہت سے حوالے سے واسطہ پڑتا ہے۔ مثلاً کام میں تاخیر، اختلافات، کاغذ

> ممکن ہے کہ ترقیاتی عمل کو مختصر کرنے یا اسے گھٹانے کی منطق کو کاغذ پر جائز قرار دیا جا سکے لیکن ایسا کرنے سے ترقیاتی پروگرام کو آگے بڑھانے اور ملک سے پچھڑے پن کو دور کرنے میں مدد نہ ملے گی۔

کی ہیر پھیر، تال میل۔ ان کے مطالعے سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ منصوبہ بندی ٹھیک ٹھیک ہے مگر عمل درآمد غلط ہے۔ اس کے موثر نتائج حاصل کرنے کے لیے دونوں میں تال میل کی ضرورت واضح کی جاتی ہے اور ان دونوں کو اس طرح خلط ملط کر دیا جاتا ہے کہ فکر و عمل میں امتیاز کرنا دشوار ہو جاتا ہے۔ اس پس منظر میں رضاکارانہ اداروں کے رول کا مطالعہ ضروری ہے۔

کس سے پوچھا جائے؟

یہ مان لینے کے بعد کہ ملک میں مختلف رضاکارانہ ادارے مختلف ذمہ داریاں سنبھالے ہوئے ہیں، اور مختلف پروگراموں کو بروئے کار لا رہے ہیں، ہم اپنے مطالعہ کو صرف ان اداروں تک محدود کر لیتے ہیں، جو درج ذیل خصوصیات کے حامل ہیں۔

۱۔ ایسے ادارے جن کی رکنیت نچلی سطح تک محدود ہو اور جو دیہی اور شہری آبادی پر محیط ہو۔

> **جب ہم ترقیاتی عمل میں حصہ لیتے ہیں، اس وقت ہمارا رویہ ایک خاص ذہنی ساخت کے تابع ہوتا ہے اور اس ذہنی ساخت کے زیر اثر مختلف کارکنوں اور مختلف اداروں کو سونپے گئے کام کی مختلف انداز سے تقسیم ذہن میں ہوتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی بہت سے عوام سے واسطہ پڑتا ہے۔**

۲۔ بیرونی ادارے کی قیادت میں چلنے والے رضاکار ادارے، یہ اور بات ہے کہ اب وہ بیرونی افراد، اندرونی افراد، کا مرتبہ حاصل کر چکے ہیں۔ یہ کوئی ضروری شرط نہیں ہے۔ البتہ مختلف کامیاب رضاکارانہ اداروں کے معاملے میں ایسا ہی دیکھنے میں آیا ہے، بنکر رائے، انل سدگوپال، ایلا بھٹ ہندوستان میں اور ظفراللہ چودھری بنگلہ دیش میں اس سلسلے کی چند مثالیں ہیں۔ البتہ جھارکھنڈ مکتی مورچہ کے شیبو سورین شروع ہی سے اندرونی فرد کا مرتبہ لیے ہوئے ہیں۔

۳۔ وہ رضاکارانہ ادارے جن کے سامنے مقصد یہ ہو کہ مختلف ترقیاتی پروگراموں سے سماج کے کمزور طبقوں کو فائدہ پہنچے۔ ان اداروں کے سامنے مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ غریب عوام کو غریبی کی دلدل سے کم سے کم اتنا ضرور اوپر اٹھا دیں جس سے کہ وہ عام انسانوں کی طرح زندگی بسر کرنے لگیں۔ اور معاشیات کی زبان میں ان کا شمار حاشیائی آبادی سے اوپر کی سطح والی آبادی میں ہونے لگے۔

۴۔ ایسے رضاکارانہ ادارے جو اپنے آپ کو خود مکتفی بنانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اور جو انفرادی اور اجتماعی طور پر دوسروں پر انحصار کو کم کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں ایسے رضاکارانہ اداروں کو خود کفیل کارپوریشنوں میں بدلنے کی کوشش کرنی ہوگی، تاکہ ان کا سماجی اور اقتصادی مرتبہ معقول حد تک خود مختارانہ ہو۔ اس کے بعد انہیں کم استحقاق یافتہ لوگوں کی خدمت کرنی ہے۔ ایسے اداروں کو سماجی اور اقتصادی حالت بہتر بنانے کے لیے متحرک رہنا ہے۔

> **اشیا کی تیاری میں لاگت کو کم سے کم کرنے کی کوشش اور مقررہ نشانوں کے مطابق مطلوبہ طبقات کو فائدہ پہنچانے کی غرض سے خدمات درکار ہیں، وہ سرکار کی عام ذیلی میدانی ایجنسیاں مہیا نہیں کر سکتیں۔**

۵۔ وہ رضاکارانہ ادارے جن کا تنظیمی ڈھانچہ ایسا ہو کہ قیادت اور ارکان کے درمیان کا فاصلہ کم سے کم ہو۔ اور فیصلے کرنے کے عمل میں ان اداروں کا ایسا جمہوری کردار ہو کہ نچلی سطح کے افراد بھی اس میں شریک ہوتے ہوں۔ جو بھی فیصلہ یا عہد کیا جائے وہ زیادہ سے زیادہ ارکان کی مرضی اور شرکت کی مدد سے ہو۔ منصوبہ بندی اور اس پر عمل درآمد کو وہ قریب سے قریب تر لانے کے لیے کوشاں ہوں۔

۶۔ ایسے رضاکارانہ ادارے جن کی داخلی ترقی، ان کے مقاصد سے ہم آہنگ ہو۔ اس میں شامل ارکان اپنے ساتھیوں اور ماحول سے عملی سبق حاصل کرنے والے ہوں۔ اس عمل سے وہ تکنیکی سروس والے اداروں کے مشابہ ہو جائیں گے۔ یہ ادارے اپنے سامنے ایسے عظیم مقاصد اور مہمات رکھیں جو علم اور ہنرمندی کی مدد سے حاصل ہو سکیں۔ ان کا مقصد عوام الناس کی خدمت کرنا ہے۔

یہ چند ایسے آئٹم ہیں جو ہمارے خیال میں رضاکارانہ اداروں کے دائرہ کار میں شامل ہونے چاہئیں۔ کہا جا سکتا ہے کہ ملک میں اتنے

بہت سے رضاکارانہ ادارے نہیں ہو سکتے۔ کچھ
ریاستوں کی صورتِ حال دوسروں کے مقابلے بہتر
ہو سکتی ہے۔ لہٰذا منصوبہ بندی کی حکمتِ عملی
اگر رضاکارانہ اداروں کی اہمیت تسلیم کر لیتی ہے

ہے کہ ایسے غیر سرکاری رضاکار ادارے جو حاشیائی
طبقات کی بہبود کے لیے کام کرنے کے اہل ہوں،
انھیں حرکت میں لایا جائے اور ترقیاتی پروگراموں
میں انھیں شریک کیا جا سکے، حقیقت یہ ہے
کہ ان اداروں کو حرکت میں لانے کا ایک

کو متحرک بنایا ہے۔ اور اس کے سبب ترقیاتی
اسکیموں سے ملک کے غریب طبقوں نے فائدہ
اٹھایا ہے۔

یہ کیسے ہو؟

منصوبہ بندی اور اس پر عمل در آمد
کے درمیان روایتی تنازعات پر قابو پانے
کے لیے جب کبھی کہ
معیاری اور بندھے ٹکے
جوابات اکثر پیش کر دیے
جاتے ہیں۔ غیر سرکاری
رضاکار اداروں کی حمایت
کرنی ہوگی۔ ان کے سبب

حقیقت یہ ہے کہ ان اداروں کو حرکت میں لانے کا ایک بڑا فائدہ یہ ہے کہ وہ حاشیائی طبقات کو منظم کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں اور اس طرح کے لوگوں کی تعداد لاکھوں تک ہوتی ہے۔

تو کیا یہ موجودہ
صورتِ حال
ایسی نہ ہو گی جہاں
ایک دوسرے کے
درمیان فرق
نمایاں ہو۔

ترقیاتی اسکیمیں کوئی خیراتی کام نہیں ہے، یہ تو غریب طبقوں کا وہ حق ہے جس کے لیے انکار نہیں کیا جا سکتا، رضاکار ادارے عوامی تنظیمیں ہیں جو کہ جمہوری ڈھانچے میں پوری طرح موزوں ہیں اور جن کے ذریعے ترقیاتی عمل تیزی سے آگے بڑھایا جا سکتا ہے۔

آج ملک میں جو صورتِ حالات ہے اس
کے پیشِ نظر یہ خدشہ بعید از قیاس نہیں کہا
جا سکتا۔ اس کے ساتھ ہی ہمیں یہ بھی تسلیم کرنا
پڑے گا کہ جہاں کہیں صحیح قسم کے رضاکارانہ ادارے
موجود ہیں اور جن کی عوام الناس کی خدمت کا
ریکارڈ شاندار رہا ہے تو ترقیاتی پروگراموں میں
ان کی خدمات سے انکار ممکن نہیں۔ بہیوا نام کے
ادارے نے احمد آباد
میں جو کام کیا ہے
وہ ایک سرکاری
ادارہ بھی نہ کر سکا
ہوتا۔ مغربی بنگال
میں سندربن میں
۲۷ دیہات میں
ٹیگور سوسائٹی کا
شاندار کام، بیورد

ترقیاتی پروگراموں کو عملی
جامہ پہنانے والے اپنا
کام آگے بڑھا سکیں گے۔
اور ان کا کام محض نگرانی
تک محدود نہ رہ کر اسے
کامیابی سے آگے بڑھانا
ہوگا۔ اس کام سے وابستہ
افراد سرکار کی طرف سے
اشیا کی تقسیم کے لیے مرتب

ترقیاتی کاموں سے وابستہ افراد اور رضاکار اداروں کے درمیان فرق دور ہو سکے گا۔ اس کے سبب سیاسی دلالوں کے رول کو بے اثر بنایا جا سکے گا۔ ان کا کام یہ ہے کہ وہ سرکاری اداروں اور ممکنہ فائدہ اٹھانے والوں کے درمیان بچولیوں کا کردار ادا کریں جس سے انھیں مالی نفع ہو اور سیاسی اقتدار حاصل ہو۔

کردہ نظام کو موثر ڈھنگ سے برت سکیں گے کار لا
سکیں گے۔ ترقیاتی کاموں سے وابستہ افراد
شاورتی خدمات بھی انجام دے سکیں گے۔
اس طرح ترقیاتی کاموں سے وابستہ افراد اور
رضاکار اداروں کے درمیان کے فرق ختم ہو
سکے گا۔ اس کے سبب سیاسی دلالوں کے

بڑا فائدہ یہ ہے کہ وہ حاشیائی طبقات کو
منظم کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں، اور اس
طرح کے لوگوں کی تعداد لاکھوں تک پہونچتی
ہے۔ دنیا کے مختلف حصوں سے اس محاذ پر
کامیابی کی متعدد مثالیں ہمارے سامنے ہیں
جہاں بنیادی سطح پر کام کرنے والے رضاکار
اداروں نے سماج کے غریب ترین طبقات

کر لیں نہ وہ کسی بھی سرکاری ادارے کی خدمات
سے زیادہ شاندار رہے۔ اشیا کی تیاری میں
لاگت کو کم سے کم کرنے کی کوشش اور مقررہ قانون
کے مطابق مطلوبہ طبقات کو فائدہ پہنچانے کی
کی غرض سے جو خدمات درکار ہیں، وہ سرکار
کی عام ذیلی میدانی ایجنسیاں مہیا نہیں کر
سکتیں۔ اس کے مختلف اسباب ہیں جن پر
یہاں بحث نہیں کی جا سکتی۔ لہٰذا ہمارا مشورہ

یکم تا ۱۵ نومبر ۱۹۸۲

یوجنا خصوصی شمارہ نئی دہلی

روں کو بہتر بنایا جا سکے گا۔ ان کا کام یہ ہے
کہ وہ سرکاری اداروں اور ممکنہ یا فائدہ

یہ ترقیاتی امداد کے معاملے میں ایک کھلے
نظام کو بروئے کار لا سکیں۔
ہندوستان میں ایسا تجربہ ہے کہ سرگرم
رضاکار ادارے

اسکیمیں کوئی خیراتی کام نہیں ہے۔ یہ تو غریب
طبقوں کا وہ حق ہے جس کے لیے انکار نہیں کیا
جا سکتا۔ رضاکار

رضاکارانہ اداروں کا تنظیمی ڈھانچہ ایسا ہو کہ قیادت اور ارکان کے درمیان فاصلہ کم سے کم ہو اور فیصلہ کرنے کے عمل میں ان اداروں کا جمہوری کردار ہو نیز نچلی سطح کے ارکان اس میں شریک ہوں، جو بھی فیصلہ کیا جائے، وہ زیادہ سے زیادہ ارکان کی مرضی اور شرکت سے ہو۔

اٹھانے والوں کے
درمیان بچولیوں کا کردار ادا کریں جس سے
انھیں مالی نفع ہو اور سیاسی اقتدار حاصل
ہو۔ اس کے علاوہ رضاکار ادارے سرکاری
ایجنسیوں کو اس کے لیے تیار کر سکیں گے کہ

دیہات کی مربوط ترقی کے پروگرام کے تحت
ایسے جائز لوگوں کی نشاندہی میں مددگار ثابت
ہوئے جو فی الواقعی اس کے مستحق تھے۔ ترقیاتی

ادارے عوامی تنظیمیں ہیں جو کہ
جمہوری ڈھانچے میں پوری طرح موزوں ہیں۔
اور جن کے ذریعے ترقیاتی عمل تیزی سے آگے
بڑھایا جا سکتا ہے۔

★

بقیہ: رضاکار تنظیمیں

کے بعد یہ روایت ٹوٹ گئی ہے۔ اقتدار کی سیاست ہر شئے پر غالب آگئی ہے۔ لہٰذا لوگ کچھ لینا چاہتے ہیں، دینا چاہتے ہیں۔ ایسی صورت میں صرف ایسی رضاکار انجمنیں ہی مددگار ثابت ہو سکتی ہیں جو اصولی طور پر اقتدار یا سیاست سے دور رہنا چاہتی ہوں۔

یہ بڑی خوشی کی بات ہے کہ موجودہ مشکل صورت حال میں بھی بہت سے مرد و زن اور رضاکار انجمنیں ایسی ہیں جو بڑی لگن سے دور دراز دیہات، شہروں کی گندی بستیوں، پہاڑوں اور جنگلوں میں غریبوں کی خدمت کر رہے ہیں۔ یہ لوگ نکتہ چینی اور نظرانداز ہونے کے باوجود اس کام پر جٹے ہوئے ہیں، جس سے مستقبل کے بارے میں روشن امید بندھتی ہے۔ گاندھی جی پر جب جارحیت کا ذکر کیا ہے وہ اس وقت دور ہی شروع ہو جائیں گے جب زیادہ سے زیادہ لوگ ترقی کے

عمل میں شامل ہونے لگیں گے۔ ان لوگوں کو کسی سے کسی چیز کی توقع نہیں۔ اس مثال اور ترغیب عمل کو دیکھ کر غریبوں کو اپنی حالت کا احساس ہوگا اور وہ اپنی حالت خود سدھارنے لگیں گے۔

اس سے سرکاری انتظامیہ میں بھی نئی جان آجائے گی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ لوگوں کا سرکار میں اعتماد بڑھے گا۔ اور ترقیاتی کاموں میں لوگوں کی شرکت بڑھ جائے گی۔ جب انفرادی اور جماعتی رضاکارانہ کوششوں کی ترقی کو متحرک کے طور پر تسلیم کیا جانے لگے گا تو ملک بھر میں ہر ماحول اور ہر سطح پر عوامی خدمت کی لہر دوڑنے لگے گی۔
اب یہ منصوبہ بندی کمیشن اور مرکزی و ریاستی سرکاروں کا کام ہے کہ وہ اس موضوع پر کوئی فیصلہ کریں کیوں کہ بھارت ورش کی تعمیر نو کے لیے عوامی طاقت اور سرکاری قوت میں باہمی تعاون ایک فیصلہ کن کردار ادا کر سکتا ہے۔

بقیہ: رضاکار تنظیموں کا رول یقیناً اہم ہے

میں کرائی گئی ہے، وہ کافی حوصلہ افزا اسکیم رہی ہے۔ اس ادارے نے نوجوانوں کو قیادت کی ذمہ داری سونپی ہے اور وہ مختلف شعبوں میں رہنمایانہ کام کر رہے ہیں۔ اس نے غریب طبقات کی ضرورتوں کا اندازہ لگایا ہے اور اس کے مطابق مزدوری پروگرام شروع کئے ہیں۔ مقصد یہ ہے کہ ان علاقوں کی آبادی کو اقتصادی اور سماجی آزادی سے ہمکنار کرایا جا سکے۔

اس طرح کے رضاکار اداروں کی تعداد بہت کم ہے۔ یہ ملک کے پسماندہ دیہی علاقوں کی جملہ ضرورتوں کو پورا نہیں کر سکے ہیں لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ سرکاری ادارے بھی ان علاقوں تک پوری طرح اپنی سرگرمیوں کو نہیں بڑھا سکے ہیں۔ ایسی صورت میں رضاکار اداروں اور سرکاری اداروں کے درمیان کام کو آپس میں بانٹ لینا ضروری معلوم ہوتا ہے تاکہ غریبی دور کرنے کے کام کو موثر طرح سے انجام دیا جا سکے۔

★

[redacted]

جے۔ بی۔ سنگھ ایگزیکٹو ڈائرکٹر، اے ایف پی آر او۔ نئی دہلی۔

یہ پہلے سمجھا جائے کہ یہ ادارے ہیں کیا

مصنف رضاکار اداروں کی نوعیت اور صحیح کردار کو بہتر طور پر سمجھنے کی تلقین کرتا ہے۔ اُسے افسوس ہے کہ نکتہ چینی کرنے والے ادارے اپنے پس منظر، نظریات، تحریک، قانونی رُتبے، عملہ کی سطح، کام کے پروگراموں، فنڈوں کے وسیلوں اور سرکاری کنٹرول کے لحاظ سے ایک دُوسرے سے مختلف ہیں۔ اور اس طرح اُن کی کارکردگی بھی قدرتاً مختلف ہے۔

ترقیات نے، خصوصاً غریبوں کے انسدادی پروگراموں میں رضاکار اداروں کے کردار اور کارکردگی کو بڑی قدرو منزلت سے دیکھا جا رہا ہے۔ وزیراعظم نے اکتوبر ۱۹۸۲ میں ریاستی وزرا اعلیٰ کو ترقیاتی پروگراموں میں رضاکار اداروں کو شامل کرنے کی ہدایت دی تھی، اور اس کے لیے مشاورتی گروپ قائم کرنے کو کہا تھا۔ چنانچہ پلاننگ کمیشن میں اعزازی مشیر کے طور پر سماجی خدمت کی تنظیموں کے ایک ڈائریکٹر کی تقرری، پیپلز ایکشن فار ڈیولپمنٹ (انڈیا) کا احیا اور سرگرم بنایا جانا، بائیو انرجی سوسائٹی آف انڈیا، سوسائٹی فار ریوموشن آف ویسٹ لینڈ ڈیولپمنٹ (ویران زمینوں کی ترقیات سے متعلق ادارہ) دیہی ٹیکنالوجی کی ترقی سے متعلق کونسل جیسی متعدد تنظیموں کا قیام رضاکار اداروں کے تئیں سرکاری رویّے میں بہتری کی علامت ہے۔

ساتویں پانچسالہ منصوبے کی دستاویزات میں رضاکار اداروں سے متعلق ایک خصوصی باب کی مجوزہ شمولیت سے ظاہر ہوتا ہے کہ آج کے پالیسی ساز ترقیات میں رضاکار اداروں کے حصّے کو بڑی سنجیدگی سے دیکھ رہے ہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ رضاکار اداروں کے تئیں اب جو سنجیدگی اور قدرشناسی دکھائی جا رہی ہے، جو جوش و خروش کی حد تک پہنچ چکی ہے۔ کیا وہ حقیقی اور تمام حلقوں میں قابلِ قبول ہے یا وہ ماضی کے دیگر بیشتر معاملوں کی مانند سوڈے واٹر کا اُبال ثابت ہوگا۔

> ان میں سے اکثر سوالات ان شبہات کی عکاسی کرتے ہیں جو رضاکار اداروں کے بارے میں سوالات دریافت کرنے والوں کے ذہنوں میں زیادہ تر لاعلمی کے باعث پیدا ہوتے ہیں لیکن سوالات رضاکار اداروں کے بارے میں تصوّراتی ابتری سے بھی پیدا ہوتے ہیں۔

غور طلب سوالات

عوام بیشتر سوالات دریافت کرتے ہیں جن میں سے بعض درج ذیل ہیں:۔

۱۔ رضاکار ادارے کیونکر رضاکار ہیں؟

۲۔ رضاکار ادارے جو کہ اچھی طرح کام کر

بنے ہیں اور اپنے عملے کو بھاری تنخواہیں دے رہے ہیں۔ دوسرے کسی سرکاری یا کاروباری ادارے سے کیونکر مختلف ہیں؟

۳۔ حکومتوں اور غیر ملکی اداروں سے عطیات اور مالی امداد دینے والے رضاکار ادارے کیوں کر آزاد ہیں؟

۴۔ کیا رضاکار اداروں کی بظاہر خیرات، خدمت اور رفاہِ عامہ کی سرگرمیوں کی پشت پر کوئی مقاصد نہیں ہیں؟ کیا وہ تخریب کاری کی قوتوں کو شہ دینے میں مصروف نہیں ہیں؟

۵۔ رضاکار ادارے نہایت مشکل حالات میں اپنی کسی دلچسپی یا مقاصد کے بغیر کیوں کر کام کرتے ہیں؟

۶۔ کیا رضاکار ادارے مقامی سیاستدانوں کے مفاد میں کام نہیں کرتے خواہ وہ برسرِ اقتدار پارٹی یا حزبِ مخالف سے تعلق رکھتے ہیں؟

۷۔ کیا ان لوگوں کو رضاکار اداروں کی واقعی ضرورت ہے جن کی خدمت کا وہ دم بھرتے ہیں؟ کیا وہ پروگراموں کی تشکیل و تشخیص اور فیصلہ سازی میں واقعی لوگوں کو شامل کرتے ہیں یا وہ خود کو عوامی مفادات کے خود ساختہ محافظوں کے طور پر پیش کرتے ہیں؟ کیا ایسی بات نہیں ہے کہ رضاکار اداروں میں کام کرنا از خود ایک پیشہ بن گیا ہے؟

۸۔ کیا رضاکار ادارے عوام اور حکومت کو باندھنے والی ایک اور کڑی نہیں ہیں؟ ان کے کارکن سرکاری محکموں کے کارندوں سے کیوں کر مختلف ہیں؟ کیا رضاکار ادارے دست کش ہو سکتے ہیں یا وہ بھی مفادات خصوصی کے اڈے بن گئے ہیں؟

۹۔ کیا رضاکار اداروں کی شمولیت کے ساتھ تقسیم کے موجودہ نظام کو بہتر بنانے کی نئی حکمت عملی کامیاب ہوگی یا وہ مایوسی کا ایک اور وسیلہ بن کر ختم ہو جائے گی؟

۱۰۔ کیا رضاکار ادارے کام انجام دے سکتے ہیں؟ کیا وہ واقعی بخوبی منظم ہیں اور رول ادا کرنے کے لیے تیار کیے گئے ہیں؟ محض اس بنا پر کہ اچھا کام دینے والے بعض ادارے موجود ہیں کیا کوئی ایسے سسٹم پر بھروسہ کر سکتا ہے؟

۱۱۔ زمانہ قبل از آزادی میں رضاکار ادارے عوام سے روپیہ پیسہ وصول کرتے تھے اور اب وہ حکومت کے عطیات اور مالی امداد پر دار و مدار رکھتے ہیں لیکن عقیدت اور جذبۂ ایثار کیوں ختم ہوتے جا رہے ہیں؟

اور جوابات

متذکرہ صدر بعض مثالیں ہیں اور عام طور پر رضاکار اداروں کے بارے میں اور ان سے دریافت کیے جانے والے سوالات کی کوئی جامع فہرست نہیں ہے۔ ان میں سے اکثر سوالات ان شبہات کی عکاسی کرتے ہیں جو رضاکار اداروں کے بارے میں سوالات دریافت کرنے والوں کے دلوں میں زیادہ تر لاعلمی کے باعث پیدا ہوتے ہیں لیکن یہ شبہات رضاکاروں کے بارے میں تصورات کی ابتری سے بھی پیدا ہوتے ہیں۔ مختلف اداروں کو ایک ہی رسّے سے باندھ دیا جاتا ہے اور انھیں 'رضاکار ادارے' کہا جاتا ہے۔ جہاں تک ان کے پس منظر، نظریات، تحریک، قانونی رتبے، عمل کی سطح، کام کے پروگراموں، فنڈوں کے وسیلوں اور سرکاری کنٹرول وغیرہ کا تعلق ہے، وہ ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ قدرتی طور پر کارکردگی، صلاحیت اور قبولیت کے معاملے میں بھی ایک ادارہ دوسرے ادارے سے مختلف ہے۔ ایک ادارے کے بارے میں جو اچھا یا برا تجربہ ہوتا ہے اس کی بنا پر تمام رضاکار اداروں سے منسوب کرنے کا رجحان پیدا ہو گیا ہے۔ یہ تمام اداروں کو

ایک ادارے کے بارے میں جو اچھا یا برا تجربہ ہوتا ہے اس کی بنا پر تمام رضاکار اداروں سے منسوب کرنے کا رجحان پیدا ہو گیا ہے۔ یہ تمام اداروں کو ایک ہی زمرے میں رکھنے کے مترادف ہے۔ یہ درست نہیں ہے اور نہ ہی مناسب۔

اسی طرح یہ کہنا کہ تمام رضاکار ادارے نکمے اور غیر ذمہ دار ہیں اور ان کے عزائم مشکوک ہیں، درست نہیں ہے بلکہ یہ بیان بھی ... دراصل رضاکار اداروں کی اصطلاح میں ایسے ملے جلے ادارے شامل ہیں جو اچھے یا برے بھی ہیں، قابلِ استعداد بھی یا ناقابل استعداد بھی، خود کفیل بھی ہیں اور دوسروں پر انحصار کرنے والے بھی، قابلِ انحصار بھی ہیں،

یہ ہی ڈھونڈنے سے ہانکنے کے مترادف ہے۔ یہ بڑی ہی دُرست ہے اور کچھ ہی مناسب۔

چونکہ تمام رضاکار ادارے انسانوں کے گروپ ہوتے ہیں، اس لیے اُن میں بھی تمام انسانی محاسن و عیوب منعکس ہوتے ہیں۔ تمام اداروں سے مثالی عمل کی توقع ممکن نہیں ہے۔

اسی طرح یہ کہنا کہ تمام رضاکار ادارے نکمّے اور غیر ذمہ دار ہیں، اور ان کے عزائم مشکوک ہیں۔ درست نہیں ہے بلکہ یہ بیان شر انگیز ہے۔ دراصل "رضاکار ادارے" کی اصطلاح میں ایسے ملے جلے ادارے شامل ہیں۔ جو اچھے یا بُرے بھی ہیں، قابلِ استعداد بھی اور ناقابلِ استعداد بھی، قابلِ انحصار بھی یا ناقابلِ انحصار بھی۔ خود کفیل بھی اور دوسروں پر انحصار کرنے والے بھی۔

اوریات اور بھیک دینا۔

۲۔ بہبودِ عامہ: تعلیم، صحتِ عامہ، پینے کے پانی، سڑکوں اور مواصلات وغیرہ کے لیے سہولیات فراہم کرنا۔

۳۔ امداد: سیلاب، خشک سالی، زلزلوں جیسی قدرتی آفات اور پناہ گزینوں کی آمد۔ جنگ کی تباہی جیسے انسان کے پیدا کردہ مصائب کے دوران فرض سمجھ کر کام کرنا۔

۴۔ آباد کاری: قدرتی آفات سے متاثرہ علاقوں میں کام جاری رکھنا اور ایسی سرگرمیاں شروع کرنا جو پائدار نوعیت کی ہوں۔

۵۔ افلاس زدہ پسماندہ علاقوں میں بنیادی ڈھانچے کی تعمیر کرنا۔ ٹریکٹر کرایہ پر حاصل کرنے کی سہولیات اور قرضہ، بیج، کیمیاوی کھاد اور تکنیکی جانکاری کی فراہمی۔

۶۔ انسانوں کے گرد سماجی اقتصادی ماحول کا فروغ: علاقائی بنا پر سماجی، اقتصادی کایا پلٹ کرنا۔ جو ایک مخصوص علاقے پر محیط ہو یا عوام کے ایک ایسے خاص گروپ پر مرکوز ہو جو عام طور پر نظر انداز کیا گیا ہو اور جسے مدد کی ضرورت ہو۔

۷۔ انسانی ترقی: شعور پیدا کرنا، بیداری لانا، تنظیم کرنا، ترجیحات کو ریکارڈ کرنا جس سے سماجی انصاف لایا جائے، ماضی کی غلطیوں کا ازالہ کرنا اور اُن لوگوں کے لیے مواقع کے دروازے کھولنا جنھیں دبایا گیا ہو اور جن کا استحصال کیا گیا ہو۔

مذکورہ بالا دستور ہائے کار کو یکجا کیا جائے تو رضا... سرگرمیوں ... وسیع ترین دائرہ اُس کی لپیٹ میں آجاتا ہے۔ اس امر کا تعین کرنے کے لیے کوئی یقینی فائدہ نہیں ہے کہ ان میں سے کونسا دستورکار کس خاص حالت میں پسندیدہ یا موثر ہوگا۔ اس کا دارومدار ادارے کی جماعتی بالمیسی، کارکنوں کی تحریک اور روشن خیالی اور اُن لوگوں کے ردِ عمل کی نوعیت پر ہے جن کے لیے وہ کام کرتے ہیں۔ لیکن یہ بات عام طور پر بھی کہی جاسکتی ہے کہ سرکاری حلقے میں مختلف دستور ہائے کار کی تمیز (۱ سے ۷ تک) درجہ بدرجہ کم ہوا جا رہا ہے۔ خیرات، بہبودِ عامہ، امداد، بحالی خدمات، انسانوں کے گرد سماجی اقتصادی ماحول کی ترقی اور انسانوں کی ترقی (۱ سے ۷ تک) دستور ہائے کار کا تعلق تقسیم سے ہے جب کہ دستورکار بنیادی طور پر "موصولہ نظام" سے

اُن کی درجہ بندی

ایک گروپ کے طور پر رضاکار اداروں کی کارکردگی کو واضح طور پر سمجھنے کے لیے ہمیں اُن دستور ہائے کار کے مطابق ان کی درجہ بندی کرنی ہوگی جو وہ اپناتے ہیں۔ یہ درج ذیل ہیں:-

۱۔ خیرات: نقدی اور جنس، زمین اور عمارتوں وغیرہ کی صورت میں خوراک، کپڑا،

> سماجی بہبود کی تنظیموں کی بڑی تعداد جو سرکاری وسائل تک آسانی سے رسائی حاصل کرتی ہے، عطیات موصول کرنا زیادہ پسند کرتی ہے۔ اُن سے نمائندے اربابِ اقتدار سے رابطوں پر زیادہ انحصار کرتے ہیں اور عوام کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ جن کی طاقت پر انہوں نے پہلے انحصار رکھا تھا۔

> رضاکار اداروں کا حصہ شوربے میں نمک کے مانند ہوتا ہے اگر رضاکارانہ سرگرمیاں بہت زیادہ بڑھ جائیں تو اس سے مزا کرکرا ہو سکتا ہے۔ اسی طرح اگر یہ بہت کم ہو جائیں تو اس سے ایک جمہوری ڈھانچے میں ترقیاتی کام بے مزہ ہو سکتا ہے۔

تعلق رکھتا ہے، اور یہ وہ مقام ہے جہاں رضاکار اداروں کی پوزیشن بہت مضبوط ہے اور جہاں مفاد کا ٹکراؤ زیادہ سے زیادہ ہوتا ہے جس سے زیادہ سے زیادہ غلط فہمی پیدا ہوتی ہے۔

اور حکمتِ عملی

مذکورہ دستور ہائے کار اور ان مرحلوں کو مدِ نظر رکھ کر جن میں رضاکارانہ سرگرمیاں بڑھی ہیں۔ ہم چار حکمت عملیوں کی نشاندہی کر سکتے ہیں کہ جنھیں یہ ادارے اپنائے ہوئے ہیں۔ یہ ہیں:-

حکمتِ عملی ۔ ۱: محض خیرات، ریاست کی بہبودِ عامہ کی سرگرمیوں کو تقویت دینا۔

حکمتِ عملی ۔ ۲: حکومت کی طرف سے حلقے یا گاؤں کے وسیع تر مفاد کے لیے جو پروگرام شروع کیے گئے ہیں اُن کی منصوبہ بندی اور تعمیل میں عوام کی شرکت کو بڑھاوا دینا۔

حکمتِ عملی ۔ ۳: پروگراموں کی منصوبہ بندی میں عوام کو شامل کرنا، وسائل فراہم کرنا، سرگرمیوں کو عملی جامہ پہنانا اور ترقیات کے ثمرہ میں شریک کرنا۔

حکمتِ عملی ۔ ۴: عوام کو باشعور بنانا اور منظم کرنا تاکہ جو ترقیاتی پروگرام اُن کے فائدے کے لیے ہیں، وہ اُن کا مطالبہ کر سکیں، اُن کی منصوبہ بندی اور تعمیل اپنے ہاتھ میں لے سکیں۔

ان میں سے پہلی حکمتِ عملی اہلِ اقتدار کو بہت زیادہ قابلِ قبول ہے لیکن اس میں بعض بنیادی کمزوریاں ہیں، جیسے احساسِ کمتری کا فروغ، بیچارگی کا احساس اور "دینے اور لینے والے" کا تعلق۔ مختصراً یہ یکطرفہ نوعیت کی ہے۔ اور انسانی گراوٹ کا موجب بنتی ہے، اور انسانی روح کی بالیدگی کے حق میں نہیں۔

رضاکارانہ سرگرمیوں کی دوسری حکمت عملی جس میں سے حکومت کی طرف سے بنائے گئے پلان اور پروگراموں میں انسانی شرکت کو فروغ دیتا ہے وہ بھی قابلِ قبول ہے لیکن اس سے بعض چیدہ لوگوں یا گروپوں کو فائدہ پہنچتا ہے۔ لوگوں کی بھاری اکثریت اچھوتی رہ جاتی ہے یا وہ ترقیات کے ثمرہ سے محروم رہتی ہے۔ اس طرح امیر اور غریب کے درمیان فاصلہ بڑھتا ہے۔ اس سے عوام کا ایک ایسا طبقہ بھی پیدا ہو جاتا ہے جو "مفاد پرست" کہلاتا ہے اور جو ترقیاتی پروگراموں میں ہونے والے فائدوں کو ہتھیانے کے لیے ہمیشہ تیار رہتا ہے۔ تجربے سے پتہ چلا ہے کہ غریب لوگ جو شروع میں زیادہ پُرجوش ہوتے ہیں، بعد میں بے اعتنائی سے کام لیتے ہیں اور ترقیاتی سرگرمیوں میں اُن کی دلچسپی ختم ہو جاتی ہے۔ لہٰذا رضاکار اداروں کے روبرو جو انتخاب ہے وہ گذشتہ دو قسم کی حکمتِ عملی تک محدود ہے جنھیں ان میں سے بیشتر ادارے کامیابی کی مختلف حدوں تک اپنا رہے ہیں۔

بنیادی ضروریات

رضاکار اداروں کی طرف سے اپنائے گئے دستور ہائے کار اور حکمتِ عملیوں پر بحث کرنے کے بعد ایک رضاکار ادارے کی ایسی بنیادی اور لازمی ضروریات پر غور و خوض کرنا مفید ہوگا جو ایک ادارے کے لیے ہونا ضروری ہیں:-

۱۔ ایک مفید نظریہ، تحریک ۔ ۲۔ ایک تحریری آئین، جماعتی و تنظیمی ڈھانچہ اور قانونی رُتبہ۔ ۳۔ آئینی حدود کے اندر کام کرنے کی خود مختاری۔ ۴۔ اعلانیہ مقاصد کی حدود کے اندر دستورِ کار میں لچک۔ ۵۔ جن لوگوں کی خدمت مقصود ہے اُن کے بہترین مفاد میں عمل کی آزادی۔ ۶۔ ایسے عمل کا ایک واضح پروگرام جو مقامی ضروریات اور دستیاب وسائل کے مطابق بنایا گیا ہو۔ ۸۔ مقامی طور پر یا باہر سے وسائل کی شیرازہ بندی کی اہلیت۔ ۹۔ ایک تجربی منضبط حسابی سسٹم جس کی باقاعدہ پڑتال چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ کی ایک فرم سے کی گئی ہو۔ اور ۱۰۔ جو مقاصد طے کیے گئے ہیں، اُن کے مطابق کارکردگی کی تشخیص کا ایک مسلسل سسٹم۔

جبکہ رضاکار اداروں کی موجودہ قبولیت۔ اُن کی ہمہ گیری، لچکیلا نظام غریبوں کے کاز کے لیے عقیدت قابلِ تعریف ہے، اس سے خود رضاکار اداروں پر بہت بھاری ذمہ داری آن پڑی ہے۔ انھیں ضابطۂ اخلاق کے بلند معیار قائم کرنے ہوں گے۔

مذکورہ بالا بنیادی اور لازمی ضروریات ہیں جنھیں بیشتر رضاکار ادارے پورا کرنا پسند کرتے ہیں۔ گو یہ امر تسلیم شدہ ہے کہ اُن میں سے تمام ایسا کرنے کی سکت نہیں رکھتے۔ حصولِ آزادی سے قبل رضاکار اداروں کے تئیں حکومت کا رُخ گو امدادی نہیں تھا تاہم وہ مخالفانہ بھی نہیں تھا۔ حصولِ آزادی کے بعد خیرات سے لے کر ترقیات تک، تمام شعبے سرکاری پروگراموں کی لپیٹ میں آگئے ہیں۔ سماجی بہبود کی تنظیموں کی بڑی تعداد جو سرکاری وسائل تک آسانی سے رسائی حاصل کرتی ہیں۔ عطیات موصول کرنا زیادہ پسند کرتی ہیں۔ اُن کے نمائندہ اربابِ اقتدار سے رابطوں پر زیادہ انحصار کرتے ہیں اور عوام کو نظر انداز کر دیتے ہیں جن کی طاقت پر انھوں نے پہلے کار روار

رکھا تھا۔ اس حالت میں ایسے اداروں کے رضاکارانہ کردار پر شک کیا جاتا ہے۔

محض امدادی کردار

رضاکار اداروں سے یہ توقع کرنا کہ وہ جُزوی طور پر بھی ترقیاتی ... سرکاری مشینری کی ... میں اُن سے بہت زیادہ توقع کرنا ہے۔ وہ زیادہ سے زیادہ معاون کا رول ادا کر سکتے ہیں۔ وہ مثالیں قائم کر سکتے ہیں، راستہ تلاش کر سکتے ہیں۔ جن عوام کی وہ خدمت کرتے ہیں، اُن کے مفاد کی نگرانی کر سکتے ہیں، حکام کے کامیابیوں کے دعووں پر حرف گیری کر سکتے ہیں اور ہر ایسی چیز کا مطالبہ کر سکتے ہیں جو عوام خصوصاً غریب عوام کے بہترین مفاد میں ہو۔ رضاکار اداروں کا حصہ شوربے میں نمک کی مانند ہو سکتا ہے۔ اگر رضاکارانہ سرگرمیاں بہت زیادہ بڑھ جائیں تو اس سے مزا کرکرا ہو سکتا ہے۔ اسی طرح اگر یہ بہت کم ہو جائیں تو اس سے ایک جمہوری ڈھانچے میں ترقیاتی کام بے مزہ ہو سکتا ہے۔ اس امر کو واضح طور پر سمجھنا ضروری ہے۔ حکومت کے لیے بھی اس امر کے لیے تیار رہنا ضروری ہے کہ وہ رضاکار اداروں کے اس محدود رول کو قبول کرے اور رضاکارانہ سرگرمیوں کو ہمدردی سے فروغ دے۔ اسی طرح رضاکار اداروں کے لیے بھی یہ احساس کرنا ضروری ہے کہ حکومت ہی ترقیات کا بڑا ذریعہ و وسیلہ ہے اور کہ ترقیات میں اُن کا نجی رول محض برائے نام ہے گو وہ بھاری اہمیت کا حامل ہے۔

جبکہ رضاکار اداروں کی موجودہ قبولیت، اُن کی ہمہ گیری، لچکداری، غریبوں کے کاز کے لیے عقیدت قابلِ تعریف ہے۔ اس سے خود رضاکار اداروں پر بہت بھاری ذمہ داری آن پڑتی ہے۔ انھیں ضابطۂ اخلاق کے بلند معیار قائم کرنے ہوں گے۔ اس کی یقین دہانی کے لیے انھیں پریس کمیشن انسٹی ٹیوٹ آف چارٹرڈ اکاؤنٹنٹس، بار کونسل، انڈین میڈیکل ایسوسی ایشن کی مانند نیشنل کونسل آف والنٹری آرگنائزیشن جیسی کوئی تنظیم قائم کرنی ہوگی۔ رضاکار اداروں کو سیاسیات سے الگ تھلگ رہ کر کوئی بے غرضانہ تعمیری پروگرام اپنانا ہوگا۔ انھیں ان دونوں کو خلط ملط نہیں کرنا چاہیئے۔ علاوہ ازیں انھیں اُن لوگوں سے بھی الگ رہنا ہوگا جو پارٹی سیاست میں سرگرم حصہ لیتے ہیں۔ حکومت کو بھی اس امر کا احساس کرنا ہوگا کہ رضاکارانہ سرگرمیاں اپنے نجی کلچر میں پھلتی پھولتی ہیں اور کچھ ٹھونسنے یا مداخلت کرنے سے وہ لاحاصل ہو جاتی ہیں۔ اس نکتے کو واضح کرنے کے لیے حکومت مہاراشٹر کے اُس بل کا ذکر کیا جا سکتا ہے جس میں میڈیکل ٹرسٹوں اور کھادی اینڈ ولیج انڈسٹریز کمیشن کے لیے مستحسن مشیر مقرر کرنے کا اہتمام کیا گیا ہے، اور گاندھی آشرموں کے آئین میں تبدیلی کرنے، 35 CCA اور 35 CCA کے تحت ٹیکس مراعات واپس لینے اور رضاکار اداروں کی سرگرمیوں سے ہونے والی آمدنی کو قابلِ ٹیکس بنانے کے لیے کہا گیا ہے۔ یہ رضاکارانہ سرگرمیوں اور رضاکار اداروں پر حکومت کے متضاد موقف کی چند مثالیں ہیں۔ اگر ہمارے ملک میں رضاکار اداروں کی رضاکارانہ سرگرمیوں کو ہی محفوظ رکھا جا سکے تو رضاکار ادارے اپنا کام انجام دے سکتے ہیں۔ ★

بقیہ: چھوٹا منہ، بڑی بات

نہیں کہتا۔ بلکہ ان کو بے کار دخل اندازی کا مرتکب سمجھا جاتا ہے اور بار سوخ سیاسی پارٹی سے مل کر ان کے کاموں میں روڑے اٹکائے جاتے ہیں۔ رضاکار ایجنسیاں بھی سرکار پر شک و شبہ رکھتی ہیں جو لال فیتے کی دیری اور سرکاری افسروں کی عدم اہلیت سے پیدا ہوتا ہے جس کی بنا پر دیہات میں لوگوں کو پروگرام کے مفاد حاصل نہیں ہو سکتے۔ اور آخر میں یہ بات بھی قابلِ توجہ ہے کہ رضاکار ایجنسیوں کے پاس سرمایہ کی کمی ہوتی ہے اور سرکار جو سرمایہ دیتی ہے، اس پر جو شرائط باندھی جاتی ہیں انہیں وہ ناپسند کرتی ہیں، اور کاروباری لوگ جن سے سرمایہ حاصل کیا جا سکتا ہے وہ اس پر اصرار کرتے ہیں کہ ان کو انکم ٹیکس کی چھوٹ دی جائے اور یہ چھوٹ اکثر غلط استعمال ہوتی ہے۔

آخر کیا کریں؟

ایسے میں پہل ان وزارتوں کی طرف سے ہونا چاہیئے جن کی کارِ خیر کی روایت ہے، یا جنھوں نے حال ہی میں رضاکار ایجنسیوں سے ایک دوسرے پر اعتماد کی رسم ڈالی ہے۔ یہ کام پلاننگ کمیشن کی رہنمائی میں وزارت سوشل ویلفیئر، وزارت صحت اور فیملی پلاننگ اور وزارت تعلیم (تعلیم بالغان) بنا سکتی ہیں اور وہ رضاکار ایجنسیوں اور دوسری وزارتوں اور پروگراموں میں جن کا مقصد غریبی دور کرنا ہے۔ تال میل پیدا کر سکتی ہیں۔

مثالیہ طرز کے غور و خوض سے بنائے ہوئے پروگرام لے کر رضاکار ایجنسیاں اپنی خاص مہارت اور اطلاع کو بروئے کار لاتے ہوئے۔ ان کی تکمیل کر سکتی ہیں۔ جس سے مقامی ضروریات پوری ہوں گی۔ اور بلا رشوت یا خورد برد کے فوائد ان تک پہنچیں گے جن کے لیے یہ مقصود ہیں۔ ان ایجنسیوں کا کام محض مثال پیدا کرنے تک ہی محدود ہوگا۔ جو ریاستوں یا قوم کے لیے ایک روشنی کا مینار بن جائے گا۔ سرکار اور رضاکار ایجنسیوں کے باہمی ربط و ضبط کے بغیر کوئی دوسرا راستہ نہیں ہے جس کو اپنا کر ہم ساتویں پلان میں غربت کے خلاف جہاد کر سکیں۔

بکرم سرکار جوائنٹ سکریٹری، وزارت داخلہ، نئی دہلی۔

رضاکار تنظیموں کا رول یقیناً اہم ہے

منصوبہ بندی کے تحت غریبی دور کرنے کے جو پروگرام شروع کیے گئے ہیں۔ ان میں رضاکار اداروں کو یقیناً ایک مثبت کردار ادا کرنا ہے اور اگرچہ ایسے رضاکار اداروں کی تعداد کم ہے جو تمام پسماندہ علاقوں کو اپنی سرگرمیوں کا مرکز بنا سکیں تاہم حکومت کی کوششوں کا دائرہ کار بھی مختصر اور محدود ہے ایسی صورت میں بہتر ہو کہ رضاکار ادارے اور حکومت دونوں ہی اپنا اپنا کام بانٹ لیں تاکہ دونوں کی مشترکہ کوششوں سے غریبی دور کرنے کے پروگرام شروع کیے جا سکیں گے۔

غیر سرکاری رضاکارانہ تنظیموں نے سماج کے کمزور طبقات، یعنی کہ غریبوں، مظلوموں، غیر استحقاق یافتہ لوگوں اور معاشی ترقی کے فائدوں سے محروم لوگوں کی بہبود کے لیے ایک اہم کردار ادا کیا ہے۔ اُنیسویں صدی میں اصلاحات سے متعلق جو تحریک شروع کی گئی، اس کے نتیجے میں بہت سی رضاکار تنظیمیں معرضِ وجود میں آئیں، خاص کر ایسی بہت سی تنظیمیں قائم ہوئیں جنھوں نے عورتوں کی بہبود کے لیے کام کیا۔ ان کے علاوہ بچوں اور پسماندہ طبقات کی بہبود کے لیے بھی بہت سی تنظیمیں قائم ہوئیں۔ سماجی بہبود کے شعبے میں عورتوں اور بچوں کی بہبود کے لیے کام کرنے والے تنظیموں کی تعداد کافی ہے۔ ۱۹۵۳ء میں اس طرح کے تنظیموں کی تعداد کل تنظیموں کے نصف کے برابر تھی۔ ۱۹۸۰ء میں ان کی تعداد بڑھ کر ۸۰ فیصد کے قریب ہو گئی۔

خدمت ایک ایسا ذریعہ ہے جس کے توسط سے اور جس کے اندر تیاگ اور ایثار و قربانی کا جذبہ اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ جلوہ گر ہوتا ہے۔ درحقیقت تیاگ ہی اصل رُوح ہے اور خدمت اس کا جسم، بے لوث قربانی اور خدمت کے بغیر تیاگ سے حقیقی طور پر لُطف اندوز نہیں ہوا جا سکتا۔

سروس یعنی خدمت کیا ہے؟

سوامی وویکانند نے اپنے مضمون بعنوان "سوامی وویکانند کا تیاگ اور سیوا کا نظریہ"۔ میں جو کہ سوامی وویکانند کی صدسالہ یادگاری مجلّے میں شامل ہے، کہا ہے کہ خدمت ایک ایسا ذریعہ ہے جس کے توسط سے اور جس کے اندر تیاگ اور ایثار و قربانی کا جذبہ اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ جلوہ گر ہوتا ہے۔

درحقیقت تیاگ ہی اصل روح ہے، اور خدمت اس کا جسم۔ بے لوث قربانی اور خدمت کے بغیر تیاگ سے حقیقی طور پر لُطف اندوز نہیں ہوا جا سکتا۔ انھوں نے کہا خدمت خیراتی کام نہیں ہے۔ یہ محبت و شفقت نیز خلوص والا اور بغیر کسی لالچ کے صادر ہونے والا عمل ہے۔ اس کی عمل آوری میں نتیجہ اور پھل پر نگاہ نہیں ہوتی۔ خدمت مادی بھی ہوتی ہے اور تعلیمی، دانشورانہ، سماجی، قومی، اخلاقی اور مذہبی بھی۔ سوامی وویکانند جنھوں نے کہ رام کرشن مٹھ اور مشن کی بنیاد ڈالی، اور جو دورِ حاضر کے سماجی تحریک کے بانیوں اور عظیم اور نامور دیش بھگتوں میں شمار ہوتے ہیں، ہمارے دیش میں عوام کی خدمت کی ایک تاریخ بنائی۔ اس عظیم ہستی نے اپنے بے شمار مراکز کے ذریعے نوعِ انسانی کی خدمت کی ہے۔

اُپنشدوں میں کہا گیا ہے کہ ماں کا درجہ انسان کے لیے بھگوان کا درجہ ہے۔ آپ کے پتا آپ کے لیے پوجا کے لائق ہیں اور آپ کے آتالیق آپ کے لیے لائق پرستش ہیں۔ سوامی وویکانند نے اس میں یہ جملہ اور بڑھایا کہ دکھیا مصیبت زدہ عوام آپ کے لیے پوجا کے قابل ہیں اور ملک کے کروڑوں فاقہ زدہ عوام لائق صد احترام اور آپ کی خدمت کے طالب ہیں۔ سوامی وویکانند نے اس بات پر مُسلسل زور دیا کہ عوام کے لیے لاپرواہی عظیم ترین قومی گناہ ہے۔ اور ہمارے زوال کے اسباب میں سے یہ بھی ایک ہے۔ سوامی وویکانند نے عوام کی خدمت کو حکم الٰہی بتایا۔ اور اس فریضہ کے تئیں بار بار یاد دہانی کرائی۔ اگر آپ کو بھگوان کی جستجو اور تلاش ہے تو اسے کہاں تلاش کریں؟ کیا یہ تمام غریب عوام، مصیبت زدہ اور تکلیف اٹھانے والے عوام بھگوان نہیں ہیں۔ ان کی پوجا پہلے ہونی چاہیئے۔ یہی بھگوان کے درشن کرائے گی۔

> خدمت خیراتی کام نہیں ہے۔ یہ محبت و شفقت نیز خلوص والا اور بغیر کسی لالچ کے صادر ہونے والا عمل ہے۔ اس کی عمل آوری میں نتیجہ اور پھل پر نگاہ نہیں ہوتی۔ خدمت مادی بھی ہوتی ہے اور تعلیمی دانشورانہ، سماجی، قومی، اخلاقی اور مذہبی بھی۔

منصوبہ بندی کیا کہتی ہے؟

رضا کار تنظیموں کی طرف سے خدمت کا تصور اس طرح کے اعلیٰ نظریات کے تابع ہے۔ گذشتہ برسوں میں، خاص کر حصولِ آزادی کے بعد رضا کار اداروں کی تعداد میں نمایاں اضافہ ہوا ہے۔ اور سماجی بہبود کے وسیع تر دائرے میں انھوں نے اپنا کام شروع کیا ہے۔ یہ کام وہ محض اپنے اخراجات سے ہی نہیں، تکنیکیات کی طرف سے فراہم کردہ وسائل سے بھی انجام دیتے ہیں۔ پہلے پنجسالہ منصوبہ کے آغاز سے عوام کی بہبود اور خدمات کی اسکیمیں ریاست اور رضا کار تنظیموں کے باہمی اشتراک اور کوششوں سے بروئے کار لائی جا رہی ہیں۔ پہلے پنجسالہ منصوبہ میں مذکور ہے کہ بچوں اور عورتوں کی بہبود، سماجی تعلیم، اجتماعی ترقی اور اس طرح کے سماجی بہبود کے دیگر شعبوں میں سرگرمیاں کو چلانے کی بڑی ذمہ داری قدرتی طور پر رضا کار پرائیویٹ تنظیموں پر آتی ہے۔ یہ پرائیویٹ تنظیمیں عرصہ دراز سے اپنے طور پر کام کرتی چلی آ رہی ہیں۔ حالانکہ ان کو اپنی قیادت، تنظیم اور وسائل سے پوری طرح امداد حاصل نہیں ہے، اس کے باوجود وہ اپنے فرائض کی انجام دہی میں مصروف ہیں۔ چنانچہ سماجی اور اقتصادی ترقی کا کوئی بھی پروگرام مرتب کرتے وقت ان تنظیموں کی طرف سے انجام دی گئی خدمات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ریاست کو ایسے اداروں کی کوششوں کے استحکام کے لیے زیادہ سے زیادہ مدد دینی چاہیئے۔ خدمتِ انسانی کی رضا کارانہ تنظیموں کی وساطت سے عوام کا تعاون حاصل کرنے کی کوششوں کو سماجی بہبود کے کاموں پر لگایا جا سکے گا۔ تیسرے پنجسالہ منصوبے میں منصوبہ بندی کمیشن نے رضا کار تنظیموں کی اہمیت کا ایک بار پھر اعادہ کیا اور انھیں منصوبوں پر عمل درآمد میں کامیابی کا ضامن بنایا۔ اس نے کہا کہ :-

بھارت ایسے ترقی پذیر ملکوں میں جہاں کہ جمہوری اقدار کو گلے لگایا گیا ہے، ان مقاصد کے حصول میں عوامی اشتراکِ عمل سب سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ آزادی کے لیے پُرامن جدوجہد اور اس کے ساتھ ہی تعمیری جدوجہد کی روایت نے ملک کی منصوبہ بند ترقی کے عظیم کام میں عوام کے فیصلہ کن رول کی اہمیت واضح کر دی۔ اس منصوبہ بندی میں جو کہ دس سال قبل شروع کی گئی تھی الیتہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ تبدیلی اور ترقی کے عمل میں عوام کے مکمل تعاون کے امکانات کو بڑی حد تک محسوس نہیں کیا جا سکا ہے۔ اس طرح نظریاتی طور پر عوام کے اشتراکِ عمل سے بحث کرتے وقت اسے ایسا عملی رُخ دینا بھی ضروری ہے جس سے کہ وہ حقیقی روپ دھارن کر سکے اور عمل جامہ پہن سکے منصوبہ کی اسی دستاویز میں کہا گیا ہے کہ :-

> ان تنظیموں کی لچک، رفتار، عوام سے رابطہ اور نئے نئے انداز سے کام کرنے اور نوعِ انسانی کی خدمت کرسکنے کے جذبہ کے سبب ان کو عوام تک رسائی حاصل کرنے کا بہترین ذریعہ خیال کیا گیا۔

سرکاری تنظیموں کی طرف سے شروع کی گئی سرگرمیوں میں عوام کے اشتراکِ عمل کی بڑی گنجائش ہے۔ اس طرح عوام کے تعاون سے منصوبہ کی کامیابی کے وہ امکانات روشن ہو سکے اور وہ کامیابی مل سکی جو بصورتِ دیگر ممکن نہ تھی۔ ان تنظیم کا اصلی کام واضح طور پر فاضی مزید بہتر انکے ساتھ ہی عوام کی ذمہ داریوں کی وضاحت

یہ ضروری ہے کہ عوامی تعاون کا نظریہ وسیع تر پس منظر میں سمجھنا چاہیئے تاکہ کاموں کو شروع کرنے اور ان کو منظم کرنے کی تمام ذمہ داری عوام پر ڈالی جا سکے۔ عوام کی ضروریات جن کی تکمیل ضروری ہے۔ اس قدر وسیع ہیں کہ پبلک اور پرائیویٹ سیکٹر میں ایک ساتھ کی سرمایہ کاری بھی ان کا صرف ایک حصہ ہی پورا کر سکتی ہے۔

اسی طرح حکومت نے حصولِ آزادی کے بعد پہلے دو دہوں میں عوام کی بہبود کی خاطر رضاکار تنظیموں کے ساتھ مل کر کام کرنے کی پالیسی اپنائی۔ ان تنظیموں کی لچک، رفتار، عوام سے رابطہ اور نئے نئے انداز سے کام کرنے اور نوعِ انسانی کی خدمت کرنے کے بے لوث جذبے کے سبب ان کو عوام تک رسائی حاصل کرنے کا بہترین ذریعہ خیال کیا گیا۔

عوامی سطح پر رضاکارانہ طور پر کی گئی کوششوں سے سماج کی سہولتوں میں اضافہ ہو سکتا ہے۔ ان کے ذریعے غریبوں کی مدد ہو سکتی ہے اور انتہائی ضرورت مند انسانوں کی زندگی بہتر بنانے میں مدد مل سکتی ہے۔ رضاکار کارکنوں کے خاموش اثر کے ذریعے عقل کی پکار اپنا دائرہ بڑھا سکتی ہے۔ چنانچہ بے لوث خدمات کے عادی افراد یا تنظیمیں ہی عقل و دانش کے فروغ کا سبب بن سکتی ہیں۔ رضاکار تنظیموں کی لچک کے باعث نئی نئی کوششوں کا نشانہ نہیں ہو سکتی ہے اور نئی نئی ضرورتوں کی تکمیل میں مدد مل سکتی ہے اور سماجی برائیاں جو معاشرے میں نفوذ کر گئی ہیں بے نقاب ہو سکتی ہیں۔ یہ تنظیمیں تبدیلی اور عملی پروگراموں کی تقلید بھی کی جا سکتی ہیں۔ ان کی مدد سے تبدیلی کا عمل آسان ہو جاتا ہے اور وہ تکلیف دہ نہیں رہتا۔

عوامی سطح پر رضاکارانہ طور پر کی گئی کوششوں سے سماج کی سہولتوں میں اضافہ ہو سکتا ہے۔ ان کے ذریعے غریبوں کی مدد کی جا سکتی ہے اور انتہائی ضرورت مند انسانوں کی زندگی بہتر بنانے میں مدد مل سکتی ہے۔ رضاکار کارکنوں کے خاموش اثر کے ذریعے عقل کی پکار اپنا دائرہ کار بڑھا سکتی ہے۔

یہ تنظیمیں تبدیلی اور جملہ پروگراموں کی تقلید بھی جا سکتی ہیں۔ ان کی مدد سے تبدیلی کا عمل آسان ہو جاتا ہے اور تکلیف دہ نہیں رہتا۔

گرانٹ اِن ایڈ

حکومت رضاکار تنظیموں کی اہمیت تسلیم کر چکی ہے اور سماجی بہبود کے تئیں اُن کی خدمات کا اعتراف کرتی ہے۔ حکومت نے ان کی کوششوں کے استحکام کے لیے کچھ قدم بھی اٹھائے ہیں۔

حکومت نے رضاکار تنظیموں کی طرف سے فراہم کردہ خدمات کو شروع کرنے میں پہل بھی دکھائی ہے تاکہ سرکار کی طرف سے شروع کیے گئے کاموں کو زیادہ موثر ڈھنگ سے پایۂ تکمیل کو پہنچایا جا سکے۔ رضاکار تنظیموں کی سرگرمیوں کو مستقل نوعیت دینے کی خاطر امدادی رقوم کا سلسلہ شروع کیا گیا تاکہ ان کی مالی مضبوطی اور تنظیمی کام جاری رہ سکے۔

چھٹے پنجسالہ منصوبے میں سماجی بہبود پر جو باب دیا گیا ہے، اس میں تحریر ہے کہ: "سماجی بہبود کے پروگراموں کا مقصد یہ ہے کہ سماج کے محروم عوام اپنی سماجی، اقتصادی اور جسمانی نیز مادی خامیوں اور کمزوریوں پر قابو پا سکیں، اور اپنا معیارِ زندگی بلند کر سکیں۔ وہ ترقیاتی پروگراموں کو آگے بڑھانے میں بالعموم مفید اور معاون ثابت ہوتے ہیں۔ اور غریبی نیز بے روزگاری کے مسئلے کو حل کرنے میں مدد دیتے ہیں۔ ان کا مقصد بنیادی طور پر انتہائی غریب اور نقصان میں رہنے والے طبقات کی مدد کرنا ہے اور غریبی کی سطح سے نیچے زندگی گزارنے والوں بالخصوص غریب اور نادار کنبوں کے بچوں، عورتوں اور کمزور نیز معذور افراد کو مدد دینا ہے۔"

اس میں سابقہ منصوبوں میں حاصل شدہ کامیابیوں کا ایک جائزہ بھی دیا گیا ہے۔ چھٹے منصوبے کی دستاویز میں مذکور ہے کہ پچھلے تین دہوں میں سماجی بہبود کی خدمات بلحاظ حجم اور بلحاظ وسعت کار بڑھی ہیں اور ان پر آنے والے اخراجات میں اضافہ ہوا ہے اور پہلے منصوبے کے ۴ کروڑ روپے سے بڑھ کر پانچویں منصوبے میں ۸۲ کروڑ روپے کر دیے گئے ہیں۔ انتظامیہ میں بھی توسیع و ترقی دیکھنے کو ملی ہے اور سماجی بہبود کے ترقیاتی منصوبے کے مقصد کے بارے میں بہتر شعور پیدا ہو سکا ہے۔ دیگر ترقیاتی شعبوں سے اس کے تعلق اور سماج کے کمزور طبقوں کے معیارِ زندگی بلند کرنے میں اس کے کردار کی اہمیت واضح ہو سکی ہے۔ اس وقت بہت سے رضاکار اداروں کو ملک کے مختلف حصوں

میں سماجی بہبود کی سرگرمیوں کو انجام دینے کی ذمہ داریاں سونپی گئی ہیں اور ان کی اس سلسلے میں مدد کی جا رہی ہے۔ ان کامیابیوں کے باوجود اس سلسلے کے پروگراموں پر عمل درآمد اور ان کی منصوبہ بندی میں کچھ خامیاں پائی جاتی ہیں اور سماجی بہبود کی اسکیموں پر موثر عمل آوری کے لیے ان کا دور کیا جانا ضروری ہے۔ اسکیم کے تحت جو ڈھانچہ مرتب کر دیا جاتا ہے۔ اس پر من و عن عمل آوری کے عام رجحان سے اس میں ایسی لچک باقی نہیں رہ جاتی جس سے مقامی ضرورتوں اور تقاضوں کے تحت ان میں تبدیلی لائی جا سکے۔

مطالعہ اور تحقیقات

ملک کے مختلف حصوں میں رضاکار اداروں کے غیر متوازی فروغ کے بارے میں جو مطالعہ کیا گیا ہے، اس سے یہ نتائج سامنے آسکے ہیں :-

۱۔ جہاں تک گرانٹ ان ایڈ کے پروگراموں کا تعلق ہے، یہ رقم ایسے علاقوں کو زیادہ دی گئی ہے۔ جہاں کا انتظام مستحکم ہے اور جہاں فنڈ کو استعمال کئے جانے کے لیے بنیادی ڈھانچہ مضبوط ہے۔ پسماندہ اور دور دراز علاقوں کے لیے فنڈ کا استعمال نہیں ہو سکا ہے

۲۔ سماجی بہبود کے پروگراموں کو اقتصادی پروگراموں کے ساتھ نہیں جوڑا گیا ہے۔ اقتصادی ترقی کے بہت سے پراجیکٹوں کو دیہی علاقوں میں شروع کیا گیا ہے، اور عورتوں نیز بچوں کے لیے درکار خدمات اور ان کی ضرورت نیز سماج پر ان کے اثرات کا جائزہ لیے بغیر یہ پروگرام شروع کر دئے گئے ہیں۔

۳۔ پروگراموں کی رفتارِ ترقی کا جائزہ لیتے وقت اقتصادی حیثیت سے ان کی کارکردگی کو جانچا جاتا ہے اور یہ نہیں دیکھا جاتا کہ وہ اسکیم اپنے بنیادی مقاصد کے لحاظ سے کس حد تک کامیاب ہے۔

سرکاری گرانٹ کا اثر ۔ گرانٹ ان ایڈ

> ہندوستان میں غریبی دور کرنا اگرچہ منصوبہ بندی کا ایک اہم مقصد رہا ہے، لیکن غریبوں کی حالت بالخصوص دیہی علاقوں کے ان عوام کی جو غریبی کے خط سے نیچے زندگی بسر کر رہے ہیں، بہت زیادہ تشویشناک اور تکلیف دہ ہے۔

> چھٹے منصوبے میں شیڈولڈ کاسٹ اور شیڈولڈ ٹرائب کی اقتصادی اور تعلیمی ترقی سے متعلق نئے طریقِ کار اور نئی حکمتِ عملی کو اپنانے سے رضاکار تنظیموں کو اس کام میں پوری طرح شریک کرنا ضروری ہو گیا ہے۔

کا نظام اور طریقِ کار پچھلے تقریباً تیس برسوں سے چل رہا ہے۔ اس نے رضاکار تنظیموں کی ترقی اور فروغ پر کچھ اثرات بھی چھوڑے ہیں۔ اس نظام کا اصل مقصد رضاکارانہ کوششوں کو بڑھاوا دینا ہے اور ان رضاکارانہ اداروں کو سرکار کے قریب لانا ہے تاکہ تال میل کے جذبے اور اشتراکِ عمل کے طریقے پر پروگراموں پر عمل درآمد ہو سکے۔

اس نظام کے تاثر اور سماج پر اس کے اثرات کے بارے میں خود رضاکارانہ تنظیموں کی آرا مختلف ہیں۔ عوامی اشتراکِ عمل اور بچوں کی بہبود و فروغ کے قومی ادارے نے اس سلسلے میں جو مطالعہ کیا ہے، اس کے تحت ۱۵۱ رضاکار تنظیموں میں سے ۲۰ تنظیموں نے گرانٹ ان ایڈ کے نظام پر مسرت اور اطمینان کا اظہار کیا ہے۔ انھوں نے خیال ظاہر کیا کہ عوام کو خدمات مہیا کرنے کے پروگراموں پر اس کے مثبت اثرات مرتب ہو سکے ہیں۔ چار رضاکار تنظیموں نے یہ خیال ظاہر کیا کہ بحیثیت مجموعی اس کے اثرات منفی رہے ہیں۔ دیگر رضاکارانہ اداروں نے خیال ظاہر کیا کہ چند محدود سرگرمیوں تک اس کے اثرات مثبت ہیں۔ جبکہ دیگر پہلوؤں پر اس کے اثرات منفی رہے ہیں۔ سولہ تنظیموں نے اس سلسلے میں کوئی رائے نہیں دی ہے۔

ایک نظریے کے مطابق گرانٹ کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ اس کے ذریعے رضاکار ادارے اپنی تجاویز اور خدمات کو باضابطہ بنا سکتے ہیں۔ گرانٹ نہ ہونے سے رضاکارانہ تنظیموں کی سرگرمیوں کی کوئی مستقل نوعیت نہیں بن سکتی اور ان کے لیے کوئی مستقل وسیلہ آمدنی نہیں بن سکتا۔ عوام سے چندہ مانگنے میں وقت جاتا ہے۔ اور اس میں تنظیم کی کافی طاقت صرف ہو جاتی ہے۔ گرانٹ کے ذریعے ریاست اور رضاکار تنظیموں کے درمیان رابطہ قائم ہو جاتا ہے جیسا کہ ایک رضاکار ادارے نے کہا ہے :-

ہمیں سرکار سے رابطہ قائم کرنے کا موقع ملتا ہے۔ سرکار بھی یہ جان سکتی ہے کہ اس شعبے میں کیا کیا سرگرمیاں ہو رہی ہیں اور مختلف اسکیموں کے تئیں عوام کا کیا رد عمل کیا ہے۔

جن کا خیال یہ ہے کہ سرکاری مدد سے رضاکارانہ کوششوں پر مثبت اثرات مرتب نہیں ہوتے، انھوں نے یہ رائے ظاہر کی ہے کہ گرانٹ صرف سرکار کی منظور شدہ اسکیموں کے لیے ہوتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اسکیموں کے تحت امداد دینے کا طریقہ اور ڈھانچہ نیز اسکیموں کی نوعیت بہت سی تنظیموں کو اس کے لیے مجبور کر دیتی ہیں کہ وہ سرکاری منظور شدہ اسکیموں کے تحت مقرر کردہ ڈھانچہ اور طرز ہی اپنائیں۔ اس کے سبب نئے پراجیکٹ اور نئے اقدامات کے بارے میں غور و خوض کا موقع نہیں مِلا

پڑ جاتی ہے اور اس سے دونوں فریقوں کے درمیان تناؤ پیدا ہو جاتا ہے۔ رضاکارانہ تنظیمیں سرکاری اداروں کی طرف سے تعاون کی کمی کی شاکی رہتی ہیں۔ لیکن اس سے بھی زیادہ بڑی بُرائی خود اس نظام میں پائی جاتی ہے۔ سرکاری رقومات کے خرچ کرنے کے سلسلے میں بہت زیادہ آزادی نہیں ہوتی۔ انتظامی طریق کار کے دوران جگہ جگہ اس کی تصنیع بھی دیکھنے میں آتی ہے۔ اس سلسلے میں یہ کہنا آسان ہے کہ ان طریقوں اور اس نظام کو پوری طرح ہٹا دیا جائے، لیکن ماضی کا تجربہ بتاتا ہے کہ اس طرح کی باتوں کا بہت زیادہ اثر نہیں لیا گیا ہے۔ ایسے بھی بہت سے معاملات دیکھنے میں آئے ہیں کہ رضاکارانہ تنظیمیں رقومات کو مناسب طور پر

خط سے نیچے زندگی گزار رہے ہیں۔ یہ ہیں بے زمین زرعی مزدور، دیہی دستکار، شیڈولڈ کاسٹ اور شیڈولڈ ٹرائب۔ لہٰذا غریبی دُور کرنے کا اگر کوئی بھی پروگرام شروع کیا جائے گا تو وہ ان طبقات کی حالت سدھارنے سے ہی متعلق ہوگا لہٰذا رضاکارانہ تنظیموں کو آگے آنا چاہیئے اور سرکاری اداروں اور ان طبقات کی بہبود سے متعلق سرکاری کوششوں کے ساتھ اس کام میں ہاتھ بٹانا چاہیئے۔ ان اداروں کو انھیں طبقات کے بہبود سے متعلق پروگراموں کو شروع کرنا چاہیئے۔ چھٹے منصوبے میں شیڈولڈ کاسٹ اور شیڈولڈ ٹرائب کی اقتصادی اور تعلیمی ترقی سے متعلق نئے طریق کار اور نئی حکمت عملی کو اپنانے سے رضاکار تنظیموں کو اس کام میں پوری طرح شریک کرنا ضروری ہو گیا ہے۔ نئی رضاکار تنظیمیں اس محاذ پر اپنی سرگرمیوں کو بڑھاوا دے رہی ہیں۔ البتہ ابھی اس

رضاکار اداروں اور سرکاری اداروں کے درمیان کام کو آپس میں بانٹ لینا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ تاکہ غریبی دُور کرنے کے کام کو موثر طرح سے انجام دیا جا سکے۔

پاتا۔ دیہی ترقی کے قومی ادارے کے اس وقت کے حیدرآباد میں واقع ڈائرکٹر ڈاکٹر ایس۔ کے راؤ نے ۲۵ تا ۲۷ اگست ۱۹۸۰ کو رضاکارانہ تنظیموں کے رول پر قومی سیمنار میں دیے گئے خطبے میں گرانٹ ان ایڈ کی اسکیموں کے نشیب و فراز کو درج ذیل الفاظ میں ادا کیا :۔

" روپے پیسے کی فراہمی قدرتی طور پر اپنا اثر رکھتی ہے۔ رضاکارانہ تنظیمیں اکثر یہ کہتے سُنی گئی ہیں کہ سرکار کے ساتھ کسی بھی طرح کا گٹھ جوڑ شکست خوردگی والا ایک تجربہ ثابت ہوتا ہے۔ سرکار کا مالیاتی طریقِ کار تکلیف دہ ثابت ہوتا ہے۔ کیسی ہی مختصر سی رقم بطور امداد کیوں نہ دی جائے، آڈٹ والوں کی ایک جماعت وہاں پہونچ جاتی ہے ماتحت سرکاری افسر چونکہ طریق کار کی صحت پر حد سے زیادہ زور دینے کے عادی ہوتے ہیں، اس لیے رضاکارانہ خدمات کی قوت کمزور

کام میں نہیں لا سکی ہیں۔"

سرپرست کے طور پر کام کرنا

ہندوستان میں غریبی دور کرنا اگرچہ منصوبہ بندی کا ایک اہم مقصد رہا ہے، لیکن غریبوں کی حالت بالخصوص دیہی علاقوں کے ایسے عوام کی حالت جو غریبی کے خط سے نیچے زندگی بسر کر رہے ہیں، بہت زیادہ تشویشناک اور تکلیف دہ ہے۔ توقعات کے مُطابق نتائج سامنے نہ آنے کا ایک اہم سبب موثر انتظامیہ کی کمی اور عوام تک رقومات اور دیگر خدمات کی فراہمی میں تصنیع کے عنصر کو بتایا جاتا ہے۔ ہندوستان میں غریبی سے مُراد زیادہ تر دیہی عوام کی غربت سے ہے، ہندوستان میں کُل آبادی کا تقریباً نصف حصّہ غریبی کے خط سے نیچے زندگی گذارتا ہے۔ اور ان میں سے ۸۵ فیصد سے زیادہ دیہات میں رہتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ وہ کون لوگ ہیں جو غریبی کے

سلسلے میں فیصلہ کیا جاتا ہے کہ یہ پروگرام کس طرح کے ہوں۔ اور ساتویں منصوبے میں ان کی نوعیت کیا ہو۔ اس سلسلے میں یہ بتانا ضروری ہے کہ کون سے پروگرام ریاستی سرکاریں شروع کریں اور کون سے رضاکار تنظیمیں۔ اس طرح سے اس سلسلے کی کوششوں کو پوری طرح انجام دیا جاتا ہے۔ ایک ہی کام کو دو، دو جگہ کرنے کی بجائے کام کی تقسیم ہو جانی بہتر رہے گی۔ اس وقت بہت سی تنظیمیں سماجی اور تعلیمی پروگراموں میں مصروف ہیں۔ چھٹے منصوبے میں سوشل ورک اینڈ ریسرچ سنٹر تلونیہ اور اسی طرح کے دیگر رضاکار ادارے چھوٹے پیمانے پر اقتصادی بہبود و ترقی کے پروگرام چلا رہے ہیں۔ ہینڈ پمپوں کی تنصیب جبکہ اس ادارے کی طرف سے شیڈولڈ کاسٹ کی آبادی

(باقی صفحہ ۶۱ پر)

مہاشویتا دیوی ممتاز سماجی کارکن، کلکتہ

نچلی سطح پر ان کی بہت ضرورت ہے

مصنفہ مغربی بنگال میں مدناپور اور پُرولیا کے لودھ کھریا قبیلوں میں کام کر چکی ہیں۔ زیرِ نظر مضمون میں اُنھوں نے بالتفصیل اپنے تجربات بیان کرتے ہوئے دیہات میں غریبی کو کم کرنے کے لیے منصوبہ سازوں اور افسر شاہی کی کارکردگی پر سخت نکتہ چینی کی ہے اور اس بات کی پُرزور حمایت کی ہے کہ غریبوں کی مدد کے لیے جنھیں بقول اِن کے خودغرض بیوروکریسی (افسر شاہی) کے ہاتھوں سخت نقصان پہونچ چکا ہے، رضاکار تنظیموں کو سرگرم انداز میں بروئے کار لایا جائے۔

دُوسروں کی طرح مَیں نے بھی کبھی یہ یقین کرنے کی کوشش کی تھی کہ بھارت کی آزادی بھارت کے غریبوں کو فائدہ پہونچانے میں یکسر ناکام نہیں رہے گی۔ ۱۹۴۷ء میں میں اکیس[21] برس کی تھی۔ ۱۹۸۴ء میں بھی یہ کہہ سکتی ہوں کہ بھارت کی قومی آزادی، اتنے سارے منصوبے، پروگرام، پراجیکٹ اور پارلیمنٹ کے بنائے ہوئے قوانین سے کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا ہم ایسے مقام پہ پہونچ چکے ہیں، جہاں سے لوٹنا ناممکن ہے یا اب بھی کوئی امید باقی ہے۔ میں نے دیکھا ہے کہ بھارت کے لوگ زیادہ تر غریب، ناخواندہ تو ہیں لیکن بے وقوف نہیں۔ شاید اب وہ یہ محسوس کرتے ہیں کہ انھیں ہمیشہ غربت میں رکھنا ایک ایسے نظام کا حصّہ ہے جو ان کی سمجھ

> میں نے دیکھا ہے کہ بھارت کے لوگ زیادہ تر غریب، ناخواندہ تو ہیں لیکن بیوقوف نہیں۔ شاید اب وہ یہ محسوس کرتے ہیں کہ انھیں ہمیشہ غربت میں رکھنا ایک ایسے نظام کا حِصّہ ہے جو ان کی سمجھ سے باہر ہے۔

سے باہر ہے۔ عوام کی غریبی وہ بنیاد ہے جس پر پراجیکٹ بنائے جا سکتے ہیں، منصوبے منظور کئے جا سکتے ہیں، ماہرین یا مُشیروں کے ذریعے انجام دئے جا سکتے ہیں اور روپے کے بہاؤ کو اس انداز سے موڑا جا سکتا ہے کہ جس کو براہِ راست فائدہ پہونچانا مقصود ہے، اُس تک کچھ نہ پہونچے۔ عوام مجھ سے اپنی زبان میں ایسا کہتے ہیں جو اکثر تلخ ہوتی ہے لیکن صحیح ہوتی ہے۔

پنچایتی نظام

برسرِاقتدار لوگوں نے بھی محسوس کیا ہوگا کہ کچھ بھی تو نہیں ہو رہا ہے۔ انتظامیہ مشینری ناکام ہو چکی ہے۔ اگرچہ اچھی نیت اور نیک ارادے رکھنے والے لوگ اب بھی پائے جاتے ہیں۔ لیکن انھیں عام طور پر ناقابلِ اعتبار سمجھا جاتا ہے اور پہلا موقع ملتے ہی ان کو ان کے عہدوں سے ہٹا دیا جاتا ہے۔ پنچایتی نظام کی تجدید شاید مایوسی و ناکامی کے بعد کی گئی۔ کم از کم مغربی بنگال میں پنچایتیں ضلع کی سب سے طاقتور تنظیمیں ہیں۔ میں پوری دیانتداری کے ساتھ یہ کہہ سکتی ہوں کہ میری ریاست میں پنچایتی نظام نے دوسری ریاستوں کے مقابلے میں یہاں وہاں ٹکڑوں میں بہتر کارکردگی کا مظاہرہ کیا ہے۔ گو یہیں بھی زیادہ کامیابی حاصل نہیں ہوئی ہے، لیکن دوسری ریاستوں کا خیال کر کے کوئی کانپ

سمجھتی ہوں۔ میری ریاست میں بھی پنچایتی نظام انتظامیہ مدارج کی توسیع اور وہی طاقت کا ایک مضبوط مرکز بن گیا ہے۔ سیاسی جماعتوں کو فائدہ پہونچا ہے اور عوام کو نقصان۔ میں یہ واضح کر دینا

میری ریاست میں بھی پنچایتی نظام انتظامیہ مدارج کی توسیع اور وہی طاقت کا ایک مضبوط مرکز بن گیا ہے۔ سیاسی جماعتوں کو فائدہ پہونچا ہے اور عوام کو نقصان۔

اہتی ہوں کہ غریبوں میں کام کرنے والی کسی رضاکار یجنسی یا تنظیم سے میرا کوئی قریبی تعلق ہیں رہا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ غریبوں ور قبائل سے میرا براہِ راست تعلق ہے۔ اص کر مدناپور اور پرولیا کے غریبوں اور بائل سے۔ نچلی سطح پر بہت سی تنظیموں ے بھی میرا تعلق ہے لیکن اپنے نقطۂ نگاہ کی وضاحت کے لیے میں صرف چند ایک کا ہی ذکر کروں گی۔

لودھ کھریا قبائل

چوں کہ میرا واسطہ زیادہ تر نچلی سطح کی نظیموں سے ہے اس لیے میں صرف انھیں کی بات روں گی۔ پہلے تو یہ سمجھنا ہوگا کہ مغربی بنگال میں لودھ شاورا اور کھریا شاورا کی طرح کے اقلیتی بیلوں نے خود اپنی تنظیمیں کیوں بنائی ہیں؟ ۔ دونوں اقلیتی قبیلے ہیں اور اگرچہ مردم شماری میں لودھ کھریا نام یکجا درج کیے گئے ہیں تاہم ریا لودھوں سے بھی زیادہ عدم توجہی کا شکار ہیں۔ لودھوں، بیرہوروں اور ٹوٹوؤں کی زمرہ بندی ان قبیلوں میں کی گئی ہے جنھیں خصوصی حفاظت مستحق سمجھا گیا ہے۔ یہ صرف کاغذ پر ہی ہے لیکن کھریا قبیلہ کو تو اس سے بھی محروم رکھا گیا ہے۔

لودھوں اور کھریاؤں میں اور بیرہوروں اور پہاڑیاؤں میں یہ بات مشترک ہے کہ ان کا طرزِ زندگی عرصہ دراز سے جنگلات پر مرکوز رہا ہے۔ اور انھوں نے اکثریتی قبائل کی بہ نسبت کافی دیر بعد کاشتکاری کو اپنایا ہے۔ مدناپور کے لودھوں اور پورولیا کے کھریاؤں پر کبھی جرائم پیشہ قبائل کا نام چسپاں کر دیا گیا تھا۔

مدناپور کے لودھوں اور پرولیا کے کھریاؤں پر کبھی جرائم پیشہ قبائل کا نام چسپاں کر دیا گیا تھا۔ گو بعد میں یہ لیبل ہٹا لیا گیا لیکن سماج، انتظامیہ اور پولیس انھیں ابھی تک جرائم پیشہ ہی سمجھتی ہے

گو بعد میں یہ لیبل ہٹا لیا گیا لیکن سماج، انتظامیہ اور پولیس انھیں ابھی تک جرائم پیشہ ہی سمجھتی ہے۔ کسی نے بھی یہ دیکھنے کی کوشش نہیں کی ہے کہ کتنے کھریا مغربی بنگال اور بہار کی جیلوں میں سڑ رہے ہیں یا کس جرم کی پاداش میں، وہ نہیں جانتے۔ یہ بتلانے کی ضرورت نہیں ہے کہ قبائل، خاص کر اقلیتی قبائل کو ایک مدت سے بنیادی انسانی حقوق سے محروم رکھا جا رہا ہے۔ لودھوں اور کھریاؤں کی زندگی خطرات سے بھری ہوئی ہے کیوں کہ گاؤں اور قصبے کے بااثر افراد ان میں سے کچھ لوگوں کو چوری اور لوٹ مار میں لگا دیتے ہیں۔ خبر دو

میں لودھوں کا ذکر اس وقت آتا ہے جب وہ مارے جاتے ہیں۔ اس کے بعد انھیں بھلا دیا جاتا ہے، پولیس اور جنگلات کے عملے کے ہاتھوں بہت سے لودھ مارے جا چکے ہیں اور بہت سے کھریا پکڑے جا چکے ہیں، لیکن آج تک کسی نے بھی چوری کا مال پانے والے امیر اور طاقتور لوگوں کو چھوا تک نہیں ہے۔

یہ مسئلہ حکومت کی جنگلات سے متعلق پالیسی سے قریبی نسبت رکھتا ہے جو یا درخت لگاتا ہے وہ جنگلات کو برباد نہیں کرتا۔ عمارتی لکڑی کے سوداگر اور جنگلات کے ٹھیکیدار اکثر محکمۂ جنگلات کے عملے کی چشم پوشی سے جنگلات کو برباد کرتے ہیں۔ اور لکڑی اور جنگلات کی پیداوار کو اسمگل کرتے ہیں۔ انھیں بڑھنے اور پنپنے دیا جاتا ہے اور قومی دولت ضائع ہوتی رہتی ہے۔ جنگلات کا جو قانون آنے والا ہے اس سے بھی یہی ہوگا کہ صرف درخت گرانے والے غریب کو ہی سزا دی جائے گی اور اصل لٹیرے اس کی گرفت سے باہر رہیں گے۔ اس صورتِ حال نے

نچلی سطح کے لوگوں کو خود اپنی تنظیمیں بنانے پر مجبور کر دیا ہے۔ سماج، حکومت اور دوسروں سے ہمدردی نہ ملنے کے سبب یہ لوگ انتہائی مایوسی کا شکار ہو گئے تھے اور یہ محسوس کرنے لگے تھے کہ ان کا وجود خطرے میں ہے۔ دراصل وہ محسوس کرتے ہیں اور پوری شدت سے کرتے ہیں کہ مرکزی اور ریاستی حکومتوں نے انھیں نظر انداز کر دیا ہے۔ پالامئو کے بندھوا مزدوروں نے خود اپنی کمیٹی بنائی ہے۔ مغربی بنگال کے لودھوں اور کھریاؤں

نے بھی ایسا ہی کیا ہے۔ یہ تنظیمیں اپنے بنانے والوں کو کیا دے سکتی ہیں؟ ٹھیک ہے کہ انھوں نے پالامئو کے نیلامبر اور پیتامبر یا سنتھل پرگنوں کے سِدو اور کنہو، یا رانچی کے برسا منڈا جیسے نام نہیں رکھے ہیں، لیکن وہ ان تنظیموں میں جمع ہو کر اپنی کھوئی ہوئی شخصیت دوبارہ حاصل کرنے کی کوشش کر سکتے ہیں۔ یہ سمیتیاں ان کے اندر شان و شوکت کا احساس پیدا کرتی ہیں اور وہ بھی ان کو اپنا سمجھ کر ان سے چپٹے رہتے ہیں۔ ان سمیتیوں کے ذریعے وہ یہ محسوس کرنے کی کوشش کر سکتے ہیں کہ وہ بھی انسان ہیں۔ یہ میرا تجربہ ہے اور میں نے خود اپنی آنکھوں سے یہ سب دیکھا ہے۔

کیوں اور کیسے؟

اب میں پہلے یہ بتاؤں گی کہ ان میں سے کچھ تنظیمیں کیسے اور کب وجود میں آئیں۔ اس کے بعد میں یہ بتاؤں گی کہ وہ کیا کام کر سکتی ہیں۔ اور انھیں کن خطرات کا سامنا ہو سکتا ہے۔ اس کے بعد میں یہ بتاؤں گی کہ میں یہ کیوں محسوس کرتی ہوں کہ مختلف ناموں والی ان تنظیموں کو سنجیدگی سے لیا جائے تو اب بھی نچلی سطح پر غریبی کم کی جا سکتی ہے۔

پالامئو ضلع بندھوا مکتی مورچہ کی تشکیل چینپور پولیس اسٹیشن کے دائرۂ اختیار میں آنے والے گاؤں سمرا میں یکم مئی ۱۹۸۱ کو عمل میں آئی تھی۔ یہ بہت سے گاؤں کے بندھوا لوگوں کی کوششوں اور ایک مقامی جرنلسٹ ڈالٹین گنج کے مشفقانہ اشتراکِ عمل کا نتیجہ تھا اور مجھ جیسے چند اور باہر کے لوگ تماشائی تھے۔ میں سمجھتی ہوں کہ بھارت میں یہ پہلا موقع تھا کہ زراعتی شعبے کے بندھوا مزدوروں نے ایسا قدم اٹھایا۔

مغربی بنگال کے لودھوں نے تھک ہار کر اپنی ایک تنظیم بنائی اور اسے ۱۹۶۲ء میں رجسٹر کروایا۔ لیکن یہ بھاری مشکلات درپیش آنے کی وجہ سے کام نہ کر سکی۔ صرف ۱۹۷۹ء اور ۱۹۸۲ء کے درمیان ۳۴ لودھ مارے گئے۔ لودھوں نے مایوسی و بے بسی کے عالم میں اپنی تنظیم کی تجدید کی اور اس کے گرد جمع ہو گئے۔ جولائی ۱۹۸۲ء میں لودھوں کے قتل کے بعد لودھ تنظیم نے گوپالی گاؤں میں ایک میٹنگ بلائی جس میں نو پولیس اسٹیشنوں کے گاؤں کے مقررین نے تقریریں کیں۔ انھوں نے مجھے اچھے الفاظ سے مرتب کی ہوئی ایک یادداشت بھیجی جس پر بہت سے لوگوں کے انگوٹھوں کے نشان اور کچھ لوگوں کے دستخط تھے، وزیر اعلیٰ کو بھیجے گئے ان کے کھلے خط کی نقل میں صاف الفاظ میں یہ لکھا ہوا تھا کہ آزادی کے ۳۵ سال بعد وہ جانوروں کی طرح قطار میں کھڑے نہیں ہوں گے۔

کھریا شاور سمیتی کی داغ بیل پورولیا کے مالدیا گاؤں میں نومبر ۱۹۸۳ء میں پڑی۔ پہلی مرتبہ دوُر دراز کے گاؤں کے کھریا ہزاروں کی تعداد میں جمع ہوئے۔ ان کے مطالبات بہت واضح تھے۔ وہ انسانوں کی طرح زندگی گزارنا چاہتے تھے۔

مغربی بنگال منڈا سماج سنگنا رگنتر ایام کی تنظیم منڈا لوگوں نے ۱۹۶۰ء کے بعد کے برسوں میں بنائی مگر اس کا رجسٹریشن ۱۹۸۱ء میں ہوا۔

سمیتیوں کا کردار

یہ سمیتیاں کیا کام کر سکتی ہیں اور انھوں نے کیا کام کیا ہے۔ میں یہ واضح کر دوں کہ پالامئو کے غیر بندھوا غریب بھی ضلع مورچہ کو اپنی تنظیم سمجھتے ہیں۔ کیوں کہ انتہائی غربت انھیں رشتۂ اعتماد میں باندھے ہوئے ہے اس لیے ضلع سمیتی میں تمکھیا یا گالوؤں کے نمائندے شامل ہیں۔ گذشتہ برسوں میں انھوں نے سیکڑوں فہرستیں تیار کی ہیں جن میں شامل ہیں:۔

۱۔ بندھوا مزدوروں کے نام، ان کے مالکوں کے نام مع تفصیل، بندھوا پن کی مدت، اصلی قرضہ جو لیا گیا اور رہائی کے لیے طلب کی گئی رقم نیز نسل در نسل بندھوا پن، جاری رہنا۔

۲۔ غیر بندھوا غریب، زمین نہ ہونے کے بارے میں تفصیلات، آب پاشی اور پینے کے پانی کی ضروریات، چھوٹے قطعاتِ اراضی پر کاشتکاری میں مدد۔

لودھ بشاور کافی آگے آئے ہیں انھوں نے کس رہنمائی کے بغیر زمین، آمدنی، حکومت سے ملی ہوئی امداد، اسکول جانے والے بچوں کی تعداد، ناراض ہجوم کے ہاتھوں مارے گئے لودھوں کی تعداد وغیرہ کے بارے میں مفصل فہرستیں تیار کی ہیں۔

کھریا بھی اس طرح کی فہرستیں اور جنگل کی زمین سے بے دخلی کے کیسوں کی تفصیلات مرتب

> منصوبے ایسے ماہرین بناتے ہیں جنھیں اُن لوگوں کے بارے میں صحیح اور تازہ ترین معلومات حاصل نہیں ہوتیں جن کی مدد کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ ایک بار جب منصوبہ یا اسکیم بن جاتی ہے تو اسے اس طرح عملی جامہ پہنایا جاتا ہے کہ جس کو فائدہ پہونچانا مقصود ہوتا ہے، وہ ہمیشہ کی طرح محروم ہی رہتا ہے۔

کر رہے ہیں۔ پورو لیا کے کھریا آبادی کے بہت سے گاؤں میں ابھی تک چھوٹے چھوٹے ندی نالے ہی پانی کی فراہمی کا واحد ذریعہ ہیں۔

منڈا گنجرانے ایسی جگہوں کی فہرستیں تیار کی ہیں جہاں آب پاشی کی سہولیات کی ضرورت ہے۔ ان سب تنظیموں نے تعلیم یافتہ بے روزگاروں کی فہرستیں تیار کی ہیں۔ میرے پاس دوسرے قبیلوں، ذاتوں اور تنظیموں کے بھی سیکڑوں نام ہیں۔ لیکن میں اس مختصر مضمون میں ان سبھی کا ذکر نہیں کر سکتی۔

مذکورہ بالا تینوں تنظیموں میں سے ہر ایک جو کام کر رہی ہے وہ حکومت کو کرنا چاہیے تھا۔

پالامئو میں ضلع حکام تنظیم کے معاون رول کو تسلیم کرنے میں ناکام رہے ہیں۔ صرف چند مہربان افسروں کو چھوڑ کر باقی انتظامیہ کا رویہ مخالفانہ رہا ہے۔ حتیٰ کہ بندھوا مزدوروں کو تنظیم میں شامل ہونے پر سنگین نتائج بھگتنے کی دھمکی دی جاتی ہے، اور انھیں اکثر اوقات یہ کہنے پر مجبور کیا جاتا ہے کہ انھوں نے خود اپنی طرف سے اطلاعات فراہم نہیں کی ہیں بلکہ تنظیم کے لوگوں نے انھیں اطلاعات۔ غلط اطلاعات دینے پر مجبور کیا ہے۔ پالامئو کے بندھوا اور غیر بندھوا غریبوں کی مدد اسی صورت میں کی جا سکتی ہے کہ تنظیم کے رول کو تسلیم کیا جائے اور حقائق کی تصدیق کے بعد ضروری اقدامات کیے جائیں۔ میں نہیں جانتی کہ بندھوا مزدوروں کی بازآباد کاری سے کیا مراد ہے؟ پہلے کس بات کی ضرورت ہے، شناخت کی یا بازآبادکاری کی؟ اور یہ کہنے کا کیا فائدہ ہے کہ بندھوا مزدوروں کے لیے روپے کی کمی نہیں ہے۔

جہاں تک لودھا تنظیم کا تعلق ہے اس کی بے باک کوششوں کے باوجود کم نتائج برآمد ہوئے ہیں۔ کچھ لودھوں کو روزگار ملا ہے۔ ان کی ایک مانگ یہ تھی کہ ترقیاتی کام کے لیے ٹھیکیداری کا طریقہ ختم کیا جائے اور اس کام کی ذمہ داری سمیتی کو سونپی جائے۔ پر ایسا ہوا نہیں ہے۔ لیکن مغربی بنگال کی سرکار نے یہ تو تسلیم کر لیا ہے کہ سب کے سب لودھ جرائم پیشہ نہیں ہیں اور انھیں ترقی کی ضرورت ہے۔

عمدہ ردِ عمل

کھریا سمیتی کی حمایت میں کھریا عوام نے قابلِ تعریف جوش و خروش کا ثبوت دیا ہے۔

> وقت کی سب سے بڑی ضرورت نقطۂ نگاہ میں انقلابی تبدیلی لانا ہے۔ اُن لوگوں کو بھی ساتھ لینا ضروری ہے جن کے لیے اتنا غُل مچایا جاتا ہے۔ ان لوگوں میں ذمّہ داری کا احساس کیسے پیدا ہو سکتا ہے اگر انھیں کبھی کوئی ذمّہ داری نہ سونپی جائے۔

> مَیں سمجھتی ہوں کہ اب وقت آگیا ہے کہ غریبوں کی مدد کرنے میں نچلی سطح کی تنظیموں کے رول کو تسلیم کیا جائے۔ جہاں تک ہو سکے ترقیاتی کام زیادہ تر مختلف سماجی تنظیموں کو سونپے جاتے چاہئیں۔

پورولیا کے کھریا لوگ خوش قسمت ہیں کہ ڈسٹرکٹ سائنس سینٹر کا افسر کم بجٹ والی اسکیموں کے ذریعے ان کی مدد کر رہا ہے اور انھیں کاشتکاری کی طرف راغب کر رہا ہے۔ [illegible] کونسل آف مینیجمنٹ کے [illegible] ہے۔ اس کے سچی لگن رکھنے والے [illegible] رہنما کے ساتھ کھریا لوگوں نے کنوئیں کھودے ہیں، چھوٹے چھوٹے ندی نالوں پر مٹی کے باندھ بنائے ہیں اور سینٹر کے فراہم کردہ آلات اور بیجوں کے ساتھ دھیرے دھیرے کاشتکاری شروع کی ہے۔ آج یہ بات ایک حقیقت بن گئی ہے۔ کھریاؤں کو اب پہلے جتنی صعوبتیں نہیں برداشت کرنی پڑ رہی ہیں۔ یہ بات اپنے آپ میں شاندار سمیتیوں کی سب سے بڑی کامیابی ہے کہ وہ ایک بڑے طبقے کو یہ پیغام دینے میں کس قدر کامیاب رہی ہیں کہ وہ مارنے، پریشان کیے جانے، ناجائز فائدہ اٹھانے اور دوسروں کے فائدے کے لیے استعمال کیے جانے کے لیے نہیں ہیں۔

اور اِن کی مشکلات

مغربی بنگال میں یہ سمیتیاں (اور دوسری سمیتیاں جن کا ذکر یہاں نہیں کیا گیا ہے) عام طور پر کن مشکلات سے دوچار ہوتی ہیں؟ قبائلی تنظیموں کو قریبی سماج اور حکام شک کی نگاہ سے دیکھتے ہیں کہ وہ علیٰحدگی پسند ہو سکتے ہیں، بیرسا منڈا یوم منائے جانے کو بھی سیاسی جماعتوں نے پہلے شک کی نظروں سے دیکھا۔ قبائل کی سماجی بہبود کی تنظیموں کی میٹنگوں میں پولیس عموماً موجود ہوتی ہے۔ لیکن یہ مخاصمت دھیرے دھیرے کم ہو رہی ہے۔ آب پاشی، پینے کے پانی کی فراہمی، رہائشی اسکولوں کی ضرورت اور چھینی ہوئی قبائلی زمینوں کی واپسی نیز مشتہر کیے ہوئے کم سے کم معاوضے کے مطابق روزگار کی فراہمی جیسی مقامی مانگیں پنچایتوں کی طرف سے پیش کی جانی چاہیے تھیں لیکن اگر ایسا نہیں ہوا تو اس سے پنچایتوں کی بے نیازی ظاہر ہوتی ہے۔

قبائلیوں کے لیے ذات کے سرٹیفکیٹ حاصل کرنا بہت مشکل ہے۔

صرف [illegible] صحیح تفصیلات فراہم کر سکتی ہیں۔ لودھوں کی طرح وہ کم بجٹ کی اسکیمیں بنانے کی اہل ہیں۔ لیکن یہ کام بار بار متعلقہ محکموں کو بھیجا جاتا رہا ہے اور ابھی تک اس کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا ہے۔

غریبوں کے سوال پر جو غلطی ہو رہی ہے اس کی بنیاد نقطۂ نگاہ ہی ہے۔ میں نے دیکھا ہے کہ بھارت کے غریب، ان پڑھ یا کم پڑھے لکھے ہونے کے باوجود بے وقوف یا غیر حقیقت پسند نہیں ہیں۔ وہ اپنی صلاحیتوں کو پہچانتے ہیں اور یہ بتانے کی پوری اہلیت رکھتے ہیں کہ انھیں کس بات سے فائدہ پہونچے گا۔ لیکن مغربی بنگال میں، سارے بھارت کی طرح، ان سے کوئی اصلاح نہیں لی جاتی جن کو فائدہ پہنچانا مقصود ہے۔ منصوبے ایسے ماہرین بناتے ہیں جنھیں ان لوگوں کے بارے میں صحیح اور تازہ ترین معلومات حاصل نہیں ہوتیں جن کی مدد کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ ایک بار جب منصوبہ یا اسکیم بن جاتی ہے تو اسے اس طرح عمل جامہ پہنایا جاتا ہے کہ جس کو فائدہ پہونچانا مقصود ہوتا ہے وہ ہمیشہ کی طرح محروم ہی رہتا ہے۔

صحیح نقطۂ نگاہ

نقطۂ نگاہ یہ ہونا چاہیئے کہ دستیاب وسائل کا زیادہ سے زیادہ استعمال کیا جائے۔ یہ سوچنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے کہ کوئی بھی کمیٹ

سے زمین افراد کو کافی قابلِ کاشت زمین دینگی۔ گھر بنانے کے لیے زمین دینا شدید ضروری ہے۔ لودھوں نے اکثر مجھ سے کہا کہ:

"ہمیں مہوا، پیپتا، جیک فروٹ اور امرود جیسے پھل، عمارتی لکڑی اور چارہ دینے والے درخت اور کچھ بکریاں دیجیئے۔" دراصل آج بھی اگر غریبوں کے ساتھ صلاح مشورہ کر کے کم بجٹ والی اسکیمیں بنائی جائیں اور انھیں مناسب رہنمائی کے ساتھ سمیتیوں کے ذریعے زیر عمل لایا جائے تو اس سے بڑی مدد مل سکتی ہے۔ وقت کی سب سے بڑی ضرورت نقطۂ نگاہ میں انقلابی تبدیلی لانا ہے۔

> جن سمیتیوں سے میری دلچسپی ہے اور جن سے میرا واسطہ ہے وہ نچلی سطح کے لوگوں کی سمیتیاں ہیں۔ اگر انھیں ساتھ نہیں لیا جاتا، ان کی شرکت حاصل نہیں کی جاتی اور اگر انھیں اس پر مجبور کیا جاتا ہے جو کچھ انھیں دیا جائے وہ اسی پر قناعت کریں تو اس سے نہ ان کا بھلا ہوگا نہ سماج کا۔

ان لوگوں کو بھی ساتھ لینا ضروری ہے جن کے لیے اتنا غل مچایا جاتا ہے ان لوگوں میں ذمے داری کا احساس کیسے پیدا ہو سکتا ہے، اگر انھیں بھی کوئی ذمہ داری نہ سونپی جائے۔ لودھوں نے خود جو سجھاؤ دیا وہ ٹیگور سوسائٹی کے رورل سائنس سینٹر کی تیار کردہ کم بجٹ کی اسکیموں سے زیادہ مختلف نہیں ہے۔ اگر دیہی معیشت کے استحکام کے لیے غریبوں کو مقامی سوداگروں سے خریدی ہوئی بکریاں (پنچایت کی دی ہوئی بکریاں جلد مر جاتی ہیں) خاصی تعداد میں دی جائیں، مچھلیاں پالنے کے تالاب بنائے جائیں اور گھریلو دستکاریوں کی امداد فراہم کی جائے تو غریبوں کا گذارہ ہو سکتا ہے اور ان کی روزی روٹی چل سکتی ہے۔ ایسا ہونے سے سال کے دوران کام کی تلاش میں ان کے دوسری جگہوں پر جانے کا سلسلہ

بچ جاتا رک سکتا ہے۔ سمیتیاں باقاعدہ سروے کر کے ہی اس بات کا پتہ لگا سکتی ہیں کہ کہاں کس بات کی ضرورت ہے۔

میں سمجھتی ہوں کہ اب وقت آگیا ہے کہ غریبوں کی مدد کرنے میں نچلی سطح کی تنظیموں کے رول کو تسلیم کیا جائے۔ جہاں تک ہو سکے ترقیاتی کام زیادہ تر مختلف سماجی تنظیموں کو سونپے جانے چاہئیں۔ پنچایتوں کو چاہیئے کہ انھیں اپنی ترقی کے لیے کام کرنے دیں۔ کھریا لوگوں نے دکھا دیا ہے کہ وہ فراہم کردہ رقم کے اندر اپنی محنت سے توقع سے بھی زیادہ کنویں کھود سکتے ہیں۔

جن سمیتیوں سے میری دلچسپی ہے اور جن سے میرا واسطہ ہے وہ نچلی سطح کے لوگوں کی سمیتیاں ہیں۔ اگر انھیں ساتھ نہیں لیا جاتا، ان کی شرکت حاصل نہیں کی جاتی اور اگر انھیں اس پر مجبور کیا جاتا ہے جو کچھ انھیں دیا جائے وہ اسی پر قناعت کریں۔ تو اس سے نہ ان کا بھلا ہوگا نہ سماج کا۔ یہ سمیتیاں کیسے کام کریں؟ کون ان کی مدد کرے گا؟ ان کے رول کو فوراً تسلیم کیا جانا چاہیئے۔ چاہے یہ پالامئو کے بندھوا مزدور ہوں یا مغربی بنگال کے شاور قبیلے یا پینٹاریا قبیلے۔ ایک ناخوشگوار حقیقت یہ ہے کہ ان لوگوں نے اپنی سمیتیاں تک تقریباً چالیس سال کی آزادی اور کچھ بیکار منصوبوں سے مایوس ہو کر اپنے تحفظ کے لیے بنائی ہیں۔ بھارت گاؤں میں بستا ہے شہروں میں نہیں۔ پھر ہمیشہ اندھیرا کیوں ہو؟

بُنکر رائے نے کہا:۔

"پہلی دفعہ اعلیٰ افسران نے کسی تحریک یا ترغیب کے بغیر مختلف فوروں میں یہ کہنا شروع کیا ہے کہ اکیلی حکومت ہی غریبوں تک نہیں پہونچ سکتی۔ ان کے پاس سارے مسائل کے حل نہیں ہیں۔ وہ مانتے ہیں کہ غریبوں کی ترقی کے لیے متبادل راستے مختلف طریقے اور مختلف نقطہ ہائے نگاہ موجود ہیں اور ان کا اظہار آزاد اور جمہوری سماج میں منصوبہ بندی کے سارے عمل میں ہونا چاہیئے۔ رضاکارانہ ایجنسیوں کی ترقی و ترویج ایک ایسا ہی اظہار ہے جسے حکومت کو صحیح طور پر تسلیم کرنا چاہیئے۔"

موہت سین نے کہا:۔

"پلان میں شامل پراجیکٹوں پر عمل درآمد کے لیے رضاکار اداروں پر انحصار خواہ وہ جزوی طور پر ہی کیوں نہ ہو، نہ صرف غلط ہوگا بلکہ مُضر بھی، خاص کر ایسے ترقیاتی پروگراموں پر عمل درآمد کے سلسلے میں جو کہ لکھوکھا غریب عوام کو فائدہ پہونچانے کی غرض سے شروع کئے گئے ہیں۔ منصوبے پر عمل درآمد کے سلسلے میں رضاکارانہ اداروں پر کم و بیش انحصار کا معاملہ ایسا ہے جس سے منصوبے اور اس پر عمل درآمد کے تئیں اپنائے گئے رویّے کی گرفت ڈھیلی پڑ جائے گی اور اس سے یہ ثابت ہوگا کہ منصوبے کی عمل آوری میں لاپروائی برتی گئی ہے۔ منصوبہ کیا ہے، یہ ریاست اور حکومت کے ذریعے ہمارے سماجی اور اقتصادی نظام کی کایا پلٹ، اور رہنمائے بڑا اس میں مداخلت کی سب سے اہم صورت ہے جو موٹے طور پر اکثر اس سے مطابقت رکھتی ہے۔"

قبائلیوں کے لیے ذات کے سرٹیفکیٹ حاصل کرنا بہت مشکل ہے۔

صرف [illegible] اپنے [illegible] صحیح تفصیلات فراہم کر سکتی ہیں۔ لودھوں کی طرح وہ کم بجٹ کی اسکیمیں بنانے کی اہل ہیں۔ لیکن یہ کام بار بار متعلقہ محکموں کو سونپا جاتا رہا ہے اور ابھی تک اس کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا ہے۔

غریبوں کے سوال پر جو غلطی ہو رہی ہے اس کی بنیاد نقطۂ نگاہ ہی ہے۔ میں نے دیکھا ہے کہ بھارت کے غریب، ان پڑھ یا کم پڑھے لکھے ہونے کے باوجود بے وقوف یا غیر حقیقت پسند نہیں ہیں۔ وہ اپنی صلاحیتوں کو پہچانتے ہیں اور یہ بتانے کی پوری اہلیت رکھتے ہیں کہ انھیں کس بات سے فائدہ پہونچے گا۔ لیکن مغربی بنگال میں، سارے بھارت کی طرح، ان سے کوئی اصلاح نہیں لی جاتی جن کو فائدہ پہنچانا مقصود ہے۔ منصوبے ایسے ماہرین بناتے ہیں جنھیں اُن لوگوں کے بارے میں صحیح اور تازہ ترین معلومات حاصل نہیں ہوتیں جن کی مدد کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ ایک بار جب منصوبہ یا اسکیم بن جاتی ہے تو اسے اس طرح عملی جامہ پہنایا جاتا ہے کہ جس کو فائدہ پہونچانا مقصود ہوتا ہے وہ ہمیشہ کی طرح محروم ہی رہتا ہے۔

صحیح نقطۂ نگاہ

نقطۂ نگاہ یہ ہونا چاہیے کہ دستیاب وسائل کا زیادہ سے زیادہ استعمال کیا جائے۔ یہ سوچنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے کہ کوئی بھی حکومت بے زمین افراد کو کافی قابلِ کاشت زمین دیگی۔ گھر بنانے کے لیے زمین دینا اشد ضروری ہے۔

لودھوں نے اکثر مجھ سے کہا کہ:

"ہمیں مہوا، پپیتا، جیک فروٹ اور امرود جیسے پھل، عمارتی لکڑی اور چارہ دینے والے درخت اور کچھ بکریاں دیجیے۔" دراصل آج بھی اگر غریبوں کے ساتھ صلاح مشورہ کر کے کم بجٹ والی اسکیمیں بنائی جائیں اور انھیں مناسب رہنمائی کے ساتھ سمیتیوں کے ذریعے زیر عمل لایا جائے تو اس سے بڑی مدد مل سکتی ہے۔ وقت کی سب سے بڑی ضرورت نقطۂ نگاہ میں انقلابی تبدیلی لانا ہے۔ ان لوگوں کو بھی ساتھ لینا ضروری ہے جن کے لیے اتنا غل مچایا جاتا ہے ان لوگوں میں ذمے داری کا احساس کیسے پیدا ہو سکتا ہے، اگر انھیں بھی کوئی ذمہ داری نہ سونپی جائے۔ لودھوں نے خود جو سجھاؤ دیا وہ جھنڈ لیا کے ٹوسٹر کٹ سائنس سینٹر کی تیار کردہ کم بجٹ کی اسکیموں سے زیادہ مختلف نہیں ہے۔ اگر دیہی معیشت کے استحکام کے لیے غریبوں کو مقامی سوداگروں سے خریدی ہوئی بکریاں (پنچایت کی دی ہوئی بکریاں جلد مر جاتی ہیں) خاصی تعداد میں دی جائیں، مچھلیاں پالنے کے تالاب بنائے جائیں اور گھریلو دستکاریوں کی امداد فراہم کی جائے تو غریبوں کا گذارہ ہو سکتا ہے اور ان کی روزی روٹی چل سکتی ہے۔ ایسا ہونے سے سال کے دوران کام کی تلاش میں ان کے دوسری جگہوں پر جانے کا سلسلہ بھی رک سکتا ہے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ غریبوں سے ہی اس بات کا پتہ لگایا جا سکتا ہے کہ کہاں کس بات کی ضرورت ہے۔

میں سمجھتی ہوں کہ اب وقت آگیا ہے کہ غریبوں کی مدد کرنے میں نچلی سطح کی تنظیموں کے رول کو تسلیم کیا جائے۔ جہاں تک ہو سکے ترقیاتی کام زیادہ تر مختلف سماجی تنظیموں کو سونپے جانے چاہئیں۔ پنچایتوں کو چاہیے کہ انھیں اپنی ترقی کے لیے کام کرنے دیں۔ کھڑیاؤں نے دکھا دیا ہے کہ وہ فراہم کردہ رقم کے اندر اپنی محنت سے توقع سے بھی زیادہ کنوئیں کھدوا سکتے ہیں۔

> جن سمیتیوں سے میری دلچسپی ہے اور جن سے میرا واسطہ ہے وہ نچلی سطح کے لوگوں کی سمیتیاں ہیں۔ اگر انھیں ساتھ نہیں لیا جاتا، ان کی شرکت حاصل نہیں کی جاتی اور اگر انھیں اس پر مجبور کیا جاتا ہے جو کچھ انھیں دیا جائے وہ اسی پر قناعت کریں تو اس سے نہ ان کا بھلا ہوگا نہ سماج کا۔

جن سمیتیوں سے میری دلچسپی ہے اور جن سے میرا واسطہ ہے وہ نچلی سطح کے لوگوں کی سمیتیاں ہیں۔ اگر انھیں ساتھ نہیں لیا جاتا، ان کی شرکت حاصل نہیں کی جاتی اور اگر انھیں اس پر مجبور کیا جاتا ہے جو کچھ انھیں دیا جائے وہ اسی پر قناعت کریں، تو اس سے نہ ان کا بھلا ہوگا نہ سماج کا۔ یہ سمیتیاں کیسے کام کریں؟ کون ان کی مدد کرے گا؟ ان کے رول کو فوراً تسلیم کیا جانا چاہیے۔ چاہے یہ پالاموں کے بندھوا مزدور ہوں یا مغربی بنگال کے شاور قبیلے یا بیشتا رنگیے قبیلے۔ ایک ناخوشگوار حقیقت یہ ہے کہ ان لوگوں نے اپنی سمیتیاں تنگ آ کر چالیس سال کی آزادی اور کچھ بہبود منصوبوں سے مایوس ہو کر اپنے تحفظ کے لیے بنائی ہیں۔ بھارت گاؤں میں بستا ہے شہروں میں نہیں۔ پھر ہمیشہ اندھیرا کیوں ہو؟

بُنکر رائے نے کہا:-

"پہلی دفعہ اعلیٰ افسران نے کسی تحریک یا ترغیب کے بغیر مختلف فورموں میں یہ کہنا شروع کیا ہے کہ اکیلی حکومت ہی غریبوں تک نہیں پہونچ سکتی۔ ان کے پاس سارے مسائل کے حل نہیں ہیں۔ وہ مانتے ہیں کہ غریبوں کی ترقی کے لیے متبادل راستے مختلف طریقے اور مختلف نقطہ ہائے نگاہ موجود ہیں اور ان کا اظہار آزاد اور جمہوری سماج میں منصوبہ بندی کے سارے عمل میں ہونا چاہیئے۔ رضاکارانہ ایجنسیوں کی ترقی و ترویج ایک ایسا ہی اظہار ہے جسے حکومت کو صحیح طور پر تسلیم کرنا چاہیئے۔"

موہت سین نے کہا:-

"پلان میں شامل پراجیکٹوں پر عمل درآمد کے لیے رضاکار اداروں پر انحصار خواہ وہ جزوی طور پر ہی کیوں نہ ہو، نہ صرف غلط ہوگا بلکہ مُضر بھی، خاص کر ایسے ترقیاتی پروگراموں پر عمل درآمد کے سلسلے میں جو کہ لکھوکھا غریب عوام کو فائدہ پہونچانے کی غرض سے شروع کئے گئے ہیں۔ منصوبے پر عمل درآمد کے سلسلے میں رضاکارانہ اداروں پر کم و بیش انحصار کا معاملہ ایسا ہے جس سے منصوبے اور اس پر عمل درآمد کے تئیں اپنائے گئے رویئے کی گرفت ڈھیلی پڑ جائے گی اور اس سے یہ ثابت ہوگا کہ منصوبے کی عمل آوری میں لاپروائی برتی گئی ہے۔ منصوبہ کیا ہے، یہ ریاست اور حکومت کے ذریعے ہمارے سماجی اور اقتصادی نظام کی کایا پلٹ، اور رہنمائی نیز اس میں مداخلت کی سب سے اہم صورت ہے جو موٹے طور پر اکثر اُس سے مطابقت رکھتی ہے۔

Regd. No. D(DN) 986
R.N. 97032/81
4 No. 15 & 16

YOJANA(URDU)

Licensed U(DN) to post without pre-payment
at Civil Lines Post Office, Delhi-110 054.
1-30 November 1984 Special Issue

دیہی ترقی اور عوام کی ضرورتوں گویا کہ بنیادی ضرورتوں کے پروگرام کی وسعت، شدت اور حجم اس قدر پھیلا ہوا ہے کہ یہ محسوس کر لیا گیا کہ عوام کی بھلائی، بہبود اور فائدے سے دلچسپی رکھنے والی کسی بھی تنظیم کو آگے بڑھانا چاہیئے، اور اس کی ہمت افزائی کی جانی چاہیئے، تاکہ وہ ان پروگراموں پر عمل درآمد کے لیے پوری قوت سے کام کر سکیں۔ اس عرصے میں کچھ رضاکار اداروں نے از خود ایسی نئی تکنیک اپنائی کہ وہ ملک کے غریب عوام پر براہِ راست اثر انداز ہو سکے۔ انھوں نے ایسی پیشہ ورانہ مہارت حاصل کی جس سے کہ وہ دیہی ترقی اور دیہی عوام کی بہبود کے لیے پروگرام شروع کر سکیں۔ یہ پروگرام اِن پروگراموں سے قطعی مختلف نوعیت رکھتے ہیں، جو کہ ابتدائی دور میں بہبودی سرگرمیوں یا راحت پہونچانے والے پروگرام کے نام سے جانے جاتے تھے۔

سی۔ایچ۔ہنومنتھ راؤ
(رکن منصوبہ بندی کمیشن)

طاقت اور اقتدار کے بھوکے اور روپے پیسے کی ہوس رکھنے والے بیوروکریٹ اور دادا درحقیقت ایسے حالات پیدا نہیں ہونے دیں گے جن میں وسیع پیمانے پر صحت مند رضاکار سیکٹر فروغ پا سکے۔ لہٰذا اس بات کی بآسانی پیشن گوئی کی جا سکتی ہے کہ ہندوستان میں صحیح معنی میں رضاکار سیکٹر کے فروغ پانے کے امکانات نہیں ہیں۔ یہاں رضاکار اداروں کے نام پر جو بھی نام نہاد ایجنسیاں کام کریں گی، وہ محض مقامی حکام اور سیاست دانوں یا بیوروکریسی میں یقین رکھنے والے حاکموں کی ایجنٹ اور کارندہ ہوں گی۔ اس طرح رقوم کے خورد برد کرنے کے لیے یہ ایک اور راستہ فراہم کریں گی۔

پروفیسر راج کرشن (منصوبہ بندی کمیشن کے سابق رکن کے
انٹرویو کا ایک اقتباس)۔

Published by the Director, Publications Division, Patiala House, New Delhi-110001

یوجنا

یکم تا ۱۵ر دسمبر ۱۹۸۴

ایک روپیہ

مبنی بر انصاف اقتصادی نظام
وقت کی اہم ضرورت
(شری راجیو گاندھی)

معاشرتی انقلاب کی جانب
اقتصادی جمہوریت کا مقدمہ
پرائیویٹ سیکٹر کا فروغ
(وسنت ساٹھے)

جوڑوں کے درد کے مریضوں کو امراض قلب
(ڈاکٹر راجن ٹنڈن)

ایک باغ بھی کھل سکتا ہے جب اس میں ہر قسم کے پھول پودے ہوں

شریمتی اندرا گاندھی

اُردو ہماری پرانی تہذیب کی نشانی ہے اور قومی ایکتا کا ایک نمونہ ہے۔ یہ ہندوستان کی قومی زبانوں میں سے ایک ہے جس کا واسطہ کسی خاص فرقے کے ساتھ نہیں ہے۔ اس کے ادب کی بلندی میں بے شمار ہندو، مسلم اور سکھ لکھنے والے اور شاعروں کا تعلق رہا ہے۔ ویسے یہ کسی خاص علاقے میں محدود نہیں رہی ہے اگرچہ اترپردیش، دلّی، بہار اور دکھن میں اس کا معیار باقی جگہوں سے آگے رہا ہے۔ یہ درباری زبان پہلے دکھن میں بنی، لیکن دلّی کے عوام میں یہ کافی عرصے سے ہر دل عزیز تھی۔ اور اس شہر کا اس کی ترقی میں ایک خاص حصہ رہا ہے۔ برج بھاشا، کھڑی بولی اور باقی آس پاس کی بولیوں کا اُردو پر گہرا اثر رہا جس کے نتیجے میں عربی، فارسی اور سنسکرت کے ساتھ عام لوگوں کی زبان کے سمیت ہماری ملی جلی ثقافت کی یہ ایک خوب صورت تصویر بن گئی۔

آج ہمارا دیش کئی مشکلات اور دشواریوں سے دوچار ہے، ان کا سامنا کرنے کے لیے سب سے ضروری ہے اتحاد۔ مختلف ریاستوں اور فرقوں میں فرق ہو سکتے ہیں۔ ہم کسی کی انفرادیت میں کمی نہیں لانا چاہتے۔ ایک باغ تبھی کھل سکتا ہے جب اس میں ہر قسم کے پھول پودے ہوں۔ ہمیں احساس ہے کہ ایک خاندان کئی فرد کا بنا ہوتا ہے، لیکن جس طرح اس میں غلط فہمیاں، ہمدردی اور پیار سے سلجھائی جاتی ہیں اسی طرح ملک کے لوگوں کے آپس کے جھگڑے سلجھانے جانے چاہئیں۔ یہ تب ہی ممکن ہو سکتا ہے جب ہم ایک دوسرے کی تکلیفیں ... میں شریک ہوں۔ انفرادیت کا مطلب یہ ... نہیں کہ ہم ایک دوسرے ... جب تک یہ انفرادیت ... حدود میں سمائی رہے ... کا ایک ذریعہ بن سکتا ... نفرت اور تشدد پھیلا ... اس سے دیش ٹوٹ جاتا ... کو ہم قائم رکھنا چاہتے ہیں، ... میں پڑ جاتی ہے۔

صدیوں سے ہمارے بزرگ ... وحدت الوجود کا ہمیں سبق سکھا ... بھکتی تحریک کے تھے اور یہی تھا ... انھیں خیالات کے سنگم سے، سکھ مذ... ہوا اور اس طرح ہندوستان کے ہر ... میں آپس کا گہرا رشتہ بنا۔ عوام کے آپسی ... وقت سے ہمدردانہ اور برادرانہ رہے۔ ... یہ ہے کہ ہندوستان کے عوام ہمیشہ اپنے کو ... ملک کی رعایا سمجھتی رہی۔ اس کے باوجود کہ ملک ... سیاسی اتحاد کم ہی عرصے کے لیے رہا، افسوس ہے کہ صدیوں کی خواہش کے بعد جب آج ہم سیاسی طور پر عوام کی رضامندی کے ساتھ ایک متحد ملک بن چکے ہیں، کچھ قوم دشمن عناصر یہ کوشش کر رہے ہیں کہ ہمارے بیچ پھوٹ پیدا کی جائے، وہی طریقے استعمال میں لائے جا رہے ہیں جنھیں انگریزوں نے ہمیں دبانے اور کمزور رکھنے کے لیے استعمال کیا۔ ہمیں ایسی سازشوں کو ناکام بنانا ہے۔ یہ سازشیں صرف ہندوستان میں نہیں چل رہی ہیں، یہ ایک ملک اور دوسرے ملک کے بیچ میں چل رہی ہے، اور دوسرے ملکوں کی بھی جو انصاف کی لڑائیاں ہیں، ان کو کمزور کرنے کے لیے بھی اس طرح کی کوششیں جاری ہیں۔

علامہ اقبال نے جب "سارے جہاں سے اچھا ...ستان ہمارا" اور اسی طرح کی دوسری بہت سی ... لکھیں تو انھوں نے نہ صرف بھارت کی ایکتا بلکہ ... کی انسانی برادری کی ایکتا پر زور دیا۔ ہمارے ... بہت ... اونچے درجے کے انسان تھے جنھوں ... کی لڑائی میں خدمات انجام دیں۔ ... کی لڑائی میں بھی اُردو کے لکھنے والوں، ... نے سب سے آگے بڑھ کر حصہ لیا۔ ... اسی اُردو کی دین ہے اور اس کی ... سب سے بڑے انگریزی سامراج کو ... پر مجبور کیا۔ آزادی کی لڑائی ... میں جو نغمے ترانے زیادہ تر ...

... ہر ایک دیش پر سیاسی ... بین الاقوامی دباؤ ہیں بھی ... کرنا سب کا پہلا فرض ... مضبوط بنانا نہیں بلکہ ... کرنا بھی ہے۔ آجکل کے ... ترقی کے عمل کے نتیجے ... ساتھ، فرقوں کی ... کی بات ... اہمیت ... ایسی ...

منصوبہ بندی اور ترقیاتی پروگراموں کی جھلک پیش کرنے والا

پندرہ روزہ

یوجنا

نئی دہلی

چیف ایڈیٹر ٭ آر۔ ٹھکرال
ایڈیٹر ٭ لکھی رام رانا
اسسٹنٹ ایڈیٹر ٭ محمد عادل صدیقی
سب ایڈیٹر ٭ وسیم حیدر

جلد ۴	یکم تا ۱۵ دسمبر ۱۹۸۴	شمارہ ۱۷

۱۰ تا ۲۴ اگرہائن شک سمبت ۱۹۰۶ ٭ فون: ۳۸۷۳۴۱

شرح چندہ

سالانہ ۲۰ روپے۔ دوسالہ ۳۵ روپے، سہ سالہ ۵۰ روپے
فی کاپی: ایک روپیہ

طالب علموں، استادوں اور لائبریریوں کے لیے ۱۰ فی صد کی رعایت

اس شمارے میں

یوجنا منصوبہ بندی کے بارے میں عوام کو آگاہ کرتا ہے، مگر اس کے مضامین صرف سرکاری نقطۂ نظر کی وضاحت تک ہی محدود نہیں ہیں

بزنس منیجر: ایل۔ آر۔ بیترہ ٭ اسسٹنٹ ڈائرکٹر (پروڈکشن) آر۔ ایس۔ منچال

مضامین سے متعلق خط و کتابت کا پتہ:
ایڈیٹر "یوجنا" (اردو) پبلیکیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس
نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

ترسیل زر کا پتہ:
بزنس منیجر، پبلیکیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس
نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

اداریہ

کیا شریمتی اندرا گاندھی ہم سے جدا ہو گئیں؟

قوم نے اپنی اشکبار آنکھوں سے ملک وقوم کی عظیم ترین ہستی شریمتی اندرا گاندھی کو الوداع کہا۔ نہ صرف ہندوستان بلکہ پوری عالمی برادری نے بچشم نم انھیں خراج عقیدت پیش کیا۔ لیکن یہ ظاہری فرقت ضرور ہے تاہم ان کے نظریات ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ہمارے لیے مشعل راہ بنیں گے۔ اندرا گاندھی کی شخصیت ایک ایسی شخصیت تھی کہ وہ عمر بھر عوامی زندگی میں اس طرح رچ بس گئی تھیں کہ ان کے بغیر ہندوستان کا تصور ہی ممکن نہیں۔ اندرا گاندھی نوع انسانی کی قیادت کا مرکز و محور بن گئی تھیں۔ دنیا کی تاریخ میں ایسی مثالیں کم ہی ملیں گی کہ ایک واحد ہستی پورے ملک کی تقدیر کی علامت بن گئی ہو۔ وہ ہندوستان کے وقار اور خود اعتمادی کے تصور کا ایک جیتا جاگتا نمونہ تھیں۔ انھیں موت کے بے رحم ہاتھوں نے ایسے وقت ہم سے چھین لیا جب کہ ساری دنیا ان کی شخصیت اور اہمیت کو تسلیم کر چکی تھی۔ ملک کی سالمیت، استحکام ترقی کے لیے ان کی عظیم خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ ہندوستان کی عاس مایۂ ناز اور عظیم ہستی کی موت نے اس ملک کو سیاسی اور معاشی ترقی کے انتہائی نازک مرحلے میں بھرپور لگن اور بے پناہ ذہانت و محنت سے کام کرنے والی ایک رہنما سے محروم کر دیا ہے۔ موت سے قبل مسز گاندھی کا یہ فرمان رہتی دنیا تک زبان زد عام رہے گا کہ اگر میں ملک کی خدمت کرتے ہوئے مر بھی جاؤں تو میں اس پر بے حد فخر محسوس کروں گی۔ مجھے یقین ہے کہ میرے خون کا ایک ایک قطرہ اس ملک کی ترقی کے لیے اور اسے ایک طاقتور اور بلند و بالا ادارے کا مالک بنانے کے لیے کام کرے گا۔

صدر جمہوریہ گیانی ذیل سنگھ نے اس موقع پر اپنے تعزیتی پیغام میں کہا کہ "ہم سب اپنے ملک کے ایک عظیم ترین لیڈر سے اور دنیا امن کے علمبردار سے جو بلاشبہ بنی نوع انسان کی تاریخ میں عظیم خاتون رہنما تھیں، محروم ہو گئے ہیں"۔ نائب صدر جمہوریہ شری آر۔ وینکٹ رمن نے اس موقع پر اپنے افسوس کا اظہار کرتے ہوئے کہا" ان کی موت سے قوم کو جو دکھ ہوا ہے، اسے قومی یکجہتی اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی کے ساز میں بدل دینا چاہیے جس کے لیے ہماری محبوب رہنما اپنی زندگی کے آخری سانس تک نبرد آزما رہیں۔ اندرا جی مہاتما گاندھی کے نقش قدم پر چل کر شہید ہو گئیں"۔

(باقی صفحہ پر)



"اندرا گاندھی کی وفات ہو گئی ہے لیکن ان کی روح زندہ ہے۔ بھارت زندہ ہے۔ بھارت امر ہے۔ بھارت کی روح امر ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ ملک اپنی ذمہ داری کو سمجھے گا، اور ہم اس بوجھ کو ہمت وعزم کے ساتھ اٹھائیں گے"۔ (وزیر اعظم شری راجیو گاندھی)

شری راجیو گاندھی

مبنی بر انصاف اقتصادی نظام وقت کی اہم ضرورت

ہندوستان کے نئے وزیر اعظم شری راجیو گاندھی نے ۱۲ر نومبر کو قوم کے نام ایک نشریے میں ملک کی اقتصادی، سیاسی اور خارجہ پالیسی سے متعلق وضاحت کی اور کہا کہ حکومت، سماج واد، منصوبہ بندی اور ملی جلی معیشت کی پالیسی پر کاربند رہے گی۔ مسٹر راجیو گاندھی نے کہا کہ شری جواہر لال نہرو نے سیاسی اور تکنیکی اعتبار سے جدید بھارت کی بنیاد ڈالی تھی تاکہ یہ ملک جمہوریت، سیکولرازم، سماج واد اور ناوابستگی کے اصولوں پر آگے بڑھ سکے۔ شریمتی اندرا گاندھی نے انھیں بنیادوں پر ملک کو مضبوط بنانے کی کوشش کی۔ انھوں نے کہا کہ وہ داخلی اور خارجی معاملات میں اپنی والدہ کی پالیسیوں پر قائم رہتے ہوئے تعلیمی نظام میں اصلاح کریں گے۔ مسٹر گاندھی نے عرب دنیا، جنوب مغربی، جنوب مشرقی ایشیا، مشرق بعید، بحرالکاہل، افریقہ، لاطینی امریکہ، کیریبین اور مغربی اور مشرقی یورپ کو یقین دلایا کہ ہم ان کے ساتھ سیاسی اور اقتصادی تعلقات کو مضبوط بنانے کی خواہش رکھتے ہیں۔ انھوں نے اس بات کا اعادہ کیا کہ ان کی حکومت سوشلزم اور منصوبہ سازی کے اصولوں پر کاربند رہے گی۔ اور جدید کاری اور پیداوار میں اضافے کی پالیسی کو جاری رکھے گی اور ایسا انتظام کرے گی جس سے عوام کو تیزی کے ساتھ سماجی انصاف حاصل ہو سکے۔ انھوں نے کہا کہ حکومت اس بات کا تہیہ کئے ہوئے ہے کہ شیڈولڈ کاسٹ، شیڈولڈ ٹرائب، پسماندہ طبقوں، کاریگروں اور زرعی مزدوروں کا معیار زندگی بلند ہو نیز سوہ گیہ وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی کے سماجی، اقتصادی ترقی کے بیس نکاتی پروگرام پر جس کا مقصد عوام کی فوری ضرورتوں کو پورا کرنا ہے، ایمانداری کے ساتھ عمل درآمد کی رفتار تیز ہو۔ انھوں نے کہا کہ ملک کی سب سے بڑی دولت اس کے عوام ہیں اور ہمیں انھیں اس قابل بنانا ہے کہ افراد اور ان کے خاندان اپنی امکانی قوت کو پوری طرح محسوس کریں۔ انھوں نے مزید کہا کہ اس کے لیے حکومت خاندانی منصوبہ بندی، غذائیت، عورتوں اور بچوں کی فلاح و بہبود، بیماریوں پر کنٹرول، ابتدائی تعلیم اور بالغوں کی تعلیم، کھیل اور بہتر صحت کی طرف توجہ دے گی۔ اس کے ساتھ ہی مزدوروں اور کسانوں کے مسائل پر بھی توجہ دے گی جو ملک کی معیشت کے لیے ستون کا درجہ رکھتے ہیں۔ انھوں نے اعلان کیا کہ ہندوستان صرف ایک ہے اور یہ سب کا ہے۔ شری راجیو گاندھی نے کہا کہ شریمتی اندرا گاندھی نے ہم میں خود اعتمادی پیدا کی اور بامقصد طریقے پر آگے بڑھنا سکھایا۔ انھوں نے ملک و قوم کو اس کا کھویا ہوا وقار واپس دلایا۔ یہ ایک قیمتی ورثہ ہے جس کی حفاظت کے لیے میں عہد کرتا ہوں۔



وزیر اعظم ہند شری راجیو گاندھی

انھوں نے کہا کہ ہماری قومیت کا بنیادی اصول سیکولر ازم ہے۔ اس سے مراد محض رواداری ہی نہیں بلکہ اس سے بھی زیادہ ہے۔ یہ آپس میل جول کی سرگرم کوشش ہے۔ کوئی بھی مذہب نفرت، تشدد، عدم رواداری کا سبق نہیں دیتا۔ داخلی اور خارجی مفادات، فرقہ وارانہ جذبات کو اُبھار کر اُن سے ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اس طرح کی تشدد آمیز حرکتوں سے وہ ملک کو تقسیم کرنا چاہتے ہیں۔ اگر فرقہ واریت کا جواب فرقہ واریت سے ہی دیا گیا تو اس سے ان علیحدگی پسند اور انتشار پسندانہ قوتوں کو مدد ملے گی۔ عوام اور سرکار کی ملی جلی کوشش ان مذموم عزائم کا سدباب کر سکتی ہے۔

ہمارے ملک میں غریبی کا جلد سے جلد خاتمہ ہو۔ یہی ہمارا بنیادی نصب العین ہے۔ حکومت کی جانچ اور پرکھ کے لیے یہی پیمانہ ہے کہ وہ کس حد تک عوام کے معیارِ زندگی میں تبدیلی لا سکتی ہے۔ پانچ سال قبل جب عوام نے اندراجی کے ہاتھ میں زمام اقتدار دی تو انھوں نے ایک موثر سرکار کے لیے وعدہ کیا تھا چنانچہ انھوں نے اپنا وعدہ نبھایا۔ خوراک کی پیداوار اور انرجی کی تیاری نے کامیابی کے نئے ریکارڈ قائم کئے ہیں۔ سائنس نے ترقی کی نئی منزلیں طے کی ہیں، صنعت نے آگے کی طرف قدم بڑھایا ہے، روزگار کے مواقع بڑھ رہے ہیں، ملک کی معیشت نے انتہائی سخت قدرتی آفات اور بین الاقوامی بحران کا سامنا کیا ہے۔

دنیا میں ہندوستان کی سیاسی اور اقتصادی ساکھ آج ہمیشہ سے زیادہ ہے۔ منصوبہ بندی کے بغیر ہم وہاں نہ ہوتے جہاں کہ ہم آج ہیں۔ ہمارا مقصد جدید کاری کو مسلسل توسیع دینا ہے، اور پیداواری صلاحیت بڑھانا ہے۔ ہماری منصوبہ بندی میں دیہی ترقی کو ترجیح دی جائے گی، غلّہ، دالوں اور تلہنوں کی پیداوار بڑھائی جائے گی، آبپاشی کی سہولتوں میں اضافہ کیا جائے گا، چھوٹے پیمانے کی صنعتوں کو بڑھاوا ملے گا، دستکاریوں کو فروغ دیا جائے گا۔ نئی ٹکنالوجی کا ہمہ جہت فروغ ہوگا۔ دیہی اور شہری نوجوانوں کو بطورِ خاص روزگار فراہم کرانے پر زور دیا جائے گا۔ تاکہ اقتصادی نابرابری کو کم کیا جا سکے۔ اور سماجی امن کو یقینی بنایا جا سکے۔ اس مقصد کے لیے زراعت اور صنعت میں اعلیٰ نشانے حاصل کئے جائیں گے۔ پبلک سیکٹر نے معیشت کو جدید بنانے میں اہم کردار ادا کیا ہے، اس کو زبردست ذمہ داریاں نبھانی ہیں۔ اور سرمایہ کاری کے لیے فاضلات حاصل کرنے ہیں۔ قومی پالیسیوں کے اندر رہتے ہوئے پرائیویٹ سیکٹر کی توسیع کے کافی امکانات ہیں۔ اسے لاگت کم کر کے اور نئی ٹکنالوجی کا سہارا لے کر منڈی کے مقابلے کی سکت پیدا کرنی ہے۔ پبلک اور پرائیویٹ سیکٹر کو معیشت کے نئے نئے گوشوں میں قدم رکھنا ہے۔ سامان کو معیاری بنانا ہے اور دیسی ٹکنالوجی کے فروغ کے لیے کام کرنا ہے۔ کسان اور مزدور ہماری معیشت کے اہم ستون ہیں۔ ان کی بہبود پر ہمیں زیادہ توجہ دینی ہوگی۔

انھوں نے کہا کہ ہم عالمی سطح پر پائی جانے والی اقتصادی نابرابری کو کم سے کم کرنے کے لیے بھرپور کوششیں جاری رکھیں گے۔ انھوں نے پڑوسی ملکوں کے ساتھ قریبی اور دوستانہ تعلقات کی خواہش کا اظہار کیا۔

ملا تھا، اس کو بنیاد بنا کر انھوں نے قوم اور انسانیت کے مستقبل کو روشن ترین بنانے کی کوشش کی۔ ان کے زیرِ قیادت ہندوستانی سماج میں زبردست تبدیلیاں دیکھنے کو ملیں۔ ان کے دور کے تاریخی فیصلے اس ملک کے عوام کی اقتصادی حالت میں بنیادی تبدیلی لانے میں اہم سنگِ میل ثابت ہوں گے۔ انھوں نے ملک و وطن کے اتحاد کے لیے آخری دم تک کام کیا۔ انھوں نے ہندوستان کی معیشت کو جدید، خود کفیل اور متحرک بنانے کی بھرپور کوشش کی۔ ان کے دور میں اقتصادی محاذ پر دُور رس تبدیلیاں عمل میں لائی گئیں۔ سائنس اور ٹکنالوجی کی جدید پیش رفتوں سے ملک کو ہمکنار کرنا ان کا محبوب مشغلہ تھا۔

وہ دفاعی افواج کو جدید لائنوں پر لانے، ملک کے ثقافتی ورثے کا تحفظ کرنے اور ماحول کو صاف ستھرا بنانے سے خصوصی دلچسپی رکھتی تھیں۔ معذور افراد کی بہبود، مستحق لوگوں کی امداد اور شیڈولڈ ٹرائب اور شیڈولڈ کاسٹ افراد کی ترقی کے کاز کے لیے انھوں نے خود کو پابند کر لیا تھا۔ وہ شب و روز ان کی بہبود کی سرگرمیوں پر غور و خوض ہوا کرتی تھیں۔ عالمی سطح پر ہندوستان کا وقار بلند کرنے کے لیے انھوں نے جو متعدد اقدامات کئے، ان میں ہندوستان میں ایشیائی کھیلوں کا انعقاد اور ناوابستہ تحریک کی قیادت خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔ چنانچہ مارچ ۱۹۸۳ میں نئی دلی میں ناوابستہ اقوام کی چوٹی کانفرنس میں شریمتی اندرا گاندھی کو اس تحریک کا صدر چن لیا گیا۔ ۱۹۷۱ میں شریمتی اندرا گاندھی کو ملک کا اعلیٰ ترین اعزاز بھارت رتن ملا۔ اس بارے میں شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہیں کہ مہاتما گاندھی اور شریمتی اندرا گاندھی نے ملک کے اتحاد کو باقی رکھنے کے لیے اپنی زندگیوں کی جو عظیم ترین قربانیاں دی ہیں، ان کی گونج صدیوں تک باقی رہے گی۔ بقول شاعر ؎

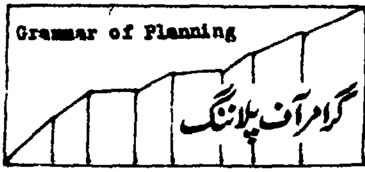
مرنے والے مرتے ہیں لیکن فنا ہوتے نہیں
یہ حقیقت میں کبھی ہم سے جدا ہوتے نہیں

(ایڈیٹر) ★

بقیہ: اداریہ

اندراجی نے اس دنیا سے رخصت ہو کر تاریخ میں ایک منفرد اور نمایاں مقام بنا لیا ہے، لیکن یہ جسمانی موت انھیں عالمی منظر نامے سے نہیں ہٹا سکتی۔ انسانی برادری کے آپسی تعلق کو خوشگوار بنانے کا جو عمل انھوں نے شروع کیا تھا، وہ آئندہ نسلوں کے لیے مشعلِ راہ ہوگا۔ وہ ماضی اور حال کے درمیان ایک اہم کڑی تھیں۔ گاندھی اور نہرو سے جو ورثہ ہمیں

ر۔ آر۔ دوبھاشی



منصوبہ بندی پر عمل درآمد

پچھلے باب میں مصنف نے منصوبہ بندی کی تنظیم کے ڈھانچوں سے بحث کی تھی۔ اس میں اس سلسلے کی تنظیمی ساخت، افرادی قوت کی وسعت اور اس کی نوعیت اور ہیئت سے بحث کی گئی تھی اور یہ بتایا گیا تھا کہ یہ تمام اجزاء مختلف انتظامی اور اقتصادی نظاموں کی ضرورت کو کس حد تک پورا کرتے ہیں۔ اس میں ان عناصر سے بحث کی گئی ہے جو منصوبہ بندی کے پروگراموں پر کامیابی کے ساتھ عمل درآمد کے لیے ضروری ہیں منصوبہ بندی کی کامیابی محض اس کے داخلی استحکام سے ہی نہیں پرکھی جاتی یا طریقہ کار کے جدید ہونے پر ہی اس کا انحصار نہیں ہے بلکہ دیکھنا یہ ہوتا ہے کہ منصوبے پر کس حد تک کامیابی سے عمل درآمد ہوا ہے۔ عمل درآمد منصوبہ بندی کا ہی جز ولازم ہے۔

منصوبے کی دستاویزات کی محض تیاری سے ہی منصوبہ بندی کا عمل پایۂ تکمیل کو نہیں پہونچتا۔ یہ عمل درآمد کے بعد ہی پایۂ تکمیل کو پہنچتا ہے، لہٰذا عمل درآمد منصوبہ بندی کا جزو لازم ہے۔ منصوبے کی تشکیل اور اس پر عمل درآمد دراصل ایک ہی سکے کے دو رُخ ہیں اور ان دونوں میں مسلسل ایک ربط قائم رہتا ہے۔ منصوبہ بندی کی کامیابی محض داخلی تواتر اور استحکام سے ہی نہیں پرکھی جاتی اور نہ ہی طریقِ کار کو جدید لائنوں پر لے آنے سے یہ عمل پورا ہو جاتا ہے۔ بلکہ دیکھنا یہ ہوتا ہے کہ اس پر حقیقی طور پر کس حد تک عمل درآمد ہوا ہے۔

اگر یہ سچ ہے تو یہ کہنا غلط ہے، جیسا کہ اکثر کہا جاتا ہے کہ منصوبہ تو ٹھیک ہے لیکن اس پر عمل درآمد ہی ناقص ہے۔ بالعموم منصوبہ ساز اپنی خامیوں کو چھپانے کے لیے اسی طرح کے جملوں کا سہارا لیا کرتے ہیں۔ چنانچہ دانشمندانہ صورت سے کی جانے والی منصوبہ بندی، منصوبے پر عمل درآمد کی راہ میں حائل دشواریوں پر نظر رکھتی ہے۔ ڈبلیو آر تھریوس کے الفاظ میں "بلاشبہ انتظامیہ پر اس قدر ذمہ داری ڈالنا جو اس کے قابو سے باہر ہو، غلطی ہوگی۔ اس طرح کے نظام کے بارے میں غیر حقیقی اندازے لگانا اور ان کی صلاحیت کا ٹھیک ٹھیک اندازہ نہ کرنا منصوبے کی تشکیل کی خامیوں کا مظہر ہے۔

غیر حقیقی منصوبہ بندی

غیر حقیقی منصوبہ بندی اور شرح ترقی کو غیر ممکنہ حد تک بڑھا کر اسے حاصل کرنے کا اندازہ لگانا، منصوبہ پر عمل درآمد کو ناکام بنا دے گا۔ ڈبلیو آر تھریوس کے الفاظ میں "ضرورتیں لامحدود ہیں" جو منصوبہ ضرورتوں پر مبنی نہ ہو بلکہ وسائل پر مبنی ہو، وہ محض اشتہار ہے، یہ محض ایک پراپگنڈہ ہی ہو سکتا ہے، نہ کہ عمل درآمد اور نگرانی کا ذریعہ۔

اس کا یقین ہے کہ پانچ سال کے عرصے کے بعد معیشت کی شرح ترقی میں بہت زیادہ انقلاب نہیں آسکتا، وہ اس کے آغاز کی بہ نسبت کچھ ہی زیادہ ہو سکتی ہے۔ لہٰذا غیر حقیقی طور پر شرح ترقی کے بڑھے ہوئے نشانے خام مال کی فراہمی، پلانٹ اور مشینری کی فراہمی اور غیر ملکی زرمبادلہ کی فراہمی وغیرہ کے ضمن میں رکاوٹیں ہی پیدا کر سکتے ہیں۔ ان تمام رکاوٹوں سے اشیا کی قیمتوں میں اضافہ ہوگا۔ اور منصوبے کی جڑیں کھوکھلی ہو جائیں گی۔ سیاسیات کی طرح سے ہی منصوبہ بندی بھی ہر عمل کو ممکن بنانے کا ایک فن ہے۔

اگر ایک منصوبہ حقیقی روپ میں تشکیل دیا جاتا ہے تو بھی اس پر عمل درآمد کا مسئلہ باقی رہتا ہے اور اس پر غور و خوض کی ضرورت ہوتی ہے۔ جیسا کہ باربرا ووٹن نے کہا ہے کہ "منصوبہ بنانا اور پھر اس پر عمل درآمد میں ناکام رہنا بیوقوفی کی نشانی ہے۔ جہاں تک سوچے سمجھے طریقے پر ... پروسسز کی تیاری اور فراہمی کا سوال ہے، وہاں افرادی قوت، پلانٹ اور سازوسامان کو ایک ساتھ ہی اشیاء کی تیاری اور خدمات کی فراہمی پر لگانا اور مامور کرنا ہے۔

اگر منصوبہ بندی کی تشکیل کے مرحلے پر یہ محض اقتصادی نوعیت کی منصوبہ بندی ہے، تو عمل درآمد کے مرحلے پر یہ خالصتاً انتظامی نوعیت لیے ہوئے ہے۔ درحقیقت ان دونوں میں باہمی ربط قائم کرنا ضروری ہے

عمل درآمد کے خاص طور پر تین طریقے ہیں: پہلے پالیسیوں کی تشکیل اور ان پر عمل درآمد، دوسرے پروگراموں کی تشکیل اور ان پر عمل درآمد، تیسرے انفرادی اقتصادی یونٹوں اور اداروں کا تعلیمی پلان۔

سہارا دینے والی پالیسی کا ڈھانچہ

منصوبہ بندی کے مجموعی نشانوں کو مناسب اور موزوں پالیسی کے ڈھانچے سے سہارا دینا ضروری ہے۔ پالیسی سے متعلق ڈھانچہ ایسے مجموعی اقدامات کی نشاندہی کرتا ہے جن سے منصوبے پر عمل درآمد میں مدد ملے اور جو اس راستے میں حائل دشواریوں کو دور کرے۔ اس طرح یہ عمل درآمد کو بڑھاوا دینے والے اور ان کو باضابطہ بنانے والے اقدامات کا مجموعہ ہے۔ اس طرح کے اقدامات میں مالی اور عملی اقدامات شامل ہیں۔

سماج وادی ملکوں میں منصوبہ بندی کے مرکزی یا کلیت پسند نظام میں، اصل زور اور انحصار عملی کنٹرول پر لاتا ہے۔ جبکہ لامرکزی نظام اور منڈی کے نظام پر انحصار کرنے والی معیشت میں جہاں کہ پرائیویٹ اور پبلک دونوں سیکٹر کام کر رہے ہوں، ترغیب و تحریص عمل کے اقدامات کا زیادہ استعمال کرنا ہوتا ہے۔ بوشیت کے الفاظ میں "لبرل نظام میں جسے وہ لچکدار منصوبہ بندی کہتا ہے، وزارت مالیات کی طرف سے زمروں پر جو مالی کنٹرول کیا جاتا ہے، وہ پبلک سیکٹر کا ہی ایک جزو ہے اور یہ لازمی ہے" جیسا کہ روس کی منصوبہ بندی میں عمل درآمد کا طریقہ اپنایا گیا ہے۔

اقتصادی شعبوں کے باقی حصوں میں منصوبے پر عمل درآمد کے مختلف ذرائع مثلاً گرانٹ، قرضے، ٹیکسوں میں راحت، سرکاری کاموں کے ٹھیکے، وغیرہ کو بالواسطہ طور پر استعمال کیا جاتا ہے اور ان کو تحریک عمل کا ذریعہ کہا جاتا ہے۔ منصوبے میں وضع کردہ ترقیاتی نظام میں شرکت کے ذریعے جو فائدہ حاصل ہوتے ہیں، ان کی نشاندہی کی جاتی ہے اور ان کی طرف عوام کو راغب کیا جاتا ہے، اور اس طرح بہت سے مقاصد حاصل کئے جاتے ہیں۔

فرانسیسی طرز کی منصوبہ بندی

سوال یہ ہے کہ کیا ہر منصوبہ پر عمل درآمد کا نظام پالیسیوں کے ایک لمبے چوڑے ڈھانچے پر مبنی ہونا چاہیئے یا وہ انتخابی نوعیت اور اہم نکات کی نشاندہی کرنے والا ہونا چاہیئے۔

فرانس کی منصوبہ بندی اس بات پر زور دیتی ہے کہ منصوبہ بندی کی لچک اگر باقی رکھنی ہے تو عمل درآمد کے ذرائع کی تعداد بہت محدود ہونی چاہیئے۔ اس طرح وہ دو باتوں پر زور دیتی ہے، ایک عمل درآمد سے متعلق عملے کی محدود تعداد اور دوسرے مالی اقدامات پر مقابلتاً زیادہ انحصار۔ جیسا کہ بوشیت نے کہا ہے کہ منصوبہ بندی سے متعلق تنظیم جس قدر کم فیصلے کرے گی، اسی قدر وہ موثر ثابت ہوگی۔ مرکزی نظام کی دلالت دینے والے سماج وادی اقتصادی نظام اس قول کی تصدیق کرتے ہیں۔ مغربی ملکوں کے نظام میں اس قول کی اور بھی تصدیق ہو جاتی ہے۔ براہِ راست رکاوٹوں کی بجائے بالواسطہ طور پر مالی اقدامات کے ذریعے مداخلت کی جاتی ہے۔ حالانکہ اس طرح کے کنٹرول اور نگرانی کی کبھی کبھی افادیت بھی واضح ہوتی ہے۔ تاہم یہ کم سے کم ہونی چاہیئے۔

کمشیریٹ جنرل ڈو پلان Commissariat general du Plan کی طرف سے پرائیویٹ سیکٹر میں بنیادی صنعتوں کو سرمایہ کاری کی اسکیموں کے طور پر منظوری دی جاتی ہے، لیکن دیگر سیکٹروں میں صنعتی پیداوار کے ڈائرکٹوریٹ کی طرف سے منظوری دی جاتی ہے۔ اقتصادی اور سماجی ترقی کے فنڈ کی طرف سے سرکاری قرضوں کی صورت میں نصف سرمایہ لگایا جاتا ہے۔ اس فنڈ سے متعلق جنرل باڈی ان میں سے ہر ایک کے لیے سرمایہ کاری کا سالانہ پلان مرتب کرتی ہے۔ جو ادارے پبلک فنڈ پر انحصار نہیں رکھتے، ان کی کارکردگی میں زیادہ آزادی رہنے کو ملتی ہے۔ پلان پر عمل درآمد کے کچھ اور بھی طریقے ہیں۔ مثلاً مربوط و مرکوز انداز پر جہاں سامان تیار کیا جاتا ہے، وہاں اشیاء کی قیمتوں پر کنٹرول۔ بھاری سامان تیار کرنے والوں کے ساتھ معاہدے، تاکہ پالیسی کے مطابق وضاحت کردہ پروگراموں کو بروئے کار لایا جا سکے۔ اس طرح جو مالی امداد دی جاتی ہے، اس کے عوض سرمایہ کاری کے پروگرام پر عمل درآمد کرایا جاتا ہے۔ منصوبے کی منظوری سے متعلق ایکٹ کے ایک حصے کے طور پر پروگراموں پر عمل درآمد کے قوانین وضع کرنے کا طریقہ بھی کام میں لایا جاتا ہے۔ اس طرح ایک کارخانہ لمبے عرصے کے لیے ایک کام شروع کرتا ہے۔ اور صنعت کار اس طریقے پر طویل مدت کے لیے سرمایہ کاری کر سکتے ہیں۔ وہ مال فراہم کرنے والوں کے ساتھ معاہدے کر سکتے ہیں۔

منصوبہ بندی سے متعلق پالیسی میں یہ اقدامات ضروری ہیں۔

منصوبہ بندی بذریعہ ترغیب

۱۔ مالی اور بجٹ سے متعلق پالیسیاں۔
۲۔ مالیات اور قیمتوں سے متعلق پالیسیاں۔
۳۔ اجرتوں اور آمدنی سے متعلق پالیسیاں۔
۴۔ بینکنگ سے متعلق پالیسیاں۔

عملی نگرانی کے ذریعے منصوبہ بندی

۵۔ لائسنس دینے کی پالیسیاں اور اجرائے سرمایہ۔
۶۔ خام مال کی الاٹمنٹ سے متعلق پالیسیاں۔
۷۔ غیر ملکی زرمبادلہ سے متعلق پالیسیاں۔
۸۔ مال کی وصولی اور مال کی سرکاری طور پر تقسیم سے متعلق پالیسیاں۔

ترقیاتی اقدامات کے ذریعے منصوبہ بندی

۹۔ تکنیکی امداد اور نگرانی سے متعلق پالیسیاں۔
۱۰۔ تربیتی سہولتوں اور ان کی فراہمی سے متعلق پالیسیاں۔
۱۱۔ تحقیق و ترقی سے متعلق پالیسیاں۔

بجٹ سالانہ منصوبہ بندی کی دستاویز ہے۔ منصوبہ بندی کے لحاظ سے بجٹ بنانے کا روایتی طریقہ پوری طرح موزوں نہیں ہے۔ لہٰذا بجٹ سے متعلق دستاویزات کو مناسب انداز میں تبدیل کرنا ہوگا تاکہ مختلف منصوبہ بند پروگراموں کے لیے وسائل کی تخصیص واضح ہو سکے۔

بجٹ محض اخراجات کا تفصیلی بیان نہیں ہے یہ بالواسطہ اور بلاواسطہ ٹیکسوں سے متعلق اقدامات پر بھی روشنی ڈالتا ہے۔ وسائل بڑھانے کے طریقوں کی بھی نشاندہی کرتا ہے۔ ٹیکسوں سے محض منصوبہ بندی کے لیے وسائل کا ہی اندازہ نہیں ہوتا بلکہ اس سے کچھ اقتصادی سرگرمیوں کو بڑھاوا ملتا ہے اور کچھ کی ہمت شکنی ہوتی ہے۔ یہ آمدنی کی ازسرِ نو تقسیم کا ذریعہ ہے۔ اس لیے یہ سرکار کی آمدنی سے متعلق پالیسی سے جڑا ہوتا ہے۔ منصوبہ میں شامل کم قابلِ ترجیح اشیا اور خدمات کی پیداوار پر اقتصادی وسائل کی روک تھام بھی اس کے ذریعے عمل میں آتی ہے۔ یہ اقتصادی سرگرمیوں میں سٹہ بازاری کے رجحان کو کم کرتا ہے اور ظاہری بھڑک والے اخراجات پر روک لگاتا ہے۔

اہمیت

منصوبہ بندی کے عمل کو زیادہ آگے بڑھانے کے لیے مالی اور اقتصادی پالیسیاں کافی اہمیت رکھتی ہیں۔ مستحکم منصوبہ بندی عملی طور پر بیحد اہم ہے۔ غلط طرح کی مالی اقتصادی اور اشیا کی قیمتوں سے متعلق پالیسیاں افراطِ زر کو تقویت دیتی ہیں جس سے منصوبہ بندی کے عمل کو آگے بڑھنے کا موقع نہیں ملتا اور اس کے نظام کو نقصان پہنچتا ہے جہاں اشیا کی قیمتوں پر نظر رکھنے کا عمل ترک کر دیا جاتا ہے جیسا کہ سامراج وادی معیشت میں ہوتا ہے، وہاں منصوبہ سازوں کو اشیا کی قیمتوں کے مسئلے کی فکر نہیں ہوتی بلکہ یہ مسئلہ مختلف شکلوں میں نمودار ہوتا ہے۔ جہاں منصوبہ بندی کے مختلف مقاصد میں سے ایک معیشت کا استحکام بھی ہے وہاں سستے زر سے متعلق پالیسی ضروری ہوتی ہے۔ البتہ معیشت میں جہاں سرمایہ کاری زیادہ ہوتی ہے، جہاں وسائل کی فراہمی میں لچک نہیں ہوتی۔ جہاں پیداوار جامد اور محدود ہوتی ہے۔ یا جہاں اشیاء کی قلت کا مستقل سامنا ہے۔ وہاں منتخبہ بنیادوں پر قرضوں پر نگرانی اور مہنگے زر سے متعلق پالیسی افراطِ زر کو روکنے میں معاون ہو سکتی ہے۔

فاضل اسٹاک

قیمتوں پر روک تھام کے لیے مختلف جنسی اور متوسط اشیاء کا فاضل ذخیرہ ہونا ضروری ہے، تاکہ اشیا کی تقسیم کے سرکاری نظام کو موثر طرح سے جاری رکھا جا سکے۔ مختلف اشیاء کی حصولی ایک ایسا موثر نظام چاہتی ہے جسے اکثر خوراک اور شہری رسدات کے انتظام کا نام دیا جاتا ہے۔ اس کے ذریعے پیداوار اور کھپت میں تعلق قائم رکھنا ہوتا ہے۔ اسے پیداوار کے مختلف مراکز پر سامان فراہم کرنا ہوتا ہے۔ اشیاء کا ذخیرہ کرنا ہوتا ہے اور تقسیم کے سرکاری نظام کے ذریعے انھیں مہیا کرنا ہوتا ہے۔ اس طرح خوراکی اشیاء اور کپاس کو کھیتوں سے حاصل کرنا ہوتا ہے جبکہ چینی، کپڑے اور فولاد نیز سیمنٹ کو فیکٹریوں سے حاصل کرنا ہوتا ہے۔

اشیاء کی قیمتوں کی حصولی منصوبہ بندی کا اہم جزو ہے۔ زرعی اشیاء کی قیمتوں سے متعلق کمیشن قائم کر کے زرعی اشیا کی قیمتوں کا تعین کیا جاتا ہے، تاکہ مال تیار کرنے والوں اور صارفین کو مناسب داموں پر مل سکے۔ البتہ یہ عمل آسان نہیں ہے، افراطِ زر پر روک لگانے کے خیال سے کم قیمتوں کا جواز بنتا ہے لیکن مال تیار کرنے والوں کے لیے ایسے حالات پیدا کرنے ہوتے ہیں کہ انھیں مال کی تیاری سے دلچسپی پیدا ہو۔ اس لیے وہ اشیاء کی زیادہ قیمتیں مانگیں گے۔

اشیاء کی حصولی سے متعلق قیمتیں: اگر مال تیار کرنے والوں کے مطالبات کے پیشِ نظر اشیاء کی زیادہ قیمتیں متعین کی جاتی ہیں۔ تو صارفین کو رعایتی نرخ پر مال فراہم کرنا ہوگا۔ یہ سرکاری خزانے پر بوجھ ہوگا۔ اور اگر منصوبہ بندی کے مالی وسائل پہلے ہی ناکافی ہوں تو یہ رعایت دینی دشوار ہوتی ہے۔

منصوبے پر عمل درآمد کے سلسلے کا ایک مسئلہ یہ ہے کہ اشیاء کی حصولی اور پھر سرکاری طور سے ان کی تقسیم کا کام کس ادارے کو سونپا جائے۔ کوآپریٹو ادارے یہ کام انجام دے سکتے ہیں بشرطیکہ وہ ایماندار اور موثر طرح سے کام کرنے کے عادی ہوں۔

یہ ادارہ خواہ کوآپریٹو ہو یا سرکاری، اگر انتظامیہ کی صلاحیت سے عاری ہوگا تو اشیاء کی تقسیم کے سرکاری نظام کا مقصد ہی فوت ہو جائے گا۔

اُجرتوں سے متعلق پالیسی

اُجرتوں سے متعلق پالیسی اور اشیاء کی قیمتوں سے متعلق پالیسی کے درمیان ایک جوڑ ہے۔ اگر اشیاء کی قیمتیں اور ان پر نفع کنٹرول میں رہے گا تو اُجرتوں کو باضابطہ بنانا ممکن ہے۔ بصورتِ دیگر محنت کش طبقہ ٹریڈ یونینوں کے ذریعے معاندانہ رویّہ اپنائے گا اور زیادہ اُجرتیں طلب کرے گا جس سے افراطِ زر کو تقویت ملے گی اور ادھر قیمتوں میں اضافہ ہوا، اُدھر اجرتوں میں اضافے کا مطالبہ ہوا۔ منصوبہ بندی کے لیے آمدنی سے متعلق ایک مربوط پالیسی وضع کرنی ہوگی۔ ہر شخص کے لیے یہ آزادی ہے کہ وہ اپنی پسند کا روزگار منتخب کرے۔ عام حالات میں یہ ممکن نہیں کہ محنت کش طبقے کو کسی خاص کام کے لیے مجبور کیا جا سکے اور اُجرتوں کا فرق محنت کش طبقے کی فراہمی اور اس کی مانگ کے درمیان تطابق پیدا کرنے کا ذریعہ بنتا ہے۔ منصوبہ بند معیشت میں چند قسم کے تکنیکی ماہروں کی کمی ہو سکتی ہے اور اس کی مد میں اضافہ

ہوتا رہے گا۔ چنانچہ ان کے لیے اُجرتوں کی شرحیں مقابلتاً زیادہ ہوں گی۔ اس کے برعکس آرٹس گریجویٹ صرف کلرک کے مقاصد پورے کر سکتے ہیں۔ چنانچہ ان کی اُجرتیں کم ہوں گی۔

وفاتر روزگار کے ذریعے اُجرتوں سے متعلق پالیسی کو بڑھاوا مل سکتا ہے۔ باربرا ووٹن کے الفاظ میں "منصوبہ بند معیشت میں محنت کش طبقے کی تقسیم کو آسان بنانے کے لیے دفاتر روزگار کو لازمی طور سے تمام کاموں کا نوٹیفکیشن جاری کرنا چاہیئے۔ اور اس کے ساتھ ہی یہ بھی مشتہر کرنا چاہیئے کہ کون کون سے کام منسوخ کر دیے گئے ہیں۔

بنکوں کا رول

قرض دینے اور روپیہ کو ٹھکانے لگانے میں بنکوں کو اہم کردار ادا کرنا ہے۔ سُود کی بہتر شرحوں کے ذریعے عوام کی بچتوں کی عادت کو بڑھانا ہے، لیکن یہ عمل بنکنگ سے متعلق مرکزی اتھارٹی کی طرف سے وضع کردہ ڈھانچے میں ہی انجام دیا جائیگا۔ ترقی پذیر ملکوں کے عوام میں بنکوں میں رقم جمع کرانے اور اُن سے استفادہ کرنے کی عادت ڈالنے کی بڑی گنجائش ہے۔ بنکنگ سے متعلق پالیسیوں کو منصوبہ بندی سے متعلق پالیسیوں کے ہم آہنگ بنانا ہوتا ہے۔ منصوبہ بندی کے تحت جن شعبوں کو ترجیحی زمروں میں رکھا جاتا ہے، ان کے لیے بنکوں کو قرضے ترجیحی بنیادوں پر دینے ہوتے ہیں۔ یہ حقیقت روز بروز محسوس ہوتی چلی گئی ہے کہ منصوبہ بندی کو محض بجٹ میں واضح کردہ وسیلوں تک ہی محدود نہیں کرنا ہوتا ہے۔ منصوبہ بند معیشت میں بنکوں کے وسیلوں کو حرکت میں لانا ہوتا ہے تاکہ منصوبہ بندی کے مقاصد پورے کیے جا سکیں۔ لہٰذا بنکوں کو ایسے منصوبے وضع کرنا چاہیئں جو بحیثیت مجموعی اقتصادی ترقی کے ڈھانچے میں مربوط ہو سکیں۔ فرانسیسی طرز کی منصوبہ بندی کے تحت بنکنگ سے متعلق سرگرمیوں اور اقتصادی سرگرمیوں کو مربوط کر دیا جاتا ہے۔ قرضوں کی منظوری کے وقت خالصتاً روائتی تجارتی تصورات کو سامنے نہ رکھ کر، قرضوں کی منظوری کے لیے شعبوں کا انتخاب احتیاط سے کیا جاتا ہے کہ منصوبے میں ترجیحی زمروں کی اسکیموں کو بروئے کار لایا جا سکے اور اس سلسلے میں قرضوں کی منظوری سے متعلق ہدایتوں کو سامنے رکھا جاتا ہے۔ قرضوں کا تمام تر نظام منصوبے میں شامل سرمایہ کاری کے پروگراموں کے تابع ہوتا ہے۔ اسے بجٹ سے متعلق پالیسی کے ساتھ جوڑا جاتا ہے تاکہ عمل درآمد میں کہیں ٹکراؤ نہ ہو۔

سماجی کنٹرول

عام اقتصادی پالیسی کے ساتھ بنکنگ کی سرگرمیوں کو جوڑنے کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ بنکوں پر سماجی کنٹرول ہو۔ اس کے متبادل طریق کار کی صورت میں بنکوں کو قومی ملکیت میں لے لیا جاتا ہے۔ غیر سماج وادی ممالک مثلاً فرانس وغیرہ میں بڑے بڑے بنکوں کو قومی ملکیت میں لے لیا گیا ہے۔ اسی مثال کو سامنے رکھ کر ہندوستان میں چودہ بڑے بنکوں کو ۱۹ جولائی ۱۹۶۹ کو قومی ملکیت میں لے لیا گیا۔ لیکن قومی ملکیت میں لے لینا ہی تمام مسائل کا حل نہیں ہو سکتا۔ اس کے بعد بھی بنکوں کا نظم و نسق اس طرح ہونا چاہیئے کہ بنکنگ کے ٹھوس اصولوں اور مالی نظم و ضبط کی قربانی دیئے بغیر منصوبہ بندی کے مقاصد پورے ہو سکیں۔

جہاں پیداواری وسائل کو تمام تر قومی ملکیت میں نہیں لیا جاتا اور جہاں پرائیویٹ صنعت کی بڑی گنجائش ہے اور اس کے لیے بڑا سیکٹر موجود ہے، وہاں پالیسیوں کے لائسنس کے اجرا کا طریق کار اور صنعتوں کو باضابطہ بنانے کے اصول و ضوابط اکثر کام میں لائے جاتے ہیں تاکہ صحیح طرز کی صنعتیں اور ادارے فروغ پا سکیں۔ لائسنسوں سے متعلق پالیسی کا مُدعا یہ ہونا چاہیئے کہ اس میں محنت کش طبقے کی زیادہ سے زیادہ کھپت ہو، چھوٹے پیمانے کی صنعتوں کا فروغ ہو، عوام کے استعمال میں آنے والی اشیاء کی تیاری زیادہ ہو، اس پالیسی کو ایسی پالیسی سے مختلف ہونا پڑے گا جس کے تحت سرمایہ زیادہ درکار ہوتا ہے۔ اجارہ داری کا رجحان بڑھتا ہے۔ سامانِ تعیش کی تیاری بڑھتی ہے، لائسنسوں کے اجرا سے متعلق پالیسی، صنعتوں کے لگانے کے لیے جگہوں کے انتخاب میں بھی معاون ہوتی ہے۔ یہ صنعتیں ایسے مقامات پر نہیں لگائی جاتیں جہاں پہلے ہی سے صنعتوں کا دباؤ زیادہ ہو بلکہ پسماندہ علاقوں میں صنعتوں کو بڑھاوا دیا جاتا ہے۔ جہاں کہیں ضرورت ہوتی ہے، وہاں روزگار کے مواقع بڑھائے جاتے ہیں۔ لائسنسوں کے اجرا سے متعلق پالیسی کے سلسلے کی ایک دُشواری یہ ہے کہ درخواستوں کی جانچ پڑتال میں تاخیر ہو جاتی ہے۔ اس سے صنعتی ترقی میں رکاوٹ پڑتی ہے۔ اسلیے اس محاذ پر کام بسُرعت انجام دینے کی ضرورت ہے۔

اجرائے سرمایہ کی پالیسی کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ سرمایہ غیر پسندیدہ سیکٹروں مثلاً سٹہ بازاری یا سامانِ تعیش کی تیاری پر توجہ مرکوز نہ کر سکے۔ اگر سرمایہ کی منڈی پر نگرانی نہ رکھی جائے، تو سرمایہ مذکورہ بالا مقاصد پر ہی خرچ کرنے پر توجہ ہوگی۔

خام مال کی تقسیم

جس طرح اشیائے صارفین کی تقسیم ضروری ہے، اسی طرح خام مال کی تقسیم بھی ضروری ہے۔ اس کے ذریعے صنعتی ترقی عمل میں آ سکتی ہے۔ خام مال کی فراہمی کو یقینی بنائے بغیر پیداوار کے مطلوبہ نشانے پورے نہیں ہو سکتے۔ اگر خام مال کی فراہمی میں کمی ہوگی، اور ان کی قیمتیں بڑھیں گی اگر ان کی قیمتوں پہ نگرانی کی گئی، تو کالے بازار کے رجحان کو تقویت نہ مل سکے گی۔ سماج وادی ممالک بھی اسی طرح کے مسائل سے دوچار ہیں۔ سماج وادی معیشت میں خام مال کی کمی پیدا کرنے کا ایک رُجحان ہے جس سے صنعتوں کو

دشوار ہی ہوتی ہے اور اشیاء کی قلت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

اکثر خام مال یا نیم مصنوعہ مال کو دور دراز مقامات پر بھیجنے میں کافی اخراجات ہوتے ہیں۔ یہ مال قریب کی کسی فیکٹری سے فراہم نہیں ہوتا۔ اشیائے صارفین کی تقسیم کے سرکاری نظام کی طرح سے ہی خام مال کی تخصیص و تقسیم کو اسی طرح سے عمل میں لانا ضروری ہے۔ جہاں خام مال یا پلانٹ یا مشینری اندرون ملک دستیاب نہیں ہوتی، وہاں غیر ملکوں سے اسے منگانا پڑتا ہے۔ اور اس کے لیے غیر ملکی زر مبادلہ درکار ہوتا ہے۔ منصوبہ بند معیشت میں غیر ملکی زر مبادلہ کے اخراجات کو سوچ سمجھ کر کرنا ہوتا ہے اور منصوبے کے نشانوں کی تکمیل کے لیے ان کی حفاظت ضروری ہے۔ منصوبے پر عمل درآمد میں غیر ملکی زر مبادلہ کے اخراجات کا معاملہ ایک نازک معاملہ ہے۔ کبھی کبھی اسے برآمدات کے ساتھ جوڑ دیا جاتا ہے۔ لیکن یہ صحیح نہیں ہے کہ اس سے اندرون ملک کارآمد صنعتوں کے لیے ایک امتیازی رویّہ پیدا ہوگا اور ممکن ہے کہ اندرون ملک کارآمد اس صنعت میں برآمداتی صلاحیت زیادہ نہ ہو۔

تکنیکی مہارت

تکنیکی نگرانی، تربیتی سہولتیں اور تحقیق و ترقی معاشی سرگرمیوں کا اہم ترین محور ہیں۔ ممکن ہے کہ ان کی اہمیت بہت زیادہ عرصے میں محسوس ہو سکے۔

منصوبہ بندی کے مقاصد کے حصول میں تکنیکی علوم کی توسیع مالی امداد سے بھی زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔ آر تھر لیوس نے کہا ہے کہ زراعت کے شعبے میں قومی آمدنی کا ایک فی صد تکنیکی علوم کی توسیع پر خرچ کرنا قومی آمدنی کو نصف فی صد کے بقدر بڑھا دے گا۔ اس سے پیداوار بڑھانے کے امکانات میں بہت زیادہ اضافہ ہوتا ہے۔

کسی حد تک اشیاء کی فروخت کے مسائل، اشیاء کی تقسیم کے سرکاری نظام کے ذریعے حل کیے جا سکتے ہیں۔ لیکن اس کے لیے گوداموں، ذخیرہ گاہوں اور ٹرانسپورٹ وغیرہ کی سہولتیں فراہم کرنی ہوں گی۔ اور اس کے ساتھ ہی منڈی کے بارے میں واقفیت کا ایک نظام رائج کرنا ہوگا نیز اشیاء کی درجہ بندی اور معیار بندی کے طریقوں کو کام میں لانا ہوگا۔ درحقیقت یہ منصوبہ بندی کا ہی ایک حصہ ہے۔

پروگرام پر عمل درآمد

پروگراموں کی عمل آوری کے ساتھ پالیسیوں کی تشکیل و تعمیل بھی ضروری ہے۔ منصوبے کے تمام شعبوں میں پروگراموں اور پراجیکٹوں کی تشکیل ضروری ہے۔ یہ منصوبہ بندی میں کلیدی اہمیت رکھتے ہیں۔ منصوبہ بند معیشت میں عمل درآمد کی ذمہ دار ایجنسی کے لیے ضروری ہے کہ وہ منصوبہ میں شامل پروگراموں کو مجموعی اقتصادی منصوبہ بندی کے ساتھ مربوط کرے۔

انتظامی منصوبہ بندی کے اہم اجزاء یہ ہیں۔ مقاصد اور نشانوں کا تعین، اسکیموں، پروگراموں پر عمل آوری، ضروری سامان کی فراہمی کے انتظامات، یہ سارے کام ہر سال اور ہر فصل میں انجام دینے ہوتے ہیں۔ یہ ذمہ داریاں اقتصادی منصوبہ بندی کے لیے مربوط انداز میں نبھانی ہوتی ہیں۔ اس مقصد کے لیے عمل آوری سے متعلق ادارے کو منصوبہ بندی کے مختلف طریقے انجام دینے ہوتے ہیں۔ مثلاً اعداد و شمار کی فراہمی اور تجزیہ، عمل آوری کے دوران نگاہ رکھنا، نظر ثانی اور ضروری تبدیلیاں وغیرہ۔ سول سروس کے وہ ارکان جو عمل آوری میں حصہ لیتے ہیں، انھیں اس سلسلے کی ضروری تربیت دی جاتی ہے۔ سول سروس کا عملہ اگر تربیت یافتہ نہ ہوگا تو منصوبے پر عمل آوری کو یقینی نہیں بنایا جا سکتا۔ اسی لیے ڈبلیو آرتھر لیوس نے لکھا ہے کہ ترقیاتی منصوبہ بندی کسی ملک میں اس وقت تک قابل عمل نہ ہوگی جب تک کہ وہاں منصوبے پر عمل آوری کے ماہر سول سروس کے ارکان نہ ہوں گے۔

اگر عمل آوری سے متعلق صرف ایک ادارہ ہوگا تو اس کی کوششوں کے نتیجے میں منصوبے کے مقاصد محض کسی ایک مخصوص شعبے میں پورے نہیں کیے جا سکتے۔ اس کی سرگرمیوں کو عمل آوری سے متعلق دیگر اداروں کی سرگرمیوں کے ساتھ مربوط کرنا ہوگا۔

انفرادی اور ادارہ جاتی کوششوں سے جو پروگرام بروئے کار لائے جاتے ہیں، ان کا مقصد پروگرام کے نشانوں کی تکمیل تک ہوتا ہے۔ پھر بھی ہر ادارے اور ہر کارخانے کے خواہ وہ پبلک سیکٹر میں ہو، پرائیویٹ سیکٹر میں ہو یا کوآپریٹو سیکٹر میں ہو، اپنے پروگرام ہونے چاہئیں جو بحیثیت مجموعی منصوبہ بندی کے ڈھانچے میں موزوں ہو سکتے ہوں۔

ہر ادارے یا کارخانے کے منیجر کو منصوبہ ساز ہونا چاہیے۔ پلان کے مجموعی نشانوں کو ذہن میں رکھتے ہوئے اسے اپنے کارخانے کے لیے پیداوار کے نشانے متعین کر لینے چاہئیں۔ ہر ادارے کے کارپوریٹ پلان میں سرگرمیوں کی تفاصیل ضروری مال اور مادی وسائل کی فراہمی، استعمال کے لیے درکار اشیاء کی فہرست وغیرہ شامل ہوتی ہے۔ اس کا اپنا بجٹ ہوتا ہے تاکہ اس میں لگائے گئے خام مال، جگہ، افرادی قوت اور سرمائے وغیرہ سے زیادہ سے زیادہ فائدہ ہو۔

پیشہ وارانہ مہارت کے حامل منیجر اس طرح کی اجتماعی منصوبہ بندی کو کامیاب بنا سکتے ہیں۔ منصوبہ بندی کے تحت اس طرح کے پیشہ ورانہ مہارت کے حامل عملے کی بہم رسانی بھی ضروری ہے۔

ڈبلیو آرتھر لیوس نے لکھا ہے "اس طرح کی پیشہ ورانہ مہارت حاصل ہونے کے بعد ہی

(باقی صفحہ ۱۹ پر)

ڈاکٹر راجن ٹنڈن

آپ اور آپ کی صحت

جوڑوں کے درد کے مریضوں کو امراضِ قلب

اس مضمون کے مصنف ایک ممتاز اور نامور کارڈیالوجسٹ ہیں۔ وہ جوڑوں کے درد کے مریضوں کو ہونے والے قلب کے امراض کے بارے میں ضروری معلومات بہم پہنچا رہے ہیں۔ اس سلسلے میں وہ اس بخار کا بھی ذکر کرتے ہیں جو جوڑوں پر ورم آنے سے ہو جاتا ہے اور جس میں جوڑوں میں درد ہوتا ہے۔

جوڑوں کا بخار جوڑوں کو چاٹ جاتا ہے لیکن دل کو کاٹ لیتا ہے۔ جوڑوں کے بخار میں سخت قسم کی سوجن کے سبب نظام بگڑ جاتا ہے۔ اس حالت میں خاص قسم کی علامات واضح ہوتی ہیں۔ شروع میں گلا خراب ہوتا ہے۔ چند جراثیم گلے میں انفیکشن پیدا کر دیتے ہیں۔ ان کو ڈاکٹری اصطلاح میں "group A Batehemolytic streptococci" کہتے ہیں۔

جوڑوں کا بخار پوری دنیا میں مشہور ہے۔ یہ مرد اور عورت دونوں کو پریشان کرتا ہے۔ بالعموم یہ ۵ سال سے ۱۵ سال کے درمیان ہوتا ہے۔ ویسے یہ عمر کے کسی بھی حصے میں ہو سکتا ہے۔ ہندوستان میں آبادی کا سروے کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ ہندوستان میں اس کے مریضوں کی اوسط ۲ فی ہزار آبادی ہے۔

امراضِ قلب سے متعلق ہسپتالوں میں ۳۰ تا ۵۰ فی صد مریض جوڑوں کے ایسے بخار میں مبتلا ہوتے ہیں جن کے باعث امراضِ قلب لاحق ہوتے ہیں۔ بچوں کی آبادی کے سروے سے پتہ چلتا ہے کہ یہ ایک ہزار بچوں میں سے اوسطاً ۳ء۵ بچوں کو ہوتا ہے۔ ہندوستان میں یہ بالعموم ۵ سال سے ۱۵ سال تک کی درمیانی عمر میں ہوتا ہے۔

اسباب

رہن سہن کے معاملات کا صاف ستھرا نہ ہونا، گندی حالت میں زندگی گزارنا۔ غذائیت کا بھرپور نہ ہونا یا ناقص غذاؤں کا استعمال کرنا یا پھر رہائشی حالات ایسے ہوں کہ وہاں گنجان آبادی میں زندگی گزارنی پڑتی ہو۔

جوڑوں کے بخار کے مضر اثرات

۱۔ ۶۰ تا ۷۰ فی صد مریضوں کے دل پر اس کا بُرا اثر پڑتا ہے۔ اس سے امراضِ قلب لاحق ہوتے ہیں جو مستقل صورت اختیار کر لیتے ہیں۔

۲۔ دل کا عارضہ بچپن میں ہو جاتا ہے جو زندگی بھر رہتا ہے۔

۳۔ جوڑوں کا بخار بار بار لوٹ سکتا ہے۔ دل کا عارضہ اگر پہلے ہی سے ہے تو اس کے سبب صورتِ حال اور خراب ہو جائے گی۔ ہر بار بخار آنے سے اس میں مزید گراوٹ آ سکتی ہے۔ اگر عارضۂ قلب نہیں بھی ہے تو یہ ہو سکتا ہے اور پھر یہ بار بار ہو سکتا ہے۔

۴۔ جوڑوں کے بخار کی روک تھام ہو سکتی ہے لیکن اگر یہ کسی بچے کو ہو جاتا ہے تو اس کا علاج نہیں ہو سکتا۔

۵۔ مرض کی تشخیص ہسپتال کی جانچ پر منحصر ہے۔ ایک ہی مریض کو کئی طرح کے امراض لاحق ہو سکتے ہیں۔

۶۔ اس کی تشخیص اس وقت ممکن ہے جب اس کا حملہ تیز ہو۔ اگر دل اس سے محفوظ ہے تو اس سے متعلق سابقہ حالات کی جانچ ممکن نہیں۔

۷۔ دل کو اگر ایک بار نقصان ہو گیا، تو دواؤں سے اس کا علاج ممکن نہیں۔

۸۔ جوڑوں کے درد کے بخار میں امراضِ قلب کا بذریعہ آپریشن علاج کوئی علاج نہیں۔

۹۔ جوڑوں کا بخار ہو جانے سے، زندگی بھر کی احتیاط ضروری ہو جاتی ہے تاکہ وہ دوبارہ نہ ہو۔

جوڑوں کے بخار کی علامات

پہلے دس یا پندرہ روز تک بخار آتا ہے، پھر گلا دُکھنے لگتا ہے۔ بخار کے ساتھ جوڑوں میں

درد شدید ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی کبھی سوجن بھی آجاتی ہے، دل پر اثر ہونے لگتا ہے۔ جلد گرم رہتی ہے۔ جلد کے نیچے نوڈول ہوتے ہیں۔ جسم کی غیر معمولی حرکت دیکھنے میں آتی ہے، اس سے دماغی بیماری کی علامت واضح ہوتی ہے۔

جوڑوں کی بیماری

۹۰ فی صد کیسوں میں واقع ہوتی ہے۔ بڑے جوڑ مثلاً ٹخنے، گھٹنے، کہنی، کلائی پر اس کا اثر ہوتا ہے۔ ہاتھوں یا پیروں کے مقابلتاً چھوٹے اور معمولی جوڑ بھی اس کی لپیٹ میں آجاتے ہیں۔ صرف داخلی درد جسے انگریزی میں (Arthralgia)، کہتے ہیں، بھی واقع ہوتا ہے یا جوڑوں پر سوجن آجاتی ہے۔ وہ گرم، لال ہوتے ہیں، انھیں موڑتے ہوئے یا حرکت دیتے ہوئے تکلیف ہوتی ہے، انگریزی میں اسے (Arthristis) کہتے ہیں۔ درد اور سوجن تیزی سے آتی ہے اور ۵ تا سات دن میں اچانک کم ہوجاتا ہے۔ بالعموم مشترکہ جوڑ بیماری سے متاثر ہوتے ہیں۔ اگرچہ صرف ایک جوڑ ہی ایک وقت میں متاثر ہوتا ہے۔

دل کی بیماری

۴۰ تا ۸۰ فی صد کیسوں میں واقع ہوتی ہے۔ جوڑوں کے درد کے بخار میں جلد ہی یہ بیماری ہوجاتی ہے۔ دل کی تمام پرتیں اس سے متاثر ہوتی ہیں۔ اوپری پرت کا اصطلاحی نام (Peri-cardium) ہے۔ دل کے پٹھے کا نام ہے، (Muscle) انھیں دل کے والو بھی کہتے ہیں۔ جو والو بیماری سے متاثر ہوتا ہے۔ اس سے خون ٹپکنے لگتا ہے۔ کچھ عرصہ بعد یہ والو کام کرنا چھوڑ دیتا ہے۔ اور خون کا بہاؤ رک جاتا ہے۔ بیماری سے (Myocardium) کو جو نقصان پہونچتا ہے، اس کے سبب دل کا وہ عمل جو خون پھینکنے سے متعلق ہے، ڈھیلا پڑ جاتا ہے۔ دل کو مستقل طور پر نقصان پہنچ جاتا ہے۔ جلد کے نیچے نوڈول جوڑوں کے ۳ ہفتے کے بعد ظاہر ہونے لگتے ہیں۔ یہ تکلیف دہ نہیں ہوتے یہ مختلف عرصے تک جسم پر رہتے ہیں اور پھر غائب ہوجاتے ہیں۔ لیکن ان کے سابقہ نقصانات تکلیف پہنچاتے ہیں۔ چلنے پھرنے میں، کھانے میں، لکھنے میں اور دیگر طرح سے حرکت کرنے میں دشواری پیش آتی ہے۔ بچیوں میں اس کی علامات زیادہ واضح صورت میں سامنے آتی ہیں۔ یہ حالت چند ہفتے تک رہتی ہے اور آہستہ آہستہ غائب ہوجاتی ہے مگر اس کے بعد کے نقصانات بھی سامنے آتے ہیں۔

جلد

جوڑوں کے بخار کے سبب جلد کی گرمی مختلف انداز سے ظاہر ہوتی ہے، چوں کہ جلد کی ساخت مقابلتاً کالی ہوتی ہے، اس لیے اس کی علامات ہمارے ملک میں مشکل ہی سے واضح ہو پاتی ہیں۔

اس طرح یہ بات واضح ہے کہ دل کی بیماری کو چھوڑ کر، جوڑوں کے بخار کی دیگر تمام علامات مستقل نقصان نہیں پہنچاتیں۔

تشخیص

جوڑوں کے بخار کی تشخیص میں دو پہلو سامنے ہوتے ہیں۔

۱۔ سرگرم بیماری کی موجودگی کی علامات جس میں مرض کا صحیح صحیح پتہ چلنا دشوار ہے۔

۲۔ گلے کی بیماری اور اس کے انفیکشن کے سبب مرض کا لاحق ہونا البتہ ایسی کوئی جانچ نہیں جو نتیجے کے طور پر یہ ثابت کردے کہ بچے کو جوڑوں کا بخار ہے۔

علاج

جوڑوں کے بخار کا بذریعہ دوا علاج ممکن نہیں۔ اس کے لیے بستر پر لیٹے رہنے سے مریض کو آرام دینا، تغذیہ بخش خوراک، پنسلین سے علاج، مرض کو دبا دینے والی دواؤں کا استعمال، دل کی بیماری کی روک تھام کرنے والی دواؤں کا استعمال (بشرطیکہ اس طرح کی بیماری کی علامت ہو) نیز مریض کو اگر عارضۂ قلب ہو تو اسے بحال کرنے کی ترکیب وغیرہ ہی کارگر ہوتی ہیں۔

جوڑوں کے بخار کے ۸۰ فیصد مریضوں میں ۱۲ ہفتے کا کورس درکار ہوتا ہے۔ ۲۰ فی صد کیسوں میں علاج اور لمبا ہوسکتا ہے۔ ۱۲ ہفتے تک مرض کو دبانے والی دوائیں استعمال کرائی جاتی ہیں۔ اس سے سوجن کم ہوجاتی ہے۔ لیکن یہ مرض کا علاج نہیں ہے۔ اسپرین اور کارٹی کو اسٹورائیڈز (Corticosteroids) کے ذریعے مرض کو دبانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اسپرین، اسٹرائیڈ کے مقابلے کم اثر کرتی ہے۔ لیکن اس کے مضر اثرات اسٹرائیڈ سے کم ہیں۔ اسٹیرائیڈ بالعموم ان مریضوں کو دی جاتی ہے جن کا دل متاثر ہوتا ہے، اسپرین ان مریضوں کو دی جاتی ہے جن کو دل کا عارضہ نہیں ہے۔

نقصان زدہ دل

دو حصوں پر نقصان کا اثر نمایاں رہتا ہے۔ دل کی والو اور مایوکارڈیم (دل کے پٹھے)۔ اگر والو میں رکاوٹ پڑ جاتی ہے تو آپریشن سے اس رکاوٹ کو دُور کیا جاسکتا ہے۔ والو سے اگر خون رِستا ہے تو اس کی مرمت ہوسکتی ہے۔ اسے بدلا بھی جاسکتا ہے۔ اعصابی والو سے متعلق نقصان ایسا ہے کہ اس میں والو کی دُرستگی کے مقابلے میں اسے بدلنے کے امکانات زیادہ رہتے ہیں۔ اس کا فیصلہ آپریشن کے وقت ہوتا ہے۔ سب سے زیادہ جو والو نقصان کی زد میں آتی ہے اس کا نام ہے مترل والو (Mitral valve) یہ والو بائیں جانب واقع جسانی خلا اور جوفِ دل (Ventricle) کے درمیان ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ جس دوسری والو کو بالعموم نقصان پہونچتا ہے اس کا نام ہے (Aortic valve) یہ بائیں طرف کے جوفِ دل اور شریانِ اعظم (Aortic)

کے درمیان ہوتی ہے۔ ۵۰ فیصد امراض میں انھیں رگو والو کو نقصان پہونچتا ہے۔ مترل والو ان تمام کیسوں میں متاثر ہوتا ہے۔ جن کو جوڑوں کے درد کے بخار سے قلب کے امراض ہوتے ہیں۔

آپریشن کے لیے علامات

مریض چاہے آرام سے لیٹا ہو، یا کام کر رہا ہو، اگر ہر دو صورتوں میں دل جسم کے تقاضے پورے نہیں کرتا تو سمجھ لیجیے کہ آپریشن کی ضرورت ہے۔

دل کی بیماری کے ہر مریض کو آپریشن کی ضرورت نہیں ہوتی۔ مریضوں کو چاہیے کہ ہر چھ ماہ بعد یا ہر سال بعد ڈاکٹر سے مشورہ کرتے رہیں۔ الیکٹرو کارڈیوگرام، ایکس رے، اور دیگر معائنے وقتاً فوقتاً کراتے رہنا چاہیے۔ ڈاکٹر ان معائنوں کی بنیاد پر یہ طے کرتا ہے کہ آپریشن کب ضروری ہے۔ (ڈاکٹر اس بات میں یقین رکھتے ہیں کہ خدا کی بنائی ہوئی والو انسان کی وضع کردہ والو سے زیادہ اعلیٰ اور زیادہ اچھی ہے)۔

جوڑوں کے درد کے بخار میں احتیاط اور ضروری روک تھام

اس بات پر کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں کہ جوڑوں کے درد کے بخار کو احتیاطی تدابیر کی مدد سے روکا جا سکتا ہے۔ لیکن ایک بار اس کے ہو جانے کے بعد، اس کا علاج ممکن نہیں۔ بہت سے ترقی یافتہ ملکوں نے جوڑوں کے درد کے بخار پر اور اعصابی امراض سے پیدا ہونے والے قلبی امراض پر قابو پا لیا ہے۔ پنسلین کی ایجاد سے قبل ہی اس سلسلے میں کافی پیش رفت دیکھنے کو ملی تھی۔

جوڑوں کے بخار کو روکنے کے لیے غیر طبی ذرائع جن کا اپنانا ضروری سمجھا گیا، ان میں معیار زندگی کو بلند کرنا، رہائشی حالات کو صاف ستھرا بنانا اور سماجی اور اقتصادی حالات کو بہتر بنانا شامل ہے۔ اس سلسلے میں درج ذیل امور کو ضروری سمجھا گیا:-

۱۔ صفائی کے حالات پیدا کرنا، گندگی کو دُور رکھنا۔

۲۔ غذائی معیار کو بلند کرنا اور تغذیہ بخش خوراک کا استعمال کرنا۔

۳۔ بھیڑ بھاڑ میں زندگی گزارنے سے بچنا۔

۴۔ گلے کی بیماریوں کا دھیان رکھنا، گلے کو دُکھنے سے بچانا اور پنسلین سے امراضِ قلب کی حفاظت کرنا۔

خاص احتیاط

پنسلین کے استعمال سے خصوصی احتیاط ممکن ہے۔ گلا دُکھے تو گرم پانی سے غرارے کرنا ضروری ہیں۔ سیکائی کرنا بھی ضروری ہے۔ اگر بچوں میں اسٹریپ ٹوکوکی (Streptococci) نامی جراثیم ہوں تو پنسلین کا استعمال ضروری ہے۔

چوں کہ گلے کے کلچر سے متعلق سہولتیں آسانی سے دستیاب نہیں، اس لیے گلے کی دُکھن کا علاج پنسلین سے کرنا جائز ہے۔ یہ کام کلچر کے بغیر بھی انجام دیا جا سکتا ہے۔ اس کے لیے پنسلین کا ایک انجیکشن جس میں ۳ لاکھ یونٹ کرسٹالین، ۳ لاکھ یونٹ پروکین اور چھ لاکھ یونٹ بنیزاتھین ہوں، کافی ہوگا۔ اس کے متبادل کے طور پر ۴ لاکھ یونٹ پروکین پنسلین کا انجیکشن دس روز تک روزانہ دو بار دیا جا سکتا ہے۔

اگر کسی مریض کو جوڑوں کا درد کا بخار ہو تو بنیزاتھین پنسلین کا انجیکشن ہر دوسرے یا تیسرے ہفتے لگوا کر اسے روکا جا سکتا ہے۔ یہ کام زندگی بھر کے لیے ضروری ہے۔ کم سے کم ۲۵ سال تک تو ایسا کرنا ہی چاہیے۔ یہ انجیکشن تکلیف دہ ہے۔ لیکن قلب کے مرض سے زندگی بھر جو تکلیف ہوتی ہے، اس کے مقابلے یہ کم ہے۔

بنیزاتھین پنسلین (Benzathine) (Penicillin)

۱۲ لاکھ یونٹ، انٹرامسکولر، ہر ۲۱ روز بعد گویا ۱۸ انجیکشن سال بھر میں لگائے جائیں۔

پنسلین کی لاگت ۶۰ روپے سالانہ۔

۶ لاکھ یونٹ انٹرامسکولر ہر پندرہ روز بعد، ۲۶ انجیکشن سالانہ۔

پنسلین کی لاگت ۵۰ روپے سالانہ۔

نوٹ:-

بچوں میں پنسلین کے مضر اثرات بہت کم ہوتے ہیں۔ اسی طرح بنیزاتھین پنسلین کے مضر اثرات اور اس کا ردِ عمل بھی بچوں میں شاذ و نادر ہی ہوتا ہے۔

علاج سے احتیاط بہتر ہے۔ خوش قسمتی سے جوڑوں کے درد کا بخار احتیاط کے ذریعے روکا جا سکتا ہے۔ لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ اس کا علاج ممکن نہیں۔ اپنے بچے کے دل کو محفوظ رکھیے۔

۱۔ گلے کی خرابی پر پورا دھیان دیں، گلا خراب نہ ہونے دیں۔

۲۔ اگر بچہ جوڑوں کے درد کی شکایت کرتا ہے، تو فوراً ڈاکٹر سے صلاح و مشورہ کریں۔ مرض کی تشخیص عمر گزرنے پر مشکل ہو جاتی ہے۔

۳۔ اگر کسی بچے کا گلا دُکھتا ہو، تو تمام بچوں کا طبی معائنہ کرانا ضروری ہے۔ اسٹریپ ٹوکوکی (جراثیم کے ذریعے) انفیکشن چھوت کی بیماری ہے۔ لیکن جوڑوں کے درد کا بخار ایسی بیماری نہیں ہے۔

۴۔ بخار جس کے بارے میں صحیح تشخیص نہ ہو سکی ہو اور جوڑوں میں درد بھی نہ ہو، پھر بھی یہ جوڑوں کے درد کا بخار ہو سکتا ہے۔

۵۔ بچوں کو بخار میں اگر سینہ دُکھتا ہو، یا اس کے ساتھ ہی دل گھبراتا ہو، اُچھلتا ہو، یا سانس کم کم یا رُک رُک کر آتا ہو، تو وہ جوڑوں کے درد کا بخار ہو سکتا ہے۔

۶۔ جوڑوں کے درد کے بخار میں پنسلین کا پابندی سے دینا والدین کا فرض بن جاتا ہے۔

(بقیہ صفحہ ۱۹ پر)

معاشرتی انقلاب کی جانب
اقتصادی جمہوریت کا مقدمہ

تیسرا باب

اقتصادی نظام قسط: ۹ پرائیویٹ سیکٹر کا فروغ

جہاں تک پرائیویٹ سیکٹر اور اس کی کارگزاری کا تعلق ہے، اس سلسلے میں اجارہ داریوں کی تحقیق سے متعلق کمیشن کا اندازہ ہے کہ پرائیویٹ کارپوریٹ سیکٹر کے مجموعی اثاثہ جات (بنکنگ کمپنیوں کو خارج کرتے ہوئے) ۱۹۶۴ میں ۵۵۰۰ کروڑ روپے کے بقدر تھے اور اس میں سے ۴۶ فیصد ۷۵ بڑے صنعتی گھرانوں کے پاس تھے۔ ۱۹۶۷-۶۸ میں کل اثاثہ جات ۵۰۰۰ کروڑ روپے تھے جن میں سے ۳۱٫۵ فیصد بڑے صنعتی اداروں کے قبضے میں تھے۔ ۱۹۵۹ء سے ۱۹۶۶ کے درمیان آٹھ سال میں نجی منظم صنعتی سیکٹر میں، ۲۰ بڑے صنعتی گھرانوں کی طرف سے کی گئی نجی سرمایہ کاری، مجموعی فاضل سرمایہ کاری کی ۴۰ فیصد کے برابر تھی۔ ان کے اثاثہ جات ۱۹۵۸ء میں ۶۵۰ کروڑ روپے تھے جو بڑھ کر ۱۹۶۳-۶۴ میں ۱۷۸۰ کروڑ روپے ہو گئے۔ اس طرح ۳۱ دسمبر ۱۹۶۶ء کو یہ اثاثہ جات ۲۳۱۰ کروڑ روپے تھے جو بڑھ کر ۳۱ مارچ ۱۹۶۸ء کو ۲۷۵۷ کروڑ روپے ہو گئے۔ ۱۹۷۹ میں یہ بڑھ کر ۶۶۱۸ کروڑ روپے ہو گئے۔ اس طرح ۱۹۵۸ء اور ۱۹۷۱ء کے درمیان ۲۰ بڑے صنعتی اداروں کے اثاثہ جات دس گنا بڑھ گئے۔ صنعتی گھرانے جن میں ٹاٹا اور برلا کے نام آتے ہیں، ان دونوں کے پاس ہی مجموعی اثاثہ جات کا ۲۵ فیصد تھا یعنی ۲۶۱۹ کروڑ روپے۔

درج ذیل گوشوارہ یہ ظاہر کرتا ہے کہ

گوشوارہ: ہندوستان میں ۲۰ بڑے صنعتی گھرانوں کی مالی صورت حال (کروڑ روپوں میں)

نام	اثاثہ جات	ٹیکسوں کی ادائیگی سے قبل منافع	ادا شدہ سرمایہ	کاروبار
برلا	۱،۳۰۹٫۹۹	۱۲۱٫۰۲	۱۵۶٫۱۹	۱،۶۲۷٫۳۹
ٹاٹا	۱،۳۰۹٫۳۸	۹۱٫۶۳	۱۸۲٫۴۲	۱،۷۲۰٫۲۵
مفت لال	۳۷۱٫۰۶	۳۹٫۸۶	۶۱٫۹۹	۵۱۶٫۰۸
جے کے سنگھانیہ	۳۵۲٫۵۳	۱۳٫۱۲	۴۹٫۸۷	۳۹۱٫۲۳
تھاپر	۲۹۱٫۰۱	۲۴٫۴۱	۴۴٫۳۰	۴۴۲٫۴۶
سارا بھائی	۲۴۹٫۵۲	۱۷٫۵۳	۲۰٫۱۰	۳۲۴٫۲۷
بنگور	۲۴۴٫۲۰	۱۴٫۱۷	۳۵٫۴۷	۳۷۲٫۹۷
آئی سی آئی	۲۳۵٫۵۵	۲۹٫۸۲	۵۷٫۳۶	۳۵۲٫۴۵
اے سی سی	۲۱۱٫۹۲	۱۴٫۷۲	۳۸٫۴۳	۱۹۹٫۳۰
آئل انڈیا	۲۱۱٫۲۷	۱۳٫۹۶	۳۳٫۹۳	۴۳۵٫۰۸
سری رام	۲۰۸٫۶۵	۱۶٫۱۶	۲۸٫۶۰	۳۸۵٫۲۳
سندیا	۲۰۵٫۹۶	(–) ۹٫۸۵	۱۹٫۲۷	۸۸٫۰۵
کرلوسکر	۱۹۱٫۹۱	۱۲٫۳۵	۲۹٫۴۴	۲۲۹٫۴۶
ہندوستان لیور	۱۸۷٫۸۰	۳۲٫۷۵	۳۳٫۵۲	۴۲۳٫۴۱
لارسن اور ٹوبرو	۱۸۵٫۴۸	۲۲٫۴۷	۲۶٫۳۱	۱۹۰٫۹۴
مودی	۱۷۷٫۰۸	۱۴٫۲۹	۲۱٫۸۸	۳۴۵٫۲۶
چوگولا	۱۷۲٫۵۹	(–) ۲٫۶۹	۲۲٫۵۹	۴۳٫۲۶
بجاج	۱۶۸٫۶۱	۱۴٫۳۵	۲۳٫۰۸	۲۱۱٫۸۶
بھیونڈی والا	۱۶۸٫۱۷	(–) ۰٫۸۴	۱۵٫۹۷	۶۴٫۶۱
کستور بھائی لال بھائی	۱۶۵٫۹۸	۲۲٫۹۴	۲۰٫۹۳	۲۳۰٫۵۳

یوجنا، نئی دہلی

۱۹۶۹ء میں ۲۰ صنعتی گھرانوں کا ٹیکس کی ادائیگی سے قبل اثاثہ، کاروبار، ادا شدہ سرمایہ اور نفع کتنا کتنا تھا۔

بڑے صنعتی گھرانوں کی بے پناہ ترقی کے اسباب منجملہ دیگر اسباب کے درج ذیل ہیں :-

۱۔ صنعتی لائسنسوں کے اجرا کا طریق کار۔

۲۔ مالی اداروں کی طرف سے امداد کا طریق کار۔

اجارہ داریوں سے متعلق تحقیقاتی کمیشن کی رپورٹ میں مذکور ہے کہ :-

لائسنسوں کے اجرا کا طریق کار چند بڑے صنعتی اداروں کو غیر معمولی طور پر ان کے حق سے زیادہ ان کو نفع پہنچاتا ہے۔ یہ صنعتی ادارے اس طریق کار کی خامیوں سے واقف ہو گئے ہیں۔ اور اس سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے کا گر جان گئے ہیں۔ کچھ ایسے ادارے بھی ہیں جو ایک ہی چیز کی تیاری کے لیے اپنے ہی زیر انتظام مختلف فرموں سے بہت سی درخواستیں دلا دیتے ہیں۔

اس ضمن میں ۱۹ اگست ۱۹۸۳ کو پریس کلب آف انڈیا میں غیر مقیم ہندوستانی تاجر مسٹر سوراج پال نے جو کچھ کہا، اس کا بیان کرنا یہاں بے موقع نہ ہوگا۔ انھوں نے کہا کہ یہ بد قسمتی کی بات ہے کہ ملک کے صرف ۱۱ بیوپاری گھرانوں نے اس صنعت پر کنٹرول کر رکھا ہے جس میں سرکاری اداروں نے ۲۷ ہزار کروڑ روپے کی سرمایہ کاری کی ہے جبکہ ان کی اپنی سرمایہ کاری مشکل سے ۱۷۸ کروڑ روپے ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ یہ گیارہ صنعتی گھرانے مالی منافعوں کا کثیر حصہ اپنے مقاصد کے لیے استعمال کر رہے ہیں اور کچھ اندازوں کی روشنی میں انھوں نے غیر ملکی بنکوں میں ۲۵ ہزار کروڑ روپے جمع کر رکھے ہیں۔ ان باتوں کی تردید بڑے صنعتی گھرانوں کی طرف سے بھیا ہو سکی ہے یا کسی بھی ذمہ دار حلقے کی طرف سے اس کے خلاف کوئی بات نہیں کہی گئی ہے۔

پرائیویٹ سیکٹر کی کارکردگی کی کامیابی کا سبب یہ ہے کہ اس کی سرگرمیوں کا دائرہ زیادہ تر اشیائے صارفین تک محدود ہے اور اسے غیر ملکی مقابلے سے کافی حد تک محفوظ رکھا گیا ہے۔ پرائیویٹ سیکٹر اسی لیے زیادہ نفع کے ساتھ کام کر رہا ہے اور پبلک سیکٹر کے مقابلے میں زیادہ منافع کما رہا ہے۔

یہ بات قابل ذکر ہے کہ پرائیویٹ سیکٹر کی اس کارگزاری کے پس پردہ اصل محرک نفع کمانا ہے۔ پرائیویٹ سیکٹر صرف ایسی اشیا اور خدمات کی تیاری پر زور دیتا ہے جو اس طبقے کے لیے ہیں جو کہ اشیاء اور خدمات کو خریدنے کے لیے کافی طاقت رکھتا ہے۔ درج ذیل گوشوارہ اس عرصے میں پبلک اور پرائیویٹ سیکٹر میں پیداوار کے موٹے موٹے اجزا کی آمدنیوں کے عناصر پر روشنی ڈالتا ہے۔

اس گوشوارے کی تفاصیل سے معلوم ہوتا ہے کہ نفع کی مد میں آمدنیوں کے عناصر کے تعلق سے پبلک سیکٹر اور پرائیویٹ سیکٹر میں بڑا فرق ہے۔ پرائیویٹ سیکٹر میں نفع کا تناسب دس برسوں کے عرصے میں ۲۲ فیصد سے بھی اوپر کی سطح پر مسلسل چلتا رہا ہے۔ مگر پبلک سیکٹر میں یہ ۱۲٫۴ اور ۸٫۰ا فیصد کے درمیان گھٹتا بڑھتا رہا ہے اور جائزہ کے آخری سال گویا کہ ۱۹۸۰-۸۱ء میں یہ ۱۹ء۱۳ فیصد رہا ہے۔ ملازمین کو معاوضہ کی مد میں تناسب پرائیویٹ سیکٹر میں ۵۹٫۶ اور ۶۲٫۵ فیصد کے درمیان چلتا رہا ہے مگر پبلک سیکٹر میں یہ ۶۰ فیصد سے اوپر کی سطح پر مستحکم رہا۔ اس سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہونچ جاتی ہے کہ منظم پرائیویٹ سیکٹر نفع کی اعلیٰ سطح پر کام کر رہا ہے۔

رواں قیمتوں کی روشنی میں (کروڑ روپیوں میں)

آئٹم	۱۹۷۰-۷۱	۱۹۷۵-۷۶	۱۹۷۶-۷۷	۱۹۷۷-۷۸	۱۹۷۸-۷۹	۱۹۸۰-۸۱
سرکاری ادارے	۲۶۰۶	۶۶۵۴	۸۲۰۶	۸۹۳۹	۹۹۴۲	۱۳,۰۹۶
۱۔ ملازمین کا معاوضہ	۱۶۴۶	۴۳۴۰	۴۷۰۵	۵۲۱۵	۵۸۶۴	۸۰۳۴
(فی صد)	(۶۳٫۲)	(۶۵٫۲)	(۵۷٫۳)	(۵۸٫۳)	(۵۹٫۰)	(۶۱٫۳)
۲۔ سود	۵۹۰	۱۱۳۳	۱۵۵۳	۱۸۴۹	۲۱۸۱	۲۹۸۶
۳۔ کرایہ	۴۶	۱۰۴	۱۶۱	۱۷۷	۲۰۹	۲۶۱
۴۔ نفع	۳۲۴	۱۰۷۷	۱۷۸۷	۱۶۹۸	۱۶۸۸	۱۸۱۵
(فی صد)	(۱۲٫۴)	(۱۶٫۲)	(۲۱٫۸)	(۱۹٫۰)	(۱۷٫۰)	(۱۳٫۹)
پرائیویٹ ادارے	۴۴۷۶	۷۷۱۰	۸۸۲۲	۹۷۸۳	۱۱,۰۰۸	۱۳,۷۱۰
۱۔ ملازمین کا معاوضہ	۲۷۹۳	۴۷۲۱	۵۲۶۰	۶۰۰۹	۶۷۴۰	۸۴۶۳
(فی صد)	(۶۲٫۴)	(۶۱٫۲)	(۵۹٫۶)	(۶۱٫۴)	(۶۱٫۲)	(۶۱٫۷)
۲۔ سود	۴۱۸	۱۰۵۲	۱۱۹۶	۱۳۴۲	۱۵۰۹	۱۷۵۵
۳۔ کرایہ	۹۵	۱۵۷	۱۶۴	۲۰۲	۲۵۶	۲۷۹
۴۔ نفع	۱۱۷۰	۱۷۸۰	۲۲۰۲	۲۲۳۰	۲۵۰۳	۳۲۱۳
(فی صد)	(۲۶٫۲)	(۲۳٫۱)	(۲۵٫۰)	(۲۲٫۸)	(۲۲٫۵)	(۲۳٫۴)

ماخذ : نیشنل اکاؤنٹس اسٹے ٹسٹکس ۱۹۷۰-۷۱ء سے ۱۹۸۰-۸۱ء فروری ۱۹۸۳ء صفحہ ۳۲-۳۳، سنٹرل اسٹے ٹسٹیکل آرگنائزیشن۔

اشیائے خوراک کے لیے قوتِ خرید

اقتصادی نظام کی صورتِ حال کو ذہن میں رکھتے ہوئے، معیشت میں غربت کے نقشے پر بھی نظر ڈالنی ضروری ہے :-

اس سے قبل ہم اپنے عوام کی فی کس کھپت پر اخراجات سے بحث کر چکے ہیں۔ ہم نے دیکھا کہ عوام کا بڑا طبقہ یعنی ۴۹ کروڑ ۸۰ لاکھ افراد کے اشیائے ضروری کی کھپت کے فی کس اخراجات ۱۲۰۰ روپے سالانہ بلکہ اس سے بھی کم ہیں۔

ان میں ۱۳ کروڑ ۵۰ لاکھ ۶۰ ہزار افراد کا سالانہ خرچ کا فی کس اوسط ۸۰۴ کروڑ روپے سے بھی کم ہے۔ یہ جاننا باعثِ دلچسپی ہے کہ وہ کس حد تک خوراکی اشیاء کی ضرورت پوری کرنے کے اہل ہیں۔ زندگی کی دیگر ضروریات کو تو چھوڑ دیجیے مثلاً گھر، کپڑے اور دوائیں وغیرہ۔

طبی تحقیق کی بھارتی کونسل نے مختلف زمروں کے لیے فی کس کیلوری (حرارے) کی کم سے کم ضرورت کا جو نقشہ پیش کیا ہے، وہ درجِ ذیل ہے :-

فی کس فی یوم خوراک کی ضرورت

گروپ	تفصیل	کیلوری
مرد	بیٹھے رہنے والے افراد	۲۴۰۰
	درمیانہ درجے کا کام کرنے والے افراد	۲۸۰۰
	بھاری کام کرنے والے افراد	۳۹۰۰
عورت	بیٹھی رہنے والی عورتیں	۱۹۰۰
	درمیانہ درجے کا کام کرنے والی عورتیں	۲۲۰۰
	بھاری کام کرنے والی عورتیں	۳۰۰۰
	حاملہ عورتیں (حمل کا آخری زمانہ)	۳۰۰ +
	ایک سال تک بچوں کو دودھ پلانے کا زمانہ	۷۰۰ +
بچے	تین سال تک	۱۲۰۰
	۴ سے ۶ سال تک	۱۵۰۰
	۷ سال سے ۹ سال تک	۱۸۰۰
	۱۰ سال سے ۱۲ سال تک	۲۱۰۰
	بالغ ہونے والے یعنی ۱۳ سال سے ۱۵ سال تک کے لڑکے	۲۵۰۰
	لڑکیاں	۲۲۰۰
	۱۶ سال سے ۱۸ سال تک کے لڑکے	۳۰۰۰
	لڑکیاں	۲۲۰۰

۱۹۶۸ء میں یہ سفارشات تغذیہ بخش خوراک کے ماہروں نے کی تھیں اور ابھی تک انھیں کو جدید ترین تحقیقات شمار کیا جاتا ہے۔

ماخذ: طبی تحقیق کی بھارتی کونسل حیدرآباد ۱۹۸۱ء سے وابستہ تغذیہ بخش خوراک کا قومی ادارہ جس نے ہندوستانی عوام کی تغذیہ بخش خوراک کی ضرورت کا جائزہ لیا۔

البتہ منصوبہ بندی کمیشن نے ۱۹۷۷ء میں خوراک کی کم سے کم ضرورت اور اس کی کھپت کا اندازہ لگانے کے لیے جو ٹاسک فورس قائم کی تھی، اس نے دیہی علاقوں میں یومیہ کیلوری ۲۴۰۰ فی کس کا اوسط لگایا جبکہ شہری علاقوں کے لیے یہ اوسط ۲۱۰۰ کیلوری فی فرد تھا۔ اس کا اندازہ لگاتے وقت جنس، عمر، کام کی نوعیت وغیرہ عناصر کو ذہن میں رکھا گیا۔

کیلوری کی ضرورت کے اخراجات

منصوبہ بندی کمیشن نے یہ اندازہ لگایا کہ ۱۹۸۰–۸۱ کی قیمتوں کو سامنے رکھ کر ماہانہ فی کس اوسط کھپت کے اخراجات شہری علاقوں میں ۹۸ روپے اور دیہی علاقوں میں ۹۰ روپے ہو گئے ہیں۔

یہ اضافہ اس عرصے میں قیمتوں میں اضافے کے سبب ہوا۔ اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ ۱۹۸۰–۸۱ء میں خوراکی اور غیر خوراکی مدات کے درمیان نجی کھپت کے اخراجات میں اضافہ زیادہ تر ۱۹۷۶–۷۷ء کے مطابق ہوا ہے۔ جیسا کہ ٹاسک فورس نے اندازہ لگایا تھا، تو بھی ماہانہ فی کس کھپت کے اخراجات خوراکی مدات پر ۱۹۸۰–۸۱ء میں دیہی علاقوں میں ۷۴.۰۷ روپے اور شہری علاقوں میں ۷۰.۴۳ روپے آتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں دیہی علاقوں میں ۲۴۰۰ کیلوری پر فی کس یومیہ اخراجات ۲.۴۳۵ روپے یا ۷۴.۰۷ روپے ماہانہ آتے ہیں۔ شہری علاقوں میں ۲۱۰۰ کیلوری کے لیے یہ اخراجات ۲.۳۴۵ روپے یومیہ یا ۷۰.۳۴ ماہانہ آتے ہیں۔

غلہ کی ضروریات

جس قدر کیلوری کی ضرورت کی سفارش کی گئی ہے، اس کے مطابق خوراکی اجناس کی مجموعی سالانہ ضرورت کا اندازہ اس طرح ہے :-

دیہی علاقوں میں فی کس یومیہ کیلوری کی ضرورت ۲۴۰۰ اور شہری علاقوں میں ۲۱۰۰ ہے، اس طرح فی کس سالانہ کیلوری کی کھپت دیہی علاقوں میں ۸۷۶۰۰۰ اور شہری علاقوں میں ۷۶۶۵۰۰ ہے۔

منصوبہ بندی کمیشن کے اندازے کے مطابق خوراکی اشیاء پر نجی کھپت کے اخراجات کا ۷۰ فیصد غلہ اور دالوں پر خرچ ہوتا ہے جبکہ شہری علاقوں میں ان مدات پر ۶۱ فیصد خرچ ہوتا ہے۔ خوراکی اجناس کی فی کس سالانہ ضرورت کا اندازہ کیلوری کے حساب سے اس طرح بنتا ہے :-

دیہی علاقوں میں ۶۱۳۲۰۰ (۷۰ فیصد اخراجات کی سطح کے مطابق)

شہری علاقوں میں ۴۶۷۵۶۴ (۶۱ فیصد اخراجات کی سطح کے مطابق)

۱۹۸۱ء میں ہندوستان کی مردم شماری کے مطابق دیہاتوں میں ۵۲ کروڑ ۳۴ لاکھ ۲۱ ہزار۔

اڑد	۳،۴۷۰	۹۷۷	۳،۳۹۰،۶۱۹
کیسری	۳،۴۵۰	۴۶۸	۱،۶۱۴،۶۰
مٹر	۳،۷۶۰	۸۴	۳۱۵،۸۴
کلتھی	۳،۴۰۰	۷۳۹	۲،۵۱۲،۶۰
دیگر دالیں	۳،۴۰۰	۶۵۷	۲،۲۳۳،۸۰
میزان	-	۱۱،۱۹۹	۳۹،۱۱۹،۲۵
مجموعی میزان (الف + ب)		۱۲۹،۹۰۱	۴۳۷،۸۳۵،۳۳

شہر میں ۱۵ کروڑ ۹۵ لاکھ ۱۵ ہزار۔
میزان ۶۸ کروڑ ۳۹ لاکھ ۸۲ ہزار۔

۸۱ – ۱۹۸۰ء میں خوراکی اجناس کی مجموعی ضرورت کیلوری کی کھپت کے حساب سے اس طرح تھی :-

دیہات میں ۳۵۳،۲۲ ہزار ملین کیلوری۔
شہر میں ۷۴،۰۰ ہزار ملین کیلوری۔
میزان ۴۲۸۳۲۲ ہزار ملین کیلوری۔

اب ہمیں خوراکی اجناس کی پیداوار اور اس سے حاصل ہونے والی کیلوری کے نقشے پر بھی نظر ڈالنی چاہیئے۔

خوراکی اجناس کی پیداوار

۸۱ – ۱۹۸۰ میں خوراکی اجناس کی پیداوار اور اس سے حاصل ہونے والی کیلوری درج ذیل نقشے سے واضح ہے :-

فصل کا نام	فی کلو کیلوری کی تعداد (ہزار میں)	پیداوار (ہزار ٹن میں)	کیلوری جو اس سے حاصل ہوئی (ہزار ملین کیلوری)
(الف) غلّہ			
چاول	۳،۴۰۰	۵۳،۲۳۱	۱۸۰،۹۸۵،۴۰
گندم	۳،۴۶۰	۳۶،۴۶۰	۱۲۶،۱۵۱،۶۰
جَو	۳،۰۰۰	۲،۲۴۲	۶،۷۲۶،۰۰
جوار	۳،۴۹۰	۱۰،۵۰۴	۳۶،۶۵۸،۹۶
باجرہ	۳،۰۳۲	۵،۴۱۸	۱۶،۴۲۷،۳۰
مکئی	۳،۴۲۰	۶،۸۰۴	۲۳،۲۶۹،۶۸
موٹے اناج	۲۶۱	۱،۵۷۸	۴۱۱،۸۶
راگی	۳،۲۸۰	۲،۴۶۵	۸،۰۸۵،۲۰
میزان		۱۱۸،۷۰۲	۳۹۸،۷۱۶،۰۸
(ب) دالیں			
ارہر	۳،۳۵۰	۲،۰۱۵	۶،۷۵۰،۲۵
چنا	۳،۷۲۰	۴،۶۵۲	۱۶،۴۴۷،۲۰
موٹھ	۳،۴۰۰	۱۹۸	۶۷۳،۲۰
مونگ	۳،۴۸۰	۹۷۴	۳،۳۸۹،۵۲
مسور	۳،۴۳۰	۴۳۵	۱،۴۹۲،۰۵

خوراکی اجناس کی فی کس کھپت میں حاشیائی اضافے کی مندرجہ بالا تصویر ایک سراب ہے۔ اور خوراکی اجناس کی تقسیم کے معقول پسندانہ نظام کی عدم موجودگی میں انتہائی گمراہ کُن ہے۔ کھپت کے اخراجات سے متعلق اعداد و شمار کے مطابق خوراکی اجناس کی کیلوری کی فراہمی پیداوار کے مطابق فی کس فراہمی کے اوسط سے کہیں زیادہ کم ہے۔ حتیٰ کہ طبی تحقیق کی بھارتی کونسل کے معیارات سے بھی کم ہے۔

خوراکی اجناس کی پیداوار میں اضافے کے ساتھ ساتھ کیلوری کی مطلوبہ مقدار کو فراہم کئے جانے کے واسطے ضروری صلاحیت حاصل کر پیدا کی جا چکی ہے لیکن جب اسے اُن لوگوں تک پہونچانے کا سوال آتا ہے جن کے لیے یہ سب کچھ کیا گیا ہے، تو اس مسئلہ کو خوراکی اجناس کی قوتِ خرید سے جوڑ دیا جاتا ہے۔ غریبی کی سطح سے نیچے زندگی گزارنے والوں کی قوتِ خرید بہت کم ہے، لہٰذا کثرت میں قلت کی صورتِ حال اور بھی خراب ہو جاتی ہے۔ اس سے ایک اہم مسئلہ سامنے آتا ہے اور وہ یہ کہ کیلوری کی ضروریات کے مطابق غریبی کی جو وضاحت کی گئی ہے، اس کا اجناس کی فراہمی سے کوئی جوڑ ہے۔ ہمیں کھپت کے مجموعی ڈھانچے کو سامنے رکھنا ہے جس سے کم سے کم معیارِ زندگی کا اشارہ ملتا ہے۔ اس ڈھانچے کے تحت مختلف آئٹموں کو سامنے رکھنا ہے اور پھر کھپت کی لاگت کا اندازہ لگانا ہے۔

خوراک کا یومیہ بجٹ

مختلف عناصر کو سامنے رکھتے ہوئے طبی تحقیق کی بھارتی کونسل نے ۲۱۵۰ کیلوری یومیہ کی ضرورت کا قومی سطح پر اندازہ لگایا ہے۔ درجِ ذیل گوشوارے سے فی کس خوراک کی ضرورت (گرام یومیہ) کا قومی سطح پر اندازہ واضح ہوتا ہے :-

خوراکی اشیاء	جسمانی ساخت کے اعتبار سے سطح	خوردہ سطح	پیداواری سطح
۱۔ غلہ	۳۸۶	۴۳۶	۴۹۰
۲۔ دالیں	۴۳	۴۷	۵۳
۳۔ پتے دار سبزیاں	۵۸	۶۲	۷۲
۴۔ دیگر سبزیاں	۴۵	۴۹	۵۵
۵۔ جڑدار/گانٹھ دار پودے	۴۰	۴۴	۵۰
۶۔ دودھ	۲۰۰	۲۲۰	۲۴۸
۷۔ چکنائی/تیل	۳۱	۳۴	۳۸
۸۔ چینی/راب	۳۱	۳۴	۳۸

یومیہ خوراک کی ضروریات کے پیشِ نظر جیساکہ مندرجہ بالا گوشوارے سے ظاہر ہوتا ہے ہمیں ایک بجٹ بنانا ہے جس سے اس خوراک کو خریدنے کے لیے درکار رقم کا اندازہ ہوسکے۔ ان آئٹموں کا کوئی ہند پیلنے پر خوردہ قیمتوں کا عدد اشاریہ نہ ہونے کی صورت میں، صرف چند مخصوص علاقوں تک اس مطالعے کو محدود کیا جاسکتا ہے۔ دلی کا شہری علاقہ لیجیے۔ یہاں بھی خوردہ قیمتوں کے لیے فیئر پرائس شاپ کی خوردہ قیمتوں پر بھروسہ کرنا پڑے گا۔ یہ دکانیں رعائتی داموں پر غلہ اور چینی تقسیم کرتی ہیں۔ ان دکانوں پر اشیاء کی قیمتیں بازار میں رائج قیمتوں کی نصف یا پونی ہوتی ہیں۔ باقی آئٹموں کے لیے سپر بازار کی قیمتوں کو سامنے رکھنا ہوتا ہے۔ درج ذیل گوشوارے سے خوراکی اشیاء کی یومیہ لاگت کا اندازہ ہوتا ہے

خوراکی اشیاء	خوردہ سطح پر مقدار (گرام)	فی کلوگرام نرخ	خریدنے کے لیے درکار رقم (روپے)
۱۔ چاول	۲۱۸ } ۴۳۶	۲٫۲۱	۰٫۴۶۱ } ۱٫۱۰ } ۱٫۳۵
۲۔ گندم	۲۱۸	۱٫۶۵	۰٫۳۴۹
۳۔ دالیں	۴۷	۵٫۰۰	۰٫۲۳۵
۴۔ پتے دار سبزیاں	۶۴	۳٫۰۰	۰٫۱۹
۵۔ دیگر سبزیاں	۴۹	۳٫۰۰	۰٫۱۵
۶۔ جڑدار پودے	۴۴	۲٫۰۰	۰٫۰۹
۷۔ دودھ	۲۲۰	۱٫۸۰۴	۰٫۴۴۲
۸۔ چکنائی اور تیل	۳۴	۱۵٫۰۰	۰٫۵۱
۹۔ چینی/شیرا/راب	۳۴	۳٫۱۵	۰٫۱۱

اس کے مطابق ماہانہ بجٹ ۲٫۸۲ × ۳۰ = ۸۴٫۶۰ روپے ہوگا۔
سالانہ بجٹ ۲٫۸۲ × ۳۶۵ = ۱۰۲۵٫۶۵ روپے ہوگا۔

مندرجہ بالا موٹے اندازوں کی روشنی میں منڈی کی سب سے کم قیمت کو سامنے رکھا گیا ہے۔ دلی کا شہری علاقہ فیئر پرائس شاپس سے فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ یہ سہولت ملک کے دیگر حصوں کے مقابلے یہاں زیادہ ہے

دلی ملک اسکیم کے تحت دودھ کم داموں پر فراہم ہوتا ہے۔ اس کا اندازہ لگاتے وقت یہ بات بھی سامنے رکھی گئی ہے کہ گندم اور چاول برابر مقدار میں استعمال ہوتا ہے۔ ملک اسکیم کے دودھ میں چکنائی کی مقدار معیاری دودھ سے بہت کم ہوتی ہے۔ اصلی دودھ تقریباً ۴ روپے لیٹر کے حساب سے فروخت ہوتا ہے۔

مندرجہ بالا قیمتوں کو صحیح مانتے ہوئے ہم دیکھتے ہیں کہ خوراکی اجناس اور دالوں کے لیے درکار یومیہ بجٹ، ترکاریاں، تیل، چینی وغیرہ کو چھوڑ کر ایک روپیہ ۳۵ پیسے آتا ہے۔ اس کا مطلب ہے ۴۰٫۵۰ روپے ماہانہ یا ۴۹۲٫۷۵ روپے سالانہ جبکہ سال ۳۶۵ دنوں کا ہوتا ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ کتنے لوگ اس خرچ کے متحمل ہو سکتے ہیں۔

نیشنل سیمپل سروے کے نتائج کی روشنی میں دیہی علاقوں کے ۴۹٫۹۵ فیصد عوام کا فی کس ماہانہ خرچ ۴۳ روپے سے کم ہے۔ شہری علاقوں میں اس زمرے کا تناسب ۳۵٫۱۱ ہے۔ ۱۹۸۱ کی مردم شماری پر اس تناسب کو لاگو کرتے ہوئے دیہی علاقوں میں ۲۱ کروڑ ۸۰ لاکھ اور شہری علاقوں میں ۳ کروڑ ۴۰ لاکھ افراد ۴۳ روپے فی کس ماہانہ کے حساب سے خرچ کرتے ہیں۔

ان اعداد و شمار کو مرتب کرتے وقت مختلف خامیوں کا لحاظ کرتے ہوئے کہا جاسکتا ہے کہ ۲۵ کروڑ ۲۰ لاکھ افراد خوراک کی یومیہ ضرورت کے بھی کفیل نہیں ہوسکتے۔ چونکہ ایک روپیہ ۳۵ پیسے یومیہ ہے۔ اس لحاظ سے خوراک کے مقابلے میں خود کفیلی کا دعویٰ مشکل سی بات ہے

کہا جا سکتا ہے۔

خوراک کی مجموعی پیداوار اطمینان بخش طور پر کافی کہی جا سکتی ہے لیکن ملک گیر پیمانے پر کسی معقول یکساں نظام کی عدم موجودگی اور قوت خرید کے مختلف ڈھانچے کی موجودگی میں یہ طبی تحقیق کی بھارتی کونسل کی طرف سے سفارش کردہ طرز کے مطابق ضروریات پوری کرنے کے لیے ناکافی ہے۔ فی کس فی یوم ۴۹۰ گرام غلہ اور اسی طرح فی کس فی یوم ۵۳ گرام دالوں کی ضرورت کے پیمانے پر ۱۹۸۱ء کی مردم شماری کے مطابق آبادی کی ضروریات ۱۲ کروڑ ۳۲ لاکھ ۳۰ ہزار ٹن غلہ اور ایک کروڑ ۳۲ لاکھ ۳۰ ہزار ٹن دالوں کی بنتی ہیں۔ اسی طرح غلہ کی مجموعی ضرورت ۱۳ کروڑ ۵۵ لاکھ ۶۰ ہزار ٹن کے بقدر ہے۔ اس سطح پر ضرورت کو پوری کرنے کے لیے ہر سال ۵۰ لاکھ ٹن اضافہ درکار ہے تاکہ بڑھتی ہوئی آبادی کی ضروریات پوری ہو سکیں۔

چکنائی اور تیلوں کی ضرورت اور اس کی تکمیل پر نظر ڈالنا بھی ضروری ہے۔ طبی تحقیق کی بھارتی کونسل کی سفارشات کے مطابق روزانہ کی ضرورت ۴۳ گرام ہے۔ اسی بنیاد پر تیل اور چکنائی کی فی کس ضرورت ۳۶۵ دنوں کے سال میں ۱۳۱۸۵ کلوگرام ہے۔ شماریات کی مرکزی تنظیم کی روشنی میں ۸۰-۱۹۷۹ء میں قدرتی تیلوں کی فی کس فراہمی ۳۱ء۳ کلوگرام اور وناسپتی کی فی کس فراہمی ایک کلوگرام تھی۔ گویا ۴۱ء۴ کلوگرام فی کس فی سال۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ عام آدمی کی خوراک کے ایک اہم جزو کی فراہمی میں ہم کس قدر پیچھے ہیں۔

قوت خرید کی تقسیم کے غیر مساوی ہونے سے بہت سے لوگ ناقص غذاؤں کا شکار ہیں۔ اس سے جسمانی اور ذہنی امراض لاحق ہوتے ہیں۔ بہت سے لوگ زندگی میں تھک جاتے ہیں۔ اس سے ان کے کام کی صلاحیت متاثر ہوتی ہے اور پیداواری ہنرمندیوں پر بُرا اثر پڑتا ہے۔

اس کا مجموعی اثر یہ ہے کہ ہماری صلاحیتوں پر غیر معمولی بوجھ پڑ رہا ہے۔ سماج کا یہ اخلاقی فرض بنتا ہے کہ اس کمی کو پورا کرے کیونکہ سماج کے ایک طبقے کی کمزوری سے مضبوط طبقے کی ترقی کی رفتار میں بھی رکاوٹ پڑتی ہے۔ اس سے سماجی اور نفسیاتی مسائل پیدا ہوئے ہیں۔ لوگ مجبوراً قسمت کا رونا روتے ہیں اور مذہبی عقائد کا سہارا لے کر خود کو اطمینان دلاتے ہیں۔

بیس نکاتی پروگرام کس حد تک غریب عوام کی مشکلات دور کرنے میں مددگار ثابت ہو سکتا ہے۔ خاص کر ان لوگوں کی مشکلات دور کرنے میں جو کہ غریبی کی سطح سے نیچے زندگی گزار رہے ہیں۔

ترقی کے بنیادی اجزا اور قومی سیکٹر

گزشتہ تیس برسوں میں سرمایہ کاری کا ڈھانچہ تیز کیا گیا ہے تاکہ قومی سطح پر آمدنی بڑھے اور فی کس اوسط آمدنی میں اضافہ ہو سکے۔ پیداواری ڈھانچے کا سرمایہ کاری نظام اس طرح مرتب کیا گیا تاکہ محنت کش طبقے کو روزگار مل سکے اور آمدنی کی منصفانہ تقسیم عمل میں آ سکے۔ مالی اصلاحات کے ذریعے عدم توازن کو کم کرنے کی کوشش کی گئی۔

پنڈت جواہر لال نہرو نے ترقی کا جو نظام چالو کیا، اس نے مضبوط اقتصادی بنیاد فراہم کی۔ اس کے ذریعے صنعتوں کو بڑھاوا ملا اور اس کے ذریعے اعلا صلاحیتوں کی حامل انتظامی افرادی قوت معرض وجود میں آ سکی۔ پبلک سیکٹر نے بنیادی نوعیت کا ڈھانچہ قائم کیا۔ اس کے سبب پرائیویٹ سیکٹر میں پیداوار بڑھ سکی۔ اس سیکٹر نے عوام کی روزمرہ کی ضروریات کا سامان مہیا کیا اور مضبوط قوت خرید کے مالک طبقے کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے سامان اور خدمات فراہم کیں۔ اس پیداواری ڈھانچے سے آمدنی کی منصفانہ تقسیم عمل میں نہ آ سکی۔ اس نے اقتصادی طور پر خوشحال طبقے کی ضرورتوں کو پورا کیا اور عوام کی ضرورتوں کے مقابلہ زیادہ خوشحال لوگوں کو خدمات فراہم کیں۔

۱۹۵۰ء سے ۱۹۷۰ء تک کے درمیانی عرصے میں پوری دنیا میں ترقی پذیر معیشتیں مجموعی قومی پیداوار بڑھانے میں مشغول رہیں اور یہ تصور ان کے دل و دماغ پر بری طرح چھایا رہا۔

ترقی یافتہ اور تجربہ کار ملکوں کی طرف سے ترقی پذیر ممالک کو یہ کہا گیا کہ مجموعی قومی پیداوار پر دھیان دو اور غریبی خود بخود دور ہو جائے گی۔ ترقی پذیر ملکوں کے سماجی، اقتصادی اور سیاسی ڈھانچے کے پیش نظر یہ تصور غلط ثابت ہوا۔ حکومت پاکستان میں اُس وقت کے منصوبہ بندی کمیشن کے صدر ڈاکٹر محبوب الحق نے ایک مضمون میں جو اقتصادی نظریے سے متعلق انھوں نے لکھا بجا طور پر کہا کہ "ایک اور سمت جو ہم نے غلط اپنائی، وہ اس مفروضے سے متعلق تھی کہ آمدنیوں کی تقسیم کی پالیسیاں ترقی کی پالیسیوں سے الگ ہیں اور ان کو بعد میں ترقی پذیر ملکوں کے مالی نظام سے مربوط کیا جا سکتا ہے۔ انھوں نے اسے اقتصادی اور سیاسی اداروں کے باہمی جوڑ توڑ اور ان کے آپسی کھیل کو سمجھنے کے سلسلے میں سادہ لوحی سے تعبیر کیا۔

انھوں نے مزید لکھا کہ "اگر پیداوار کا عمل غیر منظم طور پر ترقی پاتا ہے تو اس کے باعث عوام کی کثیر تعداد روزگار سے محروم رہتی ہے۔ آمدنیوں کی دوبارہ سے تقسیم ناممکن ہو جاتی ہے اور پیداواری عمل میں شرکت سے محروم رہنے والے افراد تک اس آمدنی کا پہنچنا دشوار ہو جاتا ہے۔ سامان تعیش اور کاروں وغیرہ جیسی اشیا کی پیداوار میں اضافے سے مجموعی قومی پیداوار میں اضافہ کر لینے کے بعد انھیں بس ٹرانسپورٹ یا دیگر عوامی استعمال کی اشیا میں بدلنا آسان نہیں ہوتا۔

مسز گاندھی کے بیس نکاتی پروگرام کو ترقی جیسی چھوٹے چھوٹے حصے قرار دے سکتے ہیں۔ اس کا مقصد پیداواری ڈھانچے کو صحیح کرنا ہے تاکہ عوام کی ضرورتیں پوری کی جا سکیں۔ اس طرح محض عوام کی مانگیں اور تقاضے پورا کرنے کی بجائے

بنیادی ضرورتوں کی تکمیل پر زور دیا گیا ہے۔ سرمایہ کاری کا نظام اشیاء کی تقسیم پیمانے وضع کرنے پر زور دیتا ہے تاکہ موجودہ پیداواری ڈھانچہ مجموعی قومی پیداوار میں معاون ہو اور وقت کے ساتھ ساتھ پیداواری ڈھانچے کی تشکیل میں ضروری تبدیلیاں لائی جا سکیں۔ مسز گاندھی کے بیس نکاتی پروگرام کے تحت پیداواری نشانے متعین کئے گئے ہیں اور انھیں موجودہ منصوبہ بندی نظام سے جوڑ دیا گیا ہے۔ اس کی بنیادیں مضبوط صنعتی ڈھانچے اور دیگر بنیادی سہولتوں پر رکھی گئی ہے اور زراعت کے جدید طریقوں سے اسے مزید مستحکم بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ بیس نکاتی پروگرام غریبوں کی حالت سدھارنے کے لیے ہے اور اس کے ذریعے ایسے لوگوں کی امداد کی جاتی ہے جنھیں اس کا جائز حق نہیں مل سکا ہے۔ اس عمل کو خود کفیل کے نظریے سے آگے بڑھایا جا رہا ہے تاکہ یہ اپنے پیروں پر آپ کھڑا ہو سکے۔ منصوبہ بندی کا موجودہ طریق کار اس طرح کے نظام کے لیے ناکافی ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ پیداوار کا موجودہ ڈھانچہ اپنے فائدے پبلک سیکٹر کو پہنچاتا ہے یا پھر پرائیویٹ سیکٹر کو۔ پبلک سیکٹر کے مقابلے میں یہ نفع بہت تھوڑا ہوتا ہے کیوں کہ اسے مجموعی اقتصادی اور سماجی مقاصد کو سامنے رکھنا ہوتا ہے اور ان مقاصد کے تحت ہی معیشت کے پیداواری امکانات کو مستحکم کرنا ہوتا ہے۔ پرائیویٹ سیکٹر میں پیداواری عمل سے وابستہ تمام عناصر کو مساوی بنیادوں پر نفع نہیں ملتا۔ پرائیویٹ سیکٹر میں منافع چند ہاتھوں میں مرکوز ہو کر اجارہ داری کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔

اس صورت حال کے پیش نظر بیس نکاتی پروگرام کے لیے الگ سے درکار وسائل اور پیداواری ڈھانچے میں داخل ہونے والے وسائل کے درمیان مقابلہ کی صورت پیش آتی ہے۔ اس وجہ سے پیداواری ڈھانچے کی تنظیم نظر ثانی چاہتی ہے۔ سرمایہ کاری کا نظام بھی نظر ثانی چاہتا ہے تاکہ آمدنیوں کی تقسیم کے لیے الگ سے پروگرام کی ضرورت نہ پیش آئے۔ پیداواری نظام کی تشکیل ہی اس ضرورت کو اپنے طور پر پورا کرائے۔

بیس نکاتی پروگرام قومی سیکٹر میں ایک جزو لازم ہے۔ اس کے ذریعے آمدنیوں کی غلط تقسیم کو روکا جا سکتا ہے۔ اس طریقے سے معیشت کی صورت حال بگاڑنے والی فاضل اقتصادی قوتوں کو روکا جا سکتا ہے۔ مسز گاندھی کا پروگرام درحقیقت سیاسی سطح پر اس ضرورت کا اعتراف ہے کہ اقتصادی ترقی کے پروگرام میں مداخلت کی جائے۔ قومی جمہوری سیکٹر کے خاص خاص اجزا پر عمل درآمد کے آغاز کے فوراً بعد یہ باقاعدہ صورت میں سامنے آ سکے گا۔ اس کا اصل مدعا یہ ہے کہ پیداواری سطح پر ہی تقسیم کے پیمانے وضع ہو سکیں اور ان دونوں کو مربوط طریقے پر آگے بڑھایا جا سکے۔ اس سے دیہی اور شہری آبادی کے لیے خصوصی پروگراموں کی ضرورت باقی نہ رہے گی۔ موجودہ صورت حال میں شہر اور دیہات کی وہ آبادی جن کے پاس کوئی اثاثہ جات نہیں ہیں، نفع بخش روزگار نہیں پاتی۔ اگر عوام کو روزگار ملتا بھی ہے تو آمدنی اس قدر مختصر ہوتی ہے کہ وہ غریبی کی سطح سے اوپر نہیں اٹھ سکتے۔ اس لیے دو زمرے وجود میں آئے ہیں۔ ایک بے روزگار غریب اور دوسرے با روزگار غریب، بیس نکاتی پروگرام کے تحت اس طبقہ کی حالت بہتر بنانے پر زور دیا گیا ہے۔ اس کے لیے وقت کے اندر اندر متعینہ نشانے پورا کرنے کی شرط ہے تاکہ یہ معیشت کے بڑے مسائل کو حل کرنے میں مؤثر ثابت ہو۔ اقتصادی جمہوریت کی اسکیم غریبی کے مسائل کو ترجیح دے گی۔ ★

بقیہ: منصوبہ بندی پر عمل درآمد

پبلک سیکٹر کے ادارے اتنے متحرک ہو سکتے ہیں جیسا کہ پرائیویٹ سیکٹر کے ادارے۔

ماہرین اقتصادیات منصوبہ بندی پر بحث کو اقتصادی ترقی کے مجموعی پہلوؤں تک محدود کر لیتے ہیں۔ یا پھر وہ صرف اس کی تشکیل تک ہی اپنی سرگرمی کو محدود کر لیتے ہیں۔ انتظامیہ کے ماہرین صرف اپنی دشواریوں پر ہی دھیان دیتے ہیں اور اس کا تذکرہ کرتے ہیں۔ منصوبے پر کامیاب عمل آوری کے لیے ضروری ہے کہ ماہرین اقتصادیات کی وسیع تر منصوبہ بندی کو انتظامی افراد کی جزوی منصوبہ بندی کے ساتھ مربوط کر دیا جائے۔

(آئندہ شمارے کے لیے
منصوبہ بندی کا عمل)

بقیہ: جوڑوں کے درد کے مریضوں کو امراض قلب

تاکہ اس کا مزید حملہ نہ ہو اور دل کو اس سے نقصان نہ پہنچے۔

۷۔ ہر تیسرے ہفتے، پنسلین کا انجکشن دینے سے سال میں صرف سترہ دنوں کی تکلیف اٹھانی پڑے گی۔ اگر ہر دوسرے ہفتے یہ انجکشن لگوایا جائے تو یہ تکلیف ۲۶ دن اٹھانی پڑے گی۔ لیکن زندگی بھر کی علت سے نجات پانے کے لیے انجکشنوں کی یہ تکلیف کچھ بھی نہیں ہے۔

(آل انڈیا میڈیکل انسٹی ٹیوٹ آف میڈیکل سائنسز کے ایک لیکچر سے ماخوذ) ★

تبصرہ

کتاب کا نام :- **"اقبال اور قومی یک جہتی"** مصنف : سید مظفر حسین برنی، گورنر ہریانہ

پبلشر :- ہریانہ ساہتیہ اکادمی، چنڈی گڑھ۔

زیر تبصرہ کتاب اقبالیات میں ایک گراں قدر اضافہ ہے۔ اس میں اقبال کی شخصیت و شاعری کے ایسے گوشے بے نقاب کیے گئے ہیں جن کے مطالعے سے اقبال کے متعلق بہت سے غلط فہمیوں کا ازالہ ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر ایک عام خیال یہ ہے کہ انھوں نے پاکستان کا نظریہ پیش کیا جبکہ اسی کتاب میں ان کی تحریروں سے یہ ثابت کیا گیا ہے کہ پاکستان ان کا منصوبہ نہیں تھا۔ اسی طرح نظریۂ قومیت کے بارے میں ان کی تبدیلی کا اظہار جو انھوں نے وفات سے ایک ماہ قبل کیا، اس سے متعلق ایک زبردست غلط فہمی کا ازالہ کر دیتا ہے۔ اقبال نے واضح کر دیا تھا کہ ہزاروں لاکھوں برس سے قومیں ملک سے اور ملک قوموں سے وابستہ رہے ہیں۔ ہم سب ہندوستانی کی حیثیت سے پہچانے جاتے ہیں۔ کیونکہ ہم دنیا کے اس حصے میں بستے ہیں جسے ہندوستان کہا جاتا ہے، اس طرح چینی، عرب، جاپانی اور ایرانی سب اپنے اپنے ملکوں سے پہچانے جاتے ہیں۔ مادرِ وطن کا تصور صرف ایک جغرافیائی اصطلاح ہے اور یہ اسلام کے خلاف نہیں ہے۔" مصنف نے اقبال کے مشہور نظریۂ خودی کی جس طرح اس کتاب میں وضاحت کی ہے، وہ عہدِ حاضر سے مطابقت رکھتی ہے۔ مصنف نے اقبال کے کلام سے یہ ثابت کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے کہ "اقبال سچے محبِ وطن، مذہبی رواداری کے پُرزور حامی اور ہندوستانی فلاسفروں اور سنتوں کے مدح خواں تھے۔ اسلام سے ان کی گہری وابستگی کے باوصف وہ ہندی فکر و فلسفے کے گہرے مطالعے کے بعد اس کی اصل رُوح سے بے حد متاثر ہوئے تھے۔ اُن کا پیغام آج ہمارے ملک کی تاریخ کے اس نازک دور میں جب کہ ذات، نسل، فرقے اور علاقائیت کے فتنے سر اُٹھا رہے ہیں خصوصی توجہ کا مستحق ہے" بالخصوص برہمن نژاد ہونے پر فخر ہے۔ اس سلسلے میں مصنف نے اقبال کی جن نظموں کا حوالہ دیا اور اُن کے اشعار ثبوت کے طور پر پیش کیے، اُن میں 'ہمالہ'، 'ترانۂ ہندی'، 'ہندوستانی بچوں کا قومی گیت'، 'بچوں کی دعا'، 'صدائے درد'، 'خفتگانِ خاک سے استفسار' وغیرہ شامل ہیں۔ کتاب کے دیباچے میں اس کتاب کا پس منظر بیان کرتے ہوئے آپ نے لکھا ہے کہ "میں نے اقبال اور قومی یک جہتی کے موضوع پر یہ کلیدی خطبہ بھوپال یونیورسٹی کے زیرِ اہتمام ۱۷ جنوری ۱۹۸۰ کو پڑھا تھا۔ اقبال کی زندگی میں بھوپال کو ایک اہم مقام حاصل ہے۔ اس شہر سے اُن کے روابط بہت پُرانے اور خوشگوار رہے ہیں۔"

اس کتاب کے کچھ ذیلی عنوانات ملاحظہ ہوں :- 'مادرِ وطن کی محبت'، 'ہندوستانی سنتوں کا احترام'، 'اقبال اور ہندوستانی مفکرین'، 'قومی یک جہتی اقبال کی زندگی کے آئینے میں'، خودی کی وضاحت کرتے ہوئے مصنف نے لکھا کہ "ہندوستانی فکر کو اقبال کی سب سے بڑی دین اُن کا نظریۂ خودی (خود اعتمادی و خود انحصاری) ہے۔ یہ پیغام آج بھی اتنا ہی مطابق حالات ہے جتنا اُن کے زمانے میں تھا۔ ان کی انسان دوستی سے اپنے وسیع تر مفہوم میں ہمیں اپنے اندر بلا لحاظِ رنگ و نسل اور عقیدہ و مذہب، احترامِ انسانیت کا شعور پیدا کرنا چاہیے۔ آج ہمارا ملک ایک بحرانی دور سے گزر رہا ہے۔ تفرقہ پیدا کرنے والی قوتیں اپنا کام کر رہی ہیں۔ فرقہ وارانہ فسادات آج بھی ہو رہے ہیں۔ ملک کے مختلف حصوں میں علاقائی عصبیت کا عفریت اپنا سر اُٹھا رہا ہے۔ نسلی جھگڑے آج بھی ہیں۔ لسانی مسائل بھی وقتاً فوقتاً اُٹھتے رہتے ہیں تاکہ عام لوگوں میں نفرت اور اختلافات پیدا کریں۔ ذات پات، مذہب، فرقہ یا علاقائیت کے نام پر ہونے والے یہ تمام جھگڑے ایسے تشنگوں ہیں جن کے ہوتے چین کا سانس نہیں لیا جا سکتا۔ ان حالات کا تقاضا یہ ہے کہ رواداری، ہم آہنگی اور صلح و آشتی کے جذبات تمام فرقوں اور سب علاقوں میں پیدا کیے جائیں۔" ایک بار پھر اقبال کی اس پُرخلوص جذباتی اپیل کو یاد کرنا چاہیے۔ اس مختصر کتاب کے مطالعے سے اقبال کی شاعری سے اعتماد کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر مصنف نے لکھا کہ "اقبال نے اس ملک میں بسنے والے مختلف طبقوں اور فرقوں کے میل ملاپ اور بھائی چارہ پر بھی زور دیا ہے۔ خاص طور سے اپنی نظم ترانۂ ہندی میں انھوں نے کہا ہے کہ اگرچہ اس ملک میں مختلف فرقے بستے ہیں تاہم ان کی اکثریت میں ایک رشتہ وحدت کا موجود ہے۔ ترانۂ ہندی اُن کی وطن پرستانہ شاعری کا اعلیٰ ترین نمونہ ہے۔ اس نظم سے مادرِ وطن کے لیے اُن کی شدید محبت کا بہت ہی پُرتاثیر اور لطیف و نازک اسلوب میں اظہار ہوتا ہے۔ اگر ہندوستان کی تقسیم کا المیہ پیش نہ آیا ہوتا تو مجھے یقین ہے کہ یہ نظم ہمارے ملک کا قومی ترانہ بن گئی ہوتی۔"

کتاب میں مذکور ہے کہ ۱۹۳۰ء میں رسالہ جوہر دہلی کے خصوصی اقبال نمبر کے لیے ایڈیٹر کے نام ایک خط میں مہاتما گاندھی نے ترانۂ ہندی کی تعریف لکھی تھی۔ یہ خط انھوں نے اُردو میں لکھا تھا۔ ان کے لفظوں میں "آپ کا خط ملا۔ ڈاکٹر اقبال مرحوم کے بارے میں کیا لکھوں، لیکن میں اتنا تو کہہ سکتا ہوں کہ جب اُن کی مشہور نظم 'ہندوستان ہمارا' پڑھی تو میرا دل بھر آیا اور بڑودا جیل میں تو سینکڑوں بار میں اس نظم کو گایا ہوگا۔ اس نظم کے الفاظ مجھے بہت ہی میٹھے لگے اور یہ خط لکھتا ہوں تب بھی وہ نظم میرے کانوں میں گونج رہی ہے۔" مصنف نے یہ بھی بتایا کہ "دُوردرشن کی نئی علامتی دھن جو پنڈت روی شنکر نے بنائی ہے وہ اسی نظم پر مبنی ہے۔ اور اسے خود مُحلدِ آشیانی شریمتی اندرا گاندھی نے پسند کیا تھا۔ یہ ۷۶-۱۹۷۵ء کی بات ہے جب میں وزارتِ اطلاعات کا سکریٹری تھا۔ اصل میں یہ تجویز بھی خود شریمتی اندرا گاندھی مرحومہ کی ہی تھی کہ دُوردرشن کی نئی علامتی دھن اس قومی گیت پر بنائی جائے۔"

فاضل مصنف نے اس کتاب کو شریمتی اندرا گاندھی مرحومہ کے نام معنون کرکے اس کی تاریخی حیثیت کو مستحکم کر دیا ہے۔ جن الفاظ میں یہ کتاب دنیا کی ایک عظیم ہستی کے نام معنون کی گئی ہے وہ دل کو چھو لینے والے ہیں۔ اس کی عبارت یوں ہے۔ "میں یہ رسالہ آنجہانی شریمتی اندرا گاندھی مرحومہ کے نام معنون کرتا ہوں، جنھوں نے قومی یک جہتی اور ملک کی سالمیت کے لیے اپنی جانِ عزیز تک قربان کر دی۔

آسمان تیری لحد پر شبنم افشانی کرے ✻ سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے۔

مختصراً یہ کہ یہ کتاب عصرِ حاضر کی ایک اہم ضرورت کو پورا کرتی ہے، یہ کتاب جس حقیقت پسندانہ انداز اور جس تعمیری نقطۂ نظر سے لکھی گئی ہے، اسے سامنے رکھ کر اگر ہم تاریخ اور ادب نیز دیگر علوم کا مطالعہ کریں تو ملک میں قومی یکجہتی کے عناصر کو تیزی سے فروغ مل سکتا ہے۔ اس کے مطالعے سے اگر ایک طرف مصنف کی عرق ریزی اور جگر کاوی کا پتہ چلتا ہے تو دوسری طرف ان کی تعمیری فکر کی نشاندہی ہوتی ہے جس کی ضرورت بار بار مختلف ادبی و ثقافتی و سیاسی فورموں پر محسوس کی جاتی رہی ہے۔ کتاب آفسیٹ پر ہے اور اس کی طباعت اور کاغذ اعلیٰ درجہ کے۔ اُردو ادب کے شائقین اور بالخصوص طلبا کے لیے اس کتاب کا مطالعہ مشعلِ راہ ثابت ہوگا۔

عادل صدیقی

یکم تا ۱۵ دسمبر ۱۹۸۴ — یوجنا، دہلی

شریمتی اندرا گاندھی کی وفات پر

صدر جمہوریہ ہند گیانی ذیل سنگھ اور دیگر مقتدر رہنماؤں کے پیغامات

آج اپنی زندگی کے غمگین ترین لمحات میں جب میں آپ سے مخاطب ہو رہا ہوں تو خود کو سیاہ بختی کے تاریک بادلوں سے گھرا ہوا محسوس کرتا ہوں۔ ہماری محبوب رہنما شریمتی اندرا گاندھی اب ہمارے درمیان نہیں ہیں۔ میں اپنی عزیز ترین دوست سے محروم ہو گیا ہوں، ہم سب اپنے ملک کے ایک عظیم ترین لیڈر سے اور دنیا امن کے علمبردار سے جو بلاشبہ بنی نوع انسان کی تاریخ میں عظیم ترین خاتون رہنما تھیں محروم ہو گئے ہیں۔

ان کے خاندان سے میرے تعلقات چالیس سال سے بھی زیادہ پرانے ہیں۔ پنڈت جی کا انتقال میرے لیے پہلا ذاتی صدمہ تھا اور شریمتی اندرا گاندھی کا گزر جانا میرے لیے ناقابلِ برداشت ہے۔ ان کی اپنی سرکاری ذمہ داریوں میں انتہائی مصروف رہنے کے باوجود ہماری اکثر ملاقات ہوتی تھی۔ ان کے ساتھ ہر ملاقات میرے لیے ایک قابلِ یادگار تجربہ ہوتا تھا۔ وہ شریف النفس، نرم گفتار، انتہائی ذہین و طباع اور تہذیب کا مجسمہ تھیں۔ وہ ایسی بیٹی تھیں جن پر پنڈت جی کو بھی فخر ہوتا۔

اب وہ سب ختم ہو گیا ہے۔ قاتلوں کی یہ بزدلانہ حرکت صرف وحشیانہ اور انسانیت سوز ہی نہیں ہے بلکہ اس نے ساری قوم کو ہماری تاریخ کے ایک انتہائی نازک مرحلہ پر ایک سخت آزمائش سے دوچار کر دیا ہے۔ قوم کی ایکتا اور سالمیت کو چیلنج کیا جا رہا ہے ہمارے دکھ کو بہ حیثیت افراد اور قوم ہماری یکجہتی کو متاثر نہیں کرنا چاہیے۔ خدا ہمیں نئے چیلنجوں کا مقابلہ کرنے کی طاقت دے گا۔ ہمیں ان آدرشوں کا سہارا لینا چاہیے جو ہمیں اپنے آباؤ اجداد سے ورثہ میں ملے ہیں۔ ہمیں دنیا پر یہ ثابت کر دینا چاہیے کہ بھارت کے استحکام کو انسانیت سے گرے ہوئے مٹھی بھر قاتل نقصان نہیں پہنچا سکتے۔

(صدر جمہوریہ ہند گیانی ذیل سنگھ)

بھارت ایک عالی مرتبت وزیر اعظم سے محروم ہو گیا جو کروڑوں لوگوں کی محبوب اور ہر دل عزیز رہنما تھیں۔ ناوابستہ تحریک، ترقی پذیر ممالک کی ممتاز بہی خواہ سے محروم ہو گئی اور دنیا نے ایک عظیم مدبر کھو دیا ہے جس نے امن و ترقی کے لیے انتھک کوشش کی تھی۔

ان کی موت سے قوم کو جو دکھ ہوا ہے اسے قومی یکجہتی اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی کے کاز میں بدل دینا چاہیے جس کے لیے ہماری محبوب رہنما اپنی زندگی کی آخری سانس تک نبرد آزما رہیں۔ اندرا جی مہاتما گاندھی کے نقش قدم پر چل کر شہید ہو گئیں۔

آئیے ہم ہر طرح کے تشدد اور علیحدگی پسندی کا خاتمہ کرکے اور امن اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی کو فروغ دے کر اپنے رہنما کو خراج عقیدت پیش کریں۔

(نائب صدر جمہوریہ شری ونکٹ رمن)

اندرا گاندھی اب ہمارے درمیان نہیں ہیں۔ لیکن ان کی روح زندہ ہے۔ ہندوستان کی روح لافانی ہے۔ امید ہے کہ قوم اپنی ذمے داریاں پہچانے گی اور اس بوجھ اور غم کا مردانہ وار عزمِ صمیم کے ساتھ مقابلہ کرے گی۔

(پرنب مکرجی)

کسی بھی ملک میں سربراہ حکومت ایسا نہیں ہے جس کو ماحولیات کے شعبے میں اتنی زیادہ واقفیت ہو جتنی اندرا گاندھی کو تھی۔ انھوں نے ماحولیات کا محکمہ قائم کیا۔ قدرت سے ان کی محبت عظیم تھی۔ وزیر موصوف نے مزید کہا کہ قدرتی دولت سے عشق و محبت رکھنے والے شریمتی گاندھی کی وفات پر سب سے زیادہ اظہار افسوس کرتے ہیں۔

(ماحولیات کے مرکزی نائب وزیر شری دگ وجے سنگھ)

Regd. No. D(UN) 985
R.N. 97032/81

Licensed U(UN) to post without pre-payment
at Civil Lines Post Office, Delhi-110054.

Vol. 4 No. 17 YOJANA (URDU) 1-15th December, 1984

شریمتی اندرا گاندھی کو عالمی شخصیتوں کی طرف سے خراجِ عقیدت

شریمتی اندرا گاندھی کے قتل کے سانحے کی پوری دنیا نے مذمت کی۔ عالمی رہنماؤں نے اس موقع پر اپنے پیغامات میں شدید رنج وغم کا اظہار کیا۔ چند رہنماؤں کے تاثرات درج ذیل ہیں۔

اندرا گاندھی کا نام روسی عوام کی خوشگوار یادوں میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے محفوظ رہے گا۔ اندرا گاندھی کا نام ہمیشہ کے لیے تاریخ میں سنہری حرفوں میں لکھا جائے گا۔

(روسی صدر اور پارٹی کے سربراہ مسٹر کانسٹن ٹن چرنینکو)

شریمتی اندرا گاندھی دنیا بھر میں اور اقوام متحدہ میں جس کی انھوں نے پُرجوش حمایت کی، بہت ہی زیادہ قابلِ تعظیم شخصیت تھیں۔ اپنے نامور پیشرو پنڈت نہرو کی روایت پر چلتے ہوئے انھوں نے اعتدال پسندی، صبر وتحمل اور مفاہمت کے جذبے کی بین الاقوامی سطح پر نمائندگی کی جس کی آج دنیا میں بیحد ضرورت ہے۔ مسز گاندھی کی بے وقت وفات بھارت کے لیے، اقوام متحدہ کے لیے اور ذاتی طور پر میرے لیے ایک عظیم نقصان ہے۔ (سکریٹری جنرل اقوام متحدہ)

نہ صرف بھارت نے بلکہ دولت مشترکہ اور دنیا نے ایک عظیم رہنما کو کھو دیا ہے۔ ان کی وفات نہ صرف وزیراعظم کی حیثیت سے بلکہ ناوابستہ تحریک کی لیڈر اور دولت مشترکہ کی گزشتہ چوٹی کانفرنس کی چیئرمین کی حیثیت سے ناقابلِ تلافی نقصان ہے۔

(دولت مشترکہ کے سکریٹری جنرل شری رامپھل)

یہ ایک مذموم، وحشیانہ اور خوفناک اقدام ہے۔ اور تمام سیاسی پارٹیوں کے لیڈر اس حادثے پر اپنے رنج وغم کے اظہار میں میرے ساتھ شریک ہیں۔

(برطانیہ کی مسز مارگریٹ تھیچر)

شریمتی گاندھی ایک ایسی سرکردہ اور نمایاں رہنما تھیں جن کی جرأت وہمت نیز طاقت وقوت کی ضرورت اور رہنمائی کی کمی ہمیشہ ہمیشہ محسوس کی جائے گی۔ اس طرح یہ نقصان صرف ہندوستان کا ہی نہیں بلکہ پوری عالمی برادری کا ہے۔

(آسٹریلیا کے وزیراعظم مسٹر باب ہاک)

شریمتی گاندھی کی ذات گرامی دوسروں کے رنج وغم میں ہاتھ بٹانے والی اور اسے کم کرنے والی ایک شخصیت تھی۔ انھیں نوعِ انسانی کی بہبود کا ہمیشہ ہی خیال رہتا تھا۔ اس لحاظ سے وہ ایک عظیم انسان تھیں۔

(جاپان کے وزیراعظم مسٹر وائی۔ ناکاسونے)

شریمتی گاندھی کی ذات گرامی ناوابستہ تحریک کا قلب تھیں۔ وہ کامن ویلتھ کی سینیئر اہم شخصیت تھیں اور نیوزی لینڈ کی اچھی دوست۔ (نیوزی لینڈ کے وزیراعظم مسٹر ڈیوڈ لانگ)

ہندوستانی عوام کا انتہائی اندوہناک نقصان۔

(اوٹاوا کینیڈا کے وزیراعظم مسٹر برین ملرونی)

شریمتی گاندھی کی بے وقت وفات نہ صرف بھارت بلکہ بین الاقوامی برادری کے لیے ایک عظیم نقصان ہے۔ (ملیشیا کے وزیراعظم)

میرے لیے یہ گہرا ذاتی صدمہ ہے۔ (امریکہ صدر ریگن)

Published by the Director, Publications Division, Patiala House, New Delhi-110001
Printed by Skylark Printers, 11355, Id-Gah Road, New Delhi-110055

یوجنا

۱۶ تا ۳۱ دسمبر ۱۹۸۴ء

ایک روپیہ

معاشرتی انقلاب کی جانب
اقتصادی جمہوریت کا مقدمہ

ہندوستانی معیشت کے چند پہلو

(وسنت ساٹھے)

ایمپلائمنٹ ایکسچینج کیا ہے اور کیا کر رہا ہے؟

(ایم۔ ایل۔ بجاج)

فالج کیوں گرتا ہے

(ڈاکٹر این۔ سی۔ مہیشوری)

ڈاکٹر این سی مہیشوری

فالج کیوں گرتا ہے

فالج دماغ کا مرض ہے۔ یہ ادھیڑ عمر پار کرنے والے گروپ کے لوگوں میں کینسر اور قلبی حملے کے بعد موت کا تیسرا عام ترین سبب ہے۔ فالج کسی بھی عمر میں گر سکتا ہے لیکن یہ بنیادی طور پر سن رسیدہ لوگوں کا عارضہ ہے۔ مصنف نے اس امر پر زور دیا ہے کہ ۴۰ سال کی عمر کے بعد اس مسئلے سے خبردار رہنا چاہیئے اور سگریٹ نوشی ترک کر کے فوری غیر معمول تناؤ یعنی ہائی پرٹینشن پر قابو پانا چاہیے۔

فالج یا دماغی رگوں کو خون کی سپلائی میں رکاوٹ ایک دماغی عارضہ ہے جو خون کی رگوں میں غیر معمولی کیفیت پیدا ہونے کے نتیجے میں عمل میں آتا ہے۔ خون کی رگوں میں شریانیں اور نسیں وغیرہ شامل ہیں۔ شریانیں دل سے آکسیجن آمیز خون جسم کے مختلف اعضا میں پہنچاتی ہیں اور رگیں مختلف اعضاء سے استعمال شدہ خون دل میں واپس لاتی ہیں اور اس کے بعد وہ پھیپھڑوں میں لے جاتی ہیں، جہاں اس پر آکسیجن کا عمل ہوتا ہے اور کاربن ڈائی آکسائڈ کو دُور کیا جاتا ہے) عالمی اعداد و شمار کے مطابق فالج ادھیڑ عمر پار کرنیوالے گروپ کے لوگوں میں موت کا تیسرا عام ترین سبب ہے۔ دُوسرے اسباب کینسر اور دل کے حملے ہیں، یُوں تو فالج کسی بھی عمر میں گر سکتا ہے لیکن یہ بنیادی طور پر سن رسیدہ لوگوں کا عارضہ ہے۔

بھارت میں فالج کے تمام مریضوں کے جائزے سے یہ پتہ چلتا ہے کہ فالج ۴۰ سے کم عمر کے لوگوں میں گرتا ہے۔ (یہ نوجوانی کا فالج بتایا جاتا ہے) بھارت میں فالج سے ہونے والی اموات اور مریضوں کی صحیح تعداد کا پتہ نہیں چلتا۔ تاہم اس کا شکار ہونے والوں کی ایک بڑی تعداد ہر برس اپاہج ہو جاتی ہے۔ مغرب کے اعداد و شمار سے ضرور پتہ چلتا ہے کہ گذشتہ دو دہائیوں میں فالج کی وارداتوں میں کمی ہوئی ہے اور یہ صحتمندانہ رُجحان ریاحی عوارضِ قلب میں کمی اور خون کے بڑھے ہوئے دباؤ پر بہتر کنٹرول سے منسوب کیا جا سکتا ہے۔

دماغ کل خون کا تقریباً چھٹا حصہ حاصل کرتا ہے جبکہ اس کا وزن جسم کے کل وزن کا محض ۲ وان حصہ ہے۔ دماغ اپنی موزوں کارکردگی کے لیے گلوکوز اور آکسیجن کی زیادہ سے زیادہ مقدار کا استعمال کرتا ہے۔

اگر دماغ کو تین منٹ تک آکسیجن یا گلوکوز نہ ملے تو اس سے ناقابلِ تلافی نقصان پہنچ سکتا ہے۔ اگر ۱۰ سیکنڈ تک بھی رکاوٹ پڑ جائے تو کوئی شخص بیہوش بھی ہو سکتا ہے۔ دماغ سا... کی دو شریانوں اور ایک گردن کے شریا... نظام سے خون کی یہ مقدار حاصل کرتا ہے۔ ہمیں سمجھنا چاہیئے کہ یہ شریانی نظام دماغ میں داخلہ ہونے سے پہلے ہڈّی میں سے گذرتا ہے۔ یہ دو... دماغ کے دونوں حصوں اور دیگر مختلف حصّوں میں خو... کی سپلائی کو ٹھیک ٹھاک رکھنے میں مدد دیتے ہ... دماغ کو خون کی سپلائی اس قدر اہم ہے کہ قد... نے ایک ایسا خودکار نظام مہیا کیا ہے جو خون کی سپ... کو منضبط رکھتا ہے۔

فالج کیوں؟

شریانیں (خون کی رگیں) جسم میں خون ک... سپلائی کرنے والی نالیاں ہیں۔ ایسی کسی بھی بیمار... سے جس سے ان نالیوں میں رکاوٹ پڑ جائے... وہ پھٹ جائیں، فالج گر سکتا ہے۔ بیماری ان نالیو... کے اندر یا ان کی دیوار کے اندر یا باہر ہو سکتی ہے... خون کی رکاوٹ کا باعث بن سکتی ہے۔ ان رگ... میں خون کی رکاوٹ سے "اسکیمیا" فالج گر سکتا... نس کے پھٹنے سے خون بہہ سکتا ہے جسے "ہیمور... فالج کہتے ہیں۔ ایسے بہت سے اسباب ہیں جن... سے "ہیموریج" اور "اسکیمیا" فالج ہوتے ہیں ا... وہ ان کی حد کا بھی تعین کرتے ہیں۔ ان اسبا... کو سمجھنا نہایت ضروری ہے اور اگر انھیں سمجھ لیا جا... تو اس مضمون کا مقصد پورا ہو جائے گا۔

منصوبہ بندی اور ترقیاتی پروگراموں کی جھلک پیش کرنے والا

پندرہ روزہ

یوجنا

نئی دہلی

چیف ایڈیٹر • آر۔ ٹھکرال
ایڈیٹر • لکھمی رام رانا
اسسٹنٹ ایڈیٹر • محمد عادل صدیقی
سب ایڈیٹر • وسیم حیدر

جلد ۴	۱۶ تا ۳۱ دسمبر ۱۹۸۴	شمارہ ۱۸

۲۵ اگرہائن تا ۱۰ پوس شک سمبت ۱۹۰۶ • فون: ۳۸۷۳۴۱

شرح چندہ

سالانہ ۲۰ روپے۔ دو سالہ ۳۵ روپے، سہ سالہ ۵۰ روپے
فی کاپی: ایک روپیہ

طلبا، اساتذہ اور لائبریریوں کے لیے ۱۰ فی صد کی رعایت

یوجنا منصوبہ بند ترقی کے بارے میں عوام کو آگاہ کرتا ہے مگر اس کے مضامین صرف سرکاری نقطۂ نظر کی وضاحت تک ہی محدود نہیں ہیں

اس شمارے میں

★

بزنس منیجر: ایل۔ آر۔ بترہ * اسسٹنٹ ڈائرکٹر (پروڈکشن): رام سروپ منجال،

مضامین سے متعلق خط و کتابت کا پتہ

ایڈیٹر یوجنا اردو، پبلیکیشنز ڈویژن پٹیالہ ہاؤس نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

ترسیل زر کا پتہ

بزنس منیجر، پبلیکیشنز ڈویژن پٹیالہ ہاؤس نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

اداریہ

ہندوستان میں آبرسانی کا نظام

اگرچہ پانی ایک قومی وسیلہ ہے، تاہم اس کا انتظام ریاستی ذمہ داریوں میں شامل ہے۔ چنانچہ آب رسانی کے ذرائع کا فروغ ریاستوں کی ذمہ داری ہے۔ لیکن پانی کے نظام کے فروغ کے بعد ایک بڑی قومی پالیسی کی تشکیل ضروری ہے۔ لہذا پانی کے نظام سے متعلق قومی ادارے کی تشکیل اسی پس منظر میں کی گئی ہے۔ اس ادارے کے ارکان میں ریاستوں کے وزرائے آب پاشی کو شامل کیا گیا ہے۔ یہ ادارہ نیشنل واٹر پلان کے فروغ کے لیے ضروری سروے اور تحقیقاتی مطالعے کرے گا۔ یہ کام اڑیسہ میں مہاندی سے شروع کیا جائے گا۔ اس کے بعد جنوبی ہند کے دریاؤں کا مطالعہ اور سروے کیا جائے گا۔ اس کے بعد دریائے گنگا اور مہاندی کو دریائے کاویری اور دیگر دریاؤں سے جوڑنے کی اسکیم ہے۔ ملک میں آبرسانی کے نظام کے فروغ کی ذمہ داری چونکہ وزارت آب پاشی کو سونپی گئی ہے، اس لیے اس کے دو تکنیکی بازو اس کو اس کام میں مدد دے رہے ہیں۔ ایک کا نام ہے سنٹرل واٹر کمیشن اور دوسرے کا نام ہے نیشنل واٹر سروسنز ڈیولپمنٹ کونسل۔ یہ دونوں ادارے وزارت آبرسانی اور منصوبہ بندی کمیشن کو پنجسالہ منصوبوں کے تحت آبرسانی کی توسیع میں مدد دیتے ہیں۔ ریاستوں کے متوسط اور بڑے آبرسانی پراجیکٹوں کے تکنیکی امور کی جانچ کرکے ان کی منظوری بھی انھیں کے ذمے ہے۔ آبرسانی کے پراجیکٹوں کے لیے ریاستوں یا مرکز کو اگر بین الاقوامی اداروں سے قرض لینا ہو تو اس کے لیے بات چیت بھی انھیں اداروں کی ذمہ داری میں شامل ہے۔ دو ریاستوں میں پانی کی تقسیم وغیرہ کے سلسلے میں اگر کوئی تنازعہ اٹھ کھڑا ہو تو اس کا فیصلہ کرانے میں بھی یہی ادارے معاونت کرتے ہیں۔ ہر ریاست میں آب رسانی کے پراجیکٹ سے متعلق تنظیمی ڈھانچہ اور اس کی دیکھ بھال کا طریقہ جدا جدا ہے۔ ہر ریاست میں چیف انجینیئر آبرسانی کے محکمے کا عملی سربراہ ہوتا ہے۔ وہی آبرسانی کے چھوٹے بڑے اور متوسط پراجیکٹوں کی تعمیر کی دیکھ بھال کرتا ہے۔ ہر ریاست میں متعدد شعبے آبرسانی سے متعلق ہوتے ہیں۔ ہر شعبہ کا سربراہ ایک ایڈیشنل چیف انجینیئر ہوتا ہے۔ علاقائی سطح کے پراجیکٹوں کی تعمیر اور دیکھ بھال کسی کے ذمے ہوتی ہے۔ اس کی مدد کے لیے سپرنٹنڈنگ انجینیرز ہوتے ہیں۔ پھر اُن کی مدد کے لیے ایگزیکیٹو انجینیئر، اسسٹنٹ انجینیئر، اور فیلڈ لیول ورکر ہوتے ہیں۔ آبرسانی کے بڑے اور متوسط پراجیکٹوں کی تعمیرات کی نگرانی وزارت آب پاشی کے ایک مرکزی ادارے کے ذمے ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ بہت سی ریاستوں میں کمانڈ ایریا ڈیولپمنٹ اتھارٹی کے نام سے ایک تنظیم بھی یہ کام کرتی ہے۔ اس میں محکمہ آبرسانی، محکمہ زراعت اور محکمہ شماریات کے افسر ہوتے ہیں۔ یہ اتھارٹی یا یہ ادارہ ایسے اقدامات کرتا ہے جس سے کھیتوں پر آبرسانی کی غرض سے ملنے والے پانی کو بہتر طریقے پر کام میں لایا جا سکے۔ کچھ ریاستوں میں زمینی پانی سے استفادے کے لیے بورڈ بھی قائم کیے گئے ہیں۔ آبرسانی کے چھوٹے وسیلوں سے استفادے کا کام ریاستوں میں زراعت کے محکموں کو سونپ دیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں کچھ ایسے تحقیقی ادارے بھی قائم کیے گئے ہیں جو مٹی، کنکریٹ وغیرہ کی جانچ کا کام کرتے ہیں۔

حالانکہ آبرسانی کے نظام کی یہ درجہ بندی کردی گئی ہے اور ہر کام الگ الگ بانٹ دیا گیا ہے، پھر بھی دورِ حاضر میں یہ احساس ترقی پا رہا ہے کہ زرعی پیداوار بڑھانے کے لیے کھیتوں پر پانی سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے کے لیے کچھ اور طریقے نکالنے پڑیں گے۔ اس کے ضرورت پانی کے نظم و نسق سے متعلق عملے، کسانوں اور پیشہ ورانہ نیز تربیت یافتہ عملے سبھی نے محسوس کی ہے۔ ملک میں آبرسانی کے نظام کا جائزہ لیتے وقت اس پہلو کو سامنے رکھنا ضروری ہو گیا ہے۔

(ایڈیٹر)

ایم۔ایل۔بجاج

ایمپلائمنٹ ایکسچینج کیا ہے اور کیا کر رہا ہے

روزگار کے متلاشیوں کا اندراج کرنا اور مالکوں کی طرف سے بتائی گئی آسامیوں پر انھیں متمکن کرانا ایمپلائمنٹ ایکسچینج کا ایک اہم رول ہے۔ ۱۹۸۳ء میں ۶۷ لاکھ ۵۶ ہزار افراد نے اس ادارے میں اپنے ناموں کا اندراج کرایا اور اُن میں سے ۴ لاکھ ۸۲ ہزار کو روزگار پر لگایا گیا۔ جب کہ ۱۹۸۲ء میں ۵۸ لاکھ ۶۳ ہزار افراد نے اپنے نام درج کرائے جن میں سے ۴ لاکھ ۷۳ ہزار کو روزگار پر لگایا گیا۔ ادارہ ہذا کو ۱۹۸۳ء میں ۸ لاکھ ۲۶ ہزار آسامیوں اور ۱۹۸۲ء میں ۸ لاکھ ۲۰ ہزار آسامیوں کے بارے میں اطلاع دی گئی تھی۔

۱۹۸۳ء میں قومی روزگار سروس ملک میں ۷۲۶ ایمپلائمنٹ ایکسچینجوں پر مشتمل تھی۔ جب کہ ۱۹۸۲ء میں اس کے مقابلے میں ۶۹۲ ایکسچینج اس سروس کے تحت کام کر رہے تھے۔ اس نظام کار میں ۴۴ یونیورسٹی ایمپلائمنٹ انفارمیشن اینڈ گائیڈینس بیوروکس (یو ای آئی جی بی ایکس)، ۱۶ پروفیشنل اینڈ ایگزیکٹو ایمپلائمنٹ ایکسچینج، ۷ کولری ایکسچینج، ۱۰ پراجیکٹ ایمپلائمنٹ ایکسچینج، جسمانی طور پر معذوروں کے لیے ۲۲ خصوصی ایمپلائمنٹ ایکسچینج شامل تھے اور ان کے علاوہ پلانٹیشن لیبر کے لیے ایک خصوصی ایکسچینج تھا۔

آسامیوں کے بارے میں لازمی اطلاع

ایمپلائمنٹ ایکسچینجز (آسامیوں کی لازمی اطلاع سے متعلق ایکٹ ۱۹۵۹ء جو ۱۹۶۰ء میں نافذ العمل ہوا تھا، پبلک سیکٹر کے تمام اداروں اور پرائیویٹ سیکٹر کے ایسے اداروں پر لاگو ہوتا ہے جو غیر زرعی سرگرمیوں میں مصروف ہیں اور جن میں ۲۵ یا زائد ملازم کام کرتے ہیں۔ اسی قانون کے تحت مالکوں پر لازم ہے کہ وہ اپنے اداروں کی تمام آسامیوں (ان کے علاوہ جو قانون میں مستثنیٰ قرار دی گئی ہیں) کے بارے میں مجوزہ ایمپلائمنٹ ایکسچینجوں کو اطلاع دیں اور اپنے اداروں کا روزگار اور آسامیوں کا گوشوارہ وقت پر ارسال کرتے رہیں۔

مارچ ۱۹۸۳ء کے آخر تک اس قانون کے دائرہ عمل میں ایک لاکھ ۶۰ ہزار ادارے آئے تھے، جن میں سے ایک لاکھ ۱۸ ہزار پبلک سیکٹر اور ۴۲ ہزار پرائیویٹ سیکٹر میں تھے۔

یہاں اس امر کا ذکر کرنا بے موقع و بے محل نہیں ہوگا کہ ۱۹۸۳ء تک ایمپلائمنٹ ایکسچینجوں کے سالہا برسوں کے اندراجات ملا کر کل ۲ کروڑ ۱۹ لاکھ ۵۳ ہزار افراد کے نام روزگار کے متلاشیوں کے طور پر مندرج تھے۔ ان کی تقریباً نصف تعداد تعلیم یافتہ تھی جنھوں نے میٹرک یا اس سے زائد تعلیم پائی تھی گریجویٹ اور پوسٹ گریجویٹ افراد کی تعداد ۱۴ لاکھ ۱۹ ہزار تھی۔

جسمانی معذوروں کیلئے روزگار : سماج کے پسماندہ طبقوں اور دیگر جسمانی طور پر معذوروں کو روزگار مہیا کرنے کے لیے بھی ایمپلائمنٹ ایکسچینج سرگرمی سے کوشاں ہیں۔ ۱۹۸۱ء میں ۹۲۶ نابینا افراد اور ۱۹۸۲ء میں ۶۵ نابیناؤں کو روزگار مہیا کیا گیا ہے اسی طرح ۱۹۸۱ء میں ۳۰۲ اور ۱۹۸۲ء میں ۷۷۴ گونگے، بہروں کو جن کے نام مندرج تھے، ملازمتوں پر لگایا گیا۔ ۱۹۸۱ء میں جسمانی طور پر معذور جن افراد کو روزگار پر لگایا گیا اُن کی تعداد ۱۰،۸۶۵ تھی اور ۱۹۸۲ء میں ایسے ہی افراد کی تعداد ۸۲۰۷ تھی۔ جو لوگ تنفس کے امراض میں مبتلا تھے اُن میں سے ۳۳ کو ۱۹۸۱ء میں اور ۴۸ کو ۱۹۸۲ء میں ملازمتیں مہیا کی گئیں۔

اسی طرح ۱۹۸۱ء میں شیڈولڈ کاسٹ کے ۶۴ ہزار اور ۱۹۸۲ء میں ۶۲ ہزار افراد کو ملازمتیں دلائی گئیں اور شیڈولڈ ٹرائبس کے ۲۲ ہزار افراد کو ۱۹۸۱ء میں اور ۲۳ ہزار افراد کو ۱۹۸۲ء میں روزگار پر لگایا گیا۔

ڈائرکٹوریٹ جنرل آف ایمپلائمنٹ اینڈ ٹریننگ کی طرف سے متعدد تربیتی اسکیمیں جاری ہیں۔ اس کی طرف سے خاص خاص پیشوں میں تربیت نہیں دی جاتی لیکن ایسی تربیت ضرور دی جاتی ہے جو سرکاری اور غیر سرکاری اداروں کے لیے جن میں صنعتی، زرعی، تجارتی اور کاروباری ادارے شامل ہیں نہ صرف لازمی ہے بلکہ مفید بھی ہے۔

تربیتی اسکیمیں

ایسی متعدد تربیتی اسکیموں کو بروئے کار لایا جا رہا ہے۔ جس سے ان اداروں کے لیے ہنرمند افرادی قوت کی باقاعدہ فراہمی یقینی ہو جاتی ہے۔ اس سلسلے میں مرکزی حکومت کی طرف سے پالیسیوں کا تعین کیا جاتا ہے۔ اور تربیتی معیاروں، پیشہ ورانہ انسٹرکٹروں (معلموں) اور صنعتی نگرانوں کی تربیت، پیشوں کے حتمی معائنوں اور سندوں کی تقسیم کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ صنعتی تربیتی اداروں میں روزمرہ کے نظم و نسق اور کاریگروں کے تربیتی پروگرام کی تعمیل کی ذمہ داری ریاستی حکومتوں پر ہے۔ بعض تربیتی اسکیمیں درج ذیل ہیں۔

۱۔ ایڈوانسڈ ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ (معلموں کے سابقہ تربیتی ادارے)، کلکتہ، بمبئی، لدھیانہ، حیدرآباد اور کانپور میں واقع ہیں اور ان میں باقاعدہ تربیت اور ریفریشر نصاب نیز ہنرمندیوں کے ترقی یافتہ نصاب عمل میں لائے جا رہے ہیں جن کا اجرا ایڈوانسڈ ووکیشنل ٹریننگ سسٹم کے تحت کیا گیا تھا۔ مدراس کے ادارے میں بھی انسٹرکٹروں کو ایسی ہی تربیت دی جاتی ہے۔

۲۔ مدراس کا ایڈوانسڈ ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ اے ٹی آئی، جو ایڈوانسڈ ووکیشنل ٹریننگ سسٹم کے ایپکس ادارے کے طور پر کام کر رہا ہے۔ اپنے خاص طور پر تیار شدہ پروگراموں سے سرکاری اور غیر سرکاری شعبوں کے اداروں کی خصوصی تربیتی ضروریات پوری کر رہا ہے۔ اب تک کوئی ۵۰۰ ایسے ادارے ان تربیتی سہولیات سے استفادہ کر چکے ہیں۔ خاص طور پر بھارتی ریلوے اپنے چارج مینوں اور فورمینوں کو تربیت دینے کے لیے اس ادارے کی سہولیات کا وسیع استعمال کر رہی ہے۔

۳۔ فورمین ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ جو بنگلور میں واقع ہے، اپنے خصوصی نصابوں کے ذریعے مینیجمنٹ کی نچلی اور متوسط سطحوں پر صنعت کی تربیتی ضروریات پوری کر رہا ہے۔ ہر نصاب کے شرکا کو دو ہفتوں کے لیے صنعتی اداروں میں بھی تربیت کے لیے بھیجا جاتا ہے۔ جس سے کارخانوں میں روزمرہ کے مسئلوں کو نبٹانے میں اُن کا اعتماد بڑھتا ہے۔

یہاں اس امر کا ذکر کرنا موجب دلچسپی ہوگا کہ مدراس اور بنگلور کے متذکرہ بالا اداروں کی درجہ بندی بڑھا کر انھیں علاقائی ادارے بنایا جا رہا ہے جن میں ایشیائی و بحرالکاہل کے ملکوں کی ہنرمندیوں کے ترقیاتی پروگرام (اے پی ایس ڈی ای پی) کے تحت شرکت کرنے والے ملکوں کی تربیتی ضروریات کو پورا کیا جا سکیگا۔

الیکٹرانکس اور پروسیس انسٹرومنٹیشن سے متعلق دو ترقیاتی تربیتی اداروں (اے ٹی آئی۔ ای پی آئی) جو حیدرآباد اور دہرہ دون میں واقع ہیں اور جمشید پور میں واقع فورمین ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ میں مختلف نصابوں کے ذریعہ تربیت دی جا رہی ہے۔

سینٹرل اسٹاف ٹریننگ اینڈ ریسرچ انسٹی ٹیوٹ (سی ایس ٹی اے آر آئی) میں تحقیق و ترقی کے اسٹاف کی تربیت کا کام جاری ہے۔

اگرچہ ایڈوانسڈ ووکیشنل ٹریننگ سسٹم (مرحلہ اول) کے تحت صنعتی ورکروں اور ٹیکنیشینوں کو ڈائرکٹوریٹ کے تحت کام کرنے والے چھ اداروں اور ۱۰ ریاستی حکومتوں کے تحت کام کرنے والے ۱۲ چیدہ صنعتی تربیتی اداروں میں تربیت دی جا رہی ہے تاہم اس سسٹم کے دوسرے مرحلے سے متعلق ایک پروگرام کا آغاز کیا گیا ہے جس کے تحت ہیٹ انجنوں اور ایڈوانسڈ ریفریجریشن، ایئر کنڈیشننگ جیسے ہنروں کے مزید شعبوں میں تربیت دی جائے گی۔

۵۷ صنعتی تربیتی اداروں کو جدید سطح پر لانے کی جو تجویز کی گئی تھی اُن میں سے ۵۳ کی نشاندہی متعلقہ ریاستی حکومتوں اور مرکزی منتظمہ علاقوں کی جانب سے کی گئی ہے۔

موجودہ ریجنل ڈائرکٹوریٹ آف اپرنٹس شپ ٹریننگ کے علاوہ جو کانپور، کلکتہ، بمبئی اور مدراس میں واقع ہیں۔ حیدرآباد میں ایک مزید ریجنل ڈائرکٹوریٹ کے قیام کی منظوری اکتوبر ۱۹۸۳ میں دی گئی تھی۔ ایک اور ریجنل ڈائرکٹوریٹ کے قیام کی تجویز ہے جس کی جگہ کے لیے ابھی کوئی قطعی فیصلہ نہیں ہوا۔

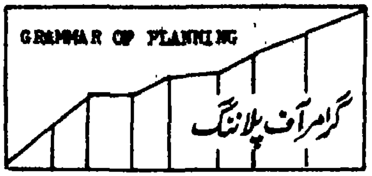
ملک بھر میں ایسے ۱۶۱۱ صنعتی تربیتی اداروں کا جال پھیلایا گیا ہے جن میں تقریباً ۲ لاکھ ۲۴ ہزار کاریگروں کو انجنیئری اور غیر انجنیئری پیشوں میں تربیت دینے کا پروگرام جاری ہے۔

چار ماڈل انڈسٹریل ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ بھارت سرکار کی طرف سے ہلدوانی (یو۔پی)، کالی کٹ (کیرل)، جودھ پور (راجستھان) اور چودوار (اڑیسہ) میں قائم کیے گئے ہیں۔ تاکہ موڈولر بنیاد پر پیشوں کی تربیت کے لیے ماہرین کی کمیٹی کی سفارشات کو عمل میں لایا جائے۔ ڈائرکٹوریٹ کے تحت کام کرنے والے مختلف تکنیکی امدادی پروگراموں کی وساطت سے غیر ملکی تربیت یافتگان کو پیشوں کی تربیت میں تکنیکی امداد دی گئی ہے۔

نئے پیشوں کا اجراء

کمپیوٹری سائنسوں کے شعبے میں روزگار کے امکانات اور تربیت یافتہ افرادی قوت کی ضرورت کے پیش نظر دو قسم کے نصاب جاری کرنے کی تجویز کی گئی ہے۔ ان میں ایک ہے DATA ENTRY OPERATOR اور دوسرا ہے CONSOLE OPE-RATOR-CUM-PROGRAMME ASSISTANT یہ نصاب بعض منتخبہ صنعتی تربیتی اداروں میں بہت جلد جاری کرنے کی تجویز ہے۔ یہ نصاب ایک اور دو برس کے لیے بالترتیب ہوں گے۔ اور داخلے کے لیے کم از کم قابلیت میٹریکولیشن یا اُس کے برابر کے امتحان میں کامیابی ہوگی جن کے ساتھ حساب اور سائنس کا علم ضروری ہوگا۔

سوئیڈن کے ترقیاتی ادارے (ایس آئی ڈی اے) (باقی صفحہ پر)



پی۔ آر۔ دوبھاشی

منصوبہ بندی کا عمل

منصوبہ بندی مختلف عرصے، مختلف سیکٹروں اور مختلف سطحوں کے لیے کی جاتی ہے۔ پالیسیوں، پروگراموں اور پراجیکٹوں کی تشکیل کے ذریعے اسے ٹھوس شکل دی جاتی ہے۔ چونکہ قومی منصوبے کو عوام کی امنگوں اور آرزوؤں کا آئینہ دار بنانا ہوتا ہے۔ اس لیے اسے مختلف مراحل سے گزرنا ہوتا ہے اور تبادلۂ خیال، نیز منظوری وغیرہ کا کام کئی سطحوں پر انجام دینا ہوتا ہے۔ لہٰذا منصوبے پر عمل درآمد کے لیے موثر نظام درکار ہے۔

منصوبہ بندی کوئی سادہ عمل نہیں۔ یہ کوئی ایسی چھلانگ بھی نہیں جسے ایک ہی بار لگایا جائے۔ اس کی انجام دہی مختلف پیچیدہ عوامل سے عبارت ہے۔ اسے طویل المدتی، متوسط مدتی اور مختصر مدتی بنیادوں پر انجام دینا ہوتا ہے۔ مجموعی منصوبہ بندی کو انجام دینے کے لیے اور اس کی پشت پناہی کے لیے مختلف سیکٹروں کی منصوبہ بندی درکار ہے۔ پرائمری سیکٹر، ثانوی سیکٹر اور تیسرے درجے کے سیکٹر نیز پبلک سیکٹر، پرائیویٹ سیکٹر اور کوآپریٹو سیکٹر کے ساتھ اسے جوڑنا ہوتا ہے۔ اسے قومی، ریاستی، ضلعی اور دیگر مقامی سطحوں پر انجام دینا ہوتا ہے۔ حتمی طور پر اسے پراجیکٹ یا مہم جوئی کی صورت میں تشکیل دے کر انجام کو پہنچانا ہوتا ہے۔ اس کے لیے پالیسیوں کی تشکیل ضروری ہے۔ پروگرام وضع کرنے ہوتے ہیں اور پراجیکٹ تشکیل دینے ہوتے ہیں منصوبہ پر عمل درآمد کے لیے نظام وضع کرکے اسے عملی صورت میں کامیاب بنانا ہوتا ہے۔ وسائل کا اندازہ لگانا ضروری ہوتا ہے، ان کی نشاندہی کرکے انھیں حرکت میں لانا ہوتا ہے تاکہ منصوبہ بندی کی مطلوبہ شرائط پوری ہو سکیں۔

عام اتفاق رائے

ان تمام پہلوؤں کو ایک ایک کرکے انجام تک پہنچانے کی کوشش کی جاتی ہے، اس کام میں مختلف سرکاری محکمے جڑے ہوتے ہیں اور بہت سے خصوصی ادارے اس میں معاونت دیتے ہیں۔ ماہرین اقتصادیات اور تکنیکی ماہرین کا تعاون حاصل ہوتا ہے۔ اس عمل میں کاروباری افراد اور اداروں کے نمائندے، محنت کش طبقے کے نمائندے، دیگر متعلقہ گروپوں کے نمائندے، سیاسی پارٹیوں کے نمائندے، رضاکار اداروں کے نمائندے اور جمہوری سماج میں بحیثیت مجموعی عوام شریک ہوتے ہیں۔

قومی منصوبے کو عوام کی آرزوؤں اور امنگوں نیز اصولوں کا آئینہ دار بنانا ہوتا ہے۔ اس لیے عوام کی اس میں شرکت ضروری ہے۔ کچھ ملکوں میں منصوبہ بندی کی منظوری کے لیے مناسب قانون کی ضرورت ہوتی ہے۔ منصوبے کو کابینہ اور پارلیمنٹ کی منظوری حاصل ہونی چاہیے۔ ایک دفاعی نظام میں منصوبے کو نہ صرف وفاقی حکومت کی منظوری درکار ہوتی ہے، بلکہ اس کے مختلف اجزائے ترکیبی کی سرکاروں کی منظوری بھی درکار ہوتی ہے۔ اس لیے منصوبے کو مختلف مرحلوں سے گزرنا ہوتا ہے۔ اس لیے ڈبلیو آر کھتر یوس نے بجا طور پر کہا ہے "منصوبہ بندی جزوی طور پر صرف ایک اقتصادی آرٹ ہے اور سیاسی سمجھوتہ بازی کی ایک مشق ہے"۔

منصوبے کے تحت زندگی کے ایک مختصر عرصے کا احاطہ کیا جاتا ہے، مگر اسے طویل المدتی پس منظر میں دیکھنا ہوتا ہے۔ تناظری منصوبہ بندی کے ذریعے اس مقصد کو سامنے رکھا جاتا ہے۔ اس کے تحت نہ صرف سامنے کے اقتصادی نظریات کو سامنے رکھنا ہوتا ہے بلکہ سائنس، ٹکنالوجی اور مختلف تنظیموں کی طرف سے لائی گئی تبدیلیوں کو بھی

سامنے رکھنا ہوتا ہے۔ تناظری منصوبہ بندی میں منصوبوں کو تشکیل کرتے وقت سروے اور مستقبل کے مطالبوں کی گنجائش بھی رکھی جاتی ہے۔ لہٰذا اس میں ماہرین منصوبہ بندی کو شامل کرنا ضروری ہوتا ہے۔ تاکہ وہ تحقیقی ماہروں کی مدد سے اس کے مختلف گوشوں کو اجاگر کیا جا سکے۔

تناظری منصوبہ

منصوبہ سازی کے ذریعے سیاسی سطح پر کئے گئے وعدوں کی تکمیل ضروری ہوتی ہے۔ البتہ غیر کمیونسٹ جمہوری ملکوں میں سرکار مختصر سے عرصے کے لیے سیاسی اقتدار کی حامل ہوتی ہے، آئندہ انتخابات میں برسراقتدار پارٹی بدل سکتی ہے اور دوسری پارٹی پہلی سے مختلف انداز نظر کی حامل ہو سکتی ہے۔ ایسی صورت میں تناظری منصوبہ بندی کی صحت مندی شبہ میں پڑ جاتی ہے۔ پانچ سالہ یا سات سالہ پلان ایک ایسا منصوبہ ہوتا ہے جس کے تحت منصوبہ بندی کے خطوط زیادہ واضح صورت میں سامنے آتے ہیں۔ یہ بالعموم مختلف سطحوں سے گزرتا ہے۔ بھارت میں یہ کم سے کم تین مراحل سے گزرتا ہے۔ پہلے انداز نظر سے متعلق دستاویز کی تیاری، دوسرا پلان کے مسودہ کا تیار کیا جانا اور تیسرا حتمی منصوبہ کا خاکہ مکمل کرنا۔

انداز نظر سے متعلق مرحلے کے تحت منصوبہ بندی سے متعلق ذمہ داروں کو ایک مختصر دستاویز تیار کرنی ہوتی ہے جس میں پچھلے منصوبے کی کامیابیوں اور ناکامیوں کا اندازہ لگانا ہوتا ہے۔ نئے منصوبے کی تشکیل میں ان نتائج کو سامنے رکھا جاتا ہے۔ اس سلسلے کے مقاصد کو شرح ترقی، روزگار، آمدنیوں اور اس کی تقسیم، پیداوار کے نشانے وغیرہ کی صورت میں متعین کرنا ہوتا ہے۔ ان تمام آنکڑوں کا وسیع تر اندازہ لگانا ہوتا ہے۔ اس مرحلے پر تفاصیل سے بحث نہیں ہوتی بلکہ منصوبے کے حجم کو سامنے رکھا جاتا ہے۔

پیش گوئی

نئے منصوبے سے متعلق انداز نظر کا انحصار محض ماضی کے نتائج اور مستقبل کی بہبودی پر نہیں ہو سکتا۔ اس کی پشت پناہی کے لیے ٹھوس تکنیکی پیش بندیاں ہوتی ہیں۔ مغربی ملکوں کی ملیشتوں میں منصوبہ بندی کے دوران ان پیش بندیوں کی بڑی اہمیت ہے۔ فرانس میں پلان کی تشکیل سے ایک سال قبل ہی کمیشیریٹ ڈو پلان (Commisseriet du Plan) اور اقتصادی ومالی مطالعوں سے متعلق محکمہ آپس میں ایک ساتھ مل کر اس عرصے پر نظر ڈالتے ہیں، جس کے لیے منصوبہ بندی کرنی ہے۔ اس عرصے کے ترقی کے امکانات کو پیش نظر رکھا جاتا ہے۔ ہالینڈ کی منصوبہ بندی سے متعلق پیش گوئی جسے اس نے ۱۹۵۰ سے ۱۹۷۰ کے عرصے کے دوران معاشی امکانات کی کھوج کا نام دیا ہے، اس سلسلے کی ایک اور مثال ہے۔ یہ پیش گوئیاں ایسی معیشتوں کی منصوبہ بندی کے لیے موزوں ہیں جہاں صارفین اور مال تیار کرنے والوں کو بڑی حد تک آزادی ہے۔ پیش گوئیاں بے اختیارانہ عمل کا مستقبل کے نقطۂ نظر سے ایک تجزیہ پیش کرتی ہیں۔ مرکزی نظام پر مبنی منصوبہ بندی کے تحت یہ ضروری نہیں جیسا کہ روس میں ہے۔ البتہ ٹکنالوجی کے سلسلے میں پیش گوئی ضروری ہے۔ مستقبل کی ترجیحات کے سلسلے کو بھی یکسر نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔ یہ پیش گوئیاں مختلف مفروضات پر مبنی ہیں۔ ان میں بہت سی غلطیوں کے امکانات کو خارج از امکانات قرار نہیں دیا جا سکتا۔ پھر بھی برشت کے الفاظ میں "یہ منصوبے کے لیے بنیادی طور پر لازم ہیں۔ پیش گوئی کے تحت مستقبل بعید میں ترقی کی نوعیت کی نشاندہی ہوتی ہے تاکہ توسیع کی مختلف شرحوں کے درمیان اعتدال پسندانہ انتخاب کا عمل انجام پا سکے۔ ضروری اطلاعات اور پیش گوئیوں کو ذہن میں رکھتے ہوئے فرانس میں سیاسی حکام توسیع کی شرح اور نوعیت کو متعین کرتے ہیں۔ اسی کی روشنی میں وہ کمشنر جنرل کو ضروری ہدایات دیتے ہیں۔ یہ ہدایات وہ ہیں کہ جدید کاری سے متعلق کمیشنوں کو ان کی روشنی میں اپنی کوششوں کو آگے بڑھانا ہے۔ اگر پیش گوئیاں منصوبہ بندی کا تکنیکی حصہ ہیں تو ہدایات سیاسی انتخاب کے عنصر کی عکاسی کرتی ہیں۔ پیش گوئیوں سے ہدایات کو مقصدیت عطا ہوتی ہے اور وہ محض ایک طرفہ سیاسی انتخاب یا پسند ہی نہیں رہ جاتی۔

انداز نظر سے متعلق دستاویز ایک عبوری دستاویز ہوتی ہے جو ایک طرح سے منصوبہ بندی کے عمل کے لیے منظوری ہے اور اس کے لیے راہ ہموار کرتی ہیں۔ زیر تشکیل پلان پر قومی سطح پر بحث کی بنیاد یہی دستاویز فراہم کرتی ہے۔ جہاں تک ممکن ہوتا ہے، مختلف تنظیموں کی طرف سے اس پر مشورے طلب کئے جاتے ہیں۔

مسودہ

منصوبہ بندی سے متعلق تنظیم مختلف آراء اور ردعمل کو سامنے رکھ کر اس کا مسودہ تیار کرتی ہے اسے منصوبے کا ڈھانچہ بھی کہا جا سکتا ہے۔ منصوبے کا مسودہ تیار کرنے کے لیے بہت سے ورکنگ گروپ یا مشاورتی بورڈ ہوتے ہیں جن میں انتظامیہ نیز اقتصادیات کے ماہرین شامل ہوتے ہیں۔ ورکنگ گروپ کا کام اس وقت تک مفید ثابت نہیں ہو سکتا جب تک کہ اس کے لیے پہلے سے بنیادی کام نہ ہو۔ مختلف محکموں کے سربراہ اپنے مطالعاتی گروپ قائم کر سکتے ہیں جو ہر سیکٹر کے لیے الگ الگ ہوں گے۔ ورکنگ گروپ اپنی نشستوں کا اہتمام کر سکتے ہیں۔ یا پھر وہ ٹاسک فورس قائم کر سکتے ہیں۔ منصوبہ بندی کے مختلف پہلوؤں مثلاً وسائل کو حرکت میں لانے، افرادی قوت کی منصوبہ بندی وغیرہ سے متعلق مختلف ورکنگ گروپوں کی رپورٹوں کو یکجا کر کے ایک مربوط پلان کشکیل دیا جا سکتا ہے۔

منصوبہ بندی سے متعلق تنظیم کو تمام مرحلوں پر ورکنگ گروپوں کی رپورٹوں سے کام لینا ہوگا۔ اس طرح سیکٹر وار ہر پہلو سے متعلق الگ الگ دستاویز تیار کرکے انھیں مربوط کرنا ہوگا۔

ملی جلی معیشت میں پرائیویٹ سیکٹر کے لیے بھی منصوبہ سازی ضروری ہے۔ پبلک سیکٹر اور پرائیویٹ سیکٹر میں منصوبہ بندی جداگانہ طریقہ پر ہوگی۔ پرائیویٹ سیکٹر میں نجی اور پرائیویٹ صنعت کاروں کو بھی شریک کرنا ہوگا۔ مختلف سیکٹروں میں منصوبہ بندی کی کمیٹیوں میں پرائیویٹ سیکٹر کی نمائندگی ضروری ہے۔ پرائیویٹ سیکٹر میں صارفین کے رجحانات اور ان کی ترجیحات کا تعین صنعتی فرمیں اور کاروباری گھرانے کریں گے اور ان کو پیش نظر رکھ کر ہی اسکیمیں وضع کی جا سکتی ہیں۔ یہ کام ایسی ہی کمیٹیاں انجام دے سکتی ہیں جن میں کاروباری مفادات کے نمائندے ہوں۔ اس طرح منصوبہ سازی کے عمل میں وہ معاون ثابت ہو سکتے ہیں۔ اور وضع کردہ اسکیموں پر عمل درآمد کے لیے ذمہ داری محسوس کر سکتے ہیں۔

قومی سطح پر منصوبہ کا مسودہ ایسا ہوگا جس کی جھلک ریاستی سطح کے منصوبوں میں ملنی ضروری ہے۔ مقامی سطح پر بھی اس کی جھلک دکھائی ضروری ہے۔ قومی سطح پر تیار کئے جانے والے منصوبے کو مربوط انداز میں اپنانا ہوگا تاکہ وہ ریاستی اور مقامی سطح تک اپنی جھلک دکھا سکے۔ یہ کام وقت چاہتا ہے اور اس کے لیے ساتھ ہی ایک ایسا ٹائم ٹیبل جس کے مطابق یہ انجام دیا جا سکے۔ البتہ اگر کسی بھی ایجنسی کی طرف سے اس سلسلے میں تاخیر ہوگی تو اس سے وضع کردہ ٹائم ٹیبل بگڑ سکتا ہے۔ قومی سطح پر تیار کیا گیا مسودہ سیاسی اقتدار اعلا کی منظوری سے ہونا چاہیئے۔ اس کے بعد ہی اسے حتمی شکل دی جا سکتی ہے۔ اگر سیاسی اقتدار اعلا کی طرف سے اس میں کچھ تبدیلیاں درکار ہوں گی تو منصوبہ بندی سے متعلق تنظیم کو انھیں عمل میں لانا چاہیئے۔ اور مسودہ پر ان کی روشنی میں نظر ثانی کی جانی چاہیئے۔ منصوبہ بندی سے متعلق تنظیم کو سیاسی اقتدار اعلا کو باخبر رکھنا چاہیئے۔ اس کے بعد ہی وہ کم سے کم تبدیلی کے ساتھ منظور ہو سکے گا۔ سیاسی اقتدار اعلا کے سامنے کئی متبادل طریقے رکھے جانے چاہئیں تاکہ وہ ان میں سے اپنی پسند کے مطابق کوئی طریقہ اختیار کر سکے۔ اگر یہ طریقے واضح صورت میں سامنے رکھے جائیں گے تو سیاسی اقتدار اعلا کو اس میں سے پسند کرنے میں دشواری پیش نہ آئے گی لیکن مبہم طریقوں کی موجودگی میں غور و خوض کا عمل طول پکڑ جائے گا اور اس سے منصوبہ بندی کی حتمی تشکیل میں دیر ہو سکتی ہے۔

حتمی دستاویز

حتمی منصوبے میں ایسی تمام تبدیلیوں کو شامل کرنا ہوگا جن پر حتمی طور پر اتفاق رائے ہو گیا ہے۔ منصوبے کی دستاویز مختلف ابواب پر مشتمل ہوتی ہے جن میں اندازِ نظر، سائز، مشمولات، وسائل کی تخصیص، افرادی قوت کے پروگرام، انتظامی تنظیمیں، زمان و مکان سے متعلق حدود وغیرہ کی تفاصیل ہوتی ہیں۔ منصوبے کی حتمی دستاویز شائع کر دی جاتی ہیں۔ یہ کئی ہزار صفحات پر مشتمل ہوتی ہے۔ اس پر منصوبہ بندی کمیشن کے ارکان کے دستخط ہوتے ہیں۔ اسے پارلیمنٹ کی طرف سے منظوری حاصل ہوتی ہے۔ کچھ ممالک میں منصوبے کی منظوری سے متعلق قانون بنا دیا جاتا ہے۔ منصوبے کے وضع کرنے میں مختلف مراحل مکمل کرنے ہوتے ہیں اور یہ سب کام وقت معینہ کے اندر انجام پا نا ضروری ہوتا ہے۔ ورنہ تو وہی ہوگا جو ہندوستان میں ہوا کہ منصوبے کی حتمی دستاویز منصوبے کے آغاز کے بعد سامنے آتی ہے۔ کچھ حالتوں میں منصوبے کا افتتاح ملتوی کرنا ہوتا ہے جس سے منصوبے میں چھٹی کرنی پڑتی ہے۔

سالانہ پلان

پانچسالہ منصوبہ یا سات سالہ منصوبے پر عمل درآمد کی غرض سے ہر سالانہ منصوبہ وضع کرنا ہوتا ہے۔ اس لیے ہر سال ایسے عملی پلان مرتب کرنے ہوتے ہیں جو اس سال کے بجٹ کے ساتھ مربوط ہو سکیں۔ سالانہ منصوبوں کے لیے ورکنگ گروپوں کو تشکیل دینا ضروری ہے تاکہ وہ تفاصیل کے ساتھ منصوبے وضع کر سکیں۔ سالانہ منصوبے میں مختلف پراجیکٹ ہوتے ہیں اور تعمیر کے لیے وقت کی وضاحت ہوتی ہے۔ وفاقی نظام والے وسیع و عریض ملک میں ورکنگ گروپوں میں ریاستی سرکاروں، مرکزی سرکار اور منصوبہ بندی کمیشن کے نمائندے ہوتے ہیں۔ ایک طرف سالانہ منصوبہ پر عمل ہوتا ہے اور اس کے ساتھ ہی اگلے سال کے لیے منصوبہ وضع ہوتا رہتا ہے۔ منصوبہ بند معیشت میں بجٹ میں ترقیاتی پلان کو اس طرح شامل کیا جاتا ہے کہ منصوبہ بندی اور مالیات میں مربوط انداز میں رشتہ قائم ہو سکے۔ منصوبہ بندی کا یہ عمل وقت چاہتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ یہ محض ایک رسم ہی بن کر رہ جائے اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس کے لیے جس قدر وقت خرچ کیا گیا ہے، اس کے حساب سے اس کے نتائج خاطر خواہ نہ ہوں۔ منصوبے کا طریقِ کار بذاتِ خود کوئی مقصد نہیں ہے لیکن ڈر یہی ہے کہ کہیں اس کو مقصد سمجھ لیا جائے اور محض طریقِ کار کے گورکھ دھندے میں الجھ کر منصوبہ بندی کا اصلی مقصد ہی فوت نہ ہو جائے۔ تجربہ کی روشنی میں سالانہ منصوبوں اور متوسط عرصے کے منصوبوں پر برابر نظر ثانی کی جاتی رہے گی۔ یہ تجربہ جائزہ کی باقاعدہ مشقوں کے ذریعہ حاصل ہوگا۔ ہندوستان میں سالانہ منصوبوں کا جائزہ لیا جاتا ہے لیکن اس سلسلے کی معلومات اور حقائق بروقت نہیں مل پاتے تاکہ اس کی روشنی میں اگلے سال کے منصوبے کو وضع کیا جا سکے۔ ہندوستان کی منصوبہ بندی میں وسط مدتی جائزہ بھی لیا جاتا ہے۔ منصوبے کے طریقِ کار بذاتِ خود کافی نہیں ہے۔ ضرورت ہے کہ تجربہ و مطالعہ کی روشنی میں منصوبہ بندی کو زیادہ مقصدیت عطا کی جائے۔ ★

غزلیں

علی ارشد

کس طرح ایسے مکاں سے کوئی بچ کر نکلے
جس کی کھڑکی سے شعاعوں کا سمندر نکلے

چند پُرزے ہی غبادت کو بہت ہوتے ہیں
اُس کی البم سے کئی قتل کے منظر نکلے

خاکِ دلّی سے یہ ہر وقت صدا آتی ہے
میرؔ و غالبؔ کی طرح کوئی سخنور نکلے

دَورِ حاضر میں بھی مل سکتی ہے منزل ہم کو
رہنمائی کے لیے کوئی پیمبر نکلے

ہر قدم اجنبی چہرے نہیں دیکھے جاتے
کوئی ہمدم، کوئی مونس، کوئی یاور نکلے

سسکیاں جاگ اٹھیں، ظلم کے دروازے کھلے
خون میں ڈوبے ہوئے چند کبوتر نکلے

جس کے سائے میں بھروسہ تھا اماں کا قدؔ
اُس کی آنکھوں سے بھی تلوار کے جوہر نکلے

★

قاضی انصار

جنونِ عشق کا سودا اگر سر میں نہیں ہوتا
تو تُو دل میں نہیں ہوتا کسی گھر میں نہیں ہوتا

صفتِ دریادلی کی شرطِ اوّل ہے حقیقت میں
گدا کم ظرف نالوں کا سمندر میں نہیں ہوتا

وہ ملنا ایک پل کا زندگی بھر کو جدا ہونا
یہی اک حادثہ اپنے مقدر میں نہیں ہوتا

کبھی لب پر شکایت آ نہیں سکتی محبت میں
کبھی شکوہ کسی بھی دیدۂ تر میں نہیں ہوتا

عجب ہے کیفیت دل کی عجب وحشت کا عالم ہے
سکونِ قلب اب حاصل فقط گھر میں نہیں ہوتا

نہ پوچھو ظلم و استبداد کی تم داستاں لوگو!
کسی پر رحم کھانا بابِ خنجر میں نہیں ہوتا

تری تخلیق کی عظمت یقیناً اور بڑھ جاتی
روایت کے اگر انصارؔ چکّر میں نہیں ہوتا

★

اے اہلِ وطن

مُحمّد شریف شادؔاں

کرو نہ تلخیٔ دَوراں کی فکر اہلِ وطن
اُٹھو کہ وقت کی سب تلخیاں بدل ڈالیں
کروگے شکوۂ بے مہریٔ جہاں کب تک
اُٹھو کہ آج نظامِ جہاں بدل ڈالیں
رہے گا یوں گلۂ جورِ آسماں کب تک
اُٹھو کہ کجروی آسماں بدل ڈالیں
اُٹھو اُٹھو کہ تشدد نے سر اُبھارا ہے
بڑھو بڑھو کہ وطن نے تمھیں پکارا ہے

وطن کی راہ میں عزمِ جواں لے کے بڑھو
نئی اُمنگ نئی آن بان لے کے بڑھو
قسم ہے عظمتِ ناموسِ زندگی کی تمھیں
رہِ وطن میں ہتھیلی پہ جان لے کے بڑھو
نہ ہوگا کچھ تمھیں تقلیدِ غیر سے حاصل
بڑھو تو اپنے وطن ہی کی شان لے کے بڑھو

تمھیں یہ عمرِ دو روزہ میں کام کرنا ہے
وطن کے واسطے جینا ہے اور مرنا ہے

★

نیاز اعظمی

ہونٹوں پہ کوئی نام تھا آنکھوں میں خواب تھا
تنہائیوں کے چاند سے گزرنا عذاب تھا
پنچھی بچشمِ نم تھا سفر کی طرف رواں سے
پیپل کی شاخ شاخ میں کیا اضطراب تھا
وہ شخص ساری عمر بھی یہ طے نہ کر سکا
جینا عذاب تھا کہ اسے مرنا عذاب تھا
آنگن کے اس انار کا کیا پوچھتے ہو بات
چڑھتی ہوئی بہار تھی ہنستا شباب تھا
پوچھو نہ کتنی شکلیں تھیں جذبات کی نیازؔ
"جو دل میں شعلہ تھا وہی آنکھوں میں آب تھا"

ملک زادہ جاوید احمد

زندگی بچ جائیگی میری وہاں سمجھا تھا میں
وہ تو مقتل تھا جسے جائے اماں سمجھا تھا میں

اُس کے لب کی ایک جنبش بن گئی میری شکست
اپنے دشمن کو بظاہر ناتواں سمجھا تھا میں

وہ تو کہیے بے گناہی رنگ لے آئی مری
ورنہ خود کو حادثوں کی داستاں سمجھا تھا میں

روز و شب مجھ کو صدا دیتا رہا میرا ضمیر
روح کی آواز کو لیکن کہاں سمجھا تھا میں

چاند تارے بن گئے انسان کے قدموں کی گرد
اس زمین و آسماں کو بیکراں سمجھا تھا میں

زندگی کا اک سلیقہ دے گئے اُردو کے لفظ
وہ تو اک تہذیب ہے جس کو زباں سمجھا تھا میں

ایک دن گر ہی گیا آنگن کا وہ بوڑھا درخت
جس کے سائے کو متاعِ جاوداں سمجھا تھا میں

★

معاشرتی انقلاب کی جانب
اقتصادی جمہوریت کا مقدمہ

چوتھا باب
ہندوستانی معیشت کے چند پہلو (حصہ اوّل) قسط : ۱۰

ہندوستان میں منصوبہ بندی کی کامیابیاں

ہندوستان میں منصوبہ بندی کے اغراض ومقاصد اور معاشرتی قاعدوں سے متعلق اس کی منطق ہمارے آئین میں مندرج پالیسی کے ہدایتی اصولوں سے لی گئی ہے۔ پبلک سیکٹر اور پرائیویٹ سیکٹر کو ایک دوسرے کے لیے معاون سمجھا گیا ہے۔ پرائیویٹ سیکٹر نہ صرف منظم صنعتوں کا احاطہ کرتا ہے بلکہ چھوٹے پیمانے کی صنعتوں، زراعت، تجارت اور مکانات نیز تعمیراتی اور دیگر بہت سے شعبوں کی سرگرمیوں پر بھی حاوی ہے۔ انفرادی کوششیں اور نجی پیش قدمیاں دونوں ہی ضروری اور پسندیدہ خیال کی گئی ہیں رضا کارانہ امداد باہمی اور تعاون کی بنیاد پر ترقیاتی پروگراموں کو مدد دینے کی پالیسی اپنائی گئی ہے۔ اقتصادی منصوبہ بندی میں پبلک سیکٹر کی ترقی کو ضروری سمجھا گیا ہے۔ اس کے لیے بنیادی نیز بھاری صنعتوں میں کثیر سرمایہ کاری ضروری سمجھی گئی ہے۔

پہلا پنجسالہ منصوبہ ۵۲-۱۹۵۱ سے ۵۶-۱۹۵۵ تک دوگونہ مقاصد کا حامل تھا۔ اس کے ذریعہ دوسری جنگ عظیم اور ملک کی تقسیم سے معیشت کو جو نقصان پہنچا اور اس میں جو عدم توازن آیا، اس کو درست کرنا تھا۔ اس کے ساتھ ہی متوازن اور ہمہ گیر ترقی کے پروگراموں کو آگے بڑھانا تھا۔ ان اقدامات کے ذریعے آمدنی کے معقولیت پسندانہ نظام کو یقینی بنانا اور عوام کے معیارِ زندگی کو بلند کرنا ضروری سمجھا گیا۔ ملک کو اناج بڑی مقدار میں باہر سے منگانا پڑتا تھا۔ اور معیشت میں افراطِ زر کے دباؤ کا سامنا تھا، لہٰذا ملک میں زرعی ترقی کو سب سے زیادہ اہمیت دی گئی۔

۱۹۵۴ میں پارلیمنٹ نے اعلان کیا کہ اقتصادی پالیسی کے موٹے موٹے مقاصد کے تحت سماجوادی نظام لاگو کیا جانا ہے تاکہ ترقیاتی پروگراموں سے سماج کو فائدہ ہو۔ اور آمدنی نیز دولت کی مساویانہ تقسیم عمل میں آسکے۔ اس میں نجی منافعوں سے گریز کی بات کہی گئی۔ دوسرا منصوبہ ۵۷-۱۹۵۶ سے ۶۱-۱۹۶۰ تک کے لیے تھا۔ اس میں سماجوادی نظام کے قیام کے لیے کوششیں کی گئیں۔ ان پروگراموں سے حاصل ہونے والے فائدوں کو کم استحقاق یافتہ طبقوں تک پہنچانے کی کوشش کی گئی۔ آمدنی، دولت اور اقتصادی طاقت کے ارتکاز کو بتدریج کم کرنے پر زور دیا گیا۔ تیسرا منصوبہ ۶۲-۱۹۶۱ سے ۶۶-۱۹۶۵ تک کے لیے تھا۔ اس میں ایسی ترقی کے لیے کوشش کی گئی جو ملک کو اپنے پیروں پر آپ کھڑا کرسکے۔ قومی آمدنی میں ۳۰ فی صد اضافے اور فی کس آمدنی میں ۱۷ فی صد اضافے کا نشانہ رکھا گیا۔ چوتھا منصوبہ ۷۰-۱۹۶۹ سے ۷۴-۱۹۷۳ تک کے لیے تھا۔ اس کے دوران ترقیاتی پروگراموں کو ملک میں استحکام لانے کی غرض سے شروع کیا گیا۔ اس کے ساتھ ہی زرعی پیداوار میں اُتار چڑھاؤ کے امکانات کو کم کرنے کی کوشش کی گئی۔ غیر ملکی امداد کی غیر یقینی صورتِ حال سے نجات پانے کی کوشش کی گئی۔ اس کے دوران مختلف ترقیاتی پروگراموں کے ذریعے عوام کا معیارِ زندگی بلند کرنے کی کوشش کی گئی۔ ان پروگراموں کے ذریعے مساوات اور سماجی انصاف لانے کی بھی کوشش کی گئی۔ دولت کے ارتکاز کو کم کرنے نیز دولت، آمدنی اور اقتصادی قوت کو زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پھیلانے کی کوشش کی گئی۔ پانچواں منصوبہ ۷۵-۱۹۷۴ سے ۷۸-۱۹۷۷ تک کے لیے تھا۔ یہ منصوبہ ایسے وقت وضع کیا گیا جبکہ معیشت کو سخت نوعیت کے افراطِ زر کا سامنا تھا۔ اس کے تحت ملک کو خود کفیل بنانے اور عوام کے لیے

نوٹ: اس باب میں پیش کردہ اعداد و شمار ریسرچ اینڈ ریفرنس ڈویژن ۱۹۸۲ کی طرف سے فراہم کردہ معلومات پر مبنی ہیں۔

ضروری اشیا کی کھپت بڑھانے پر زور دیا گیا۔ غریبی کے خط سے نیچے زندگی گذارنے والوں کا معیار زندگی بلند کرنے پر زور دیا گیا۔ منصوبے میں افراط زر کو کم کرنے اور اقتصادی صورت حال میں استحکام لانے پر زور دیا گیا۔ قومی آمدنی میں سالانہ شرح ترقی ۵٫۵ تک کر دینے کا نشانہ رکھا گیا۔ چھٹا منصوبہ (۸۵-۱۹۸۴ — ۸۱-۱۹۸۰ء) ماضی کی کامیابیوں اور ناکامیوں کو سامنے رکھ کر وضع کیا جا سکا۔ اس کے لیے زراعت اور صنعت میں بنیادی ڈھانچے کو مضبوط بنانے پر زور دیا جا رہا ہے تاکہ سرمایہ کاری، پیداوار اور برآمدات میں بتدریج اضافہ ہو۔ ان کاموں کے لیے خصوصی پروگرام وضع کرنے پر زور ہے۔ دیہی علاقوں میں روزگار کے مواقع بڑھانے پر زور ہے تاکہ عوام کی کم سے کم بنیادی ضرورتوں کو پورا کیا جا سکے۔ پلان میں پبلک سیکٹر کے مصارف ۹۰۵۰۰ کروڑ روپے رکھے گئے ہیں۔ اور مجموعی قومی پیداوار کی شرح ترقی ۵٫۲ فی صد سالانہ اور فی کس آمدنی میں ۳٫۳ فی صد اضافے کا نشانہ رکھا گیا ہے۔

نظرثانی شدہ بیس نکاتی پروگرام جس کا اعلان سابق وزیراعظم نے ۱۴ جنوری ۱۹۸۲ء کو کیا تھا، چھٹے پلان کے اغراض و مقاصد کی تکمیل میں معاونت کی غرض سے وضع کیا گیا۔ ان میں چھٹے پنج سالہ منصوبے میں شامل اہم اقتصادی اور سماجی پروگراموں پر توجہ مرکوز کی گئی ہے۔ ان کے ذریعے کم استحقاق یافتہ عوام کا معیار زندگی بلند کرنے اور اس کے ساتھ ہی پیداواری صلاحیت بڑھانے پر زور دیا گیا ہے۔ نظرثانی شدہ بیس نکاتی پروگرام کے تحت مختص کردہ اخراجات سے یہ اندازہ ہو سکتا ہے کہ چھٹے منصوبے میں ان آئٹموں کو کس قدر اہمیت دی گئی ہے۔

نظرثانی شدہ بیس نکاتی پروگرام کے مصارف
(کروڑ روپوں میں)

نمبر شمار	آئٹم	چھٹے منصوبے کے مصارف
۱۔	آبرسانی اور بارانی کھیتی	۱۰,۲۶۶٫۶۸
۲۔	دالوں اور تلہنوں کی پیداوار	۸۲٫۱۱
۳۔	مربوط دیہی ترقی اور قومی سطح پر دیہات میں روزگار	۳۴،۸۶۱٫۴۷
۴۔	اصلاحات اراضی	۳۰۴٫۶۳
۵۔	زرعی مزدوروں کی کم سے کم اُجرتیں	۲٫۵۳
۶۔	بندھوا مزدوروں کی بحالی	۳۱٫۶۸
۷۔	شیڈولڈ کاسٹ اور شیڈولڈ ٹرائب کی ترقی کے تدریجی پروگرام	۱,۳۱۰٫۰۰
۸۔	ایسے دیہات میں پینے کے پانی کی فراہمی جہاں یہ ایک مشکل مسئلہ ہے	۲,۰۰۷٫۱۱
۹۔	دیہات میں تعمیر مکانات کے لیے جگہوں کی فراہمی اور ان کی تعمیر	۳۵۳٫۵۰
۱۰۔	گندی بستیوں کے ماحول کی صفائی	۱۵۱٫۴۵
۱۱۔	بجلی	۱۹,۲۶۵٫۴۴
۱۲۔	جنگل بانی، بائیوگیس کا فروغ، جنگلات کا فروغ	۱۵۰٫۰۰
۱۳۔	خاندانی منصوبہ بندی	۱۰,۱۰۲٫۰۰
۱۴۔	صحت کی دیکھ بھال	۵۰۶٫۷۲
۱۵۔	عورتوں اور بچوں کی بہبود کے پروگرام	۲۲۰٫۱۸
۱۶۔	چھ سے چودہ سال تک کی عمر کے بچوں کے لیے پرائمری تعلیم	۱,۰۲۳٫۰۰
۱۷۔	اشیا کی تقسیم کا سرکاری نظام	۴٫۰۰
۱۸۔	دیہی اور چھوٹے پیمانے کی صنعتیں	۱,۷۸۰٫۴۵
	میزان	۴۲,۷۶۸٫۰۰

نظرثانی شدہ بیس نکاتی پروگرام کی کامیابیوں کا گوشوارہ

آئٹم ۱	یونٹ ۲	پچھلے منصوبے سے قبل ۳	چھٹے منصوبے کے نشانے ۴	۱۹۸۱-۸۲ کی کامیابیاں ۵	۱۹۸۲-۸۳ کیلئے نشانے ۶
آبرسانی کے امکانات کی توسیع	ملین ہیکٹر	۵۶٫۶	۱۳٫۷۴	۲٫۷۴	۲٫۳۸
دالوں کی پیداوار	ملین ٹن	۱۲٫۸	۱۴٫۵۰	۱۱٫۴۰	۱۴٫۸۷
تلہنوں کی پیداوار	ملین ٹن	۱۰٫۲	۱۳٫۰۰	۱۱٫۵۰	۱۳٫۵۱
دیہی مربوط ترقی کے تحت فائدہ اٹھانے والے کنبے	ملین	۲٫۸	۱۵٫۰۰	۲٫۴۱	۳٫۰۰
دیہی روزگار کے قومی پروگرام بحساب فی کس فی دن روزگار	ملین	۹۸۹٫۲	۳۰۰-۴۰۰ فی سال	۳۶۷٫۱	۳۳۱٫۱۰
فاضل اراضی برائے الاٹ منٹ	لاکھ ایکڑ	۶٫۷۹	۵۲٫۴۸	۷٫۳۱	۱۱٫۳۳
بندھوا مزدور جن کی بحالی کی گئی یا کی جاتی ہے	تعداد	۱۲۲٫۰۰۰	۳۲٫۳۰۰	۲۲٫۳۱۴	۳۲٫۵۷۴
خاندان جن کی مالی امداد کی جائے گی					
۱- شیڈولڈ کاسٹ	لاکھ	—	—	۱۲٫۰۶	۱۹٫۸۹
۲- شیڈولڈ ٹرائب	لاکھ	—	—	—	۹٫۴۷
پینے کے پانی کے مسئلے سے دوچار دیہات جہاں یہ سہولت دی جاتی ہے	ہزار	۹۵	۲۳۱	۲۷٫۷	۳۵٫۲
تعمیر مکانات کے لیے جگہوں کی فراہمی	لاکھ تعداد	۷۷	۶۸	۱۱٫۲۸	۱۱٫۳۲
مکانات کی تعمیر کے لیے امداد	لاکھ	۵۵٫۶	۱۳۹	۵٫۴۱	۷٫۴۷
گندی بستیوں کی آبادی پر جسے فائدہ ہوگا	لاکھ	۶۸	۳۱٫۰۷	۱۴٫۵۶	۱۹٫۸۱
سماج کے کمزور طبقوں کے لیے مکانات	لاکھ میں	—	۳٫۶۰ (شہر کو)	۰٫۶۰	۱٫۷۶
دیہی علاقوں میں بجلی			۱۶٫۶۲		
۱- دیہات میں بجلی پہنچائی جائے گی	تعداد	۲۴۹٫۷۹۹	۱۰۰٫۰۰۰	۲۴٫۶۶۹	۲۵٫۵۱۲
۲- پمپ سیٹ جنہیں بجلی دی جائے گی	ہزار	۴٫۰۰۰	۲٫۵۰۰	۳۲۶٫۲۴	۴۲۳
درخت جو لگائے جائیں گے	کروڑ	—	—	۱۲۵٫۷	۱۸۶
بائیو گیس پلانٹ جو لگائے جائیں گے	تعداد	۷۵٫۰۰۰	۴۰۰٫۰۰۰	۲۳٫۰۸۶	۶۵٫۰۰۰
نس بندی آپریشن	لاکھ	۳۱۳٫۷	۲۴۰	۲۹٫۷	۴۴٫۲
صحت کے بنیادی مراکز جو قائم کئے جائیں گے	تعداد	۵٫۴۰۰	۶۰۰	۱۷۱	۲۰۹
ذیلی مرکز جو قائم کئے جانے ہیں	تعداد	۵۰٫۰۰۰	۴۰٫۰۰۰	۸٫۳۱۹	۹٫۳۱
۶ سال سے ۱۴ سال تک کے بچوں کے داخلے	کروڑ	۹٫۳	۷	۱٫۱۴	۰٫۴۰
تعلیم بالغان	لاکھ	۹۰۰	۷	۲۹٫۱۸	۱۵٫۸۵
		۱۵ سے ۳۵ سال کے تمام بالغ			
فیئر پرائس شاپس	لاکھ	۲٫۹۸	۰٫۵۲	—	۰٫۵۲

اہم فصلوں کے زیر کاشت رقبے اور پیداوار (رقبہ ہزار ہیکٹیر میں)

آئٹم	۱۹۵۰-۵۱	۱۹۶۰-۶۱	۱۹۷۰-۷۱	۱۹۷۸-۷۹	۱۹۷۹-۸۰	۱۹۸۰-۸۱
۱۔ کل اناج	۹۷،۳۲۱	۱۱۵،۵۸۱	۱۲۴،۳۱۲	۱۲۹،۰۰	[illegible]۲۰۴	۱۲۵،۷۹۰
۲۔ گنا	۱،۷۰۷	۲،۴۱۵	۲،۶۱۵	۳،۰۸۷	۲،۶۱۰	۲،۶۴۸
۳۔ مونگ پھلی	۴،۴۹۴	۶،۴۶۳	۷،۳۲۶	۷،۴۳۳	۷،۱۲۴	۶،۹۰۴
۴۔ تل	۲،۲۰۴	۲،۱۶۹	۲،۴۳۳	۲،۳۸۹	۲،۳۷۷	۲،۴۴۲
۵۔ سرسوں وغیرہ	۲،۰۷۱	۲،۸۸۳	۳،۳۲۳	۳،۵۴۳	۳،۴۷۰	۴،۰۶۳
۶۔ کپاس	۵،۸۸۲	۷،۶۱۰	۷،۶۰۵	۸،۱۱۹	۸،۱۳۷	۷،۸۷۱
۷۔ پٹ سن	۵۷۱	۶۲۹	۷۴۹	۸۸۴	۸۳۴	۹۴۲
پیداوار (ہزار ٹنوں میں)						
۱۔ کل اناج	۵۵،۰۱۱	۸۲،۳۲۶	۱۰۸،۴۲۲	۱۳۱،۹۰۰	۱۰۹،۷۰۰	۱۲۹،۸۶۷
۲۔ گنا	۷۰،۴۹۰	۱۴،۰۸۰	۲۶،۳۶۸	۱۵،۷۴۴	۱۲۸،۸۳۳	۱۵۰،۵۲۲
۳۔ مونگ پھلی	۳،۳۱۹	۴،۶۹۸	۶،۱۱۱	۶،۲۰۸	۵،۷۶۸	۵،۰۱۹
۴۔ تل	۴۲۲	۳۲۰	۵۶۲	۱،۵۱۴	۳۴۷	۴۳۷
۵۔ سرسوں وغیرہ	۷۶۸	۱،۳۴۷	۱،۹۷۶	۱،۸۶۰	۱،۴۲۸	۲،۲۴۷
۶۔ کپاس (ہزار گانٹھوں میں)	۳،۰۳۹	۵،۵۵۰	۴،۷۶۳	۷،۹۵۷	۷،۱۹۷۱	۶۰۰
۷۔ پٹ سن (" "	۳،۴۹۷	۴،۱۳۶	۴،۹۳۸	۶،۴۷۰	۶،۰۷۱	۶،۵۱۵

بجلی :۔ ہندوستان میں بجلی پیدا کرنے کی نصب شدہ صلاحیت ملین کلو واٹ میں درج ذیل ہے :۔

۱۹۵۱	۱۹۵۶	۱۹۶۱	۱۹۶۶	۱۹۶۹	۱۹۷۴	۱۹۷۹	۱۹۸۲
۲٫۳	۳٫۴	۵٫۶	۱۰٫۲	۱۴٫۳	۱۸٫۵	۲۹٫۳	۳۵٫۵

چھٹے منصوبے میں یعنی ۸۵ — ۱۹۸۰ کے دوران مختلف وسائل سے انرجی کی مجموعی اضافی پیداوار ۱۹٫۶۶ ملین کلو واٹ ہونے کی توقع ہے۔

کوئلہ :۔ آزادی کے بعد کوئلہ کی کانوں میں کھدائی کا کام تیز کیا گیا چنانچہ ۱۹۵۰ میں کوئلہ کی پیداوار ۳۲ ملین ٹن تھی جو بڑھ کر ۱۲۰ ملین ٹن ہو گئی۔

تیل :۔ ۸۳ – ۱۹۸۲ میں ۲۰٫۹۵ ملین ٹن تیل کی پیداوار کی توقع تھی۔ تیل کی درآمد پر غیر ملکی زر مبادلہ کے بھاری خرچ کو روکنے کے لیے اندرون ملک تیل کی حصول پر زور دیا گیا۔

تیل کی پیداوار			ملین ٹن میں
پیداوار کا وسیلہ	۱۹۸۰ — ۸۱	۱۹۸۱ — ۸۲	۱۹۸۲ — ۸۳ (اندازہ)
ساحل سمندر سے	۵٫۵۲	۸٫۲۲	۸٫۸۴
ساحل سمندر سے دور	۴٫۹۸	۷٫۹۷	۱۲٫۱۱
میزان	۱۰٫۵۰	۱۶٫۱۹	۲۰٫۹۵

صنعت :۔ منصوبہ بند ترقی کے تیس برس میں صنعتی پیداوار بلحاظ معیار اور تنوع کافی بڑھی ہے۔ ۸۱ — ۱۹۸۰ کے دوران اس محاذ پر شرح ترقی ۵ فی صد ہے۔ یہ ترقی خاص طور پر پٹرولیم کی مصنوعات، کیمیکلز کی مصنوعات، دھات کی اشیاء،

الیکٹرانکس کے سامان، بجلی کی مشینری، ٹرانسپورٹ کے سامان اور بجلی کے تیاری کے لیے درکار سامان میں دیکھنے کو ملی۔ گھریلو اشیاء میں مال تیار کرنے کا تناسب ۶۱-۱۹۶۰ میں ۹٫۱۳ فیصد تھا، جو بڑھ کر ۸۱-۱۹۸۰ میں ۱۵٫۲ فی صد ہو گیا۔ حصولِ آزادی کے بعد ملک میں صنعتی ترقی خاص کر پبلک سیکٹر میں دیکھنے کو ملی۔ ۱۹۵۱ میں ۵ غیر محکمہ جاتی پبلک انڈرٹیکنگز تھے جن کی سرمایہ کاری ۲۹ کروڑ روپے تھی۔ یکم اپریل ۱۹۸۱ کو ان کی تعداد ۱۸۵ ہو گئی اور ان کی سرمایہ کاری کی میزان ۲۱۱۲۶ کروڑ روپے تک پہونچ گئی۔ ۸۳-۱۹۸۲ کے شروع میں یہ سرمایہ کاری بڑھ کر ۲۵ ہزار کروڑ روپے کے بقدر ہو گئی۔ ان کارخانوں میں فولاد، کوئلہ، المونیم، تانبہ، بھاری اور ہلکی انجینئرنگ کا سامان، کیمیاوی کھاد، بنیادی کیمیکلز، دوائیں، معدنی اجزا، پٹرولیم کی مصنوعات، انجن، ایرکرافٹ، جہاز وغیرہ تیار ہوتے ہیں۔ ۸۱-۱۹۸۰ میں ان کا کاروبار ۲۸۶۴۵ کروڑ روپے کے بقدر تھا۔ ان کے ملازمین کی تعداد ۱۸ لاکھ ۳۸ ہزار تھی۔

۱۹۵۴ میں پارلیمنٹ نے سماج وادی طرزِ حیات کو قومی مقصد قرار دینے کا اعلان کیا۔ چنانچہ ۱۹۵۶ میں صنعتی پالیسی پر نظرِ ثانی کی گئی۔ اس کے لیے دو شیڈول بنائے گئے۔ شیڈول اول میں اسلحہ سازی، دفاعی سامان کی تیاری، ایٹمی توانائی، لوہے، فولاد کی تیاری، معدنی تیل، طیارے، ایر ٹرانسپورٹ، ریلوے، بحری جہازوں کی تیاری، ٹیلی فون اور بجلی وغیرہ کی تیاری کو خالصتاً ریاستی ذمہ داری قرار دیا گیا۔ شیڈول دوم میں مشینی ٹولز، بنیادی سامان، نیم مصنوعہ مال، دواؤں کی تیاری، رنگوں کا سامان انٹی بائیکس، فرٹیلائزرز، مصنوعی ربڑ، لگدی، سڑکوں اور سمندری ٹرانسپورٹ وغیرہ کو شامل کیا گیا۔ ان کے لیے غیر سرکاری سیکٹر کی کوششوں کی بھی حوصلہ افزائی کی گئی اور ان کو رفتہ رفتہ سرکاری ملکیت میں لینے کے لیے کہا گیا۔ ان کے علاوہ اور بہت سی اشیاء کو پرائیویٹ کارخانوں کے لیے رکھا گیا۔ اس حد بندی کے باوجود ریاست کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ کسی بھی طرح کی صنعتی پیداوار شروع کر دے۔

سیمنٹ

۵۱-۱۹۵۰ میں سیمنٹ کی تیاری ۲۹ لاکھ تھی جو بڑھ کر ۸۲-۱۹۸۱ میں ۲ کروڑ دس لاکھ ٹن ہو گئی۔

فولاد:

مرکوز نوعیت پر کام کرنے والے فولاد کے پلانٹوں سے قابلِ فروخت فولاد کی پیداوار ۸۰-۱۹۷۹ میں ۶ ملین ٹن، ۸۱-۱۹۸۰ میں ۶٫۲۸ ملین ٹن اور ۸۲-۱۹۸۱ میں ۷٫۲۷ ملین ٹن ہو گئی۔

معدنی پیداوار

(ایٹمی معدنی اجزا کو خارج کر کے) معدنی پیداوار کی قیمت پچھلے بیس برسوں میں کافی بڑھی۔ ۱۹۶۰ میں ۱۶۵ کروڑ دس لاکھ تھی جو بڑھ کر ۱۹۸۱ میں ۳۵۰۴ کروڑ ۲۰ لاکھ روپے تھی۔

غیر ملکی تجارت

۵۱-۱۹۵۰ کے بعد سے چند منتخب برسوں میں درآمدات و برآمدات کی مالیت گویا کہ غیر ملکی تجارت کی مجموعی مالیت اور توازنِ تجارت کا اندازہ درجِ ذیل گوشوارے سے ہوگا۔

سال	درآمدات	برآمدات	غیر ملکی تجارت کی مجموعی قیمت	متوازن تجارت
۵۱-۱۹۵۰	۶۵۰٫۲۱	۶۰۰٫۶۴	۱٬۲۵۰٫۸۵	–۴۹٫۵۷
۶۱-۱۹۶۰	۱٬۱۳۹٫۶۹	۶۶۰٫۲۲	۱٬۷۹۹٫۹۱	–۴۷۹٫۴۷
۷۱-۱۹۷۰	۱٬۶۳۴٫۲۰	۱٬۵۳۵٫۱۶	۳٬۱۶۹٫۳۶	–۹۹٫۰۴
۷۴-۱۹۷۳	۲٬۹۵۵٫۳۷	۲٬۵۲۳٫۴۰	۵٬۴۷۸٫۷۷	–۴۳۱٫۹۷
۷۵-۱۹۷۴	۴٬۵۱۸٫۷۸	۳٬۳۲۸٫۸۳	۷٬۸۴۷٫۶۱	–۱٬۱۸۹٫۹۵
۷۶-۱۹۷۵	۵٬۲۶۵٫۲۰	۴٬۰۴۲٫۲۵	۹٬۳۰۷٫۴۵	–۱٬۲۲۲٫۷۵
۷۷-۱۹۷۶	۵٬۰۷۳٫۷۹	۵٬۱۴۲٫۲۵	۱۰٬۲۱۶٫۰۴	+۶۸٫۴۶
۷۸-۱۹۷۷	۶٬۰۲۵٫۲۹	۵٬۴۰۴٫۲۶	۱۱٬۴۲۹٫۵۵	–۶۲۱٫۰۳
۷۹-۱۹۷۸	۶٬۸۱۴٫۳۰	۵٬۷۲۶٫۲۲	۱۲٬۵۴۰٫۵۲	–۱٬۰۸۸٫۰۴
۸۰-۱۹۷۹	۹٬۰۲۱٫۷۵	۶٬۴۵۸٫۷۶	۱۵٬۴۸۰٫۵۱	–۲٬۵۶۲٫۹۹
۸۱-۱۹۸۰	۱۲٬۵۲۳٫۹۱	۶٬۷۱۰٫۷۱	۱۹٬۲۳۴٫۶۲	–۵٬۸۱۳٫۲۰
۸۲-۱۹۸۱	۱۳٬۵۶۰٫۱۲	۷٬۷۸۱٫۴۰	۲۱٬۳۴۱٫۵۲	–۵٬۷۷۸٫۷۲

حصولِ آزادی کے بعد صنعتی ترقی کے نتیجے میں ہندوستان کی غیر ملکی تجارت میں زبردست تبدیلی آئی ہے۔ آزادی سے قبل اس کی غیر ملکی تجارت زیادہ تر برطانیہ اور دولتِ مشترکہ کے ملکوں تک محدود تھی، برآمدات میں صرف چند بنیادی اشیاء شامل تھیں اور باہر ملکوں سے تیار مال منگایا جاتا تھا۔ بظاہر توازنِ تجارت موافق تھا لیکن یہ اقتصادی ترقی کے حق میں نہ تھا۔ آج ہندوستان کی برآمداتی تجارت میں زراعت، صنعت، ہینڈی کرافٹس، ہینڈلوم، گھریلو صنعتوں کی اشیاء

ل ہیں۔ ان کے علاوہ مشاورتی سروسس اور
ت سے پراجیکٹ بھی برآمد کئے جا رہے ہیں۔
ے معاہدے حاصل ہوئے ہیں جن کی تمام ذ
داری ہندوستان کے صنعت کاروں کو سونپی
ہے۔ حالیہ برسوں میں ہندوستان کی یہ ترقی
ِ ذکر اور قابلِ تعریف ہے۔ حالیہ برسوں میں
ات کی تکنیک اور حکمت عملی کو جدید بنانے اور
ے نئی سمتیں دینے کی کوششیں جاری ہیں طویل مدتی
دوں پر نفع بخش پراجیکٹوں کی برآمدات کو
ھایا جا رہا ہے۔

ٹرانسپورٹ

ٹرانسپورٹ سیکٹر میں بہت زیادہ ترقی دیکھنے
ملی ہے۔ یعنی ریلوے، سڑکوں کے ذریعے نقل و
، جہازرانی، اندرونِ ملک آبی راستوں کے
ذریعے نقل و حمل، شہری ہوابازی اور سیاحت
متعلق بیشتر سہولتوں میں اضافہ ہوا ہے۔ ۱۹۵۰
ے ۸۱-۱۹۸۰ کے دوران مسافت کی لمبائی، وہ
اصلہ جس پر گاڑیاں دوڑتی ہیں، مسافروں کی
داد اور ریلوں کے ذریعے ڈھوئے جانے والے
ل کا وزن وغیرہ کے اعتبار سے درجِ ذیل گوشوارہ
ورتِ حال اور اس محاذ پر ترقی کی ایک جھلک
یش کرتا ہے۔

بھارتی ریلوں کی ترقی سے متعلق گوشوارہ

سال	روٹ یعنی مسافت کی لمبائی (کلومیٹر)	فاصلہ جس پر گاڑیاں دوڑتی ہیں	مسافروں کی تعداد (لاکھ میں)	مال جسے ریلوں نے ڈھویا (لاکھ ٹنوں میں)
۵۱-۱۹۵۰	۵۳۵۹۶	۵۹۳۱۵	۱۲۸۴۰	۹۳۰
۸۱-۱۹۸۰	۶۱۲۴۰	۷۵۸۶۰	۳۶۱۲۵	۲۲۰۰

۸۰-۱۹۷۹ کے آخر میں ہندوستان میں
سڑکوں کی مجموعی لمبائی ۲۰،۴۰،۵ کلومیٹر تھی۔ اس

میں سے ۴۲۰۱۶۵ کلومیٹر مسطح سڑک تھی اور باقی
۲۰۵۵۵ کلومیٹر غیر مسطح سڑک تھی۔ ۳۱ مارچ
۱۹۸۰ کو سڑکوں پر موٹر گاڑیوں کی تعداد ۴۱ لاکھ
۰ ہزار تھی جن میں ۲ لاکھ ۵ ہزار بسیں بھی شامل
تھیں۔ ان کے علاوہ اس تعداد میں تجارتی وہیکلز
پسنجر وہیکلز اور ۳ لاکھ ۶ ہزار ٹریکٹر بھی شامل تھے۔
ہندوستان میں بڑے دریاؤں کے راستے
۵۲۰۰ کلومیٹر فاصلہ دستیاب ہے مشینی کشتیاں
ان میں چل سکتی ہیں۔ لیکن صرف ۱۷۰۰ کلومیٹر
فاصلے کو ٹرانسپورٹ کے لیے کام میں لایا جاتا ہے۔
نہروں میں ۴۳۰۰ کلومیٹر فاصلہ دستیاب ہے لیکن
۴۸۵ کلومیٹر فاصلے سے مشینی کشتیوں سے کام
لیا جا سکتا ہے مگر حقیقت میں ۳۳۱ کلومیٹر فاصلے
پر ہی کام لیا جا سکتا ہے۔ ترقی پذیر ملکوں میں بھارت
کے پاس بحری جہازوں کے ذریعے مال ڈھونے
کی سب سے زیادہ صلاحیت ہے اور یہاں کا
بحری بیڑا سب سے بڑا ہے۔ جہازرانی کے لیے
یہ دنیا میں پانچویں نمبر پر ہے۔ حصولِ آزادی
کے وقت ملک میں بحری جہازوں سے مال کی
ڈھلائی صرف ایک لاکھ ۹۲ ہزار ٹن تھی جو بڑھ کر
۳۱ مارچ ۱۹۸۱ کو ۵۸ لاکھ ۵۹ ہزار ٹن تک
پہنچ گئی۔ ہندوستان کے پاس بحری جہاز بنانے
کے چار بڑے کارخانے ہیں اور یہ پبلک سیکٹر
میں ہیں۔ ہندوستان میں اہم بڑی بندرگاہیں

ہیں اور ۱۶۰ چھوٹی، جو ملک کے ۶ ہزار کلومیٹر
ساحل پر جگہ جگہ پھیلی ہوئی ہیں۔ بڑی بندرگاہوں
کے ذریعے ہندوستان سے باہر ملکوں کو بھیجا گیا
سامان ۵۱-۱۹۵۰ میں ۵ کروڑ ۲۰ لاکھ ٹن تھا
جو بڑھ کر ۸۱-۱۹۸۰ میں ۸ کروڑ ۴۰ لاکھ ٹن ہو گیا۔

حقوق

ہندوستان نے حصولِ آزادی کے بعد ٹیلی
کمیونی کیشن، پوسٹل سروسز، شہری ہوابازی،
عوامی رابطہ کے ذرائع، تعمیرِ مکانات اور سماجی
تحفظ وغیرہ کے شعبوں میں بھی نمایاں ترقی کی ہے

نشانے اور کامیابیوں میں تفاوت

مسٹر الیس کے تلسی نے اپنے ایک حالیہ مطالعے
میں بتایا ہے کہ پہلے پنجسالہ منصوبے کے آغاز کے
بعد سے مجوزہ پراجیکٹوں میں عمل درآمد میں تاخیر
سے پیداوار کا زبردست نقصان ہوا اور قومی
سطح پر ترقی کی صلاحیت کو آگے نہیں لیجایا جا سکا۔
ایک اندازے کے مطابق ۵ سالہ پلان، سات
سات سال کی مدت میں پایۂ تکمیل کو پہنچا ہے۔ درج
ذیل گوشوارہ ۲۸ برسوں میں چند منتخب سیکٹروں
میں پیداوار میں منصوبہ بند اضافے کا نقشہ مختصراً
پیش کرتا ہے۔ اس کے ذریعے پیداوار میں کمی اور
وقت کے نقصان کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ اگر
منصوبہ بندی کمیشن کی طرف سے وضع کردہ نشانے
وقت مقررہ میں پورے کر لیے گئے ہوتے تو قومی
آمدنی میں ۱۲۰۰۸۲ کروڑ روپے کا اضافہ ہوتا۔
اس کا مطلب ہے کہ ہماری فی کس اوسط آمدنی
۸۱-۱۹۸۰ میں ۳۳۹۸ روپے ہو گئی ہوتی جب کہ
وہ صرف ۱۵۳۷ روپے ہے۔

اس سلسلے میں اگلے صفحے پر دیا گیا گوشوارہ
ضروری حقائق کو واضح کرتا ہے۔

سیکٹر		پیداوار میں منصوبہ بند اضافہ	حقیقی اضافہ	پیداوار کی کمی	وقت کا نقصان (سال)
غلّہ	(ہزار ٹنوں میں)	۱۲۱,۱۰۰	۶۶,۹۰۰	۵۴,۲۰۰	۱۰
کپاس	(" ")	۱,۷۴۵	۶۸۴	۱,۰۶۲	۱۴
سیمنٹ	(" ")	۲۸,۰۲۰	۱۵,۰۲۰	۱۳,۰۰۰	۱۰
تیار فولاد	(" ")	۱۶,۱۰۰	۵,۴۰۰	۱۰,۷۰۰	۱۵
بجلی تیار کرنے کی صلاحیت	(ہزار کلوواٹ)	۴۰,۲۳۱	۲۵,۸۰۰	۱۴,۴۳۱	۸
کاغذ	(ہزار ٹنوں میں)	۱,۰۷۱	۸۰۰	۲۶۳	۵
کیمیاوی کھاد	(" ")	۶,۸۸۵	۲,۸۴۳	۴,۰۴۲	۱۳
آبپاشی شدہ رقبہ	(" ")	۵۸,۶۰۰	۲۷,۹۰۰	۳۰,۷۰۰	۱۲
ریلوے ٹریفک	(" ")	۲۶۴,۰۰۰	۱۰۶,۰۰۰	۱۵۸,۰۰۰	۸
۶ سال سے گیارہ سال تک کی ابتدائی تعلیم	(فی صد)	۵۱٫۸	۳۳٫۵	۱۸٫۳	۸
برآمدات	(کروڑ روپوں میں)	۱۷,۲۱۷	۷,۶۰۰	۹,۶۱۷	۱۷

دیکھنا یہ ہے کہ منصوبے میں مقرر کردہ نشانے کن اسباب کی بنیاد پر پورے نہیں کئے جا سکے۔ کیا جن لوگوں کو یہ کام سونپا گیا، یہ کام ان کے قابو سے باہر تھا یا اس کے لیے کچھ اور خامیاں ذمہ دار ہیں۔ یہ خامیاں نظام سے تو متعلق نہیں ہیں۔ اگر ان خامیوں کے بارے میں یہ پتہ چلے کہ ان کا تعلق نظام کی بنیادی خامیوں سے ہے تو پھر اس مسئلے پر سنجیدگی سے غور کرنا ہوگا۔

چھٹے منصوبے کا وسط مدتی جائزہ

چھٹے پنجسالہ منصوبے کے پہلے تین برسوں میں اقتصادی ترقی کی شرح کافی رہی۔ ۸۱-۱۹۸۰ میں یہ ۷٫۹ فی صد تھی۔ ۸۲-۱۹۸۱ء میں مجموعی گھریلو پیداوار ۵٫۲ فی صد بڑھی۔ اس طرح منصوبے کے پہلے دو برسوں میں معیشت میں حقیقی صورت میں ۶٫۵ فی صد کی شرح سے اضافہ ہوا جب کہ مطلوبہ نشانہ صرف ۵٫۲ فی صد تھا۔ البتہ موسم کی خرابی اور کچھ دیگر وجوہات سے ۸۳-۱۹۸۲ میں معیشت میں شرح ترقی کا اندازہ صرف ۲ فی صد ہی لگایا گیا ہے۔ اندرون ملک افراط زر کی شرح کو کافی کم کیا جا سکا۔ ۸۱-۱۹۸۰ء میں اشیاء کی تھوک قیمتوں کا عدد اشاریہ ۲۰٫۸ فیصد تھا مگر ۸۳-۱۹۸۲ میں اس میں ۲ فی صد کمی کر دی گئی۔ البتہ باہر ملکوں سے منگائے جانے والے مال کی صورت حال تسلی بخش نہیں کہی جا سکتی۔

بھاری سامان کی درآمدات میں اضافے کے سبب منصوبے میں کی گئی سرمایہ کاری اپنا اثر نہیں دکھا سکی۔ منصوبے کے پہلے چار برسوں میں منصوبے کے منظور شدہ مصارف پبلک سیکٹر کے منظور شدہ مصارف کے ۸۳ فیصد تھے۔ گویا کہ پبلک سیکٹر کے منظور شدہ مصارف ۹۷۵۰۰ کروڑ روپے تھے۔ جب کہ حقیقی مصارف ۹۸۸۰۰ کروڑ روپے تھے۔ لیکن افراط زر کے سبب ۸۰-۱۹۷۹ کی قیمتوں کی روشنی میں یہ پلان کے منظور شدہ مصارف کے صرف ۷۲ فی صد ہی بنتے ہیں۔ ۸۴-۱۹۸۳ کے لیے اب یہ طے کیا گیا ہے کہ مرکز کی سالانہ منصوبہ جاتی سرمایہ کاری میں ۸۰۰ کروڑ روپے کا اضافہ کیا جائے تاکہ کلیدی سیکٹر کے مصارف پورے ہو سکیں۔ وسط مدتی جائزے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ منصوبے کے نشانے بہت سے معاشی شعبوں میں پورے کر لیے جائیں گے یا بہت حد تک پورے ہو سکیں گے جن میں زرعی اور صنعتی سیکٹر بھی شامل ہیں۔

قیمتیں اور زر

چھٹے منصوبے کے پہلے تین برسوں میں قیمتوں کا رویہ حوصلہ افزا رہا ہے۔ ان سے افراط زر میں کمی کا رجحان دیکھنے کو ملتا ہے۔ تھوک قیمتوں کے عدد اشاریہ میں بڑھوتری سے ۸۱-۱۹۸۰ میں ۱۸٫۲ فی صد پہنچ گیا تھا۔ مگر یہ گھٹ کر ۸۲-۱۹۸۱ میں ۹٫۳ فیصد ہو گیا اور ۸۳-۱۹۸۲ میں یہ ۲٫۵ فیصد ہو گیا۔ ۸۴-۱۹۸۳ میں اشیائے صارفین کی قیمتوں کے عدد اشاریہ میں بھی ۸۲-۱۹۸۱ء کے مقابلے میں کم اضافہ ہوا۔ لوہے، فولاد، سمنٹ، عمارتی لکڑی اور دیگر بہت سی اشیاء کی قیمتوں میں اضافے سے سرمایہ کاری کے اخراجات میں یقیناً اضافہ ہوا۔ افراط زر کے دباؤ کو روکنے کے لیے زر سے متعلق پالیسی میں لچک لائی گئی۔ اس پالیسی کے ذریعے پیداواری اور ترجیحی زمروں کی ضرورتوں کو پورا کرنے پر زور دیا گیا۔ ۸۱-۱۹۸۰ء میں مجموعی طور پر فراہمی زر میں ۱۷٫۸ فیصد کا اضافہ ہوا، ۸۲-۱۹۸۱ء میں یہ اضافہ ۱۲٫۶ فیصد اور ۸۳-۱۹۸۲ میں ۱۴٫۸ فیصد ہوا۔ فراہمی زر کی پالیسی کو برابر قابو میں رکھنے کی کوشش کی جائے تاکہ افراط زر نہ بڑھ پائے لیکن پیداواری

مقاصد کے لیے قرضے کی ضرورتوں کو ہر طرح پورا کیا جائے گا۔ سامان روزی ملک پیداوار بڑھانے اور اشیاء کو بہتر بنانے پر مسلسل زور ہوگا۔ جہاں کہیں ضروری ہوگا اندرون ملک پیداوار بڑھانے کے لیے وقت مقررہ پر درآمدات کا سہارا لیا جائے گا غلے کا وافر ذخیرہ موجود رہنے سے قیمتوں میں اُتار چڑھاؤ کو روکا جا سکتا ہے۔ لہٰذا غلہ کی فراہمی اور حصول پر مسلسل زور رہے گا۔ اشیاء کی تقسیم کے سرکاری نظام کو نئی سمتیں دی جائیں گی تاکہ عوام کو اشیائے ضروری کی فراہمی کو یقینی بنایا جا سکے۔ بالخصوص سماج کے کمزور طبقات کی ضرورتیں پوری ہوتی رہیں۔ ناجائز جمع خوری، ناجائز منافع کمانے اور سماج دشمن دیگر سرگرمیوں کو روکا جائے گا اور ایسا کرنے والوں کو سخت سزائیں دی جائیں گی۔

غریبی اور روزگار

چھٹے منصوبے میں غریبی کے خط سے نیچے زندگی گزارنے والوں کے تناسب کو ۴۷ فیصد سے کم کر کے ۳۰ فیصد کر دینا ہے۔ گویا کہ ان کی تعداد ۳۱ کروڑ ۶۰ لاکھ سے گھٹا کر ۲۱ کروڑ ۵۰ لاکھ تک کر دی ہے۔ ۱۹۸۱ء کی مردم شماری کی بنیاد پر غریبی کے خط سے نیچے زندگی گزارنے والوں کی تعداد ۳۳ کروڑ ۹ لاکھ ہے۔ ۸۱-۱۹۸۰ اور ۸۲-۱۹۸۱ کے دوران بہت سے لوگوں کی آمدنی میں اضافہ ہوا اور وہ اس سطح سے اُوپر اٹھ گئے۔ اس سلسلے میں دیہات کی ترقی کا مربوط پروگرام اور دیہات میں روزگار کی فراہمی کا قومی پروگرام معاون ثابت ہوا۔ اس سلسلے میں تو اعداد و شمار کے لیے نیشنل سیمپل سروے کے ۱۹۸۳ کے نتائج کا انتظار ہے۔ اس ضمن میں اس مفروضے کی بنیاد پر کہ حقیقی آمدنی میں اضافہ یکساں ہے، اور دیہات کی ترقی کے مربوط پروگرام اور روزگار کی فراہمی کے قومی پروگرام پر کیے گئے اخراجات، غریبی کے خط سے اوپر آنے والے کنبوں کی تعداد کے متناسب ہیں۔ غریبی کے خط سے نیچے زندگی گزارنے والوں کی تعداد میں کمی آئی ہے اور ۵۰ کی تعداد ۸۲-۱۹۸۱ میں ۳۸ کروڑ ۲۰ لاکھ رہ گئی ہے۔

روزگار کی فراہمی کا مجموعی نشانہ چھٹے منصوبے میں ۳۴ کروڑ ۲۰ لاکھ لگایا گیا ہے۔ یہ روزگار زراعت، مال تیار کرنے والے سیکٹر، اور دیگر سروس سیکٹروں میں فراہم کیا جاتا ہے۔ سروس سیکٹر میں دیہات کی مربوط ترقی کے پروگرام اور دیہات میں روزگار کی فراہمی کا قومی پروگرام دونوں ہی آتے ہیں۔ روزگار کی فراہمی کے لیے جو معیار وضع کیا گیا ہے جسے انگریزی میں اسٹینڈرڈ پرسن ایئر Standard Person Year کہتے ہیں، اس کے تحت روزگار کے مذکورہ پروگرام ۴۰ لاکھ افراد کو ہر سال معیاری روزگار فراہم کیا جانا ہے۔ منصوبے کے پہلے دو برسوں میں ایک کروڑ ۲۰ لاکھ افراد کے لیے روزگار کے مواقع نکالے گئے ہیں جو کہ منصوبے میں مجموعی روزگار کے نشانے کے ۳۶ فی صد کے بقدر ہیں۔ اس سے اس شعبے کی کچھ خامیوں کا پتہ چلتا ہے۔ مینوفیکچرنگ سیکٹر اور تعمیراتی سیکٹر میں خاص طور پر کمی دیکھنے کو ملی ہے۔ ان دونوں شعبوں میں کامیابی مطلوبہ نشانے سے کم رہی ہے۔ ۸۳-۱۹۸۲ میں ترقی میں کمی کا اندازہ ہے جس کا سبب فصل خراب ہونا ہے۔ ۸۳-۱۹۸۲ میں منصوبے میں روزگار کے نشانے میں نمایاں کمی کا اندیشہ ہے۔ ۱۹۸۱ کی مردم شماری بتاتی ہے کہ آبادی میں اضافے کی شرح اس سے زیادہ ہے جس کا چھٹے منصوبے میں اندازہ لگایا گیا تھا۔ اس کے نتیجے میں منڈی بازار میں دباؤ کا اندازہ مستقبل قریب میں نہیں ہو پائے گا۔

آبادی میں روک تھام

خاندانی منصوبہ بندی کے پروگرام کو مقبول بنانے کے لیے شادی شدہ جوڑے کو بچوں کی تعداد دو یا تین تک محدود رکھنے پر زور دیا گیا۔ ملک کی آبادی ۱۹۴۷ میں ۳۴ کروڑ تھی۔ اس میں ۲ تا ڈھائی فیصد سالانہ اضافہ ہوا اور ۳۵ برس کی مدت میں یہ دوگنی ہو گئی۔ مالتھوس کے نظریے کے مطابق یہ اضافہ غریب آبادی میں زیادہ ہوا اس طرح ایسے افراد کی تعداد بڑھی جو پیداوار میں معاون ثابت نہ ہو کر معیشت پر بوجھ بن گئے۔ اور جن کی دیکھ بھال کی ذمہ داری میں اضافہ ہوا تعلیم صحت اور مکان وغیرہ کی اُن لوگوں کی ضرورتوں کو پورا کرنے کی ذمہ داری بڑھی۔ آبپاشی والے رقبے میں اس تناسب سے اضافہ نہ ہو سکا۔ اناج کی پیداوار حالانکہ دوگنی ہو گئی، لیکن اضافہ آبادی کے سبب اس کے اثرات واضح نہ ہو سکے۔ حقیقت یہ ہے کہ اناج کی فی کس اوسط فراہمی کم و بیش پہلے ہی جیسے رہی۔ اس کے مضمرات ایک اور پہلو بھی رکھتے ہیں۔ اضافہ آبادی سے ایسے غریب بچے سامنے آئے جو ناقص غذاؤں کا شکار تھے جس کی وجہ سے وہ معذور ہو گئے۔ کچھ پولیو کا شکار ہوئے، کچھ اندھے پن کا، کچھ ذہنی طور پر معذور ہو گئے۔ اور اس طرح کی بیشتر دیگر بیماریاں سامنے آئیں۔ معذور افراد کی تعداد میں اضافہ سماج پر ایک اور بوجھ ہو جاتا ہے۔ اور جو لوگ عام کام کے لائق ہوتے ہیں، انھیں پیداواری کام نہیں ملتا۔ یہ لوگ بے چین رہتے ہیں، دل شکستگی کا شکار ہوتے ہیں اور مشتعل ہو جاتے ہیں۔ یہ شہروں کی طرف جاتے ہیں۔ اور وہاں گندی بستیوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ انھیں فٹ پاتھ پر ڈیرا ڈالنا پڑتا ہے۔ ان کو سماجی اور اخلاقی طور پر پسماندگی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ وہ سماج پر ایک خطرناک بوجھ بن جاتے ہیں۔ آبادی اگر پیداوار میں معاون ہے اور سماج کی عام ترقی اور بھلائی میں ترقی لانے کا ذریعہ ہے، تو وہ سماج میں مفید ہے۔ لیکن دولت کی تقسیم اور روزگار کے مواقع کے نقطۂ نگاہ سے بھارت میں یا بہت سے ترقی پذیر ملکوں میں آبادی نفع بخش ثابت نہیں ہوئی ہے۔

ہندوستان میں ۸۲-۱۹۸۱ کی خاندانی بہبود کے پروگراموں کی رپورٹ کے مطابق ۱۹۸۰ء میں اولاد پیدا کرنے کے لائق شادی شدہ جوڑوں

سے ۱۰.۴ فی صد حصے نے خاندانی منصوبہ بندی
کے طریقوں کو اپنایا جن میں نس بندی کا آپریشن
اور لوپ وغیرہ کا اپنانا شامل ہے مگر یہ تعداد
بڑھ کر ۸۲-۱۹۸۱ میں ۲۲.۷ فیصد ہو گئی۔
لیکن تعداد کے لحاظ سے یہ ۹۰ لاکھ سے بڑھ کر
۲ کروڑ ۸۰ لاکھ جوڑے ہو گئی۔ ایک حالیہ
اندازے کے مطابق چھٹے منصوبے کے آخر
تک تقریباً ۴ کروڑ ۴۰ لاکھ افراد بے روزگار
ہوں گے۔ بدقسمتی سے منصوبہ بندی کے آغاز کے
وقت آبادی پر روک تھام کی اس قدر ضرورت
محسوس نہ کی گئی تھی جیسا کہ پہلے پنجسالہ منصوبے
سے یہ واضح ہوتا ہے کہ اس میں خاندانی منصوبہ
بندی کے لیے صرف ساڑھے ۱۴ لاکھ روپے کی رقم
رکھی گئی تھی۔ دوسرے پنجسالہ منصوبے میں یہ رقم
بڑھ کر ۲ کروڑ ۱۶ لاکھ روپے اور تیسرے منصوبے
میں یہ ۲۴ کروڑ ۸۶ لاکھ روپے ہو گئی۔ اس کے
بعد تین سالانہ منصوبوں میں یہ بڑھ کر ۷۰ کروڑ ۴۶
لاکھ روپے اور چوتھے منصوبے میں یہ ۲.۸۴ بلین
روپے، پانچویں منصوبے میں ۴.۰۹ بلین روپے
اور چھٹے منصوبے میں دس بلین روپے یعنی دس
ارب روپے ہو گئی۔

راقم الحروف نے پہلے پانچسالہ منصوبے کے
وسط مدتی جائزے کے وقت ایک تجویز پیش کی
تھی جس میں ۲ تا ۳ بلین روپے براہِ راست نقد
انعام یا رعائت دینے کے لیے رکھنے کی سفارش
کی تھی۔ تاکہ یہ رقم ہر سال کم سے کم ایسے ایک کروڑ
لوگوں کو اولاد پیدا کرنے سے باز رہنے کے لیے دی
جا سکے جو کہ اس کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ پہلے دو
بچوں کے بعد نس بندی آپریشن کرانے والوں کے لیے
بھتہ کی ایک اسکیم کی بھی سفارش کی تھی۔ ان کو اور
کئی طرح کی مراعات دینے کے لیے بھی سفارش کی
تھی۔ مثلاً تعمیرِ مکانات کے لیے قرضہ وغیرہ۔ مقصد
یہ تھا کہ اس مسئلے کی سنگینی کے پیشِ نظر اسے جنگی
پیمانے پر حل کیا جا سکے۔ اس وقت اسے غیر عملی کہہ
کر اس پر دھیان نہیں دیا گیا۔ یہ خیال نہیں کیا گیا کہ
ایک بچے کی پیدائش کی روک تھام پر خرچ کی گئی
رقم اس سے کہیں کم ہے جو اس کی پرورش اور دیکھ
بھال پر سماج کو خرچ کرنی پڑتی ہے۔ بچہ کی دیکھ بھال
پر اٹھارہ سال تک اور اس کے بعد اگر وہ سماج میں
پیداواری عمل میں شریک نہ ہو سکا تو بھی اس پر
کتنا کچھ خرچ کرنا پڑتا ہے، اس کا اندازہ لگانا
ضروری ہے کہ خاندانی منصوبہ بندی کی ضرورت اور
اس پر موثر عمل آوری کے لیے اخراجات میں اضافے
کی ضرورت تو تسلیم کی جا چکی ہے، لیکن میری ناقص
رائے میں یہ خرچ اب بھی کم ہے۔ فی الحال اولاد پیدا
کرنے کے لائق جوڑوں میں سے صرف ۲۳ فیصد
اس پروگرام سے فائدہ اٹھا رہے ہیں، جس کا
مطلب یہ ہے کہ اضافہ آبادی کی شرح بدستور قائم
ہے۔ اس صدی کے آخر تک یہ آبادی ۱۰۰ کروڑ تک
پہنچ جانے کا اندازہ ہے۔ اضافہ آبادی کی روک
تھام کا ایک موثر ذریعہ معیارِ زندگی کو بلند کرنا
ہے۔ لوگوں میں شعور بیدار ہونے کے بعد انھیں
مختصر کنبے جانے کے فائدے خود ہی محسوس ہونے
لگتے ہیں۔ بہت سے ترقی یافتہ ملکوں میں آبادی میں
اضافے کی شرح منفی سمت ہے۔ منصوبہ بندی
پر عمل آوری کے متحرک پلان کے تحت کام کے
لائق سبھی لوگوں کو کام سے لگانا ضروری ہے۔
اس سے آبادی کی خود بخود روک تھام ہونے لگے گی۔
اس لیے اصل زور اس بات پر ہونا چاہیئے کہ
ہمارے کنبے بہبود کی اسکیموں سے پوری طرح
فیض یاب ہوں۔ ★

بقیہ: ایمپلائمنٹ ایکسچینج کیا ہے

کی طرف سے بین الاقوامی مزدور تنظیم (آئی ایل او)
نے ایک پراجیکٹ کے لیے امداد دی جو خواتین
کے پیشہ ورانہ ترقیاتی پروگرام کو عمل میں لانے کے
لیے مارچ ۱۹۷۷ میں شروع کیا گیا تھا۔ گو یہ پروگرام
۳۱ دسمبر ۱۹۸۲ کو باضابطہ طور پر ختم کر دیا گیا تھا تاہم
مذکورہ صدر تنظیم نے ۳۱ دسمبر ۱۹۸۳ تک اس
کے باقیماندہ عطیات کو استعمال کرنے کی اجازت
دے دی تھی۔

دو نئی اسکیمیں

اگرچہ ایمپلائمنٹ ایکسچینج کی طرف سے
ملازمتوں کے آرزومندوں کے ناموں کا اندراج
کرکے انھیں موزوں کام دھندوں پر لگایا جاتا ہے
تاہم اس ادارہ کی طرف سے روزگار کے مواقع
پیدا کرنے کے لیے گذشتہ برس دو نئی اسکیمیں
شروع کی گئی ہیں۔ ان میں ایک اسکیم ہے "دیہات
میں بے زمین اشخاص کو روزگار کی گارنٹی کا پروگرام"
اس کا مقصد دیہات میں ہر بے زمین مزدور گھرانے
میں سے کم از کم ایک فرد کو سال میں ۱۰۰ روز تک
روزگار کی ضمانت دی جائے۔ ۸۴-۱۹۸۳ کے
دوران روزگار کے ۶ کروڑ افرادی دن اور اس
سے اگلے برس ۳۰ کروڑ افرادی دن کے روزگار
کا پلان بنایا گیا ہے۔ اس اسکیم کو دیہی ترقیات
کی وزارت کی طرف سے بھی عمل میں لایا جا رہا
ہے۔

چھٹے پنجسالہ منصوبے میں خود روزگار کے فروغ
پر کافی زور دیا گیا ہے۔ نئی اسکیم کا مقصد تعلیم یافتہ
نوجوانوں کو خود روزگار کے مواقع مہیا کرنا ہے
اس اسکیم کے تحت جسے ڈسٹرکٹ انڈسٹریز
سینٹروں کی طرف سے عمل میں لایا جا رہا ہے۔ ان
تعلیم یافتہ نوجوانوں کے لیے زیادہ سے زیادہ ۲۵
ہزار روپے تک کے قرضے منظور کئے جاتے ہیں جو
۱۰ لاکھ یا اس سے کم آبادی والے شہروں اور
قصبوں میں رہتے ہیں اور جن کے پاس اپنا
روزگار شروع کرنے کے لیے کوئی دوسرا مالی ذریعہ
نہیں ہے۔ توقع ہے کہ اس اسکیم سے ہر برس دو
سے ڈھائی لاکھ تک بے روزگار نوجوان مستفید
ہوں گے۔ اس اسکیم کو صنعتی ترقیات کی وزارت
کی طرف سے عمل میں لایا جا رہا ہے۔ ★

مدن لعل منچندا

باہمی امداد

> رگ وید کا یہ فرمان بنی نوع انسان کے لئے مشعلِ راہ ہے:۔
> "ایک دوسرے کی مدد کرو۔ ایک جان، ایک دل اور ایک دماغ بن کر رہو، خدا کرے تم سب کا نصب العین ایک ہو، اور تمہارے خیالات کی روش ایک ہو۔ خدا کرے تمہارے سب فیصلے اتفاقِ رائے سے ہوں، اور تم تمام اتفاق کی برکت سے مالامال ہو۔"

ابتدائے آفرینش میں جب انسان جنگل کی خاموش فضا میں سانس لیتا تھا۔ وحشی جانوروں سے بچاؤ کے لیے اس نے اپنے آپ کو گروہوں میں منظم کر لیا تھا۔ پھر آہستہ آہستہ اُس نے جنگل کی غیر محفوظ فضا کو خیرباد کہا اور اپنی ضروریات کی تلاش میں وادی کی طرف رجوع کیا۔ شکار کے بجائے کھیتی باڑی شروع کی۔ بیلوں کی گھنٹیوں سے وادیاں گونجنے لگیں۔ ہری شاداب کھیتیاں لہرانے لگیں، اور پھل دار درختوں پر پرندے چہچہانے لگے۔ جھونپڑیاں تعمیر ہونی شروع ہوئیں۔ بند باندھے جانے لگے۔ کنوئیں کھودے گئے اور ان پر رہٹ گھوں گھوں کرنے لگے۔ انسان نے انسان کو سہارا دیا۔ کندھے سے کندھا لگا کر کام کیا۔ وادیاں مسکرا اٹھیں۔ زمین نے سونا، چاندی، ہیرے اور جواہرات اگل دیئے۔

آبادیاں بڑھتی گئیں۔ ضروریاتِ زندگی تجاوز کرتی گئیں۔ انسانی ہاتھوں کی جگہ مشینوں نے لے لی۔ کل، کارخانے، دندناتی فیکٹریوں سے صنعتی انقلاب آگیا۔ بنائے ہوئے سامان سے منڈیاں بھر گئیں۔ دُنیا کے ممالک میں تجارت کے نئے رشتے قائم ہونے لگے۔ باہمی تعاون کی نئی راہیں کھل گئیں، جس کے نتیجے کے طور پر آج ہر ڈرائنگ روم اور ناشتے کی ہر میز بین الاقوامی حیثیت رکھتی ہے۔

لیکن اس عالمگیر صنعتی ترقی کے باوجود آج بڑے سے بڑا ملک کُلی طور پر اپنے ذرائع پیداوار پر انحصار نہیں کر سکتا۔ معدنیات کی غیر مساوی تقسیم، غیر یکساں زرخیزیٔ زمین کے باعث بڑے سے بڑا ترقی یافتہ ملک بھی خام اشیاء کے لیے دوسرے ممالک کا دستِ نگر ہے۔ آج امریکہ جیسا ترقی یافتہ ملک جو اقتصادی طور پر ایک ممتاز حیثیت رکھتا ہے اور دُنیا بھر کی پٹ سَن کی پیداوار کا پچاس فی صدی حصہ استعمال کرتا ہے، اپنی بیشتر ضروریات دوسرے ملکوں سے پوری کرتا ہے۔

اسی طرح برطانیہ جو اپنی خوراک کا ایک بیشتر حصہ دساور سے منگاتا ہے۔ اُس کی آدھی سے زیادہ آبادی فاقوں سے مر جائے اگر اُس کا تجارتی سلسلہ دُنیا کے دوسرے ممالک سے منقطع ہو جائے۔ اسی طرح مٹی کے تیل اور پٹرول کی عدم فراہمی سے دُنیا کے کئی ملکوں میں سڑکوں پر دوڑتی موٹریں، کاریں، بسیں ساکت ہو جائیں۔ اور آسمان کی فضاؤں میں پرواز کرنے والے ہوائی جہازوں کی گونج ختم ہو جائے۔ سمندر کے سینے پر مال و اسباب لے جانے والے اسٹیمر اور جہازوں کی روانی رُک جائے۔ اسی طرح کوئلے کی قلت کی وجہ سے کئی ملکوں میں ریل گاڑیاں اور کارخانے بند ہو جائیں۔

ایک وقت تھا جب انسان نے ان ذرائع کو حاصل کرنے کے لیے دُنیا کی فتح کے خواب دیکھے۔ قرونِ وسطیٰ میں بربریت کے ننگے اور وحشیانہ حملے ملک گیری کی اسی ہوس کا نتیجہ تھا۔ کوئی ایک ہزار سال بعد جب قومی حکومتیں ظہور پذیر ہوئیں تو اپنے قومی مفاد کو فروغ دینے کے لیے انھوں نے نئی منڈیوں کی تلاش کی اور نوآبادیوں کو غلامی کی زنجیروں میں جکڑا اور اپنے تجارتی حقوق کو برقرار رکھنے کی تگ و دو میں عوام کو دو مہلک عالمی جنگوں میں دھکیلا۔

بیسویں صدی نے جہاں جمہوریت کے علم بلند ہوتے دیکھے ہیں۔ وہاں اس صدی کا طرۂ امتیاز یہ بھی ہے کہ اس نے پلیٹو کے سٹی اسٹیٹ کے نظریئے کو جسے ارسطو نے ایک ارفع تہذیب کا درجہ دیا تھا، عملی جامہ پہنایا۔ اُس زمانے میں اس طرز کی حکومتیں اپنے باہمی تعلقات کی دشواریوں پر قابو نہ پا سکنے

(باقی صفحہ پر)

عظیم الرحمٰن عظیم

جنگلات اور شجرکاری
اہم ضرورت

انسانی ضروریات میں جنگلوں، ہرے بھرے سبزہ زاروں اور پیڑ پودوں کا بنیادی کردار رہا ہے اور پیڑ پودے ہی نہیں، جنگلی جانوروں اور پرندوں کا بھی حصہ رہا ہے ان میں سے کسی ایک حصے کو اگر ہم نظر انداز کردیں تو ماحول پر اس کے برے اثرات رونما ہوتے ہیں۔ حکومتِ ہند نے ماحول کے تحفظ کو وقت کی پکار اور ملک کی اہم ضرورت تصور کرتے ہوئے اپنے قومی پنجسالہ منصوبوں میں ماحولیات سے متعلق امور کا مکمل جائزہ لینے اور منصوبہ سازی نیز ترقیاتی عمل میں ماحولیات کے وسائل و مسائل کو بھی شامل کیا ہے۔

ماحولیات کے محکمہ سے وابستہ کئی اہم مرکزی اور علاقائی تنظیموں اور اداروں کے ذریعہ جنگلی جانوروں، قومی پرندوں اور جنگلات کے تحفظ کے بارے میں کئی پروگراموں کو روبہ عمل لایا جارہا ہے۔ پیڑ پودوں کے کاٹے جانے اور جنگلات کو ختم کرنے کے رجحان کو سختی سے روکنے کے بارے میں مرکزی اور ریاستی حکومتوں نے بہتر قوانین وضع کئے ہیں تاکہ ان کے تحفظ کا بہتر انتظام ہوسکے اور تیزی سے بڑھنے والے پیڑ پودے لگاکر زیادہ پیداوار دینے والے پودوں کی کاشت کرکے جنگلات کی پیداوار میں اضافہ کو ممکن بنایا جارہا ہے۔ اس سلسلے میں ماحول کے بارے میں عوامی بیداری پیدا کرنے کی غرض سے کئی اقدامات کئے گئے ہیں۔ ریاستوں کے محکمۂ جنگلات نے اپنے اپنے پروگراموں کے ذریعے مختلف مقامات پر جلسوں، سیمناروں اور درخت اگاؤ مہم، جنگلی جانوروں کو بچاؤ مہم جیسے پروگراموں کو اس قدر موثر انداز میں شروع کررکھا ہے۔ جس سے عوام میں ماحول کے تحفظ کا احساس اپنے اچھے اثرات دکھا رہا ہے۔

بھارت میں تقریباً ۷ء۵ کروڑ ہیکٹیر زمین میں جنگلات پھیلے ہوئے ہیں۔ تاہم ملک میں جنگلاتی علاقے کا رقبہ کم از کم ۱۱ کروڑ ہیکٹیر ہونا چاہیئے۔ زمین پر موجودہ دباؤ کا یہ نتیجہ ہے کہ زمین کا ضرورت سے زیادہ استعمال ہو رہا ہے۔ کارخانوں کا تیزی سے قیام اور ان سے نکلنے والا دھواں اور ان کارخانوں سے نکلنے والا زہریلا پانی پیداواری خطوں کو متاثر کررہا ہے۔ جس کے سبب جنگلات کی موجودہ حدود کے باہر شجرکاری یا درخت اگاؤ مہم پوری طرح کارآمد ثابت نہیں ہو رہی ہے۔ ریاستوں اور حکومتوں نے اپنے اپنے وسائل و اختیارات کو کام میں لاتے ہوئے سڑکوں اور ریلوے لائنوں سے متصل نیز نہروں کے کناروں پر پیڑ پودے لگانے کی اسکیم کا آغاز کیا۔ اس طرح پیڑ پودے لگانے سے جنگلاتی رقبہ میں ۱۰ لاکھ ہیکٹیر کا اضافہ ہو جائے گا۔ یہاں نہیں اجتماعی ملکیت والی بیکار پڑی ہوئی زمین پر بھی شجرکاری کی کافی گنجائش موجود ہے۔ یہ بیکار زمین فی الحال جانوروں کی چراگاہ کا کام دیتی ہے۔ ایسی زمین پر مفید اور کام آنے والے درخت لگائے جائیں تو جانوروں کے لیے چارے کی پیداوار فراہم ہوسکتی ہے۔

مرکزی اور علاقائی حکومتوں کی طرف سے ہر سال سیمناروں، جلسوں اور نمائشوں، مختلف زبانوں میں کتابچوں کے ذریعے یہ واضح کرنے کی کوشش کی جاتی ہے کہ بنی نوع انسان کا مستقبل غیر معمولی طور پر ماحول کے تحفظ سے مربوط ہے۔ جنگل کاٹے نہ جائیں، جنگلی جانوروں، پرندوں، درندوں اور مویشیوں کی بہتر نگہداشت کی جائے۔ اگر جنگل کاٹے جائیں تو طغیانیوں اور سیلابوں کا خطرہ بڑھ جاتا ہے۔ جنگل درخت اور پیڑ پودے پانی کی تیز رفتار تباہی سے پھیلنے والے خطرات کو روکنے میں اہم کردار ادا کرتے رہے ہیں۔ جب جنگل ہی نہ رہیں اور پیڑ پودے بھی نہ رہیں تو سیلاب کا پانی نہ صرف آبادیوں بلکہ ہرے بھرے کھیتوں کو بھی بہالے جاتا ہے اور بڑے پیمانے پر تباہی کا منظر بنی نوع انسان کے لیے چھوڑ جاتا ہے۔ اس لیے انسان کے عام فائدہ کے لیے جنگلات کے تحفظ کو اہمیت دی گئی ہے۔ شہری علاقوں میں فضائی آلودگی اور کثافت پھیلانے والی صنعتوں کا جائزہ لینے کے بعد ان کی آلائش و کثافت کو کم کرنے کے لیے مختلف تدابیر، ملک گیر پیمانے پر

روع کی گئی تھیں۔ شہروں میں پٹرول سے چلنے
لی موٹر گاڑیوں اور لوہے کے کارخانوں اور دیگر
سنعتی اداروں سے نکلنے والے دھوئیں اور گرد و
بار سے ماحولیاتی نظام میں جن خرابیوں کا پیدا
ونا لازمی ہو جاتا ہے انھیں دور کرنے کے لیے درختوں
یڑ پودوں اور جنگلات کے تحفظ کا احساس ضروری
ہو جاتا ہے۔ اس پس منظر میں قومی سطح پر ایک ایسی
ومی پالیسی تشکیل دی گئی ہے جس کی سفارشات میں
سے ایک سفارش یہ ہے کہ جنگلات وغیرہ کے شعبے میں
پہاڑوں میں رہنے والے اور قبائلی عوام کے لیے روزگار
کے زیادہ بہتر مواقع پیدا کیے جائیں تاکہ وہ لوگ اپنے
آس پاس کے ماحول میں خلل نہ ڈالے بغیر قدرتی ماحول
میں گزر بسر کر سکیں۔

ہماری سابق وزیر اعظم محترمہ اندرا گاندھی نے اپنے
مقبول عوام نئے بیس نکاتی پروگرام میں درخت اُگاؤ
مہم کو شامل کر کے ماحول کے تحفظ کو اہمیت دی تھی۔
ملک کے نئے منصوبے کے اہم خدوخال میں دس
ارب پودے لگانے کا منصوبہ بھی شامل ہے۔
۱۹۸۳-۸۴ میں دو ارب تیس کروڑ پودے لگائے
گئے۔ جاری سال میں دو ارب پچاس کروڑ پودے
لگائے جانے کا منصوبہ بنایا گیا ہے۔ ملک کے اضلاع
پر جہاں جلانے والی لکڑی کی سخت قلت ہے خصوصی
توجہ دی جا رہی ہے۔ ان اضلاع میں ایک خاص
اسکیم کو عملی جامہ پہنایا جا رہا ہے۔ یہی نہیں ہمالیائی
خطے کے خصوصی مسائل کو پیش نظر رکھتے ہوئے زمین
کے کٹاؤ کا مسئلہ بھی حل کیا جا رہا ہے۔

جنگلات کا تحفظ اور ان کی سرسبزی کے سلسلے
میں مرکزی اور ریاستی سرکاروں نے اپنے کئی تحقیقی
اداروں کے ذریعے جنگلات کے بڑھنے پھیلنے اور
جنگلات سے حاصل ہونے والی پیداوار کے سائنسی
طرز پر استعمال کے سلسلے میں بھی کھوج اور تحقیق کاموں
کو بروئے عمل لانے کا بیڑہ اٹھایا ہے اور اب کچھ دنوں سے
سماجی بھلائی کے لیے پیڑ پودے لگانے پر زور دیا
جا رہا ہے تاکہ دیہاتی عوام سبھی بیکاری اور دیگر روزگار مل
سے پورے طور پر فائدہ اُٹھا سکیں۔

جنگلات کے تحفظ اور جڑی بوٹیوں کی تحقیق
اور جستجو پر بھی ان تحقیقی اداروں میں اہم کام ہوئے ہیں
اور بڑے پیمانے پر کالجوں اور یونیورسٹیوں کا جال
پھیلا دیا گیا ہے۔ جن کی مدد سے زراعت، جنگلات
اور جنگلی جانوروں کے بارے میں اعلیٰ تعلیم اور تحقیق
کو روبہ عمل لایا جا رہا ہے۔

ملک کے بہت سے حصوں میں عام طور پر اسکولوں
میں نرسری گارڈنس کے قیام کے پروگرام کو جوش و
خروش سے شروع کیا گیا ہے۔ اس پروگرام کے تحت
اسکولوں کے بچے اسکولوں میں واقع بیکار زمین پر پودے
لگاتے ہیں۔ ان پودوں کو بعد میں سرکاری محکموں،
تنظیموں یا دیگر لوگوں کو فروخت کر دیا جاتا ہے۔
اس طرح پڑھائی کے ساتھ آمدنی ہوتی ہے۔
کئی اسکولوں کو اس طرح کافی آمدنی ہوئی ہے۔
اور انھوں نے اس رقم کو اسکول کے بچوں کے
لیے بہتر سہولیات مہیا کرنے پر صرف کیا ہے۔
جنگلات کا عالمی دن اسکولوں کے بچوں کو بیج
مہیا کرنے کے مناسب مواقع فراہم کرتا ہے تاکہ وہ
درخت اُگاؤ مہم کے موسم میں ان کی تخم ریزی
کر سکیں۔ محکمہ جنگلات آندھرا پردیش بھی عوام
اور اسکولوں کو بارش کے موسم میں پودے اور بیج
فراہم کرتا ہے تاکہ گھروں اور اسکولوں کی خالی زمین
پر درخت اُگائے جائیں۔

ہر مذہب میں پیڑ پودوں کو اہمیت دی
گئی ہے ان کی حفاظت اور ان کے تحفظ پر زور
دیا گیا ہے۔ اگلے زمانے میں یہ ہوتا تھا کہ جس گھر
میں بچہ پیدا ہوتا تو ایک پودا بھی لگایا جاتا۔
اب مرکزی وزارت زراعت نے عوام سے اپیل
کی ہے کہ وہ بچہ کی پیدائش کے موقع پر اپنے
گھر میں ایک پودا لگا کر قدیم مذہبی روایت کو پھر
سے زندہ کریں اور شادی شدہ جوڑوں کی جانب
سے بھی درخت اُگاؤ مہم شروع کرنے کی خواہش
کی گئی ہے۔ اگر ہم سب ہندوستانی اس اچھے پروگرام
پر سچے دل سے عمل کریں تو بلاشبہ ملک میں پیڑ
پودوں کا انقلاب آ جائے گا جو سبھوں کے لیے خوشحالی
کا باعث ہوگا۔

حقیقت یہ ہے کہ ہمارے ملک میں تقریباً
دس کروڑ افراد کی بقا اور لگ بھگ ۵۰ کروڑ افراد
کی توانائی کی گھریلو ضروریات کا انحصار ان ہی
پیڑ پودوں پر ہے۔ ★

بقیہ: باہمی امداد

کی وجہ سے زوال پذیر ہوئیں تھیں لیکن اس
صدی میں مختلف اقوام عالم میں، مذہب و
ملت نیز نسل کی تفریق اور تہذیب کے امتیاز
کے باوجود جو باہمی تعاون کی مثال قائم ہوئی
ہے، وہ ہر لحاظ سے عظیم الشان ہے۔

آج یہ بات اقوام عالم پر روشن ہو چکی
ہے کہ اقتصادی بہتری، تہذیبی اور تمدنی ترقی
اور سیاسی کامیابی کا انحصار باہمی تعاون پر
ہے۔ ایشیائی اور افریقی ملکوں میں آپسی
بھائی چارے کی جو نئی کرن پھوٹی ہے اور دنیا کی
عظیم طاقتوں کے درمیان باہمی تعاون کی جو نادر کی
مثال قائم ہوئی ہے۔ وہ واقعی قابل ستائش
ہے۔ ہم دنیا کی ایک حکومت کے خواب کو حقیقت
میں ڈھلتا دیکھنے کے خواہاں ہیں۔

لیکن یہ تبھی ممکن ہے جب وہ طاقتیں جنھیں
اقتصادی برتری حاصل ہے۔ وہ ان ممالک کی
ضروریات کا جو ابھی تک اقتصادی بدحالی کا
شکار ہیں، خیال رکھیں اور دنیا میں ایک نئے
اقتصادی نظام کو جنم دینے کے لیے رضامند ہوں؟
اس کرۂ زمین پر بسنے والے سبھی انسانوں کے حقوق
مساوی ہیں۔ اس حقیقت سے انکار نہیں اور اس
سے آنکھ چرانے سے انسانیت کو نئے خطرات لاحق
ہو سکتے ہیں۔

خون کا دباؤ

اگر خون کا دباؤ کم ہونے سے خون کی رکاوٹ نازک مرحلے پر پہنچ جائے تو بہت حد تک "اسکیمیا" ہو سکتا ہے۔ اس کے برعکس اگر خون کا دباؤ بڑھ جائے تو نس پھٹنے سے بہت حد تک خون بہے گا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ خون کا بڑھا ہوا غیر معمولی دباؤ "ہیموریج" فالج کے لیے انتہائی بُرا ہے بالکل اسی طرح جیسا کہ کم دباؤ اسکیمیا فالج کے لیے بُرا ہے۔ اس سے بلاشبہ خون کے موزوں دباؤ کی ضرورت پیدا ہوتی ہے۔ لیکن بعض ایسے اسباب ہیں جو ہمارے قابو میں نہیں ہیں۔

فالج کے اسباب

جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا ہے اسکیمیا فالج کے متعدد اسباب ہیں۔ معمر مریضوں میں شریانوں کا سخت ہو جانا سب سے زیادہ عام سبب ہے۔ یہ ایک ایسا امر ہے جو لازماً بڑھاپے کے عمل میں موجود رہتا ہے جس سے شریانیں سخت ہو جاتی ہیں۔ سخت شریانوں میں لچک نہیں رہتی جس سے خون کا دباؤ بڑھ جاتا ہے۔ خون کے اعلیٰ دباؤ، ذیابیطس اور خون میں چربی بڑھنے سے شریانیں سخت ہو جاتی ہیں۔ فالج کا شکار ہونے والے بیشتر مریضوں پر پہلے مقامی عصبی کمزوری کے اسکیمیا کے متعدد عارضی حملے ہوتے ہیں۔ بیشتر مریضوں میں یہ حملے چند منٹ تک رہتے ہیں۔ لیکن وہ کبھی بھی ۲۴ گھنٹے سے زیادہ عرصے تک نہیں رہتے۔ یہ خون کی گردش میں رکاوٹ یا خون کے بڑھے ہوئے دباؤ کے باعث ہوتے ہیں۔ یہ عارضی حملے فالج گرنے سے پہلے انتباہی طور پر عمل میں آتے ہیں۔ یہ اس امر کو یاد رکھنے کے لیے اہم ترین مرحلہ ہے کہ ان عارضی حملوں کے وقت کچھ کیا جا سکتا ہے لیکن ایک بار فالج گر جائے تو کچھ زیادہ نہیں کیا جا سکتا۔ خطرے کی ایک اور اہم بات جس سے دماغی فالج گرتا ہے سگریٹ نوشی ہے اور اس لیے آپ کو اس امر کی طرف توجہ دینے کی ضرورت ہے کہ سگریٹ نوشی کو بند کیا جائے۔ نس پھٹنے سے ہونے والے فالج کے متعدد اسباب ہیں لیکن ان میں خون کا بڑھا ہوا دباؤ اہم ترین سبب ہے۔ خون کے غیر معمولی دباؤ پر مناسب کنٹرول سے نس پھٹنے سے ہونے والے فالج کی وارداتوں اور شدت میں واقعی کمی ہوئی ہے اور اس سے خون کی رکاوٹ سے ہونے والے فالجوں میں بھی فائدہ پہنچا ہے۔

تشخیص

اسکیمیا کے عارضی حملوں اور فالج کی تشخیص مشکل نہیں ہے اور اس کا زیادہ تر انحصار مریض یا اُس کے کسی رشتہ دار کی طرف سے مرض کی اچھی وضاحت پر ہے۔ علامتیں (جیسے کہ لقوہ، اندھا پن، بیہوشی وغیرہ) اچانک نمودار ہوتی ہیں اور مشکل وقت گزر جانے کے بعد اگر مریض زندہ رہے تو اُس کی حالت میں ہمیشہ بہتری ہو جاتی ہے۔ نس پھٹنے سے ہونے والے فالج شدید مشقت اور سرگرمی کے دَوران گرتے ہیں جبکہ خون کی رکاوٹ سے ہونے والے فالج نیند اور غیر سرگرمی کی حالت میں گرتے ہیں۔ جسم کے تمام حصّوں اور سرگرمیوں کا مرکزی مقام دماغ ہے۔ جسم کے عمل میں خرابی سے ڈاکٹر دماغ میں زخم کے مقام کو جوڑ دیتا ہے۔ طبی ٹیکنالوجی نے گذشتہ دس، بارہ برسوں میں تشخیصی صلاحیتوں کو واقعی بہتر بنا دیا ہے۔ کمپیوٹر کی مدد سے شریانوں کی ایکسرے تصویروں، سی ٹی اسکین، ڈوپلر بلڈ فلو (Doppler Blood Flow) اور ایم آر آئی سے صحیح تشخیص میں بڑی مدد ملتی ہے۔ تاہم کسی کے لیے یہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ یہ ترقی یافتہ ٹیکنالوجیاں طبی رپورٹ کی جگہ نہیں لے سکتیں۔ میں آپ سے پُرزور سفارش کرتا ہوں کہ بیماری کا حتی الامکان زیادہ سے زیادہ مشاہدہ کیا جائے اور تمام معلومات ڈاکٹر کے سپرد کی جائیں تاکہ وہ صحیح تشخیص کر سکے۔

نوجوانوں میں فالج

جہاں تک نوجوانوں میں فالج کا تعلق ہے ہمیں بھارت میں عورتوں پر حمل کے دَوران یا بچے کی پیدائش کے فوراً بعد گرنے والے فالج سے زیادہ تشویش ہے۔ زیادہ تر غریب اور نادار عورتیں اس کا شکار ہوتی ہیں۔ اس معاملے میں کچھ تحقیق و مطالعہ کیا گیا ہے لیکن صحیح سبب کا ابھی تک پتہ نہیں چلا۔ یہ ایک ایسا شعبہ ہے جہاں تحقیقی سرگرمیوں کو مرکوز کیا جانا چاہیے۔

علاج

فالج سے بچنے پر اس سے قبل کہ وہ گر جائے دھیان دینا ضروری ہے۔

خون کی رکاوٹ سے ہونے والے عارضی حملوں کے شروع ہوتے ہی علاج معالجہ شروع کر دینا چاہیے۔ اس کا طبی علاج اور سرجری سے بھی علاج ہو سکتا ہے۔ آپ پر اپنے ڈاکٹر سے مشورہ لینے کی ذمہ داری بھی عائد ہوتی ہے۔ پرہیز اور خطرے کی باتوں پر قابو پانا نہایت ضروری ہے۔ فالج گرنے کے پہلے ۷۲ - ۴۸ گھنٹوں میں خصوصی طبی توجہ دینے کی بڑی اہمیت ہے۔ مُردہ بافتوں (نسیج) کے لیے کوئی بہت کچھ نہیں کر سکتا لیکن نواحی اور جزوی طور پر معذوب بافتوں کو از سرِ نو زندہ کرنے کی جانب تمام تر توجہ دی جانی چاہیے۔ اسی سے اس امر کا یقین ہو سکتا ہے کہ کس حد تک بحالی ہو سکتی ہے اور بازیابی کے امکانات کیا ہیں۔ جزوی طور پر معذوب بافتوں کو موزوں گلوکوز اور آکسیجن کی ضرورت ہے۔ بعض مریضوں میں سکڑی ہوئی شریانوں اور بڑھے ہوئے خون کے دباؤ پر قابو پانے کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایک بار مشکل وقت گذر جائے تو واحد علاج فزیو تھیراپی ہوتا ہے۔ فزیو تھیراپی اور آبادکاری کا رول معذور شخص کو روزمرہ کی زندگی کی سرگرمیوں میں زیادہ سے زیادہ ممکن حد تک خود مختار بنانا ہے۔

میں آخر میں اس امر پر زور دوں گا کہ ہم کے رہنے میں اس مسئلے سے آگاہ ہونے کی ضرورت ہے۔ خون کے بڑھے ہوئے دباؤ کا موزوں طور پر علاج کیا جانا چاہیے۔ سگریٹ نوشی بند کر دینی چاہیے۔ فالج سے پہلے خون کی رکاوٹ سے ہونے والے حملوں کی طرف ڈاکٹروں اور مریضوں کو توجہ دینی چاہیے اور خصوصی مشورہ حاصل کرنا چاہیے۔ مختلف ذرائع سے چلنے والے اداروں کو خبردار رہنا چاہیے اور ایسے شعبوں میں خاص طور سے تحقیق و مطالعہ کرنا چاہیے جو بھارت میں اہم تعلق رکھتے ہیں۔ (آل انڈیا انسٹی ٹیوٹ آف میڈیکل سائنسز نئی دلی کے لیکچر سے ماخوذ)۔

سردار احمد (...)

ہندوستان میں کوئلے کی اہمیت اور افادیت

کوئلہ ایک ایندھن کی شکل میں اب تک جانا اور پہچانا جاتا رہا ہے۔ لیکن سائنس کے ذریعے جدید تحقیقات نے کوئلہ کے ایسے سربستہ راز کھولے ہیں کہ اس سیاہ فام شئے کی قدر و قیمت بہت بڑھ چکی ہے۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے چند حقائق دلچسپی سے خالی نہیں ہیں۔ جن کا تجربہ ہندوستان میں اب عام ہے۔ یہ درج ذیل حقائق خالق کائنات کی صناعی اور عقلِ انسانی کی رسائی کا پتہ دیتے ہیں۔

سب سے پہلے قارئینِ "یوجنا" کے لیے یہ انکشاف حیرت انگیز ہوگا کہ کوئلہ کے اندر تقریباً پانچ سو رنگ پائے گئے ہیں۔ ابھی تک رنگوں کو حاصل کرنے کا ایک اہم ذریعہ پودے تھے۔ اور اب کوئلہ بھی ہے۔ بادشاہوں کے ملبوسات رنگنے کے لیے TYRIAN PURPLE نامی رنگ ایک سمندری کیڑے سے حاصل کیا جاتا تھا اور اب یہ رنگ بھی کوئلہ سے نکالا جاتا ہے اور عام آدمی کے استعمال میں آرہا ہے۔ کوئلہ میں مختلف رنگوں کا پایا جانا انسان کی محنت ہی نہیں خدا کی بھی عظمت کا بیّن ثبوت ہے۔

کوئلے کی طبی افادیت نے نئی دواؤں کی تیاری میں بھی مدد دی ہے۔ کم ہی لوگوں کو معلوم ہوگا کہ سلفا دوائیں اور مشہور عالم دوائیں اسپرین ASPRIN کوئلہ ہی سے تیار کی جاتی ہے۔ جراثیم مارنے کے لیے جن دواؤں کا استعمال کیا جاتا ہے اس میں بھی بعض کوئلہ ہی سے بنائی جاتی ہیں۔

آج سے کچھ عرصہ قبل کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ کوئلے سے خوشبوئیں بنائی اور نکالی جائیں گی۔ لیکن کوئلے سے خوشبو بھی حاصل کی جارہی ہے۔ وینیلا خوشبو جس کا استعمال آجکل آئس کریم میں عام ہے، کوئلہ ہی سے ملتی ہے۔ کوئلہ میں مٹھاس کا ہونا بھی کب سوچا گیا تھا؟ لیکن آج شکر سے زیادہ میٹھی شئے "سکرین" کوئلہ سے تیار کی جاتی ہے۔

مذکورہ بالا حقائق کی روشنی میں کوئلے کی بڑھتی ہوئی اہمیت اور افادیت کا اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے۔

"کوئلہ صنعت" عالمی سطح پر اس لیے اور بھی اہمیت پا رہی ہے کیونکہ توانائی کے عالمی بحران نے مشینوں، کارخانوں، ملوں اور گوناگوں پروجیکٹوں میں کوئلے کو بطور ایندھن استعمال کرنے کی طرف انسان کو پھر مائل کر دیا ہے۔ ہندوستان میں کوئلے کا استعمال مندرجہ بالا کاموں کے علاوہ ایندھن کے لیے بھی مستقبل میں کم نہیں ہوگا۔ ہمارے ملک میں کوئلے کا ذخیرہ اتنا موجود ہے کہ یہ عالمی سطح پہ پانچواں مقام رکھتا ہے۔ ۱۹۷۳ء میں بھارت سرکار نے کوئلے کی صنعت کو قومیانے کے بعد اس کی تیز رفتار ترقی کے لیے پوری توجہ سے کام لیا اور "کول انڈیا لمیٹڈ" Coal India Limited کے ذریعے اصول و ضوابط وضع کیے اور کوئلے کی پیداوار میں اضافہ کرنے اور اس کی صنعت میں کام کرنے والوں کے لیے سہولتیں مہیا کرنے کے لیے بہت سے نئے اور مفید قدم اُٹھائے۔

ہندوستان میں کوئلے کی صنعت میں تقریباً سات لاکھ افراد روزگار سے لگے ہوئے ہیں جن کی فلاح و بہبود کے انتظامات سے بھی سرکار غافل نہیں ہے جس کا ثبوت یہ ہے کہ ان کے لیے رہائشی مکانات اور ضروریات زندگی کے حصول، اچھی صحت کے لیے طبی سہولتیں، بچوں کی تعلیم، کھیل کود اور ثقافتی سرگرمیوں میں اضافہ ہوا ہے۔

کول انڈیا لمیٹڈ (جو بھارت سرکار کا ادارہ ہے) نے چھٹے پنجسالہ منصوبے کے تحت ۸۵-۱۹۸۴ تک ۱۶۵ کروڑ ٹن کوئلہ کی پیداوار کا ایک نشانہ مقرر کیا تھا جس کے حصول کے لیے مذکورہ ادارہ کوشاں ہے۔ کوئلے کی ضرورت دیہی و شہری صارفین کے لیے بڑھتی نظر آرہی ہے۔ اس لیے پیداوار کا یہ نشانہ بہت صحیح ہے۔ اس منصوبے کی تکمیل پر کوئلے کی پیداوار میں اضافے، روزگار میں مزید سہولت، صنعتوں کے استحکام، اور سرمایہ کاری میں ترقی سے قومی معیشت کو ہمہ جہت فائدے ہوں گے اس سے کوئلے کی اہمیت و افادیت مزید مسلم ہوگی۔

★

Published by the Director, Publications Division, Patiala House, New Delhi-110001
Printed by Skylark Printers, 11355, Id-Gah Road, New Delhi-110055

یوجنا

یکم تا ۱۵ر جنوری ۱۹۸۵

ایک روپیہ

معاشرتی انقلاب کی جانب
اقتصادی جمہوریت کا مقدمہ

ہندوستانی معیشت کے چند پہلو
(وسنت ساٹھے)



اجتماعی جنگل بانی

(نثار احمد زکی)

دورانِ سر یا چکر

(پروفیسر ایس. کے. بگرٹی)

قومی دولت کا اہم وسیلہ

نثار احمد زکی

ہندوستان بہت بڑا زرعی ملک ہے، جس کے معاشی و اقتصادی نظام کا ڈھانچہ بڑی حد تک زراعت پر قائم ہے اور ملک کی آبادی کا بہت بڑا حصہ زرعی پیشے میں لگا ہوا ہے۔ ملک کا مستقبل اور اس کا خوشگوار معاشی نظام زراعت کے ہاتھوں میں ہی محفوظ ہے۔ زراعت کو جتنا فروغ حاصل ہوگا اُس کے نظام کو جتنا مربوط اور منظم بنایا جائے گا اس کے لیے جتنے زیادہ وسائل فراہم کئے جائیں گے اتنا ہی ملک اقتصادی طور پر مضبوط و مستحکم ہوگا۔ لوگوں کو زیادہ سے زیادہ روزگار ملے گا اور ملک سے غریبی اور ناداری دور ہوگی۔

زراعت اور جنگلات کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ بارش اور مانسون کا دارومدار جنگلات کی کثرت پر ہی قائم ہے۔ ملک میں جتنے زیادہ اچھے جنگلات ہوں گے اتنی ہی زیادہ اچھی بارش ہوگی۔ پانی زراعت اور ذی رُوح کے لیے ہوا کے بعد دوسری سب سے بڑی ضرورت ہے۔ بارش کے پانی سے نہ صرف زرعی زمینیں سیراب ہوتی ہیں بلکہ اس کے ذخائر دریاؤں اور ندیوں و تالابوں میں جمع ہوتے ہیں۔ جو غیر مانسونی موسم میں کھیتی باڑی کے لیے کام آتے ہیں۔

آج جنگلات ختم ہوتے جا رہے ہیں، کیوں کہ جلاون، ایندھن اور لکڑی کی دوسری مصنوعات کے لیے بڑے پیمانے پر ان کی کٹائی ہو رہی ہے، جس کی وجہ سے مانسون متاثر ہو رہا ہے اور آبپاشی کے لیے وافر مقدار میں پانی نہیں ملتا ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ سب میں جنگلات محفوظ کئے جائیں۔ اور بڑے پیمانے پر نئے جنگلات لگائے جائیں۔ جس کی ضرورت محسوس کی جا رہی ہے۔

اب عالمی سطح پر جنگل لگانے کے کام کو فروغ دینے کی ضرورت محسوس کی جا چکی ہے۔ جس کو اجتماعی یا سماجی جنگل بانی کا نام دیا گیا ہے۔ جس پر دنیا کے تمام ملکوں میں توجہ دی جا رہی ہے۔ لیکن ترقی پسند ملکوں میں ہندوستان پہلا ملک ہے جس نے اجتماعی جنگل بانی پر خاص طور پر توجہ دی ہے۔ وہ یہ ثابت کرکے دکھانا چاہتا ہے کہ گرچہ روپیہ درختوں اور پیڑوں میں نہیں پھلتا، لیکن جہاں درخت اور جنگل ہیں، وہاں روپیہ اور دولت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جنگل بانی کی ترقی پر بھرپور توجہ دی جا رہی ہے۔ ملک کی بیشتر ریاستی حکومتوں میں جنگلات کی ایک باضابطہ وزارت قائم ہے، جو پُرانے جنگلوں کے تحفظ اور نئی جنگل بانی کے کام کو ترقی دینے کے نظام کو سنبھالتی ہے۔ جنگلات معیشت کے لیے صنعت اور انڈسٹری کی حیثیت حاصل کر چکے ہیں۔ جہاں سے ہمیں پھل، شہد، ایندھن، چارہ اور قیمتی لکڑیاں حاصل ہوتی ہیں۔ ان سے فضائی آلودگی بھی ختم ہوتی ہے۔ اور بنی نوع انسان کو صاف ستھری ہوا اور ماحول حاصل ہوتا ہے۔ جنگل جانوروں اور چرند پرند کی افزائش ہوتی ہے اور ہمارے لیے سیر و تفریح اور سیاحت کے وسائل حاصل ہوتے ہیں۔

امریکی ایجنسی برائے بین الاقوامی ترقیات اوسیڈ (USAID) نے جنگل بانی کے لیے ہندوستان میں مدھیہ پردیش کو منتخب کیا ہے اور اس کے لیے ۲۵ کروڑ ڈالر کا ایک پروگرام بنایا ہے۔ مذکورہ ریاست ہندوستان کا ایک ایسا علاقہ ہے جہاں سب سے زیادہ جنگل ہیں۔ مذکورہ بالا امریکی ایجنسی سے قائم ہونے والے پراجیکٹ میں پروگرام کے مطابق جنگل بانی کا ایک ڈائرکٹریٹ قائم کیا جائے گا۔ جو دیہی باشندوں کو غیر روایتی جنگلاتی علاقے میں جنگل بانی کے لیے تیار کرے گا۔ اور انھیں تربیت دے گا۔ منصوبے کے مطابق گاؤں والوں کی مشترکہ زمین پر جہاں کوئی کھیتی باڑی نہیں ہوتی ہے یا دیہات میں سرکاری خالی قطعہ اراضی اور سڑکوں کے کنارے خالی زمین پر جنگل لگانے کے کام کی ترغیب دی جائے گی۔ ان زمینوں پر جس قسم کی جنگل بانی ہوگی، اس سے ایندھن کے لیے لکڑی، مویشیوں کے لیے چارہ، چھوٹی ساگوان اور دیگر جنگلاتی مصنوعات حاصل ہوں گی جن سے اس اسکیم میں حصہ لینے والے دیہی عوام کو براہِ راست فائدہ پہنچے گا۔ پراجیکٹ پر عمل درآمد کے دوران تریسٹھ ہزار ہیکٹیئر اراضی پر مختلف قسموں کے درخت بھی لگائے جائیں گے۔ جن سے بڑی مقدار میں پھل بھی حاصل ہو سکیں گے۔

اوسیڈ کے فارسٹ افسر مسٹر جارج بلیٹ کے مطابق مذکورہ پراجیکٹ کی تکمیل پندرہ برس کے اندر مکمل ہو جائے گی۔ اور ۳ سال کے اندر لوگوں کو چارہ اور ایندھن کے لیے لکڑی حاصل ہونے لگے گی۔

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ زراعت کے بعد جنگلات ملکی و قومی اقتصادی و معاشی استحکام میں اہم کردار ادا کر سکتے ہیں۔ ابتدائے آفرینش سے جنگل بانی کی جانب کبھی توجہ نہیں دی گئی اور قدرتی طور پر جنگلوں کی نشو و نما ہوتی رہی ہے۔ انسانی ذہن کبھی جنگل بانی کی جانب مائل نہیں ہو سکا۔ لیکن جُوں جُوں سائنس نے ترقی کی اور درختوں و جنگلوں سے بارش اور مانسون کے تال میل کا پتہ چلا توں توں جنگلوں کی حفاظت اور ان کی ترقی کے متعلق پلان اور پروگرام بنائے جانے لگے۔ زراعت کے میدان میں جس طرح مختلف النوع فصلیں اور اناج حاصل ہوتے ہیں۔ بالکل اسی طرح جنگلات سے بھی مختلف اقسام کی مفید اور کارآمد اشیا حاصل ہوتی ہیں۔ جنھیں برآمد کرکے بڑی مقدار میں زرِ مبادلہ حاصل کیا جا سکتا ہے۔

اجتماعی جنگل بانی کا تعلق ملک میں سیاحت و سیر و تفریح کے فروغ سے بھی ہے۔ جنگلاتی علاقے سیاحوں اور سیر سپاٹے اور تفریح سے دلچسپی رکھنے والے غیر ملکی باشندوں کے لیے باعثِ کشش ہوتے ہیں۔ اور وہ اپنی چھٹیاں اور تعطیلات گذارنے کے لیے ان ملکوں میں جاتے ہیں جہاں انھیں ایسے مقامات پر وقت گذارنے کا موقع حاصل ہوتا ہے۔ اس طرح اس اسکیم سے ملک میں سیاحت کی ترقی ہوگی اور ملک کو زرِ مبادلہ حاصل ہوگا۔ ★

منصوبہ بندی اور ترقیاتی پروگراموں کی جھلک پیش کرنے والا

پندرہ روزہ

نئی دہلی

چیف ایڈیٹر ✦ آر. ٹھکرال
ایڈیٹر ✦ تلکھی رام رانا
اسسٹنٹ ایڈیٹر ✦ محمد عادل صدیقی
سب ایڈیٹر ✦ وسیم حیدر

جلد ۳	یکم تا ۱۵ ر جنوری ۱۹۸۵ء	شمارہ ۱۹

۱۱ تا ۲۵ ر اگرہائن شک سمبت ۱۹۰۶ ✦ فون : ۳۸۴۳۱۴۲

اس شمارے میں

یوجنا منصوبہ بندی کے بارے میں عوام کو آگاہ کرتا ہے۔ مگر اس کے مضامین صرف سرکاری نقطۂ نظر کی وضاحت تک ہی محدود نہیں ہیں

شرح چندہ

سالانہ : ۲۰ روپے۔ دو سالہ : ۳۵ روپے، سہ سالہ ۵۰ روپے
فی کاپی : ایک روپیہ

طالب علموں، استادوں اور لائبریریوں کے لیے ۱۰ فی صد کی رعایت

بزنس منیجر : ایل. آر. بترہ ✦ اسسٹنٹ ڈائرکٹر (پروڈکشن) آر. ایس. منچال

مضامین سے متعلق خط و کتابت کا پتہ :
ایڈیٹر یوجنا (اردو) پبلیکیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس
نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

ترسیل زر کا پتہ :-
بزنس منیجر، پبلیکیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس
نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

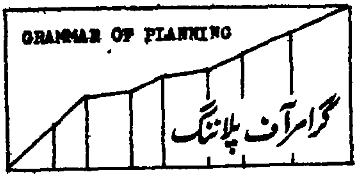
اِداریہ

فوڈ کارپوریشن آف انڈیا کی خدمات

ہندوستان بنیادی طور پر زراعتی ملک ہے۔ یہاں خوراک سے متعلق پالیسی کے تحت درج ذیل باتوں پر زور دیا جاتا ہے۔ اوّل یہ کہ پیداوار بڑھائی جائے تاکہ ملک نہ صرف خوراک کے محاذ پر خود کفیل ہوسکے بلکہ یہ اپنی زائد پیداوار دوسرے ملکوں کو بھیج سکے۔ دوم یہ کہ ملک میں خوراکی اشیاء کی تقسیم منصفانہ بنیادوں پر عمل میں لائی جاسکے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ سماج کے کمزور طبقوں کو مناسب داموں پر خوراکی اشیاء فراہم کی جاسکیں۔ اس طرح ان اقدامات کا اصل مقصد یہی ہوا کہ اشیائے ضروریہ کی قیمتیں مستحکم بنائی جاسکیں اور کم آمدنی والے طبقوں کے مفادات کا تحفظ کیا جاسکے۔ اور اس کے ساتھ ہی کسانوں کو اپنی پیداوار کے مناسب دام مل سکیں جس سے کہ پیداوار بڑھانے سے اُن کی دلچسپی بنی رہے۔ خوراکی اجناس کی ذخیرہ بندی کو بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی سمجھنا چاہیئے۔ اس کا ایک فائدہ یہ ہوتا ہے کہ قلت کے دِنوں میں اس ذخیرے سے اشیاء فراہم کردی جاتی ہیں اور قیمتوں کو بڑھنے سے روکا جاسکتا ہے۔ اسی طرح اگر قیمتیں گر رہی ہیں تو انھیں سہارا دینے کے لیے حکومت خوراکی اشیاء خرید لیتی ہے۔ خوراک سے متعلق پالیسی پر عمل درآمد کے لیے حکومت نے ۱۹۶۴ء میں فوڈ کارپوریشن آف انڈیا قائم کی۔ اس کے ملک بھر میں چار زونل اور ۱۹ ریجنل دفاتر ہیں جبکہ ضلعوں اور تحصیلوں میں ۱۴۹ مراکز ہیں۔ اس نے خوراکی اشیاء کی ذخیرہ بندی کے لیے دو ہزار ڈپو قائم کئے ہیں اور بہت سے ایسے مراکز کھولے ہیں جہاں غلّہ وغیرہ خریدا جاسکے۔ اس کارپوریشن نے ۲۵ ماڈرن رائس مِل (چاول نکالنے والے کارخانے) قائم کئے ہیں۔ چاول کی بھوسی سے عرق نکالنے اور دال بنانے کے لیے الگ سے ایک ایک مِل قائم ہے۔ چنانچہ اس کارپوریشن کے ذمّے غلّہ کی خرید، اس کی نقل و حمل، ذخیرہ بندی، تقسیم اور فروخت وغیرہ جیسے متعدد کام ہیں۔ حکومت ہند ربیع اور خریف کی فصلوں کے لیے غلّہ اور خوراکی اجناس کی خرید کے لیے قیمتوں کا اعلان کرتی ہے۔ حکومت ہند مختلف ریاستی حکومتوں کو گندم، چاول اور دیگر غلّہ الاٹ کرتی ہے۔ الاٹ کرتے وقت ریاست یا مرکز کے زیرِ انتظام علاقوں کی آبادی پیشِ نظر ہوتی ہے۔ ریاستی سرکاریں اس غلّے کو فیئر پرائس شاپس کے ذریعے فروخت کرتی ہیں۔ ملک بھر میں اس وقت ۳ لاکھ سے زیادہ فیئر پرائس شاپس کا جال پھیلا ہے۔ گندم، آٹا چکیوں کو بھی الاٹ کیا جاتا ہے۔ یہ مِل سوجی اور میدہ وغیرہ تیار کرکے فیئر پرائس شاپس کے ذریعے عوام تک ان اشیاء کو پہنچاتے ہیں۔ ملک میں روزگار کی فراہمی وغیرہ سے متعلق بہت سے پروگرام شروع کئے گئے ہیں، ان کے ذریعے اناج تقسیم کیا جاتا ہے۔ چنانچہ مرکزی ذخیرے سے روزگار دینے والے کاموں کے لیے بھی اناج تقسیم کیا جاتا ہے۔ اس طرح کی کوششوں سے دیہات کی مربوط ترقی کے کام کو آگے بڑھانے پر زور ہے۔ ۱۹۸۳ء میں مرکزی ذخیرے سے ایک کروڑ ۲۲ لاکھ ٹن گندم، چاول اور موٹا اناج ان مقاصد کے لیے دیا جاسکا۔ آج کے دَور میں سماجی مقاصد کے پیشِ نظر اناج کی ذخیرہ بندی ایک اہم اور فیصلہ کُن رول ادا کرتی ہے۔ ہماری زراعت کا انحصار چونکہ قدرتی حالات اور موسم پر ہے۔ اس لیے بھی اس عمل کی اپنی جگہ بڑی اہمیت ہے۔ فوڈ کارپوریشن آف انڈیا نے شروع میں تو درآمد شدہ مال اور اس کی تقسیم پر زور دیا۔ لیکن چونکہ خوراکی اجناس کی فراہمی کی صورتِ حال تسلی بخش ہوتی چلی گئی۔ لہٰذا اس ادارے کو زیادہ زور فاضل ذخیروں اور ان کی برآمدات پر دینا پڑا۔ یہ فاضل ذخیرے خوراکی اجناس کی فراہمی کے ذریعے بین علاقائی تفاوت کو بھی کم کرتے ہیں۔ اس کے پاس اناج بالخصوص گندم اور چاول کے جو ذخیرے ہیں وہ فصلوں کی ناکامی کی صورت میں بیمہ کی طرح تحفظ فراہم کرتے ہیں۔ حکومت کی پالیسی یہ ہے کہ روزمرّہ کے استعمال میں آنے والے اسٹاک کے علاوہ ایک کروڑ ٹن اناج کا فاضل ذخیرہ باقی رہے۔ سابق میں اس ادارے نے خشک سالی اور سیلابوں وغیرہ کے زمانے میں جو شاندار خدمات انجام دکھائیں، ان کا اعتراف سبھی نے کیا ہے۔ حصولِ آزادی کے بعد ملک میں خوراک کی قلت کو دُور کرنے کی جو کوششیں کی گئی ہیں، اور خشک سالی کے ایّام میں مشکلات سے نپٹنے کی جو حکمتِ عملی تیار کی گئی ہے، اس سلسلے میں اس ادارے کی خدمات کو فراموش نہیں کیا جاسکتا۔

(ایڈیٹر)

پی۔ آر۔ دوبھاشی



منصوبے کے لیے سرمایہ کاری

منصوبے کے دو اجزائے ترکیبی یہ ہیں: عملی نشانے اور عملی صورت میں ان کے لیے وسائل کی فراہمی۔ نشانوں کی تکمیل کے لیے ضروری مصارف کو پہلے سے ہی مختص کردیا جاتا ہے۔ اس باب میں مصنف نے ان طریقوں کی نشاندہی کی ہے جن سے منصوبے کے لیے مالی وسائل فراہم کئے جاسکتے ہیں۔

منصوبے کے حتمی جائزے کی صورت میں دو امور پر نظر ڈالی جاتی ہے، یعنی عملی نشانوں کا تعین اور ان کے لیے مالی وسائل کی فراہمی۔ مطلوبہ نشانوں کی تکمیل کے لیے پہلے ہی سے رقم مختص کردی جاتی ہے۔ اس مقصد کے لیے مالی وسائل کی فراہمی ضروری ہوتی ہے۔ یہ کام مالیات سے متعلق حکام کا ہے کہ وہ مالی وسائل فراہم کریں۔

منصوبہ جاتی وسائل اور غیر منصوبہ جاتی وسائل کے درمیان تخصیص کرنا آسان کام نہیں۔ اسی طرح منصوبے کے مصارف اور غیر منصوبہ جاتی مصارف کے سلسلے میں باریکی کے ساتھ تعین بھی دشوار ہے۔ غیر منصوبہ جاتی مصارف کے تجزیے سے کبھی کبھی یہ پتہ چلتا ہے کہ وہ منصوبے کے حصول کے لیے ضروری تھے۔ منصوبے کو کامیاب بنانے کے لیے منصوبے کی اسکیموں پر اخراجات کی جس قدر اہمیت ہے، اسی قدر بحیثیت مجموعی تمام اخراجات کی اہمیت ہے۔ لیکن کبھی کبھی اس پہلو کو فراموش کردیا جاتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ پلان کے فنڈ سے سڑکوں کی تعمیر ضرور ہوتی ہے، نئے اسکول بھی کھولے جاتے ہیں۔ نئی ڈسپنسریاں بھی کھولی جاتی ہیں۔ لیکن نہ تو سڑکوں کی دیکھ بھال کی جاتی ہے، نہ اسکولوں پر نظر رکھی جاتی ہے، نہ ڈسپنسریوں کی مناسب دیکھ ریکھ ہوتی ہے۔ سبب اس کا یہ ہوتا ہے کہ مکرر الوقوع اخراجات کے لیے گرانٹ نہیں دی جاتی۔ اس طرح پلان کے مصارف کے مقاصد خود فوت ہوجاتے ہیں۔ لہٰذا منصوبہ جاتی اور غیر منصوبہ جاتی مصارف میں بنیادی اور حتمی وحدت بہت ضروری ہے جسے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

منصوبے کے لیے مالی وسائل کی فراہمی انھیں طریقوں سے ہوتی ہے جس طرح سے کہ ریاستی وسائل کی فراہمی بالعموم عمل میں آتی ہے۔ مثلاً ٹیکسوں کے ذریعے، قرضوں کی صورت میں، پبلک سیکٹر کے اداروں کے منافعوں کی صورت میں۔ البتہ منصوبہ بندی کا عمل جوں جوں فروغ پاتا ہے، اس میں پبلک سیکٹر اداروں کا نفع سب سے زیادہ موثر اور امید افزا ہوتا ہے۔ منصوبہ جاتی مصارف سے جو اثاثہ جات بنا لیے جاتے ہیں، ان سے فاضل وسائل اور آمدنی کی امید کی جاتی ہے۔ منصوبے کو آگے بڑھانے کے لیے اس نفع کو دوبارہ سرمایے کے طور پر لگا دیا جاتا ہے۔ البتہ سرمایہ کاری کے ٹھوس ہونے کی صورت میں ہی یہ ممکن ہے۔ اس کے ساتھ ہی ان اداروں کو چلانے کے لیے انتظامی مہارت درکار ہے۔ کہا جاتا ہے کہ کمیونسٹ ملکوں میں شہریوں پر ٹیکس نہیں ہیں۔ اس کا مطلب یہی ہے کہ وسائل کی فراہمی سرمایہ کاری حکام کسی اور ڈھنگ سے کرتے ہیں۔ چوں کہ ریاست کے قبضے میں تمام پیداواری ذرائع ہوتے ہیں۔ اور اشیا کی فراہمی کی تقسیم کا نظام بھی سرکار کے قبضے میں ہوتا ہے، لہٰذا سرکاری ادارے اس منڈی سے فائدہ اٹھاتے ہیں جس پر ان کا اختیار ہوتا ہے اور جہاں قیمتوں کا تعین بھی سرکاری حکام کے ہاتھوں میں ہے۔ اس طرح سے مذکورہ قیمتوں میں کافی گنجائش چھوڑی جاسکتی ہے اور صارفین کو اس کو برداشت کرنا ہوتا ہے۔ کیوں کہ ریاست ہی مال کی پیداوار کے ذرائع کو اپنے قبضے میں کئے ہوتی ہے۔ منصوبہ بندی کے ایک ایسے نظام میں ضروری نہیں کہ قیمتیں پیداواری لاگت کی نمائندہ ہوں بلکہ وہ سرکاری حکام کے سوچے سمجھے اور جانے بوجھے فیصلوں کے تابع ہونگی

یا پھر وہ منصوبہ بندی سے متعلق اس نظام کے تابع ہوں گی جو کہ ضروری وسائل جٹانے کے لیے ذمہ دار

ٹیکس دو طرح کے ہوتے ہیں، بالواسطہ اور بلاواسطہ۔ آمدنی میں اضافے اور اقتصادی سرگرمیوں کے بڑھتے ہوئے رجحان کے ساتھ ساتھ بلاواسطہ ٹیکس مثلاً انکم ٹیکس اور بالواسطہ ٹیکس مثلاً کسٹم، ایکسائز، سیلز ٹیکس، دونوں ہی منصوبوں سے متحرک معیشت میں بڑھتی ہوئی آمدنی کا کافی حصہ سرکاری خزانے میں داخل کر سکتے ہیں۔ لیکن جہاں پرائیویٹ کارخانے بھی چل رہے ہیں اور وہ بھی معاشی ترقی میں اپنا رول ادا کر رہے ہیں، وہاں انتہائی زیادہ ٹیکس پیداوار میں مکمل ثابت ہوں گے اور سرمایہ کاری میں تعطل واقع ہوگا۔ البتہ منصوبہ بند معیشت میں ٹیکسوں کی ادائیگی کی صلاحیت کے بارے میں صحیح صحیح بتانا دشوار ہے۔

مثال کے طور پر کہا جاتا ہے کہ زرعی آمدنیوں میں ٹیکسوں کے عائد کیے جانے اور ان سے ہونے والی آمدنی کے کافی امکانات ہیں۔ آبپاشی والے رقبوں میں اس کے اور بھی امکانات ہیں، کیوں کہ ان کی آمدنی میں بسرعت اضافہ ہوا ہے۔ سبز انقلاب کی برکتوں سے مقامی اجتماعی تعمیرات کے لیے محنت کی صورت میں ٹیکسوں کے عائد کیے جانے کے مشورے بھی دیے گئے ہیں۔

بنیادی سہولتوں مثلاً آبرسانی، بجلی اور سڑکوں وغیرہ کے لیے سرکاری خزانے سے رقم دی جاتی ہے۔ ایسی صورت میں سرکار سے یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ کچھ محصولات عائد کرے گی مثلاً بجلی کی شرحیں، سڑک کا ٹیکس، پانی کا محصول، ان سے نہ صرف لاگت نکل آتی ہے بلکہ منصوبہ بندی کے حکام کے پاس کچھ فاضل رقم بھی بچ جاتی ہے۔ یہ بالکل جائز بات ہے کہ سماج کے وہ طبقے جو کہ منصوبہ بندی سے نفع اٹھاتے ہیں، انھیں منصوبہ بندی کے عمل کو جاری رکھنے کے واسطے اس میں ہاتھ بٹانے اور حصہ لینے کے لیے راضی ہونا چاہیے تاکہ منصوبہ بندی کے عمل سے ان کو بھی فائدہ پہنچے۔ جنھیں ابھی تک اس کا فائدہ نہیں ملا ہے۔ بدقسمتی یہ ہے کہ منصوبہ بندی سے فائدہ اٹھانے کے باوجود، اس میں جائز طور پر حصہ لینے اور ہاتھ بٹانے سے گریز کیا جاتا ہے۔ منصوبہ بندی کے حکام کو یہ کوشش کرنی پڑتی ہے کہ وہ اس بارے میں شعور پیدا کریں، تاکہ منصوبہ کو آگے بڑھانے کی کوششوں میں بے دھڑک آگے آتے ہیں انھیں دشواری نہ ہو۔

ٹیکسوں اور قرضوں سے سرمایہ حاصل کرنے کے علاوہ اور بھی چند طریقے ہیں۔ مثلاً زندگی بیمہ، اس کو قومی ملکیت میں لینے سے ریاست کے پاس کثیر وسائل آ سکتے ہیں۔

بلاشبہ اگر ترقیاتی پروگرام بذات خود بہت زیادہ نفع بخش نہیں ہیں تو اس طرح کے پروگراموں میں بیمہ کی رقم لگا کر ان سے ہونے والے مناسب فائدے کا سوال بھی اٹھتا ہے۔ البتہ اگر بیمہ عام ہو جائے تو اس سے ترقیاتی پروگرام کو کافی مدد مل سکتی ہے اور یہ پروگرام بھی اپنی نوعیت کے اعتبار سے سبھی عوام کو فائدہ پہنچا سکتے ہیں۔ سوڈان ایسے ملک میں پنشن کے فنڈ میں لازمی عطیات یا سماجی بیمہ فنڈ کے لیے لازمی کٹوتی کے سبب سرکار کے پاس کافی رقم اکٹھا ہو جاتی ہے۔ ان کے علاوہ ڈاک گھروں کے بینکوں میں جمع شدہ بچت اور دیگر بینکوں میں جمع کرائی گئی رقم سے نیز خصوصی بچت اسکیموں جیسا کہ یونٹ ٹرسٹ، پراویڈنٹ فنڈ وغیرہ سے وسائل اکٹھے کیے جا سکتے ہیں اور انھیں منصوبہ بندی میں لگایا جا سکتا ہے۔ اراضی کے فروغ سے متعلق بینک یا بجلی بورڈوں سے متعلق ادارے تمسکات کے ذریعے رقم فراہم کرتے ہیں۔ عام بینکوں کے علاوہ کوآپریٹو بینکوں اور اداروں سے بھی دیہی عوام کو فائدہ پہنچایا جا سکتا ہے تاکہ ایسے علاقوں میں ان سے استفادہ کیا جا سکے جہاں ابھی تک بینکوں کی سرگرمیاں نہیں آئی ہیں۔

وفاقی ڈھانچے میں جہاں منصوبے کو وفاقی، ریاستی اور مقامی منصوبوں کی صورت میں بانٹ دیا جاتا ہے۔ ان کے درمیان فنڈ کی تقسیم کا کام بڑا مسئلہ ہو جاتا ہے۔ بالعموم آئین اور قانون سازی کے ذریعے وسائل کی تخصیص کی اسکیم مرتب کی جاتی ہے۔ لیکن ضروری نہیں کہ یہ اسکیم مالی ذمہ داریوں کے اس ڈھانچے میں موزوں ہو سکے جسے منصوبے کو آگے بڑھانے کے لیے مرتب کیا جاتا ہے۔ اس طرح کے نظام میں بہت سی پیچیدگیاں رونما ہوتی ہیں ــ چنانچہ ہندوستان میں ریاستیں ہمیشہ منصوبے کو وسیع تر کرنے کے لیے آواز اٹھایا کرتی ہیں۔ لیکن وہ اس کے لیے مناسب وسائل اکٹھا کرنے کے لیے کوشش نہیں کرتیں بلکہ مرکز سے زیادہ سے زیادہ گرانٹ حاصل کرنے پر زور دیتی ہیں۔ ہندوستان کا آئین مالیاتی کمیشن کو اجازت دیتا ہے کہ وہ ٹیکسوں کی تخصیص اور گرانٹ کی تقسیم کا کام کرے مگر اس کی مدت صرف پانچ سال کے لیے ہوتی ہے۔ آئین کے تحت اختیار تمیزی پر مبنی گرانٹ منصوبہ بندی حکام کے اختیار میں نہیں ہوتی اور وہ اسے مختلف ریاستوں میں منصوبہ کی ذمہ داریوں کے مطابق نہیں بانٹ سکتے۔ ہندوستان میں منصوبہ بند کمیشن نے ایک فارمولا رکھا ہے جسے گیڈگل فارمولا کہتے ہیں۔ یہ منصفانہ نوعیت کا ہے، جسے مالی کمیشن نے اپنایا ہے۔

منصوبہ بندی کے تقاضے اور مالیات کی فراہمی کے لیے مندرجہ بالا طریقے ناکافی ہو سکتے ہیں، اس لیے مالی امور سے متعلق حکام خسارہ مالیات کی تکنیک اپنانے کے لیے مجبور ہو سکتے ہیں۔ لیکن یہ تکنیک بھی نقصان دہ ہے۔

افراط زر ترقی پذیر معیشت میں عام طور پر چڑھاؤ کا شکار رہتا ہے۔ ڈبلیو آر تھر لیوس نے کہا ہے کہ

(باقی صفحے پر)

معاشرتی انقلاب کی جانب

اقتصادی جمہوریت کا مقدمہ

چوتھا باب

ہندوستانی معیشت کے چند پہلو — منصوبہ بندی — سیکٹروار تجزیہ

حصّہ دوم، قسط : ۱۱

زراعت

زراعت میں انفرادی ملکیت کا تصور صدیوں سے غالب ہے۔ یہ دراصل اتنی گہرائی میں چلا گیا ہے کہ انسان کی بگی بہتری کی منصوبہ بندی کرتے ہوئے بھی اراضی کے لیے اُس کے لگاؤ اور احساس کو تسلیم کرنا ہوگا۔

اراضی کا تعلق مختلف روایاتی جاگیردارانہ نظاموں کے تحت افراد یا کنبوں اور اُن تمام اشخاص سے رہا ہے جو اُس پر بٹائی داروں یا مزدوروں کے طور پر کام کرتے تھے۔ مالک زیادہ تر غیر حاضر زمیندار تھے جو اپنی زمینوں پر فصلوں کی پیداوار کی طرف کوئی براہِ راست توجہ نہیں دیتے تھے۔

سائنس اور ٹکنالوجی نے صنعتی پیداوار کے شعبے میں تیز رفتار تبدیلیاں کی ہیں لیکن کاشتکاری پر اُن کا اثر محدود اور سست تھا۔ ترقی یافتہ صنعتی ملکوں میں اس سے مزدوروں اور کارکنوں کا رُخ زراعت سے صنعت کی جانب ہو گیا اور پھر زراعت کو بھی مشینی کاشتکاری جیسے نئے ٹکنالوجیکل حالات سے مطابقت پیدا کرنی پڑی۔

بھارت جیسے ملکوں میں خصوصاً کمزور طبقوں میں جو زیادہ تر دیہات میں رہتے ہیں، آبادی ایسی تیز رفتاری سے بڑھی کہ میلتھس کے نظریے سے مطابقت رکھتے ہوئے گو اُس نے شہری علاقوں میں صنعتوں کو مزدور فراہم کیے۔ تاہم اس سے مزدوروں کا رُخ صنعتوں کی جانب نہیں بدلا اور سابقہ کاشت اراضی پر دباؤ جو ہزاروں برسوں سے کم و بیش مسلسل بنا ہوا تھا، متواتر بڑھتا رہا۔ صورتِ حال یہ تھی کہ ایک طرف بڑے بڑے جاگیردار اور زمیندار تھے جن کے پاس ہزاروں ایکڑ اراضی تھی اور دوسری طرف چھوٹے چھوٹے زمیندار تھے، جن کی اراضی پُشت در پُشت اُن کے کنبوں کے افراد بڑھنے سے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں بٹ رہی تھی۔ اس طرح اُن کے زیادہ تر افراد متواتر زرعی مزدور بنتے جا رہے تھے کیونکہ اُن کے پاس اراضی نہیں تھی جس پر وہ نباہ کر سکتے اور ایسی کوئی صنعت بھی نہیں تھی جس کی طرف وہ رُخ کر سکتے۔

لہٰذا زراعت کے شعبے میں بڑی جد و جہد اراضی کی منصفانہ تقسیم رہی ہے تاکہ لوگوں کو زیادہ سے زیادہ تعداد کو پیٹ پالنے کا اچھا ذریعہ مل سکے۔ اس کے نتیجے میں ایسے قوانین بننے شروع ہوئے جن کا مقصد جاگیردارانہ نظام یعنی بڑی بڑی زمینداریوں کا انسداد کرنا تھا اور اس سلسلے میں بتدریج زمینوں پر سیلنگ کے قوانین عمل میں آئے جن کی رُو سے اراضی کی ملکیت کی بعض حدود مقرر کی گئیں اور فاضل اراضی اُن لوگوں میں تقسیم کی گئی جو اُس پر بٹائی داروں یا مزدوروں کے طور پر کام کرتے تھے، اور آخر میں بے زمین مزدوروں کو بھی فاضل زمین دی گئی۔ یہ عمل بھی مقابلتاً سست رہا ہے اور ابھی تک مکمل طور پر کامیاب نہیں ہوا۔ تاہم زیادہ تر پُرامن تبدیلی کے ذریعے سدھار لانے کی روایات کے باعث اور اُس سمت میں ونوبا بھاوے جیسے روحانی پیشواؤں کی طرف سے کی گئی مساعی کی وجہ سے یہ تقسیم کسی منظم تشدد یا خونریزی کے بغیر عمل میں آئی ہے۔

تاریخی طور پر بھارت میں ذات پات کا ارتقاء پیشوں کے گرد ہوا ہے اس لیے زمین زیادہ تر جاگیردارانہ طبقوں اور ذاتوں کی ملکیت میں رہی ہے۔ بے زمین مزدوروں یا چھوٹی چھوٹی زمینوں کے مالکوں کا تعلق زیادہ تر چھوٹی ذاتیں کہلانے والوں سے رہا ہے۔ لہٰذا اگرچہ زمینوں کی ازسرِنو تنظیم اور تقسیم کم و بیش پُرامن طور پر عمل میں آئی ہے تاہم اُن فرقوں کے درمیان سیاسی نوعیت کے اختلافات رہے ہیں جو قوانینِ اراضی کے تحت اپنی زمینوں سے محروم ہوئے ہیں اور جنھیں یہ زمینیں دی گئی ہیں۔ لیکن اس ازسرِنو تقسیم کے باوجود آبادی کا ایک بڑا حصہ ابھی تک زمین کے بغیر ہے اور جسے کوئی زمین نہیں دی جا سکتی۔

چنانچہ اس فاضل آبادی کو محض اُن دھندوں میں کھپانا ہوگا جن میں یا تو زرعی، صنعتی نوعیت کا مال تیار ہوتا ہے یا جو صارفین کی دیگر ضروریات پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ بہترین پالیسی تو یہ ہے کہ انھیں دیہی سیکٹر ہی میں ایسے پیداواری دھندے

فراہم کئے جائیں ورنہ وہ شہروں کا رُخ کرنے پر مجبور ہو جائیں گے جہاں انھیں کوئی مدد نہیں ملے گی اور انجام کار وہ گندی بستیوں میں چلے جائیں گے یا سڑکوں کی پٹڑیوں پر رہنے پر مجبور ہونگے لہٰذا دیہی علاقے زمینوں کی ایسی ملکیت کا منظر پیش کرتے ہیں جو مقابلتہً ضرورت کے مطابق رہ گئی ہیں اور جہاں زمیندار اور کاشتکار اپنی بہترین صلاحیتیں عمل میں لا رہے ہیں۔ وہ جدید سہولیات اور طریقوں کو بروئے کار لا رہے ہیں۔ اور آبپاشی کی سہولیات کے نقدان میں مون سون کے تابع اگر انھیں اُن کی پیداوار کی سود مند قیمتیں اور ضروری بیج اور کھاد وغیرہ دیا جائے تو وہ کافی اناج اور دالیں وغیرہ پیدا کر سکتے ہیں جس سے کم از کم ملک کی بنیادی ضروریات پوری ہو سکتی ہیں۔

لیکن یہ بھی تلخ حقیقت ہے کہ ملک کے بیشتر علاقے ابھی تک مون سون کے رحم و کرم پر ہیں جس کے عمل کے بارے میں کچھ پتہ نہیں چلتا اور اُس زمین کے فیصد میں کافی اضافہ نہیں ہوا جس پر آبپاشی کی جاتی ہے۔ اگرچہ ہمارے ملک میں بڑے بڑے دریا ہیں تاہم اُن کے پانی کا بہت بڑا حصہ بہہ کر سمندر میں چلا جاتا ہے۔ ہم ابھی تک کیمیائی کھاد، کیڑے مار دوائیوں، اعلیٰ قسم کے بیجوں اور برقی قوت کی قیمتوں پر بھی قابو نہیں پا سکے۔ نہ ہم اُن علاقوں میں بھی زرعی پیداوار اور صنعتی پیداوار کی قیمتوں میں برابری کا کوئی سسٹم پیدا کر سکے ہیں۔ جہاں صنعتی پیداوار چینی، روئی اور خوردنی تیلوں جیسے زرعی خام مال پر مبنی ہے۔ اس کے نتیجے میں زرعی سیکٹر اور صنعتی سیکٹر میں کام کرنے والے لوگوں کے درمیان آمدنی اور آمدنی کی تقسیم میں نابرابری پیدا ہوئی ہے۔ جغرافیائی طور پر بھی دیہی علاقوں اور شہری علاقوں میں رہنے والوں کے درمیان آمدنی کی غیر مساوی تقسیم ہوئی ہے۔

لہٰذا زرعی شعبہ میں مسئلہ دوگونہ ہے۔ خود زراعت کو بھی ایک صنعت کے طور پر تصور کئے جانے کی ضرورت ہے۔ جس پر صنعتی پیداوار سے متعلق قواعد کا اطلاق ہونا چاہیئے۔ بھارت میں کاشت کے لیے کل ۱۲۵ ملین ہیکٹرز زمین دستیاب ہے جس میں سے محض ۴۰.۵ ملین ہیکٹرز یعنی تقریباً ۲۵ فیصد ایسی ہے جس پر آبپاشی کی جاتی ہے۔ گو اس بات کو یاد رکھنا ضروری ہے کہ آبپاشی گزشتہ ۳۰ برس میں تقریباً دوگنی ہو گئی ہے۔ اور تاہم سمندر میں جانے والے پانی کی مقدار ۱۲۱۰ ملین ایکڑ فٹ ہے جب کہ زراعت کے لیے حاصل کئے جانے والے پانی کی مقدار بمشکل ۲۴۰ ملین ایکڑ فٹ ہے جو کل کا محض ۲۰ فیصد ہے۔

یہ بات سب جانتے ہیں کہ زرعی پیداوار بڑھانے میں آبپاشی اور پانی کی دستیابی کا بڑا ہاتھ ہے۔ جب اُس کی ضرورت ہوتی ہے ۱۹۵۱ء سے ۱۹۷۹ء تک کاشتکاری کے لیے آبپاشی کا فیصد بڑھنے سے اناج کی پیداوار بھی دُگنی ہو گئی ہے۔ لہٰذا اہم ترین کام دریائی پانی پر قابو پانا اور باقیماندہ قابلِ کاشت زمین کے لیے آبپاشی کی سہولیات فراہم کرنا ہے جو آج کلیتہً مون سون کے اُتار چڑھاؤ پر انحصار رکھتی ہے۔

زرعی پیداوار بڑھانے کے لیے دُوسری بڑی چیز کیمیاوی کھاد کا استعمال ہے۔ لیکن یہ بات یاد رکھنا ضروری ہے کہ اُن زمینوں کے لیے جہاں ہزاروں برس سے کاشت کی جا رہی ہے۔ کیمیاوی کھاد کے استعمال سے اس امر کی یقین دہانی ضروری ہے کہ نامیاتی اور غیر نامیاتی کھاد کے درمیان موزوں توازن برابر بنا رہے۔ تاکہ زمین کی قدرتی زرخیزی اور قابلِ تجدید صلاحیت برقرار رہے۔ اسی طرح کیڑے مار دوائیاں اور گھاس پھونس ختم کرنے والے کیمیکل بھی اس طریقے سے استعمال کئے جانے چاہئیں، جس سے قدرتی افزائش کا ماحول اور گرد و پیش متاثر نہ ہو۔ اتنا کچھ کہہ کر یہ حقیقت برقرار رہتی ہے کہ طبیعات کے شعبے کی مانند زراعت کے شعبے میں بھی ہم مصنوعی متوازن اجزا اور کیمیکلوں کا استعمال کر سکتے ہیں۔ تاکہ نہ صرف زمین بلکہ فصلوں کی بھی صحتمندانہ افزائش ہوتی رہے۔

بھارت اور اسی طرح دیگر ترقی پذیر ممالک میں کیمیاوی کھاد کا استعمال ترقی یافتہ ممالک کی نسبت کم ہو رہا ہے۔ مقابلے کی خاطر اگر ہم ایک دوسرے ترقی پذیر ملک، چین کو لیں جو ایسے ہی حالات کے تحت ہے تو ہم دیکھیں گے کہ اگرچہ چین میں پانی سے سیراب ہونے والی زمین بھارت کے مقابلے میں کچھ زیادہ ہے۔ یعنی وہاں ۴۶ ملین ہیکٹرز زمین پر آبپاشی ہوتی ہے اور بھارت میں ۴۰.۵ ملین ہیکٹرز زمین پر۔ تاہم چین میں ۸۱-۱۹۸۰ء میں کیمیاوی کھاد کی کھپت بہت زیادہ ہوئی ہے۔ جیسا کہ گوشوارہ (الف) سے ظاہر ہوتا ہے، وہاں نائٹروجن فرٹیلائزر تقریباً ۳ گنا اور فاسفیٹ فرٹیلائزر لگ بھگ دوگنا استعمال ہوتا ہے۔ پھر اگر ہم اس حقیقت پر غور کریں کہ چین نے بھارت کی تقریباً ۱۳۲ ملین ٹن ریکارڈ پیداوار کے مقابلے میں تقریباً ۳۰۰ ملین ٹن اناج پیدا کیا ہے تو ہم فرٹیلائزر جیسی اشیاء سے متعلق جدید طریقوں اور کاشتکاروں کے دیگر اعلیٰ طریقوں کے استعمال کی ضرورت کا احساس کر سکتے ہیں۔

کیمیاوی کھاد کے تعلق میں جو زراعت میں استعمال ہونے والی ایک اہم شئے ہے۔ بھارت اس امر پر بجا طور پر ناز کر سکتا ہے کہ گزشتہ ۳۰ برس میں ملک میں اس کی پیداوار میں بھاری اضافہ ہوا ہے۔ جبکہ نائٹروجن کھاد میں پیداواری صلاحیت تقریباً ۲۰۰ گنا بڑھ گئی۔ یعنی پیداوار ۱۹۵۱ء میں ۱۶ ہزار ٹن سے بڑھ کر ۸۲-۱۹۸۱ء میں ۴۰۰,۱۴۳ ٹن ہو گئی۔ فاسفیٹ کھاد میں وہ تقریباً ۸۰ گنا بڑھی یعنی ۱۹۵۱ء میں ۱۱ ہزار ٹن سے بڑھ کر ۸۲-۱۹۸۱ء میں ۹۵۰,۰۰۰ ٹن ہو گئی۔ توقع ہے کہ فرٹیلائزر کی پیداوار میں بہت بھاری اضافہ ہوگا جب چند برس میں گیس کی بنیاد پر کام کرنے والے نئے فرٹیلائزر پلانٹ نصب کئے

شے	بھارت	چین
زمین (ملین ہیکٹر میں)		
۱۔ کل زیر کاشت رقبہ	۱۶۴،۹۳ (۱۹۷۸-۷۹)	۹۸،۴۴ (۱۹۸۰)
۲۔ زیر آبپاشی زمین ۱۹۵۰-۵۱ میں	۲۰،۸۵	۳۰،۰۰ (۱۹۵۲)
۳۔ زیر آبپاشی زمین ۱۹۷۹-۸۰ میں	۴۰،۵۰	۴۶،۰۰ (۱۹۸۰)
فرٹیلائزر کی کھپت (ملین میٹرک ٹن)		
۱۔ نائٹروجن (این ۲)	۳،۷	۱۲،۱۰
۲۔ فاسفیٹ (پی ۲۰۵)	۱،۲	۲،۷
۳۔ پوٹاشس	۰،۶	۰،۵
خوراک پیداوار (ملین میٹرک ٹن)	۱۳۲،۰۰	۳۰۰،۰۰

ماخذ: فرٹیلائزر اسٹے ٹسٹکس ۱۹۸۱، فرٹیلائزر اسوسی ایشن آف انڈیا، نئی دہلی.

جائیں گے اور جب وہ پلانٹ کام کرنا شروع کردیں گے جو اس وقت زیر تعمیر ہیں۔ اگر موجودہ پلانٹ اپنی پوری صلاحیت کے مطابق کام کریں تو اس سے بھی فرٹیلائزر کی دستیابی میں بھاری اضافہ ہوگا۔

لیکن بڑی چیز جس سے زمین کی پیداواری صلاحیت بڑھائی جاسکتی ہے وہ ہے دریاؤں کا پانی جس پر ابھی تک پورے طور پر قابو نہیں پایا جاسکا، بہرحال بھارت میں دو طرح سے بھاری نقصان ہوتا ہے۔ یا تو بھاری اور بے قاعدہ مون سون سے بعض علاقوں میں سیلاب آتے ہیں جس سے قابل کاشت زمینیں تباہ ہوجاتی ہیں اور دیگر نقصان ہوتا ہے یا مون سون میں کمی سے اور بارش نہ ہونے سے قحط کی صورت میں تباہی نازل ہوتی ہے جس کے نتیجے میں مویشی ہلاک ہوتے ہیں اور دوسرا نقصان ہوتا ہے۔ بعض اوقات یہ آفات بیک وقت مختلف علاقوں پر نازل ہوتی ہیں. اگر ہم محض اپنے دریاؤں کے پانی پر قابو پاسکیں تو ان دونوں کو روکا جاسکتا ہے اُن میں کمی کی جاسکتی ہے۔ انجینئر اور سائنسدان برسوں سے مختلف دریاؤں کو ملانے کے بارے میں سوچ رہے ہیں جو تمام ملک میں پھیلے ہوئے ہیں۔ اور جو عملاً اپنی چوڑائی بڑھاتے ہوئے ملک کے پار چلے جاتے ہیں۔ اگر ان دریاؤں کو نہروں کے ذریعے ملانے کے طریقے کو فروغ دیا جائے تو اس سے نہ صرف باقیماندہ قابل کاشت اراضی پر آبپاشی میں مدد مل سکے گی بلکہ اس عمل میں پن بجلی کی پیداوار اور اندرون ملک میں جہاز رانی کی سہولت کی فراہمی کے علاوہ سیلاب اور خشک سالی پر بھی قابو پایا جاسکے گا۔ یہ ٹھیک ہے کہ یہ بہت بڑا کام ہے اور اس کے لیے بھاری سرمایہ کاری درکار ہوگی لیکن ہم جدید ٹکنالوجی اور عظیم افرادی قوت کے وسائل سے کام لے سکتے ہیں۔ اور اس کے لیے ایک مہم یا تحریک کے لیے عوام کو تیار کیا جاسکتا ہے. بھاگیرتھ (جو گنگا کو بہشت سے دھرتی پر لائے تھے) کی شدید اور ردینے مساعی سے تمام تر اقتصادی منظر تبدیل کیا جاسکتا ہے۔ اور بھارت اتنی زیادہ خوراک پیدا کرنے کی پوزیشن میں ہوجائے گا جس سے اس آبادی کا پیٹ پالا جاسکے گا۔ جو اب سے ۱۷ برس سے کم عرصے میں اس صدی کے آخر تک بڑھ کر ایک ارب تک پہونچ سکتی ہے۔

بعض اوقات یہ خیال اٹھتا ہے کہ ملکی طور پر متعلقہ پراجیکٹ جیسے کہ ملکی دریائی گرڈ اور دریاؤں کا اتصال جن میں ہمارے لکھو کھا نوجوان شامل ہوسکتے ہیں۔ ہمارے عوام کی جذباتی ہم آہنگی میں ایک عظیم مقصدی رول ادا کرسکتے ہیں۔ جہاں چاہ ہوتی ہے وہاں راہ ہوتی ہے۔ لیکن اگر ارادہ مضبوط ہو تو انسان بظاہر ناممکن کام کو بھی انجام دے سکتا ہے۔ اگر عملیت پسندی اور حقیقت پسندی کے نام پر ہم تمام سرگرمیوں کو افسر شاہی کے ضابطوں پر چھوڑ دیں تو قدرتاً ہر کام کو افسر شاہانہ طور طریقوں سے انجام دینا ہوگا۔ جس میں لاگت کا اندازہ معمول کی بنا پر کیا جاتا ہے۔ جہاں ۵۰ فیصد سے زیادہ بالائی اخراجات کے طور پر صرف ہوتا ہے۔ اور اس طرح انجام کار یہ دیکھا جاتا ہے کہ لاگت اس قدر زیادہ ہے کہ تمام تر پراجیکٹ ناقابل عمل بن گیا ہے۔

نام نہاد عملی لوگ ہیں جنھوں نے خصوصاً اقتصادی ترقی کے معاملے میں تقریباً پورے کا پورے جمود پیدا کیا ہے۔ انھوں نے سیاسیات اور ایڈمنسٹریشن میں مفادات خصوصی پیدا کئے ہیں۔ انھوں نے کالے دھن (جو بہت کم حصے کے پاس ہے) کی صورت میں غیر متوازن ترقی کو جنم دیا ہے۔ اور وہ تمام تر سیاسی اور سماجی، اقتصادی ڈھانچہ کی مجموعی بدعنوانیوں کے لیے ذمہ دار ہیں۔ اور تعجب کی بات یہ ہے کہ یہ لوگ سیاستدانوں کو قصوروار ٹھہرا کر چھوٹ جاتے ہیں جو خود جمودی اثر اور جوں کی توں حالت بنائے رکھنے سے متعلق مفادات خصوصی کی ذہنیت کے آگے جھک گئے ہیں۔

اگر گاندھی جی سیاسی آزادی کے حصول کے لیے ایک طاقتور سامراجی طاقت کے خلاف تمام

ملک کے نہتے اور افلاس زدہ اشخاص کو اکٹھا کرنے کا ناممکن کام انجام دے سکے تھے تو غریبی سے بھی اقتصادی آزادی کے حصول کے لیے یہی کام انجام دیا جاسکتا ہے۔ لیکن یہ کام عوام کو مجموعی طور پر انجام دینا ہوگا۔ یہ سچ ہے کہ اس کے لیے ایک لیڈر کی ضرورت ہے اور یہ بھارت کی خوش قسمتی رہی ہے کہ اُسے قومی اور حتیٰ کہ بین الاقوامی رتبے کے لیڈر ملتے رہے ہیں۔ پہلے جواہر لال نہرو کی صورت میں اور گذشتہ دنوں اندرا گاندھی کی صورت میں۔ لیکن جس چیز کی کمی ہے وہ ہے عزم و اعتماد جس کی زیادہ تر دانشوروں میں کمی ہے۔

شریمتی گاندھی ملک کی تیز رفتار اور منصفانہ ترقی سے متعلق عوام کی امنگوں کا ہمالیائی بوجھ اپنے کندھوں پر اٹھائے ہوئے ہیں۔

زرعی صنعتیں

چونکہ ہماری آبادی کا بڑا حصہ تقریباً ۸۰ فیصد، دیہی علاقوں میں بود و باش رکھتا ہے اور روزی کے لیے زیادہ تر زراعت یا متعلقہ پیشوں پر انحصار رکھتا ہے اس لیے یہ جاننا ضروری ہے کہ اس انسانی قوت کا پیداواری مقاصد کے لیے اس کے اپنے علاقے میں کیوں کر بہترین استعمال کیا جاسکتا ہے جو اس کے ساتھ ہی بے روزگاروں اور نیم روزگاروں کو سودمند کام فراہم کرے گی اور ایسا مال اور سروس بھی پیدا کرے گی۔ جس کی عوام کو اپنے حالاتِ زندگی بہتر بنانے کے لیے ضرورت ہے۔ اگر یہ دوگونہ مقصد حاصل کرنا ہے تو عوام کو روزگار فراہم کرنا ہوگا اور اس کے لیے بڑے پیمانے پر ہجرت یا آبادی کی منتقلی کی ضرورت نہیں ہوگی۔

جیسا کہ ہم نے پہلے دیکھا ہے زندگی کی نہایت ابتدائی ضرورت خوراک ہے۔ جہاں تک اس کے لحاظ سے اناج کی کل پیداوار عوام کی لگ بھگ ابتدائی ضروریات پوری کرتی ہے۔ اور حقیقی مسئلہ غلط تقسیم میں موجود ہے جو قوتِ خرید میں عدم توازن سے عمل میں آتا ہے۔ جیسا کہ ہم نے پہلے دیکھا ہے، بنیادی ضروریات کے لحاظ سے بھی ۵۰ فیصد سے زیادہ آبادی کو میسر نہیں ہے۔ اس کے بعد چند اشیاء کی ضروریات ہوتی ہے، وہ ہیں کپڑا، مکان اور گھروں کا ضروری سامان جیسے برتن، بنیادی فرنیچر، دودھ کے لیے مویشی، مرغیاں، سبزیاں، خوردنی تیل اور ایندھن۔ اب یہ ایک عام جانی بوجھی بات ہے کہ روایاتی طور پر یہ تمام اشیاء دیہی علاقوں میں پیدا ہوتی تھیں اور ان علاقوں کی تمام تر آبادی زیادہ تر پیشوں کے لحاظ سے منقسم تھی (یہ پیشے پشت در پشت چلے آرہے تھے اور اس سے لوگوں کو ان میں مہارت ہو جاتی تھی) انہی پیشوں سے تمام تر سماج کی ضروریات پوری ہوتی تھیں۔ مثال کے طور پر جولاہے خاندانی پیشے کے طور پر کپڑا تیار کرتے تھے۔ اس طرح لوگ بڑھئی، لوہار، کمہار اور چمڑا کمانے والوں کے طور پر بھی کام کرتے تھے۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ جو مال درکار ہوتا تھا وہ زیادہ تر دیہی علاقوں ہی میں تیار کیا جاتا تھا۔ جاگیرداری کے دور میں شہر زیادہ تر تجارتی مرکز یا کی صورت میں راجاؤں کی راجدھانیوں کے گرد ہوتے تھے۔ لیکن صنعت کاری کے عمل میں آنے سے بڑے بڑے شہروں میں آبادی کا اجتماع ہونے لگے جہاں صنعتوں نے مشینوں کے ذریعے بڑے پیمانے پر مال تیار کرنا شروع کر دیا اور اس طرح روایاتی پیشوں میں مصروف لوگ اپنے کام دھندے سے محروم ہوگئے۔ جن لوگوں نے صنعتوں پر کنٹرول کیا انہیں سستے مزدور حاصل کرنے اور زبردست مارکیٹنگ کے ذریعے دیہی علاقوں میں روایاتی مال تیار کرنے والوں کو ہٹانے کا فائدہ حاصل تھا۔ اُس طرح وہ عملاً روایاتی پیشوں کو ختم کرنے میں کامیاب ہوگئے۔ چونکہ ان نئی صنعتوں پر چند اشخاص کا کنٹرول تھا اس لیے جو فاضل (دولت) پیدا ہوئی وہ ان چند اشخاص کے ہاتھوں میں رہی اور اس طرح پرانے جاگیرداروں کی جگہ نئے بڑے بڑے سرمایہ دار ظہور میں آئے۔

لہٰذا یہ غور کرنا ضروری ہے کہ ہم ایسی صورتِ حال کو کیوں کر بحال کرسکتے ہیں جس میں انسانی پیداواری سرگرمیوں کا مرکز بنے اور اُسے کام مہیا کیا جائے خواہ اس کا مطلب یہ ہو کہ اُسے تحفظ دیا جائے اور اُس سے ترجیحی سلوک کیا جائے۔ اگر تحفظ کا ذکر کیا جائے تو کیا بڑے بڑے سرمایہ دار خود بیرونی کارخانہ داروں سے تحفظ نہیں چاہتے اور کیا ملکی پیداوار کی ترقی کے نام پر اُنہیں تحفظ نہیں دیا گیا؟ دوسرے الفاظ میں اگر آپ ملکی سرمایہ دار ہیں تو مملکت کے لیے آپ کو تحفظ دینا ضروری ہے، اور یہ یقین دلانا بھی ضروری ہے کہ آپ کو ایک ایسا صنعتی ڈھانچہ یا سسٹم برقرار رکھ کر اپنے ہی عوام کا استحصال کرنے کا حق حاصل ہے جس سے ملک بھر کے انسانوں کی اکثریت کے لیے اپنا دھندہ کرنا ناممکن ہو جائے اور وہ بھیانک افلاس کا شکار ہو جائیں۔

لہٰذا یہ محسوس کیا جاتا ہے کہ بعض شعبوں کو جن کا تعلق زندگی کی بنیادی ضروریات سے ہے خود روزگار بنیاد پر پیداوار کے لیے دیہی علاقوں میں رہنے والے لوگوں کے لیے تمام تر وقف کیا جانا چاہیے۔ حکومت کی طرف سے جو کچھ کیا جانا چاہیے وہ یہ ہے کہ اُس مال کے لیے فروختگی کی سہولیات فراہم کی جائیں جو خود روزگار غیر مرکوز سیکٹر میں تیار ہو۔

نیشنل مارکیٹنگ آرگنائزیشن جس کا ذکر ہم پانچویں باب میں کریں گے۔ ایک ایسے نظام کی تخلیق کی ذمہ دار ہوگی جو خام مال کی فراہمی کو یقینی بنائے، مختلف شعبوں میں تربیت کی سہولیات دے اور خود روزگار والوں کی طرف سے تیار کیے گئے مال کی فروختگی کا بندوبست کرے۔ مثال کے طور پر ایسی اشیاء جیسے کپڑا، خوردنی تیل، صابن، دیاسلائیاں، بیڑیاں، برتن، چھوٹے اوزار اور سامان، سبزیاں، انڈے، پولٹری، پگڑی، جوتے، چھلے، ریشمی کپڑا، اور حتیٰ کہ مصنوعی ریشے سے بنا

جو اکھیڑا، برقیاتی سامان کے لیے امدادی اشیاء، پھل اور سبزیاں، ڈبوں میں بند کرنا، اچار اور پاپیڑ، پلاسٹک کے کھلونے اور برتن غرضیکہ وہ تمام سامان جو گھریلو صنعت میں تیار ہوتا ہے اس وقت دو باتوں نے پیداوار میں رکاوٹ ڈال رکھی ہے، یہ ہیں۔ موزوں لاگت پر خام مال کا دستیاب نہ ہونا اور تیار کیے گئے مال کے لیے فروختگی کی سہولیات کا فقدان۔

ایک بار نیشنل مارکیٹنگ آرگنائزیشن ان امور کی انجام دہی کی ذمہ داری لے تو کوئی وجہ نہیں کہ پیداواری سرگرمیاں ملک بھر میں خصوصاً مزدوریات زندگی کے شعبے میں نہیں پھیل سکتیں۔ شہری مرکزوں میں دیہی صنعتیں ہونی چاہئیں جو ایسا مال تیار کریں جو لازمی طور پر (مقدار اور کوالٹی کے لحاظ سے) بڑے پیمانے پر تیار کیا جا سکے اور وہ کسی حد تک سوفسطائی قسم کا مال تیار کریں یا وہ زیادہ تر آرام اور تعیش کا سامان بنائیں۔ یا وہ چیدہ کھپت کے شعبوں یعنی ڈیفنس اور ٹرانسپورٹ کے لیے سامان تیار کریں۔ یہاں بھی ایسا امدادی سامان بنائے جانے کا موقع ہے جو چھوٹی چھوٹی صنعتوں کے لیے روزگار مہیا کرے گا۔ مختصراً کم از کم قابل کار فرد کی پیداواری قوت پر زور دیا جانا چاہیئے۔ اُسے مال تیار کرنے دیجیئے خواہ ابتدائی مرحلے میں وہ ایسی کوالٹی کا مال تیار نہ کر سکے جیساکہ خودکار مشینوں سے کیا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر اگر ایک گاؤں میں ایک خود روزگار نوجوان ایک صابن تیار کرتا ہے تو وہ ایسی اچھی کوالٹی کا نہیں ہو سکتا جیسی اچھی کوالٹی کا بڑے بڑے کارخانے تیار کرتے ہیں۔ لیکن اس میں ایک صابن کی تمام خصوصیات ہو سکتی ہیں۔ لہٰذا اگر ہم غیر مرکوز طریقے سے قصداً اسے فروخت کرنے کا فیصلہ کریں تو ایسے اقدام سے اُسے رفتہ رفتہ اپنی پیداوار کو بہتر بنانے میں مدد ملے گی۔

آیئے اب ہم روایاتی دستکاریوں کے وسیع میدان پر غور کریں جو متعدد مشکلوں کے باوجود بچ پائی ہیں۔ یہ دستکاریاں اعلیٰ ثقافتی و فنی قدر و قیمت کی حامل ہیں۔ لکڑی پر نقش بنانا، سنگتراشی، ہاتھ سے بنے قالین، خوبصورتی سے بُنے ہوئے کپڑے۔ ہمارے دستکاروں کی عملاً تمام اشیاء میں نہ صرف جمالیاتی حُسن پایا جاتا ہے بلکہ اُن میں فنی کشش بھی موجود ہے جن کے باعث وہ ایک ایسے دور میں نہایت قابلِ قدر اشیا بن گئی ہیں جن میں زیادہ تر اشیا مشینوں سے تیار ہوتی ہیں اور ان کا معیار اعلیٰ ہوتا ہے۔ لہٰذا ہمیں ان روایاتی دستکاریوں کی حوصلہ افزائی کرنی چاہیئے اور یہ خوشی کی بات ہے کہ آج بھارت میں اس بات کی طرف بڑی توجہ دی جا رہی ہے۔ ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ ہمارے کاریگروں کی بنی ہوئی اشیا کی بین الاقوامی منڈیوں میں خصوصاً متمول مغربی ملکوں میں بڑی مانگ ہے۔ جہاں خودکار مشینوں سے مال تیار ہوتا ہوتا ہے اور جو مشینوں سے عاجز آ چکے ہیں۔

پس، ملک کے دونوں منظم اور غیر منظم سیکٹروں میں نیشنل مارکیٹنگ آرگنائزیشن کی جانب سے اس کے تحرک و پرچون یونٹوں کے ذریعے پیداوار میں متوازن طور پر تال میل پیدا کیا جائے گا جو بکری کا کام سنبھال لیں گے۔ جبکہ پیداواری سیکٹر (منظم اور غیر منظم شعبوں میں) پیداواری پہلو کو سنبھال لے گا۔ یہ تنظیم استحصال پسندی سے کام نہیں کریگی۔ اس سے واقعی فاضل مال تیار ہوگا اور چونکہ ملک کی تمام تر پیداواری قوت کو مال اور سروسیں تیار کرنے کی صلاحیت فراہم ہوگی اس لیے ملکی پیداوار موجودہ وقت کے مقابلے میں بہت زیادہ ہوگی۔ جبکہ پیداواری کام بمشکل آبادی کے چند فیصد حصے کو دستیاب ہے۔

زرعی صنعتی سیکٹر میں ایک نہایت اہم ادارہ جو قائم کیا جا سکتا ہے وہ ہے ایگرو۔ سروس سینٹر جو ہر بلاک سطح پر واقع ہونا چاہیئے اور جسے میکانکی اور برقی ساز و سامان جیسے پمپوں، زرعی اوزار (ٹریکٹر اور کریشر)، تیل کے کولہوؤں اور برقی اور برقیاتی سامان (ریڈیو، ٹیلی ویژن سیٹ) کی مرمت اور رکھ رکھاؤ کی سہولیات فراہم کرنی چاہیئے۔ ایگرو سروس سینٹروں کو علاقے کے کسانوں کی ضروریات کے مطابق کھاد، کیڑے مار دوائیاں اور بیج وغیرہ بھی فراہم کرنے چاہئیں۔ اس کے علاوہ ان سینٹروں کو خود روزگار لوگوں کو دیگر اشیا بھی مہیا کرنی چاہئیں۔

ایگرو۔ سروس سینٹروں کو توسیع دیکر مقامی مارکیٹنگ سینٹروں میں بدلا جا سکتا ہے اور وہ دیگر اداروں سے تال میل قائم کر سکتا ہے۔ ان سروس سینٹروں کا ایک جال ہی تکنیکی طور پر قابل بیشتر تعلیم یافتہ نوجوانوں کو روزگار مہیا کرے گا۔ اس طرح جب تمام آبادی پیداواری سرگرمیوں میں مصروف ہو جائیگی۔ تو نوجوانوں کے لیے مواقع کی کمی نہیں رہے گی اور اس سے اُن کا احساسِ مایوسی ختم ہو جائے گا۔

ان مذکورہ بالا شعبوں اور دھندوں سے مزدوروں کو کام مل سکتا ہے جو دن بدن کھیتی میں فاضل ہوتے جا رہے ہیں۔ زراعت کے شعبے میں بھی مشینوں کے ذریعے کام لینے سے بے روزگار اور نیم روزگار مزدوروں کی تعداد بڑھتی جا رہی ہے۔ پہلے جس قسم کے پیشوں کا ذکر کیا گیا ہے اُن پر لگانے سے انھیں جو فائدہ پہنچے گا اُس سے اُن کی قوتِ خرید بڑھانے میں مدد ملے گی۔ زمین پر بوجھ کم ہوگا — کاشتکاری کی بہتر اور جدید تکنیکیں اختیار کی جائیں گی اور اس کے بدلے میں پیداوار بڑھانے میں مدد ملے گی۔ درحقیقت جب خوراکی پیداوار جیسی لازمی اجناس کی دستیابی کے ساتھ ساتھ پیشوں اور قوتِ خرید میں اضافہ ہوتا ہے تو ایک ایسا سلسلہ دار اثر پیدا ہوتا ہے جس سے ہر طرف ترقی عمل میں آتی ہے۔ صرف اُس وقت جب آمدنی کی تقسیم میں توازن کلیتہً بگڑ جاتا ہے جیساکہ وہ آج ہے تو ایک ایسی صورتحال پیدا ہوتی ہے جب میانائڈ چند لاکھ ٹن چینی کی پیداوار بھی ناقابلِ کنٹرول حد تک فاضل معلوم ہوتی ہے کیونکہ بین الاقوامی منڈیوں

میں اس کی عملاً مانگ نہیں ہوتی اور تب انجام کار چینی سستے داموں پر فروخت کرنی پڑتی ہے۔ یہ حیرانی کی بات ہے کہ پالیسی ساز بین الاقوامی منڈی میں ارزاں قیمت پر چینی فروخت کرنے کو تیار ہو جاتے ہیں۔ اور وہ اس خوف سے ملکی منڈی میں کم نرخوں پر فروخت نہیں کرتے کہ اس سے قیمت کم ہو جائے گی اور اس طرح اُن کے منافع پر بُرا اثر پڑے گا

مانگ اور سپلائی کے قانون میں یہ عدم توازن جس کا ضرورت کے ساتھ کوئی تعلق معلوم نہیں ہوتا نہایت واضح طور پر اس مثال سے ظاہر ہوتا ہے۔

دیہی پروگرام

اگرچہ دیہی ترقی اور بہبود کے پروگراموں پر جو نئے ۲۰ نکاتی پروگرام میں شامل ہیں بہت سارا پیسہ خرچ کیا جا رہا ہے۔ تاہم یہ حیرانی کی بات ہے کہ ان پروگراموں کو ایک طرف زرعی پیداوار کے ساتھ منسلک نہیں کیا گیا اور دوسری طرف پہلے سے موجود دیہی سماج کی تکنیکی اساس سے بھی اُنھیں جوڑا نہیں گیا۔ "آئی آر ڈی پی" جیسے بعض ان پروگراموں میں جو سب سے بڑا پروگرام ہے۔ غریب کنبوں میں سے غریب ترین کی نشان دہی کی جاتی ہے، ایسی اقتصادی سرگرمیوں کا بھی انتخاب کیا جاتا ہے جو مقامی طور پر روزی وغیرہ دے سکیں اور تب کنبوں یا افراد کو امداد دے کر ان سرگرمیوں میں کھپایا جاتا ہے تاکہ وہ ان سرگرمیوں سے متعلقہ آلات وغیرہ خرید سکیں۔ لیکن یہ دیکھا گیا ہے کہ یہ سرگرمیاں اکثر کنبوں پر ٹھونسی جاتی ہیں اور وہ ایسی نہیں ہیں جن کا ان کنبوں کو پہلے سے تجربہ ہو۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ بھارت میں منصوبہ سازوں نے کبھی بھی اُن خطوط پر دیہاتیوں کی عظیم مہارت کو موزوں طور پر بروئے کار لانے کی کوشش نہیں کی جن پر اُنھوں نے صدیوں سے دیہی معاشروں کو زندہ رکھا ہے۔

دیہات کے چمڑا کمانے والے موچی، لوہار، سُنار، کمہار بڑھئی، جولاہے، دست کار، دھات کا کام کرنے والے، دائی اور وید وغیرہ کو تقریباً پورے طور پر نظر انداز کیا گیا ہے۔ ہُنروں کی اعلیٰ درجہ بندی، تربیت، امداد، اوزار، برقی قوت وغیرہ۔ کچھ بھی ان ماہر دستکاروں کو فراہم نہیں کی گئی بھلے ہی ان کی مصنوعات کی شہروں اور قصبوں، اُونچی سوسائٹی اور حتیٰ کہ برآمدی تجارت میں بھی اکثر مانگ ہوتی ہے۔ دیہی ترقیات کے آج کے پروگرام لوگوں کو واقعی اُن سرگرمیوں سے نکال باہر کر رہے ہیں جن کا اُنھیں تجربہ ہے اور اکثر اُنھیں ایسے دھندوں میں ڈال رہے ہیں جن کے بارے میں اُنھیں کوئی علم نہیں ہوتا۔ لہٰذا یہ ضروری ہے کہ ان پروگراموں کے دستورکار کو دُرست کیا جائے اور دیہی ماہرین کو تکنیکی امداد اور مشینوں اور آلات وغیرہ کے لیے سرمایہ دینا شروع کیا جائے تاکہ ان دستکاروں کو ان کے پاؤں پر کھڑا کیا جا سکے اور دیہی کارکنوں کی پیداواری صلاحیت کو بڑھایا جا سکے۔

یہ بھی ضروری ہے کہ جن کارکنوں کو "این۔ آر۔ ای۔ پی" کے تحت کام ایسی بڑا اعتدال پیداواری اور غیر پیداواری سرگرمیوں جیسے دیہی کمیونٹی سینٹر اور سرپنچ کے دفتر وغیرہ کی تعمیر کے لیے دیا جاتا ہے۔ اُنھیں زراعت سے وابستہ اور انتہائی پیداواری کام پر لگایا جائے جیسے کہ تالابوں سے مٹی اور ریت وغیرہ نکالنا، کھیتوں کو پانی پہنچانے والی نالیوں کی تعمیر، کنوؤں کی کھدائی، کھیتوں کو ہموار کرنا، باندھ باندھنا اور باڑھ لگانا۔ اس سے فی کس اور اخراجات کے فی یونٹ کے حساب سے پیداواری صلاحیت میں اضافہ ہوگا۔ اور بہتر اور زیادہ مستحکم آمدنی کی تخلیق ہوگی۔

آج نظری طور پر ہم اگرچہ عظیم تر پیداوار چاہتے ہیں تاہم عملی طور پر حقیقی مانگ میں کمی کے باعث عظیم تر پیداوار از خود ایک جُرم بن جاتی ہے۔ مثال کے طور پر جس وقت زیادہ گنّا پیدا ہوتا ہے تو کاشتکاروں کو بتایا جاتا ہے کہ اُن کے ہاتھ تیار تمام تر چینی فروخت نہیں ہو سکتی۔ واضح اور عملی طور پر ہر دوسری جنس کے بارے میں ایسا ہی ہوتا ہے کیوں کہ منڈی محدود عوام کی ضروریات سے متعلق ہوتی ہے۔

لیکن صورتِ حال میں بھاری تبدیلی اُس وقت عمل میں آئے گی جب مال ملک بھر میں تمام قابل کار اشخاص کی طرف سے تیار کیا جائے گا، جب اُنھیں موزوں قوتِ خرید حاصل ہو جائے گی۔ اور جب ساری آبادی حقیقی منڈی بن جائے گی، ہر شعبے میں مال تیار کرنے والوں کو فائدہ پہنچے گا۔ کُل قومی پیداوار بہت زیادہ بڑھ جائے گی اور جو فاضل پیداوار دستیاب ہوگی اُسے سائنس اور ٹکنالوجی میں تحقیق و ترقی جیسے ترجیحی شعبوں میں استعمال کیا جا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ ہم اس پوزیشن میں بھی ہو جائیں گے کہ بیرونی ملک سے ترقی یافتہ ٹکنالوجی حاصل کریں اور اُس میں بہتری لائیں۔ مزدوروں کی بھاری تعداد ایک بوجھ بننے کے بجائے جو کہ وہ آج ہے۔ مال اور سروسوں کی پیداوار میں ایک اثاثہ ثابت ہوگی جس سے نہ صرف ہمارے عوام کی ضروریات پوری ہوں گی بلکہ اُنھیں کم قیمت پر پہلے ساتھی ترقی پذیر ملکوں کو اور بعد میں ترقی یافتہ دنیا کی منڈیوں میں بھی سپلائی کیا جائے گا۔ ایک اور غور طلب بات یہ ہے کہ بھارت جیسے ملکوں کی بھاری آبادی کی کُل اقتصادی ترقی سے خود اُس مال کے لیے ایک بڑی منڈی کھل جائے گی جو ترقی یافتہ ملکوں میں تیار ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک ملک کے اندر یا دنیا بھر میں تمام متعلقین کا باہمی مفاد اس امر میں ہے کہ خام مال کی دستیابی کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے مال نہایت کفایتی طور پر تیار کیا جائے۔ مثال کے طور پر لکڑی کی چیزیں جیسے کاغذ، فرنیچر، اور جہاز اُن ملکوں یا علاقوں میں تیار کرنا ارزاں تر ہے، جہاں لکڑی کثرت سے پیدا ہوتی ہے۔ اس کے بجائے ایسی اشیاء تیار کرنے کے لیے لکڑی دوسرے ملکوں کو بھیجنے سے

زیادہ لاگت آتی ہے۔ یہی استدلال عملاً تمام دوسری اجناس پر صادق آتا ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ موجودہ دنیا میں جس کی وسعتیں سکڑ رہی ہیں معیشت کیوں کر کام کرتی ہے۔ تمام سودے باہمی مفاد میں انجام دیے جا سکتے ہیں بشرطیکہ کوئی بھی حصہ آبادی ساتھی انسانوں کے استحصال کرنے کے حق کا دعویٰ نہ کرے اور جدید ہتھیاروں کے ذریعہ طاقت کے استعمال سے اُس حق کو واجب نہ ٹھہرانا چاہیے۔ مختصراً اس طرح ہتھیاروں کی دوڑ کے ذریعہ پیدا ہونے والا بحران اور طاقت کے لیے تمام تر جد و جہد ماند پڑ جائے گی۔

ہم ایک ایسے طریق کار (یا ایک آدرش) پر بحث کریں گے جس میں مساوی بنیاد پر اقتصادی سرگرمیوں کے بڑھے بڑے عناصر کو بروئے کار لانے کی صلاحیت ہو گی۔ اسے اس طرح عمل میں لایا جائے گا جس سے خود (سماجی) ڈھانچہ میں اس امر کا یقین دلایا جائے گا کہ: ۱۔ سماج کا ایک حصہ دوسرے حصے کا استحصال نہیں کرتا۔ ۲۔ یہ پیداوار اور تقسیم دونوں کے شعبوں میں انفرادی پہلکاری کے لیے زیادہ سے زیادہ تحریک اور موقع فراہم کرتا ہے۔ ہمارا اقتصادی ڈھانچے میں کم از کم بندشیں ہوں اور تمام تر نظام کار اس ڈھنگ سے کام کرے جس سے ہر حصہ آبادی کو مناسب صلہ ملے اور اس طرح پیداوار میں مجموعی طور پر اضافہ ہو اور اس طرح وہ فاضل بن جائے۔ اس طرح یہ اقتصادی جمہوریت کا تصور ہے جو نہ صرف بھارت بلکہ دنیا کے تمام ملکوں میں قابل عمل ہو سکتا ہے۔ یہاں تجویز کیے گئے ڈھانچے سے وہ مقصد حاصل ہو گا جس کا تصور اُس عمل کے مجموعی نتیجے میں کیا گیا ہے جس کی رہنمائی مملکت نہ صرف عوام بلکہ تمام علاقوں کے لیے بھی متوازن اقتصادی ترقی کی جانب کرے گی۔ اس سے موجودہ ڈھانچہ بھی ختم ہو جائے گا جس میں صرف مرکز ہی خط کی قیمت پر نشو و نما پاتا ہے۔

تعلیم اور سماج کا فروغ

تعلیم جس میں جدید ٹکنالوجی کے استعمال کی تربیت لازمی ہو کم ترقی یافتہ ممالک کے عوام کی متوازن اور تیز رفتار اقتصادی ترقی میں مادی طور پر حصہ لے سکتی ہے۔

بھارت میں رسمی تعلیم کے شعبے میں ایک یہ خرابی پیدا ہوئی ہے کہ لوگوں کو خواندہ بنا کر اور اُن میں انسانیات کے زُمرے کے تحت آنے والے مضامین کا علم پیدا کر کے نیم تعلیم یافتہ لوگوں کی ایک بڑی فوج پیدا کی گئی ہے۔ یہ لوگ اپنے روایتی پیشیوں اور ہنروں سے اُکھاڑ دیے گئے ہیں اور انھیں کوئی جدید تکنیکی ہنر فراہم نہیں کیا گیا۔ اس کے نتیجے میں وہ آخری نظام کے جرنیل بن گئے ہیں۔ وہ اپنے اردگرد کی سماجی تبدیلی اور سیاسی ڈھانچے یا سسٹم سے بھی آگاہ ہیں جو اُن کی حالت سُدھارنے میں قاصر ہے۔ وہ اعلیٰ تر معیارِ زندگی حاصل کرنے کے آرزو مند ہیں لیکن اُسے پا نہیں سکتے۔ وہ نوجوان ناگزیر طور پر مایوس اور غصّہ ور ہو جاتے ہیں۔

اعلیٰ مہارت رکھنے والے نوجوانوں کی حالت میں بھی خصوصاً جن کا تعلق سائنس اور انجینیرنگ سے ہے یہی معاملہ ہے کیوں کہ موجودہ پیداواری عمل ایک نہایت چھوٹی منڈی تک محدود ہے جس میں مال کم و بیش بڑے پیمانے پر خودکار مشینوں سے تیار ہوتا ہے اور تکنیکی طور پر قابل اشخاص کی تعداد کم ہو جاتی ہے۔

لہٰذا واحد حل یہ ہے کہ تمام تر آبادی کی ترقی میں وسیع تر متوازن اندازِ نظر اپنایا جائے۔

اگر پیداواری قوتوں کو مساوی شرکت کے اختیارات دے کر اُن کے مابین متوازن باہمی عمل کو یقینی بنانے کے لیے احتیاط برتی جائے تو یہ خوف بلا شبہ کافور ہو سکتا ہے کہ تینوں سیکٹر، صانع، مزدور اور سرمایہ دار مل جائیں گے اور پیدا ہونے والے فاضلات کا بڑا حصہ ہڑپ کرنے کے لیے ساز باز کریں گے۔ اس جگہ مملکت قدم رکھ سکتی ہے جو مالی اداروں کے ذریعے کام کرتی ہے۔ اور خاص فاضلات کی واحد محافظ ہے مملکت متوازن ترقی لانے کے لیے فاضلات کا استعمال کر کے (دیہی علاقوں اور کم ترقی یافتہ خطّوں میں بے روزگاروں کو روزگار کا معقول ملازمتوں کے زیادہ مواقع فراہم کر کے) اور منڈی کی قوتوں کی تنظیم کی حوصلہ افزائی کر کے بھی اس امر کی روک تھام کر سکتی ہے کہ چند اشخاص پیدا ہونے والے قومی فاضلات کو ہڑپ کر جائیں۔

سماج میں ایک بار بنیادی ضرورتوں اور آسائشوں کی یقین دہانی ہو جائے تو ہتھیانے کا احساس زیادہ تر رتبہ بلند کرنے کی خواہش اور اس جاہ سے تحریک پاتا ہے کہ زیادہ سے زیادہ دولت پیدا کرنے کے لیے مقابلہ کیا جائے اور اس کی نمو کی جائے۔ اس کے علاوہ دولت اس لیے بھی حاصل کی جاتی ہے کہ اُس سے سیاسی طاقت ملتی ہے۔ اگر اقتصادی نظام یا خود سماجی ڈھانچہ ہی ان امکانات کا خاتمہ کر دے اور اس طرح چند اشخاص کو فاضلات کی جمع خوری نہ کرنے دی جائے تو رُتبے کے تین عناصر یعنی حسد، روپیہ کی طاقت اور سیاسی طاقت کا انسداد کیا جا سکتا ہے۔

مجوزہ نظام کے تحت پیداواری تنظیمیں اور مالی ادارے اور مملکت بھی صحتمندانہ مقابلہ آرائی کا اہتمام کرنے کے لیے موزوں احتیاط سے کام لیں گی۔ اور اس سلسلے میں تمام اشخاص کو اُن کی پسند کے شعبوں میں اعلیٰ مہارت کے حصول کے لیے موزوں مواقع کو یقینی بنائیں گی۔ چونکہ کوئی اجارہ داری نہیں ہو گی اس لیے لوگوں کو مقابلے کے لیے عظیم تر آزادی حاصل ہو گی۔ اگر برابر والوں کے درمیان دوڑ میں بہترین شخص جیتتا ہے تو اس پر کسی کو دُکھ نہیں ہو گا کیوں کہ دوسروں کے لیے ہمیشہ موقع رہے گا کہ وہ مستقبل میں بہتر انجام دہی کے لیے تربیت حاصل کریں اور محنت سے کام کریں۔

لہٰذا اقتصادی جمہوریت کے تحت تعلیم کا مطلب محض رسمی تعلیم نہیں ہو گا بلکہ اس میں پیشہ ورانہ یا تکنیکی تعلیم لازمی طور پر شامل ہو گی اس سے اس امر کی یقین دہانی ہو گی کہ ہر شخص مال پیدا کرنے

یا سروس انجام دینے کے لحاظ سے اپنا حصہ ادا کرنے کے لیے کافی حد تک قابل ہے۔ اس طرح انجام کار۔ تعلیم اعلیٰ تر قوتِ خرید کے حصول کے لیے کسی شخص کی صلاحیت کو لازمی طور پر بڑھاتی ہے۔ انجام کار آخری تجزیے میں سرمایہ محض جمع شدہ قوتِ خرید ہے اور نرخ محض اُس قیمت کی علامت ہے جو اُس مال اور سروسوں میں جوڑا جاتا ہے جس پر مال یا سروسیں خریدی جاتی ہیں۔ یا مختصراً اُن کی مانگ ہوتی ہے۔

لہٰذا تعلیم کا ابتدائی مقصد ہر شہری اور خصوصاً نئی نسل کو اپنے علم و ہنر کے حصول میں مدد دینا ہے جس سے وہ سماج کا پیداواری اور تخلیقی رکن بن سکے۔ ایک بار یہ مقصد پورا ہو جائے تو یہ ضروری ہے کہ تعلیم فرد کو مزید علم و ہنر کی راہوں تک پہنچائے جس سے سائنسی تحقیق کے نئے اُفق کھلیں گے جس سے وہ نہ صرف کائنات اور ماحول کے تحفظ کے بارے میں زیادہ علم حاصل کر سکے گا بلکہ اپنے اندر بھی جھانک سکے گا اور ایسی ذہنی قابلیتوں کو فروغ دے سکے گا جس سے وہ بہت حد تک سکون و توازن، وسیع تر تناظر اور ہم آہنگی کے حصول کے لیے مجموعی صلاحیت کو فروغ دے سکے گا۔ انسان اس عمل میں اعتماد و عزم کو فروغ دیتا ہے اور اس سلسلے میں مسلسل سائنسی تحقیق میں مصروف رہتا ہے اور کسی بھی ترقی کو آخری ترقی تسلیم کرنے سے انکار کرتا ہے۔

بھارت جیسے ملکوں میں دیہی علاقوں کے عام شخص کی پرورش و تربیت پیشہ ورانہ دستکاری اور ہنرمندی کی روایات میں ہوئی ہے جو اُس نے پشتوں سے اس عام تعلیم کے ہمراہ حاصل کیے ہیں جو اُسے سنتوں اور سادھوؤں سے تلاوت کے ذریعے ملی ہے اور جسے اُس نے من لگا کر سیکھا ہے۔ اُن کی تعلیمات کس قدر سادہ لیکن دلچسپ سماعی و بصری طریقوں جیسے کتھا کہانیاں، رقصوں، ناٹکوں، موسیقی اور ڈرامائی شکلوں سے پہنچی ہیں۔ اور بھارت کے عام لوگوں کو کسی بھی بنیادی معیار سے غیر تعلیم یافتہ تصور نہیں کیا جا سکتا۔ بھلے ہی اُن میں سے بیشتر ناخواندہ ہوں۔ وہ نہ صرف اعلیٰ اخلاقی قدروں کے مالک ہیں بلکہ اُن میں غیر معمولی جبلّی فنی ہنر بھی پائے جاتے ہیں اور اس کے علاوہ اُن میں بڑی سوجھ بوجھ بھی پائی جاتی ہے۔ ان لوگوں نے بار بار ثابت کر دیا ہے کہ وہ نہ صرف زرعی شعبے بلکہ صنعتی شعبے میں تازہ ترین ٹکنالوجی جذب کرنے کی بھی صلاحیت رکھتے ہیں۔

سیاسی میدان میں جمہوریت کے لحاظ سے عوام کی کارکردگی بلاشبہ قابلِ تعریف رہی ہے۔ ایسی بات نہیں ہے کہ انھوں نے سیاستدانوں یا سیاسی پارٹیوں کو ناکام بنایا ہے۔ اگر کچھ ایسا ہوا تو معاملہ اس کے برعکس ہے۔ بیشتر انتخابات میں انھوں نے پورے دل سے اور کسی جھجک کے بغیر ایک خاص پارٹی کو ووٹ دے کر واضح اقتدار دیا ہے۔ انھوں نے شاذ ہی نیم دلی سے کام کیا ہو۔ یہ لازمی طور پر سیاستدان ہی ہیں جو ایسی تبدیلیاں لانے اور ایسے اقدامات کرنے میں ناکام رہے ہیں، جو واقعی عوام کے حالاتِ زندگی کو بہتر بناتے اور صحیح معنوں میں اُن کی حالت سدھارتی۔ سیاستدان ناکام رہے ہیں کیوں کہ وہ مفاداتِ خصوصی پر قابو نہیں پا سکے اور اس لیے بھی کیوں کہ اُن کے مابین نام نہاد تعلیم یافتہ اور پڑھے لکھے لوگ زیادہ تر اُس کلاسیکی اقتصادی نظریوں کے گرویدہ ہو گئے ہیں۔ جو زیادہ تر مغرب کے سرمایہ دار ملکوں سے حاصل کیے گئے تھے۔ نقلی سرمایہ داری ہمیشہ پُرفسوں ثابت ہوئی ہے اور ایسے معاشروں میں جہاں عام انسان نے روایاتی طور پر مذہبی توہمات اور تقدیر پرستی سے دھوکہ کھایا ہے۔ سرمایہ داری استحصال کا ایک آسان ذریعہ بن گئی ہے۔ اس کے برعکس بعض ترقی پذیر ممالک میں جمہوری اُمنگوں سے لایا گیا سیاسی دباؤ بڑھتا رہا ہے اور جب اقتصادی شعبے میں ان اُمنگوں سے پیدا کیے گئے مسائل کے جمہوری حل ممکن نظر نہیں آئے کیوں کہ اُن سے مفاداتِ خصوصی کو نقصان پہنچنے کا امکان تھا تو سیاسی حکام جو جمہوری قوتوں اور پارٹیوں پر مشتمل تھے کمزور اور بے اثر ہو گئے اور وہ ناگزیر طور پر اقتدار کے واحد باقیماندہ ذریعہ یعنی فوج کے آگے جھک گئے۔

یہ جانا گیا ہے کہ فوجی ڈکٹیٹرشپ اُن ملکوں پر کنٹرول اور حکومت کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے جن کی آبادی کم و بیش ہم نوع ہو لیکن ایسے معاملوں میں جہاں عظیم تر جینیاتی تنوع ہو، فوجی حکومت سے لازمی انتشار پیدا ہوتا ہے۔ فوجی حکومتیں اپنی نوعیت کے لحاظ ہی سے مسائل کے اقتصادی حل مہیا کرنے کی سکت نہیں رکھتیں اور اس کے نتیجے میں اندرونی طور پر کُوپ کے ذریعے اور بیرونی طور پر عوامی بغاوت سے بھی اُن کے تختے اُلٹنے کی مسلسل کوشش کی جاتی ہے۔

لہٰذا ہم محض یہ کہہ کر کہ عوام موزوں طور پر تعلیم یافتہ نہیں ہیں۔ پھیلی ہوئی صورتِ حالات کے لیے انھیں قصوروار نہیں ٹھہرا سکتے۔ یہ محض ایک عذرِ لنگ ہے جو اُن لوگوں کی طرف سے پیش کیا جاتا ہے۔ جو بہترین علم حاصل کرنے کے باوجود سماج کے کم خوش قسمت ممبروں کے مسئلوں کا حل پیش کرنے میں ناکام رہے ہیں۔

منتظموں، منصوبہ سازوں اور عوام کے نمائندوں کے طور پر سیاستدانوں کا بڑا مقصد ایسے حالات پیدا کرنا ہے جو ایک ایسے سماجی، اقتصادی ڈھانچے کی تشکیل کے لیے سازگار ہوں جو عوام کو اُن کے مفادات کے مطابق زندگی کے مختلف شعبوں میں اُس کی بہترین قابلیتوں کے فروغ کی آزادی کی یقین دہانی کرائیں۔ ایسے حالات پیدا کر کے عوام کے نمائندوں یا حکومت کا فرض ہو جاتا ہے کہ وہ محض یہ یقین دلائیں کہ کھیل کے قواعد کی موزوں طور پر پابندی ہوئی ہے اور کہ کوئی بھی ان کی خلاف ورزی نہیں کرے گا۔ اس طرح حکومت کو جج اور امپائر دونوں کا کام کرنا

ہے۔ یہ بات انسانی سرگرمی کے تمام شعبوں میں خصوصاً سماجی، اقتصادی اور سیاسی شعبوں میں لاگو ہوتی۔ دوسرے الفاظ میں یہ یقین دلانا حکومت کا فرض ہوگا کہ سارا سیاسی ڈھانچہ قدرتی افزائش کی صلاحیت کو فروغ دیتا ہے اور حکومت ایک معالج کی مانند کام کرتی ہے۔ جو اُس وقت قدرتی عمل میں مدد دینے کے لیے آتی ہے۔ جب علاج کی ضرورت ہوتی ہے۔

ہماری سماجی، اقتصادی زندگی میں تمام تر عدم توازن اور بگاڑ کے باوجود یہ حقیقت برقرار ہے کہ ہمارے سماج میں برائی کے مقابلے میں اچھائی بہت زیادہ ہے۔ ایک ایسے وسیع قلب انسان دوستانہ فلسفہ کی بنا پر ہماری روایات کے باعث جو ہزاروں برس سے رشیوں، منیوں اور صوفیوں کی طرف سے ہمارے دلوں میں داخل کیا گیا ہے، بھارت کا ایک عام آدمی نیک دل، دردمند، ملنسار، رحم دل، مددگار اور مہمان نواز بن گیا ہے اور اُس کے ذہن میں آفاقیت آگئی ہے۔

ہماری روزمرہ کی زندگی میں ایسے لوگوں سے ہمارا سامنا ہوتا ہے۔ کسی کی زندگی کا جائزہ لے کر کوئی شخص پاتا ہے کہ کسی شخص کو اپنے ساتھی انسانوں کے ساتھ بُرے تجربہ کے بجائے اچھا تجربہ زیادہ ہوا ہے۔ لیکن فطرتِ انسان کے خاصے کے طور پر ایک کانٹے کی چبھن یا آنکھ میں کسی بیرونی مادّے یا دانت کے درد کے باعث ذہن کی تمام تر توجہ اُس طرف چلی جاتی ہے۔ خواہ باقیماندہ جسم اچھی حالت میں ہو۔ ہماری سماجی چیر پھاڑ کے بارے میں بھی یہ سچ ہے۔ یہ چھوٹی چھوٹی بیماریاں ہوتی ہیں جو سماجی ذہن کی جس کی نمائندگی پریس کرتا ہے توجہ اپنی طرف کھینچتی ہیں جو اس درد کو بہت زیادہ بڑھا چڑھا کر پیش کرتا ہے۔

ہم یہ بھی دیکھ سکتے ہیں کہ دُکھ یا تکلیف کی زیادہ تر وجہ اشیائے لازمی کی کمی ہوتی ہے۔ ہمارے ناولوں، کتابوں اور فلموں میں کہانیاں ایسے واقعات سے پُر ہوتی ہیں جن میں خوراک، علاج معالجے، کپڑے اور مکان جیسی بنیادی ضروریات کی کمی کے باعث افلاس تکلیف دہ بن جاتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی استحصال، سخت گیری، غلامی اور جبر و استبداد جیسے سماجی مسائل پیدا ہوتے ہیں۔ جن پر ذات، فرقہ اور مذہب پر مبنی گروہی تصادموں کا سماجی رنگ چڑھا ہوتا ہے۔ اس ضمن میں یہ دیکھا جاتا ہے کہ بے روزگاری افلاس کا ایک اہم پہلو ہے۔

لیکن جب بنیادی ضروریات پوری ہو جاتی ہیں تو بھی دُکھ کی اگلی قسم سماجی شعبے میں مقابلے سے پیدا ہوتی ہے اور پھر یہاں سب کے لیے کافی مواقع کی کمی ہے۔ یہ بات نوعمر نسل کی حالت میں خاص طور پر نمایاں ہے جو اگرچہ تعلیم یافتہ ہے۔ تاہم اُن کے لیے سود مند روزگار حاصل کرنے کے مواقع نہیں ہیں۔ ایسی صورتِ حالات سے شادیوں اور پارٹیوں جیسے سماجی مواقع کے لحاظ سے عوام کے درمیان سماجی رشتے اور تفاعل کے مسئلے پیدا ہوتے ہیں۔

ناخوشی کی تیسری قسم کا تعلق خوشحال لوگوں سے ہے جنہیں کوئی مادی مسئلہ درپیش نہیں ہے۔ لیکن اُن کے مسائل سماجی قبولیت کی خواہش اور اعلیٰ رُتبے کے لیے مقابلے سے پیدا ہوتے ہیں۔ اس زُمرے سے تعلق رکھنے والے بیشتر اشخاص اُن نفسیاتی مسئلوں سے دبے رہتے ہیں جو خواہشوں اور اُمنگوں کی عدم تکمیل یا مناسب پیار کی کمی سے پیدا ہوتے ہیں۔ یہ مسئلے مختلف طرح کی شدتیں اختیار کرتے ہیں اور اس لیے پیدا ہوتے ہیں کیوں کہ سماجی ادارے اُن بدلتے ہوئے حالات سے مطابقت پیدا نہیں کر سکے جو مشترکہ کنبوں کے ٹوٹنے، کام کی جگہ کی مسلسل تبدیلی اور گھروں کی منتقلی یا تقسیم سے پیدا ہوتے ہیں۔ ہمیں معمر اشخاص سے متعلق مسئلوں کا بھی سامنا ہے جو درازیٔ عمر میں اضافہ ہونے کے باعث لمبی عمر تک زندہ رہ سکتے ہیں لیکن اپنے لڑکوں کے ہمراہ نہیں رہ سکتے اور انھیں نظرانداز کیا جاتا ہے۔ اُن کے مسئلے سماجی ڈھانچے میں (خصوصاً ثقافت کے شعبے میں) تبدیلیوں سے پیدا ہوتے ہیں جو جدید ترقی یافتہ مغربی معاشروں کے رجحانات سے متاثر ہوئے ہیں جنھیں ہمارے ملک کے خوشحال لوگ نقل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

تاہم ان تمام مسئلوں کے باوجود ہمارے پاس عملاً زندگی کے ہر شعبے میں، فنون سے سائنس تک اور ثقافت سے کھیلوں تک اعلیٰ درجے کا خزانہ ہے۔ ہمارے پاس اعلیٰ درجے کا ادب، انجینئرنگ، طب، ٹکنالوجی، انتظامیہ افسران اور سنگیت اور ناٹک وغیرہ ہیں۔ اس کے علاوہ یوگا اور روحانیت ہماری روایاتی میراث کے بعض ایسے عطیے ہیں جنھیں عالمگیر شہرت حاصل ہوئی ہے۔

اب جس تمام تر کام کی ضرورت ہے وہ یہ ہے کہ ہمارے تمام قابلِ کار لوگوں کی پیداواری اور تخلیقی صلاحیتوں کے لیے بہتر مواقع پیدا کیے جائیں۔ ایک بار ایسا ہو جائے تو ہم پائیں گے کہ وہ ہمارے تمام تر سماجی، اقتصادی ڈھانچے کی کایا پلٹ کر سکتے ہیں۔ اور تمام چھوٹے اور تنگ خیالوں کو ترک کر سکتے ہیں۔ وہ فخر کے ساتھ ایک نئے، خوشحال اور متحد بھارت کی تعمیر میں لگ سکتے ہیں۔

میں اگلے باب میں موجودہ اقتصادی نابرابریوں کے سوال پر بحث کروں گا اور اقتصادی جمہوریت پر مبنی حل کا سجھاؤ دوں گا تاکہ تمام تر ملک کی متوازن ترقی عمل میں آئے۔

پروفیسر ایس۔ کے۔ للا[1]

آپ اور آپ کی صحت

دورانِ سر یا چکر

دورانِ سر یا چکر یا گھمیر کیا ہے؟ یہ جسم کے اندرونی نظام کی گڑبڑی کا مظہر ہے۔ چکر آنے کی صورت میں عدم تحفظ کا احساس بڑھ جاتا ہے۔ متلی ہونے لگتی ہے۔ قے آتی ہے، دل دھڑکتا ہے، جسم سے پسینہ ٹپکتا ہے، غفلت اور غنودگی طاری ہوتی ہے۔ نیز کمزوری بڑھ جاتی ہے۔ اس بیماری سے زیادہ تر لوگوں کا زندگی میں سابقہ پڑتا ہے۔ اس باب میں چند احتیاطی تدابیر اور اس کے علاج کے سلسلے میں چند ضروری اقدامات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

دورانِ سر جسم کے تعلق سے جسم کی کارگردگی کی گڑبڑی کا مظہر ہے۔ آسان لفظوں میں اس کا مطلب ہے کہ مریض کو اس بیماری میں ہر چیز گھومتی نظر آتی ہے۔ مریض مثال کے طور پر کرسی یا بستر پر ہے، تو اسے یہ کرسی یا وہ بستر جس پر لیٹا ہے، گھومتا نظر آئے گا۔ کبھی مریض خود کو بھی گھومتا ہوا پاتا ہے۔ کبھی کبھی آپ رات بے چینی یا بے خوابی کے عالم میں گزارتے ہیں، چنانچہ صبح کو اٹھنے پر آنکھوں کے سامنے اندھیرا ہوتا ہے یا سر میں بھاری پن ہوتا ہے، کبھی کبھی شراب پینے کے بعد خمار آتا ہے، مگر یہ سب دورانِ سر میں نہیں آتا۔ کچھ لوگ میلوں ٹھیلوں میں جھولوں پر جھولتے ہیں۔ جب جھولا رکتا ہے تو انھیں زمین گھومتی نظر آتی ہے۔ یہ وہ صورتِ حال ہے جو سر کے تغیر کو صحیح طور پر واضح کرتی ہے۔ کہتے ہیں کہ ہم میں سے بہت سوں کو دورانِ سر سے سابقہ پڑا ہوگا۔

ہماری زندگی میں کبھی نہ کبھی دورانِ سر سے سابقہ پڑنے کے امکانات کافی ہوتے ہیں۔ عمر جوں جوں بڑھتی ہے اس کے اثرات کے امکانات زیادہ بڑھتے ہیں۔

ساٹھ سال تک کی عمر کے لوگوں کی نصف تعداد کے لگ بھگ دورانِ سر کے دورے سے متاثر ہو چکی ہوگی۔ دورانِ سر کے دورے کے فوراً بعد عدم تحفظ کا احساس بڑھ جاتا ہے۔ اس کے بعد متلی، قے، دل کی دھڑکن، جسم سے پسینہ ٹپکنا وغیرہ شروع ہو جاتا ہے۔ جس سے غفلت اور غنودگی طاری ہو جاتی ہے۔ جن لوگوں کو یہ مرض ہو چکا ہے وہ خوف اور ڈر کے ان جذبات سے واقف ہوں گے۔ جو اس بیماری میں لاحق ہو جاتے ہیں۔

عام اسباب

اگر ہم دورانِ سر کے عام اسباب سے واقف ہوں تو احتیاطی تدابیر کی جا سکتی ہیں۔ اس بیماری کے علاج کے لیے احتیاط، ورزش اور مریض کا تعاون درکار ہوتا ہے۔

کم عمری میں زیادہ تر مریض وہ ہوتے ہیں جنھیں کان کی بیماری ہے۔ کان کا کام یہ ہے کہ وہ سماعت اور توازن میں مدد دے۔ لہذا کان کی بیماری سے سماعت بھی جا سکتی ہے اور دورانِ سر کی شکایت بھی ہو سکتی ہے۔ زیادہ عمر کے لوگوں میں دماغی مشینری کے توازن کی خرابی سے یہ مرض لاحق ہوتا ہے۔ اس عمر میں یہ مرض ٹانگوں، ہاتھوں یا چہرے کی کمزوری کے ساتھ جڑا ہوتا ہے۔

کان کی بیماری سے جو دورانِ سر پیدا ہوتا ہے، وہ بالعموم زندگی کے لیے خطرناک نہیں ہوتا۔ لیکن اگر یہ دماغ کی وجہ سے ہے تو پھر اس کا خطرہ باقی رہتا ہے۔

کبھی کبھی دورانِ سر کے حملے کے سبب مریض گر سکتا ہے لیکن گرنے کے بعد بھی اس کے ہوش و حواس برقرار رہتے ہیں۔ اگر سڑک پر ایسا مریض دیکھنے کو ملے یا گھر میں یہ حادثہ ہو جائے تو یہ دیکھنا ضروری ہے کہ اس کے سانس کی حرکت درست رہے۔ اسے آرام سے لٹا دینا چاہیئے۔ اسے کھڑا نہیں کرنا چاہیئے۔ بلکہ زمین پر چت لٹا دینا چاہیئے۔ اس بات کو یقینی بنانا چاہیئے کہ کوئی پتھر یا تیز چیز اسے کر نقصان یا چوٹ نہ پہنچائے۔ اس کے کالر کو ڈھیلا کر دینا ضروری ہے۔ سر کی بار بار کی حرکت سے یا جھٹکے سے دورانِ سر

[1] ای۔ این۔ ٹی کے شعبے کے سربراہ۔

اور زیادہ بڑھ سکتا ہے۔ اگر کان کی بیماری کے سبب حملہ ہے تو تھوڑی دیر میں چت حالت میں لیٹنے سے وہ دُور ہو جائے گا لیکن اگر وہ دماغ کے نظام کی خرابی سے ہے تو پھر وہ برقرار رہے گا۔ اس لیے ۵ منٹ انتظار کرنے کے بعد مریض سے کہا جائے کہ وہ اپنی آنکھیں کھولے اور ہر طرف نظر ڈالے۔ اگر وہ آرام دہ حالت میں خود کو محسوس نہ کرے تو اس سے کہا جائے کہ وہ آہستہ سے سر اوپر اٹھائے۔ اگر پھر بھی چکر آئے تو اُسے دوبارہ چت لیٹ جانا چاہیئے۔ اگر چکر نہ آئے تو پھر اسے آہستہ سے بٹھا دینا چاہیئے۔ اُس کی آنکھوں کے سامنے تھوڑی دیر اندھیرا رہ سکتا ہے لیکن یہ حالت بہت دیر باقی نہیں رہے گی۔ اُسے تھوڑی دیر خاموش بیٹھے رہنا چاہیئے۔ مزید ۵ منٹ تک انتظار کرنا ضروری ہے۔ اگر اُسے آرام ہے تو وہ کھڑا ہو سکتا ہے۔ اسے قریبی ہسپتال تک پہنچا دیا جائے۔ پہلی بار جب دَوران سَر کا حملہ ہوتا ہے تو یہ بے حد تکلیف دہ ہوتا ہے۔ البتہ اگر یہ پہلے بھی ہو چکا ہے تو مریض کو اس کی علامات معلوم ہوں گی اور وہ بہت زیادہ خوف زدہ نہیں ہوگا۔

مریض کو جب آرام محسوس ہونے لگے تو اسے معائنہ کے لیے ہسپتال لے جایا جائے۔ ڈاکٹر سے معائنہ کے لیے درخواست کی جائے۔ ڈاکٹر اس کا معائنہ کرتے وقت درجِ ذیل باتوں کا دھیان رکھے گا۔ کیا فی الواقعی یہ دورانِ سَر دورہ تھا؟ یہ شکایت جسم کے کس مقام پر ہوئی ہے؟ بیماری کا سبب کیا ہے؟ مریض کا بہترین علاج کس طرح ممکن ہے؟ مستقبل میں روکنے کے لیے اسے کس احتیاط اور کس ورزش کی ضرورت ہے۔

تشخیص

کیا فی الواقعی یہ دَورانِ سَر کا حملہ ہے۔ اس کے لیے تفصیلی حالات کا جائزہ ضروری ہے۔ اس بات کا تعین ضروری ہے کہ کیا مریض خود کو گھومتا ہوا پاتا ہے یا آس پاس کی چیزوں کو گھومتا ہوا دیکھتا ہے۔ اس کا تعلق ثقلِ سماعت سے بھی ہو سکتا ہے۔ کانوں میں بجنے اور جھنجھنانے کی آوازیں آتی ہیں۔ کانوں میں کوئی چیز کھنچی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ کمزوری، گھبراہٹ، پسینہ، متلی، قے، اگر ہو تو یہ حملہ سخت ہے اور اس کی تفصیلی جانچ ضروری ہے۔

ڈاکٹر کو یہ طے کرنے کے لیے کہ جسم کا کونسا حصہ بیماری سے متاثر ہوا ہے مریض کی جانچ کرنی ہوگی۔ آنکھ کی حرکت کی جانچ بہت ضروری اور اہم ہے۔ آنکھ کے ڈھیلے کی اِدھر اُدھر حرکت سے نظامِ توازن کے بگڑنے کا پتہ چل سکتا ہے۔ ڈاکٹری اصطلاح میں اس کے لیے ایک لفظ ہے (Nysta gnuea) یعنی آنکھ کے ڈھیلے کا متواتر گھومنا۔ مریض کی سماعت کی بھی جانچ کی جاتی ہے۔ اس کے لیے قوتِ سماعت کو جانچنے والی مشین (Audiometer) ہوتی ہے۔ اس سے پتہ چل سکتا ہے کہ کان کا وسطی حصہ، داخلی حصہ، دماغ سے ملانے والی رگ یا پھر کون سا حصہ متاثر ہوا ہے۔

دماغ اور کانوں کو آپس میں ملانے والے نظام کی جانچ کی جاتی ہے۔ اس آزمائش کے لیے گرم یا ٹھنڈا پانی کان میں ڈالا جاتا ہے۔ اس سے نظامِ توازن متحرک ہو جاتا ہے۔ اور مصنوعی دورانِ سر پیدا ہو جاتا ہے۔ اس عارضی اور مصنوعی عمل سے کانوں اور دماغ کی کارکردگی کا اندازہ کر لیا جاتا ہے۔ اگر اگر کوئی ردِ عمل واضح نہ ہو تو پتہ چل جاتا ہے کہ توازن پیدا کرنے والا عضو کمزور ہے۔ اگر اس کا ردِ عمل غیر معمولی ہو تو اس کا مطلب ہے کہ یہ زُود حِس ہے۔ اس طرح کی جانچ سے یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ دَورانِ سر کی بیماری کس جگہ ہے۔ سماعت اور توازن سے متعلق ٹیسٹوں کے مقابلے میں سے اُس اصل مقام کی نشاندہی ہو جاتی ہے جو کہ دورانِ سَر پیدا کرتا ہے۔

بیماری کے اسباب

متاثرہ جگہ کان کا داخلی حصہ یا رگ یا دماغ ہو سکتی ہے۔ یہاں یہ پتہ چلانا ہوتا ہے کہ کیا یہ خون کی نالیوں پر اثر انداز ہونے والی بیماری کے سبب ہے یا پھر یہ کان کے اندرونی حصہ میں چوٹ کے سبب ہے یا کان کی داخلی رسولی کے سبب ہے، یا کان کے داخلی حصہ میں انفیکشن کے سبب ہے یا پھر ذیابیطس کے سبب ہے۔ متاثرہ جگہ کا فیصلہ مختلف جانچ کرائے جانے کے بعد ہی کیا جا سکتا ہے ان مختلف ٹیسٹوں میں کھوپڑی کا ایکسرے، گردن کا ایکسرے، کان کی ہڈی کا ایکسرے وغیرہ شامل ہے۔ اگر رسولی کا شبہ ہو تو کیٹ CAT سکیننگ سے یہ پتہ چلتا ہے کہ کان کا داخلی حصہ یا دماغ کس حد تک اس سے متاثر ہے۔ اگر رسولی اتنی بڑی ہے کہ وہ دماغ پر دباؤ ڈال رہی ہے تو نیورو سرجن کے ذریعے آپریشن کرانا ضروری ہوگا۔ ایسے مریضوں کو بصارت سے محرومی، دردِ سر، ہاتھ یا پیر کے فالج وغیرہ کی شکایت ہو سکتی ہے۔ یہ بیماری دماغ سے تعلق رکھتی ہیں۔ جن مریضوں کی بیماری کان سے متعلق ہے اس کے لیے ان خطرات کے امکانات نہیں ہوتے۔ شوگر کے لیے خون کی جانچ کی جاتی ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ مریض کو پیشاب میں شکر تو نہیں آتی۔ تشخیص کو مستحکم کرنے کے لیے بھی یہ جانچ ضروری ہے۔

علاج

مرض کا پتہ چل جانے کے بعد، مریض کا علاج ہو سکتا ہے۔ ۸۰ فی صد سے زیادہ کیسوں میں دوائیں ہی دَورانِ سر کے مرض کا دفعیہ کر دیتی ہیں۔ رسولی ہونے کی صورت میں آپریشن ضروری ہوتا ہے۔ اگر خون کا دباؤ زیادہ ہے، یا ذیابیطس ہے، تو اس پر کنٹرول کیا جا سکتا ہے۔ دورانِ سر کی بیماری کے ساتھ اگر گردن کی بیماری بھی ہے تو مریض کے گردن میں خاص قسم کا کالر پہنا دیا جاتا ہے۔

احتیاطی تدابیر

نمک کا استعمال کم کر دیا جائے۔ اسی طرح سوڈا واٹر کی طرح کے مشروبات، تلے ہوئے اخروٹ، اور تلی ہوئی دیگر خوراکی اشیاء نہیں استعمال کرنی چاہئیں۔ شراب کا استعمال نہیں ہونا چاہیئے، سگریٹ، بیڑی ترک کر دینی چاہیئے۔ چائے اور کافی کا استعمال نہ کیا جائے۔ ان سے دورانِ سر کے مریضوں کی حالت اور خراب ہو سکتی ہے۔ یہ رطوبت ہمارکارٹ اور خون کی نالیوں کے کھچاؤ کے سبب ہوتا ہے۔ زیادہ عمر کے لوگوں کو دوائیں اس غرض سے دی جاتی ہیں کہ دماغ کو خون کی فراہمی ہوتی ہے۔ لیکن سگریٹ، بیڑی وغیرہ کے استعمال سے یہ دوائیں اپنا اثر کھو دیتی ہیں۔ ان سے خون کی نالیوں میں رکاوٹ پڑ جاتی ہے۔

اگر دورانِ سر کا حملہ ہو تو گاڑی وغیرہ نہیں چلانی چاہیئے۔ کار، اسکوٹر وغیرہ کے چلانے سے باز رہنا چاہیئے۔ تیرنے اور سڑک پار کرنے سے بچنا چاہیئے۔ سڑک پار کرنے میں گردن کو بار بار تیزی سے گھمانا ہوتا ہے، اس سے دورانِ سر کا حملہ ہو سکتا ہے، مریض زمین پر گر سکتا ہے، اور کوئی بھی گاڑی اسے نقصان پہنچا سکتی ہے۔ زیادہ عمر کے مریضوں کو اور بھی احتیاط چاہیئے۔ پہاڑ پر چڑھنے، چوٹی کے آگے کام کرنے، اونچی عمارتوں پر چڑھنے وغیرہ سے گریز کیا جانا چاہیئے۔

سر اور گردن کی کسرتیں نظامِ توازن کو مضبوط بنا سکتی ہیں۔ ان احتیاطی تدابیر سے دورانِ سر کو روکا جا سکتا ہے اور اگر ہو بھی جائے تو اس کے منفی اثرات سے بچا جا سکتا ہے۔

(آل انڈیا انسٹی ٹیوٹ آف میڈیکل سائنسز نئی دلی میں دیئے گئے ایک لیکچر سے ماخوذ)

کیا آپ جانتے ہیں؟

وسیم حیدر

ہندوستان میں اول

- ہندوستان میں پہلے برٹش گورنر جنرل وارن ہیسٹنگس۔
- آزاد ہندوستان کے پہلے برٹش گورنر جنرل لارڈ ماؤنٹ بیٹن۔
- آزاد ہندوستان کے پہلے کمانڈر ان چیف جنرل کریا پا۔
- ہندوستان کے پہلے خلاء باز، اسکواڈرن لیڈر راکیش شرما۔
- ہندوستان میں مغل سلطنت کے پہلے شہنشاہ، بابر۔
- ہندوستان کے پہلے فیلڈ مارشل، ایس۔ ایچ۔ ایف۔ جے۔ مانک شاہ۔
- پہلے ہندوستانی آئی۔ سی۔ ایس افسر ستندر ناتھ ٹیگور۔
- وائسرائے ایگزیکیٹو کونسل کے پہلے ہندوستانی ممبر۔ سر ایس۔ پی۔ سنہا۔
- پہلے ہندوستانی جنھوں نے انگلش نہر کو تیر کر پار کیا۔ مہر سین۔
- پہلے ہندوستانی جو بغیر آکسیجن گیس کے ماؤنٹ ایورسٹ پر چڑھے۔ پھوڈورجی۔
- پہلے آدمی جو ماؤنٹ ایورسٹ پر چڑھے تنزنگ نورگے۔
- پہلی مسلم خاتون جو دہلی کے تخت پر بیٹھیں، رضیہ بیگم۔
- ہندوستان کے پہلے نوبل انعام پانے والے، ڈاکٹر رابندر ناتھ ٹیگور۔
- انڈین نیشنل کانگریس کے پہلے صدر، ڈبلیو۔ سی۔ بنرجی۔
- آزاد ہندوستان کے پہلے صدر، ڈاکٹر راجندر پرشاد۔
- ہندوستان کی پہلی بولتی فلم، عالم آرا۔
- ہندوستان کے پہلے وائسرائے، لارڈ کیننگ۔
- ہندوستان کی پہلی خاتون مرکزی وزیر راجکماری امرت کور۔
- پہلی خاتون چیف منسٹر، مسز سچیتا کرپلانی۔
- پہلی خاتون گورنر، مسز سروجنی نائیڈو۔
- پہلی ہندوستانی خاتون جو ہمالہ پہاڑ پر چڑھی، بچھندری پال۔
- انڈین نیشنل کانگریس کی پہلی خاتون صدر، مسز سروجنی نائیڈو۔
- پہلی خاتون وزیر اعظم، شریمتی اندرا گاندھی۔
- ریاستی اسمبلی کی پہلی خاتون اسپیکر، مسز شنو دیوی۔

دُنیا میں اول

- پہلے امریکی صدر جو ہندوستان آئے، ڈیوڈ آئزن ہاور (David Eisenhower)
- پہلے برطانوی وزیر اعظم جو ہندوستان آئے ہیرالڈ میکملن۔
- جمہوریہ چین کے پہلے چیرمین، ماؤزے تنگ۔
- چین کے پہلے سیاح جو ہندوستان آئے، فاہیان۔
- پہلے یوروپی حملہ آور جس نے ہندوستان پر حملہ کیا، سکندر اعظم۔
- پاکستان کے پہلے گورنر جنرل، محمد علی جناح۔
- خلاء میں جانے والے پہلے خلاء باز، یوری گگارین (روس)۔
- خلاء میں چلنے والا پہلا انسان، الگسی لیونو (روس)
- پہلا انسان جس نے چاند پر قدم رکھا، نیل آرمسٹرونگ۔
- وہ جگہ جہاں سب سے پہلے ایٹم بم گرایا گیا، ہیروشیما (جاپان)
- چین کے پہلے صدر، سن یات سین۔
- امریکہ کے پہلے صدر، جارج واشنگٹن
- برطانیہ کے پہلے وزیر اعظم، وال پول
- روس کے پہلے وزیر اعظم جو ہندوستان آئے، نیکولائی اے بلگانن۔
- خلاء میں جانے والی پہلی خاتون، ولنٹینا ولادیمی روونا ترشکووا۔
- پہلی خاتون جو ماؤنٹ ایورسٹ پر چڑھی، مسز جنکو تبئی (جاپان)
- کسی ملک کی پہلی خاتون صدر، ماریا اسٹیلا پیرون۔ (ارجن ٹائنا)۔
- کسی ملک کی پہلی خاتون وزیر اعظم، مسز ایس بندرا نائکے (سری لنکا)۔

اطہر پرویز

ڈرامہ

بوتل

منظر : خوشحال گھرانے کا ایک کمرہ، عقب میں ایک کھڑکی ہے، رات کا وقت ہے، دیواری گھڑی میں نو بج رہے ہیں۔ پردہ اُٹھتا ہے تو بیوی کھڑکی کے پاس کھڑی ہے نیچے دیکھ رہی ہے۔

بیوی : اجی سُنو۔

میاں : کیا ہے۔

بیوی : ادھر سنو، بولے تو، ادھر آؤ۔

میاں بائیں جانب سے آتا ہے۔

میاں : بولو۔

بیوی : ذرا کھڑکی سے باہر نیچے دیکھو۔

میاں : وہاں تو اندھیرا گھپ ہے۔

بیوی : وہی اندھیرے میں دیکھو جی۔ کوئی کھڑا ہے۔

میاں : تو کھڑا رہنے دو، (پکارتا ہے)۔ اے۔ کیا دیکھتے ہو۔

آواز : (دُور سے) صورت تمھاری۔

میاں : صورت تمھاری؟ کیا چاہتے ہو؟

آواز : چاہت تمھاری۔

میاں : بیگم۔

بیوی : ہوں۔

میاں : پوچھتا ہوں کیا دیکھتے ہو تو کہتا ہے، صورت تمھاری۔ یعنی میری۔

بیوی : ہاں۔

میاں : کیا چاہتے ہو تو کہتا ہے، چاہت تمھاری۔

بیوی : ہوں۔

میاں : ٹھہرو، میں اس کی خبر لیتا ہوں۔

آواز : کیا ہے بھا!

میاں : تم کون ہو؟

آواز : پہچانو میں کون ہوں۔

بیوی : اجی نکو بات کرو جی۔ کوئی غنڈہ دکھتا۔

میاں : مگر بیگم۔ آواز پہچانی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔

بیوی : ایسے ہیں آپ کے دوستاں؟

آواز : نواب صاحب ہیں۔

میاں : کون ہو بھائی؟

آواز : آجاؤ نیچے آجاؤ۔

بیوی : اجی نکو جاؤ جی۔ میں آپ کو نہیں جانے دیتی باوا۔

آواز : نواب بھائی۔

میاں : ارے یہ تو بھائی کہہ رہا ہے۔

آواز : آجاؤ نیچے آجاؤ۔ یہ تمھارے لیے ایک تحفہ لایا ہوں۔

میاں : (کھڑکی سے باہر سر کو نکال کر) تحفہ؟

بیوی : سمجھی کون ہو۔ تم ہی اُوپر آجاؤ۔

آواز : ایک خاص چیز لایا ہوں۔

میاں : آجاؤ، آجاؤ اُوپر آجاؤ۔

بیوی : ارے باپ رے۔ اتنے اوپر آیا تو۔

میاں : آنے دو۔ تم بیلن تیار رکھو۔ میرے ہاتھ میں بھی ڈنڈا ہے۔

بیوی : ڈنڈا مار کے تحفہ لیں گے۔

میاں : تم ٹھہرو تو۔ آؤ بھائی اُوپر آؤ۔

آواز : (دہنی جانب سے) آجاؤں اندر۔

بیوی : میں تو باتیوں با۔ (چلی جاتی ہے)

آواز : بھابی تو نہیں ہیں۔

میاں : ارے پرساد تم ہو۔ کم بخت سے آوازیں دے رہے تھے دوست۔

پرساد : پہلے یہ دیکھو میں کیا چیز لایا ہوں، تمھارے لیے۔

میاں : کیا ہے۔

پرساد : تمھارے خسر تو نہیں ہیں اندر؟

میاں : نہیں وہ باہر گئے ہوئے ہیں۔

پرساد : کاغذوں میں لپٹی ہوئی چیز میں نکالتا ہے۔ یہ دیکھو۔

میاں : بوتل۔

پرساد : شش، چُپ چُپ، کہیں بھابی سُن لیں گی۔

میاں : تو تم اس وقت پیے ہوئے ہو۔

پرساد : قسم خدا کی بالکل نہیں۔ بھلا تم کو چھوڑ کر کیسے پی سکتا ہوں۔

میاں : تم نے پینا کب سے شروع کر دیا۔

پرساد : پھر وہی، پی کس کمبخت نے ہے۔

میاں : پھر یہ۔ یہ۔

پرساد : یہ تو سالم ہے بغیر کھلی ہوئی ہے، پوری کی پوری۔ تم شیخ معبود کو جانتے ہونا۔ آج ایک کام سے میں اس کے گھر گیا تھا، وہاں رنگ کی محفل جمی ہوئی تھی۔

میاں : تو تم نے بھی چڑھالی۔

پرساد : یار پوری بات تو سنو، وہ لوگ مجھے مجبور کرنے لگے کہ بیٹھو اور پیو، میں نے کہا بھائی میں نے آج تک نہیں پی۔ تو بولے آؤ پیو، ہم تمھیں پلائے بغیر نہیں چھوڑیں گے۔

میاں : پھر۔

پرساد : میں ایک مصیبت میں پھنس گیا تھا۔

میاں : تو تم نے چڑھالی۔

پرساد : یار پھر وہی۔ پی لی پی لی کی رٹ لگا رکھی ہے تم نے۔

میاں : اچھا اچھا بولو۔

پرساد : کیا میں بے وقوف تھا جو تمھیں چھوڑ کر اکیلا پی لیتا۔

میاں : کیا۔؟ میں کب پیتا ہوں۔

پرساد : تو اب پیو۔ اسی لیے تو ان لوگوں سے میں یہ بوتل لایا ہوں۔ میں نے ان سے کہد یا بھائی میں یہاں نہیں پیتا۔ بوتل دیدو، گھر جاکر پیوں گا۔

میاں : تو اُن لوگوں نے تمھیں یہ بوتل دیدی۔

پرساد : ہاں بولے، خیر آج تو یہ بوتل لے جاؤ۔ مگر کل سے تم کو ہمارے ساتھ پینا ہوگا۔ میں نے کہا۔ کل کا کل دیکھا جائے گا اور بوتل لے آیا۔ آؤ بیٹھو۔

میاں : اپنے گھر لے جاؤ اپنے گھر۔

پرساد : کیا بیوی سے جوتے کھلوانے کا ارادہ ہے۔

میاں : تو کیا مجھے اپنی بھابی سے۔ بڑی مرآفہ ہے مرآفہ۔

بیوی : (بائیں جانب سے آتی ہے) کیا بولے جی۔

میاں : آؤ آؤ۔ یہ اپنے پرساد بھائی ہیں۔ تم خواہ مخواہ ڈر رہی تھیں۔ میں ان سے تمھاری تعریف کر رہا تھا۔ پرساد خدا کے لیے اِسے چھپاؤ۔ اور جاؤ یہاں سے۔

پرساد : واہ واہ واہ۔ میں بوتل لایا اس لیے تھا کہ ایک نیا تجربہ کریں۔ آداب عرض بھابی۔

بیوی : آداب، بیٹھو پرساد بھائی۔

میاں : کیا کہہ رہی ہو؟

خُسر : (باہر سے پکارتا ہے) بیٹی عزیزہ۔

میاں : ارے باپ رے میرے خُسر صاحب آگئے، مر گئے۔ چھپاؤ۔ چھپاؤ۔

بیوی : آداب ابا جان۔

خُسر : جیتی رہو، جیتی رہو۔

پرساد : آداب عرض ہے چچا جان۔

خسر : جیتے رہو، جیتے رہو۔ او ہو پرساد بہت دنوں بعد آئے بھئی۔ (اندر کی طرف جانے لگتا ہے)۔

پرساد : میں آپ کے لیے ایک تحفہ لایا تھا۔

میاں : ارے یہ کیا بک رہے ہو۔

خُسر : کیا کہا میاں۔

میاں : جی کچھ نہیں وہ۔ پرساد سے کہہ رہا تھا۔ آپ باہر سے آ رہے ہیں نا تھک گئے ہوں گے۔ آرام فرمائیے۔

خُسر : ہاں ذرا پرساد سے باتیں کر لوں، کیوں بھئی اچھے ہو۔

پرساد : جی ہاں میں آپ کے لیے (میاں فوراً پرساد کی چٹکی لیتا ہے، پرساد چیخ مارتا ہے)

خُسر : کیا ہوا بھئی۔

پرساد : پیر میں کسی نے کاٹ لیا۔ آہ۔

خُسر : دیکھو، دیکھو کیا ہے کس چیز نے کاٹ لیا۔ آجکل موسم خراب ہے بھائی۔ کہیں بچھو وچھو نہ ہو۔

پرساد : جی ہاں شاید بچھو ہی تھا۔ گورا بچھو۔

خُسر : ارے گورا مت کہو بھائی سفید کہو سفید۔ (اِدھر اُدھر ڈھونڈتا ہے) سفید بچھو مل جائے تو مزہ آ جائے۔

پرساد : کیوں چچا جان۔

خُسر : ارے بھائی میرے پاس کیمیا کا ایسا عمدہ نسخہ ہے، بس اس میں ایک سفید بچھو کی کمی ہے۔ ذرا ہٹنا۔ (پرساد کے ہاتھ سے پیچھے چھپائی ہوئی بوتل چھوٹ جاتی ہے)

خُسر : یہ کیا۔ بوتل۔ شراب کی بوتل۔ پرساد تم پینے بھی لگے ہو؟

پرساد : (رونے لگتا ہے) نہیں چچا جان نہیں۔

میاں : نہیں ابا جان پرساد پیتا نہیں ہے۔ یہ بوتل اس کے کچھ دوستوں نے اسے دی ہے۔ پینے کی عادت ڈالنے کے لیے۔

خُسر : (بوتل اٹھا کر میز پر رکھتا ہے) پرساد میں باہر سے آیا ہوں، بہت تھک گیا ہوں مگر تم سے اس وقت اتنا ضرور کہونگا (بوتل کی طرف اشارہ کرکے) اس سے زیادہ زہریلا بچھو، زہریلا سانپ یا زہریلا کیڑا اور کوئی اور نہیں، جس کے گھر میں یہ جاتی ہے، گھر کے ہر فرد کو ڈس لیتی ہے۔

بیوی : ابا جان۔

خُسر : ہاں بیٹی، سانپ اور زہریلے کیڑوں کا ڈسا تو پھر بھی ٹھیک ہو جاتا ہے مگر شراب کا ڈسا کبھی نہیں بچتا۔ گھر کے گھر تباہ ہو جاتے ہیں۔ خاندان تباہ ہو جاتے ہیں۔ یہ دوست اور خراب صحبت ہی ہے جو پہلے پینے پر آمادہ کرتی ہے مگر جب اس کی عادت پڑ جاتی ہے تو یہ دولت، صحت، زیور، زمین سب کچھ کھا جاتی ہے۔

میاں : آپ ٹھیک کہتے ہیں واقعی آدمی پہلے شوق اور مزہ کی خاطر اس کو منہ لگاتا ہے، مگر ایک بار یہ منہ لگنے کے بعد پھر نہیں چھوٹتی۔

پرساد : چچا جان، میں ابھی اسے واپس کئے دیتا ہوں۔

خُسر : میرا مشورہ تو یہ ہے کہ تم تینوں میری یہ لکڑی لو۔ اور اسے ابھی اسی وقت چور چور کر ڈالو۔

پرساد : چچا جان میری ہمت نہیں ہو رہا ہے کہ میں آپ سے آنکھیں ملا سکوں۔

خُسر : لاؤ اسے میں ختم کر دیتا ہوں۔ (اپنی لکڑی کے ایک وار سے بوتل توڑ دیتا ہے)۔ بوتل کے ٹوٹنے کے ساتھ ہی پردہ گرتا ہے۔

★

تدبیر کا چہرہ

رام پرکاش راہیؔ

(مرحومہ اندرا گاندھی پر ایک تاثر)

تمنا کی فضاؤں میں
کبھی پت جھڑ، کبھی کچھ شاذ و نادر سی بہاروں میں
چڑھا پروان، یعنی نخل اک اُمیدِ فردا کا
جیسے پھر پختگی کا رُوپ بخشا
گُدگُداتی، مختصر تھپاتی سی، گُلابوں سے مہکتی، ترہ تر،
چلتی ہواؤں نے
مگر جبرِ مشیت نے، پلٹ کر زہر کیا گھولا
انھیں چلتی ہواؤں میں
سبک سر، شوخ، نامنجاز، بے زُف بگولوں نے
کیا مسمار کچھ ایسے وجودِ باغباں کو
پہنچتی سازگاری کی گھنیری چھتر چھایا کی بانی کو
کر نخل آرزو کو خود اسی کی پختگی نے
دیا احساس اپنے قد و قامت کا
بڑی مضبوط اور گہری جڑوں کی تاب و طاقت کا
وہ نخل آرزو، زندہ علامت تین نسلوں کی
یہاں جس کی صلاحیت، صلاحیت کی ماہیت
بروئے کار آئی تو بدل ڈالا
تر بتر گہا، تر و تازہ کی گھنیری پتیوں، پتوں سے شاخوں سے
چمن بھر کی فضاؤں کو

کیا بھرپور، ہل چل سے، فراست کی حرارت سے۔
بڑی مبہوت، بے ہنگم خلاؤں کو
وہ نخل آرزو کا طمطراق ایسی حقیقت تھی
بگولے، آندھیاں، طوفان اس کی تُند شاخوں
سے برابر بچ کے چلتے تھے
ہیولے، نارو اتخریب و شورش کے
کہیں کروٹ بھی لیتے تھے کہ کچھ تیور اُگلتے تھے
تو نخل پختگی پر پے بہ پے حُسنِ سیاست کے
سُنہرے پھول کھلتے تھے
اور ان پھولوں کے ہالے میں جھلکتا تھا
وہی تدبیر کا چہرہ جو ہر چہرے پہ فائق تھا
وہی تقدیر کا پرتو جو تصویرِ حقائق تھا
اسے او! وقت کی کروٹ، یہ تو نے کیا فرمائی!
وہی تدبیر کا چہرہ، وہی تقدیر کا پرتو
مت شے زیست کے بس آخری ایثار کا صدقہ
مآل سلطنت از ہے ڈھل کر
ہمہ نے ذرے ذرے میں سبھی اقدارِ جمہوری
مبادی کی مقدس چوٹیوں پر
ہمیشہ کے لیے بکھرا پڑا ہے۔ ●

دلیری کا لہو

ضیاء فتح آبادی

صلح خوئی کے مقابل جنگ جوئی آ گئی
گولیوں نے دامنِ امن و اماں چھلنی کیا
آگے بڑھ کے چوم لی سولی کسی منصور نے
ہنس کے پیالہ زہر کا کوئی ارسطو پی گیا
روشنی میں دن کی شب کی تیرگی پیدا ہوئی
خون میں ڈوبا، مگر خورشید دھرتی کا ہر ذرہ ہوا
دکھی انسانیت، حیوانیت کے خوف سے
چپ، خاموشیوں کو شورِ ماتم کا اُٹھا
چاند بی بی، لکشمی بائی اٹھیں جس خاک سے
گوتم و گاندھی و نانک کو جنم جس نے دیا
اندرا گاندھی بھی اک دیوی اسی مٹی کی تھی
اس کا نصب العین تھا عشقِ وطن اور ایکتا
آدمیت ہی تو ہے دراصل آزادی کا نام
آدمی کا تجزیہ کیا ہے آدمیت کے سوا
اپنے آدرشوں کی خاطر اس نے دے دی جان بھی
یہ لہو وہ ہے جو تھا اس کی رگوں میں دوڑتا
اس لہو سے زندگی کی مانگ بھر لیں کیوں نہ آج
آستانِ یاد پر اک سجدہ کر لیں کیوں نہ آج

ایک تاثر

انور جمال غزنی

گل ہوئی شمعِ درخشاں اک درندہ چال سے
کب رہیں محفوظ اندرا دشمنوں کے جال سے
ایک لمحے میں محافظ دشمنِ جاں بن گئے
آگ برسانے لگے اسٹین گن کی نال سے
کیا خبر تھی کل کا کہنا آج سچ ہو جائے گا
سچ کی خاطر خون دوں گی صبر و استقلال سے
کون کہتا ہے کہ لوگو اندرا جی مر گئیں
کارنامے ان کے چمکیں گے جو آب و لال سے ★

منصوبہ بندی

ظفر محمود بنارسی

عقلمندی، جو مسلسل درکار ہے
اک سلیقہ اک اثر کار ہے
زندگی منصوبہ بندی کا ہے نام
زندگی کو "یوجنا" درکار ہے

نو بساماں زندگی ہو جائے گی
ظلمتوں میں روشنی ہو جائے گی
سینچیں گے خونِ جگر سے ہم انھیں
سر کھیت سب کھیتی ہری ہو جائے گی

دیش کو زندہ بنانا ہے ہمیں
عزم پائندہ بنانا ہے ہمیں
حال و ماضی سے سبق لیکر ظفرؔ
اپنا مستقبل بنانا ہے ہمیں

بقیہ: ہندوستان کی صنعتی ترقی

ہندوستان میں خام اشیاء اور قدرتی طاقت کی کمی نہیں۔ یہ دونوں چیزیں کافی مقدار میں موجود ہیں۔ جو صنعتی انقلاب کو عملی جامہ پہنا سکیں۔ جدید صنعتیں قائم کرنے کے لیے ماہروں کے نزدیک ہندوستان کی معدنیات، قدرتی وسائل اور طاقتیں یقیناً موجود ہیں۔

۱۹۱۶ء میں "صنعتی کمیشن" (INDUSTRIAL COMMISSION) نے اپنی رپورٹ میں حکومتِ ہند سے ہندوستانی صنعت و حرفت کو ترقی دینے کی پُر زور سفارش کی تھی۔ اس کے نتیجے میں ۱۹۲۱ء کا "مالیاتی کمیشن" (FISCAL COMMISSION) بیٹھا اور ایک "ٹیرف بورڈ" (TARIFF BOARD) قائم ہوا۔ صنعت و حرفت کے متعلق کچھ قوانین مرتب ہوئے اور ۱۹۲۹ء میں اس سلسلے میں ایک رائل کمیشن (ROYAL COMMISSION) مقرر ہوا جو "وِٹلے کمیشن" (WHITLEY COMMISSION) کے نام سے مشہور ہوا۔ آج سے ۵۰ سال قبل، ان ماہرین کا خیال تھا کہ ہندوستان میں فولاد کی صنعت کے لیے اتنا زیادہ سامان موجود ہے کہ اس سے ہندوستان اور مشرقِ بعید کی تمام ضروریات پوری ہو سکتی ہیں۔ جنگ کے زمانہ میں ٹاٹا (TATA) نے ہندوستان کی فوج کی اندرونی ضرورتوں کو پورا کیا۔ ایک زمانے میں ہندوستان کے معدنیات میں سونا سب سے زیادہ اہم چیز تھی۔ لیکن مدت ہوئی کوئلہ نے اُسے دبا لیا۔ چاندی، سیسہ، جست وغیرہ کھود کر نکالے جاتے تھے۔ ان تین چیزوں کا ایک حصہ مینگنیز (MANGANESE) ہندوستان سے باہر روانہ کیا جاتا تھا۔ ان کے بعد سب سے بڑی معدنی صنعتیں کوئلہ اور پیٹرولیم کی ہیں۔ کوئلہ خصوصیت کے ساتھ، بنگال، بہار اور مدھیہ پردیش میں نکلتا ہے۔ اور پیٹرولیم بمبئی اور آسام میں۔ سوتی کپڑوں کی صنعت، جو پہلے بمبئی اور سُورت کے ساتھ مخصوص تھی، اب دوسرے علاقوں میں بھی پھیل گئی ہے۔ مدراس کے چار اور بہار کے تین کارخانوں کے علاوہ سن کے جتنے کارخانے ہیں، وہ سب دریائے ہگلی (RIVER HUGLEY) کے کنارے واقع ہیں۔ "وِٹلے کمیشن" نے ان صنعتوں کے متعلق نہایت اہم اعداد و شمار فراہم کئے تھے۔

ان بڑی بڑی صنعتوں کے علاوہ یہاں اور بہت صنعتیں ہیں۔ ان میں خاص خاص ہیں، ریلوے اور ٹریموے کے کارخانے، لوہے اور اسٹیل کے کارخانے، سیمنٹ کے کارخانے، بجلی بنانے کے کارخانے، کاغذ بنانے کے کارخانے، اُونی اور سوتی کپڑوں کے کارخانے، ریشمی کپڑوں کے کارخانے، چھاپہ خانے، تیل کے کارخانے، آرد کشی کے کارخانے اور ان کے علاوہ کرگھا کی صنعتیں ہیں، جہاں کمبل اور غالیچے بنتے ہیں۔ قالین بُنے جاتے ہیں۔ شیشہ کی چیزیں ڈھالی جاتی ہیں۔ موزے، بنیان وغیرہ بنائی جاتی ہیں۔ نیز مختلف دھاتوں کے بکس ڈبے وغیرہ تیار کئے جاتے ہیں۔

ہندوستان کی مصنوعات کی ترقی کے لیے بہت ضروری ہے کہ یورپ کے سائنٹفک طریقے رائج ہونے چاہئیں۔ خاص طور پر تربیت یافتہ ماہروں کی امداد و رہنمائی ہونی چاہیئے۔ ہندوستانی مصنوعات کی ترقی سے، مُلک کی آمدنی بڑھ جائے گی اور یہاں کی مصنوعات اُن چیزوں کی جگہ لے لیں گی، جو اب ہندوستان میں باہر سے آتی ہیں۔ ہمیں چاہیئے کہ انگلستان کی طرح ہندوستان میں بھی پُر امن "صنعتی انقلاب" آئے۔

★

بقیہ: منصوبے کیلئے سرمایہ کاری

زراعت اور صنعت کے متوازن فروغ کے ساتھ افراطِ زر کے بغیر ترقی ممکن ہے۔

منصوبہ بندی کے لیے درکار غیر ملکی زرمبادلہ کے وسائل برآمدات کو بڑھا کر اور درآمدات کے نعم البدل پیش کر کے مہیا کئے جا سکتے ہیں۔ برآمدات محض غیر ملکی زرمبادلہ کمانے کا ذریعہ ہی نہیں بلکہ ترقی کے لیے زبردست محرکات میں سے ہے۔ وینزویلا نے تیل کی برآمدات سے ترقیاتی پروگراموں کو تقویت دے کر ۶ فیصد شرح ترقی کر لی ہے۔ منصوبہ بندی کے سلسلے میں ناکامی اور شرح ترقی کے تسلی بخش طریقہ پر حاصل نہ ہونے سے اقتصادی ترقی کا عمل رُک جاتا ہے۔ برآمدات کی صلاحیت برقرار رکھنے کے لیے قیمتوں پر کنٹرول ضروری ہے۔ اندرون مُلک مال کی تیاری میں اضافے سے بین الاقوامی منڈی میں مال بکنے سے رہ جاتا ہے۔ اس کے سبب روپیہ کی قدر کم کرنے پر مجبور ہونا پڑتا ہے اور یہ عمل کبھی کبھی کئی کئی بار کرنا پڑتا ہے نیز غیر ملکی امداد یعنی غیر ملکی قرضوں سے غیر ملکی زرمبادلہ کے وسائل کی کمی کو پُورا کرنے میں مدد لینی پڑتی ہے۔

★

سرداری لال تستر

گذشتہ صدی میں صنعت وحرفت
یک ضمنی چیز خیال کی جاتی تھی ۔ اور اس کا
لق صرف چند افراد یا جماعتوں سے تھا۔ مگر اب
ہندوستان کی صنعت میں نمایاں طور پر ترقی ہو
رہی ہے ۔ اُس وقت کا ہندوستان صنعت و
رفت سے بالکل بے تعلق تھا۔ کیوں کہ اُس
قت کی حکومت کو بھی کوئی خاص دلچسپی نہ تھی
ارڈ مورلے (LORD MORLE)
کے عہد تک حکومتِ ہند نے صنعت وحرفت پر
وئی خاص توجہ نہیں کی تھی ۔ لیکن آج ہندوستانی
منعت کو ترقی دینے کا خیال مُلک کے ہر فرد بشر
کے دل میں ہے ۔ اب ہر صاحبِ فکر محسوس کر
رہا ہے کہ صنعت وحرفت کی ترقی کے وسائل
ختیار کرنا ہمارا اوّلین فرض ہے ۔

اِس حقیقت میں کسی شک کی گنجائش
ہیں کہ ہمارا ملک کئی لحاظ سے خاص کر صنعت و
رفت کے لحاظ سے اعلیٰ ترقی یافتہ ملکوں کے مقابلے
ہا پیچھے ہے۔ برطانیہ ایک چھوٹا سا ملک ہے۔ اس
ی آبادی بھی قلیل ہے ۔ جس وقت برطانیہ نے
منعت کی طرف توجہ مبذول کی، اس کا کوئی بھی
ہمعصر نہ تھا۔ اور دُنیا کی منڈیاں اسے خوش آمدید
ہنے کے لیے تیار تھیں۔ اُس وقت برطانیہ کے
یے یہی راستہ صاف تھا کہ زیادہ پیداوار کرنے
کے لیے مشینوں کا استعمال کرے ۔ اس کے برعکس،
ہندوستان کی آبادی بہت زیادہ ہے ۔ اپنے
تجارتی مفاد کے لیے ہندوستانیوں کو چاہیئے کہ
صنعت وحرفت میں ترقی کرکے افلاس سے
چھٹکارا پاکر، خوشحال ملکوں کی طرح زندگی بسر
کریں ۔ اپنے ملک کی اقتصادی اور معاشی حالت
سُدھارنے اور عام خوشحالی و فارغ البالی
قائم کرنے کے لیے، ملکی صنعت وحرفت کو ترقی
دینا بہت ضروری ہے ۔

یہ ایک مسلّمہ امر ہے کہ زراعت اور صنعت و
حرفت ہی دو چیزیں ہیں جو معاشی ترقی کی جان
سمجھی جاتی ہیں۔ اگر ہندوستان کو ہر اعتبار سے
اپنی کفالت خود کرنے والا ملک بننا ہے، تو اس
ملک میں زراعت اور صنعت کے درمیان جو
فرق پایا جاتا ہے اُسے دُور کرنا ہوگا اور اس
طرح زراعتی کام کرنے والوں کی ایک معقول
تعداد، صنعتوں کی طرف لگانی پڑے گی ۔ اِس
وقت زراعت میں تقریباً ۷۰ فیصدی لوگ ہیں۔
زراعت میں ۵۰ فیصدی سے زیادہ نہیں ہونے
چاہئیں ۔ باقی لوگوں کا بڑا حصّہ صنعتوں میں
کھپانا چاہیئے ۔ یہ امر حوصلہ افزا ہے کہ زرعی
پیداوار میں اضافے کے ساتھ ساتھ اب صنعتی
شعبوں کی کارگذاری بہتر ہو رہی ہے ۔ فولاد و
معدنیات کی پیداوار میں اضافے کے علاوہ،
چھوٹے پیمانے کی صنعتوں میں بھی اضافے کے
رُجحانات بڑھتے جارہے ہیں اور ان صنعتوں
نے برآمدی محاذ پر بھی نمایاں کامیابی کا ثبوت دیا ہے۔

ہندوستان میں غُربت دُور کرنے اور عوام
کو روزگار فراہم کرنے میں، چھوٹی صنعتوں کی
اہمیت کو نظرانداز نہیں کیا جاسکتا ۔ چنانچہ پچھلے
دنوں منصوبہ بندی کمیشن نے بجا طور پر پُرزور سفارش
کی ہے کہ چھوٹے پیمانے کی صنعتوں کا فروغ سارے
ہندوستان میں، خاص کر پسماندہ علاقوں میں کیا جانا
چاہیئے ۔ اِس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ
مشینوں، کلوں اور دیگر صنعتی آلات کی ایجادات
سے طریقِ پیداوار میں زبردست تبدیلیاں آگئی ہیں ۔

لیکن اس کے ساتھ، دیہات میں گھریلو دست
کاریوں کو فروغ دینے سے مُلک کی اقتصادی ترقی
بہتر طور پر ہوسکتی ہے ۔ گھریلو اور دیہی صنعتوں
سے دیہات سے نہ صرف غُربت کم ہوسکے گی
اور اُن کا معیارِ زندگی بہتر ہو سکے گا بلکہ
دیہاتی عوام کو روزگار کے مواقع بھی میسّر
ہوسکیں گے ۔ اس لیے چھوٹے پیمانے کی
صنعتیں جو ابھی تک دستکاریوں تک محدود
ہیں، اُن کی ہمت افزائی اور استحکام پر خاص
زور دینے کی اشد ضرورت ہے ۔ کیوں کہ
صنعتی ترقی اور مادّی ایجادات ہی سے ہماری
ملکی دولت، ملکی ارتقاء اور جمہوریت
کی بنیادیں مضبوط اور مستحکم ہوسکیں گی جس کے
لیے باقاعدہ طور پر ایک جامع اور ہمہ گیر انقلاب
رُونما ہونا چاہیئے، کیوں کہ ؂

بغیر جوششِ عمل زیست کامیاب نہیں
جو قسمتیں نہ بدل دے وہ انقلاب نہیں

(باقی صفحہ ۲۰ پر)

محمد فضل

بجلی کی تیاری میں اضافہ

چھٹے پانچ سالہ منصوبے میں ۸۵-۱۹۸۴ تک ملک کے ۱۹۱ ٹی ڈبلیو ایچ بجلی پیدا کرنے کا نشانہ مقرر کیا گیا ہے جبکہ ۸۰-۱۹۷۹ میں بجلی کی حقیقی پیداوار ۱۱۲ ٹی ڈبلیو ایچ تھی جس کے معنی ہیں کہ آئندہ پانچ برسوں میں ہر سال بجلی کی پیداوار میں ۱۱٫۳ فیصد کا اضافہ ہونا چاہیئے۔ ۸۵-۱۹۸۴ میں ۱۶۴ ٹی ڈبلیو ایچ بجلی پیدا ہونے کی توقع ہے، جس کا مطلب ہے کہ بجلی کی پیداوار میں ۴۹ فیصد کے تناسب سے اضافہ ہوا ہے۔

امید کی جاتی تھی کہ ۸۵-۱۹۸۰ کے پانچ برسوں میں ۱۹۶۶۶ میگاواٹ بجلی تیار کرنے کی صلاحیت چالو ہو جائے گی جس میں سے ۱۲۸۴۶ میگاواٹ بجلی حرارتی بجلی گھروں، ۵۱۳۰ میگاواٹ بجلی پن بجلی گھروں اور ۶۹۰ میگاواٹ صلاحیت تابکاری یا ایٹمی بجلی گھروں سے حاصل ہوگی۔ اگر ہم یہ فرض کریں کہ ۸۵-۱۹۸۴ میں ۲۳۹۹ میگاواٹ بجلی پیدا کرنے کا نشانہ حاصل کر لیا جائے گا تو چھٹے پانچ سالہ منصوبے کی کل کامیابی ۱۴۵۴۵ میگاواٹ بنتی ہے جس میں سے ۱۰۷۹۸ میگاواٹ بجلی حرارتی بجلی گھروں، ۳۰۵۷ میگاواٹ پن بجلی گھروں اور ۶۹۰ میگاواٹ ایٹمی بجلی گھروں سے حاصل ہوگی۔ لہٰذا فیصد تناسب کے لحاظ سے کل نشانے کے مقابلے میں ۷۴ فیصد بجلی تیار کرنے کے کارخانے چالو ہوئے۔ ان میں حرارتی بجلی گھروں کا تناسب ۸۴ فیصد پن بجلی گھروں کا ۶۰ فیصد اور ایٹمی بجلی گھروں کا تناسب ۱۰۰ فیصد رہا۔

دیہات میں بجلی لگانے کا نشانہ ایک لاکھ دیہات کا مقرر کیا گیا تھا لیکن حقیقی کامیابی ایک لاکھ ۲۰ ہزار دیہات تک پہونچ جانے کا امکان ہے۔ توقع ہے کہ چھٹے پلان کے دوران ۱۷ لاکھ پچاس ہزار پمپ سیٹوں کو چلانے کے لیے بجلی مہیا کی جائے گی۔ جب کہ حقیقی نشانہ ۲۵ لاکھ پمپ سیٹوں کا تھا۔

چھٹے پانچ سالہ منصوبے میں بجلی کی ترسیل اور تقسیم کے لیے جو پروگرام شامل کئے گئے ہیں، ان میں کوئی نشانے مقرر نہیں کئے گئے بلکہ صرف مجموعی اخراجات شامل ہیں۔ منصوبے کے پہلے چار برسوں میں چار سو کلوواٹ کی لائنیں بچھانے کے اخراجات میں ۴۱ فیصد اور ۲۲۰ کلوواٹ کی لائنیں بچھانے پر اخراجات میں ۵۵ فیصد کامیابی حاصل ہوئی ہے۔

چھٹے منصوبے میں توانائی کے شعبے کے لیے مالی تخصیص ۱۹۲۶۵ کروڑ روپے کی ہے۔ جب کہ منصوبے کے پہلے چار برسوں میں ۱۴۲۵۸ کروڑ روپے خرچ کیا گیا ہے۔

چھٹے منصوبے میں بجلی تیار کرنے کی نصب شدہ صلاحیت میں ۱۴۳۴۵ میگاواٹ کا اضافہ پانچویں منصوبے میں ۱۰۲۱۵ میگاواٹ کے اضافے کے مقابلے میں کافی بڑا دکھائی دیتا ہے۔ لیکن جہاں تک کل نشانے کے مقابلے میں حاصل شدہ صلاحیت کے تناسب کا سوال ہے چھٹے پلان میں کامیابی کا تناسب ۷۴ فیصد رہا جب کہ پانچویں منصوبے میں یہ تناسب ۸۱٫۷ فیصد تھا۔ چوں کہ بجلی تیار کرنے کی منصوبہ بندی علاقائی بنیادوں پر کی جاتی ہے، لہٰذا علاقہ وار کامیابی کا جائزہ دلچسپی کا باعث ہوگا۔ شمالی خطے میں پیداوار میں اضافے کا تناسب ۸۴٫۳ فیصد، مغربی خطے میں ۸۰٫۵ فیصد، جنوبی خطے میں ۶۹٫۹ فیصد، مشرقی خطے میں ۶۳ فیصد اور شمالی مشرقی خطے میں ۶۴ فیصد رہا۔ پن بجلی اور حرارتی بجلی کی پیداوار کا باہمی تناسب ۸۰-۱۹۷۹ میں چالیس کے مقابلے میں ساٹھ تھا لیکن ۸۵-۱۹۸۴ میں یہ کم ہو کر ۳۳ کے مقابلے میں ۶۷ ہو جانے کا امکان ہے۔ اس کا بڑا سبب یہ ہے کہ منصوبے میں حرارتی بجلی گھروں پر زیادہ توجہ دے کر بڑے نشانے مقرر کئے گئے ہیں

(باقی کور صفحہ ۳ پر)

منصوبہ بندی اور ترقیاتی پروگراموں کی جھلک پیش کرنے والا

پندرہ روزہ

یوجنا

نئی دہلی

چیف ایڈیٹر ✦ آر۔ ٹھکرال
ایڈیٹر ✦ لکھمی رام رانا
اسسٹنٹ ایڈیٹر ✦ محمد عادل صدیقی
سب ایڈیٹر ✦ وسیم حیدر

جلد ۴	۱۶ تا ۳۱ جنوری ۱۹۸۵ء	شمارہ ۲۰

۲۳، پوشر تا ۸ مارگ شک سمبت ۱۹۰۶ ✦ فون: ۳۸۷۳۴۱

شرح چندہ

سالانہ ۲۰ روپے۔ دو سال ۳۵ روپے، سہ سال ۵۰ روپے
فی کاپی: ایک روپیہ

طالب علموں، اُستادوں اور لائبریریوں کے لیے ۱۰ فی صد کی رعایت

اس شمارے میں

یوجنا منصوبہ بندی کے سلسلے میں عوام کو آگاہ کرتا ہے، مگر اس کے مضامین صرف سرکاری نقطۂ نظر کی وضاحت تک ہی محدود نہیں ہیں

بزنس منیجر: ایل۔ آر۔ بترہ ✦ اسسٹنٹ ڈائرکٹر (پروڈکشن): آر۔ ایس۔ منچال

مضامین سے متعلق خط و کتابت کا پتہ:
ایڈیٹر "یوجنا" (اردو) پبلیکیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس
نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

ترسیل زر کا پتہ:
بزنس منیجر، پبلیکیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس
نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

اداریہ

نیا سال نیا عزم

۱۹۸۴ میں ہمارے ملک نے تاریخ کے بہت سے نشیب و فراز دیکھے ہیں۔ اس سال ملک میں خوراک کی محاذ پر استحکام دیکھنے کو ملا۔ ہمارے ملک میں اناج کا فاضل ذخیرہ ۲۲ کروڑ ۸۰ لاکھ ٹن تک پہونچ گیا اور یہی نہیں بلکہ ہم نے اناج دوسرے ملکوں کو بھی برآمد کیا۔ اس سال غیر ملکی زر مبادلہ کے ذخیرے سب سے زیادہ رہے۔ صنعتی سیکٹر میں بھی قابل ذکر ترقی دیکھنے کو ملی۔ مسز گاندھی کے مشوروں اور رہنمائی میں ساتویں منصوبے کے خدو خال وضع کئے گئے اور اس میں خوراک، کام اور پیداواری صلاحیت پر زور دیا گیا۔ تعلیم، روزگار، سائنس اور ٹکنالوجی کے شعبوں میں ترقی دیکھنے کو ملی۔ ہندوستان نے خلائی میدان میں ایک نمایاں کامیابی حاصل کی اور ہندوستان کے سکواڈرن لیڈر مسٹر راکیش شرما دنیا کے ۱۳۸ ویں خلاباز بنے۔ خلائی میدان میں ہمارے ملک کی اس کامیابی سے اس کی شہرت کو چار چاند لگ گئے اور وہ خلائی دَور میں داخل ہو گیا۔ اسی طرح کی ایک اور کامیابی انٹارکٹیکا کی چوتھی مہم جوٹیم کی روانگی ہے۔ یہ تمام کامیابیاں وہ ہیں جن پر ہندوستان بجا طور پر فخر کر سکتا ہے۔

بہار اور خزاں کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ ان تمام کامیابیوں کے ساتھ ساتھ ہندوستان کو ایک زبردست سانحہ بھی برداشت کرنا پڑا۔ ۳۱ اکتوبر بدھوار کے منحوس دن سابق وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی ہم سے جدا ہو گئیں۔ یہ وہ شخصیت تھیں جنھوں نے ملک کو طاقتور بنایا اور بڑے جوش و خروش سے ملک کو خود کفیل بنانے کی کوشش کی۔ انھوں نے ہندوستان کی ایکتا اور سالمیت کے لیے جو شاندار خدمات انجام دیں، وہ سنہرے حروف میں لکھی جائیں گی۔ انھوں نے جمہوری سیکولرازم کی پالیسی کی بقا کی خاطر اپنی عزیز جان کی قربانی دی۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ان کا سیکولرازم میں کس قدر پختہ اعتقاد تھا۔ انھوں نے ملک کے اتحاد کو اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز جانا۔ مہاتما گاندھی نے ہندوستان کو آزادی دلائی۔ جواہر لال نہرو نے اسے جمہوری، سماج واد اور سیکولر نظریات سے آگاہ کرایا لیکن شریمتی گاندھی نے اسے ایسا اعتقاد اور یقین بخشا جو ملک کے ۷۰ کروڑ عوام کی عظمت کے شایان شان تھا۔

ہمارے ملک میں پچھلے دنوں جو ہمہ جہت ترقی دیکھنے کو ملی اس کو سامنے رکھ کر ہمارا اس بات میں یقین اور پختہ ہو جاتا ہے کہ محنت ہی کامیابی کی کلید ہے اور ہمارے آئین کے بانیوں نے جن اعلیٰ نظریات کو پیش کیا اور ملک کے لیے ضروری بتایا، وہ وقت کی کسوٹی پر پورے اترتے ہیں اور ان کی بقا ہر قیمت پر ضروری ہے۔ نئے سال کے لیے یہی عزم ہمارے لیے "نشانِ منزل" ثابت ہوگا اور نئے سال کی مبارکباد کا یہی بہترین طریقہ ہے۔

ماہی گیری

ہندوستان میں خشکی کا علاقہ جس طرح قدرتی وسائل سے مالا مال ہے، اسی طرح یہاں کے سمندر بھی اپنے دامن میں بے پناہ قدرتی دولت سمیٹے ہوئے ہیں۔ چنانچہ حال ہی میں ماہی گیری کے فروغ اور اس سے غیر ملکی زر مبادلہ کمانے کے لیے مچھلیوں کے پکڑنے کے کام کو تیزی سے آگے بڑھایا گیا ہے۔ ہندوستان کی برآمدات میں مچھلیوں کی برآمدات کا حصہ برابر بڑھ رہا ہے۔ ابھی تک یہاں سے شرمپ قسم کی مچھلی باہر بھیجنے پر زور دیا جا سکا ہے تاہم ابھی مچھلیوں کی دیگر بہت سی اقسام سے زر مبادلہ کمایا جا سکتا ہے۔ اسی طرح کی ایک قسم ہے تیونا مچھلی، یہ بڑی مچھلی کی ایک قسم ہے جو برآمدات میں نمایاں پارٹ ادا کر سکتی ہے۔ اس وقت ملک میں تقریباً ۲۲ لاکھ ٹن مچھلی سالانہ حاصل ہوتی ہے۔ اس کا ۶۷ فی صد حصہ روایتی طریقوں پر ہی پکڑا جاتا ہے۔ البتہ تقریباً ۳۲ فیصد مشینی کشتیوں کی مدد سے حاصل ہوتا ہے۔ گہرے سمندر سے صرف ایک فی صد مچھلی حاصل کی جا رہی ہے۔ ہندوستان میں خالصتاً اقتصادی خطے سے، جسے مختصراً ای ای زیڈ کے نام سے پکارا جاتا ہے، پوری طرح فائدہ اٹھانے کے لیے وسائل نہیں ہیں، حالانکہ یہ خطہ تقریباً ۲۰ لاکھ مربع کلومیٹر ہے۔ اس خطے سے مچھلیاں پکڑنے کے لیے جدید قسم کی کشتیاں درکار ہیں۔ اس خطے سے ایک اندازے کے مطابق ہر سال ۴۵ لاکھ ٹن مچھلی پکڑی جا سکتی ہے۔ علاقائی پانیوں سے ہر سال تقریباً ۱۵ لاکھ ٹن مچھلی پکڑی جاتی ہے۔ اس علاقے پر اب بہت زیادہ امید کرنا بے سود ہوگا۔ اس لیے آج کے حالات میں اقتصادی خطے سے استفادہ کرنا وقت کی بڑی ضرورت ہے۔ اس کے لیے جدید قسم کی کشتیوں کو حاصل کر کے اور جدید تکنیک سے فائدہ اٹھا کر گہرے سمندر سے مچھلیاں پکڑی جا سکتی ہیں۔

(ایڈیٹر)

م۔ک۔ جہتاب

دیہی ترقی کے لیے کامیاب منصوبہ بندی

دیہات کی مجموعی ترقی کے پروگرام

ہندوستان میں منصوبہ بند ترقی کا عمل گذشتہ تیس برسوں سے جاری ہے۔ اس دوران میں پانچسالہ منصوبوں کے ذریعے ملک کی سماجی و اقتصادی زندگی میں بہتری کے لیے کم و بیش ہر شعبے کے واسطے اسکیمیں تیار کی گئیں۔ نشانے مقرر کیے گئے اور انھیں حاصل کرنے کے لیے بھاری رقوم وقف کی گئیں ہیں۔ کئی شعبوں میں نتائج حسب توقع نہیں رہے تو کئی میدانوں میں نشانے پورے کر لیے گئے لیکن بعض شعبے ایسے ہیں جہاں ترقی کا عمل توقعات سے بھی بڑھ گیا ہے۔ اور نتائج نشانوں سے بھی تجاوز کر گئے ہیں، ان میں سے ایک نہایت اہم شعبہ دیہی ترقی کا ہے۔

باپائے قوم مہاتما گاندھی کا قول تھا کہ ہندوستان کی روح دیہات میں آباد ہے اور جب تک دیہات میں زندگی آگے نہیں بڑھتی ملک کی مجموعی ترقی کے عمل میں حقیقی پیش رفت نہیں ہو سکتی۔ مہاتما گاندھی کے اسی قول کی روشنی میں منصوبہ سازوں نے دیہی ترقی کی جانب پوری توجہ دی۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے مرکز میں دیہی ترقی کے لیے الگ وزارت قائم کی گئی جس نے دیہات کی ترقی کی متنوع اور وسیع سرگرمیوں کے لیے ضروری ہدایات دینے اور ان میں تال میل پیدا کرنے کے لیے اہم کام سرانجام دیا۔ آج جب کہ چھٹا پانچسالہ منصوبہ قریب قریب مکمل ہو رہا ہے۔ یہ بات کسی حد تک فخر کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ دیہی ترقی کے مختلف شعبوں کے لیے جو نشانے مقرر کیے گئے تھے وہ نہ صرف حاصل کر لیے گئے بلکہ حقیقی نتائج نشانوں سے بھی تجاوز کر گئے ہیں۔

چھٹے منصوبوں کی اسکیموں کی کارکردگی کا جائزہ لینے اور اس کی روشنی میں ساتویں منصوبے کے لیے مالی اور عددی نشانے مقرر کرنے کی غرض سے حال ہی میں دہلی میں ریاستی وزراء دیہی ترقی کی ایک کانفرنس منعقد ہوئی۔ کانفرنس میں دو باتیں ابھر کر سامنے آئیں، اوّل یہ کہ گذشتہ چار برسوں میں حقیقی کارکردگی مقررہ نشانوں کو پار کر گئی ہے، دوسرے یہ کہ دیہی ترقی کا عمل منصوبہ بند ترقی کے اُن گنے چنے شعبوں میں سے ایک ہے جہاں عوام کا تعاون اور اشتراکِ عمل بڑھ چڑھ کر حاصل ہو رہا ہے۔ لوگ ان اسکیموں اور پراجیکٹوں کو اپنے ہاں چالو کرانے کی مانگ کر رہے ہیں۔ اور ان اسکیموں سے فائدہ اُٹھانے کے لیے زیادہ سے زیادہ تعداد میں آگے بڑھ رہے ہیں۔ اس کارکردگی سے منصوبے اور اسکیمیں تیار کرنے والوں کی بہت حوصلہ افزائی ہوئی ہے۔ چنانچہ ریاستی وزراء کی کانفرنس میں ساتویں پانچسالہ منصوبے کا جو خاکہ پیش کیا گیا اس کے مطابق دیہی ترقی کے لیے تخصیص زر کو گھٹ کر دینے کی تجویز ہے۔ اسی طرح دیہات میں امداد کے طور پر دی جانے والی رقم بھی ڈیڑھ ارب روپے سے بڑھا کر پانچ ارب کر دینے کی تجویز ہے۔

دیہی ترقی کی اس حد تک کی مرکزی وزیر شریمتی محسنہ قدوائی نے کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ دیہات میں روزگار کے قومی پروگرام نے زمین مزدوروں کے لیے روزگار کی ضمانت کے پروگرام اور دیہات کی مجموعی ترقی کے پروگرام کو بھاری کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ چنانچہ ساتویں منصوبے میں ان پروگراموں کو پہلے سے زیادہ موثر انداز میں جاری رکھا جائے گا اور وقتاً فوقتاً ان کا جائزہ لیا جاتا رہے گا۔

پروگرام پر عمل درآمد کے دوران شیڈولڈ ذاتوں اور قبائل کے نوجوانوں اور خواتین کی حالت بہتر بنانے کی جانب خصوصی توجہ دی جائے گی۔ انھوں نے کہا کہ پروگرام کو عوامی ضروریات کے مطابق ترتیب دینا ہوگا۔ جس کے لیے عوامی تعاون اور سرگرم اشتراک کی بہت ضرورت ہے۔

سابق مرکزی وزیر خزانہ شری پرنب مکرجی نے کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ساتویں منصوبے میں دیہی ترقی کے لیے زیادہ ٹھوس کام اور پیداواری صلاحیت میں اضافے پر دیا جائے گا۔ انھوں نے اُمید ظاہر کی کہ بینک منصوبے کے لیے درکار مالی امداد مہیا کریں گے۔ شری مکرجی نے دیہی

صنعتوں کے لیے کچے مال کی فراہمی اور تیار مال کی فروخت کے اچھے انتظامات کی ضرورت پر بھی زور دیا تاکہ منصوبے پر خرچ کئے جانے والے سرمائے سے زیادہ سے زیادہ لوگوں کو زیادہ سے زیادہ فائدہ ہو سکے۔

دیہی ترقی کا مُدعا

دیہی ترقی کے منصوبے کا بڑا مدعا دیہات میں سماجی و اقتصادی ترقی کے عمل کے لیے بنیادی ڈھانچے کو مضبوط کرنا اور دیہات کی غربت کو دُور کرنا ہے۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے مرکزی سرکار دیہات میں لوگوں کو کم از کم ضروری بنیادی سہولیات مُہیا کرنے کے عمل اور ذاتی و اُجرتی روزگار، آمدنی کے ذاتی ذرائع بڑھانے اور پسماندہ علاقوں کی ترقی کے پروگراموں میں تال میل پیدا کر رہی ہے۔

جہاں تک دیہات کے بے زمین مزدوروں کو روزگار مُہیا کرنے کا سوال ہے، سابق پردھان منتری نے ۱۵؍ اگست ۱۹۸۳ کو روزگار کی ضمانت کے ایک پروگرام کا اعلان کیا تھا۔ اُمید کی جاتی ہے کہ یہ پروگرام زمین نہ رکھنے والے کھیت مزدوروں کے ہر کُنبے کے ایک ایک فرد کو سال میں ایک سو دن کا کام مہیا کرنے کی جانب سنگِ میل ثابت ہوگا۔ دیہات کے غریب لوگوں کی مالی حالت بہتر بنانے کے لیے جن میں زیادہ تر چھوٹے چھوٹے کسان، کھیتی مزدور اور دیہات میں آباد کاریگر شامل ہیں۔ مختلف پروگراموں پر عمل کیا جا رہا ہے۔ ان میں مجموعی دیہاتی ترقی کا پروگرام، روزگار کا قومی پروگرام، خشک سالی سے متاثر ہونے والے علاقوں میں روزگار کا پروگرام، صحرائی علاقوں کی ترقی کا پروگرام، اصلاحاتِ زمین کا پروگرام اور زرعی پیداوار کی فروخت جیسے بڑے بڑے پروگرام شامل ہیں۔

چنانچہ دیہی ترقی کے عمل کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ دیہات میں مجموعی سماجی و اقتصادی ترقی کے لیے بنیادی ڈھانچے کی اصلاح اور دوسرے دیہات کی غربت دُور کرنے کے لیے وہاں روزگار کے وسیلے مہیا کرنے کا اہتمام۔

دیہات کی مجموعی ترقی

زیرِ نظر مضمون میں ہم دیہات کی مجموعی ترقی کے عمل کے لیے منصوبہ بندی اور اُس پر عمل درآمد کے نتائج کا جائزہ لیں گے۔ دیہات کی مجموعی ترقی کے پروگرام میں چھوٹے کسانوں سے متعلق ترقیاتی ایجنسی کے کام اور نوجوانوں کو اپنے کام دھندے شروع کرنے کی تربیت کے پروگرام بھی شامل کر دئے گئے ہیں۔ اس پروگرام کا مقصد غریب کنبوں کی مالی مدد کرنا بھی ہے جس سے وہ قرضے اور سبسڈی جیسی سہولیات سے روزگار حاصل کر کے اپنے کنبوں کی مجموعی آمدنی میں مدد کر سکتے ہیں۔ اس پروگرام کے تحت ملک کے ۵۱ اضلاع میں دیہات کی عورتوں اور بچوں کی ترقی کی ایک اسکیم بھی شروع کی گئی ہے۔ اس پروگرام کا مقصد کنبوں کی خواتین پر توجہ دینا ہے جس سے وہ آمدنی بڑھانے والی سرگرمیوں میں حصہ لے سکیں۔

مجموعی دیہی ترقی کا پروگرام ۷۹-۱۹۷۸ء میں ۲۳۰۰ ترقیاتی بلاکوں میں شروع کیا گیا تھا لیکن ۲؍ اکتوبر ۱۹۸۰ء سے اسے ملک کے تمام پانچ ہزار ترقیاتی بلاکوں میں شروع کیا جا چکا ہے۔ پروگرام پر عمل درآمد کے لیے ایک ضروری شرط یہ ہے کہ جن غریب کنبوں کی مدد کی جائے اُن میں سے کم از کم ۳۰ فی صد کنبے شیڈولڈ ذاتوں اور قبائل کے ہونے چاہئیں۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ ہر بلاک میں تین ہزار کنبوں کے حساب سے چھٹے منصوبے میں ڈیڑھ کروڑ کنبوں کو غربت کے خط سے اوپر اٹھانے اور اپنی اقتصادی حالت بہتر بنانے کے لیے مدد دی جائے گی۔

غربت دُور کرنے کے اس بڑے پروگرام کے تحت ان کنبوں کو پیداواری مقاصد کے لیے سرمائے کی مدد دی جاتی ہے۔ چھوٹے کسانوں کو ۲۵ فی صد اور حاشیائی کسانوں، کھیتی مزدوروں اور دیہات کے کاریگروں کو سرمائے کی ضروریات کا ساٹھ فیصد ... کیا جاتا ہے۔ اس سکیم کے تحت ایک کنبے کو تین ہزار روپے تک کی امداد حاصل ہو سکتی ہے جب کہ شیڈولڈ ذاتوں اور قبائل سے پانچ ہزار روپے تک کا سرمایہ فراہم ہو سکتا ہے۔ یہ رقم سرکاری سبسڈی اور بنکوں کے قرضوں کے ذریعے مہیا کی جاتی ہے۔

چھٹے منصوبے میں مجموعی دیہی ترقی کے لیے ۱۵۰۰ کروڑ روپیہ سبسڈی کے لیے وقف کیا گیا ہے، جبکہ بنکوں کے ذریعے ۳۰۰۰ کروڑ روپے کے قرضوں کا اہتمام تھا۔ اس طرح دیہی ترقی کے مجموعی عمل پر کل ساڑھے چار ہزار کروڑ روپے کے مصارف کا اندازہ ہے۔ ہر بلاک کے لیے ۳۵ لاکھ روپے مخصوص کیا گیا ہے جس سے ہر بلاک میں ہر سال چھ سو غریب کنبوں کو اپنی معاشی حالت بہتر بنانے کے لیے مدد دی جائے گی۔

اس پروگرام کی منصوبہ بندی اور اس پر عمل درآمد کے دوران عوامی نمائندوں کا قریبی تعاون حاصل کیا جاتا ہے۔ پروگرام کے تحت فائدہ پہنچانے کے لیے جن کنبوں کو چُنا جاتا ہے اُن کے انتخاب کے لیے گرام سبھاؤں سے مشورہ کیا جاتا ہے۔

پروگرام پر عمل درآمد

دیہات کی مجموعی ترقی کے پروگرام پر عمل درآمد کا جو جائزہ لیا گیا ہے اس کے مطابق ملک کی اکثر ریاستوں میں پروگرام کو لاگو کرنے میں قابلِ قدر پیش رفت ہوئی ہے۔ منصوبے میں فائدہ اٹھانے والوں میں سے شیڈولڈ ذاتوں اور قبائل کا تناسب ۳۰ فی صد رکھا گیا تھا۔ ۸۱-۱۹۸۰ میں یہ تناسب ۲۶ء۲۸ فی صد رہا، لیکن ۸۴-۱۹۸۳ میں بڑھ کر ۷ء۴۱ فی صد ہو گیا۔ اکثر بلاکوں نے منظور شدہ رقوم پوری کی پوری خرچ کر دی ہیں۔

چھٹے منصوبے میں پروگرام میں کل ۴۵ ارب روپے کے مصارف کا تخمینہ ہے۔ اس میں سے

پندرہ ارب روپیہ مرکز اور ریاستوں کی طرف سے ۳۰ ارب روپیہ بینکوں کی طرف سے فراہم کیا جانا تھا۔ پہلے چار برس کے اختتام پر صورت حال یہ ہے کہ ۱۵ سو کروڑ کی ریاستی و مرکزی امداد میں سے ۱۳۵۹ کروڑ روپیہ منظور کیا گیا۔ اس میں سے ۱۱۸۹ کروڑ روپیہ خرچ کیا جا چکا ہے۔ بنک تین ہزار کروڑ روپے کے قرضوں میں سے ۲۴۴۴ کروڑ روپے کے قرضے دے چکے ہیں۔

اس طرح پانچ برسوں کے لیے مخصوص ۴۵ ارب روپے کی رقم میں سے ۴۴ ارب ۳۳ کروڑ روپے کی رقم استعمال کی جا چکی ہے۔ منصوبہ بندی کے اخراجات کی اصطلاح میں اسے ایک ریکارڈ کہا جا سکتا ہے۔

جہاں تک اس پروگرام سے فائدہ اٹھانے والے کنبوں کی تعداد کا تعلق ہے، نشانے کے مطابق ہر سال ۳۰ لاکھ کنبوں کو فیض یاب ہونا تھا۔ منصوبے کے پہلے دو برسوں میں تعداد زائد از ۲۷ لاکھ رہی لیکن باقی دو برسوں میں یہ تعداد چھتیس چھتیس لاکھ تک جا پہنچی۔ شیڈولڈ ذاتوں اور قبائل کے کل ۴۵ لاکھ کنبوں کو پروگرام کے تحت فائدہ پہنچانا مقصود ہے۔ لیکن پہلے چار برسوں میں ہی ساڑھے سینتالیس لاکھ کنبے اس پروگرام کے تحت فائدہ اٹھا چکے ہیں۔ اس لحاظ سے جہاں ۱۹۸۰-۸۱ میں شیڈولڈ ذاتوں اور قبائل کے کنبوں کا تناسب ۲۸ فی صد رہا وہاں ۱۹۸۱-۸۲ میں ۳۶ء۹ فیصد، ۱۹۸۲-۸۳ میں ۴۱ء۹ فیصد اور ۱۹۸۳-۸۴ میں ۱۲۰ فیصد ہو گیا۔

منظور شدہ سرمائے کا استعمال ۱۹۸۰-۸۱ میں ۶۳ء۳۲ فیصد، ۱۹۸۱-۸۲ میں ۸۸ء۶۲ فیصد، ۱۹۸۲-۸۳ میں ۹۱ء۹۱ فیصد اور ۱۹۸۳-۸۴ میں ۹۹ء۶۹ فیصد رہا۔

سرکاری امداد کی فی کس شرح ۱۹۸۰-۸۱ میں ۸۲۵ روپے سے بڑھ کر ۱۹۸۳-۸۴ میں ۱۱۰۲ روپے ہو گئی۔ بنکوں کے قرضے کی فی کس مقدار ۱۹۸۰-۸۱ میں ۱۰۶۰ روپے تھی جو ۱۹۸۳-۸۴ میں بڑھ کر ۲۰۹۷ روپے ہو گئی۔ امید کی جاتی ہے کہ چالو مالی سال کے نشانے گزشتہ برسوں سے بھی آگے بڑھ جائیں گے۔

ان نشانوں کے حصول سے ظاہر ہے کہ جہاں سرکار اور بنکوں نے پروگرام کو عملی جامہ پہنانے میں پوری دلچسپی لی ہے وہاں امداد حاصل کرنے والے بھی خاموش تماشائی نہیں رہے بلکہ انھوں نے ہر اسکیم کو عملی جامہ پہنانے میں سرکاری کارندوں کو بڑھ چڑھ کر تعاون دیا ہے۔ کئی علاقوں میں مانگ اتنی زیادہ ہے کہ سرکاری عملے کی کمی کی وجہ سے پورے پروگرام کو عمل میں نہیں لا سکی۔

منصوبہ بندی کمیشن کی پروگرام کا جائزہ لینے والی کمیٹی نے ایک بالتفصیل جائزے کے بعد بتایا ہے کہ تمام مشکلات اور مجبوریوں کے باوجود یہ پروگرام دیہاتی علاقوں میں پاؤں جماتا چلا جا رہا ہے۔ جس سے بہت سے غریب اور مستحق کنبوں کو فائدہ پہنچ رہا ہے۔ کمیٹی نے مزید کہا ہے کہ پروگرام سے فائدہ اٹھانے والے افراد نے اُسے بتایا کہ وہ اس پروگرام سے بہت مطمئن ہیں۔ پروگرام کے تحت انھیں جو مالی امداد دی جا رہی ہے اس سے انھیں اور اُن کے کنبوں کی آمدنی میں نمایاں اضافہ ہوا ہے۔ کچھ ریاستی سرکاروں نے بھی اس پروگرام کے اثرات کا جائزہ لیا ہے۔ اس سلسلے میں کیرلا، تامل ناڈو، راجستھان اور گجرات کے جائزوں کا ذکر کیا جا سکتا ہے۔ جن میں کہا گیا ہے کہ پروگرام کا رجحان بہت حوصلہ افزا ہے۔ گجرات یونیورسٹی کے دیہی ترقی سے متعلق مہاتما گاندھی شعبے کے ایک جائزے میں کہا گیا ہے کہ ۱۹۸۰-۸۱ اور ۱۹۸۱-۸۲ میں اس پروگرام کے تحت جن غریب کنبوں کو امداد دی گئی اُن میں سے نمونے کے طور پر چنے گئے کنبوں میں سے ۴۳ فیصد شیڈولڈ ذاتوں، ۱۴ء۴ فیصد شیڈولڈ قبائل اور باقی ۴۲ء۵ فیصد دیگر زمروں سے تعلق رکھتے تھے۔ ان میں سے ۴۲ فیصد کھیت مزدور، ۱۵ فی صد چھوٹے کسان اور ۱۲ فیصد عورتیں تھیں۔ اسکیم سے فائدہ اٹھانے والے کنبوں کی آمدنی سرکاری امداد کے بعد اندازاً ۵۰ فیصد بڑھ گئی۔ اس لحاظ سے ۳۲ فیصد کنبوں کی آمدنی میں اتنا اضافہ ہوا کہ وہ غریبی کے خط سے اوپر اٹھنے میں کامیاب ہو گئے۔ بعض مطالعوں سے یہ بھی پتہ چلا کہ اسکیم کے تحت فائدہ اٹھانے والے کنبوں کے چناؤ میں کچھ خامیاں پائی جاتی ہیں۔ چنانچہ ریاستی سرکاروں سے کہا گیا ہے کہ وہ اس ضمن میں اصلاحی اقدامات کریں۔ ریاستوں اور مرکزی علاقوں سے کہا گیا ہے کہ وہ جس علاقے میں اس پروگرام کے تحت کوئی اسکیم شروع کرنا چاہیں، وہاں ہر گاؤں کے ہر گھر کی آمدنی کی سطح اور اقتصادی حیثیت کی جانچ کریں۔ ان کنبوں کو پندرہ سو روپیہ سالانہ، پندرہ سو ایک سے پچیس سو روپیہ اور پچیس سو ایک سے پینتیس سو روپیہ سالانہ آمدنی کے زمروں میں تقسیم کریں۔ اس طرح جن غریب کنبوں کی شناخت کی جائے اُن کی فہرستیں منظوری کے لیے گرام سبھاؤں کو پیش کی جائیں۔

مجموعی دیہی ترقی کی ایک اسکیم نوجوانوں کو اُن کے اپنے کام دھندے شروع کرنے کے لیے انھیں تربیت دینے کے بارے میں بھی ہے۔ انھیں یہ تربیت صنعتی تربیتی اداروں یا ہنرمند استادوں کی شاگردی میں دلائی جاتی ہے۔ اگر تربیت گاؤں میں ہو تو پچاس روپیہ ماہوار اور اگر باہر دی جائے تو ڈیڑھ سو روپیہ سے دو سو روپیہ ماہوار تک وظیفہ بھی دیا جاتا ہے۔ چونکہ اس پروگرام کی رفتارِ ترقی یکساں نہیں رہی اس لیے اسکیم کی مقبولیت میں اضافہ کرنے کے لیے تربیت دینے والی گشتی موٹر گاڑیاں بھیجنے اور تربیت پا چکنے والوں کو ضروری ساز و سامان مہیا کرنے کے علاوہ انھیں متعلقہ منڈیوں میں عمل

تربیت دینے کا اہتمام بھی کیا جا رہا ہے۔

دیہات کی غریب خواتین کی تربیت کا پروگرام

عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ دیہات کی عورتیں سماج کے کمزور اور محروم طبقے کا بہت بڑا حصہ ہیں۔ لہٰذا انھیں سماج و سرکار کی زیادہ سے زیادہ توجہ کی ضرورت ہے۔ لہٰذا دیہی ترقی کی مرکزی وزارت نے ان عورتوں کی حالت سدھارنے کی جانب زیادہ توجہ دی ہے۔ دیہاتی نوجوانوں کی تربیت دینے کا اہتمام کیا گیا ہے۔ یہ تربیت حاصل کرنے والوں میں عورتوں کا تناسب ہر سال بڑھتا جا رہا ہے۔ ۱۹۸۳-۸۴ میں تربیت پانے والوں میں عورتوں کا تناسب ، فیصد تھا۔ اجرتی کاموں کی تربیت میں بھی عورتوں کی کارگاہوں میں تربیت کے زیادہ مواقع کئے جا رہے ہیں۔ دیہات میں عورتوں اور بچوں کی ترقی کے لیے ایک خصوصی پروگرام ستمبر ۱۹۸۲ سے شروع کیا گیا ہے۔ نمونے کا یہ پراجیکٹ ملک کے ۲۱ ضلعوں کے ۲۰۰ بلاکوں میں زیر عمل ہے۔ اس پروگرام کے تحت عورتیں اپنا ایک گروپ بنا کر کوئی کام شروع کرنے کے لیے سرکاری امداد حاصل کر سکتی ہیں۔ اب تک ایسے ۴۸۰۰ گروپ بنائے جا چکے ہیں جن میں قریب ۹۵ ہزار عورتیں شامل ہیں۔ یہ عورتیں ٹوکریاں بنانا، کپڑے سینا، پاپڑ بڑیاں بنانے جیسے کام کرتی ہیں۔ مرکزی وزارت دیہی ترقی نے حال ہی میں ایک نئی اسکیم شروع کی ہے جس کے تحت دیہات کی عورتوں کی فلاح و بہبود کے لیے کام کرنے والی رضاکارانہ انجمنوں کو بھی براہ راست سرکاری امداد دی جائے گی۔

گذشتہ چار برسوں میں دیہات کی مجموعی ترقی کے پروگراموں کی کارکردگی کا جائزہ لینے کے بعد ریاستی وزرا کی کانفرنس کی عام رائے یہ ہے کہ یہ پروگرام ایک مضبوط معاشی پروگرام ہے حالانکہ اس پر عمل درآمد میں کہیں کہیں ڈھیل پائی جاتی ہے۔ لہٰذا کانفرنس میں یہ طے پایا کہ گذشتہ چند برسوں کی کارکردگی کے حوصلہ افزا نتائج دیکھتے ہوئے دیہات کی مجموعی ترقی کے پروگرام کو مزید وسیع اور بہتر کیا جائے۔

مرکزی سرکار کے ایک ترجمان نے کانفرنس کو بتایا کہ ساتویں منصوبے میں غریب کنبوں کو دی جانے والی سرکاری امداد کی رقم ۱۱ سو روپے سے بڑھا کر ڈیڑھ یا ڈھائی ہزار روپے کر دینے کی تجویز ہے۔ اس طرح امداد کے طور پر تقسیم ہونے والی رقم ۱۵ ارب سے بڑھ کر چالیس ارب روپے ہو جانے کا امکان ہے۔ اسی طرح یہ بھی تجویز کیا جا رہا ہے کہ بنکوں کی طرف سے غریب کنبوں کو دی جانے والی رقم بھی ۳۰ ارب روپے سے بڑھا کر ایک سو ارب روپے کر دی جائے۔ جہاں تک ہر بلاک میں غربت کے خط سے اوپر اٹھائے جانے والے کنبوں کی تعداد کا تعلق ہے ساتویں منصوبے میں یہ تعداد تین ہزار فی بلاک سے بڑھا کر چار یا پانچ ہزار کنبوں کو رکھے جانے کی تجویز ہے۔

اتنے بڑے پروگرام کو اہلیت سے چلانے کے لیے مناسب تعداد میں تربیت یافتہ عملے کی موجودگی بھی بہت ضروری ہے۔

دیکھا گیا ہے کہ محض عملے کی کمی کے سبب بعض ریاستوں کے پچھڑے ہوئے علاقوں میں اس پروگرام کو پوری طرح عملی جامہ نہیں پہنایا جا سکا۔ اس لیے وہاں پروگرام کے نشانے پورے نہیں ہو سکے۔ کانفرنس میں تربیت یافتہ عملے کی ضرورت کی جانب توجہ بھی دلائی گئی۔

سرکاری ذرائع کا کہنا ہے کہ ساتویں منصوبے میں ایک وسیع تربیتی پروگرام بھی شروع کیا جائے گا۔ جس پر قریب ایک سو کروڑ روپیہ خرچ کیا جائے گا۔ اس تربیت کے بعد مجموعی دیہی ترقی کا کام کرنے والے عملے کا ایک کیڈر بنایا جا سکے گا جو صرف اس پروگرام کی ذمہ داریاں سنبھالے گا اور ریاستوں کی انتظامیہ سے سروسز سے افسر لینے کی ضرورت نہیں رہے گی۔

پی آئی بی

بقیہ: چائے، ایک مقبول مشروب

تیل کی طرح ہوتا ہے۔ چائے کی پتیوں میں اس کی مقدار تیس فیصد تک پائی جاتی ہے۔ تیل کے علاوہ چائے کی پتیوں میں دوسرے کیمیاوی مادے بھی پائے جاتے ہیں جن کی غذائی اہمیت بہت زیادہ ہے۔ آئیے ان پر بھی ایک نگاہ ڈالیں۔

پالی فینول	ـــــــــ	۲۳ فیصد
پروٹین	ـــــــــ	۱۷٫۲ فیصد
کیفین	ـــــــــ	۳٫۴ فیصد
نامعلوم ریشے	ـــــــــ	۲٫۵ فیصد
اسٹارچ	ـــــــــ	۰٫۶۵ فیصد
چینی	ـــــــــ	۳٫۵ فیصد
پیکٹین	ـــــــــ	۲٫۵ فیصد
ایتھر	ـــــــــ	۲٫۰ فیصد

ان کے علاوہ چائے میں نیپٹا تھینک تیزاب، ریبوفلیوین Riboflavin اور Ascorbic acid وغیرہ بھی تھوڑی مقدار میں پائے جاتے ہیں۔

ایس۔ کے۔ ڈے

رضاکارانہ تحریک کے پس پردہ جذبہ کی ضرورت

امداد باہمی اور اجتماعی ترقی کے سابق مرکزی وزیر شری ایس۔ کے۔ ڈے نے اپنے اس پُرجوش مقالے میں یوجنا سے یہ شکایت کی ہے کہ اس نے نومبر میں رضاکار اداروں پر گہری نظر' کے موضوع پر جو خصوصی نمبر شائع کیا ہے، اس میں رضاکارانہ جذبے اور اس کی رُوح پر کم زور دیا ہے۔ اس تحقیق کا زیادہ تر زور اس کی حقیقت جاننے پر رہا ہے۔ چنانچہ اپنے اس جوابی مضمون میں انھوں نے رضاکار اداروں کے ایک واضح رول کی ضرورت بتائی ہے اور اسے عوامی تحریک کی صورت میں "فورم فار فریڈم" یعنی آزادی کا محاذ بتایا ہے۔ اس کے ذریعے انھوں نے عوامی زندگی سے منافقت دُور کرنے پر زور دیا ہے اور ایک ایسے طرز زندگی کی حمایت کی ہے جو ہندوستانی فلسفہ سے پوری طرح میل کھاتا ہے اور جسے ہر انسان میں خدا کا جلوہ نظر آتا ہے' کے مصداق سمجھا جاتا ہے۔

"یوجنا" کے نومبر کے خصوصی شمارے "رضاکار اداروں پر گہری نظر" میں بیشتر محاذوں کی طرف سے رضاکارانہ کارروائی' کے بارے میں ایک جائزہ پیش کیا گیا۔ اس شمارے میں جہاں تک پلان کے اندر یا باہر کے پروگراموں کی تکمیل کا تعلق ہے ان موضوعات پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ بلاشبہ یہ موضوع تفصیلات کا محتاج ہے لیکن ماضی کے جائزے سے یہ تاثر پیدا ہوتا ہے کہ اس موضوع کی حقیقت پر اظہار خیال ہی بحث کا اہم حصہ ہے۔ حالانکہ اس معاملے پر اظہارِ خیال سے پہلے اس کے پیچھے جذبے اور اس کی رُوح کا بیان ضروری ہے۔ اصل موضوع پر بحث سے پہلے اس کے پیچھے سپرٹ یعنی جذبہ کی ضرورت کا واضح کیا جانا ہر لحاظ سے ضروری ہے۔ جہاں تک رضاکارانہ کارروائی کا تعلق ہے، جذبے کو بحث میں خاص طور پر اوّلیت حاصل ہونی چاہیئے لیکن یہاں اگر اسے مطلق نظرانداز نہیں بھی کیا گیا تو اس پر یقیناً کم زور دیا گیا ہے لہٰذا موجودہ مضمون جس کی تحریک اس شمارے میں مدیر محترم کے اداریے سے حاصل ہوئی ہے۔ ایک جوابی چیلنج کے طور پر پیش کیا جا رہا ہے۔ توقع ہے کہ اس سے نئے سرے سے گہرائی میں جانے اور شائد اس مقصد کو ایک ایسی صورت میں ڈھالنے کی بھی تحریک زور پکڑ سکتی ہے، جسے موثر طور پر عمل میں لایا جا سکے۔ اس پہلو کو پلاننگ کمیشن کی نگاہ میں بظاہر نسبتاً کم اوّلیت حاصل رہی ہے۔ کیا پلاننگ کمیشن جس کا ترجمان "یوجنا" ہے۔ اس سلسلے میں ابتدائی محرک نہیں ہونا چاہیئے؟ ایسا ایک بار ۱۹۵۲ میں ہوا تھا جبکہ اجتماعی ترقیاتی پروگرام (جو اس کے بعد ختم کر دیا گیا تھا) پلاننگ کمیشن کے تحت قائم کردہ مرکزی کمیٹی کے تحت پیش پیش رہا تھا۔

یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ گذشتہ ایک لاکھ سے دس لاکھ برس میں ایک برتر حیوان کے طور پر انسان کا ارتقاء ہوا ہے۔ کوئی بھی ذی رُوح حتیٰ کہ ایک بدمعاش بھی تنہا زندہ نہیں رہ سکتا۔ چنانچہ سماج کا ارتقاء ہوا اور وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ سست لیکن مستحکم عمل کے طور پر اُس کا پھیلاؤ ہوا۔ وہ پہلے ہی قبائلی، جاگیردارانہ، سرمایہ دارانہ، کیمونسٹ اور سوشلسٹ طرز کے نظاموں میں سے گذر چکا ہے۔ اس دَوران وہ جن بے شمار انقلابی نوعیت کی تبدیلیوں اور اجتماعی نظاموں سے گذرا ہے، انھیں سرسری طور پر نظرانداز کیا جا سکتا ہے۔ لہٰذا زندگی کو ایک آخری حد کے بجائے ایک (ارتقائی) عمل تسلیم کیا جانا ضروری ہے۔ کاملیت کسی بھی مرحلے یا کسی بھی صورت میں محض افسانہ ہوگی۔ ہم اس بیان کے مقصد کے لیے خدا، تقدیر یا کسی ایسی دوسری قوت کو اکیلا چھوڑ سکتے ہیں جو انفرادی زندگی پر

حکمرانی کرتی ہے لیکن کسی شخص کو یہ تسلیم کرنے سے بھی پیچھے نہیں ہٹنا چاہیے کہ ایک کائناتی قانون موجود ہے جو عمل، توازن اور حرکیت پر حکمراں ہے جن سے کائنات کی تشکیل ہوئی ہے خواہ کسی بھی زاویۂ نگاہ سے دیکھا جائے یہ شک و شبہ سے بالا ہوگا۔ یہ امر مساوی طور پر یقینی معلوم ہوتا ہے کہ مادہ، ذہن یا اسپرٹ ہو شکل و کردار کے اعتبار سے وقت کے ساتھ ساتھ ناگزیر طور پر تبدیل ہوتی ہے کیونکہ ایسی زندگی یا مادے کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے جو جمود کی حالت میں رہ سکے۔ لہٰذا کسی خیالی بہشت کا خواب کیلئے محفوظ رکھا جانا ضروری ہے۔ تبدیلی کو جو ایک مدام فطری عمل ہے فکر و منصوبہ بندی میں تقدیم دیا جانا ضروری ہے۔

حیوانی ' انسان کو اُس کی حدود کے اندر رکھنے اور اُسے دوسروں کے حقوق کو غصب کرنے سے روکنے کے لیے مذہب، رسوم، پوشاک، فن، ثقافت اور ایسی ہی تمام چیزیں اپنی گوناگونی اور فراوانی میں عملاً لامتناہی طور پر ظہور میں آئی ہیں۔ سیاسی، اقتصادی اور سماجی نظاموں کا ارتقا زندگی کے جغرافیائی اور نسلی حالات اور فطری توازن کے مطابق ہوا ہے جو گوناگوں صورت میں پائے جاتے ہیں۔ زندگی کا نسبتاً قبل از تاریخی مرحلہ ختم ہو جانے کے بعد سیاست کا نیا دَور اپنا کردار ادا کرنے کے لیے آیا ہے۔ اس کا پھر چوری، لُوٹ، ڈاکے اور فتوحات سے نو آبادیاتی نظام تک ارتقا ہوا۔ پہلی اور دوسری عالمی جنگوں نے عملاً نو آبادیاتی نظام کا خاتمہ کرا دیا لیکن محض جنوبی افریقہ اور چند دوسرے ممالک کو اس معاملے میں استثنا حاصل ہے۔ یہاں وہ ماضی کی ایک یاد کے طور پر دَم توڑ رہا ہے لیکن یہ حیوانی انسان ابھی تک اُن زنجیروں سے آزاد نہیں ہوا جنھوں نے اسے صدیوں سے باندھ رکھا ہے۔ نو آبادیاتی نظام اگرچہ دَم توڑ چکا ہے تاہم وہ زیادہ تر وسیع تر محاذ پر ایک نئے قسم کے نو آبادیاتی نظام کی جگہ لے رہا ہے۔

نیا وائرس: نئے وائرس کا تقاضہ ہے کہ شہری علاقے دیہات کو اپنی نو آبادی بنائیں۔ شہروں کے اُبھرتے ہوئے دولت مند طبقے کا سابقہ نو آبادیاتی مغرب کے ساتھ مجرمانہ بھائی چارے کا رشتہ ہے جن کے درمیان غیر جانبدار سوئٹزرلینڈ کے بینک خندہ رُو دلالوں کے طور پر کام کر رہے ہیں۔ پُرانے نظام نے بیشتر شکلوں اور صورتوں میں عصمت فروشی کو فروغ دینے کے لیے نیا لبادہ اوڑھ لیا ہے۔ ایک طرف مٹھی بھر مال دار لوگوں کا عالمی ٹولہ ہے اور دوسری طرف نادار اور پچھڑے ہوئے ترقی پذیر ملکوں کے عوام ہیں مگر مال دار لوگ تعداد میں کم ہوتے ہوئے بھی غالب ہیں اور عالمی منظر نامے پر ایک نیا ڈرامہ پیش کر رہے ہیں — نئی سائنس اور ٹکنالوجی سے انسان کی جسمانی طاقتیں بڑھ گئی ہیں جس سے وہ معاملے کو زیادہ سمجھ اور کنٹرول کر سکتا ہے۔ اُس کا دل چھوٹا اور کسی قدر پس روی کی جانب جاتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ سائنس اور ٹکنالوجی زندگی کی بہبود اور ترقی کے ذرائع بننے کے بجائے ایک ایسے دیو کی صورت میں بڑھتے ہوئے معلوم ہو رہے ہیں جس نے انسان کو اپنے شکنجے میں جکڑ لیا ہے۔ انسان نے ہلاکت اور مار کاٹ کرنے کی جو طاقتیں حاصل کرلی ہیں انھوں نے اُن شیطانوں کو بھی مات دے دی ہے جن کا چرچا افسانوں میں ہوتا ہے۔ انھوں نے زندگی کی دوسری صورتوں کے لیے جو لوٹ مار اور تباہی مچانا شروع کی ہے جس میں ہمدردی تو کیا رحم کو قطعی دخل نہیں، ایک ایسا ظلم ہے جو تمام بیانات سے باہر ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ انسان آج زندگی کی ایک ایسی واحد نوع بن گیا ہے جو خود اپنی اور شاید مجموعی طور پر تمام روئے زمین کی زندگی کی بھی بیخ کنی کرنے پر تُلا ہوا ہے۔ انسان کی اسپرٹ اُسی تناسب سے ڈوبتی جا رہی ہے جس تناسب سے وہ بلند سے بلند تر ہوتا جا رہا ہے اور جس سے عالمی جنگ کا امکان بڑھ رہا ہے۔

اس طرح دُنیا میں سیاست نے قطعی ایک نئی صورت اختیار کرنا شروع کر دی ہے۔ جاگیرداری نے ایک ایسے کلچر کی تعمیر کی جو نوعیت کے لحاظ سے پیچیدہ تھا۔ سرمایہ داری اور اُس کے نتیجے میں آنے والے نو آبادیاتی نظام نے ایک ایسے کلچر کی جانب رہنمائی کی جو زمانہ گزرنے کے ساتھ ساتھ انتہائی عمل کا مرہونِ منت ہے۔ نو آبادیاتی نظام اپنے ساتھ جو سرمایہ داری لایا اس نے کمیونزم کو جنم دیا جو باہمی طور پر ایک چنوتی کو ختم کرنے کے سلسلے میں جوابی توازن رکھتا ہے۔ دونوں نظام اب ایک دوسرے کے حریف ہیں۔ اور دُنیا کو اپنے درمیان برابر برابر تقسیم کرنے کے لیے جد و جہد کر رہے ہیں۔ جس کا آغاز اُن کے ایجنٹوں کے ذریعے ہوا ہے۔ سرمایہ داری فرد کے لیے کمانے، دولت جمع کرنے اور فضول خرچی کے لیے مکمل آزادی کی خواہاں ہے جس سے ملک اور بیرونِ ملک میں بیشتر لوگوں کی لُوٹ کھسوٹ ہوتی ہے۔ کمیونزم سب کے لیے خوراک، کپڑے اور مکان جیسی بنیادی ضروریات پیش کرتا ہے لیکن اس سسٹم کے ساتھ جو غالب ہے اختلاف کرنے کی آزادی سے قطعاً محروم کرتا ہے۔ یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ اگر کمیونزم غریبوں اور ناداروں کے علمبردار کے طور پر دھمکی نہ دیتا تو شاید دنیا بھر میں افلاس کے اجتماعی انسداد کا چرچا بھی نہیں ہوتا۔ یہ حیرانی کی بات ہے کہ دونوں نظاموں میں مقابلے کے باوجود ہم وجودیت پائی جاتی ہے۔ گو دو برسرِ جنگ ہوئے بغیر رہ نہیں سکتے۔ ایک نے آزادی کی مشعل تھام رکھی ہے لیکن زبردست استحصال پسندی کی جانب لے جاتا ہے، دوسرا عوامی افلاس کا اختتام کرنا چاہتا ہے لیکن وہ انسان کی آزادی کو خطرہ میں ڈالتا ہے۔ ایک ایسی قوت کی عدم موجودگی میں نوعِ انسانی کی بقا کی ضمانت کون دے سکتا ہے جو حیاتیاتی

طور پر ایک دوسرے کے انتہائی حریف دونوں نظاموں میں مثبت امور کو جوڑ سکے اور منفی امور کا خاتمہ کر سکے۔

اپاہج جمہوریت

ایک سیاسی نظام کے طور پر جمہوریت جو بھارت میں ہمارا بھی مقصد ہے منافقت کے تحت زیادہ اپاہج ہو رہی ہے جو اس قدر چونکا دینے والی ہے جس کے بارے میں ہم سوچ بھی نہیں سکتے۔ جمہوریت کی شطرنج چالیں سماج میں نیک اور شریف لوگوں کے بوتے کا کھیل نہیں رہیں۔ ہمارے آئین میں نہایت انقلابی نوعیت کی ترمیمیں بھی نظام کے کردار میں کوئی تبدیلی نہیں لا سکتیں۔ پہلے ہی شروع سے ترمیموں کا ریکارڈ کوئی ایماندارانہ معیار ہوتا۔ صرف پانچویں اسٹیٹ ہی جوابی کارروائی کر سکتی ہے یہ "عوام کی اسٹیٹ" کہلائی گئی تھی۔ لیکن یہ کام کر سکتی ہے مگر اس سے بھارت بھی دیوتاؤں کا ایک اور مندر بن جائے گا۔ وقت کا تقاضہ یہ ہے کہ زندگی کو حالات کے مطابق ڈھالنے کی کوشش میں شعور کے ساتھ کام لیا جائے۔ "آزادی کا فورم" حیوان ناطق کے لیے ضروری ہے۔ رگ، پٹھوں، اعصاب اور دماغ سبھی کے لیے ضروری ہے کہ وہ آزادی کے ساتھ پرورش پائیں۔ جیسا کہ فطرت کا منشا ہے۔ ایسا کام تقابلی سیاسی، اقتصادی اور سماجی نظاموں سے انجام نہیں دیا جا سکتا جو اس وقت رائج ہیں۔ نہ ہی ان نظاموں کی برائیوں کو کسی ممکن طریقے سے دور کیا جا سکتا ہے۔ ان نظاموں کو عوام کے لیے تب کارآمد بنایا جا سکتا ہے جس صورت میں اُسے روشن خیالی کے شدید دباؤ اور ایسے اقدامات کے تابع لایا جا سکے جو انھیں صحیح توازن میں لا سکیں۔ آزادی اور واقعیت پسندوں کی ایک ایسی فوج عوامی سطح سے تیار ہونی چاہیئے۔ جہاں تک پارٹی بازی کی سیاست کا تعلق ہے اُسے غیر جانبدار ہونا ضروری ہے

اُسے کُلیتاً مقابلہ آرائی سے بالا اور انسانیت نواز ہونا چاہیئے۔ اس کے مدّ و برد دریافت طلب مسائل کیا ہو سکتے ہیں اور ایک ہیئت تجدید کی فورم کے طور پر کون اس کے لیے کام کر سکتا ہے، اور کیونکر کر سکتا ہے۔ اس سے پہلے کہ ان پہلوؤں پر غور کیا جا سکے۔ بحران اور ماحول کا قدرے جائزہ لیا جانا ضروری ہے۔ طاقت زبردست ترین قسم کی کشش رکھتی ہے جو ظاہر و باطن میں عمل کے لیے ہمیشہ ہمیشہ تحریک پاتی ہے۔ اگر اسے خود اپنی تباہی سے بچانا ہے تو اس پر قابو رکھنے کی ضرورت ہے۔ اسے حیاتیاتی طور پر دو مخالف کھنچاؤں کے درمیان متوازن رکھنا ہوگا۔ ایک ہے کُلی مطلق العنانیت کی جانب اور دوسرا ہے تعطلی لاقانونی کی جانب۔ مطلق العنانیت اپنے تصوراتی کھنچاؤ کے باعث ہتھیاروں اور مسلح افواج، پولیس، سراغرسانی، بیوروکریسی، نام نہاد پبلک سیکٹر اور تجارت کی صورت میں سیاست کی غیر معمولی نشو و نما کی جانب لے جا سکتی ہے، سائنس اور ٹکنالوجی کے موجودہ ضمن میں بڑھتے ہوئے "سیاہ بوتے" کو دیکھنے کے لیے کسی کو زیادہ دُور جانے کی ضرورت نہیں۔ اس کے نتیجے میں کوئی بھی کمیاب وسائل کی لام بندی اور اس سے عوام کے حقوق اور بہبود پر پابندی کا مشاہدہ کر سکتا ہے۔ ایسی صورت میں نہ تو گلہ کی گنجائش ہے اور نہ شکایت کی۔ اس طرح پہلی اور دوسری جنگِ عظیم میں اور پھر اس کے بعد حصولِ آزادی کے وقت سے اب تک کے واقعات پر کسی کو حیران ہونے کی بھی ضرورت نہیں۔

جہاں تک لاقانونیت کا تعلق ہے وہ بھی ہمارے ہاں رہی ہے اور اُسے ہم نے تمام تر تاریخ میں موجودہ وقت تک بڑی حد تک دیکھا ہے۔ راقم الحروف نے مئی ۱۹۶۴ کے اوائل میں نہرو جی کے ساتھ تقریباً نصف شب کو ملاقات کی۔ نہرو جی گہری سوچ میں ڈوبے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ انھوں نے واضح طور پر بتایا کہ ایک جوابی طاقت کے بغیر جو عوامی سطح تک موثر اقتدار، ذمہ داری، وسائل اور اہلیت کی توسیع کر سکے اور جسے عوام کی بیدار مغز نگرانی سے برقرار رکھا جا سکے، ہماری آزادی شدید خطرے میں پڑ جائے گی۔ "خود مختاری" کی طویل جنگ شان کے ساتھ جیت لی گئی ہے "آزادی" کی جنگ کا مشکل آغاز ہوا ہے۔ اُس وقت وہ جو کچھ سوچ سکتے تھے یہ پیشنگوئی اُس سے بھی زیادہ درست ثابت ہوئی ہے۔

نہرو جی کے انتقال کے بیس برس بعد ہمیں یہ دیکھ کر خوف ہوتا ہے کہ سیاسی پارٹیوں کے درمیان جو با اقتدار سے لے کر بے اقتدار ہیں عمل، حتیٰ کہ تقریروں میں بمشکل کوئی بنیادی فرق آیا ہے۔ اس سماج میں جو ابھی تک جاگیردارانہ ہے کسی جگہ کوئی بھی اقتدار سنبھالنے کے لیے آئے۔ یہ پارٹیاں ایک دوسرے کی جانشین معلوم ہوتی ہیں۔ کیا یہ کوئی تعجب کی بات ہے کہ گاندھی جی کا آخری فرمان تھا کہ حصولِ آزادی کے بعد ایک سیاسی پارٹی کے طور پر کانگریس کو ختم کر دیا جائے اور اُسے لوک سیوک سنگھ کی صورت دی جائے۔ سوراج کے بارے میں اُن کی زندگی کا نعرہ تھا۔ اقتدار چند ہاتھوں میں جمع نہ ہو بلکہ بہت سے ہاتھوں میں یہ صلاحیت ہو کہ جب اقتدار کا ناجائز استعمال ہو تو اُسے منضبط کیا جا سکے۔ اپنی تمام تر جدوجہد کے دوران انھوں نے سوراج کی کلید کے طور پر طاقت عوام کو دی جس کا انھوں نے اپنی زندگی میں حلف لیا تھا۔ گاندھی جی کی تجویز پر عمل کرتے ہوئے نہرو جی نے اپنے پورے دل کے ساتھ برطانیہ سے حاصل کیے ہوئے اقتدار کو عوام کو منتقل کرنے کے لیے تاکہ وہ وارثوں کے طور پر اُسے سنبھال سکیں۔ پنچایت راج، سہکاری راج اور سامو ہک وکاس کے سہ گونہ سسٹم کے لیے

کام کیا۔ ۱۹۵۲ کے [illegible] میں سامو ہک وکاس سے متعلق منشور میں زندہ رہنے کے حق کی منظوری شامل تھی جسے ایک واحد جملے کی بنیاد کے طور پر انھوں نے خود پلاننگ کمیشن اور متعلقہ وزرا کی حمایت کے ساتھ منظور کیا تھا۔

آزادی سے متعلق فورم

اس کے بعد کے برسوں میں یہ واضح ہوگیا کہ اُس وقت کیا کچھ ہوسکتا ہے جب اقتدار اونچائی پر کسی پابندی کے بغیر اُترتا ہے۔ لہٰذا "پانچویں اسٹیٹ" کے طور پر "آزادی سے متعلق فورم" اقتدار کے ناجائز استعمال کی روک تھام کے لیے ضروری ہے۔ جہاں کہیں وہ ملکی راجدھانی سے عوام تک عمل میں آتا ہے۔ اس قسم کے فورم کے بغیر بھی ہم نے دیکھا ہے کہ آندھرا پردیش کی تخلیق کے معاملے میں واقعی کیا کچھ ہوا اور اقتدار اعلیٰ کو بھی کسی طرح سے ابھی حال ہی میں بیدار اور مصمم ارادے والے لوگوں کے عزم کے سامنے جھکنا پڑا۔ ہم نے یہ بھی دیکھا ہے کہ ایک نسبتاً چھوٹے سے ملک۔ شمالی ویت نام نے اپنے چھوٹے چھوٹے ہتھیاروں لیکن مضبوط عزم کے ساتھ دُنیا کے طاقتورترین ملک کو جھکا دیا اور فرار کے لیے مجبور کر دیا۔ لیکن محض عزم ہی کافی نہیں ہے۔ عوام اجتماعی ہپناٹزم سے خواہ وہ کسی قسم کا ہو کیونکر اچھوتے رہ سکتے ہیں؟ ہمیں لازماً ایک طرح کے ادارے کو اختیار کرنا چاہیئے۔ تاکہ وہ کلیتہً مختلف قسم کا ہو۔ "لوک سیوک سماج" سے مراد پلان اور عمل کے پروگرام ہیں۔ لیکن ہمارے ملک کے موجودہ ترقیاتی مرحلے میں پلان اور عمل درآمد حکومت کی پہلکاری اور وساطت سے ہی ممکن ہوسکے ہیں۔ پنچایت راج، سہکاری سماج اور مختلف قسم کے جمہوریت کے عملی اداروں کو جو رضاکارانہ عمل پر مبنی ہیں اور سماج کے مختلف سیکرٹوں کی طرف سے چلائے جاتے ہیں اپنا موزوں رول ادا کرنا چاہیئے۔ ہم "بہت سے لوگوں" کو کیوں کر ایسی صلاحیت حاصل کرنے کے قابل بنا سکتے ہیں جس سے وہ اقتدار کا غلط استعمال ہونے پر اُسے روک سکیں۔ جیسا کہ گاندھی جی نے سمجھا دیا تھا۔ اس کام کی تکمیل کے لیے کوئی مختصر راستہ نہیں ہے اور نہ ہی کوئی جادو ہے۔ یہ تو ایک زندہ عمل ہے جو فطرت کی مانند جاری رہتا ہے اور نیا ہوتا رہتا ہے۔

اس سے مُراد کیا ہے؟

ہم ناگزیر طور پر "آزادی سے متعلق فورم" کی طرف لوٹتے ہیں۔ اس فورم کے لیے ضروری ہے کہ وہ حقوق کے سہ گونہ چارٹر کے لیے کام کرے۔ یہ ہیں" زندہ رہنے کا حق"، "کام کرنے کا حق" اور "جو کچھ کمایا جائے اُسے وصول کرنے کا حق"۔ ان حقوق کی اعتقاد کے سہ گونہ اصول سے تائید ہونی چاہیئے۔ یہ ہیں" انسان اسے کرسکتا ہے"۔ انسان کو اسے کرنے کی تربیت دی جاسکتی ہے اور اسے انجام دینے کے لیے حالات پیدا کیے جا سکتے ہیں۔ انھیں لچھے دار تقریروں سے بیان نہیں کیا جاسکتا۔ ان کی آزمائش ۱۵ اگست ۱۹۴۷ کے بعد خود نہرو جی کی سرکردگی میں محدود پیمانے پر کی گئی ہے۔ متعلقہ کیمپ اُن لوگوں کے ایک گروپ پر مشتمل تھا جو پاکستان سے اُکھڑ کر آئے تھے۔ اُن سے کہا گیا تھا کہ وہ اپنی تقدیر خود بنائیں۔ انھوں نے خود سے رہنمائی اور تحریک حاصل کی تھی۔ اور اس کام میں انھیں ایک ایسی حکومت سے امداد و حمایت ملی تھی جس کے سربراہ نہرو جی تھے۔ ان میں سے ایک انسانی لیبارٹری۔ ایک جیتا جاگتا دیہی دشہری قصبہ ابھی تک موجود ہے۔ وہ خوشحال ہے اور فرقہ وارانہ زہر، لڑائی جھگڑوں اور تلخی سے قطعاً پاک ہے جن سے حالیہ دنوں میں یہ ملک بدنام ہوا ہے۔ بھارت ماضی بعید میں اپنی بلندی کے افسانوں کے باوجود ایک ایسے طوفان میں پھنسا ہوا ہے جس نے دُنیا بھر کو ہلا کر رکھ دیا ہے۔ اسے راقم الحروف نے چند برس پہلے اقوام متحدہ کی طرف سے دُنیا بھر میں اپنے دورے کے دوران دیکھا اور اس کی رپورٹ اقوام متحدہ کو دی۔ سیاسیات، اقتصادیات اور عمرانیات کو مجموعی طور پر اُس خرابی سے دھکا لگا ہے جو "قوموں کے اندر دو قوموں" کی پیداوار ہے۔ رشت روی لیکن مضبوطی کے ساتھ دُنیا ایک ایسی کھائی کی جانب دھکیلی جارہی ہے جو بہت دُور نہیں رہ گئی ہے۔ آج بھارت میں کوئی بھی معلوم سیاسی پارٹی ایسی نہیں ہے جس میں اتنی ایمانداری، جوش اور صدق دلی ہو کہ وہ اس معمہ کو سمجھ سکے جو نوع انسانی کے ارتقاء میں ایک خطرہ بنا ہوا ہے اور جو اس کی بقاء کی راہ میں حائل ہوا جارہا ہے۔

عوام کی تنظیم

لہٰذا اگر انسان کی آزادی کے لیے بھی کوشش کی جاتی ہے تو عوام کی ایک نئی تنظیم ضروری ہے۔ آسے سیاسیات میں کسی بھی صورت میں عہدے سے کلیتہً احتراز کرنا چاہیئے اور اُس مکاری سے بھی دور رہنا چاہیئے جو ہمارے قبیلے میں اس قدر علامتی اور لازمی بن گئی ہے۔ مرد اور عورتیں، خصوصاً وہ معمر لوگ جن کی کمر ابھی تک سیدھی ہے ہمارے ماضی کی سیاسیات سے تنگ آ چکے ہیں، وہ سارے بھارت میں چلا چلا کر کہہ رہے ہیں کہ اُن کی وہ صلاحیت، توانائی اور جوش جو ابھی صرف نہیں ہوئے اُن کے تخلیقی نکاس کے لیے کوئی پروگرام ہونا چاہیئے۔ اُن سے سچے سچے توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ اب کسی بھی قیمت پر خریدے نہیں جاسکتے۔ اس میں خصوصی پیشہ ور، خاص طور پر معلم اور یونیورسٹی کے استاد بھی لازماً شامل ہونے چاہئیں۔ ایسے ایسے صحافیوں کو بھی مدعو کرنا چاہیئے جو پیسے کے غلام نہ ہوں بلکہ جن کے پاؤں مضبوطی سے

بھارت کی سرزمین پر جمے ہوں اور جو نظم و ضبط قبول کرنے کو آمادہ ہوں۔ اور نئی تحریک کو جوں جوں وہ بڑھے اخلاقی اور انسانی امداد پیش کریں۔ نوجوانوں کی بہت بھاری تعداد جسمانی، ذہنی اور قوتِ ارادی کے لحاظ سے بڑھ رہی ہے جو اپنی روزمرہ کی تعلیم کے بعد غیر نصابی سرگرمیوں کے لیے واویلا کر رہے ہیں، انھیں یہ بھی کچھ دینا چاہیے جو ان کا اپنا تقاضہ ہے جیسا کہ نوگیوں پہلے نوجوانوں کا ضابطۂ اخلاق ہوا کرتا تھا۔ وہ سیاست کے اس کھیل سے تنگ آچکے ہیں جو برسوں سے کھیلا جا رہا ہے۔ اس گروپ کے لیے ضروری ہوگا کہ وہ اپنی رکنیت کی ابتدائی شرط کے مطابق ممبر بن جانے کے بعد کم از کم دس برس کے لیے کسی بھی صورت میں اندھی طرفداری کی سیاست سے احتراز کریں گے۔ اور وہ یہ کام بخوبی کریں گے۔

پروگرام خیال و عمل میں کلیتہً تشدد سے پاک ہونا چاہیے۔ یہ اس اصول پر مبنی ہونا چاہیے کہ سب کے تئیں خیر سگالی ہونی چاہیے اور کسی کے تئیں کدورت نہیں ہونی چاہیے۔ عمل کا کردار اور وہ سمت جو اسے اپنے طور پر اختیار کرنی چاہیے اس وقت منظر پر آئیں گے جب فورم وجود میں آئے گا اور اپنی تلاش شروع کرے گا۔ روپیہ کوئی مسئلہ پیش نہیں کرتا، جو کاز حقیقی ہو وہ اس کے لیے پانی کی مانند بہتا ہے۔ آج جس شئے کی واقعی کمی ہے وہ ہے کردار، اہلیت اور عقیدت کا امتزاج۔

فورم کے لیے ضروری ہے کہ وہ شروع میں صدیوں سے دیہات میں چلے آ رہے بے زر لوگوں اور شہروں کی ان بڑھتی ہوئی گندی بستیوں میں جد و جہد کرنے والے اور مصائب جھیلنے والے لوگوں تک خود کو محدود کرے جو عملاً ہوا اور پانی کے بغیر ہیں، مکان اور کام کا تو ذکر ہی کیا۔ حکومت اور ہمارے دولت مند "بہی خواہوں" کی طرف سے پیش کردہ پلانوں اور زبردست مساعی کے باوجود افلاس، ذلت اور ناداری میں بھاری اضافہ ہوا ہے۔ اس لیے آزادی سے متعلق فورم کے لیے ضروری ہے کہ وہ ایک ایسا رضا کار ادارہ بنے جس کا خیر مقدم کیا جائے اُسے اپنے لیے حکومت سے کچھ نہیں مانگنا چاہیے۔ حکومت جو پلان بناتی ہے اور ان کی تکمیل کرتی ہے اُسے ان کی ایماندارانہ تکمیل کی مانگ کرنی چاہیے۔ اسے اس امر کا پردہ فاش کرنے کے لیے ایک پاسبان کے طور پر کام کرنے کا حق ہونا چاہیے کہ فریب کہاں، کیوں اور کیونکر ہوا۔ اس کا کردار بیشتر کی ایک نئی لڑائی کے طور پر خیر مقدم کیا جا سکتا ہے جس کا میدان معمروں اور نوجوانوں کے لیے کھلا ہے۔ ان کے درمیان متوسط درجے کے لوگوں کو بھاری تعداد میں اکیلے چھوڑا جا سکتا ہے تاکہ وہ اپنی خواہش کے مطابق زندگی اور رتبے میں فوری ترقی کے موجودہ دَور میں اپنے کو دُور رکھ سکیں۔

جاگو اور اُٹھو

معمروں کے لیے جو اپنے دل و دماغ کو ہی ہتھیار بنا کر اس نئی لڑائی میں کودنا چاہیں ضروری ہے کہ وہ اپنے نجی نام پر گنگا کے پاس پھلگو دریا یا ہردوار میں گنگا کے کنارے "پنڈ" دان کریں۔ تجربہ کے مطابق پنڈت ان لوگوں سے جو ابھی تک زندہ ہوں "پنڈ" لینے سے انکار کرتے ہیں۔ معمروں کے لیے ضروری ہے کہ جس قدر طویل ہو سکے وہ اپنی زندگیوں کو کھینچیں اور انھیں مضبوط بنائے رکھیں تاکہ وہ محنت شاقہ سے کام کریں اور گونگے و بہرے بن کر نہ رہیں اور زنگ آلود ہو کر آندھی میں بھوسے کی مانند اُڑ نہ جائیں۔ اس جہاد کو گاندھی جی اور نہرو جی کی خاموش دعائیں حاصل ہوں گی۔ اسے ماضی بعید سے گوتم بدھ کی "مسرتیں" حاصل ہوں گی۔ یہ شنکر کی "جیوتی" اپنی طرف کھینچ لے گا جنھوں نے "شو اوہم" (انا الحق) کا نعرہ لگایا تھا اور جنھوں نے تلاشِ حق مکمل ہو جانے کے بعد ۳۰ برس کی عمر میں اپنے جسم کو چھوڑ دیا تھا۔ سایہ اور سراب سے حقیقت کی جانب ہمارے کردار میں کایا پلٹ لانے کے عمل میں اُن کی سپرٹ ہمیں تحریک دے گی۔ وقت کا تقاضا ایک ایسا کردار ہے جو جاگیرداری کے اُس سنگِ میل کو اکھاڑ پھینکے گا جو صدیوں سے بھارت کی روح اور زمین کو زنگ آلود بنا کر بگاڑ رہا ہے۔

جب بھارت کی سپرٹ میں قطعاً مُردنی چھا گئی تھی تو سو برس پہلے ایک واحد سنیاسی اُٹھا۔ اُس نے پہلے ہی ملک میں چلتے ہوئے کشمیر سے کنیا کماری تک اور کچھ سے ناگا پہاڑیوں تک یاترا کی۔ وہ ایک غیر معروف سنیاسی کے طور پر بذریعہ جہاز شکاگو کی مذاہب کی بین الاقوامی کانگریس میں پہنچا اُس کے پاس ذرائع نہیں تھے۔ حتیٰ کہ دعوت نامہ بھی نہیں تھا۔ "ہر روح خدائی نور ہے"۔ یہ بھارت کے فلسفے کا جوہر ہے جو براعظموں پر گونجتا ہے۔ ۳۹ برس کی عمر میں سوامی وویکانند کی طرف سے گہرے دھیان (مراقبہ) میں جسم چھوڑنے کے بعد بھی کبھی مدھم نہ ہونے والی جیوتی بھارت بھر میں پھیل گئی۔ "جاگو، اُٹھو اور تب تک رُکو نہیں جب تک مقصد پر نہ پہنچ جاؤ"۔ یہ اُن کا پیغام تھا جو اُفق تک متواتر گونج رہا ہے۔ اسی مشن نے گاندھی جی، نہرو جی اور بیشتر معروف اور غیر معروف مسافروں کو تحریک دی جو لڑے اور ابھی تک بھارت کی روح کے لیے لڑ رہے ہیں تاکہ وہ جاگے اور اُٹھے"۔ محض اس سے بقا کے لیے قوت مل سکتی ہے۔ محض اس سے فطری توازن کے ابتدائی قوانین کے طور پر امن، دوستی اور توازن کی یقین دہانی ہو سکتی ہے۔ محض انسان ابھی تک آزاد نہیں ہے جبکہ زندگی کی تمام دوسری انواع میں نسبتاً آزادی کے ساتھ ہم وجودیت پائی جاتی ہے اور وہ اپنی انواع کی انفرادی صنف میں شاذ ہی ایک دوسرے کو مار کر کھاتے ہیں۔

وسنت ساٹھے

معاشرتی انقلاب کی جانب

اقتصادی جمہوریت کا مقصد

پانچواں باب

اقتصادی جمہوری طرز حل کی جانب

قسط : ۱۲

بیماری کا تجزیہ کر لینے کے بعد قاری کو اب کرب اور مایوسی کے عالم میں اس کے علاج کے بارے میں استفسار کرنا ہوگا۔ اس کے علاج میں چند مقاصد مضمر ہیں یعنی کہ اتحاد اور سماجی انصاف جن سے کہ جملہ عوام کی متوازن اقتصادی ترقی کو یقینی بنایا جا سکے گا۔

اقتصادی ترقی سے ہماری کیا مراد ہے؟ کسی بھی سماج میں ایک فرد کی نشو و نما اور ترقی کے لیے بنیادی ضرورت یہ ہے کہ اسے سامان یا خدمات پیدا کرنے کا اہل بنایا جائے۔ اسی قدر ایک دوسرا کام اہم ہے اور وہ یہ کہ فرد کے ذریعے پیش کردہ خدمات اور تیار کردہ سامان کی تقسیم یا تبادلہ عمل میں آئے۔ اگر اقتصادی سرگرمی کے اس عمل کو یوں ہی چھوڑ دیا جائے تو یہ مانگ اور رسد کے عام اصول کے تابع ہو جاتی ہے۔ اصل مانگ روٹی کپڑا ہے۔ ان کا شمار بنیادی اشیاء کی لازمی ضرورتوں میں ہوتا ہے۔ اس کے بعد اگر آدمی کی قوتِ خرید باقی رہتی ہے تو پھر وہ اشیائے تعیش کے آئٹموں کی مانگ کرتا ہے۔ جو کچھ اس نے پیدا کیا ہے، اس سے اس کی قوتِ خرید بنتی ہے۔ اس نے دوسروں کو سامان یا خدمات کی صورت میں جو کچھ فراہم کیا ہے، اس سے اس کی قوتِ خرید میں اضافہ ہوتا ہے؛ اس تبادلہ سے اس کے لیے فاضلات مہیا ہوتے ہیں۔ یہی سرمایہ بنتا ہے۔ اراضی گویا کہ قدرتی وسائل پر محنت کے ساتھ اقتصادی سرگرمی سے ہی سرمایہ بنتا ہے۔ جب صنعت کار اسے جمع کرتا ہے اور پھر کام میں لاتا ہے تو یہ ترقی کے لیے سرمایہ کاری کہلاتی ہے۔ لہٰذا اقتصادی سرگرمی اور ترقی کے عمل کو آگے بڑھانے کے لیے اراضی، محنت اور سرمایہ درکار ہے تاکہ صنعت کار اسے کام میں لا سکے۔ آبادی کے زیادہ تر طبقے میں معاشی حالات بہتر بنانے کی غرض سے متوازن ترقی اور ہم آہنگی کے واسطے دو اقدامات کو بیک وقت انجام دینا ہوگا۔ پہلے عوام کی قوتِ خرید میں اضافہ خاص کر کھیتی پر انحصار کرنے والوں کی قوتِ خرید میں اضافہ کیا جائے۔ ترقی پذیر ممالک میں آبادی کی اکثریت زراعت پر انحصار رکھتی ہے اور بس وہ اتنا کما پاتی ہے کہ اس کے جسم و جان کا تعلق کسی طرح باقی رہے۔ اس لیے زرعی اشیاء کی قیمتوں میں اضافہ اور کھیت مزدوروں کی اجرتوں میں اضافے سے ان کی قوتِ خرید بڑھائی جا سکتی ہے۔ لیکن ایسا کرتے ہی دوگونہ اثرات ظاہر ہو سکتے ہیں۔ فوراً ہی لازمی اور بنیادی اشیائے صارفین کی مانگ بڑھے گی اور منڈی جو کہ اس وقت ۵ تا ۱۰ فی صد آبادی تک محدود ہوتی ہے، اس میں دس تا ۱۵ فی صد خریدار کود پڑیں گے۔ اس سے قیمتیں بڑھیں گی اور افراطِ زر کا دباؤ بڑھے گا۔

دوسرے یہ کہ اجرتوں کی صورت میں محنت کے اخراجات بڑھیں گے جس سے کسان کم سے کم کھیت مزدوروں کو اپنے یہاں رکھیں گے۔ اور اپنی کھیتی میں مشینی آلات سے کام لینا چاہیں گے جس سے محنت کش طبقہ بے روزگار ہو جائے گا اس لیے اس عمل کے ساتھ ہی لامرکزی نظام کے تحت اشیائے صارفین کی تیاری پر زور دینا ضروری ہے اور زرعی مزدوروں کو اس کام میں کھپا کر اشیاء کی تیاری بڑھانی ہوگی۔ شروع میں اشیائے صارفین مثلاً کپڑا، چمڑے کی مصنوعات، تعمیر مکانات، ایندھن، گھریلو اشیاء، صابن اور دیگر سامان بہت معیاری نہیں ہوگا لیکن اشیاء کی فروخت کے نظام کے استحکام سے روزگار کے مواقع بڑھیں گے اور اشیائے صارفین کی مانگ پوری ہو سکے گی۔ اشیائے صارفین کی تیاری کے لیے ماڈرن ٹکنالوجی کو کام میں لا سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر الیکٹرانک کی اشیائے صارفین کی تیاری کی جا سکتی ہے۔ اس کی مدد سے ٹرانسسٹر ریڈیو، ٹیلی ویژن

مشینوں، ٹیپ ریکارڈروں، ٹیلی ویژن اور ٹرانزسٹروں وغیرہ کی تیاری گھریلو صنعتوں کی شکل میں ترقی کرے گی۔ معاون پرزوں اور آلات کی تیاری کے لیے لامرکزی طریقۂ کار اپنانا ہوگا۔ اس سے روزگار کے مواقع بڑھیں گے اور براہِ راست تعلیم کے عمل سے عوام میں سائنسی مزاج پیدا ہوگا۔

بار بار یہ بات دیکھنے میں آتی ہے کہ نام نہاد ناخواندہ لوگ جدید ٹکنالوجی کو اپنانے کے لیے پوری طرح اہل ہیں۔ بشرطیکہ ایک بار انھیں اس کا استعمال سکھا دیا جائے۔ وہ لڑکیاں جنھوں نے گھڑی دیکھی تک نہ تھی، انھوں نے گھڑی سازی کے کارخانوں میں بہترین کارگزاری کا ثبوت دیا ہے۔ لدھیانہ میں مشینی پرزے استعمال کرنے والے آپریٹروں نے یہ ثبوت دیا ہے کہ وہ ایک بار دیکھ کر انجینئرنگ کا انتہائی پیچیدہ اور جدید قسم کا سامان تیار کرسکتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی تربیت یافتہ ٹکنیشینوں کی کمی نہیں ہے۔ عوام کے معیارِ زندگی بلند کرنے کے لیے اشیا کی پیداوار اور تقسیم کے منصوبہ بند اور متوازن نظام کی ضرورت ہے اس لیے ان کو ان اشیا کی تیاری میں مصروف کرنا ہے کیوں کہ اس کے بغیر یہ نظام فروغ نہیں پا سکتا۔ ان کی مصروفیت سے ان کو اجرتیں ملیں گی اور اُن کی قوتِ خرید بڑھے گی۔

چنانچہ معیشت کو محدود منڈی کے ساتھ وابستہ کرنے کی بجائے ایسے لوگوں کی قوتِ خرید بڑھانی ضروری ہے، جن کے پاس فی الحال روزگار کے نہ ہونے سے یہ نہیں ہے حالانکہ ان کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ جبکہ یہ حقیقت ہے کہ مٹھی بھر لوگ منڈی سے سامان خریدنے کی بے پناہ صلاحیت کے مالک ہیں۔

سرمایہ دارانہ نظام

اس مقصد کے حصول کے لیے اراضی، محنت اور سرمایے کو منصوبہ بند اور متوازن طریقے پر لگانا ہے تاکہ سماج کے چند لوگ ملک کی کثیر آبادی کا استحصال نہ کر پائیں۔ اس کے لیے پابندیوں اور متوازن ترقی کا ایک نظام ترتیب دیا جاتا ہے تاکہ فاضلات سے پورے سماج کا بھلا ہو اور وہ ترقی کی صحیح سمت میں خرچ کئے جا سکیں اور اشیاء کی تقسیم نیز سماجی انصاف کو بیک وقت یقینی بنا سکیں۔ اس عمل سے عوام کے بڑے طبقے کے لیے کثیر مواقع سامنے آسکیں گے۔

اقتصادی ترقی کے میدان میں بنیادی مقصد ایسی اشیا کی تیاری کی حوصلہ افزائی ہے جو عام استعمال کی ہوں ان کو کم لاگت پر تیار کرنا ہے اور زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہونچانا ہے۔ اس کے ساتھ ہی اشیاء کی تقسیم کے نظام کو وسیع کرنا ہوتا ہے۔ ان کوششوں سے روزگار کے مواقع بڑھیں گے اور اقتصادی سرگرمیوں میں اضافہ ہوگا۔ پیداوار اور اشیا کی تقسیم سے متعلق تمام اقتصادی سرگرمیوں میں قیمت میں اضافہ کا عنصر سامنے رہتا ہے۔ اس تصور کے دائرۂ کار میں غیر ملکی زرِ مبادلہ کے وسائل کا سوال بھی آتا ہے۔ البتہ محنت کا نتیجہ اور اس کا پھل اقتصادی سرگرمیوں میں منقسم نہ ہونے سے' اس میں عدم توازن اور انحراف پیدا ہو جاتا ہے۔ دولت چند ہاتھوں میں مرکوز ہو کر رہ جاتی ہے اور اس سے ملک کے کثیر عوام کے خرچے پر چند لوگوں کا بھلا ہو پاتا ہے اور محنت کے ثمرات سے ملک کے عام فائدہ اٹھانے سے قاصر رہتے ہیں۔

آج کے دور جدید اقتصادی سرگرمیوں کے عناصر یہ ہیں :-

۱۔ صنعت کار یا وہ لوگ جو پیداوار سے متعلق کسی سرگرمی کی منصوبہ بندی کرتے ہیں۔

۲۔ محنت کش طبقہ جس میں انتظامیہ، تکنیکی، ہنرمند اور غیر ہنرمند عملہ شامل ہے۔

۳۔ سرمایہ جو بنکوں اور زندگی بیمہ کارپوریشن جیسے اداروں کے توسط سے ملتا ہے۔

صنعت کار منصوبہ بناتا ہے' اراضی حاصل کرتا ہے، محنت کش طبقہ کو کھپاتا ہے اور مالیاتی اداروں سے رقوم حاصل کرتا ہے۔ اس طرح وہ اگرچہ کلیدی کردار ادا کرتا ہے' تاہم ضروری نہیں کہ صنعت کار خود ہی تمام سرمایہ لگا سکے۔ آج کے دور میں صنعت کار مشکل ہی سے سرمایہ لگاتا ہے۔ صنعتی پیداوار ہو یا تجارتی اشیاء کی تقسیم ہو، غرضیکہ کسی بھی اقتصادی سرگرمی میں ۹۰ فی صد سرمایہ مالیاتی اداروں سے لیا جاتا ہے جہاں کہ تمام سماج کا جمع شدہ سرمایہ ہوتا ہے۔ اس طرح سے اب وہ خطرہ جو پہلے صنعت کار کو اپنے طور پر اٹھانا پڑتا تھا' اب پہلے کی طرح نہیں اٹھانا پڑتا۔ اس کے علاوہ بجٹ سے بھی سرمایہ فراہم کیا جاتا ہے۔ بجٹ میں عوام سے رقومات اکٹھا کی جاتی ہیں۔ اس لیے یہ سرمایہ کاری عوامی ہوئی۔ اس سرمایہ کے اخراجات کے سلسلے میں عوام کو اظہارِ رائے کا حق ہونا بجا ہے۔

اراضی اور سرمایے کے بعد ہم محنت کش طبقہ پر نظر ڈالتے ہیں۔ یہی لوگ اجتماعی صورت میں وہ سامان تیار کرتے ہیں جس کی تیاری اصلی منشا و مدعا کے مطابق ہوتی ہے۔ جب ایک عنصر دوسرے دو عناصر کو پیداواری سرگرمی میں اُن کے جائز حقوق سے محروم کر دیتا ہے' اس صورت میں فاضل رقومات کی تقسیم منصفانہ طور پر عمل میں آئے بغیر چند ہاتھوں میں محفوظ ہو جاتی ہے۔ اس طرح عوام کی اکثریت سے حقیقی منافع اور فاضلات مخفی ہو جاتے ہیں اور کالا دھن پیدا ہو جاتا ہے۔ رال پرہیش کے کہنے کے مطابق جمہوری عمل کو دبانے یا ختم کرنے سے یہ عدم توازن دور نہیں ہوگا بلکہ اقتصادی سرگرمی کے عمل کو یکسر بدلنا ہوگا تاکہ انفرادی پہل کاری اور منڈی کی قوتیں وہ سماجی صلاحیت حاصل کر سکیں جس کی کہ آج کمی ہے۔ سرکاری مالیات سرمایہ کا اصل وسیلہ ہے اور سرکار بحیثیت عوامی نمائندہ سرکاری

مالیات کی کسٹوڈین (محافظ) ہے۔ اس حقیقت کے پیش نظر جب ایک صنعت کار یا کوئی بھی مہم جو یا تاجر سرکاری مالیاتی اداروں سے قرض لیتا ہے اور پیداواری اور اشیا کی تقسیم سے متعلق سرگرمی سے پیدا شدہ حقیقی منافع کو چھپاتا ہے اور یہ حقیقت اپنے یہاں کام کرنے والے محنت کش طبقے سے، اور مالیاتی اداروں سے گویا کہ دونوں سے چھپاتا ہے اور منافع کو پیداواری عمل میں کھپا کر اس کا جھوٹا گوشوارہ دکھاتا ہے بلکہ نقصان دکھاتا ہے تو اس عمل سے کالا دھن بڑھنے لگتا ہے۔ لہذا اقتصادی سرگرمی میں معاون تینوں عناصر پیداوار اور اشیا کی تقسیم ہر دو شعبوں میں بہتر نظم و نسق چاہتے ہیں۔

خالصتاً جمہوری نقطۂ نگاہ سے بھی اگر سیاسی جمہوریت برقرار رکھنی ہے تو اقتصادی جمہوریت لانی بھی ضروری ہے۔ درحقیقت تمام کا تمام اقتصادی نظام عوام کے ہاتھوں میں ہونا چاہیئے۔ اور عوام ہی کے لیے ہونا چاہیئے، نہ کہ چند ہاتھوں میں اور محض چند لوگوں کے فائدہ پہنچانے کی غرض سے ہو۔

اقتصادی جمہوریت کے ہمارے ڈھانچے میں اقتصادی سرگرمی کے تنظیمی ڈھانچے کو اس طرح ترتیب دیا جائے جس میں تمام اقتصادی قوتیں متوازن انداز میں جمہوری طریقے پر شریک ہو سکیں۔

۱۔ اشیا کی پیداوار اور تقسیم کی اقتصادی سرگرمیاں خاص کر منظم سیکٹر اور از خود روزگار کے سیکٹر سے وابستہ ہیں۔ از خود روزگار کے سیکٹر میں اکثر تینوں عناصر ایک دوسرے سے گتھ جاتے ہیں۔ اس لیے صنعت کار جات خود ہی محنت کش طبقے میں شمار ہوتا ہے اور ایک کا دیگر کے ہاتھوں استحصال اس غیر منظم اور چھوٹے پیمانے کی سطح پر برائے نام ہوتا ہے۔ اس لیے اقتصادی ڈھانچے کا نمونہ وہ نہیں ہوتا جیسے سختی کے ساتھ غیر منظم شعبے پر لاگو کیا جا سکے، لیکن منظم صنعتی سیکٹر میں اقتصادی جمہوریت کا تنظیمی ڈھانچہ ضرور ہونا چاہیئے۔ اس کے بغیر جمہوریت پسند اور پُرامن طریقوں سے انقلاب لانا ممکن نہیں۔ عوام کے معیار زندگی میں متوازن ترقی بھی اس کے بغیر ممکن نہیں۔

اقتصادی جمہوری ڈھانچہ

پیداوار اور تقسیم کے سرمایہ دارانہ طریقہ اور اس کے اصولوں پر سابق میں روشنی ڈالی گئی تھی۔ سرمایہ دارانہ نظام کے تحت اقتصادی ترقی اور معیار زندگی میں بہتری کا انحصار جیسا کہ مختلف سماجی مطالعوں سے واضح ہوتا ہے، آمدنی کی نابرابری پر ہے لیکن غریب عوام کی کھپت کی اس میں بڑی گنجائش ہے۔ ترقی کے ابتدائی مرحلوں میں زیادہ آمدنی اور زیادہ بچتوں سے پیداوار کا وسیع ڈھانچہ بن جاتا ہے اور اس عمل میں سب کو روزگار مل جاتا ہے اور ہر ایک کی آمدنی بڑھ جاتی ہے۔ مغرب کے سرمایہ داروں کو یہ بھی فائدہ ہے کہ وہ کم ترقی یافتہ ملکوں سے کچا مال حاصل کر لیتے تھے اور پھر تیار مال منڈی میں منافع پر فروخت کرتے تھے۔ پیداواری ڈھانچے کو توسیع دئے بغیر اعلیٰ آمدنیاں اور بڑھی ہوئی بچتیں اقتصادی دولت کا ارتکاز یا نام و نمود کے لیے اخراجات میں اضافہ نہیں ہو سکیں۔ اس طرح کا ڈھانچہ ہندوستانی معیشت کے پس منظر میں موزوں نہیں ہو سکتا کیونکہ صنعتی ڈھانچے کی بنیادیں استوار نہیں تھیں۔ اس کے علاوہ یہاں مہم جو یا نہ طرز کے صنعت کاروں کی بھی کمی تھی۔ نیز نجی سیکٹر کا بھی فقدان تھا۔ ہندوستان میں زیادہ تر تاجر اور کاروباری لوگ وہ تھے جو سامان کی خرید و فروخت کے ذریعے روپیہ کماتا تھا۔ تجارت اور دوسری منافع کی منڈی کے لیے سامان اور خدمات کی تیاری کے سلسلے میں اہمیت نہیں رکھتے تھے۔

ہندوستان کی معیشت اور اقتصادی ترقی کے معمار جواہر لال نہرو نے بجا طور پر یہ مناسب سمجھا کہ سرکار کو ایک ایسے نظام کی بنیاد ڈالنی چاہیئے جو متعالیہ غیر منافع بخش پیداواری ڈھانچے پر استوار ہو سکے۔ یعنی اس کی بنیاد بنیادی اور بھاری سامان تیار کرنے والی صنعتوں پر ہو۔ جو نجی منظم سیکٹر کی صنعتوں کے فروغ میں معاون ہو۔ اور جس سے چھوٹے پیمانے کی صنعتوں کو فروغ مل سکے۔ چنانچہ پرائیویٹ اور پبلک سیکٹر دونوں پر مبنی اس ملی جلی معیشت سے یہ توقع کی گئی کہ اس کے ذریعے پیداوار بڑھے گی اور آمدنیوں کی منصفانہ تقسیم عمل میں آ سکے گی۔ لیکن اس کتاب میں پیش کردہ جائزہ یہ ثابت کرتا ہے کہ یہ توقع پوری نہ ہو سکی۔ یہی نہیں بلکہ کوآپریٹو سیکٹر، مشترکہ سیکٹر اور مالیاتی اداروں کو دی گئی مالی امداد کے فروغ کے ذریعے بھی یہ مقاصد پورے نہ ہو سکے۔ مسز اندرا گاندھی کا بیس نکاتی پروگرام آمدنیوں کی غیر منصفانہ تقسیم پر براہ راست حملہ ہے۔ چنانچہ غریبی کے خط سے نیچے زندگی بسر کرنے والوں کی آمدنی بڑھانے پر زور دیا گیا ہے۔ بیس نکاتی پروگرام سے کھپت کے مستقل آئیٹموں کی فراہمی کو یقینی بنانے پر زور ہے۔ لیکن اس کے لیے ڈھانچہ پرانا ہی ہے اور پیداواری ڈھنگ میں کوئی تبدیلی نہیں لائی گئی ہے۔ اگر اس میں تبدیلی نہیں لائی گئی تو یہ ایسا ہی ہوگا کہ سردی کے موسم میں کمرے کو گرم کرنے کے لیے ہیٹر تو جلا دیا جائے اور دروازے کھڑکیاں بند نہ کی جائیں۔

نیا ڈھانچہ

اقتصادی جمہوریت کے اس نئے ڈھنگ سے ایک انتظامی بورڈ ہوگا جس میں عوامی سطح کے صنعت کاروں کے برابر کے نمائندے ہوں گے۔ اس کے ساتھ ہی مالیاتی اداروں اور محنت کش طبقے کے نمائندے ہوں گے۔ صنعت کار سے مراد یہ ہے کہ وہ پارٹی جس نے کوئی صنعتی پراجیکٹ

لگایا ہے یا کسی منظم پیمانے پر کوئی ناجائز سرگرمی شروع کی ہے۔

فرض کیجئے کہ کسی منظم صنعت میں انتظامی بورڈ میں نو ارکان ہیں تو اس میں تین ارکان تو متعلقہ صنعت یا پراجیکٹ کے چلانے والے ہوں گے۔ تین مالیاتی اداروں کے، دو افراد مرکز میں عوام کی نمائندہ پارٹی کے ہوں گے۔ اور ایک فرد اس ریاست سے ہوگا جہاں اس پارٹی کی نمائندہ حکومت ہے۔ ان تین سرکاری نمائندوں میں ایک مالیاتی ادارے کے نمائندے کی حیثیت سے مالی امور میں ماہرانہ مشورے دے گا، دوسرا اس میں سیاسی پارٹی کا نمائندہ ہوگا، جس کی مرکزی حکومت ہے اور تیسرا ریاست سے ہوگا اور اس سیاسی پارٹی کا نمائندہ ہوگا جس کی اس ریاست میں حکومت ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ پیداواری سرگرمیوں سے متعلق عوامی نمائندوں کے درمیان تال میل قائم رہے اور منصفانہ طور پر اقتصادی مقاصد کا حصول ممکن ہو سکے۔ آخری تین ارکان صنعت میں لگے تمام لوگوں میں سے منتخب کئے جائیں گے۔ تمام ملازمین کو خواہ وہ رسمی طور پر شیئر ہولڈر ہوں یا نہ ہوں، یہ حق پہنچتا ہے کہ انتظامیہ تکنیکی امور اور غیر تکنیکی زمروں میں سے ہر سال تین نمائندے چنیں۔

اسی طرح انتظامیہ بورڈ میں پیداوار کے تینوں بڑے عناصر کی بنیادی طور پر نمائندگی ہوگی۔ اس طرح خام مال پر آئے ہوئے اخراجات اور اس کے معیار اور دیگر سرگرمیوں پر کئے گئے اخراجات وغیرہ کے بارے میں سبھی کو پوری طرح واقفیت حاصل ہوگی اور کوئی بھی ان کا استحصال نہیں کر سکے گا۔ فروخت کئے گئے مال اور اس سے حاصل ہونے والی آمدنی کے بارے میں مالیاتی اداروں نیز محنت کش طبقے کے نمائندوں کو پورا علم رہے گا۔ موجودہ حالات میں صنعتی یا تجارتی سرگرمیوں کے نظم و نسق کے ذمہ دار جنہیں بالعموم صنعت کار کہہ کر یاد کیا جاتا ہے، بالعموم حقیقی فاضلات کو آنکھوں سے اوجھل رکھتے ہیں لیکن مذکورہ نظام میں ایسا کرنا ممکن نہ ہوگا۔ انتظامی بورڈ کو ادھار لیے گئے سرمائے پر منافع نیز ابتدائی سرمایہ کاری پر منافع اور صنعت کار کے خود اپنے منافع، نیز محنت کش طبقے کو بونس وغیرہ کی تقسیم کے بعد بچنے والے فاضلات کا پتہ چل سکے گا۔ یہ نظام پبلک اور پرائیویٹ سیکٹر پر ہی نہیں بلکہ ہر معاشی اور اقتصادی شعبے پر لاگو ہوگا۔

چونکہ فاضلات کی مجموعی رقم کا اصل ماخذ پر ہی پتہ لگ جائے گا، اس لیے یہ تمام رقم عوامی ملکیت کی ہوگی یعنی کہ ریاست کی۔ ریاست عوام کی نمائندہ کی حیثیت سے یہ طے کرے گی کہ یہ فاضلات معیشت کے کن شعبوں میں دوبارہ لگائی جانی ہے تاکہ ترقی صحیح سمت میں ہو سکے۔ اس سے نہ صرف پیداواری سرگرمیاں بڑھیں گی بلکہ ضروری اشیاء کی پیداوار کو یقینی بنایا جا سکے گا۔ اس طرح سماج کے سبھی ارکان کے لیے کم سے کم معیارِ زندگی کو یقینی بنایا جا سکے گا۔ پیداواری سرگرمیوں کے ڈھانچہ بن جانے سے ملک میں صرف ایک اقتصادی سیکٹر ہوگا اور یہ تمام کا تمام اقتصادی سیکٹر قومی سیکٹر ہوگا۔ صنعتی پیداوار کے منظم سیکٹر میں قومی تنظیم کا ایک ڈھانچہ بھی ہوگا جس میں انفرادی یونٹ، مختلف صنعتی سرگرمیوں کے شعبوں میں رکن کی حیثیت سے ہوں گے۔ ان کے ذریعے کام کو آسان بنانے کی خاطر ایسے تال میل قائم کیا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر دواؤں کی تیاری کے لیے ایک قومی ادارہ ہوتا ہے، اسی طرح فولاد، سیمنٹ، کیمیاوی کھاد، کوئلہ، انرجی، خوراک اور زرعی پیداوار کی خاطر بھی ایک ایک قومی ادارہ ہو سکتا ہے۔ ہر سطح پر ہر کارخانے میں نمائندگی کا طریقہ یہی ہوگا۔ اس طرح قومی اداروں میں عوام کے منتخب ارکان کی سرکار کے نمائندے ہوں گے۔ یہ ادارے صنعتی سرگرمیوں کے لیے پالیسیاں اور پروگرام وضع کریں گے۔ یہ پالیسیاں تشکیل دیتے وقت عوام کی ضرورتوں اور ترجیحات کو سامنے رکھا جائے گا۔ چونکہ ان تنظیموں میں اقتصادی سرگرمیوں میں مشغول افراد کی نمائندگی ہوگی، اس لیے وہ اقتصادی سرگرمیوں پر کم سے کم پابندیاں لگائیں گے بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ یہ ادارے سرکار سے مدد پاکر ایسے حالات پیدا کریں گے جن سے اقتصادی ترقی کا عمل تیزی سے آگے بڑھے اور ملک کے محنت کش عوام کو زیادہ سے زیادہ کام مل سکے۔ اس میں دفتر شاہی ڈھانچے کا رول کم سے کم ہوگا۔ موجودہ دفتر شاہی نظام کسی نہ کسی پیداواری یا اشیاء کی تقسیم سے متعلق سیکٹر سے جڑ جائے گا اور آج کے حالات کی طرح تمام تر سکّہ اختیارات کا مالک نہ ہوگا۔ آج کے دور میں اس نظام کی ذمہ داری عمل درآمد سے جڑی ہوئی نہیں ہے پھر بھی یہ سیاہ و سفید کا مالک ہے۔ موجودہ انتظامی ڈھانچے میں حالانکہ کچھ بہترین صلاحیت کے افراد شامل ہیں لیکن اس میں دشواری یہ ہے کہ یہ نظام عوام کے روبرو جوابدہ نہیں ہے۔ یہ نظام ان غیر ملکی لوگوں پر روک تھام کی غرض سے وضع کیا گیا تھا جو کہ تمام تر ذمہ داری نہیں سنبھال سکتے تھے۔ اور جنہیں ہزاروں میل دور رہ کر حکومت کرنی پڑتی تھی۔ یہ تمام نظام عدمِ اعتماد کا مظہر ہے اور اس کی بنیاد روک لگانے پر ہے۔ جس کا مقصد یہ ہے کہ اس طرح کی روک تھام سے بدعنوانیاں کم سے کم ہو سکیں۔ آج اس حقیقت سے بے خبر رہتے ہوئے ایک ایسا نظام بروئے کار لایا گیا ہے جس میں تمام کی تمام پیداواری سرگرمیاں اُن کے ہاتھوں میں پہنچ گئی ہیں جنہوں نے یا تو صنعت لگائی ہے یا پھر اشیاء کی تقسیم سے متعلق تنظیم قائم کی ہے اور جو اقتصادی سرگرمی میں مشغول ہیں۔ ان پر پابندی کی خاطر ایک وسیع دفتر شاہی تمام سرعت وجود

میں آگیا ہے۔ یہ ایک ایسا طریقۂ کار ہے جس میں فائل نیچے سے اوپر گھومتا ہے اور وزیر کے دفتر تک پہونچتا ہے۔ یہی صورتِ حال کسی ایک دفتر یا وزارت تک محدود نہیں بلکہ ہر جگہ یہی صورتِ حال ہے۔ یہ سلسلہ مہینوں نہیں بلکہ برسوں تک چلتا ہے۔ کام کو جلدی سے آگے بڑھانا ہو تو اس کے لیے چکنے چپڑے طریقے استعمال کئے جاتے ہیں اور کالے دھن کا استعمال ہوتا ہے۔ یہ سلسلہ چھوٹی سطح سے لے کر بڑی سطح تک چلتا ہے۔ اس طرح معلوم ہوتا ہے کہ یہ بدعنوانی کا ہی دَور دورہ ہے۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ اعلیٰ سطح پر فیصلہ کرنے والے ادارے موجود ہیں جن سے اندازہ لگایا جاتا ہے کہ وہ منصوبہ بند طریقے پر ترقی کے عمل کو آگے بڑھائیں گے جبکہ ان اداروں سے متعلق بیشتر افراد کو پیداواری سرگرمیوں یا اشیا کی تقسیم کے نظام کا مطلق کوئی علم نہیں ہوگا۔ فیصلہ کرنے والے اداروں میں بہت سے وہ لوگ ہیں جو عام حیثیت کے ہوتے ہیں۔ بالکل اسی طرح جیسا کہ سیاسی سطح پر بہت سے ارکان ہوتے ہیں، لیکن وہ پورے سماج کے مقدر کے فیصلے کے ذمہ دار سمجھے جاتے ہیں۔

پیداوار یا پیداواری سرگرمیوں سے کسی طرح کے واسطے کے بغیر یہ لوگ درپردہ یہ ذہن رکھتے ہیں کہ ملک کی پیداواری اور اشیا کی تقسیم سے متعلق سرگرمیوں کو لاضابطہ بنانے میں ان کی آواز حتمی آواز ہے۔ اور چونکہ وہ روزمرہ کی اقتصادی سرگرمیوں کے لیے جوابدہ نہیں ہیں، اس لیے وہ سمجھتے ہیں کہ وہ الزام اُن کے سر ڈال سکتے ہیں جو پیداواری سرگرمیوں پر عمل درآمد سے متعلق ہیں۔ اور جن کے ذمے اشیاء کی تقسیم کا کام ہے۔ دفترشاہی نظام سے وابستہ افراد بہت خوش نصیب اور خوشحال ہیں کیونکہ ان کی ملازمت کی مدت پکّی ہے اور انھیں اپنی کارروائی اور کارگزاری کے لیے فوری طور پر جوابدہی نہیں کرنی ہے۔ فیصلہ سازی کے لیے مختلف سطحیں ہیں۔ فائلوں پر مبہم انداز میں نوٹ لکھے جاتے ہیں۔ اس عبارت کے مفاہیم ہمیشہ ہی ایک سے زیادہ ہوتے ہیں۔ ایک پراجیکٹ کی انجام دہی کے دوران متعلقہ افسران کا تبادلہ ہوتا رہتا ہے۔ نئے آنے والے افسران سابق کے نظریہ کو فیصلہ کی بنیاد بناتے ہیں۔ حتمی جوابدہی وزیر کی ہوتی ہے۔ اس پر حتمی فیصلے کی ذمہ داری ہوتی ہے جبکہ اسے اس شعبہ کا تجربہ نہیں ہوتا اور پھر وہ بھی اڑتی چڑیا ہوتا ہے۔ اگر وہ ذہین بھی ہے تو بھی وہ اپنی وزارت کا کام سمجھنے کے لیے وقت لیتا ہے اور اگر اس کی رائے دفترشاہی نظام کے پابند افسران سے مختلف ہوتی ہے تو اس سے کارکردگی متاثر ہوتی ہے۔ اکثر اس اختلاف رائے سے اکثر وزیر کو ہی جانا پڑتا ہے۔ اس کی جگہ دوسرا ایسا وزیر لے لیا جاتا ہے جو حالات سے سمجھوتہ کرلے۔ ایک سینیئر وزیر کابینہ کا یہ قول ہے کہ کامیاب وزیر وہی ہے جو سکریٹری سے اتفاق کرتا ہے۔ یہ کہنا ٹھیک ہے کہ ہمارے سکریٹریٹ میں ذہین، تجربہ کار اور معتبر بیورو کریٹ ہیں اور وہ وزیر کا منشا جان لیتے ہیں، اور وہ وزیر کو یہ باور کرا دیتے ہیں کہ ہر کام اس کی منشا کے مطابق ہو رہا ہے۔ عقلمند وزیر وہ ہے جو اپنے دفتری عملے سے تعلق بڑھا لیتا ہے بالکل اسی طرح جیسا کہ اچھا شہسوار اپنے گھوڑے کو سدھا لیتا ہے۔ اکثر ہم یہ سوچ لیتے ہیں کہ وزیر انتخابی منشور کی روشنی میں بنیادی اور دوررس تبدیلیاں لاسکے گا مگر ہم یہ نہیں سمجھتے کہ موجودہ بیوروکریسی میں کوئی بنیادی تبدیلی لانا ممکن نہیں۔ موجودہ بیوروکریسی نظام فائلوں کا شکار ہے۔ وہ ادھر سے اُدھر گھومتے ہیں۔ ایسی صورت میں مختلف طرح کی پابندیاں اور مجبوریاں اسے دوررس تبدیلیاں لانے سے روکیں گی۔ اس کے ساتھ ہی کالے دھن کا اثر بھی ذہن میں رکھنا ضروری ہے۔ یہ دھن چند ہاتھوں میں ہونے کے سبب فیصلہ کی تمام سطحوں کو متاثر کرتا ہے اور اوپر سے لے کر نیچے تک تمام سطحوں پر اس کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ اس لیے عوام کے چند نمائندوں کا یہ ڈرامہ دلچسپ ہے کہ وہ غصہ میں ایک دوسرے کو بدعنوانی کا مرتکب ٹھہراتے ہیں۔ حالانکہ سبھی لوگ بالواسطہ اور بلاواسطہ طور پر بدعنوانی لانے والے عمل سے متعلق ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ کوئی بھی رکن پارلیمنٹ یا ودھان سبھا کا رکن یہ دعویٰ نہیں کرسکتا کہ اس کے انتخابی اخراجات الیکشن کے مجوزہ قانون کے اندر ہوتے ہیں۔ یہ کہنا کہ اسے نہیں معلوم کہ روپیہ کہاں سے آیا یا تو سادہ لوحی ہے یا پھر بے ایمانی یا پھر وہ ان دونوں کا مرتکب ہے۔ سیاستدانوں میں ایک دوسرے پر الزام تراشی کی لڑائی اُن کو بُرا بھلا کہنا ہے جو کالی دولت کے حصے کے مالک بن بیٹھے ہیں۔ یہ حصہ مختلف جگہ مختلف ہے۔ لیکن بدعنوانی کے الزام میں کوئی سچائی نہیں۔ دراصل شکایت تو یہ ہے کہ انہیں اس میں سے حصہ کیوں نہیں مل سکا ہے۔ اور ملک کے کالے دھن سے وہ بالواسطہ یا بلاواسطہ طور پر مستفید کیوں نہیں ہو رہا ہے۔ اس لیے بدعنوانیوں کے لیے افراد کو موردِ الزام ٹھہرانا ٹھیک نہیں۔ ہمارے ملک میں ہر سطح پر ذہین لوگ موجود ہیں۔ وہ بے حد لائق ہیں۔ دراصل یہ افراد کی نہیں نظام کی خرابی ہے۔ اس میں جوابدہی کا عنصر نہ ہونے سے یہ خرابی آسکی ہے۔ اسی طرح صنعت اور اشیا کی تقسیم سے متعلق نظام میں ایک سیکٹر کو باقی دونوں سیکٹروں کو دھوکہ دینے کا موقع دیا جاتا ہے۔ سیاسی سطح پر یہ بدعنوانی اس لیے ہے کہ وہ تو اڑتی چڑیاں ہیں۔ ان کی مدتِ عہدہ بھی کم ہے اور دوسرے وہ اس پوزیشن میں بھی نہیں ہوتے کہ اپنے ماتحتوں

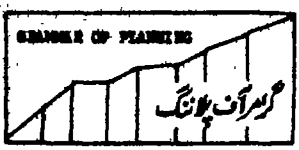
کو رہبر کو کر سکیں۔ دریں اثنا کالے دھن کی بیماری بڑھ گئی ہے۔ جس نے اقتصادی نظام کو ختم کر کے رکھ دیا ہے۔ یہ کالا دھن ہی معیشت کی تمام سطحوں کو متاثر کرتا ہے اور ہر جگہ اس کا بول بالا ہوتا ہے۔ یہ برائی ہر سطح پر نظر آتی ہے۔ انتظامیہ کے ماہرین اور عوام کے نمائندوں کی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ اس بات کو یقینی بنائیں کہ جمہوری نظام میں کوئی بھی سماج کو دھوکہ دینے کے الزام کی جوابدہی سے بچ نہیں سکتا۔ اسے ایک مذموم سماجی جرم سمجھنا چاہیے مجوزہ ڈھانچے میں ہر شخص اپنی آمدنی کو بتائے اور اپنے اخراجات بھی بتلائے۔ اگر ہر شہری کو اپنی آمدنی بتلانے کا فکر ہو اور اسے اپنے اخراجات بھی بتلانے ہوں تو اس سے رقم کے صحیح استعمال اور صحیح آمدنی کو یقینی بنایا جا سکتا ہے۔ اس کے لیے ٹیکسوں کے مجموعی نظام کو بدلنا ہوگا۔ اس طرح جملہ فاضلات سرکار کی ملکیت میں آجائیں گے۔ سرکاری مالیات کا تصور اسی وقت کام کر سکتا ہے جبکہ اقتصادی سرگرمیوں سے وابستہ ادارے کو آمدنی ہو اور ریاست اس کا ایک حصہ ٹیکس کے طور پر لے لے۔ منظم سیکٹر میں تمام فاضلات سرکار کے پاس آجائیں گے اور غیر منظم سیکٹر میں یہ بالواسطہ ٹیکسوں کی صورت میں حاصل ہو سکے گا جیسا کہ سیلز ٹیکس اور چنگیاں۔ کالے دھن سے مزید کالا دھن پیدا کرنا آسان ہوتا ہے۔ یہ رقم کچھ اس طرح کے کاموں پر صرف ہوتی ہے۔ پانچ ستاروں والے ہوٹلوں کی تعمیر، عیش پسندانہ رہائشی اور تجارتی عمارات جس میں شاندار فرنیچر لگا ہو۔ یہ رقم قیمتی نوادرات کے خریدنے پر خرچ ہوتی ہے تاکہ اسے مزید اونچے نرخ پر فروخت کیا جا سکے۔ اس سے سامان آرائش اور سامان تعیش خریدا جاتا ہے۔ یہ سامان بڑے بڑے شہروں کی منڈیوں سے خریدا جاتا ہے۔ اس طرح چند بڑے شہروں میں امارت اور عیش و آرام کی مصنوعی تصویر دیکھنے کو ملتی ہے۔ یہ اقتصادی سرگرمیاں سماج کے محدود طبقے تک ہی رہتی ہیں۔ اس سے ملک کے بے روزگار لوگوں کو خاص کر نوجوانوں میں بے چینی بڑھتی ہے۔ شہری اور دیہی علاقوں میں یہ بے چینی دیکھنے کو ملتی ہے۔ ان غریب عوام کو دل کے سکون کے لیے مذہب کا سہارا لینا پڑتا ہے یا پھر فرقہ وارانہ، لسانی، علاقائی بنیادوں پر جذبات کو ابھارا جاتا ہے۔ یہ وہ صورت حال ہے کہ اقتصادی حالت میں تقریباً جمود کی سی کیفیت کے باوجود اقتصادی بنیادوں پر کوئی شدید انقلاب نہیں آرہا ہے اور نہ سر دست آنے کی امید ہے۔ لیکن آبادی اور عدم توازن میں اضافے سے یہ آسمان کو چھونے والی عمارتیں اسے آس پاس کی غربت کے سمندر میں ہی ڈوبتی نظر آئیں گی۔ بدقسمتی کی بات یہ ہے کہ یہ انقلاب اقتصادی بنیادوں پر عمل میں نہیں آئے گا بلکہ اس کے ذریعے ذات پات اور فرقہ وارانہ تیز لسانی اور علاقائی نوعیت کے جھگڑے کھڑے ہوں گے۔ اس حالت کی موجودگی میں ملک میں اس طرح کی قیادت کا بھی فقدان نظر آتا ہوا معلوم ہوتا ہے جو عوام کو اعتماد میں لے سکے اور ملک بھر کے عوام کو پر امید بنا سکے۔ ملک کے انتشار کی صورت میں اس کی حالت کا نقشہ بیان کرنے کے لیے کسی منجم یا پیشین گوئی کرنے والے کی ضرورت نہیں بلکہ وہ خود بخود ہی ظاہر ہیں۔ اس لیے اقتصادی جمہوریت لانے کے لیے نظام کی تبدیلی ضروری ہے۔ اس کے بغیر پیداوار اور اشیا کی تقسیم کے نظام کو نہیں بدلا جا سکتا۔ اس نئے نظام میں انتظامیہ کے ماہروں کی ذمہ داری نگرانی یا محض گھومنٹا نہیں ہوگا بلکہ اقتصادی عمل کو آگے بڑھانے میں ان کو مدد دینی ہوگی۔ منصوبہ بندی اور فیصلہ کرنے والی سطح کو اس طرح جوڑنا ہوگا کہ عوام کے نمائندوں کی طرف سے پالیسی کے متعلق موٹے موٹے خطوط واضح کر دیے جانے کے بعد متعلقہ شعبوں کے ماہروں پر اس کے عمل درآمد کی ذمہ داری سونپ دی جائے تاکہ بہترین نتائج حاصل ہو سکیں۔ ہمیں اپنے نظام کی افادیت کی جانچ کا پیمانہ اس کے نتائج کی بنیاد پر بنانا ہوگا۔ اس میں پیداواری سرگرمیوں سے متعلق سبھی لوگوں کو ملانا ہوگا تاکہ ہر شخص اپنے آپ کو اس میں شریک سمجھے۔ یہی صحیح معنی میں اقتصادی جمہوریت ہے، اس کے بغیر سیاسی جمہوریت بے معنی ہے۔

تاثرات

رئیس الدین رئیس

نہیں آتا سمجھ میں کیسے لکھوں
دلاسہ تم کو میں کس طرح لکھوں
یہ غم بس ایک بیٹے کا نہیں ہے
یہ غم تو سارے ہی بیٹوں کا غم ہے
سبھی آنکھوں میں آنسو جم گئے ہیں
سبھی ہونٹوں پہ آہیں تھم گئی ہیں
دلاسہ دوں میں تم کو کیسے بھیا
کروں میں صبر کی تلقین کیسے
بجز اس کے لکھوں بھی کیا میں تم کو
کہ خوں روتا ہے دل ہندوستاں کا!
چراغ ہند جس کو آندھیوں سے
چھپایا اس نے آنچل میں ہمیشہ
بالآخر بیش قیمت خوں سے اس کے
ہے روشن آج بھی بزم جہاں میں!!
اسے روشن ہی رکھنا ہے ہمیشہ
ضرورت جب بھی ہو اس میں لہو کی
تو اپنے بھائیوں کو یاد کرنا
ہمیں سوگند ہے اس آتما کی
اسے روشن ہی رکھیں گے ہمیشہ
اسے قائم ہی رکھیں گے ہمیشہ!!!

ٹی۔ آر۔ دوبھاشی



منصوبے کی نگرانی اور اس کی کارکردگی کا جائزہ

پلان کی اسکیموں کی کامیاب تعمیل کے لیے مسلسل نگرانی و جائزے کی ضرورت ہے۔ دراصل منصوبہ بندی کی کامیابی کا انحصار منصوبے کی سائینسی تشکیل، عمل درآمد کی سطح پر پُرزور تعمیل اور مسلسل نگرانی، معائنے اور اس کی کارکردگی کے جائزے کے تغیّر و تبدّل پر ہے۔

اگر منصوبہ بندی متعینہ مقاصد پورے نہیں کر سکتی تو وہ بے معنی ہے۔ منصوبہ بندی از خود کوئی مقصد نہیں ہے۔ یہ مقصد حاصل کرنے کا ذریعہ ہے اور مقصد ہے پہلے سے طے شدہ نشانوں کا حصول۔ یہ نشانے ابتداً اجتماعی طور پر ان امور میں پائے جاتے ہیں جیسے کُل مُلکی پیداوار میں اضافہ، فی کس آمدنی میں اضافہ، کُل ملکی پیداوار کی زیادہ منصفانہ ڈھنگ سے تقسیم اور روزگار کے پورے مواقع کا اہتمام۔

لیکن ان اجتماعی قومی مقاصد کو سیکٹر اور ذیلی سیکٹر کے لحاظ سے الگ الگ کرنا ہوگا اور اس طرح ہم کروڑوں ٹن اناج، کوئلے یا فولاد یا ریلوے کے ذریعے ڈھوئے جانے والے مسافروں یا مال کی بھاری مقدار کی صورت میں متعدد مادّی نشانوں کو حاصل کر سکیں گے۔

ان مادّی مقاصد سے مالی عملیات کا تعلق پایا جاتا ہے۔ لیکن محض مالی عملیات سے مادّی کامیابیاں عمل میں نہیں آتیں۔ اس کے لیے ضروری تنظیم اور عملہ درکار ہے۔ جو ان پروگراموں کو عمل میں لا کر مال و وسائل کا بہترین استعمال کر سکتا ہے تاکہ زیادہ سے زیادہ نتائج حاصل کئے جا سکیں۔ لہٰذا ہر پلان، اسکیم یا پراجیکٹ میں تنظیمی مشینری کا ملحوظ رکھا جانا ضروری ہے۔ جس کے ذریعے پلانوں اور پروگراموں کو عمل میں لایا جائے گا۔ اگر تنظیمی مشینری موزوں ہے تو پلانوں کی کامیابی کا پورا موقع ہے۔

اگر پلان ناکام ہو جاتے ہیں اور مجوزہ مقاصد حاصل نہیں ہوتے تو یہ منصوبہ ساز کے لیے مناسب نہیں ہے کہ عمل درآمد کے ذمہ دار نظام کی عیب جوئی کرے۔ ایک منصوبہ ساز اپنے فرائض اور اونادروں کے ساتھ بھڑتا نہیں ہے۔ اس کے پلان میں عمل درآمد کے نظام کا لحاظ رکھا جانا ضروری ہے اور اس امر کو یقینی بنانا ضروری ہے کہ اُس سے مطلوبہ کام انجام دیا جا سکتا ہے۔ اس لحاظ سے منصوبہ بندی اور عمل درآمد کو الگ نہیں کیا جا سکتا ایک پلان اُن نتائج کی مانند ہی اچھا ہے جنہیں وہ وجود میں لا سکتا ہے۔ ایک کاغذی پلان کوئی پلان نہیں ہے۔ جس پلان کی تعمیل میں مستعدی کا خیال رکھا جاتا ہے۔ وہ اُن نتائج سے بھی زیادہ حاصل کر سکتا ہے، جنہیں وہ حاصل کرنا چاہتا ہے اور وہ اُنہیں کم لاگت پر بھی حاصل کر سکے گا۔ دوسرے الفاظ میں وہ مخصوص سرمایہ کاری سے اُس کے تناسب سے زیادہ نتائج دکھا سکے گا۔ وہ سرمایہ پیداوار کی شرح میں کمی کر سکے گا۔ وہ سرمایہ کاری کی فی اکائی کے حساب سے پیداوار کی مقدار میں اضافہ کر سکے گا۔

مسلسل نگرانی

بدقسمتی سے بھارت کی منصوبہ بندی اس لحاظ سے ان تمام برسوں میں ناقص رہی ہے۔ مُلکی پیداوار میں اضافے کے لحاظ سے مجوزہ نتائج حاصل نہیں ہوتے۔ اگرچہ اپنے تمام پانچسالہ پلانوں میں ہمارا مقصد یہ رہا ہے کہ کم سے کم پانچ فی صد سالانہ شرح ترقی کو یقینی بنایا جائے، تاہم درحقیقت ہماری شرح افزائش تین فیصد کے گرد ہی منڈلاتی رہی ہے۔ اس کے علاوہ لاگت میں اضافے اور کرنسی کے پھیلاؤ کے باعث مادّی منصوبہ مالی منصوبے کے مقابلے میں عموماً چھوٹا رہا ہے۔ منصوبے کے پروگراموں کی تعمیل میں زیادہ مستعدی نہ ہونے کے باعث سرمایہ پیداوار کی شرح میں اضافے کا رجحان رہا ہے۔

اس سبب سے اس امر کی اہمیت واضح ہوتی ہے کہ منصوبہ جاتی اسکیموں کی تعمیل کے لیے ایک

مضبوط اور مستعد مشینری قائم کی جائے اور تسلی بخش نتائج کو یقینی بنانے کی غرض سے اُن کی مسلسل نگرانی اور تشخیص کی جائے۔ ماضی میں ان پہلوؤں کو افسوسناک حد تک نظر انداز کیا گیا ہے اور تعمیل کی نگرانی کو بہتر بنانے کے لیے فوری اقدامات کرنے کی ضرورت ہے۔ نگرانی محض قومی سطح تک محدود نہیں رہنی چاہیئے۔ جوں جوں ہم حلقۂ عمل کے نزدیک تر جاتے ہیں، نگرانی کو زیادہ شدید ہونا پڑے گا۔ منصوبہ جاتی پروگراموں کی واقعی تعمیل کی قریبی اور مسلسل نگرانی ہونی چاہیئے اور وقتاً فوقتاً بھی اُن کی نگرانی اور تشخیص کی جانی چاہیئے۔

حقیقی مقاصد

لیکن تعمیل کی نگرانی اس قدر آسان نہیں ہے جس قدر وہ دکھائی دیتی ہے۔ ماضی میں نگرانی کا مطلب محض اخراجات کی جانچ پڑتال رہا ہے۔ یہ نہ صرف غیر تسلی بخش ہے بلکہ یہ پیداوار کے منافی بھی ہو سکتا ہے۔ اس سے اکثر مالی سال کے آخری مہینوں میں اخراجات یکدم بڑھ جاتے ہیں۔ جس بات کی ضرورت ہے وہ ہے کسی پراجیکٹ کے حقیقی مقاصد کے حوالے کے ساتھ نگرانی اور تشخیص جبکہ حقیقی مقاصد مالی اعتبار سے یا حتیٰ کہ مادی لحاظ سے بھی طے نہیں کیے جاتے۔

جس طریقے سے نتائج حاصل کیے جاتے ہیں، وہ بھی مساوی طور پر اہم ہیں۔ اگر نتائج غلط طریقے سے حاصل کیے جاتے ہیں تو اس سے عارضی فائدہ ہو سکتا ہے، لیکن آخر میں پسپائی ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر اگر خاندانی منصوبہ بندی کے پروگراموں کو سختی سے عمل میں لایا جاتا ہے تو نس بندی کے بارے میں نشانے تو پورے کیے جا سکتے ہیں لیکن سخت گیرانہ طریقوں کے استعمال سے خاندانی منصوبہ بندی کے پروگراموں کے خلاف اس قدر جذبۂ نفرت پیدا ہو سکتا ہے کہ آخر میں اُسے دھکا لگ سکتا ہے۔ جس بات کی ضرورت ہے وہ یہ ہے کہ جن لوگوں کو اس پروگرام کے تحت لایا جانا مقصود ہے، انھیں سمجھایا بجھایا جائے۔ اور اُن کی رضا کارانہ شرکت و تعاون حاصل کیا جائے۔ یہ پہلو ہمارے بیشتر پروگراموں کے بارے میں اہمیت رکھتا ہے۔

ہم اکثر بھارت میں جمہوری منصوبہ بندی کا ذکر کرتے ہیں اور جمہوری منصوبہ بندی میں عوام کی رضاکارانہ شرکت بہت بھاری اہمیت کی حامل ہے۔ اس کے علاوہ ہم جس چیز کے لیے کوشاں ہیں وہ ہے پائیدار نتائج کا حصول، نہ کہ بعض عارضی مادی فوائد۔ جلد نتائج دکھانے کی دُھن میں ان پہلوؤں کو قطعاً نظر انداز کیا جاتا ہے اور اس عمل میں اداروں اور تنظیموں کو اور عوام کے حوصلے اور جوش کو طویل المیعادی نقصان پہنچتا ہے۔ اس کے بعد اگرچہ اعداد و شمار اہم ہیں، تاہم تشخیص اور نگرانی کلیتہً مقداری عمل نہیں ہیں۔ اس میں معیار (کوالٹی) کا عمل بھی شامل ہے۔ نگرانی و تشخیص کے تسلی بخش سسٹم میں منصوبے کی تعمیل کے معیاری پہلوؤں کا خیال رکھا جانا چاہیئے۔ جو مقداری پہلوؤں سے کسی طرح کم نہیں ہونا چاہیئے۔

حتمی مقاصد

نگرانی و تشخیص میں منصوبے کے ہر پروگرام کے "حتمی" "ماقبل آخر" اور "ممد" نشانوں اور مقاصد کا خیال رکھا جانا چاہیئے۔ "حتمی نشانے" کسی پراجیکٹ یا اسکیم کے حتمی مقاصد کے لحاظ سے اُس روزگار یا پیداوار کی بنیاد پر دیکھے جانے چاہییں جو اُس اسکیم سے عمل میں آتی ہے۔ 'ماقبل آخر، نشانے' حتمی نشانوں کی تکمیل سے پہلے کا ایک مرحلہ ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ اگر حتمی نشانہ کروڑوں ٹن اناج کی صورت میں ہے تو 'ماقبل آخر نشانہ' بیجوں فرٹیلائزر اور کیڑے مار دواؤں کی تقسیم یا امکانی آبپاشی کے استعمال کی صورت میں ہو سکتا ہے۔ 'ممد نشانہ' اُن ذرائع کی صورت میں ہونا چاہیئے جن سے 'حتمی' اور 'ماقبل آخر' نشانے پورے ہوتے ہیں۔ لہٰذا وہ کاشتکاری میں مستعمل اشیا کی تقسیم کے مرکزوں، ایسے مرکزوں کے عملے کا تقرر، کنووں اور امکانی آبپاشی کی سہولت کے لیے ضروری نالیوں کی تعمیر اور اس کام کو انجام دینے کے لیے ضروری عملی تنظیم کی صورت میں ہو سکتے ہیں۔

ہماری منصوبہ بندی کا ایک نقص یہ ہے کہ اگرچہ 'حتمی نشانے' مقرر کیے جاتے ہیں 'ماقبل آخر' اور 'ممد نشانوں' کو مبہم حالت میں رکھا جاتا ہے۔ ماضی میں ہمیں منصوبوں کی تعمیل میں جو تجربہ ہوا ہے اُس کی روشنی میں یہ واضح ہونا چاہیئے کہ اگر ہم 'ماقبل آخر' یا 'ممد نشانے' مقرر نہیں کریں گے جو حتمی نشانوں سے مطابقت رکھتے ہیں تو ہم منصوبوں کے مقاصد کو حاصل نہیں کر سکیں گے۔ اس کے برعکس ہم 'ماقبل آخر' نشانوں کو مقرر کرنا بند نہیں کر سکتے۔ چنانچہ بیجوں کی زیادہ پیداواری اقسام کے تحت رقبے کو بڑھانا ایک 'ماقبل آخر' نشانہ ہو سکتا ہے۔ اس 'ماقبل آخر' نشانے کی تکمیل کا بھی کوئی مطلب نہیں ہوگا اگر اس کے ساتھ ہی ہمیں یقین نہ ہو جائے کہ زیادہ پیداواری اقسام کے تحت رقبے کی توسیع کے نتیجے میں بھی اناج یا دیگر تجارتی فصلوں کی پیداوار میں اضافہ ہوگا۔ بیجوں کی زیادہ پیداواری اقسام کے ساتھ فرٹیلائزر اور آبپاشی کے لیے پانی کی فراہمی بڑھانا ہوگی۔ بیجوں کی زیادہ پیداواری اقسام کا پروگرام ایک پورے پروگرام کا حصہ ہونا چاہیئے۔ اور جہاں پورا پروگرام زیر عمل نہ ہو وہاں محض ایک شئے سے متعلق مقاصد کی تکمیل سے کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوتا۔

منصوبے کی تکمیل کے لیے تال میل ضروری ہے۔ جس کے بغیر پروگرام غیر متوازن ہو سکتے ہیں، اور اُس سے ٹھیک نتائج برآمد نہیں ہوں گے۔ لہٰذا نگرانی و تشخیص میں حتمی مقاصد کی تکمیل یا منصوبہ بندی کے قطعی اثر کا خیال رکھنا ہوگا اور انھیں اس سے کم کام پر روکا نہیں جا سکتا اور کسی امدادی کارروائی تک محدود نہیں کیا جا سکتا۔

دو وسیع زُمرے: پلان کے پروگراموں کو وسیع طور پر

دو حصوں میں منقسم کیا جا سکتا ہے۔ پہلے حصے کا تعلق اُن سرگرمیوں سے ہے جہاں سرمایہ کاریاں جمع ہوتی ہیں اور دوسرا حصہ وہ ہے جہاں اُن کی تقسیم ہوتی ہے۔ آبپاشی، پن بجلی کے پراجیکٹ پلانٹوں کی تنصیب اور عمارتوں کی تعمیر پہلے زمرے میں آتی ہے جبکہ زراعت سے تعلق رکھنے والی اسکیمیں جیسے کہ زراعتی توسیع یا تعاونی ترقی یا فصلوں کی پیداوار دوسرے زمرے میں آتی ہے۔

پہلے زمرے میں منصوبہ بندی کی کامیابی کافی حد تک حکومت کی منظم مشینری پر انحصار رکھتی ہے، لیکن دوسرے زمرے کی اسکیموں کی کامیابی کا انحصار اُتنا ہی عوام کی پہل کاری پر ہے جتنا کہ حکومت کی مشینری پر۔ بلاشبہ ان اسکیموں کے سلسلے میں سرکاری مشینری کا بڑا رول کروڑوں کسانوں کو تحریک دینا اور سرگرم عمل بنانا ہے جن کی مساعی پر نشانوں کی تکمیل کا دارومدار ہے۔ پہلے زمرے کی کارروائیوں کی نگرانی و تشخیص دوسرے زمرے کی کارروائیوں کی نسبت آسان تر ہے۔ اس کے باوجود بڑے تعجب کی بات یہ ہے کہ اول الذکر کے مقابلے موخرالذکر کی جانب تشخیص کی زیادہ توجہ دی گئی ہے۔

اس توازن کو درست کرنے کی ضرورت ہے۔ آبپاشی اور پن بجلی کے متعدد پراجیکٹوں اور پبلک کاروباری اداروں کے قیام کے سلسلے میں کافی کوتاہیاں ہوئی ہیں جن کے نتیجے میں بھاری نقصان ہوا ہے۔ ان پراجیکٹوں کی تشخیص سے خامیاں منظر پر آگئیں۔ ان میں سے ایک یہ ہو سکتی ہے کہ وسائل بہت زیادہ پراجیکٹوں کو منتقل کئے گئے جن سے متعدد پراجیکٹوں کی تعمیل میں تاخیر ہوئی۔ بہت زیادہ پراجیکٹوں کو جلدی سے منصوبہ بندی کے دائرہ کار میں لانے کی دھن میں متعدد پراجیکٹوں کے لیے علاحق سرمایہ کاری کا اہتمام کیا گیا جس سے وہ کئی کئی برسوں تک سست روی سے چلی جاتی ہیں۔ ایسے بمشکل منصوبہ جاتی وسائل کے بہترین استعمال کا طریقہ کیا جا سکتا ہے۔ دراصل یہ پراجیکٹوں کی اسی قسم کی منصوبہ بندی ہے جس سے ممکن ہے کہ سرمایہ پیداوار کے تناسب کی شرح بڑھ گئی ہو جو ہمارے ملک کی اقتصادی ترقی کا ایک پریشان کن پہلو ہے۔

پبلک سیکٹر کی توسیع ہمارے ملک کی منصوبہ بندی کا ایک اہم پہلو رہا ہے۔ لیکن یہ بتاتے ہوئے افسوس ہوتا ہے کہ پبلک سیکٹر کے کاروباری اداروں میں بہت زیادہ سرمایہ کاری سے ضروری منافع حاصل نہیں ہوا۔ پبلک سیکٹر کے اداروں کی جامع تشخیص کرنا ضروری ہے تاکہ ماضی کی خامیوں کو دُور کیا جا سکے۔

تدارکی اقدامات

تشخیص محض لاگت سے ہونے والے فائدے کے تجزیہ کی نسبت زیادہ گہری ہونی چاہیئے۔ اس سے تنظیموں، اداروں اور عملے کی پوشیدہ اور ظاہرا خامیوں کا پتہ لگایا جانا ضروری ہے تاکہ اُنھیں دُور کیا جا سکے۔ اس قسم کی تشخیص کے لیے معاملہ کے تحقیقی طریقے کو عمل میں لانا ضروری ہو سکتا ہے تاکہ مجموعی طور پر اعداد و شمار کی فراہمی کے طریقوں اور اُن کے تجزیہ کو تقویت مل سکے۔

اگرچہ تشخیص کے لیے ایک خصوصی مشینری درکار ہے تاہم نگرانی کا اہتمام نظامت کی عام مشینری کے اندر ہی اُس کے حصے کے طور پر ہونا چاہیئے۔ ہر اہم اسکیم یا کاروبار کے لیے حکومت کے ہر محکمے یا تنظیم میں ایک کمیٹی ہونی چاہیئے جو نظرثانی یا نگرانی کا کام کرے۔ اس کمیٹی میں اُس خاص اسکیم یا کاروبار سے متعلق تمام اشخاص ہونے چاہئیں۔ اس کمیٹی کی میٹنگ وقتاً فوقتاً باقاعدہ وقفوں میں ہونی چاہیئے۔ اس کا باقاعدہ انتظامیہ اطلاعاتی سسٹم ہونا چاہیئے۔ جو کمیٹی ہذا کو باقاعدہ طور پر امدادی، ماقبل آخر، اور حتمی نشانوں کے بارے میں معلومات بہم پہنچاتا رہے۔ جب کبھی خامیاں عمل میں آئیں کمیٹی ہذا کو چاہیئے کہ وہ اُن کے بارے میں بتلائے اور اس سے پہلے کہ وہ بڑے نقصان کا باعث ہوں انھیں فوراً دُور کردیا جائے۔ نظرثانی اور نگرانی سے متعلق ایک چوکس کمیٹی وسائل کا زیادہ اتلاف روک سکتی ہے جس سے منصوبہ صحیح خطوط پر پیش رفت کر سکتا ہے۔

سابقہ تجربے سے پتہ چلتا ہے کہ پلان کی اسکیموں میں بہت زیادہ تبدیلیوں کا رُجحان رہا ہے۔ ان کی بُنیاد برسر اقتدار لوگوں کے بعض سرسری فیصلوں پر زیادہ رہی ہے اور باقاعدہ نظرثانی، نگرانی اور تشخیص پر کم رہی ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ان غیر ضروری کثیر تبدیلیوں سے احتراز کیا جائے۔ یہ بھی خیال رکھا جانا چاہیئے کہ اگرچہ ہیڈ کوارٹر میں تبدیلیاں فوراً کی جا سکتی ہیں میدانِ عمل میں اُن کی اطلاع پہنچنے اور اُن پر عمل کرنے میں لازمی طور پر بہت زیادہ وقت لگتا ہے۔ منصوبہ سازوں اور پالیسی وضع کرنے والوں کو چاہیئے کہ وہ تعمیل کرانے والے افسران کو کافی وقت دیں تاکہ اچھے نتائج برآمد ہو سکیں۔ منصوبے کے مقصد یا پالیسی کا محض اعلان منصوبے کی تعمیل کا ہم معنی نہیں ہے۔

منصوبہ بندی کی کامیابی کا انحصار منصوبے کی سائنسی تشکیل، مقامی حالات کے مطابق اُس کے کام کاج کی تقسیم، عمل درآمد کی سطح پر پُرزور تعمیل، قریبی اور مسلسل نگرانی، شدید معائنے اور تخمینہ و تشخیص پر مبنی ہے۔ ★

بجلی کی ترسیل اور تقسیم

چھٹے منصوبے میں حرارتی بجلی گھروں کی کارکردگی ناہموار رہی۔ بجلی گھروں سے صلاحیت کے مقابلے میں بجلی تیار کرنے کا تناسب ۱۹۸۰-۸۱ میں ۴ر۴۶ فیصد، ۱۹۸۱-۸۲ میں ۴۶ر۸ فیصد، ۱۹۸۲-۸۳ میں ۴۹ر۸ فیصد اور ۱۹۸۳-۸۴ میں ۴۷ر۹ فیصد رہا جب کہ ۱۹۸۴-۸۵ کے لیے یہ نشانہ ۵۰ فیصد مقرر کیا گیا ہے۔ ملک میں مانگ کے مقابلے میں بجلی کی بہم رسانی میں قلت کا تناسب ۱۹۸۰-۸۱ میں ۱۲ر۶ فیصد، ۱۹۸۱-۸۲ میں ۱۰ر۸ فی صد، ۱۹۸۲-۸۳ میں ۹ر۲ فیصد اور ۱۹۸۳-۸۴ میں ۱۰ر۰ فیصد رہا ہے۔ خیال ہے کہ ۱۹۸۴-۸۵ میں قلت کا تناسب ۶ر۱ فیصد رہے گا۔ حرارتی بجلی گھروں کی کارکردگی بھی مختلف خطوں میں ایک جیسی نہیں رہی۔ سب سے اچھی کارکردگی مغربی خطے کی تھی۔ دوسرا نمبر جنوبی خطے کا اور تیسرا شمالی خطے کا تھا۔ مشرقی اور شمالی مشرقی خطے کی کارکردگی مایوس کن تھی۔ لیکن ان سب کارخانوں کی کارکردگی ۱۹۷۵-۷ کے برسوں میں حاصل شدہ ۵۵ر۹ فیصد کے مقابلے میں کہیں کم تھی۔

ترسیل لائنیں بچھانے کے پروگرام کو عملی جامہ پہنانے کے کام میں بہت کم ترقی کے نتیجے کے طور پر بجلی مہیا کرنے کا معیار بھی بہت حد تک متاثر ہوا ہے اور بجلی کے بہت سے نظاموں میں ترسیل اور تقسیم کے دوران بجلی کے نقصان میں اضافہ ہوا ہے۔ ترسیل اور تقسیم کے دوران بجلی کے نقصان کا تناسب ۱۹۸۰-۸۱ میں ۲۰ر۶ فیصد تھا جو ۱۹۸۱-۸۲ میں ۲۰ر۸ فیصد اور ۱۹۸۲-۸۳ میں ۲۰ر۹ فیصد ہو گیا۔

بجلی کی ترسیل اور تقسیم میں غفلت اور کوتاہی کو روکنے کے لیے یہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ کسی بجلی پراجیکٹ کی منظوری دیتے وقت ترسیلی اور تقسیم کار تعمیرات پر اخراجات کی بھی جانچ کی جائے اور منظوری دی جائے۔ بجلی کی تیاری اور ترسیل و تقسیم کے کاموں پر عمل درآمد میں ترقی میں تال میل رہنا چاہیے۔

حالانکہ بجلی کی نصب شدہ صلاحیت اور تیاری میں مرکزی سیکٹر کا حصہ ۱۹۸۴-۸۵ میں ۴۸ر۱۹ فیصد ہے جو ۱۹۷۹-۸۰ میں ۱۱ر۳ فیصد تھا لیکن اس کے اثرات پوری طرح محسوس نہیں ہو سکے کیوں کہ حرارتی بجلی کی قومی کارپوریشن مختلف ریاستوں کو ان کا بجلی کا پورا حصہ دینے میں کامیاب نہیں ہوئی۔

جہاں تک آبپاشی کے پمپوں کو بجلی مہیا کرنے کا سوال ہے۔ سالانہ نشانہ ۲۴ر۷ لاکھ کا مقرر کیا گیا تھا۔ حقیقی کامیابی ۱۷ر۵ لاکھ یعنی ۷۰ر۷ فیصد ہونے کا امکان ہے۔ جن ریاستوں میں کارکردگی تسلی بخش نہیں ہے وہ ہیں آسام ۹ فیصد، بہار ۲۹ر۴ فیصد، گجرات ۶۲ر۵ فیصد، ہریانہ ۴ر۴ فیصد، ہماچل پردیش ۱۸۱ر۷ فیصد، جموں و کشمیر ۴۸ فیصد، مدھیہ پردیش ۲۳ر۲ فیصد، میگھالیہ ۲ر۱ فیصد، اڑیسہ ۲۳ر۳ فیصد، راجستھان ۳۴ر۷ فیصد، تری پورہ ۶ر۷ فیصد، اتر پردیش ۳۸ر۸ فیصد اور مغربی بنگال ۲۵ر۴ فیصد۔ چھٹے پلان میں دیہات میں بجلی لگانے کے لیے ۱۵۷ر۶ کروڑ روپے کی رقم مخصوص کی گئی ہے لیکن حقیقی اخراجات بڑھ کر ۱۵۹۹ کروڑ ہو جانے کا امکان ہے۔

بجلی کی ترقی کے تمام پروگراموں کے لیے پلان ہی ۱۲۶۵ روپے کی رقم مخصوص کی گئی ہے لیکن اخراجات ۱۵۴۴ کروڑ روپے تک پہنچ جانے کا امکان ہے۔

مذکورہ بالا بجلی کی تیاری کے نشانے حاصل کرنے کے لیے ہمیں نصب کردہ صلاحیت میں ۲۲۰۲۱ میگاواٹ کا اضافہ کرنے کی ضرورت ہے اس ضمن میں مرکزی سیکٹر کا حصہ چھٹے منصوبے کے نشانے سے زیادہ ہوگا۔ چھٹے منصوبے کے آغاز پر ملک میں بجلی تیار کرنے کی نصب شدہ صلاحیت ۴۳۰۳۵ میگاواٹ ہونے کا امکان ہے۔ اور اگر ہم ساتویں منصوبے میں ۲۲۰۲۱ میگاواٹ کی مزید صلاحیت کے نصب کرنے میں کامیاب ہو جائیں تو آٹھویں پلان کے آغاز میں ملک میں بجلی تیار کرنے کی نصب شدہ صلاحیت ۶۵۰۵۶ میگاواٹ ہو جائے گی۔

ساتویں منصوبے میں ترسیل اور تقسیم کے عدم توازن کو درست کرنے کی تجویز ہے تاکہ بجلی کے نقصان کو کم کیا جا سکے اور توانائی کے معیار کو بہتر بنایا جا سکے۔ ترسیلی نظام کی خامیوں کو دور کرنے کی بھی تجویز ہے جس سے مرکزی بجلی گھروں سے فائدہ اٹھانے والی ریاستوں اور مرکزی علاقوں کو بجلی مہیا کرنے میں رکاوٹ پیش نہ آ سکے۔

ساتویں منصوبے میں تحقیق اور ترقی، بجلی کی بچت، افرادی قوت کی منصوبہ بندی چھوٹے پیمانے کے پن بجلی پراجیکٹوں کی تیزی سے تکمیل ترقی اور تجدید اور بعض حرارتی بجلی گھروں کی تجدید پر بھی زور دیا جائے گا تاکہ ان بجلی گھروں کی پیداواری صلاحیت کا بہتر استعمال کیا جا سکے۔

قومی پیمانے پر بجلی کی تقسیم کے ایک موزوں نظام اور اس کی اہلیت کار کو یقینی بنانے میں یہ ضروری ہے کہ بجلی کے مجموعی نظام کے درمیان تال میل اور مراصلات کا ایک بہت اچھا سلسلہ کام کر رہا ہو۔

بڑی بڑی صنعتوں اور خاص طور پر فولاد سازی، الومینیم، سیمنٹ، تیل صاف کرنے کے کارخانوں، پٹرول سے بننے والی کیمیاوی کھادوں کی صنعتوں اور کوئلے کی کانوں کے لیے جہاں بجلی کی کھپت بہت زیادہ ہے۔ بجلی کی مانگ پوری کرنے کے لیے ان صنعتوں میں ہنگامی ضرورت پر کام کرنے والا بجلی گھر لگانا بھی ضروری ہے۔

★

رشید اکرم

چائے — ایک مقبول مشروب

ھماری زندگی میں پانی کے بعد اگر کثرت ستعمل کوئی مشروب ہے تو وہ چائے ہی ہے۔ شروبات میں چائے کو جو مقبولیت حاصل ہے وہ سی دوسرے مشروب کو نہیں۔ اس کا استعمال ملک میں ہر مقام پر بڑی فراوانی کے ساتھ جتنے ن کرتے ہیں اتنا کسی مشروب کو نہیں۔ گرم چائے ، ایک پیالی کو فرحت و تازگی اور نئی اُمنگ کی امت سمجھا جاتا ہے۔ دنیا کے مختلف ممالک میں ئے کے ساتھ مخصوص تہذیبیں اور رسم و واج وابستہ ہیں۔ مثلاً جاپان میں چائے پیش نے کے فن سے لڑکیوں کو متعارف کرایا جاتا ہے۔

بازار میں ملنے والی چائے کی سوکھی پتی سے م ہم بخوبی واقف ہیں اور اس میں شیر و شکر ملا کر شروب تیار کرنا بھی جانتے ہیں۔ لیکن چائے کی اریخ، اس کی پتیوں سے مشروب بنانے کی ترکیب ر اس کی خاصیت سے چائے کے متعدد عاشق ہنوز نابلد ہیں۔

چائے کی جائے پیدائش آسام یا چین مانی الی ہے۔ کہتے ہیں آج سے سینکڑوں سال قبل ہندوستان کی شمال مشرقی سرحد پہ ایک بدھ فقیر ے چائے کی پتیوں سے تیار کیے جانے والے مشروب ی تازگی بخش خاصیت کو دریافت کیا تھا۔ اس مانے میں چائے جنگلی شکل میں اُگتی تھی اور آج بھی ی طرح اُگا کرتی ہے۔ لیکن منظم کاشتکاری کے ریعے اُگائی گئی چائے جنگلی طور پر اُگنے والے پائے سے کہیں بہتر ہوتی ہے۔

چائے کے پودے کا سائنسی نام کیمپلیا سائنسس ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ہندوستان سے ۸۰۵ء میں اس پودے کو جاپان لے جایا گیا۔ اور سولہویں صدی میں اہلِ یورپ چائے سے متعارف ہوئے۔ چین نے سینکڑوں سال تک ساری دنیا کو چائے سپلائی کرتا رہا ہے۔ ۱۸۲۰ء میں جاوا نے، ۱۸۳۰ء میں ہندوستان نے اور ۱۸۹۰ء میں سری لنکا نے چائے کا ایکسپورٹ شروع کیا تھا۔

چائے کا پودا جھاڑی نما ہوتا ہے جس کی لمبائی تین یا چار فٹ ہوتی ہے۔ چائے کی پتیوں میں تیل کے غدود کافی تعداد میں پائے جاتے ہیں۔ ان دنوں ہم چائے کی تقریباً سو قسموں سے واقف ہیں۔ چائے کی کاشت سطح سمندر سے پانچ ہزار فٹ کی بلندی تک پہاڑوں کی ڈھلانوں پر کامیابی کے ساتھ کی جاسکتی ہے۔ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ چائے کے پودوں کی عمر دو سو سال تک پائی گئی ہے۔ ویسے عام طور پر پچاس سال تک چائے کا ایک پودا اچھی پتیاں دے سکتا ہے ایک ایکڑ زمین پر چائے کی کاشت کے ذریعے دو سو سے دو ہزار پونڈ تک چائے حاصل کی جاسکتی ہے۔

چائے کی پتیوں کو عموماً ہاتھ سے ہی توڑا جاتا ہے۔ یا تیز قسم کی قینچیوں کا استعمال بھی کیا جاتا ہے۔ عام حالات میں ایک آدمی ۲۵ سے ۵۰ پونڈ تک چائے کی پتیاں توڑ سکتا ہے۔ چائے کی سبز پتیاں بازاروں میں نہیں ملتیں۔ وہاں تو صرف سوکھی پتیاں ہی دستیاب ہوتی ہیں۔ سبز پتیوں کو خشک کرنے کے لیے انھیں دھوپ میں پھیلا دیا جاتا ہے یا گہری پلیٹوں میں انھیں گرم کیا جاتا ہے۔ ایسا کرنے سے پتیاں ملائم ہو جاتی ہیں۔ پھر انھیں ہاتھ یا مشینوں کے ذریعے خشک کر لیا جاتا ہے۔ سبز چائے کو بنانے میں پتیوں کو تب تک گرم کیا جاتا ہے، جب تک ان کا رنگ دھندلا نہ پڑ جائے۔

یہ بات غور طلب ہے کہ ہم اپنے گھروں میں چائے کس طرح بنائیں کہ اس کی خوشبو برقرار رہے۔ ساتھ ہی اس کی مفید خاصیتیں بھی قائم رہیں۔

جب چائے پینے کے لیے تیار کی جاتی ہے تب اُبلتے ہوئے پانی میں پتیوں کی ایک خاص مقدار ڈالی جاتی ہے۔ پتیوں میں موجود الکلائیڈ اور تیل فوراً ہی نکل کر پانی میں گھل مل جاتے ہیں اور اس طرح مشروب تیار ہو جاتا ہے۔

چائے کی پتیوں کو زیادہ وقفے تک پانی میں اُبالنے سے پتیوں میں موجود ٹینن (TANIN) بھی پانی میں گھل جاتا ہے اور مشروب کا ذائقہ بھی تلخ ہو جاتا ہے۔ ساتھ ہی چائے کے تقریباً سارے مفید اوصاف ضائع ہو جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ایسی چائے صحت کے لیے مضر ہوتی ہے جسے زیادہ جوش دے دیا جاتا ہے۔ ایسی چائے پینے سے نیند نہیں آتی۔ اس لیے جو لوگ رات میں نیند کو ٹالنا چاہتے ہیں ایسی ہی چائے کا استعمال کیا کرتے ہیں۔ لیکن ایسی چائے کے مضر اثرات کو مدنظر رکھتے ہوئے اس سے پرہیز کرنا چاہیے۔

چائے کی خوشبو کا انحصار اس کے مختلف اجزاء پر ہوتا ہے۔ یہ اجزاء حسب ذیل ہیں:-

تیل :- تیل چائے کی پتیوں میں پائے جانے والے غدودوں میں موجود ہوتا ہے۔ دراصل اسی تیل کی وجہ سے چائے میں ایک خاص قسم کا فلیور پیدا ہوتا ہے۔ یہ تیل زیتون کے

(باقی صفحہ پر)

Pu... by th Dir... Pu... D... 11 ... 1

یوجنا

یکم تا ۱۶ر فروری ۱۹۸۵ء

ایک روپیہ

انٹارکٹیکا پر چوتھی ہندوستانی سائنسی مہم
(ڈاکٹر اقبال محی الدین)

ٹیکنالوجی سے متعلق پالیسی،
(وسنت ساٹھے)

ڈاکٹر نسیم شہنوی

فصلوں کی بیماریاں اور اُن کے خطرات

پودے انسانوں کی طرح جاندار ہیں اور وہ تمام عمل کرتے ہیں جو جانداروں کے لیے ضروری ہوتے ہیں مثلاً سانس لینا اور اپنی خوراک تیار کرنا۔ موسموں کی تبدیلی کا احساس ہونا۔ آب و ہوا کی خصوصیات کے مطابق اپنی فطرت کو تبدیل کر دینا وغیرہ ایسے بہت سے قدرتی عمل ہیں جن کی بنیاد پر پودوں کو جاندار تسلیم کیا جا سکتا ہے۔ جس طرح انسان اچھی غذا اور بہتر موسم میں تندرست اور صحت مند رہتا ہے۔ ٹھیک اسی طرح پودے بھی اچھی آب و ہوا اور زرخیز زمین میں تندرست و توانا نظر آتے ہیں۔ خوشگوار موسم میں پودے کی نشوونما ٹھیک رہتی ہے۔ مگر موسم کی تھوڑی سی تبدیلی پودے کی شادابی اور سرسبزی کو ختم کر دیتی ہے۔ تیز دھوپ، بارش اور سردی سے پودے متاثر ہوتے ہیں۔ ناموافق آب و ہوا میں ان پر بے کیفی اور بے رونقی کے آثار نمایاں ہونے لگتے ہیں۔ پودوں کے لاغر اور کمزور ہونے کی صورت میں مختلف قسم کی بیماریاں حملہ آور ہو جاتی ہیں۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ جب فضا ابر آلود ہو اور کئی دنوں تک سورج کی روشنی پودوں کو نہ ملے اور زمین اور ہوا نم ہوں تو ایسے میں فصلوں پر بیماریوں کے بڑھنے کا خدشہ رہتا ہے۔

فصلوں پر عام طور پر بیماریاں، پھپھوند، بیکٹیریا اور وائرس کی وجہ سے پھیلتی ہیں مختلف بیماریوں کے جراثیم بیج کے اندر، زمین اور کھیت کے نزدیک جھاڑیوں میں چھپے رہتے ہیں۔ خراب موسم کی صورت میں یہ حملہ آور ہو جاتے ہیں۔ بیکٹیریل Bacterial اور وائرل (Viral) بیماریاں عموماً سبزیوں کی فصل، ٹماٹر، کدو، کھیرا، ککڑی، بیگن وغیرہ میں زیادہ لگتی ہے۔ جب کہ اناج والی فصلوں پر وائرس کی بیماریاں کم حملہ آور ہوتی ہیں۔ فصلوں کی بیماریاں پودے کے مختلف حصوں جیسے جڑ، تنا، پتی، پھول اور پھل وغیرہ پر کہیں بھی لگ سکتی ہیں۔ بارش کا موسم بیماریوں کے پھیلنے کے لیے سازگار ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خریف کی فصلیں بیماری سے زیادہ متاثر ہوتی ہیں۔ چنانچہ اچھی فصل اور زیادہ پیداوار اسی وقت ممکن ہے جب فصلوں کو بیماریوں سے محفوظ رکھا جائے۔ اگرچہ آجکل ایسے جدید اور ترقی یافتہ قسم کے بیج تیار کر لیے گئے ہیں جن پر بیماریوں کے اثرات کم ہوتے ہیں۔ ساتھ ہی مختلف قسم کے جراثیم کش دواؤں کے استعمال سے بھی بیماریوں کو پھیلنے سے روکا جا سکتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود فصلوں پر بیماریاں لگتی ہیں۔ بیماریوں سے فصل کی تباہی و بربادی محض کسانوں کا ہی ذاتی نقصان نہیں ہے بلکہ پیداوار کا قومی نشانہ بھی متاثر ہوتا ہے۔ یہاں فصلوں پر لگنے والی چند بیماریوں کا ذکر کیا گیا ہے جو حسب ذیل ہیں:-

جڑ سڑن :-

اس بیماری سے پودوں کی جڑیں سڑنا اور گلنا شروع ہو جاتی ہیں۔ یہ ایک پھپھوند والی بیماری ہے۔ اس کے جراثیم زمین میں اور کھیت کے آس پاس کی جھاڑیوں میں چھپے رہتے ہیں۔ چنانچہ جب تخم ریزی کی جاتی ہے اور پودے اُگنے لگتے ہیں تو یہ جراثیم حملہ آور ہو جاتے ہیں۔ اس بیماری کے شکار پودے اچانک مرجھانے لگتے ہیں ابتدائی پتیاں لال اور بھورے رنگ کی ہو کر مرجھا جاتی ہیں۔ آہستہ آہستہ ان پتیوں کا رنگ گہرا بھورا ہو جاتا ہے۔ پتیوں کا ہرا پن ختم ہو جاتا ہے۔ اس کے علاوہ پودے کی موسلا جڑ چھوڑ کر باقی تمام جڑیں سڑ جاتی ہیں۔ اکثر یہ بیماری کم زرخیز زمین میں ہوتی ہے۔ اس بیماری کے اثرات جوار، باجرا، مکا، کپاس اور ارہر پر زیادہ ہوتے ہیں۔

علاج :- اس بیماری کو دور کرنے کے لیے برا سیکا نام کی دوا کا ۲۰ فیصدی گھول ۲۵ لیٹر فی ہیکٹیر یا ۱۰۰ گرام ہیوسٹن نام کی دوا کو ۱۰۰ لیٹر پانی میں گھول کر پودے کے آس پاس کی زمین پر چھڑک دینا چاہیے۔ اگر موسم خشک ہے تو ۲۰ سے ۳۰ کا یوریا کھاد فی ہیکٹیر کی در سے ڈال کر پھر سینچائی کر دینا چاہیے۔ ان کے علاوہ فصل کو بدل کر Crop rotation بونے پر بھی بیماری سے چھٹکارا پایا جا سکتا ہے۔

پتی کی چتی دار (Leaf Spot) بیماری

اس بیماری کے لیے پھپھوند ذمہ دار ہے یہ بیماری کپاس، مکا، جوار، ارہر اور باجرہ فصل پر لگتی ہے۔ اس بیماری سے متاثرہ پودوں کی پتیوں پر چھوٹے اور گول دھبے آجاتے ہیں اور کچھ دنوں بعد یہ دھبے بڑے ہو جاتے ہیں۔ آخر میں پتیاں سوکھ کر گر جاتی ہیں۔ عام طور سے پرانی پتیوں کے نیچے پیلے دھبے پڑ جاتے ہیں اور جب بیماری کا حملہ ہو جاتا ہے تو دھبے بھورے رنگ کے ہو جاتے ہیں۔ پتیاں جھڑ جاتی ہیں۔

(باقی کور صفحہ ۳ پر)

منصوبہ بندی اور ترقیاتی پروگراموں کی جھلک پیش کرنے والا

پندرہ روزہ

یوجنا

نئی دہلی

چیف ایڈیٹر :- آر۔ ٹھکرال
ایڈیٹر :- لکھی رام رانا
اسسٹنٹ ایڈیٹر :- محمد عادل صدیقی
سب ایڈیٹر :- وسیم حیدر

جلد : ۴	یکم تا ۱۵ فروری ۱۹۸۵	شمارہ ۲۱
۱۲ تا ۲۶ ماگھ شک سمبت ۱۹۰۶		

شرح چندہ :-

سالانہ ۲۰ روپے ۔ ۲ سالہ ۳۵ روپے ۔ سہ سالہ ۵۰ روپے
فی کاپی :- ایک روپیہ

طالب علموں، استادوں اور لائبریریوں کے لیے ۱۰ فی صد کی رعایت

اس شمارے میں

یوجنا منصوبہ بند ترقی کے بارے میں عوام کو آگاہ کرتا ہے مگر اس کے مضامین صرف سرکاری نقطۂ نظر کی وضاحت تک ہی محدود نہیں ہیں

بزنس منیجر: ایل۔ آر بترہ ★ اسسٹنٹ ڈائرکٹر (پروڈکشن) آر۔ ایس۔ منچال

مضامین سے متعلق خط و کتابت کا پتہ :-

ایڈیٹر یوجنا (اردو) پبلیکیشنز ڈویژن، ایسٹ بلاک ۴، لیول ۵
آر۔ کے پورم (مین)، نئی دہلی ۱۱۰۰۶۶

ترسیل زر کا پتہ :- بزنس منیجر، پبلیکیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

اداریہ

دیہی غریب عوام کے لیے مکانات

چھٹے منصوبے میں دیہی علاقوں کے بے زمین مزدوروں کے لیے تعمیر مکانات کی اسکیموں پر کافی زور دیا گیا ہے۔ منصوبے میں تعمیر مکانات کے لیے ۴۹۰ کروڑ ۸۰ لاکھ روپے رکھے گئے ہیں۔ مرکزی سیکٹر کے لیے یہ اخراجات ۲۰۰ کروڑ روپے ہوں گے جبکہ ریاستی سیکٹر کے لیے ۲۸۰ کروڑ، ۲ لاکھ روپے ہوں گے۔ دیہات میں تعمیر مکانات کے لیے جگہ کی الاٹمنٹ اور پھر مکانات بنانے کے واسطے امداد وغیرہ کے لیے ۳۵۴ کروڑ ۵۰ لاکھ روپے کے اخراجات رکھے گئے ہیں۔ اس میں سے ۴۰۵ کروڑ روپے سماج کے کمزور طبقوں کے لیے تعمیر مکانات کے واسطے دیے جا چکے ہیں۔ اس اسکیم سے فائدہ اٹھانے والوں کو تین ہزار روپے فی مکان کے حساب سے قرضہ دیا جاتا ہے، جو رعایتی شرح سود پر ہوتا ہے اور اس کی واپسی ۲۰ تا ۲۵ سال کے درمیان ہوتی ہے۔ ۸۳-۱۹۸۲ کے دوران ۱۰ لاکھ ۷ ہزار کنبوں کو تعمیر مکانات کے لیے جگہیں فراہم کی گئیں جبکہ اس کے لیے نشانہ ۹ لاکھ ۸۳ ہزار کنبوں کا تھا۔ اس محاذ پر کامیابی کی رفتار تسلی بخش رہی البتہ تعمیر مکانات کے لیے امداد مطلوبہ نشانے کے ۶۵ فیصد کے برابر دی جا سکی۔ اس عرصے میں ۵ لاکھ ۸۰ ہزار کنبوں کو امداد دینے کا نشانہ تھا۔ جبکہ یہ صرف ۳ لاکھ ۷۷ ہزار کنبوں کو دی جا سکی۔ اہم بات یہ ہے کہ بہت سی ریاستوں میں اس اسکیم کو عملی جامہ پہنانے کے لیے بہتر طریقے اپنانے پر زور دیا جا رہا ہے۔ ۸۴-۱۹۸۳ میں ۱۰ لاکھ ۱۹ ہزار کنبوں کو تعمیر مکانات کے لیے جگہ الاٹ کرنے کا نشانہ رکھا تھا۔ اور ۵ لاکھ ۹۷ ہزار کنبوں کو تعمیر مکانات کے لیے امداد دی جا سکی۔ ۸۳-۱۹۸۲ میں سماج کے اقتصادی طور پر کمزور طبقات کے لیے تعمیر مکانات کے مطلوبہ نشانے کو ۸۰ فی صد سے زیادہ پورا کر لیا گیا۔ متعدد ریاستوں میں تو یہ کارگزاری مطلوبہ نشانوں سے بھی تجاوز کر گئی۔ ۸۴-۱۹۸۳ میں اس اسکیم کے تحت ۴ لاکھ ۲۹ ہزار مکانات الاٹ کرنے کا نشانہ رکھا گیا تھا۔ تعمیر مکانات اور شہری ترقی سے متعلق کارپوریشن جسے عرف عام میں ہڈکو کے نام سے پکارتے ہیں، ریاستی حکومتوں کی اس سلسلے میں مدد کر رہی ہے۔ اس کارپوریشن کا تہائی سرمایہ سماج کے کمزور طبقوں کے لیے مکانات فراہم کرنے پر صرف ہوتا ہے۔ کارپوریشن نے اپنی مختلف اسکیموں سے شیڈولڈ کاسٹ اور شیڈولڈ قبائل کے ارکان کو فائدہ پہنچانے پر خصوصی زور دیا ہے۔ امید ہے کہ ان اقدامات سے مکانات کی قلت کو دور کرنے میں مدد ملے گی۔

ترقی کے لیے صحت کی اہمیت :- آج منصوبہ بندی کے ۳۴ برس بعد بھی ملک کے دیہی اور شہری منظرنامے میں زبردست فرق دیکھنے کو ملتا ہے۔ یہ نہیں کہ اس عرصے میں ملک نے ترقی کی منزلیں طے نہ کی ہوں، منصوبہ بندی کے نظام کے تحت ترقیاتی عمل پوری طرح جاری و ساری رہا۔ اس عرصے میں متعدد بار یہ اعلان کیا جاتا رہا کہ منصوبہ بندی کے ذریعے دیہات کی ترقی کو فروغ دیا جا رہا ہے اور ان ترقیاتی پروگراموں کا مقصد دیہی عوام کا معیار زندگی بلند کرنا اور ملک میں سماجی انصاف کو یقینی بنانا ہے۔ لیکن پینے کے صاف پانی کی فراہمی، صفائی ستھرائی، نقل و حمل اور مواصلاتی سہولتوں میں جو بھی اضافہ ہوا، وہ دیہی علاقوں کی بہ نسبت شہری علاقوں میں زیادہ ہوا۔ چنانچہ آج بھی دیہی اور شہری علاقوں کی ترقی کی رفتار میں بڑا فرق دیکھنے کو ملتا ہے۔ صحت سے متعلق خدمات کی فراہمی کے ضمن میں تو یہ فرق اور بھی زیادہ ہے۔ قوم کی تعمیر و ترقی میں صحت ایک بنیادی حیثیت کی مالک ہے۔ سنہ ۲۰۰۰ء تک سب کو صحت کی خدمات فراہم کی جانی ہیں۔ اس مقصد میں کامیابی کے لیے دیہی علاقوں میں صحت کی خدمات فراہم کیا جانا بہت ضروری ہے۔ دیہی علاقوں میں صحت کی راہ میں حائل دشواریوں کو دور کیا جانا ہے۔ منصوبہ بندی میں دیہی علاقوں کی ضروریات کو پورا کیا جانا سب سے اہم ہے۔ اس کے لیے دیہی عوام کا حفظان صحت کے اصولوں کے بارے میں شعور بیدار کرنا وقت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ دیہی علاقوں میں اس شعور کے نہ ہونے یا اس کی کمی کے باعث صحت سے متعلق بیشتر مسائل سامنے آ جاتے ہیں۔ دیہی عوام روایت پرست ہیں، وہ توہمات کا شکار ہیں، تعلیم کی کمی ہے اور غلط سلط خیالات ان کے ذہن پر چھائے رہتے ہیں۔ لہٰذا صحت مند زندگی اور صحت کے موٹے موٹے اصولوں سے ان کو واقف کرانا بے حد ضروری سمجھا گیا ہے۔ ان کے لیے بنیادی سہولتوں کی فراہمی ضروری ہے۔

(باقی صفحہ ۱۵ پر)

ڈاکٹر اقبال محی الدین

انٹارکٹیکا پر چوتھی ہندوستانی سائنسی مہم

انٹارکٹیکا کے برفیلے برّاعظم پر چوتھی ہندوستانی سائنسی مہم ۴ دسمبر ۱۹۸۴ء کو مارماگوا کی بندرگاہ سے "فن پولیرس" نامی برف توڑنے والے جہاز پر روانہ ہوگئی۔ اس چوتھی سائنسی ٹیم نے ہندوستان کی موجودہ سائنسی ترقیات میں ایک نئے باب کا اضافہ کر دیا۔ جس سے ہندوستانی عوام اور سائنسدانوں کا سر فخر سے اونچا ہوگیا اور بین الاقوامی سطح پر سائنس دانوں کی نظروں میں ہندوستان کی عزت و شہرت آسمان کی بلندیوں تک پہونچ گئی۔

۸۲ ممبروں پر مشتمل یہ چوتھی سائنسی مہم ڈاکٹر بی۔ بی۔ بھٹا چاریہ کی قیادت میں انٹارکٹیکا روانہ ہوئی۔ ڈاکٹر بھٹا چاریہ۔ انڈین اسکول آف مائنز دھنباد سے منسلک ہیں۔ پہلے یہ طے کیا گیا کہ پہلی دسمبر ۱۹۸۴ کو یہ مہم روانہ ہو جائے، مگر "فن پولیرس" جہاز پر سامان کے لادنے میں بہت وقت لگ گیا۔ اسی لیے ۴ دسمبر ۱۹۸۴ کو صبح سوا چھ بجے گوا کی بندرگاہ مارماگوا سے یہ مہم انٹارکٹیکا کے لیے روانہ ہوئی اور ۲۸ دسمبر ۱۹۸۴ کو انٹارکٹیکا پہونچی۔

قبل اس کے کہ ہم اس چوتھی مہم کی تفصیل میں جائیں یہ مناسب ہوگا کہ انٹارکٹیکا کا جغرافیہ، تاریخ اور وہاں اس سے پہلے جانے والی تین مہموں کے بارے میں قارئین کو کچھ حقائق سے آگاہ کر دیں۔

انٹارکٹیکا کا جغرافیائی تجزیہ

برّاعظم انٹارکٹیکا دنیا کے جنوب ترین حصے کے بالکل وسط میں واقع ہے جس کا رقبہ تقریباً ۱۴ ملین مربع کلومیٹر ہے۔ یعنی یہ برّاعظم زمین کا دسواں حصہ گھیرے ہوئے ہے۔ یہ برّاعظم یورپ سے بڑا ہے، آسٹریلیا سے بھی بڑا ہے۔ امریکہ (USA) اور میکسیکو کو ملا دیا جائے تو اس سے بھی بڑا ہے۔ اسی طرح اگر ہندوستان اور چین کو ملا دیا جائے تو اس سے بھی بڑا ہے۔ یہ دنیا کا سب سے ٹھنڈا، سب سے زیادہ خشک، سب سے زیادہ تیز ٹھنڈی ہواؤں کا برفیلا ریگستان ہے، اور ساتوں برّاعظموں میں سب سے زیادہ مشکل پہونچ کا برّاعظم ہے۔

برّاعظم انٹارکٹیکا چاروں طرف سمندروں سے گھرا ہوا ہے۔ اس کے شمال مشرق میں بحر ہند پھیلا ہوا ہے، شمال میں بحر اوقیانوس ہے اور مغرب اور جنوب میں بحر الکاہل اس کو اپنے آغوش میں لیے ہوئے ہے۔ اگلے صفحہ پر نقشہ دیکھئے۔

انٹارکٹیکا کے ساحلی علاقے بحر جنوبی سے گھرے ہوئے ہیں۔ شمال مغرب کا حصہ ویڈل سی سے گھرا ہوا ہے۔ ویڈل سی کے شمال مغرب میں بحر اسکوشیا ہے جس میں فاک لینڈ آئی لینڈ اور ساؤتھ سینڈوچ آئی لینڈ ہیں۔ انٹارکٹیکا کے جنوبی حصے میں ساحلی علاقے روس سی (ROSS SEA) سے گھرا ہوا ہے۔

انٹارکٹیکا کے شمالی حصے کو کوئین موڈ لینڈ کہتے ہیں۔ یہ ناروے کی املاک ہے۔ گراہم لینڈ برطانیہ کی املاک میں آتا ہے۔ اس میں ویڈل سی اور الیگزینڈر آئی لینڈ شامل ہیں۔ جنوبی علاقہ ایلسورتھ ہائی لینڈ ہے جس میں بائرڈ لینڈ اور روک فیلر پلیٹو شامل ہیں۔ یہ امریکہ کی املاک میں ہے۔ کیوڑیہ لینڈ اور وکٹوریہ لینڈ آسٹریلیا کی املاک میں شامل ہیں۔ جنوب مشرق کا تھوڑا سا حصہ فرانس کی املاک میں ہے۔ سارے برّاعظم کو مختلف ملکوں نے اپنی املاک میں شامل کیا تھا۔ مگر ۱۹۵۹ء کے بین الاقوامی معاہدے میں یہ بات طے ہوئی تھی کہ مستقبل میں انٹارکٹیکا کسی ملک کی ملکیت نہیں ہوگا بلکہ اس کو صرف سائنسی تجربات اور پُرامن مقاصد کے لیے استعمال کیا جائے گا۔ اس پر ایٹمی دھماکہ بھی

نہیں کیا جائے گا۔

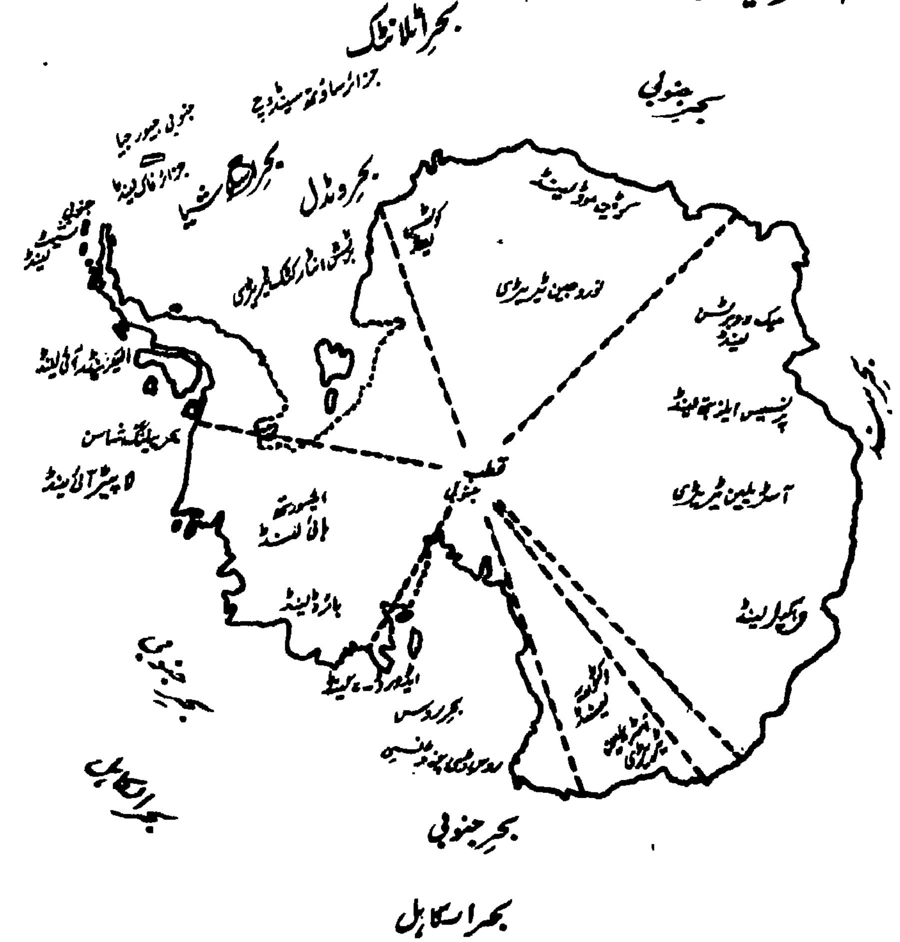
ہندوستان اور انٹارکٹیکا کے درمیان پانی کی ایک چادر ہے جس کو بحر ہند کہتے ہیں اسی لیے ہندوستان سے انٹارکٹیکا براہِ راست پہونچنے کے لیے صرف بحرِ ہند کو طے کرنا ہوتا ہے۔

انٹارکٹیکا میں قطب جنوبی بھی واقع ہے جس تک پہونچنے کے لیے امنڈسین پہلے سیاح تھے جو دسمبر ۱۹۱۱ میں پہونچے تھے۔ اس کے بعد اسکاٹ جنوری ۱۹۱۲ء میں ساؤتھ پول تک پہونچے۔ ہلیری اور فیکس بالترتیب ۴ر جنوری اور ۱۹ر جنوری ۱۹۵۸ کو قطب جنوبی پر پہونچے تھے۔

انٹارکٹیکا کا تاریخی تجزیہ

انٹارکٹیکا کی قدیم تاریخ پر بھی ایک نظر ڈالنا ضروری ہے کیونکہ سائنسی اور تاریخی ثبوت اس بات کے ملتے ہیں کہ کسی زمانے میں سب بر اعظم ایک دوسرے کے ساتھ ایسے ملے ہوئے تھے گویا یہ آپس میں ایک دوسرے کے رشتہ دار ہوں۔ یہ خیال کیا جاتا ہے کہ آج سے تقریباً بیس کروڑ سال پہلے دنیا کے سارے بر اعظم ایک ساتھ جڑے ہوئے تھے۔ انٹارکٹیکا سے ہندوستان اور آسٹریلیا جڑے ہوئے تھے اور افریقہ سے دونوں امریکہ دست و گریباں تھے۔ بر اعظموں کے اس گٹھ جوڑ کو پینگیا (PANGEA) کہتے ہیں۔ زمین کے اندر کچھ ایسی قدرتی ہلچلیں پیدا ہوئیں جن کی

انٹارکٹیکا کا نقشہ



وجہ سے یہ سارے برِ اعظم یا تو شمال کی طرف کھسک گئے یا پھر مغرب کی طرف کھسکتے چلے گئے۔ اُن کے درمیان جو خلیج پیدا ہو گئی اُن کو سمندروں نے پُر کر دیا۔ کچھ اس طرح کا خیال سائنس داں ویگنر (WEGENER) نے ظاہر کیا اور اُس نے جنوبی امریکہ کے برازیل کے حصّے کو افریقی نیوگنی میں سمونے کی کوشش کی۔ دونوں جگہوں کی نباتات اور جاندار زندگیوں کا مطالعہ کیا اور کہا کہ دونوں جگہ تقریباً ایک سی حیواناتی اور نباتاتی زندگی پائی جاتی ہے۔ اسی مشابہت سے ویگنر نے یہ کہا کہ کسی زمانے میں افریقہ اور امریکہ ایک ساتھ جُڑے رہے ہوں گے۔

موجودہ صورتِ حال کچھ اس طرح کی ہوئی کہ ایشیا، افریقہ، ہندوستان اور یورپ کے سارے ممالک شمال کی طرف کھسک گئے اور دونوں امریکہ مغرب کی جانب بڑھ گئے مگر انٹارکٹیکا جُوں کا توں دُنیا کا آخری جنوبی حصّہ بن کر رہ گیا۔

انٹارکٹیکا کی منجمد معدنیاتی دولت

انٹارکٹیکا کی برف میں مدفون دولت کی طرف اشارہ کرنا بھی ضروری ہے۔ اس برِاعظم میں زمین کے ساتھ پہاڑ بھی ہیں جن کی اُونچائی ... ۵ میٹر تک ہے۔ ان کوہستانی دامنوں اور میدانی علاقوں کی گہرائیوں میں مدفون ہے انٹارکٹیکا کی بیش بہا دولت۔ جب سے دنیا کو یہ معلوم ہوا ہے کہ انٹارکٹیکا میں کوئلہ، تیل اور گیس کے ذخیرے ہیں اور یورینیم جیسی بیش قیمت دولت چھپی ہوئی ہے، اپنا قبضہ جمانے کی دوڑ شروع ہو گئی مگر ۱۹۵۹ میں جب بین الاقوامی انٹارکٹک معاہدہ نامہ ہوا اور اس پر ۱۲ ملکوں نے دستخط کئے اس وقت سے یہ برّاعظم صرف سائنسی تجربہ گاہ کے طور پر استعمال ہو رہا ہے۔ اس معاہدے کے تحت وہاں کسی طرح کا نیوکلیائی دھماکہ بھی نہیں کیا جائے گا۔

انٹارکٹیکا کی زمین پر آبادی بالکل نہیں ہے۔ سوائے برف کے اور کچھ نظر نہیں آتا۔ مگر انٹارکٹیکا کے چاروں طرف جو سمندر ہیں اُن میں بحری جانداروں کی کمی نہیں ہے۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ساری دنیا کے سمندر بحری جانداروں سے اتنے زیادہ مالامال نہیں ہیں، جتنا کہ انٹارکٹیکا کے سمندر۔ چونکہ ابھی تک ان میں سے مچھلیاں کرل اور دوسرے پودے نہیں نکالے گئے لہٰذا وہ دن بدن بڑھتے ہی چلے گئے۔ پنگوئن اور سیل انٹارکٹیکا کے برف پر انڈے دیتے ہیں اور اُن کی آبادی بھی بڑھتی جاتی ہے۔

انٹارکٹیکا کی ۹۰ فیصد زمین کا حصّہ برف سے ڈھکا ہوا ہے۔ بعض اوقات برف کے پہاڑ ۲ سے ۴ کلو میٹر کی اونچائی تک پھیلے ہوئے ہیں۔ اسی طرح انٹارکٹیکا دُنیا کے تازہ پانی کا بہترین ذخیرہ رکھتا ہے۔ یہ انٹارکٹیکا کی بیش بہا دولت ہے جس سے "پیاسی دنیا" فیضیاب ہو سکتی ہے۔ کچھ سائنس دانوں کا خیال ہے کہ اگر کسی طرح یہ ساری برف انٹارکٹیکا کی پگھلا دی جائے تو اس کا پانی دُنیا بھر کے سطح سمندر کو ۶۰ میٹر اُونچا کر دے گا جس سے بہت سے ممالک ڈوب جائیں گے۔ مستقبل میں سائنس داں اس منجمد تازہ پانی کے ذخیرے کو پُرامن مقاصد کے لیے ضرور استعمال کریں گے جس سے ساری دنیا میں زرخیزی و خوشحالی کے شادیانے بجنے لگیں گے۔

پہلی ہندوستانی مُہم

پہلی ہندوستانی سائنسی مہم ۹ جنوری ۱۹۸۲ کو انٹارکٹیکا پہونچی تھی۔ اس مہم کے سربراہ ڈاکٹر سید ظہور قاسم صاحب تھے جو حکومتِ ہند کے شعبۂ بحری ترقیات کے سکریٹری ہیں۔ اس پہلی سائنسی مہم نے دکھن گنگوتری پر اپنا پہلا بیس کیمپ بنایا تھا اور وہیں سے سائنسی تجربہ کرتے رہے۔ یہ مہم انٹارکٹیکا میں دس روز تک رہ کر واپس ہندوستان آگئی تھی۔ اس مہم میں ۲۱ ممبران تھے۔ اس مہم کا سب سے بڑا مقصد یہ تھا کہ انٹارکٹیکا پہونچ کر سائنسی تجربہ کی دنیا میں پہل کی جائے اور آنے والی نسلوں کے لیے وہاں جانے کی راہ ہموار کی جائے اور دُنیا کے دوسرے ممالک کے ساتھ سائنسی و علمی تجربات میں شانہ بشانہ ساتھ دیا جائے۔ بہت حد تک یہ مہم اپنے مقصد میں کامیاب رہی۔ جو کام اُن لوگوں نے وہاں شروع کیا تھا دوسری سائنسی مہمیں اُن کو پورا کرتی رہیں اور کرتی رہیں گی۔

ہندوستان تیسری دنیا کا پہلا ملک ہے جس نے سب سے پہلے ۹ جنوری ۱۹۸۲ء کو انٹارکٹیکا پر اُتر کر جھنڈا گاڑ دیا۔ اور "دکھن گنگوتری" پر اپنی سائنسی تجربہ گاہ قائم کر دی۔ اب گنگوتری صرف ہمالیہ ہی میں نہیں بلکہ زمین کے آخری سرے والے برّاعظم میں بھی ہے جس کا نام ہے "دکھن گنگوتری" گنگوتری سے نکلتی ہے گنگا کی شفاف دھارا اور اس "دکھن گنگوتری" سے بہہ رہا ہے۔ سائنسی تجربات کے جوش و خروش کی گنگا جس نے ہندوستان کا سر ایک بار پھر فخر سے دُنیا کے سامنے اُٹھا دیا ہے۔

دوسری ہندوستانی سائنسی مہم

دوسری ہندوستانی سائنسی مہم ڈاکٹر وی۔ کے۔ رینا (ڈائرکٹر۔ جیولوجیکل سروے آف انڈیا) کی سربراہی میں ۸ دسمبر ۱۹۸۲ء کو انٹارکٹیکا پہونچی اور وہاں ۳ ماہ تک رہی۔ پہلی مہم نے جو سامان اور بیشتر آلات

وہاں چھوڑ دئے تھے وہ مکمل طور پر کام کر رہے تھے جس کا دوسری مہم نے پورا فائدہ اٹھایا۔ اس مہم میں ۲۸ ممبران شامل تھے۔

دوسری ہندوستانی سائنسی مہم کا مقصد یہ تھا کہ لوگوں کو زیادہ دنوں تک برفیلے ریگستان میں رکھ کر اُن پر وہاں کی فضا کا ردِ عمل دیکھا جائے۔ پہلی مہم صرف دس روز تک انٹارکٹیکا میں رُکی۔ لیکن دوسری مہم کو دو ماہ کا عرصہ وہاں گذارنا پڑا۔ اس طرح موسم، برف، حیوانی و نباتاتی زندگی، چٹانوں کی جانچ و نمونے اکٹھا کرنے سے لے کر کافی بڑے علاقے کی پوری پیمائش کرنے، ہوائی پٹی بنانے، آب و ہوا درج کرنے کے آلات نصب کرنے، پچھلی ٹیم کے چھوڑے ہوئے سائنسی آلات لانے اور برف ہی برف میں دو مہینے گذارنے سے جسم پر پڑنے والے اثرات دیکھنے تک تمام کام دوسری ہندوستانی سائنسی مہم کے ممبران نے انجام دیئے۔

دوسری ہندوستانی سائنسی مہم نے انٹارکٹیکا میں کئی اہم سائنسی تجربات کئے۔ موسم کی معلومات کے اور درجۂ حرارت کے گھٹنے بڑھنے کی معلومات حاصل کرنے کے لیے ایک چھوٹا سا تجرباتی اسٹیشن قائم کیا گیا۔ دوسرے ملکوں سے موسم کی بار بار جو خبریں نشر ہو رہی تھیں اُن کا بھی ریکارڈ رکھا گیا۔ یہ کام دوسری ٹیم کے نائب سربراہ ڈاکٹر شری دھر نے کیا۔ فوج کے ڈاکٹر شاستری نے برف کی دراروں پر اپنے سائنسی تجربات کئے، جس سے یہ معلوم ہوا کہ ان دراروں سے نکل آواز فضا کو کیسے اور کتنی متاثر کرتی ہے۔ اس تجربہ سے ہمالیہ میں آنے والے طوفان کو سمجھنے اور اُن کی پیشن گوئی کرنے میں مدد ملتی رہے گی۔

ڈاکٹر دیتی نے دکھشن گنگوتری میں قدرتی دولت کا پتہ لگایا۔ اس کے علاوہ انٹارکٹیکا کے مستقبل کو جاننے کے لیے انھوں نے چٹانوں پر بھی تجربات کئے۔ زمین کی مقناطیسی کشش کو بھی ناپنے کا تجربہ کیا گیا۔ ڈاکٹر لوڈس نے انٹارکٹیکا کی مقناطیسی کشش کی ہلچل کو بھی ناپا۔ اس مقناطیسی ہلچل کی وجہ سے ریڈیو مواصلات کا سلسلہ انٹارکٹیکا میں اکثر و بیشتر ٹوٹ جاتا ہے۔ ڈاکٹر لوڈس نے اس پر تجربات کئے کہ مقناطیسی ہلچلوں کا اثر مواصلات پر نہ پڑے اور وہاں رہنے والوں کا رابطہ ہمیشہ اپنے ملک سے قائم رہے۔ بہت حد تک اُن کو اس میں کامیابی حاصل ہوئی۔

دوسری سائنسی مہم نے ایک اور بہت اہم کام کیا۔ جس سے اُن لوگوں کو بھی اور وہاں آنے والے سائنس دانوں کو بھی سہولیت رہے گی۔ وہ کام تھا برف کے اوپر ہوائی پٹی نصب کرنا۔ اسی ہوائی پٹی پر ہیلی کوپٹر اُترتے تھے، اور اسی پر سلیج گاڑیاں سامان ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جاتی تھیں۔

انٹارکٹیکا میں ۵۶ روز تک رُک کر دوسری ہندوستانی سائنسی مہم اپنے مقاصد میں کامیاب ہو کر ہندوستان لوٹ آئی۔

تیسری ہندوستانی سائنسی مہم

تیسری ہندوستانی سائنسی مہم ڈاکٹر ایچ۔ کے۔ گپتا کی زیرِ قیادت انٹارکٹیکا ۲۷ دسمبر ۱۹۸۳ کو پہونچی اور وہاں ۷۰ روز تک قیام پذیر رہی۔ ہندوستان سے انٹارکٹیکا تک پہونچنے میں اس مہم نے صرف ۲۴ دن لیے جبکہ پہلی مہم ۴۳ دن میں اور دوسری مہم ۲۷ دن میں انٹارکٹیکا پہونچی تھی۔

تیسری ہندوستانی سائنسی مہم کا سب سے بڑا مقصد یہ تھا کہ وہ انٹارکٹیکا میں ایک مستقل سائنسی تجربہ گاہ قائم کر دے، تاکہ ہندوستانی سائنس داں وہاں مستقل طور پر رہ کر تجربات کر سکیں۔ یہ کام اس مہم نے سرانجام دیا۔ دکھشن گنگوتری پر مستقل تجربہ گاہ سائنس کی دنیا میں ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہے جس کو تیسری سائنسی مہم نے تیار کیا تھا۔

اس کے علاوہ دوسری ہندوستانی مہم نے جو سائنسی آلات انٹارکٹیکا میں چھوڑے تھے اُن کی جانچ پڑتال کرنا، موسمی اعداد و شمار حاصل کرنا، فضا میں موسم کے اعتبار سے جو تبدیلیاں رونما ہوئیں اُن کے اعداد و شمار حاصل کرنا بھی اس مہم کا مقصد تھا۔

تیسری ہندوستانی سائنسی مہم نے اپنے بیس کیمپ کے پاس پہلا سٹیلائیٹ کمیونکیشن ٹرمینل قائم کیا جس کے ذریعہ ہندوستان سے رابطہ قائم کیا جا سکتا ہے۔ دوسرا ٹرمینل دہلی میں شعبہ بحری ترقیات میں لگایا گیا ہے جو انٹارکٹیکا سے دیئے گئے سگنل کو براہِ راست حاصل کرتا رہتا ہے۔ یہ رابطہ سیٹلائٹ کے ذریعے دونوں ٹرمینل حاصل کرتے ہیں۔

اس کے علاوہ تیسری مہم نے دکھشن گنگوتری کے مقام پر ایک مستقل تجربہ گاہ جو دو منزلہ عمارت پر مشتمل ہے، قائم کر دی۔ یہ اس مہم کا سب سے بڑا کارنامہ ہے جس کی وجہ سے مستقبل میں ہندوستانی سائنس داں وہاں مستقل طور پر رہ کر تجربات کرتے رہیں گے۔ یہ عمارت دو تجربہ گاہوں اور ایک لائبریری اور ریڈنگ روم پر مشتمل ہے۔ کچن میں بہتے ہوئے نل کے گرم پانی کا بھی انتظام کیا گیا۔ برف کو پگھلانے کی مشین بھی اس عمارت میں نصب ہے۔ کپڑے دھونے اور اس کو سکھانے کی مشینیں اور سنٹرل ایرکنڈیشن کا انتظام اس تیسری مہم نے انٹارکٹیکا میں کر دیا تھا۔ اس سائنٹیفک اسٹیشن کے اندر کا درجۂ حرارت ۱۵ سے ۱۷ ڈگری سیلسیس قائم کر دیا گیا ہے تاکہ سائنس دانوں کو وہاں آرام دہ گرمی کے ماحول میں کام کرنے میں آسانی ہو۔ اس تجربہ گاہ کی عمارت میں ۱۵ آدمی رہ سکتے ہیں۔

تیسری ہندوستانی سائنسی مہم ۸۰ ممبران پر مشتمل تھی جس میں دو سائنسداں عورتیں بھی شامل تھیں۔ یہ لوگ ۷۰ روز تک رُک کر اور مختلف سائنسی تجربات کرکے وہاں سے واپس ہوئے مگر اُن میں سے ۱۲ ممبران لفٹیننٹ کرنل ایس۔ ایس۔ شرما کی زیر قیادت ۹ ماہ تک مزید رُکے اور انٹارکٹیکا کی سخت ترین سردیوں میں اور وہاں کے اندھیرے میں سارے تجربات کرتے رہے۔ مقصد یہ تھا کہ سورج کی روشنی میں اور وہاں کی گرمی میں تو بہت سے تجربات کئے ہی جا چکے تھے، دیکھنا یہ تھا کہ اندھیرے میں اور سخت سردیوں میں انٹارکٹیکا کی حیوانانی و نباتاتی زندگی پر وہاں کا ماحول کس حد تک اثر انداز ہوتا ہے۔ ایسے سخت ٹھنڈے موسم میں فضا کی کیا کیفیت ہوتی ہے۔ زمین کی مقناطیسی ہلچل کس حد تک ریڈیو پروپگیشن پر اثر انداز ہوتی ہے۔ اس تجربہ سے ایک موازنہ کا مطالعہ سامنے آیا۔ گرمیوں اور سردیوں کا فرق اور وہاں کی زندگی پر دونوں کیفیتوں کا اثر سامنے آیا۔

انٹارکٹیکا میں تقریباً بارہ سو سائنسداں مختلف ملکوں سے آکر تجربات کر رہے ہیں۔ اس ملی جلی کوشش کا نتیجہ یقیناً بہت مفید ہوگا۔ سائنسی علم کو ترقی دینے میں امداد باہمی ہمیشہ مشعلِ راہ دکھاتی رہے گی۔ ہندوستان کی تیسری سائنسی مہم ہماری امیدوں کے پیمانے پر پوری اُتری جس نے انٹارکٹیکا میں ایک مستقل سائنسی تجربہ گاہ قائم کرکے سائنسی ترقی کی راہ میں ایک نیا باب کھول دیا ہے۔ ان تجربات سے مستقبل میں ہندوستان کو سائنسی اور معاشی فوائد حاصل ہوتے رہیں گے۔ ہندوستانی سائنسدانوں کے اس زبردست کارنامے نے ہندوستان کی عزت نہ صرف تیسری دُنیا کے ممالک میں بڑھادی ہے بلکہ ساری دنیا اس کے سائنسی کارنامے پر خراجِ تحسین پیش کر رہی ہے۔

چوتھی ہندوستانی سائنسی مُہم

چوتھی ہندوستانی سائنسی مہم ڈاکٹر بی۔ بی۔ بھٹاچاریہ کی قیادت میں گوآ کی بندرگاہ مارما گوا سے ۴ دسمبر ۱۹۸۴ کو انٹارکٹیکا کے لیے روانہ ہوئی۔ ۸۲ ممبران پر مشتمل یہ ٹیم ۱۹۸۵ کے وسط تک وہاں رہےگی اور مختلف سائنسی تجربات میں مشغول رہے گی۔ زیادہ تر سائنسداں (Seismology) جیولوجی اور علم حیوانات پر کام کرتے رہیں گے۔ اس ٹیم کا سب سے پہلا کام یہ ہے کہ انٹارکٹیکا کے دکھن گنگوتری اور ہندوستان سے بذریعہ انسیٹ۔ بی رابطہ قائم رکھے۔

اس سال کے آخیر تک پہلی مرتبہ اس مہم کے چھ ممبران لیفٹیننٹ کرنل بجاج کی زیر قیادت دکھن گنگوتری سے قطب جنوبی جائیں گے۔ جس کا فاصلہ ۶۰۰۰ کلومیٹر ہے۔

سائنسی آلات کے علاوہ فِن پولریس نامی جہاز جو ۱۱۰ میٹر لمبا اور ۳۰ میٹر چوڑا ہے، اپنے ساتھ ۱۸ ٹن وزن کا کرین، ایک گیراج بنانے کا پورا سازوسامان، ۳۰۰ ٹن مال گیراج میں رکھنے کے لیے، ۴۰ ٹن میٹریل رہنے کی دوسری جگہ بنانے کے لیے اور ۴۰ ٹن کھانے کا سامان لے کر انٹارکٹیکا گیا۔ اس سامان کے علاوہ اس جہاز میں ۸۲ ممبرانِ مہم بھی سوار ہوکر گئے۔ ۶۰ × ۱۰ میٹر گیراج دکھن گنگوتری کے نزدیک بنایا گیا جس میں کرین، شوکرولس اور دوسری سواری گاڑیاں رکھی جارہی ہیں۔

اس چوتھی سائنسی مُہم پر جس پر ساڑھے پانچ کروڑ روپیہ صرف ہوا ہے یہ اُمید کی جاتی ہے کہ وہ جو بھی سائنسی تجربات انٹارکٹیکا میں کریں گے اُن سے ہندوستان مالی طور سے مستفید ہوگا۔ سمندری دولت اور معدنیاتی دولت دونوں حاصل ہوں گی اور ہندوستان کو اس سے بیحد فائدہ پہونچے گا۔

چوتھی انٹارکٹیکا مہم کے ممبران مختلف شعبوں سے لیے گئے ہیں۔ ان میں سے کچھ تو نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف اوشنوگرافی سے، کچھ شعبۂ موسمیات سے، کچھ جیولوجیکل سروے آف انڈیا سے، کچھ بھارت ہیوی الیکٹریکل لمیٹڈ (भेल) سے اور کچھ فوج سے لیے گئے ہیں۔ اس ٹیم میں ایک فوٹوگرافر ہے، چار ڈاکٹر ہیں اور انجینئرز اور سائنسداں ہیں۔ فوج سے تیس آدمی اس مہم کے لیے منتخب کئے گئے ہیں۔ دہر سائنس داں ڈاکٹر شیونت بھوجے دار اور دو جرمن سائنس داں مارلیش سے اس چوتھی مہم میں شامل ہوئے۔

قطب جنوبی پر ایک ہندوستانی سائنسی مہم کو بھیجنے کی تجویز مرحومہ محترمہ اندرا گاندھی کی تھی اور اُن کا غذات پر اُن کے آخری دستخط ثبت ہیں جن کے ذریعے قطب جنوبی پر ٹیم بھیجنے کی اجازت ملی۔ سابق وزیر اعظم محترمہ اندرا گاندھی کا یہ زبردست کارنامہ ہے کہ آج ہم تیسری دنیا کے سب سے پہلے ملک ہیں جو انٹارکٹیکا تین مرتبہ سائنسی مہم بھیج چکے ہیں اور چوتھی مہم بھی بھیجی جاچکی ہے۔

چوتھی مہم کے ۱۲ ممبران جن میں دو سائنسداں بھی ہیں انٹارکٹیکا کی زبردست سردیوں کا مقابلہ کرتے ہوئے وہاں تجربات کرتے رہیں گے جبکہ اُن کے دوسرے ساتھی ہندوستان کو واپس آچکے ہوں گے۔

چوتھی مہم کے سائنسی تجربات

چوتھی ہندوستانی سائنسی مہم ۱۹۸۵ کے وسط تک انٹارکٹیکا میں رہ کر مندرجہ ذیل تجربات کرتی رہے گی۔ اور ہر پہلو پر کام جاری بھی ہے۔ اس سائنسی مطالعہ و تجربات کے چند اہم پہلو یہ ہیں:۔

۱۔ بحریاتی علم ۲۔ گلیشیر کے متعلق معلومات۔ ۳۔ زمین کا مقناطیسی علم۔ ۴۔ علم ارضیات۔ ۵۔ علم موسمیات۔ ۶۔ نباتاتی زندگی کا مطالعہ۔ ۷۔ انٹارکٹیکا کی پہاڑیوں کے آرگینک میٹر کا تجزیہ۔ ۸۔ کیمیائی اور انٹارکٹک برف کے تجزیہ سے حیاتیاتی معلومات۔ ۹۔ فضا میں کثافت کی مقدار۔ ۱۰۔ ریڈیو پروپیگیشن کا مطالعہ۔

سمندری علم حاصل کرنے کے لیے چوتھی ہندوستانی سائنسی مہم نے سمندر کے طبعی حالات، کیمیائی حالات، سمندر کے اندر کی زندگی، علم ارضیات اور سمندر کے نیچے کی زمین کے حالات کا بہت تفصیل سے مطالعہ کیا۔ تقریباً ۳۰ ہزار مربع کلومیٹر کا ریکارڈ جو میگنیٹک اور سیسمک لہروں اور سمندر کے اندر اور انٹارکٹیکا کے ساحل سے متعلق تھا، حاصل کیا۔

گلیشیر سائنس کا علم حاصل کرنے کے لیے چوتھی ہندوستانی سائنسی مہم نے برف کے ٹکڑوں کا بھی تجزیہ کیا جس میں برف کے ننھے ننھے ذرات کا اور اس کے پگھلنے کا وقت اور تابکارانہ شعاعوں کے اثرات کا بھی مطالعہ شامل تھا۔

انٹارکٹیکا کے مقناطیسی علم حاصل کرنے کے لیے اس مہم نے سائنسی مطالعہ کیا۔ جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ مقناطیسی کشش شمالی اور جنوبی قطب پر بہت زیادہ ہوتی ہے لہٰذا وہاں مقناطیسی کشش کا ناپنا بہت ضروری ہو جاتا ہے۔ چوتھی مہم کے سائنس داں برابر کئی روز تک مقناطیسی کشش ناپنے کا کام کرتے رہے جس میں یہ محسوس کیا گیا کہ اس کشش میں بڑا فرق ہے جو کہ "مقناطیسی طوفان" کی وجہ سے ہو جاتا ہے۔

علم ارضیات حاصل کرنے کے لیے اس سائنسی مہم نے انٹارکٹیکا کے پہاڑی پتھروں کو جمع کیا اور ان پر پیٹرولوجیکل اور جیولوجیکل اور جیو کیمیکل مطالعہ کرنے کے لیے برف کی گرد اور اس میں دبی ہوئی اشیا کو جمع کرتے رہے۔

انٹارکٹیکا پر ہزاروں فٹ برف جمی ہوئی ہے جو تہ بہ تہ جمتی چلی گئی ہے۔ لاکھوں سال سے یہ برف کی تہیں جمتے جمتے پورے برف کے پہاڑ بن گئے ہیں۔ ان برف کے نمونوں پر تجربات کرنا، ان میں زندگی کے آثار دیکھنا یا کیڑے مکوڑوں پر سائنسی تجربہ کرنا بھی اس چوتھی ہندوستانی سائنسی مہم کا مقصد ہے۔

برف کی دراروں پر بھی تجربات کیے گئے ہیں جن سے معلوم ہوا کہ ان دراروں سے نکلی آواز انٹارکٹیکا کی فضا کو کیسے اور کس حد تک متاثر کرتی ہے۔ اس تجربے کا فائدہ یہ ہوگا کہ پہاڑی علاقوں میں طوفان آنے کی پیشن گوئی کی جا سکے گی۔

انٹارکٹیکا میں برف کے نیچے سیکڑوں میٹر کی گہرائی میں بہت پرانی ہوا کے بے شمار بلبلے جمع ہیں جن سے زمین کی فضائی کیفیت اور قدرتی تاریخ کے کئی عقدے کھل سکیں گے۔ اس پہلو پر بھی چوتھی سائنسی مہم کام کر رہی ہے۔ مختلف گہرائیوں سے برف کے ٹکڑے حاصل کر کے اس پر تجربہ کیا جا رہا ہے۔

موسم کا علم حاصل کرنے کی غرض سے اس مہم نے فضا کے درجۂ حرارت، ہوا کے دباؤ، ہوا کی رفتار، ہوا کی خشکی اور بادلوں کی مختلف اشکال کا اور تابکاری کا مطالعہ کیا۔ کئی غبارے ہوا میں چھوڑے گئے تاکہ فضا کا سارا حال معلوم ہوتا رہے۔ یہ غبارے ۲۵ کلو میٹر کی اونچائی تک پہونچ کر فضا کے حالات سے باخبر کرتے رہے۔ دکھن گنگوتری کے مقام پر ۱۵ غبارے چھوڑے گئے جو برابر ہوا کی رفتار، ہوا کی سمتیں، فضا کی درجہ حرارت اور فضا کی خشکی کے بارے میں معلومات فراہم کرتے رہے۔

انٹارکٹیکا کی نباتاتی زندگی کے مطالعہ سے یہ معلوم ہوا کہ وہاں پرانے زمانے کی زندگی کے آثار پائے گئے جیسے کیڑے مکوڑے اور گھاس وغیرہ۔ آرگینک میٹر کو معلوم کرنے کے لیے برف کے ٹکڑوں کا بھی تجزیہ کیا گیا تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ برف کے بڑے بڑے تودے وہاں کی حیواناتی زندگی کو کہاں تک پہنچنے میں مددگار ثابت ہو سکتے ہیں۔

فضا میں کثافت کی مقدار معلوم کرنے کے لیے اس چوتھی سائنسی مہم نے AEROSOL MEASUREMENT کا بھی تجربہ کیا۔ یہ تجربہ مارماگوا سے انٹارکٹیکا تک کیا گیا کیونکہ سمندر کے اوپر ہی فضائی کثافت کی مقدار کم معلوم ہو سکتی ہے۔ انٹارکٹیکا میں فضائی کثافت بالکل نہیں ہے۔ لہٰذا وہاں فضائی کثافت کا تجربہ کرنے سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔

چوتھی ہندوستانی سائنسی مہم نے انٹارکٹیکا کی حیواناتی زندگی پر بھی تجربات کیے۔ وہاں کرل مچھلی بہت ملتی ہے جو انسانی غذا کے طور پر استعمال کی جا سکتی ہے۔ یہ انٹارکٹیکا کے سمندر کی بہت بڑی دولت ہے۔ حکومت ہند کے شعبہ بحری ترقیات کے سکریٹری ڈاکٹر ظہور قاسم صاحب کا کہنا ہے کہ ہندوستان جلد ہی انٹارکٹیکا سے کرل مچھلی پکڑ کر یہاں بھیجے گا۔ کرل مچھلی کو پکڑنے کے لیے ہندوستان ڈنمارک سے برف توڑنے کا مضبوط جہاز حاصل کرے گا۔ جس کی قیمت ۱۵ کروڑ روپیہ ہوگی۔ کوچین میں تجربات شروع کیے جا چکے ہیں کہ انٹارکٹیکا سے پکڑی ہوئی کرل مچھلی کو انسانی استعمال کے لیے کیسے موزوں بنایا جائے۔ جس طرح گوشت،

لوبسٹر، شرمپ وغیرہ میں پروٹین پایا جاتا ہے۔ اسی طرح کِرل مچھلی میں بھی ۱۵ فیصد پروٹین کی مقدار پائی جاتی ہے۔ انٹارکٹیکا سے ۰۷ ملین ٹن مچھلی ہر سال پکڑی جائے گی۔ جس سے دنیا کے تقریباً چوتھائی انسانی آبادی کو ہر روز ۲۰ گرام پروٹین مل سکتی ہے۔

کِرل مچھلی کے علاوہ انٹارکٹیکا میں پین گوئن چڑیاں اور سیل مچھلی بھی بہت ملتی ہیں جو کِرل مچھلی کو کھا کر زندہ رہتی ہیں۔ یہ سیل اور پین گوئن بھی انٹارکٹیکا کی بیش بہا دولت ہیں جن سے ہندوستان مستقبل میں مستفید ہو سکتا ہے۔

چوتھی ہندوستانی سائنسی مہم نے انٹارکٹیکا میں ریڈیو پروپیگیشن کا مطالعہ بھی کیا۔ ریڈیو کی آواز کی سطح کا بھی مطالعہ کیا اور یہ مطالعہ فضا کے برقی کُرّے کی سطح اور نچلی نضائی سطح پر بھی کیا گیا۔ یہ تجربات کیے جا رہے ہیں کہ انٹارکٹیکا میں ریڈیو مواصلات کا سلسلہ مقناطیسی ہلچلوں کی مداخلت سے نہ ٹوٹ سکیں۔ کافی حد تک تیسری مہم نے بھی اور اس چوتھی مہم نے اس سلسلہ میں کامیابی حاصل کر لی ہے۔

انٹارکٹیکا کی روشنی اور گرمی کے بجٹ اور اُس کے صنعتی، زراعتی اور سینچائی کے استعمال پر بھی چوتھی سائنسی مہم نے تجربات کئے۔ انٹارکٹیکا بہت بڑی مقدار میں گرمی فضا اور سمندر کے ذریعے چھوڑتا ہے جو خلاء میں جذب ہو جاتی ہے۔ اس طرح ساری دنیا کی گرمی کے بجٹ کو وہ متوازن رکھتا ہے۔ اس طرح کی گرمی کے تبادلہ کے علم سے ساری دُنیا کے موسم، مانسون اور سائیکلون کا اندازہ پہلے ہی سے کیا جا سکتا ہے۔ ایسا علم دنیا کے لیے بیحد فائدہ مند ہے۔ اس پہلو پر چوتھی ہندوستانی سائنسی مہم اپنے دورانِ قیام برابر تجربات کرتی رہے گی تاکہ جو اعداد و شمار حاصل ہوں اُس سے ہندوستان کو فائدہ پہونچے۔

انٹارکٹیکا جانے والی اس چوتھی مہم کا مقصد یہ بھی ہے کہ وہ معدنیات کی تلاش کرے اور ان جگہوں کی نشاندہی کرے جہاں کوئلہ، گیس، پیٹرولیم اور یورینیم جیسی بیش قیمت دھاتیں موجود ہیں۔ اس مہم کا معدنیاتی نشاندہی کر دینے سے مستقبل میں ہندوستان کو معاشی طور پر بیحد فوائد حاصل ہوں گے۔

انٹارکٹیکا کے اس تفصیلی سائنسی مطالعہ سے ہندوستان تیسری دنیا کے ملکوں سے بہت آگے بڑھ گیا ہے اور دُنیا میں اُس کی اس سائنسی کاوش سے بیحد عزت بڑھ گئی ہے۔ یہ بات قابلِ فخر ہے کہ دنیا کے ترقی پذیر ممالک کے سائنسی ترقیاتی میدان میں ہندوستان بھی اُن کے شانہ بشانہ ہے اور جب سے انٹارکٹیکا میں ایک مستقل ہندوستانی سائنسی اسٹیشن قائم کر دیا گیا ہے ہمارے سائنس داں وہاں پر رہ کر سائنسی تجربات کر رہے ہیں جس سے نہ صرف مستقبل میں سائنسی معلومات میں اضافہ ہوتا رہے گا بلکہ معاشی طور سے بھی ہندوستان کو بہت فائدہ پہنچے گا۔

★

بقیہ: زہر کی گولیاں

فوت ہوتے تھے اور یہ امر افسوسناک ہے کہ ہندوستان میں بھی ہر سال ایک لاکھ پچاس ہزار افراد تمباکو نوشی سے اللہ کو پیارے ہو جاتے ہیں۔ انڈین کونسل آف میڈیکل ریسرچ کی ایک رپورٹ کے مطابق اس ملک میں اس سے متاثرہ ایک لاکھ پچاس ہزار مریضوں کے دوا علاج پر سالانہ سات کروڑ روپے خرچ ہوتے ہیں اور ایسے مریض مختلف شفاخانوں کے دس ہزار بستروں پر قابض ہیں۔ اس کے علاوہ منشیات کے مضر اثرات کے باعث کارخانوں سے مزدوروں کی غیر حاضری کی وجہ سے سالانہ دو ارب روپے کا قومی خسارہ ہوتا ہے اور یہ صورتِ حال روز بروز ابتر ہوتی جا رہی ہے۔ اس سے مجموعی قومی نقصانات کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

مغربی ممالک میں ان نشہ آور ادویات کے مضر اثرات کے باعث صورتِ حال ناگفتہ بہ ہو چکی ہے لیکن اب ہندوستان میں بھی حالات تشویشناک ہوتے جا رہے ہیں۔ اس بے راہروی کا شکار نہ صرف ملک بلکہ نئی نسل بھی ہوتی جا رہی ہے اور اس کے لیے قابلِ مذمت قرار دیا جانا چاہیئے۔ اس معاشرتی بُرائی کی جڑیں اب کافی گہری ہو چکی ہیں، جس کی بیخ کنی انتظامیہ کے بس کی بات نہیں ہے، بلکہ مسئلے کی نزاکت ساری قوم سے بھرپور عملی تعاون کا مقتضی ہے۔ معاشی نقطۂ نظر سے ان دواؤں کے استعمال پر مکمل پابندی عائد کرنا ناعاقبت اندیشی ہوگی، لیکن صحت مند معاشرے کی تعمیر اور نوجوانوں کی اخلاقی اور ذہنی بے راہروی کے سدِّباب کے لیے نشہ آور مشروبات اور ادویات کے اشتہارات کی اشاعت پر مکمل پابندی عائد کرنا لازمی ہے۔ اس کے علاوہ ملک میں ضروری قوانین کے موثر نفاذ کے ساتھ ہی اس کے معاشرتی علت کے خلاف رائے عامہ کو بھی استوار کرنے کی ضرورت ہے۔ تاکہ ہر گاؤں اور ہر شہر میں ان ادویات کے مہلک اثرات کی زوردار پبلسٹی کر کے ان ادویات کے خلاف نفرت کی فضا پیدا کی جائے کیوں کہ یہی وہ واحد طریقہ ہے جسے اپنا کر ان نشیلی دواؤں کے استعمال کو کم کیا جا سکتا ہے۔

معاشرتی انقلاب کی جانب
اقتصادی جمہوریت کا مقدمہ

پانچواں باب

ٹیکنالوجی سے متعلق پالیسی

قسط : ۱۲

اس کام کو بہتر طریقے پر انجام دینے اور پیداوار بڑھانے کے لیے جدید ترین ٹیکنالوجی درکار ہے۔ جدید صنعتی پیداوار کے لیے ایسا کرنا بہت ضروری ہے۔ علم کی کوئی سرحد نہیں ہوتی اور آج کے دور میں جب کہ فاصلے سکڑ گئے ہیں، ایک ہی ٹیکنالوجی سے بیک وقت مختلف مقامات پر فائدہ اٹھانا ممکن ہو گیا ہے۔ ترقی پذیر ممالک میں تحقیق و ترقی کے لیے بھاری سرمایہ کاری ایک دشوار مرحلہ ثابت ہو سکتا ہے۔ لیکن وہ ترقی یافتہ ممالک میں استعمال کی جانے والی صلاحیت سے استفادہ کی قوت ضرور رکھتے ہیں۔ انھیں یہ فن بھی آتا ہے کہ وہ ترقی یافتہ ممالک کی ٹیکنالوجی کو اپنے حالات کے مطابق ڈھال سکیں۔ اس عمل سے ترقی پذیر ملکوں کے ماہرین ٹیکنالوجی اور سائنسدان زیادہ مہارت حاصل کرتے ہیں۔ اس کی بنیاد پر وہ اپنے یہاں تحقیق و ترقی کی سرگرمیوں کو بڑھا سکتے ہیں۔ اور مستقل ٹیکنالوجی کو بہتر بنا سکتے ہیں۔ اندرون ملک صلاحیت پیدا کرنے اور خود کفیل کی طرف بڑھنے کا مطلب یہ نہیں کہ باہر سے علوم و فنون کے حصول پر پابندی لگادی جائے۔ اس طرح راؤل پری بیش کے وہ الفاظ یاد آتے ہیں جو انھوں نے لاطینی امریکہ کے اقتصادی کمیشن کے ساتویں اجلاس میں ایک بیان میں کہے، اصل بیماری کا تعلق ٹیکنالوجی سے نہیں ہے بلکہ اس سماجی ڈھانچے سے ہے جس میں اُسے سمونا ہے۔ گویا کہ وہ سماجی ڈھانچہ جہاں زرعی ہو یا پیداواری صلاحیت کے پھل کی تقسیم انتہائی غیر منصفانہ ہے اور ٹیکنالوجی سے حاصل ہونے والے فائدوں کی تقسیم غیر منصفانہ ہے جس کی وجہ سے سرمائے کے ارتکاز اور اجتماع میں برابر اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ اگر اس سرمایہ کو اقتصادی اور سماجی مقاصد کی خاطر لگا دیا جائے تو ہمارا ترقیاتی عمل مسلسل آگے بڑھ سکتا ہے۔ اور وہ غریبی اور دیگر سماجی برائیوں کو دُور کرنے میں معاون ہو سکتا ہے۔ سماجی اعتبار سے نظام کی تبدیلی کے لیے اسے نقطۂ آغاز سمجھنا چاہیے۔ اس موقع پر ایک سوال سامنے آتا ہے اور وہ یہ کہ کیا باہر والوں کو اس کا موقع دیا جائے کہ وہ اپنا سرمایہ اور ٹیکنالوجی باہر سے لاکر یہاں لگائیں اور یہاں کے محنت کشوں سے کام لیں اور تکنیکی و غیر تکنیکی شعبوں میں بھی طرز اپنائیں اور پھر انھیں اس بات کا موقع دیں کہ وہ اس سرگرمی کے نتیجے میں حاصل ہونے والے منافع کو باہر ملکوں میں لے جائیں۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ کیا نو آبادیاتی نظام کو اسی طرح چلتے رہنا چاہیئے اور ان کی اقتصادی بستیاں اسی طرح قائم رہنی چاہئیں۔ اس کا لازمی جواب نفی میں ہوگا۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہو سکتا ہے کہ باہر ملکوں سے ترقی پذیر ممالک کے لیے سرمایہ اور ٹیکنالوجی حاصل کی جائے۔ تاہم انھیں اس سے حاصل شدہ منافع کو باہر لے جانے کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔ ایک اور شکل یہ ہے کہ یہاں کی سستی لیبر سے تیز یہاں کے خام مال سے باہر سے آکر سرمایہ لگانے والے کو مال تیار کر کے اسے برآمد کرنے کا موقع مل سکتا ہے تاکہ وہ اس برآمدات سے نفع کمائے اور پھر اس اضافہ شدہ آمدنی میں اس کا مناسب حصہ ہو۔ ایسی صورت میں باہر سے آکر یہاں سرمایہ لگانے کی حوصلہ افزائی ہوگی، وہ جدید ترین ٹیکنالوجی یہاں لا سکیں گے اور اس سے ترقی پذیر ممالک کے عوام کے لیے روزگار کے مواقع نکل سکیں گے۔ اس

ملک کے ملک میں سرمایہ کی تشکیل عمل میں آسکے
اور باہر سے وافر آمدنی ہوسکے گی۔ باہر کے ملک
سے کوئی بھی شخص یہاں محض دان دینے کے
لیے نہیں آئے گا۔ لہٰذا سرمایہ کار کو منافع کا
کافی حصّہ ملنا ضروری ہے اور دوسرے متعلقہ
ملک کو بھی اس کا فائدہ پہونچنا ضروری ہے۔
ترقی یافتہ ملکوں کے لیے بھی یہ فائدے کا
سودا ہے کہ وہ ترقی پذیر ملکوں میں سرمایہ
لگائیں اور ان ملکوں میں رہنے والوں کا معیار
زندگی بلند کریں۔ نیز ان کی قوت خرید بڑھائیں
اب دیکھنے میں یہ آیا ہے کہ ترقی یافتہ ملکوں
میں عوام کی قوت خرید نقطۂ عروج تک
پہونچ چکی ہے۔ اور اب ان کا فائدہ اسی
میں ہے کہ وہ ترقی پذیر ممالک کی طرف دھیان
دیں کیونکہ ترقی یافتہ ملکوں میں یہ قوت خرید
نقطۂ عروج تک پہونچ جانے کے باعث وہاں
کے عوام کو اب بے روزگاری کا خطرہ لاحق ہو
چکا ہے۔ اس کا ایک اور تاریک پہلو یہ ہے کہ
یہ سرمایہ کاری اب زیادہ تر اسلحہ بندی پر
ہو رہی ہے۔ یہ وسائل کا غلط استعمال ہے اور
اس کے نتائج بڑے بھیانک ہیں جن سے سبھی بخوبی
واقف ہیں۔ ترقی پذیر ملکوں میں صنعتی سرگرمیوں
کی کھلی اجازت دی جانی چاہیئے بشرطیکہ منظم
سیکٹر شراکت کاروں کو ان پیداواری قوتوں
کے دائرہ کار میں سمولے جن کا ذکر پہلے کیا
جا چکا ہے۔ اس کے بعد باہر سے سرمایہ کاری
کرنے والوں کو اس ڈھانچے کے بارے میں
مطلع کرنا ضروری ہے جس میں رہتے ہوئے انہیں
سرمایہ لگانا ہے۔

مکمل اور آزادانہ ترقی کے لیے ضروری ہے
کہ ریاست کی طرف سے کم سے کم پابندیاں
ہوں بلکہ بہتر تو یہ ہے کہ پابندیاں ہی نہ ہوں۔ عوام
اگر اپنی پسند سے سرمایہ کاری کریں گے تو وہ
ایسے شعبے نہیں پسند کریں گے جن میں مقابلہ کی

کوئی گنجائش نہیں۔ باہر سے سرمایہ لگانے
والوں کو اپنی پسند سے سرمایہ کاری کے شعبے
انتخاب کرنے کی اجازت ہونی چاہیئے۔
ان پر کسی طرح کی کوئی پابندی نہ ہونی چاہیئے
البتہ اگر مالیاتی اداروں سے رقم سرمایہ کاری
کے لیے طلب کی جائے تو پھر یہ کہنا مناسب
ہے کہ یہ رقم ان پیداواری سرگرمیوں کے
لیے مل سکتی ہے جو کہ قومی ترجیحات کے ڈھانچے
میں آتی ہیں۔ الیکٹرانک صنعت کو ہی لے
لیجیے۔ اگر صنعت کاروں کو الیکٹرانک صنعت
میں رقم لگانے کی اجازت دی جاتی ہے جہاں
کہ محنت کش طبقے کی کافی تعداد کھپ سکتی
ہے، اور وہ اس شرط پر کہ وہ اپنا سرمایہ
لگائیں اور غیر ترجیحی زمرہ ہونے کے سبب
اسے سرکاری طور سے روپیہ نہیں ملے گا،
اور یہ کہ وہ زائد منافع کا چوتھائی یا پانچواں
حصّہ پا سکیں گے، تو اس عمل سے یہ صنعت
زیادہ تیزی سے پھیلے گی اور اسی میں ملک کے

ٹیکنیشینز اور کوالیفائیڈ عملہ کھپ سکے گا۔
اس سے زیادہ سے زیادہ لوگوں کو روزگار ملے
گا۔ اور ملک کو غیر ملکی زر مبادلہ کی کثیر آمدنی
ہو سکے گی۔ یہ وہ صنعت ہے جس میں جگہ کا
مسئلہ نہیں، ماحولیات اور آلودگی کا مسئلہ نہیں
اور بجلی اور سرمایہ کی مقابلتاً کم چاہنے پر
ضرورت ہے۔ درج ذیل گوشوارہ چند منتخب
صنعتی گروپوں میں روزگار کے امکانات کا
جائزہ پیش کرتا ہے۔

ہمیشہ ہی دوسرے ملکوں کی مثال دینا
مناسب نہ ہوگا کیوں کہ ہر جگہ کے حالات
مختلف ہوتے ہیں۔ البتہ کسی ایسے ملک سے
مقابلہ جہاں کئی لحاظ سے حالات میں یکسانیت
ہو، دلچسپ ہوگا اور وہ ملک ہے جمہوریہ کوریا
یا جنوبی کوریا۔ اس نے ۱۹۴۸ میں ریاست
کا درجہ حاصل کیا۔ اور اس نے بھی ہندوستان
کی طرح سے ۱۹۶۰ میں الیکٹرانک کمیشن قائم کیا۔
اس وقت جنوبی کوریا کا صنعتی ڈھانچہ کم و بیش

گوشوارہ

صنعتی گروپ	اضافی شغلے کے لیے درکار مستقل اثاثہ جات	ایک کروڑ روپیہ کی سرمایہ کاری سے پیدا شدہ جابس کی تعداد
۱۔ کیمیکل اور پیٹرو کیمیکل	۳۰۴,۰۰۰	۳۳
۲۔ بجلی کی تیاری اور تقسیم	۲۶۶,۴۷۶	۳۵
۳۔ غیر آہن آمیز دھاتوں کی پیداوار	۲۰۰,۸۳۶	۴۹
۴۔ آہن آمیز دھاتوں کی پیداوار	۱۵۰,۳۳۱	۶۶
۵۔ چینی	۱۴۲,۸۲۶	۷۰
۶۔ ربڑ کی مصنوعات	۱۳۱,۰۲۲	۷۶
۷۔ آٹوموبل اور بائیسکلس	۱۰۹,۴۴۳	۹۱
۸۔ لکڑی، کاغذ اور کاغذ کی مصنوعات	۹۲,۸۶۵	۱۰۳
۹۔ مشینری کی تیاری	۷۶,۹۱۵	۱۲۶
۱۰۔ ٹیکسٹائل	۷۴,۹۴۰	۱۳۳
۱۱۔ بجلی کا سامان	۴۰,۵۴۲	۲۴۶
۱۲۔ الیکٹرانکس	۳۲,۱۲۹	۳۱۲

ایسا ہی تھا جیسا کہ ہندوستان میں۔ ہندوستان میں دنیا کی تیسرے نمبر پر سب سے بڑی تکنیکی افرادی قوت ہے۔ اس لحاظ سے یہ تکنیکی اعتبار سے بہتر طور پر لیس ہے۔ دیگر حالات کی یکسانیت کے ساتھ جمہوریہ کوریا نے ایک معقول پسندانہ پالیسی اپنا کر الیکٹرانک کی صنعت کو تیزی سے آگے بڑھانے کا موقع دیا۔ اس نے اندرون ملک مختلف پرزے تیار کئے اور بیرونی سرمایہ کاری کی بہ نسبت زیادہ غیر ملکی زرمبادلہ کمایا۔ درج ذیل گوشوارہ سے جمہوریہ کوریا میں دس سال سے بھی کم عرصے میں حاصل شدہ شرح ترقی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اس عرصے میں ہندوستان کی ترقی سے اس کا مقابلہ کر کے یہ فرق دیکھا جا سکتا ہے۔

میں اور سرمایہ کاری کی تشکیل عمل میں آتی ہے۔ ایسی صورت میں اقتصادی اعتبار سے یہ غیر مستحکم صنعت نہیں کہی جا سکتی۔ ان اشیا کی تیاری سے ملک میں اسمگلنگ کو روکا جا سکتا ہے کیونکہ حکومت کی بہترین کوششوں کے باوجود یہ عمل میں آ رہی ہے اور ہندوستان کے کمیاب غیر ملکی زرمبادلہ کو نقصان پہنچا رہی ہے۔ اس لیے ہر لحاظ سے یہ صنعت موزوں ہے۔ لیکن کچھ پالیسی ساز خود کفیل اور دیگر ترجیحات کے نام پر جدید ترین ٹیکنالوجی کی درآمد کے منکر ہیں اور اس صنعت کے فروغ میں رکاوٹ بنے ہیں اور فرسودہ ٹیکنالوجی سے کام لینے پر اصرار کرتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ ٹیلی ویژن میں صرف کالے اور سفید رنگ کے ٹرانسمیشن انھوں نے پبلک سیکٹر میں بلیک اینڈ وہائٹ کلاس شیل اور پکچر ٹیوب بنانے کے لیے

ملین امریکی ڈالر

ملک	۱۹۷۱ پیداوار	۱۹۷۱ برآمدات	۱۹۷۶ پیداوار	۱۹۷۶ برآمدات	۱۹۸۱ پیداوار	۱۹۸۱ برآمدات
جنوبی کوریا	۱۳۸٫۰۰	۸۸٫۰۰	۱۴۲۲٫۰۰	۱۰۳۶٫۰۰	۳۶۹۱٫۰۰	۲۲۱۸٫۰۰
بھارت	۲۲۰٫۰۰	۶٫۰۰	۴۶۰٫۰۰	۲۴٫۰۰	۹۹۵٫۰۰	۵۳٫۰۰
	(۱۹۷۲ - ۷۳)		(۱۹۷۵)	(۱۹۷۵)	(۱۹۸۰)	(۱۹۸۰)

بدقسمتی سے کچھ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ الیکٹرانک صنعت کو غیر ترجیحی زمرے میں رکھا جائے۔ یہ غلط ہے۔ کیونکہ اب یہ سائنسی ترقی کے ہر شعبے کے لیے درکار ہے۔ حتیٰ کہ اس کی خلائی ٹیکنالوجی میں، صنعت میں، زراعت، تعلیم، مواصلات، انتظامیہ اور سبھی جگہ ضرورت ہے۔ بحث کی خاطر یہ مان لیجئے کہ الیکٹرانک غیر ترجیحی زمرے کی صنعت ہے تو بھی یہ حقیقت ہے کہ سو کروڑ روپے کی سرمایہ کاری سے ۲۵ کروڑ روپے سالانہ پیدا کرنے کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے یہ آمدنی اس کی برآمدات سے ہوتی ہے۔ اس ملک میں روزگار کے مواقع بڑھتے

غلط رنگ سے اس کے جواز کی کوششیں بھی کیں۔ پالیسی سازوں نے رنگین ٹی۔ وی سیٹوں کی قیمتیں جان بوجھ کر زیادہ رکھیں۔ اس کا نتیجہ سب کے سامنے ہے۔ بلیک اینڈ وہائٹ سیٹوں کی قیمتیں گر گئی ہیں۔ اور رنگین ٹی۔ وی کی قیمتیں بڑھ رہی ہیں۔ الیکٹرانک میڈیا کی ترقی کے ضمن میں بھی یہی کچھ درست ہے۔ جدید ترقی کی روشنی میں ۲۵، ۳۰ کلومیٹر قطر کے اندر ٹی۔ وی پروگرام پیش کرنے کے لیے کم طاقتی ٹرانسمیشن والے نظام چالو کئے جا سکتے ہیں اور یہ بھارت میں ہی تیار کئے جا سکتے ہیں۔ ان پر

ہونے والے [illegible] کی لاگت کا اندازہ ہے۔ سیکٹر انڈمان اور شمال مشرقی علاقے میں دور دراز علاقوں میں یہ کامیاب ہو سکتے ہیں۔ لیکن ان کم طاقتی ٹرانسمیشن سسٹم کے لیے عوام کو ترغیب دینا اور انھیں اس کے لیے راضی کرنا محنت طلب کام ہے۔ اس کے بعد ہر ضلع اور ہر پارلیمانی حلقۂ انتخاب کو اپنا ٹرانسمیشن سسٹم حاصل ہو سکے گا۔ اس طرح پورے ملک میں ٹرانسمیشن اور ٹیلی ویژن کے مفید، تعلیمی اور تفریحی اس ذریعے سے استفادہ کا موقع مل سکتا ہے۔ جدید ٹیکنالوجی کا اس طرح کا ایک اور شعبہ ویڈیو کیسٹ اور وائڈ اسکرین پراجیکشن سے متعلق ہے۔ ان دونوں کی مشترکہ لاگت دس ہزار روپے فی سیٹ سے بھی کم ہوگی۔ اجتماعی طور پر اس سرمایہ کاری میں کوئی دشواری نہ ہوگی۔ اس طرح دیہاتی لوگوں تک سماجی و بہتری تعلیم اور تفریح کے مواقع بہم پہونچائے جا سکتے ہیں۔ آج سینما گاؤں تک نہیں پہونچ پایا ہے۔ ملک بھر میں دس ہزار سے بھی کم سینما گھر ہیں۔ یہ شہری علاقوں میں ہیں۔ روس کے مقابلے یہ تعداد بہت کم ہے۔ جہاں کی آبادی بھی ہندوستان سے صرف ایک تہائی ہے مگر وہاں ایک لاکھ سینما گھر تھا۔ ویڈیو کیسٹ کی صورت میں ایک جدید میڈیم کی بھی یہی صورت حال ہے۔ وائڈ اسکرین پراجیکٹر کا بھی یہی حال ہے۔ زراعت اور دیگر شعبوں میں اس کی زبردست افادیت ہے۔ تعلیمی پروگراموں کے لیے بھی یہ مفید ہے۔ ماہرین تعلیم کی طرف سے تیار کردہ علاقائی پروگرام کو کم طاقتی ٹرانسمیٹر سے جوڑا جا سکتا ہے اور قومی اور علاقائی اسٹیشنوں سے دئے گئے پروگراموں سے ٹرانسمیشن کے کسی نا متوقع خرچ کے بغیر معمولی ٹیلی ویژن سیٹ سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ انتظامیہ کی پابندیوں کے سبب بھی الیکٹرانک کی ترقی میں رکاوٹ پڑتی ہے۔ ہم اس بات

میں چند مفروضات کے پابند ہیں اور کچھ بے بنیاد تنگ نظری پر مبنی خدشات ہمارے ذہن نشین ہیں۔ اس وجہ سے اس کی ترقی عملاً نا ممکن ہو گئی ہے۔ پبلک سیکٹر اور پرائیویٹ سیکٹر کے بارے میں آپسی اختلافات کو بھی بڑھا چڑھا کر پیش کیا جاتا ہے۔ جواہر لال نہرو کی نظر میں پبلک سیکٹر کا نظریہ یہ تھا کہ اہم اور کلیدی شعبوں میں حکومت کی طرف سے سرمایہ کاری کی جائے تاکہ ملک کے صنعتی ڈھانچے کو مضبوط بنایا جا سکے۔ اس عمل میں چونکہ لمبا عرصہ درکار ہوتا ہے اور منافع کی شرح بھی تقابلتہً کم ہوتی ہے، اس لیے نجی سرمایہ کاری اس میں نہیں کی جا سکتی۔ لہٰذا سرکاری رقم کو فولاد، بجلی، کیمیاوی کھاد، سمنٹ، کوئلہ، تیل اور قدرتی گیس جیسی اشیا میں صرف کیا جا سکے۔ تاکہ پرائیویٹ سیکٹر میں اشیائے صارفین کی تیاری کے لیے مضبوط صنعتی ڈھانچہ فراہم ہو سکے۔ دراصل اسی بنیادی حقیقت اور فرق کے علاوہ ان دونوں میں اور کوئی فرق ہے بھی نہیں۔ لیکن ان دونوں میں ایک اور فرق کو جنم دے دیا گیا۔ وہ یہ کہ پبلک سیکٹر کا انتظام زیادہ تر بیوروکریسی میں یقین رکھنے والے انتظامی عملے کے پاس ہے۔ لیکن پرائیویٹ سیکٹر غیر سرکاری افراد کے ہاتھوں میں ہے۔ پبلک سیکٹر میں بیوروکریسی نے اسے اپنا رنگ دیا اور کام کے گھنٹے، زبردست دفتری نظام اور عملہ وغیرہ کی پابندیاں لگائی گئیں جس سے اس کی لاگت بڑھی اور نظام سازی کے لیے کئی سطحیں بنائی گئیں اور کوئی ایک فرد واحد اس کے لیے ذمہ دار نہیں ٹھہرایا گیا۔ اس مقصد میں کوئی فیصلہ بروقت نہیں ہو سکا۔ وقت زیادہ لگنے سے اخراجات اور لاگت میں برابر اضافہ ہوتا رہا۔ سرمایہ کاری اور منافع کا تناسب بہت کم رہا۔ اس طرح نام نہاد پبلک سیکٹر میں بہت سے اثاثے ماتھے ہوتے چلے گئے۔ اسے سرکاری سیکٹر کے نام سے پہچانا گیا۔ اور اسے ایک ایسی "یتیم گود" سمجھا گیا کہ اس پر نکتہ چینی غیر مناسب خیال کی گئی اور حکومت کو اس کی حمایت میں ہر قیمت پر دلیلیں دینی پڑیں۔ سرمایہ کاری سے متوقع نتائج برآمد نہ ہو سکے۔ پرائیویٹ سیکٹر کو یہ سب سہولتیں حاصل نہیں۔ انتظامیہ بہتر تھا، محنت کش طبقے پر اخراجات کم تھے، سرکاری قرضوں کے حصول کی سہولت تھی، ٹیکنالوجی اور بنیادی سہولتوں کی فراہمی تھی لیکن اس سیکٹر نے ان تمام سہولتوں سے کالا دھن پیدا کیا۔ محنت کشوں کو دھوکہ دیا۔ اُجرتوں کی ادائیگی مناسب ڈھنگ سے نہ کرنے اور ٹیکسوں سے بچنے کی خاطر متعدد حیلے تراشے۔ اس رقم سے سٹہ لگایا گیا اور بیوروکریسی کی طرف سے عائد کردہ پابندیوں سے انحراف کیا گیا۔ اور فیصلوں کا رُخ بدل دیا گیا۔ اسی طرح سے بدعنوانی نے جنم لیا۔ انسداد بدعنوانی کے لیے مزید پابندیاں لگائی گئیں۔ لیکن اس سے مزید بدعنوانی نے جنم لیا۔ دولت کا ارتکاز چند ہاتھوں میں ہوتا رہا۔ اور انسداد بدعنوانی کے ضامن قوتوں کا غلبہ عوامی زندگی پر رہا۔ اور حتیٰ کہ سیاسی پارٹیاں بھی اس کے زیر اثر رہیں۔

اس موقع پر ایک غلط فہمی کا ازالہ ضروری ہے۔ خیال یہ ہے کہ پارٹیاں الیکشن تبھی جیت سکتی ہیں جبکہ ان کے پاس فنڈ کافی ہو، اور اگرچہ اکثر رقومات نے الیکشن میں پراپیگنڈہ کو تقویت دی ہے، لیکن محض فنڈ سے ہی الیکشن پر اثر انداز نہیں ہوا جا سکتا۔ ووٹروں نے یہ تھیوری غلط ثابت کر دی ہے کہ ووٹوں کو خریدا جا سکتا ہے۔ ۱۹۷۷ سے ۱۹۸۳ کے ابتدائی دَور تک مذکورہ حقیقت کو بے نقاب کیا جا چکا ہے۔ حالیہ الیکشن نے واضح کر دیا ہے کہ عام ووٹر اپنے ضمیر کی آواز پر ہی ووٹ دیتا ہے۔ وہ یہ سمجھ کر ووٹ دیتا ہے کہ کون سی پارٹی یا لیڈر ملک کی بھلائی کے لیے کام کر سکتا ہے۔ اسی طرح اگر ووٹر غصہ میں ہے، دل شکستہ ہے تو پھر وہ منفی ووٹ دے کر اپنے غصے کے اظہار کے بغیر نہیں رہتا۔ ۱۹۷۷ میں یہی ہوا کہ جبکہ عوام نے مرکز میں جنتا پارٹی کو ووٹ دیا اور ۱۹۸۳ میں انھوں نے آندھرا میں تیلگو دیشم اور کرناٹک میں جنتا پارٹی کو ووٹ دیا۔ ان انتخابات میں علاقائی اور انتشار پسندانہ قوتوں کے اُبھرنے کا خطرناک رُجحان دیکھنے کو ملا۔ اور جب تک کہ باشعور عوام نے ان کے فروغ کے اسباب کا پتہ نہیں چلا لیا اور ان سے دُور رہنے کے بارے میں نہیں سوچ لیا اس وقت تک حالات کے سنبھلنے کی توقع نہیں کی جا سکتی تھی۔ اور حالات زیادہ بگڑتے اور ملک کا اتحاد خطرے میں پڑ گیا ہوتا۔ زیادہ تر انتشار پسندانہ عناصر یا علاقائی رُجحانات اقتصادی دل شکستگی کے باعث ہیں۔ جب تک عوام اس بات میں یقین نہیں رکھیں گے کہ ملک کے عوام ایک قوم کی صورت میں اُبھر کر ہی ملک کا بھلا کر سکتے ہیں، اس وقت تک قومیت کا جذبہ نہیں اُبھرے گا اور مستحکم نہیں ہوگا۔ جذباتی اور روحانی طور پر ایک اوسط درجے کا انسان قدرتی طور پر وسیع تر وجودیت سے خود کو جوڑنا چاہے گا۔ البتہ اگر مواقع کی کمی ہو گئی تو پھر اس سے اختلافات جنم لیں گے اور اسے طبقہ واریت اور علاقائیت کی پناہ لینی پڑے گی۔ اس لیے ہر خطّے کے عوام کو زبان، رنگ، نسل اور ذات پات کے امتیاز سے بالاتر اُٹھ کر بڑھتی ہوئی پیداواری سرگرمیوں میں لگانا ہوگا۔ اور اسے مواصلات اور تجارت کی سرگرمیوں سے فائدہ پہنچانا ہوگا۔ اس سے آپسی یگانگت فروغ پائے گی اور اتحاد مضبوط ہوگا۔ پوری قوم کو ملک کی اقتصادی سرگرمیوں میں جوڑنا ضروری ہے۔ اور اشیا کی تقسیم میں اس کا مناسب عمل ہونا ضروری ہے۔ جب آدمی کسی کام سے خود کو وابستہ کر لیتا ہے تو پھر جی جان سے کام کرتا ہے۔ بشرطیکہ وہ اپنے کام سے مطمئن ہو۔ ایسی صورت میں وہ محض خود کو کسی مالک کے تحت کام کرنے

والا ہی نہیں سمجھے گا بلکہ وہ حقیقی صورت میں اس میں حصہ لے گا۔ زمین قدرت کا عطیہ ہے اور اس پر تمام انسانوں کا حق ہے۔ عوام الناس اپنی تنظیمی صلاحیتوں اور محنت سے جن میں ہنرمند اور غیر ہنرمند دونوں ہی شامل ہیں، اس زمین سے اشیا کی تیاری اور حصول کے لیے کام کریں گے اور اس عمل میں سب کو برابر کا شریک ہونا ہے۔ اس تصور کے فروغ سے ہی سب کو اپنی شرکت کا احساس ہوگا۔ حقیقی برابری سے مراد یہ نہیں ہے کہ سماج میں سب افراد یکساں طور پر مساوی ہیں۔ محنت کش طبقے اور انتظامیہ کی مساوی بنیادوں پر شراکت سے اُن شراکت کاروں کو فائدہ ہوگا جو بحیثیت مجموعی پیداوار بڑھانے میں معاون ہیں۔ سائنس ٹکنالوجی، فنونِ لطیفہ، ادب، کھیلوں وغیرہ میں اعلیٰ صلاحیت کے افراد کی ہمیشہ ہی سماج میں عزت رہی ہے۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ بہتر کوالی فکیشن کے مالک افراد کو سماج کے دیگر لوگوں کا استحصال کرنے کا حق ہے اور وہ کسی بھی طرح سے عوام کو ان کے جائز حقوق سے محروم کرنے کا حق رکھتے ہیں۔ پورے سماج کی محنت اور کوشش سے حاصل کردہ فاضلہ میں غیر ضروری حصہ حاصل کرنے اور اس میں سے دولت بٹور لینے اور اسے ہتھیانے کا حق بھی انھیں نہیں پہونچتا۔ انھیں محض نام و نمود کے اخراجات کی بھی اجازت نہیں دی جاسکتی۔ انھیں یہ حق نہیں پہونچتا کہ وہ تعیش پسندانہ اور آرام و آسائش کے لیے فضول خرچیاں کر سکیں۔ خاص کر ایسی حالت میں جبکہ سماج کے دیگر افراد بنیادی ضروری اشیا سے بھی محروم ہوں۔ لہٰذا پیداواری اور اقتصادی نظام میں منصفانہ طریقۂ کار کی ضرورت ہے۔ ملک کے ترقیاتی شعبوں میں جن کی محنت نمایاں طور پر زیادہ ہے، ان کا خیال رکھنا ضروری ہے، اس کے ساتھ ہی

مسئلہ یہ ہے کہ ہر شخص کو وہ کام ملے جس کے کرنے میں اسے لطف آئے اور جس سے وہ پوری طرح مطمئن ہو۔ ایسا بھی ممکن ہے جبکہ مواقع کافی پیدا کر دئے جائیں اور عوام اپنے ذوق و شوق کے مطابق اپنے لیے کام ڈھونڈ سکیں۔ وہ محض ایک کام سے دوسرے کام کی طرف اس لیے راغب نہ ہوں کیوں کہ دوسری جگہ تنخواہ یا اُجرت زیادہ ہے۔ اکثر لوگ محض مالی منفعت کی خاطر ایسے کام کرنے کی طرف رُخ کرتے ہیں، جن سے ان کو کوئی رغبت نہیں ہوتی۔ چوں کہ ڈاکٹری اچھا پیشہ ہے، لہٰذا ہر باپ اپنے بیٹے یا بیٹی کو ڈاکٹر بنانا چاہے گا۔ انجینئرنگ کا شعبہ بھی اسی طرح کی ایک اور مثال ہے۔ کچھ عرصے پہلے بینک میں کلرکی کوئی پسندیدہ مشغلہ نہ تھا لیکن آج وہاں اچھی تنخواہوں کے سبب اچھے تعلیم یافتہ، لڑکے اور لڑکیاں اس کلرکی کو پسند کرتی ہیں۔ یہ بات ہر جگہ صادق آتی ہے۔ ایسی بھی مثالیں ہیں کہ لوگ اپنی پسند کے کام سے چمٹے رہتے ہیں اور صرف وہی کام پسند کرتے ہیں جو ان کی اپنی پسند کے ہیں۔ لہٰذا سماج میں ایسے مواقع کی بہتات ہونی چاہیے، جہاں عوام اپنی پسند سے اپنے لیے کام کا انتخاب کر سکیں اور اپنے معیارِ زندگی کو بہتر بنا سکیں۔ سنگیت، رقص، ادب، فنونِ لطیفہ، کھیل، ڈرامہ تھیٹر اور تمام دیگر فنون معیارِ زندگی بلند کرنے میں معاون ہوتے ہیں۔ سماج میں باعزت مقام پانے کے لیے ضروری ہے کہ ان تمام لوگوں کو عزت دی جائے جو کہ زندگی کو بہتر بنانے میں معاون ہیں۔ اب غیر منظم پرائیویٹ سیکٹر پر نظر دوڑائیے یہ بھی کئی لحاظ سے اہم ہے کیوں کہ اس میں سماج کے بہت سے لوگ از خود روزگار پائے ہوئے ہیں اور یہ صورتِ حال ملک بھر میں دیکھنے کو ملی ہے۔ اقتصادی نظام میں جدید ٹکنالوجی کی مدد سے خودحرکی مشینیں وغیرہ فراہم کی جاتی ہیں۔

پیداوار کے اس نظام کے لیے ابتدا ً بھاری سرمایہ کاری درکار ہوتی ہے۔ اس کی مدد سے محنت کش طبقہ کی ضرورت نہیں رہتی اور مشینوں سے بڑے پیمانے پر پیداوار لی جاتی ہے۔ وہ شعبہ ہے جہاں ٹکنالوجی کے استعمال، منصوبہ بندی کا سوال سامنے آتا ہے۔ ایک طبقہ ہے جو خودحرکی مشینوں کے حق میں۔ تاکہ بڑے پیمانے پر سامان کی تیاری عمل میں آسکے اور دوسری طرف لامرکزی نظام کے تحت پیداوار بڑھانے پر زور دیا جاتا ہے اس خیال کے تحت پیداواری نظام کو ملک کے مختلف حصوں میں پھیلانا ضروری ہے تاکہ مال تیار کیا جاسکے۔ قطع نظر اس کے کہ اس کا مقصد کیا ہے۔ یہ دونوں انتہا پسند راستے ہیں۔ ان دونوں کے درمیان ایک راستہ اپنانے کی ضرورت ہے۔ علاقے کا انتخاب کیا جانا چاہیے۔ اور ان طریقوں سے سامان تیار کرنا چاہیے جس سے عوام کی کثیر تعداد کو فائدہ پہنچے۔ محنت کش طبقے کو چھوٹی مشینیں فراہم کرکے ان کو معیاری اور غیر ضروری محنت سے نجات دلائی جاسکتی ہے۔ مثال کے طور پر سلائی کی مشین یا بجلی سے چلنے والی آٹے کی چکی وغیرہ۔ مقصد یہ ہے کہ محنت کش طبقے میں سے ہر ایک کی محنت کے استعمال سے سامان تیار کیا جاسکے اور محنت کش طبقے کو سامان کی تیاری کے عوض مناسب اُجرت مل سکے جس سے کہ اس کی قوتِ خرید بڑھ سکے۔ اور پھر اس کے ذریعے اقتصادی منڈی تیار ہو سکے اور قومی فاضل سرمایہ تشکیل پا سکے۔ اگر چند لوگ خودحرکت کرنے والے پلانٹ سے سامان تیار کرنا بھی شروع کر دیں تو پھر سوال ہوتا ہے کہ وہ کس کے لیے مال تیار کریں گے اور کون لوگ یہ مال خریدیں گے۔ اگر سماج کے زیادہ تر لوگوں کے پاس قوتِ خرید ہی نہیں

جو کہ کام نہ ہونے کی صورت میں یقینی ہے، تو خود کار مشینوں کی مدد سے مال کی تیاری کا کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ ترقی یافتہ ملکوں میں لوگ تیار اور سلے سلائے کپڑوں سے تنگ آچکے ہیں۔ درزی سے کپڑے سلوانا اور پھر انھیں زیب تن کرنا بہت مہنگا سودا ہے۔ دستکاریوں وغیرہ کے ضمن میں بھی یہی بات صادق آتی ہے۔ دستکاریوں میں ذاتی لگاؤ ہونے کے سبب ان کی قدر و قیمت زیادہ ہے۔ انسانی ذوق ادلتا بدلتا رہتا ہے اور پھر یہ ہر انسان کے لیے جدا جدا ہے۔ ہر شخص کا سامانِ تعیش اور سامانِ آرائش کے بارے میں اپنا اپنا ذوق و شوق ہے لیکن بنیادی ضروریات کے ضمن میں یہ بات نہیں۔ کوئی بھی شخص غلہ کی شکل اور دانہ کی اقسام سے بحث نہیں کرتا، بشرطیکہ یہ اسے کافی مقدار میں مل جائے اور اس کی بھوک مٹانے کا اہل ہو۔ کپڑے کے بارے میں بھی یہی بات صادق آتی ہے۔ یہ ایک بنیادی ضرورت ہے۔ انسان صرف مضبوط اور پائیدار کپڑا چاہتا ہے۔ جو آرام دہ ہو اور گرمی، سردی کی اس کی ضرورتوں کو پورا کرسکے۔

لہٰذا ترقی پذیر ملک میں اشیائے ضروریہ کی تیاری پر سب سے زیادہ زور ہونا چاہیے۔ ان کو عوام کے زیادہ سے زیادہ ارکان تک پہونچانا ضروری ہے، خاص کر دیہی علاقوں کے عوام کی بنیادی ضرورتوں کو پورا کرنے پر دھیان دیا جانا چاہیے۔ شروع میں یہ سب سامان بہت معیاری نہیں ہوسکتا اور وہ خود کار پلانٹوں کے ذریعے تیار کردہ مال کے برابر معلوم نہیں ہوگا، لیکن بجلی، بجلی کی موٹر اور بہتر ڈیزائن سازی سے بہتر قسم کا سامان تیار کیا جاسکتا ہے۔ پارچہ جات، جوتے، صابن، تیل، باورچی خانے کا سامان، ماچس جدید ٹیکنالوجی کی مدد سے بہتر کوالٹی کی تیار کی جاسکیں گی اور از خود روزگار فراہم کرکے ان صنعتوں سے وابستہ صنعت کار اچھا اور معیاری سامان تیار کرسکیں گے۔ ایسے پرزوں اور معاون سامان کی تیاری بڑھائی جاسکتی ہے جو دیگر صنعتوں کو بڑھانے میں معاون ہوں۔

★

بقیہ: اِداریہ

اِس بارے میں گرام سیوک اہم رول ادا کرسکتے ہیں۔ آج بھی بہت سے ایسے گاؤں ہیں جہاں ڈاکٹر سے علاج کراتے ہوئے لوگ ڈرتے ہیں، اور ان کی افادیت کے بارے میں شک وغیرہ کا اظہار کرتے ہیں۔ دیہی عوام کی صحت بہتر بنانے میں غربت اور تعلیم کی کمی دونوں بڑی رکاوٹیں ہیں۔ منصوبہ بند ترقی کے تحت ملک کے عوام کی صحت میں یقیناً بہتری آئی ہے، تاہم یہ وہ توقعات پوری نہیں کرسکی ہے جو کہ صحت کے مختلف پروگراموں سے باندھی گئی تھی۔ پچھلے منصوبے میں روزگار کی فراہمی، غریبی دور کرنے، آبادی میں اضافے کو روکنے، اور بنیادی ضروریات کو پورا کرنے پر جو زور دیا گیا ہے ان کا ایک مقصد صحت کے معیار کو بلند کرنا بھی ہے۔ دیہی عوام کی صحت بہتر بنانے میں عوامی شرکت خاطر خواہ نہ ہونے سے بھی پوری کامیابی نہیں مل سکی ہے۔ اس سلسلے میں ٹیکہ کی اہمیت، شخصی طور پر حفظانِ صحت کے اصولوں کی پابندی، ماحول کی صفائی ستھرائی اور خاندانی بہبود کے پروگراموں سے عوام کی دلچسپی بہت ضروری ہے۔ دیہی عوام کے سماجی تانے بانے کو پوری طرح سمجھے بغیر صحت سے متعلق کوئی بھی کارکن اپنے مشن میں کامیاب نہیں ہوسکتا۔ اس کے لیے مربوط کوششوں اور کثیر سرمایہ کاری کی ضرورت ہے۔ ★

(ایڈیٹر)

غزل

فضا ابن فیضی

اس نے آنکھیں نوچ لیں چہرے سے میرے
دُھل گئی سب گرد آئینے سے میرے

مجھ سے پہلے کون اُس کو جانتا تھا
معرفت اس کی ہوئی حیلے سے میرے

آسماں ہے جو ترے ادراک کی حد
یہ دھواں پیدا ہوا سینے سے میرے

اُس نے ہمت ہار کر سر پھوڑ ڈالا
چھین لی ساری چمک تیشے سے میرے

اس کے پاس اپنی بصیرت ہی کہاں تھی
مجھ تلک پہونچا ہے وہ رستے سے میرے

بس اُسے اتنی بلندی ہی بہت تھی
وہ رہا لپٹا ہوا ذرّے سے میرے

اپنی اپنی کرچیاں چنتے رہے سب
زندگی بکھری بہت جینے سے میرے

یہ شفق، یہ مہر و مہ کیا چیز، ورنہ
آسماں اونچا نہ تھا زینے سے میرے

کتنے ہاتھوں سے انا کی دھوپ اُتری
حرفِ تر نکلے جو گہوارے سے میرے

مدتوں حرف و ہنر کی لو نہ پھوٹے
تھا بڑا نقصان چپ رہنے سے میرے

اس قدر شفاف ہے اسلوب کس کا
لو، تراشو چاندنی لہجے سے میرے

ہوگئے منکر فضا مجھ سے وہی لوگ
ابتدا جن کی ہوئی قصے سے میرے

★

م۔ ق۔ خان

باز یافت

میرا قیاس سچ نکلا۔ ڈرائنگ روم میں چیزیں نہایت افراتفری میں بکھری تھیں۔ گرد کی دبیز تہہ صوفے اور میز پر جمی تھی۔ اندر ہال میں داخل ہوئی تو وہاں کتابیں جا بجا بکھری تھیں۔ چپل اور جوتے کہیں سیدھے کہیں اوندھے پڑے تھے۔ دیواروں پر مکڑی کے جالے تھے اور فرش دھبوں سے بھرا تھا۔ ایک کمرے سے ریڈیو بجنے کی آواز آرہی تھی۔ باورچی خانے سے کسی چیز کے جلنے کی تیز بو نکل رہی تھی۔ میں تیزی سے وہاں گئی۔ ایک برتن میں سارا شوربہ خشک ہوکر جل رہا تھا اور دوسری جانب دال اُبل کر باہر آرہی تھی۔

سیما اسٹور روم سے آئی اور مجھے وہاں دیکھ کر حیرت میں پڑ گئی۔ وہ نہایت شرمندہ تھی۔ لیکن وہ کر بھی کیا سکتی تھی؟ محض بارہ سال کی عمر میں کھانا پکانے کا سلیقہ وہ کیسے سیکھ لیتی؟

میں یہاں محض خیریت دریافت کرنے چلی آئی تھی کیوں کہ مجھے "اُڑتی پڑتی" یہ خبر مل چکی تھی کہ بھابی جان ناراض ہوکر شوکت بھائی اور بچوں کو چھوڑ کر میکے چلی گئی ہیں۔ اب میں نے جو کچھ دیکھا اس نے مجھے عجیب کشمکش میں ڈال دیا۔ مجھے رُکنا پڑا کیونکہ ان کی حالت دیکھ کر مجھ سے برداشت نہ ہوا۔ میں نے سوچا دو تین دنوں میں سب کچھ ٹھیک ٹھاک کر دوں گی اور پھر واپس چلی جاؤں گی۔ لیکن میرا اندازہ غلط ثابت ہوا۔

آخر میں نے یہ فیصلہ کیا کہ چند دنوں اور رہ جاؤں۔ میرا دفتر اس جگہ سے دُور نہیں تھا، ہاں اپنے گھر کے کام کاج سنبھالنے کے بعد دفتر اور شوکت بھائی کا گھر سنبھالنا ممکن نہ تھا۔ اس لیے میں نے اپنے شوہر سے ایک ماہ ان بچوں کے ساتھ رہنے کی اجازت لی اور یہاں آگئی۔

میں اُدھیڑ بُن میں بیٹھی تھی کہ اس اُلجھی ڈور کا سلسلہ کہاں سے پکڑوں کہ ٹیلیفون کی گھنٹی بجنے لگی۔

"آنٹی! میں سلیم بول رہا ہوں۔ کیا آپ مجھے مبارکباد کہنے یہاں نہیں آئیں گی؟ آکر دیکھیے بھی کہ میں نے کتنی ٹرافیاں جیت لی ہیں۔"

ذہنی طور پر میں وہاں جانے کے لیے تیار نہ تھی، اس لیے میں نے ٹالنا چاہا۔

"بہت بہت مبارک باد! میں سمجھتی ہوں تمھارے پاپا وہاں ضرور جائیں گے، میں بہت چاہتی ہوں وہ کہاں ہیں؟"

"نہیں، ان کو خبر کرنے کی ضرورت نہیں، کیا ان کو آج کے کھیلوں کا پتہ نہیں ہے؟ انھوں نے تو مجھے ساتھ آنے کا وعدہ کیا تھا۔ ان سے آپ کسی ذمہ داری کی اُمید رکھتی ہیں؟ وہ کسی کام کے نہیں؟" سلیم کا لہجہ نہایت ناامیدی کا تھا۔ وہ ان کا ذکر سن کر ہی جھنجھلا گیا تھا۔

"سلیم! اپنے پاپا کے بارے میں ایسے خیالات کو دل میں جگہ نہیں دینا چاہیے۔ بہرحال میں فوراً وہاں آرہی ہوں۔"

سلیم کی باتوں سے مجھے دھکا سا لگا تھا، لیکن ٹھنڈے دل سے سوچنے لگی تو مجھے بھی اعتراف کرنا پڑا کہ سچ مچ ان سے کسی ذمہ داری کی توقع فضول ہے۔

میں کہا کرتی کہ مجھے شوکت بھیا سے زیادہ ان نوخیز بچوں کے احساسات اور جذبات کی فکر تھی۔ سلیم سب سے بڑا تھا۔ اُسے اپنے باپ کی حرکتیں بالکل پسند نہیں تھیں لیکن اپنے باغی جذبات کا اظہار ان کے سامنے نہیں کرتا تھا۔ وہ ان سے بہت ڈرتا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ وہ اپنا غصہ دوسروں پر اُتارتا۔ وہ اسکول میں اُستاد سے اُلجھ پڑتا، کبھی کبھی ہم جماعت لڑکوں سے اس کی ٹھن جاتی، اپنے بھائی اور بہنوں کو ڈانٹتا رہتا۔ حد تو یہ تھی کہ وہ مجھ سے بھی بحث کر لیتا، گو وہ میری ہر بات مان لیتا تھا۔

سیما اسی عمر میں بڑی سمجھدار، باسلیقہ اور پیاری لڑکی تھی۔ وہ اس بات کی پوری کوشش کرتی تھی کہ سب کو خوش رکھے۔ وہ ایسی ذمہ داری بھی اٹھانے کو تیار رہتی جو اس کے بس کا روگ نہیں ہوتی۔ اُن میں ثمین کی حالت قابلِ رحم تھی۔ وہ سب سے چھوٹا تھا۔ وہ شاید ہی کسی سے کچھ کہتا۔ وہ بیٹھا اسکول کی کتابیں پڑھتا۔ ریڈیو سنتا،

یا خاموش بیٹھا کمرے کی کھڑکی سے باہر خلاء میں نہ جانے کیا دیکھتا رہتا۔

میں جیسے ہی ٹائپنگ کلب کے پھاٹک کے قریب پہنچی تھی، میں نے سلیم کو باہر آتے دیکھا۔ اُس نے بھی شاید مجھے دیکھ لیا تھا۔ اس نے اپنا سگریٹ جوتے سے کچل دیا اور اپنی ٹرافیاں مجھے دکھانے لگا۔ میں اندر اندر سگریٹ نوشی پر کھول رہی تھی لیکن میں نے مصلحتاً کوئی فہمائش نہیں کی۔ سلیم میرے ساتھ بیٹھ گیا۔ واپسی میں میری نظر پھر شوکت بھائی کے اسکوٹر پر پڑی۔ وہ بمراٹش بار کے سامنے لگا ہوا تھا۔ میں نے سلیم کو باہر رُکنے کا اشارہ کیا اور اندر داخل ہو گئی۔ شوکت بھائی اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ بیٹھے تھے۔ مجھے آتا دیکھ کر کھڑے ہو گئے۔ اُن کا سُرخ چہرہ اور مخمور آنکھیں اس بات کی مظہر تھیں کہ وہ بہت زیادہ پی چکے ہیں۔ انھوں نے مُسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"شیریں! ارے یار، یہ میری چھوٹی بہن ہے، بڑی ضدی اور خود پسند ہے۔ میں کہیں بھی چھپ کر بیٹھوں، یہ تلاش کر لے گی۔"

"بھائی جان! چلئے اس وقت آپ کو گھر پر رہنا چاہیئے۔"

"ایسی بھی کیا جلدی ہے؟ ہاں ان سے ملو، یہ میرے دوست..."

میں نے فیصلہ کُن لہجے میں کہا "پھر کبھی"، اور میں وہاں سے چل پڑی۔ وہ میرے پیچھے سر جھکائے آرہے تھے۔ باہر آکر انھوں نے اسکوٹر اسٹارٹ کیا۔ میں نے انھیں ٹیکسی میں بیٹھنے کو کہا تو وہ اپنی ضد پر قائم رہے۔

راستے میں سلیم نے کہا "آنٹی! آپ پاپا کے لیے کیوں اتنی پریشان رہتی ہیں؟"

"سلیم! تم اپنے پاپا سے محبت نہیں کرتے ہو۔۔۔؟"

"پاپا سے محبت ۔۔ پہلے کبھی کرتا تھا لیکن اب ۔ چھوڑیئے اِن باتوں کو..."

"میں جانتی ہوں کہ بھائی جان اب بہت پینے لگے ہیں لیکن کبھی یہ بھی سوچا کہ اس کی کیا وجہ ہے؟ جب سے تمہاری ممی چلی گئی ہیں ان کو زندگی میں ایک خلا سا پیدا ہو گیا ہے۔ وہ تمہاری ممی سے بہت زیادہ پیار کرتے تھے۔"

"آنٹی! میں نے کہا کہ ان باتوں کے ذکر کا کوئی حاصل نہیں۔ میں سب کچھ جانتا ہوں۔ آپ ممی کو قصوروار نہیں ٹھہرا سکتی ہیں۔ یہ پہلے بھی اسی قدر پیتے تھے۔ آپ کو ان کی ذلیل حرکتیں سُن کر نفرت ہوگی۔ ہر دو تین دنوں کے بعد یہ ممی کو بُری طرح پیٹا کرتے تھے۔ ان کا رویّہ بدلنے والا نہیں۔ میں تو کہوں گا کہ آپ بھی چلی جائیں۔ بلاوجہ کیوں اپنی زندگی ان کے ساتھ تباہ کر رہی ہیں؟"

ہم گھر آگئے۔ سیما ہمارا انتظار کر رہی تھی۔ میں نے سارے بچّوں کو کھانا اور بھائی جان کے لیے میز پر کھانا لگا دیا۔ بھائی جان نے سارس کی طرح گردن گھما کر ساری چیزوں کو دیکھا۔ اس کے بعد کئی چیزوں کا مزہ چکھا۔ میں اسی درمیان بچّوں کے پاس چلی گئی۔ برتنوں کے کھنکنے کی آواز سے ہم سب گھبرا گئے۔ میں ان کے پاس دَوڑی ہوئی آئی۔ مجھے دیکھتے ہی برس پڑے۔

"کیا یہ کھانا آدمی کے کھانے کے لیے پکایا گیا ہے؟ لاحول!"

"آپ گھر پر رہتے تو ایسا نہیں ہوتا۔ اپنی ذمّہ داریوں کا احساس آپ میں جاگ جائے تو سب کچھ سُدھر سکتا ہے۔" بے ارادہ میرے مُنہ سے یہ جملے نکل پڑے۔

"کیا مطلب؟ تم نہیں جانتی ہو کہ میں دن رات گھر میں بیٹھا نہیں رہ سکتا۔ مجھے اپنے کاروبار کے سلسلے میں طرح طرح کے لوگوں سے ملنا پڑتا ہے۔"

"میں جانتی ہوں آپ کو طرح طرح کے لوگوں سے ملنا ضروری ہے لیکن ان سے ملنے کی جگہ دفتر ہے، اپنا گھر ہے یا پھر ان کا گھر، ہوٹل اور بار نہیں اور وہ بھی وقت کے ساتھ ملنا چاہیئے۔"

"شیریں! تمھیں ان باتوں سے مطلب نہیں ہونا چاہیئے۔" شوکت بھائی نے تحکمانہ انداز اپنا لیا۔

میں بھی کافی چڑچڑی ہو گئی تھی مجھ سے بھی نہیں رہا گیا۔ "میں سمجھتی ہوں مجھے مطلب نہیں ہونا چاہیئے لیکن آپ کو تو فکر ہونی چاہیئے کہ کس کی فیس دی گئی ہے، کون اسکول جاتا ہے یا نہیں، اس کے کیا مشاغل ہیں۔ سیما محض نام کو اسکول جاتی ہے۔ لوگ پیسے مانگنے یہاں آجاتے ہیں۔ کتنوں کو میں نے پیسے دیئے۔ کیا کرتی، پڑوس کے لوگ جانتے تو کیا کہتے؟ پیسہ تو درکنار میرا سارا وقت آپ کے بچّوں پہ صرف ہوتا اور آپ کہتے ہیں مجھے کچھ مطلب نہیں ہونا چاہیئے۔"

یہ منظر دیکھ کر سیما رو پڑی اور کمرے سے باہر چلی گئی۔ متین بھی اپنے بستر پہ دیوار کی جانب مُنہ کر کے لیٹ گیا۔ سلیم پہلے ہی اپنے کسی دوست کے گھر جا چکا تھا۔ میں نے سارے برتن اٹھائے، انہیں دھو کر باورچی خانے میں رکھ دیا اور بستر پہ لیٹ گئی۔ میرا غصّہ نقطۂ عروج پر تھا کہ بھائی جان کو ذرا احساس نہیں کہ میں صرف ان کے بچّوں کی وجہ سے مُصیبت میں پھنس گئی تھی۔ میں نے سونے کی بہت کوشش کی لیکن نیند کا کہیں پتہ نہیں تھا۔ اُٹھ کر بھائی جان کے کمرے کی جانب گئی تو دیکھا کہ ان کا سر تکیہ سے الگ پڑا ہے اور وہ بے سُدھ پڑے ہیں۔ ایک بار بچّوں کو دیکھ کر اپنے بستر پہ آگئی۔ مجھے اپنے پہ غصّہ آنے لگا کہ میں بیکار ہی بھائی جان سے اُلجھ گئی۔ جو ہوش و حواس میں ہی نہ ہو اس سے سمجھداری کی بات کی اُمید کیا کی جاسکتی ہے۔

دوسرے دن دفتر گئی تو میرے سر میں شدید درد تھا اور اندر سے طبیعت بے چین تھی۔ چہرہ رویا رویا جیسا تھا۔ گیتا نے کافی منگوا کر مجھے بھی اپنے کیبن میں بلا لیا۔ اس نے میرے چہرے کو غور سے دیکھا اور کہنے لگی "تمھارے چہرے کا رنگ اُڑا اُڑا سا کیوں ہے۔؟ کیا آج شوہر سے لڑ کر آئی ہو؟"

مجھ سے اب نہیں رہا گیا اور میں نے ساری باتیں کہہ دیں۔ میری باتوں کو سن کر اس نے مسکراتے ہوئے کہا "ان کو اور ان کے سارے بچوں کو برباد کرنے میں سب سے بڑا ہاتھ تمھارا ہے"

میں تو اس کا منہ تکتی رہ گئی۔ اس نے مجھے اپنے گھر اور شوہر کی باتوں سے یقین دلایا کہ میں ہی ذمہ دار ہوں لیکن موجودہ حالت میں کنارہ کش ہونا میرے لیے مشکل تھا۔ گھر آکر میں نے بہت کوشش کی کہ میں یہاں سے اٹھوں اور اپنے شوہر کے گھر چلی جاؤں لیکن ان معصوم بچوں کا منہ دیکھتی اور کلیجے پر آرا سا چلنے لگتا۔ ادھر بھائی جان کی لاپرواہی روز بروز بڑھتی جا رہی تھی۔

ایک دن بجلی ڈیپارٹمنٹ والے آئے، انھوں نے کہا کہ چھ مہینوں سے بجلی کا بل نہیں دیا گیا ہے۔ ابھی فوراً نہ دیا گیا تو کنکشن کاٹ دیا جائے گا۔ میں عجیب کشمکش میں پڑ گئی۔ میرے پاس اتنی رقم بھی نہیں کہ بل ادا کر دوں۔ گھر جا کر پیسے لاؤں تو بھی اس کا کیا حاصل۔ آخر میں کب تک یہ بوجھ برداشت کرتی رہوں گی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بجلی کا کنکشن کاٹ دیا گیا۔ اس رات کافی دیر سے بھائی جان آئے۔ انھوں نے داخل ہوتے ہی سوئچ آن کیا، لیکن کمرہ میں اندھیرا ہی رہا۔ کھڑکیوں سے باہر جھانکا۔ ہر گھر میں روشنی تھی۔ "یہاں کوئی بلب نہیں جلتا، انھیں کیا ہو گیا ہے؟"

"بجلی والوں نے کنکشن کاٹ دیا ہے" میں نے مختصر سا جواب دیا۔

"تم نے انھیں روکا نہیں کیوں؟" تیوری چڑھا کر بھائی جان نے کہا۔

"انھوں نے کئی مہینے کا بقایا بتایا اور کنکشن کاٹ دیا۔"

"ہوں ..... !" شوکت بھائی کسی شکاری جانور کی طرح غرّائے۔ میں وہاں سے ہٹ گئی۔ وہ باورچی خانے میں گئے جہاں میں نے ایک موم بتی جلا دی تھی۔ دوسرے لمحے سارے برتن آنگن میں پھینک ڈالے۔ کچھ ٹاپ ٹناپ بجتے بھی رہے، لیکن میں اپنے بستر پر جا کر لیٹ گئی۔ صبح ہوئی اور بچے اُٹھے تو انھوں نے یہ منظر دیکھا اور آنکھوں آنکھوں میں ایک دوسرے سے سوال کرنے لگے۔ مجھے دیکھ کر سیما نے دریافت کیا "آنٹی یہ سب کیسے ہوا؟"

"جا کر اپنے پاپا حضور سے پوچھو"

اسی وقت بھائی جان بھی وہاں آگئے، تعجب کا اظہار کرتے ہوئے کہا "کس نے پھینکے ہیں یہ برتن؟"

"اچھا تو یہ بھی آپ کو یاد نہیں؟"

"مجھے یقین نہیں آتا۔ بہرحال، تمہیں ابھی انھیں اٹھانے کا وقت نہیں ملا؟"

"نہیں، میں نہیں اٹھاؤں گی اور نہ کوئی دوسرا اٹھائے گا۔ بھائی صاحب خود اٹھائیں گے اور دھو کر رکھیں گے۔" یہ کہہ کر میں وہاں سے باہر نکل آئی۔

بازار سے واپس آئی تو دیکھا کہ سارے برتن دھو کر قرینے سے رکھے ہیں۔ مجھے دیکھ کر سیما نے سرگوشی میں کہا "آج تو کمال ہو گیا۔ جانتی ہیں سارے برتن پاپا نے خود دھوئے ہیں اور ٹوسٹ مکھن کا ناشتہ کرایا اور کافی بنا کر پلائی۔ آپ کا ناشتہ بھی نکال کر رکھ دیا ہے"

میں نے سارے بچوں کے لیے ایک پروگرام تیار کر دیا اور دوسرے دن سے سارے لوگ اپنا کام کرنے لگے۔ اس کے بعد ہم آہنگی کی فضا قائم ہو گئی۔ دھیرے دھیرے سلیم کی شکایتیں دور ہونے لگیں۔ سیما کو پڑھنے کا وقت ملنے لگا۔ محسن لوگوں سے باتیں کرنے لگا۔ بھائی جان شام گھر پر گزارنے لگے۔ میں نے بھی فیصلہ کر لیا تھا کہ بھائی جان کے کسی کام میں مداخلت نہیں کروں گی۔

حالات کے معمول پر آنے کے بعد میں کچھ دنوں کے لیے گھر چلی آئی۔ بچوں نے مجھ سے وعدہ لے لیا کہ میں بہت جلد لوٹ آؤں گی ورنہ حالت پھر بگڑ جائے گی۔ ایک ہفتہ گھر پر رہ کر بھائی جان کے گھر آئی تو اس گھر کا منظر دیکھ کر ششدر رہ گئی۔ گھر دلہن کی طرح سجا تھا اور سارے بچے امتحان کی تیاریوں میں مصروف تھے۔ وہاں بھائی جان نہیں تھے۔ سیما نے خبر دی کہ پاپا ممی کو میکے سے لانے گئے ہیں۔

بعد میں مجھے پتہ چلا کہ بھائی جان نے ایک دن بچوں کو ماں کے پاس بھیج دیا تھا۔ بھابی جان نے جب یہاں کی تبدیلیاں دیکھیں تو خود آنے کا خیال ظاہر کیا۔ البتہ ان کے ابا حضور نے یہ شرط رکھ دی کہ بھائی جان خود جا کر انھیں لائیں۔ ابھی بات چیت چل ہی رہی تھی کہ پھاٹک سے پر موٹر گاڑی کا ہارن گونجنے لگا۔ سارے بچے دوڑ پڑے اور میں بھی ان کے ساتھ گئی اور بھابی کو نئی دلہن کی طرح اتارا۔ ایک بار پھر سے گھر میں روشنی اور زندگی واپس آگئی۔

★

ضروری اعلان پتے کی تبدیلی

قارئین یوجنا کے علم میں یہ بات لائی جا رہی ہے کہ اس پندرہ روزہ رسالے کا ادارتی عملہ اب پٹیالہ ہاؤس سے منتقل ہو کر آر کے۔ پورم چلا گیا ہے، اور پتہ اس طرح بدل گیا ہے

ایڈیٹر یوجنا (اردو) ایسٹ بلاک ۴، لیول ۵
آر کے۔ پورم (مین)، نئی دہلی ۱۱۰۰۶۶

اس سلسلے میں یہ بتانا بھی ضروری ہے کہ سردست ادارتی عملے کے پاس کوئی فون نہیں ہے۔ فون نصب ہوتے ہی اس کے نمبر سے آپ کو مطلع کر دیا جائے گا۔ قارئین سے گزارش ہے کہ وہ مندرجہ بالا پتے پر خط و کتابت کریں اور رابطہ قائم کریں۔

ای. ایس. پیٹرس، راز دہلوی

جہیز (نظم)

ایک دانا شخص کا یہ عالمانہ تھا خیال
امن سے پُر زندگی ہو خوش رہیں اہل و عیال

احتیاطاً مختصر رکھا تھا اُس نے خاندان
ایک لڑکا ایک لڑکی کا بنا وہ پاسبان

تھا مکاں بھی اور ہر ایک چیز کی افراط تھی
سیم و زر تھا پاس اُس کے شان کی کیا بات تھی

اپنی ہر کاوش سے بچوں کو پڑھایا آپ نے
زیورِ تعلیم سے سب کو سجایا آپ نے

دونوں بچے ہو گئے علم و ہنر میں کامگار
ہو گیا ماں باپ کی خوشیوں کا اُن پر انحصار

فکر لیکن باپ کو اب ایک دامن گیر تھی
ہو گئی لڑکی جواں جو حُسن کی تصویر تھی

رات دن گرداں تھا وہ مل جائے کوئی نوجواں
جو شریف اُلذات ہو اچھا ہو اُس کا خاندان

سینکڑوں گذرے نظر سے پر نہ بھایا کوئی بھی
دوستوں کی رائے سے چُن لیا اک آدمی

ظاہرہ تھا آدمی وہ نیک صورت نیک خُو
کون جانے کب بدل جائے کسی کا رنگ و بُو

لے کے بارات آگیا وہ دُلہا اپنی باکمال
لڑکی والوں نے سجا رکھا تھا گھر کو بے مثال

عہد و پیماں زندگی باہم نبھانے کے ہوئے
قسمیں وعدے ساتھ جینے ساتھ مرنے کے کئے

آخرش سُسرال میں جانے کا بھی وقت آگیا
ہو گئی ماں باپ سے آنسو بہاتی وہ جُدا

ساتھ ملبُوسات اُس کے اور زیور بھی گئے
لوٹ کر گھر باپ کا بیٹی کے دیور بھی گئے

حُسن اُس کا دیکھ کر وہ سب کے سب حیران تھے
دل پکڑ کر رہ گئے جو صاحبِ ایمان تھے

دیکھ کر ڈولی کی دولت آنکھ سب کی کھُل گئی
اُن کی جھوٹی شان کی رنگت جو تھی سب دھُل گئی

پیار سے سُسرال میں سب نے کیا اُس کو قبول
دل عروسِ نو کا ہو جائے نہ مغموم و ملول

جا کے میکے پھر نہ لائی اِتنی دولت وہ کبھی
دل سے ناخوش ہو گئے سُسرال میں اُس سے سبھی

رفتہ رفتہ دُور تر وہ ساری خوشیاں ہو گئیں
چشم ہائے لُطفِ ذاتِ پاکِ یزداں سو گئیں

حق پرستی کی جگہ دولت پرستی چھا گئی
علم تہذیب و ادب سب بے حیائی کھا گئی

چھا گیا پھر آدمی پر زر کے لالچ کا جنُوں
بھُول وہ بالکل گیا کس فرض کا پابند ہوں

مارنے بھی لگ گیا دُشوار جینا بھی کیا
ایک دن ہاتھوں سے اپنے زہر اُس کو دے دیا

تھی وہ بے بس بے سہارا زہر سے تو مر گئی
پر شکایت مرد کی حُکام سے وہ کر گئی

حق پرستوں نے کیا یوں فیصلہ مرحُومہ کا
دی سزائے موت بدلہ لے لیا مظلوم کا

قیمتی سامانِ شادی کا جو ہوتا ہے شکار
وہ نظر میں ہے خُدا کا لعنتی و نابکار

اس کے لینے سے کسی کو فائدہ ہوتا نہیں
دل دُکھائے جو کسی کا چین سے سوتا نہیں

خون ریزی، خودکشی، تفرِقہ جیسی لعنتیں
داج[1] ہی کی دین سے ہیں یہ سماجی آفتیں

اِس وبا کا راز کوئی ہو نہ دُنیا میں شکار
جہیز کی یہ لعنتیں ہو جائیں سب پر آشکار

---

[1] پنجابی لفظ بمعنی جہیز

بشریٰ پروین

فضائیں ساکت، پتھر بے نور

سینۂ ہند گولیوں سے
ہوا ہے چھلنی خبر ملی تو
لگا اچانک
کہ آسماں سے ٹوٹ کر کوئی ستارہ ہماری آنکھوں میں
بجھ گیا ہے
فضائیں ساکت، چشم بے نور
پرندے پرواز بھُول بیٹھے
کہ بہتے دریا بھی تھم گئے تھے
مُسلّط ایسی ہوئی خموشی کہ دل کی دھڑکن
دماغ میں ایسے لگ رہی تھی
کہ جیسے جنگل میں کوئی وحشی
مسلسل اِک ڈھول پیٹتا ہو
پھر اچانک ہی بدلا منظر
عجیب پھیلی تھی افراتفری
ہر ایک صُوبے ہر ایک شہر میں
بارشیں، گولیوں، پتھروں کی ہو رہی تھیں
اور اُس میں سب انسان نہا رہے تھے!!
اُٹھا فرشتۂ امن آخر
وہا کے سینے میں درد اپنا
سمندر آنکھوں کا خشک کر کے
دِلاسہ سب کو پھر وہ دیتا
اور اب بھی غم بانٹتا سب کے پھر رہا ہے
جب کہ
وہ خود ہر اک تسلّی ہر اک دِلاسے کا مستحق تھا
کہ اُس کی ماں نے اِن سنگدل ہندواسیوں کی خاطر
پران تیاگے تھے اپنے بشرطِ
عجب زمانہ یہ آگیا ہے
کہ اُلٹا گنگا ہی بہہ رہی ہے!!!

وسیم حیدر

کیا آپ جانتے ہیں؟

ہندوستان کے گورنر جنرل

۱۷۷۲ – ۱۷۸۵	وارن ہیسٹنگس
۱۷۸۶ – ۱۷۹۳	لارڈ کارنوالس
۱۷۹۸ – ۱۸۰۵	لارڈ ویلزلی
۱۸۰۷ – ۱۸۱۳	لارڈ منٹو
۱۸۱۳ – ۱۸۲۳	لارڈ ہیسٹنگس
۱۸۲۸ – ۱۸۳۵	لارڈ ولیم بینٹک
۱۸۴۴ – ۱۸۴۸	لارڈ ہارڈنگ
۱۸۴۸ – ۱۸۵۶	لارڈ ڈلہوزی
۱۸۵۶ – ۱۸۵۸	لارڈ کیننگ

ہندوستان کے وائسرائے

۱۸۵۸ – ۱۸۶۲	لارڈ کیننگ
۱۸۸۰ – ۱۸۸۴	لارڈ رپن
۱۸۹۹ – ۱۹۰۵	لارڈ کرزن
۱۹۰۵ – ۱۹۱۰	لارڈ منٹو
۱۹۱۰ – ۱۹۱۶	لارڈ ہارڈنگ
۱۹۱۶ – ۱۹۲۰	لارڈ چیمسفورڈ
۱۹۲۱ – ۱۹۲۶	لارڈ ریڈنگ
۱۹۲۶ – ۱۹۳۱	لارڈ ارون
۱۹۳۱ – ۱۹۳۶	لارڈ ولنگڈن
۱۹۳۶ – ۱۹۴۳	لارڈ لن لتھگو
۱۹۴۳ – ۱۹۴۷	لارڈ ویول
۱۹۴۷	لارڈ لوئس ماؤنٹ بیٹن

(۲۴ مارچ تا ۱۴ اگست)

آزاد ہندوستان کے صدر

۱۹۵۰ – ۱۹۶۲	ڈاکٹر راجندر پرشاد
۱۹۶۲ – ۱۹۶۷	ایس رادھا کرشنن
۱۹۶۷ – ۱۹۶۹	ڈاکٹر ذاکر حسین
۱۹۶۹ – ۱۹۷۴	وی۔ وی۔ گری
۱۹۷۴ – ۱۹۷۷	فخر الدین علی احمد
۱۹۷۷ – ۱۹۸۲	این سنجیوا ریڈی
۱۹۸۲ سے تا حال	گیانی ذیل سنگھ

ہندوستان کے بارے میں چند اہم معلومات

- ہندوستان میں اعلیٰ ترین اعزاز بھارت رتن ہے۔
- ہندوستان میں بہادری کے لیے اعلیٰ ترین اعزاز پرم ویر چکر ہے۔
- سب سے لمبا غار امرناتھ اورا (مہاراشٹر) میں ہے۔
- سب سے پہلے ہندوستانی سائنسدانوں کی ٹیم ۹؍ جنوری ۱۹۸۲ء کو انٹارکٹیکا پہونچی۔
- سب سے اونچا ڈیم، بھاکڑا ڈیم (پنجاب) میں ہے۔
- سب سے لمبا ڈیم ہیرا کنڈ (اڑیسہ) میں ہے۔
- سب سے لمبا ریگستان تھار (راجستھان) میں ہے۔
- سب سے لمبا گنبد گول گنبد (بیجاپور) میں ہے۔
- سب سے اونچی گذرگاہ (دروازہ) بلند دروازہ فتح پور سیکری میں ہے۔
- سب سے لمبی جھیل وولر Wular جھیل (کشمیر) میں ہے۔
- سب سے لمبی مسجد جامع مسجد (دہلی) میں ہے۔
- پہاڑ کی سب سے اونچی چوٹی کنچن جنگا ہے۔
- سب سے لمبا عجائب گھر انڈین میوزیم (کلکتہ) میں ہے۔
- سب سے لمبا ریلوے پل سون پر (بہار) میں ہے۔
- سب سے لمبا پلیٹ فارم کھڑک پور (مغربی بنگال) میں ہے۔
- سب سے لمبا ریل راستہ ترونڈرم سے بوگئی گاؤں ۳۷۷۶ کیلو میٹر ہے۔
- سب سے لمبی ریل سرنگ منکی پل اور کھنڈالا اسٹیشن کے بیچ بمبئی، پونا سنٹرل ریلوے پر ہے۔
- سب سے زیادہ بارش چیرا پونجی (میگھالیہ) میں ہوتی ہے۔
- سب سے لمبا دریائی پل گنگا ندی پر پٹنہ (بہار) میں ہے۔
- سب سے لمبی سڑک گرانڈ ٹرنک روڈ ہے۔
- سب سے زیادہ رقبے والی ریاست مدھیہ پردیش ہے۔
- سب سے کم رقبے والی ریاست سکم ہے۔
- سب سے زیادہ آبادی والی ریاست اتر پردیش ہے۔
- سب سے کم آبادی والی ریاست سکم ہے۔
- سب سے گنجان آبادی والی ریاست کیرالہ ہے۔
- سب سے کم گنجان آبادی والی ریاست سکم ہے۔
- سب سے زیادہ تعلیم یافتہ خواتین کیرالہ میں ہیں۔
- سب سے لمبا مجسمہ گوماتیشور کرناٹک میں ہے۔
- سب سے لمبا مینار، قطب مینار (دہلی) میں ہے۔
- سب سے لمبی سرنگ جواہر ٹنل، درہ بانیہال (جموں و کشمیر) ہے۔
- مرکز کے زیر اہتمام علاقوں میں سب سے زیادہ گنجان آبادی والی ریاست دہلی ہے۔
- مرکز کے زیر اہتمام علاقوں میں سب سے کم گنجان آبادی والی ریاست اروناچل پردیش ہے۔
- سب سے لمبا چڑیا گھر زولوجیکل گارڈن، کلکتہ میں ہے۔

فصلوں کی کچھ اور بیماریاں

پھپھوند :-

اس کی تقریباً سینکڑوں قسمیں ہوتی ہیں۔ یہ گوبھی اور کپاس کی فصل پر حملہ آور ہوتی ہے۔ اس بیماری کا اثر اس وقت زیادہ ہوتا ہے جب ائی (بونڈی) پہلے سے پتّی کو کاٹ کر زخمی کر چکی ہوتی ہے۔

بلیک آرم (Black Arms)

اس بیماری کا عمل کپاس کے پودے پر زیادہ ہوتا ہے۔ یہ اپنا اثر پودوں پر ابتدائی زمانے سے دکھانے لگتی ہے۔ بلیک آرم سب سے پہلے پودوں کی ابتدائی پتیوں کو اپنا نشانہ بناتے ہیں۔ جس پتّی پر اس کا اثر ہوتا ہے۔ اس کی نچلی سطح نم آلود ہو جاتی ہے پھر دھبے آہستہ آہستہ بڑھ کر پوری پتّی پر چھا جاتے ہیں اور اس کے بعد پودے سوکھنے لگتے ہیں۔ پتّی کی نسیں بھی کالی پڑ جاتی ہیں۔ اس کا اثر صرف پتیوں پر ہی نہیں ہوتا ہے بلکہ شاخیں اور تنے پر بھی ہوتا ہے۔ بیمار تنوں پر دراڑ پڑ جاتی ہے۔ اور اس جگہ سے گوند نما رس نکلنے لگتا ہے۔

علاج :-

اس بیماری سے بچنے کے لیے اسٹرپٹو سائیکلین کے ۰۰۱ فیصد کا گھول ایک لیٹر پانی میں ڈال کر بیج بونے سے دو گھنٹے قبل ڈبو دیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ بلائی ٹاکس پا کلو یا کیوفان ایل ۲ سے ۳ لیٹر فی ہیکٹر کی در سے استعمال کرنا مفید ہوتا ہے اگر یہ ممکن نہ ہو تو ۱۵۰ ملی لیٹر السی کا تیل ۱۰۰ لیٹر پانی میں ملا کر چھڑکنا چاہیے۔

لال سڑن :-

یہ بیماری گنّے کی فصل کو بہت نقصان پہنچاتی ہے۔ اس بیماری سے گنّے کی پتّیاں اور تنے متاثر ہوتے ہیں۔ پودے سوکھ کر پیلے ہو جاتے ہیں۔ گنّے کا اندر والا حصہ کتھئی رنگ کا ہو جاتا ہے۔ تھوڑی تھوڑی دوری پر سفید چتّے دکھائی دیتے ہیں۔ سونگھنے پر شراب جیسی بدبو آتی ہے۔ تنے کی کھال سڑ جاتی ہے۔ یہ بیماری گنّے کے علاوہ جوار، باجرہ اور ارہر کو بھی نقصان پہنچاتی ہے۔

علاج :-

اس بیماری سے بچنے کے لیے گنّے کے سیٹ (ٹکڑے) کو اگلال اور ایراٹانی کے گھول میں ۵ منٹ تک ڈبو دینا چاہیے۔

کنڈوا بیماری

اس بیماری سے پودے کا رنگ کالا ہو جاتا ہے اور چاروں طرف سفید جھلی چڑھی رہتی ہے۔ جب یہ جھلی پھٹ جاتی ہے اس کا کالا پاؤڈر چاروں طرف ادھر اُدھر پھیل جاتا ہے۔ اس بیماری کے اثرات بیج میں موجود ہوتے ہیں اور اکثر گنّے کی پیڑی فصل میں زیادہ اثر انداز ہوتے ہیں۔ سورج مکھی، السی اور ارہر کی فصلوں پر بھی اپنا حملہ کرتی ہے۔

علاج :-

اس بیماری کے لیے اگلال اور ایراٹان کا استعمال کیا جا سکتا ہے۔

اُکٹا :-

جس پودے پر اُکٹا بیماری ہوتی ہے تو اس کے اندر گٹھالوں کے پاس کا حصہ اینٹ کے رنگ کا ہو جاتا ہے۔ تنے کے چھلکے پر بھورے رنگ کے دھبے دکھائی دیتے ہیں۔ تنا کھوکھلا ہو جاتا ہے۔ اکٹا بیماری گنا، ارہر، جوار، چنا وغیرہ میں ہوتی ہے۔

ارلی بلائیٹ :- اس بیماری سے آلو کی پتیوں پر گہرے بھورے اور کالے رنگ کے دھبے دکھائی دیتے ہیں۔

علاج :- اس پر ڈائتھان - م ، کی ۲۰۰۰ گرام مقدار کو کسی تانبے کی مرکب والی دوا کے ساتھ ملا کر استعمال کرنے سے دور کیا جا سکتا ہے۔

ورلٹ [illegible] بیماری سے [illegible] پودا سوکھ جاتا ہے۔

وائرل بیماری [illegible] سے پتیاں مڑ جاتی ہیں۔ اس بیماری کا اثر آلو، ٹماٹر پر زیادہ ہوتا ہے۔ ان کے علاوہ الٹی نیریا بلائیٹ، سفید گرد (وہائیٹ رسٹ)، اگیا (پاؤڈری مائلڈیو) وغیرہ بیماریاں بھی خطرناک ہیں۔ ان سے پتیاں اور تنے پر سفید پاؤڈر جمع ہو جاتے ہیں۔ ان سے بچنے کے لیے کیراستان پھپھوندکا استعمال کیا جاتا ہے۔ یا ۱/۲ سے ۳ کلو ڈائتھین زیڈ ۷۸ کو ۱۰۰۰ سے ۱۵۰۰ لیٹر پانی میں گھول کر فی ہیکٹر استعمال کرنا چاہیے۔

دھان پر بھورا دھبہ (Brown Spot) دھڑ سڑن Stem Rot جھلسا (Bacterial Blite) بیماریاں نقصان پہونچاتی ہیں۔

علاج :-

ان بیماریوں سے بچنے کے لیے ڈائتھان ایم - ۴۵، ڈائتھان زیڈ ۷۸، بھی مفید ہوتے ہیں۔

گیہوں پر کنڈوا یا کرگی بیماری سردیوں میں جب بارش ہو جاتی ہے یا موسم ابر آلود ہوتا ہے تو اثر انداز ہو جاتی ہیں۔ ایسے موسم میں گیہوں کی پتیوں پر لال، کالے اور پیلے دھبے دکھائی دیتے ہیں۔ انھیں گروا یا رتوا (Rest) کی بیماری کہتے ہیں۔ کبھی کبھی گیہوں کی بالیاں کالی ہو جاتی ہیں اور راکھ کی طرح بن جاتی ہیں۔ اسے اگیا بیماری کہتے ہیں

یہ تمام بیماریاں خطرناک ہیں۔ ان سے فصلوں کو بہت نقصان پہونچتا ہے۔

اس لیے یہ ضروری ہے کہ اچھی پیداوار لینے کے لیے فصلوں کو ان خطرناک بیماریوں سے بچایا جائے۔

★

محمد عبیداللہ صدیقی

زہر کی گولیاں

بیسویں صدی کی چھٹی دہائی سے ہی مغربی ممالک کی نئی نسل میں بادہ کشی اور چرس، بھنگ، ہیروئن، ایل۔ایس۔ڈی، افیم اور دیگر منشیات کا استعمال بام عروج پر ہے اور ہندوستان میں بھی ان منشیات کی ابتدا روحانی سکون کی جستجو میں آنیوالے ان مغربی ہپیوں کی آمد کے ساتھ ہی بتدریج شروع ہوئی تھی، جو لمبے بے ترتیب بال اور ڈھیلے ڈھالے گندے کپڑوں میں ملبوس نشے میں دھت دنیا و مافیہا سے بے خبر نظر آتے ہیں اور روحانی سکون کی تلاش میں آنے والے ان ہپیوں کی بے سروپا عادتوں کی اندھی تقلید نے ہندوستانی جوانوں کی نئی پود کو بھی منشیات کا خوگر بنا دیا ہے، اور آج کل کالجوں اور یونیورسٹیوں کے بیشتر طلبا، نشے کی گولیوں کے عادی ہو چکے ہیں۔ اور اب فوجی جوان اور سرکاری عملے کے اکثر ارکان بھی اس عادت بد میں مبتلا نظر آتے ہیں، جس سے چشم پوشی مجرمانہ فعل کے ارتکاب کے مترادف ہے۔ اس سلسلے میں انڈین کونسل آف میڈیسن ریسرچ کی ایک رپورٹ سے ظاہر ہے کہ کلکتہ یونیورسٹی کے ۲۶ فیصد طلبا، تمباکو نوشی اور پنجاب اور دہلی کی یونیورسٹیوں کے بالترتیب ۱۹ اور ۷ء۲۴ فیصد طلبا نشہ آور ادویات کے عادی تھے اور حیرت انگیز بات یہ ہے کہ ان ادویات کے استعمال کی سب سے اونچی شرح ۲ء۲۲ فیصد انگریزی ذریعۂ تعلیم والے تعلیمی اداروں میں پائی گئی تھی۔ تحقیق سے یہ بھی انکشاف ہوا تھا کہ نوجوان لڑکے خمار آور گولیوں کے شائق تھے اور لڑکیاں درد رفع کرنے والی دواؤں کی شیدائی تھیں۔

کچھ عادی جوان یہ جواز پیش کرتے ہیں کہ یہ دوائیں ان میں ذہانت و طباعی کے علاوہ جذباتی اور روحانی پختگی عطا کرتی ہیں، لیکن تحقیق سے یہ ثابت ہو چکا ہے کہ ان کی یہ دلیل غیر سائنسی اور یکسر غیر منطقی ہے، بلکہ اس امر کا بہ نظرِ غائر مطالعہ کیا جائے تو یہ بات واضح ہو جائے گی کہ اس ذہنیت کا سبب نفسیاتی ہے جو ان کے مقصدِ حیات میں کسی ناکامی کا نتیجہ ہے۔ ماہرین کے مطابق یہ دوائیں صحت کے لیے بہرحال مُضر ہیں اور ان کے کثرت استعمال سے دل و دماغ متاثر ہوتے ہیں اور بے حسی، ذہنی غلامی اور خود فراموشی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا ہے۔

امیر والدین کی کاروباری مصروفیات، عمر کے تضاد، دفتروں میں کام کرنے والے بیشتر والدین کے کشیدہ تعلقات اور تہذیبِ اخلاق کے غیر واضح تصورات کے باعث نئی پود بے راہروی کی طرف مائل ہوتی ہے، اور غیر مناسب رہنمائی اور توجہ کی کمی سے اخلاقی برائیوں اور فراریت کی بآسانی شکار ہو جاتی ہے، جوان کے لیے تباہ کن اور خودکشی کے مترادف ہے۔

ایل۔ایس۔ڈی کے استعمال سے نہ صرف جذباتی برانگیختگی پیدا ہوتی ہے بلکہ اس کے خوگر افراد ذہنی اور روحانی افراتفری کے شکار نظر آتے ہیں۔ ایک بار ایل۔ایس۔ڈی کے استعمال کے بعد ایک طالب علم کے ذہن میں یہ عجیب و غریب خیال پیدا ہوا کہ وہ فضا میں پرواز کرنے کی قوت رکھتا ہے اور اس نے جھٹ عمارت کی دسویں منزل سے چھلانگ لگائی اور اپنی جانِ عزیز گنوا دی۔ ماہرین کے مطابق اس دوا کے کثرت استعمال سے خونی کینسر لاحق ہوتا ہے اور چرس، افیم، کوکین، ہیروئن اور دیگر منشیات کے استعمال سے دماغی خلیے رفتہ رفتہ ضائع ہو جاتے ہیں، عرصۂ حیات میں کمی آتی ہے اور لوگ قلبی اور دماغی امراض میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ اس سلسلے میں آگرہ کے دماغی ہسپتال میں کئے گئے ایک مشاہدہ کے دوران وہاں تین سو اڑسٹھ مریضوں میں سے ایک سو مریض ایسے پائے گئے تھے جو ابتدائی عمر سے ہی نشے کی گولیوں کے خوگر تھے۔ یہ بات بھی کم حیرت انگیز نہیں ہے کہ انگلینڈ میں ہر سال مرنے والوں کی نصف تعداد تمباکو نوشی کا شکار ہوئی۔ ۱۹۶۸ء میں امریکہ میں دو لاکھ ساٹھ ہزار افراد تمباکو نوشی سے جاں بحق ہو گئے تھے۔ کینسر سوسائٹی کی ۱۹۷۲ء کی رپورٹ سے بھی ظاہر ہے کہ چھ ہزار آٹھ سو مریضوں میں سے تین ہزار آٹھ سو مریض پھیپھڑوں کے کینسر

باقی صفحہ پر

Published by the Director, Publications Division, Patiala House, New Delhi-110001

یوجنا

۱۶تا۲۸رفروری ۱۹۸۵ء

ایک روپیہ

بھارت کا دسواں بین الاقوامی فلمی میلہ
(پریم پال اشک)

مارکیٹنگ کی قومی تنظیم
(وسنت ساٹھے)

بیداری نو اور آغازِ نو
(چندن کٹھوریہ)

چندن کتھوریہ

بیداری نَو اور آغازِ نَو

چند روز قبل بھارت کے روزناموں میں زیادہ تر ایسی خبریں شائع ہوتی تھیں جنھیں کسی اعتبار سے اچھا نہیں کہا جاسکتا تھا۔ اخبارات میں کہیں بربادی کا ذکر ہوتا تھا تو کہیں حکومت کی ناکامی کا۔ اگر ایسا نہ ہو تو پھر حکومت کے کسی نہ کسی محکمے کی نااہلیت کا چرچا ہوتا تھا۔ عوام کے دلوں میں حکومت کے بارے میں کچھ ایسا خیال پیدا ہوگیا تھا کہ وہ کوئی ایسی بھاری بھرکم تنظیم ہے جو نہایت سست روی سے حرکت کرتی ہے یا پھر وہ عزم یا توانائی سے محروم ہے۔ لیکن آٹھویں لوک سبھا کے نتائج کے اعلان کے بعد شری راجیو گاندھی کے برسرِ اقتدار آنے کے ساتھ تمام منظرنامہ ہی بدل گیا ہے۔ اب ہر روز ایسی خبریں پڑھنے کو ملتی ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ ملک یا حکومت کو درپیش کٹھن مسائل میں سے کسی نہ کسی کے حل کے سلسلے میں پیش رفت ہو رہی ہے۔

اب ملک میں حالیہ انتخاب سے مسرت کی ایک نئی لہر دوڑ گئی ہے اور عوام نے راحت کی سانس لی ہے۔ عوام کو اس امر پر اطمینان ہوا ہے کہ اب ملک کی یکجہتی اور سلامتی کو تقویت ملے گی اور انتشار پسند قوتوں کی سرکوبی کی جائے گی۔ اس پُرامن انتخابی عمل میں شری راجیو گاندھی کو جو عدیم المثال اکثریت حاصل ہوئی ہے اُس سے وہ عوام کی اُمیدوں کی علامت بن گئے ہیں۔ جو حکومت کے طریقِ کار اور سیاست کی روش میں تبدیلی چاہتے ہیں۔

راجیو گاندھی عوام سے یہ وعدہ کرکے برسرِ اقتدار آئے ہیں کہ وہ بیوروکریسی (افسر شاہی) کو لال فیتہ شاہی، بدعنوانیوں، سست روی اور نااہلیت سے پاک کریں گے جو عموماً سرکاری محکموں سے وابستہ ہیں۔ انھوں نے کروڑہا عوام کے لیے بھی بہتر مستقبل کا وعدہ کیا ہے اور یقین دلایا ہے کہ اس وعدے کی تکمیل میں تاخیر نہیں کی جائے گی۔ اُن کے لیے ووٹ کا مطلب ملکی استحکام، تسلسل اور تبدیلی کے لیے بھی ووٹ تھا۔ اس کا مطلب ایک جمہوری اور سیکولر بھارت کو آگے بڑھانا ہے۔

وزیرِ اعظم شری راجیو گاندھی کی قیادت میں نئی حکومت بلا تاخیر اپنے وعدوں کو پورا کرنے اور ملک کو درپیش آسام اور پنجاب جیسے مشکل مسائل کو حل کرنے کے سلسلے میں کارروائی کر رہی ہے۔

سال کے اختتام سے قبل ملک کے لیے نئی وزارتی کونسل بن گئی جو پُرانی کونسلوں سے مختلف ہے۔ نئی کونسل میں نوعمر اور فعال اشخاص لیے گئے ہیں جن میں رائے دہندگان نے اپنے اعتماد کا اظہار کیا ہے۔ اس میں ایسے تجربہ کار اشخاص بھی ہیں جو مطلوبہ کام انجام دینے کی شہرت رکھتے ہیں۔

وزیرِ اعظم نے اپنے عہدے کا حلف اٹھانے کے فوراً بعد اخباری نمائندوں کو بتایا کہ وزراء کی کارگزاری کا جائزہ لیا جائے گا اور جن کا کام کامیابی کی کسوٹی پر پورا نہیں اُترے گا انھیں برطرف کردیا جائے گا۔ کونسل تین سطح کے وزراء پر مشتمل ہے۔ وزرائے کابینہ، وزرائے مملکت جو خود مختاری سے وزارتی امور انجام دیں گے اور وزرائے مملکت۔ نئی کونسل میں کوئی نائب وزیر نہیں ہے۔ کونسل کی تشکیل اس امر کو مدنظر رکھ کر کی گئی ہے کہ سیاسی سطح پر فیصلے جلد کئے جائیں اور عمل میں لائے جائیں۔

وزیرِ اعظم انتظامیہ ڈھانچے میں دُوررس تبدیلیاں رائج کر رہے ہیں تاکہ اُس سے اچھے نتائج نکل سکیں اور وہ محض ضابطے کی کارروائی نہ بن جائے جیسا کہ اب تک ہو رہا تھا۔ بتایا جاتا ہے کہ انھوں نے انتظامیہ ڈھانچے، پالیسیوں اور ضابطوں پر سرِ حاصل نظرِثانی کرنے کا حکم دیا ہے تاکہ فیصلہ سازی کے عمل میں تیزی لائی جاسکے۔ وہ یہ دیکھنے کے لیے بھی کوشاں ہیں کہ سرکاری دفاتر میں ایک عام آدمی کا کام سُرعت اور خوش اخلاقی سے ہوتا ہے۔ اس سمت میں ایک بڑا اقدام یہ کیا گیا ہے کہ متعدد وزارتوں اور محکموں کی ازسرِنو تنظیم کی گئی ہے تاکہ اُن کے کام کاج میں بہتری لائی جاسکے۔ زراعت کی کلیدی وزارت میں دیہی ترقی کا محکمہ ردّوبدل میں بحال کیا گیا ہے۔ وزارت (مُسلسل جاری کور صفحہ پر)

۱۶ تا ۲۸ فروری ۱۹۸۵

یوجنا، نئی دہلی

منصوبہ بندی اور ترقیاتی پروگراموں کی جھلک پیش کرنے والا

پندرہ روزہ

یوجنا

نئی دہلی

اس شمارے میں

چیف ایڈیٹر :- آر۔ ٹھکرال
ایڈیٹر :- لکھمی رام رانا
اسسٹنٹ ایڈیٹر :- محمد عادل صدیقی
سب ایڈیٹر :- وسیم حیدر

جلد ۴	۱۶ تا ۲۸ فروری ۱۹۸۵	شمارہ ۲۲

۲۷، ماگھ تا ۹، پھاگن تک سمت ۱۹۰۶

شرح چندہ :-

سالانہ ۲۰ روپے ۔ ۲ سالہ ۳۵ روپے ۔ سہ سالہ ۵۰ روپے
فی کاپی :- ایک روپیہ

طالب علموں، استادوں اور لائبریریوں کے لیے ۱۰ فی صد کی رعایت

یوجنا منصوبہ بند ترقی کے بارے میں عوام کو آگاہ کرتا ہے مگر اس کے مضامین صرف سرکاری نقطۂ نظر کی وضاحت تک ہی محدود نہیں ہیں

بزنس منیجر : ایل۔ آر۔ بترہ ✽ اسسٹنٹ ڈائرکٹر (پروڈکشن) آر۔ ایس۔ منجال

مضامین سے متعلق خط و کتابت کا پتہ :-

ایڈیٹر یوجنا (اردو) پبلیکیشنز ڈویژن، ایسٹ بلاک ۴، لیول ۵، آر۔ کے۔ پورم (مین) نئی دہلی ۱۱۰۰۶۶

ترسیل زر کا پتہ : بزنس منیجر، پبلیکیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

اداریہ

بچوں کی مربوط ترقی

حکومت ہند نے چھ سال سے کم عمر بچوں کی بہبود اور ان کی مربوط نشو و نما کے لیے جو اسکیم پہلے سے چالو کی ہے، اسے مزید توسیع دی ہے۔ ساتویں منصوبے میں اس مد پر ۶۰۰ کروڑ روپے کے اخراجات کا اندازہ لگایا گیا ہے۔ اس منصوبے میں سماجی بہبود کی مختلف اسکیموں پر جو اخراجات عمل میں آئیں گے، ان کا ایک تہائی حصہ بچوں کی بہبود اور ان کے فروغ سے متعلق متعدد اسکیموں پر خرچ کیا جائے گا۔ اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ وہ بچے جو ملک کے بھارت کی تعمیر میں اہم پارٹ ادا کرنے والے ہیں، سرکار کی توجہ کا مرکز بنے ہوئے ہیں۔ چھٹے منصوبے میں اس اسکیم کو مختصر پیمانے پر شروع کیا گیا تھا۔ مارچ ۱۹۸۴ کے آخر تک دیہات میں ۳۰۳ پراجیکٹ قبائلی آبادی والے علاقوں میں ۲۲۵ پراجیکٹ اور شہری علاقوں میں ۱۲۲ پراجیکٹ بچوں کی مربوط ترقی کی اسکیم کے تحت شروع کئے جا چکے تھے۔ ۸۵-۱۹۸۴ میں مزید ۱۸۰ پراجیکٹوں کی منظوری دی جا چکی ہے۔ اس طرح چھٹے منصوبے کے آخر تک ایک ہزار پراجیکٹ بچوں کی نشو ونما اور ان کی مربوط ترقی کے پروگرام کے تحت کام کر رہے ہوں گے۔ زیادہ تر پراجیکٹ دیہی علاقوں میں ہیں لیکن کچھ پراجیکٹ شہر کی گندی بستیوں اور قبائلی آبادی والے علاقوں میں بھی کام کر رہے ہیں۔ یوں تو اس کا آغاز تجرباتی بنیادوں پر ۷۶-۱۹۷۵ میں کیا جا چکا تھا مگر اس کی افادیت کو دیکھتے ہوئے اسے بڑے پیمانے پر توسیع دی جا رہی ہے۔ اس کے ذریعے تغذیہ بخش خوراک کی فراہمی، ٹیکہ لگانے کا انتظام، صحت کا طبی معائنہ اور دیگر متعدد سہولتیں بہم پہنچائی جاتی ہیں۔ چونکہ صحتمند جسم کے ساتھ ہی دماغی صحت اور کام کرنے کی قوت فروغ پاتی ہے لہذا بچوں کی بہبود کے پروگرام میں صحت کے پروگراموں پر خصوصی توجہ دی جا رہی ہے۔

دسمبر ۱۹۸۳ میں ۴۱ لاکھ بچے اور ۷ لاکھ ۳۵ ہزار حاملہ اور دودھ پلانے والی عورتیں تغذیہ بخش خوراک حاصل کر رہی تھیں اور ۱۶.۱۷ لاکھ بچوں کو اسکول جانے سے قبل کی مدت کی تعلیم دی جا رہی تھی۔ منصوبہ بندی کمیشن میں پروگراموں کا جائزہ لینے والی تنظیم نے بچوں کی مربوط ترقی کے پراجیکٹوں کی کامیابی کے بارے میں اپنی رپورٹ میں بجا طور پر کہا ہے کہ اس سلسلے کے تغذیہ بخش پروگراموں، صحت سے متعلق پروگراموں اور تعلیمی پروگراموں میں تال میل کی کمی ہے۔ قانون کی رو سے ۱۲ سال سے کم عمر کے بچوں کو چائے کے باغات، ربڑ کے باغات وغیرہ میں کام پر لیجانا منع ہے اور ۱۴ سال سے کم عمر کے بچوں کو فیکٹری میں کام پر لیجانا منع ہے۔ لیکن اس پر سختی سے عمل درآمد نہیں ہو رہا۔ ہندوستان میں ۲ کروڑ بچے محنت کش طبقے کے زمرے میں آتے ہیں۔ یہ زیادہ تر کھیتی باڑی میں لگے ہیں۔ غیر منظم سیکٹر میں تو اس کا اطلاق دیکھنے میں ہی نہیں آتا۔ ایک اور مشکل یہ ہے کہ ہر ریاست میں چلڈرن (بچوں) کی صراحت الگ الگ ہے۔ کچھ ریاستوں میں ۱۶ برس سے کم عمر کے لڑکے لڑکیاں بچوں کے زمرے میں آتی ہیں۔ آندھرا میں ۱۴ سال سے کم عمر کے بچے بچیاں اس زمرے میں آتی ہیں۔ اس پر نظر ثانی کی ضرورت ہے اور اچھا ہو کہ اس سلسلے میں ملک گیر پیمانے پر یکساں ضابطوں کے ذریعے یکسانیت لے آئی جائے۔ مقصد یہ ہے کہ آج کے بچے کل کے ذمہ دار شہری بن سکیں۔ ان کا استحصال نہ ہونے پائے اور وہ جو کام کریں اس سے ان کے مستقبل کی نشو نما نہ رُکنے پائے۔

کمپیوٹر روزمرہ کی زندگی میں: کمپیوٹر ہماری روزمرہ کی زندگی میں اہم سے اہم تر ہوتا جا رہا ہے۔ اعداد و شمار اکٹھا کرنے اور اطلاعات فراہم کرنے میں ان کی اہمیت سے اب سبھی واقف ہو چکے ہیں۔ ملک میں سماجی اور اقتصادی ترقی کے عمل کو تیزی سے آگے بڑھانے میں کمپیوٹری نظام کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔ اس کے ذریعے نئے مواقع سامنے آ سکتے ہیں۔ دنیا تیزی سے بدل رہی ہے۔ وزیر اعظم شری راجیو گاندھی نے کہا ہے کہ جدید ترین ٹیکنالوجی کے استعمال سے ملک کو تیزی سے آگے بڑھایا جا سکتا ہے۔ اور پیداواری صلاحیت بڑھائی جا سکتی ہے۔ نیز صلاحیت سے بھرپور استفادہ کیا جا سکتا ہے۔ اس کے بعد ہی عوام کا معیار زندگی بلند ہو سکتا ہے اور ان کی قوت خرید مستحکم ہو سکتی ہے۔ آج کمپیوٹر صنعت، تجارت، بینکنگ، تعلیم، خلائی پروگرام، موسمیات غرضیکہ زندگی کے ہر شعبے میں مقبول سے مقبول تر ہوتا جا رہا ہے۔

(ایڈیٹر)

پریم پال اشک

بھارت کا دسواں بین الاقوامی فلمی میلہ

فلم آج کے دور کا مقبول ترین میڈیا بن گیا ہے، جس کے ذریعے ہم سماجی، تہذیبی اور تمدنی اعتبار سے کافی حد تک مستفیض ہو سکتے ہیں۔ فلمی میلے منعقد کرنے کا بنیادی مقصد یہی ہوتا ہے کہ ہم ایک پلیٹ فارم پر یکجا ہو کر دُنیا کی مختلف اقوام کی سماجی، تہذیبی اور تمدنی زندگی اور اُن کی اعلیٰ اور ارفع سماجی اور اخلاقی قدروں کی جھلک دیکھ سکیں، ایک دوسرے کے مسائل کو اپنی آنکھوں سے دیکھیں اور اُن پر تبادلۂ خیال کرتے ہوئے انھیں سمجھنے کی کوشش کریں۔ اور پوری دُنیا کو ایک کنبہ تصور کرتے ہوئے ہم ایک دوسرے کے سُکھ دُکھ میں شریک ہو سکیں۔ اسی تصور کو مدِ نظر رکھتے ہوئے وسودھیو کٹم بکم "دُنیا ایک کنبہ" کو میلے کا بنیادی نعرہ قرار دیا گیا ہے۔ قصہ کوتاہ دُنیا کے دیگر مختلف ممالک میں منعقد ہونے والے فلمی میلے دنیا بھر کے عوام کو ایک دوسرے کے قریب لانے میں معاون ثابت ہوتے ہیں لیکن تو دُنیا میں پہلا بین الاقوامی فلمی میلہ ۱۹۳۲ میں منعقد ہوا تھا۔ مگر بھارت میں پہلا بین الاقوامی فلمی میلہ ۱۹۵۲ میں بمبئی میں لگا تھا۔ یہ غیر تقابلی فلمی میلہ تھا۔ اس کے بعد دوسرا بین الاقوامی فلمی میلہ ۱۹۶۱ میں، تیسرا ۱۹۶۵ میں، چوتھا ۱۹۶۹ میں، پانچواں ۱۹۷۵ میں، چھٹا ۱۹۷۷ میں، ساتواں ۱۹۷۹ میں، آٹھواں ۱۹۸۱ میں، نواں ۱۹۸۳ میں منعقد ہوا تھا اور یہ دسواں بین الاقوامی فلمی میلہ حال ہی میں بخوبی تمام ہوا۔ صرف پہلا فلمی میلہ بمبئی میں منعقد ہوا۔ اس کے بعد تمام فلمی میلے نئی دلی میں لگائے گئے۔ پہلے دو فلمی میلے غیر تقابلی تھے۔ اس کے بعد ۱۹۶۵ سے تقابلی فلمی میلے شروع کیے گئے۔ ۱۹۷۵ سے یہ طے پایا کہ ایک سال غیر تقابلی فلمی میلہ فلم اُتسو کے زیر عنوان ملک کے مختلف فلم مراکز میں منعقد کیا جائے اور دوسرے سال تقابلی فلمی میلہ نئی دلی میں لگایا جائے۔ علاوہ ازیں ۱۹۶۵ میں پیرس کی انٹرنیشنل فیڈریشن آف فلم پروڈیوسرز ایسوسی ایشن (آئی۔ ایف۔ ایف۔ پی۔ اے) نے اسے کلاس بین الاقوامی فلمی میلے کا درجہ عطا کیا۔ اس طرح ہمارا یہ بین الاقوامی فلمی میلہ برلن، کانز، وینس، کارلو ویری اور ماسکو کے فلمی میلوں Mascow Carlovary Venice Cannes Berlin) کی صف میں شامل ہو گیا۔

دسواں بین الاقوامی فلمی میلہ ۳ جنوری ۱۹۸۵ سے ۱۷ جنوری ۱۹۸۵ تک معمول کے مطابق نئی دلی میں منعقد ہوا۔ اس بار اس میں دُنیا کے ۷۰ سے زیادہ ممالک نے شرکت کی اور اُن کی سوا تین سو سے زائد فلمیں دکھائی گئیں۔ ان میں ڈھائی سو سے زائد فیچر اور ۸۰ سے زائد مختصر اور دستاویزی فلمیں شامل تھیں، جب کہ پچھلی بار ۱۵ ممالک نے شرکت تو کی تھی مگر اُن کی صرف دو سو فلمیں ہی دکھائی گئی تھیں۔ اس بار پاکستان، ترکی، ایران، افغانستان، عراق، ہنگری، تنزانیہ اور ہانگ کانگ نے شرکت نہیں کی۔

پچھلے بین الاقوامی فلمی میلے کے مقابلے میں اس بار تین زائد سیکشن کھولے گئے تھے۔ پچھلی بار سات سیکشن کھولے گئے تھے۔ اس بار دستاویزی اور مختصر فلموں کے لیے ڈاکو میڈیا کے عنوان علیحدہ سیکشن کھولا گیا۔ اس کے علاوہ لاطینی امریکہ کے ممالک کی نمائندگی کے لیے پہلی بار نیا سیکشن قائم کیا گیا۔ اور اس کے ساتھ ہی انڈین ری ٹرا سپیکٹو INDIAN RETRASPECTIVE کا نیا سیکشن بھی چالو کیا گیا۔

مقابلہ سیکشن میں ۲۷ فیچر اور سات شارٹ فلمیں دکھائی گئیں۔ اس میں دُنیا کے جن ممتاز ہدایت کاروں کی فلمیں شامل تھیں، اُن میں دُنیا کے ممتاز اور عہد آفریں فرانسیسی فلم ڈائریکٹر تروفوٹ TRUFAUT، اٹلی کے وسکانیٹی، VISCONTI کنّاڈا کے الیگزینڈر کورڈا، ALEXANDERCORDA روس کے نکیتا میخالوف NIKITA MEKALOV جاپان کے اماموُرا، IMNAMORA بھارت کے ستیہ جیت رے SATYAJIT RAY خواجہ احمد عباس، گوبند نہالنی، تاپن سنہا، شوامی گنیش، پوتانا کانیگل POTTAWA KANNAGEL مغربی جرمنی کے ورنر ہارزوگ، WERNER HERZOG مصر کے علی عبدالخلیل۔ احمد یحییٰ، یو۔ کے جیمز آئیوری JAMES AVORY ہنگری کے زولٹن فابری ZOLTAN FEBRI سویڈن کے انگمار برگمن INGMAR BERGMAN، سری لنکا کے چندرنا رتنم اور بنگلہ دیش کے سی بی۔ زمان، کی فلمیں دکھائی گئیں۔ انڈین ری ٹرا سپیکٹو میں خواجہ احمد عباس، تاپن سنہا

شرامی گھنیشس، اور پوتانا کا نیکل کی سات سات فلمیں دکھائی گئیں۔ علاوہ ازیں انڈین پینوراما میں اصول پالیکر، مہیش بھٹ، کمار شاہنی، پرکاش جھا، کیتن مہتہ، گریش کارنارڈ، ونہلکی، کے۔ بالاچندر (تامل)، اڈور گوپالا کرشنن، کے۔ جی۔ جارج، آئی۔ وی۔ سسی اور پی۔ جی۔ مینن (ملیالم)، سروت ڈے (بنگالی)، منموہن مہاپاتر (اڑیہ) اور آر دھیننکد بھٹا چاریہ (کھاسی) کے نام فخر سے لیے جا سکتے ہیں۔ اس بار کھاسی فلم پہلی بار دکھائی گئی۔

پچھلے میلے کے مقابلے میں اس بار کا ہمارا مارکیٹنگ سیکشن بھی کچھ کم کامیاب نہیں رہا۔ اس بار بھارت کی اسّی اور غیر ملکی تیس فلمیں خریدی گئیں۔ اس کے ساتھ ہی فرانس اور بھارت کے ساتھ ایک معاہدہ بھی ہوا جس کے تحت بھارت اور فرانس اپنے اپنے ممالک کی بیس بیس فلمیں خریدیں گے اور بھارت اور فرانس کے اشتراک سے فلمیں تیار کی جائیں گی۔

دسویں بین الاقوامی فلمی میلے میں متعدد سیمنار منعقد ہوئے۔ ایک سیمنار دستاویزی فلموں پر ہوا جس میں دستاویزی فلموں کی اہمیت اور افادیت پر روشنی ڈالی گئی تھی۔ دوسرا سیمنار اٹلی کے مایہ ناز ہدایت کار روسکا نیٹی اور اُس کے فن پر منعقد ہوا اور اس طرح اس عہد آفرین فلمی ہستی کو خراج عقیدت پیش کیا گیا۔ ایک سیمنار لاطینی امریکہ اور سیاہ امریکہ کی فلموں کی اہمیت اور افادیت اور اُن کے سماجی مسائل پر منعقد ہوا۔ ایک اور سیمنار میں ہندوستانی سینما۔ ٹی۔ وی اور ویڈیو الیکٹرانک عہد میں فلم فوٹوگرافی اور ویڈیو اور سینما دوست یا دشمن کے موضوعات کا احاطہ کیا گیا تھا۔ اتنے بھاری بھرکم سیمینار اب تک کسی بھی ہندوستانی بین الاقوامی فلمی میلے میں منعقد نہیں ہوئے تھے۔ اس طرح ہندوستانی اور غیر ملکی فلم سازوں، ہدایت کاروں اور فلم نقادوں کو آپس میں مل بیٹھ کر تبادلۂ خیال کرنے اور اپنا تجزیہ خود کرنے کا نادر موقع مل گیا۔

بھارت کے اس بار کے بین الاقوامی فلمی میلے میں روس کے مشہور ہدایت کار ایلڈار ریزانوف (ELDEHLYE ZANOW) کی فلم روتھ لیس رومانس RUTHLES ROMANCE اور یو۔ کے۔ ممتاز ہدایت کار اور فلم ساز جیمز ایوری اور اسمٰعیل مرچنٹ کی فلم بوسٹونینز BOSTONIAWS کو مشترکہ طور پر طلائی مور عطا کیا گیا۔ ان دونوں فلموں کو بھارت کے دسویں بین الاقوامی فلمی میلے کی بہترین فلمیں قرار دیا گیا۔ بہترین ہدایت کاری کے لیے جاپان کے شہرۂ آفاق ہدایت کار ساداؤ ناکا جیما SADAO NAKAJEMA کو اُن کی فلم اپاشونیٹا Appassionate پر نقرئی مور کے اعزاز سے سرفراز کیا گیا۔ بہترین ایکٹنگ کے لیے ایکٹروں میں برازیل کے ایکٹر کارلوس ویریزا کو اُن کی فلم "میموریز آف پریزن" MEMORIES OF PRISON پر نقرئی مور اور بہترین ایکٹریس کے لیے یو۔ کے۔ کی دو ایکٹریسوں میڈلین پوٹر MADELEINE POTTER اور وانیسا ریڈگریو VANESSA REDGRAVE کو اُن کی فلم بوسٹونینز BOSTONIANS پر مشترکہ طور پر نقرئی مور کا اعزاز عطا کیا گیا۔

اس فلمی میلے کی اہمیت اور افادیت اس لیے بھی بڑھ گئی ہے کہ اس بار بین الاقوامی فلم نقادوں کی انجمن FIPRESCI نے پہلی مرتبہ انٹرنیشنل کریٹک ایوارڈ دو فلموں پر عطا کیا۔ یہ ایوارڈ اڈور گوپالا کرشنن کو اُن کی ملیالم فلم موکھم مکھم اور رومانیہ کے ممتاز ہدایت کار ڈان پیٹا کو اُن کی فلم کانسٹیٹ پر دیے گئے۔ اس گرانقدر اعزاز عطا کیے جانے کا فیصلہ کرنے والی جیوری کے سربراہ بین الاقوامی شہرت کے مالک اور بلند پایہ فلم نقاد مارسیل مارٹن تھے۔ وہ MARCEL MARTIN کے جنرل سکریٹری ہیں۔

اس فلمی میلے کی شان اور دوبالا ہو گئی جب دلّی فلم جرنلسٹ ایسوسی ایشن نے بھی اپنی طرف سے ایک اعزاز دیے جانے کا اعلان کیا۔ ایسوسی ایشن نے برازیل کی فلم "میموریز آف پریزن" کو بہترین فلم قرار دیا اور یہ اعزاز اس فلم کے ڈائریکٹر نیلسن پریرا ڈوس سانتوس کو عطا کیے جانے کا اعلان کیا گیا۔

اس بار دسویں بین الاقوامی فلمی میلے کا جیوری کا خصوصی اعزاز ہنگری کی فلم پاسنگ فینسی PASSING FANCY پر اُس کے ڈائرکٹر گیولامار GYULAMAAR کو نقرئی مور عطا کیا گیا۔

فیچر فلموں کے علاوہ شارٹ فلموں میں طلائی مور کا اعزاز کناڈا کی فلم "نرکی شیشٹی" پر اس کے ہدایت کار نارمن میکلیرن NORMAN MELAREAV اور نقرئی مور بنگلہ دیش کی فلم "آگامی" پر اُس کے نوجوان ہدایت کار مشہور ذوالاسلام کو عطا کیا گیا۔

بھارت کے پچھلے بین الاقوامی فلمی میلے میں فلم ڈیلیگیٹوں، نقادوں، عوام، حتیٰ کہ جیوری کے ممبروں کو بھی غیر معیاری فلموں کی شکایت تھی۔ لیکن اس بار تمام فلموں کا معیار بہتر رہا۔ اور اس بار خاص بات یہ دیکھنے میں آئی کہ سیزن ٹکٹ کی بکنگ سے قبل نیشنل فلم ڈیولپمنٹ کارپوریشن نے کتابچے شائع کر دیے جس سے عوام کو اپنی پسند کی فلمیں منتخب کرنے کا موقع مل گیا۔ علاوہ ازیں فلمی میلے کے لیے منتخب کمیٹی نے عوام کی پسند کو مدِنظر رکھتے ہوئے ہر معیار کی فلموں کا انتخاب کیا۔ اور اس میں کافی فراخ دلی سے کام لیا گیا۔ ان میں اس عہد کے ممتاز فلم ڈائرکٹر ورنر ہارزوگ کی خوبصورت فلم ویئر دی گرین آنٹس ڈریم WHERE THE GREENANTS DREAM. بھی دکھائی گئی۔ ان میں دستاویزی نما فیچر فلمیں

بھی شامل تھیں۔ اور رومانی، سماجی، جنیاتی، تاریخی، سیاسی، جنگی اور تشدد سے بھرپور، ایکشن سے پُر، مار دھاڑ کی فلمیں بھی شامل تھیں۔ تماشائیوں کے موڈ اور مزاج کو مدِنظر رکھتے ہوئے آئس لینڈ کی تشدد آمیز فلم "دی ریوینز فلائز" WHEN THE RAVEN FLIES۔ رومانیہ کی چونکا دینے والی زور دار سیم جوئی تکنیک پر مشتمل فلم کا سٹیٹ اور پیرو کی ٹوپک امارو CONTEST TUPAC AMARU جیسی عمدہ اور بے پناہ فلمیں بھی دیکھنے کو ملیں۔

پچھلی مرتبہ کی طرح اس بار ایک خاص بات یہ دیکھنے میں آئی کہ عوام کے ساتھ غیر ملکی ڈیلی گیشنوں نے انڈین پینوراما کی فلموں میں خصوصی دلچسپی دکھائی۔ صفِ اوّل کے نقاد اور فلم نقادوں کی بین الاقوامی انجمن کے جنرل سکریٹری مارسیل مارٹن نے کمار شاہنی کی فلم ترنگ کیتن مہتہ کی "ہولی"، گوبند نہلانی کی فلم "پارٹی" اور آدور گوپالا کرشنن کی فلم "موکھم موکھم" میں خصوصی دلچسپی دکھائی اور ان فلموں کے ذریعے انھوں نے اپنے یہاں کے سماجی اور سیاسی مسائل کا تقابلی مطالعہ بھی کر لیا۔

اس بار لاطینی امریکہ اور دستاویزی فلموں کے نئے سیکشن کھولے گئے۔ اس میں دستاویزی اور مختصر فلموں کی اہمیت اور افادیت پر زور دیا گیا۔ اور دوسری طرف تیسری دنیا کے سماجی مسائل کو اپنے طور پر سمجھنے کے لیے لاطینی امریکہ کا خصوصی سیکشن کھولا گیا۔ اس میں لاطینی امریکہ کی فلموں کی بھرپور نمائش کی گئی۔ لاطینی امریکہ کی نمائندگی برازیل، پیرو، چلی، وینزویلا، میکسیکو، نکاراگوا، کیوبا اور ایل سلواڈور نے کی۔ علاوہ ازیں سیاہ امریکی ممالک کی فلمیں ۱۶ ایم۔ ایم کے سیکشن میں دکھائی گئیں۔

یوں تو دسواں بین الاقوامی فلمی میلہ ختم ہو چکا ہے۔ لیکن جب تک اپنا محاسبہ خود نہ کیا جائے کوئی ملک، قوم یا فرد ترقی کی شاہراہ پر گامزن نہیں ہو سکتا۔

اس فلمی میلے کے دوران کئی مقامات سے مختلف آوازیں اٹھی ہیں۔ کہیں یہ شکایت ہے کہ اس بار بھی فلموں کا معیار پست تھا۔ کہیں یہ کہا جا رہا ہے کہ فلمی میلے نئی دلّی کے بجائے کسی اور مقام پر منعقد کئے جائیں اور کہیں مقابلہ سیکشن ختم کئے جانے کی بات کی جا رہی ہے۔

جہاں تک فلموں کے معیار کا سوال ہے، یہ بات پورے وثوق اور ذمے داری سے کہی جا سکتی ہے کہ اس بار مقابلہ اور انفارمیشن دونوں سیکشنوں کی فلموں کا معیار پہلے سے بدرجہا بہتر تھا۔ لیکن میں تو یہ کہوں گا کہ اس فلمی میلے کو معیاری فلموں نے ہی ناکام ہونے سے بچایا ہے۔ اس میں جہاں ہمیں ڈریم اسکیپ جیسی باکس آفس پر سپرہٹ امریکی فلم دیکھنے کو ملی وہاں ہم نے فرانس کی فرینکسٹ ٹیشن جیسی دلچسپ کامیڈی فلم بھی دیکھی۔ روس کی فلم "لیو ٹالسٹائے"۔ پولینڈ کی فلم "کرائم اینڈ پنشمینٹ"۔ کیوبا کی "اپ ٹو اے پوائنٹ"۔ برازیل کی "میموریز آف پریزن" مغربی جرمنی کی "ویر گرین آئلنس ڈریم"۔ جاپان کی فلم "ایاشونا ٹا"۔ پیرو کی "ٹوپک امارو"۔ آسٹریلیا کی "سلور سٹی" اور مدراس کا نٹی اور امام راکی لاجواب خوبصورت، معیاری اور اعلیٰ اور ارفع سماجی اور حامل فلمیں بھی دیکھنے کو ملیں۔ ان میں اداکاری کا اعلیٰ معیار بھی برقرار رکھا گیا اور موضوع اور ہیئت دونوں کے چونکا دینے والے تجربے بھی کئے گئے تھے۔

اس فلمی میلے کے دوران ایک خاص بات یہ ضرور دیکھنے کو ملی کہ ہمارے سماجی اور سیاسی مسائل اور دنیا کے دیگر سماجی اور سیاسی مسائل مشترک ہیں۔ خاص طور پر کوریا، جاپان، مصر، سیریا، آئس لینڈ، چین کی فلموں کا انداز کم و بیش ہماری فلموں جیسا ہی ہوتا ہے اور اخلاقی معیار تو سب کے یکساں ہی ہوتے ہیں۔

ایک بات اور بھی توجہ طلب ہے۔ پچھلے فلمی میلے میں کوئی بھی فلم طلائی مور کے قابل تصور نہیں کی گئی تھی۔ معیار کی پستی کا اعتراف جیوری کے ممبروں نے بھی کیا تھا۔ لیکن اس بار کے دسویں بین الاقوامی فلمی میلے میں دو فلموں کو طلائی مور عطا کئے گئے اور ایک ہی فلم کی دو ایکٹرسوں کو مشترکہ طور پر بہترین اداکاری کے اعزازات بھی عطا کئے گئے۔ اس بار جیوری کے ممبروں کو بہترین فلموں کے انتخاب میں کافی تردّد کرنا پڑا تھا اس کے علاوہ اس بار دو فلموں پر انٹرنیشنل کریٹکس ایوارڈ "بین الاقوامی ناقدین کا اعزاز" اور دلّی فلم جرنلسٹس ایسوسی ایشن کی طرف سے ایک فلم کو اعزاز دئے جانے کا اعلان بھی ہمارے اس موقف کی بخوبی تائید کر دیتا ہے۔ لہٰذا ان حالات میں کیسے کہا جا سکتا ہے کہ فلموں کا معیار پست تھا۔ البتہ تشدد آمیز فلموں کے سدِّباب اور عوام کو جنسی پراگندگی سے بچانے کی ذمے داری سنسر بورڈ پر عائد ہو جاتی ہے۔ اس مسئلے کا حل یہی ہے کہ جہاں ہمارا سنسر بورڈ ایک طرف تو تشدد کے مناظر کے تئیں شدید رویّہ اختیار کرے، وہاں جنسی مناظر کے تئیں نرم گوشہ بھی ہونا چاہیئے۔ معترضین کی دوسری شکایت میں بھی کوئی وزن نظر نہیں آتا کہ بین الاقوامی فلمی میلے آئندہ نئی دلّی کے بجائے کسی غیر معروف مقام پر ہونے چاہئیں۔ نئی دلّی میں فلمی میلے کے انعقاد کے سلسلے میں تمام سہولیات فراہم ہیں۔ یہاں ڈیلی گیٹوں کے قیام و طعام کا بندوبست بخوبی ہو جاتا ہے نئی دلّی چونکہ پورے ہندوستان کا دل ہے اس لیے دنیا کے تمام ممالک سے سماجی اور سیاسی رشتے اُن کے سفارت خانوں کے ذریعے یہیں استوار اور ہموار ہوتے ہیں اور ڈیلی گیٹ بھی اپنے سفارت خانوں سے بخوبی رابطہ قائم کر سکتے ہیں اور عوام کشادہ سینما گھروں میں اپنی پسند کی فلمیں بھی دیکھ سکتے ہیں اور اگر یہی فلمی میلے

کیسی دُور دراز اور غیر معروف مقام پر منعقد ہوں تو مذکورہ تمام سہولیات کا تو محض خواب ہی دیکھا جاسکتا ہے۔ لہٰذا ان امور کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ہمارے بین الاقوامی فلمی میلے آئندہ بھی نئی دلّی ہی میں منعقد ہونے چاہئیں۔
البتہ ایک امر کی طرف توجہ دلانی ضروری ہے کہ اس بار عوام کو فلم ڈیلی گیٹوں، جیوری کے ممبروں اور پریس سے دُور دُور ہی رکھا گیا جبکہ پہلے یہ بات نہ تھی۔ پہلے عوام بھی وگیان بھون میں منعقدہ فلمی میلے کی فلمیں ڈیلی گیٹوں، پریس اور جیوری کے ممبروں کے ساتھ دیکھتے تھے اور انھیں تبادلۂ خیال کرنے اور وہاں کی فلم بندی کی تکنیکیں سمجھنے کا موقع بھی مل جاتا تھا۔ لیکن اس بار یہ کمی بار بار محسوس ہوتی رہی۔ لیکن مقابلے کی فلمیں مختلف سینما گھروں میں دکھایا جانا ایک صحت مند قدم تھا۔ میرے خیال میں آئندہ بھی مقابلے کی فلمیں دوسرے سینما گھروں کے علاوہ بھی عوام کو وگیان بھون میں بھی دکھائی جانی چاہئیں تاکہ فلم اور سماج کے درمیان رشتے مزید ہموار اور استوار ہو سکیں۔

اب رہی بات مقابلے کی فلمیں بند کرنے کی تو میری رائے میں تو یہ کسی بیمار ذہن ہی کی اُپج ہو سکتی ہے۔ صحت مند ذہن کبھی مقابلے سے نہیں ڈرتا۔ آخر مقابلے سے خوف زدہ ہونے اور اپنا محاسبہ کرنے سے گھبرانے کی کیا ضرورت ہے۔ دراصل مقابلے کے ذریعے ہی ہم خوب سے خوب تر کی منزل تلاش کر سکتے ہیں اور اگر ہمارے یہاں مقابلے کی فلمیں کمزور آتی ہیں تو اس کا ذمے دار کون ہے ہم خود یا مقابلہ سیکشن۔ ظاہر ہے اگر آئینہ ہمیں ہی دیکھنا پڑے تو صاحب کو دل نہ دینے پر مجبور کیوں نہ ہو۔ مثلاً اگر ہمارے صفِ اول کے ممتاز اور اعلیٰ ہدایت کار ہی اپنے ملک کے فلمی میلوں میں اپنی فلمیں داخل کرنے سے گریز کریں اور ترجیح دوسرے ملکوں کے فلمی میلوں کو دیں تو معیار بلند کون کرے گا۔ جب ہم ہی خود کو کم تر سمجھیں گے تو دوسرے ہمیں کیونکر خاطر میں لائیں گے۔
ضرورت اس بات کی ہے کہ اگر ہمارے صفِ اول کے ہدایت کار، ہمارے اپنے فلمی میلوں میں جیوری کے ممبر بننے یا چیرمین نامزد ہو کر آنے کا حق رکھتے ہیں تو اُن پر یہ اخلاقی ذمے داری بھی عائد ہو جاتی ہے کہ وہ اپنی فلمیں ہمارے کسی نہ کسی فلمی میلے میں دکھانے کی پیشکش کیا نہ کریں۔ بلکہ انھیں مقابلے میں شامل کرنے کے لیے بھی بھیجیں۔ تبھی ہمارا مقابلے کا معیار بہتر ہوگا۔

اس طرح ایک خوشگوار کیفیت یہ رونما ہوئی کہ اس بار میلے کا افتتاح فلمی دُنیا کی عہد ساز شخصیت دلیپ کمار نے کیا اور اعزازات مختلف فلمی ہستیوں نے بھی عطا کئے۔ اس سے فلمی میلے کا موڈ اور مزاج واقعی فلمی میلے کا سا ہو گیا۔ یہ امور اس کے ترجمان ہیں کہ ہمارا دسواں بین الاقوامی فلمی میلہ پہلے سے بہتر کامیاب رہا۔ اُمید ہے ہمارا گیارہواں بین الاقوامی فلمی میلہ ہمارے لیے نئی چنوتیاں لے کر آئے گا۔ جنھیں ہم خندہ پیشانی کے ساتھ قبول کرتے ہوئے کامیاب و کامران ہوں گے۔

*

بقیہ: شریانِ قلب کا مرض اور اس کا علاج

کی اپنی اپنی ضرورت ہے۔
۳۔ تناؤ پر کنٹرول۔
تناؤ پر قابو پانا یا اس میں کمی کرنا ضروری ہے۔ اس کے لیے سادہ طرزِ زندگی کو اختیار کرنا چاہیئے۔ ہفتہ مختصر کر کام کاج سے فراغت پائی جائے۔ باقاعدہ چھٹیاں لی جائیں۔ تفریح طبع کے لیے زیادہ وقت نکالا جائے۔ فراغت کے سرگرم مشاغل اختیار کیے جائیں۔ ذہن کو آرام پہنچانے والی ورزشیں، یوگ اور دھیان وغیرہ کو عمل میں لایا جائے اس سے جسم اور ذہن کو آرام ملتا ہے جو نہایت مفید ہے۔

۴۔ ادویاتی علاج
شریانِ قلب کے مرض کے علاج کے لیے ادویات اکثر ضروری ہیں۔ مختصر وقت کے لیے فوری فائدہ حاصل کرنے کے لیے نائٹروگلیسرین جیسے نائٹریٹ ڈاکٹر کے مشورے اور نسخے کے تحت استعمال کیے جاتے ہیں۔ طویل مدتی فائدہ کے لیے "بیٹا بلاکرز" "کیلشیم بلاکنگ" ادویات اس وقت استعمال کی جاتی ہیں۔ ان ادویات کی ضرورت اور اُن کی ضروری مقدار ایک مریض سے دوسرے مریض کے لیے مختلف ہے اور اس کا بہترین فیصلہ آپ کا ڈاکٹر ہی کر سکتا ہے۔ یہ بہت اہم ہے کہ آپ ڈاکٹر کی رائے پر چلیں کہ کب اور کتنی دوائی لی جائے۔ اگر بہت سی ادویات استعمال کی جاتی ہیں تو اس کے لیے ایک پروگرام مرتب کرنا ضروری ہو سکتا ہے۔ تاکہ آپ کو گھبراہٹ نہ ہو اور آپ کوئی دوائی چھوڑ نہ دیں۔

انجائنا کی سرجری

انجائنا کے علاج کا مقصد یہ ہے کہ قلبی عضلے کو خون کی سپلائی میں بہتری ہو۔ عام طور پر یہ مقاصد طرزِ زندگی میں تبدیلیاں لا کر اور ادویات کے ذریعے پورے کیے جاتے ہیں۔ لیکن اگر ان سے فائدہ نہ ہو اور انجائنا متواتر روزمرہ کی زندگی میں مخل ہوتا رہے تو سرجری پر غور کیا جانا چاہیئے اور نتیجہ بالکل تسلی بخش ہو سکتا ہے۔ سرجری کا امکان متعدد امور پر جن میں دل کی مجموعی حالت شامل ہے، انحصار کرتا ہے۔

*

پروفیسر ایم۔ ایل بھاٹیہ

شریانِ قلب کا مرض اور اس کا علاج

شریانِ قلب کا مرض دل کا ایک مرض ہے جو قلبی شریانوں کے مرض کے نتیجے میں ہوتا ہے۔ یہ بھارت میں جسمانی معذوری اور اموات کا ایک اہم سبب ہے۔ اِس مضمون میں فاضل مصنف نے "انجائنا" اور "ہارٹ اٹیک" کے طبی پہلوؤں اور علاج و معالجے کے بارے میں بحث کی ہے جو شریانِ قلب کے مرض سے پیدا ہوتا ہے۔

مرضِ قلب ہمارے ملک میں جسمانی معذوری اور اموات کا اہم سبب ہے اندازہ ہے کہ بھارت میں جتنی اموات کا اندراج ہوتا ہے اُن میں ۵ فیصد سے زیادہ امراضِ قلب سے ہوتی ہیں اور کہ ۱۹۷۸ میں ۶۷۳۶۲۵ ہندوستانی امراضِ قلب سے ہلاک ہوتے ہیں۔ موت کا یہ فیصد تمام زمروں کے کینسر سے زیادہ ہے جو ۲ء۲ فی صد ہے۔

امراضِ قلب کی بیشتر اقسام ہیں۔ ان میں سے ایک شریانِ قلب کا مرض ہے یعنی دل کا وہ مرض جو قلبی شریانوں کے مرض کے نتیجے میں ہوتا ہے۔ قدامت پسند تخمینوں کے مطابق ہمارے ملک کی عام آبادی میں ۳۰ برس سے زیادہ عمر کے ۲ء۵ فیصد لوگوں میں یہ مرض پھیلا ہوا ہے۔ اگر یہ ایسا ہے تو خطرے والا گروپ ۱۳ کروڑ ۹۹ لاکھ افراد پر مشتمل ہے جن میں سے ۳۴ لاکھ ۳۰ ہزار کو یہ مرض ہے۔ آبادی میں اضافے کے بارے میں جو اندازہ لگایا جا رہا ہے اُس کے حساب سے ۲۰۰۰ء میں ایسے افراد کی تعداد ایک کروڑ ۱۰ لاکھ ۳۰ ہزار ہو جائے گی جو واقعی بہت بڑی تعداد ہوگی۔ تمام بھارت میں ڈاکٹروں کی طرف سے اس مرض کے تیزی سے بڑھتے ہوئے جو مریض دیکھے جا رہے ہیں اُن کے پیشِ نظر یہ تعداد بہت زیادہ ہو سکتی ہے۔

شریانِ قلب کا مرض قلبی شریانوں کی بیماریوں کے نتیجے میں ہوتا ہے۔ قلبی شریانیں خون کی وہ رگیں ہیں جو دل کو آکسیجن اور دیگر ضروری غذائیت فراہم کرتی ہیں۔ دل بنیادی طور پر ایک کھوکھلا پمپ ہے جو سکڑ کر اور پھیل کر سارے جسم میں خون پہنچاتا ہے اور اس طرح تمام اعضا اور خلیوں کو غذائیت فراہم ہوتی ہے۔ خون دل سے شریانوں کے ذریعہ باہر جاتا ہے اور رگوں کے ذریعے اس میں واپس آتا ہے۔ جب خون دل کے باہر جاتا ہے تو وہ جس پہلی شریان میں سے گزرتا ہے وہ اورٹا (AORTA) کہلاتی ہے۔ اور قلبی شریانوں کی شاخیں اُس میں سے نکلتی ہیں۔ شریانیں دل کے گرد لپٹی ہوتی ہیں اور قلبی عضلے کے ہر حصے میں خون لے جاتی ہیں۔

شریانِ قلب کے مرض کا سبب

بیشتر امراض قلبی شریانوں پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ ان میں سے شریانوں کا سخت ہو جانا عام ترین سبب ہے جو ۹۰ فیصد سے زیادہ قلبی شریانی مرض کے لیے ذمہ دار ہے۔ وقت پا کر چربی دار مواد (خصوصاً کولیسٹرول) موم جیسی دکھائی دینے والی چربی جو عام طور پر حیوانی چکنائیوں، تیلوں، انڈے کی زردی اور بیشتر دیگر غذاؤں میں موجود ہوتی ہے، شریانوں کی اندرونی دیواروں میں جم جاتی ہے۔ وہ چپکنے جانا شروع کر دیتے ہیں۔ یہ عمل اوائل عمر میں شروع ہو جاتا ہے اور زندگی بھر رفتہ رفتہ بڑھتا ہے۔ جب اس طرح شریان کا اندرونی راستہ کافی (۵۰ فیصد یا زائد) تنگ ہو جاتا ہے تو اس شریان سے خون کے بہاؤ میں نمایاں کمی ہو جاتی ہے اور قلبی عضلے میں جانے والے خون کا بہاؤ متاثر ہوتا ہے۔ اس کے نتیجے میں شریانِ قلب کا مرض ہو جاتا ہے۔

خطرے کے اسباب

شریانِ قلب کے مرض کے اسباب کے بارے

له صدر شعبہ امراضِ قلب

پوجا، نئی دہلی

میں ابھی بہت کچھ جاننے کی ضرورت ہے۔ دوسرے الفاظ میں شریانوں کے سخت ہوجانے کے اسباب کے بارے میں جو معلومات دستیاب ہوئی ہیں اُن سے پتہ چلتا ہے کہ کسی شخص کے پس منظر یا طرزِ زندگی میں بعض امور ایسے ہیں جن سے شریانِ قلب کے مرض کے زیادہ بڑھ جانے کا امکان پیدا ہوجاتا ہے، یہ خطرے کے اسباب کہلاتے ہیں۔

خطرے کے ایسے بیشتر اسباب کی نشاندہی کی گئی ہے۔ عام طور پر معلوم ہوتا ہے کہ خطرے کے کسی خاص ایک سبب کے بجائے خطرے کے متعدد اسباب کے یکجا ہوجانے سے کسی شخص کے قلبی شریانی مرض میں مبتلا ہونے کے امکانات بڑھ جاتے ہیں۔

خطرے کے بعض اسباب سے چھٹکارا نہیں پایا جاسکتا اور اس لیے اُن میں تبدیلی نہیں لائی جاسکتی۔ یہ خطرے کے ناقابلِ تغیّر اسباب کہلاتے ہیں جن میں مرضِ قلب کا خاندان سے تعلق، جنس مرد اور ۴۰ برس سے زیادہ عمر شامل ہے۔ زیادہ اہم قابلِ تغیّر اسباب ہیں جن پر قابو پایا جاسکتا ہے۔ یہ اکثر اس امر کا نتیجہ ہوتے ہیں کہ کسی شخص کی طرزِ زندگی کیا ہے، وہ کیا کچھ کھاتا ہے اور کیا کچھ کرتا ہے۔

ان میں سے بعض اہم اسباب درج ذیل ہیں:

- خون کا اعلیٰ دباؤ۔
- سگریٹ نوشی۔
- خون میں چربی (کولیسٹرول) کی سطح کا بڑھ جانا۔
- وزن کا زیادہ بڑھ جانا۔
- زندگی میں شدید تناؤ۔
- ایک ہی جگہ زیادہ تر بیٹھے رہنا۔

بلاشبہ ہر شخص جس میں چند یا یہ تمام امور ہوں گے، شریانِ قلب میں مبتلا نہیں ہوگا اور ممکن ہے کہ بعض لوگ جو شریانِ قلب کے مرض میں مبتلا ہوں اُن کے مرض کا سبب ان میں سے کوئی بھی نہ ہو۔ درحقیقت شریانِ قلب کے مرض میں مبتلا تقریباً ۵ فیصد لوگوں میں ایسے خطرے کے ایک یا زیادہ اسباب ہوتے ہیں۔ لیکن اس مرض میں مبتلا ہوجانے کا خطرہ بڑھ جاتا ہے اگر خطرے کے اسباب موجود ہوں اور خطرے کے جتنے زیادہ اسباب ہوں گے اُتنا ہی زیادہ مرض کا خطرہ ہوگا۔ خطرے کے اسباب کی یکجائی سے محض مرض کا خطرہ نہیں بڑھتا بلکہ یہ خطرے کئی گنا بڑھ جاتے ہیں۔

اگرچہ شریانِ قلب کے مرض کے بارے میں بہت کچھ معلوم ہوچکا ہے تاہم بہت کچھ ابھی معلوم نہیں ہوسکا۔ لیکن اس امر کی بڑی شہادت ملی ہے کہ خطرے کے اسباب کو کم کرکے مرض کو بڑھنے سے روکا جاسکتا ہے۔ ان احتیاطی تدابیر کو عمل میں لانے سے فائدہ پہنچ سکتا ہے۔

شریانِ قلب کا مرض کسی شخص پر کئی طرح سے اثر انداز ہوتا ہے۔ ہر مریض میں اس کا پتہ لگانے کے لیے کوئی معیاری نسخہ نہیں ہے لیکن وہ عام طریقے جن سے اس کی موجودگی محسوس کی جاتی ہے درج ذیل ہیں:

- انجائنا۔
- ہارٹ اٹیک (قلبی حملہ)
- دل کا بے قاعدگی سے کام کرنا۔
- ہارٹ فیل (دل کا کام بند کرنا)۔
- اچانک موت۔

ہارٹ اٹیک کے موضوع پر اس سلسلہ مضامین میں پہلے ہی بحث کی جاچکی ہے۔ اب ہم اس قلبی مرض کے دوسرے اہم پہلو پر بحث کریں گے جو انجائنا کہلاتا ہے جسے طبّی زبان میں "انجائنا پیکٹورِس" کہتے ہیں۔

انجائنا

انجائنا قلبی شریانی مرض کے متعدد ممکن نتائج میں سے ایک ہے۔ یہ نام اُس بے چینی کو دیا گیا ہے جو اُس وقت پیدا ہوتی ہے جب قلبی عضلہ عارضی طور پر کافی خون اور آکسیجن حاصل نہیں کرتا۔ جب قلبی عضلے کو ضرورت کے مطابق خون اور آکسیجن کی کافی سپلائی نہیں ہوتی۔ یہ بے چینی دل کے "عذاب کا اشارہ" ہے۔

انجائنا کی موجودگی

انجائنا کی موجودگی اکثر "درد" کہلاتی ہے، لیکن مختلف لوگ اسے مختلف طور پر محسوس کرسکتے ہیں۔ اس طرح اسے معمولی بے چینی، سینے میں ہلکے درد یا انتہائی تھکاوٹ کی صورت میں محسوس کیا جاسکتا ہے یا پھر کئی مریضوں کو بدہضمی ہوجاتی ہے اور وہ سینے، بالائی معدے اور گلے میں جلن، بھاری پن یا جکڑن محسوس کرتے ہیں۔ کسی کسی کو ہچکیاں آنے لگتی ہیں اور کئی اپنے بازوؤں اور خصوصاً بائیں بازو میں بھاری پن یا بوجھ سا محسوس کرتے ہیں۔ بعض مریضوں کو ایسا محسوس ہوتا ہے، جیسے ان کا دم گھٹ رہا ہو۔ ان کا دم اکھڑ جاتا ہے۔ یا وہ اپنے جبڑوں، مسوڑھوں، دانتوں، گلے میں یا گردن اور کندھوں کے درمیان درد محسوس کرتے ہیں۔

انجائنا کی بے چینی کا مقام اور اس کی شدت بھی ایک مریض سے دوسرے مریض میں مختلف ہوتی ہے۔ یہ ایک یا متعدد مقامات پر ہوسکتا ہے۔ یہ ایک مقام پر شروع ہوکر دوسرے مقامات تک جاسکتا ہے۔ انجائنا کا حملہ عموماً مختصر ہوتا ہے اور یہ ۲ سے ۵ منٹ تک رہتا ہے۔ اس کے حملے متعدد ہفتوں میں ایک بار سے لے کر دن میں کئی بار تک ہوسکتے ہیں۔

انجائنا کے حملے کی علامتیں ایک شخص سے دوسرے شخص میں مختلف ہوسکتی ہیں۔ ان بیشتر علامتوں میں دل کا کام کرنا مشکل تر ہوجاتا ہے۔ (دل کی دھڑکن اور خون کا دباؤ بڑھ جاتا ہے) اور اس طرح اس کی خون کی سپلائی کی ضرورت بڑھ جاتی ہے جو اس لیے پوری نہیں ہوسکتی کیونکہ شریانوں میں رکاوٹ کی وجہ سے خون کی گردش

میں کمی آجاتی ہے۔

بعض عام سرگرمیاں ایسی ہیں جو انجائنا کا باعث بن سکتی ہیں۔

- ورزش یا مشقت۔
- بھاری غذائیں۔
- اونچائی یا سیڑھی پر چڑھنا، یا سرد موسم میں اُس جانب چلنا جہاں سے تیز سرد ہوا آرہی ہو۔
- تناؤ، لڑائی، غصہ اور دیگر جذباتی حالات۔
- جنسی اختلاط۔
- اعلیٰ تر بلندیوں پر رہنا۔

انجائنا اور ہارٹ اٹیک میں فرق

انجائنا اور ہارٹ اٹیک ایک ہی چیز نہیں ہیں اگرچہ اس کا بنیادی سبب یعنی شریان قلب کا مرض دونوں کی حالت میں مشترک ہے۔ انجائنا خون اور آکسیجن کی اُس مقدار میں عارضی کمی کے باعث ہوتا ہے جو زیادہ تر قلبی شریان کے تنگ ہونے سے عمل میں آتی ہے۔ انجائنا کے حملے سے زندگی کو خطرہ پیدا نہیں ہوتا اور اس سے قلبی عضلے کے کسی حصے کو مستقل طور پر نقصان نہیں پہنچتا۔

اس کے برعکس دل کے کسی حصے کو طویل عرصہ تک (عام طور پر ۳۰ منٹ سے زیادہ) خون اور آکسیجن کی سپلائی مکمل یا تقریباً مکمل طور پر رک جانے سے ہارٹ اٹیک ہوتا ہے۔ اس عرصے کے بعد رکاؤ مکمل ہو جاتا ہے۔ قلبی عضلے کا جو حصہ اس طرح متاثر ہوتا ہے وہ مر جاتا ہے۔ ہارٹ اٹیک سے زندگی خطرے میں پڑ جاتی ہے۔

انجائنا اور شریان قلب کے مرض میں فرق

دونوں حالتوں میں علامتوں کی ہسٹری سے آغاز کیا جاتا ہے اور پھر جسمانی معائنہ کیا جاتا ہے۔ ہسٹری سے نہ صرف نہایت مفید معلومات فراہم ہوتی ہیں اور تشخیص میں مدد ملتی ہے بلکہ اس کی شدت یا ہونے والی معذوری اور دیگر موجود اسباب مرض کی نشاندہی بھی ہوتی ہے۔ ایسی ہسٹری میں نہ صرف مریض کے مسائل بلکہ مفصل خاندانی ہسٹری بھی شامل ہوتی ہے۔

جسمانی معائنہ بالتفصیل کیا جاتا ہے اور اس سلسلے میں وزن، خون کے دباؤ اور نبض کی پڑتال کی جاتی ہے۔ پھیپھڑوں اور دل کی دھڑکن کو سنا جاتا ہے اور اس سب سے عام صحت کی حالت اور قلبی مرض اور اس کی پیچیدگیوں کا تعین کیا جاتا ہے۔

تشخیص کے سلسلے میں کئی معائنے کئے جاتے ہیں۔ چنانچہ خون میں شکر، کولیسٹرول (چربی) اور دیگر کیمیکلوں کا پتہ لگانے کے لیے خون کے نمونے کا تجزیہ کیا جاتا ہے۔ دل کی جسامت معلوم کرنے کے لیے سینے کا ایکسرے کیا جاتا ہے۔ لٹا کر اور ورزش کرانے کے بعد "ای سی جی" کیا جاتا ہے۔ قلبی امراض جن میں قلبی شریانی مرض شامل ہے کی تشخیص کے لیے موخرالذکر معائنہ خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔

ورزش کے بعد جو "ای سی جی" کیا جاتا ہے، اُس سے پتہ چلتا ہے کہ دل پر ورزش کا کیا اثر ہوتا ہے۔ ممکن ہے کہ انجائنا کے بیشتر مریضوں کی حالت میں لٹا کر "ای سی جی" کرنے سے کسی تبدیلی کا پتہ نہ چلے لیکن ورزش کے بعد جو "ای سی جی" کیا جاتا ہے اُس سے خصوصی تبدیلیوں کا اظہار ہوتا ہے۔

دل کے تابکار آئی سوٹوپ معائنے سے پتہ چلتا ہے کہ دل کی ہر دھڑکن کے ساتھ "ہارٹ پمپ" کتنا خون چھوڑتا ہے اور اس سے دل کی جسامت، صورت اور سکڑن کا بھی پتہ چلتا ہے۔ اس سے شریان قلب کے مرض کے باعث اُن مقامات کو بھی دیکھا جا سکتا ہے جہاں خون کا بہاؤ کم ہوتا ہے۔

قلبی گراف اور قلبی انجیوگرافی (ایک تابکار مادے کا انجکشن دے کر خون کی رگوں کا ایکسرے لینا) سے صحیح طور پر پتہ چلتا ہے کہ اُن میں رکاوٹ کہاں ہے۔ یہ معائنہ ہمیشہ کرنے سے پہلے بائی پاس سرجری جیسا ایک جراحی عمل کیا جاتا ہے۔

قلبی امراض کا طبی علاج

۱۔ خطرے کے اسباب پر کنٹرول۔

خطرے کے اسباب پر کنٹرول لازمی ہے۔ خون کے اعلیٰ دباؤ پر ادویات کے ساتھ یا ادویات کے بغیر جیسا کہ ضروری ہو قابو پانا ضروری ہے۔ طرز زندگی اور غذا میں تبدیلیاں فائدہ پہنچاتی ہیں جیسے کہ غذا میں نمک کی کھپت کو کم کیا جائے اور اگر مریض کا وزن زیادہ ہے تو اس کا وزن گھٹایا جائے۔ سگریٹ نوشی خصوصاً مضر ہے یہ نہ صرف دل کے لیے خطرے کا ایک بڑا سبب ہے بلکہ اس سے انجائنا بھی بگڑ سکتا ہے۔ دل کی دھڑکن میں بے قاعدگی آتی ہے اور ہارٹ اٹیک کے بعد صحت یابی کے امکانات کم ہو جاتے ہیں۔ سگریٹ نوشی بند کرنے سے خرابی قدرے دور ہو سکتی ہے۔ سگریٹ نوشی ترک کرنے میں کبھی بھی مزید تاخیر نہیں کی جانی چاہیئے۔ یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ کوئی بھی سگریٹ محفوظ نہیں ہے۔

۲۔ غذائی کنٹرول۔

حراروں، چکنائی کی مقدار اور قسم اور نمک کے کھانے کے بارے میں کافی غذائی کنٹرول کیا جانا چاہیئے۔ بہت زیادہ چکنائی اور کولیسٹرول سے بچنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ چکنائی کے بغیر پکایا ہوا گوشت، مچھلی اور چکن کھائے جائیں۔ انڈوں اور کلیجی جیسے عضویاتی گوشت کی مقدار کم کی جائے۔ مکھن، کریم اور دیگر چکنائیوں کا استعمال محدود کیا جائے۔ تلا ہوا کھانا کم کھایا جائے، یا ترک کیا جائے۔ میز پر مزید نمک کا استعمال نہ کیا جائے۔ وزن کم کرنا مفید ہے اور اسے غذا پر کنٹرول کر کے اور مناسب ورزش کر کے کم کیا جا سکتا ہے۔ ورزش سے جسمانی کام کرنے کی صلاحیت بڑھتی ہے اور اس سے کم تناؤ پیدا ہوتا ہے اور جسم میں قوت مدافعت پیدا ہوتی ہے۔ ورزش کس مقدار اور کس قسم کی ہونی چاہیئے۔ اسے بہترین طور پر آپ کا ڈاکٹر ہی بتا سکتا ہے کیونکہ اس سلسلے میں ہر شخص

(باقی ص ۹ پر)

وسنت ساٹھے

معاشرتی انقلاب کی جانب

اقتصادی جمہوریت کا مقدمہ

پانچواں باب

مارکیٹنگ کی قومی تنظیم

قسط : ۱۴

مارکیٹنگ اقتصادی سرگرمیوں کی کلید ہے۔ اقتصادی سرگرمی کے اس وقت تک کوئی معنی نہیں جبکہ تیار کیے گئے سامان کے خریدار نہ ہوں اور اس کی مانگ نہ ہو اور جب تک لوگوں میں اس کے خریدنے کی سکت یا قوت نہ ہو! اقتصادیات کے کلاسیکی طریقوں میں یقین رکھنے والے اس بات میں یقین رکھتے ہیں کہ اقتصادی سرگرمیوں کو اگر اپنے حال پر رہنے دیا جائے تو مانگ اور اس کا اصول منڈی میں اس طرح کارفرما نظر آئے گا کہ پیداوار اور مانگ میں خود بخود ایک توازن قائم ہو سکے گا۔ لیکن ہم نے اس سے پہلے یہ دیکھا ہے کہ اس ماحول کا ایک اہم جزو ہوتا ہے کہ دیگر تمام باتیں ساری بنیادوں پر کام کرتی رہیں۔ چنانچہ یہ اصول اکثر و بیشتر منطقی طور پر تو درست نظر آتا ہے، لیکن حقیقی صورت میں یہ سچا ثابت نہیں ہوتا۔ مانگ اور رسد دونوں ہی مصنوعی حالت میں کام کرتی نظر آتی ہیں اور وہ تیزی سے منافع کمانے کی خواہش کے تابع ہوتی ہیں۔ بصورت دیگر اشیا کی پیداوار اور تقسیم پر کنٹرول کرنے والی قوتیں اس قدر منافع نہیں کما سکتیں۔ اس کے نتیجے میں مانگ اور رسد کے توازن اور انصاف کے دیگر عناصر کو بھلا دیا جاتا ہے۔ اور انھیں آزادانہ طور پر مانگ اور رسد کے توازن کے لیے نہیں چلنے دیا جاتا۔ حقیقی طور پر اقتصادی سرگرمی غیر محتاط عناصر کے ہاتھوں میں کھیلنے لگتی ہے اور کاروبار کے جائز اور مناسب اصولوں کے نام پر ان کے لیے جواز پیدا کیا جاتا ہے اور ان کی سراہنا کی جانے لگتی ہے۔ اقتصادی سرگرمی میں اس طرح بے راہ روی اور انحراف دیکھنے کو ملتا ہے۔ یہ صورت حال قومی اور بین الاقوامی ہر دو سطحوں پر دیکھنے کو ملتی ہے۔ لہٰذا اشیا کی تقسیم کے ٹھوس نظام کی ضرورت ہے۔ اس کا انتظام اور انصرام اور نظم و نسق اس طرح آگے بڑھنا چاہیے کہ ایک طرف اس اقتصادی سرگرمی سے جڑے ہوئے محنت کش طبقے اور قوتوں کو مناسب معاوضہ مل سکے اور صارفین کے ساتھ بھی انصاف ہو سکے۔ اس عمل میں ملک بھر کے غیر منظم سیکٹر اور از خود روزگار پر مبنی پرائیویٹ سیکٹر میں تیار کردہ مال اور فراہم کردہ خدمات کی تقسیم کو یقینی بنانا ضروری ہے۔ اس یقین دہانی کے بعد ہی لامرکزی دائرہ کار میں پیداواری سرگرمیوں کو فروغ مل سکتا ہے۔ لہٰذا ملک بھر میں مارکیٹنگ کی سرگرمی کو مناسب طور پر منظم کیا جانا ضروری ہے۔ مارکیٹنگ کے منظم سیکٹر میں انتظامیہ میں مبنی بر انصاف اور مناسب شرکت کا اصول برتنا ضروری ہے۔ مارکیٹنگ کی ایک تنظیم قومی سطح پر تشکیل دی جانی ضروری ہے۔ تمام تھوک بیوپاری اور خوردہ بیوپاری اس سے وابستہ ہونے چاہئیں اور مارکیٹنگ کے جملہ ادارے اور افراد اس سے وابستہ ہونے چاہئیں۔ پیداواری سیکٹر کی طرح سے ہی اس تنظیم میں مالیاتی اداروں کے توسط سے مقرر کردہ افراد کی نمائندگی ہونی چاہیے۔ منظم سیکٹر کے ملازمین کی نمائندگی بھی اس تنظیم میں ہونی چاہیے۔ اس طرح مال تیار کرنے والے کی طرف سے بھی نمائندگی کے لیے اس تنظیم میں گنجائش ہونی چاہیے۔ اس تنظیم کو ہر سال بنیادی ضرورتوں کی اشیا کی قیمت متعین کرنی چاہیے۔ جس سے کسانوں کو ان کی پیداوار کی نفع بخش قیمت مل سکیں۔ یہ کام اس انداز پر ہونا چاہیے۔ گویا کہ زراعت بھی ایک صنعت ہے۔ اس عمل کے ذریعے اشیا کی قیمتوں کے تعین کے وقت دیہات میں بسنے والی کثیر آبادی کی قوت خرید اور پیداواری صلاحیت بڑھانے کے مقاصد کو سامنے رکھا جائے۔ اس کے ساتھ ہی اسے تھوک بیوپاریوں اور خوردہ بیوپاریوں کے مناسب منافع کے اصول کو سامنے رکھنا ہوگا۔

قوم کی جملہ اقتصادی سرگرمی پورے سماج کے لیے دلچسپی کا موجب ہے۔ لہٰذا اس کے لیے قومی سطح پر ایک واحد تنظیم ضروری ہے۔ پرائیویٹ سیکٹر اور پبلک سیکٹر میں کوئی تضاد نہیں رہنا چاہیئے۔ پوری اقتصادی سرگرمی بحیثیت قوم سبھی کے فائدے سے متعلق ہے۔ اس اقتصادی سرگرمی سے وابستہ ارکان کو قومی سطح پر اس سے متعلق ایک ضابطہ اخلاق کے تابع ہونا چاہیئے اور سب کے لیے ڈسپلن کا ایک مشترکہ اصول ہونا چاہیئے۔

مثال کے طور پر خوراکی اجناس کو ہی لے لیجئے جو کہ سب سے زیادہ بنیادی ضرورت ہے بارکیٹنگ کے قومی سطح کے نظام کے تحت اس گڑ سے سبھی واقف ہیں کہ اس کاروبار کے جلد سے جلد فروغ پذیر ہونے اور اس کی خرید و فروخت کا عمل تیزی سے انجام پانے کے سبب ان اجناس کی تجارت میں تھوک قیمتوں کے ساتھ ایک تا ڈیڑھ فی صد منافع ہے۔ خوردہ میں منافع کا تناسب ۳ تا ۴ فی صد ہے۔ ان دونوں سطحوں پر تجارتی سرگرمیوں کا تعلق اناج کی نقل و حمل، ذخیرہ بندی اور پبلک سے ہے۔ اگر تھوک بیوپار میں نفع کی شرح دو فی صد ہو جائے اور خوردہ میں یہ بڑھ کر پانچ فی صد تک ہو جائے اور اناج پیدا کرنے والے کو ۲۰۰ روپے فی کوئنٹل کی قیمت ہی دی جائے تو بھی گندم کی زیادہ سے زیادہ قیمت ۲۲۰ روپے فی کوئنٹل ہوگی۔ گویا کہ دو روپے ۲۰ پیسے فی کلوگرام۔ اس صورت میں قیمتوں کو باضابطہ بنانے کی ذمہ داری قومی سطح کی تنظیم کی ہوگی۔ اس تنظیم کو اس بات کو یقینی بنانا ہوگا کہ اناج کی تجارت میں مشغول تمام لوگ، خواہ وہ تھوک بیوپاری ہوں یا خوردہ، اس کی طرف سے مقرر کردہ قیمتوں کو ہی قائم رکھیں تجارتی سرگرمیوں میں مشغول ہر بیوپاری کے پاس خواہ وہ تھوک بیوپاری ہو یا خوردہ، قانونی اعتبار سے اس مرکزی تنظیم کی طرف سے لائسنس یافتہ ہونا ضروری ہے۔ قانون کی خلاف ورزی کی صورت میں بیوپاری کو سزا ملنی چاہیئے اور حق کہ اس کا لائسنس تک ضبط کر لینا چاہیئے۔ سرکار اور بیوپار کے نظم و نسق سے متعلق مشینری کا فرض ہوگا کہ وہ اشیا کی قیمتوں، ان کے معیار پر نگاہ رکھے اور دیکھے کہ اس مذکورہ مرکزی تنظیم کی طرف سے متعین کردہ اصولوں پر کاربند ہے یا نہیں۔ قانون کے تحت ایک عوامی ٹریبونل قائم کیا جا سکتا ہے جو تجارتی سرگرمیوں سے وابستہ ایسے افراد کے خلاف فوری قدم اٹھا سکے جو متعینہ قوانین اور معیار کی خلاف ورزی کرتے ہوں، یا جو سماجی جرم مثلاً ذخیرہ اندوزی، ملاوٹ اور کالا بازاری کرتے ہوں۔ اشیا کی تقسیم کا سرکاری نظام جو کہ فیئر پرائس شاپس کی صورت میں موجود ہے، ایک غلط نظریہ کے تابع ہے۔ یہ سماج وادی نظام نہیں ہے بلکہ محض اٹک شوئی ہے۔ نام نہاد قومی ملکیت کے نظام سے محض بیوروکریسی کو بڑھاوا ملتا ہے، اور اس طرح سے اہلیت اور کارکردگی کا نقصان ہوتا ہے۔ حالانکہ اس کے لیے سماج وادی یا پبلک سیکٹر جیسی بڑی اصطلاحات استعمال کی جاتی ہیں لیکن یہ سماجی بہبود کے تصور کے لیے محض ایک سراب ہے۔ جب تک سماج میں جملہ اقتصادی سرگرمیوں کی اپنی گرفت میں لینے والا کوئی ایسا نظام معرض وجود میں نہیں آ جاتا جس سے سماج کے ایک طبقے کے ہاتھوں دوسرے کے استحصال کو روکا جا سکے، اس وقت تک اقتصادی انصاف کے لیے راہ ہموار نہیں ہو سکتی۔ جمہوریت پسند اور بہبود کے تصور سے مرتبط سرکار کا فرض ہے کہ وہ یہ دیکھے کہ اقتصادی سرگرمیاں صراحت کردہ حدود میں ہی آگے بڑھیں اور سماج کے کسی بھی طبقے کے ہاتھوں ان کی خلاف ورزی نہ ہو۔ اور اس خلاف ورزی کو زبردست سماجی جرم تصور کیا جائے۔ اس طرح کے عمل سے مقصد یہ ہے کہ اقتصادی سرگرمی سے وابستہ ہر فرد کو مناسب معاوضہ مل سکے۔ ان اصولوں کی خلاف ورزی کرنے والے کو سخت سزا ملنی ضروری ہے۔

تھوک بیوپاری جو کہ عرصۂ دراز سے کام کرتے چلے آ رہے ہیں، ان کی تعداد اتنی زیادہ ہے اور ان کا تجربہ اتنا زیادہ ہے کہ ان کی جگہ کسی بیوروکریسی والے نظام کو دینا اور ایسے افراد کو سونپنا جن کو تجارت کے شعبے کا کوئی تجربہ نہیں، ایک فضول کوشش ہوگی۔ اس سے بھی زیادہ یہ بات کہ اس طرح کے نظام کے لیے سرکار کو کثیر سرمایہ کاری کرنی پڑے گی۔ یہ بات سبھی کے علم میں ہے کہ خوراکی اجناس کے سیکٹر میں فوڈ کارپوریشن آف انڈیا کے زیر اہتمام مختلف شعبوں کے اخراجات کافی زیادہ ہیں۔ اس انتظام میں دیگر وہ گوشے جہاں اناج ضائع ہوتا ہے، وہ بھی سبھی کو معلوم ہیں۔ پیداواری سیکٹر میں پبلک سیکٹر کی طرح سے اشیاء کی تقسیم سے متعلق شعبہ بھی سرکاری شعبہ ہی شمار ہوتا ہے اور برسر اقتدار پارٹی کا یہ فرض بنتا ہے کہ وہ اس "پوتر گائے" کی حفاظت کرے۔ وقت کا تقاضہ ہے کہ اس صورتِ حال کا جائزہ لیا جائے اور ہم اپنی اقتصادی پالیسی کے فلسفیانہ، نظریاتی اور عملی پہلوؤں کی جانچ کریں۔

خوردہ تجارت میں بھی یہی بات سچ معلوم ہوتی ہے۔ لکھو کھا افراد ملک کے دور دراز اور جگہ جگہ پھیلے ہوئے علاقوں میں اس تجارت سے وابستہ ہیں۔ ان کی جگہ چند فیئر پرائس شاپس چلانے کی ذمہ داری ان لوگوں کو دی جاتی ہے جو کہ خوردہ تجارت کا کوئی تجربہ نہیں رکھتے۔ ان دوکانوں سے رعائتی نرخ پر سامان تقسیم کیا جاتا ہے۔ اگر یہ اچھا مال ہے تو یہ دوسرے بیوپاریوں کے ہاتھوں میں چلا جاتا ہے۔ اس سے بدعنوانی کو فروغ ملتا ہے اور عوام کی شکایت بدستور رہتی ہے۔ اور ان کو لمبی لمبی قطار میں کھڑا رہنا پڑتا ہے۔ اگر تھوک اور خوردہ بیوپاری کے لیے یہ لازم کرایا جائے کہ وہ سماج کے سبھی ارکان کے لیے مناسب ڈھنگ سے اشیائے ضروری فراہم کریں، تو عوام کی مشکلات دور ہو سکتی ہیں اور بدعنوانی

[illegible] ہے ۔ اگر وہ [illegible] ہیں تو ان سے تجارت کا حق چھینا جا سکتا ہے۔

مجوزہ مرکزی تنظیم کی طرح سے مارکیٹنگ کے کسی بھی قومی ادارے کا قیام مختلف طرح کے سامان کے لیے ایک بڑی منڈی فراہم کر سکتا ہے۔ اگر پالیسی یہ بن جائے کہ از خود روزگار پر مبنی پرائیویٹ سیکٹر کی طرف سے تیار کردہ سامان فروخت کیا جاتا ہے اور سرکار اس سامان کو خریدنے کو ترجیح دیتی ہے تو اس سے قوتِ خرید بڑھ جائے گی اور پیداواری سرگرمیاں فروغ پائیں گی اور دیہی عوام کی بڑی تعداد کو روزگار مل سکے گا۔ اگر اشیا کی تقسیم اور فروخت کے نظام کا مقصد ضرورت مند تمام افراد کو سامان اور خدمات فراہم کرنا ہے تو اشیا کی فروخت کی مرکزی تنظیم کے لیے یہ کام دشوار نہ ہوگا اور پورے ملک کی ضرورتوں کو سامنے رکھ کر پیداوار کو برقرار رکھنا ممکن ہو سکے گا۔ اس طرح ہماری منڈیوں سے عوام کی ضرورت کا سامان بآسانی مل سکے گا اور یہ منڈی محض ان لوگوں کے لیے نہ ہوگی جن کے پاس وافر روپیہ ہے اور جن کی قوتِ خرید بہت مستحکم ہے۔ اس طرح سے موجودہ تصور کو یکسر بدلا ہوا دیکھا جا سکے گا۔

آج سماج کے بہت محدود طبقے مستحکم قوتِ خرید رکھتے ہیں اس لیے مال تیار کرنے والے عارضی مانگ پیدا کرتے ہیں اور مال تیار کرنے والے اپنے مال کی تشہیر اور پراپگنڈہ کر کے اور عوام کو اس کے استعمال کی ترغیب دلا کر اس کی مانگ پیدا کرائی جاتی ہے۔ عوام کو اس بات کی طرف راغب کیا جاتا ہے کہ وہ ہر سال اپنا سامان بدلتے رہیں اور ہر سال نیا مال خریدنے پر مجبور ہوں۔ یہ پیداواری سرگرمی کی غیر ضروری تصنع کہا جا سکتا ہے۔ ترقی پذیر ملکوں میں بھی مالدار طبقہ اس بیماری کا شکار ہے۔ اس طرح نشر و اشاعت کے جن اداروں کی طرف سے ترغیب و تحریص کی دعوت دی جاتی ہے، ان کا رُخ اس طرح پھیرنا ضروری ہے کہ وہ بنیادی ضروریات پر زیادہ توجہ دے سکیں۔ ا [illegible] چند

یوجنا، نئی دہلی۔

[illegible] سے بیس پسندانہ [illegible] کے [illegible] نہ رہ جائیں۔ نشر و اشاعت کے تصورات میں بنیادی تبدیلی کی ضرورت ہے جس سے بھی عوام اور خاص کر دیہی عوام فائدہ اٹھا سکیں۔ اس لحاظ سے پیداواری سرگرمیوں کو اشیا کی فروخت کے نظام سے جوڑنا ہوگا۔ اس عمل سے گاؤں سے شہروں کی طرف منتقل ہونے کے تسلسل پر روک لگتی ہے اور شہروں میں غیر انسانی حالات والی گندی بستیوں کے اضافے کے سلسلے کو روکا جا سکتا ہے۔ ہمارے سماجی اور اقتصادی مسائل کا حل پوری توجہ چاہتا ہے۔ یہ مسائل آپس میں ایک دوسرے سے جڑے ہیں اس لیے بحیثیت مجموعی اندازِ نظر کی ضرورت ہے۔ اس کے بغیر اقتصادی مسائل کا حل دشوار ہے۔

بقیہ: ترقی پسند معاشرہ

گزار رہا ہے۔ اس کی بہت سی وجہیں ہیں، ان میں ایک بڑی وجہ آبادی میں بے پناہ اضافہ ہے۔

انسان کو عقل و دانش، تعلیم و تہذیب سے اس لیے بہرہ ور کیا گیا کہ وہ خود غرضی سے کام نہ لے صرف خود خوش نہ رہے بلکہ دوسروں کی مسرت میں بھی اضافہ کرے۔ دُنیا کو اچھی اور بہتر جگہ بنانے کے لیے پیغمبر اور اوتار آئے، دانشوروں اور فلسفیوں نے خوش رہنے کے گُر سکھائے، سائنسدانوں نے دکھوں کا مداوا ڈھونڈنے میں زندگی صرف کر دی اور نئی نئی دریافتوں اور دواؤں نے انسانی زندگی کے دُکھوں کو کم کر دیا۔ ہندوستان جیسے ملک میں محدود وسائل کے باوجود گذشتہ دس برسوں میں اوسط عمر ۴۶ سال سے بڑھ کر ۵۴ سال ہو گئی اور شرحِ اموات ۱۵،۷ فی ہزار سے کم ہو کر ۱۴،۸ فی ہزار رہ گئی۔ بہتر خوراک، رہن سہن کے مناسب طریقہ میں اور صحت و صفائی کی بڑھتی ہوئی سہولتوں کے پیشِ نظر اس میں مزید کمی آئے گی لیکن یہ کمی اس وقت بہتر زندگی کی ضامن ہوگی جب شرحِ اموات اور شرحِ پیدائش میں تناسب قائم رہے، ورنہ بڑھتی ہوئی آبادی ہم سے وہ تھوڑا سا سکھ

اور چین بھی چھین لے گی جو ہم نے آزادی کے بعد برسوں کی جد و جہد اور کوششوں کے بعد حاصل کیا ہے۔

قدرتی وسائل کے استعمال اور سائنس اور ٹکنالوجی کی مدد سے بڑھتی ہوئی آبادی کے لیے وسائل مہیا کئے جا رہے ہیں جو وسائل ہیں وہ تمام تر کوششوں کے باوجود کم پڑ رہے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ یہ صورت حال کب تک باقی رہ سکتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ مرکزی اور ریاستی حکومتیں کنبہ بندی کے پروگرام کو قومی سطح پر آگے بڑھا رہی ہیں۔ ملک کی معاشی اور سماجی حالت کو بہتر بنانے اور تعمیر و ترقی کی رفتار کو تیز کرنے کیلئے سابق وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی نے بیس ۲۰ نکاتی پروگرام کا اعلان کیا تھا ان میں خاندانی منصوبہ بندی بھی شامل ہے۔ اور خود خاندانی منصوبہ بندی کا پروگرام سابق وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی کے الفاظ میں ایک عوامی تحریک بن چکا ہے۔ اس کام کو عملی جامہ پہنانے میں مختلف سرکاری اداروں کے ساتھ ساتھ متعدد غیر سرکاری رضاکار تنظیموں کا تعاون بھی حاصل کیا جا رہا ہے۔ رضاکار تنظیموں، مقامی اداروں اور کاروباری تنظیموں کے اس پر جوش تعاون کی بدولت مہاراشٹرا دوسری ریاستوں میں سرِ فہرست رہا ہے اور اس لیے خاندانی فلاح و بہبود کی سرگرمیوں میں بہترین کارکردگی کے لیے ڈھائی سو لاکھ روپے کا قومی انعام بھی حاصل کیا ہے۔ مہاراشٹر پہلی ریاست ہے جسے انعام کا سلسلہ شروع کرنے کے بعد ہی یہ انعام دیا گیا ہے۔ یکم اپریل ۱۹۸۳ کو مہاراشٹر کی آبادی کے سالانہ شرحِ اضافے میں ۱۹۱ را فیصد کمی ہوئی یہ ملک کا ایک نیا ریکارڈ ہے۔

ہماری ریاست آندھرا پردیش میں بھی غیر معمولی کوششیں کی جا رہی ہیں اور ریاست کے کونے کونے میں اس پروگرام کو عام کیا جا رہا ہے۔

ایم-ایل-کپور

دیہی ترقی کے لیے کامیاب منصوبہ بندی

دیہات کے غریبوں کے لیے روزگار کے پروگرام

پچھلے شمارے میں اجتماعی ترقی کے پروگرام کی کامیابی کا جائزہ پیش کیا گیا تھا۔ یہ پروگرام چھوٹے اور مجھولے کسانوں، دیہات کے کاریگروں کی مالی حالت سدھارنے کی غرض سے انھیں مالی امداد دینے اور غریب کنبوں کی خواتین کی تربیت سے متعلق تھا۔ ان پروگراموں کا مقصد یہ ہے کہ لوگوں کی آمدنی میں اضافہ ہو اور وہ غریبی کی سطح سے اوپر اٹھیں۔ زیر نظر مضمون میں دیہی غریب عوام کے لیے روزگار کے مختلف پروگراموں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ (ایڈیٹر)

دیہات میں ہزاروں برس پرانی غربت کو ختم کرنے اور ترقی کے لیے دیہات کے سماجی و معاشی ڈھانچے کو مضبوط کرنے کیلئے ملکی منصوبہ بندی کے عمل میں اجتماعی ترقی کے پروگرام اور دیہات کے بے زمین مزدوروں، غریب کسانوں اور کاریگروں کو روزگار مہیا کرنے کے پروگراموں پر گذشتہ تیس برس سے عمل جاری ہے۔

دیہی مجموعی ترقی کے کامیاب پروگرام کے علاوہ جس میں ساتویں منصوبے میں بھاری توسیع کرنے کی تجویز ہے، دیہات کے باقی ماندہ لوگوں کی ترقی کے لیے جو اُجرتوں پر گذر بسر کرتے ہیں یا خشک سالی سے مسلسل متاثر ہونیوالے یا صحرائی علاقوں میں رہتے ہیں، روزگار کے کئی پروگراموں پر عمل جاری ہے۔

نئی دہلی میں گذشتہ دنوں ریاستوں کے دیہی ترقی کے وزیروں کا جو اجلاس ہوا، اس میں دیہات میں روزگار مہیا کرنے کے ان پروگراموں پر بھی غور کیا گیا۔ سائنس اور ٹیکنالوجی کے مرکزی وزیر شری شیو راج پاٹل نے دیہات سے غربت دور کرنے کے لیے جدید ٹیکنالوجی کے استعمال پر زور دیا۔ انھوں نے کہا کہ ایسی ٹیکنالوجی دریافت کر کے عمل میں لائی جائے جو ہمارے دیہات کی ضروریات کے مطابق ہو اور جس کے فائدے استعمال کنندگان تک پہونچ سکیں۔

بے روزگار غریب دیہاتی عوام کو روزگار دلانے کے سلسلے میں منصوبہ بندی کمیشن کے رُکن ڈاکٹر سی ہنومنتھیا راؤ نے کہا کہ زراعت کی ترقی کے پروگراموں کو دیہات کی غربت دور کرنے کے پروگراموں سے جوڑا جانا چاہیئے۔ انھوں نے مزید کہا کہ دیہی ترقی کی اسکیموں کا اصل امتحان یہ ہے کہ کیا اُن سے صحیح معنوں میں اُن لوگوں کو فائدہ پہنچ رہا ہے جن کے لیے روزگار کی یہ اسکیمیں مرتب کی گئی ہیں۔

دیہات میں روزگار مہیا کرنے کا قومی پروگرام

دیہات میں روزگار مہیا کرنے اور غربت کو دور کرنے کے لیے کئی پروگرام اور اسکیمیں شروع کی گئی ہیں۔ ان میں سب سے بڑا پروگرام دیہی روزگار کا قومی پروگرام ہے۔ یہ پروگرام خوراک کے عوض کام کی جگہ شروع کیا گیا ہے۔ اور اسے چھٹے منصوبے کا اہم جزو بنا لیا گیا ہے۔ اس پروگرام کا بڑا مقصد دیہات میں روزگار کے متلاشیوں کو اُن دنوں میں روزگار کے اضافی مواقع مہیا کرنا ہے جب دیہات میں کھیتی مزدور بے کار ہو جاتے ہیں۔ اس پروگرام کے تحت جہاں دیہاتی غریبوں کے غذائی معیار کو بلند کیا جاتا ہے وہاں مزدوروں کی محنت سے اجتماعی استعمال کی املاک مثلاً سڑکیں، نہریں، اسکول اور دیگر عمارتیں بھی تعمیر کی جاتی ہیں۔ پروگرام کے تحت تعمیرات کا کام زیادہ تر پنچایتی اداروں کے ذریعہ ہوتا ہے تاکہ دیہات کے عوام کو اُن کے اپنے کام آنے والی تعمیرات میں لگایا جا سکے۔ کسی ٹھیکیدار یا درمیانہ دار کو یہ کام سپرد نہیں کیا جاتا۔ نیز ہر مزدور کو اُجرت کے ایک حصے کے طور پر ایک کلو اناج یومیہ دیا جاتا ہے۔

رقومات

اس پروگرام کے تحت روزگار کے متلاشیوں کو اناج اور نقد امداد دینے کے لیے مہیا کی جانے والی رقوم میں لگاتار اضافہ ہو رہا ہے۔ ۱۹۸۰-۸۱ میں رقم ۳۱۶ کروڑ ۱۹۸۱-۸۲

میں ٣٣٣ کروڑ ٨٣-١٩٨٢ میں ٣٩٩ کروڑ، ٨٤-١٩٨٣ میں ٥٣٨ کروڑ روپے اور ٨٥-١٩٨٤ میں ٦٠٤ کروڑ روپے ہے۔ ان میں سے استعمال کی جانے والی رقوم میں بھی متواتر اضافہ ہو رہا ہے۔ ٨١-١٩٨٠ میں ٢١٧ کروڑ روپے، ٨٢-١٩٨١ میں ٣١٨ کروڑ روپے، ٨٣-١٩٨٢ میں ٣٨٠ کروڑ اور ٨٤-١٩٨٣ میں ٣٩٤ کروڑ روپے روزگار کے متلاشیوں کو خوراک اور اُجرتیں دینے میں صرف کیا گیا۔

ریاستی سرکاروں کو اجازت دی گئی ہے کہ وہ جو رقوم مقررہ سال میں خرچ نہیں کر سکیں انھیں وہ آئندہ برس کے پروگرام میں شامل کر سکتی ہیں۔

خوراک

اِس پروگرام کے تحت روزگار پانے والوں کو اُجرت کے ایک حصے کے طور پر واجب نرخوں پر فی کس ایک کلو اناج مہیا کرنے کے انتظام کے تحت ہر برس مرکزی علاقوں اور ریاستوں کے لیے زائد از تین لاکھ ٹن اناج مہیا کیا جاتا ہے۔ لیکن دیکھا گیا ہے کہ ریاستیں یہ اناج پورا استعمال نہیں کر پا رہیں۔

روزگار

پروگرام کے تحت چھٹے پنج سالہ منصوبے میں ایک ارب ٥٠ کروڑ کے دنوں کے برابر روزگار کے مواقع پیدا کرنے کا نشانہ مقرر کیا گیا تھا۔ کارکردگی کا جائزہ لینے سے پتہ چلا ہے کہ پلان کے پہلے چار برسوں میں ایک ارب ٢٣ کروڑ دنوں کے برابر روزگار کے مواقع پیدا کیے گئے۔ پانچویں برس میں زائد از آٹھ کروڑ دنوں کے روزگار پیدا ہونے کے امکان کے ساتھ چھٹے پلان میں کارکردگی کے نشانے آسانی سے حاصل ہو جانے کی اُمید ہے۔

اس اسکیم کے تحت عوامی فائدے کے لیے جنگل لگانے کی اسکیم بھی شامل ہے۔ دیکھا گیا ہے کہ جنگل لگانے کے کام سے شیڈولڈ ذاتوں اور قبائل کے افراد کو براہِ راست فائدہ نہیں پہونچ رہا، اس لیے دیہاتیوں کو اس ضمن میں نئی ہدایات جاری کی گئی ہیں۔

بے روزگار کھیتی مزدوروں کے لیے روزگار کی ضمانت

دیہات میں غربت کا بڑا گروہ وہ مزدور ہیں جو یومیہ اُجرت پر کھیتی کا کام کرتے ہیں لیکن فصل کاشت ہو جانے کے بعد کٹائی تک اُن کے پاس کوئی کام نہیں ہوتا۔ یہ لوگ گاؤں چھوڑ کر بھی نہیں جا سکتے۔ لہٰذا ان کے مسائل کو ایک خاص ڈھنگ سے سلجھانے کی ضرورت ہے۔ چنانچہ روزگار کا ایک نیا پروگرام، جس کا نام ہے روزگار کھیتی مزدوروں کے لیے روزگار کی ضمانت کی اسکیم ہے۔ ملک بھر میں رائج کیا جا چکا ہے۔ اس پروگرام کا بڑا مقصد یہ ہے کہ ان بے زمین کھیتی مزدوروں کے کنبوں کے کم سے کم ایک فرد کے لیے سال میں ایک سو دن کی مزدوری کی ضمانت دی جائے۔ دوسرے یہ کہ پائیدار دیہی املاک کھڑی کی جائیں جن سے دیہی معیشت کی تیز تر ترقی کے لیے ڈھانچہ مہیا کیا جا سکے۔ اس پروگرام کے لیے سو فیصد مالی امداد مرکزی سرکار کی طرف سے مہیا کی جا رہی ہے۔ ٨٤-١٩٨٣ میں اس پروگرام کے لیے ایک ارب روپیہ اور ٨٥-١٩٨٤ کے لیے چار ارب روپیہ مخصوص کیا گیا ہے۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ اس پروگرام کے تحت ٨٤-١٩٨٣ میں ٦ کروڑ دنوں اور ٨٥-١٩٨٤ میں ٣٠ کروڑ دنوں کے برابر زائد روزگار حاصل ہوگا۔ یہ روزگار کے اُن مواقع کے علاوہ ہے جو دیہات میں روزگار کے قومی پروگرام کے تحت حاصل ہو رہے ہیں۔ قومی پروگرام کے تحت تیس سے چالیس کروڑ دنوں کے برابر روزگار حاصل ہو رہا ہے

اس پروگرام کے تحت جس کا اعلان پردھان منتری شریمتی اندرا گاندھی نے ١٥ اگست کو کیا تھا۔ ریاستی سرکاریں اور مرکزی انتظامیہ علاقے پراجیکٹ تیار کر کے مرکزی کمیٹی کو منظوری کے لیے بھیجتے ہیں۔ یہ پراجیکٹ ٢٠ نکاتی پروگرام اور کم از کم بنیادی ضروریات کے پروگرام سے متعلق ہوتے ہیں۔ مثلاً دیہات کو ملانے والی سڑکیں، کھیتوں کو سیراب کرنے والی نالیاں، بنجر زمینوں کی آبادکاری، کٹاؤ زمین کو روکنا اور جنگل بانی وغیرہ۔ پراجیکٹ تیار کرتے ہوئے اس چیز کا خیال رکھا جاتا ہے کہ اُس میں اُجرت کا حصہ پراجیکٹ کے کل خرچ کے نصف سے کم نہیں ہونا چاہیے۔ اسی طرح خواتین اور ہریجنوں کے لیے روزگار کا بھی ان پراجیکٹوں میں خیال رکھا جاتا ہے۔

مرکزی کمیٹی نے جولائی ١٩٨٤ تک اِس قسم کے ٢٢٠ پراجیکٹوں کی منظوری دی ہے۔ جن پر کُل ٦ ارب ١٥ کروڑ روپیہ خرچ آئے گا۔ دیکھا گیا ہے کہ جہاں تک پراجیکٹ مرتب اور منظور کرنے کا تعلق ہے، آندھرا پردیش، آسام، جموں و کشمیر، کیرل، مدھیہ پردیش، آسام، راجستھان، تامل ناڈو اور تری پورہ کی کارکردگی کا تناسب تسلی بخش رہا ہے۔ تاہم دیکھا گیا ہے کہ جو پراجیکٹ منظور ہوئے ہیں، اُن میں زیادہ تر سڑکیں تعمیر کرنے کے ہیں۔ جب کہ مرکزی کمیٹی کا خیال ہے کہ دوسری تعمیرات کو بھی اتنی ہی توجہ دی جانی چاہیے۔

منظور شدہ رقوم کے اخراجات کی رفتار اگرچہ ٨٤-١٩٨٣ کی نسبت ٨٥-١٩٨٤ میں دوگنی ہو گئی ہے۔ پھر بھی یہ منظور شدہ رقوم کے مقابلے میں بہت کم ہے۔ ریاستوں سے کہا گیا ہے کہ وہ کام کی رفتار کو تیز کریں۔

خشک سالی سے متاثر ہونے والے علاقوں میں روزگار

ملک کے کئی حصے زمانہ قدیم سے خشک سالی کی زد میں آ رہے ہیں۔ جب وہاں پانی اور اناج کی سخت قلت ہو جاتی ہے، روزگار نہیں رہتا اور لوگوں کو فاقہ کشی کا بھوت ستانے لگتا ہے۔ پھر لوگ وہاں سے نقل مکانی کرنے لگتے ہیں۔ اگرچہ

خشک سالی کو روکنا ممکن نہیں لیکن سرکار ان علاقوں میں رہنے والے لوگوں کو یہ احساس کرانے کے لیے کہ انھیں خشک سالی سے خوفزدہ نہیں ہونا چاہیے۔ ان علاقوں میں روزگار کے مواقع کا اہتمام کرتی رہتی ہے۔

خشک سالی سے متاثر ہونے والے علاقوں کے لیے پروگرام ملک کی ۱۳ ریاستوں کے ۷۰ اضلاع کے ۵۱۱ ترقیاتی بلاکوں میں زیر عمل ہے۔ چھٹے منصوبے کے پہلے چار برسوں میں اس پروگرام کے تحت دو ارب ۸۶ کروڑ ۷۰ لاکھ روپیہ خرچ کیا گیا ہے جو پورے منصوبے کے لیے مخصوص رقم کے ۷۲ فیصد اور چار برسوں کے لیے منظور رقم کے ۹۲ فیصد حصے کے برابر ہے۔ دیکھا گیا ہے کہ آندھرا پردیش، کرناٹک، مدھیہ پردیش، اتر پردیش اور مغربی بنگال میں پروگرام کی رفتار ترقی دوسری ریاستوں کی نسبت دھیمی ہے۔ کیونکہ ان ریاستوں میں منظور شدہ رقم کا پچاس سے ۷۰ فی صد حصہ ہی خرچ کیا جا سکا ہے۔ پروگرام کے تحت زیادہ تر یعنی ۳۵ فیصد رقوم آبپاشی، جنگل بانی، کٹاؤ زمین کو روکنے اور پشو پالن پر خرچ کی جا رہی ہیں۔

یہاں تک پروگرام کی کامیابی کا تعلق ہے، پچھلے چار برسوں میں تین لاکھ ۶۵ ہزار ہیکٹر زمین کو کٹاؤ سے محفوظ کیا گیا ہے۔ ۴ لاکھ ۴۷ ہزار ہیکٹر زمین کے لیے آبپاشی کے وسیلے مہیا کیے گئے ہیں اور تین لاکھ ۲۴ ہزار ہیکٹر رقبے میں چراگاہیں بنائی گئی ہیں۔ ان کاموں سے ۱۲ کروڑ ۵۰ لاکھ دنوں کے برابر روزگار حاصل ہوا۔ اس پروگرام کے تحت دیہاتیوں کو دودھ دینے والے مویشی پالنے اور ان کی دودھ فروشی انجمنیں قائم کرنے میں بھی مدد دی جا رہی ہے۔

چونکہ یہ پروگرام متاثرہ علاقوں کی منصوبہ بندی کا تجرباتی پروگرام ہے اس لیے اس میں بڑے پیمانے پر دلچسپی لی گئی ہے۔ بعض بین الاقوامی اداروں نے بھی اس کے لیے کچھ مالی مدد فراہم کی ہے۔ عالمی بینک نے چھ اضلاع کے لیے ساڑھے تین کروڑ امریکی ڈالر کی مدد دی۔ مغربی جرمنی نے مغربی بنگال کے بنکورا ضلع میں اس پروگرام کے لیے ساڑھے ۱۹ کروڑ روپیہ دیا۔ یورپی اقتصادی برادری نے اتر پردیش کے تین اضلاع جالون، ہمیر پور اور مرزا پور کے لیے ایک کروڑ امریکی ڈالر کی مدد دی۔

صحرائی علاقوں میں روزگار کے پروگرام

یہ پروگرام ملک کے صحرائی علاقوں میں ۷۸-۱۹۷۷ سے زیر عمل ہے۔ اس کا مقصد صحرا کے پھیلاؤ کو روکنے اور وہاں پیداوار میں اضافہ کرنے اور لوگوں کو روزگار مہیا کرنے کے لیے موزوں حالات پیدا کرنا ہے۔ اس مقصد کے لیے ان علاقوں میں جنگل لگائے جاتے ہیں۔ زیر زمین پانی کو نکالا اور استعمال کیا جا چکا ہے۔ دیہات میں ٹیوب ویل لگانے کے لیے بجلی مہیا کی جاتی ہے۔ اور زراعت، باغبانی اور پشو پالن کو فروغ دیا جاتا ہے۔

اس پروگرام پر ملک کی پانچ ریاستوں کے ۲۱ اضلاع کے ۱۲۶ بلاکوں میں عمل کیا جا رہا ہے۔ ان میں سے ۱۷ ضلعے راجستھان، ہریانہ اور گجرات کے گرم صحراؤں اور لداخ جموں کشمیر اور ہماچل پردیش کے سرد صحراؤں میں واقع ہیں۔

چھٹے پانچسالہ منصوبے کے پہلے چار برسوں میں ان اضلاع میں زیر تکمیل اس پروگرام پر ۶۵ کروڑ ۱۷ لاکھ روپیہ خرچ کیا جا چکا ہے۔ اس عرصے میں منصوبے کی کل تخصیص زر کا ۶۰ فیصدی حصہ اور منظور شدہ رقم کا ۹۷ فیصد حصہ خرچ کیا جا چکا ہے۔ کل اخراجات کا ۸۶ فیصد حصہ جنگل لگانے، پشو پالن، آبپاشی اور کٹاؤ زمین کو روکنے پر خرچ کیا گیا ہے۔

جہاں تک پروگرام کی کامیابیوں کا سوال ہے گزشتہ چار برسوں میں ۴۰ ہزار ہیکٹر زمین پر پودے لگائے گئے ہیں۔ ۱۰ ہزار ہیکٹر زمین پر ریت کے ٹیلوں کو آگے بڑھنے سے روکا گیا اور ریت کو اڑنے سے روکنے کے لیے دو ہزار ہیکٹر زمین پر درخت لگائے گئے ہیں۔ ۵۰ ہزار ہیکٹر زمین کی جانچ کی گئی۔ مویشیوں کے علاج کے لیے ۱۱۷ ڈسپنسریاں قائم کی گئی ہیں اور اون اکٹھی کرنے کے ۲۰ مراکز قائم کیے گئے ہیں اس عمل میں ۵۷ لاکھ دنوں کے برابر روزگار کے مواقع مہیا کیے گئے۔

ترقیاتی پروگرام کے لیے عملہ

جہاں روزگار کی مختلف اسکیموں کے تحت بڑے پیمانے پر روزگار مہیا کیا جا رہا ہے۔ وہاں دیکھا گیا ہے کہ دیہی علاقوں کی ترقی کے لیے جو اسکیمیں عمل میں لائی جا رہی ہیں، خود انھیں چلانے کے لیے بڑے پیمانے پر تربیت یافتہ عملے کی ضرورت ہے جو بجائے خود روزگار کا ایک بڑا وسیلہ ہے۔ مثلاً اندازہ لگایا گیا ہے کہ موجودہ اسکیموں کو پوری طرح عملی جامہ پہنانے کے لیے تمام ترقیاتی بلاکوں میں ۶۰ ہزار دیہی سطح کے کارکنوں، ۲۹ ہزار توسیعی افسروں اور پانچ ہزار بلاک ڈیولپمنٹ افسروں کی ضرورت ہے۔ ۱۵ سو اسسٹنٹ پراجیکٹ افسروں کی ضرورت ہے۔ اس طرح تقریباً ایک لاکھ افراد پر مشتمل ترقیاتی عملہ درکار ہے جو روزگار کا ایک بہت بڑا وسیلہ مہیا کرتا ہے۔ اتنے بڑے عملے کی تربیت ایک عظیم کام ہے، کیونکہ یہ لوگ تبدیل ہوتے رہتے ہیں، اس لیے اس سے بھی زیادہ تعداد میں لوگوں کو تربیت دینے کی ضرورت ہے جو دیہی ترقی کے پروگراموں کو صحیح ڈھنگ سے عملی جامہ پہنا سکیں۔ تربیت یافتہ عملے کے جو نشانے حاصل نہیں ہو سکتے اور نشانے حاصل کیے بغیر کروڑوں افراد کو غربت کی سطح سے اوپر اٹھانا ممکن نہیں ہے۔

★

پی۔آر۔ دوبھاشی



بین الاقوامی منصوبہ بندی

منصوبہ بندی کی کامیاب تکمیل کے لیے پلان کے معائنے اور جائزے کو لازمی بیان کرتے ہوئے فاضل مصنف نے مختلف دوملکی اور متعدد ملکی اقتصادی بندوبست کے ذریعے بین الاقوامی منصوبہ بندی پر بحث کی ہے اور بہترین منصوبہ بندی پر اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔

بیشتر ملکوں میں قومی منصوبہ بندی کے نظاموں کے ارتقاء کے ساتھ قومی منصوبہ بندی کے مختلف سسٹموں کے درمیان بعض قسم کے ارتباط یا اشتراک کار کے لیے میدان ہموار ہو گیا ہے۔

اس امر کا امکان ہے کہ آنے والے برسوں میں اس کی جگہ بتدریجی طور پر پرائیویٹ کاروبار کی وساطت سے بین الاقوامی تجارت اور سرمایہ کاری لے لیگی۔ یہ موقع اور کر پہلے ہی اقتصادی نظام میں ریاست (حکومت) کی عظیم تر شرکت کے باعث معدوم ہوتے جا رہے ہیں۔ تعمیر و ترقی سے متعلق بین الاقوامی بینک یا ایشین بینک جیسے بین الاقوامی اقتصادی ادارے خصوصاً ملکوں، بالخصوص کم ترقی یافتہ ملکوں کی اقتصادی ترقی میں بڑھ کر مدد دے رہے ہیں۔

ایک نیا طریقِ کار

لیکن یہ کافی نہیں ہے۔ لہذا کم ترقی یافتہ ملکوں اور سوشلسٹ ملکوں کے درمیان منصوبہ بندی کے نظاموں کے درمیان اشتراک کا ایک نیا طریقِ کار اُبھر رہا ہے۔ ایسے ہی اقدامات بھارت اور روس اور دیگر مشرقی ملکوں کے درمیان پہلے ہی عمل میں آچکے ہیں اور اس سلسلے میں مشترکہ اقتصادی کمیشن قائم کیے جا چکے ہیں۔

۳۰ نومبر ۱۹۷۰ کو روسی کمیونسٹ پارٹی کے جنرل سکریٹری کے تاریخی دورہ کے اختتام پر بھارت، سوویت مطالعاتی گروپ قائم کرنے کا فیصلہ کیا گیا تھا جس کا مقصد بھارت کے پلاننگ کمیشن اور سوویت یونین کی ریاستی پلاننگ کمیٹی کے درمیان اشتراکِ کار بڑھانا تھا۔

اقتصادی پیش بینی، پراجیکٹوں اور پروگراموں کی تشکیل اور پراجیکٹوں کی نگرانی اور جائزے میں تجربات کے تبادلے کے لیے گروپ قائم کیا گیا ہے اور اس کا قیام اقتصادی، سائنسی اور تکنیکی تعاون سے متعلق بھارت، سوویت کمیشن کے ڈھانچے کے اندر عمل میں لایا گیا ہے۔ اس کمیشن میں پلاننگ کمیشن کے ممبر شامل ہیں جن کی امداد سوویت یونین کی ریاستی پلاننگ کمیٹی کے افسران اور مرکزی وزارتوں کے نمائندے کرتے ہیں۔ دیگر تنظیموں اور اداروں کے ماہرین جن کا تعلق منصوبہ بندی سے ہے، مشیروں یا ماہروں کی حیثیت میں لیے جا سکتے ہیں۔ اس گروپ کی میٹنگ سال میں ایک بار نئی دلی اور ماسکو میں باری باری ہوتی ہے۔ یہ گروپ سالانہ، متوسط اور تناظری منصوبہ بندی کی منہاجیات میں تجربات اور معلومات کا تبادلہ کرتا ہے۔ مطالعاتی گروپ کی متفقہ مختصر روداد اقتصادی، سائنسی اور تکنیکی تعاون سے متعلق بین الحکومتی بھارت، سوویت اقتصادی کمیشن کو پیش کی جاتی ہے۔

دیگر مشرقی یورپی ممالک کے بارے میں بھی گزشتہ برسوں میں ایسے ہی ضوابط اور عوامل کو فروغ دیا گیا ہے۔

نیا بین الاقوامی اقتصادی نظام

نئے بین الاقوامی اقتصادی نظام سے جو حالیہ برسوں میں زیادہ مروّج ہوا ہے، بین الاقوامی منصوبہ بندی کے لیے نئے مواقع کا افتتاح ہوا ہے۔ متعدد ملکوں کے اقتصادی مفکروں، مدبروں، ڈپلومیٹوں اور رہنماؤں نے شمال جنوب اور جنوب جنوب کی اقتصادی گفتگو کے لحاظ سے سوچ بچار کیا ہے۔ یورپی ساجھے بازار کی کامیابی سے ایشیا کی مشترکہ منڈی کی تجویز کو تحریک ملی ہے۔ ترقی یافتہ

ملکوں سے ترقی پذیر ملکوں کو متعدد ملکی اور دو ملکی امداد اور مساوی شرائط پر اور ترقی یافتہ اور ترقی پذیر ملکوں کے مابین کسی رکاوٹ کے بغیر بین الاقوامی تجارت کے فروغ کی زیادہ سے زیادہ حمایت کی گئی ہے۔ متعدد ترقی پذیر ملکوں کی منصوبہ بندی کے مابین تال میل ایسے اقتصادی تعاون کے لیے موزوں ذریعہ فراہم کر سکتا ہے جو بین الاقوامی اقتصادی نظام میں مضمر ہے۔ بھارت اور ترقی پذیر ملکوں کے مشترکہ کمیشن بھارت کے ترقیاتی منصوبوں اور دیگر ملکوں کے منصوبوں کے درمیان ایسے تال میل کی داغ بیل ڈال سکتے ہیں۔

بہترین منصوبہ بندی

ہم نے پچھلے بابوں میں منصوبہ بندی کے تمام پہلوؤں پر غور کیا ہے۔ منصوبہ بندی کا تصور اور نصب العین اس کا طریقہ کار اور عمل، اس کی تنظیم اور انتظام، اس کی سرمایہ کاری اور جائزہ۔ ایک اہم نکتہ جو ابھر کر سامنے آیا ہے وہ یہ ہے کہ منصوبہ بندی از خود کوئی مقصد نہیں ہے۔ یہ مقصد کے حصول کا ایک ذریعہ ہے۔ یہ کوئی قطعی نظریہ نہیں ہے۔ اس کی کامیابی کی آزمائش یہ ہے کہ اسے قابلِ عمل ہونا چاہیئے۔ منصوبہ بندی کا محض منتر پڑھنا کامیاب اقتصادی ترقی کی ضمانت نہیں ہے اس کا تو تجربے کی روشنی میں جائزہ لینا ہوگا۔ ایسے کسی بھی عقیدے پر اصرار نہیں کیا جا سکتا کہ "جتنی زیادہ منصوبہ بندی ہوگی اتنا ہی معیشت کے لیے بہتر ہوگا" جیسا کہ فنِ معمارگری میں ہوتا ہے۔ اگر منصوبہ بندی میں "کم ہی زیادہ ہو" تو ہمیں اُسے بلا جھجک ہی قبول کر لینا چاہیئے۔

کیا منصوبہ بندی سماجی، اقتصادی مقاصد کے حصول میں سازگار ثابت ہوئی ہے؟ کیا سماج اس کی بدولت وہ عظیم ترین ترقی حاصل کر سکا ہے جو یہ امکانی طور پر کر سکتی ہے اور کیا اس ترقی کے فوائد سماج کے تمام سیکٹروں کے ذریعے دور دور تک پہونچ چکے ہیں؟ یہ سوال اٹھائے جانے پر کہ "کیا فرانس کی اقتصادی ترقی کو پلان سے منسوب کیا جا سکتا ہے؟" بوچیٹ مندرجہ ذیل جواب دیتے ہیں۔

"منصوبہ بندی شروع ہونے کے بعد ترقی خصوصاً شدت سے عمل میں آئی ہے۔ منصوبہ بندی کے عرصے کے دوران فرانس نے اقتصادی ترقی کی شرح برطانیہ کے مقابلے میں کم از کم دوگنی حاصل کی ہے۔ فرانس کی منصوبہ بندی کے مشترکہ ضوابط نے فرانس کی اقتصادی ترقی میں قدرے حصّہ لیا ہے"۔ بارہ برس میں قومی پیداوار میں ۶۰ فیصد اضافے سے پُرامن بین الاقوامی مقابلے کے شعبے میں فرانس کی پوزیشن بہت تسلی بخش ہوگئی ہے۔

سوشلسٹ ملکوں میں منصوبہ بندی کی کامیابی بھی بہت موثر رہی ہے۔ سوویت یونین میں قومی پیداوار ۱۹۵۰ - ۵۸ سے تقریباً ۱۰ فی صد سالانہ کی شرح سے بڑھی اور ۱۹۵۹ - ۶۵ میں اس کے ۷ فیصد سالانہ کی شرح سے بڑھنے کی توقع پیدا ہو گئی ہے۔

جاپان نے اختتامِ جنگ کے بعد ۲۰ برسوں کے دوران اقتصادی ترقی میں معجزہ کر دکھایا۔ اُس نے جنگ کی تباہیوں اور قطعی افلاس سے اٹھ کر ٹیکنالوجی کی جدتوں سے فائدہ اٹھایا اور اعلیٰ اقتصادی ترقی حاصل کی۔ لیکن منصوبہ بندی کو ہی کو اس تمام تر اقتصادی ترقی کا کریڈٹ نہیں ملتا۔ جاپان کی اقتصادی پلاننگ ایجنسی کا یہ معقول دعویٰ ہے کہ اس نے جاپانی معیشت میں ہونے والی مختلف تبدیلیوں کو مدِنظر رکھ کر مسلسل اقدامات کئے ہیں اور اس طرح کام کو خوش اسلوبی سے انجام دیا ہے۔ بعض اوقات یہ ادارہ آنے والی تبدیلیوں کا مقابلہ کرنے سے قاصر رہا اور بعض اوقات اس نے وقت سے بہت پہلے ہی پیش بینی کرتے ہوئے رہنمایانہ عظیم کامیابیاں حاصل کیں۔

بھارت میں منصوبہ بندی سے بنیادی صنعتوں کو فروغ ملا ہے اور زراعت کی جدید کاری اور بنیادی ڈھانچے کی تعمیر ہوئی ہے۔ لیکن اقتصادی ترقی کی شرح ۳ سے ۵ء۳ فیصد کے گرد منڈلاتی رہی ہے جب کہ پلانوں کا مقصد ۵ سے ۵ء۵ فیصد کی شرح حاصل کرنا تھا۔

اقتصادی انضباط کی تکنیک

منصوبہ بندی اتنا زیادہ نظریہ نہیں ہے جتنا کہ اقتصادی انضباط کی تکنیک جو مختلف اقتصادی نظاموں والے ملکوں میں مفید پائی گئی ہے۔ اس کے ساتھ ہی مختلف اقتصادی نظاموں نے از خود اشتراک و اتحاد کی جانب اپنے رجحان کا مظاہرہ کیا ہے۔ اس سے منصوبہ بندی کو ایک بہترین سسٹم کی اصطلاح میں سوچنا ممکن ہو گیا ہے جو مختلف ملکوں کے اقتصادی نظاموں کی بہترین خصوصیات اور تکنیکوں کو یکجا کر سکے۔ بہترین منصوبہ بندی کا تصور اگر وقت پا کر فروغ حاصل کرے تو اُس سے ملک زیادہ سے زیادہ ترقی حاصل کر سکے گا۔ بہترین منصوبہ بندی کو فروغ دینا اور ترقی یافتہ اور ترقی پذیر ملکوں میں دُنیا کے منصوبہ بندی کے مختلف نظاموں کی بہترین خصوصیات کو مدغم کرنا بھارت کے لیے خاص طور پر اہم ہے کیوں کہ منصوبہ بندی کے تجربے کے ۳۰ برس بعد بھی ہم نے محسوس کیا ہے کہ ہماری کامیابیاں جو تقریباً ۳ سے ۵ء۳ فیصد تک شرحِ ترقی کے گرد منڈلاتی رہی ہیں۔ ہماری ۵ سے ۵ء۵ فی صد شرحِ ترقی کے نشانے سے بہت کم ہیں۔ ہماری منصوبہ بندی کم و بیش پرانے ڈھرّے پر چل رہی ہے اور اُسے زیادہ مؤثر بنانے کے لیے جدت طرازیوں کی ضرورت ہے۔

چند تجاویز

منصوبہ بندی کے بہترین نظام کے فروغ کے لیے ایسی کوشش ضروری ہے جس سے تجربے سے سیکھنے کے بعد ترمیموں اور جدتوں کو رائج کیا جائے۔ اس کتاب میں منصوبہ بندی کے نظام کے

مختلف پہلوؤں کے تجزیے کرنے کی جو کوشش کی گئی ہے اس سے اس تبدیلیوں کے لیے بعض تجاویز اُبھر کر سامنے آتی ہیں۔

۱۔ منصوبہ بندی کے دو اجزا کا واضح طور پر امتیاز کیا جانا چاہیئے۔ یہ ہیں پبلک سرمایہ کاری کا جزو اور عام اقتصادی ترقی کا جزو۔ پہلے جزو کو ضروری تصور کیا جانا چاہیئے۔ گو دوسرے کو علامتی تصور کیا جا سکتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ پبلک سرمایہ کاری پر اسس قدر توجہ دی جائے کہ اُس میں کسی بھی قسم کا سرقہ یا زکاس خارج از امکان ہو جانا چاہیئے۔ پبلک سرمایہ کاریوں سے پختہ وابستگی اور ان کی تعمیل میں سو فیصد کامیابی کے ساتھ یہ ممکن ہو جانا چاہیئے کہ منصوبہ بندی کے علامتی اجزا کے بارے میں بہت حد تک بھروسہ مندی حاصل ہو جائے۔

۲۔ گو پبلک سرمایہ کاری کے بارے میں جبر کا عنصر ہو سکتا ہے۔ علامتی منصوبہ بندی کو زیادہ تر مالی اُمور پر بھروسہ کرنا چاہیئے۔

۳۔ منصوبہ بندی کے جن ماڈلوں کے لیے عوامی شرکت ضروری ہے ان کی واضح طور پر نشاندہی کی جانی چاہیئے اور منصوبہ بندی کی اُن اجزا کے بارے میں عوامی شرکت کی شیرازہ بندی کے ذرائع پر توجہ مرکوز کی جانی چاہیئے۔

۴۔ کثیر سطحی منصوبہ بندی کے تصور کو مسلسل عمل میں لایا جانا چاہیئے اور اس کے ساتھ ہی غیر مرکوزہ منصوبہ بندی کو جس میں مقامی حکام کی طرف سے منصوبہ بندی شامل ہے زیادہ سے زیادہ موقع دیا جانا چاہیئے۔ جہاں تک غیر مرکوزہ سیکٹر کا تعلق ہے، مرکزی طور پر بنائی ہوئی اسکیموں کو رہنمایانہ خطوط تصور کرنا ضروری نہیں۔

۵۔ سیکٹروں کی منصوبہ بندی کو مقامی منصوبہ بندی سے تقویت دی جانی چاہیئے۔

۶۔ سائنسی طور پر تشکیل شدہ تکنیکی طور پر قابلِ عمل اور اقتصادی طور پر جاندار پراجیکٹوں کو ہی پلانوں کی سرمایہ کاری کے قابل تصور کیا جانا چاہیئے۔

۷۔ روزگار کی توسیع کو ایسے پراجیکٹوں کی تشکیل اور تعمیل سے قریبی طور پر وابستہ ہونا چاہیئے جن سے پیداوار اور پیداواریت کو بڑھانے میں مدد مل سکتی ہے۔

۸۔ سرمایہ کاری کا پلان ملک میں وافر انسانی قوت کے مطابق ہونا چاہیئے۔

۹۔ منصوبہ بندی کی متواتر پڑتال ہونا ضروری ہے جس سے اس کی اندرونی استواری کی یقین دہانی ہو۔

۱۰۔ پلان کے نشانے پلان کی تعمیل سے متعلق انتظامیہ کی استعداد کے تناسب سے باہر نہیں جانے چاہئیں اور وہ مالی وسائل کی دستیابی کے اندر رہنے چاہئیں۔ منصوبہ بندی کو امیدوں اور خواہشوں کے بجائے حقائق پر مبنی ہونا چاہیئے۔

۱۱۔ منصوبہ بندی کی تنظیم کو خصوصاً درمیانی اور نچلی سطحوں پر زیادہ سے زیادہ تکنیکی لحاظ سے قابل بنایا جانا چاہیئے۔ جبکہ اعلیٰ تر سطح پر وہ حلقہ عمل میں حقائق سے زیادہ سے زیادہ متاثر ہونی چاہیئے۔

۱۲۔ منصوبہ بندی کو لازماً مہارت پر مبنی ایک مشق تصور کیا جانا چاہیئے اور اس کے جواز کے بارے میں یہ خیال کیا جانا چاہیئے کہ وہ حکومت کے سیاسی ڈھانچے میں ہونے والی تبدیلیوں سے بھی بالاتر ہے۔

۱۳۔ پالیسیوں اور ان کی تکمیل، پروگراموں اور ان کی تعمیل اور کارپوریٹ پلاننگ کو منصوبہ بندی کے عمل کے لیے ضروری تصور کیا جانا چاہیئے۔

۱۴۔ انجام کار پلان کا معائنہ اور جائزہ منصوبہ بندی کے اثر کے لحاظ سے لیا جانا چاہیئے اور محض یہ نہیں دیکھنا چاہیئے کہ اُس میں کتنا روپیہ اور وسائل لگائے گئے ہیں اور اُس سے کیا کچھ حاصل کیا گیا ہے۔

منصوبہ بندی کے ایک بہترین نظام کی تلاش ایک مسلسل عمل ہے۔ منصوبہ بندی کے سسٹم کو تجربہ کی روشنی میں مسلسل اصلاحات میں سے گذرنا چاہیئے۔

★

غزل

جُنید حزیں لاری

جو یوں ہی بدلا کیا، عالمِ اسباب کا رنگ
اُڑ نہ جائے مری آنکھوں سے کہیں خواب کا رنگ

رات بھر جیسے کہ انگاروں پہ تھی رقص کناں
صاف کہتا ہے یہی شبنمِ شاداب کا رنگ

رنگ اور نُور کا اک سیلِ رواں ہو جیسے
قابلِ دید ہے یارو! شبِ مہتاب کا رنگ

شوخ جتنا بھی ہو یہ زندگی پائے گا کہاں!
دل کے آگے نہ کبھی جم سکا سیماب کا رنگ

اب نہ پہلی سی محبت نہ مروّت نہ وفا!
کتنا بے کیف ہوا محفلِ احباب کا رنگ

اے حزیں! کون بھلا دام لگائے ان کا
کس نے دیکھا ہے مرے گوہرِ نایاب کا رنگ

★

ایم۔ ایل۔ بجاج

آیوروید کا فروغ
مواقع و امکانات

ہندو دیومالا کے مطابق ابتدائے آفرینش میں جب عالمی بہبود کے لیے سمندر منتھن کیا گیا یعنی جب دیوتاؤں اور راکشسوں نے مل کر سمندر بلویا تو اُس میں سے جو ۱۴ رتن (نوادرات) نکلے تھے اُن میں دولت کی دیوی لکشمی کے ساتھ ساتھ دھنونتری رشی بھی تھے جو طب ویدک کے خالق بیان کئے جاتے ہیں۔

اگرچہ تاریخی اعتبار سے دھنونتری کا تعلق قدیم ہندوؤں کے سُنہری دَور یعنی گپت عہد سے ہے اور وہ سنسکرت کے لافانی شاعر اور ڈرامہ نگار کالی داس کے ساتھ ساتھ مہاراجہ بکرماجیت کے دربار کی زینت تھے، تاہم انھوں نے رفاہِ عامہ کے لیے آیوروید یعنی طب ویدک کے فروغ کے لیے اپنی تمام تر زندگی وقف کر دی جس کی وجہ سے اُنھیں دیوتا کا رتبہ دیا گیا۔

طب ویدک ہمارا شاندار تہذیبی سرمایہ ہے۔ یہ میراث ہمیں مقدس ویدوں سے ملی ہے۔ جنھیں ہندو الہامی کتب تصوّر کرتے ہیں۔ اتھروید میں ادویات اور علاج معالجے کا ذکر پایا جاتا ہے۔ رامائن اور مہابھارت کے عہد میں بھی ایسی طب اور ویدوں کی موجودگی کا پتہ چلتا ہے۔ دھنونتری اور چرک تو اسے آسمانی بلندیوں پر لے گئے تھے۔ سشرت نے سرجری یعنی فنِ جرّاحی میں وہ کمال حاصل کیا کہ کٹے ہوئے انسانی اعضا بھی جوڑے جانے لگے تھے۔ ناگارجن نے دھاتوں اور جسمِ انسانی پر اُن کے ہونے والے اثرات کا تحقیق و مطالعہ کرنے کے بعد بھسموں یعنی کُشتوں کا سسٹم ایجاد کیا جس سے طب ویدک کو ایک نیا موڑ ملا۔ یہی کُشتے آج دنیا بھر میں اصلی یا دوسری صورتوں میں طبی مقاصد کے لیے استعمال ہو رہے ہیں۔

سرجری

جیسا کہ پہلے ذکر کیا گیا ہے سرجری بھی بھارت میں حدِ کمال تک پہنچی ہوئی تھی۔ یہاں پیچیدہ نوعیت کے آپریشن بھی انجام دئے جاتے تھے۔ یونانی مورخ "سٹریبو" نے لکھا ہے کہ بھارت میں بہت اچھے معالج ہیں اور اُنھیں خصوصاً سانپ کاٹے کے علاج پر دسترس حاصل ہے۔

یہیں آنتوں اور دماغ کے آپریشن کئے جاتے تھے۔ موتیا بند، ہرنیا اور ہائیڈروسیل کا علاج سرجری سے کیا جاتا تھا۔ مُردہ بچے کو حمل سے نکالنے کے لیے چیر پھاڑ کی جاتی تھی۔ کوئی دو دہے قبل آل انڈیا میڈیکل اسوسی ایشن کے ایک سالانہ کنونشن میں پڑھے گئے مقالہ کے مطابق راجہ بھوج کا آپریشن کر کے اُس کے دماغ میں سے رسولی نکالی گئی تھی اور بعد میں اُسے سنجیونی بُوٹی سے ہوش میں لایا گیا تھا۔ بے حس کرنے کے لیے جڑی بوٹیوں یا شراب کا استعمال کیا جاتا تھا۔ زخمی سپاہیوں کے لیے پلاسٹک سرجری بھی کی جاتی تھی۔

بعد میں راجاؤں کی سرپرستی حاصل نہ ہونے اور ملک میں بودھ دھرم کے تحت عدم تشدد کے زور پکڑنے سے سرجری زوال پذیر ہوئی اور وہ بھدی صورت میں نائیوں، حجاموں، عطائیوں اور بنجاروں کے ہاتھ میں آنے کے بعد تقریباً ختم ہو گئی۔

عروج

ٹیکسلا، نالندہ، اُجین اور کانچی یونیورسٹیوں اور بنارس میں دیگر علوم کے ہمراہ طب کی باقاعدہ طور پر تعلیم دی جاتی تھی۔ یہاں درسی کتب کے ساتھ ساتھ سرجری کی عملی تعلیم بھی دی جاتی تھی۔ ان یونیورسٹیوں میں جہاں ملک کے لوگ تعلیم پاتے تھے وہاں دُور دراز ممالک جیسے چین، تبت، جاوا، سوماترا، کوریا، یونان، ایران اور عرب ممالک سے بھی علم کی تشنگی مٹانے کے لیے طلبا آتے تھے۔ وہ ان یونیورسٹیوں میں ۱۰ برس سے بھی زیادہ عرصہ تک قیام کرتے تھے اور منطق، طب، اور فلکیات کے بارے میں تعلیم حاصل کرتے تھے۔ اس سے ظاہر ہے کہ ان یونیورسٹیوں میں تعلیم کا معیار بہت بلند تھا۔ اسی لیے تو غیر ممالک کے لوگ حصولِ تعلیم کے لیے یہاں آتے تھے۔ راجاؤں مہاراجاؤں اور گرام پنچایتوں کی طرف سے ان یونیورسٹیوں کے لیے عطیات دئے جاتے تھے جہاں تعلیم مُفت دی جاتی تھی۔ غیر مُلکی حکمرانوں کی طرف سے بھی امدادی رقوم دینے کا ذکر پایا جاتا ہے۔

عالمی شہرت

طب ویدک کا ڈنکا نہ صرف بھارت بلکہ دُنیا بھر میں بج رہا تھا۔ سکندر جب بھارت سے رُخصت ہوا تو وہ اپنے ساتھ کئی ویدوں کو لے گیا تھا۔ بتایا جاتا ہے کہ بھارت میں سکندر کی افواج سانپوں سے نہایت پریشان تھی۔ اُس کے کئی سپاہی سانپ کاٹے سے ہلاک ہو گئے تھے۔ تب راجہ پورس نے محض انسانیت کے جذبہ سے علاج معالجہ کے لیے بھارت کے ویدوں کو بھیجا تھا جن سے سکندر بڑا متاثر ہوا اور وہ اپنے ساتھ اِن ویدوں کو لے گیا۔ یونانیوں نے جہاں ان کے طریقہ علاج سے استفادہ کیا وہاں یونانی طبیبوں نے اُن کے علم سے فائدہ اُٹھا کر اپنی طب کی بنیاد رکھی جو طب یونانی کے نام سے موسوم ہوئی اور جسے بعد میں عربوں نے بھی اختیار کیا۔

عرب طب ویدک سے بلاواسطہ طور پر بھی فیضیاب ہوئے ہیں۔ جب خلیفہ ہارون الرشید بغداد

میں سخت بیمار ہوئے تو عرب معالجوں سے اُنھیں کوئی افاقہ نہیں ہوا۔ بالآخر بھارت سے مانک وید کو بُلایا گیا۔ صحتیابی کے بعد خلیفہ نے مانک سے استدعا کی کہ وہ اُن کے ملک ہی میں قیام کریں اور آیور وید کی کتابوں کا عربی میں ترجمہ کرنے میں مدد دیں۔ مانک کو بغداد کے ہسپتالوں میں سربراہ بناکر بھی اُن کی عزت افزائی کی گئی۔ اسی طرح پنڈت نہرو نے اپنی کتاب "ہندوستان کی دریافت" میں عرب مصنفوں کے حوالے سے بغداد میں چھ دیگر بھارتی ویدوں کی موجودگی کا ذکر کیا ہے۔

مغرب کے علاوہ مشرق میں بھی آیوروید نے اپنے پرچم بلند کئے ہیں۔ ساتویں صدی میں جب چینی سیاح ہیون سانگ بھارت آیا تو اُس نے بھارت کے علوم سے فیضیاب ہونے کے لیے نالندہ یونیورسٹی میں ۱۰ برس قیام کیا۔ جب وہ واپس گیا تو اپنے ہمراہ مذہبی علوم کے ساتھ ساتھ طب ویدک کی بھی بے شمار کتابیں اور نسخے لے گیا۔

اسی طرح ہیون سانگ کے بعد ایک اور چینی سیاح "آئی سینگ" ۶۷۳ء میں آیا۔ اُس نے بھی طویل عرصہ تک نالندہ یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کی اور واپسی پر اپنے ساتھ سینکڑوں سنسکرت کی درسی کتب لے گیا جن میں طب سے متعلق کتابیں شامل تھیں۔

پنڈت نہرو نے اپنی کتاب "ہندوستان کی دریافت" میں مزید لکھا ہے کہ گیارہویں صدی میں بھارت میں جو سیاسی تبدیلیاں ہوئیں اُن کے باعث بودھ بھکشوؤں (راہبوں) کے ہجوم کے ہجوم بھارت سے ہجرت کرکے نیپال سے ہوتے ہوئے تبت اور چین پہنچے اور اپنے ساتھ مذہب ریاضی اور طب سے متعلق کتابیں اور نسخے بھی لے گئے جو آج بھی بودھ خانقاہوں میں سنسکرت یا وہاں کی زبانوں میں محفوظ ہیں۔

دورِ جدید میں ویدک

اسی طرح آج برطانیہ، جرمن اور فرانس کے کتب خانوں میں طب ویدک کے متعلق بے شمار کتابیں اور نادر مسودے موجود ہیں، جو بھارت میں یوجنا، نئی دہلی

یورپی اقوام کی آمد کے بعد وہاں پہنچے۔ یورپی لوگ ڈھونڈ ڈھونڈ کر ان کتابوں کو اپنے ملکوں میں لے گئے۔ اس سلسلے میں لندن کی انڈیا آفس لائبریری کا نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔

بھارت سرکار اور عالمی ادارہ صحت کی طرف سے طب ویدک میں بڑی دلچسپی لی جارہی ہے۔ عالمی ادارہ صحت نے ۲۰۰۰ء تک سب کو صحتی سہولیات فراہم کرنے کا پروگرام بنایا ہے۔ اُس کا یقین ہے کہ طب ویدک اس سلسلے میں اہم رول ادا کرسکتا ہے۔ کیونکہ وہ اس علاقے کے لوگوں کے مزاج سے عین موافقت رکھتی ہے۔ اس کا انحصار زیادہ تر جڑی بوٹیوں پر ہے جو نہ صرف یہاں بافراط دستیاب ہیں، بلکہ وہ اسی مٹی سے اُگی ہیں جس مٹی سے یہاں کے عوام اُگے ہیں۔ بھارت سرکار اور ادارہ ہذا کی طرف سے طب ویدک کے ماہروں کو مذکورہ بالا خانقاہوں اور لائبریریوں میں بھیجا جاتا ہے اور کبھی کبھی وہاں کی حکومتوں کی طرف سے بھی بھارت سرکار کی وساطت سے سنسکرت اور آیور وید کے عالموں کو مدعو کیا جاتا ہے۔ چند ویدوں کو تو منگولیا اور بھوٹان کی بودھ خانقاہوں میں بھی لے جایا گیا ہے۔ حال ہی میں ایک نامور وید کو بنگلہ دیش کی حکومت کی استدعا پر وہاں بھیجا گیا تھا تاکہ وہاں آیور وید کے طریقۂ علاج کو رائج کیا جاسکے اور فروغ دیا جاسکے۔

سرکاری اقدامات

طب ویدک نصف صدی سے قبل اپنے شباب پر تھی۔ دیہات اور قصبات میں اسی کا بول بالا تھا۔ گو بعض شہروں میں طب یونانی کے معالجوں کا بھی زور تھا۔ لیکن دوسری عالمی جنگ کے بعد سائنس کے ساتھ ساتھ ایلوپیتھی (مغربی طریقِ علاج) نے حیرت انگیز ترقی کی ہے۔ جس سے طب ویدک اور طب یونانی دونوں ہی پچھڑ گئی ہیں۔ اس شاندار تہذیبی سرمایہ کا تحفظ کرنے اور اسے فروغ دینے اور اس سے استفادہ حاصل کرنے کے لیے بھارت سرکار نے تقریباً ۱۲ برس پہلے طب ویدک، طب یونانی اور ہومیوپیتھی سے متعلق ایک مرکزی کونسل قائم کی

تھی جس کا مقصد ان تینوں طبوں کے بارے میں تحقیق کرکے انھیں فروغ دینا تھا۔ لیکن ۳۰ مارچ ۱۹۷۹ء کو ان کے الگ الگ ادارے قائم کردیئے گئے طب ویدک کے متعلق ادارہ "سینٹرل کونسل فار ریسرچ ان آیوروید اینڈ سدھا" کے نام سے موسوم ہے۔ جو سائنسی طرز پر تحقیقی سرگرمیاں انجام دے رہا ہے۔ اس کے مختلف تحقیقی پروگراموں کو وسیع طور پر ان زمروں میں بانٹا جاسکتا ہے۔ ہسپتالی تحقیق، ادویاتی تحقیق، عالمی اور بنیادی تحقیق۔ اس کا سال رواں کا بجٹ ۱۱ کروڑ روپے کا ہے۔ مرکزی وزارتِ صحت و خاندانی بہبود کے جناب بی شنکر آنند اس کے سربراہ اور صحت و خاندانی بہبود کی وزیر ریاست محترمہ محسنہ قدوائی اس کی نائب سربراہ رہ چکی ہیں۔

اس کونسل کے تحت بھارت کے ۲۹ شہروں میں ہسپتال اور شفاخانے ہیں جہاں علاج معالجے کے ساتھ ساتھ طب ویدک کے بارے میں تحقیق و مطالعہ اور تجربے کئے جارہے ہیں۔ کونسل ہذا کی طرف سے فروغ ہمارے فیملی پلاننگ سے متعلق پروگرام عمل میں لائے جارہے ہیں۔ آدی باسی علاقوں کو بھی علاج معالجہ کی سہولیات فراہم کی جارہی ہیں اور اس پروگرام کے تحت پانچ پراجیکٹ انڈمان، نکوبار اور دیگر علاقوں میں عمل میں لائے جارہے ہیں۔

ملک کے مختلف جنگلی علاقوں میں جڑی بوٹیوں کے نمونے فراہم کئے جارہے ہیں۔ چند مقامات پر بوٹیوں کی کاشت بھی کی جارہی ہے۔ گذشتہ برس ایسے اہم علاقوں کا سروے کیا گیا اور ۱۶۹۹۳ بوٹیوں کے نمونوں کی شیشیاں تیار کی گئیں۔ کونسل کو ملیریا کے علاج میں نمایاں کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ خون کے اعلیٰ دباؤ، امراضِ قلب اور ذیابیطس وغیرہ میں کامیاب تجربے کئے جارہے ہیں۔

توقع ہے کہ حکومت کی طرف سے کئے گئے اقدامات سے طب ویدک کو ایک بار پھر مقبولیت حاصل ہوگی اور وہ صحتِ عامہ کے فروغ میں اپنا نمایاں رول ادا کرے گی۔

★

تجارت اب وزارتِ تجارت و رسد (سپلائی)
کے نام سے موسوم ہوگی۔ کامرس، سپلائی اور
ٹیکسٹائلز کے محکموں کو نئے تشکیل شدہ ڈھانچے
میں شامل کیا گیا ہے۔ وزارت مواصلات میں
پہلی بار ڈاک اور تار کے محکموں کو الگ الگ
کیا گیا ہے۔ نئی تشکیل شدہ وزارتِ دفاع کے
تحت دفاع، دفاعی پیداوار اور سپلائی اور
دفاعی تحقیق و ترقی کے محکمے ہوں گے۔ وزارت
زراعت سے آبادکاری کا محکمہ الگ کر دیا گیا ہے۔
وزارت منصوبہ بندی (پلاننگ) کے تحت اب
منصوبہ بندی اور اعداد و شمار - Stati)
stics) کے محکمے ہوں گے۔ سائنس اور ٹیکنالوجی
کی وزارت کے تحت سائنس اور ٹیکنالوجی،
سائنس اور صنعتی تحقیق اور توانائی کے غیر مروجہ
وسائل کے محکمے ہوں گے۔ سماجی بہبود کی وزارت
اب سماج اور خواتین کی بہبود کی وزارت کے
نام سے موسوم ہوگی۔ ایسا اس لیے کیا گیا ہے تاکہ
خواتین کی بہبود پر نئے سرے سے زور دیا جا
سکے۔ کھیلوں کے محکمے میں نوجوانوں کے امور کے
محکمے کو ملایا گیا ہے۔ کوئلے کے محکمے کو فولاد اور
کانوں کی وزارت میں شامل کیا گیا ہے اور یہ اب
فولاد، کانوں اور کوئلے کی وزارت کے نام سے
موسوم ہوگی۔ لیکن کوئلے کا محکمہ الگ طور پر
کام کرے گا۔

تنظیم نو کے ساتھ ساتھ ایماندار اور قابل
افسروں کی تلاش جاری ہے جو متعدد نئے محکموں
کا کام کاج خوش اسلوبی سے چلا سکیں۔ اسی
طرح کی اطلاعات ملی ہیں کہ بعض چوٹی کے افسروں
جن کی میعاد پوری ہو چکی ہے اُن کی متعلقہ
ریاستوں میں بھیج دیا جائے گا۔ پرسونل اور انتظامیہ
اصلاحات کا محکمہ وزیراعظم کی مکمل ذمہ داری میں
ہوگا۔ اور یہ بھی بتایا جا رہا ہے کہ پرسونل کے
... سے کہا گیا ہے کہ جن افسروں کی ایمانداری
مشکوک ہے اُن کے خلاف کارروائی کر کے انھیں

چلتا کیا جائے۔

یہ بھی پتہ چلا ہے کہ وزارتوں کے کام کاج میں تال میل پیدا کر کے اُن کے مسائل کو سمجھنا اور ان کے فوری حل تلاش کرنے کے لیے وزیراعظم نے متعدد وزیروں اور سیکرٹریوں کے ساتھ بات چیت کا سلسلہ شروع کیا ہے۔ متعلقہ وزارت کے وزیر اور سیکرٹری آتے ہیں اور وزیراعظم کو اپنے مسائل اور کام کاج سے آگاہ کرتے ہیں اور جب بات چیت ایک سے زیادہ وزارتوں کے بارے میں ہو تو وزیراعظم کے ساتھ وزیروں اور سیکرٹریوں کی مشترکہ میٹنگ ہوتی ہے۔ جب ضروری ہو تو باہر کے ماہروں کا مشورہ بھی لیا جاتا ہے۔

قوم کے نام اپنے نشریہ میں وزیراعظم نے کہا تھا کہ پبلک سیکٹر بدستور ملکی ترقی کا بڑا ذریعہ بنا رہے گا۔ اس کے پیش نظر پبلک سیکٹر کو زیادہ مضبوط بنایا جا رہا ہے تاکہ وہ زیادہ مستعدی سے کام کر سکے اور یہ بھی دیکھا جا سکے کہ وہ زیادہ منافع کماتے ہیں اور خسارے میں نہیں جاتے جیسا کہ اب تک ہو رہا ہے۔

مشکل مسائل کا حل

وزیراعظم نے پنجاب اور آسام کے مشکل مسائل کو حل کرنے کی جانب بھی زیادہ توجہ دی ہے کیونکہ وہ عظیم قومی اہمیت کے حامل ہیں نئی حکومت کی تشکیل کے فوراً بعد کابینہ کی ایک سب کمیٹی بنا دی گئی ہے تاکہ وہ پنجاب کے مسئلہ پر غور کر سکے یہ سب کمیٹی تیز رفتاری سے کام کر رہی ہے اور معلوم ہوا ہے کہ وہ اس مسئلہ کا پُرامن حل تلاش کرنے کے لیے تمام فریقین سے صلاح مشورہ کر رہی ہے

آسام ایجی ٹیشن کے لیڈروں کے ساتھ بھی بات چیت کی کوشش کی جا رہی ہے تاکہ غیر ملکی باشندوں کا پیچیدہ مسئلہ حل کیا جائے جو اب تک گرفت میں نہیں آ رہا تھا۔ یہ بھی پتہ چلا ہے کہ بات چیت نئی دلی میں شروع ہو سکتی ہے۔

تعلیم کو پہلی بار اس کی واجب اہمیت حاصل ہو رہی ہے۔ اپنا قلمدانِ وزارت سنبھالنے کے فوراً بعد مرکزی وزیر تعلیم نے ملازمت سے ڈگریوں کو الگ کرنے کے سوال پر فوری توجہ دینے کی تلقین کی ہے۔ اپنی وزارت کے افسران اعلیٰ کے ساتھ اپنی پہلی میٹنگ میں انھوں نے کہا کہ یونیورسٹیاں اعلیٰ تعلیم کے ادارے بن جانے چاہئیں اور اعلیٰ تعلیم پر دیئے جانے والے زور کو ختم کر دینا چاہیئے انھوں نے کہا کہ پیشہ ورانہ تعلیم کو بھی فروغ دینا چاہیئے۔

ابتدائی تعلیم کو نظرانداز نہ کرنے کی غرض سے وزارت تعلیم نے اس امر کے بارے میں تحقیق اور مطالعہ کرنے کا فیصلہ کیا ہے کہ ابتدائی تعلیم کے لیے زیادہ بچے بھرتی کیوں نہیں ہو رہے ہیں۔ یہ تحقیق و مطالعہ آسام، آندھرا پردیش، بہار، جموں و کشمیر، مدھیہ پردیش، اڑیسہ، راجستھان، اتر پردیش اور مغربی بنگال میں کیا جائے گا جہاں یہ مسئلہ نہایت سنگین ہے۔ تحقیق و مطالعہ میں اس امر پر روشنی ڈالی جائے گی کہ کیا افلاس تعلیم عامہ کی راہ میں رکاوٹ ہے کیونکہ اسکول نہ جانیوالے بچوں کی بھاری تعداد سماج کے کمزور طبقوں سے تعلق رکھتی ہے۔ وزیراعظم اس امر کے بھی آرزومند ہیں کہ مصنوعی سیاروں، ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے استعمال کے ذریعہ دی جانیوالی تعلیم کے معیار کو بلند کیا جائے۔

ملک حرکت میں آ گیا ہے اور کوئی بھی تبدیلی کی ہواؤں کو دیکھ سکتا ہے۔ مرکزی حکومت کی وزارتوں اور محکموں کی از سر نو تنظیم کی گئی ہے اور بیوروکریسی میں خدمت کی نئی روح پھونکی جا رہی ہے اور اسے عوام کی اُمنگوں اور ضرورتوں کے لیے زیادہ جوابدہ بنایا جا رہا ہے۔ ہر شخص کو زندہ رہنے کے لیے چنوتی درپیش ہے خواہ وہ سرکاری اہلکار ہو یا حکومت کا وزیر کیونکہ اُس کی کارکردگی کا بغور جائزہ کیا جا رہا ہے۔ سب کے لیے ایمانداری پر بھی زور دیا جا رہا ہے۔ ملک کے سامنے جو مشکل مسائل ہیں اُن کی جانب بھی ملک کی سالمیت کے مفاد میں فوری توجہ دی جا رہی ہے۔ گو اس سے برآمد ہونے والے بڑے بڑے نتائج کا جائزہ لینا ابھی قبل از وقت ہے۔ تاہم یہ کہا جا سکتا ہے کہ مطلوبہ سمت میں خوش قدم شروع ہو گئے ہیں۔ ★

عباس رضوی

ترقی پسند معاشرہ

ایک ترقی پسند معاشرہ میں منصوبہ بندی ملک اور قوم کی ہمہ جہتی ترقی کی ضامن ہوتی ہے۔ آزادی کے بعد ہندوستان نے پنڈت جواہر لال نہرو کی تجربہ کار قیادت میں پہلے پانچ سالہ منصوبے سے ہی آبادی کی روک تھام کے لیے جامع کوششوں پر مبنی پروگرام بنایا کیوں کہ قومی معیشت کی ضروریات کے مطابق آبادی کو ایک خاص سطح پر رکھنا مقصود تھا۔

یہ قومی سطح پر منصوبہ بندی ہی کا طفیل تھا کہ ملک نے ادویہ سازی کے شعبہ میں نمایاں ترقی کی اور صحت بخش ادویات کے باعث شرح اموات میں کمی ہوئی اور عوام کی مجموعی اوسط عمر کی شرح میں اضافہ ہوا۔ قومی اور ریاستی سطح پر سالانہ بجٹ اور منصوبوں میں تعلیم کے لیے زیادہ رقومات مختص کرنے اور ناخواندگی کے خلاف سرکاری رضاکار تنظیموں کی کوششوں کے نتیجہ میں دلوں میں حصولِ علم کا شوق جاگزیں ہوا۔ تعلیم کی ترقی اور عام مقبولیت سے ملک کی ہمہ جہتی ترقی کو کمک ملی اور ہر شعبۂ حیات میں سائنسی نقطۂ نظر اختیار کرنے اور عصری ضروریات سے زندگی [illegible] کرنے، بچوں کی تعلیم، صحت پر توجہ اور بہتر [illegible]شحال زندگی کی لگن شہری عوام میں پی[illegible] اس کے مثبت اثرات دیہی عوام پر مرتب ہ[illegible]

منصوبہ بند ترقی کی راہ پر گامزن ایک ترقی پذیر معاشرہ میں ایک خاندان کو بھی اپنی معیشت کو منصوبہ بند طریقہ پر چلانا پڑتا ہے۔ اور خاندانی فلاح و بہبود کا پروگرام کنبے کی آئیڈیل زندگی کی سمت درست رہنمائی کرتا ہے۔

چوں کہ ہندوستان نے پہلے پانچ سالہ منصوبہ ہی سے آبادی کی روک تھام پر توجہ دی اس کے نتیجہ میں ۱۹۸۱ میں ہندوستان میں دوسرے ترقی پذیر ممالک کے مقابلے میں آبادی کی شرح پیدائش کو ۲٫۲ فیصد تک کم کر دینے میں مدد ملی۔ شاید ہندوستان دنیا کا وہ واحد ملک ہے جس نے شرح پیداوار کو تقریباً تین فیصد تک پہونچنے دیے بغیر ہی اس میں کمی کی ہے۔

صحت اور خاندانی بہبود کی مرکزی وزارت کی جانب سے ۱۹۸۳ کے آخر میں خاندانی بہبود پروگرام کے سلسلہ میں کیے گئے جائزے سے معلوم ہوا ہے کہ ۱۹۸۰ سے خاندانی منصوبہ بندی کے مختلف طریقے اختیار کرنے والوں اور اولاد پیدا کرنے کے قابل جوڑوں کو کنبہ بندی پروگرام کے تحت لانے کی سطح میں جو اضافہ ہوا ۱۹۸۲ء میں بھی اس رجحان کو برقرار رکھا گیا۔ اپریل سے دسمبر ۱۹۸۳ء تک کی مدت میں گذشتہ سال کے اسی عرصہ میں نس بندی کرانے والوں کی تعداد میں ۶٫۹ فیصد، لوپ لگوانے والوں کی تعداد میں ۶٫۵ فیصد، مانع حمل کے روایتی طریقے اپنانے والوں کی تعداد میں ۱۰٫۹ فیصد اور اس سلسلے میں گولیاں استعمال کرنے والوں کی تعداد میں ۵٫۸ فیصد کا اضافہ ہوا۔ اس کے علاوہ اپریل ۱۹۸۲ء سے اپریل ۱۹۸۳ تک کی مدت میں اولاد کی پیدائش میں کمی ہو جانے والے جوڑوں کی تعداد میں ۲٫۲ فیصد کا اضافہ ہوا۔ یہ تعداد ۲۳٫۷ فیصد سے بڑھ کر ۲۵٫۹ فیصد ہو گئی اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس سلسلے میں ۲۰۰۰ء تک ۶۰ فیصد جوڑوں کو اس زمرے میں لانے کا نشانہ وقت سے کافی پہلے پورا کر لیا جائے گا۔

خاندانی منصوبہ بندی یا خاندانی بہبود سے متعلق پروگرام کی مقبولیت حاصل کرنے کا سہرا حکومت اور ان رضاکارانہ تنظیموں کے سر جاتا ہے جو ناخواندگی کے خاتمہ کے لیے سرگرم عمل ہیں۔ ایک طرف تعلیم کے فروغ کی مساعی اور دوسری طرف خاندانی بہبود پروگرام کو مقبول بنانے کی مساعی نے ناوابستہ طور پر مربوط ہو کر عوام میں معاشرتی شعور پیدا کیا جس کے سبب کنبہ بندی یا کنبہ کو محدود رکھنے کا عمل ایک مبین فطری امر بن گیا۔ پڑھے لکھے شہری طبقے کے ساتھ دیہات میں آباد اصل ہندوستان کی آبادی کا ایک قابلِ لحاظ حصہ جو ناخواندہ ہے وہ بھی خاندانی بہبود سے متعلق پروگرام کو شعوری طور پر ناگزیر سمجھنے لگا ہے۔ آبادی کی روک تھام میں مرکزی اور ریاستی حکومتوں کی جانب سے دی جا رہی ترغیبات بھی عوام کی ذہنی تربیت میں نمایاں رول ادا کر رہی ہیں۔ عوام میں معاشرتی شعور کی پختگی کے باعث اب روایتی اندازِ فکر اور قدامت پسندی خاندانی منصوبہ بندی کی راہ میں رکاوٹ نہیں رہیں۔

دُنیا کا ہر چھٹا آدمی ہندوستانی ہے، کیوں کہ ۱۹۸۱ء کی مردم شماری کے مطابق ہماری آبادی ۶۸ کروڑ ۳۰ لاکھ ہے لیکن دنیا کی پانچویں آبادی کے لیے ہمیں دُنیا کے رقبے کا صرف ۲٫۴ فیصد حصہ میسر ہے جس کا نتیجہ ہے گنجان آبادی، انسانوں کی کثرت اور اشیاء کی قلت۔ آزادی کے بعد تعلیم و ترقی کی کوششوں کی وجہ سے ملک نے بڑی ترقی کی ہے۔ عظیم الشان کارخانے، دیوقامت پراجیکٹ، بجلی گھر، فولاد کے کارخانے، کپڑے کی ملیں، کھاد کے کارخانے، چھوٹی صنعتیں، اسکول، کالج، ہسپتال۔ غرض کہ ہر شعبۂ حیات میں نمایاں ترقی ہوئی جس نے ملک کو صنعتی طور پر ترقی یافتہ ملکوں کی صف میں لا کھڑا کر دیا ہے۔ زندگی کی سہولتیں انھیں بھی میسر ہوتی گئیں جو سماج کے غریب ترین طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ غربت کا خاتمہ تو نہیں ہوا، البتہ کمی ضرور ہوئی ہے مگر ان ساری کوششوں کے باوجود ہماری آبادی کا قابل لحاظ طبقہ اب بھی غربت کی زندگی

(باقی صفحہ پر)

Published by the Director, Publications Division, Patiala House, New Delhi-110001

یوجنا

یکم تا ۱۵ مارچ ۱۹۸۵ء

ایک روپیہ

اتر پردیش ترقی کی شاہراہ پر
(مسعود عثمانی)

امراضِ قلب کا سرجری سے علاج
(پروفیسر پی وینو گوپال)

ای. سی. تھامس

بجلی کی تیاری

گزشتہ تین دہائیوں میں ہندوستان میں بجلی کی پیداوار میں حیرت انگیز ترقی ہوئی ہے۔ اس صدی کے پانچویں دہے کے اوائل میں جو بجلی شہروں کے چند خوش نصیب لوگوں کو دستیاب تھی وہی بجلی آج توانائی کی ناگزیر چیز بن گئی ہے جس سے صنعتی پہیہ گھومتا ہے، زرعی پیداوار میں اضافہ ہوتا ہے، ملک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک ریلیں چلتی ہیں۔ اور دیگر سیکڑوں طریقوں سے لوگوں کی زندگی میں روشنی آتی ہے۔

گزشتہ تین دہائیوں میں ملک میں بجلی کی کل کھپت میں نمایاں اضافہ ہوا ہے۔ گزشتہ تین دہائیوں میں بجلی کی کھپت کی مجموعی سالانہ رفتار ترقی میں تقریباً دس فی صد کا اضافہ ہوا ہے۔ ملک کے صنعتی شعبے میں بجلی کی سب سے زیادہ کھپت ہوئی ہے۔ ۸۴-۱۹۸۳ کے اختتام تک صنعتی شعبے میں بجلی کی کل پیداوار کا ۶۰ فی صد حصہ استعمال ہوا۔ بجلی کی کھپت والے دوسرے شعبوں میں سے زرعی شعبے میں بجلی کی کھپت کی رفتار ترقی سب سے زیادہ رہی۔ اس وقت اس شعبے میں بجلی کی کل کھپت کا ۱۸ فیصد حصہ استعمال ہو رہا ہے۔ ہندوستان میں پمپ سیٹوں کو بجلی سے چلانے سے آبپاشی کی سہولیات میں جو بھاری اضافہ ہوا ہے اس سے بجلی کی کھپت میں غیر معمولی اضافے ہونے کی وضاحت ہوتی ہے۔ دیگر شعبوں جیسے گھریلو، کاروباری استعمال اور گاڑیاں چلانے کے لیے بجلی کی کھپت میں اضافے کی رفتار مذکورہ دو بڑے شعبوں کی نسبت کم رہی ہے۔

بجلی کی لگاتار بڑھتی ہوئی مانگ کو پورا کرنے کے لیے وقتاً فوقتاً بجلی تیار کرنے کی صلاحیت میں بھاری توسیع کے پروگرام شروع کیے گئے ہیں۔ دسمبر ۱۹۵۰ میں ملک میں بجلی تیار کرنے کی کل نصب شدہ صلاحیت ۲۳۰۰ میگاواٹ تھی۔ یہ صلاحیت بتدریج بڑھتی ہوئی مارچ ۱۹۸۴ کے اختتام تک ۳۹۳۶۰ میگاواٹ ہو گئی۔ دسمبر ۱۹۸۴ کے اختتام تک بجلی تیار کرنے کی نصب شدہ صلاحیت کا تخمینہ زائد از ۴۳ ہزار میگاواٹ ہے۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ چھٹے منصوبہ کی مدت کے دوران ۱۴۵۴۵ میگاواٹ صلاحیت کا اضافہ ہوگا۔

پہلے پنجسالہ منصوبے کے شروع میں بجلی کی تیاری کی سطح کے مقابلے میں تیسرے منصوبے کے آخر تک بجلی کی مجموعی سطح پیداوار میں چھ گنا سے زائد اضافہ ہوا جبکہ اگلے پندرہ برس میں بجلی کی پیداوار میں چار گنا سے کم اضافہ ہوا۔ چھٹے منصوبے (۸۵-۱۹۸۴) کے اختتام تک بجلی کی کل پیداوار ۸۰-۱۹۷۹ کی ۱۱۲ ارب یونٹ کی سطح سے بڑھ کر ۱۷۰ ارب یونٹ ہو جانے کا تخمینہ لگایا گیا ہے یعنی مجموعی اضافے کی سالانہ شرح ترقی ۸.۷ فیصد ہے۔

چونکہ بجلی کا شعبہ بھاری سرمایہ کاری کا شعبہ ہے۔ اس لیے ۱۹۵۱ میں پہلے پنجسالہ منصوبے کے اجرا سے ہی منصوبے کے کل مصارف کا کافی بڑا حصہ اس شعبے کو حاصل ہوا ہے۔ پہلے پنجسالہ منصوبے میں اس شعبے کے لیے سرمایہ کاری ۲۶۰ کروڑ روپے مقرر کی گئی تھی۔ جو تیسرے پنجسالہ منصوبے میں بڑھ کر ۱۲۵۲ کروڑ روپے اور موجودہ پنجسالہ منصوبے میں ۱۹۲۶۵ کروڑ روپے ہو گئی۔ اس طرح ۳۵ برس کے عرصے میں بجلی کے شعبے میں لگانے کے لیے دستیاب سرمائے میں ۱۳ فی صد سالانہ کی رفتار سے اضافہ ہوا ہے۔

ملک میں بجلی کے ترقیاتی پروگراموں کے لیے علاقائی نظریہ اپنایا گیا۔ چنانچہ بجلی سے متعلق پروگرام کو فروغ دینے کے لیے ملک کو پانچ خطوں میں تقسیم کیا گیا۔

مرکزی سرکار نے ۱۹۷۴ میں نیشنل تھرمل پاور کارپوریشن اور نیشنل ہائیڈرو الیکٹرک پاور

(باقی صفحہ [illegible] پر)

منصوبہ بندی اور ترقیاتی پروگراموں کی جھلک پیش کر

پندرہ روزہ

یوجنا

نئی دہلی

چیف ایڈیٹر :- آر۔ ٹھکرال
ایڈیٹر :- لکھی رام رانا
اسسٹنٹ ایڈیٹر :- محمد عادل صدیقی
سب ایڈیٹر :- وسیم حیدر

جلد : ۴	یکم تا ۱۵ مارچ ۱۹۸۵	شمارہ ۲۳

۱۰ پھاگن تا ۲۴ پھاگن سمبت ۱۹۰۶

شرح چندہ

سالانہ ۲۰ روپے ۔ ۲ سالہ ۳۵ روپے ۔ سہ سالہ ۵۰ روپے
فی کاپی :- ایک روپیہ

طالب علموں، استادوں اور لائبریریوں کے لیے ۱۰ فی صد کی رعایت

اس شمارے میں

یوجنا منصوبہ بند ترقی کے بارے میں عوام کو آگاہ کرتا ہے مگر اس کے مضامین صرف سرکاری نقطۂ نظر کی وضاحت تک ہی محدود نہیں ہیں

بزنس منیجر : ایل۔ آر۔ بترہ ★ اسسٹنٹ ڈائرکٹر (پروڈکشن) آر۔ ایس۔ منچال

مضامین سے متعلق خط و کتابت کا پتہ :-
ایڈیٹر یوجنا (اردو) پبلیکیشنز ڈویژن، ایسٹ بلاک ۴، لیول ۵، آر۔ کے۔ پورم (مین) نئی دہلی ۱۱۰۰۶۶

ترسیل زر کا پتہ : بزنس منیجر، پبلیکیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

اداریہ

صحت ــــــ ترقی کی کلید

روئے زمین پر جس قدر وسیلے دیکھنے میں آتے ہیں، ان میں حضرتِ انسان کا وجود سب سے زیادہ اہم وسیلے کی صورت میں ہے۔ لہٰذا جسمانی صحت اور ذہنی آسودگی بہر طور ضروری ہے تاکہ انسان اپنی صحت مند قوتوں کے ذریعے نوعِ انسانی کی ترقی کے لیے دل و جان سے کام کر سکے۔ چنانچہ ہمارے ملک میں صحت کے مسئلے کو حل کرنے پر جو زور دیا جا رہا ہے، وہ اسی پس منظر میں ہے۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ بہت سی وہ بیماریاں جو دوسرے ممالک سے غائب ہو چکی ہیں، ابھی تک یہاں پائی جاتی ہیں لیکن ایسا نہیں کہ اس محاذ پر کوئی کامیابی حاصل نہ کی گئی ہو۔ ہندوستان سے چیچک کی بیماری کا قلع قمع کوئی معمولی کارنامہ نہیں ہے۔ البتہ آنتوں کی سوزش اور دیگر بیماریوں سے نجات پانے کے لیے ابھی بہت کچھ کیا جانا باقی ہے۔ بچوں کی بیماریوں پر قابو پانا سب سے زیادہ ضروری سمجھا گیا ہے، لہٰذا پولیو اور دستوں وغیرہ کی بیماریوں پر قابو پانے کے لیے بہت سے اقدامات کئے جا رہے ہیں۔ اس سلسلے میں پولیو کے ٹیکے کے پروگرام کو بڑے شد و مد سے شروع کیا جا چکا ہے۔ ملیریا بھی ہمارے باشندوں کے لیے بہت تشویش کا باعث رہا ہے، اس پر ایک وقت میں مکمل طور پر قابو پا لیا گیا تھا مگر اب کچھ دنوں سے یہ دوبارہ سر اٹھا رہا ہے، اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ جراثیم کش دوائیں مچھروں کو مارنے میں بے اثر ثابت ہو رہی ہیں اور مچھر اس کے برابر عادی ہوتے جا رہے ہیں۔ تپ دق، کوڑھ اور بہت سی دیگر بیماریاں ہمارے طبی سائنسدانوں کی مزید توجہ کی محتاج نظر آتی ہیں۔ اس سلسلے میں اصول صحت کی تعلیم اور حفظانِ صحت کے قواعد و ضوابط کی تعمیل بہت ضروری ہے۔ یہ تعلیم اسکول، بچوں کو محض رسمی طور پر ہی نہیں دی جانی چاہیئے بلکہ انہیں شروع سے ہی صفائی اور ستھرائی کی زندگی گزارنے کا عادی بنا دینا چاہیئے۔ تغذیہ بخش خوراک کے استعمال اور صحت کی برقراری سے متعلق اصولوں کی پابندی سے بہت سی بیماریوں کی روک تھام ہو سکتی ہے۔ اس کے لیے انڈر گریجویٹ طبی تعلیم کے نصابات پر نظرثانی کی ضرورت محسوس کی جا رہی ہے۔ نیم طبی عملے کی تعداد بڑھا کر بھی بہت سی بیماریوں کا بروقت انسداد ہو سکتا ہے۔ دوا سازی کی صنعت میں بین الاقوامی تعاون سے اس کی لاگتیں کم کی جا سکتی ہیں اور دواؤں کی تیاری کے معیار کو بلند کیا جا سکتا ہے۔ انسداد کوڑھ ہمارے ملک کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اس سلسلے میں قومی سطح پر ایک وسیع پروگرام شروع کیا جا چکا ہے۔ ہمارے طبی سائنسدانوں نے دیگر ملکوں کے ڈاکٹروں کے تعاون سے ایسی دوا تیار کر لی ہے جس کے اثرات اچھے ظاہر ہو رہے ہیں۔ انسداد کوڑھ کی راہ میں دو بڑی دشواریاں حائل ہیں اور وہ یہ کہ سماجی طور پر اس بیماری سے جو نفرت کی جاتی ہے اس نے مریضوں کے دلوں میں خوف بٹھا دیا ہے۔ اگر اس بیماری کی بروقت نشاندہی اور علاج کر لیا جائے اور مریض فوراً ہی علاج کے لیے آگے آ جائیں تو اس بیماری پر بڑی حد تک قابو پایا جا سکتا ہے۔ ہمارے ملک میں ناقص غذاؤں نے بھی بہت سی بیماریوں کو جنم دیا ہے، ترقی کے عمل کے سبب بہت سی طرح کے کینسر وجود میں آئے ہیں، سڑکوں کے حادثات بھی بہت سی جانیں لے لیتے ہیں۔ ہندوستان میں کنبہ کی بہبود کے پروگرام کو بھی بڑی اہمیت حاصل ہے۔ اگر عوام کو اس کا یقین ہو جائے کہ ان کے بچے مریں گے نہیں تو وہ بخوشی خاندانی منصوبہ بندی کے پروگرام کو اپنا لیں گے۔ لہٰذا بچوں کی شرح اموات کو گھٹانا اور ان کی بیماریوں پر قابو پانا بے حد ضروری ہے۔ اکثر یہ بات فراموش کر دی جاتی ہے کہ آبادی میں اضافے کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ صحت کے فائدے اب عام ہو گئے ہیں لیکن یہی خوبی صحت سے متعلق دیکھ بھال کے پروگرام کے لیے ایک چیلنج بھی بن گئی ہے۔ اس کے سبب اقتصادی ترقی کے فائدے سبھی لوگوں تک پہونچنے سے رہ جاتے ہیں۔ بچوں اور ان کی ماؤں کی مناسب دیکھ بھال کے کام میں رکاوٹ پڑ جاتی ہے۔ اس سے معیارِ زندگی بلند ہونے میں رکاوٹ پیش آتی ہے۔ ہندوستان میں سبھی عوام کو خاندانی منصوبہ بندی کے مختلف پروگراموں اور طریقوں سے استفادہ کرنے کی سہولت اور آزادی حاصل ہے۔ لیکن یہ سب طریقے پوری طرح قابلِ بھروسہ نہیں کہے جا سکتے۔ اس پس منظر میں ہماری خواتین پر خصوصی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ خاندانی منصوبہ بندی کا شعبہ مستقل تعلیم اور تحقیق کا محتاج ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ صحت ہمارے ترقیاتی پروگراموں کی کلید ہے۔

ایڈیٹر

مسعود عثمانی

اُتر پردیش ترقی کی شاہراہ پر

اُتر پردیش مجموعی اعتبار سے ایک زرعی ریاست ہے، اس کی تقریباً ۸۰ فی صد آبادی زراعت اور اس سے متعلق دیگر کاموں سے وابستہ ہے۔ صوبہ کی آبادی میں زبردست اضافے کے باعث آبادی تقریباً دُو گنے سے زیادہ ہو چکی ہے۔ تاہم حالیہ کوششوں کے باعث نہ صرف زرعی پیداوار میں اضافہ ہوا ہے بلکہ خطِ افلاس سے نیچے زندگی بسر کرنے والے افراد کو بہت زیادہ فائدہ پہنچا ہے۔

آبپاشی کی صلاحیت میں اضافہ کا سیدھا تعلق زرعی پیداوار میں اضافے سے ہے۔ ریاستی حکومت نے گزشتہ سال ۸۳-۱۹۸۲ء میں ۱۲ء۸۸ لاکھ ہیکٹیئر فاضل آبپاشی کے نشانے متعین کئے تھے۔ جبکہ حقیقی صورت میں ۱۲ء۰۵ لاکھ زمین پر آبپاشی کی گئی۔ لیکن موجودہ سال میں ۹ء۰۸ لاکھ فاضل زمین میں آبپاشی کا نشانہ مقرر کیا تھا جس کے تحت جنوری ۱۹۸۴ء تک ۹ء۲۴ لاکھ ہیکٹیئرز زمین میں آبپاشی کر کے ۱۰۸ء۰۲ فیصد کامیابی حاصل کر لی تھی۔ ریاستی حکومت نے اس کے علاوہ چھوٹے کسانوں کی آبپاشی کی صلاحیت میں اضافہ کرنے کی غرض سے قرضہ اور امداد دینے کی شرطوں کو اور آسان بنایا ہے دالوں کی پیداوار میں بھی امسال زبردست اضافہ ہوا ہے۔ ملک میں دالوں کی پیداوار سب سے زیادہ اسی صوبے میں ہوتی ہے۔ یہاں نہیں صوبے میں دالوں کی فصلوں کی پیداوار قومی اوسط سے بھی کہیں زیادہ ہے۔ صوبائی حکومت لگاتار کوشش کر رہی ہے کہ دوسری فصلوں کے رقبوں کو اثر انداز کئے بغیر ہی دالوں کی پیداوار میں اضافہ کیا جائے۔ اس لیے سہ فصلی کھیتی پر زور دیا جا رہا ہے۔ مالی سال ۸۴-۱۹۸۳ء میں ۲۹ لاکھ ہیکٹیئر رقبے کے سالانہ نشانے کے مقابلے میں ۲۹ء۳۶ لاکھ ہیکٹیئرز زمین سے پیداوار حاصل کر کے مجوزہ نشانے سے بھی زیادہ کامیابی حاصل کی گئی۔

حکومت کی جانب سے ترجیحی بنیادوں پر چھوٹی اور گھریلو صنعتوں، دستکاریوں کو بڑھاوا دیا جا رہا ہے۔ ڈائرکٹوریٹ برائے صنعت کی جانب سے صنعتی مرکزوں کے ذریعے دیہات کی مربوط ترقی کے پروگراموں کا آپس میں تال میل قائم کیا جا رہا ہے اور ضروری ٹریننگ اور ٹیکنیکل سہولتیں مہیا کرائی جا رہی ہیں۔ محکمہ صنعت کے تحت مختلف ایجنسیوں میں اس طرح تال میل قائم کیا گیا ہے جس سے تحصیل اور بلاک کی سطح پر چھوٹی صنعتی اکائیوں کو فائدہ پہنچ سکے۔ ان اقدامات سے انکے معیار میں کئی گنا اضافہ ہوا اس مقصد کے تحت ہر ایک بلاک میں ۲۰۰ گھریلو صنعتی یونٹیں اور دو لاکھ کی لاگت کی ایک چھوٹی صنعتی اکائی قائم کرنے کا نشانہ رکھا گیا ہے۔ ان کو مختلف سہولتیں دینے کے ساتھ ساتھ قرضہ جات تقسیم کرنے کے طریقہ کو آسان بنایا گیا ہے۔

حکومت نے غریب عوام کا معیار بلند کرنے کی غرض سے کھادی گرام اُدیوگ کی تنظیم نو کی ہے۔ اس کے علاوہ دستکاری کے معیار کو اوپر اٹھانے کی غرض سے کاریگروں کو بہت سہولتیں فراہم کی جا رہی ہیں۔ اسی غرض کے لیے مختلف ٹریننگ سینٹر قائم کئے گئے ہیں۔

چھوٹے اور گھریلو صنعت سے تیار مال کی فروخت کے لیے پہلی بار حکومت کی جانب سے باقاعدہ انتظام کیا گیا ہے۔ سال ۸۴-۱۹۸۳ء میں ۱۳ ہزار چھوٹے اور گھریلو صنعتی مرکز قائم کرنے کا سالانہ نشانہ مقرر کیا گیا تھا۔ چنانچہ جنوری ۱۹۸۴ء تک قریب دس ہزار چھوٹے اور گھریلو صنعتی مرکز قائم کئے جا چکے۔ ان مرکزوں میں ۸۸ ہزار لوگوں کو روزگار فراہم کیا گیا۔ درج فہرست ذاتوں کے لوگوں کے ذریعے قائم کی گئی صنعتوں میں ۱۴ ہزار لوگوں کو روزگار حاصل ہوا۔ اس طرح یوپی میں اس

صنعت نے جنوری ۱۹۸۴ تک ۴۲۳۹٫۸۵ لاکھ میٹر ہینڈ کرگھے کا کپڑا تیار کیا جس سے ۳۴۳ لاکھ روپیہ کا غیر ملکی زرِ مبادلہ حاصل ہوا۔

آئین کی دفعہ ۴۵ کے تحت ۱۴-۶ سال کے لڑکے، لڑکیوں کو لازمی تعلیم دیئے جانے کا عہد کیا گیا ہے۔ سال ۸۳-۱۹۸۲ سے جنوری ۸۴ تک ۱۴-۶ کے بچوں کے لیے قریب ۲۴ ہزار نئے اسکول قائم کیے گئے جن میں ۲۰٫۵ ہزار بچوں کا اندراج کیا گیا۔ ان میں ۵٫۰۷۱ ہزار بچے درجِ فہرست ذاتوں کے بھی شامل تھے۔

جمہوری نظام میں عوام کے تعلیم یافتہ ہونے سے جہاں ایک طرف جمہوریت کو تقویت پہونچتی ہے وہیں دوسری طرف عوام اپنے فرائض سے باخبر رہتے ہیں۔ تعلیم سے صرف انسان کی ذہنی سطح میں بلندی ہی نہیں آتی ہے بلکہ اس کا اثر ملک کی سماجی، سیاسی، معاشی اور ثقافتی سرگرمیوں پر بھی پڑتا ہے۔ تعلیم صرف سماجی خدمت ہی نہیں ہے، یہ تو ملک کو ترقی کی راہ پر گامزن کرنے کا ایک اہم وسیلہ بھی ہے۔

صوبہ میں ۳۵-۱۵ سال تک کی عمر میں ملو کروڑ لوگ ناخواندہ ہیں۔ اس چیلنج کا سامنا کرنے کے لیے حکومت نے اہم قدم اٹھائے ہیں۔ جبکہ ریاست میں خواندگی کی شرح ۲۷٫۲۶ فیصد تھی۔ اس میں خواتین کی شرح تو صرف ۱۴٫۰۷ فیصد ہے۔ دو لاکھ چورانوے ہزار سے زیادہ مربع کلومیٹر پر پھیلی ہوئی اس ریاست کی خواندگی کو اطمینان بخش نہیں مانا جا سکتا ہے جبکہ پورے ملک کی شرح خواندگی ۳۶٫۲۳ فی صد ہے۔ صوبے میں بارہ بنکی ضلع ایسا ہے جس کی شرح خواندگی ۹ فیصد اور مراد آباد کی ۱۰ فی صد ہے۔ اس پروگرام کو انجام دینے میں خود مختار اداروں، نہرو یووک کیندروں، یونیورسٹیوں اور ڈگری کالجوں کا رول اہم رہا ہے۔ جنوری ۱۹۸۴ تک اتر پردیش میں ناخواندہ افراد کی

تعلیم کے واسطے ۱۶ ہزار نئے پروگراموں کا انعقاد کیا گیا اور قریب ۵۵ لاکھ افراد اس پروگرام سے مستفید ہوئے۔ ان میں ایک لاکھ افراد درجِ فہرست ذاتوں کے تھے۔ اس کے علاوہ قومی سطح پر تعلیم کو لانے کی غرض سے ریاستی نظام تعلیم میں ضرورت کے مطابق تبدیلیاں کی گئی ہیں۔ تعلیم کا معیار بلند کرنے کی غرض سے مربوط پروگرام بنائے گئے ہیں۔ جن پر عمل کیا جا رہا ہے۔ بڑھتی ہوئی آبادی اور وسائل کے محدود ہونے کے باوجود نصاب میں تبدیلی اور تعلیم کے جدید نظام پر عمل کے لیے کوششیں کی جا رہی ہیں نیز امتحان کے فرسودہ نظام میں سدھار، درسی کتابوں، درس و تدریس اور اساتذہ کی ٹریننگ میں ضرورت کے مطابق تبدیلیاں کی جا رہی ہیں۔

ریاست میں صحت پر بھی خصوصی توجہ دی جا رہی ہے۔ ریاست کے دیہاتی علاقوں میں صحت سے متعلق ابتدائی سہولتیں فراہم کی جا رہی ہیں۔

اس کے علاوہ فروری ۱۹۸۴ تک صحت کے ابتدائی ۲۶ مرکز قائم کرکے سو فیصد کامیابی حاصل کر لی گئی۔ اس طرح ہریجنوں کی بستیوں میں بھی صحت کے چھ مرکز قائم کرنے کا نشانہ تھا جو جنوری ۱۹۸۴ تک مکمل کر لیا گیا۔

ریاست میں تپِ دق کی روک تھام کے لیے مناسب اقدام کیے گئے۔ جس کے ذریعے اس وبائی مرض سے دیہاتی علاقوں میں پوری طرح کنٹرول پایا جا سکے۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کی غرض سے ریاست کے تمام اضلاع میں پورے ساز و سامان اور عملے پر مشتمل تپ دق کے علاج کے مرکز قائم کیے گئے ہیں۔ سال ۸۴-۱۹۸۳ میں ۲۴ لاکھ بی سی جی BCG کے ٹیکے لگانے کا سالانہ نشانہ رکھا گیا تھا، جبکہ جنوری ۱۹۸۴ تک ۱۹ لاکھ ٹیکے لگا کر ۸۰ فیصد کامیابی حاصل کی گئی۔ اس کے علاوہ قریب ۲ لاکھ نئے رجسٹرڈ شدہ مریضوں کے نشانے کے مقابلے ۱٫۶۵ لاکھ نئے تپِ دق سے متعلق مریضوں کو رجسٹرڈ کیا گیا جو کہ ۸۰ فیصد کامیابی ہے۔ اس طرح جنوری ۱۹۸۴ تک ۱٫۶۴ لاکھ لوگوں کا باقاعدہ علاج کیا گیا۔ جس میں ۲۰ ہزار مریضوں نے اس مہلک بیماری سے نجات حاصل کی۔

حکومت نے صنعتی اور زرعی مزدوروں کو بہت سی سہولتیں دینے کا اعلان کیا ہے۔ اتر پردیش میں اب تک قریب ۹ ہزار مزدوروں کی بحالی کا کام انجام دیا جا چکا ہے۔ بندھوا مزدوروں کی بحالی سے متعلق ریاستی حکومت کی اسکیم کے تحت اب تک اس سلسلہ میں ۳٫۰۵ کروڑ روپے کی رقم خرچ کی جا چکی ہے۔ عام قاعدے کے مطابق ریاستی حکومت بندھوا مزدوروں کے واسطے اس کی بحالی کے وقت جنس کی شکل میں اشیاء اور دودھ دینے والے مویشی نیز زرعی آلات وغیرہ کے لیے ہر مزدور کو چار ہزار روپے کی رقم فراہم کرتی ہے جس میں سے نصف رقم مرکزی حکومت ادا کرتی ہے۔ حکومت مزدوروں کے واسطے صاف اور اچھے ماحول میں بنے ہوئے مکانات فراہم کر رہی ہے۔ حادثوں کی روک تھام کے لیے ضروری اقدامات کیے گئے ہیں تاکہ فیکٹریوں میں ان کو زیادہ سے زیادہ تحفظ مل سکے۔ اس بات کا بھی انتظام کیا گیا ہے کہ کوئی ٹھیکیدار کسی عورت کو صبح ۶ بجے سے پہلے اور شام ۷ بجے کے بعد کام پر نہ لگائے۔ ریاست میں ۸۶ صنعتی اداروں نے بھی پالیکر ایوارڈ لاگو کر دیا ہے۔ جو مزدوروں کی فلاح و بہبود کی سمت میں ایک اہم قدم ہے۔

جنوری ۱۹۸۴ تک ۵۴۰ کے سالانہ نشانے کے مقابلے ۲۶۵ بندھوا مزدوروں کو بحال کیا گیا۔ ایسی پلان کے تحت ۳٫۱۹ کروڑ روپے خرچ کیے

جا چکے ہیں۔ بندھوا مزدوروں کے چلن کو ختم کرنے کی غرض سے ضلع اور تحصیل کی سطح پر حکومت کی جانب سے کمیٹیوں کا انعقاد کیا گیا ہے جو کہ بندھوا مزدوروں کی بحالی سے متعلق قوانین پر عمل درآمد کے لیے ضلع اور پرگنہ مجسٹریٹ کی صدارت میں کام کر رہا ہے۔

قومی دیہی روزگار پروگرام ۲۰ نکاتی پروگرام کا ایک اہم حصہ ہے۔ کسی ترقی پذیر ملک میں ترقی یافتہ ملک کے مقابلے میں تعمیری کاموں کی اہمیت زیادہ ہے۔ اس پروگرام کا مقصد محدود وقت میں دیہی علاقوں میں بے روزگار، نیم بے روزگار اور کمزور طبقوں کے لوگوں کی آمدنی میں اضافہ کرکے ان کو غریبی کی سطح سے اوپر اٹھانا ہے۔ پروگرام اس طرح ترتیب دیے جاتے ہیں کہ یہ لوگ غریبی کی سطح سے اوپر اٹھ سکیں۔ تمام ذرائع سے ۳ر۵ ہزار روپیہ سالانہ سے کم آمدنی والے خاندان ہی اس پروگرام سے مستفید ہوں گے۔ ۱۹۸۱-۸۲ میں یہ اسکیم مرکزی حکومت کی سو فیصد مالی امداد سے شروع کی گئی تھی۔ اب مرکز اور ریاستی حکومت دونوں کے مالی تعاون سے یہ پروگرام چلایا جا رہا ہے۔

اس پروگرام کے تحت ۲۵ فیصد امداد چھوٹے اور درمیانی طبقے کے کاشتکاروں، کھیتی کے مزدوروں اور ڈھائی ہیکٹیر تک زمین کے مالک کے کاشتکاروں نیز دیہی دستکاروں کو ملتی ہے۔ سرکاری امداد خاص طور سے زراعت، چھوٹی آبپاشی، افزائش مویشیاں، دیہی اور چھوٹی صنعتوں کے لیے ملتی ہے۔ چھٹے منصوبے میں قریب چار ہزار افراد اس کا فائدہ اٹھائیں گے۔ اس پروگرام کے تحت ۱۹۸۰-۸۱ میں دس لاکھ خاندانوں، ۱۹۸۱-۸۲ میں ۲۶ر۵ لاکھ اور ۱۹۸۲-۸۳ میں ۵۰ر۵ لاکھ خاندانوں کو امداد دی گئی۔ ۱۹۸۳-۸۴ میں ۳۱ر۵ لاکھ خاندانوں کو امداد دینے کا نشانہ رکھا گیا تھا لیکن امداد چھ لاکھ خاندانوں کو دی گئی۔

جنگلات لاکھوں افراد کو براہ راست یا بالواسطہ طور پر روزگار فراہم کرتے ہیں۔ ان تمام حقائق کے پیش نظر ریاستی حکومت نے شجرکاری پر خاص طور سے توجہ دی ہے۔

یو۔پی میں پلائی ووڈ، پیکنگ کیس، کتھا، ماچس وغیرہ کی صنعتوں کے لیے خام مال کی ضرورتوں کو دیکھتے ہوئے پہلے پنجسالہ منصوبے کے آغاز سے ہی ایسے درختوں کی شجرکاری کی ایک اسکیم مرتب کی گئی تھی۔ چنانچہ ۱۹۷۹-۸۰ تک قریب ۱۵ لاکھ روپیہ کی لاگت سے ۱۸۰۰ ایکڑ رقبہ پر شجرکاری کی جا چکی تھی۔ حکومت نے کاغذ کی ضرورتوں کو دیکھتے ہوئے جلد اگنے والے مثلاً یوکلپٹس اور بانس کے درختوں کی شجرکاری کرائی۔ گرام پنچایتوں کی خالی زمین پر شجرکاری کی جا رہی ہے۔ اس اسکیم پر عمل درآمد سے دیہی باشندوں کو ایندھن اور تمام قسم کی عمارتی لکڑی کے علاوہ جانوروں کے لیے صاف ماحول اور چارہ بھی دستیاب ہوگا۔ اس اسکیم کے نفاذ سے ان باشندوں کو ایک طرف آمدنی بڑھانے کے لیے روزگار کے مواقع حاصل ہوں گے دوسری جانب جنگلات پر مبنی صنعتیں لگانے کے واسطے خام مال بھی خوب ملے گا۔

ریاستی حکومت نے شجرکاری سے متعلق سبز تحقیقاتی کام کے لیے کانپور میں ایک شجرکاری تجربہ گاہ بھی تعمیر کرائی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ زمین کی اصلاح کے لیے لکھنؤ، اناؤ، متھرا، علیگڑھ میں بھی تجربات کیے جا رہے ہیں تاکہ شجرکاری کا بھرپور فائدہ اٹھایا جا سکے۔

اترپردیش شجرکاری کے معاملے میں بہت پیچھے ہے کیونکہ یہاں جنگلات صرف ۱۲ر۷ فیصد علاقہ میں ہیں جبکہ اراضی کا ۳۳ فیصد حصہ درختوں سے گھرا ہوا ہونا چاہیے۔ شجرکاری کی حوصلہ افزائی کرنے کی خاطر ریاستی حکومت لگاتار عوام کو اس اسکیم کی اہمیت سے روشناس کرا رہی ہے۔ حکومت [illegible] امداد فراہم کر رہی ہے۔

ریاستی حکومت کے ان اقدامات سے اگرچہ ۱۹۸۲-۸۳ میں کل ۲۳ر۵ کروڑ درخت لگائے گئے تھے لیکن ۱۹۸۳-۸۴ میں فروری کے آخر تک ۲۴ر۰۰ کروڑ سالانہ نشانے کے مقابلے ۲۳ر۵۲ کروڑ درخت لگا کر ۱۲۹ر۱۷ فیصد ریکارڈ قائم کیا ہے۔

اترپردیش جیسی کثیر آبادی والی ریاست کی ہمہ گیر ترقی کے لیے بجلی کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ کچھ عرصہ پہلے اس کا استعمال ایک طبقہ کیا کرتا تھا۔ عام آدمی کے لیے بجلی محض ایک خواب تھی لیکن آج یہ زندگی کا ایک لازمی جز بن گئی ہے۔ اس ریاست کی زیادہ تر آبادی گاؤں میں رہتی ہے جس کو زرعی پیداوار اور صنعت کاری کے لیے بجلی کی سب سے زیادہ ضرورت ہے۔

اترپردیش میں منصوبے کے آغاز سے ہی بجلی کی پیداوار اس کی ضرورت کے مطابق نہیں رہی ہے۔ آج سے قریب ۳۰ سال پیشتر ۱۹۵۲ میں صوبے کی بجلی پیدا کرنے کی صلاحیت ۱۵۰ میگاواٹ تھی جو اب بڑھ کر ۳۷۰۰ میگاواٹ ہو گئی۔ لیکن بجلی کی تیاری اب بھی یہاں کی ضرورتوں کے مطابق نہیں ہو رہی ہے۔ البتہ حکومت عوام کی ضرورتوں کو دیکھتے ہوئے لگاتار اس میں اضافہ کر رہی ہے۔ اس مقصد کے پیش نظر ۱۹۸۲-۸۳ میں ۱۲۵۲۸ ملین یونٹ بجلی حاصل کرنے کا نشانہ تھا جس کے مقابلے ۱۲۵۸۰ ملین یونٹ بجلی تیار کی گئی۔ اس طرح ۱۹۸۳-۸۴ میں ۱۱۴۳۸ ملین یونٹ بجلی کی سالانہ پیداوار کے مقابلے میں جنوری ۱۹۸۴ تک ۹۶۹۶ ملین یونٹ بجلی پیدا کرکے ۸۴ر۸۸ فیصد کامیابی حاصل کی گئی۔

(باقی صفحہ پر)

پروفیسر پی وینوگوپال

امراضِ قلب کا سرجری سے علاج

تلبی شریانوں کی بائی پاس Bypass سرجری خون کی ایسی متبادل رگیں بن جاتی ہیں جو "اورطہ" سے قلبی عضلات کو خون پہنچاتی ہیں اور اس عمل میں رکاوٹوں کو نظر انداز کر دیتی ہیں۔ یہ سرجری کا کمال ہے جس سے زندگی بچائی جا سکتی ہے۔ آل انڈیا انسٹی ٹیوٹ آف میڈیکل سائنسز نے اس معقول طریقۂ علاج کو فروغ دیا ہے اور یہ سہولت کم قیمت پر امراضِ قلب کے مریضوں کے لیے دستیاب ہے۔

شریانِ قلب کی بائی پاس سرجری (پیوند کاری) ایسے قلبی عضلات کو براہِ راست خون کی سپلائی بڑھانے کا موثر ترین ذریعہ ہے جو کمی خون کا شکار ہو جاتے ہیں۔ ۱۹۶۸ کے بعد سے جب یہ طریقۂ علاج پہلی بار عمل میں لایا گیا تھا دُنیا بھر میں دس لاکھ سے زیادہ ایسے آپریشن انجام دیئے جا چکے ہیں اور اس وقت وسیع طور پر پھیلی ہوئی اس بیماری پر جو اکثر مہلک ثابت ہوتی ہے قابو پانے کے لیے یہ ایک اختیاری طریقۂ علاج بن گیا ہے۔

بائی پاس سرجری

قلبی عضلات اپنی خون کی سپلائی تین بڑی قلبی شریانوں کے ذریعے "اورطہ" (دل کے بائیں طرف سے تمام اعضا کو خون پہنچانے والی بڑی شریان) سے حاصل کرتے ہیں۔ ان میں سے دو بائیں جانب ہوتی ہیں جو بائیں قلبی شریان کی شاخیں ہوتی ہیں۔ دائیں جانب جو واحد شریان ہوتی ہے وہ دائیں قلبی شریان کے نام سے موسوم ہوتی ہے۔ ان شریانوں کی شاخیں تمام تر دل میں پھیلی ہوتی ہیں اور وہ قلبی عضلات کو قوت دینے کے لیے آکسیجن سے بھرپور خون فراہم کرتی ہیں۔ جب ان بڑی شریانوں میں سے کسی ایک میں رکاوٹ پیدا ہو جاتی ہے تو قلبی عضلات کے کسی حصے کو خون کی سپلائی میں کمی آجاتی ہے اور اس سے "انجائنا" کا مرض پیدا ہوتا ہے۔ شریانِ قلب کی بائی پاس سرجری (نسس کی پیوند کاری) ایک طریقۂ علاج ہے جس سے عملِ جراحی سے خون کی متبادل رگیں بنائی جاتی ہیں، جو اس رکاوٹ کو نظر انداز کر کے "اورطہ" سے قلبی شریان کو خون لے جاتی ہیں اور اس طرح قلبی عضلات کی خون کی سپلائی بحال کی جاتی ہے۔ اس آپریشن کے لیے جو رگ استعمال کی جاتی ہے وہ عموماً ٹانگ کی سافینہ Saphenous رگ ہوتی ہے جو اپنے سطحی مقام اور طوالت کے باعث اس مقصد کے لیے ایک مثالی رگ ہے۔ اس رگ کو ٹانگ سے الگ کرنے سے کوئی خاص معذوری پیدا نہیں ہوتی۔ کیونکہ ٹانگ کی دوسری رگیں فوراً اس کے فعل کو انجام دینے لگ جاتی ہیں۔

اس سرجری کے فوائد بہت زیادہ ہیں۔ ان میں سے چند درج ذیل ہیں۔

(ا) دوائی کے بغیر یا کم دوائی کے ساتھ انجائنا سے آرام ملتا ہے۔

(ب) زندگی بہتر قسم کی ہو جاتی ہے۔

(ج) عمر بڑھ جاتی ہے۔

(د) بار بار ہونے والے ہارٹ اٹیک کا خطرہ کم ہو جاتا ہے۔

(ہ) قلبی عضلات کے پھیلاؤ اور دل کی بافتوں کی شکست سے ہونے والے سوراخوں اور دیگر نقائص کو دُور کرنا جو ادویات سے درست نہیں ہو سکتے۔

اس سرجری کا اہم ترین فائدہ یہ ہے کہ جسمانی سرگرمیوں پر سے تمام رکاوٹیں دُور ہو جاتی ہیں اور مریض معمول کی زندگی بسر کر سکتا ہے۔ اور حتّٰی کہ خود کو ایسی سرگرمیوں میں مصروف رکھ سکتا ہے۔ جن میں جسمانی مشقت کو دخل ہوتا ہے۔ ہارٹ اٹیک کا خوف جو ہمیشہ شریانِ قلب کے مریض کے سر پر موت کا سایہ بن کر منڈلاتا رہتا ہے سرجری کے بعد "یکسر" دُور ہو جاتا ہے۔

سرجری کے لیے علامات: سرجری مندرجہ ذیل

حالات میں کی جا سکتی ہے۔

(۱) جب دوائی سے انجائنا کو آرام نہ آئے۔

(ب) تینوں شریانوں میں بیماری ہو جائے۔

(ج) بائیں بڑی شریان میں نقص ہو جائے۔

(د) دل کے بائیں خانے میں کمی خون سے پیچیدگیاں پیدا ہو جائیں۔

گذشتہ برسوں میں آپریشن کے خطرے میں بہت بھاری کمی ہو جانے سے قلبی شریان کے سرجری کے لیے حالات بہتر ہو گئے ہیں۔ اُن تمام مریضوں کے لیے سرجری کی سفارش کی جا سکتی ہے جن میں قلبی شریان کی بیماری کی علامتیں پائی جاتی ہیں۔ ایسے تمام مریضوں کو سرجری کے ذریعے بیماری کی علامتوں سے آرام ملتا ہے لیکن بڑی شریان کے مرض (جو بیرو ساز مرض کے نام سے بھی موسوم ہے) اور قلبی رگوں کی شدید بیماری جیسے بعض حالات میں محض طبی علاج معالجے سے متوقع عمر بہت کم ہو جاتی ہے اس لیے اس صورت میں سرجری سے زندگی بچائی جا سکتی ہے تین رگوں کی بیماری والے مریضوں کے لیے سرجری کے بغیر ۱۰ برس تک زندہ رہنے کے امکانات محض ۲۰ فیصد ہوتے ہیں جبکہ سرجری سے یہ امکانات ۸۰ فیصد تک بڑھ جاتے ہیں اسی لیے بائیں بڑی شریان کی بیماری میں مبتلا مریضوں کے لیے اچانک موت کا خطرہ سال میں ۵ فیصد سے زیادہ ہوتا ہے۔ سرجری ایسے مریضوں کو طویل مدتی آرام پہنچاتی ہے۔ قلبی عضلات کے پھیلاؤ اور دل کے والوں میں سوراخ ہو جانے جیسی پیچیدگیوں کو محض سرجری سے دور کیا جا سکتا ہے۔

سرجری کا ضابطہ

آپریشن جسم کو سُن کر کے کیا جاتا ہے۔ آپریشن کے لیے سب سے پہلے ٹانگ سے سافینہ رگ کو الگ کیا جاتا ہے۔ اس کی شاخوں کو کھولا جاتا ہے اور اس کا معائنہ کیا جاتا ہے تاکہ اس میں کوئی سوراخ نہ ہو۔ اس کے بعد سینہ کو کھولا جاتا ہے اور اس کے لیے چھاتی کی ہڈی (سٹرنم) کو کاٹا جاتا ہے۔ جس سے دل کھل جاتا ہے۔ شریان قلب اور سافینہ رگ کو میلائی سے جوڑنے کا مشکل کام انجام دینے کے لیے ایک خاموش، خون سے مبرا محل ضروری ہے۔ اس کے لیے مریض کو خاص ٹیوبوں کے ذریعے ایک دل اور پھیپھڑے کی مشین کے ساتھ جوڑا جاتا ہے۔ یہ مشین اس وقت دل اور پھیپھڑے کا عمل انجام دیتی ہے جب سرجری کی جا رہی ہوتی ہے۔ دل کی دھڑکن بند ہو جاتی ہے اور اسے برف کے ٹھنڈے نمکین محلول سے سرد کیا جاتا ہے۔ اس کے بعد سافینہ رگ کے حصوں کو اورطہ اور قلبی شریانوں کے درمیان سلائی سے جوڑا جاتا ہے اور رکاوٹوں کو نظر انداز کیا جاتا ہے۔ (اس سے ہر حصہ پیوند کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ پیوندوں کی ضروری تعداد کا تعین بڑی رگوں میں ہونے والی رکاوٹوں کی تعداد سے کیا جاتا ہے جس کا تعین قلبی شریانوں کے ایکسرے سے کیا جاتا ہے۔ اس کے بعد دل کی دھڑکن بحال کی جاتی ہے اور جونہی دل کی دھڑکن موثر طور پر شروع ہو جاتی ہے مریض کو دل اور پھیپھڑے کی مشین سے الگ کر دیا جاتا ہے۔ اس کے بعد سینے اور ٹانگ کے زخموں کو باقاعدہ دوائی سے ٹھیک کیا جاتا ہے۔

سرجری کے لیے تیاری

اعلیٰ نتائج اس صورت میں حاصل کیے جا سکتے ہیں جس صورت میں مریض کو جسمانی اور ذہنی لحاظ سے سرجری کے لیے بہترین طور پر تیار کیا جائے۔ آپریشن سے قبل کی تیاریوں کے سلسلے میں مریض اور اس کے کنبے کو مشورہ دے کر اُن کے خدشات دُور کیے جاتے ہیں۔ اور اس طرح مریض کا اعتماد بھی حاصل کیا جاتا ہے۔ معالجہ مریض کو سرجری کے لیے تیار کرنے کے معاملے میں اہم رول ادا کرتا ہے۔ وہ مریض کو سانس لینے کی مشق اور ٹانگ کی ورزش کے بارے میں تربیت دیتا ہے جس کا آپریشن کے بعد کے عرصے میں سختی سے عمل میں لایا جانا ضروری ہے۔ اس کے ساتھ ہی ذیابیطس، خون کے دباؤ، سینے اور دانتوں کے امراض وغیرہ کی جانچ پڑتال کی جاتی ہے جو عام طور پر اکثر پائے جاتے ہیں۔ سرجری سے پہلے ان پر بہت حد تک قابو پانا ضروری ہے تاکہ کوئی پیچیدگی پیدا نہ ہو۔ مریض کو آپریشن کی مقررہ تاریخ سے چند روز پہلے بھرتی کیا جاتا ہے، تاکہ مذکورہ بالا تیاریاں کی جا سکیں۔ اس کے علاوہ مریض ہسپتال کے ماحول کا عادی ہو جاتا ہے۔ اور جن مریضوں کا پہلے آپریشن ہو چکا ہوتا ہے اُن کو دیکھ کر اور اُن سے بات چیت کر کے اعتماد بھی حاصل کرتا ہے۔

آپریشن کے بعد کا کورس

پہلے ۲۴-۴۸ گھنٹے شدید دیکھ بھال کے یونٹ میں گذارے جاتے ہیں۔ جس کے بعد مریض کو آپریشن کے بعد کے وارڈ میں منتقل کیا جاتا ہے۔ مریض کو آپریشن کے بعد کی صبح کو ہلکا کھانا کھلایا جاتا ہے اور شام تک اُسے وارڈ میں چلایا جاتا ہے۔ یہ وہ عرصہ ہوتا ہے جس کے دوران مریض کے زیادہ سے زیادہ تعاون کی ضرورت ہوتی ہے۔ سانس لینے کی جو مشق سکھائی گئی ہوتی ہے وہ سختی سے عمل میں لائی جاتی ہے اور مریض کے لیے بستر سے اُٹھ کر چلنا ضروری ہوتا ہے۔ اس عرصے کے دوران معالج گرانقدر کردار ادا کرتا ہے۔ چند روز میں مریض رفتہ رفتہ معمول کی سرگرمیاں انجام دینے کے قابل ہو جاتا ہے اور دس روز بعد ٹانکے کھول کر اُسے رُخصت کر دیا جاتا ہے۔ آپریشن کے بعد کے عرصے میں جسمانی کمزوری کا قدرے احساس ہوتا ہے لیکن اچھی خوراک اور ہلکی ورزش سے اس مسئلہ پر جلد قابو پایا جا سکتا ہے۔ چھ ہفتے تک مریض اپنے کام پر لوٹنے کے قابل ہو جاتا ہے۔

اس عرصے میں پیش آنے والے عام مسائل

۱۔ چھاتی کا درد: یہ سٹرنم (چھاتی کی ہڈی) کے اُن کٹے ہوئے سروں کی نقل و حرکت کے نتیجے میں

پیدا ہوتا ہے جو بڑے نہیں ہوتے۔ یہ درد چھ سے آٹھ ہفتوں کے اندر عام طور پر ہلکا پڑ جاتا ہے۔ جبکہ ہڈی کے کٹے ہوئے سرے جڑ جاتے ہیں۔ پروکسی وان Proxyvon یا اینلجین Analgin جیسے دافع درد دواؤں سے یہ درد جاتا رہتا ہے۔

(ب) ٹانگوں کی سوجن

یہ سافینہ رگ کو الگ کرنے کے بعد ٹانگوں کی رگوں میں خون جم جانے سے پیدا ہوتی ہے۔ اس کی روک تھام کے لیے مریض کے لیے ضروری ہے کہ وہ کھڑے ہونے یا چلنے کے وقت لچکیلی جرابیں پہنے یا کریپ کی پٹی باندھے۔ جب وہ بیٹھے تو اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنا پاؤں اٹھا کر اسٹول پر رکھے۔ سوجن عام طور پر ۳-۶ مہینوں میں جاتی رہتی ہے:

(ج) سانس پھولنا۔

بڑی سرجری کے اثرات سے بحال ہونے میں چند ہفتے لگتے ہیں۔ تب تک مناسب یہ ہے کہ زیادہ مشقت نہ کی جائے۔ اور تھوڑے تھوڑے وقفوں کے بعد آرام کیا جائے۔ اسے ٹھیک ہونے میں چھ سے آٹھ ہفتے لگتے ہیں۔

سرجری کے بعد کیا کریں اور کیا نہ کریں؟

سگریٹ نوشی قطعاً بند کی جائے۔ اس سے قلبی شریانوں کی بیماری زور پکڑتی ہے۔ اور اس سے پیوندی رگوں میں رکاوٹ پڑ سکتی ہے۔

(ب) بہترین بات یہ ہے کہ شراب نوشی سے اجتناب کیا جائے لیکن اگر یہ ترک نہ کی جاسکے تو دن میں دو اونس سے زیادہ شراب نہ پی جائے۔

(ج) سرجری کے بعد کم از کم چھ ہفتوں تک موٹر گاڑی نہ چلائی جائے، وزن نہ اٹھایا جائے اور سائیکل وغیرہ بھی نہ چلائی جائے۔

(د) جنسی اختلاط

جب تک مریض خود کو فِٹ محسوس کرتا ہے تب تک جنسی اختلاط پر کوئی پابندی نہیں ہے لیکن سرجری کے بعد کے ابتدائی عرصے میں شریک دم پر غیر ضروری بوجھ نہیں ڈالا جانا چاہیے۔

ہسپتال میں تجربہ

گذشتہ تین برسوں میں آل انڈیا انسٹی ٹیوٹ آف میڈیکل سائنسز میں ۱۶۰ سے زیادہ مریضوں کی قلبی شریانوں کی بائی پاس سرجری کی جاچکی ہے۔ ان کی تعداد میں تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے اور آجکل ہم "اوپن ہارٹ" سرجری کی دیگر اقسام کے علاوہ ہر ہفتے چار سے پانچ ایسے آپریشن کر رہے ہیں۔ جن مریضوں کے آپریشن کیے گئے ہیں۔ وہ زیادہ تر اُس وقت یہاں بھیجے گئے تھے جب اُن میں اس مرض کی شدید علامتیں پیدا ہو گئی تھیں اور یہ مرض بڑھ گیا تھا۔ چنانچہ ایسے ۸۰ فیصد مریضوں کو تین رگوں کی شدید بیماری تھی۔ ۲۸ مریضوں کی بائیں بڑی قلبی شریان میں رکاوٹ تھی جس سے، جیسا کہ ذکر کیا گیا ہے، بہت بڑا خطرہ ہوتا ہے۔ تقریباً ۴۰ مریض ۴۵ برس سے کم عمر کے تھے۔ اوسطاً ہر مریض کو چار پیوند لگائے گئے۔ ۳۲ مریضوں کی شریانوں میں سے رکاوٹیں دور کی گئیں، چھ کے دلوں میں والو بدلے گئے اور ۹ مریضوں کے قلبی عضلات ٹھیک کیے گئے۔

اِن مریضوں کی شدید بیماری کے باوجود نتائج بہت اچھے رہے ہیں۔ کل شرح اموات ۳ سے ۴ فیصد رہی ہے، جس کا موازنہ مغربی ممالک کے ترقی یافتہ مرکزوں کی رپورٹ سے کیا جا سکتا ہے۔ اگر مریض بیماری کے ابتدائی مرحلے میں آجائیں تو آپریشن کا خطرہ نہایت ہی کم ہو سکتا ہے۔

سرجری کے بعد علاج معالجے سے ۹۰ فیصد مریضوں کو انجائنا سے نجات مل جاتی ہے اور وہ اپنے کام دھندوں پر واپس چلے جاتے ہیں۔

آل انڈیا انسٹی ٹیوٹ آف میڈیکل سائنسز میں ہر مریض کو بائی پاس سرجری پر تقریباً ۱۲ ہزار روپے خرچ کرنے ہوتے ہیں۔ یہ رقم اُن اشیا کی لاگت کے سلسلے میں ہے جو آپریشن کے دوران ضروری ہیں۔ آپریشن پر کوئی رقم نہیں لی جاتی۔ یہ رقم اُس رقم کے مقابلے میں بہت کم ہے جو امریکہ میں ایسی سرجری پر صرف ہوتی ہے جہاں اس آپریشن پر ۳ سے ساڑھے تین لاکھ روپے خرچ ہو جاتے ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ بائی پاس سرجری قلبی شریانوں کے مرض کا محفوظ، موثر اور قابل بھروسہ علاج ہے اور ہم اس انسٹی ٹیوٹ میں عوام کو سلامتی کے ساتھ کم لاگت پر فراہم کر رہے ہیں۔ ●

بقیہ: اتر پردیش ترقی کی شاہراہ پر

حکومت مواصلات کی بجلی کاری کے ساتھ ہی اس بات پر بھی توجہ دے رہی ہے کہ ہریجنوں اور دوسرے طبقے بھی محروم نہ رہیں۔ چنانچہ مارچ ۱۹۸۳ تک ۲۲۷۰۰ ہریجن بستیوں میں یہ سہولیت دی جاچکی تھی۔ جن اضلاع کی ہریجن بستیوں کی بجلی کاری میں نمایاں پیش رفت ہوئی ہے۔ ان میں ضلع رائے بریلی سب سے زیادہ آگے ہے جہاں ۸۴-۱۹۸۳ کے آخر تک ۱۵۰۰ ہریجن بستیوں میں یہ سہولت پہنچائی گئی تھی۔

ٹیوب ویل کو بجلی مہیا کرنے کے کام میں بھی حکومت پیچھے نہیں ہے۔ مارچ ۱۹۸۳ء تک صوبہ میں ۳۸ء۴ لاکھ ٹیوب ویلوں کو بجلی فراہم کی گئی جبکہ یہ تعداد ۸۴-۱۹۸۳ میں بڑھ کر ۱۶ء۴ لاکھ ہو گئی۔ اس طرح موجودہ سال میں ۲ ہزار سے زائد ٹیوب ویلوں کو بجلی دی گئی۔ اس سال میں ضلع اعظم گڑھ سب سے آگے رہا جہاں ۵۴۰ ٹیوب ویلوں کو بجلی پہنچائی گئی۔ ریاست میں مارچ ۱۹۸۴ تک سب سے زیادہ یعنی ۱۵ء۳ لاکھ ٹیوب ویلوں کو میرٹھ ضلع میں بجلی فراہم کی گئی۔ اس کے بعد بلند شہر اور اعظم گڑھ کا نمبر آتا ہے۔

وسنت ساٹھے

معاشرتی انقلاب کی جانب

اقتصادی جمہوریت کا مقدمہ

چھٹا باب

متبادل نظام

قسط : ۱۵

اشیاء کی پیداوار اور تقسیم کے ہمارے نظام سے قومی اقتصادی منظرنامے کی جو شکل موٹے طور پر اُبھرے گی، وہ یکساں قومی سیکٹر کی ہوگی۔ قومی معیشت کی پبلک سیکٹر اور پرائیویٹ سیکٹر کے نام سے مصنوعی تقسیم ختم ہو جائے گی۔ اس کے بجائے دو قدرتی نوعیت کے سیکٹر رہ جائیں گے یعنی منظم سیکٹر اور از خود روزگار والا سیکٹر۔

یہاں مجوزہ اقتصادی ڈھانچے میں اس مفروضے کو سامنے رکھا گیا ہے کہ کُل محنت کش طبقہ جو کہ درج ذیل مختلف شکلوں میں ہوگا مساوی شریک کار کی حیثیت سے کام کرے گا اور پیداواری عمل میں جو فاضلات میسر آئیں گے، اُنکی منصفانہ تقسیم عمل میں آئے گی اور ہر زمرے کو اگرچہ مساوی طور پر نہیں لیکن منصفانہ طور پر اس میں حصہ ملے گا۔

۱۔ نوآموز کاری اور تنظیمی صلاحیت والا محنت کش طبقہ۔
۲۔ ماہرین سائنس و انجینئرنگ پر مشتمل عملہ اور تکنیکی ماہرین۔
۳۔ انتظامی عملہ۔
۴۔ کلرکی کرنے والے اور غیر ہنرمند ارکان۔

اس کا معیار یہ ہوگا کہ کم سے کم زمرے والے ارکان کی بہتر رہائش اور معیار زندگی کی بنیادی ضرورتیں پوری ہو سکیں۔ اور اس کے بعد یہ دیکھا جائے کہ جن لوگوں کی محنت زیادہ ہنرمندانہ ہے، یا جن کی کوالی فکیشن زیادہ ہے، ان کو کیا بہتر اور مزید آسائشیں فراہم کی جا سکتی ہیں۔ ہمارے اس نظام میں آجر اور ملازم کا تعین نہیں ہوگا کیوں کہ ہر ایک محنت کش منظم صنعتی یا تجارتی سیکٹر میں شراکت دار کی حیثیت سے ایک رکن ہوگا۔ یہ شیر ہولڈر ہر سال اپنے درمیان سے اپنے نمائندے چُنیں گے اور انھیں انتظامی بورڈ میں بھیجا جائے گا جو کہ تین بنیادی زمروں کے نمائندے ہوں گے، یعنی انتظامی عملہ، تکنیکی عملہ اور غیر تکنیکی عملہ محنت کش طبقے کے نمائندوں کی تعداد انتظامی بورڈ کے ارکان کی مجموعی تعداد کی تہائی ہوگی۔ باقی ایک تہائی مالی اداروں، مرکز کی برسر اقتدار پارٹی اور ریاستی سطح کی برسر اقتدار پارٹی کے نمائندے ہوں گے۔ یہ مساوی تعداد میں ہوں گے۔ اس طرح عوام کے نمائندے ہر منظم صنعت میں شریک کیے جا سکیں گے۔ یہ سرکار کی طرف سے اعلان کردہ پالیسیوں اور پروگراموں پر عمل درآمد کا جائزہ لیتے رہیں گے۔ مالی اداروں کے نمائندوں کا یا دیگر نمائندوں کا یہ فرض ہوگا کہ وہ یہ دیکھیں گے کہ جو رقومات فراہم کی گئی ہیں، ان کا مناسب اور جائز استعمال ہوا ہے یا نہیں۔ باقی ایک تہائی صنعت کاروں کے نمائندہ ہوں گے یعنی ان کے جنھوں نے وہ انڈسٹری لگائی ہے۔ تمام کارکنوں کو اس طرح منظم کیا جائے گا کہ اُونچی سطح سے لے کر نچلی سطح تک جو بھی انتظامی کمیٹیاں تشکیل دی جائیں، وہ اپنے کاموں کے لیے جوابدہ ہوں۔

اگرچہ تنخواہوں اور اُجرتوں کا بنیادی ڈھانچہ مقرر کر لیا جائے گا لیکن دیگر فائدوں کو جو کہ فاضل ہوں گے، پیداواری صلاحیت سے جوڑ دیا جائے گا۔ محنت کش طبقے کو جب یہ یقین ہو جائے گا کہ حقیقی فاضلات کو کہیں اور خورد برد نہیں کیا جائے گا اور یہ کہ انھیں کسی بھی طرح دھوکہ نہیں دیا جا سکتا تو پھر انھیں کام سے دلچسپی ہوگی، اور ان کا یہ اعتماد بڑھے گا کہ متعلقہ صنعت میں ان کی محنت سے ان کی روزی بڑھے گی اور ان کا مزید فائدہ ہو سکتا ہے۔

منڈی میں طلب اور رسد کا نظام، اور اس کے نتیجے میں اشیاء کی قیمتوں کا نظام نوعِ انسانی کی ایک سب سے بڑی ایجاد ہے مبنی بر انصاف اقتصادی تنظیم اور پالیسی سازوں کو اس کا فائدہ اٹھانا چاہیے۔ لیکن منڈی میں

اشیا کی قیمتوں کے تعین کے نظام کو غیر مساوی اور غیر منصفانہ بنانے کے اور ایسے بڑے اسباب ہیں جنھیں آئیڈیل اور جمہوری اقتصادی طریق کار سے انحراف کہہ سکتے ہیں۔ ایک انحراف تو طلب کے حصے سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کا تعلق آمدنی کی غیر منصفانہ تقسیم سے ہے جس سے لاکھوں عوام کی قوت خرید متاثر ہوئی ہے جو اپنی حقیقی ضرورتوں کو منڈی کی طلب کی اصطلاح میں واضح نہیں کر سکتے۔ اور سپلائی کے نظام کو حقیقی ضرورتوں کی اشیاء کی تیاری کی طرف مائل نہیں کر سکا۔ دوسرا انحراف سپلائی سے متعلق ہے۔ اس نے منڈی کے نظام کو مسخ کر دیا ہے۔ اسنے اجارہ داری کے رجحان کو پیدا کیا ہے۔ منڈی میں ضروری اشیاء کی فراہمی پر کسی ایک ادارے یا چند اداروں کی اجارہ داری ہونے سے سماج کو نقصان پہنچا ہے۔ قیمتوں اور لاگت کے درمیان تعلق باقی نہیں رہ سکا ہے۔ اس نظام نے صارفین کی بہبود کو کم کرنے کے لیے ناجائز طریقے اپنائے ہیں اور اپنے مفاد کو ہر قیمت پر آگے بڑھایا ہے۔ اجارہ داری منصفانہ منڈی والے نظام کی سب سے بڑی دشمن ہے۔ لیکن جس اقتصادی جمہوری نظام کے لیے یہاں کہا جا رہا ہے، اس میں ان برائیوں سے محفوظ رہا جا سکتا ہے۔ بورڈ آف ڈائرکٹرز میں سرکار کے، مالیاتی اداروں کے، کارکنوں اور محنت کش طبقے کے نیز صنعت کاروں کے نمائندے ہوں گے۔ ان پر مشتمل مختلف کمیٹیاں ہوں گی۔ لہٰذا مخصوص مفادات پیداوار کو روکنے کے فیصلے نہیں کر سکتے اور قیمتوں کو ناجائز طور پر نہیں بڑھا سکتے، کالے دھن کے سودے نہیں کر سکتے، بنیادی اشیا کی خرید دستوں سے غیر ضروری طور پر زیادہ قیمتوں پر نہیں کر سکتے۔ درآمدات و برآمدات میں بدعنوانیاں نہیں کر سکتے، بینک میں غلط اندراجات نہیں کر سکتے، غرضیکہ اس طرح کی جملہ برائیوں سے اس نظام کے توسط سے بچا جا سکتا ہے

اجارہ داری نظام کے برعکس قیمتوں میں غیر ضروری اضافے کے امکانات نہیں ہوں گے جن سے محنت کش طبقے کا استحصال نہیں ہوگا۔ ان کی اُجرتیں اور تنخواہیں مناسب ہوں گی۔ کارکنوں کی یونینیں پیداواری صلاحیت سے ہٹ کر اُجرتوں اور تنخواہوں کا مطالبہ نہیں کر سکتیں۔ کیوں کہ ایسی صورت میں عارضی طور پر اُجرتیں بڑھ سکتی ہیں لیکن اس سے کمپنی کی منافع کمانے کی صلاحیت کم ہو جائے گی اور ان کا اپنا نفع کم ہو جائے گا اور شیئر ہولڈر کی حیثیت سے ان کے نفع کی صلاحیت کم ہو جائے گی۔ آمدنی کی تقسیم اور قوت خرید منصفانہ ہوگی۔ منڈی کے نظام کی اصلاح اور دولت کی غیر منصفانہ تقسیم کی اصلاح کے سبب منڈی کا نظام بخوبی کام کرے گا اور قیمتوں کے تعین میں اس کا کردار واضح ہوگا۔ اشیاء کی طلب سے حقیقی ضرورت مندوں کی ضرورت سامنے آئے گی اور اشیا کی رسد مبنی بر حقیقت ہو سکے گی۔ ایسا نہیں کہ صرف چند مخصوص طبقات یا لوگوں کی ضرورت کی اشیا کی رسد ہی عمل میں آسکے۔ اشیا کی فروخت اور پیداوار کے سہ فریقی نظام میں قیمتوں اور لاگت کے ڈھانچے کی اصلاح آسان ہے۔ اس کے تحت مقصد یہ ہوتا ہے کہ کم آمدن والے اور متوسط طبقات کے لوگوں کی قوت خرید مضبوط ہو سکے۔ اشیائے ضروری ان کی گرفت میں آسکیں۔

بھارت میں اگرچہ ہم منصوبہ بندی کے ذریعے سماج وادی نظام لاگو کرنے کی بات کرتے ہیں اور اگرچہ پہلے بیس نکاتی پروگرام میں اس کی وضاحت کی جا چکی تھی اور اس کے لیے کارکنوں کو انتظامیہ میں شامل کرنے کی اجازت مل چکی تھی لیکن حقیقت یہ ہے کہ کارکنوں کو صحیح معنی میں انتظامیہ میں شریک کرنے کی کوئی باقاعدہ اور پُرزور کوشش نہیں کی جا سکی۔ قومی ملکیت کے بینکوں کے انتظامی بورڈ میں کارکنوں کے چند نمائندے شامل کر کے بدولت کے ساتھ

اگرچہ کچھ کوشش کی بھی گئی۔ لیکن کارکنوں کو شریک کار نہیں سمجھا جا سکا اور انتظامی بورڈوں میں انھیں مساوی نمائندگی نہیں مل سکی۔ منتظم حضرات ذہنی طور پر اس کے لیے خود کو تیار نہ کر سکے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ انتظامی طبقہ بنیادی طور پر برتر ہے اور اس میں شامل ارکان وہ ہیں جن کی پرورش اعلیٰ ثقافت کی مظہر ہے اور جو کہ پبلک اسکولوں کے تعلیم یافتہ طبقے سے تعلق رکھتے ہیں اور جن میں سے اکثر نے غیر ممالک میں تعلیم پائی ہے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ پبلک سیکٹر کی انتظامی ذمہ داریاں ایسے ہی طبقے کے پاس ہونی چاہئیں۔ پرائیویٹ سیکٹر میں صنعتی طبقے میں بھی اس طرح کے تصورات پائے جاتے ہیں۔ بدقسمتی سے سیاستداں بھی اس سے متاثر نظر آتے ہیں۔ کارکن کو کمتر سمجھا جاتا ہے۔ اس کا معیار اور اس کی سمجھ کا معیار کمتر خیال کیا جاتا ہے۔ اس لیے اسے انتظامی بورڈ میں نہیں لیا جاتا۔ یہ بھی خیال ہے کہ کارکنوں کو انتظامیوں میں شامل کرنے سے کام کے چلانے میں رکاوٹ آتی ہے، اور فیصلہ سازی میں دشواری ہوتی ہے۔ خاص طور پر ایسے موقعوں پر جبکہ کروڑوں روپے کے پراجیکٹ کے لیے سامان خریدنے یا ایجنسی قائم کرنے کے فیصلے کرنے ہوتے ہیں۔ حیران کن بات یہ ہے کہ اقتصادی طور پر کمزور کارخانوں میں کارکنوں کو شراکت کاری کا رول ادا کرنے کی اجازت دیدی جاتی ہے۔ ایسے موقعوں پر خیال کیا جاتا ہے کہ اس سے کارکنوں میں زیادہ احساس ذمہ داری بیدار ہوگا اور وہ اپنے مفاد کی خاطر قربانی دے سکیں گے۔ لیکن جوں ہی وہ کارخانہ مصیبت سے باہر آتا ہے اور نفع کمانا شروع کرتا ہے تو یہ خیال بدل جاتا ہے۔ پھر ایسا سوچا جانے لگتا ہے کہ کارکنوں کا انتظامیہ میں کوئی رول نہیں ہونا چاہیئے۔ خاص کر اعلیٰ ترین سطح پر۔ آجر اور کارکن کے اس بنیادی فرق کو ایک مستقل حیثیت حاصل ہو چکی ہے۔ راقم الحروف ۳۰ برس

زیادہ عرصے سے ٹریڈ یونین تحریک سے وابستہ رہا ہے۔ میرا خیال ہے کہ کارکن انتظامیہ میں مثبت اور ذمہ دارانہ رول ادا کر سکتا ہے کیونکہ صنعت کے نفع نقصان سے ہی ان کا مفاد وابستہ ہوتا ہے۔ پرائیویٹ سیکٹر میں ایک مشہور آفسیٹ چھاپے خانے کی اس سلسلے میں مثال دی جا سکتی ہے۔ شراکت کاروں کے آپسی تنازعے کے سبب یہ ۱۵ ماہ تک بند رہا۔ لیکن جب اسے صنعتوں کی ترقی اور ضابطے سے متعلق ایکٹ ۱۹۵۱ کے تحت سرکاری انتظام میں لے لیا گیا، تو کارکنوں نے اپنی اجرتوں میں رضاکارانہ طور پر کٹوتی کر دی، انھوں نے مہنگائی بھتہ کم لینا شروع کیا، انھوں نے انتظامیہ سے مل کر اسے نفع کی سطح پر لانے کی کوشش کی۔ یہ سب کام چھ ماہ سے بھی کم مدت میں ہوا۔

راقم الحروف کا ایک اور تجربہ یہ ہے کہ پبلک سیکٹر کا ایک بڑا کارخانہ یعنی درگاپور فرٹیلائزر پلانٹ، محنت کش طبقے اور انتظامیہ کی آٹھ ماہ کی باہمی آویزش کے سبب ۱۹۸۲ میں بند کر دیا گیا تھا جس سے ہر ماہ کروڑوں روپے کی پیداوار کا نقصان اٹھانا پڑا۔ اس کارخانے کی دو بڑی یونینیں تھیں۔ ایک مارکسٹ مکتبۂ فکر سے تعلق رکھتی تھی اور دوسری انٹک سے۔ انٹک کا نظریہ کانگریس پارٹی سے مطابقت رکھتا ہے۔ یہ دونوں آپس میں برسر پیکار تھیں لیکن دونوں ہی انتظامیہ کی مخالف تھیں۔ اس سے تعطل پیدا ہو گیا۔ راقم الحروف نے انتظامیہ سے، نیز دونوں یونینوں کے رہنماؤں سے تبادلۂ خیال کیا اور پلانٹ پر پہونچ کر تمام کارکنوں کی مشترکہ میٹنگ بلائی۔ اس میں یہ مشورہ دیا گیا کہ پلانٹ کی انتظامی کمیٹی میں دونوں یونینوں کے نمائندے ہوں۔ اس انتظامی کمیٹی کو کُلّی اختیارات حاصل ہونے چاہئیں۔ انتظامیہ اور کارکنوں سے اس چیلنج سے نبرد آزما ہونے کے لیے کہا گیا اور مشترکہ کوششوں سے پلانٹ چالو کرنے کی دعوت دی گئی۔ اس تجربے کی کامیابی کو مشکوک سمجھا گیا۔ انتظامیہ کے اعلیٰ سطح کے ذمہ داروں نے اس پر شبہ کا اظہار کیا۔ لیکن اس کوشش سے پلانٹ کام کرنے لگا اور صلاحیت کے بھرپور استعمال سے پیداوار کا نیا ریکارڈ قائم ہوا۔ یہ کام صرف تین ہفتے میں ہوا۔ اس سے ثابت ہوا کہ یہ تجربہ عارضی طور پر ہی کامیاب نہیں ہے بلکہ ایک سال سے زیادہ عرصے سے اس کی کامیابی بدستور قائم ہے۔ ستمبر ۱۹۸۳ سے قبل اس کی صلاحیت کا استعمال ۴۰ فیصد سے اوپر نہیں پہنچا تھا، مگر اب یہ بڑھ کر ۹۰ فیصد تک پہنچ چکا ہے۔ اوسطاً یہ ۸۰ فیصد کے لگ بھگ ہے۔ اس عرصے میں کارکنوں اور انتظامیہ کے درمیان کسی طرح کا کوئی جھگڑا بھی نہیں ہوا۔ اس سے کارکنوں کی شرکت کی افادیت ثابت ہوتی ہے۔ لیکن اگر یہ اقدام مخصوص مفادات سے میل نہیں کھاتا تو اس تبدیلی لانے کی راہ میں متعدد دیواریں کھڑی کی جا سکتی ہیں۔

بمبئی کی ٹیکسٹائل انڈسٹری کی ایک اور مثال ہے۔ یہ دو سال سے بھی زیادہ عرصے سے بند پڑی تھی۔ اس کے سبب دو لاکھ مزدور بے کار ہو رہے تھے اور کروڑوں روپے کا نقصان اٹھانا پڑا۔ اس کا خاص سبب یہ تھا کہ انتظامیہ اس بات پر مُصر تھا، کہ ایک مخصوص یونین ہی تسلیم شدہ یونین متصور ہوگی۔ بد قسمتی سے سرکار بھی انتظامیہ کی حامی تھی۔ یہ یونین ممبر سازی کے لیے تیار نہ تھی۔ ملازمین میں اس کا کوئی جمہوری کردار نہ تھا اس لیے وہ اس پر بھروسہ نہیں کرتے تھے انتظامیہ کا اصرار اس بات پر تھا کہ خفیہ ووٹ کے ذریعے انتخاب نہ کر کے محض تصدیق کے ذریعے اسے تسلیم کیا جائے۔ امید تھی کہ تصدیق کے مقابلے میں سرکار اس کی حمایت کرے گی کیوں کہ اس کی سیاسی ذمہ داریاں قابل بھروسہ سمجھی جاتی رہی تھیں چنانچہ ہمارے ملک میں آجر اور ملازم کے جھگڑے کی یہی بنیاد ہے۔ لہٰذا ضروری ہے کہ ملازمین ہی سے ان کا نمائندہ خفیہ بیلٹ کے ذریعے گاہے بگاہے چُنا جاتا رہے۔ مثال کے طور پر انتخاب ہر دو سال بعد کیا جائے۔ یہ صنعتی تنازعات سے متعلق ایکٹ میں مناسب ترمیم کے بعد اس مقصد کو حاصل کیا جا سکتا ہے۔ اس بنیادی ضرورت کو نظر انداز کرنے یا اسے کوئی اور رُخ دینے کے لیے کوئی متبادل اور آسان طریقہ نہیں ہو سکتا۔ البتہ اقتصادی جمہوریت کے اس خاکے میں تمام کے تمام مزدور شیئر ہولڈر کی صورت میں شراکت دار ہوں گے۔ ہر ایک کا مناسب حصہ ہوگا اور وہ انتظامیہ، تکنیکی عملے اور غیر تکنیکی عملے غرضیکہ ان تینوں زمرے کے کارکنوں میں سے اپنے نمائندے ہر سال چُنیں گے۔ یہ نمائندے انتظامی بورڈ میں حصہ دار ہوں گے۔ اس کے بعد سودے بازی کے لیے کسی ایجنٹ کی ضرورت نہ رہے گی! اگر ٹیکسٹائل انڈسٹری میں اس پالیسی کو اپنایا گیا ہوتا یا خفیہ ووٹ کے ذریعے سودے بازی والے ایجنٹ کا انتخاب عمل میں آگیا ہوتا تو کپڑا ملوں میں ہڑتال نہ ہوئی ہوتی۔

اب جبکہ اس کے حل کے بارے میں سوچا جا رہا ہے اور بند ملوں کو سرکار کے انتظام میں لینے کے لیے کہا جا چکا ہے، میرا مشورہ یہی ہوگا کہ ان کارخانوں میں مجوزہ ڈھنگ کو اپنا لیا جائے اور کارکنوں کو شیئر ہولڈر بنا دیا جائے نیز انتظامیہ میں ان کی آواز کو موثر بنا دیا جائے تاکہ وہ وقت ضرورت قربانی دے سکیں اور پیداواری صلاحیت بڑھانے نیز ملوں کو جدید لائنوں پر لانے کی غرض سے کی جانے والی اصلاحات میں عملی تعاون دے سکیں۔ یہ تبھی ہوگا جبکہ وہ خود کو ساجھی دار سمجھیں گے۔ بدقسمتی سے

قومی ملکیت میں لینے کا مطلب یہی سمجھا جاتا ہے کہ اس پر بیوروکریسی کی گرفت مضبوط کردی جائے یا انتظامی عملے کی نامزدگی سرکار کی طرف سے عمل میں آئے۔ اس سے اعتماد کو ٹھیس پہونچتی ہے جیساکہ تمام کی تمام کپڑا ملوں میں دیکھنے کو ملا ہے دیگر بہت سے قومی ملکیت والے یونٹوں میں بھی کچھ دیکھنے میں آیا ہے۔

مذکورہ نظام میں ہر فرد کو نئی صنعت کاری کے میدان میں اپنے جوہر دکھانے کے مواقع ملیں گے، انھیں اپنی سرمایہ کاری اور ہنرمندی کا دلکش منافع مل سکے گا۔ مالیاتی اداروں کا بھی نفع ہوگا۔ البتہ خالص فاضلات ریاست کی ملکیت ہوںگے جو کہ بحیثیت مجموعی قوم کی نمائندہ ہے۔ اس طرح دولت چند ہاتھوں میں مرکوز نہ ہو سکے گی۔ چوں کہ منظم سیکٹر کے فاضلات خود بخود ہی ریاستی ملکیت میں چلے جائیں گے، اس لیے اس پر ٹیکس عائد کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس طرح کالا دھن بنانے کے بہت سے وسائل کی جڑ بنیاد ہی ختم ہو جائے گی۔

غیر منظم یا از خود روزگار والے سیکٹر میں مارکیٹنگ کی قومی تنظیم کے توسط سے اشیاء کی تقسیم کے نظام سے ریاست کو ہر مقام پر نفع کی حد معلوم کرنے میں آسانی رہے گی۔ اس کے ذریعے یہ بھی معلوم رہے گا کہ نجی طور پر مال تیار کرنے والے یا تاجر نے کسی خاص اقتصادی سرگرمی سے کس قدر نفع کمایا ہے۔ اس طرح بالواسطہ ٹیکس جمع کرکے ریاست از خود روزگار والے یا غیر منظم سیکٹر سے پیدا شدہ فاضلات سے حصہ لے سکتی ہے۔ اس سیکٹر کے ارکان کے پاس ایک بار اس قدر قوت خرید بڑھ جانے پر، جس سے کہ یہ اپنی بنیادی ضرورتیں پوری کرلیں، اور یہ کہ ایسی سطح پر پہونچ جائیں جس سے کہ یہ بہتر سامان تیار کرسکیں اور بہتر خدمات فراہم کرسکیں، ان کی اس بارے میں بہت افزائی کی جاسکتی ہے کہ وہ اپنے فاضلات کا ایک حصہ بچائیں، یا پھر اس کو دیگر شکلوں میں بالواسطہ طور پر جمع کیا جاسکتا ہے۔

مال تیار کرنے والے اور اس کی تقسیم کرنے والے قومی تنظیموں کے توسط سے ہر سال تمام اشیا کے صارفین کی قیمتیں متعین کریں گے۔ اور خام مال اور تیار مال کے درمیان مناسب توازن قائم کریں گے۔ زرعی خام مال کی قیمتیں بڑھا کر عدم توازن کو دور کرنے کی کوشش کی جاسکتی ہے اور خوردنی تیلوں اور غلہ جیسی بنیادی اور ضروری اشیا کے صارفین کی قیمتوں پر سبسڈی دی جاسکتی ہے اور سامان تعیش کی قیمتوں کو بڑھایا جاسکتا ہے۔ پرائیویٹ سیکٹر کو بحیثیت مجموعی سماج دشمن عناصر اور استحصال پسندوں کے گروپ سے تعبیر کرنا غلط ہے۔ اسی طرح یہ سوچنا غلط ہے کہ پبلک سیکٹر میں تمام کے تمام فرشتے ہیں۔ اس تصور نے سماجی و اقتصادی نظام کی جڑیں کھوکھلی کی ہیں۔

اس کے برعکس اگر تمام اقتصادی سیکٹر کو قومی سیکٹر سمجھ لیا جائے اور اس میں خود انضباطی کا نظام شروع کردیا جائے، تو اس سے سب لوگوں میں خود اعتمادی پیدا ہوگی اور قومی اقتصادی سرگرمی کو نئی جلا مل سکے گی۔

اقتصادی سرگرمیوں کی توسیع اور وسائل میں تیزی سے اضافے کے سبب بڑے بڑے پراجیکٹ اس طرح شروع کئے جاسکتے ہیں جس میں لکھوکھا نوجوان نیم رضاکارانہ طور پر شریک ہوسکیں۔ ان میں قومی کام انجام دینے کا جذبہ نفوذ کر آئے گا اور وہ قوم کی تعمیر کی جدوجہد میں خود کو شریک کرسکتے ہیں۔ قومی دریاؤں کو ایک دوسرے سے مربوط کرنے کا عظیم کام اس سلسلے کی ایک کڑی بن سکتا ہے۔

ایک بار ملک کے سبھی خطوں میں بڑے پیمانے پر روزگار کے مواقع پیدا ہو جانے پر، عوام کو اقتصادی سوراج کی قومی کوشش میں ہاتھ بٹانے کا موقع مل سکے گا۔ وہ انتشار پسندانہ رجحانات سے چھٹکارا پاسکیں گے جن سے کہ آج ملک کے اتحاد اور جمہوریت کو خطرہ ہے۔

اس کے ساتھ ہی علاقائی عدم توازن دور کرنے کا سوال ہے۔ اقتصادی نظام خواہ کچھ بھی کیوں نہ ہو اُسے دُور کرنا ہی ہے۔ مجوزہ نظام سے دیہات پھلے پھولیں گے۔ اور تمام دیہی آبادی نفع میں ہوگی۔ اس کے ساتھ ہی ایسے خطوں میں صنعتوں کے قیام کی حوصلہ افزائی کی جاسکتی ہے جہاں کہ صنعتی ترقی نہیں ہو پائی ہے۔ آئین کے آرٹیکل ۳۰۱ کے نفاذ سے ملک کی تمام ریاستوں میں صنعتوں کا قیام عمل میں آسکتا ہے۔ محض بڑی صنعتوں کے قیام پر ہی زور نہیں دیا جانا چاہیئے بلکہ ایسی صنعتوں کے قیام پر زور ہونا چاہیئے جس میں زیادہ سے زیادہ لوگ کھپ سکیں۔ چھوٹے پیمانے کی صنعتوں اور گھریلو صنعتوں کے قیام سے بڑے پیمانے پر روزگار فراہم کیا جاسکتا ہے۔ چھوٹی قسم کے الیکٹرانک کے سامان کی تیاری، گھڑیوں، سائیکلوں مشینی پرزوں، دواؤں، کاسمیٹکس اور کیمیکلز کی تیاری ہر جگہ بآسانی عمل میں آسکتی ہے۔ انھیں بڑے پیمانے پر پانی یا بجلی کی فراہمی کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ یہ صنعتیں دیہات میں بھی قائم ہوسکتی ہیں۔ اور ایسے خطوں میں بھی جہاں پہلے سے کوئی صنعت قائم نہیں ہے۔ اس کے لیے مقامی آبادی کو ضروری ٹکنالوجی کی تربیت دی جاسکتی ہے اور خام مال ترجیحی بنیادوں پر فراہم کیا جاسکتا ہے اور اشیاء کی فروخت کے نظام کو مستحکم کیا جاسکتا ہے۔ مرکزی ریاستی حکومت کو ان کی حوصلہ افزائی کے لیے دو یا تین سال تک ان کی سرمایہ کاری کے سلسلے کے بارے میں نہیں پوچھنا چاہیئے بشرطیکہ انھیں ایسے خطوں میں لگایا جائے جہاں پہلے سے کوئی صنعت قائم نہیں ہے۔ ایسا کرنے کے لیے

عوام کو ترغیب عمل کے طور پر کچھ رعایتیں دینی ہوں گی۔ ریاستی حکومت اور مرکز کی طرف سے ٹرانسپورٹ کی سہولتوں اور تقسیم کی سہولتوں وغیرہ کی شکل میں بہت سی رعایتیں بھی ضروری ہیں تاکہ شہری علاقوں سے ان کا رابطہ بنا رہے اور تقسیم کی مشاغل کے سبب نئے صنعت کار اُدھر مائل ہو سکیں۔ ذرا محنت اور توجہ سے ایسے خطوں کا فروغ کوئی دشوار نہ ہوگا۔ صنعتوں کے قیام کے بعد ان خطوں کی ترقی کا عمل آسان ہو جائے گا۔ اس وقت جن علاقوں میں صنعتوں کا ارتکاز ہے، وہاں سے انھیں دیگر مقامات پر منتقل کرنے کے لیے مثبت کوششیں درکار ہیں۔ اس کے لیے بھی رعایتیں دینی ہوں گی تاکہ وہ پسماندہ علاقوں کی طرف منتقل ہو سکیں۔ سب سے بڑی ذمہ داری تیار مال کی فروخت ہے اس کے لیے عوام کی قوتِ خرید بڑھانی ہوگی جو اس نظام کا بنیادی مقصد ہے۔

اقتصادی سرگرمی میں مشغول ہر فرد کو یہی سمجھا جائے کہ وہ قومی سرگرمی میں مصروف ہے۔ اسے قومی مفاد ہر قیمت پر مقدم سمجھنا ہے۔ افراد کو اگرچہ اپنی پسند کی اقتصادی سرگرمی سے وابستہ ہونے کی پوری آزادی ہوگی۔ تاہم انھیں اقتصادی سرگرمی میں مصروف دیگر عناصر کے ساتھ ہم آہنگی رکھنی ہوگی اور پورے سماج کے مفاد کے ساتھ ہم آہنگی برتنی ہوگی۔ یہ ہم آہنگی اس اقتصادی نظام کا جزوِ لازم ہے اسے اوپر سے لاگو نہیں کیا جاتا ہے۔

بھارت ایسے ترقی پذیر ملک میں اکثر سماج واد کا ایک غلط تصور ابھرا ہے۔ مثال کے طور پر ایک وقت تھا جبکہ یہ سمجھا گیا کہ قومی ملکیت میں لے لینے اور اسے سول حکام کے حوالے کر دینے سے اس کی استحصال پسندی کا عنصر ختم ہو جائے گا۔ اور سماج واد کا مقصد حاصل ہو جائے گا۔ لیکن عمل سے یہ ثابت ہوا کہ نام نہاد قومی ملکیت نے جیسے کہ موٹے طور پر پبلک سیکٹر کہا جاتا ہے، اقتصادی عدم اہلیت کی بڑی گنجائش پیدا کر دی ہے۔ اس نے زبردست نقصانات اٹھائے ہیں اور سرکاری خزانے پر یہ بوجھ بنا ہے۔ ایک سادہ سا عام تصور کہ پرائیویٹ سیکٹر استحصال پسند ہے اور قوم دشمن عناصر پر مشتمل ہے، اور پبلک سیکٹر جو کہ تنخواہ دار سرکاری ملازموں کے ماتحت ہے، سماج واد کا نمونہ ہے، اور لہذا یہ پاک و صاف ہے، غلط ثابت ہوا ہے اور اس نے اقتصادی نظام پر غلط اثرات ڈالے ہیں۔

یہ ابتدائی تصور بھی کہ ملی جلی معیشت سے پبلک سیکٹر کی بنیادی ضرورتوں کو پورا کرنے والی صنعتیں فروغ پائیں گی اور پرائیویٹ سیکٹر میں تیار مال دینے والی صنعتیں فروغ پا سکیں گی، غلط ثابت ہوا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ پبلک سیکٹر میں کوئی بھی اپنے کاموں کے لیے جوابدہ نہیں ہے اور اس میں اقتصادی نظم و نسق کے ابتدائی اصولوں کو مدنظر نہیں رکھا گیا۔ پبلک سیکٹر پر ایسے افراد کی گرفت ہے جو کہ بیوروکریسی نظام کے پروردہ ہیں اور انھیں نتائج دکھانے پر اصرار نہیں ہے۔ چونکہ اس میں جو سرمایہ کاری کی گئی، وہ کسی ایک کی رقم نہیں تھی، لہذا اس پر جو نقصان ہوا، اس کی پروا کسی نے نہ کی۔

اگرچہ پبلک سیکٹر کی عدم اہلیت ہی اصل بیماری کا سبب بنی لیکن پرائیویٹ سیکٹر کا ریکارڈ بھی ملک کے لیے نقصان کا سبب بنا اور اس سے کچھ زیادہ ہی نقصان پہونچا۔ پرائیویٹ سیکٹر کی ترقی چند بڑے کاروباری گھرانوں کی صورت میں ظاہر ہوئی۔ انھوں نے دولت کے بڑے حصے کو قبضہ میں لیا۔ انھوں نے بہت سی چھوٹی اور متوسط صنعتوں کو جو کہ معاون صنعتوں کی صورت میں ابھر رہی تھیں، اپنے قبضے میں لیا۔ یہ وہ صنعتیں تھی جو مقابلتاً چھوٹی اور شہر میں ضرورتوں کو پورا کرنے والی صنعتوں سے متعلق تھیں۔ یہ مغرب کی صارفین کی سوسائٹی کے طرز پر آگے بڑھیں۔ ایسی صورت میں ٹیکس کاری کے غیر عملی تصور نیز قواعد و ضوابط کی شکل میں اقتصادی سرگرمیوں پر لگائی گئی پابندیوں کے سبب جو کہ حصولِ آزادی کے وقت کے مقابلے میں اس وقت ہزار گنا ہیں، قابلِ ٹیکس آمدنی پر سے ٹیکس کی چوری کا لالچ بڑھا۔ اس کے سبب سرکار نے قانون کی گرفت اور مضبوط کرنا چاہی۔ چنانچہ ایک طرف ٹیکسوں کی چوری اور دوسری طرف ان کی روک تھام کے لیے سرکاری قوانین سازی کا چکر بڑھتا رہا۔ اس سے بدعنوانیوں کی نئی نئی راہیں کھلیں۔

ہر اقتصادی سیکٹر کو قومی سیکٹر بنا دینے اور اسے اقتصادی جمہوریت کے دائرے میں باندھ دینے کی اسکیم کے ذریعے معیشت کو موجودہ اقتصادی ڈھانچے سے باہر نکال لینا ہے تاکہ وہ جمود سے باہر آسکے۔ اس کے لیے بددلی کے ساتھ کئے گئے اقدامات ناکافی ہوں گے۔ اس سلسلے میں کمیشنوں یا کمیٹیوں کے تصور کے مشورے اکثر و بیشتر خود کو دھوکہ دینے کے مترادف ہیں۔ درحقیقت ڈھانچہ کو بدلنا کوئی نہیں چاہتا۔ موجودہ ڈھانچے میں مخصوص مفادات اس قدر با اثر اور طاقتور ہیں کہ کوئی بھی عوامی تنظیم حقیقی طور پر تبدیلی نہیں لا سکتی۔

اصولی طور پر اقتصادی جمہوریت کی اسکیم کا خیر مقدم وہ سب کریں گے جو کہ آزادانہ طور پر مہم جوئی میں یقین رکھتے ہیں۔ اس نظام سے آزادانہ مہم جوئی کو تقویت ملے گی۔ اس میں سرکار کی طرف سے مسلط ہونے سے کوئی پابندی ہوگی اور اقتصادی سرگرمی قواعد و ضوابط کے چکر سے آزاد ہوگی۔ جو لوگ کسی شعبہ میں مہارت رکھتے ہوں گے، وہی اس کے قواعد و ضوابط بنائیں گے۔ خواہ وہ تجارتی سرگرمی سے متعلق قواعد و ضوابط ہوں یا صنعتی سرگرمی سے متعلق ہوں۔ اس پر بیوروکریسی کی چھاپ بھی نہیں ہوگی۔ اس کے

ذریعے پورے ملک کی متوازن ترقی کو یقینی بنایا جائے گا۔ کام کے لائق سبھی افراد کو پیداواری کاموں میں کھپایا جاسکے گا۔ اس کے ذریعے ان کی قوت خرید بڑھے گی۔ پیداواری سرگرمی یا اشیاء کی تقسیم سے متعلق سرگرمی سے مناسب فائدہ اٹھانے کے لیے ہر سال اشیاء کی قیمتوں کی پالیسی کا تعین کیا جائے گا۔ یہ کام مال تیار کرنے والے اور اسے تقسیم کرنے والوں اور صارفین نیز سرکار کے نمائندے انجام دینگے۔

سرکار رہنمایانہ خطوط پر کام کرنے کو کہیگی، لیکن اس پر عمل درآمد وہی کرائیں گے جو اس شعبے کے ماہر ہوں گے۔

اقتصادی جمہوریت کا تصور جس کے تحت تمام کی تمام اقتصادی سرگرمی ایک قومی سیکٹر کے تابع ہوگی، ایک پُرامن اقتصادی انقلاب کہا جاسکتا ہے۔ اس میں ملک کی بے روزگار افرادی قوت کو پیداواری سرگرمیوں میں لگایا جاسکے گا اور ملک کے دستیاب قدرتی وسائل سے فائدہ اٹھایا جاسکے گا۔ مالیات اور بجٹ کے ماہرین کی طرف سے شرح ترقی کا جو اندازہ لگایا جاتا ہے اس کا تمام تر تصور بدل جائے گا۔ اس سے مجموعی قومی پیداوار کی شرح ترقی کافی بڑھ سکتی ہے۔ اس کے نتیجے میں سرمایہ کاری کی تشکیل ہو سکتی ہے اور فاضلات میں اضافہ ہوگا، اور ملک کی ترقی کا عمل تیزی سے انجام دیا جاسکے گا۔

ہم نے ۵ فیصد شرح ترقی کا نشانہ متعین کیا ہے۔ جبکہ حقیقی طور پر یہ صرف ڈھائی سے لے کر تین فیصد تک ہے۔ عام نوعیت کے مالی طریقے آزمائے جاچکے ہیں۔ ان سے غریب اور امیر کا فرق دور نہیں ہو سکے گا۔

ایک بنیادی تبدیلی جس کے ذریعے ایسا کیا جانا سوچا جاسکتا ہے، وہ ہے مکمل کمیونسٹ انقلاب لیکن مذہبی روایات میں ڈوبا ہوا ملک اس انقلاب کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ اس انقلاب سے کچھ اقتصادی مسائل ضرور حل ہو جائیں گے۔ لیکن اس سے فرد کی آزادی پر اثر پڑے گا۔ طلاپرینٹیس نے اس صورت حال کا خلاصہ بیان کرتے ہوئے لکھا ہے،

ترقی کے لیے نئی راہوں کی تلاش اور اس کے تئیں فکر و تردد بہر طور بجا ہے۔ لیکن اس مسئلے کا حل مارکسٹ تھیوری میں نہیں ہے۔ اس کے لیے کلاسیکی تعلیمات کو آزاد کر آگے بڑھنے کی کوشش ضروری گئی ہے۔ لیکن اس میں منڈی کی قوتیں بے پناہ طور پر اثر انداز ہوتی ہیں اور اس میں ارتکاز کا مسئلہ سامنے آتا ہے۔ مارکس کے لیے سرمایہ داری کے فروغ کے نتیجے میں ارتکاز ایک میکانیک اور باضابطہ نظام کی صورت میں ابھرا۔ لیکن کمیونزم کے تصور کو عام کر کے کیا ایک ایسے اقتصادی نظام کے تسلسل کی اجازت دی جاسکتی ہے جس سے چند افراد بہت سے افراد کا استحصال کرسکیں۔

★

بقیہ: بجلی کی تیاری

کارپوریشن کے نام سے بجلی پیدا کرنے والی دو کارپوریشنیں قائم ہیں۔ نیشنل تھرمل پاور کارپوریشن اس وقت چھ بڑے علاقائی حرارتی بجلی گھر لگانے کے عمل میں مصروف ہے جن کی بجلی تیار کرنے کی مجموعی صلاحیت ۳۰۰۰ میگا واٹ ہے۔ ان میں سے تین علاقائی بجلی گھروں میں کام شروع بھی ہو چکا ہے۔

پن بجلی تیار کرنے والی قومی کارپوریشن مرکزی سیکٹر جیسے سلال، لوک تک، بیرا سیول اور چمیرا میں متعدد پن بجلی گھر قائم کرنے میں مصروف ہے۔ بجلی تیار کرنے کے عمل میں مرکز کی اور زیادہ شرکت سے یہ امید کی جاتی ہے کہ مرکزی ذرائع سے بجلی کی تیاری کا تناسب چھٹے منصوبہ کے آغاز میں ۱۷ فی صد سے بڑھ کر چھٹے منصوبہ کے آخر میں تقریباً ۲۵ فی صد ہو جائے گا۔

اب تک بجلی کی کل پیداوار میں پن بجلی کا حصہ تقریباً ۳۰ فی صد رہا ہے، تاہم اب پن بجلی کی تیاری میں تیزی لانے کے لیے منصوبہ بندی کی جارہی ہے تاکہ حرارتی اور پن بجلی کی موجودہ صورت حال کو بہتر بنایا جاسکے اور ملک میں پھر سے کام میں لائے جانے کے قابل وسیع پیمانے پر موجودہ وسیلوں سے فائدہ اٹھایا جاسکے۔

ملک کی بجلی کی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے تابکاری بجلی کو جو کردار ادا کرنا ہے اس کو مدنظر رکھتے ہوئے تابکاری بجلی میں اضافے کرنے کے لیے ایک حکمت عملی مرتب کی گئی ہے۔ ہندوستان میں تابکاری بجلی کے پروگرام کی بنیاد اندرون ملک تیار کی گئی ٹیکنالوجی کی صلاحیت پر رکھی گئی ہے۔ اس پروگرام کے مطابق ۲۰۰۰ء تک دس ہزار میگا واٹ بجلی تیار کرنے کا نشانہ مقرر کیا گیا ہے۔ اس وقت تابکاری بجلی کی پیداوار ملک میں تیار کی جارہی کل بجلی کے تقریباً تین فیصد حصے کے برابر ہے۔

ایک اور قابل ذکر امر جو بجلی کے شعبے پر اثر انداز ہو رہا ہے وہ ہے بجلی مہیا کرنے کے نظام قائم کرنے کے تیزی سے بڑھتے ہوئے اخراجات اسی طرح ایندھن اور بجلی تیار کرنے کے لیے استعمال ہونے والے ساز و سامان کی قیمتوں میں بھی تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے۔ بجلی کے طویل المدت منصوبے کا بنیادی مقصد یہ رہا ہے کہ بجلی سے متعلق ایسے پروگرام مرتب کئے جائیں جن سے بجلی پیدا کرنے والی صنعت کا ایک تنظیمی ڈھانچہ فراہم کیا جاسکے تاکہ بجلی کے صارفین کو کم سے کم ممکنہ لاگت پر مناسب بجلی مہیا ہو سکے۔ چنانچہ بجلی کے موجودہ طویل المدت منصوبے کے جائزہ کی مدت ۹۵-۱۹۹۴ء تک ہو گئی ہے۔ ★

غزلیں

قیصر ارجن پوری

اس دل کی دھڑکنیں ہیں امیدِ بہار تک
ہنگامۂ خزاں ہے غمِ انتظار تک

پھر اس کی آستین سے خنجر نکل پڑا
مخلص بنا رہا وہ مرے اعتبار تک

جو صرف پھول چننے ہیں وہ اور لوگ ہیں
مجھ کو تو ہیں عزیز گلستاں میں خار تک

اب زندگی بھی جیسے تمنا کی قبر ہے
تجھ سے چھٹے تو آئے غمِ روزگار تک

کیسے کہیں کہ ختم ہوا درد کا سفر
آنے کو ہم جنوں میں چلے آئے دار تک

اب دیکھئے یہ جوششِ جنوں اور کیا کرے
قیصر نہ بچ سکا ہے گریباں میں تار تک

ابرار نعمی

جو راہِ دار و رسن سے گزر نہیں سکتے
وہ نام کچھ بھی زمانے میں کر نہیں سکتے

ہم ہی سنوارتے آئے ہیں وقت کی زلفیں
تمہارے ہاتھوں یہ گیسو سنور نہیں سکتے

حیات ان سے بہت دور ہے گزرتی ہے
برائے زیست جو ہر گام مر نہیں سکتے

جو تیرتے ہیں کسی غیر کے سہارے پر
وہ ڈوب سکتے ہیں لیکن ابھر نہیں سکتے

یہ زخم تیر یا تلوار تو نہیں نعمی
یہ زخم دل ہیں یہ مرہم سے بھر نہیں سکتے

اختر شاہجہانپوری

جب بات ہے سچی تو قسموں کی ضرورت کیا
اظہارِ غمِ دل کو اشکوں کی ضرورت کیا

یہ شہر ہے شیریں کا اس شہرِ محبت میں
فرہاد نہیں کوئی تیشوں کی ضرورت کیا

الفت کا تعلق جب روحوں کا تعلق ہے
پھر وصل کی خواہش کیوں جسموں کی ضرورت کیا

محروم سماعت ہے جب آج کا ہر منصف
پھر حق کی حمایت میں لفظوں کی ضرورت کیا

جب تم سے ہی ملنے کی امید نہیں کوئی
یہ جسم ہے بے معنی آنکھوں کی ضرورت کیا

گردِ غمِ الفت ہی غازہ ہے مرے رخ کا
پھر آئینے کیا دیکھوں شیشوں کی ضرورت کیا

ہم خانہ خرابانِ الفت کے لیے اختر
ویرانوں میں راحت کیا محلوں کی ضرورت کیا

فریاد آذر

اب نہ اس دل میں کبھی شمع جلائے گا کوئی
اب مری موت کا پیغام نہ لائے گا کوئی

مجھ کو ہو جائے گی پھر لفظِ وفا سے نفرت
جب ترا نام مجھے یاد دلائے گا کوئی

اب تصور سے بھی ہونے لگی وحشت مجھ کو
اب ترا ذکر دعاؤں میں نہ آئے گا کوئی

پھر وہ اشکوں کی حرارت سے ہوا پتھر موم
پھر مری روح پہ اک زخم لگائے گا کوئی

میں نے خود اپنے ہی ہاتھوں سے کیا قتل اپنا
کیا مرے خواب کی تعبیر بتائے گا کوئی

کون اب کیسے رلائے گا مجھے اے آذر
اب مری دید کو ترسے گا نہ پائے گا کوئی

عابد مناوری

صرف کرب انا دیا ہے مجھے
زندگی نے بھی کیا دیا ہے مجھے

مسکراتے ہوئے بھی ڈرتا ہوں
غم نے بزدل بنا دیا ہے مجھے

میں اسے دل لگی سمجھتا تھا
تو نے سچ مچ بھلا دیا ہے مجھے

جس طرح ریت پر ہو نقش کوئی
یوں ہوا نے مٹا دیا ہے مجھے

یارب! اس بے حسوں کے شہر میں کیوں
دلِ درد آشنا دیا ہے مجھے

سب نے یوں میری خاک اڑائی ہے
خاک ہی میں ملا دیا ہے مجھے

وہ بھی ٹھنڈی ہوا کا جھونکا تھا
جس نے یکسر جلا دیا ہے مجھے

اس نے رکھا ہے یوں طرح مصروف
روز ہی غم نیا دیا ہے مجھے

آج میرے ہی دل نے اے عابد!
اپنا دشمن بنا دیا ہے مجھے

خضر برنی

لطفِ وصال مل گیا مجھ کو ترے نیاز میں
مجھ میں نماز ہے کبھی میں ہوں کبھی نماز میں

شانۂ زلف میں نہاں ہستی دل ہے کہاں
عمر تو اس کی جا چکی سلسلۂ دراز میں

میری غریب زندگی کس کے سہارے جائے گی
سجدے تو پی کے سو رہے میکدۂ مجاز میں

جوششِ کرم کی ہے صدا کیف کا وقت آ گیا
پیاسو چلو سبیل ہے میکدۂ نیاز میں

بابِ کرم جو کھل گیا، کھل گئی قسمتِ خضر
اس کو خزانے مل گئے سارگہِ نیاز میں

دھرمیندر ناتھ

گھر کا نہ گھاٹ کا

چاندے کی رات، چاندنی میں نہائی شہر کی عمارتیں۔ سانولی حسینہ کی طرح چمکتی تارکول کی سڑک۔ ہر طرف سناٹا۔ کبھی کبھی ہوا کا جھونکا آتا تو نیم کی پتیاں سہر اُٹھتیں اور پیپل کی شاخیں دبی آوازمیں تالیاں بجا دیتیں۔ کچھ دیر کے بعد پھر وہی خاموشی۔

بس ایک پلے کی آواز جو اس خاموشی کا سینہ چیرتے ہوئے کہیں گم ہو جاتی۔

پیپل کے پیڑ کے نیچے بھورے رنگ کا مریل سا پلّا جو آسمان کی طرف مُنہ اٹھا کر تھوڑی تھوڑی دیر بعد احتجاج کی صدا بلند کرتا تھا۔ بھوک اور سردی اُسے بے چین کرتی تو وہ رو دیتا تھا۔ اُس کی آواز آسمان تک تو نہیں، شاید پیپل کی پھنگی تک ہی پہنچ پاتی ہوگی مگر اُسے تسلی تھی کہ وہ رو تو رہا ہے اور کوئی سُنے یا نہ سُنے اس خاموشی میں وہ اپنی آواز خود تو سُن سکتا تھا۔ جو دن کے ہنگامے میں کہاں ممکن۔

دن کی تیز رفتار زندگی میں کس کو کس کی فکر۔ دوڑتی بھاگتی زندگی میں کون کس کا دُکھ بانٹے۔ وقت کی زنجیر میں بندھے سب گھسٹتے ہی چلے جا رہے تھے۔

بس آوازیں ہی آوازیں۔ ریل پیل، بھاگ دوڑ یہی بھاگ دوڑ تو پلے کی ماں کو کھا گئی۔ ایک دن سڑک پار کرتے وقت بس کے پہیوں کے نیچے آگئی تھی۔ بریک کی کریہہ کی آواز گونجی، ساتھ ہی ڈرائیور کی موٹی سی گالی۔ بس تو آگے بڑھ گئی، ماں تڑپ کر ٹھنڈی ہوگئی۔ دے گئی اپنے بچے کو ایسا سنسار جس میں کوئی اپنا نہ تھا۔

سڑک پر پیدا ہونے والوں کو باپ سے کیا لینا دینا۔ حسب و نسب کا دعویٰ بے معنیٰ۔ بس ایک ہی سچائی کے سہارے زندہ رہتے، بھوک کی خاندانی روایت۔ اس شہر میں نجانے کتنے بھوکے زندہ ہیں۔ ایک اور بڑھ گیا تو کیا۔

شہری دُنیا میں ایک پلے کی وقعت کیا جیسے تیسے پل ہی رہا تھا۔

دُبلا پتلا پلّا جس کا پیٹ لگاتار بھوکے رہنے کی وجہ سے پیٹھ سے لگ گیا تھا۔ چلتے وقت ٹانگیں لڑکھڑاتی۔ صرف ہڈیوں کا ڈھانچہ ناک پر سفید نشان۔ مُنہ اٹھا کر دیکھتا تو آنکھوں میں وہ بلا کی مسکینیت اور مظلومیت ہوتی کہ دل والوں کے من میں ہمدردی جگا دیتی۔ اسی سہارے ایک آدھ ٹکڑا مل جاتا۔ بھاگتے بھاگتے جاتے تو حلوائی کی دُکان کے پاس پڑے جوٹھے سکوڑے اور پتے چاٹنے کو مل جاتے ورنہ وہاں بھی تو کوئی نہ کوئی دُم دار کتا ڈیرا ڈالے رہتا۔ کبھی آنکھ بچتی یا اُس کا پیٹ بھرا ہوتا تو اسے بھی زبان کی لپک کے لیے کچھ نہ کچھ مل ہی جاتا ورنہ زیادہ تر تو کاٹک کی دُتکار اور دکان پر کام کرنے والے نوکروں کی لات ہی ملتی تھی۔ کیاؤں کیاؤں کرکے تھوڑی دور چلا جاتا مگر بھوک پھر واپس کھینچ لاتی۔ حلوائی کی دُکان پر پیٹ نہیں بھرتا تھا۔ اسی لیے زیادہ تر وقت اسپتال کمپاؤنڈ کے باہر کوڑے کے ڈھیر کُریدنے میں گزرتا تھا۔

❖

ایک دن پلّا ہمت کرکے اسپتال کے وارڈ نمبر ۲ میں داخل ہو ہی گیا۔ دروازے کے سامنے یہی وارڈ گراؤنڈ فلور پر تھا۔ سڑک والوں کی قسمت چمکے تو بلڈنگ یا بن بلڈنگ گراؤنڈ فلور میں ہی گھسنے کا موقع مل جاتا ہے ویسے بھی سڑک پر رہنے والے زمین والوں کے زیادہ نزدیک تھا۔

وارڈ میں جدھر گیا دُتکارا گیا مگر غرض مند میں قوتِ برداشت بلا کی ہوتی ہے۔ زینے کے نیچے ٹھکانا بنا لیا۔ کچھ دنوں تو نرسوں کی ٹیڑھی نظریں اور ڈانٹ، صفائی کرنے والوں کی گالیاں اور جھاڑو کھانی پڑی۔ پھر سمجھوتہ سا ہو گیا۔ دھیرے دھیرے لوگوں نے اس کے وجود کو مان لیا۔ دھرنے کے آگے تو بڑی بڑی سرکاریں جھک گئیں یہ تو انسان کے دل کی بات تھی۔ لوگ زینے کے نیچے پلے کے ہونے کے عادی ہو گئے بلکہ آتے جاتے لوگ بچا کھچا دے دیتے اور مریضوں کا کھانا بانٹنے والے

ایک آدھ روٹی دے ڈالتے۔ اس پلے کو نام بھی دے دیا گیا۔ 'بھورا' ورنہ ایسے کو نام کی کیا ضرورت جس کے نہ تو باپ دادا کا پتہ ہو نہ گھر کا۔ بھورے کو پہلے ہی کسی صاحب کی تھپکی یا کسی مہ جبین کی آغوش نصیب نہیں ہوئی۔ لیکن دسٹ بین سے اچھا تھا، آخر سر پر چھت تھی یعنی زینے کے نیچے ٹھور ٹھکانہ تھا۔

صبح شام بھورا وارڈوں میں گھومتا کچھ نہ کچھ اچھا کھانے کو مل ہی جاتا۔ کیوں کر بیماروں جیسے دوسروں کے دکھ درد بھگتنے کا احساس بڑھ جاتا ہے۔ حلوائی کی دکان پر بھی کبھی کبھار چلا جاتا۔ آخر پرانا تعلق یوں ہی تو نہیں توڑا جاتا۔ ہاں کوڑے کے ڈھیر پر جانا بہت کم ہو گیا۔ جاڑے کی پریشان کرنے والی لمبی راتوں اور گرمی کی تپتی دوپہر میں گھومنا پھرنا محدود ہو جاتا تو کسی نہ کسی مریض کی الماری یا پلنگ سے کچھ نہ کچھ جھپک لیتا۔ یہ عادت تو بنی ہی رہنی چاہیئے۔ اسپتال کے ٹھکانے کا کیا آج ہے کل نہیں۔ سڑک کے کنارے کی زندگی کی وراثت آخر چھوڑ کیسے دی جائے۔ اسی چوری چکاری سے تو کام چلتا ہے۔ مریض گالی دیتے یا وارڈ بوائے ایک دو لات جڑ دیتے۔ دسٹ بین گالیوں میں عزت نہیں جاتی سو دو سو کوئی دینے سے رہا۔ سڑک پر پیدا ہونے والوں کا وجود کا احساس یہی گالیاں تو کراتی ہیں۔

* * *

وارڈ نمبر ۲ میں دو ہی ایسی ہستیاں تھیں جن سے سب واقف تھے، ایک تو 'بھورا' پلا اور دوسرے اسپیشل روم نمبر ۱ کا مریض سیٹھ حکومت رائے۔

سیٹھ کی بیماری سے زیادہ تنہائی اور نظرانداز ہونے کے احساس نے مار رکھا تھا۔ کوئی پاس بیٹھنے کو تیار نہ تھا۔ بڑھاپے میں دکھا اور دوا دونوں ہی چاہئیں مگر حکومت رائے کے کمرے میں لوگ جاتے گھبراتے۔ نرسیں اور وارڈ بوائے مجبوراً آتے تو کان بہرے کر لیتے، آنے سے زیادہ جانے کی جلدی ہوتی۔ ڈاکٹر راؤنڈ پر آتے تو ہاں ہوں کر کے چلے جاتے۔ سیٹھ اکیلے میں خود سے لڑتا جھگڑتا، گالیاں اس زور سے دیتا کہ کوئی اگر اس کے پاس نہ آئے تو اس کی آواز تو دوسروں تک پہونچ جائے۔ اس چیخ و پکار سے وارڈ کی فضا گونجتی رہتی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ سب سے دور سے دور ہوتا چلا جا رہا تھا۔ لوگوں کے بیٹے بہویں، پوتے پوتیاں صبح شام چکر کاٹتے، پھل پھلاری لاتے۔ کتنی گہما گہمی رہتی، شام کو ملنے کے مقررہ وقت میں۔ بچوں کی ہنسی بھاگ دوڑ سے ماحول تازہ دم ہو جاتا۔ آنے والے اپنے مریضوں کا حال چال پوچھتے مگر سیٹھ کا سب کچھ ہوتے ہوئے بھی کوئی نہ تھا۔

حکومت رائے کا بھرا پُرا گھر تھا۔ پوتے پوتیاں، ناتی بیٹے بیٹیاں، بہویں سب کوئی تو تھا۔ دھن اتنا کہ سب کچھ اس کے نیچے دب گیا۔ جوانی پھاڑ کے کمایا۔ رات دن کمانے کا چکر، دن رات کام ہی کام اور دوسروں کو ڈانٹ پھٹکار۔ سب کو کولہو کے بیل کی طرح جوتے رکھتا۔ دھن کمانے کے پھیر میں وہ یہ بھول ہی گیا کہ محبت زندگی کا احساس بہتر ہے۔ دن رات بیوی بچوں اور نوکروں کو ڈانٹتا پھٹکارتا۔ دولت بڑھی تو یہ خیال اور بھی جم گیا کہ جو وہ کرتا ہے وہی ٹھیک ہے، دوسروں کو اس کا حکم ماننا ہی چاہیئے۔ صبح سے دوکان پر آ جاتا تو رات دیر تک حساب کتاب ملا کر دوکان بند کرتے کراتے دس گیارہ بج جاتے۔ گھر پہونچتا تو احکامات جاری ہوتے۔ فرمانبردار بیٹے، سہمے ہوئے بچے، گردن جھکائے بہویں۔ پورے گھر کی زندگی ایک مشین سی تھی۔ ہاں جب سیٹھ حکومت رائے دوکان کا سامان خریدنے شہر سے باہر جاتے تو یہ دو تین دن گھر میں امن چین کے ہوتے۔ ہنسی قہقہے گونجتے مگر لالہ جی کے واپس آتے ہی سب بدستور ہو جاتے۔

شہر کی مانی ہستیوں میں تھے سیٹھ حکومت رائے۔ کیوں نہ ہوں دونوں ہاتھوں سے دھن بٹورا۔ کئی حویلیاں، کوٹھیاں، کاریں، نوکر چاکر سب کچھ تو تھا باہر نکلتا تو لوگ سلام کرتے۔ یہ اوروں کو صلاح دیتا۔ ان پر پھبتی کستا۔ گردن اٹھا کر چلتا آخر دولت کا نشہ کم تو نہیں ہوتا۔ لڑکوں اور لڑکیوں کی شادیاں دھن والے گھرانوں میں کیں۔ گھر پر رعب داب تھا، سماج میں عزت، بازار میں ساکھ اور کیا چاہیئے۔ آجکل لوگ اسی کی تو تمنا کرتے ہیں۔ مگر دولت کا سراب حکومت رائے کو دوڑاتا ہی رہا۔ بیوی کہتی ذرا بچوں سے ڈھنگ سے بولا کرو آخر بیٹے بیٹیوں والے ہو گئے ہو، تو وہ اُسے بھی ڈانٹ دیتا۔ لڑکے بہوؤں کو لے کر کہیں گھومنے جاتے تو کسی نہ کسی بہانے تنبیہہ کرتا۔ اپنی پسند کا کھانا گھر میں بنواتا غرض پورے گھر پر حاوی تھا۔ مگر بیماری نے گھر والوں کی محبت کا ملمع اتار دیا۔

سیٹھ جی کو ہسپتال میں داخل کرانے کی بہت جلدی کی گئی۔ لڑکوں نے اسپیشل روم میں انھیں رکھا الگ سے نرس کی ڈیوٹی لگا دی گئی۔ اسٹاف کو بھی انعام سے نوازا جاتا تھا۔ بڑے سے بڑا ڈاکٹر، موٹی سے موٹی فیس لے کر مریض کو دیکھنے آتا۔ خاندان والوں کا ایک ہی بات پر زور کہ خرچ کی فکر نہیں بس لالہ جی کو آرام سے اسپتال میں ہی رکھئے گھر پر ایسا آرام کہاں شہر کے لوگوں میں واہ واہ تھی کہ اولاد ہو تو سیٹھ حکومت رائے جیسی کہ باپ کے علاج میں پیسہ پانی کی طرح بہا رہے ہیں۔

مگر حکومت رائے پریشان کوئی آئے تو...

* * *

شاید اسی اکیلے پن کے رشتے نے 'بھورے' اور حکومت رائے کو ایک دوسرے کے قریب کر دیا۔ بھورا وارڈ میں سونگھتا، چکر لگاتا اسپیشل

روم میں داخل ہوا۔ الماری کے پیچھے گھسا، الماری ہلی، حکومت رائے نے موٹی سی گالی دیتے ہوئے کہا کون ہے بے' جواب میں دکھائی دیا مُنہ اٹھائے مرگھلا سا ایک پلا۔

حکومت رائے نے دو چار اور سنائیں' مگر بے چارگی سے بھری آنکھیں جو خاموش زبان سے کہہ رہی تھیں ' بس بہی کچھ۔ اور بھی جو کہنا ہو کہہ لو' لالہ حکومت رائے نے مڑنے کی کوشش کی ہاتھ سے دُودھ کا گلاس چھلکا۔ زمین پر گری بوندوں کو بھورے نے چاٹ لیا۔ پھر گردن اُٹھاکر دودھ طلب نگاہوں سے دیکھا۔ سیٹھ نے موٹی سی گالی دے کر تھوڑا سا دُودھ اور گرا دیا۔

دونوں میں ایک سمجھوتہ سا ہو گیا' سیٹھ کو گالی سُننے والا مل گیا اور بھورے کو کھانا دینے والا۔

حکومت رائے شروع میں کچھ دن تو گالیاں ہی دیتا رہا' رفتہ رفتہ اپنے دل کا درد بے زبان کتے کے سامنے رکھنے لگا۔ جیسے جیسے دُکھڑا بڑھتا گیا' بھورے کو ملنے والے دُودھ کی مقدار بھی بڑھتی گئی۔ لوگوں کو تعجب ہوتا کہ سیٹھ کی گالیاں اب کم کیوں ہو گئیں۔ کبھی کبھی تو ہنسی کی دبی آواز بھی سُنائی دینے لگی تھی اور کبھی سسکیاں اُبھرتیں۔ دوسروں کے سامنے چہرے پر بڑکپن کی نقاب ڈالے سیٹھ کُتے کے سامنے اپنا دل کھول دیتا۔

صبح شام کا ناشتہ آتا تو بھورا اسپیشل روم میں موجود ہوتا۔ اگر کسی وجہ سے دیر بھی ہو جاتی تو کچھ وقت تک حکومت رائے انتظار کرتا پھر بھورے کا حصہ الگ رکھ دیتا۔ کھانے میں بھی بھورے کا باقاعدہ حصہ ہو گیا۔ کمرے سے بے ربط جُملے بھی سُنائی پڑتے۔

وہ کہہ رہے تھے'

' آجکل کی دُنیا یہی ہے بس کماؤ اور کھلاؤ

اس کے آگے سُننے کو بھی تیار نہیں۔ کتنی مطلبی ہے یہ دُنیا۔ تُو بھی مطلبی ہے دودھ کے چکر میں آتا ہے۔ مگر پیار تو آتا تو ہے۔

"مجھے ٹھیک ہو جانے دے دونوں ساتھ گھومنے جایا کریں گے۔"

"آ تو.... فرش سے دودھ پوری طرح کیوں نہیں چاٹا' تیرا باپ یہاں صفائی کرنے آئے گا؟"

"اچھا ابھی بھوکا ہے لے اور پی لے' تُو ہی تو میرے دل کا درد سمجھتا ہے۔"

گھر کی یاد آتی تو سیٹھ حکومت رائے بے چین ہو جاتا کہتا رہتا' او بھورے اس وقت شام کے ۴ بجے ہیں۔ دھنپت کی ماں بچوں کے ساتھ چائے پی رہی ہوگی اور تو اور وہ بھی تو مجھے دیکھنے نہیں آتی۔ جب دھنپت کا جنم ہوا تھا تو کتنی بڑی دعوت کی تھی میں نے۔ سیکڑوں آدمیوں کو وہ کھانا کھلایا کہ آج بھی لوگ تعریف کرتے ہیں۔ دھنپت کیسا نمک حرام ہو گیا ہے۔ یہاں جھانکتا تک نہیں۔ اپنا ہی خون جب نالائقی کرے تو اور کسی سے کیا اُمید۔ آجکل کی اولاد میں وفاداری کہاں' جب اپنے ہی اپنے نہیں تو اور لوگ وقت پر کیا کام آئیں گے۔"

سیٹھ حکومت رائے دل کی بھڑاس نکالتے رہتے' بھورا اُن کی طرف دیکھتا رہتا۔ کبھی کبھار دو ایک دفعہ کوں کوں کر دیتا۔ مطلب تو یہ تھا کہ اپنی موجودگی کا احساس کرا دے۔ سیٹھ جی بھی جانتے تھے اُن کا کہا کتا کیا سمجھے گا۔ مگر کوئی سُن رہا ہے۔ سب سے زیادہ ضروری یہ ہے کہ کوئی سُن تو رہا ہے۔ یہ بھی کیا کم ہے۔ تھوڑی تھوڑی دیر کچھ نہ کچھ ڈالتے رہتے۔ بھورا بھی آس لگائے بیٹھا رہتا۔ بیان جاری رہتا۔

"میں نے چھاتی پھاڑ کے دھن کمایا۔ کون جانے گا میں بھی کبھی جوان تھا۔ گھومنے پھرنے کو بھی چاہتا تھا۔ گھر میں جوان بیوی تھی مگر بیٹے سے

زیت تیتے تک دوکان میں لگا رہتا۔ کتنا کمایا پیچھے سے لادیا۔ بیوی کے زیور پکڑنے کی کوشش فرمائش پوری نہیں کی۔ اب پوتے پوتیوں والی ہو گئی ہے تو بُڈھے کو کیوں پوچھے گی۔"

بھورے نے کوں کوں کی۔ سیٹھ نے ڈبل روٹی کا ٹکڑا ڈال دیا۔ چپ چاپ اُسے کھاتا دیکھتا رہا۔ روشندان میں چڑیاں چوں چوں کر رہی تھیں۔ وقت کیسا عجیب ہے۔ چلتا ہی رہتا ہے۔ شاید ہم چلتے رہتے ہیں اور وقت رُکا رہتا ہے۔ یاد آئی اپنے بچپن کی جب ایک دفعہ چڑیا کا بچہ گھونسلے سے گر پڑا تھا اُسے رکھنے کے لیے حکومت رائے کتنی مشکل سے مُنڈیر پر چڑھا تھا۔ بچہ تو گھونسلے میں رکھ دیا مگر اُترتے وقت پیر پھسلنے سے گر پڑا۔ دیوار میں لگی کیل نے ہاتھ چیر دیا تھا۔ سیٹھ نے آستین اُلٹ کر زخم کے پُرانے نشان پر بہت محبت سے ہاتھ پھیرا جیسے بوڑھا سپاہی اپنے تمغوں کو صاف کرتا ہے۔ سوچتا رہا تب کیا سے کیا ہو گیا۔ جب دوکان میں گھونسلا بنانے کے لیے تنکا لے جاتی چڑیا نے رجسٹر کے صفحے پر گوڑا گرایا تو کتنا ڈانٹا تھا منیم کو اور نوکروں کو۔ صفائی کیوں نہیں کرتے فوراً گھونسلا نوچ کے پھینک دیا گیا اور صفائی کر دی گئی تھی۔

آج نہ وہ دوکان ہے نہ وہ منیم۔ زندگی کا رجسٹر سامنے کھُلا ہے مگر سب خالی۔ ساتھی ہیں تو روشندان میں چوں چوں کرتی چڑیاں جو بچپن سے ساتھ دیتی آ رہی ہیں۔ اور سامنے آس لگائے بیٹھا بھورا۔

ڈاکٹروں کا راؤنڈ شروع ہو گیا تھا سیٹھ کے کمرے میں بھی ڈاکٹر آئے۔ تھوڑا بہت حال چال پوچھا۔ دوا لکھی۔ سیٹھ نے کچھ کہنا بھی چاہا تو ڈاکٹروں نے بات کاٹ دی "سیٹھ جی بڑی عمر میں تو یہ سب ہوتا ہی رہتا ہے گھبرانے کی کیا بات ہے۔ علاج تو ہو ہی رہا ہے" سیٹھ جب تک کچھ اور کہتا ڈاکٹر کمرے سے باہر چلے گئے۔

سیٹھ نے پانی کا گلاس پھینکا اور اسپتال کے

۔ جنا، نئی دہلی

انتظام کو کوستے رہے۔

٭

آج سیٹھ حکومت رائے کی حالت بہت خراب تھی۔ کبھی کبھی بے ہوشی طاری ہو جاتی۔ نرسوں نے ڈاکٹروں کو اطلاع دی 'اسپیشل روم کا پیشنٹ بہت ریسٹ لیس ہے۔' جونیئر ڈاکٹروں نے سیٹھ کے گھر پر فون بھی کروا دیا۔ سینئر ڈاکٹر تو پہلے ہی کہہ دیا تھا 'اِٹ اِز اے گون کیس۔' لیکن جب تک سانس تب تک کچھ نہ کچھ کرنا ہی تھا۔ ڈاکٹر نیند کا انجکشن لگا کر اور نرس کو ہدایتیں دے کر چلے گئے۔ کچھ دیر بعد پھر وہی حال تیرا سناٹا، نیند کہاں، سیٹھ جی بڑبڑاتے رہے۔

"شیلا شادی کو کتنے برس ہو گئے یاد ہے۔ جب پہلی بار تجھے گھر لایا تھا کیسی لجائی، سکچائی، گٹھڑی سی تھی۔ دوکان جاتا تو کہتی 'سنئے ذرا جلدی آجائیے گا۔' جاتے وقت تیرے ہاتھوں کی گرما گرم چائے پی کر جاتا تھا۔ دیر سے آتا تو منہ پھلا لیتی تھی۔ کیسے تھے وہ دن۔ شیلا وقت مجھے اور تجھے دونوں کو کھا گیا۔ پیسے کی چمک نے مجھے اندھا کر دیا۔ روپیوں کی جھنکار میں تمام آوازیں ڈوب گئیں۔" غنودگی کچھ دیر کو ٹوٹتی پھر آنکھیں جھپک جاتیں اور لالہ جی بولنے لگتے۔

"بیٹا دھنپت اور لکشمی چند دُور کیوں کھڑے ہو۔ ڈرو نہیں میرے پاس آؤ میں نے تمہیں سینے سے لگا کر پالا ہے۔ ایک بار جب لکشمی بیمار ہو گیا تھا تو میں نے دو دن تک دوکان بند رکھی۔ رات رات بھر جاگ کر اس کا منہ دیکھتا رہتا۔ بیٹے دھنپت کتنے ارمان سے میں نے تیری شادی کی تھی۔ تم لوگ مجھ سے ناراض ہو نا کہ بہوؤں کو گھومنے پھرنے کی اجازت نہیں دیتا تھا۔ تم کو جلدی گھر جانے کیوں نہیں دیتا تھا۔ بیٹا اگر ایسا نہ کرتا تو تم آج سیٹھ کیسے کہلاتے۔ تمہارے دل کا حال مجھے معلوم تھا۔ دوکان میں تمہیں جوانی کھا گئی۔ تیری ماں میرا کہنا انتظار کرتی تھی، لیکن میں کیا کرتا اگر تھوڑی بھی ڈھیل ڈال دیتا تو دھن کمانے کا سپنا پورا کیسے ہوتا۔ بیٹے میں نے غریبی دیکھی تھی۔ اس لیے مجھے ہر چیز سے بڑا روپیہ لگتا تھا۔ میں نے مجھے سب سے الگ کر دیا تو نے دولت دیکھی تھی تجھے اپنا پن چاہیئے تھا۔ یہی تو آج رونا ہے۔ نردھن پیسے کے لیے تڑپ رہے ہیں اور دھن والے اپنے پن کے لیے۔"

سیٹھ نے کروٹ بدلی پیاس لگی تھی مگر پانی دینے والا کوئی نہ تھا کمرے میں ہلکی نیلی روشنی کا بلب جل رہا تھا۔ سامنے دیوار پر چھپکلیاں پتنگوں پر جھپٹ رہی تھیں۔

پھر جھپکی آئی خیالات کا دھارا بہہ نکلا۔
بڑی بہو کیسے دکھی ہو نا میں نے تمہیں بھاوج کی شادی میں نہیں جانے دیا۔ چھوٹی بہو تم بھی ناراض ہو، سینما جانے سے کیوں روک دیا۔ اس لیے تو تم نے شام کو کھانا نہیں کھایا تھا۔ تم لوگ زمانے کو کیا سمجھو۔ سیٹھ کی بہو ایسے ویسے گھروں میں کہاں جاتی ہے۔ شہر بھر میں دھاک ہے۔ لڑکے اگر گھومنے پھرنے اور سینما، کلبوں وغیرہ کے چکر میں پڑ گئے تو میری گدی کون سنبھالے گا۔ دنیا کی رنگ رلیوں سے تو دور رکھنا ہی چاہتا تھا، اور چنٹو، کہاں اپنی اماں کے پیچھے چھپا کھڑا ہے۔ میرے پاس آ بیٹا۔ ڈر نہیں، میں تو تم لوگوں کو اس لیے ڈانٹتا تھا کہ ڈھیل چھوڑنے سے سارا گھر چوپٹ ہو جاتا تھا۔

غنودگی ختم ہوئی۔ سیٹھ کی پھیلی باہیں سمٹ گئیں۔ گردن گھما کر دیکھا کوئی بھی تو نہیں تھا۔ میں ایک پیڑ اکیلا سمجھا۔ سوچا کون ہے میرا۔ نہ روپے پیسے جو رات دن کمائے تھے، نہ بازار والے جو آگے پیچھے سیٹھ جی سیٹھ جی کہتے گھومتے تھے۔ نہ گھر کے لوگ ہی یہاں آئے۔ "اونہہ گھر کے لوگ" سیٹھ جی کے چہرے پر ایک تلخ ہنسی ابھری ساتھ ہی آنسو کی بوندیں پلکوں پر لرزنے لگیں۔ سوچتا رہا۔ یہاں گھر کے لوگ کیوں آتے۔ اب مجھ سے کسی کو کیا لینا دینا۔ مگر میں نے بھی تو گھر کو گھر کب سمجھا۔ دوسروں پر رعب جمانا۔ اپنے خیالات دوسروں پر تھوپنا۔ حکم چلانا۔ ہمیشہ اپنے کو صحیح اور دوسروں کو غلط سمجھنا۔ سب سے ٹیڑھے منہ بات کرنا۔ اگر ہنس کر بات کر لیتا تو کیا میرا رعب قائم رہتا۔

سیٹھ کے من میں روشنی اٹھی، میرا ایسے سوچنا، صحیح تھا یا غلط، گھر کوئی سرکس تو ہے نہیں جہاں ہنٹروں کی پھٹکار سے آگے شیر بھی دُم دبائے کھڑے رہیں۔ دنیا کی بنیاد تو محبت پر قائم ہے۔ کاش اس بات کو میں پہلے سمجھ سکتا۔ آج کون ہے میرا۔

سیٹھ نے بے بسی کے ساتھ دروازے کی طرف دیکھا۔ مجبورا کھڑا اُسے دیکھ رہا تھا۔ آنکھیں بھر آئیں۔ کوئی تو ہے جو میرے لیے ہے۔ سرہانے الماری سے ڈبل روٹی کا ٹکڑا اٹھانے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ سینے میں زور کا درد اٹھا۔ گلے میں چیخ پھنس کر رہ گئی۔ سیٹھ جی اندھیرے میں ڈوبنے لگے ہاتھ جھول گیا۔

٭

سیٹھ جی کے پریوار والے، پتنی، بیٹے، بیٹیاں، داماد، بہویں، پوتے پوتیاں، ناتی وغیرہ۔ نوکر چاکر سب آئے۔ گاڑیوں کی لائن لگ گئی۔ آخر شہر کے مشہور رئیس سیٹھ حکومت رائے کا سُرگباش ہوا تھا۔ اخبار والوں نے فوٹو لیے پھولوں سے سیٹھ جی کو لاد دیا گیا۔ ارتھی بڑی شان سے اٹھائی گئی۔ آج تو سیٹھ جی اپنوں سے گھرے تھے۔ مجبورا دور سے کھڑا دیکھتا رہا۔ ایک آدھ بار آگے بڑھنے کی کوشش بھی کی تو دُھتکار دیا گیا۔ آخر ایسے وجود کی آجکل کیا وقعت جس کے پاس نہ طاقت ہو نہ خوبصورتی۔ بس ہمدردی...

اسپیشل روم نمبر ۱۱ کا ایک چکر لگا کر لوٹ آیا مجبورا پھر اپنے ٹھکانے پر زینے کے نیچے ایک مریل سا پِلّا بیٹھا لوگوں کو تک رہا تھا۔

اِدھر اُدھر سے

ساتویں پنجسالہ منصوبے میں زرعی پیداوار کو بڑھانے کی غرض سے کلیدی موضوعات کی نشاندہی کرنے کے لیے قائم کیے گئے عامل گروپ نے اپنی رپورٹ میں سفارش کی ہے کہ کسانوں کو بروقت پانی اور بجلی مہیا کرنے کے ساتھ ساتھ تحقیق، توسیع، کھیتی کے لیے درکار کھاد، بیج، ادویہ، قرضے اور مال کی فروخت جیسی کلیدی خدمتوں کو مضبوط کیا جائے۔ گروپ نے پسماندہ علاقوں میں کیمیائی کھاد کے مناسب استعمال کو یقینی بنانے کے لیے بھی اقدامات تجویز کیے ہیں تاکہ ماضی میں کھاد کے استعمال کے رجحان میں جو بھاری عدم توازن دیکھا گیا ہے اسے روکا جا سکے۔

عامل گروپ کی رپورٹ کے مطابق ساتویں پنجسالہ منصوبے کے آخر تک اناج کی پیداوار کے درج ذیل نشانے مقرر کیے جا سکتے ہیں۔ چاول سات کروڑ ۵۰ لاکھ ٹن، گندم پانچ کروڑ ۸۰ لاکھ ٹن، موٹے اناج تین کروڑ ۱۵ لاکھ ٹن اور دالیں ایک کروڑ ۶۰ لاکھ ٹن۔

منصوبہ بندی کمیشن نے مدھیہ پردیش کے جوبٹ درمیانی آبپاشی پراجیکٹ کو منظوری دے دی ہے۔ اس کی تعمیر پہ ۳۰٫۷۵ کروڑ روپے کے مصارف آئیں گے۔

منصوبہ بندی کمیشن نے اتر پردیش کے مرکزی سیکٹر کے ٹنک پور پن بجلی پروجیکٹ کو منظوری دے دی ہے۔ اس پروجیکٹ پر ۱۸۵٫۶۲ کروڑ روپے کے مصارف آئیں گے۔

زمینی وسائل کے تحفظ اور فروغ سے متعلق قومی کمیشن کی جانب سے مقرر کردہ ماہرین کی کمیٹی نے زمینی استعمال سے متعلق قومی پالیسی کے مسودے کا خاکہ پیش کر دیا ہے جسے اب مرکزی وزارتوں، ریاستی حکومتوں اور مرکز کے زیر انتظام علاقوں کے پاس ان کے مشوروں اور رائے کے لیے بھیجا جائیگا۔

منصوبہ بندی کمیشن نے دادو پور چھوٹا پن بجلی پروجیکٹ قائم کرنے کی اسکیم کو منظوری دے دی ہے جس میں ہریانہ میں ۱٫۵×۴ میگاواٹ کے سیٹوں کی تنصیب شامل ہے۔ اس اسکیم پر ۷٫۱۴ کروڑ روپے کی لاگت آئے گی۔ ●

میزورم کو موجودہ منصوبہ کے چالیس کروڑ روپے کے اخراجات کے مقابلے ۸۶-۱۹۸۵ء کے دوران سالانہ منصوبہ کے اخراجات کے لیے ۴۸ کروڑ روپے دیے جائیں گے۔ یہ فیصلہ منصوبہ بندی کمیشن کے نائب چیئرمین ڈاکٹر منموہن سنگھ اور مرکز کے زیر انتظام علاقہ میزورم کے وزیر اعلیٰ شری لال تھنہولا کے درمیان یہاں ایک میٹنگ میں کیا گیا۔

منصوبہ بندی کمیشن نے راجستھان کے جاکم پن بجلی پراجیکٹ کی منظوری دے دی ہے جس پر ۱۲ کروڑ ۹۳ لاکھ روپے خرچ آنے کا اندازہ ہے۔

ٹیکنیکل تعلیم اور روزگار کے مواقع بڑھانے کے لیے وزارت تعلیم جلد ہی مناسب پروگرام شروع کرے گی اور تعلیمی اداروں اور صنعت میں قریبی رابطہ قائم کیا جائے گا۔

ملازمین کی انشورنس اسکیم کے تحت جو ملازمین چھ روپے یومیہ سے کم اجرت پا رہے ہیں وہ بھی ۲۷ جنوری ۱۹۸۵ء سے مفت طبی سہولیات حاصل کر سکیں گے۔

مرکزی وزارت اور صحت اور خاندانی بہبود کے متعدد اقدامات کے نتیجے میں خاندانی منصوبہ بندی کے پروگراموں کی پیش رفت میں نمایاں اضافہ ہوا ہے۔ چنانچہ ۱۹۸۴ء کے پہلے گیارہ ماہ میں خاندانی منصوبہ بندی اپنانے والے افراد کی تعداد گذشتہ برس کے اسی عرصے کے مقابلے ۱۰٫۸ فیصد بڑھ گئی ہے۔ اس عرصے میں ایک کروڑ ۲۵ لاکھ ۵۰ ہزار افراد نے خاندانی منصوبہ بندی کے طریقے اپنائے۔

بھارت اور فرانس فلموں کی مشترکہ تیاری میں تعاون دیں گے۔ اس سلسلے میں حال ہی میں اطلاعات و نشریات کی وزارت اور حکومت فرانس کے سینماٹوگرافی سے متعلق قومی مرکز کے درمیان ایک معاہدے پر دستخط کیے گئے ہیں۔

موجودہ مالی سال کے ابتدائی نو ماہ یعنی اپریل سے دسمبر ۱۹۸۴ء کے دوران ملک کی دس بڑی بندرگاہوں نے مجموعی طور پر ۷۰۰ لاکھ ٹن مال کی لدائی کی جبکہ گذشتہ سال کی مدت کے دوران ۷۴۰ لاکھ ٹن مال کی لدائی کی گئی تھی۔

انڈسٹریل فائننس کارپوریشن آف انڈیا نے ۸۵-۱۹۸۴ء (جولائی تا جون) کے نصف اول میں صنعتی پروجیکٹوں کے لیے ۱۲۷٫۶۷ کروڑ روپے کی مالی امداد کی منظوری دے دی ہے، جس کے ذریعے تقریباً ۱۲۰۰۰ افراد کے لیے روزگار کے مواقع پیدا کرنے کی توقع ہے۔

وزارت تعلیم نو ریاستوں آندھرا پردیش، آسام، بہار، جموں و کشمیر، مدھیہ پردیش، اڑیسہ، راجستھان، اتر پردیش اور مغربی بنگال کا ایک جائزہ لے گی تاکہ ان ریاستوں میں ابتدائی تعلیم کے لیے کم تعداد میں داخلوں کی وجوہات کا پتہ لگایا جا سکے گا۔ ★

سمندری ترقیات

محمد خلیل

آج انسان اپنی تحقیقی کاوشوں سے خلا میں پہنچ گیا ہے جہاں قدرت نے انسانی شوق و تسکین کے لیے متعدد اشیاء پیدا کی ہیں اسی طرح قدرت نے سمندر کی گہرائیوں میں انسانی دلچسپی کی لاتعداد چیزیں مہیا کی ہیں۔ اس سے زیادہ اور کیا ہوگا کہ خود زندگی سمندر کی گود سے پیدا ہوئی اور اس کے بعد بے شمار صدیوں سے گزرتی ہوئی زمین پر پہنچ گئی۔ سمندری حرکتوں کا علم ہندوستان کو قدیم زمانے سے ہی رہا ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ انھیں سائنسی نقطۂ نظر سے معلومات نہ تھی لیکن پھر بھی سمندر کا چڑھنا، اترنا، پانی کا بہاؤ اور ہواؤں کے رُخ کی تھوڑی تبدیلی کے بارے میں انھیں معلوم تھا اور اس تھوڑی معلومات سے وہ فائدہ اٹھا رہے تھے۔ مثال کے طور پر شہنشاہ بابر کی سوانح عمری میں اور "آئین اکبری" میں ہندوستانی جہازوں کا ذکر ملتا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ہندوستان میں جدید علم بحریات کی ابتدا برطانوی دورِ حکومت میں ہوئی جس کا سلسلہ ایک طویل عرصہ تک جاری رہا اور اس دوران سمندری جانوروں کی متعدد اقسام دریافت کی گئیں اس کے علاوہ سمندری طبعیات اور سمندری کیمیات کے شعبوں میں تحقیق ہوئی۔

ملک میں آزادی کے بعد ہمارے سائنسدانوں نے کثیر تعداد میں معدنیات کو زیادہ سے زیادہ حاصل کرنے کی ضرورت محسوس کی ۱۹۴۷ء میں سینٹرل میرین فشریز ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کی بنیاد رکھی گئی۔ ۱۹۵۲ء میں آندھرا یونیورسٹی میں علم بحریات پر باقاعدہ تحقیقی کام ایک امریکی پروفیسر کی رہنمائی میں شروع ہوا۔ یہ ملک میں اس قسم کی پہلی کوشش تھی اس کے بعد مرکزی حکومت نے ۱۹۶۰ء میں بحری تحقیقات پر ایک کمیٹی مقرر کی اور اس طرح مختلف تجربات کے بعد گوا میں ۱۹۶۶ء میں نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف اوشنوگرافی قائم کیا گیا اور گزشتہ اٹھارہ برسوں میں اس ادارہ نے قابلِ قدر تحقیقی ترقی کی ہے۔ اس وقت اس کے تین علاقائی مرکز کوچین، بمبئی اور والٹیر میں ہیں جہاں علم بحریات کی مختلف شاخوں پر تحقیقات کے لیے سات شعبے ہیں۔ نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف اوشنوگرافی کا اپنا ایک تحقیقی جہاز ہے جس کا نام گویشنی ہے۔ یہ جہاز جدید ترین سائنسی آلات سے لیس ہے۔ اس جہاز کی مدد سے متعدد بحریاتی حرکات کی معلومات حاصل کی گئی ہیں۔ اس جہاز کے ذریعے ہمارے سائنسدانوں نے بحر عرب اور خلیج بنگال میں کئی ایسے مقام دریافت کیے ہیں جو ماہی گیری کے لیے نہایت موزوں ہیں۔ اس کی اہمیت کا اندازہ آپ اس سے کر سکتے ہیں کہ ہندوستان کی تقریباً پندرہ کروڑ ساحلی آبادی کی غذا کا ایک اہم جز مچھلی ہے اس میں لحمیہ یعنی پروٹین کی ایک اچھی مقدار پائی جاتی ہے جو ہماری صحت کے لیے نہایت ضروری ہے۔ ایک اندازے کے مطابق ملک میں ہر سال تقریباً بیس لاکھ ٹن مچھلیاں سمندر سے حاصل کی جاتی ہیں جو بیرونی ممالک کو بھی درآمد ہوتی ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ اس سے ایک بڑی رقم زرِ مبادلہ میں حاصل ہوتی ہے۔ سائنسدانوں کا خیال ہے کہ سمندری کاشت ایک ایسا ذریعہ ہے جس سے پیداوار میں ایک کثیر اضافہ کیا جا سکتا ہے۔

سمندر میں خوردبینی تیرنے والے پودوں کی ایک کثیر تعداد پائی جاتی ہے جسے سمندر میں پائے جانے والے حیوانات اپنی غذا کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ بحری تحقیق سے یہ بات معلوم ہوئی ہے کہ یہ پودے عام طور پر تین سو فٹ گہرائی تک اُگتے ہیں کیونکہ انھیں زندہ رہنے کے لیے شمسی شعاعوں کی بے حد ضرورت ہوتی ہے دوسری جانب پانی میں غذائی نمکیات کی کثیر تعداد پائی جاتی ہے جس سے سمندری نباتات کی تعداد میں بڑے پیمانے پر اضافہ ہوتا ہے۔ ان میں الجی پودوں کو ایک اہم مقام حاصل ہے۔ ان کے خلیے میں غذائی اجزا کی ایک کثیر مقدار پائی جاتی ہے اس میں کلوروفل، غیر نامیاتی اجزا، حیاتین اور لحمیہ پائے جاتے ہیں۔ غذائی نقطۂ نظر سے یہ ہمارے لیے بڑی اہمیت رکھتے ہیں انھیں اُگانے کے لیے ابتک جو کوششیں کی گئی ہیں اس میں بڑی کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ اس کی کاشت نہایت آسان ہے اور بہت کم جگہ میں ہو سکتی ہے۔ مثال کے طور پر سرگاسم نامی پودوں کو گجرات کے ساحلی علاقوں سے حاصل کیا جاتا ہے۔ سی ایس آئی آر کی کچھ تحقیقی درسگاہوں میں نسیجی کاشت یعنی کلچر تکنیک کے ذریعے اس کی کاشت شروع کی گئی ہے اور اس کے بہتر نتائج برآمد ہو رہے ہیں۔ بحری الجی کا استعمال غذا تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ ساحلی علاقوں میں لوگ بحری الجی کو بطور کھاد بھی استعمال کر رہے ہیں۔

سمندر بہت سے معدنیات کا بھی خزانہ ہے جو کافی عرصہ تک انسانی ضرورتوں کو پورا کر سکتا ہے لیکن اب بھی اسے محدود مقدار میں ہی حاصل کیا جا رہا ہے اور ہمارے سائنسداں اس بات میں دلچسپی رکھتے ہیں کہ اس کی مقدار میں بڑے پیمانے پر اضافہ کیا جائے اور نئی معدنیات کی دریافت کی جائے۔ سمندر سے ملنے والے معدنیات میں تیل، گیس کے علاوہ مینگنیز کے گولے بھی بڑی اہمیت رکھتے ہیں یہ تقریباً چار، پانچ ہزار میٹر کی گہرائی میں پائے جاتے ہیں ان میں مینگنیز کے علاوہ نکل، کوبالٹ اور تانبہ بھی حاصل کیا گیا ہے۔ لیکن ان کے حاصل کرنے میں ابھی بہت سی دشواریاں صنعتی نقطۂ نظر سے درپیش ہیں۔ یہ معدنیات جیسے سیاٹائٹ، میگناٹائٹ، مونازائٹ، گارنٹ وغیرہ جو مغربی اور مشرقی ساحلوں پر ملتے ہیں ان میں رتناگری کا الیمنائٹ اور کیرالا کے مونازائٹ کے ذخیرے قابلِ ذکر ہیں۔ یہ معدنیات ساحلی چٹانوں کے قدرتی طور پر ہونے والے کٹاؤ کا نتیجہ ہیں۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ سمندری کانکنی میں پٹرولیم گیس سب سے زیادہ اہمیت رکھتی ہیں۔ مغربی ساحل پر بمبئی ہائی میں اس کے بڑے ذخائر دریافت کیے گئے ہیں اور ان سے فائدہ اٹھایا جا رہا ہے۔ ملکی سائنسدانوں کی کوشش سے سمندری تحقیقات کے نتیجے میں جو معدنیاتی گولیاں حاصل کی گئی ہیں بڑی اہمیت رکھتی ہیں اور یہ ایک اہم ٹکنالوجی کی حیثیت رکھتی ہے۔

سمندری پودے جہاں غذائی اہمیت رکھتے ہیں وہیں دوسری جانب سمندری پودوں کی ادویاتی اہمیت بھی کچھ کم نہیں ہے مثال کے طور پر کئی ممالک میں ایسی پودوں کی کچھ خاص قسموں کو کافی عرصہ سے دوا کی حیثیت سے استعمال کیا جا رہا ہے ان پودوں کا استعمال گلا پھولنے کی بیماریوں میں بھی مفید ہے اس کی ایک خاص وجہ یہ ہے کہ ان سمندری پودوں میں آیوڈین موجود ہوتی ہے۔ اس سلسلے میں حالیہ دریافت سے ایسے سمندری پودے ملے ہیں جو جراثیم کو ختم کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ مختلف سمندری پودے سنتور میں بھی مددگار ثابت ہوتے ہیں۔ اسی طرح سمندری لہروں سے توانائی حاصل کی جا سکتی ہیں۔ جس سے توانائی کے بحران کو بڑی حد تک کم کرنے میں مدد ملے گی۔ ملک میں سمندری لہروں سے بجلی پیدا کرنے کا ایک پلانٹ گجرات خلیج کچھ اس سلسلے کی ایک اہم شروعاتی کڑی ہے۔ جسے گزشتہ دنوں شروع کیا گیا ہے۔ سمندری لہریں ۱۵ میٹر یا اس سے بھی زیادہ اونچی ہوتی ہیں اور انھیں مشینی تکنیک سے بجلی میں تبدیل کیا جا سکتا ہے۔

اس طرح سمندری ترقیات ہماری زندگی میں بڑی اہمیت رکھتی ہیں لیکن اب تک سمندری وسائل سے ہم جس قدر فائدہ اٹھا رہے ہیں وہ سمندر میں موجود ذخائر کو دیکھتے ہوئے کہیں کم ہے اور ظاہر ہے کہ ان سمندری ذخائر سے ہمیں پوری طور پر فائدہ اٹھانا ہوگا۔ لیکن ہمارے سائنسدانوں نے سمندری ترقیات سے جس قدر فائدہ اٹھایا ہے وہ بلاشک و شبہ ہمارے لیے بڑی اہمیت رکھتی ہے اور مستقبل میں سمندری ذخائر سے متعدد مسائل کو حل کرنے کے امکانات کی نشاندہی کرتی ہے۔

(بشکریہ اُردو سروس)

Regd. No. D(DN) 985
R.N. 97032/81

Licensed U(DN) to post without pre-payment
at Civil Lines Post Office, Delhi-110 054.

ol.4.No.23

YOJANA (URDU)

1-15th March. 1985

ساحلی محافظ دستے اور آلودگی کی روک تھام

بحیرہ عرب اور خلیج بنگال میں ہمارے خصوصی اقتصادی خطے میں سمندر کے ذریعے تیل کی نقل و حمل اور ہندوستان کی بندرگاہوں پر بڑے پیمانے پر تیل اور تیل سے بنی اشیا کی بڑے پیمانے پر باربرداری میں کچھ امکانی خطرات ہیں جن سے ہمارے سمندروں میں تیل گر کر پھیل سکتا ہے۔ سمندر کی آلودگی متعدد دیگر ذرائع سے بھی ہو سکتی ہے مثلاً سمندر میں تیل نکالنے کے پلیٹ فارموں، ساحل پر تیل صاف کرنے کے کارخانوں نیز صنعتوں، شہروں اور دریاؤں سے بہہ کر آنے والی گندگی جو سمندر اور اکثر ساحل کی سطح کو آلودہ کر دیتی ہے۔ چنانچہ کوسٹ گارڈ ایکٹ ۱۹۷۸ کے تحت ساحلی محافظ فوج کی ایک ذمہ داری یہ ہے کہ وہ سمندروں کے ماحول کو صاف ستھرا رکھے اور بالخصوص خصوصی اقتصادی خطے کو آلودگی سے بچائے۔

ان امور سے ظاہر ہے کہ سمندر کی آلودگی کے بارے میں ساحلی محافظوں کا دائرہ کار بہت وسیع ہے خاص طور پر ایسی حالت میں جبکہ تیل کے علاوہ دوسری گندگی کو بھی مدنظر رکھا جائے تاہم چونکہ سمندر میں ہونے والے حادثات کے سبب اتنے بڑے پیمانے پر گندگی پھیل سکتی ہے جس سے ہمارے جاندار اور غیر جاندار ذرائع کو سخت نقصان پہونچ سکتا ہے، لہٰذا یہ ضروری ہے کہ اس کی روک تھام کے لیے ایک موثر نظام قائم کیا جائے جو جدید قسم کے سازوسامان اور متعلقہ سہولیات سے لیس ہو۔ اس کے علاوہ ایک ایسے نظام کی بھی ضرورت ہے جس سے بین الاقوامی پیمانے پر سمندر کے اندر تیل کے اخراج اور تیل بردار جہازوں کے ٹنکوں کی دھلائی یا فالتو تیل پمپوں کے ذریعے باہر پھینکنے کے عمل کو روکا جا سکے۔

چنانچہ ساحلی محافظ فورس اپنے آپ کو اس طرح کی آلودگی سے نپٹنے کے لیے تیار کر رہی ہے۔ تاہم سوال پیدا ہوتا ہے کہ ساحلی محافظ فورس کی جوابی صلاحیت کس حد تک ہونی چاہیے؟ خوش قسمتی یہ ہے کہ گزشتہ بیس برسوں میں ہمارے سمندروں میں بہت کم حادثات ہوئے ہیں۔ جولائی ۱۹۷۳ میں ایک تیل بردار جہاز کا سماسس پائنر کے خشکی پر چڑھ جانے کے سبب قریب تین ہزار ٹن ہلکا ڈیزل تیل بہہ گیا تھا۔ جس سے گجرات کے ساحل سے دور سمندر میں بڑے پیمانے پر مچھلیوں کا اتلاف ہوا۔ پھر ستمبر ۱۹۷۴ میں "ٹرانس ہوراں" نام کے ایک جہاز کو جس میں ۵۰،۰۰۰ ٹن بھٹی کا تیل لدا تھا۔ لکادیو سمندر میں حادثہ پیش آیا جس سے ۲۳۲۵ ٹن تیل سمندر میں بہہ گیا اور جزیرہ کلفن کے نواح میں سمندری جانوروں کی زندگی پر بہت برا اثر پڑا۔ ۱۹۷۵ میں کچھ کے ساحل سے کچھ دور ایک یونانی تیل بردار جہاز طوفانی سمندر میں گم ہو گیا اور تیل کی بڑی مقدار سطح سمندر پر پھیل گئی۔ ۱۹۷۹ء میں امریکی بحریہ کا ایک تیل بردار جہاز "سی لفٹ" شمالی سماترا کے جزیرے رونڈو کے پاس خشکی پر چڑھ گیا جس سے نکوبار جزائر کے مجموعے کے کچھ جزیروں کے ساحلوں کو خطرہ پیدا ہو گیا اس سے ظاہر ہے کہ اب تک ہمیں ایسا کوئی واقعہ پیش نہیں آیا جس سے پانچ ہزار ٹن سے زیادہ تیل ہندوستان کے سمندروں میں بہہ کر آیا ہو۔

لہٰذا ساحلی محافظ فورس نے ان خطرات کا مقابلہ کرنے کے لیے تین دستے قائم کرنے کا فیصلہ کیا ہے جو جوابی کارروائیوں کے سازوسامان سے لیس ہوں اور تیل کے پھیلاؤ کو روکنے نیز چار ہزار ٹن تیل کو سمیٹنے کی استعداد رکھتے ہوں۔ یہ جوابی دستے بمبئی مدراس اور پورٹ بلیئر پر مقیم ہوں گے اور سب بالترتیب بحرۂ عرب، خلیج بنگال اور انڈیمان نکوبار جزائر کے نواح میں کسی بڑے حادثے کے سبب تیل سے سمندر کی آلودگی کو روکنے کی جوابی کارروائی کریں گے۔ ہر دستے کے پاس روآئل ماپ سکمر، ڈسک ٹائپ سکمر اور آٹھ سو میٹر اوشن بوم ہوگا اس کے علاوہ ان کے پاس ہوائی چھڑکاؤ کا سامان مال اتارنے کا گشتی سازوسامان، تیل کو پانی سے الگ کرنے کے آلات اور کیمیکلز چھڑکنے کی مشینیں وغیرہ بھی ہوں گی۔ بمبئی میں مقیم آلودگی روکنے والے دستے کے لیے یہ سازوسامان حاصل کر لیا گیا ہے اور کام پر لگا بھی دیا گیا ہے۔ مدراس کے دستے کے لیے یہ سامان ۱۹۸۵ کے وسط تک اور پورٹ بلیئر کے لیے مستقبل قریب میں حاصل ہو جانے اور کام پر لگا دئے جانے کی اُمید ہے۔

کوسٹ گارڈ تنظیم بچاؤ اور آلودگی پر قابو پانے کے دو بڑے فرائض انجام دینے والے جہاز بھی مرحلہ وار خریدنے کا ارادہ رکھتی ہے۔ ان جہازوں پر بھی آلودگی کی جوابی کارروائیوں کے لیے کافی انتظامات ہوں گے۔ خیال ہے کہ ان میں سے پہلے دو جہاز ۱۹۹۰ تک کام پر لگا دئے جائیں گے جن میں سے ایک مغربی اور دوسرا مشرقی خطے کے لیے ہوگا۔ ساحلی محافظ فورس کے ہوائی جہازوں کو بڑے سمندروں میں بین الاقوامی جہازوں سے تیل کے اخراج کے سبب تیل کے پھیلاؤ کا پتہ لگانے کے لیے الٹرا ریڈ اور الٹرا وائلٹ شعاعوں کے سازوسامان سے آراستہ کیا جا رہا ہے ان میں فضا سے چھڑکنے کے آلات بھی لگائے جا رہے ہیں۔

Published by the Director, Publications Division, Patiala House, New Delhi-110001
Prin' by S'yl * Prin' - 113' ld C h ' ' ' D 'hi 110C'5

یوجنا

۱۶ تا ۳۱ مارچ ۱۹۸۵

ایک روپیہ

بھارت میں جنگلی زندگی کا تحفظ

(ایکتور رائی)

رام گنگا ترقیاتی پراجیکٹ

(سومیتا کندپال)

محمد عبداللہ

نیا بیس نکاتی پروگرام اور بینک کا تعاون

پہلی جولائی ۷۵ء کو معاشی بدحالی سے نجات دلانے کے لیے قوم کے سامنے اس وقت کی وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی نے ایک جامع پروگرام پیش کیا جو کہ ۲۰ نکات پر مشتمل تھا، ہر نکتہ ایک بڑی اسکیم تھی جس کا مقصد ناخواندگی ختم کرنا اور روزمرہ کی زندگی کے معیار کو اوپر اٹھانا تھا۔ سماج کا ہر فرد اس سے بالواسطہ یا بلاواسطہ مستفید ہوتا نظر آیا۔ یہی وجہ تھی کہ ہر طرف اس کا چرچا ہوا اور لوگوں کے دلوں میں زندگی میں بہتری اور ترقی لانے کا نیا جوش اور ولولہ پیدا ہو سکا۔ بہت تھوڑی مدت میں بہت زیادہ کام ہوئے۔ لوگوں کو پتہ ہی نہ تھا کہ اسمگلروں کا گروہ اتنا بڑا اور طاقتور ہے جو کہ ہندوستان کی معیشت کو بری طرح کھا رہا ہے۔ اس پروگرام کے تحت جب باضابطہ حکومت کی مشنری نے دھر پکڑ شروع کی تب عوام نے جانا۔ یہی حال بندھوا مزدور کے سلسلے میں تھا۔ آزادی کے اتنے دنوں بعد بھی مزدور اور محنت کش طبقہ کا استحصال اس طرح ہو رہا ہے۔ یہ بات بھی لوگوں سے پوشیدہ تھی۔ انھیں اس پروگرام کے تحت آزاد کرایا گیا اور اب انھیں آباد اور روزگار مہیا کرنے کا کام ۲۰ نکاتی پروگرام کے تحت ہو رہا ہے۔ گزشتہ چند برسوں سے ملک میں کروڑوں غریب لوگوں کو غریبی کے خط سے اوپر اٹھانے کے لیے کوششیں کی جا رہی ہیں۔ اس مقصد میں کامیابی کے لیے بیس نکاتی پروگرام کا سہارا لیا گیا ہے۔ یہ کام کسی ایک شخص، ایک فرد، ایک ادارے یا محض سرکار کا ہی نہیں ہے، اس کے لیے عوامی تعاون کو بڑے پیمانے پر حاصل کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

مسز اندرا گاندھی نے نیا ۲۰ نکاتی پروگرام پیش کیا جو ۱۴ جنوری ۸۲ء میں منظر عام پر آیا۔ اس کا مقصد بھی ناخواندگی ختم کرنا، سیٹھ ساہوکار سے سود پر پیسہ کا لین دین روکنا، بندھوا مزدور کو آزاد کرانا، دیہی علاقوں کے لوگوں کی معاشی حالت بہتر بنانا اور Socio Economic انقلاب لانا ہے۔ یہ تمام کام ہو رہا ہے اور اس کے اچھے نتائج سامنے آ رہے ہیں۔

رقبہ کے اعتبار سے ہندوستان ایک بڑا ملک ہے۔ اتنے بڑے ملک اور اتنی آبادی میں ۱۶ ملین لوگ بیکار رہیں۔ جبکہ مارچ ۱۹۸۱ء کی مردم شماری کی رپورٹ کے مطابق یہاں ۲۴۴٫۱ لاکھ لوگ برسر روزگار ہیں۔ جو کہ کل آبادی کا ۳۶ فیصد ہے۔ اندازاً ڈیڑھ کروڑ مزدور، بے زمین ہیں جو کہ دوسرے کی زمین پر جوتائی کرتے ہیں۔ اس پروگرام کے تحت انھیں سہولت پہنچائی جاتی ہے۔ ان میں زیادہ تعداد شیڈولڈ کاسٹ اور شیڈولڈ ٹرائب کی ہے۔ پسماندہ ذات کی کل آبادی ۸۰ ملین ہے۔ جبکہ پسماندہ قبائل Scheduled tribe ۴۰ ملین ہیں۔ ایسے کسان جن کے پاس زمین ۲ ہیکٹیر سے کم ہے ان کی تعداد ۳۵٫۷ ملین ہے غریبی کی لائن سے نیچے کے لوگوں کی آبادی کل آبادی کا ۴۲٫۶ فیصد ہے۔

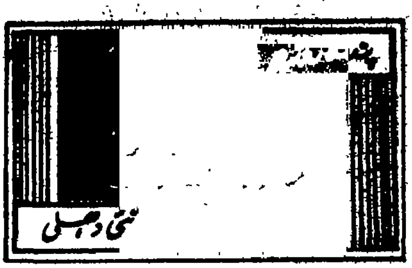
۲۰ نکاتی پروگرام کے تحت کام کو ہر سطح پر بخوبی انجام دیا جائے اس کے لیے کوشش کی جا رہی ہے، ۱۹۸۵ء تک ہر ۱۷ ہزار کی آبادی پر ایک بینک ہو جبکہ بینکوں کو قومی تحویل میں لینے کے قبل ہر ایک لاکھ کی آبادی پر ایک بینک تھا۔ بینکنگ کا نظام ملک و قوم کی ترقی میں براہ راست حصہ لے رہا ہے اب بینکوں کا کام اور ذمہ داریاں دونوں پہلے کی نسبت بہت بڑھ گئی ہیں۔ Nationalisation کے قبل بینک کا کام صرف Deposit بڑھانا اور کچھ خاص قسم کے لوگوں کو قرض دینا تھا۔ یہ پرائیویٹ کمپنی کی طرح کام کرتے تھے جن کا دائرہ اختیار بہت ہی محدود تھا۔ لوگوں کے دھن کو محفوظ رکھنا اور پونجی پتیوں کو سود پر قرض دینا یہی دو خاص کام ان کے ذمے تھے۔ لیکن یہ اُن دنوں کی بات ہے جب کہ بینک قومی ملکیت نہ ہو کر ذاتی ملکیت میں تھے۔ اسی لیے اس کی خدمت بھی ذاتی حد تک محدود تھی۔ آج اس کی Service کو National planning and programme کے تحت وسیع کر دیا گیا ہے۔

(باقی کور صفحہ ۳ پر)

اس شمارے میں

اداریہ

خصوصی بندی سے متعلق ترقیاتی پروگراموں کی جھلک پیش کرتا



چیف ایڈیٹر ——— آر. ٹھکرال
ایڈیٹر ——— لکشمی رام رانا
اسسٹنٹ ایڈیٹر ——— محمد عادل صدیقی
سب ایڈیٹر ——— وسیم حیدر

جلد ۴	۱۶ تا ۳۱ مارچ ۱۹۸۵ء	شمارہ ۲۴

۲۵ پھالگن تا ۱۰ چیتر شک ۱۹۰۷

شرح چندہ

سالانہ ۲۰ روپے، ۲ سال ۳۵ روپے، ۳ سال ۵۰ روپے
فی کاپی ——— ایک روپیہ
طالب علموں، استادوں اور لائبریریوں کے لیے دس فیصد کی رعایت

یوجنا منصوبہ بند ترقی کے بارے میں عوام کو آگاہ کرتا ہے، مگر اس کے مضامین صرف سرکاری نقطۂ نظر کی وضاحت تک ہی محدود نہیں ہیں۔

بزنس منیجر: ایل۔ آر۔ بترہ ❖ اسسٹنٹ ڈائرکٹر (پروڈکشن) آر۔ ایس۔ منجال

مضامین سے متعلق خط و کتابت کا پتہ:

ایڈیٹر یوجنا (اردو) پبلیکیشنز ڈویژن، ایسٹ بلاک ۴، لیول ۵، آر۔ کے۔ پورم (مین)
نئی دہلی ۱۱۰۰۶۶

ترسیل زر کا پتہ: بزنس منیجر، پبلیکیشنز ڈویژن، پٹیالہ ہاؤس، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۱

اداریہ

وقت کی ضرورت

آج دنیا کے بیشتر مسائل انسان کے اپنے پیدا کردہ ہیں۔ کچھ تو امیروں کے لالچ کے سبب اور کچھ ملک کے غریب عوام اور ضرورت مندوں کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے عمل کے دوران یہ مسائل شدت اختیار کر لیتے ہیں۔ قدرتی وسائل کا اندھادھند استعمال بھی اس سلسلے کی ایک کڑی ہے، ترقیاتی پروگراموں کی انجام دہی میں اس بات پر زور دیا جارہا ہے کہ فوری ضرورتوں کی تکمیل طویل المدتی بنیادوں پر ہونی چاہیئے۔ ترقیاتی عمل کو اس لحاظ سے آگے بڑھانے پر زور ہے جس سے آلودگی کا مسئلہ شدید نوعیت اختیار نہ کرلے۔ یہ سوچنا غلط ہے کہ ماحول کے تحفظ سے متعلق اقدامات اس کام میں رکاوٹ ڈالتے ہیں۔ وسائل کے محتاط استعمال سے انسانی زندگی کے مستقبل کو محفوظ اور آرام دہ بنانا وقت کی اہم ضرورت ہے۔ اس کے لیے قدرتی وسائل اور معاشی نظام کے درمیان توازن کو قائم کرنا ہوگا۔ ماحول کے تحفظ کے مسائل کسی ایک ملک تک ہی محدود نہیں ہیں۔

بھوپال کی گیس کا المیہ ہو، سویڈن میں تیزاب کی بارش ہو، سوئٹزر لینڈ میں درختوں کا فقدان ہو یا برازیل کے شہر گیوبوٹو میں سخت قسم کی آلودگی کا مسئلہ ہو، یہ سب وہ مسائل ہیں جو عالمی سطح پر آپسی تعاون اور احساس ذمہ داری سے حل کئے جاسکتے ہیں۔

ہندوستان وہ سرزمین ہے جہاں مظاہر قدرت کے تئیں احترام ہی نہیں ہے بلکہ ان کی پرستش تک ہوتی ہے۔ ہمارا تعلیمی نظام درختوں کے نیچے پھلا پھولا اور ہمارے رشیوں منیوں نے درختوں کے نیچے بیٹھ کر گیان دھیان کیا۔ اس لیے ہندوستان میں درختوں سے محبت کوئی نئی بات نہیں۔

تئیس سَو سال قبل شہنشاہ اشوک نے جانوروں کے ذبیحے پر پابندی لگادی تھی اور انھوں نے درختوں کے تحفظ پر زور دیا تھا۔ لیکن ان سب روایات کی موجودگی کے باوجود شجر کاری کا کام خاطر خواہ طور پر آگے نہیں بڑھ سکا ہے اور ماحول کے تحفظ کا مسئلہ بھی صنعت کاری کے عمل کے سبب پیچیدہ سے پیچیدہ تر ہوتا جارہا ہے۔ ہندوستان کے ماحول کو خراب کرنے میں دو عناصر خاص طور پر نمایاں ہیں۔ ایک غریبی اور دوسرا اضافۂ آبادی۔ ان کی جڑیں اس قدر دُور تک پھیلی ہوئی ہیں کہ عوام کے معیار زندگی بلند کرنے کی تمام کوششیں بے اثر ہوتی جارہی ہیں۔ آج سب سے بڑی ضرورت اس بات کی ہے کہ پُرش اور پراکرتی میں مناسب توازن قائم کیا جائے۔ انسان اور قدرت کا یہ آپسی صحت مند تعلق ہی نوعِ انسانی کی بہبود اور اس کے مستقبل کا ضامن ہے۔

آج کے دَور میں اراضی اور وسائل پر بے حد دباؤ ہے، بے روزگاری دُور کرنے کے لیے معاشی ترقی کی رفتار تیز سے تیز کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ حتیٰ کہ آج کے دَور میں پینے کا صاف پانی اور سانس لینے کے لیے تازہ ہوا تک کی کمی محسوس کی جانے لگی ہے۔ اضافہ آبادی کی روک تھام اس پس منظر میں اور بھی ضروری ہوتی جارہی ہے۔ دنیا بھر کے سماج پر نظر دَوڑانے سے پتہ چلتا ہے کہ مَردوں کا پلڑا ہر جگہ بھاری ہے، حالاں کہ بچّہ کی تخلیق اور اس کی پرورش کی زیادہ ذمہ داری ماں پر آتی ہے لیکن افسوس کہ عورت کی رائے اور اس کی بہبود پر توجّہ نہیں دی جارہی ہے۔ ہمارے ملک میں چھٹے پنجسالہ منصوبے میں افرادی قوّت کو قومی دولت تصوّر کرتے ہوئے انسانی ذہن کو قوم کی خدمت کے لیے وقف کرنے پر خصوصی توجّہ دی گئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں کے ہر فرد اور یہاں کے ہر بچّے کو بہتر شہری، بہتر کارکن اور ترقیاتی پروگراموں میں بہتر طور پر شریک کرنے کا اہل بنانے کے لیے دو پروگراموں پر خصوصی توجہ دی جارہی ہے۔ ان میں سے ایک ہے تعلیم اور اس سے جڑا ہوا دوسرا پروگرام ہے خاندانی منصوبہ بندی۔ ان کی مدد سے ہی وسائل سے بہتر طور پر استفادہ کیا جاسکے گا۔

(ایڈیٹر)

کشور راؤ

بھارت میں جنگلی زندگی کا تحفظ

جنگلی زندگی سے متعلق بھارتی بورڈ (آئی بی ڈبلیو ایل) جو ملک میں جنگلی زندگی کے تحفظ کے شعبے میں اعلیٰ ترین مشاورتی ادارہ ہے جو ۱۹۸۰ میں مرحومہ وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی کی قیادت میں قائم ہوا تھا یکم اکتوبر ۱۹۸۲ کو بورڈ کی میٹنگ سے خطاب کرتے ہوئے وزیر اعظم نے ایسے مقاصد کی ایک فہرست پیش کی تھی جس پر ملک میں جنگلی زندگی کے تحفظ کے بارے میں پالیسی اور عمل کا پروگرام مبنی ہونا چاہیئے۔ ان مقاصد نے جنگلی زندگی سے متعلق قومی سطح پر عملی منصوبے کی بنیاد فراہم کی جو ۱۳ اکتوبر ۱۹۸۳ کو آئی بی ڈبلیو ایل کی طرف سے منظور کیا گیا تھا اس منصوبہ عمل میں وہ اصول بھی شامل تھے جو ورلڈ کنزرویشن سٹریٹیجی WORLD CONSERV- ATION STRATEGY میں بیان کئے گئے تھے جو مارچ ۱۹۸۰ میں بھارت میں شروع کی گئی تھی اور بالی ایکشن پلان کے اصول بھی شامل تھے جو اکتوبر ۱۹۸۲ میں بالی میں منعقدہ ورلڈ پارکس کانگریس نے منظور کئے تھے۔

تحفظ کے یہ اصول روائتی اور تاریخی طور پر بھارتی فکر اور عقائد میں سموئے ہوئے ہیں۔ اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہوئے ہمارے آئین سازوں نے قدرتی اور جنگلی زندگی کے تحفظ کے بارے میں خصوصی اہتمام کیا۔

مملکتی پالیسی کے ہدایتی اصولوں کے صیغہ میں مملکت اور شہریوں کے فرائض کے لیے درج ذیل فرائض بیان کئے گئے ہیں۔

آرٹیکل ۴۸ ۔ " مملکت ملک کے جنگلات اور جنگلی زندگی کے تحفظ اور ماحولیات کی حفاظت بہتری کے لیے کوشاں رہے گی۔

آرٹیکل ۵۱ اے ۔ " بھارت کے ہر شہری (جی) کا فرض ہوگا کہ وہ قدرتی ماحول کا جس میں جنگلات، جھیلیں، دریا اور جنگلی زندگی شامل ہے تحفظ کرے اور اس میں بہتری لائے اور زندہ مخلوق کے لیے رحم دلی کا اظہار کرے۔"

جنگلات اور جنگلی زندگی کے اہم معاملے ۱۹۷۶ میں آئین کی مملکتی فہرست سے کونکرنٹ (CONCURRENT .) فہرست (فہرست سوئم) میں منتقل کر دیے گئے تاکہ اُن کی طرف زیادہ توجہ دی جاسکے۔

جنگلی زندگی کے تحفظ سے متعلق قانون

بھارت کے حیوانات اور نباتات میں قابل قدر گوناگونی پائی جاتی ہے اور اندازہ ہے کہ کرہ ارض پر جو نباتاتی اور حیواناتی انواع علم میں آئی ہیں اُن تمام کا تقریباً ۵ فیصد بھارت میں پایا جاتا ہے۔ بھارت میں زندگی کی صورتوں کی یہ فراوانی زیادہ تر اس لیے ظہور میں آئی ہے کیونکہ یہاں مختلف جغرافیائی خطے ہیں اور مختلف قسم کی آب وہوا پائی جاتی ہے۔ حیاتیاتی میراث کی اس فراوانی کے باوجود ملک کے قدرتی وسائل میں سُرعت سے کمی آئی ہے کیونکہ انسانوں اور مویشیوں کی تیزی سے بڑھتی ہوئی آبادی سے ان وسائل پر دباؤ پڑا ہے اور اس کے علاوہ منافع کے لالچ سے بھی بعض لوگوں نے انھیں اُجاڑ دیا ہے۔ خوش قسمتی سے قدرتی تحفظ کے بڑھتے ہوئے احساس کی وجہ سے خصوصاً ۱۹۷۰ کے بعد ایسے متعدد ٹھوس اقدامات کئے گئے جن سے یہ خطرناک رجحان رُک گیا۔ ان پیش رفتوں کے سلسلے میں پہلا اقدام یہ کیا گیا کہ ۱۹۷۲ میں جنگلی زندگی (تحفظ) قانون بنایا گیا اب جو تمام ملک پر لاگو ہے نیشنل پارکوں اور سینچوریوں (جائے پناہ) جو جانوروں کے قدرتی مسکنوں کے مختلف اقسام کے نمونوں پر مشتمل تھے کا قیام تیزی سے عمل میں آیا اور حیوانات کی اُن انواع کے تحفظ کے لیے خصوصی پراجیکٹ شروع کئے گئے جن کے نابود ہونے کا خطرہ پیدا ہو گیا تھا۔ ایک اور بڑا قانون ۔ جنگلات (تحفظ) قانون ۱۹۸۰ میں عمل میں لایا گیا جس سے ملک میں جنگلی زندگی کے بڑے بڑے قدرتی مسکنوں (جنگلات) کے تحفظ میں مدد ملی۔ ملک کی جنگلی زندگی کے وسیلوں کا انتظام کرنے کے سلسلے میں تربیت یافتہ عملے کی تیاری کے لیے قومی سطح پر ایک ادارہ دہرہ دون میں قائم کیا گیا جس کا نام " وائلڈ لائف انسٹی ٹیوٹ آف انڈیا" رکھا گیا۔ قدرتی اور جنگلی زندگی کے

تحفظ کے کام کو بڑھاوا دینے سے متعلق اپنے عہد کو پورا کرنے کے لیے بھارت اُن تمام بڑے بڑے معاہدوں کا ممبر بن گیا جن کا ذکر تحفظ کی عالمی پالیسی میں کیا گیا ہے۔

جنگلی زندگی کا قومی منصوبہ عمل

منصوبۂ عمل کے دس بڑے حصے ہیں جن میں سے ہر ایک کے تحت بڑے مقاصد بیان کئے گئے ہیں، اُن میں اُس کارروائی کا بھی ذکر ہے جو ان مقاصد کے حصول کے لیے درکار ہے اور اُن ترجیحی پراجیکٹوں کا بھی ذکر ہے جو اُس مقصد کے لیے عمل میں لائے جانے ضروری ہیں۔

سردست ملک میں ۸۰ نیشنل پارک اور ۴۴۳ سینکچوریاں ہیں جو کل ۹۰ ہزار کلو میٹر علاقوں میں پھیلی ہوئی ہیں۔ یہ تمام تر علاقہ سرسری طور پر ملک کے کل جنگلاتی علاقے کا ۱۲ فیصد اور کل جغرافیائی علاقے کا لگ بھگ ۴ فیصد ہے۔ لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان پارکوں کا قیام کسی باقاعدہ یا کلیتہً سائنسی پلان کے مطابق عمل میں نہیں آیا۔ نہ ہی یہ دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ ملک کے اندر تمام معلوم حیاتیاتی اور جغرافیائی خطوں کے نمونوں کو نیشنل پارکوں کے محفوظ نظام میں نمائندگی حاصل ہے۔ منصوبہ عمل اس محدودیت پر قابو پانے کے لیے کوشاں ہے اور اس سمت میں کارروائی کی جارہی ہے۔ وائلڈ لائف انسٹی ٹیوٹ کی طرف سے ملک کے لیے حیاتیاتی جغرافیائی درجہ بندی کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اور آزاد مشیروں کو اُن علاقوں اور انواع کی نشاندہی کرنے کے لیے خطے سونپے گئے ہیں جنھیں تحفظ کی ضرورت ہے۔ وہ موجودہ محفوظ علاقوں کی تشکیل اور انتظام کا بھی معائنہ کریں گے اور ان کی بہتری کے لیے اقدامات کی سفارشیں کریں گے۔

جنگلی زندگی کا تحفظ

ایک اور قابلِ ذکر دستاویز جو آئی یو

ڈبلیو ایل نے اپنی ۱۳ اکتوبر ۱۹۸۳ کی میٹنگ میں منظور کی تھی وہ اس ٹاسک فورس (ایسا گروپ جسے کوئی خاص کام سونپا گیا ہو) کی رپورٹ تھی جو اُس کی طرف سے جنگلی زندگی کے تحفظ کے لیے رائے عامہ بیدار کرنے کی غرض سے قائم کی گئی تھی۔ اس ٹاسک فورس کی طرف سے جو سفارشات کی گئی ہیں وہ جنگلی زندگی کے قومی منصوبہ عمل میں موزوں طور پر شامل کی گئی ہیں۔ یہ ایک بڑا شعبہ ہے جس کے لیے کارروائی شروع کی جارہی ہے تاکہ جنگلی زندگی کے محفوظ علاقوں میں اور اُن کے اردگرد رہنے والے لوگوں کی ضروریات مربوط کمیونٹی فلاحی پروگراموں کے ذریعے مکمل طور پر پوری کی جائیں۔ اس کے ساتھ ہی تعلیم وتبادلے کی سہولیات فراہم کی جائیں گی تاکہ تحفظ وانتظام کی مجموعی مساعی کے لیے مقامی لوگوں کی حمایت وشرکت حاصل کی جاسکے۔ ایسے انتظامیہ پلانوں کی تیاری کے لیے رہبرانہ خطوط بنا لیے گئے ہیں اور وہ ریاستوں اور مرکزی منتظم علاقوں کو ارسال کئے جاچکے ہیں۔

کثیرالجہت استعمال کے علاقے

ہماری زیادہ تر جنگلی زندگی نیشنل پارکوں اور سینکچوریوں کے محفوظ علاقوں کے باہر پائی جاتی ہے۔ یہ علاقے لکڑی، چارہ اور ایندھن کی ضروریات پوری کرتے ہیں لیکن چونکہ ایسے علاقوں میں جنگلی زندگی کے اعلیٰ قدرتی مسکن بھی پائے جاتے ہیں اس لیے اُن کے مفادات کے تحفظ کا خیال منصوبہ عمل کے تحت رکھا گیا ہے۔ ایک سے زیادہ مقاصد کے لیے استعمال کئے جانے والے علاقوں کے ذریعہ جانوروں اور نباتاتی زندگی کے تحفظ کے لیے جگہ جگہ قائم کردہ علاقوں میں تال میل قائم کیا جائے گا۔ اس سے ان کی زندگی کے تحفظ اور ان کی نسل کو مداومت بخشنے میں مدد ملے گی۔

بھارت کے وائلڈ لائف انسٹی ٹیوٹ کی طرف سے اس مقصد کے لیے ٹیوٹوریل اور تربیتی نصاب تیار کئے جارہے ہیں۔

مٹنے والی انواع کی آبادکاری

منصوبہ عمل کے اس مقصد کے تحت شروع میں نباتات وحیوانات کی اُن انواع کی فہرستیں تیار کرنے کی تجویز کی گئی ہے جو خطرے میں ہیں، تاکہ اُن کے تحفظ وآبادکاری کے لیے خصوصی اقدامات کئے جائیں۔ سردست جنگلی جانوروں (دودھ پلانے والوں) پرندوں، سانپوں اور آبی جانوروں کی تقریباً ۲۰۳ انواع کی جنگلی زندگی (تحفظ) قانون ۱۹۷۲ کے شیڈول رول کے تحت نشاندہی کی گئی ہے۔ اس طرح بھارت کے بوٹنیکل سروے کی طرف سے نباتات کی اُن انواع کی فہرست تیار کی گئی ہے جو خطرے میں ہیں۔ لیکن اب زیادہ باقاعدہ اور سائنسی دستور کار اختیار کیا جائے گا۔ آبادکاری کے جو اقدامات تجویز کئے گئے ہیں اُن میں ان انواع کو موزوں حفاظتی مسکن میں ازسرِ نو بسانے کی تجاویز شامل ہیں۔ جیسے کہ آسام کے ایک سینگ والے عظیم بھارتی گینڈے کو حال ہی میں وہاں سے نکال کر اتر پردیش کے دُدھوا نیشنل پارک میں بسایا گیا ہے۔ ایسے پراجیکٹوں میں امداد دینے کے لیے ایک مرکزی وائلڈ لائف ٹرانس لوکیشن یونٹ قائم کیا جائے گا۔

جنگل میں بہت سے جانوروں کا وجود اس لیے خطرے میں ہے کیونکہ ان کے لیے وہ قدرتی ماحول نہیں جس کی انھیں ضرورت ہے لہٰذا ایسے پروگرام شروع کئے جانے چاہئیں جن سے مصنوعی تجرباتی حالات کے اندر ان جانوروں کی افزائشِ نسل کا موقع ملے اور ان کو معدوم ہونے سے بچایا جا سکے۔ یہاں پر مقصد یہ ہوگا کہ نباتات اور حیوانات کی متعلقہ انواع کو ایسے حالات کے تحت اُن قدرتی مسکنوں میں ازسرِ نو بسایا جائے جہاں سے ان کا خاتمہ ہو گیا ہو۔ جن انواع کو اس طریقے کے علاوہ

کی ضرورت ہے، اُن کی فہرستیں تیار کی جائیں گی اور عملے کو افزائشِ نسل اور آبادکاری کی تکنیکوں کی تربیت دی جائے گی۔ جنگلی زندگی کی جن انواع کو شدید خطرہ پیدا ہو گیا ہے انھیں بچانے کے لیے جنگلی جانوروں کی افزائشِ نسل کے پروگرام کس قدر مؤثر ثابت ہوئے ہیں۔ اس کا پتہ بھارت کے مگرمچھوں کے تحفظ کے پروگرام کی کامیابی سے چلتا ہے، چڑیا گھر اور بوٹینکل گارڈن ایسی سرگرمیوں کے بڑے مرکز ہوں گے۔

جنگلی زندگی کے تحفظ کے لیے عوام کی مفاہمت اور حمایت بہت ضروری ہے۔ چنانچہ منصوبۂ عمل میں جنگلی زندگی کے محفوظ علاقوں اور چڑیا گھروں میں جانے والے لوگوں اور بچوں اور فیصلہ سازوں نیز ان محفوظ علاقوں اور ان کے اردگرد رہنے والے لوگوں کو جانکاری دینے کی کوششوں کا خیال رکھا گیا ہے۔ دلّی کے چڑیا گھر اور مدھیہ پردیش کے کانہا نیشنل پارک میں تماشائیوں کے مثالی اطلاعاتی مرکز قائم کئے جا رہے ہیں اور تشریحی سہولیات فراہم کی جا رہی ہیں۔

تحقیق و نگرانی

ہمارے جنگلی زندگی کے تحفظ کے پروگراموں کی ایک بڑی خامی تحقیق و نگرانی کے سلسلے میں رہی ہے۔ منصوبۂ عمل کا مقصد جنگلی زندگی کی تحقیق و نگرانی کی سہولیات کا اہتمام کرنا ہے، اور جنگلی زندگی کے ماحولی نظام کے بارے میں ایک ملکی معلومات بینک بھی قائم کرنا ہے۔ بھارت کا وائلڈ لائف انسٹی ٹیوٹ اور اس کے مجوزہ تحقیقی مرکز اس مقصد کے لیے بنیادی ڈھانچے کا اہتمام کریں گے۔ جنگلی زندگی سے متعلق تربیتی و تحقیقی صلاحیتوں کو فروغ دینے کے لیے یونیورسٹیوں کی بھی حوصلہ افزائی کی جائیگی۔ جن ملکی قوانین کا جنگلی زندگی اور ان کے مسکن سے براہِ راست تعلق ہے وہ ہیں جنگلی زندگی (تحفظ) قانون ۱۹۷۲، بھارت کا جنگلاتی قانون ۱۹۲۷ء اور جنگلات (تحفظ) قانون ۱۹۸۰ء۔ یہ عملی منصوبہ ان قوانین پر نظرِ ثانی کرے گا تاکہ انھیں زیادہ مؤثر بنایا جا سکے اور وہ اس معاملے کے بارے میں ایک نئے قانون کی ضرورت کا جائزہ بھی لے گا۔ جیسا کہ پہلے ذکر کیا گیا ہے بھارت جنگلی زندگی کے متعلق تمام بڑے بڑے بین الاقوامی معاہدوں کا ممبر ہے۔ منصوبہ عمل میں دو ملکی معاہدوں اور سمجھوتوں کی ضرورت کا جائزہ لینے کے لیے بھی کہا گیا ہے تاکہ جنگلی جانوروں کی مہاجر انواع (جن میں پرندے شامل ہیں) اور اُن کے مسکنوں کو تحفظ دیا جا سکے۔ مہاجر پرندوں سے متعلق ہند۔ روسی معاہدہ اِس ضرورت کی مثال ہے۔

رضاکار اداروں کے ساتھ تعاون

جنگلی زندگی سے متعلق قومی منصوبۂ عمل کے جو بڑے بڑے مقاصد ہیں اُن میں ایک ہے غیر سرکاری تنظیموں اور رضاکار جماعتوں سے تعاون کیوں کہ اس منصوبے کی تکمیل کے لیے اُن کی حمایت بہت ضروری ہے۔ نامور غیر سرکاری اصحاب کا ایک گروپ پہلے ہی قائم کیا جا چکا ہے جو اس منصوبے کی تکمیل میں رضاکار اداروں کے کردار و فرائض کا تعین کرے گا۔

آخر میں یہ بتانا ضروری ہے کہ مذکورہ بالا پلانوں کو عمل میں لانے کے لیے خصوصی اسکیمیں وضع کی گئی ہیں۔ دراصل جنگلی زندگی سے متعلق منصوبے (۹۰۔۱۹۸۵) کی محکمہ ماحولیات کی تجاویز کُلی طور پر جنگلی زندگی کے قومی عملی منصوبے پر مبنی ہیں اور وہ اس کے مقاصد کو حل کرنے کا خواہاں ہے۔ لہٰذا یہ عملی منصوبہ بھارت میں جنگلی زندگی اور قدرتی ماحول کے تحفظ کے لیے ایک جامع، منظم اور مربوط قومی پروگرام کی نمائندگی کرتا ہے۔

★

بقیہ: گیہوں کی پیداوار میں دشواریاں

ہونے والا کچھ رقبہ دالوں، تلہن اور دوسری فصلوں کے لیے دیا جا سکتا ہے۔ کاشت کاروں کا یہ رجحان بھی نظر آتا ہے کہ اب وہ گیہوں کی کاشت میں زیادہ دلچسپی نہیں لیتے کیوں کہ اس میں مقابلتاً لاگت زیادہ آتی ہے اور منافع کم ہوتا ہے اس لیے وہ سبزیوں اور دالوں کی پیداوار کی طرف زیادہ متوجہ ہو گئے ہیں۔ کاشت کاروں کو گیہوں کی پیداوار کی طرف متوجہ رکھنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ انھیں گیہوں کی قیمت کے طور پر اچھا معاوضہ دیا جائے۔ نئی تکنیکیں بنائی جائیں جن سے گیہوں کی پیداوار میں لاگت کم آئے اور جو کھاد وغیرہ استعمال کی جائے اس کا زیادہ سے زیادہ فائدہ حاصل ہو سکے۔

گیہوں کی پیداوار میں اضافے کے جو فوری اقدامات کئے جا سکتے ہیں ان میں بارش کے پانی سے پیدا ہونے والے گیہوں کے پیداواری رقبے میں اضافہ، بھارت کے وسطی علاقے میں کاشت کے لیے ایسے گیہوں کے بیج کی تیاری جو زیادہ گرمی برداشت کر سکے، اور گیہوں کے ایسے بیجوں کی تیاری جو شور اور دلدلی زمینوں میں کاشت کئے جا سکیں، شامل ہیں اسی طرح گیہوں کی فصل کی مختلف بیماریوں خاص طور پر کرنال بنٹ KARNAL BUNT نامی بیماری کی روک تھام کے لیے اقدامات کئے جائیں۔ گیہوں کی ایسی اقسام کی تیاری جن کی کاشت فصل بدل بدل کر ہو، مثلاً چاول/گیہوں، آلو/گیہوں، گنا/گیہوں اور کپاس/گیہوں وغیرہ بھی ضروری ہے۔

لمبی مدت کے اقدامات کے طور پر کاشت کے ڈھانچے میں تبدیلی کی ضرورت ہے تاکہ گیہوں کی پیداوار میں جو ٹھہراؤ آگیا ہے اس کو دور کیا جا سکے۔

سومیتا کند پال

رام گنگا ترقیاتی پراجیکٹ

پودوں کی افزائش کے لیے جو بڑے عناصر درکار ہیں اُن میں ایک زمین کی نمی ہے' اور انسان صدیوں سے کسی خاص علاقے کی زمین اور ارضیاتی حالات کے مطابق آبپاشی کے ذریعے پانی کا موثر طور پر استعمال کرنے کے لیے کوشاں ہے۔ بھارت میں آبپاشی کے بارے میں عام طور پر خیال کیا جا رہا ہے کہ وہ زمین کی پیداوار اور پیداواری قوت بڑھانے کا ذریعہ ہے۔ لیکن بھارت سرکار طویل عرصے سے اس حقیقت سے باخبر ہے کہ حصول آزادی کے بعد شعبۂ آبپاشی، خصوصاً سطحی آبپاشی کے بڑے نظاموں میں جو بھاری سرمایہ کاری کی گئی ہے اُس کے باوجود ان پراجیکٹوں کے حلقہ جاتی علاقوں میں ابھی پیداوار بڑھانے کا بڑا امکان موجود ہے تیسرے منصوبے کے عرصے کے دوران ایک جائزہ لینے سے واضح ہو گیا تھا کہ مناسب منصوبہ بند سرمایہ کاری کے بغیر آبپاشی کے پانی کا بہترین طور پر استعمال نہیں ہو سکے گا۔ مزید برآں آبپاشی کے بہترین استعمال اور ایسے پراجیکٹوں کے حلقہ جاتی علاقوں کی مربوط ترقی کے علاوہ بعض ایسی اڑچنوں کو دُور کرنے کی ضرورت ہے جو سطحی آبپاشی میں پیش آتی ہیں۔ یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ ملک کے آبپاشی کے موجودہ پراجیکٹوں پر نظر ثانی کرتے ہوئے بھارت سرکار کو منجھلے درجے کے پراجیکٹوں کے اُن چیدہ مطالعات سے بعض دلچسپ معلومات کا علم ہوا جو زراعت سے متعلق قومی کمیشن کے ایما پر عمل میں لائے گئے تھے۔ واضح رہے کہ اس کمیشن نے آبپاشی کے اُن منصوبوں پر نظر ثانی کرنے کی تلقین کی تھی جن کی تعمیر پہلے تین منصوبوں میں ہوئی تھی۔ چند بڑی بڑی معلومات یہ تھیں:۔

۱۔ پانی کے تقسیمی سسٹم میں آبرسانی کا بھاری نقصان ہوتا ہے۔

۲۔ پراجیکٹوں کی تشکیل کے وقت جس ڈھنگ سے فصلیں اُگانے کا پلان بنایا گیا تھا اُس میں تبدیلی کی گئی ہے اور ۳۔ اُن نہری نظاموں میں تبدیلیاں کی گئی ہیں جو پانی کی سپلائی کو مناسب طور پر منضبط بنائے رکھنے کے لیے ضروری تھے۔ اس رپورٹ میں سطحی اور زمینی پانی کے ملے جُلے استعمال، علاقے کی موزوں ترقی' زرعی اصلاحات اور نالیوں کے سسٹم کی ضرورت پر بھی زور دیا گیا۔ دراصل سطحی آبپاشی کی خامیاں اور اڑچنیں طویل عرصے سے مشاہدے میں آئی تھیں۔ ڈاکٹر ایم۔ ایس۔ سوامی ناتھن نے اپنے ایک مقالے بعنوان "بھارتی زراعت چوراہے پر" میں بتایا ہے کہ "آبپاشی کامل طور پر نعمت ثابت نہیں ہوئی۔ اس طرح اُن کے اس بیان میں رائل کمیشن کی اُس رائے کی گونج سُنائی دیتی ہے جس کا اظہار اُس کی طرف سے ۱۹۲۹ میں کرتے ہوئے کہا گیا تھا "معلوم ہوتا ہے کہ بھارت کے آبپاشی سے سیراب ہونے والے علاقوں میں پانی کے رکاؤ اور شور زمین کی تشکیل کے بارے میں جو مسائل پیدا ہوئے ہیں اُن میں سے زیادہ تر کی وجہ یہ ہے کہ آبپاشی کے نئے نظام کو علاقے کی نالیوں کے قدرتی نظام سے منسلک نہیں کیا گیا۔ سائنس اور ماحولیات کے مرکز کی طرف سے شائع کی گئی "بھارت کے ماحولیات" کے متعلق ایک سٹیزنز رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ نہری علاقوں میں زمینیں زیادہ تر چپٹی ہیں اور اُن میں بہت کم نالیاں ہیں۔ جب ان علاقوں میں آبپاشی کی جاتی ہے تو کچھ وقت پا کر اُن میں پانی کا رکاؤ ہو جاتا ہے اور زمین کھاری ہو جاتی ہے بھارت کے بیشتر حصوں میں بعض حالات کے باعث پانی کے رکاؤ اور شور زمین کے عمل میں تیزی آ گئی ہے۔ اوّل فصلوں کو نہری پانی اُن کی ضروریات سے کہیں زیادہ دیا گیا ہے۔ دوئم نہریں اور نالیاں عموماً سیدھی قطاروں میں ہوتی ہیں اور ان سے جو پانی رِستا ہے اُس سے پانی جمع ہو کر رُک جاتا ہے۔ پانی کے رکاؤ کا ایک اہم سبب یہ ہے کہ نکاس کے لیے نالیوں کے نظام کو نظر انداز کیا گیا ہے۔"

ہم نے آبپاشی کے پانی کے زائد استعمال کا ذکر کیا ہے۔ آبپاشی کے پراجیکٹوں میں وارا بندی سے متعلق بھارت سرکار کے مینوئل کے مطابق

زائد پانی سے زمین کے طبیعیاتی حالات غیر موافق ہو جاتے ہیں۔ مینوئل میں آبپاشی کی اُس گہرائی کی سفارش کی گئی ہے جو مختلف قسم کی فصلوں کے لیے ضروری ہے اور تجربات پر مبنی مثالوں کے ساتھ سفارشات کی گئی ہیں جن کا مقصد یہ واضح کرنا ہے کہ فصلیں اُس وقت خوب پھولتی ہیں جب پانی ٹھیک ڈھنگ سے دیا جائے اور اس سے پہلے زمین کی نمو اُس کی پانی تھامنے کی صلاحیت سے ۵۰ فیصد سے کم ہو جائے لیکن آبپاشی کے بیشتر علاقہ جاتی علاقوں میں کاشتکار اس پوزیشن میں نہیں ہیں کہ وہ فصل کو اُس وقت پانی دیں جب انھیں پانی کی واقعی ضرورت ہوتی ہے۔ اور لہٰذا جب پانی دستیاب ہوتا ہے تو اُس وقت قدرتی طور پر یہ رجحان ہوتا ہے کہ پانی فصلوں کو دیا جائے خواہ انھیں اُس کی ضرورت نہ ہو۔ اس کے نتیجے میں ضرورت سے زیادہ آبپاشی ہو جاتی ہے۔ ڈاکٹر رابرٹ ویڈ اور ڈاکٹر رابرٹ چیمبرز نے اپنے مشترکہ مقالے میں آبپاشی کے پانی کے زائد استعمال کے مسئلہ پر بحث کی ہے اور بجا طور پر بتایا ہے کہ اس کی وجہ محض کاشتکاروں میں پائی جانے والی لاعلمی نہیں ہے بلکہ آبپاشی کے پانی کے بندوبست اور تقسیم میں موجود خامیاں بھی ہیں۔ اس مقالے میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ نکاس کی سطح پر پانی کے ناقص بندوبست کے نتیجے میں جو کھیت پہلے آتے ہیں انھیں زیادہ پانی ملتا ہے اور جو پیچھے آتے ہیں انھیں پانی کم ملتا ہے۔ یہ بدنظمی انتظامیہ خامیوں یا پانی کی سیاسیات کے نتیجے میں زیادہ تر ہو سکتی ہے۔

زمین اور پانی کا بندوبست

لہٰذا ہم دیکھتے ہیں کہ سطحی آبپاشی بیشتر خامیوں کا شکار ہوئی ہے اور کمانڈ ایریا ڈیولپمنٹ کا تصور آبپاشی کے پراجیکٹوں کے لیے ایک مربوط علاقائی ترقیاتی دستور کا رائج کرنے کی ضرورت سے پیدا ہوا۔ یہ ۱۹۷۴ کی بات ہے کہ یہ تصور ملک میں آبپاشی کے حلقوں میں حالات کو بہتر بنانے کی ضرورت سے ظہور میں آیا اور بھارت میں پہلی بار زراعتی آبپاشی سے متعلق ایک مربوط پالیسی کی تشکیل کی گئی۔ جس میں زمین اور پانی کے بندوبست پر مناسب زور دیتے ہوئے تحفظ اراضی کی ضرورت کو بھی پیش نظر رکھا گیا۔ کمانڈ ایریا ڈیولپمنٹ کے لیے جن متعدد رُخی اور ہم آہنگ بھرے مقاصد کا تصور کیا گیا تھا اُن کا اظہار اُس منشور سے ہوتا ہے جو اُسے "سی اے ڈی اے" سے متعلق مرکزی حکومت کے رہبرانہ خطوط میں دیا گیا تھا جس میں اِس نئی تنظیم سے کہا گیا تھا کہ وہ ایک کیوسک کی صلاحیت کے نکاس تک آبپاشی کے نظام کی جدید کاری کرے اور اُسے موثر طور پر برقرار رکھے اور عمل میں لائے اس کے لیے اُسے تلقین کی گئی کہ وہ نالیوں کے بڑے اور منجھلے سسٹم کو فروغ دے اور برقرار رکھے، کھیتوں میں پانی لے جانے والی نالیوں کی تعمیر کرے، زمین کو ٹھیک حالت میں رکھے اور اُسے غیر ہموار نہ ہونے دے۔ آبپاشی کے لیے زمینوں کی جمع بندی کرے اور حدبندی کی ازسرِنو تشکیل کرے، انفرادی کھیتوں کے لیے پانی کی تقسیم کا موزوں سسٹم نافذ کرے، سطحی آبپاشی کو تقویت دینے کے لیے زمینی پانی کو فروغ دیا جائے، فصلوں کے مناسب نمونوں کا انتخاب کر کے انھیں رائج کیا جائے بیجوں، کھاد اور سروس وغیرہ کی جس میں قرضہ بھی شامل ہے۔ سپلائی کو یقینی بنایا جائے۔ فصلوں کی فروخت کی سہولیات اور مواصلات کو فروغ دیا جائے، چھوٹے چھوٹے کاشتکاروں اور زرعی مزدوروں کے لیے انفرادی پروگرام اور عملی کارروائیاں مرتب کی جائیں، پشو پالن، جنگل بانی اور مرغبانی وغیرہ جیسی زراعتی و ترقیاتی سرگرمیوں میں گوناگونی لائی جائے، جہاں تک ضروری ہو تحفظ اراضی اور جنگل بانی کو عمل میں لایا جائے اور علاقے کے شہری مرکزوں میں ٹاؤن شپ کی مناسب منصوبہ بندی کو عملی صورت دی جائے۔

رام گنگا کمانڈ ایریا ڈیولپمنٹ پراجیکٹ ۱۹۷۴ میں دو دوسرے کمانڈ ایریا پراجیکٹوں کے ساتھ اتر پردیش میں شروع کیا گیا تھا۔ دو دوسرے منصوبے ہیں شاردا سہایک اور گنڈک پراجیکٹ، رام گنگا کمانڈ ایریا پراجیکٹ قدیم اور جدید کا علامتی سنگم ہے۔ اور اس کی بنیاد سو سالہ پُرانے گنگا نہری نظام پر ہے جسے ۶۰ کی دہائی کے اواخر اور ۷۰ کی دہائی کے آغاز میں دریائے گنگا پر ایک باندھ کی تعمیر کے ساتھ شروع کیا گیا تھا۔ جس سے اس پراجیکٹ نے اپنا نام حاصل کیا ہے۔

سطحی آبپاشی کا نظام

پہلے پانچ سالہ منصوبے سے قبل یو۔ پی کے مغربی اور وسطی حصے جو ملک کے بعض نہایت زرخیز علاقوں کے طور پر مشہور ہیں زیادہ تر اپر گنگا نہر، لوئر گنگا نہر، ایسٹرن جمنا نہر، آگرہ نہر اور رام گنگا نہر کنال سے سیراب ہوتے تھے۔ اپر گنگا نہر اور لوئر گنگا نہر دونوں ہی دریائے گنگا سے نکلتی ہیں اور ملک میں سطحی آبپاشی کے قدیم ترین نظام ہیں۔ اپر گنگا نہر دراصل ۱۰۰ سال سے زیادہ پُرانی ہے اور اس کی صلاحیت اخراج ۱۰۵۰۰ کیوسک ہے۔ لوئر گنگا نہر کی صلاحیت اخراج ۵۲۲۵ کیوسک اور ایسٹرن جمنا نہر کی صلاحیت اخراج ۳۰۰۰ کیوسک ہے اور اُس نے اپنا نام دریائے جمنا سے حاصل کیا ہے۔ آگرہ نہر بھی اسی دریا سے اوکھلا میں نکلی ہے اور اس نے اپنا نام ضلع آگرہ سے حاصل کیا ہے جسے وہ سیراب کرتی ہے۔ رام گنگا، پمپڈ کنال ایک چھوٹا نہری نظام ہے جس کی صلاحیت اخراج تقریباً ۱۸۴ کیوسک ہے۔ یہ نہر مراد آباد اور بجنور کے اضلاع کے بعض حصوں کو سیراب کرتی ہے اور اس میں

ذریا نے رام گنگا سے پانی آتا ہے جو سیوہارہ ضلع بجنور میں ۱۲۰۸ میٹر کی بلندی پمپ سے کیا جاتا ہے۔ چونکہ اتنی بلندی سے پمپ کے ذریعے پانی حاصل کرنے پر بڑی لاگت آتی ہے اس لیے اس نہر کا خسارے پر چلنا ایک قدرتی امر ہے۔

رام گنگا ہائیڈرو الیکٹرک پراجیکٹ کا خیال ۱۹۴۴ میں آیا تھا۔ جب یہ محسوس کیا گیا تھا کہ گنگا جمنا دوآب کی آبپاشی سے متعلق ضروریات اُن نہری نظاموں سے پوری نہیں ہوتی تھیں جو اُس وقت موجود تھے اور جنھیں تقویت اور توسیع دینے کی ضرورت تھی۔ انجام کار اس پراجیکٹ کی منظوری ۱۹۶۱ میں ۶۰ کروڑ ۸۰ لاکھ روپے کی لاگت کے ساتھ دی گئی۔ ۱۹۶۶ میں اس کا تخمینہ بڑھ کر ۹۸ کروڑ ۱۵ لاکھ روپے اور ۱۹۷۳ میں ایک ارب ۲۷ کروڑ ۹۰ لاکھ روپے ہوگیا۔

آبپاشی کے سسٹم سے جو علاقہ مستفید ہوتا ہے وہ دو لگان ڈویژنوں۔ آگرہ اور الہ آباد کے اُس خطہ میں آتا ہے جو دس اضلاع پر مشتمل ہے۔ اس علاقے میں کل ۱۰۷ بلاک ہیں رام گنگا میں سی اے ڈی" پراجیکٹ کے تحت محض ۱۴۴ بلاک آتے ہیں۔ پراجیکٹوں کا کل قابل کاشت رقبہ تقریباً ۲۰ لاکھ ہیکٹیئر ہے جس میں سے ... ۱۷۶ ہیکٹیئر علاقے میں اس پراجیکٹ کی تعمیر سے پہلے آبپاشی ہوتی تھی۔ موخرالذکر پراجیکٹ سے مزید ۵۷۵۰۰۰ ہیکٹیئر زمین میں آبپاشی کا امکان پیدا ہوگیا ہے جس سے کل ۱۲ لاکھ ہیکٹیئر سے زیادہ زمین پر آبپاشی ہوگی۔

پراجیکٹ کی تنظیم

اس پراجیکٹ کی تنظیم یو۔ پی کی دوسری کمانڈوں کی تنظیم جیسی ہے۔ ایک چیف ایگزیکٹو پراجیکٹ کمشنر رام گنگا کمانڈ ایریا ڈیولپمنٹ کا سربراہ ہے اور صدر دفاتر میں پراجیکٹ میں زراعت، پشو پالن اور کوآپریٹو جیسے مختلف محکموں کے نمائندے اس کا کام کاج چلاتے ہیں۔ اس کے علاوہ اس میں ڈپٹی ڈائریکٹر بھی ہیں جو پانی کے بندوبست اور زمینی سروے کی دیکھ بھال کرتے ہیں جن کی مدد متعلقہ معاملوں کے ماہرین کرتے ہیں۔

رام گنگا سی اے ڈی پراجیکٹ کو متعدد کامیابیاں حاصل کرنے کا مشورہ حاصل ہے۔ بلاشبہ یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ یہ پراجیکٹ اپنی تنظیم کی نوعیت کے لحاظ سے کھیتوں میں نالیوں اور فارم پر ہی دیگر ترقیاتی کاموں کی تعمیر کا ایک ادارہ بن گیا ہے۔

کامیاب پراجیکٹ

جو اعداد و شمار فراہم کئے گئے ہیں اُن سے واضح ہوتا ہے کہ گو ابتدائی برسوں میں نہیں تاہم بعد کے برسوں میں چاول اور گیہوں کی پیداوار میں نمایاں اضافہ ہوا ہے کیوں کہ ان کی فصلوں کو وقت پر پانی مل گیا تھا۔ اس پراجیکٹ نے علاقے کی ترقی کے لیے بھی کام کیا ہے۔ رام گنگا سی اے ڈی پراجیکٹ کے تحت دو ترقیاتی مرکز چلائے جا رہے ہیں، ایک کانپور میں اور دوسرا ضلع فتح پور میں۔ جبکہ کمانڈ کے علاقے میں آنے والے باقیماندہ اضلاع کے لیے دیگر ترقیاتی مرکزوں کا پلان بنایا گیا ہے۔ ان ترقیاتی مرکزوں میں مرغبانی، مچھلی پالن اور باغبانی جیسی ترقیاتی سرگرمیاں انجام دی جا رہی ہیں کاشتکاروں کو ڈیزرٹ پمپوں، زراعتی تجربوں، شفاخانوں، بنکوں اور کوآپریٹو اداروں کی صورت میں سہولیات فراہم کی جا رہی ہیں اور ایسے کام دھندوں کی تربیت بھی دی جا رہی ہے جن سے وہ اپنی آمدنی بڑھا سکتے ہیں۔ ان دونوں مرکزوں کا علاقے پر اچھا اثر پڑا ہے اور وہ مقامی کاشتکاروں کے لیے دلچسپی کے مقامات بن گئے ہیں۔

چوں کہ یہ ایک وسیع پراجیکٹ ہے اس لیے ابھی اس کے کاموں میں کچھ خامیاں ہیں جنھیں دُور کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے لیکن اس کے باوجود رام گنگا پراجیکٹ نے بیشتر سرگرمیوں کے سلسلے میں پیش قدمی کی ہے۔

★

غزلیں

ایس۔ ایچ۔ ایم۔ حسینی

آئینِ وفا گو کہ رہا مدِّ نظر بھی
ہاں سنگِ ملامت کے لیے وقف یہ سر بھی

کیا بات بنے کل کو خدا جانیے کیا ہو
وہ ساتھ ہی لیتا گیا تاثیرِ نظر بھی

تم نے مری وحشت کا تماشہ نہیں دیکھا
اس ہاتھ پہ مقتل تھا ادھر سامنے گھر بھی

اک عمر کہ گذری ہے غریب الوطنی میں
کیا پوچھو ہو بتلاؤں کہ کیا ہوتا ہے گھر بھی

ہم نے تو ہر اک بُت کو خدا جان کے پُوجا
آیا نہ مگر عرضِ تمنا کا ہُنر بھی

کیا جانیے کیا سوچ کے چپ ہو گیا ورنہ
اس کی یہ تمنا کہ ہتھیلی پہ ہو سر بھی

کاٹے تو کوئی میری طرح ہجر میں راتیں
کیا چیز ہے کچھلے کوئی پچھلا پہر بھی

تسکین کے سامان کو شورش سے بدل کر
رکھ دوں گا تہہِ تیغ کسی روز یہ سر بھی

دے پائے گی کیا آبلہ پائی بھی ضمانت
جو راہ کہ مری۔ ہو تری راہ گذر بھی

یاد آئے گی غربت میں تری موہنی صورت
کیا چیز ہے واللہ محبت کی نظر بھی

وحشت ہمیں اس دشت میں لے آئی تو لیکن
کس درجہ خفا ہے بیابان سے گھر بھی

★

خوشتر اشا علی

معدنی دولت پر ایک نظر

بھارت کی معدنی دولت کا خزانہ

ہمارے فن کانکنی کی مہارت کا مظہر ہے۔ ۱۹۸۳ء میں ہماری معدنی پیداوار ۶۳ ارب روپے سے بھی بڑھ گئی۔ اُس سے ایک برس پہلے ۱۹۸۲ء میں وہ ۶۰ ارب روپے سے بھی کم تھی (اس میں جوہری معدنیات اور چھوٹی چھوٹی معدنیات شامل نہیں ہیں)۔ یوں تو بمبئی ہائی کا حصہ سب سے زیادہ رہا۔ وہاں سے ۲۳ ارب روپے کی مالیت کا مال دستیاب ہوا جو سب کا سب پٹرولیم اور قدرتی گیس کی شکل میں تھا۔

کانکنی کے شعبے میں دوسرے نمبر پر بہار رہا۔ اس ریاست کی مختلف کانوں سے ۱۹۸۳ء میں دس ارب روپے کی مالیت کی معدنیات حاصل کی گئیں۔ اُس سے ایک برس پہلے یہ اعداد ۹۷ کروڑ روپے تک ہی پہونچ پائے تھے۔

آسام کا نمبر تیسرا رہا۔ وہاں سے تقریباً سات ارب روپے کی معدنیات نکالی گئیں۔ اس سے قدرے کم معدنی پیداوار ہوئی مدھیہ پردیش میں۔ وہاں کی کانوں سے چھ ارب ۳۰ کروڑ روپے کی مالیت کی معدنیات نکالی گئیں جو اُس سے ایک برس پہلے کے مقابلے میں ایک ارب روپے زیادہ مالیت کی تھیں۔ ۱۹۸۲ء میں مدھیہ پردیش کی کانوں سے کُل ۵ ارب روپے کی معدنیات نکالی گئی تھیں۔

کانکنی کے لحاظ سے گجرات نے بھی اہم مقام حاصل کیا جہاں پانچ ارب روپے سے کچھ کم کی مالیت کی معدنیات نکالی گئیں۔ یہ رقم ۴۹۰۹۱۲۳۰۰۰ روپے تھی۔ گجرات کی معدنی پیداوار میں بھی ایک ارب روپے کا اضافہ ہوا۔ یاد رہے کہ ۱۹۸۲ء میں ریاست گجرات کی کُل معدنی پیداوار چار ارب روپے سے قدرے کم رہی تھی۔

مغربی بنگال کی حالت بھی اسی کے اردگرد رہی۔ وہاں کی کانوں سے ساڑھے تین ارب روپے کی معدنی دولت نکالی گئی۔ ۱۹۸۲ء کے برس میں یہ رقم ۳۲۸۵۳۲۳۰۰ روپے تھی۔

دیگر ریاستوں میں معدنی پیداوار اس طرح ہوئی۔

ریاست (روپے میں)	برس ۱۹۸۳ (روپے میں)	برس ۱۹۸۲ (روپے میں)
آندھرا پردیش	دو ارب ۲۰ کروڑ	دو ارب ۵ کروڑ
دلی	۷ لاکھ روپے	۱۰ لاکھ روپے
گوا	۲۶ کروڑ "	۳۰ کروڑ "
ہریانہ	۵۰ء۱ کروڑ "	۵۰ء۱ کروڑ "
ہماچل پردیش	۱ کروڑ "	۶۲ لاکھ "
جموں و کشمیر	۹۵ لاکھ "	۹۷ لاکھ "
کرناٹک	۷۰ کروڑ "	۶۳ کروڑ "
کیرل	۳ کروڑ "	۴ کروڑ "
مہاراشٹر	ایک ارب ۳۹ کروڑ	ایک ارب ۲۰ کروڑ
منی پور	۲۵ ہزار	۶ ہزار
میگھالیہ	۷۵ لاکھ	۸۶ لاکھ
اُڑیسہ	ایک ارب ۳۸ کروڑ	ایک ارب ۲۴ کروڑ
راجستھان	ایک ارب ۳ کروڑ	۷۳ کروڑ
سِکم	۱۳ لاکھ	۱۰ لاکھ
تامل ناڈو	ایک ارب ۱۲ کروڑ	ایک ارب ۱ کروڑ
اتر پردیش	۴۹ کروڑ	۴۰ کروڑ

موٹے طور پر کہا جا سکتا ہے کہ ۱۹۸۳ء میں دلی، گوا، جموں و کشمیر، کیرل، میگھالیہ اور سِکم میں معدنی پیداوار میں کمی ہوئی۔

یہ تو ہے تمام معدنیات کی پیداوار کا ایک جائزہ۔ اس سے اس حقیقت کا اظہار ہوتا ہے کہ اس پیداوار کا ایک بڑا حصہ (۶۴ کروڑ روپے میں سے ۵۸ کروڑ روپے) صرف ایندھنی معدنیات سے حاصل ہوا۔ یعنی پٹرولیم، قدرتی گیس، کوئلہ اور لگنائٹ چاروں چیزیں ملاکر کی پیداوار ۵۸ ارب روپے کی ہوئی۔ دھاتوں کی پیداوار تقریباً چار ارب اور غیر فلزاتی دھاتوں کی پیداوار دو ارب روپے کے لگ بھگ تھیں۔

واضح رہے کہ ہماری کل معدنی آمدنی کوئلے، لگنائٹ، پٹرولیم اور قدرتی گیس کے وسائل ہی سے حاصل ہوتی ہے۔ اس میں زیادہ حصہ آسام

۷ ارب روپے۔ بہار ۱۰ ارب روپے۔ مدھیہ پردیش ۵ ارب روپے۔ گجرات ۵ ارب روپے۔ مغربی بنگال ساڑھے ۳ ارب روپے کا ہی تھا۔ یہ حالت ۱۹۸۳ کی رہی لیکن ۱۹۸۲ کے مقابلے میں یہ ۲۵ فیصد زیادہ رہی۔

باقیماندہ دیگر ریاستوں میں ایندھن کی پیداوار اس طرح رہی۔

ریاست	۱۹۸۳	۱۹۸۲
آندھرا پردیش	ایک ارب ۹۶ کروڑ	ایک ارب ۳ کروڑ
جموں و کشمیر	۱۷ لاکھ	۹۲ لاکھ
مہاراشٹر	ایک ارب ۴۳ کروڑ	ایک ارب ۳ کروڑ
اڑیسہ	۶۷ کروڑ ۴۰ لاکھ	۵۷ کروڑ ۶۰ لاکھ
تامل ناڈو	۹۳ کروڑ ۴۶ لاکھ	۸۲ کروڑ ۷۴ لاکھ
اتر پردیش	۴۱ کروڑ ۷۵ لاکھ	۳۲ کروڑ

۱۹۸۲ کے مقابلے میں ۱۹۸۳ میں ایندھنی معدنیات کی پیداوار میں صرف جموں و کشمیر ہی میں قدرے پس روی ہوئی۔ باقیماندہ تمام ریاستوں میں ریکارڈ پیداوار ہوئی۔

اب معدنی دھاتوں کا جائزہ لیا جاتا ہے۔ معدنی دھاتوں میں موٹے طور پر یہ دھاتیں آتی ہیں۔ باکسائیٹ، کرومائٹ، خام تانبہ، ٹاپلور، سونا، خام لوہا، سیسہ، خام مینگنیز، چاندی، ٹنگسٹن اور جست وغیرہ۔ ان تمام دھاتوں کی پیداوار ۱۹۸۳ میں ۳ ارب ۶۶ کروڑ ۷۵ لاکھ روپے کی مالیت کی ہوئی جو اس سے ایک برس پہلے کے مقابلے میں ۲۶ کروڑ روپے زیادہ تھی۔

معدنی دھاتوں میں سب سے بلند مقام مدھیہ پردیش کو حاصل ہوا۔ وہاں ۱۹۸۳ء میں معدنی پیداوار ۶۸ کروڑ روپے کی مالیت کی ہوئی۔ دوسرے نمبر پر بہار رہا جہاں ۶۳ کروڑ ۵۹ لاکھ روپے کی ریکارڈ پیداوار ہوئی۔ کرناٹک میں بھی لگ بھگ ایسی حالت رہی جہاں ۶۲ کروڑ ۲۰ لاکھ روپے کی مالیت کی دھاتیں نکالی گئیں۔ راجستھان میں ۶۰ کروڑ اور اڑیسہ میں ۲۷ کروڑ روپے کی دھاتیں نکالی گئیں۔ باقیماندہ ریاستوں میں جو معدنی دھاتیں نکالی گئیں اُن کی تفصیل درج ذیل ہے۔

(ہزار روپے میں)

ریاست	۱۹۸۳	۱۹۸۲
آندھرا پردیش	۴۰۱۲۵ روپے	۳۲۶۸۲ روپے
گوا	۲۵۷۵۶۸ ″	۳۰۴۱۱۰ ″
گجرات	۲۳۹۶۸ ″	۲۲۵۷۲ ″
مہاراشٹر	۱۳۱۵۶۳ ″	۱۴۳۸۸۹ ″
منی پور	۲۵ ″	۶ ″
اڑیسہ	۵۹۲۰۱۸ ″	۳۶۳۷۵۱ ″
سکم	۱۲۱۰ ″	۱۸۲۳ ″
اتر پردیش	۴۶۰ ″	۷۰۹ ″
مغربی بنگال	۸۳ ″	۶۸۷ ″

ظاہر ہے کہ گوا، گجرات، مہاراشٹر، اڑیسہ، سکم، اتر پردیش اور مغربی بنگال میں معدنی دھاتوں کی پیداوار میں کمی ہوئی جبکہ راجستھان میں ۱۹۸۲ کے مقابلے میں ۲۳ کروڑ روپے کی مالیت کی زیادہ دھاتیں نکالی گئیں۔

تیسرے زمرے کی معدنیات میں غیر فلزاتی معدنیات آتی ہیں جیسے اگیٹ، اپیٹائٹ، فاسفورائٹ، ایسبسٹاس، برائٹس، کلسائٹ، کھڑیا (چاک)، کورنڈم، ہیرا، ڈولومائٹ، فیلسپار، آتشی مٹی، فلورائٹ، گریفائٹ، جپسم، جیسپر، کیولین، کائنائٹ، اینڈالوسائٹ، سیلمانائٹ، چونا پتھر، لائم شیل، میگنسائٹ، ابرق، گیرو، پائیلائٹ، گندھک، پائروفلائٹ، کوارٹز، تکسائٹ، کوارٹ، سیلیکا، ریت، مولڈنگ ریت، نمک، سلیٹ، سٹارولائٹ، سٹویٹائٹ، برمکلائٹ اور ولیسٹونائٹ۔

مذکورہ بالا غیر فلزاتی معدنیات کی ملکی پیداوار ایک ارب ۲۹ کروڑ روپے مالیت کی ہوئی جو ۱۹۸۲ کے مقابلے میں یقیناً زیادہ تھی۔ واضح رہے کہ ایسی معدنیات پیدا کرنے والی بڑی ریاستیں ہیں۔ راجستھان، مدھیہ پردیش، اڑیسہ، تامل ناڈو اور آندھرا پردیش۔ ان ریاستوں میں ایسی معدنیات کی پیداوار ۱۹۸۳ میں اس طرح ہوئی۔

(ہزار روپے میں)

ریاست	۱۹۸۳	۱۹۸۲
راجستھان	۴۴۴۲۸۲ روپے	۳۱۲۸۴۴ روپے
مدھیہ پردیش	۳۲۴۱۳۷ ″	۳۲۷۱۵۱ ″
اڑیسہ	۴۳۴۹۲۲ ″	۲۲۰۴۳۰ ″
تامل ناڈو	۲۰۳۷۹۸ ″	۲۴۶۵۹۸ ″
آندھرا پردیش	۱۹۲۹۶۲ ″	۱۷۹۸۸۲ ″
بہار	۱۷۰۷۴۴ ″	۱۸۷۵۸۱ ″
گجرات	۱۱۶۷۰۴ ″	۱۴۴۳۶۱ ″

مذکورہ بالا اعداد و شمار سے ظاہر ہے کہ جہاں تک غیر فلزاتی معدنیات کا سوال ہے، ۱۹۸۳ میں تامل ناڈو، بہار اور گجرات میں ۱۹۸۲ کے مقابلے میں کم معدنیات نکالی گئیں۔ خاص طور پر تامل ناڈو میں جہاں ۱۹۸۲ میں ۲۴ کروڑ ۶۶ لاکھ روپے کی مالیت کی معدنیات نکالی گئیں، وہاں ۱۹۸۳ میں پیداوار میں ۴ کروڑ روپے کی کمی ہوئی۔ اور وہ ۲۰ کروڑ ۳۸ لاکھ روپے تک رہ گئی۔

جن ریاستوں میں ۱۰ کروڑ روپے سالانہ سے بھی کم مالیت کی ایسی دھاتیں نکالی گئیں اُن کی تفصیل درج ذیل ہے۔

(ہزار روپے میں)

ریاست	۱۹۸۳	۱۹۸۲
آسام	۹۷۰۱ روپے	۱۳۳۱۹ روپے
دلی	۴۸۰ ″	۹۹۲ ″
گوا	۱۹۱ ″	۴۴۴ ″
ہریانہ	۱۴۰۵۴ ″	۱۰۱۹۴ ″

ہماچل پردیش	۱۰۲۹۰ روپے	۱۴۴۲۱ روپے
جموں و کشمیر	۲۴۳۴ "	۵۶۴ "
کرناٹک	۳۸۳۱۲ "	۵۷۹۶۱ "
کیرل	۳۵۸۵۶ "	۳۸۵۲۸ "
مہاراشٹر	۳۸۵۷۳ "	۳۴۲۴۰ "
میگھالیہ	۵۷۳۸ "	۸۹۷۵ "
اُتر پردیش	۷۹۴۹۸ "	۸۲۵۲۵ "
مغربی بنگال	۱۷۵۹ "	۱۷۹۵ "

ظاہر ہے کہ آسام، دلی، میگھالیہ، گوا، کرناٹک، کیرل اور اُتر پردیش میں جہاں تک غیر فلزاتی معدنیات کا تعلق ہے، اُن کی پیداوار میں کمی ہوئی ہے۔

البتہ ہریانہ، ہماچل پردیش، جموں و کشمیر، مہاراشٹر اور مغربی بنگال میں سابقہ برس کے مقابلے میں ۱۹۸۳ میں کہیں زیادہ مالیت کی دھاتیں نکالی گئی ہیں۔

مجموعی طور پر ہمارے ملک میں معدنی پیداوار اور کانکنی دونوں کو اُمید سے زیادہ فروغ حاصل ہوا ہے اور جدید تکنیکی علم اور سائنسی آلات و مشینری کی بدولت ملک کی اقتصادی خوشحالی کی بنیادیں مضبوط ہونا شروع ہو گئی ہیں۔

★

بقیہ: متبادل کیا ہو؟

خرچ کرتا ہے۔ حالاں کہ عوام کی کثیر تعداد کا استحصال ہوتا ہے۔ لیکن چند لوگوں کے پاس کالا دھن بھی ہوتا ہے جسے وہ شان و شوکت اور بھڑک والے کاموں پر خرچ کرتے ہیں۔ دورِ جدید میں اسے صارفیت والی ثقافت کا نام دیا گیا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ عام خوراک جو ملنا تاکیلوری اور معیار دس یا بیس روپے کا ہے، اس کی قیمت سو روپے ہو جاتی ہے۔ اس میں طعام و قیام کا یومیہ خرچ ۲۰۰ تا ۵۰۰ روپے ہوتا ہے۔ آج کے دور میں عوام پھتروں کے تاثل وغیرہ پر توجہ نہیں دے رہے ہیں بلکہ غسل کرنے کے تالاب بنوا رہے ہیں، گولف کے میدان بنوا رہے ہیں، ٹینس کے میدان بنوا رہے ہیں۔ حالاں کہ زندگی کی بھاگ دوڑ وہاں ٹھہرنے کا موقع کم ہی دیتی ہے۔ تاہم یہ شخصی مرتبہ کی جانچ کے پیمانے ضرور بن گئے ہیں۔ نشر و اشاعت کے ادارے ان کی تشہیر میں حصہ لیتے ہیں۔ ریاست ان کا احترام کرتی ہے اور تحفظ بھی۔ لیکن اقتصادی جمہوریت میں ان سب کی گنجائش نہیں۔ مارکیٹنگ اور طلب و رسد کا پورا نظام اس طرح مرتب کیا جائے گا کہ اس میں اولیت بنیادی ضرورتوں کی تکمیل پر ہوگی اور مال تیار کرنے والوں، صارفین اور تاجروں کے باہمی مشوروں سے قیمتوں کا نظام مرتب کیا جائے گا۔

اس کا مقصد یہ ہے کہ مال تیار کرنے والے اور اس کی تقسیم کرنے والے بذاتِ خود عام صارفین کے ساتھ مل کر ردعمل کو بھانپ سکیں۔ سیاسی سطح پر اس کی نمائندگی عوام کے منتخب نمائندے کریں گے۔ ہر سیکٹر کے لیے مناسب معاوضہ کا لحاظ رکھا جائے گا لیکن بحیثیت مجموعی سماج کا نفع سب سے مقدم ہوگا۔ یہ سب جانتے ہیں کہ بڑی آمدنی کمانے والے اپنی رقم کو زیادہ تر صنعتی اور تجارتی کاموں میں لگاتے ہیں۔ اس طرح کی سرمایہ کاری کی لاگت کا اندازہ لگا لینا مشکل نہیں۔ اس کے لیے عمارت سازی کے دوران استعمال شدہ سامان کے معیار اور فی مربع فٹ اس کی لاگت کو سامنے رکھنا ہوگا۔ اس کے علاوہ کس علاقے میں وہ مکان بنوایا گیا ہے، اسے بھی سامنے رکھنا ہوگا۔

اس طرح اقتصادی جمہوریت کے نظام سے استحصال پسندی کا عنصر کم ہو سکے گا اور دولت غیر مساوی طور پر چند ہاتھوں میں مرکوز ہو کر نہیں رہ جائے گی۔ آج اس طرح سے دولت جمع کرنا ممکن ہے کیوں کہ بنیادی طور پر وہ جو کہ سیاسی، اقتصادی، سماجی امور کو چلانے کے ذمہ دار ہیں، معیشت کے استحصال پسندانہ ڈھانچے سے مطمئن ہیں اور اس پر قانع ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ وہ اس میں یقین رکھتے ہیں یا نہیں۔ کچھ مخصوص مفادات کی پشت پناہی بھی کرتے ہیں۔ وہ ڈھانچے میں تبدیلی کے مخالف بھی ہیں۔ اور وہ موجودہ نظام کے غلام بن کر رہ گئے ہیں۔ اور اس سے نکل نہیں سکتے۔ اور اسے گرا نہیں سکتے۔ روپے پیسے کو آسان ڈھنگ سے کمانے کا اپنا لالچ ہوتا ہے۔ اور پھر روپے سے صاحبِ اقتدار بننے میں مدد ملتی ہے۔ البتہ کالے دھن کی چند ہاتھوں میں اس قدر بہتات ہے کہ اس کے زہریلے اثرات فیصلہ کی سطح تک پہونچتے ہیں اور توازن ترقی کی راہ میں حائل ہوتے ہیں۔ اقتصادی جمہوریت کا مقصد یہ ہے کہ مبنی بر انصاف سماج وجود میں آئے۔ یہ بات بھی اپنی جگہ حقیقت ہے کہ یہ بات جس قدر کہنی آسان ہے، اس پر عمل اسی قدر دشوار ہے۔ مخصوص مفادات کی جڑیں گہری ہیں۔ عملی اندازِ نظر کا بہانہ کر کے اور اسی طرح کے دیگر مفروضات کو بنیاد بنا کر وہ اس راستے پر بہت آہستہ آگے بڑھنا چاہتے ہیں۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ یہ استحصال پسندی کا عنصر بہت دنوں تک نہیں چل سکے گا۔

وسنت ساٹھے

معاشرتی انقلاب کی جانب

اقتصادی جمہوریت کا مقصد

چھٹا باب

متبادل کیا ہو؟

قسط : ۱۶

جب سے کبھی ترقی پذیر ملکوں میں بے چینی کی صورت میں عوامی دباؤ بڑھتا ہے تو اس کا نتیجہ ہیجان کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ یہ جذبات کا سیلاب کسی بھی صورت میں سامنے آسکتا ہے۔ یہ جس شکل میں سامنے آتا ہے، اس کا اقتصادیات سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ اس موقع پر شہری حکام کے اختیارات بے اثر ہوکر رہ جاتے ہیں اور فوج کو موقع مل جاتا ہے اور وہ بندوق کی نالی سے مدافعت کرتی ہے اور انتظام اپنے ہاتھ میں لے لیتی ہے۔ بہت سے ترقی پذیر ملکوں میں یہی صورت حال دیکھنے میں آئی۔ جہاں جمہوریت کو فوجی حکومت کے سامنے ہتھیار ڈالنے پڑے۔ اس کی وجہ صرف یہی ہوئی کہ وہاں کوئی اقتصادی نظام رائج نہ ہوسکا۔ اور کوئی نظام نہ ملا جس سے عوام کی آزادی اور ترقی کو یقینی بنایا جاسکتا۔ اقتصادیات کے تحت ایسا کوئی جادوئی نظام نہیں ہے جو ایک طرف استحصال پسندی پر مبنی مخصوص مفادات کے حق میں ہو اور اس کے ساتھ ہی دوسری جانب تمام لوگوں کے لیے منصفانہ اور مساویانہ ترقی کا مظہر ہو۔ لیکن کم سے کم جبکہ نظام کی کایا پلٹ کی ضرورت لابد ہو جائے تو اس کا اظہار برملا ہونا چاہیئے جیسا کہ رال پری بیش نے کہا ہے۔

"ہوتا کیا ہے کہ وہ لوگ جو غریبی دور کرنے کی تجویز رکھتے ہیں، وہ بالعموم اپنا فارمولا پیش تو کر دیتے ہیں لیکن یہ واضح نہیں کر پاتے کہ اس پر عمل درآمد کیسے ہو۔ کیا از سر نو تقسیم کا کام سادہ طریقے پر اور براہِ راست ہونا چاہیئے: کیا سماجی مساوات کا مسئلہ نظام کو متاثر کئے بغیر حل کیا جاسکتا ہے؟ یہ بات قرینِ قیاس ہے کہ یہ ایسے ممالک میں تو آسان ہے جہاں کافی عرصہ گذر جانے کے دوران کافی سرمایہ اکٹھا کر لیا گیا ہے اور اس کے مقابلے غریبی چھوٹے پیمانے پر پائی جاتی ہے۔ لیکن دیگر بڑے ممالک میں جہاں حالات اس سے مختلف ہیں، اس طرح کا تصور دشوار ہے۔ ایک خاص حد تک تو اس کا صادر ہونا ممکن ہے اور اس کے بعد استحقاق یافتہ صارفین کے سماج سے مقابلہ کرنا دشوار ہے۔

جمہوری ملکوں کو متوازن ترقی کے قومی اقتصادی ضابطوں کو تسلیم کرنا ہوگا۔ اس کے لیے ایسا نظام ضروری ہے جس میں سبھی عوام اپنی اپنی سطح سے اس میں شریک ہوسکیں۔ انھیں پیداواری عمل اور اشیاء کی تقسیم کے عمل میں شرکت کرنی ہوگی۔ اقتصادی اور سیاسی جمہوریت کے تحت ہر سطح پر عوام کی شرکت ضروری ہے۔ یہ نظام عوام کے ذریعے، عوام کے واسطے اور عوام کا ہوا ہونا چاہیئے۔ یہی اس مقالے کا مقصد ہے۔

اس کے لیے حکمراں پارٹی کو قیادت کرنی پڑے گی جو کہ خوش قسمتی سے عوام کی ہی ہے۔ خوش قسمتی سے یہاں کی قیادت کو عوام کا اعتماد اور ان کی شفقت حاصل ہے لیکن اس کے لیے سبھی سیاسی قوتوں کا تعاون درکار ہے اور اقتصادی جمہوریت پر سبھی کا اتفاق ہونا ضروری ہے۔ اسی لیے بات چیت کی ضرورت لاحق ہوتی ہے۔ یہ مقالہ اس طرح کی بات چیت کے لیے بنیاد فراہم کرتا ہے۔ تمام تر پیچیدہ اقتصادی نظام کی مزید تفاصیل کو مرتب کرنا ہوگا اور یہ کام محض کوئی ایک فرد واحد انجام نہیں دے سکتا۔ اس کے لیے ایک ڈھانچہ فراہم کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ جس سے کہ جمہوریت کا تحفظ ہوسکے اور اس کے ذریعے جملہ عوام کے لیے سماجی اور اقتصادی انصاف کو یقینی بنایا جاسکے۔

شراکت داری والی اقتصادی جمہوریت کے نظام کے تحت محنت کش طبقہ ہم شراکت دار ہوگا۔ انتظامیہ میں اس کا برابر کا حصہ ہوگا اور اس کے منتخبہ نمائندے اس میں ہوں گے تمام نتائج سے انھیں آگاہی ہوگی۔ ایسی صورت میں ہڑتال یا تالا بندی کی نوعیت نہیں آئے گی۔ بحیثیت مجموعی فنڈ کے پیش نظر نفع کی حصہ داری طے کی جائے گی۔ توسیع و تحقیق کی ضرورتوں کو بھی دھیان میں رکھا جائے گا اور ایک طبقہ دوسرے

کا استعمال نہ کر سکے گا۔ اس نظام کے تحت کوئی بھی شخص خواہ کتنا ہی چالاک اور ہوشیار کیوں نہ ہو، غیر مناسب حصہ حاصل نہ کر سکے گا۔ اور اسے اپنی سرمایہ کاری پر واجب حصّہ ہی مل سکے گا۔ صنعت کار کو اور اسی طرح پراجیکٹ سے متعلق سائنس داں، ماہر ٹکنالوجی اور ماہر انتظامیہ کو زیادہ حصہ ملے گا جس سے کہ وہ اپنی زندگی آسائش سے گزار سکے گا۔ سرمایے کو جوڑنے کا موقع زیادہ نہ مل سکے گا۔ اور دولت چند ہاتھوں میں مرکوز نہ ہو سکے گی۔

آج ہماری زندگی متضادات کا شکار ہے۔ انسداد بدعنوانی کے نام پر مختلف اقدامات ہنسی ٹھٹھا بن کر رہ گئے ہیں۔ ہر شخص دوسرے کو بے ایمان سمجھتا ہے اور اس پر اخلاقی ذمہ داریوں کا بوجھ ڈالتا ہے۔ حالانکہ ہر شخص ذرا گریبان میں جھانکے تو کسی نہ کسی حد تک بدعنوانی کے جراثیم اس تک پہنچتے نظر آئیں گے۔

آج اوسطاً کوئی بھی صنعت کار یا تاجر ایک سے لے کر ۳ فیصد تک کی رقم ٹھیکہ یا لائسنس حاصل کرنے کے اخراجات کے طور پر خرچ کرنا جائز سمجھتا ہے۔ یہ فی صد تناسب ہر پراجیکٹ کے لیے جداجدا ہے۔ کچھ معاملوں میں یہ اور بھی زیادہ ہے۔ اس کا اندازہ نفع کی صلاحیت کی بنیاد پر لگایا جاتا ہے۔ اس خرچ کا حساب کتاب کوئی نہیں ہوتا۔ یہ کالے دھن کی صورت میں نکلتا ہے۔ اس کے لیے بجٹ بنے ہوتے ہیں اس طرح ان کے اخراجات کے تباہ کن اثرات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ آج کل دلّی کی ٹھاٹ باٹ والی آبادی میں مکان کی قیمت ۵ لاکھ روپے سے زیادہ ہے۔ دو کمرے والے فلیٹ کی قیمت ۲ لاکھ روپے کے قریب ہے۔ کیا ایسی صورت میں کوئی سرکاری ملازم جس کی پنشن ایک ہزار روپے ماہانہ ہوگی اور جس نے مشکل سے چند لاکھ روپے بچا لیے ہوں گے، اس طرح کا مکان بنوا سکتا ہے۔ فرض کیجیے کہ روپے کی قیمت میں ۲۰ فی صد گراوٹ آ گئی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مستقل اور بندھی ٹکی آمدنی والے خواہ اُن میں سے کسی کی تنخواہ ۴ ہزار روپے ماہانہ ہی کیوں نہ ہو، وہ بیس سال قبل کے حساب سے صرف ایک ہزار روپے پا رہے ہیں۔ بنکوں کی بچت میں اسی تناسب سے اضافہ نہیں ہو سکا ہے جس تناسب سے کہ روپے کی قیمت میں گراوٹ آئی ہے۔

اگر کسی عدالت کے جج کے پاس سکریٹری یا فوج کے جنرل کو ۱۹۴۷ میں ۳ ہزار روپے ماہانہ کے حساب سے مل رہے تھے تو آج اُن تین ہزار روپے کے پانے کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ محض قوتِ خرید کے حساب سے صرف ایک ہزار روپے پا رہا ہے۔ جبکہ اس سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ اپنا پہلا جیسا معیارِ زندگی برقرار رکھے۔ اسی طرح کی ایک ضرورت اس کی کار ہے۔ ۱۹۴۷ میں جس کی تنخواہ دو ہزار روپے تھی، وہ دس ہزار روپے سے لے کر ۱۵ ہزار روپے تک کی کار رکھ سکتا تھا، لیکن آج دو ہزار روپے صرف ۵۰۰ کے لگ بھگ رہ گئے ہیں، ایسی صورت میں ۵۰ ہزار روپے کی کار کون خرید سکتا ہے۔

بچّوں کی تعلیم کا بھی یہی معاملہ ہے۔ بچّے کے مستقبل کو بنانے کے لیے پبلک اسکول کی تعلیم ضروری سمجھی جاتی ہے اور مقابلے کے امتحانات میں یہی بچّے آتے ہیں۔ ان کی فیس ۲۰۰ سے ۳۰۰ روپے ماہانہ کے درمیان ہے۔ اب نمبروں کی بنیاد پر درجہ بندی بے کار ہو کر رہ گئی ہے، کیوں کہ ۸۰ فیصد نمبر پانے والا طالب علم بھی میڈیکل یا انجینیرنگ میں مشکل ہی سے داخلہ لے پاتا ہے۔ ۹۲ فیصد پر داخلے بند ہو جاتے ہیں۔

ہندوستان میں اگرچہ ڈاکٹروں اور انجینیروں سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ دیہی علاقوں کو اپنی سرگرمی کا مرکز بنائیں گے لیکن اکثر یہی لوگ باہر ملکوں میں پیسہ کمانے کی غرض سے آسامیوں کی تلاش میں رہتے ہیں۔ یہ لوگ امریکہ اور برطانیہ جاتے ہیں۔ یا پھر ہندوستان کے بڑے شہروں میں اپنی پریکٹس وغیرہ کرتے ہیں۔ صاحبِ زر اور صاحبِ اقتدار لوگ اس عادت سے کیسے باز رکھ سکتے ہیں۔ اس سلسلے کے مختلف علاج بے سود ثابت ہوتے ہیں۔ عادت کو درست کرنے کی کوشش میں چند ایک کو قربانی کا بکرا بنا دیا جاتا ہے۔

یہ بات سچ ہے کہ اقتصادی بنیادوں پر کوئی حقیقی انقلاب نہیں آ سکا ہے۔ مخصوص مفادات نے بڑی بڑی جائدادیں بنا لی ہیں۔ لسانی، علاقائی اور فرقہ وارانہ فسادات سے اُن پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ بلکہ اس کا شکار تو غریب بنتے ہیں۔ کچھ ایسے لوگ ہیں کہ بلا سے ملک تقسیم ہو تو ہونے دو، فوجی حکومت آتی ہے تو آنے دو۔ ایک مطلق العنان شخص سے نپٹنا آسان رہے گا۔ اس کے ساتھ چند افروں سے واسطہ ہوگا۔ سول سروس بھی متاثر نہیں ہوگی۔ وہ فوجی جنرلوں کے احکامات کی تابع ہو جائے گی مخصوص مفادات کے اختیارات کو بہر صورت قائم رکھنا ہوگا۔ کالا دھن بنانے والا طبقہ زندہ رہے گا۔ اس لیے سیاسی جمہوریت کے خطرے کا تعلق ان سیاسی قوتوں اور شہریوں سے ہے، جو کہ جمہوری آزادی اور جمہوری حقوق میں یقین رکھتے ہیں لیکن افسوس اس بات کا ہے کہ قومی سطح کے سیاستداں اپنے فوری مفادات سے پرے نہیں دیکھ پاتے اور اس لیے ان پر سے اعتماد اٹھتا جا رہا ہے اور علاقائی سطح پر نئی قوتیں ابھر رہی ہیں اور ہندوستانی قومیت کے مجموعی تصوّر کے لیے خطرہ ثابت ہو رہی ہیں۔

جانوروں کی افزائش کی سہولتیں میسر آنی چاہئیں سوروں کی پرورش اور مرغبانی کے ذریعے دیہی عوام کی آمدنی میں اضافہ ضروری ہے۔ اس سے ان کو پروٹین بھی مل سکے گا۔ مفید خلائق مویشیوں کے ذبیحے پر پابندی ہونی چاہیئے۔ اندرون ملک ماہی گیری کی ہمت افزائی کی جانی چاہیئے۔ گہرے سمندر سے مچھلیوں کے پکڑنے کے کام کو آگے بڑھانا چاہیئے۔ روایتی دستکاریوں کی ہمت افزائی کے لیے ان شعبوں کی مصنوعات کی فروخت کے واسطے مارکیٹنگ ادارے ہونے چاہیئں۔ ان کی برآمدات کی حوصلہ افزائی کی جائے اور اس کے لیے سہولتیں دی جائیں۔ اندرون ملک ان کی ہمت افزائی کے لیے بھی متعدد اقدامات ضروری ہیں۔

منصوبہ بندی کی حکمت عملی

منصوبہ بندی کا اصل مقصد افرادی قوت اور خام وسائل کا بھرپور استعمال ہے جس سے لوگوں کو نفع بخش کام مل سکے اور ملک کے نوجوانوں کے لیے روزگار کے مواقع نکل سکیں۔ یہ مقصد قومی صنعتی اور مارکیٹنگ تنظیموں کو حرکت میں لا کر حاصل کیا جا سکتا ہے اور متوازن ترقی کی راہ پر ملک کو آگے بڑھایا جا سکتا ہے۔

ملک کا اقتصادی ڈھانچہ ایسا ہونا چاہیئے کہ فاضلات چند ہاتھوں میں مرکوز نہ ہونے پائیں۔ انفرادی آمدنیوں پر خالص آمدن کے نصف سے سے زیادہ ٹیکس نہیں لگنا چاہیئے۔ ایک خاص سطح کے بعد آمدنی قومی ملکیت میں آجانی چاہیئے ملک میں انفرادی آمدنیوں میں ایک اور دس کی نسبت قائم کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ بنیادی ضرورتوں کی قیمتیں کم رہنی چاہئیں مثلاً پارچہ جات، ٹرانسپورٹ، مکانات، ادویات، تعلیم۔ ان کو رعایتی نرخ پر مہیا کیا جانا چاہیئے۔ ایسی صورت میں شخصی دولت کو جمع کرنے کی ضرورت باقی نہیں رہ جاتی اور اس عمل سے امیر اور غریب کا فرق بھی نہیں بڑھ سکے گا۔

عوام میں کفایت سے خرچ کرنے، ظاہری ٹھاٹ باٹ سے بچنے اور فضول خرچیوں سے منہ موڑنے کی عادت ڈالنی ضروری ہے۔ اس سے بحیثیت مجموعی اقتصادی منظر نامے پر خاطر خواہ اثرات مرتب ہو سکیں گے۔

مالی مراعات

ٹکنالوجی کے ساتھ ساتھ غیر ملکی سرمایہ کاری کی اجازت دینے کی صورت میں، اس بات کا دھیان رکھنا ضروری ہے کہ اس طرح کی کسی سرمایہ کاری پر ملکی سرمایہ اس وقت تک نہ لگایا جائے جب تک کہ وہ صنعت ترجیحی سیکٹر میں نہ آجائے۔

بیرونی سرمایہ کاری کے لیے روپے کی شکل میں اس کی واپسی کی اجازت نہیں دی جانی چاہیئے۔ یہ واپسی برآمدات کی آمدنی سے ہی ہونی چاہیئے یا غیر ملکی زر مبادلہ کی بچت سے ہونی چاہیئے جس کی زیادہ سے زیادہ حد ۳۰ فیصد ہو۔ اس مفاہمت کے بعد غیر ملکی سرمایہ کاری پر کوئی پابندی نہیں ہونی چاہیئے۔

صنعتی طور پر پسماندہ خطوں میں صنعتوں کو بڑھاوا دینے کے لیے تین سال تک یہ یقین دہانی دلانی ضروری ہے کہ وہاں سرمایہ کاری کے ماخذ کے بارے میں کوئی سوال نہیں کیا جائے گا۔ ان خطوں میں لگی ہوئی صنعتوں سے پانچ سال تک کوئی ٹیکس نہیں لینا چاہیئے۔

سرکاری ادارے چونکہ اشیائے صارفین کے سب سے بڑے گاہک ہیں، لہٰذا ان اداروں کو چھوٹے پیمانے کی صنعتوں سے مال خریدنے کو ترجیح دینی چاہیئے۔

اُن مالیاتی اداروں کو جو کہ قومی صنعتی اور مارکیٹنگ اداروں کے ساتھ مل کر کام کر رہے ہیں، چھوٹے کسانوں کی مالی امداد فراخدلی سے کرنی چاہیئے۔ انھیں چھوٹے پیمانے کی صنعتوں کی امداد بھی کرنی چاہیئے اور گھریلو صنعتوں کی حوصلہ افزائی کرنی چاہیئے۔ اور ان کے لیے سامان کی صورت میں کچا مال فراہم کرنا چاہیئے۔ ان کی سرگرمیوں کو مال کی فروخت کی سرگرمیوں سے جوڑ دینا چاہیئے تاکہ سرمایہ کاری سے بھرپور استفادہ کیا جا سکے۔

کارکنوں کا رول

اگر صنعتی اور تجارتی اداروں میں محنت کش طبقے کو انتظامیہ میں شریک کر لیا جائے اور ان اداروں سے حاصل ہونے والے نفع میں ان کا حصہ یقینی ہو جائے تو پھر ٹریڈ یونین تحریک کا تصور یکسر بدلنا پڑے گا۔ ایسی صورت میں ملازمین کی ایسوسی ایشن بہبودی سرگرمیوں پر توجہ دے گی جس سے معیارِ زندگی بڑھ سکے۔

اس طرح کی اقتصادی جمہوریت سے زیادہ سے زیادہ شہری معیشت کے پیداواری اور اشیاء کی تقسیم کے نظام سے وابستہ ہو سکیں گے اور تعلیمی و ثقافتی اداروں سے ان کی دلچسپیاں بڑھیں گی۔ یہ ادارے مختلف صنعتی تنظیموں کی سرپرستی میں آگے بڑھیں گے۔ یہ صنعتی ادارے کھیلوں کو بھی بڑھاوا دیں گے اور اپنے یہاں کھلاڑیوں کو روزگار دیں گے۔

نئے نظام کا اہم ترین پہلو یہ ہے کہ ہر صنعتی ادارہ اپنے کارکنوں کے لیے مکانات مہیا کرے گا۔ تجارتی ادارے بھی ایسا ہی کریں گے۔ اس سے گندی بستیوں کو روکا جا سکے گا اور تعمیر مکانات کے ذریعے بہت سے لوگوں کو روزگار مل سکے گا۔ سرکار کا کام چونکہ پالیسی بنانا اور اس کے عمل درآمد پر نگاہ رکھنا ہے، اس لیے مختلف صنعتی اور تجارتی سیکٹروں پر کافی عملا تعینات کیا جائے گا۔

سیاسی اور سماجی تال میل

قومی سطح پر جمہوری ڈھانچے کی موجودگی میں زیادہ سے زیادہ صرف دو بڑی سیاسی پارٹیوں کے قیام اور تشکیل کے لیے ہی کوشش کرنی چاہیئے۔

دوران گفتگو معلوم ہوا کہ وہ پاس کے علاقہ کا
ہنے والا ہے۔ اس کی بیوہ ماں ہے۔ ایک چھوٹی
ن اور بس۔ بچپن میں ہی وہ مفلوج ہو گیا تھا،
پ کے مر جانے کی وجہ سے اس کا علاج نہیں ہو
۔ اور ساتویں درجے کے بعد اس کی تعلیم بھی
ٹ گئی۔

وہ آہستہ آہستہ پالیش کرتا رہا۔

تمھاری ماں نے دوا علاج ...؟

"بابوجی! جب گھر میں روٹی کا ٹھکانا نہ ہو تو دوا علاج کیسے ہو؟... پھر دیدی پڑھتی ہے ماں جی محنت مزدوری کر کے جو کچھ ہوتا ہے دیدی کی پڑھائی پر خرچ کرتی ہیں۔"

"بابوجی! میرا کیا ..... دیدی کا ہی جیون بن جائے ... " اس کا لہجہ سرد ہو گیا۔

"تم ایسا کیوں سوچتے ہو..... سرکار نے تمھارے جیسے لوگوں کے لیے بہت کچھ انتظام کیا ہے، کئی ایسے مرکز قائم ہیں جن میں جسمانی طور پر بیکار لوگوں کو مناسب تعلیم و تربیت دیکر انھیں اس لائق بنا دیا جاتا ہے کہ وہ کسی پر بوجھ نہ رہیں۔"

"تمھیں کیا ہوا ہے۔ تم تو بہت لائق آدمی ہو۔" میں نے اسے تسلی دی، اس کی طرف ایک روپیہ کا سکہ بڑھا دیا اور اس کی آنکھوں میں چمک دوڑ گئی۔

"ہاں میں آؤں گا تو بتاؤں گا۔"

میری بس آگئی اور میں جلدی سے سوار ہو گیا۔

درمیان میں میرا ٹرانسفر ہو گیا تھا۔

آج عرصے بعد اس کی بیوہ ماں، یتیم بہن اور خود اس کے لیے کئی منصوبے لے کر میں ادھر آیا تھا۔

وہ مجھے حسب معمول دکھائی پڑا۔

مگر اُسے دیکھتے ہی میں چونک پڑا۔ وہ لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلائے بیٹھا تھا اور اسی کے سامنے کچھ سکے پڑے تھے۔

"یہ تم نے کیا کیا؟"

"اچھا خاصہ کام چھوڑ کیوں دیا؟"

"یہ تمھیں کس نے بتا دیا؟"

میں نے یکلخت کئی سوالات کر ڈالے۔ اس کی نگاہیں جھک گئیں۔

"کیا بتاؤں میں ادھر نہیں آسکا" میرا جی بھاری ہو گیا تھا۔

"بابوجی! کیا کرتا، لوگ محنت کا پیسہ بھی نہیں دینا چاہتے... مزدوری بھی بھیک سمجھتے ہیں... اپنی محنت کا پیسہ مانگنے پر بھی لوگ ناراض ہو جاتے ہیں۔ میں نے لوگوں کی ڈانٹ پھٹکار سُنی ہے، مار بھی کھائی ہے۔"

"بابوجی! جوتہ پوچھنا بُرا تو نہیں۔ پالش کر کے کھانا کوئی پاپ تو نہیں۔"

"نہیں۔"

"بالکل نہیں"۔ میرا لہجہ سرد تھا۔

"تو لوگ آخر کسی پالیش کرنے والے کو اتنا گرا کیوں سمجھتے ہیں؟"

اور تب ہی مجھے معلوم ہوا گویا اس نے سماج کی غیرت کو چیلنج دے کر خود معاشرے کو ذلیل کیا ہو۔

"کوئی کیسے جئے... بابوجی! دیدی بھی بڑی ہو گئی ہے!"

میں نے اس کا مطلب سمجھ لیا۔

"بھئی! آج تو میں تمھیں یہی ساری باتیں بتانے آیا تھا کہ تمھارا معقول انتظام ہو جائے گا۔ اور تمھاری دیدی کی شادی..."

"بابوجی! شادی تو ہو جائے مگر دیدی کے لیے جہیز کہاں سے آئے گا... اور پھر... میری تو ایک ہی بہن ہے۔"

اس کی آنکھوں سے کوئی چیز ٹوٹ کر گر پڑی اور میں کانپ اُٹھا۔ جیسے کسی نے مجھ پر ڈھیر سارے گولے برسا دیئے ہوں اور میں بکھر گیا ہوں۔

عرش کی بلندیوں تک پہنچنے والے انسان نے خلا نے ہاتھوں کتنی بے شمار کا سامنا کر لیا ہے!

چاند ستاروں کا سفر کرنا تو آسان ہے لیکن امن و سلامتی، خوشیوں اور زندگی کی تلاش شاید آج بھی مشکل ہے!۔

حیات مسرتوں کا سرچشمہ ہے۔

زندگی محدود خوشیوں، حوصلوں، ارمانوں کی امین ہے۔

زندگی سے، زندگی کی یہ پاکیزہ امانتیں کب تک چھنتی رہیں گی؟۔

کامران و کامیاب زندگی کا خواب انسان کا پیدائشی حق ہے اور شمار ماؤں کے خواب زندگی کے امانت دار ہیں۔ یہ خواب کب تک بکھرتے رہیں گے؟

فضا کی غلاظتوں، اسلحے کے مہلک اثرات پر نگاہ رکھنے والو! کاش دل کی وہ کثافتیں دیکھتے جو اندر ہی اندر انسانیت کے جسم میں زہر بن کر پھیلتی جا رہی ہیں۔

انسانیت ذلتوں کے بوجھ سے کتنا جھکے گی آخر؟

کیا اس کا کوئی مداوا نہیں؟

اور اگر نہیں، تو کیا آج کی ظاہری تہذیب و تمدن دکھوکھلی عظمت و بلندی، بے کار سجاوٹ اور بناوٹ کا آئندہ نسلیں مذاق نہیں اُڑائیں گی؟؟۔

میں سوالات کے ریلے میں بہا جا رہا ہوں۔ کاش کوئی کنارا مل جائے۔!!

نثار احمد زکی

طب یونانی قابل اعتماد طریقہ علاج

یونانی طریقہ علاج جو علاج و معالجہ کا قدیم ترین سسٹم ہے۔ ہزاروں سال سے اس دکھی دنیا کے انسانوں کو جسمانی امراض اور تکالیف میں صحت اور تندرستی بخشتا رہا ہے۔ جدید سائنس اور علم کیمیا میں حیرت انگیز ترقی کے جلو میں یوروپی علم طب اور طریقہ علاج نے چاردانگ عالم میں شہرت حاصل کرلی جس کے نتیجہ میں قدیم طریقہ علاج بڑی حد تک نیم مردہ اور جدید دور کے تقاضوں اور ضرورتوں کو پورا نہ کرنے والا تصور کیا جانے لگا۔ لیکن علم اپنے کمال کی وسعتوں کو چھپا نہیں سکتا ہے۔ قیمتی پتھروں پر آکر گرد و غبار کی تہہ جم جائے، تو وہ اپنے جوہر سے بے صفت نہیں ہو جاتے ہیں۔ یونانی طبی سسٹم بھی بیسویں صدی کے اوائل میں کسی حد تک گمنامی کی زندگی گذارنے کے بعد اب ایک نئی آب و تاب اور آن بان کے ساتھ منظرِ عام پر دوبارہ آرہا ہے۔ اس نے ثابت کر دیا ہے کہ علاج و معالجہ کی دنیا میں وہ ایک ایسی "ماں" کی حیثیت رکھتا ہے۔ جس کے بطن سے نت نئے طریقۂ علاج کی پیدائش ہوئی ہے۔ آج یہ سسٹم جلدی امراض، پیٹ کی متعلقہ بیماریوں، جگر اور دل کی خرابیوں اور عارضہ قلب میں دوسرے طریقہ علاج کے مقابلے میں زیادہ مفید، موثر اور سستا واقع ہوا ہے۔

اس طریقہ علاج کا ایک معمولی واقف کار بھی یہ جانتا ہے کہ اس کی ابتدا یونان میں ہوئی۔ سرزمین یونان نے بڑے بڑے باکمال فلسفیوں کو پیدا کیا ہے۔ اس دھرتی نے ایسے ایسے حکماء کو جنم دیا ہے۔ جن کے علم کی بنیاد پر جدید سائنسی علوم و فنون کی وسیع و عریض عمارتیں قائم ہیں۔ انھیں حکماء اور عظیم دانشوروں میں ہپوکریٹس (HIPPOCRATES) بھی تھے۔ وہ ۴۶۰ قبل مسیح میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے ہی اس عظیم علم کی بنیاد رکھی۔ جو یونانی طریقہ علاج کے نام سے مشہور ہوا۔ بعد ازاں عرب دنیا اس سسٹم سے واقف ہوئی، عربوں نے اس سسٹم میں مزید نئی باتوں کو شامل کیا۔ جس وقت عرب علم طب کی دنیا میں محیر العقول کارنامے انجام دے رہے تھے۔ اُس وقت یورپی دانشور علاج و معالجہ کی دنیا میں محض ابتدائیہ کا آموختہ پڑھ رہے تھے۔ اس کے ثبوت کے لیے اتنا بتا دینا کافی ہوگا کہ علم طب میں ۱۶۵۰ء تک یوروپی میڈیکل اسکولوں میں جو نصاب بنایا گیا تھا۔ اس میں مشرق کے عظیم سائینسداں، فلسفی اور مہندس حکیم بوعلی سینا کا قانون شریعت بھی شامل تھا۔ یوں تو عربوں نے اپنی ایماندارانہ فطرت کی بنا پر اس سسٹم کو یونانی عصر نظام طب کا نام دیا۔ اُس وقت تک اس طریقۂ علاج میں وسطی ایشیا کے ممالک، مصر، شام، فارس، ہندوستان، چین اور شرق وسطیٰ و مشرق بعید کے ملکوں میں اُس وقت رائج طریقہ علاج بھی شامل ہو چکا تھا۔

یہ تاریخی حقیقت ہے کہ عربوں سے طریقہ علاج ہندوستان میں آیا۔ اور ایک مختصر مدت میں یہ یہاں عرب، ایران اور ہندوستان کے اُس وقت کے موجودہ سسٹم سے مالا مال ہوگیا۔ ملک کے عوام کے مزاج اور یہاں کی آب و ہوا اس طریقہ علاج کے لیے بہت ہی سازگار ثابت ہوئی۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ ہندوستان میں جو یونانی طریقہ علاج آج رائج ہے۔ وہ اس سسٹم سے بالکل مختلف ہے۔ جس کی ابتدا یونان میں ہوئی تھی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ طریقہ جن ملکوں سے ہوکر گذرا وہاں کے مقامی سسٹم کو بھی قبول کرتا چلا گیا۔ اس کے نتیجہ میں یہ خوب سے خوب تر ہوتا گیا جو یونانی حکماء ہندوستان میں تھے۔ انھوں نے بھی اپنے سسٹم میں مقامی طریقوں اور دواؤں کی جانب توجہ دی۔ اور ان کو اپنے عمل میں شامل کرنے سے کبھی نہیں جھجکے علم اور تجربے سے مالا مال خزانے کے حامل اس طریقہ علاج نے جلد ہی عوام میں مقبولیت حاصل کرلی اور صدیوں تک پوری آب و تاب کے ساتھ ہر خاص و عام کی خدمت کرتا رہا۔

ہپوکریٹس نے سب سے پہلے بتایا تھا کہ مرض ایک نیچرل پراسس ہے۔ اس کی علامتیں مرض کے تئیں انسانی جسم کا ردِّ عمل ہیں۔ طبیب کا یہ کام ہے کہ وہ انسانی جسم میں قدرتی دفاعی قوت

: جہاں نما دہلی

کو مزید تقویت بخشی۔ اسی عظیم دانا نے طب کی دنیا کو اخلاط سے متعلق علم کے بارے میں بتایا اور اس طریقۂ علاج کو سائنس کی حیثیت دی۔ حکیم جالینوس نے اس کی مضبوط بنیادیں رکھیں، جن پر عرب حکما اور علما نے یونانی علم طب کی عظیم الشان عمارت کی بنیاد رکھی۔

انقلاباتِ زمانہ نے یورپی اور انگریزی طریقۂ علاج کی مقبولیت اور فروغ کے مواقع پیدا کئے۔ اس کا سبب یہ تھا کہ یونانی طب کے معالجین اور حکما نے اس میدان میں تحقیق اور جستجو کی راہ چھوڑ دی۔ جدید تہذیب کی برکتوں کے ساتھ مختلف قسم کے امراض پھیلتے رہے۔ تشخیص اور علاج کی جانب خصوصی توجہ نہیں دی گئی۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ یونانی طب فرسودہ اور یہ طریقۂ علاج غیر سائنسی سمجھا جانے لگا۔ دوسری افسوسناک بات یہ بھی تھی کہ اس سسٹم کو فرقہ پرستی، تعصب اور تنگ نظری کی آگ نے جھلسا دیا۔ یہ طریقۂ علاج ایک مخصوص مذہبی طبقے سے منسوب کر دیا گیا۔ کیونکہ ہندوستان میں مغلیہ عہد میں ایک مخصوص تہذیب نے پرورش پائی تھی اور ایک خاص کلچر ابھر کر سامنے آیا تھا۔ اس لیے اُس وقت کے بادشاہوں نے جب اس طریقۂ علاج کی سرپرستی کی تو حکما کا ایک خاص طبقہ وجود میں آیا۔ اس کا طرزِ لباس، زبان اور آداب اُس دور کی مسلم تہذیب سے مماثلت رکھتا تھا۔ انگریزوں کی حکومت کے دور میں جب اس ملک سے اُس مخصوص دور کے کلچر کو جس سے مسلمانوں کے دور کی عظمت کی ترجمانی ہوتی تھی بدیشی نکالا دیا جانے لگا۔ تب یونانی طب اور اس کی تابندہ روایتیں بھی ماضی میں کھوتی گئیں۔

بیسویں صدی کے اوائل میں مسیح الملک حکیم اجمل خاں نے جن کو اگر مشرق کا ابن سینا کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ یونانی طب میں ایک نئی روح پھونکی۔ حکیم صاحب اپنے وقت کے خداداد صلاحیت کے حامل انسان تھے۔ انھوں نے تحقیق و ریسرچ کا ایک ایسا [illegible] شروع کیا جو اس علم کے احیاء کی جانب نہایت ہی اہم قدم تھا۔ وہ دُنیا کے مختلف ملکوں میں گئے اور علاج و معالجہ کے قدیم و جدید طریقوں کا جائزہ لیا۔ اس فن پر چونکہ کتابیں شاذ و نادر دستیاب ہوتی تھیں۔ اس لیے حکیم اجمل خاں نے نشر و اشاعت کی جانب بھی توجہ دی۔ جس کے نتیجے میں ان کی دسیوں کتابیں مطبوعات کی شکل میں منظرِ عام پر آئیں۔

ملک کی آزادی کے بعد یونانی طب کی جانب توجہ دی گئی۔ حکومتِ ہند نے ۱۹۶۹ء میں انڈین میڈیسن اینڈ ہومیوپیتھی ریسرچ کونسل قائم کی۔ اس کونسل کے تحت طبِ یونانی پر جدید سائنس کی روشنی میں تحقیق و ریسرچ کا کام شروع کیا گیا۔ اس کونسل نے دسمبر ۱۹۷۱ء میں یونانی ادویات کے لیے حیدرآباد میں ایک سینٹرل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ قائم کیا۔ یہ انسٹی ٹیوٹ ۳۰ مارچ ۱۹۷۹ء سے آزادانہ طور پر کام کر رہا ہے۔ انسٹی ٹیوٹ ہذا کی زندگی ختم ہونے کے باوجود اس نے جو شاندار خدمات انجام دی ہیں۔ وہ ناقابلِ فراموش ہیں۔ یہاں مختلف ریسرچ اسکیموں پر بہت اچھا کام ہوا ہے اور ہو رہا ہے۔ بعد ازاں حکومتِ ہند نے یونانی سینٹرل ریسرچ کونسل قائم کی۔ اس کے قیام کی ابتداء میں اخراجات کے لیے سالانہ دس لاکھ روپے کی منظوری دی گئی تھی۔ لیکن ۱۹۸۸-۸۹ء کے رواں مالی سال میں اخراجات کے لیے کونسل کے بجٹ میں ایک کروڑ ۱۵ لاکھ ایک ہزار روپے مخصوص کئے گئے ہیں۔

حکومت نے طبِ یونانی کی ترقی کی جانب جو توجہ دی ہے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ اس طریقۂ علاج کے ذریعے مُلک کے عوام کو بھی خدمات بہم پہنچائی جا سکتی ہیں۔ کیونکہ یہ اس ملک کے عوام کے مزاج کے مطابق ہے۔ یہ علاج [illegible] سستا بھی ہے۔ [illegible] کو پورا کرتا ہے۔ یونانی سسٹم جڑی بوٹیوں پر انحصار کرتا ہے۔ یہاں کے قدرتی موسم ایسے ہیں کہ سیکڑوں اقسام کی جڑی بوٹیاں پیدا ہوتی ہیں۔ ان جڑی بوٹیوں کی حیرت انگیز صفتوں اور خوبیوں نے دُنیا کے دوسرے ترقی یافتہ ملکوں کے سائنسدانوں اور طبی ماہرین کو بھی اپنی جانب مائل کیا ہے۔ آج "بلڈ پریشر" کے مریض تقریباً دُنیا کے ہر ملک میں پائے جاتے ہیں۔ انگریزی دواؤں نے ابھی اس کا کوئی [illegible] دافع نہیں نکالا ہے۔ اس مرض کے کامیاب علاج کا سہرا ہندوستانی ابن سینا حکیم اجمل خاں کے سر چڑھتا ہے۔ حکیم صاحب کی اس کے لیے ایک دافع دوا "اسرول" ایجاد ہے۔ یہ دوا بہت ہی کامیاب ثابت ہوئی ہے۔ اس سسٹم میں معدنیاتی اشیاء اور جانوروں کے جسم سے حاصل ہونے والے اجزاء کے استعمال پر بھی خاص طور پر زور دیا گیا ہے۔ جوارش جالینوس اور خمیرہ آبریشم حکیم ارشد والا پیٹھا، امراض جگر و دل کے لیے زبردست شہرت کی حامل دوائیں ہیں۔

یونانی سینٹرل ریسرچ کونسل ایک جامع تحقیقی پروگرام پر گامزن ہے۔ سنہ ۲۰۰۰ء تک "سب کے لیے صحت" کا جو نشانہ مقرر کیا گیا ہے۔ اس میں کونسل بھی اپنی خدمات بدرجہ احسن بجا لانے کے لیے تیار ہے۔ سفید داغ، برص، ملیریا، فائیلیریا، پرانی خونی پیچش، دست وغیرہ جیسی موذی بیماریوں کے لیے مذکورہ کونسل نے کافی کام کیا ہے۔ اور ان امراض کے نوّے فیصد کامیاب علاج کی ایسی ضمانت دی جا سکتی ہے جس سے طب کی دُنیا میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا جا سکتا ہے۔ اور جب یہ اہم اور یادگار باب کے اضافے کا سہرا طبِ یونانی کے سر چڑھتا ہے۔

[illegible]

[illegible]

بینکوں کی طرف سے امداد

تمام بینکوں کو ریزرو بینک کے ذریعہ عائد کردہ Instructions یعنی احکامات اور ضابطہ کے تحت کام کرنا پڑتا ہے۔ اس طرح کا ایک working group جناب اے۔ گھوش کی سربراہی میں یکم مارچ ۱۹۸۲ء کو قائم کیا گیا جسے پتہ لگانا تھا کہ کس طرح سے ۲۰ نکاتی پروگرام کو موثر بنایا جائے۔ بینکوں کے لیے پالیسی وضع کرتے وقت خاص طور پر یہ دیکھا جاتا ہے کہ آبادی کا کتنا بڑا حصہ کتنا خوشحال ہے اور کتنا معاشی اعتبار سے پسماندہ ہے۔ ان اعداد و شمار Facts & figure کو سامنے رکھ کر ہی کوئی پالیسی وضع کی جاتی ہے۔ اس وقت پورے سال کے لیے یہ طے کر لیا جاتا ہے کہ کتنے لوگوں کے لیے کتنی رقم کی ضرورت ہے اور اس کا شرح سود کیا ہے۔ یہ باتیں طے پانے کے بعد ایک نشانہ سامنے آتا ہے اور اس کے مطابق کام کرنے کے احکام بینکوں کو جاری کیے جاتے ہیں۔ ان احکامات کی روشنی میں کتنا کام ہو رہا ہے نہیں اس کی رپورٹ ہر بینک کو اپنے ریجنل آفس کو بھیجنا ہوتی ہے وہ تمام شاخوں کی رپورٹ اکٹھا کر کے اپنے زونل آفس کو بھیجتا ہے پھر وہ اپنے سنٹرل آفس کو جہاں سے کہ پھر تمام اعداد و شمار کو یکجا کر کے ریزرو بینک کے متعلقہ ڈیپارٹمنٹ کو بھیج دیا جاتا ہے صرف اتنا ہی نہیں بلکہ ان رپورٹوں کی جانچ ہر بینک میں مختلف قسم کے Audit کے ذریعے وقتاً فوقتاً ہوتی رہتی ہے۔

قرض کی سہولت اس طور پر فراہم کرانے کے تاکہ کوئی بھی علاقہ یا طبقہ مروجہ اسکیم سے محروم نہ جائے اسے الگ الگ Sectors میں بانٹا ہے۔ یہاں ایسے صرف تین Sectors کا [illegible] زیر غور ہے۔

۱۔ ترجیحی زمرے

جیسا کہ نام سے ظاہر ہے اس کے تحت معاشی اعتبار سے بہت ہی پسماندہ طبقہ کو رکھا گیا ہے۔ اس میں خصوصیت سے ہریجن اور پسماندہ قبائل آتے ہیں۔ بینکوں کو انھیں قرض دینے میں نظر انداز نہیں کرنا ہے بلکہ اس کو اولیت دینا ہے۔ اور ...۴ تک کا قرض انھیں بہت ہی کم شرح سود پر دینا ہے۔ ۱۹۸۱ء میں کل ۳۱ فیصد قرض اس مد کے تحت دیا گیا۔ دیہی علاقے کی ترقی کے لیے Regional Rural Bank کی دسمبر ۱۹۸۱ء تک ۹۵،۴ شاخیں قائم کی گئیں جن کے ذریعے ۷،۴ کروڑ روپیہ تقسیم کیا گیا — ۱۹۸۵ء تک اس کی ...۹ شاخیں قائم کی جائیں گی۔

سماج کے کمزور طبقات

اس کے تحت ایسے کسان آتے ہیں جن کے پاس ۵ ایکڑ یا اس سے کم زمین ہو یا پھر بے زمین مزدور یا آزاد کردہ بندھوا مزدور یا بٹائی پر کام کرنے والے مزدور ان سب کے علاوہ کاٹیج انڈسٹریز یا سلائی بنائی کرنے والے کاریگر بھی اسی زمرے میں آتے ہیں ایسے لوگوں کی مدد ... ۲۵ روپے تک سے کی جاتی ہے تاکہ وہ اپنے کام کو اچھی طرح چلا سکیں اور خود کفیل ہو جائیں۔ پولٹری فارم یا ڈیری فارم کے لیے بھی اس کے تحت مدد کی جاتی ہے۔

بیس نکاتی پروگرام کے اٹھارویں نکتہ میں یہ بات واضح کر دی گئی ہے کہ ہر ایسے آدمی کو جو ہتھ کرگھے وغیرہ میں لگا ہوا اس کی مدد کی جائے تاکہ وہ اپنی ٹکنالوجی کو جدید بنا سکے اس میں بھی بینکوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ہے وہ بیس نکاتی پروگرام کے تحت کیے گئے وعدہ کو عملی جامہ پہنانے کے لیے بھرپور کوشش اور مدد کر رہا ہے۔ اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ پبلک سیکٹر کے بینکوں نے صرف ایگریکلچر (Agriculture) کے لیے ۱۱۲۳ کروڑ روپیہ کا قرض دسمبر ۱۹۸۱ء تک دیا جبکہ اس مدت میں ایگریکلچر سے منسلک دوسرے کاموں کے لیے اس نے ۳۱۹۱ کروڑ روپیہ دیا۔

زرعی شعبہ

ایگریکلچر کو نظر انداز کر کے ملک کی خوشحالی ناممکن ہے اس لیے چھٹے پنجسالہ منصوبے میں جہاں ۸۰-۱۹۷۹ء کے لیے ۲۵۵۰ کروڑ روپیہ قرض کی شکل میں دیا گیا تھا۔ وہاں ۸۵-۱۹۸۴ء تک کے لیے ۵۴۱۵ کروڑ روپے تک دینے کا تہیہ کیا گیا ہے اس مد میں قرض کھاد، بیج اور ٹریکٹر تک خریدنے کے لیے دیا جاتا ہے۔

غریب کسان اپنی غربت کی وجہ سے اکثر نہ تو کھاد ہی خرید سکتا تھا نہ ہی اچھے قسم کا بیج کھیتی کے لیے جدید آلات تو اس کے بس کی بات ہی نہ تھی۔ نتیجتاً ہندوستان کھیتی پردھان دیش ہوتے ہوئے بھی غلہ درآمد کرتا تھا۔

لیکن آج صورت حال یکسر بدل گئی ہے کسان کی حالت بالکل کایا پلٹ تو نہیں ہوئی ہے مگر اب وہ پہلے کی طرح دانے دانے کا محتاج نہیں ہے۔ بینک انھیں آسان شرح سود پر بیل، گائے، بیج اور کھاد خریدنے کو پیسے قرض کی شکل میں دے رہے ہیں۔ ان کی حالت میں رفتہ رفتہ سدھار بھی آ رہا ہے اگر ہم ۵۲-۱۹۵۱ء سے ۸۲-۱۹۸۱ء تک کا کھیتی میں ترقی کا اوسط نکالیں تو دیکھتے ہیں کہ ہر سال یہ ترقی قریب ۲،۷ فیصد ہے۔

آج ہمارا شمار دنیا کے غریب ملکوں میں ہوتے ہوئے بھی ترقی کے مقابلے میں حوصلہ افزا ہے کل کو ہمارا شمار بھی دنیا کے امیر ملکوں میں ہوگا کیونکہ ہمارے پاس Natural Resources بھی ہیں اور محنت کرنے والے ہاتھ بھی۔ ۱۹۳۰ء کے آس پاس جاپان کا شمار دنیا کے غریب ملکوں میں ہوتا تھا مگر وہ آج دنیا کے امیر ترین ملکوں میں سے ایک ہے۔

فی کس اوسط آمدنی کے لحاظ سے آج وہ تیسرے نمبر پہ ہے اس کی کامیابی کی وجہ اس کی پیداواری صلاحیت بڑھنی ہے جو اس نے کڑی محنت اور جدید ٹیکنک کے ذریعہ حاصل کی ہے۔

★

سیاسی پارٹیوں کے پاس اپنے فنڈ ہونے چاہئیں۔ اور ان کے پاس آمدنی کے اپنے وسائل ہونے چاہئیں۔ الیکشن کے لیے انھیں قومی خزانے سے رقم فراہم کی جانی چاہیئے۔ قومی سطح کی تجارتی اور صنعتی تنظیموں کو سماج دشمن سرگرمیوں مثلاً اسمگلنگ، ذخیرہ اندوزی اور کالا بازاری وغیرہ کی حوصلہ شکنی کرنی چاہیئے۔ سرکار قانون کی محافظ ہے، اس لیے اس کا فرض ہے کہ وہ مجرموں کو جلد سے جلد سزا دلوائے۔ عوامی عدالتوں میں بسرعت فیصلے کا اہتمام ہونا چاہیئے۔

نوجوانوں کو سماج کے مفید رکن بنانے نیز انھیں نفع بخش روزگار کے اہل بنانے کے لیے تعلیمی نظام بدلنا ضروری ہے۔ اس کے لیے یونی ورسٹیوں اور تعلیمی اداروں میں بنیادی تبدیلیاں لانی ہوں گی۔ تعلیمی اداروں کے نظم ونسق میں طلبا کی تنظیمیں معاون ہونی چاہئیں۔ اپنی شخصیت کے نکھار کے لیے نوجوانوں کو بھرپور موقع ملنا چاہیئے۔ ان میں از خود نظم وضبط کی عادت آنی چاہیئے اور تعلیمی اداروں سے بدنظمی اور تشدد کا خاتمہ ہونا چاہیئے۔

تعمیر مکانات، سڑکوں کی تعمیر، مواصلات، دریائی نظاموں کی تعمیر، نہروں کی تعمیر، زرعی خام مال پر مبنی صنعتوں اور ان کے سروس سنٹروں وغیرہ ایسے پراجیکٹوں میں نوجوانوں کو شریک کیا جانا چاہیئے۔ تاکہ یہ پراجیکٹ قومی تحریک کی صورت میں ابھر سکیں۔ مثال کے طور پر نیشنل یوتھ تحریک کو جواہر لال نہرو کے نام پر شروع کیا جا سکتا ہے۔

فنونِ لطیفہ اور قدیم ثقافت کے فروغ کے لیے خصوصی زور دیا جانا چاہیئے اور لوک سنگیت، رقص، ڈرامہ، وغیرہ کو از سرِنو زندہ کر کے انھیں آگے بڑھانا چاہیئے تاکہ نوجوانوں کا ثقافت کے لیے ذوق وشوق بڑھ سکے۔ یہ کام ملک گیر پیمانے پر انجام دیا جانا ہے۔

ان تمام مشوروں کا مقصد یہ ہے کہ ملک محض سب سے بڑی جمہوریت ہی نہ بن سکے بلکہ سب سے بڑے اقتصادی نظام کی بھی مالک ہو اور ترقی پذیر دنیا میں خاص طور پر اس کا اس حیثیت سے جانا پہچانا جانا بہت ضروری ہے۔ جب ہم نئے اقتصادی نظام کے تحت ترقی کرتے ہیں اور ہمارے پاس فاضلات کی رقم آتی ہے تو ترقی کے مزید امکانات سامنے آتے ہیں اور ملک کے عوام کا معیارِ زندگی بلند ہوتا ہے۔ اور ان کی سرگرمیاں گوناگوں بن جاتی ہیں۔ ہمیں عوام کا معیارِ زندگی بہتر بنانے کے لیے موثر فیصلے کرنے ہوں گے تاکہ ماحولیاتی اور معاشی توازن کو از سرِنو توانائی بخشی جا سکے۔ اور قابلِ کاشت زمین پر آبرسانی کی صلاحیت میں مزید ۵۰ فیصد اضافہ کیا جا سکے۔ اس سے کھیتی باڑی کی دنیا میں ایک نیا انقلاب آئے گا اور زراعت کو صنعت کے مانند آگے بڑھانے کا موقع مل سکے گا۔ اس سے مجموعی قومی آمدنی میں کم سے کم ۱۰ تا ۱۵ فیصد سالانہ اضافہ ہوگا نہ کہ ۲ تا ۳ فیصد جیسا کہ فی الحال ہے۔ اس مقصد کی خاطر مخصوص مفادات کو سمجھانا ہوگا کہ فضول خرچیوں پر مبنی تعیش پسندانہ اشیا کا لالچ چھوڑ دیں اور مخصوص مفادات کی طرف سے سوجھ بوجھ کے ساتھ ان کے تئیں خود ہی رکاوٹ پیدا ہوگی خاص کر سیاسی میدان میں۔ روایات میں پھنسے انتظامیہ کی طرف سے اس سلسلے میں کھڑی کی جانے والی رکاوٹیں خطرناک ہو سکتی ہیں۔

اس طرح کی اقتصادی جمہوریت، پُرامن انقلاب جمہوری طریقوں سے لانا چاہتی ہے۔ یہ کوئی معجزہ نہیں ہوگا۔ البتہ معاشی شعبوں کا مساویانہ، منصفانہ اور ایماندارانہ تعاون خاص اہمیت رکھتا ہے۔ اس کے لیے تعلیمی سطح پر تبدیلیاں لانی ہوں گی اور صحت اور حفظانِ صحت کے اصولوں میں ضروری تبدیلیاں لانی ہونگی۔

اس عمل سے پوری زندگی میں جو تبدیلی آئے گی، اس سے عوام کی پُرجوش شرکت کی توقع کی جا سکتی ہے۔ خاص کر نوجوان نسل کی ترقیاتی پروگراموں سے وابستگی کو یقینی بنایا جا سکتا ہے۔ یہ کام پورے جوشِ عمل اور صدق دلی سے انجام دینا ہوگا۔ ادھوری کوششیں بے سود ہوں گی نیم دلی سے کیئے گئے اقدامات ناکام رہیں گے اور ان کوششوں کا اُلٹا اثر ظاہر ہو سکتا ہے، لہٰذا اقتصادی جمہوریت کے فلسفہ پر تبادلۂ خیال پہلے سے بہت ضروری ہے۔ اس کے لیے اصلاح وبہتری کے اقدامات پر غور وخوض ضروری ہے لیکن جب اس موضوع پر فیصلہ کر لیا جائے تو پھر اس پر عمل درآمد کے لیے بھرپور کوشش کی جانی چاہیئے۔

مَیں ایک بار پھر کہوں گا کہ موجودہ نظام میں استحصال پسندی کے عنصر کے سبب اسے خطرہ ہے کیوں کہ ہمارے ملک کے عوام زیادہ تر غریب ہیں۔ سیاستداں، ماہرین اقتصادیات، تاجر عوام کی مشکلات پر آنسو بہا سکتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ مالی مجبوریوں اور وسائل کے محدود ہونے کے باعث مختلف شعبوں کی ترجیحات میں ان کا اپنا حصہ اور اپنا خیال زیادہ ہے۔ البتہ بیس نکاتی پروگرام کے تحت زیادہ سے زیادہ لوگوں کو غریبی کی سطح سے اوپر لانے کی کوشش کی جا سکتی ہے۔

تعمیر مکانات میں مصروف افراد کو ہی لے لیجئے۔ کسی نے کبھی یہ نہیں سوچا کہ بارش، سردی گرمی میں یہ لوگ کہاں قیام کریں گے اور ان کو کہاں سے لایا جاتا ہے۔ اسی لیے گندی بستیاں قائم ہوتی رہتی ہیں لیکن گندی بستیوں کی اصلاح و بہتری کی اسکیموں کو غیر کفایتی سمجھا جاتا ہے اور ان کے لیے اخراجات متعین کرنے والے ان اخراجات کو غیر کفایتی سمجھتے ہیں۔

معیشت کی بدحالی کا ایک سبب سماج کا وہ طبقہ بھی ہے جو نام ونمود کے لیے پیسہ

(باقی صفحہ ۔۔ پر)

حاصل کر سکیں۔

اقتصادی اسباب

طبی دیکھ بھال پر آنے والا بہت زیادہ خرچ

تاخیر کا ایک اہم سبب ہے۔ ہمارے مریضوں کی

اکثریت اس قدر غریب ہے کہ وہ روزمرہ کی کم از کم

ضروریات بھی بمشکل پورے کر سکتے ہیں۔ جب چھاتی کے

کینسر کا خطرہ پیدا ہوتا ہے جس کے لیے تشخیص کی خاطر

ہسپتال میں بار بار جانا ضروری ہوتا ہے تو وہ اکثر اسے

ٹال دیتے ہیں۔

سماجی اسباب

ہمارے مریضوں میں اکثر ایسے کسی بھی شخص سے

مشورہ حاصل کرنے کا رجحان پایا جاتا ہے جو مناسب

تشخیص اور آپریشن کے بغیر مرض کا علاج کر سکیں۔ اس

کا نتیجہ ہوتا ہے کہ چھاتی کے کینسر والی یہ عورتیں "شرطیہ"

علاج کرنے والے ڈاکٹروں اور حکیموں کا شکار ہو جاتی ہیں

جو نہ ہی ڈاکٹر ہوتے ہیں اور نہ ہی اُن کا علاج "شرطیہ"

ہوتا ہے۔

لیکن یہ نام نہاد ڈاکٹر اور کلینک چھاتی کے کینسر

کے ایسے مریضوں کا دوائیوں اور انجکشنوں وغیرہ سے

علاج کرتے رہتے ہیں۔ جب مریض کے پاس پیسے

ختم ہو رہتے اور وہ بیزار ہو جاتے ہیں تو وہ کسی دوسری

جگہ سے مشورہ پانے کے لیے مجبور ہو جاتے ہیں۔ یہ ایک

نہایت ہی افسوسناک امر ہے کہ تب تک بیماری بہت

زیادہ بڑھ چکی ہوتی ہے۔

نفسیاتی اسباب

ایسے نفسیاتی اور جذباتی اسباب کا ایک مکمل

سلسلہ موجود ہے جس سے چھاتی کے مرض بالخصوص کینسر

کے لیے ڈاکٹر سے مشورہ کرنے میں تاخیر ہو سکتی ہے مثالی

کے طور پر چھاتی کے کینسر کا خوف یا آپریشن یا مرض

کا ناقابل علاج ہونا، جھوٹی شرم اور مرض کے علم ہونے

کے نتیجے میں افسوس کا ہونا، اس کا طویل المدتی علاج،

ایک لڑکی کو اپنی ماں کے بارے میں روداد، جو

چھاتی کے کینسر میں مبتلا ہو چکی تھی۔

چھاتی کے کینسر کی ابتدائی تشخیص: چھاتی کے

کینسر سے متعلق پبلک یا ادارتی حتمی پروگرام کا ایک

بنیادی مقصد عورتوں کو مطلع کرنا اور یاد کرانا ہے کہ

اگر مرض کا ابتدائی مرحلے میں سراغ لگا لیا جائے اور

علاج کیا جائے تو اس کا علاج ہو سکتا ہے۔ چھاتی

کے کینسر کا از خود پتہ چلانا بھی ضروری ہے۔ کینسر کی ابتدائی

تشخیص میں یہ معاون ہے لہٰذا خواتین کو مشورہ دیا جاتا

ہے کہ وہ از خود اس کی شناخت کرنے کی کوشش ضرور کریں۔

خود معائنہ

چھاتی کے خود معائنے کا پہلا طریقہ ہے ایک

آئینے کے سامنے پستانوں کا معائنہ کرنا، کسی بغیر

مناسب گومڑ، صورت میں تبدیلی، نپل کی جسامت،

اس کے سکڑنے، جلد پر گڑھوں یا کسی سرخی نظر آنے

اور گھنڈی سے خون آلودہ مواد کے اخراج کی صورت

میں فوری طبی مشورہ کیا جانا ضروری ہے۔

دوسرا طریقہ ہے بستر، صوفے یا فرش پر

لیٹ کر چھاتی کو چھو کر معائنہ کرنا۔ ہر پستان کا باری

باری مخالف ہاتھ کی چپٹی انگلیوں سے دبا کر معائنہ

کیا جائے۔ چھاتی کے تمام حصوں کا نرمی سے باقاعدگی

کے ساتھ دبا کر معائنہ کیا جانا چاہیے۔ دیکھنا یہ ہے کہ کہیں

کوئی گومڑ یا دباؤ سے درد کا احساس تو نہیں ہوتا۔

جب عورتیں تیس کے دہے کے آخری برسوں میں

ہوں تو انہیں سال میں دو بار ایسا معائنہ کرنا چاہیے۔

یہ وہ عمر ہے جب پہلے پہل چھاتی کا کینسر شروع ہوتا

ہے۔ جب چھاتی کے خود معائنے کے بارے میں

کوئی شبہ ہو تو ڈاکٹر سے فوراً مشورہ کرنا چاہیے۔

ہسپتالی مرحلہ

ہسپتالی مرحلہ تب شروع ہوتا ہے جب

سرجن کی طرف سے مریض کے جسمانی معائنے اور

تشخیص پر مبنی کینسر کی حد کی نشاندہی کرنے کا

عمل شروع ہو جائے۔

چھاتی کے کینسر کے چار مرحلے ہیں۔

مرحلہ نمبر ۱: رسولی چھاتی تک محدود رہتی ہے۔

مرحلہ نمبر ۲: رسولی چھاتی تک محدود رہتی ہے لیکن

اسے چھو کر دیکھا جا سکتا ہے۔ اسی پہلو کی بغل میں

لمف کی گشتی گومڑیاں موجود رہتی ہیں۔

مرحلہ نمبر ۳۔ رسولی پھیلتی ہوئی چھاتی کے باہر چلی

جاتی ہے۔

ا۔ وہ جلد کو متاثر کرتی ہے یا چھاتی پر پھوڑا ہو

جاتا ہے۔

(ب) رسولی پھٹوں کے بغل کی رگوں کے نیچے جم جاتی

ہے۔

مرحلہ نمبر ۴: کینسر جسم کے دوسرے حصوں یعنی پھیپھڑوں

جگر اور ہڈیوں وغیرہ میں پھیل جاتا ہے۔

مداوا

۱۔ معائنہ (۲) علاج۔

معائنہ :۔ خون، پیشاب، چھاتی کا ایکسرے اور

بائیوپسی۔

بائیوپسی :۔ خوردبین سے چھاتی کی غیر معمولی بافت

یا گومڑ کا معائنہ، زخم یا مرض کی نوعیت کا تعین کرنے

کا واحد یقینی طریقہ ہے کہ چھاتی کو چھونے سے لوتھڑا

محسوس ہو، درد ہو یا نہ ہو۔ گشتی ہو یا نہ ہو اور وہ

کتنے ہی وقت سے موجود ہو اُس کی بائیوپسی ضرور

کرا لینی چاہیے۔ چھاتی کی بائیوپسی ایک ایسا عمل ہے

جس میں کوئی خطرہ نہیں ہے اور وہ مقامی طور پر پورے

جسم کو سُن کر کے کی جا سکتی ہے۔ بائیوپسی سے جو مواد

الگ کیا جائے وہ خوردبینی معائنے کے لیے ضرور دیا

جانا چاہیے۔ بعض اداروں میں چھاتی کی رسولی کی

سوئی سے بائیوپسی کی جاتی ہے۔ اور وہ نہایت

اطمینان بخش ہے بشرطیکہ معائنہ کار اس قسم کے طریقے

سے جانکاری رکھتا ہو۔

آل انڈیا انسٹی ٹیوٹ آف میڈیکل سائنسز میں

منجمد سیکشن کی بائیوپسی کی سہولیات میسر ہیں۔ یہ بائیوپسی

کا نہایت اطمینان بخش طریقہ ہے۔ سارے جسم کو

سُن کر کے سرجری سے بافت نکالی جاتی ہے۔ پھر

اس نمونے پر خاص عمل کیا جاتا ہے۔ ایک بڑے معائنہ

کار کی حیثیت سے سلائیڈ پر سٹین لگایا جاتا ہے اور

رسولی کی نوعیت کے بارے میں رپورٹ دی جاتی ہے۔

اُس طریقے سے سرجن کو تقریباً ۲۰ منٹ میں رپورٹ مل

کو مزید تقویت بخشے۔ اسی عظیم دانا نے طب کی دُنیا کو اخلاط سے متعلق علم کے بارے میں بتایا اور اس طریقۂ علاج کو سائنس کی حیثیت دی۔ حکیم جالینوس نے اس کی مضبوط بنیادیں رکھیں۔ جن پر عرب حکماء اور علماء نے یونانی علم طب کی عظیم الشان عمارت کی بنیاد رکھی۔

انقلاباتِ زمانہ نے یورپی اور انگریزی طریقۂ علاج کی مقبولیت اور فروغ کے مواقع پیدا کیے۔ اس کا سبب یہ تھا کہ یونانی طب کے معالجین اور حکماء نے اس میدان میں تحقیق اور جستجو کی راہ چھوڑ دی۔ جدید تہذیب کی برکتوں کے ساتھ مختلف قسم کے امراض پھیلتے رہے۔ تشخیص اور علاج کی جانب خصوصی توجہ نہیں دی گئی۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ یونانی طب فرسودہ اور یہ طریقۂ علاج غیر سائنسی سمجھا جانے لگا۔ دوسری افسوسناک بات یہ بھی تھی کہ اس سسٹم کو فرقہ پرستی، تعصب اور تنگ نظری کی آگ نے جھلسا دیا۔ یہ طریقۂ علاج ایک مخصوص مذہبی طبقے سے منسوب کر دیا گیا۔ کیونکہ ہندوستان میں مغلیہ عہد میں ایک مخصوص تہذیب نے پرورش پائی تھی اور ایک خاص کلچر ابھر کر سامنے آیا تھا۔ اسی لیے اُس وقت کے بادشاہوں نے جب اس طریقۂ علاج کی سرپرستی کی تو حکماء کا ایک خاص طبقہ وجود میں آیا۔ اس کا طرزِ لباس، زبان اور آداب اُس دور کی مسلم تہذیب سے مماثلت رکھتا تھا۔ انگریزوں کی حکومت کے دور میں جب اس ملک سے اُس مخصوص دور کے کلچر کو جس سے مسلمانوں کے دور کی عظمت کی ترجمانی ہوتی تھی دیس نکالا دیا جانے لگا۔ تب یونانی طب اور اس کی نمائندہ صلاحیتیں بھی ماضی میں کھو گئیں۔

بیسویں صدی کے اوائل میں مسیح الملک حکیم اجمل خاں نے جن کو اگر مشرق کا ابن سینا کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ یونانی طب میں ایک نئی روح پھونکی۔ حکیم صاحب اپنے وقت کے خداداد صلاحیت کے حامل انسان تھے۔ انھوں نے تحقیق و ریسرچ کا ایک ایسا سلسلہ شروع کیا جو اس علم کے احیاء کی جانب نہایت ہی اہم قدم تھا۔ وہ دُنیا کے مختلف ملکوں میں گئے اور علاج و معالجے کے قدیم و جدید طریقوں کا جائزہ لیا۔ اس فن پر چونکہ کتابیں شاذ و نادر دستیاب ہوتی تھیں۔ اس لیے حکیم اجمل خاں نے نشر و اشاعت کی جانب بھی توجہ دی۔ جس کے نتیجہ میں ان کی درجنوں کتابیں مطبوعات کی شکل میں منظرِ عام پر آئیں۔

ملک کی آزادی کے بعد یونانی طب کی جانب توجہ دی گئی۔ حکومتِ ہند نے ۱۹۶۹ء میں انڈین میڈیسن اینڈ ہومیوپیتھی ریسرچ کونسل قائم کی۔ اس کونسل کے تحت طبِ یونانی پر جدید سائنس کی روشنی میں تحقیق و ریسرچ کا کام شروع کیا گیا۔ اس کونسل نے دسمبر ۱۹۷۱ء میں یونانی ادویات کے لیے حیدرآباد میں ایک سینٹرل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ قائم کیا۔ یہ انسٹی ٹیوٹ ۳۰ر مارچ ۱۹۷۹ء سے آزادانہ طور پر کام کر رہا ہے۔ انسٹی ٹیوٹ ہذا کی زندگی مختصر ہونے کے باوجود اس نے جو شاندار خدمات انجام دی ہیں۔ وہ ناقابلِ فراموش ہیں۔ یہاں مختلف ریسرچ اسکیموں پر بہت اچھا کام ہوا ہے اور ہو رہا ہے۔ بعد ازاں حکومتِ ہند نے یونانی سینٹرل ریسرچ کونسل قائم کی۔ اس کے قیام کی ابتداء میں اخراجات کے لیے سالانہ دس لاکھ روپے کی منظوری دی گئی تھی۔ لیکن ۸۵-۱۹۸۴ء کے رواں مالی سال میں اخراجات کے لیے کونسل کے بجٹ میں ایک کروڑ ۱۵ لاکھ ایک ہزار روپے مخصوص کیے گئے ہیں۔

حکومت نے طبِ یونانی کی ترقی کی جانب جو توجہ دی ہے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ اسی طریقۂ علاج کے ذریعے مُلک کے عوام کو بھی خدمات بہم پہنچائی جا سکتی ہیں۔ کیونکہ یہ اس ملک کے عوام کے مزاج کے مطابق ہے۔ یہ علم کے معیارِ زندگی اور ان کے تقاضوں [illegible] کو پورا کرتا ہے۔ یونانی سسٹم جڑی بوٹیوں پر انحصار کرتا ہے۔ یہاں کے قدرتی موسم ایسے ہیں کہ سیکڑوں اقسام کی جڑی بوٹیاں پیدا ہوتی ہیں۔ ان جڑی بوٹیوں کی حیرت انگیز صفتوں اور خوبیوں نے دُنیا کے دوسرے ترقی یافتہ ملکوں کے سائنسدانوں اور طبی ماہرین کو بھی اپنی جانب مائل کیا ہے۔ آج "بلڈ پریشر" کے مریض تقریباً دُنیا کے ہر ملک میں پائے جاتے ہیں۔ انگریزی دواؤں نے ابھی اس کا کوئی مکمل دافع نہیں نکالا ہے۔ اس مرض کے کامیاب علاج کا سہرا ہندوستانی ابن سینا حکیم اجمل خاں کے سر چڑھتا ہے۔ حکیم صاحب کی اس کے لیے ایک دافع دوا "امرل" ایجاد ہے۔ یہ دوا بہت ہی کامیاب ثابت ہوئی ہے۔ اس سسٹم میں معدنیاتی اشیاء اور جانوروں کے جسم سے حاصل ہونے والے اجزاء کے استعمال پر بھی خاص طور پر زور دیا گیا ہے۔ جوارش جالینوس اور خمیرہ آبریشم حکیم ارشد والا پیٹ، امراض جگر و دل کے لیے زبردست شہرت کی حامل دوائیں ہیں۔

یونانی سینٹرل ریسرچ کونسل ایک جامع تحقیقی پروگرام پر گامزن ہے۔ سنہ ۲۰۰۰ء تک "سب کے لیے صحت" کا جو نشانہ مقرر کیا گیا ہے۔ اس میں کونسل بھی اپنی خدمات بدرجہ احسن بجا لانے کے لیے تیار ہے۔ سفید داغ، برص، ملیریا، فائیلیریا، پرانی خونی پیچش، دست وغیرہ جیسی موذی بیماریوں کے لیے مذکورہ کونسل نے کافی کام کیا ہے۔ اور ان امراض کے ننانوے فیصد کامیاب علاج کی ایسی ضمانت دی جا سکتی ہے جس سے طب کی دُنیا میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا جا سکتا ہے۔ اور جب کہ اس اہم اور ریکارڈ باب کے اضافے کا سہرا طبِ یونانی کے سر جاتا ہے۔

میں کیمپ پر ایک ہیلی پیڈ بھی تیار کرلیا گیا ہے۔ جس پر سے کسی بھی موسم میں ہیلی کوپٹروں کو اُڑایا یا اُتارا جا سکتا ہے۔ یہ آسانی سے ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنے والے ہیلی پیڈ کو محکمۂ دفاع کی تحقیق و ترقی سے متعلق تنظیم Defence Research and Development Organisation نے تیار کیا تھا۔ دو منزلہ عمارت انٹارکٹیکا میں تیار ہو چکی ہے جس میں ہمارے سائنس داں مستقل طور پر وہاں رہیں گے اور سائنسی تجربات کرتے رہیں گے۔ اس اسٹیشن میں اندرونی درجۂ حرارت ۱۵ سے ۱۷ ڈگری سیلسیس رہے گا جو بہت آرام دہ گرمی ہے جس سے ہمارے سائنس دانوں کو کام کرنے میں سہولت ہوگی۔ اس عمارت میں تفریحی آسانیاں بھی مہیا کی گئی ہیں مثلاً ٹیبل ٹینس کھیلنے سے لے کر تاش، کیرم اور دوسرے اندرونی خانہ کھیلوں کا انتظام کیا گیا ہے۔ ویڈیو کیسیٹ ریکارڈرس بھی وہاں رکھے گئے ہیں اور ہندوستانی کلاسیکل سنگیت کے ریکارڈورس بھی وہاں سائنس دانوں کی تفریح کے لیے رکھے گئے ہیں۔

باہر برف پر فٹ بال کھیلنے یا باکسٹ بال کھیلنے کا بھی انتظام کردیا گیا ہے۔ خالی اوقات میں سائنس دانوں کو دوسری بین الاقوامی زبانوں کے سیکھنے کے لیے لنگوافون کا بھی انتظام کیا گیا ہے۔ یہ عمارت ۲ تجربہ گاہوں اور ایک لائبریری اور ریڈنگ روم پر مشتمل ہے۔ کچن میں بہتے ہوئے نل کے گرم پانی کا بھی انتظام کردیا گیا ہے۔ برف کو پگھلانے کی مشین بھی اس عمارت میں نصب کردی گئی ہے۔ کپڑے دھونے کی مشین اور سنٹرل ایر کنڈیشن کا بھی انتظام کردیا گیا ہے۔

اس عمارت میں ۱۵ آدمی رہ سکتے ہیں۔ عمارت کے باہر برف پر چلنے والی گاڑیوں کے ٹھہرانے کے لیے جگہ مہیا کردی ہے۔

انٹارکٹیکا کا جغرافیائی تجزیہ: انٹارکٹیکا دُنیا کے جنوب ترین حصے کے بالکل وسط میں واقع ہے، جس کا رقبہ تقریباً ۱۴ ملین مربع کلومیٹر ہے۔ یہ دنیا کا سب سے ٹھنڈا، سب سے زیادہ خشک سب سے زیادہ تیز ہواؤں کا برفیلا ریگستان ہے اور ساتوں براعظموں میں سب سے زیادہ مشکل پہونچ کا براعظم ہے۔

براعظم انٹارکٹیکا چاروں طرف سمندروں سے گھرا ہوا ہے۔ اس کے شمال مشرق میں بحرِ ہند پھیلا ہوا ہے۔ شمال میں بحرِ اٹلانٹک ہے اور مغرب اور جنوب میں بحرالکاہل اس کو اپنے آغوش میں لیے ہوئے ہے۔

انٹارکٹیکا کے ساحلی علاقے بحرِ جنوبی سے گھرے ہوئے ہیں۔ شمال مغربی حصہ ویڈیل سی سے گھرا ہوا ہے۔ ویڈل سی کے شمال مغرب میں اسکوشیا سی ہے جس میں فاک لینڈ آئی لینڈ اور ساؤتھ سینڈوچ آئی لینڈ ہیں۔ انٹارکٹیکا کے جنوبی حصے میں ساحلی علاقہ روس سی (Ross Sea) سے گھرا ہوا ہے۔

انٹارکٹیکا کے شمالی حصے کو کوئین موڈ لینڈ کہتے ہیں۔ یہ ناروے کی املاک ہے۔ گراہم لینڈ برطانیہ کی املاک میں آتا ہے۔ اس میں ویڈیل سی اور الیگزینڈر آئی لینڈ شامل ہیں۔ جنوبی علاقہ ایلسورتھ ہائی لینڈ ہے جس میں بائرڈ لینڈ اور روک فیلر پلیٹو شامل ہیں۔ یہ امریکہ کی املاک میں ہے۔ وکٹوریہ لینڈ اور ولکیز لینڈ آسٹریلیائی املاک میں شامل ہیں۔ جنوب مشرق کا تھوڑا سا حصہ فرانس کی املاک میں ہے۔ یہ سارے براعظم کو مختلف ملکوں نے اپنے املاک میں شامل کیا تھا۔ مگر ۱۹۵۹ء کے بین الاقوامی معاہدے میں یہ بات طے ہوئی تھی کہ مستقبل میں انٹارکٹیکا کسی ملک کی ملکیت نہیں ہوگا بلکہ اس کو صرف سائنسی تجربات اور پُر امن مقاصد کے لیے استعمال کیا جائے گا۔ اور اس پر ایٹمی دھماکہ بھی نہیں کیا جائے گا۔

ہندوستان اور انٹارکٹیکا کے درمیان پانی کی ایک چادر ہے جس کو بحرِ ہند کہتے ہیں۔ اور اسی لیے ہندوستان سے انٹارکٹیکا براہ راست پہونچنے کے لیے صرف بحرِ ہند کو طے کرنا ہوتا ہے۔

انٹارکٹیکا میں قطب جنوبی بھی واقع ہے جس تک پہونچنے کے لیے اُمنڈسین پہلے سیاح تھے جو دسمبر ۱۹۱۱ء میں پہونچے تھے۔ اس کے بعد اسکاٹ جنوری ۱۹۱۲ء میں ساؤتھ پول تک پہونچے۔ ہلیری اور فکس بالترتیب ۴ جنوری اور ۱۹ جنوری ۱۹۵۸ء کو قطب جنوبی پر پہونچے تھے۔

تیسری سائنسی مُہم کے مقاصد

تیسری ہندوستانی سائنسی مُہم کا سب سے بڑا مقصد یہ ہے کہ انٹارکٹیکا میں وہ ایک مستقل سائنسی تجربہ گاہ قائم کرے تاکہ ہندوستانی سائنس داں وہاں مستقل رہ کر تجربات کرتے رہیں۔ اس طرح ہندوستان دوسرے ممالک کی دوڑ میں شانہ بشانہ رہے گا۔ دکھن گنگوتری پر مشتمل تجربہ گاہ سائنس کی دُنیا میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھے گی جس سے ہندوستان کا وقار دنیا کے دوسرے ممالک میں بہت بڑھ جائے گا۔

اس کے علاوہ دوسری مہم نے جو سائنسی آلات انٹارکٹیکا میں چھوڑے تھے اُن کی جانچ پڑتال کرنا، موسمی اعداد و شمار حاصل کرنا۔ فضا میں موسم کے اعتبار سے جو تبدیلیاں رونما ہوں گی اُن کے اعداد و شمار حاصل کرنا بھی اس مُہم کا مقصد ہے۔ وہ چھوٹی ٹیم جو ۹ ماہ تک وہاں رُکی ہے وہ یہ سارے سائنسی تجربات کرتی رہے گی۔ اس ٹیم میں ۱۲ ممبران ہیں ——— جو لیفٹیننٹ کرنل ایس۔ ایس۔ شرما کی قیادت میں کام کرتی رہے گی۔

سائنس دانوں کا خیال ہے کہ انٹارکٹیکا میں بیش بہا معدنیات کا ذخیرہ ہے جن میں کوئلہ، تیل اور گیس کے بہت بڑے ذخیرے موجود ہیں۔ ان کے علاوہ یورینیم جیسی قیمتی دھاتیں بھی وہاں